تاریخ

دعوت و عزیمت

حصّہ اوّل

عالم اسلام کی اصلاحی و تجدیدی کوششوں کا تاریخی جائزہ
نامور مصلحین اور ممتاز اصحابِ دعوت و عزیمت کا مفصل تعارف
ان کے علمی کارناموں کی روداد اور ان کے اثرات و نتائج کا تذکرہ

مفکر اسلام مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ

مجلس نشریاتِ اسلام
۱۔کے۔۳ ناظم آباد مینشن۔ ناظم آباد ۱ کراچی ۱۸

مفکر اسلام مولانا سیّد ابوالحسن علی ندوی رح

اپنی حیات میں مندرجہ ذیل اداروں کے ذمہ دار رہے

- ناظم دار العلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ
- رکن مجلس شوریٰ دار العلوم دیوبند
- صدر مجلس تحقیقات ونشریات اسلام لکھنؤ
- صدر مجلس انتظامی ومجلس علمی دار المصنفین اعظم گڑھ
- رکن عربی اکادمی دمشق
- رکن مجلس شوریٰ جامعہ اسلامیہ مدینہ منورہ
- رکن مجلس تاسیسی رابطہ عالم اسلامی مکہ معظمہ
- رکن مجلس عاملہ موتمر عالم اسلامی بیروت
- صدر آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ
- صدر رابطۃ الادب الاسلامی العالمیۃ
- رکن مجلس انتظامی اسلامک سینٹر جنیوا
- سابق وزیٹنگ پروفیسر دمشق یونیورسٹی و مدینہ یونیورسٹی
- صدر آکسفورڈ سینٹر فار اسلامک اسٹڈیز آکسفورڈ یونیورسٹی آکسفورڈ۔

نام کتاب ـــــــــ تاریخ دعوت وعزیمت (حصہ اول)
تصنیف ـــــــــ مفکر اسلام مولانا سیّد ابوالحسن علی ندوی رح
طباعت ـــــــــ احمد برادرز پرنٹنگ پریس۔ کراچی
ضخامت ـــــــــ ۳۶۴ صفحات
ٹیلیفون : ۶۶۰۱۸۱۴

اسٹاکسٹ: مکتبہ ندوہ قاسم سینٹر اردو بازار کراچی

ناشر

فضل ربی ندوی

مجلس نشریات اسلام ۱۔ کے۔۳ ناظم آباد مینشن۔ ناظم آباد نمبر ۱ کراچی ۷۴۶۰۰

تاریخ دعوت وعزیمت

(حصّہ اوّل)

عربی ـــــــــــ کویت و بیروت

انگریزی ـــــــــــ لکھنؤ، کراچی

اردو ـــــــــــ لکھنؤ

اردو ـــــــــــ کراچی

فہرست

تاریخ دعوت وعزیمت

حصۂ اول

نورالدین زنگیؒ اور صلاح الدین ایوبیؒ
۲۵۲ - ۲۸۶

شیخ الاسلام عزالدین بن عبدالسلامؒ
۲۸۷ - ۳۰۲

فتنۂ تاتار اور اسلام کی ایک نئی آزمائش ۳۰۳-۳۳۴

مولانا جلال الدین رومیؒ

۳۱۰ – ۴۰۰

دیباچہ طبع دوم

"تاریخ دعوت وعزیمت" حصہ اوّل کے دوسرے ایڈیشن پر ناچیز مصنفِ کتاب اللہ تبارک وتعالیٰ کے حضور میں بہ ہزار زبان ثنا خواں اور سپاس گذار ہے۔

اس حصہ کے دوسرے ایڈیشن کی نوبت کئی سال کے وقفہ کے بعد آرہی ہے، لیکن اس کی وجہ کاتبوں کی نایابی، طباعت کی دشواریوں، اور مصنف کی بڑھتی ہوئی مصروفیت کے سوا کچھ نہیں، ورنہ یہ کتاب برصغیر ہند کے علمی و دینی حلقوں میں جس طرح مقبول ہوئی، اور جس طرح اہل علم، اور اہل قلوب نے اس پر اپنے تاثرات کا اظہار کیا، اور اس کے پہلے ایڈیشن کے ختم میں جتنا طویل عرصہ گذر چکا ہے، اس سب کا قدرتی تقاضا تھا کہ اس وقت تک اس کے متعدد ایڈیشن نکل چکے ہوتے، لیکن اردو کتابوں کی طباعت میں اب جو دشواریاں پیدا ہوگئی ہیں، اور جن کا اندازہ کچھ مصنفین ہی کو ہے، انھوں نے اس کتاب کی اشاعت دوم میں غیر معمولی تاخیر پیدا کردی، اس کے لئے مصنف کتاب متأسف بھی ہے، اور معذرت خواہ بھی۔

کتاب کے مضامین و مواد میں تعداد و عنوانات کے لحاظ سے کوئی بڑا اضافہ نہیں ہوا، لیکن جو کچھ ہوا وہ وقیع اور قابل لحاظ ہے، اور اس سے کتاب کی قیمت وافادیت میں ضرور اضافہ ہوتا ہے، ان میں دو اضافے ضرور قابل ذکر ہیں، ایک عنوان "فتنۂ تاتار اور اسلام کی ایک نئی آزمائش" کے تحت تاتاری حملہ اور اس کے اسباب کے مضمون کا اضافہ کیا گیا ہے، اس میں (مصنف کی معلومات کی حد تک) اس وقت کے عالم اسلام کے اخلاقی، معاشرتی

دینی، روحانی اور سیاسی حالات کا پہلی مرتبہ جائزہ لیا گیا ہے، اور اس فتنۂ عالم آشوب اور طوفان بلاخیز کے باطنی اور غیبی اسباب کو قرآن مجید کی مشعل ہدایت لے کر اور الٰہی قانون مجازاۃ کی مدد سے معلوم کرنے، اور ان کو واضح کرنے کی کوشش کی گئی ہے، مواد اور وقت دونوں کی کمی، اور مصنف کی بعض معذوریوں کی بنا پر اس باب میں اضافہ اور ترقی کی بڑی گنجائش ہے، لیکن یہ ایک ابتدائی کوشش اور ایمانی فکر و نظر کا ایک نمونہ ہے، جس کو بہت آگے بڑھایا جا سکتا ہے، بایں ہمہ وہ اس موجودہ حالت میں بھی عبرت و بصیرت اور درس و موعظت سے خالی نہیں، دوسرا اضافہ مقدمہ کتاب میں "دوسرے مذاہب کی تاریخ میں تجدیدی شخصیتوں کی کمی" کے زیرِ عنوان کیا گیا ہے، جس میں مسیحیت، اور ہندومت کی اصلاح و تجدید کے بارے میں کچھ نئے معلومات کا اضافہ کیا گیا ہے، ان دو اضافوں کے علاوہ اس نئے ایڈیشن میں صرف پہلے ایڈیشن کے اغلاط کی تصحیح اور قلیل التعداد جزوی ترمیمات ہیں۔

اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ مصنف کی یہ سعی مقبول ہو، اس سلسلہ کی ترتیب میں جو مقاصد پیش نظر رہے ہیں، اور جن کا تذکرہ "پیش لفظ" میں کیا گیا ہے، ان کی تکمیل ہو۔

وَمَا تَوْفِيقِيْ إِلَّا بِاللّٰهِ عَلَيْهِ تَوَكَّلْتُ وَإِلَيْهِ أُنِيْبُ۔

ابوالحسن علی ندوی

دائرۂ شاہ علم اللہؒ رائے بریلی

۳؍صفر المظفر ۱۳۸۹ھ
۲۱؍اپریل ۱۹۶۹ء دوشنبہ

پیش لفظ

محرم ۱۳۷۲ھ میں لکھنؤ میں جماعت دعوت اصلاح و تبلیغ کی طرف سے انتظام کیا گیا کہ رفقاء کے سامنے ضروری عنوانات اور پہلوؤں پر تقریریں کی جائیں اور ان کی واقفیت اور ذہنی تربیت کا سامان بہم پہونچایا جائے، ان تقریروں اور مضامین کا سلسلہ ایک ہفتہ جاری رہا، اس تربیتی ہفتہ میں ایک طویل اور مسلسل عنوان "اصلاح و تجدید کی تاریخ اور اس کی اہم شخصیتیں" تھا، یہ عنوان راقم سطور کے حصہ میں آیا تھا، اور تقریباً ایک ہفتہ اس موضوع پر عرض کیا جاتا رہا، اس وقت صرف ایک مختصر یادداشت سامنے ہوتی تھی جس میں کچھ عنوانات اور اشارے ہوتے تھے، احباب اس کا خلاصہ اپنے طور پر محفوظ کر لیتے تھے۔

بعد میں اشاعت کی نیت سے جب اس پر نظر ڈالی تو محسوس ہوا کہ یہ کام بڑی توجہ اور اطمینان سے کرنے کا ہے اور یہ ایک اہم تاریخی موضوع ہے جس پر (ہمارے محدود علم کے مطابق) کوئی مفصل اور مکمل چیز موجود نہیں، اور یہ تاریخ اسلام اور ادبیات اسلامیہ کا ایک بڑا خلا ہے جس کو جلد پر ہونا چاہئے، اس خلا کے موجود ہونے کی وجہ سے اچھے اچھے سنجیدہ حلقوں میں یہ خیال قائم ہو چکا ہے کہ اسلام اور مسلمانوں کی تاریخ میں اصلاح و تجدید اور انقلاب حال کی کوشش مسلسل اور غیر منقطع طور پر نہیں پائی جاتی، بلکہ اس میں بڑے طویل طویل خلا ہیں، جو صدیوں پر پھیلے ہوئے ہیں، کئی کئی سو برس کے بعد کچھ شخصیتیں ابھرتی رہی ہیں، جنھوں نے حالات سے کشمکش کی، اور جو فکری اور عملی حیثیت سے کوئی ممتاز مقام رکھتی ہیں، ورنہ عام طور پر متوسط درجہ کے لوگ نظر آتے ہیں، جو فکری اور عملی

حیثیت سے عہدِ انحطاط کی عام سطح سے بلند نہیں تھے اور جن کے علمی و عملی کارناموں میں کوئی جدت اور ندرت نہیں پائی جاتی صرف چند گنی چنی شخصیتیں (جن کی تعداد ۷۔۸ سے زیادہ نہیں سمجھی جاتی) اس کلیہ سے مستثنیٰ ہیں۔

یہ بات دیکھنے میں بڑی معمولی معلوم ہوتی ہے، مگر اس کے نتائج بڑے اہم اور دور رس ہیں، یہ اسلام کی اندرونی طاقت و صلاحیت سے ایک طرح کی بدگمانی اور مایوسی ہے، جو ہر زمانہ میں ضرورت کے آدمی اور اہلِ دعوت و عزیمت کو پیدا کرتی رہی ہے اور جس کی نظیر کسی دوسرے مذہب اور قوم میں نہیں ملتی، یہ ایک احساسِ کہتری اور ذہنی شکست خوردگی ہے جس کی کوئی علمی بنیاد نہیں۔

لیکن یہ نتیجہ بے سبب نہیں، بدقسمتی سے تاریخ اسلام کے وسیع ذخیرہ میں یا تو وہ کتابیں ملتی ہیں، جن کو واقعات کی "فہرست" کہنا صحیح ہے اور جن کی مرکزی شخصیت بادشاہوں کی ذات ہے، یا چند نمایاں شخصیتوں کی سوانح (تراجم و تذکرے) مگر اسلام اور مسلمانوں کی کوئی مسلسل فکری اور اصلاحی تاریخ نہیں، جن میں ان تمام شخصیتوں کی تحریکوں کا تعارف ہو، جنھوں نے عالمِ اسلام پر گہرا اثر ڈالا ہے، اور اسلام کی بروقت حفاظت یا تجدید و تقویت کی خدمت انجام دی ہے، غلط رجحانات کی اصلاح اور فتنوں کا سدِ باب کیا ہے، اور اسلام کے فکری اور علمی ذخیرہ میں کوئی قابلِ قدر اضافہ کیا ہے، درحقیقت اسلام کے سلسلۂ دعوت و اصلاح میں خلا نہیں، تاریخ اسلام کی ترتیب و تالیف میں خلا ہے، اس خلا کا پر کرنا وقت کا ایک ضروری کام اور ایک اہم دینی و علمی خدمت ہے۔

اس کام کی تکمیل سے نہ صرف اصلاح و دعوت کی تاریخ مرتب ہو جائے گی، بلکہ ضمناً مسلمانوں کی فکری و علمی انحطاط و ارتقاء کی تاریخ بھی وجود میں آجائے گی۔

لیکن جب اس موضوع پر قلم اٹھایا گیا تو معلوم ہوا کہ یہ ایک مقالہ یا رسالہ کا مضمون نہیں ہے، یہ ایک اہم اور ضخیم تصنیف کا موضوع ہے، اس کے لئے تاریخ کو دوبارہ پڑھنا ہوگا، اور اس کو ایک خاص انداز سے مرتب کرنا ہوگا، اس کے لئے صرف تاریخ عام کا جائزہ لینا کافی نہ ہوگا، بلکہ مذاہب و فرق، علوم و فنون کی تاریخ اور تراجم و تذکرے کی کتابوں کو اس نظر سے دیکھنا ہوگا، واقعہ یہ ہے کہ یہ مضمون جس سکون و اطمینان اور فرصت کا طالب ہے، وہ اس

پریشان اوقات کی زندگی میں بہت کمیاب ہے، پھر بھی ضرورت کے احساس نے اس موضوع پر قلم اٹھانے پر مجبور کیا، اور طبیعت کی افتاد سرسری طور پر گذرنے سے مانع ہوئی۔

یہ بات ناظرین کرام کے پیشِ نظر رہے کہ اس کتاب میں ہمیں اصطلاحی تجدید سے بحث کرنا نہیں ہے، نہ ان اشخاص کا تعین کرنا ہے، جو اس منصب کے اہل ہو سکتے ہیں، اور جن کی واحد ذات نے دینی انقلاب برپا کر دیا، اور تجدید کے شرائط پورے کئے، یہاں ہمیں اسلام کی تیرہ سو برس کی تاریخ میں اصلاح و انقلابِ حال کی کوششوں کے تسلسل کو دکھانا ہے، اور ممتاز شخصیتوں اور تحریکوں کی نشان دہی کرنی ہے، جنھوں نے اپنے اپنے وقت میں اپنی اپنی صلاحیتوں کے مطابق دین کے احیاء اور تجدید اور اسلام اور مسلمانوں کی حفاظت کے کام میں حصہ لیا ہے، اور جن کی مجموعی کوششوں سے اسلام زندہ اور محفوظ شکل میں اس وقت موجود ہے، اور مسلمان اس وقت ایک ممتاز امت کی حیثیت سے نظر آتے ہیں، اس مضمون میں متعدد ایسے اشخاص کا تذکرہ آئے گا، جو انفرادی طور پر تو مجدد نہیں کہے جا سکتے، مگر دین کی تجدید و احیاء اور اصلاح و انقلاب کے مجموعہ میں ان کا ضرور حصہ ہے، اور مسلمان ان کے احسان سے کبھی سبکدوش نہیں ہو سکتے۔

اس کتاب کی تالیف کے سلسلہ میں مندرجہ ذیل باتوں کا لحاظ رکھا گیا ہے:۔

(۱) کسی دعوت یا شخصیت کے حالات و مقاصد معلوم کرنے کے لئے عموماً خود اس کی تصنیفات، تحریروں اور اقوال سے مدد لی گئی ہے، اگر اس میں پوری کامیابی نہیں ہوئی، اور خلا رہ گیا، تو اس کے رفقاء و تلامذہ اور معاصرین کی تصنیفات و بیانات کو ترجیح دی گئی ہے، آخری صورت میں سند کے مستند ماخذوں پر اعتماد کیا گیا ہے، اس بارے میں کسی زبان یا زمانہ کی تخصیص نہیں، جہاں کوئی کام کی بات دیکھی گئی، اخذ کی گئی، اور اس کا حوالہ دے دیا گیا۔

(۲) شخصیتوں کی سیرت اور تذکرہ کے سلسلہ میں ان کے گرد و پیش، اس زمانہ کی علمی و فکری سطح، اور کام کے میدان کی وسعتوں کو بھی سامنے لانے کی کوشش کی گئی ہے، تاکہ ان شخصیتوں کی صحیح عظمت اور ان کی کامیابی کی مقدار کا تعین ہو سکے، اور اس دور اور ماحول کی کامیابی کے امکانات کا صحیح اندازہ کر کے ان کو تاریخ میں صحیح مقام دیا جا سکے، کسی شخصیت کو اس کے ماحول سے نکال کر اپنے ماحول میں لا کر اپنے زمانہ کے پیمانوں اور تقاضوں اور اپنے

ذاتی رجحانات اور خواہشات کے معیار سے جانچنا پھر اس معیار کے لحاظ سے اس کی کوتاہیوں اور فرد گذاشتوں کو نمایاں کرنا ظاہری نگاہ میں ایک بڑا تنقیدی کارنامہ معلوم ہوتا ہے جس سے کتاب سطحی النظر لوگوں کی نگاہ میں وزنی اور وقیع بن جاتی ہے، لیکن اہلِ نظر سمجھتے ہیں کہ یہ ایک بڑی ناانصافی اور کوتاہ نظری ہے، اس لئے کہ آدمی اپنے زمانہ کی ضرورتوں اور تقاضوں اور اس عہد کے میدانِ عمل کے حدود کے لحاظ سے کامیاب و ناکامیاب کہا جاسکتا ہے، ورنہ ہر عظیم سے عظیم شخصیت دوسرے زمانہ اور ماحول کے لحاظ سے اور مورخ کے رجحانات اور خیالات کے پیمانہ سے سخت ناکام ثابت کی جاسکتی ہے، اور نہ صرف اسلامی تاریخ، بلکہ انسانی تاریخ کی بھی کوئی شخصیت کامل اور معیاری قرار نہیں دی جاسکتی۔

(۳) کسی صاحبِ دعوت، یا مصنف اور مفکر کی کتابوں کے چند مختصر اقتباسات پیش کرنے پر اکتفا نہیں کی گئی کہ اس سے اس کے مقاصد، اس کے علمی مرتبہ اور اس کے ذہن کا اندازہ صحیح طور پر نہیں ہوسکتا، اور قارئین اس کا لطفِ صحبت اور شرفِ ملازمت حاصل نہیں کرسکتے، اس کتاب میں ممتاز صاحبِ دعوت، مصلحین، مصنفین اور اصحابِ فکر کی تصنیفات و خطابات کے اتنے مختلف اور مبسوط اقتباسات دیئے گئے ہیں کہ پڑھنے والا محسوس کرے گا کہ اس کا کچھ وقت ان کی صحبت میں گزرا، اور اس کو اطمینان کے ساتھ "دید و شنید" کا موقع ملا ہے، اس کے لئے خود مؤلف کتاب نے اپنے وقت کا ایک معتدبہ حصہ ان حضرات کی تصنیفات و مواعظ، اور ان کے علمی و فکری آثار کے ماحول میں گزارا ہے اور کوشش کی ہے کہ ان کا تذکرہ اور تعارف کرانے کے زمانہ میں وہ اپنا وقت خالص اسی ماحول میں گزارے اور ان اثرات و کیفیات کو اپنے اوپر طاری ہونے کا موقع دے، جو ان کے معاصرین اور ہمنشینوں پر طاری ہوتی تھیں، اسی کا نتیجہ ہے کہ قارئین مختلف شخصیتوں کے بارے میں مؤلف کتاب کا قلبی رجحان صاف معلوم کرسکیں گے، اور ان کو زبان میں بھی تغیر اور صاحبِ ترجمہ کی زبان و ادب سے مناسبت نظر آئے گی، یہ بات اگر کسی نقاد کی نگاہ میں قابلِ اعتراض اور کتاب کی کمزوری شمار کئے جانے کے قابل ہے، اور اس کے نزدیک مورخ کو اپنے قلم کی طرح "چوبِ خشک" اور ناقلِ بے ضمیر ہونا چاہیئے، تو مصنف اس کمزوری کا اعتراف کرتا ہے، اور اس کے لئے کسی معذرت کی ضرورت نہیں سمجھتا۔

(۴) تاریخی شخصیتوں کے صرف علمی کمالات، تحقیقات اور تصنیفات کے اقتباسات پر اکتفا نہیں کیا گیا، بلکہ ان کی زندگی کے باطنی پہلو، تعلق مع اللہ اور اخلاقی خصوصیات کو بھی نمایاں کیا گیا ہے کہ اولاً تو یہ متقدمین اہلِ دعوت و اہلِ فکر کی مشترک خصوصیت ہے کہ وہ اپنے علمی کمالات اور علمی انہماک کے ساتھ عبادت وانابت الی اللہ کا ذوقِ خاص رکھتے تھے، اور ان کی کامیابی و مقبولیت میں اس کو خاص دخل ہے، اور اس کے تذکرہ کے بغیر ان کا تذکرہ نامکمل رہتا ہے، دوسرے اس ضخیم تصنیف اور تاریخ کے اس وسیع دفتر کے پڑھنے والے کا یہ حق اور اس کی محنت اور دقت کا یہ خاموش مطالبہ ہے کہ وہ اس سے صرف تاریخی معلومات ہی اخذ نہ کرے، بلکہ قلب و روح کی تازگی اور ذوقِ عمل کا حصہ بھی پائے۔

(۵) کسی شخصیت کے تعارف کے سلسلہ میں صرف اس کے فضائل و کمالات بیان کرنے پر اکتفا نہیں کیا گیا بلکہ اگر اس کے منصف و محتاط معاصرین یا صاحبِ نظر متاخرین نے اس پر یا اس کی تصنیفات و افکار پر تنقید کی ہے، تو اس کا بھی تذکرہ کر دیا گیا ہے، اور اگر اس کا جواب دیا گیا ہے، اور اس کی طرف سے دفاع کیا گیا ہے، تو اس کو بھی پیش کر دیا گیا ہے، لیکن تاریخ کو ناقدانہ تالیف ثابت کرنے کے لئے بے ضرورت تنقید نقل کرنے کا اہتمام نہیں کیا گیا۔

یہ کتاب کی پہلی جلد ہے، پہلے خیال تھا کہ یہ جلد شیخ الاسلام ابن تیمیہ پر تمام ہوگی، اس طرح اس حصہ میں پہلی صدی ہجری سے لے کر آٹھویں صدی ہجری تک کی تاریخ دعوت و عزیمت اور اصلاح و تجدید کی روداد آجاتی لیکن ابن تیمیہ کا تذکرہ (ان کے زمانہ کی اہمیت اور ان کے کام کی وسعت کی بنا پر) اتنا مبسوط ہوگیا کہ اس کو کتاب کا ایک مستقل حصہ بنانا پڑا، جو اس سلسلہ کی دوسری جلد ہوگی، کتاب کا تیسرا حصہ (اور شاید چوتھا بھی) ہندوستان کے اہلِ دعوت و عزیمت کے ساتھ مخصوص ہوگا، جو پچھلی صدیوں میں عالم اسلام میں اصلاح و تجدید کے علمبردار اور فکر و تحقیق کا منبع و سرچشمہ تھے۔

آخر میں مؤلف کو صاف اعتراف ہے کہ اس کتاب کے لئے جتنی طویل مدتِ تصنیف، جیسا سکونِ خاطر،

جتنا وسیع و عمیق مطالعہ اور جیسا وسیع اور متنوع علم درکار ہے، مصنف اس سے بہرہ مند نہیں، لیکن جو کچھ بھی اس عرصہ اور ان حالات میں ہو سکا، اور جو ناظرین کے سامنے ہے، وہ مصنف کی پریشان خاطری، انتشار ذہنی اور علمی بے بضاعتی کے پیش نظر محض تائید الٰہی اور توفیق خداوندی ہے، وَمَا التَّوْفِيْقُ اِلَّا بِاللّٰهِ عَلَيْهِ اللّٰہِ۔

ابوالحسن علی ندوی

دائرہ حضرت شاہ علم اللہؒ رائے بریلی

۴ ربیع الاول ۱۳۷۴ھ

مقدمہ

اصلاح و تجدید کی ضرورت اور تاریخ اسلام میں ان کا تسلسل

زندگی متحرک اور تغیر پذیر ہے

اسلام اللہ تعالے کا آخری پیغام ہے، اور کامل و مکمل طور پر دنیا کے سامنے آچکا ہے، اور اعلان کیا جا چکا ہے کہ

اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ	آج کے دن میں نے تمہارے لئے تمہارا دین مکمل کردیا
نِعْمَتِيْ وَرَضِيْتُ لَكُمُ الْاِسْلَامَ دِيْنًا ؕ	اور تم پر اپنی نعمت تمام کردی، اور دین کی حیثیت
(المائدہ ـ ۳)	سے اسلام کو تمہارے لئے پسند کر چکا۔

ایک طرف تو اللہ کا دین مکمل ہے، دوسری طرف یہ حقیقت ہے کہ زندگی متحرک اور تغیر پذیر ہے، اور اس کا شباب ہر وقت قائم ہے۔ ع

جاوداں، پیہم دواں، ہر دم جواں ہے زندگی

اس رواں دواں اور سدا جواں زندگی کا ساتھ دینے اور اس کی رہنمائی کے لئے اللہ تعالے نے آخری طور پر جس دین کو بھیجا ہے، اس کی بنیاد اگرچہ "ابدی عقائد و حقائق" پر ہے، مگر وہ زندگی سے پُر ہے، اور حرکت اس کی رگ و پے میں بھری ہوئی ہے، اس میں اللہ تعالے نے یہ صلاحیت رکھی ہے کہ وہ ہر حال میں دنیا کی رہنمائی کر سکے، اور ہر منزل میں تغیر پذیر انسانیت کا ساتھ دے سکے، وہ کسی خاص عہد کی تہذیب یا کسی خاص دور کا فن تعمیر نہیں ہے، جو اس دور کی یادگاروں کے اندر محفوظ ہو، اور اپنی زندگی کھو چکا ہو، بلکہ ایک زندہ دین ہے، جو علیم و حکیم صانع کی صنعت کا

بہترین نمونہ ہے۔

ذَالِكَ تَقْدِيْرُ الْعَزِيْزِ الْعَلِيْمِ ٥ (الانعام ۱۲) یہ ہے اندازہ غالب اور علم رکھنے والے کا۔

صُنْعَ اللّٰهِ الَّذِىْٓ اَتْقَنَ كُلَّ شَيْءٍ ٥ (النمل ۸۸) کاریگری اللہ کی جس نے ہر چیز کو محکم کیا۔

اُمّتِ اسلامیہ کا زمانہ سب سے زیادہ پُر از تغیرات ہے

یہ دین چونکہ آخری اور عالمگیر دین ہے، اور یہ امت آخری اور عالمگیر اُمّت ہے، اس لئے یہ بالکل قدرتی بات ہے کہ دنیا کے مختلف انسانوں اور مختلف زمانوں سے اس امت کا واسطہ رہے گا، اور ایسی کشمکش کا اس کو مقابلہ کرنا ہوگا جو کسی دوسری امت کو دنیا کی تاریخ میں پیش نہیں آئی، اس امت کو جو زمانہ دیا گیا ہے، وہ سب سے زیادہ پُر از تغیرات اور پُر از انقلابات ہے، اور اس کے حالات میں جتنا تنوع ہے، وہ تاریخ کے کسی گذشتہ دور میں نظر نہیں آتا۔

اسلام کے بقا اور تسلسل کے لئے غیبی انتظامات

ماحول کے اثرات کا مقابلہ کرنے کے لئے اور مکان وزمان کی تبدیلیوں سے عہدہ برآ ہونے کے لئے اللہ تعالیٰ نے اس امت کے لئے دو انتظامات فرمائے ہیں، ایک تو یہ کہ اس نے جناب رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کو ایسی کامل و مکمل اور زندہ تعلیمات عطا فرمائی ہیں، جو ہر کشمکش اور ہر تبدیلی کا بآسانی مقابلہ کر سکتی ہیں، اور ان میں ہر زمانہ کے مسائل و مشکلات کو حل کرنے کی پوری صلاحیت موجود ہے۔ دوسرے اس نے اس کا ذمہ لیا ہے (اور اس وقت کی تاریخ اس کی شہادت دیتی ہے) کہ وہ اس دین کو ہر دور میں ایسے زندہ اشخاص عطا فرماتا رہے گا، جو ان تعلیمات کو زندگی میں منتقل کرتے رہیں گے، اور مجموعاً یا انفراداً اس دین کو تازہ اور اس امت کو سرگرم عمل رکھیں گے، اس دین میں ایسے اشخاص کے پیدا کرنے کی جو صلاحیت و طاقت ہے، اس کا اس سے پہلے کسی دین سے اظہار نہیں ہوا، اور یہ امت تاریخ عالم میں جیسی "مردم خیز" ثابت ہوئی ہے، دنیا کی قوموں اور امتوں میں اس کی کوئی نظیر نہیں ملتی۔ یہ محض اتفاقی بات نہیں ہے

بلکہ انتظامِ خداوندی ہے کہ جس دور میں جس صلاحیت و قوت کے آدمی کی ضرورت تھی، اور زہر کو جس "تریاق" کی حاجت تھی، وہ اس امت کو عطا ہوا۔

اسلام کے قلب و جگر پر حملے

شروع ہی سے اسلام کے قلب و جگر اور اس کے اعصاب پر ایسے حملے ہوئے ہیں کہ دوسرا مذہب ان کی تاب نہیں لا سکتا، دنیا کے دوسرے مذاہب جنھوں نے اپنے اپنے وقت میں دنیا فتح کر لی تھی، اس سے کم درجہ کے حملوں کو سہار نہ سکے اور انھوں نے اپنی ہستی کو گم کر دیا، لیکن اسلام نے اپنے ان سب حریفوں کو شکست دی، اور اپنی اصلی شکل میں قائم رہا، ایک طرف باطنیت اور اس کی شاخیں، اسلامی روح، اور اس کے نظامِ عقائد کے لیے سخت خطرہ تھیں، دوسری طرف مسلمانوں کو زندگی سے بے دخل کرنے کے لیے صلیبیوں کی یورش اور تاتاریوں کا حملہ بالکل کافی تھا، دنیا کا کوئی دوسرا مذہب ہوتا تو وہ اس موقع پر اپنے سارے امتیازات کھو دیتا، اور ایک تاریخی داستان بن کر رہ جاتا، لیکن اسلام ان سب داخلی و خارجی حملوں کو برداشت کر لے گیا، اور اس نے نہ صرف اپنی ہستی قائم رکھی، بلکہ زندگی کے میدان میں نئی نئی فتوحات حاصل کیں، تحریفات، تاویلات، بدعات، عجمی اثرات، مشرکانہ اعمال و رسوم، مادّیت، نفس پرستی، تعیشات، الحاد و لادینیت، اور عقلیت پرستی، کا اسلام پر بارہا حملہ ہوا، اور کبھی کبھی محسوس ہونے لگا کہ شاید اسلام ان حملوں کی تاب نہ لا سکے، اور ان کے سامنے سپر ڈال دے، لیکن امتِ مسلمہ کے ضمیر نے صلح کرنے سے انکار کر دیا، اور اسلام کی روح نے شکست نہیں کھائی، ہر دَور میں ایسے افراد پیدا ہوئے جنھوں نے تحریفات و تاویلات کا پردہ چاک کر دیا، اور حقیقت اسلام اور "دینِ خالص" کو اجاگر کیا، بدعات اور عجمی اثرات کے خلاف آواز بلند کی، سنت کی پُرزور حمایت کی، عقائدِ باطلہ کی بے باکانہ تردید اور مشرکانہ اعمال و رسوم کے خلاف علانیہ جہاد کیا، مادیت اور نفس پرستی پر کاری ضرب لگائی، تعیشات اور اپنے زمانہ کے "مترفین"[۱] کی سخت مذمت کی، اور جابر سلاطین کے سامنے

[۱] متکبر دولتمندوں اور مستغنی آسودہ حال اور فارغ البال لوگوں کو قرآن مجید "مترفین" کے لفظ سے یاد کرتا ہے۔

کلمۂ حق بلند کیا، عقلیت پرستی کا طلسم توڑا، اور اسلام میں نئی قوت و حرکت اور مسلمانوں میں نیا ایمان اور نئی زندگی پیدا کردی، یہ افراد دماغی، علمی، اخلاقی اور روحانی اعتبار سے اپنے زمانہ کے ممتاز ترین افراد تھے، اور طاقتور اور دلآویز شخصیتوں کے مالک تھے، جاہلیت اور ضلالت کی ہر نئی ظلمت کے لئے ان کے پاس کوئی نہ کوئی "ید بیضا" تھا جس سے انھوں نے تاریکی کا پردہ چاک کردیا، اور حق روشن ہوگیا، اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کو اس دین کی حفاظت اور بقا منظور ہے، اور دنیا کی رہنمائی کا کام اسی دین اور اسی امت سے لینا ہے، اور جو کام وہ پہلے تازہ نبوت اور انبیاء سے لیتا تھا، اب رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے نائبین اور امت کے مجدّدین و مصلحین سے لے گا۔

دوسرے مذاہب کی تاریخ میں تجدیدی شخصیتوں کی کمی

اس کے برخلاف دنیا کے دوسرے مذاہب میں ایسی ہستیوں کی نمایاں کمی نظر آتی ہے، جو ان مذاہب میں نئی روح اور ان کے ماننے والوں میں نئی زندگی پیدا کردیں، ان کی تاریخ میں صدیوں اور ہزاروں برس کے ایسے خلا نظر آتے ہیں جن میں اس دین کا کوئی مجدد دکھائی نہیں دیتا، جو اس دین کو تحریفات و بدعات کے نرغہ سے نکالے، اس کی حقیقت واضح کرے، اصل دین اور حقیقتِ ایمان کی طرف پوری قوت سے دعوت دے، رسوم کے خلاف پُر زور صدائے احتجاج بلند کرے، مادّیت و نفس پرستی کی تحریک و رجحانات کے خلاف جہاد کرنے کے لئے کمربستہ ہو کر میدان میں آجائے، اور اپنے یقین، سچی روحانیت اور قربانیوں سے اس مذہب کے پیروؤں میں نئی روح اور نئی زندگی پیدا کردے۔

اس کی سب سے بڑی مثال مسیحیت ہے، وہ اپنے عہد کے آغاز یعنی پہلی صدی مسیحی کے نصف ہی میں ایسی تحریف کا شکار ہوئی، جس کی نظیر اس دور کی تاریخ مذاہب میں کہیں نہیں ملتی، وہ ایک صاف اور سادہ توحیدی مذہب سے ایک ایسے مشرکانہ مذہب میں تبدیل ہوگئی، جس کو یونانی اور بودھ افکار و خیالات کا مجموعہ کہا جاسکتا ہے، دیکھنے کی بات یہ ہے کہ یہ سب کچھ اس کے سب سے بڑے داعی اور پیروسینٹ پال (۱۰-۶۵ء) کے ہاتھوں ہوا، یہ تبدیلی دراصل ایک روح سے دوسری روح، ایک شکل سے دوسری شکل، اور ایک نظام سے دوسرے نظام کی طرف ایک ایسی جست یا چھلانگ کے مرادف تھی، جس میں

پہلی شکل سے صرف نام اور بعض رسوم کا اشتراک باقی رہ گیا تھا، ایک مسیحی فاضل (ERUSET DE BUNSEN) اس تغیّر وانقلاب کا ذکر کرتے ہوئے لکھتا ہے:۔

"جس عقیدہ اور نظام کا ذکر ہمیں انجیل میں ملتا ہے، اس کی دعوت حضرت مسیحؑ نے اپنے قول وعمل سے کبھی نہیں دی تھی، اس وقت عیسائیوں اور یہودیوں و مسلمانوں کے درمیان جو نزاع قائم ہے اس کی ذمّہ داری حضرت مسیحؑ کے سر نہیں ہے بلکہ یہ سب اس یہودی، عیسائی بے دین پال کا کرشمہ ہے، نیز صحف مقدسہ کی تمثیل وتجسیم کے طریقہ پر تشریح اور ان صحیفوں کو پیش گوئیوں اور مثالوں سے بھر دینے کا نتیجہ ہے، پال نے اسٹیفن (STEPHEN) کی تقلید میں جو مذہب ایسانی (ESSENIO) کا داعی ہے، حضرت مسیحؑ کے ساتھ بہت سی بودھ رسوم وابستہ کر دیں، آج انجیل میں جو متضاد کہانیاں اور روایات ملتے ہیں، اور جو حضرت مسیحؑ کو ان کے مرتبہ سے بہت فروتر شکل میں پیش کرتے ہیں، وہ سب پال کے وضع کئے ہوئے ہیں، حضرت مسیحؑ نے نہیں، بلکہ پال اور ان کے بعد آنے والے پادریوں اور راہبوں نے اس سارے عقیدہ ونظام کو مرتب کیا ہے، جس کو آرتھوڈکس مسیحی دنیا نے اٹھارہ صدیوں سے اپنے عقیدہ کی اساس قرار دے رکھا ہے۔"[1]

مسیحیت نے طویل صدیوں تک اور آج بھی پال کی اس روح اور اس کے ورثہ کو سینہ سے لگائے رکھا، اور اس پوری مدّت میں مسیحی دنیا میں کوئی ایسا آدمی پیدا نہیں ہوا، جو مسیحیت کے اس بیرونی مستعار اور غیر حقیقی نظام کے خلاف عَلَم بغاوت بلند کرے، اور اس نقطہ کی طرف واپسی کی کوشش کرے، جس نقطہ پر حضرت مسیحؑ اور ان کے مخلص خلفاء اور تبعین چھوڑ کر گئے تھے، صدیوں پر صدیاں بیت گئیں، اور کوئی ایسا شخص پیدا نہ ہوا، جو مسیحیت کے ان نئے اور بیرونی اجزاء کو علیحدہ کر سکے، آخر کار پندرہویں صدی مسیحی میں مارٹن لوتھر (M. LUTHER) جرمنی میں پیدا ہوا، اور اس نے بعض جزئی مسائل میں کچھ محدود قسم کی اصلاح کی، یہ کوئی جوہری یا عمومی اصلاح نہ تھی، اور نہ مسیحیت کے غلط رخ اور اس کے انحراف کے خلاف کوئی بغاوت، گویا مسیحیت کی تاریخ کی تقریباً پندرہ صدیاں انقلاب انگیز بنیادی اور کامیاب اصلاح مذہب کی تحریکوں سے خالی رہیں، اور اس عرصہ میں کوئی کوشش بھی پورے طور پر بار آور اور نتیجہ خیز ثابت نہ ہوئی، مسیحی

[1] ISLAM OR TRUE CHRISTIANITY – P. 128

فضلاء کو بھی اس کا اعتراف ہے کہ اس طویل مدت میں مسیحی دنیا میں کوئی شخصیت یا تحریک رونما نہیں ہوئی جو مسیحیت کی اصلاح یا تجدید میں نمایاں کامیابی حاصل کر سکے۔

انسائیکلو پیڈیا برٹانیکا کا مقالہ نگار (J. BASSMULLINGER) لکھتا ہے:۔

"اگر ہم اس کے اسباب تلاش کریں کہ سولہویں صدی سے قبل اصلاح مذہب (ریفارمیشن) کی کوششوں میں جزوی کامیابی بھی کیوں نہ ہوئی تو بلا کسی دشواری کے کہہ سکتے ہیں کہ سب سے بڑا سبب قرون وسطیٰ کے ذہن کی ماضی کی مثالوں کی غلامی تھی۔"[1]

دوسری جگہ لکھتا ہے:۔

"چرچ کے اصلاح کی کوئی جامع تجویز بروئے کار لانے کی ان کی مسلسل کوششوں کی ناکامی یورپین تاریخ کی ایک جانی بوجھی حقیقت ہے۔"[2]

یہی مقالہ نگار آگے لکھتا ہے:۔

"سولہویں صدی سے قبل اصلاح مذہب کی چند نہیں، متعدد اور بعض بہت یادگار قسم کی کوششیں کی جا چکی تھیں، لیکن بلا استثناء ان سب کو کلیسا کی لعنت و ملامت کا شکار ہو جانا پڑا تھا۔"[3]

اس کے بعد کوئی دوسرا شخص ایسا پیدا نہیں ہوا جو کلیسا کے خرافات و اوہام اور اس کی زبردستیوں کے خلاف اپنی آواز بلند کرتا، اور کم از کم اتنا ہی کرتا جتنا لوتھر نے (اپنے مخصوص دائرۂ عمل اور کمزوری کے باوجود) کیا تھا۔ غرض اس طرح مسیحیت اس راستہ پر مسلسل چلتی رہی جس کو اس نے اپنے لئے انتخاب کیا تھا، یا زیادہ صحیح الفاظ میں اس کے سر تھوپ دیا گیا تھا، کلیسا کا اثر کم پڑ گیا، اور بعد میں اس کا اقتدار بالکل ختم ہو گیا، یورپ میں مادیت کی حکومت قائم ہوئی، اور اس نے اس اصل مذہب کی جگہ لے لی، اور مغرب کے ہر مذہب کو اس نے اپنے پیچھے چھوڑ دیا، اور مسیحیت میں کوئی ایسا انسان پیدا نہ ہو سکا، جو اس مادیت کا مقابلہ کرتا، اور اس کو اپنے صحیح مرکز پر واپس لاتا، یا

---

[1] ENC. BRITTANICA-ED. IX VOL. XX P. 320
ARTICLE BY J.B. MULLINGER.

[2] ایضاً ص ۳۲۱ [3] ایضاً ص ۳۲۱

عیسائیوں میں اپنے مذہب پر اعتماد کو بحال کرنا، ان سب میں وہ روحانی و اخلاقی قوت پیدا کرتا جو ان کو مادیت کے ان زبردست تھپیڑوں اور ایمان سوز ترغیبات کے سامنے ثابت قدم رکھ سکے، اور ان کو ایسی زندگی گزارنے پر مجبور کر سکے، جو علم و اخلاق اور صحیح عیسائی عقائد پر قائم ہو، اور جہاں نئے زمانہ کے سوالات، عصر جدید کے مسائل کا حل اس کی روشنی میں ممکن ہو، اس کے برعکس یہ ہوا کہ عیسائی مفکرین و مصنفین مسیحیت کے مستقبل سے خود مایوس ہو گئے، اور لادینی مادیت کے مقابلہ میں ان کے اندر احساس کہتری پیدا ہو گیا۔

یہی قصہ مشرق کے مذاہب کے ساتھ بھی پیش آیا، ہندو مذہب بھی اپنی اصل راہ سے بالکل ہٹ گیا، اس نے اپنی سادگی اور خالق کائنات سے براہِ راست روحانی نسبت بالکل کھو دی، اخلاقی قوت بھی مفقود ہو گئی، اور اپنی پیچیدگی کی وجہ سے وہ محض ایک دقیق اور غیر عملی فلسفہ بن کر رہ گیا، اور رفتہ رفتہ عقائد میں توحید خالص اور معاملات میں مساوات دونوں اہم چیزوں کا سررشتہ اس کے ہاتھ سے بالکل چھوٹ گیا، اور یہی وہ دو اہم بنیادیں تھیں، جن پر کوئی ایسا مذہب قائم ہو سکتا ہے، جس کی جڑیں باطن میں مضبوط ہوں، اور شاخیں ظاہر میں پھیلی ہوئی ہوں۔

اپنیشد کے مصنفین نے بہت کوشش کی کہ اس فساد کا تدارک کریں، چنانچہ انھوں نے ان رسوم کو جو ہندو مذہب اور ہندو سماج پر پوری طرح چھا گئی تھیں، مسترد کر دیا، اور اس کی جگہ ایک ایسے فلسفیانہ اور تصوراتی نظام کو پیش کیا، جو کثرت میں وحدت کے نظریہ پر قائم تھا، یہ نئی تصویر ہندو مذہب کے علمی حلقوں میں تو ضرور پسند کی گئی، اس لئے کہ ان کا رجحان شروع ہی سے وحدۃ الوجود و ہمہ اوست کی طرف تھا، لیکن عوام نے جن کی فکری سطح پست تھی، اور جو عملی نظام اور عملی تعلیمات کے خواہشمند تھے، اس بات کو قبول نہ کیا، اور اس طرح ہندو مذہب رفتہ رفتہ اپنی قوت و تاثیر کھوتا رہا، اس کی طرف سے بے اعتمادی اور بے اطمینانی روز بروز بڑھنے لگی، ہندو سماج کی یہی بے اطمینانی اور بے چینی تھی، جس نے آگے چل کر بودھ کی شخصیت میں جنم لیا، یہ مرحلہ چھٹی صدی قبل مسیح میں سامنے آیا۔

بودھ نے ایک نیا فکر یا ایک نیا مذہب (اگر اس موقع پر لفظ مذہب کا استعمال درست ہو) پیش کیا جو ترک دنیا، تہذیب نفس، خواہشات سے مقابلہ، رحم دلی و ہمدردی، خدمت و عمل اور رسوم و عادات اور طبقاتی کشمکش

کی تردید و مخالفت پر قائم تھا، جو ہندو سماج میں آخر زمانہ میں بہت نمایاں ہو گئی تھی، یہ فکر یا یہ مذہب[1] بہت سرعت کے ساتھ پھیلا، اور ایشیا کے جنوبی اور مشرقی حصہ پر جو بحر ہند اور بحر الکاہل کے درمیان واقع ہے، اس کا تسلط قائم ہو گیا۔

لیکن کچھ ہی عرصہ کے بعد یہ زبردست مذہبی تحریک بھی اپنے راستہ سے ہٹ گئی، اور تحریف کا شکار ہو گئی، مورتیاں اور رسوم وغیرہ جن کے خلاف اس مذہب نے علم بغاوت بلند کیا تھا، اس پر پھر سے حملہ آور ہوئے، یہاں تک کہ اس کے آخر دور میں وہ بھی شرک اور مورتی پوجا کا مذہب بن کر رہ گیا، جو اپنے پیشرو ہندو مذہب سے مورتیوں کی اقسام اور ان کی تعداد کے سوا کسی اور چیز میں مختلف اور بہتر نہ تھا، اس کی اخلاقیات کو بھی زوال ہوا، افکار و خیالات میں پیچیدگی آ گئی، نئے نئے فرقے اور مذہبی گروہ قائم ہو گئے، پروفیسر ایشور اٹوپا اپنی کتاب "ہندوستانی تمدن" میں لکھتے ہیں:۔

"بودھ مت کے سایہ میں ایسی حکومت قائم ہوئی جس میں اوتاروں کی بھرمار اور مورت پرستی کا دور دورہ دکھلائی دینے لگا، سنگھوں کی فضا بدل رہی تھی، اس میں بدعتیں اور جدتیں یکے بعد دیگرے نظر آ رہی تھیں۔"[2]

پنڈت جواہر لال نہرو اپنی کتاب "تلاش ہند" (DISCOVERY OF INDIA) میں بدھ مت کے بگاڑ اور تدریجی زوال کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:۔

"برہمنیت نے بودھ کو اوتار بنا لیا، اور بودھ مت نے بھی یہی کیا، سنگھ بہت دولتمند ہو گئے، اور ایک خاص جماعت کے مفاد کے مرکز بن کر رہ گئے، اور ان میں ضبط و قاعدہ بالکل نہیں رہا، عبادت کے طریقوں میں سحر اور اوہام داخل ہو گئے، اور ہندوستان میں ایک ہزار سال تک باقاعدہ رائج رہنے کے بعد بودھ مت کا تنزل شروع ہو گیا، اس عہد میں اس کی جو مریضانہ کیفیت تھی، (MRS. RHYS DAVIS) نے اس کا ذکر اس طرح کیا ہے:۔

"ان مریضانہ خیالات کے گہرے سایہ میں آ کر گوتم کی اخلاقی تعلیم نظر سے اوجھل ہو گئی، ایک نظریہ پیدا ہوا اور اس نے فروغ پایا، اس کی جگہ دوسرے نے لے لی اور ہر ایک قدم پر ایک نیا نظریہ پیدا ہونے لگا، یہاں تک کہ ساری فضا میں

---

[1] بودھ مت کے لئے لفظ مذہب کے استعمال میں مجھے تردد اس لئے ہے کہ اس میں خالق اور مبدأ و معاد کے سلسلہ میں کوئی عقیدہ یا نظریہ نہیں ملتا، اور اکثر مصنفین و مؤرخین کی یہی رائے ہے، دیکھئے انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا لفظ بودھ (BUDDHA)۔

[2] ہندوستانی تمدن (اردو) ایشور اٹوپا۔

ذہن کی ان پُرفریب تخلیقوں سے گھٹاٹوپ اندھیرا چھا گیا، اور بانیٔ مذہب کے سادہ اور بلند اخلاقی درس ان الہیاتی موشگافیوں کے انبار کے نیچے دب کر رہ گئے۔[1]

مجموعی حیثیت سے بودھ مت اور برہمنیت دونوں میں گراوٹ پیدا ہو گئی، اور ان میں اکثر مبتذل رسوم داخل ہو گئیں، دونوں میں امتیاز کرنا مشکل ہو گیا، اس وسیع بودھ دنیا میں اور اس کی حکمرانی کی اس طویل مدت میں کوئی ایسا مصلح سامنے نہ آیا، جو حقیقی بودھ مت کی طرف دعوت دے، اور اس جدید اور منحرف مذہب کا پوری قوت کے ساتھ مقابلہ کرے، اور اس کا گذشتہ دورِ شباب اور اس کی گم شدہ سادگی اور صفائی پھر سے واپس لے آئے۔[2]

غرض قدیم ہندو مذہب، بودھ مت کے سامنے بالکل پنپ نہ سکا، یہاں تک کہ آٹھویں صدی مسیحی میں شنکر آچاریہ[3] نے بودھ مت کی مخالفت اور قدیم ہندو مذہب کی اشاعت کا علم بلند کیا، اور آخر کار اس کو اس ملک سے تقریباً باہر ہی کر دیا، یا یہ کہا جا سکتا ہے کہ اس کی حیثیت ہندوستان کے بہت سے مذاہب میں ایک قدیم رُو بزوال اور محدود مذہب کی رہ گئی، شنکر آچاریہ نے اپنی ذہانت، مذہبی جرأت اور جوشِ عمل سے یہ تو کیا کہ بودھ مت کو بالکل زندگی سے بے دخل کر دیا، لیکن وہ اس باب میں کامیاب نہ ہوئے (بلکہ شاید اس کا انھوں نے سرے سے ارادہ ہی نہیں کیا تھا) کہ قدیم ہندو مذہب کو اس کی پہلی اور حقیقی شکل پر واپس لے آئیں، اس میں توحید کا عقیدہ، خالقِ کائنات سے براہِ راست اتصال، بندہ اور خدا کے درمیان واسطوں کی نفی، اجتماعی انصاف اور طبقاتی مساوات کی رُوح پیدا کریں، چنانچہ آج تک یہ دونوں ہندوستانی مذاہب اپنی بدلی ہوئی ہیئت پر قائم ہیں، اور دورِ انحطاط کی میراث رسوم و عادات اور مورتیوں کو اپنے سینہ سے لگائے ہوئے ہیں، مذاہب و اخلاق کے انسائیکلوپیڈیا (ENCYCLOPAEDIA OF RELIGION AND ETHICS.) کے مقالہ نگار (V. S. GHATE) جو الفنسٹن کالج بمبئی میں سنسکرت کے پروفیسر تھے اور ہندوستان کے قدیم مذاہب و فلسفوں پر گہری نظر رکھتے ہیں، شنکر آچاریہ کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:-

"اس کی زندگی کا سب سے بڑا مقصد اس نظامِ مذہب اور فلسفہ کا زندہ کرنا تھا، جس کی "اوپنشد" میں تعلیم دی گئی ہے۔"

---

[1] تلاشِ ہند ص ۲۰۱، ۲۰۳۔ [2] ایضاً ص ۲۰۱، ۲۰۳۔ [3] شنکر آچاریہ آٹھویں صدی کے نصف آخر میں گزرا ہے، ۳۲ سال کی عمر میں انتقال ہوا۔

اس نے مطلق وحدۃ الوجود کے عقیدہ کو رائج کر دیا، اس کا اصلی مقصد یہ تھا کہ وہ یہ بتائے کہ "اوپنشد" اور "بھگوت گیتا" میں قانون پیش نہیں کیا گیا ہے، بلکہ مکمل وحدۃ الوجود کی تعلیم ہے۔ شنکر آچاریہ نے بت پرستی کی نہ مخالفت کی اور نہ حملہ کیا، اس کے نزدیک بت ایک رمز اور مظہر ہیں، شنکر آچاریہ نے رسمیت (RITUALISM) اور کرما کی مذمت کی، لیکن مقبول عام دیوتاؤں کی پرستش کی طرف سے مدافعت کی۔ "اپنے نشو ونما کی ایک خاص منزل میں بت پرستی ہماری فطرت کی ایک ضرورت ہے، جب مذہبی روح پختہ اور بالغ ہو جاتی ہے تو پھر بت پرستی کی ضرورت نہیں رہتی ہے، علامتوں اور رموز کو ترک کر دینا چاہیے، جب مذہبی روح پختہ اور بالغ ہو جاتی ہے۔ شنکر نے بتوں کی اجازت دی، [illegible] ایک علامت کے ان لوگوں کے لئے جو ایسے برہمنوں کے مرتبے تک نہیں پہونچ سکے، جو صفات سے آزاد اور ناقابل تبدیل ہوتے ہیں۔"[1]

بہرحال وہ تمام کوششیں ناکام ہو چکی ہیں، جو شنکر آچاریہ سے لے کر دیانند سرسوتی اور گاندھی جی تک کی گئیں، اور جن کا مقصد اس مذہب کا اس کی ان صحیح بنیادوں پر احیاء تھا، جو نبوت کی دعوت انسان کی فطرت سلیم اور تغیر پذیر عہد سب کے ساتھ ہم آہنگ ہو، ان دونوں مذاہب نے آخر کار مادیت ولادینیت کے سامنے بالکل سپر ڈال دی ہے، اور زندگی سے کنارہ کش ہو کر عبادت گاہوں اور تیرتھ گاہوں میں پناہ لی ہے، اور رسوم وعادات اور ظاہری اشکال میں محصور ہو کر رہ گئے ہیں، ہندوستان میں اس وقت کوئی ایسی طاقتور دعوت نہیں جس کا نعرہ اور جس کا منشور یہ ہو (پھر سے مذہب کی طرف آؤ) اس کے برعکس ایسی تحریکیں بہت بیدار اور طاقتور ہیں، جن کا نعرہ اور اصول یہ ہے کہ اپنی پرانی تہذیب کو زندہ کرو، اور ہندوستان کی قدیم تاریخی زبان "سنسکرت" کو پھر سے ملک میں رائج کرو۔

مذہب کو زندہ اشخاص کی ضرورت

دراصل کوئی مذہب اس وقت تک زندہ نہیں رہ سکتا، ان خصوصیات کو زیادہ دنوں تک برقرار نہیں

---

[1] ماخوذ از مقالہ شنکر آچاریہ باختصار وانتخاب ملاحظہ ہو۔
ENC OF RELIGION AND ETHICS—FOVRTH EDITION, 1958
ARTICLE SANKARACHARYA.

رکھ سکتا، اور بدلتی ہوئی زندگی پر اثر نہیں ڈال سکتا، جب تک وقتاً فوقتاً اس میں ایسے اشخاص نہ پیدا ہوتے رہیں جو اپنے غیر معمولی یقین، روحانیت، بےغرضی وایثار اور اپنی اعلیٰ دماغی اور قلبی صلاحیتوں سے اس کے تن مردہ میں زندگی کی نئی روح پھونک دیں، اور اس کے ماننے والوں میں نیا اعتماد اور جوش اور قوتِ عمل پیدا کردیں، زندگی کے تقاضے ہر وقت جواں ہیں، مادیت کا درخت سدا بہار ہے، نفس پرستی کی تحریک اور اس کے مذہب کو حقیقتہً کسی تجدید کی ضرورت نہیں کہ اس کی ترغیبات اور اس کے محرکات قدم قدم پر موجود ہیں، پھر بھی اس کی تاریخ اس کے پُرجوش داعیوں اور کامیاب مجدّدوں سے کبھی خالی نہیں رہی، جنھوں نے اس کی جوانی کو قائم اور اس کی دعوت کو اس وقت تک زندہ رکھا ہے۔ ع

اگرچہ پیر ہے مومن جواں ہیں لات و منات

اس کا مقابل جب ایک نئی زندگی اور نئی طاقت کے ساتھ میدان میں نہیں آئے گا، اور وقتاً فوقتاً اس کی تجدید نہیں ہوتی رہے گی، تازہ دم مادیت کے مقابلہ میں اس کا زندہ رہنا مشکل ہے۔

ہر نئے فتنہ اور نئے خطرے کے لئے نئی شخصیت وطاقت

اس حقیقت سے کوئی انکار نہیں کرسکتا کہ اسلام کے اس طویل اور پُرآشوب تاریخ میں کوئی قلیل سے قلیل مدت ایسی نہیں پائی جاتی، جب اسلام کی حقیقی دعوت بالکل بند ہوگئی، حقیقتِ اسلام بالکل پردہ میں چھپ گئی ہو، امت اسلامیہ کا ضمیر بالکل بےحس ہوگیا ہو، اور تمام عالم اسلام پر اندھیرا چھا گیا ہو، یہ تاریخی واقعہ ہے کہ جب کبھی اسلام کے لئے کوئی فتنہ نمودار ہوا، اس کی تحریف اور اس کو مسخ کرنے کی کوشش کی گئی، یا اس کو غلط طریقہ پر پیش کیا گیا، مادیت کا کوئی سخت حملہ ہوا، کوئی طاقتور شخصیت ایسی ضرور میدان میں آگئی جس نے اس فتنہ کا پوری طاقت سے مقابلہ کیا، اور اس کو میدان سے ہٹا دیا، بہت سی دعوتیں اور تحریکیں ایسی ہیں، جو اپنے وقت میں بڑی طاقتور تھیں، لیکن آج ان کا وجود صرف کتابوں میں رہ گیا ہے، ان کی حقیقت کا سمجھنا بھی آج مشکل ہے، کتنے آدمی ہیں جو قدریہ، جہمیہ، اعتزال، خلق قرآن

وحدۃ الوجود اور اکبر کے دین الٰہی کی حقیقت اور تفصیلات سے واقف ہیں، حالانکہ یہ اپنے اپنے وقت کے بڑے اہم عقائد و مذاہب تھے، ان میں سے بعض کی پشت پر بڑی بڑی سلطنتیں تھیں، اور اپنے زمانہ کے بعض بڑے ذہین اور لائق اشخاص ان کے داعی اور علمبردار تھے، لیکن بالآخر حقیقت اسلام نے ان پر فتح پائی، اور کچھ عرصہ کے بعد یہ زندہ تحریکیں اور سرکاری مذہب علمی مباحث بن کر رہ گئے، جو صرف علم کلام اور تاریخ عقائد کی کتابوں میں محفوظ ہیں، دین کی حفاظت کی یہ جدوجہد، تجدید و انقلاب کی کوشش اور دعوت و اصلاح کا یہ سلسلہ اتنا ہی پرانا ہے، جتنی اسلام کی تاریخ، اور ایسا ہی مسلسل ہے، جیسی مسلمانوں کی زندگی۔

تاریخ کے گم شدہ مآخذ

لیکن اس کی ذمہ داری صرف مورخین پر عائد نہیں ہوتی، اس کے ذمہ دار وہ تمام لوگ ہیں، جو تاریخ کی اصطلاحی اور سرکاری حیثیت کے سوا کوئی اور حیثیت ماننے پر تیار نہیں، اور کسی ایسی کتاب کو لائق اعتبار نہیں سمجھتے جو کسی کتب خانہ میں تاریخ کی الماری کے اندر نہ ہو، یا فن تاریخ کے تحت درج نہ ہو، حالانکہ ایسی بہت سی کتابیں اپنے اندر تاریخ کا بہت قیمتی ذخیرہ رکھتی ہیں، اور ان کو بہت اہم مآخذ قرار دیا جا سکتا ہے، یہ وہ ادبی اور دینی کتابیں ہیں، جن میں ان داعیوں اور مصلحین امت نے اپنی دلی احساسات و کیفیات کو بے نقاب کیا ہے، اور اپنی زندگی کے اہم واقعات اور تجربے درج کئے ہیں، یہ وہ کتابیں ہیں، جن میں شاگردوں اور مریدوں نے اپنے اساتذہ و شیوخ کے نصائح و ملفوظات اور حقائق و معارف قلم بند کئے ہیں، اور ان کی پُر اثر اور بابرکت مجلسوں کی روداد پیش کی ہے، یہ مکتوبات اور مواعظ کے وہ مجموعے ہیں، جن سے ان کے خیالات و افکار، اور جذبات و کیفیات کا صحیح اندازہ ہوتا ہے، یا وہ کتابیں جو اخلاقی سوسائٹی پر تنقید اور بدعات و منکرات کے رد و ابطال میں لکھی گئی ہیں، اگر ہمارا مطالعہ اپنی مقرر کردہ حدود سے آگے بڑھ کر ان اہم اور گم شدہ تاریخی مآخذ تک وسیع ہو سکتا اور کوئی وسیع النظر نکتہ رس اور باہمت محقق اس موضوع پر جم کر کام کر سکتا تو ایک مربوط و مکمل تاریخ اصلاح و تجدید پیش کرنے میں کامیاب ہو جاتا، اور ہمیں صاف نظر آتا کہ

دعوت و عزیمت دونوں چیزیں اس اُمّت کے ہر دور اور ہر مرحلہ میں اس کا ساتھ دیتی رہیں، اور انھوں نے کبھی اس کو مایوس اور محروم نہیں کیا۔

اسلام کی میراث

یہ میراث جو ہمارے ہاتھ میں پہونچی (اور جس کو ہم میراث) کے معنی میں نہیں بول رہے ہیں، جو اہلِ مغرب کا مفہوم ہے، اس لئے کہ اسلام ایک زندہ جاوید دین ہے، ہم میراث سے وہ دولت اور ثروت مراد لیتے ہیں، جو ہمارے اسلاف سے ہماری طرف منتقل ہوئی ہے، علم راسخ، محفوظ و مضبوط عقائد، طاقتور ایمان، سنّت سنیّہ، اخلاقِ عالیہ، فقہ و شریعت اور شاندار اسلامی ادب کی ثروت، اس میراث میں ہر اس فرد کا پورا حصّہ ہے، جس نے اسلام کے کسی دور میں بھی منہاج خلافت پر حکومت قائم کی، جاہلیت اور مادّیت کا مقابلہ کیا، اللہ تعالےٰ کی طرف دعوت دی، اسلام کے خصائص مٹ گئے تھے، ان کو اُجاگر کیا، امت میں ایمانی روح پیدا کی، اس لازوال ثروت میں ہر اس شخص کا اضافہ تسلیم کیا جائے گا، جس نے اس دین پر اس کے مآخذ اور اس کی تعبیرات پر اعتماد کو از سرِ نو استوار کیا، نو وارد فلسفوں کا ابطال کیا، اسلام کی حقیقی فکر کی حفاظت کی، اور اس ...امت کو کسی نئے فتنہ میں پڑنے سے باز رکھا، جس نے اس امت کے لئے اس کے دین اور مصادر دین کی حفاظت کی، حدیث و فقہ کی تدوین جدید کا کام انجام دیا، اجتہاد کا دروازہ کھولا، اور امت کو تشریع کا خزانۂ عامرہ اور زندگی و معاشرہ کا منظم قانون عطا کیا، جس نے معاشرہ میں احتساب کا فرض ادا کیا، اور اس کے انحراف اور کج روی پر کھل کر تنقید کی، اور صحیح و حقیقی اسلام کی برملا و آشکارا دعوت دی، جس نے شکوک و شبہات کے دور اور اضطراب عقائد کے زمانہ میں علمی طرز استدلال اختیار کرکے دماغوں کو مطمئن کرنے کی کوشش کی، اور ایک نئے علم کلام کی بنیاد ڈالی، جس نے دعوت و تذکیر اور انذار و تبشیر میں انبیاء علیہم السلام کی نیابت کی، اور ایمان کی دبی ہوئی چنگاریوں کو شعلۂ جوالہ کی حرارت و حرکت بخشی، جس نے مادہ پرستی کے تند و تیز دھارے کے سامنے کھڑے ہو کر اس کی تیزی و بلاخیزی کم کی، اور خدا کی مخلوق کو اس دھارے میں بہ جانے یا اس میں دب جانے

سے محفوظ رکھا، جس نے اس امت کی سیاسی قوت کی حفاظت کی اور اس کو پے در پے خارجی حملوں کو سہار لینے کی قوت عطا کی، جس نے اپنی حکیمانہ دعوت اور اپنے دامِ محبت سے اس دشمن کو شکار کیا، جو زورِ شمشیر اور نوک خنجر سے بھی زیر نہ ہو سکا تھا، اور جس نے عالم اسلام کو اس سرے سے اس سرے تک زیر وزبر کر کے رکھ دیا تھا، جس نے اپنے طاقتور ایمان اور اپنی روحانی قوت سے ایسے دشمنوں کو حظیرۂ اسلام میں داخل کیا اور محمد عربی علیہ الصلوٰۃ والسلام کی غلامی کا شرف بخشا، جس نے اپنے طاقتور ادب اور دل گداز و بلیغ اشعار سے ان ذہنوں کو اسیرِ دام کیا، جو علمی مباحث اور مذہبی فلسفوں سے مطمئن ہونے والے نہیں تھے، یہ پورا ایک سلسلہ ہے، اور اس میں ہر شخصیت کا ایک خاص حصہ اور مرتبہ ہے، تاریخ دراصل امانت کی ادائیگی اور حق شناسی اور اعترافِ حقیقت کا نام ہے۔ یہ ان لوگوں کے نام ہیں جن میں سے ہر شخص اسلام کی کسی نہ کسی سرحد کا محافظ اور اسلام کے ترکش کا ایک قیمتی تیر تھا، اگر ان لوگوں کی مخلصانہ کوششیں نہ ہوتیں، جن کو آج ہم تاریخ کی دوربین سے دیکھنے کی کوشش کر رہے ہیں، تو ہم تک یہ مجموعہ نہ پہونچ پاتا، جس میں ہمارے لئے عزت، عبرت اور موعظت کا وافر سامان موجود ہے، اور جس کی موجودگی میں ہم اقوام عالم کے سامنے بجا طور پر اپنا سر بلند رکھ سکتے ہیں۔

اس مسلک اور ان خطوط پر جو مصنف کے نزدیک منصفانہ اور عادلانہ مسلک ہے، اس نے آئندہ صفحات میں ان اہم شخصیتوں کی تصویر پیش کرنے کی کوشش کی ہے، جنھوں نے دعوت و عزیمت اور اصلاح و تجدید کے میدان میں کوئی بڑی خدمت انجام دی ہے۔ وبیداللہ التوفیق

پہلی صدی کی اصلاحی کوششیں

اور

عمر بن عبدالعزیزؒ

عہد اموی میں جاہلی رجحانات واثرات

خلافتِ راشدہ کے اختتام، اور بنی امیہ کی حکومت کے استحکام نے (جو اسلامی سے زیادہ عربی تھی) تجدید و انقلاب کی فوری ضرورت پیدا کردی، قدیم جاہلی رجحانات جو آنحضرت (صلے اللہ علیہ وسلم) کی صحبت و تربیت اور خلافتِ راشدہ کے اثر سے دب گئے تھے، نیم تربیت یافتہ مسلمانوں اور نئی عربی نسل میں اُبھر آئے، حکومت کا محور جس پر اس کا پورا نظام گردش کرتا تھا، کتاب و سنت نہیں رہا، بلکہ عربی سیاست اور "مصالح ملکی" بن گیا، تفاخر اور عربی عصبیت کی روح جس کو اسلام نے شہر بدر کردیا تھا، اور جو بادیۂ عرب میں پناہ گزیں تھی، پھر واپس آگئی، قبائلی غرور، خاندانی جنبہ داری، اعزہ پروری جو خلافتِ راشدہ میں سخت عیب اور معصیت شمار ہوتی تھی، ہنر اور محاسن بن گئے، اعمال و اخلاق کے محرکات (بجائے اجر و ثواب کے) جاہلی ناموری، مدح و تعریف اور تفوق ہو گئے،[1]

---

[1] اس سلسلہ میں جاہلیت کا جذبۂ مسابقت اور شہرت و عزت پورے طور پر زندہ اور بیدار ہوگیا تھا، اس ذہنیت کا اندازہ اس دلچسپ واقعہ سے ہوسکتا ہے، جو ابوالفرج اصفہانی نے اغانی میں نقل کیا ہے کہ عہد اموی کے دو عرب سرداروں حوشب اور عکرمہ کے درمیان عرصہ سے اس بات کا مقابلہ تھا کہ کس کے یہاں کھانا زیادہ تیار ہوتا ہے، اور مہمان زیادہ ہوتے ہیں، اس سلسلہ میں حوشب کا پلہ اکثر بھاری رہتا، ایک عرصہ بعد عکرمہ نے اپنے حریف کو زک دینے کے لئے یہ تدبیر کی کہ صدہا بوریاں آٹے کی خریدکیں اور اپنے قبیلہ میں تقسیم کردیں کہ آٹا گوندھ لیا جائے اس گندھے ہوئے آٹے کو اس نے ایک بڑے گڑھے میں بھروادیا اور اوپر سے گھانس ڈال دی اور اس کا انتظام کیا کہ حوشب کا گھوڑا اس گڑھے میں گرجائے، چنانچہ ایسا ہی ہوا کہ گھوڑا گندھے ہوئے آٹے کی اس خندق میں جا پڑا اور آٹے میں لت پت ہوگیا، اور دھوم مچ گئی کہ عکرمہ کے یہاں اس مقدار میں آٹا گندھتا ہے کہ گھوڑا اس میں گرگیا، لوگ تماشا دیکھنے کے لئے جمع ہوگئے دیکھا تو گھوڑے کا سر اور گردن باہر تھی، اور سارا جسم (باقی ص ۳۳ پر)

بیت المال (جو مسلمانوں کے پیسہ پیسہ سے جمع ہوتا تھا) خلیفہ کی ذاتی ملکیت اور خاندانی جاگیر بن گیا تھا، پیشہ ور شعراء، خوشامدی درباریوں اور آبرو باختہ مصاحبین کا ایک طبقہ پیدا ہو گیا، جس پر مسلمانوں کی دولت بیدریغ صرف ہوتی تھی، اور ان کی بے عنوانیوں سے چشم پوشی کی جاتی تھی[1]، گانا سننے کا ذوق اور موسیقی کا انہماک حد کو پہونچ گیا تھا[2] حکومت کی غلط روی، اور اہلِ حکومت کی بے دین زندگی سے پوری اسلامی سوسائٹی متاثر ہو رہی تھی، اور مترفین کا ایک طبقہ پیدا ہو گیا تھا، جس کے اخلاق قدیم مترفین سے ملتے جلتے تھے، ایسا معلوم ہوتا تھا، کہ جیسے زخم خوردہ جاہلیت اپنے فاتح حریف سے انتقام لینے پر تلی ہوئی ہے، اور چالیس برس کا حساب ایک دن میں پورا کرنا چاہتی ہے۔

عہدِ اموی کی دینی شخصیتیں اور ان کا اخلاقی اثر

بنی امیہ کے اس مادی اقتدار اور اس کے قدرتی اثرات کے باوجود اس عہد تک دین کا وقار اور اس کا اخلاقی اثر کسی حد تک مسلمانوں کی زندگی میں قائم تھا، یہ دینی وقار اور اخلاقی اثر ان اشخاص کی بدولت تھا، جو دینی و علمی حیثیت سے بلند مقام رکھتے تھے، اور اپنی للہیت، اخلاص، پاکیزہ نفسی، اور علم و تفقہ میں مشہور و معروف تھے، حکومت و انتظامات کے دائرہ سے باہر انہی حضرات کا اثر و اقتدار تھا، اس اثر اور قلبی احترام کی وجہ سے مسلمان بہت سی خرابیوں اور گمراہیوں سے محفوظ تھے، اور مادیت کے سیلاب میں بالکل بہ جانے سے رکے ہوئے تھے، ان دینی شخصیتوں میں سب سے بااثر اور محبوب شخصیت حضرت علی بن الحسین (زین العابدین علیہ و علیٰ آبائہ السّلام) کی تھی، جو عبادت و تقویٰ اور زہد و ورع میں اپنی نظیر نہیں

(باقی ص ۳۱ کا) ڈوبا ہوا تھا، رسیوں اور بلیوں سے اس کو بڑی مشکل سے نکالا گیا، عام طور پر اس واقعہ کی شہرت ہوئی، اور شعراء نے اشعار کہے، اس طرح عکرمہ نے اپنے حریف کے مقابلہ میں فتح حاصل کری، اور اپنا تفوق تسلیم کروالیا (از رنات اخالت جلد ا ص ۱۳۹-۱۴۰)

[1] اموی عہد کا مشہور عیسائی شاعر اخطل (م ۹۵ھ) خلیفہ عبدالملک بن مروان کی مجلس میں اس شان سے آتا کہ گلے میں سونے کی صلیب ہوتی اور داڑھی کے بالوں سے شراب کے قطرے ٹپکتے، اور کوئی اس کو ٹوکنے والا نہ ہوتا (اغانی ج ۷ ص ۱۷۸)

[2] اس کا اندازہ اس واقعہ سے ہوگا کہ ایک مرتبہ عراق کا مشہور مغنی حنین اپنے ہم پیشہ لوگوں کی دعوت پر مدینہ منورہ آیا، اور ایک مکان میں اس نے اپنے فن کا مظاہرہ کیا، سننے والوں کا اس قدر ہجوم ہوا کہ چھت بیٹھ گئی، اور خود حنین دب کر مر گیا۔

(اغانی ج ۲ ص ۱۲۲، ۱۲۳)

رکھتے تھے، مسلمانوں کو ان کے ساتھ جو تعلق تھا، اس کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے، کہ ایک مرتبہ ہشام بن عبدالملک اپنی ولی عہدی کے زمانہ میں طواف کے لئے آیا، شدّتِ ہجوم کی وجہ سے وہ حجرِ اسود تک نہیں پہونچ سکا، اور اس انتظار میں بیٹھ گیا کہ مجمع کچھ کم ہو تو وہ استلام[1] کرے، اس درمیان میں حضرت علی بن الحسین آئے، ان کا آنا تھا کہ مجمع کائی کی طرح چھٹ گیا، اور انھوں نے بآسانی طواف و استلام کیا، وہ جدھر سے گزرتے، لوگ احتراماً راستہ چھوڑ دیتے تھے، ہشام نے انجان بن کر پوچھا کہ یہ کون ہیں؟ عہدِ اموی کے مشہور شاعر فرزدق نے برجستہ اشعار میں اس کے تجاہلِ عارفانہ کا جواب دیا، اور ان کا شایانِ شان تعارف کرایا۔[2]

اسی طرح دوسرے فضلاءِ اہلِ بیت حضرت حسن المثنّیٰ، اور ان کے صاحبزادہ حضرت عبداللہ المحض نیز دوسرے فضلائے تابعین حضرت سالم بن عبداللہ بن عمرؓ، حضرت قاسم بن محمد بن ابی بکرؓ، حضرت سعید بن المسیب حضرت عروہؓ بن الزبیر[3] مسلمانوں کے لئے دینی نمونہ (آئیڈیل) تھے، انھوں نے اپنی خودداری، حکومت سے بے تعلقی، حق گوئی، اور بے باکی، علمی انہماک اور بے غرض خدمتِ دین سے اپنی اخلاقی برتری کا نقش قائم کر دیا تھا، حکومت کے بڑھتے ہوئے ہمہ گیر اثرات کے مقابلہ میں یہ اخلاقی اثر اگرچہ کافی نہ تھا، مگر اس میں شبہ نہیں کہ وہ بے قیمت اور بے نتیجہ نہ تھا، اس سے مسلمانوں کی زندگی میں کسی حد تک اعتدال و توازن اور دین کا احترام قائم تھا، اور کبھی کبھی عین دنیاوی انہماک میں بھی اصلاحِ حال کا جذبہ ابھرتا تھا۔

انقلابِ حکومت کی ضرورت، اس کی مشکلات

رفتہ رفتہ سیاسی انقلاب کے اثرات وسیع اور گہرے ہوتے چلے گئے، ان دینی شخصیتوں میں بھی کمی آنے لگی، جو اسلام

---

[1] حجرِ اسود کو بوسہ دینا، یا ہاتھ سے چھونا، ۱۲۔ [2] یہ قصیدہ اب بھی عربی ادب میں یادگار ہے، اس کا مطلع ہے۔

هٰذا الّذی تعرف البطحاء وطأته — والبیت یعرفه والحِلُّ والحرم

محققین کا خیال ہے کہ اس قصیدہ میں بہت سے اشعار بعد میں اضافہ ہوئے ہیں۔

[3] مفصل حالات و تراجم کے لئے ملاحظہ ہو تذکرۃ الحفاظ للذہبی، صفوۃ الصفوۃ لابن الجوزی اور تاریخ ابن خلکان۔

کے اصلی اخلاق و اوصاف کی محافظ اور قرنِ اول کی یادگار تھیں، حکومت کا دائرۂ اثر وسیع اور مستحکم ہوگیا، اب اخلاق و دینی انقلاب اس کے بغیر مشکل تھا کہ خود حکومت میں کوئی خوشگوار انقلاب ہو۔

اموی حکومت ایسی مستحکم فوجی بنیادوں پر قائم تھی کہ آسانی سے ہلائی نہیں جا سکتی تھی، اس وقت کوئی بیرونی یا اندرونی طاقت ایسی نہ تھی، جو اس کو میدان جنگ میں شکست دے سکے، ماضی قریب میں دو بڑی کوششیں ایک سیدنا حضرت حسین رضی اللہ عنہ کا مخلصانہ و سرفروشانہ اقدام، دوسرے حضرت عبد اللہ بن زبیرؓ کا دلیرانہ و منظم مقابلہ ناکام ہو چکا تھا، کسی فوجی انقلاب کی کامیابی کے قریبی امکانات و آثار نہ تھے، شخصی و موروثی حکومت نے اصلاح و تبدیلی کے دروازے بند کر دیئے تھے، اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ صدیوں کے لئے مسلمانوں کی قسمت پر مہر لگ چکی ہے، اس وقت اسلام کو غالب ہونے اور حالات کو بدل دینے کے لئے ایک معجزہ کی ضرورت تھی، اور وہ معجزہ ظاہر ہوا۔

عمر بن عبد العزیزؒ کی جانشینی

یہ معجزہ حضرت سیدنا عمرؒ بن عبد العزیز کی ذات ہے، جو خود بانی خاندان (مروان) کے پوتے، اور ان کی ماں (ام عاصم) فاروق اعظمؓ کی پوتی تھیں، فاروقیت اور امویت کا یہ سنجوگ[۱] اسی لئے ہوا تھا، کہ بنی امیہ کے خاندان میں ایک خلیفۂ راشد پیدا ہو، جو حالات میں انقلاب برپا کر دے۔

عمر بن عبد العزیزؒ ۶۱ھ میں پیدا ہوئے، وہ خلیفۂ وقت سلیمان بن عبد الملک کے چچا زاد بھائی تھے، اور اس کے پیشرو ولید بن عبد الملک کے اور اس کے زمانہ میں مدینہ منورہ کے حاکم (گورنر) تھے، ان کی جوانی اور امارت کو ان کی خلافت

---

[۱] اس رشتہ کی تاریخ یہ ہے کہ حضرت عمرؓ نے منادی کروائی تھی کہ دودھ میں پانی نہ ملایا جائے، اسی زمانہ میں ایک رات وہ گشت پر تھے کہ ایک گھر سے آواز آئی کہ کوئی عورت کہہ رہی ہے، بیٹی صبح ہو رہی ہے، دودھ میں پانی ملا دے، لڑکی نے جواب دیا کہ اماں آپ کو معلوم نہیں کہ امیر المومنین نے اس کی ممانعت کی ہے؟ عورت نے کہا کہ امیر المومنین اس وقت کہاں ہیں، ان کو کیا خبر؟ لڑکی نے جواب دیا کہ امیر المومنین کو خبر نہیں تو خدا تو دیکھ رہا ہے، حضرت عمرؓ نے اس گھر کو نظر میں رکھ لیا، اور اپنے صاحبزادہ عاصم سے کہا کہ تم اس لڑکی کو پیام دو، مجھے امید ہے کہ اس کے بطن سے ایسا جوانمرد پیدا ہوگا جو سارے عرب پر حکومت کرے گا، عاصم نے اس سے نکاح کر لیا، عمر بن عبد العزیز اس کے نواسے ہیں۔ (سیرت عمر بن عبد العزیز ص ۱۷، ۱۸)

کے بعد کی زندگی سے کوئی مناسبت نہیں، وہ ایک صاحب ذوق امیرانہ مزاج اور نفیس طبع نوجوان تھے، وہ جس راستہ سے گزرتے تھے، دیر تک اس کی مہک بتلاتی تھی کہ ادھر سے عمر گزرے ہیں، ان کی چال مشہور اور نوجوانوں کا فیشن تھی، سوائے طبیعت کی سلامتی، حق پسندی اور فطری نیک مزاجی کے ان میں کوئی ایسی علامت نہ تھی جس سے ثابت ہو کہ وہ تاریخ اسلام میں اتنا اہم کام انجام دینے والے ہیں۔

لیکن ان کی ذات سرتاپا اسلام کا اعجاز تھی، اور وہ جس طرح منصب خلافت پر آئے، وہ بھی خدا کی قدرت کی ایک نشانی تھی، موروثی نظام حکومت میں ان کی خلافت کا کوئی موقع نہ تھا، اگر حالات اپنی طبعی رفتار سے چلتے رہتے، تو امارت سے زیادہ ان کا کوئی حصہ نہ تھا، مگر خدا کو کچھ اور منظور تھا، سلیمان بن عبدالملک بیمار ہوا، اس کے بچے چھوٹے چھوٹے تھے، اس نے ان کو لانبی لانبی قبائیں پہنائیں، اور ہتھیار باندھے کہ وہ بڑے معلوم ہوں، مگر وہ آنکھوں میں نہ جنچے، اس نے بڑی حسرت سے ان کی طرف دیکھا، اور کہا کہ وہ بڑا خوش قسمت ہے، جس کے لڑکے بڑے بڑے ہوں، "رجاء بن حیوۃ" نے جو اسی انتظار میں تھے، حضرت عمرؒ بن عبدالعزیز کی جانشینی کا مشورہ دیا، جو منظور ہوا، رجاء کا یہ کارنامہ (جو دینی انقلاب کا ذریعہ بنا) بڑے بڑے مجاہدات اور سالہا سال کی عبادت پر بھاری ہے۔

خلافت کے بعد ان کی زندگی

عمر بن عبدالعزیزؒ نے زمام حکومت ہاتھ میں لیتے ہی بلا تاخیر ان چند عمال حکومت کو معزول کیا، جو سخت ظالم اور ناخدا ترس تھے، ان کے سامنے شاہی تزک و احتشام اور جانشینی کا جو سامان پیش کیا گیا، اس کو بیت المال میں داخل کیا، اور اسی گھڑی سے ان کی سیرت یکسر بدل گئی، اب وہ سلیمان کے جانشین نہ تھے، بلکہ امیر المؤمنین عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ کے جانشین تھے، جواری اور باندیوں کو تحقیق کے بعد ان کے خاندانوں اور شہروں کو واپس کر دیا، مظالم کا تصفیہ کیا، اور اپنی مجلس کو جس نے کسریٰ و قیصر کے دربار کی حیثیت اختیار کر لی تھی، سنت اور خلافت راشدہ کے نمونہ پر سادہ اور مطابق سنت بنا دیا، اپنی جاگیر مسلمانوں کو واپس کر دی، بیوی کا زیور بیت المال میں داخل کیا، انھوں نے ایسی زاہدانہ

زندگی اختیار کی، جس کی نظیر بادشاہوں میں تو کیا مل سکتی ہے، درویشوں اور فقراء میں بھی ملنی مشکل ہے، لباس میں ایسی کمی کی کہ بعض اوقات کرتا سوکھنے کے انتظار میں جمعہ میں تاخیر سے پہنچنا ہوتا، بنی امیہ جو ساری سلطنت کو اپنی جاگیر اور بیت المال کو اپنی ملکیت سمجھتے تھے، اب اپنا اپنا ثلث حصہ پاتے، خود ان کے گھر کا یہ حال تھا کہ ایک مرتبہ اپنی بچیوں سے ملنے گئے، تو دیکھا جو بچی ان سے بات کرتی ہے، وہ منھ پر ہاتھ رکھ لیتی ہے، سبب دریافت کیا تو معلوم ہوا کہ ان بچیوں نے آج صرف دال اور پیاز کھائی ہے، رو کر فرمایا کہ کیا تم اس پر راضی ہو کہ تم انواع واقسام کے کھانے کھاؤ اور تمہارا باپ جہنم میں جائے؟ یہ سن کر وہ بھی رو پڑیں[۱]، اس وقت جبکہ وہ روئے زمین کی سب سے بڑی سلطنت کے حکمران تھے، ان کی ذاتی ملکیت کا یہ حال تھا کہ باوجود شوق کے حج کا خرچ ان کے پاس نہ تھا، نوکرے جوان کا سچا رفیق تھا، پوچھا کہ تمہارے پاس کچھ ہے؟ اس نے کہا کہ دس بارہ دینار، کہا کہ اس میں حج کیسے ہو سکتا ہے؟ اس کے بعد ایک بڑی خاندانی مالیت آئی تو خادم نے مبارک باد دی، اور کہا کہ حج کا سامان آ گیا، فرمایا ہم نے اس مال سے بہت دنوں فائدہ اٹھایا ہے، اب یہ مسلمانوں کا حق ہے، یہ کہہ کر اس کو بیت المال میں داخل کر دیا۔

ان کے دو وقت کھانے کا حساب دو درہم یومیہ سے زیادہ نہ تھا، احتیاط کا یہ عالم تھا کہ اگر سرکاری شمع جل رہی ہوتی، اور کوئی ان کی خیریت دریافت کرنے لگتا، یا ذاتی بات چیت شروع کر دیتا تو فوراً اس کو گل کر دیتے، اور اپنی ذاتی شمع منگواتے، بیت المال کے باورچی خانہ میں گرم کئے ہوئے پانی سے غسل کرنے سے بھی ان کو احتراز تھا، بیت المال کے مشک کو سونگھنا بھی گوارا نہ تھا[۲]۔

ان کی احتیاط تنہا اپنی ذات تک محدود نہ تھی، بلکہ وہ اپنے عمال حکومت کو بھی احتیاط کا سبق دیتے تھے، اور ان سے توقع کرتے تھے کہ وہ بھی حکومت کے معاملہ میں اسی قدر محتاط اور جزرس ہوں گے، والئ مدینہ ابوبکر بن حزم نے سلیمان بن عبدالملک کو درخواست دی تھی کہ حسب دستور سابق ان کو سرکاری موم بتیاں اور قندیلیں ملنی چاہئیں، سلیمان کے انتقال کے بعد یہ پرچہ عمر بن عبدالعزیزؒ کے ملاحظہ میں آیا، آپ نے لکھا کہ ابوبکر مجھے یاد ہے کہ تم اس عہدے سے پہلے جاڑے کی اندھیری راتوں میں بے شمع و موم بتی کے نکلتے تھے، تمہاری وہ حالت اس حالت سے بہتر تھی، میرے خیال میں تمہارے گھر کی موم بتیاں

---

[۱] سیرت عمر بن عبدالعزیز (محمد بن عبدالحکم ص ۵۵) [۲] سیرت عمر بن عبدالعزیز ص ۴۴

اور قند یلیں کافی ہیں انہی سے تم کو کام لینا چاہئے[1]، اسی طرح کی ایک درخواست پر جس میں سرکاری کام کے لئے کاغذ طلب کیا گیا تھا، لکھا کر:۔

"قلم باریک کرو اور گھٹا ہوا لکھو، اور ایک پرچہ میں بہت سی ضرورتیں لکھ دیا کرو، اس لئے کہ مسلمانوں کو ایسی لمبی چوڑی بات کی ضرورت نہیں جس سے خوانخواہ بیت المال پر بار پڑے[2]"

ان کی انقلابی اصلاحات

اس زاہدانہ زندگی اور تقویٰ و احتیاط کے ماسوا انھوں نے حکومت کی روح ہی بدل دی، پہلا اور بنیادی انقلاب یہ تھا کہ انھوں نے حکومت کا نقطۂ نظر بدلا اس وقت تک حکومت محاصل و خراج وصول کرنے اور صرف کرنے کا ایک انتظامی ادارہ تھا، جس کو جمہور کے اخلاق و عقائد، سیرت و تربیت اور ضلالت و ہدایت سے کچھ بحث نہ تھی، اسی نقطہ کے گرد اس کا سارا نظام گردش کرتا تھا، انھوں نے اپنے اس مشہور تاریخی فقرے سے کہ:۔

"محمد (صلے اللہ علیہ وسلم) دنیا میں ہادی بنا کر بھیجے گئے تھے، تحصیلدار بنا کر نہیں بھیجے گئے تھے[3]"

حکومت کا مزاج اور نقطۂ نظر ہی تبدیل کر دیا، اور اس کو دنیاوی حکومت کے بجائے خلافت نبوت بنا دیا، ان کی ساری مدتِ خلافت اسی ایک جملہ کی عملی تفسیر تھی، انھوں نے ملکی مصالح و منافع کے مقابلہ میں ہمیشہ دین و اصول و اخلاق کو ترجیح دی، اور دینی نفع کے مقابلہ میں حکومت کے مالی نقصان کی کبھی پروا نہیں کی، ان کے زمانۂ خلافت میں اسلامی حکومت کے غیر مسلم باشندے (ذمّی) بڑی تعداد میں مسلمان ہو رہے تھے جس کا نتیجہ یہ تھا کہ جزیہ کی رقم جو حکومت کی آمدنی کا ایک اہم عنصر تھی، روز بروز کم ہوتی جا رہی تھی، اور حکومت کے مالی توازن پر اس کا زبردست اثر پڑ رہا تھا، اہلکاران سلطنت نے ان کو اس خطرہ کی طرف توجہ دلائی، اور تشویش کا اظہار کیا، انھوں نے فرمایا کہ یہ تو آنحضرت (صلے اللہ علیہ وسلم) کی بعثت کا عین مقصد ہے، ایک دوسرے عہدہ دار کو لکھا کہ مجھے اس سے بڑی خوشی ہوگی کہ سب غیر مسلم مسلمان ہو جائیں اور (جزیہ کی

[1] سیرت عمر بن عبدالعزیز ص ۶۴ [2] ایضاً ص ۶۴ [3] کتاب الخراج امام ابو یوسف ص ۷۵

آمدنی بند ہو جانے کی وجہ سے) ہم تم دونوں کھیتی کر کے اور مل جلا کر اپنا پیٹ بھریں[۱]، یمن میں خراج کی ایک متعین مقدار مقرر تھی خواہ فصل اچھی ہو یا بری، حاکم نے اطلاع دی، آپ نے فرمایا کہ فصل کے مطابق رقم وصول ہونی چاہیے، خواہ اس کا نتیجہ یہ ہو کہ سارے یمن سے ایک مٹھی غلہ وصول ہو، میں اس پر راضی ہوں[۲]، چنگی ساری مملکت سے معاف کر دی، اور عمال کو لکھا کہ وہ نجس ہے، اس کے متعلق قرآن مجید میں ارشاد ہے:۔

وَلَا تَبْخَسُوا النَّاسَ اَشْيَاۗءَهُمْ وَلَا تَعْثَوْا — اور لوگوں کو ان کی چیزیں کم مت دو، اور زمین میں

فِي الْاَرْضِ مُفْسِدِيْنَ ۝ (ہود - ۸۵) — فساد پھیلاتے نہ پھرو۔

لوگوں نے اس کا نام بدل کر اس کو جائز بنا لیا ہے[۳]، چند شرعی محاصل کے علاوہ ہر طرح کے ناجائز محاصل اور بیسیوں ٹیکس جو سابق فرمانرواؤں اور عمالِ حکومت نے ایجاد کیے تھے، یکسر معاف کر دیئے[۴]، خشکی اور سمندر کے راستوں کو کھولنے کی ہدایت کی، اور ہر طرح کی پابندیاں اٹھا دیں[۵]۔

مملکت میں ایسی اصلاحات کیں، جن کے نتائج بہت دوررس تھے، ساری مملکت کے لئے یکساں پیمانے مقرر کیے، جس میں فرق نہیں ہو سکتا تھا[۶]، حکام وعمال سلطنت کو تجارت کی ممانعت کی[۷]، بیگار کو قانوناً ممنوع قرار دیا[۸]، سلطنت کی زمین کا خاصا رقبہ امراء اور شاہی خاندان کے افراد و حکام نے اپنی شکارگاہ یا چراگاہ کے لئے گھیر کر بیکار بنا رکھا تھا، حکم دیا کہ وہ عوام کی ملکیت ہے[۹]، عمال کو تحفہ تحائف قبول کرنے کی ممانعت کی، اور فرمایا کہ اگر وہ کبھی تحفہ تھا، تو اب رشوت کے سوا کچھ نہیں ہے[۱۰]، حکام کو ہدایت کی کہ لوگوں کو اپنے تک پہنچنے اور شکایات پہونچانے کے پورے مواقع اور سہولتیں مہیا کریں، حج کے موقع پر اعلان ہوتا تھا کہ جو کسی ظلم کی اطلاع یا کوئی نیک مشورہ دے گا، اس کو سو سے لے کر تین سو دینار تک انعام ملے گا[۱۱]۔

اعمال و اخلاق کی طرف توجہ

اس وقت تک خلیفہ صرف حاکم و بادشاہ ہوتا تھا، اس کو لوگوں کے اعمال و اخلاق کی طرف توجہ کرنے کی

---

۱ مناقب عمر بن عبدالعزیز ص ۶۳ (طبع یورپ) ۲ سیرت عمر بن عبدالعزیز ص ۱۲۶ ۳ ایضاً ص ۴۳ ۴ ایضاً ص ۹۹ ۵ ایضاً ص ۹۸ ۶ ایضاً ص ۹۹

۷ ایضاً ص ۱۰۰ ۸ ایضاً ص ۹۷ ۱۰ ایضاً ص ۱۶۲ ۱۱ ایضاً ص ۱۴۱

نہ فرصت تھی، نہ اہلیت، نہ اس کا یہ منصب سمجھا جاتا تھا کہ وہ لوگوں کو دینی مشورے دے، ان کے اخلاق و رجحانات کی نگرانی کرے، اور وعظ و نصیحت کا منصب اختیار کرے، یہ کام علماء و محدثین کا سمجھا جاتا تھا، عمر بن عبدالعزیزؒ نے اس دوئی کو مٹایا اور اپنے کو حقیقی معنی میں "خلیفہ" ثابت کیا، انھوں نے زمامِ خلافت ہاتھ میں لیتے ہی عمالِ حکومت اور امراء اجناد (فوجی افسروں) کو طویل طویل خط اور فرمان لکھے، جو انتظامی سے زیادہ دینی و اخلاقی ہیں، اور ان میں حکومت کی روح سے زیادہ شورہ و نصیحت کی روح ہے، ایک خط میں انھوں نے سابق اسلامی زندگی (عہدِ نبوت و خلافت) اور اس وقت کی معاشرت کا نقشہ کھینچا ہے، اور اسلامی نظامِ مالیات اور طرزِ حکومت کی تشریح کی ہے[۱]، ان خطوط میں وہ امراء اجناد (فوجی افسروں) کو وقت پر نمازیں پڑھنے، اور ان کے اہتمام اور علم کی نشر و اشاعت کی تاکید کرتے ہیں[۲]، عمال کو تقویٰ و اتباعِ شریعت کی وصیت فرماتے ہیں[۳]، اپنے اپنے علاقہ اور حلقہ میں اسلام کی دعوت و تبلیغ کی ترغیب دیتے ہیں، اور اسی کو رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی بعثت اور اسلام کے ظہور کا مقصد بتلاتے ہیں[۴]، ان کو امر بالمعروف و نہی عن المنکر کے اہتمام کی تاکید کرتے ہیں، اور بتلاتے ہیں کہ اس فریضہ کے ترک ہو جانے کے کیا نقصانات ہیں، اور اس کا کیا وبال پڑتا ہے[۵]، عمالِ سلطنت کو سزا و عقوبت میں اعتدال و احتیاط سے کام لینے کی تاکید فرماتے ہیں، اور اسلام کے قانونِ تعزیرات کی تشریح کرتے ہیں[۶]، پھر سلطنت کی عمومی شہری خرابیوں اور بداخلاقیوں کی طرف توجہ کرتے ہیں، نوحہ گری اور جنازہ میں عورتوں کے ساتھ جانے کو بند کرتے ہیں، پردہ کی تاکید کرتے ہیں[۷]، قبائلی عصبیت کی مذمت اور اس کی ممانعت کرتے ہیں[۸]، نبیذ کے استعمال میں بڑی بے احتیاطی شروع ہو گئی تھی، اور لوگ اس کے ذریعہ نشہ اور شراب تک پہنچ گئے تھے جس سے مختلف قسم کی بداخلاقیاں پیدا ہو رہی تھیں، اس کی تحدید و تشریح کرتے ہیں[۹]۔

تدوینِ علوم اور احیائے سنن

اس کے ساتھ انھوں نے دینی علوم کی تدوین اور سنتوں کی احیاء کی طرف بھی توجہ کی، ابوبکر بن حزم جو ایک

---

[۱] سیرت عمر بن عبدالعزیز (ابن عبدالحکم) ص ۶۹ [۲] ایضاً ص ۷۹ [۳] ایضاً ص ۹۲ [۴] ایضاً ص ۹۲ [۵] ایضاً ص ۱۳۴ [۶] ایضاً ص ۱۲۶ [۷] ایضاً ص ۱۰۳ [۸] ایضاً ص ۱۰۱ [۹] ایضاً ص ۱۰۲

بڑے عالم تھے، ان کو حدیث کی تدوین کی طرف توجہ دلائی اور لکھا:۔

انظر ما کان من حدیث رسول اللہ	آنحضرت (صلے اللہ علیہ وسلم) کی جو کچھ حدیثیں تم کو ملیں
صلے اللہ علیہ وسلم فاکتبہ فانی خفت	ان کو تحریری شکل میں لے آؤ اس لئے کہ مجھے اندیشہ ہے کہ
دروس العلم وذھاب العلماء۔	علماء رخصت ہوجائیں گے، اور علم مٹ جائے گا۔

انھوں نے تعین کے ساتھ عمرہ بنت عبدالرحمٰن انصاریہ اور قاسم بن محمد بن ابی بکر کے ذخیرۂ روایات کی طرف توجہ دلائی کہ جلد اس کو قلم بند کرلیا جائے، پھر صرف ابوبکر بن حزم ہی پر اکتفا نہیں کی، بلکہ عمال سلطنت اور مشاہیر علماء کو بالعموم اس ضرورت کی طرف متوجہ کیا، اور گشتی فرمان جاری کیا کہ:۔

انظروا الیٰ حدیث رسول اللہ (صلے اللہ	رسول اللہ علیہ وسلم کی احادیث ڈھونڈ ڈھونڈ کر
علیہ وسلم) فاجمعوہ[1]۔	جمع کرو۔

اسی کے ساتھ علماء کے وظائف[2] مقرر کئے کہ وہ یکسوئی اور انہماک کے ساتھ علم کی اشاعت اور تعلیم کا کام کرسکیں۔

وہ خود بڑے عالم تھے، انھوں نے بنفس نفیس فرائض وسنن کی تشریح کی طرف توجہ کی، خلافت کے ابتدائی دنوں میں ایک گشتی فرمان جاری کیا، جس میں فرماتے ہیں کہ:۔

"اسلام کے کچھ حدود و قوانین وسنن ہیں، جو ان پر عمل کرے گا، اس کے ایمان کی تکمیل ہوگی، اور جو عمل نہیں کرے گا، اس کا ایمان نامکمل رہ جائے گا، اگر زندگی نے وفا کی، تو میں تمھیں اس کی تعلیم دوں گا، اور تمھیں ان پر چلاؤں گا، اگر اس سے پہلے میرا وقت آگیا، تو میں تمہارے درمیان رہنے پر کچھ ایسا حریص بھی نہیں ہوں[3]"

چند خطوط و فرامین

سیدنا عمر بن عبدالعزیزؒ کے قالب میں جو خالص اسلامی ذہن اور اسلامی روح کارفرما تھی (اور جو بالآخر ان کے

---

[1] تاریخ اصبہان (ابونعیم) [2] سیرت عمر بن عبدالعزیز ص ۱۶۴ [3] صحیح بخاری کتاب الایمان باب قول النبی صلے اللہ علیہ وسلم بنی الاسلام علی خمس

(نظامِ سلطنت میں جلوہ گر ہوئی) اس کا صحیح اندازہ ان کے خطوط اور سرکاری فرامین سے ہوتا ہے، جو انھوں نے وقتاً فوقتاً سلطنت کے کارپردازوں اور اعلیٰ عہدہ داروں کو لکھے، ان سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کو کیا خالص اسلامی ذہن و دماغ بخشا تھا جس پر جاہلیت کی کوئی پرچھائیں، اور شاہانِ بنی اُمیہ کے اخلاق و افکار کا کوئی سایہ بھی نہیں پڑا تھا، یہاں چند خطوط پیش کئے جاتے ہیں۔

ان کو ایک مرتبہ معلوم ہوا کہ بعض قبائلی سردار اور عہدِ اموی کے "نو دولت" جاہلیت کی رسم حلف و محالفت کو زندہ کر رہے ہیں[1]، اور جنگ و مقابلہ کے موقع پر "یا لبنی فلان" یا "المضر" (فلاں قبیلہ کی دہائی ہے، ہاں اے اہلِ مضر اپنے حلیف کی مدد کرو) کا جاہلی نعرہ لگانے لگے ہیں، یہ اسلام کے رشتہ، اخوت اور نظامِ اجتماعی کے متوازی ایک جاہلی نظام اور جاہلی رسم کا احیا تھا، اور بہت سے فتنوں کا پیش خیمہ، سابق فرمانروا شاید اس کو بعض ملکی مصالح سے شہ دیتے یا کم از کم اہمیت نہ دیتے، لیکن عمر بن عبدالعزیزؒ نے اس خطرہ کو محسوس کیا، اور اس کے بارے میں مستقل فرمان صادر کیا، اپنے ایک بڑے عہدہ دار ضحاک ابن عبدالرحمٰن کو لکھتے ہیں:-

"حمد و صلوٰۃ کے بعد معلوم ہو کہ بیشک اللہ تعالیٰ اس اسلام کے علاوہ جس کو وہ اپنے لئے اور اپنے بندگان خاص کے لئے پسند فرما چکا ہے، کسی دین کو قبول نہیں فرماتا، اللہ تعالیٰ نے اسلام کو اپنی اس کتاب سے عزت بخشی اور اس کے ذریعہ اسلام اور غیر اسلام میں تفریق کر دی ہے، ارشاد فرمایا:-

قَدْ جَآءَكُمْ مِّنَ اللّٰهِ نُوْرٌ وَّكِتٰبٌ مُّبِيْنٌ ۙ	تمہارے پاس اللہ کی طرف سے ایک روشن چیز آئی، اور ایک
يَّهْدِيْ بِهِ اللّٰهُ مَنِ اتَّبَعَ رِضْوَانَهٗ	کتابِ واضح کہ اس کے ذریعہ سے اللہ تعالیٰ ایسے شخصوں کو جو
سُبُلَ السَّلٰمِ وَيُخْرِجُهُمْ مِّنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى	رضائے حق کے طالب ہیں، سلامتی کی راہیں بتلاتے ہیں، اور ان کو اپنی
النُّوْرِ بِاِذْنِهٖ وَيَهْدِيْهِمْ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ	توفیق سے تاریکیوں سے نکال کر نور کی طرف لے آتے ہیں اور
(المائدہ - ۱۵، ۱۶)	ان کو راہِ راست پر قائم رکھتے ہیں۔

[1] جاہلیت میں ایک قبیلہ دوسرے قبیلہ کا اور ایک شخص دوسرے شخص کا حلیف بن جاتا تھا، پھر وہ جا بیجا اس کی پاسداری کرتا تھا، اور حق و باطل میں اس کا ساتھ دیتا تھا۔

نیز ارشاد ہے:۔

وَبِالْحَقِّ اَنْزَلْنٰهُ وَبِالْحَقِّ نَزَلَ ؕ وَمَآ اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا مُبَشِّرًا وَّنَذِيْرًا ۝ (اسراء ۱۰۵)

اور ہم نے اس قرآن کو راستی ہی کے ساتھ نازل کیا اور وہ راستی ہی کے ساتھ نازل ہوگیا، اور ہم نے آپ کو صرف خوشی سنانے والا اور ڈرانے والا بنا کر بھیجا ہے۔

اللہ نے آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کو مبعوث فرمایا، اور آپ پر اپنی کتاب نازل فرمائی، اس وقت تم اے اہلِ عرب (جیسا کہ تم کو معلوم ہے) ضلالت، جہالت، پریشانی، تنگی، اور سخت انتشار میں مبتلا تھے، فتنے تمہارے درمیان عام تھے، لوگ تم کو دبائے ہوئے تھے، اور لوگوں کے پاس جو تھوڑا بہت دین باقی تھا اس سے بھی تم محروم تھے، اس کے برعکس لوگوں کی گمراہیوں میں سے کوئی گمراہی ایسی نہیں تھی، جس میں تم مبتلا نہ ہو، تم میں سے جو زندہ رہتا تھا وہ جہالت و گمراہی کے ساتھ زندہ رہتا تھا، اور تم میں سے جو مرتا تھا، اس کا انجام جہنم ہوتا تھا، یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ نے تم کو ان برائیوں، بتوں کی پرستش، جنگ و جدال، منافرت اور تعلقات کی خرابیوں سے صاف بچالیا، تم میں سے انکار کرنے والے نے انکار کیا، اور تم میں سے تکذیب کرنے والے نے جھٹلایا، اور اللہ کا پیغمبر اللہ کی کتاب اور اسلام کی دعوت دیتا رہا، پھر تم میں سے بہت کم اور کمزور لوگ اس پر ایمان لائے، ان کو ہر وقت خطرہ لگا رہتا تھا، کہ لوگ انھیں اُچک نہ لیں، تو اللہ نے ان کو پناہ دی، اور اپنی مدد سے ان کی تائید کی، اور ان کو وہ لوگ عطا فرمائے جن کا اسلام لانا اس کو منظور ہوا، آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم اس دنیا سے تشریف لے جانے والے تھے، اور اللہ کو اپنے رسول سے اس وعدہ کو پورا کرنا تھا، جس میں کوئی تغیّر و تبدّل ممکن نہیں، اس وعدہ کو تھوڑے سے مسلمانوں کے علاوہ عام طور پر لوگوں نے بعید سمجھا تو اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا:۔

هُوَ الَّذِيْٓ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰى وَدِيْنِ الْحَقِّ لِيُظْهِرَهٗ عَلَى الدِّيْنِ كُلِّهٖ وَلَوْ كَرِهَ الْمُشْرِكُوْنَ ۝ (الصف - ۹)

وہ اللہ ایسا ہے کہ اس نے اپنے رسول کو ہدایت اور سچا دین دے کر بھیجا ہے تاکہ اس کو تمام دینوں پر غالب کرے اگرچہ مشرک کیسے ہی ناخوش ہوں۔

بعض آیتوں میں اللہ تعالٰے نے خود مسلمانوں سے وعدہ کیا ہے، ارشاد فرماتا ہے کہ :۔

وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِي الْاَرْضِ كَمَا اسْتَخْلَفَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ وَلَيُمَكِّنَنَّ لَهُمْ دِيْنَهُمُ الَّذِي ارْتَضٰى لَهُمْ وَلَيُبَدِّلَنَّهُمْ مِّنْۢ بَعْدِ خَوْفِهِمْ اَمْنًا يَعْبُدُوْنَنِيْ لَا يُشْرِكُوْنَ بِيْ شَيْئًا (نور ۵۵)

تم میں جو لوگ ایمان لاویں اور نیک عمل کریں ان سے اللہ تعالٰے وعدہ فرماتا ہے کہ ان کو زمین میں حکومت عطا فرمائے گا، جیسا کہ ان سے پہلے لوگوں کو حکومت دی تھی، اور جس دین کو ان کے لئے پسند کیا ہے اس کو ان کے لئے قوت دے گا، اور ان کے خوف کے بعد اس کو مبدل بامن کر دے گا، بشرطیکہ میری عبادت کرتے رہیں، میرے ساتھ کسی قسم کا شرک نہ کریں۔

اللہ تعالٰے نے اپنے نبی اور مسلمانوں سے اپنے کئے ہوئے وعدہ کو پورا کر دیا، اے اہل اسلام! یاد رکھو تم کو اللہ تعالٰے نے جو کچھ بھی دیا، اسی اسلام کے صدقہ میں دیا ہے، جس کی بدولت تم اپنے دشمنوں پر فتح پاتے ہو، اور جس کی وجہ سے تم قیامت کے دن گواہ ہوگے، تمہارے لئے دنیا و آخرت میں اس کے علاوہ نہ نجات ہے، اور نہ کوئی حجت، نہ کوئی بچاؤ ہے، اور نہ کوئی حفاظت کا سامان اور طاقت، جب اللہ تعالٰے تم کو وہ بہترین دن نصیب کرے گا، جس کا تم سے وعدہ کیا گیا ہے، تو موت کے بعد اللہ کے ثواب کی امید ہے، اس لئے کہ اللہ تعالٰے نے ارشاد فرمایا ہے :۔

تِلْكَ الدَّارُ الْاٰخِرَةُ نَجْعَلُهَا لِلَّذِيْنَ لَا يُرِيْدُوْنَ عُلُوًّا فِي الْاَرْضِ وَلَا فَسَادًا وَالْعَاقِبَةُ لِلْمُتَّقِيْنَ ۝ (سورۃ القصص ۸۳)

یہ عالم آخرت ہم انہی لوگوں کے لئے خاص کرتے ہیں، جو دنیا میں نہ بڑا بننا چاہیں اور نہ فساد کرنا، اور نیک نتیجہ متقی لوگوں کو ملتا ہے۔

میں تم لوگوں کو اس قرآن اور اس پر عمل نہ کرنے کے نتائج بد سے ڈراتا ہوں، اس لئے کہ اس پر عمل نہ کرنے کے نتیجہ میں جو واقعات پیش آئے ہیں، امت میں جو خونریزی، جو خانہ ویرانی، جو پراگندگی اور انتشار برپا ہوا، وہ تمہاری نگاہوں کے سامنے ہے، پس جس چیز سے اللہ نے تم کو اپنی کتاب میں منع کیا ہے، اس سے رک جاؤ، کیونکہ اللہ تعالٰے کی وعید سے

زیادہ کوئی چیز خوف اور احتیاط کی مستحق نہیں ہے۔............

جس چیز نے مجھے اس خط کے لکھنے پر مجبور کیا ہے، وہ یہ بات ہے، جو دیہات کے باشندوں کے متعلق مجھ سے ذکر کی گئی، اور ان لوگوں کی بابت جو نئے نئے حاکم اور عہدہ دار بنے ہیں، یہ بیچارے اجڈ اور جاہل قسم کے لوگ ہیں، احکام الٰہی کا ان کو علم نہیں، وہ اللہ کے معاملہ میں سخت دھوکہ میں مبتلا ہیں، اللہ تعالیٰ کا ان کے ساتھ جو معاملہ رہا ہے، اس کو وہ بھول گئے ہیں، اور اللہ تعالیٰ کی ان نعمتوں کی انھوں نے ناشکری اور ناقدری کی ہے، جس تک پہنچنے کی ان میں صلاحیت نہیں تھی، مجھے بتایا گیا ہے کہ ان میں سے کچھ لوگ جنگ میں مضر اور یمن والوں کا سہارا لیتے ہیں، اور ان کا خیال ہے کہ وہ دوسروں کے مقابلہ میں ان کے حامی اور ولی ہیں، سبحان اللہ وبحمدہٖ! یہ کس قدر ناشکر گزار اور کافر نعمت ہیں، ان کو ہلاکت، ذلت و خواری کا کیسا شوق ہے؟ یہ دیکھتے نہیں کہ انھوں نے اپنے لئے کون سا مقام پسند کیا، کس امن وامان سے اپنے کو محروم کیا، اور کس گروہ سے اپنا تعلق پیدا کیا؟ اب مجھے معلوم ہوا کہ شقی اپنے ارادوں ہی سے شقی ہوتا ہے، اور جہنم بیکار نہیں پیدا کی گئی ہے، کیا ان لوگوں نے کلام پاک میں اللہ تعالیٰ کا یہ کلام نہیں سنا:۔

إِنَّمَا الْمُؤْمِنُونَ إِخْوَةٌ فَأَصْلِحُوا بَيْنَ أَخَوَيْكُمْ وَاتَّقُوا اللَّهَ لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُونَ (الحجرات ۱۰)	مسلمان تو سب بھائی بھائی ہیں، سو اپنے دو بھائیوں کے درمیان صلح کرا دیا کرو، اور اللہ سے ڈرتے رہا کرو، تاکہ تم پر رحمت کی جائے۔

کیا انھوں نے یہ آیت کبھی نہیں سنی؟:۔

الْيَوْمَ أَكْمَلْتُ لَكُمْ دِينَكُمْ وَأَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِي وَرَضِيتُ لَكُمُ الْإِسْلَامَ دِينًا (المائدہ ۳)	آج کے دن تمہارے دین کو میں نے کامل کر دیا، اور میں نے تم پر اپنا انعام تام کر دیا، اور میں نے اسلام کو تمہارا دین بننے کے لئے پسند کر لیا۔

مجھے بتایا گیا ہے کہ کچھ لوگ زمانۂ جاہلیت کے طرز کی مخالفت کی دعوت دیتے ہیں، حالانکہ آنحضرت

صلے اللہ علیہ وسلم نے غیر مشروط حمایت کے وعدہ سے منع فرمایا ہے؛ اور ارشاد ہے "لاحلف فی الاسلام" (یعنی اسلام میں غلط دوستیاں اور جتھہ بندی نہیں ہے) جاہلیت میں ہر حلیف دوسرے حلیف سے اس کی توقع رکھتا تھا کہ وہ اس کے معاہدہ اور رشتۂ محالفت کا حق ادا کرے گا، اور اس کو پورا کرے گا، خواہ وہ بالکل ظالمانہ اور فاجرانہ ہو، اور اس میں صریح اللہ اور رسول کی نافرمانی ہوتی ہو..........

میں ڈراتا ہوں ہر اس شخص کو جو میرا یہ خط سُنے، اور جس کو یہ خط پہنچے اس بات سے کہ وہ اسلام کے علاوہ کسی قلعہ کو اختیار کرے، اور اللہ و رسول اور مؤمنین کو چھوڑ کر کسی اور کو اپنا دوست بنائے، بڑے شد و مد سے اور بار بار اس سے آگاہ اور متنبہ کرتا ہوں، اور میں ان لوگوں پر اس ذات کو گواہ بنا رہا ہوں، جس کی قدرت اور تصرف میں تمام جان دار ہیں، اور جو ہر شخص کی شہ رگ سے بھی زیادہ اس کے قریب ہے"۔[1]

انھوں نے اپنے ایک فوجی افسر کو جنگ پر روانہ ہونے کے وقت جو ہدایت نامہ لکھا ہے، اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ ان کا ذہن قرآن کے سانچہ میں کس طرح ڈھل گیا تھا، اور ان کا نقطۂ نظر اور طریق فکر دنیا دار بادشاہوں اور سیاسی حکمرانوں سے کس قدر مختلف تھا۔

منصور بن غالب کے نام ایک فرمان میں لکھتے ہیں:۔

"اللہ کے بندے امیر المؤمنین عمرؒ کا یہ ہدایت نامہ منصور بن غالب کے نام جب کہ امیر المؤمنین نے ان کو اہلِ حرب سے اور ان اہلِ صلح سے جو مقابلہ میں آئیں، جنگ کرنے کے لئے بھیجا ہے، امیر المؤمنین نے ان کو حکم دیا ہے کہ ہر حال میں تقویٰ اختیار کریں، کیونکہ اللہ کا تقویٰ بہترین سامان، مؤثر ترین تدبیر اور حقیقی طاقت ہے، امیر المؤمنین ان کو حکم دیتے ہیں کہ وہ اپنے اور اپنے ساتھیوں کے لئے دشمن سے زیادہ اللہ کی معصیت سے ڈریں، کیونکہ گناہ دشمن کی تدبیروں سے بھی زیادہ انسان کے لئے خطرناک ہے، ہم اپنے دشمنوں سے جنگ

---

[1] سیرت عمر بن عبدالعزیز (ابن عبدالحکم) صفحہ ۱۰۴ تا ۱۰۷ ترجمۂ مولوی ابوالعرفان صاحب ندوی۔

کرتے ہیں اور ان کے گناہوں کی وجہ سے ہم ان پر غالب آجاتے ہیں کیونکہ اگر یہ بات نہیں ہے تو ان سے درحقیقت ہم کو مقابلہ کی قوت نہیں ہے کیونکہ نہ تو ہماری تعداد ان کی تعداد کے برابر ہے اور نہ ہمارا سامان ان کے سامان کے برابر پس اگر ہم اور وہ دونوں معصیت میں برابر ہو جائیں تو وہ قوت اور تعداد میں ہم سے بڑھ کر ثابت ہوں گے، یاد رکھو اگر ہم ان پر اپنے حق کی وجہ سے فتح نہ پا سکیں گے تو اپنی قوت کی وجہ سے کبھی ان پر غالب نہ آسکیں گے، اور اپنے گناہوں سے زیادہ کسی کی دشمنی سے چوکنا نہ ہوں جہاں تک ممکن ہو اپنے گناہوں سے زیادہ کسی چیز کی فکر نہ کریں، سمجھ لو کہ اللہ تعالےٰ کی جانب سے تم پر کچھ محافظ مقرر کئے گئے ہیں جو تمہارے سفر و حضر کے افعال کو جانتے ہیں پس ان سے شرم کرو، اور اپنے ساتھیوں کے ساتھ حسن سلوک کرو، اور ان کو اللہ کی نافرمانی کر کے ایذا نہ پہونچاؤ، خصوصاً ایسی حالت میں کہ تمہارا دعویٰ ہے کہ تم راہِ خدا میں نکلے ہوئے ہو، اور یہ مت سمجھو کہ ہمارے دشمن ہم سے گئے گزرے ہیں، اس لئے گو ہم گناہ گار ہیں لیکن وہ ہم پر غالب نہیں آسکتے، کیونکہ بہت سی ایسی قومیں ہیں، جن پر ان کے گناہوں کی وجہ سے ان سے بدتر لوگوں کو مسلط کر دیا گیا ہے، پس اللہ تعالےٰ سے اپنے نفسوں کے مقابلہ میں مدد چاہو، جیسا کہ اللہ تعالےٰ سے تم اپنے دشمنوں کے مقابلہ میں مدد چاہتے ہو، میں بھی اپنے لئے اور تمہارے لئے اللہ تعالےٰ سے سوال کرتا ہوں۔

اور امیر المومنین منصور بن غالب کو حکم دیتے ہیں کہ سفر میں اپنے ساتھیوں کے ساتھ نرمی کا برتاؤ کریں، اور اپنے ساتھیوں کو ایسی قطع مسافت پر مجبور نہ کریں، جو مشقت میں مبتلا کر دے، اور سفر میں کسی ایسی منزل پر پڑاؤ سے گریز نہ کریں، جس سے ان کو آرام ملتا ہو، یہاں تک کہ ان کا دشمنوں سے اس حالت میں سامنا ہو کہ سفر کی تکان نے ان کی قوتوں کو گھٹا نہ دیا ہو، وہ ایسے دشمن کے پاس جا رہے ہیں، جو اپنے گھروں میں ہیں، ان کا سامان اور سواریاں سستائی ہوئی ہیں، پس اگر سفر میں اپنے اور اپنی سواریوں کے ساتھ نرمی کا معاملہ نہ کریں گے، تو ان کے دشمنوں کو ان پر زیادہ قوت حاصل ہوگی، کیونکہ دشمن اپنے گھروں میں ہیں، جہاں ان کے آدمی اور سواریاں آرام کئے ہوئے ہیں، اور اللہ ہی سے مدد چاہی جاتی ہے۔

اور امیر المؤمنین ان کو حکم دیتے ہیں کہ ہر جمعہ ایک رات اور دن سفر نہ کریں، اور آرام کریں جس میں خود کو اور جانوروں کو آرام پہونچائیں، اور اپنے سامان اور ہتھیاروں کی مرمت کریں، اور امیر المؤمنین ان کو حکم دیتے ہیں کہ اپنا قیام صلح کی بستیوں سے الگ رکھیں، امن و امان والی بستیوں میں ان کے ساتھیوں میں سے کوئی نہ جائے، نہ ان کے بازاروں میں، نہ ان کی مجلسوں میں، ہاں وہ شخص جا سکتا ہے، جس کو اپنے دین اور امانت پر پورا بھروسہ ہو، اور نہ ان بستی والوں پر ظلم کریں اور نہ وہاں سے اپنے لئے گناہ جمع کریں، اور نہ ان کو کچھ اذیت پہونچائیں، سوائے اس کے کہ شرعی مطالبہ یا واجبی حق ہو، کیونکہ ان کا حق اور ان کی ذمہ داری ہے، جس کے پورا کرنے کا تم کو اسی طرح ذمہ دار بنایا گیا ہے، جس طرح کہ وہ لوگ حقوق و ذمہ کی پابندی کے مکلّف ہیں، پس جب تک کہ وہ لوگ اپنے حقوق کی ادائیگی پر ثابت قدم رہیں، تم لوگ بھی ان کے حقوق ادا کرتے رہو، اور صلح والوں پر ظلم کر کے جنگ والے ملکوں پر غلبہ حاصل کرو، قسم اللہ کی تمہیں ان لوگوں کے مال میں سے اتنا حصہ[1] پہلے ہی دے دیا گیا ہے کہ اب مزید کی نہ گنجائش ہے نہ ضرورت ہم نے تمہارے سامان میں کوئی کوتاہی بھی نہیں کی ہے، اور نہ تمہاری قوت میں کوئی ضعف رہنے دیا ہے، اور تمہارے لئے سامان اچھی طرح جمع ہو گیا ہے، تمہیں ایک منتخب فوج دی گئی ہے، اور شرک والے ملکوں کی طرف تم کو مشغول کر کے صلح والوں کی طرف سے تمہاری توجہ ہٹالی ہے، اور ایک مجاہد کے لئے جتنا بندوبست کر سکتا تھا، اس سے بہتر تمہارے لئے کر دیا، ہم نے تمہارے لئے قوت کی بہم رسانی میں کوئی گنجائش نہیں چھوڑی اور اللہ ہی پر بھروسہ ہے" وَلَا حَوْلَ وَلَا قُوَّةَ اِلَّا بِاللّٰہِ" اور امیر المؤمنین کی ہدایت ہے کہ ان کے جاسوس عرب اور اہلِ ملک میں سے وہ لوگ ہوں جن کے اخلاص اور صدق پر ان کو اطمینان ہو، کیوں کہ دروغ گو کی اطلاع نفع نہیں پہونچاتی، اگرچہ اس کی کوئی بات صحیح بھی ہو، فریب دہندہ دراصل تمہارے دشمن کا جاسوس ہے، تمہارا جاسوس نہیں۔ وَالسَّلَامُ عَلَیْکَ۔[2]

[1] جزیہ و خراج وغیرہ [2] سیرت عمر بن عبد العزیز ص ۸۳-۸۷ ترجمہ مولوی ابو العرفان صاحب ندوی۔

ایک عمومی خط میں عمالِ سلطنت کو تحریر فرماتے ہیں:۔

"اما بعد بےشک یہ ذمہ داری جو اللہ تعالٰی نے میرے سپرد فرمائی ہے اگر میں نے اس کو قبول کیا ہے کہ اس سے میرا مقصد کھانا، لباس، سواری یا شادیاں یا جمع اموال ہوتا، تو اللہ تعالٰی نے مجھے اس سے پہلے ہی یہ چیزیں اتنی دے رکھی تھیں، جو شکل سے لوگوں کو ملا کرتی ہیں، لیکن میں نے اس ذمہ داری کو بہت ڈرتے ڈرتے قبول کیا ہے، مجھے اس کا بخوبی احساس ہے کہ یہ عظیم الشان ذمہ داری ہے، اس کی باز پرس بڑی سخت ہے، جس وقت فریق اور مدعی قیامت کے دن جمع ہوں گے، تو اس کے معاملہ میں بڑی سخت جرح ہوگی، ہاں اگر اللہ تعالٰی معاف فرمائے، اور نظر انداز فرمائے، اور رحم فرمائے تو الگ بات ہے۔

میں نے تم کو حکومت کا جو کام سپرد کیا ہے، اور جو اختیارات تفویض کئے ہیں، ان میں سے تم کو احتیاط اور خدا کے خوف کی ہدایت کرتا ہوں، ذمہ داریوں کی ادائیگی، اور اللہ تعالٰی کے اوامر کے اتباع اور اس کے نواہی سے اجتناب کی تاکید کرتا ہوں، جو باتیں اس کے خلاف ہوں، ان کی طرف بالکل توجہ کی ضرورت نہیں، تمہاری نظر اپنے اوپر اور اپنے عمل پر رہے، اور ان چیزوں کی طرف ہو جو تمہارے رب تک پہونچائیں، اور جو تم اپنے اور اپنی رعیت کے درمیان کرتے ہو، وہ تمہارے پیش نظر رہے، اور تم اچھی طرح جانتے ہو کہ حفظ و نجات اسی میں منحصر ہے کہ اللہ تعالٰی کی اطاعت میں منزلِ مقصود تک پہونچ جاؤ، اس یوم موعود کے لئے وہی چیز تیار رکھو، جو خدا کے ہاں کام آنے والی ہو اور دوسروں کے واقعات میں تم نے ایسی عبرتیں دیکھی ہیں، جن کے برابر ہمارا وعظ و نصیحت مؤثر نہیں ہو سکتی۔ والسلام"[1]

تبلیغ واشاعتِ اسلام کی طرف توجہ

حضرت عمر بن عبدالعزیز نے صرف مسلمانوں کی اصلاح اور ملک میں اسلامی شریعت کے نفاذ پر

[1] سیرت عمر بن عبدالعزیز صـ۹۲-۹۳ ترجمہ مولوی ابوالعرفان صاحب ندوی۔

اکتفا نہیں کیا، بلکہ انھوں نے غیر مسلموں میں اسلام کی اشاعت کی طرف بھی خصوصی توجہ کی اور اس میں ان کو اپنے صدق و اخلاص کی برکت اور اپنی زندگی و عمل سے اسلام کی صحیح اور مؤثر نمائندگی کی وجہ سے بہت کامیابی حاصل ہوئی ——— بلاذری نے "فتوح البلدان" میں لکھا ہے:-

"عمر بن عبدالعزیز نے ہندوستان کے راجاؤں کو ساتھ خطوط لکھے اور ان کو اسلام اور اطاعت کی دعوت دی اور وعدہ کیا کہ اگر انھوں نے ایسا کیا تو ان کو اپنی سلطنتوں پر باقی رکھا جائے گا، اور ان کے حقوق و فرائض وہی ہوں گے جو مسلمانوں کے ہیں۔

ان کے اخلاق و کردار کی خبریں وہاں پہلے ہی پہونچ چکی تھیں اس لئے انھوں نے اسلام قبول کیا اور اپنے نام عربوں ہی کے نام پر رکھے۔[1]

جب اسماعیل بن عبداللہ بن ابی المہاجر مولی بنی مخزوم بلاد مغرب کے والی بنائے گئے تو انھوں نے وہاں اپنے کردار و اخلاق کا بہت اچھا مظاہرہ کیا اور اہل بربر کو اسلام کی دعوت دی، حضرت عمر بن عبدالعزیز نے ان لوگوں کو ایک خط بھیجا اور ان کو اسلام کی دعوت دی، یہ خط اسماعیل نے مجموں میں پڑھ کر سنایا، اور اسلام بالآخر وہاں غالب آیا،[2] اپنی خلافت کے بعد انھوں نے ماوراء النہر کے سلاطین کو اسلام کی دعوت کے خطوط لکھے اور خراسان کے جو لوگ اسلام لائے ان سے خراج معاف کر دیا، لیکن جو لوگ اسلام لائے اور ساتھ ہی انھوں نے سرائیں تعمیر کیں، ان کے لئے انعام اور وظیفہ مقرر کیا۔"[3]

ان کی اصلاحات کے اثرات اور ان کا ردّ عمل

عمر بن عبدالعزیز کی مالی اصلاحات اور بندشوں اور نظام حکومت میں شرعی و اخلاقی پابندیوں سے بجائے اس کے کہ حکومت کو مالی خسارہ اور شہریوں کو نئی مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا، ملک میں خوشحالی عام ہو گئی،

---

[1] فتوح البلدان ص ۴۴۶-۴۴۷ [2] ایضاً ص ۳۳۹ [3] ایضاً ص ۴۳۲

اور دولت کی وہ فراوانی ہوئی کہ زکوٰۃ قبول کرنے والا ڈھونڈھے سے نہیں ملتا تھا۔

یحییٰ بن سعید کہتے ہیں کہ مجھے عمر بن عبدالعزیزؒ نے افریقہ میں زکوٰۃ کی تحصیل وصول پر مقرر کیا، میں نے زکوٰۃ وصول کی، جب میں نے اس کے مستحق تلاش کئے، جن کو وہ رقم دی جائے تو مجھے ایک بھی محتاج نہیں ملا، اور ایک شخص بھی ایسا دستیاب نہیں ہوا، جس کو زکوٰۃ دی جاسکے، عمر بن عبدالعزیزؒ نے سب کو غنی بنا دیا، آخر میں نے کچھ غلام خرید کر آزاد کئے، اور ان کے حقوق کا مالک مسلمانوں کو بنا دیا۔[1]

ایک دوسرے قریشی کہتے ہیں کہ عمر بن عبدالعزیزؒ کی مختصر مدتِ خلافت میں یہ حال ہوگیا تھا کہ لوگ بڑی بڑی رقمیں زکوٰۃ کی لے کر آتے تھے کہ جس کو مناسب سمجھا جائے دے دیا جائے، لیکن مجبوراً واپس کرنی پڑتی تھیں کہ کوئی لینے والا نہیں ملتا، عمرؒ کے زمانہ میں سب مسلمان غنی ہوگئے، اور زکوٰۃ کا کوئی مستحق نہیں رہا۔[2]

ان ظاہری برکات کے علاوہ (جو صحیح اسلامی حکومت کا ثانوی نتیجہ ہیں) بڑا انقلاب یہ ہوا کہ لوگوں کے رجحانات بدلنے لگے، اور قوم کے مزاج و مذاق میں تبدیلی ہونے لگی، ان کے معاصر کہتے ہیں کہ ہم جب ولید کے زمانہ میں جمع ہوتے تھے، تو عمارتوں اور طرزِ تعمیر کی بات چیت کرتے تھے، اس لئے کہ ولید کا یہی اصل ذوق تھا، اور اس کا تمام اہلِ مملکت پر اثر پڑ رہا تھا، سلیمان کھانوں اور عورتوں کا بڑا شائق تھا، اس کے زمانہ میں مجلسوں کا موضوعِ سخن یہی تھا، لیکن عمر بن عبدالعزیزؒ کے زمانہ میں نوافل و طاعات، ذکر و تذکرہ گفتگو اور مجلسوں کا موضوع بن گیا، جہاں چار آدمی جمع ہوتے تو ایک دوسرے سے پوچھتے کہ رات کو تمہارا کیا پڑھنے کا معمول ہے، تم نے کتنا قرآن یاد کیا ہے، تم قرآن کب ختم کروگے، اور کب ختم کیا تھا، مہینے میں کتنے روزے رکھتے ہو۔[3]

ان کی زندگی کا جوہر

عمر بن عبدالعزیزؒ کی زندگی کا جوہر اور ان کی تمام سرگرمیوں اور جد و جہد کی روح اور قوتِ محرکہ

---

[1] سیرت عمر بن عبدالعزیز ص ۱۶۹ [2] ایضاً ص ۱۲۸ [3] تاریخ طبری واقعات ۹۶ھ۔

ان کا قوی ایمان آخرت کا یقین اور جنت کا شوق ہے' انھوں نے جو کچھ کیا، خدا کے خوف اور اس کی رضا کے شوق میں کیا، اور یہی وہ طاقت تھی جو اپنے وقت کے اس سب سے بڑے طاقتور حکمراں کو روئے زمین کی سب سے بڑی سلطنت کی ترغیبات اور وسائل کے مقابلہ میں ثابت قدم رکھتی تھی' ان کو کوئی اگر اس طرز عمل کے خلاف نصیحت کرتا اور تمتع و لطف اندوزی کی ترغیب دیتا، تو ہمیشہ یہ آیت پڑھ دیا کرتے تھے۔

اِنِّیْٓ اَخَافُ اِنْ عَصَیْتُ رَبِّیْ عَذَابَ یَوْمٍ عَظِیْمٍ ○ (الانعام ۱۵)

اگر میں نے اپنے رب کی نافرمانی کی تو مجھے ایک بڑے دن کے عذاب کا خطرہ ہے۔

انھوں نے ایک موقع پر اپنے خادم سے کہا تھا، اور یہ ان کی صحیح تعریف تھی کہ "اللہ نے مجھے بڑی حوصلہ مند طبیعت دی ہے' جو مرتبہ بھی مجھے حاصل ہوا، میں نے اس سے بلند تر مرتبہ کی تمنا کی' اور اب میں اس مقام پر پہونچ گیا ہوں کہ کوئی مرتبہ باقی نہیں رہا، اب میری حوصلہ مند طبیعت جنت کی مشتاق و متمنی ہے"۔[1]

ان کی رقت و خشیت کا یہ حال تھا کہ ایک شخص سے انھوں نے نصیحت کی فرمائش کی اس نے کہا کہ اگر خدا نے تم کو جہنم میں ڈال دیا، اور ساری دنیا جنت میں چلی گئی تو تمہیں کیا فائدہ ہوا، اور اگر ساری دنیا جہنم میں چلی گئی' اور تمہیں اللہ نے جنت نصیب کی' تو تمہارا کیا نقصان ہوا۔ یہ سن کر وہ اس قدر روئے کہ ان کے سامنے جو انگیٹھی رکھی تھی' وہ بجھ گئی'[2] یزید بن حوشب کہتے ہیں کہ معلوم ہوتا تھا کہ جنت و دوزخ صرف عمر بن عبدالعزیزؒ اور حسن بصریؒ کے لئے پیدا کی گئی ہے۔[3]

عمر بن عبدالعزیزؒ کی وفات

اگر اللہ کو منظور ہوتا اور عمر بن عبدالعزیزؒ کو اپنے کسی پیش رو کی مدت خلافت مل جاتی تو پوری اسلامی مملکت میں گہرا اور دیرپا انقلاب ہو جاتا اور مسلمانوں کی تاریخ ہی دوسری ہوتی، لیکن بنی اُمیہ جن کو اپنے

[1] سیرت عمر بن عبدالعزیز صہ ۶۱ [2] ایضاً صہ ۱۰۸ [3] صفۃ الصفوۃ ابن جوزی ج ۳ صہ ۱۵۶

اس فرد خاندان کی خلافت میں سب سے بڑی قربانی کرنی پڑی تھی، اور جو اپنی بے تکلف مجلسوں میں حضرت عمرؓ کے گھرانے میں رشتہ کرنے پر بہت پچھتاتے رہتے تھے، زیادہ دن تک اس مجاہدہ کو برداشت نہ کرسکے اور انھوں نے جلد ان سے خلاصی حاصل کرکے مسلمانوں کو اس عطیۂ خداوندی سے محروم کردیا، سیدنا عمر بن عبدالعزیزؒ کل دو سال پانچ مہینے خلافت کرکے سنہ ۱۰۱ھ میں دنیا سے رخصت ہوئے۔[1] اس بات کے آثار و قرائن موجود ہیں کہ ان کے خاندان نے ان کو زہر دیا۔

---

[1] ابن سعد، ابن اثیر، ابن جوزی۔

دوسری صدی کی اصلاحی کوششیں

اور

حضرت حسن بصریؒ

امت میں اخلاقی انحطاط اور ایمانی ضعف

حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ کی وفات کے بعد حکومت کا دھارا اسی طرح بہنے لگا، جیسا کہ ان سے پہلے بہتا تھا، جاہلیت نے اپنے پنجے مضبوطی کے ساتھ گاڑ لئے، ان کے جانشین نے (جس کو سلیمان ان کے بعد خلیفہ بنا گیا تھا) اور اس کے جانشینوں نے اس "ناپسندیدہ وقفہ" کی تلافی کی پوری کوشش کی، اور حکومت کو اسی چول پر لے آئے جس پر وہ سلیمان کے زمانہ تک تھی۔

اب صورتِ حال یہ تھی کہ شخصی و موروثی حکومت کے تسلسل اور دولت و کامیابی کی فراوانی سے اسلامی معاشرہ میں "نفاق" کے جراثیم اور "مترفین سابقین" (گذشتہ امتوں کے دولت مندوں اور عیش پسندوں) کے اخلاق و اعمال پیدا ہونے شروع ہو گئے تھے، سوسائٹی میں تعیش کا عمومی رجحان پیدا ہو گیا تھا ایمان و عمل صالح کی زندگی جو اس امت کا قیمتی سرمایہ، اس کی قوت کا راز اور نبوت کا ایک بیش قیمت ترکہ تھا، اس وقت خطرہ میں تھی، اندیشہ تھا کہ یہ امت اخلاقی حیثیت سے دیوالیہ اور روحانی حیثیت سے کھوکھلی نہ ہو جائے، قلوب میں سردی و افسردگی، ایمان میں کمزوری اور تعلق باللہ میں اضمحلال بڑی شدّت و سرعت سے پیدا ہوتا چلا آرہا تھا، اور یہ بڑی تشویش کی بات تھی، حکومت اس جوہر کی حفاظت اور پرورش سے نہ صرف غافل و بے تعلق تھی، بلکہ اس کا وجود، اور اس کے نمایندے اس مقصد کے لئے حقیقی خطرہ

بنے ہوئے تھے، اور اپنی ذاتی سیرت وکردار سے وہ اس اخلاقی انحطاط کے محرک و داعی تھے، رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے اس امت میں ایمان، اللہ تعالٰی کے ساتھ زندہ تعلق اور انابت وعبودیت کی جو کیفیات پیدا کی تھیں، اور جو ایک نبی ہی پیدا کرسکتا ہے، وہ روبہ تنزل تھیں، یہ وہ کمی تھی جو حکومت کے رقبہ کی توسیع اور بڑی سے بڑی فتوحات سے پوری نہیں کی جاسکتی تھی، اور جو ایک مرتبہ زائل ہونے کے بعد (پچھلی امتوں کی تاریخ اس کی شاہد ہے) بڑی مشکل سے واپس لائی جاسکتی ہیں۔

اگر اس سرمایہ کی حفاظت نہ کی جاتی، اور زمانہ کے اثرات اور اخلاقی و سیاسی عوامل کو آزادی کے ساتھ اپنا عمل کرنے کی اجازت دے دی جاتی، تو یہ امت بھی سابقہ امتوں کی طرح ایک نفس پرور، آخرت فراموش، مادہ پرست قوم بن کر رہ جاتی، رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کو اپنے آخری ایام میں سب سے زیادہ خطرہ اسی بات کا تھا کہ یہ دنیا مسلمانوں کو ہضم نہ کرلے، اور وہ اگلی امتوں کی طرح اس کے دھارے میں پڑ کر ضائع نہ ہو جائیں، آپ نے وفات سے چند دن پہلے جو خطبہ ارشاد فرمایا تھا، اس میں صاف صاف کہا تھا:۔

ما الفقر اخشی علیکم ولکن اخشی علیکم ان تبسط الدنیا علیکم کما بسطت علی من کان قبلکم فتنافسوها کما تنافسوها فتهلککم کما اهلکتهم۔	مجھے تمہارے بارے میں فقر و افلاس کا خطرہ نہیں، مجھے جو کچھ خطرہ ہے، وہ اس بات کا کہ دنیا کی تم پر ایسی کشائش و فراخی ہو جیسی تم سے پہلے لوگوں پر ہوئی تھی، اور تم بھی اس میں ایک دوسرے سے مقابلہ شروع کردو اور تم کو بھی وہ اسی طرح ہلاک کردے جیسے اگلوں کو ہلاک کیا۔

تابعین کی دعوتِ ایمانی

یہ خطرہ جس کا زبانِ نبوت نے اظہار کیا تھا، جلد پیش آگیا، لیکن اس خطرہ کا مقابلہ کرنے کے لئے

اللہ کے کچھ مخلص اور سرفروش بندے میدان میں آئے، جنھوں نے اپنی قوتِ ایمانی سوزِ دروں، صحبت و تربیت، وعظ و نصیحت اور دعوت و تلقین سے لاکھوں آدمیوں کو مادیت کے اس طوفان میں تنکے کی طرح بہنے سے بچایا، اور خود اس سیلاب کی رفتار کو سست کر دیا، انھوں نے امت کے ایمانی و روحانی تسلسل کو قائم رکھا، جو اس کے نسلی و سیاسی تسلسل سے زیادہ ضروری تھا، اور اس کی زندگی میں وہ خلا نہیں آنے دیا، جس میں محض ایک بے سیرت بے روح، اور بے یقین قوم بن کر رہ جائے، اس فتنہ کا مقابلہ کرنے کے لئے فضلاءِ تابعین کی ایک سربرآوردہ جماعت تھی، جن میں سعید بن جبیرؒ، محمد بن سیرینؒ اور شعبیؒ خاص طور سے ممتاز تھے۔

حسن بصریؒ

لیکن اس خطرہ کے اصل حریف اور ایمانی دعوت کے علمبردار حضرت حسن بصریؒ ہیں، جو ۲۱ھ میں پیدا ہوئے، ان کے والد یسار مشہور صحابی حضرت زیدؓ بن ثابت کے آزاد کردہ غلام تھے، اور خود انھوں نے ام المومنین ام سلمہ رضی اللہ تعالےٰ عنہا کے گھر میں پرورش پائی تھی۔

حسن بصریؒ کی شخصیت ان کی داعیانہ صلاحیتیں

حضرت حسن بصریؒ میں اللہ تعالےٰ نے وہ تمام صلاحیتیں جمع فرما دی تھیں، جو اس دور کے مخصوص حالات میں دین کا وقار بڑھانے اور دینی دعوت کو موثر بنانے کے لئے درکار ہیں، ان کی شخصیت میں بڑی جامعیت، دل آویزی اور کشش تھی، ایک طرف وہ دین میں پورا تبحر اور گہری بصیرت رکھتے تھے، بلند پایہ مفسر اور مستند محدث تھے، جس کے بغیر اس وقت کوئی اصلاحی کوشش انجام نہیں پا سکتی تھی، صحابۂ کرامؓ کا انھوں نے اچھا خاصا زمانہ پایا تھا، اور معلوم ہوتا ہے کہ بڑے غور سے اس کا مطالعہ کیا تھا، مسلمانوں کی زندگی اور اسلامی معاشرہ میں جو تغیرات پیش آئے تھے، ان پر گہری نظر رکھتے تھے، اپنے زمانہ کی سوسائٹی، ہر طبقہ کی زندگی اور معاشرہ

سے وہ پورے طور پر باخبر تھے، اور اس کی خصوصیات اور اس کی بیماریوں سے ایک تجربہ کار طبیب کی طرح واقف تھے، وہ بڑے فصیح و بلیغ اور شیریں زبان تھے، وہ جب گفتگو کرتے تھے تو منہ سے پھول جھڑتے تھے، جب آخرت کا بیان کرتے تھے، یا صحابۂ کرامؓ کے دور کی تصویر کھینچتے تھے تو آنسوؤں کی جھڑیاں لگ جاتی تھیں، حجاج بن یوسف کا سا زبان آور اور قادر الکلام اس اخیر دور میں نہیں گذرا، لوگ حسن بصری اور حجاج کو فصاحت میں ہم پایہ سمجھتے تھے، مشہور امام لغت و نحو ابو عمرو بن العلا کہتے ہیں کہ میں نے حسن بصری اور حجاج بن یوسف سے بڑھ کر فصیح نہیں دیکھا، اور حسن حجاج سے زیادہ فصیح تھے[1]۔ وسعتِ علم کا یہ حال تھا کہ ربیع بن انس کہتے ہیں کہ میں دس برس تک حسن بصری کے پاس آتا جاتا رہا، ہر روز ان سے کوئی ایسی بات سنتا تھا، جو اس سے پہلے نہیں سنی[2]، ایک شخص نے ان کی اس جامعیت کو اس طرح بیان کیا:۔

کان من دراری النجوم علما وتقوی	وہ اپنے علم و تقوی، زہد و ورع و استغنا و عالی ہمتی
وزهدا وورعا وعفة ورقة، وفقها	لطافت، تفقہ اور علم کے اعتبار سے ایک درخشاں
ومعرفة يجمع مجلسه ضروبا من الناس	ستارہ تھے، ان کی مجلس میں قسم قسم کے لوگ جمع رہتے
هذا يأخذ عنه الحديث، وهذا يلقن	تھے، اور ہر ایک فیض پاتا تھا، ایک شخص حدیث
منه التاويل وهذا يسمع منه الحلال	حاصل کر رہا ہے، ایک تفسیر میں استفادہ کر رہا ہے، ایک
والحرام، وهذا يحكي له الفتيا وهذا	فقہ کا درس لے رہا ہے اور ایک فتوی پوچھ رہا ہے
يتعلم الحكم والقضاء وهذا يسمع الوعظ	کوئی مقدمات فیصل کرنے اور قضا کے قواعد سیکھ رہا
وهو في جميع ذلك كالبحر العجاج تدفقا	ہے، کوئی وعظ سن رہا ہے، اور وہ ایک بحر زخار ہیں جو
وكالسراج الوهاج تالقا ولاتنس مواقفه	موجیں لے رہا ہے، اور ایک روشن چراغ ہیں جو مجلس کو
ومشاهده في الامر بالمعروف والنهي	پرنور کر رہا ہے، پھر امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے

[1] دائرۃ المعارف بستانی ج ۶، ص ۴۴ [2] ایضاً۔

عن المنكر عند الامراء واشباه الامرأ	سلسلہ میں ان کے کارنامے اور حکام و امراء کے روبرو
بالكلام الفصل واللفظ الجزل۔[1]	پوری فصاحت اور پرشکوہ الفاظ میں اظہارِ حق کے
	واقعات بھلانے کی چیز نہیں ۔

اس سب کے علاوہ اور اس سب سے بڑھ کر ان کی تاثیر کی سب سے بڑی وجہ یہ تھی کہ وہ محض صاحبِ قال اور صاحبِ کمال نہ تھے، بلکہ صاحبِ دل اور صاحبِ حال بھی تھے، وہ جو کچھ کہتے تھے ان کے دل سے نکلتا تھا، اس لئے دل پر اثر کرتا تھا، جس وقت وہ تقریر کرتے تھے، سراپا درد و اثر ہوتے تھے، اس کا نتیجہ تھا کہ اگرچہ بصرہ میں کوفہ میں بڑے بڑے صاحبِ علم اور صاحبِ درس تھے، مگر ان کے حلقۂ درس میں مقناطیس کی کشش تھی، ان کے مواعظ و بیانات کی بڑی خصوصیت یہ تھی کہ ان کو "کلامِ نبوت" سے بڑی مناسبت تھی ۔

امام غزالیؒ نے "احیاء العلوم" میں لکھا ہے کہ "اس پر اتفاق ہے کہ حسن بصری کا کلام انبیاء علیہم السلام کے طرزِ کلام سے بڑی مناسبت رکھتا ہے، ایسی مناسبت دوسرے واعظین کے کلام میں نہیں دیکھی گئی، اسی طرح ان کا طرزِ زندگی صحابۂ کرامؓ کے طرزِ زندگی سے بہت مشابہ تھا"۔[2]

ان کی ان خصوصیات و جامعیت کا یہ اثر تھا کہ لوگ ان کی شخصیت سے مسحور تھے، اور ان کو امتِ محمدی کے ممتاز ترین افراد میں شمار کرتے تھے، تیسری صدی کے ایک غیر مسلم فلسفی (ثابت بن قرہ) کا مقولہ ہے کہ امتِ محمدیہ کی جن چند ممتاز ترین شخصیتوں پر دوسری امتوں کو رشک آنا چاہیئے ان میں حسن بصریؒ بھی ہیں مکہ معظمہ ہمیشہ سے عالمِ اسلام کا مرکز ہے، وہاں ہر فن کے صاحبِ کمال آتے رہتے ہیں، لیکن اہلِ مکہ بھی حسن بصری کا علم دیکھ کر ان کی تقریریں سن کر ششدر رہ گئے کہ ہم نے ان جیسا آدمی نہیں دیکھا۔[3]

حسن بصریؒ کے مواعظ

حسن بصریؒ کے مواعظ دورِ صحابہ کی قوت و سادگی کا نمونہ ہیں، ان میں زیادہ تر دنیا کی بے ثباتی،

---

[1] ابوحیان التوحیدی نے اس کو ثابت بن قرہ سے نقل کیا ہے، [2] احیاء علوم الدین ج ا ص ۱۶۳ [3] دائرۃ المعارف للبستانی ج ۶ ص ۴۴

زندگی کی بے وفائی، اور آخرت کی اہمیت کا مضمون، ایمان وعمل کی تلقین، تقویٰ اور خشیتِ الٰہی کی تعلیم، طولِ امل اور فریبِ نفس کی مذمت ملتی ہے، اور اس دور میں جس پر مادیت اور غفلت کا سخت حملہ ہوا تھا، اور عوام اور بہت سے خواص دولت اور عیش وعشرت کے سیلاب میں خس وخاشاک کی طرح بہے چلے جا رہے تھے انہی مضامین کی ضرورت تھی، انھوں نے چونکہ صحابۂ کرام کا دور اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا، اور ان کی صحبت کا فیض اٹھایا تھا، اب حکومت امویہ کا شباب دیکھ رہے تھے، اس لئے وہ اپنے مواعظ میں اکثر بڑے درد وجوش کے ساتھ صحابۂ کرامؓ کی ایمانی کیفیات اور ان کی اخلاقی وعملی خصوصیات بیان کرنے لگتے ہیں، اور جب وہ ان دونوں زمانوں کا مقابلہ کرتے ہیں، اور اس عظیم انقلاب کا تذکرہ کرنے لگتے ہیں، جو ان کو دیکھتے دیکھتے ایمان وعمل اور اخلاق وعادات میں رونما ہوا تھا تو ان کا درد اور جوش بہت بڑھ جاتا ہے، اور ان کے مواعظ تیر ونشتر بن جاتے ہیں، اور ان کے مواعظ اپنی دل آویزی اور دل نشینی کے علاوہ اس دور کی فصیح وبلیغ زبان اور اعلیٰ ادب کا نمونہ ہیں، ایک موقع پر اہلِ زمانہ پر تبصرہ، صحابۂ کرامؓ کا تذکرہ اور اسلامی اخلاق کا نقشہ کھینچتے ہوئے فرماتے ہیں:-

هيهات هيهات اهلك الناس الاماني	ہائے افسوس! لوگوں کو امیدوں اور خیالی منصوبوں نے
قول بلا عمل، ومعرفة بغير صبر وايمان	غارت کیا، زبانی باتیں ہیں عمل کا نام نشان نہیں، علم ہے
بلا يقين، مالي ارى رجالاً ولا ارى	مگر (اس کے تقاضوں کو پورا کرنے کے لئے) صبر نہیں، ایمان ہے
عقولاً واسمع حسيساً ولا ارى انيساً،	مگر یقین سے خالی، آدمی بہت نظر آتے ہیں، مگر دماغ نایاب
دخل القوم والله ثم خرجوا، وعرفوا	آنے جانے والوں کا شور ہے مگر ایک بندۂ خدا ایسا نظر
ثم انكروا وحرموا ثم استحلوا، انما دين	نہیں آتا جس سے دل لگے، لوگ داخل ہوئے اور پھر
احدكم لعقة على لسانه اذا سئل أمؤمن	نکل گئے، انھوں نے سب کچھ جان لیا پھر مکر گئے، انھوں نے
انت بيوم الحساب؟ قال نعم، كذب	پہلے حرام کیا، پھر اسی کو حلال کر لیا، تمہارا دین کیا ہے؟
ومالك يوم الدين، ان من اخلاق	زبان کا ایک چٹخارہ! اگر پوچھا جاتا ہے کیا تم روزِ حساب

المؤمنین قوۃ فی دین وایمانًا فی یقین
وعلمًا فی حلم وحلمًا بعلم وکیسًا فی
رفق وتجملًا فی فاقۃ وقصدًا فی غنی
وشفقۃ فی نفقۃ ورحمۃ لمجهود وعطاءً
فی الحقوق وانصافًا فی استقامۃ لایحیف
علی من یبغض ولا یاثم فی مساعدۃ من
یحب ولا یهمز ولا یغمز ولا یلمز ولا یلغو
ولا یلهو ولا یلعب ولا یمشی بالنمیمۃ
ولا یتبع ما لیس له ولا یجحد الحق الذی
علیه ولا یتجاوز فی العذر ولا یشمت
بالفجیعۃ ان حلت بغیرہ ولا یسرّ
بالمعصیۃ اذا انزلت بسواہ، المؤمن
فی الصّلوٰۃ خاشع والی الرکوع مسارعٌ
قوله شفاء وصبرہ تقیٌ وسکوته فکرۃ
ونظرہ عبرۃ یخالط العلماء لیعلم
ویسکت بینهم لیسلم ویتکلم لیغنم
ان احسن استبشر وان أساء استغفر
وان عتب استعتب وان سفه علیه
حلم وان ظلم صبر وان جیر علیه

پر یقین رکھتے ہو؟ تو جواب ملتا ہے کہ ہاں ہاں! قسم
ہے روز جزا کے مالک کی، غلط کہا، مومن کی شان تو
یہ ہے کہ وہ قوی فی الدین ہو، صاحب ایمان و یقین
ہو، اس کے علم کے لئے حلم اور اس کے حلم کے لئے علم باعث
زینت ہو، عقلمند ہو، لیکن نرم خو، اس کی خوشپوشی
اور ضبط اس کے فقر و افلاس کی پردہ داری کرے،
دولت ہو تو اعتدال کا دامن ہاتھ سے نہ چھوٹنے
پائے، خرچ کرنے میں شفیق، خستہ حالوں کے حق میں
رحیم و کریم، حقوق کی ادائی میں کشادہ دست و فراخ دل،
انصاف میں سرگرم و ثابت قدم، کسی سے نفرت ہو تو اس کے
حق میں زیادتی نہ ہونے پائے، کسی سے محبت ہو تو اس کی
مد میں حد شریعت سے نہ بڑھنے پائے، نہ عیب چینی کرتا ہو،
نہ طنز و اشارہ، نہ طعن و تشنیع، نہ لایعنی سے اس کو کچھ کام
ہو، نہ لہو و لعب سے دلچسپی، چغلخوری نہیں کرتا، جو اس کا حق
نہیں اس کے پیچھے نہیں پڑتا، جو اس پر واجب آتا ہے
اس کا انکار نہیں کرتا، معذرت میں حد سے نہیں بڑھتا
دوسرے کی مصیبت میں خوش نہیں ہوتا، دوسرے کی
معصیت سے اس کو مسرت نہیں ہوتی، مومن کو نماز
میں خشوع اور نماز وں کا ذوق ہوتا ہے، اس کا کلام

عدل ولا يتعوذ بغير الله ولا يستعين
الا بالله وقور في الملاء، شكور في الخلاء
قانع بالرزق، حامد على الرخاء، صابر
على البلاء ان جلس مع الغافلين كتب
من الذاكرين وان جلس مع الذاكرين
كتب من المستغفرين.. هكذا كان
اصحاب النبي صلى الله عليه وسلم،
الاول فالاول حتى لحقوا بالله عز وجل
وهكذا كان المسلمون من سلفكم الصالح
وانما غير بكم لما غيرتم. انّ الله لا يُغيّر
مَا بِقَوْمٍ حَتّٰى يُغَيِّرُوْا مَا بِاَنْفُسِهِمْ وَاِذَا
اَرَادَ اللهُ بِقَوْمٍ سُوْٓءًا فَلَا مَرَدَّ لَهٗ وَمَا لَهُمْ
مِنْ دُوْنِهٖ مِنْ وَّالٍ[1]

شعار کا پیام اس کا صبر تقویٰ اس کا سکوت سراسر
غور و فکر اس کی نظر سراپا درس و عبرت ہے علماء کی صحبت
اختیار کرتا ہے علم کی خاطر خاموش رہتا ہے تو اس لئے کہ گناہوں
اور گزند سے محفوظ رہے بولتا ہے تو اس لئے کہ کچھ (ثواب) کمائے
اور فائدہ حاصل کرے نیکی کرے اس کو خوشی ہوتی ہے غلطی
ہو جاتی ہے تو استغفار کرتا ہے شکایت کرتا ہے اور اس کے
دل میں کسی کی طرف سے رنج آتا ہے تو معافی تلافی کر لیتا ہے اس سے
کوئی جہالت کرتا ہے تو وہ تحمل اور عقل سے کام لیتا ہے ظلم
کیا جاتا ہے تو وہ صبر کرتا ہے کوئی اس کے حق میں ناانصافی
کرے تو وہ انصاف کو نہیں چھوڑتا، اللہ تعالےٰ کے سوا کسی
کی پناہ نہیں لیتا، اور اس کے سوا کسی سے مدد نہیں چاہتا مجمع
میں باوقار تنہائی میں شکر گزار رزق پر قانع، آرام و عیش
کے زمانہ میں شاکر مصیبت اور آزمائش کی گھڑیوں میں صابر
غافلوں میں ذاکر، ذاکروں میں ہو تو استغفار میں شاغل
یہی شان اصحاب رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی اپنے درجوں اور
مرتبہ کے مطابق جب تک دنیا میں رہے اسی شان سے رہے اور جب
دنیا سے گئے تو اسی آن بان سے گئے مسلمانو! تمہارے سلف صالحین کا
یہی نمونہ تھا جب تم نے اللہ کے ساتھ اپنا معاملہ بدل دیا تو اللہ نے بھی
تمہارے ساتھ اپنا معاملہ بدل دیا۔ اِنَّ اللہَ لَا یُغَیِّرُ مَا بِقَوْمٍ حَتّٰی یُغَیِّرُوْا مَا بِاَنْفُسِہِمْ وَاِذَا اَرَادَ اللہُ بِقَوْمٍ سُوْٓءًا فَلَا مَرَدَّ لَہٗ وَمَا لَہُمْ مِّنْ دُوْنِہٖ مِنْ وَّالٍ (اللہ تعالےٰ کسی قوم کی (اچھی) حالت میں تغیر نہیں کرتا جب تک
وہ لوگ خود اپنی (صلاحیت) کی حالت کو نہیں بدل دیتے اور جب اللہ تعالےٰ کسی قوم پر مصیبت ڈالنا تجویز کرتا ہے تو پھر اس کے ہٹنے کی کوئی صورت ہی نہیں، اور کوئی خدا کے سوا ان کا مددگار نہیں رہتا)

[1] سیرۃ الحسن البصری لابن الجوزی ص ۶۹۔

ایک دوسرے موقع پر صحابۂ کرامؓ کو یاد کرتے ہوئے اور سورۂ الفرقان کی ان آیتوں کی تفسیر بیان کرتے ہوئے جن میں مومنین کے اوصاف بیان کئے گئے ہیں، فرمایا:۔

ان المؤمنين لما جاءتهم هذه الدعوة من الله صدقوا بها وافضى يقينها الى قلوبهم خشعت لله قلوبهم وابدانهم وابصارهم كنت والله اذا رأيتهم رأيت قومًا كانهم رأى عين والله ما كانوا باهل جدل ولا باطل ولكنهم جاءهم امر عن الله فصدقوا به فنعتهم الله في القرآن احسن نعت قال "وَعِبَادُ الرَّحْمٰنِ الَّذِيْنَ يَمْشُوْنَ عَلَى الْاَرْضِ هَوْنًا" والهون في كلام العرب اللين والسكينة والوقار "وَاِذَا خَاطَبَهُمُ الْجَاهِلُوْنَ قَالُوْا سَلَامًا" حلماء لا يجهلون وان جهل عليهم حلموا يصاحبون عباد الله نهارهم بما يسمعون ثم ذكر ليلهم خير ليل فقال "وَالَّذِيْنَ يَبِيْتُوْنَ لِرَبِّهِمْ سُجَّدًا وَّقِيَامًا" ينتصبون لله على اقدامهم ويفترشون وجوههم

مومنین (اولین) کے کان میں جب خدا کی یہ پکار پہونچی تو انھوں نے اسی وقت اس کی تصدیق کی، اور اس پر لبیک کہا، اس کا یقین انکے دلوں کی گہرائی میں اتر گیا، ان کے دل، ان کے بدن، اور ان کی نگاہیں خدا کی عظمت اور ہیبت میں جھک گئیں، بخدا میں جب ان کو دیکھتا تو صاف معلوم ہوتا کہ دین کے حقائق، اور غیب کی باتیں گویا ان کی آنکھوں دیکھی حقیقتیں ہیں، ان کو بحث و مباحثہ اور فضول باتوں سے کچھ کام نہ تھا، ان کو تو خدا سے ایک چیز پہونچی، اور انھوں نے مان لی، اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں ان کا بہترین سراپا کھینچا ہے، اللہ تعالیٰ فرماتا ہے "رحمٰن کے بندے وہ ہیں، جو زمین پر عاجزی کے ساتھ چلتے ہیں" آیت میں "ھونًا" کا لفظ آیا ہے، ھون کے معنی کلام عرب میں نرمی و سکینہ اور وقار کے ہیں، پھر فرمایا "اور جب ان سے بے سمجھ لوگ باتیں کریں تو کہتے ہیں سلام ہے" یعنی وہ ضابط و حلیم ہیں، جہالت پر نہیں اترتے اور اگر کوئی دوسرا جہالت پر اتر آئے تو ان کے حلم و وقار میں فرق نہیں آتا، یہ لوگ اللہ کے بندوں کے ساتھ کام کا

تجد الى بهم تجرى دموعهم على
خدودهم فرقا من ربهم لامرما
سهروا ليلهم ولامرما خشعوا نهارهم
قال "الَّذِيْنَ يَقُوْلُوْنَ رَبَّنَا اصْرِفْ
عَنَّا عَذَابَ جَهَنَّمَ اِنَّ عَذَابَهَا كَانَ
غَرَامًا" وكل شئ يصيب ابن آدم ثم
يزول عنه فليس بغرام، انما الغرام
اللازم له مادامت السَّمٰوٰتُ وَالْاَرْض
صدق القوم والله الذى لَا اِلٰهَ اِلَّا هُوَ
فعملوا وانتم تمنون، فاياكم وهذه
الامانى، رحمكم الله فان الله لم يعط
عبدا بامنيته شيئا فى الدنيا والآخرة۔ [له]

بات سننے کے لئے دن گذارتے تھے پھر ان کی بڑی اچھی
راتیں گزرتی تھیں، جن کی اللہ تعالیٰ خود تعریف کرتا ہے "اور
وہ لوگ اپنے رب کے سامنے سجدے میں اور کھڑے ہو کر رات
گزارتے ہیں" واقعی یہ لوگ اپنے پاؤں پر کھڑے ہو جاتے،
چہروں کو خاک پر رکھ دیتے اور سجدے میں پڑ جاتے، ان کے
رخساروں پر آنسوؤں کا تار بندھ جاتا، اللہ کا خوف ان کی
آنکھوں کو اشکبار رکھتا، آخر کوئی تو بات تھی جس کے لئے
وہ راتیں آنکھوں میں کاٹ دیتے، کوئی تو بات تھی جس کے باعث وہ
دن میں سہمے سہمے رہتے، اللہ تعالیٰ فرماتا ہے "اور وہ لوگ جو کہتے
ہیں اے ہمارے رب ہم سے دوزخ کا عذاب دور کر دے، بیشک
اس کا عذاب بڑا تاوان اور بلائے جان ہے" آیت میں غرام
کا لفظ آیا ہے، جو مصیبت انسان کو لاحق ہو اور ٹل جائے
اس کو عرب غرام نہیں کہتے، غرام وہ مصیبت ہے جو قیامت
تک انسان کے سر سے نہ ٹلے، قسم ہے اس خدا کی جس کے سوا کوئی
معبود نہیں، یہ اللہ کے بندے (اپنے قول اور اپنے دین میں)
سچے اور پکے ثابت ہوئے، اور جو انھوں نے زبان سے کہا تھا
اس پر عمل کیا، لیکن افسوس تم صرف تمناؤں میں مشغول ہو
لوگو! ان خالی تمناؤں سے باز آؤ، اس لئے کہ اللہ تعالیٰ
نے کبھی کسی بندے کو محض اس کی تمنا پر دنیا و آخرت کی کوئی چیز نہیں عطا فرمائی۔

[له] قیام اللیل صـ ۱۲ (محدث محمد بن نصر مروزی تلمیذ امام احمد بن حنبل)

اس تقریر کے آخر میں فرمایا، (اور اکثر مواعظ کے بعد فرماتے) کہ اس وعظ و نصیحت میں تو کوئی کمی نہیں، لیکن دلوں میں زندگی بھی تو ہو۔

ان کی حق گوئی و بیباکی

ان کے کمالات، فصاحت و بلاغت، تبحرِ علمی، اور تقریر و تاثیر ہی تک محدود نہ تھے، بلکہ وہ اپنے زمانہ میں حق گوئی و بیباکی، اخلاقی جرأت و شجاعت میں بھی ممتاز تھے، انھوں نے خلیفۂ وقت یزید بن عبد الملک پر برملا تنقید کی، ایک موقع پر بر سرِ درس کسی شخص نے سوال کیا کہ اس زمانہ کے فتن (یزید ابن المہلب اور ابن الاشعث کی شورش) کے متعلق آپ کی کیا رائے ہے؟ انھوں نے کہا کہ "نہ اس کا ساتھ دو، نہ اس کا ساتھ دو" ایک شامی نے کہا، اور نہ امیر المومنین کا" یہ سن کر آپ کو غصہ آگیا، پھر ہاتھ اٹھا کر کہا "ہاں نہ امیر المومنین کا، ہاں نہ امیر المومنین کا"[1] حجاج کی تلوار اور سفاکی مشہور ہے، مگر حسن کی زبان اس کے زمانہ میں بھی اظہارِ حق سے باز نہ آئی، اور اس کے متعلق بھی انھوں نے اپنے ضمیر اور عقیدہ کے خلاف کوئی بات نہیں کہی۔

اسلامی حکومت میں "نفاق" اور منافقین

اسلام کے سیاسی و مادی اثر و اقتدار سے اسلامی مملکت میں بڑی تعداد میں ایک ایسا طبقہ پیدا ہو گیا تھا، جس نے اسلام کو قبول تو کر لیا تھا، مگر اس کے اخلاق و معاملات اور قلب و دماغ پوری طرح اسلام سے متاثر نہیں ہو سکے تھے، اور ان میں حقیقی ایمان اور "اُدْخُلُوْا فِی السِّلْمِ کَآفَّةً" (اسلام میں پورے پورے داخل ہو جاؤ) کی شان پیدا نہیں ہوئی تھی، خود مسلمانوں کی نئی نسل میں (جس کی پوری اسلامی تربیت نہیں ہو سکی تھی) بکثرت ایسے افراد تھے، جو جاہلی اثرات سے پاک نہیں ہوئے تھے، اور اسلام سے ان کو گہرا تعلق اور زندگی میں احکامِ الٰہی کے سامنے

---

[1] طبقات ابن سعد ج ۷ ص ۱۱۸-۱۱۹

"انقیاد و تسلیم" کی تو نہیں پیدا ہوئی تھی۔ ان میں خاصی تعداد میں (بالخصوص حکومت کے طبقہ اور امراء و اغنیاء میں) ایسے لوگ تھے جن میں قدیم منافقین کے اخلاق و اعمال، اور ان کے ذہن و مزاج کا پرتو نظر آتا تھا، یہی لوگ بالعموم زندگی پر چھائے تھے، درباروں میں، حکومت میں کلیدی جگہوں پر، فوج میں، بازاروں میں انہی کا غلبہ تھا، انہی کا طرز زندگی سوسائٹی میں فیشن کی حیثیت رکھتا تھا۔

بعض حضرات کا یہ خیال تھا کہ نفاق ایک وقتی و مقامی بیماری تھی، جو عہد رسالت میں مدینہ طیبہ کے مخصوص حالات کی بنا پر پیدا ہو گئی تھی، اسلام کے غلبہ اور کفر کی مغلوبیت کے بعد وہ ختم ہو گئی، اس لئے کہ دو قوتوں کی کشمکش جاتی رہی، اور صرف اسلام باقی رہ گیا، اس لئے قدرتی طور پر کسی ایسے گروہ کے پیدا ہونے کا موقع نہیں رہا جو ان دونوں کے درمیان متردد و مذبذب رہے، اور کسی ایک کا وفادار اور مخلص رفیق نہ بن سکے، اب یا تو کھلا ہوا کفر ہے یا علانیہ اسلام، ان دونوں کے درمیان تذبذب کی کوئی وجہ نہیں، تفسیر و تاریخ میں اس خیال کے اثرات ملتے ہیں۔

ان حضرات نے اس حقیقت کو نظر انداز کر دیا تھا کہ نفاق فطرت انسانی کی ایک کمزوری اور بیماری ہے، جو اسی کی طرح پرانی اور عام ہے، اس بیماری کے پیدا ہونے کے لئے یہ بالکل ضروری نہیں ہے کہ اسلام و کفر کی دو طاقتیں میدان میں ضرور ہوں، اور ان میں کشمکش جاری ہو، خالص اسلام کے غلبہ اور اقتدار کی حالت میں بھی ایک ایسا گروہ پیدا ہو جاتا ہے جو کسی وجہ سے اسلام کو ہضم نہیں کر پاتا، اور وہ اس کے دل و دماغ میں گھر نہیں کر سکتا، لیکن اس میں اتنی اخلاقی جرأت نہیں ہوتی کہ وہ اس کا انکار اور اس سے اپنی بے تعلقی کا اظہار کرے یا اس کے مصالح اس کی اجازت نہیں دیتے کہ وہ ان فوائد سے دست بردار ہو جائے جو اسلام کے انتساب سے اس کو کسی اسلامی سلطنت یا مسلمان سوسائٹی میں حاصل ہیں، اس لئے وہ ساری عمر اس دو عملی اور تذبذب کی حالت میں رہتا ہے، اس کی نفسی کیفیات، اس کے اعمال و اخلاق، اس کی اخلاقی کمزوری، اس کی مصلحت شناسی، موقع پرستی، زندگی سے تمتع و لطف اندوزی کا جذبہ، دنیاوی انہماک، آخرت فراموشی، اہل اقتدار کے سامنے روباہ مزاجی، اور کمزوروں و غریبوں پر دست درازی "منافقین اوّلین" کی یاد تازہ کرتی ہے۔

"نفاق" ومنافقین کی نشاندہی

حضرت حسن بصریؒ کی یہ بہت بڑی دینی ذہانت تھی کہ انھوں نے اس حقیقت کو اچھی طرح سمجھ لیا کہ نفاق موجود اور زندہ ہے، اور منافقین نہ صرف موجود ہیں بلکہ زندگی پر اثر انداز اور سلطنت میں دخیل ہیں[١]، اور انہی سے شہروں کی چہل پہل ہے، کسی نے ان سے کہا کہ اس زمانہ میں بھی "نفاق" پایا جاتا ہے؟ فرمایا:-

لو خرجوا من ازقة البصرة لاستوحشتم فيها[٢]	اگر منافقین بصرہ کی گلیوں سے نکل جائیں تو تمہارا شہر میں جی لگنا مشکل ہو جائے۔

یعنی شہر کی آبادی میں بڑی تعداد ان لوگوں کی ہے، جن کو اسلام سے برائے نام تعلق ہے، اور اسلام نے ان کے دل میں گھر نہیں کیا ہے، یا وہ اپنے اعمال واخلاق کے لحاظ سے اسلامی سیرت سے آراستہ نہیں، ایک دوسرے موقع پر انھوں نے فرمایا:-

یا سبحان الله ما لقیت هذه الامة من منافق قهرها واستأثر علیها[٣]	خدا کی شان ہے اس امت پر کیسے کیسے منافق غالب آگئے ہیں جو پرلے درجہ کے خودغرض ہیں۔

---

[١] متاخرین میں سے شاہ ولی اللہ صاحبؒ بھی اسی کے قائل ہیں کہ نفاق ہر زمانہ میں موجود اور زندہ ہے، اور منافقین کا وجود کسی خاص زمانہ کے ساتھ مخصوص نہیں، ان کے نزدیک نفاق کی دو قسمیں ہیں، نفاق اعتقادی، اور نفاق عمل و اخلاق، نفاق اعتقادی کا قطعی علم زمانۂ رسالت کے بعد انقطاع وحی کی وجہ سے دشوار ہے، لیکن نفاق عمل، اور نفاق اخلاق، کثیر الوقوع ہے، وہ اپنے زمانہ کے متعلق فرماتے ہیں کہ اس وقت نفاق بکثرت موجود ہے "فوز الکبیر" میں ارشاد فرماتے ہیں، "اگر خواہی کہ از منافقاں نمونہ ببینی برو در مجلس امراء و مصاحبان ایشاں را ببیں کہ مرضی ایشاں را بر مرضی شارع ترجیح می دہند او رانصاف ہیچ فرق نیست درمیان آنانکہ کلام آنحضرت صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم بے واسطہ شنیدہ نفاق درزیدند، ودرمیان آنانکہ الحال پیدا شدہ اند بطریق یقین حکم شارع معلوم کردہ اند بعد ازاں بر ایشار خلاف آں اقدام می نمایند، وعلیٰ ہذا القیاس جماعۃ از معقولیاں کہ شکوک و شبہات بسیار بخاطر دارند و معاد را نسیاً منسیاً ساختہ اند نمونہ آں گروہ اند" (ص١٢ مطبع محمدی)

[٢] صفۃ النفاق وذم المنافقین، مولفہ محدث ابوبکر فریابی ص٦٨ [٣] ایضاً ص٥٧

یعنی حکومت میں وہ عنصر موجود ہے، جو اسلام اور مسلمانوں کا مخلص نہیں، اور جس کو صرف اپنے اغراض اور منافع سے دلچسپی ہے۔

حسن بصریؒ کی دعوت و اصلاح کی طاقت و تاثیر میں اس بات کو بڑا دخل ہے کہ انھوں نے زندگی کا ایک سرا پکڑ لیا، اور سوسائٹی کی اصل بیماری کی طرف توجہ کی، ان کے زمانہ میں بہت سے واعظ اور داعی تھے، لیکن اس زمانہ کے معاشرہ نے کسی کے وجود اور کسی کی دعوت کو اس طرح محسوس نہیں کیا، جس طرح حسن بصری کے وجود اور ان کی دعوت کو محسوس کیا، اس لئے کہ ان کی تقریروں اور ان کے درسوں سے اس بگڑے ہوئے معاشرہ پر زد پڑتی تھی، وہ "نفاق" کی حقیقت بیان کرتے تھے، اور نفاق ایک مرض تھا، جو اس سوسائٹی میں پھیل رہا تھا، وہ منافقین کے اوصاف و اخلاق بیان کرتے تھے، اور یہ اوصاف و اخلاق بہت سے لوگوں میں پائے جاتے تھے، جو حکومت، فوج اور تجارت میں پیش پیش تھے، اور زندگی میں نمایاں تھے، وہ آخرت فراموشی اور دنیا طلبی کے بحران کی مذمت کرتے تھے، اور بکثرت لوگ اس وبا کا شکار تھے، وہ موت اور آخرت کی تصویر کھینچتے تھے، اور ان حقیقتوں کو مستحضر کراتے تھے، اور مترفین وغافلین کا ایک ایسا طبقہ پیدا ہو گیا تھا، جس کی زندگی ان چیزوں کے بھلائے رکھنے میں تھی۔

غرض ان کی دعوت، ان کے مواعظ، اور ان کے اصلاحی درس اس زمانہ کی خواہشات و اغراض سے اس طرح متصادم تھے کہ اس زمانہ کی سوسائٹی کے لئے اُن سے غیر متعلق رہنا مشکل ہو گیا تھا، اس کا نتیجہ تھا کہ بکثرت لوگ ان کی تقریروں اور مجلسوں سے چوٹ کھا کر پچھلی زندگی سے تائب ہوتے تھے، اور نئی زندگی اختیار کرتے تھے، وہ اپنی تقریروں، اور مجلسوں سے دین و ایمان کی دعوت بھی دیتے تھے، اور اپنی صحبت و عمل سے نفوس کی تربیت اور تزکیہ بھی کرتے تھے، ساٹھ سال کی طویل مدت انھوں نے اس دعوت و اصلاح میں گذاری، کوئی اندازہ نہیں کر سکتا کہ کتنے نفوس کو ان کی وجہ سے حلاوتِ ایمان اور حقیقتِ اسلام نصیب ہوئی، عوام بن حوشب کہتے ہیں کہ حسنؒ نے ساٹھ برس تک اپنی قوم میں وہ کام کیا، جو انبیاء کرام (ختم نبوت سے پہلے) اپنی امتوں میں کرتے تھے[1]

---

[1] دائرۃ المعارف للبستانی ج ۶ ص ۳۴

حسن بصریؒ کی وفات اور ان کی مقبولیت

اس خلوص، دینی انہماک اور علمی و روحانی کمالات کا یہ اثر تھا کہ سارا البصرہ[1] ان کا گرویدہ تھا، سنہ ۱۱۰ھ میں ان کا جب انتقال ہوا تو سارے شہر نے ان کے جنازہ کی مشایعت کی اور بصرہ کی تاریخ میں یہ پہلا موقع تھا کہ پوری آبادی کے قبرستان چلے جانے کی وجہ سے اس دن شہر کی جامع مسجد میں عصر کی نماز نہیں ہو سکی[2]۔

حسن بصری کے بعد ان کے روحانی و علمی جانشینوں نے اور اپنے اپنے زمانہ کے داعیوں نے "دعوت الی اللہ" دعوت آخرت اور دعوتِ ایمان و عمل کے تسلسل کو جاری رکھا اور درمیان میں کوئی خلا واقع نہیں ہونے دیا، حسن بصری کی وفات کے بائیس برس بعد خلافتِ امویہ کا خاتمہ اور خلافت عباسیہ کا آغاز ہوا، اور دمشق کے بجائے بغداد دارالخلافت اور پورے مشرق کا مرکزِ توجہ بن گیا۔

انقلابِ حکومت کی کوششیں

ان اصلاحی کوششوں اور دعوت و تذکیر کے تسلسل کے ساتھ تھوڑے تھوڑے وقفہ کے بعد اس کی کوشش بھی جاری رہی کہ خلافت کو اس کے صحیح مرکز پر قائم کیا جائے، اور اس اجارہ داری کو ختم کردیا جائے، جو امویوں اور ان کے بعد عباسیوں نے قائم رکھی تھی، خلافت غلطی سے ایسی قومی اور نسلی بنیادوں پر قائم ہوگئی تھی کہ اس کے مقابلہ میں کوئی آواز اور کوئی تحریک اس وقت تک موثر نہیں ہو سکتی تھی، جب تک کہ اس کو شرافتِ نسب اور علوِ خاندان کی سند حاصل نہ ہو اور اس کی پشت پر خاندانی طاقت و حمایت نہ ہو، اس لئے ہم دیکھتے ہیں کہ جن لوگوں نے خلافتِ اموی اور خلافتِ عباسی کے خلاف علمِ جہاد بلند کیا، ان کا تعلق اہل بیت سے تھا کہ ان کی کامیابی کا زیادہ امکان تھا، لیکن وہ امت کے دینی رجحان کے نمائندہ بھی تھے، اور ان کو مسلمانوں کے دینی عنصر اور اصلاح پسند جماعتوں کی ہمدردی اور تائید حاصل تھی۔

---

[1] بصرہ اس وقت عراق کا سب سے بڑا شہر تھا، اور خلافت کے پایۂ تخت دمشق کے بعد اسلامی مملکت میں دوسرے درجہ کا شہر شمار ہوتا تھا۔
[2] ابن خلکان (حسن بصری)

واقعۂ کربلا کے بعد بھی خاندانِ نبوت کے متعدد افراد نے انقلاب کی کوشش کی، سیدنا حسین (علیہ وعلیٰ آبائہ السلام) کے بعد ان کے پوتے زید بن علی بن الحسین نے ہشام بن عبد الملک کے مقابلہ میں علمِ جہاد بلند کیا، اور ۱۲۲ھ میں شہید و مصلوب ہوئے، امام ابوحنیفہ نے ان کی خدمت میں دس ہزار درہم بھیجے اور حاضر نہ ہو سکنے پر معذرت کی[1]، ان کے بعد بنی حسن میں سے حضرت محمد ذو النفس الزکیہ (بن عبد اللہ المحض ابن الحسن المثنیٰ بن سیدنا حسن بن علیؓ) نے مدینہ طیبہ اور ان کے مشورہ سے ان کے بھائی ابراہیم بن عبد اللہ نے کوفہ میں منصور کے خلاف علمِ جہاد بلند کیا، امام ابوحنیفہ اور امام مالک[2] ان کی تائید و حمایت میں تھے، امام ابوحنیفہ نے برملا ان کی تائید کی، اور کچھ رقم بھی ان کی خدمت میں بھیجی، منصور کے فوجی افسر حسن بن قحطبہ کو ابراہیم کا مقابلہ کرنے سے باز رکھا، اور اس نے خلیفہ سے معذرت کر دی[3]، اوّل الذکر رمضان ۱۴۵ھ میں مدینہ طیبہ میں اور آخر الذکر ذوالقعدہ ۱۴۵ھ میں کوفہ میں شہید ہوئے، بنی امیہ اور بنی عباس کی حکومتوں کے استحکام اور وسیع انتظامات کی وجہ سے اگرچہ یہ سب کوششیں ناکام رہیں، لیکن انھوں نے امت میں غلط اقتدار کے خلاف جدوجہد اور اعلانِ حق کی ایک نظیر قائم کر دی، اگرچہ علاوہ کامیاب نہیں ہو سکے، لیکن ان کی کوششوں کا یہ ذہنی اثر قربانی، اور جدوجہد کا یہ تسلسل کچھ کم قیمتی نہیں، اسلامی تاریخ کی آبرو انہی جواں مردوں سے قائم ہے، جنھوں نے غلط اقتدار اور مادی ترغیبات کے سامنے سپر نہیں ڈالی اور صحیح مقصد کے لئے اپنے خون کا آخری قطرہ بہا دیا۔

"مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ رِجَالٌ صَدَقُوْا مَا عَاهَدُوا اللّٰهَ عَلَيْهِ"

---

[1] مناقب ابی حنیفہ بزازی . ج ۱ ص ۵۵

[2] امام مالک نے اہلِ مدینہ کو محمد ذو النفس الزکیہ کی رفاقت و طاعت کا فتویٰ دیا، اگرچہ وہ منصور کی بیعت کر چکے ہوں (تاریخ الکامل ج ۵ ص ۲۱۴)

[3] مورخین کا خیال ہے کہ ابوحنیفہ کے خلاف منصور نے جو سخت کارروائی کی اس کی وجہ ان کا عہدۂ قضا سے انکار نہ تھا بلکہ دراصل محمد و ابراہیم کی حمایت تھی جس کا منصور کو علم تھا، اس باب کی تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو "امام ابوحنیفہ کی سیاسی زندگی" از مولانا سید مناظر احسن گیلانی۔

خلافتِ عبّاسیہ اور دینی دعوت و تذکیر

خلافتِ عبّاسیہ اور اس کے اثرات

خلافتِ عباسیہ، خلافت امویہ کی پوری پوری جانشیں تھی، وہی دنیاداری کی روح، وہی شخصی وموروثی سلطنت کا نظام وآئین، اور وہی اس کی خرابیاں اور بُرے نتائج، وہی بیت المال میں آزادانہ تصرف، وہی عیش وعشرت کی گرم بازاری، فرق اتنا تھا کہ امویوں کی سلطنت میں اور ان کے زمانہ کی سوسائٹی میں عربی روح کارفرما تھی، اس کی خرابیاں، اور بے اعتدالیاں بھی اسی نوع کی تھیں، عباسی سلطنت کے جسم میں عجمی روح داخل ہوگئی تھی، اور عجمی قوموں اور تہذیبوں کے امراض وعیوب اپنے ساتھ لائی تھی، سلطنت کا رقبہ اتنا وسیع ہوگیا تھا کہ ہارون رشید نے ایک مرتبہ ابر کے ایک ٹکڑے کو دیکھ کر بڑے اطمینان سے کہا:۔

امطری حیث شئتِ فسیاتینی خراجك۔ — جہاں تیرے جی میں آئے جاکر برس جانیری پیداوار کا خراج بہر حال میرے ہی پاس آئے گا۔

ابن خلدون کے اندازہ کے مطابق سلطنتِ عباسیہ کی سالانہ آمدنی ہارون رشید کے زمانہ میں سات ہزار پانچ سو قنطار (سات کروڑ ڈیڑھ لاکھ دینار سے زیادہ تھی، یعنی اکتیس کروڑ پچاس لاکھ روپیہ ......۳۱۵) سالانہ سے زائد[1] جو اس زمانہ کے اعتبار سے بہت بڑی مالیت تھی، مامون کے زمانہ میں اس میں

---

[1] مقدمۂ ابن خلدون ص۱۵۱

کافی اضافہ ہوا، اس کثیر آمدنی میں سب سے بڑی سلطنت کا پایۂ تخت ہونے کی وجہ سے ساری دنیا کا سامانِ عیش و عشرت اور ساری دنیا کے اہلِ کمال، صنّاع و مغنّی، غلام، باندیاں، مصاحب و شاعر اور خوش باش و خوش فکر سمٹ کر بغداد میں آگئے تھے، دولت کی فراوانی عجمیوں کے اختلاط سے تمدن کی ساری خرابیاں اور متمدن زندگی کی ساری بے اعتدالیاں دار السلام یا مرکزِ اسلام میں شروع ہوگئی تھیں[1]، دولت کی بہتات، مال کی بے وقعتی اور اس وقت کے تمدن و تعیش کا اندازہ کرنے کے لئے تاریخ میں مامون کی شادی کا حال پڑھ لینا کافی ہے، مورخ لکھتا ہے:۔

"مامون مع خاندان شاہی وارکانِ دولت و کل فوج و تمام افسران ملکی و خدام حسن بن سہل (وزیر اعظم جس کی لڑکی سے مامون کی شادی ہو رہی تھی) کا مہمان ہوا، اور برابر انیس ۱۹ دن تک اس عظیم الشان بارات کی ایسی فیاضانہ حوصلہ سے مہانداری کی گئی کہ ادنیٰ سے ادنیٰ آدمی نے بھی چند روز کے لئے امیرانہ زندگی بسر کرلی، خاندان ہاشم و افسران فوج اور تمام عہدہ دارانِ سلطنت پر مشک و عنبر کی ہزاروں گولیاں نثار کی گئیں، جن پر کاغذ لپیٹے ہوئے تھے، اور ہر کاغذ پر نقد، لونڈی، غلام، املاک، خلعت، اسپ خاصہ، جاگیر وغیرہ کی ایک خاص تعداد لکھی ہوئی تھی، نثار کی عام لوٹ میں یہ فیاضانہ حکم تھا، جس کے حصہ میں جو گولی آئے، اس میں جو کچھ لکھا ہو اسی وقت وکیل المخزن سے دلا دیا جائے، عام آدمیوں پر مشک و عنبر کی گولیاں اور درہم و دینار نثار کئے گئے، مامون کے لئے ایک نہایت مکلف فرش بچھایا گیا جو سونے کے تاروں سے بنایا گیا تھا، اور گوہر و یاقوت سے مرصع تھا، مامون جب اس پر جلوہ فرما ہوا تو بیش قیمت موتی اس کے قدم پر نثار کئے گئے، جو زریں فرش پر بکھر کر نہایت دل آویز سماں دکھاتے تھے"[2]

بغداد کے داعی الی اللہ

لیکن اسی پر عیش و عشرت بغداد میں کچھ نفوسِ قدسیہ تھے، جو دعوت الی اللہ، تزکیۂ نفوس، علوم دینیہ

---

[1] تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو کتاب الحیوان" (جاحظ) ج ۳ ص ۹۱، و ج ۵ ص ۱۱۵ و مجلدات الأغانی۔

[2] المامون (مولانا شبلی نعمانی مرحوم ص ۱۵۷، بحوالہ ابن خلدون، ابو الفداء، ابن الاثیر، ابن خلکان۔

کی نشرواشاعت اور تعلیم و تعلّم میں ہمہ تن منہمک تھے، انھوں نے شہر کے ہنگاموں اور زندگی کی ساری دلچسپیوں سے اپنے کو علیحدہ کرلیا تھا، اور اس امت کی روح اور تعلق باللہ کے سرمایہ اور اسلامی زندگی کے سرچشمہ (قرآن وحدیث) کی حفاظت میں مصروف تھے، حکومت ان کو کسی قیمت پر خرید نہیں سکی، اور دنیا کی کوئی ترغیب ان کو اپنے کام سے ہٹا نہیں سکی، مادیت کے اس پر تلاطم سمندر میں وہ انسانی جزیرے تھے، جہاں ڈوبنے والے پناہ لیتے تھے، انھوں نے بغداد میں مادی و پرعشرت زندگی کے پہلو بہ پہلو ایک خالص ایمانی اور روحانی زندگی قائم کررکھی تھی، جو اپنی طاقت اور وسعت میں مادّی و سیاسی زندگی سے کم نہ تھی، اگر خلفاء اور امراء و وزراء کا قبضہ جسموں پر تھا، تو ان کی حکومت لوگوں کے دلوں اور دماغوں پر تھی، اور جہاں کہیں ان دونوں میں مقابلہ پیش آتا تو اکثر اوقات انہی کا غلبہ ثابت ہوتا، سلطانِ وقت ہارون رشید اپنے شاہانہ تزک واحتشام کے ساتھ رقہ میں مقیم تھا کہ مشہور امام حدیث اور مردصالح حضرت عبداللہ بن مبارک کی آمد ہوئی، شہر کی ساری آبادی ان کے استقبال کے لئے نکل پڑی، خلیفہ تنہا رہ گیا، ازدحام کا یہ حال تھا کہ جوتیاں ٹوٹ گئیں، ہارون کی ایک کنیز بالاخانہ سے دیکھ رہی تھی، پوچھا کہ یہ ماجرا کیا ہے؟ لوگوں نے کہا کہ خراسان کے ایک عالم آئے ہیں، جن کا نام عبداللہ بن مبارک ہے، اس نے کہا کہ یہ بادشاہی ہے نہ کہ ہارون کی بادشاہی کہ بغیر پولیس اور اہل کاروں کے جمع ہی نہیں ہوتے۔

یہ ایمانی اور علمی زندگی بغداد میں صاف نمایاں تھی، بغداد جس طرح عیش وعشرت اور مال و دولت کا گہوارہ تھا، اور اس کے طالب دنیا کے گوشہ گوشہ سے سمٹ کر یہاں جمع ہوگئے تھے، اسی طرح علم وعمل، صلاح و تقوی اور دعوت واصلاح کا بھی سب سے بڑا مرکز تھا، جہاں اس فن کے امام اور اس فن کے طالب پورے عالم اسلام سے آکر جمع ہوگئے تھے، طبقات وتراجم کی کتابیں دیکھنے سے تو یہ محسوس ہونے لگتا ہے کہ بغداد میں صلحاء و علماء کے علاوہ اور کوئی بستا ہی نہ تھا، اور قال اللہ وقال الرسول کے سوا کوئی صدا بلند نہیں ہوتی تھی، یہ دینی رونق اور علمی مرکز حکومت میں دین واصلاح کی یہ دعوت انہی مجاہد بندوں کے دم سے تھی، جنھوں نے اسی کام کو اپنی زندگی کا مقصد سمجھ لیا تھا، اس سلسلہ میں سفیان ثوری، فضیل بن عیاض، جنید بغدادی

معروف کرخی، اور بشر حافی کا نام اور کام سب سے زیادہ نمایاں اور روشن ہے، ان حضرات کے اعمال واخلاق، سچی خدا ترسی، بے لوث زاہدانہ زندگی، مخلوق سے استغنا، ایثار و بے نفسی، بے غرض خدمت خلق، اور ایمانی کیفیات غیر مسلم آبادی تک پر اثر ڈالتی تھیں، ان کی ذات سے اسلام کا اخلاقی وقار قائم تھا، اس کا نتیجہ تھا کہ ان کی تقریریں سن کر اور ان کے اعمال و اخلاق دیکھ کر بہ کثرت یہودی، عیسائی مجوسی اور صابئی مسلمان ہوتے تھے[1]

---

[1] ملاحظہ ہو تاریخ بغداد (خطیب بغدادی) اور حلیۃ الاولیاء (ابو نعیم) اور تاریخ ابن خلکان۔

تدوینِ حدیث وفقہ

امت کی دو فوری ضرورتیں

امت کی روح اور اس کے اخلاق کی حفاظت کے ساتھ (جس کا سلسلہ برابر جاری تھا) امت کی اجتماعی زندگی و معاشرت، اور معاملات و سیاست کی حفاظت کی بھی ضرورت تھی، اور اس بات کی ضمانت کی کہ وہ آئندہ بھی اسلام کے اصول و آئین کے مطابق ہوں گے، اس وقت دو براعظم (ایشیا و افریقہ) اور براعظم یورپ کا ایک حصہ (اسپین) اسلام کی نگرانی و تولیت میں تھے، اسلام کی سلطنت روئے زمین کی سب سے بڑی وسیع اور سب سے طویل و عریض سلطنت تھی جو دنیا کے متمدن ترین ممالک پر مشتمل تھی، نئے حالات و مسائل سے مسلمانوں کا سابقہ تھا، تجارت و زراعت، جزیہ و خراج محکومین، مفتوحہ ممالک کے نئے نئے مسائل درپیش تھے، قدیم عادات و رواج کا بہت بڑا ذخیرہ، اور نئی نئی ضروریات تھیں، جو مسلمانوں کی قوتِ فیصلہ اور اسلامی احکام کی منتظر تھیں، ان میں سے نہ کسی ضرورت کو ٹالا جا سکتا تھا، نہ سرسری طور پر ان سے گذرا جا سکتا تھا، حکومت مفصل و مکمل آئین و قانونِ سلطنت کی طالب تھی، حکومت کی انتظامی مشین کو روکا نہیں جا سکتا تھا، اگر قانونِ اسلامی کی ترتیب میں تاخیر ہوتی تو وہ رومی یا ایرانی قانون کو اختیار کرنے پر مجبور تھی، جس کا نتیجہ وہ ہوتا جو اس وقت کی نام نہاد "اسلامی سلطنتوں" کا ہوا ہے، علماء کی ذرا سی غفلت، اور محافظین سنت کی دماغی کاہلی اور راحت پسندی اس امت کو ہزاروں برس کے لئے اسلامی معاشرت، اور اس کے اجتماعی قوانین کی برکت سے محروم کر دیتی

ع یک لحظہ غافل بودم صد سالہ راہم دور شد

اس وقت دو مسئلوں کی طرف فوری توجہ کی ضرورت تھی، ایک تو یہ کہ حدیث و سنت کے سرمایہ کو محفوظ و مدون کر لیا جائے، جو محدثین کے سینوں اور منتشر سفینوں[1] میں تھا، یہ نئے مسائل کے استنباط کا بہت بڑا ذریعہ اور فقہ اسلامی کا ایک بہت بڑا ماخذ تھا، اسی کے ساتھ وہ امت کے اسلامی مزاج اور زندگی کے اسلامی سانچہ کی حفاظت کا بھی ذریعہ تھا، حدیث رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی سب سے زیادہ مفصل اور مستند سیرت ہے، وہ زمانۂ نبوت کے تئیس برسوں کا ایک طرح کا روزنامچہ ہے، جو کسی پیغمبر کی امت کو حاصل نہیں، اس کا ضائع ہو جانا بہت بڑا علمی و دینی سانحہ تھا، علاوہ بریں اس میں امت کی اخلاقی اصلاح، اعتدال، صحیح روحانیت زہد و تقویٰ، اور تغیر و انقلاب پر ابھارنے والی زبردست طاقت ہے، جس کے اثر سے ہر زمانہ میں اہلِ دعوت و اہل عزیمت پیدا ہوتے رہیں گے اور ہر زمانہ کی مسلمان سوسائٹی کا شرعی و اخلاقی احتساب ہو سکے گا، اور ہر زمانہ اور ہر طبقہ کی بدعات کا مقابلہ کیا جا سکے گا۔

دوسری ضرورت فقہ کی تدوین اور استنباط و اجتہاد کی تھی، قرآن و حدیث میں اگرچہ زندگی کے ہر شعبہ کے لئے اصول و کلیات موجود ہیں، اور ان سے باہر کہیں جانے کی ضرورت نہیں، مگر زندگی متغیر ہے اور انسان کے حالات و ضروریات غیر محدود اور بیحد متنوع، ان اصول کلیات کو زندگی کے ان تغیرات و تنوعات پر حاوی بنانے کے لئے اور ہر نئی حالت اور نئی ضرورت کے لئے ان کی ترجمانی و تشریح کے لئے اجتہاد و استنباط کی ضرورت تھی۔

---

[1] حدیث کے جمع و تدوین کا کام عہد تابعین سے شروع ہو چکا تھا، اس سلسلہ میں حضرت عمر بن عبد العزیزؒ کی توجہ و دلچسپی کا حال گذر چکا ہے، دوسری ہی صدی میں حدیث کے مختلف مجموعے تیار ہو چکے تھے جن میں سے ابن شہاب زہری (م ۱۲۴ھ) ابن جریج مکی (م ۱۵۰ھ) ابن اسحاق (م ۱۵۱ھ) سعید ابن ابی عروبہ مدنی (م ۱۵۶ھ) معمر یمنی (م ۱۵۳ھ) ربیع بن صبیح (م ۱۶۰ھ) وغیرہ کے مجموعے خاص طور پر مشہور ہیں، لیکن ضرورت تھی کہ اس کو زیادہ علمی و ترقی یافتہ شکل پر انجام دیا جائے۔

تدوین حدیث

پہلی ضرورت کے لئے قدرتی طور پر یہ انتظام ہوا کہ ظہورِ اسلام کے لئے اس ملک اور قوم کا انتخاب ہوا، جو اپنی راست گفتاری، امانت اور قوت حفظ میں دنیا میں ممتاز تھی، صحابۂ کرامؓ نے جو کچھ دیکھا جو کچھ سنا اس کو محفوظ کرلیا، اور بےکم وکاست دوسری نسل کو پہنچا دیا، دوسری قوموں نے اپنے اپنے پیغمبروں کے بُت تراشے اور ان کی تصویریں بنائیں، اسلام میں بُت تراشی اور صورت گری حرام ہے، مگر صحابۂ کرامؓ نے آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کے شمائل وعادات کا ایسا جیتا جاگتا مرقع پیش کردیا جس کی موجودگی میں کسی تصویر کی ضرورت نہیں، اور جو تصویر کے تمام مفاسد سے پاک ہے۔

محدثین کی بلند ہمتی اور جفاکشی

پھر ان روایات کی حفاظت واشاعت کے لئے اللہ تعالیٰ نے صدہا کی تعداد میں ایسے بلند حوصلہ، تازہ دم، پرجوش طالب علم مہیا کردیئے، جو قوت حافظہ وذکاوت میں بےنظیر تھے، ان کا سیلاب عجم کے ملکوں سے امنڈ آیا، اللہ تعالیٰ نے ان کے دل میں حدیث کا ایسا عشق بھر دیا کہ ان کے لئے چین سے بیٹھنا مشکل ہوگیا تھا، ان کو ہر جگہ سے اس علم کو حاصل کرنے اور اپنے سینہ اور سفینہ میں محفوظ کرنے کی دُھن تھی، علوم کی تاریخ اور پیغمبروں کی امتوں میں اس عشق اور دُھن اور پھر اس احتیاط وامانت کی مثال نہیں ملتی، انھوں نے ان احادیث کو جمع کرنے اور ان روایات کو ان کے راویوں سے سننے کے لئے اسلامی دنیا کا کونہ کونہ چھان ڈالا، اس بادیہ پیمائی کا کچھ اندازہ اس سے ہوسکتا ہے کہ امام بخاری نے ۱۴ برس کے سن میں سیاحت شروع کردی تھی، بخارا سے لے کر مصر تک سارے ممالک انھوں نے کھنگال ڈالے، امام ابوحاتم رازی کہتے ہیں کہ میں نے تین ہزار فرسخ (نو ہزار میل) سے زیادہ مسافت پیادہ پا طے کی، پھر میں نے میلوں کا شمار کرنا چھوڑ دیا، محدث اندلس ابن حیوان نے حدیث اندلس، عراق، حجاز،

اور یمن کے شیوخ کی خدمت میں حاضر ہو کر اخذ کی، گویا طنجہ سے لے کر سوئز تک سارا برّ اعظم افریقہ اور پھر بحر احمر طے کیا، بہت سے محدثین کا سفرنامہ تین تین برّ اعظموں ایشیا، افریقہ، یورپ (اسپین) پر مشتمل ہے،[1] اس وقت کی متمدن و معروف دنیا کے مغرب بعید (اندلس) سے مشرق بعید (خراسان) تک سفر کرنا اور شہر شہر پھرنا تو معمولی بات تھی۔

فن اسماء الرجال

ان مخلصین نے صرف حدیث و روایات کے جمع و تدوین پر اکتفا نہیں کی بلکہ درمیانی واسطوں کی بھی تحقیق کی، اور ان تمام راویوں کے نام و نشان و تاریخ زندگی اور اخلاق و عادات کو محفوظ کر دیا جن کے توسط سے یہ روایات ان کو پہونچی تھیں، اس طرح جس ذاتِ گرامی کے متعلق "وَرَفَعْنَا لَكَ ذِكْرَكَ" کا وعدہ اور اطلاع تھی، اس کی بدولت لاکھوں اشخاص کی زندگی روشنی میں آ گئی، ان ہزاروں لاکھوں انسانوں کی اہمیت کی وجہ صرف یہ تھی کہ وہ اس ہستی کے اقوال و اعمال و احوال میں سے کسی جز کے راوی، اور اس سلسلۂ روایت کے ایک ناقل تھے، نتیجہ یہ ہوا کہ احادیث و روایات کی تدوین کے ساتھ ساتھ ایک نیا علم "اسماء الرجال" کا وجود میں آ گیا، یہ علم محدثین کی عالی ہمتی، علمی شغف، تحقیقی ذوق، اور احساس ذمہ داری کی روشن مثال ہے، اس امت کا ایک قابل فخر کارنامہ ہے، ڈاکٹر اسپرنگر نے "الاصابة فی احوال الصحابة" (حافظ ابن حجرؒ) کے انگریزی مقدمہ[2] میں بالکل صحیح لکھا ہے کہ:۔

"کوئی قوم دنیا میں ایسی گزری، نہ آج موجود ہے، جس نے مسلمانوں کی طرح "اسماء الرجال" کا عظیم الشان فن ایجاد کیا ہو جس کی بدولت آج پانچ لاکھ شخصوں کا حال معلوم ہو سکتا ہو"۔[3]

---

[1] یہ مثالیں "علمائے سلف" (مولانا حبیب الرحمٰن خاں شروانی مرحوم) سے ماخوذ ہیں تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو کتاب کا عنوان "سفر"

[2] مطبوعہ کلکتہ ۱۸۵۳ء تا ۱۸۶۴ء [3] خطبات مدراس از مولانا سید سلیمان ندوی۔

محدثین کی احتیاط و امانت

محدثین نے نہ صرف رجال حدیث کے حالات جمع و محفوظ کردیئے بلکہ صحیح حالات لکھنے کی پابندی کی، اور ان کے اخلاق و عادات، قوت و ضعف، احتیاط و بے احتیاطی، دیانت و تقویٰ، علم و حافظہ کے متعلق ان کے معاصرین کے بیانات اور ہر قسم کی معلومات یکجا کردیئے، اور ان کے بارہ میں کسی رو رعایت سے کام نہیں لیا خواہ ان کے زمانہ میں حاکم ہوں یا اپنے وقت کے بڑے زاہد ہوں۔

"راویوں کی چھان بین اور تحقیق میں اس درجہ دیانتداری اور حق گوئی سے کام لیا کہ وہ واقعتاً آج اسلام کے مفاخر میں ہیں، راویوں میں بڑے بڑے خلفاء اور امراء بھی تھے جن کی تلواروں کی دھاک بیٹھی ہوئی تھی، مگر محدثین نے نڈر ہوکر سب کی پردہ دری کی، اور ان کو وہی درجہ دیا جو اس بارگاہ میں ان کو مل سکتا تھا، امام وکیع بڑے محدث تھے لیکن ان کے باپ سرکاری خزانچی تھے، اس بنا پر وہ خود ان سے جب روایت کرتے تو ان کی تائید میں کسی دوسرے کو ضرور ملالیتے یعنی تنہا اپنے باپ کی روایت کو تسلیم نہیں کرتے تھے، اس احتیاط اور حق پسندی کی کوئی حد ہے[1]؟"

مسعودی ایک محدث ہیں، ۱۵۴ھ میں ایک امام معاذ بن معاذ نے ان کو دیکھا کہ ان کو اپنی تحریری یادداشت کے دیکھنے کی ضرورت ہوتی ہے تو انھوں نے فوراً ان کے حافظہ سے اپنی بے اعتباری ظاہر کردی[2]، یہی امام معاذ بن معاذ وہ بزرگ ہیں کہ ان کو ایک شخص نے دس ہزار دینار جس کی قیمت آج دس ہزار گنی سے زیادہ ہے، صرف اس معاوضہ میں پیش کرنے چاہے کہ وہ ایک شخص کو معتبر (عدل) اور غیر معتبر کچھ نہ کہیں، یعنی اس کے متعلق خاموش رہیں، انھوں نے اشرفیوں کے اس توڑے کو حقارت کے ساتھ ٹھکرادیا، اور فرمایا کہ میں کسی حق کو چھپا نہیں سکتا[3]، کیا تاریخ اس سے زیادہ احتیاط اور اس سے زیادہ دیانتداری کی کوئی مثال پیش کرسکتی ہے[4]؟

---

[1] تہذیب التہذیب جلد ۱۱ ص ۱۳۰ [2] ایضاً ج ۶ ص ۲۱۱ [3] ایضاً ج ۱۰ ص ۱۹۳ [4] خطبات مدراس ص ۵۹-۶۰

قوتِ حافظہ اور استحضار

محدثین کی یہ جماعت ایران وترکستان کا بہترین دماغی جوہر تھا، وہ نسلاً بڑے تندرست، توانا، جفاکش، عالی حوصلہ، علم کے حریص اور حافظہ کے نہایت قوی تھے، حافظہ پر اعتماد اور اس سے کام لینے کی وجہ سے (تمام انسانی اعضاء کی طرح جو پرورش اور ورزش سے غیر معمولی طور پر طاقتور ہو جاتے ہیں) ان کا حافظہ اپنی قوتِ حفظ کے محیرالعقول نمونے پیش کرتا تھا، جو ضعف وکمزوری کے اس خالص کتابی دور میں بعض اوقات ناقابلِ فہم معلوم ہوتے ہیں، لیکن تاریخ ان کے وقوع کی متواتر شہادتیں بہم پہونچاتی ہے اور تجربات ان کے امکان کی تصدیق کرتے ہیں، اور ان کی علمی توجیہ بالکل مشکل نہیں، کثرتِ کار، مناسبتِ تام اور اپنے موضوع سے عشق وشغف ایسا ملکہ پیدا کر دیتا ہے، اور انتقالِ ذہنی کے ایسے نمونے ظاہر ہوتے ہیں، جو غیر متعلق اشخاص کے لئے حیرت انگیز ہوتے ہیں۔

امام بخاریؒ جب بغداد آئے تو علماء بغداد نے ان کے امتحان کا یہ طریقہ تجویز کیا کہ سو حدیثوں کی سند اور متن (مضمون حدیث) کو الٹ دیا، ایک حدیث کی سند دوسرے متن کے ساتھ اور ایک حدیث کا متن دوسری سند کے ساتھ لگا دیا، اور دس دس حدیثوں کو ایک ایک شخص کے حوالہ کیا کہ وہ ان سے سوال کرے، امام بخاری جب مجلس میں آئے تو ایک ایک شخص نے دس دس حدیثیں سنائیں، اور ان کی رائے دریافت کی، وہ سنتے اور فرماتے کہ میں ان حدیثوں سے واقف نہیں، اہلِ علم اس راز کو سمجھے اور ناواقف اشخاص ان کی لاعلمی پر مسکرائے، جب سب نے اپنے اپنے حصہ کی حدیثیں سنالیں تو امام نے باری باری ایک ایک کی طرف توجہ فرمائی اور کہا کہ آپ نے جو دس حدیثیں سنائی تھیں ان کا متن یہ ہے، اور ان کی سند یہ ہے، پھر دوسرے تیسرے کی طرف توجہ کی، یہاں تک کہ سب کی احادیث کی تصحیح کر دی، اور جس سند کا جو متن تھا، اور جس متن کی جو سند تھی، وہ بیان کی، لوگ ان کی وسعتِ نظر، حاضر دماغی اور حافظہ پر انگشت بدنداں رہ گئے۔[1]

---

[1] مقدمۂ فتح الباری ص ۴۸۷

مجالسِ درس میں سامعین کا ہجوم

اس ذہین طبقہ کی توجہ وانہماک اور حدیث کی ضرورت کے احساس نے حدیث کا ایسا عام ذوق اس کے درس وروایت کی مجلسوں میں شرکت کا شوق اور ائمۂ فن سے تلمذ واستفادہ کی حرص پیدا کر دی تھی کہ محدثین کی مجالسِ درس میں حاضرین کی تعداد ہزاروں سے متجاوز ہوتی، اور بادشاہوں کے دربار سے زیادہ ان میں سکون اور نظام ہوتا۔ یزید بن ہارون نے جب بغداد میں درس حدیث دیا، تو اس میں ستّر ہزار حاضرین کا تخمینہ کیا گیا، امام عاصم بن علی املائے حدیث کے واسطے بغداد سے باہر نخلستان میں ایک بلند چبوترے پر بیٹھے تھے، خلیفہ معتصم باللہ نے ایک بار اپنا ایک معتمد اس مجلس کے شرکاء کا اندازہ کرنے کے لئے بھیجا تو ایک لاکھ چوبیس ہزار حاضرین کی تعداد کا اندازہ تھا، احمد بن جعفر راوی ہیں کہ جب ابو مسلم بغداد میں آئے تو رحبۂ غسان نامی مقام پر انھوں نے حدیث کا املا کیا، سات مستملی کھڑے ہوئے جن میں سے ایک دوسرے کو شیخ کی روایت پہونچا تا تھا، اور لوگ کھڑے کھڑے تحریر حدیث میں مصروف تھے، دواتوں کا شمار کیا گیا تو کچھ اوپر چالیس ہزار دواتیں شمار ہوئیں، جو لوگ لکھتے نہ تھے، صرف سماعاً شریک تھے، وہ اس تعداد سے خارج ہیں، شیخ وقت فریابی نے بغداد میں املائے حدیث کیا تو تین سو سولہ مستملی ان کی مجلس میں حاضر تھے، اور حاضرین تخمیناً تیس ہزار، فریابی کی مجلس میں دس ہزار آدمی ان کے پاس ایسے پڑھنے آتے تھے، جو دوات قلم لے کر بیٹھتے،[۱] فربری کی روایت ہے کہ امام بخاری کی جامع صحیح کو ان سے نوّے ہزار آدمیوں نے سنا۔[۲]

صحاحِ ستّہ

یہ عمومی ذوق، انہماک، اور جذبۂ مسابقت خالی از حکمت نہ تھا، اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ احادیث کا ایسا محفوظ ومستند سرمایہ جمع ہوگیا، جو اس امت کی بہت بڑی ثروت اور اصلاح وتجدید کا ایک بڑا طاقت ور

---

[۱] علمائے سلف ص۲۶ بحوالہ تذکرۃ الحفاظ وتاریخ ابن خلکان۔ [۲] مقدمۂ فتح الباری ص۴۹۲

ذریعہ ہے، اس سرمایہ میں امام بخاری کی صحیح بخاری، امام مسلم کی صحیح مسلم (جن کو اکثر صحیحین کے لقب سے یاد کیا جاتا ہے) اور جس حدیث کو ان دونوں نے روایت کیا ہے، اس کو "متفق علیہ" کے لفظ سے یاد کرتے ہیں، (جو حدیث کا اعلیٰ درجہ ہے) سب سے ممتاز اور بلند پایہ ہیں[1]۔ ان دونوں کے بعد امام مالک کی موطا اور امام ترمذی کی جامع، امام ابوداؤد سجستانی کی سنن ابی داؤد، امام نسائی، اور امام ابن ماجہ کے مجموعے اپنی بہت سی خصوصیتوں کی وجہ سے ممتاز ہیں، بعد کی اصلاحی کوششوں اور تجدیدی کارناموں میں محدثین کرام کی ان ابتدائی محنتوں کا بہت بڑا حصہ ہے آج بھی کوئی سنجیدہ اور وسیع اصلاحی تحریک اور دینی انقلاب کی کوشش اس علمی ذخیرہ سے مستغنی نہیں ہو سکتی۔

تدوینِ فقہ

اسی طرح فقہ کی تدوین، مسائل کا استنباط و استخراج، جزئیات و فتاویٰ کی ترتیب اسلام کی ایسی عملی ضرورت تھی جس کو بالکل مؤخر نہیں کیا جا سکتا تھا، اسلام جزیرۃ العرب سے نکل کر شام، عراق، مصر و ایران اور دوسرے وسیع اور زرخیز ملکوں میں پہونچ گیا تھا، معاشرت، تجارت، انتظام ملکی سب بہت وسیع اور پیچیدہ شکلیں اختیار کر گئے تھے، اس وقت ان نئے حالات و مسائل میں اسلام کے اصول کی تطبیق کے لئے بڑی اعلیٰ ذہانت، معاملہ فہمی، باریک بینی، زندگی اور سوسائٹی سے وسیع واقفیت، انسانی نفسیات اور اس کی کمزوریوں سے باخبری، قوم کے طبقات اور زندگی کے مختلف شعبوں کی اطلاع اور اس سے پیشتر اسلام کی تاریخ و روایات اور روح شریعت سے گہری واقفیت، عہد رسالت اور زمانۂ صحابہ کے حالات سے پوری آگاہی اور اسلام کے

---

[1] شاہ ولی اللہ "حجۃ اللہ البالغہ" میں صحیحین کے متعلق لکھتے ہیں: اما الصحیحان فقد اتفق المحدثون علی ان جمیع ما فیھما من المتصل المرفوع صحیح بالقطع وانھما متواتران الی مصنفیھما وانہ کل من یھون امرھما فھو مبتدع متبع غیر سبیل المؤمنین" (ج امص) یعنی محدثین کا اس امر پر اتفاق ہے کہ ان دونوں کتابوں میں جتنی متصل مرفوع روایات ہیں وہ یقینی طور پر صحیح ہیں، اور ان دونوں کتابوں کی نسبت اپنے مصنفین کی تواتر سے ثابت ہے، اور جو شخص ان دونوں کتابوں کی تحقیر کرتا ہے، وہ مبتدع اور اہل ایمان کا راستہ چھوڑ کر چلنے والا ہے۔

پورے علمی ذخیرہ (قرآن و حدیث اور لغت و قواعد) پر کامل عبور کی ضرورت تھی۔

ائمۂ اربعہ اور ان کی خصوصیات

یہ اللہ کا بہت بڑا فضل تھا، اور اس امت کی اقبال مندی کہ اس کارِ عظیم کے لئے ایسے لوگ میدان میں آئے، جو اپنی ذہانت، دیانت، اخلاص اور علم میں تاریخ کے ممتاز ترین افراد ہیں، پھر ان میں سے چار شخصیتیں امام ابوحنیفہ (م [۱۵۰ھ]) امام مالک (م [۱۷۹ھ]) امام شافعی (م [۲۰۴ھ]) امام احمد بن حنبل (م [۲۴۱ھ]) جو فقہ کے چار دبستانِ فکر کے امام ہیں اور جن کی فقہ اس وقت تک عالمِ اسلام میں زندہ اور مقبول ہے، اپنے تعلق باللہ، للّٰہیت، قانونی فہم، علمی انہماک اور جذبۂ خدمت میں خاص طور پر ممتاز ہیں، ان حضرات نے اپنی پوری زندگی اور اپنی ساری قابلیتیں اس بلند مقصد اور اس اہم خدمت کے لئے وقف کر دی تھیں، انھوں نے دنیا کے کسی جاہ و اعزاز اور کسی لذت و راحت سے سروکار نہیں رکھا تھا، امام ابوحنیفہ کو دوبار عہدۂ قضا پیش کیا گیا، اور انھوں نے انکار کیا یہاں تک کہ قید خانہ ہی میں آپ کا انتقال ہوا، امام مالک نے ایک مسئلہ[۱] کے اظہار میں کوڑے کھائے اور ان کے شانے اتر گئے، امام شافعی نے زندگی کا بڑا حصہ عسرت میں گذارا، اور اپنی صحت قربان کر دی، امام احمد نے تنِ تنہا حکومتِ وقت کے رجحان اور اس کے "سرکاری مسلک" کا مقابلہ کیا اور اپنے مسلک اور اہلِ سنت کے طریقہ پر پہاڑ کی طرح جمے رہے، ان میں سے ہر ایک نے اپنے موضوع پر تنِ تنہا اتنا کام کیا اور مسائل و تحقیقات کا اتنا بڑا ذخیرہ پیدا کر دیا، جو بڑی بڑی منظم جماعتیں اور علمی ادارے بھی آسانی سے نہیں پیدا کر سکتے، امام ابوحنیفہ نے تراسی [۸۳] ہزار مسائل اپنی زبان سے بیان کئے، جن میں سے اڑتیس [۳۸] ہزار عبادت سے تعلق رکھتے ہیں، اور پینتالیس [۴۵] ہزار معاملات سے۔[۲]

---

[۱] مسئلہ یہ تھا کہ مجبور کی طلاق کا کچھ اعتبار نہیں، اس مسئلہ کا سیاسی پہلو یہ تھا کہ خلفاء کے لئے جو بیعت لی جاتی تھی، اس میں یہ کہلایا جاتا تھا کہ اگر بیعت توڑی تو بیوی کو طلاق ہو جائے گی، اگر مجبور کی طلاق کا اعتبار نہیں تو بیعت کے اس حلف نامے میں کوئی طاقت اور تاثیر باقی نہیں رہ جاتی، اسی بنا پر حکومت کو امام مالک کے اس فتوے سے بڑی تشویش لاحق ہوئی، اور اس کے حکام نے ان کے ساتھ سخت برتاؤ کیا۔ [۲] فجر الاسلام (بحوالہ مناقب ابی حنیفہ للمکی ص ۹۶) ج ۲ ص ۱۸۰

شمس الائمہ کردری نے لکھا ہے کہ امام ابوحنیفہ نے جس قدر مسائل مدون کئے ان کی تعداد چھ لاکھ ہے،[1] المدونہ میں جو امام مالک کے فتاوی کا مجموعہ ہے چھتیس ہزار مسائل ہیں کتاب الأم جو امام شافعی کے افادات کا مجموعہ ہے، سات ضخیم جلدوں میں ہے ابوبکر خلال (م ۳۱۱ھ) نے امام احمد کے مسائل چالیس[2] جلدوں میں جمع کئے[3]۔

ائمۂ اربعہ کے شاگرد و جانشین

پھر ان کو شاگرد ایسے متاز ملے جنھوں نے اس ذخیرہ میں اضافہ کیا اور ان کی تنقیح و ترتیب کا کام جاری رکھا، امام ابوحنیفہ کے شاگردوں میں امام ابویوسف جیسا قانونی دماغ نظر آتا ہے، جس نے ہارون رشید کی وسیع ترین سلطنت کے قاضی القضاۃ کے فرائض کامیابی کے ساتھ انجام دیئے، اور اسلام کے اصول معاشیات پر کتاب الخراج جیسی عالمانہ تصنیف کی، اسی طرح ان کے شاگردوں میں امام محمد جیسا فقیہ اور مؤلف اور امام زفر جیسا صاحب قیاس نظر آتا ہے، جنھوں نے فقہ حنفی کو چار چاند لگائے، امام مالک کو عبداللہ بن وہب، عبدالرحمٰن ابن القاسم، اشہب بن عبدالعزیز، عبداللہ ابن عبدالحکم، یحیٰی بن یحیٰی اللیثی جیسے وفادار شاگرد اور لائق عالم ملے جن کی کوششوں سے مصر اور شمالی افریقہ فقہ مالکی کا حلقہ بگوش ہوگیا، امام شافعی کو بویطی، مزنی اور ربیع جیسے مخلص اور ذہین شاگرد ملے جنھوں نے فقہ شافعی کو مرتب و منقح شکل میں پیش کردیا، امام احمد کی فقہ کو ابن قدامہ جیسا مصنف اور محقق حاصل ہوا جس نے "المغنی" جیسی عظیم الشان تصنیف کی جو فقہ اسلامی کے وسیع ذخیرہ میں خاص امتیاز رکھتی ہے۔

تدوین فقہ کا فائدہ

اسلام کی ابتدائی صدیوں میں ان ائمۂ فن اور صاحب اجتہاد علماء کا پیدا ہوجانا اس دین کی

---

[1] سیرۃ النعمان (مولانا شبلی) بحوالہ قلائد عقود العقیان۔ [2] اس کتاب کا نام "الجامع العلوم للامام احمد" ہے۔
[3] ابوبکر خلال کا مفصل حال شذرات الذہب فی اخبار من ذہب ج ۲ ص ۲۶۱ میں ملاحظہ ہو۔

زندگی، اور اس امت کی کارکردگی، کی صلاحیت کی دلیل تھی، ان کی کوششوں اور ذہانتوں سے اس امت کی عملی و معاملاتی زندگی میں ایک نظم اور وحدت پیدا ہوگئی، اور اس ذہنی انتشار اور معاشرتی بےنظمی اور ابتری سے محفوظ رہ گئی، جس کی قومیں اپنے ابتدائی عہد میں شکار ہو چکی ہیں، انھوں نے فقہ کی ایسی بنیادیں قائم کردیں، اور ایسے اصول مرتب کر دیئے، جن سے بعد میں پیش آنے والے مسائل اور مشکلات کے حل کرنے میں مدد لی جا سکتی ہے، اور عام معتدل زندگی کو باقاعدہ اور شرعی رہنمائی کے ساتھ گذارا جا سکتا ہے۔

فتنۂ خلق قرآن اور امام احمد ابن حنبل

فلسفۂ الٰہیات اور ذات و صفات کی بحثیں

دوسری صدی کی ابتدا ہی میں مسلمانوں کا تعارف یونانی فلسفہ سے ہوا، یہ فلسفہ محض چند خیالات و قیاسات کا مجموعہ اور الفاظ کا ایک طلسم تھا، جس کے پیچھے کوئی حقیقت و اصلیت نہ تھی، محدود الفاظ جن کے ساتھ خاص تصورات اور تجربات وابستہ ہوں، ایک غیر محدود ذات کی حقیقت و صفات کو کس طرح بیان کر سکتے ہیں، اللہ کی ہستی اور اس کی ذات و صفات کا مسئلہ کیمیاوی طرز کی تحلیل و تجزیہ اور علمی موشگافیوں اور قیاس آرائیوں کا میدان نہ تھا، اس معاملہ میں انسانوں کو وہ ابتدائی معلومات اور ذاتی تجربات ہی حاصل نہیں، جن پر بحث و قیاس کی عمارت قائم کی جا سکے، اس بارہ میں انسانوں کا ذریعۂ علم صرف انبیاء علیہم السلام کی اطلاع اور وحی الٰہی ہے، اسی سے اللہ تعالیٰ کی صحیح معرفت اور اس کی صفت بیان کرنے کا طریقہ معلوم ہو سکتا ہے، اور اسی پر اکتفا کرنا عقل کی پختگی اور بالغ نظری ہے، مسلمانوں کے پاس قرآن و حدیث کی صورت میں یہ علم محکم موجود تھا، اور ان کو اس شغل بے حاصل (الٰہیاتی مباحث) کی مطلق ضرورت نہ تھی، صحابۂ کرام، تابعین، ائمۂ دین، اور محدثین اسی مسلک پر قائم تھے، اور مسلمانوں کی ساری توجہ دعوتِ اسلام، فتح و جہاد، اور زندگی کے عملی مسائل، اور مفید علوم کی تدوین میں مصروف تھی، جب یونانی اور سُریانی کتابوں کے تراجم ہوئے اور قدیم مذاہب و ممالک کے علماء و متکلمین سے اختلاط ہوا تو امت کے وہ گروہ جو جلد متاثر ہونے کی قابلیت رکھتے تھے، اور جن کی ذہانت میں گہرائی اور پختگی سے

زیادہ سطحیت اور جدت تھی، اس طرز فکر اور طریقۂ بحث سے متاثر ہوئے، اس کے نتیجہ میں اللہ تعالیٰ کی ذات و صفات ان کے باہمی تعلق، کلامِ الٰہی، رویت باری، مسئلۂ عدل، تقدیر، جبر و اختیار کے متعلق ایسی بحثیں اور مسائل پیدا ہو گئے، جو نہ دینی حیثیت سے ضروری تھے، نہ دنیاوی حیثیت سے مفید، بلکہ امت کی وحدت اور مسلمانوں کی قوتِ عمل کے لئے مضر۔

معتزلہ کا عروج

دینی فلسفیوں کے اس گروہ کی امامت معتزلہ کر رہے تھے، جو اپنے وقت کے "روشن خیال" عالم اور پرجوش متکلم تھے، انھوں نے ان علمی بحثوں کو کفر و ایمان کا معیار بنا دیا، اور اپنی ساری ذہانتوں کو ان مباحث پر لگا دیا، ان کے مقابلہ میں محدّثین و فقہاء کا گروہ تھا، جو ان مسائل میں سلف کے مسلک کا قائل تھا، اور ان موشگافیوں کو مضر اور ان تعبیرات کو غلط سمجھتا تھا، ہارون رشید کے دورِ خلافت تک معتزلہ کو عروج حاصل نہیں ہوا، مامون کے زمانہ میں جو یونانی فلسفہ اور عقلیت سے مرعوب تھا، اور مخصوص تربیت اور حالات کی وجہ سے اس کی دماغی ساخت معتزلہ سے ملتی جلتی تھی، معتزلہ کو عروج حاصل ہوا اور قاضی ابن ابی دُواد کی بدولت جو سلطنت عباسیہ کا قاضی القضاۃ ہو گیا تھا، اور معتزلہ کے افکار و آراء کا پرجوش داعی اور مبلغ تھا، مذہب اعتزال کو حکومتِ وقت کی سرپرستی اور حمایت حاصل ہو گئی، مامون میں خود دعوت کی روح اور ایک داعی کا جوش اور جذبۂ تبلیغ تھا، اس میں ذہین نوجوانوں کی عجلت پسندی[1] اور مطلق العنان فرماں رواؤں کی ضد (راج ہٹ) دونوں جمع تھیں، اس کے دربار اور مزاج پر معتزلہ حاوی تھے۔

[1] اس نے ایک مرتبہ حضرت علیؓ کی تفضیل کا اعلان کر دیا جس سے ملک میں خاصی برہمی پیدا ہوئی، ایک مرتبہ متعہ کے جواز کا اعلان کیا، پھر جب قاضی القضاۃ یحییٰ بن اکثم نے علمی طور پر اس کو قائل کیا تو اس کی حرمت کا اعلان کروا دیا۔

عقیدۂ خلق قرآن[۱] اس وقت معتزلہ کا شعار اور کفر و ایمان کا معیار بن گیا تھا، محدثین اس مسئلہ میں معتزلہ کے حریف اور مدمقابل تھے، اور محدثین کی طرف سے امام احمد بن حنبلؒ اس مسئلہ میں سینہ سپر تھے۔

امام احمد بن حنبلؒ

امام احمد بن حنبلؒ ربیع الاول ۱۶۴ھ میں بغداد میں پیدا ہوئے، وہ خالص عربی النسل اور قبیلۂ شیبان میں سے تھے، صبر و ہمت اور استقامت و عزیمت اس قبیلہ کے تاریخی خصائص میں سے ہیں[۲]۔ ان کے دادا حنبل بن ہلال بصرہ سے خراسان منتقل ہو گئے، اموی حکومت میں وہ علاقۂ سرخس کے حاکم بھی تھے، لیکن جب عباسیوں نے اہلِ بیت اور بنی ہاشم کے نام سے خراسان میں اپنی دعوت پھیلائی تو وہ اس دعوت کے ہمدردوں اور کارکنوں میں تھے، امام احمد کی ماں مرو سے بغداد آئیں، تو وہ پیٹ میں تھے، ولادت سے پہلے ان کے والد کا انتقال ہو گیا تھا ماں نے بڑی ہمت اور حوصلہ مندی سے پرورش کی، گذر اوقات کے لئے برائے نام ایک جائداد تھی، ان حالات نے ان میں تحمل و جفاکشی اور عزم و اعتماد علی النفس کی صفات پیدا کر دیں، بچپن میں قرآن مجید حفظ کیا، اور زبان کی تعلیم حاصل کی، پھر ایک دفتر میں داخل ہوئے تاکہ تحریر و انشاء کی مشق حاصل کریں نجابت اور صلاحیت کے

---

۱ خلق قرآن کی بحث ایک خاص علمی اور فلسفیانہ بحث تھی جس کا دماغی اثر (جیسا کہ بعض اعتزال دوست مورخین نے اعتراف کیا ہے) یہ پڑنا لازمی تھا کہ قرآن مجید کی عظمت و جلالت اور اس کے لفظاً و معناً کلام الٰہی ہونے کا عقیدہ کمزور پڑ جاتا محدثین معتزلہ کی ان تعبیرات کو غلط اور امت کے لئے مضر سمجھتے تھے، اس لئے انھوں نے اس کی علانیہ مخالفت کی، معتزلہ روشن خیال اور آزادیٔ آراء کا احترام کرنے والے مشہور ہیں، لیکن انھوں نے اس مسئلہ میں سخت غلو اور مذہبی جبر و استبداد سے کام لیا، اور اپنی ناعاقبت اندیشی سے سارے عالم اسلام کو میدانِ جنگ اور دارالامتحان بنا دیا، انھوں نے اس مسئلہ میں اپنے مخالفین کے ساتھ وہ سلوک کیا جو قرونِ وسطیٰ میں اربابِ کلیسا نے آزاد خیالوں کے ساتھ کیا تھا، بالآخر یہی سختی اور حکومتِ وقت کی سرپرستی مذہب اعتزال، اور معتزلہ کے زوال کا باعث ہوئی۔

۲ عہد صدیقی کے مشہور سپہ سالار مثنیٰ بن حارثہؓ کا تعلق اسی قبیلہ سے تھا۔

آثار بچپن سے نمایاں تھے، ان کے چچا بغداد کے وقائع نگار تھے، اور خلیفہ کی غیر موجودگی میں وہ پرچہ نویسی کرتے تھے، اور خبریں بھیجتے تھے، ایک مرتبہ انھوں نے یہ تحریریں اپنے کمسن بھتیجے کے سپرد کیں کہ وہ ایک معین شخص کو پہنچا دیں انھوں نے اس خیال سے کہ اس میں اہل بغداد کی شکایت اور بہت سے لوگوں کی مخبری ہوگی، ان کاغذات کو دجلہ میں ڈال دیا، جب وہ دفتر میں خطوط نویسی کی مشق کرتے تھے تو بہت سی عورتیں جن کے شوہر ہارون رشید کے ساتھ فوج میں باہر گئے ہوئے تھے، ان سے خط پڑھواتی اور جواب لکھواتی تھیں، وہ خطوط لکھ دیا کرتے تھے، لیکن جس مضمون کو شریعت یا تہذیب کے خلاف سمجھتے تھے، اس کو نہیں لکھتے تھے، تقویٰ اور طہارت اور صلاحیت و نجابت کے انہی آثار کو دیکھ کر ان کے زمانہ کے ایک صاحب نظر (ہیثم ابن جمیل) نے کہا تھا کہ اگر یہ نوجوان زندہ رہا تو اہل زمانہ پر حجت ہوگا۔[1]

علوم دینیہ میں انھوں نے حدیث کی طرف خصوصی توجہ کی، سب سے پہلے قاضی ابو یوسف رحمہ اللہ سے حدیث کی کتابت کی،[2] پھر چار برس تک بغداد میں امام حدیث ہیثم ابن بشیر ابن ابو حازم الوسطیٰ (م ۱۸۳ھ)[3] سے استفادہ کرتے رہے، اس اثنا میں مشہور ائمہ حدیث عبد الرحمٰن بن مہدی، ابو بکر بن عیاش وغیرہ سے استفادہ کیا، ان کی اپنے مقصد میں مستعدی اور سرگرمی کا اندازہ اس سے ہوگا کہ وہ کہتے ہیں کہ میں بعض دن حدیث سننے کے لئے اتنے سویرے جانے کا ارادہ کرتا کہ میری ماں میرا دامن پکڑ لیتیں کہ اتنا تو ٹھہر جاؤ کہ اذان ہو جائے، اور کچھ اجالا ہو جائے۔

بغداد سے فارغ ہو کر انھوں نے بصرہ، حجاز، یمن، شام اور جزیرہ کا سفر کیا، اور ہر جگہ کے نامور محدثین سے استفادہ کیا۔

۱۸۷ھ میں حجاز کے پہلے سفر میں ان کی ملاقات امام شافعیؒ سے ہوئی، پھر بغداد میں دوبارہ ملاقات ہوئی، جب کہ وہ اپنے اصول اور اپنی فقہ بہت کچھ مدوّن کر چکے تھے، امام احمد اس وقت پختہ کار ہو چکے تھے، امام شافعیؒ احادیث کے صحت و سقم کے بارے میں اکثر ان پر اعتماد کرتے، اور فرماتے تھے، کہ اگر تم محدثین کے یہاں

---

[1] تاریخ حافظ ذہبی (ترجمہ امام احمد بن حنبل) [2] المناقب لابن الجوزی ص ۲۳ [3] ایضاً

حدیث صحیح ہو تو مجھے بتلا دیا کرو میں اسی کو اختیار کروں گا۔

انھوں نے جریر بن عبدالحمید محدث سے حدیث سننے کے لئے رے (ایران) جانے کا بھی قصد کیا، لیکن خرچ نہ ہونے کی وجہ سے نہ جا سکے، کہتے تھے کہ اگر میرے پاس ۹۰ درہم بھی ہوتے تو میں چلا جاتا، طلب حدیث میں ان کی بلند ہمتی کا اندازہ اس سے ہو گا کہ ۱۹۸ھ میں انھوں نے حج کی نیت سے حجاز، اور وہاں کچھ دن قیام کرکے عبدالرزاق بن ہمام سے حدیث سننے کے لئے صنعاء یمن کا قصد کیا تھا، اور اپنے ہم درس یحییٰ بن معین سے اس کا تذکرہ بھی کر دیا تھا، دونوں نے اس کی نیت کی، اور مکہ پہونچے، ابھی دونوں طواف قدوم کر رہے تھے کہ عبدالرزاق بن ہمام طواف کرتے دکھائی دیئے، ابن معین ان کو پہچانتے تھے، انھوں نے سلام کیا، اور امام احمد کا تعارف کرایا، انھوں نے ان کو دعا دی، اور کہا کہ میں نے ان کی بڑی تعریف سنی ہے، یحییٰ بن معین نے کہا کہ ہم کل آپ کی خدمت میں حاضر ہوں گے اور آپ سے حدیث کی سماعت کریں گے، جب وہ چلے گئے، تو امام احمدؒ نے اپنے رفیق سے کہا کہ تم نے شیخ سے کیوں وعدہ لے لیا؟ انھوں نے کہا کہ حدیث سننے کے لئے شکر کرو کہ اللہ تعالیٰ نے تم کو ایک مہینہ کے سفر، پھر واپسی کے ایک مہینہ اور مصارف کثیر سے بچا لیا، اور شیخ کو یہیں پہونچا دیا، امام احمدؒ نے کہا کہ مجھے خدا سے شرم آتی ہے کہ میں حدیث کے لئے سفر کی نیت کروں، پھر اسی وجہ سے فسخ کر دوں، ہم تو جائیں گے اور وہیں جا کر سنیں گے چنانچہ حج کے بعد صنعاء گئے، اور زہری اور ابن المسیب کی روایتوں کی (جو پہلے سے ان کی سنی ہوئی نہیں تھیں) انھوں نے وہاں سماعت کی۔[1]

اس بلند ہمتی، جفاکشی، کثرت اسفار اور فطری اور غیر معمولی قوتِ حافظہ کا نتیجہ تھا کہ ان کو دس لاکھ حدیثیں یاد تھیں، اس وسعتِ علم اور کثرتِ حفظ کے باوجود وہ امام شافعیؒ کے تفقہ، حسن استنباط اور ذکاوت سے متاثر تھے، اور کہتے تھے کہ "ما رأیت عینای مثلہ" انھوں نے ان سے اجتہاد کے اصول سیکھے اور اس کا ملکہ اخذ کیا، اور بالآخر وہ اس امت کے نامور مجتہدین میں ہوئے، جن کی فقہ ابھی تک عالم اسلام میں زندہ ہے، امام شافعیؒ بھی

---

[1] ابن کثیر اور ابن جوزی۔

ان کے بڑے معترف اور قدرداں تھے، بغداد سے جاتے ہوئے انھوں نے فرمایا "خرجت من بغداد وما خلفت بها اتقی وافقه من ابن حنبل" (میں بغداد چھوڑ کر جارہا ہوں، اس حالت میں کہ وہاں احمد بن حنبل سے بڑھ کر نہ کوئی متقی ہے نہ کوئی فقیہ)

چالیس سال کی عمر میں غالباً ۲۰۴ھ میں انھوں نے حدیث کا درس دینا شروع کیا، یہ بھی ان کا کمال اتباعِ سنت تھا کہ انھوں نے عمر کے چالیسویں سال جو سنِ نبوت ہے، اشاعت شروع کی، ابتدا ہی سے ان کے درس میں طالبین وسامعین کا ازدحام ہوتا تھا، بعض راویوں کا بیان ہے کہ ان کے درس کے سامعین کی تعداد پانچ پانچ ہزار ہوتی تھی جن میں سے پانچ پانچ سو صرف لکھنے والے ہوتے تھے، ان کے درس کی مجلسیں بڑی باوقار اور سنجیدہ ہوتی تھیں، کوئی وہاں تفریح کی بات یا غیر سنجیدہ حرکت جو حدیث کے وقار کے خلاف ہے نہیں کرسکتا تھا، غربار کو امرار اور اہل دنیا کے مقابلہ میں ترجیح اور اعزاز حاصل تھا، علامہ ذہبی امام احمد کے ایک رفیق اور ہمعصر کا بیان نقل کرتے ہیں :-

لم ار الفقیر فی مجلس اعز منه فی مجلس	میں نے غریب آدمی کو جتنا امام احمد کی مجلسِ درس
ابی عبد الله، کان مائلاً الیهم، مقصرا	میں معزز دیکھا، کہیں نہیں دیکھا، وہ غربار کی طرف متوجہ
عن اهل الدنیا. وکان فیه حلم ولم	رہتے تھے، اور امرار سے بے رخی برتتے تھے، ان میں حلم و
یکن بالعجول، وکان کثیر التواضع	وقار تھا، ان کے مزاج میں عجلت نہ تھی، بڑے متواضع
تعلوه السکینة والوقار اذا جلس فی	اور منکسر المزاج تھے، طمانینت اور وقار ان کے چہرہ سے
مجلسه للفتیا بعد العصر لا یتکلم حتی یسأل.[۲]	عیاں تھا، عصر کے بعد جب درس کے لئے بیٹھتے تو جب تک
	ان سے سوال نہ کیا جائے گفتگو نہ فرماتے تھے۔

ان کی زندگی ائمۂ سلف کی طرح فقر و زہد اور توکل و قناعت کی زندگی تھی، اور ان کا یہ فقر اختیاری

[۱] ابن حنبل محمد ابوزہرا ص ۳۳-۳۴ [۲] ترجمۃ الامام ص ۳۵

تھا، انھوں نے کبھی خلفاء اور سلاطینِ وقت کا کوئی عطیہ قبول نہیں کیا، ان کے لڑکوں نے کبھی ان سے اس مسئلہ پر بات چیت کی تو انھوں نے فرمایا کہ یہ مال حلال ہے، اس سے حج درست ہے، میں اس کو حرام سمجھ کر نہیں، بلکہ احتیاطاً چھوڑتا ہوں، وہ محنت کرکے یا اپنی آبائی جائداد کی آمدنی سے گذارا کرتے تھے، اس فقر وتنگی کے باوجود بڑے فیاض اور عالی حوصلہ تھے، فرماتے تھے اگر ساری دنیا سمٹ کر ایک لقمہ بن جائے، اور وہ لقمہ کسی مسلمان کے ہاتھ میں ہو، اور وہ مسلمان اس لقمہ کو کسی مسلمان بھائی کے منھ میں رکھ دے تو ذرا بھی اسراف نہ ہوگا، وہ صرف مال کے بارے میں نہیں بلکہ اپنی ذات کے بارے میں بھی بڑے فراخ حوصلہ اور عالی ظرف تھے، ایک شخص نے ایک موقع پر ان کو بہت سخت سست کہا، تھوڑی ہی دیر کے بعد اس کو ندامت ہوئی، اور اس نے آکر معذرت کی، اور کہا کہ آپ مجھے معاف کردیں، فرمایا جہاں یہ بات ہوئی تھی، وہاں سے قدم اٹھانے سے پہلے میں تم کو معاف کرچکا تھا، انھوں نے فتنۂ خلق قرآن میں اپنے سب دشمنوں کو حتیٰ کہ خلیفۂ وقت کو جس کے حکم سے ان کو سخت ترین اذیت پہونچی تھی، معاف کردیا، فرماتے تھے کہ صرف داعی بدعت کو تو معاف نہیں کرتا، ورنہ جس نے میری اذیت میں حصہ لیا ہے، سب میری طرف سے آزاد ہیں، کبھی فرماتے کہ تمہارا اس میں کیا نفع ہے کہ تمہارے سبب سے کسی مسلمان کو عذاب دیا جائے۔

ان کمالات واوصاف کے ساتھ کبھی ان کو اپنی عظمت کا احساس نہیں ہوتا تھا، اور کوئی فخریہ کلمہ ان کی زبان سے نہیں نکلتا تھا، ان کے ساتھی یحییٰ بن معین کہتے ہیں:-

ما رأیت مثل احمد بن حنبل صحبتہ	میں نے احمد جیسا آدمی نہیں دیکھا میں پچاس برس
خمسین سنۃ ما افتخر علینا بشیٔ مما کان	ان کے ساتھ رہا، انھوں نے کبھی ہمارے سامنے
فیہ من الصلاح والخیر[1]	اپنی صلاح وخیر پر فخر نہیں کیا۔

ان کی تواضع اور اخفائے حال کا یہ حال تھا کہ اگرچہ وہ عالی نسب عرب تھے، اور یہ اس دور میں بڑا سرمایۂ فخر تھا، لیکن اس کا تذکرہ بھی وہ پسند نہیں کرتے تھے، علامہ ذہبی ان کے ایک معاصر عارم ابوالنعمان سے

[1] حلیۃ الاولیاء جلد ۹ ص ۱۸۱

نقل کرتے ہیں کہ احمد بن حنبل نے میرے پاس اپنا خرچ رکھا دیا تھا، اور اس سے بقدر ضرورت وہ لیتے رہتے تھے، ایک دن میں نے ان سے کہا کہ ابو عبداللہ مجھے معلوم ہوا ہے کہ آپ عرب ہیں، انھوں نے جواب دیا: "یا ابا النعمان نحن قوم مساکین" (ابو نعمان ہمارا کیا ہم غریب لوگ ہیں) میں ان سے بہت پوچھتا رہا، مگر انھوں نے ٹال دیا، اور کوئی جواب نہیں دیا۔

باوجود اس کے کہ فتنۂ خلق قرآن میں ان کی ثابت قدمی کی وجہ سے تمام عالم اسلام میں ان کا چرچا تھا اور ہر طرف ان کی تعریف اور ان کے لئے دعا کا غلغلہ بلند تھا، وہ برابر خائف رہتے تھے، اور ان کو اپنی طرف سے اطمینان نہیں تھا، مروزی کہتے ہیں کہ میں نے ایک روز ان سے کہا کہ آپ کے لئے بڑی کثرت سے دعا ہوتی ہے، فرمایا مجھے اندیشہ ہے کہیں استدراج[1] نہ ہو، کیوں تم نے یہ کیسے کہا؟ میں نے کہا کہ طرسوس سے ایک شخص آیا ہے، وہ کہتا ہے کہ ہم ملک روم میں جہاد کر رہے تھے، رات کے سناٹے میں احمد کے لئے دعا کا شور ہوا، اور کہنے والے نے کہا کہ احمد کے لئے دعا کرو! ہم امام احمد کی طرف سے نیت کر کے منجنیق بھی چلاتے تھے، اور ایک مرتبہ ایسا ہوا کہ دشمن کا ایک شخص قلعہ کی دیوار پر کھڑا ہوا تھا، اور سپر کو بالکل آڑ بنائے ہوئے تھا، ہم نے احمد کی نیت کر کے منجنیق چلائی، اس کا سر اور سپر اڑ گئی، یہ سن کر امام احمدؒ کے چہرہ کا رنگ بدل گیا، اور فرمایا خدا کرے یہ استدراج نہ ہو!

بعض مرتبہ ان کو دیکھنے کے لئے غیر مسلم بھی دور دور سے آتے، ایک مرتبہ ایک عیسائی طبیب علاج کے لئے آیا، اس نے کہا کہ میں کئی سال سے آپ کی زیارت کا آرزومند تھا، آپ کی زندگی صرف اسلام ہی کے لئے خیر و برکت کا باعث نہیں، ساری مخلوق کے لئے وہ خیر و برکت ہے، ہمارے سب دوست آپ سے بہت خوش ہیں، مروزی کہتے ہیں کہ جب وہ چلا گیا تو میں نے عرض کیا کہ میرا خیال ہے کہ ساری دنیائے اسلام میں آپ کے لئے دعا ہوتی ہوگی، انھوں نے فرمایا کہ بھائی انسان پر اپنی حقیقت منکشف ہو جاتی ہے تو کوئی کچھ کہے، اس کو دھوکہ نہیں ہوتا ہے۔[2]

اللہ تعالیٰ نے تواضع اور مسکنت کے ساتھ ان کو رعب و وقار بھی اتنا بخشا تھا کہ اہل حکومت اور فوجی اور سپاہی بھی ان سے مرعوب ہو جاتے تھے، اور ان کا احترام کرنے پر مجبور تھے، ان کے ایک معاصر کہتے ہیں کہ

---

[1] خدا کی طرف سے ڈھیل اور کسی غیر مقبول اور فاسد العقیدہ آدمی کی کرامت اور وجاہت کا ظہور [2] ترجمۃ الامام احمد (ذہبی) ص ۲۱-۲۲

میں اسحاق بن ابراہیم (نائب بغداد) اور فلاں فلاں حکام کے پاس گیا ہوں لیکن میں نے احمد ابن حنبل سے زیادہ بارعب کسی کو نہیں دیکھا، میں ان سے ایک مسئلہ میں گفتگو کرنے گیا، مجھ پر ان کی ہیبت سے لرزہ طاری ہوگیا، ان کے زمانہ کے تمام اہل قلوب اور اہل خلوص ان کی عظمت کے قائل اور ان کا ادب کرتے تھے، علماء وقت اور ائمۂ فن ان کے تبحر و وسعتِ علم کے معترف اور اس سے متعجب ہیں، مشہور محدث ابراہیم الحربی کہتے ہیں:۔

رأیت احمد بن حنبل فرأیت کان اللہ	میں نے احمد بن حنبل کو دیکھا ایسا معلوم ہوتا تھا کہ
جمع لہ علم الاولین والآخرین من کل	اللہ تعالیٰ نے ان کے سینہ میں اگلوں پچھلوں کا ہر قسم کا علم
صنف یقول ما شاء و یمسک	جمع کر دیا ہے جس کا چاہتے ہیں اظہار کرتے ہیں اور جس کو
ماشاء۔[1]	چاہتے ہیں اپنے سینہ میں رکھتے ہیں۔

امام احمد کا زہد ضرب المثل تھا، مامون، معتصم اور واثق کا دور ان کے لئے اس حیثیت سے آزمائش کا تھا کہ وہ تینوں ان کے درپئے آزار تھے، متوکل کا دور اس لئے آزمائش کا تھا کہ وہ ان کا عقیدت مند اور نہایت قدرداں تھا، ان کو اس دور کی آزمائش زیادہ سخت معلوم ہوتی تھی، اور اس سے ہمیشہ خائف رہتے تھے، کبھی کبھی فرماتے تھے کہ ان لوگوں کی ایذا و تعذیب کے باوجود میرا دین سلامت رہا، اب اس بڑھاپے میں اس دوسری آزمائش میں مبتلا ہوں، لیکن جس طرح معتصم کے تازیانے ان کے اعتصام بالسنۃ اور استقامت میں فرق نہ پیدا کر سکے، اسی طرح متوکل کی عقیدت مندی ان کے استغناء و توکل میں تغیر نہ پیدا کر سکی، ایک مرتبہ متوکل نے ایک ایسی بھاری تھیلی بھیجی جو خچر پر رکھ کر لائی گئی تھی، انھوں نے صاف کہدیا کہ مجھے حاجت نہیں، لانے والے نے کہا کہ آپ کو واپس کرنا مناسب نہیں، بڑی مشکل سے خلیفہ کا دل صاف ہوا ہے، اس کو پھر بدگمانی ہو جائے گی، انھوں نے ایک جگہ ڈلوا دی، آدھی رات کو انھوں نے اپنے چچا کو بلایا، اور کہا کہ مجھے اس تھیلی کی وجہ سے رات بھر نیند نہیں آئی، میں یہ لے کر بڑا پشیمان اور پریشان ہوں، انھوں نے کہا کہ اس وقت تو آدھی رات ہے، لوگ غافل

---

[1] مناقب ابن جوزی، مناقب حافظ ذہبی، طبقات ابن السبکی۔

سو رہے ہیں، صبح جیسا آپ کی سمجھ میں آئے کیجئے گا، صبح ہی انھوں نے بعض معتمد اور بعض واقف کار لوگوں کو بلایا، اور ان لوگوں کی فہرست تیار کروائی جو صالح اور مستور الحال تھے، اور مال تقسیم کرنا شروع کیا یہاں تک کہ تھیلی میں ایک درہم بھی نہیں بچا، پھر تھیلی بھی ایک مسکین کو خیرات کر دی[1]۔

انھوں نے متوکل کے حکم و اصرار سے کچھ روز اس کی لشکر گاہ میں قیام فرمایا، اس عرصہ میں وہ شاہی مہمان تھے، روزانہ ان کے لئے پُر تکلف کھانا آتا تھا جس کی قیمت کا اندازہ ایک سو بیس ۱۲۰ درہم روزانہ ہے، انھوں نے اس کھانے کو کسی روز چکھا تک نہیں، وہ مسلسل روزہ رکھتے رہے، آٹھ روز انھوں نے روزہ پر روزہ رکھا یہاں تک کہ بے انتہا ضعیف ہو گئے، اگر جلدی ان کو رخصت نہ مل جاتی تو ان کی زندگی مشکل تھی[2]، ان کے صاحبزادہ عبداللہ کہتے ہیں کہ میرے والد لشکر گاہ میں سولہ ۱۶ روز رہے، انھوں نے اس عرصہ میں ایک چوتھائی ستو کھایا ہوگا، ان کی آنکھوں میں حلقے پڑ گئے تھے، متوکل کے اصرار سے ان کے صاحبزادوں کے لئے شاہی رقم مقرر ہو گئی تھی، ان کی احتیاط کا یہ عالم تھا کہ ان کے صاحبزادہ بیان کرتے ہیں کہ پہلے تو ہمارے یہاں سے وہ کوئی چیز استعمال کے لئے منگوا بھی لیتے تھے لیکن جب سے شاہی رقم ہمارے گھر آنے لگی، انھوں نے یہ سلسلہ بالکل بند کر دیا، ایک مرتبہ طبیب نے ان کے لئے ایک بھنے ہوئے کدو کا پانی تجویز کیا، لوگوں نے کہا کہ اس کو صالح (امام احمد کے صاحبزادہ) کے تنور میں پکا لو، وہ ابھی گرم ہے، انھوں نے منع فرمایا[3]، آخر میں ان کو خود اپنی احتیاط بھی کافی نہ معلوم ہوئی، صالح کہتے ہیں کہ مجھ سے ایک روز فرمایا کہ صالح! میرا جی چاہتا ہے کہ تم اس عطیۂ شاہی کو چھوڑ ہی دو، اس لئے کہ یہ تم کو میرے سبب سے ملتا ہے۔

۷۷ سال کی عمر ہوئی تھی کہ بیمار ہوئے، عیادت کرنے والوں کا اتنا ہجوم تھا کہ لوگ فوج در فوج داخل ہوتے تھے اور گھر بھر جاتا تھا، جب وہ چلے جاتے تو دوسرا انبوہ آتا، سڑک آدمیوں سے بھر جاتی تھی ۹ روز وہ بیمار رہے، ہجوم بڑھتا جاتا تھا، سلطان کو اطلاع ہوئی تو ان کے دروازہ پر اور گلی میں پولیس کا پہرہ لگایا،

---

[1] ترجمۃ الامام احمد من تاریخ الاسلام للحافظ الذہبی ص۶۰   [2] ایضاً ص۶۱   [3] ایضاً ص۶۴

اور وقائع نگار متعین کر دیئے کہ حالات کی اطلاع برابر ملتی رہے، ہجوم دم بہ دم بڑھتا جاتا تھا، یہاں تک کہ گلی بند کر دی گئی، لوگ سڑکوں اور مسجدوں میں بھر گئے، یہاں تک کہ بازار میں خرید و فروخت مشکل ہو گئی، پیشاب خون کا آنے لگا تھا، طبیب سے دریافت کیا گیا تو اس نے کہا کہ غم اور فکر نے ان کے پیٹ کو ٹکڑے ٹکڑے کر دیا ہے،[1] جمعرات کو طبیعت زیادہ خراب ہو گئی، ان کے شاگرد مروزی کہتے ہیں کہ میں نے ان کو وضو کرایا، تو انھوں نے تکلیف کی حالت میں بھی مجھے ہدایت کی کہ انگلیوں میں خلال کراؤں، شب جمعہ میں حالت زیادہ نازک ہو گئی اور جمعہ ۱۲ ربیع الاول[2] کو اس امام سنت نے انتقال کیا۔[3]

فتنۂ خلق قرآن

مامون نے خلق قرآن کے مسئلہ پر اپنی پوری توجہ مرکوز کر دی، ۲۱۸ھ میں اس نے والی بغداد اسحٰق بن ابراہیم کے نام ایک مفصل فرمان بھیجا جس میں عامۃ المسلمین اور بالخصوص محدثین کی سخت مذمت اور حقارت آمیز تنقید کی، ان کو خلق قرآن کے عقیدہ سے اختلاف کرنے کی وجہ سے توحید میں ناقص، مردود الشہادۃ، ساقط الاعتبار اور شرار امت قرار دیا، اور حاکم کو حکم دیا کہ جو لوگ اس مسئلہ کے قائل نہ ہوں، ان کو ان کے عہدوں سے معزول کر دیا جائے، اور خلیفہ کو اس کی اطلاع کی جائے۔[4]

یہ فرمان مامون کی وفات سے چار مہینے قبل کا ہے، اس کی نقلیں تمام اسلامی صوبوں کو بھیجی گئیں اور صوبہ داروں (گورنروں) کو ہدایت کی گئی کہ اپنے اپنے صوبوں کے قضاۃ کا اس مسئلہ میں امتحان لیں، اور جو اس عقیدہ سے متفق نہ ہو اس کو اس کے عہدہ سے ہٹا دیا جائے۔

اس فرمان کے بعد مامون نے حاکم بغداد کو لکھا کہ سات بڑے محدثین کو (جو اس عقیدہ کے مخالفین کے

---

[1] ذہبی ص ۲۲ [2] بخاری تاریخ کبیر و صغیر [3] جنازہ و کفن کی تفصیل آگے آئے گی۔

[4] اس خط کا مکمل مضمون "تاریخ طبری" اور طیفور کی "تاریخ بغداد" میں موجود ہے۔

سرگروہ ہیں، اس کے پاس بھیج دیا جائے، وہ سب آئے تو مامون نے ان سے خلق قرآن کے متعلق سوال کیا، ان سب نے اس سے اتفاق کیا، اور ان کو بغداد واپس کر دیا گیا، جہاں انھوں نے علما ومحدثین کے ایک مجمع کے سامنے اپنے اس عقیدہ کا اقرار کیا، لیکن شورش ختم نہیں ہوئی، اور عام مسلمان اور تقریباً تمام محدثین اپنے خیال پر قائم رہے۔

انتقال سے پہلے مامون نے اسحٰق بن ابراہیم کو تیسرا فرمان بھیجا، جس میں ذرا تفصیل سے پہلے خط کے مضمون کو بیان کیا تھا، اور امتحان کے دائرہ کو وسیع کرکے اہلکارانِ سلطنت اور اہلِ علم کو بھی اس میں شامل کر لیا تھا، اور سب کے لئے اس عقیدہ کو ضروری قرار دیا تھا، اسحٰق نے فرمان شاہی کی تعمیل کی، اور مشاہیر علما کو جمع کرکے ان سے گفتگو کی، اور ان کے جوابات اور مکالمہ کو بادشاہ کے پاس لکھ کر بھیج دیا، مامون اس محضر کو پڑھ کر سخت برافروختہ ہوا، ان علما میں سے دو (بشر بن الولید اور ابراہیم ابن المہدی) کے قتل کا حکم دیا، اور لکھا کہ بقیہ میں سے جس کو اپنی رائے پر اصرار ہو، اس کو پابجولاں اس کے پاس بھیجد یا جائے، چنانچہ بقیہ تیس[۳۰] علما میں سے (جو پہلے قائل نہیں ہوئے تھے) چار اپنی رائے (عدم خلق قرآن) پر قائم رہے، یہ چار اشخاص امام احمد ابن حنبل، سجادہ، قواریری، اور محمد بن نوح تھے، دوسرے دن سجادہ اور تیسرے دن قواریری نے بھی اپنی رائے سے رجوع کیا، اور صرف امام اور محمد بن نوح باقی رہے، جن کو مامون کے پاس طوس ہتھکڑیوں اور بیڑیوں میں روانہ کر دیا گیا، ان کے ہمراہ انیس دوسرے مقامات کے علما تھے، جو خلق قرآن کے منکر اور اس کے غیر مخلوق ہونے کے قائل تھے، ابھی یہ لوگ رقہ ہی پہونچے تھے کہ مامون کے انتقال کی خبر ملی، اور ان کو حاکم بغداد کے پاس بغداد واپس کر دیا گیا، راستہ میں محمد بن نوح کا انتقال ہو گیا، اور امام اور ان کے رفقا بغداد پہونچے۔

مامون نے اپنے جانشین معتصم بن الرشید کو وصیت کی تھی کہ وہ قرآن کے بارے میں اس کے مسلک اور عقیدہ پر قائم رہے، اور اسی کی پالیسی پر عمل کرے (وخذ بسیرة اخیك فی القرآن) اور قاضی ابن ابی دواد کو بدستور اپنا مشیر اور وزیر بنائے رہے، چنانچہ معتصم نے ان دونوں وصیتوں پر پورا پورا عمل کیا۔

امام احمد ابتلاء و امتحان میں

اب مسئلہ خلق قرآن کی مخالفت اور عقیدۂ صحیحہ کی حمایت اور حکومتِ وقت کے مقابلہ کی ذمہ داری تنہا امام احمد بن حنبل کے اوپر تھی جو گروہ محدثین کے امام اور سنت و شریعت کے اس وقت امین تھے۔

امام احمد کو رقہ سے بغداد لایا گیا، چار چار بیڑیاں ان کے پاؤں میں پڑی تھیں تین دن تک ان سے اس مسئلہ پر مناظرہ کیا گیا، لیکن وہ اپنے اس عقیدہ سے نہیں ہٹے چوتھے دن والیِ بغداد کے پاس ان کو لایا گیا، اس نے کہا کہ احمد! تم کو اپنی زندگی ایسی دوبھر ہے؟ خلیفہ تم کو اپنی تلوار سے قتل نہیں کرے گا، لیکن اس نے قسم کھائی ہے کہ اگر تم نے اس کی بات قبول نہ کی تو مار پر مار پڑے گی اور تم کو ایسی جگہ ڈال دیا جائے گا جہاں کبھی سورج نہیں آئے گا" اس کے بعد امام کو معتصم کے سامنے پیش کیا گیا، اور ان کو اس انکار و اصرار پر ۲۸ کوڑے لگائے گئے، ایک تازہ جلاد صرف دو کوڑے لگاتا تھا، پھر دوسرا جلاد بلایا جاتا تھا، امام احمد ہر کوڑے پر فرماتے تھے:۔

اعطونی شیئاً من کتاب اللہ او سنۃ رسولہ حتی اقول بہ

میرے سامنے اللہ کی کتاب یا اس کے رسول کی سنت سے کچھ پیش کرو تو میں اس کو مان لوں۔

واقعہ کی تفصیلات امام احمد کی زبان سے

امام احمد نے اس واقعہ کو خود تفصیل کے ساتھ بیان کیا ہے، وہ فرماتے ہیں:۔

"میں جب اس مقام پر پہونچا جس کا نام باب البستان ہے تو میرے لئے سواری لائی گئی، اور مجھ کو سوار ہونے کا حکم دیا گیا، مجھے اس وقت کوئی سہارا دینے والا نہیں تھا، اور میرے پاؤں میں بوجھل بیڑیاں تھیں، سوار ہونے کی کوشش میں کئی مرتبہ اپنے منہ کے بل گرتے گرتے بچا، آخر کسی نہ کسی طرح سوار ہوا اور معتصم کے محل میں پہنچا، مجھے ایک کوٹھری میں داخل کر دیا گیا، اور دروازہ بند کر دیا گیا، آدھی رات کا

وقت تھا، اور وہاں کوئی چراغ نہیں تھا، میں نے نماز کے لئے مسح کرنا چاہا، اور ہاتھ بڑھایا تو پانی کا ایک پیالہ اور طشت رکھا ہوا ملا، میں نے وضو کیا، اور نماز پڑھی، اگلے دن معتصم کا قاصد آیا اور مجھے خلیفہ کے دربار میں لے گیا، معتصم بیٹھا ہوا تھا، قاضی القضاۃ ابن ابی دُواد بھی موجود تھا، اور ان کے ہم خیالوں کی ایک بڑی جمعیت تھی، ابوعبدالرحمٰن الشافعی بھی موجود تھے، اسی وقت دو آدمیوں کی گردنیں بھی اڑائی جا چکی تھیں، میں نے ابوعبدالرحمٰن الشافعی سے کہا کہ تم کو امام شافعی سے مسح کے بارے میں کچھ یاد ہے؟ ابن ابی دُواد نے کہا کہ اس شخص کو دیکھو کہ اس کی گردن اڑائی جانے والی ہے، اور یہ فقہ کی تحقیق کر رہا ہے، معتصم نے کہا کہ ان کو میرے پاس لاؤ، وہ برابر مجھے پاس بلاتا رہا، یہاں تک کہ میں اس سے بہت قریب ہو گیا، اس نے کہا بیٹھ جاؤ، میں بیڑیوں سے تھک گیا تھا، اور بوجھل ہو رہا تھا، تھوڑی دیر کے بعد میں نے کہا کہ مجھے کچھ کہنے کی اجازت ہے، خلیفہ نے کہا کہو، میں نے کہا کہ میں پوچھنا چاہتا ہوں کہ اللہ کے رسول نے کس چیز کی طرف دعوت دی ہے؟ تھوڑی دیر کی خاموشی کے بعد اس نے کہا کہ "لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہ" کی شہادت کی طرف، میں نے کہا تو میں اس کی شہادت دیتا ہوں، پھر میں نے کہا کہ آپ کے جدامجد ابن عباسؓ کی روایت ہے کہ جب قبیلۂ عبدالقیس کا وفد آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا تو انھوں نے ایمان کے بارے میں آپ سے سوال کیا، فرمایا تمھیں معلوم ہے کہ ایمان کیا ہے، انھوں نے کہا کہ اللہ اور اس کے رسولؐ کو زیادہ معلوم ہے، فرمایا اس بات کی گواہی کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں اور محمد (صلے اللہ علیہ وسلم) اللہ کے رسول ہیں، نماز کی پابندی، زکوٰۃ کی ادائیگی، اور مالِ غنیمت میں سے پانچویں حصہ کا نکالنا، اس پر معتصم نے کہا کہ اگر تم میرے پیش رو کے ہاتھ میں پہلے نہ آگئے ہوتے تو میں تم سے تعرض نہ کرتا، پھر عبدالرحمٰن بن اسحٰق کی طرف مخاطب ہو کر کہا کہ میں نے تم کو حکم نہیں دیا تھا کہ اس آزمائش کو ختم کرو، امام احمد کہتے ہیں کہ میں نے کہا اللہ اکبر اس میں تو مسلمانوں کے لئے کشائش ہے، خلیفہ نے علماء حاضرین سے کہا کہ ان سے مناظرہ کرو اور گفتگو کرو، پھر عبدالرحمٰن سے کہا کہ ان سے گفتگو کرو (یہاں امام احمد اس مناظرہ کی تفصیل بیان

کرتے ہیں) :-

ایک آدمی بات کرتا، اور میں اس کا جواب دیتا، دوسرا بات کرتا، اور میں اس کا جواب دیتا، معتصم کہتا، احمد! تم پر خدا رحم کرے، تم کیا کہتے ہو؛ میں کہتا امیرالمومنین! مجھے کتاب اللہ یا سنتِ رسول میں سے کچھ دکھایئے تو میں اس کا قائل ہو جاؤں، معتصم کہتا کہ اگر یہ میری بات قبول کر لیں تو میں اپنے ہاتھ سے ان کو آزاد کر دوں، اور اپنے فوج ولشکر کے ساتھ ان کے پاس جاؤں اور ان کے آستانہ پر حاضر ہوں، پھر کہتا احمد! میں تم پر بہت شفیق ہوں اور مجھے تمہارا ایسا ہی خیال ہے، جیسے اپنے بیٹے ہارون کا، تم کیا کہتے ہو؛ میں وہی جواب دیتا کہ مجھے کتاب اللہ یا سنتِ رسول میں سے کچھ دکھاؤ تو میں قائل ہوں، جب بہت دیر ہو گئی تو وہ اکتا گیا اور کہا جاؤ، اور مجھے قید کر دیا اور میں اپنی پہلی جگہ پر واپس کر دیا گیا، اگلے دن پھر مجھے طلب کیا گیا اور مناظرہ ہوتا رہا اور میں سب کا جواب دیتا رہا یہاں تک کہ زوال کا وقت ہو گیا، جب اکتا گیا تو کہا کہ ان کو لیجاؤ، تیسری رات کو میں سمجھا کہ کل کچھ ہو کر رہے گا، میں نے ڈوری منگوائی اور اس سے اپنی بیڑیوں کو کس لیا، اور جس ازاربند سے میں نے بیڑیاں باندھ رکھی تھیں، اس کو اپنے پائجامہ میں پھر ڈال لیا کہ کہیں کوئی سخت وقت آئے اور میں برہنہ ہو جاؤں، تیسرے روز مجھے پھر طلب کیا گیا، میں نے دربار بھرا ہوا ہے، میں مختلف ڈیوڑھیاں اور مقامات طے کرتا ہوا آگے بڑھا، کچھ لوگ تلواریں لئے کھڑے تھے، کچھ لوگ کوڑے لئے، اگلے دونوں دن کے بہت سے لوگ آج نہیں تھے، جب میں معتصم کے پاس پہونچا تو کہا بیٹھ جاؤ، پھر کہا ان سے مناظرہ کرو اور گفتگو کرو، لوگ مناظرہ کرنے لگے، میں ایک کا جواب دیتا، پھر دوسرے کا جواب دیتا، میری آواز سب پر غالب تھی، جب دیر ہو گئی تو مجھے الگ کر دیا اور ان کے ساتھ تخلیہ میں کچھ بات کہی، پھر ان کو ہٹا دیا، اور مجھے بلا لیا، پھر کہا احمد! تم پر خدا رحم کرے، میری بات مان لو، میں تم کو اپنے ہاتھ سے رہا کروں گا،[1] میں نے پہلا سا جواب دیا، اس پر اس نے برہم ہو کر کہا کہ ان کو پکڑو اور

[1] معتصم امام احمد کے معاملہ میں نرم پڑ گیا تھا، مگر احمد بن دُوَاد برابر اس کو گرم کرتا رہا، اور غیرت دلاتا رہا کہ لوگ کہیں گے کہ معتصم اپنے بھائی مامون کے مسلک سے ہٹ گیا۔

کھینچو، اور ان کے ہاتھ اکھیڑ دو، معتصم کرسی پر بیٹھ گیا، اور جلادوں اور تازیانہ لگانے والوں کو بلایا، جلادوں سے کہا آگے بڑھو، ایک آدمی آگے بڑھتا اور مجھے دو کوڑے لگاتا، معتصم کہتا زور سے کوڑے لگاؤ، پھر وہ ہٹ جاتا، اور دوسرا آتا اور دو کوڑے لگاتا، انیس ۱۹ کوڑوں کے بعد پھر معتصم میرے پاس آیا، اور کہا کیوں احمد اپنی جان کے پیچھے پڑے ہو، بخدا مجھے تمہارا بہت خیال ہے، ایک شخص عجیف مجھے اپنی تلوار کے دستے سے چھیڑتا، اور کہتا کہ تم ان سب پر غالب آنا چاہتے ہو، دوسرا کہتا کہ اللہ کے بندے! خلیفہ تمہارے سر پر کھڑا ہوا ہے، کوئی کہتا کہ امیرالمؤمنین! آپ روزے سے ہیں، اور آپ دھوپ میں کھڑے ہوئے ہیں، معتصم پھر مجھ سے بات کرتا، اور میں اس کو وہی جواب دیتا، وہ پھر جلاد کو حکم دیتا کہ پوری قوت سے کوڑے لگاؤ، امام کہتے ہیں کہ پھر اس اثنا میں میرے حواس جاتے رہے جب میں ہوش میں آیا تو دیکھا کہ بیڑیاں کھول دی گئی ہیں، حاضرین میں سے ایک شخص نے کہا کہ ہم نے تم کو اوندھے منہ گرادیا، تم کو روندا، احمد کہتے ہیں کہ مجھ کو کچھ احساس نہیں ہوا۔"[1]

بے نظیر عزیمت واستقامت

اس کے بعد احمد بن حنبل کو گھر پہنچا دیا گیا، جب سے وہ گرفتار کئے گئے، رہائی کے وقت تک اٹھائیس مہینے ان کو حبس میں گزرے، ان کو ۳۳-۳۴ کوڑے لگائے گئے، ابراہیم ابن مصعب جو سپاہیوں میں سے تھے، کہتے ہیں کہ میں نے احمد سے زیادہ جری اور دلیر نہیں دیکھا، ان کی نگاہ میں ہم لوگوں کی حقیقت بالکل مکھی کی سی تھی ___ محمد بن اسمٰعیل کہتے ہیں کہ میں نے سنا ہے کہ احمد کو ایسے کوڑے لگائے گئے کہ اگر ایک کوڑا ہاتھی پر پڑتا تو چیخ مار کر بھاگتا، ایک صاحب جو واقعہ کے وقت موجود تھے بیان کرتے ہیں کہ امام روزے سے تھے، میں نے کہا بھی کہ آپ روزے سے ہیں، اور آپ کو اپنی جان بچانے کے لئے اس عقیدہ کا اقرار کر لینے کی گنجائش

---

[1] تاریخ الاسلام للذہبی، ترجمۃ الامام احمد ص ۴۱-۴۹ باختصار وتلخیص۔

ہے، لیکن انھوں نے اس کی طرف التفات نہیں کیا، ایک مرتبہ پیاس کی بہت شدت ہوئی تو پانی طلب کیا، آپ کے سامنے برف کے پانی کا پیالہ پیش کیا گیا، آپ نے اس کو ہاتھ میں لیا، اور کچھ دیر اس کو دیکھا، پھر بغیر پیئے واپس کر دیا۔[1]

صاحبزادہ کہتے ہیں کہ انتقال کے وقت میرے والد کے جسم پر ضرب کے نشان تھے، ابوالعباس الرقی کہتے ہیں کہ احمد جب رقہ میں محبوس تھے، تو لوگوں نے ان کو سمجھانا چاہا، اور اپنے بچاؤ کرنے کی حدیثیں سنائیں، انھوں نے فرمایا کہ خباب کی حدیث کا کیا جواب ہے، جس میں کہا گیا ہے کہ پہلے بعض بعض لوگ ایسے تھے، جن کے سر پر آرا رکھ کر چلا دیا جاتا تھا، پھر بھی وہ اپنے دین سے ہٹتے نہیں تھے۔

یہ سن کر لوگ ناامید ہو گئے اور سمجھ گئے کہ وہ اپنے مسلک سے نہیں ہٹیں گے اور سب کچھ برداشت کریں گے۔

امام احمد کا کارنامہ اور اس کا صلہ

امام احمد کی بے نظیر ثابت قدمی اور استقامت سے یہ فتنہ ہمیشہ کے لئے ختم ہو گیا، اور مسلمان ایک بڑے دینی خطرہ سے محفوظ ہو گئے، جن لوگوں نے اس دینی ابتلا میں حکومت وقت کا ساتھ دیا تھا، اور موقع پرستی اور مصلحت شناسی سے کام لیا تھا، وہ لوگوں کی نگاہوں سے گر گئے، اور ان کا دینی و علمی اعتبار جاتا رہا، اس کے بالمقابل امام احمد کی شان دوبالا ہو گئی، ان کی محبت اہل سنت اور صحیح العقیدہ مسلمانوں کا شعار اور علامت بن گئی، ان کے ایک معاصر قتیبہ کا مقولہ ہے کہ:-

اذا رأیت الرجل یحب احمد بن حنبل فاعلم انہ صاحب سنۃ[2]	جب تم کسی کو دیکھو کہ اس کو احمد بن حنبل سے محبت ہے تو سمجھ لو کہ وہ سنت کا متبع ہے۔

---

[1] تاریخ الاسلام للذہبی، ترجمۃ الامام احمد ص ۴۹-۵۰ باختصار و تلخیص۔

[2] ایضاً ص ۱۶

ایک دوسرے عالم احمد بن ابراہیم الدورقی کا قول ہے۔

من سمعتموہ یذکر احمد بن حنبل	جس کو تم احمد بن حنبل کا ذکر برائی سے کرتے سنو
بسوء فاتھموہ علی الاسلام۔[1]	اس کے اسلام کو مشکوک نظر سے دیکھو۔

امام احمد حدیث میں امامِ وقت تھے، مسند کی ترتیب و تالیف ان کا بہت بڑا علمی کارنامہ ہے وہ مجتہد فی المذہب اور امام مستقل ہیں، وہ بڑے زاہد و عابد تھے، یہ سب فضیلتیں اپنی جگہ پر مسلم ہیں لیکن ان کی عالمگیر مقبولیت و محبوبیت اور عظمت و امامت کا اصل راز ان کی عزیمت اور استقامت، اس فتنۂ عالم آشوب میں دین کی حفاظت اور اپنے وقت کی سب سے بڑی بادشاہی کا تنہا مقابلہ تھا، یہی ان کی قبولِ عام اور بقائے دوام کا اصل سبب ہے۔

آوازۂ خلیل ز تعمیر کعبہ نیست
مشہور شد ازاں کہ در آتش نکو نشست

ان کے معاصرین نے جنھوں نے اس فتنہ کی عالم آشوبی دیکھی تھی، ان کے اس کارنامہ کی عظمت کا بڑی فراخ دلی سے اعتراف کیا ہے، اور اس کو دین کی بروقت حفاظت اور مقام صدیقیت سے تعبیر کیا ہے، ان کے ہمعصر اور ہم استاد مشہور محدثِ وقت علی بن المدینی (جو امام بخاری کے مایۂ ناز استاد ہیں) کا ارشاد ہے:-

انّ اللّٰہ اعزّ ھذا الدّین برجلین	اللہ تعالیٰ نے اس دین کا غلبہ و حفاظت
لیس لھما ثالث، ابوبکر الصدیق	کا کام دو شخصوں سے لیا ہے جن کا کوئی تیسرا ہمسر
یوم الردۃ واحمد بن حنبل یوم المحنۃ۔[2]	نظر نہیں آتا، ارتداد کے موقع پر ابوبکر صدیقؓ
	اور فتنۂ خلق قرآن کے سلسلہ میں احمد بن حنبل۔

---

[1] تاریخ بغداد للخطیب ج ۴ ص ۴۲۱ [2] ایضاً ص ۴۱۸

اس عظمت و مقبولیت کا نتیجہ یہ تھا کہ ۲۴۱ھ میں جب اس امامِ سنت نے انتقال کیا تو سارا شہر امنڈ آیا، کسی کے جنازہ پر خلقت کا ایسا ہجوم اس سے پہلے دیکھنے میں نہیں آیا تھا، نماز جنازہ پڑھنے والوں کی تعداد کا اندازہ یہ ہے کہ آٹھ لاکھ مرد اور ساٹھ ہزار عورتیں تھیں[1]۔

---

[1] ترجمۃ الامام احمد للذہبی، تاریخ ابن خلکان۔

فتنۂ اعتزال

اور

امام ابوالحسن اشعری اور ان کے پیرو

معتزلہ کا علمی اقتدار اور اس کے اثرات

معتصم اور واثق کے انتقال پر (جو مذہب اعتزال اور معتزلہ کے سرپرست تھے) معتزلہ کا زور ٹوٹ گیا، واثق کا جانشین خلیفہ متوکل مذہب اعتزال سے بیزار اور معتزلہ کا دشمن تھا اس نے ڈھونڈھ ڈھونڈھ کر معتزلہ کی عظمت واقتدار کے نشانات مٹائے اور ان کو حکومت سے بالکل بیدخل کر دیا، لیکن علمی حلقوں میں ابھی معتزلہ کا اثر باقی تھا، خلق قرآن کا عقیدہ تو اپنی طاقت کھو چکا تھا لیکن ان کے دوسرے مباحث اور مسائل ابھی تازہ اور زندہ تھے، معتزلہ نے اپنی ذہانت، علمی قابلیت اور اپنی بعض نمایاں شخصیتوں کی وجہ سے اپنا علمی وقار قائم کرلیا تھا، اور قضا، وافتار وحکومت کے اندر بعض اونچے عہدوں پر فائز تھے، تیسری صدی کے وسط میں ان کا خاصا دور دورہ ہوگیا، عام طور پر تسلیم کیا جانے لگا کہ معتزلہ دقیق النظر وسیع الفکر اور محقق ہوتے ہیں اور ان کی آرا و تحقیقات عقل سے زیادہ قریب ہوتی ہیں، بہت سے نوجوان طالب علم اور شہرت پسند اعتزال کو فیشن کے طور پر اختیار کرتے، امام احمد کے بعد حنابلہ میں کوئی طاقت ور علمی اور دینی شخصیت نہیں پیدا ہوئی، محدثین اور ان کے ہم مسلک علماء نے علوم عقلیہ اور نئے طریقۂ بحث ونظر کی طرف (جس کا معتزلہ اور فلاسفہ کے اثر سے رواج پڑ چلا تھا) توجہ نہیں کی، نتیجہ یہ تھا کہ مباحثہ کی مجلسوں

اور درس کے حلقوں میں محدثین کی یہ علمی کمزوری اور فلسفہ کے مبادی سے بے خبری محسوس کی جاتی تھی، اس کے مقابلہ میں علمی مباحثوں میں معتزلہ کا پلڑا بھاری رہتا، اور جو لوگ دین کا گہرا علم نہیں رکھتے تھے، اور اس حقیقت سے واقف نہیں تھے کہ سطحی ذہانت معتزلہ کی تائید کرتی ہے، اور پختہ اور گہری ذہانت بالآخر محدثین ہی کے مسلک اور محکمات شریعت کو قبول کرتی ہے، وہ معتزلہ کی حسن تقریر، حاضر جوابی اور علمی موشگافی سے متاثر ہوتے تھے، اس کا نتیجہ یہ تھا کہ ظاہر شریعت اور مسلک سلف کی علمی بے توقیری، اور اس کی طرف سے بے اعتمادی پیدا ہو رہی تھی، خود محدثین اور ان کے تلامذہ کے گروہ میں بہت سے لوگ احساس کہتری کا شکار تھے اور معتزلہ کی عقلیت اور تفلسف سے مرعوب ہو رہے تھے، یہ صورتِ حال دینی وقار اور سنت کے اقتدار کے لئے سخت خطرناک تھی، قرآن مجید کی تفسیر اور عقائدِ اسلام، ان فلسفی نما مناظرین کے لئے بازیچۂ اطفال بنے جا رہے تھے مسلمانوں میں ایک خام عقلیت اور سطحی فلسفیت مقبول ہو رہی تھی، یہ محض ایک ذہنی ورزش تھی، اور اصطلاحات کی معرکہ آرائی اس صورتِ حال کا مقابلہ کرنے کے لئے اور اس بڑھتے ہوئے سیلاب کو روکنے کے لئے نہ تو محدثین و حنابلہ کی دینی غیرت اور جوش کافی تھا، نہ عابدوں وزاہدوں کا زہد و عبادت، اور نہ فقہاء کے فتاویٰ اور جزئیات و مسائل پر ان کا عبور و استحضار۔

سنت کے وقار کے لئے ایک بلند شخصیت کی ضرورت

اس کے لئے ایک ایسی شخصیت درکار تھی جس کی دماغی صلاحیتیں معتزلہ سے کہیں بلند ہوں، جو عقلیت کے کوچہ سے نہ صرف واقف بلکہ عرصہ تک اس کا رہ نورد رہ چکا ہو، جس کی بلند شخصیت اور مجتہدانہ دماغ کے سامنے اس زمانہ کی عقلیت و فلسفہ کے علمبردار مبتدی طالب علم معلوم ہوتے ہوں، اور ایسے پست و حقیر نظر آتے ہوں جیسے کسی دیو قامت انسان کے سامنے پستہ قد انسان اور نو عمر بچے، اسلام کو فوری طور پر ایک ایسے امامِ سنت کی ضرورت تھی، اور شیخ ابوالحسن اشعری کی ذات میں اس کو وہ شخصیت مل گئی۔

امام ابوالحسن اشعری

ابوالحسن علی نام، والد کا نام اسمٰعیل تھا، مشہور صحابی حضرت ابوموسیٰ اشعری کی اولاد میں تھے، ۲۶۰ھ میں بصرہ میں پیدا ہوئے، ان کی والدہ نے ان کے والد اسمٰعیل کے انتقال کے بعد ابوعلی الجبائی سے نکاح کر لیا تھا، جو اپنے وقت میں معتزلہ کے امام اور مذہب اعتزال کے علمبردار تھے، شیخ ابوالحسن نے ان کی آغوش میں تربیت پائی اور بہت جلد ان کے معتمد اور دستِ راست بن گئے، ابوعلی الجبائی اچھے مدرس اور مصنف تھے، مباحثہ پر زیادہ قدرت نہیں رکھتے تھے، ابوالحسن اشعری شروع سے زبان آور، حاضر جواب تھے، ابوعلی بحث و مناظرہ کے موقع پر انہی کو آگے کر دیتے تھے، بہت جلد وہ سرحلقہ اور مجالس بحث کے صدر نشیں بن گئے،[1] تمام ظاہری قیاسات و قرائن بتلاتے تھے کہ وہ اپنے مربی اور استاد کے جانشیں ہوں گے اور مذہب اعتزال کی حمایت و اشاعت میں شاید ان سے بھی آگے بڑھ جائیں، لیکن اللہ تعالیٰ کے انتظامات عجیب ہیں، اس نے سنت کی حفاظت و نصرت کے لئے اس شخص کو انتخاب کیا، جس نے ساری زندگی مذہب اعتزال کی حمایت و اثبات میں گزاری تھی، اور جس کے لئے اعتزال کی سندِ امامت تیار تھی، شیخ ابوالحسن کی طبیعت میں اعتزال کا ردّ عمل پیدا ہوا، ان کی طبیعت معتزلہ کی تاویلوں اور قیاس آرائیوں سے متنفر ہونے لگی، اور ان کو یہ محسوس ہونے لگا کہ یہ سب ذہانت کی باتیں ہیں، اور اپنے مذہب کی پچ ہے، حقیقت کچھ اور ہے، اور وہ وہی ہے، جو صحابہ کرام اور سلف کا مسلک ہے، بالآخر عقل کو اسی آستانہ پر جھکنا پڑتا ہے، چالیس برس تک معتزلہ کے مذہب اور اعتقادات کی حمایت اور ان کو ثابت کرنے کے بعد ان کی طبیعت اس سے بالکل پھر گئی اور ان کے ذہن میں اس کے خلاف بغاوت پیدا ہوئی، پندرہ دن وہ گھر سے نہیں نکلے سولہویں دن وہ گھر سے سیدھے جامع مسجد پہونچے، جمعہ کا دن تھا، اور جامع مسجد

[1] تبیین کذب المفتری از ابن عساکر دمشقی، ص۱۱۷

کھڑی ہوئی تھی انھوں نے منبر پر چڑھ کر بلند آواز سے اعلان کیا "جو مجھے جانتا ہے وہ جانتا ہے، جو نہیں جانتا ہے اس کو بتلاتا ہوں کہ میں ابوالحسن اشعری ہوں، میں معتزلی تھا، فلاں فلاں عقیدوں کا قائل تھا، اب توبہ کرتا ہوں اپنے سابق خیالات سے باز آتا ہوں، آج سے میرا کام معتزلہ کی تردید اور ان کی کمزوریوں اور غلطیوں کا اظہار ہے[1]" وہ دن اور ان کی زندگی کا اخیر دن ان کی ذہانت، علمی تجربہ، قوتِ گویائی اور استدلال تحریر اعتزال کی تردید اور سلف کے مسلک اور اہلِ سنت کے عقائد کی تائید اور اثبات میں صرف ہوئی، جو کل تک معتزلہ کی زبان اور ان کا سب سے بڑا وکیل تھا، وہ اہلِ سنت کا ترجمان اور ان کا سب سے بڑا حامی بن گیا۔

امام ابوالحسن اشعری کا جذبۂ تبلیغ و احقاق حق

وہ اس فرض کو تقرب الی اللہ اور جہاد و دعوت سمجھ کر انجام دیتے تھے، اور خود معتزلہ کی مجلسوں میں جا کر اور ان کے ممتاز لوگوں سے مل کر ان کو مطمئن کرنے اور حق کی تفہیم کرنے کی کوشش کرتے تھے، کسی نے ان سے کہا کہ آپ اہلِ بدعت سے کیوں ملتے جلتے ہیں، اور خود کیوں ان کے پاس چل کر جاتے ہیں، حالانکہ ان کے مقاطعہ کا حکم ہے؟ انھوں نے جواب میں فرمایا کیا کروں وہ بڑے بڑے عہدوں پر ہیں، ان میں سے کوئی حاکمِ شہر ہے، کوئی قاضی ہے، وہ اپنے عہدہ اور وجاہت کی وجہ سے میرے پاس آنے سے رہے، اب اگر میں بھی ان کے پاس نہ گیا تو حق کیسے ظاہر ہوگا، اور ان کو کیسے معلوم ہوگا کہ اہلِ سنت کا بھی کوئی مددگار اور دلائل سے ان کے مذہب کو ثابت کرنے والا ہے؟[2]

ان کی ذہنی صلاحیتیں اور علمی کمالات

امام ابوالحسن کو مناظرہ اور بحث و استدلال کا پہلے سے ملکہ تھا، اور یہ ان کا فطری ذوق اور خداداد

---

[1] ابن خلکان جلد ۱ صـ ۴۲۷ [2] تبیین کذب المفتری۔ صـ ۱۱۶

صلاحیت تھی، مذہبِ حق کی حمایت کے جذبہ اور تائیدِ الٰہی نے ان کی ان قوتوں اور صلاحیتوں کو اور جلا دیدی وہ اپنے زمانہ کی عقلی سطح سے بلند تھے، اور عقلیات وعلم وکلام میں مجتہدانہ دماغ رکھتے تھے، معتزلہ کے سوالات و اعتراضات کا جواب وہ اس آسانی سے دیتے تھے، جیسے کوئی کہنہ مشق استاد اور ماہرِ فن مبتدی طالب علموں کے سوالات کا جواب دیتا ہے، اور ان کو خاموش کر دیتا ہے، ان کے ایک شاگرد ابو عبداللہ بن خفیف اپنی پہلی ملاقات اور ایک مجلس کی کیفیت بیان کرتے ہیں :۔

"میں شیراز سے بصرہ آیا، مجھے ابوالحسن اشعری کی زیارت کا شوق تھا، لوگوں نے مجھے ان کا پتہ دیا، میں آیا، تو وہ ایک مجلس مناظرہ میں تھے، وہاں معتزلہ کی ایک جماعت تھی، اور وہ لوگ گفتگو کر رہے تھے، جب وہ خاموش ہوئے، اور انھوں نے اپنی بات پوری کرلی، تو ابوالحسن اشعری نے گفتگو شروع کی، انھوں نے ایک ایک سے مخاطب ہو کر کہا کہ تم نے یہ کہا تھا اور اس کا جواب یہ ہے، تم نے یہ اعتراض کیا تھا، اور اس کا جواب اس طرح ہے، یہاں تک کہ انھوں نے سب کا جواب دے دیا، جب وہ مجلس سے اٹھے تو میں ان کے پیچھے پیچھے چلا، اور ان کو اوپر سے نیچے تک دیکھنے لگا، انھوں نے فرمایا کہ تم کیا دیکھتے ہو؟ میں نے کہا کہ یہ دیکھتا ہوں کہ آپ کی کتنی زبانیں ہیں، کتنے کان اور کتنی آنکھیں ہیں (کہ آپ سب کی سنتے، سب کی سمجھتے، اور سب کا جواب دیتے ہیں) وہ یہ سن کر ہنس دیئے[۱]"

ایک روایت میں یہ اضافہ ہے کہ میں نے ان سے کہا کہ "آپ کی سب باتیں تو سمجھ میں آئیں، مگر یہ نہ سمجھ سکا کہ آپ ابتداءً خاموش کیوں رہتے ہیں، اور معتزلہ کو گفتگو کا موقع کیوں دیتے ہیں، آپ کی شان تو یہ ہے کہ آپ ہی گفتگو کریں، اور اعتراضات کو خود دفع کر دیں، انھوں نے فرمایا کہ میں ان مسائل واقوال کو اپنی زبان سے ادا کرنا جائز نہیں سمجھتا، البتہ یہ جب کسی کی زبان سے نکل جائیں تو پھر ان کا جواب دینا، اور ان اقوال کی تردید اہلِ حق کا فرض ہو جاتا ہے[۲]"

---

[۱] تبیین کذب المفتری ص ۹۵ [۲] ایضاً ص ۹۵-۹۶

امام ابوالحسن اشعری مجتہد فن اور علم کلام کے بانی تھے، ان کے بعد متکلمین ان کی خداداد ذہانت، ان کے کلام کی گہرائی، ان کی نکتہ رسی، اور ان کی بالغ نظری کے قائل ہیں، قاضی ابوبکر باقلانی سے جس کو ان کے معاصرین نے ان کی فصاحت و حسن تقریر و قوتِ تحریر کی وجہ سے "لسان الامۃ" کا خطاب دیا تھا، کسی نے کہا کہ آپ کا کلام ابوالحسن اشعری کے کلام سے زیادہ بلند اور واضح معلوم ہوتا ہے، انھوں نے کہا کہ "میری یہی سعادت ہے کہ میں ابوالحسن کے کلام کو سمجھ لوں"۔[1]

علامہ ابواسحٰق اسفرائنی کا پایہ علم کلام و اصول فقہ میں مسلم ہے، وہ کہتے ہیں کہ میں شیخ ابوالحسن باہلی (امام ابوالحسن اشعری کے شاگرد) کے سامنے ایسا تھا، جیسے سمندر کے اندر قطرہ اور شیخ ابوالحسن باہلی کہتے تھے کہ میری حیثیت امام ابوالحسن اشعری کے سامنے ایسی تھی، جیسے سمندر کے پہلو میں ایک قطرہ۔[2]

ان کا مسلک اور ان کی خدمات

امام ابوالحسن اشعری نے معتزلہ اور محدثین کے درمیان ایک معتدل و متوسط مسلک اختیار کیا، وہ نہ تو معتزلہ کی طرح عقل کی غیر محدود طاقت اور فرمانروائی کے قائل تھے کہ وہ الٰہیات کے بارے میں اور مابعد الطبیعیات میں بھی بے تکلف اپنا عمل کر سکے اور اس کے جزئیات و تفصیلات اور ذات و صفاتِ باری تعالیٰ کے بارے میں اپنا فیصلہ صادر کر سکے، اور اس کو معیار قرار دیا جا سکے، نہ وہ بعض پرجوش محدثین و حنابلہ کی طرح دین کی نصرت اور عقائد اسلامیہ کی حفاظت کے لئے عقل کا انکار اور اس کی تحقیر ضروری سمجھتے تھے، اور ان کلامی و اعتقادی مباحث سے جو زمانہ کے اثرات سے شروع ہو گئے تھے، احتیاط و سکوت واجب سمجھتے تھے، وہ معتزلہ اور فلسفہ زدہ علماء سے ان کی اصطلاحات اور علمی زبان میں گفتگو کرتے تھے، جس سے مذہب و عقائد اہل سنت کا وقار اور وزن بڑھتا تھا، ان کا اس پر عمل تھا کہ "کلموا الناس علیٰ قدر عقولہم"[3] اس میں

۱؎ تبیین کذب المفتری ص ۱۲۶ ۲؎ ایضاً ص ۱۲۵

جس طرح عوام کی عقلی سطح کی رعایت ضروری ہے، اسی طرح اہل علم و عقلاء کی عقلی سطح کی رعایت بھی ضروری ہے

ابوالحسن اشعری نے پوری قوت اور وضاحت کے ساتھ معتزلہ پر تنقید کی کہ انھوں نے دین کے اخذ و فہم میں اپنی خواہشات کی پیروی اور اپنے فرقہ کے پیشواؤں کی تقلید کی، اور کتاب و سنت کو اس کا ماخذ نہیں بنایا، بلکہ جہاں قرآن کی آیات اور اپنے عقائد میں تعارض دیکھا، بے تکلف اس کی تاویل اور توجیہہ کر لی۔ "کتاب الابانۃ عن اصول الدیانۃ" میں جو اعتزال سے علیحدگی کے بعد کی اولین تصنیفات میں سے ہے، تحریر فرماتے ہیں:-

أمّا بعد فإنّ من الزائغين عن الحق	حمد و صلوٰۃ کے بعد معلوم ہو کہ معتزلہ اور قدریہ فرقوں
من المعتزلة وأهل القدر مالت بهم	نے جو حق سے منحرف ہیں اپنی خواہشات کی پیروی میں
أهواؤهم إلى تقليد رؤسائهم ومن مضى	اپنے پیشواؤں اور اپنے فرقہ کے پیش روؤں کی تقلید
من أسلافهم فتأولوا القرآن على آرائهم	کی، اور اپنی آراء کے مطابق کرنے کے لئے قرآن مجید کی
تأويلا لم ينزل الله به سلطانا ولا أوضح	ایسی تاویلات کیں جن کی خدا نے کوئی سند نہیں
به برهانا ولا نقلوه عن رسول الله	اتاری نہ ان کی کوئی واضح دلیل ہے، اور نہ وہ
رب العالمين ولا عن السلف	رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم اور سلف (صحابہ و
المتقدمين۔[1]	تابعین) سے منقول ہیں۔

پھر اپنے مسلک کی وضاحت کرتے ہوئے صاف لکھتے ہیں۔

قولنا الذي نقول به وديانتنا التي	ہمارا عقیدہ جس کے ہم قائل ہیں اور ہمارا مسلک
ندين بها التمسك بكتاب ربنا عز وجل	جس پر ہم قائم ہیں۔ یہ کہ قرآن مجید اور سنتِ
وبسنة نبينا عليه السلام وما روي	رسولؐ کو مضبوط پکڑا جائے اور صحابہ و تابعین

[1] کتاب الابانۃ عن اصول الدیانۃ ص۵ ، طبع دائرۃ المعارف حیدر آباد۔

عن الصحابة والتابعين وائمة الحديث ونحن بذلك معتصمون وبما كان يقول به ابو عبد الله احمد بن محمد بن حنبل نضر الله وجهه ورفع درجته واجزل مثوبته قائلون ولما خالف قوله مخالفون لانه الامام الفاضل والرئيس الكامل الذی ابان الله به الحق ورفع به الضلال واوضح به المنهاج وقمع به بدع المبتدعين وزيغ الزائغين وشك الشاكين فرحمة الله عليه من امام مقدم وجليل معظم مفخم[1]

اور ائمۂ حدیث سے جو منقول ہے اس کو اختیار کیا جاتا ہے ہم اسی مسلک پر مضبوطی سے قائم ہیں اور امام احمد بن حنبل کے عقائد و مسلک کے (اللہ ان کے چہرہ کو تر و تازہ رکھے اور ان کے درجات بلند فرمائے اور ان کو اجر جزیل عطا فرمائے) قائل و معتقد ہیں اور جو ان کے مسلک سے علیحدہ ہے ہم اس سے علیحدہ ہیں، اس لئے کہ وہ ایسے امام فاضل اور پیشوائے کامل تھے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کے ہاتھوں حق کو واضح اور گمراہی کو زائل فرمایا اور صراط مستقیم کو روشن کیا اور مبتدعین کی بدعات، اہل زیغ کی کجروی اور اہل شک کے شکوک کا ازالہ کیا، اللہ تعالیٰ ایسے بلند پایہ امام اور ایسے مستحق محبت و احترام پر اپنی رحمتیں نازل فرمائے۔

لیکن ان کا اصلی کارنامہ اس مسلکِ سنت اور عقیدۂ سلف کے ساتھ موافقت اور اس کی اجمالی تائید نہیں ہے، یہ تو محدثین اور عام حنابلہ کرہی رہے تھے، ان کا اصل کارنامہ یہ ہے کہ انھوں نے کتاب و سنت کے ان حقائق اور اہلِ سنت کے ان عقائد کو عقلی دلائل سے ثابت کیا، اور معتزلہ اور دوسرے فرقوں سے ان کے ایک ایک مسئلہ اور ایک ایک عقیدہ میں انہی کی زبان اور اصطلاحات میں بحث کرکے عقائدِ اہلِ سنت کی صداقت اور ان کا منقول و معقول کے مطابق ہونا واضح کیا۔

---

[1] کتاب الابانۃ عن اصول الدیانۃ ص۸

دین کی اہم خدمت کی تکمیل اور وقت کے اس عظیم الشان فریضہ کے ادا کرنے میں وہ معتزلہ او منحرف فرقوں کے "معتوب" بنے اور ایسا ہونا بالکل قدرتی تھا، لیکن وہ ان متشدد محدثین اور جامد حنابلہ کے اعتراضات کا ہدف بھی بن گئے، جن کے نزدیک ان مباحث میں حصہ لینا، اور فلسفہ کی اصطلاحات کا استعمال کرنا اور نقلی مباحث و مسائل میں عقلی استدلال سے کام لینا ہی ایک "زیغ و ضلال" کی بات تھی۔

امام ابوالحسن اشعری خود اس بات کے قائل و داعی ہونے کے باوجود کہ عقائد کا ماخذ اور الٰہیات وما بعد الطبیعیاتی مسائل کے علم کلام کا سرچشمہ کتاب و سنت اور تعلیماتِ نبوت ہے، نہ کہ عقل مجرد، اور قیاسات یا یونانی الٰہیات اس خیال سے متفق نہیں تھے کہ زمانہ کے اثرات سے یا دوسری قوموں اور فلسفوں کے اختلاط سے عقائد کے بارے میں جو مسائل چھڑ گئے ہیں اور ان کی بنیاد پر مستقل گروہ اور فرقے بن گئے ہیں ان سے صرف اسی بنا پر سکوت کیا جائے کہ حدیث میں ان مسائل و مباحث اور ان الفاظ و اصطلاحات کا ذکر نہیں ہے، ان کے نزدیک اس سے سنت و شریعت کے وقار کو نقصان پہونچے گا، اور اس کو ان کی شکست اور کمزوری پر محمول کیا جائے گا، نیز فرقِ باطلہ کو جو عقلی استدلال اور فلسفہ کی اصطلاحات سے کام لے رہے ہیں، خود اہلِ سنت کے اندر نفوذ کرنے اور ان کے نوجوان اور ذہین عنصر کو اپنی طرف مائل کرنے کا موقع ملے گا، ان کے نزدیک عقائد کا ماخذ یقیناً وحی و نبوتِ محمدیؐ ہے اور اس کا ذریعہ علم کتاب و سنت اور صحابۂ کرام کے اقوال و روایات ہیں، اس بارے میں ان کا راستہ معتزلہ و فلاسفہ سے بالکل جدا اور اس کے متوازی ہے[1] ان حقائق و عقائد کے ثبوت میں تائید کے لئے عقلی استدلال اور رائج الوقت الفاظ و اصطلاحات سے کام لینا نہ صرف جائز بلکہ وقت کے تقاضے کی بنا پر ضروری اور افضل الجہاد سمجھتے ہیں، نیز وہ مباحث جن کا تعلق عقلیات و حسیات سے ہے، اور معتزلہ و فلاسفہ نے ان کو (خوامخواہ) عقائد کی بحث کا جزو بنا دیا ہے، اور اپنی ذہانت اور زبان آوری سے ان کو حق و باطل کا معیار قرار دے دیا ہے، امام ابوالحسن اشعری کے نزدیک ان سے گریز کرنا درست نہیں، شریعت کے وکیل و ترجمان کو ان دائروں میں بھی ان کا مقابلہ کرنا ضروری ہے، اور عقلی و حسی حیثیت سے

ان کی تردید اور اہلِ حق کے مذہب کا اثبات فرض ہے، ان کے نزدیک آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم اور صحابۂ کرام کے سکوت کی وجہ لاعلمی نہ تھی، بلکہ یہ تھی کہ اس زمانہ میں یہ مباحث اور یہ طرزِ استدلال پیدا نہیں ہوا تھا، لیکن جس طرح زمانہ کے تغیرات اور نئے حالات نے بہت سی فقہی تفصیلات و جزئیات پیدا کر دیں، اور نئے مسائل کے استنباط اور اجتہاد پر مجبور کیا، اور زمانہ شناس اور مخلص فقہاء و مجتہدین نے استنباط و اجتہاد سے کام لے کر نئے حوادث و مسائل کا جواب دیا، اور امت کو نئے فتنوں اور الحاد و بے عملی کے حملوں سے بچا لیا، اسی طرح محافظینِ شریعت اور متکلمین اہلِ سنت کا فرض ہے کہ عقائد و الٰہیات کے دائرہ میں جو نئے سوالات پیدا ہو رہے ہیں، یا نئے اعتراضات کئے جا رہے ہیں، ان کا جواب دیں اور زمانہ کی عقلیت کے مطابق عقائدِ حقہ کو ثابت و مدلل کریں، امام ابوالحسن اشعری نے اسی مدعا کو ثابت کرنے کے لئے ایک مستقل رسالہ "استحسان الخوض فی الکلام" تصنیف کیا۔

بہر حال انھوں نے دونوں گروہوں کی رضامندی اور نارضامندی سے آنکھیں بند کر کے دین کی نصرت و حمایت اور ایمان و عقیدہ کی حفاظت کے لئے جو طرزِ عمل ضروری سمجھا، بڑی شجاعت اور ذہانت کے ساتھ اس کی طرف توجہ کی، اور تقریراً و تحریراً اس میں مصروف رہے، اور اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ معتزلہ و فلاسفہ کے بڑھتے ہوئے سیلاب کو تھام لیا، اور بہت سے اکھڑتے ہوئے قدموں کو جما دیا، عقائدِ اہلِ سنت اور طریقۂ سلف کی طرف سے پُرزور و مدلل حمایت و وکالت کرنے کی وجہ سے اہلِ سنت میں نیا اعتماد اور نئی زندگی پیدا ہوئی، اور وہ احساسِ کہتری رک گیا، جو گھن کی طرح سوادِ امت کو کھاتا جا رہا تھا، معتزلہ بھی ان کے پے در پے حملوں سے پیچھے ہٹ گئے، اور ان کو اپنی حفاظت اور اپنے مذہب کے وجود کو قائم رکھنے کی فکر لاحق ہو گئی، ابوبکر بن الصیرفی کہتے ہیں کہ معتزلہ نے بہت سر اٹھایا تھا، ان کے مقابلہ کے لئے اللہ تعالیٰ نے امام ابوالحسن اشعری کو پیدا کر دیا، انھوں نے معتزلہ کو اپنی ذہانت و استدلال سے بند کر دیا، ان کے اس کارنامے کی وجہ سے لوگوں نے ان کو مجددین و محافظینِ سنت میں شمار کیا ہے، اور ابوبکر اسماعیلی جیسے بعض اہلِ نظر

نے تجدید دین اور حفاظتِ شریعت کے سلسلہ میں امام احمد کے بعد ان کا نام لیا ہے۔[1]

ان کی تصنیفات

امام ابوالحسن اشعری نے صرف بحث و مناظرہ اور زبانی تقریر و تفہیم پر اکتفا نہیں کی بلکہ عقائدِ باطلہ کی تردید میں جلیل القدر کتابیں تصنیف کی ہیں، انھوں نے اہل سنت کے عقیدہ کے مطابق قرآن مجید کی تفسیر کی جو ذہبی کے بیان کے مطابق تیس اجزاء میں ہے[2]، بعض مؤلفین نے امام ابوالحسن اشعری کی تصنیفات ڈھائی سو سے تین سو تک بیان کی ہیں[3] جن میں سے اکثر معتزلہ کے رد میں ہیں، اور بعض دوسرے مذاہب و ادیان و فرق کی تردید میں، ان میں ایک کتاب الفصول ہے، جس میں انھوں نے فلاسفۂ طبائعیین (نیچری) دہریہ، ہندوؤں، یہودیوں، عیسائیوں اور مجوسیوں کا رد کیا ہے، یہ بڑی ضخیم کتاب ہے، اور بارہ کتابوں کا مجموعہ ہے[4]، ابن خلکان نے کتاب "اللمع" "الموجز" "ایضاح البرہان" "التبیین عن اصول الدین" "الشرح والتفصیل فی الرد علی اہل الافک والتضلیل" کا بھی ذکر کیا ہے، علوم عقلیہ و کلام کے علاوہ علوم شریعت میں بھی ان کی متعدد تصنیفات ہیں جن میں سے "کتاب القیاس" "کتاب الاجتہاد" "خبر الواحد" "ابن الراوندی کے انکارِ تواتر کے رد میں بھی ایک مستقل تصنیف ہے، انھوں نے خود اپنی کتاب (العمد) میں ان کتابوں کے نام لکھے ہیں جو وہ ۳۲۰ھ تک یعنی وفات سے چار سال پہلے تصنیف کر چکے تھے، یہ گنتی میں ۶۸ کتابیں ہیں، جن میں سے متعدد دس دس بارہ بارہ جلدوں میں ہیں، زندگی کے آخری چار سال کے اندر بھی انھوں نے بکثرت تصنیفات کیں "مقالات الاسلامیین" (جو ان کی مشہور کتاب ہے) کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ صرف متکلم ہی نہ تھے، بلکہ علم عقائد کے ایک بلند پایہ اور محتاط مورخ بھی تھے، انھوں نے اس کتاب میں معتزلہ اور دوسرے فرقوں کے جو اقوال و مذاہب نقل کئے ہیں، ان میں بڑی احتیاط و دیانت سے کام لیا ہے، اور

---

[1] تبیین کذب المفتری ص۵۳ [2] الاشعری ابوالحسن [3] تبیین کذب المفتری ص۱۳۶ [4] ایضاً ص۱۲۸

خود ان فرقوں کی کتابوں سے ان کی تصدیق ہوتی ہے۔[1]

عبادت وتقویٰ

امام ابوالحسن محض علمی و عقلی آدمی نہ تھے، بلکہ علم وعقل میں درجۂ امامت واجتہاد کو پہنچنے کے ساتھ عبادت وتقویٰ اور اخلاق فاضلہ سے بھی آراستہ تھے اور یہ ائمہ سلف کی عام خصوصیت ہے، احمد بن علی فقیہ کہتے ہیں کہ میں نے امام ابوالحسن کی بیس سال خدمت کی، میں نے ان سے زیادہ متورع، محتاط، باحیا دنیاوی معاملات میں شرمیلا اور امورِ آخرت میں مستعد نہیں دیکھا،[2] متکلم ابوالحسین ہروی بیان کرتے ہیں کہ امام ابوالحسن نے برسوں عشا کے وضو سے صبح کی نماز پڑھی ہے،[3] ان کے خادم بندار بن الحسین کا بیان ہے کہ امام ابوالحسن صرف ایک جائداد پر گزر کرتے تھے، جو ان کے دادا بلال ابن ابی بردہ بن ابی موسیٰ اشعری نے وقف کی تھی، اور جس کی آمدنی سترہ درہم روزانہ تھی۔[4]

وفات

۳۲۴ھ میں امام ابوالحسن اشعری نے انتقال کیا، اور بغداد محلہ مشرع الزوایا میں مدفون ہوئے،[5] ان کے جنازہ پر اعلان کیا گیا کہ آج ناصر سنت کا انتقال ہو گیا۔

امام ابومنصور ماتریدی

اسی زمانہ میں دنیائے اسلام کے ایک دوسرے سرے ماوراء النہر میں ایک دوسرے عالم اور

---

[1] مشہور مستشرق WENSINK نے اپنی کتاب اسلامی عقیدہ MUSLIM CREED میں صفحہ ۹۲ پر اور ہیرنے "مقالات اسلامیین" کے مقدمہ میں اس کا بڑا اعتراف کیا ہے (الاشعری ابوالحسن) [2] تبیین کذب المفتری ص ۱۴۱ [3] ایضاً
[4] ایضاً ص ۱۴۲ و ابن خلکان ص ۳۶۵ بحوالہ خطیب، [5] ابن خلکان ص ۳۶۴۔

متکلم ابومنصور ماتریدی (م ۳۳۲ھ) نے علم کلام اور عقائدِ اسلام کی طرف توجہ کی[1]، وہ بڑے متوازن دماغ کے آدمی تھے، معتزلہ سے ہر وقت برسرِ مقابلہ ہونے کی وجہ سے امام ابوالحسن کے علم کلام میں بعض انتہاپسندانہ باتیں آگئی تھیں، اور بعد کے اشاعرہ نے معاملہ کو اور آگے بڑھا دیا، امام ابومنصور نے حشو وزوائد اور ایسے التزامات کو جو معتزلہ کی ضد میں اشعری علم کلام کا جز بن گئے تھے، اور ان کا ثابت کرنا، اور نباہنا مشکل تھا، خارج کر دیا، اور اہل سنت کے علم کلام کی مزید تنقیح وتہذیب کی، اور اس کو زیادہ معتدل اور جامع بنا دیا، امام ابومنصور اور ان کے متبعین کا یہ اختلاف جزئی اور محدود تھا، ایسے مسائل جن میں ماتریدین نے اشاعرہ سے اختلاف کیا ہے، تیس ۳۰ چالیس ۴۰ سے زائد نہیں، اور ان میں بھی اختلاف بیشتر لفظی ہے۔[2]

امام ابومنصور ماتریدی فقہی مسلک کے لحاظ سے حنفی تھے، جس طرح شافعی علماء متکلمین عقیدۃً واصولاً اشعری ہیں، اسی طرح حنفی علماء متکلمین بالعموم ماتریدی ہیں، امام ابومنصور بہت بڑے مصنف بھی تھے، معتزلہ روافض اور قرامطہ کی تردید میں ان کی بڑی فاضلانہ تصنیفات ہیں، ان کی کتاب "تاویلات القرآن" اپنے موضوع پر ایک جلیل القدر تصنیف ہے، جس سے ان کی غیر معمولی قابلیت، علوم عقلیہ سے واقفیت اور اعلیٰ درجہ کی ذکاوت کا اظہار ہوتا ہے۔

امام ابوالحسن اشعری نے چونکہ معتزلہ اور اعتزال کا براہ راست مقابلہ کیا تھا، اور وہ عالمِ اسلام کے علمی مرکز (عراق) میں تھے، جہاں معتزلہ کا بڑا زور تھا، اس لئے انھوں نے علمی حلقہ کو زیادہ متاثر کیا، اور علمِ کلام

---

[1] یہ زمانہ اعتزال کے خلاف ردّعمل اور سنی علم کلام وعقائد کی تدوین کا خاص دور تھا، امام ابوالحسن اشعری کے علاوہ تقریباً اسی زمانہ میں مصر میں طحاوی (م ۳۲۱ھ) اور سمرقند میں امام ابومنصور ماتریدی (م ۳۳۳ھ) پیدا ہوئے، اول الذکر نے اپنے دونوں نامور معاصرین کے مقابلہ میں علمِ کلام میں شہرت حاصل نہیں کی اور امام ابومنصور ماتریدی کا مدرسۂ فکر بھی اشعری مدرسہ میں ضم ہو کر رہ گیا۔ [2] عقائد عضدیہ کے تعلیقات میں شیخ محمد عبدہ نے ثابت کیا ہے کہ یہ مختلف فیہ مسائل تیس سے زائد نہیں۔ (ابن تیمیہ از محمد ابوزہرہ) ص ۱۵۲۔

کی تاریخ میں ان کا نام اور کام زیادہ نمایاں اور پیش پیش ہے۔

اشعری حلقہ کے علما اور ان کا علمی اثر

امام اشعری کے بعد ان کے سلسلہ اور مکتبِ خیال میں بڑے جلیل القدر علمائے متکلمین اور اساتذہ پیدا ہوئے جنھوں نے تمام عالم اسلام پر اپنا ذہنی تفوق اور اپنی قابلیت کا سکہ قائم کر دیا، اور ان کی وجہ سے دنیائے اسلام کی علمی و ذہنی قیادت معتزلہ کے ہاتھ سے نکل کر علمائے اہل سنت کے ہاتھ میں آگئی، چوتھی صدی میں قاضی ابوبکر باقلانی (م ۴۰۳ھ) اور شیخ ابو اسحٰق اسفرائنی (م ۴۱۸ھ) بڑے نامور متکلم اور باعظمت عالم تھے، پانچویں صدی میں علامہ ابو اسحٰق شیرازی متوفی ۴۷۶ھ اور امام الحرمین ابو المعالی عبد الملک الجوینی (م ۴۷۸ھ) نے اپنے علم و فضل سے دنیا پر بادشاہت کی۔

علامہ ابو اسحٰق شیرازی مدرسۂ نظامیہ بغداد کے صدر مدرس تھے خلیفہ مقتدی باللہ نے ان کو ملک شاہ سلجوقی کے پاس سفیر بنا کر بھیجا، وہ بغداد سے نیشاپور اس شان سے پہونچے کہ جس شہر سے گذرتے شہر کا شہر ان کے استقبال کے لئے نکل آتا، جوشِ عقیدت میں یہ لوگ ان کے پاؤں کے نیچے کی مٹی اٹھا لیتے، دوکاندار اپنا سامان تجارت ان پر نثار کرتے، مٹھائیوں، پھلوں، قیمتی کپڑوں کی بارش کرتے، نیشاپور پہنچے تو پورا شہر استقبال کے لئے امنڈ آیا، امام الحرمین ان کا غاشیہ اپنے کاندھوں پر رکھ کر خادم کی طرح ان کے سامنے چلتے تھے، اور کہتے تھے کہ مجھے اس بات پر فخر ہے۔[1]

الپ ارسلان سلجوقی کی سلطنت اور نظام الملک کی وزارت میں سب سے بڑی اسلامی مملکت میں امام الحرمین کو سب سے بڑا دینی اعزاز حاصل تھا، وہ نیشاپور کے خطیب سلطنت کے اسلامی اوقاف کے ناظم و نگراں اور مدرسۂ نظامیہ کے صدر مدرس تھے۔ ابن خلکان لکھتے ہیں:-

---

[1] طبقات الشافعیۃ الکبریٰ ج ۳ ص ۹۱، ۹۲

وبقی علیٰ ذالک قریباً من ثلثین سنۃ	تیس سال تک وہ اس طرح رہے کہ علمی ودینی
غیر مزاحم ولامدافع مسلم لہ المحراب	میدان میں ان کا کوئی ہمسر اور حریف نہ تھا، محراب
والمنبر والخطابۃ والتدریس ومجلس	ومنبر کی وہ زینت تھے خطاب و تدریس اور وعظ
التذکیر یوم الجمعۃ۔[1]	وتذکیر انھیں کا منصب سمجھا جاتا تھا۔

ان کے اثر ورسوخ اور علوم مرتبت کا یہ حال تھا کہ ایک مرتبہ ملک شاہ سلجوقی نے عید کے چاند کا اعلان کرا دیا، امام الحرمین کے نزدیک رویت ثابت نہیں تھی، انھوں نے منادی کروادی کہ ابوالمعالی (امام الحرمین کی کنیت) کہتا ہے کہ کل تک ماہ رمضان ہے، جو میرے فتویٰ پر عمل کرنا چاہتا ہے اسے لازم ہے کہ وہ کل بھی روزہ رکھے، ملک شاہ نے باز پرس کی، تو فرمایا کہ "جو امور فرمانِ سلطانی پر موقوف ہیں ان کی اطاعت ہم پر فرض ہے، اور جو حکم فتویٰ سے متعلق ہے، وہ بادشاہ کو مجھ سے پوچھنا چاہئے، کیونکہ بحکم شریعت علماء کا فتویٰ حکم قاضی کے برابر ہے، روزہ رکھنا، عید کرنا یا امور فتویٰ پر موقوف ہیں، بادشاہِ وقت کو ان سے کوئی تعلق نہیں" چنانچہ بادشاہ نے اعلان کرا دیا کہ میرا حکم درحقیقت غلط تھا، اور امام الحرمین کا حکم صحیح ہے۔[2]

ان کا انتقال ہوا تو نیشاپور کے بازار بند ہو گئے، جامع مسجد کا منبر توڑ دیا گیا، ان کے شاگرد جو چار سو کے قریب تھے، سب نے دوات قلم توڑ ڈالے، لوگ ایک دوسرے سے تعزیت کرتے تھے، سال بھر ان کا غم تازہ رہا۔[3]

نظام الملک طوسی (کے عہد وزارت سے) جو عقیدۃً اشعری تھا، اور اپنے وقت کی سب سے بڑی اسلامی (سلجوقی) سلطنت کا نفس ناطقہ تھا، اشعریت کو بڑا فروغ ہوا، اور اس کو ایک طرح کی سرکاری حمایت اور تائید حاصل ہو گئی، بغداد اور نیشاپور کے مدرسۂ نظامیہ کے قیام نے جو اشعری

---

[1] ابن خلکان ج ۲ ص ۳۴۲ [2] اخلاق جلالی ص ۱۱۵، ۱۱۹

[3] ابن خلکان ج ۲ ص ۳۴۳

علماء واساتذہ کے زیر اہتمام تھے، اشعریت کو علمی وسعت واستحکام بخشا، مدرسۂ نظامیہ بغداد عالم اسلام کا سب سے بڑا دارالعلوم تھا جس کو بڑے احترام کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا، اور اس میں پڑھانا اور پڑھنا علماء وطلبہ کے لئے ایک فخر کی بات تھی، اس کے اثر سے طلبہ اور عوام کا اشعری عقائد وفکر سے متاثر ہونا قدرتی امر ہے۔

علم کلام کا انحطاط، فلسفہ اور باطنیت کا فروغ

اور

ایک نئے متکلم کی ضرورت

علم کلام کا انحراف و انحطاط

اس وقت اگرچہ اشعری مکتبِ خیال کے علما تمام عالم اسلام، نظامِ تعلیم اور مذہبی زندگی پر حاوی ہو گئے تھے، لیکن خود ان کے کلام اور ان کے اقتدار کو اندر سے گھن لگ گیا تھا، امام ابو الحسن اشعری کی طاقتور شخصیت و عقلیت اور مجتہدانہ دماغ نے معتزلہ کے سحر کو باطل کر دیا تھا، اور سنت و شریعت کا اقتدار از سرِ نو قائم کر دیا تھا، اس میں ان کے اصول و قواعد کو تنہا دخل نہ تھا، ان کی بلند ذہنی صلاحیتوں اور علمی ملکۂ استدلال و اجتہاد کو بھی دخل تھا، یہ وقار ایسی ہی طاقت ور شخصیتوں اور اجتہادی قابلیتوں سے قائم رہ سکتا تھا، لیکن ان کے پیرو رفتہ رفتہ لکیر کے فقیر بن گئے، اور علم کلام میں بھی بجائے تجدید و اجتہاد کے نقل در نقل کا سلسلہ شروع ہو گیا، جن لوگوں نے زمانہ کی تبدیلی کا احساس کیا، اور جدت سے کام لیا، انھوں نے فلسفہ کی اصطلاحات اور فلسفیانہ طرزِ استدلال کو علم کلام میں داخل کر دیا، جو نہ قرآن مجید کے طریقِ استدلال کی طرح فطری، عام فہم اور دلکش تھا، نہ ان کے دعاوی کے ثبوت کے لئے قطعی دلائل فراہم کرتا تھا، اس میں خود قیل و قال کی بڑی گنجائش تھی، اور ہر وقت اس کا خطرہ تھا کہ اس کے مقدمات کو کمزور اور مشکوک ثابت کر دیا جائے[1]، اس طرح نہ انھوں نے اہل سنت اور مسلکِ سلف کی صحیح نمایندگی کی، نہ خالص فلسفہ کے

---

[1] جیسا کہ ابن تیمیہ نے اپنی بعض تصنیفات خصوصاً الرد علی المنطقیین میں کیا۔

حلقوں میں احترام و عظمت حاصل کی۔

فلسفہ کا رواج

دوسری طرف مامون کی قدر دانی اور دلچسپی اور مترجمین کی محنت اور توجہ سے سریانی، یونانی اور فارسی سے یونانی فلسفہ کی بکثرت کتابیں خصوصاً ارسطو کی تصنیفات عربی میں منتقل ہو گئی تھیں، اور وہ تیز طبیعت اور خام عقلیت مسلمانوں پر بڑا اثر ڈال رہی تھیں، اس ذخیرہ میں کچھ تو منطق، طبیعیات، عنصریات، ریاضیات کی کتابیں اور علوم تھے، جن کے استعمال کرنے میں کوئی حرج نہ تھا، اور کچھ الٰہیات اور مابعد الطبیعیات کے مباحث اور دفتر تھے، الٰہیات کا یہ ذخیرہ درحقیقت یونانیوں کا علم الاصنام (دیومالا) تھا، جس کو انھوں نے بڑی چالاکی سے فلسفیانہ زبان اور علمی اصطلاحات میں منتقل کر دیا تھا، یہ مفروضات اور تخیلات کا ایک طلسم تھا، جس کا نہ کوئی ثبوت تھا نہ کسی عالم میں ان کا وجود، اس میں کہیں عقول و افلاک کا شجرۂ نسب ہے، کہیں ان فرضی اور خیالی چیزوں کے افعال و حرکات کا زائچہ کھینچا گیا ہے، ایک ایسی امت کے لئے، جس کو اللہ تعالیٰ نے نبوت کی دولت سے سرفراز فرمایا تھا، اور محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ اپنی ذات و صفات کے صحیح معرفت اور نوعِ انسان اور کائنات کی ابتدا و انتہا اور آغاز و انجام کا یقینی علم بخشا تھا، اس یونانی افسانہ اور طلسم ہوشربا کی طرف التفات کرنے اور اس کی تفصیلات و جزئیات پر وقت ضائع کرنے کی مطلق ضرورت نہ تھی، مگر جو لوگ یونانیوں کے منطق و طبیعیات اور ریاضیات سے مرعوب تھے، انھوں نے الٰہیات کے اس دفتر پارینہ کو بھی صحیفۂ آسمانی کی طرح قبول کر لیا، اور اس کو اس طرح ہاتھوں ہاتھ لیا کہ گویا ان کے پاس پیغمبر اور آسمانی کتاب کے ذریعہ کوئی علم نہیں پہنچا تھا، اور وہ جاہل قوموں کی طرح الٰہیات و دینیات میں بھی اسی طرح بے بضاعت اور تہی دامن تھے، جیسے ریاضیات و طبیعیات میں۔

فلسفۂ یونان کے عرب ناقل و شارح

دوسری طرف فلسفۂ یونان کو یعقوب کندی (م ۲۵۰ھ) ابو النصر فارابی (م ۳۳۹ھ) اور شیخ بوعلی ابن سینا (م ۴۲۸ھ) کے سے پرجوش وکیل حاصل ہوئے کہ خود یونان میں بھی ان کی نظیر ملنی مشکل ہے، انھوں نے ارسطو کو عصمت و تقدیس اور علم و حکمت کے ایسے مقام پر پہونچا دیا جو یونانی الٰہیات میں شاید مبدأ اول (واجب الوجود) کو بھی حاصل نہیں، یہ بھی ایک بدقسمتی تھی کہ مسلمانوں کے حصہ میں یونان کے علمی ذخیرہ میں سے زیادہ تر ارسطو کی تصنیفات و افکار آئے جو پیغمبروں کی تعلیمات، اور دین کی روح و مزاج سے زیادہ اختلاف اور کم از کم مناسبت رکھتے ہیں، پھر دوسری بدقسمتی یہ تھی کہ فلاسفۂ عرب میں سے کوئی بھی ان کے اصل ماخذوں اور ان کی اصل زبانوں سے واقف نہیں تھا، ان کا تمام تر انحصار تراجم پر تھا، اور ان سے خود ان فلاسفہ کا منشا سمجھنے میں غلطیاں ہوئیں، پھر ان پر ارسطو کا ایسا علمی رعب اور اس کی شخصیت کا ایسا سحر غالب تھا کہ انھوں نے اس کے افکار و آراء پر نقد و جرح کرنے کی ضرورت نہیں سمجھی، اور معقولات کو بھی منقولات بنا دیا۔

جماعتِ اخوان الصفا اور اس کے رسائل

چوتھی صدی کے آخر میں تمام عالمِ اسلام پر فلسفۂ یونان کا اثر پڑ رہا تھا، ہر ذہین و متجسس نوجوان اس کو شوق و عظمت کی نگاہ سے دیکھتا تھا، چوتھی صدی کے وسط ہی میں اخوان الصفا کے نام سے فری میسن کے طرز کی ایک خفیہ انجمن بغداد میں قائم ہوئی، جس میں فلسفۂ یونان کو معیار قرار دے کر دینی مباحث اور عقائد پر گفتگو ہوتی تھی، اور مسائل کو طے کیا جاتا تھا، اس انجمن کا منشور ان کے الفاظ میں یہ تھا:۔

إن الشريعة الإسلامية قد تنجست   اسلامی شریعت جہالتوں اور گمراہیوں کی آمیزش سے

بالجهالات واختلطت بالضلالات	گندی ہوگئی ہے اس کو صرف فلسفہ کے ذریعہ
ولا سبیل الیٰ غسلها وتطهیرها الا بالفلسفة	دھویا اور پاک کیا جا سکتا ہے اس لئے کہ فلسفہ
لانها حاویة للحکمة الاعتقادیة والمصلحة	اعتقادی علوم وحکمت اور اجتہادی مصلحتوں
الاجتهادیة وانه متی انتظمت الفلسفة	پر حاوی ہے اب صرف فلسفۂ یونان اور شریعت
الیونانیة والشریعة المحمدیة فقد	محمدی کے امتزاج سے کمال مطلوب حاصل
حصل الکمال۔[1]	ہو سکتا ہے۔

ان کی اپنے رفقاء کو خاص ہدایت تھی کہ وہ پختہ کار اور سن رسیدہ لوگوں پر وقت ضائع کرنے کے بجائے نوجوانوں اور کم عمروں کی طرف توجہ کریں، اور ان کو اپنے خیالات سے متاثر کرنے کی کوشش کریں، اس لئے کہ عمر رسیدہ لوگوں میں پختگی اور جمود ہوتا ہے، جو نئی چیز کو قبول کرنے سے مانع ہوتا ہے، نوجوان نئی چیز کو قبول کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔[2]

انھوں نے اس بحث ونظر کے نتیجہ میں ۵۲ رسالے مرتب کئے، جو ان کے فلسفہ کی نمایندگی کرتے ہیں اور رسائل اخوان الصفا کے نام سے تاریخ وادب میں مشہور ہیں اور طبیعیات، ریاضیات، عقلیات کے مباحث پر مشتمل ہیں، معتزلہ اور ان کے ہم مذاق لوگوں نے ان رسائل کو ہاتھوں ہاتھ لیا، وہ اپنی مجلسوں میں ان کو پڑھتے تھے، اور جہاں جاتے تھے اپنے ساتھ لے جاتے تھے، یہاں تک کہ ایک صدی کے اندر وہ اندلس پہونچ گئے۔[3]

معتزلہ وفلاسفہ کا فرق

معتزلہ سے اگرچہ دانستہ یا نادانستہ شریعت کو نقصان پہنچا تھا، اور انھوں نے عقل کی طاقت کو غیر محدود سمجھ کر ذات وصفات کے نازک وماوراء عقل (نہ کہ مخالف عقل) مسائل کو بازیچۂ اطفال بنا دیا

[1] تاریخ فلاسفۃ الاسلام فی المشرق والمغرب محمد لطفی جمعہ ص۲۵۳ [2] ایضاً ص۲۶۰، ۲۶۱ [3] تاریخ فلسفۃ الاسلام ص۲۵۰

تھا، لیکن وہ اصلاً مذہبی ذہن کے لوگ تھے، وحی نبوت پر ایمان رکھتے تھے، اور عموماً متقشف، معاصی سے مجتنب و محتاط تھے، عبادت اور دینی دعوت کا ذوق رکھتے تھے، اور امر بالمعروف ونہی عن المنکر کے سختی کے ساتھ پابند تھے[1]، اور یہ سب ان کے اصول وعقائد کا اقتضا تھا[2]۔ اس لئے اعتزال کے فروغ اور معتزلہ کے اقتدار سے عالم اسلام میں کفر والحاد وانکار نبوت، انکار معاد اور بے عملی اور تعطل کا رجحان پیدا نہیں ہو سکا، اور مسلمانوں کا مذہبی شعور مجروح یا کمزور نہیں ہونے پایا۔

لیکن فلاسفہ کا معاملہ اس سے بالکل مختلف تھا، فلسفہ نبوت کے بالکل متوازی چلتا ہے، اور کہیں جا کر نہیں ملتا، وہ دین کے اصول وکلیات اور اس کے بنیادی عقائد و مسائل سے متصادم ہے، اس لئے جس قدر فلسفہ کی مقبولیت اور عظمت بڑھتی گئی، قدرتی طور پر دین کی وقعت اور انبیاء علیہم السلام کی عظمت کم ہوتی گئی، اور عقائد سے لے کر اخلاق واعمال تک اس ذہنی تبدیلی سے متاثر ہوئے، مسلمانوں میں ایک ایسا گروہ پیدا ہو گیا، جو دین کی علانیہ تحقیر کرتا، اور اسلام سے فخریہ اپنی بے تعلقی کا اظہار کرتا، جو لوگ اتنی اخلاقی جرأت نہیں رکھتے تھے، وہ ظاہری طور پر رسم ورواج کے پابند تھے، لیکن اندر سے وہ کسی معنی میں مسلمان نہیں تھے۔

باطنیت کا فتنہ

فلسفہ کے ساتھ ساتھ اور اس کے اثر سے ایک نیا فتنہ پیدا ہوا، جو اسلام کے حق میں اور نبوت کی تعلیمات کے لئے فلسفہ سے بھی زیادہ خطرناک تھا، یہ باطنیت کا فتنہ ہے، اس کے بانی اور داعی اکثر ان قوموں کے افراد تھے، جو اسلام کے مقابلہ میں اپنی سلطنتیں اور اقتدار کھو چکے تھے، اور ظاہری مقابلہ اور جنگ سے ان کی بازیافت کی، کوئی امید نہ تھی، یا شہوت پرست اور لذت پسند لوگ تھے، اور اسلام ان کی زندگی پر

---

[1] تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو، ضحی الاسلام ج ۳ فصل اول [2] ان کے نزدیک کبیرہ کے ارتکاب سے آدمی مخلد فی النار ہوتا ہے، اور امر بالمعروف ونہی عن المنکر فرض ہے۔

حدود و قیود عائد کرتا تھا، یا شخصی اقتدار اور سرداری کے حریص تھے۔ ان تمام مختلف مقاصد کے لوگ باطنیت کے نشان کے نیچے جمع ہوگئے، انھوں نے محسوس کیا کہ وہ اسلام کو جنگی طاقت سے شکست نہیں دے سکتے، نہ مسلمانوں کو کفر و الحاد کی کھلی ہوئی دعوت دے سکتے ہیں، اس لئے کہ اس سے ان کے مذہبی احساسات بیدار ہوجائیں گے اور مقابلہ کی قوت ابھر آئے گی، انھوں نے اس کے لئے ایک نیا راستہ اختیار کیا۔

ظاہر و باطن کا مغالطہ

انھوں نے دیکھا کہ شریعت کے اصول و عقائد اور احکام و مسائل کو الفاظ میں بیان کیا گیا ہے اور انسانوں کے سمجھنے اور عمل کرنے کے لئے ایسا ضروری تھا۔

وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا بِلِسَانِ قَوْمِهٖ لِيُبَيِّنَ لَهُمْ (سورۂ ابراہیم ۴)	اور ہم نے کوئی پیغمبر دنیا میں نہیں بھیجا مگر اپنی قوم ہی کی زبان میں تاکہ لوگوں پر مطلب واضح کردے۔

ان الفاظ کے معنی و مفہوم متعین ہیں، رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے اپنی زبان سے ان کی تشریح اور اپنے عمل سے ان کی تعیین کردی ہے، یہ معنی و مفہوم امت میں عملی و لفظی طور پر تواتر و تسلسل سے چلے آرہے ہیں، اور ساری امت ان کو جانتی اور مانتی ہے، نبوت و رسالت، ملائکہ، معاد، جنت، دوزخ، شریعت، فرض و واجب، حلال و حرام، صلاۃ، زکوٰۃ، روزہ، حج، یہ سب وہ الفاظ ہیں جو خاص دینی حقائق کو بیان کرتے ہیں، اور جس طرح یہ دینی حقائق محفوظ چلے آرہے ہیں، اسی طرح ان دینی حقائق کو ادا کرنے والے یہ الفاظ بھی محفوظ چلے آرہے ہیں، اور اب دونوں لازم ملزوم بن گئے ہیں۔

جب نبوت و رسالت، یا نبی یا صلوٰۃ یا زکوٰۃ کا لفظ بولا جائے گا تو اس سے اس کی وہی حقیقت سمجھ میں آئے گی، اور وہی عملی شکل سامنے آئے گی، جو رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے بتائی اور صحابۂ کرامؓ نے اس کو سمجھا، اس پر عمل کیا، اور اس کو دوسروں تک پہنچایا، اور اسی طرح نسلاً بعد نسلٍ وہ چیز امت تک

منتقل ہوتی رہی' انھوں نے اپنی ذہانت سے اس نکتہ کو سمجھا کہ الفاظ و معانی کا یہ رشتہ امت کی پوری زندگی اور اسلام کے فکری و عملی نظام کی بنیاد ہے، اور اسی سے اس کی وحدت اور اپنے سرچشمہ اور اپنے ماضی سے اس کا ربط قائم ہے، اگر یہ رشتہ ٹوٹ جائے' اور دینی الفاظ و اصطلاحات کے مفہوم و معانی متعین نہ رہیں' یا مشکوک ہو جائیں تو یہ امت ہر دعوت اور ہر فلسفہ کا شکار ہو سکتی ہے' اور اس کے سنگین قلعہ میں سیکڑوں چور دروازے اور اس کی مضبوط دیواروں میں ہزاروں شگاف پیدا ہو سکتے ہیں۔

اس نکتہ کو پا جانے کے بعد انھوں نے اپنا سارا زور اس تبلیغ پر صرف کیا کہ ہر لفظ کے ایک ظاہری معنی ہوتے ہیں' اور ایک حقیقی اور باطنی، اسی طرح قرآن و حدیث کے کچھ ظاہر ہیں' اور کچھ حقائق' ان حقائق سے ان ظواہر کو وہی نسبت ہے' جو گودے اور مغز سے چھلکے اور پوست کو ہے، جہلا صرف ان ظواہر کو جانتے ہیں' اور ان کے ہاتھ میں پوست ہی پوست ہے' عقلا حقائق کے عالم ہیں' اور ان کے حصہ میں مغز آیا ہے' وہ جانتے ہیں کہ یہ الفاظ دراصل حقائق کے رموز و اشارات ہیں' ان سے وہ مراد نہیں جو عوام سمجھتے اور عمل کرتے ہیں' ان سے مراد کچھ اور چیزیں ہیں' جن کا علم صرف اہلِ اسرار کو ہے' اور انھیں سے دوسروں کو حاصل ہو سکتا ہے' جو ان حقائق تک نہیں پہونچا، اور ظواہر میں گرفتار ہے، وہ ظاہری بیڑیوں اور شریعت کی پابندیوں میں جکڑا ہوا ہے' اور نہایت نیچی سطح پر ہے' جو حقائق و رموز کی بلند سطح تک پہونچ جاتا ہے' اس کی گردن سے یہ طوق و سلاسل اتر جاتے ہیں' اور وہ شریعت کی پابندیوں سے آزاد ہو جاتا ہے،[1] یہی اس آیت کا مفہوم ہے:

وَيَضَعُ عَنْهُمْ إِصْرَهُمْ وَالْأَغْلَالَ الَّتِي ۔۔۔ (پیغمبر) اس بوجھ سے نجات دلائے گا جس کے تلے دبے ہو

[1] تعطیل شریعت کا مستقل عقیدہ بھی پایا جاتا تھا، ایک باطنی امام و داعی سیدنا ادریس لکھتے ہیں:۔

نعت اللہ محمد بن اسمٰعیل وھو نبی ناطق ینسخ شریعۃ محمد صلے اللہ علیہ وسلم (محمد بن اسمٰعیل کو اللہ تعالیٰ نے نبی ناطق کی حیثیت سے مبعوث فرمایا، اور انھوں نے محمد صلے اللہ علیہ وسلم کی شریعت کو منسوخ کر دیا، (عاصمۃ نفوس المھتدین و قاصمۃ ظھور المعتدین لسیدنا ادریس) معز لدین اللہ فاطمی سے بھی ایسے ہی اقوال منقول ہیں۔

كَانَتْ عَلَيْهِمْ۔ (اعراف ۱۵۷) ہیں ان پھندوں سے نکالے گا جن میں گرفتار تھے۔

جب یہ اصول تسلیم کرلیا گیا، اور حقائق وظواہر کے اس فلسفہ کو قبول کرلیا گیا تو انھوں نے نبی، وحی، نبوت، ملائکہ، آخرت، اور اصطلاحاتِ شرعیہ کی من مانی تشریح کرنی شروع کردی جس کے بعض نادر نمونے یہ ہیں:

"نبی اس ذات کا نام ہے جس پر قوت قدسیہ صافیہ کا فیضان ہو، جبریل کسی ہستی کا نام نہیں، صرف فیضان کا نام ہے، معاد سے مراد ہر چیز کا اپنی حقیقت کی طرف واپس آجانا ہے، جنابت سے مراد افشائے راز ہے، غسل سے مراد تجدید عہد، زنا سے مراد علم باطن کے نطفہ کو کسی ایسی ہستی کی طرف منتقل کرنا جو عہد میں شریک نہ ہو، طہارت سے مراد مذہب باطنیہ کے علاوہ ہر مذہب سے برأت، تیمم سے مراد ماذون (اجازت یافتہ) سے علم کا حصول، صلوٰۃ سے مراد امام وقت کی طرف دعوت، زکوٰۃ سے مراد اہل استعداد و صفا میں اشاعتِ علم، صیام (روزہ) سے مراد افشائے راز سے پرہیز و احتیاط، حج سے مراد اس علم کی طلب جو عقل کا قبلہ اور منزل مقصود ہے، جنت، علم باطن، جہنم علم ظاہر، کعبہ خود نبی کی ذات ہے، بابِ کعبہ سے مراد حضرت علی رضی اللہ تعالےٰ عنہ کی ذات، قرآن مجید میں طوفانِ نوح سے مراد علم کا طوفان ہے جس میں اہل شہادت غرق کردیئے گئے، آتش نمرود سے مراد نمرود کا غصہ ہے نہ کہ حقیقی آگ، ذبح سے مراد جس کا ابراہیم کو حکم دیا گیا تھا، بیٹے سے عہد لینا، یاجوج ماجوج سے مراد اہلِ ظاہر ہیں، عصائے موسیٰ سے مراد ان کی دلیل اور حجت ہے[1]، وغیرہ وغیرہ۔"

نبوتِ محمدی کے خلاف بغاوت

الفاظِ شرعی کے متواتر و متوارث معنیٰ و مفہوم کا انکار اور قرآن و حدیث کے ظاہر و باطن اور مغز و پوست کی تقسیم ایسا کامیاب حربہ تھا، جس سے اسلام کے نظامِ اعتقاد و نظام فکر کے خلاف سازش

[1] قواعد عقائد آل محمد (باطنیہ) تالیف محمد بن حسن الدیلمی یمانی زمانۂ تالیف ۷۰۷ھ ص ۱۶

کرنے والوں نے ہر زمانہ میں کام لیا، اسلام کی پوری عمارت کو اس طرح آسانی سے ڈائنامیٹ کیا جا سکتا تھا اور اسلام کے ظاہری خول کے اندر ریاست اندرونِ ریاست قائم کی جا سکتی تھی، چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ بعد کی صدیوں میں جن فرقوں نے اور منافقین کی جس جماعت نے نبوتِ محمدی کے خلاف بغاوت کرنی چاہی، اس نے باطنیت کے اسی حربہ سے کام لیا، اور اس معنوی تواتر و توارث کا انکار کر کے پورے نظامِ اسلامی کو مشکوک و مجروح بنا دیا، اور اپنے لئے دینی سیادت بلکہ نئی نبوت کا دروازہ کھول لیا، ایران کی بہائیت اور ہندوستان کی قادیانیت اس کی بہترین مثالیں ہیں۔[1]

---

[1] قادیانیوں نے بھی باطنیوں کی طرح الفاظ کو قائم رکھتے ہوئے ان کا نیا مفہوم بیان کیا ہے، اور معنوی توارث و تواتر کا عملاً انکار کیا ہے، ختم نبوت، مسیح و نزول مسیح، معجزات، دجال وغیرہ سب الفاظ وہی ہیں مگر ان کی تشریح و تطبیق میں باطنیوں کی طرح اختراع و ایجاد سے کام لیا ہے، مرزا صاحب کی کتابیں اور مولوی محمد علی کی تفسیر اس کی مثالوں سے بھری ہوئی ہیں۔

بہائیوں نے بالکل نئی شریعت وضع کی ہے جس کے بعض دفعات یہ ہیں "روزہ سال میں ایک ہی مہینہ کا ہے، مگر مہینہ ۱۹ دن کا ہے، روزہ کی ابتدا صبح صادق کے بجائے طلوع آفتاب سے ہے ۱۱ سال سے ۴۲ سال تک انسان احکام شرعی کا مکلف رہتا ہے، پھر پابندیاں اٹھ جاتی ہیں، وضو فرض نہیں ہے مستحب ہے، عورتوں پر نظر جائز ہے کوئی پردہ نہیں جس گھر میں بانیٔ مذہب (باب) کی ولادت ہوئی ہے، اس کی زیارت واجب ہے، جماعت کی نماز صرف جنازہ میں مشروع ہے، ایمان کے بعد کوئی چیز نجس نہیں بلکہ محض مذہب بابی کی پیروی سے آدمی طاہر ہو جاتا ہے، پھر کبھی گندہ نہیں ہوتا، بلکہ جس چیز کو اس کا ہاتھ لگ جاتا ہے وہ بھی طاہر ہو جاتی ہے، پانی ہمیشہ طاہر و مطہر رہتا ہے، بہائیوں کا قانونِ میراث علیٰحدہ ہے (حاضر العالم الاسلامی بحوالہ فرنچ انسائیکلوپیڈیا آف اسلام) موسیو ہوارٹ نے اپنے مقالہ "بابیت" میں صحیح لکھا ہے کہ باب نے اسلام میں اصلاح کے نام سے ایک نئے دین کی تشکیل کی ہے جس کے عقائد و اصول علیٰحدہ ہیں، اور اس کو نئی سوسائٹی اور ہیئت اجتماعیہ کے منشور کے طور پر پیش کیا ہے، یہی صورت حال قادیانیت کی ہے، دونوں جگہ ایک نئی نبوت اور ایک نئے نظام دینی کی تاسیس ہے، درحقیقت یہ سب باطنیت کی صدائے بازگشت ہے۔

ظاہر ہے کہ ان "نکتہ آفرینیوں" کو (جن کی چند مثالیں اوپر پیش کی گئی ہیں) کوئی سلیم الطبع آدمی قبول نہیں کرسکتا تھا لیکن علم کلام کی معرکہ آرائیوں نے عالم اسلام میں ایسا ذہنی انتشار پیدا کردیا تھا، اور فلسفہ کے اثر سے لوگوں میں پیچیدہ اور غامض مضامین کا (خواہ اس کے اندر کوئی مغز نہ ہو) ایسا مذاق پیدا ہوگیا تھا کہ ایک طبقہ پر باطنیوں کا جادو چل گیا، جنھوں نے قدیم علم ہیئت، علم طبیعیات اور یونانی الٰہیات کے مسائل اور یونانی اصطلاحات عقل اول وغیرہ کو آزادی سے استعمال کیا تھا، اور مختلف اثرات اور مختلف اغراض سے لوگ ان کے گرد جمع ہوگئے، کچھ جذبۂ انتقام میں، کچھ اسرار و رموز کے شوق میں، کچھ غلط قسم کی ظاہریت اور تقشف کے ردِ عمل میں، کچھ بوالہوسی اور نفس پرستی کی آزادی کے لالچ میں، کچھ اہلِ بیت کے نام سے، اس طرح باطنیوں نے ایسی خفیہ تنظیم قائم کرلی جس سے طاقتور اسلامی حکومتیں عرصہ تک پریشان رہیں، عالم اسلام کی بعض لائق ترین اور مفید ترین ہستیاں (نظام الملک طوسی و فخر الملک وغیرہ) ان کا شکار ہوئیں[1]، عرصہ تک کسی بڑے عالم اور مسلمان بادشاہ یا وزیر کو اس کا اطمینان نہیں تھا کہ صبح وہ صحیح سلامت اٹھے گا، ابن جوزی نے لکھا ہے کہ اصفہان میں اگر کوئی شخص عصر تک اپنے گھر واپس نہ جاتا تو سمجھ لیا جاتا کہ وہ کسی باطنی کا شکار ہوگیا، اس بدامنی کے علاوہ انھوں نے ذہن و ادب اور علم کو بھی متاثر کرنا شروع کیا، اور دین کے اصول و نصوص اور قطعیات کی تاویل و تحریف اور عام الحاد کا دروازہ کھل گیا۔

ایک نئی شخصیت کی ضرورت

فلسفہ اور باطنیت کے ان اسلام کش اثرات کے لئے ایک ایسی شخصیت کی ضرورت تھی جس کو علومِ عقلیہ و نقلیہ دونوں میں پوری بصیرت اور دستگاہ حاصل ہو، اور وہ تمام علوم میں مجتہدانہ نظر اور اپنا خود مقام رکھتا ہو، جو اپنے ذہن خدا داد، جودتِ طبع اور دقتِ نظر میں فلاسفۂ یونان اور بہت سے

[1] باطنیوں کے ہاتھ سے شہید ہونے والوں کی مفصل فہرست کے لئے ملاحظہ ہو "نظام الملک طوسی" صفحہ ۵۶، ۵۱۳

قدیم ائمہ فکر سے کم نہ ہو، جو بہت سے علوم کو نئے طریقہ سے مدوّن کرنے کی قابلیت رکھتا ہو، جو وفورِ علم اور وسعتِ نظر کے ساتھ دولتِ یقین سے بھی مالامال ہو، اور اس نے اپنے ذاتی تفکر، تلاش و تحقیق، اور ریاضت و عبادت سے دین کے ان ابدی حقائق پر نیا ایمان حاصل کیا ہو، اور وہ نئے اعتماد، تازہ یقین کے ساتھ علیٰ وجہ البصیرۃ دین کی پیروی اور رسولؐ کے اقتداء کی طرف دعوت دیتا ہو، نیز عالمِ اسلامی اور علمی دنیا میں اپنے علم و یقین اور فکر و نظر سے ایک نئی روح اور زندگی کی ایک نئی لہر پیدا کر دے، پانچویں صدی کے عین وسط میں اسلام کو ایسی شخصیت عطا ہوئی، جس کی عالمِ اسلام کو سخت ضرورت تھی، یہ شخصیت امام غزالیؒ کی تھی۔

امام غزالیؒ

تعلیم اور علمی عروج

امام غزالیؒ کا نام محمدؒ کنیت ابو حامدؒ والد کا نام بھی محمد تھا، طوس کے ضلع میں ۴۵۰ھ میں طاہران میں پیدا ہوئے، والد کی وصیت کے مطابق جو ایک مخلص علم دوست اور غریب مسلمان تھے، اُن کے ایک صوفی دوست نے تعلیم کا انتظام کرنے سے معذرت کی، اور کسی مدرسہ میں داخل ہو جانے کا مشورہ دیا، چنانچہ وہ ایک مدرسہ میں داخل ہو کر تعلیم میں مشغول ہو گئے۔

امام غزالیؒ نے اپنے وطن میں شیخ احمد الراذکانی سے فقہ شافعی کی تعلیم حاصل کی پھر جرجان میں امام ابونصر اسماعیلی سے پڑھا، اس کے بعد نیشاپور جا کر امام الحرمین کے حلقۂ درس میں شامل ہوئے، اور تھوڑی ہی مدت میں اپنے رفقاء میں جو۔۔ سو کی تعداد میں تھے، ممتاز ہو گئے، اور اپنے نامور استاد کے نائب (معید) بن گئے، امام الحرمین ان کی تعریف میں فرماتے تھے کہ غزالیؒ بحرِ زخار ہے، امام الحرمین کے انتقال کے بعد نیشاپور سے نکلے، اس وقت ان کی عمر ۲۸ سال کی تھی، لیکن بڑے بڑے کبیر السن علماء سے وہ زیادہ ممتاز اور باکمال سمجھے جاتے تھے۔

درس و تدریس سے فارغ ہونے کے بعد امام غزالیؒ نظام الملک کے دربار میں پہونچے نظام الملک نے ان کی شہرت اور ممتاز قابلیت کی بنا پر بڑے اعزاز و اکرام سے دربار میں ان کو لیا، یہاں اہل کمال کا مجمع تھا، علمی مباحثے اور دینی مناظرے درباروں اور مجلسوں یہاں تک کہ تقریبات شادی و غمی کا ایک ضروری عنصر تھے،

امام غزالیؒ ان مباحث میں سب پر غالب رہتے تھے، ان کی نمایاں قابلیت دیکھ کر نظام الملک نے ان کو مدرسۂ نظامیہ کی صدارت کے لئے انتخاب کیا جو اس وقت ایک عالم کے لئے سب سے بڑا اعزاز اور منتہائے ترقی تھا، اس وقت ان کی عمر ۳۴ سال سے زیادہ نہ تھی، ۴۸۴ھ میں وہ بڑی شان و شوکت کے ساتھ بغداد میں داخل ہوئے اور نظامیہ میں درس شروع کیا، تھوڑے ہی دن میں ان کے درس، حسن تقریر، اور تبحر علمی کی بغداد میں دھوم مچ گئی، طلبہ و علماء نے استفادہ کے لئے ہر طرف سے ہجوم کیا، ان کی مجلس درس مرجع خلائق بن گئی، تین تین سو منتہی طالب علم اور سو سو امراء اور روساء اس میں شرکت کرتے تھے، رفتہ رفتہ انھوں نے اپنی عالی دماغی، علمی فضیلت اور طاقتور شخصیت سے بغداد میں ایسا اثر اور رسوخ پیدا کر لیا کہ ارکانِ سلطنت کے ہمسر بن گئے، اور بقول ایک معاصر (شیخ عبدالغافر فارسی) کے ان کے جاہ و جلال کے سامنے امراء اور وزراء اور خود بارگاہِ خلافت کی شان و شوکت بھی ماند پڑ گئی،[1] یہاں تک کہ ۴۸۵ھ میں ان کو خلیفۂ عباسی (مقتدی باللہ) نے ملک شاہ سلجوقی کی بیگم ترکان خاتون کے پاس (جو اس وقت سلطنت کی مالک تھی) اپنا سفیر بنا کر بھیجا، خلیفہ مستظہر جو مقتدی باللہ کا جانشین تھا، امام سے خاص ربط و ارادت رکھتا تھا، اسی کی فرمائش سے امام غزالیؒ نے باطنیہ کے رد میں کتاب لکھی، اور اس کا نام خلیفہ کی نسبت سے "مستظہری" رکھا۔

گیارہ سال کی رہ نوردی اور اس کے تجربات

اس انتہائی عروج کا جو کسی علمی و دینی شخصیت کو حاصل ہو سکتا ہے، تقاضا تھا کہ امام غزالیؒ اس پر قناعت کریں اور اسی کے دائرہ کے اندر پوری زندگی گزار دیں، جیسا کہ ان کے بعض اساتذہ نے کیا اور لوگ عموماً کیا کرتے ہیں، مگر ان کی بے چین طبیعت اور بلند حوصلہ طائر ہمت اس بلندی پر راضی نہ تھا، اور دراصل اسی بلند ہمتی نے ان کو امام اور حجۃ الاسلام بنا دیا، دنیا میں جاہ و اعزاز کی قربانی اور مقصد کی دھن اور سچی لگن

---

[1] طبقات الشافعیۃ الکبریٰ ج ۴ ص ۱۰۴

کی ایسی مثالیں بہت کم ملتی ہیں، امام غزالیؒ نے خود ان حالات و اسباب کو بیان کیا ہے جنہوں نے ان کو ایسا قدم اٹھانے پر آمادہ کیا، اور ان کو تعلیم و تدریس کے کام کا نہیں رکھا یہاں تک کہ وہ اقلیم علم کے بادشاہی چھوڑ کر یقینی علم اور دولت باطن کی تلاش میں نکل گئے اور اپنے مقصد میں کامیاب ہو کر پلٹے "المنقذ من الضلال" میں وہ لکھتے ہیں:۔

"عنفوانِ شباب سے میری طبیعت تحقیقات و معلومات کی طرف مائل تھی، ہر فرقہ اور جماعت سے ملتا، اور اس کے عقائد و خیالات معلوم کرتا رفتہ رفتہ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ تقلید کی بندش ٹوٹ گئی، جو عقائد بچپن سے ذہن میں جمے ہوئے تھے، وہ متزلزل ہو گئے، میں نے خیال کیا کہ عیسائی اور یہودی بچے بھی اپنے عقائد پر پرورش پاتے ہیں، حقیقی علم تو یہ ہے کہ کسی قسم کے شبہہ کا احتمال تک نہ رہ جائے، مثلاً مجھے اس بات کا یقین ہے کہ دس کا عدد تین سے زائد ہوتا ہے، اگر کوئی شخص کہے نہیں بلکہ تین زائد ہے، اور میرے دعویٰ کی دلیل ہے کہ لاٹھی کو سانپ بنا سکتا ہوں اور وہ بنا کر دکھا بھی دے تب بھی مجھے اپنے علم میں کوئی شک نہیں ہوگا، مجھے اس پر تعجب ضرور ہوگا لیکن پھر بھی میرا یقین باقی رہے گا کہ دس تین سے زائد ہے، میں نے غور کیا تو مجھے معلوم ہوا کہ اس قسم کا یقینی علم صرف حسیات اور بدیہیات کے دائرہ میں ہے، لیکن جب زیادہ کد و کاوش سے کام لیا تو معلوم ہوا کہ اس میں بھی شک کی گنجائش ہے، میں نے دیکھا کہ حواس میں سب سے زیادہ قوی حاسہ بصارت کا ہے، لیکن اس میں غلطی ہوتی ہے، میرا یہ شک یہاں تک بڑھا کہ مجھے محسوسات کے یقینی ہونے کا اطمینان نہیں رہا، پھر میں نے عقلیات پر غور کیا تو وہ مجھے حسیات سے بھی زیادہ مشکوک و کمزور نظر آئے، تقریباً دو مہینے تک میری یہ ارتیابی کیفیت رہی اور مجھ پر سوفسطائیت کا غلبہ رہا، پھر اللہ تعالیٰ نے مجھے اس بیماری سے شفا دی اور طبیعت صحت و اعتدال پر آگئی، اور بدیہیاتِ عقلی پر اطمینان پیدا ہو گیا، لیکن یہ کسی استدلال اور ترتیب کی بنا پر نہ تھا، بلکہ ایک وجدانی اور وہبی بات تھی، اس مرض سے شفا پانے کے بعد اب میرے سامنے چار گروہ تھے جو طالب حق معلوم ہوتے تھے متکلمین جو اہلِ عقل و نظر ہونے

کے مدعی تھے باطنیہ جن کا دعویٰ تھا کہ ان کے پاس خاص تعلیمات و اسرار ہیں اور انھوں نے براہِ راست امام معصوم سے علم حقائق حاصل کیا ہے، فلاسفہ جن کا کہنا ہے کہ وہی اہلِ منطق و اہل استدلال ہیں، صوفیہ جو اپنے کو صاحب کشف وشہود کہتے ہیں، میں نے ہر ایک گروہ کی کتابوں اور خیالات کا مطالعہ کیا تو کسی سے بھی مطمئن نہیں ہوا، علم کلام کے متعلق اس فن کے محققین کی تصنیفات پڑھیں اور خود بھی اس موضوع پر تصنیفات کیں، میں نے دیکھا کہ اگرچہ یہ فن اپنے مقصود کو پورا کرتا ہے، لیکن میری تسلی کے لئے وہ کافی نہیں کیونکہ اس میں ایسے مقدمات پر بنا رکھی گئی ہے، جو فریق مقابل کے مسلّم کئے ہوئے ہیں، اور متکلمین نے ان کو محض تقلیداً تسلیم کر لیا ہے، یا اجماع یا قرآن و حدیث کے نصوص ہیں، اور یہ چیزیں اس شخص کے مقابلہ میں کچھ زیادہ کارآمد نہیں، جو بدیہیات کے سوا کچھ اور تسلیم نہ کرتا ہو، فلسفہ کے متعلق رائے قائم کرنے کے لئے پہلے میں نے اس کا تحقیقی مطالعہ ضروری سمجھا، اگرچہ مجھے تصنیف و تدریس کے مشاغل سے بہت کم فرصت ملتی تھی، میرے حلقۂ درس میں بغداد میں تین تین سو طالب علم ہوتے تھے، پھر بھی میں نے اس کے لئے وقت نکالا، اور دو سال کے اندر اندر میں نے ان کے تمام علوم کا مطالعہ کر ڈالا پھر تقریباً ایک سال تک ان پر غور و فکر کرتا رہا، میں نے دیکھا کہ ان کے علوم چھ قسم کے ہیں، ریاضیات، منطقیات طبیعیات، سیاسیات، اخلاقیات اور الٰہیات، ابتدائی پانچ علوم کا مذہب سے نفیاً و اثباتاً کچھ تعلق نہیں، اور نہ مذہب کے اثبات کے لئے ان کے انکار کی ضرورت ہے، طبیعیات میں ان کے بعض نظریات کا کہیں کہیں مذہب سے تصادم ہوتا ہے، مگر وہ چند چیزیں ہیں، اس سلسلہ میں اصولاً یہ عقیدہ رکھنا چاہئے کہ طبیعت اللہ تعالیٰ کے اختیار میں ہے وہ خود مختار نہیں، البتہ جو لوگ ان علوم و مضامین میں فلاسفہ کی ذہانت اور باریک بینی دیکھتے ہیں وہ عمومی طور پر ان سے مرعوب ہو جاتے ہیں، اور سمجھتے ہیں کہ تمام علوم میں ان کا یہی حال ہوگا، حالانکہ یہ ضروری نہیں کہ جو شخص ایک فن میں ماہر ہو، وہ ہر فن میں ماہر ہو، پھر جب ان کی بے دینی اور ان کے انکار کو دیکھتے ہیں تو محض تقلیداً وہ بھی دین کا انکار و استخفاف کرنے لگتے ہیں،

دوسری طرف اسلام کے بعض نادان دوست فلاسفہ کے ہر نظریہ اور ہر دعویٰ کی تردید اپنا فرض اور اسلام کی خدمت سمجھتے ہیں، حتیٰ کہ طبعیات کے سلسلہ میں ان کی تمام تحقیقات کا بھی انکار کرنے لگتے ہیں، اس کا ایک مضر اثر یہ ہوتا ہے کہ جو لوگ ان علمی نظریات و تحقیقات کی صداقت کے قائل ہیں، اور ان کے نزدیک وہ چیزیں پایۂ ثبوت کو پہونچ چکی ہیں، ان کا اعتقاد خود اسلام کے بارے میں متزلزل ہو جاتا ہے، اور بجائے فلسفہ کے انکار کرنے کے وہ اسلام سے بدگمان ہو جاتے ہیں، لے دے کر جو فن مذہب سے متصادم ہوتا ہے، وہ الٰہیات ہے، اسی میں انھوں نے زیادہ ٹھوکریں کھائی ہیں، درحقیقت انھوں نے منطق میں جو شرطیں رکھی تھیں، ان کو وہ الٰہیات میں نباہ نہیں سکے، اسی لئے اس میں سخت اختلاف پایا جاتا ہے، غرض میں اس نتیجہ پر پہونچا کہ فلسفہ سے میری تشفی نہیں ہوگی، اور عقل تنہا تمام مقاصد کا احاطہ نہیں کر سکتی، اور نہ تمام مشکلات کی نقاب کشائی کر سکتی ہے، رہے باطنیہ تو مجھے اپنی کتاب "مستظہری" کی تالیف کے سلسلہ میں ان کے مذہب کے مطالعہ کرنے کا اچھی طرح موقع ملا، میں نے دیکھا کہ ان کے عقائد کا دارو مدار امام وقت کی تعلیم پر ہے، لیکن امام وقت کا وجود اور اس کی صداقت خود محتاج دلیل ہے، اور یہ دونوں حد درجہ مشتبہ ہیں، اب صرف تصوف باقی رہ گیا میں ہمہ تن تصوف کی طرف متوجہ ہوا، تصوف علمی بھی ہے عملی بھی ہے، میرے لئے علم کا معاملہ آسان تھا، میں نے ابو طالب مکی کی "قوت القلوب" اور حارث محاسبی کی تصنیفات اور حضرت جنید شبلی و بایزید بسطامی وغیرہ کے ملفوظات پڑھے، اور علم کے راستے سے جو کچھ حاصل کیا جاتا تھا، وہ میں نے حاصل کر لیا، لیکن مجھے معلوم ہوا کہ اصلی حقائق تک تعلیم کے ذریعہ سے نہیں، بلکہ ذوق و حال اور حالات کی تبدیلی سے پہنچا جا سکتا ہے، جو علوم میرا سرمایہ تھے خواہ وہ شرعی ہوں یا عقلی، ان سے مجھے وجودِ باری، نبوت اور معاد پر ایمان راسخ حاصل ہو چکا تھا، لیکن یہ بھی کسی دلیل محض سے نہیں، بلکہ ان اسباب و قرائن اور تجربوں کی بنا پر جن کی تفصیل مشکل ہے، مجھ پر یہ اچھی طرح سے واضح ہو چکا تھا کہ سعادتِ اُخروی کی صورت

صرف یہ ہے کہ تقویٰ اختیار کیا جائے اور نفس کو اس کی خواہشات سے روکا جائے، اور اس کی تدبیر یہ ہے کہ دارِ فانی سے بے رغبتی، آخرت کی طرف میلان و کشش اور پوری یکسوئی کے ساتھ توجہ الی اللہ کے ذریعہ قلب کا علاقہ دنیا سے ٹوٹ جائے، لیکن یہ جاہ و مال سے اعراض، اور موانع و علائق سے فرار کے بغیر ممکن نہیں، میں نے اپنے حالات پر غور کیا تو مجھے معلوم ہوا کہ میں سرتاپا علائقِ دنیوی میں غرق ہوں، میرا سب سے افضل عمل تدریس و تعلیم کا معلوم ہوتا تھا، لیکن ٹٹولنے سے معلوم ہوا کہ میری تمام تر توجہ ان علوم پر ہے، جو نہ تو اہم ہیں، اور نہ آخرت کے سلسلہ میں کچھ فائدہ پہنچانے والے ہیں، میں نے اپنی تدریس کی نیت کو دیکھا تو وہ بھی خالص توجہ اللہ نہ تھی، بلکہ اس کا باعث و محرک بھی محض طلب جاہ و حصول شہرت تھا، تب مجھے یقین ہوگیا کہ میں ہلاکت کے غار کے کنارے کھڑا ہوا ہوں، اگر میں نے اصلاحِ حال کی کوشش نہ کی تو میرے لئے سخت خطرہ ہے، میں ایک عرصہ تک اس سب کو چھوڑ دینے اور بغداد سے نکل جانے کا ارادہ کرتا رہا، لیکن اس کا فیصلہ نہ کرسکا، چھ مہینے اسی کشمکش میں گذر گئے کہ کبھی تو دنیاوی خواہشات کشش کرتیں اور کبھی ایمان کا منادی پکارتا کہ کوچ قریب ہے، تھوڑی عمر باقی ہے، طویل سفر درپیش ہے، اور یہ سب علم و عمل محض ریا و تخیلات ہیں، کبھی نفس کہتا کہ یہ عارضی حالت ہے، اللہ نے جو کچھ جاہ و عزت دے رکھی ہے، چھوڑنے کے بعد اگر پھر واپس آنے کا خیال ہوا تو اس کا دوبارہ حصول مشکل ہے، غرض اسی لیت و لعل میں چھ مہینے گذر گئے، یہاں تک کہ اب معاملہ بس سے باہر ہوگیا، زبان بھی رک گئی، جیسے اس میں تالا پڑ گیا ہو، میں کوشش کرتا تھا کہ آنے جانے والوں کی خوشی کے لئے ایک ہی دن پڑھادوں لیکن زبان بالکل ساتھ نہیں دیتی تھی، اور ایک لفظ بھی نہیں نکلتا تھا، زبان کی بندش سے قلب میں ایک رنج و غم کی کیفیت پیدا ہوئی، جس کے اثر سے قوت ہاضمہ نے بالکل جواب دے دیا، کھانے پینے کی خواہش بالکل جاتی رہی، یہاں تک کہ ایک گھونٹ پانی، کھانے کے ایک لقمہ کا ہضم کرنا بھی میرے لئے دشوار ہوگیا، رفتہ رفتہ تمام قوائے جسمانی پر ضعف کا غلبہ ہوا، یہاں تک کہ اطبا نے علاج سے ہاتھ اٹھالیا اور کہا کہ قلب پر

کوئی اثر ہے اور اس سے مزاج متاثر ہو گیا ہے، جب تک قلب سے یہ اثر نہ جائے، اس وقت تک علاج کچھ سودمند نہیں، جو میں نے دیکھا تو میں اس معاملہ میں بالکل بے بس ہوں، تو میں نے اللہ کی طرف رجوع کیا اور اضطراری کیفیت کے ساتھ اس سے دعا کی، اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اس جاہ و مال اور اہل و عیال کا چھوڑ دینا مجھے آسان معلوم ہونے لگا، میں نے مکہ کا قصد ظاہر کیا، اور میرے دل میں یہ تھا کہ میں شام کا سفر کروں گا، اور بڑے لطائف الحیل سے میں نے بغداد سے نکلنے کا سامان کیا، اہل عراق کو جب میرا قصد معلوم ہوا تو انھوں نے چاروں طرف سے مجھے ملامت کرنی شروع کی اس لئے کہ کسی کے خیال میں بھی یہ بات نہیں آسکتی تھی کہ اس ترک و انقطاع کا کوئی دینی سبب بھی ہو سکتا ہے، اس لئے کہ ان کے خیال میں مجھے دین کا بلند ترین منصب حاصل تھا، "ذَالِكَ مَبْلَغُهُمْ مِنَ الْعِلْمِ" پھر لوگوں نے طرح طرح کی قیاس آرائیاں شروع کیں، جو مرکزِ حکومت سے دور تھے انھوں نے خیال کیا کہ اس میں کچھ حکام کا اشارہ ہے، اور ان کے ایماء سے یہ خدمت ترک کی جارہی ہے، لیکن جن لوگوں کا حکومتی حلقوں سے تعلق تھا، وہ دیکھتے تھے کہ اہلِ حکومت کو کس قدر میرے قیام پر اصرار ہے، اور ان کی کیسی شدید خواہش ہے کہ میں اپنے کام میں مشغول رہوں، وہ یہ کہتے تھے کہ اس کے سوا اور کیا کہا جاسکتا ہے کہ اسلام کی اس رونق اور علمی چہل پہل کو کسی کی نظر لگ گئی ہے کہ یہ شخص سب چھوڑ چھاڑ کر جارہا ہے، غرض میں نے بغداد کو الوداع کہی، اور جو کچھ میرے پاس مال و متاع تھا، اس میں سے بقدر کفاف رکھ کر سب بانٹ دیا، بغداد سے میں شام آیا، اور وہاں دو سال کے قریب رہا، وہاں میرا کام عزلت و خلوت اور مجاہدے کے سوا کچھ نہ تھا، میں نے علم تصوف سے جو کچھ حاصل کیا تھا، اس کے مطابق نفس کے تزکیہ، اخلاق کی درستی و تہذیب اور ذکر اللہ کے لئے اپنے قلب کو مصفا کرنے میں مشغول رہا، میں مدت تک دمشق کی جامع مسجد میں معتکف رہا، مسجد کے منارے پر چڑھ جاتا، اور تمام دن دروازہ بند کئے وہیں بیٹھا رہتا، دمشق سے میں بیت المقدس آیا، وہاں بھی روزانہ صخرہ کے اندر چلا جاتا، اور دروازہ بند کرلیتا، سیدنا ابراہیمؑ کی

زیارت کے بعد میری طبیعت میں حج و زیارت کا شوق اور مکہ مکرمہ و مدینہ منورہ کے برکات سے استفادہ کا خیال ہوا، چنانچہ میں حجاز گیا، حج کرنے کے بعد اہل و عیال کی کشش اور بچوں کی دعاؤں نے مجھے وطن پہونچایا حالانکہ میں وطن کے نام سے کوسوں بھاگتا تھا، وہاں بھی میں نے تنہائی کا اہتمام رکھا، اور قلب کی صفائی سے غافل نہیں ہوا لیکن حوادث و واقعات، اہل و عیال کے افکار اور معاشی ضرورتیں طبیعت میں انتشار پیدا کرتی رہتی تھیں، اور دلجمعی اور سکونِ قلب مسلسل نہیں رہتا تھا لیکن میں اس سے مایوس نہیں ہوتا تھا، اور وقتاً فوقتاً اس سے لذت یاب ہوتا رہتا تھا، دس برس اسی حالت میں گذر گئے، ان تنہائیوں میں مجھے جو انکشافات ہوئے اور جو کچھ مجھے حاصل ہوا، اس کی تفصیل اور اس کا استقصا، تو ممکن نہیں لیکن ناظرین کے نفع کے لئے اتنا ضرور کہوں گا کہ مجھے یقینی طور پر معلوم ہوگیا، کہ صوفیا ہی اللہ کے راستے کے سالک ہیں، ان کی سیرت بہترین سیرت، ان کا طریق سب سے زیادہ مستقیم اور ان کے اخلاق سب سے زیادہ تربیت یافتہ اور صحیح ہیں، اگر عقلاء کی عقل، حکماء کی حکمت، اور شریعت کے رمز شناسوں کا علم مل کر بھی ان کی سیرت و اخلاق سے بہتر لانا چاہے تو ممکن نہیں، ان کے تمام ظاہری و باطنی حرکات و سکنات مشکوٰۃِ نبوت سے ماخوذ ہیں، اور نورِ نبوت سے بڑھ کر روئے زمین پر کوئی نور نہیں، جس سے روشنی حاصل کی جائے۔"

خلوت سے جلوت کی طرف

ممکن تھا کہ امام غزالیؒ اس خلوت و عزلت کی حالت میں رہ جاتے اور بقیہ عمر بھی روحانی لذت اور یکسوئی کے سکون و اطمینان میں گذار دیتے، لیکن اللہ تعالیٰ کو ان سے جو عظیم الشان کام لینا تھا، اس کے لئے ضروری تھا کہ وہ اس خلوت سے نکلیں اور درس و تدریس، تالیف و تصنیف اور اجتماعی زندگی اختیار کریں تاکہ خلائق کو نفع ہو، الحاد و فلسفہ کی تردید اور عقلی و علمی طور پر اسلام کی برتری اور صداقت ثابت کرنے کے لئے خصوصاً جب کہ اللہ تعالیٰ نے ان کو یقین و مشاہدے کے مقام تک پہنچا دیا تھا، عالم اسلام

میں ان سے زیادہ کوئی موزوں شخصیت نہیں تھی، چونکہ یہ کام خدا کو منظور تھا، اور اسلام کو اس کی سخت ضرورت تھی، اس لئے خود ان کی طبیعت میں اس کا داعیہ اور جذبہ پیدا ہوا، اور ان پر اس چیز کا غلبہ ہوا کہ یہی عزیمت کا کام اور انبیاء علیہم السلام کی نیابت اور وقت کا فریضہ اور افضل عبادت ہے، اپنے ان احساسات کو وہ خود بیان کرتے ہیں، اور خلوت سے جلوت میں آنے کا سبب تحریر کرتے ہیں :۔

"میں نے دیکھا کہ فلسفہ کے اثرات بہت سے مدعیان تصوف کی گمراہی بہت سے علماء کی بےعملی اور متکلمین کی غلط اور کمزور نمائندگی کی وجہ سے اکثر طبقات کا ایمان متزلزل ہو چکا ہے، اور عقائد پر اچھا خاصا اثر پڑ چکا ہے، بہت سے فلسفہ زدہ لوگ ظاہری احکام کے پابند بھی ہیں، لیکن نبوت اور دین کی حقیقت پر ان کا ایمان نہیں ہے، بعض لوگ محض جسمانی ورزش کے خیال سے نماز پڑھتے ہیں، بعض محض سوسائٹی، اہلِ شہر کی عادت کی پیروی، اور اپنی حفاظت کے لئے، بعض احکام شرعی کی مادی منفعتیں اور ان کے نہ کرنے کے دنیاوی نقصانات بتلاتے ہیں، اور اگر ان نقصانات سے بچا جا سکے تو ان کے ارتکاب میں کوئی حرج نہیں سمجھتے، میں نے دیکھا کہ میں ان شبہات کے دور کرنے کی صلاحیت رکھتا ہوں اور بآسانی اس پر قادر ہوں، یہاں تک کہ ان لوگوں کی پردہ دری مجھے اپنے مطالعہ اور ان کے علوم سے گہری واقفیت کی وجہ سے پانی پینے سے بھی زیادہ آسان معلوم ہوتی ہے، یہ دیکھ کر میرے دل میں شدت سے خیال پیدا ہوا کہ مجھے یہی کام کرنا چاہئے، اور یہی وقت کا فریضہ ہے، میں نے اپنے دل میں کہا کہ تجھے یہ خلوت و عزلت کب جائز ہے، مرض پھیل گیا ہے، اور طبیب خود بیمار ہیں، اللہ کی مخلوق ہلاکت کے کنارے پہونچ گئی ہے، پھر میں نے کہا کہ یہ عظیم الشان کام تم سے کیسے انجام پا سکے گا، عہدِ نبوت سے بہت بُعد ہو گیا ہے، باطل کا ہر طرف دور دورہ ہے، اگر تم نے خلقِ خدا کو ان کی محبوب و مانوس چیزوں سے ہٹانے کی کوشش کی تو سارا زمانہ تمہارا مخالف ہو جائے گا، تم تنہا کیسے ان کا مقابلہ کر سکو گے، اور کیسے زندگی بسر کرو گے، یہ تو جب ممکن تھا کہ زمانہ مساعد ہوتا، اور سلطانِ وقت دین دار اور صاحب اقتدار

ہوتا، میں نے یہ کہہ کر اپنے دل کو سمجھالیا، اور اپنے لئے عزلت و خلوت کی زندگی کو جائز قرار دے لیا، لیکن اللہ تعالےٰ کو کچھ اور منظور تھا، اس نے سلطانِ وقت کے دل میں خود ہی تحریک پیدا کردی اس نے مجھے اس فتنہ کا مقابلہ کرنے کے لئے نیشاپور پہونچنے کا تاکیدی حکم دیا، یہ حکم سلطانی کچھ اس نوعیت کا تھا کہ مجھے محسوس ہوا کہ اگر میں نے اس کی تعمیل نہ کی تو ناراضی تک نوبت پہونچے گی، میں نے خیال کیا کہ اب میرے لئے عذر باقی نہیں رہا، اب میری گوشہ نشینی اور خلوت پسندی محض سستی اور راحت طلبی اور تن آسانی کے لئے ہوگی، اور آزمائش اور تکالیف سے گریز، حالانکہ اللہ تعالےٰ فرماتا ہے:۔

"أَحَسِبَ النَّاسُ أَنْ يُتْرَكُوا أَنْ يَقُولُوا آمَنَّا وَهُمْ لَا يُفْتَنُونَ ○ وَلَقَدْ فَتَنَّا الَّذِينَ مِنْ قَبْلِهِمْ فَلَيَعْلَمَنَّ اللَّهُ الَّذِينَ صَدَقُوا وَلَيَعْلَمَنَّ الْكَاذِبِينَ ○" نیز اپنے رسولِ کریم سے جو اس کے بندوں میں سب سے معزز و کرم تھے، اس کا ارشاد ہے:۔

"وَلَقَدْ كُذِّبَتْ رُسُلٌ مِنْ قَبْلِكَ فَصَبَرُوا عَلَىٰ مَا كُذِّبُوا وَأُوذُوا حَتَّىٰ أَتَاهُمْ نَصْرُنَا وَلَا مُبَدِّلَ لِكَلِمَاتِ اللَّهِ وَلَقَدْ جَاءَكَ مِنْ نَبَإِ الْمُرْسَلِينَ ○"

میں نے چند اہلِ قلوب اور اہلِ مشاہدات سے بھی اس بارے میں مشورہ کیا، انھوں نے بھی بالاتفاق مجھے ترکِ عزلت کا مشورہ دیا، اس کی تائید میں بہت سے صلحاء نے متواتر خواب بھی دیکھے، جن سے پتہ چلتا تھا کہ میرا یہ اقدام بڑی خیر و برکت کا باعث ہوگا، اور پانچویں صدی کے شروع میں جس میں ایک ہی مہینہ باقی تھا، کوئی شاید عظیم الشان تجدیدی کام ہوگا، اس لئے کہ حدیث میں آیا ہے کہ اللہ تعالےٰ ہر صدی کے سرے پر ایسے آدمی کو پیدا کرتا ہے، جو اس امت کے دین کو تازہ کردیتا ہے، ان سب آثار و قرائن سے مجھے بھی اس کی امید پیدا ہوئی، اللہ تعالےٰ نے میرے لئے نیشاپور کا سفر کردیا اور میں نے اس کارِ عظیم کا ارادہ کرلیا، یہ ۴۹۹ھ کے ماہ ذیقعدہ کا قصہ ہے، بغداد سے ذیقعدہ ۴۸۸ھ میں نکلا تھا، اس طرح سے میری گوشہ نشینی کی مدت ۱۱ سال ہوتی ہے،

یہ سب تقدیر الٰہی کی کارفرمائی تھی، جس طرح بغداد سے نکلنا اور وہاں کے جاہ و اعزاز کو خیر آباد کہنا تصور میں نہیں آتا تھا، لیکن اللہ کے حکم سے، وہ سب کچھ آسان ہوگیا، اسی طرح سے اس عزلت کے زمانہ میں خلوت سے جلوت کی طرف دوبارہ آنے کا خیال بھی پیدا نہیں ہوتا تھا لیکن وقت پر اس کا بھی سامان ہوگیا"

غرض ذیقعدہ ۴۹۹ھ میں امام صاحب نے پھر نیشاپور کا رُخ کیا، اور مدرسہ نظامیہ کی مسندِ درس کو زینت دی اور دوبارہ تدریس و افادہ کا کام شروع کیا، لیکن اب امام غزالیؒ کے درس و تدریس اور اصلاح و ارشاد اور اس انقلاب سے پہلے کے تدریسی مشاغل اور وعظ و ارشاد میں فرق تھا، پہلے وہ نفس کے تقاضے اور طبیعت کے جذبہ سے کرتے تھے، اب وہ اپنے کو مامور اور آلۂ کار سمجھتے تھے، چنانچہ خود پوری صاف گوئی سے لکھتے ہیں:۔

"مجھے محسوس ہوتا ہے کہ اگرچہ علم کی نشر و اشاعت کی طرف میں نے پھر رجوع کیا ہے، لیکن درحقیقت اس کو پہلی حالت کی طرف بازگشت کہنا صحیح نہیں ہے، میری اس پہلی، اور دوسری حالت میں زمین و آسمان کا فرق ہے، میں پہلے اس علم کی اشاعت کرتا تھا، جو حصول جاہ کا ذریعہ ہے، اور میں اپنے قول و عمل سے اسی کی دعوت دیتا تھا، اور یہی میرا مقصود و نیت تھی، لیکن اب میں اس علم کی دعوت دیتا ہوں، جس سے جاہ سے دست بردار ہونا پڑتا ہے، اب میں اپنی اور دوسرے کی اصلاح چاہتا ہوں، مجھے نہیں معلوم کہ میں اپنے مقصود تک پہونچوں گا، یا اس سے پہلے میرا کام تمام ہوجائے گا، لیکن اپنے یقین و مشاہدہ کی بنا پر میرا ایمان ہے کہ اصل طاقت اللہ کی طاقت ہے، اسی سے آدمی گمراہی اور شر سے بچ سکتا ہے، اور ہدایت و طاعت کی طاقت حاصل کرسکتا ہے، دراصل میں نے اپنی طرف سے حرکت نہیں کی، اللہ مجھے حرکت میں لایا ہے، میں نے خود کام نہیں شروع کیا ہے، اللہ نے مجھے کام میں لگایا ہے، میری دعا ہے کہ پہلے اللہ میری اصلاح فرمائے، پھر مجھ سے دوسروں کی اصلاح ہو، پہلے مجھے راہ پر لگائے پھر مجھ سے دوسروں کی رہنمائی فرمائے، حق مجھ پر منکشف ہوجائے، اور اس کے

فضل سے مجھے اتباع کی توفیق ہو، باطل مجھ پر واضح کردے، اور مجھے اس کی پیروی سے بچائے۔[۱]

امام غزالیؒ کا تجدیدی کام

امام غزالیؒ نے اس کے بعد جو مجددانہ کام انجام دیا، اس کو دو حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔

۱۔ فلسفہ اور باطنیت کے بڑھتے ہوئے سیلاب کا مقابلہ اور اسلام کی طرف سے ان کی بنیادوں پر حملہ۔

۲۔ زندگی و معاشرت کا اسلامی و اخلاقی جائزہ اور ان کی تنقید و اصلاح۔

فلسفہ پر عملِ جراحی

ان کے پہلے اور سب سے بڑے کارنامہ کی تفصیل یہ ہے کہ فلسفہ الحاد، باطنیت کے خلاف اس وقت تک جو کچھ کیا جاتا رہا تھا، اس کی حیثیت صرف مدافعت و جواب دہی کی تھی، اس وقت تک فلسفہ اسلام پر حملہ آور تھا، اور متکلمین اسلام صفائی کے وکیل تھے، فلسفہ اسلام کی بنیادوں پر تیشہ چلاتا تھا، اور علم کلام سپر بننے کی کوشش کرتا تھا، اس وقت تک متکلمین و علماء اسلام کے گروہ میں کسی نے خود فلسفہ کی بنیادوں پر ضرب لگانے کی جرأت نہیں کی، فلسفہ "جن" مفروضات" پر قائم تھا، ان پر جرح کرنے اور خود ان کی علمی تنقید کرنے کی صدیوں تک کسی کو ہمت نہیں ہوئی، امام ابوالحسن اشعری کو چھوڑ کر جن کو فلسفہ سے براہِ راست واسطہ نہیں پڑا، پورے علم کلام کا لہجہ معذرت آمیز اور مدافعانہ تھا، امام غزالیؒ پہلے شخص ہیں، جنھوں نے فلسفہ کا تفصیلی و تنقیدی مطالعہ کیا، اس کے بعد "مقاصد الفلاسفہ" کے نام سے ایک کتاب لکھی، جس میں آسان زبان اور سلجھے ہوئے طریقہ پر منطق، الٰہیات اور طبیعیات کا خلاصہ پیش کیا، اور پوری غیر جانبداری کے ساتھ فلاسفہ کے نظریات اور مباحث کو مدون کر دیا، کتاب کے مقدمہ میں انھوں نے وضاحت کے ساتھ

---

[۱] المنقذ من الضلال ص ۲۸ تا ۳۰ مختصراً۔

لکھ دیا ہے کہ ریاضیات میں قیل وقال کی گنجائش نہیں، اور دین کا اس سے نفیاً واثباتاً کوئی تعلق نہیں، لیکن اصل مذہب کا تصادم الٰہیات سے ہے، منطقیات میں بھی شاذونادر غلطیاں ہیں، اگر کچھ اختلاف ہے تو اصطلاحات کا، طبیعیات میں ضرور حق وباطل کی آمیزش ہے، اس لئے ان کا موضوع بحث دراصل الٰہیات اور کسی قدر طبیعیات ہے، منطق محض تمہید و اصطلاحات کے لئے۔

اس کتاب سے فارغ ہو کر جس کی علم کلام کے حلقہ میں سخت ضرورت تھی، انھوں نے اپنی معرکۃ الآرا کتاب "تہافت الفلاسفۃ" لکھی جس کی خاطر انھوں نے "مقاصد الفلاسفۃ" لکھی تھی، اس میں انھوں نے فلسفہ کے الٰہیات و طبیعیات پر اسلامی نقطۂ نظر سے تنقید کی، اور اس کی علمی کمزوریوں، اس کے استدلال کے ضعف اور فلاسفہ کے باہم تناقض واختلاف کو پوری جرأت وقوت کے ساتھ ظاہر کیا، اس کتاب میں ان کا لہجہ پُراز اعتماد، ان کی زبان طاقت ور اور شگفتہ ہے، کہیں کہیں وہ طنزیہ اور شوخ طرزِ بیان بھی اختیار کر لیتے ہیں جس کی فلسفہ سے مرعوب حلقوں میں ضرورت تھی، اور جو بڑا نفسیاتی اثر رکھتا ہے، اس کے پڑھنے سے محسوس ہوتا ہے کہ کتاب کا مصنف فلاسفہ کے مقابلہ میں احساس کہتری کے ہر شائبہ سے پاک، اعتماد اور یقین سے لبریز، اور فلسفہ سے بالکل غیر مرعوب ہے، وہ فلاسفۂ یونان کو اپنی صف اور سطح کا آدمی سمجھتا ہے، اور ان سے مساویانہ و حریفانہ باتیں کرتا ہے، اس وقت ایک ایسے ہی آدمی کی ضرورت تھی، جو فلسفہ سے آنکھیں ملا کر بات کر سکے، اور بجائے مدافعت اور جواب دہی کے فلسفہ پر پورا وار کرے، امام غزالیؒ نے "تہافت الفلاسفۃ" میں یہی خدمت انجام دی ہے، اول سے آخر تک اس کتاب میں ان کا طرز یہی ہے، کتاب کی تمہید میں لکھتے ہیں:۔

"ہمارے زمانہ میں کچھ ایسے لوگ پیدا ہو گئے ہیں، جن کو یہ زعم ہے کہ ان کا دل ودماغ عام آدمیوں سے ممتاز ہے، یہ لوگ مذہبی احکام وقیود کو حقارت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں، اور اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ انھوں نے سقراط و بقراط، افلاطون وارسطو کے پرہیبت نام سنے، اور ان کی شان میں ان کے مقلدوں کی مبالغہ آرائیاں اور قصیدہ خوانی سنی، ان کو معلوم ہوا کہ ریاضیات، منطقیات، طبیعیات والٰہیات

میں انھوں نے بڑی موشگافیاں کی ہیں، اوران کا عقل وذہن میں کوئی ہمسر نہ تھا۔ اس عالی دماغی اور ذہانت کے ساتھ وہ مذاہب اوران کی تفصیلات کے منکر تھے، اوران کے نزدیک ان کے اصول و قواعد فرضی ومصنوعی ہیں، بس انھوں نے بھی تقلیداً انکارِ مذہب کو اپنا شعار بنالیا، اور تعلیم یافتہ اور روشن خیال کہلانے کے شوق میں مذاہب کا انکار کرنے لگے، تاکہ ان کی سطح عوام سے بلند سمجھی جائے اور وہ بھی عقلاء وحکماء کے زمرہ میں شمار ہونے لگیں، اس بنا پر میں نے ارادہ کیا کہ ان حکماء نے الٰہیات پر جو کچھ لکھا ہے، اس کی غلطیاں دکھاؤں اور ثابت کروں کہ ان کے مسائل اور اصول بازیچۂ اطفال اوران کے بہت سے اقوال ونظریات حد درجہ کے مضحکہ خیز بلکہ عبرت انگیز ہیں۔[1]

اس کتاب میں آگے چل کر ان کا زور بیان اور طنز آمیز طریقۂ تحریر اور شوخ ہو جاتا ہے اور ذات و صفات باری کے متعلق فلاسفہ کے عجائبات اور عقول وافلاک کا پورا شجرۂ نسب لکھ کر جو فلاسفہ نے تصنیف کیا ہے لکھتے ہیں :۔

قلنا ما ذکرتموہ تحکمات وھی علی التحقیق	تمہارا یہ سارا بیان اور تفصیلات محض دعاوی اور
ظلمات فوق ظلمات لو حکاہ الانسان	تحکمات ہیں بلکہ درحقیقت تاریکیوں پر تاریکیاں ہیں اگر
عن منام رآہ لاستدل علی سوء مزاجہ[2]	کوئی شخص اپنا ایسا خواب بھی دیکھنا بیان کرے
	تو اس کے سوء مزاج کی دلیل ہوگی۔

آگے چل کر لکھتے ہیں :۔

لست ادری کیف یقنع المجنون من نفسہ بمثل	مجھے حیرت ہے کہ دیوانہ آدمی بھی ان خود ساختہ
ھذہ الاوضاع فضلاً عن العقلاء الذین	باتوں پر کیسے قانع ہو سکتا ہے، چہ جائیکہ وہ عقلاء
یشقون الشعر بزعمہم فی المعقولات۔[3]	جو بزعم خود معقولات میں بال کی کھال نکالتے ہیں۔

[1] تہافت الفلاسفہ: ص۲-۳ مطبع علامیہ مصر [2] ایضاً ص۲۹-۳۰ [3] ایضاً ص۳۳

دوسری جگہ لکھتے ہیں:-

انتهى بهم التعمق فى التعظيم الى ان ابطلوا كل ما ينبغى من العظمة وقربوا حاله من حال الميت الذى لا خبر له بما يجرى فى العالم الا انه فارق الميت فى شعوره بنفسه فقط، وهكذا يفعل الله بالزائغين عن سبيله والناكبين عن طريق الهدى المنكرين لقوله تعالى "ما اشهدتهم خلق السموت والارض ولا خلق انفسهم" الظانين بالله ظن السوء المعتقدين ان امور الربوبية تستعلى على كنهها القوى البشرية المغرورين بعقولهم زاعمين ان فيها مندوحة عن تقليد الرسل واتباعهم فلاجرم اضطروا الى الاعتراف بان لباب معقولاتهم رجع الى ما لو حكى فى المنام لتعجب منه۔[1]

(مبداء اول) کی تعظیم میں مبالغہ کرنے سے ان کو اس حد تک پہنچا دیا کہ انھوں نے عظمت کے تمام شرائط و لوازم کو باطل قرار دے دیا، اور اللہ تعالیٰ کو (اپنے فلسفہ میں) اس مردہ کی طرح بنا دیا جس کو کچھ خبر نہیں کہ عالم میں کیا ہو رہا ہے، صرف اس بات میں وہ مردہ سے غنیمت ہے کہ اس کو اپنا شعور ہے (مردہ کو اپنا شعور بھی نہیں ہوتا) اللہ تعالیٰ ایسے لوگوں کا ایسا ہی حشر کرتا ہے، جو اس کے راستہ سے ہٹ جاتے ہیں اور ہدایت کے راستہ سے کترا جاتے ہیں جو اس آیت کے منکر ہیں "ہمیں نے ان کفار و مشرکین کو آسمان اور زمین کی پیدائش کے وقت گواہ نہیں بنایا، اور نہ ان کی پیدائش کے وقت" جو اللہ تعالیٰ سے بدگمانی کرتے ہیں، اور یہ اعتقاد رکھتے ہیں جن کا خیال ہے کہ امور ربوبیت کی حقیقت پر انسانی قوتیں حاوی ہو سکتے ہیں جو اپنی عقلوں پر نازاں ہیں اور سمجھتے ہیں کہ ان کی موجودگی میں پیغمبروں کی تقلید اور ان کے

[1] تہافت الفلاسفہ ص ۳۱

اتباع کی ضرورت نہیں، لامحالہ اس کا انجام یہ ہوا کہ
ان کی زبان سے (معقولات کے نام سے) ایسی ایسی
مضحکہ خیز باتیں نکلیں کہ اگر کوئی خواب بھی ایسا بیان
کرے تو لوگ تعجب کریں۔

"تہافت الفلاسفہ" کا اثر

فلسفہ پر یہ دلیرانہ تنقید اور کسی حد تک تحقیر علم کلام کی تاریخ میں ایک نئے دور کا آغاز تھا جس کا سہرا امام غزالیؒ کے سر ہے، بعد میں شیخ الاسلام ابن تیمیہؒ نے اس کی تکمیل کی، اور فلسفہ اور منطق کی لاش کی تشریح "(پوسٹ مارٹم) کا فرض انجام دیا، فلسفہ کی جراحی کے اس سلسلہ کا آغاز امام غزالیؒ ہی کی تصنیفات سے ہوتا ہے۔

"تہافت الفلاسفہ" نے فلسفہ کے خیالی طلسم پر کاری ضرب لگائی، اور اس کی عظمت، ذہنی تقدس کو کافی نقصان پہنچایا، اس کتاب کی تصنیف نے فلسفہ کے حلقوں میں ایک اضطراب اور غم و غصہ پیدا کر دیا، مگر سو برس تک اس کے جواب میں کوئی شایانِ شان کتاب تصنیف نہیں ہوئی، یہاں تک کہ چھٹی صدی ہجری کے آخر میں فلسفہ کے مشہور پرجوش وکیل اور ارسطو کے حلقہ بگوش ابن رشد (م ۵۹۵ھ) نے "تہافت التہافت" کے نام سے اس کا جواب لکھا، علماء مغرب کہتے ہیں کہ اگر ابن رشد فلسفہ کی حمایت کے لئے نہ کھڑا ہو جاتا تو فلسفہ غزالیؒ کے حملوں سے نیم جان ہو چکا تھا، ابن رشد کی حمایت نے اس کو سو برس تک کے لئے پھر زندگی عطا کر دی۔[1]

باطنیت پر حملہ

فلسفہ کے علاوہ امام غزالیؒ نے فتنۂ باطنیت کی طرف بھی توجہ کی انھوں نے قیام بغداد اور

---

[1] تاریخ فلاسفۃ الاسلام فی المشرق والمغرب محمد لطفی جمعہ ص۲

مدرسۂ نظامیہ کی تدریس کے زمانہ میں باطنیوں کی تردید میں خلیفۂ وقت کے اشارہ سے "المستظہری" تالیف کی تھی، جس کا تذکرہ انھوں نے اپنی خودنوشت تلاش حق کی کہانی "المنقذ من الضلال" میں کیا ہے، اس کتاب کے علاوہ اس موضوع پر ان کی تین کتابیں اور ہیں، جو غالباً اس بازگشت زمانہ کی تصنیف ہیں "حجۃ الحق"، "مفصل الخلاف"، "قاصم الباطنیہ"[1] ان کی تصنیفات کی فہرست میں اس موضوع پر دو کتابیں "فضائح الاباحیہ" اور "مواھم الباطنیۃ" اور بھی ملتی ہیں، باطنیت کے رد کے لئے درحقیقت اہل سنت کے حلقہ میں ان سے زیادہ موزوں آدمی ملنا مشکل تھا، وہ فلسفہ و تصوف اور ظاہری علوم اور حقائق و معارف دونوں کوچوں سے واقف تھے، اور باطنیہ کی اسرار فروشی اور ان کی عقلی سازش کا آسانی سے پردہ فاش کرسکتے تھے، باطنیہ کا بڑا حربہ فلسفہ اور اس کی اصطلاحات تھیں، اس لئے امام غزالیؒ جیسا جامع شخص اور عقلیات کا مبصر ان کی تردید کا کام کرسکتا تھا، چنانچہ اس کام کو انھوں نے بخوبی انجام دیا اور ان کو علمی طور پر بے وقعت اور بے اثر بنا دیا۔

زندگی اور معاشرت کا اسلامی جائزہ

امام غزالیؒ کا دوسرا اصلاحی کارنامہ زندگی و معاشرت کا اسلامی جائزہ اور اس کی اصلاح و تجدید کی کوشش تھی، ان کی اس کوشش کا نمونہ اور کامیاب نتیجہ ان کی زندہ جاوید تصنیف "احیاء علوم الدین" ہے۔

"احیاء علوم الدین"

تاریخ اسلام میں جن چند کتابوں نے مسلمانوں کے دل و دماغ اور ان کی زندگی پر سب سے زیادہ اثر ڈالا ہے، اور جن سے اسلامی حلقے طویل عرصہ تک متاثر رہے ہیں، ان میں "احیاء علوم الدین" کو ممتاز مقام

[1] ان تینوں کتابوں کا تذکرہ امام غزالی نے "جواہر القرآن" میں کیا ہے۔

حاصل ہے، حافظ زین الدین العراقی صاحب "الفیہ" (م ۸۰۶ھ) جنھوں نے احیاء کی احادیث کی تخریج کی ہے، کہتے ہیں کہ امام غزالیؒ کی احیاء العلوم اسلام کی اعلیٰ ترین تصنیفات سے ہے[۱] عبدالغافر فارسی جو امام غزالیؒ کے معاصر اور امام الحرمین کے شاگرد ہیں، کہتے ہیں کہ "احیاء العلوم" کے مثل کوئی کتاب اس سے پہلے تصنیف نہیں ہوئی،[۲] شیخ محمد گازرونی کا دعویٰ تھا کہ اگر دنیا کے تمام علوم مٹا دیئے جائیں تو میں "احیاء العلوم" سے ان کو دوبارہ زندہ کردوں گا،[۳] حافظ ابن جوزی نے بھی بعض باتوں سے اختلاف کے باوجود اس کتاب کی تاثیر اور مقبولیت کا اعتراف کیا ہے، اور اس کا خلاصہ "منہاج القاصدین" کے نام سے لکھا۔

یہ کتاب خاص حالات وکیفیات اور خاص جذبہ کے ساتھ لکھی گئی ہے، بغداد سے انھوں نے طلب حق اور تلاش یقین کا جو سفر شروع کیا تھا، اور جو دس برس کے مجاہدات اور بادیہ پیمائی کے بعد کامیابی پر ختم ہوا، احیاء العلوم اس سفر کی سوغات تھی، جو امام غزالیؒ اہلِ وطن کے لئے لائے، یہ ان کے قلبی تاثرات، علمی تجربات، اصلاحی خیالات اور وجدانی کیفیات کا آئینہ ہے۔

مولانا شبلی نے "الغزالی" میں لکھا ہے:-

"بغداد میں ان کو تحقیق حق کا شوق پیدا ہوا، تمام مذاہب کو چھانا کسی سے تسلّی نہیں ہوئی آخر تصوف کی طرف رُخ کیا، لیکن وہ قال کی چیز نہ تھی، بلکہ سرتاپا حال کا کام تھا، اور اس کا پہلا زینہ اصلاح باطن اور تزکیۂ نفس تھا، امام صاحب کے مشاغل اس کیفیت کے بالکل سدّراہ تھے، قبول عام و ناموری جاہ و منزلت مناظرات ومجادلات اور پھر تزکیۂ نفس شَتَّانَ بَیْنَھُمَا۔ ع

این رہ کہ می روی تو بمنزل نمی رود

آخر سب چھوڑ چھاڑ ایک کملی پہن بغداد سے نکلے، اور دشت پیمائی شروع کی سخت مجاہدات اور ریاضات کے بعد بزم راز تک رسائی پائی، یہاں پہونچ کر ممکن تھا کہ اپنی حالت میں مست ہوکر تمام عالم سے بے خبر بن جاتے لیکن

[۱] و [۲] و [۳] تعریف الاحیا بفضائل الاحیاء (شیخ عبدالقادر الحسنی)

ع بیاد آر حریفاں بادہ پیما را

کے لحاظ سے افادۂ عام پر نظر پڑی دیکھا تو آٓے کا آوا بگڑا ہوا ہے امیر وغریب عام وخاص عالم وجاہل، رند وزاہد سب کے اخلاق تباہ ہو چکے ہیں اور ہوتے جاتے ہیں علما جو دلیل راہ بن سکتے تھے، طلب جاہ میں مصروف ہیں، وہ یہ دیکھ کر ضبط نہ کر سکے اور اس حالت میں یہ کتاب لکھی، دیباچہ میں خود لکھتے ہیں کہ میں نے دیکھا کہ مرض نے تمام عالم کو چھا لیا ہے اور سعادتِ اخروی کی راہیں بند ہو گئی ہیں، علما جو دلیل راہ تھے، زمانہ ان سے خالی ہوتا جاتا ہے، جو رہ گئے ہیں، وہ نام کے عالم ہیں، جن کو ذاتی اغراض نے اپنا گرویدہ بنا لیا ہے، اور جنھوں نے تمام عالم کو یقین دلایا ہے کہ علم صرف تین چیزوں کا نام ہے، مناظرہ (جو فخر ونمود کا ذریعہ ہے) وعظ (جس میں عوام کی دلفریبی کے لئے رنگین اور مسجع فقرے استعمال کئے جاتے ہیں) فتویٰ (جو مقدمات کے فیصل کرنے کا ذریعہ ہے) باقی آخرت کا علم تو وہ تمام عالم سے ناپید ہو گیا ہے اور لوگ اس کو بھول بھلا چکے، یہ دیکھ کر مجھ سے ضبط نہ ہو سکا، اور مہر سکوت ٹوٹ گئی"[1]

تنقید واحتساب

کتاب کی تالیف سے جو اصلاح وتربیت امام غزالی کے پیش نظر تھی اس کے لئے آمادگی اور شوق اور اپنی اور اپنے ماحول کی اصلاح کا تقاضا پیدا کرنے کے لئے ضروری تھا کہ ان کمزوریوں اور خرابیوں کی نشاندہی کی جائے، جو علمی ودینی حلقوں اور مسلم معاشرہ میں بالعموم پھیلی ہوئی تھیں، نیز اس حقیقت کو آشکارا کیا جائے کہ نفس وشیطان نے کس کس طرح سے مختلف طبقوں کو فریب دے رکھا ہے، دینی مفاہیم وحقائق کس طرح تبدیل ہو گئے ہیں، لوگ حقائق ومقاصد سے ہٹ کر ظواہر واشکال اور رسوم میں کس طرح گرفتار ہیں، اور مقصد اصلی سعادتِ اخروی اور رضائے الٰہی سے کس طرح غافل ہیں، اس کے لئے انھوں نے

---

[1] الغزالی صفحہ ۱۴۲ و ۱۴۳

اپنے زمانہ کی زندگی اور معاصر سوسائٹی کا پورا جائزہ لیا، اور اس کی بے لاگ تنقید کی، اور ہر طبقہ کے امراض اور مغالطوں کو صفائی کے ساتھ بیان کیا، مقاصد اور وسائل و آلات میں فرق کیا، علوم میں دنیاوی علوم اور دینی علوم اور پھر علومِ محمودہ اور علومِ مذمومہ فرض اور فرض کفایہ کی تقسیم کی، وقت کے فریضہ اور اصل کام کی طرف توجہ دلائی، اہل دولت اور اغنیاء کی کوتاہیوں اور ان کی مخصوص بیماریوں کو کھول کر بیان کیا، سلاطین و حکام پر جرأت کے ساتھ تنقید کی، اور ان کے جبر و ظلم، خلاف شرع اعمال و قوانین کی مذمت کی، اس کے علاوہ جمہور و عوام کے امراض اور مختلف طبقوں اور مقامات کے منکرات، مذموم عادات اور مخالف دین رسوم و بدعات کی تفصیل کی، اس طرح یہ کتاب اسلام میں پہلی مفصل و مدلل کتاب ہے، جس میں پوری زندگی اور بگڑے ہوئے اسلامی معاشرہ کا قوت کے ساتھ احتساب کیا گیا ہے، اور اخلاقی بیماریوں کے عوارض و اسباب اور ان کا طریق علاج بتایا گیا ہے۔

علماء و اہل دین

امام غزالی کے نزدیک اس عالمگیر فساد، دینی و اخلاقی انحطاط کی سب سے بڑی ذمہ داری علماء پر ہے، جو ان کے نزدیک امت کا نمک ہیں، اگر نمک بگڑ جائے تو اس کو کون سی چیز درست کر سکتی ہے، بقول شاعر:۔

یامعشر القراء یا ملح البلد   ما یصلح الملح اذا الملح فسد

اے جماعت علماء! اے وہ جو شہر کا نمک ہو۔ بھلا یہ تو بتلاؤ کہ جب نمک ہی بگڑ جائے تو پھر اس کی اصلاح کس سے کی جائے

ایک جگہ امراضِ قلب کی کثرت اور عام غفلت کے اسباب بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:۔

الثالثۃ وھو الداء العضال فقد	تیسرا سبب اور وہ لاعلاج مرض کی حیثیت رکھتا
الطبیب فان الاطباء ھم العلماء	ہے، یہ ہے کہ مریض موجود ہیں اور طبیب مفقود،
وقد مرضوا فی ھذہ الاعصار مرضاً	طبیب علماء ہیں، اور وہ خود اس زمانہ میں بری
شدیداً وعجزوا عن علاجہ۔	طرح بیمار ہیں، اور علاج سے عاجز ہیں۔

ان کے نزدیک سلاطین وحکام کی خرابی کا سبب بھی علماء کی کمزوری اور اپنے فرائض سے غفلت ہے، ایک جگہ لکھتے ہیں۔

وبالجملة انّما فسدت الرعية	خلاصہ یہ ہے کہ رعیت کی خرابی کا سبب سلاطین
بفساد الملوك وفساد الملوك	کی خرابی ہے، اور سلاطین کی خرابی کا سبب علماء
بفساد العلماء فلولا القضاة السّوء	کی خرابی ہے اس لئے کہ اگر خدا نا ترس قاضی اور
والعلماء السّوء لقل فساد الملوك	علماء سو نہ ہوتے تو سلاطین اس طرح نہ بگڑتے
خوفاً من انكارهم[1]	اور ان کو علماء کی روک ٹوک کا کھٹکا ہوتا۔

ان کو علماء وقت سے شکایت ہے کہ وہ علماء سلف کی طرح امر بالمعروف اور نہی عن المنکر اور کلمۂ حق عند سلطان جائر کا فریضہ انجام نہیں دیتے، ان کے نزدیک اس کا سبب یہ ہے کہ خود بہت سے علماء دنیا طلبی اور جاہ طلبی کا شکار ہو گئے ہیں، وہ سلاطین وقت اور ارباب حکومت کے سامنے علماء حق کی جرأت و بیباکی اور احتساب و انکار کے موثر واقعات نقل کرنے کے بعد ارشاد فرماتے ہیں :-

• یہ تھا علماء کا طرز عمل اور امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کی شان، ان کو سلاطین کی شان و شوکت کی ذرا پرواہ نہ تھی، وہ اللہ تعالٰے کے فضل پر اعتماد رکھتے ہیں، اور ان کو اطمینان تھا کہ اللہ تعالٰے ان کی حفاظت فرمائے گا، اور وہ اللہ تعالٰے کے اس فیصلہ پر بھی راضی تھے کہ ان کو شہادت نصیب ہو، چونکہ ان کی نیت خالص تھی، اس لئے ان کے کلام سے پتھر موم ہو جاتے تھے اور بڑے سے بڑے سنگدل متاثر ہوتے تھے، اب تو حالت یہ ہے کہ طمع دنیا نے علماء کی زبانیں گنگ کر رکھی ہیں، اور وہ خاموش ہیں، اگر بولتے بھی ہیں تو ان کے اقوال و حالات میں مطابقت نہیں ہوتی، اس لئے کوئی اثر نہیں ہوتا، اگر آج بھی وہ خلوص و صداقت سے کام لیں اور علم کا حق ادا کرنے کی کوشش کریں تو ان کو ضرور کامیابی ہو، کیونکہ رعیت کی خرابی سلاطین کی خرابی

[1] احیاء علوم الدین ج ۲ ص ۳۳۲۔

کا نتیجہ ہے اور سلاطین کی خرابی علماء کی خرابی کا نتیجہ ہے اور علماء کی خرابی کی وجہ دولت اور جاہ کی محبت کا غلبہ ہے اور جس پر دنیا کی محبت غالب آجائے وہ ادنیٰ درجہ کے لوگوں پر بھی احتساب اور روک ٹوک نہیں کر سکتا، چہ جائیکہ سلاطین واکابر۔[1]

امام غزالی کے زمانہ میں ایک عالم کا علم فقہ کی جزئیات اور اختلافی مسائل میں مشغول تھا، مباحثہ ومناظرہ کا بازار گھر گھر اور ملک کے چپہ چپہ پر گرم تھا، مجالس وتقریبات اور بادشاہوں کے درباروں کی رونق بھی انہی مذہبی وفقہی مباحثوں اور مناظروں سے تھی، اس بارہ میں علماء وطلبہ کا انہماک اور غلو اتنا بڑھ گیا تھا کہ تمام دوسرے علوم ومشاغل اور خدمتِ دین کے شعبے نظر انداز ہوتے جا رہے تھے، حد یہ ہے کہ اصلاحِ نفس، تہذیب اخلاق اور سعادت اُخروی کا جس علم اور کوشش پر انحصار تھا، اس سے بھی توجہ ہٹ گئی تھی، امام غزالی اس صورت حال کی تنقید کرتے ہوئے لکھتے ہیں:۔

"اگر کسی فقیہ سے ان مضامین (صبر وشکر، خوف ورجاء وغیرہ، بالبغض وحسد وکینہ، ناشکری، دغا، فریب وغیرہ) میں سے کسی کی بابت حتیٰ کہ اخلاص وتوکل اور ریاء سے بچنے کے طریقوں کے متعلق سوال کیا جائے جن کا جاننا اس کے لئے فرض عین ہے اور اس کی طرف سے غفلت کرنے میں آخرت کی تباہی کا خطرہ ہے تو وہ جواب نہ دے سکے گا، اور اگر آپ لعان وظہار سبق ورمی کو دریافت کریں تو وہ ایسی ایسی باریک جزئیات کے دفتر کے دفتر سنا دے گا جن کی ضرورت مدتوں پیش نہیں آتی، اور اگر کبھی ضرورت پیش آجائے تو شہر میں ان کے متعلق فتویٰ دینے والا، اور بتانے والا ہر وقت موجود ہے، لیکن یہ عالم دن رات انہی جزئیات کے سلسلہ میں محنت کرتا رہے گا، اور ان کے حفظ ودرس میں مشغول رہے گا اور اس چیز سے غفلت برتے گا، جو دینی حیثیت سے اس کے لئے ضروری ہے، اگر اس سے کبھی اس بارہ میں سوال ہوتا ہے تو کہتا ہے کہ میں اس علم میں اس لئے مشغول ہوں کہ وہ علم دین ہے اور فرض کفایہ ہے اور وہ اس کے تعلیم وتعلم کے بارہ میں اپنے کو بھی

---

[1] احیاء علوم الدین ج ۲ ص ۳۱۲۔

مغالطہ دیتا ہے اور دوسروں کو بھی، حالانکہ سمجھدار آدمی خوب جانتا ہے کہ اگر اس کا مقصد فرض کفایہ کے حق کو ادا کرنا ہوتا اور اپنی ذمہ داری سے عہدہ برآ ہونا ہوتا تو وہ اس فرض کفایہ پر فرض عین کو مقدم رکھتا، بلکہ دوسرے فرض کفایہ بھی ہیں جن کو مقدم ہونا چاہیے مثلاً کتنے شہر ہیں جن میں صرف غیر مسلم طبیب ہیں جن کی شہادت احکام فقہ میں قبول نہیں کی جا سکتی لیکن ہم نہیں دیکھتے کہ کوئی عالم (اس کمی اور ضرورت کو محسوس کر کے) علم طب کی طرف توجہ کرتا ہو، اس کے بالمقابل علم فقہ بالخصوص خلافیات وجدلیات پر طلبہ ٹوٹ پڑتے ہیں، حالانکہ شہر ایسے علماء سے بھرا ہوا ہے جن کا مشغلہ فتویٰ نویسی اور مسائل بتلانا ہے، میرے سمجھ میں نہیں آتا کہ علماء دین ایسے فرض کفایہ میں مشغول ہونے کو کیسے درست سمجھتے ہیں جس کو ایک جماعت سنبھالے ہوئے ہے، اور ایسے فرض کو انھوں نے کیسے چھوڑ رکھا ہے جس کی طرف کوئی توجہ کرنے والا نہیں کیا اس کا سبب اس کے علاوہ اور کچھ ہے کہ طب کے ذریعہ سے اوقاف کی تولیت، وصیتوں کی تنفیذ اور یتیموں کے مال کی نگرانی و انتظام اور منصب قضا و افتاء پر تقرر اور ہمعصروں اور ہم چشموں میں فوقیت و امتیاز اور دشمنوں اور حریفوں پر حکومت و غلبہ حاصل ہونے کا کوئی امکان نہیں۔[1]

ایک دوسری جگہ تحریر فرماتے ہیں:-

"کوئی شہر بھی ایسا نہیں ہے جہاں کچھ ایسے کام نہ ہوں جو فرض کفایہ کی حیثیت رکھتے ہیں، اور ان کی طرف توجہ کرنے والا کوئی نہیں، اور علماء کو ان کی طرف مطلق التفات نہیں، زیادہ دور جانے کی ضرورت نہیں ایک طب ہی کو لیجئے کہ اکثر اسلامی شہروں میں مسلمان طبیب موجود نہیں جن کی شہادت شرعی امور میں معتبر ہو، علماء اس مشغلہ سے کوئی دلچسپی نہیں رکھتے، اس طرح سے امر بالمعروف اور نہی عن المنکر بھی فرض کفایہ ہے (لیکن متروک ہو رہا ہے)[2]"

وہ ایک جگہ عام جہالت و غفلت، دین سے ناواقفیت کا نقشہ کھینچتے ہوئے اور تبلیغ اور عمومی تعلیم کی ضرورت ظاہر کرتے ہوئے ارشاد فرماتے ہیں:-

---

[1] احیاء علوم الدین ج ۱ ص ۱۹ [2] ایضاً ص ۳۸۔

"اس شخص کے لئے جس کو اپنے دین کی واقعی فکر ہے، یہ (تبلیغ و تعلیم) خود ایسا مشغلہ ہے کہ پھر اس نادر الوقوع جزئیات دور از کار تفصیلات اور ان علوم میں موشگافی کرنے کی فرصت ہی نہیں ہو سکتی جو خود فرض کفایہ ہیں"[1]

امام غزالی محققانہ و مورخانہ حیثیت سے اس کی وجہ بتلاتے ہیں کہ اختلافی مسائل نے پچھلے دور میں کیوں اس قدر اہمیت اور مقبولیت حاصل کرلی، اور علماء نے اس کو اپنی ذہانتوں اور محنتوں کا میدان بنالیا، اور ان کی بہترین توجہات اس میں صرف ہونے لگیں، امام غزالی کے نزدیک اس کے کچھ تاریخی اسباب ہیں، اور ان کے نتیجہ میں ایسا ہونا بالکل قدرتی بات ہے، وہ تحریر فرماتے ہیں:۔

"آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کے بعد آپ کے جانشین حضرات خلفائے راشدین خود بڑے عالم، فقیہ اور صاحبِ فتویٰ تھے، ان کو شاذ و نادر کسی خاص موقع پر دوسرے اہلِ علم صحابہؓ سے مدد لینے کی ضرورت پیش آتی تھی، اس لئے علماء صحابہ علوم آخرت کے لئے فارغ اور ان میں منہمک تھے، اگر کوئی فتویٰ کا موقع پیش آتا، تو وہ ایک دوسرے پر محمول کرتے اور ہمہ تن متوجہ الی اللہ رہتے جیسا کہ ان کے حالات میں منقول ہے، جب ان لوگوں کی نوبت آئی جو خلافت کا استحقاق اور قابلیت نہیں رکھتے تھے، اور ان میں خود فیصلہ کرنے اور فتویٰ دینے کی صلاحیت نہیں تھی تو ان کو مجبوراً دوسرے علماء سے مدد لینی پڑی اور ان کو ساتھ رکھنا پڑا، تاکہ ان سے وہ فتویٰ حاصل کرتے رہیں، علماء تابعین میں ابھی ایسے لوگ زندہ تھے، جو قدیم روش پر تھے، اور جن میں دین کی حقیقت اور سلف کی شان تھی، جب ان کو بلایا جاتا تو وہ گریز کرتے، اور اعراض کرتے، خلفاء (بنی امیہ و بنی عباس) کو ان کو تلاش کرنا پڑتا، اور عہدۂ قضاء اور حکومت کے لئے ان سے اصرار کرنے کی کوشش پیش آتی، ان کے زمانہ کے لوگوں نے جب علماء کی یہ شان، سلاطین و حکام کا ایسا رجوع اور اہلِ علم کا یہ استغناء اور بے پرواہی دیکھی تو وہ سمجھے کہ حصولِ جاہ و عزت کے لئے فقہ کا علم بہترین نسخہ ہے، اسی سے حکام کا تقرب اور قضاء و افتاء کا منصب حاصل ہوتا ہے بس وہ اسی طرف متوجہ ہو گئے، انھوں نے حکام کے سامنے خود اپنی پیش کش کی اور

[1] احیاء علوم الدین ج ۱ ص ۳۸-۳۷

ان سے مراسم پیدا کئے، اور عہدوں اور انعامات کے خواہاں و امیدوار بنے، بعض کو تو کچھ ہاتھ نہ آیا، بعض کامیاب ہوئے، جو کامیاب بھی ہوئے وہ امیدواری کی ذلت سے محفوظ نہیں رہے، اور ان کو اپنے مقام سے نیچے اترنا، اور عامیانہ اور مبتذل سطح پر آنا پڑا، اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ علماء جو پہلے مطلوب تھے، اب طالب بن گئے پہلے حکام سے استغناء اور اعراض کی وجہ سے معزز تھے، اب ان کی طرف متوجہ ہونے کی وجہ سے ذلیل و خوار ہو گئے، البتہ اس کلیہ سے ہر دور میں کچھ اللہ کے بندے مستثنیٰ رہے ہیں۔

ان زمانوں میں سب سے زیادہ اہمیت، اور توجہ احکام اور فتاویٰ کی طرف تھی، اور انتظامات اور مقدمات کے سلسلہ میں ان کی ضرورت بھی زیادہ تھی، اس کے بعد بعض رؤساء و حکام کو اصول و عقائد سے دلچسپی پیدا ہوئی اور اس کا شوق ہوا کہ ہر فریق کے دلائل و مباحث سنیں اور ان کا بحث و مباحثہ دیکھیں، لوگوں کو ان رؤساء و حکام کے اس ذوق کا علم ہوا تو وہ علم کلام کی طرف رجوع ہوئے، مصنفین نے اس موضوع پر بکثرت تصنیفات کیں اور مناظرے کے اصول و قواعد کو مرتب کیا، اور رد و قدح کو ایک فن بنا دیا، ان لوگوں کا یہ بیان تھا کہ ان کا مقصود دین کی طرف سے مدافعت و جوابدہی، سنت کی نصرت، اور بدعت کی تردید و مخالفت ہے، ٹھیک جیسے ان لوگوں کے پہلے کے لوگ یہ کہتے تھے کہ فتاویٰ میں مشغولیت سے مقصود محض دین، خدمتِ خلق، اور بندگان خدا پر شفقت اور خیر خواہی ہے، اس کے بعد کچھ رؤساء و حکام ایسے ہوئے، جو علم کلام و مناظرہ کو نظرِ استحسان نہیں دیکھتے تھے، ان کا خیال تھا، کہ اس سے تعصب، جنگ و جدال اور بعض اوقات خونریزی و فساد کی نوبت آجاتی ہے، ان کو فقہی بحث و مناظرہ سے رغبت تھی، اور اس تحقیق کا شوق تھا کہ خصوصیت کے ساتھ امام ابو حنیفہ اور امام شافعی میں سے کس کا مذہب زیادہ صحیح ہے، لوگوں نے یہ دیکھ کر کلام و عقائد کو بالائے طاق رکھ دیا، اور اختلافی مسائل بالخصوص امام ابو حنیفہ اور امام شافعی کے اختلافات کو موضوعِ سخن بنا لیا، اور امام مالک، امام سفیان ثوری، اور امام احمد وغیرہ کے مذاہب و اختلافات کو نظر انداز کر دیا (اس لئے کہ ان کے اختلافات سے حکام کو دلچسپی نہ تھی) ان کا کہنا تھا کہ ان کا مقصد یہ ہے کہ شریعت کی باریکیوں کو

ظاہر کریں، مذاہب کے وجوہ و اسباب کو بیان کریں، اور فتاوی کے اصول کو مرتب و مدون کریں، انھوں نے اس میں کثرت سے تصنیفات کیں، اور استنباطات کئے، اور مجادلہ اور تصنیف کے فن کو ترقی دی، اور یہ شغلہ ابھی تک جاری ہے، ہمیں معلوم نہیں کہ آئندہ اللہ تعالیٰ کیا دکھائے گا، اور اس میں کیا تغیر ہوگا، تو دراصل اختلافی مسائل اور مناظرہ سے علماء کی دلچسپی اور ان کے انہماک کا سبب یہ ہے جو ہم نے بیان کیا، اگر اہل دنیا اور ارباب اقتدار کو (امام ابو حنیفہ اور امام شافعی کے علاوہ) کسی اور امام یا (اختلافی مسائل و مناظرہ کے علاوہ) کسی اور علم سے دلچسپی ہو جائے تو علماء بھی اسی کی طرف جھک پڑیں گے، اور اس کی وجہ یہی بیان کریں گے کہ ان کا مقصد علم دین اور قربتِ خداوندی کے سوا کچھ نہیں ہے۔[1]

اس کے بعد امام غزالی نے تفصیل کے ساتھ مناظرہ اور بحث و مجادلہ کے اخلاقی و روحانی نقصانات و مفاسد اور اس کے شرور و آفات بیان کئے، وہ عرصہ تک اس میدان کے شہسوار رہ چکے تھے، اس لئے اس سلسلہ میں ان کا بیان چشم دید شہادت کی حیثیت رکھتا ہے، اور مشاہدات اور ذاتی تجربات پر مبنی ہے۔[2]

اس سلسلہ میں ایک بڑا مغالطہ الفاظ کا تھا، امام غزالی کے زمانہ کے علوم مروجہ اور ان کی بگڑی ہوئی شکلوں کے لئے جو الفاظ عنوان کا کام دیتے تھے، وہ قدیم الفاظ تھے، جو قرآن و حدیث، صحابہؓ کے کلام اور علمائے سلف کی سیرتوں میں بہ کثرت آتے ہیں، مثلاً اختلافی مسائل فقہ کی نادر الوقوع جزئیات اور باریکیوں کے لئے بے تکلف "فقہ" کا لفظ استعمال ہوتا تھا، ہر طرح کے علمی اشغال اور شرعی و غیر شرعی علم کے لئے مطلق علم کا لفظ بولا جاتا تھا، علم کلام اور اس کے فلسفیانہ مباحث کو "توحید" کے نام سے موسوم کیا جاتا تھا، بے سروپا روایات و سطحیات اور عبارات آرائی و رنگین بیانی کو "تذکیر" کے لفظ سے یاد کیا جاتا تھا، ہر طرح کے نامانوس مضامین اور پیچیدہ عبارتوں کو "حکمت" کا خطاب دیا جاتا تھا، اور پھر ان سب خود ساختہ اعمال و اشغال پر وہ سب فضائل چسپاں کئے جاتے تھے، جو قرآن و حدیث میں ان علوم کی حقیقتوں کے بارہ میں وارد ہوئے ہیں، مثلاً فقہ

[1] احیاء علوم الدین ج ۱ ص ۳۸ [2] ملاحظہ ہو احیاء العلوم ج ۱ ص ۴۰ تا ۴۳

کی اس بگڑی ہوئی شکل (محض اختلافات و جزئیات کے لئے) قرآن مجید کی آیت "لِیَتَفَقَّهُوْا فِی الدِّیْنِ" اور حدیث "مَنْ یُّرِدِ اللّٰهُ بِهٖ خَیْرًا یُّفَقِّهْهُ فِی الدِّیْنِ" فلسفہ اور پانچویں صدی کے علم کلام کے لئے "وَمَنْ یُّؤْتَ الْحِکْمَةَ فَقَدْ اُوْتِیَ خَیْرًا کَثِیْرًا" کی بشارت[1]، جاہل اور ناخدا ترس واعظوں کے عامیانہ مواعظ کے لئے "فَذَکِّرْ اِنَّمَآ اَنْتَ مُذَکِّرٌ" اور دوسری آیات و احادیث منطبق کی جاتی تھیں، امام غزالی نے اس مغالطہ کا پردہ چاک کیا اور تفصیل سے بتلایا کہ یہ الفاظ اپنی اصل حقیقت کھو چکے ہیں، اور اپنے اصل مفہوم سے دور ہوتے ہوتے کہیں سے کہیں پہنچ گئے ہیں، قرونِ اولیٰ میں ان کا جو مفہوم تھا، اس سے علماء کے ان موجودہ مشاغل کو کوئی مناسبت نہیں، ان کی یہ بحث الفاظ کے سفر کی ایک دلچسپ روداد اور اصطلاحات اور عنوانات کے تغیر کی ایک سبق آموز تاریخ ہے اور بہت سی غلط فہمیوں کے ازالہ کا ذریعہ ہے، جو علمی اور دینی حلقوں میں اس وقت پھیلی ہوئی تھیں[2]۔

حکام و سلاطین

دوسرا جو امام غزالی کے نزدیک اس عالمگیر فساد، اخلاقی انحطاط اور دینی تنزل کا ذمہ دار تھا، وہ اہل حکومت اور سلاطین و امراء کا طبقہ تھا، امام غزالی سے دو سو برس پہلے حضرت عبداللہ ابن مبارک نے انہی دونوں (علماء و سلاطین) کے گروہوں کو دین کا بگاڑنے والا قرار دیا تھا۔

وهل افسد الدين الا الملوك　　　واحبار سوء ورهبانها

امام غزالی نے ایک ایسے زمانہ میں کہ بادشاہ مطلق العنان، اور ہر طرح کے قوانین و ضوابط سے بالاتر تھے، اور ان پر اعتراض کرنا موت کو پیام دینا تھا، اس طبقہ کا پوری جرأت کے ساتھ احتساب کیا اور ان پر آزادانہ تنقید کی، ان کے زمانہ میں بادشاہوں کے عطیوں اور پیشکشوں کو قبول کرنے کا عام رواج

---

[1] چنانچہ فلسفہ کی درسی کتابوں پرحتیٰ کہ قطب کی بعض بعض کتابوں کے سرورق پر اب بھی یہ آیت نظر آتی ہے۔

[2] ملاحظہ ہو احیاء علوم الدین۔ بیان مابدل من الفاظ العلوم۔ ج ۱ ص ۲۸-۳۴

تھا، امام غزالی نے اموال سلطانی کو ناجائز اور بالعموم مشتبہ اور حرام بتلایا۔ ایک جگہ تحریر فرماتے ہیں۔

اغلب اموال السّلاطین حرام فی هذه الاعصار والحلال فی ایدیهم معدوم او عزیز۔[1]

بادشاہوں کے مال اس زمانہ میں عموماً حرمت سے خالی نہیں، حلال مال ان کے پاس یا تو سرے سے ہوتا ہی نہیں یا بہت کم ہوتا ہے۔

دوسری جگہ لکھتے ہیں :-

ان اموال السلاطین فی عصرنا حرام کلها او اکثرها وکیف لا والحلال هو الصدقات والفیئ والغنیمة ولا وجود لها ولیس یدخل منها فی ید السلطان ولم یبق الا الجزیة وانها تؤخذ بانواع من الظلم لا یحل اخذها به فانهم یجاوزون حدود الشرع فی المأخوذ والمأخوذ منه والوفاء له بالشرط ثمّ اذا نُسب ذالك الی ما ینصب الیهم من الخراج المضروب علی المسلمین ومن المصادرات والرشا وصنوف الظلم لم یبلغ عشر معشار عشیرة۔[2]

سلاطین کے مال ہمارے زمانہ میں یا تو سب حرام ہیں، یا ان میں کا بڑا حصہ، اور یہ کچھ تعجب کی بات نہیں اس لئے کہ حلال مدیں زکوٰۃ، فے اور مال غنیمت کی ہیں اور ان کا کہیں وجود نہیں اور ان میں سے کوئی چیز بادشاہ تک پہونچنے نہیں پاتی، لے دے کے صرف جزیہ کی مد ہے اور اس کا حال یہ ہے کہ وہ مختلف ظالمانہ طریقوں سے وصول کیا جاتا ہے جن سے اس کا وصول کرنا جائز ہی نہیں، عمال سلطنت حدود شریعت سے تجاوز کرتے ہیں نہ مال کی مقدار میں شریعت کا کچھ پاس کیا جاتا ہے، نہ ذمی جن سے وصول کیا جاتا ہے ان کے بارہ میں شریعت کے احکام کا خیال کیا جاتا ہے نہ اس کے شرائط پورے کئے جاتے ہیں، پھر مسلمانوں پر مقرر شدہ خراج مالوں اور جائدادوں کی ضبطی رشوت اور انواع واقسام کے ظلم سے ان پر سونے چاندی کی جو بارش ہوتی ہے، اس کو

[1] احیاء علوم الدین ج ۲ ص ۱۲۰۔ [2] ایضاً ص ۱۲۲

اس جزیہ کو بھی کوئی نسبت نہیں۔

امام غزالی اس سے ترقی کرکے یہاں تک لکھتے ہیں کہ سلاطین وقت سے ان رقوم کا قبول کرنا بھی مناسب نہیں جن کے متعلق تحقیق یا گمان غالب ہے کہ وہ مشتبہ اور ناجائز نہیں ہیں اس لئے کہ اس میں بکثرت دینی مفاسد ہیں، اس موقع پر گذشتہ عہد کی مثالیں دی جا سکتی تھیں کہ سلف میں بعض علما و صلحا نے اپنے زمانہ کے خلفاء و سلاطین کی پیشکش بعض اوقات قبول کی ہیں، امام غزالی اس عہد کے ملوک و سلاطین اور ان دونوں زمانوں کے حالات کا فرق بیان کرتے ہیں :-

• دور اول کے ظالم سلاطین خلفاء راشدین کے عہد کے قرب کی وجہ سے اپنے ظالمانہ رویہ کا احساس رکھتے تھے، اور ان کو صحابہ و تابعین کی دلجوئی اور استمالت کا خیال رہا کرتا تھا۔ اور اس بات کی فکر رکھتے تھے کہ وہ کسی طرح ان کے عطیے اور انعامات قبول کرلیں، وہ ان کے پاس یہ رقمیں اور نذرانے بغیر ان کی طلب کے اور ان کی شان اور مرتبہ پر حرف آئے بغیر ان کی خدمت میں بھیجا کرتے تھے، بلکہ ان کے قبول کر لینے پر ان کے احسان مند ہوتے تھے، اور مسرت کا اظہار کرتے تھے، وہ حضرات بھی ان چیزوں کو لے کر تقسیم کر دیا کرتے تھے، وہ سلاطین کی اغراض میں ان کا ساتھ نہیں دیتے تھے، نہ ان سے ملاقات کرنے آتے تھے، نہ ان کے ساتھ اجتماع کو پسند کرتے تھے، نہ ان کو ان کی درازی عمر اور جاہ و اقبال کے باقی رہنے کی خواہش تھی، بلکہ وہ ایسے ظالموں کے لئے بد دعا کرتے تھے، ان کے بارہ میں آزادانہ اظہار خیال کرتے تھے اور ان کے منہ پر ان کے خلافِ شرع امور پر ٹوک دیا کرتے تھے اور تردید کرتے تھے، اس لئے اس کا خطرہ نہ تھا کہ جتنا ان کو سلاطین سے فائدہ پہونچا ہے اتنا ہی ان کو سلاطین کے ان [illegible] سے دینی نقصان پہونچے گا، اس لئے ان کے قبول کرنے میں کوئی قباحت نہ تھی۔

لیکن اس [illegible] عکس آج سلاطین ان ہی لوگوں کے ساتھ یہ فیاضی کرتے ہیں، جن کے متعلق ان کو یہ امید ہوتی ہے کہ وہ ان سے کام لے سکیں گے، ان سے ان کو سہارا حاصل ہوگا، وہ ان سے اپنی اغراض پوری کر سکیں گے، ان سے ان کے درباروں اور مجلسوں کی رونق بڑھے گی، اور وہ ہمیشہ دعا گوئی، ثنا خوانی اور

حاضر و غائب ان کی تعریف و توصیف میں لگے رہیں گے، اس سلسلہ میں پہلا درجہ سوال کی ذلت کا ہے، دوسرا خدمت کے لئے آمدورفت کا، تیسرا تعریف و دعاگوئی کا، چوتھا یہ کہ ضرورت کے وقت ان کے اغراض میں ان کی مدد کی جائے، پانچواں حاضر باشی اور دربارداری، جلوس کی شرکت، چھٹا اظہار محبت، دوستی اور حریفوں کے مقابلہ میں ان کی امداد و نصرت، ساتواں ان کے ظلم اور ان کے عیوب اور بداعمالیوں کی پردہ پوشی، اگر کوئی شخص ان میں سے کسی درجہ کے لئے تیار نہیں ہے، تو خواہ وہ امام شافعی کے مرتبہ کا ہو، سلاطین ایک پیسہ بھی ان پر خرچ کرنا گوارا نہیں کریں گے، اس لئے اس زمانہ میں ان بادشاہوں سے ایسے مال کا قبول کرنا بھی جائز نہیں جس کے متعلق یہ علم ہے کہ وہ حلال ہے، اس لئے کہ اس کے وہ نتائج ہوں گے جن کا اوپر ذکر ہوا ہے، اس مال کا تو کیا ذکر جس کے متعلق معلوم ہے کہ حرام یا مشتبہ ہے، اب اگر کوئی شخص ان سلاطین کے اموال کو جرأت کے ساتھ قبول کرتا ہے، اور صحابہ و تابعین کی مثال دیتا ہے، تو وہ درحقیقت فرشتوں کو لوہاروں پر قیاس کرتا ہے، اس لئے کہ ان کے اموال کو قبول کرنے کے بعد ان سے ملنے جلنے اور اختلاط کی ضرورت پیش آئے گی، ان کا لحاظ کرنا پڑے گا، ان کے اہلکاروں اور عمال کی خدمت کرنا پڑے گی، اور ان سے دبنا اور ان کے سامنے جھکنا گوارا کرنا پڑے گا، پھر ان کی تعریف اور ان کے در پر حاضری دینے سے چارہ نہیں، اور یہ سب معصیت کی باتیں ہیں۔

جب گذشتہ بیان سے سلاطین کی آمدنی کے ابواب اور اس میں سے حلال و حرام کی..... تفصیل معلوم ہوگئی تو اگر کسی طرح یہ ممکن ہو کہ انسان شاہی رقوم میں سے اتنا جزو قبول کرے جو حلال ہے، اور وہ اس کا مستحق ہے، اور وہ رقم اس کے پاس گھر بیٹھے آتی ہو، اور کسی حاکم یا ملازم کی تلاش و خدمت اور ان سلاطین و حکام کی تعریف و تصدیق کی ضرورت بھی نہ ہو، اور نہ ان کی امداد و اعانت کی شرط ہو، تو پھر (مسئلہ کے اعتبار سے) ایسی رقم کا قبول کرنا حرام نہیں ہے، لیکن دوسری خرابیوں اور بعد کے نتائج کے لحاظ سے مکروہ ضرور ہے۔[1]

---

[1] احیاء علوم الدین ج ۲ ص ۱۲۳۔

ایک دوسری جگہ سلاطین سے کنارہ کشی اور ان کے اعمال و مظالم سے نفرت کی تبلیغ کرتے ہیں:۔

الحالة الثانية ان يعتزل عنهم فلا يراهم ولا يرونه وهو الواجب والسلامة فيه فعليه ان يعتقد بغضهم على ظلمهم ولا يحب بقاءهم ولا يثني عليهم فلا يستخبر عن احوالهم ولا يتقرب الى المتصلين بهم۔

دوسری حالت یہ ہے کہ انسان ان سلاطین سے الگ تھلگ رہے کہ ان کا سامنا ہی نہ ہونے پائے اور یہی واجب ہے اور اسی میں حفاظت ہے انسان کو ان کے مظالم کی بنا پر ان سے بغض کا اعتقاد رکھنا چاہئے وہ نہ ان کی زندگی کا خواہشمند ہو نہ ان کی تعریف کرے نہ ان کے حالات کی جستجو رکھے نہ ان کے مقربین سے میل جول۔

شخصی سلطنت اور جابر و مستبد بادشاہوں اور خود مختار وزراء و حکام کے اس دور میں کہ جب پوری کی پوری قوم اور اس کے بیش قیمت سے بیش قیمت افراد کی زندگی ان کے رحم و کرم پر تھی اور جب شبہ پر قتل عام ہو سکتا تھا، امام غزالی کی یہ صاف گوئی اور سلطنت کے نظام مالیات آمد و صرف پر یہ کھلی ہوئی تنقید اور علماء کو سلاطین و حکام کے عطیوں کو قبول نہ کرنے کی ترغیب و تبلیغ (جو حکومت سے عدم تعاون اور اظہار ناراضگی یا بے تعلقی کی علامت سمجھی جاتی تھی) ایک اچھا خاصا جہاد تھا جس کی نزاکت کا اندازہ اخبارات اور تقریروں کی آزادی کے اس عہد اور جمہوری اور دستوری (خواہ برائے نام) دور میں صحیح طور پر نہیں لگایا جا سکتا۔

امام غزالی نے صرف تحریر و تصنیف پر اکتفا نہیں کی، بلکہ جب ان کو بادشاہ وقت سے ملنے کا اتفاق ہوا تو بھرے دربار میں بھی انھوں نے کلمۂ حق بلند کیا، ملک شاہ سلجوقی کا بیٹا سلطان سنجر پورے خراسان کا فرمانروا تھا، امام غزالی نے ملاقات کے وقت اس سے خطاب کر کے کہا کہ:۔

"افسوس کہ مسلمانوں کی گردنیں مصیبت اور تکلیف سے ٹوٹی جاتی ہیں اور تیرے گھوڑوں کی

گردنیں طوقہائے زریں کے بار سے"[1]

محمد بن ملک شاہ کو جو سنجر کا بڑا بھائی اور اپنے وقت کا سب سے بڑا بادشاہ تھا، ایک ہدایت نامہ لکھ کر بھیجا، جس میں اس کو حاکمانہ ذمہ داریوں، خوفِ خدا، اور اصلاحِ ملکی کی طرف متوجہ کیا۔[2]

مشرقی سلطنتوں میں عموماً حکومت کا تمام نظم و نسق چونکہ وزرا کے ہاتھ میں ہوتا تھا، اور وہی در و بست حکومت کے منتظم اور ذمہ دار ہوتے تھے، اس لئے انہی کی اصلاح و توجہ سے مملکت کی اصلاح ہو سکتی تھی، امام غزالی اس حقیقت سے واقف تھے، اس لئے انھوں نے سلاطین سلجوقیہ سے زیادہ ان کے وزرا کی طرف توجہ کی، ان کو مفصل خطوط اور ہدایت نامے لکھے، اور بڑی جرأت و صفائی کے ساتھ حکومت کی بدنظمیوں حقوق کی پامالی، حکام کی مردم آزاری، اہل کاران دولت کی دولت ستانی، ذمہ داروں کی غفلت کی طرف توجہ دلائی اور خدا کا خوف دلا کر اور پچھلے وزرا اور صدور حکومت کا انجام یاد دلا کر اصلاح و تنظیم کی طرف متوجہ کیا، ان کے یہ خطوط شخصی جرأت، اظہارِ حق اور تاثیر، و قوت انشا و تحریر کا اعلیٰ نمونہ ہیں۔

فخر الملک کو ایک خط میں لکھتے ہیں:-

"بداں کہ ایں شہر از قحط و ظلم ویران بود و تا خبر تو از اسفرائن و دامغان بود ہمہ می ترسیدند، دہقاناں از بیم غلہ می فروختند و ظالماں از مظلوماں عذر می خواستند اکنوں کہ اینجا رسیدی ہمہ ہراس و خوف برخاست و دہقاناں و خبازاں تبدیر غلہ دوکان نہادند، و ظالماں دلیر گشتند اگر کسی کار ایں شہر بخلاف ایں شکایت می کند دشمن دین تست، بداں کہ دعائے مردمانِ طوس بہ نیکی و بدی مجرب است و عمید را ایں نصیحت بسیار کردم نپذیرفت تا حال وے عبرت ہمہ گشت بشنو ایں سخنہائے تلخ با منفعت، از کسی کہ او طمع گاہ خویش را بہمہ سلاطین وداع کردہ است تا ایں سخن می تواند گفت، و قدر ایں بشناس کہ نہ ہمانا از کسے دیگر شنوی

---

[1] مکتوبات امام غزالی ص۱۰ [2] یہ ہدایت نامہ ایک رسالہ کی شکل میں ہے، اور "نصیحت الملوک" کے نام سے موسوم ہے چونکہ محمد شاہ کی زبان فارسی تھی، اس لئے یہ کتاب بھی فارسی زبان میں ہے۔

بدانکہ ہرکس کہ خبر ایں می گوید باتو طمع وے حجاب است میان او و کلمہ حق"۔

مجیر الدین کو ایک خط میں لکھتے ہیں :۔

"اما فریاد رسیدن خلق بر عموم واجب است کہ کار ظلم از حد گذشتہ و بعد ازاں کہ من شاہد ایں حال می بودم قریب یک سال است کہ از طوس ہجرت کردہ ام تا باشد کہ از مشاہدۂ ظالماں بے رحمت و بے حرمت خلاص یابم چوں بحکم ضروری معاودت افتاد ظلم ہمچناں متواتر است"۔

پھر وزرا ر سابقین کا انجام لکھ کر مجیر الدین کو متنبہ کرتے ہیں :۔

"و بحقیقت شناسد کہ ہیچ وزیر بدیں بلا مبتلا نبود کہ وے در روزگار ہیچ وزیر آں ظلم و خرابی نہ رفت کہ اکنوں می رود، و اگر چہ وے کارہ است ولیکن در خبر چنیں است کہ چوں ظالماں را روز قیامت مواخذہ کنند ہم متعلقاں را و ہم ایشاں را بداں ظلم بگیرند مسلماناں را کار باستخواں رسید و مستاصل گشتند و ہر دینارے کہ قسمت کردند اضعاف آں از رعیت بشد و بسلطاں نرسید و درمیانہ ارذال عواماں و ظالماں ببردند"۔

مسلمانوں کے دوسرے طبقے

طبقۂ علما و طبقۂ سلاطین و حکام کے علاوہ انھوں نے عام زندگی کا بھی جائزہ لیا ہے، اس میں جس قدر غیر دینی عناصر بدعات و منکرات، مغالطے اور خود فریبیاں داخل ہو گئی ہیں، ان کی تنقید کی ہے، احیاء العلوم کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ علمی اشتغال اور عالمانہ زندگی کے باوجود وہ اس وقت کی سوسائٹی اور عام زندگی سے واقف ہیں، اور ان کا زندگی کا مطالعہ بڑا وسیع اور ہمہ گیر ہے، انھوں نے مسلمانوں کی عمومی زندگی اور امت کے مختلف طبقات اور ان کی مختلف بیماریاں اور کمزوریوں کی جو نشاندہی کی ہے، اس سے ان کی قوت مشاہدہ اور قوتِ نظر کا اندازہ ہوتا ہے، انھوں نے ایک مستقل باب ان منکرات کی تفصیل میں

لکھا ہے، جو عادات میں داخل ہو چکے ہیں، اور لوگوں کو ان کا منکر (خلافِ شرع و اخلاق) ہونا محسوس نہیں ہوتا، اس سلسلہ میں انھوں نے پوری شہری زندگی پر نظر ڈالی ہے، اور اس کے نمایاں منکرات کا تذکرہ کیا ہے، اور مساجد سے لے کر بازاروں، سڑکوں، حمام اور دعوت کی محفلوں تک کے منکرات کو شمار کر دیا ہے[1]۔

انھوں نے "احیاء العلوم" کا ایک مستقل حصہ (کتاب ذم الغرور) ان لوگوں کے متعلق لکھا ہے جو مختلف قسم کے مغالطوں اور فریبِ نفس میں مبتلا ہیں، اس سلسلہ میں انھوں نے ہر طبقہ کے فریب خوردہ اشخاص اور ان کی غلط فہمیوں اور خود فریبیوں کا حال بیان کیا ہے، اور ان کے بعض ایسے نفسیاتی امراض اور خصوصیات کا ذکر کیا ہے، جن کو صرف ایک دقیق النظر مصلح اور ایک تجربہ کار ماہر نفسیات ہی دیکھ سکتا ہے، اس باب میں انھوں نے علماء، عبّاد و زہاد، امراء و اغنیاء، اور اہلِ تصوف سب کا جائزہ لیا ہے، اور سب کے خصوصی امراض اور بے اعتدالیوں کا پردہ فاش کیا ہے، اور ہر ایک کے متعلق بڑے پتہ کی باتیں لکھی ہیں، جس سے ان کی ذہانت دقیقہ رسی اور حقیقت شناسی کا اندازہ ہوتا ہے۔

ان کے زمانہ کے علماء نے جن جن علوم کے اشتغال میں حد سے تجاوز کر رکھا تھا، مثلاً فقہی جزئیات و خلافیات، علم کلام و مباحثہ و مجادلہ، وعظ و تذکیر، علم حدیث اور اس کے متعلقات نحو، لغت، شعر و مفردات کی تحقیق و حفظ میں غلو و مبالغہ اور زاہدوں کے ملفوظات و حالات کے یاد رکھنے پر اکتفاء، اس سب پر انھوں نے تنقید کی، اور ان کو اپنے ان مضامین کے بارہ میں جو غلط فہمی اور خوش گمانی تھی، اس کی تحقیق کی، اور حقیقتِ حال بیان کی، اور آخر میں اپنا یہ تجربہ بیان کیا، جو بالکل قرینِ قیاس ہے کہ "دنیاوی علوم مثلاً طب و حساب اور صنعتوں کے علم میں اس قدر خوش گمانی اور خود فریبی نہیں ہے جتنی علوم شرعیہ میں ہے، اس لئے کہ کسی شخص کا یہ خیال نہیں ہے کہ دنیاوی علوم فی نفسہ ذریعۂ مغفرت ہیں، بخلاف علوم شرعیہ کے کہ وہ اپنے نتائج و مقاصد سے قطع نظر کر کے بجائے خود بھی ذریعۂ مغفرت و تقرب سمجھے جاتے ہیں"[2]۔ اپنے زمانہ کے عباد و زہاد اور اہلِ تصوف

---

[1] ملاحظہ ہو احیاء علوم الدین۔ ج ۲ از ص ۲۹۴ تا ۲۹۹ [2] ایضاً ج ۳ ص ۳۴۳

کو بھی انھوں نے بڑی گہری نظر سے دیکھا ہے اور ان کی بڑی باریک باریک کوتاہیوں، خوش فہمیوں اور خود فریبیوں کو محسوس کیا ہے، ان کے بہت سے ظاہری اعمال و رسوم کی تہ میں ان کو نفس پرستی، جاہ طلبی، ریاکاری، ظاہری نقالی اور بے روح رسمیت نظر آئی ہے اور انھوں نے بڑی صفائی کے ساتھ اس کو ظاہر کر دیا۔[1]

اہل دولت اور اغنیا پر بھی انھوں نے بڑی صحیح گرفت کی ہے اور اس سلسلہ میں ان کے قلم سے حقائق نکل گئے ہیں، ایک جگہ فرماتے ہیں:-

"ان دولت مندوں میں بہت سے لوگوں کو حج پر روپیہ صرف کرنے کا بڑا شوق ہوتا ہے، وہ بار بار حج کرتے ہیں اور کبھی ایسا ہوتا ہے کہ اپنے پڑوسیوں کو بھوکا چھوڑ دیتے ہیں اور حج کرنے چلے جاتے ہیں، حضرت عبداللہ بن مسعودؓ نے صحیح فرمایا ہے کہ اخیر زمانہ میں بلا ضرورت حج کرنے والوں کی کثرت ہوگی، سفر ان کو بہت آسان معلوم ہوگا، روپیہ کی ان کے پاس کمی نہ ہوگی، وہ حج سے محروم و تہی دست واپس آئیں گے، وہ خود ریتوں اور چٹیل میدانوں کے درمیان سفر کرتے ہوں گے، اور ان کا ہمسایہ ان کے پہلو میں گرفتار بلا ہوگا، اس کے ساتھ کوئی سلوک اور غمخواری نہیں کریں گے۔

ابو نصر تمار کہتے ہیں کہ ایک شخص بشر بن الحارث کے پاس آئے اور کہا کہ میرا قصد حج کا ہے، آپ کا کچھ کام ہے؟ انھوں نے فرمایا کہ تم نے خرچ کے لئے کیا رکھا ہے؟ اس نے کہا دو ہزار درہم، بشر نے کہا کہ تمہارا حج سے مقصد کیا ہے، اظہار زہد یا شوقِ کعبہ یا طلب رضا، اس نے کہا طلبِ رضا، انھوں نے فرمایا کہ اچھا اگر میں تمہیں ایسی تدبیر بتلا دوں کہ تم گھر بیٹھے اللہ کی رضا حاصل کر لو، اور تم یہ دو ہزار درہم خرچ کر دو، اور تم کو یقین ہو کہ اللہ کی رضا حاصل ہوگئی تو کیا تم اس کے لئے تیار ہو؟ اس نے کہا بخوشی، فرمایا کہ اچھا پھر جاؤ، اس مال کو ایسے دس آدمیوں کو دے آؤ جو مقروض ہیں، وہ اس سے اپنا قرض ادا کر دیں، فقیر اپنی حالت درست کرے، صاحبِ عیال اپنے بال بچوں کا سامان کرے، یتیم کا منتظم یتیم کو کچھ دے کر اس کا دل خوش کرے اور

[1] ملاحظہ ہو احیاء علوم الدین ج ۳ - از ص ۳۴۵ تا ۳۵۰

اگر تمہاری طبیعت گوارا کرے تو ایک ہی کو پورا مال دے آؤ اس لئے کہ مسلمان کے دل کو خوش کرنا، بیکس کی امداد کسی کی مصیبت دور کرنا، کمزور کی اعانت سو نفلی حجوں سے افضل ہے، جاؤ جیسا میں نے تم سے کہا ہے ویسا ہی کر کے آؤ ورنہ اپنے دل کی بات ہم سے کہہ دو، اس نے کہا کہ شیخ سچی بات یہ ہے کہ سفر کا رجحان غالب ہے، بشر سن کر مسکرائے اور فرمایا کہ مال جب گندہ اور مشتبہ ہوتا ہے تو نفس تقاضا کرتا ہے کہ اس سے اس کی خواہش پوری کی جائے، اور وہ اس وقت اعمال صالحہ کو سامنے لاتا ہے، حالانکہ اللہ تعالیٰ نے عہد فرمایا ہے کہ صرف متقین کے عمل کو قبول فرمائے گا۔[1]

دولت مندوں کا ایک گروہ بربنائے بخل دولت کی حفاظت میں مشغول رہتا ہے، اور ایسی بدنی عبادات سے اس کو دلچسپی ہوتی ہے جس میں کچھ خرچ نہیں، مثلاً دن کا روزہ، رات کی عبادت اور ختم قرآن وہ بھی فریب میں مبتلا ہیں، اس لئے کہ مہلک بخل ان کے باطن پر مستولی ہے، اور اس کے ازالہ کے لئے مال کے خرچ کرنے کی ضرورت ہے، لیکن وہ ایسے اعمال میں مشغول ہیں جس کی ان کو کوئی خاص ضرورت نہیں، اس کی مثال ایسی ہے کہ ایک شخص کے کپڑے کے اندر سانپ گھس گیا ہے، اور اس کا کام تمام ہونے والا ہے، اور وہ سکنجبین کے تیار کرنے میں مشغول ہے تاکہ صفرا کو تسکین ہو، حالانکہ جو سانپ کا مارا ہے، اس کو سکنجبین کی ضرورت کب پڑے گی؟ بشر سے کسی نے کہا کہ فلاں دولت مند کثرت سے روزہ رکھتا ہے اور نمازیں پڑھتا ہے، انھوں نے فرمایا کہ بیچارہ اپنا کام چھوڑ کر دوسروں کے کام میں مشغول ہے، اس کے مناسب حال تو یہ تھا کہ بھوکوں کو کھانا کھلاتا، مساکین پر خرچ کرتا، یہ اس سے افضل تھا کہ اپنے نفس کو بھوکا رکھتا ہے اور اپنے لئے (نفلی) نمازیں پڑھتا ہے، اور ساتھ ہی ساتھ دنیا بھی سمیٹنے میں مشغول ہے، اور فقیر کو محروم رکھتا ہے۔[2]

عوام کے امراض اور خود فریبیوں کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:۔

---

[1] احیاء علوم الدین ج ۳ ص ۳۵۱-۳۵۲ [2] ایضاً ج ۳ ص ۳۵۲

"عوام دولت مندوں اور فقرا میں سے کچھ لوگ ہیں جن کو مجالس وعظ کی شرکت سے دھوکا لگا ہے، ان کا اعتقاد ہے کہ محض ان مجالس میں شرکت کافی ہے، انھوں نے اس کو ایک معمول بنا لیا ہے، وہ سمجھتے ہیں کہ عمل اور نصیحت پذیری کے بغیر بھی محض مجلس وعظ میں شرکت باعث اجر ہے، وہ بڑے دھوکہ میں مبتلا ہیں، اس لئے کہ مجلسِ وعظ کی فضیلت محض اس لئے ہے کہ اس سے خیر کی ترغیب ہوتی ہے، اگر اس سے خیر کی آمادگی اور اس کا جذبہ نہیں پیدا ہوتا تو اس میں کچھ خیر نہیں، رغبت بھی اس لئے محمود ہے کہ وہ عمل کی محرک ہے، اگر اس میں عمل پر آمادہ کرنے کی قوت نہیں تو اس میں بھی کوئی خیر نہیں، جو چیز کسی مقصد کا ذریعہ ہوتی ہے اس کی قیمت محض مقصد کا ذریعہ ہونے کی وجہ سے ہے، اگر وہ مقصد اس سے پورا نہ ہو تو وہ بے قیمت ہے، کبھی واعظ سے مجلسِ وعظ اور گریہ وبکا کی فضیلتیں سن سن کر اس کا دھوکا ہوتا ہے، کبھی کبھی اس پر عورتوں کی طرح ایسی رقت طاری ہوتی ہے، اور وہ رونے لگتا ہے، لیکن عزم کا کہیں پتہ نہیں ہوتا، کبھی کبھی کوئی ڈرانے والی بات سنتا ہے اور وہ تالیاں پیٹتا ہے، اور کہتا ہے، الٰہی تو بہ! خدایا تیری پناہ، اور وہ سمجھتا ہے کہ اس نے حق ادا کر دیا، حالانکہ وہ دھوکہ میں ہے، اس کی مثال اس مریض کی سی ہے، جو کسی طبیب کے مطب میں بیٹھتا ہے، اور نسخے سنتا رہتا ہے، لیکن اس سے اس کو صحت نہیں ہو سکتی، یا ایک بھوکا آدمی کسی سے کھانے کے انواع واقسام کی فہرست سنتا ہے، اس سے اس کی بھوک نہیں مٹ سکتی، اور اس کا پیٹ نہیں بھر سکتا، اسی طرح سے طاعات واعمال کی تشریح وتفصیل کا سنتے رہنا اللہ کے یہاں کچھ کام نہیں آئے گا، اسی طرح سے ہر وعظ جو تمہاری حالت میں ایسا تغیر نہ پیدا کرے جس سے تمہارے اعمال میں تغیر ہو جائے، اور اللہ تبارک وتعالےٰ کی طرف انابت اور رجوع (قوی ہو یا ضعیف) پیدا ہو، اور دنیا سے بے رغبتی اور اعراض پیدا ہو وہ وعظ تمہارے لئے وبال اور تمہارے خلاف ایک دلیل کا کام دے گا، اگر تم خالی خولی وعظ کو وسیلۂ نجات اور ذریعۂ مغفرت سمجھتے ہو تو دھوکہ میں ہو۔"[1]

---

[1] احیاء علوم الدین ج ۳ ص ۳۵۲

ایک اصلاحی و تربیتی کتاب

لیکن احیاء العلوم نری تنقیدی کتاب نہیں ہے، وہ اصلاح و تربیت کی ایک جامع اور مفصل کتاب ہے، اس کے مصنف نے ایک ایسی کتاب تالیف کرنے کی کوشش کی ہے، جو ایک طالب حق کے لئے اپنی اصلاح و تربیت اور دوسروں کی تعلیم و تبلیغ کے لئے تنہا کافی ہو سکے، اور بڑی حد تک ایک وسیع اسلامی کتب خانہ کی قائم مقامی کر سکے اور دینی زندگی کا دستور العمل بن سکے، اس لئے یہ کتاب عقائد[1] و فقہ، تزکیۂ نفس و تہذیب اخلاق اور حصول کیفیت احسانی (جس کے مجموعہ کا نام تصوف ہے) تینوں شعبوں کی جامع ہے

اس کتاب کی ایک نمایاں صفت اس کی تاثیر ہے، مولانا شبلی کے اس تاثر میں ہزاروں پڑھنے والے شریک ہوں گے کہ "احیاء العلوم" میں یہ عام خصوصیت ہے کہ اس کے پڑھنے سے دل پر عجیب اثر ہوتا ہے ہر فقرہ نشتر کی طرح دل میں چبھ جاتا ہے، ہر بات جادو کی طرح تاثیر کرتی ہے، ہر لفظ پر وجد کی کیفیت طاری ہوتی ہے، اس کا بڑا سبب یہ ہے کہ یہ کتاب جس زمانہ میں لکھی گئی، خود امام صاحب تاثیر کے نشہ میں سرشار تھے۔[2]

مصنف کے ان حالات و کیفیات کا (جو اس سفر اور کتاب کی تصنیف کے زمانہ میں ان پر طاری تھیں، اور جن سے یہ کتاب متاثر ہوئی ہے) پڑھنے والوں پر بعض اوقات یہ اثر پڑتا ہے کہ دل دنیا سے بالکل اچاٹ ہو جاتا ہے، زہد و تقشف کا ایک شدید اور بعض اوقات غیر معتدل رجحان پیدا ہوتا ہے، خوف و ہیبت کی ایسی کیفیت طاری ہو جاتی ہے، جو کبھی کبھی صحت و مشاغل پر اثر انداز ہوتی ہے، یہ اس کا نتیجہ ہے کہ خود مصنف پر اس کتاب کی تصنیف کے زمانہ میں ہیبت کا غلبہ تھا، اس لئے بہت سے مشائخ مبتدیوں کو اس کتاب کے مطالعہ کا مشورہ نہیں دیتے، اعتدال کامل اور توازن صحیح تو صرف سیرت نبوی اور احادیث

---

[1] امام غزالی چونکہ شافعی ہیں اور فقہ شافعی کا اس زمانہ میں زور بھی تھا، اس لئے اس کتاب میں انھوں نے فقہ شافعی ہی کو اختیار کیا ہے۔ [2] الغزالی ص ۳۳

کے مجموعہ کے مطالعہ اور کسی نمونۂ کامل کی صحبت و تربیت ہی سے حاصل ہو سکتا ہے۔

احیاء العلوم اور فلسفۂ اخلاق

امام غزالی صرف ایک بلند پایہ فقیہ، ایک صاحب اجتہاد متکلم اور ایک صاحبِ دل صوفی نہیں ہیں، اخلاقیات اسلامی اور فلسفۂ اخلاق کے ایک نامور مصنف اور ایک دقیق النظر اور نکتہ رس ماہر اخلاق و نفسیات بھی ہیں، اخلاق اسلامی اور فلسفۂ اخلاق کی کوئی تاریخ ان کے تذکرہ کے بغیر مکمل نہیں ہو سکتی[1] احیاء العلوم اس موضوع پر بھی ان کا ایک کارنامہ ہے، امراضِ قلب اور کیفیاتِ نفسانی پر انھوں نے جو کچھ لکھا ہے، وہ ان کی دقت نظر اور سلامتِ فکر کا نمونہ ہے، یہاں اس کا بھی ایک نمونہ پیش کیا جاتا ہے۔

حبِّ جاہ

احیاء العلوم میں "بیان سبب کون الجاہ محبوباً بالطبع حتی لا یخلو عنہ قلب الا بشدید المجاھدۃ" (جاہ انسان کو کیوں طبعی طور پر محبوب ہے یہاں تک کہ شدید مجاہدہ کے کسی قلب کا بھی اس سے خالی ہونا مشکل ہے) کے عنوان سے تحریر فرماتے ہیں:۔

"معلوم ہونا چاہئے کہ جس بناء پر سونا چاندی اور مال کی بقیہ اقسام محبوب ہیں بعینہ اسی بناء پر جاہ بھی محبوب ہوتا ہے، بلکہ جس طرح سونا چاندی سے زیادہ محبوب ہے، خواہ وہ مقدار میں برابر ہی کیوں نہ ہوں، اسی طرح جاہ کو مال پر فوقیت حاصل ہونا چاہئے، یہ تو تمہیں معلوم ہی ہے کہ درہم و دینار کی ذات میں کوئی کشش اور معنویت نہیں، اس لئے نہ وہ کھانے کے کام کے ہیں، نہ پینے کے، نہ شادی بیاہ کے، نہ پوشاک و لباس کے، اپنی

---

[1] ملاحظہ ہو ڈاکٹر محمد یوسف موسیٰ استاد جامعۃ القاہرۃ کی تصنیفات "تاریخ الاخلاق" اور "فلسفۃ الاخلاق وصلاتہا بالفلسفۃ الاغریقیۃ"

ذات کے لحاظ سے تو وہ اور نیکیاں برابر ہی ہیں لیکن ان دونوں میں کشش اور محبوبیت محض اس بنا پر ہے کہ وہ محبوبات کا ذریعہ اور خواہشات کی تکمیل کا سامان ہیں، یہی معاملہ جاہ کا ہے اس لئے کہ جاہ دلوں کی تسخیر کا نام ہے، اور جس طرح سے سونے چاندی کی ملکیت ایسی قدرت عطا کرتی ہے جس سے انسان اپنے تمام اغراض و مقاصد تک پہونچ سکتا ہے، اسی طرح سے بندگانِ خدا کے قلوب کی تسخیر تمام اغراض و مقاصد کی تکمیل کا ذریعہ ہے، اسی بنا پر سونا چاندی اور جاہ انسان کو محبوب ہے۔

لیکن محبوبیت میں شریک ہونے کے ساتھ جاہ کو مال پر کئی وجوہ سے ترجیح حاصل ہے، اور اس کی محبوبیت مال کی محبوبیت سے کہیں بڑھی ہوئی ہے، اس کے تین نمایاں اسباب ہیں، پہلا سبب تو یہ ہے کہ جاہ کے ذریعہ سے مال تک پہونچنا، مال کے ذریعہ سے جاہ تک پہونچنے کے مقابلہ میں آسان ہے، کھلی ہوئی بات ہے کہ ایک عالم باز اہد جس کا اعتقاد لوگوں کے دلوں میں بیٹھا ہوا ہے، اگر مال حاصل کرنا چاہے تو اس کے لئے کوئی بڑی بات نہیں اس لئے کہ لوگوں کے مال و دولت ان لوگوں کے دلوں کے تابع ہوتے ہیں، اب اگر ان کے دل کسی کے تابع ہوجائیں تو ان کے مال بھی اسی کے تابع ہوجائیں گے، اور وہ اپنی دولت بھی اسی کے قدموں پر نثار کردیں گے، اس کے برخلاف ایک کم مرتبہ اور ذلیل آدمی جس میں کمال کی کوئی صفت نہیں ہے، اگر اس کو کوئی خزانہ بھی مل جائے اور اس کو وہ جاہ حاصل نہیں ہے، جس سے وہ اپنے مال کی حفاظت کرسکے، اگر اس مال کے ذریعہ جاہ تک پہونچنا چاہے گا تو نہیں پہونچ سکے گا اس لئے کہ جاہ مال کا آلہ اور وسیلہ ہے، جو جاہ کا مالک ہے، وہ بآسانی مال کا بھی مالک بن سکتا ہے، لیکن جو مال کا مالک ہے، وہ ہر حالت میں جاہ کا مالک نہیں بن سکتا، اس لئے جاہ مال سے زیادہ محبوب ہوا۔

دوسرا سبب یہ ہے کہ مال کے لئے ہر وقت خطرہ ہے کہ وہ کسی آزمائش میں آجائے، چوری یا غصب کے ذریعہ تلف ہوجائے، بادشاہ اور ظالم بھی اس کی تاک میں لگے رہتے ہیں، یوں بھی اس کو محافظوں، پہرہ داروں اور محفوظ صندوقوں کی ضرورت ہے، پھر بھی اس کے لئے ہزار خطرے ہیں، لیکن دل جب کسی کا غلام بن جائے،

تو ان کے لئے کوئی آفت نہیں وہ دراصل محفوظ خزانے ہیں، جو چوروں، غارت گروں اور غاصبین کی دست رس سے باہر ہیں ملکیتوں میں سب سے محفوظ ملکیت زمین اور جائداد ہے، لیکن اس میں بھی غاصبانہ اور ظالمانہ کارروائیوں کا خطرہ ہے، اور پہرہ اور حفاظت کی اس کو بھی ضرورت ہے، لیکن دلوں کے خزانے خود ہی محفوظ و مامون ہیں، اور جاہ کو کسی غصب و سرقہ کا خطرہ نہیں، ہاں دلوں پر بھی تھوڑا بہت تصرف کیا جا سکتا ہے، اور جس سے عقیدت مندی ہے، اس کی طرف سے اعتقاد پھیرا جا سکتا ہے اور بدگمانی پیدا کی جا سکتی ہے، لیکن اس کا ازالہ مشکل نہیں اور ایسا عمل ہر ایک کے لئے آسان نہیں۔

تیسرا سبب یہ ہے کہ قلوب کی ملکیت میں ازدیاد و نمو اور اضافہ ہوتا رہتا ہے، اور اس کے لئے کسی محنت و جفاکشی کی ضرورت نہیں، اس لئے کہ قلوب جب کسی شخص کے علم یا عمل کی وجہ سے اس کے حلقہ بگوش اور معتقد ہو جاتے ہیں تو زبانیں اس کے کلمات کا کلمہ پڑھنے لگتی ہیں، لوگ دوسروں سے اس کا تذکرہ کرتے ہیں، اور نئے نئے دل اس کے مفتوح ہوتے جاتے ہیں، اسی بنا پر انسان طبعی طور پر شہرت اور ناموری کا دلدادہ ہے، اس لئے کہ جب اس کا چرچا دوسرے شہروں اور ملکوں میں ہوتا ہے، نئے نئے دل شکار ہوتے ہیں، اور اس کے حلقہ بگوش بنتے ہیں، اسی طرح اس کی محبت و عظمت ایک سے دوسرے کی طرف منتقل ہوتی اور بڑھتی رہتی ہے، اور کہیں جا کر رکتی نہیں، برخلاف مال کے کہ جو جتنی مقدار کا مالک ہے اس کا مالک ہے، اس میں بغیر سخت محنت اور جانفشانی کے اضافہ نہیں ہو سکتا، لیکن جاہ خود بخود نمو پذیر ہے، اور اس کی کوئی حد نہیں، مال میں ٹھہراؤ اور وقوف ہے، جاہ پھلتا پھولتا رہتا ہے، اسی لئے جب جاہ میں ترقی ہو جاتی ہے، اور شہرت عام حاصل ہو جاتی ہے، اور لوگ کسی شخص کی تعریف میں رطب اللسان ہوتے ہیں، تو مال و دولت اس کی نظر میں ہیچ ہو جاتا ہے، یہ تو مال کی جاہ پر ترجیح کے نمایاں اسباب ہیں، اگر تفصیل کی جائے تو اور بہت سے وجوہ نکلیں گے۔

اگر کوئی شخص کہے کہ اس تقریر کا نتیجہ تو یہ ہے کہ انسان کو مال و جاہ سے اسی قدر محبت ہونی

چاہئے کہ ان کے ذریعہ لذتیں حاصل کرکے اور تکلیفیں دور کردے، اس لئے کہ مال وجاہ محبوبات کا ذریعہ ہیں، اور محبوبات کے حصول کا ذریعہ بھی محبوب ہوتا ہے، لیکن اس کی کیا وجہ ہے کہ بات یہیں جاکر نہیں رکتی، اور انسان اموال کے جمع کرنے، خزانہ پر خزانہ اور ذخیرہ پر ذخیرہ کرنے میں مصروف رہتا ہے، یہاں تک کہ وہ ضروریات کی سرحد کو بھی پار کرجاتا ہے، یہاں تک کہ اس کا وہ حال ہوجاتا ہے (جو حدیث شریف میں بیان کیا گیا ہے) کہ اگر بندے کے پاس سونے کی دو گھاٹیاں ہوں تو وہ تیسری کا خواہشمند ہوگا اسی طرح سے انسان جاہ میں وسعت و ترقی کی فکر میں رہتا ہے، اور اس کی خواہش ہوتی ہے کہ اس کی شہرت ان دور دراز ملکوں تک بھی پہونچ جائے، جن کے متعلق وہ قطعی طور پر جانتا ہے کہ وہ ان ملکوں میں کبھی قدم بھی نہیں رکھے گا، اور کبھی وہاں کے رہنے والوں سے ملاقات کی بھی امید نہیں کہ ان کی تعظیم سے اس کو خوشی حاصل ہوگی یا وہ اپنی دولت اس پر خرچ کریں گے، یا اس کی غرض برآری کریں گے، یہ سب جانتے ہوئے بھی اس کو اس سے بڑی خوشی حاصل ہوتی ہے اور دل میں اس کا مزہ لیتا رہتا ہے کہ اس کا ان ملکوں میں چرچا ہو، اور اس کو وہاں جاہ حاصل ہو، بظاہر یہ ایک حماقت کی بات معلوم ہوتی ہے اس لئے کہ یہ ایک ایسی چیز کی خواہش ہے جس کا دنیا آخرت میں کوئی فائدہ نہیں، آخر اس کی کیا وجہ ہے؟

اس کا جواب یہ ہے کہ واقعی جاہ کی ایسی محبت دلوں کی ایک عمومی کیفیت ہے، جس کا ازالہ ممکن نہیں، اس کے دو سبب ہیں، ایک جلی جس کا ادراک سب کرسکتے ہیں، ایک خفی جو بڑا سبب ہے لیکن اتنا نازک ہے کہ عبقری و ذکی بھی اس کو بمشکل محسوس کرسکتے ہیں، اس لئے کہ اس کا تعلق نفس و طبیعت کی ایک ایسی خاصیت سے ہے جس کا علم باریک بیں اور ان اشخاص کو ہے جو طبائع انسانی کی گہرائیوں میں غوطہ لگا سکتے ہیں۔

پہلا سبب تو یہ ہے کہ انسان فطرۃً محبوب کے بارہ میں بدگمان واقع ہوا ہے، اور خطرات کو دور کرنا چاہتا ہے

ع عشق است و ہزار بدگمانی

انسان کی بسر اوقات کے لئے خواہ ضروری سامان موجود ہو، لیکن اس کی آرزوئیں بہت

طویل ہوتی ہیں، اس کے دل میں بار بار یہ خطرہ گذرتا ہے کہ جو مال فی الحال اس کی ضروریات کے لئے کافی ہے شاید تلف ہو جائے اور اس کو دوسرے مال کی ضرورت ہو، جب اس کے دل میں اس کا خیال آتا ہے تو اس کے دل میں فکر و غم کا جوش اٹھتا ہے، یہ خلش اس کی جبھی دور ہو سکتی ہے، جب اس کو دوسرے مال کے مل جانے سے اطمینان حاصل ہو جائے کہ اگر یہ پہلا مال ضائع ہو گیا، یا اس پر کوئی آفت آئی تو یہ دوسرا مال موجود ہے، اپنی ذات سے دلچسپی اور زندگی کی محبت کی بنا پر اپنی زندگی کا بہت طویل اندازہ لگاتا ہے، اور نئی نئی ضرورتوں کے پیش آنے کا حق رکھتا ہے، اور نئے نئے خطروں اور نئی نئی آفتوں کو فرض کرتا رہتا ہے، اور ان کے تصور سے لرزہ براندام رہتا ہے، اس لئے ان خطروں کو زائل کرنے کے وسائل سوچتا رہتا ہے، اور اس کا سب سے بڑا وسیلہ اس کی نظر میں یہ ہے کہ مال اتنا کثیر ہو کہ اگر اس کے کسی حصہ پر کوئی زد پڑے تو دوسرے حصہ سے وہ اپنا کام نکال سکے، یہ خوف اور فکرمندی اس کو مال کی کسی مخصوص مقدار پر قانع نہیں ہونے دیتی، اور وہ کسی حد پر بھی جا کر نہیں ٹھہرتا، یہاں تک کہ ساری دنیا کو اپنی ملک بنا لینے کی ہوس پیدا ہو جاتی ہے، اسی لئے رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ہے کہ "دو حریص ایسے ہیں، جو کبھی سیر نہیں ہوتے، علم کا حریص، اور مال کا حریص" بعینہٖ یہی علت دور دراز کے شہروں اور بیگانہ لوگوں کے دلوں میں اعتقاد اور جاہ پیدا ہونے کی خواہش میں ہوتی ہے، حب جاہ کا مریض بھی ان خیالی خطرات کو سوچتا رہتا ہے، جو پیش آ سکتے ہیں، ہو سکتا ہے کہ اس کو اپنے وطن کو خیرباد کہنا پڑے، ممکن ہے کہ دوسرے ملکوں کے لوگ اس کے شہر میں آجائیں اور اس کو ان سے کام پڑ جائے، اور جب تک یہ سب کچھ ممکن ہے اور یہ کوئی ناممکن الوقوع بات نہیں ہے کہ اس کو ان کی ضرورت پڑے، نفس کو اس بات کی فرحت ولذت ہوتی ہے کہ اس کا اعتقاد اور عظمت ان بعید الوطن لوگوں کے دل میں قائم ہے جن سے کبھی کام پڑ سکتا ہے۔

دوسرا سبب جو زیادہ طاقت ور ہے، وہ یہ کہ روح ایک امر ربانی ہے، قرآن مجید میں ارشاد ہے "وَيَسْئَلُونَكَ عَنِ الرُّوحِ قُلِ الرُّوحُ مِنْ أَمْرِ رَبِّي" حکم ربانی ہونے کا مطلب یہ ہے کہ وہ علوم مکاشفہ کے اسرار میں سے ہے، اور اس کے اظہار کی اجازت نہیں، خود آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم نے اس کی حقیقت کا اظہار نہیں فرمایا، لیکن اس کی حقیقت کا علم حاصل کئے بغیر بھی تم کو اتنا معلوم ہو سکتا ہے کہ قلب میں ایک تو بہیمی صفات (کھانے پینے اور جماع) کا میلان پایا جاتا ہے، ایک میلان درندوں کی صفات قتل وضرب و ایذا کا، اور ایک شیطانی صفات مکر و فریب کا اور اسی کے ساتھ ایک میلان صفات ربوبیت کبر و عظمت، عزت و تجبر اور سر بلندی کا بھی پایا جاتا ہے، اس لئے کہ قلب انسانی مختلف اصول و عناصر سے مرکب ہے، جن کی شرح و تفصیل میں بڑی طوالت ہے، قلب میں امر ربانی کا جو حصہ ہے اس کی بنا پر انسان کے اندر طبعی طور پر ربوبیت کی خواہش پائی جاتی ہے، ربوبیت کیا ہے؟ کمال میں یکتائی اور مستقل وجود جو کسی کا شرمندۂ احسان نہ ہو، اس لئے کمال صفاتِ الوہیت میں سے ہے، اور وہ انسان کو بالطبع محبوب ہے، اور کمال یہی ہے کہ وجود میں یکتا ہو، اس لئے کہ وجود میں کسی اور کی شرکت یقیناً ایک نقص ہے، آفتاب کا کمال یہ ہے کہ وہی ایک آفتاب ہے، اگر کوئی دوسرا آفتاب ہوتا، تو یہ اس آفتاب کے چہرۂ کمال کے لئے داغ ہوتا، اس لئے کہ وہ اپنی شان آفتابی میں یکتا نہ ہوتا اور وجود کی یکتائی اللہ تبارک و تعالےٰ ہی کو حاصل ہے اس لئے اس کے سامنے کوئی موجود (حقیقی) نہیں، اس کے علاوہ جو کچھ بھی ہے، وہ اس کی قدرت کا ایک کرشمہ ہے، جو اپنے بل بوتے پر نہیں رہ سکتا، وہ اسی کے سہارے قائم ہے تو درحقیقت اس کے سامنے کوئی موجود ہی نہیں، اس لئے کہ معیت کے لئے رتبہ کی مساوات ضروری ہے، اور رتبہ کی مساوات کمال کے لئے نقص ہے، کامل وہی ہے، جس کا کوئی ہم مرتبہ نہ ہو، اور جس طرح سے آفتاب کے نور کی تابش آفاق عالم میں آفتاب کا نقص نہیں بلکہ اس کا کمال ہے، آفتاب کے لئے نقص تو دوسرے ہم مرتبہ آفتاب کا وجود ہے، جبکہ اس کی ضرورت بھی نہیں، اسی طرح سے عالم میں ہر چیز کا وجود انوار قدرت کی تابش کا فیضان

ہے، یہ سب تابع ہیں، متبوع نہیں، پس ربوبیت کی شان وجود کی یکتائی ہے، اور یہی کمال ہے، انسان بھی بالطبع اس بات کا خواہشمند ہے کہ وہ کمال میں یکتا ہو، بعض مشائخ صوفیہ نے فرمایا ہے کہ ہر انسان کے باطن میں وہی بات مضمر ہے جس کو فرعون نے صاف صاف کہہ دیا تھا کہ "اَنَا رَبُّكُمُ الْاَعْلٰى" لیکن اس کو اس کا موقع نہیں ملتا[1]، عبودیت نفس اسی لئے نفس پر شاق اور ربوبیت اسی لئے طبعاً سہل اور مرغوب ہے، یہ اسی نسبت ربانی کی وجہ سے ہے، جس کی طرف "قُلِ الرُّوْحُ مِنْ اَمْرِ رَبِّيْ" میں اشارہ ہے۔

لیکن جب انتہائے کمال تک پہونچنے سے عاجز رہا تو اس کے کمال کی خواہش بالکلیہ زائل نہیں ہوئی، اب بھی وہ کمال کا خواہشمند اور متمنی ہے، اور اس کو کمال سے بالذات لذت حاصل ہوتی ہے، کمال کے علاوہ کسی اور مقصود کی خاطر نہیں (جس کا کمال ذریعہ ہے) بلکہ نفس کمال کی خاطر، دنیا میں جو بھی موجود ہے، اس کو اپنی ذات سے محبت اور اپنی ذات کے کمال سے محبت ہے اور ہر ایک کو ہلاکت اور فنا نامرغوب ہے، اس لئے کہ اس میں اپنی ذات اور اپنی صفاتِ کمال کا فنا سمجھتا ہے، کمال تو یہی ہے کہ وجود میں یکتائی حاصل ہو اور تمام موجودات پر غلبہ اور حکمرانی، اس لئے کہ کامل ترین کمال یہ ہے کہ دوسرے کا وجود تمہارا ہی رہینِ منت ہو، اگر وہ تمہارا رہینِ منت نہیں ہے تو کم از کم اتنا ہو کہ تم اس پر غالب ہو، اس بنا پر سب پر غلبہ حاصل کرنا انسان کو طبعی طور پر محبوب ہے، اس لئے کہ یہ کمال کی ایک قسم ہے، ہر موجود جو اپنی ذات کا شناسا ہے، وہ اپنی ذات کا عاشق ہے اور اپنی ذات کے کمال کا بھی عاشق ہے، اور اس سے اس کو لذت حاصل ہوتی ہے، اگر کسی چیز پر غلبہ کے معنیٰ یہ ہیں کہ تم اس پر اثر ڈال سکو اپنے ارادہ کے مطابق اس میں تغیر کر سکو اور اپنی مرضی کے مطابق اس میں تصرف کرو، انسان نے چاہا تو یہ تھا کہ اس کو تمام موجودات پر غلبہ حاصل ہو جائے لیکن موجودات میں سے کچھ موجود ایسے ہیں جو

---

[1] مولانا روم نے اس مضمون کو بیان کیا ہے:۔

نفس ما را کمتر از فرعون نیست　　　لیک او را عون ما را عون نیست

کسی تغیر کو قبول نہیں کرتے، جیسے اللہ کی ذات وصفات، اور بعض موجود ایسے ہیں جو تغیر کو قبول کرتے ہیں، لیکن ان پر مخلوق کی کوئی دست رس نہیں، اور اس پر ان کا کوئی زور نہیں چلتا، جیسے افلاک، کواکب، ملکوت، سماوات، نفوس، ملائکہ، جن وشیاطین اور جیسے پہاڑ وسمندر اور ان کے بیچ کی چیزیں، تیسری قسم وہ ہے جس میں انسان اپنی قدرت سے تغیر کر سکتا ہے، جیسے زمین اور اس کے اجزاء، معدنیات، نباتات، حیوانات، اور انہی میں سے انسانوں کے دل بھی ہیں، جو بدن ہی کی طرح تاثر اور تغیر قبول کرتے ہیں، جب موجودات کی ایک قسم وہ ہوئی جن پر انسان تصرف کی قدرت رکھتا ہے، جیسے ارضیات، اور ایک وہ جن پر قدرت نہیں رکھتا، جیسے ذات الٰہی، ملائکہ، افلاک، تو انسان کے اندر اس کی خواہش پیدا ہوئی کہ وہ کم سے کم آسمانوں کا زیادہ سے زیادہ علم حاصل کرے، ان کی حقیقت کو سمجھے، اور ان کے اسرار کو فاش کرے، اس لئے کہ یہ بھی ایک طرح کا غلبہ ہے، اس لئے جس کا پورا پورا علم حاصل ہو جاتا ہے وہ علم کے ماتحت ہو جاتا ہے، اور عالم ایک طرح سے غالب کی شان رکھتا ہے، (گویا اس علم سے اس کے جذبۂ حکومت واستعلاء کی کسی درجہ میں تسکین ہوتی ہے) اسی بنا پر اس کو اللہ تعالیٰ کی معرفت، ملائکہ، افلاک، کواکب، عجائب، سمٰوات، سیاروں اور سمندروں کے عجائبات وغیرہ کے علم کا شوق ہوتا ہے اس لئے کہ یہ ایک طرح کا تغلب ہی اور تغلب کمال کی ایک قسم ہے، اسی بنا پر تم دیکھتے ہو گے کہ جو شخص کوئی عجیب چیز بنا نہیں سکتا، وہ کم سے کم اس کے بنانے کا طریقہ جاننے کا خواہشمند ہوتا ہے، (گویا اس طرح سے وہ صنعت کی خواہش کی تسکین کرتا ہے) جو شطرنج وضع کرنے سے عاجز ہے، وہ کم سے کم شطرنج کھیلنے کا طریقہ سیکھ لینا چاہتا ہے، اور یہ جاننا چاہتا ہے کہ شطرنج کیسے بنائی گئی ہے، جو شخص کسی ہندسہ یا شعبدہ یا جر ثقیل کے آلے کو دیکھتا ہے، اور وہ محسوس کرتا ہے کہ وہ ایسا آلہ بنانے سے قاصر ہے، تو وہ اس کے بنانے کی کیفیت جاننا چاہتا ہے، اس کو اپنے اس عجز سے تکلیف اور علم کے کمال سے لذت حاصل ہوتی ہے، گویا وہ اس کی کمی اس سے پوری کرنا چاہتا ہے۔

دوسری قسم جس پر انسان قدرت حاصل کر سکتا ہے جیسے اراضیات وغیرہ تو وہ طبعی طور پر ان پر غلبہ اور اتنی قدرت حاصل کرنا چاہتا ہے کہ ان میں اپنی منشا کے مطابق تصرف کر سکے ان کی بھی دو قسمیں ہیں، اجسام اور ارواح، اجسام تو روپیہ پیسہ سامان ہے ان کے بارہ میں تو انسان یہ چاہتا ہے کہ اس کو ان میں ہر طرح کے تصرف کا اختیار ہو، وہ ان کو اٹھا بٹھا سکے جس کو چاہے دے جس کو چاہے نہ دے، اس لئے کہ یہ قدرت ہے اور قدرت کمال ہے اور کمال صفاتِ ربوبیت میں سے ہے، اور ربوبیت بالطبع محبوب، اسی لئے اس کو اموال کی محبت ہے، چاہے اس کو اپنے پہننے کھانے اور اپنی خواہشات کی تکمیل کے لئے کبھی بھی اس کی ضرورت نہ ہو اسی طرح سے غلام رکھنا، اور آزاد شریف لوگوں کو اپنا غلام بنانا خواہ زبردستی اور تغلب سے ہو، یہاں تک کہ ان کے اجسام اور ان کی ذات میں تصرف کر سکے، یعنی بیگار لے سکے، چاہے ان کے دل غلام نہ بنیں، اس لئے کہ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ ان غلاموں کے دل میں اس کا اعتقاد نہیں ہوتا، اور ان کو اس سے محبت نہیں ہوتی، لیکن کبھی محض غلبہ بھی محبت کا قائم مقام بن جاتا ہے، انسان کو ایسا رعب و داب بھی لذیذ اور عزیز ہے، جو زبردستی کی بنا پر ہو، اس لئے کہ اس میں قدرت کا اظہار ہوتا ہے، اور انسان اس کا دلدادہ ہے۔

دوسری قسم آدمیوں کے نفوس اور قلوب ہیں، اور یہ روئے زمین کی سب سے زیادہ بیش قیمت اور نفیس چیز ہے، اور انسان چاہتا ہے کہ اس کو ان قلوب پر غلبہ و قدرت حاصل ہو جائے تاکہ وہ اس کے لئے مسخر ہو جائیں، اور اس کے ایک اشارہ پر کام کریں، اس لئے کہ اس میں غلبہ کا کمال پایا جاتا ہے، اور صفاتِ ربوبیت سے مشابہت ہے، قلوب صرف محبت سے مسخر ہوتے ہیں، اور محبت کمال کے اعتقاد سے پیدا ہوتی ہے، اس لئے کہ ہر کمال محبوب ہے، اور کمال اس لئے محبوب ہے کہ وہ صفاتِ الٰہیہ میں سے ہے، اور صفاتِ الٰہیہ سب انسان کو بالطبع محبوب ہیں، اس لئے کہ انسان میں ایک نسبتِ ربانی پائی جاتی ہے، اور یہ نسبت غیر فانی ہے، نہ موت اس کو ختم کر سکتی ہے، اور نہ مٹی اس پر قابو پا سکتی ہے، یہی نسبتِ ربانی ایمان و معرفت کا محل ہے، وہی بقائے الٰہی تک پہنچنے والی ہے، اور وہی اس کے لئے کوشش کرنے والی ہے، جاہ کے معنی قلوب کا مسخر ہونا ہے، اور جس کے لئے قلوب مسخر

ہو گئے اس کو ان پر قدرت و استیلا رحاصل ہو گیا، اور قدرت و استیلا رکمال ہے اور کمال اوصافِ ربوبیت میں سے ہے، پس قلب کو جو چیز بالطبع محبوب ہے، وہ کمال ہے، خواہ علم سے حاصل ہو، خواہ قدرت سے، مال و جاہ بھی اسبابِ قدرت میں سے ہیں اس لئے کہ وہ محبوب کا وسیلہ ہیں، اور محبوب کا وسیلہ بھی محبوب ہوتا ہے، پھر نہ معلومات کی کوئی انتہا ہے، نہ مقدورات کی کوئی انتہا ہے، اور جب تک کہ ایک چیز بھی دنیا میں باقی ہے، جو معلوم کی جا سکتی ہے اور ایک چیز بھی دنیا میں موجود ہے، جس پر قدرت حاصل کی جا سکتی ہے تو نہ شوق کو سکون ہے اور نہ نقص کو زوال اسی لئے آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ دو حریص کبھی آسودہ نہیں ہو سکتے۔[1]

محاسبۂ نفس

کتاب کا موثر ترین حصہ وہ ہے، جہاں امام غزالی نصیحت اور ترغیب و ترہیب پر قلم اٹھاتے ہیں، اور دنیا کی بے ثباتی، آخرت کی عظمت، ایمان و عمل صالح کی ضرورت، اصلاح و تہذیب نفس کی اہمیت اور امراض قلبی و نفسانی کی مضرت کی طرف توجہ دلاتے ہیں، اس موقع پر وہ بیک وقت ایک شیوہ بیان واعظ، ایک نکتہ شناس حکیم اور ایک تجربہ کار و ماہر نفسیات معالج کی حیثیت سے سامنے آتے ہیں، جو اپنے مخاطبین کے حالات اور کمزوریوں اور ضرورتوں سے خوب واقف ہے، وہ ان کی طرف سے ان سے بہتر وکالت کرتا ہے، اور بڑی قابلیت اور انصاف کے ساتھ ان کے عذر اور دلائل پیش کرتا ہے، پھر ایک ماہر محقق و عالم نفسیات کی طرح ان میں سے ایک ایک کا جواب دیتا ہے، پھر ایک شفیق معالج اور ایک خیر خواہ مربی کی طرح ان کا علاج تجویز کرتا ہے، اس لئے ان کے مواعظ صرف واعظانہ تاثیر ہی کا نمونہ نہیں، حکمت و بلاغت کا بھی نمونہ ہیں، ہر دور میں ہزاروں آدمیوں نے ان کے مواعظ و مکالمات سے فائدہ اٹھایا ہے، اور کثیر التعداد آدمیوں کی اصلاح و انقلاب کا ذریعہ بنے ہیں، کتاب کے آخری چوتھے حصہ (ربع رابع) میں اس کا بڑا ذخیرہ ہے، یہاں اس کا ایک اقتباس

[1] احیاء علوم الدین ج ۳ ص ۲۴۴، ۲۴۱

پیش کیا جاتا ہے، جہاں انھوں نے نفس کو زجر و توبیخ کی ہے، اور پڑھنے والوں کو تعلیم دی ہے کہ ان کو اپنے نفس سے کس طرح مکالمہ کرنا چاہیئے اور منزلِ آخرت کے لئے کس طرح اس کو تیار کرنا چاہیئے "المرابطۃ السادسۃ فی توبیخ النفس ومعاتبتہا" عنوان کے تحت نفس سے مکالمہ کرتے ہوئے ایک جگہ لکھتے ہیں:-

"اے نفس ذرا انصاف کر! اگر ایک یہودی تجھ سے کہہ دیتا ہے کہ فلاں لذیذ ترین کھانا تیرے لئے مضر ہے تو تو صبر کرتا ہے، اور اسے چھوڑ دیتا ہے، اور اس کی خاطر تکلیف اٹھاتا ہے، کیا انبیاء کا قول جن کو معجزات کی تائید حاصل ہوتی ہے، اور فرمانِ الٰہی اور صحفِ سماوی کا مضمون تیرے لئے اس سے بھی کم اثر رکھتا ہے، جتنا کہ اس یہودی کا ایک قیاس و اندازہ، عقل کی کمی اور علم کی کمی اور کوتاہی کے ساتھ تعجب ہے! اگر ایک بچہ کہتا ہے کہ تیرے کپڑوں میں بچھو ہے تو بغیر دلیل طلب کئے اور سوچے سمجھے اپنے کپڑے اتار پھینکتا ہے کیا انبیاء، علماء، اولیاء اور حکماء کی متفقہ بات تیرے نزدیک اس بچہ کی بات سے بھی کم وقعت رکھتی ہے؟ یا جہنم کی آگ اس کی بیڑیاں، اس کے گرز، اس کا عذاب، اس کا زقوم، اور اس کے آنکڑے، اس کے سانپ، بچھو اور زہریلی چیزیں تیرے لئے ایک بچھو سے بھی کم تکلیف دہ ہیں، جس کی تکلیف زیادہ سے زیادہ ایک دن یا اس سے کم رہتی ہے، یہ عقلمندوں کا شیوہ نہیں، اگر کہیں بہائم کو تیری حالت کا علم ہو جائے تو وہ تجھ پر ہنسیں اور تیری دانائی کا مذاق اڑائیں، پس اگر اے نفس! تجھ کو یہ سب چیزیں معلوم ہیں، اور ان پر تیرا ایمان ہے، تو کیا بات ہے کہ تو عمل میں تساہل اور ٹال مٹول سے کام لیتا ہے، حالانکہ موت کمین گاہ میں منتظر ہے کہ وہ بغیر مہلت کے تجھے اُچک لے جائے، اور فرض کر کہ تجھے سو برس کی مہلت بھی مل گئی ہے تو کیا تیرا خیال ہے کہ جس کو ایک گھاٹی طے کرنی ہے، اور وہ اس گھاٹی کے نشیب میں اطمینان سے اپنے جانور کو کھلا رہا ہے، وہ کبھی بھی اس گھاٹی کو طے کر سکے گا، اگر تو یہ گمان رکھتا ہے تو تو کس قدر نادان ہے، ایسے شخص کے بارہ میں تیری کیا رائے ہے جو علم حاصل کرنے کی غرض سے پردیس کا سفر کرتا ہے، اور وہاں کئی سال بیکاری اور تعطّل میں گزار دیتا ہے اس خیال سے کہ وطن کی واپسی کے سال سب علم حاصل کرے گا، تو اس کی عقل پر ہنستا ہے اور اس کے

اس وہم کا مذاق اڑاتا ہے کہ علم و تفقہ اتنی قلیل مدت میں حاصل ہو جائے گا، یا قضا کا منصب بغیر علم و تفقہ کے توکل کی برکت سے ہاتھ آجائے گا، پھر اگر یہ مان بھی لیا جائے کہ آخر عمر کی کوشش مفید ہوتی ہے اور بلند درجات تک لے جاتی ہے تو یہ بھی ہو سکتا ہے کہ یہی آج کا دن تیری عمر کا آخری دن ہو تو اس دن تو اس کام میں کیوں مشغول نہیں ہوتا، اگر اللہ تعالیٰ نے تجھے بتلا بھی دیا ہے کہ تجھے مہلت دے دی گئی ہے تو پھر بھی عجلت کرنے سے کیا چیز مانع ہے اور آج کل آج کل کرنے کی کیا وجہ ہے یہی وجہ ہو سکتی ہے کہ تجھے اپنی خواہشات نفس کی مخالفت مشکل معلوم ہوتی ہے کیونکہ اس میں محنت و مشقت ہے کیا تو اس دن کا منتظر ہے جب خواہشات کی مخالفت تیرے لئے آسان ہو جائے گی، ایسا دن تو اللہ تعالیٰ نے مطلق پیدا ہی نہیں کیا اور نہ پیدا کرے گا جنت ہمیشہ ناگواریوں اور مکارہ سے گھری رہے گی، اور مکارہ کبھی نفس کے لئے آسان نہیں ہو سکتے ایسا ہونا محال ہے کتنا ایسا ہوتا ہے کہ تو کہتا ہے کہ کل سے یہ کام کریں گے تجھے معلوم نہیں کہ جو کل آچکی ہے وہ گذشتہ دن کے حکم میں ہے، جو کام تو آج انجام نہیں دے سکا کل اس کا انجام دینا تیرے لئے اور بھی مشکل ہے اس لئے کہ شہوت کی مثال ایک تناور درخت کی سی ہے جس کو آدمی اکھاڑنا اپنا فرض سمجھتا ہے اگر کوئی اس کے اکھاڑنے سے عاجز ہو گیا، اور اس نے اس کو کل پر رکھا تو اس کی مثال اس نوجوان کی سی ہے جس سے ایک درخت اکھاڑا نہیں گیا، اور اس نے اس کام کو دوسرے سال کے لئے ملتوی کر دیا، وہ جانتا ہے کہ جتنا زمانہ گزرے گا درخت مستحکم اور اس کی جڑیں مضبوط اور وسیع ہو جائیں گی، اور اکھاڑنے والے کی کمزوری اور ضعف میں اضافہ ہوگا، ظاہر ہے کہ جس کو شباب میں نہیں اکھاڑ سکا، اس کو بڑھاپے میں کیا اکھاڑے گا بڑھاپے کی ورزش اور محنت بہت تکلیف دہ ہوتی ہے بھیڑیئے کی تربیت و اصلاح ایک عذاب ہے، سرسبز شاخ لچک رکھتی ہے اور جھکائی جا سکتی ہے جب سوکھ جائے گی، اور ایک زمانہ گزر جائے گا تو اس کا موڑنا ناممکن ہو جائے گا، پس اگر اے نفس! تو ان حقائق پر ایمان نہیں رکھتا، اور سہل انگاری سے کام لیتا ہے تو تجھے کیا ہو گیا ہے کہ حکمت و دانش کا دعویٰ دار ہے، اس سے بڑھ کر حماقت اور کیا ہو سکتی ہے غالباً تو یہ کہے کہ استقامت سے

روکنے والی چیز شہوت پرستی اور آلام و مصائب پر بے صبری ہے اگر یہی بات ہے تو تیری غباوت کتنی بڑھی ہوئی ہے اور تیرا عذر کتنا لنگ ہے اگر تو اپنے قول میں سچا ہے تو ایسی لذت کیوں نہیں تلاش کرتا جو تمام کدورتوں اور آلائشوں سے پاک ہو اور ابدالآباد تک کے لئے ہو، اور یہ نعمت جنت ہی میں حاصل ہو سکتی ہے اگر تو خواہشات کا حریص ہے اور تجھے لذت ہی عزیز ہے تو ان کی خاطر بھی تجھے نفس کی وقتی خواہشات کی مخالفت کرنی چاہیے، اس لئے کہ بسا اوقات ایک لقمہ کئی لقموں سے محروم کر دیتا ہے تیرا کیا خیال ہے اس مریض کے بارے میں جس کو طبیب نے صرف تین روز کے لئے ٹھنڈے پانی سے پرہیز بتایا ہو تاکہ وہ صحت حاصل کر سکے، پھر زندگی بھر ٹھنڈے پانی کا لطف اٹھائے، اس نے اس کو خبردار کر دیا ہو کہ ٹھنڈا پانی اس حالت میں اس کے لئے سخت مضر ہے اگر اس نے بدپرہیزی کی تو زندگی بھر اس ٹھنڈے پانی سے اس کو ہاتھ دھو لینا پڑے گا، اس وقت سچ سچ بتلا عقل کا تقاضا کیا ہے؟ کیا اس کو تین دن صبر کر لینا چاہیے تاکہ زندگی آرام سے گذرے یا اپنی خواہش پوری کر لینی چاہیے، پھر تین سو دن یا تین ہزار دن برابر اس نعمت سے محروم رہے؟ تین دن کی بھی پوری عمر کے مقابلہ میں وہ حقیقت نہیں جو تیری پوری عمر کی ابدالآباد کی زندگی کے مقابلہ میں ہے (جو اہل جنت اور اہل جہنم کی مدت ہے) کیا تو کہہ سکتا ہے کہ خواہشات نفسانی کے ضبط کرنے کی تکلیف طبقات جہنم میں عذاب نار سے زیادہ سخت اور طویل ہے؟ جو شخص ایک معمولی تکلیف بھی نہیں برداشت کر سکتا، وہ عذاب الہٰی کو کیسے برداشت کر سکتا ہے!

میں دیکھتا ہوں کہ تو دو وجہ سے اپنے نفس کو ڈھیل دیتا ہے ایک کفر خفی اور ایک صریح حماقت کفر خفی یہ ہے کہ یوم حساب پر تیرا ایمان کمزور ہے اور ثواب و عقاب سے تو ناواقف ہے اور صریح حماقت اللہ تعالیٰ کی تدبیر خفی اور اس کے استدراج کا خیال کئے بغیر اس کے عفو و کرم پر اعتماد ہے اس کے باوجود کہ تو روٹی کے ایک ٹکڑے غلہ کے ایک دانہ اور زبان سے نکلے ہوئے ایک کلمہ کے لئے خدا تعالیٰ پر بھروسہ کرنے کے لئے تیار

نہیں ہوتا، بلکہ اس کے حصول کے لئے ہزار جتن کرتا ہے اور اسی جہالت کی وجہ سے تو آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد کا مصداق ہے کہ "الکیس من دان نفسہ وعمل لما بعد الموت والاحمق من اتبع نفسہ ھواھا وتمنّیٰ علی اللہ الامانی" (ہوشیار وہ ہے جو اپنے نفس کا محاسبہ کرے اور موت کے بعد کی زندگی کے لئے عمل کرے اور احمق وہ ہے جو اپنے نفس کو اپنی خواہشات کے پیچھے لگا دے اور اللہ پر آرزوئیں باندھتا ہے) افسوس اے نفس! تجھ کو زندگی کے دام ہمرنگ زمین سے ہوشیار رہنا چاہیئے تھا، اور شیطان سے فریب نہیں کھانا چاہیئے تھا، تجھے اپنے اوپر ترس کھانا چاہیئے، تجھے اپنی ہی فکر کا حکم دیا گیا ہے، دیکھ تو اپنے اوقات ضائع نہ کر تیرے پاس گنی چنی سانسیں ہیں، اگر تیری ایک سانس بھی رائگاں گئی تو گویا تیرے سرمایہ کا ایک حصہ ضائع ہو گیا، پس غنیمت سمجھ صحت کو مرض سے پہلے، فراغت کو مصروفیت سے پہلے، دولت کو غربت سے پہلے، شباب کو ضعیفی سے پہلے، زندگی کو ہلاکت سے پہلے اور آخرت کے لئے تیاری کر، اسی لحاظ سے جتنا تجھے وہاں رہنا ہے، اے نفس کیا جب موسم سرما سر پر آجاتا ہے تو اس پوری مدت کے لئے تو تیاری نہیں کرتا، خوراک کا ذخیرہ، لباس کی ضروری مقدار اور ایندھن کا ایک ڈھیر جمع نہیں کر لیتا، تو تمام ضروری سامان جاڑے کا مہیا کر لیتا ہے اور اس بھروسہ پر نہیں رہتا کہ لبادہ، جرا اول اور ایندھن کے بغیر جاڑا گذار دے گا، اور تجھ میں اس کی طاقت ہے کیا تیرا گمان ہے کہ جہنم کی زمہریر جاڑوں کی سخت سردی سے کم ہے ہرگز نہیں، اور اس کا کوئی امکان نہیں، شدت و برودت میں ان دونوں کے درمیان کوئی تناسب نہیں، کیا تو سمجھتا ہے کہ تو بغیر سعی کے اس سے نجات حاصل کرے گا، جیسے کہ سردی بغیر اونی کپڑے لبادہ آگ اور اسی طرح کی دوسری چیزوں کے بغیر نہیں جاتی، اسی طرح دوزخ کی گرمی اور سردی توحید کے قلعہ اور طاعت کے خندق کے بغیر نہیں جاسکتی، اور اللہ تعالےٰ کا یہ کرم ہے کہ اس نے تجھے حفاظت کی تدابیر سے آگاہ کر دیا ہے اور اسباب آسان کر دیئے ہیں، اس کا کرم یہ نہیں کہ وہ سرے سے عذاب ہی کو ٹال دے، اس دنیا میں اللہ تعالےٰ کا قانون یہی ہے، وہ جاڑا پیدا کرتا ہے تو اس کے لئے آگ بھی پیدا کرتا ہے اور تجھے حفاظت کے طریقہ پر

پتھروں سے آگ نکالنے کا طریقہ بھی بتاتا ہے کہ تو ان طریقوں سے فائدہ اٹھائے اور اپنے کو ٹھنڈک سے محفوظ رکھے اور جیسے کہ لکڑی خریدنا اور اونی کپڑے حاصل کرنا، خدا کی ضرورت نہیں، انسانوں کی ضرورت ہے، اسی طرح طاعت وعبادت سے بھی خدا مستغنی ہے اور یہ تمہارا فریضہ ہے کہ اس کے وسیلہ سے نجات حاصل کرو، "مَنْ اَحْسَنَ فَلِنَفْسِہٖ وَمَنْ اَسَآءَ فَعَلَیْھَا وَاللّٰہُ غَنِیٌّ عَنِ الْعَالَمِیْنَ" (جس نے اچھائی کی تو اپنے نفس کے لئے اور جس نے برائی کی، اس کا بوجھ بھی اسی پر ہے، اور اللہ جہان والوں سے بے پرواہ ہے) تیری خرابی ہو اے نفس اجہالت کی قبا چاک کر اور اپنی آخرت کو اپنی دنیا پر قیاس کر "فَمَا خَلْقُکُمْ وَلَا بَعْثُکُمْ اِلَّا کَنَفْسٍ وَّاحِدَۃٍ" "تمہارا پیدا کرنا اور تمہارا برپا کرنا ایک جان کی طرح ہے" "کَمَا بَدَاْنَآ اَوَّلَ خَلْقٍ نُّعِیْدُہٗ" (جیسے ہم نے پیدا کیا تھا پھر اسے دھراتے ہیں) "کَمَا بَدَاَکُمْ تَعُوْدُوْنَ" (جیسے اس نے تم کو ابتداءً پیدا کیا تھا، ویسے ہی پھر تم واپس ہو جاؤ گے)۔[1]

احیاء کے ناقد

شیخ الاسلام ابن تیمیہؒ نے احیاء العلوم کی اجمالی تعریف واعتراف کیا ہے، اور لکھا ہے کہ "کلامہ فی الاحیاء غالبہ جید"[2] (احیاء میں عموماً ان کا کلام اچھا ہے) اس کے ساتھ وہ چار باتوں میں اس کتاب پر تنقید کرتے ہیں، ان کی پہلی تنقید اس پر ہے کہ اس میں فلاسفہ کے بہت سے اقوال آگئے ہیں، اور توحید، نبوت اور معاد سے متعلق ان کے بعض خیالات وبیانات شامل ہوگئے ہیں، ان کے نزدیک امام غزالی فلاسفہ کے اثرات سے ضرور کچھ نہ کچھ متاثر ہوئے ہیں، وہ اگرچہ ان کے بڑے ناقد اور مخالف ہیں، مگر ان کی تصنیفات میں ان کے خیالات کی (غیر شعوری طور پر) کہیں کہیں جھلک آجاتی ہے، شیخ الاسلام ابن تیمیہؒ کی حس فلسفہ وفلاسفہ کے بارہ میں چونکہ بہت تیز ہے، اس لئے کچھ عجب نہیں کہ ان کے معیار سے امام غزالی کی بعض چیزیں فلسفہ سے متاثر ہوں۔

---

[1] احیاء علوم الدین ج ۴ ص ۳۵۸،۳۵۶ ۔ [2] فتاویٰ شیخ الاسلام ابن تیمیہ۔

دوسری تنقید یہ ہے کہ اس میں بعض ایسے کلامی مباحث ہیں، جو ابن تیمیہؒ کے نزدیک کتاب و سنت کی روح کے پورے طور پر مطابق نہیں ہیں، اور ان کے معیار پر پورے نہیں اُترتے۔ تیسری تنقید یہ ہے کہ اس میں اہلِ تصوف کے بعض متشددانہ اقوال اور مغالطے ہیں، چوتھی چیز یہ ہے کہ احیاء میں بہت سی ضعیف احادیث و آثار ہیں، بلکہ موضوع روایات تک ہیں[1]۔ اس کے باوجود شیخ الاسلام لکھتے ہیں:۔

وفیہ مع ذٰلک من کلام المشائخ الصوفیۃ العارفین المستقیمین فی اعمال القلوب الموافق للکتاب والسنۃ ماھو اکثر مما یرد منہ، فلھٰذا اختلف فیہ اجتھاد الناس وتنازعوا فیہ۔[2]	اس کے باوجود احیاء میں ان مشائخ صوفیہ کا جو صاحبِ معرفت و استقامت تھے، اعمال قلوب کے بارہ میں بہت سا ایسا کلام ہے جو کتاب و سنت کے موافق ہے اور جس کا اکثر حصہ قابلِ قبول ہے، اسی بنا پر اس کتاب کے بارہ میں علماء مختلف رائیں رکھتے ہیں، اور سب ...

علامہ ابن جوزی کی بھی بڑی تنقید ضعیف اور موضوع روایتوں پر ہے، ان کے نزدیک اس کی وجہ امام صاحب کا حدیث سے عدم اشتغال ہے[3]، حافظ زین الدین العراقی صاحب الفیہ نے احیاء کی بہت بڑی خدمت انجام دی ہے کہ اس کی احادیث کی تخریج کی، ہر راوی اور حدیث کا درجہ اور اس کی حیثیت بیان کر دی ہے۔

ابن جوزی نے امام غزالی کے بعض تاریخی مسامحات اور فروگذاشتوں کا بھی تذکرہ کیا ہے، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ حدیث کی طرح ان کو تاریخ سے بھی اشتغال کا موقع نہیں ملا تھا[4]۔

ان کا دوسرا اعتراض اس پر ہے کہ بعض امراضِ قلب (ریا و حُبِّ جاہ) وغیرہ کے علاج کے سلسلہ میں اور نفس کُشی اور اصلاح کے لئے انھوں نے صوفیہ کے بعض ایسے واقعات نقل کر دیئے ہیں، جو قابلِ تقلید نہیں ہیں، اور فقہی حیثیت سے ان کا جواز بھی ثابت ہونا مشکل ہے[5]، ان نقائص کے باوجود وہ

---

[1] فتاویٰ شیخ الاسلام ابن تیمیہؒ ص ۱۹۴، اور التاج المکلل نواب صدیق حسن خاں ص ۳۸۸

[2] فتاویٰ ابن تیمیہؒ ج ۲ ص ۱۹۴ [3] المنتظم ج ۹ ص ۱۶۹، ۱۷۰ [4] ایضاً [5] ایضاً ص ۱۶۹

احیاء العلوم کی اہمیت و مقبولیت کے قائل ہیں، اور انھوں نے خود "منہاج القاصدین" کے نام سے اس کا اختصار کیا ہے، جس میں انھوں نے قابل اعتراض چیزوں کو حذف کر دیا ہے، لیکن اس خلاصہ میں اصل کتاب کی روح اور اس کی تاثیر باقی نہیں رہی ہے۔

امام غزالی اور علم کلام

امام غزالی جس مجتہدانہ دماغ کے آدمی تھے، اس کے لئے یہ مشکل تھا، کہ وہ متقدمین کے مباحث و تحقیقات کے ناقلِ محض یا ترجمان و شارح بن کر رہ جائیں، اور کہیں ان کی شخصیت نمودار نہ ہونے پائے، بدقسمتی سے چوتھی صدی میں علم کلام کا حلقہ بھی (جس کو تمام دوسرے علمی اداروں سے زیادہ اپنے زمانہ کی عقلی اور علمی سطح کے ساتھ چلنے کی ضرورت تھی) جمود و تقلید کا شکار ہو گیا تھا، متکلمین اشاعرہ کو نہ صرف اس پر اصرار تھا کہ ان کے نتائج تحقیقات اور ان کے عقائد تسلیم کئے جائیں، بلکہ اس پر بھی اصرار تھا کہ ان عقائد کے ثبوت کے لئے امام ابوالحسن اشعری اور علامہ ابوبکر باقلانی وغیرہ نے جو مقدمات و دلائل قائم کئے ہیں، ان کو بھی بعینہٖ تسلیم کیا جائے، اور ان کے علاوہ دوسرے مقدمات و دلائل سے کام نہ لیا جائے۔ امام غزالی نے اپنی تصنیفات میں مجتہدانہ انداز میں اصول و عقائد پر گفتگو کی، اور ان کے ثبوت کے لئے انھوں نے بعض ایسے نئے مقدمات و دلائل قائم کئے، جو ان کے نزدیک زیادہ موثر و دلپذیر تھے، صفاتِ باری تعالیٰ ...... نبوت، معجزات، تکلیفاتِ شرعیہ، عذاب و ثواب، برزخ، قیامت کے متعلق انھوں نے نئے متکلمانہ انداز سے گفتگو کی، اور ان کے ثبوت کے لئے انھوں نے بہت سے متکلمین کی طرح احتمال آفرینیوں، تشکیکات اور منطقی مقدمات و نتائج کے بجائے زیادہ عام فہم اور اطمینان بخش دلائل فراہم کئے، اور اس سلسلہ میں انھوں نے پیشرو متکلمین کے استدلال، زبان اور اصطلاحات اور ان کی ترتیب کی پابندی نہیں کی، اور اس طرح اشعری علم کلام کی تجدید کی خدمت انجام دی، جس کے لئے متکلمین اشاعرہ کو ان کا ممنون اور

ان کی عظیم الشان دینی خدمت کا معترف ہونا چاہیئے تھا، مگر چونکہ انھوں نے یہ کام عام متکلمین کی روش سے ہٹ کر انجام دیا تھا، اور کہیں کہیں امام ابوالحسن اشعری اور ان کے نامور متبعین کی تحقیقات سے اختلاف پایا جاتا تھا، اس لئے اشعری مکتبِ فکر (جس سے خود امام صاحب مسلکاً منسوب تھے) ان کے اس علم کلام اور ان دلائل و مقدمات پر چیں بجبیں تھا، اور اس حلقہ کے بہت سے پرجوش علماء اس میں "زیغ و ضلال" اور مسلکِ سلف سے بُعد وانحراف محسوس کرتے تھے احیاء العلوم کی تالیف اور اس کی غیر معمولی اشاعت و مقبولیت کے بعد اس مسئلہ پر اشعری علماء میں چہ میگوئیاں بہت بڑھ گئیں، اور بہت سے لوگوں کو امام صاحب کے عقائد میں شبہات پیدا ہونے لگے، کسی مخلص نے امام صاحب کو خط لکھا اور اس صورتِ حال کی اطلاع دیتے ہوئے اپنی قلبی تکلیف کا اظہار کیا، امام صاحب نے ان کو مفصل جواب دیا، ایک مستقل رسالہ (فیصل التفرقۃ بین الاسلام والزندقۃ) کے نام سے موجود ہے، اس کے شروع میں وہ تحریر فرماتے ہیں:۔

"برادرِ شفیق! حاسدین کا گروہ جو میری بعض تصنیفات (متعلق باسرار دین) پر نکتہ چینی کر رہا ہے اور خیال کرتا ہے کہ یہ تصنیفات قدمائے اسلام اور مشائخ اہل کلام کے خلاف ہیں، اور یہ کہ اشعری کے عقیدے سے بال برابر بھی ہٹنا کفر ہے، اس پر جو تم کو صدمہ ہوتا ہے اور تمہارا دل جلتا ہے، میں اس سے واقف ہوں لیکن عزیزمن! ہم کو صبر کرنا چاہیئے، جب رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم مطاعن سے نہ بچ سکے تو میری کیا ہستی ہے؟ جس شخص کا یہ خیال ہے کہ اشاعرہ یا معتزلہ یا حنابلہ یا اور دیگر فرقوں کی مخالفت کفر ہے تو سمجھ لو کہ وہ اندھا مقلد ہے، اس کی اصلاح کی کوشش میں اپنے اوقات ضائع نہ کرو، اس کو خاموش کرنے کے لئے مخالفین کا دعویٰ کافی ہے، اس لئے کہ تمام مذاہب (کلامیہ) میں اشعری سے اختلافات پائے جاتے ہیں، اب اگر کوئی دعویٰ کرتا ہے کہ تمام تفصیلات و جزئیات میں اشعری کا اتباع ضروری ہے، اور ادنیٰ مخالفت بھی کفر ہے تو اس سے سوال کرو کہ یہ کہاں سے ثابت ہوا کہ حق اشعری کے ساتھ مخصوص ہے، اور انہی کی اتباع میں منحصر ہے، اگر ایسا ہے تو وہ شاید باقلانی کے کفر کا فتویٰ دیں گے،

اس لئے کہ صفت بقا میں ان کو اشعری سے اختلاف ہے اور ان کا خیال ہے کہ وہ ذاتِ الٰہی سے زائد کوئی صفت نہیں ہے، اور پھر سوال یہ ہے کہ باقلانی ہی اشعری کی مخالفت کرکے کیوں کفر کے مستحق ہیں، اشعری، باقلانی سے اختلاف کی بنا پر کیوں کفر کے مستحق نہیں، اور حق ان میں سے کسی ایک میں کیوں منحصر سمجھا جائے، اگر کہا جائے کہ اشعری متقدم ہیں تو خود اشعری سے معتزلہ متقدم ہیں تو پھر معتزلہ کو برحق ہونا چاہئے یا یہ محض علم و فضل کے تفاوت کی بنا پر ہے، تو بتلایا جائے کہ علم و فضل کا موازنہ کرنے کے لئے کون سا ترازو ہے جس کی وجہ سے ایک شخص اپنے پیشوا کو علم و فضل میں سب سے بلند مرتبہ مانتا ہے، اگر باقلانی کو اشعری سے اختلاف کرنے کی اجازت ہے تو باقلانی کے بعد آنے والے اس حق سے کیوں محروم رہیں، اور اس میں کسی ایک شخص کی تخصیص کیوں کی جائے؟"[1]

علم کلام پر مجتہدانہ گفتگو اور اس میں بیش بہا اضافہ کرنے کے بعد امام غزالی اپنی سلامتِ طبع، حق پسندی اور ذاتی تجربوں کی بنا پر اس نتیجہ پر پہونچے کہ علم کلام کا فائدہ بہت محدود ہے، اور بعض اوقات اس کا ضرر اس کے نفع سے زیادہ ہے، نیز وہ ایک وقتی اور ضرورت کی چیز ہے، اور ایک دوا ہے، جس کی صحیح المزاج اور سلیم الطبع انسانوں کو ضرورت نہیں، عمومی چیز جو ایک صالح غذا کا حکم رکھتی ہے، اور جس سے کوئی انسان مستثنیٰ نہیں، وہ قرآن مجید کا طرز بیان اور استدلال ہے، جس سے سب کو اپنا اپنا حصہ ملتا ہے، اور کوئی اس سے محروم نہیں، "إلجام العوام عن علم الکلام" میں جو ان کی آخری تصنیف ہے، لکھتے ہیں۔

فأدلۃ القرآن مثل الغذاء وینتفع بہ	قرآنی دلائل غذا کی طرح ہیں جس سے انسان فائدہ
کل انسان وادلۃ المتکلمین مثل الدواء	اٹھاتا ہے، اور متکلمین کے دلائل دوا کی طرح ہیں، جس سے
وینتفع بہ آحاد الناس ویستضر بہ الاکثرون	کوئی کوئی فائدہ اٹھاتا ہے اور اکثر آدمیوں کو اس سے
بل ادلۃ القرآن کالماء الذی ینتفع بہ	نقصان ہوتا ہے، بلکہ قرآنی دلائل کی مثال پانی کی سی ہے

[1] فیصل التفرقۃ بین الاسلام والزندقہ۔

الصبي الرضيع والرجل القوي	جس سے دودھ پیتا بچہ اور طاقتور آدمی یکساں فائدہ
وسائر الادلة كالاطعمة التي ينتفع	اٹھاتے ہیں، باقی دلائل (کلامیہ) کھانے کے انواع واقسام
بها الاقوياء مرة ويمرضون بها اخرى	کی طرح ہیں کہ کبھی ان سے طاقتور آدمیوں کو فائدہ پہنچتا ہے
ولا ينتفع بها الصبيان اصلا۔[1]	اور کبھی ضرر، اور بچوں کے لئے وہ مطلقاً کارآمد نہیں۔

علم کلام سے جو نقصان پہنچا ہے، اس کا ذکر کرتے ہوئے اپنا مشاہدہ اور تجربہ بیان کرتے ہیں:۔

والدليل على تضرر الخلق به المشاهدة	لوگوں کو علم کلام سے جو نقصان پہونچا ہے اس کی
والعيان والتجربة وما ثار من الشر	دلیل خود مشاہدہ اور تجربہ ہے، اہل تجربہ جانتے ہیں کہ
منذ نبغ المتكلمون وفشت صناعة الكلام مع	جب سے متکلمین پیدا ہوئے اور علمِ کلام کا چرچا ہوا
سلامة العصر الاول من الصحابة عن مثل	کیسی مصیبت آئی اور خرابی پھیلی، صحابہؓ کا دور اس
ذلك۔[2]	خرابی سے محفوظ تھا۔

تدریس کے لئے دوبارہ اصرار اور امام غزالی کی معذرت

ذوالقعدہ ۴۹۹ھ میں امام غزالی نے نیشاپور کے مدرسۂ نظامیہ کی مسندِ درس کو دوبارہ آباد کیا تھا، یہ سنجر سلجوقی (پسر ملک شاہ) کی سلطنت اور فخر الملک (پسر نظام الملک) کی وزارتِ عظمیٰ کا زمانہ تھا، (فخر الملک) محرم ۵۰۰ھ میں ایک باطنی کے ہاتھ سے شہید ہوا، اس کی وفات کے تھوڑے ہی دن بعد امام نے مدرسۂ نظامیہ کی تدریس سے کنارہ کشی کی، اور اپنے وطن طوس میں سکونت اختیار کی، گھر کے پاس ہی ایک مدرسہ اور خانقاہ کی بنیاد ڈالی، جہاں تعلیم و تربیت میں مشغول ہو گئے۔

۵۰۰ھ میں سلطان محمد بن ملک شاہ نے جب نظام الملک کے بڑے بیٹے احمد کو وزیر اعظم مقرر کیا تو

[1] الجام العوام عن علم الکلام ص ۲۰ [2] ایضاً

اس نے امام صاحب کو پھر بغداد میں بلانا چاہا، امام غزالی کی جگہ مدرسۂ نظامیہ میں اگرچہ پُر کردی گئی تھی، مگر خالی تھی، امام غزالی کا جانشین پورے عالمِ اسلامی میں ملنا مشکل تھا، مدرسۂ نظامیہ سلطنت عباسیہ کی زینت اور بغداد کی آبرو تھی، اس نقصان کا احساس سب کو تھا، بارگاہِ خلافت سے بھی اس کی تحریک ہوئی کہ امام غزالی مدرسۂ نظامیہ کو پھر زینت بخشیں، توام الدین نظام الملک وزیرِ اعظم نے خود خط لکھا، اور مدرسۂ نظامیہ کی اہمیت اور مرکزیت بیان کی، اور خود خلیفۂ عباسی کی طرف سے اس خواہش کا اظہار کیا، وہ لکھتا ہے:

"ونیز از سرائے عزیز مقدس نبوی (یعنی ایوانِ خلافت) ذریعت نمودند و تدبیر آں رامبالغہا فرمودند، وایں خطاب صادر نشد تا صدر الدین[1] بہ تحفظ ایں خبر بخواجہ اجل زین الدین حجۃ الاسلام، فرید الزمان، ابو حامد محمد بن محمد الغزالی ادام اللہ تمکنہ، اہتمام نگیرد ازانچہ اویگانۂ جہان وقدوۂ عالم وانگشت نمائے روزگار است"

اس فرمان پر دربارِ خلافت کے تمام ارکان کے دستخط ثبت تھے، اور یہ ظاہر کیا گیا تھا، کہ "حاشیہ بوسانِ خلافت اور ارکانِ سلطنت سب امام صاحب کے قدوم کے لئے چشم براہ ہیں"، احمد بن نظام الملک نے خود امام صاحب کو جو خط لکھا، اس کا ماحصل یہ تھا کہ اگرچہ آپ جہاں تشریف رکھیں گے، وہی جگہ درسگاہِ عام بن جائے گی، لیکن جس طرح آپ مقتدائے روزگار ہیں، آپ کی قیامگاہ بھی وہی شہر ہونا چاہئے جو عالمِ اسلام کا مرکز اور قبلہ گاہ ہو، تاکہ تمام دنیا کے ہر حصہ کے لوگ آسانی وہاں پہونچ سکیں، اور ایسا مقام صرف دار السلام بغداد ہے"۔

امام صاحب نے ان خطوط و فرامین کے جواب میں ایک طول طویل خط لکھا، اور بغداد میں نہ آنے کے متعدد عذر لکھے: ایک یہ کہ یہاں (طوس میں) ڈیڑھ سو مستعد طلبہ مصروفِ تحصیل ہیں، جن کو بغداد جانے میں زحمت ہوگی، دوسرے یہ کہ جب میں پہلے بغداد میں تھا تو میرے اہل و عیال نہ تھے، اب بال بچوں کا جھگڑا ہے، اور یہ لوگ ترکِ وطن کی زحمت نہیں اٹھا سکتے، تیسرے یہ کہ میں نے مقامِ خلیل میں عہد کیا ہے کہ کبھی مناظرہ و مباحثہ نہ کروں گا، اور بغداد میں مباحثہ کے بغیر چارہ نہیں، اس کے سوا دربارِ خلافت میں سلام کرنے کے لئے حاضر ہونا ہوگا، اور

---

[1] صدر الدین محمد نظام الملک طوسی کا پوتا اور سلطان سنجر کا وزیرِ اعظم تھا، جس کی حکومت میں طوس واقع تھا۔

میں اس کو گوارا نہیں کر سکتا، سب سے بڑھ کر یہ کہ میں مشاہرہ اور وظیفہ قبول نہیں کر سکتا، اور بغداد میں میری کوئی جائداد نہیں" غرض خلافت، ور سلطنت کی طرف سے گو بہت کچھ کد ہوئی، لیکن امام صاحب نے صاف انکار کیا، اور گوشۂ عافیت سے باہر نہ نکلے۔[۱]

بقیہ زندگی اور وفات

امام غزالی نے یہ زمانہ علمی و دینی اشتغال میں گذارا، ان میں اب بھی طالب علمانہ روح تھی، وہ حدیث کی طرف ایسی توجہ نہیں کر سکے تھے جیسی انھوں نے علومِ عقلیہ اور بعض علومِ نقلیہ کی طرف کی تھی، اس زمانہ میں ان کو اپنی اس کمی کو پورا کرنے کا خیال ہوا، چنانچہ ایک مشہور محدث حافظ عمر بن ابی الحسن الرواسی کو اپنے یہاں مہمان رکھ کر ان سے صحیح بخاری و صحیح مسلم کا درس لیا، اور اس کی سند حاصل کی، یہ اخیر زمانہ ان کا حدیث کے مطالعہ اور اشتغال میں گذرا، ابنِ عساکر کہتے ہیں:۔

وکانت خاتمة امره اقباله علی حدیث	ان کی زندگی کا آخری کام یہ تھا کہ وہ حدیثِ نبوی
المصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم ومجالسة	کی طرف پوری طرح متوجہ ہوئے، اور علماء حدیث
اهله ومطالعة الصحیحین البخاری ومسلم	کی ہم نشینی اختیار کی، اور صحیحین (بخاری و مسلم) کا
الذین هما حجة الاسلام۔[۲]	مطالعہ شروع کیا جو اسلام میں سند کا درجہ رکھتی ہیں

انتقال سے ایک سال پہلے ۵۰۴ھ میں انھوں نے "المستصفیٰ" لکھی، جو اصولِ فقہ کے ارکانِ ثلثہ میں شمار کی جاتی ہے،[۳] اور علماء نے اس کے ساتھ بڑی اعتنا کی ہے، یہ ان کی آخری تصنیف ہے۔

امام غزالی نے طابران میں ۱۴ رجمادی الاخریٰ ۵۰۵ھ کو ۵۵ سال کی عمر میں انتقال کیا، اور

---

[۱] الغزالی ص ۲۱ [۲] تبیین کذب المفتری ص ۲۹۶ ، [۳] یہ تین کتابیں جو اصولِ فقہ کے تین ستون سمجھے جاتے ہیں حسبِ ذیل ہیں، ابو الحسین البصری کی (المعتمد) امام الحرمین کی (البرہان) اور امام غزالی کی (المستصفیٰ)۔

یہ گنجِ گرانمایہ اسی خاک میں ودیعت ہوا، ابن جوزی نے ان کے انتقال کا واقعہ ان کے بھائی احمد غزالی کی روایت سے اس طرح بیان کیا ہے :-

"دو شنبہ کے دن وہ صبح کے وقت بستر خواب سے اٹھے، وضو کرکے نماز پڑھی، پھر کفن منگوایا، اور آنکھوں سے لگاکر کہا" آقا کا حکم سر آنکھوں پر" یہ کہہ کر پاؤں پھیلادیئے لوگوں نے دیکھا تو روح پرواز کرچکی تھی"[1]

امام غزالی کی دو ممتاز خصوصیتیں

امام غزالی کی دو خصوصیتیں بڑی ممتاز ہیں، اخلاص، علوِّ ہمت، ان کے اخلاص کا اعتراف موافق و مخالف سب کو ہے، اور وہ ان کی تصنیفات کے لفظ لفظ سے ٹپکتا ہے، شیخ الاسلام ابن تیمیہؒ اگرچہ ان کے ناقد ہیں، اور ان کی بہت سی چیزوں سے ان کو اختلاف ہے، لیکن اس کے باوجود وہ ان کو کبار مخلصین میں شمار کرتے ہیں، ان کی کتابوں کی تاثیر اور مقبولیت کی اصل وجہ ان کا یہی اخلاص ہے، اسی اخلاص نے ان سے اقلیم علم کی مسند شاہی ترک کروائی، اور برسوں دشت و بیاباں کی خاک چھنوائی، اور باوجود طلبی و اصرار کے بادشاہوں کے دربار اور اپنے وقت کے سب سے بڑے اعزاز سے روگرداں اور بے نیاز رکھا، انھوں نے ایک جگہ لکھا ہے کہ آخری چیز جو صدیقین کے قلب سے نکلتی ہے، وہ حبِّ جاہ ہے، ان کی آخری زندگی شہادت دیتی ہے کہ وہ اس مقام سے محروم نہیں رہے۔

علو ہمت ان کی زندگی کا طغرائے امتیاز ہے، انھوں نے علم و عمل کے دائرہ میں اپنے زمانہ کی سطح اور اپنے ہمعصروں کی کسی منزل پر قناعت نہیں کی، وہ علم و عمل کے جس ترقی یافتہ مقام پر پہونچے ان کے کانوں میں یہی صدا آئی کہ

ع مسافر یہ تیرا نشیمن نہیں

علوم نقلیہ میں بھی وہ اپنے زمانہ اور اپنے معاصرین کی عام سطح سے بہت بلند ہیں، فقہ و اصول فقہ میں

---

[1] اتحاف السادۃ المتقین (شرح احیاء العلوم) ص ۱۲-۱۱

انھوں نے جو تصنیفات کیں، صدیوں تک علما ان کی شرح و تحشیہ میں مشغول رہے، پھر اپنے زمانہ کے رواج اور علمائے نقلیات کے دستور کے خلاف انھوں نے علومِ عقلیہ کی طرف توجہ کی، اور منطق و فلسفہ کا اس طرح مطالعہ کیا کہ بقول قاضی ابوبکر بن العربی فلسفہ کے جگر اور فلاسفہ کے شکم میں اتر گئے اور پھر ان کی تنقید و تردید میں ایسی کتابیں لکھیں، جن سے اس کی عمارت ایک صدی تک متزلزل رہی۔

عمل کے سلسلہ میں اپنی ذہنی، علمی، اخلاقی، اور روحانی ترقی و تکمیل کا انھوں نے کوئی گوشہ فروگذاشت نہیں کیا، علمی تبحر اور جامعیت و کمال کے ساتھ اپنے وقت کے ایک مخلص و مبصر شیخ طریقت شیخ ابوعلی فارمدی (م ۴۷۷ھ) سے بیعت کی، اور تصوف کی تعلیم حاصل کی، پھر اس راہ میں اپنا سب کچھ قربان کر کے اس کے مقاصد و غایات کو پہونچے، اور اذواق صحیحہ سے لذت آشنا ہوئے۔

اصلاح و انقلاب کے سلسلہ میں صرف تصنیف و تالیف پر اکتفا نہیں کی، بلکہ ایک نئی اسلامی سلطنت کی داغ بیل پڑنے میں بھی ان کا ہاتھ ہے، مولانا شبلی لکھتے ہیں :۔

"امام صاحب کو ان باتوں پر تسلی نہ تھی، وہ دیکھتے تھے کہ موجودہ سلطنتوں کا سرے سے خمیر ہی بگڑ گیا ہے، اس لئے جب تک اسلامی اصول کے موافق ایک نئی سلطنت نہ قائم کی جائے اصل مقصد نہیں حاصل ہو سکتا لیکن امام صاحب کو ریاضت، مجاہدہ اور مراقبہ سے اتنی فرصت نہ تھی کہ ایسے بڑے کام میں ہاتھ ڈال سکتے" اتفاق یہ کہ جب احیاء العلوم شائع ہوئی اور ۵۰۳ھ میں اسپین میں پہونچی تو علی بن یوسف بن تاشفین نے جو اسپین کا بادشاہ تھا تعصب اور تنگ دلی سے اس کتاب کے جلانے کا حکم دیا۔[1] اور نہایت بیدردی سے اس حکم کی تعمیل کی گئی، امام صاحب کو اس واقعہ کی اطلاع ہوئی، تو سخت رنج ہوا، اسی اثنا میں اسپین سے ایک شخص امام صاحب کی خدمت میں تحصیل علم کے لئے آیا جس کا نام محمد بن عبداللہ تومرت تھا، یہ ایک نہایت معزز خاندان کا آدمی تھا، اور اس کے آباء و اجداد ہمیشہ سے آزادی پسند اور صاحب حوصلہ چلے آتے تھے

[1] شرح احیاء العلوم۔

امام صاحب کی خدمت میں رہ کر اس نے تمام علوم میں نہایت کمال پیدا کیا اور اپنے ذاتی جوہر اور امام صاحب کے فیض صحبت سے یہ ارادہ کیا کہ اسپین میں علی بن یوسف کی سلطنت کو مٹا کر ایک نئی سلطنت قائم کرے یہ خیال اس نے امام صاحب کے سامنے پیش کیا، امام صاحب نے چونکہ خود ایک عادلانہ سلطنت کے آرزومند تھے اس رائے کو پسند کیا لیکن پہلے یہ دریافت کیا کہ اس مہم کے انجام دینے کے اسباب بھی مہیا ہیں یا نہیں محمد بن عبداللہ[1] نے اطمینان دلایا تو امام صاحب نے نہایت خوشی سے اجازت دی، علامہ ابن خلدون اس واقعہ کے متعلق لکھتے ہیں

ولقی فیما زعموا ابا حامد الغزالی وفاوضہ بذات صدرہ فارادہ علیہ لما کان فیہ الاسلام یومئذ باقطار الارض من اختلال

جیسا کہ لوگوں کا خیال ہے وہ ابو حامد غزالی سے ملا اور ان سے اپنے دلی خیالات کے متعلق مشورہ کیا، امام صاحب نے اس کی تائید کی کیونکہ اس زمانہ میں اسلام تمام دنیا

---

[1] چونکہ محمد بن عبداللہ نے ایک عظیم الشان سلطنت قائم کی اور اسی اصول پر قائم کی جو امام غزالی کا منشا تھا، اس لئے اس کا ایک مختصر سا حال طبقات الشافعیہ ابن السبکیؒ سے نقل کرتے ہیں :-

"محمد بن عبداللہ اقصائے مغرب کا رہنے والا تھا، اول اپنے وطن میں نشو و نما پایا، پھر مشرق کا سفر کیا اور فقہ و کلام کی تحصیل کی، وہ نہایت پرہیزگار، عابد اور قناعت پسند تھا، فارغ التحصیل ہو کر امر بالمعروف و نہی عن المنکر پر کمربستہ ہوا، مصر میں پہنچا تو اس سختی سے لوگوں کو مناہی سے روکا کہ لوگ اس کے دشمن ہو گئے، اور اس کو شہر بدر کر دیا، مصر سے اسکندریہ اور چند روز وہاں اقامت کی پھر بلاد مغرب کی طرف روانہ ہوا، ۵۰۵ھ میں مہدیہ پہنچا اور اپنے کام میں مشغول ہوا، وہاں سے چل کر بجایہ اور بجایہ سے مراکش گیا، یہاں بھی نہایت آزادی سے امر بالمعروف کی خدمت انجام دی، یہاں تک کہ خود شاہی خاندان سے متعرض ہوا، بادشاہ وقت علی بن یوسف تاشفین نے اس کو دربار میں طلب کیا، دربار کے علماء نے اس سے کہا کہ ایسے عادل اور منصف بادشاہ کی حکومت سے ناراضی کی کیا وجہ بیان کر سکتے ہو، محمد بن عبداللہ نے نہایت جوش کے ساتھ کہا کہ کیا اس شہر میں علانیہ شراب کی خرید و فروخت نہیں ہوتی؟ اور کیا یتیموں کے مال پر دست درازی نہیں کی جاتی؟ اس کی پرجوش تقریر سے بادشاہ بھی متاثر ہوا، یہاں تک کہ اس کی آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے، محمد مراکش سے نکل کر اغمات میں آیا، اور رفتہ رفتہ ایک جماعت کثیر اس کے ساتھ ہو گئی، پھر تینمل میں قیام کر کے قبیلہ مصامدہ کی اعانت سے سلطنت کی بنیاد ڈالنی شروع کی اور کامیاب ہوا۔

الدولة وتفويض اركان السلطان الجامع للأمة المقيم للملة بعد ان ساله عمن له من العصابة والقبائل التى يكون بها الاعتزاز والمنعة ۔

میں ضعیف ہو رہا تھا، اور کوئی ایسا سلطان موجود نہ تھا جو تمام امت کو فراہم کر سکے اور دینِ اسلام کو قائم رکھے لیکن پہلے امام صاحب نے اس سے پوچھ لیا کہ تمہارے پاس اتنا سروسامان اور جمعیت ہے یا نہیں جس سے قوت اور حفاظت ہو سکے ۔

غرض محمد بن عبداللہ بن تومرت نے واپس جا کر امر بالمعروف کے شعار سے ایک نئی سلطنت کی بنیاد ڈالی، جو مدت تک قائم رہی، اور موحدین کے لقب سے پکاری جاتی تھی، علی بن یوسف کی حکومت میں جور و تعدی بہت پھیل گئی تھی، فوج کے لوگ علانیہ لوگوں کے گھروں میں گھس جاتے تھے، اور عفت مآب خاتونوں کے ناموس کو برباد کرتے تھے، علی بن یوسف کے خاندان میں ایک مدت سے یہ الٹا دستور چلا آتا تھا کہ مرد منہ پر نقاب ڈالتے تھے، اور عورتیں کھلے منہ پھرتی تھیں، اس لحاظ سے یہ لوگ "ملثمین" کہلاتے تھے، محمد بن تومرت نے اول اول انہی دونوں بدعتوں کے مٹانے پر کمر باندھی، اور رفتہ رفتہ اسی سلسلہ میں ملثمین کی حکومت برباد ہو کر ایک نئی سلطنت قائم ہوگئی، مح[illegible] تومرت نے خود فرمانروائی کا قصد نہیں کیا، بلکہ ایک لائق شخص کو جس کا نام عبدالمؤمن تھا تخت نشین کیا، عبدالمؤمن اور اس کے خاندان نے جس طرز پر حکومت کی، وہ بالکل اس اصول کے موافق تھی، جو امام غزالی کی تمنا تھی، ابنِ خلدون کتاب ثالث "اخبار بربر" فصل ثالث میں عبدالمومن اور اس کی اولاد کے متعلق لکھتے ہیں :۔

"ان کی حکومت کا یہ انداز تھا کہ علماء کی عزت کی جاتی تھی، اور تمام واقعات اور معاملات میں ان سے مشورہ لے کر کام کیا جاتا تھا، دادخواہوں کی فریاد سنی جاتی تھی، رعایا پر عمال ظلم کرتے تھے تو ان کو سزا دی جاتی تھی، ظالموں کا ہاتھ روک دیا گیا تھا، شاہی ایوانوں میں مسجدیں تعمیر کی گئی تھیں، تمام سرحدی ناکے جہاں یورپ کا ڈانڈا ملتا تھا فوجی طاقت سے مضبوط کر دیئے گئے تھے، اور غزوات و فتوحات کو روز افزوں ترقی تھی"[1]

---

[1] الغزالی ص ۱۷-۱۱۶ ۔

امام غزالی کا عالمِ اسلام پر اثر

ان علمی و عملی کمالات، طاقتور اور جامع شخصیت کا یہ نتیجہ تھا کہ انھوں نے عالمِ اسلام پر بڑا گہرا اثر ڈالا، ان کی عہد آفریں تصنیفات اور مباحث نے علمی حلقوں میں ایک ذہنی تموج اور فکری حریت پیدا کر دی اور ان کو نئی غذا اور طاقت پہونچائی، اسلام کی جو چند شخصیتیں صدیوں تک عالم اسلام کے دل و دماغ پر اور اس کے علمی و فکری حلقوں پر حاوی رہی ہیں، ان میں سے ایک امام غزالی کی شخصیت بھی ہے، جن کی اثر آفرینی، علمی پایہ، ان کی تصنیفات کی اہمیت اور تاثیر، مخالف اور موافق سب کو تسلیم رہی ہے، صدہا انقلابات کے بعد ان کا نام اور کام آج بھی زندہ ہے، اور ان کی تصنیفات ایک بڑے حلقہ میں وقیع اور مقبول ہیں، اور پڑھنے والوں کو آج بھی متاثر کرتی ہیں۔

عمومی دعوت و تذکیر کی ضرورت، اصلاح عام اور بغداد کے داعی الی اللہ

امام غزالی کی مؤثر شخصیت ان کے علمی و اصلاحی کارناموں کی عظمت کے باوجود عمومی دعوت و تذکیر کی ضرورت باقی تھی، مسلمانوں کی بڑی تعداد علمی شبہات اور خصوصی امراض کے بجائے عام اخلاقی کمزوریوں عملی کوتاہیوں اور غفلت اور جہالت کا شکار تھی، اور اس کا جلد مداوا ضروری تھا، اس لئے فوری طور پر ایک سحر بیان خطیب اور ایک ایسی بلند روحانی شخصیت کی ضرورت تھی، جس کا عوام سے زیادہ ربط ہو، اور جو اپنی دعوت و مواعظ، تزکیہ و اصلاح سے جمہور اہل اسلام میں دینی روح، اور نئی ایمانی زندگی پیدا کر دے، مطلق العنان حکومت نے چار سو برس تک مسلمانوں کے اخلاق کو متاثر کیا تھا، اور بڑی تعداد میں ایک ایسا طبقہ پیدا ہو گیا تھا جس کا مقصد زندگی حصول دولت یا جاہ و عزت تھا، اور جو اگرچہ اعتقادی طور پر خدا و آخرت کا منکر نہ تھا، مگر عملاً خدا فراموش، آخرت سے غافل اور عیش میں مست تھا، عجمی تہذیب و معاشرت

نے بھی اسلامی زندگی میں اپنے پنجے گڑ رکھے تھے اور عجمی عادات اور جاہلی رسوم تیز و زندگی بن گئی تھیں زندگی کا معیار بہت بلند ہو گیا تھا سوسائٹی کے مطالبات بہت بڑھ گئے تھے حکام رس، مزاج شناس موقع پرست لوگوں کی ایک مستقل قوم پیدا ہو گئی تھی، متوسط طبقہ امراء کے نقش قدم پر تھا، اور عوام اور محنت کش متوسط طبقہ کے اخلاق و عادات سے متاثر ہو رہے تھے، جن کو وسائل معیشت حاصل تھے، وہ غلط طریقہ پر ان کو استعمال کر رہے تھے، اور زندگی سے تمتع اور لطف اندوزی میں مصروف تھے، جو امیرانہ ٹھاٹ سے محروم تھے، وہ کوفت میں مبتلا تھے اور اپنے کو چوپایہ سے بدتر سمجھتے تھے، اہل دولت ایثار و ہمدردی اور جذبۂ شکر سے خالی اور تنگ حال اور محنت کش، صبر و قناعت، اور یقین و خودداری سے محروم ہوتے جا رہے تھے اس طرح زندگی ایک بحرانی کیفیت میں مبتلا تھی، اس وقت ایک ایسی دعوت کی ضرورت تھی، جو دنیا طلبی کے بحران کو کم کرے، ایمان کو بیدار کرے، اور آخرت کے یقین کو ابھارے، خدا طلبی کا ذوق پیدا کرے، اللہ تعالیٰ کی سچی معرفت، اس کی بندگی اور رضامندی میں عالی ہمتی، اور بلند حوصلگی سے کام لے اور اس راستہ میں سبقت کرنے کی دعوت دے، توحید کامل کو واشگاف بیان کیا جائے، اہلِ دنیا اور اربابِ دولت کی بے وقعتی، اور اسباب کی کمزوری کو طاقت اور وضاحت سے بیان کیا جائے۔

داعی کی علمی صلاحیتیں

پانچویں صدی تاریخِ اسلام میں علوم و فنون کی ترقی میں خاص امتیاز رکھتی ہے، اس صدی میں دینی، عقلی، اور ادبی علوم میں بڑے بڑے باکمال اور ائمۂ فن پیدا ہوئے ہیں، اسی صدی کے آخر میں علامہ ابو اسحٰق شیرازی (م ۴۷۶ھ) اور امام غزالی (م ۵۰۵ھ) جیسے متبحر عالم، اور صاحبِ فنون، ابو الوفا ابنِ عقیل (م ۵۱۳ھ) جیسے فقیہ اور محقق، عبد القاہر جرجانی (م ۴۷۱ھ) جیسے صاحبِ ذوق اور مجتہد فن، ابو زکریا تبریزی (م ۵۰۲ھ) جیسے لغوی اور نحوی، ابو القاسم الحریری (م ۵۱۶ھ) جیسے نثار اور صاحبِ طرز نظر آتے ہیں، جنھوں نے صدیوں دماغوں اور مذاقوں پر حکومت کی ہے، اس مردم خیز عہد اور بغداد جیسی شاداب سرزمین میں

وقیع دینی خدمت کے لئے، اور ذہنوں اور طبیعتوں کا رخ موڑنے کے لئے اعلیٰ علمی صلاحیتوں اور جامع کمالات شخص کی ضرورت تھی، جو اس عصر کے تمام مروجہ علوم میں بلند پایہ رکھتا ہو، اور جس کی روحانی عظمت کے اعتراف کے ساتھ ساتھ اس کے علم و فضیلت کی بھی تحقیر ممکن نہ ہو، وہ اس زمانہ کی معیاری اور بلند زبان میں گفتگو کرتا ہو، اس کی مجلس میں ہر ذوق کے لوگوں کو حظ حاصل ہو، اور کوئی اس کو "عابدِ جاہل" یا "واعظِ بے علم" کہہ کر نظر انداز نہ کر سکے، پھر ضعیف الایمان لوگوں کو اس کی مجلس وعظ اور حلقۂ درس میں یقین کی قوت، ایمان کی حرارت، اہلِ شک و ارتیاب کو شرح صدر کی دولت، مضطرب و بے چین طبیعتوں اور مجروح دلوں کو سکونِ قلب کی نعمت، حقائق و معارف کے طالبین و شائقین کو دقیق علوم اور لطیف مضامین کا خزانہ، بے عملوں اور افسردہ دلوں کو جذبات اور عمل کے محرکات اور قوتِ عمل حاصل ہو۔

بغداد کے دو داعی

اس پر از کمالات دور میں اللہ تعالیٰ نے دین کی دعوت اور مسلمانوں میں از سرِ نو ایمانی حرکت و حرارت اور توبہ و انابت کی کیفیت پیدا کرنے کے لئے دو ہستیوں کو پیدا کیا، جن کی ذات سے دین کو بڑی قوت حاصل ہوئی، ان میں سے ایک کا نام نامی سیدنا عبد القادر جیلانی رحمۃ اللہ علیہ ہے، دوسرے عبد الرحمٰن بن الجوزی ہیں، ذوق و رجحان طبع کے اختلاف کے باوجود دونوں نے اپنے زمانہ میں مسلمانوں کی زندگی پر بڑا گہرا اثر ڈالا ہے، اور اللہ تعالیٰ نے دین کو ان سے بڑا نفع پہونچایا۔ اس میں بھی خدا کی بڑی حکمت تھی کہ بغداد ان کے قیام و دعوت کا مرکز تھا، جو عالم اسلام کا مرکزِ اعصاب اور اس کا علمی و سیاسی دار السلطنت تھا، اللہ تعالیٰ نے ان کو خدمت کے لئے طویل عمر اور وسیع میدان بھی عطا فرمایا۔

مذہب حنبلی کے لئے یہ بڑے فخر کی بات ہے کہ دونوں صاحبوں کا تعلق اسی مذہب کی فقہ و اصول سے ہے۔

حضرت شیخ عبدالقادر جیلانیؒ

تعلیم و تکمیل

سیدنا عبدالقادر جیلانیؒ کی ولادت گیلان[1] میں ۴۷۰ھ[2] میں ہوئی، آپ کا نسب دس واسطوں سے سیدنا امام حسن رضی اللہ عنہ پر منتہی ہوتا ہے، ۱۸ سال کی عمر میں غالباً ۴۸۸ھ میں بغداد تشریف لائے، یہی وہ سال ہے جس سال امام غزالی نے تلاش حق و حصول یقین کے لئے بغداد کو خیر باد کہا تھا، یہ محض اتفاق نہیں کہ ایک جلیل القدر امام سے جب بغداد محروم ہوا تو دوسرا جلیل القدر مصلح اور داعی الی اللہ کا وہاں ورود ہوا[3]، آپ بغداد میں پوری عالی ہمتی اور بلند حوصلگی کے ساتھ تحصیلِ علم میں مشغول ہو گئے، عبادت و مجاہدات کی طرف طبعی کشش کے باوجود آپ نے تحصیلِ علم میں قناعت و زہد سے کام نہیں لیا، ہر علم کو اس کے باکمال استادوں اور صاحبِ فن عالموں سے حاصل کیا، اور اس میں پوری دستگاہ پیدا کی آپ کے اساتذہ میں ابوالوفاء ابن عقیل، محمد بن الحسن الباقلانی اور ابوزکریا تبریزی جیسے نامور علماء و ائمۂ فن کا نام

---

[1] جیلان یا گیلان کو دیلم بھی کہا جاتا ہے، یہ ایران کے شمالی مغربی حصہ کا ایک صوبہ ہے اس کے شمال میں روسی سرزمین تالیس واقع ہے، جنوب میں برز کا پہاڑی سلسلہ ہے، جو اس کو آذربائیجان اور عراق عجم سے علیحدہ کرتا ہے، جنوب میں مازندان کا مشرقی حصہ ہے اور شمال میں بحر قزوین کا مغربی حصہ، وہ ایران کے بہت خوبصورت علاقوں میں شمار ہوتا ہے (دائرۃ المعارف)۔

[2] ابن کثیر ج ۱۲ ص ۱۴۹ [3] البدایہ والنہایہ (اللبنانی) ج ۱۲ ص ۱۴۹

نظر آتا ہے، طریقت کی تعلیم شیخ ابوالخیر حماد بن مسلم الدباس[1] سے حاصل کی، اور قاضی ابوسعید[2] مخرمی سے تکمیل کی اور اجازت حاصل کی۔[3]

اصلاح وارشاد اور رجوع عام

ظاہری و باطنی تکمیل کے بعد اصلاح وارشاد کی طرف متوجہ ہوئے، مسندِ درس، اور مسندِ ارشاد کو بیک وقت زینت دی، اپنے استاد و شیخ شیخ مخرمی کے مدرسہ میں تدریس اور وعظ کا سلسلہ شروع کیا، بہت جلد مدرسہ کی توسیع کی ضرورت پیش آگئی، مخلصین نے عمارت میں اضافہ کرکے اس کو آپ کی مجالس کے قابل بنا دیا، لوگوں کا اس قدر ہجوم ہوا کہ مدرسہ میں تل رکھنے کی جگہ نہ رہی، سارا بغداد آپ کے مواعظ پر ٹوٹ پڑا، اللہ تبارک و تعالیٰ نے ایسی وجاہت و قبولیت عطا فرمائی جو بڑے بڑے بادشاہوں کو نصیب نہیں، شیخ موفق الدین ابن قدامہ صاحبِ "مغنی" کہتے ہیں کہ میں نے کسی شخص کی آپ سے بڑھ کر دین کی وجہ سے تعظیم ہوتے نہیں دیکھی، بادشاہ اور وزرا آپ کی مجالس میں نیازمندانہ حاضر ہوتے اور ادب سے بیٹھ جاتے، علماء و فقہاء کا کچھ شمار نہ تھا، ایک ایک مجلس میں چار چار سو دواتیں شمار کی گئی ہیں، جو آپ کے ارشادات قلمبند کرنے کے لئے لائی جاتیں۔

محامد و اخلاق

بایں رفعت و منزلت حد درجہ متواضع اور منکسر المزاج تھے، ایک بچہ اور ایک لڑکی بھی

---

[1] شعرانی نے لکھا ہے کہ مریدین کی تربیت میں ان کو بلند مقام حاصل تھا، اور بغداد کے اکثر مشائخ اور صوفیہ انہی سے وابستہ تھے ۵۲۵ھ میں انتقال ہوا (طبقات الکبریٰ ج ۱ ص ۱۳۱) [2] اصل نام مبارک بن علی بن الحسین ہے، ابن کثیر نے لکھا ہے کہ انھوں نے حدیث کا سماع، اور امام احمد کے مذہب پر علوم فقہیہ میں کمال پیدا کیا، اور زیادہ تر مناظرہ اور درس و افتاء سے مشغولیت رکھی، ستودہ صفات معتدل مسلک رکھنے والے اور اپنے فن میں بہت صائب الرائے تھے، ۵۱۱ھ میں وفات پائی۔ [3] تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو ذیل طبقات الحنابلہ (ابن رجب

باندھنے لگتی تو کھڑے ہو کر سنتے اور اس کا کام کرتے، غریبوں اور فقراء کے پاس بیٹھتے، اور ان کے کپڑوں کو صاف کرتے، جوں نکالتے لیکن اس کے برخلاف کسی معزز آدمی اور ارکانِ سلطنت کی تعظیم میں کھڑے نہ ہوتے[1] خلیفہ کی آمد ہوتی تو قصداً دولت خانہ میں تشریف لے جاتے یہاں تک کہ خلیفہ آکر بیٹھ جاتا، پھر برآمد ہوتے، تاکہ تعظیماً کھڑا نہ ہونا پڑے[2]، کبھی کسی وزیر یا سلطان کے دروازہ نہیں گئے۔[3]

آپ کے دیکھنے والے اور آپ کے معاصرین آپ کے حسنِ اخلاق، علوحوصلہ، تواضع وانکسار، سخاوت وایثار اور اعلیٰ اخلاقی اوصاف کی تعریف میں رطب اللسان ہیں، ایک بزرگ (حرادہ) جنھوں نے بڑی طویل عمر پائی، اور بہت سے بزرگوں اور ناموروں کو دیکھا، اور ان کی صحبت اٹھائی، فرماتے ہیں:۔

مارأت عيناي احسن خلقاً ولا اوسع	میری آنکھوں نے حضرت شیخ عبدالقادر سے بڑھ کر
صدراً ولا اكرم نفساً ولا الطف قلباً	کوئی خوش اخلاق، فراخ حوصلہ، کریم النفس، رقیق القلب
ولا احفظ عهداً او وداً من سيدنا الشيخ	محبت اور تعلقات کا پاس کرنے والا نہیں دیکھا، آپ
عبدالقادر ولقد كان مع جلالة قدره	عظمت اور علو مرتبت اور وسعت علم کے باوجود چھوٹے
وعلو منزلته وسعة علمه يقف	کی رعایت فرماتے، بڑے کی توقیر کرتے، سلام میں سبقت
مع الصغير ويوقر الكبير ويبدأ بالسلام	فرماتے، کمزوروں کے پاس اٹھتے بیٹھتے، غریبوں کے ساتھ
ويجالس الضعفاء ويتواضع للفقراء	تواضع وانکساری سے پیش آتے، حالانکہ آپ کسی
وما قام لاحد من العظماء ولا الاعيان	سربرآوردہ یا رئیس کے لئے تعظیماً کھڑے نہیں ہوئے
ولا الم بباب وزير ولا سلطان۔[4]	اور نہ کسی وزیر یا حاکم کے دروازہ پر گئے۔

الامام الحافظ ابوعبداللہ محمد بن یوسف البرزالی الاشبیلی ان الفاظ میں آپ کی تعریف کرتے ہیں:۔

كان مجاب الدعوة سريع الدمعة	آپ مستجاب الدعوات تھے، (اگر کوئی عبرت اور

[1] الطبقات الکبریٰ للشعرانی ج ۱ ص ۱۲۷ [2] ایضاً ص ۱۲۸ [3] ایضاً ص ۱۲۷ [4] ایضاً

دائم الذکر کثیر الفکر رقیق القلب	رقت کی بات کی جاتی) تو جلدی آنکھوں میں آنسو
دائم البشر کریم النفس سخی الید	آجاتے ہمیشہ ذکر و فکر میں مشغول رہتے بڑے رقیق
غزیر العلم شریف الاخلاق طیب	القلب تھے خندہ پیشانی شگفتہ رو کریم النفس،
الاعراق مع قدم راسخ فی العبادۃ	فراخ دست، وسیع العلم بلند اخلاق، عالی نسب،
والاجتہاد، [1]	عبادات اور مجاہدہ میں آپ کا پایہ بلند تھا۔

مفتیِ عراق محی الدین ابو عبد اللہ محمد بن حامد البغدادی لکھتے ہیں:۔

ابعد الناس عن الفحش اقرب	غیر مہذب بات سے انتہائی دور، حق اور معقول
الناس الی الحق شدید الباس	بات سے بہت قریب اگر احکام خداوندی اور
اذا انتہکت محارم اللہ عز و جل	حدود الٰہی میں سے کسی پر دست درازی ہوتی تو آپ کو
لا یغضب لنفسہ ولا ینتصر لغیر ربہ	جلال آجاتا، خود اپنے معاملہ میں کبھی غصہ نہ آتا، اور
	اللہ عز و جل کے علاوہ کسی چیز کے لئے انتقام نہ لیتے
	کسی سائل کو خالی ہاتھ واپس نہ کرتے خواہ بدن کا
	کپڑا ہی کیوں نہ اتار کر دینا پڑے۔

بھوکوں کو کھانا کھلانے اور ضرورت مندوں پر بے دریغ خرچ کرنے کا خاص ذوق تھا، علامہ ابن النجار آپ سے نقل کرتے ہیں کہ "اگر ساری دنیا کی (دولت) میرے قبضہ میں ہو تو میں بھوکوں کو کھانا کھلادوں" یہ بھی فرماتے تھے کہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ میری ہتھیلی میں سوراخ ہے، کوئی چیز اس میں ٹھہرتی نہیں، اگر ہزار دینار میرے پاس آئیں تو رات نہ گزرنے پائے [2]، صاحب "قلائد الجواہر" لکھتے ہیں کہ "حکم تھا کہ رات کو وسیع دسترخوان بچھے، خود مہمانوں کے ساتھ کھانا تناول فرماتے، کمزوروں اور غریبوں کی ہم نشینی فرماتے،

---

[1] قلائد الجواہر ص ۹ [2] ایضاً

طلبہ کی باتوں کو برداشت کرتے اور تحمل فرماتے، ہر شخص یہ سمجھتا کہ اس سے بڑھ کر کوئی ان کا مقرب، اور ان کے یہاں معزز نہیں، ساتھیوں میں سے جو غیر حاضر ہوتا، اس کا حال دریافت فرماتے اور اس کی فکر رکھتے، تعلقات کا بڑا پاس اور لحاظ تھا، غلطیوں اور کوتاہیوں سے درگزر کرتے، اگر کوئی کسی بات پر قسم کھا لیتا تو اس کو مان لیتے اور جو کچھ (حقیقت حال جانتے تھے) اس کا اخفا فرماتے۔"[1]

مردہ دلوں کی مسیحائی

سیدنا عبدالقادر جیلانیؒ کی کرامت کی کثرت پر مورخین کا اتفاق ہے، شیخ الاسلام عزالدین بن عبدالسلام[2] اور امام ابن تیمیہ کا قول ہے کہ شیخ کی کرامات حد تواتر کو پہونچ گئی ہیں، ان میں سب سے بڑی کرامت مردہ دلوں کی مسیحائی تھی، اللہ تعالیٰ نے آپ کے قلب کی توجہ اور زبان کی تاثیر سے لاکھوں انسانوں کو نئی ایمانی زندگی عطا فرمائی، آپ کا وجود اسلام کے لئے ایک باد بہاری تھا جس نے دلوں کے قبرستان میں نئی جان ڈال دی، اور عالمِ اسلام میں ایمان و روحانیت کی ایک نئی لہر پیدا کر دی۔[3] شیخ عمر کیسانی کہتے ہیں کہ کوئی مجلس ایسی نہ ہوتی تھی جس میں یہودی اور عیسائی اسلام نہ قبول کرتے ہوں، اور رہزن خونی اور جرائم پیشہ توبہ سے مشرف نہ ہوتے ہوں، فاسد الاعتقاد اپنے غلط عقائد سے توبہ نہ کرتے ہوں۔[4]

جبائی کا بیان ہے کہ مجھ سے حضرت شیخ نے ایک روز فرمایا کہ میری تمنا ہوتی ہے کہ زمانۂ سابق کی طرح صحراؤں اور جنگلوں میں رہوں، نہ مخلوق مجھے دیکھے، نہ میں اس کو دیکھوں، لیکن اللہ تعالیٰ کو اپنے بندوں کا نفع منظور ہے، میرے ہاتھ پر پانچ ہزار سے زائد یہودی اور عیسائی مسلمان ہو چکے ہیں، عیاروں اور جرائم پیشہ لوگوں میں سے ایک لاکھ سے زائد توبہ کر چکے ہیں، اور یہ اللہ تعالیٰ کی بڑی نعمت ہے۔[5]

مورخین کا بیان ہے کہ بغداد کی آبادی کا بڑا حصہ حضرتؒ کے ہاتھ پر توبہ سے مشرف ہوا، اور

---

[1] قلائد الجواہر ص ۹ [2] ذیل طبقات الحنابلہ ابن رجب [3] بلاء العینین ص ۱۳۰ [4] ص ۵۰۴ [5] قلائد الجواہر و مختلف کتب تذکرہ

بکثرت یہودی، عیسائی، اور اہل ذمہ مسلمان ہوئے[۱]

تعلیمی مشاغل وخدمات

اعلیٰ مراتب ولایت پر فائز ہونے اور نفوس واخلاق کی اصلاح وتربیت میں ہمہ تن مشغول ہونے کے ساتھ آپ درس وتدریس، افتاء اور تصحیح اعتقاد اور مذہب اہل سنت کی نصرت وحمایت سے غافل نہ تھے، عقائد واصول میں امام احمد اور محدثین کے مسلک پر تھے، مذہب اہل سنت اور سلف کے مسلک کو آپ سے بڑی تقویت حاصل ہوئی، اور اس کے مقابلہ میں اعتقادی وعملی بدعات کا بازار سرد ہوگیا ابن السمعانی کہتے ہیں کہ متبعین سنت کی شان آپ کی وجہ سے بڑھ گئی، اور ان کا پلڑا بھاری ہوگیا۔

مدرسہ میں ایک سبق تفسیر کا، ایک حدیث کا، ایک فقہ کا اور ایک اختلافاتِ ائمہ اور ان کے دلائل کا پڑھاتے تھے، صبح شام تفسیر، حدیث، فقہ، مذاہب ائمہ، اصول فقہ اور نحو کے اسباق ہوتے، ظہر کے بعد تجوید کی تعلیم ہوتی، اس کے علاوہ افتاء کی مشغولیت تھی، بالعموم مذہب شافعی اور مذہبِ حنبلی کے مطابق فتویٰ دیتے، علماء عراق آپ کے فتاویٰ سے بڑے متعجب ہوتے، اور بڑی تعریف کرتے[۲]۔

ایک مرتبہ استفتاء آیا کہ ایک شخص نے قسم کھائی کہ وہ کوئی ایسی عبادت کرے گا جس میں عبادت کے وقت کوئی دوسرا شریک نہیں ہوگا، اگر اس نے قسم پوری نہیں کی تو اس کی بیوی کو تین طلاق، علماء یہ استفتا سُن کر حیرت میں پڑ گئے کہ ایسی کون سی عبادت ہوسکتی ہے جس میں وہ بالکل تنہا ہو، اور روئے زمین پر کوئی شخص بھی اس وقت وہ عبادت نہ کر رہا ہو، حضرت شیخ کے پاس استفتاء آیا تو بے تکلف فرمایا کہ مطاف اس کے لئے خالی کردیا جائے، اور وہ سات چکر کرکے خانۂ کعبہ کا طواف تنہا مکمل کرے، علما نے یہ جواب سن کر بے ساختہ داد تحسین دی اور کہا کہ یہی ایک صورت ہے کہ وہ بلا شرکت غیرے عبادت کرے، اور اپنی

---

[۱] قلائد الجواہر ومختلف کتب تذکرہ۔ [۲] الطبقات الکبریٰ للشعرانی ج ا ص۱۲۶، وطبقات الحنابلہ ابن رجب۔

قسم پوری کرے، اس لئے کہ طواف بیت اللہ پر موقوف ہے، اور مطاف اس شخص کے لئے مخصوص کر دیا گیا ہے، اب اس عبادت میں کہیں بھی شرکت کا امکان نہیں۔[۱]

استقامت و تحقیق

حضرت شیخ استقامت کا پہاڑ تھے، اتباع کامل، علم راسخ، اور تائید غیبی نے آپ کو اس مقام پر پہونچا دیا تھا کہ حق و باطل، نور و ظلمت، الہام صحیح اور کید شیطانی میں پورا امتیاز پیدا ہو گیا تھا، آپ پر یہ حقیقت پوری طرح منکشف ہو گئی تھی کہ شریعتِ محمدی کے احکام اور حلال و حرام میں قیامت تک کے لئے تغیر و تبدل کا امکان نہیں، جو اس کے خلاف دعویٰ کرے، وہ شیطان ہے، ارشاد فرماتے ہیں کہ "ایک مرتبہ ایک بڑی عظیم الشان روشنی ظاہر ہوئی جس سے آسمان کے کنارے بھر گئے، اس سے ایک صورت ظاہر ہوئی، اس نے مجھ سے خطاب کر کے کہا کہ اے عبد القادر! میں تمہارا رب ہوں، میں نے تمہارے لئے سب محرمات حلال کر دیئے ہیں، میں نے کہا دور ہو مردود! یہ کہتے ہی وہ روشنی ظلمت سے بدل گئی، اور وہ صورت دھواں بن گئی، اور ایک آواز آئی کہ عبد القادر! خدا نے تم کو تمہارے علم و تفقہ کی وجہ سے بچا لیا، ورنہ اس طرح میں ستر صوفیوں کو گمراہ کر چکا ہوں، میں نے کہا کہ اللہ کی مہربانی ہے، کسی نے عرض کیا کہ حضرت آپ کیسے سمجھے کہ یہ شیطان ہے، فرمایا اس کے کہنے سے کہ میں نے حرام چیزوں کو تمہارے لئے حلال کر دیا۔"[۲]

یہ بھی آپ کا ارشاد ہے کہ اگر حدود الٰہی (احکام شرعی) میں سے کوئی حد ٹوٹتی ہو تو سمجھ لو کہ تم فتنہ میں پڑ گئے ہو، اور شیطان تم سے کھیل رہا ہے، فوراً شریعت کی طرف رجوع کرو، اس کو مضبوط تھام لو، نفس کی خواہشات کو جواب دو، اس لئے کہ ہر وہ حقیقت جس کی شریعت تائید نہیں کرتی، باطل ہے۔[۳]

---

[۱] الطبقات الکبریٰ للشعرانی ج ۱ ص ۱۲۶، و طبقات الحنابلہ (ابن رجب) [۲] ایضاً ص ۱۲۸ [۳] ایضاً۔

تفویض و توحید

تسلیم و تفویض اور توحیدِ کامل حضرت کا خصوصی حال تھا، کبھی کبھی تعلیماً اس حال اور اس مقام کی تشریح فرماتے تھے، وہ دراصل آپ کا حال ہے۔

خوشتر آں باشد کہ سرِّ دلبراں | گفتہ آید در حدیث دیگراں

ایک موقع پر ارشاد فرماتے ہیں:-

"جب بندہ کسی بلا میں مبتلا کیا جاتا ہے تو پہلے وہ خود اس سے نکلنے کی کوشش کرتا ہے، اگر نجات نہیں پاتا، تو مخلوقات میں سے اوروں سے مدد مانگتا ہے، مثلاً بادشاہوں یا حاکموں یا دنیاداروں یا امیروں سے اور درد دکھ میں طبیبوں سے، جب ان سے بھی کام نہیں نکلتا اس وقت اپنے پروردگار کی طرف دعا اور گریۂ وزاری و حمد و ثنا کے ساتھ رجوع کرتا ہے (یعنی) جب تک اپنے نفس سے مدد مل جاتی ہے، خلق سے رجوع نہیں کرتا، اور جب تک خلق سے مدد مل جاتی ہے، خدا کی طرف متوجہ نہیں ہوتا، پھر جب خدا کی طرف سے (بھی) کوئی مدد نظر نہیں آتی تو (بے بس ہو کر) خدا کے ہاتھوں میں آرہتا ہے، اور ہمیشہ سوال و دعا، اور گریۂ وزاری اور ستائش و اظہارِ حاجت مندی، امید و بیم کے ساتھ کیا کرتا ہے، پھر خدا اس کو دعا سے (بھی) تھکا دیتا ہے، اور قبول نہیں کرتا یہاں تک کہ کل اسباب (منقطع ہو جاتے ہیں، اور وہ سب سے) علیحدہ ہو جاتا ہے، اس وقت اس میں (احکام) قضا و قدر کا نفاذ ہوتا ہے، اور اس کے اندر (خدا اپنا) کام کرتا ہے، تب بندہ کل اسباب و حرکات سے بے پروا ہو جاتا ہے، اور روح صرف رہ جاتا ہے، اسے فعلِ حق کے سوا کچھ نظر نہیں آتا، اور وہ ضرور بالضرور صاحبِ یقین موحد ہو جاتا ہے، قطعی طور پر جانتا ہے کہ درحقیقت خدا کے سوا نہ کوئی (کچھ) کرنے والا ہے، اور نہ حرکت و سکون دینے والا، نہ اس کے سوا کسی کے ہاتھ میں اچھائی اور برائی، نفع و نقصان، بخشش و حرمان، کشائش و بندش، موت و زندگی، عزت

ذلت، غنا و فقر، اس وقت (احکام قضا و قدر) میں بندہ کی یہ حالت ہوتی ہے، جیسے شیر خوار بچہ دایہ کی گود میں یا مردہ غسال کے ہاتھ میں یا (پولوکا) گیند سوار کے قبضہ میں کہ الٹا پلٹا جاتا ہے، اور بگاڑا بنایا جاتا ہے، اس میں اپنی طرف سے کوئی حرکت نہیں، نہ اپنے لئے، نہ کسی اور کے لئے، یعنی بندہ اپنے مالک کے فعل میں اپنے نفس میں غائب ہو جاتا ہے، اور اپنے مالک اور اس کے فعل کے سوا نہ کچھ دیکھتا سنتا ہے، نہ کچھ سوچتا سمجھتا، اگر دیکھتا ہے، تو اس کی صنعت، اور اگر سنتا ہے تو اسی کا کلام، اس کے علم سے (ہر چیز کو) جانتا ہے، اس کی نعمت سے لطف اٹھاتا ہے، اس کے قرب سے سعادت پاتا ہے، اس کی تقریب (جاذبہ) سے آراستہ پیراستہ ہوتا ہے، اس کے وعدہ سے خوش ہوتا ہے، سکون پاتا اور اطمینان حاصل کرتا ہے، اس کی باتوں سے مانوس ہوتا ہے، اور اس کے غیر سے وحشت و نفرت کرتا ہے اس کی یاد میں سرنگوں ہوتا اور جی لگاتا ہے، اس کی ذات پر اعتماد اور بھروسہ کرتا ہے، اس کے نور معرفت سے ہدایت پاتا اور اس کا خرقہ لباس پہنتا ہے، اس کے علوم عجیب و نادر پر مطلع ہوتا ہے، اس کے قدرت کے اسرار سے مشرف ہوتا ہے اس کی ذات پاک سے (ہر بات سنتا اور اسے یاد رکھتا ہے، پھر ان (نعمتوں) پر حمد و ثنا و شکر و سپاس کرتا ہے۔"[1]

خلق خدا پر شفقت

عامۃ الناس اور امت محمدیہ کے ساتھ آپ کو جو تعلق، جو فکر اور اس کے حال پر جو شفقت تھی، اور جو نائبین رسول اور مقبولین کی خاص علامت ہے، اس کا اندازہ آپ کی اس تقریر سے ہو سکتا ہے، جس میں آپ نے بازار میں جانے والوں کے احوال و مراتب بیان کئے ہیں، ان میں آخری مرتبہ کا ذکر کرتے ہوئے فرماتے ہیں، اور دراصل حدیث دیگراں میں اپنا ہی حال اور مقام بیان کرتے ہیں۔

"اور پانچواں وہ شخص ہے کہ جب بازار میں داخل ہوتا ہے تو اللہ سے ان کا دل بھر جاتا ہے، ان لوگوں پر

[1] فتوح الغیب مقالہ (۳) ترجمہ مولوی محمد عالم صاحب کاکوروی (رموز الغیب) ص ۱۱، ۱۲، ۱۳

رحمت کرنے کے لئے، اور یہ رحمت اسے کچھ دیکھنے ہی نہیں دیتی کہ ان لوگوں کے پاس کیا کچھ ہے، وہ تو اپنے داخلہ کے وقت سے باہر نکلنے کے وقت تک بازار والوں کے لئے دعا و استغفار و شفاعت میں اور ان پر رحمت و شفقت میں مشغول رہتا ہے، اس کا دل ان لوگوں کے لئے ان کے حال پر جلتا رہتا ہے، اور آنکھیں روتی رہتی ہیں، اور زبان ان نعمتوں پر جو خدا نے ان لوگوں کو اپنے فضل سے دی ہیں، خدا کا شکر اور اس کی حمد و ثنا کرتی رہتی ہے۔"[1]

حضرت شیخ کا عہد اور ماحول

حضرت شیخ عبدالقادر جیلانیؒ نے بغداد میں ۷۳ سال گزارے اور عباسی خلفاء میں سے پانچ ان کی نظروں کے سامنے یکے بعد دیگرے مسند خلافت پر بیٹھے، جس وقت وہ بغداد میں رونق افروز ہوئے اس وقت خلیفہ مستظہر باللہ ابوالعباس (م ۵۱۲ھ) کا عہد تھا، ان کے بعد بالترتیب مسترشد، راشد المقتفی لامراللہ و المستنجد باللہ تخت سلطنت پر متمکن ہوئے۔

شیخؒ کا یہ عہد بہت اہم تاریخی واقعات سے لبریز ہے، سلجوقی سلاطین اور عباسی خلفاء کی باہمی کشمکش اس زمانہ میں پورے عروج پر تھی، یہ سلاطین عباسی حکومت پر اپنا اقتدار قائم کرنے کے لئے دل و جان سے کوشاں تھے، کبھی خلیفہ کی رضامندی کے ساتھ اور کبھی اس کی مخالفت و ناراضی کے باوجود، کبھی کبھی خلیفہ اور سلطان کے لشکروں میں باقاعدہ معرکہ آرائی بھی ہوتی، اور مسلمان ایک دوسرے کا بے دریغ خون بہاتے۔

اس طرح کے واقعات مسترشد کے زمانہ میں کئی مرتبہ پیش آئے، یہ عہد عباسی کا سب سے زیادہ طاقتور اور معقول[2] خلیفہ تھا، اور اکثر معرکوں میں فتح بھی اسی کو حاصل ہوتی، لیکن ۱۰ رمضان ۵۱۹ھ میں سلطان مسعود

---

[1] فتوح الغیب مقالہ (۷۰) ترجمہ مولوی محمد عالم صاحب کاکوروی (رموز الغیب) ص ۱۷۵ [2] ابن کثیر نے اس کے مناقب میں لکھا ہے کہ مسترشد بہت شجاع، حوصلہ مند، فصیح و بلیغ، شیریں کلام اور بہت عبادت گذار خلیفہ تھا، اور خاص و عام (باقی ص ۲۰۷)

اور اس کے درمیان جو معرکہ ہوا اس میں اس کو شکست فاش ہوئی۔

ابن کثیر لکھتے ہیں :-

"سلطان کے لشکر کو فتح حاصل ہوئی، خلیفہ قید کر لیا گیا، اہل بغداد کی املاک کو لوٹ لیا گیا، اور یہ خبر دوسرے تمام صوبوں میں پھیل گئی، بغداد اس المناک خبر سے بہت متاثر ہوا، اور وہاں کے باشندوں میں ظاہر و باطن ہر لحاظ سے ایک زلزلہ سا آگیا، عوام نے مسجد کے منبروں تک کو توڑ ڈالا، اور جماعتوں میں شریک ہونا بھی چھوڑ دیا، عورتیں سر سے دوپٹہ ہٹا کر نوحہ خوانی کرتی ہوئی باہر نکل آئیں اور خلیفہ کی قید، اور اس کی پریشانیوں و مصیبتوں کا ماتم کرنے لگیں، دوسرے علاقے بھی بغداد ہی کے نقش قدم پر چلے، اور اس کے بعد یہ فتنہ اتنا بڑھا کہ کم و بیش تمام علاقے اس سے متاثر ہو گئے، ملک سنجر نے یہ ماجرا دیکھ کر اپنے بھتیجے کو معاملہ کی نزاکت اور اہمیت سے آگاہ اور خبردار کیا اور اس کو حکم دیا کہ خلیفہ کو بحال کرے، ملک مسعود نے اس حکم کی تعمیل کی، لیکن خلیفہ کو باطنیوں نے بغداد کے راستہ میں قتل کر دیا۔"

یہ تمام الم انگیز واقعات شیخ عبدالقادر جیلانیؒ کی نگاہوں کے سامنے گزرے، انھوں نے مسلمانوں کے باہمی افتراق و خانہ جنگی اور دشمنی کو اپنی آنکھوں سے دیکھا، انھوں نے یہ بھی دیکھا کہ دنیا کی محبت کی خاطر اور ملک و سلطنت اور جاہ و مرتبہ کے حصول کے لئے لوگ سب کچھ کر گزرنے پر آمادہ ہیں، اور ان کو صرف دربار کی شان و شوکت سے دلچسپی باقی رہ گئی ہے، وہ اہل سلطنت کو تقدس کی نگاہ سے دیکھنے لگے ہیں، اور صوبوں اور شہروں کی حکومت حاصل کرنے کے لئے سر دھڑ کی بازی لگائے ہوئے ہیں۔

شیخ عبدالقادر جیلانیؒ کا مادی وجود خواہ ان واقعات سے علیحدہ اور دور رہا ہو لیکن اپنے شعور و احساس کے ساتھ وہ اسی آگ میں جل رہے تھے، اور اسی سوز دروں نے ان کو پوری ہمت و طاقت اور اخلاص

(باقی ص۲۰۶ کا) سب کی نظروں میں محبوب تھا، وہ آخری خلیفہ تھا جس نے خطبہ دینے کی رسم برقرار رکھی، ۵۴ سال ۳ ماہ کی عمر میں اس کو شہید کر دیا گیا، اس کی مدت خلافت ۱۷ [illegible] ۲۰ روز ہے (البدایہ والنہایہ ج ۱۲ ص۲۰۵)

کے ساتھ وعظ وارشاد، دعوت وتربیت، اصلاح نفوس اور تزکیۂ قلوب کی طرف متوجہ کیا، اور انھوں نے نفاق اور حب دنیا کی تحقیر وتذلیل، ایمانی شعور کے احیا، عقیدۂ آخرت کی تذکیر اور اس سرائے فانی کی بے ثباتی کے مقابلہ میں اس حیات جاودانی کی اہمیت، تہذیب اخلاق، توحید خالص اور اخلاص کامل کی دعوت پر سارا زور صرف کر دیا۔

مواعظ وخطبات

حضرت شیخ کے مواعظ دلوں پر بجلی کا اثر کرتے تھے، اور وہ تاثیر آج بھی آپ کے کلام میں موجود ہے، فتوح الغیب اور الفتح الربانی کے مضامین اور آپ کی مجالس کے وعظ کے الفاظ آج بھی دلوں کو گرماتے ہیں، ایک طویل مدت گزر جانے کے بعد بھی ان میں زندگی اور تازگی محسوس ہوتی ہے۔

انبیاء علیہم السلام کے نائبین اور عارفین کاملین کے کلام کی طرح یہ مضامین بھی ہر وقت کے مناسب اور سامعین اور مخاطبین کے حالات وضروریات کے مطابق ہوتے تھے، عام طور پر لوگ جن بیماریوں میں مبتلا، اور جن مغالطوں میں گرفتار تھے انھیں کا ازالہ کیا جاتا تھا، اسی لئے حاضرین آپ کے ارشادات میں اپنے زخم کا مرہم اپنے مرض کی دوا، اور اپنے سوالات وشبہات کا جواب پاتے تھے، اور تاثیر اور عام نفع کی یہ ایک بڑی وجہ تھی، پھر آپ زبان مبارک سے جو فرماتے تھے، وہ دل سے نکلتا تھا، اس لئے دل پر اثر کرتا تھا، آپ کے کلام میں بیک وقت شوکت وعظمت بھی ہے، اور دل آویزی اور حلاوت بھی، اور "صدیقین" کے کلام کی یہی شان ہے۔

توحید خالص اور غیر اللہ کی بے حقیقتی

اس وقت ایک عالم کا عالم اہل حکومت اور اہل دولت کے دامن سے وابستہ تھا، لوگوں نے مختلف انسانوں اور مختلف ہستیوں کو نفع وضرر کا مالک سمجھ لیا تھا، اسباب کو ارباب کا درجہ دے دیا گیا

تھا، اور قضاو قدر کو بھی اپنے جیسے انسانوں سے متعلق سمجھ لیا گیا تھا ایک ایسی فضا میں حضرت شیخ فرماتے ہیں:

"کل مخلوقات کو اس طرح سمجھو کہ بادشاہ نے جس کا ملک بہت بڑا اور حکم سخت اور رعب و داب دل ہلا دینے والا ہے ایک شخص کو گرفتار کر کے اس کے گلے میں طوق اور پیروں میں کڑا ڈال کر ایک صنوبر کے درخت میں ایک نہر کے کنارے جس کی موجیں زبردست پاٹ بہت بڑا تھا، بہت گہری بہاؤ بہت زوروں پر ہے لٹکا دیا ہے اور خود ایک نفیس اور بلند کرسی پر کہ اس تک پہنچنا مشکل ہے، تشریف فرما ہے، اور اس کے پہلو میں تیر و پیکان، نیزہ و کمان اور ہر طرح کے اسلحہ کا انبار ہے، جن کی مقدار خود بادشاہ کے سوا کوئی نہیں جانتا، اب ان میں سے جو چیز چاہتا ہے اٹھا کر اس لٹکے ہوئے قیدی پر چلاتا ہے، تو کیا (یہ تماشا) دیکھنے والے کے لئے بہتر ہو گا کہ وہ سلطان کی طرف سے نظر ہٹا لے اور اس کے خوف و امید ترک کردے، اور لٹکے ہوئے قیدی سے امید و بیم رکھے کیا جو شخص ایسا کرے عقل کے نزدیک بے عقل، بے ادراک دیوانہ، چوپایہ اور انسانیت سے خارج نہیں ہے، خدا کی پناہ بینائی کے بعد نابینائی، اور وصول کے بعد جدائی اور قرب و ترقی کے بعد تنزل اور ہدایت کے بعد گمراہی اور ایمان کے بعد کفر سے"[1]

ایک دوسری مجلس میں توحید و اخلاق اور ماسوائے اللہ سے انقطاع کی تعلیم اس طرح دیتے ہیں:-

"اس پر نظر رکھو جو تم پر نظر رکھتا ہے اس کے سامنے رہو جو تمہارے سامنے رہتا ہے، اس سے محبت کرو جو تم سے محبت کرتا ہے اس کی بات مانو جو تم کو بلاتا ہے اپنا ہاتھ اسے دو جو تم کو گرنے سے سنبھال لے گا اور تم کو جہل کی تاریکیوں سے نکال لے گا، اور ہلاکتوں سے بچائے گا، نجاستیں دھو کر میل کچیل سے پاک کرے گا تم کو تمہاری سڑاہند اور بدبو اور پست ہمتی اور نفس بدکار، و رفیقان گمراہ، و گمراہ کن سے نجات دے گا جو شیاطین خواہشیں اور تمہارے جاہل دوست ہیں، خدا کی راہ کے رہزن اور تم کو ہر نفیس اور ہر عمدہ اور پسندیدہ چیز سے محروم رکھنے والے، کب تک عادت؟ کب تک خلق؟ کب تک خواہش؟ کب تک

---

[1] رموز الغیب ترجمہ فتوح الغیب مقالہ (۱۷) ص ۴۹

رعونت؟ کب تک دنیا؟ کب تک آخرت؟ کب تک ماسوائے حق؟ کہاں چلے تم؟ (اس خدا کو چھوڑ کر جو) ہر چیز کا پیدا کرنے والا ہے، اور بنانے والا ہے، اول ہے، آخر ہے، ظاہر ہے، باطن ہے، دلوں کی محبت روحوں کا اطمینان، گرانیوں سے سبکدوشی، بخشش و احسان، ان سب کا رجوع اسی کی طرف ہے، اور اسی کی طرف سے اس کا صدور ہے۔[1]

ایک دوسری مجلس میں اسی توحید کے مضمون کو اس طرح واشگاف بیان فرماتے ہیں :۔

"ساری مخلوق عاجز ہے، نہ کوئی تجھ کو نفع پہنچا سکتا ہے، نہ نقصان، بس حق تعالیٰ اس کو ان کے ہاتھوں کرا دیتا ہے، اسی کا فعل تیرے اندر اور مخلوق کے اندر تصرف فرماتا ہے، جو کچھ تیرے لئے مفید ہے یا مضر ہے، اس کے متعلق اللہ کے علم میں قلم چل چکا ہے اس کے خلاف نہیں ہو سکتا، جو موحد اور نیکوکار ہیں، وہ باقی مخلوق پر اللہ کی حجت ہیں، بعض ان میں سے ایسے ہیں، جو ظاہر اور باطن دونوں اعتبار سے دنیا سے برہنہ ہیں، گو دولت مند ہیں، مگر حق تعالیٰ ان کے اندرون پر دنیا کا کوئی اثر نہیں پاتا، یہی قلوب ہیں، جو صاف ہیں، جو شخص اس پر قادر ہوا، اس کو مخلوقات کی بادشاہت مل گئی، وہی بہادر پہلوان ہے، بہادر وہی ہے جس نے اپنے قلب کو ماسوائے اللہ سے پاک بنایا، اور قلب کے دروازہ پر توحید کی تلوار اور شریعت کی شمشیر لے کر کھڑا ہو گیا کہ مخلوقات میں سے کسی کو بھی اس میں داخل نہیں ہونے دیتا اپنے قلب کو مقلب القلوب سے وابستہ کرتا ہے، شریعت اس کے ظاہر کو تہذیب سکھاتی ہے، اور توحید و معرفت باطن کو مہذب بناتی ہیں۔"[2]

معبودانِ باطل کی تشریح کرتے ہوئے فرماتے ہیں :۔

"آج تو اعتماد کر رہا ہے اپنے نفس پر، مخلوق پر، اپنے دیناروں پر، اپنے درہموں پر، اپنی خرید و فروخت پر، اور اپنے شہر کے حاکم پر، ہر چیز کہ جس پر تو اعتماد کرے، وہ تیرا معبود ہے، اور ہر وہ شخص

---

[1] رموز الغیب مقالہ (۶۲) ص۱۵۱ [2] فیوض یزدانی ترجمہ الفتح الربانی، مجلس ۱۳ ص۸۹

جس سے تو خوف کرے، یا توقع رکھے، وہ تیرا معبود ہے، اور ہر وہ شخص جس پر نفع اور نقصان کے متعلق تیری نظر پڑے، اور تو یوں سمجھے کہ حق تعالیٰ ہی اس کے ہاتھوں اس کا جاری کرنے والا ہے، تو وہ تیرا معبود ہے[1]"

ایک دوسرے موقع پر خدا کی غیرت، شرکا سے نفرت، اور انسان کی محبوب چیزوں کے سلب اور ضائع ہو جانے کی حکمت اس طرح بیان فرماتے ہیں :۔

"تم اکثر کہتے ہو گے اور کہو گے، میں جس سے محبت کرتا ہوں اس سے میری محبت رہنے نہیں پاتی، اور رخنہ پڑ جاتا ہے، یا تو جدائی ہو جاتی ہے یا وہ مر جاتا ہے یا رنجش ہو جاتی ہے اور مال سے اگر محبت کرتا ہوں تو وہ ضائع ہو جاتا ہے، اور ہاتھ سے نکل جاتا ہے، تب تم سے کہا جائے گا کہ اے خدا کے محبوب، اے وہ کہ جس پر خدا کی عنایت ہے، اے وہ جو خدا کا منظور نظر ہے، اے وہ جس کے لئے اور جس پر خدا کی غیرت آتی ہے، کیا تمہیں معلوم نہیں کہ اللہ غیور ہے، اس نے تم کو اس لئے پیدا کیا، اور تم غیر کے ہو رہنا چاہتے ہو، کیا تم نے خدا کا یہ ارشاد نہیں سنا کہ" وہ ان لوگوں کو دوست رکھتا ہے، اور وہ اسے" اور یہ ارشاد کہ "میں نے جن و انس کو صرف اس لئے پیدا کیا ہے کہ وہ میری عبادت کریں" کیا تم نے رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد نہیں سنا کہ" خدا جب کسی بندے سے محبت کرتا ہے، تو اسے مبتلا کرتا ہے، پھر اگر وہ صبر کرتا ہے تو اسے رکھ چھوڑتا ہے" عرض کیا گیا یا رسول اللہ رکھ چھوڑنے سے کیا مراد ہے؟ فرمایا "اس کے مال و اولاد کو باقی نہیں رکھتا" اور یہ معاملت اس لئے ہے کہ جب مال و اولاد ہوں گے تو اسے ان کی محبت بھی رہے گی، اور خدا سے جو محبت اسے ہے، متفرق اور ناقص اور تقسیم ہو کر حق اور غیر حق میں مشترک ہو جائے گی، اور خدا شریک کو قبول نہیں کرتا، وہ غیور ہے اور ہر چیز پر غالب و زبردست، تو وہ اپنے شریک کو ہلاک و معدوم کر دیتا ہے، تاکہ وہ اپنے بندہ کے دل کو خالص کر لے خاص اپنے لئے بغیر شریک کے، اس وقت اس کا یہ ارشاد صادق آجاتا ہے کہ" وہ ان لوگوں کو

---

[1] فیوض یزدانی مجلس ۲۰ - ص ۱۳۷

دوست رکھتا ہے، اور وہ لوگ ایسے یہاں تک کہ دل جب (خدا کے ان مصنوعی) شریکوں اور برابری کرنے والوں سے جو اہل و عیال، دولت و لذت اور خواہشیں ہیں، نیز ولایت و ریاست، کرامات و حالات، منازل و مقالات، جنتوں اور درجات اور قرب و نزدیکی کی طلب سے پاک و صاف ہو جاتا ہے تو اس میں کوئی ارادہ اور آرزو باقی نہیں رہتی، اور وہ مثل سوراخ دار برتن کے ہو جاتا ہے جس میں کوئی چیز نہیں ٹھہرتی، کیونکہ وہ خدا کے فعل سے ٹوٹ جاتا ہے، جب اس میں کوئی ارادہ پیدا ہوتا ہے، خدا کا فعل اور اس کی غیرت اس کو توڑ ڈالتی ہے، تب اس کے دل کے گرد عظمت و جبروت و ہیبت کے پردے ڈال دیئے جاتے ہیں، اور اس کے گرداگرد کبریائی اور سطوت کی خندقیں کھود دی جاتی ہیں کہ دل میں کسی چیز کا ارادہ گھسنے نہیں پاتا، اس وقت دل کو اسباب یعنی مال اور اہل و عیال و اصحاب اور کرامات و حکم و بیانات کچھ مضر نہیں ہوتے، کیونکہ یہ سب دل سے باہر رہتے ہیں، تب اللہ تعالےٰ ان سے غیرت نہیں کرتا، بلکہ یہ سب چیزیں خدا کی طرف سے بندہ کے لئے بطور لطف و کرامت و رزق و نعمت کے ہوتی ہیں، اور جو لوگ اس کے پاس آتے ہیں، انھیں نفع پہونچانے کے لئے ہے۔[1]

شکستہ دلوں کی تسکین

حضرت شیخ کے زمانہ میں ایک طبقہ ایسا تھا جو اپنے اعمال و اخلاق اور ایمانی کیفیت کے لحاظ سے پست لیکن دنیاوی حیثیت سے بلند اور ہر طرح سے اقبال مند تھا، اس کے برخلاف دوسرا طبقہ معاشی حیثیت سے پست، دنیاوی ترقیات سے محروم، بے بضاعت و تہی دست لیکن اعمال و اخلاق کے لحاظ سے بلند اور ایمانی کیفیات و ترقیات سے بہرہ مند تھا، وہ پہلے طبقہ کی کامیابیوں اور ترقیات کو بعض اوقات رشک کی نگاہ سے دیکھتا، اور اپنے کو کسی وقت محروم و نامراد سمجھنے لگتا تھا حضرت شیخ اس شکستہ دل

---

[1] رموز الغیب مقالہ (۳۲) ص ۸۶-۸۷

طبقہ کی دلجوئی فرماتے ہیں اور ان پر اللہ تعالیٰ کی جو عنایات ہیں، ان کا ذکر فرماتے ہوئے اس امتیاز و فرق کی حکمت بیان کرتے ہیں۔ ارشاد ہوتا ہے:۔

"اے خالی ہاتھ فقیر! اے وہ کہ جس سے تمام دنیا برگشتہ ہے! اے گمنام! اے بھوکے پیاسے ننگے، جگر جلے ہوئے! اے ہر مسجد و خرابات سے نکالے ہوئے! اے ہر در سے پھنکارے ہوئے! اے وہ کہ ہر مراد سے محروم، خاک پر پڑا ہے! اے وہ کہ جس کے دل میں (مٹی ہوئی) آرزوؤں اور ارمانوں کے (کشتوں کے) پشتے لگے ہیں، مت کہہ کہ خدا نے مجھ کو محتاج کر دیا، دنیا کو مجھ سے پھیر دیا، مجھے پامال کر دیا، چھوڑ دیا، مجھ سے دشمنی کی، مجھے پریشان کیا اور جمعیتِ (خاطر) نہ بخشی، مجھے ذلیل کیا اور دنیا سے میری کفایت نہ کی، مجھے گمنام کیا، اور خلق میں اور میرے بھائیوں میں میرا ذکر بلند نہ کیا، اور غیر پر اپنی تمام نعمتیں نچھاور کر دیں، جس میں اس کے رات دن گزرتے ہیں، اسے مجھ پر اور میرے دیار والوں پر فضیلت دی، حالانکہ وہ بھی مسلمان ہے اور میں بھی، اور ایک ماں باپ آدم و حوا کی اولاد میں دونوں ہیں (اے فقیر) خدا نے تیرے ساتھ یہ برتاؤ اس لئے کیا ہے کہ تیری سرشت مٹیار زمین (کے مثل) بے ریت ہے اور رحمتِ حق کی بارشیں برابر تجھ پر ہو رہی ہیں، از قسم صبر و رضا و یقین موافقت و علم اور ایمان و توحید کے انوار تیرے گرداگرد ہیں تو تیرے ایمان کا درخت اور اس کی جڑ اور بیخ اپنی جگہ پر مضبوط ہے، کلے دے رہا ہے، پھل رہا ہے، بڑھ رہا ہے، شاخیں پھیلا رہا ہے، سایہ دے رہا ہے، بلند ہو رہا ہے، روزانہ زیادتی اور نمو میں ہے، اس کے بڑھانے اور پرورش کرنے میں پانس اور کھاد دینے کی ضرورت نہیں، اس بارہ میں خداوند تعالیٰ تیرے حکم سے فارغ ہے (کہ وہ خود تیری ضروریات کو بخوبی جانتا ہے) اس نے آخرت میں تجھ کو مقام بخشا ہے، اور اس میں تجھ کو مالک بنایا ہے، اور عقبیٰ میں تیرے لئے اتنی کثرت سے بخششیں رکھی ہیں کہ نہ کسی آنکھ نے دیکھیں، نہ کان نے سنیں نہ کسی انسان کے دل میں گزریں، اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ کوئی نفس نہیں جانتا کہ کون سی آنکھوں کی ٹھنڈک ان کے لئے چھپا رکھی گئی ہے، اس کام کے بدلہ میں جو وہ کرتے رہے ہیں، یعنی جو کچھ دنیا میں ان لوگوں نے

احکام کی بجاآوری ممنوعات کے ترک پر صبر، مقدرات میں تفویض و تسلیم اور کل امور میں خدا کی موافقت کی ہے۔

اور وہ غیر جیسے خدا نے دنیا عطا فرمائی اور (مال دنیا کا) مالک کیا ہے، اور نعمت دنیاوی دی، اور اس پر اپنا فضل فرمایا، اس کے ساتھ یہ معاملہ اس لئے کیا ہے کہ اس کے ایمان کی جگہ رتیلی اور پتھریلی زمین ہے کہ اس میں پانی ٹھہرنا اور درخت اگنا اور کھیتی اور پھل کا پیدا ہونا دِقت سے خالی نہیں تو اس زمین پر کھاد وغیرہ ڈالی جاتی ہے جس سے پودوں اور درختوں کی پرورش ہو اور وہ کھاد دنیا اس کا سامان ہے تاکہ اس سے درختِ ایمان اور نہالِ اعمال کی جو اس زمین میں اگے ہیں، حفاظت ہو اگر یہ چیز اس سے علیحدہ کر دی جائے تو پودے اور درخت سوکھ جائیں گے اور پھل جاتے رہیں گے، پس گھر ہی اجڑ جائے گا، حالانکہ خداوند تعالیٰ اس کے بنانے کا ارادہ رکھتا ہے تو اے فقیر! دولتمند آدمی کا درختِ ایمان کمزور جڑ کا ہوتا ہے اور اس تو ویسے خالی جو تیرے درختِ ایمان میں بھری ہوئی ہے اس کی مضبوطی، اور اس کا ٹکاؤ انہی چیزوں سے ہے جو مال دنیا اور طرح طرح کی نعمتیں اس کے پاس تجھ کو نظر آتی ہیں، اگر درخت کی کمزوری میں یہ چیزیں اس سے الگ کر دی جائیں، تو ایمان کا درخت سوکھ کر کفر و انکار (پیدا) ہو جائے گا، اور وہ شخص منافقین و مرتدین و کفار میں شامل ہو جائے گا، البتہ (اگر) خداوند تعالیٰ دولت مند کی طرف صبر و رضا و یقین علم اور طرح طرح کی معرفتوں کے لشکر بھیجے اور اس سے اس کا ایمان قوی ہو جائے تو پھر اس کو تونگری اور نعمتوں کے علیحدہ ہو جانے کی نہ پروا رہے گی۔"[1]

دنیا کی صحیح حیثیت

حضرت شیخ کے یہاں رہبانیت کی تعلیم نہیں، وہ دنیا کے استعمال اور اس سے بقدر ضرورت

---

[1] رموز الغیب مقالہ (۲۵) صفحہ ۶۴-۶۵

انتفاع سے منع نہیں فرماتے، اس کی پرستش اور غلامی اور اس سے قلبی تعلق اور عشق سے منع فرماتے ہیں، ان کے مواعظ درحقیقت حدیث نبوی "انّ الدّنیا خلقت لکم وانّکم خلقتم للاٰخرۃ" (بیشک دنیا تمہارے لئے پیدا کی گئی (یعنی تمہاری لونڈی ہے) اور تم آخرت کے لئے پیدا کئے گئے) کی تفسیر ہیں، ایک موقع پر فرماتے ہیں۔

"دنیا میں سے اپنا مقسوم اس طرح مت کھا کہ وہ بیٹھی ہوئی ہو اور تو کھڑا ہو، بلکہ اس کو بادشاہ کے دروازہ پر اس طرح کھا کر تو بیٹھا ہوا ہو، اور وہ طباق اپنے سر پر رکھے ہوئے کھڑی ہو، دنیا خدمت کرتی ہے اس کی جو حق تعالیٰ کے دروازہ پر کھڑا ہوتا ہے، اور جو دنیا کے دروازہ پر کھڑا ہوا ہوتا ہے اس کو ذلیل کرتی ہے، کھا حق تعالیٰ کے ساتھ عزت و تونگری کے قدم پر۔"[1]

ایک دوسرے موقع پر ارشاد ہوتا ہے:۔

"دنیا ہاتھ میں رکھنی جائز، جیب میں رکھنی جائز، کسی اچھی نیت سے اس کو جمع رکھنا جائز، باقی قلب میں رکھنا جائز نہیں (کہ دل سے بھی محبوب سمجھنے لگے) دروازہ پر اس کا کھڑا ہونا جائز، باقی دروازہ سے آگے گھسنا نہ جائز ہے، نہ تیرے لئے عزت ہے۔"[2]

خلفاء اور حکام وقت پر تنقید

حضرت شیخ صرف مواعظ، پند و نصیحت اور ترغیب و تشویق ہی پر اکتفا نہیں فرماتے تھے، جہاں ضرورت سمجھتے تھے، بڑی صاف گوئی اور جرأت کے ساتھ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا فریضہ انجام دیتے، حکام و سلاطین اور خلیفۂ وقت پر بھی تنقید اور ان کے غلط افعال اور فیصلوں کی مذمت سے بھی باز نہیں رہتے تھے، اور اس بارہ میں کسی کی وجاہت اور اثر و نفوذ کی مطلق پروا نہیں کرتے تھے، حافظ عماد الدین ابن کثیر اپنی تاریخ میں لکھتے ہیں:۔

---

[1] فیوض یزدانی، مجلس ۲۱ ص ۱۳۵ [2] ایضاً ۔ مجلس ۵۱ ص ۳۶۳

كان يأمر بالمعروف وينهى عن المنكر للخلفاء والوزراء والسلاطين والقضاة والخاصة والعامة يصدعهم بذلك على رؤس الاشهاد ورؤس المنابر وفي المحافل وينكر على من يولى الظلمة ولا تأخذه في الله لومة لائم۔[1]	آپ خلفا، وزراء، سلاطین، قضاۃ، خواص و عوام سب کو امر بالمعروف اور نہی عن المنکر فرماتے اور بڑی صفائی اور جرأت کے ساتھ ان کو بھرے مجمع میں اور برسرِ منبر علی الاعلان ٹوک دیتے، جو کسی ظالم کو حاکم بناتا، اس پر اعتراض کرتے اور خدا کے معاملہ میں کسی ملامت کرنے والے کی آپ کو پرواہ نہ ہوتی۔

صاحب "قلائد الجواہر" لکھتے ہیں کہ جب خلیفہ مقتفی لامر اللہ نے قاضی ابوالوفاء یحییٰ بن سعید بن یحییٰ بن المظفر کو قاضی بنایا جو ابن المرجم الظالم کے لقب سے مشہور تھا تو حضرت نے برسرِ منبر خلیفہ کو مخاطب کر کے فرمایا۔

وليت على المسلمين أظلم الظالمين ما جوابك غداً عند رب العالمين ارحم الراحمين۔	تم نے مسلمانوں پر ایک ایسے شخص کو حاکم بنایا ہے جو اظلم الظالمین ہے، کل کو قیامت کے دن تم اس رب العالمین کو جو ارحم الراحمین ہے کیا جواب دوگے؟

مؤرخ موصوف کا بیان ہے کہ خلیفہ یہ سن کر لرزہ براندام ہوگیا، اور اس پر گریہ طاری ہوگیا، اور اس نے اسی وقت قاضی کو اس عہدہ سے ہٹا دیا۔[2]

حضرت شیخ ان "درباری سرکاری" علماء اور مشائخ کی بھی پرزور تردید اور پردہ دری فرماتے تھے جنھوں نے سلاطین اور ناخدا ترس حکام کی مصاحبت اختیار کی تھی، اور ان کی ہاں میں ہاں ملانا ان کا شعار تھا، جن کی وجہ سے ان سلاطین و حکام کو زیادہ جرأت اور بے خوفی پیدا ہوگئی تھی، ایک موقع پر اسی طبقہ کو خطاب کر کے فرماتے ہیں۔

"اے علم و عمل میں خیانت کرنے والو! تم کو ان سے کیا نسبت، اے اللہ اور اس کے رسولؐ کے دشمنو! اے بندگانِ خدا کے ڈاکوؤ! تم کھلے ظلم اور کھلے نفاق میں (مبتلا) ہو، یہ نفاق کب تک رہے گا؟ اے عالمو

---

[1] قلائد الجواہر ص ۸ [2] ایضاً

اور اے زاہدو! شاہان وسلاطین کے لئے کب تک منافق بنے رہوگے کہ ان سے دنیا کا زروِ مال اور اس کی شہوات ولذات لیتے رہو، تم اور اکثر بادشاہ اس زمانہ میں اللہ تعالیٰ کے مال اور اس کے بندوں کے متعلق ظالم اور خائن بنے ہوئے ہیں، بارالٰہا! منافقوں کی شوکت توڑ دے، اور ان کو ذلیل فرما یا ان کو توبہ کی توفیق دے، اور ظالموں کا قلع قمع فرما، اور زمین کو ان سے پاک کردے، یا ان کی اصلاح فرما۔[۱]

ایک دوسرے موقع پر اسی طبقہ کے ایک فرد کو اپنا مخاطب بناتے ہوئے فرماتے ہیں:۔

• تجھے شرم نہیں آتی کہ تیری حرص نے تجھ کو ظالموں کی خدمت گاری اور حرام خوری پر آمادہ کر دیا تو کب تک حرام کھاتا اور دنیا کے ان (ظالم) بادشاہوں کا خدمت گار رہنا ہے گا جن کی خدمت میں لگا ہوا ہے، ان کی بادشاہت عنقریب مٹ جائے گی، اور تجھے حق تعالیٰ کی خدمت میں آنا پڑے گا، جس کی ذات کو کبھی زوال نہیں۔[۲]

دین کے لئے دلسوزی اور فکرمندی

حضرت شیخ دینی اور اخلاقی انحطاط کو (جس کا سب سے بڑا مرکز خود بغداد تھا) دیکھ دیکھ کر کڑھتے تھے، اور عالمِ اسلام میں جو ایک عام دینی زوال رونما تھا، اس کے آثار دیکھ کر ان کے سینہ میں حمیتِ اسلامی اور غیرتِ دینی کا جوش اٹھتا تھا، وہ اپنے اس قلبی احساس اور درد کو بعض اوقات چھپا نہیں سکتے، اور یہ دریا ان کے خطبات اور مواعظ میں امنڈ آتا ہے۔

ایک موقع پر ارشاد فرماتے ہیں:۔

• جناب رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے دین کی دیواریں پے درپے گر رہی ہیں، اور اس کی بنیاد بکھری جاتی ہیں، اے باشندگانِ زمین آؤ اور جو گر گیا ہے اس کو مضبوط کر دیں، اور جو ڈھے گیا ہے اس کو درست

---

[۱] فیوض یزدانی مجلس ۱۵ ص۳۶۳ [۲] ایضاً۔ مجلس ۵۲ ص۳۷۱

کردیں، یہ چیز ایک سے پوری نہیں ہوتی، سب ہی کو مل کر کام کرنا چاہئے، اے سورج، اے چاند اور اے دن
تم سب آؤ۔"[1]

ایک دوسرے موقع پر فرماتے ہیں:۔

"اسلام رو رہا ہے اور ان فاسقوں، اور ان بدعتیوں، گمراہوں، مکر کے کپڑے پہننے والوں، اور ایسی باتوں کا دعویٰ کرنے والوں کے (ظلم) سے جو اُن میں موجود نہیں ہیں، اپنے سر کو تھامے ہوئے فریاد مچا رہا ہے، اپنے متقدمین اور نظر کے سامنے والوں کی طرف غور کرو کہ امر و نہی بھی کرتے تھے، اور کھاتے پینے بھی تھے، (اور دفعۃً انتقال پاکر ایسے ہوگئے) گویا ہوئے ہی نہ تھے، تیرا دل کس قدر سخت ہے؟ کتا بھی شکار کرنے اور کھیتی اور مولیشی کی نگہبانی اور مالک کی حفاظت کرنے میں اپنے مالک کی خیرخواہی کرتا ہے، اور اسے دیکھ کر (خوشی کے مارے) کھلاریاں کرتا ہے، حالانکہ وہ اس کو شام کے وقت صرف ایک دو نوالے یا ذرا سی مقدار کھانا دیا کرتا ہے، اور تو ہر وقت اللہ کی قسم قسم کی نعمتیں شکم سیر ہو کر کھاتا رہتا ہے، مگر ان نعمتوں کے دینے سے جو اس کو مقصود ہے، نہ تو اس کو پورا کرتا ہے، اور نہ اس کا حق ادا کرتا ہے (بلکہ اس کے برعکس) اس کا حکم رد کرتا ہے، اور اس کی حدود شریعت کی حفاظت نہیں کرتا۔"[2]

بیعت و تربیت

ان پرتاثیر اور انقلاب آفریں مواعظ سے اگرچہ اہل بغداد کو عظیم الشان روحانی اور اخلاقی نفع پہونچا، اور ہزار ہا انسانوں کی زندگی میں اس سے تبدیلی پیدا ہوگئی، لیکن زندگی کے گہرے تغیرات، ہمہ گیر اصلاح اور مستقل تربیت کے لئے صاحب دعوت سے مستقل اور گہرے تعلق اور مسلسل اصلاح و تربیت کی ضرورت تھی، مجالس دعوت و ارشاد مدارس کی طرح منضبط اور مستقل تربیت گاہیں نہیں ہوتیں، جہاں

---

[1] ملفوظات ص۶۴۹ (فیوض یزدانی) [2] ایضاً ص۶۶۱ (فیوض یزدانی)

طالبین کی تسلسل و انضباط کے ساتھ تعلیم و تربیت اور نگرانی کی جائے، ان مجالس کے شرکار و سامعین آزاد ہوتے ہیں کہ ایک مرتبہ وعظ سن کر چلے جائیں، پھر کبھی نہ آئیں یا ہمیشہ آتے رہیں، لیکن اپنی حالت پر قائم رہیں اور ان کی زندگی میں بدستور بڑے بڑے خلا اور دینی و اخلاقی شگاف باقی رہیں۔

اسلامی آبادی کا پھیلاؤ اور زندگی کی ذمہ داریاں اور معاشی تفکرات اتنے بڑھ گئے تھے کہ مدارس کے ذریعہ سے (جن کو بہت سی رسوم و قیود کا پابند ہونا پڑتا ہے) عمومی اصلاح و تربیت کا کام نہیں لیا جا سکتا تھا، اور کسی بڑے پیمانہ پر کسی دینی و روحانی انقلاب کی توقع نہیں کی جا سکتی تھی، پھر اس کی کیا صورت تھی کہ مسلمانوں کی بڑی تعداد اپنے ایمان کی تجدید کرے، دینی ذمہ داریوں اور پابندیوں کو شعور اور احساس ذمہ داری کے ساتھ دوبارہ قبول کرے، اس میں پھر ایمانی کیفیات اور دینی جذبات پیدا ہوں، اس کے افسردہ و مردہ دل میں پھر محبت کی گرمی پیدا ہو، اور اس کے مضمحل قویٰ میں پھر حرکت اور نشاط پیدا ہو، اس کو کسی مخلص خدا شناس پر اعتماد ہو، اور اس سے وہ اپنے امراض روحانی و نفسانی میں علاج اور دین میں صحیح روشنی اور رہنمائی حاصل کرے، ناظرین کو اس کا اندازہ ہو چکا ہے کہ خلافت جس کا یہ اصلی فرض تھا (اس لئے کہ جس نبیؐ کی نیابت و نسبت پر یہ خلافت قائم تھی، بقول سیدنا عمر ابن عبدالعزیزؒ وہ ہدایت کے لئے مبعوث ہوا تھا، جبایت (تحصیل وصول) کے لئے نہیں) نہ صرف اس فریضہ سے غافل اور کنارہ کش ہو چکی تھی، بلکہ اپنے اعمال و کردار کے لحاظ سے اس کام کے لئے مضر اور اس کے راستہ میں مزاحم تھی، دوسری طرف وہ اس قدر بدگمان، توہم پرست اور شکی واقع ہوئی تھی کہ کسی نئی تنظیم اور نئی دعوت کو جس میں وہ قیادت اور سیاست کی آمیزش پاتی، برداشت نہیں کر سکتی تھی، اس کو فوراً کچل دیتی۔

ایسی صورت میں مسلمانوں میں نئی دینی زندگی، نیا نظم و ضبط اور نئے سرے سے حرکت و عمل پیدا کرنے کے لئے اس کے علاوہ کیا شکل تھی کہ خدا کا کوئی مخلص بندہ آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کے طریقہ پر ایمان و عمل، اور اتباعِ شریعت کے لئے بیعت لے اور مسلمان اس کے ہاتھ پر اپنی سابقہ غفلت و جاہلیت کی زندگی

سے توبہ اور ایمان کی تجدید کریں، اور پھر وہ نائب پیغمبر ان کی دینی نگرانی، اور تربیت کرے، اپنی کیمیا اثر صحبت، اپنے شعلۂ محبت، اپنی استقامت، اور اپنے نفسِ گرم سے پھر ایمانی حرارت گرمی محبت، خلوص وللّٰہیت، جذبۂ اتباعِ سنت، اور شوقِ آخرت پیدا کر دے، ان کو اس نئے تعلق سے محسوس ہو کہ انھوں نے ایک نئی زندگی سے توبہ کی ہے، اور ایک نئی زندگی میں قدم رکھا ہے، اور کسی اللہ کے بندے کے ہاتھ میں ہاتھ دے دیا ہے، وہ بھی یہ سمجھے کہ ان بیعت کرنے والوں کی اصلاح و تربیت اور ان کی دینی خدمت اللہ تعالیٰ نے میرے سپرد کی ہے، اور اس محبت و اعتماد کا مجھ پر نیا حق قائم ہو گیا ہے، پھر اپنے تجربہ و اجتہاد اور کتاب و سنت کے اصول و تعلیمات کے مطابق ان میں صحیح روحانیت و تقویٰ اور ان کی زندگی میں ایمان و احتساب و اخلاص، اور ان کے اعمال و عبادات میں کیفیات اور روح پیدا کرنے کی کوشش کرے، یہی حقیقت ہے اس بیعت و تربیت کی جس سے دین کے مخلص داعیوں نے اپنے اپنے وقت میں احیاء و تجدید دین اور اصلاحِ مسلمین کا کام لیا ہے، اور لاکھوں بندگانِ خدا کو "حقیقتِ ایمان اور درجۂ احسان" تک پہونچا دیا ہے، اس سلسلۂ زریں کے سرحلقہ اور گلِ سرسبد حضرت شیخ محی الدین عبدالقادر جیلانی رحمۃ اللہ علیہ ہیں، جن کا نام اور کام اس "طبِ نبوی" کی تاریخ میں سب سے زیادہ روشن اور نمایاں ہے، الفاظ و اصطلاحات اور علمی بحثوں سے الگ ہو کر اگر واقعات و حقائق پر بنیاد رکھی جائے تو تسلیم کرنا پڑے گا کہ اس دورِ انتشار میں (جو ابھی تک قائم ہے) اصلاح و تربیت کا اس سے زیادہ سہل اور عمومی اور اس سے زیادہ موثر اور کارگر ذریعہ نہیں ہو سکتا تھا۔

حضرت شیخ سے پہلے دین کے داعیوں اور مخلص خادموں نے اس راستہ سے کام کیا ہے، اور ان کی تاریخ محفوظ ہے، لیکن حضرت شیخ نے اپنی محبوب و دلآویز شخصیت، خداداد روحانی کمالات، فطری علو استعداد، اور ملکۂ اجتہاد سے اس طریقہ کو نئی زندگی بخشی، وہ نہ صرف اس سلسلہ کے ایک نامور امام اور ایک مشہور سلسلہ (قادریہ) کے بانی ہیں، بلکہ اس فن کی نئی تدوین و ترتیب کا سہرا آپ ہی کے

سر ہے، آپ سے پہلے وہ اتنا مدوّن و مرتب اور مکمل و منضبط نہ تھا، نہ اس میں اتنی عمومیت اور وسعت ہوئی تھی، جتنی آپ کی مقبولیت اور عظمت کی وجہ سے پیدا ہوگئی، آپ کی زندگی میں لاکھوں انسان اس طریقہ سے فائدہ اٹھا کر ایمان کی حلاوت سے آشنا، اور اسلامی زندگی اور اخلاق سے آراستہ ہوئے اور آپ کے بعد آپ کے مخلص خلفاء اور باعظمت اہلِ سلسلہ نے تمام ممالکِ اسلامیہ میں دعوت الی اللہ اور تجدیدِ ایمان کا یہ سلسلہ جاری رکھا جن سے فائدہ اٹھانے والوں کی تعداد اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی بیان نہیں کر سکتا، یمن، حضرموت، اور ہندوستان میں پھر حضرمی مشائخ و تجار کے ذریعہ جاوہ اور سماٹرا میں اور دوسری طرف افریقہ کے برِّ اعظم میں لاکھوں آدمیوں کی تکمیلِ ایمان اور لاکھوں غیر مسلموں کے قبولِ اسلام کا ذریعہ بنا، رضی اللہ تعالیٰ عنہ، وارضاہ وجزاہ عن الاسلام خیر الجزاء۔

زمانہ پر اثر

حضرت شیخ کا وجود اس مادیت زدہ زمانہ میں اسلام کا ایک زندہ معجزہ تھا، اور ایک بڑی تائیدِ الٰہی، آپ کی ذات، آپ کے کمالات، آپ کی تاثیر، اللہ تعالیٰ کے یہاں آپ کی مقبولیت کے آثار، اور خلق اللہ میں قبولیت و وجاہت کے کھلے ہوئے مناظر، آپ کے تلامذہ اور تربیت یافتہ اصحاب کے اخلاق اور ان کی سیرت و زندگی، سب اسلام کی صداقت کی دلیل اور اس کی زندگی کا ثبوت تھا، اور اس حقیقت کا اظہار تھا کہ اسلام میں سچی روحانیت، تہذیبِ نفس اور تعلق مع اللہ پیدا کرنے کی سب سے بڑی صلاحیت ہے، اور اس کا خزانۂ عامرہ کبھی جواہرات و نادرات سے خالی نہیں۔

وفات

ایک طویل مدت تک عالم کو اپنے کمالات ظاہری و باطنی سے مستفید کر کے اور عالم اسلام میں

روحانیت اور رجوع الی اللہ کا عالمگیر ذوق پیدا کر کے ۵۶۱ھ میں ۹۰ سال کی عمر میں وفات پائی ،
صاحبزادہ حضرت شرف الدین عیسیٰ آپ کی وفات کا حال بیان کرتے ہیں :۔

• جب آپ اس مرض میں بیمار ہوئے کہ جس میں انتقال فرمایا تو آپ کے صاحبزادہ شیخ عبدالوہاب نے آپ سے عرض کیا کہ مجھے کچھ وصیت فرمائیے کہ آپ کے بعد اس پر عمل کروں فرمایا ہمیشہ خدا سے ڈرتے رہو اور خدا کے سوا کسی سے نہ ڈرو، اور نہ اس کے سوا کسی سے امید رکھو اور اپنے تمام ضروریات اللہ کے سپرد کر دو، صرف اسی پر بھروسہ رکھو اور سب کچھ اسی سے مانگو، خدا کے سوا کسی پر وثوق اور اعتماد نہ رکھو توحید اختیار کرو کہ توحید پر سب کا اجماع ہے اور فرمایا جب دل خدا کے ساتھ درست ہو جاتا ہے تو کوئی چیز اس سے چھوٹتی نہیں ہے اور نہ کوئی چیز اس سے باہر نکل کر جاتی ہے، اور فرمایا میں مغز بے پوست ہوں، اور اپنے صاحبزادوں سے فرمایا میرے گرد سے ہٹ جاؤ، میں ظاہر میں تمہارے ساتھ ہوں اور باطن میں دوسروں کے ساتھ ہوں، میرے پاس تمہارے سوا اور لوگ (فرشتے) حاضر ہیں، ان کے لئے جگہ خالی کرو، اور ان کے ساتھ ادب کرو، یہاں بڑی رحمت نازل ہے ان کے لئے جگہ تنگ نہ کرو، اور آپ بار بار فرماتے تھے، تم پر سلام اور خدا کی رحمت اور اس کی برکتیں! اللہ میری اور تمہاری مغفرت کرے، اور میری اور تمہاری توبہ قبول کرے، بسم اللہ! آؤ اور واپس نہ جاؤ، اور یہ آپ ایک دن ایک رات برابر فرماتے رہے، اور فرمایا تم پر افسوس! مجھے کسی چیز کی پرواہ نہیں، نہ کسی فرشتہ کی، نہ ملک الموت کی، اے ملک الموت! ہمارے کارساز نے تم سے زیادہ ہم کو بہت کچھ دے رکھا ہے، اور اس دن جس کی شب کو آپ نے رحلت فرمائی ایک بڑی سخت چیخ ماری تھی، اور آپ کے دو صاحبزادے شیخ عبدالرزاق و شیخ موسیٰ فرماتے تھے کہ آپ بار بار دونوں ہاتھ اٹھا کر پھیلاتے، اور فرماتے تھے، تم پر سلام اور خدا کی رحمت اور برکتیں! حق کی طرف رجوع کرو، اور صف میں داخل ہو، میں ابھی تمہارے پاس آیا، اور آپ یہ بھی فرماتے تھے کہ نرمی کرو، پھر آپ پر امر حق آیا، اور موت کے نشہ نے غلبہ کیا، اور آپ نے فرمایا میرے اور تمہارے اور

تمام خلق کے درمیان میں زمین و آسمان کا فرق ہے، مجھے کسی پر قیاس نہ کرو، اور نہ کسی کو مجھ پر، پھر آپ کے صاحبزادہ شیخ عبدالعزیز نے آپ کی تکلیف اور حال دریافت کیا تو فرمایا مجھ سے کوئی نہ پوچھے، میں علم الٰہی میں پلٹے کھا رہا ہوں، اور آپ کے صاحبزادہ شیخ عبدالعزیز نے آپ کے مرض کو پوچھا تو فرمایا میرے مرض کو نہ کوئی جانتا ہے، اور نہ کوئی سمجھتا ہے، نہ انسان نہ جن، نہ فرشتہ، خدا کے حکم سے خدا کا علم نہیں ٹوٹتا، حکم بدل جاتا ہے، اور علم نہیں بدلتا، حکم منسوخ ہو جاتا ہے، علم منسوخ نہیں ہوتا اللہ جو چاہتا ہے مٹاتا ہے، اور باقی رکھتا ہے، اور اس کے پاس اصلی تحریر ہے، جو کچھ وہ کرتا ہے، اس سے باز پرس نہیں ہوتی، اور خلق سے باز پرس ہوتی ہے، صفات کی خبریں گزر رہی ہیں جیسی آئی ہیں، پھر آپ کے صاحبزادہ شیخ عبدالجبار نے آپ سے پوچھا کہ آپ کے جسم میں کہاں تکلیف ہے؟ فرمایا میرے کل اعضاء مجھے تکلیف دے رہے ہیں، مگر میرے دل کو کوئی تکلیف نہیں، اور وہ خدا کے ساتھ صحیح ہے، پھر آپ کا وقت اخیر آیا، تو آپ فرمانے لگے میں اس خدا سے مدد چاہتا ہوں، جس کے سوا کوئی معبود نہیں، وہ پاک و برتر ہے، اور زندہ ہے، جسے فوت ہونے کا اندیشہ نہیں، پاک ہے، وہ جس نے اپنی قدرت سے عزت ظاہر کی، اور موت سے بندوں پر غلبہ دکھایا، اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں، محمد صلے اللہ علیہ وسلم خدا کے رسول ہیں، اور آپ کے صاحبزادہ شیخ موسیٰ فرماتے تھے کہ آپ نے لفظ "تعزز" فرمایا اور یہ لفظ صحت کے ساتھ آپ کی زبان سے ادا نہ ہوا تب آپ بار بار اسے دہراتے تھے، یہاں تک کہ آپ نے آواز بلند اور سخت کر کے لفظ "تعزز" اپنی زبان سے ٹھیک ٹھیک فرمایا پھر (تین بار) اللہ اللہ اللہ فرمایا، اس کے بعد آپ کی آواز غائب ہو گئی، اور زبان تالو سے چپک گئی، اور روح مبارک رخصت ہو گئی۔ رضی اللہ عنہ وارضاہ۔[1]"

حضرت شیخ اس دنیا سے تشریف لے گئے، لیکن اپنے پیچھے دین کے داعیوں اور نفوس و اخلاق کے مربیوں

[1] الشکلا رموز الغیب ص ۱۸۹-۱۹۲

کی ایک جماعت چھوڑ گئے، جس نے آپ کے کام کو جاری رکھا، اور بڑھتی ہوئی مادیت اور غفلت کا مقابلہ کرتے رہے[1]

[1] حضرت شیخ کے بعد جن عارفین و مصلحین نے دعوت و تذکیر اور تربیت نفوس کا کام پوری طاقت اور عمومیت سے جاری رکھا، اور غفلت اور دنیاوی انہماک کا مقابلہ اور اخلاقی اور نفسانی امراض کا علاج کیا، ان میں حضرت شیخ کے فیض یافتہ اور شیخ بغداد شیخ ابوالنجیب سہروردیؒ کے بھتیجے اور خلیفہ شیخ الشیوخ ابوحفص شیخ شہاب الدین سہروردی (۵۹۳ھ-۶۳۲ھ) سب سے زیادہ نمایاں اور ممتاز تھے، جو طریقۂ سہروردیہ کے بانی اور تصوف کی مقبول کتاب "عوارف المعارف" کے مصنف ہیں۔

ابن خلکان لکھتے ہیں "لم یکن فی آخر عمرہ فی عصرہ مثلہ وکان شیخ الشیوخ ببغداد" (اخیر عمر میں ان کے زمانہ میں ان کی نظیر نہ تھی، اور وہ بغداد کے سب سے بڑے شیخ اور اپنے فن میں مرجع تھے[1]) ابن النجار کہتے ہیں "انتھت الیہ الریاسۃ فی تربیۃ المریدین ودعاء الخلق الی اللّٰہ" (تربیت مریدین اور دعوت الی اللہ کے کام میں وہ مرجع خلائق تھے[2]) ابن خلکان کہتے ہیں کہ ان کے زمانہ کے مشائخ دور دور سے ان کی طرف رجوع کرتے تھے اور استفادہ کرتے رہتے تھے[3]، شیخ کے مواعظ سے خلق اللہ کو بہت نفع ہوا، ابن خلکان کے الفاظ ہیں "وکان لہ مجلس وعظ وعلیٰ وعظہ قبول کثیر ولہ نفس مبارک" (وہ اہتمام سے وعظ فرمایا کرتے تھے، ان کے وعظ کو اللہ تعالیٰ نے بڑی قبولیت عطا فرمائی، اور ان کے انفاس متبرکہ سے لوگوں کو بڑا نفع تھا۔)

تصوف کو بدعات سے پاک کرنے اور کتاب و سنت کو اس کا ماخذ بنانے کی کوشش میں حضرت شیخ کا تجدیدی حصہ ہے، ان کی کتاب "عوارف المعارف" کو اگر اس فن کی قدیم کتابوں سے مقابلہ کرکے دیکھا جائے تو ان کی اس تجدیدی کام کا اندازہ ہوتا ہے[4]۔

اللہ تعالیٰ نے شیخ شہاب الدینؒ کو بڑے بلند پایہ اور عالی استعداد خلفاء عطا فرمائے جنھوں نے دعوت و تربیت کا کام بڑی قوت و وسعت کے ساتھ انجام دیا، ان کے صرف ایک خلیفہ شیخ الاسلام شیخ بہاء الدین زکریا ملتانی سے ہندوستان میں جو فیض پہنچا اور خلق اللہ کو ہدایت ہوئی، وہ ان کی جلالتِ قدر اور عظمتِ شان کے لئے کافی ہے۔

(حاشیہ علی الحاشیہ) [1] وفیات الاعیان ج ۳ ص ۱۱۹ (النھضۃ المصریہ) [2] مرأۃ الجنان للیافعی ج ۴ ص ۸۱
[3] وفیات الاعیان ج ۳ ص ۱۲۰ [4] نواب صدیق حسن خان مرحوم لکھتے ہیں "در تصوف سنی کتابے بہتر از عوارف نیست" "تقصار جیود الاحرار" ص ۶۳

علامہ ابن جوزیؒ

عبدالرحمٰن ابن جوزی، دعوت واصلاح کا ایک دوسرا نمونہ ہیں، وہ اپنے زمانہ کے یکتائے روزگار مفسر، محدث، مورخ، ناقد، مصنف اور خطیب ہیں، اور ان میں سے ہر موضوع پر ان کی ضخیم تصنیفات اور علمی کارنامے ہیں۔

ابتدائی حالات اور تحصیل علم

۵۰۸ھ میں بغداد میں پیدا ہوئے، گویا حضرت شیخ سے ۲۷ سال چھوٹے ہیں، بچپن ہی میں باپ کا سایہ سر سے اٹھ گیا جب پڑھنے کے قابل ہوئے تو ماں نے مشہور محدث ابن ناصر کی مسجد میں چھوڑ دیا، ان سے حدیث سنی، قرآن مجید حفظ کیا، اور تجوید میں مہارت پیدا کی، شیوخ حدیث سے حدیث کی سماعت اور کتابت کی، اور بڑی محنت وانہماک اور جفاکشی سے علم کی تحصیل کی، اپنے صاحبزادہ سے اپنے حالات زندگی بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں:۔

"مجھے خوب یاد ہے کہ میں چھ سال کی عمر میں مکتب میں داخل ہوا، بڑی عمر کے طلبہ میرے ہم سبق تھے، مجھے یاد نہیں کہ میں کبھی راستہ میں بچوں کے ساتھ کھیلا ہوں یا زور سے ہنسا ہوں، سات برس کی عمر میں جامع مسجد کے سامنے کے میدان میں چلا جایا کرتا تھا، وہاں کسی مداری یا شعبدہ باز کے حلقہ میں کھڑے ہو کر تماشہ دیکھنے کے بجائے محدث کے درس حدیث میں شریک ہوتا، وہ حدیث و سیرت کی جو بات کہتا، وہ مجھے زبانی

یاد ہو جاتی، پھر گھر جا کر اس کو لکھ لیتا، دوسرے لڑکے دجلہ کے کنارے کھیلا کرتے تھے اور میں کسی کتاب کے اوراق لے کر کسی طرف چلا جاتا اور الگ تھلگ بیٹھ کر مطالعہ میں مشغول ہو جاتا۔

میں اساتذہ و شیوخ کے حلقوں میں حاضری دینے میں اس قدر جلدی کرتا تھا کہ دوڑنے کی وجہ سے میری سانس پھولنے لگتی تھی، صبح اور شام اس طرح گزرتی کہ کھانے کا کوئی انتظام نہیں ہوتا تھا، مگر اللہ تعالیٰ کا شکر ہے کہ اس نے مخلوق کی احسان مندی سے بچایا۔"[1]

کتابت حدیث میں انہماک

حدیث کی سماعت و کتابت میں اتنا اشتغال رہا، اور اپنے ہاتھ سے مرویات حدیث کی اتنی کتابت کی کہ بعض مورخین کا بیان ہے کہ انھوں نے انتقال کے وقت وصیت کی کہ ان کے غسل کا پانی اس کترن اور بُرادہ سے گرم کیا جائے، جو حدیث کے لکھنے کے لئے قلم بنانے میں جمع ہو گیا تھا، چنانچہ وہ اتنا تھا کہ پانی گرم ہو گیا اور وہ بچ رہا۔[2]

ذوقِ مطالعہ

مطالعہ کا ذوق اور اس کی حرص بچپن ہی سے بڑھی ہوئی تھی، بغداد عظیم الشان کتابی ذخیروں اور وسیع کتب خانوں سے مالامال تھا، ابن جوزی کا محبوب مشغلہ کتابوں کا مطالعہ تھا، ان کا مطالعہ کسی خاص فن یا موضوع سے مخصوص نہ تھا، وہ ہر موضوع کی کتابیں پڑھتے تھے اور ان کو آسودگی نہیں ہوتی تھی، "صید الخاطر" میں جو ان کے خیالات و تاثرات کا کشکول ہے، لکھتے ہیں:۔

"میں اپنا حال عرض کرتا ہوں، میری طبیعت کتابوں کے مطالعہ سے کسی طرح سیر نہیں ہوتی، جب کوئی نئی کتاب نظر پڑ جاتی ہے تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کوئی دفینہ ہاتھ آگیا، اگر میں کہوں کہ میں نے بیس ہزار (۲۰۰۰۰)

۱؎ لفتۃ الکبد فی نصیحۃ الولد ص ۸۱-۸۲ ۲؎ ابن خلکان ج ۳ ص ۳۲۱

کتابوں کا مطالعہ کیا ہے تو بہت زیادہ معلوم ہوگا۔ اور یہ طالب علمی کا ذکر ہے، مجھے ان کتابوں کے مطالعہ سے سلف کے حالات و اخلاق، ان کی عالی ہمتی، قوتِ حافظہ، ذوقِ عبادت اور علوم نادرہ کا ایسا اندازہ ہوا، جو ان کتابوں کے مطالعہ کے بغیر نہیں ہو سکتا، اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اپنے زمانہ کے لوگوں کی سطح پست معلوم ہونے لگی، اور اس وقت کے طلبۂ علم کی کم ہمتی منکشف ہو گئی۔"[1]

تصنیف و تالیف اور تبحر علمی

علامہ ابن جوزی تصنیف و تالیف کی طرف نو عمری ہی سے متوجہ ہوئے، روزانہ چار جزو لکھنے کا زندگی بھر معمول رہا، حافظ ابن تیمیہ کہتے ہیں کہ میں نے ان کی تالیفات شمار کیں، تو ہزار تک پہونچیں، حدیث میں ایسا بلند پایہ رکھتے تھے کہ دعویٰ سے کہتے تھے کہ ہر حدیث کے متعلق کہہ سکتا ہوں کہ صحیح ہے یا حسن یا محال ہے، ادب و انشا و خطابت میں بغداد میں ان کی نظیر نہ تھی۔

تقویٰ اور ذوق عبادت

ان علمی کمالات کے ساتھ اللہ تعالیٰ نے دیانت و تقویٰ، اور ذوقِ عبادت کی دولت بھی عطا فرمائی تھی، ان کے نواسہ ابوالمظفر کہتے ہیں کہ وہ ہر ہفتہ ایک قرآن مجید ختم کرتے تھے، کبھی کسی سے مذاق نہیں کیا، بچپن میں کسی بچہ کے ساتھ کھیلے نہیں، کبھی کوئی مشتبہ چیز نہیں کھائی، ساری عمر یہی حال رہا، ابن النجار کہتے ہیں کہ ان کو اذواقِ صحیحہ حاصل تھے، اور حلاوتِ مناجات و لذتِ دعا کے ذوق آشنا تھے، ابن الفارسی کا بیان ہے کہ شب بیدار تھے، اور ذکر اللہ سے کبھی غافل نہیں ہوتے تھے، ان کی تصنیفات اور حالات و اشارات سے خود معلوم ہوتا ہے کہ چشم بینا اور دل بیدار رکھتے تھے، اور جمعیتِ خاطر اور تعلق

---

[1] صید الخاطر ج ۳ ص ۶۰۷

مع اللہ کو سرمایۂ زندگی سمجھتے تھے، اور اس میں کمی آنے سے بے چین و مضطرب ہو جاتے تھے، "صید الخاطر" میں اپنی ایک حالت کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:۔

"ابتدائے عمر ہی سے میرے اندر طریق زہد اختیار کرنے کی رغبت اور اندرونی تقاضا تھا، روزے اور نوافل کا اہتمام و التزام تھا، اور تنہائی مرغوب تھی، اس وقت میرے دل کی بڑی اچھی حالت تھی، میری چشم بصیرت روشن اور سریع الادراک تھی، عمر کا جو لمحہ بغیر طاعت کے گزر جاتا، اس پر افسوس ہوتا، ایک ایک گھڑی غنیمت معلوم ہوتی، اور زیادہ سے زیادہ عمل اور خدا کی رضا کا کام کرنے کا جذبہ پیدا ہوتا، مجھے اللہ کے ساتھ ایک تعلق اور اُنس اور دعا میں لذت و حلاوت محسوس ہوتی، اس کے بعد ایسا معلوم ہوا کہ بعض حکام و اہل کارانِ سلطنت میری حسن تقریر اور وعظ سے متاثر ہوئے، اور انھوں نے مجھے اپنی طرف مائل کیا، اور طبیعت بھی مائل ہوئی، نتیجہ یہ ہوا کہ وہ حلاوت جو دعا و مناجات میں محسوس ہوتی تھی، جاتی رہی پھر دوسرے حاکم نے اپنی طرف مائل کیا، میں (مشتبہ چیزوں کے ڈر سے) اس کے اختلاط اور کھانے پینے سے بچتا تھا، اور میری حالت کچھ بُری نہ تھی، پھر رفتہ رفتہ تاویل کا دروازہ کھل گیا، اور میں نے مباحات میں آزادی سے کام لیا، تو وہ ساری کیفیت جاتی رہی، جتنا میں ان حاکموں سے ملتا اور ان کے ساتھ اٹھتا بیٹھتا تھا، قلب کی تاریکی بڑھتی جاتی، یہاں تک کہ ایسا محسوس ہوا کہ وہ روشنی بجھ گئی، اور قلب تاریک ہو گیا، اس صورتِ حال سے میری طبیعت میں ایک بے چینی پیدا ہوئی، اس بے چینی کا اثر مجلسِ وعظ کے سامعین پر یہ پڑا کہ وہ بھی بے چین اور متاثر ہونے لگے اس بے چینی کے اثر سے ان کو بکثرت توبہ اور اصلاح کی توفیق ہوتی، اور میں خالی ہاتھ کا خالی ہاتھ رہتا، اپنی اس مفلسی اور بد قسمتی کو دیکھ کر میرا اضطراب اور بڑھا، لیکن کوئی علاج بن نہ آیا، آخر میں نے صالحین کی قبور کی زیارت کی، اور اللہ سے اپنے دل کی اصلاح کی دعا کی، بالآخر اللہ کے لطف و کرم نے میری دستگیری کی، اور مجھے کشاں کشاں خلوت کی طرف مائل کیا، جس سے

مجھے وحشت تھی اور وہ دل جو میرے ہاتھ سے نکل گیا تھا، پھر قابو میں آیا، اور جو حالت مجھے بہت اچھی معلوم ہوتی تھی اس کا عیب مجھ پر ظاہر ہوا، میں اس خواب غفلت سے بیدار ہوا اور میں نے اپنے مہربان و شفیق آقا (خدا) کا دل کھول کر شکر ادا کیا۔[1]

ظاہری محاسن واوصاف

ابن جوزی اس لازوال دولت کے ساتھ دولت دنیا، دولتِ عافیت اور دولتِ جمال سے بھی بہرہ مند تھے، موفق عبداللطیف کہتے ہیں، کہ وہ نہایت خوش پوشاک، خوش خوراک، خوش مذاق، اور نفیس طبع تھے، ابن الدبیثی کہتے ہیں کہ وہ شیریں زبان، شیوہ بیان، خوش آواز، موزوں قامت اور خوش اندام تھے، ان کو اللہ تعالیٰ نے ہمیشہ فراخ دست اور با حرمت رکھا، اپنی صحت اور اعتدال مزاج کا بڑا اہتمام رکھتے، اور ایسی چیزوں کا استعمال کرتے رہتے، جو ذکاوت و لطافت مزاج میں معین ہیں "صید الخاطر" میں جا بجا صحت کی حفاظت، اعتدال مزاج، اور بد پرہیزی سے پرہیز کرنے کی تلقین کی ہے، تلبیس ابلیس میں زہد کے مبالغہ آمیز اور متشددانہ عجمی رجحانات پر جا بجا تنقید کی ہے۔

بلند ہمتی اور جامعیت کا شوق

ان کی خاص صفت ان کی عالی ہمتی، اور کسب کمالات اور جامعیت کا شوق ہے، جس کا اظہار انھوں نے اپنے حالات میں جا بجا کیا ہے، انھوں نے جب کبھی مشہور حوصلہ مندوں اور بلند ہمتوں کا جائزہ لیا ہے، ان کی حوصلہ مندی اپنی بلند ہمتی کے سامنے پست اور محدود نظر آئی ہے، "صید الخاطر" میں ایک جگہ تفصیل سے لکھتے ہیں۔

"انسان کے لئے سب سے بڑی ابتلا اس کی بلند ہمتی ہے، اس لئے کہ جس کی ہمت بلند ہوتی ہے، وہ

---

[1] صید الخاطر ج ۱ ص ۲۲-۱۲۱

بلند سے بلند مراتب کو انتخاب کرتا ہے، پھر کبھی زمانہ مساعد نہیں ہوتا، کبھی وسائل مفقود ہوتے ہیں، تو ایسا شخص ہمیشہ کوفت میں رہتا ہے، مجھے بھی اللہ تعالیٰ نے بلند حوصلہ عطا فرمایا ہے، اور اس کی وجہ سے میں بھی تکلیف میں ہوں، لیکن میں یہ بھی نہیں کہتا کہ کاش مجھے یہ بلند حوصلہ نہ عطا ہوتا، اس لئے کہ زندگی کا پورا لطف اور بے فکری بے عقلی اور بے حسی کے بغیر نہیں، اور صاحب عقل یہ گوارا نہیں کرسکتا کہ اس کی عقل کم کردی جائے، اور زندگی کا لطف بڑھا دیا جائے، میں نے کئی آدمیوں کو دیکھا کہ وہ اپنی بلند ہمتی کا بڑی اہمیت سے ذکر کرتے ہیں، لیکن غور کیا تو معلوم ہوا کہ ان کی ساری بلند ہمتی صرف ایک ہی صنف اور شعبہ میں ہے، اس کے علاوہ دوسرے شعبوں میں (جو بعض اوقات ان کے شعبہ سے زیادہ اہم ہوتے ہیں) ان کو اپنی کمی یا پستی کی کوئی پرواہ نہیں، شریف رضی اپنے ایک شعر میں کہتا ہے کہ ہر جسم کی لاغری کا ایک سبب ہے، اور میرے جسم کی مصیبت میری بلند ہمتی ہے" لیکن میں نے اس کے حالات کا جائزہ لیا تو معلوم ہوا کہ حکومت کے سوا اس کا کوئی مطمع نظر نہ تھا، ابو مسلم خراسانی اپنی جوانی کے زمانہ میں سوتا نہ تھا، کسی نے اس سے سبب پوچھا تو اس نے کہا کہ دماغ روشن، ہمت بلند، نفس بلندیوں کا حریص، اس سب کے ہوتے ہوئے پست اور محدود زندگی، بھلا نیند کس طرح آئے؟ کسی نے کہا کہ تمہاری تسکین کس طرح ہوسکتی ہے؟ کہا کہ صرف اس طرح کہ سلطنت حاصل ہوجائے، لوگوں نے کہا کہ پھر اس کی کوشش کرو، اس نے کہا کہ یہ خطروں میں پڑے اور جان کی بازی لگائے بغیر ممکن نہیں، لوگوں نے کہا کہ پھر کیا مانع ہے؟ کہا کہ عقل روکتی ہے، پوچھا گیا کہ پھر کیا ارادہ ہے؟ کہا کہ پھر عقل کا مشورہ قبول نہیں کروں گا، اور نادانی کے ہاتھ میں اپنی باگ ڈور دے دوں گا، نادانی سے خطرہ مول لوں گا اور جہاں عقل کے بغیر کام نہیں چلتا، وہاں عقل سے کام لوں گا، اس لئے کہ گمنامی اور افلاس لازم و ملزوم ہیں، میں نے اس فریب خوردہ حوصلہ مند (ابو مسلم) کے حالات پر نظر کی تو معلوم ہوا کہ اس نے سب سے اہم مسئلہ ہی کی بیخ کنی کردی، اور وہ مسئلہ آخرت ہے، وہ حکومت کی طلب میں دلوانہ رہا، اس کی خاطر

اس نے کتنا خون بہایا، کتنے بے گناہ بندگانِ خدا کو قتل کیا، یہاں تک کہ اس کو دنیاوی لذتوں کا ایک قلیل حصہ حاصل ہوا، جو اس کا مطلوب تھا، لیکن اس کو آٹھ سال سے زیادہ اس سے لطف اندوز ہونے کا موقع نہ ملا، اس کو دھوکہ سے قتل کر دیا گیا، وہ اپنی عقل سے اپنا کوئی بندوبست نہ کر سکا، اور (سفاح کے ہاتھوں) قتل ہو کر دنیا سے بڑی بُری حالت میں رخصت ہو گیا، اسی طرح متنبی نے اپنی بلند ہمتی اور حوصلہ مندی کا بڑا اترانہ گایا ہے، لیکن میں نے دیکھا کہ اس کو محض دنیا کی ہوس تھی۔

لیکن میری عالی ہمتی کا معاملہ عجیب ہے، میں علم کا وہ درجہ حاصل کرنا چاہتا ہوں، جہاں تک مجھے یقین ہے کہ پہونچ نہیں سکوں گا، اس لئے کہ میں تمام علوم کا حصول چاہتا ہوں، خواہ ان کا کچھ موضوع ہو، پھر ان میں سے ہر علم کی تکمیل اور احاطہ چاہتا ہوں، اور اس مقصد کے ایک حصہ کا حصول بھی اس چھوٹی سی عمر میں ناممکن ہے، پھر میرا یہ حال ہے کہ اگر کسی فن میں کسی کو کمال حاصل ہوتا ہے، اور دوسرے فن میں وہ ناقص ہوتا ہے، تو مجھے وہ ناقص نظر آتا ہے، مثلاً محدث فقہ سے بے بہرہ ہے، فقیہ حدیث سے بے خبر، میرے نزدیک علم کا نقص ہمت کی پستی کا نتیجہ ہے، پھر علم سے میرا مقصود پورا پورا عمل ہے، میرا جی چاہتا ہے کہ مجھ میں بشر حافی کی احتیاط اور معروف کرخی کا زہد جمع ہو جائے، پھر یہ بات تصانیف کے مطالعہ، عامۃ الناس اور بندگانِ خدا کو تعلیم و افادہ اور ان کے ساتھ رہنے سہنے کے مشاغل کے ساتھ بہت مشکل ہے، پھر میں یہ بھی چاہتا ہوں کہ مخلوق سے مستغنی رہوں، اور بجائے ان کا احسان لینے کے ان پر احسان کرنے کے قابل بن سکوں، در آنحالیکہ علم کے ساتھ اشتغال کسبِ معاش سے مانع ہے، دوسروں کا ممنون ہونے اور ان کے سلوک و ہدایا کو قبول کرنے کو میری ہمت گوارا نہیں کرتی، پھر مجھے اولاد کی بھی خواہش ہے، اور بلند پایہ تصانیف کا بھی شوق ہے تاکہ یہ سب میری یادگار اور دنیا سے جانے کے بعد میرے قائم مقام ہوں، اس کا اہتمام کیا جائے تو دل کے پسندیدہ اور محبوب مشغلہ خلوت و تنہائی میں فرق آتا ہے، اور طبیعت میں انتشار پیدا ہوتا ہے، پھر مجھے طیبات و

مستحسنات سے جائز لطف لینے کا بھی شوق ہے، لیکن اس میں مال کی کمی سدِ راہ ہے، پھر اگر اس کا سامان بھی ہو جائے تو جمعیت خاطر رخصت، اسی طرح میں ان غذاؤں اور ایسے کھانے پینے کا بھی شائق ہوں، جو جسم کے موافق اور اس کے لئے مفید ہوں، اس لئے کہ میرا جسم نفاست پسند اور شائق واقع ہوا ہے، لیکن مال کی کمی یہاں بھی رکاوٹ بنتی ہے، یہ سب درحقیقت اضداد کو جمع کرنے کی کوشش ہے، بھلا اس عالی ہمتی کا مقابلہ وہ لوگ کیا کر سکتے ہیں، جن کو صرف دنیا مطلوب ہے، پھر میری خواہش یہ بھی ہے کہ دنیا کا حصول اس طرح ہو کہ میرے دین پر آنچ نہ آئے، اور وہ بالکل محفوظ ہو، اور نہ میرے علم اور عمل پر کچھ اثر پڑے، میری بے چینی کا کوئی کیا اندازہ کر سکتا ہے، ایک طرف مجھے شب بیداری عزیز ہے، اخفا وتقویٰ کا اہتمام ہے، دوسری طرف علم کی اشاعت وافادہ اور تصنیف وتالیف اور جسم کے مناسب غذائیں بھی مطلوب ہیں، اور یہ بغیر قلب کی مشغولیت کے ممکن نہیں، ایک طرف لوگوں سے ملنا جلنا اور ان کی تعلیم بھی ضروری ہے، دوسری طرف خلوت وتنہائی کی دعاء ومناجات کی حلاوت میں کمی ہو تو اس پر سخت تأسف ورنج ہوتا ہے، متعلقین کے لئے قوت لایموت کا انتظام کیا جائے تو زہد واحتیاط کے معیار میں فرق آتا ہے، لیکن میں نے اس ساری تکلیف اور کوفت کو گوارا کر رکھا ہے، اور راضی برضا ہو گیا ہوں، اور شاید میری اصلاح وترقی اسی تکلیف وکشمکش میں ہے، اس لئے کہ بلند ہمت ان اعمال کی فکر میں رہتے ہیں، جو خدا کے یہاں باعث تقرب ہیں، میں اپنے انفاس کی حفاظت کرتا ہوں، اور اس سے احتیاط کرتا ہوں، اور اس سے احتیاط کرتا ہوں کہ ایک سانس بھی کسی لایعنی کام میں صرف ہو، اگر میرا مطلوب حاصل ہو گیا تو سبحان اللہ ورنہ نیۃ المؤمن خیر من عملہ۔"[1]

مجالسِ وعظ اور تاثیر

ان کی زندگی کا سب سے بڑا کارنامہ ان کے انقلاب انگیز مواعظ اور مجالسِ درس ہیں، ان مجالس وعظ

---

[1] صید الخاطر ج ۲ ص ۳۴۲-۳۴۳

نے سارے بغداد کو زیر وزبر کر رکھا تھا، خلفاء وسلاطین، وزراء اور اکابر علماء ان میں بڑے اہتمام اور بڑے شوق سے شرکت کرتے، ہجوم کا یہ حال تھا کہ ایک ایک لاکھ آدمی ایک ایک وعظ میں شمار کئے گئے ہیں، دس پندرہ ہزار آدمیوں سے تو کسی طرح کبھی کم نہ ہوتے،[1] تاثیر کا یہ عالم تھا، کہ لوگ غش کھا کھا کر گرتے، وجد وشوق میں گریبان پھاڑتے، لوگوں کی چیخیں نکل جاتیں، آنسوؤں کی جھڑیاں لگ جاتیں، توبہ کرنے والوں کا کچھ شمار نہ تھا، اندازہ کیا گیا ہے کہ بیس ہزار یہودی، عیسائی ان کے ہاتھ پر مسلمان ہوئے، اور ایک لاکھ آدمیوں نے توبہ کی۔[2]

ابن جوزی نے اپنی مجالسِ وعظ میں بدعات ومنکرات کی کھل کر تردید کی، عقائدِ صحیحہ اور سنت کا اظہار کیا، اپنی بے مثل خطابت، زبردست علمیت اور عام رجوع کی وجہ سے اہل بدعت کو ان کی تردید کا حوصلہ نہ ہوا، سنت کو ان کے مواعظ و درس اور تصنیفات سے بہت فروغ ہوا، اور خلیفۂ وقت اور امراء بھی امام احمد کے (جو اس زمانہ میں مسلکِ سلف اور طریقۂ سنت کی نشانی سمجھے جاتے تھے) معتقد اور ان کے مذہب کی طرف مائل ہو گئے۔

ان کی ناقدانہ تصانیف

ابن جوزی نے زبانی وعظ وتقریر پر اکتفا نہیں کی، انھوں نے متعدد کتابیں ایسی لکھیں، جنھوں نے علمی طبقہ پر اثر ڈالا، اور غلط رجحانات کی اصلاح کی۔

"کتاب الموضوعات"

یہ موضوعاتِ حدیث پر ان کی ایک کتاب ہے، جس میں انھوں نے ان حدیثوں کی حقیقت بیان کی ہے، جن سے اس زمانہ کے اہل ہویٰ یا ضعیف العلم متصوفین استدلال کرتے تھے، اور وہ لوگوں کی گمراہی اور

[1] صید الخاطر ج ۱ ص ۱۲ [2] ایضاً

صدہا غلط فہمیوں کا باعث بنی تھیں، اس طرح انھوں نے اس شاخ پر تیشہ چلایا، جس پر اہلِ بدعت نے آشیانہ بنایا تھا، اگرچہ اس میں ان سے خود کہیں کہیں بے اعتدالی ہوئی ہے، اور انھوں نے کہیں کہیں سخت فیصلہ صادر کیا ہے، مگر اس میں شبہ نہیں کہ اس کتاب نے ایک مفید خدمت انجام دی۔

"تلبیس ابلیس"

ان کی دوسری ناقدانہ تصنیف تلبیس ابلیس ہے، جو ان کی نقاد طبیعت اور سلفی ذوق کا اصلی نمونہ ہے اس کتاب میں انھوں نے اپنے زمانہ کی پوری مسلمان سوسائٹی کا جائزہ لیا ہے، اور مسلمانوں کے ہر طبقہ اور ہر جماعت کو سنت و شریعت کے معیار سے دیکھا ہے، اور اس کی کمزوریوں، بے اعتدالیوں اور غلط فہمیوں کی نشاندہی کی ہے، اور یہ دکھلایا ہے کہ شیطان نے کس کس طرح سے اس امت کو دھوکا دیا ہے، اور کن کن راہوں سے اس کے عقائد، اعمال اور اخلاق میں رخنہ اندازی کی ہے، انھوں نے اس کتاب میں کسی طبقہ اور کسی شخص کی رعایت نہیں کی، اور کسی کو معاف نہیں کیا ہے، اس میں علماء و محدثین فقہاء و واعظین، ادباء شعراء، سلاطین و حکام، عباد و زہاد، صوفیہ اہلِ دین، اور عوام کی علیحدہ علیحدہ کمزوریاں، غلط رسوم و عادات مغالطے اور بے اعتدالیاں بیان کی ہیں، یہ کتاب ان کی وسعتِ نظر زندگی سے واقفیت، باریک بینی اور دقیقہ رسی کا کامیاب نمونہ ہے، اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ انھوں نے شیطان کی نفسیات و سیاست کا گہرا مطالعہ کیا تھا، اور مذاہب کی تاریخ اور گمراہ فرقوں کے عقائد سے وہ بہت باخبر تھے۔

مختلف طبقات پر تنقید

اس کتاب میں اگرچہ کہیں کہیں وہ اپنی تنقید میں حد سے بڑھ گئے ہیں، اور انھوں نے فیصلہ کرنے میں عجلت اور شدت سے کام لیا ہے، مگر اس میں شبہ نہیں کہ اس کتاب میں بڑی کارآمد چیزیں، بڑے بیش قیمت

اقتباسات، اور بہت سی صحیح تنقیدیں ملتی ہیں، اور اکثر جگہ ماننا پڑتا ہے کہ ان کی گرفت صحیح اور ان کی تنقید حق بجانب ہے، یہاں پر اس کے چند نمونے پیش کئے جاتے ہیں۔

اپنے زمانہ کے ان علماء پر تنقید کرتے ہوئے لکھتے ہیں، جو فقہ کے مسائل و جزئیات میں دن رات منہمک تھے، اور اس فن میں موشگافیاں کرتے رہتے تھے۔

"ان فقہاء کی ایک کمزوری یہ ہے کہ ان کا سارا انہماک اسی غور و فکر میں ہے، انھوں نے اپنے فن میں ان چیزوں کو شامل نہیں کیا ہے، جن سے قلوب میں رقّت پیدا ہوتی ہے، مثلاً قرآن مجید کی تلاوت، حدیث و سیرت کی سماعت اور صحابۂ کرام کے حالات کا مطالعہ و بیان، سب جانتے ہیں کہ محض ازالۂ نجاست اور ماء متغیر کے مسائل کے بار بار دہرانے سے قلوب میں نرمی اور خشیت نہیں پیدا ہو سکتی، قلوب کو تذکیر اور مواعظ کی ضرورت ہے، تاکہ آخرت طلبی کی ہمت اور شوق پیدا ہو، اختلافی مسائل اگرچہ علومِ شریعت سے خارج نہیں، مگر حصولِ مقصد کے لئے کافی نہیں ہیں، جو سلف کے حالات اور ان کے حقائق و اسرار سے واقف نہیں، اور جن کے مذہب کو اس نے اختیار کیا ہے، ان کے حالات سے باخبر نہیں، وہ ان کے راستہ پر کیسے چل سکتا ہے، یاد رکھنا چاہئے کہ طبیعت چور ہے، اگر اس کو اسی زمانہ کے لوگوں کے ساتھ چھوڑ دیا جائے گا تو وہ اہل زمانہ کے طبائع سے اخذ کرلے گی، اور ان ہی کی طرح ہو جائے گی، اور اگر متقدمین کے حالات اور طریقوں کا مطالعہ کیا جائے گا تو ان کے ساتھ چلنے کی کوشش کی جائے گی، اور ان کا رنگ اور ان کے سے اخلاق پیدا ہوں گے، سلف میں سے ایک بزرگ کا مقولہ ہے کہ ایک حدیث جس سے میرے دل میں رقّت پیدا ہو، قاضی شریح کے سو فیصلوں سے مجھے زیادہ محبوب ہے"[1]

واعظین پر تنقید کرتے ہوئے لکھتے ہیں:-

---

[1] تلبیس ابلیس ص ۱۱۹، ۱۲۰

"ان میں سے اکثر لوگ بڑی آراستہ اور بڑی پُرتکلف عبارت بولتے ہیں جو اکثر بے معنی ہوتی ہے، اس زمانہ میں مواعظ کا بڑا حصہ حضرت موسیٰ کوہ طور، یوسف زلیخا کے قصوں سے متعلق ہوتا ہے، فرائض کا بہت کم تذکرہ آنے پاتا ہے، اسی طرح گناہ سے بچنے کا ذکر کبھی نہیں ہوتا، ایسے مواعظ سے ایک زانی، ایک سود خوار کو توبہ کرنے کی ترغیب اور توفیق کیسے ہوسکتی ہے، اور کب عورت کو شوہر کے حقوق ادا کرنے اور اپنے تعلقات درست کرنے کا خیال پیدا ہوسکتا ہے، اس لئے کہ یہ مواعظ ان مضامین سے خالی ہوتے ہیں، ان واعظوں نے شریعت کو پس پشت ڈال دیا ہے، اسی لئے ان کا بازار خوب گرم ہے، اس لئے کہ حق ہمیشہ طبیعتوں پر بھاری ہوتا ہے، اور باطل ہلکا اور خوشگوار ہے۔"[1]

آگے لکھتے ہیں:۔

"کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ واعظ سچا اور خیر خواہ ہوتا ہے، لیکن جاہ طلبی اس کے دل میں سرایت کرچکی ہوتی ہے، وہ چاہتا ہے کہ اس کی عزت و تعظیم کی جائے، اور اس کی علامت یہ ہے کہ اگر دوسرا واعظ اس کی قائم مقامی کرے، یا اصلاح کے کام میں اس کی مدد کرنا چاہے تو اس کو ناگوار ہوتا ہے، حالانکہ اگر یہ مخلص ہوتا، تو اس کو اس سے کبھی ناگواری نہ ہوتی۔"[2]

یہی تنقید ان کی علماء پر بھی ہے کہ:۔

"اگر طلبہ کسی اور عالم یا مدرس کے پاس چلے جائیں، جو علم میں اس سے فائق ہے تو اس عالم کو اس سے بڑی گرانی ہوتی ہے، یہ مخلص کی شان نہیں ہے، اس لئے کہ مخلص علماء اور مدرسین کی مثال اطباء کی سی ہے، جو لوجہ اللہ مخلوق کا علاج کرتے ہیں، اس لئے کہ اگر کسی مریض کو کسی طبیب کے ہاتھ سے شفا ہوجائے تو دوسرا خوش ہوتا ہے۔"[3]

حکام و سلاطین پر تنقید کرتے ہوئے لکھتے ہیں:۔

---

[1] تلبیس ابلیس ص ۱۲۵ [2] ایضاً [3] تلبیس ابلیس ص ۱۳۱ (نقد مسالک العلماء الکاملین)۔

"یہ حضرات شریعت کے مقابلہ میں اپنی رائے پر عمل کرتے ہیں، کبھی اس شخص کا ہاتھ کاٹتے ہیں جس کا ہاتھ کاٹنا جائز نہیں، اور کبھی اس کو قتل کرتے ہیں جس کا قتل حلال نہیں، ان کو یہ دھوکہ ہے کہ یہ سیاست ہے جس کا دوسرا مطلب یہ ہے کہ شریعت ناقص ہے، اس کو تکملہ اور ضمیمہ کی ضرورت ہے، اور ہم اپنی رائے سے اس کی تکمیل کر رہے ہیں۔ یہ شیطان کا بہت بڑا فریب ہے، اس لئے کہ شریعت سیاستِ الٰہی ہے، اور محال ہے کہ خدائی سیاست میں کوئی خلل یا کمی ہو، جس کی وجہ سے اس کو مخلوق کی سیاست کی ضرورت ہو، اللہ تعالیٰ فرماتا ہے "مَا فَرَّطْنَا فِي الْكِتَابِ مِنْ شَيْءٍ" (ہم نے کتاب میں کوئی چیز نہیں چھوڑی) اور ارشاد ہے کہ "لَا مُعَقِّبَ لِحُكْمِهِ" (اس کے حکم کو کوئی ٹالنے والا نہیں) تو جو اس سیاست کا مدعی ہے، وہ دراصل شریعت میں خلل اور کمی کا دعویٰ کرتا ہے، اور یہ کفر کی بات ہے[1]۔"

ان حکام وامراء اور سلاطین کی ایک دوسری کمزوری اور مغالطہ کا ذکر کرتے ہیں:۔

"معاصی پر اصرار کے ساتھ ساتھ ان کو صلحاء کی ملاقات کا بھی بڑا شوق ہوتا ہے، اور ان سے وہ اپنے حق میں دعائیں کراتے ہیں، شیطان اس کو سمجھاتا ہے کہ اس سے گناہوں کا پلڑا ہلکا ہو جائے گا، حالانکہ اس خیر سے اس شر کا دفعیہ نہیں ہو سکتا، ایک مرتبہ ایک تاجر ایک محصول وصول کرنے والے کے پاس سے گزرا، اس چنگی والے نے اس کی کشتی روک لی، وہ تاجر اپنے زمانہ کے مشہور مردِ صالح مالک بن دینار کے پاس آیا، اور ان سے واقعہ بیان کیا، مالک بن دینار چنگی والے کے پاس گئے، اور اس تاجر کی سفارش کی، اس نے اس کی بڑی تعظیم کی، اور کہا کہ آپ نے کیوں زحمت فرمائی، وہیں سے کہلوا دیا ہوتا، ہم تعمیل کرتے، پھر اس نے ان سے دعا کی درخواست کی، انھوں نے اس برتن کی طرف اشارہ کر کے (جس میں وہ چنگی کا ناجائز روپیہ وصول کر کے رکھتا تھا) فرمایا کہ اس برتن سے کہو کہ وہ تمہارے لئے دعا کرے، پھر فرمایا کہ میں تمہارے حق میں کیا دعا کروں جبکہ ہزار آدمی تمہارے لئے بد دعا کرتے ہیں، کیا ایک آدمی کی سُن لی جائے گی، اور ہزار کی نہ سُنی جائے گی[2]"

---

[1] نقد مسالک الولاۃ والسلاطین ص ۱۳۲ [2] ایضاً ص ۱۳۴

ایک جگہ اس کا ذکر کرتے ہیں کہ "ان امراء اور دنیا داروں کو علماء و فقہاء سے زیادہ خلاف شرع پیروں اور گانے بجانے والے صوفیوں سے عقیدت و محبت ہوتی ہے' اور ان پر وہ بڑی فراخ دلی سے خرچ کرتے ہیں' جبکہ اہل علم پر ایک پیسہ خرچ کرنا ان کو بار ہوتا ہے' اس لئے کہ علماء اطباء کی طرح ہیں' اور دوائیں خرچ کرنا انسان کو بڑا بار معلوم ہوتا ہے' لیکن ان پیروں اور قوالوں پر خرچ کرنا ایسا ہی ہے جیسا مغنیات (گانے والی عورتوں) پر خرچ کرنا' یہ بھی ان کے لئے گویوں اور مداریوں کی طرح سامان تفریح اور لازمۂ ریاست ہیں۔[1]

اسی طرح سے یہ لوگ بناوٹی زاہدوں اور تارک الدنیا درویشوں کے بڑی جلدی معتقد ہوتے اور ان کو علماء پر ترجیح دیتے ہیں' یہ لوگ اگر سب سے بڑے جاہل کے جسم پر درویشی کا لباس دیکھ لیں تو فوراً معتقد ہو جائیں۔ اور اگر وہ سر کو جھکائے اور خشوع و خضوع کا اظہار کرے تو فریفتہ ہونے میں دیر نہیں لگتی' اور کہتے ہیں کہ بھلا اس درویش اور فلاں عالم کا کیا مقابلہ' یہ تارک الدنیا وہ طالب دنیا' یہ اچھی غذائیں کھاتا ہے' نہ شادی کرتا ہے حالانکہ محض جہالت ہے' اور شریعت محمدیؐ کی تحقیر ہے کہ ایسے زہد کو علم پر ترجیح دی جائے' خدا کا بڑا احسان ہے کہ یہ لوگ آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں نہ تھے' ورنہ اگر آپ کو شادیاں کرتے' پاک و صاف چیزیں کھاتے' اور میٹھے اور شہد کی رغبت رکھتے ہوئے پاتے تو آپ سے بھی بداعتقاد ہو جاتے۔[2]

عوام پر تنقید کرتے ہوئے لکھتے ہیں :-

"شیطان نے بہت سے عوام کو یہ دھوکہ دے رکھا ہے کہ وعظ و ذکر کی مجالس میں شریک ہونا اور متاثر ہو کر رونا ہی سب کچھ ہے' وہ سمجھتے ہیں کہ مقصود محفل خیر میں شرکت اور رقت ہے' اس لئے کہ وہ واعظوں سے اس کے فضائل سنتے رہتے ہیں' اگر ان کو یہ معلوم ہو جائے کہ مقصود عمل ہے' تو یہ سننا اور عمل کرنا ان کے لئے گرفت کا باعث اور وبال جان ہے' میں ذاتی طور پر بہت سے آدمیوں کو

---

[1] نقد مسالک لولاۃ والسلاطین ص ۳۷۳ [2] تلبیس ابلیس علی العوام ص ۳۸۸-۸۹

جانتا ہوں' جو سالہا سال سے مجلس وعظ میں شریک ہوتے ہیں' اور روتے ہیں' متاثر ہوتے ہیں' لیکن نہ سود لینا چھوڑتے ہیں نہ تجارت میں دھوکہ دینے سے باز آتے ہیں' ارکان صلوٰۃ سے جیسے وہ بے خبر برسوں پہلے تھے' ویسے ہی اب بھی ہیں' مسلمانوں کی غیبت' والدین کی نافرمانی میں جس طرح پہلے مبتلا تھے' اسی طرح اب بھی مبتلا ہیں' شیطان نے ان کو یہ چکّر دے رکھا ہے کہ مجلس وعظ کی حاضری اور گریہ و بکا اُن کے گناہوں کا کفارہ بن جائے گا' بعض کو یہ سمجھا رکھا ہے کہ علماء و صالحین کی صحبت ہی مغفرت کا ذریعہ ہے۔"[1]

دولت مندوں پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:۔

"ان میں سے بہت سے لوگ مساجد اور پلوں کی تعمیر میں بہت کچھ خرچ کرتے ہیں' مگر ان کا مقصود ریا اور شہرت ہوتی ہے' اور یہ کہ ان کا نام چلے اور یادگار رہے' چنانچہ وہ اس تعمیر پر اپنا نام کندہ کرواتے ہیں' اگر رضائے الٰہی مقصود ہوتی تو اس کو کافی سمجھتے کہ اللہ دیکھتا اور جانتا ہے' ایسے لوگوں سے اگر صرف ایک دیوار بنانے کو کہا جائے جس پر ان کا نام کندہ نہ ہو تو وہ منظور نہ کریں گے۔

اسی طرح سے رمضانِ مبارک میں شہرت کے لئے موم بتیاں بھیجتے ہیں' حالانکہ ان کی مسجدوں میں سال بھر اندھیرا پڑا رہتا ہے' اس لئے کہ روزانہ تھوڑا تھوڑا سا تیل مسجدوں میں دینے سے وہ شہرت اور ناموری حاصل نہیں ہوتی جو رمضان میں ایک موم بتی بھیج دینے سے حاصل ہوتی ہے۔"[2]

"صید الخاطر"

"صید الخاطر" ایک کشکول ہے' جس میں مصنف نے اپنے قلبی تاثرات' بے تکلف خیالات' زندگی کے تجربات اور منتشر افکار و حوادث قلمبند کئے ہیں' اور اپنی بہت سی کمزوریوں اور غلطیوں کا بے تکلف

---

[1] تلبیس ابلیس علی العوام ص ۳۹۳-۳۹۴ [2] تلبیس ابلیس علی اصحاب الاموال ص ۳۹۵

اعتراف کیا ہے' اس کتاب میں جابجا نفس سے مکالمے' سوال وجواب' ذہنی کشمکش کی روداد، معاشرتی زندگی کے تجربے' عورتوں' نوکروں' اور دوستوں کے متعلق تجربہ کی باتیں' اور مفید ہدایات روزمرہ کے واقعات کی تحلیل' امراض نفسانی کا بیان' مختلف طبقات پر تنقید' نفس کا احتساب اور صدہا کام کی باتیں ہیں' اس کتاب کی ایک بڑی خصوصیت صداقت اور سادگی وبے تکلفی ہے پوری کتاب اپنے زمانہ کے ادبا و مصنفین کے طرز کے خلاف نہایت رواں وبے تکلف عبارت میں لکھی گئی ہے' اور اپنے موضوع پر غالباً ایک عرب عالم و مصنف کی پہلی کتاب ہے۔

عام واقعات سے بڑے بڑے نتائج

ابن جوزی اس کتاب میں چھوٹے چھوٹے واقعات' اور روزمرہ کے مشاہدات سے بڑے بڑے نتائج نکالتے ہیں' اور یہی ایک عامی اور ایک صاحبِ نظر میں فرق ہے' ایک جگہ لکھتے ہیں:۔

"میں نے دو مزدوروں کو دیکھا کہ ایک بھاری شہتیر اٹھا کر لے جارہے ہیں' اور دونوں کچھ گا رہے ہیں،... ایک مصرعہ پڑھتا ہے' دوسرا ترنم کے ساتھ اس کا جواب دیتا ہے' ایک پڑھتا ہے' تو دوسرا کان لگا کر سنتا ہے' پھر دوسرا اس کو دہراتا ہے' یا اسی طرح کے مصرعہ سے جواب دیتا ہے' مجھے خیال ہوا کہ اگر وہ ایسا نہ کریں تو ان کو محنت اور بوجھ کا احساس زیادہ ہو' لیکن اس ترکیب سے ان کا کام آسان ہوجاتا ہے' میں نے غور کیا تو معلوم ہوا کہ اس کا سبب یہ ہے کہ ذہن اتنی دیر دوسرے کام میں لگ کر سستا لیتا ہے' اور کچھ سرور حاصل کرلیتا ہے' اور جواب کی فکر میں مشغول ہوکر اس میں تازگی پیدا ہوجاتی ہے اور اس طرح راستہ طے ہوجاتا ہے' اور بوجھ کے احساس سے غفلت ہوجاتی ہے' اس سے میرا ذہن اس طرف منتقل ہوا کہ انسان نے شرعی ذمہ داریوں اور فرائض کا بڑا بوجھ اٹھا رکھا ہے' اور سب سے بڑا بوجھ اپنے نفس کی سیاست ہے' بڑا کام یہ ہے کہ اس کو

اس کے مرغوبات سے روکا جائے، اور جن چیزوں سے اس کو رغبت نہیں ان پر اس کو قائم رکھا جائے، میں نے یہ نتیجہ نکالا کہ صبر کے راستہ کو تسلّی اور نفس کی جائز دلداری کی مدد سے قطع کیا جائے، جیسا کسی شاعر نے کہا ہے کہ "رات بھر چلنے سے سواریاں تھک جائیں اور فریاد کریں، تو صبح کی روشنی کی امید دلاؤ اور دن چڑھے آرام کرنے کا وعدہ کرلو۔"

اسی طرح کی حکایت بشر حافی رحمۃ اللہ علیہ سے منقول ہے کہ وہ اور ان کے ایک ساتھی کہیں جا رہے تھے، ساتھی کو پیاس لگی، اس نے کہا کہ اس کنویں سے پانی پی لیں، بشر حافی نے کہا کہ اگلے کنویں سے پی لیں گے، جب وہ کنواں آیا تو بشر حافی نے آگے کے کنویں کی طرف اشارہ کیا کہ وہاں تک صبر کرو، اسی طرح تسلی دیتے ہوئے بہت دور لے آئے، پھر اس سے کہا کہ اسی طرح دنیا کا سفر طے ہوجاتا ہے، واقعہ یہ ہے کہ جس نے اس نکتہ کو سمجھ لیا، وہ اپنے نفس کو بہلائے گا، اور اس کی دلجوئی کرے گا، اور اس سے وعدہ کرتا ہے گا تاکہ وہ اپنے بوجھ کو سنبھال سکے، اور اس پر صبر کرے، بعض بزرگانِ سلف فرماتے تھے کہ "اے نفس میں تجھے تیرے مرغوب چیز سے جو روکتا ہوں تو محض شفقت اور خوف کی بنا پر" بایزید بسطامیؒ کا قول ہے کہ اپنے نفس کو خدا کی طرف بڑھائے لے جاتا اور وہ روتا ہوتا تھا، پھر رفتہ رفتہ ہنستا کھیلتا اللہ کی طرف بڑھنے لگا، یاد رکھنا چاہیے کہ نفس کی خاطر داری اور ملاطفت ضروری ہے، اور راستہ اسی طرح طے ہوتا ہے۔"[۱]

ایک دوسری جگہ لکھتے ہیں:۔

"میں نے دیکھا ہے کہ شکاری کتے جب محلہ کے کتوں کے پاس سے گزرتے ہیں، تو محلہ کے کتے تو ان کو بھونکتے ہیں، اور بہت شور مچاتے ہیں، اور ان کے پیچھے دوڑتے ہیں، وہ دیکھتے ہیں کہ ان کتوں کی بڑی عزت ہے، ان پر جھول پڑی ہے تو ان کو ان پر حسد آتا ہے، لیکن اس کے برخلاف شکاری کتے ان کی طرف توجہ ہی نہیں کرتے، اور ان کو خاطر میں نہیں لاتے اور ان کے بھونکنے کی کچھ پرواہ نہیں کرتے، اس سے ایسا معلوم

---

[۱] صید الخاطر ج ۱ ص ۱۴۷-۱۴۶

ہوا کہ شکاری کتے گویا ان کتوں کی قوم ہی میں سے نہیں ہیں، اس لئے کہ مقامی کتے موٹے موٹے بدن اور بھدّے اعضاء کے ہیں، ان میں امانت کی صفت نہیں، لیکن شکاری کتے نازک اور پھرتیلے ہیں، اور جیسا ان کا بدن نازک اور پھرتیلا ہے، اسی طرح ان کے عادات مہذب ہیں، وہ جب شکار کرتے ہیں تو کیا مجال ہے کہ اس کو منھ لگائیں، مالک کے ڈر سے یا اس کے احسانات کے شکریہ میں وہ اس شکار کو جوں کا توں پہنچا دیتے ہیں، اس سے ایک بات تو میں سمجھا کہ بدن اور اخلاق میں خاص مناسبت ہوتی ہے، اگر وہ لطیف ہے، تو یہ بھی لطیف ہیں، دوسرے یہ معلوم ہوا کہ آدمی کو اس پر حسد نہیں آتا جس کو وہ اپنے طبقہ یا اپنی سطح کا نہیں سمجھتا، اسی طرح جس کو اللہ تعالیٰ ایمان و عقل کی دولت سے سرفراز کرے، اس کو اپنے اس حاسد پر حسد نہیں ہوتا، جو ایمان و عقل سے محروم ہو، اور وہ اس کو قابلِ التفات نہیں سمجھتا، اس لئے کہ وہ دوسرے عالم میں ہے، اور یہ دوسرے عالم میں، وہ دنیا کی بنا پر حسد کرتا ہے، اور اس کا مطمعِ نظر آخرت ہے، اور دونوں میں بُعد المشرقین ہے۔[1]

واقعاتِ زندگی اور نفس سے مکالمہ

وہ واقعات کی پوری تحلیل کرتے ہیں، اور خود اپنی زندگی کے واقعات میں نفس سے حکیمانہ مکالمہ کرتے ہیں، ایک مرتبہ انھوں نے دعا کی، ایک دوسرے صالح بزرگ دعا میں شریک تھے، دعا قبول ہوئی لیکن کس کی دعا قبول ہوئی، اس پر ان کا اپنے نفس سے مکالمہ ہوا۔

• مجھے ایک مرتبہ ایسا معاملہ پیش آیا جس میں اللہ سے مانگنے اور دعا کی ضرورت تھی، میں نے دعا کی، اور اللہ سے سوال کیا، ایک صاحبِ صلاح اور اہلِ خیر بھی میرے ساتھ دعا میں شریک ہو گئے، میں نے قبولیت کے کچھ آثار دیکھے، میرے نفس نے کہا کہ یہ اس بزرگ کی دعا کا نتیجہ ہے، تمہاری دعا کا نتیجہ نہیں، میں نے کہا کہ

---

[1] صید الخاطر ج ۳ صفحہ ۶۳۹-۶۴۰

مجھے اپنے ایسے گناہوں اور کوتاہیوں کا علم ہے جن کی وجہ سے واقعی مجھے اس کا حق نہیں کہ میری دعا قبول ہو لیکن کیا تعجب ہے کہ میری ہی دعا قبول ہوئی ہو اس لئے کہ یہ مرد صالح ان گناہوں اور تقصیرات سے محفوظ ہے جن کا مجھے اپنے متعلق علم ہے لیکن مجھ میں اور اس میں ایک فرق ہے مجھے اپنی تقصیر کی بنا پر دل شکستگی اور ندامت ہے اور اس کو اپنے معاملہ پر فرحت و سرور ہے اور کبھی اعترافِ تقصیر ایسی ضرورتوں کے موقع پر زیادہ کارآمد اور موثر ہوتا ہے اور ایک بات میں ہم اور وہ مساوی ہیں وہ یہ کہ ہم دونوں میں سے کوئی اپنے اعمال کی بنا پر فضل کا طالب نہیں تو اگر میں ٹوٹے ہوئے دل کے ساتھ ندامت سے گردن جھکا کر اور اپنے گناہوں کا اعتراف کرتے ہوئے کہوں کہ خدایا مجھے محض اپنے فضل سے عطا فرما میں بالکل خالی ہاتھ ہوں تو مجھے امید ہے کہ میری سن لی جائے گی اور ممکن ہے کہ اس کی نظر اپنے حسن عمل پر پڑے اور یہ اس کے لئے روک بن جائے تو اے میرے نفس میرا دل زیادہ نہ توڑ وہ پہلے ہی بہت ٹوٹا ہوا ہے مجھے اپنے حالات کا ایسا علم ہے جس کا تقاضا ادب اور تواضع ہے پھر اپنی تقصیروں کا اقرار ہے جس چیز کا میں نے سوال کیا ہے اس کا بے حد محتاج ہوں اور جس سے سوال کیا ہے اس کے فضل کا یقین ہے اور یہ سب باتیں اس عابد کو حاصل نہیں تو اللہ اس کی عبادت میں برکت کرے، میرا تو اعترافِ تقصیر ہی بڑے کام کی چیز ہے۔"[1]

ایک جگہ لکھتے ہیں:۔

"ایک مرتبہ ایک ایسے معاملہ میں جو شرعاً مکروہ تھا، مجھے کچھ کشمکش درپیش تھی، نفس کچھ تاویلیں سامنے لاتا تھا، اور کراہت کو نظر سے ہٹاتا تھا، اور درحقیقت اس کی تاویلات فاسد تھیں، اور کراہت کی کھلی ہوئی دلیل موجود تھی، میں نے اللہ کی طرف رجوع کیا، اور دعا کی کہ اس کیفیت کو دور فرما دے، اور قرآن مجید کی تلاوت شروع کر دی، میرے درس کے سلسلہ میں سورۂ یوسف شروع ہو رہی تھی، میں نے

---

[1] صید الخاطر ج ۱ ص ۱۵۶-۱۵۷

وہیں سے شروع کیا، وہ خیال دل پر مستولی تھا، مجھے کچھ خبر نہ ہوئی کہ میں نے کیا پڑھا، جب اس آیت پر پہونچا، "قَالَ مَعَاذَ اللّٰهِ اِنَّهٗ رَبِّیْ اَحْسَنَ مَثْوَایَ" تو میں چونکا، اور مجھے ایسا معلوم ہوا کہ گویا میں ہی اس آیت کا مخاطب ہوں، مجھے دفعتاً ہوش آیا، اور آنکھوں سے غفلت کا پردہ دور ہوا، میں نے اپنے نفس سے کہا، تو نے خیال کیا؟ حضرت یوسف علیہ السلام آزاد تھے، وہ زبردستی اور ظلم سے غلام بنا کر بیچے گئے، انھوں نے اس شخص کا اتنا حق مانا جس نے ان کے ساتھ سلوک کیا تھا اور اس کو اپنا آقا کہا، حالانکہ نہ وہ غلام تھے، نہ ان کا کوئی آقا تھا، پھر اپنی اس حق شناسی کی وجہ یہ بیان کی کہ "اَحْسَنَ مَثْوَایَ" مجھے اچھی طرح سے رکھا، اب ذرا اپنے اوپر غور کر، تو حقیقۃً غلام ہے، ایسے آقا کا جو تیرے وجود کے وقت سے برابر تیرے ساتھ احسانات کرتا رہا، اور اتنے بار اس نے تیری پردہ پوشی کی جس کا کوئی شمار نہیں، تجھے یاد نہیں کہ اس نے کس طرح تیری پرورش کی، تجھے سکھایا پڑھایا، تجھے روزی دی، تیری حفاظت کی، خیر کے اسباب مہیا کئے، بہترین راستہ پر تجھے ڈالا، اور ہر مکر و دشمنی سے تجھے بچایا، اور حسن صورت ظاہری کے ساتھ باطنی ذکاوت و جودتِ طبع عنایت فرمائی، علوم کو تیرے لئے سہل بنا دیا، یہاں تک کہ مختصر سے عرصہ میں تجھے وہ علوم حاصل ہوئے جو دوسروں کو طویل عرصہ میں نصیب نہیں ہوئے، تیری زبان پر علوم کو رواں کیا اور فصاحت و بلاغت کے ساتھ ان کی تعبیر کی قوت عطا فرمائی، اور مخلوق سے تیرے عیوب کو چھپایا، ان کا معاملہ تیرے ساتھ حسن ظن کا رہا، تیرا رزق بغیر اہتمام و تکلف کے تجھ تک پہونچایا، اور کسی کا احسان مند نہیں بنایا، اور وہ بھی فراغت و اطمینان و کشائش کے ساتھ، بخدا میری سمجھ میں نہیں آتا کہ اس کے کس کس احسان کا تذکرہ کیا جائے، حسن صورت کا یا صحتِ اعضاء کا یا سلامتِ مزاج، یا اعتدالِ ترکیب کا یا لطافتِ طبع اور دناءت و ابتذال سے بری ہونے کا، یا بچپن ہی سے سیدھے اور معتدل راستہ کی توفیق کا، یا بے حیائیوں اور لغزشوں سے حفاظت کا، یا منقولات کی ترجیح اور حدیث و سنت کی اتباع اور تقلید جامد سے نجات کا،

یا مبتدع کی پیروی اور اس کے سلسلہ میں شمولیت سے محفوظ رہنے کا، "وَاِنْ تَعُدُّوْا نِعْمَةَ اللّٰهِ لَا تُحْصُوْهَا" کتنے دشمنوں نے تیرے لئے جال بچھایا، اور اللہ تعالیٰ نے اس سے بچایا، کتنے مخالفوں نے تجھ کو سبک کرنا چاہا، اور اس نے تجھے سربلندی عطا فرمائی، کتنی نعمتوں سے دوسرے محروم رہے اور تو ان سے سیراب کیا گیا، کتنے آدمی دنیا سے نامراد چلے گئے، اور تو شادکام اور فائز المرام ہے، اس حالت میں تیرے دن گزر رہے ہیں کہ تیرا جسم صحیح سالم، دین محفوظ، علم روز افزوں، دلی مقاصد پورے، اگر کوئی مقصد بر نہیں آتا تو اس کی طرف سے صبر پیدا کر دیا جاتا ہے، اور تجھے معلوم ہوتا ہے کہ اس کے پورا نہ ہونے ہی میں حکمتِ الٰہی تھی، یہاں تک کہ تجھے یقین آجاتا ہے کہ یہی تیرے حق میں بہتر تھا، اگر میں پچھلے احسانات کو گنانا شروع کروں تو دفتر کے دفتر سیاہ ہو جائیں، اور وہ ختم نہ ہوں، اور تجھے معلوم ہے کہ جن احسانات کا تذکرہ میں نے نہیں کیا ہے، وہ ان سے کہیں زیادہ ہیں، اور جن کا ذکر میں نے کیا ہے ان کی طرف بھی میں نے صرف اشارہ کیا ہے، اس سب کے ساتھ تجھ کو ایسا فعل کرنا کیسے زیب دیتا ہے، جو اس کی مرضی کے خلاف ہے" مَعَاذَ اللّٰهِ اِنَّهٗ رَبِّیْٓ اَحْسَنَ مَثْوَایَ اِنَّهٗ لَا یُفْلِحُ الظّٰلِمُوْنَ[1]۔"

ایک دوسری جگہ لکھتے ہیں:۔

"میں نے ایک مرتبہ ایک ایسے مسئلہ پر عمل کیا جس کی بعض مذاہب (فقہیہ) میں گنجائش تھی، اور دوسرے مذاہب میں وہ جائز نہ تھا، اس پر عمل کرنے سے مجھے اپنے قلب میں بڑی قساوت محسوس ہوئی، اور ایسا معلوم ہوا کہ گویا میں راندۂ درگاہ اور معتوب ہو گیا، اور کچھ محرومی اور گہری تاریکی محسوس ہوئی، میرے نفس نے کہا کہ یہ کیا بات ہے، تم تو دائرۂ فقہاء سے نکلے نہیں، میں نے کہا کہ اے نفس بد! تیرے سوال کا جواب دو طرح سے ہے، اوّل تو یہ کہ تو نے اپنے عقیدہ کے خلاف تاویل کی، اگر خود تجھ سے

---

[1] صید الخاطر ج ۲ ص ۸۵-۲۸۳

فتویٰ لیا جاتا تو وہ اس کا فتویٰ نہ دیتا، اس نے کہا کہ اگر میں اس کے جواز کا قائل نہ ہوتا، تو کرتا کیوں؟ میں نے کہا کہ تو اپنے اس خیال کو دوسرے کے لئے بھی فتویٰ کے طور پر پسند نہیں کرتا، دوسری بات یہ ہے کہ تجھے ظلمت کے اس احساس پر خوش ہونا چاہئے، اس لئے کہ اگر تیرے دل میں نور نہ ہوتا تو تجھ پر یہ اثر بھی نہ پڑتا، اس نے کہا کہ بہر حال مجھے اس ظلمت سے جو پلٹ پلٹ کر آتی ہے، وحشت ہے، میں نے کہا کہ پھر اس فعل کے ترک کا عزم کرے اور فرض کرے کہ تو نے جس کو ترک کیا ہے، وہ بالاجماع جائز ہے، تب بھی برنائے ورع و تقویٰ اس کو چھوڑنے کا وعدہ کر، چنانچہ اس عمل سے اس کیفیت سے اس کو نجات ملی"[1]

سلف صالحین کے حالات کے مطالعہ کی ضرورت

وہ باوجود محدث و فقیہ ہونے کے اس حقیقت سے بے خبر نہ تھے کہ قلب کی اصلاح اور ذوق و شوق پیدا کرنے کے لئے موثر واقعات اور سلف صالحین کے حالات کے مطالعہ کی ضرورت ہے "تلبیس ابلیس" اور "صید الخاطر" دونوں میں فقہاء و محدثین اور طلبہ و علماء کو وہ اس کا مشورہ دیتے ہیں، اور اپنا تجربہ بیان کرتے ہیں، "صید الخاطر" میں ایک جگہ لکھتے ہیں:۔

"میں نے دیکھا کہ فقہ اور سماع حدیث میں انہماک و مشغولیت قلب میں صلاحیت پیدا کرنے کے لئے کافی نہیں، اس کی تدبیر یہی ہے کہ اس کے ساتھ موثر واقعات اور سلف صالحین کے حالات کا مطالعہ بھی شامل کیا جائے، حرام و حلال کا خالی علم قلب میں رقت پیدا کرنے کے لئے کچھ زیادہ سودمند نہیں، قلوب میں رقت پیدا ہوتی ہے، موثر احادیث و حکایات سے اور سلف صالحین کے حالات سے، اس لئے کہ ان نقول و روایات کا جو مقصود ہے، وہ ان کو حاصل تھا، احکام پر ان کا عمل شکلی اور ظاہری نہ تھا، بلکہ ان کو ان کا اصلی ذوق اور لب لباب حاصل تھا، اور یہ جو میں تم سے کہہ رہا ہوں وہ عملی تجربہ اور

[1] صید الخاطر ج ۲ ص ۳۰۳

خود آزمائش کرنے کے بعد ہے، میں نے دیکھا ہے کہ عموماً محدثین اور طلبۂ فنِ حدیث کی ساری توجہ اونچی سند حدیث اور کثرتِ مرویات کی طرف ہوتی ہے، اسی طرح عام فقہاء کی تمام تر توجہ جدلیات اور حریف کو زیر کرنے والے علم کی طرف ہوتی ہے، بھلا ان چیزوں کے ساتھ قلب میں کیا گداز اور رقت پیدا ہوسکتی ہے، سلف کی ایک جماعت کسی نیک اور بزرگ شخص سے محض اس کے طور طریقہ کو دیکھنے کے لئے ملنے جاتی تھی، علم کے استفادہ کے لئے نہیں، اس لئے کہ یہ طور و طریقہ اس کے علم کا اصلی پھل تھا، اس نکتہ کو اچھی طرح سمجھ لو اور فقہ و حدیث کی تحصیل میں سلف صالحین اور زہادِ امت کی سیرت کا مطالعہ ضرور شامل کرو تاکہ اس سے تمہارے دل میں رقت پیدا ہو۔"[1]

صلحاء امت کی سیرت

ابن جوزی نے اسی غرض کے لئے سلف صالحین اور صلحائے امت میں سے بہت سے متقدمین اور مشاہیر کی مستقل سیرتیں لکھی ہیں، مثلاً حضرت حسن بصری، سیدنا عمر بن عبدالعزیز، حضرت سفیان ثوری، حضرت ابراہیم بن ادہم، حضرت بشر حافی، امام احمد بن حنبل، حضرت معروف کرخی،[2] ان مستقل تذکروں کے علاوہ ایک جامع تذکرہ "صفۃ الصفوۃ" لکھا، جو چار جلدوں میں ہے، یہ دراصل ابو نعیم اصبہانی کی مشہور کتاب "حلیۃ اولیاء" کی تہذیب و تنقیح ہے، جس کو ابن جوزی نے مناسب حذف و اضافہ اور تلخیص کے ساتھ محدثانہ و مورخانہ طرز پر مرتب کیا ہے، اس کتاب میں جو حالات و واقعات آئے ہیں، وہ موثر و دل گداز ہونے کے ساتھ ساتھ تاریخی حیثیت سے مستند بھی ہیں، اور مبالغہ آمیز روایات اور حشو و زوائد سے پاک ہیں۔

تاریخ کی اہمیت

ابن جوزی علوم دینیہ میں اشتغال اور فقہ و حدیث میں کمال کے ساتھ ساتھ فنِ تاریخ کی اہمیت و ضرورت

---

[1] صید الخاطر ج ۲ ص ۳۰۲-۳۰۳ [2] اپنی اس مستقل تالیفات کا تذکرہ انھوں نے خود "صید الخاطر" میں کیا ہے ج ۱ ص ۱۳۷، ص ۱۵۴ و ص ۱۷۹، ص ۲ ج ۲ ص ۲۶۳ ج ۳ ص ۵۶۳، ص ۶۰۴ اور ص ۶۰۶ ان میں سے دو اول الذکر چھپ چکی ہیں۔

کے بھی بڑے قائل اور اس کی تعلیم کے مبلغ ہیں' ان کے نزدیک تاریخ سے ناواقفیت کی بنا پر علماء و فقہاء سے اپنی کتابوں میں بعض بڑی افسوسناک فروگذاشتیں ہوئی ہیں' جو ان کے منصب اور علم و فضل کے شایانِ شان نہیں' اس لئے وہ طالب علم کو مشورہ دیتے ہیں کہ ہر فن سے وہ فی الجملہ واقف ہو' اور تاریخ سے اتنی واقفیت رکھتا ہو کہ کوئی بڑی تاریخی غلطی نہ کر بیٹھے جو اس کی خفت کا باعث ہو' "صید الخاطر" میں لکھتے ہیں :۔

"فقیہ کو چاہئے کہ ہر فن کے ضروری حصہ سے واقف ہو' تاریخ ہو یا حدیث' لغت ہو یا دوسرا فن اس لئے کہ فقہ تمام علوم کا محتاج ہے' اس لئے ہر فن کے ضروری حصہ سے اس کو واقف ہونا چاہئے میں نے بعض فقہاء کو کہتے ہوئے سنا ہے کہ شیخ شبلیؒ اور قاضی شریکؒ ایک مجلس میں جمع ہوئے مجھے سن کر تعجب ہوا کہ اس کو دونوں بزرگوں کے زمانہ کا فاصلہ نہیں معلوم! ایک عالم نے ایک مباحثہ کے دوران میں کہا کہ حضرت علیؓ اور سیدہ فاطمہؓ کے درمیان زوجیت منقطع نہیں ہوئی تھی' اس لئے حضرت علیؓ نے سیدہ کو غسل دیا' میں نے کہا کہ خدا تمہارا بھلا کرے' پھر حضرت علیؓ نے حضرت فاطمہؓ کے بعد ان کی بھانجی امامہ بنت زینبؓ سے نکاح کیسے کیا' اسی طرح میں نے امام غزالی کی کتاب احیاء العلوم میں ایسی تاریخی فروگذاشتیں دیکھیں جن سے مجھے سخت حیرت ہوئی کہ انھوں نے کس طرح مختلف واقعات اور تواریخ کو آپس میں ملا دیا' میں نے ان تاریخی اغلاط کو ایک مستقل کتاب میں جمع کیا ہے' اسی طرح انھوں نے اپنی کتاب "مستظہری" میں لکھا ہے' جس کو انھوں نے مستظہر باللہ کی خدمت میں پیش کیا تھا کہ سلیمان ابن عبدالملک نے ابو حازم سے کہلایا کہ مجھے اپنے ناشتہ میں سے کچھ تبرکاً بھیجو' انھوں نے ان کے پاس اُبلا ہوا چوکر بھیجا' سلیمان نے اس کا ناشتہ کیا' پھر اپنی بیوی سے ہم بستر ہوا' اور اس سے عبدالعزیز پیدا ہوئے' عبدالعزیز کے عمر بن عبدالعزیز پیدا ہوئے' یہ سخت مغالطہ ہے' اس لئے کہ انھوں نے عمر ابن عبدالعزیز کو سلیمان بن عبدالملک کا پوتا قرار دیا' حالانکہ وہ اس کے ابن عم تھے' شیخ ابو المعالی جوینی نے اپنی کتاب "الشامل" کے آخر میں جو اصول فقہ

میں ہے، لکھا ہے کہ اہل باطن کی ایک جماعت ناقل ہے کہ حلاج، جنابی قرمطی، اور ابن المقنع نے سلطنتوں کے نظام کے الٹنے، مملکت کی تخریب اور عوام کی استمالت کی سازش کی، اور ہر ایک نے ایک ایک ملک کی ذمہ داری لے لی، جنابی نے احسا میں سکونت اختیار کی، ابن المقنع ترکستان کے حدود میں جا بسا، اور حلاج نے بغداد کو اپنا مرکز بنایا، اس پر اس کے دونوں ساتھیوں نے فیصلہ کر دیا کہ وہ ہلاک ہو جائے گا، اور اپنے مقصد میں ناکام رہے گا، اس لئے کہ اہل بغداد دھوکہ نہیں کھاتے، اور بڑے مردم شناس اور فہیم ہیں، اور میں کہتا ہوں کہ اگر ناقل کو یہ معلوم ہوتا کہ حلاج نے ابن المقنع کا زمانہ ہی نہیں پایا، اس لئے کہ ابن المقنع کے قتل کا منصور نے حکم دیا تھا، اور یہ سنہ ۱۴۴ھ کا واقعہ ہے، درانحالیکہ ابوسعید الجنابی کا ظہور سنہ ۲۸۶ھ میں ہوا ہے، اور حلاج سنہ ۳۰۹ھ میں مقتول ہوا، اس بنا پر قرمطی اور حلاج کا زمانہ قریب قریب ہے، لیکن ابن المقنع بہت متقدم ہے، اس کے ان دونوں سے ملنے اور سازش کرنے کا کوئی امکان نہیں، اس سے معلوم ہوا کہ ہر صاحب علم کو چاہئے کہ دوسرے علوم سے بھی تعلق رکھے، اور اس کا کچھ نہ کچھ مطالعہ ہو، اس لئے کہ ہر علم کا دوسرے علم سے تعلق ہے، ایک محدث کے لئے یہ بات کتنی معیوب ہے کہ کسی واقعہ کے متعلق اس سے فتویٰ لیا جائے، اور وہ جواب نہ دے سکے، اس لئے کہ وہ طرق حدیث کے جمع کرنے میں مشغول ہے، اس کو مسائل و جزئیات کے علم کی فرصت ہی نہیں ہوئی، اسی طرح ایک فقیہ کے لئے یہ بات کتنی نامناسب ہے کہ اس سے ایک حدیث کا مطلب پوچھا جائے، اور وہ حدیث کی صحت اور اس کے مفہوم سے بالکل ناواقف ہو، اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ ایسی بلند ہمت عطا فرمائے، جو پست اور بے ہمتی کی باتوں کو گوارا نہ کرے۔"[1]

تاریخی تصنیفات

انھوں نے صرف اس تنقید اور مشورہ پر اکتفا نہیں کی، بلکہ ایک مبسوط کتاب "المنتظم فی تاریخ الملوک والامم"

---

[1] صید الخاطر ج ۳ ص ۶۰۴-۶

لکھی جو دس جلدوں میں ہے، اور جو ابتدائے اسلام سے لے کر سنہ ۵۷۴ھ تک کے حالات پر مشتمل ہے، مصنف پہلے سن لکھتے ہیں، پھر اس سن کے اہم واقعات و حالات کا تذکرہ کرتے ہیں، پھر اس سن میں جن ممتاز اور قابلِ ذکر اشخاص کا انتقال ہوا ہے، ان کے حالات بیان کرتے ہیں، اس طرح یہ کتاب حالات و تذکرہ دونوں کی ایک جامع تاریخ ہے۔[1]

اسی طرح ان کی ایک مختصر کتاب "تلقیح فہوم اهل الاثر فی عیون التاریخ والسیر" ہے، جو ایک تاریخی بیاض کی حیثیت رکھتی ہے، جس میں بہت سے تاریخی معلومات یکجا کر دیئے گئے ہیں۔[2]

ادبیت و خطابت

ابن جوزی کی فصاحت و بلاغت اور حسن خطابت پر مورخین کا اتفاق ہے، ان کی مجالس وعظ کی مقبولیت اور لوگوں کے ازدحام کا یہ بھی ایک بڑا سبب تھا، انھوں نے "صید الخاطر" میں اپنی اس ذہنی کشمکش کا بھی ذکر کیا ہے کہ نفس نے ان کو اس کی ترغیب دی کہ وہ اس کا اہتمام بالکل چھوڑ دیں اور الفاظ کی طرف بالکل توجہ نہ کریں، یہ سب تکلف اور تصنع ہے، لیکن انھوں نے اپنے علم اور تفقہ سے اس خیال کو دفع کیا، اور اپنے نفس کو سمجھایا کہ حسن کلام ایک خداداد قابلیت، ایک ہتھیار اور ایک کمال کی بات ہے نہ کہ نقص اور عیب، اس لئے ان کو دعوت و تبلیغ میں اس سے کام لینا چاہئے، اس کی ناقدری نہیں کرنی چاہیے، اسی طرح ان کے دل میں کئی بار بشدت اس کا خیال پیدا ہوا کہ وہ اس وعظ گوئی اور دعوت و تبلیغ کو چھوڑ کر زہد و انقطاع کی زندگی اختیار کرلیں، اور لوگوں سے بالکل یکسو ہو کر گوشہ نشیں ہو جائیں، مگر انھوں نے دلائل و براہین سے اور اپنے نفس سے مفصل مباحثہ و مناظرہ کر کے اس خیال کو

---

[1] اس کتاب کے آخری پانچ حصے دائرۃ المعارف حیدرآباد کی طرف سے شائع ہوئے ہیں۔ [2] یہ کتاب ہندوستان میں مولوی سید محمد یوسف صاحب ٹونکی مرحوم کے اہتمام سے شائع ہو چکی ہے۔

ہٹایا، اور اس کو قائل کیا کہ یہ القا شیطانی ہے، شیطان یہ دیکھ نہیں سکتا کہ ہزاروں آدمی اس کے جال سے نکل کر ہدایت کے راستہ پر پڑ جائیں، انبیاء علیہم السلام کا راستہ دعوت و تبلیغ کا تھا اور ان کی زندگی اجتماع و اختلاط کی تھی، اس میں نفس کا چور یہ ہے کہ وہ بیکاری اور تعطل کو پسند کرتا ہے اور جدّ و جہد سے بھاگتا ہے، دوسرے اس میں جاہ طلبی بھی ہے اس لئے کہ عزلت و گوشہ نشینی اور زہد و انقطاع کی زندگی عوام کے لئے زیادہ باعثِ کشش اور جاذب توجہ ہے، غرض یہ کہ شیطان ان کو افادۂ عوام اور عمومی دعوت کے کام سے ہٹا نہیں سکا، انھوں نے اپنی ساری دماغی صلاحیتیں اور خدا کی بخشی ہوئی طاقتیں اصلاح پر لگا دیں، اور نصف صدی سے زیادہ پورے انہماک و قوت کے ساتھ اصلاح و افادہ کے کام میں مشغول رہے۔

وفات

۵۹۷ھ میں شبِ جمعہ کو اس داعی الی اللہ نے انتقال کیا، بغداد میں کہرام مچ گیا، بازار بند ہو گئے جامع منصور میں نمازِ جنازہ ہوئی، یہ وسیع مسجد کثرتِ ازدحام سے تنگ اور ناکافی ثابت ہوئی، یہ بغداد کی تاریخ میں ایک یادگار دن تھا، ہر طرف غم کے آثار اور گریہ کی آوازیں بلند تھیں، لوگوں کو ان سے ایسا تعلق تھا کہ رمضان بھر لوگوں نے راتیں ان کی قبر کے پاس گزاریں اور قرآن مجید کے ختم کئے۔

نور الدین زنگی اور صلاح الدین ایوبی

صلیبی حملے، اور عالم اسلام کے لئے نیا خطرہ

ایک طرف مرکزِ اسلام میں پوری قوت سے تصنیفی و تعلیمی کام ہو رہا تھا، اور بعض عظیم شخصیتیں اصلاح و تربیت میں مشغول تھیں، دوسری طرف پورے عالم اسلام پر خطرہ کے بادل منڈلا رہے تھے، اور مسلمانوں کی ہستی اور نفسِ اسلام کا وجود زد میں تھا۔ مسیحی یورپ صدیوں سے اسلام سے ادھار کھائے بیٹھا تھا۔ مسلمان اس کی پوری مشرقی سلطنت پر قابض تھے، اور اس کے تمام مقدس مقامات اور خود مولدِ مسیح ان کے قبضہ اور تولیت میں تھا۔ یورپ کے اشتعال اور جذبۂ انتقام کے لئے یہ صورت حال بالکل کافی تھی، لیکن طاقت ور اسلامی سلطنتوں کی موجودگی اور ہمسایہ مسیحی سلطنت یونان کی مسلسل پیش قدمیوں کے سبب سے اس کو یہ حوصلہ نہیں ہوتا تھا کہ وہ شام و فلسطین یا کسی اسلامی ملک کی طرف نظر اٹھائے۔ سلجوقی سلطنت کے زوال اور اسلامی سلطنت کی شمالی سرحدوں کی کمزوری کی وجہ سے یورپ میں قسمت آزمائی کا خیال پیدا ہوا۔ اسی عرصہ میں اس کو راہب پطرس کی صورت میں ایک ایسا خطیب اور مذہبی واعظ مل گیا، جس نے ساری مسیحی دنیا میں اپنی آتش نوائیوں سے آگ لگا دی، اور ایک سرے سے دوسرے سرے تک مذہبی جنون کی ایک لہر پیدا کر دی، اس کے علاوہ وسیع و زرخیز اسلامی مملکت پر حملہ کرنے کے اور بھی متعدد سیاسی و معاشی اسباب و محرکات جمع ہو گئے جنھوں نے صلیبی حملوں میں دینی و دنیاوی کشش اور ترغیب پیدا کر دی۔[1]

[1] تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو "انسائیکلو پیڈیا برٹانیکا" ج ۶ مضمون (CRUSADES)

بہر حال ۴۹۰ھ میں صلیبیوں کے پہلے لشکر نے شام کی طرف کوچ کیا، دو سال کے عرصہ میں صلیبیوں کے لشکر نے الرہا (ایڈیسا) اور ولایتِ انطاکیہ کے بڑے شہروں، بہت سے قلعوں اور حلب پر قبضہ کرلیا، ۴۹۲ھ مطابق ۱۰۹۹ء میں صلیبی مبارزوں نے یروشلم (بیت المقدس) کو فتح کرلیا، اور چند سال کے اندر اندر ملک فلسطین کا بڑا حصہ یعنی ساحل شام پر انطرطوس، عکہ، طرابلس الشرق اور صیدا صلیبیوں کے تصرف میں آگیا، مشہور انگریز مورخ سٹینلے لین پول کے بقول صلیبی سپاہی ملک پر اس طرح گھسے جیسے کوئی پرانی لکڑی میں پچر ٹھونکے، تھوڑی دیر کو یہی معلوم ہونے لگا کہ درخت اسلام کے تنے کو چیر کر اس کی چھپٹیاں اڑا دیں گے، صلیبیوں نے داخلۂ بیت المقدس کے موقع پر فتح کے نشہ میں سرشار ہو کر مجبور مسلمانوں کے ساتھ جو سلوک کیا اس کا ذکر ایک ذمہ دار مسیحی مورخ ان الفاظ میں کرتا ہے:۔

"بیت المقدس میں فاتحانہ داخلہ پر صلیبی مجاہدین نے ایسا قتل عام مچایا کہ بیان کیا جاتا ہے، کہ ان صلیبیوں کے گھوڑے جو مسجد عمر سوار ہو کر گئے، گھٹنوں گھٹنوں خون کے چشمے میں ڈوبے ہوئے تھے، بچوں کی ٹانگیں پکڑ کر ان کو دیوار سے دے مارا گیا، یا ان کو چکر دے کر فصیل سے پھینک دیا گیا، یہودی کل کے کل اپنے ہیکل (معبد) میں زندہ جلا دیئے گئے۔"

"دوسرے دن اس سے بڑے پیمانہ پر ان لرزہ خیز مظالم کا جان بوجھ کر اعادہ کیا گیا، ٹینکرڈ نے تین سو قیدیوں کی جان کی حفاظت کی ضمانت کی تھی، وہ چیختا چلاتا رہا، اور ان سب کو باہر لا کر قتل کر دیا گیا، پھر ایک زبردست قتل عام شروع ہوا، مردوں عورتوں اور بچوں کے جسم ٹکڑے ٹکڑے اور ریزہ ریزہ کر دیئے گئے، ان کی لاشوں کے ٹکڑوں اور کٹے ہوئے اعضا کے ڈھیر لگے تھے، بالآخر یہ سفاکانہ قتل عام اختتام کو پہنچا، شہر کی خون آلودہ سڑکوں کو عرب قیدیوں سے دھلوایا گیا۔"[1]

بیت المقدس کی فتح اسلامی سلطنت کے ضعف اور زوال اور مسیحی دنیا کی بیداری اور

[1] انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا ج ۶ ص ۶۲۷ مضمون "CRUSADES"۔

اس کی نوخیز طاقت کی خبر دیتی تھی، اور عالم اسلام میں خطرہ کی گھنٹی تھی، شام و فلسطین میں مستقل چار عیسائی ریاستیں (قدس، انطاکیہ، طرابلس، اور یافا کی) قائم ہو چکی تھیں، جو مرکز اسلام (حجاز) کی آزادی اور حرمت کے لئے مستقل خطرہ تھیں اور مسیحیوں کے حوصلے اتنے بلند ہو چکے تھے، کہ ریجی نالڈ والی کرک نے مکہ معظمہ اور مدینہ منورہ پر چڑھائی کا ارادہ کیا،[1] اور روضۂ اطہر سے متعلق گستاخانہ اور اہانت آمیز کلمات اور ارادوں کا اظہار کیا، حقیقت یہ ہے کہ واقعۂ ارتداد کے بعد اسلام کی تاریخ میں اس سے زیادہ نازک وقت اور خطرہ کی گھڑی نہیں آئی، یہ دوسرا موقع تھا کہ اسلام کا وجود خطرہ میں تھا، اور عالم اسلام کو ایک فیصلہ کن جنگ کرنی ضروری تھی۔

چھٹی صدی ہجری کا ابتدائی زمانہ عالم اسلام میں بڑے انتشار و بدنظمی کا تھا، ملک شاہ سلجوقی کے جانشین باہم دست و گریباں تھے، خلفاء بنی عباس مدتوں پہلے ترکوں کو اپنی طاقت منتقل کر چکے تھے، عالم اسلام میں کوئی طاقتور سلطان اور کوئی ایسا قائد نہ تھا، جو تنظیمی صلاحیتیں رکھتا ہو اور جو عالم اسلام کی بچی کھچی طاقت کو ایک جھنڈے کے نیچے جمع کر کے شمال و مغرب سے بڑھتے ہوئے خطرہ کا مقابلہ کر سکے، اسٹینلے لین پول نے صحیح لکھا ہے کہ "یہ زمانہ التباس و تذبذب کا تھا کہ اتنی وسیع اور عظیم الشوکت (سلجوقی) سلطنت کو موت کے کرب میں ہاتھ پاؤں مارتے دیکھ کر ہر شخص پر تحیر کا عالم طاری تھا، یہ بیچ کا زمانہ اس وقت تک بدنظمی کا تھا جب تک کہ نئی طاقتیں پورے طور پر یکجہت ہو کر ایک ہی سمت میں رجوع نہ ہو جائیں، مختصر یہ کہ یہی وہ ٹھیک وقت تھا جب کہ یورپ والے فوج کشی کر کے اپنی کامیابی کو ممکن کرلیں"[2]

اتابک عماد الدین زنگی

لیکن عین اس کشمکش اور بڑھتی ہوئی مایوسی کے عالم میں عالم اسلام کے افق پر ایک نیا ستارا طلوع

[1] سلطان صلاح الدین ایوبی از (اسٹینلے لین پول) ص ۱۸۱ [2] ایضاً ص ۲۱

ہوا، عالم اسلام کو حسب معمول عین ضرورت کے موقع پر ایک نیا قائد اور ایک تازہ دم مجاہد مل گیا، اور جس گوشہ سے امید نہ تھی، وہاں سے ایک نئی طاقت ابھری، جس کا کسی کو خیال بھی نہ تھا۔

لین پول لکھتا ہے:۔

"مسلمانوں کے لئے ضروری ہوا کہ وہ جہاد کا اعلان کریں اور ایک ایسا سردار پیدا کریں جس کی دلیری اور ہمت اور جنگی قابلیت کا سکہ سب ماننے لگیں، ترکمانی سردار اور ان کے ماتحت والیان ملک ایک ایسی جوانمرد اور جنگجو دینداروں کی جماعت پیدا کریں جن کے سامنے صلیبیوں کو اپنے مظالم اور زیادتیوں کا جواب دینا پڑے اور اب یہ سردار عماد الدین زنگی کی ذات میں نمودار ہوا۔"[1]

عماد الدین سلجوقیوں کا پروردۂ نعمت تھا، وہ سلطان محمود سلجوقی کے شہزادوں کا اتالیق (اتابک) اور سلطان کی طرف سے موصل کا حاکم تھا، زنگی نے عراق و شام میں اپنی طاقت مستحکم و منظم کر کے الرہا (ایڈیسا) پر حملہ کیا جو عیسائیوں کی ریاست میں سب سے زیادہ مضبوط و مستحکم مقام تھا، اور اس کو بڑی فوجی اہمیت حاصل تھی، ۶ جمادی الاخری ۵۳۹ھ مطابق ۲۳ دسمبر ۱۱۴۴ء کو اس نے الرہا پر قبضہ کر لیا، عرب مورخین کے الفاظ میں یہ فتح الفتوح تھی، یہ شہر لاطینی سلطنت کا بڑا سہارا تھا، اس طرح فرات کی وادی صلیبیوں کے خطرہ سے محفوظ ہو گئی، اس فتح کے کچھ عرصہ بعد ۵۴۱ھ مطابق ۱۱۴۶ء میں وہ ایک غلام کے ہاتھ سے شہید ہو گیا، شہادت سے پہلے اس نے صلیبیوں کے خلاف جہاد کی شاندار ابتدا کر دی تھی، جس کو اس کے نامور فرزند الملک العادل نورالدین زنگی نے بہت آگے تک پہونچا دیا۔

الملک العادل نورالدین زنگی

نورالدین محمود اب سلطان شام تھا، اور تمام مسلمانوں کی طرف سے صلیبیوں کے اخراج اور بیت المقدس

---

[1] سلطان صلاح الدین ص ۲۹

کے بازیافت کے لئے اپنے کو مامور من اللہ سمجھتا تھا، اور اس خدمت عظیم کو اپنی سب سے بڑی عبادت اور تقرب الی اللہ کا ذریعہ جانتا تھا، اس نے اپنے حملوں سے تمام مسیحی ریاستوں پر دھاک بٹھا دی تھی، ۵۵۹ھ ۱۱۶۴ء میں وہ قلعہ حارم پر قابض ہوا، جو ایک مضبوط شمالی سرحدی قلعہ تھا، بادشاہ انطاکیہ نواب طرابلس مع دیگر مشہور و معروف نائٹوں کے گرفتار ہو گئے، اس معرکہ میں دس ہزار عیسائی قتل ہوئے اور بے شمار قید، اس قبضہ کے بعد ہی قلعۂ بانیاس فتح کیا[۱]، ادھر اس نے مصر فتح کر کے عیسائیوں کو دو طرف سے محصور کر لیا، لین پول لکھتا ہے:۔

"نور الدین سلطان شام کے سپہ سالار (صلاح الدین) کا رو ڈنیل پر قابض ہو جانا یہ معنی رکھتا تھا کہ یروشلم کی مسیحی سلطنت ایک چری ہوئی لکڑی کے بیچ میں آ گئی تھی، دونوں طرف سے وہ دب رہی تھی اور دونوں طرف جو چیز اسے بھینچ رہی تھی، وہ ایک ہی طاقت کے دو لشکر تھے، دمیاط اور اسکندریہ کی بندرگاہوں پر قابض ہو جانے سے مسلمانوں کا قبضہ ایک جہازی بیڑے پر بھی ہو گیا، اور انہوں نے مصر کے صلیبیوں کا تعلق یورپ سے منقطع کر دیا۔"[۲]

نور الدین نے تقریباً فلسطین کے پورے علاقہ کو صلیبیوں سے صاف کر دیا، لیکن اس کی سب سے بڑی آرزو اور سب سے مقدس خدمت بیت المقدس کی بازیابی تھی، لیکن یہ سعادت اس کے سپہ سالار سلطان صلاح الدین ایوبی کی قسمت میں تھی، جو خود نور الدین کے حسنات میں شمار کئے جانے کے قابل ہے، ۵۶۹ھ مطابق ۱۱۷۳ء کو چھپن ۵۶ برس کی عمر میں بعارضۂ خناق اس کا انتقال ہوا، بقول انگریز مورخ "سلطان نور الدین بادشاہ شام کے مرنے کی خبر مسلمانوں میں اس طرح پہنچی جیسے آسمان سے بجلی گرے۔"[۳]

نور الدین کے محامد و اوصاف

مسلمان مورخ سلطان نور الدین کے عدل، دیانت و تقوی، حسن انتظام، شرافت نفس، محامد اخلاق

---

[۱] الکامل (ابن اثیر) جلد ۱۱ ص ۱۲۴ [۲] سلطان صلاح الدین ص ۸۹ [۳] ایضاً ص ۱۱۵

اور جذبۂ جہاد کی تعریف میں رطب اللسان ہیں، اور وہ اپنے نام کی طرح ان سب کا "ممدوح" و "محمود" ہے۔

ابن جوزی جو سلطان کے معاصر ہیں اپنی مشہور تاریخ المنتظم میں لکھتے ہیں :-

جاهد الثغور وانتزع من ايدى الكفار نيفاً وخمسين مدينة، وكانت سيرته اصلح من كثير من الولاة والطرق في ايامه آمنة والمحامد له كثيرة وكان يتدين بطاعة الخلافة وترك المكوس قبل موته وكان يميل الى التواضع ومحبة العلماء واهل الدين۔[1]

نورالدین نے سرحدوں پر جہاد کیا اور کفار کے قبضہ سے کچھ اوپر پچاس شہر آزاد کئے، ان کی زندگی اکثر سلاطین و حکام سے بہتر تھی، راستے محفوظ تھے، ان کی تعریف کی باتیں بہت ہیں، وہ خلافت بغداد کی ماتحتی و اطاعت کا اپنے کو پابند سمجھتے تھے، انتقال سے پہلے ناجائز محاصل اور ٹیکس معاف کر دیئے طبیعت میں سادگی اور تواضع تھی، اور علماء و اہل دین سے محبت کرتے تھے۔

ابن خلکان جو اپنی مورخانہ احتیاط، جچے تلے الفاظ اور نپی تلی تعریف میں مشہور ہیں، لکھتے ہیں :-

وكان عادلاً زاهداً عابداً ورعاً متمسكاً بالشريعة، مائلاً الى اهل الخير مجاهداً في سبيل الله تعالى كثير الصدقات، بنى المدارس بجميع بلاد الشام الكبار وله من المناقب والمآثر والمفاخر ما يستغرق الوصف۔[2]

وہ ایک منصف، زاہد، عابد، متقی، متبع شریعت سلطان تھے، اہل خیر کی طرف بڑا میلان رکھتے تھے، اور جہاد فی سبیل اللہ کا خاص اہتمام تھا کثرت سے صدقات و خیرات کرتے، شام کے تمام بڑے بڑے شہروں میں مدارس تعمیر کئے، ان کے مناقب یادگاروں اور کارناموں کا احاطہ مشکل ہے۔

تاریخ الکامل کے نامور مصنف ابن الاثیر جزری نے ان کے متعلق یہاں تک لکھا ہے کہ :-

---

[1] المنتظم ج ۱۰ صـ ۲۴۸-۲۴۹   [2] ابن خلکان "محمود نورالدین زنگی" ج ۴ صـ ۲۷۲

وقد طالعت سير الملوك المتقدمين فلم ار فيها بعد الخلفاء الراشدين وعمر بن عبد العزيز احسن من سيرة ولا اكثر تحريا منه العدل۔[1]

میں نے گذشتہ سلاطین کی زندگی اور حالات کا مطالعہ کیا ہے خلفاء راشدین اور عمر بن عبدالعزیز رحمۃ کے بعد نورالدین سے بہتر سیرت اور ان سے زیادہ عادل سلطان میری نظر سے نہیں گذرا۔

سلطان نورالدین کی وفات کے وقت ابن الاثیر کی عمر ۱۴ سال کی تھی، اس لئے ان کی روایت اور شہادت خاص وقعت رکھتی ہے، وہ سلطان مرحوم کی سیرت و اخلاق بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:۔

"وہ صرف اپنی اس جائداد کی آمدنی سے کھاتے پہنتے تھے، جو انھوں نے مال غنیمت میں اپنے حصہ کو فروخت کر کے خریدی تھی، ان کی اہلیہ نے ایک مرتبہ تنگی کی شکایت کی تو انھوں نے اپنی تین دوکانیں خرچ کے لئے دے دیں، جو حمص میں ان کی ملکیت تھیں، اور جن کی سالانہ آمدنی بیس[2] دینار کے قریب تھی، جب بیوی نے اس کو کم سمجھا تو انھوں نے کہا کہ اس کے علاوہ میرے پاس کچھ نہیں ہے، اور جو کچھ تم میرے پاس دیکھتی ہو وہ سب مسلمانوں کا ہے، میں محض خزانچی ہوں، میں ... اس امانت میں خیانت کر کے تمہاری خاطر جہنم میں جانا گوارا نہیں کر سکتا۔

وہ رات کو بڑی عبادت کرتے، ان کے اوراد و اذکار مقرر تھے، حنفی فقہ کے عالم تھے، لیکن تعصب سے بری تھے، حدیث کا درس لیا، اور ثواب کی نیت سے اس کی روایت کی، اور اجازت دی۔

عدل و انصاف کا یہ حال تھا کہ اپنی وسیع سلطنت میں انھوں نے کوئی محصول اور چنگی باقی نہیں رکھی، مصر و شام، جزیرۂ موصل سب جگہ اس کو موقوف کر دیا، شریعت کا بڑا ادب کرتے تھے، اور اس کے احکام کی تعمیل کرتے، ایک شخص نے ان کو عدالت میں طلب کیا، وہ حاضر ہو گئے، اور قاضی صاحب کو کہلا بھیجا کہ میں عدالت میں حاضر ہو رہا ہوں، میرے ساتھ کوئی امتیازی سلوک نہ کیا جائے، مقدمہ میں ان کو کامیابی

۱؎ الکامل ج ۹ ص ۱۶۳

ہوئی تو انھوں نے اپنا حق معاف کر دیا، اور کہا کہ میرا پہلے سے یہی ارادہ تھا لیکن مجھے اندیشہ تھا کہ شاید عدالت میں حاضر نہ ہونے کا سبب میرا تکبر ہو اس لئے میں حاضر ہو گیا، اور میں اپنا حق معاف کرتا ہوں، انھوں نے دار العدل کی تعمیر کی تھی، جہاں وہ قاضی کے ساتھ بیٹھ کر مظلوم کا انصاف کرتے، خواہ وہ یہودی ہوتا، اور ظالم کو سزا دیتے، خواہ وہ ان کا فرزند ہوتا یا بڑے سے بڑا افسر اور حاکم۔

شجاعت ان پر ختم تھی، وہ جنگ میں دو کمانیں اور دو ترکش ساتھ رکھتے تھے، ایک صاحب نے ان سے کہا کہ آپ کو اللہ کا واسطہ آپ اپنی زندگی کو خطرہ میں ڈال کر اسلام کو مصیبت میں مبتلا نہ کریں، انھوں نے جواب دیا کہ محمود کیا چیز ہے کہ اس کے متعلق یہ بات کہی جائے، مجھ سے پہلے ملک اور اسلام کی کس نے حفاظت کی؟ وہ معبود برحق ہے، لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ۔

علماء و اہل دین کی تعظیم کرتے تھے، ان کے لئے کھڑے ہو جاتے، اپنے پاس بٹھاتے، بے تکلفی سے باتیں کرتے، کسی بات سے انکار نہ کرتے، اپنے قلم سے ان کو خط لکھتے، لیکن اس تواضع و خاکساری کے باوجود بڑے رعب و داب کے آدمی تھے، لوگوں پر اس کا اثر پڑتا تھا، حقیقت یہ ہے کہ ان کے مناقب و محامد کی یہ کتاب متحمل نہیں، اس کے لئے دفتر درکار ہے۔[1]

شوق جہاد اور ایمان و یقین

نور الدین کی تمام تر توجہ اور دلچسپی جہاد اور عیسائیوں کے مقابلہ سے تھی، اس بارہ میں اس کا عزم اعتماد و توکل اور ایمان و یقین بہت بڑھا ہوا تھا۔

۵۵۸ھ میں نور الدین کو حصن الاکراد کے معرکہ میں (جو بقیعہ کے معرکہ کے نام سے مشہور ہے) عیسائیوں کے اچانک حملہ کر دینے کی وجہ سے شکست ہوئی،[2] نور الدین حمص کے قریب دشمن سے چند میل کے فاصلہ پر مقیم تھے،

---

[1] الکامل ج ۱۱ ص ۱۶۳-۱۶۲ [2] تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو الکامل ج ۱۱ ص ۱۱۹۔

بعض خیر خواہوں نے کہا کہ بادشاہ کا، نجیابِ دشمن کے اتنے قریب قیام کرنا، مناسب نہیں نورالدین نے ان کو خاموش کیا اور کہا کہ اگر ہزار سوار بھی میرے پاس ہوں تو مجھے دشمن کی پرواہ نہیں، خدا کی قسم میں جب تک اپنا اور اسلام کا انتقام نہ لے لوں گا کسی چھت کے نیچے نہ آؤں گا، نورالدین نے بڑی دریا دلی سے اہلِ لشکر کو عطایا اور رقوم کی تقسیم کی بعض لوگوں نے ان سے کہا بھی کہ فقہاء، فقراء اور صوفیہ و قراء کے لئے جو وظائف اور رقوم خزانہ شاہی سے مقرر ہیں، ان سے اس موقع پر کام لیا جائے، نورالدین نے غضبناک ہو کر جواب دیا کہ مجھے تو نصرتِ الٰہی کی امید انہی فقراء و ضعفاء کی دعا اور رضا سے ہے، حدیث میں آتا ہے کہ "اللہ کی طرف سے رزق اور مدد کمزور بندوں کی بدولت ہوتی ہے" میں کس طرح ایسے لوگوں کی مدد بند کر دوں جو ایسے وقت میں میری طرف سے جنگ کرتے ہیں جب میں اپنے بستر پر سوتا ہوتا ہوں، اور ان کے تیر خطا نہیں جاتے، درانحالیکہ جن کا تم تذکرہ کرتے ہو، وہ صرف اس وقت جنگ کرتے ہیں جب مجھے دیکھتے ہیں اور ان کے تیر کبھی خطا کر جاتے ہیں کبھی نشانہ پر لگتے ہیں، ان غریبوں کا تو بیت المال میں حق بھی ہے، میں ان کا حق لے کر دوسروں کو کیوں کر دے دوں[1]"

نورالدین نے عیسائیوں سے اپنی شکست کا بدلہ لینے کی پوری تیاری کی لشکر کو انعامات و تقسیمات سے نہال کر دیا، سرحدی مقامات اور اسلامی ریاستوں کے امراء و حکام کو پراثر خطوط لکھے، اور ان کو جہاد فی سبیل اللہ اور شرکت و رفاقت کی ترغیب دی، ان مقامات کے زہاد و عباد اور صلحاء و فقراء کو بھی خطوط لکھے، جن میں فرنگیوں کی زیادتیوں اور مظالم کا تذکرہ کیا، اور ان سے دعا کی درخواست کی، اور اس کی خواہش کی کہ وہ مسلمانوں کو جہاد پر آمادہ کریں، چنانچہ ان حضرات نے رو رو کر لوگوں کو یہ خطوط پڑھ کر سنائے، اور سلطان کے لئے دعا کی، لوگوں میں جوشِ جہاد کی ایک لہر پیدا ہو گئی، والیانِ ملک اپنے اپنے لشکر لے کر آئے، ادھر عیسائیوں نے بھی اپنی پوری طاقت اور ہر طرف کی افواج مقابلہ کے لئے جمع کر دیں لیکن

---

[1] الکامل ج ۱۱ ص ۱۱۹

سلطان نے اپنی نذر پوری کی، اور عیسائیوں کی متحدہ طاقت پر فتح حاصل کر کے حارم پر قبضہ کر لیا۔[۱]

نورالدین کے ایمان و یقین کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ قلعہ بانیاس کے محاصرہ میں اس کے بھائی نصرۃ الدین امیر امیران کی ایک آنکھ جاتی رہی، نورالدین نے دیکھا تو بھائی سے کہا کہ اگر تم کو وہ اجر و ثواب نظر آ جائے جو اللہ تعالیٰ نے تمہارے لئے رکھا ہے، تو تم کو تمنا ہو کہ دوسری آنکھ بھی راہ خدا میں کام آ جائے۔[۲]

سلطان صلاح الدین ایوبیؒ[۳]

صلاح الدین ایوبی کی ذات آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کا مستقل معجزہ اور اسلام کی صداقت و ابدیت کی روشن دلیل ہے۔

ایک متوسط درجہ کے کرد شریف زادہ اور خاندانی سپاہی کی حیثیت سے ان کا نشو و نما ہوا[۴]، مصر کی فتح اور صلیبیوں کے مقابلہ میں میدان میں آنے سے پہلے کوئی اندازہ نہیں کر سکتا تھا کہ یہ کرد نوجوان

---

[۱] الکامل ج ۱۱ ص ۱۲۲، ۱۲۳ [۲] ایضاً ص ۱۲۳ [۳] سلطان صلاح الدین ایوبی اس لئے کہلاتے ہیں کہ ان کے والد کا نام ایوب تھا، اسی نسبت سے سارا خاندان ایوبی کہلاتا ہے، یہ غلط فہمی نہ ہو کہ ان کا کوئی تعلق ابو ایوب انصاری سے ہے، سلطان اور ان کا پورا خاندان نسلاً کرد ہے، یہ قوم اب بھی عراق، شام، ترکی اور ایران میں پائی جاتی ہے۔

[۴] ان کے والدین اور اہل خاندان مشرقی آذربائجان کے گاؤں "دوین" کے رہنے والے تھے، ان کا تعلق قبیلہ "ہذانیہ" کی ایک شاخ "روادیہ" سے تھا جو کردوں کا ایک بہت بڑا قبیلہ ہے، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ان کے دادا شادی اپنے دونوں لڑکوں ایوب نجم الدین اور شیرکوہ اسدالدین کو لے کر بغداد منتقل ہو گئے تھے، اس کے بعد تکریت میں سکونت پذیر ہوئے اور وہیں شادی کا انتقال ہوا، کچھ دن کے بعد یہ دونوں لڑکے مجاہد الدین بہروز کوتوال شہر کے عملہ میں داخل ہو گئے، جو سلطان مسعود بن غیاث الدین محمد بن ملک شاہ سلجوقی کی طرف سے مامور کیا گیا تھا، نجم الدین ایوب اس کے بعد عماد الدین زنگی سے متعلق ہو گئے، اور قلعہ "بعلبک" وغیرہ کے محافظ بنا دیئے گئے۔ (صلاح الدین ایوبی از محمد فرید ابو حدید ص ۶۱، ۶۲)

بیت المقدس کا فاتح اور عالمِ اسلام کا محافظ ثابت ہوگا، اس کی قسمت میں وہ سعادت لکھی ہے جو بڑے بڑے عالی نسب شرفاء اور صلحاء کے لئے قابلِ رشک ہے، اور تاریخ میں وہ اتنا بڑا کارنامہ انجام دے گا جس سے روحِ مبارک تک کو شادمانی حاصل ہوگی۔

لین پول لکھتا ہے کہ "بجائے اس کے کہ صلاح الدین سے کوئی علامت ایسی ظاہر ہوتی جس سے معلوم ہوتا کہ وہ آئندہ کوئی بڑا آدمی ہونے والا ہے، وہ ایک روشن مثال اس خاموش اور پُرامن نیکی کی بنا رہا، جو شریف طبیعتوں کو تمام اخلاقی کمزوریوں سے دور رکھتی ہے۔"[1]

لیکن جب اللہ تعالیٰ کو ان سے کام لینا منظور ہوا تو اس کا غیبی سامان کیا گیا، ان کو ان کے ولی نعمت نور الدین نے سخت اصرار و حکم سے مصر بھیجا، قاضی بہاء الدین ابن شداد سلطان کے معتمد خاص لکھتے ہیں کہ "سلطان نے مجھ سے خود بیان کیا کہ میں بڑی ناگواری اور مجبوری سے مصر آیا، میرا مصر آنا، بالکل میری مرضی سے نہیں ہوا، میرا معاملہ بالکل وہی ہے جس کو قرآن مجید میں بیان کیا گیا ہے "وَعَسٰی اَنْ تَکْرَهُوْا شَیْئًا وَّهُوَ خَیْرٌ لَّکُمْ"[2]

زندگی میں تبدیلی

مصر پہونچ کر جب صلاح الدین کے لئے میدان بالکل صاف ہوگیا، اور مصر کی زمامِ مملکت ان کے ہاتھ میں آگئی تو ان کی زندگی یکسر بدل گئی، یہ خیال دل میں جم گیا کہ اللہ تعالیٰ کو ان سے کوئی بڑا کام لینا ہے، اور اس کام کے ساتھ عیش و راحت کا کوئی جوڑ نہیں۔

قاضی بہاء الدین ابن شداد لکھتے ہیں کہ "حکومت (مصر) کی باگ ڈور ہاتھ میں آجانے کے بعد دنیا ان کی نظر میں ہیچ ہوگئی، شکر گزاری کا جذبہ ان کے دل میں موجزن ہوا، شراب سے توبہ کی، عیش و تفریحات سے منھ موڑ لیا، اور ایک سنجیدہ اور جفاکش زندگی اختیار کی، اور اس میں دن بدن ترقی ہی ہوتی گئی۔"[3]

---

[1] سلطان صلاح الدین ص۹۳ [2] النوادر السلطانیہ ص۳۱ [3] ایضاً والمحاسن الیوسفیہ ص۳۲، ۳۳

لین پول بھی یہی لکھتا ہے:۔

"اب جہاں تک صلاح الدین کا اپنی ذات سے تعلق تھا، اس نے اپنی زندگی کے قواعد سخت کر دیئے۔ متقی اور پرہیزگار تو وہ ہمیشہ کا تھا، مگر اب ان میں اور سختی اختیار کی، دنیا کے عیش و آرام اور لذتوں کا خیال بالکل ترک کر دیا، اور اپنے اعمال پر بھی سخت پابندیاں عائد کیں، اور اپنے ساتھیوں کے حق میں خود ایک مثال بنا۔ اس نے اپنی تمام بلیغ کوششیں اس بات میں صرف کیں کہ ایک ایسی اسلامی سلطنت قائم کرے جس میں کہ کفار کو ملک سے خارج کرنے کی پوری طاقت ہو، چنانچہ ایک موقع پر اس نے کہا

"جب خدا نے مجھے مصر دیا تو میں سمجھا کہ فلسطین بھی مجھے اللہ کو دینا منظور ہے۔"

اس وقت سے صلاح الدین کی زندگی کا مقصد آخر عمر تک اسلام کی نصرت اور حمایت رہا، اور اس نے عہد کر لیا کہ کفار پر جہاد کرے گا۔"[1]

جہاد کا عشق

سلطان کو جہاد سے عشق تھا، جہاد اس کی سب سے بڑی عبادت، سب سے بڑی لذت عیش اور اس کی روح کی غذا تھی۔

قاضی ابن شداد کہتے ہیں کہ:۔

"جہاد کی محبت اور جہاد کا عشق ان کے رگ و ریشہ میں سما گیا تھا، اور ان کے قلب و دماغ پر چھا گیا تھا، یہی ان کا موضوع گفتگو تھا، اسی کا ساز و سامان تیار کرتے رہتے تھے، اور اس کے اسباب و وسائل پر غور کرتے، اسی مطلب کے آدمیوں کی ان کی تلاش رہتی، اسی کا ذکر کرنے والے اور اسی کی ترغیب دینے والے کی طرف وہ توجہ کرتے، اسی جہاد فی سبیل اللہ کی خاطر انھوں نے اپنی اولاد اور اہل خاندان اور وطن و

---

[1] سلطان صلاح الدین صہ ۸۶

مسکن اور تمام ملک کو خیرباد کہا اور سب کی مفارقت گوارا کی اور ایک خیمہ کی زندگی پر قناعت کی، جس کو ہوائیں ہلا سکتی تھیں، کسی شخص کو اگر ان کا قرب حاصل کرنا ہوتا تو وہ ان کو جہاد کی ترغیب دیتا، (اور اس طرح ان کی نظر میں وقعت حاصل کر لیتا) قسم کھائی جا سکتی ہے کہ جہاد کا سلسلہ شروع کرنے کے بعد انھوں نے ایک پیسہ بھی جہاد اور مجاہدین کی امداد و اعانت کے علاوہ کسی مصرف میں خرچ نہیں کیا۔"[1]

سلطان کی اس عاشقانہ کیفیت اور دردمندی کی تصویر ابن شدّاد نے ان الفاظ میں کھینچی ہے:۔

"میدانِ جنگ میں سلطان کی کیفیت ایک ایسی غمزدہ ماں کی سی ہوتی تھی جس نے اپنے اکلوتے بچہ کا داغ اٹھایا ہے، وہ ایک صف سے دوسری صف تک گھوڑے پر دوڑتے پھرتے، اور لوگوں کو جہاد کی ترغیب دیتے خود ساری فوج میں گشت کرتے اور پکارتے پھرتے "یاللاسلام" اسلام کی مدد کرو! آنکھوں سے آنسو جاری ہوتے۔"[2]

عکا کے معرکہ میں ان کی کیفیت یہ تھی:۔

"سارے دن سلطان نے ایک دانہ منھ میں نہیں رکھا، صرف طبیب کے مشورہ اور اصرار سے ایک مشروب کا استعمال کیا۔[3] شاہی طبیب نے مجھے بتلایا کہ ایک مرتبہ جمعہ سے اتوار تک سلطان نے صرف چند لقمے کھائے، ان کی طبیعت میدانِ جنگ کے علاوہ کسی اور طرف متوجہ ہی نہیں تھی۔"[4]

حطین کی فیصلہ کن جنگ

آخر مختلف جنگی کارروائیوں اور مقابلوں کے بعد وہ معرکہ پیش آیا، جو تاریخ میں فیصلہ کن حیثیت رکھتا ہے، اور جس نے فلسطین کی مسیحی سلطنت کا خاتمہ اور صلیبیوں کی قسمت کا فیصلہ کر دیا، یہ حطین کی جنگ تھی، جو سنیچر کے دن ۲۴ ربیع الآخر ۵۸۳ھ[5] (۱۱۸۷ء) کو پیش آئی، اور جس میں مسلمانوں کو فتح مبین حاصل ہوئی۔

لین پول اس میدانِ جنگ کی تصویر کھینچتے ہوئے لکھتا ہے:۔

---

[1] النوادر السلطانیہ ص۱۰ [2] ایضاً ص۱۵۵ [3] ایضاً [4] ایضاً ص۹ [5] ۴ جولائی ۱۱۸۷ء۔

"مسیحی لشکر کے چیدہ اور منتخب جوانمرد قید کر لئے گئے، گائی بادشاہ یروشلم اور اس کا بھائی جاٹیلون (حنین) کا ریجی نالڈ تینن کا ہمفری طبقات داویہ اور سبیطار کے دونوں مقدم اور بڑے بڑے عیسائی شرفا گرفتار کر لئے گئے...... باقی فلسطین کے تمام عیسائی بہادر اور شہسوار مسلمانوں کے پہرے میں تھے، مسیحی لشکر کے معمولی سپاہی پیدل اور سوار جو زندہ بچے تھے، سب مسلمانوں کے اسیر ہو گئے تھے، ایک ایک مسلمان سپاہی تیس تیس عیسائیوں کو جنھیں خود اس نے گرفتار کیا تھا، خیمے کی رسّی میں باندھے جاتا دیکھا گیا، ٹوٹی ہوئی صلیبوں اور کٹے ہوئے ہاتھ پاؤں میں مردوں کے ڈھیر اس طرح لگے تھے، جیسے پتھر پر پتھر پڑے ہوں، اور کٹے ہوئے سر زمین پر اس طرح بکھرے پڑے تھے جیسے خربوزوں کے کھیت میں خربوزے پڑے نظر آئیں[1]...... مدتوں تک جنگ کا یہ میدان جس میں یہ خونی لڑائی ہوئی تھی، اور جہاں بیان کیا جاتا تھا کہ تیس ہزار آدمی مارے گئے تھے، مشہور رہا، ایک سال کے بعد سپید سپید ہڈیوں کے تودے اور ڈھیر دور سے لوگوں کو نظر آتے تھے، اور جانوروں کے کھانے کے بعد جو ٹکڑے لاشوں کے بچے تھے، وہ بھی میدان میں جا بجا پڑے دکھائی دیتے تھے۔"[2]

سلطان کی دینی حمیت

اس فتح کے ساتھ یہ واقعہ بھی تاریخ میں یادگار رہے گا جس سے سلطان کی دینی حمیت اور اس کی قوتِ ایمانی کا اندازہ ہوتا ہے، مناسب ہے کہ یہ واقعہ بھی ہم انگریز مورخ کی زبان سے سنیں۔

"سلطان صلاح الدین نے اپنا خیمہ لڑائی کے میدان میں نصب کرایا جب خیمہ نصب ہو گیا، تو حکم دیا کہ قیدی سامنے حاضر کئے جائیں، بادشاہ گائی اور ریجی نالڈ جاٹیلون (حنین) دونوں اندر لائے گئے، سلطان نے بادشاہ یروشلم کو اپنے پہلو میں بٹھایا، اور اُسے پیاسا دیکھ کر برف میں سرد کئے ہوئے پانی کا

---

[1] سلطان صلاح الدین ص ۱۸۷، ۱۸۸ [2] ایضاً ۱۸۹۔

کٹورا دیا، گائی نے پانی پیا، اور پانی کا کٹورا والی کرک ریجی نالڈ کو دیا، سلطان یہ دیکھ کر ناخوش ہوا اور ترجمان سے کہا کہ بادشاہ سے کہو کہ میں نے اس شخص کو پانی نہیں دیا ہے، بادشاہ گائی نے دیا ہے، روٹی اور نمک جسے دیتے ہیں، وہ محفوظ سمجھا جاتا ہے، مگر یہ آدمی اس قسم کی حفاظت میں بھی میرے انتقام سے نہیں بچ سکتا، صلاح الدین اتنا کہہ کر کھڑا ہوا، اور ریجی نالڈ کے سامنے آیا، ریجی نالڈ جب خیمہ میں داخل ہوا تھا، برابر کھڑا رہا تھا، سلطان نے اس سے کہا سن ابھی میں نے تجھے قتل کرنے کی قسم دو[۲] مرتبہ کھائی تھی، ایک[۱] مرتبہ تو اس وقت جب کہ تو نے مکہ اور مدینہ کے مقدس شہروں پر حملہ کرنا چاہا تھا، دوسری[۲] مرتبہ اس وقت جب کہ تو نے دھوکے اور دغابازی سے حاجیوں کے قافلہ پر حملہ کیا تھا،[ل] دیکھ میں اب تیری بے ادبی اور توہین کا انتقام لیتا ہوں، اتنا کہہ کر صلاح الدین نے تلوار نکالی اور جیسا کہ عہد کیا تھا، ریجی نالڈ کو اپنے ہاتھ سے قتل کیا، جو کچھ رمق باقی تھی اسے پہرے والوں نے آکر ختم کیا۔

بادشاہ گائی اس قتل کو دیکھ کر لرز گیا، اور سمجھا کہ اب اس کی باری آئے گی، صلاح الدین نے اس کا اطمینان کیا، اور کہا کہ بادشاہوں کا دستور نہیں کہ وہ بادشاہ کو قتل کریں، اس شخص نے بار بار عہد شکنیاں کی تھیں، اب جو کچھ گذر گیا گذر گیا۔"[۲]

ابن شداد نے لکھا ہے کہ سلطان نے ریجی نالڈ کو طلب کیا، اور کہا کہ "ھاانا انتصر لمحمد علیہ الصلوٰۃ والسلام"(لو میں محمد صلے اللہ علیہ وسلم کا انتقام لیتا ہوں) ابن شداد نے یہ بھی لکھا ہے کہ سلطان نے اس کو اسلام کی دعوت دی، مگر اس نے قبول نہیں کی۔[۳]

---

[۱] قاضی ابن شداد کی روایت میں اتنا اضافہ ہے کہ جب ان بیکس حجاج نے اس سے انسانیت و شرافت کی درخواست کی تو اس نے گستاخانہ کہا کہ "اپنے محمد سے کہو کہ تمہیں رہائی دیں" یہ فقرہ صلاح الدین کو پہونچا، اور اس نے منت مانی کہ اگر یہ بے ادب اس کے ہاتھ آئے گا تو اپنے ہاتھ سے اس کو قتل کروں گا ص۱۲۷ [۲] سلطان صلاح الدین ص۱۸۸ [۳] النوادر السلطانیہ ص۶۴

فتح بیت المقدس

حطین کی فتح کے بعد وہ مبارک موقع جلد آگیا، جس کی سلطان کو بے حد آرزو تھی یعنی بیت المقدس کی فتح، قاضی ابن شداد نے لکھا ہے کہ۔

"سلطان کو بیت المقدس کی ایسی فکر تھی، اور اس کے دل پر ایسا بار تھا کہ پہاڑ اس کے متحمل نہیں تھے۔"[1]

اسی سال ۵۸۳ھ ۱۱۸۷ء ۲۷ رجب کو سلطان بیت المقدس میں داخل ہوئے اور پورے ۹۰ برس کے بعد یہ پہلا قبلہ جہاں حضور صلے اللہ علیہ وسلم نے معراج کی شب میں انبیاء علیہم السلام کی امامت کی تھی، اسلام کی تولیت میں آیا، یہ بھی حسن اتفاق ہے کہ سلطان کے داخلہ کی تاریخ بھی وہی تھی، جس تاریخ کو آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کو معراج ہوئی تھی۔

قاضی ابن شداد لکھتے ہیں:-

"یہ عظیم الشان فتح تھی، اس مبارک موقع پر اہل علم کی بہت بڑی جماعت اور اہل حرفہ اور اہلِ طرق کی کثیر تعداد جمع تھی، اس لئے کہ لوگوں کو جب ساحلی مقامات کی فتح اور سلطان کے ارادہ کی اطلاع ملی تو مصر و شام سے علماء نے بیت المقدس کا رخ کیا، اور کوئی روشناس اور معروف آدمی پیچھے نہیں رہا ہر طرف دعا، تہلیل و تکبیر کا شور بلند تھا، بیت المقدس میں (۹۰ برس کے بعد) جمعہ کی نماز ہوئی، قبۂ صخرہ پر جو صلیب نصب تھی، وہ اتار دی گئی، ایک عجیب منظر تھا، اور اسلام کی فتح مندی اور اللہ تعالےٰ کی مدد کھلی آنکھوں نظر آرہی تھی۔"[2]

نورالدین زنگی مرحوم نے بیت المقدس کے لئے بڑے اہتمام اور بڑے صرف سے منبر بنوایا تھا کہ جب اللہ تعالےٰ بیت المقدس واپس دلائے گا، تو یہ منبر نصب کیا جائے گا، صلاح الدین نے حلب سے وہ منبر طلب کیا اور اس کو مسجد اقصیٰ میں نصب کیا۔[3]

---

[1] ایضاً ص۲۱۳ [2] ایضاً ص۲۶۶ [3] تاریخ ابی الفداء اسماعیل ج ۳ ص۷۲

اسلامی اخلاق کا مظاہرہ

صلاح الدین نے اس موقع پر جس عالی ظرفی، دریا دلی اور اسلامی اخلاق کا مظاہرہ کیا، وہ عیسائی مورخ کی زبان سے سننے کے قابل ہے۔

"صلاح الدین نے کبھی پہلے اپنے تئیں ایسا عالی ظرف اور باہمت نائٹ ثابت نہیں کیا تھا جیسا کہ اس موقع پر کیا جب یروشلم مسلمانوں کے حوالہ کیا جارہا تھا، اس کی سپاہ اور معزز افسران ذمہ دار نے جو اس کے تحت تھے، شہر کے گلی کوچوں میں انتظام قائم رکھا، یہ سپاہی اور افسر ہر قسم کی ظلم و زیادتی کو روکتے تھے اور اس کا نتیجہ تھا کہ اگر کوئی واقعہ جس میں کسی عیسائی کو گزند پہنچا ہو، پیش نہ آیا، شہر کے باہر جانے کے کل راستوں پر سلطان کا پہرہ تھا، اور ایک نہایت معتبر امیر باب داؤد پر متعین تھا، کہ ہر شہر والے کو جو زرِ فدیہ ادا کر چکا ہے، باہر جانے دے۔"

پھر سلطان کے بھائی العادل اور بطریق اور بالیان کے ہزار ہزار غلام آزاد کرنے کے تذکرہ کرنے کے بعد لکھتا ہے

"اب صلاح الدین نے اپنے امیروں سے کہا کہ میرے بھائی اپنی طرف سے اور بالیان اور بطریق نے اپنی طرف سے خیرات کی، اب میں اپنی طرف سے بھی خیرات کرتا ہوں اور یہ کہہ کر اس نے اپنی سپاہ کو حکم دیا کہ شہر کے تمام گلی کوچوں میں منادی کردیں کہ تمام بوڑھے آدمی جن کے پاس زرِ فدیہ ادا کرنے کو نہیں ہے آزاد کئے جاتے ہیں کہ جہاں چاہیں وہ جائیں اور یہ سب باب البعزر سے نکلنے شروع ہوئے اور سورج نکلنے سے سورج ڈوبنے تک ان کی صفیں شہر سے نکلتی رہیں، یہ خیر و خیرات تھی، جو صلاح الدین نے بے شمار مفلسوں اور غریبوں کے ساتھ کی۔"

غرض اس طرح سلطان صلاح الدین نے اس مغلوب و مفتوح شہر پر اپنا احسان و کرم کیا، جب سلطان کے ان احسانات پر غور کرتے ہیں تو وہ وحشیانہ حرکتیں یاد آتی ہیں جو شروع کے صلیبیوں نے ۱۰۹۹ء میں یروشلم کی فتح پر کی تھیں جب گوڈ فرے اور ٹنکریڈ یروشلم کے کوچہ و بازار میں گذرے تھے تو وہاں مرے پڑے اور جاں طلب زخمی لوٹتے تھے جب کہ

بے گناہ اور لاچار مسلمانوں کو ان صلیبیوں نے سخت اذیتیں دے کر مارا تھا، اور زندہ آدمیوں کو جلایا تھا، جہاں قدس کی چھتوں اور بُرجوں پر جو مسلمان پناہ لینے چڑھے تھے، وہیں ان صلیبیوں نے انھیں اپنے نیزوں سے چھید کر گرایا تھا، اور جہاں ان کے اس قتلِ عام نے مسیحی دنیا کی عزت کو بٹہ لگایا تھا جبکہ اس مقدس شہر کو ظلم و بدنامی کے رنگ میں انھوں نے رنگا یا تھا، جہاں رحم و محبت کا وعظ جنابِ مسیح نے سنایا تھا، اور فرمایا تھا کہ خیر و برکت والے ہیں، وہ لوگ جو رحم کرتے ہیں، ان پر خدا کی برکتیں نازل رہتی ہیں۔

جس وقت یہ عیسائی اس پاک و مقدس شہر کو مسلمانوں کا خون کر کے اس کو مذبح بنا رہے تھے، اس وقت وہ اُن کلام کو بھول گئے تھے، اور ان بے رحم عیسائیوں کی خوش قسمتی تھی کہ سلطان صلاح الدین کے ہاتھوں ان پر رحم و کرم ہو رہا تھا۔

صفاتِ خداوندی میں سب سے بڑھ کر صفت رحم ہے، رحم عدل کا تاج اور اس کا جلال ہے، جہاں عدل اپنے اختیار اور استحقاق سے کسی کو جان سے مار سکتا ہے، رحم جان بچا سکتا ہے۔

اگر سلطان صلاح الدین کے کاموں میں صرف یہی کام دنیا کو معلوم ہوتا کہ اس نے کس طرح یروشلم کو بازیاب کیا، تو صرف یہی کارنامہ اس بات کے ثابت کرنے کے لئے کافی تھا کہ وہ نہ صرف اپنے زمانہ کا بلکہ تمام زمانوں کا سب سے بڑا عالی حوصلہ انسان اور جلالت اور شہامت میں یکتا، اور بے مثل شخص تھا۔[1]

صلیبی سیلاب

بیت المقدس کی فتح اور حطین کی ذلت آمیز شکست سے یورپ میں غیظ و غضب کی آگ پھر بھڑک اٹھی، اور سارا یورپ شام کے چھوٹے سے ملک پر اُبل پڑا، جس میں یورپ کے تقریباً تمام مشہور جنگ آزما، اور مشہور بادشاہ اور سپہ سالار تھے، قیصر فریڈرک، رچرڈ شیر دل، شاہانِ انگلستان، فرانس، صقلیہ آ پڑیا

[1] سلطان صلاح الدین ص۲۰۲ تا ۲۰۵

برگنڈی، فلانڈرز کے ڈیوک اور نائٹ اپنی آہن پوش فوجوں کے ساتھ امنڈ آئے، ان سب کے مقابلہ میں تنہا سلطان صلاح الدین تھا، اور اس کے اعزہ اور چند حلیف جو پورے عالم اسلام کی طرف سے مدافعت کر رہے تھے

صلح اور سلطان کے کام کی تکمیل

آخر پانچ برس کی مسلسل خونریز و خون آشام جنگوں کے بعد ۱۱۹۲ء میں رملہ پر دونوں حریفوں میں جو تھک کر چور ہو گئے تھے، صلح ہو گئی، بیت المقدس اور مسلمانوں کے مفتوحہ شہر اور قلعے بدستور ان کے قبضہ میں رہے، ساحل پر عکہ کی مختصر سی ریاست عیسائیوں کے قبضہ میں تھی، اور سارا ملک سلطان صلاح الدین کے زیر نگیں تھا، صلاح الدین نے جو خدمت اپنے ذمہ لی تھی، اور صحیح تر الفاظ میں جو کام اللہ تعالیٰ نے اس کے سپرد کیا تھا، اس کے ہاتھوں مکمل ہوا، عیسائی مورخ اس کی کامیابی اور جنگ صلیبی کے نامبارک سلسلہ کے اختتام کا ذکر اس طرح کرتا ہے:۔

• جنگ مقدس خاتمہ کو پہنچی، پانچ برس کی مسلسل لڑائیاں ختم ہوئیں، جولائی ۱۱۸۷ء میں حطین پر مسلمانوں کی فتح سے قبل دریائے اردن کے مغرب میں مسلمانوں کے پاس ایک انچ زمین بھی نہ تھی، ستمبر ۱۱۹۲ء میں جب رملہ پر صلح ہوئی ہے، تو صور سے لے کر یافا تک ساحل بحر زمین کی ایک پتلی سی پٹی کے سارا ملک مسلمانوں کے قبضہ میں تھا، اس صلحنامہ پر صلاح الدین کو شرمندہ ہونے کی مطلق ضرورت نہ تھی، صلیبیوں نے جو کچھ فتح کیا تھا، اس کا بڑا حصہ از نجو کے پاس رہا، لیکن اگر صرف جان و مال کا لحاظ کیا جائے تو نتیجہ نہایت حقیر تھا، پاپائے روما کی فریاد سنتے ہی کل مسیحی دنیا نے ہتھیار اٹھا لئے تھے، قیصر فریڈرک، شاہان انگلستان و فرانس و صقلیہ، آسٹریا کا لیوپولڈ، برگنڈی کا ڈیوک، فلانڈرز کا کاؤنٹ، صدہا مشہور و معروف بیرن اور تمام عیسائی قوموں کے نامور سردار، یروشلم کا عیسائی بادشاہ اور فلسطین کے دیگر عیسائی والیان ملک، طبقہ داویہ اور طبقہ اسبتار کے بڑے بڑے پہلوان اس کوشش میں مصروف ہوئے کہ بیت المقدس پر اپنا

قبضہ اور یروشلم کی مسیحی سلطنت جو مٹنے کے قریب ہے پھر سرسبز ہو جائے، لیکن انجام کیا ہوا؟ اسی دوران میں قیصر فریڈرک قضا کر گیا، شاہان انگلستان، فرانس اپنے اپنے ملک کو سدھارے اور ان کے بڑے بڑے شریف اور معزز ساتھی ارضِ ایلیا میں خاک کا پیوند ہوئے، لیکن یروشلم اس پر بھی سلطان صلاح الدین کا رہا، صرف ساحلِ عکہ کی مختصر سی ریاست پر اس کا برائے نام عیسائی بادشاہ حکومت کرتا رہا۔

تیسری جنگ صلیب میں تمام مسیحی دنیا کی مجموعی طاقت مقابلہ کرنے آئی، مگر صلاح الدین کی قوت کوٹس سے مس نہ کر سکی، صلاح الدین کی سپاہ مہینوں کی سخت محنت و جانفشانی اور برسوں کی مخدوش اور خطرناک خدمت کے بعد تھک کر چور چور ہو چکی تھی، مگر کسی کی زبان پر حرف شکایت نہ تھا کبھی طلبی پر حاضر ہونے اور ایک نیک کام میں اپنی جانیں قربان کرنے سے کسی نے انکار نہ کیا، دریائے دجلہ کی دور دراز وادیوں میں ممکن ہے کہ سلطان کے تابع والیانِ ملک کے دل میں اس ہمیشہ کی طلبی کمک پر کچھ شکایت پیدا ہوئی ہو، لیکن بہرکیف اپنی اپنی فوجیں سلطان کی خدمت میں بڑی جان نثاری اور نیک خواہی کے ساتھ لائے، آخری جنگ جو ارسوف پر ہوئی، اس میں موصل کی فوجوں نے بڑی مردانگی اور جانبازی سے کام لیا، ان تمام لڑائیوں میں سلطان کو ہمیشہ مصر اور عراق کی فوجوں سے مدد ملنے کا بھروسہ رہا۔... اور یہی تقویت ملک شام کی شمالی اور مرکزی فوجوں سے رہی، کرد، ترکمان، عرب، مصری سب مسلمان اور سلطان کے خادم تھے، اور طلبی پر خادموں کی طرح سلطان کی خدمت میں حاضر ہوئے، باوجود اس کے کہ ان کی نسل و قوم جدا تھی، اور باوجود قومی چشمکوں اور قبائلی غرور و تفاخر کے سلطان نے ان کو ایسا شیر و شکر بنا رکھا تھا کہ تمام لشکر تنِ واحد نظر آتا تھا، سب ایک ہی لشکر کے رُکن رہے، دو ایک مرتبہ اس میں شک نہیں کہ ان کو متفق اور متحد رکھنے میں مشکلات پیش آئیں، اور بعض نازک مواقع ایسے بھی آئے کہ ان کی طبیعتوں میں فرق پیدا ہوتا معلوم ہوا، باوجود دیا فار پر فوج کے تمرد کے یہ تمام مختلف النسل قومیں ۱۱۹۲ء کے موسم خریف تک سلطان کے حکم کے تابع رہیں، اور جس طرح ۱۱۸۶ء میں پہلی مرتبہ خدا کی

راہ میں کام کرنے کو انھیں طلب کیا تھا، اسی طرح اخیر تک راہ خدا میں وہ کام کرتی رہیں، اس تمام زمانہ میں نہ تو سلطان کا کوئی صوبہ اس سے منحرف ہوا اور نہ کسی ماتحت سردار یا باج گزار ریاست نے اس سے بغاوت کی، اگر جو توقعات ان کی خیر خواہی اور جفاکشی سے رکھی گئی تھیں وہ کافی طور پر ایسی تھیں کہ مضبوط سے مضبوط اعتقاد اور قیادت کی طاقت کو بھی آزمائش میں لاکر ہرا دیتیں، صرف عراق میں سلطان کے ایک عزیز کی سرکشی کی مثال جس کی اصلاح فوراً اسحاق نے کر کر دی گئی، ایسی ہے جس کا استثنا اس اثر کو اور قوت کے ساتھ ثابت کرتا ہے، جو سلطان اپنی رعایا پر رکھتا تھا جب جنگ پنج سالہ کی یہ آزمائشیں اور تکلیفیں ختم ہولیں، تب بھی سلطان کردستان کے پہاڑوں سے لے کر صحرائے نوبہ تک بذاتِ واحد حکمراں رہا، اور ان حدود سے بھی دور کردستان کا بادشاہ ارمینیہ کا کاتلین (حاکم وقت) قونیہ کا سلطان اور قسطنطنیہ کا قیصر اس بات کا شوق رکھتا ہے کہ صلاح الدین کو اپنا دوست اور مدد و معاون سمجھیں، لیکن صلاح الدین ان دوستوں اور اتحادیوں میں سے کسی کا زیر بار احسان نہ ہوا، اس کی مدد کو نہ آئے مبارکباد دینے البتہ حاضر ہوئے، یہ کل کشمکش صرف صلاح الدین نے کی تھی، بجز سلطان کے بھائی العادل کے جو آخری زمانہ میں بین طور پر سب کے سامنے آیا، ممکن نہیں کہ کوئی شخص کسی ایک سپہ سالار یا مشیر کو بتا سکے جس کی نسبت کہہ سکیں کہ وہ سلطان کا مشیر با صلاح کار ہو کر اس پر حاوی ہو گیا تھا، ایک مجلس حرب البتہ اس کے یہاں تھی، جو معاملاتِ جنگ میں مشورہ دیتی تھی، اور کبھی کبھی ایسا بھی ہوا تھا کہ سلطان کی صحیح رائے پر اس کی غلط رائے غالب آگئی، جیسا کہ صور اور عکہ کے سامنے ہوا تھا، لیکن اس مجلس میں بھی اس کے کسی ایک رکن کی طرف اشارہ نہیں کر سکتے کہ اس کی رائے نے سلطان پر کسی دوسرے کی رائے سے زیادہ اثر کیا ہو، بھائی، بیٹے، بھتیجے، پرانے رفیق، نئے ماتحت عامل، اور ہوشیار قاضی، مخالف اور وفا شعار معتمد وزیر، متعصب واعظ، اور ملا بھی اس میں متفق الکلام تھے کہ جہاد کیا جائے، اور سب اس میں شریک بھی ہوئے، اور سب نے آقا کی بڑی تندہی اور خیر خواہی سے اپنی اپنی لیاقت اور قوت کے مطابق مدد کی، لیکن ان میں سے کوئی بھی ایسا نہ تھا، جو اس بات کو بھولا ہو کہ آقا کون ہے؟ اس تشویش، فکر اور محنت و

جانفشانی کے نازک وقت میں صرف ایک دل اور ارادہ تھا، جو سب پر حاوی تھا، اور یہ دل اور ارادہ سلطان صلاح الدین کا تھا۔"[1]

وفات

بالآخر اپنا مقدس فریضہ ادا کرکے اور عالم اسلام کو صلیبیوں کی غلامی کے خطرہ سے محفوظ کرنے کے بعد ۲۷ صفر ۵۸۹ھ کو اسلام کا یہ وفادار فرزند دنیا سے رخصت ہوا، اس وقت ان کی عمر ستاون سال کی تھی،[2] قاضی بہاء الدین بن شداد سلطان کی وفات کا حال بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:۔

"۲۷ صفر کی شب کو جو سلطان کی علالت کا بارہواں دن تھا، مرض میں شدت ہو گئی، اور قوت گھٹ گئی شیخ ابو جعفر امام الکلاسہ کو جو ایک نہایت صالح اور بزرگ شخص تھے، زحمت دی گئی کہ رات کو قلعہ میں رہیں کہ اگر رات کو وہ ساعت مقررہ آ گئی، جو سب کو پیش آنے والی ہے تو وہ اس وقت سلطان کے پاس ہوں اور ان کو تلقین کرسکیں، اور اللہ کا نام لیں، رات کو سلطان ایسا معلوم ہوتا تھا کہ سفر کے لئے پا بر کاب ہیں شیخ ابو جعفر ان کے پاس بیٹھے ہوئے تلاوت و ذکر میں مشغول تھے، تین دن پہلے سے ان پر ایک ذہول اور غفلت طاری تھی، کسی کسی وقت ان کو ہوش آتا تھا، جب شیخ ابو جعفر نے تلاوت کرتے ہوئے "ھُوَ اللّٰہُ الَّذِیْ لَا اِلٰہَ اِلَّا ھُوَ عَالِمُ الْغَیْبِ وَالشَّھَادَۃِ" پڑھی تو سلطان کو ہوش آ گیا، ہونٹوں پر مسکراہٹ آئی اور چہرہ کھل گیا، اور کہا صحیح ہے، اور یہ کہہ کر جان جانِ آفریں کے سپرد کی، یہ چہار شنبہ کا دن صفر کی ۲۷ تاریخ اور فجر کا وقت تھا، ایسا معلوم ہوتا تھا کہ خلفائے راشدین کی وفات کے بعد سے ایسا سخت دن مسلمانوں کی تاریخ میں نہیں آیا، قلعہ، شہر اور تمام دنیا پر ایک وحشت سی برس رہی تھی، اللہ تعالیٰ ہی کو معلوم ہے کہ کیسا سناٹا اور کیسی اداسی تھی، میں پہلے جب سنتا تھا کہ لوگ دوسروں پر قربان ہو جانے اور ان کا فدیہ بن جانے

---

[1] سلطان صلاح الدین صفحہ ۳۱۲، ۳۱۳ [2] سلطان کی ولادت ۵۳۲ھ کی ہے، (ابو الفداء ج ۳ صفحہ ۹۰)

کی تمنا کرتے ہیں تو سمجھتا تھا کہ یہ محض ایک مجاز اور تکلف کی باتیں ہیں، لیکن اس دن معلوم ہوا کہ یہ حقیقت ہے، خود میں اور بہت سے لوگ ایسے تھے کہ اگر ان کے امکان میں ہوتا تو وہ سلطان پر اپنی جان قربان کر سکیں اور ان کی طرف سے فدیہ ہو جائیں تو وہ اس کے لئے تیار تھے۔"[1]

قاضی ابن شداد لکھتے ہیں کہ سلطان نے اپنے ترکہ میں صرف ایک دینار اور ۴۷ درہم چھوڑے تھے، کوئی ملک، مکان، جائداد، باغ، گاؤں، زراعت نہیں چھوڑی، ان کی تجہیز و تدفین میں ایک پیسہ بھی ان کی میراث سے صرف نہیں ہوا، سارا سامان قرض سے کیا گیا، یہاں تک کہ قبر کے لئے گھانس کے پولے بھی قرض سے آئے، کفن کا انتظام ان کے وزیر و کاتب قاضی فاضل نے کسی جائز و حلال ذریعہ سے کیا۔

درویش سیرت سلطان

قاضی ابن شداد سلطان کی سیرت، اخلاق و عادات اور خصوصیات میں لکھتے ہیں:-

"سلطان نہایت صحیح العقیدہ، راسخ الاعتقاد مسلمان تھے، عقائد میں اہل السنۃ والجماعۃ کے ہم مسلک و ہم اعتقاد، نماز و واجب کے بڑے پابند، ایک موقع پر فرمایا کہ سالہا سال ہو گئے، میں نے ایک نماز بھی بے جماعت نہیں پڑھی، حالتِ مرض میں بھی امام کو بلا لیتے اور بتکلف کھڑے ہو کر نماز پڑھتے، سنن رواتب پر مداومت تھی، رات کو حتی الامکان نوافل پڑھتے، اگر رات کے نوافل رہ جاتے تو (شافعیہ کے مسلک کے مطابق[2]) نماز فجر سے پہلے ادا کرتے، ان کو آخری بیماری میں کھڑے ہو کر نماز پڑھتے دیکھا، صرف تین دن جن میں ان پر بیہوشی طاری رہی، نماز فوت ہوئی، زکوٰۃ فرض ہونے کی ساری عمر نوبت ہی نہیں آئی، اس لئے کہ انھوں نے کبھی اتنا پس انداز ہی نہیں کیا جس پر زکوٰۃ فرض ہو، ان کی ساری دولت صدقات و خیرات میں خرچ ہوئی، صرف ۴۷ درہم ناصری اور ایک سونے کا سکہ چھوڑا، باقی کوئی جائداد، ملکیت نہیں چھوڑی۔

---

[1] النوادر السلطانیہ صفحہ ۲۴۹ ‏ [2] سلطان شافعی المذہب تھے۔

رمضان میں روزے کے سخت پابند تھے، کچھ روزے ان کے ذمہ باقی تھے، قاضی فاضل کی یادداشت میں تحریر تھے، وفات سے پہلے پہلے بڑے اہتمام سے وہ سب روزے قضا کئے، معالج نے ہر چند منع کیا لیکن فرمایا کہ کل کا حال مجھے معلوم نہیں، چنانچہ ان کی قضا کے بعد ہی خود قضا کر گئے۔

حج کی بڑی آرزو تھی، لیکن اس کا موقع نہیں مل سکا، وفات کے سال اس کا شوق بہت غالب تھا لیکن نوبت نہیں آنے پائی۔

قرآن مجید سننے کا بڑا شوق تھا کبھی کبھی اپنے برج میں پہرہ داروں سے دو دو، تین تین، چار چار پارے سن لیتے، بڑے خاشع، خاضع، رقیق القلب تھے قرآن مجید سن کر اکثر آنکھوں سے آنسو جاری ہو جاتے، حدیث سننے کے بڑے شائق تھے اور اس کا بڑا احترام کرتے تھے، حدیث کی قرأت کے وقت لوگوں کو احتراماً بیٹھ جانے کا حکم دیتے، اگر کوئی عالی سلسلہ حدیث کا شیخ ہوتا تو خود اس کی مجلس میں جا کر حدیث سنتے، خود بھی حدیث کے قرأت کا شوق تھا، اگر کسی حدیث میں کوئی عبرت کی بات ہوتی تو آنکھیں پرنم ہو جاتیں، عین میدانِ جنگ میں بعض مرتبہ دو صفوں کے درمیان کھڑے ہو کر حدیث کی سماعت کی کہ یہ وقت خاص فضیلت کا ہے، دینی شعائر کی بڑی تعظیم کرتے، سہروردی ملحد کو انہی کے ایماء سے ان کے صاحبزادہ الملک الظاہر نے قتل کروایا ان کو خدا پر بڑا بھروسہ اور اس کی ذات عالی کے ساتھ بڑا حسن ظن تھا، کٹھن گھڑیوں اور نازک اوقات میں اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع اور دعا و مناجات کی عادت تھی، ایک مرتبہ بیت المقدس کو صلیبی افواج کی طرف سے جو اس کے قریب مجتمع تھیں، سخت خطرہ لاحق تھا، سلطان کو بیت المقدس کی بڑی فکر تھی، اور وہ کسی طرح بھی وہاں سے چلے جانے پر راضی نہ تھے، شبِ جمعہ تھی، جاڑوں کی راتیں تھیں، میں تنہا خدمت میں حاضر تھا، ہم دونوں رات بھر ذکر و دعا میں مشغول رہے، سلطان کے مزاج پر اکثر خشکی اور یبوست غالب آجایا کرتی تھی، رات بھر جاگتے رہنے کی وجہ سے مجھے اندیشہ ہوا کہ ان کا مزاج ناساز ہو جائے گا، میں نے عرض کیا کہ کچھ دیر آرام فرمالیں، فرمایا شاید تمہیں نیند نے

سنایا ہے اس لئے مجھے مشورہ دیتے ہو؟ یہ کہہ کر وہ اٹھے لیکن تھوڑی ہی دیر میں موذن نے صبح کی اذان دی،
میں عموماً فجر ساتھ ہی پڑھا کرتا تھا، حاضر ہوا تو دیکھا کہ اپنے ہاتھ پاؤں پر پانی ڈال رہے ہیں، مجھے دیکھ کر
فرمایا کہ میں نے جھپکی بھی نہیں لی، ہم نماز میں مشغول ہوگئے، مجھے ایک خیال آیا، اور میں نے عرض کیا کہ میرے
ذہن میں ایک بات آئی ہے اور انشاء اللہ وہ مفید ہوگی، وہ یہ کہ آپ اللہ تعالےٰ کی طرف رجوع کریں، اور اس سے
گڑگڑا کر دعا مانگیں، اور یقین رکھیں کہ وہی یہ مشکل آسان کرسکتا ہے، فرمایا کہ اس کی کیا ترکیب ہو؟ میں نے
عرض کیا کہ آج جمعہ کا دن ہے، مسجد جاتے ہوئے آپ غسل فرمائیں، اور مسجد اقصیٰ میں اس مقام پر نماز پڑھیں
جہاں سے حضور صلے اللہ علیہ وسلم معراج میں تشریف لے گئے، اور پہلے کسی معتبر آدمی کے ذریعہ بالکل پوشیدہ طور پر
کچھ صدقہ کریں، پھر اذان واقامت کے درمیان دو رکعت نماز پڑھیں ایک حدیث میں اس کی فضیلت
اور اس وقت دعا کی قبولیت کی خبر دی گئی ہے، اور سجدہ میں سر رکھ کر عرض کریں کہ "خدایا مادی اسباب اور
دنیاوی سہارے سب ٹوٹ چکے، اب تیرے دین کی مدد اور فتح کے لئے صرف یہی سہارا رہ گیا ہے کہ تیرے
آستانہ پر سر رکھ دیا جائے، اور تیرے سہارے کو مضبوط پکڑ لیا جائے، اب صرف تیرا بھروسہ ہے، اور تو ہی
میرا حامی و ناصر ہے" مجھے امید قوی ہے کہ اللہ تعالےٰ آپ کی دعا قبول فرمائے گا، سلطان نے ایسا ہی کیا،
میں نے اپنے معمول کے مطابق ان کے پہلو میں نماز پڑھی، میں نے دیکھا کہ وہ سجدہ میں پڑے ہیں، آنسوؤں
سے ان کی داڑھی تر ہوگئی ہے، اور جانماز پر آنسو ٹپ ٹپ گر رہے ہیں، میں نے نہیں سنا کہ انھوں نے
کیا دعا کی، اسی دن سے ان کی دعا کے قبولیت کے آثار ظاہر ہونے لگے، صلیبی فوجوں میں انتشار و
اضطراب پیدا ہوا، پے در پے اطمینان بخش اطلاعیں آتی رہیں، یہاں تک کہ دو شنبہ کی صبح تک
میدان بالکل صاف ہوگیا، اور حملہ آور فوجیں بیت المقدس کا خیال چھوڑ کر رملہ کی جانب
چلی گئیں"۔[1]

---

[1] النوادر السلطانیہ ص ۱۱۵

محاسنِ اخلاق

عبادات وفضائل اعمال کے علاوہ حاکمانہ فضائل، عدل، عفو وحلم، جود وسخاوت، مروت وشرافت صبر واستقامت، شجاعت وفتوت، اور شہامت وعلوِ ہمت کے اوصافِ عالیہ سے آراستہ تھے۔

قاضی ابن شداد لکھتے ہیں کہ "ہفتہ میں دوبار، دوشنبہ وپنجشنبہ کو اذنِ عام ہوتا تھا، فقہا، قضاۃ وعلما، اور اہلِ مقدمہ حاضر ہوتے، بڑے چھوٹے امیر غریب، بوڑھے اور عام بڑھیوں تک کو آنے کی اجازت تھی، سفر وحضر میں کبھی اس معمول میں فرق نہ آتا، رات دن میں ایک بار خود معاملات کو دیکھتے، اور رقعات وفرامین پر خود دستخط کرتے، کبھی کسی صاحبِ غرض اور حاجت مند کو ناکام واپس نہ کرتے، اس کے ساتھ ساتھ ذکر و تلاوت میں مشغول رہتے۔

اگر کوئی فریاد یا شکایت کرتا تو خود کھڑے ہو کر اس کا مقدمہ سنتے اس کی دادرسی کرتے، اور اس کے معاملہ سے پوری دلچسپی لیتے، ایک مرتبہ ایک معمولی شخص نے ان کے بھتیجے تقی الدین کے خلاف (جو سلطان کو بہت عزیز تھے) دعویٰ کیا، سلطان نے فوراً ان کو طلب کیا، اور مقدمہ کی سماعت کی، خود ان کے خلاف ایک شخص نے دعویٰ کیا، سلطان نے معاملہ کی پوری تحقیق کی، اگرچہ مدعی کا حق ثابت نہیں ہوا لیکن سلطان نے اس کو ناکام واپس نہیں کیا، اور خلعت ومال سے سرفراز کیا۔

بڑے بردبار اور متحمل مزاج تھے، مورخ ابن خلکان لکھتے ہیں کہ "اپنے رفقاء وخدام کی غلطیوں اور لغزشوں سے چشم پوشی کرتے، بعض مرتبہ کوئی ایسی بات سنتے جس سے ان کو تکلیف یا ناگواری ہوتی، لیکن وہ اس کو محسوس بھی نہیں ہونے دیتے اور نہ اپنے طرزِ عمل سے کوئی فرق آنے دیتے، ایک مرتبہ پانی مانگا، پانی نہیں آیا، پھر مانگا، پھر نہیں ملا، یہاں تک کہ ایک ہی مجلس میں پانچ مرتبہ نوبت آئی، آخر میں کہا کہ دوستو! میں تو پیاس سے مرا جا رہا ہوں، اتنے میں پانی آیا، سلطان نے پی لیا

اور اس تاخیر پر کچھ نہ کہا[۱] ایک مرتبہ سخت بیماری سے اٹھے اور غسل صحت کے لئے حمام میں گئے پانی بہت گرم تھا، ٹھنڈا پانی مانگا، خادم نے پانی حاضر کیا، پانی کچھ چھلک کر ان پر گرا، ضعف کی وجہ سے ان کو تکلیف ہوئی، پھر ٹھنڈا پانی مانگا، اس مرتبہ ٹھنڈے پانی کا پورا طشت گر گیا، اور سارا پانی ان پر آ گیا' اور وہ مرتے مرتے بچے، لیکن صرف اتنا کہا کہ مجھے مارنے کا ارادہ ہو تو کہدو، خادم نے معذرت کی اور وہ خاموش ہو گئے، اور کوئی باز پرس نہیں کی[۲] قاضی ابن شداد نے سرداران فوج کی غلطیوں اور اہل دربار کی بے عنوانیوں سے درگذرا اور سلطان کے عفو و حلم کے متعدد موثر واقعات لکھے ہیں[۳]:۔

"جود و سخاوت کا یہ حال تھا کہ بقول ابن شداد بعض اوقات فتح کئے ہوئے صوبے دوسروں کو بخش دیئے آمد فتح کیا، ایک سردار ابن قرہ ارسلاں نے ان سے خواہش کی اور انھوں نے بخش دیا بعض مرتبہ سامان بیچ کر وفود کو عطایا و انعامات سے نوازتے، محافظین خزانہ بعض اوقات کسی نازک وقت کے لئے کچھ چھپا کر رکھ لیتے کہ سلطان کو اگر خبر ہو گی، تو وہ رہنے نہیں دیں گے' ایک مرتبہ انھوں نے دوسروں پر رکھ کر یہ بات کہی کہ بعض ایسے لوگ بھی ہو سکتے ہیں' جو روپیہ اور مٹی کو ایک نظر سے دیکھتے ہیں' مجھے معلوم ہے کہ انھوں نے اپنا ہی حال بیان کیا ہے[۴]"

"مروت و شرافت کا یہ حال تھا کہ آنے والے اور ملاقات کرنے والے کو خالی ہاتھ نہ جانے دیتے، خواہ کافر ہو، صیدا کا والی ملاقات کے لئے آیا، سلطان نے اس کی بڑی خاطر کی' اپنے ساتھ کھانا کھلایا، لیکن اس کے ساتھ ساتھ اسلام کی دعوت بھی دی' اور اس کے فضائل و محاسن بیان کر کے اس کو اسلام کی ترغیب دی' اس مروت و شرافت کا نتیجہ تھا کہ اپنے سب سے بڑے حریف رچرڈ کو اس کی بیماری میں برف اور پھل بھیجتے رہے[۵]"

---

[۱] تاریخ ابن خلکان ترجمہ سلطان صلاح الدین [۲] ایضاً [۳] النوادر السلطانیہ ص ۳۱،۲۴ [۴] ایضاً ص ۱۳،۱۴
[۵] الفتح القسی فی الفتح القدسی عماد الدین الکاتب۔

"سلطان بڑے شریف النفس، رقیق القلب اور درد مند انسان تھے، ظلم کو برداشت نہ کر سکتے تھے، کسی آفت رسیدہ کمزور مخلوق کی تکلیف کی تاب نہ لاسکتے، ابن شداد لکھتے ہیں کہ ایک مرتبہ ایک عیسائی بڑھیا ان کے پاس آئی، وہ سینہ پیٹتی تھی اور برابر روئے جا رہی تھی، سلطان نے سبب پوچھا، کہا کہ میری چھوٹی سی بچی کو ڈاکو میرے خیمہ سے اٹھالے گئے، مجھے روتے پوری رات ہوگئی، سلطان کے ایک آدمی نے مجھ سے کہا کہ سلطان شفیق و مہربان ہیں، ہم تمھیں ان کے پاس پہنچا دیتے ہیں، تم ان سے فریاد کرنا، انھوں نے مجھے آپ کی خدمت میں پہونچا دیا، اب میں اپنی بچی آپ ہی سے لوں گی، سلطان کو اس کی حالت پر بڑا ترس آیا، اُن کی آنکھیں پُرآب ہوگئیں، اسی وقت ایک شخص کو لشکر کے بازار میں بھیجا کہ تحقیق کرے کہ کس نے اس کی بچی کو خریدا ہے، جس نے خریدا ہو اس کو قیمت دے کر، اور بچی کو لے کر آئے، تھوڑی دیر میں وہ سوار بچی کو کاندھے پر لئے ہوئے نظر آیا، بڑھیا زمین پر گر گئی، اور اپنی پیشانی خاک پر رکھ کر دیر تک اپنی (مغربی) زبان میں کچھ کہتی رہی پھر خوش خوش اپنی بچی کو لے کر چلی گئی"[1]

قاضی ابن شداد کہتے ہیں کہ جب سلطان کسی یتیم کو دیکھتے تو محبت و شفقت کی باتیں کرتے، اور اس کی دلجوئی فرماتے، اس کو کچھ عنایت فرماتے، اگر کوئی پرورش کرنے والا نہ ہوتا تو اپنی طرف سے اس کا کچھ انتظام فرماتے، اسی طرح جب کسی معمر شخص یا بوڑھے کو دیکھتے تو بڑے متاثر ہوتے، اس کے ساتھ کچھ سلوک کرتے"[2]

مردانہ اوصاف

صبر و استقامت اس درجہ کی تھی کہ قاضی ابن شداد کا بیان ہے کہ ایک مرتبہ کمر سے گھٹنوں تک اس قدر دانے اور پھوڑے تھے کہ بیٹھنے سے معذور تھے، یہاں تک کہ دسترخوان بچھا اور کھانا تناول نہ کر سکے اس لئے کہ بیٹھنے کی قدرت ہی نہ تھی، اس کے باوجود دشمن کے مقابل صف آرا تھے، میں نے دیکھا ہے کہ صبح سے

---

[1] النوادر السلطانیہ ص ۲۶ [2] ایضاً ص ۲۸

مغرب تک گھوڑے پر سوار ایک طرف سے دوسری طرف برابر چکر لگاتے، اور افواج اور انتظامات کا معائنہ فرماتے اور پھوڑوں کی تکلیف کو تحمل سے برداشت کرتے، میں تعجب کا اظہار کرتا تو فرماتے کہ گھوڑے پر سوار ہونے کے بعد مجھے درد کا احساس نہیں رہتا۔[1]

ایک معرکہ میں حالتِ بیماری میں برابر دشمن کا تعاقب کیا، ایک رات میں اور طبیب سلطان کے پاس تھے، ہم تیمارداری بھی کرتے تھے، اور ان کی طبیعت بھی بہلاتے تھے، سلطان کبھی سوتے، کبھی جاگتے، یہاں تک کہ صبح ہوگئی، سلطان سوار ہو کر تیار ہوگئے، اپنے لڑکوں کو اللہ کے راستہ میں سب سے آگے کیا، اور سب کو خدا کے نذر کر دیا، ایک ایک کر کے سلطان نے سب کو روانہ کر دیا، صرف میں اور طبیب رہ گئے، شام تک سلطان اسی طرح اپنی جگہ پر کھڑے رہے، اور جنگ کی نگرانی کی، یہاں تک کہ رات کو لشکر کو مسلح اور ہوشیار رات گزارنے کی اجازت ملی، اور ہم اور سلطان اپنے خیمہ میں واپس آئے۔[2]

شجاعت میں سلطان ضرب المثل تھے، قاضی ابن شداد راوی ہیں کہ سلطان دن میں ایک ایک دو دو بار دشمن کے گرد گشت کرتے، گھمسان کی لڑائی میں سلطان تنِ تنہا گھوڑے پر صفوں کے درمیان چکر لگاتے، ایک کوتل گھوڑا سائیس کے ساتھ ہوتا، اور وہ خیمہ سے میسرہ تک فوجوں میں گھستے، صفیں چیرتے نکل جاتے فوجی دستوں کو بلاتے، ان کو مناسب مقامات پر ٹھہرنے یا بڑھنے کا حکم دیتے، ان کے اطمینان اور بے خوفی کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ ایک مرتبہ میں نے ان سے کہا کہ سلطان نے مختلف مواقع پر حدیث سنی ہے، لیکن کبھی عین معرکہ اور دو صفوں کے درمیان حدیث سننے کی نوبت نہیں آئی، اگر یہ شرف بھی حاصل ہو جائے تو بہت اچھا ہے، چنانچہ سلطان نے صفوں کے درمیان کھڑے ہو کر حدیث شریف کی سماعت کی،[3] انھوں نے کبھی دشمن کی تعداد کی پرواہ نہیں کی، اور نہ کبھی اس کا اثر قبول کیا، بعض بعض مرتبہ پانچ پانچ چھ چھ لاکھ کی تعداد ان کے مقابلہ میں تھی، اللہ نے ان کو فتح دی، اور کثیر خلقت قتل اور گرفتار ہوئی،[4] ایک مرتبہ دشمن کے کچھ اوپر تیئس

[1] النوادر السلطانیہ ص۱۸ [2] ایضاً ص۱۹ [3] ایضاً ص۱۵ [4] ایضاً

جہاز عکہ میں آئے، بین عصر سے مغرب تک گھمسان کی لڑائی جاری رہی لیکن سلطان کے چہرہ پر شکن نہ تھی، عکہ کے سب سے بڑے معرکہ میں مسلمانوں کے قدم اکھڑ گئے، قلب لشکر تک نے اپنی جگہ چھوڑ دی، نشان و پرچم اور طاشے زمین پر گر گئے، لیکن سلطان چند ساتھیوں کے ساتھ اپنی جگہ پر جمے رہے، یہاں تک کہ پہاڑ کو پشت پر رکھ کر کھڑے ہو گئے، مسلمانوں کو للکارا اور شرم دلائی، اور وہ میدان میں واپس آئے، اور دوبارہ حملہ کیا جس میں دشمن کے سات ہزار آدمی قتل ہوئے اور مسلمانوں کو فتح ہوئی[۱]، سلطان کی بلند ہمتی اور عالی حوصلگی کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ قاضی ابن شداد کہتے ہیں کہ سلطان نے ایک روز فرمایا کہ "میں تم سے اپنے دل کی بات کہتا ہوں، میرا ارادہ ہے کہ ساحل کو صلیبیوں سے پاک کرنے کے بعد ملک کو تقسیم کر دوں، وصیت کر کے اور ہدایات دے کر خود یہاں سے رخصت ہو کر چلا جاؤں، اور سمندر میں سفر کر کے یورپ کے جزائر تک پہونچوں، اور ان مغربیوں (یورپین قوموں) کا وہاں تک تعاقب کروں کہ روئے زمین پر کوئی کافر نہ رہ جائے، یا میں اس ارادہ میں کام آ جاؤں[۲]"۔

علم و فضیلت

سلطان عالم فاضل شخص تھے، عرب کے انساب و قبائل یہاں تک کہ ان کے مشہور گھوڑوں کے سلسلۂ نسب پر ان کو عبور تھا، عربوں کے واقعات و حالات ان کو مستحضر تھے، دنیا کے عجائبات و نوادر کا ان کو علم تھا، ہر طرح کے معلومات رکھتے تھے، ان کے ہمنشینوں کو ان سے بہت سی نئی باتیں معلوم ہوتی تھیں[۳]، بعض مورخین کا بیان ہے کہ ان کو حماسہ حفظ تھا[۴]، لین پول ان کی ابتدائی زندگی کا ذکر کرتے ہوئے لکھتا ہے:۔

"اس کا اصلی رجحان طبیعت دینیات کی طرف تھا، علمائے وقت سے احادیث سنتے، ان کے براہین اور راویوں کے سلسلہ کی تحقیق، مسائل فقہ پر بحث، آیات قرآنیہ کی تفسیر میں اسے بڑا انہماک رہتا تھا، اور سب سے بڑھ کر اس بات کا ذوق تھا کہ مذہب اہل سنت والجماعت کی تائید اور ثبوت قوی دلائل سے دیا جائے[۵]"۔

---

[۱] النوادر السلطانیہ ص۱۵ [۲] ایضاً ص۱۷ [۳] ایضاً ص۱۷ [۴] ایضاً ص۲۷ [۵] سلطان صلاح الدین۔

فاطمی حکومت کا زوال اور صلاح الدین کا دوسرا کارنامہ

سلطان صلاح الدین کا مصر میں اقتدار عبیدی سلطنت[1] (جو عام طور پر فاطمی مشہور ہے) کا خاتمہ تھا جو ۲۹۷ھ سے ۵۶۷ھ تک پورے دو سو اڑسٹھ سال بڑی شان و شوکت سے قائم رہی، اور اس نے اسلامی دنیا کے ایک بڑے حصہ کے عقائد، اعمال و اخلاق اور تمدن پر بڑا گہرا اثر ڈالا تھا، یہ دورِ حکومت اعتقادی عجائبات، عجیب و غریب احکام اور مضحکہ خیز قوانین سے پُر تھا، جس کے بعض نمونے مشہور مورخ مقریزی کی کتاب "الخطط والآثار" سے پیش کیے جاتے ہیں:۔

• ۳۶۲ھ میں قانونِ میراث میں ترمیم کی گئی، اور قانون بنا لیا گیا کہ اگر متوفی نے بیٹی چھوڑی ہو تو بیٹے بھتیجے چچا وغیرہ کو میراث میں کوئی حصہ نہیں ملے گا، اس قانون کی خلاف ورزی کو حضرت فاطمہؓ کے ساتھ عداوت کا مرادف سمجھا جاتا ہے، ہلال کا دیکھنا پوری مملکت مصر میں موقوف ہو گیا، روزہ اور عید حساب سے ہونے لگے۔

۳۷۲ھ میں پورے ملک مصر میں تراویح کی سرکاری ممانعت کر دی گئی، موطا امام مالک کے ایک نسخہ کے پائے جانے پر ایک شخص کی تشہیر کی گئی۔

۳۹۳ھ میں ۱۳ آدمیوں کو اس جرم میں زد و کوب کیا گیا، اور ان کی تشہیر کی گئی کہ انھوں نے صلوٰۃ الضحیٰ (نماز چاشت) پڑھی تھی، ۳۹۵ھ میں ملوخیا (ایک ترکاری) کو جو اہلِ مصر کو بہت مرغوب ہے، اس لئے ممنوع قرار دیا گیا کہ معاویہ رضی اللہ عنہ کو بہت پسند تھی، جرجیر کی اس لئے ممانعت ہوئی کہ کہا جاتا ہے کہ حضرت عائشہؓ کو مرغوب تھی، اسی سنہ میں تمام مساجد، دیواروں، مقابر اور صحراؤں میں سلف کو سب و شتم اور لعنت لکھی گئی، اور اس کو منقش کیا گیا، ۴۱۱ھ میں "الظاہر لاعزاز دین اللہ" نے شراب کی عام اجازت

---

[1] محققینِ انساب کا تقریباً اس پر اتفاق ہے کہ بنی عبید کو خاندانِ نبوت سے دور کا بھی تعلق نہیں تھا، ان کا مورثِ اعلیٰ عبید مجوسی یا یہودی تھا، قاضی ابوبکر محمد بن الطیب نے اپنی کتاب "الکشف عن اسرار الباطنیہ" اور قاضی عبدالجبار نے کتاب "تثبیت النبوۃ" اور مقدسی نے اپنی کتاب "کشف ما کان علیہ بنو عبید" میں اس پر مفصل بحث کی ہے۔

دی، عیش وعشرت اور لہو ولعب کی گرم بازاری ہوئی، اسی زمانہ میں ملک میں سخت گرانی اور بیماریوں کا زور تھا، لوگ محل شاہی کے گرد جمع ہو جاتے تھے، اور "الجوع الجوع" (بھوک بھوک) کے نعرے لگاتے تھے، لوٹ مار کی کثرت ہوئی۔

۴۴۲ھ میں ولی عہد کی جس کی عمر ۴ سال کی تھی، سواری نکلی تمام بازار آراستہ تھے، لوگ زمیں بوس ہوتے تھے۔

ان خلفاء میں متعدد اشخاص ایسے تھے، جو نہایت کم سنی میں خلیفہ بنائے گئے، اور مسلمانوں پر ان کی اطاعت فرض قرار دی گئی، مستنصر باللہ جب خلیفہ ہوا تو سات برس کی عمر تھی، آمر باحکام اللہ کی عمر خلافت کے وقت پانچ سال ایک مہینہ کچھ دن تھی، الفائز بنصر اللہ خلافت کے وقت صرف پانچ سال کا تھا، عاضد لدین اللہ کی عمر جب وہ خلیفہ ہوا گیارہ سال تھی۔"[1]

سلطان صلاح الدین کی حکومت سے اس دور کا خاتمہ اور دوسرے دور کا آغاز ہوا مصر سے شیعیت و رفض کے آثار مٹنے لگے، سنت کا فروغ ہوا، جا بجا مدارس قائم ہوئے جن میں علمائے سنت علوم دینیہ کی تعلیم دیتے، رفتہ رفتہ عبیدی حکومت کے اثرات بالکل زائل ہو گئے، اس کے ساتھ اسماعیلیت جو تقریباً تین صدیوں تک مصر کا سرکاری مذہب رہا تھا، مصر میں غریب الوطن ہو گیا، مورخ مصر مقریزی لکھتا ہے:-

واختفیٰ مذهب الشیعة والاسماعیلیة	شیعہ، اسماعیلیہ اور امامیہ کا مذہب روپوش ہو گیا،
والامامیة حتی فقد من ارض مصر کلها۔	یہاں تک کہ پورے ملک مصر میں اس کا کہیں وجود نہیں تھا

عبیدی حکومت کا یہ صد سالہ عہد اسلام کے لئے ایک دورِ ابتلا تھا، جس میں مسلسل شریعت وسنت اور عقائد و اخلاق کے ساتھ تمسخر و تلاعب جاری رہا، اہلِ سنت اور اہلِ علم مقہور و مغلوب رہے، سفلہ طبیعت، اوباش مزاج، اور بد دین غالب و حاوی رہے، علامہ مقدسی اپنی کتاب کتاب الروضتین فی اخبار الدولتین میں اس دور کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:-

دامی هذا البلاء علی الاسلام من اول	عبیدیوں کی حکومت آغاز سے اختتام تک یہ بلا ر

[1] کتاب الخطط والآثار للمقریزی ص ۳۴۰، ۳۵۵

دولتهم الی آخرها وذلك من ذی الحجة
سنة تسع وتسعين ومائتين الی سنة سبع
وستين وخمسمائة وفی ايامهم كثرت الرافضة
واستحكم امرهم ووضعت المكوس علی الناس
واقتدی بهم غيرهم وافسدت عقائد
طوائف من اهل الجبال الساكنين بثغور الشام
كالنصيرية والدرزية والحشيشة نوع منهم
وتمكن دعاتهم منهم لضعف عقولهم
وجهلهم ما لم يتمكنوا من غيرهم واخذت
الفرنج اكثر البلاد بالشام والجزيرة الی
ان منّ الله علی المسلمين بظهور البيت
الاتابكی وتقدمه مثل صلاح الدين
فاستردوا البلاد وازالوا هذه الدولة
عن ارقاب العباد۔[1]

اسلام پر مسلط رہی اس کی ابتدا ذی الحجہ ۲۹۹ھ سے
ہوتی ہے اور اس کا خاتمہ ۵۶۷ھ پر ہوتا ہے ان کے دور
حکومت میں روافض کی کثرت اور ان کا غلبہ ہوا، لوگوں
پر محاصل اور ٹیکس مقرر کئے گئے اور دوسروں نے ان کی
اقتدا کی، شامی حدود پر بسنے والے کوہستانوں نصیریوں
دروزیوں کے عقائد انہی کے اثر سے خراب ہوئے، حشیشی
(بھنگ استعمال کرنے والے) انہی کی ایک قسم ہیں، ان
اسماعیلیوں کے مبلغین کا جو اثر و نفوذ ان کوہستانیوں کے
اندر ان کی کم عقلی اور جہالت کی وجہ سے ہوا، وہ
دوسروں میں نہیں ہو سکا، انہی کے دورِ حکومت میں
فرنگیوں نے شام اور جزیرہ کے اکثر اسلامی شہروں پر
قبضہ کر لیا، یہ سلسلہ اس وقت تک جاری رہا کہ
خاندان اتابک برسرِ اقتدار ہوا، اور صلاح الدین
جیسے مجاہد سامنے آئے جنھوں نے اسلامی ملک از سرِ نو بازیاب
کیا، اور اس حکومت سے بندگانِ خدا کو نجات دی۔

اس انقلاب سلطنت پر جو ایک بڑے دینی و اخلاقی انقلاب کا پیش خیمہ تھا، صحیح العقیدہ مسلمان اور محبینِ سنت کی مسرت بالکل قدرتی بات تھی، علامہ مقدسی نے جن کی ولادت سے صرف ۲۹ سال پہلے انقلاب ہوا تھا، اور ان تغیرات و اثرات کا انھوں نے خود مشاہدہ کیا تھا، جو اس کے نتیجہ میں پیش آئے تھے،

[1] کتاب الروضتین فی اخبار الدولتین ج ۱ ص ۲۰۰

اپنی مسرت کا اظہار ان الفاظ میں کیا ہے:۔

انقرضت تلك الدولة وزالت من	یہ حکومت ختم ہوئی، اور اس کے ساتھ ساتھ مصر میں
الاسلام بمصر بانقراضها الذلة۔[1]	اسلام کی ذلت کا دور بھی اختتام کو پہونچا۔

حافظ ابن قیمؒ نے اپنی کتاب "الصواعق المرسلة" میں باطنیوں کے عروج اور اس کے اثرات، پھر نورالدین اور صلاح الدین کے ہاتھوں اس سلطنت کے زوال کا تذکرہ ان پُرجوش الفاظ میں کیا ہے:۔

"ان باطنیوں کی دعوت مشرق میں تو مضمحل ہوگئی، اور مغرب میں رفتہ رفتہ اس کا ظہور شروع ہوا، یہاں تک کہ وہ بڑی طاقتور دعوت بن گئی، اور اس کے پنجے جم گئے، اور اس کے علمبردار مغربِ اقصیٰ کے اکثر شہروں پر قابض ہو گئے پھر انھوں نے آگے قدم بڑھایا، اور مصر تک پہونچ گئے، انھوں نے اس پر قبضہ کرلیا، اور قاہرہ کی بنیاد رکھی، انھوں نے اور ان کے حکام و قضاۃ نے کھلے طریقہ پر اپنی دعوت کا سلسلہ جاری رکھا، انہی کے زمانہ میں رسائل اخوان الصفا تصنیف ہوئے، اور ابن سینا نے "اشارات" اور "شفا" اور دوسری تصنیفات کیں، خود ابن سینا کا بیان ہے کہ میرے والد حاکم باللہ (فاطمی خلیفہ اور داعی) کے مبلّغین میں سے تھے، ان فاطمیوں کے دور میں سنّت و آثار کا چلن موقوف ہوا، اور کتب سنّت بالائے طاق رکھدی گئیں کہیں کوئی چھپ چھپا کر ان کو دیکھتا ہوگا، اور عمل کرتا ہوگا، اس دعوت کا تمغۂ امتیاز اور بنیادی اصول یہ تھا کہ عقل کو انبیاء علیہم السلام کی وحی و تعلیمات پر ترجیح حاصل ہے۔

رفتہ رفتہ سارے ملک مغرب، مصر و شام و حجاز پر ان باطنیوں کا تسلّط ہوگیا، عراق پر بھی سال بھر ان کا قبضہ رہا، اہلِ سنّت ان کے دورِ حکومت اور ان کی مملکت میں ذمّیوں (مسلمان حکومت کی غیر مسلم رعیت) کی طرح رہتے تھے بلکہ واقعہ یہ ہے کہ ذمّیوں کو وہ امن و امان اور عزّت و اعتبار حاصل تھا، جو اہل سنّت کو نصیب نہ تھا، کتنے علماء اس دور میں قابلِ گردن زدنی قرار پائے، کتنے وارثین انبیاء ان کے قیدخانوں میں پڑے پڑے دنیا سے چلے گئے۔

---

[1] ایضاً ص۲۰

آخر غیرتِ الٰہی کو جوش آیا، اور نور الدین اور صلاح الدین کے ذریعہ اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو ان باطنیوں کے پنجۂ غضب سے چھڑایا، ان ملکوں میں اسلام کا دم واپسیں معلوم ہوتا تھا، لیکن اس انقلاب سلطنت سے اسلام کو نئی زندگی عطا ہوئی، اور اس کا آفتابِ اقبال گہن سے نکلا، اور روئے زمین کے مسلمانوں کو اس سے مسرّت ہوئی، جب کہ ہر طرف یہ پوچھا جا رہا تھا کہ اس دورِ ابتلا میں اسلام کا کوئی حامی و مددگار ہے؟ اللہ تعالیٰ نے اپنے بندے اور لشکرِ مجاہدین کے ذریعہ بیت المقدس کو پرستاران صلیب سے آزاد کرایا، اور اللہ اور اس کے رسولؐ کے انصار نے اپنی اپنی ہمت اور توفیق کے مطابق دینِ حق کی نصرت کا حق ادا کیا۔[1]

اس عصر کی تاریخی کتابوں سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ عالم اسلام نے بالعموم اور شام و عراق نے بالخصوص اس اطلاع کا گرم جوشی کے ساتھ خیر مقدم کیا، اور عام و خاص مسلمانوں نے اس پر بڑی مسرّت کا اظہار کیا۔[2]

اس طرح صلاح الدین نے ایک طرف مجاہدینِ صلیب کے بڑھتے ہوئے سیلاب کو روک کر عالم اسلام کو سیاسی غلامی اور اخلاقی و تہذیبی بدنظمی اور مغربی ترکتازوں کی ہوس کا شکار بننے سے صدیوں تک کے لئے محفوظ کر دیا، دوسری طرف عبیدی (مشہور بفاطمی) حکومت کا خاتمہ کر کے اس نے ایک چشمۂ فساد کو بند کر دیا، جو مصر سے نکل کر عالم اسلام میں باطنیت و اسماعیلیت کے اثرات کو پھیلا رہا تھا، اور دو تین صدیوں سے امت میں ذہنی انتشار اور اعتقادی و اخلاقی فساد کا ذمہ دار تھا، تاریخِ اسلام صلاح الدین کے ان دونوں کارناموں کو کسی طرح فراموش نہیں کر سکتی، اور کسی ملک کا مسلمان اس کردی مجاہد کے بارِ احسان سے سبکدوش نہیں ہو سکتا۔

جزاہ اللہ عن الاسلام والمسلمین خیر الجزاء

---

[1] الصواعق المرسلہ علی الجہمیہ والمعطلہ ج ۱ ص ۲۳۳،۲۳۴ [2] کتاب الروضتین ج ۱ ص ۱۹۰،۱۹۸

شیخ الاسلام عزالدین بن عبدالسّلام

سلطان صلاح الدین کی مجاہدانہ کوششوں، ان کی علمی و دینی سرپرستی، جا بجا دینی مدارس کے قیام، نیز شیعی اثرات کے اضمحلال اور سنی العقیدہ سلاطین کے اثر سے علمی و عملی زندگی میں تازگی پیدا ہوئی، اور علوم شرعیہ کے تعلیم و تعلّم اور ان میں کمال پیدا کرنے کی طرف عالم اسلام میں از سر نو توجہ ہوئی، اس کا نتیجہ تھا کہ ساتویں صدی ہجری میں متعدد باوقار دینی شخصیتیں پیدا ہوئیں، جنھوں نے اپنے اپنے دائرہ میں دعوت و اصلاح کا فریضہ انجام دیا، اور حکومت اور زمانہ کے غلط رجحانات کا مقابلہ کیا، ان میں سب سے زیادہ باعظمت شخصیت شیخ الاسلام عزالدین بن عبدالسلام (م ۶۶۰ھ) کی ہے، جو اپنے علم و تقویٰ اور حق گوئی و بیباکی میں نادرۂ روزگار اور قرونِ اولیٰ کی یادگار تھے۔

علمی عظمت

عزالدین بن عبدالسلام دمشق میں ۵۷۸ھ میں پیدا ہوئے، اساتذۂ دمشق اور مشاہیر علماء سے تعلیم حاصل کی، جن میں فخر الدین بن عساکر، سیف الدین آمدی، حافظ ابو محمد القاسم بن عساکر جیسے اجلّہ علماء او اساتذۂ وقت تھے، بعض روایتوں کے مطابق انھوں نے جوانی میں پڑھنا شروع کیا، لیکن جلد تمام علوم میں تبحر حاصل کرلیا، اور ان کے معاصرین نے ان کی علمی جلالت شان اور عظمت کا اعتراف کیا، علّامہ ابن دقیق العید نے

اپنی بعض تصانیف میں ان کو سلطان العلماء کے لقب سے یاد کیا ہے، وہ جب ۶۳۹ھ میں مصر تشریف لے گئے تو حافظ عبد العظیم المنذری صاحب کتاب "الترغیب والترہیب" نے فتویٰ دینے سے معذوری ظاہر کی، اور کہا کہ جس شہر میں عز الدین بن عبد السلام ہوں، وہاں دوسرے کے لئے فتویٰ دینا درست نہیں، شیخ جمال الدین بن الحاجب کا قول ہے کہ فقہ میں شیخ عز الدینؒ کا پایہ امام غزالی سے بلند ہے۔[۱]

ذہبی اپنی کتاب "العبر" میں لکھتے ہیں:۔

انتهت اليه معرفة المذهب مع الزهد والورع وبلغ رتبة الاجتهاد۔[۲]	فقہ کے علم اور زہد و ورع میں ان کو کمال حاصل تھا، اور درجۂ اجتہاد کو پہونچے ہوئے تھے۔

شیخ عز الدین بن عبد السلام نے عرصہ تک دمشق میں "زاویہ غزالیہ" میں درس دیا، جامع اموی میں خطابت و امامت کے منصب پر عرصہ تک فائز رہے، شیخ شہاب الدین ابو شامہ کا بیان ہے کہ ان کی وجہ سے بدعات کا ازالہ ہوا، جو ان کے زمانہ میں رواج پذیر ہو گئی تھیں، صلاۃ الرغائب اور نصف شعبان[۳] کی کھل کر مخالفت کی، اور ان کو بدعت ثابت کیا، بعض اکابر علماء ان کے بارہ میں ساکت اور متردد تھے، الملک الکامل نے دمشق کے عہدۂ قضا کے لئے بڑا اصرار کیا، شیخ نے بڑی شرطوں کے ساتھ اس کو منظور کیا، اسی عرصہ میں ایک بار وہ الملک الکامل کی طرف سے دربار خلافت (بغداد) میں سفیر بن کر گئے۔

---

[۱] طبقات الشافعیۃ الکبریٰ ج ۵ ص ۸۰ [۲] حسن المحاضرۃ للسیوطیؒ ص ۱۴۱ [۳] صلوٰۃ الرغائب ایک نماز تھی، جو ستائیس رجب کو بارہ رکعتوں اور خاص ترکیب کے ساتھ شب کو پڑھی جاتی تھی، اور اس کی بڑی فضیلت بیان کی جاتی تھی، یہ نماز ۴۴۸ھ میں ایجاد ہوئی، اور عام بدعات کی طرح تیزی سے پھیل گئی، شیخ عز الدین بن عبد السلام نے اس کے ظہور کی پوری تاریخ لکھی ہے، ملاحظہ ہو "اتحاف السادۃ شرح احیاء ص ۴۴۳۔ نصف شعبان پندرہویں شب کو سو رکعتیں خاص ترکیب کے ساتھ پڑھی جاتی تھیں، علمائے اہل سنت کے نزدیک یہ دونوں بدعت ہیں، ابن سبکی نے اس کو بدعت مذمومہ لکھا ہے، امام نووی نے اس کے لئے موضوع، منکر اور قبیح کے الفاظ استعمال کئے ہیں (اتحاف السادۃ ج ۳ ص ۴۲۵-۲۷)

سلاطین کو صلاحِ نیک اور اسلام اور مسلمانوں کی خیر خواہی

شیخ عزالدین کی شخصیت شام میں سب سے بڑی دینی شخصیت تھی، جس کا سلاطین وقت تک احترام کرتے تھے، وہ بڑے باوقار، بارعب اور خود دار تھے، انھوں نے کبھی کسی بادشاہ کے یہاں حاضری دینا یا درباداری کرنا گوارا نہیں کیا، جب کبھی بادشاہ وقت نے خود تشریف آوری کی درخواست کی تو تشریف لے گئے، اور اس کو صحیح مشورہ دیا، اور اس کی اور اسلام، مسلمانوں کی خیر خواہی میں کمی نہیں کی۔

سلطان الملک الاشرف نے مرض الموت میں اپنے سب سے بڑے عہدہ دار کو شیخ کی خدمت میں بھیجا، اور کہلایا کہ آپ کا محب موسیٰ بن الملک العادل ابوبکر سلام عرض کرتا ہے، اور عیادت اور دعا کی درخواست کرتا ہے، اور چاہتا ہے کہ آپ اس کو کوئی ایسی نصیحت فرمائیں، جو کل خدا کے سامنے اس کے کچھ کام آئے، شیخ نے سن کر کہا کہ یہ عیادت افضل عبادت ہے، اس لئے کہ انشاء اللہ اس کا نفع متعدی ہے، چنانچہ تشریف لے گئے، سلطان ان کی تشریف آوری سے بیحد مسرور ہوا، ان کے ہاتھوں کو بوسہ دیا، اس سے پہلے سلطان کو کچھ غلط فہمی ہو گئی تھی، اور سلطان عرصہ تک ان سے ناراض رہا تھا[1] سلطان نے اس کی معافی چاہی اور کہا کہ آپ

---

[1] چھٹی ساتویں صدی میں اشعریت و حنبلیت کے اختلاف نے باوجود بنیادی اتحاد کے تقریباً وہ شکل اختیار کر لی تھی، جو چوتھی صدی میں اعتزال و سنیت کے اختلاف کی تھی، اشاعرہ صفات کی تشریح اور تاویل کرتے تھے، اور حنابلہ اس کو بالکل اپنی حقیقت اور لفظ پر رکھتے تھے، ہر گروہ خوش نیتی کے ساتھ اس کو دینی خدمت اور سنت و شریعت کے ساتھ خیر خواہی سمجھتا تھا لیکن بعد کی صدیوں میں اس کو غیر معمولی اہمیت اور طول دے دیا گیا، اور رائی کا پہاڑ بن گیا، تحزب و تعصب نے اس کو بھی کفر و ایمان کا معیار قرار دے دیا، شیخ عزالدین کے زمانہ میں یہ مباحث بڑی شدت اختیار کر چکے تھے، وہ عقیدۃً و عملاً اشعری تھے، الملک الاشرف حنابلہ کا معتقد اور حنبلیت کی طرف مائل تھا، ابتدا میں اس کو شیخ سے بدگمانی اور شکایت پیدا ہوئی، لیکن شیخ کی ملاقات اور تفصیلی معلومات کے بعد اس کی بدگمانی دور ہو گئی۔ (تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو طبقات الشافعیہ۔ ج ۵ ص ۸۵، ۹۵)

مجھے معاف فرمائیں، میرے لئے دعا بھی فرمائیں اور مجھے کچھ نصیحت بھی فرمائیں، شیخ نے فرمایا کہ جہاں تک معاف کرنے اور باز پرس کرنے کا تعلق ہے، میں روزانہ سونے سے پہلے اللہ کے بندوں کو اپنی طرف سے معاف کر دیتا ہوں، اور اس وقت سوتا ہوں، جب کہ کسی کے ذمہ میرا کوئی حق یا مطالبہ یا شکایت باقی نہیں رہتی، اور میرا اجر مخلوق کے بجائے اللہ کے ذمہ ہوتا ہے "فَمَنْ عَفٰى وَاَصْلَحَ فَاَجْرُهٗ عَلَى اللّٰهِ"۔

باقی رہی دعا تو میں سلطان کے لئے اکثر دعا کیا کرتا ہوں، اس لئے کہ اس کی صلاح میں اسلام اور مسلمانوں کی خیر و فلاح ہے، اللہ تعالیٰ سلطان کو ان امور کی بصیرت عطا فرمائے، جن سے وہ خدا کے سامنے سرخرو ہو، رہی نصیحت تو اب وہ سلطان کی آمادگی اور تقاضے کی وجہ سے فرض واجب ہو گئی ہے، مجھے یہ کہنا ہے کہ آپ کی فتوحات اور دشمنوں پر غلبہ کی دھوم ہے، اس وقت حالت یہ ہو رہی ہے کہ تاتاری اسلامی ممالک میں گھستے چلے جا رہے ہیں، ان کو اس بات سے تسلی ہے کہ آپ کو اس وقت اللہ تعالیٰ کے دشمنوں اور مسلمانوں کے حریفوں سے جنگ کرنے کی فرصت نہیں، اس وقت آپ کا رُخ الملک الکامل سے جنگ کرنے کی طرف ہے، اور آپ ان کے مقابلہ کے لئے پڑاؤ ڈالے پڑے ہیں، الملک الکامل آپ کے بڑے بھائی اور قریبی رشتہ دار ہیں، میں صرف یہ عرض کروں گا کہ آپ اپنا رُخ اپنے بھائی کی طرف سے ہٹا کر دشمنانِ اسلام کی طرف پھیر لیں، اور اس اخیر وقت میں اپنا رشتہ نہ توڑیں، آپ اللہ کے دین کی مدد اور اس کی سربلندی کی نیت کریں، اگر اللہ تعالیٰ سلطان کو صحت عطا فرماتا ہے، تو ہم اللہ سے کفار پر آپ کے غلبہ کی امید رکھتے ہیں، اور آپ کے نامۂ اعمال میں یہ سعادت لکھی جاتی ہے، اور اگر اللہ تعالیٰ کا کچھ اور فیصلہ ہے تو سلطان اپنی نیت کی برکت کے ساتھ دنیا سے جاتے ہیں۔

سلطان نے کہا اللہ تعالیٰ آپ کو اس بروقت تنبیہ اور مخلصانہ مشورہ پر جزائے خیر عطا فرمائے، اسی وقت حکم دیا کہ فوج کا رُخ بجائے مصر کے (جو الملک الکامل کی جانب تھا) تاتاریوں کی طرف کر دیا جائے، اور فوج اس مقام سے کوچ کر کے مقام قصیرہ میں پڑاؤ ڈالے، چنانچہ دن کے دن اس کی تعمیل ہوئی، اور لوگوں کو معلوم ہو گیا کہ بادشاہ کا ارادہ اب تاتاریوں سے مقابلہ کرنے کا ہے۔

الملک الاشرف نے مزید نصیحت کی فرمائش کی، شیخ نے فرمایا کہ بادشاہ تو اس حال میں ہے، اور نائبین سلطنت اور اہل کارانِ حکومت رنگ رلیاں کر رہے ہیں، شراب کے دور چل رہے ہیں، گناہوں کا ارتکاب ہو رہا ہے نئے نئے محاصل اور ٹیکس مسلمانوں پر لگائے جارہے ہیں، آپ کے لئے خدا کے حضور میں سب سے افضل عمل پیش کرنے کا یہ ہو سکتا ہے کہ آپ ان سب گندگیوں کو دور کریں، یہ نئے نئے ٹیکس بند کریں، اور تمام ظالمانہ کارروائیاں روک دیں، اور اہل معاملہ کی دادرسی کریں، الملک الاشرف نے اسی وقت ان سب چیزوں کی ممانعت کے احکام جاری کئے، اور کہا کہ اللہ تعالیٰ آپ کو اس دینی خدمت اور خیر خواہی پر تمام مسلمانوں کی طرف سے جزائے خیر دے، اور اپنے لطف و کرم سے مجھے جنت میں آپ کی معیت نصیب فرمائے، اسی کے ساتھ ایک ہزار دینار مصری نذر کئے، شیخ نے قبول کرنے سے معذرت کی، اور فرمایا، کہ میری یہ ملاقات خالصۃً لوجہ اللہ تھی، میں اس میں دنیا کی کوئی آمیزش نہیں کرنا چاہتا۔

بادشاہ شام کے مقابلہ میں جرأت و استقامت

الملک الاشرف کے جانشین صالح اسمٰعیل (ابو الجیش) نے الملک الصالح نجم الدین ایوب بادشاہِ مصر کے مقابلہ میں (جس کے شام پر حملہ کا خطرہ تھا) فرنگیوں سے مدد چاہی، اور حق الخدمت کے طور پر شہر صیدا اور ثقیف اور چند قلعوں کا پروانہ لکھ دیا، اس دوستانہ تعلق کی بنا پر فرنگی اتنے بے تکلف ہو گئے کہ دمشق میں آکر ہتھیار خریدتے شیخ کو اس بات سے بڑا صدمہ ہوا کہ فرنگی مسلمانوں کے شہر میں آکر ان سے ہتھیار خرید کر مسلمانوں کی گردنوں پر چلائیں، تاجرانِ اسلحہ نے شیخ سے فتویٰ پوچھا، شیخ نے صاف کہا کہ فرنگیوں کے ہاتھ ہتھیار فروخت کرنا حرام ہے، اس لئے کہ تم کو خوب معلوم ہے کہ یہ تمہارے مسلمان بھائیوں کے خلاف کام آئیں گے، شیخ کی طبیعت پر بادشاہ کی اس بے حمیتی اور اسلام کی اس ذلت و بے بسی کا بڑا اثر تھا، انھوں نے بادشاہ کے لئے خطبہ میں دعا ترک کر دی، اس کے بجائے وہ منبر پر دونوں خطبوں سے فارغ ہو کر بڑے جوش کے ساتھ دعا کرتے تھے کہ الٰہی!

اسلام اور حامیان اسلام کی مدد اور نصرت فرما، اور ملحدین و دشمنانِ دین کو ذلت و نکبت نصیب فرما، اور تمام مسلمان بڑی رقت واثر کے ساتھ آمین کہتے تھے، حکومتی آدمیوں نے بڑھا چڑھا کر سلطان کو اس واقعہ کی اطلاع دی، شیخ کی گرفتاری کا فرمان صادر ہوا، شیخ ایک عرصہ تک محبوس رہے، کچھ عرصہ کے بعد وہ دمشق سے بیت المقدس منتقل کئے گئے۔

اسی اثناء میں سلطان صالح اسمٰعیل، الملک المنصور والیٔ حمص، اور سلاطینِ فرنگ اپنی افواج وعساکر کے ساتھ مصر کے ارادہ سے بیت المقدس آئے، صالح اسمٰعیل کے دل میں شیخ عزالدین کی ناراضگی برابر کھٹکتی رہتی تھی، اور اس کو اس کی فکر تھی، اس نے اپنے عمائد وخواص میں سے ایک شخص کو اپنا رومال دیا، اور کہا کہ یہ رومال شیخ کی خدمت میں پیش کرنا، اور انتہائی خوشامد واستمالت کے ساتھ ان سے کہنا کہ سابقہ خدمات ومناصب پر آپ پورے اعزاز کے ساتھ واپس آسکتے ہیں، اگر وہ منظور فرمالیں تو میرے پاس لے آنا، اگر منظور نہ کریں تو میرے خیمہ کے پہلو میں دوسرے خیمہ میں ان کو محبوس کر دینا، امیر نے شیخ سے بڑی خوشامدانہ باتیں کیں، اور ان کی تعظیم وتکریم اور ان کی دلجوئی میں کوئی دقیقہ اٹھا نہیں رکھا، اور آخر میں کہا کہ آپ ذرا آگے ذرا بادشاہ سے نیازمندانہ مل لیں، اور اس کی دست بوسی کرلیں، تو یہ قصہ رفع دفع ہوجائے گا، اور آپ اضافہ وترقی کے ساتھ اپنے سابقہ عہدوں پر واپس آجائیں گے، شیخ نے اس کا جو جواب دیا وہ تاریخ میں ہمیشہ یادگار رہے گا، انھوں نے فرمایا:-

واللہ یا مسکین ما ارضاہ ان تقبل یدی	اے نادان! میں تو اس کا بھی روادار نہیں کہ بادشاہ
فضلاً عن اقبل یدہ، یا قوم انتم فی واد	میرے ہاتھ کو بوسہ دے چہ جائیکہ میں اس کی دست بوسی
وانا فی واد والحمد للہ الذی عافانی	کروں، لوگو! تم کسی اور عالم میں ہو میں کسی اور عالم میں
مما ابتلاکم بہ۔ (طبقات الشافعیہ۔ ج۵)	خدا کا شکر ہے کہ میں اس سے آزاد ہوں جس میں تم گرفتار ہو۔

یہ جواب سن کر امیر نے کہا کہ پھر مجھے حکم ہے کہ میں آپ کو گرفتار کرلوں، شیخ نے کہا شوق سے جو کچھ تم سے ہوسکے اس سے دریغ نہ کرو، امیر نے ان کو بادشاہ کے خیمہ کے پہلو میں دوسرے خیمہ میں رکھا، شیخ اپنے خیمہ میں قرآن مجید

پڑھتے رہتے تھے، اور بادشاہ اپنے خیمہ کے اندر سنتا تھا، ایک روز بادشاہ نے فرنگی بادشاہوں سے کہا کہ تم شیخ کو قرآن مجید پڑھتا ہوا سنتے ہو؟ انھوں نے کہا کہ ہاں! کہا جانتے ہو، یہ مسلمانوں کا سب سے بڑا پادری ہے (ھذا اکبر قسوس المسلمین) میں نے اس کو اس لئے قید کیا ہے کہ وہ تم کو مسلمانوں کے قلعہ سپرد کر دینے کے خلاف تھا، اور اس پر معترض تھا، میں نے اس کو دمشق کی خطابت اور دوسرے منصبوں سے معزول کیا، اور اس کو دمشق سے شہر بدر کر دیا، اب میں نے تمہاری خاطر پھر اس کو قید کر دیا ہے، عیسائی بادشاہوں نے کہا کہ اگر یہ ہمارا پادری ہوتا تو ہم اس کے پاؤں دھو کے پیتے[1]۔

اسی عرصہ میں مصری افواج آئیں، صالح اسمٰعیل کو شکست ہوئی، فرنگی افواج قتل و غارت ہوئیں، اور شیخ صحیح و سلامت مصر روانہ ہو گئے۔

راستہ میں جب کرک کی ریاست سے گزرنا ہوا تو والیٔ کرک نے قیام کی درخواست کی، فرمایا کہ:۔

"تمہارا یہ مختصر شہر میرے علم کا متحمل نہیں ہو سکتا"۔

شیخ عزالدین مصر میں

مصر میں سلطان مصر الملک الصالح نجم الدین نے شیخ کو ہاتھوں ہاتھ لیا، جامع عمرو ابن العاص کا خطیب مقرر کیا، اور الوجہ القبلی مصر کا عہدۂ قضا، اور ویران مساجد کی آبادی کا کام سپرد کیا، سلطان نے جب مدرسہ صالحیہ کی تعمیر کی، تو مذہب شافعی کی تعلیم شیخ عزالدین کے سپرد کی، اور انھوں نے پورے انہماک کے ساتھ تعلیم و اشاعت علم کا فرض انجام دیا، اور لوگوں کو بہت نفع ہوا۔

شیخ کی حق گوئی و بیباکی

اسی دوران میں ایک مرتبہ فخر الدین عثمان نے جو قصر شاہی کا مہتمم اور عملاً سلطنت مصر کا منتظم اعلیٰ تھا

[1] طبقات الشافعیۃ الکبریٰ ج ۵ صفحہ ۱۰۱ بروایت شیخ شرف الدین عبداللطیف فرزند شیخ عزالدین ابن عبدالسلام

مصر کی ایک مسجد کی چھت پر طبل خانہ کی عمارت بنوائی اور وہاں طبل ونقارہ بجنے لگا، شیخ عزالدین کو جب اس واقعہ کی تحقیق ہوئی تو انھوں نے (بحیثیت قاضی اور مہتمم مساجد کے) اس عمارت کے انہدام کا حکم دے دیا اور اس جرم میں فخرالدین کو ساقط الشہادۃ قرار دیا، اور ساتھ ہی ساتھ عہدۂ قضا سے استعفا دے دیا، اس کارروائی سے سلطان کی نگاہ میں شیخ کی منزلت کم نہیں ہوئی، مگر اس نے عہدۂ قضا پر شیخ کا دوبارہ تقرر نہیں کیا، ادھر شیخ کے فیصلوں کا اتنا احترام اور ان کا دینی نفوذ واثر اس قدر تھا کہ اسی زمانہ میں الملک الصالح سلطان مصر نے خلیفۂ بغداد کی خدمت میں ایک سفارت بھیجی، جب سفیر کی باریابی ہوئی، اور اس نے سلطانِ مصر کا پیغام پہونچایا تو اس سے دریافت کیا گیا کہ یہ پیغام تم نے خود سلطانِ مصر کی زبان سے سنا ہے، یا کسی کے واسطہ سے؟ اس نے کہا کہ میں نے یہ پیغام مہتمم قصر شاہی فخرالدین کی زبان سے سنا ہے، خلیفہ نے کہا کہ فخرالدین کی شہادت معتبر نہیں، اس کو شیخ عزالدین نے ساقط الشہادۃ قرار دیا ہے، اس لئے ہم اس کی روایت قبول نہیں کر سکتے، اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ سفارت پھر مصر واپس آئی، اور براہِ راست سلطان سے پیغام سن کر بغداد واپس ہو کر خلیفہ کو پیغام پہونچایا۔

ان کی جرأت کا اس سے زیادہ حیرت انگیز واقعہ یہ ہے کہ عید کے دن قلعہ میں دربارِ شاہی تھا، بادشاہ اپنے تزک واحتشام کے ساتھ سریر آرا تھا، دورویہ افواجِ شاہی دست بستہ کھڑی تھیں، امراء حاضر ہو کر آداب و تسلیمات بجا لاتے تھے، اور زمین بوس ہوتے تھے، اس بھرے دربار میں دفعۃً شیخ نے بادشاہ کو نام لے کر خطاب کیا، اور کہا کہ "ایوب! خدا کو تم کیا جواب دو گے، جب پوچھا جائے گا کہ ہم نے تم کو مصر کی سلطنت اس لئے دی تھی کہ شراب آزادی سے پی جائے؟ بادشاہ نے کہا کیا یہ واقعہ ہے؟ شیخ نے بلند آواز سے فرمایا، ہاں فلاں میخانہ میں شراب آزادی سے بک رہی ہے، اور دوسرے ناگفتنی کام ہو رہے ہیں، اور تم یہاں بیٹھے دادِ عیش دے رہے ہو، بادشاہ نے کہا کہ جناب والا مجھے اس میں کچھ دخل نہیں، یہ میرے والد کے زمانہ سے ہو رہا ہے، شیخ نے فرمایا کہ پھر تم بھی انہی لوگوں میں سے ہو، جن کا جواب یہ ہوتا ہے "اِنَّا وَجَدْنَا اٰبَآءَنَا عَلٰٓی اُمَّۃٍ" (یہ ہمارے باپ دادا کے زمانہ سے چلا آیا ہے) سلطان نے فوراً اس شراب خانہ کی بندش کا حکم جاری کیا۔

شیخ کے ایک شاگرد کہتے ہیں کہ دربار سے واپسی پر میں نے عرض کیا کہ حضرت! کیا واقعہ ہے؟ فرمایا کہ میں نے بادشاہ کو جب اس شان و شوکت کے ساتھ اجلاس کرتا ہوا دیکھا تو مجھے اندیشہ ہوا کہ کہیں یہ منظر دیکھ کر اس پر تکبّر کا حملہ ہو، اور وہ اپنے نفس کا شکار ہو جائے، میں نے اس کی اصلاح کے لئے یہ بات کہی، میں نے کہا کہ آپ کو کچھ خوف نہیں معلوم ہوا؟ فرمایا اللہ تعالیٰ کی ہیبت و جلال اس وقت ایسا مستحضر اور پیش نظر تھا کہ وہ مجھے اس کے مقابلہ میں ایک بلّے کی طرح معلوم ہوتا تھا۔[1]

فرنگیوں سے جہاد

وہ زمانہ فرنگیوں کی ریشہ دوانیوں سے خالی نہ تھا، ایک مرتبہ فرنگی فوجیں منصورہ تک پہونچ گئیں، اور مسلمانوں پر انھوں نے غلبہ حاصل کر لیا، شیخ مسلمانوں کے ساتھ شریک جہاد تھے، اللہ تعالیٰ نے ان کو استجابتِ دعا کی نعمت عطا فرمائی تھی، ابن السبکی طبقات میں لکھتے ہیں کہ ان کی دعا سے اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو فتح دی، ہوا کا رُخ بدل گیا، فرنگیوں کے جہاز ٹوٹ گئے، اور اکثر فرنگی غرق ہوئے۔[2]

مصارفِ جہاد کے لئے شیخ کا انتظام

اس زمانہ میں تاتاری عالمِ اسلام پر جا بجا سے یورش کر رہے تھے، اسی اثناء میں انھوں نے مصر کا رخ کیا، تاتاریوں کی مسلمانوں پر جو ہیبت بیٹھی ہوئی تھی، وہ ضرب المثل ہے، مصر میں سراسیمگی پھیل گئی، سلطان مصر اور اہل مصر کی ہمت مقابلہ کی نہیں ہوتی تھی، شیخ الاسلام نے ہمت دلائی، اور فرمایا کہ تم اللہ کا نام لے کر نکلو، میں فتح کی ضمانت کرتا ہوں، بادشاہ نے کہا کہ میرے خزانہ میں روپیہ کم ہے، میں تجّار سے قرض لینا چاہتا ہوں، شیخ نے فرمایا کہ "پہلے اپنے محل کے جواہرات، اور اپنی بیگمات کے زیورات نکالو، ارکانِ سلطنت،

---

[1] طبقات الشافعیہ ص۲ [2] ایضاً ص۸۴

اور امراء دربار اپنی بیگمات کے وہ زیورات حاضر کریں، جو حرام ہیں، اور اس کے سکے ڈھلوائے جائیں، اور وہ لشکر میں تقسیم ہوں، اس کے بعد اگر ضرورت ہو تو قرض لیا جا سکتا ہے، لیکن اس سے پہلے قرض کی کوئی ضرورت نہیں، شیخ کا اتنا رعب تھا کہ بادشاہ اور امراء سلطنت نے بے چون و چرا جواہرات و زیورات شیخ کے سامنے حاضر کر دیئے، اور ان سے جنگ کے مصارف پورے ہو گئے، اور مسلمانوں کو فتح ہوئی۔

امراء سلطنت کا نیلام

شیخ کی زندگی کا سب سے زیادہ حیرت انگیز اور اہم واقعہ یہ ہے کہ انھوں نے ان امراء سلطنت کو نیلام کیا، جو ان کے نزدیک مسلمانوں کے بیت المال کی ملکیت تھے، اور شرعی طریقہ پر آزاد نہیں کئے گئے تھے، یہ امراء سلطنت نسلاً ترک تھے، اور سلطنتِ مصر پر بڑے حاوی تھے، ان میں سے ایک نائب السلطنت تھا، شیخ نے فتویٰ دیا کہ جب تک یہ امراء شرعی طریقہ پر آزاد نہ ہوں، ان کے معاملات شرعاً صحیح نہیں ہیں، اور وہ عالم غلاموں کے حکم میں ہیں، ان کے فتویٰ کا اثر یہ ہوا کہ لوگوں نے ان کے ساتھ معاملہ کرنے میں احتیاط شروع کر دی اور وہ بڑی دقت میں پڑ گئے، یہ دیکھ کر ان امراء کے حلقہ میں بڑی برہمی اور تشویش پیدا ہوئی، انھوں نے ایک دن جمع ہو کر شیخ کو طلب کیا، اور کہا کہ آپ کیا چاہتے ہیں، شیخ نے فرمایا کہ ہم ایک مجلس طلب کریں گے، اور بیت المال کی طرف سے آپ کا نیلام کریں گے، اور شرعی طریقہ پر آپ کو آزادی کا پروانہ دیا جائے گا، انھوں نے سلطان سے عرض کیا کہ شیخ ہم کو ذلیل کرنا چاہتے ہیں، اور سر بازار نیلام کرنے کو کہتے ہیں، بادشاہ نے شیخ کو راضی کرنا چاہا، مگر انھوں نے اپنی رائے سے رجوع نہیں کیا، اس گفت و شنید میں بادشاہ کی زبان سے کوئی ایسا کلمہ نکل گیا، جو شیخ کے خلاف شان تھا، بادشاہ نے اس کا بھی اظہار کیا کہ شیخ کو اس معاملہ سے کیا تعلق، اور وہ امراء کے قضیہ میں کیوں پڑتے ہیں، شیخ یہ سن کر ناراض ہوئے، اور انھوں نے مصر سے چلے جانے کا عزم کر لیا، اپنا سامان جانور پر بار کیا، اور گھر والوں کو سوار کیا، اور روانہ ہو گئے، ان کی روانگی

کی خبر سن کر قاہرہ میں کھلبلی مچ گئی، شہر کی مسلمان آبادی کا بڑا حصہ ان کے پیچھے ہولیا، علماء، صلحاء، تجار، سب ان کے پیچھے پیچھے روانہ ہوگئے، سلطان کو اطلاع ہوئی، اور کسی نے اس سے کہا کہ شیخ عزالدین چلے گئے تو تمھاری سلطنت جاتی رہے گی، سلطان خود سوار ہو کر ان کے پاس پہنچا، اور ان کو منا کر شہر واپس لایا اور طے ہوا کہ امراء سلطنت کا وہ خود نیلام کریں، یہ سن کر نائب السلطنت نے بڑے خوشامدانہ لہجہ میں ان کو اس ارادہ سے باز رکھنا چاہا، لیکن وہ اپنی رائے پر قائم رہے، نائب کو غصہ آگیا، اس نے کہا کہ یہ شیخ کیسے ہمارا نیلام کرے گا، ہم ملک کے حاکم ہیں؟ خدا کی قسم! میں اس تلوار سے اس کی گردن اڑا دوں گا، چنانچہ وہ اپنے عملہ کے ساتھ سوار ہو کر شیخ کے دروازہ پر پہنچا، ننگی تلوار اس کے ہاتھ میں تھی، دروازہ کھٹکھٹایا، شیخ کے صاحبزادہ باہر نکلے تو یہ حال دیکھا کہ نائب السلطنت شمشیر برہنہ لئے دروازہ پر کھڑا ہے، انھوں نے اندر جا کر شیخ سے یہ حال کہا، شیخ نے بے پروائی سے جواب دیا کہ "بیٹا! تمہارے والد کا یہ رتبہ کہاں کہ اللہ کے راستہ میں شہید ہو" یہ کہہ کر وہ باہر نکلے، ان کا نکلنا تھا کہ تلوار نائب السلطنت کے ہاتھ سے چھوٹ گئی اور اس کے جسم پر رعشہ طاری ہوگیا، اس نے رو کر شیخ سے دعا کی درخواست کی، اور کہا کہ میرے آقا! آپ کیا کرنا چاہتے ہیں، فرمایا "میں تمہارا نیلام کروں گا، اور تمہیں فروخت کروں گا" اس نے کہا کہ "ہماری قیمت آپ کس مد میں صرف کریں گے؟" فرمایا "مسلمانوں کے کاموں میں" اس نے عرض کیا کہ "قیمت وصول کون کرے گا" فرمایا "میں خود" اس نے کہا "بہت اچھا" چنانچہ شیخ نے ایک ایک کر کے سب امراء کو نیلام کیا، ہر ایک پر بولی بولی گئی، شیخ نے (ان کے اعزاز کے طور پر) ان کے دام بہت لگائے، اور بہت بڑی بولی پر ان کو فروخت کیا، اور قیمت وصول کر کے خیر کے کاموں میں صرف کی، اور وہ آزاد ہو کر اپنے اپنے گھر گئے،[1] ابن السبکی لکھتے ہیں کہ "یہ واقعہ کسی اور کے متعلق سننے میں نہیں آیا" ایک عالم کی عظمت اور اس کے رعب و داب کی یہ انتہائی مثال ہے۔

شیخ عزالدین اور سلاطین مصر

مصر میں شیخ کی زندگی میں بڑے انقلابات آئے، وہ مصر آئے تھے تو ایوبی سلطنت کا زمانہ تھا، اور

---

[1] طبقات الشافعیۃ الکبریٰ ج ۵ ص ۸۴، ۸۵

صلاح الدین کا خاندان حکومت کر رہا تھا، ان کی زندگی ہی میں یہ خاندان ختم ہوا، الملک الصالح نجم الدین ایوب کے جانشین الملک المعظم توران شاہ کے بعد ترکی النسل امراء کا دورِ حکومت آیا، وہ سب شیخ کے قدردان اور نیازمند رہے اور ان کی تعظیم و تکریم اور بزرگداشت میں کوئی کمی نہیں آئی، خصوصیت کے ساتھ مصر کا نامور ترک سلطان الملک الظاہر بیبرس، شیخ کا بڑا ادب شناس اور ان کی شخصیت سے متاثر تھا، شیخ ہی کے مشورہ سے سقوطِ بغداد اور سلطنتِ عباسیہ کے اختتام پر سلطان نے بغداد کے آخری خلیفہ مستعصم کے چچا ابو القاسم احمد کو جن کا لقب المستنصر ہے، ۶۵۹ھ/۱۲۶۱ء میں مصر میں اعزاز و اکرام کے ساتھ ٹھہرایا، پہلے شیخ عزالدین نے بیعت کی، پھر الملک الظاہر بیبرس نے، پھر قاضی القضاۃ تاج الدین وغیرہ نے۔[1]

مکارمِ اخلاق

شیخ اپنے علم و فضل، وقار و ہیبت کے ساتھ بڑے کریم النفس، فیاض اور مخیر تھے، قاضی القضاۃ بدر الدین بن جماعہ ناقل ہیں کہ دمشق کے زمانۂ قیام میں ایک سال بڑی گرانی کا آیا، باغات کے دام بہت گر گئے، اور بہت سستے بکنے لگے، شیخ کی اہلیہ محترمہ نے ان کو ایک زیور دیا کہ گرمی گزارنے کے لئے ایک باغ خرید لیں، انھوں نے وہ زیور فروخت کرکے ساری قیمت خیرات کر دی، اہلیہ نے پوچھا کہ آپ نے باغ خرید لیا؟ فرمایا کہ "ہاں! مگر جنت میں، میں نے دیکھا کہ لوگ بڑی عسرت اور تکلیف میں ہیں، میں نے اس کی قیمت ان پریشان حال لوگوں پر صرف کر دی" انھوں نے فرمایا، جزاک اللہ۔"

قاضی القضاۃ موصوف یہ بھی بیان کرتے ہیں کہ شیخ تنگ حالی کے باوجود بڑے فراخ دست اور مخیر تھے، یہاں تک کہ بعض اوقات ان کے پاس کچھ دینے کو نہ ہوتا تو اپنا عمامہ چیر کر اس کا ایک ٹکڑا دے دیتے۔

شیخ عزالدین صرف سلاطین ہی کے مقابلہ میں جری اور حق گو نہ تھے، بلکہ اپنے نفس کے معاملہ میں بھی

---

[1] حسن المحاضرہ ج ۲ ص ۳۹

اسی طرح بیباک اور حق شناس تھے، ابن السبکی اور سیوطی راوی ہیں کہ ایک مرتبہ مصر کے زمانۂ قیام میں ان سے ایک فتویٰ میں غلطی ہوگئی تو انھوں نے اعلان کروا دیا کہ جس کو ابن عبد السلام نے فلاں فتویٰ دیا ہو، وہ اس پر عمل نہ کرے اس لئے کہ وہ غلط ہے[1]۔

ابن السبکی کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ شیخ علوم ظاہری کے کمالات کے ساتھ دولت باطنی سے بھی مالامال تھے، اگرچہ ان کے ایمان ویقین، اعتماد علی اللہ، بے خوفی وشجاعت، اربابِ دنیا کی بے وقعتی کے واقعات خود اس پر دلیل ہیں، لیکن ابن السبکی نے طبقات میں تصریح کی ہے کہ انھوں نے امام طریقت شیخ شہاب الدین سہروردیؒ سے استفادہ کیا تھا، اور ان کی طرف سے ارشاد وتربیت کے لئے مجاز تھے[2]، سیوطی نے شیخ ابوالحسن شاذلیؒ سے بھی ملاقات واستفادہ کا ذکر کیا ہے[3]۔

امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے بارہ میں شیخ کا مسلک

شیخ علمی ونظری طور پر بھی اس کے قائل تھے کہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر بدعات اور گمراہیوں کی علانیہ مخالفت وانکار علماء کا فریضہ ہے، اور اس سلسلہ میں ان کو خطرات اور شدائد بھی برداشت کرنے چاہئیں، اور ہر طرح کے مصائب کے لئے تیار رہنا چاہیئے۔

الملک الاشرف کے نام ایک خط میں لکھتے ہیں:۔

وبعد ذلک فانا نزعم انا من جملۃ	ہمارا دعویٰ ہے کہ ہم اللہ تعالیٰ کی جماعت میں سے
حزب اللہ وانصار دینہ وجندہ	ہیں، اور اس کے دین کے مددگار اور اس کا لشکر
وکل جندی لایخاطر بنفسہ فلیس	ہیں، وہ لشکری جو اپنے کو خطرہ میں ڈالنے کے لئے
بجندی۔[4]	تیار نہ ہو، وہ لشکری نہیں ہے۔

[1] حسن المحاضرہ ص ۱۴۲، ۱۴۳ [2] طبقات ج ۵ ص ۸۳ [3] حسن المحاضرہ ص ۱۴۲ [4] طبقات ج ۵ ص ۹۵

ان کا خیال تھا کہ علم وزبان علماء کا ہتھیار ہیں، اس لئے ان کا جہاد یہ ہے کہ وہ ان دونوں کو حق کی تائید اور باطل کی مخالفت میں کام میں لائیں، ایک دوسرے خط میں لکھتے ہیں:۔

قد امرنا الله بالجهاد في نصرة دينه، الا ان سلاح العالم علمه ولسانه كما ان سلاح الملك سيفه وسنانه، فكما لا يجوز للملوك اغماد اسلحتهم عن الملحدين والمشركين لا يجوز للعلماء اغماد السنتهم عن الزائغين والمبتدعين۔[1]	اللہ تعالیٰ نے ہم کو اپنے دین کی مدد کے لئے جہاد و جد وجہد کا حکم دیا ہے، اور یہ کھلی ہوئی بات ہے کہ عالم کا ہتھیار اس کا علم اور اس کی زبان ہے، جیسا کہ بادشاہ کا ہتھیار اس کی تلوار اور تیر وسنان ہے تو جس طرح بادشاہوں کے لئے اپنے ہتھیاروں کو نیام میں رکھنا جائز نہیں، اسی طرح علماء کے لئے اہل زیغ وضلال اور مبتدعین سے اپنی زبان کو بند کرنا جائز نہیں۔

ان کے نزدیک امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے سلسلہ میں عالم ربانی کو ہر طرح کے خطرات برداشت کرنا چاہئیں گویا ان کو ان علماء سے اتفاق نہیں ہے جو ہر طرح کے خطرہ میں پڑنے کو مطلقاً ناجائز سمجھتے ہیں اور آیت "وَلَا تُلْقُوْا بِاَيْدِيْكُمْ اِلَى التَّهْلُكَةِ" سے غلط اور بے محل استدلال کرتے ہیں، اسی خط میں بڑے موثر انداز میں فرماتے ہیں:۔

والمخاطرة بالنفوس مشروعة في اعزاز الدين، ولذلك يجوز للبطل من المسلمين ان ينغمر في صفوف المشركين وكذلك المخاطرة بالامر بالمعروف والنهي عن المنكر ونصرة قواعد الدين بالحجج والبراهين	دین کے اعزاز وغلبہ کے لئے جانوں کو خطرہ میں ڈالنا دین میں مشروع ہے، اسی لئے مسلمان شہ زور کے لئے جائز ہے کہ مشرکین کی صفوں میں گھس جائے، اسی طرح سے امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے سلسلہ میں اپنے کو خطرہ میں ڈالنا اور اصول دین کی دلائل وبراہین کے ذریعہ تقویت مشروع ہے

[1] طبقات الشافعیۃ الکبریٰ ج ۵ ص ۱۰-۱۲

مشروعة فمن خشی علی نفسه سقط عنه	البتہ جس کو اپنی جان کا خطرہ ہو اس سے وجوب ساقط
الوجوب وبقی الاستحباب ومن قال بان	ہو جائے گا، اور استحباب باقی رہے گا، جس کا خیال ہے کہ
التغزیر بالنفوس لایجوز فقد بعد عن الحق	جان کو خطرہ میں ڈالنا جائز ہی نہیں، وہ حق سے بہت
ونأی عن الصواب وعلی الجملة فمن آثر	دور ہو گیا اور اس کا یہ خیال بالکل صحیح نہیں، خلاصہ
الله علی نفسه آثره الله ومن طلب رضا	یہ کہ جو اللہ کو اپنے نفس پر ترجیح دے گا، اللہ اس کو دوسروں
الله بما یسخط الناس رضی الله عنه وارضی	پر ترجیح دے گا، اور جو لوگوں کو ناراض کر کے اللہ کو راضی
عنه الناس ومن طلب رضا الناس بما	کرنے کی کوشش کرے گا، اللہ اس سے خود بھی راضی
یسخط الله سخط الله علیه واسخط علیه	ہو جائے گا، اور لوگوں کو راضی کر دے گا، اور جو اللہ کو
الناس وفی رضا الله کفایة عن رضا	ناراض کر کے لوگوں کو راضی کرنے کی کوشش کرے گا،
کل احد۔ (طبقات ج ۵ ص ۹۱)	اللہ اس سے ناراض ہوگا، اور لوگوں کو بھی ناراض کر دے گا۔

عرب شاعر نے خوب کہا ہے:۔

فلیتك تحلو والحیاة مریرة ولیتك ترضی والانام غضاب

(کاش کہ آپ کی محبت کی حلاوت مجھے حاصل ہو جاتی، پھر چاہے زندگی کتنی ہی تلخ ہوتی، اور کاش کہ آپ مجھ سے راضی ہو جاتے، چاہے ساری دنیا ناراض ہوتی۔)

ان کی زندگی بتلاتی ہے کہ انھوں نے ساری عمر اپنے اس عقیدہ اور مسلک پر عمل کیا، اور امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے سلسلہ میں اور اپنے نزدیک کسی غلط اور خلافِ شرع چیز کی تردید میں اپنی جان مال آبرو وطن وعہدہ کی کبھی پرواہ نہیں کی۔

شیخ کی تصنیفات

شیخ جس طرح کامیاب مدرس، وسیع النظر فقیہ اور متبحر مفتی تھے، اسی طرح کہنہ مشق مصنف بھی تھے،

ان کی تصنیفات میں "القواعد الکبریٰ" اور کتاب "مجاز القرآن" خاص وقعت رکھتی ہے، ابن السبکی لکھتے ہیں:

وھذان الکتابان شاھدان بامامتہ	یہ دونوں کتابیں ان کی امامت اور علوم شریعت
وعظیم منزلتہ فی علوم الشریعۃ۔[1]	میں ان کے علوِ منزلت پر شاہد ہیں۔

ان دونوں کتابوں کا انھوں نے دو الگ کتابوں میں اختصار کیا ہے، ابن السبکی نے ان کی دو اور کتابوں "شجرۃ المعارف" اور "الدلائل المتعلقۃ بالملائکۃ والانس علیہم السلام" کی بھی خصوصی تعریف کی ہے، ان کی ایک کتاب "مقاصد الصلاۃ" خود ان کے زمانہ میں بڑی مقبول ہوئی، اور لوگوں نے اس کی ہزاروں نقلیں کیں،[2] چھوٹی بڑی تصنیفات کے علاوہ ان کے فتاویٰ کا ضخیم مجموعہ ہے، جو فقہ شافعی کا قیمتی ذخیرہ ہے۔

امام غزالیؒ کے بعد شیخ عزالدین غالباً دوسرے عالم اور مصنف ہیں جنھوں نے خصوصیت کے ساتھ احکام شرعیہ کے مقاصد ولطائف پر گفتگو کی، اور شریعت کے اسرار ونکات بیان کئے، اس موضوع کے سب سے بڑے مصنف شیخ الاسلام شاہ ولی اللہ صاحبؒ محدث دہلوی نے "حجۃ اللہ البالغۃ" کے مقدمہ میں اس موضوع کے پیش رو مصنفین میں تین بزرگوں حجۃ الاسلام غزالی، ابوسلیمان خطابی اور شیخ الاسلام عزالدین کا نام لیا ہے۔[3]

شیخ کی وفات

۹ جمادی الاولیٰ ۶۶۰ھ میں ۸۳ سال کی عمر میں شیخ کی وفات ہوئی، یہ الملک الظاہر بیبرس کا عہد حکومت تھا، اس کو شیخ کی وفات کا بڑا صدمہ ہوا، کہتا تھا کہ خدا کی شان ہے شیخ کی وفات میرے عہد حکومت ہی میں مقدر تھی، جنازہ میں امراء دربار، ارکانِ سلطنت اور افواجِ شاہی شریک تھیں، سلطان نے خود کاندھا دیا، اور دفن میں شریک ہوا۔

شیخ کا جنازہ جب قلعہ کے نیچے سے گزرا اور سلطان نے خلقت کا ازدحام دیکھا تو اپنے خواص میں سے کسی سے کہا کہ آج میں سمجھتا ہوں کہ میری سلطنت مضبوط ہوئی ہے، اس لئے کہ یہ شخص جو مرجع خلائق ہے، اگر اشارہ کر دیتا تو میری سلطنت چلی جاتی، اس کے انتقال کے بعد مجھے اب اپنی سلطنت کی طرف سے اطمینان ہوا ہے۔[4]

---

[1] طبقات الشافعیۃ الکبریٰ ج۵ ص۱۰۳ [2] ایضاً ج۵ ص۹۸ [3] حجۃ اللہ البالغۃ ص۵ مطبع صدیقی [4] طبقات الشافعیۃ الکبریٰ ج۵ ص۸۴

فتنۂ تاتار اور اسلام کی ایک نئی آزمائش

تاتاری حملے اور اس کے اسباب

ساتویں صدی میں عالم اسلام کو وہ حادثہ پیش آیا جس کی نظیر دنیا کی تاریخ میں مشکل سے ملے گی، اور جو قریب تھا کہ اس کی ہستی کو فنا کردے، یہ تاتاری غارتگروں کا حملہ تھا، جو مور و ملخ کی طرح مشرق سے بڑھے، اور سارے عالم اسلام پر چھا گئے۔

اس منحوس واقعہ کا سبب سلطانِ وقت علاء الدین محمد خوارزم شاہ کی بظاہر ایک غلطی اور بے تدبیری تھی کہ اس نے پہلے ان تاتاری تاجروں کو قتل کرادیا، جو اس کے ملک میں تجارت کے لئے آئے تھے، پھر جب چنگیز خاں نے اس کا سبب دریافت کرنے کے لئے ایک سفارت بھیجی تو خوارزم شاہ نے سفیر کو بھی قتل کرادیا، اس پر تاتاری خاقان چنگیز خاں نے برافروختہ ہو کر خوارزم شاہی سلطنت اور پھر پورے عالم اسلام پر حملہ کردیا۔

لیکن قرآن مجید میں اعمال و اخلاق کے نتائج اور اقوام و ملل کے عروج و زوال کا جو ابدی اور عالمگیر قانون بتایا گیا ہے، اور خاص طور پر سورۂ اسرا کی ابتدا میں بنی اسرائیل کی تباہی، قتل عام و نکبت و ذلت، اور بیت المقدس کی تخریب و بے حرمتی کی جو داستانِ عبرت سنائی گئی ہے[۱]، اس کی روشنی میں اس فتنۂ عالم آشوب

---

[۱] اس موقع پر سورۂ اسرا کی آیات "وَقَضَيْنَا إِلَىٰ بَنِي إِسْرَائِيلَ فِي الْكِتَابِ لَتُفْسِدُنَّ فِي الْأَرْضِ مَرَّتَيْنِ وَلَتَعْلُنَّ عُلُوًّا كَبِيرًا" سے لے کر "وَلِيُتَبِّرُوا مَا عَلَوْا تَتْبِيرًا" تک آیات پر غور کیا جائے۔

اور اس وقت کی دنیائے اسلام کی اس قیامتِ صغریٰ کا حقیقی سبب صرف اتنا نہیں معلوم ہوتا کہ ایک بادشاہ نے کوتاہ نظری و بے تدبیری سے کام لیا، اور اچانک یہ سیلاب عالمِ اسلام پر امنڈ پڑا، اور ایک فرد کی غلطی سے ساری ملت اسلامیہ کو یہ روزِ بد دیکھنا پڑا، جس کے لئے نہ وہ تیار تھی، نہ اس کی مستحق، قرآن مجید کا چراغ اگر ہاتھ میں لے کر اس وقت کے مسلمانوں کی اخلاقی، دینی، تمدنی اور سیاسی حالات کا بالغور مطالعہ کیا جائے تو یہ حقیقت روز روشن کی طرح سامنے آجاتی ہے کہ یہ منحوس واقعہ اچانک پیش نہیں آیا، اور اس کے اسباب اس سے کہیں زیادہ وسیع، گہرے اور ٹھوس ہیں، جتنے سمجھے اور بیان کئے گئے ہیں، اس کے لئے ہم کو کئی سال پیچھے ہٹ کر اپنا کام شروع کرنا پڑے گا، اور اس وقت کی اسلامی سلطنتوں، اہم ترین تمدنی مراکز اور اسلامی معاشرہ پر ایک اجمالی نگاہ ڈالنی ہوگی۔

سلطان صلاح الدین ایوبی کی وفات (۵۸۹ھ) پر اس کی وسیع و زرخیز سلطنت اس کی اولاد و خاندان کے افراد میں تقسیم ہوگئی، دنیا کے بہت سے بانیانِ سلطنت اور اولوالعزم فرمانرواؤں کی طرح[1] اس کی اولاد اس کی صلاحیتوں کی وارث اور اس کی صحیح جانشین ثابت نہ ہوسکی، عرصہ تک وہ ایک دوسرے سے دست و گریبان اور برسرِ پیکار رہے، بعض اوقات ان میں سے بعض افراد نے اپنے ہی بھائیوں اور افرادِ خاندان کے خلاف صلیبی فرمانرواؤں اور فرنگی حریفوں سے بھی مدد لینے اور ان سے ساز باز کرنے سے بھی احتراز نہیں کیا، جس کا ایک نمونہ شیخ الاسلام عزالدین بن عبدالسلام کے تذکرہ میں گذر چکا ہے، اس طوائف الملوکی خاندانی رقابتوں اور خانہ جنگیوں سے سلطنت کے زیرِ فرماں ممالک میں سیاسی انتشار، انتظامی ابتری اور اخلاقی زوال رُونما تھا، لوگ ایک بے یقینی کی فضا میں زندگی گزار رہے تھے، صلیبیوں اور فرنگیوں کی بار بار ان اسلامی شہروں پر تاخت ہوتی رہتی تھی، جن کو سلطان صلاح الدین نے بڑی جدوجہد اور قربانیوں کے بعد واپس لیا تھا، انتظامی و اخلاقی دونوں طرح کی کوتاہیوں اور بے راہ روی کا نتیجہ وباؤں، امراض اور شدید قحط کی شکل

[1] ہندوستان میں عالمگیر اعظم اور اس کے جانشینوں کی مثال ہمارے لئے کافی ہے۔

میں رونما ہوا، اور مصر جیسے زرخیز ملک میں جو دوسرے ملکوں کا بھی پیٹ بھر سکتا تھا، ۵۹۶ھ میں جبکہ چچا بھتیجے الملک العادل اور الملک الافضل کی خانہ جنگی نے مصر کو جھنجھوڑ کر رکھ دیا تھا، دریائے نیل میں طغیانی نہیں آئی اور مصر میں ایسی گرانی رونما ہوئی، اور ایسا شدید قحط پڑا کہ آدمی نے آدمی کو بھون کر کھایا، موت کی ایسی گرم بازاری تھی کہ مردوں کو کفن دینا ممکن نہ تھا، مورخ ابو شامہ کے بیان کے مطابق تنہا الملک العادل (سلطان مصر) نے صرف ایک مہینہ میں دو لاکھ بیس ہزار مردوں کو اپنے ذاتی مال سے کفن دیا، کتوں اور مردوں کے کھانے کی نوبت آگئی، بہت بڑی تعداد میں بچے بھون بھون کر کھالئے گئے، اور اس کی ایسی عمومیت ہوئی کہ اس میں لوگوں کو کوئی قباحت نہیں محسوس ہوتی تھی، مؤرخ ابن کثیر کے بیان کے مطابق جب کھانے کے لئے بچے اور چھوٹی عمر کے لڑکے نہیں رہے تو جس آدمی کا جس آدمی پر زور چلا، اس نے اس کو بھون کر کھالیا[1]، سنت اللہ کے مطابق آسمانی تنبیہات کا سلسلہ بھی جاری تھا، اور ایسے غیر معمولی واقعات پیش آرہے تھے، جو توبہ انابت اور اصلاحِ حال کا خیال و جذبہ پیدا کرنے کے لئے کافی تھے، چنانچہ اسی ۵۹۷ھ میں ایک عظیم زلزلہ آیا، جس کی زد میں خاص طور پر ملکِ شام، بلادِ روم اور عراق تھے، اس کی ہلاکت آفرینی اور دہشت انگیزی کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ تنہا شہر نابلس اور اس کے اطراف میں بیس ہزار انسان زلزلہ میں دب کر مر گئے، "مرأۃ الزمان" کے مصنف کا بیان ہے (جو شدید مبالغہ سے خالی نہیں ہے) کہ اس زلزلہ کا شکار گیارہ لاکھ انسان ہوئے۔

اِدھر یہ غیر معمولی حوادث پیش آرہے تھے، جو مسلمانوں کو خوابِ غفلت سے بیدار کرنے کے لئے بالکل کافی تھے، اُدھر عالمِ اسلام کے مختلف حصوں میں خانہ جنگی اور برادر کشی کا سلسلہ جاری تھا، ۶۰۱ھ میں ایک ہی خاندان کے دو افراد قتادہ حسینی امیر مکہ اور سالم حسینی امیر مدینہ میں سخت جنگ ہوئی، ۶۰۳ھ میں غوریوں اور خوارزم شاہیوں کی جنگوں کا سلسلہ شروع ہوا، اور مسلمانوں نے مسلمان کا خون بہایا، اِدھر یہ ہو رہا تھا، اُدھر (۶۰۴ھ) میں فرنگیوں نے شام کے مختلف علاقوں پر حملے شروع کئے،

---

[1] تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو "البدایۃ والنہایۃ" ج ۱۳ صفحہ ۲۶ حوادث ۵۹۶ھ۔

۶۰۷ھ میں جزیرہ[1] کے مسلمان حکام نے فرنگیوں سے سازش کی[2] اور ۶۱۶ھ میں فرنگیوں نے مصر کے شہر دمیاط پر قبضہ کرلیا، جو فوجی و دفاعی حیثیت سے بڑی اہمیت رکھتا تھا۔

ادھر مرکز خلافت دارالسلام بغداد میں سلطنت کی ظاہری شان و شوکت عجمی تکلفات اور دولت و تمدن کے کھوکھلے مظاہر اپنے نقطۂ عروج کو پہونچ گئے تھے، خلفاء کے منظورِ نظر مصاحبین اور معتمدین کی دولت (جو غلام کی حیثیت سے حریم خلافت میں داخل ہوتے تھے اور فراش، ساقی، مہتمم توشک خانہ وغیرہ کے منصبوں پر فائز تھے) کا کوئی ٹھکانہ نہ تھا، اس کا کچھ اندازہ اس سے ہوسکتا ہے کہ خلیفہ الظاہر کے زرخرید علاء الدین الطبرسی الظاہری کی سالانہ آمدنی جو اس کو اپنی نئی جائداد سے حاصل ہوئی تھی، تین لاکھ دینار تھی، بغداد میں اس کے محل کی کوئی نظیر نہ تھی، یہی حال مجاہد الدین ایبک الدویدار المستنصری کی دولت کا تھا، ان لوگوں نے اپنے بیٹوں اور بیٹیوں کی شادی میں جو جہیز دیا، اور جو تحائف تقسیم کئے، ان کو پڑھ کر عقل دنگ رہ جاتی ہے، آخرالذکر کی جاگیر کی آمدنی پانچ لاکھ دینار سالانہ تھی، یہی حال الصلاح عبدالغنی بن فاخر فراش کا تھا، جو زیورِ علم سے عاری لیکن شاہانہ معیار کی زندگی گزارتا تھا، اس کے مقابلہ میں سلطنت عباسیہ کے سب سے بڑے مدرسہ المستنصریہ کے لائق اساتذہ کی تنخواہیں اتنی حقیر تھیں کہ اس کا یقین کرنا مشکل ہے، ان میں سے بڑے بڑے استاذ کو ۱۲ دینار ماہوار سے زیادہ نہیں ملتے تھے، جب کہ اس کے مقابلہ میں عہد عباسی کے ایک امیر الشرابی کے ایک خادم نے چار ہزار دینار ایک امیر کی شادی میں لٹائے، اور تین ہزار دینار شرابی کی طرف سے ایک پرندہ کی قیمت میں جو اس کے لئے تحفہ میں موصل سے لایا گیا تھا، ادا کئے گئے[3]۔

شان و شوکت کے اظہار کے لئے عید اور جانشینی کے موقع پر جو شاہانہ جلوس بغداد میں نکلتے تھے، سارا شہر

---

[1] جزیرہ سے مراد وہ علاقہ ہے، جو دجلہ اور فرات کے درمیان واقع ہے، اس کو بلاد ما بین النہرین بھی کہتے ہیں، اس کا مغربی شمالی حصہ "الجزیرہ" کے نام سے مشہور ہے، اور جنوبی مشرقی حصہ عراق کے نام سے مشہور ہے۔ [2] البدایۃ والنہایۃ ج ۱۳ ص ۵۹

[3] یہ سب معلومات اس عہد کی معاصر تاریخوں "الحوادث الجامعہ" اور "العسجد المسبوک" سے ماخوذ ہیں۔

ان میں شرکت کرنے، ان کا تماشا دیکھنے میں محو اور خود فراموش ہو جاتا تھا، نمود و نمائش کے ماسوا جس طرح بے تکلف دینی فرائض ان میں نظر انداز ہوتے تھے اور نمازیں قضا ہوتی تھیں، اس کا اندازہ کرنے کے لئے صرف اتنا کافی ہے کہ ۶۴۰ھ کے عید کے موقع پر جو شاہی جلوس نکلا، وہ رات کو جا کر ختم ہوا، اس کی ایسی مشغولیت اور محویت رہی کہ لوگوں نے اس دن عید کی نماز نصف شب سے پہلے قضا کر کے پڑھی،[1] اسی طرح ۶۴۳ھ کی عید الاضحیٰ کو اہلِ بغداد شہر کے باہر خلیفہ کا شاہی جلوس دیکھنے نکلے، اور نماز عید انھوں نے غروبِ آفتاب کے وقت پڑھی۔

خلیفہ کے لئے زمین بوسی کا عام رواج تھا، اسی طرح سے آستانہ بوسی اور زمین پر ناک رکھنے کا بھی دستور تھا، اور اس میں کسی کو کوئی قباحت نہیں محسوس ہوتی تھی، جائدادوں کی ضبطی کے واقعات بکثرت پیش آتے تھے، رشوت کی گرم بازاری تھی، باطنیوں، عیاروں اور ٹھگوں کی سرگرمی تیز ہو گئی تھی، اخلاقی بے راہ روی بہت بڑھ گئی تھی، دل بہلانے والے مشاغل کا زور تھا، مغنیات کی کثرت تھی، اور دولت جمع کرنے کا شوق حد سے فزوں تھا۔[2]

یہ وہ زمانہ تھا کہ تاتاری، ایران و ترکستان کو تہ و بالا کر رہے تھے، اور اسلام کے سب سے بڑے قلعہ بغداد پر ان کی نگاہیں تھیں، مورخ ابن کثیر ۶۳۶ھ کے آغاز کی ان الفاظ کے ساتھ خبر دیتا ہے کہ "اس سن ہجری کی ابتدا اس شان سے ہوئی کہ سلاطین بنی ایوب (سلطان صلاح الدین کے خاندان کے بادشاہ) ایک دوسرے سے نبرد آزما اور برسرِ پیکار رہیں" دار الخلافت بغداد میں کچھ ایسا انتشار برپا رہا کہ ۶۴۰ھ سے ۶۴۳ھ تک خلفاء اسلام کے قدیم و مسلسل معمول کے خلاف خلیفہ کی طرف سے نہ حج کا انتظام ہوا، اور نہ غلاف کعبہ بدلا گیا، ۲۱ دن تک بیت اللہ شریف کی دیواریں بالکل کھلی رہیں، لوگوں نے اس سے بدشگونی لی۔

۵۷۵ھ میں الناصر لدین اللہ تخت خلافت پر بیٹھا، اس کو چھیالیس سال سے زیادہ مسلسل خلافت و حکومت کا موقع ملا، یہ اتنی طویل مدت ہے، جو کسی عباسی خلیفہ کو بھی نصیب نہیں ہوئی، لیکن اس کا دور خلافتِ عباسیہ کا تاریک ترین دور تھا، مورخین نے بڑے سخت الفاظ میں اس پر تنقید اور اس کے اعمال و اخلاق کی

---

[1] الحوادث الجامعہ، واقعات ۶۴۳ھ [2] ملاحظہ ہو مضمون "عصر الشرائی ببغداد" از ناجی معروف رسالہ "الاقلام" بغداد محرم ۱۳۸۶ھ۔

مذمت کی ہے، مورخ ابن اثیر نے ان لفظوں میں اس کو یاد کیا ہے۔

"رعیت کے ساتھ اس کا سلوک نہایت خراب اور ظالمانہ تھا، اس کے زمانہ میں عراق کا ملک ویران ہو گیا، ملک کے باشندے مختلف شہروں اور ملکوں میں متفرق و آوارہ ہو گئے، اس نے اُن کی جائدادیں اور دولتیں ضبط کر لیں، اس کے کاموں میں بڑا انضاد تھا، آج ایک بات کرتا تھا کل اس کے خلاف، اس کو تمام تر دلچسپی تفریحی مشاغل سے تھی، اس نے جوانمردی و سپہ گری کے لئے ایک خاص وردی ایجاد کی، صرف اس وردی والوں کے لئے مردانہ کھیلوں اور فنون سپہ گری کے مظاہرہ کی اجازت تھی، اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مردانہ کمالات اور فنون سپہ گری کا عراق سے خاتمہ ہو گیا، خلیفہ کی شیفتگی ان تفریحات سے حد کو پہونچ گئی، اہل ایران کا بیان ہے کہ اسی نے سب سے پہلے تاتاریوں کو اسلامی قلمرو پر حملہ کرنے کی طرف متوجہ کیا،[1] اور ان کے پاس پیام بھیجا۔"[2]

۶۲۲ھ میں الناصر لدین اللہ کی وفات ہوئی، اور مستنصر باللہ (۶۲۳-۶۴۰ھ) اس کا جانشین ہوا، یہ خلیفہ دیندار، پاکباز، نیک سیرت، پاکیزہ خصائل اور بہت سے اوصاف و خصوصیات میں خلفاء صالحین کی یادگار تھا،[3] لیکن افسوس ہے کہ اس کو انتظام و اصلاح کے لئے زیادہ مدت نہ مل سکی، ۶۴۰ھ میں اس کی وفات پر اس کا فرزند مستعصم باللہ خلیفہ ہوا، مستعصم ایک صحیح العقیدہ، دیندار، محتاط خلیفہ تھا، جو کبھی مسکرات و محرمات کے قریب نہیں گیا، ہر مہینہ دوشنبہ اور جمعرات اور ماہ رجب کے روزے رکھتا تھا، قرآن کا حافظ تھا، وقت پر نماز پڑھنے کا شدت سے پابند تھا، لیکن مؤرخ ابن اثیر کے قول کے مطابق طبیعت میں ضرورت سے زیادہ نرمی اور بیدار مغزی کی کمی تھی، دولت کے معاملہ میں کسی قدر حریص اور بخیل واقع ہوا تھا۔

۶۴۲ھ میں ابن العلقمی کے نام خلافت عباسیہ کی وزارت عظمیٰ کا قرعۂ فال نکلا،[4] ہماہنگ کے نظم و نسق میں اس وقت سے بڑی برہمی پیدا ہوئی، جب ۶۵۵ھ میں بغداد میں شیعہ سنی کا زبردست جھگڑا ہوا،

---

[1] خوارزمی سلطنت کا زور توڑنے کے لئے جس سے خلیفہ بغداد کے تعلقات خراب تھے۔ [2] تاریخ الکامل ج ۱۲ ص ۱۸۱۔

[3] ملاحظہ ہو البدایہ والنہایہ ج ۱۳ ص ۱۵۹ [4] پورا نام مؤید الدین ابو طالب محمد بن احمد بن علی محمد العلقمی ہے۔

شیعوں کے مکانات یہاں تک کہ ابن العلقمی کے عزیزوں کے مکانات تک لوٹ لئے گئے،[1] ان واقعات سے ان کے دل میں بد دلی کا پیدا ہونا اور جذبۂ انتقام کا اُبھرنا بعید از قیاس نہیں، اس وقت اگرچہ تاتاری خطرہ بغداد کے دروازوں پر دستک دے رہا تھا، اور تاتاری فوجیں بغداد کی طرف بڑھ رہی تھیں، وزیر ابن العلقمی کی ہدایت اور حکم سے بغداد کی افواج میں زبردست تخفیف کی گئی، سواروں کی تعداد گھٹا کر دس ہزار کر دی گئی، بقیہ سپاہیوں کو رخصت کر دیا گیا، اور ان کے منصب روک لئے گئے یہاں تک کہ ان کو بازاروں اور مسجدوں کے دروازوں پر بھیک مانگتے ہوئے دیکھا گیا، شعراء نے اسلام کی کسمپرسی پر مرثیے کہے۔[2]

مستعصم اگرچہ ذاتی طور پر نیک سیرت اور نیک خیال خلیفہ تھا، اور اصلاح و ترقی کا خواہشمند بھی تھا، لیکن زمانہ کا فساد، معاشرہ کا انتشار اور اہل حکومت کا بگاڑ اس حد کو پہونچ گیا تھا کہ اس کو روکنے اور حکومت و معاشرہ میں اصلاح کی نئی روح پھونکنے اور اس کو نئی زندگی عطا کرنے کے لئے ایسے اولوالعزم اور طاقتور شخصیت رکھنے والے افراد کی ضرورت تھی، جو عام طور پر تاریخ میں نئی سلطنتوں کے بانی اور نئے عہد کے فاتح ثابت ہوئے ہیں، یہ واقعہ تاریخ میں بار بار پیش آیا ہے کہ اکثر حکمراں خاندانوں کے آخری افراد اور کسی زوال پذیر سلطنت کا آخری فرمانروا اپنی ذات سے صلاحیت شعار، اصلاح پسند اور نیک سیرت تھا، لیکن اس خاندان یا اس سلسلۂ سلطنت کی زندگی کا پیمانہ لبریز ہو چکا تھا اور فساد بڑھتے بڑھتے اس آخری نقطہ پر پہونچ چکا تھا کہ اب اس کو آخری منزل پر پہونچنے اور اس کے قدرتی نتائج کے ظاہر ہونے سے بظاہر کوئی طاقت نہیں روک سکتی تھی، چنانچہ اس خاندان اور حکومت کا زوال تاریخ میں اسی شخص کے نام لکھا گیا، جو اپنے بہت سے پیشروؤں سے بہتر تھا، اور بہت حد تک اصلاح حال کا خواہشمند تھا۔

اگرچہ بغداد میں اہل اصلاح کی ایک تعداد علم و درس اور عبادت میں مشغول تھی، اور کچھ اللہ کے بندے خانقاہوں اور مساجد میں خلوت نشین اور یکسو تھے، لیکن حکام اور آسودہ حال طبقے میں بگاڑ پھیل گیا تھا،

---

[1] البدایۃ والنہایۃ ج ۱۳ ص ۱۹۶ [2] ایضاً ص ۲۰۱

اس عہد کا ایک مورخ ابوالحسن خزرجی اپنے زمانہ کے اہل عراق کا حال بیان کرتے ہوئے لکھتا ہے :۔

"جاگیروں اور جائدادوں کے حصول کا شوق بہت بڑھ گیا ہے، رفاہ عام کے کام اور اجتماعی مصالح سے لوگوں کی نظر ہٹ گئی ہے، ان دنیاوی امور میں مشغولیت بہت بڑھ گئی ہے، جو جائز نہیں ہے، عمال سلطنت نے ظلم پر کمر باندھ رکھی ہے، اور سب کو زیادہ سے زیادہ دولت کمانے کی فکر ہے۔"

آگے چل کر وہ لکھتا ہے کہ :۔

"یہ صورت حال بڑی خطرناک ہے، سلطنت کفر کے ساتھ تو رہ جاتی ہے، ظلم کے ساتھ نہیں رہتی۔"[1]

اُدھر عالم اسلام کے مشرقی حصہ میں خوارزم شاہی بلا شرکت غیرے حکومت کر رہے تھے، یہ بڑے جاہ و جلال کی سلطنت تھی، جو پانچویں صدی کے آخر میں سلطنت سلجوقیہ کے کھنڈروں پر قائم ہوئی، مصر و شام عراق و حجاز اور شمال مغرب میں ایشیائے کوچک کے مختصر سلجوقی علاقہ اور جنوب مشرق میں غوریوں کی نوخیز سلطنت کو مستثنیٰ کر کے تقریباً سارا عالم اسلام خوارزم شاہیوں کے زیر نگین تھا، اس خاندان کا سب سے بڑا حوصلہ مند عالی ہمت اور کشور کشا سلطان علاء الدین محمد خوارزم شاہ (۵۹۶ - ۶۱۷ھ) تھا، جو اپنے عہد کا سب سے بڑا نہ صرف مسلمان بادشاہ بلکہ شاید اپنے عہد کا سب سے طاقتور سلطان تھا، ہیرلڈ لیمب (H. LAMB) اپنی کتاب "چنگیز خاں" میں صحیح لکھتا ہے :۔

"اسلامی ملکوں کے قلب میں سلطان محمد خوارزم شاہ اورنگ شاہی پر خدائے جنگ بنا بیٹھا تھا، اس کی قلمرو ہندوستان کی سرحد سے بغداد تک اور بحر خوارزم (آرال) سے خلیج عجم تک چلی گئی تھی، سلجوقی ترکوں کے سوا جنھوں نے صلیبیوں پر فتوحات حاصل کی تھیں، اور مصر کے سلاطین مملوک سے قطع نظر کر کے جو روز افزوں ترقی پر تھے، باقی جس قدر اسلامی سلطنتیں تھیں ان پر سلطان محمد خوارزم شاہ بالکل چھایا ہوا تھا، سلطان محمد رتبہ میں شہنشاہ تھا، عباسی خلیفہ ناصر الدین اللہ اس سے ناراض تھے، مگر اس کی قوت کو مانتے تھے، خلیفہ

---

[1] ملاحظہ ہو مضمون "عصر الشرابی بغداد" از ناجی معروف رسالہ "الاقلام" بغداد شمارہ محرم ۱۳۸۶ھ۔

بغداد دنیاوی اقتدار سے محروم ہوکر پاپائے روم کی طرح صرف دین کا ہادی و رہنما رہ گیا تھا۔[1]

عرب مورخین علاء الدین محمد خوارزم شاہ کی سیرت و اخلاق کی کسی بڑی کمزوری اور کسی قابل ذکر شخصی عیب کی طرف اشارہ نہیں کرتے، بلکہ اس کی دینداری، خوش اعتقادی اور شجاعت و صلابت کا عام طور پر اعتراف کرتے ہیں، لیکن اس میں کوئی شک نہیں کہ اس کی ساری صلاحیتیں اور طاقتیں ان چھوٹی بڑی اسلامی سلطنتوں کے ختم کرنے میں صرف ہوئیں، جو اس وسیع مشرقی حصہ میں کہیں کہیں واقع تھیں، ایک طرف شمال و مغرب میں اس نے سلجوقیوں کو ان کے آخری حدود تک پسپا ہونے پر مجبور کیا، دوسری طرف مشرق اور جنوب میں وہ ہمیشہ غوریوں سے نبرد آزما رہا، اور ان کو بھی ایک محدود حصہ میں محصور ہونے پر مجبور کر دیا، ایران و ترکستان کی سپہ گری کا بہترین عنصر اس غیر مختتم سلسلۂ جنگ میں حصہ لینے کی وجہ سے تھک کر چور ہو گیا تھا، ان زرخیز و مردم خیز ممالک کے شہروں و قصبات کی فضا اور ذہن پر جنگ ہر وقت چھائی ہوئی رہتی تھی، مفتوحہ ممالک کی دولت شاداب و حاصل خیز ملکوں کی پیداوار، دستکاروں اور اہل صنعت کی تراش و خراش کی وجہ سے جو سلطنت و طاقت کے اس مرکز میں جمع ہو گئے تھے، تمدن اپنے نقطۂ عروج پر پہونچ گیا تھا، اور فراغت و امارت اور فتوحات کے سارے لوازم جمع ہو گئے تھے، اس وقت کی تمدنی خرابیوں و کمزوریوں کا ذکر تو ان تاریخوں میں ملنا مشکل ہے، جن کو صرف سرکار دربار سے سروکار تھا، اگر اس کا سراغ کچھ مل سکتا ہے تو اہل دل صوفیا و مشائخ اور مصلحین کی بیاضوں، ملفوظات اور مواعظ میں، جن کا بڑا حصہ تاتاری سیلاب کے نذر ہو گیا، چنگیز خاں کا مسیحی مورخ ہیرلڈ لیمب کا یہ بیان محض دینی تعصب اور مبالغہ آرائی پر محمول نہیں کیا جا سکتا کہ:۔

"مسلمانوں کی دنیا جنگ و پیکار کی دنیا تھی، اور ایسی دنیا تھی جو نغمہ و سرود سے بھی شغل رکھتی تھی، اور کان بھی اچھے پائے تھے، لیکن اس ظاہر کے ساتھ باطن میں ایک ہیجان کی حالت ہمہ وقت موجود رہتی تھی، بادشاہوں کی جگہ غلام اور ملوک حکومت کرتے تھے، دولت جمع کرنے کا شوق بہت تھا، اخلاقی برائیاں

[1] چنگیز خاں ص ۱۴۷ ماخوذ از ترجمہ مولوی عنایت اللہ صاحب مرحوم۔

اور ملکی نازشیں بھی کچھ کم نہ تھیں، انتظام امور ایسے لوگوں کے سپرد تھا، جو رعایا کو لوٹتے اور کھاتے تھے، عورتوں کی نگہداشت خواجہ سراؤں کے ذمہ تھی، اور ایوان کا مالک خدا تھا۔[1]

خوارزم شاہی سلاطین سے اس موقع پر بھی وہی مہلک غلطی ہوئی، جو اسپین کے عرب فرمانرواؤں نے کی تھی، اور جس کو الٰہی قانونِ مکافات نے معاف نہیں کیا، یعنی یہ کہ انھوں نے اپنی ساری طاقت سلطنت کی توسیع و استحکام اور حریفوں کی سرکوبی میں صرف کی، اور اس انسانی آبادی میں جو ان کی سرحد سے متصل تھی، اور بجائے خود ایک دنیا تھی، تبلیغ اسلام، اور ان تک خدا کا آخری پیغام پہونچانے کی کوئی فکر نہیں کی، جذبۂ دینی سے قطع نظر کرکے سیاسی فراست اور دوربینی کا بھی تقاضا تھا کہ وہ اس وسیع انسانی آبادی کو اپنا ہم آہنگ اور ہم عقیدہ بنانے کی کوشش کرتے، اور اس طرح ہمیشہ کے لئے اس خطرہ سے محفوظ ہو جاتے، جو نہ صرف ان کو بلکہ پورے مسلمانوں کو پیش آیا۔

یہ زمانہ اور حالات تھے، جب تاتاری ابتداءً اپنے سردار اور قائد چنگیز خاں[2] کی قیادت میں عذابِ الٰہی کی طرح عالمِ اسلام کے مشرقی حصہ ایران و ترکستان کی طرف بڑھے، پھر اس بغداد کی بھی نوبت آگئی، جہاں کا نقشہ اوپر کی سطروں میں گذر چکا ہے، اور بالآخر انھوں نے ۶۵۶ھ میں اس کی اینٹ سے اینٹ بجادی؟ وَاتَّقُوْا فِتْنَةً لَّا تُصِيْبَنَّ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا مِنْكُمْ خَاصَّةً وَاعْلَمُوْا اَنَّ اللّٰهَ شَدِيْدُ الْعِقَابِ۔

عالمِ اسباب میں اس کا قریبی محرک یہ واقعہ ہوا کہ چنگیز خاں نے خوارزم شاہ کو پیام بھیجا کہ میں بھی ایک وسیع سلطنت کا فرمانروا ہوں، اور آپ بھی ایک وسیع سلطنت کے تاجدار ہیں، بہتر ہے کہ ہم دونوں تجارتی تعلقات قائم کریں، ہمارے تاجر بے خوف و خطر آپ کے قلمرو میں جائیں، اور یہاں کی مخصوص پیداوار اور مال

---

[1] چنگیز خاں ص ۱۴۳ ہیرلڈلیمب ماخوذ از ترجمہ مولوی عنایت اللہ صاحب مرحوم [2] چنگیز خاں کی سلطنت کی ابتدا ۵۹۵ھ سے ہوئی، خوارزم شاہ کی حکومت پر پہلا حملہ ۶۱۶ھ میں ہوا، اس کا انتقال ۶۲۴ھ میں ہوا، اس کے بیٹوں اور پوتوں نے اس کے مقاصد کی تکمیل کی، ۶۵۶ھ میں جب بغداد پر حملہ ہوا تو تاتاری افواج کا قائد اور امیر چنگیز خاں کا پوتا ہلاکو خاں تھا۔

وہاں فروخت کریں، اور آپ کے تاجر اطمینان کے ساتھ ہمارے ملک میں آئیں، اور وہاں کا مال فروخت کریں، خوارزم شاہ نے اس کو منظور کرلیا، اور تجارتی تعلقات قائم ہوگئے، اور تجارتی قافلے بے تکلف دونوں ملکوں میں آنے جانے لگے، اس کے بعد کیا پیش آیا، جس سے عالم اسلام اچانک خون کے سمندر میں ڈوب گیا، اس کی تفصیل مغربی مورخ کی زبان سے سنئے، جس کی اسلامی مورخین کے بیان سے حرف بحرف تصدیق ہوتی ہے۔[۱]

ہیرلڈ لیمب اپنی کتاب "چنگیز خاں" میں لکھتا ہے:-

"لیکن تجارت کے تعلقات جو چنگیز خاں نے قائم کئے تھے، وہ اتفاق سے یک لخت ختم ہوگئے، اور یہ اس طرح پیش آیا کہ قراقورم سے تاجروں کا ایک قافلہ مغرب کو آرہا تھا کہ راستہ میں اترار کے حاکم نے جس کا نام اینل جق تھا قافلہ کے سب آدمیوں کو گرفتار کرلیا، اور اس کی اطلاع اپنے آقا یعنی خوارزم شاہ کو اس طرح کی گویا اس قافلہ میں جاسوس بھی موجود ہیں، اینل جق کا یہ خیال بالکل قرین عقل تھا۔

حاکم اترار کے پاس سے اطلاع کے آتے ہی سلطان محمد خوارزم شاہ نے بے سوچے سمجھے حکم دے دیا کہ قافلہ کے کل تاجروں کو ہلاک کر دیا جائے، چنانچہ اس حکم کے مطابق قراقورم سے آئے ہوئے کل تاجر قتل کردیئے گئے، اس کی اطلاع جس وقت چنگیز خاں کو ہوئی تو اس نے فوراً اپنے سفیر بھیج کر خوارزم شاہ سے اس کی شکایت کی، سلطان محمد نے سفیروں کے سردار کو بھی قتل کرا دیا، اور جو لوگ اس کے ساتھ تھے، ان کی داڑھیاں جلوا دیں، اس سفارت میں سے جن لوگوں کی جان بچ گئی تھی، وہ چنگیز خاں کے پاس واپس آئے اور کل حال عرض کیا، دشت گوبی کا خان حال سنتے ہی ایک پہاڑی پر چڑھ گیا کہ تنہائی میں اس واقعہ پر غور کرے، مغلوں کے ایلچی کو مار ڈالنا ایسا فعل تھا جسے بغیر سزا کے چھوڑنا ممکن نہ تھا، یہ حرکت ایسی تھی جس کا بدلہ لینا مغلوں کی گذشتہ روایات کے لحاظ سے ضروری تھا۔

چنگیز خاں نے کہا جس طرح آسمان پر دو آفتاب نہیں رہ سکتے، اسی طرح زمین پر دو خاقان نہیں رہ سکتے"۔[۲]

---

[۱] ملاحظہ ہو البدایۃ والنہایۃ ج ۱۳ ص ۸۰-۹۲، الکامل لابن الاثیر ج ۱۲ ص ۱۴۹ [۲] چنگیز خاں ص ۱۴۳ ہیرلڈ لیمب۔

اسلام کے مشرقی ممالک تاتاریوں کی زد میں

تاتاریوں نے پہلے بخارا کی اینٹ سے اینٹ بجادی، اور اس کو ایک تودۂ خاک بنادیا، شہر کی آبادی میں سے کوئی زندہ نہیں بچا، پھر سمرقند کو خاک سیاہ کردیا، اور ساری آبادی کو فنا کے گھاٹ اتار دیا، یہی حشر عالمِ اسلام کے نامی گرامی شہروں رے، ہمدان، زنجان، قزوین، مرو، نیشاپور، خوارزم کا ہوا، خوارزم شاہ جو عالم اسلامی کا واحد فرمانروا اور سب سے طاقت ور سلطان تھا، تاتاریوں کے خوف سے بھاگا پھرتا تھا، اور تاتاری اس کے تعاقب میں تھے، یہاں تک کہ ایک نامعلوم جزیرہ میں اس نے قضا کی۔

خوارزم شاہ نے ایران وترکستان کی اسلامی ریاستوں اور خود مختار حکومتوں کو اپنی شاہی میں ضم کرلیا تھا، اس لئے جب انھوں نے تاتاریوں کے مقابلہ میں شکست کھائی تو پھر ان کا مقابلہ کرنے والا مشرق میں کوئی نہ تھا، تاتاریوں کی ہیبت اور مسلمانوں کی دہشت کا یہ عالم تھا کہ بعض اوقات ایک تاتاری ایک گلی میں گھسا ہے، جہاں سو مسلمان موجود تھے، کسی کو مقابلہ کی ہمت نہ ہوئی، اور اس نے ایک ایک کرکے سب کو قتل کردیا، اور کسی نے ہاتھ تک نہ اٹھایا، ایک گھر میں ایک تاتاری عورت مرد کے بھیس میں گھس گئی اور تنہا سارے گھر والوں کو قتل کردیا، پھر ایک قیدی کو جو اس کے ساتھ تھا، احساس ہوا کہ یہ عورت ہے تو اس نے اس کو قتل کیا، بعض اوقات تاتاری نے کسی مسلمان کو گرفتار کیا، اور اس سے کہا کہ اس پتھر پر سر رکھ دے، میں خنجر لاکر تجھے ذبح کروں گا، مسلمان سہما پڑا رہا، اور بھاگنے کی ہمت نہ ہوئی، یہاں تک کہ وہ شہر سے خنجر لایا اور اس کو ذبح کیا۔[1]

تاتاری یورش عالمِ اسلام کے لئے ایک بلائے عظیم تھی، جس سے دنیائے اسلام کی چولیں ہل گئیں، مسلمان مبہوت و ششدر تھے، ایک سرے سے دوسرے سرے تک ایک ہراس اور یاس کا عالم طاری تھا،

---

[1] تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو "الکامل" (ابن اثیر) ج ۱۲۔ اور دائرۃ المعارف (بستانی ج ۶۔ مادہ تتر)

تاتاریوں کو ایک بلائے بے درماں سمجھا جاتا تھا، ان کا مقابلہ ناممکن اور ان کی شکست ناقابل قیاس سمجھی جاتی تھی یہاں تک کہ ضرب المثل کے طور پر یہ فقرہ مشہور تھا کہ "اِذَا قِیْلَ لَکَ اِنَّ التَّتَرَ انْھَزَمُوْا فَلَا تُصَدِّقْ" یعنی اگر تم سے کہا جائے کہ تاتاریوں کو کہیں شکست ہوئی ہے، تو یقین نہ کرنا" جن ملکوں یا شہروں کی طرف ان کا رُخ ہو جاتا، سمجھ لیا جاتا تھا کہ ان کی شامت آگئی، جان و مال، عزت و آبرو، مساجد و مدارس کسی کی خیر نہیں تھی، تاتاریوں کا رُخ کرنا بربادی، قتلِ عام، ذلت و بے آبروئی کا مرادف تھا، ایک مرتبہ تقریباً سارا عالمِ اسلام (خصوصاً اس کا مشرقی حصہ) اس فتنۂ جہاں سوز کی لپیٹ میں آگیا، مورخ ہر طرح کے واقعات پڑھتا اور لکھتا ہے، اس کے سامنے قوموں کی بربادی اور ملکوں کی تباہی کے اتنے مناظر گذرتے ہیں کہ اس کی طبیعت بے حس اور اس کا قلم بیدرد ہو جاتا ہے، لیکن اس واقعہ کا ذکر کرتے ہوئے، ابن اثیر جیسا مورخ (جس نے بڑے صبر و تحمل کے ساتھ دنیا کی تاریخ لکھی ہے) اپنی قلبی کیفیت اور تاثر کو چھپا نہیں سکا وہ لکھتا ہے:

"یہ حادثہ اتنا ہولناک اور ناگوار ہے کہ میں کئی برس تک اس پس و پیش میں رہا کہ اس کا ذکر کروں یا نہ کروں، اب بھی بڑے تردد و تکلف کے ساتھ اس کا ذکر کر رہا ہوں، واقعہ بھی یہ ہے کہ اسلام اور مسلمانوں کی خبر موت سنانا کس کو آسان ہے، اور کس کا جگر ہے کہ ان کی ذلت و رسوائی کی داستان سنائے؟ کاش میں نہ پیدا ہوا ہوتا، کاش میں اس واقعہ سے پہلے مر چکا ہوتا، اور بھولا بسرا ہو جاتا، لیکن مجھے بعض دوستوں نے اس واقعہ کے لکھنے پر آمادہ کیا، پھر بھی مجھے تردد تھا، لیکن میں نے دیکھا کہ نہ لکھنے سے کچھ فائدہ نہیں، یہ وہ حادثۂ عظمیٰ اور مصیبتِ کبریٰ ہے کہ دنیا کی تاریخ میں اس کی نظیر نہیں مل سکتی، اس واقعہ کا تعلق تمام انسانوں سے ہے، لیکن خاص طور پر مسلمانوں سے ہے، اگر کوئی شخص دعویٰ کرے کہ از آدم تا ایں دم ایسا واقعہ دنیا میں پیش نہیں آیا تو وہ کچھ غلط دعویٰ نہ ہوگا، اس لئے کہ تاریخوں میں اس واقعہ کے پاسنگ بھی کوئی واقعہ نہیں ملتا، اور شاید دنیا قیامت تک (یاجوج ماجوج کے سوا) کبھی ایسا واقعہ نہ دیکھے، ان وحشیوں نے کسی پر رحم نہیں کھایا، انھوں نے عورتوں، مردوں، اور بچوں کو قتل کیا، عورتوں کے پیٹ چاک کر دیئے، او

پیٹ کے بچوں کو مار ڈالا" إِنَّا لِلّٰهِ وَإِنَّا إِلَيْهِ رَاجِعُوْنَ وَلَا حَوْلَ وَلَا قُوَّةَ إِلَّا بِاللّٰهِ الْعَلِيِّ الْعَظِيْمِ۔

یہ حادثہ عالمگیر و عالم آشوب تھا، یہ ایک طوفان کی طرح اٹھا اور دیکھتے دیکھتے سارے عالم میں پھیل گیا۔[1]

"مرصاد العباد" کا مصنف جو اس تاتاری حملہ کا شاہد عینی ہے اور جس کا مولد رے اور مسکن ہمدان اس تاتاری غارت گری کے نذر ہو چکے تھے، لکھتا ہے:۔

"تاریخ شہور سنہ سبع وعشر وستمائہ لشکر مخذول کفار تاتار خذلہم اللہ ودمرہم استیلا یافت بر آں دیار و آں فتنہ و فساد و قتل و ہدم و حرق کہ از اں ملاعین ظاہر گشت در ہیچ عصر در زمان کفر و اسلام کس نشان نہ دادہ است، و در ہیچ تاریخ نیامدہ و قبل ازیں بیشتر چگونہ بود کہ از یک شہر رے کہ مولد و منشاء ایں ضعیف است قیاس کردہ اند کہ بیش ہفت صد ہزار آدمی بقتل آمدہ است و اسیر گشتہ از شہر و ولایت و فتنہ و فساد آں ملاعین مخاذیل بر کلگی اسلام و اسلامیاں ازاں زیادت است کہ در حیز عبارت گنجد، و ایں واقعہ ازاں شائع تر است در جہاں کہ بشرح حاجت فتد و اگر عیاذاً باللہ غیرت و حمیت اسلام در نہاد ملوک و سلاطین بجنبد کہ عہدہ رعایت مسلمانی و مسلماناں در ذمہ ایشاں است کہ "الامیر راع علی رعیتہ وھو مسئول عنہم" و اریحیت و رجولیت دین و امن ایشاں نگیرد تا باتفاق جمعیتے کنند و کمر انقیاد فرمان "اِنْفِرُوْا خِفَافًا وَّثِقَالًا وَّجَاهِدُوْا بِاَمْوَالِكُمْ وَاَنْفُسِكُمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ" بر میان جان بندند و نفس و مال و ملک در دفع ایں فتنہ فدا کنند بوے آں می آید کہ بیکبارگی مسلمانی بر انداختہ شود و اکثر بلاد اسلام بر افتاد، ایں بقیت را نیز براندازند، جہان کفر گیرد و نعوذ باللہ خوف و خطر آں است کہ مسلمانی آں قدر اسمے کہ ماندہ بود شومی معاملۂ مدعیان بے معنی چناں برخیزد کہ نہ اسم ماند نہ رسم۔[2]

تنہا عالم اسلام نہیں اس وقت کی پوری متمدن دنیا تاتاریوں کے حملہ سے لرزہ براندام تھی، جہاں

[1] الکامل (ابن اثیر متوفی ۶۳۰ھ) ج ۱۲ ص ۱۴۷، ۱۴۸ [2] مرصاد العباد (قلمی) (محفوظ کتب خانہ ندوۃ العلماء) ص ۸

ان کے پہونچنے کے بہت کم امکانات تھے، وہاں بھی دہشت پھیلی ہوئی تھی، گبن اپنی مشہور کتاب "تاریخ انحطاط وسقوط روما" میں لکھتا ہے:۔

"سویڈن کے باشندوں نے روس کے ذریعہ تاتاری طوفان کی خبر سُنی ان پر اتنی دہشت طاری ہوئی کہ وہ ان کے خوف سے اپنے معمول کے مطابق انگلستانی سواحل پر شکار کھیلنے کے لئے نہیں نکلے۔"

کیمبرج کی "تاریخ عہد وسطیٰ" کے مصنفوں نے مغلوں کے اس شدید تصادم کو جس کا محرک چنگیز خاں ہوا بڑی خوبی کے ساتھ ان الفاظ میں بیان کیا ہے:۔

"انسان کی طاقت سے باہر تھا کہ مغلوں کو روک سکیں، دشت وصحرا کے تمام خطروں پر وہ غالب آئے، پہاڑ، سمندر، موسمی سختیاں، قحط، وبائیں کوئی بھی ان کی راہ میں مزاحم نہ ہو سکا، کسی قسم کے خطروں کا انھیں خوف نہ تھا، کوئی قلعہ ان کے حملہ کی تاب نہ لا سکتا تھا، اور رحم کے لئے کسی مظلوم کی فریاد ان پر اثر نہ کرتی تھی، یہاں میدانِ تاریخ میں ایک نئی طاقت سے ہم کو واسطہ پڑتا ہے، یہ طاقت اور زور ایسا تھا جس نے بہت سی ملکی اور سیاسی قضیوں کا چشم زدن میں فیصلہ کر دیا، اور انھیں اس طرح مٹا دیا، جیسے آسمان زمین پر گر کر سب چیزوں کو مٹا دے، یہ ملکی اور سیاسی قضیے بھی ایسے تھے کہ اگر آفت نازل نہ ہوتی تو آگے چل کر یا تو کسی کے حل کئے وہ حل نہ ہوتے، اور اگر جاری رہتے تو کبھی ختم ہونا نہ جانتے، تاریخ عالم میں اس نئی قوت کا ظہور یعنی ایک شخص واحد کی یہ غالبیت کہ بنی نوع انسان کے تمدن کو بدل دے، چنگیز خاں سے شروع ہوا، اور اس کے پوتے قوبلائی خاں پر ختم ہو گیا، جس کے زمانہ میں مغلوں کی سالم اور وسیع سلطنت نے تقسیم وتفریق کے آثار ظاہر کرنے شروع کر دیئے، ایسی طاقت پھر کبھی دنیا کے پردہ پر ظاہر نہیں ہوئی۔"[1]

بغداد کی تباہی

بالآخر یہ وحشی عالم اسلام کو زیر وزبر کرتے، خون کے دریا بہاتے اور آگ لگاتے ۶۵۶ھ میں چنگیز خاں

---

[1] ماخوذ از "چنگیز خاں" ص ۲۶۶

کے پوتے ہلاکو خاں کی سرکردگی میں دنیائے اسلام کے دارالخلافت اور اس عصر کے سب سے بڑے علمی مرکز اور متمدن شہر بغداد میں داخل ہوئے اور اس کی اینٹ سے اینٹ بجادی، بغداد کی تباہی اور مسلمانوں کے قتلِ عام کی تفصیل طویل اور بہت دردناک ہے، کچھ اندازہ ان مورخین کے بیانات سے ہوگا، جنھوں نے اس حادثہ کے آثار اپنی آنکھوں سے دیکھے، اور اس کی تفصیلات دیکھنے والوں سے سنیں، مورخ ابن کثیر لکھتے ہیں:

"بغداد میں چالیس دن تک قتل و غارت کا بازار گرم رہا، چالیس دن کے بعد یہ گلزار شہر جو دنیا کا پُررونق ترین شہر تھا، ایسا ویران و تاراج ہوگیا کہ تھوڑے سے آدمی دکھائی دیتے تھے، بازاروں اور راستوں پر لاشوں کے ڈھیر اس طرح لگے تھے کہ ٹیلے نظر آتے تھے، ان لاشوں پر بارش ہوئی تو صورتیں بگڑ گئیں، اور سارے شہر میں بدبو پھیلی جس سے شہر کی ہوا خراب ہوگئی، اور سخت وبا پھیلی جس کا اثر شام تک پہونچا، اس ہوا اور وبا سے بکثرت مخلوق مری، گرانی، وبا اور فنا، تینوں کا دور دورہ تھا"[1]

شیخ تاج الدین السبکی لکھتے ہیں:۔

"ہلاکو خاں نے خلیفۂ بغداد (مستعصم) کو ایک خیمہ میں اتارا اور وزیر ابن العلقمی نے علماء و اعیان شہر کو دعوت دی کہ خلیفہ اور ہلاکو کے صلح نامہ پر گواہ بنیں، وہ آئے تو ان سب کی گردن اڑادی گئی، اسی طرح ایک ایک گروہ یکے بعد دیگرے بلایا جاتا اور اس کی گردن اڑادی جاتی، پھر خلیفہ کے معتمدین و مقربین کو بلایا گیا اور ان کو بھی قتل کردیا گیا، خلیفہ کے متعلق عام طور پر مشہور تھا کہ اگر اس کا خون زمین پر گرا تو کوئی بڑی آفت آئے گی، ہلاکو کو تردد تھا، نصیر الدین طوسی[2] نے کہا کہ یہ کچھ مشکل بات نہیں، خلیفہ کا خون نہ بہایا جائے بلکہ

---

[1] البدایۃ والنہایۃ ج ۱۳ صـ ۲۰۲-۲۰۳ [2] ایک ایرانی فاضل کی تاریخ "اخبار و آثار خواجہ نصیر الدین طوسی" شائع کردہ طہران یونیورسٹی سے بھی اس کی تصدیق ہوتی ہے، اس کتاب کے ایرانی مصنف نے بھی نصیر الدین طوسی کو اس واقعہ کا ذمہ دار قرار دیا ہے۔ طوسی کی سب سے بڑی سیاسی چال جو بالآخر کامیاب ہوئی، یہ تھی کہ ہلاکو کو اس نے خلافتِ عباسیہ کی بیخ کنی پر ابھارا اور قصرِ خلافت کی اینٹ سے اینٹ بجادی، ہلاکو خود بھی اپنے بھائی منکوقاآن کی طرف سے اس پر مامور تھا کہ باطنیوں کے استیصال

(باقی صـ ۳۱۹ پر)

دوسری طرح اس کی جان لی جائے، چنانچہ اس کو فرش میں لپیٹ دیا گیا، اور ٹھوکروں اور لاتوں سے اس کو ختم کر دیا گیا۔

بغداد میں ایک مہینہ سے زیادہ قتل عام جاری رہا، اور صرف وہی بچ سکا، جو چھپا رہا، کہا جاتا ہے کہ ہلاکو نے مقتولین کو شمار کرایا، تو ۱۸ لاکھ مقتول شمار ہوئے[1]۔

عیسائیوں کو حکم دیا گیا کہ علانیہ شراب پئیں اور سور کا گوشت کھائیں، اگرچہ رمضان کا زمانہ تھا مگر مسلمانوں کو مجبور کیا گیا کہ وہ شرکت کریں، مسجدوں کے اندر شراب انڈیلی گئی، اور اذان کی ممانعت کر دی گئی، یہ وہ بغداد ہے جو (جب سے آباد ہوا) کبھی دار الکفر نہیں ہوا تھا، وہاں وہ واقعہ پیش آیا جو کبھی تاریخ میں پیش نہیں آیا۔[2]

بغداد ہزار خرابیوں کے باوجود عالم اسلامی کا سب سے بڑا شہر، علوم و فنون کا مرکز، ہزارہا علماء و صلحاء کا مسکن اور دار الخلافت ہونے کی وجہ سے مسلمانوں کی آبرو تھا، اس کی بربادی نے تمام حساس مسلمانوں کو تڑپا دیا، اور ہر طرف اس کا ماتم کیا گیا، شیخ سعدی علیہ الرحمہ نے جو بغداد میں طالب علمی کر چکے تھے، اور اس کی رونقیں دیکھے ہوئے

(باقی ص ۳۱۸ کا) کے بعد خلافت عباسیہ کا خاتمہ کر دے، خلیفہ بغداد مستعصم باللہ کے پاس ہلاکو نے اطاعت کا حکم بھیج دیا، مراسلت ہوتی رہی، مگر کوئی نتیجہ نہیں نکلا، اب ہلاکو نے اپنے ساتھیوں سے مشورہ کیا، مغل نجوم سعد و نحس کے بہت معتقد تھے، حسام الدین نامی ایک سنی نجومی اس کے دربار میں تھا، اس نے کہا کہ حملۂ بغداد کی یہ گھڑی نحس ہے، اور جب کسی بادشاہ نے خلافت پر ہاتھ ڈالا ہے، تو اسے منہ کی کھانی پڑی ہے، اور کسی نہ کسی بلا میں گرفتار ہوا ہے، اگر آپ حملہ کرتے ہیں، تو بارش بند ہو جائے گی، طوفان اور زلزلے آئیں گے، اور ایک عالم ویران ہو جائے گا اور سب سے بڑھ کر یہ کہ بادشاہ (منکو قاآن) ہلاک ہو جائے گا، یہ سن کر ہلاکو متردد ہو گیا، ہلاکو نے طوسی کی رائے معلوم کی کہ "اگر بغداد حملہ کنیم عاقبت چہ خواہد شد"؟ طوسی نے جواب میں کہا "چیزے نخواہد شد جز اینکہ بجائے خلیفہ خان خواہد بود" ہلاکو نے طوسی اور حسام الدین دونوں کو بلا کر مناظرہ کرایا، طوسی نے کہا کہ "ہزاروں صحابہؓ شہید کر دیئے گئے، مگر کوئی فساد ظاہر نہیں ہوا، اگر عباسیوں کی خصوصیت کہتے ہو تو طاہر کو دیکھو جس نے مامون کے حکم سے خلیفہ وقت امین سے جنگ کی، اور اس نے قتل کر دیا، متوکل کو اس کے لڑکوں اور غلاموں نے اتفاق کر کے مار ڈالا، منتصر اور معتضد کو امراء اور غلاموں نے ختم کر دیا مگر کوئی زلزلہ اور طوفان نہیں آیا۔ [1] ۲۵ لاکھ آبادی میں یہ کچھ بعید نہیں، بعض مورخین نے مقتولین کی تعداد اس سے کم بیان کی ہے

[2] طبقات الشافعیۃ الکبریٰ ج ۵ ص ۱۱۴، ۱۱۵

تھے، ایک دل دوز مرثیہ کہا جس میں اس وقت کے تمام مسلمانوں کے زخمی دلوں کی ترجمانی ہے، اس کے چند اشعار نقل کئے جاتے ہیں :۔

آسماں را حق بود گر خوں ببارد بر زمین | بر زوال ملک مستعصم امیر المومنین
اے محمدؐ گر قیامت می بر آری سر زخاک | سر بر آور دین قیامت درمیان خلق بین
نازنینان حرم را خون خلق نازنین | ز آستان بگذشت و ما را خون دل آستین
زینہار از دور گیتی و انقلاب روزگار | در خیال کس نگشتی کانچناں گردد چنیں
دیدہ بر دار اے کہ دیدی شوکت بیت الحرام | قیصراں روم سر بر خاک و خاقاں بر زمین
خون فرزندان عم مصطفیٰ شد ریختہ | ہم بر آں خاکے کہ سلطاناں نہادندے جبیں
دجلہ خونابست زیں پس گر نہد سر بر نشست | خاک نخلستان بطحا را کند با خون عجیں
روئے دریا در ہم آمد زیں حدیث ہولناک | می تواں دانست بر رویش ز برج افتادہ چیں
نوحہ لائق نیست بر خاک شہیداں زانکہ ہست | کمتریں دولت مر ایشاں را بہشت برتریں
لیکن از روئے مسلمانی و راہ مرحمت | مہرباں را دل بسوزد در فراق نازنین[1]

بغداد کے بعد تاتاریوں نے حلب کا رخ کیا، اور ابن کثیر کے بیان کے مطابق اس کے ساتھ بھی بغداد کا سا سلوک کیا، وہاں سے دمشق کی طرف بڑھے، اور جمادی الاولیٰ ۶۵۸ھ میں اس پر قبضہ کر لیا، شہر کے عیسائیوں نے تاتاری فاتحوں کا شہر سے نکل کر استقبال کیا، اور ان کو تحائف پیش کئے، اور ان کے حاکم کے پاس سے فرمان لے کر آئے، اور شہر میں فاتحانہ داخل ہوئے، ابن کثیر جو خود دمشق کے رہنے والے ہیں، اس واقعہ کی تصویر کھینچتے ہیں، جس سے مسلمانوں کی بے بسی، ذلت و کمزوری کا اندازہ ہوتا ہے :۔

"عیسائی باب توما سے داخل ہوئے، وہ صلیب کو لوگوں کے سروں پر بلند کئے ہوئے تھے اور اپنا مخصوص نعرہ

[1] کلیات سعدی ص ۵۶

لگا رہے تھے، وہ پکار پکار کر کہہ رہے تھے کہ دین برحق یسوع مسیح کا دین غالب آیا، اور اسلام اور اہل اسلام کی صاف صاف مذمت کرتے تھے، ان کے ہاتھوں میں شراب کے برتن تھے جس مسجد کے پاس سے گذرتے، اس کے پاس شراب چھڑکتے، کچھ شراب کی بوتلیں تھیں، جن کو لوگوں کے چہروں اور کپڑوں پر چھڑکتے تھے، گلیوں اور بازاروں میں جو شخص بھی گذرتا، اس کو حکم دیتے تھے کہ صلیب کی کھڑے ہو کر تعظیم کرے، مسلمان یہ نقشہ دیکھ کر جمع ہو گئے، اور ان کو دھکا دے کر کنیسۂ مریم تک پہونچا دیا، وہاں عیسائی مقرر نے کھڑے ہو کر مسیحیت کی تعریف میں تقریر کی، اور دین اسلام، اور اہل اسلام کی مذمت کی؛

ابن کثیرؒ ذیل المرأۃؒ کے حوالہ سے آگے لکھتے ہیں:-

"عیسائی جامع مسجد میں شراب لئے ہوئے داخل ہوئے ان کی نیت تھی کہ اگر تاتاریوں کا زیادہ رہنا ہوا، تو وہ بہت سی مسجدوں کو گرادیں گے، جب شہر میں یہ واقعات پیش آئے تو مسلمان، قاضی، شاہد اور علماء جمع ہو کر قلعہ میں گئے، اور تاتاری حاکم قلعہ "ایل سیان" سے شکایت کی، لیکن اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مسلمان بڑی ذلت سے نکال دیئے گئے، اور عیسائیوں کے سربرآوردہ لوگوں کی بات سنی گئی" اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ[1]

شام کے قبضہ کے بعد تاتاریوں کا رخ قدرتی طور پر مصر کی طرف تھا، اور وہی تنہا اسلامی ملک تھا، جو ان کی غارت گری سے بچا ہوا تھا، سلطان مصر الملک المظفر سیف الدین قطز کو معلوم تھا کہ اب مصر کی باری ہے، اور تاتاریوں کی چڑھائی کے بعد ملک کی حفاظت مشکل ہے، اس نے مناسب سمجھا کہ وہ مصر میں مدافعت کرنے کے بجائے آگے بڑھ کر شام میں تاتاریوں پر خود حملہ کرے، چنانچہ ۲۵ رمضان المبارک ۶۵۸ھ کو عین جالوت کے مقام پر تاتاریوں اور مصر کی اسلامی افواج کا مقابلہ ہوا، اور سابق تجربوں کے بالکل خلاف تاتاریوں کو شکست فاش ہوئی، وہ بُری طرح سے بھاگے مصریوں نے ان کا تعاقب کیا، اور کثرت سے ان کو قتل کیا، اور بڑی تعداد میں گرفتار۔

سیوطیؒ تاریخ الخلفاءؒ میں لکھتے ہیں:-

---

[1] البدایۃ والنہایۃ ج ۱۳ ص ۲۲۰، ۲۱۹

"تاتاریوں کو شرمناک ہزیمت ہوئی، اور خدا کے فضل و کرم سے مسلمانوں نے ان پر فتح پائی، تاتاریوں کا قتل عام ہوا، اور وہ اس طرح سراسیمہ ہو کر بھاگے کہ لوگوں کی ہمتیں بڑھ گئیں، وہ آسانی سے ان کو پکڑ لیتے تھے اور لوٹتے تھے۔"[1]

عین جالوت کے معرکہ کے بعد سلطان الملک الظاہر بیبرس نے متعدد بار تاتاریوں کو شکست دی، اور سارے ملک شام سے ان کو بے دخل اور خارج کر دیا، اور اس طرح وہ کہاوت غلط ثابت ہوئی کہ "تاتاریوں کی شکست ممکن نہیں"!

تاتاریوں میں اشاعتِ اسلام

قریب تھا کہ سارا عالمِ اسلام اس سیلاب بلا میں بہہ جائے، اور جیسا کہ اس وقت کے اہل نظر اور دردمند مسلمان مصنفین نے خطرہ ظاہر کیا ہے، اسلام کا نام و نشان بھی مٹ جائے کہ دفعۃً تاتاریوں میں اشاعتِ اسلام شروع ہو گئی، اور جو کام مسلمانوں کی شمشیریں اور مسلمان بادشاہ نہ کر سکے، وہ اسلام کے داعیوں اور خدا کے مخلص بندوں نے انجام دیا، اور خود اسلام نے اپنے خون آشام دشمنوں کے دل میں گھر کرنا شروع کر دیا۔

تاریخ کے عجیب ترین واقعات اور حقائق میں سے اس ناقابلِ تسخیر قوم کا اسلام سے مسخر اور مسلمانوں کے فاتح کا اسلام سے مفتوح ہو جانا ہے، تاتاریوں کا ایک سال کے عرصہ میں برق و باد کی طرح وسیع اسلامی دنیا پر چھا جانا، اور عالم اسلام کو بزورِ شمشیر فتح کر لینا، اتنا عجیب واقعہ نہیں، اس لئے کہ ساتویں صدی کا عالم اسلام ان بیماریوں، کمزوریوں کا شکار تھا، جو بالعموم تمدن و تہذیب کی انتہائی ترقی کے بعد قوموں میں پیدا ہو جایا کرتی ہیں، اور ان کو اندر سے کھوکھلا کر دیتی ہیں، اس کے بالمقابل تاتاری تازہ دم، جفاکش، بدوی زندگی کے عادی اور خون خوار خون آشام تھے، لیکن عجیب واقعہ اور تاریخ کا معمہ یہ ہے کہ اپنے انتہائی عروج کے زمانہ میں

[1] تاریخ الخلفاء، ص ۴۵۱ (مطبعۃ المیمنیہ مصر)

یہ نیم وحشی قوم اپنے مفتوح اور بے دست و پا مسلمانوں کے دین کی حلقہ بگوش بن گئی، جو اپنی ہر قسم کی مادی اور سیاسی طاقت کھو چکا تھا، اور جس کے پیروؤں کو تاتاری سخت ذلت اور حقارت کی نظر سے دیکھتے تھے، پروفیسر ٹی۔ ڈبلیو۔ آرنلڈ اپنی مشہور کتاب دعوتِ اسلام (PREACHING IN ISLAM) میں استعجاب کا اظہار کرتے ہوئے لکھتا ہے:۔

"لیکن اسلام اپنی گذشتہ شان و شوکت کے خاکستر سے پھر اٹھا، اور واعظین اسلام نے ان ہی وحشی مغلوں کو جنھوں نے مسلمانوں پر کوئی ظلم باقی نہ رکھا تھا، مسلمان کر لیا یہ ایسا کام تھا جس میں مسلمانوں کو سخت مشکلیں پیش آئیں کیونکہ دو مذہب اس بات کی کوشش میں تھے کہ مغلوں اور تاتاریوں کو اپنا معتقد بنائیں، وہ حالت بھی عجیب و غریب اور دنیا کا بے مثل واقعہ ہوگی جس وقت بدھ مذہب اور عیسائی مذہب اور اسلام اس جد و جہد میں ہوں گے کہ ان وحشی اور ظالم مغلوں کو جنھوں نے ان تین بڑے مذہبوں کے معتقدوں کو پائمال کیا تھا، اپنا مطیع بنائیں"[1]

"اسلام کے لئے ایسے وقت میں بدھ مذہب اور عیسائی مذہب کا مقابلہ کرنا، اور مغلوں کو ان دونوں مذہبوں سے بچا کر اپنا پیرو بنانا ایسا کام تھا جس میں بظاہر کامیابی ناممکن معلوم ہوتی تھی، مغلوں کے طوفان ہلاکت سے مسلمانوں کے برابر کسی نے نقصان نہ اٹھایا تھا، وہ مشہور و معروف شہر جو ایک زمانہ میں اسلامی علوم و فنون کا مرکز تھے، اور جہاں ایشیا کے ارباب علم و فضل آباد تھے، اکثر جلا کر خاک کر دیئے گئے تھے، مسلمانوں کے عالم اور فقیہ یا تو قتل کئے گئے، یا ان کو غلام بنا لیا گیا[2] خانانِ مغل جو اسلام کے سوائے اور سب مذہبوں پر مہربان تھے، اسلام کے ساتھ مختلف درجہ کی نفرت اور عداوت رکھتے تھے، چنگیز خاں نے حکم دیا تھا کہ جو لوگ جانوروں کو شرع کے مطابق

---

[1] دعوتِ اسلام (مترجمہ مولوی عنایت اللہ) صفحہ ۲۴۰، ۲۴۱ [2] مغلوں نے مسلمانوں پر ایسے ظلم کئے کہ چینی تماشے والے جب پردہ پر عکس کی تصویریں دکھاتے ہیں، تو ایک تصویر میں سفید داڑھی کا ایک بڈھا آدمی آتا ہے جس کی گردن گھوڑے کی دُم سے بندھی ہوتی ہے، اور گھوڑا اس کو گھسیٹے گھسیٹے پھرتا ہے، یہ تصویر گویا ظاہر کرتی ہے کہ مغلوں کے سواروں نے مسلمانوں کو کیسے آزار پہنچائے (ہوورتھ پہلی جلد صفحہ ۱۵۹)۔

ذبح کریں ان کو قتل کر دیا جائے، اسی حکم کو قوبلائی خان نے اپنے زمانہ میں از سرِ نو جاری کیا، اور اس کی پیروی کے لئے مخبر اور مخبروں کے لئے انعام مقرر کئے۔ اور اس طرح سات برس تک مسلمانوں کو سخت سے سخت آزار پہونچائے۔ مفلسوں نے اس موقع پر دولت جمع کر لی، اور غلاموں نے آزاد ہونے کے لئے آقاؤں پر ذبیحہ کا الزام لگایا۔[1] کیوک خاقان کے عہد میں (۱۲۴۶ء و ۱۲۴۸ء) جس نے کل انتظام سلطنت دو عیسائی وزیروں کے سپرد کر رکھا تھا، مسلمانوں کو سخت اذیتیں پہنچائیں۔[2] ارغوخان نے بھی جو چوتھا ایلخان (۱۲۸۴ء و ۱۲۹۱ء) ہوا مسلمانوں پر ظلم کئے، اور عدالت اور مال کے محکموں میں جس قدر اسامیاں ان کے پاس تھیں وہ خالی کرالیں اور ان کا دربار میں آنا بند کر دیا۔[3]

باوجود ان مشکلات کے مغلوں اور وحشی قوموں نے جو مغلوں کے بعد آئیں انہی مسلمانوں کا مذہب قبول کیا جن کو انھوں نے اپنے پیروں میں روندا تھا۔[4]

یہ واقعہ جتنا عجیب اور عظیم الشان ہے، اتنا ہی یہ امر حیرت انگیز ہے کہ تاریخ میں اس کی تفصیلات اور جزئیات بہت کم ملتی ہیں، اور جن لوگوں کے ہاتھوں یہ کارنامہ انجام پایا، ان کا تاریخ کے دفتر میں بہت کم سراغ ملتا ہے، جن مخلصین نے اس خون آشام تاتاری قوم کو اسلام کا حلقہ بگوش بنایا، ان میں بہت کم لوگوں کا نام دنیا کو معلوم ہے، مگر ان کا یہ کارنامہ کسی اسلامی کارنامہ سے کم نہیں، اور ان کا احسان نہ صرف مسلمانوں پر بلکہ پوری انسانیت پر قیامت تک رہے گا کہ انھوں نے دنیا کو وحشت و بربریت سے محفوظ کر کے ایک ایسی قوم کی تولیت میں دے دیا، جو خدائے واحد کی پرستار اور رحمۃ للعالمین صلے اللہ علیہ وسلم کے دین کی علمبردار تھی۔

چنگیز خاں کی سلطنت انتقال کے بعد اس کے چار بیٹوں کی چار شاخوں میں بٹ گئی تھی، ان چاروں شاخوں میں اسلام کی اشاعت شروع ہو گئی اور تاتاری خاقان اور ان کی دعوت و تبلیغ اور اثر سے تاتاری قوم مسلمان ہونا شروع ہو گئی، یہاں تک کہ ایک صدی کے اندر اندر تقریباً ساری تاتاری قوم مسلمان ہو گئی،

---

[1] ہوورتھ ج ۱ ص ۲۷۳،۱۱۲ (جس وقت یہ دیکھا گیا کہ اس حکم سے مسلمان تاجروں کا دربار میں آنا بند ہو گیا اور اس کی وجہ سے تجارت کو نقصان پہنچا تو حکم منسوخ کر دیا گیا) [2] ہوورتھ ج ۱ ص ۱۶۵ [3] دی گوین ج ۳ ص ۲۶۵ [4] دعوتِ اسلام ص ۲۴۶،۲۴۵

پروفیسر آرنلڈ نے "دعوتِ اسلام" میں اس کے جستہ جستہ واقعات لکھے ہیں، چنگیز خاں کے بڑے بیٹے جوچی خاں کی شاخ میں جو سلطنت کے مغربی حصہ سیرا دادرا پر حکمران تھی، اشاعتِ اسلام کی تاریخ بیان کرتے ہوئے آرنلڈ لکھتا ہے:۔

"مغلوں کا پہلا بادشاہ جو مسلمان ہوا، وہ برکہ خاں تھا، جو ۱۲۵۶ء سے ۱۲۶۷ء تک سیرا دادرا کا خان رہا،[۱] اس بادشاہ کے مسلمان ہونے کی نسبت لکھا ہے کہ ایک دن وہ ایک کارواں میں پہنچا، جو بخارا سے آتا تھا، اس میں دو مسلمان تاجر تھے، جن کو برکہ خاں الگ لے گیا، اور اسلام کے متعلق کچھ سوالات ان سے کئے، مسلمانوں نے اپنے مذہب کے احکام و ارکان اس خوبی سے بیان کئے کہ سیرا دادرا کو مسلمان ہونے کا شوق پیدا ہوا، وہ اسلام لایا، اس کا حال برکہ خاں نے اپنے چھوٹے بھائی سے بیان کیا، اور اس کو بھی اسلام قبول.... کرنے کی ہدایت کی، اس کے بعد برکہ خاں نے اپنے مسلمان ہونے کا اعلان کر دیا،[۲] اسلام قبول کرنے کے بعد برکہ خاں نے سلطان مصر رکن الدین بیبرس سے مصالحت کر لی، اس مصالحت کا باعث خود سلطان مصر اس طرح ہوا کہ اس نے سیرا دادرا کے دو سو مغلوں کی نہایت خاطر مدارات کی، ان مغلوں کا قصہ یہ ہے کہ جب خان سیرا دادرا اور ہلاکو خاں فاتح بغداد میں عداوت زیادہ بڑھی تو یہ دو سو مغل جو ہلاکو خاں کی فوج میں بھرتی تھے، بھاگ کر شام کے ملک میں چلے آئے، اور یہاں سے وہ بڑے اعزاز کے ساتھ قاہرہ پہونچائے گئے، جہاں دربار مصر سے ان کو اسلام قبول کرنے کی ہدایت ہوئی،[۳] سلطان رکن الدین نے ان مغلوں میں سے دو سو آدمیوں کے ساتھ اپنے چند سفیر کئے، اور برکہ خاں کو ایک خط ان کی معرفت روانہ کیا، جب یہ لوگ سیرا دادرا سے قاہرہ کو واپس آئے تو سلطان کو خبر دی کہ برکہ خاں کے امیروں کے ہاں اور ایک شہزادی کے ہاں ایک ایک امام اور موذن مقرر ہے، اور بچوں کو مکتب میں قرآن پڑھایا جاتا ہے،[۴] سلطان سے انھوں نے یہ بھی کہا کہ جب ہم قاہرہ سے

---

[۱] ۱۲۶۳ء میں نجم الدین مختار الزاہدی نے برکہ خاں کے لئے ایک کتاب لکھی جس میں رسالت کو برہان ثابت کیا، اور مسلمانوں اور عیسائیوں کے مذہبی مناظروں کا حال لکھا۔ [۲] ابوالغازی توم ۲ ص ۱۸۱/۱۸۷ [۳] مقریزی ۱ توم ۲ ص ۱۸۰/۱۸۱/۱۸۷ [۴] ایضاً ص ۲۱۵

روانہ ہوئے تھے تو راستہ میں برکہ خاں کے سفیر ملے[1]، جو سلطان مصر کی خدمت میں اطلاع کے لئے حاضر ہوئے تھے کہ برکہ خاں اور اس کی رعایا مسلمان ہوگئی ہے، غرض جب سلطان رکن الدین اور برکہ خاں میں رسم اتحاد پیدا ہوئی تو بیرا داور اکے بہت مغل مصر میں آئے، جہاں ان کو اسلام قبول کرنے کی ترغیب ہوئی[2]۔

تاتاری سلطنت اور خاندان چنگیز خاں کی دوسری شاخ دولت ایلخانیہ میں اشاعتِ اسلام کے متعلق آرنلڈ لکھتا ہے:۔

"ایران میں جہاں ہلاکو خاں دولت ایلخانیہ کا بانی ہوا، ترکوں میں اسلام کی اشاعت رفتہ رفتہ ہوئی (ہلاکو خاں کا بیٹا تکودار[3] جو اپنے بھائی اباقا خاں کا جانشین ہوا، دولت ایلخانیہ کا پہلا بادشاہ تھا جس نے اسلام قبول کیا، ایک عہد نویس عیسائی مصنف نے لکھا ہے[4] کہ تکودار کی تعلیم و تربیت عیسوی مذہب پر ہوئی تھی، بچپن میں اس کو اصطباغ ملا تھا، اور نکولس اس کا نام رکھا گیا تھا، لیکن تکودار جب بڑا ہوا تو اس نے مسلمانوں کے اثر صحبت سے جن کو وہ بہت عزیز رکھتا تھا، عیسائی مذہب چھوڑ کر اسلام اختیار کیا، اور سلطان محمد (یا احمد) نام رکھا، اور جس قدر ہو سکا، اس بات کی کوشش کی کہ سب تاتاری اسلام قبول کرلیں، اور اس کے لئے انعام و اکرام اور اختیار اور عزت لوگوں کو بخشی یہاں تک کہ اس کے زمانہ میں بہت تاتاری مسلمان ہوگئے، اس بادشاہ نے سلطان مصر کو اپنے مسلمان ہونے کی خبر ذیل کے مراسلے سے بھیجی۔

"خدا کی قوت اور قاآن کے اقبال سے سلطان احمد کا فرمان بادشاہ مصر کے نام، بعد تمہید کے واضح ہو کہ خدا نے اپنی عنایت اور ہدایت کی روشنی سے آغاز نوجوانی کے زمانہ میں ہم کو اپنی الوہیت اور وحدانیت کا اقرار کرنے اور محمد صلے اللہ علیہ وسلم کی نبوت کی تصدیق کرنے اور اپنے دوستوں اور نیک بندوں کی نسبت خوش اعتقاد رہنے کی ہدایت کی تھی، وہ جس کسی کو ہدایت پر لانا چاہتا ہے اس کے دل کو مذہب اسلام قبول کرنے کے لئے

---

[1] مقریزی ص۱۸۸ [2] ایضاً ص۲۲۲ [3] وصاف نے اس بادشاہ کو مسلمان ہونے سے پہلے تکودار اور مسلمان ہونے کے بعد احمد لکھا ہے۔ [4] ہیتوم (راموسیو توم ۲ ص۶۰)

کھول دیتا ہے، ہم اس وقت سے آج تک دین کا بول بالا کرنے اور مذہب اسلام اور مسلمانوں کے معاملات کی اصلاح
کرنے پر مائل رہے، یہاں تک کہ والد بزرگوار اور برادر بزرگ کی طرف سے حکمرانی کی نوبت ہم تک آ پہنچی، اور خدا نے اپنی
مہربانی سے ہماری امیدوں کو پورا کیا، اور حکومت و سلطنت ہم کو عنایت کی، پھر قرلبتائی (کورلتائی) مبارک میں
جس سے وہ مجلس مراد ہے، جس میں تمام بھائی بند اور شہزادے اور بڑے بڑے امیر اور فوج کے سردار مشورہ کرنے
کے لئے بیٹھتے ہیں، سب نے مل کر یہ اقرار کیا کہ ہمارے برادر بزرگ کے حکم سے فوج کشی کو جاری کیا جاوے، اور ہماری فوجوں
میں سے جن کی کثرت سے زمین باوجود وسیع ہونے کے تنگ ہے، اور جن کی صولت اور ہیبت سے سب کے دل کانپتے اور
تھراتے ہیں، ایک جم غفیر کو اطراف میں روانہ کیا جائے، اور یہ فوج کشی ایسے مضبوط ارادہ کے ساتھ ہو جس کے سامنے
بلند پہاڑ جھک جاویں، اور سنگ خارا کے چٹان نرم پڑ جاویں، ہم نے اس مقصد پر غور کیا، جس پر ان کے ارادے
پختہ اور ان کی رائیں متفق تھیں، اور ان سب کا خلاصہ جو معلوم ہوا، وہ اس عام نیکی کے خلاف تھا جس کے جاری
کرنے کا ہم ارادہ رکھتے تھے، اور جس سے مراد یہ ہے کہ شعار اسلام کو زندہ کیا جائے، اور جو احکام ہماری طرف سے
جاری ہوں، ان سے خونریزی موقوف ہو، اور دنیا کی مصیبت کم ہو، اور دنیا کے اطراف میں امن وامان کی ہوا
چلے، اور تمام شہروں کے حاکم ہماری شفقت اور مہربانی سے آرام پاویں، کیونکہ ہم خدا کی تعظیم کرتے ہیں، اور
خدا کی مخلوق پر مہربان ہیں، اس لئے خدا نے ہمارے دل میں الہام کیا کہ ہم مشتعل آگ کو بجھائیں، اور فتنہ و فساد کو
فرو کریں، اور جن لوگوں نے یہ رائے دی ہے، ان کو اس تدبیر سے مطلع کریں جس سے دنیا کی بیماریاں اور تکلیفوں کے
دور ہونے کی امید ہے، اور جس کو سب سے پہلے عمل میں لانے کی سب سے آخری علاج سے باز رہنے کی خدا نے ہم کو ہدایت
کی ہے، اس لئے ہم پیکانوں کو جنبش میں لانے، اور کمانوں پر چلّے چڑھانے میں جلدی نہیں کرتے ہیں، اور
جب تک حق بات ظاہر نہ ہو، حجت قوی نہ ہو، ہم اس امر کی اجازت نہیں دیتے، شیخ الاسلام قدوۃ العارفین
کی نصیحت سے جو امور مذہبی میں ہمارے سب سے بہتر مددگار ہیں، ہمارے اس ارادہ کو جو فلاح و بہبودی کی
خواہش پر مبنی ہے، اور اس رائے کو جس سے کامیابی کی امید ہے، پختہ اور مصمم کر دیا، چنانچہ ہم نے یہ فرمان

جاری کیا، جو ماننے والوں کے لئے خدا کی رحمت اور نہ ماننے والوں کے لئے خدا کا عذاب ہے، ہم نے اس فرمان کے ماننے والوں کے لئے قاضی القضاۃ قطب الدین شیرازی اور اتابک بہاء الدین کو جو اس سلطنت کے عمائد میں روانہ کیا ہے، تاکہ لوگوں کو ہمارے طریقہ سے واقف کریں اور تمام مسلمانوں کے فائدہ کے لئے جو باتیں ہمارے دل میں پوشیدہ ہے، سب اس سے آگاہ ہوں، نیز ان سب لوگوں کو اس بات سے مطلع کریں کہ خدا نے ہم کو بصیرت و ہدایت عطا کی ہے، اور اسلام ان تمام گناہوں کو معاف کرتا ہے، جو مسلمان ہونے سے پہلے وقوع میں آئے ہوں، اب تو خدا نے ہم کو ہدایت کی ہے کہ ہم حق کی اور اہل حق کی پیروی کریں، پس اگر لوگوں کے دل ایسی دلیل کی جستجو میں ہیں جن سے وہ ہم پر بھروسہ کرسکیں، اور ایسی حجت طلب کرتے ہیں جس سے کامیابی کی امید کرسکیں، تو وہ ہماری ان تمام فضیلتوں پر نظر ڈالیں، جو دنیا میں عام طور پر مشہور ہوچکی ہیں، کیونکہ ہم نے خدا کی عنایت سے دین کے نشانوں کو بلند کیا ہے، اور ہر ایک حکم جاری کرنے میں اس امر کو پیش نظر رکھا ہے، اور شرع محمدی کے قوانین کو بلحاظ ان کی عظمت اور بزرگی کے عین مقتضائے انصاف پر جاری کیا ہے، ہم نے تمام رعیت کے دلوں کو خوش کیا ہے، اور جن سے پہلے کوئی برائی یا خطا سرزد ہوئی تھی، ان سب کو یہ کہہ کر معاف کردیا ہے کہ خدا بھی تمہاری اگلی خطاؤں کو معاف کرے، ہم نے مسلمانوں کے اوقاف کی جن میں مسجدیں اور مقبرے اور مدرسے شامل ہیں، اصلاح کی ہے، اور تمام خیرات خانوں اور مہمان سراؤں کو جن کے نشانات مٹ گئے تھے، دوبارہ آباد کیا ہے، اور اوقاف کی آمدنی کو ان کے قدیم دستور اور وقف کرنے والوں کے شرائط کے موافق حقداروں تک پہنچا دیا ہے، ہم نے حکم دیا ہے کہ ہمارے حکام حاجیوں کے معاملہ کو مہتم بالشان سمجھیں، اور ان کے لئے سامان سفر مہیا کریں، اور جن رستوں سے وہ سفر کرتے ہیں، ان کو آباد و بے خطر رکھیں، اور حاجیوں کے قافلوں کو بآرام تمام روانہ کریں، ہم نے تمام سوداگروں کو جو ملک میں آمد و رفت رکھتے ہیں، پوری آزادی عطا کی ہے کہ وہ اپنے طریقہ سے جس طرح چاہیں سفر کریں، اور فوج اور قراغول اور شحنوں کو جو ملک کے اطراف میں مقرر ہیں سخت ممانعت کی ہے کہ وہ سوداگروں کی آمد و رفت میں کسی طرح کی مزاحمت کریں، تاکہ شہر اور ملک

آباد ہوں، فتنے اور فساد فرو ہوں، نیز تلواریں میان میں رہیں، اور تمام باشندے آرام و آسایش سے بسر کریں اور مسلمانوں کی گردنیں ذلت و خواری کے طوق سے نکل جائیں۔[1]

"تاریخ مغلیہ کے ناظرین کو ان صدہا ظلموں اور متواتر کشت و خون کے ہنگاموں کو پڑھنے کے بعد جو مغل اور تاتاریوں نے برپا کئے، اس فرمان کے مطالعہ کرنے سے بہت راحت معلوم ہوئی ہوگی، اور تعجب ہوا ہوگا کہ ایک مغل فرمانروا کی زبان سے بھی اس قدر فیاضی اور انسانی ہمدردی کے خیالات ادا ہوئے۔"[2]

"۱۲۸۴ء میں تکودار احمد کے خلاف ایک بغاوت برپا ہوئی، جس کا سرغنہ ارغون خاں تھا، تکودار کو اس نے قتل کیا، اور خود مالک تخت و تاج بن گیا، ارغون کے عہد حکومت میں (۱۲۸۴ء۔۱۲۹۱ء) جو چند سال تک جاری رہا، عیسائیوں پر پھر سلطنت کی طرف سے مہربانی ہوئی اور مسلمانوں کو سختیاں اٹھانی پڑیں، اور سرکاری عہدوں اور نوکریوں سے وہ برطرف کر دیئے گئے۔[3] ۱۲۹۵ء تک تکودار کے جانشین اپنے قدیم مذہب شامان کے پیرو رہے، لیکن ۱۲۹۵ء میں البتہ ان کا ساتواں بادشاہ غازان جو خاندان ایلخانیہ کا سب سے زیادہ بارعب اور پر سطوت بادشاہ ہوا، مسلمان ہوگیا، اور اس نے اسلام کو ایران کا شاہی مذہب قرار دیا۔

مسلمان ہونے سے پہلے سلطان غازان کی تعلیم و تربیت بدھ مذہب پر ہوئی تھی، اور خراسان میں اس بادشاہ نے بدھوں کے لئے مندر تعمیر کر دیئے تھے، بدھ مذہب کے عالموں کی صحبت سے وہ بہت خوش ہوتا تھا، اور یہ لوگ جس وقت دولت مغلیہ کو عروج ہوا تھا، ایران میں کثرت سے چلے آئے تھے۔[4] سلطان غازان کو مختلف مذہبوں کی تحقیق و تفتیش کا بڑا شوق تھا، اور ہر مذہب کے عالموں سے وہ مذہبی مباحثہ کرتا تھا۔[5] غازان کا وزیر اور اس کے عہد کا مورخ حکیم رشید الدین تھا، جس کا یہ خیال غالباً صحیح معلوم ہوتا ہے کہ سلطان غازان سچی نیت اور عقیدہ سے مسلمان ہوا، اور اپنے تمام زمانہ بادشاہی میں وہ اسلام کا نہایت پابند رہا۔"[6]

---

[1] وصاف ص ۲۳۱، ۲۳۴ [2] دعوتِ اسلام ص ۲۴۸، ۲۵۱ [3] دے گبن ج ۳ ص ۲۶۳، ۲۶۵ [4] دہوسن توم ۴ ص ۱۳۸

[5] ایضاً ص ۳۶۵ [6] دعوتِ اسلام ص ۲۵۳

مورخ ابن کثیر نے بھی غازان کے اسلام لانے کا ذکر ۶۹۴ھ کے واقعات میں بڑی مسرت کے ساتھ کیا ہے، اور ان کے اور دوسرے مورخین کے بیانات سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کا سہرا ایک دل مسلمان ترک امیر توزون[1] کے سر ہے، جن کی تلقین اور سعی سے تاتاری سلطان نے اسلام قبول کیا، ابن کثیر ۶۹۴ھ کے واقعات میں لکھتے ہیں:۔

"اس سال چنگیز خاں کا پر پوتا قازان بن ارغون بن ابغا بن تولی بن چنگیز خاں تاتاریوں کا بادشاہ ہوا اور امیر توزون رحمۃ اللہ علیہ کے ہاتھ پر علانیہ مشرف باسلام ہوا، اور تاتاری کل یا بیشتر اسلام میں داخل ہو گئے جس روز بادشاہ نے اسلام قبول کیا، اس روز سونا چاندی اور موتی لوگوں کے سروں پر نچھاور کئے گئے، اس نے اپنا نام محمود رکھا، اور جمعہ اور خطبہ میں شرکت کی، بہت سے مندر اور گرجے گرا دیئے گئے، اور ان پر جزیہ مقرر کیا، بغداد اور دوسرے شہروں اور ملکوں کی غصب کی ہوئی چیزیں واپس کی گئیں، اور انصاف کیا گیا، لوگوں نے تاتاریوں کے ہاتھ میں تسبیحیں اور ہیاکل (؟) دیکھے اور اللہ کے فضل و احسان کا شکر ادا کیا۔"[2]

"آرنلڈ لکھتا ہے کہ ۱۳۰۴ء میں غازان کا بھائی سلطان بن محمد خدابندہ کے نام سے تخت ایران پر بیٹھا، اس سلطان کی ماں عیسائی تھی، اور بچپن میں اس کی تعلیم و تربیت بھی عیسوی طریقہ سے ہوئی تھی اور نکولس کے نام سے اس نے اصطباغ پایا تھا لیکن ماں کے مرنے پر وہ اپنی بیوی کے کہنے سے مسلمان ہو گیا، ابن بطوطہ نے لکھا ہے کہ نکولس خاں یعنی سلطان خدابندہ کے مسلمان ہونے سے مغلوں میں بڑا اثر پیدا ہوا[3]، غرض اس زمانہ سے قلمرو ایلخانیہ میں اسلام سب مذہبوں پر غالب آ گیا۔"[4]

اس خاندان کی تیسری شاخ میں جو بلاد متوسط پر قابض تھی، اور جس کا بانی چغتائی بن چنگیز خاں تھا، اشاعتِ اسلام کی کیفیت بیان کرتے ہوئے آرنلڈ لکھتا ہے:۔

"بلاد متوسط میں جو چغتائی ابن چنگیز خاں اور اس کی اولاد کے حصہ میں آئے تھے، دعوتِ اسلام کے حالات

---

[1] آرنلڈ اور دوسرے مورخین اس کو نوروز بیگ کے نام سے یاد کرتے ہیں۔ [2] البدایۃ والنہایۃ۔ ج ۱۳ صفحہ ۳۴

[3] ابن بطوطہ ج ۲ صفحہ ۵۷ [4] دعوت اسلام صفحہ ۲۵۴

کا پتہ کم چلتا ہے، اس سلسلہ میں پہلا بادشاہ جس کو نورِ اسلام کی برکت ملی، وہ براق خاں تھا جو چغتائی خاں کا پڑپوتا تھا، اور جس نے تخت نشین ہونے کے ۔ ورس کے بعد مسلمان ہو کر سلطان غیاث الدین (۱۲۶۶ء و ۱۲۷۰ء) اپنا نام رکھا[۱] لیکن یہاں شروع زمانہ میں اسلام کی ترقی زیادہ عرصہ تک جاری نہ رہ سکی، چونکہ براق خان کے مرنے کے بعد جو مغل مسلمان ہوئے تھے، انھوں نے پھر اپنا قدیم مذہب اختیار کیا، اور چودھویں صدی عیسوی سے پہلے اس حالت کی اصلاح نہ ہو سکی، البتہ طرمشرین خان جس نے ۱۳۲۲ء سے ۱۳۳۰ء تک سلطنت کی، جس وقت مسلمان ہوا، تو چغتائیہ مغلوں نے بالعموم اسلام اختیار کر لیا، اور جب ایک دفعہ انھوں نے اپنے بادشاہ کی طرح اسلام قبول کر لیا تو وہ مضبوط دل سے اس مذہب پر قائم رہے، لیکن اس سال میں بھی اسلام کا اور مذہبوں پر غالب آنا جو حریف مقابل تھے، یقینی امر نہ تھا، کیونکہ طرمشرین کے جانشینوں نے مسلمانوں کے اوپر ظلم و ستم کرنے شروع کر دیئے، اور جب تک کاشغر کا بادشاہ جس کی ریاست چغتائیہ سلطنت کی تقسیم و ضعف سے خود مختار ہو گئی تھی، اسلام کی حمایت کو نہ اٹھا، اس وقت تک اسلام کی ترقی ممکن نہ ہوئی، سلطان کاشغر کے مسلمان ہونے کی نسبت جس کا نام تغلق تیمور خاں (۱۳۴۷ء و ۱۳۶۳ء) تھا، لکھا ہے کہ بخارا سے ایک بزرگ شیخ جمال الدین کاشغر میں آئے، اور انھوں نے تغلق تیمور کو مسلمان کیا، شیخ جمال الدین اور ان کے ساتھی سفر میں تھے کہ نادانستہ تغلق کی شکاری زمین پر سے ان کا گذر ہوا، بادشاہ نے اس قصور میں ان سب لوگوں کی مشکیں کسوا کر اپنے سامنے طلب کیا، اور نہایت غصہ کی حالت میں ان سے پوچھا کہ تم لوگ کیوں ہماری زمین پر بے اجازت داخل ہوئے، شیخ نے جواب دیا کہ ہم اس ملک میں اجنبی ہیں اور ہم کو مطلق خبر نہ تھی کہ ہم ایسی زمین پر چل رہے ہیں جس پر چلنے کی ممانعت ہے، بادشاہ کو جب یہ معلوم ہوا کہ یہ لوگ ایرانی ہیں تو اس نے کہا کہ ایرانی سے تو کتا بہتر ہوتا ہے، شیخ نے کہا کہ سچ ہے اگر دینِ برحق ہمارے پاس نہ ہوتا تو فی الحقیقت ہم کتے سے بھی بدتر تھے، یہ جواب سن کر تغلق تیمور حیران رہ گیا، اور

[۱] ابوالغازی ترجمہ ص ۱۵۵

حکم دیا کہ جب ہم شکار سے واپس آئیں تو یہ ایرانی ہمارے سامنے حاضر کئے جائیں چنانچہ ایسا ہی ہوا، اور بادشاہ نے شیخ جمال الدین کو علیحدہ لے جاکر کہا کہ جو کچھ تم اس وقت کہتے تھے اس کو اب سمجھاؤ، دین برحق سے تمہارا کیا مطلب ہے؟ یہ سن کر شیخ نے اسلام کے احکام اور ارکان کو ایسے جوش سے بیان کیا کہ تغلق تیمور کا دل جو پہلے پتھر تھا، اب موم کی طرح نرم ہوگیا، شیخ نے حالت کفر کا ایسا مہیب نقشہ کھینچا کہ بادشاہ کو اپنی غلطیوں سے اب تک بے بصیرت رہنے کا یقین ہوگیا، لیکن اس نے کہا کہ "اگر اس وقت میں اپنا مسلمان ہونا ظاہر کروں گا، تو پھر رعایا کو راہ راست پر نہ لاسکوں گا، اس لئے کچھ عرصہ کے لئے تم سکوت کرو، جب میں اپنے باپ کے تخت اور ملک کا مالک ہوں تو اس وقت تم میرے پاس آنا، چغتائیہ سلطنت اب حصہ ہوکر چھوٹی چھوٹی عملداریوں میں تقسیم ہوگئی تھی اور برسوں کے بعد تغلق تیمور اس قابل ہوا کہ ان سب عملداریوں کو شامل کرکے پھر قلمرو چغتائیہ کی شکل ایک سلطنت قائم کردے، اس عرصہ میں شیخ جمال الدین اپنے وطن کو چلے گئے، اور یہاں سخت بیمار پڑے، جب موت کا وقت قریب آیا، تو اپنے بیٹے رشید الدین سے کہا کہ تغلق تیمور ایک دن بڑا بادشاہ ہوگا، تم اس وقت اس کے پاس جانا، اور میرا اسلام پہنچاکر بے خوف وخطر بادشاہ کو یاد دلانا کہ اس نے مجھ سے کیا وعدہ کیا تھا، چند سال کے بعد تیمور تغلق نے باپ کا تخت حاصل کرلیا تو ایک دن رشید الدین بادشاہ کے لشکر میں پہونچا کہ باپ کی وصیت کو پوری کرے، لیکن باوجود کوشش کے اس کو خان کے دربار میں حضوری نہ ہوئی، آخر کار اس نے مجبور ہوکر یہ تدبیر کی کہ ایک دن علی الصباح تغلق کے خیمہ کے قریب اذان کہنی شروع کی، تغلق کی جب نیند خراب ہوئی تو غصہ ہوا، اس نے رشید الدین کو اپنے سامنے بلوایا، رشید الدین آیا اور اپنے باپ کا پیغام تغلق کو سنایا، تغلق کو پہلے ہی سے اپنے وعدہ کا خیال تھا، وہ کلمہ پڑھ کر مسلمان ہوا، اس کے بعد اس نے اپنی رعایا میں اسلام کی اشاعت کی، اور اس کے زمانہ میں ان تمام ملکوں کا مذہب اسلام ہوگیا، جو چغتائی ابن چنگیز خاں کی اولاد کے تسلط میں رہتے تھے"۔[1]

بعض ترکی مورخین کی تاریخوں میں یہ روایت اس طرح منقول ہے کہ تغلق تیمور نے اپنے شکاری کتے

---

[1] دعوت اسلام از آرنلڈ ص ۲۵۶

کی طرف اشارہ کرکے کمال حقارت سے شیخ جمال الدینؒ سے پوچھا کہ یہ بہتر ہے کہ تم بہتر ہو؟ شیخ نے بڑے اطمینان سے جواب دیا کہ اگر میں دنیا سے ایمان کے ساتھ چلا گیا تو میں بہتر ہوں ورنہ یہ کتا، تغلق تیمور کے دل میں یہ بات چبھ گئی، اور اس نے اس کی تفصیل دریافت کی اور پوچھا کہ ایمان کسے کہتے ہیں؟ شیخ نے ایمان کی حقیقت بیان کی، اس پر تغلق تیمور نے اس سے خواہش کی کہ اس کی تخت نشینی کے بعد وہ اس کو اپنی زیارت سے مشرف کریں، اور پھر وہ واقعہ پیش آیا، جو اوپر مذکور ہوا، بہر حال اتنا محقق ہے کہ تغلق تیمور کے اسلام لانے، اور بالواسطہ کاشغر اور سلطنت چغتائیہ میں اسلام کی اشاعت کا ظاہری سبب شیخ جمال الدین ہیں، جن کے دل سے نکلے ہوئے ایک فقرہ نے اور ان کی قوت ایمانی اور اخلاص و درد نے وہ کام کیا، جو ہزاروں تقریریں اور لاکھوں شمشیریں نہیں کر سکتیں "جَزَاهُ اللّٰهُ عَنِ الْاِسْلَامِ وَبَنِيْهِ خَيْرَ الْجَزَاءِ"

چنگیز خاں کی چوتھی شاخ کے متعلق (جس کا بانی اوگتائی خاں تھا، اور جس میں منگو خاں اور قوبلائی خاں جیسے نامور فرمانروا گذرے ہیں، اور جو تاتاری سلطنت عظمیٰ کے مشرقی حصہ پر قابض تھی) آرنلڈ لکھتا ہے:۔

"تمام سلطنت مغلیہ میں ہر جگہ ایسے مسلمان موجود تھے، جو منکرین کو خفیہ طور پر مسلمان کر لیتے تھے، اوگتائی خاں (۶۲۶ھ تا ۶۳۹ھ / ۱۲۲۹ء تا ۱۲۴۱ء) کے عہد میں حاکم ایران کرگز نامی کا حال لکھا ہے کہ وہ اول بدھ مذہب کا پیرو تھا، پھر اس نے یہ مذہب چھوڑ کر اسلام اختیار کیا،[1] تیمور خاں کے زمانہ میں (۱۲۹۴ء تا ۱۳۰۷ء) خان انندا نے جو قوبلائی خاں کا پوتا تھا، اور چین میں صوبہ کانسوہ کا حاکم تھا، اسلام قبول کیا، اور تانگوت میں اس نے بہت لوگوں کو مسلمان کیا، بلکہ جو فوج اس کے تحت میں تھی، اس کے بھی اکثر لوگ مسلمان ہو گئے، تیمور خاں نے انندا خاں کو اپنے دربار میں بلایا اور کوشش کی کہ انندا خاں اسلام چھوڑ کر بدھ مذہب قبول کرے، لیکن اس نے انکار کیا، اور قید میں بھیج دیا گیا، تھوڑے عرصہ کے بعد انندا خاں قید سے رہا کر دیا گیا، کیونکہ تانگوت کی رعایا جس کو اپنے حاکم کے ساتھ بہت الفت تھی، بغاوت پر آمادہ ہو چلی تھی"[2]

---

[1] وہوسن ج ۳ ص ۱۲۱ [2] ایضاً توم ۲ ص ۵۳۲، ۵۳۳

غرض اس طرح پوری تاتاری قوم جس نے پورے عالم اسلام کو پامال کر کے رکھ دیا تھا، اور جس کے سامنے کوئی اسلامی طاقت ٹھہر نہیں سکتی تھی، چند برس کے عرصہ میں اسلام کی حلقہ بگوش بن گئی، اور اسلام نے دوبارہ اس کا ثبوت دیا کہ اس کو اپنے دشمنوں کو تسخیر اور اپنے دام محبت میں اسیر کرنے کی عجیب غریب قدرت حاصل ہے، تاتاری نہ صرف مسلمان ہوئے، بلکہ ان میں بڑے بڑے مجاہد، بڑے بڑے عالم اور فقیہ اور بڑے بڑے باخدا درویش پیدا ہوئے، اور انھوں نے بہت سے نازک موقعوں پر اسلام کی پاسبانی کا فرض بھی انجام دیا۔

ہے عیاں فتنۂ تاتار کے افسانے سے
پاسباں مل گئے کعبے کو صنم خانے سے

مولانا جلال الدین رومیؒ

علم کلام و عقلیت کا بحران

ساتویں صدی میں سارا عالمِ اسلام علمِ کلام کے مسائل و مباحث سے گونج رہا تھا، جو شخص علمِ کلام کی اصطلاحات اور معتزلہ و اشاعرہ پھر اشاعرہ و حنابلہ کے مختلف فیہ مسائل سے واقف نہیں ہوتا تھا، وہ پڑھا لکھا انسان نہیں سمجھا جاتا تھا، اسی صدی کی ابتدا میں (۶۰۶ھ میں) امام رازی نے انتقال کیا تھا، جنھوں نے علمِ کلام کا صور اس بلند آہنگی سے پھونکا تھا، کہ اس کی صدائے بازگشت کے علاوہ کوئی آواز سننے میں نہیں آتی تھی، عالمِ اسلام کے علمی و فکری حلقے استدلال و قیاس کے خوگر تھے، کسی شئی کا وجود، کسی چیز کی حقیقت، دین کا کوئی عقیدہ اس وقت تک قابلِ تسلیم نہیں سمجھا جاتا تھا، جب تک کہ اس کو عقلی دلائل، منطقی ترتیب، اور فلسفیانہ مقدمات سے ثابت نہ کر دیا جاتا۔

متکلمین اشاعرہ نے عام زندگی میں اگرچہ معتزلہ اور فلاسفہ پر فتح حاصل کر لی تھی، اور ان کے علم کلام کے مقابلہ میں اعتزال و فلسفہ کی آواز پست ہو چکی تھی، لیکن اعتزال کی روح اور عقلیت خود اپنے فاتحین کو مفتوح بنا چکی تھی، اشاعرہ کے علمِ کلام میں معتزلہ کی عقلیت پرستی کی روح سرایت کر گئی تھی، انھوں نے بھی عقل کو اتنی وسعت دے دی تھی کہ وہ ذات و صفات کے نازک اور ماورائے عقل (نہ کہ مخالفِ عقل) مسائل و تفصیلات میں آزادانہ بحث کر سکے، انھوں نے بھی ظواہر و محسوسات کو بڑی حد تک

فیصلہ کن سمجھ لیا تھا، انھوں نے بھی دینی مسائل کے اثبات اور حقائق اشیاء کے وجود کی بنیاد استدلال و قیاس پر رکھی تھی۔

اس کا نتیجہ تھا کہ تمام عالم اسلام پر ایک لفظی و استدلالی ذوق غالب تھا، علم کلام نقل در نقل ہو کر رہ گیا تھا، جس میں عرصہ سے کوئی جدّت پیدا نہیں کی جا سکی تھی، اس کے حلقہ میں مدتہائے دراز سے امام ابوالحسن اشعری یا حجۃ الاسلام غزالی سا مجتہد اور ذہین وطباع پیدا نہیں ہوا تھا، قیاس و استدلال کے غلو نے دماغوں کو خواہ کتنی جولانی بخشی ہو، دلوں کی حرارت اور یقین کی روشنی کو نقصان پہنچایا تھا، متکلمین نے اپنی قوت استدلال اور مقدمات و نتائج کی آراستگی سے معترضین کی زبانوں کو خاموش کر دیا تھا، لیکن وہ قلوب کو سکینت و ایمان و اہل شک و ارتیاب کو یقین و اذعان عطا کرنے میں ناکام رہے تھے، ان کے اس طریق بحث و استدلال نے دماغوں اور دلوں میں بیسیوں گرہیں ڈال دی تھیں، جن کو علم کلام سلجھانے سے قاصر تھا، "وجدان" جو علم و یقین کا ایک بہت بڑا سرچشمہ ہے، علم کلام کی مسلسل بے اعتنائیوں بلکہ تحقیر کی وجہ سے بالکل معطل ہوتا جا رہا تھا، ظاہری حواس خمسہ کے علاوہ کسی اور باطنی حاسّہ کا وجود تسلیم نہیں کیا جا رہا تھا، اس لئے بہت سے وہ مسائل و حقائق جو حاسّۂ باطنی کے بغیر محسوس و معلوم نہیں کئے جا سکتے تھے، محل اعتراض بنے ہوئے تھے، اور ان کے انکار و نفی کا رجحان پیدا ہوتا جا رہا تھا، غرض سارا عالم ایک کلامی بحران میں مبتلا تھا، اور سب پر ایک "عقلی ظاہریت" چھائی ہوئی تھی، امت کی قوتِ عمل اور اس سے بڑھ کر "حرارتِ عشق" جو اس امت کا سرمایہ، اس کی طاقت کا سرچشمہ اور نبوت کا فیضان ہے، سرد ہوتی جا رہی تھی، دل سوز سے خالی، اور "حرارتِ عشق" سے عاری ہوتے جا رہے تھے، فلسفیانہ مباحث اور علم کلام کی معرکہ آرائیوں نے عالم اسلام کو ایک "مدرسہ" میں تبدیل کر دیا تھا، جس میں قیل و قال تو بہت تھی، مگر "زندگی" اور "محبت" "معرفت" اور "نگاہ" نایاب تھی، اہل قلوب کے روحانی جزیروں میں البتہ عشق کا سرور اور یقین کا نور پایا جاتا تھا، ورنہ عالم کا عالم الفاظ کے طلسم کا گرفتار اور ظواہر و محسوسات کا پرستار تھا۔

صاحبِ دل متکلم کی ضرورت

ایسی حالت میں عالمِ اسلام کو ایک ایسی بلند اور طاقتور شخصیت کی ضرورت تھی، جو دل دردمند اور فکرِ ارجمند دونوں سے فیضیاب ہو جس کے لئے عقلیات کا سمندر پایاب ہو چکا ہو، اور الفاظ و ظواہر کا طلسم ٹوٹ چکا ہو، جو اپنی گرمیٔ عشق اور سوزِ دروں سے اس یخ بستہ عالمِ اسلام میں زندگی کی نئی حرارت پیدا کر دے، اور عقل کے اس نگارخانہ" میں عشق کا صور پھونک دے، جو ایک ایسے نئے علمِ کلام کی بنیاد رکھے جو دماغوں سے زور آزمائی اور مخالفین کی زبان بندی کے بجائے دماغ کی شکن دور کر دے، اور دل کی گرہ کھولے، اور ان کو سکینت و ایمان اور یقین و اطمینان سے بھر دے، یہ شخصیت مولانا جلال الدین رومیؒ (م ۶۷۲ھ) کی تھی، جن کی مثنوی علم کلام کی بے اعتدالیوں اور عقل کی "ہوس پرستی" کے خلاف ایک صدائے احتجاج بلکہ اعلانِ جنگ ہے، اور ایک ایسے نئے علم کلام کی بنیاد جس کی بدلتے ہوئے عالمِ اسلام کو سخت ضرورت تھی۔

مختصر حالات

مؤلف "مرأۃ المثنوی" نے اپنی (غیر مطبوعہ) تصنیف "صاحب المثنوی" میں مولانا کے حالات نہایت تفصیل و تحقیق سے لکھے ہیں، یہاں اس کا خلاصہ درج کیا جاتا ہے۔[1]

---

[1] قاضی تلمذ حسین گورکھپوری مرحوم اس دورِ آخر میں مثنوی اور صاحبِ مثنوی کے بہت بڑے شیدائی اور محقق عالم تھے، ان کی کتاب "مرأۃ المثنوی" سے متعلق لٹریچر میں اپنا جواب نہیں رکھتی، "مرأۃ المثنوی" کے علاوہ (جو طبع ہو کر مقبول ہو چکی ہے) ان کی دو اور محققانہ تصانیف ہیں، جو ابھی تک طبع نہیں ہوئیں۔ (۱) صاحب المثنوی (۲) نقد المثنوی۔ ان دو کتابوں کی اشاعت "ادبیاتِ رومیؒ" میں ایک گراں قدر اضافہ اور ایک بڑی خدمت ہوگی، صاحب المثنوی دار المصنفین میں زیرِ طبع ہے، راقم سطور کو ان کے صاحبزادہ توکل حسین کی عنایت سے اس بیش بہا کتاب سے استفادہ و اقتباس کا موقع ملا، جزاہ اللہ خیرا۔

خاندان اور والد نامدار

محمد نام، لقب جلال الدین، شہرت مولانا روم یا مولانا رومی کے لقب سے ہے آپ کا نسب باپ کی جانب سے نو واسطوں سے حضرت ابوبکر صدیق سے مل جاتا ہے، اور ماں کی جانب سے حضرت علی کرم اللہ وجہہ سے۔

مولانا کے آبائے کرام بلخ واقع خراسان[1] کے رہنے والے تھے، مولانا کی وہیں پیدائش ہوئی مولانا کے پدری و مادری سلسلہ میں اجلہ علماء اور سلاطینِ وقت ہیں، مولانا کی دادی ملکۂ جہان شاہان خوارزم کے خاندان سے تھیں۔

مولانا کے والد کا نام محمد اور لقب بہاء الدین ولد تھا، ان کی ولادت غالباً ۵۴۳ھ میں ہوئی حضرت بہاء الدین ولد نوعمری ہی میں تمام علوم میں کامل و ماہر ہو گئے تھے آپ کے علم و فضل کی کیفیت یہ تھی کہ اقصائے خراسان سے مشکل فتائے آپ ہی کے پاس آتے تھے، مجلس کا طریق بادشاہوں کا سا تھا، سلطان العلماء خطاب بھی تھا، معمول تھا کہ صبح سے دوپہر تک درس عام ہوتا، ظہر کے بعد اپنے خاص اصحاب کے حلقہ میں حقائق و معارف بیان فرماتے، دوشنبہ اور جمعہ کو عام وعظ کہتے، ہیبت نمایاں رہتی، اور ہمیشہ متفکر معلوم ہوتے۔

مولانا کی پیدائش اور ابتدائی تعلیم

آپ کے صاحبزادہ مولانا جلال الدین رومی ۶ ربیع الاول ۶۰۴ھ کو پیدا ہوئے، سلطان العلماء کے مریدان خاص میں ایک بلند پایہ بزرگ سید برہان الدین محقق ترمذی تھے، سلطان العلماء نے آپ ہی کو مولانا کا اتالیق مقرر فرمایا، اور ۲۴-۲۵ سال کی عمر تک مولانا آپ ہی کے زیر تربیت رہے، اور اپنے والد بزرگوار کے انتقال کے بعد آپ ہی کے زیر ہدایت منازل سلوک طے کئے۔

---

[1] حال واقع ملک افغانستان۔ (ندوی)

والد کی بلخ سے ہجرت

مولانا کے والد ماجد کا اثر جب زیادہ بڑھا، اور آپ کی دعوت و نصیحت کو حد سے زیادہ قبول عام حاصل ہوا، اور مریدوں کی تعداد بے شمار ہوگئی تو بعض علماء عصر کو رشک ہونے لگا، حضرت سلطان العلماء اپنے وعظ میں مذہب حکمائے یونان کی مذمت فرمایا کرتے کہ کچھ لوگوں نے کتب آسمانی کو پس پشت ڈال رکھا ہے، اور فلسفیوں کے ازکار رفتہ اقوال کو اپنا مسلک بنا لیا ہے، یہ لوگ کیوں کر نجات کی امید کرسکتے ہیں، اس برملا مذمت سے علماء ظاہر کے دلوں میں آپ کی طرف سے کدورت بیٹھ گئی، مگر چونکہ خوارزم شاہ آپ کا نہایت معتقد تھا، ان لوگوں کو شکایت کا موقع نہیں ملتا تھا، اتفاق کہ ایک روز سلطان آپ کی زیارت کو آیا تو دیکھا کہ مجمع نہایت کثیر ہے، ایک عالم سے جو رکاب شاہی میں تھے[1]، مخاطب ہو کر کہا کہ کتنا کثیر مجمع ہے، فاضل مذکور کو موقع ملا، اور کہا کہ اگر اس کی تدبیر نہ کی گئی تو اندیشہ ہے کہ انتظام سلطنت میں خلل واقع ہو، اور تدارک مشکل ہوجائے، یہ بات خوارزم شاہ کے دل میں بیٹھ گئی، اس نے پوچھا کہ کیا تدبیر کرنا چاہیے، فاضل مذکور نے

---

[1] عام طور پر تذکروں میں ہے کہ یہ مکالمہ امام فخر الدین رازی سے ہوا، جو سلطان کے ساتھ تھے، مصنف صاحب المثنوی کی تحقیق ہے کہ یہ ایک تاریخی غلطی ہے، جو منقول چلی آرہی ہے، اس لئے کہ حضرت بہاء الدین ولد نے بلخ کو ۶۰۹ھ یا ۶۱۰ھ میں ترک کیا ہے، امام رازی نے ۶۰۶ھ میں اپنے وطن ہرات میں انتقال کیا، جہاں انھوں نے اپنے انتقال سے کئی سال پیشتر سے مستقل قیام اختیار کرلیا تھا۔ مولانا روم کے فاضل سوانح نگار بدیع الزماں فروزانفر حن کی محققانہ کتاب زندگانی مولانا جلال الدین محمد البلخی ایران سے شائع ہو کر آئی ہے، کی بھی یہی تحقیق ہے کہ یہ روایت تاریخی حیثیت سے ناقابل اعتبار ہے، اور ان کی بنیاد بھی یہی ہے کہ بہاء الدین ولد کی ہجرت بقول اکثر ۶۱۶ھ کا واقعہ ہے، اور امام فخر الدین رازی ۶۰۶ھ میں ہرات میں انتقال کرچکے تھے۔ ملاحظہ ہو ص ۱۲۔

قاضی تلمذ حسین مرحوم فرماتے ہیں، ممکن ہے یہ عالم سید بہاء الدین رازی ہوں، جو خوارزم شاہ کے مقربین میں تھے، اور طبقاتِ ناصری ص ۳۳۵ میں ان کا ذکر آتا ہے۔ (ندوی)

یہ صلاح دی کہ خزانہ اور قلعوں کی کنجیاں مولانا کے پاس بھیج کر یہ کہلانا چاہئے کہ جمعیت و کثرت تو سب کچھ جناب کو حاصل ہے ہی، میرے پاس امور سلطنت میں سے صرف کنجیاں رہ گئی ہیں، وہ بھی حاضر ہیں۔

اس پیغام کو سن کر آپ نے ارشاد فرمایا کہ "سلطانِ اسلام سے میرا سلام کہنا اور کہنا کہ اس ملک فنا کا یہ تمام خزانہ و دفینہ، ملک و لشکر بادشاہوں کے لائق ہے، ہم درویشوں کو اس سے کیا سروکار؟ میں نہایت خوشی سے سفر کرتا ہوں کہ بادشاہ اپنے اتباع و احباب کے ساتھ یہاں باستقلال سلطنت کرے، جمعہ کو وعظ کہہ کر چلا جاؤں گا"۔

اہالی بلخ کو جب یہ حال معلوم ہوا، شہر میں ایک تہلکۂ عظیم برپا ہو گیا، خوارزم شاہ سخت متوہم ہوا، قاصد بھیجے، اور رات کو خود مع وزیر کے آیا کہ ارادۂ سفر سے باز رہئے، مگر آپ نے قبول نہ کیا، آخر یہ استدعا کی کہ آپ اس طرح روانہ ہوں کہ لوگوں کو خبر نہ ہو، ورنہ سخت فتنہ برپا ہو جائے گا، مولانا نے اس کو منظور فرمایا، جمعہ کو وعظ کہا، اور شنبہ کو بلخ سے بغداد کی طرف روانہ ہو گئے، اس وعظ میں خوارزم شاہ کو متنبہ کر دیا کہ میرے بعد لشکر تاتار آرہا ہے[1]۔

سلطان العلماء بلخ سے اس شان کے ساتھ روانہ ہوئے کہ جس شہر کے قریب پہونچتے تھے، وہاں کے عمائد و علماء شہر سے باہر نکل کر استقبال کرتے اور نہایت اعزاز و اکرام کے ساتھ شہر میں لاتے تھے۔

بغداد و مکہ معظمہ، دمشق اور مختلف مقامات سے ہوتے ہوئے آپ ملاطیہ پہنچے، آقشہر میں آپ نے چار سال قیام فرمایا، اور درس و تدریس میں مشغول رہے، آقشہر سے لارندہ تشریف لائے، جو توابع قونیہ سے تھا۔

مولانا قونیہ میں

علاء الدین کیقباد سلطان روم کی خواہش و درخواست پر آپ ۶۲۶ھ میں قونیہ تشریف لے گئے،

---

[1] بدیع الزماں فروزانفر کا رجحان یہ ہے کہ بہاء الدین ولد کی ہجرت کا اصل سبب تاتاریوں کا عزم خراسان و ایران تھا، اس اطلاع سے بڑے بڑے خاندان شرفا و علماء ترک وطن کر رہے تھے اور محفوظ مقامات کی طرف رخت سفر باندھ رہے تھے، ملاحظہ ہو۔ ص ۱۵ (ندوی)

سلطان نے خود استقبال کیا، محل کے قریب گھوڑے سے اتر پڑا، اور بڑی فروتنی کا اظہار کیا، آپ نے مدرسۂ قونیہ میں قیام فرمایا، سلطان مع اکثر امراء کے مرید ہوگیا۔

حضرت بہاء الدین ولد نے قونیہ میں دو برس قیام کے بعد ۶۲۸ھ میں انتقال فرمایا۔

اس تمام مدت میں مولانا ہمیشہ اپنے والد کے ہمراہ رہے، اور علوم ظاہری و باطنی آپ سے حاصل کرتے رہے، ۲۲ برس کے سن میں آپ شہر (قونیہ) میں وارد ہوئے، جو آئندہ آپ کا مسکن و مدفن بننے والا تھا۔

قونیہ میں سلطان کے اتالیق امیر بدر الدین گہرتاش نے آپ کے تبحر علمی اور خداداد ذہانت سے متاثر ہوکر آپ کے لئے مدرسۂ خداوندگار تعمیر کیا، اور اس کے لئے بہت بڑا وقف کیا۔

سلطان علاء الدین کیقباد آپ کی بڑی تعظیم کرتا تھا، اور آپ سے بڑی عقیدت رکھتا تھا، سلطان نے جب قونیہ کا قلعہ تیار کیا تو ایک روز آپ سے سیر کی درخواست کی، آپ نے فرمایا کہ "دفع سیل و منع خیل کے لئے اچھا ہے، مگر مظلوموں کی تیرِ دعا کا کیا علاج آپ نے سوچا ہے، جو ہزاروں، لاکھوں برجوں سے گذر جاتی، اور عالم کو خراب کر ڈالتی ہے، عدل و انصاف کا قلعہ بنائیے کہ اس میں دنیا کا امن اور عافیت کی خیر ہے" سلطان پر اس نصیحت کا بڑا اثر ہوا۔

مولانا بہاء الدین ولد کے انتقال کے بعد سلطانِ وقت اور علماء و اکابر کے اتفاق رائے سے آپ مولانا کے جانشین ہوئے، اور آپ نے سلسلۂ درس و تدریس اور تلقین و ارشاد کو بدستور جاری رکھا، سید برہان الدین محقق ترمذی جو آپ کے اتالیق رہ چکے تھے، اور ترمذ کو چلے گئے تھے، مولانا بہاء الدین ولد کے انتقال کے بعد قونیہ تشریف لائے، مولانا آپ کے مرید ہوگئے، اور اپنے والد ماجد کے بعد مراتب سلوک آپ ہی سے طے کئے، ۹ برس مولانا کی آپ سے صحبت رہی، ۶۳۷ھ میں انھوں نے انتقال کیا۔

آپ کے تعلیمی سفر اور مشاغل

۶۳۰ھ میں مولانا نے مزید تکمیل علوم و اکتساب فیض کے لئے شام کا سفر کیا، اور حلب میں وارد ہوئے،

سلطان صلاح الدین کے فرزند الملک الظاہر نے قاضی بہاء الدین ابن شداد کی تحریک سے جو اجلۂ علماء میں سے تھے، ۵۹۱ھ میں متعدد بڑے بڑے مدرسے قائم کئے تھے، جس کی وجہ سے حلب بھی دمشق کی طرح مدینۃ العلوم بن گیا تھا۔

حلب میں مولانا مدرسہ حلاویہ میں قیام پذیر ہوئے، اور کمال الدین ابن العدیم سے استفادہ کیا، مولانا یہاں اگرچہ تحصیلِ علم میں مشغول تھے، مگر آپ کے کمال کا یہ حال تھا کہ بقول سپہ سالار جو مشکل مسائل کسی سے حل نہ ہوتے تھے، وہ آپ ہی حل کرتے تھے، اور ایسے وجوہ بیان کرتے تھے، جو کسی کتاب میں درج نہ ہوتے۔

حلب سے مولانا دمشق تشریف لے گئے، یہاں آپ نے مدرسہ مقدسیہ میں قیام فرمایا، دمشق اس وقت مجمع علماء تھا، سپہ سالار نے لکھا ہے کہ دمشق میں شیخ محی الدین ابن عربی، شیخ سعد الدین حموی، شیخ عثمان رومی شیخ اوحد الدین کرمانی، شیخ صدر الدین قونوی سے مولانا کی صحبت رہا کرتی، اور باہم دگر حقائق و معارف بیان ہوتے تھے۔

۶۳۴ھ یا ۶۳۵ھ میں آپ نے دمشق سے واپس آکر قونیہ میں مستقل قیام اختیار کیا، سید برہان الدین کے انتقال (۶۳۷ھ) کے بعد ۵ سال تک آپ علماء ظاہر کے لباس میں رہے، اور علمی و تدریسی مشاغل میں ہمہ تن منہمک رہے، ۶۳۸ھ میں شیخ محی الدین ابن عربی نے انتقال کیا، جو بزمِ علم آپ کے گرد جمع تھی، اس کے اکثر افراد قونیہ میں آگئے، جن میں شیخ صدر الدین بھی تھے، مشرق کی طرف سے جو علماء و فضلاء وہاں کی تباہیوں سے پریشان ہوکر روم کا رخ کرتے تھے، وہ بھی اکثر قونیہ کو اپنا ملجا و ماویٰ بناتے، اس طرح قونیہ اس زمانہ میں مدینۃ العلماء بن گیا، اور ان علماء میں مولانا کی حیثیت سب سے بلند تھی، اس زمانہ میں مولانا کے وہی اشغال تھے، جو علماء ظاہر کے ہوتے ہیں، یعنی درس و تدریس، وعظ و تذکیر اور فتاویٰ نویسی، مولانا بہت زیادہ وقت شغل تدریس میں صرف کرتے، خود آپ کے مدرسہ میں چار سو سے زیادہ طلبہ تھے۔

درس و تدریس کے علاوہ مولانا کا دوسرا شغل یا فرض وعظ کہنا تھا، فتویٰ نویسی کا شغل بھی مستقل

تھا، بیت المال سے مولانا کے لئے ایک دینار مقرر تھا، اسے اسی فتویٰ نویسی کا معاوضہ تصور فرماتے تھے اور اس معاملہ میں اس قدر سخت تھے کہ جب فقر کا رنگ غالب ہوا، اور مجلس میں مستغرق رہنے لگے اس وقت بھی حکم تھا کہ جس وقت کوئی فتویٰ آئے فوراً خبر کی جائے، قلم و دوات ہمہ وقت ساتھ رہتا تھا۔

انقلابِ حال

یہ حالت ۶۴۲ھ تک قائم رہی اس کے بعد مولانا کی زندگی میں وہ واقعہ پیش آیا جس نے زندگی میں انقلابِ عظیم پیدا کر دیا، اور مولوی جلال الدین قونوی کو مشہور روزگار مولانائے روم بنا دیا، یہ واقعہ مولانا کی شمس تبریز سے ملاقات اور ان کی ذات سے شیفتگی و فنائیت تھی۔

مولوی ہرگزنہ شد مولائے روم   تا غلام شمس تبریزی نہ شد

شمس تبریز

(محمد بن علی بن ملک داد) شمس تبریز کا نسب اور وطن کیا تھا؟ آپ کے مخالفین نے جہاں اور الزامات آپ پر لگائے تھے، وہاں ایک الزام یہ بھی تھا کہ آپ کا نسب نامعلوم ہے[1]۔

نے در و اصل و نے نسب پیداست   می نہ دانیم ہم کہ او ز کجا است

آپ بچپن سے اعلیٰ استعداد اور جذبۂ عشق و محبت کے حامل تھے، "مناقب العارفین" میں خود آپ ہی کی زبانی منقول ہے کہ ابھی سن بلوغ کو بھی نہیں پہونچے تھے کہ آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کے عشق میں

[1] بعض تاریخوں میں ہے کہ آپ حسن بن صباح اسماعیلی کے جانشین و رفیق و طریق کیا بزرگ امید کی نسل سے تھے، ان کے والد جلال الدین حسن جب منصب امامت پر فائز ہوئے تو انھوں نے اپنے بزرگوں کا طریقہ ترک کر کے صحیح اسلامی عقائد اختیار کئے، اور نومسلم کے لقب سے مشہور ہوئے لیکن یہ روایات مشتبہ اور قابل بحث ہیں، ملاحظہ ہو زندگانی مولانا جلال الدین محمد ص۵۲،۵۳ (ندوی)

تیس تیس چالیس چالیس روز تک آپ کو غذا کی خواہش نہیں ہوتی تھی، علوم ظاہری سے فارغ ہونے کے بعد آپ شیخ ابوبکر سلہ باف کے مرید ہوئے، بعض روایتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ شیخ زین الدین سنجاسی[1] کے مرید تھے، بعض روایتوں میں دوسرے نام لئے گئے ہیں، ممکن ہے آپ نے سب سے اکتساب فیض کیا ہو۔

جب آپ کو اس طرح سیری نہ ہوئی تو آپ اطراف عالم میں مردانِ خدا کی تلاش میں پھرنے لگے، یہ سفر اس طرح کرتے تھے کہ خود آپ کی ولایت و کمال سے لوگ آگاہ نہیں ہوتے تھے، نمد سیاہ پہنتے، اور جہاں جاتے سرائے میں قیام کرتے، دروازہ میں قیمتی قفل لگا دیتے کہ لوگ سمجھیں کہ کوئی بڑا تاجر ہے، مگر اندر سوائے بوریہ کے کچھ نہ ہوتا، کثرت اسفار کی وجہ سے لوگ آپ کو "شمس پرندہ" کہنے لگے تھے، تبریز، بغداد، اردن، الروم قیصریہ و دمشق کا سفر فرمایا، معاش کا یہ طریقہ تھا کہ ازار بند بُن لیا کرتے، اور اسی کو بیچ کر کام چلاتے تھے، غذا کی کیفیت یہ تھی کہ دمشق میں ایک برس رہے، ہفتہ میں ایک پیالہ سری کا شوربا اور وہ بھی بے روغن پی لیا کرتے، کسی کو اپنی صحبت کا متحمل نہیں پاتے تھے، اکثر یہ دعا فرماتے کہ خدایا کوئی رفیق ایسا عطا کر جو میری صحبت کا متحمل ہو۔

مولانا کی ملاقات اور تغیر عظیم

آپ کے شیخ نے آپ سے فرمایا کہ روم جاؤ، وہاں ایک دل سوختہ ہے اسے روشن کر آؤ، دو شنبہ ۲۶ جمادی الاخریٰ ۶۴۲ھ کو قونیہ پہونچے، اور شکر فروشوں کے محلہ میں قیام فرمایا، ایک روز دیکھا کہ مولانا سوار چلے آرہے ہیں، اور لوگ گرد و پیش استفادہ کر رہے ہیں، شمس نے آگے بڑھ کر پوچھا کہ ریاضات و علوم کی غرض کیا ہے؟ مولانا نے کہا آداب و شریعت کا جاننا، شمس نے کہا نہیں، غرض یہ ہے کہ معلوم تک رسائی ہو جائے اور حکیم سنائی کا یہ شعر پڑھا ؎

[1] بدیع الزماں فروزانفر نے بجائے زین الدین سنجاسی کے رکن الدین سنجاسی لکھا ہے، وہ لکھتے ہیں کہ سنجاس، زنجان کے توابع میں سے ہے، ص۵۶، لیکن تاریخی حیثیت سے ان کو اس روایت کی صحت میں کلام ہے۔ (ندوی)

علم کز تو ترا نہ بستاند　　　جہل ازاں علم بہ بود بسیار

مولانا اس سے متغیر و متحیر ہوئے، اور تیر نشانہ پر بیٹھا[1]

مولانا حضرت شمس کو ہمراہ لے کر اپنے مقام پر آئے، اور بقول افلاکی چالیس روز تک حضرت شمس کے ساتھ ایک حجرہ میں رہے، جس میں کوئی داخل نہیں ہو سکتا تھا، سپہ سالار نے لکھا ہے کہ چھ ماہ تک صلاح الدین زرکوب کے حجرہ میں دونوں بزرگ عزلت نشین رہے، سوائے شیخ صلاح الدین کے کسی کی مجال نہ تھی کہ حجرہ میں داخل ہو سکے۔

شمس کی ملاقات نے مولانا کو نئی روح اور حقائق و اذواق کی نئی دنیا عطا کی وہ خود فرماتے ہیں ؎

شمس تبریزی بما راہِ حقیقت بنمود　　　از فیض قدم اوست کہ ایماں داریم

ابھی تک مولانا استاذ دوراں تھے، اور خود صاحبِ سجادہ تھے، اور علماء، وطلبہ وصوفیہ مستفید و طالب، اب مولانا مستفید و طالب تھے، اور شمس تبریز صاحبِ فیض وارشاد، مولانا کے صاحبزادہ سلطان ولد فرماتے ہیں ؎

شیخ استاذ گشت نو آموز　　　درس خواندی بخدمتش ہر روز

گرچہ در علم فقر کامل بود　　　علم نو بود کو بوے بہ نمود

خود مولاناؒ اپنی زبان سے فرماتے ہیں ؎

زاہد بودم ترانہ گویم کردی　　　سرفتنۂ بزم وبادہ جویم کردی

سجادہ نشیں باوقارے بودم　　　بازیچۂ کودکاں کویم کردی

نتیجہ یہ ہوا کہ شمس کی ملاقات کے بعد مولانا نے درس و تدریس، وعظ گوئی وغیرہ سب یک قلم

---

[1] صاحب المثنوی کی مختلف روایات میں سے اس روایت کو انتخاب کیا گیا ہے، یہ روایت تذکرۂ دولت شاہ کی ہے، ص ۱۹۶، ۱۹۷ فروز انفر نے اس سلسلہ کی تمام روایات کو نقل کر کے ان سے بے اطمینانی کا اظہار کیا، اور شمس سے مولانا کے تاثر و فریفتگی کا سبب کسی اچانک واقعہ اور تصرف کو قرار نہیں دیا بلکہ مردانِ خدا کی تلاش عشق و اہلِ عشق سے مولانا کی مناسبت فطری کو قرار دیا ہے، ملاحظہ ہو زندگانی جلال الدین محمد ص ۶۱-۶۲ (ندوی)

ترک کردی، خود فرماتے ہیں ؎

عطار دوار دفتر پارہ بودم — زدشت او زبانے می نشستم
چو دیدم لوح پیشانی ساقی — شدم مست و قلم ہارا شکستم

شورش عام

مولانا جب اس طرح ہر بات میں حضرت شمس کی پیروی کرنے لگے، اور تمام تعلقات منقطع ہونے لگے، تو یہ امر مولانا کے شاگردوں اور مریدوں پر سخت شاق گذرا، ایک شورش کی سی کیفیت پیدا ہوگئی، ایک برہمی کے ساتھ گو نہ حیرت بھی شامل تھی، شمس کے حالات سے لوگ واقف نہ تھے، مریدوں کا خیال تھا کہ ہم نے عمریں مولانا کی خدمت میں گذاریں، مولانا کی کرامتوں کو دیکھا، تمام اطراف واکناف میں آپ کی شہرت کا باعث ہوئے، اب ایک بے نام ونسب شخص آیا، اور مولانا کو سب سے الگ کر لیا کہ آپ کی صورت تک دیکھنا نصیب نہیں ہوتی، درس وتدریس وعظ سب بند ہوگئے، ضرور یہ کوئی ساحر یا مکار شخص ہے، ورنہ اس کی کیا ہستی ہے کہ ایسے پہاڑ کو تنکہ کی طرح بہالے جائے۔

غرض سب کے سب شمس کے دشمن ہوگئے، مولانا کے سامنے کچھ نہ کہہ سکتے تھے، اِدھر اُدھر ٹل جاتے تو برا بھلا کہتے، اور رات دن اسی فکر میں غلطاں وپیچاں رہتے کہ کسی طرح حضرت شمس کو وہاں سے نکالیں کہ پھر حسب سابق مولانا کی صحبت سے فیض یاب ہوسکیں۔

شمس کی غیبت

حضرت شمس الدین ان لوگوں کی گستاخیوں کا تحمل کرتے رہے، اور سمجھتے رہے کہ مولانا کی وفور عقیدت کی وجہ سے یہ لوگ اس طرح آزردہ ہیں، مگر جب معاملہ حد سے تجاوز کر گیا، اور آپ نے سمجھ لیا کہ اب انجام اس کا

فتنہ و فساد برپا ہوگا، تو آپ ایک دن خاموشی کے ساتھ قونیہ سے نکل گئے، افلاکی نے اس غیبت اول کی تاریخ روز پنجشنبہ یکم شوال ۶۴۳ھ دی ہے، اس طرح باراول قونیہ میں آپ کا قیام سوا برس رہا۔

شمس کی جدائی مولانا پر سخت شاق گذری، مریدوں نے جو کچھ سوچا تھا، اس کے برعکس واقع ہوا، اس کے بجائے کہ شمس کے چلے جانے کے بعد مولانا ان لوگوں کی طرف متوجہ ہوتے، جو کچھ توجہ تھی، وہ بھی جاتی رہی، اور ان ناقصوں کی وجہ سے اصحابِ صدق و وفا بھی مولانا کی صحبت سے محروم ہو گئے۔

مولانا کی بیقراری اور شمس کی واپسی

بقول سپہ سالار انقطاع کلی کی یہ حالت اس وقت تک قائم رہی کہ دمشق سے شمس الدین کا خط اچانک مولانا کے نام آیا، اس خط کے پانے کے بعد مولانا کی کچھ حالت بدلی، اور شمس کے شوق و عشق میں سماع کی جانب متوجہ ہوئے، اور جن لوگوں نے حضرت شمس کے خلاف حرکات میں شرکت نہیں کی تھی، ان پر حسب سابق عنایت فرمانے لگے، اس عرصہ میں مولانا نے حضرت شمس کی خدمت میں چار منظوم خطوط لکھے، جن میں اپنی کیفیت اور اشتیاق ملاقات کی بیتابی کا ذکر کیا ہے، پہلے نامۂ شوق میں فرماتے ہیں ؎

ایہا النور فی الفواد تعال — غایۃ الوجد والمراد تعال

ایہا السابق الذی سبقت — منک مصدوقۃ الوداد تعال

چوں بیائی زہے کشاد و مراد — چوں نیائی زہے کساد تعال

انت کالشمس اذ دنت و نأت — یا قریبا علی البعاد تعال

اس اثنا میں شورش بہت کچھ فرو ہو گئی، اطمینان ہو جانے کے بعد کہ اب لوگوں نے شمس کی مخالفت ترک کر دی ہے، مولانا نے شمس کو واپس بلانے کی تدبیر کی، صاحبزادہ سلطان ولد سے فرمایا کہ تم میری طرف سے اس شاہ مقبول کی طرف جاؤ، اور یہ لے جا کر ان کے قدموں پر نثار کرو، اور میری جانب سے کہو کہ جن

مریدوں نے گستاخی کی تھی، وہ سب صدق دل سے توبہ کرتے، اور التجا کرتے ہیں کہ جو خطا ہوئی درگذر فرمائیں، اور اس جانب قدم رنجہ فرمائیں، ان کے ہاتھ جو نیاز نامہ بھیجا اس میں اس مفارقت سے اپنی حالت بیان کرتے ہیں۔

کہ ازاں دم کہ تو سفر کردی ازحلاوت جدا شدیم چو موم
ہمہ شب چو شمع مے سوزیم زآتشش جفت وز انگبیں محروم
در فراق جمالِ تو مارا جسم ویران وجان ازو چوں بوم
ہاں عناں رابدیں طرف برتاب زفت کن پیل عیش را خرطوم
بے حضورت سماع نیست حلال ہمچو شیطان طرب شدہ مرجوم
یک غزل بے تو ہیچ گفتہ نشد تارسید آں مشرفہ مفہوم
پس بذوق سماع نامۂ تو غزل پنج وشش بشد منظوم
شام ازتو چو صبح روشن باد اے بتو فخر شام وارمن وروم

سلطان ولد حضرت شمس کو عزت واحترام شاہانہ کے ساتھ قونیہ لائے۔

شمس کی دوبارہ غیبت

حضرت شمس کے قونیہ پہونچنے پر مولانا کی مسرت کی کوئی انتہا نہ رہی جن لوگوں سے گستاخیاں سرزد ہوئی تھیں، سب نے آ آکر معافی مانگی، ایک مدت تک یہ صحبت بے کدورت اسی طرح برقرار رہی اس اثنا میں شمس کے ساتھ مولانا کا اخلاص واتحاد پہلے سے زیادہ بڑھتا گیا، مگر اس دور خرمی کو زیادہ زمانہ نہیں گذرا کہ پھر آزردگی کے اسباب پیدا ہوگئے، حضرت شمس کا قیام مولانا کے تا بخانہ کے قریب ہی دالان "صفہ" میں ایک طرف تھا، شمس وہاں اپنی اہلیہ کے ساتھ جن سے قونیہ میں عقد ہوا تھا، مقیم تھے، مولانا کے منجھلے صاحبزادہ (چلپی علاء الدین) جب مولانا کے گھر جاتے تو اسی طرف سے ہو کر گذرتے، مولانا شمس الدین

کو یہ بات ناگوار ہوتی، کئی مرتبہ مشفقانہ طور پر سمجھایا، علاء الدین کو یہ بات شاق گزری، ان کے دل میں کچھ اس بات سے بھی کدورت تھی، کہ حضرت شمس الدین سلطان ولد پر زیادہ نظرِ عنایت رکھتے ہیں، اس کا چرچا لوگوں سے بھی کیا، جو لوگ اس قسم کے موقع کے منتظر تھے، انھوں نے اور بھی حاشیے چڑھائے، اور کہنے لگے کہ یہ بھی خوب ہے کہ ایک بیگانہ نے آکر مولانا کے مکان پر قبضہ کرلیا ہے، اور فرزند کو گھر میں آنے نہیں دیتا۔

حضرت شمس الدین نے محض لطف و حلم کی وجہ سے مولانا سے اس کا کچھ ذکر نہیں کیا، مگر جب معاملہ حد سے گزر گیا تو سلطان ولد سے برسبیلِ حکایت۔ یہ فرمایا کہ ان لوگوں کی حرکات سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس مرتبہ میں اس طرح غائب ہوں گا کہ پھر کسی کو پتہ نہ چلے گا، مولانا کی بعض غزلوں سے مترشح ہوتا ہے کہ مولانا ابھی بالکلیہ اس سے بے خبر نہ تھے، بلکہ ان کو اس کا اندیشہ تھا، اور انھوں نے اشعار میں اس سے باز رہنے کی منت سماجت کی ہے۔

بہرحال لوگوں میں حضرت شمس الدین کے خلاف خیالات پھر جوش زن ہو گئے تھے، اور آپ خود ہی آزردہ خاطر ہو گئے، نتیجہ یہ ہوا کہ آپ دفعتہً غائب ہو گئے[1]۔

ناگہاں گم شد از میانِ ہمہ تا رود از دل اندبان ہمہ

مولانا کی بیتابی

مولانا جب صبح کو مدرسہ تشریف لائے، اور شمس کو گھر میں نہ دیکھا تو چیخ اٹھے، اور سلطان ولد

---

[1] بعض لوگوں نے کہا ہے کہ قونیہ میں کچھ لوگوں نے حضرت شمس کو قتل کر دیا، اور مولانا نے فرمایا "یَفْعَلُ اللّٰہُ مَا یَشَآءُ وَ یَحْکُمُ مَا یُرِیْدُ" لیکن فروزانفر نے غیبت کی اسی روایت کو ترجیح دی ہے کہ سلطان ولد سب سے قریب تر اور حالات سے باخبر تھے ان کی روایت اس باب میں سب سے زیادہ قابلِ اعتماد ہے، اس لئے شمس کے قتل کی روایت قابلِ اعتبار نہیں، اس کی تائید اس سے بھی ہوتی ہے کہ اگر شمس قتل کر دیئے گئے ہوتے، اور مولانا کو اس واقعہ کا علم ہوتا، تو ان کی تلاش میں یہ سرگردانی نہ ہوتی (زندگانی ص ۸۲-۸۳) (ندوی)

کے خلوت خانہ پر جاکر آواز دی، "بہاء الدین چہ خفتہ؟ برخیز و طلب شیخت کن کہ بازمشام جان را از فوائح لطف او خالی می یابیم"

دو تین روز ہر طرف جستجو کرتے رہے، مگر کہیں حضرت شمس کا پتہ نہ چلا، اس مرتبہ شمس کی غیبت سے مولانا کا حال پہلے سے بھی زیادہ متغیر ہوگیا۔

شیخ گشت از فراق او مجنون　　　بے سروپا ز عشق او چو ذو النون

جو لوگ حضرت شمس کی آزردگی کا باعث ہوئے تھے، مولانا نے ان سب کو قطعاً اپنی صحبت سے خارج کر دیا، لیکن سابق کے برخلاف اس مرتبہ آپ نے غزل گوئی اور سماع میں اپنا وقت صرف کرنا شروع کیا، یہ ۶۴۵ھ کا واقعہ ہے۔

حضرت شمس کے غائب ہو جانے کے بعد مولانا نے دو روز ہر طرف آپ کی تلاش کی، مگر جب کسی طرح آپ کا کچھ پتہ نہ چلا، تو مولانا کی حالت متغیر ہونا شروع ہوئی، طریق سماع تو آپ پہلے ہی اختیار کر چکے تھے اب یہ حالت ہوئی کہ ایک دم سماع کے بغیر نہیں گزرتا تھا، مدرسہ میں ٹہلا کرتے تھے، اور آشکار و نہاں شور و فریاد کرتے تھے، تمام شہر میں غلغلہ پڑ گیا، اسی زمانہ میں مولانا نے حضرت شمس کے فراق میں بہت کثرت سے اور نہایت ہی دل دوز غزلیں کہیں، آپ کی درد انگیز فراقیہ غزلیں زیادہ تر اسی زمانہ کی ہیں۔

اس تمام جان گدازی و بے قراری کے باوجود مولانا کے دل سے یہ خیال محو نہ ہوسکا کہ رومیوں کی خانہ جنگی، مصریوں کی ترکتازی اور تاتاریوں کی تاراجی کے باعث سارا ملک تہ و بالا ہو رہا ہے، معلوم نہیں، اس عالم آشوب میں حضرت شمس پر کیا گزری؟!

شمس الدین کے غائب ہو جانے کے بعد آپ کے اشتیاق میں مولانا کا یہ حال تھا کہ اگر کوئی شخص جھوٹوں بھی کہہ دیتا کہ میں نے حضرت شمس کو فلاں جگہ دیکھا ہے تو مولانا لباس تک اتار کر اس کی نذر کر دیتے شکرانہ دیتے، اور بہت کچھ اظہار شکر کرتے۔

سفرِ شام اور سکونِ خاطر

اسی جوش و خروش کے عالم میں مولانا نے سفر کا ارادہ کیا، اور شام کی طرف روانہ ہوگئے، آپ کے اصحاب بھی آپ کے ساتھ چل کھڑے ہوئے اسی طرح دمشق پہنچے، اور وہاں بھی لوگوں کے دلوں میں آتشِ عشق بھڑکا دی، تمام لوگ حیران تھے کہ ایسا عالم و فاضل شخص کیوں اس طرح دیوانہ ہو رہا ہے، شمس تبریز کیا چیز ہیں، جو کہ ایسا فرد فریدان کے پیچھے یوں مارا مارا پھر رہا ہے، یہ راز کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔

جب دمشق میں شمس کا کچھ پتہ نہ چلا، اس وقت مولانا نے فرمایا کہ میں اور شمس دو نہیں ہیں، وہ اگر آفتاب ہیں تو میں ذرہ ہوں، وہ اگر دریا ہیں تو میں قطرہ ہوں، ذرہ کی ہستی آفتاب ہی سے ہے، اور قطرہ کی تری دریا ہی سے ہے، بس فرق کیا ہوا، چند روز بعد آپ نے شام سے روم کی جانب مراجعت فرمائی۔

چند برس قونیہ میں قیام فرمایا، مگر پھر عشق نے جوش کیا، اور کچھ لوگوں کو لے کر دمشق کی طرف روانہ ہوئے اور آخر پھر... قونیہ تشریف فرما ہوئے، اور اس مرتبہ یہ خیال لے کر آئے کہ میں خود عین شمس ہوں، شمس کی جستجو کیا تھی، درحقیقت خود اپنی ہی جستجو کر رہا تھا، اس مرتبہ قونیہ اس خیال کے ساتھ واپس آئے کہ شمس میں جو کچھ تھا، وہ خود مجھ میں موجود ہے۔

اس مرتبہ دمشق سے واپس آنے کے بعد مولانا حضرت شمس کے ملنے سے بالکل مایوس ہو گئے تھے، مگر جس کیفیت کو آپ شمس میں ملاحظہ فرماتے تھے، اسے اب خود اپنے میں ملاحظہ فرمانے لگے، سلطان ولد کے الفاظ ہیں کہ "اگرچہ مولانا قدس اللہ سرہٗ شمس الدین تبریزی و اعظم اللہ ذکرہٗ بصورت در دمشق نیافت بمعنی در خود بیافت زیراں حال کہ شمس الدین را بود حضر تش را ہماں حاصل شد۔"

شیخ صلاح الدین زرکوب

دمشق سے دوسری مرتبہ واپس آنے کے بعد مولانا کچھ دنوں ساکن رہے، اس کے بعد آپ نے شیخ

صلاح الدین کو اپنا ہمراز و خلیفہ بنایا، ۶۶۲ھ میں آپ نے ان کو اپنا جلیس خاص بنایا، اور حضرت شمس الدین کے بجائے ان کو اپنا معین و دمساز قرار دیا۔[1]

شہ صلاح الدین زبعد شمس دین — گشت اورا اندریں درزش معین
حال و قالش از وجودش می فزود — سرہائے نادر از وے می شنود

شیخ صلاح الدین قونیہ کے قریب کے ایک گاؤں کے رہنے والے تھے، غریب الدین کی اولاد تھے، جو ماہی گیری کیا کرتے تھے، خود شیخ صلاح الدین نے زرکوبی کا پیشہ اختیار کیا، ابتدائے حال سے امانت و دیانت میں مشہور تھے، سید برہان الدین جب قونیہ آئے تو آپ ان کے مرید ہو گئے، اور ان کی نظروں میں اختصاص خاص پیدا کیا، سید کے انتقال کے بعد مولانا سے تجدید بیعت کی، انتقال سے دس برس قبل مولانا سے آپ کو وہ قرب حاصل ہوا، اس دس سالہ مدت میں آپ مولانا کے خلیفۂ خاص رہے، شیخ نے یکم محرم ۶۵۷ھ میں انتقال فرمایا۔

لوگوں میں اس قرب و اختصاص سے پھر شورش پیدا ہوئی، اب لوگوں کو شکوہ تھا کہ ان سے تو شمس تبریزی ہی بہتر تھے، وہ بہرحال صاحب علم تھے، یہ صاحب تو یہیں کے رہنے والے ہیں، سب جانتے ہیں کہ ایک عامی آدمی ہیں عمر بھر ورق کوٹتے رہے، اب مولانا کے رفیق بنے ہیں، حیرت ہے کہ مولانا اس رتبہ اور پایہ کے باوجود ایسے شخص کی تعظیم و تکریم میں یہ مبالغہ کرتے ہیں، شیخ نے سنا تو فرمایا کہ لوگوں کو ملال اس کا ہے کہ مولانا نے مجھے سب میں مخصوص کر لیا ہے مگر اصل بات کو نہیں سمجھتے کہ مولانا خود اپنے پر عاشق ہیں، میں تو محض ایک حیلہ ہوں۔[2]

---

[1] فروزانفر لکھتا ہے "مولانا از دیدار شمس نومید گشت بتمامی دل و یکی ہمت روئے در صلاح آورد و او را شیخی و خلیفتی و سرلشکری جنود الٰہی منصوب فرمود و یاراں را با طاعت وے مامور ساخت" ص ۹۳ (ندوی) [2] بدیع الزماں فروزانفر "زندگانی مولانا جلال الدین محمد" میں لکھتا ہے "مولانا بکوری چشم منکران حسود دیدہ بر صلاح الدین گماشت وجہان عشق و دل باخنگی را شمس داشت با وے بنیاد نہاد و از انجا کہ صلاح الدین مردے درام و نرم و جذب و ارشادش بنوعے دیگر بود شورش و انقلاب مولانا آرام تر گردید و از بے قراری بقرار باز آمد و برائے شکستن خمار ہجران شمس از پیمانہ وجود و طلب بادۂ سبک می نوشید" ص ۱۰۲-۱۰۳۔

دس برس کی خدمت و صحبت کے بعد شیخ ناگہاں بیمار ہوئے اور یکم محرم کو نہایت طمانیت قلب کے ساتھ اس دار غرور سے دار سرور کی طرف سفر کیا۔

چلپی حسام الدین

شیخ صلاح الدین کے انتقال کے بعد مولانا نے چلپی[۱] حسام الدین ابن اخی ترک کو اپنا نائب اور خلیفہ بنایا، چلپی حسام الدین مولانا کے ممتاز مریدوں میں سے تھے اور مولانا کے انتقال کے بعد ۱۱ برس تک مولانا کی خلافت کے فرائض انجام دیئے، آپ اصلاً ترک اور وطناً ارموی تھے، اور روم کے مشہور اور ذی اثر خاندان اخی سے تعلق رکھتے تھے[۲]۔

حضرت شمس الدین تبریزی اور شیخ صلاح الدین سے بھی آپ کو ارادت تھی، اور ان لوگوں کے فیض سے بھی آپ بیش از بیش متمتع ہوئے تھے۔

حضرت حسام الدین چلپی نے اپنے تمام ملازموں اور غلاموں کو حکم دے دیا کہ اپنے طور پر کام کریں، آہستہ آہستہ اپنا کل مملوکہ مولانا کی خدمت میں صرف کر دیا، آخر میں غلاموں کو بھی آزاد کر دیا، مولانا کا پاس ادب اس قدر ملحوظ تھا کہ مولانا کے وضو خانہ میں کبھی وضو نہ کرتے، سخت سے سخت سردی ہوتی، برف پڑتی ہوتی، مگر گھر جا کر وضو کر کے آتے، دوسری طرف مولانا بھی آپ سے اس طرح پیش آتے کہ دیکھنے والوں کو گمان ہوتا کہ مرید ہیں[۳]۔

---

[۱] چلپی ترکی زبان میں سیدی کا ہم معنی ہے، [۲] فروزانفر نے ان کی تاریخ ولادت ۶۲۲ھ لکھی ہے [۳] مولانا کو جو کچھ فتوحات ہوتیں سب چلپی کے پاس بھیج دیتے، صاحبزادہ سلطان ولد نے ایک مرتبہ شکایت کی تو فرمایا کہ "واللہ باللہ تاللہ کہ اگر صد ہزار کامل زاہد را حالت مخمصہ واقع شود و بہم ہلاکت باشد و مار انگیتا نان باشد آں را ہم بحضرت چلپی فرستیم" مولانا کو ان کے بغیر انبساط و شگفتگی نہیں ہوتی تھی، جس مجلس میں چلپی نہ ہوتے مولانا کی طبیعت میں جوش و گرمی نہ پیدا ہوتی اور اسرار و معرفت کی باتیں نہ کرتے، جن لوگوں کو یہ حقیقت معلوم تھی وہ مجلس میں سب سے زیادہ اس کا اہتمام کرتے کہ حضرت چلپی موجود رہیں، تاکہ دریائے فیض جاری ہو (ملاحظہ ہو زندگانی ص ۱۰۵)۔ ندوی

مثنوی کی تحریک

مثنوی شریف کی تصنیف اسی زمانہ کا کارنامہ ہے، اس میں حضرت حسام الدین کی تحریک کو بہت بڑا دخل ہے، بلکہ یہ کہنا کچھ بیجا نہ ہوگا، "مثنوی شریف کا وجود میں آنا آپ ہی کی وجہ سے ہوا[1]"۔

رفقاء کے انتخاب کا سبب

مولانا کو کسی نہ کسی رفیق کے بغیر راحت نہیں ملتی تھی، شمس الدین کے بعد صلاح الدین اور صلاح الدین کے

---

[1] فروزانفر نے لکھا ہے کہ مثنوی کی تالیف چلپی حسام الدین کی فرمائش وطلب سے ہوئی، انھوں نے لکھا ہے کہ چلپی دیکھتے تھے کہ مولانا کے احباب وتحسین شیخ عطار و سنائی کی تصنیفات وکلام کے مطالعہ میں مصروف رہتے ہیں، مولانا کی غزلیات کا اگرچہ بڑا ذخیرہ ہے، مگر اس میں حقائق تصوف ودقائق سلوک سے زیادہ مولانا کی گرمی طبع وجوش عشق ہے، وہ موقع کے منتظر تھے، ایک رات مولانا کو تنہا دیکھ کر انھوں نے عرض کیا کہ کوئی کتاب حدیقہ سنائی یا منطق الطیر کے طرز پر لکھی جائے، مولانا نے سنتے ہی اپنے عمامہ سے ایک کاغذ نکالا، جس میں ۱۸ شعر لکھے ہوئے تھے، پہلا شعر وہ تھا، جس کو مثنوی کا آغاز اور مطلع بننا نصیب ہوا۔

بشنو از نے چوں حکایت می کند   وز جدائی ہا شکایت می کند

آخری مصرعہ تھا۔ ع

پس سخن کوتاہ باید والسلام

پس یہ مثنوی کی تالیف کا آغاز تھا، مولانا برجستہ اشعار زبان مبارک سے ادا کرتے، اور مولانا حسام الدین لکھتے جاتے، لکھ لینے کے بعد حسام الدین اس کو بلند طور پر خوش آوازی کے ساتھ پڑھتے، بعض مرتبہ پوری پوری رات اسی شغل میں گزر جاتی، اور مثنوی کی تالیف شام سے صبح تک جاری رہتی، مثنوی کی جلد اول مکمل ہوئی تھی کہ حسام الدین کی اہلیہ نے انتقال کیا، اور حسام الدین کی طبیعت پر سخت اثر پڑا، اور وہ مضمحل ہو گئے، ان کے اضمحلال سے مولانا کی طبیعت بھی رک گئی، اور دو سال تک مثنوی کا سلسلہ بند رہا، پھر دوبارہ حسام الدین کی تحریک اور تقاضا سے اس کا سلسلہ شروع ہوا، اور مولانا کی وفات تک جاری رہا، یہ مدت ۱۵ سال کی تھی (زندگانی مولانا جلال الدین محمد ص۱۱۸-۱۱۹)۔ ندوی

بعد حسام الدین آپ کے ہمراز و دمساز رہے، بلکہ سلسلۂ خیال کو اور آگے بڑھایا جائے تو صاف نظر آتا ہے کہ سید برہان الدین ترمذی بھی اسی زمرہ میں داخل تھے، اگرچہ دوسری حیثیت سے تھے، سید موصوف کے انتقال اور شمس کی آمد کے درمیان پانچ برس کا زمانہ مولانا نے اس طرح گزارا گویا اس دوران میں آپ کچھ کمی محسوس کرتے تھے، اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ مولانا کے باطن میں جو کمالات مخفی تھے، ان کے اظہار کے لئے کسی نہ کسی محرک کی ضرورت تھی، "دیوان و مثنوی" انہی حضرات کی تحریک باطنی کے شواہد ظاہری ہیں، صرف حسام الدین کی عدم فرصت کی وجہ سے مثنوی شریف کی تصنیف دو برس معلق رہی۔

مولانا نے جن اصحاب کو اپنی ہم نشینی کے لئے منتخب کیا، ان کے انتخاب کی وجہ کشف و کرامت نہیں تھی، آپ کا قول اور مسلک یہ تھا کہ محبت کا سبب جنسیت ہوا کرتی ہے، خود مولانا نے سلطان ولد کے سوال پر فرمایا کہ میں مناسبت جنسیت کی وجہ سے ان کو خاص طور پر دوست رکھتا ہوں، فرمایا کہ جو محبت مناسبت کی وجہ سے ہوتی ہے، اس کا نتیجہ پشیمانی نہیں ہوتا، حقیقی محبت اور مناسبت سے دنیا و آخرت کہیں بھی پشیمانی نہیں ہوتی، چنانچہ اہل غرض دوستوں کو آخرت میں یہ تمنا ہوگی کہ "یٰلَیْتَنِیْ لَمْ اَتَّخِذْ فُلَانًا خَلِیْلًا" محبان متقی کی صفت یہ ہوگی "اَلْاَخِلَّآءُ یَوْمَئِذٍۭ بَعْضُهُمْ لِبَعْضٍ عَدُوٌّ اِلَّا الْمُتَّقِیْنَ"

خود فرماتے ہیں:-

موجبِ ایماں نہ باشد معجزات　　　　لیک جنسیت بود جذب صفات

مولانا کی وفات

سپہ سالار کا قول ہے کہ مولانا کے انتقال سے قبل قونیہ میں چالیس روز زلزلہ آتا رہا، افلاکی کا بیان ہے کہ مولانا ہنوز صاحب فراش تھے کہ سات روز برابر زلزلہ رہا، تمام لوگ عاجز آگئے، مولانا سے طلب امداد کی، فرمایا زمین بھوکی ہوگئی ہے، لقمۂ چرب چاہتی ہے، جلد کامیاب ہو جائے گی، اور یہ زحمت تم لوگوں سے

رفع ہو جائے گی، اور اس زمانہ میں یہ غزل ارشاد فرمائی:۔

با ایں ہمہ مہر و مہربانی دل می دہدت کہ خشم رانی
دیں جملہ شیشہ ہائے جان را درہم شکنی بہ لن ترانی

چلپی حسام الدین کی روایت ہے کہ ایک روز شیخ صدر الدین اکابر درویشوں کے ساتھ مولانا کی عیادت کو آئے، مولانا کی حالت دیکھ کر رنجیدہ ہوئے اور فرمایا خدا شفائے عاجل عطا فرمائے، امید ہے کہ صحتِ کلی حاصل ہو جائے گی، مولانا نے فرمایا، اب شفا آپ ہی کو مبارک ہو، عاشق و معشوق میں بال کا پیراہن رہ گیا ہے کیا آپ نہیں چاہتے کہ وہ بھی اٹھ جائے اور نور، نور میں شامل ہو جائے۔

مرض ہی میں یہ غزل شروع کی، حسام الدین چلپی لکھتے جاتے تھے، اور روتے جاتے تھے۔

رو سر بنہ بہ بالین تنہا مرا رہا کن ترکِ من خراب شب گرد مبتلا کن
مائیم و موجِ سودا شب تا بروز تنہا خواہی بیا ببخشا خواہی برو جفا کن
از من گریز تا تو ہم در بلا نیفتی بگزیں رہِ سلامت ترک رہ بلا کن
مائیم و آبِ دیدہ در کنج غم خزیدہ بر آب دیدۂ ما صد جائے آسیا کن
خیرہ کشی است ما را دارد دلے چو خارا بکشد کشش نہ گوید تدبیرِ خوں بہا کن
بر شاہ خوبرویان واجب وفا نباشد اے زرد روئے عاشق تو صبر کن وفا کن
دردیست غیر مردن کاں را دوا نباشد پس من چگونہ گویم کاں درد را دوا کن
در خواب دوش پیری در کوئے عشق دیدم با دست اشارتم کرد کہ عزم سوئے ما کن

عین انتقال کے قریب فرمایا:۔

گر مومنی و شیریں ہم مومنست مرگت در کافری و تلخی ہم کافرست مردن

۵ جمادی الاخری ۶۷۲ھ کو بوقت غروب آفتاب حقائق و معارف بیان فرماتے ہوئے انتقال

فرمایا، انتقال کے وقت مولانا کی عمر ۶۸ برس تین ماہ کی تھی۔

جنازہ کو جب باہر لائے، قیامت کا ازدحام برپا ہوا، ہر قوم و ملت کے لوگ ساتھ تھے، اور سب روتے جاتے تھے، یہودی اور عیسائی توریت و انجیل پڑھتے جاتے تھے، مسلمان ان کو ہٹاتے، مگر وہ باز نہیں آتے تھے، فساد کا اندیشہ ہوا، جب یہ خبر پروانہ[1] کو پہونچی، تو اس نے راہبوں اور قسیسوں سے پوچھا کہ تمھیں اس امر سے کیا تعلق ہے، انھوں نے کہا کہ ہم نے انبیائے سابقین کی حقیقت کو انہی کے بیان سے سمجھا اور اولیائے اکمل کی روش کو انہی کی روش سے جانا، وہ لوگ اسی طرح تابوت کے ساتھ رہے، ہجوم کی حالت یہ رہی کہ تابوت صبح سویرے مدرسہ سے روانہ ہوا تھا، اور شام کے قریب قبرستان پہونچا، آخر بوقتِ شب یہ آفتاب فقر و تصوف دیدۂ ظاہر سے نہاں ہو گیا۔

اخلاق و خصوصیات

مولانا شبلی مرحوم سوانح مولانا روم میں لکھتے ہیں:۔

"مولانا جب تک تصوف کے دائرہ میں نہیں آئے، آپ کی زندگی عالمانہ جاہ و جلال کی ایک شان رکھتی تھی، ان کی سواری جب نکلتی تھی تو علماء اور طلبہ بلکہ امراء کا ایک بڑا گروہ رکاب میں ہوتا تھا، سلاطین و امراء کے دربار سے بھی ان کو تعلق تھا، لیکن سلوک میں داخل ہونے کے ساتھ یہ حالت بدل گئی، درس و تدریس، افتاء و افادہ کا سلسلہ اب بھی جاری تھا، لیکن وہ پچھلی زندگی کی محض ایک یادگار تھی، ورنہ زیادہ تر محبت و معرفت کے نشہ میں سرشار رہتے۔"

ریاضت و مجاہدہ

ریاضت و مجاہدہ حد سے بڑھا ہوا تھا، سپہ سالار برسوں ساتھ رہے ہیں، ان کا بیان ہے کہ

[1] معین الدین پروانہ حاکم قونیہ۔

میں نے کبھی ان کو شب خوابی کے لباس میں نہیں دیکھا، بچھونا اور تکیہ بالکل نہیں ہوتا تھا، قصداً لیٹتے نہیں تھے، نیند غالب ہوتی تو بیٹھے بیٹھے سو جاتے، ایک غزل میں فرماتے ہیں:۔

چہ آساید بہر پہلو کہ خسپد کسے کز خار دارد او نہالین

سماع کے جلسوں میں مریدوں پر جب نیند غالب ہوتی تو ان کے لحاظ سے دیوار سے ٹیک لگا کر زانو پر سر رکھ لیتے کہ وہ لوگ بے تکلف ہو کر سو جائیں، وہ لوگ پڑ کر سو جاتے تو خود اٹھ بیٹھتے، اور ذکر و شغل میں مصروف ہوتے، ایک غزل میں اس کی طرف اشارہ کیا ہے۔

ہمہ خفتند و من دل شدہ را خواب نبرد ہمہ شب دیدۂ من بر فلک استارہ شمرد

خوابم از دیدہ چناں رفت کہ ہرگز ناید خواب من زہر فراق تو بنوشید و بمرد

روزہ اکثر رکھتے تھے، اور مسلسل کئی کئی روز کچھ نہ کھاتے تھے۔

نماز کی کیفیت

نماز کا وقت آتا تو فوراً قبلہ کی طرف مڑ جاتے، اور چہرہ کا رنگ بدل جاتا، نماز میں نہایت استغراق ہوتا تھا، سپہ سالار کہتے ہیں کہ بارہا میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے کہ اول عشا کے وقت سے نیت باندھی، اور دو رکعتوں میں صبح ہو گئی، مولانا نے ایک غزل میں اپنی نماز کی کیفیت بیان کی ہے، فرماتے ہیں:۔

چو نماز شام ہر کس بنہد چراغ و خوانے منم و خیال یارے غم و نوحہ و فغانے

چو وضو ز اشک سازم بود آتشیں نمازم در مسجدم بسوزد چو در رسد اذانے

عجبا نماز مستاں تو بگو درست ہست آں کہ نداند او زمانے نہ شناسد او مکانے

عجبا دو رکعت ست ایں عجبا چہارم آئیں عجبا چہ سورہ خواندم چو نداشتم زبانے

در حق چگونہ کوبم کہ نہ دست ماند و نے دل دل و دست چوں تو بردی بدہ اے خدا امانے

بخدا خبر نہ دارم چو نماز می گزارم   کہ تمام شد رکوعے کہ امام شد فلانے

ایک دفعہ جاڑوں کے دن تھے، مولانا نماز میں اس قدر روئے کہ تمام چہرہ اور داڑھی آنسوؤں سے تر ہوگئی، جاڑے کی شدت کی وجہ سے آنسو جم کر یخ ہو گئے، لیکن وہ اسی طرح نماز میں مشغول رہے۔

زہد و قناعت

مزاج میں انتہا درجہ کا زہد و قناعت تھی، تمام سلاطین و امراء نقدی اور ہر قسم کے تحائف بھیجتے تھے، لیکن مولانا اپنے پاس کچھ نہیں رکھتے تھے، جو چیز آتی، اسی طرح صلاح الدین زرکوب یا چلپی حسام الدین کے پاس بھجوا دیتے، کبھی کبھی ایسا اتفاق ہوتا کہ گھر میں نہایت تنگی ہوتی، اور مولانا کے صاحبزادہ سلطان ولد اصرار کرتے تو کچھ رکھ لیتے، جس دن گھر میں کھانے کا سامان کچھ نہ ہوتا تو بہت خوش ہوتے، اور فرماتے کہ آج ہمارے گھر میں درویشی کی بو آتی ہے۔

فیاضی و ایثار

فیاضی و ایثار کا یہ حال تھا کہ کوئی سائل سوال کرتا تو عبا یا کرتا یا جو کچھ بدن پر ہوتا اتار کر دے دیتے، اسی لحاظ سے کرتا عبا کی طرح سامنے سے کھلا ہوتا تھا کہ اتارنے میں زحمت نہ ہو۔

بے نفسی اور فنائیت

ایک دفعہ مریدوں کے ساتھ راہ میں جارہے تھے، ایک تنگ گلی میں ایک کتا سر راہ سو رہا تھا، جس سے راستہ رک گیا تھا، مولانا وہیں رک گئے، اور دیر تک کھڑے رہے، اُدھر سے ایک شخص آرہا تھا، اس نے کتے کو ہٹا دیا، مولانا نہایت آزردہ ہوئے، اور فرمایا کہ ناحق اس کو تکلیف دی۔

ایک دفعہ دو شخص سرِراہ لڑ رہے تھے، اور ایک دوسرے کو گالیاں دے رہے تھے، ان میں سے ایک نے کہا کہ او لعین! تو ایک کہے گا تو دس سنے گا، اتفاق سے مولانا کا ادھر گزر ہوا، آپ نے اس شخص سے فرمایا کہ بھائی جو کچھ کہنا ہے مجھ کو کہو کہ تم مجھ کو اگر ہزار کہو گے تو ایک بھی نہ سنو گے، دونوں مولانا کے پاؤں پر گر پڑے، اور آپس میں صلح کر لی۔

کسبِ حلال

معاش کا یہ طریقہ تھا کہ اوقاف کی مد سے پندرہ دینار ماہوار روزینہ مقرر تھا، چونکہ مولانا مفت خوری کو نہایت ناپسند کرتے تھے، اس لئے اس کے معاوضہ میں فتویٰ لکھا کرتے تھے، مریدوں کو تاکید تھی کہ اگر کوئی فتویٰ لائے تو گو میں کسی حالت میں ہوں، ضرور خبر کر دو تاکہ یہ آمدنی مجھ پر حلال ہو۔

ایک دفعہ کسی نے کہا کہ شیخ صدرالدین کو ہزاروں روپیہ کا وظیفہ ہے، اور آپ کو کل پندرہ دینار ماہوار ملتے ہیں، مولانا نے کہا کہ شیخ کے مصارف بھی بہت ہیں، اور حق یہ ہے کہ یہ پندرہ دینار بھی انہی کو ملنے چاہئیں۔

اہلِ دنیا سے یکسوئی

مولانا کو بالطبع امراء و سلاطین سے نفرت تھی، صرف حسنِ خلق کی وجہ سے آن سے مل لیتے تھے، ورنہ ان کی صحبتوں سے کوسوں دور بھاگتے تھے، ایک دفعہ ایک امیر نے معذرت کی کہ اشغال سے فرصت نہیں ہوتی، اس لئے کم حاضر ہو سکتا ہوں، معاف فرمایئے گا، فرمایا

"معذرت کی ضرورت نہیں، میں آنے کی بہ نسبت نہ آنے سے زیادہ ممنون ہوتا ہوں"۔[1]

مثنوی معنوی اور اس کا علمی و اصلاحی مقام و پیغام

مثنوی معنوی

مولانا کے حالات سے ظاہر ہوتا ہے کہ انھوں نے پُرجوش طبیعت پائی تھی، عشق ان کی فطرت

---

[1] سوانح مولانا روم باختصار و خفیف تغیر۔

میں کوٹ کوٹ کر بھرا تھا، ظاہری علم اور عقلیات کے توغل نے اس آگ کو دبا رکھا تھا، شمس تبریز کی آتشین صحبت نے ان کی فطرت کو چھیڑ دیا، اور تربیت و ماحول نے اس پر جو پردے ڈال دیئے تھے، وہ دفعۃً اٹھ گئے، اور وہ سراپا سوز و ساز بن گئے۔

شعلہا آخر ز ہر مویم دمید ۔۔۔ از رگ اندیشہ ام آتش چکید[1]

اس مقام پر پہونچ کر عارف کے ہر بُن مو سے صدا آتی ہے کہ۔

درجہان یارب ندیم من کجاست ۔۔۔ نخل سینایم کلیم من کجاست[2]

یہی وجہ تھی کہ ہمدم و ہمراز کے بغیر ان کے لئے جینا محال تھا، شمس تبریز کے بعد جب تک ان کو صلاح الدین زرکوب اور صلاح الدین زرکوب کے بعد جب تک ان کو حسام الدین چلپی نہیں مل گئے، ان کی بے قرار طبیعت کو سکون نہیں ہوا۔ ع

شمع را تنہا طپیدن سہل نیست

یہی آتش سوزاں تھی جو ان کو کشاں کشاں سماع کی طرف لے جاتی تھی، اور وہ اس سے قوت اور غذا حاصل کرتے تھے، چنانچہ فرماتے ہیں۔

پس غذائے عاشقاں آمد سماع ۔۔۔ کہ ازو باشد خیال اجتماع

قوتے گیرد خیالات ضمیر ۔۔۔ بلکہ صورت گردد از بانگ صفیر[3]

آتش عشق از نواہا گرد تیز ۔۔۔ آنچنانکہ آتش آں جوز ریز[4]

اسی سوز نے ان کے ساز کو چھیڑا اور خاموش رہنا ان کے لئے ناممکن کر دیا اس لئے ان کے بقول ؎

جوش نطق از دل نشان دوستیست ۔۔۔ بستگی نطق، از بے الفتی است

دل کہ دلبر دید کے ماند ترش ۔۔۔ بلبل گل دیدہ کے ماند خمش[5]

---

[1] اقبال در مثنوی اسرار خودی [2] ایضاً [3] مثنوی صہ ۳۱۹۔ نول کشور اشاعت نہم [4] ایضاً [5] ایضاً صہ ۵۵۱

اس ساز سے جو نغمے نکلے ان کے مجموعے کا نام مثنوی ہے، یہ ان کے خیالات و حالات، واردات و تاثرات اور مشاہدات و تجربات کا آئینہ ہے، اس میں صاحبِ کلام کا سوز و درد، جوش و مستی، اور ایمان و یقین بھرا ہوا ہے، اور یہی اس کی عالمگیر مقبولیت اور بے نظیر تاثیر کی اصل وجہ ہے۔ ع

ہے رگِ ساز میں رواں صاحبِ ساز کا لہو[1]

عقلیت و ظاہر پرستی پر تنقید

مولانا کا علمی نشو و نما تمام تر اشاعرہ کے علمی ماحول میں ہوا تھا، وہ خود ایک کامیاب مدرس اور معقولی عالم تھے، توفیقِ الٰہی نے جب ان کو معرفت و آگہی کے مقام تک پہونچایا، اور قال سے حال، خبر سے نظر، الفاظ سے معانی، اور اصطلاحات و تعریفات کے لفظی طلسم سے ترقی کر کے حقیقت و مغز تک پہونچے تو ان کو فلسفہ و علمِ کلام کی کمزوریوں اور استدلال و قیاس کی غلطیوں کا اندازہ ہوا، اور فلاسفہ و متکلمین اور اہلِ استدلال کی بے بضاعتی اور حقیقت ناشناسی کی حقیقت ان پر منکشف ہو گئی، تو انھوں نے بڑی قوت اور وضاحت کے ساتھ علمِ کلام پر تنقید کی، وہ چونکہ اس کوچہ کے ذرہ ذرہ سے آشنا ہیں، اس لئے وہ جو کچھ کہتے ہیں، وہ ان کا ذاتی تجربہ و مشاہدہ ہوتا ہے، اور اس کی واقعیت کا کوئی انکار نہیں کر سکتا۔

اس عصر کے فلسفہ و عقلیات کا سب سے زیادہ زور حواس ظاہری پر تھا، ان حواسِ خمسہ کو علم اور حصولِ یقین کا سب سے زیادہ مستند اور قابلِ وثوق ذریعہ سمجھا جاتا تھا، اور جو چیز ان کی گرفت میں نہ آ سکے، اور ان کے ذریعہ اس کی تصدیق نہ ہو سکے، اس کی نفی اور اس کے انکار کی طرف رجحان روز بروز ترقی کر رہا تھا، معتزلہ اس "حسّیت" کے سب سے بڑے نقیب تھے، اس حواس پرستی نے ایمان بالغیب کو بہت نقصان پہنچایا تھا، اور شریعت اور وحی کے پیش کئے ہوئے حقائق کی طرف سے ایک طرح کی بے اعتمادی پیدا کر دی

---

[1] اقبال بال جبریل۔

تھی، مولانا اس حواس پرستی اور اس کے پرجوش وکیلوں پر تنقید کرتے ہوئے فرماتے ہیں:۔

چشمِ حس را ہست مذہب اعتزال　　دیدۂ عقل است سنّی در وصال
سخرۂ حس اند اہلِ اعتزال　　خویش را سنّی نمایند از ضلال
ہر کہ در حس ماند او معتزلی است　　گرچہ گوید سنّیم از خامی است
ہر کہ بیروں شد ز حس سنی وے است　　اہلِ بینش اہلِ عقل خویش بیست[۱]

انھوں نے جا بجا ثابت کیا ہے کہ ان حواس ظاہری کے علاوہ انسان کو کچھ حواسِ باطنی عطا ہوئے ہیں، یہ حواسِ باطنی حواسِ ظاہری کے مقابلہ میں کہیں زیادہ وسیع اور وقیع ہیں، فرماتے ہیں:۔

پنج حسے ہست جز ایں پنج حس　　آں چو زر سرخ وایں حسہا چو مس
اندراں بازار کاہل محشر اند　　حس مس را چوں حسِ زر کے خرند
حس ابداں قوتِ ظلمت می خورد　　حسِّ جان از آفتابے می چرد[۲]

ان کے نزدیک کسی چیز کے انکار کے لئے یہ ثبوت بالکل کافی نہیں کہ وہ دیکھنے میں نہیں آتی، یا حواس اس کی تصدیق نہیں کرتے، ان کے نزدیک باطن ظاہر کے پیچھے نہاں اور دوا میں فائدہ کی طرح اس میں پنہاں ہے، منکرین باطن کا ذکر کرتے ہوئے فرماتے ہیں:۔

حجتِ منکر ہمی آمد کہ من　　غیر ازیں ظاہر نمی بینم وطن
ہیچ نندیشد کہ ہر جا ظاہر است　　آں ز حکمت ہائے پنہاں مخبر است
فائدہ ہر ظاہرے خود باطنیت　　ہمچو نفع اندر دوا ہا مضمریست[۳]

ان کا کہنا ہے کہ منکرین اپنی اس ظاہر بینی اور کوتاہ نظری کی عادت کی وجہ سے ان حقائق باطنی کی دید سے محجوب اور اصل غایت و مقصد سے محروم ہیں:۔

---

[۱] مثنوی ص۱۰۱　[۲] ایضاً　[۳] ایضاً ص۳۶۸

چونکہ ظاہر ہا گرفتند احمقاں   آں دقائق شد ازیشاں لس نہاں

لاجرم محجوب گشتند از غرض   کہ دقیقہ فوت شد در مفترض[1]

حواس سے آگے بڑھ کر وہ عقل پر بھی تنقید کرتے ہیں کہ عالمِ غیب کے حقائق اور انبیاء کے علوم و معارف کے بارہ میں عقل بھی کوتاہ اور نارسا ہے، اس کے پاس قیاس کی کوئی بنیاد نہیں، اور وہ اس عالم کا کوئی تجربہ نہیں رکھتی، دریائے شور کا رہنے والا آبِ شیریں کا کیا اندازہ کرسکتا ہے؟

اے کہ اندر چشمۂ شور است جات   تو چہ دانی شط و جیجون و فرات[2]

وہ اس عقل کو جو محسوسات اور مقدمات کی پابند ہو عقلِ جزوی کے نام سے یاد کرتے ہیں، ان کے نزدیک اوہام و شکوک اس کا ثمرہ، عالمِ ظلمات اس کا وطن ہے، وہ عقل کے لئے باعثِ بدنامی اور انسان کے لئے سببِ ناکامی ہے، اس عقلِ جزوی سے دیوانگی اچھی!

عقلِ جزوی آفتش وہم ست وظن   زانکہ در ظلمات شد او را وطن[3]

عقلِ جزوی عقل را بدنام کرد   کامِ دنیا مرد را بے کام کرد[4]

زیں خرد جاہل ہمی باید شدن   دست در دیوانگی باید زدن[5]

وہ کہتے ہیں کہ میں نے خود اس عقلِ دور اندیش کا تجربہ کیا ہے، اور اس نتیجہ تک پہونچا ہوں۔

آزمودم عقلِ دور اندیش را   بعد ازیں دیوانہ سازم خویش را[6]

پھر وہ ایک سیدھی اور عام فہم بات کہتے ہیں کہ اگر عقل دینی حقائق و معارف کے ادراک کے لئے کافی ہوتی تو اہلِ منطق و استدلال اور ائمۂ کلام سب سے بڑے عارف اور دین کے محرمِ اسرار ہوتے۔

اندریں بحث از خرد رہ بیں بُدے   فخر رازی رازدارِ دین بُدے[7]

ان کے نزدیک انسانوں کے ساختہ پرداختہ علوم، علمِ حقیقی کے لئے حجاب اور سالک کے لئے

---

[1] مثنوی ص۴۲۲ [2] ایضاً ص۹۶۔ [3] ایضاً ص۲۲۳۔ [4] ایضاً ص۴۰۲۔ [5] ایضاً ص۱۵۲۔ [6] ایضاً ص۱۵۲۔ [7] ایضاً ص۴۸۹

انتشار و اضطراب کا موجب ہیں، اس لئے یقین و معرفت کے لئے ان میں اضافہ و ترقی کے بجائے کمی اور ان سے گلو خلاصی کی ضرورت ہے، فرماتے ہیں:۔

گر تو خواہی کت شقاوت کم شود ۔۔۔ جہد کن تا از تو حکمت کم شود
حکمتے کز طبع آید و ز خیال ۔۔۔ حکمتے بے فیض نور ذو الجلال
حکمتے دنیا فزاید ظن و شک ۔۔۔ حکمتِ دینی برد فوق فلک[1]

ان کے خیال میں استدلال مقدمات کی ترتیب اور نتیجہ کا استخراج ایک مصنوعی طریقہ ہے اور اس سے بہت محدود اور ناقص نتائج حاصل کئے جا سکتے ہیں، اس سے دینی حقائق کا ثابت کرنا ایسا ہی مشکل ہے، جیسے لکڑی کے مصنوعی پاؤں کے ذریعہ آزادانہ چلنا پھرنا اور سفر طے کرنا، ان کی یہ تمثیل ضرب المثل کا درجہ رکھتی ہے اور زبان زد خاص و عام ہے کہ:۔

پائے استدلالیان چوبیں بود ۔۔۔ پائے چوبیں سخت بے تمکیں بود[2]

ان کے نزدیک علم کلام اور متکلمانہ بحث و استدلال سے یقین کی کیفیت اور حلاوت ایمانی حاصل نہیں ہوتی، اس لئے کہ متکلم جو تقلیداً متقدمین کے دلائل و براہین کو نقل کر دیتا ہے، اور آموختہ سا سنا دیتا ہے، خود بے روح، اور ذوق و کیفیاتِ یقین سے محروم ہے۔

آں مقلد صد دلیل و صد بیان ۔۔۔ بر زبان آرد ندارد ہیچ جان
چونکہ گوینده ندارد جان و فر ۔۔۔ گفت او را کے بود برگ و ثمر[3]

وہ اس عقل جزوی کے بجائے جو محسوسات و معلومات اور تجربات کی پابند اور دنیا کے اندر محدود ہے، اس عقلِ ایمانی کے قائل ہیں، جو خود عقل کے لئے رہنما اور اس کے لئے چراغ راہ ہے، اور حواس سے وہ نسبت رکھتی ہے، جو عقل جزوی جسم کے ساتھ، اور حس کے بغیر یہ عقل، عقل کہلانے کی مستحق نہیں، اس لئے اس کو عقلِ عقل

---
[1] مثنوی ص ۱۷۱ [2] ایضاً [3] ایضاً ص ۴۴۹

کہہ سکتے ہیں، یہ عقلِ عقل ان لوگوں کا حصہ ہے، جو نورِ ایمان اور دولتِ یقین سے بہرہ ور ہیں۔

بندِ معقولات آمد فلسفی   شہسوارِ عقلِ عقل آمد صفی[1]

عقلِ جزدی سے انسان کے دفتر کے دفتر سیاہ ہیں، عقلِ عقل سے عالم مطلعِ انوار ہے۔

عقلِ دفترہا کند یکسر سیاہ   عقلِ عقل آفاق دارد پُر زماہ

از سیاہی وسپیدی فارغ است   نورِ ماہش بردل وجاں بازغ است[2]

عقلِ ایمانی شہر کے لئے پاسبان کا حکم رکھتی ہے، عقلِ جزوی کا تقاضا خوف وہراس اور دنیا کے اندیشے ہیں، عقلِ ایمانی کا تقاضا اطمینان وسکون اور خواہشاتِ نفس سے حفاظت ہے۔

عقلِ ایمانی چو شحنہ عادل است   پاسبان وحاکمِ شہرِ دل است

عقل درتن حاکمِ ایمان بود   کز ہیبش نفس در زندان بود[3]

ان کے نزدیک جس طرح حواس عقل کے تابع اور محکوم ہیں، اسی طرح عقل پر روح کو تفوق اور حکومت حاصل ہے، روح ایک اشارہ میں عقل کی سیکڑوں گرہیں کھول دیتی ہے، اور چٹکیوں میں اس کی مشکل آسان کردیتی ہے۔

حس اسیرِ عقل باشد اے فلاں   عقل اسیرِ روح باشد ہم بدان

دست بستۂ عقل راجان باز کرد   کارہائے بستہ راہم ساز کرد[4]

فلسفی ادنیٰ معقولات اور ابتدائی معلومات کی منزل سے آگے نہیں بڑھتا، اس کی عقل نے ابھی دروازہ سے باہر قدم ہی نہیں نکالا ہے۔

فلسفی گوید ز معقولات دون   عقل از دہلیز می ناید بروں[5]

فلسفی خود اپنی عقل وفکر کا مارا ہوا ہے، وہ ایسا بدقسمت مسافر ہے کہ اس کی پشت منزل کی طرف اور رُخ صحرا کی طرف ہے، اس لئے وہ جس قدر تیز قدم بڑھاتا ہے، منزلِ مقصود سے دور ہوجاتا ہے۔

[1] مثنوی صد ۲۴۶ [2] ایضاً صد ۲۴۶ [3] ایضاً صد ۳۴۷ [4] ایضاً صد ۲۳ [5] ایضاً صد ۸۲

فلسفی خود را از اندیشہ بکشت کو بدو کو را سوے گنج است پشت

کو بدو چنداں کہ افزوں می دود از مرادِ دل جدا تر می شود[1]

فلسفی دنیا کے علوم سے باخبر، بڑا وسیع النظر، صدہا چیزوں سے آشنا، مگر اپنے سے ناآشنا ہے، حالانکہ سب سے بڑا علم خود شناسی ہے۔

صد ہزاراں فضل دارد از علوم جان خود را می نداند ایں ظلوم

داند او خاصیتِ ہر جوہرے در بیان جوہرِ خود چون خرے

قیمتِ ہر کالہ می دانی کہ چیست قیمتِ خود را ندانی ز احمقیست

جانِ جملہ علمہا این ست این کہ بدانی من کیم در یومِ دین[2]

وہ اپنے زمانہ کے عالم و متکلم کو حکمتِ یونانی سے حکمتِ ایمانی کی طرف ہجرت کی دعوت دیتے ہیں، جو حقیقی علم اور حکمت ہے۔

چند چند از حکمت یونانیان حکمت ایمانیاں را ہم بخوان[3]

وہ کہتے ہیں کہ تزکیۂ نفس سے صحیح معرفتِ نفس حاصل ہوگی، لوحِ دل جتنی صاف ہوگی، حکمتِ ایمانی کے نقوش اتنے ہی روشن اور اجاگر ہوں گے، اس وقت بغیر کتاب و استاد کے انبیاء علیہم السلام کے علوم و معارف وارد ہوں گے، اور حکمت کے دہانے کھل جائیں گے۔

خویش را صافی کن از اوصافِ خود تا بہ بینی ذات پاک وصافِ خود

بینی اندر دل علوم انبیاء بے کتاب و بے معید و اوستا[4]

دوسری جگہ فرماتے ہیں۔

آئینہ دل چون شود صافی و پاک نقشہا بینی برون از آب و خاک

---

[1] مثنوی ص۳۳۳ [2] ایضاً ص۴۲۹ [3] ایضاً ص۸٦ [4] ایضاً۔

روزنِ دل گر گشاد ست و صفا — می رسد بے واسطہ نورِ خدا

دعوتِ عشق

ساتویں صدی میں علم کلام اور عقلیت کی جو سرد ہوا عالمِ اسلام میں مشرق سے مغرب تک چلی تھی، اس سے دل کی انگیٹھیاں سرد ہو گئی تھیں، اگر کہیں عشق کی چنگاریاں تھیں تو راکھ کے ڈھیر کے نیچے دبی ہوئی تھیں، ورنہ ایک سرے سے دوسرے سرے تک افسردہ دلی بلکہ مردہ دلی چھائی ہوئی تھی، اور کہنے والا دیر سے کہہ رہا تھا کہ۔

کبھی عشق کی آگ اندھیر ہے — مسلماں نہیں خاک کا ڈھیر ہے

اس سرد اور خواب آور فضا میں مولانا نے "عشق" کی صدا بلند کی، اور اس زور سے بلند کی کہ ایک بار عالمِ اسلام کے جسم میں بجلی سی کوند گئی۔

مولانا نے کھل کر عشق کی دعوت دی اور محبت کی کرامت اور عشق کی کرشمہ سازیاں بیان کیں۔

از محبت تلخہا شیریں شود — وز محبت مسہا زریں شود

از محبت دردہا صافی شود — وز محبت دردہا شافی شود

از محبت سجن گلشن می شود — بے محبت روضہ گلخن می شود

از محبت سنگ روغن می شود — بے محبت موم آہن می شود

از محبت سقم صحت می شود — وز محبت قہر رحمت می شود

از محبت مردہ زندہ می شود — وز محبت شاہ بندہ می شود[1]

وہ عشق کی طاقت و رنعمت کو بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں۔

---

[1] مثنوی ص ۱۳۴۔

جسمِ خاک از عشق بر افلاک شد　　　کوہ در رقص آمد و چالاک شد

عشق جانِ طور آمد عاشقا　　　طور مست و خرّ موسیٰ صعقا[1]

وہ فرماتے ہیں، عشق نہایت غیور خوددار ہے، وہ ہفت اقلیم کی سلطنت کو خاطر میں نہیں لاتا، جس نے ایک بار اس کا مزہ چکھ لیا، اس نے پھر کسی کی طرف نظر اٹھا کر نہ دیکھا۔

دو عالم سے بیگانہ کرتی ہے دل کو　　　عجب چیز ہے لذت آشنائی[2]

وہ دو عالم سے بیگانہ اور دنیا کا سب سے بڑا مست و دیوانہ ہے۔

با دو عالم عشق را بیگانگی　　　اندرو ہفتاد و دو دیوانگی[3]

وہ شاہوں کا شاہ اور مطلوبوں کا مطلوب ہے، بادشاہوں کے تخت و تاج اس کے قدموں کے نیچے ہیں۔

سخت پنہاں است و پیدا حیرتش　　　جانِ سلطانانِ جاں در حسرتش

غیرِ ہفتاد و دو ملّت کیشِ اُو　　　تختِ شاہان تختہ بندے پیشِ اُو[4]

اس فقرِ جسور اور عشقِ غیور کا جب وہ تذکرہ کرنے لگتے ہیں تو خود ان پر جوش و سرمستی کی کیفیت طاری ہو جاتی ہے، اور وہ بیخود ہو کر کہنے لگتے ہیں۔

ملکِ دنیا تن پرستان را حلال　　　ما غلامِ ملکِ عشقِ بے زوال[5]

وہ کہتے ہیں کہ عشق کی ہی وہ بیماری ہے جس سے بیمار کبھی شفا نہیں چاہتا، بلکہ اس میں اضافہ و ترقی ہی کی دعا کرتا ہے۔

جملہ رنجوراں شفا جویند و این　　　رنج افزون جوید و درد و چنین

خوبتر زین سم ندیدم شربتے　　　زین مرض خوشتر نباشد صحتے[6]

لیکن وہ ایسی بیماری ہے کہ پھر کوئی بیماری نہیں ہوتی۔

---

[1] مثنوی ص۵　[2] اقبال (بال جبریل)　[3] ایضاً ص۲۴۳　[4] ایضاً ص۲۴۳　[5] ایضاً ص۵۹۱　[6] ایضاً ص۵۹۵

آں کلامت می رہاند از کلام　　　وان سقامت می جہاند از سقام[۱]

بیماری بھی ایسی بیماری ہے کہ ہزار صحتیں اس پر قربان، اس کی کلفت ایسی کلفت ہے کہ ہزاروں راحتیں اس پر نثار۔

پس مقامِ عشق جانِ صحت است　　　رنجہا یش حسرتِ ہر راحت است[۲]

یہ عشق پاکباز اگر گناہ ہے تو ایسا گناہ ہے کہ طاعتیں اس کے سامنے ہیچ ہیں، اس سے ایک گھڑی میں جو ترقی حاصل ہوتی ہے، وہ سالہا سال کی ریاضت سے میسر نہیں۔

زین گنہ بہتر نباشد طاعتے　　　سالہا نسبت بدین دم ساعتے[۳]

راہِ عشق میں جو خون بہے وہ کسی پانی سے کم پاک نہیں، شہیدِ عشق کو ہمارے غسل و وضو کی ضرورت نہیں۔

خونِ شہیدان را ز آب اولیٰ تر است　　　این خطا از صد صواب اولیٰ تر است[۴]

عاشق وہ جگر سوختہ و دل باختہ ہیں کہ ان پر عام انسانوں کے قوانین جاری نہیں کئے جا سکتے، جو گاؤں سراسر ویران ہو گیا ہو اس پر خراج کیسا؟

عاشقان را ہر نفس سوزید نیست　　　بردہ ویران راخراج وعشر نیست[۵]

عشق آدمؑ کی میراث اور زیرکی و چالاکی شیطان کا سرمایہ ہے۔

داند آں کو نیک بخت ومحرم است　　　زیرکی ز ابلیس و عشق از آدم است[۶]

زیرکی و چالاکی میں اپنے دست و بازو (عقل و خرد) پر اعتماد ہوتا ہے، عشق میں کسی کے دامن سے وابستگی ہوتی ہے، اور سپردگی، زیرکی و چالاکی، شناوری، (پیراکی) کا فن ہے، عشق "کشتیِ نوح"، زیرک و چالاک کو اس طوفان میں بچتے اور ساحل تک پہنچتے اور صاحبِ عشق کو غرق ہوتے کب دیکھا گیا ہے؟

زیرکی سباحی آمد در بحار　　　کم زہد، غرق است او پایان کار

---

[۱] مثنوی ص ۵۹۵　[۲] ایضاً　[۳] ایضاً　[۴] ایضاً ص ۱۳۹　[۵] ایضاً　[۶] ایضاً ص ۳۳۴

عشق چوں کشتی شود بہر خواص　　　کم بود آفت، بود اغلب خلاص[1]

عقل کی ہوشمندی عشق کی حیرانی پر قربان کر دینے کے قابل ہے، وہ ہوشمندی محض ظن و قیاس ہے اور یہ حیرانی مشاہدہ و عرفان۔

زیرکی بفروش و حیرانی بخر　　　زیرکی ظنیست، حیرانی نظر[2]

مولانا عشق کی تلقین کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ محبوب بننا تو ہر ایک کے بس میں نہیں لیکن عاشق بننا ممکن ہے، اگر خدا نے تم کو محبوب نہیں بنایا ہے تو تم عاشق بن کر زندگی کا لطف حاصل کرو۔

تو کہ یوسف نیستی یعقوب باش　　　ہمچو او باگریہ و آشوب باش

تو کہ شیریں نیستی فرہاد باش　　　چوں نئی لیلیٰ تو مجنوں گرد فاش[3]

وہ ایک قدم آگے بڑھاتے ہیں، اور کہتے ہیں کہ عاشق بننے میں جو مزہ ہے، اور ترقی ہے، وہ محبوب بننے میں کہاں؟ اگر محبوبانِ عالم کو اس دولتِ سرمد کا پتہ چل جائے، محبوبوں کی صف سے نکل کر "عشاق" کی صف میں شامل ہو جائیں۔

ترک کن معشوقی و کن عاشقی　　　اے گمان بردہ کہ خوب و فائقی[4]

لیکن "عشق" کی یہ دولت بیدار کسی مردہ و ناپائدار محبوب کے لائق نہیں، عشق خود زندہ ہے، اسے ایک زندہ و پائندہ محبوب چاہیے۔

عشق بر مردہ نباشد پائدار　　　عشق را برحیِ جان افزائے دار[5]

اسی زندہ و پائندہ حی و قیوم محبوب سے عشقِ جاوداں کی تشفی و استواری ہے، اسی سے اس کی تازگی اور آبیاری ہے۔

عشق زندہ در رواں و در بصر　　　ہر دمے باشد ز غنچہ تازہ تر

---

[1] مثنوی ص۳۳۴　[2] ایضاً　[3] ایضاً ص۴۹　[4] ایضاً ص۳۶۶　[5] ایضاً ص۳۶۸

عشق آں زندہ گزیں کو باقیست　　　وز شراب جانفزایت ساقیست

عشق آں بگزیں کہ جملہ انبیاء　　　یافتند از عشق او کار و کیا[۱]

حسن کی اس بارگاہ عالی میں عشق کو اپنی نارسائی کا شکوہ نہیں ہونا چاہیئے کہ حسن ازل سدا سے عشق نواز اور دوست طلب ہے ۔

تو مگو ما را بداں شہ بار نیست　　　با کریماں کارہا دشوار نیست[۲]

یہ عشق دیکھنے میں ایک بیماری ہے، جو دل کی شکستگی سے پیدا ہوتی ہے، یہ بیماری بڑی جان لیوا ہے، لیکن آدمی اگر اس کو برداشت کر لے جائے تو اس کا نتیجہ معرفت حقیقی اور حیاتِ ابدی ہے ۔

عاشقی پیداست از زاریٔ دل　　　نیست بیماری چوں بیماریٔ دل

علت عاشق زعلتہا جداست　　　عشق اُصطرلاب اسرارِ خداست[۳]

یہ بیماری سب بیماریوں کی دوا اور ہر قسم کے نفسانی و اخلاقی امراض کے لئے شفا ہے، جن روحانی امراض کے علاج سے طبیب مایوس اور معالج و مصلح دست بردار ہو چکے ہوں، اور کوئی تدبیر کارگر نہ ہوتی ہو عشق ایک نگاہ میں اس کو اچھا کر سکتا ہے، برسوں کا مریض جب عشق کے ہاتھوں اپنے روحانی امراضِ کہنہ سے شفا پاتا ہے، تو سرور و بیخودی کے عالم میں پکار اٹھتا ہے ۔

شاد باش اے عشقِ خوش سودائے ما　　　اے طبیب جملہ علتہائے ما

اے دوائے نخوت و ناموسِ ما　　　اے تو افلاطون و جالینوسِ ما[۴]

عشق ایک شعلہ ہے جو خس و خاشاک کو جلا کر خاک کر دیتا ہے، اور محبوب کے سوا کسی کا روادار نہیں، وہ بڑا موحّد، بڑا غیور ہے ۔

عشق آں شعلہ است کو چوں برفروخت　　　ہر چہ جز معشوق باقی جملہ سوخت

۱؎ مثنوی ص۱　۲؎ ایضاً ص۲　۳؎ ایضاً ص۲　۴؎ ایضاً ص۵

تیغ لا در قتلِ غیرِ حق براند   در نگر زاں پس کہ بعد از لا چہ ماند
ماند الا اللہ باقی جملہ رفت   شاد باش اے عشق شرکت سوز رفت [1]

یہ عشقِ الٰہی ایک بحرِ ناپیدا کنار ہے، اس کی داستان ختم ہونے والی نہیں، زمانہ کی وسعت بھی اس کے لئے تنگ اور دنیا کی عمر بھی اس کی داستان سرائی کے لئے کوتاہ ہے، یہ اُس حسنِ ازلی کا قصہ ہے، جس کا نہ اول ہے نہ آخر، اس لئے یہاں خاموشی ہی بہتر اور اعترافِ عجز ہی مناسب ہے۔

شرحِ عشق ار من بگویم بر دوام   صد قیامت بگزرد واں ناتمام
زانکہ تاریخِ قیامت را حد است   حد کجا آنجا کہ وصفِ ایزد است [2]

جہانِ دل

لیکن یہ عشق جس کی دعوت مولانا اس جوش و خروش سے دیتے ہیں، دل کی زندگی، اور بیداری اور دل کی گرمی کے بغیر ممکن نہیں، ہر زمانہ کی طرح مولانا کے زمانہ میں بھی دل کی طاقتوں اور معنویت سے غفلت اور ناواقفیت بڑھتی جارہی تھی، اور دماغ کی عظمت کا سکہ دلوں پر بیٹھتا جارہا تھا، دماغ روشن اور دل سرد ہوتے جارہے تھے، معدہ زندگی میں مرکزی مقام حاصل کرتا جارہا تھا، مولانا نے دل کی عظمت و وسعت کی طرف متوجہ کیا، اور اس کے عجائبات و فتوحات بیان کئے، اور یاد دلایا کہ انسان اپنے اس جسمِ خاکی میں کیسا سدا بہار باغ رکھتا ہے، اور اس کے پہلو میں کیسی دنیا آباد ہے، جس میں ملک کے ملک گم ہو جائیں، جس کو کسی دشمن کا خطرہ اور کسی رہزن کا اندیشہ نہیں۔

ایمن آباد است دل اے مرداں   حصن محکم موضعِ امن و اماں
گلشنِ خرم بکامِ دوستاں   چشمہا و گلستاں در گلستاں [3]

---

[1] مثنوی ص۳۰۵   [2] ایضاً ص۲۴۲   [3] ایضاً ص۱۹۹

انھوں نے بتلایا کہ دنیا کے باغات چند دنوں کے مہمان، لیکن نخلِ دل سدا جوان اور باغِ دل بہار بے خزاں ہے، جسم کا باغ برسوں میں لگتا ہے، اور دم میں اجڑ جاتا ہے، دلوں کے باغ لگنے میں دیر نہیں لگتی، مگر اس کی رعنائی اور تازگی میں کبھی فرق نہیں آتا۔

گلشنے کز نقل روید یک دم است　　گلشنے کز عقل روید خرم است

گلشنے کز تن دمد گردد تباہ　　گلشنے کز دل دمد وافرحتاہ[1]

وہ تلقین کرتے ہیں کہ جسم کو جوان بنانے کی سعی لاحاصل اور سکندر کی طرح "چشمۂ حیوان" کی ناکام تلاش کے بجائے عشق کے آبِ حیات کا ایک جرعۂ نوشِ جان اور دل کی زندگی کا سامان کرنے کی ضرورت ہے تاکہ صحیح معنی میں زندہ دلی اور نشاطِ روح حاصل ہو اور ہر دورِ زندگی میں توانائی و رعنائی محسوس ہو۔

دل بجز تا دائما باشی جوان　　از تجلی چہرہ ات چوں ارغوان

طالبِ دل شو کہ تا باشی چو دل　　تا شوی شادان و خنداں ہمچو گل[2]

لیکن دل کے لفظ سے دھوکہ نہ ہو، دل وہ نہیں ہے جو سینہ میں دھڑکتا ہے، اور خواہشاتِ نفس اور بوالہوسی کی آماجگاہ ہے، جو محبت کی لذت سے ناآشنا، یقین کی دولت سے محروم، ذوق و شوق سے خالی ہے، جس کی کلی کبھی کھلتی نہیں، اور جس کی قسمت کبھی چمکتی نہیں، یہ دل دل نہیں، پتھر کی ایک سِل ہے۔

تنگ و تاریک است چوں جانِ جہود　　بینوا از ذوقِ سلطانِ ودود

نے دراں دل تابِ نورِ آفتاب　　نے کشادہ عرصہ نے فتح باب[3]

یہ دل اپنی ساخت اور اپنی صورت شکل، جسامت کے لحاظ سے، ویسا ہی ایک دل ہے، جیسے اہلِ دل کا بیدار و بیتاب دل، لیکن حقیقت کے لحاظ سے دیکھئے تو سوائے لفظی اشتراک اور جسمانی مشابہت کے دونوں میں کوئی مناسبت نہیں، وہ بھی پانی ہے، جو چشمۂ صافی میں رواں ہے، اور وہ بھی پانی ہے، جو کسی دلدل

---

[1] مثنوی ص۴۹ [2] ایضاً ص۱۵۶ [3] ایضاً ص۱۷

یا کیچڑ کے اندر ہے، لیکن پہلا پانی خالص پانی ہے، جس سے پیاس بھی بجھائی جا سکتی ہے، اور ہاتھ بھی صاف ہو سکتے ہیں، دوسرے پانی میں مٹی کا اتنا جزء ہے کہ اس سے پانی کا کام لینا مشکل ہے، یہی فرق دل، اور دل میں ہے، ایک دل مادہ پرست اور بوالہوس، ایک بے حس و مردہ دل انسان کا ہے، ایک دل انبیاء و اولیاء کا ہے، جس کی بلندی کے سامنے آسمان بھی پست اور جس کی وسعت کے آگے سارے عالم کی وسعت گرد ہے، اس لئے سوچ سمجھ کر کہو کہ ہمارے پہلو میں بھی دل ہے

توہمی گوئی مرا دل نیز ہست | دل فراز عرش باشد نہ بہ پست
در گل تیرہ یقین ہم آب ہست | لیک ازاں آبت نباید آبدست
زانکہ گر آب است مغلوب گل است | پس دل خود را مگو کایں ہم دل است
آں دلے کز آسمانہا برتر است | آں دل ابدال یا پیغمبر است[1]

لیکن پھر تسلی دیتے ہیں کہ دل بہر حال دل ہے، اور خدا کے یہاں کوئی دل مردود نہیں، وہ ہر دل کا خریدار ہے، اس لئے کہ خریداری سے اس کو کوئی فائدہ مقصود نہیں۔

کالۂ کہ ہیچ خلقش ننگرید | از خلافت آں کریم آں را خرید
ہیچ قلبے پیش او مردود نیست | زانکہ قصدش از خریدن سود نیست[2]

پھر وہ فرماتے ہیں کہ معدہ کے قفس زریں کو چھوڑ کر دل کی آزاد بستی کی سیر کرو، اور خدا کی قدرت کا تماشا دیکھو، تمہارے اور خالق کے درمیان بڑا حجاب یہی معدہ اور شکم پرستی ہے، تم اس حجاب سے نکلے کہ تم کو اس بارگاہِ عالی سے سلام پہونچے۔

معدہ را بگذار سوئے دل خرام | تاکہ بے پردہ زحق آید سلام[3]

مقامِ انسانیت

مستبد شخصی سلطنتوں کے اثرات اور پیہم مظالم، مسلسل جنگوں کے نتیجہ میں عام انسانوں میں

---

[1] مثنوی ص ۲۳۹ [2] ایضاً ص ۵۲۱ [3] ایضاً ص ۴۵۰

زندگی سے بیزاری، اپنے مستقبل سے مایوسی اور احساس کہتری پیدا ہوگیا تھا، اور انسان خود اپنی نگاہ میں ذلیل ہوگیا تھا، عجمی تصوف نے فنائیت، انکار ذات اور خودشکنی کی تلقین اتنے جوش اور قوت سے کی تھی کہ خودنگری اور خودشناسی جس پر حرکت، جد وجہد اور کشمکش موقوف ہے ایک اخلاقی جرم اور مانع ترقی سمجھی جانے لگی تھی، انسانوں کے سامنے ملکوتی صفات کے حصول، اور لوازم بشریت سے انسلاخ، تجرد و تفرید کی تبلیغ، اس انداز میں ہوئی تھی کہ انسان کو اپنی انسانیت سے شرم آنے لگی تھی، اور وہ اپنی ترقی انسانیت میں نہیں، بلکہ ترکِ انسانیت میں سمجھنے لگا تھا، عام طور پر مقامِ انسانیت سے غفلت اور انسان کی رفعت و شرافت سے ذہول پیدا ہوگیا تھا، اور اس وقت کی ادبیات اور شعر و شاعری میں تحقیرِ انسانیت کی روح سرایت کرگئی تھی، اس کا نفسیاتی اثر یہ تھا کہ لوگوں میں عام طور پر اپنے بارہ میں بے اعتمادی، ناامیدی، افسردگی اور شکستہ دلی پائی جاتی تھی، اور انسان کبھی کبھی حیوانات اور جمادات پر رشک کرنے لگتا تھا، وہ جوہرِ انسانیت سے ناواقف اور اپنی عظمتوں اور ترقیات سے غافل تھا، مولانا نے اپنے مخصوص انداز میں اس پہلو کو ابھارا اور انسان کی بلندی کا ترانہ اس جوش سے بلند کیا کہ اس کی سوئی ہوئی خودی بیدار ہوگئی، اور وہ اپنے مقام سے آگاہ ہوگیا، مولانا کی اس رجز خوانی کا پوری اسلامی ادبیات پر اثر پڑا اور اس نے شعر و شاعری اور تصوف میں ایک نیا رجحان پیدا کردیا۔

مولانا انسان کو اپنی انسانی خلقت کی طرف توجہ دلاتے ہیں، جس کو اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں جابجا "اَحْسَنِ تَقْوِیْم" کے خطاب سے یاد فرمایا ہے، یہ لباس موزوں خاص طور پر اسی کے لئے قطع کیا گیا ہے، اور اس کی قامت پر راست آتا ہے۔

"احسن التقویم" در "والتین" بخواں	کہ گرامی گوہر است اے دوست جان
"احسن التقویم" از فکرت برون	"احسن التقویم" از عرشش فزون[1]

[1] مثنوی ص۵۱۵

وہ فرماتے ہیں کہ انسان کے سوا اور کس کے سر پر "کرامت" کا تاج رکھا گیا ہے اور "کَرَّمْنَا" اور "اَعْطَیْنَاکَ" کے خطاب سے مشرف کیا گیا ہے؟!

ہیچ کَرَّمْنَا شنید ایں آسمان — کہ شنید ایں آدمی پُر غمان[1]

تاجِ کَرَّمْنَا ست بر فرقِ سرت — طوقِ اَعْطَیْنَاکَ آویز برت[2]

وہ فرماتے ہیں کہ انسان خلاصۂ کائنات اور مجموعۂ اوصافِ عالم ہے۔ انسان کیا ہے؟ ایک کوزہ میں دریا بند ہے، اور ایک مختصر سے وجود میں پورا عالم پنہاں ہے۔

آفتابے در یکے ذرّہ نہان — ناگہاں آں ذرّہ بکشاید دہان

ذرہ ذرہ گردد افلاک و زمین — پیشِ آں خورشید چوں جست از کمین[3]

بحرِ علمے در نمی پنہاں شدہ — در سہ گز تن عالمے پنہان شدہ[4]

انسان آفرینشِ عالم کا مقصود اور تمام کائنات کا محسود ہے، اسی سے اس عالم کا رنگ و بو اور زندگی کی آبرو ہے، اس کی طاعت تمام موجودات پر فرض ہے۔

ہر شرابے بندہ آں قد و خد — جملہ مستان رالود بر تو حسد

ہیچ محتاجِ مے گلگون نئے — ترک کن گلگونہ تو گلگونئے

جوہر است انسان و چرخ او را عرض — جملہ فرع و سایہ اند و تو غرض

علم جوئی از کتب ہائے فسوس — ذوق جوش تو ز حلوائے سبوس

خدمتت بر جملہ ہستی مفترض — جوہرے چون عجز دارد با عرض[5]

یہی نہیں بلکہ انسان مظہرِ صفاتِ الٰہی ہے، وہی ایک ایسا آئینہ ہے جس میں تجلیات و آیات کا عکس نظر آتا ہے۔

---

[1] مثنوی ص۴۹۵ [2] ایضاً ص۴۷۵ [3] ایضاً ص۵۹۴ [4] ایضاً ص۴۷۵ [5] ایضاً۔

آدم اصطرلابِ اوصافِ علوست ۔۔۔ وصفِ آدم مظہرِ آیاتِ اوست
ہر چہ در وے می نماید عکسِ اوست ۔۔۔ ہمچو عکسِ ماہ اندر آبِ جوست
خلق را چوں آب دان صاف و زلال ۔۔۔ وندرو تابان صفاتِ ذوالجلال
علمِ شان و عدلِ شان و لطفِ شان ۔۔۔ چوں ستارہ چرخ در آبِ رواں[1]

اس سب کے فرمانے کے بعد وہ محسوس کرتے ہیں کہ انسان کی تعریف اور اس کی قدر و قیمت کا بیان اب بھی مکمل نہیں، اور سچ پوچھئے تو کسی میں اس کے سننے کی تاب بھی نہیں۔

گر بگویم قیمت آں ممتنع ۔۔۔ من بسوزم، ہم بسوزد مستمع[2]

اس رفعت و بلندی کے بعد خدا کے سوا انسان کا کون خریدار ہو سکتا ہے، اور کون اس کی قیمت لگا سکتا ہے، حیف ہے کہ انسان خود اپنی قیمت نہ جانے اور ہر قیمت پر ہر ایک کے ہاتھ بک جانے کے لئے تیار ہو، وہ بڑی دل سوزی سے فرماتے ہیں۔

اے غلامت عقل و تدبیرات و ہوش ۔۔۔ تو چرائی خویش را ارزاں فروش[3]

پھر فرماتے ہیں کہ انسان کا سودا ہو چکا ہے، اللہ اس کا خریدار ہے، اور وہی انسان کا سچا قدردان ہے

مشتریٔ ماست اللہ اشتریٰ ۔۔۔ از غمِ ہر مشتری ہین بر تر آ
مشتریٔ جو کہ جویانِ تو است ۔۔۔ عالمِ آغاز و پایانِ تو است[4]

لیکن یہ سب ان انسانوں کا تذکرہ ہے، جو جوہرِ انسانیت سے آراستہ اور حقیقتِ انسانیت سے آشنا ہیں، ان انسان نما آدمیوں کا ذکر نہیں، جو انسانیت کا خول اور صورت ہی صورت ہیں، جو اپنے نفس کے مارے ہوئے اور خواہشاتِ نفس کے قتیل ہیں، یہ آدمی نہیں ہیں، آدمی کی بے جان تصویریں ہیں۔

ایں نہ مردانند اینہا صورت اند ۔۔۔ مردۂ نان اند و کشتہ شہوت اند[5]

---

[1] مثنوی ص ۲۰۵ [2] ایضاً ص ۵۱۵ [3] ایضاً ص ۴۷۵ [4] ایضاً ص ۴۲۶ [5] ایضاً ص ۴۵۹

ہر زمانہ کی طرح مولانا کے زمانہ میں بھی یہ حقیقی انسان کمیاب اور عنقا صفت تھا، عام طور سے وہی انسان ملتے تھے، جو چوپایوں اور درندوں کے اخلاق رکھتے تھے، مولانا ان بہائم صفت اور درندہ خصلت انسانوں سے اُکتا گئے تھے، اور ان کو "انسان" کی تلاش تھی، اپنی تلاش تھی، اپنی تلاش کا واقعہ ایک دلچسپ مکالمہ کی شکل میں بیان فرماتے ہیں۔

دی شیخ با چراغ ہمی گشت گرد شہر — کز دام و دد ملولم و انسانم آرزوست
زیں ہمرہانِ سست عناصر دلم گرفت — شیر خدا و رستم دستانم آرزوست
گفتم کہ یافت می نہ شود جستہ ایم ما — گفت آں کہ یافت می نشود آنم آرزوست[۱]

دعوتِ عمل

مولانا کا تصوف اور ان کی تلقین، تعطل، بے عملی اور رہبانیت کی مبلغ نہیں، وہ عمل، جد وجہد، کسب اور اجتماعی زندگی کے داعی اور مبلغ ہیں، رہبانیت اور ترکِ دنیا کو اسلام کی روح کے منافی اور تعلیماتِ نبوت کا مخالف سمجھتے ہیں، ان کے نزدیک اگر اجتماعی زندگی مطلوب نہ ہوتی تو جمعہ و جماعت اور امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کی تاکید کیوں ہوتی، فرماتے ہیں۔

مرغ گفتش خواجہ در خلوت مایست — دین احمدؐ را ترہب نیک نیست
از ترہب نہی فرمود آں رسولؐ — بدعتے چوں در گرفتی اے فضول
جمعہ شرط است وجماعت در نماز — امر معروف و ز منکر احتراز
درمیانِ امت مرحوم باش — سنتِ احمدؐ مہل محکوم باش[۲]

ان کے زمانہ میں توکل تعطل محض کا مرادف بن کر رہ گیا تھا، کسی قسم کی احتیاط وانتظام توکل

---

[۱] دیوان   [۲] ایضاً ص ۵۰۳

کے منافی سمجھا جاتا تھا، اور بری نظر سے دیکھا جاتا تھا، مولانا نے توکل کا شرعی مفہوم بیان کیا، اور کسب کی ترغیب دی، اور اس کی فضیلت بیان کی "اعقلها وتوکل علی اللہ"[1] کا مضمون حدیث بیان کرتے ہوئے ارشاد فرماتے ہیں:-

گفت پیغمبر بآواز بلند　　با توکل زانوے اشتر بہ بند

رمز الکاسب حبیب اللہ شنو　　از توکل در کسب کاہل مشو

رو توکل کن تو با کسب اے عمو　　جہد می کن، کسب می کن مو بمو

جہد کن جدّے نما تا وارہی　　ورتو از جہدش بمانی ابلہی[2]

انھوں نے کمزور جانوروں کی زبان سے توکل و تعطل کے وہ تمام دلائل نقل کر دیئے ہیں جو عام طور پر ضعیف الہمت اشخاص پیش کیا کرتے ہیں، یہ دلائل بڑے معقول اور وزنی معلوم ہوتے ہیں، پھر ان کا تفصیل سے جواب دیا ہے، شیر کا جواب مولانا کے اصلی خیالات کا آئینہ ہے۔

شیر کی زبان سے وہ فرماتے ہیں کہ انسانوں کو جو اعضا و جوارح اور جو صلاحیتیں اور طاقتیں دی گئی ہیں، ان سے خود ظاہر ہوتا ہے کہ اس سے کوشش اور جد و جہد مطلوب ہے، اگر کوئی شخص اپنے غلام کے ہاتھ میں کدال یا پھاوڑا دے دے تو اس کا صاف مطلب یہ ہے کہ اس سے وہ زمین کھودے، یا چٹان توڑے اس کے لئے زبان سے کہنے کی کچھ ضرورت نہیں، اسی طرح جب ہم کو ہاتھ پاؤں اور کام کرنے کی قدرت دی گئی ہے تو اس کا مقصد یہی ہو سکتا ہے کہ ہم اپنے ہاتھ پاؤں اور جسمانی قوت سے کام لیں، اور اپنے ارادہ و اختیار کو عمل میں لائیں، اس بنا پر سعی و عمل اور کسب و جہد عین خدا کی مرضی اور فطرت کا اشارہ ہے، اور تعطل اور ترک عمل منشائے الٰہی کے خلاف اور کفران نعمت ہے، صحیح توکل یہ ہے کہ کوشش میں کمی نہ کی جائے اور نتیجہ کے بارے میں خدا پر بھروسہ کیا جائے کیونکہ کامیابی خدا کے ہاتھ میں ہے، فرماتے ہیں:-

[1] اونٹنی باندھ دو پھر اللہ پر توکل کرو　[2] ص ۲۶

گفت شیر آری ولے رب العباد — نردبانے پیش پائے ما نہاد
پایہ پایہ رفت باید سوئے بام — ہست جبری بودن اینجا طمع خام
پائے داری چوں کنی خود را تو لنگ — دست داری چوں کنی پنہاں تو چنگ
خواجہ چوں بیلے بدست بندہ داد — بے زبان معلوم شد او را مراد
چوں اشارتہاش را بر جان نہی — در وفائے آں اشارت جان دہی
پس اشارتہاش اسرارت دہد — بار بردارد ز تو کارت دہد
سعی شکر نعمت قدرت بود — جبر تو انکار آں نعمت بود
شکر نعمت نعمتت افزوں کند — کفر نعمت از کفت بیروں کند
ہاں مخسپ اے جبری بے اعتبار — جز بزیر آں درختِ میوہ دار
تا کہ شاخ افشاں کند ہر لحظہ باد — بر سر خفتہ بریزد نقل و زاد
گر توکل می کنی در کار کن — کسب کن پس تکیہ بر جبار کن[1]

پھر شیر کی زبان سے وہ اس حقیقت کا اظہار کرتے ہیں کہ جد و جہد اور سعی و عمل سنت انبیاء اور طریق اولیاء ہے، پھر وہ یہ نکتہ بیان کرتے ہیں کہ مال و اولاد دنیا نہیں ہے جس کی شریعت میں مذمت ہے، اور جو خدا کی رحمت سے دور ہے وہ غفلت کی زندگی ہے، وہ فرماتے ہیں:۔

شیر گفت آرے ولیکن ہم ببیں — جہدہائے انبیاء و مرسلیں
حق تعالیٰ جہد شاں را راست کرد — آنچہ دیدند از جفا و گرم و سرد
جہد می کن تا توانی اے کیا — در طریق انبیاء و اولیاء
چیست دنیا از خدا غافل بدن — نے قماش و نقرہ و فرزند و زن

---

[1] دیوان ص ۲۷

مال راگر بہرِ دین باشی حمول   نعم مالُ صالحٌ گفت آں رسولؐ

جہد حق است و دوا حق است و درد   منکر اندر نفی جہدش جہد کرد[1]

وہ صرف اپنے زمانہ کے عوام ہی پر تنقید نہیں کرتے، اور صرف ان غلطیوں ہی پر نہیں ٹوکتے، جن کا تعلق علمی اور دینی حلقوں سے ہے، بلکہ وہ پوری جرأت کے ساتھ اس طبقہ کی بھی تنقید کرتے ہیں، جن کے ہاتھ میں زمامِ حکومت تھی، وہ برملا اس حقیقت کا اظہار کرتے ہیں کہ حکومت نااہلوں کے ہاتھ میں آگئی ہے اور بازیچۂ اطفال بن گئی ہے، مطلق العنان شخصی سلطنت کے زمانہ میں یہ تنقید بڑے خطرناک نتائج پیدا کر سکتی ہے، مگر مولانا کی حق گو زبان خاموش نہیں رہتی، وہ فرماتے ہیں:-

حکم چوں بر دست زنداں اوفتاد   لاجرم ذوالنون بزنداں اوفتاد

چوں قلم در دست غدارے بود   لاجرم منصور بردارے بود

چوں سفیہاں را بود کارو کیا   لازم آمد یَقْتُلُوْنَ الْاَنْبِیَاءَ[2]

حکومت کے غلط ہاتھوں میں ہونے کا نتیجہ بیان کرتے ہوئے اپنے زمانہ کی شکایت فرماتے ہیں:-

حکم چوں در دستِ گمراہے بود   جاہ پندارید و در چاہے فتاد

احمقاں سرور شدستند و زبیم   عاقلاں سرہا کشیدہ در گلیم[3]

عقائد و علمِ کلام

مولانا نے عقلیات و حسیات پر صرف تنقید اور اپنے زمانہ کے علم کلام کی بے اعتدالی، ظاہر پرستی اور لفظی معرکہ آرائی پر گرفت ہی نہیں کی، اور صرف باطنی احساسات و وجدان اور روح سے کام لینے اور عشق کی دعوت دینے پر اکتفا نہیں کیا، بلکہ کلامی مسائل و مشکلات کو اپنے مخصوص انداز سے حل کرنے

[1] دیوان ص ۳۸ [2] ایضاً ص ۱۳۱ [3] ایضاً ص ۳۲۵

اور اپنے مخصوص پیرایہ میں بیان کرنے اور دل نشیں کرنے کی کوشش بھی کی ہے گویا مولانا کی دعوت اور ان کا فلسفہ صرف سلبی اور ناقدانہ ہی نہیں ہے، بلکہ ایجابی اور معلمانہ بھی ہے، جن مسائل کے حل کرنے میں علم کلام کے بازو شل ہو کر رہ گئے ہیں، اور جن گتھیوں کے سلجھانے کی کوشش میں اور بے شمار گتھیاں پڑ گئی ہیں، مولانا ان مسائل کو اس طرح بیان کر جاتے ہیں کہ گویا ان میں کوئی پیچیدگی ہی نہیں تھی، اور وہ بدیہی حقائق اور روزمرہ کی زندگی کی باتیں اور واقعات ہیں، مولانا کا خاص طرز یہ ہے کہ وہ دماغ کو شکست دینے کی اور مخاطب کو لاجواب کرنے کی کوشش نہیں کرتے، بلکہ اپنی بات کو اس کی خوشی اور رضامندی سے دل میں بٹھانے اور ذہن میں اتارنے کی کوشش کرتے ہیں، اور مخاطب کو یہ محسوس ہونے لگتا ہے کہ یہ بات پہلے سے اس کے دل میں تھی، اور مولانا نے اس کی ترجمانی کی ہے، اس طرز کلام کا نتیجہ یہ ہے کہ مثنوی سے دینی اصول و عقائد اور متکلمانہ مسائل و مباحث کے بارہ میں ایسا اذعان، شرح صدر اور اطمینانِ قلب پیدا ہوتا ہے، جو علمِ کلام کے پورے کتب خانہ سے نہیں پیدا ہوتا اس کے ساتھ ساتھ ایک ذوق و سرور بھی پیدا ہوتا ہے، جو ایک صاحبِ یقین اور صاحبِ عشق ہی کے کلام سے پیدا ہو سکتا ہے۔

مولانا اگرچہ اشعری مکتبِ خیال کے ایک کہنہ مشق استاد اور متبحر عالم ہیں، مگر وہ اپنے ذاتی تجربہ اور موہبتِ ربانی سے عقائد و کلام میں مجتہد کا درجہ رکھتے ہیں، اور ایک نئے علم کلام کے بانی ہیں، ان کی روش عام متکلمین اور علمائے عقائد سے بالکل علیحدہ ہے، اور یقیناً قرآن مجید کے طرز استدلال اور فطرتِ سلیم سے زیادہ قریب ہے۔

وجود باری

وجود باری کا مسئلہ علمِ کلام اور تمام مذاہب کا معرکۃ الآرا اور بنیادی مسئلہ ہے، قدیم علم کلام نے اس کے جو دلائل دیئے ہیں، وہ محض منطقی ہیں، ان سے اذعان اور یقین کی کیفیت پیدا نہیں ہوتی، زیادہ سے

زیادہ آدمی لاجواب ہو کر رہ جاتا ہے، قرآن مجید کا طرز یہ ہے کہ وہ اس بارہ میں انسان کی فطرت سلیم کو اکساتا ہے، اور اس پر اظہار اعتماد کر کے اس کے سوئے ہوئے احساس کو بیدار کر دیتا ہے، وہ پیغمبر کی زبان سے بے ساختہ کہلواتا ہے۔

اَفِی اللّٰہِ شَکٌّ فَاطِرِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ۔	بھلا اللہ کے بارہ میں بھی شک ہو سکتا ہے، جو آسمان و
(ابراہیم - ۱۰)	زمین کا پیدا کرنے والا ہے۔

اس بیساختگی اور استعجاب سے انسان کی فطرت چونک پڑتی ہے، اور وہ اپنا صحیح کام کرنے لگتی ہے، پھر زمین و آسمان کی پیدائش سے پیدا کرنے والے، مصنوعات سے صانع اور آثار سے موثر کی طرف دفعۃً رہبری ہو جاتی ہے، سارے قرآن مجید میں یہی طرز استدلال ملے گا کہ اللہ کی نشانیاں دیکھو، اور مخلوقات سے خالق، اور مصنوعات سے صانع تک پہنچو، قرآن کے نزدیک خدا کی معرفت کا یہی یقینی، مختصر اور بے خطر راستہ ہے۔

سَنُرِیْهِمْ اٰیٰتِنَا فِی الْاٰفَاقِ وَفِیْٓ اَنْفُسِهِمْ	اب ہم دکھلائیں گے ان کو اپنے نمونے دنیا میں
حَتّٰی یَتَبَیَّنَ لَهُمْ اَنَّهُ الْحَقُّ اَوَلَمْ یَكْفِ	اور خود ان کی جانوں میں یہاں تک کہ کھل جائے
بِرَبِّكَ اَنَّهٗ عَلٰى كُلِّ شَیْءٍ شَهِیْدٌ ۝	ان پر کہ یہ ٹھیک ہے، کیا تیرا رب تھوڑا ہے ہر چیز
(حٰمٓ السجدہ ۵۳)	پر گواہ ہونے کے لئے۔

مولانا نے بھی مثنوی میں یہی طرز استدلال اختیار کیا ہے، وہ جابجا کائنات سے خالق کائنات کے وجود پر استدلال کرتے ہیں، وہ کہتے ہیں کہ دنیا میں بہت کچھ ہوتا ہوا نظر آتا ہے، لیکن کرنے والا ان ظاہری آنکھوں سے نظر نہیں آتا، مگر جو کچھ ہو رہا ہے، یہ خود اس کی دلیل ہے کہ اس پردہ کے پیچھے کوئی کرنے والا ہے، لیکن فعل ظاہر اور فاعل مخفی ہے۔

دست پنہان و قلم بین خط گزار　　　اسپ در جولان و ناپیدا سوار

تیر پیدا بیں و ناپیدا کماں — جانہا پیدا و پنہاں جانِ جاں[1]

لیکن حرکت خود محرک کے وجود کی دلیل ہے، اگر کہیں ہوا کی سنسناہٹ ہے تو سمجھ لو کہ ہوا کا چلانے والا بھی ہے۔

باد را دیدی کہ می جنبد بدان — بادِ جنبا نیست اینجا بادران
پس یقین در عقل ہر دانندہ ہست — ایں کہ با جنبیدہ جنبانندہ ہست[2]

اگر تمھیں موثر نظر نہیں آتا تو آثار تو نظر آتے ہیں، ان آثار سے سمجھ لو کہ موثر ضرور ہے، جسم میں حرکت و زندگی روح سے ہے، روح اگرچہ نظر نہیں آتی، مگر جسم کی حرکت اس کا ثبوت ہے۔

گر تو او را می نہ بینی در نظر — فہم کن آں را باظہارِ اثر
تن بجان جنبد نمی بینی تو جان — لیک از جنبیدنِ تن جان بداں[3]

موثر کے لئے اس کے آثار اور صانع کے لئے اس کے مصنوعات سے بڑھ کر اور کیا دلیل ہو سکتی ہے؟ آفتاب کے وجود کے لئے اس کی روشنی سے بڑھ کر اور کیا دلیل ہے؟

خود نباشد آفتابے را دلیل — جز کہ نورِ آفتابِ مستطیل[4]

پھر کائنات صرف موجود ہی نہیں ہے، بلکہ منظم، باقاعدہ اور مرتب ہے، ہر چیز اپنے چوکھٹے میں جڑی ہوئی ہے، سیاروں کی گردش کا ایک نظام ہے، آفتاب و ماہتاب کے لئے بھی اصول و ضوابط ہیں، ابر و باد بھی بے زنجیر نہیں کہ جدھر کو چاہیں، اُدھر کو چل دیں، ان کے لئے بھی تازیانہ مقرر ہے، اگر ذرا سرتابی کریں، فوراً گوشمالی کی جائے، یہ نظام و ترتیب صاف اس بات کا ثبوت ہے کہ کائنات کے اوپر کائنات کا خالق اور مدبر ہے، اور وہ حکیم و علیم بھی ہے، اور کائنات اس کے اختیار و انتظام سے کسی وقت خارج نہیں۔

---

[1] مثنوی ص ۳۰۵ [2] ایضاً [3] ایضاً [4] ایضاً

گرمی بینی تو تدبیر قدر — در عناصر، گردش و جوشش نگر
آفتاب وماہ دوگاؤ خراس — گردمی گردند و می دارند پاس
اختران ہم خانہ خانہ می روند — مرکب ہر نحس و سعدے می شوند
ابر راہم تازیانہ آتشیں — می زند کہ ہاں چنیں رو نے چنیں
برفلان وادی ببار ایں سو مبار — گوشمالش می دہد کہ گوش دار[1]

پھر وہ فرماتے ہیں کہ اس کائنات کو خالق کائنات نے اپنے فائدہ کے لئے نہیں پیدا کیا، بلکہ انسان کے فائدہ اور اس کی ترقیات کے لئے پیدا کیا ہے' اس طرح وہ خلق عالم کی مصلحت کو جس میں فلاسفہ و متکلمین سرگرداں ہیں' بڑے دل نشین پیرایہ میں بیان کرتے ہیں' اس میں بھی ان کا البیلا پن اور سرور و مستی موجود ہے۔

گفت پیغمبرؐ کہ حق فرمودہ ست — قصد من از خلق احسان بودہ ست
آفریدم تا زمن سودے کنند — تا ز شہدم دست آلودے کنند
نے برائے آں کہ من سودے کنم — در برہنہ من قبائے برکنم[2]
من نہ کردم خلق تا سودے کنم — بلکہ تا بر بندگاں جودے کنم

نبوت اور انبیاء

انبیاء علیہم السلام کا تعارف وہ خود ان کی زبان سے کراتے ہیں' اور بتلاتے ہیں کہ وہ طبیبانِ الٰہی اور معالجینِ قلوب ہیں' طبیب نبض سے دل تک پہونچتے ہیں' انبیاء براہ راست دل تک پہونچ جاتے ہیں' طبیبوں نے صحت جسمانی کے بقاء' اور انبیاء نے دلوں کی شفا اور اخلاق و اعمال کی اصلاح اور اعتدال پر توجہ دی ہے'

ما طبیبانیم شاگردانِ حق — بحر قلزم دید ما را فانفلق

[1] مثنوی ص ۵۱۳ [2] ایضاً ص ۱۵۹

آں طبیبانِ طبیعت دیگر اند | کہ بدل از نبضے بنگرند
ما بدل بیواسطہ خوش بنگریم | کز فراست ما بہ اعلیٰ منظریم
آں طبیبانِ غذا اند و ثمار | جانِ حیوانی بدیشاں استوار
آں طبیبانِ فعالیم و مقال | ملہم ما پرتوِ نور جلال
کایں چنیں فعلے ترا نافع بود | واں چناں فعلے زرہ قاطع شود
ایں چنیں قولے ترا پیش آورد | واں چناں قولے ترا نیش آورد
آں چناں وایں چنان از نیک و بد | پیش تو بنیم و بنمائیم جد
آں طبیبانِ رابود بوے دلیل | ویں دلیل ما بود وحیِ جلیل[1]

دلائلِ نبوت میں بھی وہ عقلی دلائل و مقدمات سے استدلال کرنے کے بجائے عموماً ذوقی اور وجدانی دلائل سے استدلال کرتے ہیں، وہ کہتے ہیں کہ پیغمبر کی ہر ادا بتلاتی ہے کہ وہ پیغمبر ہے، وہ سرتاپا اعجاز ہوتا ہے دیکھنے والوں کے لئے (بشرطیکہ ان میں عناد اور تکبّر نہ ہو) وہ خود اپنی نبوت کا دلیل ہوتا ہے، یہی وہ چیز ہے کہ عبداللہ بن سلام رضؓ نے جمال جہان آرا پر نظر پڑتے ہی بے ساختہ فرمایا تھا:۔

وَاللّٰہِ ھٰذا لیس بوجہِ کذّاب | بخدا یہ کسی دروغ گو کا چہرہ نہیں ہوسکتا۔
در دلِ ہر کس کہ دانش را مزہ است | روئے آواز پیمبر معجزہ است

وہ فرماتے ہیں کہ پیغمبر اور امت کے ضمیر میں ایک ایسی مناسبت ہوتی ہے کہ پیغمبر جو کچھ کہتا ہے، امت کا ضمیر اس پر آمنّا و صدّقنا ہی پکارتا ہے، امت کا ضمیر پیغمبر کی ہر صدا پر وجد کرتا ہے، اس لئے کہ وہ صدا ایسی دلکش، ایسی معصوم اور دنیا میں ایسی انوکھی اور نرالی ہے کہ اس میں اور کسی صدا اور دعوت میں کوئی مناسبت اور کسی اشتباہ کا موقع نہیں، فرماتے ہیں:۔

[1] مثنوی صفحہ ۲۵

چوں پیمبر از بروں بانگے زند — جانِ امت در درون سجدہ کند
زانکہ جنس بانگِ او اندر جہان — از کسے نشنیدہ باشد گوشِ جان
آن غریب از ذوق آوازِ غریب — از زبانِ حق شنود انّی قریب[1]

وہ کہتے ہیں کہ سننے والوں کو پیغمبر کی صداقت کے لئے کسی خارجی دلیل کی ضرورت نہیں، ان کا کہنا دعویٰ بھی ہے، اور دلیل بھی، اور نظامِ عالم اسی پر قائم ہے، پیاسے کو (بشرطیکہ سچی پیاس ہو) پانی کی دعوت دی جاتی ہے تو وہ پانی کا ثبوت نہیں مانگتا، بچہ کو ماں دودھ پلانا چاہتی ہے تو وہ دلیل کا انتظار نہیں کرتا، طلب اور محبت اعتماد اور پیش قدمی کے لئے کافی ہے۔

تشنہ را چوں بگوئی تو شتاب — در قدح آب است بستان زود آب
ہیچ گوید تشنہ کیں دعویٰ است رد — از برم اے مدعی! مہجور شو
یا طفل شیر مادر بانگ زد — کہ بیا من مادرم ہاں اے ولد
طفل گوید مادرا حجت بیار — تاکہ باشیرت بگیرم من قرار[2]

ان کے نزدیک معجزہ موجبِ ایمان نہیں ہے، یعنی ضروری نہیں کہ معجزہ دیکھنے والا ایمان لے ہی آئے، اور واقعہ بھی یہی ہے کہ معجزہ دیکھ کر ایمان لانے والوں کے نام سیرت میں مشکل سے ملیں گے، مشاہیر صحابہ وہی ہیں جو خود حضور صلے اللہ علیہ وسلم کو دیکھ کر ایمان لائے تھے، اور اصل ایمان ان ہی کا ہے، مولانا فرماتے ہیں کہ معجزات تو مغلوب اور لاجواب کرنے کے لئے ہیں، اور جو مغلوب ولاجواب ہوتا ہے، وہ مشکل سے یارِ غار اور جان نثار بنتا ہے، اصل کشش اور تسخیر کی چیز جنسیت اور مناسبت ہے۔

موجبِ ایمان نباشد معجزات — بوئے جنسیت کند جذبِ صفات

---

[1] مثنوی صفحہ ۱۸ [2] ایضاً

معجزات از بہر قہر دشمن است　　بوئے جنسیت سوے دل بردن است

قہر گردد، دشمن، اما دوست نے　　دوست کے گردد بہ بستہ گردنے[1]

انبیاء کے تذکرہ میں وہ فرماتے ہیں کہ وہ بڑے غیور اور خوددار ہوتے ہیں، ان سے استفادہ کے لئے ادب اور نیازمندی شرط ہے، وہ سلطان مزاج[2] ہیں، ان کا منصب یہ ہے کہ وہ فرمائیں اور دوسرے سنیں، معارضہ اور مجادلہ محرومی کا باعث اور حجاب اکبر ہے۔

گر ہزاراں طالب اند و یک ملول　　از رسالت بازی ماند رسول

ایں رسولانِ ضمیر راز گو　　مستمع خواہند، اسرافیل خو

نخوتے دارند و کبرے چون شہان　　چاکری خواہند از اہل جہان

تا ادبہا شان بجا گہ ناوری　　از رسالت شان چگونہ برخوری[3]

فرماتے ہیں کہ اور ایسا کیوں نہ ہو یہ بھی تو دیکھو کہ وہ کہاں سے آئے ہیں، اور کس کا پیام لائے ہیں۔

ہر ادب شان کے ہمی آید پسند　　کامد ایشان زایوان بلند[4]

معاد

مولانا کے نزدیک موت حقیقی زندگی کا پیش خیمہ اور انسان کی ترقی کا زینہ ہے، آبادی ویرانی کے بغیر ممکن نہیں، خزانہ جب ہی دستیاب ہوتا ہے، جب زمین کھودی جاتی ہے، جب بنے ہوئے مکان کو ویران کیا جا رہا ہو تو سمجھ لو کہ دوبارہ آباد کرنے کا سامان کیا جا رہا ہے۔

شاہ جان جسم را ویران کند　　بعد ویرانیش آبادان کند

کرد ویران خانہ بہر گنج و زر　　وز ہمان گنجش کند معمور تر[5]

---

[1] مثنوی ص۵۱۹ [2] شاہ طبیعت [3] مثنوی ص۲۷۱ [4] ایضاً [5] ایضاً ص۱۲

اس جسم خاکی کی شکست ایک بڑی تعمیر کی علامت ہے، کلی کے چٹکنے سے سمجھ لینا چاہیے کہ پھل آنے والے ہیں۔

چون شگوفہ ریخت میوہ سر کند　　　چونکہ تن بشکست جان سر بر کند[1]

وہ جواد مطلق، وہ فیاض برحق، جان جیسی دولت دے کر کیسے بالکل چھین لے گا، اس لئے سمجھنا چاہیے کہ وہ زار و نزار جان لے کر زندگی جاوداں عطا فرمانا چاہتا ہے، وہ اس خاکدان سے نکال کر وہ نعمتیں عطا فرمانا چاہتا ہے، جو وہم و خیال میں بھی نہیں "مَالَا عَینٌ رَأَت وَلَا اُذُنٌ سَمِعَت، وَلَا خَطَرَ عَلٰی قَلبِ بَشَرٍ"

آں کسے را کش چنیں شاہے کشد　　　سوئے تخت و بہترین جاہے کشد

نیم جان بستاند و صد جان دہد　　　انچہ در وہمت نیاید آن دہد[2]

ترقی کے مدارج عالیہ کے لئے فنا اور نیستی ضروری ہے، کبھی کسی نے اگلی تختی دھوئے اور پرانے نقش مٹائے بغیر تختی لکھی ہے؟ کبھی مٹی نکالے بغیر زمین کے اندر سے پانی نکلا ہے؟ لکھنے کے لئے آدمی سادہ کاغذ اور بونے کے لئے آدمی خالی زمین ڈھونڈتا ہے۔

لوح را اول بشوید بے وقوف　　　آنگہے بروے نویسد او حروف

وقتِ شستن لوح را باید شناخت　　　کہ مر آں را دفترے خواہند ساخت

چون اساسِ خانۂ تو افگنند　　　اولین بنیاد را برمی کنند

گل برآرند اول از قعر زمین　　　تا بآخر برکشی ماءِ معین[3]

کاغذے جوید کہ آں بنوشتہ نیست　　　تخم کارد موضعے کہ کشتہ نیست

نیستی ہی ہستی کا استحقاق پیدا کرتی ہے، اور خالق کی رحمت کو جوش میں لاتی ہے، منعم

---

[1] مثنوی ص۲۴۳　[2] ایضاً ص۱۰　[3] ایضاً ص۱۳۱

ہمیشہ فقیروں ہی پر سخاوت کرتے ہیں۔

ہستی اندر نیستی بتواں نمود　　　مالداراں بر فقیر آرند جود

تم خود اپنی حالت پر غور کرو، تم برابر ارتقا کے منازل طے کرتے آئے ہو اور ٹوٹ پھوٹ کا سلسلہ برابر جاری رہا ہے، تم نے ایک جامۂ ہستی اتارا، دوسرا پہنا، ایک فنا سے تم نے بقا حاصل کیا، اگر تم پہلی حالت پر رہتے، تو تم کو یہ ترقی و کمال کہاں سے حاصل ہوتا، اور تم آب و گل میں مقید رہتے، اب آخری ترقی سے کیوں گھبراتے ہو، اور تمہارا طائرِ روح قفسِ عنصری سے نکلتے ہوئے کیوں ڈرتا ہے۔

تو ازاں روزے کہ در ہست آمدی　　　آتشے یا خاک یا بادے بُدی

گر بداں حالت ترا بودے بقا　　　کہ رسیدے مر ترا ایں ارتقا

از مبدّل ہستی اول نماند　　　ہستیٔ دیگر بجائے اُو فشاند[1]

ایں بقاہا از فناہا یافتی　　　از فنایش رو چرا بر تافتی

ایں فناہا چہ زیاں بودت کہ تا　　　بر بقا چفسیدۂ اے بے نوا[2]

اس لئے دراصل موت، موت نہیں زندگی کی تمہید ہے، اور مرنے کا دن مومن کے لئے شامِ غم نہیں صبحِ عید ہے۔

آزمودم مرگِ من در زندگی است　　　چون رہم زیں زندگی پایندگی است[3]

عارفوں کی موت کو عامیوں کی موت پر قیاس نہیں کرنا چاہئے، ان کو اس جہانِ فانی سے چھوٹنے کا غم نہیں ہوتا، موت ان کے لئے مژدۂ جانفزا، اور موت کا جھونکا ان کے حق میں بادِ بہاری بن کر آتا ہے، قومِ عاد پر جو ہوا چلائی گئی تھی، وہ حضرت ہودؑ اور ان کے ساتھیوں کے لئے نسیم بن گئی تھی۔

ہودؑ گرد مومناں خطے کشید　　　نرم می شد باد کانجا می رسید

---

[1] مثنوی ص۳۱۰　[2] ایضاً　[3] ایضاً ص۲۷۶

ہمچنیں بادِ اجل با عارفان　　　نرم و خوش ہمچو نسیمِ بوستان[1]

جبر و اختیار

جبر و اختیار کی بحث علمِ کلام کی مشکل ترین بحثوں میں سے ہے، ایک فرقہ اختیار کا منکر اور جبرِ محض کا قائل ہے، اور عقائد و فرق کی تاریخ میں جبریہ کے لقب سے مشہور ہے، مولانا فرماتے ہیں کہ اگر انسان مجبورِ محض ہوتا، تو وہ خدا کی طرف سے امر و نہی کا مخاطب کیوں بنتا، اور شریعت کے احکام اس کی طرف کیوں متوجہ ہوتے، کیا کسی نے کسی پتھر کو بھی حکم دیتے سنا ہے۔

جبر لش گوید کہ امر و نہی راست　　　اختیارے نیست دین جملہ خطا است

جملہ قرآن امر و نہی است و وعید　　　امر کردن سنگ مرمر را کہ دید[2]

فرماتے ہیں کہ اختیار کا عقیدہ انسان کی فطرت میں داخل ہے، اور وہ روزمرہ کی زندگی میں اس عقیدہ کا اقرار اور جبر کا انکار کرتا رہتا ہے، کسی پر چھت کی لکڑی گر جاتی ہے، تو اس کو چھت پر غصہ نہیں آتا، سیلاب سامان بہالے جاتا ہے، تو کسی کو اس پر غصہ اتارتے نہیں دیکھا گیا، ہوا کسی کی پگڑی اڑا لے جاتی ہے، تو کوئی ہوا سے نہیں لڑتا، سب جانتے ہیں کہ یہ مجبور و بے قصور ہیں، البتہ انسان کے ساتھ انسان کا یہ معاملہ نہیں، گویا صرف وہی صاحبِ اختیار ہے۔

گر ز سقفِ خانہ چوبے بشکند　　　بر تو افتد سخت مجروحت کند

ہیچ خشمے آیدت بر چوبِ سقف　　　ہیچ اندر کینِ او باشی تو وقف

کہ چرا بر من زد و دستم شکست　　　یا چرا بر من فتاد و کرد پست

واں کہ قصدِ عورت تو می کند　　　صد ہزاراں خشم از تو سر زند

---

[1] ایضاً ص ۲۵　[2] ایضاً ص ۳۶۱-۳۶۲

در بیاید سیل رخت تو برد | ہیچ با سیل آورد گیتی خرد
گر بیاید باد و دستار ت ربود | کے ترا با باد، دل خشمے نمود
خشم در تو شد بیانِ اختیار | تا نہ گوئی جبریانہ اعتذار[1]

وہ ایک قدم آگے بڑھا کر فرماتے ہیں کہ جانور تک جبر و قدر کے مسئلہ سے فطری طور پر واقف ہیں، اور سمجھتے ہیں کہ آلات و جمادات کا کچھ قصور نہیں، کتے کو کبھی اگر پتھر مارا جائے تو وہ پتھر پر نہیں لپکتا، بلکہ انسان کے پیچھے دوڑتا ہے، شتربان اونٹ کو مارتا ہے تو اونٹ کو لکڑی پر غصہ نہیں آتا، شتربان سے انتقام لینا چاہتا ہے، جب حیوان تک اس حقیقت سے واقف ہیں، تو انسان کو جبری بننے سے شرم آنی چاہئے۔

ہمچنیں گر بر سگے سنگے زنی | بر تو آرد رود گردد منثنی
گر شتربان اشترے رامی زند | آں شتر قصدِ زنندہ می کند
خشمِ اشتر نیست با آں چوبِ او | پس ز مختاری، شتر بردہ است بو
عقلِ حیوانی چو دانست اختیار | ایں مگو اے عقلِ انسان شرم دار
روشن است ایں لیک از طمعِ سحور | آں خورندہ چشم بربندد ز نور
چونکہ کلی میل آں نان خور دنیست | رو بہ تاریکی کند کہ روز نیست[2]

علت و معلول

اسباب و علل کے بارہ میں اسلامی فرقوں میں بڑی افراط و تفریط تھی، حکماء کے نزدیک کائنات میں علت و معلول کا سلسلہ قائم ہے، اور معلول کبھی علت، مسبب کبھی سبب سے متخلف نہیں ہو سکتا، معتزلہ بھی اس رائے سے بڑی حد تک متاثر ہیں، ان کا بھی رجحان یہی ہے کہ جو چیز جس کی علت مان لی گئی، جس شئی کا

[1] مثنوی ص ۴۶۳ [2] ایضاً

جو خاصہ اور اثر تسلیم کرلیا گیا، اس میں تغیر و انقلاب کا بہت کم امکان ہے' اس کا نتیجہ یہ ہے کہ وہ بڑی مشکل سے خرق عادت کا وجود تسلیم کرتے ہیں' اور کسی شئی کے اپنے خاصہ کے خلاف وقوع پذیر ہوتے اور کسی حادثہ کے بغیر سبب کے وجود میں آنے کو بہت بعید سمجھتے ہیں' اشاعرہ دوسرے سرے پر ہیں' ان کے نزدیک کوئی چیز کسی چیز کی علت نہیں' نہ کسی شئی میں کوئی خاصہ اور تاثیر ہے' اس بے اعتدالی اور انتہا پسندی سے بھی نقصان پہنچا، اور ہر شخص کو ہر بات کہنے اور اسباب کے انکار و ترک کا بہانہ مل گیا، اور اس سے ایک بے نظمی اور تعطل پیدا ہوا۔

مولانا کا مسلک ان دونوں سروں کے درمیان ہے' وہ اعتراف کرتے ہیں کہ اسباب کی ایک حقیقت ہے' اور علل و معلومات' اسباب و مسبّبات کا ایک سلسلہ ہے جس کا انکار نہ ممکن ہے' نہ معقول' عام سنۃ اللہ یہی ہے کہ مسبّبات اسباب کے تابع ہوں' اور اشیاء سے ان کے خواص برآمد ہوں، البتہ خرقِ عادت ممکن ہے' اور کبھی کبھی اس کا وقوع ہوتا ہے' فرماتے ہیں :۔

بیشتر احوال بر سنت رود گاہ قدرت خارقِ سنت شود

سنّت و عادت نہادہ بامزہ باز کردہ خرقِ عادت معجزہ

بے سبب گر عزّ بما موصول نیست قدرت از عزل سبب معزول نیست[1]

عام لوگ انہی اسباب کو دیکھتے ہیں' اور معذور ہیں کہ ان کو کچھ اور نظر نہیں آتا :۔

حاصل آنکہ در سبب پیچیدہ' لیک معذوری ہمیں را دیدہ'[2]

فرماتے ہیں کہ بیشک قطع اسباب مناسب نہیں' اسباب کی ایک حقیقت ہے' لیکن مسبب الاسباب اس سے بھی بالاتر حقیقت ہے' وہ مسبب الاسباب' رب الاسباب اور قادرِ مطلق ہے' اس طرح اسباب پرستی نہ کرنے لگو کہ قادرِ مطلق کو بالکل معزول و معطل سمجھنے لگو۔

---

[1] مثنوی ص۴۲۷ [2] ایضاً ص۲۶۱

اے گرفتارِ سبب بروں مپر — لیک عزل آں مسبب ظن مبر
ہرچہ خواہد آں مسبّب آورد — قدرتِ مطلق سببہا بردرد[1]

یہ بھی سمجھنا چاہیے کہ اسباب صرف وہی نہیں ہیں جو ہمارے علم اور مشاہدہ میں ہیں، بلکہ ان اسبابِ ظاہری سے اوپر کچھ اسباب اور ہیں، جو ہماری نظر سے اوجھل ہیں، یہ اسبابِ باطنی ان اسبابِ ظاہری کے لئے اس طرح سے سبب اور محرک ہیں، جس طرح یہ اسبابِ ظاہری مسبّبات ونتائج کے لئے، سببِ حقیقی اسبابِ ظاہری کو کبھی متحرک وعامل کر دیتا ہے، اور کبھی بیکار ومعطل کر کے رکھ دیتا ہے، سب سے اعلیٰ اور اصل سبب ارادۂ الٰہی اور امرِ الٰہی ہے:۔

سنگ برآہن زنی آتش جہد — ہم بامرِ حق قدم بیروں نہد
سنگ وآہن خود سبب آمد ولیک — تو بالاتر نگر اے مردِ نیک
کایں سبب راآں سبب آورد پیش — بے سبب کے شد سبب ہرگز بخویش
ایں سبب راآں سبب عامل کند — باز گاہے بے پرد عاطل کند[2]

ہم جس طرح ان اسبابِ ظاہری کو جانتے پہچانتے ہیں، انبیائے کرام ان اسبابِ حقیقی کو دیکھتے اور محسوس کرتے ہیں:۔

واں سبب ہا کانبیا را رہبر است — آں سببہا زیں سببہا برتر است
ایں سبب را محرم آمد عقلِ ما — واں سببہا راست محرم انبیا[3]

وہ اسبابِ حقیقی اسبابِ ظاہری کے حاکم اور اُن پر غالب ہیں:۔

ہست بر اسباب اسبابِ دگر — در سبب منگر دراں افگن نظر[4]

یہ اسبابِ ظاہری اسبابِ حقیقی کے سامنے بہت حقیر وضعیف ہیں، معاملہ حقیقی اسباب ہی سے وابستہ ہے،

---

[1] مثنوی ص۴۲۷ [2] ایضاً ص۲۵ [3] ایضاً [4] ایضاً ص۲۴۶

این سبب ہمچو مریض است و علیل — این سبب ہمچو چراغ است و فتیل
شب چراغت را فتیلے نو بتاب — پاک دان زینہا چراغ آفتاب[1]

انبیاء علیہم السلام کے زمانہ میں چونکہ ساری دنیا اسبابِ ظاہری میں الجھی ہوتی ہے اور اسباب پرستی اپنے پورے عروج پر ہوتی ہے، خالقِ اسباب اور اس کی قدرتِ مطلقہ بالکل نگاہوں سے اوجھل اور دماغوں سے محو ہو چکی ہوتی ہے اور عالم کا عالم شرک اور ظواہر و مظاہر پرستی میں گرفتار ہوتا ہے اس لئے انبیاء علیہم السلام اسباب پر ضرب لگاتے ہیں، اور اسباب کے بجائے مسبّب اور قادرِ مطلق کی طرف متوجہ کرتے ہیں، اللہ تعالیٰ بھی ان کے ہاتھوں سے سلسلۂ اسباب کے بالکل خلاف واقعات ظاہر کر کے اور معجزات دکھا کر اسباب کی بے حقیقتی اور کمزوری ظاہر کرتا ہے:۔

انبیاء در قطع اسباب آمدند — معجزاتِ خویش بر کیوان زدند
بے سبب بر بحر را بشگافتند — بے زراعت چاش گندم یافتند
ریگہا ہم آرد شد از سعیٔ شان — پشم بر ابریشم آمد کشکشان
جملہ قرآن است در قطعِ سبب — عزّ درویش و ہلاک بولہب[2]

لیکن اللہ تعالیٰ کی عمومی عادت اور سنتِ جاریہ اسباب سے مسببات کا وجود ہے، اور اس سے بندوں کو سعی و تعلیم مقصود ہے:۔

لیک اغلب بر سبب راند نفاذ — تا بداند طالبے جستن مراد[3]

اسی انداز پر مولانا ان تمام کلامی مسائل اور مذہب کے اصول و عقائد کی تشریح اور تلقین کرتے چلے جاتے ہیں، جن کو متکلمین و اشاعرہ کے مناظرانہ طرزِ استدلال اور فلاسفہ کی طلسم آرائی نے چیستان اور نہایت خشک اور محدود موضوعِ بحث بنا دیا تھا، مولانا نے ان مباحث و حقائق کو علم کلام اور فلسفہ

---

[1] مثنوی ص۱۳۱ [2] ایضاً ص۲۴۶ [3] ایضاً ص۴۲۷

کے تنگ کوچہ سے نکال کر عام فہم اور عقل سلیم کے وسیع آفاق میں لے جاکر بحث کی، اور دل نشین مثالوں، عام فہم نکتوں اور سادہ و موثر طرز بیان سے ان کو روزمرہ کی حقیقت اور زندگی کا واقعہ بنا دیا۔

مثنوی کا اثر

مثنوی نے عالم اسلام کے افکار و ادبیات پر بڑا گہرا اور دیرپا اثر ڈالا، اسلامی ادب میں ایسی شاذ و نادر کتابیں ملیں گی، جنھوں نے عالم اسلام کے اتنے وسیع حلقہ کو اتنی طویل مدت تک متاثر رکھا ہے، چھ صدیوں سے مسلسل دنیائے اسلام کے عقلی، علمی، ادبی حلقے، اس کے نغموں سے گونج رہے ہیں، اور وہ دماغ کو نئی روشنی اور دلوں کو نئی حرارت بخش رہی ہے، اس سے ہر دور میں شاعروں کو نئے مضامین، نئی زبان، نیا اسلوب ملتا رہا، اور وہ ان کے قوائے فکر اور ادبی صلاحیتوں کو ابھارتی رہی، معلمین و متکلمین کو اپنے زمانہ کے سوالات و شبہات کو حل کرنے کے لئے اس سے نئے نئے دلائل، دل نشین مثالیں، دلآویز حکایتیں، اور جواب کی نئی نئی راہیں ملتی رہیں، اور وہ اس کے سہارے اپنے زمانہ کی بے چین طبیعتوں اور ذہین نوجوانوں کو مطمئن کرتے رہے، اہل سلوک و معرفت کو اس سے عارفانہ مضامین، دقیق و عمیق علوم اور سب سے بڑھ کر محبت کا پیغام اور سوز و گداز اور جذب و مستی کا سامان ملتا رہا، اور وہ ان کی خلوتوں اور انجمنوں کو صدیوں تڑپاتی، اور گرماتی رہی، اس لئے ہر دور کے اہل محبت اور اہل معرفت نے اس کو شمع محفل اور ترجمان دل بنا کر رکھا۔

اس کے مضامین یکسر تنقید سے بالاتر اور ہر قسم کی لغزش اور خطا سے مبرا نہیں، بہت سے فاسد العقیدہ صوفیوں اور اہل ہوی نے اس سے کبھی کبھی غلط فائدہ بھی اٹھایا ہے، وحدت وجود کے قائلین کو اب بھی اس سے اپنے مسلک کے لئے دلائل و شواہد مل جاتے ہیں، وہ بہرحال ایک

انسان کا کلام ہے، جو معصوم نہ تھا، اور جس کے مضامین میں اس کے قلبی واردات اور خارجی "تاثرات" کو بھی دخل ہے، اس سب کے باوجود اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ وہ اپنے وقت کا ایک بڑا علمی کارنامہ اور اسلام کی عقلی برتری اور اس کی غیر فانی زندگی کا ثبوت ہے، اس نے عالمِ اسلام کے فکری تعطل، علمی و ادبی جمود، اور تقلیدی ادب و علمِ کلام پر کاری ضرب لگائی، اور اسلام کے کاروانِ فکر کو جو ساتویں صدی میں آمادۂ قیام اور مائل بہ آرام تھا، دوبارہ متحرک و سرگرمِ سفر کر دیا۔

اس کا ایک اہم کارنامہ یہ ہے کہ بیسویں صدی عیسوی میں جب عالم اسلام پر دوبارہ مادیت و حسیت کا حملہ ہوا، اور یورپ کے نئے فلسفہ اور سائنس نے قلوب میں شکوک و شبہات کی تخم ریزی کی، اور ایمانیات و غیبیات کی طرف سے ایک عام بے اعتمادی پیدا ہونے لگی، اس کا رجحان بڑھنے لگا کہ ہر وہ چیز جو مشاہدہ و تجربہ کے ماتحت نہ آسکے، اور حواس ظاہری اس کی گرفت نہ کر سکیں، وہ موجود نہیں، عقائد کی قدیم کتابوں اور قدیم طرزِ استدلال و علم کلام نے اس کا مقابلہ کرنے سے معذوری ظاہر کی تو مثنوی نے اس بڑھتے ہوئے سیلاب کا (جو یورپ کی مادی و سیاسی فتوحات سے کم خطرناک نہ تھا) کامیاب مقابلہ کیا، اور دلوں میں دوبارہ دینی و غیبی حقائق کی وقعت، علوم انبیاء کی عظمت، عالم غیب کی وسعت، اور قلب و روح، ایمان و وجدان کی اہمیت کا نقش قائم کر دیا، اور فلسفۂ و مادیت کے صدہا زخم خوردہ نوجوانوں اور فاضلوں کو جو الحاد وارتداد کے دروازہ پر کھڑے تھے، یا ایمان و اسلام کی سرحد عبور کر چکے تھے، دوبارہ ایمان و یقین کی دولت عطا کی، ہندوستان میں ان اہلِ علم کی ایک بڑی تعداد ہے، جو اس حقیقت کا صاف اعتراف کرتے ہیں کہ ان کو مثنوی کی بدولت دوبارہ دولتِ اسلام نصیب ہوئی، اور وہ اس کے فیض سے مسلمان اور صاحبِ ایمان ہیں، بیسویں صدی کے سب سے بڑے مسلمان فلسفی اور مفکر (ڈاکٹر سر محمد اقبال)

نے شیخ رومی کے فیض و ارشاد اور اپنے تلمذ و استرشاد کا جا بجا اعتراف کیا ہے، اور اس کا برملا اظہار کیا ہے کہ مثنوی نے ان کو ایک نئی روح اور ایک نیا جذبہ عطا کیا ایک جگہ فرماتے ہیں :۔

پیرِ رومی مرشدِ روشن ضمیر　　کاروانِ عشق و مستی را امیر
منزلش برتر ز ماہ و آفتاب　　خیمہ را از کہکشاں سازد طناب
نورِ قرآن درمیانِ سینہ اش　　جامِ جم شرمندہ از آئینہ اش
از نئے آں نے نواز پاک زاد　　باز شورے در نہادِ من فتاد[1]

دوسری جگہ فرماتے ہیں :۔

رومی آں عشق و محبت را دلیل　　تشنہ کامان را کلامش سلسبیل[2]

لیکن اس کے ساتھ وہ شکایت اور احتجاج کرتے ہیں کہ ایک طبقہ نے اپنی نظر اس کے الفاظ اور ظاہری مطالب میں محدود رکھی، اور اس کو جاں گدازی اور دل سوزی کے بجائے رقص و وجد کا ذریعہ بنایا۔

شرحِ او کردند و اورا کس ندید　　معنیٔ او چوں غزال از ما رمید
رقصِ تن از حرفِ او آموختند　　چشم را از رقصِ جاں بر دوختند[3]

لیکن یہ نقص ہمارا ہے، مثنوی کا نہیں، مثنوی اس دورِ انقلاب میں بھی رفیقِ راہ بن سکتی ہے، اس مادہ پرست دور کی سب سے زیادہ نایاب جنس سوز و گداز اور محبتِ پاک باز ہے :۔

دل سوز سے خالی ہے نگہ پاک نہیں ہے　　پھر اس میں عجب کیا کہ تو بیباک نہیں ہے
وہ آنکھ کہ ہے سرمۂ افرنگ سے روشن　　پرکار و سخن ساز ہے نمناک نہیں ہے[4]

یہ دولتِ بیدار مثنوی سے حاصل کی جا سکتی ہے، عصرِ حاضر کے نوجوانوں کو وصیت کرتے ہوئے

---

[1] مثنوی پس چہ باید کرد اے اقوامِ مشرق ص۱ [2] جاوید نامہ ص۲۴ [3] ایضاً ص۲۲ [4] بالِ جبریل۔

فرماتے ہیں:۔

پیرِ رومی را رفیقِ راہ ساز — تا خدا بخشد ترا سوز و گداز
زانکہ رومی مغز را داند ز پوست — پائے او محکم فتد در کوئے دوست[1]

---

[1] جاوید نامہ ص ۲۲۳

INDEX

اشاریہ

(انڈکس: "تاریخ دعوت و عزیمت" حصہ اول)

مرتب

محمد غیاث الدین ندوی

شخصیات

اقوام وقبائل۔ طبقات وملتیں

کتابیات

مقامات

متفرقات

قلعے۔ نہر و دریا:

مساجد و مقدس مقامات و معبد:

درس گاہیں، ادارے اور مطابع:

مذاہب و ادیان، عقائد و فلسفہ:

مذہبی، اسلامی اور اصطلاحی الفاظ:

علوم وفنون:

زبان:

سلطنتیں و حکومتیں:

عہد و ادوار:

سکے:

تحریکات و سلاسل طرق :

اہم واقعات و معرکے :

دیگر متفرقات :

تاریخ

دعوت و عزیمت

حصّہ دوم

سوانح شیخ الاسلام حافظ ابن تیمیہؒ

آٹھویں صدی ہجری کے مشہور عالم و مصلح شیخ الاسلام حافظ ابن تیمیہؒ
کے سوانح حیات، ان کے صفات و کمالات، اُن کی علمی و تصنیفی خصوصیات
اُن کا تجدیدی و اصلاحی کام اور مقام اور ان کی تصنیفات کا مفصل تعارف
اور ان کے ممتاز تلامذہ اور منتسبین کے حالات

مولانا سیّد ابوالحسن علی ندویؒ

مجلس نشریاتِ اسلام

۱۔کے۔۳ ناظم آباد مینشن۔ ناظم آباد نمبر۱ کراچی ۱۸

مفکر اسلام مولانا سید ابوالحسن علی ندوی رح

اپنی حیات میں مندرجہ ذیل اداروں کے ذمہ دار رہے

- ناظم دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ
- رکن مجلس شوریٰ دارالعلوم دیوبند
- صدر مجلس تحقیقات ونشریات اسلام لکھنؤ
- صدر مجلس انتظامی و مجلس علمیہ دارالمصنفین اعظم گڑھ
- رکن عربی اکادمی دمشق
- رکن مجلس شوریٰ جامعہ اسلامیہ مدینہ منورہ
- رکن مجلس تاسیس رابطۂ عالم اسلامی مکہ معظمہ
- رکن مجلس عاملہ موتمر عالم اسلامی بیروت
- صدر آل انڈیا مسلم پرسنل لابورڈ
- صدر رابطۃ الادب الاسلامی العالمیۃ
- رکن مجلس انتظامی اسلامک سینٹر جنیوا
- سابق وزیٹنگ پروفیسر دمشق یونیورسٹی و مدینہ یونیورسٹی
- صدر آکسفورڈ سینٹر فار اسلامک اسٹڈیز آکسفورڈ یونیورسٹی آکسفورڈ۔

نام کتاب	تاریخ دعوت وعزیمت (حصہ دوم)
تصنیف	مفکر اسلام مولانا سید ابوالحسن علی ندوی رح
طباعت	احمد برادرز پرنٹنگ پریس۔ کراچی
ضخامت	۴۱۶ صفحات

ٹیلیفون : ۶۶۰۱۸۱۷

اسٹاکسٹ : مکتبہ ندوہ قاسم سینٹر اردو بازار کراچی

ناشر

فضل ربی ندوی

مجلس نشریاتِ اسلام ۱۔ کے۔ ۳ ناظم آباد مینشن۔ ناظم آباد ۱۔ کراچی ۷۴۶۰۰

فہرست مضامین

تاریخ دعوت وعزیمت حصۂ دوم

۳۔ غیر اسلامی ملل وفرق کی تردید
اور
ان کے عقائد ورسوم واثرات کا مقابلہ

بسم اللہ الرحمن الرحیم

دیباچہ

الحمد للہ وسلام علی عبادہ الذین اصطفیٰ

الحمد للہ کہ ناظرین کے سامنے "تاریخ دعوت و عزیمت" کا دوسرا حصہ پیش کرنے کی سعادت و مسرت حاصل ہو رہی ہے "الحمد للہ الذی بعزتہ وجلالہ تتم الصالحات"۔

کتاب کی پہلی جلد میں پہلی صدی ہجری سے لے کر نویں صدی ہجری تک کی روداد اصلاح و دعوت تھی، شخصیتوں کے لحاظ سے سیدنا عمر بن عبدالعزیزؓ سے لے کر مولانا جلال الدین رومیؒ تک اصحابِ دعوت و عزیمت کا تعارف اور ان کے مصلحانہ و اولوالعزمانہ کارناموں کی تفصیل آگئی تھی۔

اس دوسری جلد میں حسب وعدہ شیخ الاسلام ابن تیمیہؒ کی سوانح حیات اور ان کے تلامذہ اور ان کے دبستانِ فکر کے فضلاء کا تذکرہ ہے ابتدائی خاکہ کے مطابق یہ جلد اس دور اور اس مدرسۂ فکر کے لئے مخصوص کر دی گئی تھی، اور اسی انداز سے لکھنا شروع کیا تھا، یہاں تک کہ صرف شیخ الاسلام کے تذکرہ نے مسودہ کے تقریباً دو سو صفحات گھیر لئے، ابھی ان کے اصلاحی و تجدیدی کارناموں اور ان کے اثرات کا تذکرہ باقی تھا کہ پہلی جلد پر تبصرہ کرنے والوں میں سے بعض نے مخلصانہ مشورہ دیا کہ اس زمانہ کی کم فرصتی اور اختصار پسندی کے پیشِ نظر کتاب میں اختصار سے کام لیا جائے اور کتاب کے پیمانہ کو کچھ محدود کر دیا جائے اس کا تقاضا تھا کہ شیخ الاسلام کے تذکرہ میں بھی تلخیص و انتخاب سے کام لیا جائے تاکہ اس جلد میں

دوسرے اصحابؓ دعوت و عزیمت" کی جگہ نکل سکے، مصنف نے (جو اس دور کے رجحانات سے ناواقف نہیں) اس کا ارادہ بھی کیا، لیکن جب تذکرہ پر نظر ڈالی تو ایسا محسوس ہوا کہ بہت کارآمد اور قیمتی مواد فراہم ہوگیا ہے، جو اپنی جگہ پر مفید اور ضروری ہے، جس طرح بعض گوشوں سے اختصار کا مشورہ دیا گیا ہے، اسی طرح بعض اہلِ خلوص واہلِ طلب نے تفصیل کا مطالبہ کیا ہے، اور بہت اصرار سے کہا ہے کہ اس باب میں قطعاً اختصار سے کام نہ لیا جائے، بالآخر طبیعت نے یہی فیصلہ کیا کہ اس حصہ کو یوں ہی رہنے دیا جائے اور جو کچھ لکھا جا چکا ہے اس کو قلمزد نہ کیا جائے کہ یہ علمی کام روز روز نہیں ہوتے، اور طبیعت کے نشاط و انبساط، فرصت کے لمحات اور قلم کی روانی کا کچھ بھروسہ نہیں، کتاب کے مرتب ہو جانے کے بعد اپنے اپنے ذوق کے مطابق لوگ خود انتخاب و تلخیص کا کام کر سکتے ہیں۔

اس دوسری جلد کی اشاعت کے موقع پر اس کی حسرت اور دلی قلق ہے کہ فاضل گرامی مولانا سید مناظر احسن گیلانی اور مولانا شاہ حلیم عطا موجود نہیں جو اس سلسلہ کے سب سے بڑے قدرداں اور مؤید تھے، پہلی جلد شائع ہوئی تو سب سے زیادہ مسرت کا اظہار مولانا گیلانی نے فرمایا، کتاب کا لفظ لفظ ذوق و شوق سے پڑھا اور بڑے جوش و اثر کا خط لکھا، مرحوم اگرچہ (ہمارے علم میں) شیخ اکبر کے علوم کے ہندوستان میں بہت بڑے عارف و حامل تھے، لیکن بایں ہمہ شیخ الاسلام کی امامت و عظمت کے قائل، ان کے بڑے مرتبہ شناس اور ان کی تصنیفات کے بڑے شائق تھے، یقین ہے کہ اگر وہ زندہ ہوتے تو اس حصہ کی اشاعت سے ان کو بڑی مسرت ہوتی۔

مولانا شاہ حلیم عطا نے زندگی گوشۂ گمنامی میں گزاری اور اہلِ علم نے بھی ان کو بہت کم جانا، مگر واقعہ یہ ہے کہ اس تحتی برِ اعظم (ہندوستان و پاکستان) میں شیخ الاسلام اور ان کے تلامذہ کے علوم پر ان سے زیادہ کسی کو عبور نہ تھا، وہ ان کی تصنیفات و تحقیقات کا ایک زندہ دائرۃ المعارف (انسائیکلوپیڈیا) تھے، اگرچہ پہلی جلد بھی ان کی رہنمائی و اعانت سے محروم نہیں رہی لیکن اس دوسری جلد میں تو ان کی وسیع

معلومات، ان کا قوی حافظہ اور ان کا قیمتی کتب خانہ مصنف کا مشیر و رفیق رہا ہے، اور اس کتاب کی ترتیب و تالیف میں ان کا اتنا بڑا حصہ ہے کہ شکر و اعتراف کے بلند سے بلند لفظ اس کے لئے کفایت نہیں کرتے اس دور آخر میں یہ دونوں بزرگ علمائے سلف کے علمی شغف و انہماک، وسعتِ نظر، ذوقِ مطالعہ اور علمی فنائیت کی یادگار تھے" غفر اللہ لهما ورفع درجاتهما"

قدیم مآخذ کے علاوہ اس حصہ کی تالیف میں مصری فاضل شیخ محمد ابوزہرہ کی کتاب "ابن تیمیہؒ" سے بڑی مدد ملی، اس کا اعتراف اور شکر واجب ہے۔

اللہ تعالیٰ کی ذات سے امید ہے کہ جلد اول کی طرح یہ جلد ثانی بھی ہندوستان کے علمی و دینی حلقوں میں مقبول ہوگی اور ذوق و شوق سے پڑھی جائے گی۔

ابوالحسن علی

۷ا رمحرم الحرام ۱۳۷۶ھ — دائرہ شاہ علم اللہؒ۔ رائے بریلی

شیخ الاسلام حافظ ابن تیمیہؒ

شریعت کے ترجمان اور ایک ہمہ گیر مصلح کی ضرورت

الٰہیات وعقائد میں تفلسف ویونانیت اور متکلمین کی عقلی ظاہریت کے خلاف ایک ردِ عمل وہ تھا، جس کے علمبردار مولانا جلال الدین رومی تھے، یہ ایک خام وسطحی عقلیت کے مقابلہ میں ایک بلند تر عقلیت اور پختہ تر فکر ونظر کا مظاہرہ تھا، اور ایک نئے علم کلام کا افتتاح جس کی بنیاد قلب ونظر کی بلندی وپاکیزگی اور متکلم کے ذاتی تجربہ پر تھی، مولانا روم اپنے وقت کے ایک متبحر عالم اور کہنہ مشق متکلم تھے، جن کو اللہ تعالیٰ نے عارفِ قلب اور عاشق طبیعت عطا فرمائی تھی، فلاسفہ کی سخن سازیوں اور متکلمین کی موشگافیوں سے ان کی طبیعت سرد اور بیزار ہو چکی تھی، ایک صاحبِ یقین اور صاحبِ عشق کی صحبت اور ریاضت ومجاہدہ نے ان کو اس مقام تک پہنچا دیا، جہاں سے ان کو علم کلام کی ان معرکہ آرائیوں میں حقیقت کم، اور ذہانت وخطابت زیادہ نظر آئی، اس مقام پر پہنچ کر انھوں نے دینی حقائق کو اپنی زبان میں بیان کیا، اور ان کے ثبوت کے لئے وہ راستہ اختیار کیا جو حقیقت سے زیادہ قریب اور وجدان وتجربہ پر مبنی تھا۔

لیکن فلسفہ کی اس سرکشی اور علم کلام کی اس بے اعتدالی کے خلاف ایک ردِ عمل اور بھی ضروری تھا، جو سابق الذکر ردِ عمل کے مقابلہ میں کچھ کم حق بجانب نہ تھا، فلسفہ (الٰہیات) اور علم کلام کا موضوعِ بحث اللہ کی ذات وصفات کے مسائل تھے، شریعتِ اسلامیہ نے عقائد کے بارہ میں انسان کو تاریکی میں

نہیں چھوڑا، بلکہ چونکہ یہ شعبہ پوری زندگی، اعمال و اخلاق اور صحیح تمدن و معاشرہ کی بنیاد ہے، اس لئے اس نے تمام مذاہب سابقہ سے کہیں زیادہ اللہ تعالےٰ کی ذات و صفات کے متعلق ایسی واضح، عام فہم اور فیصلہ کن تعلیم دی، جس کے بعد اس سلسلہ میں کسی محنت درد سری اور کسی قیاس آرائی کی ضرورت نہیں تھی، اس علم و یقین کا سرچشمہ اور ماخذ صرف انبیاء علیہم السلام کی تعلیم ہے، انھوں نے جو کچھ کہہ دیا اور جتنا کہہ دیا، وہ حرفِ آخر ہے کہ وہی اس وراء الوراء ہستی اور اس کے ناقابلِ قیاس و بے مثال صفات کے عارف ہیں، فلسفہ کو اس موضوع پر گفتگو کرنے اور فریق بننے کا کوئی حق نہ تھا کہ اس کو اس علم کے مبادی اولیہ بھی حاصل نہ تھے اور نہ وہ معلومات جن کو ترتیب دے کر وہ مجہول تک پہنچا کرتا ہے، نہ یہاں کسی تجربہ اور تحلیل و تجزیہ کی گنجائش تھی، اور نہ اہلِ فلسفہ میں اس کی صلاحیت لیکن فلسفہ نے اپنے حدود سے تجاوز کیا، اور اس موضوع میں نہ صرف دخل دیا، بلکہ اس کے مسائل و جزئیات میں اس وثوق و تحکم اور اس تفصیل و تدقیق سے بحث کی اور اس تحلیل و تجزیہ سے کام لینا شروع کیا جو صرف ایک کیمیاوی معمل میں انجام دیا جاسکتا ہے۔

فلسفہ کے مقابلہ اور مذہب کی حمایت کے لئے علم کلام وجود میں آیا اور ایسا ہونا ضروری تھا لیکن اس میں رفتہ رفتہ خود فلسفہ کی روح گھس گئی، اور وہ ایک مذہبی فلسفہ بن کر رہ گیا، وہی اس کا موضوع، وہی طریقِ بحث و استدلال، اور وہی بنیادی غلطی کہ ذات و صفاتِ الٰہی اور ماوراء العقل مسائل کو عقل سے ثابت کیا جاسکتا ہے، وہی انبیاء علیہم السلام کی تعبیرات و تشریحات پر عدم قناعت، وہی محدود و ناقص اور غلط فہمی پیدا کرنے والے یونانی اصطلاحات کا استعمال، اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مسائل سلجھنے اور بات مختصر ہونے کے بجائے زیادہ پیچیدگی اور طوالت پیدا ہوتی چلی گئی، اور ذات و صفات کے نہایت سادہ موثر اور دل آویز بیان کے متوازی جس میں دلوں میں ایمان و اذعان پیدا کرنے اور ہر زمانہ کے دماغوں کو تسکین دینے کی پوری صلاحیت تھی، اور وہ کتاب و سنت کے نصوص پر مبنی تھا، ایک طویل پر پیچ فلسفۂ الہیات اور ایک ضخیم "شرحِ عقائد" تیار ہوگئی، جس پر باوجود فلسفۂ یونان کے حریف و مقابل ہونے کے یونانی فکر

کا اچھا خاصا اثر پڑ چکا تھا، اس صورتِ حال کے خلاف کتاب و سنت کی روح ہمیشہ احتجاج کرتی رہی، امت کا ایک اچھا خاصا گروہ ان فلسفیانہ تفصیلات اور متکلمانہ تاویلات کا مخالف رہا لیکن کتاب و سنت کی صحیح و مؤثر ترجمانی کے لئے ایک ایسے قوی الایمان، وسیع العلم اور دقیق النظر عالم کی ضرورت تھی جو علیٰ وجہ البصیرۃ اس پر ایمان راسخ رکھتا ہو کہ کتاب و سنت کے نصوص اور ذات و صفات کے بارہ میں اس کے بیانات و تعبیرات بالکل کافی و شافی ہیں، جو اپنی ذہانت و مطالعہ سے فلسفہ کے رگ و ریشہ سے واقف ہو چکا ہو، حکمائے یونان کے اقوال و خیالات اور ان کے مذاہبِ فکریہ کی علمی تنقید کر سکتا ہو اور ان کی بنیادی کمزوریوں سے واقف ہو، جو اپنے غور و فکر سے علم کلام کی تہ تک پہنچ چکا ہو، مذاہب و فرق اسلامیہ کے دقیق اختلافات سے واقف ہو، علم کلام کی پوری تاریخ اور اس کے ارتقاء پر اس کی نظر ہو اور اس پورے مطالعہ و تجربہ سے اس کے اندر کتاب و سنت کے نصوص اور مسلکِ سلف پر حد درجہ کا وثوق و اعتماد اور اس کی حمایت و ترجمانی کا جوش اور عزم پیدا ہو چکا ہو اور وہ عقلی حیثیت سے بھی اس کی ترجیح اور اس کی برتری ثابت کرنے کے لئے بے چین ہو، پھر اس نازک اور عظیم الشان کام کے لئے اس کے پاس وہ تمام وسائل اور صلاحیتیں ہوں، جو اتنے بڑے کام کے لئے درکار ہیں، وہ اپنی ذکاوت، قوتِ استدلال، قوتِ بیانیہ، وسعتِ نظر، کثرتِ مطالعہ میں بھی ممتاز اور اپنے زمانہ کی سطح سے بلند ہو اور ہر طرح سے اس خدمت کا اہل ہو۔

دوسری طرف اسلام اندرونی اور بیرونی حملوں کا آماجگاہ بنا ہوا تھا، عیسائیوں میں اپنے مذہب کی حقانیت ثابت کرنے اور اسلام پر اعتراضات کرنے کی نئی تحریک پیدا ہوئی تھی، صلیبیوں کے پے در پے حملوں اور شام و فلسطین و قبرص میں مغربی النسل عیسائیوں کی ایک بڑی تعداد کی موجودگی نے ان میں اس کا حوصلہ پیدا کر دیا تھا کہ وہ مسلمانوں سے علمی مقابلہ کریں، نبوتِ محمدیؐ پر اعتراضات اور اپنے مذہب کی ترجیح پر کتابیں تصنیف کریں، اس کا جواب دینے کے لئے بھی ایک ایسے عالم و متکلم کی ضرورت تھی جو مسیحیت اور دوسرے مذاہب کا وسیع اور گہرا مطالعہ کر چکا ہو، صحفِ سماوی اور ان کی تبدیلیوں اور تحریفات پر

پوری نظر رکھتا ہو، مذاہب کے تقابل و موازنہ کا کام بڑی خوبی سے انجام دے سکتا ہو اور اسلام کی صداقت و برتری کو طاقتور و مؤثر علمی انداز میں ثابت کر سکتا ہو، اور حکمت و قوت کے ساتھ دوسرے مذہب کے لوگوں کو اسلام کی دعوت دے سکتا ہو۔

ان عیسائی مناظرین و مصنفین کے حملے سے زیادہ خطرناک حملہ ایک نام نہاد "اسلامی فرقہ" باطنیہ کا تھا جن کا مذہب اور جن کی تعلیمات مجوسی عقائد، افلاطونی تصورات اور خطرناک سیاسی اغراض کا عجیب و غریب مجموعہ تھا، یہ اور اس کی مختلف شاخیں (اسماعیلی، حشاشی، دروزی، نُصیری) مسلمانوں کے خلاف غیر مسلم طاقتوں اور بیرونی حملہ آوروں کی ہمیشہ مدد کرتے رہے، اور اکثر اوقات ان ہی کی تحریک و سازش سے اسلامی ملکوں پر بیرونی حملے ہوئے، شام و فلسطین پر صلیبی حملوں کے موقع پر انھوں نے صلیبیوں کا ساتھ دیا، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ جب صلیبیوں کا شام پر تسلط ہوا تو انھوں نے ان باطنی فرقوں کے لوگوں کو اپنا معتمد و مقرب بنایا، اور ان کو ان کی مدد کا صلہ دیا، زنگی اور ایوبی دور سلطنت میں یہ ہمیشہ سازشوں اور بغاوتوں میں مشغول رہے، آٹھویں صدی میں جب تاتاریوں نے شام پر حملہ کیا تو انھوں نے کھل کر تاتاریوں کا ساتھ دیا، اور مسلمانوں کو سخت نقصان پہنچایا، اس کے علاوہ وہ مسلمانوں میں ہمیشہ ذہنی انتشار، دین سے بے اعتمادی اور بغاوت پھیلانے اور الحاد و بے دینی کی اشاعت میں منہمک رہتے تھے، اور مسلمانوں کے دینی قلعہ میں غنیم کے جاسوسوں کا کام کرتے تھے، اس سب کا تقاضا تھا کہ اس فرقہ پر علمی و عملی حیثیت سے کاری ضرب لگائی جائے، اس کے عقائد و اغراض کو بے نقاب کیا جائے، مسلمانوں کو ان کی طرف سے خبردار کر دیا جائے، اور ان کی دشمنِ اسلام کارروائیوں پر ان کو قرار واقعی سزا دی جائے، یہ کام بھی وہی انجام دے سکتا تھا، جو اس فرقہ کی حقیقت و اسرار اور اس کے ماضی و حال اور اس کی تمام شاخوں اور اس کے تمام فرقوں کے عقائد و خیالات سے واقف ہو، ان کی علمی تنقید و تردید پر پوری قدرت رکھتا ہو، اس کے سینہ میں حمیتِ اسلامی کا جوش اور ان دشمنانِ اسلام کے خلاف جذبۂ جہاد کارفرما ہو۔

اس سب کے علاوہ غیر مسلموں کے اختلاط، عجمی اثرات اور علماء کے تساہل و غفلت سے عوام میں مشرکانہ عقائد و اعمال پھیلے ہوئے تھے، توحید و دینِ خالص پر پردے پڑتے چلے جارہے تھے، اولیاء اللہ و صالحین کے بارہ میں یہود و نصاریٰ کا سا غلو پیدا ہوتا جارہا تھا، وساطت اور تقرب بالاولیاء کا عقیدہ راسخ اور "مَا نَعْبُدُهُمْ إِلَّا لِيُقَرِّبُونَا إِلَى اللَّهِ زُلْفَى"[1] کا جاہلی خیال مسلمانوں میں ابھر رہا تھا، غیر اللہ کی دہائی دینے اور "استغاثہ لغیر اللہ" تک میں بہت سے علماء تک کو کوئی قباحت نظر نہیں آتی تھی، انبیاء و صالحین کی قبور کے پاس وہ سب کچھ ہونے لگا تھا جس کا آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کو خطرہ تھا، اور جس سے پوری شدت سے آپ نے منع کیا تھا، مسلمان غیر مسلموں اور ذمیوں کے شعائر و خصوصیات اختیار کرنے اور ان کے مذہبی تہواروں اور میلوں میں شرکت اور ان کے رسوم و عادات اختیار کرنے میں تکلف محسوس نہیں کرتے تھے، اس مشرکانہ جاہلیت کے خلاف جہاد کرنے اور توحید خالص کی طرف پوری قوت اور وضاحت کے ساتھ دعوت دینے کے لئے ایک ایسے مجاہد عالم کی ضرورت تھی جس کا ذہن توحید و شرک کے فرق کو خوب سمجھتا ہو، جو جاہلیت کو اس کے تمام لباسوں اور مظاہر میں پہچان سکتا ہو جس نے توحید کی حقیقت کو متاخرین کی کتابوں یا جاہل مسلمانوں کے تعامل، اور زمانہ کے رسم و رواج کے بجائے براہِ راست کتاب و سنت اور صحابۂ کرام کے عمل سے سمجھا ہو، جو عقیدۂ صحیح کے اعلان و اظہار میں حکومتوں کی مخالفت، اہلِ زمانہ کی عداوت، علماء کے اختلاف اور کسی طرح کی لومۃ لائم کی پرواہ نہ کرتا ہو، جو کتاب و سنت اور دین کے مستند اور اولین مآخذ اور قرونِ اولیٰ کے حالات پر غائر نظر اور کامل عبور رکھتا ہو، جو یہود و نصاریٰ کے انحراف ان کے مسخ و تحریف کی تاریخ، اور جاہلی قوموں کے ذہن و نفسیات سے پورے طور پر واقف ہو، اور جو مسلمانوں کو قرآن کی تعلیم اور صدرِ اول کے عقیدہ و عمل پر واپس لانے اور ان کو صحابۂ کرام اور ان کے جانشینوں کی روش اور مسلک پر دیکھنے کے لئے بے چین ہو۔

---

[1] ترجمہ (مشرکین) کہتے ہیں کہ ہم تو ان کی پرستش صرف اس لئے کرتے ہیں کہ ہم کو خدا کا مقرب بنا دیں۔ (الزمر۔۳)

اہلِ تصوّف کے گروہ میں (مختلف تاریخی و علمی اسباب کی بنا پر) یونانی و ہندوستانی فلسفۂ اشراقیت کے اثرات دخیل ہو گئے تھے، اور اسلامی عقائد و افکار کے ساتھ اس طرح شیر و شکر ہو گئے تھے کہ ان کا سراغ لگانا مشکل تھا، افلاطونیتِ جدیدہ کی اشراقیت یا ہندوستان کا جوگ، حلول و اتحاد کا عقیدہ، وحدۃ الوجود کا مسلک، ظاہر و باطن کی سرحد بندی، رموز و اسرار اور "علوم سینہ کا فتنہ" کاملین و واصلین سے تکالیفِ شرعیہ کا سقوط اور احکامِ شریعت سے استثناء، یہ سب وہ عقائد و خیالات تھے، جو اہلِ تصوف کے ایک بڑے حلقہ میں مقبول و مسلّم تھے، اگرچہ ہر زمانہ کے محققین و راسخین ان عقائد فاسدہ کی تردید و انکار کرتے رہے، مگر تصوف کے ایک بڑے حلقہ کو اس پر اب بھی اصرار تھا، تصوف کی بعض شاخیں اور سلسلے شعبدہ بازی اور نظر بندی کی نیچی سطح تک اتر آئے تھے، ساتویں اور آٹھویں صدی میں رفاعی سلسلہ اس بارہ میں خاص طور پر پیش پیش تھا، عوام اور بہت سے خواص ان مغالطوں کا شکار تھے، اس خطرہ کے سدِباب اور شریعت کی حفاظت کے لئے بھی ایک صاحبِ یقین اور جری مصلح کی ضرورت تھی، جو اس گروہ کی شوکت و دبدبہ اور اس کے معتقدین و متوسلین کی تعداد و طاقت سے بے پروا و بے خوف ہو کر ان پر آزادانہ و دلیرانہ تنقید کرے اور ان کی غلطیوں اور مغالطوں کا پردہ چاک کرے۔

علمی و درسی حلقوں میں صدیوں سے ایک ایسا جمود طاری تھا کہ اپنے گروہ کے فقہی دائرہ سے سرِ مو قدم نکالنا جرم سمجھا جاتا تھا، قرآن و حدیث کو ان فقہی مسلکوں اور اپنے گروہ کے عمل کی عینک سے دیکھنے کا عام رواج تھا، فقہی اختلافات میں قرآن و حدیث کو حَکَم بنانے کے بجائے قرآن و حدیث کو ہر حال میں ان کے مطابق کرنے کی کوشش کی جاتی تھی، ترجیح و اختیاراتِ فقہیہ کا دروازہ بھی عملاً بند تھا، زمانہ اور حالات کے تغیر کے ساتھ بہت سے نئے مسائل درپیش تھے جن میں فتویٰ دینے کے لئے اسلام کے پورے فقہی ذخیرہ پر وسیع نظر، کتاب و سنت پر عبور، قرونِ اولیٰ کے تعامل پر اطلاع اور

اصولِ فقہ سے گہری واقفیت کی ضرورت تھی، لیکن عرصہ سے علم و نظر اور مطالعہ محدود ہوتا چلا جا رہا تھا، قوائے فکریہ مضمحل ہو رہے تھے، اور کوئی عالم نئے مسائل کے استنباط کی جرأت نہیں کر رہا تھا، اسلامی قانون اور فقہ اپنا نمو اور ارتقاء کی صلاحیت کھو چکے تھے اور قدیم فقہی ذخیرہ میں اضافہ ناممکن سمجھا جانے لگا تھا، اس صورتِ حال کی اصلاح کے لئے بھی ایک ایسے محدث و فقیہ اور اصولی کی ضرورت تھی، جو پورے اسلامی کتب خانہ اور اس کے علمی ذخیرہ کا جائزہ لے چکا ہو، قرآن و حدیث کا اس کو ایسا استحضار ہو کہ لوگ انگشت بدنداں رہ جاتے ہوں، حدیث کی اقسام اور اس کے مراتب اور اس کے مجموعوں پر اس کی ایسی نظر ہو کہ کہنے والے کہیں کہ جس حدیث کو یہ شخص نہیں جانتا وہ حدیث ہی نہیں، فقہاء کے اختلافات اور ان کے مآخذ و دلائل اس کو ہر وقت مستحضر رہیں، اپنے مذہب کے علاوہ دوسرے مذاہب اور ان کی جزئیات سے وہ ان مذاہب کے اہلِ درس و اہلِ فتویٰ سے زیادہ باخبر ہو، قوت استنباط اور ذاتی تحقیق کے ساتھ سلف کے دائرہ میں محدود اور ائمۂ مجتہدین کا مرتبہ شناس اور ان کا خوشہ چیں ہو، لغت میں محقق اور زبان کے معاملہ میں نقّاد اور مبصّر ہو، نحو میں اس کو یہ درجہ حاصل ہو کہ ائمۂ فن و مصنفین نحو کی بے تکلف غلطیاں نکالتا ہو، اس کا حافظہ محدثین اولین کی یاد تازہ کرتا ہو، اس کی ذکاوت قدرتِ خداوندی کی ایک نشانی، اس کا علم فیاضِ ازل کی فیاضی کی ایک دلیل، اس کی ذات امتِ اسلامیہ کی مردم خیزی، درختِ اسلام کی شادابی اور علومِ اسلامیہ کی زندگی اور تازگی کا ثبوت ہو، اور اس حدیث کی تصدیق کہ۔

مثل امتی مثل المطر لا یدری اولہ	میری امت کی مثال بارش کی سی ہے کہ نہیں کہا جا سکتا
خیرام آخرہ۔[۱]	کہ اس کا ابتدائی حصہ زیادہ بہتر و بابرکت ہے کہ آخری حصہ

اس کے ساتھ وہ زندگی کے علمی میدان کا بھی شہسوار ہو، صاحبِ قلم بھی ہو اور صاحبِ سیف بھی، سلاطین وقت کے سامنے کلمۂ حق کہنے سے اس کو باک نہ ہو، اور تاتاری جیسے خونخوار دشمن کے مقابلہ میں

[۱] ترمذی عن انس بن مالک۔

لشکرِ اسلام کی قیادت کرنے سے اس کو عذر نہ ہو، درس کے حلقوں، کتب خانہ کے گوشوں، مسجد کی خلوتوں، مناظرہ کی مجلسوں سے لے کر جیل خانہ کی کال کوٹھری اور میدان کارزار تک اس کی یکساں پرواز اور فاتحانہ ترکتاز ہو، اور ہر جگہ اس کی ذات محترم اور اس کی امامت مسلّم ہو۔

آٹھویں صدی کے لئے ایک ایسے ہی مردِ کامل کی ضرورت تھی، جو زندگی کے تمام میدانوں کا مجاہد ہو، اور جس کی جد و جہد اور اصلاحات کسی ایک شعبہ میں محدود نہ ہوں، یہ شیخ الاسلام حافظ ابن تیمیہؒ کی ذات تھی جس نے عالمِ اسلام میں ایک ایسی علمی و عملی حرکت اور زندگی پیدا کر دی جس کے اثرات صدیاں گزر جانے کے بعد بھی قائم ہیں۔

ابن تیمیہؒ کا زمانہ

ابنِ تیمیہؒ کا زمانہ بڑا پُر آشوب اور پُر از واقعات ہے، سیاسی، اجتماعی، اخلاقی، علمی اور دینی حیثیت سے یہ دور خاص اہمیت رکھتا ہے، ابن تیمیہؒ کی اصلاحی جد و جہد اور ان کے علمی و اصلاحی مزاج کو سمجھنے کے لئے اس ماحول کا جائزہ لینے کی ضرورت ہے، جس میں ان کا نشو و نما ہوا، اور جس میں انھوں نے اپنا تجدیدی و اصلاحی کام انجام دیا۔

ابن تیمیہ بغداد کی تباہی کے پانچ برس بعد اور حلب اور دمشق میں تاتاریوں کے داخلہ کے کل تین برس بعد پیدا ہوئے، اس لئے یہ بات یقینی ہے کہ انھوں نے جب ہوش سنبھالا ہوگا تو ان اسلامی شہروں کی تباہی اور مسلمانوں کے قتل عام کی داستانیں اور تاتاریوں کے دہشت انگیز اور وحشیانہ مظالم کے واقعات بچہ بچہ کی زبان پر ہوں گے، اور اس کے چشم دید گواہ ہر جگہ موجود ہوں گے، وہ جب سات سال کے تھے تو خود ان کے وطن حرّان پر جو تاتاریوں کے مقبوضہ علاقہ (عراق) کے شمال اور دجلہ و فرات کے دوآبہ میں واقع ہے، تاتاریوں کا حملہ ہوا، اور بہت سے خاندانوں اور گھرانوں کی طرح ان کا خاندان بھی

تاتاریوں کے مظالم اور وحشیانہ سلوک سے بچنے کے لئے دمشق کی طرف روانہ ہوا، راستہ میں ہر جگہ تاتاریوں کی دہشت پھیلی ہوئی تھی، اس دہشت و پریشانی، بے امنی اور بے نظمی کی یاد ان کے غیر معمولی حافظہ سے کبھی محو نہیں ہوئی ہوگی، بڑے ہو کر انھوں نے اس تباہی و بربادی کے آثار و نشانات اپنی آنکھوں سے دیکھے ہوں گے اور خود ان لوگوں کی زبان سے اس کی دردناک تفصیل سنی ہوگی، جنھوں نے یہ سارے مناظر اپنی آنکھوں سے دیکھے، اس لئے قدرتی طور پر ان کی حساس اور غیور طبیعت مسلمانوں کی اس بے بسی اور رسوائی سے متاثر ہوئی ہوگی، اور ان غارتگروں کے خلاف ان کے دل میں نفرت کا جذبہ پیدا ہوا ہوگا۔

اسی کے ساتھ عین جالوت میں مسلمانوں کی شاندار فتح کا واقعہ ان کی ولادت سے صرف تین[۳] سال پہلے پیش آیا تھا، نیز الملک الظاہر بیبرس کی فتوحات ان کے بچپن کی باتیں تھیں اور مجلسیں ان کے تذکرہ سے گرم تھیں، اس سب سے ان کے قلب کو سکون اور تقویت حاصل ہوئی ہوگی اور ان واقعات سے ان کا حوصلہ بلند ہو گیا ہوگا۔

مصر کے مملوک سلاطین

مصر و شام پر ابن تیمیہؒ کی ولادت سے ۱۳ برس پہلے سے ممالیک (خاندانِ غلامان) کی حکومت تھی، یہ سلطان صلاح الدین کے خاندان کے آخری بادشاہ الملک الصالح نجم الدین ایوب (م ۶۴۷ھ) کے ترک غلام تھے، جن کو سلطان نے ان کی وفاداری اور بہادری کا تجربہ کرنے کے بعد مصر میں آباد کیا تھا، اور بحریہ[۱] کے لقب سے مشہور رہے، ان میں ایک فرد عز الدین ایبک الترکمانی نے ۶۴۷ھ میں الملک الصالح کے جانشین توران شاہ کو قتل کر کے حکومت پر قبضہ کر لیا، اور الملک المعز کا لقب اختیار کیا۔

---

[۱] ان کی قیام گاہ دریائے نیل کے کنارہ واقع تھی، اس لئے بحریہ مشہور ہو گئے، مصر میں اب بھی دریائے نیل کو بے تکلف بحر کہتے ہیں۔

۶۵۵ھ میں وہ قتل ہوا، اور اس کا بیٹا نور الدین علی جانشین ہوا، ۶۵۷ھ میں عز الدین ایبک کے غلام سیف الدین قطز نے جو حکومت کا ناظمِ اعلیٰ تھا، تخت پر قبضہ کیا، یہ وہی سلطان ہے، جس نے تاتاریوں کو پہلی مرتبہ شکست فاش دی، اگلے ہی سال (۶۵۸ھ میں) الملک الصالح نجم الدین الیوب کے دوسرے غلام رکن الدین بیبرس نے سیف الدین قطز کو قتل کر کے عنانِ مملکت اپنے ہاتھ میں لی اور الملک الظاہر لقب اختیار کیا، اور ۱۸ سال تک نہایت شان و شوکت کے ساتھ حکومت کی، اور تاتاریوں اور صلیبیوں پر پے در پے فتوحات حاصل کیں۔

امام ابن تیمیہؒ کی ولادت ہوئی تو مصر و شام پر ظاہر بیبرس ہی کی حکومت تھی، ان کا بچپن اسی کی حکومت میں گذرا، اس کا انتقال ہوا تو ان کی عمر ۱۵ پندرہ سال کی تھی، اور وہ جوان تھے، الملک الظاہر بیبرس سلطان صلاح الدین کے بعد پہلا طاقتور مسلمان بادشاہ تھا جس نے جہاد کی طرف پوری توجہ کی، اور دشمنانِ اسلام کو پے در پے شکستیں دیں، ابن کثیر سلطان کے متعلق لکھتے ہیں:-

• بیبرس بیدار مغز، بلند حوصلہ، بہادر بادشاہ تھا، دشمنوں سے کسی وقت غافل نہیں ہوتا تھا، برابر ان کے مقابلہ میں صف آرا اور کمربستہ رہتا تھا، اس نے اسلام کی پراگندگی دور کی اور مسلمانوں کے منتشر شیرازہ کو جمع کیا، واقعہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس کو اس اخیر زمانہ میں اسلام اور اہلِ اسلام کی مدد اور تقویت کے لئے مقرر کیا تھا، فرنگی، تاتاری اور مشرکین کی نظر میں وہ کانٹے کی طرح کھٹکتا تھا، اس نے شراب کی بندش کی، فاسقوں اور جرائم پیشہ لوگوں کو ملک بدر کیا، وہ جس خرابی اور فساد کو دیکھتا، اس کو دور کئے بغیر چین نہ لیتا۔[۱]

ظاہر بیبرس کی سلطنت بہت وسیع اور منظم تھی، مشرق میں دریائے فرات تک اور جنوب میں سوڈان کے آخری حصہ تک اس کے حدود پہونچ گئے تھے، مصر اس سلطنت کا مرکز اور قاہرہ اس کا

[۱] البدایۃ والنہایۃ ج ۱۳ ص ۲۷۶

صدر مقام تھا، جو سلطان اور خلیفۂ عباسی[1] کے قیام کی وجہ سے اس وقت کی دنیائے اسلام کا نمایاں علمی اور تمدنی مرکز بن گیا تھا، بیبرس نے بکثرت مدارس قائم کئے، دور دور سے علماء و اہل کمال قاہرہ میں جمع ہوئے۔

بیبرس اپنی ذاتی صلاحیت اسلامی جذبات اور جوشِ جہاد کے ساتھ بہرحال ایک مطلق العنان فرمانروا تھا، اس لئے اس میں مطلق العنان بادشاہوں کی کمزوریاں بھی پائی جاتی ہیں، اس کی تاریخ جہاں مجاہدانہ کارناموں اور اسلامی خدمات سے روشن ہے، وہاں شخصی سلطنت کی خصوصیات استبداد، ضد اور اصرار کے واقعات سے بھی داغدار ہے، اس سلسلہ کا ایک افسوسناک واقعہ وہ ہے، جو امام نووی کے ساتھ پیش آیا۔[2]

بیبرس کی ۱۸ سالہ منظم و مستحکم حکومت کے بعد بہت جلد جلد مصر و شام کے تختِ حکومت پر سلاطین آئے اور گئے، اس کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ ۶۷۶ھ سے لے کر (جس سال بیبرس نے انتقال کیا ہے) ۷۰۹ھ تک کل ۳۳ سال کی مدت میں ۹ بادشاہ مصر کے تخت پر بیٹھے، اس ۳۳ سال کی مدت میں مصر و شام و حجاز کی اسلامی حکومت کو صرف ایک طاقتور منتظم اور مجاہد سلطان نصیب ہوا، جس کا نام الملک المنصور سیف الدین قلاوؤن ہے جس نے ۶۸۰ھ میں تاتاریوں پر حملہ کیا، اور سخت شکست دی، اور طرابلس کو جو ۱۸۵ سال سے صلیبیوں کے قبضہ میں تھا، فتح کیا، اس نے ۶۷۸ھ سے ۶۸۹ھ تک ۱۲ سال بڑی شان سے حکومت کی منصور قلاوؤن کے بعد مصر کا تخت بادشاہوں اور بادشاہ گروں کا کھیل بن گیا، بالآخر ۷۰۹ھ میں منصور قلاوؤن کے بیٹے الملک الناصر محمد بن قلاوؤن نے تیسری مرتبہ عنانِ مملکت ہاتھ میں لی،

---

[1] خلیفہ مستعصم کی شہادت کے بعد مسلمان تین سال تک بغیر کسی خلیفہ کے رہے مورخین نئے سال کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں: "دخلت سنۃ والمسلمون بلا خلیفۃ" بالآخر سلطان ظاہر بیبرس نے ۶۵۹ھ میں خاندان عباسی کے ایک فرد المستنصر باللہ ابوالقاسم احمد بن امیر المومنین الظاہر کے ہاتھ پر بیعت کی اور مصر خلافت کا مرکز قرار پایا، لیکن یہ خلافت برائے نام اور تبرکاً تھی، اصل حکمران اور فرماں روا خود سلطان تھا۔ [2] ملاحظہ ہو "طبقات الشافعیۃ الکبریٰ" ترجمۂ امام نووی۔

اور ۳۲ سال تک سلطنت کو استقرار حاصل رہا، الملک الناصر، امام ابن تیمیہؒ کا اصل معاصر ہے، جس سے ان کی اصلاحی و تجدیدی تاریخ کا تعلق ہے، وہ بڑی حد تک ظاہر بیبرس کا جانشین اور بہت سی صفات میں اس کا نمونہ اور اپنے والد نامدار منصور قلاوؤن کی یادگار تھا، اس کے زمانہ میں پھر اسلامی سلطنت میں وحدت اور طاقت پیدا ہوئی، اس نے اپنے نامور پیشرو کی طرح تاتاریوں پر شاندار فتح حاصل کی اور اسلامی حکومت کی دھاک بٹھادی۔

اس پورے عرصہ میں عراق، ایران و خراسان بدستور تاتاریوں کے قبضہ میں رہے، اور بغداد اس وقت تک مسلمانوں کو واپس نہیں ملا، جب تک کہ اس کے حکمران (تاتاری) خود مسلمان نہیں ہوگئے، مصر کے عباسی خلیفہ نے خود فوج کشی کی، اور سلطان ظاہر بیبرس نے بارہا ارادہ کیا، مگر کامیابی نہیں ہوئی، سلاطینِ ممالیک کے قبضہ و انتظام میں صرف مصر، سوڈان، شام اور حجاز تھے۔

نظامِ سلطنت

ملوک سلاطین کی سلطنت کا سرکاری مذہب اگرچہ اسلام تھا، اور سلطان اور اعیانِ سلطنت اسلام سے محبت کرتے تھے، اور دین کی حمیت رکھتے تھے، قضاۃ و ائمہ، شیخ الاسلام اور دینی عہدہ داروں کا باقاعدہ تقرر ہوتا تھا، احتساب کا محکمہ قائم تھا، قاضی کے فیصلے واجب التعمیل تھے، مدارس میں آزاد دینی تعلیم ہوتی تھی، لیکن سارے نظامِ سلطنت میں اصل کارفرما ذات سلطان اور اس کے معتمد وزراء اور ارکانِ سلطنت کی تھی، اور انہی کا فیصلہ اور دلی منشاء سلطنت کا اصل قانون تھا، اسلامی قوانین کے نفاذ کا رقبہ ان کی وسیع سلطنت میں بہرحال محدود تھا، نظامِ حکومت تقریباً فوجی و عسکری طرز کا تھا، جس کا نہ تو کوئی مدون و مرتب دستور تھا، نہ کوئی مقرر و معین نظام، نہ کوئی مجلسِ شوریٰ تھی۔

ظاہر بیبرس اور اس کے جانشین سلاطین اس کی کوشش ضرور کرتے تھے کہ ان کی سلطنت کے

قوانین واحکام اوران کی کارروائیوں کو علمائے وقت کی تصدیق وتائید حاصل ہوا اور وہ حتی الامکان ان کی رضامندی اور مشورہ سے کام کریں، ایسا بھی ہوا ہے کہ اگر علماء نے کسی نئے اقدام یا قانون کی سختی سے مخالفت کی ہے تو اس کو ملتوی کر دیا گیا ہے، خود ظاہر بیبرس نے مصر وشام میں زمینداروں کی زمینیں اور جاگیریں بحقِ حکومت ضبط کرنی چاہیں، امام نوویؒ نے اس کی سختی سے مخالفت کی بیبرس نے اگرچہ اس پر ناراضگی کا اظہار کیا، اور امام نووی کو اس کی وجہ سے دمشق چھوڑ کر چلا جانا پڑا لیکن اس کا اثر اتنا ضرور ہوا کہ زمینوں کی وہ صورتِ حال باقی رہی، اور بیبرس نے اس میں کوئی ترمیم نہیں کی۔

یہ نظامِ سلطنت موروثی بنیادوں پر قائم تھا لیکن عملاً اس کے خلاف ہو رہا تھا، مگر یہ بھی کسی اسلامی بنیاد پر نہیں تھا، اور نہ اس لئے کہ اسلام کی روح اور اس کی مستند روایات کا تقاضا ہے کہ امیر ذاتی صلاحیت سے متصف ہو، اور اس کو امت کا اعتماد حاصل ہو، بلکہ اس لئے کہ خاندانِ غلامان (ممالیک) کی بنیاد ہی ذاتی جدوجہد شخصی حوصلہ مندی اور کارکردگی پر پڑی تھی، اور اس سلطنت کا یہ مزاج بن گیا تھا کہ جو زیادہ طاقتور اور دلیر ہو وہ زمامِ حکومت اپنے ہاتھ میں لے لے، سلطنت ایوبیہ کے غلاموں نے اپنی ذاتی کوشش اور ہمت سے اپنے آقاؤں کی سلطنت پر قبضہ کیا تھا، یہ سلسلہ اخیر تک جاری رہا، ان میں سے ہر ایک اپنے بیٹے کو جانشین بنانے کی کوشش کرتا رہا، مگر اس کے غلاموں میں جو زیادہ جری اور حوصلہ مند ہوتا، وہ اس کو ہٹا کر خود تختِ سلطنت پر بیٹھ جاتا، تخت وتاج کے ان امکانات نے حوصلہ مندوں میں قسمت آزمائی کا شوق پیدا کر دیا تھا، اور اس کے حصول کے لئے اکثر رسّہ کشی اور زور آزمائی ہوتی رہتی، اسی عرصہ میں اگر تاتاریوں یا فرنگیوں کا حملہ ہوتا تو وہ اکثر متحد ہو جاتے۔

ملک کی اجتماعی واخلاقی حالت

یہ ترکی النسل حکمراں طبقہ اپنی برتری کا احساس رکھتا تھا اور ہر چیز میں عام شہری آبادی سے

ممتاز رہتا تھا، اس کی زبان ترکی تھی، صرف عبادات کے موقع پر یا علماء سے خطاب کے مواقع پر یا عوام سے گفتگو کرنے میں (جس کی نوبت براہِ راست کم آتی تھی) وہ عربی زبان استعمال کرتا تھا، ان میں سے بعض عربی سے اتنی واقفیت رکھتے تھے کہ وہ فرض ادا کرلیں، اس کے ساتھ ساتھ وہ علماء کے قدرداں، مشائخ و صلحاء کے معتقد، مدارس کے قیام اور مساجد کی تعمیر کے شائق تھے، عہدوں کی تقسیم میں کسی خاص نسل یا طبقہ کی تخصیص نہ تھی، پھر بھی بڑے بڑے انتظامی اور فوجی عہدے قدرتی طور پر ترکی النسل سرداروں کو ملتے تھے، حکام اور بڑے بڑے جاگیردار ترک و تاتاری ہوتے تھے، جو کاشتکاروں اور مزدوروں کی محنت سے فائدہ اٹھاتے، ۱۹۷ھ میں حسام الدین لاجین نے اپنے عہد حکومت میں اس کی کوشش کی کہ زمینوں کی تقسیم اس طرح ہو کہ مزارعین کو فائدہ ہو اور ان کی حالت درست ہو، اور زراعت و پیداوار کو بھی ترقی ہو، لیکن حکام کو اس کا یہ رویہ پسند نہ آیا، اور انھوں نے اس کے خلاف بغاوت کردی، شہری آبادی کا ایک اہم عنصر تاتاری تھے، سیف الدین قطز، ظاہر بیبرس اور ناصر الدین قلاؤون کی جو جنگیں تاتاریوں سے ہوئی تھیں، ان میں بشمار تاتاری قید ہوئے اور گرفتار ہو کر مصر و شام میں آئے، اور وہاں انھوں نے سکونت اختیار کرلی، مقریزی کے بیان کے مطابق ظاہر بیبرس کے زمانہ میں مصر و شام ان سے بھر گئے، اور ان کے عادات اور رسم و رواج ملک میں پھیل گئے، اور انھوں نے اگرچہ اسلام قبول کرلیا تھا، لیکن وہ اپنی بہت سی رسوم و عادات پر قائم تھے، اور انھوں نے اپنی قومی خصوصیات کو برقرار رکھا تھا، نومسلموں کے اسلام کی طرف کلیۃً منتقل ہوجانے اور اپنے سابقہ عقائد و خیالات، تہذیبی خصوصیات اور ذہنی اثرات سے بالکل مجرد و یکسو ہوجانے کی مثالیں تاریخ میں بہت کم ہیں، یہ تو صحابۂ کرام کی خصوصیت اور آنحضرت (صلے اللہ علیہ وسلم) کا معجزہ تھا کہ ان کی زندگی میں اسلام و جاہلیت کی کشمکش بالکل ختم ہوگئی تھی، اور گویا دوبارہ وہ اسلام میں پیدا ہوئے تھے، ایک ایسے زمانہ اور سوسائٹی میں جب اسلامی تعلیم و تربیت کا مکمل نظام قائم نہ ہو، اور اسلامی معاشرہ میں نوواردوں کو جذب کرلینے اور از سر نو ڈھال لینے کی صلاحیت نہ رہی ہو،

تاتاریوں اور ترکی النسل عجمیوں کے اسلامی عقائد و عبادات کے سانچہ میں ڈھل جانے اور اپنے قدیم عادات و اخلاق سے یکسر آزاد و دستبردار ہو جانے کی توقع صحیح نہیں ہے، چنانچہ ان تاتاری النسل نومسلموں کی زندگی اسلامی و جاہلی اثرات کا معجون مرکب تھی، مصر کا نامور مورخ مقریزی لکھتا ہے:۔

"ان تاتاریوں کی تربیت دارالاسلام میں ہوئی تھی، انھوں نے قرآن کی اچھی طرح تعلیم حاصل کی اور اسلام کے احکام و قوانین سیکھے لیکن ان کی زندگی حق و باطل کا مجموعہ تھی، اس میں اچھی چیزیں بھی تھیں، اور بری بھی، انھوں نے اپنے دینی معاملات نماز، روزہ، زکوٰۃ، حج، اوقاف، اور یتامیٰ کے مسائل، زوجین کے اختلافات، قرض خواہوں کے تنازعے وغیرہ، قاضی القضاۃ کے سپرد کر رکھے تھے، اور خود اپنے ذاتی معاملات میں چنگیزی عادات و روایات کے پابند اور الیاسا (تاتاری قانون) پر کاربند تھے، انھوں نے اپنے لئے ایک حاکم حاجب کے نام سے مقرر کر رکھا تھا، جو ان کے روزمرہ کے واقعات میں فیصلہ کرے، طاقتور کو نظم و ضبط میں رکھے اور الیاسا کے مطابق کمزور کو اس کا حق دلائے، اسی طرح بڑے بڑے تاتاری سوداگروں کے معاملات کا فیصلہ بھی الیاسا کے مطابق ہوتا تھا، اور جاگیروں اور جائدادوں کے معاملات میں اگر اختلاف واقع ہوتا تو اس کا تصفیہ اس قومی قانون کے مطابق ہوتا۔"[1]

ان ترکی النسل عجمیوں اور ان تاتاری نومسلموں کے عادات و اخلاق، رسم و رواج اور تہذیب و معاشرت حتیٰ کہ عقائد و خیالات کا اثر قدیم عرب اور مسلمان آبادی پر پڑنا لازمی تھا، جس طرح صلیبی جنگوں میں یورپ و ایشیا کا اختلاط ہوا تھا اسی طرح تاتاری یورش اور تاتاریوں کے فاتح اور مفتوح بننے کی حالت میں مشرق و مغرب کا اختلاط ہو رہا تھا، یہ اختلاط و اجتماع میدان جنگ کی آویزش سے شروع ہوا تھا، لیکن تہذیبی و فکری و اخلاقی آمیزش پر ختم ہوا، ہر ایک نے دوسرے کو

---

[1] خطط مصر

متاثر کیا اور ہر ایک نے دوسرے کا اثر قبول کیا۔

اس اختلاط و اجتماع نے بہت سے نئے مسائل پیدا کر دیئے، اور ایک نئی تہذیب اور نئی معاشرت وجود میں آئی جس کے متعلق یہ کہنا مشکل تھا کہ وہ اسلامی تہذیب یا عربی معاشرت ہے، اس صورت حال سے ایک ایسے مصلح اور معلم کی ذمہ داری بہت بڑھ جاتی ہے جو مسلمانوں کی زندگی میں غیر اسلامی اثرات اور جاہلی عادات کو دیکھنا گوارا نہیں کر سکتا، اور جو اس کو سرتاسر کتاب و سنت کے تابع صدر اول اور خیر القرون کے نقش قدم پر اور۔

اُدْخُلُوا فِي السِّلْمِ كَافَّةً   اسلام میں پورے کے پورے داخل ہو جاؤ۔

کی تفسیر دیکھنا چاہتا ہے۔

علمی حالات

اس صدی کے وسط میں علامہ تقی الدین ابو عمرو بن الصلاح (۵۷۷-۶۴۳ھ) شیخ الاسلام عز الدین بن عبد السلام (۵۷۸-۶۶۰ھ) اور امام محی الدین النووی (۶۳۱-۶۷۶ھ) جیسے امام فن موجود تھے، اس صدی کے آخر میں شیخ الاسلام تقی الدین ابن دقیق العید (۶۲۵-۷۰۲ھ) جیسے محدث اور علامہ علاء الدین الباجی (۶۳۱-۷۱۴ھ) جیسے اصولی و متکلم نظر آتے ہیں، ابن تیمیہؒ کے معاصرین میں علامہ جمال الدین ابو الحجاج المزی (۶۵۴-۷۴۲ھ) حافظ علم الدین البرزالی (۶۶۵-۷۳۹ھ) اور علامہ شمس الدین الذہبی (۶۷۳-۷۴۸ھ) جیسے محدث و مورخ موجود تھے، جو اپنے زمانہ میں فن حدیث و روایت کے ارکان اربعہ میں شمار ہوتے تھے، اور جن کی کتابوں پر متاخرین کا دارومدار ہے۔

ان کے علاوہ قاضی القضاۃ کمال الدین ابن الزملکانی (۶۶۷-۷۲۷ھ) قاضی القضاۃ جلال الدین القزوینی (م ۷۳۹ھ) قاضی القضاۃ تقی الدین السبکی (۶۸۳-۷۵۶ھ) اور علامہ ابو حیان النحوی

(۶۵۴-۷۴۵ھ) جیسے کامل الفن اساتذہ اور قوی الاستعداد عالم موجود تھے، جن کا درس مرجعِ خلائق اور جن کا تبحر شہرۂ آفاق تھا۔

علم کی اشاعت ترقی پر تھی، مصر و شام میں ایوبیوں اور ممالیک کے قائم کئے ہوئے بڑے بڑے مدرسے اور دار الحدیث تھے، جن میں اطرافِ عالم کے طلبہ علومِ دینیہ اور علوم عقلیہ کی تعلیم پاتے تھے، مدارس کے ساتھ اور مستقل طور پر بھی بڑے بڑے کتاب خانے تھے، جن میں ہر علم و فن کی نادر کتابیں اور علمی ذخیرہ محفوظ تھا، جس سے ہر طالب علم فائدہ اٹھا سکتا تھا، صرف مدرسۂ کاملیہ میں (جس کو الکامل محمد الایوبی نے ۶۲۱ھ میں قائم کیا تھا) جو کتب خانہ تھا، اس میں ایک لاکھ کتابیں تھیں، اسی صدی میں بعض جلیل القدر کتابیں تصنیف ہوئیں، جو متاخرین کا مرجع ہیں، مثلاً علامہ تقی الدین ابن الصلاح کا "مقدمہ"، شیخ عزالدین بن عبدالسلام کی "القواعد الکبریٰ"، امام نوادی کی مجموع (شرح المہذب) اور شرح مسلم، ابن دقیق العید کی کتاب "الامام" اور "احکام الاحکام شرح عمدۃ الاحکام"، ابوالحجاج المزی کی "تہذیب الکمال" اور علامہ ذہبی کی "میزان الاعتدال" اور "تاریخ الاسلام"۔

لیکن چند شخصیتوں اور علمی کارناموں کو مستثنیٰ کرکے اس صدی کے علم اور تصنیف و تالیف میں وسعت زیادہ تھی، عمق کم تھا، غور و فکر و تعمق کے بجائے نقل و اقتباس کا ذوق غالب تھا، مذاہبِ فقہیہ کے آہنی سانچے بن گئے تھے، جن میں لوچ نہیں تھا، یوں کہنے کو تو حق کو مذاہبِ اربعہ میں دائر مانا جاتا تھا، لیکن عملاً ہر مذہب کے پیرو حق کو اپنے مذہب و مسلک کے اندر محدود مانتے تھے، بہت رعایت سے کام لیتے تو کہتے کہ۔

رأی امامنا صواب یحتمل الخطاء	ہمارے امام کے اجتہادات تمام تر درست ہیں، ان میں
ورأی غیرنا خطاء یحتمل الصواب۔	غلطی کا احتمال ہے، اور دوسرے امام کے اجتہادات
	نادرست ہیں، ان میں صحت کا احتمال ہے۔

ہر مذہب کے پیرو اپنے فقہی مسلک کو تمام مذاہبِ فقہیہ سے افضل و اعلیٰ مقبول و مؤید من اللہ سمجھتے تھے، ان کی تمام ذہانت، قوتِ تصنیف، قوتِ بیانیہ اس کی ترجیح اور اس کی فضیلت ثابت کرنے میں صرف ہوتی تھی، متبعین اپنے مذہب کو حسن نظر سے دیکھتے تھے، اور جو ذہنیت اہلِ مذاہب میں کارفرما تھی، اس کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ جب سلطان الملک الظاہر بیبرس نے پچھلے دستور کے برخلاف شافعی قاضی القضاۃ کے علاوہ باقی تینوں مذاہب کے بھی علیحدہ علیحدہ قاضی القضاۃ مقرر کئے تو فقہاء شافعیہ نے اس کو سخت ناپسندیدگی کی نظر سے دیکھا، اس لئے کہ وہ مصر کو شافعی قاضی القضاۃ کے ماتحت ہی دیکھنا چاہتے تھے، اور سمجھتے تھے کہ قدیم روایات اور امام شافعی کا مدفن ہونے کی وجہ سے مصر پر مذہبِ شافعی ہی کا حق ہے، جب بیبرس کی حکومت کا خاتمہ ہوا، اور اس کے خاندان سے حکومت منتقل ہوئی تو بعض شافعیہ نے اس کو اسی فعل کی سزا اور قدرتی انتقام سمجھا۔[1]

اس فقہی تحزّب (گروہ بندی) کے ساتھ کلامی تعصب بھی انتہا کو پہنچا ہوا تھا، مذاہبِ اربعہ کے پیرو ایک دوسرے کے معترف اور شاگرد و استاد بھی تھے، آپس میں ملتے جلتے بھی تھے، محبت و احترام بھی کرتے تھے، لیکن اشاعرہ و حنابلہ کا اتحاد تقریباً ناممکن تھا، مذاہب میں بحث صرف ارجحیت و اولیت کی تھی، یہاں بحث کفر و اسلام کی تھی، ایک کو دوسرے کی گمراہی پر اصرار تھا، عقائد کی بحثوں نے اور متکلمانہ موشگافیوں نے تمام مباحث کو دبا لیا تھا، اور یہ ذوق ہر ذوق پر غالب تھا، سلطنتوں کو اس سے دلچسپی تھی، اور عوام و خواص سب اس نشہ میں سرشار تھے۔

دوسری طرف تصوّف بھی عروج پر تھا، اس میں بہت سے غیر اسلامی افکار اور عناصر شامل ہو گئے تھے، اور بہت سے پیشہ ور جاہل، غیر محقق اور مبتدع اس گروہ میں شامل ہو کر عوام و خواص کی گمراہی اور شرک و بدعات کی گرم بازاری کا سبب بن رہے تھے۔

---

[1] طبقات الشافعیۃ الکبریٰ۔

فلسفہ کا ایک حلقہ مذہب اور انبیاء کی تعلیمات سے آزاد ہو کر اپنی تعلیمات کی اشاعت میں بعض اوقات علانیہ اور بعض اوقات خفیہ طور پر مصروف تھا، دوسرا حلقہ فلسفہ کو اصل اور معیار قرار دے کر مذاہب کا اس سے پیوند لگانا چاہتا تھا، اور عقل و نقل کی تطبیق کی کوشش کرتا تھا، دونوں حلقے ارسطو و افلاطون کے جامد مقلد اور ان کے افکار و خیالات کی تقدیس، ان کے علوم کی صحت اور ان کی برتری اور مافوق البشری حیثیت کے پورے پورے قائل تھے اور کسی چیز میں ان کے نتائجِ فکر اور تحقیقات سے ہٹنے اور ان کی غلطی تسلیم کرنے کے لئے تیار نہ تھے۔

یہ تھا وہ سیاسی، اجتماعی، اخلاقی، ذہنی و علمی ماحول جس میں ابن تیمیہ نے ہوش سنبھالا، اور جس میں انھوں نے اصلاح و تجدید کا عَلَم بلند کیا۔

ابن تیمیہؒ کا آبائی وطن

دجلہ و فرات کا دوآبہ دو حصوں میں تقسیم ہے (۱) جنوبی جو عراق عربی کہلاتا ہے، اور جس میں بغداد و بصرہ وغیرہ واقع ہیں (۲) شمالی جس کو قدیم عربی لٹریچر میں دیار بکر، دیار ربیعہ اور دیار مضر کے ناموں سے یاد کیا جاتا ہے اور عرب جغرافیہ نویس عام طور پر الجزیرہ کے نام سے یاد کرتے ہیں، اس کے شمال میں آرمینیا، جنوب میں عربی عراق، مشرق میں کردستان اور مغرب میں ایشیائے کوچک اور بادیۃ الشام (صحرائے شام) واقع ہے، اسی علاقہ میں موصل، الرقّہ (البیضاء) نصیبین اور الرہا[1] (ایڈیسا) واقع ہیں، الرہا کے جنوب میں تقریباً ۸ گھنٹے کی مسافت پر مشہور تاریخی شہر حرّان ہے، ابن حوقل کے بیان کے مطابق یہ قدیم زمانہ سے صابئین کا مذہبی و علمی مرکز رہا ہے، فلسفہ اور قدیم یونانی علوم میں اس کو خاص امتیاز اور شہرت حاصل رہی ہے، یہی حران ابن تیمیہ کا آبائی وطن ہے، جہاں ان کا خاندان صدیوں سے آباد تھا۔

---

[1] آج کل اس کو اورفا کہتے ہیں، اور وہ سلطنت ترکی میں شامل ہے۔

ابن تیمیہؒ کا خاندان

ابن تیمیہؒ کا خاندان جو پہلے سے اسرۃ ابن تیمیہ[1] (خاندانِ ابن تیمیہ) کے نام سے مشہور تھا حران کا مشہور علمی اور دینی خاندان تھا .... یہ خاندان (جب سے اس کی تاریخ معلوم ہے) حنبلی العقیدہ اور حنبلی المذہب تھا، اپنے دیار میں اس کو مذہب حنبلی میں پیشوائی کا منصب حاصل تھا، اور اس کے صاحبِ علم افراد ہمیشہ درس و افتاء اور تصنیف و تالیف میں مشغول رہے۔

شیخ الاسلام ابن تیمیہؒ کے دادا ابوالبرکات مجدالدین ابن تیمیہؒ کا شمار مذہب حنبلی کے ائمہ و اکابر میں ہے، بعض اہل علم نے ان کو مجتہد مطلق کے لقب سے یاد کیا ہے[2]، امامِ فنِ رجال حافظ ذہبی کتاب النبلاء میں لکھتے ہیں کہ مجدالدین ابن تیمیہؒ سنہ ۵۹۰ھ کے لگ بھگ پیدا ہوئے، پہلے اپنے چچا مشہور خطیب و واعظ فخرالدین ابن تیمیہ سے علم حاصل کیا، پھر حران اور بغداد کے علماء و محدثین سے علوم کی تحصیل و تکمیل کی، اور فقہ میں کمال حاصل کیا" ذہبی کے الفاظ ہیں۔

وانتهت اليه الامامة في الفقه — فقہ میں ان کو درجۂ امامت حاصل تھا۔

سنہ ۶۵۱ھ کے سفرِ حج میں جب وہ بغداد پہنچے تو علماء ان کی ذکاوت اور کمالات دیکھ کر حیران رہ گئے، ذہبی کہتے ہیں کہ شیخ الاسلام ابن تیمیہؒ نے خود مجھ سے نقل کیا کہ شیخ ابن مالک کہتے تھے کہ اللہ نے علم فقہ کو مجدالدین ابن تیمیہؒ کے لئے ایسا ہی نرم کر دیا ہے، جیسے حضرت داؤد علیہ السلام کے لئے لوہے کو موم کر دیا گیا تھا، وہ یہ بھی کہتے تھے کہ ہمارے دادا (مجدالدینؒ) کی طبیعت میں کچھ تیزی اور جوش تھا، ایک مرتبہ ایک عالم نے

---

[1] ابن تیمیہؒ سے چار پشت اوپر ان کے جد امجد محمد بن الخضر کے وقت سے یہ نسبت شروع ہوئی تھی، اس وجہ تسمیہ میں مورخین کا اختلاف ہے ایک قول یہ ہے کہ محمد بن الخضر کی والدہ کا نام (جو واعظہ تھیں) تیمیہ تھا، اس لئے یہ خاندان تیمیہؒ کی طرف منسوب ہو گیا۔

[2] ترجمۂ صاحب منتقی الاخبار بقلم علامہ محمد بن علی الشوکانی صاحب نیل الاوطار۔

ان سے ایک علمی سوال کیا، انھوں نے فرمایا کہ اس کا جواب ساٹھ طریقہ پر ہے، پھر ایک ایک کر کے پورے جوابات گنا دیئے، اور آخر میں کہا کہ تمہارے لئے اتنا کافی ہے کہ تم ان جوابات کو دہرادو، وہ یہ ذہانت دیکھ کر متحیر رہ گیا، اور خاموش ہو گیا، شیخ الاسلام کہتے ہیں کہ متون کے نقل اور مذاہب کے حفظ میں وہ ایک عجوبۂ روزگار تھے، ان کو اس میں کچھ تکلف اور اہتمام نہیں کرنا پڑتا تھا،[1] ۶۵۲ھ میں ان کی وفات ہوئی ان کی سب سے مشہور تصنیف اور علمی یادگار "منتقی الاخبار" ہے، علماء نے ہر زمانہ میں اس کتاب سے استفادہ اور اس سے اعتناء کیا ہے، مصنف نے اس کتاب میں فقہی ابواب پر وہ احادیث جمع کر دی ہیں، جو اہل مذاہب کی دلیل اور ان کا ماخذ ہیں، آخر میں یمن کے مجتہد عالم اور سرآمد روزگار محدث علامہ محمد بن علی الشوکانی (م ۱۲۵۵ھ) نے "نیل الاوطار" کے نام سے آٹھ جلدوں میں اس کی شرح لکھی، جو اپنی حسن تلخیص و حسن ترتیب فیصلہ کن بحثوں اور مصنف کی وسعتِ نظر اور وسعتِ قلب کی وجہ سے علمی و درسی حلقوں میں خاص وقعت رکھتی ہے۔

شیخ الاسلام کے والد شہاب الدین عبد الحلیم ابن تیمیہ عالم و محدث، حنبلی فقیہ اور صاحبِ درس و افتاء تھے، حران سے دمشق منتقل ہونے کے بعد انھوں نے دمشق کی جامعِ اموی میں جو اکابر علماء و مدرسین کا مرکز تھی، اور جہاں ہر عالم اور مدرس کا کام نہیں تھا کہ درس دے، باقاعدہ درس کا سلسلہ شروع کیا، ان کے درس کی خصوصیت یہ تھی کہ وہ بالکل زبانی اور برجستہ ہوتا تھا، اور وہ اثنائے درس میں کسی کتاب سے مدد نہیں لیتے تھے، تمام تر اپنے حافظہ اور یادداشت پر اعتماد تھا، جامع اموی کے درس و وعظ کے ساتھ وہ دمشق کی دارالحدیث السکریہ کے شیخ الحدیث بھی تھے، وہیں ان کی سکونت بھی تھی، ۶۸۲ھ میں ان کا انتقال ہوا، اور مقابر الصوفیہ میں مدفون ہوئے۔[2]

ولادت اور نقل سکونت

اس نامور اور مخلص علمی و دینی خاندان میں دو شنبہ ۱۰ ربیع الاول ۶۶۱ھ میں تقی الدین ابن تیمیہ

---

[1] یہ سب خصوصیات ان کے پوتے کی طرف منتقل ہوئیں۔ [2] البدایہ والنہایہ (ابن کثیر) ج ۱۳ ص ۳۰۳

کی ولادت ہوئی، باپ نے احمد تقی الدین نام رکھا، بڑے ہو کر انھوں نے ابو العباس کنیت اختیار کی، لیکن خاندانی لقب ابن تیمیہ سب پر غالب آیا، اور وہ اسی نام سے مشہور ہیں۔

یہ زمانہ جیسا کہ اوپر گذر چکا ہے "تاتار گردی کا زمانہ تھا، سارا عالم اسلام ان کی ہیبت سے لرزہ براندام تھا لیکن عراق و جزیرہ کی سرزمین خاص طور پر ان کی جولانگاہ تھی، ابن تیمیہ سات برس کے تھے کہ ان کا وطن حرّان تاتاری حملہ کی زد میں آگیا، تاتاریوں کے حملہ کے بعد علم و فضل، عزت و آبرو اور جان و مال کے لئے کوئی پناہ کی جگہ نہ تھی، آخر مجبور ہو کر ان کا خاندان بھی شرفاء و علماء کے صدہا خاندانوں کی طرح کسی اسلامی ملک میں پناہ ڈھونڈھنے کے لئے نکل کھڑا ہوا، عراق کی طرف جانے کا کوئی سوال نہ تھا، قریب تر ملک جو اس وقت تک تاتاری غارتگروں سے بچا ہوا تھا، شام تھا، جہاں مصر کے طاقتور ملوک سلاطین حکومت کر رہے تھے، آخر اس خاندان نے مغرب ہی کا رخ کیا اور دمشق کی طرف روانہ ہوگئے۔

اس پریشانی اور بے سروسامانی کی حالت میں بھی اس علمی خاندان نے اپنے قیمتی کتب خانہ کو جو کئی پشتوں کا اندوختہ اور ایک بڑا علمی سرمایہ تھا، جدا کرنا گوارا نہیں کیا چنانچہ سب مال و متاع چھوڑ کر کتابیں ایک گاڑی پر بار کیں، اور روانہ ہوگئے، تاتاریوں کا کھٹکا لگا ہوا تھا، ہر جگہ دہشت پھیلی ہوئی تھی، عورتوں اور بچوں کا ساتھ تھا، بڑی مشکل یہ تھی کہ جانوروں کے دستیاب نہ ہونے کی وجہ سے کتابوں کی گاڑی خود کھینچنی پڑتی تھی، قافلہ افتاں و خیزاں چلا جا رہا تھا، ایک جگہ قریب تھا کہ تاتاری سر پر پہونچ جائیں، قباحت یہ ہوئی کہ کتابوں کی گاڑی چلتے چلتے رک گئی، خاندان کے لوگوں نے اللہ تعالےٰ سے دعا کی اور گریہ و زاری کی، اللہ تعالےٰ نے مدد فرمائی اور گاڑی کے پہیے کام کرنے لگے اور قافلہ آگے بڑھا۔[1]

دمشق میں

دمشق پہونچتے ہی اس علمی گھرانہ کی آمد کی خبر ہوگئی، اہلِ علم ابو البرکات مجد الدین ابن تیمیہ کے نام

---

[1] الکواکب الدرّیہ۔

اور کام سے واقف تھے، عبدالحلیم ابن تیمیہ کا علم و فضل بھی معروف تھا، چند دن کے اندر ہی جامع اموی اور دارالحدیث السکّریہ میں ان کا درس شروع ہو گیا، اور وہ طلباء اور حنبلی علماء کا مرجع بن گئے، اور اس خاندان کو اس نئے شہر میں کوئی غربت و اجنبیت محسوس نہیں ہوئی۔

کمسن احمد ابن تیمیہ نے جلد قرآن مجید کے حفظ سے فراغت کر لی، اور حدیث و فقہ و عربیت کی تحصیل میں مشغول ہو گئے، اس عرصہ میں اپنی نو عمری کے باوجود اپنے والد کی مجالسِ درس و وعظ اور علماء کے حلقوں میں شرکت کرتے تھے، اور علمی مذاکرات میں شریک رہتے تھے، جس سے ان کا اخاذ ذہن وسعت و ترقی حاصل کرتا تھا۔

غیر معمولی حافظہ

ابن تیمیہ کا خاندان قوتِ حافظہ اور کثرتِ حفظ میں مشہور تھا، ان کے دادا اور والد دونوں بڑے قوی الحفظ تھے، لیکن تقی الدین ابن تیمیہ اس نعمت میں اپنے پورے خاندان سے سبقت لے گئے، اور بچپن ہی میں ان کے عجیب و غریب حافظہ اور سرعتِ حفظ نے علماء و اساتذہ کو متحیر کر دیا، اور دمشق میں اس کی شہرت پھیل گئی، صاحبِ "العقود الدریہ" لکھتے ہیں کہ:۔

"ایک مرتبہ حلب کے ایک بڑے عالم دمشق آئے، انھوں نے سنا کہ ایک بچہ ہے جس کا نام احمد بن تیمیہ ہے، اور وہ بہت جلد یاد کر لیتا ہے، ان کو اس کے دیکھنے اور امتحان لینے کا شوق ہوا، جس راستہ سے ابن تیمیہ گذرا کرتے تھے، وہاں وہ ایک درزی کی دکان پر بیٹھ گئے، درزی نے کہا کہ وہ بچہ آتا ہو گا، یہی اس کے مکتب کا راستہ ہے، آپ تشریف رکھئے، تھوڑی دیر میں کچھ بچے مکتب جاتے ہوئے گذرے، درزی نے کہا دیکھئے وہ بچہ جس کے پاس بڑی سی تختی ہے، وہی ابن تیمیہ ہے، شیخ نے اس بچہ کو آواز دی، وہ آیا تو اس کی تختی لے لی، اور کہا کہ بیٹا اس تختی پر جو کچھ لکھا ہوا ہے

اس کو پونچھ ڈالو، جب وہ صاف ہوگیا، تو انھوں نے اس پر کوئی ۱۱ یا ۱۳ حدیثیں لکھوا دیں، اور کہا ان کو پڑھ لو، بچہ نے اس کو ایک مرتبہ غور سے پڑھا، شیخ نے تختی اٹھالی، اور کہا کہ سناؤ، بچہ نے پوری حدیثیں سنا دیں، شیخ نے کہا کہ اچھا اب ان کو بھی پونچھ ڈالو، پھر چند سندیں لکھ دیں اور کہا کہ پڑھو، بچہ نے ایک بار غور سے دیکھا، اور پھر سنا دیا، شیخ نے یہ تماشا دیکھ کر فرمایا کہ اگر یہ بچہ جیتا رہا تو کوئی چیز بنے گا، اس لئے کہ اس زمانہ میں اس کی مثال ملنی مشکل ہے۔[1]

محدثین متقدمین کے حافظہ کے جو واقعات معتبر تاریخوں میں منقول ہیں، اور راویانِ حدیث، اور ائمۂ ادب کے خداداد حافظہ کی جو مثالیں تجربہ اور مشاہدہ میں آئی ہیں، ان کے پیش نظر یہ واقعہ بالکل بعید از قیاس اور ناممکن نہیں، خود ابن تیمیہ کی بعد کی زندگی اور ان کے حفظ و نقل کے واقعات سے اس کی تصدیق ہوتی ہے کہ ان کو غیر معمولی حافظہ عطا ہوا تھا۔

تعلیم و تکمیل

ابنِ تیمیہ نے بڑی محنت اور توجہ اور انہماک کے ساتھ علوم کی تحصیل شروع کی، ان کے مورخ اور معاصر بیان کرتے ہیں کہ ان کو کمسنی کے باوجود کھیل کود سے کوئی دلچسپی نہ تھی، اور وہ وقت ضائع نہیں کرتے تھے، بایں ہمہ وہ زندگی اور اپنے زمانہ کی سوسائٹی، شہر کے حالات اور لوگوں کے اخلاق و عادات سے بے خبر اور بے تعلق نہیں تھے، ان کی تصنیفات سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ ان کا زندگی کا مطالعہ وسیع اور عمیق تھا، اور انھوں نے عوام سے الگ تھلگ کسی علمی گوشہ میں زندگی نہیں گزاری تھی۔

ابن تیمیہ نے اپنے زمانہ کے تمام مروجہ علوم کی تحصیل کی، انھوں نے عربیت کی طرف خاص توجہ کی اور لغت و نحو میں اعلیٰ بصیرت حاصل کی، امام نحو سیبویہ کی کتاب "الکتاب" (جو نحو کی سب سے مقبول اور مستند

---

[1] ابنِ تیمیہ (محمد ابوزہرہ) بحوالہ العقود الدریۃ۔ ص ۲۱

کتاب ہے، یہاں تک کہ جب محض الکتاب کہا جائے تو اس سے کتاب سیبویہ ہی مراد ہوتی ہے) کا انھوں نے خاص طور پر بڑے غور وفکر سے مطالعہ کیا،[1] اور اس کے کمزور مقامات اور غلطیوں کی گرفت کی، عربیت اور لغت ونحو پر محققانہ اور ناقدانہ نظر رکھنے اور اپنے اس ادبی ونحوی ملکہ اور رسوخ سے انھوں نے اپنی علمی زندگی اور اپنی تصنیفات ومباحث میں بڑا کام لیا، نثر ونظم کا ایک بڑا حصہ انھوں نے محفوظ کیا، عرب جاہلیت اور عرب ولین کے حالات وواقعات تفصیل سے دیکھے، اور اسلامی عہد اور اسلامی حکومتوں کی تاریخ کا وسیع مطالعہ کیا، یہ وسیع اور متنوع مطالعہ ان کو اپنے بعد کی گوناگوں علمی زندگی میں بہت کام آیا، ان کے معاصرین ومناظرین میں کوئی وسعتِ نظر اور وسعتِ مطالعہ میں ان کا مقابلہ نہیں کر سکتا تھا، ان کے علمی تفوق کا یہ بھی ایک بڑا سبب تھا۔

نظری علوم کے علاوہ انھوں نے کتابت وخوشنویسی اور حساب وریاضی کی طرف بھی توجہ کی اور ان کو ان کے اساتذہ سے حاصل کیا۔[2]

علوم دینیہ میں فقہ واصولِ فقہ، فرائض اور حدیث وتفسیر کی طرف پوری توجہ کی، فقہ حنبلی ان کے گھر کی چیز تھی، اور خود ان کے والد اس سلسلہ میں شفیق استاد، تجربہ کار عالم اور بہترین مشیر ورہنما تھے، اس زمانہ میں حدیث کی کتابت وحفظ اور سماع کا عام رواج تھا، ابنِ تیمیہ نے سب سے پہلے امام حُمیدی کی کتاب "الجمع بین الصحیحین" حفظ کی، پھر اساتذۂ وقت اور علمائے وقت اور علمائے شام سے حدیث کی سماعت اور کتابت کی، ابن عبدالہادی کا بیان ہے کہ حدیث میں ابنِ تیمیہ کے شیوخ کی تعداد دو سو (۲۰۰) سے متجاوز ہے،[3] ان کے خاص شیوخِ حدیث میں ابن عبدالدائم المقدسی اور ان کے طبقہ کے لوگ ہیں، مسند امام احمد کی کئی بار سماعت کی، اسی طرح صحاح ستہ کی سماعت کی کئی بار نوبت آئی۔[4]

تفسیر ابن تیمیہ کا محبوب موضوع تھا، اور ان کو اس سے خاص دلچسپی تھی، ان کا خود بیان ہے کہ

---

[1] الکواکب الدریہ [2] ۔۔۔۔ ایضاً ص ۲

انھوں نے تفسیرِ قرآن میں چھوٹی بڑی.. ا سے زائد کتابوں کا مطالعہ کیا[۱]۔اس فن سے ان کو فطری مناسبت تھی،قرآن مجید کی تلاوت، تدبّر اور مطالعہ کی کثرت سے اللہ تعالیٰ نے ان پر علوم قرآن کا خاص افاضہ فرمایا تھا، کتابوں کے علاوہ خود صاحبِ کتاب کی طرف رجوع کرتے تھے،اوراس سے فہم قرآن اور شرحِ صدر کی دولت مانگتے تھے،اپنی طالب علمی اور اپنے تدبر فی القرآن کے طریقہ کے متعلق وہ خود بیان کرتے ہیں:۔

وربما طالعت على الآية الواحدة نحو مائة	بعض اوقات ایک آیت کے لئے میں نے سو تفسیریں
تفسير ثم أسأل الله الفهم وأقول يا معلّم	کا مطالعہ کیا ہے، مطالعہ کے بعد میں اللہ تعالیٰ سے
آدم وابراهيم علّمني وكنت اذهب الى	دعا کرتا کہ مجھے اس آیت کا فہم عنایت ہو، میں عرض
المساجد المهجورة ونحوها وامرّغ وجهي	کرتا کہ اے آدم وابراہیمؑ کے معلّم مجھے تعلیم فرما، میں سنسان
في التراب واسأل الله تعالى واقول يا معلّم	اور غیر آباد مسجدوں اور مقامات کی طرف چلا جاتا اپنی
ابراهيم فهّمني[۲]	پیشانی خاک پر ملتا اور کہتا کہ اے ابراہیم کو تعلیم دینے
	والے مجھے سمجھ عطا فرما!

اس زمانہ میں (بالخصوص مصر وشام میں) اشاعرہ کے علم کلام کا زور تھا،سلطان صلاح الدین خود اشعری العقیدہ تھا،مورخ مصر مقریزی کا بیان ہے کہ سلطان نے بچپن میں قطب الدین ابوالمعالی اشعری کا متن (جو انھوں نے عقائد کے بارے میں تصنیف کیا تھا) حفظ کیا تھا،اور بعد میں اپنے خاندان کے بچوں کو حفظ کراتا تھا،اس نے اور اس کے جانشینوں (بنی ایوب) نے لوگوں کو اشعری عقیدہ کا پابند کر دیا تھا،ان کے زمانہ اور ان کے جانشینوں (ممالکِ مصر) کے زمانہ تک اشعری عقیدہ کو حکومت کی سرپرستی اور حمایت حاصل تھی۔

حنابلہ صحیح یا غلط طریقہ پر اشاعرہ کے حریف اور مدمقابل سمجھے جاتے تھے، دونوں فریق بحث وگفتگو میں مشغول رہتے،اشاعرہ کا علم کلام اور طریق اثبات عقلی استدلال اور منطقی برہان پر مبنی تھا،حنابلہ نصوص

---

[۱] تفسیر سورۃ النور (ابن تیمیہ) صفحہ ۱۳۶

[۲] العقود الدریہ صفحہ ۲۶

اور آیات واحادیث کے ظاہری مفہوم سے بحث کرتے تھے علم کلام میں عدم تعمق اور منطق و فلسفہ سے عدم اشتغال کی وجہ سے بعض اوقات بحث و مناظرہ میں حنابلہ کا پلڑا ہلکا معلوم ہوتا تھا، اوران کے متعلق یہ تخیل قائم ہوتا جاتا تھا کہ یہ عقلیات سے بے خبر اور ظاہری و سطحی علم کے لوگ ہیں، غالباً اسی احساس نے ابن تیمیہ جیسے غیور و ذکی الحس نوجوان عالم کو علم کلام کے وسیع اور گہرے مطالعہ اور عقلیات اور فلسفہ و منطق سے براہِ راست واقفیت کی طرف متوجہ کیا، انھوں نے ان علوم کا گہرا مطالعہ کیا اوران پر ایسا عبور حاصل کیا کہ وہ خود ان علوم کی کمزوریوں اوران کے مصنفین و ائمہ حتی کہ حکمائے یونان کی غلطیوں سے واقف ہو گئے اور انھوں نے ان علوم کی تنقید میں ایسی مدلل اور عالمانہ کتابیں لکھیں جن کا جواب فلسفہ کا پورا حلقہ نہیں دے سکا۔

غرض ابن تیمیہ نے اپنے زمانہ میں کتاب و سنت کی ترجمانی، دین کی صداقت و برتری ثابت کرنے اور علمی و عملی گمراہیوں کو دور کرنے کے لئے ایسی وسیع اور مکمل علمی تیاری کی جس کی اس ترقی یافتہ علمی دور اور فکری و دینی انتشار کے زمانہ میں ضرورت تھی، انھوں نے ان تمام اسلحہ کا استعمال سیکھا جن سے ان کے حریف اور مخالفین اسلام (یہود و نصاریٰ، فلاسفہ اور باطنیہ) مسلح تھے، انھوں نے وہ علمی تبحر پیدا کیا کہ ان کے معاصرین دیکھ کر دنگ رہ گئے، ان کے مشہور حریف علامہ کمال الدین الزملکانی ان کی علمی جامعیت اور ہمہ دانی کا اعتراف ان الفاظ میں کرتے ہیں۔

قد الان اللہ لہ العلوم کما الان لداؤد	ابن تیمیہ کے لئے اللہ تعالیٰ نے علوم اس طرح نرم
الحدید کان اذا سئل عن فن من العلم	کر دیئے تھے، جیسے داؤد (علیہ وعلی نبینا الصلوٰۃ
ظن الرائی والسامع انہ لایعرف غیر	والسلام) کے لئے لوہا نرم کر دیا تھا، جس علم کے بارہ
ذالک الفن وحکم ان احدًا لایعرفہ	میں ان سے سوال کیا جاتا، اس طرح جواب دیتے کہ
مثلہ وکان الفقہاء من سائر الطوائف	دیکھنے والا اور سننے والا یہ سمجھتا کہ وہ اس فن کے سوا کچھ
اذا جلسوا معہ استفادوا فی مذاھبھم	نہیں جانتے اور یہ فیصلہ کرتا کہ ان کی طرح کوئی اس

منه مالم يكونوا عرفوه قبل ذلك، ولا يعرف انه ناظر احدًا فانقطع منه ولا تكلم في علم من العلوم سواءً كان من علوم الشرع او غيرها الا فاق فيه اهله والمنسوبين اليه وكانت له اليد الطولى في حسن التصنيف۔[1]

فن کا عالم نہیں، ہر مذہب و فقہ کے علماء جب ان کی مجلس میں شریک ہوتے تو ان کو کوئی نہ کوئی ایسی چیز معلوم ہوتی جو ان کو پہلے سے معلوم نہیں تھی، یہ کبھی نہیں ہوا کہ انھوں نے کسی سے مناظرہ کیا ہو اور بند ہو گئے ہوں، جب کبھی انھوں نے کسی شرعی یا عقلی علم میں کلام کیا تو ماہرین فن سے اور اس کے مخصوص عالموں سے بڑھ گئے، تصنیف میں بھی ان کو یدِ طولیٰ حاصل تھا۔

ابنِ تیمیہ کا پہلا درس

ابھی ابن تیمیہ کی عمر ۲۲ ہی سال کی تھی کہ (۶۸۲ھ میں) ان کے جلیل القدر والد عبدالحلیم ابن تیمیہ کا انتقال ہوا، اور دار الحدیث السکریہ میں ان کی مسند درس خالی ہو گئی۔

لیکن یہ مسند درس زیادہ دن خالی نہیں رہنے پائی، ۲ محرم ۶۸۳ھ کو ان کے قابلِ فخر فرزند احمد تقی الدین ابن تیمیہ نے اس کو زینت دی، اور پہلا درس دیا، اس وقت ان کی عمر ۲۲ سال کی تھی، درس میں دمشق کے مشہور فضلاء و عمائد شریک تھے، قاضی القضاۃ بہاء الدین ابن الزکی الشافعی بنفس نفیس موجود تھے، علماء شافعیہ میں سے ان کے علاوہ شیخ الشافعیہ شیخ تاج الدین الفزاری، علمائے حنابلہ میں سے زین الدین بن المنجا الحنبلی اور دوسرے سربرآوردہ علماء حاضر تھے، اس درس سے تمام حاضرین بیحد متاثر اور نوجوان عالم کے تبحر علمی، حاضر دماغی اور جرأت و فصاحت کے معترف تھے، حافظ ابن کثیر جو شیخ الاسلام کے تلامذہ میں ہیں ۶۸۳ھ کے واقعات کے ضمن میں اس درس کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

---

[1] الکواکب الدریۃ صہ

وكان درسًا هائلا، وقد كتبه الشيخ	یہ جیرالعقول درس تھا، شیخ تاج الدین الفزاری
تاج الدين الفزاري بخطه لكثرة فوائده	نے اس کے کثیر فوائد اور لوگوں کی عام پسندیدگی کی
وكثرة ما استحسنه الحاضرون وقد اطنب	وجہ سے اس کو اپنے قلم سے ضبط کیا، حاضرین نے
الحاضرون في شكره، على حداثة سنه و	ابن تیمیہ کی کم عمری اور جوانی کی بنا پر اس درس کی
صغره فانه كان عمره اذ ذاك عشرين	بڑی تعریف کی اور ان کو بہت داد دی، اس لئے
سنة وسنتين[1]۔	کہ ان کی عمر اس وقت ۲۲ سال کی تھی۔

اگلے مہینہ (صفر) کی دسویں تاریخ کو جمعہ کے دن ابن تیمیہ نے اپنے والد کی جگہ پر جامع اموی میں تفسیر کا درس دیا، ان کے لئے خاص طور پر منبر رکھا گیا تھا، انھوں نے سلسلہ وار تفسیر بیان کرنی شروع کی، روز بروز مجمع میں اضافہ ہوتا چلا گیا، ابن کثیر لکھتے ہیں کہ وہ اپنے درس تفسیر میں اس کثرت سے علوم اور جدید مضامین بیان کرتے تھے کہ سامعین کی تعداد بڑھتی چلی گئی، اسی کے ساتھ ان کی دینداری زہد و عبادت کی وجہ سے لوگ اور گرویدہ ہوتے تھے اور ان کی شہرت دور دور کے شہروں اور ملکوں میں پھیلتی جاتی تھی، کئی برس تک ان کا یہی معمول رہا[2]۔

حج

۶۹۲ھ میں ابن تیمیہ نے شامی قافلہ کے ساتھ جس کے امیر الباسطی تھے، حج کیا، معان میں جب یہ قافلہ پہنچا تو ایک بڑی تند و تیز ہوا چلی جس میں بہت سے آدمی کام آئے، اونٹ بھی اپنی جگہ پر قائم نہ رہ سکے، کسی کو کسی کا ہوش نہ تھا[3]۔

شاتم رسول کی تعزیر

۶۹۳ھ میں ایک ایسا واقعہ پیش آیا، جس سے ابن تیمیہ کی دینی حمیت اور ایمانی جذبہ کا

---

[1] البدایہ والنہایہ ج ۱۳ ص ۳۰۳ [2] ایضاً [3] ایضاً ص ۳۳۳

عملی اظہار ہوا، دمشق میں عساف نامی ایک عیسائی کے متعلق ایک جماعت نے گواہی دی کہ اس نے حضرت سرورِ عالم صلے اللہ علیہ وسلم کی شان میں گستاخی کی ہے، اس جرم کے بعد اس نے ایک عرب سردار کے پاس پناہ لی، یہ سن کر ابن تیمیہ اور دار الحدیث کے شیخ زین الدین الفارقی اکٹھا ہو کر نائب السلطنت عز الدین ایبک الحموی کے پاس گئے، اور اس واقعہ کی طرف توجہ دلائی، امیر نے اس کو منظور کیا، اور مجرم کو بلا بھیجا، شیخین حاکم کے پاس سے جارہے تھے، اور ان کے ساتھ ایک جمع کثیر تھا کہ عساف کو لوگوں نے آتا ہوا دیکھا، اس کے ساتھ ایک عرب بھی تھا، مجمع یہ دیکھ کر عرب کو گالیاں دینے لگا، عرب نے کہا کہ یہ عیسائی تم سے بہتر ہے، مجمع یہ سن کر مشتعل ہو گیا، اور دونوں پر سنگ باری کرنے لگا اور ایک ہنگامہ برپا ہو گیا، حاکم نے دونوں عالموں (ابن تیمیہ اور فارقی) کو بلایا، اور اپنے سامنے ان کو زدوکوب کیا، عیسائی مسلمان ہو گیا، اور اس کی حفاظت کی ضمانت کی گئی، بعد میں دونوں عالموں کو چھوڑ دیا گیا، اور حاکم نے ان سے معافی مانگی، اسی زمانہ میں ابن تیمیہ نے اپنی مشہور کتاب "الصارم المسلول علی شاتم الرسول" لکھی۔[1]

۱۹ شعبان ۶۹۵ھ میں شیخ الحنابلہ علامہ زین الدین بن منجیٰ شیخ المدرسۃ الحنبلیہ نے وفات پائی، تو ان کی قائم مقامی اور مدرسہ حنبلیہ کی صدارت تدریس بھی ابن تیمیہ کے سپرد ہوئی۔[2]

پہلی مخالفت

ابن تیمیہؒ درس و تدریس میں مشغول تھے اور عوام و خواص میں ان کی مقبولیت و شہرت روز افزوں تھی کہ ۶۹۸ھ میں ان کے خلاف پہلی شورش برپا ہوئی اور ان کی ذات اور ان کے عقائد موضوعِ بحث بنے۔

اس واقعہ کی تفصیل یہ ہے کہ ۶۹۸ھ میں شہر حماۃ (شام) کے چند باشندوں نے ایک استفتاء مرتب کر کے بھیجا، جس میں دریافت کیا گیا تھا کہ "اَلرَّحْمٰنُ عَلَی الْعَرْشِ اسْتَوٰی" "ثُمَّ اسْتَوٰی اِلَی السَّمَآءِ"

---

[1] البدایہ والنہایہ۔ ج ۱۳ ص ۳۳۵-۳۳۶ [2] ایضاً ص ۳۴۴

جیسی آیات اور "ان قلوب بنی آدم بین اصبعین من اصابع الرحمٰن" اور "یضع الجبار قدمہ فی النار" وغیرہ احادیث کے بارہ میں علماء کی کیا تحقیق، اور صفات کے بارہ میں علماءِ اہلِ سنت کا کیا مسلک ہے؟

شیخ الاسلام نے اس کا مبسوط و مفصل جواب[1] دیا، صفات کے بارہ میں صحابہ، تابعین، ائمہ مجتہدین، متکلمین، متقدمین (امام ابوالحسن اشعریؒ، قاضی ابوبکر الباقلانیؒ اور امام الحرمین تک) کا مسلک ان کے اقوال اور ان کی تصانیف سے بیان کیا، اور ان کی کتابوں کے اقتباسات سے ثابت کیا کہ سب حضرات ان صفات پر ایمان لانا ضروری سمجھتے ہیں، ان کی وہ حقیقت تسلیم کرتے ہیں، جو اللہ تعالیٰ کی شان کے مطابق اور اس کی ذات (لیس کمثلہ شیٔ) کے لائق اور تشبیہ و تجسیم نیز نفی و تعطیل سے منزہ اور پاک ہے، یعنی نہ تو ان صفات کو مخلوق کی صفات پر قیاس کرتے ہیں، نہ تنزیہ و تقدیس کے غلو و افراط میں ان کی نفی اور ان کا انکار کرنے لگتے ہیں، نہ ان کی ایسی تاویل کرتے ہیں جس سے وہ حقیقت سے دور اور محض کنایہ اور مجاز بن کر رہ جائیں، بلکہ جس طرح خود اس کی ذات اور اس کی صفات سبعہ (حیاۃ، علم، قدرت، سمع، بصر، کلام، ارادہ) پر ایمان لاتے ہیں، اور ان کی وہ حقیقت تسلیم کرتے ہیں، جو ذاتِ الٰہی اور شانِ خداوندی کے لائق ہے، اسی طرح الفاظ منصوص، وجہ، ید، غضب و رضا، فی السماء، علی العرش، فوق کو بھی "حقیقۃً" بلا کسی تاویل کے تسلیم کرتے ہیں، اور ان کی وہ حقیقت ثابت کرتے ہیں، جو اس منزہ و مقدس ذات اور بے چوں و بےچگوں و بے مثال و بے قیاس ہستی کے شایانِ شان ہے، ان دونوں قسم کی صفات میں ان حضرات کا مسلک اور رویہ علیحدہ علیحدہ اور متضاد نہیں ہے، اور جس طرح حیات، علم، قدرت وغیرہ پر ایمان لانے سے یہ لازم نہیں آتا کہ مخلوقات اور محدثات کی سی کمزور حیات اور ان کا محدود و مستعار علم اور ناقص قدرت مراد ہے، اور نہ ان صفات کی حقیقت پر

---

[1] یہ جواب "الفتویٰ الحمویۃ الکبریٰ" کے نام سے مشہور ہے، یہ تقریباً ۵۰ صفحہ کا رسالہ ہے جو "مجموعۃ الرسائل الکبریٰ" میں شامل ہے اور ۱۳۲۳ھ میں مصر سے شائع ہوا ہے۔

ایمان لانے والے کو "مجسمہ" کا خطاب دیا جا سکتا ہے، اسی طرح یَدُ اللہِ فَوقَ اَیدِیھِم، وَیَبقیٰ وَجہُ رَبِّکَ، اَلرَّحمٰنُ عَلَی العَرشِ استَویٰ، ءَاَمِنتُم مَّن فِی السَّمَآءِ پر بلا تاویل ایمان لانے سے یہ مطلب نکالنا صحیح نہیں ہے کہ مخلوق وحادث کا سا وجود اور یَد مراد ہے اور اسی طرح کی فوقیت ومکانیت مقصود ہے جو ایک محدود کی دوسرے محدود پر اور ایک جسم کی دوسرے جسم کے ساتھ ہوتی ہے، اور نہ ان صفات کی حقیقت پر ایمان لانے والے کو تجسیم وتشبیہ کا طعنہ دینا درست ہے اس سلسلہ میں انھوں نے سلف اولین اور متکلمین متقدمین کے جو اقوال اور عبارتیں نقل کی ہیں، ان سے اسی مسلک کی تائید ہوتی ہے، وہ کہتے ہیں کہ "اس کے خلاف نصاً وظاہراً ایک لفظ بھی صحابہ وتابعین وسلف سے ثابت نہیں، ان میں سے کسی نے یہ نہیں کہا کہ اللہ آسمان پر نہیں ہے، یا وہ عرش پر نہیں ہے، یا وہ ہر جگہ ہے، اور یہ کہ تمام امکنہ اس کی نسبت سے یکساں ہیں اور یہ کہ نہ وہ عالم میں داخل ہے، نہ اس سے خارج ہے، نہ متصل ہے، نہ منفصل ہے، اور یہ کہ اس کی طرف انگلیوں سے حسّی طور پر اشارہ جائز نہیں، اگر مسلک وہی صحیح ہے، جو نفی کرنے والوں کا ہے تو آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم اور صحابۂ کرام ہمیشہ اس کے خلاف الفاظ کیوں بولتے رہے، اور حق کے اظہار سے ساری عمر کیوں خاموش رہے؟ یہاں تک کہ یہ ایرانی اور رومی اور یہود وفلاسفہ کے پروردہ آئیں اور امت کو صحیح عقیدہ کی تعلیم کریں۔!

پھر انھوں نے ثابت کیا کہ متکلمین متاخرین کچھ تو فلسفۂ یونان کے اثر سے اور کچھ تنزیہ کے جوش وغلو میں ان صفات کی ایسی تاویل کرنے لگے کہ جو حقیقت لغوی، فہم صحابہ اور نصوص حدیث سے بہت دور جا پڑی، اور جس کی سرحد نفی وتعطیل سے ملنے لگی، اس سلسلہ میں وہ علمائے سلف، ائمہ سنت، اور خود متکلمین متقدمین کے مسلک سے دور ہوگئے، یہاں تک کہ وہ سلف کے متعلق ایسے لفظ بولنے لگے، جس سے ان کے علم کی تحقیر ہوتی ہے، جو بہت احتیاط سے کام لیتے ہیں، وہ کہتے ہیں کہ سلف کا طریقہ زیادہ مامون وبے خطر، مگر خلف کا طریقہ زیادہ علمی اور پر از حکمت ہے، یہ سب سلف کی حقیقت اور

مقام سے ناآشنائی کا نتیجہ اور ناواقفیت کی دلیل ہے، اصل علم سلف کو حاصل تھا، بھلا وارثین انبیاء نائبین رُسُل، حاملین کتاب و سنت سے معرفت الٰہی اور اسماء و صفات کے فہم میں وہ لوگ کیا مقابلہ کرسکتے ہیں، جو مدعیانِ فلسفہ کے چونے بچے اور ہند و یونان کے خوانِ نعمت کے زلّہ رباہیں، فلاسفہ و متکلمین کے آخری اقوال اور دنیا سے کوچ کرنے کے وقت کے مقولے بتلاتے ہیں کہ وہ اپنی موشگافیوں پر نادم، عالم حیرت میں سرگرداں اور اپنی ناکامی و بے حاصلی پر ماتم کناں تھے، ان میں سے بعض نے کہا ہے کہ "ہماری ساری عمر کا اندوختہ قیل وقال کے سوا کچھ نہیں" کسی نے کہا کہ دریائے ناپیدا کنار میں غوطے لگائے اہلِ اسلام کے علوم کو چھوڑ کر بیاباں کی خاک چھانی، اب یہ حال ہے کہ اگر لطفِ خداوندی نے دستگیری نہ کی تو میں کہیں کا نہ رہا، گواہ رہنا کہ اپنی ماں کے عقیدہ پر مررہا ہوں۔"

یہ فتویٰ ایک مستقل علمی رسالہ ہے، جس میں شیخ الاسلام کی علمی و تصنیفی خصوصیات پوری موجود ہیں روانی، قوتِ استدلال، خطابت، قرآن و حدیث سے حسن استشہاد، جدتِ اسلوب، عقلِ عام سے اپیل، برجستگی و بے تکلفی، تاریخی معلومات، متکلمین و فلاسفہ پر بیباک تنقید، یہ سب وہ خصوصیات ہیں، جو اس زمانہ کی عام تصانیف بالخصوص فتاویٰ میں (جو عموماً فقہی و اصطلاحی زبان میں لکھے جاتے تھے) ناپید ہیں۔

اس فتویٰ میں پہلی مرتبہ انھوں نے ایسے واضح اور طاقتور طریقہ پر اس عقیدہ کی توضیح و تبلیغ کی تھی، جو ان کے نزدیک سلف کا عقیدہ اور اہلِ سنت کا اعتقاد تھا، اور ان کے مخالفین کے نزدیک "تجسیم" کا عقیدہ اور بگڑی ہوئی حنبلیت تھی، یہ فتویٰ جس لب ولہجہ اور جس تحدی (چیلنج) کے انداز میں لکھا گیا تھا، اور حنبلی حلقوں میں جس طرح اس کا استقبال ہوا، اس کا قدرتی نتیجہ یہ تھا کہ اشاعرہ و متکلمین کے حلقہ میں جن کو جمہور اور حکومت کی تائید حاصل تھی، اور جو قضاء و افتاء کے سرکاری منصبوں سے لے کر درس و تصنیف کے علمی حلقوں تک پر حاوی تھے، ناراضگی کی ایک لہر اور عام برہمی کی کیفیت پیدا ہوجائے، ابن کثیر ۶۹۸ھ کے واقعات میں لکھتے ہیں:۔

- علماء کا ایک گروہ شیخ الاسلام ابن تیمیہ کی مخالفت میں کھڑا ہوگیا، ان کا اصرار تھا کہ وہ حنفی قاضی شیخ جلال الدین کی مجلس میں حاضر ہوں، اور اس فتویٰ کے متعلق صفائی پیش کریں، ابن تیمیہ نے اس کو منظور نہیں کیا، اس پر شہر میں منادی کرادی گئی کہ یہ فتویٰ قابلِ قبول نہیں، لیکن امیر سیف الدین جاغان نے ابن تیمیہ کی حمایت کی، اور ان لوگوں کو طلب کیا جنھوں نے ہنگامہ کیا تھا، مگر ان میں سے اکثر روپوش ہوگئے، امیر نے منادی کرنے والوں میں سے ایک گروہ کو زدوکوب کیا جس سے باقی خاموش ہوگئے، جب جمعہ کا دن آیا تو شیخ اپنی عادت کے مطابق جامع مسجد میں گئے اور (انک لعلی خلق عظیم) کی تفسیر بیان کی، اگلے روز سنیچر کو وہ قاضی امام الدین (شافعی) کے پاس گئے اور فضلاء کی ایک جماعت بھی وہاں آگئی، ان سب نے فتویٰ حمویہ کے بارے میں ان سے سوال وجواب کیا، اور کئی مقامات کی توضیح چاہی، انھوں نے سب کو مطمئن اور خاموش کر دیا، شیخ واپس آگئے، اور حالات اعتدال پر آگئے۔[1]

ممکن ہے یہ قصہ طول پکڑتا، اور پھر کوئی مخالفت یا شورش پیدا ہوتی، مگر اس کے بعد ہی ایسے حالات پیش آئے کہ ایک عرصہ تک کسی ایسے علمی اختلاف اور بحث ومناظرہ کی فرصت اور ہوش باقی نہیں رہا، یہ تاتاریوں کا حملہ تھا جس میں شیخ الاسلام پہلی مرتبہ ایک عظیم الشان مجاہد اور ایک عمومی قائد کی حیثیت سے نمایاں ہوئے۔

تاتاریوں کا رُخ دمشق کی طرف

سنہ ۶۹۹ھ کا نیا سال شروع ہی ہوا تھا کہ متواتر اطلاعیں اس مضمون کی ملیں کہ ایران وعراق کے تاتاری فرمانروا غازان[2]

---

[1] البدایۃ والنہایۃ ج ۱۴ ص ۴۔ [2] قازان جس کا اسلامی نام محمود ہے چنگیز خاں کا پرپوتا تھا، سنہ ۶۹۴ھ میں اس نے امیر توزون رحمۃ اللہ علیہ کی تبلیغ وترغیب سے اسلام قبول کرلیا تھا، لیکن پانچ سال کے مختصر عرصہ میں سیرت واخلاق کی یکسر تبدیلی اور اسلامی تعلیم وتربیت کی زیادہ توقع نہیں کی جاسکتی، اس لئے باوجود مسلمان ہوجانے کے تاتاریوں کی دہشت انگیزی، غارتگری اور سفاکی میں کوئی فرق واقع نہیں ہوا تھا۔

کی نیت شام پر حملہ کرنے کی ہے اور اس کی فوجوں کا رخ دمشق کی جانب ہے، تاتاریوں کے حملہ کے جو تلخ تجربات اسلامی ممالک کو تھے اور جو روایات قائم ہو چکی تھیں ان کی بنا پر پورے ملک شام میں اس اطلاع سے ایک دہشت پھیل گئی، حلب و حماۃ سے جو دارالسلطنت سے فاصلہ پر ہیں لوگ نکل نکل کر دارالسلطنت کا رخ کرنے لگے، یہاں تک کہ صرف حماۃ سے دمشق تک گھوڑے کا کرایہ دو سو درہم ہو گیا، لیکن لوگوں کو بہت جلد یہ سن کر اطمینان ہوا کہ سلطان مصر (الملک الناصر محمد بن قلاوون) افواج شاہی کے ساتھ شام کی حفاظت اور تاتاریوں کے مقابلہ کے لئے آرہا ہے، ۸ ربیع الاول ۶۹۹ھ کو مصری افواج دمشق میں داخل ہوئیں، اہلِ شہر نے سخت بارش اور کیچڑ کے باوجود بڑی گرمجوشی سے سلطان اور اس کی افواج کا استقبال کیا، شہر آراستہ کیا گیا، جابجا اس کے لئے اور مسلمانوں کی فتح کے لئے دعائیں کی گئیں، ۱۷ ربیع الاول کو سلطان اپنے عساکر کے ساتھ تاتاریوں کا مقابلہ کرنے کے لئے نکلا، حنفی قاضی القضاۃ اور بڑے بڑے علماء اور اعیان شہر ہمرکاب ہوئے، پورا لشکر ساتھ تھا، مجاہد رضاکاروں اور نئے رنگروٹوں کی بھی ایک بڑی تعداد تھی، مسجدوں میں قنوتِ نازلہ اور دعاؤں کا خاص اہتمام کیا گیا۔

سلطان مصر کی شکست اور دمشق کی حالت

دمشق کے باہر، ۲۷ ربیع الاول کو قازان اور سلطان کے درمیان معرکہ پیش آیا، مسلمان جم کر لڑے اور بہادری سے مقابلہ کیا، لیکن مسلمانوں کو شکست ہوئی، سلطانی افواج نے مصر کا رخ کیا اور اہل دمشق نے دمشق میں پناہ لی، اس شکست، مصری افواج کی واپسی اور تاتاریوں کے فاتحانہ دمشق میں داخل ہونے کے خطرہ سے شہر میں بدحواسی پھیلی ہوئی تھی، بڑے بڑے علماء اور سربرآوردہ اشخاص شہر چھوڑ چھوڑ کر مصر کا رخ کر رہے تھے، خود قاضی شافعی، قاضی مالکی بعض دوسرے نامور علماء، حاکم شہر، محتسب اور بڑے بڑے تاجر اور عوام شہر چھوڑ چکے تھے، حکومتی عملہ رخصت ہو چکا تھا، حکام میں سے صرف منتظم قلعہ ابھی مقیم تھا اور شہ

کوئی ذمہ دار حاکم اور منتظم شہر میں موجود نہ تھا، گرانی حد کو پہنچی ہوئی تھی، باہر کی آمد و رفت موقوف تھی، اس پر طرفہ یہ ہوا کہ قیدی جیل خانہ توڑ کر باہر نکل آئے، اور انھوں نے شہر میں لوٹ مچا دی، اوباشوں نے موقع سے فائدہ اٹھایا، باغات (جو اہلِ دمشق کی آمدنی کا بڑا ذریعہ ہے) کے دروازے توڑ ڈالے، اور دروازے اور کھڑکیاں اکھاڑ کر لے گئے، اور اونے پونے کوڑیوں کے مول بیچ ڈالا، اِدھر دمشق میں یہ طوفان بے تمیزی برپا تھا، اُدھر قازان کی آمد آمد کا غلغلہ تھا، جس سے رہے سہے حواس اور پراگندہ تھے۔

ابن تیمیہؒ کی قازان سے ملاقات

یہ حالات دیکھ کر اعیانِ شہر اور ابن تیمیہؒ نے مشورہ کیا، اور یہ قرار پایا کہ ابن تیمیہؒ چند علماء اور رفقاء کی معیت میں قازان سے ملاقات کریں اور دمشق کے لئے پروانۂ امن حاصل کرنے کی کوشش کریں۔

دوشنبہ ۳ ربیع الثانی ۶۹۹ھ کو مقام نبک[1] میں اہلِ دمشق کے نمائندہ اور اسلام کے سفیر ابن تیمیہؒ اور تاتاریوں کے جبار بادشاہ قازان کی ملاقات ہوئی، شیخ کمال الدین بن الانجا جو دمشق سے ابن تیمیہؒ کے ساتھ گئے تھے، اور اس مجلس میں شریک تھے، اس ملاقات کا حال بیان کرتے ہیں:-

> میں شیخ کے ساتھ اس مجلس میں موجود تھا، وہ سلطان (قازان) کو عدل و انصاف کی آیات و احادیث اور اللہ و رسولؐ کے ارشادات و احکام سناتے تھے، ان کی آواز بلند ہوتی جاتی تھی، اور برابر سلطان کے قریب ہوتے جاتے تھے، یہاں تک کہ قریب تھا کہ ان کے گھٹنے اس کے گھٹنے سے مل جائیں، سلطان کو اس سے کچھ ناگواری نہیں ہوئی، وہ بڑی توجہ سے کان لگائے ان کی گفتگو سن رہا تھا، اور ہمہ تن متوجہ تھا، اس پر ان کا رعب ایسا طاری تھا، اور وہ ان سے ایسا متأثر

---

[1] یہ مقام دمشق اور حمص کے درمیان واقع ہے، وہاں کا پانی خاص طور پر مشہور ہے، آج کل ایک سیرگاہ ہے، ۱۳۵۱ھ میں حمص جاتے ہوئے راقم سطور نے یہ جگہ دیکھی تھی۔

تھا کہ اس نے ان لوگوں سے پوچھا کہ یہ عالم کون ہیں؟ میں نے ابھی تک ایسا شخص نہیں دیکھا، اور نہ اس شخص سے زیادہ کوئی دلیر اور قوی القلب آج تک دیکھنے میں آیا مجھ پر ابھی تک کسی کا ایسا اثر نہیں پڑا تھا، لوگوں نے ان کا تعارف کرایا، اور ان کے علمی اور عملی کمالات کا تذکرہ کیا۔

ابن تیمیہؒ نے قازان سے کہا کہ تمہارا دعویٰ ہے کہ تم مسلمان ہو اور مجھے معلوم ہوا ہے کہ تمہارے ساتھ قاضی، امام، شیخ اور موذنین بھی رہا کرتے ہیں، لیکن اس کے باوجود تم نے ہم مسلمانوں پر حملہ کیا، حالانکہ تمہارے باپ اور دادا کافر ہونے کے باوجود ایسے اعمال سے محترز رہے، انھوں نے جو کچھ عہد کیا تھا، وہ پورا کیا اور تم نے جو عہد کیا تھا، وہ توڑ دیا، اور جو کچھ کہا تھا، اس کو پورا نہیں کیا اور بندگانِ خدا پر ظلم کیا؟!

شیخ کمال الدین کہتے ہیں کہ ایسی سخت گفتگو کرنے کے باوجود شیخ بڑے اعزاز واکرام کے ساتھ واپس آئے تاتاریوں کے ہاتھ میں جو مسلمان قید تھے ان کی بڑی تعداد ان کی حسن سفارش سے چھوڑ دی گئی شیخ کہا کرتے تھے کہ غیر اللہ سے تو وہ ڈرے گا جس کے دل میں کوئی بیماری ہے امام احمد ابن حنبل سے کسی نے حکام سے اپنے اندیشہ اور خوف کا اظہار کیا، فرمایا کہ "اگر تم تندرست ہوتے تو کسی سے نہ ڈرتے"[1]

ایک دوسرے ہمراہی قاضی القضاۃ ابوالعباس اتنا اور اضافہ کرتے ہیں:۔

"اس مجلس میں ابن تیمیہؒ اور ان کے رفقاء کے سامنے کھانا رکھا گیا، اور سب شریک ہوگئے لیکن ابن تیمیہ دست کش رہے، دریافت کیا گیا کہ آپ کیوں نہیں شرکت کرتے؟ فرمایا کہ یہ کھانا کب جائز ہے؟ یہ تو غریب مسلمانوں کی بھیڑ بکریوں کے گوشت سے تیار کیا گیا ہے اور لوگوں کے درختوں کی لکڑی کے ایندھن سے پکایا گیا ہے" قازان نے ان سے دعا کی درخواست کی، شیخ نے ان الفاظ کے ساتھ دعا کی کہ خدایا اگر آپ کے نزدیک قازان کا اس جنگ سے مقصد تیرے کلمہ کی بلندی اور

---

[1] الکواکب الدریۃ فی مناقب الامام المجتہد شیخ الاسلام ابن تیمیہؒ تالیف الشیخ مرعی ابن یوسف الکرمی الحنبلیؒ ص ۲۵ شامل مجموعہ فرج اللہ زکی الکردی ص ۱۶۳

بہادنی سبیل اللہ ہے تو اس کی مدد فرما، اور اگر سلطنت دنیا اور حرص دہوس ہے تو اس کو سمجھ دے، حیرت کی بات یہ ہے کہ شیخ دعا کر رہے تھے اور قازان آمین کہہ رہا تھا ہمارا حال یہ تھا کہ ہم اپنے کپڑے سمیٹ رہے تھے کہ اب جلاد کو ان کی گردن مارنے کا حکم ہوگا، ان کے خون کی چھینٹیں ہمارے دامن پر کیوں آئیں؟!

ابو العباس کہتے ہیں کہ :-

"جب مجلس برخاست ہوئی اور ہم دربار کے باہر آئے تو ہم نے کہا کہ آپ نے تو ہماری ہلاکت میں کوئی کسر نہیں اٹھا رکھی تھی، ہم اب آپ کے ساتھ نہیں جائیں گے، انھوں نے کہا کہ میں خود تمہارے ساتھ نہیں جاؤں گا، چنانچہ ہم لوگ تو روانہ ہو گئے اور وہ ذرا دیر ٹھہر کر واپس ہوئے، خوانین و امراء کو جب اس واقعہ کی اطلاع اور ان کی موجودگی کا علم ہوا تو ہر طرف سے انھوں نے ہجوم کیا، اور برکت و حسن اعتقاد میں چاروں طرف سے ان کو گھیر لیا، اور وہ اس شان سے دمشق واپس ہوئے کہ تین سو سواران کی رکاب میں تھے۔

اس کے مقابلہ میں ہم پر یہ گزری کہ ہم راستہ میں تھے کہ ایک گروہ حملہ آور ہوا، اور اس نے ہمارے کپڑے اتار لئے۔"[1]

دمشق میں تاتاریوں کی بے عنوانیاں

اہلِ دمشق کو اگرچہ تاتاری سلطان کی طرف سے پروانۂ امن مل گیا تھا، اور اس کا دمشق میں اعلان بھی ہو گیا تھا لیکن دمشق کے اطراف و نواح میں تاتاریوں کی غارتگری اور بے آئینی جاری تھی، اور شہر پناہ سے باہر ایک غدر سا مچا ہوا تھا، شہر میں نرخ بہت چڑھ گئے تھے، اور گرانی بے حد تھی، اِدھر تاتاریوں نے اہلِ دمشق سے مطالبہ کیا کہ حکومت سابقہ کے جتنے گھوڑے، ہتھیار، اور نقد لوگوں کے پاس چھپا ہوا

[1] الکواکب الدریۃ ص ۲۵

وہ تاتاریوں کے حوالہ کر دیا جائے" تاتاریوں نے سیف الدین[1] قبجق کو اپنی طرف سے حاکم شام مقرر کیا، اور اس نے اہل شہر پر سختی شروع کی، شہر پر تاتاریوں کا قبضہ مکمل طور پر ہو چکا تھا، صرف قلعہ، قلعہ دار ارجواش نے حوالہ نہیں کیا تھا، اور صاف انکار کر دیا تھا، ابن کثیر لکھتے ہیں کہ اس کے محرک ابن تیمیہؒ تھے" انھوں نے قلعہ دار کو پیغام بھیجا کہ جب تک قلعہ کی ایک اینٹ بھی سلامت ہے، قلعہ تاتاریوں کے حوالہ نہ کرنا" قلعہ دار نے آخر وقت تک اس پر عمل کیا اور تاتاریوں کا اس پر عمل دخل اخیر تک نہ ہو سکا[2]، تاتاریوں نے شہر میں دست درازیاں شروع کیں اور قدیم روایات کے مطابق ہر طرح کی بے عنوانیاں کیں، کثرت مسلمان مرد عورت قید کئے، اور غلام بنائے، صرف محلہ صالحیہ کے چار سو افراد قتل اور چار ہزار کے قریب گرفتار ہوئے، بڑے بڑے شریف خاندانوں اور علماء کے گھرانوں کے لڑکے اور لڑکیاں غلام اور باندیاں بنالی گئیں، کتب خانے لوٹ لئے، اور وقف کی کتابیں کوڑیوں کے مول بکیں۔

یہ حال دیکھ کر ابن تیمیہ نے دوبارہ قازان سے ملاقات ضروری سمجھی، وہ ایک جماعت کے ساتھ ۲۵ ربیع الثانی کو پھر سلطان سے ملنے گئے لیکن دو روز انتظار کرنے کے باوجود ان کو سلطان سے ملنے نہیں دیا گیا، اس عرصہ میں دمشق میں خبر گرم ہوئی کہ تاتاری (جو ابھی تک باہر پڑاؤ ڈالے ہوئے تھے) شہر میں داخل ہوا چاہتے ہیں، یہ سن کر لوگوں کے رہے سہے ہوش و حواس جاتے رہے، اور شہر میں کھلبلی پڑ گئی، لوگوں نے شہر چھوڑ کر جانا چاہا، مگر جائیں تو کہاں جائیں؟ تاتاریوں نے قلعہ فتح کرنے کے انتظامات کئے، خندق کھودی جانے لگی، اور منجنیقیں نصب کی گئیں، لوگ اس ڈر سے کہ بیگار میں پکڑے جائیں گے، گھر بیٹھ رہے، ابن کثیر لکھتے ہیں کہ:۔

"راستوں، سڑکوں پر سناٹا تھا، اکا دکا کوئی آتا جاتا نظر آتا تھا، جامع مسجد میں نمازیوں کی تعداد بہت کم رہ گئی تھی، جمعہ کی نماز میں جامع اموی میں بڑی مشکل سے ایک صف پوری ہوتی، اور کچھ آدمی پیچھے ہوتے، جو شخص ضرورتاً نکلتا بھی وہ تاتاریوں کا بھیس بدل کر، اور فوراً واپس آجاتا، پھر بھی

---

[1] جو ترکی النسل اور غالباً تاتاری نو مسلم تھا۔ [2] البدایہ والنہایہ۔ ج ۱۴ ص ۱۷

یہ کھٹکا لگا رہتا کہ شاید واپس آنا نصیب نہ ہو۔[1]

۱۹ر جمادی الاولیٰ کو قازان نے عراق کی طرف کوچ کیا، اور اپنے قائم مقام اور ساٹھ ہزار فوج شام کی حفاظت کے لئے چھوڑ دی، چلتے ہوئے اس نے اعلان کیا کہ "ہم اپنے نائب اور کثیر فوج چھوڑ کر جا رہے ہیں اور اگلے سال موسمِ خزاں میں ہم پھر واپس آئیں گے، اس وقت ہم شام کے ساتھ مصر بھی فتح کریں گے" قازان اگرچہ چلا گیا تھا، مگر دوسرے تاتاری امیر بولائی نے دمشق کے اطراف و جوانب میں لوٹ مار مچا رکھی تھی، کثیر آبادیاں اور بستیاں ویران ہو گئی تھیں، کثیر التعداد مسلمان بچوں کو غلام بنا لیا گیا تھا، خود دمشق سے اس نے بڑی رقم وصول کی تھی، ۸ر رجب کو ابن تیمیہؒ نے بولائی کی لشکر گاہ میں جا کر اس سے خود ملاقات کی، اور قیدیوں کی رہائی کے معاملہ میں اس سے گفتگو کی، اور ایک بڑی تعداد کو رہا کرا لیا،[2] ان رہا ہونے والوں میں مسلمان بھی تھے، اور غیر مسلم شامی (ذمّی) بھی تھے۔[3]

۳ر رجب کو دمشق میں قلعہ دار کی طرف سے اعلان کیا گیا کہ مصری افواج شام کی طرف آ رہی ہیں، اگلے ہی روز بولائی اور اس کے تاتاری ساتھی دمشق چھوڑ کر روانہ ہو گئے، ۷ر تاریخ تک دمشق اور اس کے اطراف تاتاریوں سے بالکل خالی ہو گئے۔

۹ر رجب کو اطلاع ملی کہ سلطان (محمد بن قلاوؤن) اور مصری افواج شام کے استخلاص کے لئے روانہ ہو گئیں، اس وقت دمشق میں کوئی ذمہ دار حاکم اور منتظم نہ تھا، شہر پناہ تاتاریوں کے حملہ سے شکستہ پڑی ہوئی تھی، قلعہ دار ارجواش نے اعلان کرایا کہ "اہلِ شہر، شہر پناہ اور دروازوں کی حفاظت کریں، کوئی اپنے گھر میں نہ سوئے، سب مسلح شہر پناہ پر موجود رہیں" لوگوں نے تعمیل کی ابن کثیر کہتے ہیں کہ "ابن تیمیہؒ کا ان دنوں معمول تھا کہ رات بھر شہر پناہ کا گشت کرتے تھے، اور لوگوں کو جہاد اور رباط فی سبیل اللہ کی آیات سنا کر صبر و قتال کی ترغیب دیتے تھے"[4]

---

[1] البدایہ والنہایہ۔ ج ۱۴ ص ۹ [2] ایضاً ص ۱۰ [3] ابن تیمیہ (محمد ابوزہرہ) ص ۳۹ [4] البدایہ والنہایہ۔ ج ۱۴ ص ۱۱

شراب کے خلاف جہاد

مصری افواج اور مسلمان سلطان کی آمد آمد اور تاتاریوں کے کوچ کوس کر دینے دار مسلمانوں کے حوصلے بڑھ گئے، اور انھوں نے ان خرابیوں کو دور کرنے کا عزم کیا، جو اس ناتربیت یافتہ قوم اور اس کے ناخدا ترس حکام کے زمانہ میں پیدا ہوئی تھیں، حافظ ابن تیمیہؒ اس کام میں پیش پیش تھے، نائب شام سیف الدین قبجق نے شراب خانوں کی خاص سرپرستی کی تھی، اور وہ اس کی آمدنی کا بڑا ذریعہ تھے، اس کے مختصر دورِ حکومت میں متعدد نئے شراب خانے قائم ہوئے تھے، اب ان کے باقی رہنے کے لئے کوئی جواز نہ تھا، دمشق میں کوئی حاکم اور ذمہ دار افسر نہ تھا، ابن تیمیہ نے یہ کام اپنے ہاتھ میں لیا، اپنے تلامذہ اور احباب کے ساتھ سارے شہر کا دورہ کیا، جہاں شراب خانہ نظر آیا، اس کے مٹکے اور جام وسبو توڑ ڈالے، شراب اُنڈیل دی، ان میخانوں میں جو اوباش مقیم تھے، اور افعالِ شنیعہ کے مرتکب ہوتے تھے، ان کی تعزیر کی، شہر میں عام طور پر اس کارروائی پر مسرت کا اظہار کیا گیا۔[1]

بدعقیدہ کوہستانیوں کی تادیب وتبلیغ

۶۹۹ھ میں جب تاتاری لشکر دمشق میں داخل ہوا تھا، اور انھوں نے دست درازی کی تھی تو پہاڑ کے (عیسائی باطنی اور اسماعیلی) باشندوں نے ان کا پورا ساتھ دیا تھا، مسلمان فوجیں جب تاتاریوں سے شکست کھا کر واپس ہو رہی تھیں، اور ان کے علاقہ سے گزریں تو ان کوہستانیوں نے ان پر حملہ کر دیا، ان کے اسلحہ اور گھوڑے چھین لئے، اور بہت سے مسلمانوں کو شہید کیا، انھوں نے کبھی لشکر کی اطاعت نہیں کی تھی، نہ دین حق کو قبول کیا تھا، اور نہ کسی نظام کے پابند تھے۔[2]

---

[1] البدایہ والنہایہ [2] ایضاً

شام کا مطلع صاف ہو جانے اور اندرونی اطمینان حاصل ہو جانے کے بعد ابن تیمیہؒ نے ان مفسدوں کی تادیب و تبلیغ ضروری سمجھی، حسن اتفاق سے اسی زمانہ میں نائب السلطنت جمال الدین آقوش الافرم نے جرد و کسروان نامی پہاڑوں کی طرف فوج کشی کی، ابن تیمیہ نے اس موقع سے فائدہ اٹھایا اور رضاکاروں اور حوران کے باشندوں کی ایک بڑی تعداد کے ساتھ نائب السلطنت کی رفاقت کی، نائب السلطنت کی آمد سن کر قبائل کے سردار ابن تیمیہ کے پاس حاضر ہوئے، شیخ نے ان سے توبہ کرائی، ان کو اچھی طرح تبلیغ کی، اور اس سے بڑا نفع ہوا، انھوں نے مسلمان فوج سے جو کچھ چھینا لوٹا تھا، اس کی واپسی کی ذمہ داری لی، بیت المال کی طرف سے ان پر رقوم عائد کی گئیں، جن کو ادا کرنے کا انھوں نے عہد کیا، اور یہ مہم ۱۳ ذی القعدہ کو کامیاب واپس آئی۔[1]

تاتاریوں کی دوبارہ آمد اور ابنِ تیمیہ کا اعلانِ جہاد

۷۰۰ھ شروع ہی ہوا تھا کہ تاتاریوں کی دوبارہ آمد کی اطلاع دمشق میں پہنچی، لوگوں کے پاؤں تلے کی زمین نکل گئی، اور مصر اور دوسرے مقامات اور محفوظ قلعوں کی طرف بھاگنے کا سلسلہ شروع ہو گیا، لوگ اپنا سامان، پوشاک اور غلہ اونے پونے بیچ کر سفر کا سامان کرنے لگے، سواری کا کرایہ بہت بڑھ گیا، اور جانوروں کے دام کہیں سے کہیں پہنچ گئے، یہ دیکھ کر ابن تیمیہ نے جامع مسجد میں مواعظ اور درس کا سلسلہ سرگرمی سے شروع کیا، لوگوں کو جہاد پر آمادہ کیا، بھاگنے سے غیرت دلائی، اور اس بزدلانہ حرکت کی مذمت کی انھوں نے لوگوں کو مسلمانوں اور مسلمانوں کے ملکوں کی حفاظت و مدافعت کے سلسلہ میں خرچ کرنے کی ترغیب دی اور فرمایا کہ لوگ بھاگنے میں جو روپیہ صرف کر رہے ہیں، یہاں رہ کر مسلمانوں کی حفاظت اور جہاد فی سبیل اللہ میں صرف کریں، وہ کہتے تھے کہ اس مرتبہ تاتاریوں سے کھلے میدان میں مقابلہ

---

[1] البدایہ والنہایہ

کرنا چاہئے، اس مرتبہ ان سے جہاد فرض ہے' ان کی اس مسلسل تقریروں سے لوگوں کی ڈھارس بندھی' ادھر شہر میں سرکاری اعلان ہوگیا کہ کوئی شخص حکومت کی اجازت اور پروانہ کے بغیر شہر نہیں چھوڑ سکتا، اس سے بھاگنے کا سلسلہ بند ہوا' ادھر سلطانِ مصر کی روانگی کی بھی اطلاع ملی جس سے لوگوں کو مزید اطمینان ہوا۔

مصر کا سفر

ربیع الثانی میں پھر تاتاریوں کی آمد آمد کی خبر گرم ہوئی، اور اطلاع ملی کہ وہ مقام بیرۃ تک پہنچ گئے ہیں' شہر میں جہاد کا اعلان عام ہوگیا' تاتاریوں کے آگے بڑھنے کی اطلاعیں پے درپے آرہی تھیں، لوگوں کو تسکین دی گئی' اور کہا گیا کہ اپنا کام دلجمعی سے کریں' سلطان مصر سے روانہ ہوچکے' دفعۃً یہ اطلاع ملی کہ سلطان نے فسخِ عزیمت کردی' یہ سن کر جمے ہوئے قدم اکھڑ گئے' اور لوگ اپنے اپنے اہل وعیال کو مصر اور دوسرے محفوظ مقامات کی طرف منتقل کرنے لگے' یہ حالت دیکھ کر ابن تیمیہ نائب الشام سے ملاقات کے لئے (جو دمشق کے باہر تاتاریوں کو روکنے کے لئے پڑاؤ ڈالے پڑا تھا) تشریف لے گئے انھوں نے اس کو بہت اطمینان دلایا' اور فرمایا کہ ہم مظلوم ہیں' ہم کو ضرور فتح ہوگی اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔

وَمَنْ عَاقَبَ بِمِثْلِ مَا عُوقِبَ بِهِ ثُمَّ	اور جس نے اسی قدر بدلہ لیا جس قدر اسے تکلیف دی
بُغِيَ عَلَيْهِ لَيَنْصُرَنَّهُ اللَّهُ إِنَّ اللَّهَ	گئی تھی' پھر اس پر زیادتی کی گئی تو اللہ ضرور اس کی
لَعَفُوٌّ غَفُورٌ (الحج ــ ۶۰)	مدد کرے گا' بیشک اللہ درگذر کرنے والا معاف کرنے والا ہے

نائب شام اور امراء نے ان سے درخواست کی کہ وہ خود مصر جائیں' اور سلطان کو ملک شام کی حفاظت اور تاتاریوں سے مقابلہ کرنے پر آمادہ کریں' چنانچہ وہ ڈاک کی سواری سے مصر روانہ ہوئے' ان کے پہونچتے پہونچتے سلطان قاہرہ میں داخل ہوچکا تھا' ابن تیمیہ نے سلطان کو بڑی غیرت دلائی اور فرمایا کہ "اگر شام تمہاری سلطنت میں داخل نہ ہوتا، اور بحیثیت سلطان مصر وشام کے تم پر اس کی

براہِ راست ذمہ داری نہ ہوتی جب بھی اگر اہل شام تم سے مدد مانگتے تو تمہیں ان کی مدد کرنی ضروری تھی، چہ جائیکہ شام تمہاری سلطنت کا ایک صوبہ اور تمہاری حکومت کا ایک اہم جزء ہے، اگر تم کو شام کی حفاظت کی کوئی فکر نہیں تو صاف کہہ دو ہم اپنا انتظام خود کرلیں، اور کسی کو وہاں کا حاکم منتخب کریں، جو خطرہ کے وقت اس کی خدمت و حفاظت کرے، اور معتدل حالات میں اس سے فائدہ اٹھائے"

ابن تیمیہ نے سلطان کو یقین دلایا کہ اس مرتبہ فتح مسلمانوں ہی کی ہوگی، وہ آٹھ دن تک قلعۂ مصر میں مقیم رہے، اور جہاد اور تاتاریوں کے مقابلہ کی ترغیب دیتے رہے۔

ابن تیمیہ کی اس ایمان افروز اور یقین آفریں گفتگو اور مخلصانہ مساعی کا یہ نتیجہ ہوا کہ سلطان دوبارہ شام کے لئے آمادہ ہوگیا، اور مصری افواج جہاد کے لئے روانہ ہوگئیں، ابھی اہل دمشق یہ سن کر پوری طرح خوش نہیں ہونے پائے تھے کہ تاتاریوں کے قریب آجانے اور سلطان کی واپسی کی اطلاع پہونچ گئی، غضب یہ ہوا کہ حاکم شہر ابن النحاس نے منادی کرادی کہ جس میں سفر کی طاقت ہو وہ دمشق سے ضرور چلا جائے، یہ سن کر شہر میں ہلچل مچ گئی، بازار بند ہوگئے، لوگ جنگلوں اور میدانوں کی طرف بھاگنے لگے، ہر شخص کی زبان پر تھا کہ اہلِ دمشق کی قسمت میں تو دشمن کا لقمہ بننا لکھا ہے، بڑے بڑے علماء اور دمشق کے اعیان و شرفاء نے شہر سے کوچ کیا، ان کے متعلقین پہلے جا چکے تھے، سربرآوردہ اور معزز لوگوں میں دمشق میں گنتی کے چند آدمی رہ گئے تھے، شہر میں اعلان ہوا کہ جس کی نیت جہاد کی ہو، وہ لشکر سے جاملے، اس لئے کہ تاتاری قریب آگئے ہیں، جو علماء باقی تھے، (جن میں ابن تیمیہ کے چھوٹے بھائی شرف الدین ابن تیمیہ بھی تھے) انھوں نے نائب السلطنت کو ہمت دلائی، اور "مہنا" امیر عرب کو بھی جہاد پر آمادہ کرلیا، اسی عرصہ میں ابن تیمیہ مصر سے واپس آگئے، انھوں نے سلطان کی آمادگی اور ارکانِ سلطنت کے عزم جہاد کی خوشخبری سنائی، ادھر یہ اطلاع ملی کہ سلطان تاتار نے واپسی کا ارادہ کرلیا اور دریائے فرات عبور کرکے عراق پہنچ گیا،

تاتاریوں سے فیصلہ کن جنگ اور ابن تیمیہ کا کارنامہ

رجب ۷۰۲ھ میں باوثوق ذرائع سے معلوم ہوا کہ تاتاری اس مرتبہ شام کا عزم مصمم رکھتے ہیں لوگوں میں اس خبر سے ایک اضطراب پیدا ہوا، نمازوں میں قنوتِ نازلہ کا اہتمام کیا گیا، اور بخاری شریف کا ختم ہوا، لوگ حسب عادت مصر اور محفوظ مقامات کا رخ کرنے لگے جس قدر سلطان مصر اور مصری افواج کی آمد میں تاخیر ہوتی جاتی تھی لوگوں کا اضطراب بڑھتا جاتا تھا، بالآخر ۸ر شعبان کو مصری فوج کا ایک بڑا حصہ نامور ترکی امراء کی قیادت میں پہنچا، پھر دوسرا دستہ پہنچا اور لوگوں میں سکون پیدا ہوا لیکن دوسرے مقامات سے پناہ گزینوں کی آمد کا سلسلہ شروع ہو گیا اور شمالی شہروں سے بکثرت لوگ اپنا اپنا شہر چھوڑ کر دمشق میں آنے لگے مختلف قسم کی افواہیں بھی پھیلنے لگیں، امرائے شام نے جمع ہو کر دشمن کے مقابلہ کا عہد کیا اور قسم کھائی اور شہر میں اعلان کرایا گیا کہ کوئی شہر چھوڑ کر نہ جائے ابن تیمیہ نے دمشق سے باہر جاکر لشکر کو اس کی اطلاع دی اور ان سے بھی اس بات کی قسم لی، وہ امراء اور عوام سے قسم کھا کر کہتے تھے کہ تم اس مرتبہ ضرور فتح پاؤ گے ان کو اس کا اس قدر یقین تھا کہ اگر کوئی کہتا کہ انشاء اللہ تو کہیے تو فرماتے کہ "انشاء اللہ تحقیقاً لا تعلیقاً" وہ فرماتے تھے کہ ہم مظلوم ہیں اور مظلوم کی ضرور مدد ہوتی ہے۔[1]

ثُمَّ بُغِيَ عَلَيْهِ لَيَنْصُرَنَّهُ اللّٰهُ (الحج۔ ۶۰) جس پر زیادتی کی جائے گی اس کی اللہ ضرور مدد کرے گا

اس لئے اس وعدۂ خداوندی کی رو سے ہماری فتح یقینی ہے اس میں ذرہ برابر شک نہیں۔[2]

اس وقت ایک سوال یہ چھیڑا گیا کہ تاتاری بہر حال مسلمان ہیں اس لئے ان سے جنگ کرنے کی فقہی حیثیت کیا ہے؟ وہ نہ کافر ہیں نہ باغی ہیں، باغی اس لئے نہیں ہیں کہ کبھی وہ مسلمان امیر کی اطاعت میں

---

[1] البدایہ والنہایہ۔ ج ۱۴ ص ۱۶

[2] ایضاً ص ۲۳

داخل ہی نہیں ہوئے، اس لئے بغاوت کا بھی سوال نہیں، پھر ان سے جنگ کس بنیاد پر کی جائے؟ علماء کو اس بارہ میں تردد ہوا، ابن تیمیہ نے کہا کہ وہ خوارج کے حکم میں ہیں، خوارج نے سیدنا علیؓ اور حضرت معاویہؓ دونوں کے خلاف بغاوت کی تھی، وہ اپنے کو خلافت کا زیادہ مستحق سمجھتے تھے، یہ تاتاری اسی طرح دوسرے مسلمانوں کے مقابلہ میں اپنے کو حکومت کا زیادہ مستحق سمجھتے ہیں، اور کہتے ہیں کہ ہم ان سے زیادہ حق وانصاف کو قائم کر سکتے ہیں، وہ مسلمانوں پر گناہوں اور مظالم کا الزام لگاتے ہیں اور خود اس سے کہیں بڑھ کر افعالِ شنیعہ اور حرکاتِ ناشائستہ کے مرتکب ہیں، ان کی اس توضیح سے علماء کو اطمینان ہو گیا، اور یہ نکتہ سمجھ میں آ گیا، ان کو اس بارہ میں اتنا وثوق اور اطمینان تھا کہ فرماتے تھے کہ اگر تم مجھے بھی اس حال میں تاتاریوں کی صف میں دیکھو کہ قرآن مجید سر پر رکھا ہے، تب بھی مجھے قتل کر دینا، اس سے لوگوں کا تردّد دور ہوا، اور ان کے حوصلے بلند ہوئے۔

دمشق میں بڑی سراسیمگی تھی، سلطان کی آمد کی اطلاع نہ تھی، شامی و مصری فوجوں کے جنگ کرنے کا یقین نہ تھا، تاتاریوں کی آمد آمد کی اطلاع دم بدم مل رہی تھی، لوگ دوسرے شہروں سے بھاگ بھاگ کر دمشق میں پناہ لے رہے تھے، سارا شہر پناہ گزینوں سے بھرا ہوا تھا، ابن تیمیہ لشکر گاہ جانے کے لئے چلے تو راستہ ملنا مشکل تھا، جن لوگوں کو ان کے عزم کی اطلاع نہ تھی، انھوں نے طعنہ دیا کہ ہمیں تو آپ بھاگنے سے روکتے تھے، اور آپ خود دمشق سے فرار اختیار کر رہے ہیں؟ امام خاموشی سے سنتے ہوئے چلے گئے، شہر میں کوئی حاکم نہ تھا، اوباشوں اور بدمعاشوں نے اُدھم مچا رکھی تھی، لوگ میناروں پر چڑھ چڑھ کر اسلامی لشکر کو تلاش کرتے تھے، اور قیاس آرائی کرتے رہتے تھے، ہر شخص اپنی قسمت کے فیصلہ کا منتظر تھا جنگ ہوتی ہے یا نہیں؟ اگر جنگ ہوتی ہے تو فتح کس کو ہوتی ہے، اگر خدا نخواستہ اسلامی لشکر شکست کھاتا ہے، تو پھر مسلمانوں کا کہیں ٹھکانا نہیں، اور عزت و آبرو جان و مال کی خیر نہیں غرض:-

وَإِذْ زَاغَتِ الْأَبْصَارُ وَبَلَغَتِ الْقُلُوبُ ۔۔۔ اور جب آنکھیں پتھرا گئی تھیں اور کلیجے منہ کو آنے لگے تھے

الحَنَاجِرَ وَتَظُنُّوْنَ بِاللّٰهِ الظُّنُوْنَا هُنَالِكَ ابْتُلِيَ الْمُؤْمِنُوْنَ وَزُلْزِلُوْا زِلْزَالًا شَدِيْدًا (احزاب ۱۰،۱۱)

اور تم اللہ کے ساتھ طرح طرح کے گمان کر رہے تھے اس موقع پر ایمان دار آزمائے گئے اور سخت ہلا دیئے گئے۔

کا نقشہ تھا۔

ابن تیمیہ شامی لشکر میں پہونچے تو امرائے لشکر نے ان سے خواہش کی کہ وہ آگے بڑھ کر سلطان سے ملیں، اور ان سے جلد تشریف آوری کی درخواست کریں، ابن تیمیہ نے سلطان سے ملاقات کی، ابن تیمیہ کی گفتگو سے ان کا عزم پختہ ہو گیا، اور وہ ابن تیمیہ کی معیت میں لشکر گاہ میں آئے، سلطان نے ان سے خواہش کی کہ جنگ کے موقع پر وہ سلطان کے ساتھ ہوں، ابن تیمیہ نے کہا کہ سنت یہ ہے کہ آدمی اپنی قوم کے جھنڈے کے نیچے جنگ کرے، ہم شامی لشکر سے تعلق رکھتے ہیں، اس لئے اسی جھنڈے کے نیچے جنگ کریں گے، انھوں نے سلطان کو دوبارہ جہاد کی تلقین کی، اور کہا کہ خدائے واحد کی قسم کھا کر کہتا ہوں کہ فتح ہماری ہی ہے، اس موقع پر بھی امرا نے ان کو یاد دلایا کہ انشاء اللہ کہنا چاہئے، فرمایا "انشاء اللہ تحقیقاً لا تعلیقاً"

۲۹ شعبان جمعہ کی شب کو رمضان کا چاند ہو گیا، اہل دمشق نے تراویح کی تیاری کی رمضان کی مسرت بھی تھی اور دشمن کا خوف اور مستقبل کا اندیشہ بھی، جمعہ کا دن بہت سخت گزرا، سنیچر کو لوگوں نے میناروں سے دیکھا کہ لشکر کی جانب گرد اور سیاہی ہے، وہ سمجھ گئے کہ آج ہی مقابلہ ہے، دعاؤں کی کثرت ہوئی، عورتیں اور بچے کوٹھوں پر ننگے سر کھڑے تھے، اور شہر میں ایک غلغلہ تھا، سنیچر ۲ رمضان کو ظہر کے بعد سلطان کا فرمان جامع مسجد میں پڑھا گیا کہ "سنیچر کے دن دو گھڑی دن گزرے، شامی اور مصری فوجیں سلطان کی ہمرکابی میں صف آرا ہوں گی، مسلمان اللہ سے فتح و نصرت کی دعا کریں، اور قلعہ اور شہر پناہ کی حفاظت میں مستعد رہیں"۔

۲ رمضان کو شقحب کے میدان میں ایک طرف شامی و مصری فوجیں، دوسری طرف تاتاری لشکر صف آرا ہوا، ابن تیمیہ نے فتویٰ دیا کہ مجاہدین کو روزہ کھول لینا چاہئے تاکہ جنگ کی طاقت پیدا ہو، وہ ایک ایک علم اور ایک ایک دستہ کے پاس خود جاتے تھے، ان کے ہاتھ میں کھانے کی کوئی چیز تھی،

وہ ان کو دکھا کر افطار کرتے تھے، اور حدیث سناتے تھے کہ:۔

انکم ملاقوا العدو غدا والفطر اقوی لکم۔ — آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ کل دشمن سے تمہارا مقابلہ ہونے والا ہے اور روزہ نہ رکھنے کی حالت میں تم زیادہ قوی ہو گے۔

جنگ شروع ہوئی، سلطان خود بنفس نفیس لشکر میں موجود تھا، خلیفۂ عباسی ابوالربیع سلیمان سلطان کے پہلو میں تھے، بالآخر دونوں لشکر آپس میں گتھ گئے، اور جنگ کا بازار گرم ہوا، سلطان نے بڑی ثابت قدمی دکھائی، اس نے اپنے گھوڑے کے پاؤں میں بیڑیاں ڈال دیں کہ بھاگنے نہ پائے، اس نے اللہ سے اس موقع پر عہد کیا، سخت معرکہ ہوا، بڑے بڑے ترکی امراء کام آئے بالآخر مسلمانوں کو فتح ہوئی، اور تاتاریوں کے قدم اکھڑ گئے رات کو تاتاریوں نے ٹیلوں، پہاڑوں اور ٹیکریوں پر پناہ لی، مسلمانوں نے رات بھر پہرہ دیا، اور ان کو بھاگنے نہیں دیا، اور اپنے تیروں پر رکھ لیا، بکثرت تاتاری قتل ہوئے، صبح مسلمان ان کو رسیوں میں باندھ باندھ کر لاتے تھے، اور گردن اڑا دیتے تھے، بھاگنے والوں میں سے ایک کثیر تعداد گھاٹیوں اور خطرناک جگہوں میں گر کر اور بہت سے دریائے فرات میں ڈوب کر ہلاک ہوئے۔

دوشنبہ ۴ رمضان کو ابن تیمیہ دمشق میں داخل ہوئے، لوگوں نے ان کا بڑا استقبال کیا، ان کو مبارکباد اور دعائیں دیں۔

سہ شنبہ ۵ رمضان ۷۰۲ھ کو سلطان، اعیان سلطنت، خلیفہ اور افواج شاہی کے ساتھ منصور و کامران دمشق میں داخل ہوا۔

انکار بدعات اور ازالۂ منکرات

تاتاریوں کے قصہ سے فرصت پاکر ابن تیمیہ نے حسبِ معمول سابق پوری سرگرمی کے ساتھ درس و تدریس،

اشاعتِ سنت اور ردِّ بدعات کا کام شروع کر دیا، اور شرک وجاہلیت کے خلاف جہاد میں مشغول ہو گئے، جو ان کا محبوب مشغلہ اور زندگی کا ایک بڑا مقصد تھا، اس زمانہ میں عیسائیوں اور یہودیوں کے اختلاط اور فاسد العقیدہ اور جاہل مقتداؤں کی تعلیم سے مسلمانوں میں بہت سے ایسے اعمال آ گئے تھے، جو جاہلیت کی یادگار اور مشرک وبت پرست اقوام کا شعار تھے، دمشق کے نواح میں نہر قلوط کے کنارہ ایک چٹان تھی، جس کے متعلق مختلف قسم کی روایات مشہور تھیں، یہ جہلاء اور توہم پرست مسلمانوں کے لئے ایک فتنہ بن گیا تھا، مسلمان جاتے تھے، اور وہاں منتیں مانتے تھے، ابن تیمیہ رجب ۷۰۴ھ کو مزدوروں اور سنگ تراشوں کے ساتھ وہاں خود گئے، اور اس کو کاٹ کر شرک کے اس دروازہ کو بند کر دیا، اور ایک بڑا فتنہ ختم ہوا۔[۱]

وہ شریعت اور سنت کے خلاف جو عمل دیکھتے، اس کو حتی الامکان اپنے ہاتھ سے بدل دینے اور روکنے کی کوشش کرتے، اس لئے کہ ایمان کا یہ اعلیٰ درجہ اور دینی حمیت کا اوّلین تقاضہ ہے۔

من رای منکم منکرا فلیغیرہ بیدہ	تم میں سے جو کوئی خلافِ شرع امر (منکر) دیکھے، وہ
فمن لم یستطع فبلسانہ فمن لم	اس کو اپنے ہاتھ سے بدل دے جو ایسا نہ کر سکے وہ اپنی زبان
یستطع فبقلبہ وذلک اضعف	سے اس کی مخالفت اور اصلاح کرے جو ایسا بھی نہ کر سکے
الایمان۔	وہ اپنے دل سے اس کی مخالفت کرے، اور یہ ضعیف
	ترین ایمان ہے۔

حکام کو امور سلطنت سے فرصت نہ تھی، علماء بعض اوقات بہت سی چیزوں کو اہمیت نہیں دیتے تھے، اور بعض اوقات انکار ومخالفت کرتے جھجکتے تھے، اس لئے ابن تیمیہ کو اکثر یہ کام خود انجام دینا پڑتا تھا، ان کے ساتھ ان کے تلامذہ ومحبین کی ایک جماعت تھی، جو ان کی مددگار اور رفیق تھی، اس لئے انھوں نے اعزازی طور پر حسبۃً للہ ایک طرح کا شرعی اور اخلاقی احتساب قائم کر رکھا تھا اور

---

[۱] البدایہ والنہایہ۔ ج ۱۴ ص ۳۴

مبتدعین و مخالفینِ سنت، حکام کی نگرانی اور علماء کے عتاب سے اگر بچ بھی جاتے تھے تو اس "شرعی پولیس" کی نظر سے نہیں بچ سکتے تھے۔

رجب ۷۰۴ھ ہی کا واقعہ ہے کہ ان کے پاس ایک پیر مرد جو اپنے کو "المجاهد ابراهیم بن القطّان" کہتا تھا لایا گیا جو بہت لمبی چوڑی گدڑی پہنے ہوئے تھا، بال اور ناخن بڑھے ہوئے تھے، لبیں منہ پر آرہی تھیں، گالی اور فحش کثرت سے بکتا تھا، اور نشہ آور چیزوں کا استعمال بھی کرتا تھا، ابن تیمیہ نے اس کی گدڑی کے ٹکڑے ٹکڑے کر دینے کا حکم دیا، سب طرف سے لوگ ٹوٹ پڑے اور اس کا تار تار "تبرک" ہو گیا، سر کے بال اور لبیں ترشوائیں، ناخن کٹوائے، فحش گوئی اور نشے سے اس کو توبہ کرائی گئی[1]۔

اسی طرح ایک معمر شخص محمد الخباز البلاسی کے نام سے مشہور تھا، وہ حرام چیزوں کا استعمال کرتا تھا، یہودیوں عیسائیوں کے پاس اس کی نشست و برخاست تھی، خوابوں کی تعبیر دیتا تھا، اور ان مسائل و علوم میں دخل دیتا تھا جن کا علم نہیں رکھتا تھا، ابن تیمیہ نے اس کو بھی طلب کرایا، اور اس سے بھی ان تمام افعال سے توبہ کرائی، ابنِ کثیر کا بیان ہے کہ یہ واقعات بھی ایک طبقہ کی ناراضگی کا سبب بنے۔

ملحدین و مفسدین کے خلاف جہاد

داخلی اصلاح کے علاوہ ابن تیمیہ ان مفسدین سے بھی غافل نہ تھے جنھوں نے ایسے ہر موقع پر جب مسلمان کسی نرغہ میں آئے، مسلمانوں کو زک پہنچانے اور دشمنانِ اسلام سے ساز باز کرنے میں کمی نہیں کی، اگرچہ ۶۹۹ھ میں انھوں نے نائب السلطنت الافرم کی معیت میں جرد و کسروان جا کر وہاں کے بددین، شرارت پسند قبائل کی تادیب و تنبیہ کی تھی، اور ان میں سے بہت سے لوگوں نے توبہ اور آئندہ ان حرکات سے باز رہنے اور سلطنت کے نظام اور احکامِ اسلام کے تابع رہنے کا وعدہ کیا تھا، مگر پچھلے تجربوں سے

[1] البدایہ والنہایہ ص ۳۴

معلوم ہوا کہ وہ شرارت سے باز نہیں آئے، اور ان کی مزید تنبیہ و گوشمالی کی ضرورت ہے، اور ہر خطرہ کے موقع پر ان سے گزند پہونچنے کا اندیشہ ہے، چنانچہ ذی الحج کے اوائل میں ابن تیمیہ اپنے تلامذہ واحباب کی ایک جماعت کی رفاقت اور نقیب الاشراف زین الدین ابن عدنان کی معیت میں دوبارہ جرد و کسروان کی طرف تشریف لے گئے، اور ان کو تبلیغ کی، ان میں کی ایک بڑی تعداد تائب ہوئی، اور اس نے احکام اسلام کی پابندی اختیار کی۔

جرد کے علاقہ کے روافض (باطنی اسماعیلی حاکمی و نُصیری) قبائل نے کھلم کھلا مسلمانوں کو نقصان پہنچایا تھا، صلیبیوں اور تاتاریوں کو مسلمان ممالک پر حملہ کرنے کی دعوت دی تھی اور ان کو سہولتیں بہم پہونچائی تھیں، مسلمانوں کی بےبسی اور کمزوری سے فائدہ اٹھا کر ان کی جان و مال اور عزت و آبرو پر دست درازیاں کی تھیں، اور مسلمانوں کو دشمنوں کے ہاتھوں بھیڑ بکریوں کی طرح فروخت کیا تھا، ابن تیمیہ کے غیور اور باحمیت دل پر اس کا بڑا داغ تھا، وہ ان دنی الفطرت اور شریر النفس منافقوں کو معاف نہیں کر سکتے تھے جنھوں نے ایسی کٹھن گھڑیوں اور نازک وقت میں مسلمانوں کو تنگ اور ذلیل کیا، اور ان کے حریفوں کی مدد کی، ابن تیمیہ نے ان کو ان جرائم اور اس غداری کی پوری پوری سزا دینی چاہی اور اس کا انتظام کرنا چاہا کہ آیندہ کسی جنگ یا خطرہ کے موقع پر وہ مسلمانوں کو نقصان نہ پہنچا سکیں، انھوں نے السلطان الناصر (سلطان مصر و شام) کو ان کی طرف توجہ دلائی اور ان کی شرارتوں اور خطرات سے آگاہ کیا، ایک خط میں انھوں نے سلطان کو لکھا کہ :-

"جب تاتاریوں نے شام کا رخ کیا تو ان بدباطنوں (نُصیریوں اور اسماعیلیوں) نے اسلامی افواج کے ساتھ بڑی بدسلوکیاں کیں، یہ وہی ہیں جنھوں نے اہلِ قبرص (عیسائیوں) کو پیغام بھیجا، اور ساحل شام کے ایک حصہ پر ان کو قبضہ دلایا، اور صلیب کا جھنڈا خود اٹھا کر لے چلے، اور مسلمانوں کے گھوڑوں، ہتھیاروں، اور قیدیوں کی اتنی تعداد انھوں نے قبرص پہنچائی، جس کا علم صرف اللہ کو ہے، بیس دن تک نخاسہ کا بازار لگا رہا، جس میں مسلمان اور گھوڑے اور ہتھیار اہلِ قبرص کے ہاتھ (جو

صلیبی اور مسلمانوں کے حریف تھے) بکتے رہے' تاتاریوں کی آمد پر انھوں نے گھی کے چراغ جلائے' اور جب تاتاریوں کے مقابلہ کے لئے اسلامی فوجیں مصر سے روانہ ہوئیں تو ان کے چہرے فق ہو گئے جب اللہ تبارک و تعالٰے نے سلطان کی آمد پر مسلمانوں کو فتح مبین عطا فرمائی تو ان کے یہاں صفِ ماتم بچھ گئی' یہ اور اس سے بڑھ کر بھی چیزیں ان کے یہاں پیش آئیں' یہی چنگیز خاں کو اسلامی ممالک پر حملہ کرنے کی دعوت دینے والے تھے' یہی ہلاکو کے بغداد پر تسلط' حلب کی بربادی' اور صالحیہ کی غارتگری کا سبب تھے' اس کے علاوہ ان کی اسلام دشمنی اور مسلم کشی کے اور بہت سے واقعات ہیں۔

ان کے پڑوس میں جو مسلمان رہتے ہیں' وہ بڑی مصیبت میں مبتلا تھے' ہر رات ان کی ٹولی پہاڑ سے اترتی' اور وہ فساد برپا کرتی جس کو اللہ ہی جانتا ہے' یہ ڈاکے ڈالتے' پر امن شریف گھرانوں کو پریشان کرتے اور جرائم کا ارتکاب کرتے' قبرص کے عیسائی ان کے علاقہ میں آتے تو یہ ان کی میزبانی کرتے' اور مسلمانوں کے ہتھیار ان کے حوالہ کرتے' جو نیک اور صالح مسلمان ان کو ملتا اس کو قتل کر ڈالتے یا اس کا سب کچھ چھین لوٹ لیتے' شاذ و نادر ہی کوئی ان سے بچ کر نکلتا۔[1]

۷۰۵ھ میں ۲ محرم کو وہ ایک مہم کے ساتھ ان مفسدین و ملحدین کے خلاف جہاد کرنے کے لئے روانہ ہوئے ان کے پیچھے نائب السلطنت ایک لشکر کے ساتھ دمشق سے روانہ ہوا' اور جرد کے علاقہ اور روافض و تیامنہ کے پہاڑوں پر چڑھائی کی' سرکش قبائل کی اچھی طرح سرکوبی کی گئی اور اس پورے علاقہ کو جو بہت دشوار گذار اور محفوظ تھا' صاف کر دیا گیا' ابن تیمیہ نے فتویٰ دیا کہ بنی النضیر کی طرح ان کے باغات کے درخت کاٹنا درست ہے' اس لئے کہ یہ اس میں کمین گاہ بناتے ہیں' اور یہ ان کے فوجی اڈے اور سازش کی جگہیں ہیں' ابن کثیر لکھتے ہیں کہ شیخ الاسلام کی موجودگی اور شرکت سے بڑی خیر حاصل ہوئی اور اس موقع پر ان کے علم و شجاعت کا بڑا ظہور ہوا' اسی کے ساتھ ان کے دشمنوں کے دل حسد اور غم سے لبریز ہو گئے۔[2]

---

[1] ابن تیمیہ (محمد ابوزہرہ) ص۴۵ [2] البدایہ والنہایہ۔ ج ۱۴ ص۳۵

رفاعیوں سے مناظرہ

۹ جمادی الاول ۷۰۵ھ کو رفاعی فقراء کی ایک جماعت کثیر نائب السلطنت کے پاس حاضر ہوئی، ابن تیمیہ بھی تشریف لائے رفاعیوں کا مطالبہ تھا کہ ابن تیمیہ کو ان پر اپنے احکام جاری کرنے سے روک دیا جائے اور ان کو اپنے حال پر چھوڑ دیا جائے، ابن تیمیہ نے جواب دیا کہ ایسا ممکن نہیں، ہر شخص کو کتاب و سنت کے ماتحت ہو کر رہنا پڑے گا۔ جو اس سے قدم باہر نکالے گا، اس کی تردید اور مخالفت ضروری ہے، رفاعیوں نے اس موقع پر اپنی حقّانیت اور مقبولیت ثابت کرنے کے لئے اپنے کچھ کرتب دکھانے چاہے، ان کا دعویٰ تھا کہ ہم پر آگ اثر نہیں کرتی، ہم آگ میں کود کر دکھاتے ہیں، اگر ہم صحیح سالم نکل آئیں تو تسلیم کر لیا جائے کہ ہم برسرِ حق ہیں اور مؤیّد من اللہ، ابن تیمیہ نے کہا کہ یہ شیطانی حالات ہیں، اور ان کا کچھ اعتبار نہیں، یہ محض شعبدہ بازی اور مکروفریب ہے، جو شخص آگ میں کودے پہلے حمام میں اس کو غسل دیا جائے، اور اس کے جسم کو سرکہ اور گھاس سے اچھی طرح دھویا مانجھا جائے، پھر آگ میں گھسے اور اپنا کمال دکھائے، اگر فرض کر لیا جائے کہ کوئی شخص غسل کے بعد آگ میں گھستا ہے تو وہ اگر اہلِ بدعت میں سے ہے تو اس وقت بھی اس کا کچھ اعتبار نہیں کیا جائے گا، بلکہ اس کو دجّال سمجھا جائے گا، اس موقع پر ایک رفاعی صوفی (شیخ صالح) کی زبان سے بے ساختہ نکلا کہ ہمارے یہ کرتب تاتاریوں کے یہاں چلتے ہیں، شریعت کے مقابلہ میں نہیں چلتے، لوگوں نے ان کی یہ بات پکڑ لی اور اس کو دلیل بنا لیا، آخر یہ فیصلہ ہوا کہ وہ لوہے کے طوق اپنی گردنوں سے اتار دیں، اور جو کتاب و سنت کی مخالفت کرے، اس کی گردن اڑا دی جائے، ابن تیمیہ نے اس کے بعد اس مسئلہ پر مستقل رسالہ تصنیف کیا، جس میں طریقۂ رفاعیہ پر تفصیل سے روشنی ڈالی، اور ان کے حالات، مسلک و تخیلات کا کتاب و سنت سے موازنہ کیا۔[1]

---

[1] البدایہ والنہایہ۔ ج ۱۴ ص ۳۶

۸ رجب کو علماء کی ایک مجلس میں جو نائب السلطنت کی موجودگی میں منعقد ہوئی تھی، ابن تیمیہ کے رسالہ "عقیدۂ واسطیہ" پر بحث ہوئی، اور علماء نے ان سے سوال و جواب کئے، جس کے نتیجہ میں یہ فیصلہ ہوا کہ ان کا عقیدہ اہلِ سنت کے عقیدہ کے مطابق ہے، اور ان کو بڑے اعزاز و اکرام کے ساتھ ان کے مکان پہونچا دیا گیا، عوام کی ایک بڑی تعداد شمعیں ہاتھوں میں لئے ہوئے، ان کے رکاب میں چل رہی تھی، جو اظہارِ عقیدت کا اس زمانہ میں ایک طریقہ تھا۔[1]

ابن تیمیہ کی مخالفت اور مصر طلبی

دمشق میں ابن تیمیہ کی ایک طرح کی دینی سیادت قائم ہو گئی تھی، وہ اگر دیکھتے تھے کہ حکومت کسی بدعت یا فعلِ منکر کے روکنے میں تساہل سے کام لے رہی ہے، اور علماء خاموش ہیں تو وہ قانون اپنے ہاتھ میں لے لیتے اور خود شرعی احکام کا اجراء کرتے، ان کے ساتھ عقیدت مند تلامذہ اور دیندار اور صحیح العقیدہ عوام کی ایک بڑی جماعت تھی، اور ان کا حلقۂ اثر بڑھتا جا رہا تھا، اہلِ علم کی ایک جماعت کو ان کا یہ دینی عروج اور شخصی اثر پسند نہیں آیا، اور ان کو اس میں ان کی خودسری نظر آئی، اس نے ان کے حاسدوں کا ایک طبقہ پیدا کر دیا، جو ان کے زوال کا متمنی، اور ان کی اہانت کے درپے تھا، ابن کثیر لکھتے ہیں۔

وکان للشیخ تقی الدین من الفقهاء	شیخ تقی الدین ابن تیمیہ سے حسد کرنے والی علماء کی
جماعة یحسدونه لتقدمه	ایک جماعت تھی، جس کا باعث ان کا حکومت میں
عند الدولة وانفراده بالأمر بالمعروف	رسوخ، امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے کام کو
والنهی عن المنکر، وطاعة الناس له	تنہا انجام دینا، لوگوں کو ان کے حق میں فرمانبرداری
ومحبتهم له وکثرة اتباعه وقیامه	محبت، ان کے متبعین کی بڑھتی ہوئی تعداد، ان کا

---

[1] البدایہ والنہایہ۔ ج ۱۴ ص ۳۳

فی الحق وعلمہ وعملہ[1]۔ دینی جوش و عزم اور علم و عمل تھا۔

عقیدۂ وحدۃ الوجود کی تردید

ادھر کچھ ایسے واقعات پیش آئے کہ عقائد کی بحث دوبارہ چھڑ گئی اور بحث و مباحثہ کی مجلسیں منعقد ہوئیں[2]، اس سب سے بڑھ کر یہ تھا کہ وہ شیخ محی الدین ابن عربیؒ کے مسلک وحدۃ الوجود کی برملا تردید کرتے تھے، مصر و شام میں ان کے معتقدین و منتسبین کا بہت بڑا گروہ تھا، اور علماء و مشائخ کی ایک بڑی جماعت تھی، جو ان کو نہایت بلند پایہ عارف و محقق، امام مشرب توحید اور شیخ اکبر مانتی تھی، ابن تیمیہ کا خیال تھا کہ ان کی تحقیقات والہامات انبیاء علیہم السلام کی تعلیمات اور توحید کی اس تعلیم کے بالکل معارض ہیں، جو ہر پیغمبر نے اپنے وقت میں دی، اور جناب رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے اس کی آخری وضاحت اور تکمیل فرمائی، اور جو صاف صاف قرآن و حدیث سے سمجھ میں آتی ہے اور لفظی و معنوی تواتر کے ساتھ ہم تک پہنچی ہے، شیخ محی الدین ابن عربی نے ۶۳۸ھ میں (ابن تیمیہؒ کی ولادت سے ۲۳ سال پیشتر) وفات پائی تھی، ان کی کتابیں خصوصاً "فتوحاتِ مکیہ" اور "فصوص الحکم" عام طور پر متداول تھیں، اور علمی حلقوں میں وقعت کی نگاہ سے دیکھی جاتی تھیں، ابن تیمیہ نے فلسفہ اور تصوف و اشراق کا دقتِ نظر سے مطالعہ کیا تھا، اور اس سلسلہ میں "فتوحات" و "فصوص" کو بھی پڑھا تھا، وہ اپنی کتابوں میں جا بجا ان کتابوں کے اقتباسات نقل کرتے ہیں، اور ان کی تردید کرتے ہیں، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کا مطالعہ براہ راست تھا، وہ ان

۱؎ البدایہ والنہایہ۔ ج ۱۴ ص ۳۷ ۲؎ ایک مجلس میں جو ۸ رجب کو نائب السلطنت کے یہاں منعقد ہوئی شیخ کی موجودگی میں "العقیدۃ الواسطیہ" پڑھا گیا، اور اس پر بحث ہوئی اس کے بعد دو مجلسوں میں شیخ صفی الدین الہندی اور علامہ کمال الدین ابن الزملکانی سے بحث و مذاکرہ ہوا، اور ثابت ہوا کہ یہ عقیدہ اہل سنت والجماعت کے خلاف نہیں ہے، اور شیخ نہایت عزت و حرمت کے ساتھ گھر واپس ہوئے، عوام شعلیں ہاتھ میں لئے ہوئے ساتھ تھے (ابن کثیر جلد ۱۴ ص ۳۶-۳۷)

کتابوں کے مطالعہ سے اس نتیجہ تک پہونچے تھے کہ ان کتابوں کی تعلیمات اور نبوت کی تعلیمات میں تطبیق کی کوئی صورت نہیں، وہ شیخ ابن عربی کا مسلک بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں :۔

"ابن عربی اور ان کے متبعین کا مسلک یہ ہے کہ وجود ایک ہی ہے، وہ کہتے ہیں، مخلوق کا وجود خالق کا وجود ہے، وہ دو متغائر موجودوں کے قائل نہیں، جن میں سے ایک دوسرے کا خالق ہو، بلکہ کہتے ہیں کہ خالق ہی مخلوق ہے، اور مخلوق ہی خالق ہے[1]، وجود میں رب و عبد کی کوئی تفریق نہیں، وہاں نہ کوئی خالق ہے، نہ کوئی مخلوق، نہ کوئی داعی نہ کوئی مجیب، وجود کا جب اعیان پر فیضان ہوا، اور اس نے ان کے اندر ظہور کیا تو اعیان کی حیثیت سے اس میں تنوع اور تفریق پیدا ہوئی، جیسے کہ روشنی مختلف الالوان شیشوں میں مختلف رنگوں میں ظاہر ہوتی ہے[2]، اس بنا پر وہ کہتے ہیں کہ گوسالہ پرستوں نے درحقیقت خدا ہی کی پرستش کی تھی، موسیٰ علیہ السّلام نے ہارون کو جو ٹوکا تھا تو اس بات پر کہ انھوں نے اس گوسالہ پرستی کی (جو دراصل خدا پرستی تھی، اس لئے کہ موجود تو ایک ہی ہے) مخالفت کیوں کی؟ ان کے نزدیک موسیٰ علیہ السلام ان عارفین میں سے تھے، جو ہر چیز میں حق کا مشاہدہ کرتے ہیں، اور اس کو ہر چیز کا عین سمجھتے ہیں، ان کے نزدیک فرعون اپنے اس دعویٰ میں برسرِ حق تھا کہ "انا ربّکم الاعلیٰ"، بلکہ وہ عین حق تھا[3]۔

صاحبِ فصوص کا کہنا ہے کہ فرعون کو چونکہ (تکوینی طور پر) منصبِ حکومت حاصل تھا، اور وہ صاحبِ وقت تھا تو اس نے بجا طور پر "انا ربکم الاعلیٰ" کہا اس لئے کہ جب سب کسی نہ کسی نسبت سے ارباب ہیں تو میں ان میں سب سے اعلیٰ ہوں، کیونکہ مجھے ظاہر میں تم پر حکومت کرنے اور فیصلہ کرنے کا اختیار دیا گیا ہے، وہ کہتے ہیں کہ جادوگروں کو جب فرعون کی صداقت کا علم ہوا تو انھوں نے اس کی مخالفت نہیں کی بلکہ اس کا اعتراف کیا، اور کہا "اِقْضِ مَا اَنْتَ قَاضٍ اِنَّمَا تَقْضِی هٰذِهِ

---

[1] الرد الاقوم علی ما فی کتاب فصوص الحکم ص۱۱ [2] ایضاً ص۱۰۲ [3] ان سب اقوال کو انھوں نے صاحبِ فصوص کی طرف منسوب کیا ہے۔

الحیٰوۃَ الدُّنیا" (جو تمہیں فیصلہ کرنا ہو کرو، تم اس دنیا کی زندگی پر حکم چلا سکتے ہو) اس لئے فرعون کا یہ کہنا بالکل بجا تھا کہ "اَنَا رَبُّکُمُ الاَعلیٰ" اگرچہ فرعون عین حق پر تھا۔[۱]

ابن عربی حضرت نوح علیہ السلام پر تنقید کرتے ہیں اور ان کی کافر قوم کی تصویب و تعظیم جنھوں نے پتھروں کی پرستش کی، وہ کہتے ہیں کہ ان (بت پرستوں نے) درحقیقت اللہ ہی کی عبادت کی تھی اور یہ طوفان دراصل معرفتِ الٰہی کی طغیانی اور اس کے سمندر کا جوش تھا جس میں وہ غرق ہوئے۔[۲]

معلوم ہوتا ہے کہ ابن تیمیہ کے زمانہ میں "وحدت وجود" کے عقیدہ میں حد درجہ کا غلو پیدا ہو گیا تھا اور لوگ اس سلسلہ میں شریعت، عقل و اخلاق کے حدود پھلانگ گئے تھے اور ایک بحرانی کیفیت پیدا ہو گئی تھی، ابن تیمیہ لکھتے ہیں:-

"اس سلسلہ میں ایک جماعت (جس کو علم کلام، فلسفہ اور تصوف سے واقفیت تھی) بہت زیادہ گمراہ ہوئی، ان میں سے ابن سبعین، صدرالدین قونوی (تلمیذ ابن عربی) اور بلیانی اور تلمسانی خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں، ان میں تلمسانی اس مسئلہ کے علم و معرفت میں سب سے بڑھا ہوا تھا، وہ مذہب وحدۃ الوجود کا صرف قائل ہی نہ تھا، بلکہ اس پر عامل بھی تھا، چنانچہ شراب پیتا تھا، اور محرمات کا ارتکاب کرتا تھا، (کہ جب موجود ایک ہے تو حلال و حرام کی تفریق کیسی؟)

مجھ سے ایک معتبر آدمی نے بیان کیا کہ وہ تلمسانی سے "فصوص الحکم" کا درس لیتے تھے اور اس کو اولیاء اللہ اور عارفین کا کلام سمجھتے تھے، جب انھوں نے فصوص کو پڑھا اور دیکھا کہ اس کے

---

[۱] الفرقان بین الحق والباطل ص۱۴۲ [۲] ایضاً ص۱۴۸ یہاں اس بات کا ذکر کر دینا بھی ضروری معلوم ہوتا ہے کہ شیخ اکبر کی کتابوں اور علوم کے اشتغال رکھنے والوں کی ایک جماعت اس بات کی قائل ہے کہ شیخ کی کتابوں بالخصوص فصوص الحکم میں کثرت سے الحاقات اور اضافات کئے گئے ہیں، دمشق میں شیخ احمد الحارون العسل جو شیخ کے عشاق اور ان کے علوم کے حاملین میں سے تھے، بڑے جزم و وثوق سے فرماتے تھے کہ فصوص کا تہائی حصہ یا بیشتر محض الحاقی و بے اصل ہے۔ ۱۲

مضامین تو قرآن شریف کے صریح مخالف ہیں تو انھوں نے تلمسانی سے کہا کہ یہ کلام تو قرآن مجید کے مخالف ہے تو اس نے جواب دیا کہ قرآن تو سارا شرک سے بھرا ہوا ہے اس لئے کہ وہ رب و عبد کے درمیان فرق کرتا ہے، توحید تو ہمارے کلام میں ہے اس کا یہ بھی مقولہ ہے کہ کشف کے ذریعہ وہ ثابت ہوا ہے، جو صریح عقل کے خلاف ہے[1]"

"ایک شخص نے جو تلمسانی اور اس کے ہم خیال کے ساتھ تھا، مجھے خود سنایا کہ ہمارا گزر ایک مردہ کتے کے پاس سے ہوا جس کو خارش تھی، تلمسانی کے رفیق نے کہا کہ یہ بھی ذات خداوندی ہے؟ اس نے جواب دیا کہ کیا کوئی چیز اس کی ذات سے خارج ہے، ہاں سب کے سب اس کی ذات کے اندر ہیں[2]"

"بعض لوگوں سے کہا گیا کہ جب وجود ایک ہے تو بیوی کیوں حلال اور ماں کیوں حرام ہے؟ اس "محقق" نے جواب دیا کہ ہمارے نزدیک سب ایک ہیں، لیکن ان محجوبین نے (جو توحید حقیقی سے ناآشنا ہیں) کہا کہ ماں حرام ہے؟ ہم نے بھی کہا کہ ہاں تم (محجوبین) پر حرام ہے[3]"

شیخ الاسلام نے ۷۰۵ھ کو شیخ ابوالفتح نصر المنبجی کو ایک مفصل خط لکھا جس میں انھوں نے ظاہر کیا کہ وہ قائلین وحدۃ الوجود کے ضرر کو راہِ خداوندی کے سالکین سے دفع کرنا قریب قریب اتنا ہی ضروری سمجھتے ہیں کہ جتنا تاتاریوں کا مقابلہ اور ازالہ، شیخ کو اچھی طرح معلوم ہے کہ دعوت انبیاء کا مقصد بلکہ خلق و انزالِ کتب و ارسال رسل کا مقصود یہی ہے کہ دعوت و اطاعت صرف اللہ کی ہو، "اَنْ یَّکُوْنَ الدِّیْنُ کُلُّہٗ لِلّٰہِ" اس کا مقصود مخلوقات کو اپنے خالق کی طرف دعوت دینا ہے، ان اتحادیوں نے سالکین کے لئے اس توحید کو جس کے ساتھ اللہ تعالیٰ نے اپنے صحیفے نازل کئے، اور اپنے انبیاء کو مبعوث فرمایا، اس اتحاد کے ساتھ خلط ملط کر دیا ہے، جس کا نام انھوں نے "توحید" رکھا ہے، اور اس کی حقیقت صانع (جل مجدہ) کو معطل قرار دینا اور خالق (عز اسمہٗ) کا انکار ہے، میں ابتداء میں شیخ ابن عربی

---

[1] الفرقان بین الحق والباطل ص ۱۴۵ [2] ایضاً [3] الرد الاقوم علی فصوص الحکم ص ۴۳

کے ساتھ حسن ظن رکھتا تھا، اور ان کی میری نگاہ میں بڑی عزت تھی، اس لئے کہ ان کی تصنیفات "فتوحاتِ مکیہ" "کنہ المحکم المربوط" "الدرۃ الفاخرۃ" "مطالع النجوم" وغیرہ میں بڑے اچھے علمی فوائد اور نکات تھے، لیکن اس وقت تک مجھے ان کے مقصود کی حقیقت کا علم اور "فصوص الحکم" وغیرہ کے مطالعہ کا اتفاق نہیں ہوا تھا، ہم اپنے دینی بھائیوں کے ساتھ مذاکرہ اور طلبِ حق میں مشغول تھے، اور اس کی پیروی کرتے تھے، اور حقیقت طریق معلوم کرنا چاہتے تھے، جب حقیقت واضح ہوگئی تو ہم کو (اس سلسلہ میں) اپنا فریضہ اور کرنے کا کام معلوم ہوگیا، اس عرصہ میں مشرق سے معتبر مشائخ تشریف لائے، اور انھوں نے طریقۂ اسلامیہ اور دینِ اسلامی کی حقیقت اور ان لوگوں (ابنِ عربی، صدر رومی، تلمسانی، ابنِ سبعین) کی حقیقتِ حال دریافت کی تو اس کی شرح و تفصیل ضروری معلوم ہوئی، اسی طرح سے اطرافِ شام سے کچھ مخلص و صادق طالبین و سالکین نے فرمائش کی کہ قائلین وحدۃ الوجود کے اقوال کا خلاصہ اور ان کا مدعا اختصار و جامعیت کے ساتھ لکھا جائے، جناب والا اپنے نورِ قلب، ذکاوتِ طبع، اخلاص اور اس خیر خواہی کے ساتھ جو اسلام و اہل اسلام اور برادرانِ طریقت کے ساتھ رکھتے ہیں، اس سلسلہ میں کوئی ایسا قدم اٹھائیں، جس سے اللہ تعالیٰ کی رضا، دنیا و آخرت میں اس کی مغفرت کی امید واثق ہو۔

اس کے بعد وہ بڑی تفصیل سے ان عقائد و نظریات اور مذاہب کا جائزہ لیتے ہیں جو اتحاد و حلول کے بارہ میں مسیحی فرقوں (یعقوبیہ، نسطوریہ، ملکانیہ) اور بعض مسلمان کہلانے والے فرقوں (روافض اور جہمیہ) کے درمیان شائع و ذائع تھے، نیز اتحادِ معین، اتحادِ مطلق، حلولِ معین، حلولِ مطلق کی تشریح و تفصیل کرتے ہیں، اور جو لوگ ان کے قائل ہوئے ان کا ذکر فرماتے ہیں، اس سے ان کی وسعتِ نظر اور مذاہبِ سابقہ سے واقفیت کا اندازہ ہوتا ہے، پھر شیخ ابن عربی کا مسلک اور تحقیق بڑی تدقیق اور احتیاط کے ساتھ (جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ انھوں نے "فتوحات" و

"فصوص" کا بڑی دقّتِ نظر سے مطالعہ کیا تھا، اور ان کے کلام کا سر اور کلید ان کے ہاتھ آگئی تھی جس سے ان کے علوم و حقائق کا سمجھنا ان کے لئے آسان ہو گیا تھا) بیان کرتے ہیں، اس سلسلہ میں ان کا اور وحدۃ الوجود کے دوسرے داعیوں کا فرق اور ابن عربی کے قول کی حقیقت سمجھ میں آجاتی ہے، اسی کے ساتھ وہ اس کے نتائج اور لوازم فاسدہ بیان کرتے ہیں اور غایت بے تعصبی کے ساتھ ان کو شک و احتمال کا پورا حق دیتے ہیں، اور ان کے دوسرے اتحادیوں کے درمیان فرق کرتے ہیں، ایک جگہ اسی خط میں لکھتے ہیں:۔

لكن ابن عربي اقربهم الى الاسلام واحسن	ابن عربی ان لوگوں میں اسلام سے قریب تر ہیں، اور
كلاما في مواضع كثيرة، فانه يفرق بين	ان کا کلام بہت سے مقامات پر نسبتاً بہتر ہے، اس لئے
المظاهر والظاهر فيقر الامر والنهي	وہ مظاہر اور ظاہر میں فرق کرتے ہیں، امر و نہی اور شرائع
والشرائع على ما هي عليه، ويأمر بالسلوك	و احکام کو اپنی جگہ رکھتے ہیں مشائخ نے جن اخلاق و
بكثير مما امر به المشائخ من الاخلاق	عبادات کی تاکید کی ہے ان کو اختیار کرنے کا مشورہ
والعبادات ولهذا كثير من العباد يأخذون	دیتے ہیں، اس لئے بہت سے عابد و صوفی ان کے کلام
من كلامه سلوكهم فينتفعون بذالك	سے سلوک کو اخذ کرتے ہیں، اگرچہ وہ ان کے حقائق کو
وان كانوا لا يفقهون حقائقه ومن	اچھی طرح نہیں سمجھتے، ان میں سے جو ان حقائق کو سمجھ لیتے
فهمها منهم ووافقه فقد تبين قوله[1]	ہیں، اور ان کی موافقت کرتے ہیں، ان پر ان کے کلام
	کی حقیقت منکشف ہو جاتی ہے۔

دوسری جگہ لکھتے ہیں:۔

وهذه المعاني كلها هي قول صاحب	یہ تمام مضامین صاحب فصوص کے اقوال ہیں، اللہ تعالیٰ
الفصوص والله تعالى اَعْلَمُ بما مات	ہی کو علم ہے کہ ان کا خاتمہ کس چیز پر ہوا، اللہ تعالیٰ

[1] مکتوب شیخ الاسلام بنام شیخ نصر المنبجی مندرجہ "جلاء العینین" ص ۵۷

الرجل علیه واللہ یغفر لجمیع المسلمین	تمام مسلمان مردوں اور عورتوں زندہ و مردہ کی
والمسلمات والمومنین والمومنات	مغفرت فرمائے، اے ہمارے پروردگار ہماری اور ہمارے
الاحیاء منهم والاموات ربنا اغفرلنا	ان... بھائیوں کی مغفرت فرمادے جو ہم سے پہلے ایمان
ولاخواننا الذین سبقونا بالایمان	کے ساتھ چلے گئے اور ہمارے دلوں میں اہلِ ایمان کی
ولا تجعل فی قلوبنا غلاً للذین اٰمنوا	طرف سے کھوٹ نہ رکھ، اے ہمارے پروردگار تو بڑی
ربنا انك رؤف رحیم۔[1]	شفقت والا مہربان ہے۔

پھر صدر[2] رومی کے مسلک کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں "هوابعد عن الشریعة والاسلام"[3] اس کے بعد تلمسانی، اور ابن سبعین کی پرزور تردید کرتے ہیں، وہ سب سے زیادہ ناراض تلمسانی سے ہیں، جن کے متعلق حمیتِ دینی میں ان کے قلم سے حسب ذیل الفاظ نکلے ہیں۔

واما الفاجر التلمسانی[4] فهو اخبث	باقی رہا تلمسانی فاسق تو اس گروہ میں اس کی خباثت
القوم واعمقهم فی الکفر فانه لایفرق	سب سے بڑھی ہوئی تھی اور کفر میں وہ سب سے گہرا ہے
بین الوجود والثبوت کما یفرق ابن	اس لئے کہ وہ وجود و ثبوت کے درمیان اس طرح
عربی ولا یفرق بین المطلق والمعین	بھی فرق نہیں کرتا جس طرح ابن عربی کرتے ہیں اور
کما یفرق الرومی ولکن عنده ما ثم	نہ مطلق و معین میں تمیز کرتا ہے جس طرح صدر الدین
غیره ولاسوی بوجه من الوجوه وان	قونوی سے منقول ہے، اس کا مسلک تو یہ ہے کہ خدا
العبد انما یشهد السوی ما دام محجوبا	کی ذات سے مغایر و ماسوا کا وجود ہی نہیں، بندہ کو
فاذا انکشف حجابه رأی انه ما ثم غیره	اگر ماسوی کا شاہدہ ہوتا ہے تو محض اس وقت تک

[1] مکتوب شیخ الاسلام بنام شیخ نصر المنبجی مندرجہ جلاء العینین ص۵۷ [2] علامہ صدر الدین قونوی [3] ایضاً ص۵۷

[4] تلمسانی اپنے معتقدین کے حلقہ میں العفیف التلمسانی کے لقب سے مشہور ہیں۔

يبين له الأمر ولهذا كان يستحل جميع المحرمات[1] الخ	جب تک کہ وہ محجوب ہے، جب یہ حجاب مرتفع ہوجائیگا تو وہ دیکھے گا کہ ماسوی کا وجود نہیں اس وقت اس کو حقیقتِ حال کا علم ہوگا، اسی بنا پر یہ تلسانی تمام محرمات کو حلال سمجھتا تھا۔

آخر میں وہ ایک نکتہ کی بات یہ لکھتے ہیں کہ :۔

"فرقہ جہمیہ کے متکلمین کسی چیز کی عبادت نہیں کرتے، اور اس فرقہ کے متعبدین (شائقین عبادت) ہر چیز کی عبادت کرتے ہیں، اس لئے کہ ان کے متکلم کے دل میں کوئی خدا پرستی اور شوقِ عبادت نہیں، وہ اپنے کو سلبی صفات (صفات عدم وموات) سے موصوف کرتا ہے، لیکن متعبد کے دل میں خدا پرستی اور عبادت کا جذبہ ہے، اور قدرتی بات ہے کہ قلب موجود کی طرف مائل ہوتا ہے، معدوم کی طرف نہیں، اس لئے اس کو (مجبوراً) مخلوقات کی پرستش کرنی پڑتی ہے، یا تو وجود مطلق کی یا بعض مظاہر کی، جیسے آفتاب، ماہتاب، انسان، بت وغیرہ، اس طرح اتحادیوں کا قول (وحدۃ الوجود) دنیا کے ہر شرک پر حاوی ہے، وہ اللہ تعالیٰ کی توحید کے قائل وعامل نہیں بلکہ اس قدرِ مشترک کی توحید کے قائل ہیں، جو اس کے اور مخلوقات کے درمیان ہے، اس لئے وہ دوسروں کو اپنے رب کا ہمسر بناتے ہیں "وھم بربھم یعدلون" اسی بنا پر ایک معتبر شخص کا بیان ہے کہ ابن سبعین ہندوستان جانے کا ارادہ رکھتا تھا کہتا تھا کہ اسلام کی سرزمین میں اس کی گنجائش نہیں، ہندوستان کے لوگ[2] چونکہ مشرک ہیں، ہر چیز کی عبادت کرتے ہیں، یہاں تک کہ درختوں اور جانوروں تک کی (اس لئے ان کے ساتھ اچھی گزرے گی) اور یہی "اتحادیوں" کے قول کی حقیقت ہے، میں ذاتی طور پر کچھ لوگوں کو جانتا ہوں جو فلسفہ اور کلام کے ساتھ اشتغال رکھتے ہیں، وہ انہی اتحادیوں کے طریق پر خدا پرست اور عابد بنتے ہیں، وہ جب اللہ تعالیٰ کی صفت

[1] جلاء العینین ص۵۵ [2] ہندوستان کے قدیم باشندے۔

بیان کرتے ہیں تو کہتے ہیں کہ وہ ایسا نہیں ہے، ویسا نہیں ہے، اور اس کی صفت میں مسلمانوں کی طرح بیان کرتے ہیں کہ وہ مخلوقات کی طرح نہیں ہے، لیکن خالق کی ان صفات کا انکار کرتے ہیں جو انبیاء علیہم السلام نے بیان کی ہیں، اور جب ان میں سے کسی پر ذوق اور وجد غالب آتا ہے، تو اتحادیوں کا راستہ اختیار کرتا ہے، اور کہنے لگتا ہے کہ تمام موجودات خدا ہی ہیں، جب اس سے کہا جاتا ہے کہ کہاں تو وہ نفی (کہ خدا نہ ایسا ویسا) اور کہاں یہ اثبات (کہ سب موجوداتِ خدا ہی ہیں) تو کہنے لگتا ہے کہ وہ میرا وجدان تھا، یہ میرا ذوق ہے، اس گمراہ سے کوئی کہے کہ جو ذوق اور وجد اعتقاد کے مطابق نہ ہو تو ان میں سے ایک یا دونوں باطل ہوں گے، اذواق اور مواجید درحقیقت معارف و اعتقادات کے نتائج ہیں، اس لئے کہ قلب کی معرفت اور اس کا حال دونوں متلازم ہیں، چنانچہ بقدر علم و معرفت کے وجد، محبت اور حال ہوتا ہے، یہ لوگ اگر انبیاء و مرسلین علیہم السلام کا راستہ اختیار کرتے جنھوں نے اللہ وحدہ لاشریک لہٗ کی عبادت کا حکم دیا اور اس کی وہی صفات بیان کرتے جو اس نے اپنی خود بیان کیں اور اس کے انبیاء نے بیان کیں اور سابقین اولین کی پیروی اختیار کرتے تو ہدایت کے راستہ پر چلتے اور یقین کی حلاوت اور قلب کی طمانیت ان کو حاصل ہوتی، کسی نے صحیح کہا ہے[1] کہ انبیاء علیہم السلام کے یہاں اللہ تعالیٰ کی صفات کا اثبات مفصّل اور (جو صفات اس کے لائق نہیں) ان کی نفی مجمل ہے "ان الرسل جاؤا باثبات مفصل و نفی مجمل" بخلاف اس کے بددین اہل تعطیل (جہمیہ و فلاسفہ جن سے اتحادی متأثر ہیں) نفی کے وقت تو خوب تفصیل سے کام لیتے ہیں، اور اثبات کے وقت محض اجمال پر اکتفا کرتے ہیں، قرآن مجید صفات ثبوت سے بھرا پڑا ہے، اور ان میں بڑی تفصیل ہے "إِنَّ اللّٰهَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيمٌ" "وَهُوَ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ" "إِنَّهُ سَمِيعٌ بَصِيرٌ"

[1] خود امام نے اپنی تصنیفات میں جا بجا یہ بات کہی ہے۔

"وَسِعَ كُلَّ شَيْءٍ رَّحْمَةً وَّعِلْمًا" اور نفی کے موقع پر ایک جامع مانع بات یہ کہہ دی "لَيْسَ كَمِثْلِهٖ شَيْءٌ" "لَمْ يَكُنْ لَّهٗ كُفُوًا اَحَدٌ" "هَلْ تَعْلَمُ لَهٗ سَمِيًّا" "سُبْحٰنَ رَبِّكَ رَبِّ الْعِزَّةِ عَمَّا يَصِفُوْنَ ۝ وَسَلٰمٌ عَلَى الْمُرْسَلِيْنَ ۝"

اس عقیدہ سے جو اخلاقی فتنہ اور بدنظمی ولاقانونی پھیل رہی تھی، اور فساق اہلِ ہوس نے اس کو جس طرح آڑ بنالیا تھا، اس کا تذکرہ کرتے ہوئے ابن تیمیہ لکھتے ہیں :۔

"اس عقیدہ کے مدعی خواہشاتِ نفس، بوالہوسی اور اعتقادی خرابیوں کے جامع ہیں، اور اس کا نتیجہ کہیں کہیں یہ ظاہر ہوا ہے کہ بعض لوگ لڑکوں کے عشق میں مبتلا ہوتے ہیں، اور کہتے ہیں کہ ان میں اللہ تعالیٰ کی تجلی ہے، اور یہ مظہر جمال خداوندی ہیں، بعض بعض بوسہ دیتے ہیں، اور اپنے محبوب سے کہتے ہیں کہ تو خدا ہے، بعض لوگ اپنی اولاد پر دست درازی کرتے ہیں، اور الوہیت کا دعویٰ کرتے ہیں وغیرہ وغیرہ[1]"

یہ وہ زمانہ تھا کہ الملک الناصر محمد بن قلاؤون برائے نام سلطان تھا، اور امیر رکن الدین بیبرس الجاشنگیر مدار المہام اور سلطنت کے سیاہ سپید کا مالک تھا، جاشنگیر شیخ نصر المنبجی کا معتقد و مرید تھا، اور ان کو شیخ ابن عربی سے بغایت اعتقاد تھا، شیخ کے متعلق ابن تیمیہؒ کے جو خیالات تھے، اور جن کا وہ تقریراً و تحریراً وقتاً فوقتاً اظہار کرتے رہتے تھے، اس کی اطلاع مصر پہونچتی رہتی تھی، اور یہ شیخ نصر المنبجی کی برافروختگی کے لئے کافی وجہ تھی، جاشنگیر جو عام ترک امراء کی طرح معمولی پڑھا لکھا اور فوجی اور انتظامی قابلیت کا آدمی تھا، اپنے شیخ کی رائے سے متأثر تھا، اور ابن تیمیہ کے متعلق وہی رائے رکھتا تھا، جو اس کے شیخ کی رائے تھی، شام سلطنتِ مصر کا ایک صوبہ اور کلیۃً اس کے ماتحت تھا، اور سلطان مصر کو ایسے تمام اشخاص کو طلب کرنے اور ان کے متعلق فیصلہ کرنے کا حق تھا، جو اس کی رائے میں "امنِ عامہ" کے لئے مضر یا کسی "شورش" کا باعث تھے، عام طور پر اس بارہ میں ذاتی رجحانات یا اہلِ دربار کی خواہشات کام کرتی تھیں،

---

[1] الرد الاقوم علیٰ فصوص الحکم ص۵۲

اور اس وقت بھی صورتِ حال یہی تھی کہ مدار المہام سلطنت کے شیخ و مقتدی نصر المنبجی کو ابن تیمیہ سے کد تھی، اور وہ ان کو زک پہونچانا چاہتے تھے۔

ابن تیمیہ مصر میں

بہر حال ۵ رمضان ۷۰۵ھ کو ابن تیمیہؒ کی طلبی کا فرمان شام پہنچا، ان کے احباب و تلامذہ کو اس سے بڑی تشویش پیدا ہوئی، نائب السلطنت نے (جو ان کا ہمدرد اور معتقد تھا) ان کو روکنے کی کوشش کی اور کہا کہ میں سلطان سے خط و کتابت اور معاملہ کو سلجھانے کی کوشش کرتا ہوں لیکن ابن تیمیہ سفر کے لئے آمادہ تھے، اور انھوں نے کہا کہ مصر کے سفر میں بہت سے مصالح اور منافع پیشِ نظر ہیں، بالآخر ان کے احباب و معتقدین نے بادیدۂ پرنم ان کو رخصت کیا، مشائعت کرنے والوں کا بڑا ہجوم تھا، اور لوگ بڑے متأثر تھے۔

دمشق سے چل کر انھوں نے غزہ کی جامع مسجد میں درس دیا، جس میں بڑا اجتماع تھا۔

اسیری و رہائی

۲۲ رمضان کو وہ مصر پہونچے، جمعہ کے دن بعد نماز جمعہ قلعہ میں ایک بڑی مجلس منعقد ہوئی، جس میں قضاۃ اور اعیانِ سلطنت شریک ہوئے، ابن تیمیہ نے وہاں گفتگو کا آغاز کرنا چاہا، لیکن ان کو اجازت نہیں دی گئی، بعض حاضرین نے ان کے عقائد و مسائل[1] پر اعتراضات کئے، انھوں نے جب جواب دینے کے لئے حمد و ثنا کے ساتھ تقریر کا آغاز کیا تو ان سے کہا گیا کہ ہم آپ کا خطبہ سننے کے لئے جمع نہیں ہوئے ہیں، انھوں نے دریافت کیا کہ میرے مقدمہ میں حَکم کون ہے؟ کہا گیا کہ قاضی ابن مخلوف مالکی[2]، انھوں نے کہا کہ آپ تو میرے

---

[1] یہ عقائد و مسائل وہی قدیمی کلامی مسائل تھے، جن پر بارہا دمشق میں بحث ہو چکی تھی اور ابن تیمیہ نے ان پر مستقل کتابیں اور رسائل لکھے تھے، مثلاً "استواء علی العرش" کی حقیقت، کلام باری کی حقیقت اور حرف و صوت کی بحث۔ [2] یہ مصر میں ابن تیمیہ کے بڑے حریف اور مقابل تھے۔

حریف اور مدمقابل ہیں، آپ حَکم کیسے بن سکتے ہیں؟ اس پر ان کو سخت غصہ آیا اور انھوں نے ابن تیمیہ کے خلاف فیصلہ صادر کر دیا[1] جس کے نتیجہ میں وہ کچھ عرصہ بُرج میں قید رہے، پھر عید کی رات کو وہ مشہور قید خانہ میں جس کو مصر میں "جُب" (کنواں) کہتے تھے، اپنے بھائی شرف الدین عبداللہ اور زین الدین عبدالرحمٰن کے ساتھ منتقل کر دیئے گئے[2]، اگلے سال (سنہ ۷۰۶ھ) میں عید کی رات نائب مصر اور بعض قضاۃ و فقہاء کی طرف سے اس بات کی سلسلہ جنبانی ہوئی کہ ابن تیمیہ کو آزاد کر دیا جائے، بعض حاضرین نے یہ شرط کی کہ وہ اپنے بعض عقائد سے رجوع کا اعلان کریں، ابن تیمیہ کو جب اس کی اطلاع ہوئی تو انھوں نے صاف انکار کر دیا، چھ مرتبہ ان کو دعوت دی گئی کہ وہ خود آ کر اس مسئلہ پر گفتگو کر لیں، مگر انھوں نے منظور نہیں کیا اور ان کا جواب یہی رہا کہ رَبِّ السِّجْنُ اَحَبُّ اِلَیَّ مِمَّا یَدْعُوْنَنِیْ اِلَیْہِ[3]

بنائے اختلاف اور مسلک کی توضیح خود شیخ الاسلام کی زبان سے

خوش قسمتی سے خود شیخ الاسلام کا ایک مستقل رسالہ جس میں انھوں نے مصر کی مجلسِ مباحثہ، پھر حبس و اسارت کے واقعات، رہائی کی سلسلہ جنبانی اور انکار اور اپنے مسلک کی توضیح خود کی ہے، حال میں شائع ہوا ہے، اس رسالہ سے بہت سے نئے اور ضروری حالات پر روشنی پڑتی ہے، یہاں اس کے کچھ جستہ جستہ اقتباسات نقل کئے جاتے ہیں[4]۔

"ایک دن میرے پاس داروغۂ جیل آیا، اور اس نے کہا کہ نائب (مصر) سلام کہتے ہیں، اور فرماتے ہیں کہ آخر کب تک جیل میں رہنا ہے؟ کیا نکلنے کا ارادہ نہیں؟ کیا اب بھی آپ "اسی بات" پر قائم ہیں؟ میں نے

۱؎ اس مجلس کی سرگذشت خود امام ابن تیمیہ نے اپنے ایک مکتوب میں لکھی ہے جو "المحنۃ" کے نام سے حال میں شائع ہوا ہے ۲؎ ابن کثیر ص۳۸ ۳؎ ایضاً ص۴۲ ۴؎ یہ رسالہ دمشق کے مشہور کتب خانہ "الظاہریہ" میں شیخ کے برادرِ حقیقی اور رفیق زندان شیخ شرف الدین ابن تیمیہ کے قلم کا لکھا ہوا موجود تھا، ہمارے فاضل دوست شیخ محمد عبدالرزاق حمزہ سابق امام حرم کی حسن مساعی اور شیخ محمد نصیف کے اہتمام سے وہ چند دوسرے رسائل کے ساتھ شائع ہو گیا ہے جس کا نام "مجموعۂ علمیہ" ہے۔

خیال کیا کہ اس شخص کی زبانی پیغام بھیجنا مناسب نہیں (کہ معلوم نہیں پورے طور پر ادا کر پائے یا نہیں؟) تو میں نے اس سے کہا کہ نائب صاحب کو سلام کہنا اور ان سے کہنا کہ مجھے معلوم نہیں کہ "وہ بات" کیا ہے، مجھے ابھی تک یہی معلوم نہیں کہ میں کس جرم میں قید کیا گیا ہوں اور میرا قصور کیا ہے، نیز اس پیغام کا جواب میں ملازمین کی زبانی نہیں دینا چاہتا، آپ اپنے معتبر لوگوں میں سے چار ایسے شخصوں کو بھیجیں جو سمجھدار بھی ہوں، اور راست گفتار اور امین بھی، تاکہ میں ان سے پوری بےکم وکاست بات کہہ سکوں، اس لئے کہ مجھے معلوم ہے کہ اس قضیہ میں بہت دروغ گوئی اور تحریف سے کام لیا گیا ہے۔

اس کے بعد داروغہ آیا، اور اس کے ساتھ ایک دوسرا شخص تھا جس کو میں پہچانتا نہیں تھا، لیکن لوگوں نے بیان کیا کہ ان کا نام علاء الدین الطبرسی ہے، لوگ جو ان سے واقف تھے، ان کی تعریف بھی کرتے ہیں، لوگ جانتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے مجھے صبر وتحمل اور تلخ بات سننے کی قوت عطا فرمائی ہے، اور ادنیٰ مخاطب سے بھی میں انصاف کے ساتھ گفتگو کرتا ہوں، چہ جائے کہ حکام اور ذمہ داران حکومت سے، لیکن انھوں نے ایسا طریقہ اختیار کیا جس سے اندازہ ہوتا تھا کہ وہ مجھے مطالبہ کے منظور کرنے پر مجبور کرنا چاہتے ہیں، انھوں نے ایک محضر بھی نکالا جس میں خلاف واقعہ اور غلط باتیں لکھی تھیں، اور جس میں اللہ تعالیٰ کی نافرمانی کی دعوت تھی، میں جب ان کو اس کا جواب دیتا، اور پیغام سپرد کرتا، تو وہ کچھ سننے کے لئے تیار نہ ہوتے، اور اسی پر اصرار کرتے کہ میں اس مطالبہ کو منظور کرلوں اور وعدہ کروں کہ پھر اپنے مسلک کی طرف رجوع نہ کروں گا (اگرچہ قرآن وحدیث میں مباحثہ میں رفق ولین کا حکم ہے، مگر جب ظلم کیا جائے تو شدت، اور خودداری کا بھی حکم ہے) میں نے سلسلۂ کلام میں ان سے کہا کہ اس معاملہ میں مجھے فیصلہ کا حق نہیں، یہ معاملہ اللہ اور رسولؐ اور تمام عالم کے مسلمانوں کا ہے، مجھے اللہ کے دین کے تغیر وتبدل

کا اختیار نہیں، اور میں تمہاری اور کسی دوسرے کی وجہ سے دین اسلام سے ہٹ نہیں سکتا، اور نہ کذب و بہتان کا اقرار کر سکتا ہوں۔

جب میں نے دیکھا کہ وہ اس پر اصرار کرتے ہیں تو میں نے سختی سے بات کی، اور میں نے کہا کہ یہ فضول باتیں چھوڑو، اور جاؤ اپنا کام کرو، میں نے تم سے اس کی درخواست نہیں کی تھی کہ تم مجھے جیل سے نکالو، اس وقت اوپر کا دروازہ بند تھا، میں نے کہا کہ دروازہ کھولو، میں جاتا ہوں گویا گفتگو ختم ہے۔

میں نے قاصد سے کہا تھا کہ میں نے ان مسائل میں جو کچھ لکھا یا کہا ہے، وہ ہمیشہ سوال و استفتاء کے جواب میں تھا، میں نے کسی سے اس مسئلہ پر ابتداءً مراسلت نہیں کی، نہ کسی کو از خود مخاطب بنایا، ایک طالبِ حق میرے پاس آتا ہے اور بار بار مجھ سے سوال کرتا ہے کیا ازروئے دین اس کی گنجائش ہے کہ میں کتمانِ حق سے کام لوں، حالانکہ آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں من سئل عن علم یعلمہ فکتمہ الجمہ اللہ یوم القیامۃ بلجام من النار[1] اللہ تعالےٰ کا ارشاد ہے:

"اِنَّ الَّذِیْنَ یَکْتُمُوْنَ مَآ اَنْزَلْنَا مِنَ الْبَیِّنٰتِ وَالْھُدٰی مِنْۢ بَعْدِ مَا بَیَّنّٰہُ لِلنَّاسِ فِی الْکِتٰبِ اُولٰٓئِکَ یَلْعَنُھُمُ اللّٰہُ وَیَلْعَنُھُمُ اللّٰعِنُوْنَ[2]" کیا میں تمہارے کہنے سے طالبِ حق کے جواب دینے سے احتراز کروں تاکہ میرا انجام وہ ہو (جو آیت میں بیان کیا گیا ہے) کیا سلطان مجھ کو اس کا حکم دیتے ہیں، یا کوئی اور مسلمان، لیکن اصل بات تو یہ ہے کہ تم ان بے اصل باتوں کی بنا پر جو تم تک پہنچی ہیں، بادشاہ کے حکم کو آڑ بنانا چاہتے ہو۔

---

[1] جس شخص سے (دین کی) کوئی ایسی بات پوچھی جائے جس کا اس کو علم ہے اور وہ اس کو ظاہر نہ کرے اور کتمان سے کام لے، اللہ تعالےٰ اس کے منہ میں قیامت کے دن آگ کی لگام ڈالے گا۔

[2] بیشک جو لوگ ان کھلی کھلی باتوں اور ہدایت کو جو ہم نے نازل کر دیا ہے، اس کے بعد بھی چھپاتے ہیں کہ ہم نے ان لوگوں کے لئے کتاب میں بیان کر دیا، یہی لوگ ہیں کہ ان پر اللہ لعنت کرتا ہے اور لعنت کرنے والے لعنت کرتے ہیں (سورۂ بقرہ - ۱۵۹)

اس پر قاصد نے کہا کہ جناب والا! بادشاہ کا نام تو درمیان میں نہ لائیے کوئی بادشاہ کی شان میں گفتگو نہیں کرتا! میں نے کہا کہ جی ہاں اس وقت کوئی بھی بادشاہ کے معاملہ میں کچھ کہنے سننے کی جرأت نہیں کرتا، یہ فتنہ اسی وجہ سے ہوا ہے، یہ ہم نے شام ہی میں سن لیا تھا کہ یہ الزام لگایا جا رہا ہے کہ بادشاہ پر حرف زنی کی گئی ہے اور ان کو الزام لگایا گیا ہے، لیکن ہم سمجھتے تھے کہ کوئی بھی اس کو باور نہیں کرے گا۔

میں نے اس سے کہا کہ اس معاملہ کا نقصان مجھ پر عائد نہیں ہوگا، مجھے کس بات کا اندیشہ ہو سکتا ہے اگر میں اس مقدمہ میں قتل کر دیا گیا تو میں بڑے درجہ کی شہادت پاؤں گا، اور یہ میرے حق میں ایک بڑی سعادت ہوگی، قیامت میں مجھے راضی کیا جائے گا، اور جو لوگ اس میں ساعی بنیں گے، قیامت تک وہ لعنت کے مستحق ہوں گے، اس لئے کہ ساری امتِ محمدی کو معلوم ہے کہ میں حق پر مارا جا رہا ہوں جس کے ساتھ اللہ نے اپنے رسول کو مبعوث فرمایا، اور اگر میں محبوس کر دیا گیا تو خدا کی قسم میرا محبوس ہونا اللہ تعالیٰ کی ایک عظیم ترین نعمت ہوگی اور مجھے کسی ایسی چیز کا بھی خوف نہیں، جو لوگ مجھ سے چھین لیں گے، نہ کسی مدرسہ کی صدر مدرسی یا اہتمام، نہ کوئی جائداد، نہ دولت، نہ حکومت، اور عہدہ اور نہ کوئی اور چیز، لیکن اس معاملہ کا ضرر تمہیں پر عائد ہوگا، اس لئے کہ جن لوگوں نے اس معاملہ میں شام میں بیٹھ کر ریشہ دوانی کی ہے میں جانتا ہوں کہ ان کا مقصود تمہارے خلاف سازش کرنا اور تمہارے دین و حکومت کو نقصان پہنچانا ہے، ان میں سے بعض تاتاریوں کے ملک میں گئے اور بعض اب بھی وہاں مقیم ہیں، انہی لوگوں نے تمہارے دین و دنیا کے بگاڑنے کا ارادہ کیا ہے اور مجھے محض آلہ بنایا ہے، اس لئے کہ وہ جانتے ہیں کہ میں تمہارا دوست اور خیر خواہ ہوں، اور تمہارے لئے دنیا و آخرت کی بھلائی چاہتا ہوں، اس معاملہ میں بہت سی باتیں ابھی تک سربستہ راز ہیں، وہ اپنے وقت پر منکشف

ہوں گی، ورنہ میرے اور مصر میں کسی کے درمیان نہ کوئی عداوت تھی، نہ مخالفت، اور میں ہمیشہ سے اہلِ مصر کا محب اور ان کے اور ان کے حکام کا اور علماء کا حامی اور دوست رہا ہوں۔

اس نے کہا کہ میں نائب السلطان کو کیا جا کر جواب دوں؟

میں نے کہا کہ سلام کہنا اور پورا پیغام پہنچا دینا۔

اس نے کہا کہ آپ نے تو بہت سی باتیں کہی ہیں!

میں نے کہا کہ خلاصہ یہ ہے کہ اس محضر میں جو کچھ ہے، اس کا بڑا حصہ جھوٹ ہے۔

البتہ یہ جملہ استوی حقیقۃ (ضرور میں نے کہا ہے) اور مالکی اور غیر مالکی علماء میں سے متعدد نے لکھا ہے کہ اس پر اہلِ سنت والجماعت کا اجماع ہے، اور اس کا سلف اور اس امت کے پیشواؤں اور اکابر علماء میں سے کسی نے انکار نہیں کیا، بلکہ میرے علم میں تو کسی عالم نے بھی اس کا انکار نہیں کیا ہے تو میں ایسے اجماعی عقیدہ کو جس کا کسی عالم نے انکار نہیں کیا ہے کیسے چھوڑ دوں؟ علامہ ابو عمر ابن عبد البر کہتے ہیں "اھل السنۃ مجمعون علی الاقرار بالصفات الواردۃ کلھا فی القرآن والسنۃ، والایمان بھا وحملھا علی الحقیقۃ لا علی المجاز، الا انھم لا یکیفون شیئاً من ذلک ولا یحدون فیہ صفۃ محصورۃ، واما اھل البدع الجھمیۃ والمعتزلۃ کلھا والخوارج فکلھم ینکرھا، ولا یحمل شیئاً منھا علی الحقیقۃ ویزعمون ان من اقربھا مشبھۃ وعند من اقربھا نافون للمعبود، والحق فیما قالہ القائلون بما نطق بہ کتاب اللہ وسنۃ رسولہ وھم ائمۃ الجماعۃ۔"

الشیخ العارف ابو محمد عبد القادر گیلانی "غنیۃ الطالبین" میں فرماتے ہیں "وھو بجھۃ العلو مستو علی العرش محتو علی الملک محیط علمہ بالاشیاء" آگے فرماتے ہیں "ولا یجوز وصفہ بانہ فی کل مکان بل یقال انہ فی السماء علی العرش کما قال الرحمٰن علی العرش استوی۔"

وینبغی لطلاق صفة الاستواء من غیر تاویل وانہ استواء الذات علی العرش"۔[1]

ابنِ مخلوف (تاویل سے) جس عقیدہ کا اظہار کرتے ہیں، وہ خود امام مالکؒ ان کے ائمۂ اصحاب اور ابوالحسن اشعری اور ان کے ائمۂ اصحاب کے نصوص کے خلاف ہے، ان سب نے اسی کی تصریح کی ہے، جو ہم کہتے ہیں، اسی بنا پر حنابلہ اور اشعریہ کی مصالحت ہوگئی اور لوگوں کا اتفاق ہوا جب حنابلہ نے ابوالحسن اشعری کا قول دیکھا تو انھوں نے کہا کہ یہ الشیخ الموفق[2] کے قول سے بہتر ہے، اور اس طرح دلوں کے کینے نکل گئے، اور فقہاء شافعیہ وغیرہ کی زبان سے نکلا کہ "الحمد للہ علی اتفاق کلمۃ المسلمین"۔

میرا بھی یہی عقیدہ ہے کہ "ھو مستو علی العرش حقیقۃ بذاتہ بلا تکییف ولا تشبیہ" اس نے کہا کہ اس کو آپ لکھ دیجئے اور اسی کی پابندی کیجئے، میں نے کہا کہ وہ انہی لفظوں میں اس عقیدہ میں لکھا ہوا ہے، جو تمہارے پاس موجود ہے، اور اس پر دمشق میں بحث ہو چکی ہے، اور اس پر مسلمانوں کا اتفاق ہے، اب میں اس میں کیا اضافہ کروں؟

میں نے اس سے کہا کہ میں نے پچاس کتابوں سے زیادہ مہیا کی ہیں، جو تمام تر محدثین، صوفیہ، متکلمین اور فقہاء، مذاہبِ اربعہ کی کتابیں ہیں، سب میری مؤید ہیں، اور میں اپنے مخالفین کو تین سال کی مہلت دیتا ہوں کہ اس کے خلاف ایک حرف بھی ائمۂ اسلام سے ثابت کردیں، اب میں کیا کروں۔

جب طبرسی چلے گئے تو کچھ دیر کے بعد داروغہ آیا، اور اس نے کہا کہ نائب السلطان آپ کو سلام کہتے ہیں، اور کہتے ہیں کہ آپ اپنے قلم سے اپنا عقیدہ لکھ دیجئے، میں نے کہا کہ نائب صاحب کو سلام کہو اور میری طرف سے عرض کرو کہ اگر میں اس وقت کچھ لکھوں گا تو کہنے والا کہے گا کہ شیخ نے اپنے عقیدۂ سابق میں کمی زیادتی کی یا اپنا عقیدہ بدل دیا، اسی طرح جب دمشق میں انھوں نے عقیدہ کی تحریر کا مطالبہ کیا،

---

[1] شیخ نے اس موقع پر اس مضمون کی تائید میں اکابر علماء مذاہب اربعہ کی بہت سی نقول نقل کی ہیں، ان میں سے یہاں انہی دونوں نقلوں پر اکتفاء کی گئی۔ [2] شیخ موفق الدین ابنِ قدامہ جن کا رجحان حنابلہ میں تاویل کی طرف ہے۔

تو میں نے وہی چیز پیش کی جو پہلے لکھی جا چکی تھی، میں نے کہا کہ یہی وہ عقیدہ ہے جو شام کی تینوں مجلسوں میں پڑھا جا چکا ہے، اور نائب شام سرکاری ڈاک کے ساتھ اس کو بھیج چکا ہے اور یہ سب تحریریں آپ کے پاس موجود ہیں، اور عقیدہ کوئی ایسی چیز نہیں جو میں اپنی طرف سے ایجاد کروں، یہاں تک کہ روزانہ ایک نئے عقیدہ کا اعلان کروں، میرا عقیدہ وہی ہے جس کا پہلے اظہار کر چکا اور تحریر وہی ہے جو آپ کے پاس موجود ہے، آپ اس کو دیکھ لیجئے۔

وہ واپس گیا اور پھر آیا اور کہا کہ آپ اپنے قلم سے کچھ لکھ دیجئے، میں نے کہا کہ میں کیا لکھ دوں؟ اس نے کہا کہ مثلاً معافی نامہ اور یہ کہ آپ کسی سے تعرض نہ کریں گے، میں نے کہا کہ ہاں مجھے یہ منظور ہے، کسی کو ایذا پہنچانا میرا مقصود نہیں، نہ کسی سے انتقام لینا چاہتا ہوں نہ کسی سے دار و گیر کرنے کا ارادہ ہے، اور میں ہر اس شخص کو معاف کرتا ہوں جس نے میرے ساتھ زیادتی کی، میں نے یہ لکھ دینا چاہا، پھر میں نے کہا کہ اس کے لکھنے کا دستور نہیں اس لئے کہ انسان کا اپنے حق کو معاف کر دینا کسی تحریر کا محتاج نہیں ہے۔

شیخ نصر المنبجی کو اس حقیقت حال کی اطلاع ضرور کر دینی چاہئے تاکہ اپنی تدبیر سے کچھ اس کی اصلاح اور انتظام کریں، میرا مقصود محض اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت ہے، جس چیز کا اصل خطرہ ہے وہ یہ کہ اہل مصر کے آپس کے اختلافات اور ایک دوسرے کے بارہ میں ان کے اقوال سے کہیں فساد نہ برپا ہو جیسا کہ ابھی تک دیکھنے میں آیا ہے اور شام میں جو کچھ ہوا وہ آپ کو معلوم ہے، حالانکہ شام میں اتفاق کی صورت مصر سے زیادہ ہے، اور میں بخدا فساد کی آگ بجھانے میں (خواہ مصر میں ہو خواہ کہیں اور) اعانت کرنے میں سب سے پیش پیش رہوں گا، اور خیر کے قائم کرنے میں کسی سے پیچھے نہیں رہوں گا اور ابن مخلوف خواہ میرے ساتھ کیسا سلوک کریں میں حتی الامکان ان کے ساتھ حسن سلوک اور ان کو نفع پہنچانے سے کبھی دریغ نہیں کروں گا، اور ان کے دشمن کی ان کے مقابلہ میں کبھی مدد نہیں کروں گا، اور اصل ہمارا اور مدد اللہ کی ہے، یہی میری نیت اور میرا عزم ہے، حالانکہ میں تمام امور اور حالات سے واقف ہوں،

لیکن مجھے علم ہے کہ شیطان مومنین کے دلوں میں فساد ڈال دیتا ہے' اور میں اپنے مسلمان بھائیوں کے مقابلہ میں کبھی شیطان کا معاون نہیں بنوں گا۔

یہ جھگڑا اور یہ پریشانی اسی طرح رفع ہوسکتی ہے کہ اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع کیا جائے' اور اس سے استغفار اور توبہ کی جائے اور سچے دل سے اس کی پناہ لی جائے "فانہ سبحانہ لاملجأ منہ الا الیہ ولاحول ولاقوۃ الا باللہ"

باقی رہا استغاثہ کا مسئلہ تو تمام مسلمانوں کا اس پر اتفاق ہے' اور دینِ اسلام کا یہ بدیہی اور قطعی مسئلہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے سوا کسی کی عبادت' کسی سے دعا، اور کسی سے استغاثہ، اور کسی پر توکل جائز نہیں' اور یہ کہ جس نے کسی مقرب فرشتہ یا مبعوث پیغمبر کی عبادت کی' یا اس سے دعا کی' یا اس سے استغاثہ کیا، تو وہ مشرک ہے' کسی مسلمان کے نزدیک یہ جائز نہیں کہ یہ کہے کہ اے جبرئیل' اے میکائیل' اے ابراہیم' اے موسیٰ' یا رسول اللہ میری مغفرت فرمائیے یا مجھ پر رحم کیجئے یا مجھے رزق دیجئے' یا میری مدد فرمائیے یا میری فریاد سنئے یا میرے دشمن سے مجھے پناہ دیجئے' اور اسی طرح کی باتیں' بلکہ یہ سب خصائصِ الوہیت ہیں' اور بڑے اہم اور مشہور مسائل ہیں جن کی علماء تشریح کرچکے ہیں' اور اللہ اور رسول کے حدود اور حقوق میں فرق بیان کرچکے ہیں[1]' یہ اصول اسلام میں سے ہے' تو اگر قاصد (ابن مخلوف) دینِ اسلام اور دین نصاریٰ میں امتیاز نہ کرسکتے ہوں جو حضرت مسیح اور ان کی والدہ محترمہ سے دعا کرتے ہیں تو پھر میں کیا کروں' لیکن جو سیدہ نفیسہ[2] کو رب بنالے' اور کہے کہ وہ خوف زدہ کو پناہ دیتی ہیں' اور مصیبت زدہ کی فریاد سنتی ہیں' اور مدد کرتی ہیں' اور وہ ان کے دامنِ عاطفت اور وجاہت میں ہے' اور ان کا سجدہ کرتا ہے' اور ان سے گریہ وزاری کے ساتھ ایسی ہی دعا کرتا ہے جیسے کہ

---

[1] اس موقع پر شیخ نے اس مضمون کی آیات واحادیث جمع کردی ہیں' ملاحظہ ہو رسالہ "المحنۃ" شامل رسائل مجموعہ علمیہ' ص ۶۰-۶۲

[2] سیدہ نفیسہ اہل بیت رسول میں سے ہیں' اور ان کی قبر قاہرہ میں ہے' جس کی عوام بڑی تعظیم کرتے ہیں۔

رب السمٰوات والارض سے دعا کرنے میں گڑگڑاتا ہے اور ایسے زندہ پر بھروسہ کرتا ہے جس کا انتقال ہوگیا ہے اور اس زندہ پر بھروسہ نہیں کرتا، جو ہمیشہ زندہ رہے گا، اور جس کو فنا نہیں تو اس میں شک نہیں کہ ایسی ہستی کو شریک کرنا جو سیدہ نفیسہ سے افضل ہے ان کو شریک کرنے سے زیادہ قوی ہوگا۔[1]

باقی رہے رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے حقوق (میرے ماں باپ آپ پر قربان ہوں) مثلاً آپ کی محبت کا اپنے نفس، متعلقین اور مال پر مقدم رکھنا، اور آپ کی تعظیم و توقیر اور احترام و عظمت اور اتباع و اطاعت اور آپ کی سنت کی پیروی وغیرہ وغیرہ تو وہ بڑے عظیم الشان ہیں، اسی طرح سے دعا میں آپ کو وسیلہ بنانا مستحسن ہے، باقی آپ سے دعا اور آپ سے استغاثہ (آپ کی دہائی دینا) تو وہ حرام ہے، میں نے اس موضوع (حقوق رسول) پر ایک کتاب "الصارم المسلول علی شاتم الرسول" تصنیف کی ہے، جس میں اس مسئلہ کی ایسی تحقیقات اور تفصیلات ہیں کہ میرے علم میں اس سے پہلے کسی تصنیف میں نہیں ملتیں، اسی طرح سے ان اصول و قواعد ایمان کے بارہ میں بہت سے مضامین اور رسائل لکھ چکا ہوں جو دین کے بارہ میں مفید ترین چیزیں ہیں۔

شیخ (نصر) کی اطلاع میں یہ بات آجانی چاہئے کہ مجھے اس کا اندیشہ ہے کہ معاملہ کہیں ان کے ہاتھ سے نکل نہ جائے اور بے قابو نہ ہوجائے، اور کوئی ایسی بات نہ پیش آئے جس کا نقصان ان کو اور ابن مخلوف وغیرہ کو برداشت کرنا پڑے، اس لئے کہ مجھ سے ایسی بات کی فرمائش کی گئی ہے جو اس نقصان کا سبب بن سکتی ہے، میں نے اس کو منظور نہیں کیا، اس لئے کہ میں ان کا مخلص ہوں، واللہ میں نے ان کے ساتھ کبھی فریب نہیں کیا، اگر فریب کیا ہوتا تو اس بات کا اظہار نہ کرتا (کہ مجھ سے ایسی بات کی فرمائش کی جارہی ہے جس میں ان کا نقصان ہے) میں ان دونوں کا نیکی اور خدا ترسی کے کام پر معاون ہوں۔

آپ یہ بھی ان سے کہہ دیجئے کہ وہ بنیاد جس پر معاملات درست ہوسکتے ہیں، یہ ہے کہ ہر شخص

---

[1] اس موقع پر شیخ نے توحید کی آیات واحادیث نقل کی ہیں، ملاحظہ ہو "المحنۃ" ص ۶۳

اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع کرے، اور (رمضان کے) اس مبارک عشرہ میں توبہ کرے، جب قلوب اور اندرون درست ہوجائیں گے تو ظواہر خود بخود درست ہوجائیں گے" اِنَّ اللّٰهَ مَعَ الَّذِیْنَ اتَّقَوْا وَّالَّذِیْنَ هُمْ مُّحْسِنُوْنَ ؕ

جیل کے اندر اصلاح و تعلیم اور اس کے اثرات

صاحب "الکواکب الدریہ" شیخ الاسلام کے معاصر اور رفیق درس شیخ علم الدین البرزالی کے حوالہ سے لکھتے ہیں کہ :-

"شیخ جب محبس میں پہونچے تو دیکھا کہ قیدی لہو ولعب اور تفریحات میں مشغول ہیں، اور اسی طرح اپنا دل بہلاتے اور وقت کاٹتے ہیں، شطرنج، چوسر وغیرہ کا زور ہے، نمازیں بے تکلف قضا ہوتی ہیں، شیخ نے اس پر اعتراض کیا، اور قیدیوں کی نماز کی پابندی، اور اللہ تعالیٰ کی طرف توجہ، اعمالِ صالحہ، تسبیح و استغفار اور دعا کی طرف متوجہ کیا اور سنت کی تعلیم اور اعمالِ خیر کی ترغیب شروع کردی، یہاں تک کہ علم و دین کی ایسی مشغولیت شروع ہوگئی کہ یہ جیل خانہ بہت سی خانقاہوں اور مدارس سے زیادہ بارونق اور بابرکت نظر آنے لگا، لوگوں کو ان کی ذات سے ایسا تعلق اور جیل کی اس دینی و علمی زندگی سے ایسی دلچسپی ہوگئی کہ بہت سے قیدی رہائی پانے کے بعد بھی ان کو چھوڑنے کے لئے تیار نہیں تھے، اور انہی کی خدمت میں رہنا پسند کرتے تھے۔"[1]

چار مہینے کے بعد (۱۴ صفر ۷۰۸ھ) کو دوبارہ ان کی رہائی کی کوشش کی گئی، قاضی القضاۃ بدر الدین بن جماعہ نے خود ان سے ملاقات کی، اور دیر تک گفتگو رہی، لیکن وہ نکلنے پر رضامند نہ ہوئے بالآخر ۲۳ ربیع الاول کو امیر حسام الدین مہنا بن عیسیٰ ملک العرب[2] خود جیل خانہ گئے، اور شیخ کو قسم دی،

---

[1] الکواکب الدریہ ص ۱۸۱ [2] امیر حسام الدین عربی النسل امراء کے خاندان کے فرد اور شام کے ایک بڑے ذی وجاہت اور (باقی ص ۸۹ پر)

اور اپنے ساتھ نائب مصر کے مکان پر لائے، امیر حسام الدین ان کو اپنے ساتھ دمشق لیجانا چاہتے تھے لیکن نائب السلطنت نے مشورہ دیا کہ شیخ ابھی کچھ روز مصر میں قیام فرمائیں تاکہ لوگوں کو ان کے علم و فضل کا اندازہ ہو اور ان سے استفادہ کریں۔

ابن تیمیہ کی اخلاقی بلندی

اس عرصہ میں ابن تیمیہ کی سیرت کی بلندی اور نمایاں ہوئی، انھوں نے کسی طاقت کے سامنے گردن نہیں خم کی اور نہ کسی دنیاوی ترغیب یا مالی منفعت سے ان کا دامن داغدار ہوا، انھوں نے سلطانی خلعت اور عطایائے سلطانی کے قبول کرنے سے بھی صاف انکار کر دیا۔

ان کا دوسرا کارنامہ یہ تھا کہ انھوں نے جیل سے باہر آتے ہی اپنے تمام مخالفین کو اور ان تمام لوگوں کو جنھوں نے ایذا رسانی کی کوشش کی تھی، بلا استثناء معاف کر دیا، اور اس کا صاف اعلان کر دیا کہ ان کو کسی سے کوئی شکایت نہیں اور نہ وہ کسی سے مواخذہ کریں گے، اپنی رہائی کے بعد انھوں نے شام جو خط لکھا تھا، اس میں فرماتے ہیں:۔

تعلمون رضی اللّٰہ عنکم انی لا احب	اللہ تعالیٰ آپ سے راضی ہو آپ کو معلوم ہے کہ میں
ان یوذی احدٌ من عموم المسلمین	نہیں چاہتا کہ عامۂ مسلمین میں سے کسی کو بھی ایذا
فضلاً عن اصحابنا شیٔ اصلاً لا ظاھرًا	پہونچے کسی طرح کی بھی ظاہری یا باطنی، چہ جائے کہ
او باطنًا، ولا عندی عتبٌ علیٰ احد	یہ پسند کروں کہ ہمارے احباب (علماء و اہلِ دین)

(باقی صفحہ ۸۸ کا) طاقت ور رئیس تھے، شامی ہونے کی وجہ سے وہ ابن تیمیہ کے مجاہدانہ کارناموں اور اصلاحی کوششوں سے بہ نسبت مصریوں کے زیادہ واقف تھے، اس لئے انھوں نے ابن تیمیہ کی رہائی میں خاص دلچسپی لی، ان کے خلوص، علو خاندان اور حریت پسندی کی وجہ سے ابن تیمیہ نے بھی ان کی پیش کش قبول کی، اور جیل سے باہر آنے پر آمادہ ہو گئے۔

منهم ولا لوم اصلاً بل لهم عندی من الکرامة والاجلال والمحبة اضعاف ما کان، کل بحسبه، ولا یخلو الرجل اما ان یکون مجتهداً، او مخطئاً، او مذنباً، فالاول ماجور مشکور، والثانی مع اجرہ علی الاجتهاد معفو عنه، والثالث فالله یغفر لنا وله ولسائر المومنین۔

کو میری وجہ سے کوئی ایذا پہونچی، مجھے نہ کسی سے شکایت ہے، نہ کسی پر ملامت، بلکہ واقعہ یہ ہے کہ ان کی عزت و عظمت اور محبت میرے دل میں پہلے سے کئی گنا زیادہ ہے، اور وہ ہر ایک مرتبہ کے مطابق، انسان (کسی شخص کے ساتھ اختلاف و نزاع کرتے ہیں) یا تو مجتہد ہوتا ہے یا غلط کار یا گنہگار، مجتہد تو ثواب اور شکریہ دونوں کا مستحق ہے، غلط کار قابلِ معافی ہے، رہا گنہگار تو اللہ ہماری، اس کی اور تمام مومنین کی مغفرت فرمائے۔

لا احب ان ینتصر من احد بسبب کذبه علیّ او ظلمه او عدوانه، فانی قد احللت کل مسلم، وانا احب الخیر لکل المسلمین، وارید لکل مؤمن من الخیر ما ارید لنفسی والذین کذبوا وظلموا هم فی حل من جهتی۔[1]

میں نہیں چاہتا کہ کسی شخص سے اس وجہ سے انتقام لیا جائے کہ اس نے مجھ پر بہتان باندھا تھا یا ظلم یا زیادتی کی، اس لئے کہ میں نے ہر مسلمان کو معاف کر دیا ہے اور میں تمام مسلمانوں کے لئے بھلائی چاہتا ہوں، اور ہر مومن کے لئے اسی چیز کا طالب ہوں جس کا اپنے لئے، وہ تمام لوگ جو جھوٹ بولے اور جنھوں نے ظلم کیا، وہ میری طرف سے بری الذمہ اور آزاد ہیں، میری طرف سے کوئی مواخذہ نہیں۔

---

[1] ابن تیمیہ (محمد ابوزہرہ) صـ ۶۳

درس وافادہ

جیل سے آنے کے بعد ابن تیمیہ درس وافادہ میں مشغول ہو گئے، مصر کی فضا ان کے لئے ابھی ساز گار نہ تھی، علماء وقضاۃ نے ان کے متعلق مختلف قسم کی غلط فہمیاں پھیلا رکھی تھیں، گروہ صوفیہ بھی (جس میں توحید وجودی کا ذوق اچھا خاصا پایا جاتا تھا) ان سے بدگمان اور آزردہ تھا، مذاہبِ اربعہ میں سے صرف حنبلی اور عقائد میں سے صرف "عقیدۂ سلف" کی وکالت اور نمائندگی کے لئے ملک میں کوئی طاقتور اور مؤثر شخصیت موجود نہ تھی[1]، ورنہ دوسرے مذاہب کے بڑے بڑے قاضی اور عالم موجود تھے، ان سب وجوہ کی بنا پر ابن تیمیہ نے مصر میں کچھ عرصہ قیام اور درس وافادۂ عام کا ارادہ کر لیا، اور ان کے باقاعدہ اور بے قاعدہ درس اور مجالس شروع ہو گئیں، خالص علمی اور کلامی مسائل پر انھوں نے قاہرہ کے مشہور مدارس بالخصوص صالحیہ میں کئی درس دیئے جن سے خواص نے فائدہ اٹھایا اور ان کے اصلی خیالات وعقائد سے واقف ہوئے۔

اس درس وافادہ کا سلسلہ چھ مہینے جاری رہا، جس سے عوام وخواص نے دینی وعلمی فائدہ اٹھایا اور عام طور پر لوگ ان کے خلوص، غیر معمولی ذہن ودماغ اور علمی کمالات کے گرویدہ ہوئے۔

ابن تیمیہ کا خط والدہ کے نام

ابن تیمیہ کا مصر آنا اچانک ہوا تھا، اور یہ اندازہ نہ تھا کہ ان کو یہاں اتنے عرصہ قیام کرنا ہوگا، ان کی والدہ اور سارا کنبہ شام میں تھا، جو ان کی بخیریت واپسی کے لئے چشم براہ تھا، ابن تیمیہ نے دینی مصالح کے پیش نظر جب کچھ عرصہ مصر میں قیام کا فیصلہ کیا تو انھوں نے والدہ محترمہ کو اس ارادہ کی

---

[1] اتفاق سے اس وقت قاضی حنبلی بہت محدود علم وفہم کے آدمی تھے، اور ان کی وجہ سے حنابلہ کا پہلو بہت کمزور تھا۔ (ملاحظہ ہو ابن کثیر ص ۳۰ ج ۱۴)

اطلاع دی، اور ان سے اجازت طلب کی، یہ خط لطیف جذبات، پاک محبت، فرزندانہ سعادت مندی اور مردانہ حوصلہ مندی اور اولوالعزمی کا آئینہ ہے، اور بے ساختہ اور بے تکلف زبان میں لکھا گیا ہے، اس لئے پورا نقل کرنے کے قابل ہے، وہ لکھتے ہیں:-

من احمد بن تيمية الى الوالدة السيدة اقرّ الله عينيها بنعمه واسبغ عليها جزيل كرمه وجعلها من امائه و خدمه.	احمد بن تیمیہ کی جانب سے مخدومہ والدہ صاحبہ کی خدمت میں، اللہ تعالیٰ اپنی نعمتوں سے ان کی آنکھیں ٹھنڈی رکھے، اور ان کو اپنے احسانات سے مالا مال فرمائے، اور ان کو اپنی مقبول بندیوں میں شامل فرمائے۔
سلام عليكم ورحمة الله وبركاته، انا نحمد اليكم الله الذي لا اله الا هو، وهو للحمد اهل، وهو على كل شئ قدير، ونسأله ان يصلي على خاتم النبيين وامام المتقين محمد عبده ورسوله صلى الله عليه وسلم وعلى آله وسلم تسليمًا.	السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ، اس خدائے پاک کا شکر گذار ہوں جس کے سوا کوئی معبود نہیں، اور وہ لائق حمد و ستائش ہے، اور ہر چیز پر قادر ہے، اللہ تعالیٰ کا درود و سلام اپنے رسول اور بندۂ خاص جناب محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی ذات گرامی پر جو خاتم النبیین، امام المتقین ہیں، اور ان کے آل پر۔
كتابي اليكم عن نعم من الله عظيمة، ومنن كريمة والآء جسيمة نشكر الله عليها ونسأله المزيد من فضله ونعم الله كلما جاءت في نمو وازدياد	میں یہ عریضہ آپ کی خدمت میں لکھ رہا ہوں، اور حالت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی اپنے اوپر بڑی نعمتیں بڑے انعامات اور بڑے عظیم الشان عطیے پاتا ہوں جن پر اس کی بارگاہ میں شکر گذار اور مزید کا

وایادیه جلّت عن التعداد وتعلمون
ان مقامنا الساعة فی هذه البلاد
انما هو لامور ضروریة متی اهملناها
فسد علینا امر الدین والدنیا ولسنا
والله مختارین للبعد عنکم ولو حملتنا
الطیور لسرنا الیکم ولکن الغائب
عذره معه وانتم لو اطلعتم علی
باطن الامور فانکم. ولله الحمد.
ما تختارون الساعة الا ذلك، ولم
نعزم علی المقام والاستیطان شهرًا
واحدًا بل کل یوم نستخیر الله ولکم
وادعوا لنا بالخیرة فنسأل الله
العظیم ان یخیر لنا وللمسلمین ما فیه
الخیرة فی خیر وعافیة۔

طلب گار ہوں، اللہ کی نعمتیں روزافزوں اور
اس کے احسانات لاتعداد ہیں، آپ کی اطلاع
کے لئے لکھ رہا ہوں کہ اس وقت ہمارا مصر میں
قیام چند ایسے ضروری امور کی بنا پر ہے کہ اگر
ہم ان سے غفلت برتیں تو دین و دنیا کی خرابی
اور نقصان کا اندیشہ ہے، خدا کی قسم ہم اپنے
اختیار اور خواہش سے یہاں ٹھہرے ہوئے
نہیں ہیں اور ہم نے آپ سے دوری خود اختیار
نہیں کی ہے (اپنے جذبہ اور شوق کا حال
تو یہ ہے کہ) جی چاہتا ہے کہ پر لگ جائیں اور
ہم اڑ کر آپ کے پاس پہنچ جائیں، لیکن دور افتادہ
کا صحیح صحیح حال اور اس کی معذوری سمجھ میں نہیں
آسکتی، وہ اپنے حالات تو خود ہی جانتا ہے
اگر آپ کو حقیقت حال معلوم ہو جائے تو آپ
بھی (اپنے دینی شوق اور بلند ہمتی کی بنا پر) یہی
فیصلہ کریں گی کہ اس وقت میرا مصر ہی میں
ٹھہرنا انسب ہے، جہاں تک ہمارے ارادہ کا
تعلق ہے ہم نے ایک مہینہ بھی مصر میں قیام
کرنے اور سکونت اختیار کرنے کا کبھی عزم نہیں کیا،

بلکہ ہم روزانہ اپنے اور آپ کے لئے اللہ سے خیر کی
دعا کرتے رہتے ہیں آپ بھی ہمارے لئے اس کی دعا
کیجئے کہ اللہ تعالیٰ خیر مقدر کرے اور اسی چیز کا
فیصلہ فرمائے جو ہمارے حق میں بہتر ہو۔

اللہ تعالیٰ نے اپنے فضل سے خیر و رحمت اور ہدایت
و برکت کے ایسے ایسے دروازے کھولے ہیں جو پہلے
وہم و گمان میں بھی نہیں تھے ہم کو ہر وقت سفر کی
فکر ہے اور اللہ سے استخارہ کرتے رہتے ہیں کوئی
یہ خیال نہ کرے کہ ہم آپ کے قرب پر دنیا کی کسی
دولت کو ترجیح دیتے ہیں، بلکہ دین کے امور میں سے
بھی (نوافل وغیرہ کے درجہ کی چیزوں میں سے)
کسی ایسی چیز کو ترجیح دینے کے لئے تیار نہیں
جن کے مقابلہ میں آپ کا قرب اور آپ کی خدمت
دینی اعتبار سے افضل اور اعلیٰ ہے، لیکن کچھ
ایسے اہم امور و مسائل درپیش ہیں جن کے چھوڑ
دینے سے ہم کو عمومی اور خصوصی ضرر کا اندیشہ ہے
اور اس کا اندازہ اسی کو ہو سکتا ہے جو موقع پر
پر موجود ہے "شنیدہ کے بود مانند دیدہ" آپ سے
درخواست ہے کہ اس کی دعا کثرت سے کریں کہ

وقد فتح الله من ابواب الخير والرحمة
والهداية والبركة مالم يكن يخطر بالبال
ولا يدور في الخيال، ونحن في كل وقت
مهمومون بالسفر مستخيرين الله سبحانه
وتعالى فلا يظن الظان انا نؤثر على
قربكم شيئاً من امور الدنيا قط بل
لا نؤثر من امور الدين ما يكون قربكم
ارجح منه ولكن ثم أمور كبار نخاف
الضرر الخاص والعام من اهمالها
والشاهد يرى مالا يرى الغائب
والمطلوب كثرة الدعاء بالخيرة
فان الله يعلم ولا نعلم ويقدر
ولا نقدر وهو علام الغيوب وقال
النبي صلى الله عليه وسلم من سعادة
ابن آدم استخارته الله ورضاه

بما یقسم اللہ لہٗ ومن شقاوۃ ابن
آدم ترك استخارتہ اللہ وسخطہ بما
یقسم اللہ لہٗ والتاجر یکون مسافرًا
ویخاف ضیاع مالہ فیحتاج ان یقیم حتی
یستوفیہ ومانحن فیہ أمر یجل عن
الوصف ولاحول ولاقوۃ الا باللہ
والسلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ
کثیرًا کثیرًا وعلیٰ سائر من فی البیت
فی الکبار والصغار والاھل والاصحاب
واحدًا واحدًا والحمد للہ رب
العالمین وصلی اللہ علیٰ سیدنا محمد
وآلہٖ وصحبہٖ وسلم تسلیمًا۔

اللہ تعالےٰ ہمارے لئے ایسی چیز کا فیصلہ فرمائے
جو ہمارے حق میں بہتر ہو (قیام یا سفر) اس لئے
کہ اللہ تعالےٰ جانتا ہے، ہم بے خبر ہیں اسی کو
صحیح اندازہ ہے، ہم بے اندازہ ہیں، وہ سب چھپی
ڈھکی چیزوں سے واقف ہے، آنحضرت صلے اللہ
علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ انسان کی سعادتمندی
یہ ہے کہ وہ اللہ سے خیر طلب کرتا ہو اور اس کا
فیصلہ اسی پر چھوڑتا ہو اور پھر جو فیصلہ فرمائے
اس پر راضی ہو جاتا ہو اور بدبختی اور شقاوت ہے کہ
وہ استخارہ اور خیر طلبی چھوڑ دے اور اس کے فیصلہ
سے ناراض اور غیر مطمئن ہو، والدہ صاحبہ آپ
جانتی ہیں کہ تاجر بھی جب کبھی پردیس میں ہوتا ہے
اور اس کی رقمیں اور مال پھیلا ہوا ہوتا ہے تو
وہ بھی اتنا انتظار کرتا ہے اور مجبورًا قیام اختیار
کرتا ہے کہ وہ اپنی سب رقمیں وصول کرلے اور
اپنا مال سمیٹ لے، اور ہم تو جس بڑے کام اور
جس عظیم مقصد کے لئے ٹھہرے ہوئے ہیں وہ تو چیز ہی
کچھ اور ہے، اس سے تجارت کو کیا نسبت؟ بس
سب سہارا اور آسرا اللہ ہی کا ہے آپ پر اور گھر کے

سب چھوٹوں بڑوں پر اور سب متعلقین اور گھر والوں
پر بہت بہت سلام ہو، وصلے اللہ علی سیدنا محمد
وآلہ وصحبہ وسلم تسلیماً۔

دوبارہ اسیری

مصر "وحدتِ وجود" کے عقیدہ اور خیال کا مستقل مرکز تھا، مشہور صاحبِ حال شاعر ابن الفارضؒ جنھوں نے ۶۳۲ھ میں وفات پائی اس خیال کے پرجوش داعی معلوم ہوتے ہیں، اور ان کے اشعار میں جا بجا اس کے مضامین ملتے ہیں، ابن تیمیہ اس عقیدہ کی برملا تردید کرتے تھے، اور اپنے درس و مجالس میں ان اقوال و اعمال پر جرح و اعتراض کرتے رہتے تھے، جو ان کی تحقیق کے مطابق کتاب و سنت کے خلاف اور صوفیۂ متاخرین کے اضافات میں سے ہے، وہ اپنی کتابوں میں جا بجا حضرت شیخ عبد القادر جیلانی اور شیخ عدی بن مسافر اموی جیسے محقق و راسخ صوفیۂ کرام کا نام بڑے ادب و احترام سے لیتے ہیں، لیکن اپنے معاصر مشائخ و صوفیہ پر تنقید کرنے سے تامل نہیں کرتے جو ان کے اعتقاد کے مطابق فلسفۂ یونان اور مصری و ہندی اشراق سے متاثر تھے، شیخ کی ان تقریروں اور تنقیدوں سے تصوف کے حلقوں میں برہمی پیدا ہوئی اور مصر کے مشہور شیخ طریقت ابن عطاء اللہ اسکندری (صاحب الحکم) نے گروہ صوفیہ کی طرف سے حکام کے یہاں ابن تیمیہ کے خلاف نالش کی، صوفیوں کا ایک بڑا گروہ خود قلعہ میں ابن تیمیہ کی شکایت کرنے گیا، سلطان نے ان شکایتوں سے متاثر ہو کر حکم دیا کہ "دار العدل" میں مجلس منعقد ہو، اور اس معاملہ کی تحقیق کی جائے اس مجلس میں ابن تیمیہ نے خود شرکت اور اپنے مقدمہ کی وکالت کی، ان کی مدلل اور پر زور تقریر سے سب لوگ خاموش ہو گئے، اور ان کے خلاف کوئی کارروائی نہیں کی جا سکی۔

لیکن ان کے خلاف شورش دبی نہیں، اب ان کے خلاف یہ الزام بھی تھا کہ وہ علانیہ اس بات کی

تبلیغ کرتے ہیں کہ اللہ کے سوا کسی کی دہائی نہیں دی جاسکتی، اور خود سرورِ کائنات صلے اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ گرامی سے استغاثہ بھی درست نہیں، یہ شکایت جب پیش ہوئی تو بعض علماء نے کہا کہ اس بات میں تو کوئی قباحت نہیں، قاضی القضاۃ نے صرف اتنا کہا کہ اس میں کچھ بے ادبی ضرور ہے، لیکن کسی نے یہ نہیں کہا کہ یہ بات حدِ کفر تک پہونچتی ہے، اس لئے یہ شکایت بھی بے نتیجہ رہی۔

مگر اس روز روز کی شکایت اور شورش سے حکومت تنگ آگئی تھی، اس نے شیخ کو تین امور میں سے کسی ایک امر کو اختیار کر لینے کا مشورہ دیا، یا تو اپنے وطن دمشق چلے جائیں، یا اسکندریہ میں قیام اختیار کریں، مگر دونوں جگہ ان کو بعض شرائط کی پابندی کرنی ہوگی[1]، یا جیل جانا منظور کریں، شیخ نے آخری شکل کو ترجیح دی، لیکن ان کے تلامذہ واحباب نے دمشق کے سفر کے لئے اصرار کیا، اور انھوں نے ان کے اصرار سے اس کو منظور کر لیا، اور ۱۸ رشوال ۷۰۷ھ کو وہ روانہ بھی ہوگئے، لیکن اسی روز ان کو مصر واپس لایا گیا، اور کہا گیا کہ حکومت کی مصلحت یہی ہے کہ وہ جیل میں رہیں، لیکن قضاۃ وعلماء اس مرتبہ متردد تھے، کہ وہ کس الزام کے تحت جیل جائیں، قاضی مالکی شمس الدین التونسی نے صاف کہا کہ ان کے خلاف کوئی چیز ثابت نہیں ہوسکی، نورالدین مالکی کو بھی توقف تھا، اور وہ خاموش تھے، شیخ نے علماء وقضاۃ کی اس ذہنی کشمکش کو دیکھ کر خود فیصلہ کر دیا کہ وہ از خود جیل جانے کے لئے تیار ہیں، نورالدین الزواوی نے کہا کہ وہ ایسی جگہ رکھے جائیں، جو ان کے شایانِ شان ہو، حکومت کی طرف سے کہا گیا کہ وہ کوئی استثناء اور رعایت کے لئے تیار نہیں، "الدولۃ ما ترضیٰ الا الحبس" (حکومت تو ان کو اسی جگہ رکھنا چاہتی ہے جس کا نام جیل خانہ ہے) چنانچہ قضاۃ کے مجلس میں ان کو بھیج دیا گیا، اور یہ اجازت دی گئی کہ ان کی خدمت کے لئے کوئی آدمی رہ سکتا ہے[2]۔

اس مجلس میں ابن تیمیہ کے مشاغل ومعمولات جاری رہے، یہ دراصل ایک نظربندی کی شکل تھی،

---

[1] غالباً اہم شرط یہ تھی کہ وہ اپنے عقائد اور مخصوص خیالات کی عمومی تبلیغ نہ کریں۔ [2] تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو ابن کثیر ص ۴۶، ج ۱۴

طلبہ اور علماء ان سے ملاقات کر سکتے تھے اور استفادہ اور مذاکرہ کرتے تھے اہم مسائل میں ان سے فتویٰ بھی لیا جاتا تھا۔

کچھ ہی عرصہ کے بعد مدرسۂ صالحیہ میں فقہاء و قضاۃ کا اجتماع ہوا اور ان کی متفقہ خواہش اور تجویز سے ابن تیمیہ کو رہا کر دیا گیا، لوگوں نے ان کا پرجوش خیر مقدم کیا، اور پہلے سے زیادہ ان کی طرف رجوع ہوا۔

سیاسی تغیر اور ابن تیمیہ پر سختی

دفعۃً مصر کے سیاسی حالات میں ایسا تغیر ہوا کہ ابن تیمیہؒ کے لئے مشکلات بہت بڑھ گئیں، اور ان کے حریف کو ان کے خلاف آزادی سے ہر قسم کی کارروائی کا موقع مل گیا، اس وقت تک اصل سلطان مصر و شام ناصر بن قلاؤون تھا، جو ابن تیمیہؒ کے علم و فضل اور خلوص کا معتقد اور ان کا ہمدرد تھا، ابن تیمیہؒ نے اس کو تاتاریوں کے مقابلہ پر آمادہ کیا تھا، اور اس نے ان کی شجاعت، ایمانی قوت اور استقامت خود دیکھی تھی، ۷۰۸ھ میں سلطان نے بہت سے اسباب کی بنا پر جو اس کی بددلی کا باعث تھے، سلطنت سے کنارہ کشی اختیار کی، اور کرک میں قیام اور وہاں کی محدود حکومت پر قناعت کرنے کا فیصلہ کیا۔

اس کے اس فیصلہ سے رکن الدین بیبرس جاشنگیر کے لئے تختِ مصر خالی ہو گیا، اور اس نے اپنی خود مختار سلطنت کا اعلان کر دیا، اب وہ مصر و شام کا مطلق العنان فرمانروا اور اس کے شیخ نصر المنبجی اس طویل و عریض سلطنت کے روحانی سرپرست اور مشیر خاص تھے، ابن تیمیہؒ اپنے دینی عقائد و تحقیقات کے علاوہ (جو شیخ نصر المنبجی کے رجحانات کے صریحاً مخالف تھے) خود سلطان ناصر بن قلاؤون کے ہمدرد اور حامی سمجھے جاتے تھے اس لئے ان کے خلاف کارروائی کرنے کے لئے دینی اور سیاسی محرک دونوں جمع ہو گئے۔

چنانچہ اس تغیر کے بعد ہی ابن تیمیہ کی اسکندریہ جلاوطنی اور نظر بندی کا سرکاری فرمان صادر ہوا،

اور وہ صفر ۷۰۹ھ کی آخری تاریخ کو اسکندریہ بھیج دیئے گئے، کہا جاتا ہے کہ حکومت کا ایک مقصد یہ بھی تھا کہ اس نئے شہر میں جو تصوف اور اہل تصوف کا قدیمی مرکز ہے، ممکن ہے کوئی شخص ان کا کام تمام کر دے اور حکومت بغیر کسی بدنامی اور الزام کے اس دردِ سر سے نجات پائے[1]۔

لیکن اسکندریہ میں شیخ نے بہت جلد معتقدین و تلامذہ کا حلقہ پیدا کر لیا، اور ان کی طرف رجوع عام شروع ہو گیا، وہاں بھی وہ خاموش اور بے کار نہیں بیٹھے، کتاب و سنت کی اشاعت اور شرک و بدعات کی تردید ان کا مشغلہ تھا، لوگوں کے دلوں میں ان کی محبت اور اعتقاد پیدا ہو گیا اور بہت جلد انھوں نے مقبولیت عام حاصل کر لی، ان کے بھائی شرف الدین ابن تیمیہ جو وہاں ان کے رفیق اور شریک زنداں تھے، اہلِ دمشق کے نام ایک خط میں لکھتے ہیں۔

وانقلب اهل الثغر اجمعين الى الاخ مقبلين	اہلِ اسکندریہ کو برادر محترم کی طرف بڑی توجہ ہو گئی
عليه مكرمين له وفي كل وقت ينشر من	اور ان کے دل میں ان کی بڑی عزت ہے، وہ ہر وقت کتاب
كتاب الله وسنة رسوله ما تقربه عين	و سنت کی اشاعت کرتے رہتے ہیں جس سے اہل ایمان کی
المومنين وذلك شجى في حلوق الاعداء......	آنکھیں ٹھنڈی اور دشمنوں کو کوفت ہوتی ہے......
واستقر عند عامة المومنين و خواصهم	شیخ کی محبت اور عظمت عام و خاص مومنین کے دل
من امير وقاضٍ وفقيه ومفت وشيخ و	میں بیٹھ گئی ہے کیا حاکم، کیا قاضی، کیا فقیہ، کیا مفتی،
جماعة المجتهدين الا من شذ من	کیا مشائخ اور جماعت مجتہدین سوائے بے خبر
الاغمار الجهال مع الذلة والصغار محبة	جاہلوں کے سب ان کے حلقہ بگوش اور معتقد ہو گئے
الشيخ وتعظيمه وقبول كلامه والرجوع	ہیں، ان کا کلام پسند کرتے ہیں اور ان کے احکام کی
الى امره ونهيه[2]۔	تعمیل کرتے ہیں۔

---

[1] ابن کثیر ج ۱۴ ص ۴۹ [2] ایضاً ص ۵۰

اسکندریہ میں اس وقت فرقہ سبعینیہ کے خیالات اور وحدت وجود کے مسلک کا بڑا غلبہ تھا، اور بعض اشخاص اس کے پُرجوش داعی اور مبلغ تھے؛ خواص سے نکل کر عوام میں بھی یہ عقائد وافکار مقبول ہورہے تھے، ان دقیق مسائل و متشابہات کا عوام کے اعمال و اخلاق پر جو خراب اثر پڑسکتا ہے، اور ان میں شریعت کے معاملہ میں جو بیباکی، اور آزادی پیدا ہونی چاہئے، وہ پیدا ہورہی تھی، ابن تیمیہؒ نے بڑی قوت اور جوش کے ساتھ اس کی تردید اور مخالفت کی، اور ان کے قیام کے زمانہ ہی میں جس کی مدت آٹھ مہینے سے زیادہ نہیں، ان کا زور ٹوٹ گیا، اور عوام وخواص ان سے منحرف ہوگئے، ابن تیمیہؒ نے ان میں سے بہت سے آدمیوں سے توبہ کرائی، اور ان کے ایک بڑے داعی اور اس خیال کے علمبردار نے بھی توبہ کی۔[1]

اسکندریہ میں ابن تیمیہؒ کی قیامگاہ بڑی وسیع وخوش منظر تھی، اس کی ایک کھڑکی سمندر کی طرف کھلتی تھی، ایک کھڑکی شہر کی طرف، لوگ آزادانہ ان کے پاس آتے جاتے تھے، اور استفادہ و مذاکرہ کرتے تھے۔

رکن الدین جاشنگیر کا زوال

ابن تیمیہؒ جاشنگیر اور اس کے شیخ کے زوال کی علانیہ پیش گوئی کرتے رہتے تھے، اور فرماتے تھے، "زالت ایامه وانتهت ریاسته وقرب القضاء اجله"[2] ابھی اس کی سلطنت کو ایک سال بھی نہیں گزرا تھا کہ سلطان ناصر بن قلاوؤں نے زمام سلطنت ہاتھ میں لینے کا فیصلہ کیا، اور ۱۳/ شعبان ۷۰۹ھ کو اس نے دمشق کا رخ کیا، اہل شام نے جن کو اس سے بہت گہرا تعلق خاطر تھا، پرجوش استقبال کیا، ۱۷/ شعبان کو وہ بڑے تزک و احتشام کے ساتھ دمشق میں داخل ہوا، دمشق سے اس نے مصر کا رخ کیا، اہلِ مصر نے بھی اس کے استقبال کی تیاری کی، رکن الدین جاشنگیر نے حالات دگرگوں ہوتے دیکھے تو خود سلطنت سے استعفاء دے دیا، عید کے روز سلطان کی سواری مصر میں داخل ہوئی اور اس نے ۱۱ مہینے کچھ دن کی

---

[1] مکتوب شیخ شرف الدین ابن تیمیہ بنام اہلِ دمشق، ابن کثیر ج ۱۴ ص ۵۰ [2] ایضاً ص ۴۹

بے تعلقی کے بعد عنانِ سلطنت اپنے ہاتھ میں لی، جاشنگیر نے مصر سے فرار اختیار کیا، ۷ ذی القعدہ کو امیر سیف الدین نائب شام کے ہاتھ آگیا اور مصر میں قتل کر دیا گیا۔

مورخین کا اتفاق ہے کہ جاشنگیر اپنی مدار المہامی کے زمانہ میں بڑا مقبول اور باوقار و باہیبت وزیرِ سلطنت تھا، اس کی خود مختار سلطنت اور اس کا ادبار ساتھ ہی ساتھ شروع ہوا، اپنی سلطنت کا اعلان کرنے کے بعد ہی سے اس کا سارا کرّ وفر اور اقبال مندی اور مقبولیت ختم ہو گئی اور اس کے زوال کے دن شروع ہو گئے، اور بنتے ہوئے کام بگڑتے چلے گئے، مورخ مصر مقریزی نے صاف صاف لکھا ہے۔

وكان رحمه الله خيّراً عفيفاً كثير الحياء وافر الحرمة جليل القدر مهاب السطوة في ايام امارته فلما تلقب بالسلطنة ورسم باسم الملك اتضح قدره و استضعف جانبه وطمع فيه وتغلب عليه الامراء والمماليك ولم تنجح مقاصده ولا سعد في شيءٍ من تدبيره الى ان انقضت ايامه وانا خ به حمامه۔[1]

مرحوم صاحبِ خیر، محتاط، باحیاء، باوقار اور صاحبِ شوکت امیر تھا، لیکن جب سے اس نے سلطان کا لقب اختیار کیا اور بادشاہی کا خلعت پہنا اس کی شان میں کمی آگئی، اس کو کمزور سمجھا جانے لگا، لوگوں کو اس کے خلاف جرأت پیدا ہوئی، امراء اور غلاموں نے خودسری اختیار کی، وہ اپنے مقاصد میں ناکام رہا، اور اس کی کوئی تدبیر کارگر نہ ہوئی یہاں تک کہ اس کا دور ختم ہوا، اور اس کا پیمانۂ عمر لبریز ہو گیا۔

کیا عجب ہے کہ اس کا یہ غیر متوقع زوال ایک مخلص داعی حق کی مخالفت و ایذا کا نتیجہ اور اس مشہور شعر کی تفسیر ہو ؎

بس تجربہ کردیم دریں دیرِ مکافات
با دُرد کشاں ہر کہ در افتاد بر افتاد

---

[1] خطط مصر جلد ۲ ص ۴۱۸

ابن تیمیہ کی رہائی اور شاہانہ عزت افزائی

ابن تیمیہ کے معاصر شیخ علم الدین البرزالی کا بیان ہے کہ سلطان جب عید کے دن مصر میں داخل ہوا ہے تو اس کو سب سے زیادہ عجلت اور فکر اس کی تھی کہ ابن تیمیہ کو رہا کرکے عزت وحرمت کے ساتھ مصر لایا جائے، چنانچہ اگلے ہی روز (۲ شوال ۷۰۹ھ کو) اسکندریہ ان کی طلبی کا پروانہ پہنچا، اور وہ ۸ شوال کو مصر کے لئے روانہ ہو گئے، ایک جم غفیر نے ان کو بڑے اعزاز کے ساتھ رخصت کیا۔

ابن تیمیہ دربارِ شاہی میں پہنچے تو سلطان نے خود چند قدم بڑھ کر ان کا استقبال کیا سلطان کے ساتھ مصر وشام کے قضاۃ اور اکابر علماء بھی تھے، قاضی جمال الدین ابن القلانسی جو قاضی لشکر تھے، اور خود اس مجلس میں اس وقت موجود تھے، ابن تیمیہ کی آمد اور سلطان کے استقبال کا چشم دید واقعہ بیان کرتے ہیں:۔

"جس وقت سلطان کو اطلاع ملی کہ ابن تیمیہ پہونچ گئے ہیں، وہ سرو قد کھڑا ہو گیا، اور ایوان سلطنت کے کنارہ تک چل کر آیا، وہاں دونوں کی ملاقات اور معانقہ ہوا، سلطان ابن تیمیہ کو لئے ہوئے قصر شاہی کی اس منزل کی طرف آیا، جس کی کھڑکی باغ کی طرف کھلتی ہے، وہاں دونوں تنہا ایک گھڑی بیٹھے باتیں کرتے رہے، پھر دونوں دربار کی طرف اس ہیئت سے آئے کہ شیخ کا ہاتھ بادشاہ کے ہاتھ میں تھا، سلطان بیٹھ گیا، اس کے دائیں جانب ابنِ جماعۃ قاضی مصر، بائیں طرف ابن الخلیلی وزیرِ سلطنت تھے، ابن تیمیہ سلطان کے سامنے اس کی مسند کے پاس بیٹھے تھے، وزیر نے اس وقت یہ درخواست پیش کی کہ اہلِ ذمّہ (غیر مسلم رعایا) کو سفید عماموں کے استعمال کی اجازت حسبِ دستور سابق دے دی جائے[1]، انھوں نے خزانہ شاہی کو سات لاکھ

[1] پچھلے تلخ تجربوں نے علمائے اسلام کو اس نتیجہ پر پہنچا دیا تھا کہ اسلامی سلطنت کی غیر مسلم رعایا کے لباس میں (باقی ص۱۰۳ پر)

سالانہ لی پیشکش کی ہے' یہ موجودہ ٹیکس کے علاوہ ہوگا، اس وقت اہلِ مجلس پر سکوت طاری تھا، قضاۃ واکابر علماء سب خاموش تھے' اس میں علامہ ابن الزملکانی بھی تھے' سلطان نے قضاۃ وعلماء کی طرف خطاب کر کے فرمایا کہ آپ اس بارہ میں کیا کہتے ہیں؟ اس پر بھی کسی نے کچھ نہیں کہا، اس موقع پر ابن تیمیہ اپنے گھٹنوں کے بل پر بیٹھ گئے اور بڑے جوش وغصہ کے ساتھ گفتگو کرنی شروع کی' اور وزیر پر سختی سے جرح کی' ان کی آواز بلند ہوتی جارہی تھی' اور سلطان ان کو نرم کرنے کی کوشش کر رہا تھا، اس وقت ابن تیمیہ نے اس طرح گفتگو کی کہ دوسرا شخص اس کی جرأت نہیں کر سکتا تھا، انھوں نے سلطان کو مخاطب کر کے کہا کہ "بڑے افسوس کی بات ہوگی کہ آپ کے اس پہلے دربار کا افتتاح اس کارروائی سے ہو کہ آپ فانی دنیا کی حقیر منفعت کے لئے اہلِ ذمہ کی مدد کریں' اللہ نے آپ پر کتنا بڑا احسان کیا کہ آپ کی کھوئی ہوئی سلطنت ملادی' آپ کے دشمن کو ذلیل وخوار کیا، اور حریفوں پر آپ کو فتح دی، سلطان نے یہ سن کر کہا کہ یہ قانون تو جاشنگیر کا بنایا ہوا ہے' ابن تیمیہ نے جواب دیا کہ یہ تو آپ ہی کے فرمان سے ہوا، جاشنگیر تو اس وقت آپ کا نائب تھا، سلطان کو ابن تیمیہ کی یہ حق گوئی

(باقی ص۱۰۲ کا) کچھ امتیازی نشان ضروری ہے' صلیبی جنگوں کے بعد مصر وشام میں بکثرت ایسے عیسائی رہ گئے تھے' جو دوسرے ملکوں سے آئے تھے' اور بیرونی حملہ آوروں کے لئے رضاکارانہ طریقہ پر جاسوسی کی خدمات انجام دیتے تھے' یوں بھی مسلمان سوسائٹی میں گھس مل کر اپنے اثرات پھیلاتے تھے' ۷۲۱ھ کے واقعات میں ابن کثیر نے لکھا ہے کہ ۹ جمادی الاولیٰ کو قاہرہ میں بڑے ہولناک طریقہ پر آگ لگی، خوبصورت مکانات' عالیشان محل اور بعض مسجدیں بھی اس کی زد میں آگئیں' لوگوں پر اس حادثہ کا اتنا اثر تھا کہ مسجدوں میں قنوت نازلہ پڑھی گئی' بعد میں تحقیق ہوئی کہ یہ بعض عیسائیوں کی شرارت تھی' اس وقت سے یہ حکم صادر ہوا کہ عیسائی نیلا لباس پہنیں عماموں میں گھنٹیاں رکھیں اور کہیں ان سے کام نہ لیا جائے' اس پر آتش زنی کے واقعات کا سلسلہ ختم ہوا، ان تجربات کی بنا پر کچھ عرصہ سے مصر میں عیسائیوں کو حکم تھا کہ وہ زرد رنگ کے عمامے باندھیں سلطان ناصر کی دوبارہ آمد پر عیسائیوں نے کوشش کی تھی کہ یہ قانون منسوخ ہوجائے۔

پسند آئی، اور یہ قانون بدستور رہا۔[۱]

مصر میں سنّتِ یوسفی

ابن القلانسی کا بیان ہے کہ ابن تیمیہ نے خود مجھ سے کہا کہ سلطان جب مجھے تنہائی میں لے گیا تو اس نے مجھ سے ان قضاۃ کے قتل کے بارہ میں فتویٰ لینا چاہا جنھوں نے جاشنگیر کی حمایت کی تھی، اور سلطان کی معزولی کا فتویٰ دیا تھا، اور وہ فتوے نکال کر دکھائے بھی، اس کے ساتھ مجھ سے یہ بھی کہا کہ انہی لوگوں نے آپ کے خلاف شورش برپا کی، اور آپ کو تکلیف پہنچائی، اس کا مقصد یہ تھا کہ میں اس سے متأثر ہو کر ان کے قتل کا فتویٰ دے دوں، میں اس کا منشاء سمجھ گیا، اور میں نے ان قضاۃ و علماء کی مدح سرائی شروع کی، اور اس کی شدت سے مخالفت کی کہ سلطان کے ہاتھ سے ان کو کوئی گزند پہنچے، میں نے اس سے کہا کہ اگر آپ نے ان کو قتل کر دیا تو آپ کو ان کا بدل نہیں ملے گا، اس نے پھر (مجھے مشتعل کرنے کے لئے) کہا کہ انھوں نے تم کو نقصان پہنچانے میں کمی نہیں کی اور بارہا تمہارے قتل کی سازشیں کیں، میں نے کہا جہاں تک میری ذات کا تعلق ہے جس نے مجھے تکلیف پہنچائی، اس پر میری طرف سے کوئی مواخذہ نہیں، میں اسے بالکل معاف کرتا ہوں، اور جس نے اللہ اور رسول کا قصور کیا تو اللہ تعالیٰ اس سے خود انتقام لے گا، میں اپنے نفس کا انتقام نہیں لیتا" میں برابر اس کو سمجھاتا رہا، یہاں تک کہ سلطان نے ان کا قصور معاف کر دیا۔[۲]

ابن کثیر لکھتے ہیں کہ مصر میں ابن تیمیہ کے سب سے بڑے حریف و مدمقابل قاضی مالکیہ ابن مخلوف کہتے تھے کہ ہم نے ابن تیمیہ جیسا عالی ظرف و فراخ حوصلہ نہیں دیکھا کہ ہم نے تو ان کے خلاف سلطنت کو آمادہ کیا (اگرچہ ہمارا مقصد پورا نہیں ہوا) لیکن ان کو جب قدرت حاصل ہوئی تو ہم کو

۱؎ ابن کثیر جلد ۱۴ صفحہ ۵۴ ۲؎ ایضاً

صاف معاف کر دیا، اور الٹے ہماری طرف سے وکالت اور مدافعت کی۔[۱]

مجلس سلطانی کے بعد شیخ قاہرہ میں آگئے، اور حسب معمول درس و تدریس اور اصلاح و تبلیغ کے کام میں منہمک ہو گئے، ان کی رہائی کا شہرہ سن کر شائقین علم اور ان کے محبین و معتقدین چاروں طرف سے امنڈ آئے، علمائے شہر نے حاضر ہو کر اپنی غلطیوں کا اعتراف کیا، اور معذرت کی، انھوں نے سب سے کہہ دیا کہ میری طرف سے سب کو معافی ہے، میرا کسی پر کوئی مطالبہ نہیں، اس طرف سے اطمینان پا کر اور یہ اندازہ کر کے کہ ان کو ابھی اپنے کام کی تکمیل کے لئے دار السلطنت میں رہنا ہے، انھوں نے گھر ایک مفصل خط لکھا جس میں حالات کی اطلاع تھی، اور کچھ ضروری کتابیں طلب کی تھیں۔

ابن تیمیہ کی باعزت رہائی کے بعد جب ان کے مخالفین نے دیکھا کہ ان کے اقبال کا ستارہ اور بلند ہو گیا اور کسی علمی مسئلہ کی بنا پر اب ان کے خلاف شورش برپا کرنی مشکل ہے تو انھوں نے عوام کو ان کے خلاف اشتعال دلایا اور (عوام کو ابن تیمیہ کے خلاف (کم سے کم مصر میں جہاں عوام ان سے زیادہ واقف نہ تھے) اشتعال دلانا کچھ مشکل کام نہ تھا چنانچہ ۴ رجب ۷۱۱ھ کو چند ناخدا ترس انسانوں نے ان پر دست درازی کی، اور ان کو ایذا پہنچائی، لیکن محلہ حسینیہ (جہاں عام شہرت کے مطابق سیدنا حسین رضی اللہ عنہ کا سر مبارک دفن ہے[۲]) کے باشندے شیخ کا انتقام لینے کے لئے جمع ہو گئے، شیخ نے ان کو منع کر دیا، اور ان سے فرمایا۔

اما ان یکون الحق لی او لکم او للّٰہ فان	تین ہی صورتیں ہو سکتی ہیں، یا تو (ان سے انتقام
کان الحق لی فہم فی حل منہ وان کان	لینا) میرا حق ہے تو میں اعلان کرتا ہوں کہ وہ
لکم فان لم تسمعوا منی ولم تستفتونی	سبکدوش ہیں، اور میرا کوئی مطالبہ نہیں، یا تمہارا
فافعلوا ما شئتم وان کان الحق للّٰہ	حق ہے تو اگر تم میری بات سننے کے لئے تیار نہیں

---

[۱] ابن کثیر جلد ۱۴ ص ۵۴ [۲] اس کی تردید میں امام ابن تیمیہ کا مستقل رسالہ "رأس سیدنا الحسین" چھپ چکا ہے۔

فالله یاخذ حقه ان شاء۔ اور مجھ سے دریافت بھی نہیں کرتے تو جو جی میں آئے کرو،
تیسری اور آخری شکل یہ ہے کہ یہ اللہ کا حق ہے تو اللہ
اگر چاہے گا اپنا حق لے لے گا۔

اسی ردّوکد میں نماز عصر کا وقت آگیا، امام جامع مسجد (غالباً جامع حسینی) جماعت کی شرکت کے لئے جانے لگے ہمدردوں نے اس سے روکا لیکن شیخ نے کوئی پروا نہیں کی، اور چلے گئے ان کے ساتھ ان کے حامیوں کا ایک بڑا گروہ بھی گیا۔

اس کے بعد ایک مرتبہ ایک عالم نے برسر مجلس ان کو بہت سخت سست کہا، اس کے بعد ان کو اپنی غلطی محسوس ہوئی، یا اندیشہ ہوا کہ حکومت کچھ دار و گیر کرے تو شیخ سے معذرت کی شیخ نے کھلے دل سے معاف کر دیا، اور فرمایا "لا انتصر لنفسی" میں اپنا انتقام نہیں لیتا۔[1]

ابن تیمیہ نے مصر کے قیام میں صرف درس و تدریس اور کتاب و سنت کی اشاعت پر اکتفا نہیں کی، بلکہ دار السلطنت کے قیام سے فائدہ اٹھا کر سلطان کو بعض نہایت مفید مشورے دیئے، اور اس سے بعض ضروری اور مفید فرمان جاری کروائے ابن کثیر نے لکھا ہے کہ ۷۱۲ھ میں دمشق فرمان سلطانی پہنچا کہ کسی کو کوئی عہدہ کسی مالی پیشکش یا رشوت کی بنا پر نہ دیا جائے اس لئے کہ اس کا قدرتی نتیجہ یہ نکلے گا کہ نااہل اور خائن لوگ عہدوں پر سرفراز ہو جائیں گے، اور اہل اور امانت دار محروم رہیں گے، ابن کثیر کہتے ہیں کہ یہ فرمان ابن تیمیہ کی تجویز اور کوشش کا نتیجہ تھا[2] اسی طرح ایک دوسرا فرمان صادر ہوا کہ قاتل پر کسی کو دست درازی کرنے کا اختیار نہیں حکومت اس کو گرفتار کرے گی اور شرع شریف کے مطابق اس کا قصاص ہو گا، ابن کثیر لکھتے ہیں کہ یہ بھی ابن تیمیہ کی تجویز سے ہوا۔[3]

---

[1] ابن تیمیہ محمد ابو زہرہ۔ [2] ابن کثیر جلد ۱۴ صفحہ ۶۶ [3] ایضاً۔

دمشق واپسی

شوال ۷۱۲ھ میں تاتاریوں کے حملہ کے ارادہ کی مسلسل اطلاعیں مل رہی تھیں بالآخر سلطان نے خود مصر سے نکل کران کا مقابلہ کرنے کا فیصلہ کیا اور ۸ر شوال کو دمشق کا رخ کیا ۲۳ر شوال کو وہ دمشق میں داخل ہوا سلطان کی معیت میں ابن تیمیہ بھی تھے، جو پورے سات سال کے بعد اپنے وطن مالوف آرہے تھے، لوگوں نے ان کا پرجوش استقبال کیا، اہلِ شہر نے بڑی مسرت کا اظہار کیا، مردوں کے علاوہ بہت بڑی تعداد میں عورتیں بھی ان کو دیکھنے کے لئے باہر تک آئیں، شیخ کا یہ سفر بہ نیت جہاد تھا، لیکن دمشق آکر معلوم ہوا کہ تاتاری واپس گئے، شیخ نے دمشق سے بیت المقدس کی زیارت کی نیت کرلی، کچھ روز وہاں قیام کرکے بعض دوسرے مقامات سے ہوتے ہوئے یکم ذی القعدہ کو دمشق واپس آئے، اور ہمہ تن اپنے کام میں مشغول ہو گئے۔

مسائلِ فقہیہ کی طرف توجہ خصوصی

اس مرتبہ دمشق واپسی کے بعد اگرچہ شیخ الاسلام اپنے قدیم دینی و علمی و اصلاحی مشاغل میں مشغول ہو گئے اور حسب معمول درس و افتاء اور تصنیف کا کام شروع کردیا، لیکن اس مرتبہ ایک خاص بات یہ تھی کہ ابھی تک ان کی زیادہ تر توجہ عقائد و اصول اور ان کلامی مسائل کی طرف تھی، جو اشاعرہ و حنابلہ کے درمیان مابہ النزاع تھے، لیکن اس مرتبہ ان کی توجہ خصوصیت کے ساتھ فقہی مسائل اور جزئیات کی طرف منعطف ہوئی، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے یہ محسوس کیا کہ وہ پہلے موضوع پر بقدر ضرورت مواد و دلائل فراہم کرچکے ہیں، اور ان کی تقریروں، درس اور تصنیفات سے حق واضح ہو چکا ہے، اب انھوں نے اپنی علمی خصوصیتوں اور خداداد ذہنی صلاحیتوں کے ساتھ فقہی مسائل کی طرف توجہ کی۔

ابن تیمیہ کا خاندان پشتوں سے حنبلی چلا آرہا تھا، خود ان کے اکثر فتاویٰ مذہب حنبلی کے

مطابق ہیں[1]، لیکن انھوں نے سر تا سر مذہب حنبلی کی پابندی نہیں کی، کتاب و سنت کے ذخیرہ پر ان کی جیسی وسیع نظر تھی، مذاہب فقہیہ، ان کے اصول اور دلائل کا جیسا استحضار ان کو حاصل تھا، اس کے بعد ان کے لئے مشکل تھا کہ وہ مذہب حنبلی کے دائرہ میں محدود رہیں، اور تنہا سوفی صدی اس کی پابندی کریں، اس لئے وہ بعض اوقات ائمہ اربعہ کے مذاہب میں اس مذہب کو ترجیح دیتے جس کے دلائل ان کے نزدیک زیادہ قوی تھے، اور جس کے ساتھ صحابہؓ تابعین کی زیادہ جماعت ہوتی، وہ اپنے علمی تبحر، قوتِ استنباط اور استقلالِ فکر کے باوجود ائمۂ اربعہ کی علمی عظمت، حسن اجتہاد، دیانت و تقویٰ اور عقلی تفوق کے بڑے قائل اور معترف تھے، ان کے نزدیک وہ حضرات طالب حق، متبع سنت اور راسخ فی العلم تھے، ان کے اجتہادات کا ماخذ کتاب و سنت اور قرآن و حدیث کے نصوص، اور اجماع اور شرعی قیاس ہے، اور وہ اس بارہ میں متبع تھے، مبتدع نہ تھے، اس لئے وہ اپنے زمانہ کے ان لوگوں کو بہت ناپسند کرتے تھے، جو ان کے بارہ میں بیباکانہ الفاظ بولتے اور ان پر زبانِ طعن دراز کرتے، انہی لوگوں کی زبان بندی اور ائمۂ مجتہدین کی حمایت و نصرت کے لئے انھوں نے ایک مستقل رسالہ "رفع الملام عن الائمۃ الاعلام" تصنیف کیا، جو اس موضوع کی بہترین تصنیفات میں سے ہے، اس رسالہ کے شروع میں لکھتے ہیں:-

یجب علی المسلمین بعد موالاۃ اللہ ورسولہ	مسلمانوں پر اللہ اور اس کے رسول کی دوستی اور محبت کے
موالاۃ المومنین کما نطق بہ القرآن خصوصاً	بعد اہل ایمان کی دوستی اور محبت واجب ہے، جیسا کہ
العلماء الذین ھم ورثۃ الانبیاء الذین	قرآن مجید میں ضمناً موجود ہے، خصوصاً ان علماء کی
جعلھم اللہ بمنزلۃ النجوم یھتدی	دوستی اور محبت جو وارث انبیاء تھے، اور جن کو اللہ تعالیٰ
بھم فی ظلمات البر والبحر، وقد اجمع	نے ان ستاروں کا مرتبہ عطا فرمایا، جن سے تاریکیوں
المسلمون علی ھدایتھم ودرایتھم	میں روشنی اور رہنمائی حاصل کی جاتی ہے، تمام مسلمانوں کا

[1] ملاحظہ ہو فتاویٰ ابن تیمیہ، ۱، ۲، ۳، ۴، ۵۔

اذ کل امة قبل مبعث محمد (صلی الله
علیه وسلم) علمائها شرارها الا المسلمین
فان علمائهم خیارهم فانهم خلفاء
الرسول فی امته والمحیون لما مات من سنته
بهم قام الکتاب وبه قاموا، وبهم نطق
الکتاب وبه نطقوا، ولیعلم انه لیس احد
من الائمة المقبولین عند الامة قبولا
عاما یتعمد مخالفة رسول الله صلی الله
علیه وسلم فی شیء من سنة دقیق ولا جلیل
فانهم متفقون اتفاقا یقینیا علی وجوب
اتباع الرسول وعلی ان کل احد من الناس
یؤخذ من قوله ویترك الا رسول الله صلی الله
علیه وسلم واذا وجد لواحد منهم قول
قد جاء حدیث صحیح بخلافه فلابد له
من عذر فی ترکه، وجمیع الاعذار ثلاثة
اصناف (احدها) عدم اعتقاده
ان النبی (صلی الله علیه وسلم) قاله
(والثانی) عدم اعتقاده ارادة تلك
المسئلة بذالك القول (الثالث) اعتقاده

اس پر اتفاق ہے کہ یہ حضرات صاحب ہدایت اور
صاحب درایت تھے آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کی
بعثت سے قبل دوسری امتوں کے علماء شرار امت
تھے لیکن اس امت کے علماء خیار امت ہیں، اس لئے کہ
وہ اس امت میں رسول علیہ الصلوٰۃ والسلام کے
جانشین ہیں، وہ سنتوں کے زندہ کرنے والے ہیں، ان سے
کتاب اللہ کی رونق اور رواج ہے، اور وہ اس کے
علمبردار ہیں، وہ کتاب اللہ کے ترجمان اور شارح اور
کتاب اللہ ہی ان کی ورد زبان اور دلیل و برہان
ہے، یاد رکھنا چاہئے کہ ان ائمہ میں سے جو عام طور پر
مسلمانوں میں مقبول و معتمد ہیں کوئی بھی ایسا نہیں
تھا جو جان بوجھ کر رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی کسی
چھوٹی یا بڑی سنت کی مخالفت کرتا ہو اس لئے کہ
وہ سب یقینی طور پر اس پر متفق تھے کہ آنحضرت صلے اللہ
علیہ وسلم کی پیروی اور اتباع واجب ہے، اور آپ ہی کی
تنہا وہ ذات ہے جس کے سب اقوال و احکام واجب
القبول ہیں، اور نہ دوسرے کا کوئی قول قبول کیا جا سکتا
ہے اور کوئی ترک بھی کیا جا سکتا ہے) ان ائمہ میں سے
اگر کسی کا کوئی ایسا قول پایا جائے جو کسی صحیح حدیث

ان ذلك الحكم منسوخ.[1]

کے خلاف ہو تو ضرور اس امام کا کوئی عذر ہوگا۔ اس کے ترک کرنے میں، یہ عذر عموماً تین قسموں سے خارج نہیں (اولاً) وہ امام اس کا قائل ہی نہ ہو کہ آنحضرت (صلے اللہ علیہ وسلم) نے ایسا فرمایا ہے اور یہ حدیث صحیح ہے (ثانیاً) اس کا خیال ہو کہ اس حدیث سے یہ مسئلہ نکلتا ہی نہیں اور یہ حدیث کی مراد ہی نہیں ہے (ثالثاً) اس کی تحقیق یہ ہو کہ یہ حکم منسوخ ہے۔

تین طلاقوں کا مسئلہ

باایں ہمہ جس طرح انھوں نے مذہبِ حنبلی کے دائرہ سے بعض اوقات باہر قدم نکالا ہے اور دلائل کی بنا پر دوسرے مذاہب کو ترجیح دی ہے، اسی طرح بعض مسائل میں شاذ و نادر انھوں نے کل مذاہبِ اربعہ کے خلاف بھی فتویٰ دیا ہے، اور اپنے نزدیک براہِ راست کتاب و سنت کے نصوص اور دلائل کی پیروی کی ہے، یہ مسائل (جن میں انھوں نے مجموعی طور پر ائمۂ اربعہ سے اختلاف کیا ہے) دو چار سے زیادہ نہیں، ان میں سب سے مشہور مسئلہ ایک مجلس میں تین طلاقوں کا ہے۔

سوال یہ ہے کہ اگر کسی شخص نے اپنی بیوی کو ایک مجلس میں تین طلاقیں (خواہ بیک لفظ خواہ بالفاظ متعددہ) دے دیں تو اگرچہ اس نے باتفاق ائمہ و جمہور امت بدعت کی بات اور خلافِ شرع کام کیا، اور گنہگار ہوا، لیکن ان طلاقوں کا حکم کیا ہے؟ کیا وہ واقع ہو گئیں، اور عورت باین ہو گئی اور اب رجعت کرنا شرعاً ممکن نہیں ہے (جب تک کہ دوسرے مرد سے نکاح نہ کرے اور وہ اس کی

[1] رفع الملام عن الائمۃ الاعلام۔

صحبت سے متمتع ہو، پھر طلاق دے، پھر پہلا مرد نکاح کرے) یا تین طلاقیں ایک ہی طلاق شمار ہوگی، اور رجعت ممکن ہے؟ ائمۂ اربعہ اور ائمۂ فقہ وحدیث (اوزاعی، نخعی، ثوری، اسحق ابن راہویہ، ابوثور، بخاری) اور جمہور صحابہ وتابعین کا مسلک یہ ہے کہ باوجود بدعت ومعصیت کے ارتکاب کے یہ تین طلاقیں واقع ہوجائیں گی، اور رجعت ممکن نہیں ہے، امام نووی شرح مسلم میں لکھتے ہیں "وقد اختلف العلماء فی من قال لامراتہ انت طالق ثلاثا فقال الشافعی ومالك وابوحنیفۃ واحمد وجماھیر العلماء من السلف والخلف یقع الثلاث" علامہ ابن رشد "بدایۃ المجتہد" میں لکھتے ہیں "جمھور فقھاء الامصار علی ان الطلاق بلفظ الثلاث حکمہ حکم الطلقۃ الثالثۃ" شیخ الاسلام کے تلمیذ رشید حافظ ابن قیم "زاد المعاد" میں فرماتے ہیں "وھذا قول الائمۃ الاربعۃ وجمھور التابعین وکثیر من الصحابۃ"

ان حضرات کے دلائل میں متعدد مرفوع حدیثیں منقول ہیں، جن سے ثابت ہوتا ہے کہ آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم نے ان تین طلاقوں کو یا تین سے زائد طلاقوں کو تین طلاقیں قرار دیا، اور عورت کو بائن ہوجانے کا فتویٰ دیا۔[1]

شیخ الاسلام ابن تیمیہ اور ان کے بعض رفقاء وتلامذہ کا مسلک یہ تھا کہ یہ تین طلاقیں ایک ور رجعی شمار ہوگی، اور مرد اس کے بعد اسی طرح رجوع کرسکتا ہے، جیسے ایک طلاق کے بعد کرسکتا تھا، وہ لکھتے ہیں؛

"وھذا القول منقول عن طائفۃ من السلف من اصحاب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مثل الزبیر بن عوام، وعبد الرحمن بن عوف، ویروی عن علی، وعن ابن مسعود، وابن عباس وھو قول داؤد واکثر اصحابہ ویروی عن ابی جعفر محمد (الباقر) ابن علی بن حسین وابنہ جعفر (الصادق) ولھذا ذھب الی ذلك من ذھب من الشیعۃ"[2]

---

[1] ان حدیثوں کے متن و اسناد میں فریق ثانی نے کلام کیا ہے، اور فریق اول نے محدثانہ طریق پر اس کا جواب دیا ہے [2] فتاویٰ ابن تیمیہ جلد ۳ ص ۳۸

شیخ الاسلام اپنے اس مسلک کے ثبوت کے لئے قرآن و حدیث اور قیاس سے استدلال کرتے ہیں[۱]۔
اس مسئلہ میں واقعہ یہ ہے کہ خواہ وہ منفرد نہ ہوں اور ان سے پہلے سلف میں کسی کا یہ مسلک رہا بھی ہو، تو بھی اس میں شک نہیں کہ اس کی شہرت انہی کی ذات سے ہوئی، اور انھوں نے اس کی علمبرداری کی، اسی وجہ سے جب انھوں نے اس مسئلہ میں اپنی تحقیق اور رائے کا اظہار کیا تو اس سے عام طور پر فقہی حلقوں میں ایک استعجاب اور انتشار پیدا ہوا۔

حلف بالطلاق کا مسئلہ اور نظربندی

لیکن بہرحال تین مجموعی طلاقوں کا مسئلہ ایک خالص فقہی اور خانگی مسئلہ تھا، جس کا اثر ایک خاندان کی زندگی پر پڑتا تھا، مگر دوسرا مسئلہ جس میں انھوں نے مذاہبِ اربعہ اور مشہور مسلک سے اختلاف کیا، اور جو معاملات اور سیاست اور رعیت و حکومت کے تعلقات تک پر اثر انداز ہوتا تھا، وہ حلف بالطلاق کا مسئلہ تھا۔

اس زمانہ میں حلف بالطلاق کا عام رواج ہو گیا تھا، لوگ کسی بات پر زور دینے کے لئے یا اپنی صداقت یا عزم ظاہر کرنے کے لئے بے تکلف طلاق کا سہارا لیتے تھے، اور اس کو درمیان میں لے آتے تھے، مثلاً میں ضرور ایسا کروں گا نہیں تو طلاق ہے (علی الطلاق لأفعلن کذا) میں یہ ہرگز نہیں کروں گا، نہیں تو طلاق (علی الطلاق لأمتنعن عن کذا) یا تمہیں ایسا کرنا ہوگا، نہیں تو طلاق ہے (علی الطلاق لتفعلن کذا) یا میں نے یہ چیز اتنے دام میں خریدی ہے، اگر میں غلط کہہ رہا ہوں تو طلاق (علی الطلاق اشتریتہا بکذا) ابن تیمیہ دیکھتے تھے کہ یہ دراصل قسم اور تاکید کا ایک طریقہ ہے، لیکن لوگ زور دینے اور یقین پیدا کرنے کے لئے طلاق کا لفظ بیچ میں لے آتے ہیں، اور ان کا ارادہ کبھی طلاق کا نہیں ہوتا،

---

[۱] مفصل بحث اور تفصیلی استدلال کے لئے ملاحظہ ہو حافظ ابن قیم کی کتاب "زاد المعاد" بحث "فی من طلق ثلاثا بکلمۃ واحدۃ" ج ۴ اور "اغاثۃ اللهفان"۔

اس لئے یہ دراصل قسم ہی کی ایک قسم ہے، مگر طلاق معلق سمجھ لئے جانے کی وجہ سے اس پر طلاق کے احکام جاری کئے جاتے ہیں، اور سیکڑوں خاندان اور گھرانے اس کی وجہ سے اُجڑ جاتے ہیں، اور خانگی زندگی میں سخت انتشار اور ابتری پیدا ہو رہی ہے۔

پھر حجاج بن یوسف کے زمانہ سے بیعت کو پختہ اور مؤکد کرنے کے لئے بیعت کے صیغہ میں بھی طلاق کے الفاظ داخل کر دیئے گئے ہیں، اور یہ لفظ جز و بیعت بن گئے ہیں کہ "اگر میں نے فلاں کی بیعت توڑی تو میری بیویوں کو طلاق"۔

ابن تیمیہ نے اس مسئلہ پر غور کرنے کے بعد فتویٰ دینا شروع کر دیا کہ یہ محض ایک حلف کی صورت ہے، اور اس کے خلاف کرنے کی حالت میں یا بیان کے خلاف واقعہ ہونے کی صورت میں قسم کھانے والا حانث ہوگا، اور اس پر قسم کا کفّارہ لازم آئے گا، طلاق واقع نہیں ہوگی۔

اگرچہ ابن تیمیہؒ نے اپنے اس فتویٰ کی تائید میں مذاہب اربعہ میں سے بعض ائمہ اور ان کے بعض اصحاب کے اقوال بھی پیش کئے ہیں[1]، مگر واقعہ یہ ہے کہ یہ فتویٰ ان مذاہب کے مشہور اور مفتیٰ بہ قول کے خلاف تھا، اور ایک نئی تحقیق اور ان کا اجتہاد معلوم ہوتا تھا، اس لئے اس فتویٰ سے عام طور پر ایک اضطراب پیدا ہوا، اور علماء و قضاۃ نے اس کی ضرورت سمجھی کہ ان کو اس فتویٰ سے باز رہنے کا مشورہ دیا جائے، تاکہ زیادہ اضطراب اور انتشار نہ پیدا ہو، حافظ ابن کثیر ۸۱۷ھ کے واقعات میں لکھتے ہیں:۔

"پنجشنبہ ۱۵ ربیع الاول کو قاضی القضاۃ شمس الدین بن مسلم نے امام ابن تیمیہ سے ملاقات کی اور ان کو مشورہ دیا کہ حلف بالطلاق کے مسائل میں وہ آئندہ فتویٰ نہ دیں، شیخ نے ان کا مشورہ قبول کیا، اور ان کی خاطر اور اہل افتاء کی رعایت سے اس کا وعدہ کیا، جمادی الاولیٰ کے شروع میں مصر سے

---

[1] اس مسئلہ کی صحیح صورت اور فریقین کے دلائل سمجھنے کے لئے ملاحظہ ہو شیخ محمد ابو زہرہ مصری کی کتاب "ابن تیمیہ" میں بحث "الحلف بالطلاق" صفحہ ۴۲۶، ۴۳۶

فرمان سلطانی بھی آیا جس میں ابن تیمیہ کو حلف بالطلاق کے مسئلہ میں فتویٰ دینے سے روکا گیا تھا۔ ایک مجلس عام میں یہ فرمان پڑھا گیا، اور امام نے اس کو منظور کیا، اور شہر میں اس کا اعلان ہو گیا، اس فرمان سلطانی سے پہلے ہی اہل افتاء کی ایک جماعت قاضی ابن مسلم سے ملاقات کر چکی تھی، ان کے مشورہ سے قاضی صاحب نے ابن تیمیہ سے یہ خواہش ظاہر کی تھی کہ وہ اس مسئلہ میں سکوت کریں، اور انھوں نے اختلاف اور ہنگامہ سے بچنے کے لئے اس کو منظور کر لیا تھا"۔[1]

معلوم ہوتا ہے کہ فرمان سلطانی کے صدور کے بعد اس خیال سے کہ حکومت کو اس مسئلہ میں مداخلت کرنے کا کوئی حق نہیں، اور کسی عالم کو حکومت کے خوف سے اپنے علم اور عقیدہ کو چھپانا جائز نہیں یا اس لئے کہ مسئلہ میں ان کا اطمینان اور شرح صدر بڑھ گیا تھا، انھوں نے اپنی تحقیق کے مطابق فتوے دینا شروع کر دیا، اور حکومت کے امتناعی احکام کی کوئی پرواہ نہیں کی، اس لئے کہ ابن کثیر ۷۲۰ھ کے واقعات میں لکھتے ہیں:

"پنجشنبہ ۲۲ رجب کو دار السعادۃ میں نائب السلطنت کی موجودگی میں ایک مجلس منعقد کی گئی جس میں مذاہب اربعہ کے قاضی و مفتی اور شیخ الاسلام نے شرکت کی شرکائے مجلس نے اعتراض کیا کہ انھوں نے (ابن تیمیہ نے) مسئلہ طلاق میں پھر فتویٰ دینا شروع کر دیا ہے، چنانچہ نائب السلطنت نے قلعہ میں نظربند کئے جانے کا حکم جاری کیا، اور وہ (۲۲ رجب ۷۲۰ھ) کو قلعہ میں محبوس کر دیئے گئے۔

لیکن یہ مدت اسیری کچھ زیادہ طویل نہیں ہوئی، پانچ مہینے اٹھارہ دن کے بعد، ۱۰ محرم ۷۲۱ھ کو براہِ راست مصر سے ان کی رہائی کے احکام آئے، اور وہ آزاد کر دیئے گئے۔"[2]

آخری اسیری

۷۲۱ھ سے ۷۲۶ھ تک تقریباً ساڑھے پانچ سال شیخ الاسلام پوری آزادی اور انہماک

---

[1] البدایۃ والنہایۃ جلد ۱۴ ص ۸۷ [2] ایضاً

کے ساتھ درس و تصنیف، افتاء اور وعظ میں مشغول رہے، اس عرصہ میں وہ زیادہ تر مدرسہ حنبلیہ میں یا اپنے مخصوص مدرسہ میں جو قصّاصین میں واقع تھا، درس دیتے تھے، اس عرصہ میں انھوں نے اپنی پرانی کتابوں اور رسائل پر نظر کی، اور بعض نئی تصنیفات کیں۔

شاید وہ اس عرصہ میں بہت زیادہ مفید کام کرتے، اور ان کے قلم سے بعض اہم موضوعات پر کچھ بیش قیمت اور نادر کتابیں نکلتیں لیکن ان کا علمی تفوق اور بعض مسائل پر تفرد ان کے معاصرین اور خود ان کے لئے ایک بڑا ابتلاء تھا، جس کی ان کو بار بار بڑی قیمت ادا کرنی پڑتی تھی، پھر بھی زیادہ دن اطمینان سے بیٹھنا نصیب نہیں ہوتا تھا، تھوڑا ہی عرصہ گذرا تھا کہ ایک نیا مسئلہ زیر بحث آگیا، جو خواص و عوام سب کے لئے جاذبِ توجہ تھا، اور جو مسئلۂ طلاق کی طرح خالص فقہی مسئلہ نہ تھا بلکہ اس میں جذباتی عنصر بھی شامل تھا، اور جس میں قلوب کو مضطرب کرنے کی زیادہ صلاحیت تھی، یہ مسئلہ زیارت قبر نبوی (علی صاحبہ الصّلوٰۃ والسّلام) کا تھا۔

ابن تیمیہ نے سترہ سال پہلے یہ فتویٰ دیا تھا کہ کسی قبر کی زیارت کے لئے (خواہ وہ قبر انور ہو، علیٰ صاحبہ الف صلاۃ وسلام) اہتمام سے سفر کر کے جانا (جس کو عربی میں شدّ الرحل کہتے ہیں) جائز نہیں، اس لئے کہ حدیث میں آتا ہے "لا تشدّ الرحال الا الی ثلاثۃ مساجد، المسجد الحرام ومسجدی ھذا والمسجد الاقصیٰ" کجاوے نہ کسے جائیں (اہتمام سے سفر نہ کیا جائے) مگر تین مسجدوں کی طرف، مسجدِ حرام (خانۂ کعبہ) میری مسجد (مسجد نبوی) اور (مسجد اقصیٰ)، (بیت المقدس) پھر وہ حسب معمول اس کی شرعی حکمتیں اور اس کی مخالفت کی صورت میں اس کی قباحتیں اور نقصانات گناتے ہیں، جن کا خلاصہ یہ ہے کہ اس اہتمام سفر سے شرک و مشرکانہ عقائد و اعمال کا دروازہ کھلتا ہے، لوگ اس زیارت کو عبادت اور تقرب الی اللہ کا ذریعہ سمجھنے لگتے ہیں، وہاں پہونچ کر حدود شریعت سے تجاوز کرتے ہیں، اور توحید کا دامن ہاتھ سے چھوٹ جاتا ہے، آنحضرت (صلے اللہ علیہ وسلم) کو اس بات کا کہ قبر مبارک

ان اعمال و رسوم سے محفوظ رہے، جو جاہلی قوموں اور یہود و نصاریٰ میں شائع و ذائع تھے، اس قدر اہتمام تھا کہ فرمایا "لعن اللہ الیہود والنصاریٰ اتخذوا قبور انبیائہم مساجد"[1] (اللہ یہود و نصاریٰ پر لعنت کرے انھوں نے اپنے انبیاء کی قبروں کو سجدہ کی جگہ بنالیا) نیز بڑے اہتمام سے دعا فرمائی "اللھم لا تجعل قبری وثنا یعبد اشتد غضب اللہ علی قوم اتخذوا قبور انبیائہم مساجد"[2] (اے اللہ میری قبر کو بت نہ بنادینا جس کی عبادت کی جائے، اللہ کا غصہ ان لوگوں پر سخت ہوا جنھوں نے اپنے پیغمبروں کی قبور کو سجدہ گاہ بنالیا) نیز ارشاد فرمایا "لا تتخذوا قبری عیدًا وصلوا علیّ فان صلاتکم حیثما کنتم تبلغنی"[3] نیز آپ نے اسی لئے کسی میدان میں دفن ہونا پسند نہیں کیا، بلکہ حضرت عائشہؓ کے حجرہ میں مدفون ہوئے جو ایک محفوظ جگہ ہے، اس سب کا مقتضا یہ ہے کہ قبر انور کو ان تمام خطرات سے محفوظ رکھا جائے، اور اہتمام سے جوق در جوق زیارت کی نیت سے آنے کی اجازت نہ دی جائے، البتہ جو لوگ مسجد نبویؐ میں نماز پڑھنے کی نیت سے آئیں وہ مسنون طریقہ سے زیارت کریں اور صلوٰۃ و سلام بھیجیں جیسا کہ صحابہؓ و تابعینؒ کا دستور تھا۔[4]

مختلف اسباب و محرکات کی بنا پر ستّرہ برس پہلے کا یہ فتویٰ نکالا گیا، اور اس کی تشہیر کی گئی، ایک طرف اس سے عام مسلمانوں کے جذبات کو ٹھیس لگتی تھی، جو اس زیارت کو بڑی سعادت اور نعمت عظمیٰ سمجھتے تھے، اور اس کا ذوق و شوق رکھتے تھے، اور ان کو بارگاہ نبوت میں کمی ادب کی جھلک نظر آئی،

---

[1] بخاری و مسلم [2] مالک مرسلا، مسند امام احمد [3] سنن ابی داؤد وغیرہ [4] جہاں تک ان مقاصد کا تعلق ہے (کہ توحید کا زیادہ سے زیادہ اہتمام کیا جائے، اور شرک و مشرکانہ اعمال و رسوم کے ذرائع مسدود کئے جائیں، اور ان کی اجازت نہ دی جائے) کسی صاحب علم کو اس سے اختلاف نہیں ہو سکتا، لیکن اس کے لئے زیارت قبر نبویؐ کو مطلقاً روکنا ذکاوت حس اور تشدد سے خالی نہیں معلوم ہوتا، اور یہ بات نہ ان کی علمی و دینی عظمت کے منافی ہے نہ ہمارے حسن اعتقاد اور ان کے کمالات کے اعتراف کے لئے مانع، نہ یہ مسئلہ اتنا سنگین تھا کہ اس کے لئے ان کو محبوس کیا جائے، اور اسی حالت اسیری میں وہ دنیا سے رخصت ہوں۔

دوسری طرف اس میں علماء کو جمہور امت کی مخالفت اور خود دوسری اور خود رائی نظر آئی، اور شاید یہی ان کی مخالفت کا اصل محرک تھا۔

بہر حال اس اختلاف نے اتنی اہمیت اختیار کی، اور اس کا اتنا چرچا ہوا کہ حکومتِ وقت نے (علماء کی توجہ دہانی سے یا اپنی انتظامی مصلحتوں سے) اس میں دخل دینا مناسب سمجھا اور ۷ رشعبان ۷۲۶ھ کو ان کے محبوس کئے جانے کا فرمان صادر ہوا، شیخ نے اس اطلاع کا بڑا خیر مقدم کیا، اور اس پر بڑی مسرت کا اظہار فرمایا، انھوں نے اپنے حبس کی اطلاع پاتے ہی فرمایا "اناکنت منتظراً ذلک وھذا فیہ خیر کثیر و مصلحۃ کبیرۃ" (میں تو اس کا منتظر ہی تھا، اس میں بڑی خیر اور بہت بڑی مصلحت ہے۔)

شیخ قلعۂ دمشق میں منتقل کر دیئے گئے جہاں ان کے لئے ایک ایوان خالی کر دیا گیا، اس کا انتظام کیا گیا کہ باہر سے پانی کا چشمہ قلعہ میں لایا جائے، ان کی خدمت اور راحت کے لئے اجازت دی گئی کہ ان کے بھائی زین الدین ابن تیمیہ بھی ان کے ساتھ قیام کریں، حکومت نے ان کے مصارف کے لئے ایک معقول رقم بھی مقرر کی۔

ان کے محبوس ہو جانے کے بعد لوگوں کو انتقامی کارروائی کرنے کا موقع ملا اور ان کے حاسدین و مخالفین نے ان کے مخصوص دوستوں اور شاگردوں پر دست درازی کی، بعض حضرات کو جانوروں پر سوار کرا کے گشت کرایا گیا، اور تشہیر کی گئی، پھر قاضی القضاۃ کے حکم سے ایک جماعت کو قید بھی کر دیا گیا، کچھ دنوں کے بعد سب کو رہا کر دیا گیا، لیکن شیخ الاسلام کے مایۂ ناز شاگرد اور جانشین حافظ ابن قیم اپنے استاد اور شیخ کے ساتھ ہی رہے، اور ان کی وفات کے بعد رہا ہوئے۔[1]

---

[1] ابن تیمیہ محمد ابوزہرہ صفحہ

اہلِ علم و دین کا تاسف اور احتجاج

شیخ الاسلام کی اسارت اور نظر بندی جہاں حاسدین و مخالفین کی ایک قلیل جماعت کی شادمانی اور تسکینِ قلب کا سامان بنی، وہاں ہزاروں اہلِ علم اور لاکھوں مسلمانوں کو اس پر سخت تاسف اور رنج ہوا، اور انھوں نے اس کو سنت کے مقابلہ میں بدعت کی فتح اور حق اور اہلِ حق کے لئے ایک ذلت کے مرادف سمجھا، سلطنت کے مختلف گوشوں سے اور بڑے بڑے اہلِ علم و اہلِ دین کی جانب سے سلطان معظم (الملک الناصر) کی خدمت میں ایسے خطوط اور عرائض پہونچے جس میں اس واقعہ پر دلی تأثر اور استعجاب کا اظہار کیا گیا تھا، اس سلسلہ کا صرف ایک خط جو علمائے بغداد نے سلطان کی خدمت میں بھیجا تھا، نقل کیا جاتا ہے، اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ شیخ کی دعوت اور شہرت تمام ممالکِ اسلامیہ میں پھیل گئی تھی، اور تمام اہلِ حق کو ان کی ذات سے خاص تعلق اور شیفتگی تھی، علمائے بغداد لکھتے ہیں :۔

لما قرع اهل البلاد المشرقية والنواحي	بلادِ مشرق اور ملکِ عراق کے باشندوں کو جب اس کا
العراقية التضييق على شيخ الاسلام	علم ہوا کہ شیخ الاسلام تقی الدین احمد بن تیمیہ پر تنگی کی
تقي الدين احمد بن تيمية سلمه الله	جارہی ہے تو اہلِ اسلام کو اس سے بڑی گرانی اور
عظم ذلك على المسلمين وشق على	اہلِ دین کو اس سے بڑی کوفت ہوئی، اور دیکھا گیا کہ
ذوي الدين وارتفعت رؤس	ملحدین کو اس سے بڑی مسرت اور عزت حاصل ہوئی،
الملحدين وطابت نفوس اهل الأهواء	اور اہلِ اہوٰی اور مبتدعین کے دل باغ باغ ہوئے
والمبتدعين، ولما رأى علماء اهل	جب ان اطراف کے علماء کو اس واقعہ کی اہمیت
هذه الناحية عظم هذه النازلة من	کا علم ہوا، اور انھوں نے دیکھا کہ اہلِ بدع اور
شماتة اهل البدع واهل الاهواء	اہلِ باطل اکابر فضلاء اور ائمہ علماء کی اس ذلت

باكابر الفضلاء وائمة العلماء انهوا حال
هذا الامر الفظيع والامر الشنيع الى الحضرة
الشريفة السلطانية زادها الله شرفاً،
وكتبوا اجوبتهم فى تصويب ما اجاب به
الشيخ سلمه الله فى فتاواه وذكروا من
علمه وفضائله بعض ما هو فيه، وحملوا
ذلك بين يدى مولانا ملك الامراء
اعز الله انصاره وضاعف اقتداره
غيرة منهم على هذا الدين ونصيحة
للاسلام وامراء المؤمنين۔ [1]

اور ابتلاء پر خوشیاں منا رہے ہیں تو انھوں نے
اس ناگوار واقعہ اور اس کے اثرات کی اطلاع
بارگاہ سلطانی میں دینا ضروری سمجھا اور انھوں نے
شیخ کے فتاویٰ کی تائید میں اپنے جوابات لکھ کر روانہ
کئے، انھوں نے شیخ کے علم اور ان کے فضائل و کمالات
کے متعلق اپنے تاثرات اور معلومات بھی قلمبند کئے،
اور اس سب کو ملک معظم کی خدمت ہمایوں میں
پیش کر دیا، اس سب کا محرک و باعث سوائے دینی
غیرت وحمیت اور اسلام اور سلاطین اسلام کی
خیر خواہی کے کچھ نہ تھا۔

قلعہ میں شیخ کے مشاغل

عرصۂ دراز کے بعد شیخ کو سکون کے لمحات اور یکسوئی کی دولت حاصل ہوئی، غالباً اسی پر انھوں نے فرمایا تھا (فيه خير كثير ومصلحة كبيرة) انھوں نے اس خلوت وانقطاع کی پوری قدر کی، اور پورے انہماک اور ذوق وشوق کے ساتھ عبادت وتلاوت میں مشغول ہو گئے، اس سے جو کچھ وقت بچتا تھا وہ مطالعہ وتصنیف اور اپنی کتابوں کی تنقیح وتصحیح میں صرف کرتے تھے، جو خود ایک مستقل عبادت تھی، اس فرصت میں ان کا سب سے بڑا مشغلہ اور ورد تلاوتِ قرآن تھا، وہ اس محبس میں دو سال رہے، اس مختصر مدت میں انھوں نے اپنے بھائی شیخ زین الدین ابن تیمیہ کے ساتھ قرآن مجید کے اسی دور کئے۔ [2]

---

[1] العقود الدریۃ ص ۳۵ اور الکواکب الدریۃ ص ۱۹۵
[2] البدایہ والنہایہ ص ۱۳۸

جیل میں انھوں نے جو کچھ لکھا اس کا زیادہ تر حصہ تفسیر سے متعلق تھا، اس کا سبب بھی غالباً تلاوت کی کثرت اور قرآن مجید میں غور و تدبر تھا، بعض مسائل پر بھی انھوں نے رسائل اور جوابات لکھے، باہر سے جو اہم اور خاص علمی سوالات اور فقہی استفسارات آتے ان کے جوابات دیتے، اس طرح سوائے عمومی درس و وعظ کے ان کے سب کام جاری تھے، اور کثرتِ تلاوت اور عبادت کا اضافہ تھا۔

نئی پابندیاں اور سامانِ مطالعہ و تحریر سے محرومی

شیخ جیل خانہ میں جو کچھ لکھتے تھے، لوگ اس کو ہاتھوں ہاتھ لیتے اور وہ ملک کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک پہنچ جاتا، دوسرے رسائل و مسائل کے علاوہ جو انھوں نے جیل میں تحریر کئے ان کا ایک مستقل رسالہ مسئلۂ زیارت میں تھا، جس میں انھوں نے مصر کے ایک مالکی المذہب قاضی عبداللہ بن الاخنائی کی تردید کی تھی[۱]، اس میں انھوں نے ثابت کیا تھا کہ قاضی موصوف بہت قلیل العلم اور ناواقف آدمی ہیں، قاضی صاحب نے سلطان سے اس کی شکایت کی اور اپنے غم و غصہ کا اظہار کیا، سلطان نے فرمان جاری کیا کہ شیخ کے پاس جتنی کتابیں کاغذ قلم دوات ہے، لے لیا جائے اور ان کے پاس کوئی ایسا سامان نہ رہے جس کی مدد سے وہ تصنیف و تالیف کر سکیں۔

۹ جمادی الاخریٰ ۷۲۸ھ کو اس فرمان کی تعمیل کی گئی اور پڑھنے لکھنے کا سارا سامان بحق حکومت ضبط کر لیا گیا، یکم رجب کو ان کے سب مسودات اور اوراق جیل سے اٹھا کر عادلیہ[۲] کے بڑے کتب خانہ میں داخل کر دیئے گئے، یہ کتابوں کی ساٹھ جلدیں اور ۱۴ کاغذ کے شیرازے تھے جن میں وہ لکھتے پڑھتے تھے۔

---

[۱] ملاحظہ ہو رسالۂ "الاخنائیہ" مطبوعہ مصر [۲] یہ عمارت المکتبۃ الظاہریۃ کے سامنے ہے، اسی میں ابن خلکان نے اپنی مشہور تالیف "وفیات الاعیان" لکھی، اور ابن مالک صاحبِ الفیہ نے درس دیا، آج کل اس میں المجمع العلمی العربی کا مرکز ہے۔

کوئلہ سے تحریر و تصنیف

شیخ نے اس پر بھی کسی جزع و فزع کا اظہار نہیں کیا، اور نہ حکومت سے کوئی شکایت کی، ان سے جب قلم و دوات لے لئے گئے تو انھوں نے منتشر اوراق پر کوئلہ سے لکھنا شروع کیا، ان کے متعدد رسائل ور تحریریں کوئلہ سے لکھی ہوئی ملیں، اور عرصہ تک اسی حالت میں محفوظ رہیں، اس مجبوری اور بے سروسامانی کی حالت میں وہ شاکر اور راضی برضا معلوم ہوتے ہیں، ان کو اس کا بھی احساس ہے کہ ان کو میدانِ جہاد کی فضیلت حاصل ہے، اور صورتِ حال میں کوئی تغیر نہیں ہوا، ایک مکتوب میں فرماتے ہیں:۔

نحن وللہ الحمد فی عظیم الجہاد فی سبیلہ	ہم بحمد اللہ بہت بڑے جہاد فی سبیل اللہ میں مشغول ہیں،
بل جہادنا فی ھذا مثل جہادنا یوم قازان	ہمارا یہاں کا جہاد واقعۂ قازان، جہاد کوہستان جہمیوں
والجبلیۃ، والجہمیۃ والاتحادیۃ وامثال	اور اتحادیوں (وحدۃ الوجود کے قائلین) وغیرہ کے
ذلک، وذلک من اعظم نعم اللہ علینا وعلی	مقابلہ میں ہمارے گذشتہ جہاد سے کم نہیں ہے، یہ
الناس ولکن اکثر النّاس لایعلمون۔[1]	اللہ تعالیٰ کا ہم پر اور لوگوں پر بہت بڑا احسان ہے،
	لیکن اکثر لوگ اس کی حقیقت سے واقف نہیں۔

تسلیم و رضا اور حمد و شکر

ایک دوسرے خط میں ان کی ایمانی کیفیت اور تسلیم و رضا کی شان اس طرح جھلکتی ہے:۔

کل مایقضیہ اللہ تعالیٰ فیہ الخیر والرحمۃ	اللہ تعالیٰ بندہ کے لئے جو کچھ فیصلہ فرمائے اسی میں خیر
والحکمۃ، انّ ربّی لطیف لما یشاء انہ	اور رحمت اور حکمت ہے (انّ ربّی لطیف لما یشاء)

[1] ابن تیمیہ محمد ابوزہرہ۔

هو القوی العزیز العلیم الحکیم ولا یدخل
علی أحد ضرر الا من ذنوبه" ما اصابك
من حسنة فمن الله وما اصابك من
سیئة فمن نفسك" فالعبد علیه ان
یشکر الله ویحمده دائماً علی کل حال،
ویستغفر من ذنوبه، فالشکر یوجب
المزید من النعم والاستغفار یدفع
النقم، ولا یقضی الله للمرء من قضاء
الا کان خیراً له ان اصابته سراء
شکر، وان اصابته ضراء صبر فکان
خیراً له۔

بیشک وہ قوی، غالب اور علیم وحکیم ہے، انسان کو
صرف اپنے گناہوں سے نقصان پہنچتا ہے "ما اصابك
من حسنة فمن الله وما اصابك من سیئة
فمن نفسك (تجھے جو بھلائی بھی پہونچے وہ اللہ کی
طرف سے ہے، اور جو تجھے برائی پہنچے، وہ تیرے نفس کی
طرف سے ہے) اس لئے بندہ کا فرض ہے کہ اللہ تعالے
کا ہر حال میں شکر اور اس کی حمد کرے اور اپنے گناہوں سے
استغفار، اس لئے کہ شکر تازہ نعمتوں اور مزید انعامات کا
موجب ہے اور استغفار غضب اور سزا کو دفع کرتا ہے
اور اللہ تعالے انسان کے لئے جو کچھ فیصلہ فرماتا ہے وہ
اس کے حق میں بہتر ہی ہوتا ہے، حدیث شریف میں آتا
ہے کہ مومن کو جب مسرت اور نعمت حاصل ہوتی ہے تو
شکر کرتا ہے، جب مصیبت اور تکلیف پہنچتی ہے تو صبر سے
کام لیتا ہے اور یہ اس کے حق میں بہتر ہے۔

ان کو اس حالت میں بھی اپنے مسلک کی صحت اور بے گناہی کا یقین ہے، وہ اپنا جرم اتنا ہی سمجھتے ہیں کہ انھوں نے ایک مسئلہ شرعی میں حاکمِ وقت کی بات نہیں مانی اور جس کو وہ حق... سمجھتے تھے اس پر اڑے رہے لیکن وہ اپنے اس جرم کا اعتراف کرتے ہیں، اور اس کو ایمان و توحید کا مقتضاء سمجھتے ہیں۔

غایة ما عندهم انه خولف مرسوم
بعض المخلوقین والمخلوق کائناً من

ان کا بڑے سے بڑا الزام یہ ہے کہ ایک انسان کی
(جو دوسرے انسانوں کی طرح خدا کا ایک بندہ ہے)

كان اذا خالف امر الله تعالىٰ ورسوله لم يجب، بل لا تجوز طاعته في مخالفة امر الله ورسوله باتفاق المسلمين۔

حکم عدولی کی مخلوق خواہ حاکم وقت ہو یا سلطان دوراں جب اللہ اور اس کے رسول کے حکم کی مخالفت کرے گا تو اس کی بات کبھی نہیں مانی جائے گی، بلکہ باتفاق مسلمین اللہ اور رسول کی مخالفت کی حالت میں اس کی اطاعت جائز ہی نہیں۔

زندگی کے آخری دن اور وفات

شیخ الاسلام کے بھائی زین الدین عبدالرحمٰن کہتے ہیں کہ قرآن مجید کے اسّی دور ختم کرنے کے بعد جب نیا دور شروع کیا، اور سورۂ قمر کی اس آیت پر پہنچے "اِنَّ الْمُتَّقِیْنَ فِیْ جَنّٰتٍ وَّنَهَرٍ فِیْ مَقْعَدِ صِدْقٍ عِنْدَ مَلِیْكٍ مُّقْتَدِرٍ" تو بجائے میرے عبداللہ بن محب اور عبداللہ الزرعی کے ساتھ دور شروع فرمایا، یہ دونوں نہایت صالح شخص تھے، اور آپس میں حقیقی بھائی تھے، شیخ کو ان کی قرأت بہت پسند تھی، ابھی یہ دور ختم نہیں ہونے پایا تھا کہ زندگی کے دن پورے ہو گئے۔

مرض وفات شروع ہوا، تو نائب دمشق (حاکم دمشق) عیادت کے لئے آیا، مزاج پرسی کے بعد اس نے بڑی معذرت کی، اور کہا مجھ سے اگر کوئی تقصیر ہوئی یا تکلیف پہونچی ہو تو للہ معاف کر دیا جائے، شیخ نے جواب میں فرمایا:-

اني قد احللتك، وجميع من عادا ني وهو لا يعلم اني على الحق، واحللت السلطان المعظم الملك الناصر من حبسه اياي، لكونه فعل ذالك مقلدا

میں نے تم کو بھی اپنی طرف سے معاف اور سبکدوش کر دیا ہے، اور ان سب لوگوں کو بھی جنھوں نے مجھ سے دشمنی کی، اور ان کو میرا حق پر ہونا معلوم نہیں تھا اور سلطان معظم الملک الناصر سے بھی میرا کوئی مطالبہ اور

معذورًا ولم يفعله لحظ نفسه وقد احللت كل احد مما بيني وبينه الا من كان عدوا الله ورسوله (صلى الله عليه وسلم)

دار و گیر نہیں کہ انھوں نے مجھے محبوس کیا، اس لئے کہ انھوں نے یہ علماء کے اعتماد اور ان کی تقلید میں کیا ہے اور وہ معذور ہیں، اس میں ان کی نفسانیت شامل نہیں میں نے ہر شخص کو اپنے معاملہ میں معاف کر دیا ہے، صرف اس شخص کو نہیں کیا، جو اللہ اور اس کے رسول کا دشمن ہے۔

انتقال سے بیس بائیس روز پہلے طبیعت خراب ہوئی، پھر درست نہیں ہوئی، یہاں تک کہ ۲۲ رذی القعدہ ۷۲۸ھ کی شب میں وقت موعود آپہنچا، اور اس مجمع کمالات ہستی نے سرسٹھ سال کی عمر میں دنیا سے کوچ کیا۔ کُلُّ مَنْ عَلَيْهَا فَانٍ وَيَبْقَىٰ وَجْهُ رَبِّكَ ذُو الْجَلَالِ وَالْإِكْرَامِ۔

شیخ الاسلام کی وفات کی اطلاع قلعہ کے موذن نے مینار پر چڑھ کر دی، برجوں پر جو چوکیدار متعین تھے انھوں نے وہاں سے اعلان کیا، شہر میں بجلی کی طرح یہ خبر پھیل گئی، قلعہ کا دروازہ کھول دیا گیا، اور اذن عام دے دیا گیا، لوگ جوق در جوق آتے تھے اور زیارت کر کے جاتے تھے، بہت سے لوگ فرط محبت میں اس پیشانی کو بوسہ دیتے تھے، جو گھنٹوں خاک پر اپنے مالک کے سامنے ٹکی رہتی تھی۔

غسل سے پہلے ہی لوگوں نے قرآن مجید ختم کئے، مردوں کے بعد عورتوں کو آنے کی اجازت ہوئی اور انھوں نے زیارت کی، غسل کے وقت صرف وہی لوگ رہ گئے جن کو غسل دینا تھا۔

جنازہ کی کیفیت اور تدفین

غسل کے بعد ایک نماز جنازہ قلعہ میں ہوئی، شیخ محمد تمام نے نماز پڑھائی، نماز کے بعد جنازہ باہر لایا گیا، قلعہ اور جامع مسجد کے درمیان کے سب راستے ہجوم سے بھرے ہوئے تھے، چار گھڑی دن چڑھے جنازہ جامع مسجد (جامع اموی) میں پہونچا، ہجوم کا یہ حال تھا کہ فوج جنازہ کو اپنے گھیرے میں

لئے ہوئے تھی، ورنہ جنازہ کی حفاظت اور انتظام مشکل تھا، مجمع کا کوئی اندازہ نہ تھا، اس ہجوم خلائق میں کسی نے بلند آواز سے پکار کر کہا "ھٰکذا تکون جنائز ائمۃ السنۃ" (سنت کے پیشواؤں کا جنازہ اسی شان کا ہوتا ہے) یہ سن کر اور کہرام مچ گیا۔

ظہر کے بعد نمازِ جنازہ ہوئی، لحظہ بلحظہ ہجوم بڑھتا جارہا تھا، یہاں تک کہ میدان، گلیاں، بازار سب بھر گئے، ہر طرف مجمع ہی مجمع نظر آتا تھا، بازار بند تھا، اور کھانے کی دوکانیں سب بند تھیں، بہت سے لوگوں نے روزہ کی نیت کرلی کہ آج کھانے پینے کا ہوش نہیں۔

نمازِ جنازہ کے بعد جنازہ اٹھا، کاندھا دینے کا موقع نہ تھا، جنازہ انگلیوں اور سروں پر جارہا تھا، ہر طرف گریہ و بکا کی صدائیں بلند تھیں، ہر زبان اور ہر لب پر مدح و توصیف اور دعا کے الفاظ تھے، لوگ فرطِ عقیدت میں رومال اور کپڑے پھینک پھینک کر جنازہ سے مس کراتے تھے، شدتِ ازدحام سے لوگوں کے پاؤں کے جوتے اور کھڑاویں نکل گئیں، اور پگڑیاں اور رومال گر گئے، لوگ جنازہ کے دیکھنے اور اس کی مشایعت میں ایسے محو اور مستغرق تھے کہ ان کو اپنے کپڑوں اور جوتوں کا ہوش نہ تھا، جنازہ سروں پر جارہا تھا، کبھی کچھ آگے بڑھ جاتا تھا، کبھی پیچھے کھسک جاتا تھا، کبھی ٹھہر جاتا تھا، سوق الخیل میں پہنچکر مجمع کا کوئی حد و حساب نہیں رہا، جنازہ وہاں رکھا گیا، چھوٹے بھائی زین الدین عبدالرحمٰن نے آگے بڑھ کر نماز پڑھائی، نماز کے بعد مقبرۃ الصوفیہ میں اپنے بھائی شرف الدین عبداللہ کے پہلو میں دفن کئے گئے۔[1]

---

[1] یہ قبرستان جو بڑے بڑے مشاہیر اہلِ قلم و صلاح (مثلاً ابن عساکر، ابن الصلاح، ابن الاثیر، ابوالحجاج المزی، حافظ عماد الدین ابنِ کثیر وغیرہ) کا مدفن ہے، اب بالکل ناپید ہوگیا ہے، اس پر بڑی بڑی عمارتیں کھڑی ہیں، صرف شیخ الاسلام ابن تیمیہ کی قبر جامعہ سوریہ کے ہال اور اسپتال کی ایک عمارت کے سامنے ابھی تک موجود ہے، ۱۰ شوال ۱۳۷۰ھ (۲۸ جولائی ۱۹۵۱ء) کو علامۂ شام شیخ محمد بہجۃ البیطار کی معیت و رہبری میں راقم سطور نے اس کی زیارت کی، علامۂ موصوف نے واقعہ سنایا کہ یونیورسٹی کی کسی تعمیر کے سلسلہ میں شب بھر میں اس مقبرہ کو کھدواڈالا گیا، صبح جب اس کی اطلاع ہوئی تو صدرِ جمہوریہ شکری القوتلی نے عیسائی

(باقی صفحہ ۱۲۶ پر)

جنازہ صبح کے وقت قلعہ سے نکلا تھا، لیکن ہجوم کی کثرت کی وجہ سے کہیں عصر کی اذان کے وقت دفن کی نوبت آئی، بظاہر سارا شہر جنازہ کی مشایعت میں تھا، حاضرین کا کم سے کم اندازہ ۶۰ ہزار سے ایک لاکھ تک کیا گیا ہے، ۱۵ ہزار صرف عورتوں کا اندازہ ہے جو جنازہ میں شریک تھیں، جو بالاخانوں اور چھتوں سے دیکھ رہی تھیں، اس کے علاوہ ہیں، جنازہ میں ایسا ہجوم دمشق کی تاریخ میں دیکھا نہیں گیا، ممکن ہے بنی امیہ کے زمانہ میں جب دمشق کی آبادی بہت تھی، اور وہ دارالخلافہ تھا کسی کے جنازہ میں ایسا ازدحام ہوا ہو۔[1]

نمازِ جنازہ غائبانہ

اکثر اسلامی ممالک میں یہاں تک کہ اقصائے جنوب اور اقصائے مشرق میں غائبانہ نمازِ جنازہ پڑھی گئی، ابنِ رجبؒ ذیل طبقات الحنابلہ میں لکھتے ہیں :۔

وصلی علیہ صلاۃ الغائب فی غالب بلاد	اکثر قریب و بعید ممالکِ اسلامیہ میں نمازِ جنازہ غائبانہ
الاسلام القریبۃ والبعیدۃ حتی فی الیمن	پڑھی گئی، یہاں تک کہ یمن اور چین میں بھی نمازِ جنازہ
والصین واخبر المسافرون انہ نودی	ہوئی، مسافروں نے بیان کیا کہ چین کے ایک بعید ترین
باقصی الصین للصلاۃ علیہ یوم	شہر میں جمعہ کے دن نمازِ جنازہ (غائبانہ) کا اعلان
جمعۃ "الصلاۃ علی ترجمان القرآن"۔	ان الفاظ میں ہوا کہ "ترجمان قرآن کی نمازِ جنازہ ہوگی"۔

(باقی صفحہ ۱۲۵ کا) وائس چانسلر کو تنبیہ کی کہ ابن تیمیہؒ کی قبر اگر مندرس ہو گئی تو میں سلطان ابن سعود کو کیا جواب دوں گا جن سے میرے دوستانہ تعلقات ہیں، چنانچہ وہ قبر باقی رکھی گئی جو ابھی تک محفوظ ہے۔

[1] یہ ساری تفصیل ابنِ کثیر نے شیخ علم الدین البرزالی کے حوالہ سے لکھی ہے، جو شیخ الاسلام کے معاصر اور رفیق درس تھے۔ ج ۱۴ صفحہ ۱۳۶-۱۳۹

نمایاں صفات اور کمالات

خداداد حافظہ اور ذہانت

شیخ الاسلام حافظ ابن تیمیہؒ نے اپنے دور میں علوم اسلامیہ میں جو مجتہدانہ مقام حاصل کیا، اور تفسیر و حدیث و فقہ میں بیک وقت اپنی امامت، تبحّر اور غیر معمولی عبور کا جو نقش اپنے زمانہ پر قائم کیا، اس میں بہت بڑا دخل ان کے غیر معمولی حافظہ اور ذہانت کو تھا، جو ایک موہبتِ خداوندی اور ایک نعمتِ خداداد تھی، ابن تیمیہ کے عصر میں اسلامی علوم اتنی وسعت اختیار کر چکے تھے اور منقولات کا اتنا بڑا ذخیرہ مجتمع ہو گیا تھا کہ جو شخص غیر معمولی حافظہ کا مالک نہ ہوتا، وہ نہ اس وسیع ذخیرہ پر عبور حاصل کر سکتا تھا، نہ مختلف فیہ اور مابہ النزاع مسائل میں اپنے نامور اور متبحّر معاصرین کے سامنے لب کشائی کی جرأت کر سکتا تھا، اور نہ کسی مسئلہ میں کسی پیشرو عالم سے اختلاف کا حق رکھتا تھا، لیکن اللہ تعالیٰ نے ابن تیمیہ کو جو حافظہ اور قوت استحضار عطا فرمائی تھی، اس کی مدد سے انھوں نے تفسیر، حدیث، فقہ، اصولِ فقہ، علم الخلاف (اختلافات ائمہ) علم کلام، تاریخ، سیر و آثار، علم رجال، لغت و نحو، کے اس وقت تک کے ذخیرہ پر عبور حاصل کر لیا، جتنی کتابیں اور ماخذ و مواد اس وقت موجود تھا، اور وہاں تک ان کی دسترس تھی، انھوں نے اس کا مطالعہ کیا، اور ان کے قوی اور امانت دار حافظہ نے اس کو محفوظ کر لیا، اور انھوں نے اپنی علمی اور تصنیفی زندگی میں اس سے اس طرح مدد لی، جیسا کہ ایک تجربہ کار جنگ آزما اپنے ترکش کے

ذخیرہ سے مدد لیتا ہے۔

ان کے معاصرین ان کے حافظہ کی غیر معمولی قوت، استحضار اور نمایاں ذکاوت و ذہانت کے مدّاح اور معترف ہیں، اور اس پر معاصرین و متاخرین سب کا اتفاق ہے کہ وہ نہایت قوی الحفظ، سریعُ الفہم اور ذہین و ذکی تھے، ان کے رفیقِ درس علامہ علم الدین البرزالی کہتے ہیں "قل ان سمع شیئاً الاحفظہ وکان ذکیاً کثیر المحفوظ"[1] (وہ جو کچھ بھی سنتے یاد کر لیتے، کم اس میں تخلّف ہوتا، وہ نہایت ذہین تھے، اور کثرت سے ان کو چیزیں یاد تھیں) حافظ ذہبی جو فنِ رجال کے امام اور مورخ اسلام ہیں فرماتے ہیں۔ "ما رأیت اشد استحضاراً للمتون وعزوھا منہ، وکانت السنۃ بین عینیہ وعلی طرف لسانہ"[2] (میں نے ان سے زیادہ متون (حدیث کے الفاظ اور اصلی عبارات) کا یاد رکھنے والا، اور بر وقت ان سے کام لینے والا اور ان کا صحیح حوالہ دینے والا اور نسبت کرنے والا نہیں دیکھا، حدیث کا ذخیرہ تو ان کی آنکھوں کے سامنے اور زبان کی نوک پر تھا) ان کے حافظہ کے لئے سب سے بڑی شہادت ان کے معاصرین کا یہ قول تھا کہ جس حدیث کو ابن تیمیہ کہہ دیں کہ میں نہیں جانتا وہ حدیث ہی نہیں ہے، حدیث کا ذخیرہ جتنا عظیم اور وسیع تھا، اور اس کو ہر وقت مستحضر رکھنا جتنا مشکل کام تھا، اس کے بعد حدیث کے بارہ میں تنہا ان کے حافظہ اور علم پر اعتماد اور ان کے قول پر فیصلہ جب ہی ہو سکتا تھا جب یہ تسلیم کر لیا جائے کہ وہ اپنے زمانہ کے سب سے بڑے حافظ حدیث تھے، اور ان کا حافظہ کبھی ان سے بے وفائی اور خیانت نہیں کرتا تھا، حافظ ذہبی کہتے ہیں "یصدق علیہ ان یقال کل حدیث لا یعرفہ ابن تیمیۃ فلیس بحدیث"[3] (ان کے متعلق یہ کہنا درست ہوگا کہ جس حدیث کو ابن تیمیہ نہیں جانتے وہ حدیث ہی نہیں ہے۔)

ان کے بعض معاصرین نے یہاں تک کہا ہے کہ کئی صدی سے ایسا قوی الحفظ انسان پیدا نہیں ہوا، علامہ کمال الدین ابن الزملکانی جو شیخ الاسلام کے ایسے معاصر تھے جو مجلس مناظرہ میں ان کے

---

[1] الرّد الوافر ص ۶۶ [2] القول الجلی ص ۱۰ [3] الکواکب ص ۱۴۵

حریف رہے ہیں، اور بہت سے مسائل میں ان کو ان سے سخت اختلاف رہا ہے، ان کے اس وصفِ خداداد کی شہادت ان الفاظ میں دیتے ہیں:۔

لم یرمن خمس مائۃ سنۃ او قال اربع مائۃ سنۃ ۔ والشك من الناقل ۔ احفظ منہ[1] ۔	پانچ سو سال سے یا چار سو سال سے (ناقل کو اس میں تردد ہے کہ پانچ سو سال کہے یا چار سو سال) ایسا قوی الحفظ آدمی پیدا نہیں ہوا۔

ذہانت کے متعلق حافظ ذہبی کے الفاظ ہیں "کان تیوقد ذکاءً" (وہ ذہانت کا ایک شعلہ تھے) دوسری جگہ لکھتے ہیں "کان آیۃ من الذکاء وسرعۃ الادراك[2]" (ذہانت اور سرعت فہم میں عجوبۂ روزگار تھے)۔

تبحّرِ علمی اور جامعیّت

اس خداداد حافظہ اور ذہانت، علم سے خاندانی مناسبت، سخت محنت و مشقت، شوق مطالعہ اور ذوقِ علم اور سب سے بڑھ کر توفیقِ خداوندی سے انھوں نے اسلامی علوم اور رائج الوقت فنون و مضامین میں ایسا تبحّر اور جامعیت کی شان پیدا کرلی تھی کہ ان کے وہ نامور معاصرین جو سِن میں ان سے بڑے اور اپنے زمانہ کے مسلّم الثبوت استاد اور امام فن تھے، ان کے تبحّر اور جامعیت کو دیکھ کر انگشت بدنداں رہ جاتے تھے، اور اس کی شہادت دیتے تھے کہ وہ علم کا دریا اور اسلام کا بولتا ہوا کتب خانہ ہیں، اور ہر فن میں ان کو ایسا دخل ہے کہ معلوم ہوتا ہے کہ یہی ان کا خاص فن ہے، علامہ تقی الدین ابن دقیق العید کا پایہ فنِ حدیث میں مسلّم ہے، اس زمانہ کے علماء بالعموم ان کو اپنا استاد اور بزرگ مانتے تھے، ۷۰۰ھ میں جب ابن تیمیہ مصر گئے تو علامہ ابن دقیق العید سے ملاقات ہوئی، اس ملاقات کے بعد علامۂ موصوف نے اپنا تأثر ان الفاظ میں ظاہر کیا:۔

---

[1] الکواکب ص۱۴۵ [2] الرّد الوافر ص۲۹

لما اجتمعت بابن تیمیہ رأیت رجلاً	جب ابن تیمیہ سے میری ملاقات ہوئی تو مجھے ایسا
العلوم کلها بین عینیه یأخذ منها	محسوس ہوا کہ تمام علوم اس شخص کی آنکھوں کے
ما یرید ویدع ما یرید۔[۱]	سامنے ہیں' جو چاہتا ہے لے لیتا ہے' اور جس کو چاہتا
	ہے چھوڑ دیتا ہے۔

علامہ کمال الدین ابن الزملکانی جو خود ایک متبحر عالم اور کثیر الفنون شخص تھے' ان الفاظ میں اپنا استعجاب ظاہر کرتے ہیں :۔

کان اذا سئل عن فن من العلم ظن	جب کسی فن کے اندر ان سے سوال کیا جاتا تو دیکھنے
الرائی والسامع انہ لا یعرف غیر	اور سننے والا یہ سمجھتا کہ وہ اس فن کے سوا کچھ نہیں
ذلك الفن وحکم ان احداً لا یعرف	جانتے اور یہ رائے قائم کر لیتا کہ کوئی دوسرا شخص
مثله۔[۲]	ان کا اس فن میں ہمسر نہیں۔

علامہ تقی الدین ابن السبکی ان کے مشہور حریف ہیں' جنھوں نے مسئلہ شد رحال اور بعض دوسرے فقہی مسائل میں ان کی تردید میں مستقل کتابیں لکھی ہیں' اور نظم میں بھی ان کے متعلق اظہار خیال کیا ہے'[۳] بایں ہمہ حافظ ذہبی کے نام ایک خط میں لکھتے ہیں :۔

المملوك يتحقق كبير قدره وزخارة	فقیر کو اس کا خوب اندازہ ہے کہ ابن تیمیہ ایک
بحره وتوسعه في العلوم الشرعية	جلیل القدر عالم' بحر زخار اور علوم شرعیہ و عقلیہ
والعقلية وفرط ذكائه واجتهاده	میں متبحر ہیں' اس کو ان کی اعلیٰ ذہانت محنت و غور و فکر
وبلوغه في كل ذلك المبلغ الذي	کا بھی خوب اندازہ ہے اور معلوم ہے کہ وہ (علمی کمالات)
لا يتجاوزه الوصف والمملوك	کے ایسے مرتبہ پر پہونچ گئے ہیں کہ اس کی تعریف

[۱] الرد الوافر ص ۳۱ [۲] ایضاً ص ۳۱ [۳] ملاحظہ ہو ترجمہ علامہ تقی الدین ابن السبکی (طبقات الشافعیۃ الکبریٰ، تاج الدین ابن السبکی)

یقول ذلک دائماً۔[1] مشکل ہے، فقیر اپنی مجلس میں ہمیشہ اس کا اعتراف

اور اظہار کرتا رہتا ہے۔

تاریخ ان کا خصوصی فن نہیں تھا، اور نہ انھوں نے اس کو اپنا موضوع بنایا تھا، اس کے باوجود ذہبی جیسے مورخ و نقاد کا بیان ہے کہ "ومعرفتہ بالتاریخ والسیر فعجب عجیب" (ان کی تاریخی واقفیت حیرت انگیز اور تعجب خیز ہے۔)

ان کی تاریخ دانی، وسعتِ نظر اور حاضر دماغی کا ایک حیرت انگیز واقعہ ان کے تلمیذ رشید حافظ ابن قیمؒ نے زاد المعاد میں نقل کیا ہے، وہ لکھتے ہیں کہ:۔

"ایک اسلامی ملک میں (غالباً شام یا عراق میں) یہودیوں نے ایک قدیم دستاویز پیش کی جو دیکھنے میں بھی بہت قدیم تحریر اور کاغذ معلوم ہوتا تھا، اس میں یہ درج تھا کہ آنحضرت صلے اللہ علیہ نے خیبر کے یہودیوں کو جزیہ سے معاف فرما دیا تھا، اس دستاویز پر حضرت علیؓ، سعد بن معاذؓ اور صحابۂ کرام کی ایک جماعت کے دستخط تھے بعض ناواقف جن کی نظر تاریخ و سیرت اور اس عہد کے حالات پر وسیع اور گہری نہ تھی، دھوکہ میں آگئے اور ان کو اس کی صحت کا یقین ہو گیا اور انھوں نے اس پر عمل کرنے اور یہودیوں سے جزیہ کے ساقط کرنے کا فیصلہ کر دیا، جب یہ دستاویز شیخ الاسلام کے سامنے آئی تو انھوں نے اس کو بالکل ناقابلِ اعتبار اور جعلی قرار دیا، اور اس کے جعلی اور مصنوعی ہونے کے ثبوت میں دس دلیلیں پیش کیں، ان میں سے ایک دلیل یہ تھی کہ اس پر حضرت سعد بن معاذؓ کے دستخط ہیں، حالانکہ جنگِ خیبر سے پہلے ان کی وفات ہو چکی تھی، دوسرے یہ کہ اس میں ذکر ہے کہ یہودیوں سے جزیہ کو ساقط کر دیا گیا ہے، حالانکہ جزیہ کا حکم اس وقت تک آیا ہی نہ تھا، اور نہ صحابۂ کرام اس سے واقف تھے، اس کا حکم تو خیبر کے تین سال کے بعد تبوک کے سال

---

[1] الکواکب صفحہ ۱۴۶

نازل ہوا ہے، تیسرے یہ کہ اس میں تذکرہ ہے کہ یہودیوں سے بیگار نہیں لیا جائے گا، یہ ایک مہمل بات ہے، اس لئے کہ کیا یہودی کیا غیر یہودی کسی سے بیگار لینے کا دستور نہیں تھا، اور آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم اور صحابۂ کرام اس ظلم اور زبردستی سے بالکل پاک تھے، وہ کسی سے بیگار نہیں لیتے تھے، یہ تو جابر بادشاہوں کی ایجاد ہے، جو اس وقت تک چل رہی ہے، چوتھی دلیل یہ ہے کہ اہل علم اہلِ مغازی وسیر، محدثین، وفقہاء ومفسرین میں سے کسی نے اس دستاویز کا ذکر نہیں کیا ہے، اور نہ سلف کے زمانہ میں کبھی وہ نکالی گئی، بہرحال یہ دستاویز بالکل بناوٹی اور بے اصل ہے، اور جعلی ہونے کی داخلی شہادتیں موجود ہیں، شیخ الاسلام کی اس تحقیق سے یہ طلسم ٹوٹ گیا، اور اس جعل کی قلعی کھل گئی۔[1]

ان کے تبحر علمی اور ذہانت کا اندازہ اس واقعہ سے ہوگا کہ ان کے ایک معاصر شیخ صالح تاج الدین بیان کرتے ہیں کہ میں ایک مرتبہ حاضر ہوا، ایک یہودی نے تقدیر کا ایک مسئلہ پوچھا تھا، اور اپنا سوال واعتراض آٹھ شعروں میں لکھ کر بھیجا تھا، شیخ نے تھوڑی دیر تامل کیا، پھر جواب لکھنا شروع کیا، ہم حاضرین مجلس یہ سمجھتے رہے کہ وہ اس کا نثر میں جواب دے رہے ہیں، جب وہ فارغ ہوئے تو کسی نے کاغذ اٹھا کر دیکھا اور ہماری حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی، جب ہم کو یہ معلوم ہوا کہ ٹھیک اسی قافیہ وردیف میں شیخ نے ۱۸۴ اشعار میں برجستہ اس کا جواب دیا تھا، اس جواب میں اتنے علوم آگئے تھے کہ اگر ان کی شرح وتفصیل کی جائے تو دو ضخیم جلدیں تیار ہو جائیں۔[2]

اس تبحر علمی اور جامعیت کو دیکھ کر ان کے معاصرین اور متأخرین نے ان کے متعلق نہایت بلند کلمات کہے ہیں، اور ان کو نادرۂ روزگار، سرآمد محققین، آخر المجتہدین اور "آیۃ من آیات اللہ" شمار کیا ہے، ابن سید الناس (م ۷۳۴ھ) کہتے ہیں "لم ترعین من رأہ مثلہ ولا رأت عینہ مثل نفسہ"[3] (ان کے معاصرین اور دیکھنے والوں نے ان کا جیسا نہیں دیکھا، اور نہ انھوں نے خود اپنی نظیر دیکھی)

---

[1] زاد المعاد ج ۱ ص ۳۳ فصل واما ھدیہ فی عقد الذمۃ واخذ الجزیۃ۔ الخ [2] الکواکب ص ۱۵۴ [3] ایضاً

حافظ شمس الدین الذہبی جیسے وسیع النظر مورخ اور نقاد مبصر نے یہاں تک فرمایا ہے :۔

لوحلفت بین الرکن والمقام لحلفت	اگر رکن و مقام ابراہیم کے درمیان مجھے قسم دے کر
انی مارأیت بعینی مثلہ ولا واللہ	پوچھا جائے تو میں حلفیہ کہوں گا کہ نہ میں نے علم میں
رای ھو مثل نفسہ فی العلم۔	ان جیسا دیکھا نہ انھوں نے اپنا جیسا دیکھا ۔

شجاعت اور فکری استقلال

ابن تیمیہ کی شجاعت و دلیری اور موت سے بے خوفی ان کے تمام معاصرین حتیٰ کہ ترک سرداروں اور فوجی افسروں کے لئے بھی حیرت انگیز تھی، مغلوں کے مقابلہ میں انھوں نے جس شجاعت و جوانمردی اور جس جرأت و بیباکی کا اظہار کیا اس پر خود قبجق کو جو اپنے زمانہ کا مشہور ترک فوجی افسر اور امیر تھا سخت حیرت تھی، حافظ سراج الدین کے الفاظ ہیں :۔

وکان اذا رکب الخیل یجول فی العدو	جب وہ گھوڑے پر سوار ہوتے تھے تو دشمن کی صفوں
کأعظم الشجعان ویقوم کاثبت	میں اس طرح گھومتے تھے جیسے بڑے سے بڑا بہادر
الفرسان وینکی العدو من کثرۃ	اور اس طرح کھڑے رہتے تھے جیسے بڑے سے بڑا
الفتك بھم ویخوض بھم خوض	ثابت قدم شہسوار، وہ دشمن کو اپنے حملوں سے چور
رجل لا یخاف الموت۔[1]	کر دیتے تھے اور اس بے تکلفی سے فوج میں گھس
	جاتے تھے جیسے ان کو موت کا کوئی ڈر نہیں ۔

لیکن یہاں ان کی اس شجاعت کا تذکرہ مقصود نہیں جو جنگ کے میدان اور سلاطین کے مقابلہ میں کلمۂ حق بلند کرنے میں ان سے ظہور میں آئی، اس کی کچھ تفصیل پچھلے اوراق میں گزر چکی ہے،

[1] الکواکب صـ۱۶۱

یہاں ان کی اس شجاعت کا اظہار مقصود ہے، جو قلمی معرکوں، علمی میدان اور تحقیق اور اظہارِ حق میں ان سے ظاہر ہوئی۔

اہلِ علم ناظرین کو اس کا اندازہ ہے کہ اکثر مسائل میں وہ منفرد نہیں، ان مسائل پر پہلے بھی بحثیں ہوئی ہیں، اور رسائل لکھے گئے ہیں، اور ان کے زمانہ میں بھی ان کے متعدد معاصران کے ہم خیال تھے، مگر جس جرأت و شجاعت اور جس صاف گوئی اور بلند آہنگی کے ساتھ انھوں نے اپنے خیالات و تحقیقات کا اعلان کیا، اور تقریر و تحریر میں بے محابا بیان کیا، وہ ان کا خاص حصہ تھا، توحید خالص کی وضاحت، استغاثہ و استعانت بغیر اللہ کی تردید، بدعات و منکرات زمانہ کی مخالفت، وحدۃ الوجود اور حلول و اتحاد کے خلاف قلمی و لسانی جہاد، مدعیانِ تصوف اور مبتدعین کی تلبیسات کی پردہ دری میں انھوں نے جس شجاعت و بے خوفی کا اظہار کیا، اور جن مسائل و تحقیقات کو وہ حق سمجھتے تھے، خواہ وہ کلامی مباحث سے تعلق ہوں یا فقہی مذاہب سے، ان کو جس طرح انھوں نے مدلل و پرزور طریقہ پر بیان کیا، اور ان کے ثبوت کے لئے جو مقدمات و دلائل قائم کئے اور آخر دن تک جس طرح اپنے ان خیالات و عقائد پر قائم رہے، اور ان کے راستہ میں تکلیفیں برداشت کیں، اس سے ان کی نہ صرف شجاعت و استقامت بلکہ عظمت و امامت کا ثبوت ملتا ہے، ذہبی ان کی اس علمی و دینی شجاعت و استقامت کا ذکر ان مداحانہ الفاظ میں کرتے ہیں:-

اطلق عبارات احجم عنها الاولون	انھوں نے اپنے مفہوم کے لئے ایسی تعبیرات استعمال
والآخرون وهابوا وجسر هو عليها	کیں جن کی متقدمین و متأخرین کو جرأت نہیں ہو سکی
حتى قام عليه خلق من علماء مصر	تھی یہاں تک کہ نتیجہ یہ نکلا کہ مصر و شام کے علماء کا
والشام قياما لامزيد عليه وبدعوه،	ایک انبوہ ان کا مخالف ہو گیا، اور اس نے ان کی
وناظروه وكابروه وهو ثابت	مخالفت میں کوئی کسر نہیں اٹھا رکھی، ان علماء نے

لايداهن ولايحالي بل يقول الحق المرّ	ان پر بدعت کا الزام لگایا، مناظرے کئے، مراسلت
الذي اداه اليه اجتهاده وحدّة ذهنه	کی، لیکن وہ ان تمام حالتوں میں اپنے خیال و عقیدے
وسعة دائرته في السنن والاقوال مع	پر قائم رہے، نہ انھوں نے مداہنت کی، نہ کسی کی رورعایت،
ما اشتهر عنه من الورع وكمال الفكر	بلکہ وہی سچی کڑوی بات کہتے رہے جو ان کے اپنے
وسرعة الادراك والخوف من الله	اجتہاد، غور و فکر، ذکاوت اور سنن و اقوال پر وسیع نظر
العظيم والتعظيم لحرمات الله فجرى	کی بنا پر سمجھ میں آئی تھی، تنہا یہی بات نہیں تھی، بلکہ
بينه وبينهم حملات حربية ووقعات	اس کے ساتھ ان کا زہد و ورع، بالغ نظری، سرعتِ فہم،
شامية ومصرية وكم من نوبة رموه عن	خوفِ خدا، حدود و احکامِ الٰہی کا ادب و تعظیم بھی شامل
قوس واحدة فينجيه الله۔[1]	تھی، ان کے اور ان کے معاصرین و مخالفین کے
	درمیان بڑے بڑے معرکے اور شام و مصر میں بڑے
	بڑے مقابلے ہوئے، کتنے بار اس کی نوبت آگئی کہ
	سب گروہ ایک طرف تھے، اور وہ تنہا ایک طرف،
	پھر اللہ تعالیٰ نے ان کو ان کے مخالفین کے ضرر سے بچالیا۔

ابن تیمیہؒ اپنے معاصرین میں اپنے علمی تبحر میں ضرور ممتاز تھے، جیسا کہ ان کے معاصرین نے بلند کلمات میں اس کا اعتراف کیا ہے لیکن ان کا اصلی امتیاز جس نے ان کو اپنے نامور اور فاضل معاصرین میں یگانۂ روزگار اور تاریخ میں زندۂ جاوید اور یادگار بنا دیا، وہ تنہا ان کا علمی تبحر نہ تھا، بلکہ ان کا فکری استقلال، ذوق تحقیق اور مجتہدانہ طرز تھا، انھوں نے ان ہی علوم و فنون کا اور انہی کتابوں کا مطالعہ کیا، جن کا ان کے اکثر معاصرین نے مطالعہ کیا تھا، مگر انھوں نے انہی علوم اور کتابوں کے اندر اپنی

---

[1] الرد الوافر ص ۷۔

راہ پیدا کر لی، اور جلد خصوصی مقام حاصل کر لیا، نحو سب نے پڑھی تھی، اور سب سیبویہ کو واجب التقلید امام اس کے قول کو حرف آخر مانتے تھے، لیکن ابن تیمیہ نے "الکتاب" کا بھی (جس کو علمائے نحو، نحو کا صحیفہ اور ناسخ کتب مانتے ہیں) ناقدانہ مطالعہ کیا تھا، ابوحیان نحوی نے جب سیبویہ کا حوالہ دیا، تو انھوں نے صاف کہا کہ کیا سیبویہ کوئی نبی تھا، جس پر نحو اتری ہے؟ اس نے "الکتاب" میں ۸۰ مقامات پر غلطی کی ہے، یونانی منطق و فلسفہ کے مطالعہ سے ان کے زمانے کے اکثر علماء و فقہاء محتاط تھے، اور جنھوں نے مطالعہ کیا تھا، وہ اس سے کم و بیش متأثر تھے، حد یہ ہے کہ فلسفہ کے سب سے بڑے ناقد اور مسلمانوں میں اس کے نبض شناس حجۃ الاسلام غزالی اپنی تصنیفات حتیٰ کہ احیاء العلوم کو یونانی الٰہیات اور فلسفۂ اخلاق کے اثرات سے کلی طور پر محفوظ نہ رکھ سکے، اور ان کی بہت سی تصنیفات میں مؤرخین فلسفہ کو یونانی فلسفہ کی جھلک اور پرچھائیاں نظر آئی ہیں[1]، لیکن ابن تیمیہ نے یونانی منطق اور فلسفہ کے خلاف علم بغاوت بلند کیا، اور اس سے وہ کہیں سمجھوتہ کرتے نظر نہیں آتے، انھوں نے کتاب "الرد علی المنطقیین" میں یونانی منطق و فلسفہ کے مسلم الثبوت مسائل و مقدمات پر ناقدانہ بحث کی ہے، اور ان پر عمل جراحی کر کے اس کے پورے نظام کو مجروح اور اپنے اعتراضات کے تیروں سے چھلنی کر کے رکھ دیا ہے، فقہ و حدیث میں بحث و نظر کے عرصہ سے کچھ محدود دائرے بن گئے تھے، جن سے باہر قدم نکالنے کی کوئی جرأت نہیں کر سکتا تھا، اور عرصۂ دراز سے اس ذخیرہ میں کوئی اضافہ نہیں ہوا تھا، ابن تیمیہ نے بہت سے فقہی مسائل پر جو طے شدہ سمجھے جا رہے تھے، از سر نو غور کیا، اور اپنی تحقیقات کے نتائج پوری شجاعت اور علمی سنجیدگی کے ساتھ پیش کیے جس کا اثر یہ ہوا کہ دماغوں اور علمی حلقوں کی ساکن سطح میں پھر جنبش پیدا ہوئی، اور غور و فکر کا دروازہ کھلا، آخر میں انھوں نے استقلالاً محض کتاب و سنت اور آثار صحابہ کی بنا پر فتوے دینے شروع کیے، حافظ ذہبی ان کی زندگی میں لکھتے ہیں:

[1] تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو "فلسفۃ الاخلاق فی الاسلام وصلاتہا بالفلسفۃ الاغریقیۃ" اور "تاریخ الاخلاق" از ڈاکٹر محمد یوسف موسیٰ۔

وله الآن عدة سنين لا يفتي بمذهب معين بل بما قام الدليل عليه، ولقد نصر السنة المحضة والطريقة السلفية ببراهين ومقدمات وامور لم يسبق اليها۔[1]	ادھر وہ کئی سال سے (مذاہب اربعہ میں سے) کسی مذہبِ معین کے مطابق فتوے نہیں دیتے، بلکہ جس مذہب کی دلیل پاتے ہیں، اس کے مطابق فتوی دیتے ہیں، انھوں نے سنتِ خالصہ اور طریقہ سلف کی نصرت میں ایسے دلائل، مقدمات اور وجوہ قائم کئے جن میں وہ منفرد ہیں، کسی نے اس سے پہلے ایسے دلائل و مقدمات قائم نہیں کئے۔

ان "اجتہادات" میں وہ کبھی کبھی منفرد بھی نظر آتے ہیں، ان سے غلطیاں بھی ہوئی ہیں، جیسے کہ ہر غیر معصوم سے ہوتی ہیں، ان کے دلائل ہر مسئلہ میں ضروری نہیں کہ قوی اور واجب التسلیم ہی ہوں، لیکن اس میں شبہ نہیں کہ وہ اپنے مقصد میں مخلص تھے، وہ نفس پرستی، خواہشات کی پیروی، سہولت پسندی یا کسی مصلحت کی خاطر کسی امام کے مسلک، کسی مذہبِ فقہی یا جمہور کے قول کو ترک اور کسی مسئلہ کا استنباط نہیں کرتے تھے، بلکہ وہ طالبِ حق، دلیل کے پابند اور کتاب و سنت کے متبع تھے، اس بارہ میں حافظ ابن حجر عسقلانی شافعی صاحبِ "فتح الباری" کا یہ ارشاد قولِ فیصل کا حکم رکھتا ہے، وہ فرماتے ہیں:۔

انه شيخ مشائخ الاسلام في عصره بلا ريب والمسائل التي أنكرت عليه ما كان يقولها بالتشهي ولا يصر على القول بها الا بعد قيام الدليل عليه غالبًا فالذي اصاب فيه وهو الاكثر	وہ بلا شبہ اپنے زمانہ کے شیخ المشائخ تھے جن مسائل میں ان پر اعتراض ہوا ہے، وہ بھی انھوں نے نفسانیت کی بنا پر نہیں کئے، عموماً جب ان کو اس کی دلیل پر اطمینان ہو جاتا تھا، جب وہ ان پر اصرار کرتے تھے، جن مسائل میں وہ برسرِ حق ہیں اور وہی تعداد

[1] الرد الوافر ص ۱۷

سيستفاد منه ويترحم عليه بسببه والذي اخطأ فيه لا يقلد فيه بل هو معذور لأن ائمة عصره شهدوا له بأن ادوات الاجتهاد فيه حتى كان أشد المتعصبين عليه والعالمين في ايصال الشر اليه وهو الشيخ جمال الدين الزملكاني شهد له بذلك۔[1]

میں زیادہ بھی ہیں، اس میں ان سے استفادہ کرنا چاہئے، اور ان کی بنا پر ان کے حق میں دعائے خیر کرنی چاہئے جن مسائل میں ان سے غلطی ہوئی، ان میں ان کی تقلید نہیں کرنی چاہئے، وہ ان میں معذور ہیں، اس لئے کہ ان کے زمانہ کے اکابر علما نے اس کا اعتراف کیا ہے کہ ان میں شرائط اجتہاد موجود تھے یہاں تک کہ ان کے ایک بہت بڑے حریف جو ان کے درپئے آزار بھی رہتے تھے یعنی شیخ جمال الدین الزملکانی وہ بھی اس کے معترف ہیں۔

اخلاص وانہماک

ابن تیمیہ کی زندگی کا ایک نمایاں پہلو یہ تھا کہ وہ علم دین کی خدمت کے لئے ہمہ تن وقف تھے، انھوں نے زندگی بھر کسی اور چیز سے سروکار نہیں رکھا، ان کے اکثر معاصرین، رفقاء اور ہم عمر جن میں بڑے بڑے مخلص، بڑے بڑے فاضل تھے، حکومت کے مختلف عہدوں پر سرفراز رہے، یا انھوں نے کوئی دینی منصب یا انتظامی ذمہ داری قبول کی، یا عطیۂ سلطانی یا خلعتِ شاہانہ یا انعام واکرام سے سرفراز ہوئے، یا حکومت کے وظیفہ خوار رہے، لیکن ابن تیمیہ کا دامن ساری عمر ان آلائشوں سے پاک رہا، انھوں نے علم ودین کے اشتغال، افتاء، درس وتدریس، وعظ وارشاد اور تصنیف وتالیف اور تحقیق وتدقیق کے سوا کسی مشغلہ سے تعلق ہی نہیں رکھا، ان کے ایک معاصر ان کی اس علمی یکسوئی،

---

[1] الرد الوافر ص۵۶

دینی انہماک اور دنیا سے بے لوثی و بے تعلقی کی شہادت ان الفاظ میں دیتے ہیں:۔

ماخالط الناس فی بیع ولاشراء ولا معاملة ولاتجارة ولامشارکة ولامزارعة ولاعمارة ولاکان ناظراً اومباشراً المال وقف، ولم یقبل جرایة ولاصلة لنفسه من سلطان ولاامیر ولاتاجر ولاکان ممّن خوّل دیناراً ولادرهماً ولامتاعاً ولاطعاماً وانّما کانت بضاعته مدة حیاته ومیراثه بعد وفاته رضی الله عنه العلم اقتداً بسید المرسلین، فانّه قال ان العلماء ورثة الانبیاء، ان الانبیاء لم یورثوا دیناراً ولادرهماً ولکن ورثوا العلم فمن اَخَذ به اخذ بحظّ وافر[1]

انھوں نے لوگوں کے ساتھ بیع وشراء، معاملہ، تجارت، شرکت، زراعت، عمارت وغیرہ کسی قسم کا تعلق نہیں رکھا، نہ کبھی کسی مال وقف کے نگراں یا متولی رہے نہ کبھی انھوں نے حکومت کا وظیفہ یا کسی سلطان، حاکم یا تاجر کی پیش کش قبول کی نہ کبھی انھوں نے دینار و درہم یا سامان یا خوراک جمع کی، ان کا سرمایہ اور ان کی پونجی جب تک وہ زندہ رہے اور جب انتقال کیا تو ان کی میراث یہی علم تھا اور یہ سنت نبوی ہے، کیونکہ آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے، علماء وارثین انبیاء ہیں انبیاء نے دینار و درہم کبھی اپنی میراث میں نہیں چھوڑے انھوں نے علم کی میراث چھوڑی، جس کو یہ میراث ملی وہ بڑا خوش نصیب ہے۔

صاحب "الکواکب الدریة" معتبر لوگوں سے نقل کرتے ہوئے لکھتے ہیں:۔

انه کان قد قطع جُلّ وقته وزمانه فی العبادة حتی انه لم یجعل لنفسه شاغلة تشغله عن الله ومایراد له

انھوں نے اپنا سارا وقت اور پورا زمانہ عبادت میں مصروف کر رکھا تھا، یہاں تک کہ انھوں نے اپنی ذات کے لئے کوئی دوسرا شغل ہی اختیار

[1] الکواکب الدریہ ص ١٥٦، ١٥٧

لا من اهل ولا من مال[1] | نہیں کیا، جو ان کو اللہ تعالیٰ سے مشغول کرے اور جس میں وہ منہمک ہوں، نہ گھر والے نہ مال۔

ان کے مشاغل و افکار علم و دین کے انہماک اور مصروف زندگی نے (جس کا خاصہ حصہ جیل و نظربندی میں گذرا) ان کو اس کی بھی مہلت نہ دی کہ وہ نکاح کریں، انھوں نے ساری عمر تجرد اور طالب علمانہ و مجاہدانہ زندگی میں گزار دی، صاحبِ "الکواکب الدریۃ" ان کے روزمرہ کے معمولات اور نظام الاوقات اس طرح بیان کرتے ہیں:۔

ولا یزال تارۃ فی افتاء الناس وتارۃ فی قضاء حوائجھم حتی یصلی الظھر مع الجماعۃ ثم کذالک بقیۃ یومہ ثم یصلی المغرب ویقرأ علیہ الدرس ثم یصلی العشاء ثم یقبل علی العلوم الی ان یذھب طویل من اللیل وھو فی خلال ذلک کلہ اللیل والنھار لایزال یذکر اللہ تعالیٰ ویوحدہ ویستغفرہ۔[2]

وہ کبھی فتوی دینے میں مشغول ہوتے کبھی لوگوں کی ضرورتیں پوری کرنے میں یہاں تک کہ ظہر کی نماز جماعت کے ساتھ پڑھتے، پھر دن کا باقی حصہ اسی طرح گزرتا، پھر مغرب پڑھتے، اور اسباق شروع ہو جاتے، پھر عشاء پڑھتے پھر درس و مطالعہ شروع ہو جاتا یہاں تک کہ بڑی رات گزر جاتی، وہ اس اثناء میں دن میں بھی اور رات میں بھی برابر اللہ تعالیٰ کے ذکر اور کلمۂ توحید و استغفار میں مشغول رہتے۔

علم اگر کسی مدرس یا مفتی کے لئے ایک ضرورت، وقتی مشغلہ اور خدمت کی حیثیت رکھتا ہو، تو ابن تیمیہ کی وہ غذا اور اوڑھنا بچھونا بن گیا تھا، اور ان کی طبیعتِ ثانیہ ہو گیا تھا، شیخ سراج الدین ابوحفص البزار فرماتے ہیں:۔

وکان العلم کأنہ قد اختلط بلحمہ ودمہ | ایسا معلوم ہوتا تھا کہ علم ان کے رگ و ریشہ میں سرایت

---

[1] الکواکب الدریۃ ص۱۵۲ [2] ایضاً۔

وسائرہ فانہ لم یکن مستعاراً بل کان لہ شعاراً ودثاراً۔[1] | گر گیا ہے اور گوشت پوست بن گیا ہے، علم ان کے لئے کوئی عارضی اور وقتی مانگے کی چیز نہیں تھی ان کا اوڑھنا بچھونا تھا۔

ان کے اخلاص وللہیت کی ایک بڑی دلیل یہ تھی کہ انھوں نے اپنے حریفوں اور بدخواہوں کو ہر موقع پر معاف کیا اور صاف اعلان کر دیا کہ "احللت کل مسلم عن ایذائہ لی" السلطان الناصر کی واپسی کے بعد اس کے اصرار کے باوجود انھوں نے اپنے سب سے بڑے حریف قاضی ابن مخلوف کو جس طرح معاف کیا، اور سلطان سے ان کی اور تمام شرکاء وعلمائے سلطنت کی جس طرح تعریف وسفارش کی، اس سے ان کی بے نفسی، عالی ظرفی اور اخلاص کا اندازہ ہوتا ہے، اور ثابت ہوتا ہے کہ ان کا سارا اختلاف علمی ودینی بنیاد پر تھا، اس میں نفسانیت اور ذاتیات کا شائبہ بھی نہ تھا، اس اخلاص وانہماک کا نتیجہ یہ تھا کہ انھوں نے ۶۷ سال کی مصروف اور پُر از حوادث وواقعات اور تلاطم خیز زندگی میں تصنیفات وتحقیقات اور علمی آثار کا ایک ایسا ذخیرہ چھوڑا جو اہلِ علم کی ایک پوری جماعت کے لئے سرمایۂ فخر بن سکتا ہے، اسی اخلاص وانہماک کا نتیجہ تھا کہ انھوں نے زمانہ پر ایسے دیرپا اثرات چھوڑے کہ وہ بجا طور پر ایک نئے دور کے بانی اور ایک عہد آفریں شخصیت کے مالک کہے جا سکتے ہیں۔

ان کی تصنیفی خصوصیات

ابن تیمیہ کی تصنیفات کچھ منفرد خصوصیات رکھتی ہیں، جو اس عصر کی عام تصنیفات سے ان کو نمایاں طور پر ممتاز کرتی ہیں، اور جس کا نتیجہ یہ ہے کہ کئی صدیاں گذر جانے کے بعد اور بڑے اہم علمی و

---

[1] الکواکب الدریہ ص ۱۵۶

ذہنی انقلابات کے باوجود وہ ابھی تک نئی نسل کے دل و دماغ کو متأثر کرتی ہیں، اور اسی کا نتیجہ ہے کہ اس عقلیّت پسند اور جدّت طلب دور میں وہ از سرِ نو مقبول ہو رہی ہیں، ان خصوصیات میں چار چیزیں خاص اہمیت رکھتی ہیں۔

۱۔ ابن تیمیہ کی تقریباً ہر تصنیف کے ناظر پر یہ اثر پڑتا ہے کہ اس کتاب کا مصنف مقاصدِ شریعت اور روحِ دین کا رازداں ہے، اس کے ہاتھ میں دین کے سرے (اطراف و اصول) آگئے ہیں، اس لئے ہر مبحث میں اس کی بحث اصولی و مرکزی، تشفی بخش، اطمینان آفریں اور موجبِ یقین ہوتی ہے، وہ جزئیات کے بجائے اصول پر زور دیتے ہیں، اور بحث کا اس طرح آغاز کرتے ہیں کہ پڑھنے والے کو یہ محسوس ہوتا ہے کہ یہی دین کا مزاج اور اس کی روح ہے، اور بداہتہً و اضطراراً شریعت محمدی کا تقاضا ہے، اپنے معاصرین اور دوسرے مصنفین کے مقابلہ میں ان کے تفوق کا راز یہی مقاصدِ شریعت اور روحِ دین کی واقفیت اور ان کی کامیاب ترجمانی ہے، جو ان کی ہر چھوٹی بڑی تصنیف میں نمایاں طور پر نظر آتی ہے، خصوصاً جب وہ عقائد اور اہم کلامی و فقہی مسائل پر بحث کرتے ہیں۔

۲۔ ان کی دوسری نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ ان کی کتابوں میں زندگی نظر آتی ہے، ایسا محسوس ہوتا ہے کہ وہ کتابیں کسی علمی گوشہ یا الگ تھلگ جزیرہ میں نہیں لکھی گئی ہیں بلکہ عین زندگی کے میدان اور عوام کے بیچ میں لکھی گئی ہیں، ان کی کتابوں سے آسانی کے ساتھ ان کے زمانہ کا تعین کیا جاسکتا ہے، اور اس سوسائٹی کے ذہن و اخلاق کا اندازہ کیا جاسکتا ہے جس سے ان کا مصنف متعلق تھا۔[1]
پھر ان کتابوں سے ان کے جذبات، جوش، پسندیدگی و ناپسندیدگی کا بھی اندازہ لگایا جاسکتا ہے، معلوم ہوتا ہے کہ ان کا مصنف دل و دماغ اور انسانی احساسات و جذبات رکھنے والا

[1] نمونہ کے طور پر ملاحظہ ہو "اقتضاء الصراط المستقیم مخالفۃ اصحاب الجحیم"۔

انسان تھا، محض آلۂ کتابت یا عقل محض نہ تھا۔

ان کے طریقۂ تفسیر کی بھی بہت بڑی خصوصیت یہ ہے کہ اس کا زندگی سے ربط ہے، ان کا مصنف آیات الٰہی کو اپنی گردوپیش کی زندگی اور اپنے معاصر انسانوں پر منطبق کرتا ہے، اور ان آیات کے نقطۂ نظر سے زندگی کا جائزہ لیتا ہے، اور اپنے ہم عصروں اور امت کے مختلف طبقوں کا احتساب کرتا ہے، وہ بتلاتا ہے کہ ان آیات و حقائق سے زندگی میں کہاں انحراف ہو رہا ہے، اور اس کے کیا نتائج برآمد ہو رہے ہیں[1]، زندگی کے اس وصف نے ان کی تصنیفات کو ایک طویل زندگی، تاثیر اور دل آویزی بخش دی ہے، جو دوسری تصنیفات میں کمیاب اور اکثر نایاب ہے۔

۳۔ وہ جس موضوع پر قلم اٹھاتے ہیں، اس پر اتنا مواد اور مسالہ جمع کر دیتے ہیں، جو بیسیوں کتابوں اور سیکڑوں صفحات میں منتشر ہوتا ہے، ان کا یہ طرز تصنیف (جو انسائیکلوپیڈیائی طرز کہلایا جا سکتا ہے) ان کی تمام تصنیفات کا نمایاں وصف ہے، خواہ وہ نقلی مباحث پر ہوں یا عقلی مباحث پر، اس طرح ان کی کتابوں میں یکجا اتنا مواد مل جاتا ہے کہ ان کی ایک کتاب اکثر ایک کتب خانہ کی قائم مقام بن جاتی ہے، اور طالب علم کو بہت سی کتابوں سے مستغنی کر دیتی ہے[2]، اکثر اس مواد اور نقول کے پیش کرنے میں بحث کا سرا ہاتھ سے جاتا رہتا ہے، اور مطالعہ کرنے والا اقوال و نقول کی کثرت میں گم ہو جاتا ہے، اور اس کو بحث کا سمیٹنا مشکل ہو جاتا ہے، اس دشواری کے باوجود ان کی کتابوں کے اس افادی پہلو کی تحقیر نہیں کی جا سکتی کہ وہ متقدمین و معاصرین کے اقوال و آراء کا ایک مخزن اور اپنے موضوع پر ایک چھوٹا سا "دائرۃ المعارف" ہیں، یہ ان کا بڑا علمی احسان ہے کہ انھوں نے بہت سا قدیم مواد و مسالہ محفوظ کر دیا اور بہت سے آراء و افکار کو اپنی کتابوں میں نقل کر کے ضائع ہونے سے بچا لیا۔

---

[1] ملاحظہ ہو تفسیر سورۃ النور، سورۃ الاخلاص وغیرہ [2] مثال کے طور پر ملاحظہ ہو منہاج السنۃ اور الجواب الصحیح لمن بدل دین المسیح۔

۴. ان کی کتابیں عام کلامی وفقہی تصنیفات سے اس لحاظ سے بھی ممتاز ہیں کہ ان میں اس موضوع کی کتابوں کی طرح خشکی، پیچیدگی، اور "متون" کی شان نہیں ہے، جن میں بالعموم ہر لفظ بندھا ٹکا اور قانونی ہوتا ہے، ابن تیمیہ کی تصنیفات میں سلاست، زور، عربیت، اور کہیں کہیں (بلا قصد) بلاغت وادبیت اور خطابت کی شان پیدا ہو جاتی ہے، جو ان کی کتابوں کو (جو اکثر ضخیم دفتر ہیں) دلچسپ، جاندار اور پرزور بنا دیتی ہے، خصوصاً جب وہ سلف کے طریق کی ترجیح اور ان کی دینی و علمی و عملی و فکری فضیلت وتفوق پر بحث کرتے ہیں، تو ان کے قلم میں بڑا زور اور ان کی بحث میں "رجز" کی شان پیدا ہو جاتی ہے، ان کے معاصرین اور سوانح نگاروں نے ان کے حالات و کمالات کے سلسلہ میں خصوصیت کے ساتھ ان کی بلاغت وخطابت کا تذکرہ کیا ہے، حافظ ابو حفص کہتے ہیں:۔

یجری کما یجری التیار ویفیض کما یفیض	ان کے کلام میں سیلاب کی سی روانی اور سمندر کی سی
البحر ویصیر منذ یتکلم الی ان یفرغ کالغائب	طغیانی ہوتی ہے گفتگو کے آغاز سے لے کر اختتام تک
عن الحاضرین، مغمضاً عینیہ ویقع	وہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہاں نہیں ہیں، وہ آنکھیں
علیہ اذ ذاک من المھابۃ ما یرعد القلوب	بند کر لیتے ہیں، اور تقریر فرماتے ہیں، اس وقت ان پر
ویحیّر الابصار والعقول[1]۔	ایسا وقار وجلال ساطاری ہوتا ہے کہ مجلس پر ایک
	رعب سا چھایا ہوا ہوتا ہے۔

ان کی تصنیفات کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ الفاظ کی روانی اور علم کی طغیانی ان کی مجلسوں سے مخصوص نہیں، ان کا قلم بھی ان کی زبان کا شریک ہے، اقشہری نے اپنے سفرنامہ میں اپنا یہی تأثر ظاہر کیا ہے، وہ لکھتا ہے "وقلمہ ولسانہ متقاربان" (ان کا قلم اور ان کی زبان ایک دوسرے کے ہم پلہ ہیں۔)

ان محاسن کے ساتھ ساتھ ایک مؤرخ ونقاد کے لئے اس کا اظہار بھی ضروری ہے کہ ان کی کتابوں

---

[1] الکواکب ص ۱۵۵

اور مباحث میں انتشار، ایک مضمون سے دوسرے مضمون کی طرف انتقال، اور ادنیٰ مناسبت سے ایک دوسری بحث کا آغاز اور طوالت و اطناب بہت پایا جاتا ہے، جو ان کی کتابوں کا مطالعہ کرنے والے کے لئے (خصوصاً ان کے طرزِ تصنیف اور اسلوبِ کلام کا عادی نہ ہو) سخت ابتلا و امتحان کا سبب بن جاتا ہے اس کا بڑا سبب تو ان کی حدت ذہن، فرطِ ذکاوت، وفورِ علم اور جوش طبیعت ہے، ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ان کا ذہن اور قلم بحث کرتے وقت ایک نقطہ پر جمنے نہیں پاتا مضامین کا ورود اور انتقال ذہن اس شدت و سرعت کے ساتھ ہوتا ہے کہ وہ محدود نہیں رہ سکتے یہی ان کے درس کی خصوصیت تھی، ان کے شاگرد ابو حفص البزار کہتے ہیں:۔

کان ابن تیمیۃ اذا شرع فی الدرس یفتح	ابن تیمیہ جب درس کا آغاز کرتے تو اللہ تعالےٰ
اللہ علیہ اسرار العلوم وغوامض ولطائف	ان پر علم کے اسرار، باریک باتیں، لطیف نکات،
ودقائق وفنون ونقول واستدلالات	دقیق مسائل، فنون، علماء کے اقوال و نقول اور
بآیات واحادیث واستشهادا باشعار	کلام عرب کے شواہد و امثال کا دہانہ کھول دیتا
العرب وهو مع ذالك يجرى كما يجرى	اور ایسا معلوم ہونے لگتا کہ ایک سیلاب اور ایک
التيار ويفيض كما يفيض البحر[1]۔	دریا امنڈ رہا ہے۔

اسی انتقال ذہنی، وفور مضامین و دلائل اور ذہنی تموّج کی وجہ سے ان کے مناظرین کو مجلسِ مناظرہ میں بڑی دقت پیش آتی تھی، وہ اپنے بحث و مناظرہ میں اتنے مسائل چھیڑ دیتے اور اتنے علوم داخل کر لیتے کہ ان کے حریف کو ایک مرکوز و منضبط بحث کرنے میں بڑی دشواری پیش آتی، اسی وجہ سے شام اور مصر میں علماء و فقہاء عمومی مجلسوں میں ان سے بحث و مناظرہ کرنے سے احتراز کرتے، اور اکثر معذرت کر دیتے، اس دشواری کو ان کے ایک فاضل ہم عصر اور مناظر شیخ صفی الدین الہندی

[1] الکواکب ص ۱۵۵

نے ان الفاظ میں بیان کیا:۔

ما اراك يا ابن تيميه الا كالعصفور حيث	ابن تیمیہ تم ایک چھوٹی چڑیا یا (گنجشک) کی طرح ہو
اردت ان اقبضه من مكان فرّ إلى	جب میں اس کو ایک جگہ سے پکڑنا چاہتا ہوں وہ
مكان آخر[1]	اڑ کر دوسری جگہ جا پہنچتی ہے۔

ان کی یہ مزاجی خصوصیت (جو کسی کمی کا نتیجہ نہیں بلکہ ایک زیادتی اور کمال، وفور ذکاوت و علم کا نتیجہ ہے) ان کی تصنیفات میں بھی پائی جاتی ہے، طالبِ صادق اگر صبر و ہمت سے کام لے اور اس دشواری پر عبور حاصل کرے تو اس بحرِ موّاج سے بڑے قیمتی موتی نکال سکتا ہے۔

---

[1] نزہۃ الخواطر ج ۲ ص ۱۴۰۔ ترجمہ محمد بن عبدالرحیم الارموی (الشیخ صفی الدین الہندی)۔

مخالفت کے اسباب
اور
ان کے ناقدین ومدافعین

ان غیر معمولی علمی وذہنی کمالات اور مسلّم اخلاص وتدیّن کے ساتھ ایک سلیم الطبع انسان کے دل میں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ ان کے معاصرین اور بعض متأخرین نے کیوں اس شدت سے ان کی مخالفت کی[1]، اور ان کی ذات ان کے زمانہ سے لے کر اس وقت تک کیوں موضوعِ بحث بنی ہوئی ہے؟ ایسے جامع کمالات انسان کی عظمت وقبولیت پر تو سب کا اتفاق ہونا چاہئے! یہ سوال حق بجانب ہے، اور اس کا مستحق ہے کہ ان کی سیرت اور ان کی معاصر تاریخ کی روشنی میں سنجیدگی سے اس کا جواب دیا جائے۔

۱۔ اوّلاً تو یہی ان کی عظمت کی دلیل ہے کہ ان کی ذات کے بارے میں شروع سے دو فریق بنے ہوئے ہیں، اور ان میں حریفانہ کشمکش جاری ہے، تاریخ میں جو شخصیتیں بہت ممتاز، غیر معمولی اور خارق عادت کمالات کی حامل ہیں، ان کے بارے میں ہمیشہ سے یہی طرزِ عمل رہا ہے کہ ایک گروہ ان کے معتقدین کا بن گیا ہے، جو ان کی تعریف میں غلو اور مبالغہ سے کام لیتا ہے، دوسرا گروہ ناقدین و

---

[1] یاد رہے کہ مخالفت اور اختلاف میں فرق ہے، اختلاف اہلِ علم اور اہلِ تحقیق کا حق ہے، اور یہ حق کسی دور میں علماء سے سلب نہیں کیا جاسکتا، یہاں اختلاف سے نہیں، بلکہ مخالفت تضلیل وتکفیر کے اسباب سے بحث ہے۔

مخالفین کا ہے، جو ان کی تنقید بلکہ تنقیص میں انتہا پسند اور غالی نظر آتا ہے، عظیم الشان اور غیر معمولی شخصیتوں کے بارے میں تاریخ کا یہ ایک ایسا مسلسل اور متواتر تجربہ ہے کہ بعض فلاسفہ تاریخ اور نفسیات "عظمت و عبقریت" کے مبصرین نے اس کو قاعدہ کلیہ اور شرطِ عظمت و عبقریت قرار دیا ہے۔

۲۔ ابن تیمیہ کی ذات میں ان کے معاصرین کے لئے سب سے بڑا ابتلا اور امتحان یہ تھا کہ وہ اس زمانہ اور اس نسل کی عام ذہنی و علمی سطح سے بلند تھے، اپنے زمانہ کی سطح سے بلند ہونا ایک نعمتِ خداداد اور ایک قابلِ رشک کمال ہے، مگر اس کمال کی صاحبِ کمال کو بہت بڑی قیمت ادا کرنی پڑتی ہے، وہ صاحبِ کمال اپنے معاصرین کی طرف سے ایک مسلسل ابتلاء اور آزمائش میں رہتا ہے، اور وہ معاصرین اس صاحبِ کمال کی طرف سے زندگی بھر ایک مصیبت اور زحمت میں مبتلا رہتے ہیں، وہ اس کی تازگیٔ فکر، بلندیٔ نظر، قوتِ اجتہاد کا ساتھ نہیں دے سکتے، اور اس کے آفاقِ علم و فکر تک ان کی رسائی نہیں ہوتی، اور وہ ان کے معیّن و محدود اصطلاحات اور مدرسی حدود میں مقید نہیں رہ سکتا، وہ علم و نظر کی آزاد فضائے اور قرآن و حدیث کے بلند اور وسیع آفاق میں آزادانہ پرواز کرتا ہے، ان کا مبلغ علم متقدمین اور اہلِ درس کی کتابوں کا سمجھ لینا ہوتا ہے، وہ واضع علوم اور بہت سے فنون کا مجتہد و مجدد ہوتا ہے، غرض مدارک اور استعدادوں کا یہ تفاوت اس کے اور اس کے مخلص معاصرین کے درمیان ایسی کشمکش پیدا کر دیتا ہے کہ یہ گتھی کبھی سلجھتی نہیں، اور وہ کبھی اپنے معاصرین کو مطمئن نہیں کر سکتا، ہر زمانہ کے صاحبِ کمال اور مجتہد الفن علماء نے اس کی شکایت کی ہے کہ ان کی تحقیقات اور علوم و مضامین ان کے زمانہ کی علمی و نصابی سطح سے بلند اور ان اہلِ علم کی دسترس سے باہر ہیں، جن کی پروازِ فکر متداول کتابوں سے آگے نہیں، اور یہی بہت سے اہلِ علم کی مخالفت کا

سبب اور محرک ہے۔[۱]

۳۔ مخالفین کا ایک گروہ اس بنا پر مخالف تھا کہ وہ اپنی غیر معمولی ذہانت و علم، اپنی شخصیت کی دلآویزی اور بلندی کی وجہ سے عوام و خواص میں مقبول اور حکومت کے اشخاص پر حاوی ہوتے جاتے ہیں، اور ان کے علم و تقریر کے سامنے کسی کا چراغ نہیں جلتا، وہ جہاں رہتے ہیں، سب پر چھا جاتے ہیں، درس دیتے ہیں تو درس کی دوسری محفلیں بے رونق ہو جاتی ہیں، تقریر کرتے ہیں تو علم کا دریا امنڈتا نظر آتا ہے، ذہبی نے اس معنی خیز فقرہ میں دلوں کی اس چھپی ہوئی بات کو آشکارا کر دیا ہے۔

غیر انہ یغترف من بحر وغیرہ من	ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ تو سمندر سے پانی لیتے
الائمۃ یغترفون من السواقی۔[۲]	ہیں، اور دوسرے اکابر علماء چھوٹی چھوٹی نہروں اور نالیوں سے پانی لیتے ہیں۔

ہر زمانہ کے علماء بہر حال بشر تھے، اور انسانوں ہی کا دل و دماغ اور انسانی احساسات رکھتے تھے، اس لئے کوئی تعجب کی بات نہیں کہ بہت سے لوگوں کے لئے ان کی مخالفت کا موجب یہی احساس کہتری اور انسانی طبیعت کی قدیم کمزوری تھی، جس سے بچنا بڑا مشکل کام ہے، امام ابو حنیفہؒ سے شدید اختلاف و عناد رکھنے کے اسباب کا ذکر کرتے ہوئے مؤرخین نے یہ شعر لکھا ہے جو ہر زمانہ پر صادق ہے۔

حسدوا الفتی اذ لم ینالوا سعیہ فالناس اعداءٌ لہٗ وخصوم

---

[۱] افضل المتاخرین حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ نے اپنی تصنیفات میں جا بجا اس طرف اشارے کئے ہیں، ایک جگہ "ازالۃ الخفاء" میں فرماتے ہیں "چوں ایں مقدمہ بایں آب و تاب در کتب کلامیہ نخواندہ تحمل کہ وحشتے بخاطر تو راہ یابد" دوسری جگہ فرماتے ہیں "لیکن فہم ایں معنی بغایت دقیق است جمعے کہ سرمایۂ علم ایشاں شرح وقایہ و ہدایہ باشد کجا ادراک ایں سر دقیق توانند کرد" ج ۲ ص ۸۴ [۲] الکواکب الدریہ ص ۱۴۵

۴۔ بہت سے معاصرین کی مخالفت کا ایک قدرتی سبب شیخ الاسلام کی ایک مزاجی خصوصیت بھی تھی، جو بہت سے اِن اہلِ کمال میں ہوتی ہے جو غیر معمولی طور پر ذہین، وسیع النظر اور کثیر المعلومات ہوتے ہیں، یعنی طبیعت کی تیزی اور ذکاوتِ حس، جو بعض اوقات ان کو اپنے بعض حریفوں کی سخت تنقید اور ان کے جہل اور غباوت اور قلتِ علم کے اظہار پر آمادہ کر دیتی ہے، اور شدتِ تأثر میں ان کی زبان سے بعض ایسے الفاظ نکل جاتے ہیں، جس سے ان کے اہلِ علم معاصرین اور ان کے معتقدین و تلامذہ کی دل شکنی اور تحقیر ہوتی ہے، اور ان کے دل میں مستقل نفرت و عناد کے بیج پڑ جاتے ہیں، جو علمی و فقہی اصطلاحات، کفر و ضلال کے فتوے اور مسلسل مخالفتوں اور ریشہ دوانیوں کی شکل میں ظاہر ہوتے ہیں، شیخ الاسلام کے معاصرین اور سوانح نگاروں نے ان کے فضائل و مناقب اور حالات بیان کرنے میں اس "مزاجی کیفیت" کو جو بہت حد تک ان کے حالاتِ زندگی اور کمالاتِ علمی و ذہنی کا نتیجہ تھی، نظر انداز نہیں کیا، علامہ ذہبی جو ان کے علمی و دینی کمالات سے بیحد متأثر ہیں ایک جگہ لکھتے ہیں:۔

تعتریہ حدۃ فی البحث، وغضب وصدمۃ للخصوم، تزرع لہ عداوۃ فی النفوس، ولولا ذلک لکان کلمۃ اجماع فانّ کبارھم خاضعون لعلومہ معترفون بانّہ بحر لاساحل لہ وکنز لیس لہ نظیر۔	بحث کے اثناء میں کبھی کبھی ان کی طبیعت میں تیزی اور غصہ پیدا ہو جاتا ہے، اور اپنے مقابل و مناظر پر ایسا وار کرتے ہیں جس سے طبیعتوں میں عداوت کا بیج پڑ جاتا ہے، اگر ایسا نہ ہوتا تو ان کے فضل و کمال پر سب کا اتفاق اور اجماع ہوتا اس لئے کہ ان کے نامور معاصرین اور اکابر علماء ان کی علمیت و قابلیت کے سامنے سرافگندہ ہیں اور صاف صاف اعتراف کرتے ہیں کہ وہ ایک دریائے ناپیدا کنار اور مخزنِ علوم ہیں، جس کی کوئی نظیر نہیں۔

ان کی زندگی میں متعدد واقعات ایسے ملتے ہیں کہ کسی علمی و دینی مسئلہ میں اپنے معاصر کی کم فہمی یا اس کے

مطالعہ اور نظر کی کوتاہی ان سے برداشت نہ ہوسکی، اور انھوں نے برملا اس کا اظہار کر دیا اور اس اظہار کی وجہ سے ان کا وہ صاحبِ علم معاصر ان کا مستقل حریف اور معاند بن گیا چنانچہ مسئلۂ زیارت میں جب تقی ابن الاخنائی مالکی نے ان کا رد کیا، اور انھوں نے ان کا تردیدی رسالہ پڑھا تو انھوں نے اس کا جواب لکھا جس میں ظاہر کیا کہ موصوف نہایت کم علم اور قلیل المعلومات شخص ہیں، اور وہ اس مسئلہ میں خامہ فرسائی کی لیاقت نہیں رکھتے، ان کا یہ تبصرہ ان کے لئے آزمائش کا باعث اور مزید تکلیفوں کا سبب بن گیا، ان کے بعض سوانح نگاروں کا خیال ہے کہ ان کی آخری نظر بندی اور اسارت کی طوالت اور سامان تحریر کی ضبطی کا سبب ان کا یہی تبصرہ اور اظہار خیال تھا۔[1]

اسی طرح ابوحیان مفسر جو اپنے زمانہ کا امام نحو سمجھا جاتا تھا، ابن تیمیہ کی خدمت میں معتقدانہ و نیاز مندانہ حاضر ہوا اور ان کی منقبت میں ایک زوردار قصیدہ لکھ کر لایا جس کا مطلع تھا۔

لما اتانا تقی الدین لاح لنا ۔۔۔ داع الی اللہ فرد ما لہ وزر

(جب ہمارے پاس تقی الدین (ابن تیمیہ) آئے تو ہم کو ایک ایسا داعی الی اللہ نظر آیا جو اپنی خصوصیات میں یکتا ہے، اور جس کا کوئی ہمسر نہیں)۔

اور جس کا ایک شعر ہے:۔

یا من یحدث عن علم الکتاب أصغ ۔۔۔ ھذا الامام الذی قد کان ینتظر

(اے وہ شخص جو علم کتاب کی باتیں کرتا تھا، غور سے سن، یہی وہ امام ہے جس کا مدت سے انتظار تھا)

اثنائے گفتگو میں نحو کے کسی مسئلہ پر بات چیت شروع ہوگئی، ابوحیان نے اپنے قول کی تائید میں سیبویہ کا حوالہ دیا، اس کی توقع تھی کہ ابن تیمیہ سیبویہ کا نام سن کر خاموش ہو جائیں گے، اور سر تسلیم خم کر دیں گے، لیکن اس کی توقع کے بالکل خلاف اس کو جواب ملا کہ سیبویہ کوئی نحو کا نبی معصوم تو نہیں تھا،

---

[1] البدایۃ والنہایۃ جلد ۱۴ ص ۱۳۴

اس نے "الکتاب" میں ۸۰ جگہ غلطی کی ہے جن کو تم سمجھ بھی نہیں سکتے، یہ سن کر ابو حیان کی طبیعت ایسی منغّص ہوئی کہ اس نے اس قصیدہ کو اپنے دیوان سے خارج کر دیا، اور ابن تیمیہ کا نہ صرف غیر معتقد بلکہ ہمیشہ کے لئے مخالف اور ناقد بن گیا۔

۵۔ مخالفت کا ایک سبب ان کی بعض وہ تحقیقات اور ترجیحات ہیں، جن میں وہ متفرد اور مذاہب مشہورہ اور ائمۂ اربعہ سے بھی بعض اوقات الگ نظر آتے ہیں، جن لوگوں کی فقہ و خلاف کی تاریخ اور ائمہ و مجتہدین کے اقوال و مسائل پر وسیع نظر ہے ان کے لئے تو یہ "تفردات" کوئی وحشت کی چیز اور ابن تیمیہ کے فضل و کمال کے انکار کا موجب نہیں، وہ جانتے ہیں کہ اگر ائمۂ مشہورین اور اولیائے مقبولین کے تفردات اور مسائلِ غریبہ جمع کر دیئے جائیں تو یہ تفردات بہت ہلکے اور معمولی نظر آنے لگیں، اور ان لوگوں کا حسن اعتقاد جو "تفرد" کو مقبولیت اور حقانیت کے منافی سمجھتے ہیں، اور ان کے لئے عظمت و ولایت کی ایک شرط یہ بھی ہے کہ اس کا کوئی قول اور کوئی تحقیق مشہور تحقیقات کے خلاف نہ ہو، تزلزل میں پڑ جائے گا، خود شیخ محی الدین ابن عربی جن کی عظمت و ولایت کا ایک عالم قائل ہے، ایسے بہت سے فقہی اور کلامی مسائل میں متفرد ہیں، جن میں وہ بالکل تنہا نظر آتے ہیں، اور ان سے پہلے کسی نے ان آراء اور تحقیقات کا اظہار نہیں کیا، ان کے یہ "تفردات" ان کے زمانہ سے لے کر اس وقت تک کے علمائے سنت کے لئے موضوع بحث بنے ہوئے ہیں۔[1]

لیکن جن لوگوں کی نظر "خلافیات" پر اتنی وسیع نہیں، یا جو "متقدمین" کے لئے تو تفرد اور "شذوذ" کی اجازت دے سکتے ہیں، لیکن کسی صاحبِ کمال اور صاحبِ نظر معاصر کے لئے ان کے نزدیک اس کی گنجائش نہیں، ان کے لئے یہ تفرد بھی موجب مخالفت اور فساد عقیدہ اور ضلالت اور خرق اجماع کی دلیل بن گیا، اس سلسلہ میں امیر المومنین فی الحدیث حافظ ابن حجر عسقلانی کا یہ مقولہ

---

[1] علامہ نعمان آلوسی نے "جلاء العینین" میں ان تفردات کو ایک جگہ جمع کر دیا ہے، ملاحظہ ہو جلاء العینین ص ۴۳

(جو اوپر نقل ہو چکا ہے) بڑا معتدل و متوازن اور افراط و تفریط سے پاک ہے، وہ فرماتے ہیں :۔

فالذی اصاب فیه وهو الاكثر یستفاد منه ویترحم علیه بسببه والذی اخطأ فیه لا یقلد فیه بل هو معذور.	جن مسائل میں وہ اپنے اجتہاد سے صحیح نقطہ پر پہونچ گئے ہیں (اور تعداد میں وہی مسائل زیادہ ہیں) ان میں تو ان سے استفادہ کیا جائے، اور ان کی وجہ سے ان کے حق میں دعائے خیر کی جائے اور جن میں ان سے اجتہادی غلطی ہوئی ہے ان میں ان کی تقلید نہ کی جائے بلکہ ان کو معذور سمجھا جائے۔

۶۔ ان کی مخالفت کا ایک قوی سبب یہ ہے کہ انھوں نے اس طرزِ کلام اور صفات و متشابہات کی تاویل کے اس طریقہ کی مخالفت کی، جو "عقیدۂ اشعریہ" بلکہ عقیدۂ اہلِ سنت کے نام سے موسوم تھا، اور اس سے عدول یا تو جہالت پر محمول کیا جاتا تھا، یا مخالفت اہلِ سنت پر، اوپر تفصیل کے ساتھ گزر چکا ہے کہ امام ابن تیمیہؒ نے اس سے پوری جرأت و قوت کے ساتھ اختلاف کیا، اور صفات کے بارے میں صحابہؓ، تابعین، ائمۂ مجتہدین، متکلمین، متقدمین امام ابوالحسن اشعریؒ، قاضی ابوبکر الباقلانی اور امام الحرمینؒ تک کا مسلک ان کے اقوال اور ان کی تصانیف سے بیان کیا، اور ان کی کتابوں کے اقتباسات سے ثابت کیا کہ سب حضرات ان صفات پر ایمان لانا ضروری سمجھتے ہیں، ان کی وہ حقیقت تسلیم کرتے ہیں، جو اللہ تعالیٰ کی شان کے مطابق "لیس کمثلہ شیٔ" کے لائق اور تشبیہ و تجسیم نیز نفی و تعطیل سے منزہ اور پاک ہے، وہ دعوے سے کہتے ہیں کہ اس کے خلاف نصًّا و ظاہرًا ایک لفظ بھی صحابہؓ و تابعین و سلف سے ثابت نہیں۔

اس وقت تمام عالمِ اسلام پر اشعری العقیدہ علماء و متکلمین کا اثر تھا، امام ابن تیمیہؒ کا یہ اختلاف جو خالص علمی بنیادوں پر تھا، ایک بدعت اور "یتبع غیر سبیل المؤمنین" کا مرادف

سمجھا گیا، اور ان پر تجسیم کا الزام لگایا گیا، اس وقت چونکہ تاویل ہی پر زور دیا جا رہا تھا، اس لئے ان کا سارا زورِ قلم اسی کے مقابلہ میں صرف ہوا "تاویل" کی تردید میں ان کی اس بلند آہنگی سے لوگوں کو ان پر تجسیم کا شبہہ ہوا، اس سلسلہ میں یہاں تک غلو کیا گیا کہ ان کی طرف وہ روایات منسوب کی گئیں جن سے ان کا صاف صاف فرقۂ مجسّمہ میں ہونا ثابت ہوتا ہے، مثلاً یہ کہ وہ جامع اموی دمشق میں خطبہ دے رہے تھے، انھوں نے منبر کے ایک زینہ سے دوسرے زینہ پر قدم رکھا، اور کہا کہ جس طرح میں نے نزول کیا ہے بالکل اسی طرح اللہ تعالیٰ نزول فرماتا ہے[۱]، امام ابن تیمیہؒ نے اور ان کے تلامذہ نے اس الزام کی پرزور تردید کی ہے، اور بار بار کہا ہے کہ جس طرح وہ تعطیل کے منکر ہیں، اسی طرح وہ تجسیم کے دشمن ہیں، پھر بھی تاویل کے خلاف انھوں نے ضرورۃً جس شدومد سے لکھا اور کہا ہے اس کو مخالفین نے تجسیم کے ثبوت میں پیش کیا ہے، بہت سے علماء اور ان کے متبعین کی مخالفت کے اسباب میں سے ایک قوی سبب یہ بھی تھا، اور حقیقت یہ ہے کہ تاویل و تجسیم کے درمیان کا یہ راستہ اتنا ہی نازک ہے کہ ہر شخص کی گرفت میں آنا مشکل ہے، پھر جبکہ حنابلہ اور منکرین تاویل میں سے متعدد اشخاص "تجسیم" کی سرحد میں داخل ہو گئے، امام ابن تیمیہؒ پر "تجسیم" کا الزام لگنا خلاف قیاس اور مستبعد نہیں، اگرچہ واقعہ یہ ہے کہ وہ اس الزام سے بالکل بری ہیں۔

۷۔ مخالفت کا ایک سبب شیخ اکبر شیخ محی الدین بن عربی کی مخالفت ہے، بہت سے

---

[۱] یہ روایت ابن بطوطہ نے ایک چشم دید واقعہ کے طور پر اپنے سفرنامہ میں لکھی ہے، راقم سطور نے علامۂ شام شیخ بہجۃ البیطار سے اس کا ذکر کیا، تو انھوں نے فرمایا کہ تاریخی حیثیت سے یہ روایت بالکل بے بنیاد ہے، خود ابن بطوطہ ذکر کرتا ہے کہ وہ دمشق رمضان ۷۲۶ھ میں آیا ہے، اور یہ بات مسلّم ہے کہ شیخ الاسلام شعبان ۷۲۶ھ میں محبوس ہو چکے تھے، پھر ابن تیمیہ کبھی بھی جامع اموی کے خطیب نہیں رہے، اس زمانہ میں جامع اموی کے خطیب شیخ جلال الدین قزوینی تھے، اس سے ثابت ہوتا ہے کہ یا تو ابن بطوطہ کو اشتباہ ہوا یا غلط بیانی سے کام لیا۔

لوگوں کے نزدیک خصوصاً جو تصوف کا مذاق رکھتے ہیں، ابن تیمیہ کا یہ جرم ناقابلِ معافی ہے، اور ان کے تمام محاسن و کمالات پر پانی پھیر دیتا ہے کہ انھوں نے شیخ اکبر کے مشہور آراء و تحقیقات اور ان کے مسلک وحدۃ الوجود کی پرزور تردید کی ہے، اور وہ ان کے مخالفین میں سے ہیں۔

اس سلسلہ میں اگرچہ ہمارا مسلک اور ذوق بعینہٖ وہ ہے جو امام ربانی مجدد الف ثانی حضرت شیخ سرہندی نے مکتوبات میں تحریر فرمایا ہے کہ :-

عجائب کار و باراست، شیخ محی الدین از مقبولان نظر می آید، و اکثر علوم او کہ مخالف آرائے اہلِ حق اند، خطا و ناصواب ظاہر می شود۔[1]	عجب معاملہ ہے شیخ محی الدین مقبولین میں نظر آتے ہیں لیکن ان کے اکثر علوم جو اہلِ حق کے مسلک کے مخالف ہیں، خطا اور نادرست معلوم ہوتے ہیں۔

اسی مکتوب میں آگے چل کر تحریر فرماتے ہیں :-

اکثر معارف کشفیہ او از علوم اہلسنت جدا افتادہ است از صواب دور است پس متابعت نہ کند آن را، مگر کسے کہ دلش مریض است یا مقلد صرف۔[2]	ان کے اکثر کشفی علوم جو اہلِ سنت کے علوم سے اختلاف رکھتے ہیں، صحت سے دور ہیں، ان کی پیروی یا تو وہ کرے گا جس کا دل بیمار ہے، یا مقلد محض۔

لیکن جہاں تک شیخ الاسلام ابن تیمیہؒ کی تردید و اختلاف کا تعلق ہے، وہ اس میں منفرد نہیں، صاحب "جلاء العینین" نے ان لوگوں کی فہرست دی ہے، جو اس مسئلہ میں ابن تیمیہ کے ہمنوا ہیں، ان میں سے متعدد نے اس موضوع پر مستقل رسائل بھی تصنیف کئے ہیں، اس فہرست میں ہم کو علامۂ سخاوی، علامۂ سعد الدین تفتازانی، ملا علی قاری، حافظ ابن حجر عسقلانی، ابو حیان مفسر، شیخ الاسلام عز الدین بن عبد السلام، حافظ ابو زرعہ، شیخ الاسلام سراج الدین البلقینی جیسے نامور علماء و ائمۂ فن نظر آتے ہیں۔[3]

---

[1] مکتوبات مکتوب ج ۱ نمبر ۲۶۶ [2] ایضاً [3] جلاء العینین ص ۴۳، ۴۴

پھر شیخ الاسلام ابنِ تیمیہ کی مخالفت، شیخ اکبر سے ذاتی اور جذباتی نہیں، وہ دینی حمیّت اور شرعی غیرت کی بنا پر ہے اور سلف اور خلف میں اس کی بیشمار نظیریں ملتی ہیں کہ اہلِ حمیّت اور محافظینِ شریعت نے جب کسی شخص کا کوئی ایسا قول دیکھا جو اس کو سنت و شریعت کے نصوص اور اس کے متواتر قطعی عقائد کے خلاف نظر آیا[1]، تو انھوں نے اس قول کی تردید کی، اور صاحبِ قول کی عظمت و شہرت اور اس کی ولایت و مقبولیت کے آثار بھی اس کو اس تردید سے باز نہ رکھ سکے، اس لئے کہ ان کے نزدیک شریعت کی حرمت اور مقامِ نبوت کی عظمت ہر حرمت سے مقدم اور ہر عظمت سے بالاتر تھی، خود حضرت مجدد الف ثانیؒ ایسے مواقع پر اپنے فاروقی جوش اور حمیتِ دینی کے خروش کو روک نہیں سکے، اور بڑی قوت سے ایسے اقوال کی تردید کرتے ہیں، ان کو کسی نے لکھا کہ شیخ عبدالکبیر یمنی اس کے قائل ہیں کہ اللہ عالم الغیب نہیں ہے اس پر تحریر فرماتے ہیں :-

مخدوما! فقیر را تابِ استماعِ امثال ایں سخناں ہرگز	مخدومی! فقیر کو ہرگز اس طرح کی باتیں سننے کی
نیست بے اختیار رگِ فاروقیم در حرکت می آید	تاب نہیں، بے اختیار میری رگِ فاروقی حرکت
و فرصتِ تاویل و توجیہ آں نمی دہد قائلِ ایں سخناں	میں آجاتی ہے، اور ایسے اقوال کی تاویل و توجیہ
شیخ کبیر یمنی باشد یا شیخ اکبر شامی کلام محمد عربی	کی فرصت نہیں دیتی، اس طرح کا مقولہ شیخ کبیر
علیہ و علیٰ آلہ الصلوٰۃ والسلام درکار است	یمنی کا ہو یا شیخ اکبر شامی کا ہمیں محمد عربی صلے اللہ
نہ کلام محی الدین عربی و صدر الدین قونوی	علیہ وسلم کا کلام درکار ہے نہ کہ محی الدین (ابن) عربی
و عبدالرزاق کاشی ما را بنص کار است	و صدر الدین قونوی، اور عبدالرزاق کاشی کا ہم کو
نہ بفص، فتوحاتِ مدنیہ از فتوحاتِ مکیہ	نص[2] سے کام ہے نہ کہ فص[3] سے فتوحاتِ مدنیہ[4]

[1] خواہ وہ حقیقت میں نہ ہو، لیکن انسان اپنی نظر اور بصیرت و فہم ہی کا مکلّف ہے، عالم السرائر اور عالم الغیب صرف اللہ تعالیٰ ہے۔

[2] نصوص کتاب و سنت مراد ہیں [3] شیخ اکبر کی مشہور کتاب "فصوص الحکم" کی طرف اشارہ ہے [4] تعلیمات کتاب و سنت۔

مستغنی ساختہ است۔[1] | نے ہم کو فتوحاتِ مکیہ[2] سے مستغنی کر دیا ہے۔

یہ حمیت و جوش اور یہ اختلاف و انکار جس کا باعث و محرک دینی حمیت اور کتاب و سنت کی حمایت و نصرت کے سوا کچھ نہ ہوا اور یہ اللہ اور اس کے رسول کو ماسوا پر ترجیح دینا اور جس سے محبت کرنا انہی کے لئے محبت کرنا، کسی شخص کے معائب میں شمار ہونے کے لائق نہیں، اس کے اعلیٰ فضائل و مناقب میں شمار کئے جانے کے لائق ہے، اس لئے کہ وہ اس حدیث کا صحیح مصداق ہے۔

ثلث من کن فیہ وجد بھن حلاوۃ الایمان من کان اللہ ورسولہ احب الیہ مما سواھما ومن احب عبدا لا یحبہ الا للہ ومن یکرہ ان یعود فی الکفر بعد ان انقذہ اللہ منہ کما یکرہ ان یلقی فی النار۔	تین باتیں جس میں ہوں گی، اس کو ان کی وجہ سے ایمان کی حلاوت محسوس ہوگی، ایک یہ کہ اللہ اور اس کا رسولؐ ماسوا سے زیادہ محبوب ہوں، دوسرے یہ کہ آدمی کسی شخص سے محض اللہ تعالیٰ کے لئے محبت کرے، تیسرے یہ کہ اس کو کفر کی طرف واپس جانے سے اس کے بعد کہ اللہ تعالیٰ نے اس کو اس سے نجات دے دی ہو ایسی ہی نفرت معلوم ہوتی ہو جیسے آگ میں ڈالے جانے سے ہوتی ہے۔

۸۔ ایک گروہ کو ان کی طرف سے شدید غلط فہمیاں اور مغالطے تھے، بعض غیر محتاط و متعصب مصنفین نے ان کی طرف ایسے اقوال کی نسبت کی تھی، جو عام عقیدۂ اہلِ سنّت اور جمہور کے مسلک کے مطابق موجبِ کفر ہیں، اور بعض ایسے اقوال ان کی طرف منسوب کئے گئے جن سے مقامِ رسالت میں سوءِ ادب اور تنقیص کا پہلو نکلتا ہے (اعاذنا اللہ وجمیع المسلمین منہ) یہ معاملہ تنہا امام ابن تیمیہ کے ساتھ نہیں کیا گیا، دوسرے اکابرِ امت بھی معاندین کی اس سازش کا شکار ہوئے ہیں، ان کی طرف نہ صرف ان

---

[1] مکتوبات امام ربانی، مکتوب ۱۰۰ جلد اول۔ [2] شیخ اکبر کی مشہور کتاب۔ [3] بخاری و مسلم۔

اقوال وعقائد کی نسبت کی گئی جن سے وہ بالکل بری تھے، بلکہ ان کی کتابوں میں ایسے مضامین شامل کئے گئے جو موجبِ کفر وضلال تھے، ایک قدم اس سے بڑھ کر مستقل کتابیں (جو کفریہ اقوال پر مشتمل تھیں) تصنیف کرکے ان کی طرف منسوب کردی گئیں، اور ان کی وسیع پیمانہ پر اشاعت کی گئی، حجۃ الاسلام امام غزالیؒ کے ساتھ یہی سلوک ہوا، ایک بڑے گروہ علماء کا خیال ہے کہ "المضنون به علی غیر اهله، للضنون به علی اهله، "معارج القدس، مشکوٰۃ الانوار" بے اصل اور منحول کتابیں ہیں جو امام غزالی کے دشمنوں اور بدخواہوں نے تصنیف کرکے ان کی طرف منسوب کردی ہیں، شیخ محی الدین ابن عربی کی کتابوں میں بھی امام شعرانی وغیرہ کا خیال ہے کہ یہ عمل ہوا ہے، اور مضامین ومواد کی آمیزش کی گئی ہے، امام شعرانی خود اپنی کتابوں کے متعلق ایک دلچسپ اور عبرت انگیز تجربہ لکھتے ہیں، "الاجوبۃ المرضیۃ" میں فرماتے ہیں کہ:۔

"میری کتاب "البحر المورود فی المواثیق والعہود" میں بعض حاسدوں نے ایسے مضامین شامل کردیئے جو مخالف شریعت تھے، اور جامع ازہر وغیرہ میں ان کو خوب گشت کرایا، اس سے ایک فتنہ کھڑا ہوگیا یہاں تک کہ میں نے اپنا صحیح اور محفوظ نسخہ علماء کے پاس بھیجا، جس پر بڑے بڑے علماء ومشائخ اسلام نے تقریظ وتوثیق لکھی تھی، اس وقت ان کو ان الحاقی مضامین کی حقیقت معلوم ہوئی، اور فتنہ فرو ہوا۔"

ابن تیمیہ کے ساتھ شروع سے ان کے معاصرین اور بعض متعصبین کا جو معاملہ رہا ہے، اس کی بنا پر یہ بات قطعاً محلِ تعجب نہیں کہ ان کی طرف بھی اقوالِ کفریہ اور اہانت آمیز مضامین کا ایک طومار منسوب کردیا گیا ہو اور بہت سے مخلصین اور اہلِ حمیت علماء اس سے متأثر ہو کر ان کی مخالفت بلکہ تضلیل وتکفیر پر آمادہ ہو گئے ہوں، خود آٹھویں صدی کے آخر اور نویں صدی کی ابتداء میں متعصبین ومخالفین کا ایک گروہ اس بارے میں اتنا غلو اختیار کرچکا تھا کہ وہ اس کا فتویٰ دیتا تھا کہ "جو ابن تیمیہ کو شیخ الاسلام کہے وہ کافر ہے" اس کی تردید اور ان کی صداقت وعظمت اور امامت کے ثبوت میں حافظ شمس الدین الشافعی (م ۸۴۲ھ) نے اپنی مشہور کتاب "الرد الوافر علی من زعم ان من سمی ابن تیمیہ شیخ الاسلام

کاہذ" لکھی،[1] جس میں ستاسی اکابر ومشاہیر علماء وائمۂ فن کی رائے اور تأثرات واعترافات اور ان کی عظمت وامامت کے متعلق ان کی شہادتیں نقل کیں، اس کتاب پر جس میں حافظ ابن حجر عسقلانی اور علامہ عینی نے تقریظیں لکھیں، اور ان کی تائید اور شیخ الاسلام کی دل کھول کر تعریف وتحسین کی اور ظاہر کیا کہ وہ بلاشبہہ صحیح العقیدہ، سنّی المسلک اور مسلّم شیخ الاسلام تھے، علامہ عینی نے یہاں تک لکھا کہ "من نسبه الى الزندقة فهو زنديق وقد سارت تصانيفه الى الآفاق وليس فيها شيئ مما يدل على الزيغ والشقاق" (جو ان پر زندقہ کا الزام لگائے وہ خود ملحد وزندقہ ہے، ان کی تصنیفات دنیا میں پھیل گئی ہیں، ان میں کوئی ایسی چیز نہیں ہے، جو ضلالت اور مخالفت اہلِ سنت پر دلالت کرے۔)

معلوم ہوتا ہے کہ یہ سلسلہ برابر جاری رہا، اور ان بے اصل اقوال ونقول کی نقل درنقل ہوتی رہی اور لوگ اس سے متاثر ہو کر ان کے خلاف قلم اٹھاتے رہے، اس سلسلہ میں سب سے پیش پیش دسویں صدی ہجری کے مشہور عالم اور مصنف علامہ ابن حجر مکی ہیں،[2] جنھوں نے ابن تیمیہؒ کے خلاف بہت سخت فتویٰ لکھا، اور ان کے متعلق ان کے قلم سے "عبدٌ خذله الله تعالى واضله واعماه

---

[1] یہ کتاب ایک مجموعہ میں جس کی جمع وترتیب فرج اللہ زکی کردی نے کی ہے، شیخ عبدالقادر تلمسانی کے اہتمام سے مطبعہ کردستان مصر میں ۱۳۲۶ھ میں شائع ہوئی، یہ شیخ کے حالات کا ایک بہت بڑا قیمتی ذخیرہ ہے۔

[2] ولادت ۹۰۹ھ (مصر) وفات ۹۷۳ھ (مکۂ معظمہ) تصنیفات میں "تحفۃ المحتاج" (۱۔۲۔۳۔۴) "الزواجر عن اقتراف الکبائر" "الصواعق المحرقہ" اور "الفتاوی الفقہیۃ والحدیثیۃ" خاص طور پر مشہور ہیں، یہ ابن حجر مکی، علامہ ابن حجر عسقلانی صاحب "فتح الباری" کے علاوہ اور ان سے متأخر ہیں، ابن حجر عسقلانی حدیث کے مشہور امام اور نہایت محقق اور وسیع النظر عالم ہیں، متأخرین میں ان کی مثال ملنی مشکل ہے، ابن حجر مکی علم، وسعتِ نظر وسعتِ قلب اور تحقیق میں اپنے نامور ہم نام کو نہیں پہونچتے۔

واتمه واذله" جیسے الفاظ نکلے۔

لیکن اسی فتوے کی عبارت سے معلوم ہوتا ہے کہ خود علامہ ابن حجر نے ابن تیمیہ کی کتابیں نہیں پڑھی تھیں، اوران کے معلومات ذاتی اور براہِ راست نہ تھے، ان کا سارا اعتماد اور فتوی کی بنیاد ان منقولات ومشہورات پر ہے، جو اس زمانہ میں ان کے مخالفین اپنی کتابوں میں نقل کرتے اور اپنی مجلسوں میں ذکر کرتے تھے، وہ اسی فتوی میں شیخ الاسلام کے کلامی وفقہی تفردات نقل کرنے کے بعد لکھتے ہیں" وقال بعضھم ومن نظر الی کتبہ لم ینسب الیہ اکثر ھذہ المسائل" (بعض لوگوں کا کہنا ہے کہ جس شخص نے ان کی کتابوں کا براہِ راست مطالعہ کیا ہے، وہ مذکورہ بالا مسائل میں اکثر کی نسبت ان کی طرف صحیح نہیں مانتا) فتوے کے آخر میں اپنا تردد ان الفاظ میں ظاہر کرتے ہیں" فان صح عنہ مکفر او مبتدع یعاملہ اللہ تعالیٰ بعدلہ والا یغفر اللہ لنا ولہ" (اگر ان سے کوئی ایسا عقیدہ ثابت ہوگیا، جو موجبِ کفر یا بدعت ہے تو اللہ اپنے عدل کے ساتھ ان سے معاملہ کرے، ورنہ ہماری اور ان کی بخشش فرمائے۔)

اس فتوی کا جواب اور ابنِ تیمیہ اور ابنِ حجر کا فاضلانہ محاکمہ بغداد کے مشہور علمی خاندان کے رکن، فخرِ عراق علامہ محمود آلوسی صاحبِ"روح المعانی" کے نامور فرزند علامہ خیر الدین نعمان آلوسی زادہ نے اپنی ضخیم تصنیف"جلاء العینین فی محاکمۃ الاحمدین" میں کیا ہے، اور علامۂ موصوف کے ایک ایک لفظ کا مفصّل جواب دیا ہے، اور ثابت کیا ہے کہ ان منقولات کا ایک حصہ تو بالکل بے اصل اور بے بنیاد اور افتراءِ محض ہے، اور شیخ الاسلام کی کتابوں میں بالکل اس کے خلاف اور برعکس تصریحات اور بیانات ملتے ہیں، ایک حصّہ (جو بہت ہلکا) ہے، وہ تفصیل کا محتاج ہے، اس کی یا تو وہ حقیقت نہیں جو بیان کی گئی ہے، یا وہ اس میں منفرد نہیں، اس کے علاوہ انھوں نے اس کتاب میں شیخ الاسلام کی سیرت اور حالات کا بھی ایک گراں قدر اور قیمتی ذخیرہ جمع

کر دیا ہے۔[1]

ابن حجر مکی کے بعد سے اس وقت تک علمائے محققین اور وسیع النظر اور منصف مصنفین علامۂ ابن حجر سے اس بارے میں اپنا اختلاف ظاہر کرتے رہے، اور اپنی تصنیفات و رسائل میں شیخ الاسلام ابن تیمیہ کی برأت اور ان کی عظمت اور علو مرتبت کا اظہار کرتے رہے، خود علامہ ابن حجر مکی کے شاگرد رشید ملا علی قاریؒ[2] کو شیخ الاسلام کے بارے میں اپنے استاد کی رائے سے اختلاف ہے، وہ اپنی تصنیفات میں بڑے بلند تعریفی کلمات میں ان کا ذکر خیر کرتے ہیں، "شرح شمائل ترمذی" اور "مرقاۃ شرح مشکوٰۃ" میں لکھتے ہیں:

ومن طالع شرح منازل السائرین تبین	جو شخص منازل السائرین کی شرح (مدارج السالکین)
لہ انہما کانا من اکابر اہل السنۃ	کا مطالعہ کرے گا اس پر واضح ہو جائے گا کہ ابن تیمیہ
والجماعۃ ومن اولیاء ھذہ الامۃ۔	اور ابن قیم اہل سنت والجماعت کے اکابر اور
	اس امت محمدیؐ کے اولیاء اللہ میں سے تھے۔

آخر میں امام المتأخرین شیخ الاسلام شاہ ولی اللہ دہلوی رحمۃ اللہ علیہ نے شیخ الاسلام ابن تیمیہ کی طرف سے پر زور دفاع کیا ہے، اور صاف لکھا ہے کہ وہ نہ صرف سنی العقیدہ اور سلفی المسلک عالم تھے، بلکہ شریعت کے بہت بڑے ترجمان اور وکیل اور کتاب و سنت کے مخلص خادم اور امتِ محمدیہ کے ایک جلیل القدر عالم تھے، ان کا وجود نوادر روزگار میں سے تھا، جو صدیوں میں پیدا ہوتا ہے،

---

[1] یہ کتاب جو باریک مصری ٹائپ کے ۲۶۲ صفحات میں ہے، ۱۲۹۰ھ میں مطبع بولاق مصر میں طبع ہوئی ہے۔

[2] ہرات (افغانستان) کے رہنے والے تھے، اپنے زمانہ کے اکابر علماء میں شمار تھا، مکۂ معظمہ کا سفر کیا، اور وہیں سکونت اختیار کر لی، مناسک حج اور فقہ و حدیث کے ممتاز ترین علماء میں تھے، تصنیفات میں مرقاۃ، شرح فقہ اکبر، شرح شفاء، شرح شمائل ترمذی، شرح نخبہ، شرح شاطبیہ، شرح جزریہ، خلاصۂ قاموس، وغیرہ مشہور ہیں، تصوف و معرفت کے بھی لذت آشنا تھے، ۱۰۱۴ھ کو وفات ہوئی، جامع ازہر مصر میں ایک بڑی جماعت کے ساتھ نماز جنازہ غائبانہ پڑھی گئی۔

جن لوگوں نے ان کی مخالفت اور ان کا تعقب کیا ہے، ان کو علم و نظر میں ان سے کوئی نسبت نہیں ہے، شاہ صاحب حاملین کتاب و سنت اور علمائے اسلام کی تعدیل فرماتے ہوئے اور حدیث مشہور یحمل ھذا العلم من کل خلف عدولہ" (اس علم کتاب و سنت کے حامل ہر نسل میں سے عادل لوگ ہوں گے) سے استدلال کرتے ہوئے شیخ الاسلام کے متعلق فرماتے ہیں :۔

وعلی ھذا الاصل اعتقدنا فی شیخ الاسلام ابن تیمیہ رحمہ اللہ تعالیٰ فانا قد تحققنا من حالہ انہ عالم بکتاب اللہ ومعانیہ اللغویۃ والشرعیۃ وحافظ لسنۃ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم وآثار السلف عارف لمعانیھما اللغویۃ والشرعیۃ، استاذ فی النحو واللغۃ محرر لمذھب الحنابلۃ فروعہ واصولہ فائق فی الذکاء ذو لسان وبلاغۃ فی الذب عن عقیدۃ اھل السنۃ لم یؤثر عنہ فسق ولا بدعۃ اللھم الا ھذہ الامور التی ضیق علیہ لاجلھا ولیس شئ منھا الا ومعہ دلیلہ من الکتاب والسنۃ وآثار السلف فمثل	اسی بنیاد پر ہم شیخ الاسلام ابن تیمیہؒ کے بارے میں عقیدہ رکھتے ہیں، ہم پر ان کے حالات سے ثابت ہو چکا ہے کہ وہ کتاب اللہ کے عالم اس کے لغوی اور شرعی معانی سے بخوبی واقف، نحو و لغت میں ماہر مذہب حنابلہ کے فروع و اصول کی تنقیح و تدوین کرنے والے، ذکاوت میں یگانہ، بڑے زبان آ ، اور عقیدہ اہل سنت کی حمایت و مدافعت میں بڑے فصیح و بلیغ تھے،...................... ان سے کوئی فسق یا بدعت کی بات ثابت نہیں بس یہی چند مسائل ہیں جن کے بارے میں ان کے ساتھ سختی کی گئی، ان میں بھی کوئی ایسا مسئلہ نہیں جس کے بارے میں ان کے پاس کتاب و سنت و آثار سلف میں سے کوئی دلیل نہ ہو، ایسے فاضل کی نظیر علم میں

هذا الشيخ عزيز الوجود في العلم ومن يطيق ان يلحق شأوه في تحريره وتقريره، والذين ضيقوا عليه ما بلغوا معشار ما آتاه الله تعالى وان كان تضييقه ذلك ناشئا من اجتهاد ومشاجرة العلماء في مثل ذلك ما هي الا كمشاجرة الصحابة رضي الله تعالى عنهم فيما بينهم والواجب في ذلك كف اللسان الا بخير۔[1]

ملنی مشکل ہے، اور کس کی مجال ہے کہ تحریر و تقریر میں ان کے پایہ کو پہونچے، اور جن لوگوں نے ان پر تشدد کیا، ان کو ان سے ان کے کمالات وخصوصیات میں کوئی نسبت نہیں تھی، اگرچہ یہ تشدد ایک اجتہادی امر تھا علماء کا اختلاف اس بارے میں مشاجرات صحابہ ہی کی طرح ہے، اس میں مناسب یہی ہے کہ زبان کو روکا جائے اور خیر کے سوا کچھ منہ سے نہ نکالا جائے۔

شاہ ولی اللہ صاحبؒ کے اس تزکیہ وشہادت اور ان بلند توصیفی کلمات کے بعد کسی ایسے عالم یا مصنّف کی جرح جس کی ابن تیمیہ کے آفاق علم وفکر تک رسائی نہ ہو کوئی

---

[1] یہ اس عربی مکتوب کا ایک حصہ ہے، جو حضرت شاہ صاحب نے اپنے ایک فاضل معاصر مخدوم معین الدین ٹھٹھوی (ٹھٹھہ صوبہ سندھ) کے جواب میں لکھا تھا، فاضل موصوف نے شاہ صاحب سے امام ابن تیمیہ کے بعض تفردات اور ان کے مخالفین کے اختلافات کا حوالہ دیتے ہوئے ان کے بارے میں آپ کی رائے پوچھی تھی، یہ مجموعۂ مکاتیب شاہ صاحب کے مشہور تلمیذ ومسترشد خواجہ محمد امین کشمیری کا مرتب کیا ہوا ہے، یہ مجموعۂ مکتوبات معہ مناقب ابی عبداللہ محمد بن اسمٰعیل البخاری وفضیلت ابن تیمیہ کے نام سے مطبع احمدی میں چھپا ہے جلاء العینین میں بھی یہ عبارت بجنسہٖ منقول ہے۔ (ص ۴۵-۴۶)

علمی وزن نہیں رکھتی، حکیم الاسلام شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ کو اللہ تعالٰی نے جو تبحرِ علمی، تنوعِ کمالات، مجتہدانہ فکر ونظر، اختلافات میں مسلکِ اعتدال اور علمائے اسلام کی مرتبہ شناسی کا ملکہ عطا فرمایا تھا، اس کے بعد ان کا قول اس بارے میں قولِ فیصل ہے۔ ؏

داستانِ فصلِ گل خوش می سراید عندلیب

شیخ الاسلام ایک عارف باللہ اور محقق

عموماً لوگ شیخ الاسلام ابن تیمیہ کو ایک متکلم و مناظر و محدث اور فقیہ (جدلی) کی حیثیت سے جانتے ہیں، ان کے علمی کمالات اور ان کی مناظرانہ تصنیفات کا مطالعہ کرنے والے اپنے ذہن میں ان کا جو تصور قائم کرتے ہیں، وہ ایک نہایت ذہین و ذکی، وسیع العلم، قوی الحجت اور ایک عالمِ ظاہر سے کچھ اور زیادہ نہیں ہوتا، ان کے شاگرد رشید حافظ ابن قیمؒ کو مستثنیٰ کر کے (جنھوں نے شیخ الاسلام ہروی کی کتاب "منازل السائرین" کی شرح "مدارج السالکین" میں اپنی اور اپنے محبوب استاد کی زندگی کا باطنی پہلو محفوظ کر دیا ہے، اور یہ ثابت کر دیا ہے کہ دونوں اعلیٰ درجہ کے عارف باللہ اور صاحبِ ذوق و معرفت بزرگ تھے) جن لوگوں نے عام سوانح نگاروں اور تذکرہ نولیسوں کی مدد سے شیخ الاسلام کو سمجھنے کی کوشش کی ہے یا ان کے متأخر متبعین و منتسبین کو دیکھ کر ان کے متعلق قیاس کیا ہے، وہ ان کو ایک محدثِ خشک اور ایک عالمِ ظاہر بیں سے زیادہ مقام نہیں دے سکے، لیکن "مدارج السالکین" میں ابن قیمؒ نے جستہ جستہ شیخ الاسلام کے جو اقوال و احوال پیش کئے ہیں، اور علامہ ذہبی وغیرہ نے ان کے تذکرہ میں بر سبیل تذکرہ ان کے اخلاق و اذواق، عادات و شمائل اور اشغال و اعمال کا تذکرہ کیا ہے، اس کو سامنے رکھنے سے ایک منصف شخص اس نتیجہ پر پہونچتا ہے کہ شیخ الاسلام کا شمار اس امت کے عارفین اور اہل اللہ میں کیا جانا

چاہئے، اور اس کو اس بات کا وجدان حاصل ہو جاتا ہے کہ وہ ان منازل پر فائز اور ان مقاصد سے بہرہ مند تھے، جن کے حصول کے لئے سالہا سال ریاضت، مجاہدہ، ائمۂ فن سلوک کی صحبت اور دوام ذکر و مراقبہ کا راستہ بالعموم اختیار کیا جاتا ہے، اور جس کو متأخرین صوفیہ "نسبت مع اللہ" سے تعبیر کرتے ہیں" وَذٰلِكَ فَضْلُ اللّٰهِ يُؤْتِيْهِ مَنْ يَّشَاءُ"۔

اہل نظر اس حقیقت سے واقف ہیں کہ ذوق و معرفت، ایمان حقیقی اور یقین، اخلاص و استقامت تزکیۂ باطن اور تہذیب اخلاق، کامل اتباع سنت اور فنا فی الشریعت وہ حقیقی مقاصد ہیں، جن کے لئے مختلف وسائل اختیار کئے جاتے ہیں محققین ان مقاصد کے حصول کو کسی ایک وسیلہ میں منحصر نہیں مانتے، بلکہ کہنے والوں نے یہاں تک کہدیا ہے (اور کچھ غلط نہیں کہا) کہ "طرق الوصول الی اللہ بعدد أنفاس الخلائق" ابتداء میں ان مقاصد کے حصول کے لئے سب سے مؤثر اور طاقتور ذریعہ صحبت نبوی تھی، جس کی کیمیا اثری عالم آشکارا ہے، اس نعمت سے محرومی کے بعد اطباء امت اور خلفائے نبوت نے اپنے اپنے زمانہ میں مختلف بدل تجویز کئے، آخر میں مختلف اسباب کی بنا پر صحبت اور کثرتِ ذکر پر زور دیا گیا، جس کا ایک منقح اور مدون طریقہ وہ نظام ہے جو تصوف و سلوک کے نام سے مشہور ہو گیا ہے لیکن اس سے کسی کو انکار نہیں کہ ان مقاصد کا حصول ان وسائل پر منحصر نہیں، اجتباء و موہبت کے علاوہ ایمان و احتساب، محاسبۂ نفس سنتوں کا تتبع، کتب حدیث و شمائل سے محبت و عظمت کے ساتھ اشتغال کثرتِ نوافل و دعا، کثرت درود، نیت و احتساب کے ساتھ خدمتِ خلق، جہاد، امر بالمعروف اور نہی عن المنکر، دعوت و تبلیغ، ان میں سے کوئی ایک چیز بھی استحضار و اہتمام کے ساتھ تقرب کا ذریعہ اور حصول نسبت کا سبب بن سکتی ہے[1]، وسائل مختلف

[1] تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو "صراط مستقیم" ملفوظات حضرت سید احمد شہید جمع کردہ مولانا اسمٰعیل شہیدؒ و مولانا عبدالحیؒ بالخصوص حصہ سلوک راہ نبوت۔

ہو سکتے ہیں، لیکن مقصود ایک ہے، شیخ الاسلام کے حالات کے مجموعہ سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ ان کو یہ مقصود حاصل تھا، اور اسی کا اظہار یہاں مقصود ہے۔

کسی شخص کے متعلق اس کے بے تکلف حالات واذواق، اخلاق وعادات اور کیفیات دیکھ کر اس بات کی شہادت دی جاسکتی ہے کہ وہ عارفین ومحققین اور مقبولین وکاملین میں سے تھا، اس کا کوئی ظاہری مقیاس اور پیمانہ اور کوئی منطقی دلیل نہیں ہوتی، اہل اللہ اور عارفین کے حالات بکثرت پڑھنے اور ان کی صحبت میں رہنے سے ایک سلیم الفطرت اور صحیح الذوق انسان کو ایک ملکہ اور وجدان حاصل ہو جاتا ہے، جس سے وہ اس بات کا فیصلہ کر سکتا ہے، لیکن پھر بھی کچھ حالات وعلامات ایسی ہیں جن سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ شخص اپنی دینی سطح میں عوام سے بلند اور دین کی صحیح کیفیات واذواق اور اہل اللہ کے اخلاق سے بہرہ مند ہے، مثلاً ذوقِ عبودیت وانابت (توجہ الی اللہ) کی ایک خاص کیفیت، عبادت کا ذوق وانہماک، ذوق دعا وابتہال، زہد وتجرید وتحقیر دنیا، سخاوت وایثار، فروتنی اور بے نفسی، سکینت وسرور، کمال اتباع سنت، صالحین میں مقبولیت اور علمائے وقت کی شہادت، متبعین ومحبین کی دینداری اور حسن سیرت وغیرہ وغیرہ، ہم اس موقع پر انہی عنوانات کے ذیل میں شیخ الاسلام کے معاصرین اور مورخین کی شہادت اور ان کے تأثرات نقل کرتے ہیں۔

ذوقِ عبودیت وانابت

ذوقِ عبودیت وانابت الی اللہ کی حقیقی کیفیت اس بات کی بیّن شہادت ہے کہ اس شخص کا باطن یقین سے معمور، اللہ تعالیٰ کی عظمت وکبریائی سے بھرپور، اپنی بے بسی، بیچارگی اور مالک الملک کی قدرت وجلال کے مشاہدے سے پرنور ہے، یہ یقین ومشاہدہ جب باطن میں پیدا ہو جاتا ہے، تب الفاظ اور اعمال سے ظاہر ہوتا ہے، اس سلسلہ میں حقیقت وتکلف میں زمین وآسمان کا فرق ہے،

یہ فرق صاحبِ نظر اور صاحبِ وجدان سے چھپ نہیں سکتا۔

لیس التکحّل فی العینین کالکحل

ابن تیمیہ کے واقعات بتلاتے ہیں کہ ان کو یقین و مشاہدہ حاصل تھا، اور اس نے ان کے اندر ایک افتقار و اضطرار اور ایک انابت و عبودیت کی کیفیت پیدا کر دی تھی، گزشتہ صفحات میں گزر چکا ہے کہ جب ان کو کسی مسئلہ میں اشکال یا کسی آیت کے سمجھنے میں دقّت ہوتی تھی، تو وہ کسی سنسان مسجد میں چلے جاتے تھے، اور پیشانی خاک پر رکھ کر دیر تک یہ کہتے رہتے کہ "یا معلّم ابراھیم فہّمنی"[۱] (اے ابراہیم کو علم عطا کرنے والے مجھے اس کی سمجھ عطا فرما) ذہبی کہتے ہیں :۔

لم أر مثلہ فی ابتھالہ واستغاثتہ	میں نے گریہ و زاری اللہ تعالیٰ سے استمداد اور فریاد
وکثرۃ توجھہ۔	اور توجہ الی اللہ میں ان کی نظیر نہیں دیکھی۔

وہ فرماتے ہیں :۔

انہ لیقف خاطری فی المسئلۃ او الشئ	کسی وقت کسی مسئلہ میں میری طبیعت بند ہو جاتی
او الحالۃ التی تشکل علیّ فاستغفر	ہے یا کسی معاملہ میں مجھے اشکال پیش آجاتا ہے تو میں
اللہ تعالیٰ الف مرۃ او اکثر او اقل حتّٰی	ایک ہزار بار استغفار کرتا ہوں، یا اس سے کم یا زیادہ
ینشرح الصدر وینحلی اشکال ما اشکل۔	یہاں تک کہ طبیعت کھل جاتی ہے اور بدلی چھٹ جاتی ہے اور اشکال رفع ہو جاتا ہے۔

اس کیفیت میں جلوت، مجمع، بازار، شور و شغب کوئی چیز مانع نہ ہوتی، فرماتے ہیں :۔

واکون اذ ذلک فی السوق او المسجد	ایسی حالت میں کبھی بازار میں کبھی مسجد میں یا گلی یا مدرسہ
او الدرب او المدرسۃ لا یمنعنی ذلک	میں ہوتا ہوں لیکن ذکر و استغفار میں کوئی رکاوٹ نہیں

[۱] العقود الدریہ ص۲۶

من الذكر والاستغفار الى ان أنال	پیش آتی، اور برابر مشغول رہتا ہوں یہاں تک کہ
مطلوبی[1]	مطلوب حاصل ہو جاتا ہے۔

یہ یقین اور ذوقِ عبودیت جب پیدا ہو جاتا ہے اور باطن میں سرایت کر جاتا ہے تو انسان میں اپنی بے بسی و بیچارگی، اپنی تہی دستی و بے بضاعتی کا ایسا احساس پیدا ہو جاتا ہے کہ وہ آستانۂ شاہی پر کشکولِ گدائی لے کر کھڑا ہو جاتا ہے، اور خدائی کا صدقہ اور رحمت کی بھیک مانگتا ہے، اس وقت اس کے روئیں روئیں سے یہ صدا آتی ہے کہ ؎

مفلسانیم آمدہ در کوے تو　　شیأً للہ از جمالِ روے تو
دست بکشا جانبِ زنبیلِ ما　　آفریں بر دست و بر بازوے تو

ابن تیمیہ کے حالات سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کو یہ دولتِ فقر اور یہ عزتِ تذلل حاصل تھی، ابن قیم بیان کرتے ہیں کہ میں نے شیخ الاسلام ابن تیمیہ کا اس بارہ میں ایسا حال دیکھا ہے جو کسی کے یہاں نظر نہیں آیا، وہ فرماتے تھے، نہ میرے پاس کچھ ہے، نہ میرے اندر کچھ ہے، وہ اکثر یہ شعر پڑھتے۔

انا المکدی انا المکدی　　وھکذا کان ابی وجدی

(ہاں میں تیرے در کا بھکاری ہوں! ہاں میں تیرے در کا بھکاری ہوں! اور کوئی نیا بھکاری نہیں، خاندانی بھکاری ہوں، اور پشتینی سائل، میرا باپ بھی تیرے در کا بھکاری تھا، اور میرا دادا بھی)

ذوقِ عبادت و انہماک

عبادت کا ذوق اور اس میں انہماک اس وقت تک نہیں ہو سکتا، جب تک کہ انسان کو اس کی لذت اور اس کا حقیقی ذائقہ نہ نصیب ہو اور وہ اس کے درد کی دوا، قلب کی غذا اور روح کی قوت نہ بن جائے،

---

[1] الکواکب الدریہ ص ۱۴۵

اور اس کو مقام "جعلت قرۃ عینی فی الصلاۃ" اور "ارحنا یا بلال" سے مناسبت نہ بخشی جائے، ابن تیمیہ کے معاصرین اور واقفینِ حال اس کی شہادت دیتے ہیں کہ ان کو اس دولت بیدار سے حصہ ملا تھا، اور ان کو خلوت و مناجات اور نوافل و عبادات کا خاص ذوق تھا، اور ان کا انہماک اس سلسلہ میں بہت بڑھا ہوا تھا، "الکواکب الدریہ" میں ہے:۔

وکان فی لیلہ منفرداً عن الناس	رات کو وہ تمام لوگوں سے علٰحدہ رہتے تھے، اس
کلھم خالیاً بربہ عزوجل ضارعاً	وقت خدا کے سوا کوئی نہیں ہوتا تھا، وہ تھے اور
الیہ مواظباً علیٰ تلاوۃ القرآن العظیم	گریہ وزاری، برابر قرآن مجید پڑھتے رہتے، رات
مکرراً لانواع التعبدات اللیلیۃ والنھاریۃ	اور دن مختلف قسم کے نوافل و عبادات میں مشغول
وکان اذا دخل فی الصلاۃ ترتعد فرائصہ	رہتے، جب نماز شروع کرتے تو ان کے شانے اور
واعضاؤہ حتیٰ یمیل یمنۃ ویسرۃ۔[1]	اعضاء کانپنے لگتے یہاں تک کہ ان کو دائیں بائیں لرزش ہوتی

ایسے اہلِ قلوب اور اہلِ ذوق کی طاقت اور نشاط، ذکر و عبادت سے قائم ہوتا ہے اگر اس میں فرق واقع ہو تو ان کی قوت جواب دے جاتی ہے، اور ان کو محسوس ہوتا ہے کہ فاقہ ہوا، ابن قیم لکھتے ہیں:۔

وکان اذا صلی الفجر یجلس فی مکانہ حتیٰ	نماز فجر کے بعد اپنی جگہ بیٹھے رہتے، یہاں تک کہ دن
یتعالیٰ النھار جداً یقول ھذہ غدوتی	اچھی طرح سے چڑھ آتا، کوئی پوچھتا تو فرماتے کہ یہ میرا
لو لم اتغد ھذہ الغدوۃ سقطت	ناشتہ ہے، اگر میں یہ ناشتہ نہ کروں تو میری قوت میں
قوای۔[2]	سقوط ہو جائے اور میرے قویٰ کام نہ کریں۔

اس ذوق و اہتمام کے بعد اللہ تعالیٰ استقامت عطا فرما دیتا ہے، اور ذکر و عبادت و معمولات طبیعت ثانیہ بن جاتے ہیں، ذہبی لکھتے ہیں:۔

---

[1] الکواکب ص۱۵۶ [2] الرد الوافر ص۳۶

لہ اوراد و اذکار یں منہا بکیفیۃ وجمعیۃ[1]	وہ اپنے اوراد واذکار کی پوری پابندی کرتے تھے اور ہر حالت میں جمعیتِ خاطر کے ساتھ ادا کرتے تھے۔

زہد و تجرید و تحقیرِ دنیا

زہد اور دنیا کی تحقیر کی سچی کیفیت اس وقت تک پیدا نہیں ہو سکتی جب تک کہ دنیا کی حقیقت پوری طرح منکشف اور "اِنَّ الدَّارَ الآخِرَةَ لَھِیَ الْحَیَوَانُ" اور "مَا عِنْدَ اللّٰہِ خَیْرٌ وَّ اَبْقٰی" کا حال پوری طرح طاری نہ ہو جائے اور یہ یقین اور معرفتِ صحیحہ اور تعلق باللہ کے بغیر ممکن نہیں، ان کے معاصرین نے ان کے زہد و تجرید اور فقر اختیاری کا جا بجا تذکرہ کیا ہے، ان کے رفیقِ درس اور ہم عصر شیخ علم الدین البرزالی (م ۷۳۹ھ) فرماتے ہیں :-

وجری علی طریقۃ واحدۃ من	شروع سے آخر تک ان کی حالت یکساں رہی کہ
اختیار الفقر والتقلل من الدنیا	انھوں نے ہمیشہ فقر کو ترجیح دی، دنیا سے بقدرِ ضرورت
ورد ما یفتح بہ علیہ[2]	اور برائے نام تعلق رکھا اور جو ملا اس کو واپس کر دیا۔

جب یہ کسی کا حال بن جاتا ہے اور اللہ تعالیٰ اس کو غنائے قلب کی دولتِ سرمدی سے نوازتا ہے تو اس کو کسریٰ و قیصر کی سلطنت ہیچ معلوم ہونے لگتی ہے اور وہ اس کی طرف نگاہ اٹھا کر دیکھنا گناہ اور اللہ تعالیٰ کی نعمت کی ناشکری سمجھتا ہے، اس وقت وہ بیخودی کے عالم میں کہتا ہے ؎

من دلقِ خود بافسرِ شاہان نمی دہم | من فقرِ خود بملکِ سلیمان نمی دہم
از رنجِ فقر در دلِ گنجے کہ یافتم | این رنج را براحتِ شاہاں نمی دہم

اس کے مقام سے بے خبر کبھی اس کے متعلق بدگمانی کرتے ہیں کہ وہ سلطنت پر طمع کی

لہ الرد الوافر ص۱۸ ۔ ۲ہ ایضاً ص۶۵

نگاہ ڈالتا ہے اور وہ ان کی بے خبری اور بدذوقی پر ماتم کرتا ہے کہ اس دولت جاوید کے بعد بھی اس ملک فانی پر نگاہ کی جا سکتی ہے؟! ابن تیمیہ کا یہی حال تھا، الملک الناصر نے ایک مرتبہ ان سے کہا کہ میں نے سنا ہے کہ بہت سے لوگ آپ کے مطیع ہوگئے ہیں، اور آپ کے دل میں سلطنت پر قبضہ کرنے کا خیال ہے؟ الشیخ نے بڑے اطمینان کے ساتھ بلند آواز سے جس کو تمام حاضرین نے سنا جواب دیا:۔

انا افعل ذلك؟ واللہ ان ملكك و	میں ایسا کروں گا؟ خدا کی قسم تمہاری اور تاتاریوں کی
ملك المغل لايساوی عندی فلسًا۔[1]	سلطنت مل کر بھی میری نگاہ میں ایک پیسہ کے برابر نہیں۔

سخاوت وایثار

اہل اللہ اور اخلاق نبوی کی میراث میں حصہ پانے والوں کی خاص صفت، سخاوت وایثار ہے، ابن قیم نے "زاد المعاد" میں "الم نشرح" کی تفسیر میں لکھا ہے کہ شرح صدر کی دولت اور ایمان ویقین کا نتیجہ سخاوت وایثار ہے، اس لئے جس کو اس دولت سے حصہ ملے گا، سخاوت وایثار اس کا شعار ہوگا، شیخ الاسلام کے معاصرین واحباب ان کی سخاوت کے بے حد معترف اور ثنا خواں ہیں "الکواکب الدریۃ" میں ہے "وھو احد الاجواد الاسخیاء الذین یضرب بھم المثل"[2] (وہ ان معدودے چند اہل سخاوت میں سے ہیں جن کی سخاوت ضرب المثل ہے) الحافظ ابن فضل اللہ العمری جو ان کے معاصر ہیں، اس سخاوت کا حال اس طرح بیان کرتے ہیں:۔

كانت تاتيه القناطير المقنطرة من	ان کے پاس ڈھیروں سونا چاندی، اعلیٰ اصیل
الذهب والفضة والخيل المسوّمة	گھوڑے، جانور، املاک واموال آتے، وہ سب کا
والانعام والحرث فيهب ذلك باجمعه	سب اٹھا کر دوسروں کو دے دیتے، یا اہل ضرورت

[1] الکواکب الدریہ ص۱۶۶ [2] ایضاً ص۱۴۶

ویضعہٗ عند اھل الحاجۃ فی موضعہ لا — کے پاس رکھوا دیتے اور صرف دوسروں کو دینے کے لئے

یاخذ منہ شیئًا الا لیھبہ ولا یحفظ الا لینذ ھبہ[1] — لیتے اور صرف عطا کرنے کے لئے اٹھا رکھتے۔

ان کی سخاوت یہاں تک پہنچی ہوئی تھی کہ اگر دینے کے لئے کچھ نہ ہوتا تو کپڑا اتار کر دے دیتے:۔

کان یتصدق حتیٰ اذا لم یجد شیئًا — وہ صدقہ کرتے تھے جب کچھ پاس نہ ہوتا تو اپنا کوئی کپڑا

نزع بعض ثیابہ فیصل بہ الفقراء[2] — ہی اتار کر دے دیتے اور اہلِ حاجت کی کاربرآری کرتے۔

ایک دوسرے صاحب فرماتے ہیں:۔

وکان یتفضل من قوتہ الرغیف — کھانے سے ایک روٹی، دو روٹیاں بچا لیتے اور

والرغیفین فیوثر بذلک علیٰ نفسہ[3] — اپنے اوپر ایثار کر کے دوسروں کو دے دیتے۔

ایثار کا ایک نازک مقام یہ ہے کہ آدمی اپنے دشمنوں اور حریفوں کے ساتھ فراخ دلی بلکہ عفو واحسان اور اس سے آگے بڑھ کر دعا وخیر خواہی کے ساتھ پیش آئے، یہ مقام ان ہی لوگوں کو حاصل ہوتا ہے، جو انانیت اور حظوظ نفس سے بہت آگے بڑھ چکے ہوں اور ان پر نعمائے الٰہی کی ایسی بارش ہو اور سکینت وسرور اس درجہ کا حاصل ہو کہ وہ ان سب مخالفتوں کو ان کے مقابلہ میں ہیچ اور پرکاہ سمجھتے ہوں اور جن کے اندر اپنے دشمنوں اور مخالفین کے لئے بھی خیر طلبی ورحم کا جوش پیدا ہوتا ہو، اوپر گذر چکا ہے کہ ۷۰۹ھ میں جب وہ دوسری بار رہا ہوئے تو سلطان نے تنہائی میں ان سے ان قضاۃ کے قتل کے بارے میں فتوے لینا چاہا جنھوں نے جاشنگیر کی حمایت کی تھی، اور سلطان کی معزولی کا فتویٰ دیا تھا، اور یہ بھی کہا کہ انھوں نے آپ کے خلاف شورش برپا کی، اور آپ کو تکلیف پہنچائی، اس کے جواب میں ابن تیمیہؒ نے ان لوگوں کی بڑی مدح وتوصیف کی، اور پرزور الفاظ میں سلطان سے ان کی سفارش کی، اور اس کو ان کے قتل کے ارادہ سے باز رکھا، ان کے سب سے بڑے

---

[1] الکواکب ص۱۵۸ [2] ایضاً ص۱۵۷ [3] ایضاً

حریف و مدمقابل قاضی ابن مخلوف مالکی کا یہ مقولہ بھی گذر چکا ہے کہ "ہم نے ابن تیمیہؒ جیسا عالی ظرف وفراخ حوصلہ نہیں دیکھا کہ ہم نے توان کے خلاف سلطنت کو آمادہ کیا، لیکن ان کو جب قدرت حاصل ہوئی تو ہم کو صاف معاف کر دیا، اور الٹے ہماری طرف سے وکالت و مدافعت کی"۔

ان کے تلمیذ رشید اور رہروقت کے ساتھی حافظ ابن قیمؒ کہتے ہیں کہ وہ اپنے دشمنوں کے لئے دعائے خیر کرتے تھے، میں نے نہیں دیکھا کہ وہ ان میں سے کسی کے لئے بددعا کرتے ہوں، میں ایک روز ان کے سب سے بڑے حریف اور ایک ایسے صاحب کی خبر وفات لے کر آیا جو عداوت اور ان کو ایذا پہنچانے میں سب سے آگے تھے، انھوں نے مجھے جھڑک دیا اور منھ پھیر لیا، اناللہ وانا الیہ راجعون پڑھی، پھر فوراً ان کے مکان پر گئے، ان کی تعزیت کی، اور فرمایا کہ مجھے ان کی جگہ پر سمجھنا، جس چیز کی تم کو ضرورت پڑے گی میں تمہاری اس میں مدد کروں گا، اسی طرح ان سے ایسی ملاطفت و دلجوئی کی باتیں کیں جن سے وہ نہایت مسرور ہوئے، اور ان کو بڑی دعائیں دیں اور ان کو اس پر سخت استعجاب ہوا۔

عفو و احسان، اعداء و مخالفین کے ساتھ شفقت و مرحمت کا یہ مقام مالی ایثار سے بہت بلند اور آگے کا مقام ہے، یہ وہ مقام ہے جو صدیقین و خواص اولیاء کو ملتا ہے، ابن تیمیہؒ اس مقام پر فائز تھے، اور گویا زبانِ حال سے وہ کہتے تھے، جو اسی مقام کے کسی صاحبِ حال شاعر نے فارسی میں کہا ہے ؎

ہر کہ مارا یار نبود ایزد او را یار باد — ہر کہ ما را رنج دادہ راحتش بسیار باد
ہر کہ اندر راہ ما خارے نہد از دشمنی — ہر گلے کز باغ عمرش بشگفد بے خار باد

فروتنی و بے نفسی

فروتنی و بے نفسی اہل اللہ کی خاص صفت اور وہ مرتبۂ کمال ہے جو ہزار کرامتوں سے بلند اور

ہزار فضیلتوں سے بالاتر ہے، یہ مقام اسی وقت حاصل ہوتا ہے جب خودی مٹ جاتی ہے اور نفس کا کامل تزکیہ ہو جاتا ہے، شیخ الاسلام کو اپنے کمالات علمی اور عروج دینی و دنیاوی کے ساتھ یہ کمال بھی حاصل تھا، ان کے اقوال پتہ دیتے ہیں کہ وہ بےنفسی وللہیت اور ہضم نفس اور انکارِ ذات کے درجۂ علیا پر پہونچے ہوئے تھے، ابن قیم فرماتے ہیں کہ وہ اکثر کہتے تھے کہ "مالی شئ، ولا منی شئ، ولا فی شئ" اگر کوئی ان کے منھ پر ان کی تعریف کرتا تو فرماتے:۔

واللہ انی الی الآن اجدد اسلامی کل وقت وما اسلمت بعد اسلاماً جیداً۔[1]	خدا کی قسم میں ابھی تک برابر اپنے اسلام کی تجدید کرتا رہتا ہوں اور ابھی تک نہیں کہہ سکتا کہ کامل طور پر مسلمان ہوا

کبھی کوئی تعریف کرتا تو یوں بھی فرماتے کہ "انا رجل ملة لا رجل دولة"[2] (میں امت کا ایک عام آدمی ہوں سلطنت و حکومت کا آدمی نہیں۔)

بےنفسی اور عبودیت کے اس درجہ پر پہونچ کر آدمی کی یہ حالت ہو جاتی ہے کہ وہ اپنا نہ کسی پر کوئی حق سمجھتا ہے، نہ اس کا کوئی مطالبہ کرتا ہے، نہ اس کو کسی سے شکایت ہوتی ہے، نہ اپنے نفس کا انتقام لیتا ہے، اللہ تعالیٰ نے ان کو اس مقام پر پہنچا دیا تھا، ابن قیم فرماتے ہیں:۔

سمعت شیخ الاسلام ابن تیمیة قدس اللہ روحه، یقول العارف لایری له علی احد حقاً ولا یشهد له علی غیره فضلاً ولذلك لا یعاتب ولا یطالب ولا یضارب۔[3]	میں نے شیخ الاسلام ابن تیمیہ قدس اللہ روحہ سے سنا ہے کہ فرماتے تھے کہ عارف اپنا کسی پر کوئی حق نہیں سمجھتا، اور نہ یہ جانتا ہے کہ اس کو کسی پر کوئی فضیلت حاصل ہے، اسی لئے نہ وہ کسی کی شکایت کرتا ہے، نہ مطالبہ کرتا ہے نہ مارپیٹ کرتا ہے۔

ان کے حالات سے واقفیت رکھنے والے جانتے ہیں کہ "حدیثِ دیگراں" میں وہ اپنا ہی حال

۱؎ مدارج السالکین جلد ۱ صفحہ ۲۹۶ ۲؎ الکواکب الدریہ صفحہ ۱۶۴ ۳؎ مدارج السالکین جلد ۱ صفحہ ۴۹۶

بیان کر رہے ہیں۔

سکینت وسرور

اس ایمان ویقین اور اللہ تعالیٰ کے ساتھ اس صحیح تعلق اور مخلوق سے آزادی اور قلب کی وارستگی اور بے تعلقی کے بعد انسان کو وہ سکینت وسرور حاصل ہوتا ہے کہ اس زندگی ہی میں اس کو جنت کا مزہ آنے لگتا ہے، شیخ الاسلام نے (جیسا کہ ابن قیم نے نقل کیا ہے) خود ایک بار فرمایا کہ

انّ فی الدنیا جنۃ من لم یدخلھا لم	دنیا میں (مومن کے لئے) ایک ایسی جنت ہے کہ جو اس میں
یدخل جنۃ الآخرۃ۔[1]	یہاں داخل نہیں ہوا آخرت کی جنت سے بھی محروم رہے گا۔

اہلِ نظر جانتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کبھی اپنے مخلص بندوں کو اس زندگی میں بھی "لَاخَوْفٌ عَلَیْھِمْ وَلَاھُمْ یَحْزَنُوْنَ" کی دولت عطا فرماتا ہے، اور وہ اس کا نمونہ (بقدر وسعت دنیا) یہاں بھی دیکھ لیتے ہیں، شیخ الاسلام اور ان کے رفقاء کے بیانات سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کو یہ دولت حاصل تھی، خود بھی ایک بار جوش میں آکر فرمایا:۔

ما یصنع اعدائی بی، ان جنتی وبستانی	میرے دشمن میرا کیا بگاڑ سکتے ہیں، میری جنت اور
فی صدری ان رحت فھی معی	میرا باغ میرے سینے میں ہے، جہاں جاؤں گا وہ
لاتفارقنی۔[2]	میرے ساتھ ہے۔

یہ نسبت سکینت ورضا زندگی میں اور بعد وفات ان کے ساتھ رہی، ابن قیمؒ نے لکھا ہے کہ میں نے ایک مرتبہ ان کو خواب میں دیکھا، میں نے ان سے بعض اعمالِ قلبیہ کا ذکر کیا، اس پر شیخ نے فرمایا:۔

امّا أنا طریقی الفرح والسرور بہ۔[3]	بھائی میری نسبت تو فرحت وسرور کی ہے۔

---

[1] الردالوافر ص ۳۶ [2] الوابل الصیب ص ۶۶ [3] اغاثۃ اللہفان۔

ابن قیم لکھتے ہیں :-

وھکذا کانت حالہ فی الحیاۃ یبدو ذلک علیٰ ظاھرہ وینادی بہ علیہ حالہ[1]	یہی حالت ان کی زندگی میں تھی کہ ان کے چہرہ پر فرحت و سرور کے آثار نظر آتے تھے، اور ان کی کیفیت اس کا اعلان کرتی تھی۔

کمال اتباع سنت

اس مقام (قبولیت وصدیقیت) کی ابتداء اتّباع سنت سے ہے اور اس کی انتہا بھی کمالِ اتّباعِ سنت پر ہے، حدیث وسنت کے ساتھ ابن تیمیہ کا شغف وانہماک ان کے مخالفین کو بھی تسلیم ہے، لیکن یہ شغف وانہماک محض علمی ونظری نہ تھا، علمی اور ظاہری بھی تھا، ان کے معاصرین شہادت دیتے ہیں کہ مقامِ رسالت کا جیسا ادب و احترام، اور اتّباع سنت کا جیسا اہتمام ابن تیمیہ کے یہاں دیکھا کسی اور کے یہاں نظر نہیں آیا، حافظ سراج الدین البزّار قسم کھا کر کہتے ہیں :-

لا واللہ ما رأیت احداً اشد تعظیما لرسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ولا احرص علیٰ اتّباعہ ونصر ما جاء بہ منہ[2]	خدا کی قسم میں نے رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کا اتنا ادب و احترام کرنے والا اور آپ کے اتّباع اور آپ کے دین کی نصرت کی حرص رکھنے والا ابن تیمیہ سے بڑھ کر نہیں دیکھا۔

یہ چیز ان پر اتنی غالب اور ان کی زندگی میں نمایاں تھی کہ دیکھنے والوں کا قلب شہادت دیتا تھا کہ اتّباع کامل اور سنت کا عشق اس کا نام ہے، علامہ عماد الدین الواسطی فرماتے ہیں:-

ما رأینا فی عصرنا ھذا من تستجلی النبوۃ	ہم نے اپنے زمانہ میں ابن تیمیہ ہی کو ایسا پایا کہ نبوت محمدیؐ

[1] مدارج السالکین [2] الکواکب الدریۃ ص ۱۴۹

المحمدیة وسننها من اقواله وافعاله	کا نور ان کی زندگی میں اور سنتوں کا اتباع ان کے
الا هٰذا الرجل یشهد القلب الصحیح ان	اقوال و افعال میں عیاں تھا، قلب سلیم اس کی شہادت
هذا هو الاتباع حقیقة۔[1]	دیتا تھا کہ حقیقی اتباع اور کامل پیروی اس کا نام ہے۔

صالحین میں مقبولیت اور علمائے وقت کی شہادت

کسی انبوہ اور عوام کی بھیڑ کا کسی شخص کی تعریف کرنا مقبولیت عند اللہ و استقامت اور علو مرتبت کی دلیل نہیں، دلیل اس کے زمانہ کے اہلِ صلاح و استقامت اور اہلِ علم اور اہلِ بصیرت کی شہادت اور توصیف ہے، نیز یہ کہ اس کے پیروؤں، اس سے محبت و تعلق رکھنے والوں اور اس کے پاس اٹھنے بیٹھنے والوں میں صلاح و سداد، حسن اعتقاد، تقویٰ و احتیاط اور آخرت کی فکر و اہتمام پایا جائے، اور وہ اپنے ابنائے زمانہ سے اپنی دینداری اور سلامت روی میں ممتاز ہوں، ابن تیمیہ کا معاملہ یہی تھا کہ اس زمانہ کے ممتاز ترین اہلِ صلاح و رشد اور اصحاب علم و نظر ان کی عظمت و فضیلت، صحت اعتقاد و سلامت عقیدہ کے قائل و معترف اور ان کے مداح تھے، اور ان کے مخالفین میں بڑی تعداد حکومت کے متوسلین اور ابنائے دنیا کی تھی، جو جاہ طلبی کے مریض اور دولت و عزت کے خواہاں تھے[2]، صاحب "کواکب" لکھتے ہیں:

قالوا ومن امعن النظر ببصیرته لم یر	لوگ بیان کرتے ہیں کہ جو ذرا غور سے کام لے گا وہ
عالمًا من اهل ای بلدٍ شاء موافقًا له	دیکھے گا کہ ان کا جو موافق جس شہر میں بھی ہے وہ اس
الا ورأیه من اتبع علماء بلده للکتاب و	شہر کے علماء میں سب سے زیادہ کتاب و سنت کا متبع
السنة واشغلهم بطلب الآخرة والرغبة	اور طلبِ آخرت میں مشغول اور سب سے زیادہ اس کا

[1] جلاء العینین ص۸ [2] اس کلیہ سے وہ حضرات مستثنیٰ ہیں جن کو کوئی غلط فہمی تھی، یا ان کا اختلاف خالص علمی و اصولی تھا، "وما من عام الا وقد خُصَّ منه البعض"۔

فیها وابلغهم فی الاعراض عن الدنیا	حریص اور دنیا سے بے پروا، اور اس کی طرف
والاهمال لها ولا یری عالماً مخالفاً لہ منحرفاً	غیر متوجہ نظر آئے گا، اس کے برخلاف ان کا جو مخالف
عنه الا وهو من اکبرهم نهمة فی جمع الدنیا	نظر آئے گا وہ دنیا کا حریص، بوالہوس، ریاکار اور
واکثرهم ریاءً او سمعة واللہ اعلم۔[1]	شہرت کا طالب دکھائی دے گا۔ واللہ اعلم۔

علامہ ذہبی کے یہ الفاظ بھی فراموش کرنے کے قابل نہیں :۔

واخیف فی نصر السنة المحفوظة حتی	سنت کی نصرت کے جرم میں ان کو بہت ڈرایا
اعلی اللہ تعالیٰ منارہ وجمع قلوب	دھمکایا گیا، یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ نے ان کو سرخرو
اهل التقوی علی محبته والدعاء له۔[2]	اور معزز کیا، اور اہل تقویٰ کے قلوب کو ان کی
	محبت اور دعا کے لئے مجتمع کر دیا۔

فراست و کرامت

ہر چند کہ کشف و کرامت نہ بزرگی و مقبولیت کا جز ہے، نہ اس کی دلیل محققین نے صاف لکھ دیا ہے کہ "الاستقامة فوق الکرامة" اور یہ مسئلہ اب کسی بحث کا محتاج نہیں لیکن یہ بھی واقعہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے بہت سے مقبول بندوں کو بطریق انعام یہ دولت بھی عطا فرماتا ہے، اور ان کے ہاتھوں یا زبان سے ایسے واقعات کا ظہور ہوتا ہے، جو ان کی مقبولیت و وجاہت کے مؤیدات و آثار میں سے ہوتے ہیں، اہل سنت کا متفق علیہ مسئلہ ہے کہ "کرامات الاولیاء حق" اور قرآن و حدیث میں اس کے متعدد شواہد و واقعات ہیں، اور خود شیخ الاسلام کی کتابوں میں اس مسئلہ کی تقریر اور اس حقیقت کا اثبات ہے۔

---

[1] الکواکب الدریہ ص۱۶۱ [2] جلاء العینین ص۶

ان واقعات کی شہادت جو بطریقِ کرامت وخرق عادت پیش آئے ان کے تلامذہ واحباب ومعاصرین نے دی ہے اور متأخرین نے بھی اس کا اعتراف کیا ہے کہ وہ اس قدر مشہور اور بکثرت منقول ہیں کہ ان کا انکار ممکن نہیں، علامہ عینی صاحب "عمدۃ القاری شرح البخاری، تقریظ الردالوافر" میں لکھتے ہیں :-

وھذا الامام مع جلالۃ قدرہ فی العلوم	اپنی علمی عظمت وکمال کے ساتھ ان سے ایسی کرامات
نقلت عنہ علی لسان جم غفیر من الناس	کا بھی صدور ہوا ہے جس کو ایک جم غفیر نے نقل کیا
کرامات ظھرت منہ بلا التباس۔[1]	ہے اور ان میں شبہہ کی گنجائش نہیں۔

انہی کرامات کا ایک شعبہ "فراستِ صادقہ" ہے جو اکابر مومنین و اولیائے متقین کو حاصل ہوتی ہے، اس فراست کے عجیب و غریب واقعات نقل کئے جاتے ہیں، حافظ ابن قیم نے "مدارج السالکین" اور دوسری کتابوں میں اس "فراست" کے بہت سے واقعات نقل کئے ہیں، "مدارج السالکین" میں ایک جگہ لکھتے ہیں :-

ولقد شاھدت من فراسۃ شیخ الاسلام	میں نے شیخ الاسلام کی فراست کے عجیب و غریب
اموراً عجیبۃ وما لم نشاھدہ منھا اعظم	واقعات کا مشاہدہ کیا ہے اور جو واقعات میرے
واعظم، ووقائع فراستہ تستدعی	مشاہدہ میں نہیں آئے (بلکہ میں نے معتبر لوگوں کی
سفراً ضخماً۔[2]	زبانی سنے ہیں) وہ اور بڑھ چڑھ کر ہیں، ان کی فراست
	کے واقعات کے نقل کرنے کے لئے ضخیم کتاب چاہئے۔

مثلاً وحدۃ الوجود، فنا، بقا، معرفت، اعمالِ قلبیہ وغیرہ پر انھوں نے جو کچھ لکھا ہے اس سے پتہ چلتا ہے کہ وہ عملی طور پر بھی ان منازل سے گذرے ہوئے تھے، اور اس سلسلہ میں ان کو "اذواقِ عالیہ" اور "احوالِ صحیحہ" حاصل تھے، اور جو کچھ کہتے اور لکھتے ہیں وہ محض عام ذہانت، قوتِ علم یا

---

[1] الردالوافر ص ۵۹ [2] مدارج السالکین جلد ۲ صفحہ ۲۵۰

زورِ قلم کا نتیجہ نہیں ہے بلکہ ان کے تجربات و مشاہدات ہیں، ان مسائل و مباحث میں بعض مرتبہ ان کا کلام اور تحقیقات محققینِ صوفیہ اور مجتہدینِ فنِ سلوک (مثلاً مخدوم شیخ شرف الدین یحییٰ منیری اور امام ربانی حضرت شیخ احمد سرہندیؒ) کے کلام و تحقیقات سے مل جاتی ہیں، "رسالۃ العبودیۃ" میں فنا کے اقسام اور اس کے مراتب و مقامات کی تفصیل بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:۔

"فنا کی تین قسمیں ہیں، ایک فنا کا مقام وہ ہے جو انبیاء و اولیاء کاملین کو حاصل ہوتا ہے، ایک وہ مقام ہے جو ان اولیاء و صالحین کو حاصل ہوتا ہے، جو کمال و ترقی کے اس درجہ پر نہیں ہوتے ایک مقام منافقین و ملحدین اہل تشبیہ کا ہے، پہلا مقام یہ ہے کہ ماسوی اللہ سے ایسی فنائیت حاصل ہو جائے کہ صرف اللہ ہی کے لئے محبت اور اللہ ہی کی عبادت، اللہ ہی پر توکل، اور اللہ ہی کی طلب رہ جائے ماسوا کا کوئی گذر نہ رہ جائے، شیخ بایزید بسطامی کا یہ فقرہ جو منقول ہے کہ "لا ارید الا ما یُرِید" (میں نہیں چاہتا مگر وہی جو وہ چاہتا ہے) کا یہی مطلب لینا چاہئے، یعنی میری مراد وہی ہے جو خدا کا منشا و مرضی ہے، اور اس سے مراد دینی ارادہ ہے، عبد کا کمال یہی ہے کہ اس کے اندر اسی کا ارادہ، اسی کی محبت اور اسی سے رضامندی رہ جائے جس کا ارادہ اللہ تعالیٰ فرمائے اور جس سے وہ راضی ہو، اور جس کو وہ پسند فرمائے، اور اس سے مراد وہ اوامر الٰہی ہیں جن میں امر وجوب یا استحباب ہو، یہ ملائکہ انبیاء و صالحین کا مقام ہے جس کو یہ مقام حاصل ہو اس کو قلبِ سلیم کی دولت حاصل ہے۔ "اِلَّا مَنْ اَتَی اللّٰہَ بِقَلْبٍ سَلِیْمٍ" علماء نے اس کی یہی تفسیر کی ہے کہ وہ غیر اللہ کی عبادت یا غیر اللہ کے ارادے یا غیر اللہ کی محبت سے پاک ہو، اس کا نام فنا رکھا جائے یا نہ رکھا جائے یہی اسلام کی ابتداء و انتہا اور یہی دین کا باطن و ظاہر ہے۔

فنا کی دوسری قسم یہ ہے کہ ماسوا کے مشاہدے سے بالکل استغناء و غیبت کلی ہو جائے، یہ ایک مقام ہے جو بہت سے سالکین کو پیش آتا ہے، ان کے قلوب کا ذکر و عبادت اور محبت الٰہی

کی طرف ایسا انجذاب اور ایسی زور کی کشش ہوتی ہے کہ ان کے قلوب ماسوا کے مشاہدے کی تاب نہیں لا سکتے، اور اپنے مقصود کے سوا کچھ دیکھ نہیں سکتے، غیر اللہ کا ان کے دل میں گذر بھی نہیں ہو سکتا بلکہ اس کا احساس تک باقی نہیں رہتا، اس مقام میں جس طرح اس کشش اور انجذاب کو دخل ہے اسی طرح کسی درجہ میں ان کے قلوب کے ضعف کو بھی دخل ہے قرآن مجید میں ہے "وَاَصْبَحَ فُؤَادُ اُمِّ مُوْسٰى فٰرِغًا اِنْ كَادَتْ لَتُبْدِیْ بِهٖ لَوْلَاۤ اَنْ رَّبَطْنَا عَلٰى قَلْبِهَا" مفسرین نے لکھا ہے اس کا مطلب یہ ہے کہ حضرت موسیٰؑ کی والدہ کا دل سوائے حضرت موسیٰؑ کے خیال و یاد کے ہر چیز سے خالی ہو گیا، یہ بات اکثر ان لوگوں کو پیش آتی ہے جن پر اچانک کسی محبت یا خوف یا امید کا حملہ اور غلبہ ہوتا ہے اس وقت ان کا دل سوائے اس محبوب یا دشمن یا مطلوب کے ہر چیز سے سادہ اور خالی ہو جاتا ہے، اور بعض اوقات اس محبت یا خوف یا طلب میں ایسا استغراق ہو جاتا ہے کہ اس کے سوا کسی چیز کا احساس باقی نہیں رہتا جب کسی ایسے شخص پر جو فنا کے اس مقام پر ہے، اس حال کا پورا پورا غلبہ ہو جاتا ہے تو وہ اس موجود کے استغراق سے خود اپنے وجود سے بے خبر ہو جاتا ہے اس ایک شہود کے شہود کا ایسا غلبہ ہوتا ہے کہ اس کو اپنا شہود نہیں رہتا، اس ایک مذکور کے ذکر کا ایسا تسلط ہو جاتا ہے کہ اپنا ذکر و فکر بالکل جاتا رہتا ہے ایک کی معرفت ایسی طاری ہو جاتی ہے کہ اپنی معرفت باقی نہیں رہتی، اس وقت اس ایک وجود کے سوا تمام موجودات اس کی نظر میں معدوم اور فانی ہو جاتے ہیں، جس شخص کو اللہ تعالیٰ کی محبت یا معرفت میں یہ مقام حاصل ہو جائے اس کو تمام مخلوقات معدوم اور فانی نظر آنے لگتی ہیں اور صرف اللہ تعالیٰ کا وجود باقی رہ جاتا ہے اور حقیقت یہ ہوتی ہے کہ مخلوقات حقیقتاً معدوم اور فنا نہیں ہوتیں، بلکہ اس شخص کے شہود اور ذکر میں فنا اور گم ہو جاتی ہیں اور وہ ان کے ادراک یا شہود سے فانی ہو جاتا ہے جب اس چیز کا غلبہ ہو جاتا ہے

اور محب میں ایسا ضعف پیدا ہو جاتا ہے کہ اس کی قوتِ تمیز جواب دینے لگتی ہے تو بعض اوقات وہ اپنے کو عین محبوب سمجھنے لگتا ہے، واقعہ بیان کیا جاتا ہے کہ ایک شخص دریا میں کود پڑا، اس کا عاشق کھڑا دیکھ رہا تھا، وہ بھی اس کے پیچھے دریا میں کود پڑا، محبوب نے کہا کہ میں تو دریا میں کودا تھا، تم میرے پیچھے کیوں کود پڑے، اس نے کہا کہ تمہاری محبت میں مجھے اپنا ہوش نہ رہا، یہاں تک کہ مجھے ایسا محسوس ہونے لگا کہ تم اور میں، ایک ہی ہوں۔

اس مقام میں پہونچکر بہت سے لوگوں کے قدم کو لغزش ہوئی ہے، انھوں نے خیال کیا کہ یہ اتحاد ہے، اور محب محبوب سے مل کر ایک ہو جاتے ہیں، یہاں تک کہ ان کے اصل وجود میں کوئی فرق باقی نہیں رہتا، یہ بالکل غلط ہے، خالق کے ساتھ کوئی چیز بھی مل کر ایک نہیں ہو سکتی، بلکہ واقعہ یہ ہے کہ کوئی چیز بھی کسی چیز سے ملکر ایک نہیں ہو سکتی، دو چیزوں میں اتحادِ کلّی اسی وقت ہو سکتا ہے، جب وہ دونوں چیزیں بدل جائیں، یا بگڑ جائیں یا ان کے اتحاد سے ایک تیسری چیز پیدا ہوتی ہے، جو نہ وہ ہوتی ہے، نہ یہ ہوتی ہے، جیسے پانی اور دودھ، پانی اور شراب مل کر ایک تیسری چیز بن جاتی ہے، البتہ ارادہ، پسندیدگی اور ناپسندیدگی میں اتحاد ہو سکتا ہے، دو ہستیاں ارادے میں پسندیدگی اور ناپسندیدگی میں متحد ہو سکتی ہیں، ایک جس سے محبت کرے، دوسرا بھی اس سے محبت کرے، ایک جس سے بغض رکھے، دوسرا بھی اس سے بغض رکھے، ایک جس چیز کو پسند کرے، دوسرا بھی اس کو پسند کرے، اسی طرح ایک جس سے دشمنی کرے، دوسرا بھی اس سے دشمنی کرے، لیکن وہ فنائے کلّی جس میں دوسری موجودات بالکل معدوم ہونے لگیں، اور ان کا شہود و احساس بھی باقی نہ رہے، یہ ایک ناقص مقام ہے، ابوبکر و عمر جیسے اکابر اولیاء اور مہاجرین و انصار میں سے جن کو سبقت اور اولیت حاصل تھی، وہ اس فنا میں مبتلا نہیں ہوئے، جب وہ اس سے بالاتر تھے، تو انبیاء کرام کا کیا ذکر، اس طرح کے اذواق و حالات صحابۂ کرام کے بعد کے لوگوں کو پیش آئے ہیں، ان کے

قلب پر بعض مرتبہ ایسی ایمانی کیفیات وارد ہوئیں کہ ان کو عقل و ہوش اور تمیز باقی نہیں رہی، صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم بڑے کامل الاحوال، بڑے قوی القلب تھے، ایمانی کیفیات کے وقت نہ تو ان کی عقلیں معطل ہوتی تھیں، نہ ان میں حجاب، ضعف، سکر و بے خودی، فنا، یا مستی، دیوانگی کی کیفیات پیدا ہوتی تھیں، اس سلسلہ کی ابتدا دورِ تابعین میں ہوئی، اور بصرہ کے مرتاض اور کثیر العبادت لوگوں کو یہ حالات پیش آئے، ان میں سے بعض بعض لوگ قرآن مجید سن کر بے ہوش ہو جاتے، بعض کو موت بھی واقع ہوئی، جیسے ابوجہیر نابینا، زرارہ بن ابی اوفیٰ قاضی بصرہ، اسی طرح مشائخ صوفیہ کو بھی فنا اور سکر کی ایسی کیفیتیں حاصل ہوئیں کہ ایسی حالت میں ان میں تعقل و تمیز باقی نہیں رہی، اکثر ایسی حالت میں ان کی زبان سے ایسے کلمے بھی نکل جاتے جو ہوش میں آنے کے بعد ان کو صریحاً غلط معلوم ہوتے، شیخ بایزید بسطامی، شیخ ابوالحسن نوری اور شیخ ابوبکر شبلی کو یہ چیزیں پیش آئیں، اور ان سے ایسے واقعات نقل کئے جاتے ہیں، لیکن ابوسلیمان دارانی، معروف کرخی، فضیل بن عیاض، بلکہ جنید بغدادی وغیرہ سے اس طرح کی باتیں منقول نہیں، ایسے احوال میں بھی ان کی عقل اور قوت تمیز ان کا ساتھ نہیں چھوڑتی تھی، اور وہ اس طرح کے فنا و سکر میں مبتلا نہیں ہوتے تھے، ان کاملین کے ذہن میں سوا اللہ کی محبت اور اس کے ارادے کے کچھ نہیں ہوتا، ان کا علم اتنا وسیع اور وہ ایسے صاحبِ تمیز ہوتے ہیں کہ ان کو اشیاء اور امور اپنی اصل حالت اور صورت میں نظر آتے ہیں، بجائے اس کے کہ مخلوقات ان کے لئے معدوم یا غیر مشہود ہو جائیں، وہ اللہ کے حکم و ارادے کے ساتھ قائم، اس کی مشیئت کے تابع اور مسخر نظر آتی ہیں، بلکہ تسبیح و اطاعت میں مشغول، اس طرح یہ مشاہدہ ان کی بصیرت اور نذکر کو بڑھاتا ہے، اور ان کی معرفت، اخلاص، توحید و عبادت میں اضافہ کرتا ہے، یہی وہ حقیقت ہے جس کی طرف قرآن نے دعوت دی، اور یہی مومنین محققین اور عارفین و کاملین کا مقام ہے، اور ہمارے پیغمبر صلے اللہ علیہ وسلم ان سب کے امام و سرگروہ ہیں، اور

ان میں سب سے اکمل واعلیٰ ہیں، اس لئے جب آپ کو معراج ہوئی، اور آپ نے وہاں آیاتِ الٰہی کا مشاہدہ کیا اور آپ سے ہم کلامی اور سرگوشیاں ہوئیں، پھر جب آپ اس عالم میں تشریف لائے تو آپ کی حالت میں کوئی تغیر نہیں ہوا، اور نہ کسی نے اس کا اثر محسوس کیا حالانکہ حضرت موسیٰؑ پر ایسے مواقع میں ایک بے خودی اور بے ہوشی طاری ہو جاتی تھی۔

ایک اور حالت ہے جس کو بھی کبھی فنا کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے، وہ یہ کہ آدمی اس بات کی شہادت دے کہ خدا کے سوا کوئی چیز بھی موجود نہیں، اور یہ کہ خالق کا وجود ہی مخلوقات کا وجود ہے، اس لئے رب وعبد کے درمیان کوئی فرق نہیں، یہ ان اہل ضلال والحاد کا فنا ہے، جو حلول واتحاد میں مبتلا ہو جاتے ہیں، صاحبِ استقامت مشائخ میں اگر کوئی کہتا ہے کہ مجھے اللہ کے سوا کوئی اور نظر نہیں آتا، یا میں غیر اللہ کی طرف نہیں دیکھتا، یا اسی طرح کے کلمے، تو اس سے مراد یہ ہوا کرتی ہے کہ مجھے اس کے سوا کوئی رب نظر نہیں آتا، یا مجھکو اس کے سوا کوئی خالق یا اس کے سوا کوئی مدبر یا اس کے سوا کوئی معبود نہیں نظر آتا، یا میں محبت سے یا خوف کے ساتھ یا امید ورجاء کے ساتھ اس کے سوا کسی پر نظر نہیں ڈالتا، اس لئے کہ قاعدہ یہی ہے کہ آنکھ ہمیشہ اس کو دیکھتی ہے جس سے قلب متعلق ہوتا ہے، جس شخص کو کسی چیز سے محبت ہو، یا امید ہو، یا اس کا خوف ہو، وہ اسی طرف متوجہ رہے گا، اگر اس کے دل میں اس کی محبت یا امید یا خوف یا بغض یا قلب کے تعلق کی کوئی ایسی بات نہیں ہے، تو قلب میں اس کی طرف متوجہ ہونے کا ارادہ ہی پیدا نہ ہوگا، اور نہ وہ اس کی طرف نگاہ اٹھائے گا، اور نہ وہ اس کو دیکھے گا، اور اگر کبھی اس پر نظر پڑے گی تو محض اتفاقاً اور محض نگاہ جیسے کوئی شخص کسی دیوار کو یا کسی ایسی چیز کو دیکھتا ہے جس سے اس کا قلب متعلق نہیں، مشائخ صالحین کبھی کبھی خالص توحید اور اخلاص کامل کے متعلق کلمات ارشاد فرماتے ہیں، ان کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ بندہ غیر اللہ کی طرف ملتفت ہی نہ ہو اور نہ

ماسوا پر محبت یا خوف یا امید کے ساتھ نظر ڈالے بلکہ قلب تمام مخلوقات سے بالکل خالی اور فارغ ہو، ان کی طرف وہ اللہ کے نور کے ساتھ نظر کرے، حق ہی کے ذریعہ وہ سنے، حق ہی کے ذریعہ وہ دیکھے، حق ہی کے ساتھ وہ ہاتھ اٹھائے اور حق ہی کی قوت سے وہ چلے، جس سے اللہ کو محبت ہے اس سے وہ محبت رکھے، جس سے اللہ کو بغض ہے، اس سے وہ بھی بغض رکھے، جس کو اللہ دوست بنائے اس کو وہ بھی دوست بنائے، جس سے اللہ دشمنی کرے اس سے وہ بھی دشمنی کرے، ان کے معاملہ میں اللہ سے ڈرے، اور اللہ کے معاملہ میں ان سے نہ ڈرے، یہی وہ قلب سلیم، حنیفی موحد، مسلم، مومن ہے، جس میں انبیاء مرسلین والی معرفت، تحقیق و توحید پائی جاتی ہے، یہی وہ مقام ہے جس پر انبیاء کے پیرو فائز ہوتے ہیں، اور یہی فنائے محمود ہے، اسی مقام کے فائزین کی اللہ تعالیٰ نے مدح و توصیف کی ہے، اور ان کو اولیاء متقین، حزب مفلحین اور جند غالبین میں شمار کیا ہے۔

باقی فنا فی الوجود والی قسم (توحید وجودی یا وحدۃ الوجود) تو وہ قرامطہ جیسے آلِ فرعون کی تحقیق و توحید کی معرفت ہے، مشائخ و صالحین میں سے کسی کی بھی یہ مراد نہیں تھی، مخلوقات میں سے میں جس چیز کو اپنی آنکھ سے دیکھتا ہوں، وہی "رب الارض والسموٰت" ہے، یہ بات تو وہی کہہ سکتا ہے، جو پرلے درجہ کا گمراہ ہو، اور فسادِ عقل یا فسادِ اعتقاد میں مبتلا ہو یا جنون اور الحاد میں سے کسی کا شکار ہو، تمام مشائخ جو دین میں مقتدا کی حیثیت رکھتے ہیں، وہ سب اسی مسلک پر متفق ہیں جو اس امت کے سلف اور پیشواؤں کا مسلک تھا کہ خالق سبحانہ و تعالیٰ مخلوقات سے بالکل الگ ایک وجود رکھتا ہے، نہ تو اس کی مخلوقات میں اس کی ذات کا کوئی جزء ہے، اور نہ اس کی ذات میں اس کی مخلوقات کا کوئی جزء، وہ سب اس پر متفق ہیں کہ قدیم کو حادث سے الگ اور خالق کو مخلوق سے ممتاز سمجھنا چاہیئے، اس بارہ میں ان کے جو اقوال و ارشادات منقول ہیں، اس مختصر سے مضمون میں ان کی گنجائش نہیں، انھوں نے یہ بھی بتلایا ہے کہ قلوب کو کبھی کبھی ایسے امراض

وشبہات پیش آتے ہیں، اور بعض لوگوں پر ایسی کیفیت طاری ہوتی ہے کہ ان کو مخلوقات کے وجود کا مشاہدہ ہوتا ہے، اور وہ قوتِ تمیز کی کمزوری یا فقدان کی وجہ سے ان کو خالق الارض والسموٰت سمجھنے لگتے ہیں، جیسے ایک شخص آفتاب کی ایک شعاع دیکھتا ہے اور یہ سمجھ لیتا ہے کہ یہی وہ آفتاب ہے جو آسمان میں ہے۔

یہاں پر یہ بھی سمجھ لینا چاہئے کہ خالق ومخلوق میں تفریق کے دو مقام ہیں، ایک مقام وہ ہے کہ بندہ تفرقہ کا مشاہدہ کرے، اور کثرت اس کو پریشان کرے، اس کا قلب اس کثرت وتفرقہ کی وجہ سے انتشار میں رہے، وہ قلب ونظر کے انتشار میں گرفتار رہے، کبھی محبت کبھی خوف اور کبھی رجاء کی وجہ سے جو ان مخلوقات کے ساتھ قائم ہوجاتی ہے، اس کو یکسوئی اور توحید حقیقی حاصل نہ ہو، جب انسان اس تفریق سے جمع کی طرف اور کثرت سے وحدت کی طرف منتقل ہوتا ہے تو اس قلب کو جمعیت اور اس وحدہٗ لاشریک لہٗ کی توحید وعبادت کی لذت حاصل ہوتی ہے، اور اس کا قلب مخلوقات کی طرف متوجہ رہنے کے بعد اللہ تعالیٰ کی طرف کلیۃً ملتفت ہوجاتا ہے، اس کی محبت، اس کا خوف، اس کی امید، اس کی استعانت سب اللہ تعالیٰ کے ساتھ متعلق ہوجاتی ہے، اس حالت میں بعض اوقات اس کے قلب میں مخلوقات کی طرف نظر کرنے کی گنجائش باقی نہیں رہتی، جس کے ذریعہ وہ خالق ومخلوق کے درمیان امتیاز کرے، اس کو حق تعالیٰ کی طرف التفات کلّی اور خلق کی طرف سے اعراض کلّی حاصل ہوتا ہے، ہم نے فنا کی جس دوسری قسم کا اوپر ذکر کیا ہے، یہ حالت بھی اس سے ملتی جلتی ہے، لیکن اس کے بعد تفریق کا ایک دوسرا مقام ہے، جو اس سے بلند وبرتر ہے، وہ یہ کہ بندہ مشاہدہ کرے کہ مخلوقات اللہ تعالیٰ کے ساتھ قائم اس کے امر کے تابع، اور اس کے ارادہ سے مسخر ہیں، اللہ تعالیٰ کی وحدانیت کے سامنے وہ ان کی کثرت کو معدوم دیکھے، وہ یہ مشاہدہ کرے کہ اللہ تعالیٰ مصنوعات کا رب، الٰہ، خالق اور مالک ہے، ایسی حالت میں کہ اس کا دل اللہ تعالیٰ

کی طرف یکسو ہوتا ہے، اور اس کو اخلاص و محبت، خوف و رجا، استعانت و توکل علی اللہ، حب فی اللہ و بغض فی اللہ کی جیسی کیفیات حاصل ہوتی ہیں، وہ خالق و مخلوق کے درمیان فرق کو بھی صاف صاف دیکھ رہا ہوتا ہے، اور ان دونوں کے درمیان صاف صاف تمیز کرتا ہوتا ہے، وہ مخلوقات کے تفرّق و کثرت کو بھی دیکھتا ہوتا ہے، اور اس بات کی بھی گواہی دیتا ہوتا ہے کہ اللہ تعالٰی ہر چیز کا رب، اس کا مالک اور خالق ہے (ان اللہ رب کل شئ ومليكه وخالقه وانه هو الله لا اله الا هو) یہی صحیح اور مستقیم شہود ہے، اور یہی "لا الٰہ الا اللہ" کی تحقیقی شہادت ہے۔[1]

ان کی تصنیفات میں اس طرح کی تحقیقات اور علوم صحیحہ بہت ہیں، حافظ ابن قیم نے "مدارج السالکین" میں ان کی تحقیقات و کیفیات کا بہت سا ذخیرہ جمع کر دیا ہے، ان کے انہی معارف و احوال کو دیکھ کر ملا علی قاری نے استاد و شاگرد کے متعلق لکھا ہے :-

ومن طالع شرح منازل السائرين	جو شخص "منازل السائرین" کی شرح (مدارج السالکین)
تبين له انهما كانا من اكابر اهل	کا مطالعہ کرے گا اس پر واضح ہو جائے گا کہ ابن تیمیہ
السنة والجماعة ومن اولياء هذه	ابن قیم اہلِ سنت والجماعت کے اکابر اور امتِ
الامة۔[2]	محمدی کے اولیاء اللہ میں سے تھے۔

---

[1] رسالۃ العبودیہ فی تفسیر قولہ تعالٰی "یا ایہا الناس اعبدوا ربکم" ص ۳۵-۳۸ شامل مجموعۂ رسائل مطبعہ حسینیہ مصریہ۔

[2] مرقاۃ شرح مشکوٰۃ، ج ۴ ص ۴۲۷

شیخ الاسلام حافظ ابن تیمیہؒ کا تجدیدی و اصلاحی کام

شیخ الاسلام حافظ ابن تیمیہ نے اسلام کی تاریخ دعوت وعزیمت میں جو اہم کارنامہ انجام دیا، وہ اگرچہ بہت سے علمی و عملی شعبوں اور پہلوؤں پر حاوی ہے لیکن اس کو ان چار حصوں پر تقسیم کیا جا سکتا ہے جو ان کی تاریخ اصلاح و تجدید میں خصوصی اہمیت رکھتے ہیں، یہ چار اہم شعبے حسب ذیل ہیں:۔

۱۔ عقیدۂ توحید کی تجدید اور مشرکانہ عقائد و رسوم کا ابطال۔

۲۔ فلسفہ و منطق اور علم کلام کی تنقید اور کتاب و سنت کے طرز و اسلوب کی ترجیح۔

۳۔ غیر اسلامی ملل و فرق کی تردید اور ان کے عقائد، رسوم و اثرات کا مقابلہ۔

۴۔ علوم شریعت کی تجدید اور فکر اسلامی کا احیا۔

عقیدۂ توحید کی تجدید اور مشرکانہ عقائد و رسوم کا ابطال

امام ابن تیمیہ کے زمانہ میں مشرکانہ عقائد و رسوم

غیر مسلم اور عجمی اقوام کے اختلاط، اسمٰعیلی و باطنی حکومت کے نفوذ و اثر، نیز جاہل اور گمراہ صوفیوں کی تعلیم و عمل سے عام مسلمانوں میں مشرکانہ عقائد و رسوم کا رواج ہو چلا تھا، بہت سے مسلمان اپنے دینی پیشواؤں، مشائخ طریقت اور اولیاء و صالحین کے بارے میں اسی طرح کے

غالیانہ اور مشرکانہ خیالات اور عقیدہ رکھنے لگے تھے، جو یہود و نصاریٰ حضرت عزیرؑ و مسیحؑ اور اپنے احبار اور رہبان کے متعلق رکھتے تھے، بزرگانِ دین کے مزارات پر جو کچھ ہونے لگا تھا، وہ ان سب اعمال و رسوم کی ایک کامیاب نقل تھی، جو غیر مسلموں کی عبادتگاہوں اور مقدس شخصیتوں کی قبروں پر ہوتے تھے، اہل قبور سے صاف صاف استعانت و استغاثہ کا معاملہ ہونے لگا تھا، ان سے فریاد اور ان کی دہائی دینے، سوال و دعا کرنے کا رواج ہو گیا تھا، ان کی قبور پر بڑی بڑی مسجدیں تعمیر کرنے اور خود قبور کو سجدہ گاہ بنانے، ان پر سال بسال میلہ لگانے اور دور دور سے سفر کر کے وہاں آنے کا عام دستور تھا، ساتویں صدی کے آخر میں یہ غلو اور عقیدہ اور عمل کا فساد جس حد تک پہنچ گیا تھا، اس کا کچھ اندازہ ان اقتباسات سے ہو سکتا ہے، جو خود شیخ الاسلام ابنِ تیمیہ کی تصنیفات اور تحریروں سے ماخوذ ہیں، ان اقتباسات میں انھوں نے کسی جواب کے سلسلہ یا کسی بحث کے ضمن میں اپنے زمانہ کی بعض گمراہیوں کا ذکر کیا ہے، اور اس سے ان کے زمانہ کے دینی انحطاط اور قلب اسلام پر جاہلیت کے حملہ کی شدت کا کسی قدر اندازہ ہوتا ہے :۔

"بہت سے لوگوں نے مُردے کو بالکل خدا کا درجہ اور اس زندہ پیر کو جو اس کی قبر کا مجاور یا اس کا جانشین ہے، پیغمبر کا مرتبہ دے رکھا ہے، وہ مُردے سے اپنی کاربرآری اور مشکل کشائی کا مطالبہ کرتے ہیں، انھوں نے اپنے اس زندہ پیر یا بزرگ کو یہ مرتبہ دے رکھا ہے کہ جس چیز کو وہ حلال کر دیں، وہی حلال، اور جس چیز کو وہ حرام کہہ دیں وہی حرام ہے، انھوں نے درحقیقت اپنے حساب سے اللہ تعالیٰ کو خدائی کے منصب اور محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کو نبوت کے مرتبہ سے سبکدوش کر دیا ہے، اکثر ایسا ہوتا ہے کہ کوئی نو مسلم یا ان کا پیرو عقیدت مندی کی بنا پر آتا ہے اور صاحبِ مزار سے کسی بادشاہ کے ظلم کو دفع کرنے یا کسی اور مطلب کی کاربرآری کے لئے دعا کرتا ہے تو یہ مجاور اندر جاتا ہے، اور کہتا ہے کہ میں نے حضرت صاحب سے عرض کر دیا، حضرت صاحب نے پیغمبر صاحب سے

فرمادیا پیغمبر صاحب نے اللہ تعالے تک پہونچایا، اللہ تعالے نے فلاں بادشاہ کے پاس اپنا قاصد بھیجا کر (خبردار فلاں آدمی پر زیادتی نہ ہونے پائے) کیا یہ کھلا ہوا مشرکین و نصاریٰ کا دین نہیں ہے؟ اس میں تو اتنی غلط بیانی اور ایسا جہل صریح ہے جس کو ہر مشرک اور ہر نصرانی بھی گوارا نہیں کرسکتا، اور وہ بھی اس فریب میں نہیں آسکتے، یہ مجاور لوگ جس طرح بے تکلف نذر و نیاز اور ان قبروں کے چڑھاوے کھاتے ہیں، وہ قرآن مجید کی اس آیت کی پوری تفسیر و تصویر ہے "یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اِنَّ كَثِیْرًا مِّنَ الْاَحْبَارِ وَالرُّهْبَانِ لَیَاْكُلُوْنَ اَمْوَالَ النَّاسِ بِالْبَاطِلِ وَیَصُدُّوْنَ عَنْ سَبِیْلِ اللّٰهِ"[1] (اے ایمان والو۔ یہود و نصاریٰ کے بہت سے علماء و مشائخ لوگوں کا مال ناحق کھاتے ہیں اور اللہ کے راستہ سے روکتے ہیں۔)

کھلا قبر پرستی

"ان جہلا میں سے بہت سے لوگ صاف صاف قبر کی طرف منھ کرکے نماز پڑھتے ہیں بعض بعض لوگوں کو اس طرح دعا کرتے سنا گیا ہے کہ "حضرت میری مغفرت فرما دیجئے، مجھ پر رحم کھائیے" بعضے آدمی قبر کو سامنے رکھ کر اور کعبہ کی طرف پیٹھ کرکے نماز پڑھتے ہیں، اور کہتے ہیں کہ قبر تو خواص کا قبلہ ہے اور کعبہ عوام کا، یہ بھی ان لوگوں کا مقولہ ہے، جو عبادت و زہد میں ممتاز ہیں اور جن کے سیکڑوں ہزاروں مرید و معتقد ہیں اور یہ بھی ممکن ہے کہ وہ اپنے شیخ کے پیروؤں میں سب سے بہتر ہوں، اس شخص کا اپنے شیخ کے بارے میں یہ قول ہے بعض ایسے شیوخ اور مقتدا بھی ہیں، جو بڑی ریاضت و مجاہدہ کرتے ہیں، جب مرید اُن کے ہاتھ پر توبہ کرتا ہے تو وہ سب سے پہلے ان کو یہ ہدایت کرتے ہیں کہ وہ شیخ کی قبر پر جاکر چلّہ کھینچے جیسے کہ بت پرست اپنے اپنے بتوں پر آسن جمائے بیٹھے ہوتے تھے ان قبر پرستوں میں بہت سے لوگوں کو ان قبروں کی پرستش میں وہ رقت و خشوع، دعا کی کیفیت اور حضور قلب حاصل ہوتا ہے جو ان کو مساجد میں حاصل

---

[1] الرد علی البکری ص ٢٩٥

نہیں ہوتا، جن کے متعلق اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے "فِی بُیُوتٍ اَذِنَ اللّٰہُ اَنْ تُرْفَعَ وَیُذْکَرَ فِیْھَا اسْمُہٗ"
(ترجمہ۔ ان گھروں (مساجد) میں جن کے لئے اللہ کا حکم ہے کہ بلند کئے جائیں اور ان میں اس کا نام لیا جائے[1])

خدا سے بے خوفی اور صاحبِ مزار سے خوف وخشیت

"ان لوگوں کا اعتقاد اور قبور سے تعلق اتنا بڑھا ہوا ہے کہ وہ بے تکلف کبائر اور منہیات کا ارتکاب کرتے رہتے ہیں، لیکن جب وہ مزار کا گنبد یا کلس دیکھ لیتے ہیں تو رک جاتے ہیں، ایک دوسرے سے کہتا ہے، خبردار، یہ گنبد کا کلس نظر آرہا ہے، ان کو اس کلس کے نیچے دفن ہونے والے انسان کا تو خیال خطرہ ہوتا ہے، اور اس خدا کا ذرا بھی لحاظ نہیں ہوتا جو آسمانوں اور زمین کا خالق ہے، اور جس کے حکم سے چاند گھٹتا اور بڑھتا ہے، ان کا خیال یہ ہے کہ اگر ان سے کوئی بحث کرے تو اپنے حریف کو ان بزرگوں کے جلال اور قدرت سے ڈراتے ہیں، بالکل جس طرح مشرکین نے ابراہیم علیہ السلام کو ڈرایا تھا، قرآن شریف میں ہے:۔

وَحَاجَّہٗ قَوْمُہٗ قَالَ اَتُحَاجُّوْنِّیْ فِی اللّٰہِ وَقَدْ	اور اس کی قوم نے اس سے جھگڑا کیا، اس نے کہا
ھَدٰىنِ وَلَآ اَخَافُ مَا تُشْرِکُوْنَ بِہٖٓ اِلَّآ اَنْ یَّشَآءَ	کیا تم مجھ سے اللہ کے ایک ہونے میں جھگڑتے ہو اور اس نے
رَبِّیْ شَیْئًا وَسِعَ رَبِّیْ کُلَّ شَیْءٍ عِلْمًا اَفَلَا	میری رہنمائی کی ہے اور جنہیں تم شریک کرتے ہو میں ان سے
تَتَذَکَّرُوْنَ ۝ وَکَیْفَ اَخَافُ مَآ اَشْرَکْتُمْ	نہیں ڈرتا، مگر یہ کہ میرا رب مجھے کوئی تکلیف پہنچانا
وَلَا تَخَافُوْنَ اَنَّکُمْ اَشْرَکْتُمْ بِاللّٰہِ مَا لَمْ	چاہے میرے رب نے علم کے لحاظ سے سب چیزوں پر
یُنَزِّلْ بِہٖ عَلَیْکُمْ سُلْطٰنًا فَاَیُّ الْفَرِیْقَیْنِ	احاطہ کر رکھا ہے کیا تم سوچتے نہیں ہو اور میں تمہارے
اَحَقُّ بِالْاَمْنِ اِنْ کُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ۝ اَلَّذِیْنَ	شریکوں سے کیوں ڈروں حالانکہ تم اس بات سے

[1] الرد علی البکری ص ۲۹۵

اٰمَنُوْا وَلَمْ يَلْبِسُوْٓا اِيْمَانَهُمْ بِظُلْمٍ اُولٰٓئِكَ لَهُمُ الْاَمْنُ وَهُمْ مُّهْتَدُوْنَ ۝[۲]	نہیں ڈرتے کہ تم اللہ کا شریک ٹھہراتے ہو اس چیز کو جس کی اللہ نے تم پر کوئی دلیل نہیں اتاری اگر تم کو کچھ سمجھ ہے تو بتاؤ دونوں جماعتوں میں سے امن کا زیادہ مستحق کون ہے، جو لوگ ایمان لائے اور انھوں نے اپنے ایمان میں شرک نہیں ملایا، امن ان ہی کے لئے ہے، اور وہی راہِ راست پر ہیں۔[۱]

اللہ اور شعائر اللہ سے استہزاء و استخفاف

"یہ قبر پرست توحید اور خدائے واحد کی عبادت کا مذاق اڑاتے ہیں، اور جن کو خدا کو چھوڑ کر اپنا شفیع اور کارساز بنا رکھا ہے، ان کی بڑی تعظیم کرتے ہیں، ان میں سے بہت سے لوگ حج بیت اللہ اور حجاج کی تحقیر کرتے ہیں، اور یہ عقیدہ رکھتے ہیں کہ ان کے ائمہ اور شیوخ کی زیارت حج بیت اللہ سے افضل ہے، یہ عقیدہ اہلِ تشیع اور بہت سے سنی کہلانے والوں میں بھی پایا جاتا ہے، کچھ لوگ مساجد، اور نماز پنجگانہ کی تحقیر کرتے ہیں، اور عقیدہ رکھتے ہیں کہ ان کے شیخ کی دعا اس سے افضل و اعلیٰ ہے، یہ عقیدہ ان شیعوں میں ابھی تک موجود ہے، جو یونس قلیسی کی طرف اپنی نسبت کرتے ہیں، ان کی اس گیت سے اندازہ ہوگا۔

تعالوا نخرب الجامع	ونجعل فيه خماره
ونكسر المنبر	ونجعل منه طنباره
ونخرق المصحف	ونجعل منه زماره

---

[۱] الرد علی البکری ص۲۹۵ [۲] سورۂ انعام ۔ ۸۱ ۔ ۸۲ ۔ ۸۳

ونتف لحية القاضي ونجعل منه اوتاره[1]

مشرکین کی بیباکی و شوخ چشمی

"ان کی بیباکی کا حال یہ ہے کہ بے تکلف جھوٹی قسم کھا لیتے ہیں، لیکن اپنے شیخ کی جھوٹی قسم نہیں کھا سکتے۔ ان میں بعض بعض لوگ کہتے ہیں کہ جو رزق میرے پیر کی طرف سے نہ ملے وہ مجھے قبول نہیں، ان میں سے بعض بکری ذبح کرتے ہیں، اور کہتے ہیں کہ "میرے آقا کے نام سے" بعض صاف صاف کہتے ہیں کہ ان کے شیخ انبیاء و مرسلین سے افضل تھے، ان میں سے بعض ان کے متعلق الوہیت کا اعتقاد رکھتے ہیں، جیسے کہ نصاریٰ حضرت مسیحؑ کے متعلق رکھتے تھے، جب وہ اپنے شیخ کا ذکر کرتے ہیں تو بڑی تعظیم و تکریم سے کرتے ہیں، اور ان کی الوہیت کا دعویٰ کرتے ہیں، انھوں نے اپنے اپنے بزرگوں کی طرف سے بڑے بڑے شعر بنا رکھے ہیں، جن میں صاف صاف خدائی کا دعویٰ ہے، اور بڑی بڑی لن ترانیاں ہیں، کوئی کہتا ہے کہ موسیٰؑ طور پر مجھی سے ہمکلام ہوئے تھے، اور میری ہی تجلی دیکھ کر بیہوش ہو گئے تھے، کوئی کہتا ہے کہ عرش پر میں نے ہی چیخ ماری تھی، جو عالم میں شور مچ گیا، اور ساتوں سمندر میری ہی ہیبت سے تلاطم میں ہیں"[2]

بزرگوں کی الوہیت کا اعتقاد

"بہت سے جہلاء و مشرکین پیغمبروں اور بزرگانِ دین کے متعلق یہ اعتقاد رکھتے ہیں کہ وہی دنیا کا

---

[1] آؤ ہم لوگ مسجد کو : ویران کردیں اور اس میں شراب کی دوکان قائم کردیں
اور منبر کو توڑ کر .... اس سے ساز و مزامیر بنائیں
اور قرآن کو پھاڑ کر .... اس سے بانسری بنائیں
اور قاضی کی داڑھی اکھاڑ کر اس سے اس کے تانت بنائیں

[2] الرد علی البکری ص ۳۵۱

انتظام کرتے ہیں، پیدائش اور رزق کی ضرورتوں کا پورا کرنا، مصیبتوں کا دور کرنا ان ہی کا کام ہے، یہ قطعاً مسلمانوں کا عقیدہ نہیں ہو سکتا، نصاریٰ بھی صرف حضرت مسیحؑ کے متعلق ایسا اعتقاد رکھتے ہیں، اس لئے کہ وہ اتحاد و حلول کے قائل ہیں، اسی بنا پر حضرت ابراہیمؑ و موسیٰؑ اور دوسرے انبیاء کے متعلق بھی ان کا اعتقاد نہیں باوجودیکہ وہ پرلے درجہ کے جاہل ہیں[1]۔

بہت سے لوگوں کا عقیدہ ہے کہ جس شہر یا بستی میں کسی بزرگ کا مزار ہوتا ہے، اسی کی برکت سے ان کو رزق ملتا ہے، ان کی مدد ہوتی ہے، اور دشمنوں سے حفاظت ہوتی ہے، اور ملک محفوظ رہتا ہے، جس شخص سے ان کو اعتقاد ہوتا ہے، اس کے متعلق کہتے ہیں کہ وہ فلاں شہر کا پاسبان ہے، مثلاً سیدہ نفیسہ مصر و قاہرہ کی پاسبان ہیں، فلاں و فلاں بزرگ دمشق وغیرہ کے محافظ ہیں، فلاں و فلاں بغداد وغیرہ کے پہرہ دار ہیں، ان کا عقیدہ ہے کہ ان ہی صالحین و انبیاء کی قبروں کی برکت سے ان شہروں اور بستیوں سے بلا دفع ہوتی ہے[2]۔

ان لوگوں کا حال یہ ہے کہ جب دشمن نے دمشق کا رخ کیا، تو یہ (قبر پرست) بزرگوں سے فریاد کرنے کے لئے مقابر و مزارات کی طرف روانہ ہوئے جن سے ان کو اس خطرہ کے دفع کرنے کی امید تھی، اور بعض شعراء نے کہا:۔

یا خائفین من التتر	لوذوا بقبر ابی عمر
اے تاتاریوں سے ڈرنے والو	ابو عمرؒ کی قبر کی پناہ میں آجاؤ

دوسرے نے کہا:۔

عوذوا بقبر ابی عمر	ینجیکم من الضرر
ابو عمر کی قبر سے پناہ حاصل کرو	تم کو وہ تکلیف سے نجات دیں گے[3]

---

[1] الرد علی البکری ص۳۲۸ [2] الرّد علی الاخنائی ص۸۲ [3] الرّد علی البکری ص۳۷۷-۳۷۸

مشاہد کا فتنہ

اس اولیا پرستی اور قبر پرستی کا قدرتی و لازمی نتیجہ یہی ہے کہ مساجد کے مقابلہ میں "مشاہد" کی اہمیت بڑھ جائے، اور وہ "زیارت گاہ خلائق" اور عوام و جہاں کا قبلۂ حاجات بن جائیں، چنانچہ عالمِ اسلام کے چپہ چپہ پر ان مشاہد و مزارات کا جال بچھ گیا، ہزاروں، لاکھوں صحیح اور جعلی قبریں بن گئیں، امراء و سلاطین نے بڑی فراخدلی اور حوصلہ مندی سے ان کے لئے املاک و زمین وقف کی، ان مزاروں و بزرگوں کی جگہوں پر سر بفلک عمارتیں اور طلائی گنبد تعمیر ہوئے، مجاورین، جاروب کشوں، اور خادموں کی ایک مستقل قوم اور امت وجود میں آئی، دھوم دھام اور بڑے تزک و احتشام کے ساتھ ان کی طرف سفر کا رواج ہوا، اور بڑے بڑے قافلے دور دراز مقامات سے اس طرح سفر کر کے جانے لگے کہ حجاج کے قافلوں کے ہمسر یا ان سے کچھ بڑھے ہوئے نظر آنے لگے، مساجد سے عام مسلمانوں کی توجہ ہٹ کر مشاہد کی طرف ہو گئی، ساتویں اور آٹھویں صدی ہجری میں "مشاہد و مزارات" نے دینی زندگی میں پوری مرکزیت اور مرجعیت اختیار کر لی تھی، اور وہ بیت اللہ کے حریف و رقیب بن گئے تھے، شیخ الاسلام ابن تیمیہ کی تصنیفات و تحریروں سے پتہ چلتا ہے کہ "مشاہد" کا فتنہ کتنا جڑ پکڑ چکا تھا، اور جاہل و اہل غرض مسلمانوں کو اس سے کتنا تعلق ہو گیا تھا، اس فتنہ کے طاقت پکڑنے اور وسیع ہونے میں اس بات کو بھی بڑا دخل تھا کہ باطنی[1] سلطنت نے صدیوں بڑے کر و فر سے مغربِ اقصیٰ سے مصر و شام تک حکومت کی تھی، اہل رفض و تشیع کو شروع سے مساجد سے زیادہ مشاہد سے اور حرمین سے زیادہ نجف و کربلا و مشہد سے تعلق رہا ہے، امام ابن تیمیہ کی ولادت سے پیشتر اگرچہ مصر کی "فاطمی" سلطنت ختم ہو چکی تھی، لیکن اس کے ذہنی و تہذیبی

---

[1] یہ عام طور پر "فاطمی سلطنت" کے نام سے معروف ہے، یہ درحقیقت عبیدیوں کی سلطنت ہے، ملاحظہ ہو "تاریخ دعوت و عزیمت حصہ اول" ص ۳۴۹ دوسرا ایڈیشن۔

اثرات ابھی باقی تھے، خاص طور پر شام میں بڑی تعداد میں شیعہ و اسمٰعیلی موجود تھے جن کی صحبت کا اثر عام اور جاہل مسلمانوں پر پڑ رہا تھا، پھر غلط قسم کے تصوف نے جس میں بزرگوں کے مزارات و مشاہد خاص اہمیت اور تقدس رکھتے تھے اور ان پر سالانہ اجتماعات (عرس) وغیرہ کا رواج ہو چلا تھا، ان مشاہد و مزارات کو اور زیادہ چمکا دیا تھا، اور اب وہ شرک و بدعات کا ایک بڑا ذریعہ بن گئے تھے، امام ابن تیمیہ ان مشاہد و مزارات کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں :-

مشاہد و مزارات کا حج

"کچھ لوگ ہیں جو قبروں کا حج کرتے ہیں، کچھ لوگوں نے اس سفر کے آداب و احکام پر مستقل کتابیں تصنیف کی ہیں جن کا نام انھوں نے "مناسک حج المشاہد" رکھا ہے، چنانچہ ایک شیعہ عالم ابوعبداللہ محمد بن نعمان الملقّب بالمفید کی اسی نام کی مستقل تصنیف ہے جس میں ایسی بہت سی بے سروپا روایات اہلِ بیت کی طرف منسوب کی ہیں جن کا بے اصل ہونا اہل نظر سے مخفی نہیں، کچھ لوگ بڑی دھوم دھام کے ساتھ مشائخ کے قبور کی زیارت کے لئے سفر کر کے جاتے ہیں اگرچہ وہ اس کو مناسک یا حج تو نہیں کہتے لیکن دونوں میں کوئی فرق نہیں، ان میں سے بعض بعض لوگ جب قسم کھاتے ہیں تو کہتے ہیں کہ "وحق النبی الذی تحج الیہ المطایا" وہ آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کی طرف حج کا ذکر کرتے ہیں، بیت اللہ کی طرف حج کا ذکر نہیں کرتے، بعض حجاج کا حج سے بڑا مقصد قبر مبارک کی زیارت ہوتی ہے نہ کہ حج بیت اللہ۔[1]

حج بیت اللہ پر ترجیح

"بعض بعض لوگ مقابر کے حج کو حج بیت اللہ پر ترجیح دیتے ہیں، بعض لوگوں کا عقیدہ ہے کہ اگر

[1] الرد علی البکری ص ۲۹۵

فلاں بزرگ کی قبر کی زیارت دو مرتبہ یا تین مرتبہ کر لی جائے تو ایک حج بن جائے گا، بعض کسی بزرگ کے مزار کو میدان عرفات قرار دیتے ہیں، اور حج کے زمانہ میں سفر کر کے وہاں جاتے ہیں، اور اسی طرح وقوف کرتے ہیں، جیسے مسلمان میدانِ عرفات میں کرتے ہیں، اور مغرب و مشرق میں ایسا ہوتا رہتا ہے، بعض لوگوں کے اعتقاد میں اس مقدس مقام یا اپنے بزرگ کی قبر کا سفر حج سے بھی افضل ہے، ایک مرید نے جس نے سات حج کئے تھے، دوسرے مرید سے کہا کہ شیخ کی قبر کی زیارت ان سات حج کے بدلے میں فروخت کرتے ہو؟ اس نے اپنے پیر سے مشورہ کیا، اس نے اس سے کہا کہ اگر تم نے یہ سودا کر لیا تو تم بڑے گھاٹے میں رہو گے، ان میں بعض کو کہتے سنا گیا ہے کہ جو شیخ کی قبر کے سات پھیرے کر لے، اس کو ایک حج کا ثواب ملے گا۔[1]

مساجد کی ویرانی و کس مپرسی اور مشاہد کی رونق و اہتمام

• ان میں سے بہت سے لوگ مساجد کو ویران رکھتے ہیں، اور مشاہد کو بڑا آباد و پر رونق، ان کی مسجد جو نمازِ پنجگانہ کے لئے بنائی گئی ہے، بالکل ویران اور بے چراغ نظر آتی ہے، غریب اہلِ محلہ اگر دری فرش کا انتظام کر دیں تو کر دیں ورنہ یہ بھی نہیں، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جیسے کوئی سرائے ہے جس کا کوئی پرسان حال نہیں، اس کے مقابلہ میں مزار و مقبرہ کا حال یہ نظر آتا ہے کہ پردے اس پر پڑے ہوئے ہیں، سونے چاندی سے اس کو مرصع کیا گیا ہے، سنگ مرمر کا فرش ہے، صبح و شام نذر و نیاز آ رہی ہے، کیا یہ اللہ اور اس کی آیات اور اس کے رسولؐ کی کھلی ہوئی تحقیر اور شرک کی علانیہ تعظیم نہیں ہے، یہ سب کیوں ہوتا ہے؟ ان کا عقیدہ یہ ہے کہ صاحبِ مزار کی دعا اور اس کی دہائی اللہ کے گھر میں اللہ سے مانگنے اور اس کے نام کی دہائی دینے سے زیادہ مؤثر و مفید ہے، اس لئے قدرتی طور پر خدا کے گھر (مسجد) کے مقابلہ میں اس گھر کو ترجیح حاصل ہوئی، جو مخلوق سے دعا کے لئے بنایا گیا ہے، اگر مسجد کے لئے کبھی کوئی وقف ہے، اور مزار کے لئے بھی

---

[1] الرد علی البکری ص ۲۹۷

کوئی وقف ہے تو مزار کا وقف ان کے نزدیک زیادہ اہم اور مہتم بالشان ہوگا، اور مسجد سے بڑھا ہوگا، اس بارے میں وہ مشرکین عرب کے قدم بہ قدم ہیں، جن کا حال اللہ تعالیٰ نے سورہ انعام میں اس طرح بیان کیا ہے:۔

وَجَعَلُوْا لِلّٰهِ مِمَّا ذَرَاَ مِنَ الْحَرْثِ وَالْاَنْعَامِ	اور اللہ کی پیدا کی ہوئی کھیتی اور مویشیوں میں سے ایک حصہ
نَصِيْبًا فَقَالُوْا هٰذَا لِلّٰهِ بِزَعْمِهِمْ وَهٰذَا	اس کے لئے مقرر کرتے ہیں اور اپنے خیال کے مطابق کہتے
لِشُرَكَآئِنَا ۚ فَمَا كَانَ لِشُرَكَآئِهِمْ فَلَا يَصِلُ اِلَى	ہیں کہ یہ اللہ کا حصہ ہے اور یہ ہمارے شریکوں کا ہے، سو جو
اللّٰهِ ۚ وَمَا كَانَ لِلّٰهِ فَهُوَ يَصِلُ اِلٰى شُرَكَآئِهِمْ ۚ	حصہ ان کے شریکوں کا ہے وہ اللہ کی طرف نہیں جا سکتا
سَآءَ مَا يَحْكُمُوْنَ[2] ○	اور جو اللہ کا ہے، وہ ان کے شریکوں کی طرف جا سکتا
	ہے، کیسا برا فیصلہ کرتے ہیں[1]۔

مندرجۂ بالا اقتباسات سے ناظرین کو اندازہ ہوا ہوگا کہ ساتویں اور آٹھویں صدی میں باوجود اس کے کہ طاقتور اسلامی سلطنتیں قائم تھیں، اور بڑے بڑے ائمۂ فن، کبار محدثین و فقہاء موجود تھے، بڑے بڑے مدارس اور علمی مرکزوں کا وجود تھا، عوام و جہلا کن اعتقادی اور عملی گمراہیوں میں مبتلا تھے، اور کس درجہ کے مشرکانہ عقائد و اعمال مسلم معاشرہ اور عام مسلمانوں کے مزاج میں درخور پا گئے تھے، عوام اور جہلاء سے قطعِ نظر بہت سے علماء اور فقہاء بھی ان عقائد و اعمال کے بارے میں بہت سے شبہات میں گرفتار تھے، اور ان کی تحریروں اور فتاویٰ کو دیکھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ شرک و توحید کے بارے میں ان کا ذہن بھی اتنا صاف اور یکسو نہیں تھا، جتنا ایک ایسے شخص کا ہونا چاہیے جس نے عقیدۂ توحید کو براہِ راست قرآن و حدیث سے اخذ کیا ہے، اور جس کے سامنے رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے عہدِ سعادت اور صحابۂ کرام کے دورِ خیر و برکت کے نمونے اور اقوال و اعمال ہیں، اس طبقہ کے طرزِ فکر کا اندازہ جو اپنے زمانہ کے رسوم مروّجہ اور عاداتِ قدیمہ سے متأثر تھا، امام ابنِ تیمیہ کے معاصر شیخ علی بن یعقوب البکری اور الاخنائی کی ان تحریروں

---

[1] الرد علی البکری ص۳۵۱ [2] سورۂ انعام۔۱۳۷

سے ہوتا ہے، جس کی تردید میں امام ابن تیمیہ نے وہ دو مبسوط کتابیں لکھیں[1] جن کے اقتباسات اوپر پیش کئے گئے۔

امام ابن تیمیہ کا اصلاحی کام اور مشرکانہ عقائد کی تردید و مخالفت

امام ابن تیمیہ نے ان مشرکانہ اعمال و رسوم کے خلاف جہاد و تجدید کا علم بلند کیا، اور عوام کی رضامندی و ناراضگی نیز خواص کالعوام کے قہر و عتاب سے بالکل بے نیاز ہو کر مروجہ اعمال و رسوم اور مشرکانہ عقائد و خیالات کی تردید کی، اور ان عقائد و تخیلات پر تیشہ چلایا، جو اس مشرکانہ طرزِ عمل کی بنیاد تھے۔

ان مزارات پر عوام کے ہجوم اور مشرکانہ اعمال و رسوم کی سب سے بڑی وجہ یہ تھی کہ عوام ان اصحابِ مزارات سے اپنے مقاصد و اغراض کے لئے دعا کرتے تھے، ان کے نام کی دہائی دیتے تھے، ان کی پناہ میں آتے تھے، امام ابن تیمیہ نے اپنی تحریروں میں صاف صاف لکھا کہ دعا غیر اللہ سے بالکل جائز نہیں، اور یہ شرک صریح ہے، جو مسلمانوں کی جہالت یا غیر مسلم اقوام کی مخالطت سے مسلمانوں میں داخل ہو گیا ہے۔ "الرد علی البکری" میں لکھتے ہیں:-

غیر اللہ سے دعا و استغاثہ کی ممانعت

"رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات کا مطالعہ کرنے اور اس کو اچھی طرح سمجھ لینے کے بعد یقینی اور بدیہی طور پر معلوم ہوتا ہے کہ آپ نے اپنی امت کو کسی مُردے پیغمبر یا صالح آدمی سے دعا کرنے کی اجازت نہیں دی، نہ استغاثہ کے طور پر، نہ استعاذہ کے طور پر، اسی طرح آپ کی امت کے لئے کسی مردہ یا زندہ کا سجدہ کرنا جائز نہیں، اور اسی طرح کے وہ اعمال جو عبادات میں شامل ہیں، ہم کو

---

[1] تلخیص کتاب الاستغاثہ المعروف بالرد علی البکری مطبعۂ سلفیہ مصر ۱۳۴۶ھ اور کتاب الرد علی الاخنائی و استحباب زیارۃ خیر البریۃ الزیارۃ الشرعیۃ ایضاً مطبعۂ سلفیہ ۱۳۴۶ھ آخر الذکر کتاب اول الذکر کے حاشیہ پر ہے۔

خوب معلوم ہے کہ آپ نے ان تمام امور سے منع فرمایا ہے، اور یہ سب اس شرک میں داخل ہے جس کو اللہ نے اور اس کے رسولؐ نے حرام قرار دیا ہے، لیکن چونکہ پچھلے زمانہ میں جہالت بہت عام ہو گئی اور تعلیمات نبوت اور آثار رسالت سے واقفیت بہت کم تھی، اس لئے بہت سے علماء نے اس وقت تک ان جہلا کی تکفیر کرنے سے احتیاط کی ہے، جب تک کہ ان پر آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کی تعلیم اور دین کے احکام واضح نہ ہو جائیں[1]۔

ایک دوسرے موقع پر لکھتے ہیں:۔

"میت سے اپنی ضرورت کا سوال یا اس سے استغاثہ جیسا کہ بہت جگہ رواج ہے شریعت محمدیؐ سے کوئی تعلق نہیں رکھتا، یہ بھی درحقیقت بت پرستی کی ایک قسم ہے اسی لئے ان دعا کرنے والوں کے سامنے کبھی کبھی شیاطین صاحبِ مزار کی صورت میں یا کسی غائب کی شکل میں آتے ہیں، جیسا کہ بت پرستوں کو اکثر ایسا پیش آتا ہے، بلکہ واقعہ یہ ہے کہ جیسا کہ حضرت ابن عباسؓ کا ارشاد ہے، "بت پرستی کی ابتداء قبروں ہی سے ہوئی"[2]

ایک دوسرے موقع پر فرماتے ہیں:۔

"کسی میت یا غائب سے سوال خواہ وہ پیغمبر ہو یا غیر پیغمبر ان اعمال میں سے ہے، جن کی حرمت پر تمام ائمۂ مسلمین متفق ہیں، اللہ اور اس کے رسولؐ نے نہ تو اس کا حکم دیا، اور نہ صحابہ و تابعین میں سے کسی نے ایسا کیا، اور نہ ائمۂ مسلمین میں سے کسی نے اس کو پسند کیا، جو دین اس وقت ہمارے سامنے ہے اور محفوظ چلا آ رہا ہے اس سے بداہتہً یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ قرونِ خیر میں بالکل اس کا رواج نہیں تھا کہ اگر کوئی شخص کسی شکل میں یا مصیبت میں گرفتار ہوتا یا اس کو کوئی ضرورت پیش آتی تو وہ کسی گذشتہ بزرگ یا پیغمبر کا نام لے کر کہتا "یاسیدی فلاں انا فی حسبک (حضور والا

---

[1] الرد علی البکری ص ۳۷۷ [2] ایضاً ص ۵۶

میں آپ کے ذمہ میں ہوں) میں نے آپ کا دامن پکڑا ہے' یا فلاں بزرگ میری ضرورت پوری کر دیجئے، جیسے کہ اس زمانہ کے بعض مشرکین اپنے ایسے بزرگوں کا نام لے کر کہتے ہیں' جو یا تو انتقال کر چکے ہیں یا وہاں موجود نہیں ہوتے' نہ کہیں سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ کسی صحابی نے آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد آپ کی یا کسی اور پیغمبر کی قبر شریف کے پاس یا قبر شریف سے فاصلہ پر دُہائی دی ہو، صحابۂ کرام کے مشرکین و کفار کے ساتھ بڑے بڑے معرکے ہوئے اور بارہا وہ ان کے مقابلہ میں صف آرا ہوئے، بڑے گھمسان کا رن پڑا، اور بعض اوقات بڑی پریشانی پیش آئی' اس کے باوجود ان میں سے کسی نے نہ کسی نبی کی دُہائی دی' اور نہ غیر نبی کی' اور نہ خدا کو کسی مخلوق کی قسم دی نہ یہ حضرات انبیاء اور غیر انبیاء کی قبور پر دعا کرنے کے لئے جاتے نہ نماز پڑھنے کے لئے' امام مالکؒ اور بعض علماء نے تو اس کو بھی ناپسند کیا ہے کہ کوئی شخص قبر انور کے پاس کھڑے ہو کر بھی اپنے لئے دعا کرے' اور انھوں نے تصریح کی ہے کہ یہ ان بدعات میں سے ہے' جن کا عہدِ سلف میں سُراغ نہیں ملتا۔[1]

اپنے مشہور رسالہ "التوسل والوسیلہ" میں لکھتے ہیں :-

"ملائکہ اور انبیاء سے (ان کے انتقال کے بعد یا ان کی غیر موجودگی میں) دعا کرنا، ان سے مانگنا، ان کی دُہائی دینا، اور ان سے یا ان کے مجسموں سے سفارش چاہنا ایک نیا دین ہے جس کو اللہ تعالیٰ نے مشروع نہیں کیا' اور نہ کسی نبی کو اس کے ساتھ مبعوث فرمایا، اور نہ کوئی آسمانی کتاب اس کی تائید میں نازل فرمائی"[2]

غیر اللہ سے دعا کی حرمت کی حکمت

اس کتاب میں وہ ایک جگہ اس حرمت کی حکمت بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں :-

"اللہ تعالیٰ نے باوجود اس کے کہ بیان فرمایا ہے کہ ملائکہ ہمارے لئے دعا و استغفار کرتے ہیں' ہم کو

---

[1] الرد علی البکری ص ۲۳۴ [2] قاعدہ جلیلہ فی التوسل والوسیلہ ص ۱۵

ملائکہ سے دعا کرنے کی ممانعت فرمائی، اسی طرح انبیاء و صالحین اگرچہ اپنی قبور میں زندہ ہیں اور جیسا کہ بعض آثار میں آیا ہے، وہ زندوں کے لئے بھی دعا کرتے ہیں لیکن کسی کو خود ان سے دعا کرنا جائز نہیں اور نہ سلف سے ایسا منقول ہے اس لئے کہ یہ فعل ذریعہ بن جاتا ہے، شرک اور ان کی مستقل پرستش کا بخلاف اس کے اگر زندگی میں ان سے کچھ مانگا جائے یا سوال کیا جائے تو وہ شرک تک نہیں پہنچاتا دوسری بات یہ ہے کہ ملائکہ اور انبیاء و صالحین انتقال کے بعد زندوں کے لئے جو کچھ دعا و استغفار کرتے ہیں، وہ ایک تکوینی امر ہے جس میں دوسروں کے سوال و دعا کا کوئی دخل نہیں، برخلاف زندگی کے کہ اس میں سائل کا سوال کرنا مشروع ہے انتقال کے بعد وہ ان چیزوں کے مکلف نہیں رہتے۔"[1]

اہلِ قبور سے دعا کرنے والوں کی قسمیں اور صورتیں

ایک دوسری جگہ وہ قبر پر دعا و سوال کرنے والوں کی قسمیں اور حالات لکھ کر الگ الگ حکم بیان کرتے ہیں، فرماتے ہیں:۔

• جو شخص کسی پیغمبر یا مردِ صالح کی قبر کے پاس آتا ہے یا کسی ایسی قبر کے پاس جس کے متعلق اس کا خیال ہے کہ کسی پیغمبر یا مردِ صالح کی قبر ہے (حالانکہ واقعہ یہ نہیں ہے) وہاں سوال و سجدہ کرتا ہے تو اس کی تین صورتیں ہیں۔

ایک صورت تو یہ ہے کہ اس سے اپنی ضرورت کا سوال کرتا ہے، مثلاً اس سے اپنے یا اپنے جانوروں کے مرض کا ازالہ، یا اپنے قرض کی ادائیگی یا اپنے دشمن سے انتقام یا اپنی یا اپنے گھر والوں اور جانوروں کی صحت کی درخواست کرتا ہے، اور اسی طرح کے وہ امور جن پر خدا کے سوا اور کسی کو قدرت نہیں تو یہ کھلا ہوا شرک ہے، ایسے شخص سے توبہ کرانی چاہئے، اگر وہ توبہ کرلے تو خیر ورنہ قتل

---

[1] ایضاً ص ۱۳۲

کردیا جائے۔

اگر وہ کہتا ہے کہ میں ان صاحبِ مزار سے یا اس پیغمبر یا ولی سے اس لئے سوال کرتا ہوں کہ اس کو میرے مقابلہ میں خدا سے زیادہ تقرّب حاصل ہے یہ ان امور میں میری سفارش کردے اس لئے میں اللہ کے لئے یہاں اس کو وسیلہ بناتا ہوں جیسے کہ سلطان کے یہاں اس کے خواص و عوام کو وسیلہ بنایا جاتا ہے تو یہ عمل مشرکین و نصاریٰ کا سا عمل ہے اس لئے کہ وہ بھی یہی کہتے ہیں کہ وہ اپنے احبار و رہبان کو صرف شفیع بناتے ہیں اور ان سے اپنے اغراض و مقاصد کے لئے اللہ تعالیٰ کے یہاں سفارش چاہتے ہیں اسی طرح سے اللہ تعالیٰ نے مشرکین کے متعلق اطلاع دی ہے کہ وہ کہتے ہیں "مَا نَعْبُدُهُمْ اِلَّا لِيُقَرِّبُوْنَآ اِلَى اللّٰهِ زُلْفٰى" (ہم ان کی عبادت نہیں کرتے مگر اس لئے کہ وہ ہم کو اللہ سے قریب کردیں۔ الزمر۔۳)

اور ارشاد ہوتا ہے:۔

اَمِ اتَّخَذُوْا مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ شُفَعَآءَ ۭ قُلْ اَوَلَوْ كَانُوْا لَا يَمْلِكُوْنَ شَيْـًٔـا وَّلَا يَعْقِلُوْنَ ۝ قُلْ لِّلّٰهِ الشَّفَاعَةُ جَمِيْعًا ۭ لَهٗ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۭ ثُمَّ اِلَيْهِ تُرْجَعُوْنَ ۝ (سورہ زمر۔۴۳۔۴۴)	کیا انھوں نے اللہ کے سوا اور حمایتی بنا رکھے ہیں کہہ دو کیا اگرچہ وہ کچھ بھی اختیار نہ رکھتے ہوں اور نہ عقل رکھتے ہوں کہہ دو ہر طرح کی حمایت اللہ ہی کے اختیار میں ہے آسمانوں اور زمین میں اسی کی حکومت ہے پھر اسی کی طرف تم لوٹائے جاؤ گے۔

اور ارشاد ہوتا ہے کہ:۔

مَا لَكُمْ مِّنْ دُوْنِهٖ مِنْ وَّلِيٍّ وَّلَا شَفِيْعٍ ۭ اَفَلَا تَتَذَكَّرُوْنَ ۝ (السجدہ۔۴)	تمہارے لئے نہ اس کے سوا کوئی کارساز ہے، نہ سفارشی، پھر کیا تم نہیں سمجھتے۔

اسی طرح ارشاد ہے:۔

مَنْ ذَا الَّذِیْ یَشْفَعُ عِنْدَہٗۤ اِلَّا بِاِذْنِہٖ ط ایسا کون ہے جو اس کی اجازت کے سوا اس کے

(البقرہ-۲۵۵) یہاں سفارش کرسکے۔

دوسری صورت یہ ہے کہ اس بزرگ یا صاحبِ مزار سے فعل کو طلب نہ کیا جائے، نہ اس سے دعا کی جائے، اس سے صرف یہ درخواست کی جائے کہ وہ حصولِ مقصد کے لئے دعا کردے، جیسے کسی زندہ انسان سے کہا جاتا ہے کہ میرے لئے دعا کردیجئے، اور جیسے صحابۂ کرام رضوان اللہ علیہم آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم سے دعا کی درخواست کرتے تھے تو معلوم ہونا چاہئے کہ زندہ انسان کے معاملہ میں تو یہ جائز اور مشروع ہے، باقی ایک فوت شدہ مردِ صالح یا پیغمبر کے اس دنیا سے تشریف لے جانے کے بعد اس سے دعا کی درخواست کرنا شریعت میں نہیں آیا، یہ کوئی مشروع فعل نہیں کہ ہم کسی بزرگ یا پیغمبر سے انتقال کے بعد یہ کہیں کہ ہمارے لئے دعا کردیجئے یا اپنے رب سے ہمارے لئے یہ مانگ دیجئے، اور نہ کسی صحابی یا تابعی سے ایسا ثابت ہے، اور نہ کسی امام کا یہ مسلہ ہے، نہ اس کے ثبوت میں کوئی حدیث ہے، اس کے برخلاف صحیح احادیث سے ثابت ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے زمانہ میں جب قحط پڑا تو انھوں نے حضرت عباس رضی اللہ عنہ سے دعا کرائی اور ان کو وسیلہ بنایا اور کہا اے اللہ! جب ہم پہلے قحط میں مبتلا ہوتے تھے تو تیرے نبیؐ کو وسیلہ بناتے تھے، اور تو بارش نازل فرماتا تھا، اب ہم اپنے پیغمبر کے چچا کو وسیلہ بناتے ہیں تو بارانِ رحمت بھیج، چنانچہ بارش ہوئی انھوں نے اس ضرورت اور مصیبت کے وقت یہ نہیں کیا کہ قبرِ انور کے پاس آئیں اور عرض کریں کہ یا رسول اللہ! ہمارے لئے دعا کردیجئے، اور بارش بھجوایئے، ہم آپ سے فریاد کرتے ہیں کبھی کسی صحابی نے اس طرح نہیں کیا، یہ ایک ایسی بدعت ہے جس کا قرآن وحدیث سے کوئی ثبوت نہیں ملتا۔

تیسری صورت یہ ہے کہ زائر یوں کہے کہ اے اللہ فلاں شخص کے طفیل جس کا تیرے یہاں

بڑا مرتبہ ہے یا فلاں کی برکت سے یا بحُرمتِ فلاں و فلاں مجھے فلاں چیز عطا فرما میرے ساتھ ایسا معاملہ فرما، تو یہ بہت سے لوگوں کا معمول ہے لیکن ایسا کرنا کسی صحابی یا تابعی یا سلف میں سے کسی سے منقول نہیں ہے کہ وہ اس طرح دعا کرتے ہوں بعض علماء اور اکابر نے اس کی صرف آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کے لئے اجازت دی ہے' اور بعض کہتے ہیں کہ یہ بھی آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کی حیات میں تھا، ہمیشہ کے لئے نہیں[1]"۔

زندہ ہستی سے بھی کسی ایسی چیز کا مطالبہ جو اسبابِ دنیاوی سے ماوراء ہو جائز نہیں

امام ابن تیمیہ صرف اسی پر اکتفا نہیں کرتے کہ کسی فوت شدہ بزرگ یا پیغمبر اور صاحبِ مزار سے سوال و طلب اور دعا کرنا جائز نہیں بلکہ کسی زندہ انسان سے بھی کسی ایسی چیز کا مطالبہ جو اسبابِ دنیاوی سے ماوراء اور قدرت "کُنْ فَیَکُوْنُ" سے متعلق ہو، یا ان امور سے تعلق رکھتی ہو جو صرف خدا کی قدرت اور ارادہ سے ہو سکتے ہیں اور ان کو اللہ تعالےٰ نے اپنے ساتھ مخصوص رکھا ہے' ان کے نزدیک ناجائز اور شرک ہے' اپنے رسالہ "زیارۃ القبور" میں فرماتے ہیں :۔

"بندہ کا مطلوب اگر ان امور اور معاملات سے تعلق رکھتا ہے جن پر صرف خدا کو قدرت حاصل ہے' اس کا غیر اللہ سے طلب کرنا خواہ وہ بادشاہ ہو، خواہ نبی، خواہ پیر یا بزرگ خواہ زندہ ہو یا مردہ جائز نہیں، مثلاً اپنی یا جانوروں کی بیماری سے صحت طلب کرے' یا بغیر کسی معین جہت کے اپنے قرض کی ادائیگی چاہے، گھر والوں کی عافیت اور دنیا و آخرت کی بلاؤں کا دفع ہونا یا دشمن پر

---

[1] رسالہ زیارۃ القبور مشمولہ مجموع رسائل ص۱۰۶-۱۱۲ باختصار۔

توسّل کے بارے میں امام ابنِ تیمیہ کا مسلک مشہور و معلوم ہے' تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو ان کی مستقل تصنیف "قاعدہ جلیلہ فی التوسّل والوسیلہ" لیکن اکثر ائمہ و علماء اس بارے میں ان سے اختلاف رکھتے ہیں۔

فتح، قلب کی ہدایت، گناہوں کی مغفرت جنت میں دخول، جہنم سے چھٹکارا، علم کا حاصل ہوجانا، قرآن کا پڑھ جانا، قلب کی درستی، اخلاق کی آراستگی نفس کا تزکیہ وغیرہ وغیرہ، یہ سب امور ہیں، جو صرف خدا سے طلب کیے جا سکتے ہیں، یہ جائز نہیں کہ کوئی شخص کسی بادشاہ یا پیغمبر یا پیر سے یہ کہے (خواہ وہ مردہ ہو یا زندہ) کہ میرے گناہ بخش دیجیے، مجھے میرے دشمن پر فتح دیجیے، میرے مریض کو شفا دیجیے، مجھے عافیت عطا کیجیے، یا میرے گھر والوں اور میرے جانوروں کو سلامتی عطا ہو، اور اسی طرح کی دعائیں اور فرمائشیں اگر کوئی شخص کسی مخلوق سے ان باتوں کا سوال کرے گا، خواہ وہ کوئی ہو، تو وہ مشرک ہے، اور انہی مشرکین کی جنس میں سے ہے، جو ملائکہ اور انبیاء کی عبادت کرتے تھے، اور ان کے بتوں اور مورتیوں کی پرستش کرتے تھے، جو ان کی شکل پر انھوں نے بنا رکھی تھیں اور جیسے نصاریٰ حضرت مسیحؑ اور ان کی والدہ محترمہ حضرت مریمؑ سے دعا کرتے تھے۔[1]

واسطہ کی حقیقت

اس سلسلہ میں ایک بحث واسطہ کی پیدا کی جاتی ہے، اور جو لوگ آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم یا کسی ولی بزرگ اور مرد صالح سے دعا کرنے یا سفارش کرانے کے مخالف ہیں، ان کے متعلق کہا جاتا ہے کہ واسطہ کے منکر ہیں، حالانکہ نبی خلق اور خالق کے درمیان واسطہ ہے، اور اس کے بغیر خدا تک پہنچنا امر محال ہے، امام ابن تیمیہ نے واضح طریقہ پر اس کا جواب دیا ہے، اور بتلایا ہے کہ واسطہ کے دو مفہوم ہیں، ایک مفہوم برحق اور متفق علیہ ہے، اور اس پر سارے دین کی بنیاد ہے، ایک مفہوم باطل بے بنیاد اور اختراعی ہے، انھوں نے اس موضوع پر ایک مستقل رسالہ "الواسطۃ بین الخلق والحق" کے نام سے لکھا ہے، اس میں ارشاد فرماتے ہیں:۔

---

[1] زیارۃ القبور ص۱۰۴-۱۰۵

"رسول کے واسطہ ہونے کا اگر مفہوم یہ ہے کہ مخلوق کے لئے ایک ایسا واسطہ ضروری ہے جو اللہ کا حکم اور اس کا منشاء خلق خدا کو بتلاتا ہے تو یہ سراسر حق ہے اس لئے کہ خلقِ خدا کے لئے اللہ تعالیٰ کی مرضیات، احکام، منہیات کے معلوم کرنے کا، اس کے سوا کوئی ذریعہ نہیں، اپنے دوستوں اور مقبول بندوں کے لئے اللہ تعالیٰ نے جو نعمتیں رکھی ہیں، اور اپنے دشمنوں کے لئے جس عذاب کا وعدہ کیا ہے، وہ ان کے بغیر معلوم نہیں ہوسکتا، کون سے اسماء و صفات اللہ تعالیٰ کی ذات بے چوں و بے چگوں کے شایانِ شان اور مناسب ہیں، اور کون سے نامناسب، عقل تنہا اس کی معرفت سے عاجز و درماندہ ہے، یہ سب حقائق اور علوم صحیحہ محض انبیاء علیہم السّلام کے ذریعہ حاصل ہوسکتے ہیں، جن کو اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں کی ہدایت و تعلیم کے لئے بھیجا ہے، یہ ایک ایسا بنیادی مسئلہ ہے، جس پر نہ صرف مسلمانوں بلکہ تمام اہلِ ملل یہود و نصاریٰ تک کا اتفاق ہے، وہ سب خلق و خالق کے درمیان اس طرح کے وسائط کے قائل ہیں، یہ وسائط خدا کے وہ پیغمبر ہیں، جنھوں نے اللہ کی طرف سے احکام و اطلاعات پہنچائیں، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے :-

اَللّٰهُ يَصْطَفِىْ مِنَ الْمَلٰٓئِكَةِ رُسُلًا وَّمِنَ النَّاسِ، (سورہ حج ـ ۷۵)	فرشتوں اور آدمیوں میں سے اللہ ہی پیغام پہونچانے کے لئے چن لیتا ہے۔

جو ان واسطوں کا منکر ہے، وہ باتفاق تمام اہلِ ملل و ادیان کافر ہے[1]۔

"اور اگر واسطہ کا مفہوم یہ ہے کہ حصول منافع و دفع مضرات کے لئے ایک ایسے واسطہ کی ضرورت ہے، مثلاً ایک ایسی شخصیت ضروری ہے جو رزق، نصرت اور بھولے بھٹکے کو راستہ بتلانے میں خدا اور بندوں کے درمیان واسطہ ہو، لوگ اس سے ان سب چیزوں کا سوال کریں، اور وہ خدا سے لے کر کے دے، اور لوگ اسی سے امید باندھیں تو یہ پرلے درجہ کا شرک ہے، جس کی بنا پر اللہ تعالیٰ نے مشرکین کی

---

[1] الواسطہ بین الخلق والحق ص ۴۵-۴۶

تکفیر فرمائی ہے، کیونکہ انھوں نے اللہ تعالیٰ کے علاوہ دوسرے اولیاء و شفعاء کو اختیار کر رکھا تھا، جن کے ذریعہ سے وہ منافع حاصل کرتے تھے اور مضرات سے بچتے تھے۔[۱]

عوام و جہلاء اور بہت سے خواص کالعوام نے یہاں تک غلو کیا تھا کہ صرف حضرات انبیاء اور جناب رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم ہی نہیں، بلکہ عام اولیاء و صالحین کو اپنے اور خدا کے درمیان واسطہ بنا رکھا تھا، اور دعا و استعانت، توکل و رجاء سب کا تعلق انہی سے قائم کر رکھا تھا، امام ابن تیمیہ ان کے بارے میں یہی تفریق کرتے ہیں، وہ فرماتے ہیں:۔

"انبیاء علیہم السلام کے علاوہ علم دین کے جو ائمہ اور پیشوا ہیں ان کے بارے میں بھی یہی تفصیل ہے کہ جو شخص ان کو رسول اور امت کے درمیان واسطہ مانتا ہے، وہ رسول کے احکام و مسائل کے مبلّغ اور معلّم اور امت کے مربّی و مقتدیٰ ہیں اور نمونۂ عمل تو یہ بات بجا اور درست ہے یہ ائمہ و علماء اگر کسی مسئلہ پر اجماع کر لیں تو ان کا اجماع حجت قطعی ہے، اس لئے کہ یہ سب گمراہی پر مجتمع نہیں ہو سکتے اور اگر کسی مسئلہ میں ان کا اختلاف ہو تو اس کو وہ اس میں اللہ و رسول کی طرف رجوع کریں گے، اس لئے کہ ان میں سے کوئی شخص انفرادی حیثیت سے علی الاطلاق معصوم نہیں ہے ان میں سے ہر ایک کے کلام میں تحقیق کا کچھ حصہ لیا جا سکتا ہے اور کچھ ترک کیا جا سکتا ہے، صرف رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم ہی کی ذاتِ گرامی ہے، جو بالکل معصوم ہے اور جن کا کوئی حکم و ارشاد قابلِ ترک نہیں۔

اور اگر کسی شخص کا یہ خیال ہے کہ یہ بزرگانِ دین اور ائمہ و علماء اللہ اور اس کی مخلوق کے درمیان اسی طرح سے واسطہ ہیں، جیسے بادشاہ اور رعیت کے درمیان حاجب و دربان ہوتے ہیں کہ یہی خدا تک اس کی مخلوق کی ضرورتیں پہونچاتے ہیں اور اللہ ان ہی کے توسط سے اپنے بندوں کو ہدایت اور رزق عطا فرماتا ہے، مخلوق ان سے سوال کرتی ہے اور وہ خدا سے سوال کرتے ہیں، جیسے

---

[۱] الواسطہ ص۳۶

بادشاہوں کے حاجب و دربان رعیت کی ضرورتیں ان سے طلب کرتے ہیں، لوگ براہ راست بادشاہ سے سوال نہیں کرتے اس کو بے ادبی سمجھتے ہیں، وہ ان حاجبوں سے سوال کرتے ہیں اس لئے کہ ان سے طلب کرنا زیادہ مفید ہوتا ہے کیونکہ وہ بادشاہ سے زیادہ قریب ہوتے ہیں، اور طالب اتنا قریب نہیں ہوتا، اور جو شخص اس نوعیت کے وسائط کا قائل ہے، اور اس معنی میں بزرگانِ دین اور علماء وصلحاء کو واسطہ مانتا ہے، وہ کافر و مشرک ہے، اس سے توبہ کرانی واجب ہے اگر توبہ کرلے تو خیر ورنہ قتل کر دیا جائے، یہ درحقیقت تشبیہ میں گرفتار ہیں، کیونکہ انھوں نے مخلوق کو خالق کا مشابہ سمجھ رکھا ہے، اور اللہ کے ہمسر اور نظیر ٹھہرا رکھے ہیں[1]۔"

مشاہد بدعتِ قبیحہ ہیں

امام ابنِ تیمیہ ان مشاہد اور زیارت گاہوں کے سخت مخالف ہیں، جو پورے عالمِ اسلام میں شرک و بدعت، فسق و فجور اور انواع و اقسام کے منکرات کا مرکز بن گئی تھیں، اور جنھوں نے عالمِ اسلام میں ایک فتنۂ عظیم کی شکل اختیار کر لی تھی، اور کہتے ہیں کہ یہ شریعت کی صریح مخالفت، اور پچھلے زمانہ کی ایک مکروہ بدعت ہے "الرد علی البکری" میں فرماتے ہیں:-

"یہ مسجدیں جو قبروں پر بنائی گئی ہیں، جن کو مشاہد کے نام سے یاد کیا جاتا ہے، یہ ایک بدعت ہے، جو لوگوں نے اسلام میں پیدا کی ہے، ان کی طرف سفر کرکے جانا بھی ایک رواج ہے، جس کی کوئی شرعی بنیاد نہیں، اسلام کی ابتدائی تین صدیوں میں جن کی خیر و فضیلت کی آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم نے شہادت دی ہے، ان کا وجود نہ تھا، بلکہ صحیح احادیث میں آپ سے یہ ثابت ہے کہ آپ نے اس سے ڈرایا، اور منع فرمایا، بخاری کی حدیث ہے کہ "لعن اللہ الیھود والنصاریٰ اتخذوا قبور انبیاءھم مساجد" (اللہ

---

[1] الواسطہ صـ۴۸

یہود و نصاریٰ پر لعنت کرے، انھوں نے اپنے پیغمبروں کی قبور کو مساجد بنالیا) حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ اگر اس کا اندیشہ نہ ہوتا تو قبر مبارک کو کھلے میدان میں کردیا جاتا، لیکن آپ کو یہ ناپسند تھا کہ اس کو مسجد بنالیا جائے۔ اسی طرح سے یہ بھی صحیح حدیث ہے کہ آپ نے وفات سے پانچ روز پہلے فرمایا:-

من کان من قبلکم کانوا یتخذون القبور مساجد الا فلا تتخذوا القبور مساجد فانی انہاکم من ذلک۔[1]	جو لوگ تم سے پیشتر تھے، وہ قبور کو مساجد بنالیا کرتے تھے، دیکھو یاد رکھنا قبروں کو مسجد نہ بنانا، میں تم کو اس سے روکتا ہوں۔

آگے چل کر فرماتے ہیں:-

"جب مسلمانوں نے "تستر" فتح کیا تو وہاں حضرت دانیال علیہ السّلام کی قبر ان کو ملی، اہلِ شہر وہاں بارش کی دعا کرتے تھے، اور پانی مانگتے تھے، حضرت ابوموسیٰ اشعریؓ نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو اس کی اطلاع دی، آپ نے لکھا کہ دن کو تیرہ قبریں کھودو، اور رات میں ان کو ان میں سے کسی ایک میں دفن کردو تاکہ لوگ فتنہ میں مبتلا نہ ہوں، اور ان سے بارش کا سوال نہ کریں، حقیقتہً یہی صحابۂ کرامؓ کا طریق تھا، اسی لئے صحابہ و تابعین کے زمانہ میں سرزمینِ اسلام میں ایک مسجد بھی ایسی نہیں پائی جاتی تھی، جو کسی قبر پر تعمیر کی گئی ہو، اور نہ کہیں کوئی مشہد تھا جس کی زیارت کی جائے، نہ حجاز میں، نہ یمن میں، نہ شام میں، نہ مصر، عراق، خراسان میں۔"[2]

ایک دوسری کتاب میں تحریر فرماتے ہیں:-

"قبور کی طرف حج کرکے جانے والوں اور ان کو عبادت گاہ اور مساجد اور میلہ کی جگہ بنانے والوں کا صحابہ اور تابعین اور تبع تابعین کے زمانہ میں سراغ نہیں لگتا، اسلام میں نہ کوئی ایسی قبر اور مشہد تھا جس کی طرف حج کرکے جایا جائے، یہ تین صدیوں کے بعد کی پیداوار ہے، بدعت کی

[1] الرد علی البکری ص ۲۳۴ [2] ایضاً ص ۲۸۱

خاصیت ہی یہ ہے کہ اس میں جس قدر رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی مخالفت ہوتی ہے، اسی قدر دین میں اس کا ظہور ہوتا ہے، شروع میں وہ بدعات ظاہر ہوتی ہیں جن کی مخالفت اتنی واضح اور جلی نہیں ہوتی۔"[1]

مشاہد کے موجد باطنی و روافض ہیں

ان کی تحقیق ہے کہ ان مشاہد و مزارات کی بدعت اور دعوت روافض اور باطنیہ نے شروع کی، اور ان کے بارے میں احادیث وضع کیں اس لئے کہ ان کو حقیقی دلچسپی اپنے ائمہ کے مزارات و مشاہد سے ہے، فرماتے ہیں :-

"سب سے پہلے جنھوں نے ان مشاہد کی زیارت کے لئے سفر کرنے کی فضیلت میں حدیثیں وضع کیں وہ روافض وغیرہ دوسرے اہل بدعت تھے جن کا دستور یہ ہے کہ مساجد کو ویران کرتے ہیں، اور مشاہد کو جن میں شرک، کذب اور ایک نئے دین کی اختراع ہوتی ہے، پر رونق اور آباد رکھتے ہیں، اور توقیر و تعظیم کرتے ہیں، کتاب و سنت میں مشاہد کے بجائے مساجد کا جابجا تذکرہ ملتا ہے، اللہ تعالیٰ فرماتا ہے :-

قُلْ اَمَرَ رَبِّیْ بِالْقِسْطِ وَاَقِیْمُوْا وُجُوْهَكُمْ عِنْدَ كُلِّ مَسْجِدٍ وَّادْعُوْهُ مُخْلِصِیْنَ لَهُ الدِّیْنَ ۚ (سورۂ اعراف۔ ۲۹)	کہہ دو میرے رب نے انصاف کا حکم دیا ہے، اور ہر نماز کے وقت اپنے منھ سیدھے کرو اور اس کے خالص فرمانبردار ہو کر اسے پکارو۔
وَاَنَّ الْمَسٰجِدَ لِلّٰهِ فَلَا تَدْعُوْا مَعَ اللّٰهِ اَحَدًا ۝ (سورۂ جن۔ ۱۸)	اور بیشک مسجدیں اللہ کے لئے ہیں پس تم اللہ کے ساتھ کسی کو نہ پکارو۔
اِنَّمَا یَعْمُرُ مَسٰجِدَ اللّٰهِ مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ	اللہ کی مسجدیں وہی آباد کرتا ہے جو اللہ پر اور آخرت

[1] الرد علی الاخنائی صہ ۱۰۲

وَالْيَوْمِ الْآخِرِ (سورۂ توبہ ـ ۱۸) کے دن پر ایمان لایا۔

وَلَا تُبَاشِرُوهُنَّ وَأَنْتُمْ عَاكِفُونَ فِي الْمَسَاجِدِ اور ان سے مباشرت نہ کرو جب کہ تم مسجدوں میں

(سورۂ بقرہ ـ ۱۸۷) معتکف ہو۔

وَمَنْ أَظْلَمُ مِمَّنْ مَنَعَ مَسَاجِدَ اللَّهِ أَنْ يُذْكَرَ اور اس سے بڑھ کر کون ظالم ہوگا جس نے اللہ کی

فِيهَا اسْمُهُ (سورۂ بقرہ ـ ۱۱۴) مسجدوں میں اس کا نام لینے کی ممانعت کردی۔

نیز صحیح حدیث سے یہ ثابت ہے کہ آپ ارشاد فرماتے تھے "ان من کان قبلکم کانوا یتخذون القبور مساجد الا فلا تتخذوا القبور مساجد فانی انہاکم عن ذلک" (تم سے پہلے جو لوگ تھے۔ یہود ونصاریٰ۔ وہ قبروں کو مساجد بنا لیا کرتے تھے، دیکھو یاد رکھنا قبروں کو مسجد نہ بنانا، میں تم کو اس سے منع کرتا ہوں[1])

اکثر مشاہد ومزارات جعلی ہیں

امام ابن تیمیہ کی تحقیق ہے کہ ان مشاہد اور مشہور زیارت گاہوں میں سے اکثر جعلی اور فرضی ہیں، وہ اس سلسلہ میں کیسی اچھی بات لکھتے ہیں کہ چونکہ مشاہد ومزارات کے جاننے اور پہچاننے پر شریعت کا کوئی دارومدار نہیں ہے اور یہ اس دین میں داخل نہیں ہے جس کی حفاظت کی اللہ تعالیٰ نے ضمانت کی ہے، اس لئے اس میں کثرت سے جعل اور فریب ہوا ہے اور بہت سے مزارات اور مشاہد محض بے حقیقت اور بے اصل ہیں، اور مخلوق کی مخلوق ان کے بارے میں غلط فہمی میں مبتلا ہے، وہ تحریر فرماتے ہیں:۔

وكثير من المشاهد كذب وكثير منها مشاہد میں سے بہت سے محض جعلی ہیں اور بہت سے

مشكوك فيه وسبب ذلك ان معرفة مشکوک ہیں، اس سلسلہ میں لوگ کیوں اس قدر غلط فہمیو

---

[1] الرد علی الاخنائی ص ۴۹

المشاهد ليست من الدين الذي تكفل الله بحفظه لعدم حاجتهم الى معرفة ذلك۔[1]	کا شکار ہوئے اس کا راز یہ ہے کہ مشاہد کی شناخت اور معرفت اس دین کا کوئی حصہ نہیں جس کے محفوظ رہنے کی اللہ تعالیٰ نے ذمہ داری لی ہے کیونکہ امت کو ان معلومات اور تحقیقات کی ضرورت نہیں ہے، اور اس پر دین کا کوئی کام موقوف نہیں ہے۔[2]

مشاہد و مزارات پر حصول مقصد کے افسانے

اس سلسلہ میں ایک بڑا فتنہ یہ پھیل رہا تھا کہ ان مشاہد اور زیارت گاہوں میں بڑے بڑے مریضوں کو شفا ہوتی ہے اور دعائیں قبول ہوتی ہیں، لوگ اس سلسلہ میں اپنے ذاتی تجربے اور مشاہدے بیان کرتے تھے، امام ابن تیمیہ کو اللہ تعالیٰ نے رسوخ فی الدین اور ایمان و یقین کا جو مقام عطا فرمایا تھا، اس کی بنا پر وہ ان افواہوں اور دعووں سے متأثر ہونے والے نہیں تھے، اور قطعیات دین اور منصوصات کتاب و سنت کو ان روایات و بیانات کی بنا پر نہیں چھوڑ سکتے تھے انھوں نے اپنی خداداد فراست اور دینی فہم سے کام لیا اور ثابت کیا کہ یہ سب توہمات اور بے اصل باتیں ہیں، اس سلسلہ میں زیادہ تر جانوروں کے شفایاب ہونے کے واقعات بیان کئے جاتے تھے، امام ابن تیمیہ نے اس کی جو وجہ بیان کی ہے، وہ بہت عجیب و غریب، اور بصیرت افروز ہے، وہ ایک جگہ لکھتے ہیں:۔

---

[1] الرد علی البکری ص ۳۱۳ [2] مزارات و مشاہد کے بکثرت جعلی ہونے کے متعلق امام ابن تیمیہ نے جو کچھ لکھا ہے، تاریخ و تحقیق سے اس کی تصدیق ہوتی ہے، مثال کے طور پر قاہرہ میں سیدنا حسینؓ کے سر مبارک کا دفن، مدفن سیدہ زینب، مدفن سیدہ سکینہ، نجف میں حضرت علیؓ کا مدفن، دمشق میں ازواج مطہرات کے مدفن اور ہندوستان کے بعض بعض مشہور مزارات مثلاً لاہور میں حضرت سید علی ہجویری معروف بہ داتا گنج بخش کا مزار تاریخی اعتبار سے مشکوک ہے۔

"قاہرہ میں ایک گروہ عبیدیین (مشہور بفاطمیین) کے متعلق یہ عقیدہ رکھتا تھا کہ وہ اولیائے صالحین میں سے تھے، میں نے جب ان سے کہا کہ وہ تو منافق وزندیق تھے، اور ان میں سب سے کم اور ہلکے درجے کے وہ تھے جو رافضی تھے، تو ان کو بڑا تعجب ہوا، اور وہ کہنے لگے کہ ہم تو ایسے گھوڑوں کو جن کے پیٹ میں درد ہوتا ہے، ان کے مشاہد ومزارات پر لے جاتے ہیں، اور وہ وہاں اچھے ہو جاتے ہیں، میں نے ان سے کہا کہ یہ تو ان کے کفر کی سب سے بڑی دلیل ہے، میں نے بعض سائیسوں کو بلایا اور ان سے کہا کہ تم شام اور مصر میں جب گھوڑوں کے پیٹ میں درد ہوتا ہے تو ان کو کہاں لے جاتے ہو؟ انھوں نے کہا کہ ہم شام میں ان قبروں کے پاس لے جاتے ہیں جو اسماعیلیوں کے علاقہ میں ہیں، جیسے "علیقہ اور منقیہ" وغیرہ اور مصر میں ہم عیسائیوں کی ایک خانقاہ میں لے جاتے ہیں، اور عبیدیوں کی قبر پر، میں نے کہا کیا تم ان کو صلحائے مسلمین کی قبروں کے پاس بھی لے جاتے ہو، مثلاً حضرت لیث بن سعد، امام شافعی، ابن القاسم وغیرہ؟ انھوں نے کہا نہیں! میں نے ان عقیدتمندوں سے کہا کہ لو سنو، یہ ان گھوڑوں کو کفار ومنافقین کی قبروں کے پاس لے جاتے ہیں، اور ان کو شفا ہوتی ہے، اس کی وجہ یہ ہے کہ ان لوگوں پر قبر میں عذاب ہو رہا ہے، اور جیسا کہ حدیث صحیح میں آیا ہے کہ چوپائے اور بہائم مُردوں کی آوازیں سنتے ہیں، تو جب یہ گھوڑے اس قسم کی آوازیں سنتے ہیں گھبرا جاتے ہیں، اور اسی گھبراہٹ اور ہیبت سے ان کے پیٹ پانی ہو جاتے ہیں، اور وہ پاخانہ کر دیتے ہیں، اس لئے کہ ہیبت ودہشت سے اکثر اسہال ہو جاتا ہے، ان کو اس پر بڑا تعجب ہوا، میں اکثر لوگوں سے یہی سبب بیان کرتا تھا، اور مجھے علم نہیں تھا کہ کسی اور نے بھی یہ بات لکھی ہے، بعد میں معلوم ہوا کہ بعض علماء نے یہی سبب بیان کیا ہے۔"[1]

مشرکین کے لئے شیاطین کا تمثل

خود صالحین اور اولیاء کی قبروں پر حصول مقصود اور کامیابی کے جو واقعات بیان کئے جاتے

[1] الرد علی البکری صفحہ ۳۱۱

ہیں، نیز صاحبِ مزار کی زیارت، گفتگو وغیرہ کے واقعات نقل کئے جاتے ہیں، امام ابنِ تیمیہ اس کی دوسری وجہ بیان کرتے ہیں، فرماتے ہیں :۔

"بعض لوگوں نے اپنے شیخ کی دُہائی دی، اور ان کو ان کی صورت نظر آئی، اور بعض اوقات انھوں نے ان کا کوئی کام بھی کر دیا، اس سے ان کو یہ عقیدہ ہوا کہ شیخ خود آئے یا یہ کوئی فرشتہ تھا، جو ان کی صورت میں ظاہر ہوا، اور یہ ان کی کرامت ہے، اس سے اس کا مشرکانہ عقیدہ اور راسخ اور غلو اور ترقی کر جاتا ہے، اس کو معلوم نہیں کہ اس طرح کی باتیں اور معاملات شیاطین بُت پوجنے والوں کے ساتھ بھی کرتے رہتے ہیں، وہ ان بُت پرستوں کے سامنے اکثر ظاہر ہوتے ہیں، اور بعض غیبی باتیں ان کو بتلاتے ہیں، اور ان کے بعض مطلب بھی پورے کر دیتے ہیں، لیکن یہ سب امور دورِ آخر کی پیداوار ہیں، ان کا خیر القرون میں کوئی وجود نہ تھا"

دوسری جگہ لکھتے ہیں :۔

"شیاطین اکثر اس شخص کی صورت میں ظاہر ہوتے ہیں، جن کی دہائی دی جائے، مجھ سے بہت سے شیوخِ طریقت کے متعلقین نے یہ واقعات بیان کئے اور ایک جماعت کثیر نے مجھ سے نقل کیا کہ انھوں نے بعض زندہ انسانوں اور بعض مردوں سے فریاد کی تو انھوں نے اسی طرح کے واقعات دیکھے، یہ بات پورے طور پر عیاں ہوگئی کہ شیاطین انسانوں کو اپنے مقدور بھر گمراہ کرنے کی کوشش کرتے ہیں، اگر وہ شخص دینِ اسلام سے ناآشنا ہوتا ہے تو اس کو کھلے شرک اور خالص کفر میں مبتلا کر دیتے ہیں، اس کو حکم دیتے ہیں کہ وہ اللہ کا ذکر نہ کرے، شیطان کا سجدہ کرے، اس کے لئے قربانی پیش کرے، اور اس کو مُردار کھانے اور خون پینے کا حکم دیتے ہیں اور کھلی بے حیائیوں کے ارتکاب پر آمادہ کرتے ہیں، یہ ان شہروں میں بکثرت ہوتا ہے، جہاں یا تو محض کفر پایا جاتا ہے، یا کمزور سا اسلام، نیز ان اسلامی شہروں میں جہاں کے لوگوں کا ایمان ضعیف ہوتا ہے، چنانچہ مصر و شام میں بھی ایسا ہوا،

اور تاتاریوں کے قبول اسلام سے پہلے تو ان میں بکثرت ایسے واقعات پیش آتے تھے، جس قدر اسلام کی ان میں اشاعت ہوتی گئی، اس کی حقیقت سے وہ آشنا ہوتے گئے اسی قدر شیاطین کے اثرات کمزور پڑتے گئے۔[1]

امام ابن تیمیہ لکھتے ہیں کہ صرف صالحین کے ساتھ ہی یہ معاملہ پیش نہیں آتا، بلکہ ستارہ پرستوں کو ایسی باتوں سے سابقہ پڑتا ہے اور ان کو اس طرح کے احساسات اور فتوحات حاصل ہوتے ہیں، فرماتے ہیں:۔

"جو لوگ کواکب سے دعا کرتے ہیں، ان پر ایسی صورتیں نازل ہوتی ہیں، جن کو کواکب کی روحانیت کہتے ہیں، حالانکہ وہ شیطان ہوتا ہے، جو اس کے شرک کی بنا پر اس کو گمراہ کرنے کے لئے نازل ہوتا ہے جیسے کہ بعض اوقات شیاطین بتوں اور مورتیوں کے اندر گھس جاتے ہیں، اور بعض اوقات لوگوں سے باتیں کرتے ہیں، اور بعض اوقات مجاوروں اور پوجا پاٹ کرنے والوں کو دکھائی دیتے ہیں، اور دوسروں کو بھی دکھائی دیتے ہیں۔"[2]

امام ابنِ تیمیہ کا اصلاحی کارنامہ اور اس کے اثرات

ساتویں اور آٹھویں صدی ہجری (جس کی مردم خیزی و مردم آفرینی کا تذکرہ کتاب کے شروع میں گزر چکا ہے) اگرچہ اکابر علماء و شیوخ سے معمور تھی، اور تصنیف و تالیف وعظ و ارشاد اور دعوت و تبلیغ کا کام پوری قوت سے جاری تھا، اس میں شبہہ کی گنجائش نہیں کہ علمائے راسخین اور کتاب و سنت کے حاملین نے اس شرک صریح اور "جاہلیت وثنیہ" کو کسی طرح گوارا نہیں کیا ہوگا، اور زبان و قلم سے ضرور اس کی مخالفت کی ہوگی لیکن ایسے علمائے کبار جنھوں نے اس صورتِ حال کے خلاف علم جہاد بلند کیا، اور اپنے گرانقدر علمی مشاغل و مباحث کے باوجود اس فتنۂ کبریٰ کے مقابلہ کے لئے میدان میں آئے اور

---

[1] تفسیر سورۂ اخلاص ص۱۱۱ [2] کتاب النبوات ص۲۷۴

عوام کو خطاب کیا اور اس شرک صریح کی تردید و مخالفت کو اپنا موضوع اور مقصد زندگی بنایا، یا تو نہیں تھے، یا تاریخ کے منظر عام پر نہیں ہیں، یا ان کی بہت ممتاز اور بلند شخصیت نہیں تھی، اور انھوں نے اس موضوع پر کوئی ایسا وسیع علمی ذخیرہ یادگار نہیں چھوڑا جو ان کی شخصیت اور اصلاحی کارنامہ کی یاد تازہ کرتا ہے، درحقیقت اس فتنۂ عالم آشوب کے مقابلہ اور عقیدۂ توحید کی توضیح و تشریح اور احیاء و تجدید کے لئے شیخ الاسلام ابن تیمیہ کی جیسی طاقتور اور بلند شخصیت کی نیز ان مشرکانہ عقائد و رسوم کے تفصیلی جائزہ اور احتساب اور مدلل و پرزور تردید کی ضرورت تھی، جو مسلم معاشرہ پر حاوی ہوتے جارہے تھے، توحید کا مزاج ہی یہ ہے کہ وہ تاویل اور عوام کی رعایت کے ساتھ نہیں چل سکتی، اس کے لئے تو انبیاء علیہم السلام کی واشگاف تقریر اور فیصلہ کن اور غیر مبہم طرز خطاب کی ضرورت ہے، جو بالکل "فرقان" کی شان رکھتا ہو، امام ابن تیمیہ نے اپنے زمانہ میں نیابتِ انبیاء کا فرض انجام دیا، اور "فَاصْدَعْ بِمَا تُؤْمَرُ وَاَعْرِضْ عَنِ الْمُشْرِكِيْنَ" پر عمل کیا، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ان عقائد و رسوم میں جو جہالت غیر مسلموں کے اختلاط و صحبت اور فرقِ ضالّہ اور اہلِ غرض کے اثر سے پیدا ہو گئی تھی، ایک عام تزلزل پیدا ہو گیا، اسلام کا عقیدۂ توحید جو انبیاء علیہم السلام کی بعثت کا سب سے بڑا مقصد اور ان کی دعوت کا نقطۂ مرکزی ہے، ایک بار پھر نکھر کر اور منقح ہو کر سامنے آ گیا "لِيَهْلِكَ مَنْ هَلَكَ عَنْ بَيِّنَةٍ وَّيَحْيٰى مَنْ حَيَّ عَنْ بَيِّنَةٍ"، امام ابن تیمیہ کے اصلاحی کارناموں میں سے اگر صرف یہی ایک کارنامہ ہوتا تو ان کے مقامِ تجدید اور دعوت و عزیمت کے ثبوت کے لئے کافی تھا۔

ان کی کتابوں کے اثر سے ان کے بعد بھی وقتاً فوقتاً ایسے اربابِ دعوت و عزیمت پیدا ہوتے رہے، جنھوں نے اپنے اپنے زمانہ کے مشرکانہ عقائد و رسوم اور "جاہلیت وثنیہ" کے خلاف عَلمِ جہاد بلند کیا اور "اَلَا لِلّٰهِ الدِّيْنُ الْخَالِصُ" کا آوازہ اس بلند آہنگی سے بلند کیا کہ عالمِ اسلام کے دشت و جبل اس سے گونج اٹھے۔

فلسفہ و منطق و علم کلام کی تنقید

اور

کتاب و سنت کے طرز و اسلوب کی ترجیح

شیخ الاسلام حافظ ابن تیمیہ کا دوسرا علمی و اصلاحی کارنامہ یہ ہے کہ انھوں نے اپنے زمانہ میں فلسفہ و منطق و علم کلام کی مفصل تنقید کا فرض انجام دیا، اور ان کے مقابلہ میں مدلّل طریقہ پر کتاب و سنت کے طرز و اسلوب کی برتری ثابت کی، ان کے اس کارنامہ کی عظمت کا اندازہ کرنے کے لئے یہ معلوم کرنا ضروری ہے کہ فلسفہ و منطق کو اس وقت عالم اسلام میں کیا مقام اور ذہن و افکار پر کیسا تسلّط حاصل تھا، اور انھوں نے کس ماحول میں یہ کارنامہ انجام دیا۔

فلسفۂ یونان کا عالمِ اسلام پر اثر و اقتدار

یونانی فلسفہ و منطق کی کتابوں کے ترجمہ کا کام خلیفۂ منصور کے زمانہ (تقریباً ۱۳۶ھ) سے شروع ہو گیا تھا، معتزلہ نے ان کتابوں کا مطالعہ اور ان سے استفادہ کیا تھا، ان کی کتابوں میں فلسفۂ یونان کی اصطلاحات کا استعمال اسی زمانہ سے شروع ہو گیا تھا، لیکن علوم یونانی کا اصل فروغ مامون کے زمانہ سے شروع ہوا، مامون نے ترجمہ کی تحریک کی شاہانہ سرپرستی کی، وہ بذات خود یونانی علوم کا بڑا قدر دان

اور حرّانیص تھا، صاعد اندلسی نے "طبقات الامم" میں لکھا ہے کہ "اس نے شاہانِ روم سے حکمائے یونان کی کتابوں کی فرمائش کی، انھوں نے افلاطون، ارسطو، بقراط، جالینوس، اقلیدس اور بطلیموس وغیرہ کی تصنیفات تحفۃً بھیجیں اور مامون نے بڑے اہتمام سے ان کا ترجمہ کرایا، اور لوگوں کو ان کے مطالعہ کی ترغیب دی، اس کے زمانہ میں ان کتابوں کا عام چلن ہوگیا، اور فلسفہ نے عروج حاصل کیا، اس کی قدر دانی کی وجہ سے ذہین و ذکی نوجوانوں اور اہلِ علم نے ان مضامین پر عبور پیدا کیا، اور اپنی اپنی جنسِ کمال مامون کے ہنر پرور دربار میں لے کر آئے اور انعام و اکرام و مراتب و مناصب سے سرفراز ہوئے، اس طرح سلطنتِ عباسیہ ان علوم میں رومتہ الکبریٰ کی ہمسر و ہم چشم نظر آنے لگی۔"[1]

ترجمہ کا یہ کام مامون کے بعد تک جاری رہا، اور تاریخ سے معلوم ہوتا ہے کہ چوتھی صدی ہجری تک یونان کے علمی ذخیرہ کا بڑا حصہ عربی میں منتقل ہو چکا تھا۔[2]

اس علمی ذخیرہ میں اگرچہ افلاطون اور دوسرے حکمائے یونان کی تصنیفات و تحقیقات بھی تھیں، لیکن شاید مترجمین (جو زیادہ تر نسطوری اور یعقوبی، عیسائی اور جندیسابور اور حرّان کے علمائے فلسفہ تھے) کے ذاتی رجحان کی وجہ سے یا اس بنا پر کہ ارسطو کا زمانہ قریب تر ہے اور اس کی تصنیفات میں فلاسفۂ متقدمین کے مباحث زیادہ مدوّن و مرتب ہیں، ارسطو کی کتابوں نے عالمِ اسلامی کے علمی و درسی حلقوں میں زیادہ قبولیت و رواج حاصل کیا، اور بالآخر وہی فلسفۂ یونان کا نمائندہ اور وکیل اور عالمِ اسلام میں فلسفہ کا رمز اور نشان بن کر رہ گیا، عالمِ اسلام کی بدقسمتی تھی کہ حکمائے یونان میں سے اس کے حصہ میں وہ فلسفی عالم آیا، جو بہت سے اسباب و وجوہ کی بنا پر (جن میں سے بعض کی تفصیل امام ابن تیمیہ کے بیانات و انتقادات میں آئے گی) ادیانِ سماوی کی روح اور دینی مفاہیم و تصورات و حقائق سے زیادہ بعید و ناآشنا اور مادّی فکر و نظر کا پرجوش حامی و داعی ہے۔

---

[1] طبقات الامم صـ۴۷ [2] تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو: فہرست ابن ندیم، طبقات الاطباء (ابن ابی اصیبعہ) اخبار الحکماء (قفطی) وغیرہ

فلسفہ کا دورِ تقلید

ابتداء میں عالمِ اسلام کے علمائے فلسفہ نے ارسطو کے فلسفہ و منطق کو آنکھ بند کرکے قبول کرنے سے انکار کیا، اور اس کو تنقید و تحقیق سے بالاتر اور مستغنی نہیں سمجھا، بہت سے علماء نے اس کی تردید میں کتابیں لکھیں، اور اس کے فلسفیانہ و منطقی مباحث پر آزادانہ و ناقدانہ نظر ڈالی، اور جو چیز ان کو مخدوش اور کمزور نظر آئی، برملا اس کا اظہار کیا، اس سلسلہ میں ابتدا میں معتزلہ پیش پیش تھے، ان میں سے نظام اور ابو علی جبّائی خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں، تیسری صدی میں حسن بن موسیٰ نوبختی نے کتاب "الآراء والدیانات" لکھی، اور اس میں ارسطو کی منطق کے بعض اہم مسائل کا رد کیا، چوتھی صدی میں امام ابوبکر باقلّانی نے "دقائق" کے نام سے ایک کتاب لکھی جس میں فلسفہ کا رد لکھا، اور یونانیوں کی منطق پر اہلِ عرب کی منطق کی ترجیح ثابت کی، پانچویں صدی میں علامہ عبدالکریم شہرستانی (صاحبُ الملل والنحل) نے برقلس اور ارسطو کے رد میں ایک کتاب لکھی اور قواعدِ منطق کے موافق ان پر دلائل کا نقض کیا، اسی صدی کے آخر میں امام غزالی فلسفہ کے مدمقابل ہوئے، اور انھوں نے تہافۃ الفلاسفہ کے نام سے وہ کتاب لکھی جس سے سو برس تک فلسفہ کے ایوان میں تزلزل رہا[1]، چھٹی صدی میں ابوالبرکات بغدادی نے اس سلسلہ کو بڑی ترقی دی، اور "المعتبر" کے نام سے ایک معرکۃ الآراء کتاب لکھی جس میں اکثر مسائل میں ارسطو کے خیالات کو غلط ثابت کیا، اس صدی میں امام رازی نے متکلمین اسلام اور اشاعرہ کا وکیل بن کر فلسفہ کو اپنے اعتراضات کا نشانہ بنالیا۔

لیکن عالمِ اسلام کا وہ علمی حلقہ جو فلسفۂ یونان کا اصل علم بردار اور ترجمان سمجھا جاتا تھا، ارسطو کی شخصیت و عظمت سے مسحور تھا، اور ایک طرح اس کو تنقید و تحقیق سے بالاتر سمجھتا تھا، زمانہ کے ساتھ ساتھ علمائے فلسفہ کی ارسطو کی ذات کے ساتھ یہ گرویدگی اور شیفتگی بھی بڑھتی جارہی تھی، اور فلسفہ کے حلقوں

---

[1] تفصیل تاریخ دعوت و عزیمت حصہ اول میں ملاحظہ ہو۔

میں ارسطو رفتہ رفتہ تقدس و عظمت کے مقام پر فائز ہوتا جا رہا تھا، ہر بعد کا فلسفی اپنے پیشرو سے اس عظمت و تقدیس میں فائق اور مقدم نظر آتا ہے' ابونصر فارابی (م ۳۳۹ھ ۹۵۰ء) افلاطون و ارسطو کی نسبت لکھتا ہے:۔

وکان هذان الحکیمان هما مبدعان	یہ دونوں حکیم فلسفہ کے موجد اور اس کے مبادی
للفلسفة ومنشأن لاوائلها واصولها	واصول کے بانی و مرتب ہیں، اور فلسفہ کے
ومتمّمان لأواخرها وفروعها وعليهما	مسائل و مباحث میں تمام تر انہی دونوں پر
المعوّل فی قلیلها وکثیرها۔[1]	بنیاد ہے۔

بوعلی سینا (م ۴۲۸ھ) فارابی سے بھی زیادہ ارسطو کی عظمت کا قائل اور کلمہ گو ہے، وہ "منطق الشفاء" میں لکھتا ہے کہ "ارسطو کو اتنا زمانہ ہوا لیکن آج تک اس کے ان مسائل و تحقیقات پر کچھ اضافہ نہ ہو سکا"[2]

بوعلی سینا کے بعد فلسفہ کے حلقہ نے ابن رشد (م ۵۹۵ھ) سے بڑا عالم اور وکیل پیدا نہیں کیا، ارسطو کی عظمت و تقدیس میں اس کا قدم بوعلی سینا سے بھی آگے ہے' اور اگر اس موقع پر تصوف کی اصطلاح (دخل در معقولات نہ ہو تو) یہ کہنا صحیح ہو گا کہ اس کو ارسطو کی ذات میں فنا فی الشیخ کا درجہ حاصل ہے' اس کا ایک سوانح نگار اس کی اس خصوصیت کا ان الفاظ میں اظہار کرتا ہے:۔

اما تمجید ابن رشد لارسطو	ارسطو کی عظمت و تقدیس کے سلسلہ میں ابن رشد
فلاحدّ له فیکاد یؤلهه، وقد	اتنا آگے ہے جس کی کوئی انتہا نہیں' یہاں تک کہ
وضع له اوصافاً تجعله فوق	وہ اس کو خدا بنانے کی حد تک پہونچ گیا اور عقل
درجات الکمال الانسانی عقلاً وفضلاً	و فضل کے اندر انسانی کمال کے درجات سے بھی
ولو کان ابن رشد یقول	بہت اونچے اس کے اوصاف بیان کئے اور اگر
بتعدد الآلهة لجعل ارسطو	ابن رشد تعدد آلہہ کا قائل ہوتا تو وہ ارسطو کو

---

[1] الجمع بین رأی الحکیمین [2] مضمون "فلسفۂ یونان اور اسلام" از مولانا شبلی نعمانی، "الندوہ" جلد ا، بحوالۂ "منطق الشفاء"۔

رب الارباب[1]۔ رب الارباب بنا دیتا۔

ساتویں صدی میں فلسفہ کے حلقہ میں نصیر الدین طوسی (م ۶۷۲ھ) کی شخصیت نمایاں ہوتی ہے، جن کو فلسفہ کے مدرسی حلقہ نے محقق طوسی کے لقب سے یاد کیا ہے، یہ وہ زمانہ تھا کہ تاتاریوں کے حملے اور بغداد کے سقوط نے عالم اسلام کو بے حواس بنا رکھا تھا، اور ایک عام علمی زوال پورے عالم اسلام پر سایہ فگن تھا، اس وقت نصیر الدین طوسی ہی (جو ہلاکو خاں کے مقرب و معتمد تھے) یونانی علم و فلسفہ کے علم بردار تھے، انہی کے شاگردوں نے (جن میں قطب الدین شیرازی اور ان کے ہم نام قطب الدین رازی خاص طور پر نامور ہیں) درس و تدریس اور تصنیف و تالیف کا کام سنبھالا اور انہی سے ایران کے اس طرز تعلیم کی بنیاد پڑی، جس میں فلسفہ و منطق کو مرکزی مقام حاصل تھا[2]، نصیر الدین طوسی اس مکتب فکر سے تعلق رکھتے تھے، جو ارسطو کو عقل کل کا درجہ دیتا تھا، اور اس کی تحقیقات کو حرف آخر سمجھتا تھا، انھوں نے امام رازی کے مقابلہ میں ارسطو کے فلسفہ کی زور شور سے حمایت و مدافعت کی تھی، اور ارسطو کے فلسفہ میں نئی جان ڈال دی تھی۔

فلسفہ و منطق کا علمی محاسبہ اور ابن تیمیہ کا کارنامہ

شیخ الاسلام ابن تیمیہ نصیر الدین طوسی کی وفات سے دس برس پہلے پیدا ہوئے، ان کی علمی زندگی کا آغاز ہوا تو نصیر الدین طوسی اور ان کے تلامذہ کے اثر سے یونانی فلسفہ و منطق یعنی ارسطو کے فلسفہ و منطق کا طوطی بول رہا تھا، اس کے مسائل و مباحث کے سمجھ لینے ہی کو منتہائے ذکاوت اور معیار فضیلت سمجھا جاتا تھا، کسی کو اس کے مقابلہ میں یا اس کی مخالفت میں لب کشائی کی جرأت نہ تھی، محدثین و فقہاء اس میدان کے حریف نہیں تھے، وہ زیادہ سے زیادہ یہ کر سکتے تھے کہ اس کی حرمت کا فتویٰ دے دیں، مگر اس سے

---

[1] تاریخ فلاسفۃ الاسلام فی المشرق و المغرب (لطفی جمعہ) ص ۱۵۵ [2] علامہ سید شریف جن سے زمانۂ مابعد میں تعلیم و تعلّم کا سلسلہ پھیلا، قطب الدین رازی کے شاگرد تھے، انہی کا سلسلہ ہندوستان پہونچا، جس کی ترقی یافتہ یا بگڑی ہوئی شکل یہاں کا درس نظامی ہے۔

یہ سیلاب رک نہیں سکتا تھا، عالمِ اسلام کے علم و فکر پر اس کا رعب چھایا ہوا تھا، اس مرعوبیت سے ایک حلقہ میں (جو فلسفہ سے قریب اور براہِ راست تعلق رکھتا تھا) تشکک و ارتیابیت کا دور دورہ تھا، اور سوفسطائیت (حقائقِ اشیاء کا انکار) کا رجحان بھی پایا جاتا تھا، جو حلقہ اس سے براہِ راست تعلق نہیں رکھتا تھا، احساس کہتری اور مرعوبیت کا شکار تھا، اس صورتِ حال کا مقابلہ کرنے کے لئے فلسفہ و منطق کے بے لاگ علمی محاسبے اور جائزے اور اس کی علمی کمزوریوں کا پردہ فاش کرنے کی ضرورت تھی، وقت کی یہ ضرورت شیخ الاسلام ابن تیمیہ نے پوری کی، اور اس کو مستقل موضوع بنا کر یونانی فلسفہ و حکمت کی مفصّل و مدلّل تنقید اور اس کے علمی محاسبے کا کام انجام دیا، اور ایک ایسی شخصیت (ارسطو) سے حریفانہ گفتگو اور علمی مناظرہ کیا، جس کو علمائے فلسفہ مافوق البشر ہستی اور تنقید و تردید سے بالاتر سمجھنے لگے تھے۔

ان کے کام کی نوعیت اور ان کے تنقید و محاسبہ کی حیثیت، ان کا نقطۂ نظر اور بنائے اختلاف کیا تھی؟ بہتر یہ ہے کہ اس کے لئے ان ہی کی کتابوں کی طرف رجوع کیا جائے، ذیل میں مختلف عنوانات کے تحت ان کی تحریروں کے بعض خلاصے اور ان کی کتابوں کے بعض اقتباسات پیش کئے جاتے ہیں، جن سے ان کا نقطۂ نظر اور طریقِ فکر واضح ہو جائے گا۔

طبعیات و ریاضیات کا اعتراف

اس علمی ذخیرہ کے بارے میں جو فلاسفۂ یونان و ارسطو کی طرف منسوب تھا، ان کی رائے بہت معتدل اور متوازن ہے، وہ طبعیات، ریاضیات اور الٰہیات میں فرق کرتے ہیں، اور اپنے پیشرو امام غزالی کی طرح طبعیات اور ریاضیات کے بہت سے مسائل کی صحت و معقولیت کا اقرار اور اس بارے میں علمائے یونان کی ذہانت کا اعتراف کرتے ہیں، ایک جگہ لکھتے ہیں:-

نعم لهم في الطبعيات كلام غالبه جيّد — ان فلاسفہ کی طبعیات میں جو گفتگو اور بحث ہے اس کا اکثر

وھو کلام کثیر واسع، ولھم عقول عرفوا بھا ذلك وھم قد یقصدون الحق لا یظھر علیھم العناد۔[۱]

بڑا حصہ اچھا ہے اوران کا یہ کلام خاصا وسیع اور مفصل ہے ان باتوں کو سمجھنے اور معلوم کرنے کے لئے وہ اچھا دماغ رکھتے تھے بہت سے مباحث میں وہ حق کے جویا اور طالب نظر آتے ہیں اور ضد اور زبردستی سے کام نہیں لیتے۔

وہ ایک جگہ صاف اعتراف کرتے ہیں کہ طبعیات وریاضیات وغیرہ فلاسفۂ یونان کا اصل موضوع اوران کے غور وفکر کا میدان ہے، فرماتے ہیں:۔

لکن لھم معرفۃ جیدۃ بالامور الطبعیۃ وھذا بحر علمھم ولہ تفرغوا وفیہ ضیعوا زمانھم۔[۲]

امور طبعیہ سے ان کی واقفیت اچھی خاصی ہے درحقیقت یہی ان کا دائرہ فکر اور فن خاص ہے اور اسی میں انھوں نے اپنے اوقات کا بیشتر حصہ صرف کیا۔

یونان کے علم ریاضی کے متعلق وہ "الرد علی المنطقیین" میں اپنی رائے ظاہر کرتے ہیں:۔

فھذہ الامور وامثالھا مما یتکلم فیہ الحساب امر معقول مما یشترك فیہ ذووا العقول وما من احد من الناس الا یعرف منہ شیئا فانہ ضروری فی العلم ضروری فی العمل ولھذا یمثلون بہ فی قولھم الواحد نصف الاثنین ولا ریب ان قضایاہ کلیۃ واجبۃ القبول لا تنتقض البتۃ۔[۳]

ریاضی کے یہ مسائل جن سے اہل حساب بحث کرتے ہیں، ایسے معقول مسائل ہیں، جن پر تمام اہل عقول کا اتفاق ہے اور ہر شخص اس سے کچھ نہ کچھ واقفیت رکھتا ہے، اس لئے کہ وہ علم اور عمل دونوں کے لئے ضروری ہے، اس سے کسی کو اختلاف ہو سکتا ہے کہ الواحد نصف الاثنین اس میں کوئی شبہ نہیں کہ اس کے سب قضایا کلی ہیں، واجب القبول ہیں اور ان پر کوئی نقض وارد نہیں ہو سکتا۔

---

[۱] الرد علی البکری ص۱۴۳ [۲] تفسیر سورۃ الاخلاص ص۵۷ [۳] الرد علی المنطقیین ص۱۳۴

اختلاف کا اصل میدان فلسفۂ الٰہیات

امام ابن تیمیہ کو فلسفۂ یونان کے جس دائرہ سے اصل اختلاف ہے، وہ الٰہیات کا دائرہ ہے، الٰہیات کے بارے میں وہ فلسفۂ یونان کی بے بضاعتی اور بے مایگی اور فلاسفۂ یونان کی ناکامی و بے حاصلی اور ان کے جہل مرکب میں مبتلا ہونے پر بار بار زور دیتے ہیں، ان کا یہ عقیدہ ہے کہ یہ فلاسفۂ یونان کا فن اور ان کے غور و فکر اور بحث و نظر کا میدان نہ تھا، انھوں نے اس دائرہ میں قدم رکھ کر اپنے حدود سے تجاوز کیا ہے اور اپنی تحقیر و تضحیک کا سامان بہم پہونچایا ہے، وہ ایک جگہ لکھتے ہیں:-

للمتفلسفة في الطبيعيات خوض	فلسفہ سے اشتغال کرنے والے فنِ طبیعیات میں غور و فکر
وتفصيل تميزوا به بخلاف الالهيات	اور تفصیل سے کام لیتے ہیں اور ان کا امتیاز نظر آتا ہے
فانهم من اجهل الناس بها وابعدهم	لیکن الٰہیات میں وہ جاہل محض اور حق سے بالکل
عن معرفة الحق فيها، وكلام ارسطو	ناآشنا معلوم ہوتے ہیں، اس سلسلہ میں ارسطو سے جو کچھ
معلمهم فيها قليل كثير الخطاء۔[1]	منقول ہے، وہ ہے بہت تھوڑا اور غلطیاں بہت زیادہ ہیں۔

ایک دوسری جگہ طبیعیات میں ان کی واقفیت کا اعتراف کرتے ہوئے "الٰہیات" میں ان کی نامرادی و تہی دستی کا ذکر کرتے ہیں:-

واما معرفة الله تعالىٰ فحظهم منها	جہاں تک اللہ تعالیٰ کی معرفت کا تعلق ہے اس کے
مبخوس جدًا واما ملائكته وكتبه	بارے میں فلاسفہ بڑے محروم اور نامراد نظر آتے ہیں،
ورسله فلا يعرفون ذلك البتة ولم	رہے ملائکہ، اللہ کی کتابیں اور اس کے رسول تو اس کا
يتكلموا فيه لابنفي ولا باثبات وانما	ان کو قطعاً علم نہیں ہے اور اس بارے میں ان سے

[1] معارج الوصول من مجموعۃ الرسائل الکبریٰ ص۱۸۶

تکلموا فی ذلک متأخر وهم الداخلون فی الملل[1]

نفیاً اور اثباتاً کوئی چیز منقول نہیں ہے، اس بارے میں درحقیقت متاخرین فلاسفہ نے گفتگو کی ہے، جن کا مذاہب وادیان سے تعلق رہا ہے۔

امام ابن تیمیہ کا بیان ہے کہ فلسفۂ یونان کے اصل ارکان واساطین کو خود بھی اس کا اعتراف ہے کہ ان کو اس علم کے حصول کے ذرائع اور مقدمات ومبادی حاصل نہیں اور اس بارے میں یقین تک پہونچنا ان کے لئے بہت مشکل ہے، وہ لکھتے ہیں:۔

بل قد صرّح اساطین الفلسفة بأنّ العلوم الالهية لاسبيل فيها الى اليقين وانّما يتكلّم فيها بالاحرى والاخلق فليس لهم فيها الا الظن (وَاِنَّ الظَّنَّ لَا يُغْنِیْ مِنَ الْحَقِّ شَيْئًا)[2]

ان لوگوں نے جو فلسفہ میں ستون کا درجہ رکھتے ہیں اس بات کو صاف طریقے سے کہا ہے کہ علوم الٰہیہ میں یقین تک پہونچنے کا کوئی راستہ نہیں، ان مسائل میں جو کچھ کہا جائے گا، اس کی حیثیت زیادہ سے زیادہ یہ ہوگی کہ یہی لگتی ہوئی بات ہے، یا زیادہ مناسب بات ہے، اس سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ فلاسفہ کے پاس الٰہیات میں ظن وتخمین کے سوا کچھ نہیں اور جیسا کہ قرآن مجید میں کہا گیا ہے "کہ ظن وتخمین کبھی حق کا قائم مقام نہیں ہو سکتا۔"

یونانی الٰہیات اور پیغمبروں کے علوم وتعلیمات کا تقابل

ایک جگہ وہ فلاسفۂ یونان کے الٰہیات کے بارے میں اقوال وقیاسات پر تبصرہ کرتے ہوئے ان لوگوں پر تعجب کرتے ہیں، جو ان کو انبیاء علیہم السلام کے علوم وحقائق کے سامنے لاتے ہیں، اور

---

[1] تفسیر سورۃ الاخلاص ص۵۷ [2] نقض المنطق ص۱۲۷

ان سے مقابلہ کرنے لگتے ہیں، وہ بڑے جوش و اثر سے لکھتے ہیں:۔

"الٰہیات کے بارے میں جب معلم اول ارسطو کے کلام پر نظر ڈالی جاتی ہے، اور ایک پڑھا لکھا آدمی اس کو غور سے دیکھتا ہے تو وہ اضطراراً اس نتیجہ پر پہونچتا ہے کہ ان فلاسفۂ یونان سے بڑھ کر رب العالمین کی معرفت سے کوئی بے بہرہ اور نا آشنا نہیں تھا، وہ دریائے حیرت میں غرق ہو جاتا ہے، جب دیکھتا ہے کہ کچھ لوگ یونان کی الٰہیات کا پیغمبروں کے علوم و تعلیمات سے مقابلہ کرنے لگتے ہیں، اس کو یہ بات ایسی ہی نظر آتی ہے جیسے کوئی لوہاروں کا فرشتوں سے یا گاؤں کے زمینداروں کا شاہانِ عالم سے مقابلہ کرنے لگے، بلکہ اس میں بھی کسی قدر علم و عدل کا شائبہ ہے، لیکن جو فلاسفہ کا انبیاء سے مقابلہ کرتے ہیں، وہ تو سخت ظلم و جہل سے کام لیتے ہیں، اس لئے کہ گاؤں کا زمیندار بہرحال گاؤں کا منتظم ہے، اور اس میں اس کو بادشاہ کے ساتھ کسی نوع کی مشابہت اور کسی جزء کی شرکت ہے، لیکن فلاسفہ و انبیاء کا حال تو یہ ہے کہ انبیاء جو کچھ لے کر آتے ہیں فلاسفہ کو اس کی مطلق خبر نہیں، بلکہ وہ اس کے قریب بھی نہیں پھٹکتے، واقعہ یہ ہے کہ کفار یہود و نصاریٰ بھی ان فلاسفہ کے مقابلہ میں امور الٰہیہ سے زیادہ باخبر ہیں، میری مراد اس سے وحی کا وہ علم خاص نہیں ہے، جو صرف انبیاء کی خصوصیت ہے اور دوسروں کو نصیب نہیں ہے، اس لئے کہ یہ علم تو خارج از بحث ہے، میری مراد ان علوم عقلیہ سے ہے، جن کا تعلق اللہ تعالیٰ کی معرفت، توحید، اس کے اسماء و صفات کی معرفت، نبوت و رسالت، معاد اور ان اعمال سے ہے، جو آخرت میں سعادت کا موجب ہیں، اور جن میں سے اکثر کو انبیاء علیہم السلام نے براہین عقلیہ سے بیان کیا ہے، یہ الٰہی و دینی و شرعی عقلیات بھی وہ ہیں، جن کی ان فلاسفہ کو ہوا بھی نہیں لگی، اور نہ ان کے علوم میں ان کا کوئی پتہ اور نشان ہے، باقی وہ علوم و معارف اور حقائق غیبیہ جو انبیاء کے خصائص میں سے ہیں، ان کے ذکر کا تو اس سلسلہ میں کوئی موقع ہی نہیں، اور فلسفہ اور علوم نبویہ کے مقابلہ میں وہ بحث ہی میں نہیں آتے۔"[1]

[1] الرد علی المنطقیین ص ۳۹۵

فلاسفۂ یونان کا جہل و انکار

علوم الٰہیہ میں فلاسفہ کی بے بضاعتی ان کے علم و بیان کی کوتاہی اور بہت سے غیبی حقائق و موجودات کے انکار کی وجہ امام ابن تیمیہ بیان کرتے ہیں :۔

"جس غیب کی انبیاء علیہم السلام خبر دیتے ہیں' اور وہ کلیات عقلیہ جو تمام موجودات پر حاوی اور شامل ہوں اور جو موجودات کی صحیح تقسیم کرتی ہیں' ان سے فلاسفہ بالکل ناآشنا ہیں' اس لئے اس پر اسی کو قدرت ہو سکتی ہے' جو موجودات کی تمام انواع کا احاطہ کر سکے' اور ان فلاسفہ کا حال یہ ہے کہ یہ صرف حساب اور اس کے بعض لوازم سے واقف ہیں' اور یہ بہت تھوڑے موجودات کی واقفیت ہے اس لئے کہ جن موجودات کا انسانوں کو مشاہدہ نہیں ہے' وہ ان موجودات کے مقابلہ میں کہیں زیادہ کثیر اور وسیع ہیں' جن کا ان کو مشاہدہ ہوتا ہے' اسی بنا پر جن لوگوں کا علم فلاسفہ کی معلومات تک محدود ہے جب وہ انبیاء، ملائکہ، عرش، کرسی، جنت، جہنم وغیرہ کا ذکر سنتے ہیں' اور وہ اس بات کے قائل ہوتے ہیں کہ موجود وہی ہے' جو ان کو معلوم ہے' اور ان کی معلومات کے دائرہ سے باہر موجودات کا وجود نہیں تو وہ حیران رہ جاتے ہیں' اور اپنی معلومات کے مطابق انبیاء علیہم السلام کے کلام کی تاویل کرنے لگتے ہیں' اگرچہ یہ سرے سے کوئی دلیل نہیں ہے' اور ان کو ان موجودات کے نہ ہونے کا کوئی ثبت علم نہیں' اس لئے کہ کسی چیز کے وجود کا علم نہ ہونا الگ چیز ہے' اور کسی چیز کے معدوم ہونے کا علم ہونا الگ چیز ہے' یہ ضروری نہیں کہ جو ہمیں معلوم نہیں وہ معدوم بھی ہو' وہ جب ان غیبی حقائق کا انکار کرنے لگتے ہیں تو ان کا انکار ایسا ہی ہوتا ہے کہ جیسے کوئی طبیب جنات کے وجود کی اس بنا پر نفی کرے کہ فن طب میں جنات کا کوئی ثبوت .... نہیں ہے' حالانکہ فن طب میں جنات کے وجود کا انکار بھی نہیں ہے اسی طرح سے تم دیکھو گے کہ جس شخص کو کوئی فن آتا ہے' اور اس میں وہ عوام کے مقابلہ میں کچھ امتیاز رکھتا ہے

تو وہ اپنی ناواقفیت سے ان چیزوں کی نفی کرنے لگتا ہے جو اس کے فن سے خارج ہیں، واقعہ یہ ہے کہ لوگوں نے چیزوں کے ماننے اور اقرار کرنے میں اتنی ٹھوکر نہیں کھائی، جتنی نہ ماننے میں اور انکار کرنے میں جس چیز کی حقیقت سے انسان پورے طور پر واقف نہیں ہے اس کو جھٹلانے اور اس کے وجود کے انکار کرنے کا رجحان انسانوں میں بہت قدیم اور عام ہے، اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:۔

بَلْ كَذَّبُوا بِمَا لَمْ يُحِيطُوا بِعِلْمِهِ وَلَمَّا يَأْتِهِمْ تَأْوِيلُهُ۔ (سورۂ یونس۔۳۹)

ان کفار نے ان چیزوں کو جھٹلایا جن کا ان کو پورا علم حاصل نہیں تھا، حالانکہ ابھی تک ان پر ان کی پوری حقیقت منکشف نہیں ہوئی۔

بت پرست و ستارہ پرست یونان

یونان قدیم کی تاریخ سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ دنیا کو طبعیات و ریاضیات اور علوم و آداب کا یہ وسیع اور عظیم سرمایہ عطا کرنے والا ملک جس نے ہزاروں برس تک دنیا کی عقلی و فکری قیادت کی ہے، اپنی تاریخ کے بیشتر حصہ میں بت پرست اور ستارہ پرست واقع ہوا تھا اور صدہا توہمات و خرافات میں گرفتار تھا، جدید تاریخ نے یونان کے علم الاصنام اور اس کے قومی دیومالا کو بے نقاب کر دیا ہے، اور اب اس میں کوئی شبہ نہیں رہا کہ یونان قدیم میں دیوتاؤں، اور دیبیوں اور ستاروں کے معبدوں اور ہیاکل کا ایک جال بچھا ہوا تھا، یونان کا جو فلسفہ عالم اسلام میں ترجمہ ہو کر آیا اور پھر اس کے ذریعہ یورپ تک پہونچا وہ اسی صنم پرستی اور ستارہ پرستی کے رنگ میں ڈوبا ہوا ہے، یونانی فلاسفہ نے اپنے مذہبی اعتقادات اور مشرکانہ تصورات کو فلسفہ کی مہیب اصطلاحات میں منتقل کر دیا اور مسلمان علمائے فلسفہ نے جو یونان کی مذہبی تاریخ سے واقف نہیں تھے، ان کو علمی حقائق سمجھ کر اپنے غور و فکر کا موضوع بنا لیا، اور ان کو ثابت کرنے کے درپے ہوئے، امام ابن تیمیہ کی یہ بڑی ژرف نگاہی اور ذہانت ہے کہ انھوں نے کئی صدی پہلے اس نکتہ کو

فاش کیا، وہ ایک جگہ لکھتے ہیں:۔

اما قدماء الیونان فکانوا مشرکین من اعظم	جہاں تک قدمائے یونان کا معاملہ ہے تو واقعہ یہ ہے کہ
الناس شرکاً وسحراً یعبدون الکواکب	وہ پکے مشرک تھے، اور ان کو سحر سے بھی بڑی دلچسپی تھی۔
والاصنام ولهذا عظمت عنایاتهم	وہ ستاروں اور بتوں کی پرستش کرتے تھے علم ہیئت
بعلم الهیئة والکواکب لاجل عبادتها	اور کواکب کی طرف غیر معمولی توجہ کرنے کا یہی راز
وکانوا یبنون لها الهیاکل[1]	ہے، اس لئے کہ وہ ان کی پرستش کرنا چاہتے تھے
	اور ان کے لئے معبد اور ہیکل تعمیر کرتے تھے۔

ایک دوسری جگہ لکھتے ہیں:۔

ولهذا کان رؤسهم المتقدمون	ان کے متقدمین و متاخرین پیشوا شرک کا حکم دیتے ہیں
والمتأخرون یامرون بالشرك فالاولون	متقدمین کواکب کو آلہہ صغری (چھوٹے خدا) کے
یسمون الکواکب الآلهة الصغری	لقب سے یاد کرتے ہیں، اور مختلف طریقوں پر ان کی عبادت
ویعبدونها باصناف العبادات کذلك	کرتے ہیں مسلمانوں میں جن لوگوں نے ان کی پیروی اختیار
کانوا فی ملة الاسلام لاینهون عن	کی ان کا بھی حال یہ ہے کہ وہ شرک سے نہیں روکتے،
الشرك ویوجبون التوحید بل	اور توحید کو ضروری قرار نہیں دیتے بلکہ شرک کو یا تو
یسوغون الشرك او یامرون به	جائز قرار دیتے ہیں، یا کم سے کم توحید کو ضروری
اولا یوجبون التوحید[2]	قرار نہیں دیتے۔

متقدمین و متاخرین فلاسفۂ یونان کا فرق

امام ابن تیمیہ کی یہ بھی ایک بڑی باریک بینی اور حقیقت شناسی تھی کہ انھوں نے یونان کے

[1] تفسیر سورۃ الاخلاص ص ۵۷ [2] نقض المنطق ص ۱۷۷

فلاسفۂ متقدمین اور متاخرین میں فرق کیا، ان کے نزدیک فلاسفۂ متقدمین اور ارسطو کے پیشرو غیبی حقائق اور دینی مفاہیم و تصورات سے زیادہ آشنا اور قریب تھے، اور ان کے اندر غیب اور غیر مادی حقائق کے انکار کا وہ رجحان نہیں پایا جاتا، جو ارسطو میں نمایاں طور پر نظر آتا ہے، وہ ایک جگہ لکھتے ہیں:۔

"یہ فلاسفہ جو ارسطو کے پیرو ہیں، انھوں نے ان فلاسفۂ متقدمین کی پیروی نہیں کی جو فلسفہ کے ستون و ارکان تھے، وہ فلاسفۂ متقدمین عالم کے حدوث کے قائل تھے، اور اس کے بھی قائل تھے، کہ اس عالم سے اوپر ایک دوسرا عالم ہے، اور اس عالم علوی کی بعض ایسی صفتیں بیان کرتے تھے، جو حدیث میں جنت کے متعلق آئی ہیں، اسی طرح وہ حشر اجساد کے قائل تھے، جیسا کہ سقراط و تالیس وغیرہ اساطین فلسفہ کے کلام میں نظر آتا ہے۱؎"

ارسطو حقائق دینیہ سے بعید تر ہے

ان کے نزدیک اس فرق کی وجہ یہ ہے کہ قدماء فلاسفہ کو ان ملکوں میں آنے جانے کا اتفاق ہوا جہاں انبیاء علیہم السلام مبعوث ہوئے تھے، اور اس طرح وہ دینی حقائق سے واقف ہوئے لیکن ارسطو کو اس کا اتفاق نہیں ہوا، وہ بعض مؤرخین کے حوالہ سے بیان کرتے ہیں:۔

"جن لوگوں نے فلاسفہ کی تاریخ و تذکرہ مرتب کیا ہے، ان کا بیان ہے کہ فلسفہ کے ابتدائی ارکان (فیثاغورث، سقراط، افلاطون) شام وغیرہ ارض انبیاء کی طرف آمد و رفت رکھتے تھے، اور لقمان حکیم وغیرہ سے اور حضرت داؤدؑ، سلیمانؑ کے اصحاب سے استفادہ کرتے تھے، لیکن ارسطو کو کبھی اس سرزمین کی طرف سفر کرنے کا اتفاق نہیں ہوا، جو انبیاء کی بعثت سے مشرف ہوئی، نہ اس کے پاس انبیاء علیہم السلام کی تعلیم کا کوئی حصہ تھا، جیسا کہ اس کے پیشروؤں کے پاس تھا، اس کے پاس

۱؎ تفسیر سورۃ الاخلاص ص ۶۷

ستارہ پرستی کے مذہب کا کچھ حصہ تھا، اس نے ان قیاسی تعلیمات کی بنیاد ڈالی، اور وہ ایک ایسا قانون بن گیا جس پر اس کے پیرو آنکھ بند کر کے چلتے رہے۔"[1]

بدقسمتی سے عالم اسلام میں جو فلسفہ رائج اور مقبول ہوا، وہ ارسطو ہی کا فلسفہ تھا، اور وہی آخری دور میں یونان کا فلسفہ سمجھا جانے لگا، امام ابن تیمیہ لکھتے ہیں:۔

ولکن هذه الفلسفة التی یسلکها الفارابی	یہ فلسفہ جس کی فارابی، ابن سینا، ابن رشد اور سہروردی
وابن سینا وابن رشد والسهروردی	مقتول وغیرہ پیروی کرتے ہیں، مشائین کا فلسفہ ہے
المقتول ونحوه فلسفة المشائین وهی المنقولة	اور یہ تمام تر ارسطو سے منقول ہے جس کو معلم اول
عن ارسطو الذی یسمونه المعلم الاول۔[2]	کے نام سے فلاسفہ یاد کرتے ہیں۔

یونانی فلسفہ میں خدا کی حیثیت

ارسطو کے اس فلسفہ میں خدا کی ہستی اور اس کا تصور محض وجود ذہنی بن کر رہ جاتا ہے، وہ لکھتے ہیں:

فاذا تصور العاقل اقوالهم حق التصور	جب ایک صاحب عقل ان کے اقوال پر غور کرتا
تبین له ان هذا الواحد الذی اثبتوه	ہے، جو خدا کی ہستی کے متعلق ہیں تو اس پر یہ بات
لا یتصور وجوده الا فی الاذهان	واضح ہو جاتی ہے کہ جس واحد کو ان فلاسفہ نے ثابت
لا فی الاعیان۔[3]	کیا ہے اس کے وجود کا تصور صرف ذہن میں ہو سکتا
	ہے، خارج میں کہیں اس کا وجود نہیں۔

فلاسفہ نے خدا کے افعال و صفات کی نفی و انکار میں جس مبالغہ سے کام لیا ہے، اور اس کو جس طرح صفاتِ کمالیہ اور ان تمام محاسن اور اختیارات سے مجرّد ثابت کیا ہے، جو ادنیٰ مخلوقات

---

[1] نقض المنطق ص۱۱۳ [2] الرد علی البکری ص۲۰۶ [3] تفسیر سورۃ الاخلاص ص۳۷

میں پائے جاتے ہیں' اس کی بنا پر ان کا خیال ہے کہ اس سے بڑھ کر خدا کی توہین ممکن نہیں' وہ کسی کا قول نقل کرتے ہوئے اس حقیقت کو اس طرح بیان کرتے ہیں:۔

لقد احسن بعض الفضلاء اذ قال	کسی کا مقولہ ہے کہ فلاسفہ کی توحید سے تو تھپڑ
الصفع احسن من توحید الفلاسفة	مار دینا ہی بہتر ہے' بلکہ واقعہ یہ ہے کہ اس کہنے
بل قصّر فیما قال[1]	والے نے بھی رعایت سے کام لیا۔

فلاسفۂ اسلام یونان کے مقلّدِ محض ہیں

ان کے نزدیک فلاسفۂ متاخرین جو اسلامی عہد میں پیدا ہوئے اس فلسفۂ یونانی کے لکیر کے فقیر ہیں' اور ارسطو کے مقلّد محض ہیں' اور اسی تقلید کی پابندی کی وجہ سے ان کے یہاں فاش غلطیاں اور سخت تناقض پایا جاتا ہے' ان کو اس بات کی سخت شکایت اور رنج و غصہ ہے کہ ان مسلمان فلاسفہ نے اس نعمت کی بالکل قدر نہ کی جو رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ ان تک پہونچی تھی' اور اس روشنی و ہدایت سے کچھ فائدہ نہیں اٹھایا جو ان کی دسترس میں تھی' بلکہ انھوں نے اس پر پردہ ڈالنے کی کوشش کی' وہ لکھتے ہیں:۔

ان ھٰؤلاء المتفلسفة المتاخرین فی الاسلام	یہ پچھلے دور کے مسلمان فلسفی اہل علم و ایمان کے نزدیک
من اجھل الخلق عند اھل العلم والایمان	جاہل ترین مخلوق نظر آتے ہیں' ان کی گمراہی تضاد بیان
وفیھم من الضلال والتناقض مالا یخفی	ایسا کھلا ہوا ہے کہ ذرا ہوشیار بچے بھی اس کو سمجھ سکتے ہیں
علی اذکیاء الصبیان' لانھم لما التزموا	انھوں نے جب اس بات کو طے کر لیا کہ ان کو اپنے پیشرؤں
ان لا یسلکوا الا سبیل سلفھم الضالین	اور پیشواؤں کے راستے پر چلنا ہے' جن کو خود راستہ نہیں ملا
وان لا یفرقوا الا بما یبنونہ علی تلك	تھا' اور ان کے قوانین پر استدلال کی جو عمارت کھڑی

[1] الرد علی المنطقیین صا۲۲

القوانین وقد جاء ھم من النور والھدی والبیان ما ملأ القلوب والالسنۃ والآذان صاروا بمنزلۃ من یرید ان یطفیٔ نور الشمس بالنفخ فی الھباء او یغطی ضوءھا بالعباء۔[1]

ہوتی ہے اسی کو تسلیم کرتا ہے اور اس روشنی اور ہدایت سے کوئی فائدہ نہیں اٹھاتا ہے جس نے دلوں اور کانوں کے پردے اٹھا دیئے تو اب ان کی مثال ایسی ہے جیسے کوئی شخص آفتاب کی روشنی کو پھونک مار کر بجھانا یا اپنے دامن کے نیچے چھپانا چاہے۔

ابن سینا حقیقت و منصب نبوت سے ناآشنا ہے

عہدِ اسلامی کے جن فلاسفہ نے فلسفہ کی تقلید اور ارسطو کے اتباع میں دینی حقائق اور عقائد کی تشریح کی کوشش کی، اور فلسفہ کی روشنی اور اس کے سہارے سے ان حقیقتوں کو سمجھنا اور سمجھانا چاہا، امام ابن تیمیہ ان فلاسفہ پر بھی جو حکمائے اسلام کے نام سے یاد کئے جاتے ہیں، سخت تنقید کرتے ہیں، ان کے نزدیک ان غیبی حقائق اور علوم کو فلسفۂ یونان کی تنہا مدد اور اس کے اصول و ضوابط سے نہیں سمجھا جا سکتا، اس سلسلہ میں ان کی سب سے بڑی تنقید ابن سینا پر ہے، جو اسلامی مشرق میں ارسطو کے فلسفہ کا سب سے بڑا شارح اور ترجمان سمجھا جاتا ہے، ایک جگہ لکھتے ہیں:

"ابن سینا نے ثابت کیا ہے کہ منصبِ نبوت بھی نفس کی قوتوں میں سے ایک قوت ہے، اور نفوس کی قوتیں باہم بہت متفاوت ہیں، یہ بات ایک ایسا ہی شخص کہہ سکتا ہے، جو نبوت کی حقیقت سے محض ناآشنا اور اس سے بعید ہے، یہ بات ایسی ہے جیسے کوئی شخص صرف شعراء کے طبقوں اور ان کے گروہ سے واقف ہو، اور وہ یہ ثابت کرنا چاہے کہ دنیا میں فقہاء اور اطباء کا بھی ایک گروہ ہے، اور وہ شعراء کے وجود سے فقہاء اور اطباء کے وجود پر دلیل لائے، بلکہ یہ مثال بھی پوری پوری چسپاں نہیں ہوتی، اس لئے کہ نبی اور غیر نبی میں اس سے بھی زیادہ تفاوت اور بُعد ہے، جتنا کہ فقیہ و طبیب اور شاعر کے درمیان میں، لیکن یہ فلا-

---

[1] الرد علی البکری ص۱۱۱

نبوت کے مفہوم سے بالکل ناآشنا ہیں، جب انبیائے کرام کا چرچا ہوا، تو ان کے متبعین نے اس کو بھی ان فلاسفہ کے اصول سے ثابت کرنا چاہا جس کو نبوت کا کوئی اندازہ اور انبیائے کرام سے کوئی واقفیت نہیں تھی"[1]

ایک دوسری جگہ لکھتے ہیں :-

"ان گروہوں میں نبوت کے مفہوم و حقیقت سے سب سے زیادہ بعید فلسفۂ یونان کے پیرو (متفلسفہ) اور باطنیہ اور ملاحدہ ہیں، ان کے نزدیک نبوت کی بنیاد وہ قدرِ مشترک ہے جو تمام انسانوں کے درمیان پایا جاتا ہے، اور وہ خواب ہے، حقیقتۂ ارسطو اور اس کے متبعین کے یہاں نبوت پر کوئی بحث نہیں ملتی، فارابی نے نبوت کو محض خواب کی ایک قسم قرار دیا ہے، اس لئے وہ اور اس کے ہم خیال فلسفی کو نبی پر ترجیح دیتے ہیں، ابنِ سینا کے نزدیک نبوت کا پایہ اس سے کچھ بلند ہے، اس نے نبی کی تین خصوصیتیں قرار دی ہیں، ایک یہ کہ اس کو علم بغیر تعلّم کے حاصل ہوتا ہے، اس کا نام اس کے نزدیک قوتِ قدسیہ ہے، اور اس کی حقیقت اس کے نزدیک وہی ہے، جو قوتِ حدسیہ کی ہے، دوسرے یہ کہ وہ اپنے نفس میں کسی معلوم چیز کا تخیل قائم کرتا ہے، اور اس کو اپنے اندرون میں کچھ نورانی صورتیں نظر آنے لگتی ہیں، اور وہ اپنے باطن میں کچھ آوزیں سننے لگتا ہے، جیسے کوئی سونے والا نیند کی حالت میں کچھ صورتیں دیکھتا ہے، جو اس سے ہم کلام ہوتی ہیں، اور ان کا کلام سنتا ہے، اور اس سب کا وجود صرف اس کے اندر ہوتا ہے، خارج میں کوئی وجود نہیں، اس طرح ان سب لوگوں کے نزدیک ایک نبی جو کچھ سنتا ہے اور جو کچھ دیکھتا ہے، اور لوگ اس کے دید و شنید میں اس کے شریک نہیں ہوتے، یہ سب اس کے اندرون ہی پیش آتا ہے، اور اس کے باطنی مشاہدات موجودات ہیں، جن کا خارج میں کوئی وجود نہیں، یہی بات ایسے شخص کو پیش آسکتی ہے جس کے دماغ پر کوئی اثر ہو، یا صفرا و سودا کا غلبہ ہو، ان کے نزدیک نبی کی تیسری خصوصیت یہ ہے کہ اس کو ایک ایسی قوت حاصل ہوتی ہے جس کے ذریعے سے وہ عالم کے ہیولیٰ میں تصرف کرتا ہے، اور عجیب امور اور حوادث ظاہر ہوتے ہیں، اور ان کے نزدیک

---

[1] النبوات ص ۲۲

یہی انبیاء کے معجزات ہیں، اس لئے کہ ان کے نزدیک عالم میں جو حادثہ بھی پیش آتا ہے، وہ قوتِ نفسانیہ یا قوتِ ملکیہ یا قوتِ طبعیہ کا نتیجہ ہوتا ہے.........

ان متفلسفہ کے نزدیک انبیاء کے نفوس میں جو کچھ بھی واقع ہوتا ہے، وہ سب عقل فعّال کا فیضان ہے۔

پھر جب انھوں نے انبیاء علیہم السّلام کا کلام سنا تو انھوں نے ان کے اور اپنے اقوال کے درمیان جمع و تطبیق کی کوشش کی، اس کے لئے وہ یہ کرتے تھے کہ الفاظ تو انبیاء علیہم السلام کے لیتے تھے، اور اس کی تشریح اپنے اصول کے مطابق کرتے تھے اور اپنے مفہوم و معانی کو انبیاء علیہم السلام کے الفاظ میں ادا کرتے تھے، اس طرح وہ بحث کرتے ہیں، اور انبیاء علیہم السلام سے حاصل کئے ہوئے الفاظ اور اصطلاحات میں کتابیں تصنیف کرتے ہیں، جس شخص کو اس کی خبر نہیں کہ انبیاء علیہم السلام کی مراد کیا ہے، اور ان فلاسفہ کی مراد کیا ہے اور دونوں کے مفہوم میں کتنا بڑا فرق ہے، وہ یہ سمجھتا ہے کہ ان فلاسفہ کی مراد وہی ہے، جو انبیاء علیہم السلام کی تھی، اس طرح بہت سے گروہ اور جماعتیں گمراہ ہوئیں، ابن سینا اور اس کے متبعین کے کلام میں یہ بات صاف نظر آئے گی۔[1]

علمِ کلام کا نقص، متکلّمین کا تذبذب

امام ابن تیمیہ کی تنقید صرف فلاسفۂ یونان اور ان کے مقلدین متفلسفۂ اسلام ہی پر نہیں ہے، بلکہ ان متکلّمین پر بھی ہے جنھوں نے اگرچہ اسلام کی طرف سے مدافعت کرنے کی کوشش کی، لیکن دینی اور غیبی حقائق کو ثابت کرنے کے لئے فلسفہ ہی کے طرزِ استدلال و مقدمات، اور اس کی محدود اور ناقص اصطلاحات کو اختیار کیا جو اپنا خاص مفہوم رکھتے تھے، اور جن کے ساتھ خاص روایات اور تاثرات وابستہ تھے، وہ کتاب "النبوات" میں ایک جگہ لکھتے ہیں:۔

"ان متکلمین کا کلام خلق و بعث، مبدأ و معاد، اور صانع کے اثبات میں نہ عقلی طور پر محققانہ اور

---

[1] النبوات صـ۱۶۸

تشفی بخش ہے، نہ نقلی طور پر، اور ان کو خود بھی اس کا اعتراف ہے، امام رازی نے آخر عمر میں کھلے طریقہ پر اعتراف کیا ہے کہ میں نے کلامی طریقوں اور فلسفیانہ مناہج پر بہت غور کیا آخر میں اس نتیجہ پر پہونچا کہ ان سے نہ کسی بیمار کی شفا ہوتی ہے، نہ کسی پیاسے کی پیاس بجھتی ہے، میں نے سب سے قریب تر راستہ قرآن کے راستہ کو پایا، نفی کے بارے میں ذرا اس آیت کو پڑھو "لَيْسَ كَمِثْلِهِ شَيْءٌ" "وَلَا يُحِيطُونَ بِهِ عِلْمًا" اور اثبات میں ان آیات کو پیش نظر رکھو "الرَّحْمَٰنُ عَلَى الْعَرْشِ اسْتَوَىٰ" "إِلَيْهِ يَصْعَدُ الْكَلِمُ الطَّيِّبُ" "أَأَمِنتُم مَّن فِي السَّمَاءِ" آخر میں وہ کہتے ہیں کہ جو میری طرح تجربہ کرے گا، وہ میری ہی طرح اس نتیجہ پر پہونچے گا، اسی طرح سے غزالی اور ابن عقیل نے بھی اسی سے ملتی جلتی باتیں کہی ہیں، اور یہی حقیقت ہے[1]۔

ایک دوسری جگہ لکھتے ہیں:۔

"متکلمین نہ تو فطرت عقلی کے راستہ پر ٹھیک ٹھیک چلے اور نہ شریعت نبوی کے راستہ پر، اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ نہ تو سلامت فطرت رہی، اور نہ شریعت کی استقامت، عقلیات میں وہ سفسطہ کی حد تک پہونچ گئے، اور سمعیات میں انتہائی باریک بینی اور بیجا تعمق کی سرحد تک پہونچ گئے[2]۔"

وہ بعض متکلمین کی اس کمزوری کا بھی اظہار کرتے ہیں کہ بعض اوقات ان کے سوالات و شبہات بڑے طاقتور اور جوابات نسبتاً کمزور ہوتے ہیں، ان کے نزدیک اس سے ان لوگوں کو بعض اوقات بڑا نقصان پہنچتا ہے، جو ان کو اسلام کا وکیل و ترجمان سمجھتے ہیں، اور جن کا مطالعہ انہی کی کتابوں تک محدود ہے، وہ لکھتے ہیں:۔

"جب یہ متکلمین نبوت کے بارے میں بحث کرتے ہیں تو اس پر ایسے سوالات وارد کرتے ہیں، جو بڑے قوی اور عام فہم ہوتے ہیں، اور جب جواب دینے پر آتے ہیں تو جوابات کمزور نظر آتے ہیں، ہم اس کی مثالیں بھی دے چکے ہیں، اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ جو شخص ان کتابوں سے علم، ایمان اور ہدایت

---

[1] النبوات ص۱۴۸ [2] ایضاً

حاصل کرنا چاہتا ہے اور یہ سمجھتا ہے کہ یہی اسلام کے حامی، اور اس کی طرف سے وکیل اور مناظر ہیں، اور انہی نے اس کو عقلی دلائل سے ثابت کرنے کا بیڑہ اٹھایا ہے، پھر اس کو نبوت کے ثبوت میں ان کی کتابوں میں تشفی بخش دلائل نہیں ملتے تو اس کے عقیدہ میں کچھ تذبذب اور تزلزل ہی پیدا ہوتا ہے، اس سے ایمان وعلم کا راستہ بند ہو گیا، اور نفاق وجہل کا راستہ کھل گیا خصوصاً ان لوگوں کے لئے جن کے معلومات متکلمین ہی کے دلائل تک محدود ہیں[۱]"

متکلمین وفلاسفہ کی مشترک غلطی وکمزوری

ان کے نزدیک متکلمین وفلاسفہ نے ایک ہی طرح کی غلطی کا ارتکاب کیا اور تمام اختلافات کے باوجود ان کا طریقۂ کار ایک ہے، ان دونوں گروہوں کی غلطی اور کمزوری یہ ہے کہ انھوں نے قیاس سے اس چیز کو حاصل کرنا چاہا جو قیاس سے حاصل نہیں ہو سکتی، اور فطرت ونبوت دونوں سے کشمکش اور زور آزمائی کی، اس لئے ان دونوں کی تحقیقات میں غلطیاں زیادہ اور نفع کم ہے[۲]۔

تطویل وتکلفات

متکلمین وفلاسفہ کے طرز استدلال اور دلائل کے متعلق ان کی رائے یہ ہے کہ اس میں غیر ضروری تطویل اور تکلفات ہیں، جن حقائق اور مقاصد کو ان متکلمین نے ان طول طویل دلائل ومقدمات سے ثابت کرنے کی کوشش کی ہے، وہ اس سے زیادہ آسانی سے اختصار اور فطرت کے مطابق ثابت کئے جا سکتے ہیں، فلاسفہ ومتکلمین نے ان کے ثابت کرنے کے لئے ناحق طول طویل اور پیچیدار راستہ اختیار کیا، وہ اپنے کسی پیشرو کا مقولہ لکھتے ہوئے اس کی مثال دیتے ہیں "کسی شخص سے پوچھا گیا کہ تمہارے کان کہاں ہیں، اس نے اپنا

---

[۱] النبوات ص۲۴۰ [۲] نقض المنطق ص۱۶۳

دایاں ہاتھ سر پر سے اٹھا کر بائیں کان تک بمشکل پہونچایا، اور کہا کہ یہ حالانکہ سیدھے طریقے پر اپنے دائیں ہاتھ سے دائیں کان یا بائیں کان کی طرف اشارہ کرسکتا تھا" اس موقع پر انھوں نے کسی شاعر کا شعر لکھا ہے ؂

اقام بعمل ایاما ردیتہ　　　　وشبّہ الماء بعد الجھد بالماء

"بہت دن تک آدمی غور کرتا رہا، اور اپنے دماغ پر زور دیتا رہا، بڑی محنت کے بعد پھر پانی کی تعریف یہ کی کہ وہ پانی ہے۔"

متکلمین کے دلائل پر انحصار نہیں

ان کو متکلمین کی اس بات سے اختلاف ہے کہ ان مقاصد کو ثابت کرنے کے لئے وہی طریقۂ استدلال اور وہی مقدمات ہیں جو ان متکلمین نے اختیار کئے ہیں اور ان کے لئے اور کوئی راستہ نہیں ہے، وہ کہتے ہیں کہ بعض اوقات یہ طریقۂ استدلال اور یہ مقدمات تو صحیح ہوتے ہیں لیکن یہ کہنا غلط ہوتا ہے کہ ان کے علاوہ کوئی اور طریقۂ استدلال، اور دوسرے مقدمات نہیں ہیں، اس لئے کہ مطالعہ اور تجربہ سے معلوم ہوتا ہے کہ جس چیز کا علم انسانوں کے لئے زیادہ ضروری ہوتا ہے، اللہ تعالیٰ اس کے دلائل اور اس کی معرفت کو بھی اسی طرح آسان اور عام بنا دیتا ہے، اس بنا پر صانع کے اثبات اور اس کی توحید کے دلائل اور نبوت کے علامات و دلائل بہت کثیر ہیں، اور لوگوں کے لئے ان کی معرفت کے ذرائع اور راستے بھی بہت کثیر ہیں، ان متکلمانہ دلائل اور مقدمات کی اکثر لوگوں کو سرے سے ضرورت ہی نہیں، اور ضرورت بھی عام طور پر ان ہی لوگوں کو ہوتی ہے، جو ان کے علاوہ اور کچھ نہیں جانتے یا دوسرے طریقوں سے اعراض کرتے ہیں۔[1]

ایک طبقہ کو فائدہ

اس کے باوجود ان کو اعتراف ہے کہ بعض لوگوں کی ذہنی ساخت اور افتاد طبع ایسی ہوتی ہے کہ

---

[1] الرد علی المنطقیین ص ۲۵۵

ان کو اس طرزِ استدلال اور ان مقدمات کلامیہ و منطقیہ سے فائدہ پہنچتا ہے اور اس کے بغیر ان کی تشفی نہیں ہوتی، لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ علم و یقین ان طریقوں پر منحصر ہے بلکہ یہ ایک دماغی کیفیت ہے جو خاص ماحول و تربیت اور نفسیاتی احوال کی وجہ سے پیدا ہو جاتی ہے، وہ لکھتے ہیں:-

"بعض لوگوں کا حال یہ ہے کہ طریقۂ استدلال اس قدر دقیق و خفی ہوتا ہے، اور اس کے مقدمات جتنے کثیر اور طویل ہوتے ہیں، اسی قدر اس کے لئے نفع بخش ہوتے ہیں، اس لئے کہ اس کو باریک امور میں طویل غور و فکر کی عادت پڑ چکی ہوتی ہے، جب کوئی دلیل قلیل المقدمات ہوتی ہے یا بہت واضح اور جلی ہوتی ہے تو اس کے نفس کو اس سے خوشی اور تسکین نہیں ہوتی، ایسے لوگوں کے مقابلہ میں کلامی اور منطقی طریقۂ استدلال کو استعمال کرنے میں مضائقہ نہیں، اس لئے نہیں کہ مطلوب کا علم اس پر موقوف ہے بلکہ اس لئے کہ یہ اس کے حال کے مناسب ہے، کیونکہ اس طرح کے لوگوں کو جب ایسی چیزیں معلوم ہوتی ہیں جو عوام کو معلوم ہیں اور غیر ذہین لوگ بھی ان کو سمجھ سکتے ہیں، تو ان کو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ کوئی خاص بات نہیں ہوئی، اور ان کو کوئی علمی امتیاز حاصل نہیں ہوا، وہ طبعی طور پر ایسے دقیق اور غامض مسائل کو جاننا چاہتے ہیں جو کثیر المقدمات ہوں، ایسے لوگوں کے ساتھ بیشک یہ راستہ اختیار کیا جا سکتا ہے۔"[1]

قرآن کا اسلوبِ استدلال زیادہ دلنشیں اور یقین آفریں ہے

وہ اپنی کتابوں میں بڑے شد و مد سے اس بات کو ثابت کرتے ہیں کہ مقاصدِ شریعت، حقائقِ غیبیہ اور حقائقِ دینیہ کے اثبات کے لئے سب سے بہتر اور طاقتور اور دلنشیں اسلوب و طرزِ استدلال قرآن مجید کا ہے، وہ لکھتے ہیں:

"اہلِ کلام و فلسفہ نے مطالبِ الٰہیہ پر جو دلائلِ عقلی قائم کئے ہیں ان کے مقابلہ میں قرآن مجید کے دلائل کہیں زیادہ مکمل اور بلیغ و موثر ہیں، پھر اس کے ساتھ وہ ان بڑے بڑے مغالطوں سے بھی پاک صاف

[1] الرد علی المنطقیین ص ۲۵۵

ہیں، جو ان فلاسفہ و متکلمین کے دلائل میں پائے جاتے ہیں۔[1]"

ایک دوسری جگہ لکھتے ہیں:۔

"قرآن مجید میں جو عقلی اور برہانی قیاسات اور ربوبیت، الٰہیت، وحدانیت، خدا کے علم و قدرت، امکان معاد وغیرہ جیسے مطالب عالیہ اور معارفِ الٰہیہ کے جو دلائل مذکور ہیں، وہ شریف ترین علوم و معارف ہیں، جن سے نفوس انسانی کی تکمیل ہوتی ہے۔[2]"

ذات و صفات کے بارے میں قرآن اور فلسفہ کا بنیادی و اصولی فرق

ایک دوسری جگہ اللہ تعالیٰ کے ذات و صفات کے بارے میں قرآن مجید اور فلسفہ کا ایک اصولی فرق بیان کرتے ہوئے انھوں نے یہ اہم علمی نکتہ لکھا ہے کہ:۔

"قرآن مجید جہاں صفاتِ الٰہی ثابت کرتا ہے، وہاں تفصیل سے کام لیتا ہے اور صرف تمثیل کی نفی پر اقتصار کرتا ہے (لیس کمثلہ شیء) اور یہی انبیاء علیہم السلام کا طریقہ ہے کہ ان کے یہاں اثبات مفصل اور نفی مجمل ہے، اس کے برخلاف ان کے حریفوں اور مخالفین (فلاسفہ یونان) کے یہاں سارا زور نفی پر صرف ہوتا ہے اور اثبات سے وہ سرسری طور پر گذر جاتے ہیں۔[3]"

نفی صفات کا اثر پوری زندگی پر

فلسفۂ یونان کا پورا دفتر ابن تیمیہ کے اس نکتہ کی تصدیق کرتا ہے، فلاسفہ نے نفی میں جس مبالغہ اور اہتمام سے کام لیا ہے، اس نے خدا کے وجود کو محض ایک ذہنی تصور اور ایک مفلوج مجہول و مجبور ہستی بنا کر رکھ دیا ہے، لیکن خدا کیا ہے؟ اور کیسا ہے؟ اس بارے میں ان کے یہاں چند لفظوں اور فلسفیانہ

---

[1] الرد علی المنطقیین ص۳۲۱ [2] ایضاً ص۱۵۰ [3] النبوات ص۱۵۳

اصطلاحات سے زیادہ کچھ نہیں ملتا، اس کا نتیجہ ہے کہ یونان کے اندر اور ان تمام حلقوں میں جو یونان کے فلسفہ کے زیر اثر رہے ہیں، خدا سے کوئی حقیقی زندہ اور عملی تعلق نہیں رہا ہے، اس لئے کہ اس حقیقی اور عملی، قلبی اور جذباتی تعلق کے لئے اسماء وصفات وافعال کی ضرورت ہے، اور فلسفہ کو ان کی نفی پر اصرار ہے، دنیا کی پوری عقلی تاریخ میں کبھی انسان کو کسی ایسی ہستی سے قلبی تعلق اور وابستگی نہیں رہی ہے جس کی صفت و فعل کا اس کو کوئی علم نہ ہو، محبت، خوف، امید و رجاء، طلب و سوال سب کے لئے صفات کی ضرورت ہے، اور وہ فلسفۂ یونان میں بالکل منفی ہیں، اس لئے مورخین اخلاق و ادیان کا بیان ہے کہ اہلِ یونان کا تعلق نہ صرف خدا کے ساتھ بلکہ مذہب کے ساتھ بالکل سطحی اور برائے نام تھا، اور اس میں کوئی روح اور گہرائی نہیں تھی، امام ابن تیمیہ نے ایک جگہ پر صحیح لکھا ہے کہ "لاکھوں نفی ایک اثبات کے قائم مقام نہیں ہو سکتے" واقعہ یہ ہے کہ نفی محض پر کسی مذہب اور زندگی کی عمارت نہیں کھڑی ہو سکتی، اور غالباً مغرب میں فلسفۂ یونان اور مشرق میں بودھ مذہب اسی وجہ سے ایک ایسی انسانی سوسائٹی کے پیدا کرنے میں ناکام رہے جس کی عمارت خدا کے تصور اور عقیدہ پر قائم ہو اور اسی کا نتیجہ ہے کہ ان دونوں فلسفہ کے حلقۂ اثر میں ایک طرف بت پرستی اور دوسری طرف الحاد اور انکارِ خدا کا رجحان بہت جلدی دبے پاؤں چلا آیا، اس لئے کہ عوام کی تشفی (جن کی فطرت میں عبادت اور خدا پرستی کے جذبات ودیعت ہوتے ہیں) ایسے فلسفہ سے نہیں ہو سکتی جس میں سارا زور دماغی ورزش اور فلسفیانہ تصورات پر ہو اور قلب و دماغ کے لئے معرفت و محبت کی کوئی غذا فراہم نہ کی جائے۔

صحابۂ کرام کا امتیاز

ان کے نزدیک اس کا نتیجہ ہے کہ صحابۂ کرام کو جو نبوت کے فیض یافتہ تھے، جو معرفت و علوم حاصل ہوئے، وہ بڑے مکمل اور گہرے ہیں، اور ان میں تکلف کا نام و نشان نہیں ہے، وہ صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم اور متاخرین کا، جو فلسفہ اور علمِ کلام سے متاثر تھے، مقابلہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:-

واصحاب محمد (صلی اللہ علیہ وسلم)	صحابۂ کرام باوجود اس کے کہ علم نافع اور عمل صالح
کانوا مع انھم اکبر الناس علماً نافعاً	کے اعتبار سے کامل ترین خلائق تھے، تکلفات سے بالکل
وعملاً صالحاً اقل الناس تکلفاً یصدر	پاک و بری تھے کسی صحابی کی زبان سے ایک یا دو لفظ
من احدھم الکلمۃ والکلمتان من	حکمت و معارف کے نکل جاتے ہیں، اور ان دو لفظوں کے اثر و
الحکمۃ او من المعارف ما یھدی اللہ	برکت سے پوری کی پوری قوم کو ہدایت نصیب ہو جاتی
بہ امۃ وھذا من من اللہ علی ھذہ	ہے، یہ اس امت پر اللہ تعالیٰ کا انعام ہے اس کے
الامۃ، وتجد غیرھم یحشون الاوراق	مقابلہ میں دوسرے لوگ صفحے کے صفحے ان تکلفات
من التکلفات والشطحات ما ھو من	و شطحات سے بھر دیتے ہیں، جو محض غیر ضروری مباحث
اعظم الفضول المبتدعۃ والآراء المخترعۃ۔[1]	اور نو ایجاد آراء و نظریات ہیں۔

منطق یونانی کا سحر اور رعب عالم اسلام پر

امام ابن تیمیہ نے فلسفہ پر اجمالی و تفصیلی تنقید کرنے اور اس کے بکثرت مسائل و مباحث کو خالص عقلی و استدلالی طریقہ پر رد کرنے اور ان کو کمزور و بے بنیاد ثابت کرنے کے بعد یونان کے مایۂ ناز علم منطق پر بھی ناقدانہ نظر ڈالی ہے، علمائے اسلام پر منطق کا سحر فلسفہ سے کچھ زائد ہی غالب تھا، اور اس کے سرتاپا معقول و مدلل اور محکم و مبرہن ہونے پر عام طور پر اتفاق تھا، ساعد قرطبی کے بیان کے مطابق تیسری ہی صدی میں منطق کی کتابوں کا عام رواج ہو گیا تھا، پانچویں صدی میں امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ نے بھی منطق کو بڑی اہمیت دی اور اس کو تمام علوم کا مقدمہ قرار دیا، اپنی معرکۃ الآراء کتاب المستصفیٰ کے مقدمہ میں لکھتے ہیں "ھی مقدمۃ العلوم کلھا ومن لا یحیط بھا فلا ثقۃ بعلومہ اصلاً" (منطق تمام علوم کا مقدمہ ہے اور جس کو

[1] نقض المنطق ص ۱۱۴

اس پر مجبور نہیں، اس کو اپنے علوم پر مطلقاً اعتبار نہیں کرنا چاہئے)[1] اپنی دوسری کتاب (مقاصد الفلاسفہ) میں لکھتے ہیں:۔

اما المنطقیات فاکثرها علیٰ منهج الصواب	جہاں تک منطقی مسائل و مباحث کا تعلق ہے تو واقعہ
والخطاء نادر فیها وانما یخالفون اهل الحق	یہ ہے کہ ان میں اکثر درست اور ثابت ہیں اور ان میں غلطی
فیها بالاصطلاحات والایرادات دون	شاذ و نادر ہے، اگر ان یونانی علمائے منطق کا اہل حق
المعانی والمقاصد، اذ غرضها تهذیب	سے کوئی اختلاف بھی ہے تو محض اصطلاحات اور اعتراضات
طرق الاستدلالات وذلك مما یشترك	کا ہے، معانی اور مقاصد کا نہیں، اس لئے کہ اس فن کی
فیه النظار۔[2]	غرض طرقِ استدلال کی درستگی اور اصلاح ہے، اور
	اس بارے میں تمام اہل نظر متفق ہیں۔

ساتویں صدی کے مشہور حکیم و فلسفی ابن رشد کو منطق کے بارے میں اتنا غلو اور اعتماد تھا کہ وہ اس کو انسانی سعادت کا سرچشمہ اور معیار سمجھتا تھا، اور اس کے بغیر حقیقت تک پہنچنا اس کے نزدیک ناممکن تھا، اس کا سوانح نگار لکھتا ہے:۔

کان متهوسا بمنطق ارسطو وقال عنه	ابنِ رشد کو ارسطو کی منطق سے عشق تھا، اس کے بارے
انه مصدر السعادة للناس وان سعادة	میں اس کا قول ہے کہ وہ انسانوں کے لئے سعادت کا
الانسان تقاس بعلمه بالمنطق والمنطق	منبع ہے کسی انسان کی سعادت کے لئے صحیح پیمانہ یہ ہے کہ
أداة تسهل الطریق الشاقة فی الاصول	وہ منطق کتنی جانتا ہے، منطق ایک ایسا آلہ اور ذریعہ ہے
الی الحقیقة التی لا یصل الیها العامة	جو اس حقیقت تک پہونچنے کا راستہ آسان کر دیتا ہے،
بل بعض الخاصة بفضل المنطق۔[3]	جس تک عوام تو کیا بعض خواص بھی نہیں پہنچ سکتے۔

---

[1] المستصفی ج۰ اول صلا [2] مقاصد الفلاسفہ ص۳ [3] تاریخ فلاسفۃ الاسلام محمد لطفی جمعہ ص۱۲۰-۱۲۱

یونان کی اس منطق کے دفتر کو علمائے اسلام نے ہمیشہ ادب اور احترام کے ہاتھوں سے لیا اور وہ اس کے دعاوی و مقدمات اور اصول وکلیات سے مرعوب رہے، فلسفہ پر تنقید اور اس کی تشریح (چیر پھاڑ) کا کام تو طول طویل وقفوں کے بعد کسی حد تک ہوا، لیکن ہمارے علم میں کسی نے مستقل طور پر منطق یونانی کے علمی محاسبے و محاکمے کی ضرورت نہیں سمجھی، اور اس موضوع پر کوئی بڑی محققانہ اور مفصل کتاب نہیں ملتی۔

منطق علومِ عقلیہ کی میزان نہیں!

ابن تیمیہ پہلے شخص ہیں، جنھوں نے اس کو مستقل موضوع بنایا اور اس پر آزادانہ اور مجتہدانہ تبصرہ اور تنقید کی، اس موضوع پر ان کی ایک مختصر اور مجمل کتاب "نقض المنطق" اور دوسری مفصل کتاب "الرد علی المنطقیین" ہے، آخر الذکر کتاب میں انھوں نے فنی اور علمی طور پر منطق کے قضایا، دعاوی اور حدود و تعریفات اور جزئیات وکلیات سے بحث کی ہے[1]، اور ثابت کیا ہے کہ اس فن کو علمائے اسلام نے جتنی اہمیت دی ہے اور اس کو جس قدر مسلّم الثبوت اور محکم سمجھا ہے، وہ صحیح نہیں ہے، ان کو اس بات سے انکار ہے کہ وہ علومِ عقلیہ کی میزان ہے، اور اس پر استدلال و استنتاج کا اور علم یقین تک پہونچنے کا انحصار ہے، وہ لکھتے ہیں:-

"یہ لوگ کہتے ہیں کہ منطق علومِ عقلیہ کی میزان ہے، اور اس کی رعایت و پابندی، ذہن کو فکری غلطی سے بچا لیتی ہے، جیسے فنِ عروض شعر کے لئے اور نحو و تصریف عربی کے مرکب و مفرد الفاظ کے لئے میزان کا درجہ رکھتے ہیں، اور جس طرح آلات ہیئت اوقات کے لئے میزان ہیں۔

لیکن واقعہ یہ نہیں ہے، اس لئے کہ عقلی علوم ان اسباب ادراک کے ذریعہ سے حاصل کئے جاسکتے

---

[1] یہ کتاب حال میں مطبع قیمہ کی طرف سے شائع ہو گئی ہے، جس پر مولانا سید سلیمان ندوی رحمۃ اللہ علیہ کا مقدمہ ہے، اس کتاب کی ضخامت ۵۴۵ صفحات ہے، علمائے فن کو اس کتاب کا مطالعہ ضرور کرنا چاہیئے۔

ہیں، جو اللہ تعالیٰ نے بنی آدم کی فطرت میں ودیعت کئے ہیں، ان کا کسی شخص معین کے وضع کئے ہوئے میزان پر انحصار نہیں، اور جس طرح عربیت میں تقلید کے بغیر چارہ نہیں، اس لئے کہ وہ ایک قوم کی عادت ہے جو صرف سماع سے معلوم کی جاسکتی ہے، اور اس کے قوانین کا ذریعۂ علم صرف استقراء ہے، اس طرح عقلیات میں تقلید نہیں چلتی، اس طرح سے کیل، وزن، عدد و شمار، اور زراعت وغیرہ میں پیمانوں وغیرہ کی ضرورت ہے۔

منطق یونانی کی وضع و ایجاد سے پہلے بھی دنیا کی قومیں حقائق اشیاء کو جانتی تھیں، اور اس کی وضع و ایجاد کے بعد بھی اکثر قومیں ہیں، جو منطق کی مدد کے بغیر حقائق اشیاء کو جانتی سمجھتی ہیں، اور تمام دنیا کی قوموں کے اکثر عقلاء ارسطو کے ان اصول و قواعد کو سیکھے بغیر حقائق کو سمجھتے ہیں، اور یہ لوگ بھی اگر اپنی حالت پر غور کریں گے تو ان کو محسوس ہوگا کہ ان کے نفوس کو اس وضعی فن کے بغیر حقائق کا علم حاصل ہوتا ہے۔[1]

بہت سی منطقی حدود و تعریفات مخدوش اور کمزور ہیں

ان کو اس سے بھی انکار ہے کہ منطقی حدود و تعریفات پورے طور پر جامع و مانع اور فنی طور پر مکمل ہیں، اور ان پر کسی اعتراض کی گنجائش نہیں، وہ ایک جگہ لکھتے ہیں:-

وصاروا یعظمون امر الحدود ویدعون	اہلِ منطق حدود منطقیہ کی اہمیت میں بڑا مبالغہ
انهم هم المحققون لذلك وان ما یذکره	کرنے لگے، ان کا دعویٰ ہے کہ وہ اس فن کے محقق ہیں
غیرهم من الحدود انما هی لفظیة	اور یہ کہ ان کے علاوہ دوسرے علماء جو حدود بیان کرتے
لا تفید تعریف الماهیة والحقیقة	ہیں، وہ لفظی ہوتی ہیں، اور ماہیت اور حقیقت کو پورے
بخلاف حدودهم ویسلکون الطرق	طور پر بیان نہیں کرتیں، بخلاف ان کے حدود کے اہلِ
الصعبة الطویلة والعبارات المتکلفة	منطق بڑے دشوار اور طویل راستے اختیار کرتے ہیں

[1] الرد علی المنطقیین ص ۲۷-۲۸

الهائلة وليس لذلك فائدة الا تضييع الزمان	اور بڑی پرتکلف اور مرعوب کرنے والی عبارتیں
واتعاب الاذهان وكثرة الهذيان ودعوى	استعمال کرتے ہیں، لیکن واقعہ یہ ہے کہ سوائے اضاعت
التحقيق بالكذب والبهتان وشغل النفوس	وقت، دماغی تکان، کثرت ہذیان اور تحقیق کے دعویٰ
بما لا ينفعها بل قد يضلها عما لابد لها	اور لاف زنی کے اس کا کوئی فائدہ نہیں، نفوس کو
منه واثبات الجهل الذي هو اصل	ایسی چیزوں میں مشغول کرتے ہیں، جو کچھ مفید نہیں،
النفاق في القلوب وان ادعوا انه	بلکہ بعض اوقات گمراہی اور جہالت آفرینی کے سوا
اصل المعرفة والتحقيق۔[1]	جو قلوب کے نفاق کا ذریعہ ہے کچھ اور حاصل نہیں
	اگرچہ ان کا دعویٰ ہے کہ یہ معرفت اور تحقیق کی بنیاد ہے

کوہ کندن وکاہ برآوردن

ایک جگہ وہ ثابت کرتے ہیں کہ منطق درحقیقت ایک کوہ کندن اور کاہ برآوردن کا سا عمل ہے کہ محنت اور بحث بہت زیادہ اور حاصل محصول بہت کم "نقض المنطق" میں فرماتے ہیں:-

"یہ بات واضح ہے کہ منطق کو واجب قرار دینا محض ان لوگوں کا قول ہے جو غالی اور حقیقت سے ناآشنا ہیں، خود ماہرین فن بھی اپنے تمام علوم میں منطق کے قوانین کی پابندی نہیں کرتے، بلکہ بعض اوقات کبھی تو ان کی طوالت کی وجہ کبھی غیر مفید ہونے کی بنا پر اور کبھی بعض قوانین کے فاسد ہونے کی وجہ سے اور کبھی ان کے اجمال اور اشتباہ کی وجہ سے وہ ان سے خود اعراض کرتے ہیں، اس میں متعدد ایسے مقامات ہیں، جو کوہ کندن اور کاہ برآوردن کا مصداق ہیں۔"[2]

---

[1] الرد علی المنطقیین ص ۳۱ [2] نقض المنطق ص ۱۵۵

منطق کا اثر ذہن اور قوت بیانیہ پر

ان کے نزدیک منطق سے اکثر اوقات یہ نقصان بھی پہنچا ہے کہ طبیعت کی جولانی اور زبان و خیالات کی روانی میں رکاوٹ پیدا ہو گئی ہے چنانچہ جو لوگ قواعدِ منطقیہ اور منطقی اسلوب کی بڑی پابندی کرتے ہیں ان میں ژولیدہ بیانی، مشکل پسندی و اغلاق اور ایک طرح کی ذہنی کجی پیدا ہو جاتی ہے، چنانچہ متاخرین کے متون اور پچھلے دور کی نصابی کتابیں اس کا واضح نمونہ ہیں، امام ابن تیمیہ لکھتے ہیں:۔

وما زال نظار المسلمین یعیبون طرق اهل المنطق ویبینون ما فیها من العی واللکنة وقصور العقل وعجز المنطق ویبینون انها الی افساد المنطق العقلی واللسانی اقرب منها الی تقویم ذلک۔[۱]

مسلمان اہلِ نظر و مناظرہ شروع سے اہلِ منطق پر کڑی تنقید کرتے رہے کہ اس سے اشتغال کرنے والوں میں اکثر یہ عیب پیدا ہو جاتا ہے کہ بے تکلف اظہارِ خیال نہیں کر سکتے، ان کی زبان و قلم میں ایک طرح کی بندش اور رکاوٹ پیدا ہو جاتی ہے، ذہن اپنا پورا کام نہیں کرتا اور زبان ساتھ نہیں دیتی اور وہ اس بات کو واضح کرتے رہے کہ بجائے ذہن اور زبان کی ترقی اور تقویت کے اکثر یہی دیکھا گیا ہے کہ ذہن اور زبان کو اس نے نقصان ہی پہنچایا ہے۔

دوسری جگہ لکھتے ہیں:۔

اذا اتسعت العقول وتصوراتها اتسعت عباراتها واذا ضاقت العقول

قاعدہ یہ ہے کہ جب عقول و تصورات میں وسعت ہوتی ہے تو عبارتوں میں بھی وسعت ہوتی ہے اور

---

[۱] الرد علی المنطقیین ص ۱۹۴

والتصورات بقى صاحبها كانه محبوس العقل واللسان كما يصيب اهل المنطق اليوناني تجده من اضيق الناس علما وبيانا، واعجزهم تصورا وتعبيرا، ولهذا من كان منهم ذكيا اذا تصرف في العلوم وسلك مسلك اهل المنطق طوّل وضيّق وتكلّف وتعسّف وغايته بيان البين وايضاح الواضح من العيّ وقد يوقعه ذلك في انواع من السفسطة التي عافى الله بها من يسلك طريقه۔[1]

دماغ تنگ اور تصورات محدود ہوتے ہیں تو انسان ایسا معلوم ہوتا ہے گویا وہ عقلی اور لسانی طور پر محبوس ہے جیسے کہ منطق یونانی سے اشتغال کرنے والوں کو اکثر پیش آتا ہے، تم دیکھو گے کہ وہ اپنے علم و بیان میں بڑے تنگ دامن اور اپنے تصور و تعبیر میں بڑے عاجز نظر آتے ہیں، اسی لئے ان میں سے جو ذکی بھی ہوتا ہے جب علوم میں تصرف کرتا ہے، اور اہلِ منطق کا راستہ اختیار کرتا ہے تو تطویل و تضییق اور تکلف و مشقت سے کام لیتا ہے اور زیادہ سے زیادہ اس کا کارنامہ یہ ہوتا ہے کہ ایک معلوم چیز کو بیان اور ایک واضح چیز کو زیادہ واضح کر دے، اور اس کا نتیجہ ہے کہ منطق کے اشتغال سے اس کے ذہن و زبان پر قفل سے پڑ گئے ہیں، بعض اوقات وہ سفسطہ اور حقائق اشیاء کے انکار کے مرض میں مبتلا ہو جاتا ہے، جس سے وہ لوگ محفوظ ہیں، جنھوں نے ان اہلِ منطق کا راستہ اختیار نہیں کیا ہے۔

بعض مستثنیات

امام ابن تیمیہ کے سامنے بعض ایسے اشخاص بھی ہیں جو یونانی علم و حکمت میں انہماک رکھنے اور ان علوم

[1] الرد علی المنطقیین ص ۱۶۷

میں درجۂ امامت تک پہونچنے کے باوجود بڑے شگفتہ قلم، خوش تحریر اور ادیب تھے، مثلاً ابن سینا جس کا قصیدۂ روحِ عربیت کا بڑا عمدہ نمونہ اور جس کی تحریروں میں اہلِ حکمت کے برخلاف حلاوت و بلاغت پائی جاتی ہے، ان کے نزدیک یہ اسلامی اور عربی ادب و لٹریچر سے اشتغال اور علوم اسلامیہ کا فیض ہے، اور اس میں شبہ نہیں کہ ابن سینا کے حالات وسوانح سے اس کی تصدیق ہوتی ہے، وہ لکھتے ہیں:۔

ومن وجد في بعض كلامه فصاحة وبلاغة كما يوجد في بعض كلام ابن سينا وغيره فلما استفاده من المسلمين من عقولهم والسنتهم والا فلو مشى على طريقة سلفه واعرض عما تعلمه من المسلمين لكان عقله ولسانه يشبه عقولهم والسنتهم[1]

ان فلاسفہ واہلِ منطق میں سے جس شخص کے کلام میں کچھ فصاحت یا بلاغت محسوس ہوتی ہے جیسے کہ ابن سینا کی بعض تحریروں میں نظر آتی ہے تو یہ مسلمانوں کے عقول وآداب سے فائدہ اٹھانے کا نتیجہ ہے، ورنہ اگر وہ اپنے پیشروؤں کے راستہ پر چلتا رہتا اور اس نے مسلمانوں سے جو علوم حاصل کئے ہیں ان سے اعراض کرتا تو اس کی عقل وزبان بھی ان ہی کے عقل وزبان کی طرح کوتاہ اور قاصر نظر آتی۔

منطق کے متعلق اجمالی رائے

ان تنقیدات اور تبصروں کے بعد اس فن کے متعلق ان کی اجمالی رائے خود ان کے الفاظ میں یہ ہے:

فنفعه النافع فطري لا يحتاج اليه وما يحتاج اليه ليس فيه منفعة الا معرفة اصطلاحهم وطريقتهم

منطق کا جتنا حصہ درست اور مفید ہے وہ تو فطری ہے جس کی (ایک سلیم الفطرت کو) ضرورت نہیں، اور جتنے حصے کی ضرورت ہے اس کا بھی فائدہ صرف اتنا ہے کہ اہلِ فن کی

[1] الرد علی المنطقیین ص۱۹۹

اوخطأهم.[1]	اصطلاحات ان کا طریقۂ استدلال یا ان کی غلطیاں معلوم ہو جاتی ہیں۔

ایک دوسری جگہ لکھتے ہیں:۔

انی کنت دائماً اعلم ان المنطق الیونانی لا یحتاج الیہ الذکی ولا ینتفع بہ البلید.[2]	میرا ہمیشہ سے یہ خیال تھا کہ جس شخص کو اللہ تعالیٰ نے فطری ذکاوت عطا فرمائی ہے اس کو تو اس یونانی منطق کی ضرورت نہیں، اور جو اس ذکاوت سے محروم ہے اس کو اس منطق سے کوئی بڑا فائدہ حاصل نہیں ہو سکتا۔

منطق کا صحیح مقام اور فائدہ

منطقِ یونانی کے بارے میں امام ابن تیمیہ کے ان آراء و خیالات میں خواہ کسی قدر انتہا پسندی اور غلو کا رنگ نظر آئے، لیکن اس میں کوئی شبہ نہیں کہ منطق کی عظمت و تقدیس کے اس طلسم پر جو تمام عالمِ اسلام پر پانچویں صدی کے بعد سے چھایا رہا ہے، ابنِ تیمیہ کی تنقید وں سے ایک ضرب لگی، اور ایسا ہونا ضروری تھا، اس کے بارے میں ہمارے درسی اور علمی حلقوں میں جس قدر غالیانہ اور مبالغہ آمیز عقیدت قائم رہی ہے اس کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ جو منطق سے ناآشنا ہو اس کو اس کے تمام علوم و کمالات اور فطری ذکاوت کے باوجود جاہل اور احمق سمجھا جاتا رہا ہے، اور عرصہ تک ہندوستان میں منطق و فلسفہ کو "دانشمندی" اور ان کی کتابوں کو "کتبِ دانشمندی" کے نام سے یاد کیا جاتا رہا ہے اس غلو اور عقیدت کے خلاف ردِّ عمل بھی قدرتی امر ہے، اور اسی ردِّ عمل سے اس بات کا امکان ہے کہ اس کے بارے میں معتدل رائے قائم کی جائے گی، اور اس کو اس کا صحیح مقام دیا جائے گا، منطق ایک طرح کی ذہنی ورزش اور دماغی ریاضت ہے، اور اس میں کوئی شبہ

[1] الرد علی المنطقیین صـ۲۰۱ [2] ایضاً صـ۳

نہیں کہ اس سے تشحیذ ذہن کا کام لیا جا سکتا ہے، اور اگر اس کو اسی حد تک رکھا جائے تو اس پر کسی کو اعتراض نہیں ہو سکتا، خود امام ابن تیمیہ کو اس کا اعتراف ہے "الرد علی المنطقیین" میں ایک جگہ لکھتے ہیں:۔

وایضاً فان النظر فی العلوم الدقیقۃ	یہ بات بھی ہے کہ علوم دقیقہ میں غور و مطالعہ سے
یفتق الذھن ویدربہ ویقویہ	ذہن کھلتا ہے، اور اس کی مشق ہوتی ہے، اور علم کی
علی العلم فیصیر مثل کثرۃ الرمی بالنشاب	طاقت حاصل ہوتی ہے، بالکل جس طرح سے تیر اندازی
ورکوب الخیل تعین علی قوۃ الرمی	اور شہسواری کی مشق سے نشانہ ٹھیک ہوتا ہے اور گھوڑے
والرکوب وان لم یکن ذلک وقت	کی سواری آسان ہو جاتی ہے، اور لوگ جنگ سے پہلے بھی
قتال، وھذا مقصد حسن[1]۔	ان چیزوں کی مشق کرتے ہیں یہ ایک اچھا مقصد ہے۔

لیکن لوگوں نے جس طرح اس کو بجائے وسیلہ کے مقصود، اور بجائے مقدمہ کے اصل علم سمجھ لیا ہے اس سے ہر منصف اور بالغ نظر کو اختلاف ہوگا۔

دینی و الٰہی حقائق کے بارے میں منطق کی بے بسی

منطق و فلسفہ کے بارے میں ایک غلو شروع سے یہ چلا آ رہا ہے کہ جس طرح اس کے قواعد و اصول کو علوم عقلیہ میں فیصلہ کن اور حکم سمجھا جاتا ہے، اس طرح سے دینی و الٰہی حقائق کے بارے میں بھی ان سے بے تکلف کام لیا جاتا ہے، اور ان کے فیصلہ کو تسلیم کیا جاتا ہے، امام ابن تیمیہ اس بات کو پوری طاقت سے واضح کرتے ہیں کہ اگر منطق کو ایک میزان و ترازو کا بھی درجہ دیا جائے تو اس ترازو کا کام اور اس کا دائرۂ عمل بہر حال محدود رہے گا، اس ترازو پر حقائقِ دینیہ کو تولنا ایسا ہی ہے، جیسے لکڑی، سیسہ اور پتھر تولنے کی ترازو پر سونے چاندی اور جواہرات کو تولا جائے "نقض المنطق" میں لکھتے ہیں:۔

[1] الرد علی المنطقیین ص ۲۵۵

"اتنی بات مسلم ہے کہ لکڑی اور سیسہ اور پتھر کو تولنے کے لئے جو ترازو بنائے گئے ہیں ان پر سونے چاندی کو نہیں تولا جا سکتا، نبوت کا معاملہ اور انبیاء علیہم السلام جن حقائق کو لے کر آئے ہیں، وہ علوم میں اس سے کہیں زیادہ رفیع اور نازک ہیں، جتنا کہ سونا مالیات میں ہے، تمہاری منطق اس کے لئے کوئی میزان نہیں بن سکتی، اس لئے کہ اس میزان میں جہل و ظلم دونوں جمع ہیں یا تو وہ ان کے وزن و درجہ سے واقف نہیں، اور ان کو وزن کرنے اور ان کی حیثیت بیان کرنے کی اس میں صلاحیت نہیں اس لئے جاہل ہے یا وہ حق کا انکار کرتی ہے اور اس کو قبول نہیں کرتی ہے اس لئے ظالم ہے، حالانکہ وہ حق ہے جس کا طبائع انسانی کے پاس کوئی بدل نہیں اور نہ ان علوم سے کسی کو استغنا ہے اور اسی پر بنی نوع کی سعادت منحصر ہے[1]"

اس موقع پر نامناسب نہ ہوگا کہ نویں صدی کے ایک دوسرے سلیم الطبع اور نقاد عالم ابن خلدون کا ایک اقتباس بھی پیش کر دیا جائے جو بالکل اس مفہوم و معنی کو ادا کرتا ہے، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ دنیا میں مختلف اور متعدد سلیم الطبع انسان محض اپنی سلامتِ طبع سے کس طرح ایک حقیقت تک پہونچ جاتے ہیں، اور ان میں خیالات و افکار کا کیسا توارد ہوتا ہے، عقل کے محدود ہونے اور حقائق دینیہ و غیبیہ کا احاطہ کرنے سے قاصر ہونے کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے :-

"عقل ایک صحیح ترازو ہے، اس کے فیصلے یقینی ہیں، جن میں کوئی جھوٹ نہیں لیکن تم اس ترازو میں امور توحید، امور آخرت، نبوت، صفاتِ الٰہی اور وہ تمام امور و حقائق جو ماوراءِ عقل ہیں تول نہیں سکتے، یہ لاحاصل کوشش ہوگی، اس کی مثال ایسی ہے کہ ایک شخص نے ایک ترازو دیکھی جو سونے کا وزن کرنے کے لئے ہے، اس کو اس ترازو میں پہاڑوں کے تولنے کا شوق پیدا ہوا، جو ناممکن ہے، اس سے ترازو کی صحت پر کوئی حرف نہیں آتا، لیکن اس کی گنجائش کی ایک حد ہے،

[1] نقض المنطق ص۱۶۴

اسی طرح عقل کے عمل کا بھی ایک دائرہ ہے جس سے باہر وہ قدم نہیں نکال سکتی، وہ اللہ اور اس کے صفات کا احاطہ نہیں کر سکتی، اس لئے کہ وہ اس کے وجود کا ایک ذرہ ہے"۔[1]

منطق پر تفصیلی و فنّی تنقید اور ابن تیمیہ کے اجتہادات و اضافات

امام ابن تیمیہ نے فن منطق پر محض اجمالی تبصرہ اور اصولی اعتراضات پر اکتفا نہیں کی، بلکہ پورے فن پر ایک ناقدانہ اور مجتہدانہ نظر ڈالی اور اس کا علمی احتساب کیا، انھوں نے اس کے بہت سے اصول و مسلّمات کے تسلیم کرنے سے انکار کیا، اور ان پر خالص عقلی اور فنی حیثیت سے بحث کی، اس کی بہت سی تعریفات وحدود کو مخدوش و کمزور ثابت کیا، اور ان سے بہتر تعریفات وحدود پیش کئے، اس کے بہت سے قضایا اور ان کی ترتیب سے اختلاف کیا، قیاس کے مقابلہ میں جو ارسطو کے منطق کی اساس ہے، استقراء کی ترجیح ثابت کی اور اس کو حصولِ علم و یقین کا زیادہ طبعی سہل اور محفوظ طریقہ بتلایا، اسی کے ساتھ انھوں نے منطق و فلسفہ میں کئی جدید نظریات پیش کئے، اور فن میں اضافے کئے، مولانا سید سلیمان ندوی مرحوم "الرد علی المنطقیین" کے مقدمہ میں ان کی اس خدمت و عظمت کو واضح کرتے ہوئے لکھتے ہیں:-

"اگر تم اس کتاب کا غور و فکر سے مطالعہ کرو گے تو تم کو متعدد ایسے منطقی اور فلسفی مسائل ملیں گے جن کے ابن تیمیہ موجد ہیں، اور وہ اس وقت کے مغربی فلاسفہ کی تصنیفات و نظریات سے بالکل مطابقت رکھتے ہیں، مثلاً تمام مسلمان علماءِ منطق نے اس بارے میں ارسطو کی پیروی کی ہے کہ کلیات علم کی بنیاد ہیں، اور اس بنا پر انھوں نے برہانیات کو ترجیح دی ہے، اور اصول استقراء کی تحقیر کی ہے، اس بنا پر بعض علماءِ فرنگ نے یہاں تک لکھا کہ مشہور انگریز منطقی عالم مل (MILL) پہلا شخص ہے جس نے استقراء کے اصول کو مرتب کیا، اور منطق جدید کی بنیاد رکھی (حالانکہ واقعہ یہ ہے کہ اس سے

---

[1] مقدمہ ابن خلدون ص ۴۷۳

کئی صدی پہلے امام ابن تیمیہ اس پر زور دے چکے ہیں۔

اسی طرح سے انھوں نے حقیقتِ حد، جنس، فصل، لزوم، حقیقت علت، قیاس، استقراء، استدلال بالمشہورات، قیاس میں ایک مقدمہ پر اکتفا وغیرہ جیسے اہم اور پیچیدہ مباحث کو جس طرح حل کیا ہے اور محکم دلائل سے اپنے نظریات ثابت کئے ہیں، وہ ان کی ذکاوت واجتہاد پر گواہ ہے، علت ولزوم کے بارہ میں انھوں نے جو کچھ کہا ہے، بعینہ وہی نظریہ ہے جس کو مشہور فلسفی ہیوم (HUME) نے اپنی کتابوں میں ثابت کیا ہے، اہلِ علم کو معلوم ہے کہ لزوم وعلّیت ان دشوار ترین مسائل میں سے ہے، جن میں دماغوں نے بڑی ٹھوکریں کھائی ہیں، اور اسی سے طبائعیین (نیچر کو ماننے والے) اور ملحدین کی بہت سی گمراہیاں نکلی ہیں، اس کتاب میں امام ابن تیمیہ کی بہت سی جدید تحقیقات اور جدید نظریات ہیں، جو ان کی علمی عظمت اور غیر معمولی ذکاوت کی دلیل ہے؛[1]

علومِ عقلیہ میں تقلید درست نہیں ہے

امام ابنِ تیمیہ کو اس بات کا احساس ہے کہ لوگ ان کے ان اعتراضات اور اختلافات کو دیکھ کر یہ کہیں گے کہ یونانی علوم ایک بڑا قدیم علمی ذخیرہ ہے جس کی ترقی وتہذیب میں کئی نسلوں کے بہترین دماغوں نے حصہ لیا ہے، اور ان کو ترقی وکمال کے اعلیٰ مقام تک پہونچا دیا ہے، اس لئے اب ان میں غلطی کا بہت کم احتمال رہ گیا ہے، اور ان پر پچھلے دور کے کسی ناقد کا تنقید اور اعتراض کرنا ایک بڑی علمی جسارت اور اضاعت وقت ہے، امام ابن تیمیہ اس مقدمہ کو تسلیم نہیں کرتے، وہ کہتے ہیں کہ جب یہ علوم محض عقلی ہیں، اور ان کی بنیاد غور وفکر اور مطالعہ پر ہے تو ان میں محض تقلید کا کیا جواز ہے، خود اس کے ناقل اس کو کسی وحی والہام پر مبنی نہیں بتاتے بلکہ اس کی بنیاد عقل پر رکھتے ہیں اس لئے ہر زمانہ کے اہل عقل کو یہ حق ہے کہ ان پر ناقدانہ

---

[1] مقدمہ الرد علی المنطقیین صث

نظر ڈالے اور عقل کے ترازو پر تولے اور جو چیز خلافِ عقل ہو اس کو بے تکلف رد کر دے، وہ "الرد علی المنطقیین" میں ایک جگہ بعض شیوخِ منطق کا یہ قول نقل کرتے ہیں کہ "یہ علوم وہ ہیں جن کو ہزار برس تک بہترین دماغوں نے صیقل کیا ہے اور ہر زمانہ کے اہل فضل نے ان کو قبول کیا ہے" پھر اس کا جواب دیتے ہیں :-

هب ان الامر كذلك فهذه العلوم	فرض کرو کہ بات یوں ہی ہے لیکن یہ علوم تو خالص
عقلية محضة ليس فيها تقليد لقائل	عقلی علوم ہیں جن میں کسی کی تقلید کی ضرورت نہیں
وانما تعلم بمجرد العقل فلا يجوز ان	یہ تو مجرد عقل سے معلوم کئے جاتے ہیں، اور اس لئے
تصحح بالنقل بل ولا يتكلم فيها الا بالمعقول	نقل کے ذریعہ ان کی تصحیح درست نہیں اور ان میں
المجرد فاذا دل المعقول الصريح على	خالص معقولات کی بنا پر کلام کیا جاتا ہے تو جب
بطلان الباطل منها لم يجز رده فان	معقول صریح ان میں سے کسی باطل کے بطلان پر
اهلها لم يدعوا انها ماخوذة عمن	دلالت کرے تو اس کا مسترد کرنا جائز نہیں اس لئے
يجب تصديقه بل عن عقل محض	کہ خود علمائے منطق نے یہ دعویٰ نہیں کیا ہے کہ وہ کسی
فيجب التحاكم فيها الى موجب	ایسی ہستی یا ذریعہ سے ماخوذ ہے جس کی تصدیق واجب ہے
العقل الصريح۔[1]	وہ خود کہتے ہیں کہ ان کا تعلق عقل محض سے ہے، اس لئے
	ان کے بارے میں عقل صریح کے موجبات ہی کی طرف رجوع
	کرنا صحیح اور اس کے فیصلہ کو قبول کرنا ضروری ہوگا۔

عالمِ اسلام کے پچھلے دور میں علومِ عقلیہ کا جمود و انحطاط، اور ابن تیمیہ کے کام کی اہمیت

واقعہ بھی یہی ہے کہ معقول کو ہمیشہ معقول ہی رہنا چاہئے، منقول نہیں بننا چاہئے لیکن عالمِ اسلام

[1] الرد علی المنطقیین ص ۳۰۸

پر جب علمی و فکری زوال طاری ہوا اور دماغوں اور قوتِ فکریہ نے اپنا کام آزادی سے کرنا چھوڑ دیا تو تمام علمائے حکمت و فلسفہ بھی اپنے پیشروؤں کی لکیر کے فقیر بن گئے اور ان کی تحقیقات و تصنیفات کے ناقل و شارح بن کر رہ گئے، اور معقولات اور منقولات میں کوئی فرق نہیں رہ گیا، متاخرین کی بڑی سے بڑی پرواز یہ تھی کہ وہ متقدمین کے کلام کی شرح کر دیں، اور ان کے مطالب کو کم سے کم الفاظ میں ادا کر دیں، یہی مشرق کا وہ دور انحطاط ہے، جب علم و حکمت میں اضافہ، تجدید، اجتہاد اور تخلیقی" کام کا دروازہ بالکل بند ہو گیا، یورپ میں (جس نے یونان کے منطق و فلسفہ کو مسلمانوں کے واسطے سے حاصل کیا تھا، اور حکمائے یونان کے افکار و فلسفہ کو ابن سینا اور ابن رشد کے ذریعہ سمجھا تھا) کچھ عرصہ تک اس علمی میراث پر قناعت کرنے کے بعد فکر و نظر اور تحقیق و تجربہ کا کام آزادانہ طریقہ پر شروع ہوا، اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ یونانیوں کی منطق و فلسفہ کی بساط الٹ گئی، قیاس کے بجائے استقراء پر منطق کی بنیاد رکھی گئی، مابعد الطبعیات اور الٰہیات کے بجائے جن کا علمی اور علمی زندگی میں کچھ حاصل نہ تھا، طبعیات پر زور دیا گیا اور اس فکری انقلاب نے نہ صرف یورپ کی دنیا کو بلکہ سارے عالمِ انسانی کو متاثر کیا، اس کے برخلاف ہمارے قدیم علمی و مدرسی حلقوں میں یونانی علوم اور ان کے مشرقی شارحین اور پھر آخر میں ایرانی مصنّفین کی کتابوں اور شروح و حواشی کو اس مضبوطی سے پکڑا گیا کہ گویا وہ العروۃ الوثقیٰ اور فکر و نظر کا سدرۃ المنتہیٰ ہیں، اس عقلی جمود و تقلید کے دشت بے نشان میں امام ابن تیمیہ کا یہ مجتہدانہ کارنامہ اور فلسفہ و منطقِ یونانی کی علمی تنقید و محاسبہ ایک سنگِ میل اور چراغِ راہ کی حیثیت رکھتا ہے، اور نئے اجتہاد و تفکر کا دروازہ کھولتا ہے۔

غیر اسلامی ملل و فرق کی تردید

اور

ان کے عقائد و رسوم و اثرات کا مقابلہ

شیخ الاسلام حافظ ابن تیمیہ نے یوں تو تقریباً تمام غیر اسلامی مذاہب و عقائد کی تنقید و تردید کی خدمت انجام دی اور ان کی عمر کا ایک بڑا حصہ اس علمی جہاد کی نذر ہوا مشکل سے ان کی کوئی تصنیف متکلمانہ بحث و مناظرہ سے خالی ہوگی، لیکن ہم یہاں ان مذاہب و فرق میں جن کا ابن تیمیہ نے مقابلہ کیا، صرف دو (عیسائیت اور شیعیت) کو انتخاب کرتے ہیں، اس لئے کہ ان دونوں پر ان کی دو علیحدہ و معرکۃ الآراء تصانیف (الجواب الصحیح لمن بدل دین المسیح اور منہاج السنۃ النبویہ فی نقض کلام الشیعہ والقدریہ) یادگار ہیں، نیز ان دونوں میں ایک لطیف مناسبت اور قدر مشترک بھی ہے، جس کا اظہار اس حدیث میں ہوا ہے، جس میں حضرت علیؓ کو خطاب کرکے فرمایا گیا ہے "یهلك فیك اثنان محب غال ومبغض" (اے علی! تمہارے بارے میں دو طرح کے لوگ ہلاک ہوں گے ایک غالی محب اور ایک بغض رکھنے والے) اور اس لئے بھی کہ شیخ الاسلام کے زمانہ میں مذاہب میں سے صرف مسیحیت اور فرقوں میں سے صرف شیعیت (اپنی مختلف شاخوں اور اقسام کے ساتھ) دو زندہ تحریکیں اور طاقتور مذاہب تھے، اور شاید اسی لئے امام ابن تیمیہ نے ان دونوں کو اپنی مستقل اور منفرد تصانیف کا موضوع بنایا۔

ردِّ عیسائیت

عالمِ اسلام میں عیسائیت کی نئی تحریک

مسلمانوں کے سیاسی زوال کے ساتھ ساتھ اسلامی ملکوں میں دوسرے مذاہب و ادیان نے نئی کروٹ لی ان مذاہب و ادیان میں سب سے زیادہ جرأت و مستعدی کا اظہار مسیحیت نے کیا جس کے ماننے والوں کی بڑی تعداد اسلامی ممالک بالخصوص مصر و شام میں موجود تھی خصوصیت کے ساتھ شام سے متصل عیسائی ممالک کا سلسلہ تھا، اور ان کی عظیم و عنان عیسائی سلطنت (سلطنت قسطنطنیہ) کی سرحدیں اس سے ملتی تھیں، پانچویں صدی ہجری کے آخر میں یورپ نے شام و فلسطین پر حملوں کا وہ سلسلہ شروع کیا جو جنگ صلیبی کے نام سے تاریخ میں مشہور ہیں، شام کا ایک بڑا حصہ مسلمانوں کے قبضہ سے نکل گیا اور نوّے برس تک بیت المقدس عیسائیوں کے اقتدار و تولیت میں رہا، سلطان صلاح الدین ایوبی نے اگرچہ حطین کے میدان میں عیسائیوں کو فیصلہ کن شکست دی تھی، اور بیت المقدس کو بازیاب کر لیا تھا، لیکن شام کے ساحل پر اب بھی ان کی ایک ریاست باقی تھی، اور عیسائی مبلغین اور علماء کے حوصلے اس فتح سے اتنے بلند ہو چکے تھے کہ وہ شام کو دوبارہ مسیحیت کے جھنڈے کے نیچے اور صلیب کے سایہ میں لینے کے خواب دیکھتے تھے، تاتاریوں کے حملے نے ایک طرف مسلمانوں کو نیم جان کر دیا تھا اور دوسری طرف عیسائیوں کو بڑا سہارا دیا تھا، کتاب کے پہلے حصہ میں گذر چکا ہے کہ ۶۵۸ھ میں جب تاتاری دمشق میں فاتحانہ داخل ہوئے تو عیسائیوں نے شہر سے نکل کر ان کا استقبال کیا، اور ان کو تحائف پیش کئے، وہ صلیب کو سروں پر بلند کئے ہوئے تھے، اور پکار پکار کر کہہ رہے تھے کہ دین برحق یسوع مسیح کا دین غالب آیا۔[1]

---

[1] تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو تاریخ دعوت و عزیمت حصۂ اول ص ۳۲۰ دوسرا ایڈیشن۔

"الجواب الصحیح" کی تصنیف

یوں تو مسیحی علماء اور پادری مسلمانوں سے اکثر سوال و جواب کرتے رہتے تھے، اور علمائے اسلام ان کے اعتراضات کا جواب دیتے تھے اور مذہب مسیحی کی کمزوریاں ظاہر کرتے رہتے تھے، لیکن امام ابن تیمیہ کے لئے اس موضوع کی طرف خصوصی توجہ کرنے کا خاص سبب یہ پیش آیا کہ قبرص (سائپرس) سے عیسائیوں کی ایک نئی مناظرانہ تصنیف ملک شام پہونچی جس میں عقلی اور نقلی حیثیت سے مسیحیت کا اثبات کیا گیا تھا، اور مسیحی عقائد کو عقلاً و نقلاً ثابت کرنے کی کوشش کی گئی تھی، اس کتاب میں پوری قوت کے ساتھ یہ بھی ثابت کرنے کی کوشش کی گئی تھی کہ رسول اللہ کی بعثت عمومی نہیں، آپ صرف عربوں کی طرف مبعوث کئے گئے تھے، اور مسیحی آپ پر ایمان لانے کے لئے مکلّف نہیں، معلوم ہوتا ہے کہ اس کتاب نے شام کے علمی اور دینی حلقہ میں کافی اہمیت اختیار کر لی تھی۔

اس کتاب کا جواب دینے کے لئے وہی شخص موزوں تھا جو ایک طرف فلسفہ اور علم کلام اور عقائد و فرق پر بڑی وسیع اور گہری نظر رکھتا ہو، دوسری طرف عہدِ عتیق اور عہدِ جدید کے صحیفوں (بائبل) پر اس کو پورا عبور اور مسیحیت کی تاریخ پر اطلاع ہو، اس لحاظ سے اس عصر میں امام ابن تیمیہؒ سے زیادہ کوئی اس کام کا اہل نہ تھا، انھوں نے اس موضوع پر قلم اٹھایا، اور "الجواب الصحیح لمن بدّل دین المسیح" کے نام سے چار جلدوں میں ایک کتاب لکھی، جو نہ صرف اس موضوع پر بلکہ خود امام ابن تیمیہ کی تصنیفات میں ایک امتیازی مقام رکھتی ہے[1]، اس کتاب سے ان کی وسعتِ نظر مطالعہ کے تنوع، مذاہب و ادیان کی تاریخ سے گہری واقفیت اور صحفِ سابقہ پر وسیع نظر کا اندازہ ہوتا ہے اس کتاب میں انھوں نے صرف مدافعت اور صفائی پیش کرنے ہی پر اکتفا نہیں کیا ہے، بلکہ مسیحیت کی بنیادوں پر بھی حملہ کیا ہے، نبوتِ محمدیؐ کے ثابت کرنے کے لئے انھوں نے

[1] اس کتاب کے مجموعی صفحات ۱۳۹۵ ہیں ۱۳۲۲ھ (۱۹۰۵ء) میں شیخ فرج اللہ زکی کردی اور شیخ مصطفےٰ قبانی دمشقی کے اہتمام میں مصر میں شائع ہوئی۔

وہی قدیم اور اصطلاحی دلائل نہیں پیش کئے ہیں، جو علمِ کلام اور مناظرۂ فرق کی کتابوں کا قدیم شعار ہے، بلکہ ایسے نئے وجوہ ودلائل پیش کئے ہیں، جو زیادہ دل نشیں اور ایمان آفریں ہیں، ایک منصف مزاج اور معقولیت پسند انسان کو تسلیم واعتراف پر مجبور کر دیتے ہیں، پھر اس کتاب میں مسیحیت کی تاریخ، مسیحی علم کلام، اور مسیحی علماء کی موشگافیوں اور تاویلات کا اتنا مواد نیز آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کی بعثت کی بشارتوں اور آپ کے دلائل نبوت اور آپ کی پیشین گوئیوں کا اتنا بڑا ذخیرہ پیش کر دیا ہے، جو تنہا کسی ایک کتاب میں دستیاب نہیں ہو سکتا اور جس کے لئے بہت بڑا کتب خانہ کھنگالنے کی ضرورت ہوگی، ہمیں مشہور مصری فاضل شیخ محمد ابو زہرہ کی اس رائے سے بالکل اتفاق ہے:۔

وان هذا الكتاب أهدأ ما كتبه ابن تيمية	امام ابن تیمیہ کی مناظرانہ تصنیفات میں یہ کتاب سب سے
في الجدال، وهو وحده جدير بان يكتب	زیادہ ٹھنڈی اور پرسکون ہے، یہ کتاب تنہا ان کو
ابن تيمية في سجل العلماء العاملين والأئمة	باعمل علماء، مجاہد ائمہ، اور غیر فانی مفکرین کا مرتبہ
المجاهدين والمفكرين الخالدين[1]۔	دلانے کے لئے کافی ہے۔

پیشِ نظر مضمون میں اس کتاب پر ایک اجمالی نگاہ ڈالنی ہے، اور اقتباسات کی مدد سے اس کا ایک ایسا خلاصہ پیش کرنا ہے، جس سے ان کا نقطۂ نظر اور اس کتاب کی روح سامنے آجائے۔

مسیحیت حضرت مسیح کی تعلیم اور رومی بت پرستی کا مجموعہ ہے

جن مسلمان علماء و مصنفین نے مسیحیت کی تردید و تنقید پر قلم اٹھایا، ان میں سے اکثر خود مسیحیت کی تاریخ سے ناواقف تھے، انھوں نے مسیحیت کو حضرت مسیح کے اقوال وحالات کا مجموعہ سمجھ کر اور ایک آسمانی مذہب کا درجہ دے کر بحث کی اور اس طرح اس کو ایسا اعزاز بخشا جس کی وہ مستحق نہیں تھی، امام ابن تیمیہ

---

[1] ابن تیمیہ، ص ۵۱۹

چونکہ مسیحیت کی تاریخ اور اس کے تدریجی ارتقاء و تغیرات پر نظر رکھتے ہیں، اس لئے وہ اس حقیقت سے ناواقف نہیں ہیں کہ ان کے زمانہ کی مسیحیت حضرت مسیح کی تعلیمات اور یونانیوں اور رومیوں کے مشرکانہ عقائد اور رسوم اور علم الاصنام (دیومالا) کا ایک معجون مرکب ہے، اس لئے وہ عام ناقدین کی اس تاریخی غلطی کا شکار نہیں ہوتے اور پوری جرأت و بیباکی کے ساتھ موجودہ مسیحیت کی تنقید کا فرض انجام دیتے ہیں، وہ لکھتے ہیں:-

"رومی اور یونانی وغیرہ مشرک وبت پرست تھے، وہ ہیاکل علوی اور اصنامِ ارضی کی پرستش کرتے تھے، حضرت مسیح علیہ السلام نے اپنے سفراء و مبلغین کو ان کی طرف امر الٰہی کی دعوت دینے کے لئے بھیجا، ان میں سے بعض آپ کی زندگی میں ان ملکوں میں گئے، اور بعض آپ کے آسمان پر تشریف لے جانے کے بعد، انھوں نے ان کو اللہ کے دین کی دعوت دی، کچھ لوگوں نے اللہ کے دین کو قبول کیا، اور ایک مدت تک اس پر قائم رہے، پھر شیطان نے ان میں سے کچھ لوگوں کو یہ پٹی پڑھائی کہ وہ حضرت مسیح کے دین کو بدل دیں، انھوں نے ایک ایسا دین ایجاد کیا جو حضرت مسیح علیہ السلام کے دین اور مشرکین کے دین کا مجموعہ تھا۔"[1]

ایک دوسری جگہ لکھتے ہیں:-

"عیسائیوں نے دو دینوں کو ملا کر ایک دین بنایا، ایک انبیاء موحدین کا دین، ایک مشرکین کا دین، ان کے دین میں ایک حصہ تو انبیاء کی تعلیمات کا ہے، اور ایک حصہ ان نئے اقوال و افعال کا ہے جو انھوں نے مشرکین کے دین میں سے لے کر شامل کئے ہیں، اس طرح سے انھوں نے اقانیم کے الفاظ ایجاد کئے جن کا انبیاء علیہم السلام کے کلام میں کہیں پتہ نہیں چلتا، اسی طرح سے انھوں نے مجسم اور سایہ دار بتوں کی جگہ پر وہ بت ایجاد کئے جن کا سایہ نہیں، اسی طرح آفتاب، چاند اور کواکب کی طرف نماز پڑھنے، موسم بہار میں روزہ رکھنے کو دین میں داخل کیا، تاکہ دین شرعی اور امر طبعی دونوں کو وہ جمع کر لیں۔"[2]

---

[1] الجواب الصحیح حصہ اول ص ۱۱۹-۱۲۰ [2] ایضاً۔ جلد ۳ ص ۱۹۹

موجودہ مسیحیت عہد قسطنطین کی تصنیف ہے

وہ اس سے ایک قدم آگے بڑھا کر یہ کہتے ہیں کہ مسیحیت کی ابتدائی تحریف و تبدیلی کے علاوہ جو مسیحیت کے ابتدائی عہد اور پال (پولس) کے زمانہ میں ہوگئی تھی، دوسری بڑی تحریف اور تبدیلی قسطنطین کے زمانہ میں ہوئی، جو چوتھی صدی مسیحی کا مشہور رومی بادشاہ ہے اور جو پہلی مسیحی سلطنت کا بانی ہے، وہ لکھتے ہیں:

"عیسائیوں کے عقائد اور شریعت و احکام ان کے علماء وا کا بر برابر تصنیف کرتے رہے جیسے کہ بادشاہ قسطنطین کے زمانہ میں ۳۱۸ آدمیوں نے وہ عیسائی محضر تیار کیا، جس پر مختلف مسیحی فرقوں نے اتفاق کیا اور اریوسی وغیرہ جو اس کے مخالف تھے ان پر لعنت کی، اس محضر میں وہ مسائل ہیں جن کا کسی آسمانی کتاب میں نشان نہیں ملتا، بلکہ تمام آسمانی کتابوں کی تعلیمات کے مخالف اور عقلِ صریح کے معارض ہیں۔"[1]

دوسری جگہ لکھتے ہیں :-

"اس مذہبی سمجھوتے میں انھوں نے حضرت مسیحؑ اور انبیاء کی پیروی نہیں کی، بلکہ ایک نیا عقائد نامہ تیار کیا، جس کا انبیاء علیہم السلام کے کلام میں کوئی سراغ نہیں ملتا، انبیاء علیہم السلام کے کلام نیز حضرت مسیح اور دوسرے انبیاء کے کلام میں، کہیں اللہ کے اقانیم کا ذکر نہیں، نہ تین کا نہ زیادہ کا، نہ کہیں صفات ثلاثہ کا ثبوت ہے، نہ کہیں کسی صفتِ الٰہی کو ابن اللہ یا رب کے لفظ سے تعبیر کیا گیا ہے، نہ اللہ کی حیات کو روح کہا گیا ہے اور نہ یہ کہا گیا ہے کہ خدا کا ایک فرزند ہے جو ازلی حق ہے اور ازلی حق سے وجود میں آیا ہے، وہ اپنے باپ کے جوہر سے ہے اور وہ بھی اسی طرح خالق ہے جیسے کہ اللہ خالق ہے اسی طرح ہے اور وہ دوسرے اقوال جو مختلف اقسام کفر پر مشتمل ہیں اس طرح کے اقوال کسی نبی سے بھی منقول نہیں۔"[2]

---

[1] الجواب الصحیح حصہ اول صـ۱۰۱ [2] ایضاً حصہ سوم صـ۱۳۴

اناجیل کی صحیح حیثیت

بعض علمائے اسلام سے یہ غلطی ہوئی ہے کہ انھوں نے انجیل کو قرآن مجید اور دوسرے صحفِ سماوی کے درجہ میں رکھ کر بحث کی ہے اور عیسائی علماء و مبلغین کے دعوے اور شہرت عام سے متاثر ہو کر یہ تسلیم کر لیا کہ وہ بھی اسی طرح کی ایک آسمانی کتاب ہے، جیسے کہ دوسری آسمانی کتابیں یہ ایک بنیادی غلطی تھی جو محض عہدِ جدید کی تاریخ سے ناواقفیت کا نتیجہ ہے، امام ابن تیمیہ انجیل کو وہی مقام دیتے ہیں جس کی وہ مستحق ہے ان کے نزدیک انجیل کے ان چار صحیفوں کی حیثیت سیرت اور حدیث کی عام کتابوں سے کسی طرح زائد نہیں، وہ لکھتے ہیں:۔

"ان اناجیل اربعہ میں بعض راویوں نے کچھ حضرت مسیح کے اقوال اور کچھ ان کے افعال و معجزات نقل کئے ہیں، انھوں نے اس کا ذکر کیا ہے کہ انھوں نے حضرت مسیح سے جو کچھ سنا اور دیکھا سب نقل نہیں کیا، بس جیسے محدثین اور اصحاب سیر و مغازی آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کے اقوال و افعال نقل کرتے ہیں اور کوئی ان کو قرآن کا درجہ نہیں دیتا، اسی طرح سے ان راویوں نے حضرت مسیح کے اقوال و افعال نقل کئے ہیں، اور اور ان کی حیثیت بھی وہی ہے، جو ہمارے یہاں سیرت اور حدیث کی کتابوں کی ہے۔"[1]

ایک دوسری جگہ لکھتے ہیں:۔

"آج جو انجیل عیسائیوں کے ہاتھوں میں ہے اس کے متعلق ان کو خود اعتراف ہے کہ وہ نہ حضرت مسیح کی لکھی ہوئی ہے، نہ ان کی لکھوائی ہوئی ہے، حضرت مسیح کے آسمان پر تشریف لے جانے کے بعد متی اور یوحنا نے (جو حضرت مسیح کے حواری تھے، اور ان کو آپ کی صحبت حاصل ہوئی) اور مرقس اور لوقا نے (جنھوں نے حضرت مسیح کو نہیں دیکھا) لکھوایا، اس کو اتنے آدمیوں نے یاد نہیں کیا، جو تواتر کی حد تک پہنچ جائے، ان چاروں مصنفین کا بھی یہ بیان ہے کہ انھوں نے حضرت مسیح کے اقوال و حالات کا

---

[1] الجواب الصحیح حصہ دوم ص۱۷

کچھ حصہ نقل کیا ہے، انھوں نے پورے اقوال و افعال کا استیعاب بھی نہیں کیا، دو تین چار کے نقل کرنے میں غلطی کی گنجائش ہے، خصوصیت کے ساتھ اس لئے اور بھی کہ خود حضرت مسیح کے بارے میں ان کو غلطی ہوئی، اور یہ بات مشتبہ ہوگئی کہ کون مصلوب ہے[1]"

وہ نہ صرف انجیل بلکہ تورات کے متعلق بھی لکھتے ہیں :-

"تورات کی نقل و روایت میں بھی انقطاع واقع ہوا جب بیت المقدس ویران کیا گیا اور بنی اسرائیل وہاں سے جلاوطن کئے گئے، یہودیوں کی روایت ہے کہ اس کے بعد ایک شخص نے تورات قلمبند کروائی، جس کا نام عازر بتلاتے ہیں، ان کا خیال ہے کہ وہ نبی تھے، بعض لوگ کہتے ہیں کہ وہ نبی نہیں تھے، ان کا بیان ہے کہ اس نسخہ کا ایک دوسرے پرانے نسخہ سے مقابلہ کیا گیا، ایک روایت یہ ہے کہ ایک نسخہ جو مغرب میں نکالا گیا، اس سے مقابلہ ہوا، اس سب سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ ان کتابوں کے الفاظ متواتر نہیں ہیں، اور ان میں بعض مقامات میں غلطی کا وقوع ناممکن نہیں، جیسے ان تمام کتابوں میں پیش آتا ہے جس کو دو چار آدمی نقل کرتے ہیں اور ان کا مقابلہ کرتے ہیں اور حفظ کرتے ہیں[2]"

آخر میں وہ نتیجہ نکالتے ہیں :-

"عیسائیوں کے پاس ان انجیلوں کے الفاظ کی حضرت مسیح سے کوئی متواتر روایت نہیں، اور نہ احکام و عقائد کی کوئی متواتر نقل ہے، جن پر وہ قائم ہیں، نہ یہودیوں کے پاس توراۃ کے الفاظ اور انبیاء کی پیشین گوئیوں کی کوئی متواتر نقل ہے، جیسی مسلمانوں کے یہاں قرآن اور احکامِ شریعت کی متواتر نقل موجود ہے، جو عوام و خواص سب کو معلوم ہے[3]"

وہ قرآن مجید اور تورات و انجیل کا فرق دکھاتے ہوئے لکھتے ہیں :-

"قرآن مجید کے الفاظ و معانی رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم سے متواتر چلے آرہے ہیں، اور ان پر

---

[1] الجواب الصحیح۔ حصہ اول ص ۳۶۸-۳۶۹ [2] ایضاً ص ۳۶۸ [3] ایضاً ص ۳۷۲

اجماع ہے، اسی طرح سے سنت متواترہ، اسی طرح مسلمانوں کے پاس اپنے نبیؐ کے بہت سے حالات اور واقعات ہیں، جن کا صحیح ہونا مختلف طریقوں سے معلوم ہے مثلاً امت کی تصدیق، عادات کی دلالت وغیرہ، یہ قرآن مجید مسلمانوں کے سینوں میں محفوظ ہے، اس کا حفظ کسی لکھی ہوئی کتاب پر موقوف نہیں، اگر مصاحف خدانخواستہ دنیا سے ناپید ہوجائیں تو اس سے ان کے حفظ پر کوئی اثر نہیں پڑے گا، بخلاف اہلِ کتاب کے کہ اگر بائبل کے نسخے معدوم ہوجائیں تو ان کے پاس اس کے الفاظ کی کوئی متواتر نقل نہیں ہے، اس لئے کہ کتابوں کے معدودے چند حافظ ہیں، جن کے حفظ پر اعتماد نہیں کیا جاسکتا، اسی لئے عہدِ نبوت کے بعد ان کتابوں میں برابر تبدیلی (معنوی یا لفظی) واقع ہوتی رہی، اور اسی لئے ان میں اس سند کا رواج نہیں جس کا مسلمانوں میں رواج ہے، اور نہ جرح و تعدیل اور اسماء الرجال کا وہ علم ہے، جو مسلمانوں کے پاس موجود ہے۔[1]

اناجیل میں تحریف

امام ابن تیمیہ کے متعلق عام طور پر مشہور رہا ہے کہ وہ تورات و انجیل میں تحریفِ لفظی کے قائل نہیں، لیکن اس کتاب کے مطالعہ سے اس کی تردید ہوتی ہے، اس کی حقیقت صرف اتنی ہے کہ وہ اس پر بار بار زور دیتے ہیں کہ تحریفِ معنوی پر اتفاق ہے اور چونکہ ان کے نزدیک علمائے یہود و نصاریٰ بھی اس کے قائل ہیں کہ تحریفِ معنوی ہوئی ہے، اس لئے وہ اس سے زیادہ استدلال کرتے ہیں، اور علمائے یہود و نصاریٰ کے مقابلہ میں اس کو پیش کرتے ہیں، وہ ایک جگہ لکھتے ہیں:۔

واذا عرف ان جميع الطوائف من المسلمين	جب یہ بات مسلّم ہے کہ مسلمان یہود اور عیسائی سب
واليهود والنصارى يشهدون انه قد وقع	اس بات کے قائل ہیں کہ ان کتابوں (توراۃ و انجیل)

[1] الجواب الصحیح حصہ دوم صفحہ ۱۲-۱۳

فی ھذہ الکتب تحریف وتبدیل فی معانیھا	کے معانی وتفسیر واحکام میں تحریف واقع ہوئی ہے
وتفاسیرھا وشرائعھا فھذا القدر کافٍ[1]۔	تو اتنی بات بھی کافی ہے۔

ایک دوسری جگہ لکھتے ہیں:۔

ولکن علماء المسلمین وعلماء اھل الکتاب	مسلمان علماء اور علمائے اہلِ کتاب اس بات پر متفق
متفقون علی وقوع التحریف فی المعانی والتفسیر[2]	ہیں کہ تورات وانجیل کے معانی وتفسیر میں تحریف ہوئی ہے

لیکن کیا تورات وانجیل کے الفاظ میں بھی تحریف ہوئی ہے یا نہیں؟ تو اس بارے میں ان کو اس سے تو اتفاق نہیں ہے کہ یہ کتابیں سرتاپا محرّف ہو گئی ہیں، اور ان میں کہیں بھی اصل الفاظ نہیں ہیں، لکھتے ہیں کہ اس قول کی نسبت مسلمانوں کی طرف صحیح نہیں کہ ان کتابوں کے تمام الفاظ آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کی بعثت کے بعد تمام زبانوں میں بدل دیئے گئے ہیں، وہ کہتے ہیں کہ "میرے علم میں علمائے مسلمین میں سے کوئی اس کا قائل نہیں ہے[3]" البتہ وہ اس کے قائل ہیں کہ ان کتابوں میں جزدی تحریف ضرور ہوئی ہے، اور بہت سے مقامات پر اس کے الفاظ بدل دیئے گئے ہیں، وہ اسی کو جمہور کا مسلک بتلاتے ہیں، وہ لکھتے ہیں:۔

فجمھور المسلمین یمنعون ھذا	جمہور کو اس بات سے انکار ہے (کہ رسول اللہ صلے اللہ
ویقولون انّ بعض الفاظھا بُدّل	علیہ وسلم نے تورات وانجیل کے تمام الفاظ کی تصدیق
کما قد بدّل کثیر من معانیھا[4]۔	کی ہے) اور ان کا مسلک ہے کہ ان کتابوں کے بعض
	الفاظ تو ضرور بدل دیئے گئے ہیں جیسے کہ اس کے
	بہت سے مطالب اور تشریحات بدل دی گئی ہیں۔

دوسری جگہ لکھتے ہیں:۔

والصواب الذی علیہ الجمھور انہٗ	صحیح مسلک جس پر جمہور ہیں وہ یہ کہ ان کتابوں کے

---

[1] الجواب الصحیح حصہ اول ص۳۷۶ [2] ایضاً ص۳۸۰ [3] ایضاً ص۳۷۳ [4] ایضاً

بدّل بعض الفاظہا۔[1] بعض الفاظ میں ضرور تبدیلی ہوئی ہے۔

نصاریٰ الفاظِ انبیاء کو سمجھے نہیں

وہ لکھتے ہیں کہ عیسائیوں کی گمراہی اور عقیدۂ تثلیث اور مشرکانہ خیالات کا بڑا سبب اور فساد کا سرچشمہ یہ ہے کہ عیسائیوں نے انبیاء علیہم السّلام کے بہت سے الفاظ کا صحیح مفہوم نہیں سمجھا، اور بہت سے الفاظ کے مفہوم کی تحریف کردی، وہ کہتے ہیں، اس لحاظ سے یہودیوں کو عیسائیوں پر کسی درجہ میں فوقیت حاصل ہے اگرچہ وہ ضد تکبر اور انکار حق میں ان سے بڑھے ہوئے ہیں، لیکن انبیاء علیہم السلام کی زبان اور الفاظ سے اتنے ناآشنا نہیں ہیں۔[2]

وہ اس بات پر بڑا زور دیتے ہیں کہ ان آسمانی کتابوں کے سمجھنے اور ان سے صحیح طور پر تعلیم کو اخذ کرنے کے لئے انبیاء علیہم السلام کی زبان اور اصطلاحات کا سمجھنا بہت ضروری ہے، وہ لکھتے ہیں:۔

ان معرفۃ اللغۃ التی خاطبنا بہا الانبیاء	اس زبان کا سمجھنا جس میں انبیاء علیہم السلام نے
وحمل کلامہم علیہا امر واجب متعین	ہم سے خطاب کیا اور ان کے الفاظ کا وہی مطلب لینا
ومن سلک غیر ھذا المسلک فقد	جو ان کی مراد تھی ضروری اور یقینی چیز ہے، جو اس کے
حرف کلامہم عن مواضعہ وکذب	علاوہ دوسرا راستہ اختیار کرے گا وہ ان کے کلام کو
علیہم وافتری۔[3]	اصل مفہوم سے ہٹادے گا، اور ان پر جھوٹ باندھے
	اور افتراپردازی کے جرم کا مرتکب ہوگا۔

اسی زبان اور اصطلاحات کو نہ سمجھنے کا نتیجہ یہ ہے کہ ابن اور روح القدس کے معنی غلط سمجھ لئے گئے اور تثلیث کا عقیدہ پیدا ہوگیا۔

---

[1] الجواب الصحیح حصہ دوم ص۴ [2] ایضاً ص۱۰۹ [3] ایضاً حصہ سوم ص۱۸۱

الفاظ کے صحیح معنی

وہ لکھتے ہیں :۔

"اہل کتاب نے انبیاء علیہم السلام سے نقل کیا ہے کہ انھوں نے اب (باپ) اور ابن (فرزند) کے الفاظ استعمال کئے، ان کی خود مراد اب سے رب اور ابن سے منتخب اور محبوب تھی کسی نے بھی ان سے یہ نقل نہیں کیا کہ انھوں نے صفات الٰہی میں سے کسی صفت کو لفظ ابن سے تعبیر کیا ہو اور نہ اللہ تعالیٰ کی صفت کے متعلق یہ کہا ہو کہ اس کا اس سے تولّد ہوا، یا وہ اس کی مولود ہے، پس اگر حضرت مسیحؑ کے کلام میں یہ آتا ہے کہ لوگوں کو باپ بیٹے اور روح القدس کے نام سے بپتسمہ دو تو لفظ ابن کی یہ تفسیر کرنا کہ وہ اللہ تعالیٰ کی ایک قدیم اور ازلی صفت ہے، حضرت مسیح پر محض افترا ہے اس لئے کہ ان کی زبان میں ابن سے مراد اللہ تعالیٰ کی قدیم ازلی صفت نہیں تھی، اسی طرح سے انبیاء علیہم السلام کے کلام میں اللہ تعالیٰ کی صفت حیات کو روح القدس کے لفظ سے کبھی تعبیر نہیں کیا گیا، ان کی زبان اور اصطلاح میں روح القدس سے مراد وہ ہستی یا شئ تھی جس کو اللہ تعالیٰ انبیاء اور صالحین پر نازل فرماتا تھا، اور اس سے ان کی تائید فرماتا تھا۔[1]

دوسری جگہ عیسائیوں کو خطاب کر کے لکھتے ہیں :۔

"تمہاری گمراہی کا سبب یہ ہے کہ تم نے انبیاء علیہم السلام کے صریح اور واضح کلام کو چھوڑ کر وہ تاویلیں اختیار کیں، جن پر انبیاء علیہم السلام کا کلام نصّاً اور ظاہراً دلالت نہیں کرتا، تم نے محکم کو چھوڑ دیا، اور فتنہ اور تاویل کی جستجو میں متشابہ کی پیروی کی، اگر تم اس کلام کے ظاہر کو پکڑے رہتے تو گمراہ نہ ہوتے اس لئے کہ ابن کا لفظ جہاں انبیاء علیہم السلام کے کلام میں آتا ہے وہاں اس سے کوئی صفت مراد نہیں ہوتی بلکہ اللہ کا دوست اور اس کا محبوب مراد ہوتا ہے، روح القدس

---

[1] الجواب الصحیح حصہ سوم صفحہ ۱۸۱۔۱۸۲

سے بھی کوئی صفت مراد نہیں ہوتی، بلکہ وحی اور فرشتہ مراد ہوتا ہے، تم نے ظاہرِ لفظ اور اس کے مفہوم کو چھوڑ کر ایسے معنی مراد لئے، جن پر لفظ مطلقاً دلالت نہیں کرتے۔"[1]

الفاظ "ابن" اور "روح القدس" مشترک اور عام ہیں

پھر وہ توراۃ وانجیل کی عبارتوں اور نصوص سے ثابت کرتے ہیں کہ ابن اور روح القدس کے الفاظ حضرت مسیح کے ساتھ مخصوص نہیں بلکہ بکثرت دوسروں کے لئے استعمال ہوئے ہیں، وہ لکھتے ہیں:

• ابن اور روح القدس کے الفاظ حضرت مسیح کے علاوہ دوسروں کے حق میں خود تمہارے نزدیک آئے ہیں، تم خود بیان کرتے ہو کہ حواریوں نے کہا کہ حضرت مسیح نے ان سے فرمایا بیشک اللہ میرا اور تمہارا باپ ہے اور میرا اور تمہارا معبود ہے، وہ خود کہتے ہیں کہ روح القدس ان میں حلول کرتا ہے، تمہارے پاس جو تورات ہے اس کے اندر یہ عبارت موجود ہے کہ رب نے حضرت موسیٰ سے کہا فرعون کی طرف جا، اور اس سے کہہ رب کہتا ہے اسرائیل میرا پلوٹھی کا لڑکا ہے، اس کو چھوڑ دے تاکہ وہ میری عبادت کرے، اگر تو نے میرے پلوٹھی کے بیٹے کو چھوڑنا منظور نہ کیا تو میں تیرے پلوٹھی کے بیٹے کو قتل کردوں گا جب فرعون نے بنی اسرائیل کو نہ چھوڑا تو جیسے خدا نے کہا تھا تو خدا نے فرعون کے اور فرعون کی قوم کے پلوٹھی کے بیٹوں کو قتل کردیا، اس فرعون کے بیٹے سے لے کر جو تخت پر بیٹھا تھا، دوسرے آدمیوں اور ان کے جانوروں کے پلوٹھی کے بیٹوں تک" تو یہ تورات تمام بنی اسرائیل کو اللہ کے بیٹے اور اس کی پلوٹھی کی اولاد کہہ رہی ہے، اور اہلِ مصر کے بیٹوں کو فرعون کے بیٹے بتلا رہی ہے، اور اس سے بھی زیادہ وسعت سے کام لیتی ہے، اور جانوروں کے بچوں کو جانوروں کے مالک کا بچہ کہتی ہے، اسی طرح سے مزامیرِ داؤد میں ہے تو میرا بیٹا ہے تو مجھ سے سوال کریں دوں گا، انجیل میں حضرت مسیح کا یہ قول نقل

[1] الجواب الصحیح حصہ سوم صـ۱۵۵

کیا گیا ہے، میں اپنے اور تمہارے باپ اور اپنے اور تمہارے معبود کے پاس جانے والا ہوں اور انھوں نے فرمایا جب تم دعا کرو تو کہو اے ہمارے باپ جو آسمان میں ہے، قدوس تیرا نام ہے، ہمیں فلاں فلاں نعمتیں عطا کر، اسی طرح روح القدس کے حلول کرنے کا تذکرہ صرف حضرت مسیح ہی کے بارے میں نہیں آتا بلکہ اور انسانوں کے بارے میں بھی آتا ہے[1]۔

غرض انھوں نے مدلل طریقہ پر ثابت کیا ہے کہ جن الفاظ سے نصاریٰ حضرت مسیح کی ابنیت، حلول واتحاد اور الوہیت کے لئے استدلال کرتے ہیں، وہ الفاظ تورات وانجیل میں بکرات ومرات غیر مسیح کے لئے استعمال کئے گئے ہیں، اور وہ سب کنایات، مجازات ومحاورات ہیں[2]، آخر میں وہ نتیجہ نکالتے ہیں:-

"خلاصہ یہ ہے کہ گذشتہ پیشین گوئیوں اور تورات وانجیل وزبور جیسی آسمانی کتابوں اور دوسرے انبیاء کی پیشین گوئیوں میں کوئی بات ایسی نہیں کی گئی ہے، جس سے حضرت مسیحؑ کے متعلق خصوصیت سے یہ ثابت ہو کہ ان کو الوہیت کا اتحاد وحلول حاصل تھا، جیسا کہ عیسائیوں کا عقیدہ ہے، ان کی خصوصیت بس اتنی ہی بیان کی گئی ہے جتنی کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے اس آیت میں بیان کر دی ہے: اِنَّمَا الْمَسِيْحُ عِيْسَى ابْنُ مَرْيَمَ رَسُوْلُ اللّٰهِ وَكَلِمَتُهٗ اَلْقٰهَآ اِلٰى مَرْيَمَ وَرُوْحٌ مِّنْهُ، واقعہ یہ ہے کہ انبیاء کے صحفِ سابقہ اور تمام پیشین گوئیاں اس کے بالکل مطابق ہیں، جس کی رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے اطلاع دی، اور ان میں سے ایک سے دوسرے کی تصدیق ہوتی ہے، عیسائی باقی جن الفاظ سے حضرت مسیح کی الوہیت پر استدلال کرتے ہیں، اور انبیاء علیہم السلام کے اقوال سے ثابت کرتے ہیں، یہ تمام الفاظ وکلمات حضرت مسیح کے علاوہ دوسروں کے متعلق بھی آئے ہیں تو حضرت مسیح کو الوہیت کے ساتھ مخصوص کرنا بے اصل بات ہے، مثلاً ابن مسیح، روح القدس کا آپ میں حلول کر جانا یا آپ کو الٰہ کے لفظ سے یاد کرنا، یا آپ کے اندر رب کا ظہور یا حلول کرنا، یا ساکن ہونا یا اس کی جگہ پر ساکن ہونا،

[1] الجواب الصحیح حصہ سوم ص ۱۸۵، ۱۸۶ [2] تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو الجواب الصحیح حصہ دوم ص ۱۱۹-۱۳۲

یہ سب الفاظ دوسروں کے لئے بھی موجود ہیں، اور اس سے وہ الٰہ ثابت نہیں ہوتے"۔[1]

مسیحی کبھی ان منقولات سے ہٹ کر اقانیم وحلول واتحاد پر عقلی بحث کرتے ہیں، اور اس کو ایک فلسفیانہ یا متصوفانہ بحث بنا دیتے ہیں، امام ابن تیمیہ نے اس پر خالص اور فلسفیانہ نقطۂ نظر سے سیر حاصل بحث کی ہے، چونکہ یہ ان کا خاص موضوع ہے، اور علم کلام وعقائد اور وحدۃ الوجود کے سلسلہ میں وہ اس پر بار بار بحث کر چکے ہیں، اس لئے وہ دل کھول کر اس پر بحث کرتے ہیں، اور ثابت کر دیتے ہیں کہ یہ بالکل خلافِ عقل باتیں ہیں، اور ایک خود ساختہ فلسفہ ہے، جس کا حقائق ومعقولات سے کوئی تعلق نہیں۔[2]

منافی عقل باتیں

جب عقلی حیثیت سے عیسائیوں پر گرفت کی جاتی ہے، اور ثابت کیا جاتا ہے کہ تثلیث کا عقیدہ بالکل خلافِ عقل اور ناقابلِ فہم عقیدہ ہے، اور عام انسانی عقل اس کی تائید نہیں کرتی تو وہ پھر منقولات کی طرف پناہ لیتے ہیں، اور کہتے ہیں کیا کیا جائے آسمانی کتابوں میں اسی طرح سے آیا ہے، اور یہ امور وعقائد عقل وقیاس سے بالاتر حقیقتیں ہیں، جن میں ایمان وتقلید ہی سے کام لینا پڑتا ہے، اس کو عقلی حیثیت سے سمجھنے اور سمجھانے کی کوشش نہیں کرنی چاہئے، امام ابن تیمیہ اول تو اسی بات سے انکار کرتے ہیں کہ یہ عقائد وتعلیمات آسمانی کتابوں میں آئی ہیں، بلکہ واقعہ یہ ہے کہ آسمانی کتابوں میں ان کے خلاف تعلیمات ہیں، پھر وہ کہتے ہیں کہ دو چیزیں الگ الگ ہیں، ایک وہ جو عقلی حیثیت سے محال اور باطل ہے، اور سب جانتے ہیں کہ وہ چیزیں ناممکن ہیں، اور ایک وہ جس سے عقل قاصر ہے، وہ اس کی حقیقت کو پہچان نہیں سکتی، اور اس میں نفیاً واثباتاً کوئی فیصلہ صادر نہیں کر سکتی، وہ فرماتے ہیں کہ انبیاء علیہم السلام کی تعلیمات اور کلام میں صرف دوسری قسم پائی جاتی ہے، گویا ان کے کلام میں مخالفِ عقل چیزیں نہیں ہیں، ماورائے عقل

---

[1] الجواب الصحیح حصہ دوم ص ۱۸۹-۱۹۰ [2] تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو الجواب الصحیح حصہ سوم ص ۱۱۹-۱۹۰، ۱۹۱، ۲۱۵

چیزیں ہیں، اور مخالف عقل اور ماورائے عقل میں بڑا فرق ہے، وہ لکھتے ہیں :-

لا يميزون بين ما يحيله العقل ويبطله ويعلم انه ممتنع وبين ما يعجز عنه العقل فلا يعرفه ولا يعلم فيه بنفي ولا اثبات وان الرسل اخبرت بالنوع الثاني ولا يجوز ان تخبر بالنوع الاول فلم يفرقوا بين محالات العقول ومحارات العقول وقد ضاهوا في ذلك من قبلهم من المشركين الذين جعلوا لله ولدا و شريكا۔[1]

یہ عیسائی علماء ان چیزوں میں جن کو عقل محال بتلاتی ہے، اور باطل ٹھہراتی ہے اور یقین سے معلوم ہے کہ وہ ممتنع ہیں، اور ان چیزوں میں جن کے بارے میں عقل عاجز ہے، وہ اس کی حقیقت نہیں معلوم کرسکتی، اور نفی و اثبات کا فیصلہ نہیں کرسکتی، کچھ فرق نہیں کرتے حالانکہ انبیاء نے صرف دوسری قسم کی اطلاع دی ہے پہلی قسم کی اطلاع ان کے کلام میں ممکن نہیں، یہ تمام علم محالات ہیں، اور ان مسائل و حقائق میں جن میں عقل سرگرداں و حیران رہتی ہے، تمیز نہیں کرسکے، انھوں نے اس بارہ میں مشرکین کا مقابلہ کیا ہے، جنھوں نے اللہ کے لئے بیٹا اور شریک ٹھہرایا۔

وہ بڑے شدّ و مد سے ثابت کرتے ہیں، اور ان کی تمام کتابیں اس بیان سے بھری ہوئی ہیں کہ دینِ صحیح عقلِ صریح کے خلاف نہیں ہوتا، وہ کہتے ہیں، اس مقام پر دو جماعتوں نے ٹھوکر کھائی ہے، بعض لوگوں نے معقولات میں ایسا غلو کیا کہ جو معقول نہیں تھا، اس کو بھی معقول بنا دیا، اور اس کو حسیات اور انبیاء کے نصوص پر ترجیح دی، ایک گروہ نے یہ بے اعتدالی کی کہ صریح معقولات کو رد کر دیا، اور اپنے خیالی سمعیات اور حسیات کو ان پر مقدم رکھا، یہ بات یاد رکھنی چاہیئے کہ ایک حق دوسرے حق کا مخالف اور مکذب نہیں ہوتا، بلکہ ان میں سے ایک کی دوسرے سے تصدیق ہوتی ہے، بخلاف باطل کے کہ وہ مختلف

---

[1] الجواب الصحیح حصہ دوم ص۹۵

اور متناقض ہوتا ہے، اللہ تعالیٰ مخالفین انبیاء کا ذکر کرتے ہوئے فرماتا ہے:۔

وَالسَّمَآءِ ذَاتِ الْحُبُكِ ۝ اِنَّكُمْ لَفِیْ قَوْلٍ مُّخْتَلِفٍ ۝ یُّؤْفَكُ عَنْهُ مَنْ اُفِكَ ۝ (الذاریات۔ ۷، ۸، ۹)

آسمان جالی دار کی قسم ہے البتہ تم پیچیدہ باتیں پڑے ہوئے ہو قرآن سے وہی روکا جاتا ہے، جو ازل سے گمراہ ہے۔

واقعہ یہ ہے کہ جو چیز عقل صریح سے ثابت ہو جائے اس کی مخالف نہ تو خبر صحیح ہوتی ہے، نہ حس صحیح اور جو چیز نقل صحیح سے ثابت ہو جائے، اس کی معارض نہ عقل ہوتی ہے، نہ حس اسی طرح جو چیز حس صحیح سے معلوم ہو جائے اس کے متناقض نہ خبر ہوتی ہے نہ معقول[1]۔

اور یہی عیسائیت اور اسلام کا فرق ہے کہ اسلام میں عقل و نقل کی پوری مطابقت ہے، اس میں حقائق غیبیہ ضرور ہیں جو ماورائے عقل ہیں لیکن مخالف عقل نہیں، بخلاف مسیحیت کے جس میں بہت سے مسائل اور عقائد مخالف عقل ہیں، اور بہت سے مسیحی علماء بھی ان کو مخالفِ عقل مانتے ہیں لیکن کہتے ہیں کہ یہ مرتبۂ عقل کے بعد کی چیزیں ہیں، اور ان کو آنکھ بند کر کے ماننا ہی پڑے گا۔

توحید اور حضرت مسیحؑ کی عبدیت کے قائل مسیحی علماء

اس کتاب میں امام ابن تیمیہ نے ایک بڑا مفید کام یہ کر دیا ہے کہ ان علمائے مسیحیت اور پیشوایان مذاہب کے اقوال اور ان کا کلام نقل کر دیا ہے، جو توحید اور حضرت مسیحؑ کی عبدیت کے قائل تھے لیکن ان کو مختلف اسباب کی بنا پر مسیحی دنیا میں قبول عام حاصل نہ ہو سکا، اس سلسلہ میں انھوں نے فرق نصاریٰ کی تفصیل اور غالب مذہب کا تذکرہ اور اس کی تشریح کی ہے، جس سے ان کی گہری واقفیت، وسیع مطالعہ اور باریک بینی کا اظہار ہوتا ہے، اسی سلسلہ میں انھوں نے ایک نو مسلم عالم حسن بن ایوب کا ایک طویل رسالہ نقل کر دیا ہے،

---

[1] الجواب الصحیح حصہ سوم ص ۱۳۶

جس میں اس نے اپنے اسلام قبول کرنے کے اسباب اور دین اسلام کی ترجیح کے دلائل تفصیل سے نقل کئے ہیں، یہ رسالہ گرانقدر معلومات پر مشتمل ہے۔[1]

تورات و صحف سماویہ میں آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کی بشارتیں

اس سب سے فارغ ہو کر امام ابن تیمیہ نے وہ بشارتیں اور پیشین گوئیاں نقل کی ہیں جن میں آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کی نبوت کی اطلاع اور بعثت کی خبر دی گئی ہے، ان بشارتوں اور پیشین گوئیوں کے تذکرے میں انھوں نے بڑے استقصاء اور استیعاب سے کام لیا ہے، اور اشعیاء نبی، حبقوق، دانیال اور حضرت مسیح کے کلام سے وہ تمام جملے اور عبارتیں نقل کر دی ہیں، جو آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم سے متعلق ہیں، اس سلسلہ میں جتنا مواد اس کتاب میں آگیا ہے، وہ مشکل سے کسی اور کتاب میں مل سکتا ہے، انھوں نے ان پیشین گوئیوں کی تشریح بھی کی ہے اور ثابت کیا ہے کہ یہ پیشین گوئیاں آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم ہی پر منطبق ہوتی ہیں۔[2]

ان پیشین گوئیوں میں سے ایک پیشین گوئی انجیل یوحنا کی پیشین گوئی ہے کہ حضرت مسیح نے فرمایا کہ "ان آرکون العالم سیاتی ولیس لی شئی" (ارکون کے معنی عبرانی میں عظیم الشان اور جلیل القدر کے ہیں، اور عظماء و اکابر کو ارکنہ کہتے ہیں) امام ابن تیمیہ یہ ثابت کرتے ہوئے کہ اس پیشین گوئی کا مصداق آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم ہیں، لکھتے ہیں:-

"تمام اہل زمین کا اس پر اتفاق ہے اور یہ بات بالکل بدیہی اور یقینی ہے کہ حضرت مسیح کے بعد صرف آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کی ذات ایسی تھی جن کی باطنی اور ظاہری سیادت تمام عالم پر قائم ہوئی، قلوب اور اجسام ان کے فرمانبردار تھے، اور اپنی زندگی اور اپنی وفات کے بعد تمام زمانوں میں اور مشرق و مغرب کے تمام اقالیم متمدنہ میں آپ کی ظاہراً اور باطناً اطاعت کی گئی، بادشاہوں کی صرف ظاہری

[1] ملاحظہ ہو حصہ دوم ص۳۱۲ تا حصہ سوم ص۳ [2] حصہ سوم ص۲۶۵ تا حصہ چہارم ص۲۰

طور پر اطاعت کی جاتی ہے اور موت کے بعد کوئی ان کی فرمانبرداری نہیں کرتا، اور اہلِ مذہب کو ان کی ایسی اطاعت سے کوئی سروکار نہیں ہوتا جس سے کہ ان کو آخرت میں اجر کی امید اور سزا کا خوف ہو لیکن انبیاء علیہم السلام کی اطاعت کی یہی شان ہوتی ہے۔

محمد صلے اللہ علیہ وسلم نے انبیاء سابقین کے دین کو ظاہر کیا، ان کی تصدیق فرمائی ان کے نام کا چرچا کیا، اور ان کا مرتبہ بلند کیا، آپ ہی کی بدولت وہ بڑی قومیں حضرت موسیٰ اور مسیحؑ وغیرہ انبیاء اور مرسلین پر ایمان لائیں کہ اگر آپ نہ ہوتے تو ان پر ایمان نہ لاتیں اہل کتاب ان میں سے جن کے نام سے آشنا بھی تھے ان کے بارے میں بھی ان کو اختلاف تھا، وہ حضرت داؤد و سلیمان وغیرہ پر اعتراض کرتے تھے، اور ان پر طعن کرتے تھے، ان کے علاوہ اور بہت سے پیغمبر شلاً ہودؑ، صالحؑ، شعیبؑ وغیرہ ہیں جن کو جانتے بھی نہ تھے۔[1]

معجزات و دلائلِ نبوت

اس سے فارغ ہونے کے بعد امام ابن تیمیہ نے معجزاتِ نبوی (جن کے متعلق ان کو اصرار ہے کہ آیات کا لفظ اصل قرآنی اصطلاح اور زیادہ صحیح تعبیر ہے) کا تفصیل سے ذکر کیا ہے اور اپنی عادت کے موافق اس سلسلہ میں اتنا مواد جمع کر دیا ہے جو آسانی کے ساتھ ایک جگہ نہیں مل سکتا،[2] اس سلسلہ میں معجزات کی تعریف، ان کے ثبوت کا طریقہ اور بہت سے اصولی اور کلامی مباحث اور لطیف نکتے آگئے ہیں۔

ان معجزات و آیات کے بارے میں امام ابن تیمیہ نے صرف ان ہی مشہور و معروف معجزات پر اکتفا نہیں کیا ہے، جو عام طور پر سیرت و کلام کی کتابوں میں ذکر ہوتے چلے آرہے ہیں، بلکہ آیات و دلائل نبوت کے دائرہ کو اتنا وسیع کیا ہے کہ اس میں آپ کی پوری سیرت و شمائل کو شامل کر لیا ہے، جو نبوت کی سب سے بڑی دلیل اور

---

[1] الجواب الصحیح حصہ چہارم ص۸۶-۱۲۰ تا ص۹۵ و ۷۸ تا ۸۶   [2] ملاحظہ ہو حصہ چہارم ص۶۶ تا ۲۲۴

اہلِ انصاف اور اہلِ نظر کے لئے نبوتِ محمدی پر سب سے بڑی حجت اور برہان ہے گویا وہ مولانا روم سے اس بارے میں اتفاق کرتے ہیں ؎

در دلِ ہر کس کہ دانش را مزہ است

روئے و آواز پیمبر معجزہ است

اس سلسلہ میں انھوں نے سیرت و شمائل نبوی کا بہت اچھا خلاصہ پیش کر دیا ہے[۱]، وہ اس دائرہ میں اور وسعت کرتے ہیں، وہ فرماتے ہیں :۔

"رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی سیرت، آپ کے اخلاق اور اقوال و افعال بھی آپ کا معجزہ ہیں آپ کی شریعت بھی آپ کا ایک مستقل معجزہ ہے اور آپ کی امت اور آپ کی امت کا علم اور ان کی دینداری اور زندگی بھی آپ کا ایک معجزہ ہے اور آپ کی امت کے صالحین کی کرامات بھی آپ کا ایک معجزہ ہے[۲]"

اسلامی انقلاب اور امّتِ محمدی مستقل معجزہ ہے

پھر حیاتِ طیبہ کا ایک خلاصہ پیش کرنے کے بعد جس کو پڑھ کر یہ اذعان پیدا ہو جاتا ہے کہ آپ پیغمبر صادق مؤید من اللہ اور رسول برحق تھے، لکھتے ہیں :۔

"اسلام کی دعوت تمام سرزمین عرب پر چھا گئی وہ اس سے پیشتر بتوں کی پرستش کاہنوں کی اطاعت، خالق کے انکار اور مخلوق کی اطاعت، خونریزی اور قطع رحمی سے معمور تھی، نہ کسی کو آخرت کا علم تھا، نہ زندگی بعد موت کا ہوش، یہ جاہل و کندۂ ناتراش آپ کی تعلیم کے فیض سے روئے زمین کے سب سے بڑے عالم، سب سے بڑے دیندار، سب سے بڑے عابد اور سب سے بڑے فاضل بن گئے، عیسائیوں نے ان صحابۂ کرام کو جب شام میں دیکھا تو انھوں نے کہا کہ سچی بات یہ ہے کہ مسیح کے حواری ان لوگوں سے افضل نہ تھے، یہ ان کے علم اور عمل کی

---

[۱] ملاحظہ ہو حصہ چہارم ص ۸۶ تا ۹۵ و ۷۸ تا ۸۹ [۲] حصہ چہارم ص ۱۷۸

یادگاریں ہیں، جو تمام دنیا میں روشن و درخشاں ہیں، ان کے مقابلہ میں دوسری قوموں کی یادگاریں، اور آثار دیکھو، اہل عقل کو دونوں میں زمین و آسمان کا فرق معلوم ہوتا ہے۔[۱]

"آپ کی امت ہر فضیلت میں تمام امتوں سے زیادہ مکمل ہے، اگر تمام دنیا کی قوموں کے علم کا ان کے علم سے مقابلہ کیا جائے تو ان کے علم کی برتری ثابت ہوگی، اگر ان کے دین و عبادت اور طاعتِ الٰہی کو ان کے دین و عبادت و طاعتِ الٰہی کے مقابلہ میں لایا جائے تو صاف معلوم ہوتا ہے کہ وہ دوسروں سے زیادہ دیندار ہیں، اگر شجاعت و جہاد فی سبیل اللہ، اللہ کے راستہ میں صبر علی المکارہ اور جفاکشی کو دیکھا جائے تو ان کا پلّہ بڑھا ہوا معلوم ہوتا ہے، اگر سخاوت و انفاق اور فراخ دلی اور بلند حوصلگی کو دیکھا جائے تو ان ہی میں زیادہ سخاوت و کرم نظر آتا ہے، یہ تمام فضائل و مکارمِ اخلاق ان مسلمانوں کو آپؐ ہی سے حاصل ہوئے، اور آپ ہی کی ذات سے انھوں نے اخذ کئے، اور آپ ہی نے ان کو ان کا حکم دیا، آپ کی بعثت و نبوت سے پہلے وہ کسی کتاب کے پیرو نہ تھے، جس کی آپؐ نے تکمیل فرمائی ہوتی جیسے کہ حضرت مسیح تورات کی شریعت کی تکمیل کے لئے تشریف لائے تو حضرت مسیح کے پیروؤں کے فضائل و علوم کچھ تورات سے ماخوذ تھے، کچھ زبور سے، کچھ اور تعلیماتِ انبیاء سے، اور کچھ حضرت مسیح سے اور کچھ حصہ حواریوں کے بعد بعض دوسری تعلیموں اور فلاسفہ وغیرہ کے کلام سے ماخوذ ہیں، لیکن امتِ محمدی میں آپؐ سے پہلے نہ کسی کتاب کا وجود تھا، اور نہ کسی نبی کی تعلیم تھی، بلکہ ان میں سے اکثر تو موسیٰؑ، عیسیٰؑ، اور داؤدؑ اور تورات اور زبور پر بھی آپ ہی کے ذریعہ سے ایمان لائے، آپ ہی نے ان کو تمام انبیاء پر ایمان لانے اور تمام کتبِ منزّلہ کے اقرار کا حکم دیا، اور انبیاء علیہم السلام کے درمیان تفریق کرنے کی ممانعت کی۔"[۲]

شریعتِ محمدیؐ کا اعجاز

شریعتِ محمدی کی کاملیت کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:۔

[۱] الجواب الصحیح حصہ چہارم صہ ۱۸۱ [۲] حصہ چہارم صہ ۸۲

"آپ کی شریعت مکمل ترین شریعت ہے، کوئی ایسی معقول اور بھلی بات نہیں جو عقلی طور پر معقول و مستحسن ہو، اور آپ نے حکم نہ دیا ہو، اور کوئی ایسی نامناسب اور قبیح بات نہیں جس کو عقل نامناسب اور قبیح سمجھتی ہو اور آپ نے اس سے نہ روکا ہو، آپ نے کسی ایسی بات کا حکم نہیں دیا، جس کے متعلق آج یہ کہنے کا موقع ہو کہ کاش آپ اس کا حکم نہ دیتے، اور نہ کسی ایسی چیز کی ممانعت کی کہ آج یہ کہا جا سکے کہ کاش آپ اس کی ممانعت نہ کرتے، آپ نے تمام پاکیزہ و صاف ستھری چیزوں کو حلال کیا، اور ان میں سے کسی چیز کو حرام نہیں کیا، جیسا کہ بعض شریعتوں میں حرام کیا گیا تھا، اور تمام ناپاک اور گندی چیزوں کو حرام کیا، ان میں سے کسی چیز کو حلال نہیں کیا جیسے کہ بعض شریعتوں میں حلال ہوئیں۔ دنیا کی تمام قوموں کے پاس جتنی خوبیاں اور محاسن ہیں، اس شریعت میں وہ سب جمع ہیں، تورات و انجیل و زبور میں اور اس کے فرشتوں اور یوم آخرت کے متعلق جو اطلاعات ہیں، وہ مکمل ترین طریقہ پر قرآن میں اور آپ کی شریعت میں آگئی ہیں، اور کچھ ایسی چیزوں کی بھی اطلاع دی گئی ہے، جن کا ان کتابوں میں تذکرہ نہیں، ان کتابوں میں عدل کی ضرورت، صحیح فیصلہ، فضائل کی دعوت اور حسنات کی جو کچھ ترغیب آئی ہے، وہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم لائے اور اس پر اضافہ کیا، اگر کوئی عقلمند ان عبادات کے بارے میں غور کرے گا، جو اسلام میں مشروع ہیں، اور دوسری قوموں کی عبادتوں پر بھی غور کرے گا، تو اسلامی عبادات کی برتری اور فوقیت ظاہر ہوگی، یہی حال تمام حدود و احکام اور شریعت کے مسائل و قوانین کا ہے۔"[1]

اس سلسلہ میں انھوں نے عبادات کا مقصود اور اس کے بارے میں مختلف گروہوں کے مذاہب اور نقطۂ نظر کا ذکر کرنے کے بعد اسلامی عبادات کے مقاصد و اسرار اور فوائد و آثار پر بڑی حکیمانہ بحث کی ہے،[2] پھر ثابت کیا ہے کہ آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم صدق و عدل کا نمونۂ کامل تھے، اور آپ کے خلفائے راشدین

---

[1] الجواب الصحیح حصہ چہارم ص ۸۱-۸۲ [2] ایضاً ص ۱۰۶-۱۱۰

اور صحابۂ کرام نے اپنی زندگی اور حکومت و خلافت اور معاملہ و سیاست میں اس صدق و عدل کا اظہار کیا اور ایسے زہد و ورع کی زندگی گزاری جس کی نظیر دنیا کی تاریخ میں نہیں ملتی۔[1]

نبوتِ محمدیؐ کا اقرار ہر مقرِ نبوت کے لئے ضروری ہے

امام ابن تیمیہ بڑے واضح اور مدلل طریقہ پر ثابت کرتے ہیں کہ اگر کوئی شخص نبوت کے مفہوم سے آشنا نبوت کا قائل اور کسی ایک نبی کا بھی کلمہ گو ہے، اس کے لئے نبوتِ محمدی کا انکار ممکن نہیں، اس لئے کہ دوسرے انبیاء کی نبوت کے جو بھی دلائل اور ثبوت پیش کئے جا سکتے ہیں، انہی سے آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کی نبوت بطریقِ اولیٰ ثابت ہوتی ہے، اگر کوئی کہے کہ ان انبیاء کی نبوت معجزات سے ثابت ہوتی ہے، تو آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کے معجزات کہیں زیادہ عظیم اور ایسے تواتر سے ثابت ہیں، جس تواتر سے کسی نبی کا معجزہ ثابت نہیں، اسی طرح آپ کی لائی ہوئی کتاب دوسرے صحیفوں سے زیادہ مکمل آپ کی امت دوسرے پیغمبروں کی امتوں سے زیادہ بہتر و برتر آپ کے دین کے احکام و قوانین فائق و اعلیٰ ہیں، درحقیقت رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی نبوت کی تکذیب سے تمام نبوتوں کی تکذیب لازم آتی ہے، اور کسی ایک کا ثابت ہونا مشکل ہو جاتا ہے۔[2]

وہ کہتے ہیں کہ دوسرے انبیاء کی نبوت کے ثبوت پر اصرار کرنا اور آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کی نبوت کا انکار کرنا ایسا ہی ہے جیسے کسی فن کے علماء کی عظمت و امامت کا اقرار کیا جائے، اور اس فن کے استاذ الاساتذہ اور امام الائمہ کا انکار کیا جائے، وہ اس کی متعدد دلچسپ مثالیں دیتے ہیں، فرماتے ہیں:۔

"یہ ایسا ہی ہے جیسے کوئی کہے زفر، ابن القاسم، مزنی اور اثرم[3] تو بڑے فقیہ تھے لیکن ابو حنیفہ، شافعی اور مالک فقیہ نہیں تھے، یا کوئی شخص کہے کہ اخفش، ابن الانباری اور مبرّد[4] تو ضرور نحوی تھے لیکن خلیل، سیبویہ اور فرّا[5] نحوی نہیں تھے، یا کہے کہ ملکی اور مسیحی وغیرہ طب کے مصنفین تو بیشک اطباء تھے، لیکن

---

[1] الجواب الصحیح حصہ چہارم ص۱۱۹ [2] ایضاً حصہ اول ص۱۸۱ [3] یہ ائمۂ اربعہ کے تلامذہ اور ان کی فقہ کے مرتبین ہیں [4] مشہور علمائے نحو و لغت [5] مشہور ائمۂ نحو۔

بقراط و جالینوس وغیرہ طبیب نہیں تھے، یا کہے کہ کوشیار اور خلفی تو علم ہئیت سے واقف تھے لیکن بطلیموس وغیرہ کو ہئیت کا کوئی علم نہیں تھا، یا کوئی کہے کہ داؤد و سلیمان و لیخا و عاتوص اور دانیال تو ضرور پیغمبر تھے اور محمد ابن عبداللہ صلے اللہ علیہ وسلم نبی نہیں تھے، اس شخص کا تناقض اور اس کے قول کی نامعقولیت اوپر کے تمام اقوال سے زیادہ روشن ہے، بلکہ جو شخص یہ کہے کہ موسیٰ و عیسیٰ علیہما السلام تو بیشک اللہ کے رسول اور تورات و انجیل تو ضرور آسمانی کتابیں تھیں لیکن محمد صلے اللہ علیہ وسلم اللہ کے رسول نہیں اور قرآن آسمانی کتاب نہیں، جو شخص محمد صلے اللہ علیہ وسلم کے لائے ہوئے دین اور آپ سے پہلے آئے ہوئے ادیان و صحف پر غور کرے گا، اور اس کو نبوتِ محمدی کے دلائل و آیات اور انبیائے سابقین کی نبوت کے دلائل و آیات اور شرع محمدی اور شرائع سابقہ پر غور کرنے کا موقع ملا ہوگا وہ اس قول کو بالکل باطل اور مہمل سمجھے گا۔"[1]

رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی بعثت عامّہ

آخر میں مسیحیوں کے اس دعویٰ کا ذکر کر دینا بھی مناسب معلوم ہوتا ہے جس کو امام ابن تیمیہ نے اپنی کتاب میں سب سے پہلے جگہ دی ہے کہ آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم صرف عرب جاہلیت کی طرف مبعوث ہوئے تھے اور انہی لوگوں سے ایمان کا مطالبہ تھا، اور مسیحی آپ پر ایمان لانے کے لئے مجبور نہیں ہیں، اور اگر وہ ایمان نہ لائیں تو ان سے کسی طرح کا مواخذہ نہیں ہوگا، یہ عقیدہ اس زمانہ کے عرب عیسائیوں اور مسیحی علماء میں بھی پایا جاتا ہے، خود ہمارے ملک ہندوستان میں بھی کچھ دنوں سے بعض حلقوں میں یہ خیال ظاہر کیا جانے لگا ہے کہ ادیانِ سابقہ کی مکمل پیروی نجات کے لئے کافی ہے، نبوتِ محمدی پر ایمان لانا ایک مکمل و صادق مسیحی یا یہودی یا غیر مسلم کے لئے ضروری نہیں، چونکہ یہ عقیدہ اسلام کی دعوتِ عامّہ اور رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی

[1] الجواب الصحیح حصہ اول ص۱۸۱

بعثت عامہ پر ایک بہت بڑی ضرب ہے اور اس سے تبلیغ و دعوتِ اسلام کا دروازہ بند ہوتا ہے اور وہ ساری جد و جہد بے معنی اور عبث ٹھہرتی ہے جو اسلام کی دعوت و اشاعت میں کی گئی، اس لئے امام ابن تیمیہ نے اس عقیدہ کی تردید میں اپنا پورا زورِ قلم صرف کیا، یہ بحث کتاب کے پہلے حصہ کے صفحہ ۲۸ سے صفحہ ۲۳۰ تک پھیلی ہوئی ہے اور اس موضوع پر علمی اور استدلالی حیثیت سے سب سے مکمل اور وسیع بحث ہے جو ایک متکلم اور عالم کے قلم سے نکلی ہے، انھوں نے اس سلسلہ میں وہ تمام آیات و نصوص قرآنی اور احادیث صحیحہ جمع کر دی ہیں جن کو دیکھنے کے بعد ایک لمحہ کے لئے بھی اس شبہہ کی گنجائش باقی نہیں رہتی کہ آپ کی بعثت صرف عرب کی طرف تھی، یا آپ کی نبوت کے اقرار کے بغیر نجات ہو سکتی ہے، وہ ایک جگہ لکھتے ہیں:-

"آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا" کان النبی یبعث الی قومه خاصة وبعثت الی الناس عامة" (پہلے پیغمبر اپنی قوم کی طرف مخصوص بھیجے جاتے تھے، اور میں تمام لوگوں کی طرف مبعوث ہوا ہوں) اور اللہ تعالےٰ کا ارشاد ہے "قُلْ يَا أَيُّهَا النَّاسُ إِنِّي رَسُولُ اللَّهِ إِلَيْكُمْ جَمِيعًا الَّذِي لَهُ مُلْكُ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ" (اے لوگو! میں تم سب کی طرف اس خدا کا پیغمبر ہوں جس کی آسمانوں اور زمین پر سلطنت ہے) نیز ارشاد ہے "وَمَا أَرْسَلْنَاكَ إِلَّا كَافَّةً لِلنَّاسِ بَشِيرًا وَنَذِيرًا" (ہم نے نہیں بھیجا آپ کو مگر تمام ہی انسانوں کے لئے بشیر و نذیر بنا کر) قرآن مجید کی جن آیتوں میں اہلِ کتاب یہود و نصاریٰ مشرکین اور بت پرستوں اور تمام انسانوں اور جنات کو دعوت دی گئی ہے، ان کا بڑی مشکل و تکلف ہی سے شمار ہو سکتا ہے، یہ ایک بدیہی اور یقینی مسئلہ اور اسلامی عقیدہ ہے، یہ کیسے کہا جا سکتا ہے کہ آپ نے خود عربوں کے علاوہ کسی اور کی طرف اپنے مبعوث ہونے کا ذکر نہیں کیا ہے، یہ آپ کی دعوت و تبلیغ کے واقعات، یہ آپ کے سفراء اور داعیانِ اسلام کے حالات ہیں، یہ یہود و نصاریٰ اور مجوسیوں سے (علاوہ مشرکین کے) جہاد کے تذکرے ہیں، اور یہ آپ کی سیرت ہمارے سامنے ہے، پھر وہ کتاب مقدس جو تواتر سے آپ سے ہم تک پہونچی ہے اس میں جا بجا اہلِ کتاب کو آپ پر ایمان لانے کی دعوت دی گئی ہے"[1]

[1] الجواب الصحیح حصہ اول ص ۱۱۵-۱۱۶

دوسری جگہ لکھتے ہیں:۔

"ان دلائل سے کئی گنا دلائل ہیں، جو ثابت کرتے ہیں کہ آپ نے خود اس بات کی اطلاع دی کہ آپ نصاریٰ اور دوسرے اہلِ کتاب کی طرف رسول بنا کر بھیجے گئے، اور یہ کہ آپ نے ان کو دعوت دی، ان سے جہاد کیا، اور ان کو دعوت دینے اور ان سے جہاد کرنے کا حکم دیا، اور یہ کوئی ایسا فعل نہیں جو آپ کی امت نے آپ کے بعد اپنی طرف سے کیا ہو، اور اس کی کوئی سند نہ ہو جیسے کہ عیسائیوں نے حضرت مسیح کے بعد بہت سے نئے کام کئے، اس لئے کہ مسلمان کسی کے لئے بھی اس کو جائز نہیں قرار دیتے کہ وہ آپ کے بعد آپ کی شریعت میں تغیر کرے، اور کسی حرام فعل کو حلال اور کسی حلال کو حرام بنائے، ان کے نزدیک امت میں کسی کو کسی غیر واجب اور کسی واجب کو ساقط کرنے کا اختیار نہیں، ان کے نزدیک حلال وہی ہے جس کو اللہ و رسولؐ نے حلال کیا، اور حرام وہی ہے جس کو اللہ و رسولؐ نے حرام کیا، اور دین وہی ہے جس کو اللہ و رسول نے مشروع کیا۔"[1]

ردِّ شیعیت

یوں تو شیخ الاسلام ابن تیمیہ نے اپنی تصنیفات میں شیعیت کا جا بجا رد کیا ہے، اور سنت و عقائدِ اہلِ سنت، خلفائے راشدین و صحابۂ کرام کی طرف سے پر زور مدافعت کی ہے لیکن ردِ شیعیت میں ان کی ایک ہی مستقل اور منفرد تصنیف "منہاج السنۃ النبویۃ فی نقض کلام الشیعۃ والقدریۃ" ہے، اس تصنیف کی تحریک و تقریب یہ ہوئی کہ ان کے ایک معاصر شیعی عالم ابن المطہّر الحلّی نے اپنے ولی نعمت اور مخدوم تاتاری بادشاہ اولیجا خدا بندہ خاں کے لئے جس نے عالمِ مذکور ہی کی تبلیغ و تحریک سے مذہبِ شیعہ اختیار کیا تھا، ایک ضخیم کتاب اثباتِ شیعیت و امامت و ردِّ شیعیت و خلافت میں "منہاج الکرامۃ فی معرفۃ الامامۃ" کے نام سے لکھی؛

[1] الجواب الصحیح حصہ اول ص ۱۱۷-۱۱۸

یہ کتاب ہاتھوں ہاتھ شام پہنچی، اور شیخ الاسلام کے مطالعہ میں بھی آئی شیعوں کو اس کتاب پر بڑا ناز تھا، وہ اس کو ناقابلِ تردید اور لاجواب تصنیف سمجھتے تھے، اس کتاب کا بڑا حصہ حضرت علی کرم اللہ وجہہ اور اہلِ بیت کی امامت و عصمت کے ثبوت اور خلفائے ثلثہ کی خلافت کی تردید اور ان کے اور صحابۂ کرام کے مطاعن پر مشتمل تھی، سیدنا علیؓ اور ائمۂ اثنا عشر کے فضائل اور ان کی امامت و عصمت کو آیات و نصوص قرآنی اور احادیث و روایات سے ثابت کرنے کی کوشش کی گئی تھی، اسی طرح سے خلفائے ثلثہ و صحابۂ کرام کے مطاعن کو آیات و احادیث اور تاریخ و سیر سے ثابت کیا گیا تھا، اور مصنف نے اپنی ذہانت، قوتِ استدلال اور علمی تبحر کا پورا ثبوت دینے کی کوشش کی تھی، اور اپنے نزدیک اہلِ سنت پر اتمامِ حجت کیا تھا، مصنف چونکہ عام متاخرین شیعہ کی طرح اصول و عقائد میں معتزلی العقیدہ ہے، اس لئے ذات و صفات اور اہلِ سنت کے اصول و عقائد پر بھی متکلمانہ اور فلسفیانہ بحث کی ہے، اہلِ سنت نے امام ابن تیمیہ سے اس کتاب کا جواب لکھنے کے لئے شدید اصرار کیا، چونکہ اس کتاب میں علم کلام، عقائد، فلسفہ، تفسیر، حدیث، تاریخ، اور آثار کے بکثرت مباحث آگئے تھے، اس لئے اس کتاب کا جواب دینے کے لئے وہی شخص موزوں تھا، جو ان تمام علوم و مضامین پر نہایت وسیع اور گہری نظر رکھتا ہو، اور ان علوم کا صاحبِ نظر جوہری و نقاد ہو اور چونکہ بدقسمتی سے شیعہ مصنفین احادیث کے وضع کرنے میں اور ان کا غلط حوالہ دینے میں نہایت مشاق اور جری واقع ہوئے ہیں، فنِ حدیث نے اتنی وسعت اختیار کر لی تھی، اور اس کے اتنے مجموعے اور دفاتر تیار ہو گئے تھے، کہ ان سب میں ان احادیث و روایات کی چھان بین کرنا اور جرح و تعدیل اور اسماء الرجال کے اصول پر ان کو جانچنا نہایت دشوار کام تھا، اس لئے یہ خدمت وہی شخص انجام دے سکتا تھا جس کو حدیث و رجال کے ذخیرہ پر پورا عبور ہو اور حدیث کے کتب خانہ کا ایک ایک ورق اس کے سامنے ہو اور کسی روایت کسی راوی اور کسی حوالہ کے بارے میں اس کو دھوکا نہ دیا جا سکے، اسی کے ساتھ تاریخ اسلام پر بھی اس کی ایسی نظر ہو کہ وہ ایک نظر میں مصنف کی تاریخی غلطی پکڑ لے، اور کوئی غلط بیانی یا فرضی روایت اس کے سامنے چل نہ سکے

یہ بات مسلم ہے کہ کسی تاریخی شخصیت پر اعتراض کرنا، اور اس میں عیب نکالنا، تاریخ کے وسیع ذخیرہ میں سے آسان ہے، لیکن صفائی پیش کرنا، اور مدافعت کرنا مشکل ہے، اور مطاعن صحابہ اہلِ تشیّع کا پسندیدہ موضوع اور ان کی جولانی طبع کا خاص میدان ہے، علم دین کی یہ بڑی خوش قسمتی تھی کہ اس کتاب کے زمانۂ تصنیف ہی میں ایک ایسے عالم اہلِ سنت نے اس کے جواب کی طرف توجہ کی جو اپنے زمانہ کا امیر المومنین فی الحدیث تھا، جس کی آنکھوں کے سامنے حدیث و رجال کا پورا کتب خانہ کھلا ہوا تھا، اور اس کے متعلق اہلِ نظر کا مقولہ ہے کہ جس حدیث کو امام ابن تیمیہ کہہ دیں کہ میں نہیں جانتا وہ حدیث ہی نہیں، انھوں نے مطاعن صحابہ کے باب میں امت کی طرف سے فرض کفایہ ادا کر دیا اور وہ کام کر دیا جو ان کے زمانہ کے بعد کسی دوسرے عالم کے لئے بہت مشکل تھا، اس باب میں ان کے بعد کے تمام علماء ان ہی کے خوشہ چیں رہیں گے۔

ابن المطہر الحلّی کی کتاب "منہاج الکرامۃ" کے جواب میں انھوں نے "منہاج السنۃ" کے نام سے جو کتاب لکھی[1] وہ ان کی تمام تصانیف میں ایک امتیازی شان رکھتی ہے، ابن تیمیہ کے علمی تبحر، وسعتِ نظر، حاضر دماغی، حفظ و استحضار، پختگی، اور اتقان اور ذہانت و طباعی کا اگر صحیح نمونہ دیکھنا ہو تو اس کتاب کو دیکھنا چاہئے، مصنف "منہاج الکرامۃ" کی عبارت نقل کرنے کے بعد جب ان کے علم و حمیّت دینی کو جوش آتا ہے، اور ان کے علم کے سمندر میں طوفان اٹھتا ہے، اور تفسیر و حدیث، تاریخ و سیر کے معلومات کا لشکر امنڈ آتا ہے تو بے اختیار ان کے فریق مقابل سے کہنے کو جی چاہتا ہے کہ "يَا أَيُّهَا النَّمْلُ ادْخُلُوا مَسَاكِنَكُمْ لَا يَحْطِمَنَّكُمْ سُلَيْمَانُ وَجُنُودُهُ وَهُمْ لَا يَشْعُرُونَ"[2]

کتاب کا محرک اور اندرونی باعث

امام ابن تیمیہ کے لئے اس کتاب (منہاج السنۃ) کی تصنیف کا اصل محرک اور اندرونی باعث

---

[1] یہ کتاب بڑے سائز کی چار جلدوں میں ہے، کتاب کے مجموعی صفحات ۱۲۱۴ ہیں، ۱۳۲۲ھ میں شیخ مصطفےٰ البابی الحلبی کے اہتمام میں مطبعۂ امیریہ مصر میں شائع ہوئی، علامہ ذہبی نے اس کا خلاصہ "المنتقیٰ" کے نام سے کیا تھا، حال میں وہ شیخ محمد نصیف کی توجہ اور عالی ہمتی سے اور استاد محب الدین الخطیب کے اہتمام سے مصر میں شائع ہوا ہے۔ [2] النمل - ۱۸

یہ ہے کہ مصنف "منہاج الکرامۃ" نے خلفائے راشدین اور سابقین اولین پر جو امام ابن تیمیہ اور اہل سنت کے عقیدہ میں انبیائے کرام کے بعد افضل خلائق اور صالح ترین افراد انسانی ہیں، عامیانہ اور سوقیانہ طریقہ پر زبان طعن دراز کی اور ان کو شرار خلق اور ارذل مخلوقات ثابت کیا، اور یہ بات ان کے نزدیک اسلام کی بنیادوں پر تیشہ چلانے اور نبوت محمدی پر اعتراض و طعن اور الحاد و زندقہ کا دروازہ کھولنے کے مرادف ہے، وہ ایک جگہ لکھتے ہیں:۔

"اگر اس متکبر حد سے بڑھنے والے شخص نے ان لوگوں پر دست درازی نہ کی ہوتی جو سرخیل اولیاء اللہ اہل زمین کے سردار و پیشوا، اور انبیائے کرام کے بعد اللہ کی مخلوق میں سب سے بہتر ہیں، اور دست درازی بھی ایسی جو دین میں رخنہ ڈالتی ہے، اور کفار و منافقین کو دلیل اور حجت فراہم کرتی ہے، اور بہت سے اہل ایمان کے دلوں میں ضعف و شبہہ پیدا کرتی ہے تو ہمیں اس شخص کی تنقید و تردید کی اور اس کی قلعی کھولنے کی ضرورت پیش نہ آتی، اللہ تعالیٰ اس شخص سے اور اس کے ہم عقیدہ لوگوں سے انصاف کرے[1]۔"

شیعوں کے نزدیک خیر الامم سے یہود و نصاریٰ بہتر ہیں

ایک دوسری جگہ شیعوں کے مطاعن اور صحابہ کرام کی تنقیص کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:۔

"امت محمدی خیر الامم ہے، اور اس امت محمدی میں سب سے بہتر قرن اول کے لوگ تھے، قرن اول کے لوگ علم نافع اور عمل صالح میں سب سے اکمل و اعلیٰ تھے، لیکن ان افترا پردازوں نے اس کے خلاف نقشہ کھینچا ہے، ان کے بیانات سے معلوم ہوتا ہے کہ نہ ان کو حق کا علم تھا، اور نہ وہ حق کی پیروی کرتے تھے، بلکہ ان میں سے اکثر حق کی جان بوجھ کر مخالفت کرتے تھے، جیسے کہ ان کا خلفاء ثلثہ اور جمہور صحابہ امت کے متعلق بیان ہے، اور ان کے نزدیک ان میں سے بہت سے حق سے آشنا نہیں تھے، بلکہ انھوں نے ظالموں کی تقلید کی، اس لئے کہ ان کو غور و فکر حاصل نہیں تھا، جو علم تک پہنچا سکے اور جس نے غور و فکر سے کام

---

[1] حصہ چہارم ص۱۳۷

نہیں لیا، اس نے خواہش نفسانی یا دنیا طلبی میں کیا ہوگا، یا اپنے قصور اور ادراک میں کمی کی وجہ سے ان کا دعویٰ ہے کہ صحابۂ کرام میں سے بعض استحقاقاً اپنے لئے خلافت کے طالب تھے اس سب سے یہ لازم آتا ہے کہ امت اپنے نبیؐ کے بعد ساری کی ساری گمراہ تھی اس میں سے کوئی ہدایت کے راستہ پر نہیں تھا، اسی طرح یہود و نصاریٰ (یہودیت و مسیحیت کے نسخ و تبدیل کے بعد) ان مسلمانوں سے بہتر ثابت ہوتے ہیں، اس لئے کہ قرآن شریف میں آتا ہے "وَمِنْ قَوْمِ مُوْسٰی اُمَّةٌ یَّهْدُوْنَ بِالْحَقِّ وَبِهٖ یَعْدِلُوْنَ[1]" (اور موسیٰؑ کی قوم میں سے ایک جماعت ہے، جو حق کی راہ بتاتے ہیں اور اسی کے موافق انصاف کرتے ہیں) آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم نے اطلاع دی ہے کہ یہود و نصاریٰ میں ستّر سے زائد فرقے ہو جائیں گے ان میں سے ایک نجات پانے والا ہوگا، لیکن اگر ان شیعوں کی بات مان لی جائے تو ان مسلمانوں میں آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد ایک گروہ بھی ایسا ثابت نہیں ہوتا، جو حق پر قائم ہو، اور انصاف کا علمبردار ہو، اور جب ان کے بہترین دور میں بھی ایسا نہیں تھا تو اس کے بعد تو اور بھی میدان صاف ہوگا، اس سے یہ لازم آتا ہے کہ یہود و نصاریٰ نسخ و تبدیل کے بعد بھی اس امت سے بہتر ہیں، جن کی تعریف اللہ تعالیٰ فرماتا ہے "کُنْتُمْ خَیْرَ اُمَّةٍ اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ[2]"۔

شیعوں نے خیارِ امت کو شرار امت بنا دیا

ایک دوسری جگہ لکھتے ہیں:۔

"ان شیعوں نے ان اخیار امت کو جو انبیاء و مرسلین کے بعد اولین و آخرین میں سب سے اعلیٰ و افضل تھے، اور جن کی شان میں "کُنْتُمْ خَیْرَ اُمَّةٍ اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ" آیا ہے شرار الناس ثابت کیا، اور ان پر بڑے بڑے قبائح کا الزام لگایا، اور ان کے حسنات کو بھی سیئات بنا دیا، اور اس کے بالمقابل اسلام

---

[1] الاعراف - ۱۵۹۔ [2] حصہ اول صـ۱۵۲

کی طرف اپنی نسبت کرنے والوں میں جو اہلِ اہواء تھے، اور جن سے بڑھ کر جاہل، کاذب، ظالم، کفر و فسق و معاصی سے قریب اور حقائق ایمانی سے دور کوئی نہیں، ان کو انھوں نے برگزیدہ ترین خلائق ثابت کیا، اور اس طرح ساری امت کی تکفیر کی، یا اس کو گمراہ ثابت کیا، سوائے اپنی چھوٹی سی ٹولی کے جس کے متعلق ان کا اعتقاد یہ ہے کہ وہی برسرِ حق ہے۔

ایک مثال

ان کی مثال ایسی ہے جیسے کوئی شخص بھیڑ بکریوں کے ایک بڑے ریوڑ میں جائے، اس سے کہا جائے کہ اس ریوڑ میں سب سے اچھی بھیڑ بکری چھانٹ دو، تاکہ ہم اس کی قربانی کریں، وہ ان میں سے ایک کانی لنگڑی لاغر، مریل، بکری چھانٹ دے جس میں نہ گوشت نہ گودا، اور کہے یہ اس ریوڑ کی سب سے اچھی بکری ہے، اور قربانی اسی کی جائز ہے، باقی جتنی بھیڑ بکریاں ہیں، یہ سب بھیڑ بکریاں نہیں ہیں، بلکہ سور ہیں، ان کا قتل واجب اور قربانی ناجائز ہے۔[1]

امام شعبی کا قول

وہ امام شعبی کا ایک قول نقل کرتے ہیں کہ یہود و نصاریٰ روافض کے مقابلہ میں اپنے پیغمبر کے زیادہ مرتبہ شناس اور قدرداں ہیں، یہودیوں سے پوچھا گیا کہ تمہاری ملت میں سب سے بہتر کون لوگ ہیں، انھوں نے کہا حضرت موسیٰؑ کے ساتھی اور ان کے اصحاب، عیسائیوں سے پوچھا گیا کہ تمہاری ملت میں سب سے بہتر کون ہے، انھوں نے کہا حضرت عیسیٰؑ کے حواری، اور روافض سے پوچھا گیا کہ تمہاری ملت میں سب سے بدتر کون ہے، انھوں نے کہا اصحاب محمد صلے اللہ علیہ وسلم ان نیک بختوں کو حکم دیا گیا تھا صحابہ کے لئے مغفرت کی دعا کرنے کا انھوں نے ان کو سب و شتم کیا۔[2]

---

[1] حصہ سوم صـ۲۰ [2] حصہ اول صـ۶

سابقین اولین سے عداوت کفار سے محبت

"روافض کی ہمیشہ سے عادت ہے کہ جماعت مسلمین کو چھوڑ کر ہمیشہ یہود و نصاریٰ اور مشرکین کا ساتھ دیتے ہیں اور انہی کی دوستی کا دم بھرتے ہیں ان لوگوں سے بڑھ کر کون گمراہ ہوگا جو مہاجرین و انصار میں سے سابقین اولین سے عداوت رکھیں اور منافقین و کفار سے دوستی کریں۔" [1]

پھر وہ شیعوں کے کفار کا ساتھ دینے اور ان کی مدد کرنے کے واقعات لکھتے ہوئے فرماتے ہیں:-

"ان میں سے اکثر تہ دل سے کفار سے دوستی رکھتے ہیں مسلمانوں کے مقابلہ میں کہیں زیادہ، چنانچہ جب تاتاری مشرق کی طرف سے آئے اور انھوں نے مسلمانوں کا قتل عام کیا، اور خراسان، عراق و شام اور جزیرہ میں ان کے خون کے دریا بہائے تو یہ روافض مسلمانوں کے مقابلہ میں ان کے حامی و مددگار تھے اسی طرح جو شیعہ شام و حلب وغیرہ میں تھے، وہ مسلمانوں کے مقابلہ میں دشمنان اسلام کے بہت زیادہ مدد کرنے والے تھے اسی طرح سے جب عیسائیوں نے شام میں مسلمانوں سے جنگ کی تو روافض ان کی کمک پر تھے اسی طرح اگر یہودیوں کی عراق میں یا کہیں اور حکومت قائم ہو جائے تو یہ روافض ان کے سب سے بڑے مددگار ثابت ہوں گے تو وہ ہمیشہ کفار، مشرکین یہود و نصاریٰ کی مدد کے لئے اور مسلمانوں کے مقابلہ میں ان کا ساتھ دینے کے لئے تیار رہتے ہیں۔" [2]

تعصب و بے انصافی

ایک جگہ ابن المطہر الحلی نے خواجہ نصیر الدین طوسی کا ذکر کرتے ہوئے بڑی تعظیم و تقدیس سے ان کا نام لیا ہے اور "شیخنا الامام الاعظم خواجہ نصیر الملۃ والحق والدین محمد بن الحسن الطوسی قدس اللہ روحہ" [3] کے الفاظ

---

[1] حصہ دوم ص ۸۳ [2] حصہ دوم ص ۸۴ [3] منہاج السنۃ ج ۲ ص ۹۹

لکھے ہیں' اس پر ابن تیمیہ کی حمیت ایمانی کو جوش آ گیا ہے' وہ خواجہ نصیر الدین طوسی کے فضائح اور خلیفہ عباسی اور بغداد کے قتل عام کے کارنامہ' اور ان کے ملحدانہ عقائد و خیالات کا ذکر کرتے ہوئے بڑے تعجب سے لکھتے ہیں:۔

"حیرت کی بات یہ ہے کہ یہ مصنف ابوبکرؓ و عمرؓ و عثمانؓ اور سابقین اولیں اور ان کے بعد کے ائمہ مسلمین اور اہل علم و دین کی شان میں گستاخی کرتا ہے' اور ان کی طرف بڑے بڑے قبائح کا انتساب کرتا ہے' اور ان کا سیدھے منہ نام نہیں لیتا، اور جس شخص کی اسلام دشمنی عالم آشکارا ہے' اس کو شیخنا الاعظم اور قدس اللہ روحہ' لکھتا ہے' حالانکہ خود یہ ان عقائد پر تکفیر کا فتویٰ دے چکا ہے جن کا یہ شخص (نصیر الدین طوسی) اور اس کے پیرو قائل ہیں' حقیقت میں یہ بے انصاف اس آیت قرآنی کا مصداق ہے۔

اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ اُوْتُوْا نَصِيْبًا مِّنَ الْكِتٰبِ	کیا تم نے ان لوگوں کو نہیں دیکھا جنھیں کتاب کا کچھ
يُؤْمِنُوْنَ بِالْجِبْتِ وَالطَّاغُوْتِ وَيَقُوْلُوْنَ	حصہ دیا گیا، وہ بتوں اور شیطان کو مانتے ہیں' اور
لِلَّذِيْنَ كَفَرُوْا هٰٓؤُلَآءِ اَهْدٰى مِنَ الَّذِيْنَ	کافروں کے لئے یہ کہتے ہیں کہ یہ لوگ مسلمانوں سے
اٰمَنُوْا سَبِيْلًا ۝ اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ لَعَنَهُمُ	زیادہ راہِ راست پر ہیں' یہی وہ لوگ ہیں جن پر
اللّٰهُ ۚ وَمَنْ يَّلْعَنِ اللّٰهُ فَلَنْ تَجِدَ لَهٗ	اللہ تعالیٰ کی لعنت ہے' اور جس پر اللہ لعنت
نَصِيْرًا ۝[1] (النساء۔ ۵۱۔ ۵۲)	کرے تو اس کا کوئی مددگار نہیں۔

شیعوں کی بوالعجبیاں

امام ابن تیمیہ لکھتے ہیں کہ شیعوں کی ہمیشہ سے عادت ہے کہ وہ انبیاء سے نسبی تعلق رکھنے والے (اصول و فروع) یعنی ان کے والدین اور ان کی اولاد کی تو بڑی تعظیم کرتے ہیں' لیکن ان کی شریک زندگی اور رفیقۂ حیات بیویوں کی شان میں گستاخی اور طعن و تشنیع کرتے ہیں' یہ سب تعصب و خواہش نفسانی کا کرشمہ ہے' چنانچہ حضرت فاطمہؓ

---

[1] منہاج السنۃ ج ۲ ص ۹۹-۱۰۰

اور حضرت حسنؓ و حسینؓ کی تو تعظیم کرتے ہیں، اور حضرت عائشہ ام المومنینؓ کی توہین اور ان پر اعتراض کرتے ہیں لے
ایک دوسری بوالعجبی یہ ہے کہ محمد بن ابی بکر کی تعظیم میں تو بڑا غلو اور مبالغہ کرتے ہیں، اور ان کے والد حضرت
ابو بکر صدیقؓ کی شان میں بے ادبی، امام ابن تیمیہ لکھتے ہیں:۔

"روافض محمد بن ابی بکر کی تعظیم میں بڑے غلو سے کام لیتے ہیں، اور یہ ان کی قدیم عادت ہے کہ جن لوگوں نے حضرت عثمانؓ کے خلاف شورش میں حصہ لیا تھا، ان کی مدح کرتے ہیں، اسی طرح سے جنھوں نے حضرت علیؓ کی معیت میں جنگ کی تھی، ان کی بڑی تعریف کرتے ہیں، یہاں تک کہ محمد بن ابی بکرؓ کو ان کے والد حضرت ابو بکرؓ پر فضیلت دیتے ہیں، طرفہ تماشا یہ ہے کہ جو شخص پوری امت میں نبیؐ کے بعد افضل ہے، اس پر تو لعنت کرتے ہیں، اور جس کو نہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی صحبت حاصل ہے، نہ سبقت نہ فضیلت، اس کی مدح کرتے ہیں، اور انساب کی تنظیم میں ان سے عجیب قسم کا تضاد و تناقض ظاہر ہوتا ہے۔" ۲ے

صحابۂ کرام سے دل میں کھوٹ دل کی ناپاکی ہے

وہ لکھتے ہیں:۔

"دلوں کی سب سے بڑی ناپاکی اور مرض یہ ہے کہ انسان کے دل میں ان لوگوں کی طرف سے کھوٹ ہو جو اخیار مومنین اور انبیائے کرام کے بعد اولیاء اللہ کے سرگروہ اور سرتاج تھے اسی لئے مال غنیمت (فئی) میں ان ہی لوگوں کا حصہ رکھا گیا ہے، جو مہاجرین و انصار اور سابقین اولین کی طرف سے دل میں کھوٹ نہ رکھتے ہوں، اور ان کے لئے دعا و استغفار کرتے ہوں۔"

وَالَّذِيْنَ جَآءُوْا مِنْۢ بَعْدِهِمْ يَقُوْلُوْنَ رَبَّنَا	اور ان کے لئے بھی جو مہاجرین کے بعد آئے دعا مانگا
اغْفِرْ لَنَا وَلِاِخْوَانِنَا الَّذِيْنَ سَبَقُوْنَا بِالْاِيْمَانِ	کرتے ہیں کہ اے ہمارے رب! ہمیں اور ہمارے ان بھائیوں کو

لے منہاج السنۃ حصہ دوم ص۱۹۳ ۲ے ایضاً ص۲۰۰ ـ ۲۰۱

وَلَا تَجْعَلْ فِيْ قُلُوْبِنَا غِلًّا لِّلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا	بخش دے جو ہم سے پہلے ایمان لائے ہیں اور ہمارے دلوں
رَبَّنَآ اِنَّكَ رَءُوْفٌ رَّحِيْمٌ۠	میں ایمان داروں کی طرف سے کینہ قائم نہ ہونے پائے
(الحشر۔ ۱۰)	اے رب ہمارے! بیشک تو بڑا مہربان نہایت رحم والا ہے۔

شیخین پر طعن کرنے والا دو حال سے خالی نہیں

ابوبکر وعمر رضی اللہ عنہا پر دو ہی طرح کے آدمی طعن کر سکتے ہیں ایک منافق زندیق، اسلام کا دشمن جس کو ان دونوں پر طعن واعتراض کے ذریعہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی ذات اور دین اسلام پر اعتراض وطعن مقصود ہو اور روافض کے معلم اول کا یہی حال تھا، اور ائمہ باطنیہ کا بھی یہی معاملہ ہے، دوسرے وہ جاہل شخص جو جہالت اور خواہش کی پیروی میں بہت بڑھا ہوا ہو اور شیعوں میں سے عوام کا حال یہی ہے، اگر وہ اندر سے مسلمان ہیں۔

رسالت پر الزام

"یہ بات تواتر سے عوام وخواص کے نزدیک ثابت ہے کہ حضرت ابوبکر وعمر وعثمان رضی اللہ عنہم کو رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم سے خصوصی تعلق تھا، اور ان تینوں حضرات کو آپ کا قرب واختصاص حاصل تھا، اور ان تینوں کے آپ کے ساتھ رشتے ہیں، دو کی صاحبزادیاں آپ کے نکاح میں تھیں اور ایک کے نکاح میں آپ کی دو صاحبزادیاں تھیں، اور کہیں اس کا ذکر نہیں آتا کہ آپ ان کی مذمت کرتے تھے، یا ان پر لعنت کرتے تھے، بلکہ معروف یہی ہے کہ آپ ان سے محبت کرتے تھے، اور ان کی تعریف فرماتے تھے، اب دو حال سے خالی نہیں، یا تو یہ ماننا پڑے گا کہ یہ تینوں حضرات آپ کی زندگی میں اور آپ کی وفات

لہ منہاج السنۃ

کے بعد ظاہراً و باطناً صالح، وفادار، سلیم العقیدہ اور صحیح العمل تھے یا یہ کہ وہ تینوں آپ کی زندگی میں اور آپ کی وفات کے بعد استقامت پر نہیں تھے اور (معاذ اللہ) دین سے منحرف تھے، دوسری صورت میں اگر اس حالت اور انحراف کے باوجود ان کو آپ کا یہ تقرب حاصل تھا تو دو میں سے ایک بات ماننی پڑے گی، یا تو آپ کو ان کے حالات کا علم نہیں تھا، یا علم تھا، لیکن آپ معاذ اللہ مداہنت کرتے تھے، ان دونوں صورتوں میں سے ہر صورت رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی شان پر بڑا دھبہ اور بہت بڑا اعتراض ہے، یہ تو وہی بات ہوگی جو شاعر نے کہی ہے ؎

فان کنت لا تدری فتلک مصیبۃ

وان کنت تدری فالمصیبۃ اعظم

اور اگر یہ کہا جائے کہ آپ کی زندگی تک تو وہ راہِ راست پر تھے، تو یہ اس بات کی دلیل ہے کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کو اپنی امت کے خواص اور اکابر اصحاب کے بارے میں بڑا دھوکا اور ناکامی ہوئی، جس شخص کو اپنے بعد کی اطلاعیں دی گئی تھیں اور جس نے اپنے بعد ہونے والے واقعات کی خبر دی اس کو اتنی بات نہیں معلوم تھی کہ اس کے اخص خواص اس طرح منحرف ہو جائیں گے، اور احتیاط کا تو یہی تقاضا تھا کہ امت کو آپ اس کی خبر دے جاتے، تاکہ وہ غلطی سے کہیں ان کو خلیفہ نہ بنالیں اور جس شخص سے یہ وعدہ کیا گیا کہ اس کا دین تمام ادیان پر غالب ہوگا، اس کے اکابر و خواص کیسے مرتد ہو سکتے ہیں، حقیقت یہ ہے کہ ایسی باتوں سے روافض رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ گرامی پر بہت بڑا اعتراض کرتے ہیں، حضرت امام مالک نے صحیح فرمایا کہ دراصل روافض نے رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ گرامی کو مطعون کرنا چاہا، تاکہ لوگ کہیں کہ برے آدمی تھے اس لئے ان کے برے ساتھی تھے، اگر اچھے آدمی ہوتے تو ان کے ساتھی بھی اچھے ہوتے، اسی لئے اہلِ علم کا قول ہے کہ رفض زندقہ کی ایک سازش ہے[1]۔

---

[1] منہاج السنۃ حصہ چہارم ص ۱۲۳

فضائلِ صحابہ قطعی و متواتر ہیں

امام ابن تیمیہ صحابۂ کرام کی عدالت کو اسلام کی ایک اہم بنیاد مانتے ہیں، اور ان کو ان کی صداقت، ثقاہت پر بڑا یقین ہے، وہ ان کو اسلام کی تعلیم کا سچا نمونہ اور رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی تربیت اور فیض صحبت کا بہترین نتیجہ تسلیم کرتے ہیں، ان کے نزدیک صحابۂ کرام کے فضائل ایسے قطعی اور متواتر ہیں اور قرآن مجید کی ایسی صریح نصوص و آیات سے اور ایسی صحیح احادیث و روایات سے ثابت ہیں کہ وہ کسی تاریخی روایت یا کسی غریب و شاذ حدیث سے مشکوک نہیں ہوسکتے، وہ لکھتے ہیں:-

"جب کتاب و سنت اور نقل متواتر سے صحابۂ کرام کے محاسن و فضائل ثابت ہوچکے ہیں تو یہ درست نہیں کہ وہ ایسی منقولات سے رد ہوجائیں، جن میں سے بعض منقطع، بعض محرّف ہیں، اور بعض ایسی روایات ہیں جن سے ان ثابت شدہ حقائق پر کوئی اثر نہیں پڑتا، اس لئے کہ یقین، شک سے زائل نہیں ہوا کرتا ہم کو کتاب و سنت، اور اپنے پیشرؤں کے اجماع اور ان کی مؤید اور متواتر روایات اور عقلی دلائل سے اس بات کا یقین ہوچکا ہے کہ صحابۂ کرام انبیاء علیہم السلام کے بعد افضل الخلق تھے، اس یقینی و متواتر چیز پر ان امور کا اثر نہیں پڑ سکتا جو مشکوک و مشتبہ ہیں، چہ جائیکہ جن کا باطل ہونا ظاہر ہوچکا ہے[1]"

صحابۂ کرام معصوم نہیں تھے

امام ابن تیمیہ اس کے قائل نہیں ہیں کہ صحابۂ کرام انبیاء علیہم السلام اور حضور صلے اللہ علیہ وسلم کی طرح معصوم تھے، ان سے گناہ کا صدور ہو ہی نہیں سکتا تھا، لیکن وہ اس کے ضرور قائل ہیں کہ امت کے تمام لوگوں میں وہ سب سے زیادہ عادل، خدا ترس، صادق القول، امین، اور راست باز تھے، اگر ان سے غلطیاں یا گناہ ہوئے تو

---

[1] منہاج السنۃ حصہ سوم ص۳۰۹

اس کے مقابلہ میں ان سے ایسے اعمال حسنہ اور خدا اور رسولؐ کو راضی کرنے والے کام ہوئے جو ان سیئات کا کفارہ بن گئے اور بہر حال ان کے حسنات اور اعمال کا پلہ ان کی تقصیرات پر بھاری ہے، وہ لکھتے ہیں:۔

"ہم پہلے لکھ چکے ہیں کہ ہم رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے بعد کسی کے بھی گناہوں سے معصوم ہونے کے قائل نہیں، چہ جائیکہ خطاء فی الاجتہاد کے بھی قائل نہ ہوں اللہ تعالےٰ فرماتا ہے:۔

وَالَّذِیْ جَآءَ بِالصِّدْقِ وَصَدَّقَ بِهٖٓ اُولٰٓئِكَ	اور جو سچی بات لایا اور جس نے اس کی تصدیق کی وہی پرہیزگار
هُمُ الْمُتَّقُوْنَ ۝ لَهُمْ مَّا يَشَآءُوْنَ عِنْدَ رَبِّهِمْ ۚ	ہیں ان کے لئے جو کچھ وہ چاہیں گے ان کے رب کے پاس
ذٰلِكَ جَزٰٓؤُا الْمُحْسِنِيْنَ ۝ لِيُكَفِّرَ اللّٰهُ عَنْهُمْ	موجود ہوگا نیکو کاروں کا یہی بدلہ ہے تاکہ اللہ ان سے وہ
اَسْوَاَ الَّذِيْ عَمِلُوْا وَيَجْزِيَهُمْ اَجْرَهُمْ	برائیاں دور کر دے جو انھوں نے کی تھیں اور اللہ ان کو ان کا
بِاَحْسَنِ الَّذِيْ كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ۝ (الزمر ۳۳،۳۵)	اجر دے ان نیک کاموں کے بدلہ میں جو وہ کیا کرتے تھے۔

دوسری جگہ لکھتے ہیں:۔

اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ نَتَقَبَّلُ عَنْهُمْ اَحْسَنَ مَا عَمِلُوْا	یہی وہ لوگ ہیں جن سے ہم وہ نیک عمل قبول کرتے ہیں،
وَنَتَجَاوَزُ عَنْ سَيِّاٰتِهِمْ فِيْٓ اَصْحٰبِ الْجَنَّةِ ۭ	جو انھوں نے کئے اور بہشتیوں میں شامل کر کے ان کے
وَعْدَ الصِّدْقِ الَّذِيْ كَانُوْا يُوْعَدُوْنَ ۝	گناہوں سے درگزر کرتے ہیں، یہ اس سچے وعدہ کے
(الاحقاف۔۱۶)	مطابق ہے جو ان سے کیا گیا تھا۔

صحابۂ کرام کی نظیر تاریخ میں نہیں ملتی

وہ کہتے ہیں کہ ان بشری لغزشوں اور کوتاہیوں کے باوجود جو انسانیت کا لازمہ ہیں، مجموعی حیثیت سے انبیاء علیہم السلام کے علاوہ افراد انسانی کا کوئی مجموعہ اور انسانوں کی کوئی نسل صحابۂ کرام سے بہتر سیرت و کردار

ؔ منہاج السنۃ حصہ سوم ص۲۳۸

کی نظر نہیں آتی، اگر ان کی زندگی میں کہیں کہیں کچھ ہلکے سے دھبے اور داغ نظر آتے ہیں تو اس کی مثال ایسی ہے، جیسے سفید کپڑے میں کہیں کچھ تھوڑی سی سیاہی نظر آجائے، یہ عیب چینوں کا قصور ہے کہ ان کو اس کپڑے میں سیاہی کا نقطہ تو نظر آیا، اور اس کپڑے کی سفیدی نظر نہ آئی، دوسری جماعتوں کا تو حال یہ ہے کہ ان کا سارا نامۂ اعمال سیاہ نظر آتا ہے کہیں کہیں سفیدی نظر آتی ہے، وہ لکھتے ہیں :۔

"صحابۂ کرام اخیار امت ہیں، امتِ محمدی میں کوئی ایسا گروہ نہیں ہے، جو ان سے زیادہ ہدایت اور دین حق پر مجتمع اور تفرق و اختلاف سے دور ہو، ان کی زندگی میں کوئی نقص کی بات بھی نظر آتی ہے تو اگر اس کا کسی دوسری امت کے حالات و زندگی سے مقابلہ کیا جائے تو اس کے مقابلہ میں اس کی کوئی حقیقت نہیں معلوم ہوتی، غلطی اس شخص کی ہے جس کو سفید کپڑے کی تھوڑی سی سیاہی تو نظر آتی ہے اور سیاہ کپڑے کی تھوڑی سی سفیدی نظر نہیں آتی، یہ بڑی نادانی اور بڑا ظلم ہے، اگر ان اکابر کا اپنے ہم مرتبہ لوگوں سے مقابلہ کیا جائے تو پھر ان کی فوقیت اور ان کی ترجیح ظاہر ہو جائیگی، یہ کہ کوئی شخص اپنے دل میں کوئی خیالی تصویر بنالے یا کوئی معیار تجویز کرلے جس کو اللہ تعالیٰ نے پیدا ہی نہ کیا ہو تو اس کا کوئی اعتبار نہیں، ایک شخص اپنے دل میں ایک امام معصوم کا تصور قائم کر لیتا ہے، ایک شخص ایک اور ایسے امام کا تصور قائم کرتا ہے جس میں اور معصوم میں کوئی فرق نہیں اگرچہ اس کو صاف صاف معصوم نہیں کہتا، اور وہ تجویز کرتا ہے کہ عالم کو یا شیخ کو یا امیر کو یا بادشاہ کو ایسا ہی ہونا چاہئے اور خواہ وہ کیسا ہی کثیر العلم، کیسا ہی دیندار صاحبِ محاسن ہو اور اس کے ہاتھ سے اللہ تعالیٰ نے کیسے ہی خیر کے کام کرائے ہوں، لیکن یہ تجویز کرتا ہے کہ اس کو ایسا کامل العلم ہونا چاہئے کہ اس پر کوئی چیز پوشیدہ نہ ہو، اور وہ کسی بھی مسئلہ میں غلطی نہ کرے، وہ بشریت کے لوازم و خصائص سے پاک ہو، کبھی اس کو غصہ نہ آتا ہو، تو اس کا کوئی علاج نہیں، بلکہ بہت سے لوگ تو ان ائمہ کے متعلق وہ تجویز کرتے ہیں، جو انبیاء تک کے لئے تجویز نہیں کرتے ہیں۔"[1]

---

[1] منہاج السنۃ: حصہ سوم صفحہ ۲۴۳

امام ابن تیمیہ اس پر بڑا زور دیتے ہیں کہ جس شخص کی ساری تاریخ پر نظر ہوگی اور اس نے مختلف امتوں، قوموں اور ملتوں کے حالات پڑھے ہوں گے اور مختلف انسانی جماعتوں کا تجربہ کیا ہوگا اس کو اس بات کا یقین ہو جائے گا کہ صحابۂ کرام سے زیادہ متبع حق کا پیرو، فتنہ اور افتراق سے نفور، اور نفسانیت و دنیا داری سے دور کوئی جماعت نہیں گزری، وہ لکھتے ہیں :-

فمن استقرأ اخبار العالم فی جمیع الفرق	جس شخص نے دنیا کے تمام فرقوں کے حالات و واقعات کا
تبیّن لہ انّہ لم یکن قط طائفۃ اعظم اتفاقاً	اہتمام سے مطالعہ کیا ہے اور ان کے حالات کا تتبع کیا ہے وہ
علی الہدی والرشد وابعد عن الفتنۃ	جانتا ہے کہ کوئی گروہ ایسا نہیں گذرا جو ہدایت و رشد پر
والتفرق والاختلاف من اصحاب	صحابہ کرامؓ سے زیادہ مجتمع اور تفرق و اختلاف سے اتنے
رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم الذین ہم	زیادہ دور ہو ان صحابۂ کرام کے متعلق اللہ تعالیٰ نے شہادت
خیر الخلق بشہادۃ اللہ لہم بذالک اذ یقول	دی ہے کہ وہ اس کی مخلوق میں سب سے بہتر ہیں، وہ فرماتا
تعالیٰ کُنْتُمْ خَیْرَ اُمَّۃٍ اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَاْمُرُوْنَ	ہے تم وہ بہترین امت ہو، جو لوگوں کے لئے نکالی گئی ہے تم
بِالْمَعْرُوْفِ وَتَنْہَوْنَ عَنِ الْمُنْکَرِ وَتُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰہِ [لہ]	نیکی کا حکم دیتے ہو، برائی سے روکتے ہو اور اللہ پر ایمان لاتے ہو۔

مسلمانوں میں جو کچھ خیر ہے صحابۂ کرامؓ کی برکت ہے

امام ابن تیمیہ یہ بالکل صحیح فرماتے ہیں کہ اس وقت مسلمانوں کے پاس علم و دین کا جو کچھ سرمایہ ہے خیر و برکت کا جو کچھ ذخیرہ ہے، شعائر اسلام کی بلندی، اسلام کی اشاعت، عمل خیر کے جو کچھ محرکات اور جو کچھ توفیقِ خیر ہے، اور سچ پوچھئے تو عالم میں اس وقت جو کچھ صلاح و خیر نظر آرہی ہے، وہ سب صحابۂ کرام کی جاں فشانیوں، اخلاص، علو ہمت، ایثار، اور قربانیوں کا نتیجہ اور ان کے نفوس قدسیہ کی برکت و نورانیت ہے، امام ابن تیمیہ بڑے

لہ منہاج السنۃ حصہ سوم صہ ۲۴۱

جوش سے لکھتے ہیں:-

واما الخلفاء والصحابة فكل خير فيه المسلمون الى يوم القيامة من الايمان والاسلام والقرآن والعلم والمعارف والعبادات ودخول الجنة والنجاة من النار وانتصارهم على الكفار وعلو كلمة الله فانما هو ببركة ما فعله الصحابة الذين بلغوا الدين وجاهدوا في سبيل الله وكل مؤمن امن بالله فللصحابة رضي الله عنهم عليه فضل الى يوم القيامة وكل خير فيه الشيعة وغيرهم فهو ببركة الصحابة، وخير الصحابة تبع لخير الخلفاء الراشدين فهم كانوا اقوم بكل خير في الدين والدنيا من سائر الصحابة۔[1]

اس وقت سے لے کر قیامت تک مسلمانوں کے پاس جو کچھ خیر ہے مثلاً ایمان و اسلام، قرآن، علوم و معارف، عبادات، دخول جنت، جہنم سے نجات، کفار پر غلبہ، اللہ کے نام کی بلندی، وہ سب صحابۂ کرام کی کوششوں کی برکت ہے، جنھوں نے دین کی تبلیغ کی اور اللہ کے راستہ میں جہاد کیا، جو مومن بھی اللہ پر ایمان لایا اس پر صحابہ کرام کا احسان قیامت تک رہے گا، اور شیعہ وغیرہ کو بھی جو کچھ خیر حاصل ہے وہ صحابۂ کرام کی برکت سے، اور صحابۂ کرام کی خیر خلفائے راشدین کی خیر کی تابع ہے اس لئے کہ وہ دین و دنیا کی ہر خیر کے ذمہ دار و سرچشمہ تھے۔

حضرت ابوبکرؓ کی خلافت دلیل نبوت و صداقت ہے

امام ابن تیمیہ نے یہ بات بھی بڑے کام کی لکھی ہے کہ حضرت ابوبکرؓ کی جانشینی و خلافت آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کی نبوت کے کمال کی ایک دلیل ہے، اور اس بات کا ثبوت ہے کہ آپ رسول برحق تھے، اور آپ کا مزاج، مزاج نبوت تھا مزاج سیاست نہ تھا، اور آپ کو دنیا کے بادشاہوں اور سلاطین عالم سے کوئی مناسبت نہیں جو ہمیشہ اپنے بیٹے یا اپنے خاندانی آدمی کو اپنا جانشین بناتے ہیں اگر آپ میں بھی معاذ اللہ سلطنت

[1] منہاج السنۃ حصہ سوم ص ۲۴۵

اور خاندان پرستی کا کوئی شائبہ ہوتا تو حضرت علیؓ اور عباسؓ کے علاوہ بنی ہاشم کے اور بھی بہت سے افراد تھے، جن کو اپنا جانشین بنا کر ایک خاندانی سلطنت کی بنیاد رکھی جا سکتی تھی، اور اس اثر و اقتدار کو جو آپ کو من جانب اللہ حاصل تھا، اپنے خاندان میں محفوظ کیا جا سکتا تھا، وہ لکھتے ہیں:۔

"یہ بات بھی سوچنے کی ہے کہ حضرت ابوبکرؓ و عمرؓ کی خلافت محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی نبوت و رسالت کا کمال ہے، اور جس سے صاف پتہ چلتا ہے کہ آپ رسولِ برحق تھے، کوئی دنیاوی بادشاہ نہیں تھے، اس لئے کہ بادشاہوں کی عادتِ قدیمہ ہے کہ وہ اپنے عزیزوں کو ترجیح دیتے ہیں، اور انہی کو حکومتیں سپرد کرتے ہیں، اور اس سے وہ اپنے نزدیک اپنی سلطنت کی حفاظت کرتے ہیں، اسی طرح اطراف و نواح کے والیوں اور حکمرانوں کو ہم دیکھتے ہیں کہ ان کا بھی یہی دستور ہے بنو بویہ، بنی سلجوق (سلاجقہ) اور مشرق و مغرب اور شام و یمن کے تمام سلاطین و ملوک اپنے ہی عزیزوں کو اور اپنے خاندانی لوگوں کو حکومت حوالہ کرتے ہیں، اسی طرح سے عیسائی اور مشرکین بادشاہوں کا بھی یہی معمول ہے، فرنگی بادشاہ اور چنگیز خاں کے خاندان کے بادشاہوں کی ہمیشہ یہ کوشش رہتی ہے کہ سلطنت بادشاہ کے خاندان میں باقی رہے، وہ کہتے ہیں کہ یہ شاہی خاندان میں سے ہے، یہ شاہی خاندان میں سے نہیں ہے، یہ ہڈی کا ہے، یہ ہڈی کا نہیں ہے، اس بنا پر حضرت ابوبکرؓ و عمرؓ کی تولیت اور اپنے چچا حضرت عباسؓ اور اپنے چچا زاد بھائی علیؓ، عقیل، ربیعہ ابن الحارث بن عبد المطلب، ابوسفیان بن الحارث بن عبد المطلب وغیرہ کا خلیفہ نہ بنانا اس بات کا ثبوت ہے کہ آپ اس شاہی آئین کے پابند نہیں تھے، ان کے علاوہ بنی عبد مناف میں حضرت عثمانؓ بن عفان، خالدؓ بن سعید ابن العاص، ابان بن سعید بن العاص وغیرہ موجود تھے، اور بنو عبد مناف کا خاندان قریش میں سب سے جلیل القدر اور نسب میں آپ سے قریب تر تھا، یہ اس بات کی بہت بڑی دلیل ہے کہ محمد صلے اللہ علیہ وسلم اللہ کے بندہ اور اللہ کے رسول ہیں، اور وہ کوئی بادشاہ نہیں ہیں، کیونکہ انھوں نے خلافت کے بارہ میں کسی کو محض قربِ نسب یا خاندانی شرف کی وجہ سے آگے نہیں کیا،

بلکہ ایمان و تقویٰ کی بنا پر؛ اور اس سے یہ بات بھی ظاہر ہوئی کہ محمد صلے اللہ علیہ وسلم اور آپ کی امت آپ کے بعد اللہ ہی کی عبادت کرے گی، اور اللہ ہی کے حکم پر چلے گی، قومی یا خاندانی یا ذاتی سر بلندی اور علو فی الارض اس کا مقصود نہیں، یہاں تک کہ بعض انبیاء کے لئے جس سلطنت کی اجازت دی گئی، اس تک کو اختیار نہیں کریں گے، کیوں کہ اللہ تعالے نے محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کو اختیار دیا کہ آپ عبد رسول رہیں یا پیغمبر بادشاہ، آپ نے اسی کو اختیار کیا کہ آپ عبد رسول رہیں، درحقیقت حضرت ابو بکرؓ و عمرؓ کی تولیت اسی کا تتمہ تھا، اس لئے کہ اگر آپ اپنے اہل بیت میں سے کسی کو اپنا قائم مقام بنا جاتے تو ان لوگوں کو یہ کہنے کا موقع مل جاتا کہ آپ نے مال اپنے ورثا کے لئے جمع کیا ہے۔"[1]

جاہلیت کی نسب پرستی

درحقیقت ان تمام فرقوں میں جو حضرت علیؓ کے وصی ہونے کے مدعی ہیں، اور جن کے ذہن میں یہ بات نہیں آتی کہ حقیقی چچا زاد بھائی اور داماد کے ہوتے کوئی دوسرا شخص خلیفہ ہو سکتا ہے، جاہلیت کی بو اور اہل جاہلیت کی نسب پرستی کی رگ پائی جاتی ہے، جو اس بات کے تصور سے ہمیشہ قاصر رہے ہیں کہ مناصب و مراتب محض نسب و قرابت کی بنا پر نہیں بلکہ استعداد و قابلیت اور فضائل پر عطا ہوتے ہیں، عرب، ایران، ہندوستان اور اسلام سے پہلے تمام ملکوں کا یہی ذہن اور مزاج تھا، جن لوگوں نے یہ فیصلہ صادر کیا، اور قطعی طور پر یہ رائے قائم کر لی کہ حضرت علیؓ ہی کو خلیفہ ہونا چاہیئے تھا، انھوں نے دراصل اپنی قومی عادات اور اپنی طبیعتوں پر قیاس کیا اور انھوں نے انبیاء علیہم السلام کا مقابلہ اور مذاق و مزاج اور ان کا ظرف و حوصلہ نہیں سمجھا۔ ؎

فکر ہر کس بقدر ہمتِ اوست

امام ابن تیمیہ لکھتے ہیں:۔

[1] منہاج السنۃ۔ حصہ چہارم ص۱۲۶

"روافض کا کلام مشرکین جاہلیت ہی کے کلام سے ملتا جلتا ہے، وہ نسب اور آباء کے بارے میں تو بڑا تعصب برتتے ہیں، اور خاندان کی بنیاد پر حمایت و محبت کرتے ہیں، اور انسان کے لئے وہ چیزیں قابلِ اعتراض قرار دیتے ہیں جس سے ایمان و تقویٰ میں کوئی نقص واقع نہیں ہوتا، اور یہ سب جاہلیت کے افعال ہیں۔"[1]

شیعوں کا انتساب اور مدح اولادِ حسین کے لئے ایک آزمائش ہے

امام ابن تیمیہ کے نزدیک شیعہ اہلِ بیت کے نادان دوست ہیں، اور ان کی مبالغہ آرائیوں، غلو اور غلط واقعات و روایات سے اہلِ بیت کی بدنامی ہوتی ہے، وہ لکھتے ہیں:۔

"اولادِ حسین کے لئے شیعوں کا ان کی طرف انتساب اور تعظیم و مدح بھی ایک مصیبت اور ابتلا ہے، اس لئے کہ وہ ان کی ایسی چیزوں کے ساتھ مدح کرتے ہیں جو مدح کی بات نہیں، وہ ان کے لئے ایسے دعوے کرتے ہیں جن کی کوئی حجت نہیں اور ان کے متعلق ایسی باتیں ذکر کرتے ہیں کہ اگر ان کی فضیلت سنیوں کے کلام سے اور کتابوں سے نہ معلوم ہوتی تو شیعہ ان کے متعلق جو کچھ بیان کرتے ہیں، وہ مدح سے زیادہ قدح ہوتی۔"[2]

ایک دوسری جگہ لکھتے ہیں:۔

"ان شیعوں کو مناقب و مثالب کی حقیقت کی خبر ہی نہیں، اور نہ ان کو ان طرق کا علم ہے جن سے یہ مناقب ثابت ہوتے ہیں۔"[3]

تعصب کی کرشمہ سازیاں

مصنفؒ منہاج الکرامۃ نے حضرت علیؓ اور ائمۂ اہلِ بیت کی امامت کے ثبوت میں اور ان کے مناقب میں بکثرت آیات اور احادیث و روایات جمع کر دی ہیں،[4] ان آیات و احادیث و روایات کو دیکھ کر اندازہ

---

[1] منہاج السنۃ حصہ چہارم ص۱۴۶ [2] حصہ دوم ص۱۲۵ [3] حصہ دوم ص۱۲۶ [4] ملاحظہ ہو حصہ چہارم از ص۲ تا ۷۹ و از ص۱۰۰ تا ۱۲۵ و از ص۲۰۹ تا ۲۱۴

ہوتا ہے کہ تعصب انسان کو کہاں تک پہنچا سکتا ہے' ان آیات میں بیشتر یا تقریباً تمام تر حصہ وہ ہے جس کا اہل بیت سے یا تو سرے سے کوئی تعلق نہیں یا وہ بھی عامۂ مسلمین کے ساتھ شامل ہیں' احادیث و روایات میں سے اکثر موضوع وضعیف ہیں' اور بقول امام ابن تیمیہ کے "الروایات المسیبة التی لازمام لها ولاخطام" یعنی وہ احادیث جن کا کوئی سر پیر نہیں' اس سلسلہ میں شیعہ مصنف نے ایسی جرأت و بے باکی سے کام لیا ہے کہ بہت سی احادیث کو صحیحین کی طرف اور بہت سی احادیث کو مسند احمد ابن حنبل کی طرف منسوب کیا ہے' اور امام ابن تیمیہ نے لکھا ہے کہ ان کا کہیں صحیحین و مسند میں وجود نہیں' بعض احادیث کے متعلق لکھا ہے کہ احادیث کے کسی مجموعہ اور دواوین اسلام میں کہیں ان کو نہیں دکھایا جا سکتا' شیعہ چونکہ قرآن و حدیث سے بہت ناواقف ہیں' اس لئے وہ معمولی اصطلاحات بھی نہیں سمجھتے اور بعض اوقات بے تکلف غلط بیانی سے کام لیتے ہیں۔

آیات کے سلسلہ میں مصنف نے بڑے بڑے لطیفے کئے ہیں' ان کی تفسیر کو دیکھ کر وہ مشہور لطیفہ یاد آجاتا ہے کہ کسی بھوکے سے پوچھا گیا دو دو کتنے ہوتے ہیں' اس نے کہا چار روٹیاں' مصنف نے چالیس آیتیں لکھی ہیں' جو اس کے نزدیک حضرت علیؓ کے بارے میں نازل ہوئیں' یہاں پر چند نمونے پیش کئے جاتے ہیں۔

آیت "اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِيْ وَرَضِيْتُ لَكُمُ الْاِسْلَامَ دِيْنًا" مصنف ابونعیم کی ایک حدیث نقل کرتا ہے کہ یہ آیت غدیر خم کے خطبہ کے بعد نازل ہوئی ہے' اور رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا "اللہ اکبر علی اکمال الدین واتمام النعمة ورضا الرب برسالتی وبالولایة لعلی من بعدی"۔

امام ابن تیمیہ پہلے تو محدثانہ طریقہ پر لکھتے ہیں کہ یہ حدیث باتفاق اہل فن موضوع ہے' اور کتب حدیث میں سے کسی قابل اعتماد کتاب میں نہیں پائی جاتی' پھر مفسرانہ اور مورخانہ طریقہ پر ثابت کرتے ہیں کہ صحاح' مسانید اور تفسیر سے ثابت ہوتا ہے کہ یہ آیت عرفہ کے دن وقوف کی حالت میں نازل ہوئی' ایک یہودی نے حضرت عمرؓ سے کہا تھا کہ ایک آیت آپ کے قرآن میں ایسی ہے کہ اگر ہم یہودیوں پر نازل ہوتی تو ہم اس دن کو عید بنا لیتے' حضرت عمرؓ نے فرمایا کونسی' اس نے کہا "اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِيْ وَرَضِيْتُ لَكُمُ الْاِسْلَامَ دِيْنًا"

حضرت عمرؓ نے فرمایا مجھے خوب معلوم ہے کہ کس دن نازل ہوئی تھی، اور کس جگہ نازل ہوئی ہے، یہ عرفہ کے دن عرفات میں ایسی حالت میں نازل ہوئی تھی کہ آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم وقوف میں تھے، امام ابن تیمیہ کہتے ہیں کہ دوسرے ذرائع سے بھی یہ بات شہرت اور تواتر کو پہونچ گئی ہے، اور یہ مسلمانوں کی تمام کتابوں میں موجود ہے، یہ یوم جمعہ ۹ ذی الحجہ یوم خم سے ۹ دن پہلے کا واقعہ ہے، تو یہ کہنا کیسے صحیح ہوسکتا ہے کہ یہ غدیر خم کے موقع پر نازل ہوئی، دوسرے اس روایت میں یہ الفاظ جو نقل کئے گئے ہیں: اَللّٰھُمَّ والِ من والاہ وعاد من عاداہ وانصر من نصرہ واخذل من خذلہ" آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم سے بڑھ کر مستجاب الدعوات کون ہوسکتا ہے، اگر یہ حدیث صحیح ہوتی تو اس دعا کا تحقق ہوتا، لیکن تاریخ سے اس کے خلاف ثابت ہوتا ہے۔

مصنف نے لکھا ہے کہ آیت "مَرَجَ الْبَحْرَيْنِ يَلْتَقِيٰنِ ۝ بَيْنَهُمَا بَرْزَخٌ لَّا يَبْغِيٰنِ"[1] بحرین سے مراد علی وفاطمہ اور "بَرْزَخٌ لَّا يَبْغِيٰنِ" سے مراد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم اور "يَخْرُجُ مِنْهُمَا اللُّؤْلُؤُ وَالْمَرْجَانُ" سے مراد حسن حسینؓ ہیں، امام ابن تیمیہ اس کا جواب دیتے ہوئے لکھتے ہیں:-

ان ھذا وامثالہ یقولہ من لایعقل ما	اس طرح کی باتیں وہی کہہ سکتا ہے جو بے سمجھے بات
یقول وھٰذا بالھذیان اشبہ منہ بتفسیر	کرنے کا عادی ہے، اور یہ تفسیر کے بجائے ایسی ہی بے ربط
القرآن وھو من تفسیر الملاحدۃ	اور مہمل باتیں ہیں، جیسی سرسامی کیفیت میں مریض کی زبان
والقرامطۃ الباطنیۃ للقرآن بل ھو	سے نکلتی ہیں، اور وہ اسی طرح کی تفسیر ہے جیسی ملاحدہ قرامطہ
شر من کثیر منھم۔	اور باطنیہ کرنے کے عادی ہیں، بلکہ یہ اس سے بھی بدتر ہے۔

امام ابن تیمیہ نے پھر اس تفسیر کے غلط ہونے کے چھ وجوہ لکھے ہیں، ان میں سے پہلی وجہ یہ ہے کہ یہ آیت سورۂ رحمٰن کی ہے، اور وہ بالاتفاق مکی ہے، اور حضرت حسن حسین مدینہ طیبہ میں اس کے نزول کے کئی سال بعد پیدا ہوئے ہیں، دوسرے اس آیت کی تفسیر سورۂ فرقان کی آیت سے ہوتی ہے "وَهُوَ الَّذِي مَرَجَ الْبَحْرَيْنِ هَٰذَا عَذْبٌ فُرَاتٌ

---

[1] ترجمہ:- اس نے دو سمندر ملا دیئے جو باہم ملتے ہیں، ان دونوں میں پردہ ہے کہ وہ حد سے تجاوز نہیں کرسکتی (سورہ رحمٰن ۱۹-۱۱)

وَهٰذَا مِلْحٌ اُجَاجٌ[1] "اگر اس سے مراد علی وفاطمہ ہیں تو ان میں سے ایک کو ملح اجاج (کڑوا نمکین) قرار دینا پڑے گا، تیسرے اگر برزخ سے مراد حضور صلے اللہ علیہ وسلم ہیں تو آپ مانع وحجاب ہوئے اور یہ مدح نہیں بلکہ ذم ہے[2]۔"

اسی طرح سے یہ حصہ عجائب ولطائف سے بھرا ہوا ہے، اور شیخ الاسلام نے مفسرانہ اور محدثانہ، فقیہانہ ومورخانہ اور ناقدانہ جوابات دیئے ہیں، جو ان کی ذہانت، وفورِ علم اور قوتِ مناظرہ کا روشن ثبوت ہیں، انھوں نے ان تمام دلائل پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ "حضرت علیؓ کی فضیلت وولایت اور علو مرتبت ایسے صحیح اور مسلّم طریقوں سے ثابت ہے جس سے یقینی اور قطعی علم حاصل ہوتا ہے، ان چیزوں کی موجودگی میں دروغ بافی، غلط بیانی اور مشکوک روایات وبیانات کی ضرورت نہیں[3]۔"

کتاب کا دوسرا معرکۃ الآراء حصہ وہ ہے جس میں منہاج الکرامۃ کے اس حصہ پر بحث ہے جس میں مصنف نے صحابۂ کرام پر بالعموم اور شیخین پر بالخصوص اور صدیق اکبرؓ پر بالاخص مطاعن، اور اعتراض جمع کئے ہیں، یہ اعتراضات بزعم مصنف قرآن مجید سے بھی ماخوذ ہیں، احادیث وسیر سے بھی، اور تاریخ سے بھی، یہ مطاعن واعتراضات اس بات کا ثبوت ہیں کہ عداوت ایک پڑھے لکھے انسان کو بھی کہاں تک لے جا سکتی ہے، یہاں پر اس کے صرف دو نمونے پیش کئے جاتے ہیں۔

قرآن مجید کی مشہور آیت جو صدیق اکبرؓ کی خصوصیت کی سب سے بڑی دلیل، اور ان کی وہ فضیلت ومنقبت ہے جس میں امت کا کوئی فرد ان کا شریک وسہیم نہیں، وہ یہ آیت ہے "اِلَّا تَنْصُرُوْهُ فَقَدْ نَصَرَهُ اللّٰهُ اِذْ اَخْرَجَهُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا ثَانِيَ اثْنَيْنِ اِذْ هُمَا فِي الْغَارِ اِذْ يَقُوْلُ لِصَاحِبِهٖ لَا تَحْزَنْ اِنَّ اللّٰهَ مَعَنَا[4]" منہاج الکرامۃ کا مصنف لکھتا ہے کہ اس میں حضرت ابو بکرؓ کے لئے فضیلت کی کوئی بات نہیں، اس لئے کہ یہ ممکن ہے کہ آنحضرت صلے اللہ

---

[1] ترجمہ:- اور وہی ہے جس نے دو دریاؤں کو آپس میں ملا دیا، یہ میٹھا خوشگوار ہے، اور یہ کھاری کڑوا ہے (الفرقان ۵۳) [2] حصہ ۴ ص ۶۷-۶۸

[3] حصہ ۴ ص ۱۸۶ [4] ترجمہ: اگر تم رسول کی مدد نہ کروگے تو اس کی اللہ نے مدد کی ہے جس وقت اسے کافروں نے نکالا تھا کہ وہ دو میں سے دوسرا تھا جب وہ دونوں غار میں تھے، جب وہ اپنے ساتھی سے کہہ رہا تھا تو غم نہ کھا بیشک اللہ ہمارے ساتھ ہے (التوبہ- ۴۰)

علیہ وسلم نے آپ کو صرف اس لئے ساتھ لیا ہو کہ وہ آپ کے روانہ ہو جانے کے بعد کہیں مخبری نہ کر دیں اس لئے کہ ان کے متعلق اس بات کا اطمینان نہ تھا، دوسرے اس آیت کے اندر خود ان کی ہجو موجود ہے کہ حضور اکرم صلے اللہ علیہ وسلم نے آپ سے کہا "لاتحزن" اس سے معلوم ہوا کہ آپ (معاذ اللہ) بہت ڈرنے والے اور بے صبر تھے، اور آپ کو اللہ پر یقین اور اس کے فیصلہ پر اطمینان نہیں تھا، تیسرے یہ کہ قرآن مجید کا قاعدہ ہے کہ جہاں کہیں نزولِ سکینہ کا ذکر کرتا ہے، وہاں مومنین کو ضرور شریک کرتا ہے لیکن یہاں تنہا رسول کا ذکر کیا حضرت ابوبکرؓ کا ذکر نہیں جس سے معلوم ہوا کہ سکینہ کا نزول ان پر نہیں ہوا۔

امام ابن تیمیہ نے اول تو ثابت کیا ہے کہ اس آیت نے ابوبکرؓ کے لئے کیسے کیسے فضائل و مناقب جمع کر دیئے ہیں، اور یہ معیت کیسی خصوصی تھی[۱]، باقی مصنف کا یہ کہنا کہ ان کو اس لئے ساتھ لے لیا تھا تاکہ وہ دشمنوں کو خبر نہ کر دیں، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ ناقابلِ اعتماد تھے، اور آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم ان کی طرف سے مطمئن نہیں تھے، تو دنیا کا ضعیف العقل سے ضعیف العقل انسان ایسے نازک اور خطرناک سفر میں ایسے ناقابلِ اعتماد آدمی کو ساتھ نہیں لے سکتا، امام ابن تیمیہ لکھتے ہیں:۔

فقبح الله من نسب رسوله الذی	اللہ سمجھے اس شخص سے جس نے رسول اللہ صلے اللہ
هو اکمل الخلق عقلا و علما و خبرة	علیہ وسلم کی طرف جو عقل و علم و تجربہ میں کامل ترین
الی مثل هذه الجهالة والغباوة۔[۲]	انسان تھے ایسی جہالت و غباوت کی نسبت کی۔

امام ابن تیمیہ لکھتے ہیں کہ میں نے سنا ہے کہ بادشاہ خربندہ[۳] جس کے لئے مصنف نے یہ کتاب تصنیف کی ہے جب اس سے یہ کہا گیا کہ ابوبکرؓ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم سے بغض رکھتے تھے، اور آپ کے دشمن تھے، اور اس کے باوجود آپ نے ان کو سفر ہجرت میں ساتھ لیا جو سب سے زیادہ خوفناک سفر تھا، تو اس نے

---

[۱] منہاج السنۃ ص ۲۴۳ تا ۲۵۵ [۲] ایضاً حصہ چہارم ص ۲۵۵ [۳] منہاج السنۃ۔ اور بعض تاریخ کی اور کتابوں میں بھی اس تاتاری بادشاہ کو اس نام سے یاد کیا گیا ہے۔

سنتے ہی وہ بات کہی جو ایسے موقعہ پر کہی جا سکتی ہے اور آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کی ذات گرامی اس سے بالکل منزّہ ہے یعنی "یہ کسی عقلمند آدمی کا فعل نہیں ہو سکتا"[1] پھر تفصیل کے ساتھ ایک ایک بات کا جواب دیا ہے[2] اور بتایا ہے کہ قرآن مجید میں حزن وخوف کا ذکر کہاں کہاں آیا ہے، کیسے کیسے انبیائے اولوالعزم اور صلحائے مومنین اور افرادِ اہلِ بیت سے طبعی طور پر خوف اور حزن ثابت ہوتا ہے، باقی مصنف کا یہ کہنا کہ قرآن مجید میں جہاں جہاں نزول سکینہ کا ذکر ہے، وہاں مومنین کا ہمیشہ تذکرہ آتا ہے تو اس سے یہ غلط فہمی ہوتی ہے کہ قرآن مجید میں بکثرت ایسا ہوا ہے، حالانکہ صرف ایک ہی آیت ایسی ہے[3] جہاں نزول سکینہ کے موقع پر رسول کے ساتھ مومنین کا بھی ذکر ہے، اور وہ آیت یہ ہے "وَيَوْمَ حُنَيْنٍ إِذْ أَعْجَبَتْكُمْ كَثْرَتُكُمْ فَلَمْ تُغْنِ عَنكُمْ شَيْئًا وَضَاقَتْ عَلَيْكُمُ الْأَرْضُ بِمَا رَحُبَتْ ثُمَّ وَلَّيْتُم مُّدْبِرِينَ ثُمَّ أَنزَلَ اللَّهُ سَكِينَتَهُ عَلَىٰ رَسُولِهِ وَعَلَى الْمُؤْمِنِينَ وَأَنزَلَ جُنُودًا لَّمْ تَرَوْهَا"[4] وہ فرماتے ہیں کہ یہاں پر مومنین کے ذکر کا خاص موقعہ تھا، اس لئے کہ "ثُمَّ وَلَّيْتُم مُّدْبِرِينَ" آچکا ہے، اس کے برخلاف قرآن مجید میں کسی جگہ صرف مومنین ہی کا تذکرہ نزول سکینہ کے موقع پر آیا ہے، پھر امام نے اس کے لطائف اور وجوہ تفصیل سے لکھے ہیں[5]۔

اس تعصب کا دوسرا نمونہ یہ ہے کہ روایات وسیر میں آیا ہے کہ آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم میدانِ بدر میں عریش[6] کے نیچے تھے تو حضرت ابوبکرؓ بھی ساتھ تھے، مصنف لکھتا ہے کہ چونکہ آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم جانتے تھے کہ اگر حضرت ابوبکرؓ کو جنگ کا حکم دیا جائے گا تو کھیل بگڑ جائے گا، اس لئے کہ وہ آپ کے غزوات میں کئی دفعہ بھاگ چکے تھے، امام ابن تیمیہ کو اس موقع پر علمی وایمانی جوش آگیا ہے،

---

[1] منہاج السنۃ حصہ چہارم ص۲۵۵ [2] ایضاً ص۲۵۶ [3] ایک دوسری آیت بھی ہے "إِذْ جَعَلَ الَّذِينَ كَفَرُوا فِي قُلُوبِهِمُ الْحَمِيَّةَ حَمِيَّةَ الْجَاهِلِيَّةِ فَأَنزَلَ اللَّهُ سَكِينَتَهُ عَلَىٰ رَسُولِهِ وَعَلَى الْمُؤْمِنِينَ الخ" (سورۃ الفتح-۲۶) [4] التوبہ

[5] منہاج السنۃ حصہ چہارم ص۲۷۳ تا ۲۷۷ [6] میدانِ بدر میں ایک چھپر ڈال دیا گیا تھا، اس کے نیچے آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم سربسجود ومشغول دعا تھے، اس وقت تنہا حضرت ابوبکرؓ آپ کے ساتھ تھے ملاحظہ ہو کتب سیرت واحادیث۔

وہ لکھتے ہیں کہ مصنف نے یہ جو کہا ہے کہ وہ غزوات نبوی میں کئی دفعہ راہِ فرار اختیار کر چکے تھے' اس سے معلوم ہوتا ہے کہ مصنف غزواتِ نبوی کے بارے میں بالکل جاہل واقع ہوا ہے' اور یہ کوئی تعجب کی بات نہیں' اس لئے کہ جس گروہ سے اس کا تعلق ہے' اُس کو رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے حالات و واقعات سے نہ کوئی واقفیت ہے' نہ کوئی دلچسپی' اس کو یہ خبر نہیں کہ بدر کی جنگ پہلی جنگ تھی جس میں لڑائی ہوئی، اس سے پہلے کوئی ایسی جنگ نہیں ہوئی جس میں رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم اور حضرت ابوبکرؓ شریک ہوئے ہوں' اس پر تمام اہلِ سیر' حدیث و مغازی، فقہ و تواریخ کا اتفاق ہے کہ بدر پہلی جنگ تھی جس میں رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے قتال فرمایا، اس سے پہلے کوئی غزوہ یا سریہ ایسا پیش نہیں آیا جس میں جنگ کی نوبت آئی ہو سوائے ابن الحضرمی کے واقعہ کے جس میں حضرت ابوبکرؓ شریک ہی نہیں تھے' تو یہ کہنا کیسے صحیح ہوگا کہ حضرت ابوبکرؓ اس سے پہلے کئی بار میدان جنگ سے فرار اختیار کر چکے تھے' دوسری بات یہ ہے کہ حضرت ابوبکرؓ کا کسی جنگ سے بھاگنا ثابت نہیں' اس کا بارِ ثبوت مدعی کے ذمہ ہے کہ وہ ثابت کرے کہ کس جنگ سے انھوں نے فرار اختیار کیا' تیسری بات یہ ہے کہ اگر معاذ اللہ حضرت ابوبکرؓ ایسے ہی بزدل تھے تو ان کو اپنے ساتھ عریش میں رکھنا مناسب نہیں تھا، بلکہ ایسے آدمی کو میدانِ جنگ میں لانا بھی مناسب نہیں تھا، چہ جائیکہ خاص طور پر تمام صحابہ کرام میں سے ان کو اپنی رفاقت کے لئے انتخاب فرمایا۔[1]

حضرت علیؓ کے بارے میں تناقض

امام ابن تیمیہ لکھتے ہیں کہ جس طرح عیسائیوں نے حضرت مسیحؑ کو خدا کا بیٹا اور خدا بنایا، دوسری طرف ان کی صلیب کے واقعہ کی ایسی تصویر کھینچی کہ وہ ایک بے بس و مجبور انسان نظر آتے ہیں' جو ہر طرح کی توہین و تذلیل اور تمسخر و استہزاء کا نشانہ و تختۂ مشق ہیں' اسی طرح سے شیعہ حضرات نے ایک طرف تو حضرت علیؓ

---

[1] تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو ص ۲۸۲ تا ۲۸۶

کے لئے وہ صفات اور قوتیں ثابت کیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کا پایہ آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم سے بھی کچھ بلند تھا، اور اگر وہ نہ ہوتے تو اسلام کو فروغ نہ ہوتا، ان ہی کے پنجۂ خیبر شکن اور ذوالفقار آبدار سے اسلام کی فتح ہوئی، اور کفر سرنگوں ہوا، دوسری طرف خلفائے ثلٰثہ کی خلافت میں ان کو ایسا مجبور و بے بس ثابت کیا ہے کہ وہ سب کچھ اپنے ضمیر و عقیدہ کے خلاف دیکھتے اور ان کی اور ان کے اہل بیت کی ہر طرح توہین و تذلیل ہوتی، اور وہ کچھ نہ کر سکتے، یہ صریح تناقض اور تضاد ہے، امام ابن تیمیہ لکھتے ہیں :-

"یہ شیعہ جمع بین النقیضین کرتے ہیں، ایک طرف وہ حضرت علیؓ کو قوت و شجاعت میں سب سے کامل اور بڑھا ہوا بتاتے ہیں، یہاں تک کہ معلوم ہوتا ہے ان ہی نے دین رسول کو قائم کیا، اور خود رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم ان کے محتاج تھے، اور ان کو اقامت دین میں اللہ کا شریک بتاتے ہیں، پھر اسلام کے غلبہ اور قوت کے بعد لوگوں کے اسلام میں داخل ہو جانے کے بعد ان کے عجز و ضعف، اضطراب و تقیہ کو اس طرح بیان کرتے ہیں کہ ان سے زیادہ کمزور اور بے بس ہستی نہ تھی، حالانکہ یہ قطعی طور پر معلوم ہے کہ اسلام قبول کر لینے کے بعد وہ بہ نسبت سابق کے زیادہ حق کے پیرو ہو گئے، تو جو شخص دین محمدی کے قائم کرنے میں اللہ کا شریک حال تھا، جس نے کفار کو مغلوب کیا، اور وہ اسلام لائے وہ اپنی طاقت اس جماعت کے مغلوب کرنے میں کیوں نہیں دکھاتا، جنھوں نے اس پر زیادتی کی تھی، حالانکہ وہ تعداد میں بھی ان کفار سے کم تھے، اور قوت و شوکت میں بھی کمزور تھے، اور یہ مخالفین بہر حال حق سے زیادہ قریب تھے۔"[1]

مبحثِ امامت

امام ابن تیمیہ نے امامت کے مبحث پر بھی بڑی مفصل بحث کی ہے، اور شیعہ امامت کی جو تعریف کرتے ہیں اور اس کو دین کا رکن قرار دیتے ہیں، اس کا بہ شدت انکار کیا ہے، اور ان تمام عقلی و نقلی دلائل کا رد کیا ہے جو اس کے

[1] منہاج السنۃ حصہ ۴ صلہ ۵

ثبوت میں پیش کیے جاتے ہیں، اس سلسلہ میں امام غائب کے عقیدہ کا بڑا مذاق اڑایا ہے، اور ثابت کیا ہے کہ اس عقیدہ سے سوائے فساد، اختلاف، بے علمی اور تعطل کے کوئی فائدہ نہیں۔[1]

شیعوں کو قرآن و حدیث سے دلچسپی نہیں

امام ابن تیمیہ لکھتے ہیں کہ شیعوں کو حفظ قرآن کی طرف اور اس کے معانی و تفسیر کا علم اور ادلّہ کی تلاش و جستجو کی طرف کوئی توجہ نہیں، اسی طرح احادیث صحیح و سقیم کی پہچان، حدیث کے معانی و مطالب اور صحابہ و تابعین کے آثار سے واقفیت کا کوئی اہتمام نہیں، ان کا سرمایہ اور مبلغ علم کچھ آثار ہیں، جو بعض اہلِ بیت سے نقل ہوتے چلے آرہے ہیں، ان میں جھوٹ سچ سب کچھ ہے۔[2]

مساجد و جمعہ و جماعت سے بیگانگی

امام ابن تیمیہ لکھتے ہیں کہ شیعوں نے انبیاء بلکہ ائمہ کے بارے میں ایسا غلو کیا کہ ان کو اربابٌ من دونِ اللہ بنادیا، اور اللہ وحدہٗ لاشریک کی عبادت سے جس کا پیغمبروں نے حکم دیا تھا بے اعتنائی کی، تم دیکھو گے کہ وہ مساجد جن کو بلند اور بارونق رکھنے اور ان میں اللہ کا نام لینے کا حکم دیا ہے، ان کو ویران رکھتے ہیں، اور ان میں جمعہ و جماعت کو قائم نہیں کرتے، اور ان کے نزدیک ان کا کوئی بڑا احترام نہیں ہے اور اگر ان میں کبھی نماز پڑھتے بھی ہیں، تو الگ الگ، اور ان مشاہد کی بڑی تعظیم کرتے ہیں، جو قبور پر بنائے گئے ہیں، ان پر معتکف رہتے ہیں جیسے مشرکین، اور دُور دُور سے سفر کرکے ان کی زیارت کے لئے آتے ہیں، جیسے کہ حجاج خانہ کعبہ کی زیارت کے لئے آتے ہیں۔[3]

متاخرین شیعہ معتزلہ کے پیرو ہیں

متاخرین شیعہ عقلیات میں عام طور پر معتزلہ کے پیرو ہیں، اور کچھ لوگوں نے فلاسفۂ یونان کی پیروی کی ہے،

---

[1] منہاج السنۃ حصہ سوم ص ۲۴۹ تا ۲۵۰ [2] ایضاً ص ۴۰ [3] ایضاً حصہ اول ص ۱۳۱

اوران پر تفلسف غالب ہے ان کے علماء میں سے کوئی تو فلسفہ و اعتزال اور رفض کا جامع ہے، جیسے منہاج الکرامۃ کا مصنف[1] اس سلسلہ میں مصنف کتاب نے عقائد و علم کلام کی جو بحثیں چھیڑی ہیں جن میں اعتراض و فلسفہ کا رنگ صاف جھلکتا ہے ان کا امام ابن تیمیہ نے تفصیلاً جواب دیا ہے یہ حصہ گہری فلسفیانہ اور متکلمانہ بحثوں سے بھرا ہوا ہے اور چونکہ وہ معقول و منقول دونوں سمندروں کے شناور ہیں اس لئے انھوں نے اپنی عادت کے مطابق دل کھول کر بحث کی ہے[2] اور ایک ایک حرف کا رد کیا ہے اور اس نتیجہ تک پہونچے ہیں کہ اس فرقہ کی واقفیت عقلیات سے بہت سطحی اور رعامیانہ ہے اور ان کے علماء بھی اس علم میں طفل مکتب معلوم ہوتے ہیں۔[3]

گذشتہ تاریخ

امام ابن تیمیہ نے جابجا لکھا ہے کہ تاریخ کے ہر دور میں شیعوں نے کفار و مشرکین کا ساتھ دیا، اور اسلام سے بے وفائی کی اور اسلامی سلطنت کو نقصان پہونچایا اور اخیر میں ان کا قلم یہ لکھنے پر مجبور ہوا ہے؛

"فایامھم فی الاسلام کلھا سود"[4]

اہلِ سنت راہِ اعتدال پر

امام ابن تیمیہ لکھتے ہیں کہ اسلامی فرقوں میں صرف اہلِ سنت ہی توسط اور اعتدال کی راہ پر ہیں، اور افراط و تفریط سے محفوظ ہیں، ان کے نزدیک اہلِ بیت کی محبت اور صحابہ کرام کی تعظیم میں کوئی تضاد نہیں، انھوں نے ان دونوں نعمتوں کو جمع کر رکھا ہے اور یہی صحیح اسلام ہے، وہ لکھتے ہیں:-

"اہلِ سنت تمام مومنین کی دوستی کا دم بھرتے ہیں، اور علم و عدل کے ساتھ گفتگو کرتے ہیں،

---

[1] منہاج السنۃ حصہ سوم ص۴۰ [2] ملاحظہ ہو ص۳۰ تا ۱۲۹ حصہ اول [3] ایضاً

[4] ایضاً حصہ چہارم ص۱۱۱ ترجمہ: خلاصہ یہ ہے کہ جہاں تک اسلام کا تعلق ہے ان کی تاریخ بالکل سیاہ ہے۔

وہ نہ اہلِ جہل میں سے ہیں، نہ اہل اہواء میں سے، وہ روافض اور خوارج دونوں کے طریقہ سے بیزار، وہ تمام سابقین اولین کے معتقد ہیں، اور صحابۂ کرام کی قدر و منزلت کے شناسا اور معترف ہیں، اور ان کے مناقب کے قائل ہیں، اور اس سب کے ساتھ اہلِ بیت کرام کے حقوق کی ادائگی ضروری سمجھتے ہیں، جو شریعت سے ثابت ہیں۔[1]

---

[1] منہاج السنۃ حصہ اول ص ۱۶۵

علومِ شریعت کی تجدید

امام ابنِ تیمیہ کا عہد

امام ابن تیمیہ جس زمانہ میں پیدا ہوئے' اس میں شرعی اور دینی علوم بڑی وسعت اختیار کر چکے تھے' خصوصیت کے ساتھ تفسیر' حدیث' فقہ اور اصولِ فقہ میں سے ہر موضوع پر اتنا وسیع کتب خانہ مرتب ہو چکا تھا کہ ان میں سے کسی ایک موضوع پر عبور حاصل کرنا اور اس وقت تک کے علمی ذخیرہ سے اجمالی واقفیت بھی ایک متوسط آدمی کے لئے بہت بڑا علمی کارنامہ تھا' لیکن پھر بھی ان کے عہد میں بکثرت ایسے عالم اور مدرّس موجود تھے' جو اس کتب خانہ پر نظر ڈال چکے تھے' اور ان میں سے متعدد ایسے بھی تھے' جو اپنے قوی حافظہ' علمی اشتغال' کثرتِ مطالعہ اور کثرتِ درس و تدریس کی وجہ سے اس کے ایک معتدبہ حصہ کو اپنے سینہ میں محفوظ رکھتے تھے' اور تدریس و مناظرہ کے وقت اس سے بے تکلف استفادہ اور اس کا اعادہ کر سکتے تھے' علامہ کمال الدین ابن الزملکانی' تقی الدین علی بن السبکی' شمس الدین الذہبی' ابوالحجاج المزّی اس کا ایک نمونہ ہیں "طبقات الشافعیۃ الکبریٰ" کے مطالعہ سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ اس زمانہ میں علمی استحضار' تبحُّر' محفوظات کی کثرت اور علمی تفنن کس حد تک پہونچ چکا تھا' متعدد اصحاب ایسے تھے جن کو علوم شرعیہ کا دائرۃ المعارف (انسائیکلوپیڈیا) کہنا صحیح ہوگا۔

لیکن علم و معلومات میں جتنی وسعت تھی' فکر میں اتنا عمق نہیں تھا' ایسے لوگوں کی عرصہ سے کمی چلی آرہی تھی' جو اس پورے علمی ذخیرہ پر ناقدانہ اور استادانہ نظر رکھتے ہوں' متقدمین کے آراء و خیالات میں موازنہ و تقابل کی قوت رکھتے ہوں اور مسائل و آراء میں اپنی کوئی ذاتی اور منفرد رائے بھی رکھتے ہوں' متقدمین نے جو قابلِ قدر

علمی اندوختہ چھوڑا تھا، اکثر متاخرین کا کام صرف اس پر عبور حاصل کرلینا، اور اس کی شرح و توضیح، اختصار و تلخیص رہ گیا تھا، عرصہ سے اس میں کوئی معتد بہ اور قابلِ قدر اضافہ نہیں ہورہا تھا، کوئی ایسی تصنیف جس کو طبع زاد یا مجتہدانہ کہا جاسکے، کمیاب تھی، اس عصر کی جو بہترین اور مایۂ ناز تصنیفات سمجھی جاتی تھیں، ان کا جوہر بھی صرف یہ تھا کہ مصنّف نے اپنے سے پہلے کے منتشر معلومات کو یکجا جمع اور سلیقہ سے مرتب کردیا تھا، یا وہ کسی سابق فقہی متن کی عمدہ شرح تھی۔

ان کی تصنیفی و علمی خصوصیات

امام ابن تیمیہ نے اپنے حافظۂ خداداد سے اس پورے علمی ذخیرہ پر عبور حاصل کیا اور اس کو فکری طور پر ہضم کرلیا، اور اس سے اپنی تصنیفات میں پورا فائدہ اٹھایا، لیکن ان کی بے چین اور مواج طبیعت، ان کا نکتہ سنج و نکتہ آفریں دماغ اور ان کا سیّال و رواں قلم اس پر قانع نہیں ہوسکتا تھا کہ وہ صرف نقل و روایت اور شرح و تلخیص یا انتخاب پر اکتفا کریں قرآن مجید کا گہرا علم، مقاصد شریعت سے گہری واقفیت اور اصولِ فقہ اور اصولِ تشریع کا ملکۂ راسخہ ان کی ہر تصنیف میں ان کا رفیق ہے، وہ جس موضوع پر قلم اٹھاتے ہیں، اس میں اپنے تازہ علم سے جان ڈال دیتے ہیں، ان کی کوئی ایسی تصنیف نہیں ہوگی جس میں کچھ نئے علمی حقائق، علمی نکتے، ناقدانہ بحثیں اور جدید اصولی مباحث نہ ملیں، اور قرآن مجید کے فہم کی ایک نئی راہ اور شریعت کے مقاصد کے سمجھنے کا نیا دروازہ کشادہ نہ ہو، ان کی دو ضخیم تصنیفات "الجواب الصحیح" اور "منہاج السنّۃ" پر مفصل تبصرہ اور ان کے مضامین کی تلخیص گزر چکی ہے، ان دونوں کے علاوہ ان کی متعدد تصنیفات ایسی ہیں، جو ان کے مجتہدانہ فکر و نظر و ذہن رسا، اور قوت تنقید کی شاہد ہیں، اور ہر عہد کے دماغوں کو جدید و صالح علمی و فکری غذا مہیا کرتی ہیں، اور زمانہ کے اہل علم کو ان میں نیا مواد، نئے دلائل اور نئی تحقیقات نظر آتی ہیں، مثال کے طور پر کتاب النبوات" "الرد علی المنطقیین"

"اقتضاء الصراط المستقیم"[1] نہ صرف اعلیٰ علمی تصنیفات اور اپنے موضوع پر کامیاب کتابیں ہیں بلکہ اس طرح کی خیال آفریں وخیال افروز کتابیں ہیں، جو ذہن کو سوچنے پر آمادہ کرتی ہیں، اور ان کے سامنے نئے علمی میدان اور سوچنے اور غور کرنے کے لئے نئے مسائل اور مضامین لاتی ہیں۔

تفسیر

امام ابن تیمیہ نے تفسیر کو اپنے فکر وتصنیف کا خاص موضوع بنایا، یہ ذوق ان پر اس قدر غالب تھا کہ ان کی کوئی تصنیف مشکل سے ایسی ہوگی جس میں قرآن مجید کی تفسیر کا مواد نہ ملے اور آیات سے استدلال و ان کی شرح وتفسیر نہ ہو، ان کے سامنے جب کوئی آیت آتی ہے تو اس کی تفسیر کئے بغیر ان سے بڑھا نہیں جاتا، ان کے تلامذہ کا بیان ہے کہ انھوں نے جو تفسیری ذخیرہ چھوڑا وہ تیس جلدوں سے زائد ہے، اس میں کوئی شبہہ نہیں کہ اگر وہ ذخیرہ دستیاب ہوجائے تو وہ تفسیر کا ایک بہت قیمتی اور مستند ذخیرہ ہوگا، فکر ونظر کی گہرائی، سلامتِ ذوق، روایات پر کامل عبور اور ان سے استناد، آیات کی زندگی پر تطبیق، اپنے ماحول ومعاشرہ سے واقفیت، داعیانہ روح اور جذبۂ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر اور حمیت دین کی جو دولت اللہ نے ان کو عطا فرمائی تھی، اس کی وجہ سے ان کے قلم سے نکلی ہوئی تفسیر شاید سب سے بہتر اور جامع تفسیر ہوتی اگرچہ یہ مفصل وسلسل تفسیر اس وقت نایاب ہے، لیکن قرآن مجید کی متعدد سورتوں کی تفسیریں چھپ چکی ہیں، اور ان سے ان کی مفسرانہ خصوصیات کا اندازہ ہوسکتا ہے، ان میں سے تفسیر سورۃ الاخلاص، تفسیر معوذتین اور تفسیر سورۂ نور، عرصہ ہوا

---

[1] اقتضاء الصراط المستقیم مخالفۃ اصحاب الجحیم کا موضوع اگرچہ صرف یہ ہے کہ غیر مسلموں کے رسوم وشعائر اختیار نہ کئے جائیں، اور ان کی مذہبی تقریبات اور تہواروں میں شرکت نہ کی جائے مگر حسب معمول یہ کتاب بڑے نفیس مباحث وعلوم پر مشتمل ہے، اور شیخ الاسلام کی بہترین تصنیفات میں شمار ہونے کے قابل ہے، اس کا ایک ایڈیشن بڑے اہتمام سے انصار السنۃ قاہرہ نے شائع کیا ہے، مجلس تحقیقات ونشریات اسلام لکھنؤ کی جانب سے اس کے ضروری اور موجودہ حالات میں رہنمائی کرنے والے مباحث کو اردو میں "اسلام اور غیر اسلامی تہذیب" کے نام سے شائع کیا گیا ہے۔

مصر میں چھپ چکی ہیں، حال میں ان کی مختلف تصنیفات میں سے تفسیری حصوں کو علیحدہ کرکے چھاپ دیا گیا ہے[1]، تفسیر سے ان کا تعلق اس میں ان کا اشتغال و انہماک ان کی زندگی میں بھی معروف تھا، یہ ان کا ایسا امتیازی نشان سمجھا جاتا ہے کہ ان کے جنازہ کی نماز کا اعلان بھی اسی عنوان سے ہوا "الصلوٰۃ علی ترجمان القرآن" ان کا ایک چھوٹا سا رسالہ اصول تفسیر پر بھی ہے، جہاں تک ہم کو معلوم ہے امام ابن تیمیہ کا یہ رسالہ اصول تفسیر کا پہلا مستقل رسالہ ہے۔

حدیث

حدیث اور شرح حدیث میں اگرچہ امام ابن تیمیہ کی کوئی مستقل تصنیف نہیں ہے، اور حدیث کا فن ساتویں اور آٹھویں صدی میں جس وسعت و کمال کو پہونچ چکا تھا، اس کے بعد یہ کام کچھ ایسا ضروری بھی نہیں رہ گیا تھا، مگر ان کی تصنیفات میں اصول حدیث، اسماء الرجال، جرح و تعدیل، نقد حدیث اور فقہ حدیث کا جتنا مواد ملتا ہے اگر وہ سب علیحدہ جمع کر دیا جائے تو وہ ایک بہت بڑی تصنیف اور ایک بڑا قیمتی ذخیرہ ہوگا، خصوصیت کے ساتھ موضوعات پر ان کی جیسی بے لاگ اور محققانہ رائیں ان کی کتابوں میں ملتی ہیں، اس کا کہیں اور ملنا مشکل ہے، اس سلسلہ میں "منہاج السنۃ" میں جو مواد ملتا ہے، اور بیسیوں مشہور، متداول حدیثوں پر انھوں نے جو کلام کیا ہے، وہ بڑا کار آمد اور نادر ذخیرہ ہے۔

اصولِ فقہ

اصولِ فقہ ان کا ایک پسندیدہ اور ذوقی موضوع تھا، جس میں ان کو ملکۂ راسخہ حاصل ہو گیا تھا، اور جس میں وہ مجتہدانہ شان رکھتے تھے، ان کی کوئی تصنیف ان اصولی مباحث سے خالی نہیں، "اقتضاء الصراط المستقیم" اور ان کے فتاویٰ میں اس کا بہت بڑا ذخیرہ ہے، اور بعض مستقل رسائل مثلاً "رسالۃ القیاس"

---

[1] یہ تفسیر ابن تیمیہ کے نام سے مطبع قیمہ بمبئی میں چھپ چکی ہے۔

منہاج الوصول الی علم الاصول وغیرہ بھی یادگار ہیں۔

علم کلام

امام ابن تیمیہ کی تصنیفات کا اگر تجزیہ کیا جائے تو شاید علم کلام و عقائد ان کی تحریروں کے پورے نصف حصہ پر مشتمل ہوگا، یا دو ثلث حصوں پر، اس موضوع پر ان کے وہ رسائل جو مختلف مقامات اور شہروں کے نام پر معنون ہیں[1] مثلاً شرح اصبہانیہ، رسالہ حمویہ، تدمریہ، واسطیہ، کیلانیہ، بغدادیہ، ازہریہ وغیرہ وغیرہ اس موضوع پر ان کے اصلی خیالات، قوتِ استدلال، حمیتِ دینی، اور ان کے علم و ذہانت کا مظہر ہیں۔

فقہ

ان کے زمانہ میں ہر مذہب کی فقہ اتنی مدوّن ہو چکی تھی کہ اس میں نیا اضافہ بہت مشکل تھا، پھر بھی انھوں نے بکثرت مسائل واحکام پر مجتہدانہ نظر ڈالی ہے، اور کتاب وسنّت، اجماع وقیاس اور اصول فقہ ..... کی روشنی میں استنباط واجتہاد سے کام لیا ہے، فقہ وحدیث میں تطبیق کی کوشش کی، اور فقہی آراء وجزئیات کو صحیح احادیث کے تابع بنانے کی کوشش کی، نئے پیش آنے والے مسائل وحالات اور نئی ضروریات کے لئے استنباط واجتہاد سے کام لیا، جس طرح ہر مذہب کے فقہاء اور قضاۃ ہر عصر میں نئے مسائل پر اجتہاد واستنباط سے کام لیتے رہے تھے، اسی طرح امام ابن تیمیہ نے بھی (جن کے متعلق بعض اہلِ نظر کا خیال ہے کہ ان میں شرائط اجتہاد جمع تھے) ان نئے مسائل پر اجتہاد سے کام لیا، اور اپنے فتاویٰ اور اختیارات کا ایک بہت بڑا ذخیرہ چھوڑا، یہ ذخیرہ فتاویٰ ابن تیمیہ کی چار ضخیم جلدوں میں محفوظ ہے اور نہ صرف فقہی مسائل واحکام کا بلکہ بہت سے علمی مسائل اور اصولی

[1] عام طور پر جس شہر سے کوئی استفتاء آتا تھا، اسی شہر پر اس رسالہ کا نام رکھ دیا جاتا تھا۔

بحثوں کا ایک بڑا قیمتی و نادر ذخیرہ ہے۔[1]

امام ابن تیمیہ کا اثر بعد کی صدیوں پر

اس عظیم علمی کارنامہ کے ساتھ جس میں وسعت بھی تھی، اور عمق بھی تھا، اور جس میں نقل و عقل دوش بدوش ہیں، انھوں نے علوم شریعت کی تجدید کی خدمت انجام دی اور فکر اسلامی پر جو جمود و اضمحلال طاری ہونے لگا تھا، اس کو دور کیا، نئی علمی راہیں، اور نئے فکری دروازے کھولے، اور تصنیفات و مباحث کا ایسا علمی ذخیرہ چھوڑا جس کے مطالعہ سے ذہن میں وسعت، طبیعت میں جولانی اور فکر میں تحریک و نشاط پیدا ہوتا ہے، اور جس کے اثر سے ہر دور میں اچھے مصنّف، بلند خیال مفکر، پر جوش مصلح اور مخلص داعی پیدا ہوتے رہے، اس فکری و اصلاحی تسلسل و حرکت میں جو آٹھویں صدی کے بعد سے نظر آتی ہے، بلاشبہہ شیخ الاسلام ابن تیمیہ کا نمایاں حصہ ہے، اور وہ علوم و افکار اسلامیہ کے مجدّدین کبار میں شمار ہونے کے قابل ہیں، خصوصیت کے ساتھ بارہویں صدی ہجری سے عالم اسلام کے مختلف گوشوں میں جو اصلاحی و فکری و علمی تحریکیں پیدا ہوئیں، ان کے ماخذوں میں ایک بڑا ماخذ اور محرک امام ابن تیمیہ کی تصنیفات ہیں۔

---

[1] یہ مجموعۂ فتاوی شیخ الاسلام ابن تیمیہ کے نام سے شیخ فرج اللہ زکی کردی کے اہتمام سے ۱۳۲۶ھ میں مصر میں چار حصوں میں شائع ہوا ہے، مجموعی صفحات ۱۵۸۶ ہیں، چوتھے حصہ کے اخیر میں الاختیارات العلمیۃ کے نام سے کتاب ہے جس میں ان کے اختیارات و ترجیحات کو جمع کر دیا گیا ہے، فتاوی کا پانچواں حصہ عقائد و علم کلام کے مسائل و رسائل سے متعلق ہے، حکومت سعودیہ کی طرف سے "فتاوی ابن تیمیہؒ" کے نام سے جو مجموعہ شائع ہوا ہے، اور تیس جلدوں پر مشتمل ہے، اس کی حیثیت ایک مستقل کتبخانہ اور دائرۃ المعارف کی ہے۔

فکرِ اسلامی کا احیاء

عقائد کا ماخذ کتاب و سنت

عقائد و دینی حقائق کا صحیح ماخذ

امام ابن تیمیہ کا ایک مستقل تجدیدی کارنامہ (جو شاید ان کی زندگی کا سب سے بڑا کارنامہ اور ان کا امتیازی کام ہے) یہ ہے کہ انھوں نے فکرِ اسلامی کا احیاء کیا، اسلام کا دوسرے نظامہائے فکر کے مقابلہ میں امتیاز یہ ہے کہ اس کی بنیاد وحی و نبوتِ محمدی پر ہے، اس کے عقائد و حقائق قیاس، تجربے، ظن و تخمین، اور انسانی ذہانت، اور بحث و جدال پر مبنی نہیں، بلکہ اللہ تعالےٰ کی تعلیم اور رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی تبلیغ پر مبنی ہیں، پیغمبر نے خدا کی ذات و صفات و افعال، عالم کی ابتداء و انتہاء اور دنیا کے آغاز و انجام، معاد اور اعمال کے خواص و نتائج اور دوسرے مابعد الطبیعیاتی مسائل کے متعلق جن کا دین سے تعلق ہے جو کچھ اور جتنا کچھ کہہ دیا وہی عقائد ہیں، اور وہی حقائق ہیں، اور وحی و نبوت کے سوا درحقیقت ان کے معلوم کرنے کا پھر ان پر یقین کرنے کا کوئی اور ذریعہ ہی نہیں، اس لئے کہ تمام معلومات اور حقائق کا ذریعۂ علم مبادی اولیہ ہی ہوتے ہیں، اور ان حقائق دینیہ و غیبیہ کے مبادی اولیہ ہی کسی کو حاصل نہیں، کسی نئی چیز کے علم کا ذریعہ ہی یہ ہے کہ معلومات کو اس طرح ترتیب دیا جائے کہ مجہول تک رسائی ہو جائے، لیکن جس طرح ہم کو طبعیات و مادیات کے معلومات اولیہ حاصل ہیں، ان غیبی و دینی حقائق کے ابتدائی معلومات و مقدمات حاصل نہیں، اللہ کی ذات و صفات حواس و عقل دونوں سے ماوراء ہیں، اور اس کے بارے میں انسان کو کوئی تجربہ و مشاہدہ حاصل نہیں، اور

نہ یہاں قیاس کے لئے کوئی بنیاد ہے "لَیْسَ کَمِثْلِهٖ شَیْءٌ" اس لئے اس بارہ میں سوائے اس کے کہ انسانوں کے اس گروہ پر اعتماد کیا جائے جس کو اللہ تعالیٰ نے اپنی ذات وصفات کا علم ویقین خود بخشا ہے، اور روشنی و ہدایت عطا کی ہے، کوئی اور ذریعہ نہیں ہے، اور ہمیں اس کے مقابلہ میں انکار و بحث کا کوئی حق نہیں، اسی حقیقت کو قرآن مجید میں ایک پیغمبر کی زبان سے اس طرح بیان کیا گیا ہے "قَالَ اَتُحَآجُّوْٓنِّیْ فِی اللّٰهِ وَقَدْ هَدٰىنِ" (کیا تم مجھ سے اللہ کے بارے میں بحث وجدال کرتے ہو، حالانکہ اللہ تعالیٰ مجھے اس بارے میں راستہ پر لگا چکا ہے)۔

فلسفہ کی سعی لاحاصل

یہ ایک ایسی واضح اور روشن حقیقت تھی کہ جس کی موجودگی میں فلسفہ کو ذات وصفاتِ الٰہی کے بارے میں کسی دردِ سری کی ضرورت نہ تھی، لیکن یہ علم انسانی کی تاریخ کا ایک عجیب واقعہ ہے کہ کئی ہزار برس تک فلسفہ نے اس شغل لاحاصل کو جاری رکھا، اور اپنی بہترین ذہانتیں اور توانائیاں ایک ایسے موضوع پر صرف کیں جس کے متعلق خود اس کو اعتراف ہے کہ اس کو اس کے مبادی ومقدمات بھی حاصل نہیں تھے، اور اس کے بارے میں اس کے پاس یقین حاصل کرنے اور قطعی رائے قائم کرنے کا کوئی ذریعہ نہ تھا، پھر اس نے اس بارے میں ایسی تدقیق وتفصیل اور ایسی بے تکلفی سے کام لیا جو علمائے لغت و اشتقاق کسی لفظ کے بارے میں، اور علمائے صرف ونحو تصریف وترکیب میں برتتے ہیں، بلکہ ماہرین علم الکیمیا ادویہ ونباتات کے بارے میں کرتے ہیں، اور مباحث وتفصیلات کا اتنا انبار اکٹھا کر دیا اور ایسی بال کی کھال نکالی کہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ ساری بحث کسی ایسی محسوس ومرئی ہستی کے بارے میں ہو رہی ہے، جو بالکل ان کے تصرف اور دسترس میں ہے۔

متکلّمین کا تفلسف

اس سے زیادہ عجیب تر واقعہ یہ ہے کہ متکلمین اسلام نے جو فلسفہ کے رد کے لئے اور اسلام کی

مدافعت کے لئے کھڑے ہوئے تھے فلسفہ کی انہی اصطلاحات ومفروضات کو تسلیم کرلیا اور خدا کی ذات وصفات کے متعلق ایسے وثوق وتحکم اور تفصیل وتدقیق سے بحث شروع کردی گویا وہ بھی کسی محسوس ومشاہد ہستی اور کسی طبعی مسئلہ کے متعلق گفتگو کر رہے ہیں، وہ فلسفہ کی تردید کے لئے نکلے تھے لیکن وہ بھی فلسفہ کے مفروضات اور اصطلاحات کے جنگل میں گم ہوگئے، سوال وجواب وبحث ومباحثہ کے جوش میں ان کو یہ خیال نہیں رہا کہ وہ فلسفہ کو اس کی بنیادی غلطی پر سرزنش کریں کہ وہ ایک ایسے مسئلہ وموضوع سے بحث کر رہا ہے جس کے مبادی ومقدمات اور اس پر بحث کرنے کی استعداد واستحقاق حاصل نہیں اور وہ فلاسفہ سے یہ کہیں کہ تمہارے بحث ونظر کا میدان صرف ریاضیات وطبعیات ہے، تم کو اپنی بحث ونظر کو اسی میدان کے اندر محدود رکھنا چاہئے الٰہیات میں تمہاری مداخلت اپنے حدود سے تجاوز اور "دخل در معقولات" ہے اور وہ قرآن کے حکیمانہ وبلیغ الفاظ میں فلاسفہ کو مخاطب کرکے کہیں :۔

هَاَنْتُمْ هٰٓؤُلَآءِ حَاجَجْتُمْ فِيْمَا لَكُمْ بِهٖ عِلْمٌ	سنتے بھی ہو تم جھگڑ چکے ایسی باتوں میں جس کا تم کو
فَلِمَ تُحَآجُّوْنَ فِيْمَا لَيْسَ لَكُمْ بِهٖ عِلْمٌ ؕ	(تھوڑا بہت) علم تھا، پھر اب کیوں جھگڑا کرتے
وَاللّٰهُ يَعْلَمُ وَاَنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ ۝	ہو، ایسی باتوں میں جس کا تم کو کچھ بھی تو علم نہیں، اور
(آل عمران۔٦٦)	اللہ تعالیٰ جانتا ہے، اور تم نہیں جانتے۔

قرونِ متاخرہ میں اسلامی فکر کا انحطاط

پچھلی صدیوں میں تو اسلامی فکر کے انحطاط کا یہ عالم تھا کہ خدا کی ہستی، عالم کے حدوث، توحید، معاد، تمام بنیادی عقائد کے ثبوت کے لئے ان ہی دلائل اور ترتیب مقدمات کو اصل قرار دے دیا گیا تھا، جو متکلمین نے ترتیب دیئے تھے، اور جن کی بنیاد فلسفہ پر تھی، محدثین وفقہاء کے ایک چھوٹے سے گروہ کو چھوڑ کر عام طور پر متکلمین ونظّار عقل کو معیار قرار دیتے تھے اور کتاب وسنت کو عقائد واحکام کا ماخذ بنانے کے بجائے

متکلمین کی کتابوں کو عقائد کا ماخذ بناتے تھے، اور فلسفہ کے اعتراضات سے بچنے کے لئے، یا فلسفہ کے بعض ثابت کئے ہوئے اصول کو قائم رکھنے کے لئے اور دین کو ان کے مطابق ثابت کرنے کے لئے وہ آیات و احادیث میں تاویل سے کام لیتے تھے، باوجود فلسفہ کی تردید کے ان پر فلسفہ کا اتنا رعب طاری تھا کہ وہ بجائے فلسفہ کے انکار اور اپنے علم کلام میں تبدیلی کر دینے کے آیات و احادیث کی تفسیر و تشریح میں تاویل و توجیہ سے کام لیتے، امام ابن تیمیہ اسی ذہنیت کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں :۔

"حالت یہ ہے کہ ہر فریق نے اپنے لئے انبیاء علیہم السلام کی لائی ہوئی تعلیم کے بارے میں ایک قانون بنا رکھا ہے، جس چیز کو ان کی عقول نے تسلیم کر لیا ہے، اس کو وہ اصل قرار دیتے ہیں جس پر ان کو اعتقاد و اعتماد ہے، اور جس کو انبیاء علیہم السلام لائے اس کو تابع قرار دیتے ہیں، بس جتنا حصہ ان کے قانون کے مطابق ہوتا ہے، اس کو قبول کرتے ہیں اور جو اس کے مخالف ہوتا ہے اس کو قبول نہیں کرتے۔"[1]

ان متکلمانہ عقائد و مباحث کو اصل و معیار قرار دینے کے بعد اور یہ سمجھ لینے کے بعد کہ ان مباحث میں بڑے بلند اور عمیق علوم اور بڑے حکم و معارف ہیں، ایک کشمکش یہ پیش آتی تھی کہ اگر یہ اصلی علوم و معارف ہیں، تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم و صحابہ کرام کا کلام ان سے کیوں خالی ہے، اور ان کے یہاں یہ تفصیلات و تدقیقات کیوں نہیں ہیں؟ جو لوگ فلسفہ اور علم کلام پر پورا ایمان رکھتے تھے، اور ان کا دماغ اس سے پورے طور پر مرعوب و مسحور تھا، وہ کبھی صاف صاف اور کبھی دبی زبان سے یہ کہہ دیتے کہ وہ زمانہ ابتدائی زمانہ تھا، اس زمانہ کے لوگ سیدھے سادھے لوگ تھے، ان کو ان حقائق اور ان گہرے علوم کی خبر نہیں تھی، جو لوگ فلسفہ کی عظمت کے بھی قائل تھے اور صحابہ کرام کی عظمت کے بھی معترف تھے، وہ ایک تحیر اور کشمکش کی حالت میں تھے، اور ان سے اس بارے میں کوئی فیصلہ نہیں بن پڑتا تھا، امام ابن تیمیہ ان مختلف گروہوں کی ذہنی کیفیت کو بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں :۔

"جن لوگوں کا یہ عقیدہ ہے کہ علم کلام کی یہ بحثیں اصول دین پر مشتمل ہیں، اور ان کے اندر علوم کلیہ ،

---

[1] بیان موافقۃ صریح المعقول لصحیح المنقول حصہ اول ص۳

معارفِ الٰہیہ، حقیقی حکمت اور بنیادی فلسفہ ہے، ان میں سے بہت سے لوگ تو یہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم اصولِ دین سے واقف نہیں تھے، جنھوں نے بہت رعایت کی، انھوں نے یہ کہا کہ آپ واقف تو تھے، لیکن آپ نے ان اصول کو بیان نہیں کیا، جن کے دل میں نبیؐ کا احترام ہے، وہ کہتے ہیں کہ صحابہؓ و تابعین ان اصول سے واقف نہیں تھے، جن کے دلوں میں صحابہؓ و تابعین کی بھی عظمت ہے، اور ان متکلمین و فلاسفہ کے اقوال کی بھی، وہ ایک تحیر و کشمکش کی حالت میں ہیں، اور ان کے پاس اس کا کوئی جواب نہیں کہ ان بزرگواروں نے ان امور و مسائل میں کیوں کلام نہیں کیا، جو افضل العلوم ہیں، اور جو رسول اللہ (صلے اللہ علیہ وسلم) پر ایمان رکھتے ہیں، اور آپ کی عظمت بھی ان کے دل میں ہے، ان کو یہ بڑا اشکال معلوم ہوتا ہے کہ آپ نے دین کے ان اصولی مسائل کی تشریح و تفصیل کیوں نہیں فرمائی، حالانکہ دوسرے مسائل کے مقابلہ میں لوگوں کو ان کی ضرورت زیادہ ہے۔"[1]

امام ابن تیمیہ لکھتے ہیں کہ فلسفہ و علم کلام کے ان پرستاروں نے اللہ اور اس کے رسول کے قول کو مجمل قرار دیا، جس سے کوئی علم و ہدایت حاصل نہیں ہو سکتی، اور اپنے متشابہ کلام کو محکم، اور اللہ اور اس کے رسول کے محکم کلام کو متشابہ قرار دیا۔[2]

عقل کی تعظیم و تقدیس میں مبالغہ

فلاسفہ اور متکلمین دونوں نے مل کر صدیوں عقل کا ایسا آوازہ بلند کیا اور ذات و صفات کے مسائل میں اس کو اس طرح حکم و میزان قرار دیا کہ معلوم ہوتا تھا کہ وہ ان مسائل میں اسی طرح فیصلہ کرنے کی مجاز ہے، جیسے محسوسات میں ہمارے حواس خمسہ اور عملیات میں تجربہ و استقراء، اس صورتِ حال کا نتیجہ یہ تھا کہ عقل شریعت کے ثبوت کے لئے خواہ شرعیات ہوں، خواہ فقہیات، بنیاد بن گئی، اسلام کی ان چھ صدیوں میں کسی مفکر اور عالم نے عقل کی اس غیر محدود فرمانروائی کے خلاف علم بغاوت بلند کرنے کی جرأت نہیں کی، حجۃ الاسلام امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ نے فلسفہ کے حصۂ الٰہیات کے

---

[1] بیان موافقۃ صریح المعقول لصحیح المنقول حصۂ اول ص ۱۳
[2] ایضاً ص ۱۶۴

خلاف قلم اٹھایا، اور اس کو اپنے طنز و تحقیر کا نشانہ بنایا لیکن عقل کی اس مطلق العنان سلطنت اور اس کے دخل در معقولات کے خلاف انھوں نے کبھی کوئی مؤثر آواز بلند نہیں کی' امام ابن تیمیہ (ہمارے علم میں) پہلے شخص ہیں جنھوں نے اس صورتِ حال کے خلاف بلند آہنگی کے ساتھ صدائے احتجاج بلند کی اور پوری جرأت کے ساتھ یہ ثابت کیا کہ عقائد و حقائق کا اصل ماخذ وحی و نبوت اور کتاب و سنت ہے عقل ان کی مؤید اور مصدق تو ہے لیکن ان کے ثبوت کی بنیاد نہیں وہ ایک جگہ صاف لکھتے ہیں :-

انّ العقل لیس اصلاً لثبوتِ الشرع فی نفسہ ولا معطیاله صفۃ لم تکن له ولا مفیدًا له صفۃ کمال[1]	عقل فی نفسہٖ شریعت کے ثبوت کے لئے اصل کی حیثیت نہیں رکھتی، اور نہ اس کو کوئی ایسی صفت بخشتی ہے، جو اس کو پہلے سے حاصل نہ تھی اور نہ اس کو کمال کی صفت عطا کرتی ہے

عقل کا منصب و مقام

ان کا کہنا یہ ہے کہ عقل صرف معرّف و رہنما ہے' اس کا کام یہ ہے کہ رسول کی صداقت و عصمت کے اقرار و اعتراف تک پہنچا دے پھر سبکدوش ہو جائے' عقل یہ ثابت کر دیتی ہے کہ رسول جو کچھ اطلاع دے اس کی تصدیق اور جو کچھ حکم دے اس میں اس کی اطاعت واجب ہے' وہ رسول کی صداقت پر عمومی اور مطلق حیثیت سے دلالت کرتی ہے' ان کے نزدیک اس کی حیثیت بالکل ایسی ہے، جیسے کوئی عامی شخص کسی ناواقف کو شہر کے مفتی کے پاس پہنچا دے' اور بتلا دے کہ یہ عالم و مفتی ہے' پھر اگر اس عامی رہنما اور اس مفتی کے درمیان کسی مسئلہ میں اختلاف ہو تو مستفتی کا بھی فرض ہوگا کہ وہ مفتی کے قول کو ترجیح دے اور اس عامی کو یہ کہنے کا حق نہیں ہوگا کہ میں نے ہی تو رہنمائی کی ہے اگر میں رہنمائی نہ کرتا تو تم کو اس مفتی تک رسائی کیسے ہوتی؟[2] وہ لکھتے ہیں کہ رسالت کے علم کے بعد عقل کا کام ہے کہ وہ رسول پر اعتماد اور اس کی اطاعت کرے جس طرح ہر فن میں صاحبِ فن کی تقلید کی جاتی ہے'

---

[1] بیان موافقۃ صریح المعقول لصحیح المنقول جلد اول ص۴۶ [2] ایضاً ص۷

اور بے چوں وچرا اس کے مشورہ پر عمل کیا جاتا ہے، اور اس کے قول کو قولِ فیصل سمجھا جاتا ہے، اسی طرح سے امورِ غیبیہ احکام وشرائع اور مابعد الطبیعات میں رسول سند کی حیثیت رکھتے ہیں، اور ان کا قول قولِ فیصل ہے، وہ لکھتے ہیں:۔

"جب کسی شخص کو عقل سے یہ معلوم ہو جائے کہ فلاں شخص رسول ہے، اور اس کے نزدیک یہ ثابت ہو جائے کہ اس نے کسی چیز کی خبر دی ہے، اور اس کی عقل اس میں کوئی اشکال پیش کرے تو اس کی عقل ہی کا یہ تقاضا ہے کہ وہ یہ مختلف فیہ چیز ایسی ہستی پر محوّل کرے، جو اس کے مقابلہ میں اس کا زیادہ علم رکھتی ہے، اور اپنی رائے کو اس کے قول پر مقدم نہ رکھے، اور یہ سمجھے کہ اس کی عقل اس کے مقابلہ میں قاصر اور ضعیف ہے، اور اس ہستی کو اللہ تعالیٰ کا اور اس کے اسماء وصفات کا اور یوم آخرت کا علم زیادہ ہے، جو فرق اس عامی شخص اور ایک پیغمبر میں ہے، وہ فرق اس سے کہیں زیادہ بڑا ہے جو عوام اور علمائے طب میں ہے، پس جب وہ اپنی عقل کے بموجب ایک یہودی طبیب کی بھی اطاعت کرتا ہے، اور غذا، شربت، ضماد (لیپ) اور مسہلات وغیرہ کی جو مقدار اور ترکیب تجویز کر دیتا ہے تو باوجود تکلیف اور مشقت کے وہ اس کی تعمیل کرتا ہے محض یہ سمجھ کر کہ یہ طبیب اپنے فن کا مجھ سے زیادہ واقف ہے، اگر میں اس پر اعتماد کروں گا اور اس کے مشورہ کی تعمیل کروں گا تو صحت کی امید ہے، باوجود اس کے کہ وہ یہ بھی جانتا ہے کہ اطبّاء سے غلطیاں بھی ہوتی ہیں، اور بہت سے لوگوں کو طبیبوں کی تجویز اور معالجہ سے صحت بھی نہیں ہوتی، بلکہ بعض اوقات یہی علاج موت کا سبب بن جاتا ہے، اس کے باوجود وہ اس کا قول قبول کرتا ہے، اور اس کی تقلید کرتا ہے، خواہ اس کا گمان اور اجتہاد طبیب کی تجویز کے مخالف ہو، اس سے سمجھنا چاہئے کہ پیغمبروں کے مقابلہ میں مخلوق کی حیثیت کیا ہے، پھر یہ بھی یاد رکھنا چاہئے کہ خدا کے پیغمبر صادق القول ہوتے ہیں، اور ان کو بھی صحیح اطلاع دی جاتی ہے، یہ ممکن نہیں کہ ان کی اطلاع خلافِ واقعہ ہو، اور جو لوگ محض اپنی عقل کی بنا پر ان کے اقوال کا مقابلہ کرتے ہیں، ان کی جہالت اور ضلالت کا کوئی ٹھکانا نہیں"۔[1]

[1] بیان موافقۃ صریح المعقول لصحیح المنقول۔ حصۂ اول ص۳۸

رسول پر بلا شرط ایمان ضروری ہے

جو لوگ عقلیات اور فلسفہ سے متاثر تھے ان کی ذہنی ساخت کچھ ایسی ہوگئی تھی کہ شریعت کی جو بات عقل اور اصولِ فلسفہ کے مطابق ہوتی اس کو ان کا ذہن قبول کرتا اور جو ان کے اِن اصول و مسلمات کے خلاف ہوتی اس کے قبول کرنے سے ان کا ذہن قاصر رہتا، اور اس میں ہزاروں الجھنیں محسوس کرتے ان میں سے جو لوگ بیباک اور جری ہوتے وہ صاف انکار کر دیتے اور کہتے کہ شریعت کا مطابقِ عقل ہونا ضروری ہے، یہ بات چونکہ عقل کے خلاف ہے، اس لئے قابلِ قبول نہیں جو لوگ اس درجہ جری نہ ہوتے، وہ اس کی توجیہ کرتے اور بعید سے بعید تاویل سے ان کو باک نہ ہوتا، امام ابن تیمیہ نے جابجا یہ ثابت کیا ہے کہ رسول پر بلا شرط ایمان ضروری ہے اور رسول کی صحیح حیثیت و منصب یہی ہے کہ اس پر غیر مشروط طریقہ پر ایمان لایا جائے، اور درحقیقت اسی کا نام ایمان ہے مشروط تصدیق کا نام شریعت کی اصطلاح میں ایمان ہی نہیں ہے، وہ لکھتے ہیں:-

ففی الجملۃ لا یکون الرجل مؤمنا حتی	خلاصہ یہ ہے کہ انسان اس وقت تک مومن نہیں ہو سکتا
یؤمن بالرسول ایمانا جازما لیس مشروطا	جب تک کہ رسول پر ایسا قطعی ایمان نہ لائے جس کے ساتھ کسی
بعدم معارض فمتی قال أومن بخبرہ الا	معارض کے نہ ہونے کی بھی شرط نہ ہو جب وہ شخص یہ کہے گا کہ
ان یظھر لہ معارض یدفع خبرہ لم یکن	میں رسول کی اطلاع پر اس وقت تک کے لئے ایمان لاتا ہوں
مؤمنا بہ فھذا اصل عظیم تجب معرفتہ[1]	جب تک کہ کوئی ایسا معارض ظاہر نہ ہو، جو اس کی اطلاع
	کی تردید کر دے تو وہ شخص مومن نہیں ہوگا یہ ایک بہت
	بڑا اصول ہے جس کا جاننا ضروری ہے۔

دوسری جگہ لکھتے ہیں:-

---

[1] بیان موافقۃ صریح المعقول لصحیح المنقول حصہ اول ص۱۰۱

"دین اسلام سے یہ بات قطعی اور بدیہی طور پر ثابت ہو چکی ہے کہ مخلوق پر رسول کی ایسی تصدیق و ایمان واجب ہے جو قطعی اور عمومی ہو جس میں کوئی شرط اور قید نہ ہو اور یہ کہ اس کی ہر اطلاع کی تصدیق کی جائے اور اس کے ہر حکم کی اطاعت کی جائے اس کے خلاف جو بات بھی ہوگی وہ باطل ہوگی، جو شخص رسول کی اس بات کی تو تصدیق کرتا ہے جس کو اس کی عقل قبول کرتی ہے اور اس کی اس اطلاع کو رد کر دیتا ہے جو اس کی رائے اور عقل کے خلاف ہوتی ہے اور رسول کی اطلاعات پر اپنی عقل کو مقدم رکھتا ہے اور یہ بھی کہے جاتا ہے کہ میں رسول کو سچا جانتا ہوں تو وہ متناقض باتیں کرتا ہے اور فاسد العقل اور ملحد ہے اور جو شخص کہتا ہے کہ میں اس وقت تک رسول کی اطلاع کی تصدیق نہ کروں گا جب تک کہ میں اس کو اپنی عقل سے سمجھ نہ لوں تو اس کا کفر کھلا ہوا ہے۔"[1]

عقل کے ہوائی قلعے

امام ابن تیمیہ اس کے بعد مدعیانِ عقل کے اس دعوی کا بھی جائزہ لیتے ہیں کہ عقل و نقل میں اکثر تعارض و تضاد ہوتا ہے اور پیغمبروں نے جن چیزوں کو عقائد و حقائق کے طور پر پیش کیا ہے، وہ بعض اوقات صریح عقل و ہدایت کے خلاف ہوتے ہیں اور ان حقائق و مسلّمات سے متصادم ہوتے ہیں جو ہزاروں برس کے غور و فکر کا نتیجہ اور فلسفہ کی بنیاد ہیں، وہ ثابت کرتے ہیں کہ جن عقلیات کو پیغمبروں کی اطلاعات اور کتاب و سنت کے نصوص کا معارض بتایا جاتا ہے وہ اکثر محض توہمات ہیں اور غور کرنے کے بعد عقل کے ہوائی قلعے ثابت ہوتے ہیں اگر ان کی علمی تنقید اور احتساب کیا جائے اور ان کو قریب سے دیکھا جائے تو معلوم ہو کہ یہ محض لفاظی اور ہوا بندی تھی ان کی کوئی علمی بنیاد نہیں، وہ لکھتے ہیں:-

"بہت سے وہ عقلیات جن کا یہ مدعیانِ عقل دعوی کرتے ہیں اور ان کو نصوص کا مخالف بتلاتے ہیں تنقید اور امتحان کے بعد ثابت ہوتا ہے کہ ان میں کوئی حقیقت نہیں تھی، یہ ایسا ہی ہے جیسے کوئی بچوں کو یا بچوں کی طرح ناواقف آدمی کو خالی سوکھی ہوئی مشکیں ہلا ہلا کر اور بجا بجا کر ڈرائے جب کبھی معقولات پر پورا غور

---

[1] بیان موافقۃ صریح المعقول لصحیح المنقول حصہ اول صا۱۱

کیاجاتا ہے اور ان پر گہری نظر ڈالی جاتی ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ وہ خود رسول کی اطلاعات کی صداقت کے لئے دلائل وبراہین کا کام دیتی ہیں اور یہ کہ اس کی اطلاعات سے جو کچھ لازم آتا ہے وہ سب صحیح ہے، اور جس شخص نے اس کی نفی کی ہے، وہ محض حقیقت سے ناواقفیت کی بنا پر اور ظاہری اور باطنی طور پر مرعوب ہو کر، بالکل جیسے کوئی شخص معبودانِ باطل سے ڈر جائے اور سمجھے کہ وہ اس کو نقصان پہنچا سکتے ہیں یا کوئی شخص اپنے ضعفِ ایمان کی وجہ سے دشمن اسلام سے جو خود کمزور ہو، ہراس زدہ اور سراسیمہ ہو جائے۔[۱]

دوسری جگہ لکھتے ہیں:۔

"یہ لوگ جو فلسفہ کے مہیب و پرشکوہ الفاظ سے ان کی حقیقت کے جانے بغیر مرعوب ہو گئے ہیں ان کی مثال ایسی ہی ہے جیسے کوئی نامرد دشمن سے محض ان کا لباس اور پوشاک دیکھ کر مرعوب ہو جائے اور اس کو ان کی حقیقت حال دریافت کرنے کی نوبت نہ آئے لیکن جو شخص ان کی حقیقت دریافت کرے گا وہ دیکھے گا کہ وہ خود انتہائی ضعیف و عاجز ہیں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:۔

سَنُلْقِيْ فِيْ قُلُوْبِ الَّذِيْنَ كَفَرُوا الرُّعْبَ	ہم جلد ہی ڈال دیں گے کافروں کے دلوں میں ہیبت
بِمَآ اَشْرَكُوْا بِاللّٰهِ مَالَمْ يُنَزِّلْ بِهٖ سُلْطَانًا[۲]	کیونکہ انھوں نے شریک جانا اللہ کا جن کی اللہ نے کوئی
(آلِ عمران۔۱۵۱)	سند نہیں اتاری۔

اہلِ دانش کی بے دانشی

وہ کہتے ہیں کہ ان اقوال و تدقیقات پر غور کیا جائے جن پر ان کو بڑا ناز ہے اور جن کو انھوں نے الٰہیات کا نام دیا ہے اور جن کو ان کے پیرو انبیاء علیہم السلام کے کلام کے مقابلہ میں پیش کرتے ہیں، نظر انصاف سے دیکھا جائے کیا اس میں اور دیوانوں کی بے سروپا باتوں میں کچھ فرق معلوم ہوتا ہے:۔

---

[۱] بیان موافقۃ صریح المعقول لصحیح المنقول حصہ چہارم ص۱۵۳ [۲] ایضاً ص۱۵۴

"صاحبِ عقل ان لوگوں کے کلام کو غور سے دیکھے جو بڑی مہارت اور تحقیق کے مدعی ہیں، اور اپنی عقل و دانش سے انبیاء علیہم السلام کے کلام کو رد کرتے ہیں، فلسفہ کی چوٹی پر پہونچ کر اور عقل و حکمت کے بلند ترین مقام سے ایسی باتیں کہتے ہیں، جو دیوانوں کی باتوں سے بالکل ملتی جلتی ہیں، جو صحیح و حق بات بداہتہً ثابت ہے اس کو رد کرتے ہیں، اور جو بے بنیاد اور بے اصل بات جس کا بطلان بالکل بدیہی اور ظاہر ہے اس کو اپنے تلبیس آمیز کلام سے مقبول بناتے ہیں۔"[1]

صریح عقل اور صحیح نقل میں کبھی تعارض نہیں ہوتا

لیکن امام ابن تیمیہ عقل کا پورا احترام کرتے ہیں، ان کے نزدیک قرآن مجید میں جا بجا عقل سے کام لینے اور اس سے فائدہ اٹھانے کی تلقین کی گئی ہے، ان کے نزدیک صریح عقل اور صحیح نقل میں کبھی تعارض نہیں ہو سکتا، وہ کہتے ہیں کہ میں نے اپنے وسیع مطالعہ و طویل غور و فکر میں کبھی عقل و نقل میں تعارض و تضاد نہیں دیکھا، لیکن شرط یہ ہے کہ عقل سلیم ہو، اور نقل صحیح و محفوظ ہو، اس موضوع پر انھوں نے ایک مستقل ضخیم کتاب "بیان موافقۃ صریح المعقول لصحیح المنقول" تصنیف کی ہے،[2] جس میں انھوں نے مفصّل و مدلل طریقہ پر ثابت کیا ہے کہ معقول و منقول میں پوری موافقت ہے، اور جو باتیں وحی و نبوت کتاب و سنت سے ثابت ہو چکی ہیں صحیح و کامل عقل ان سب کی تصدیق کرتی ہے، عقل ہمیشہ ان نصوص و منقولات کی تائید و تصدیق کرتی رہی، اور جب بالغ نظری اور دقّتِ نظر سے کام لیا جائے گا، عقل کو ان منقولات کی تائید و تصدیق ہی میں دیکھا جائے گا، وہ لکھتے ہیں:۔

"صحیح و واضح عقلی دلائل جن میں کوئی شک نہیں ہے بلکہ یقینی فطری علوم سب کے سب انبیاء علیہم السلام کی اطلاعات کے موافق ہیں، مخالف نہیں اور صحیح عقلی دلائل تمام تر نقل و روایت (سمع) کے مطابق ہیں ذرا بھی اس کے خلاف نہیں، الحمد للہ میں نے مختلف فرقوں کا کلام اور ان کے مسائل پر غور کیا ہے، اور اسی بات کو صحیح پایا ہے۔"[3]

---

[1] ایضاً حصہ سوم صفحہ ۲۴۲ [2] یہ کتاب منہاج السنۃ کے حاشیہ پر چار جلدوں میں شائع ہوئی ہے۔ [3] حصہ اول صفحہ ۲۴۷

ایک دوسری جگہ لکھتے ہیں :۔

"منقول صحیح کا کبھی معقول صریح معارض نہیں ہوتا، میں نے اختلافی مسائل میں بھی اس اصول کی تحقیق کی اور میں نے یہی دیکھا کہ صحیح و صریح نصوص کے خلاف جو کچھ بھی پیش کیا جاتا ہے، وہ محض فاسد شبہات ہوتے ہیں، جن کا ابطال عقل سے ثابت ہوتا ہے بلکہ عقل سے ان شبہات کے بالکل خلاف اور شرع کے بالکل موافق ثابت ہوتا ہے، میں نے بڑے بڑے اصولی مسائل توحید و صفات، مسائل قدر و نبوات وغیرہ کو بھی اس نظر سے دیکھا اور یہی پایا کہ جو صراحۃً عقل سے ثابت ہوتا ہے کبھی سمعیات و منقولات ان کے مخالف نہیں ہوتے، بلکہ وہ نقل و روایت جس کے متعلق کہا جاتا ہے کہ وہ صریح عقل کے خلاف ہے، تحقیق سے یا تو موضوع حدیث ثابت ہوتی ہے، یا اس کی روایت ضعیف ہوتی ہے اس لئے وہ دلیل بنانے کے قابل نہیں ہوتی ہم جانتے ہیں کہ پیغمبر اُن چیزوں کی اطلاع نہیں دیتے، جو عقلاً محالات میں سے ہیں بلکہ ان چیزوں کی اطلاع دیتے ہیں جن میں عقل حیران و سرگشتہ ہوتی ہے، وہ اس چیز کی اطلاع نہیں دیتے جس کی عقل نفی کرتی ہے، بلکہ اس چیز کی اطلاع دیتے ہیں جس کی حقیقت سمجھنے سے عقل عاجز رہتی ہے[1]"

وہ دعویٰ سے کہتے ہیں (اور ان کا دعویٰ بڑا وزن رکھتا ہے) کہ ایک حدیث یا نقل بھی عقل کے مخالف نہیں، اور اگر ایسی کوئی حدیث ہے تو وہ اہلِ فن کے نزدیک ضعیف یا موضوع ہے۔

قرآن میں بہترین عقلی دلائل ہیں

ان کو متکلمین و فلاسفہ کے اس دعویٰ کے تسلیم کرنے سے انکار ہے کہ قرآن مجید ایک ایسا صحیفہ ہے، جس کی بنیاد محض نقلیات و سمعیات پر ہے، انھوں نے جابجا ثابت کیا ہے کہ قرآن مجید میں بہترین عقلی دلائل ہیں، اور دلائل ایسے محکم، مدلّل اور واضح الثبوت ہیں جن کو فلاسفہ اور متکلمین کے دلائل جو بحث و تنقید کے بعد تارِ عنکبوت ثابت ہوتے ہیں، پہنچ نہیں سکتے، وہ فرماتے ہیں :۔

[1] حصہ اول ص۸۳

"اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں ایسے عقلی دلائل بیان فرمائے ہیں، جن کی اس علم میں ضرورت ہے، اور یہ فلاسفہ و متکلمین ان کا پورا اندازہ بھی نہیں کر سکتے، یہ جن دلائل و نتائج کو پیش کرتے ہیں، قرآن مجید نے ان کا خلاصہ بہترین طریقہ پر پیش کر دیا ہے"۔[1]

دوسری جگہ لکھتے ہیں:-

"رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے اثبات صانع اور اس کی صفات و افعال کی معرفت کے سلسلہ میں دنیا کے سامنے جو کچھ پیش کیا وہ صریح عقل کے مطابق ہے، اور عقلاء کی بڑی سے بڑی عقلی بلند پروازیوں سے بلند ہے، ان اگلے پچھلے فلاسفہ و متکلمین کو جن دلائل پر بڑا ناز ہے وہ قرآن مجید میں کہیں ضمناً آجاتے ہیں، لیکن یہ فلاسفہ حق و باطل کی تلبیس کے عادی ہیں، اس لئے اس کو سیدھے سیدھے طریقہ پر بیان نہیں کرتے"۔[2]

رسول کی تعلیم میں التباس نہیں

فلاسفہ و متکلمین اور ان کے ہمنواؤں کے گروہ میں بہت سے لوگ اس بات کے قائل تھے کہ رسول نے ذات و صفات کے بارے میں پوری تفصیل و تشریح سے کام نہیں لیا، بلکہ ان چیزوں کو مجمل و مبہم طریقہ پر بیان کیا گیا ہے، قرآن مجید کا بہت سا حصہ شرح کا محتاج ہے، اور خدا نے پچھلے دور میں متکلمین کو یہ توفیق دی کہ وہ اس کی شرح و تفصیل کریں اور عقائد و حقائق دینی کو مفصل و مدلل طریقہ پر امت کے سامنے پیش کریں، وہ کہتے ہیں کہ رسول کو بلاغِ مبین کا حکم تھا، آپ نے ہر اس چیز کی تفصیل و تشریح کی جس کی تفصیل و تشریح دین کے لئے ضروری تھی، عقائد و اصول دین کی بنیادیں اور خدا کی ذات و صفات جس کے بغیر معرفت اور انسان کی سعادت و نجات ممکن نہیں، کیسے مجمل و مبہم چھوڑے جا سکتے تھے، جس کتاب کے سمجھنے اور سمجھ کر پڑھنے اور اس پر غور و تدبر کی جا بجا دعوت دی گئی ہے، وہ اس اجمال و ابہام کی حالت میں کیسے چھوڑی جا سکتی تھی، وہ لکھتے ہیں:-

"رسول نے تبلیغ کا حق ادا کیا، اور مکمل و واضح طریقہ پر خدا کی بات پہنچائی، اور اس کے مراد و منشاء

---

[1] حصہ اول ص۱۴۲ [2] حصہ سوم ص۶۸

کو واضح کیا، قرآن و حدیث میں اگر کوئی لفظ ایسا ہے جس کے ظاہری معنی نہیں لئے جا سکتے تو یہ ضروری بات ہے کہ رسول نے دوسرے لفظوں سے اس کے معنی و مراد کی تعیین کی، یہ ممکن نہیں کہ آپ ایسے لفظ بولیں جس کا ظاہری مفہوم و مدلول باطل ہو، اور آپ اس کی صحیح مراد بیان نہ کریں اور یہ بات بھی کسی طرح عقل میں نہیں آتی کہ آپ لوگوں سے کلام کے اس مطلب کے سمجھنے کا مطالبہ کریں جس کی آپ نے ان سے تشریح نہ کی ہو، اور جس کی رہنمائی نہ فرمائی ہو محض اس وجہ سے کہ لوگ اس کو اپنی عقل سے سمجھ سکتے ہیں، یہ حقیقت میں اس رسول پر بہت بڑا اعتراض ہے، جس نے خدا کی بات بے کم و کاست پہنچائی ہے۔[1]

دوسری جگہ لکھتے ہیں :-

"اللہ تعالیٰ نے رسول کو بلاغ مبین کا حکم دیا، اور آپ سے بڑھ کر اپنے رب کا کوئی فرمانبردار اور تابعدار نہیں تھا، تو یہ ضروری بات ہے کہ آپ نے یہ بلاغ مبین پہونچایا، اس بلاغ مبین کے ساتھ آپ کے بیان میں التباس و تلبیس نہیں ہو سکتی، باقی جن آیات کے متعلق قرآن مجید میں کہا گیا ہے کہ متشابہات ہیں جن کی تاویل اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی نہیں جان سکتا تو یہاں تاویل سے مراد تفسیر نہیں بلکہ ان کی حقیقت ان کے وقوع کی شکل اور ان کا آل ہے۔"[2]

امام ابن تیمیہ کی دعوت اور ان کا کارنامہ

غرض یہ کہ امام ابن تیمیہ نے اس بات پر پورا زور دیا ہے کہ عقائد کا ماخذ وحی و نبوت اور کتاب و سنت کو بنایا جائے اور انہی کے نصوص کو اس بارے میں معیار کا درجہ دیا جائے، انھوں نے ساری عمر اس کی دعوت دی اور مشکل سے ان کی کوئی تصنیف اس سے خالی نظر آئے گی، اس طرح انھوں نے فکر اسلامی کو طاقت و تازگی بخشی، جو فلسفہ و علم کلام اور عجمی روح سے بہت کچھ مجروح و مضمحل ہو گئی تھی۔

---

[1] حصہ سوم ص۱ [2] حصہ اول ص۱۶۷ امام ابن تیمیہ نے اپنی مختلف تصنیفات میں تفصیل کے ساتھ اس بات کو ثابت کیا ہے کہ تاویل کے تین معنی ہیں، ایک اصطلاح قرآنی جس سے مراد حقیقت و مآل ہے، ایک اصطلاح متقدمین جس سے مراد تفسیر ہے، اور ایک اصطلاح متاخرین و متکلمین جس سے مراد کسی لفظ کے وہ معنی مراد لینا جو ظاہری طور پر نہ نکلتے ہوں کسی خاص وجہ سے۔

فقہیات کا ماخذ کتاب و سنت

دورِ تقلید سے پہلے

"تاریخ سے معلوم ہوتا ہے کہ چوتھی صدی ہجری سے پیشتر کسی ایک امام یا کسی ایک مذہب (فقہی) کی تقلید کا رواج نہیں ہوا تھا، لوگ کسی ایک عالم کی تقلید یا کسی ایک مذہب کی تعیین اور التزام کے بغیر عمل کرتے تھے، اور یہ سمجھتے تھے کہ وہ شریعت پر عمل کر رہے ہیں، اور براہِ راست رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی پیروی کر رہے ہیں، اسی طرح سے ضرورت کے وقت کسی معتبر عالم سے مسئلہ دریافت کر لیتے تھے، اور عمل کرتے تھے، چوتھی صدی میں بھی کسی ایک مذہب کی تقلیدِ خالص اور اس کے اصول و طریق پر فقہ حاصل کرنے اور فتویٰ دینے کا دستور عام نہیں تھا، شیخ الاسلام حضرت شاہ ولی اللہ "حجۃ اللہ البالغہ" میں لکھتے ہیں :۔

"چوتھی صدی میں بھی امت کے دو طبقوں کا معاملہ الگ الگ تھا، عوام ان مسائل میں جو اجماعی ہیں، اور جن میں مسلمانوں کے درمیان یا جمہور مجتہدین میں کوئی اختلاف نہیں، صاحبِ شرع (علیہ الصلوٰۃ والسلام) ہی کی تقلید کرتے تھے، وہ وضو، غسل اور نماز و زکوٰۃ کا طریقہ اپنے والدین یا اپنے شہر کے اساتذہ و مربیوں سے سیکھ کر اسی کے مطابق چلتے رہتے تھے، اگر کوئی غیر معمولی صورتِ حال پیش آتی تو اس کے بارے میں کسی مفتی سے جو ان کو میسر آتا، استفتاء کرتے تھے اس میں کسی مذہب کی شرط نہ تھی۔

خواص میں سے جن کا اشتغال حدیثِ نبوی سے تھا، ان کو صحیح احادیث اور آثارِ صحابہ کی موجودگی

میں کسی اور چیز کی ضرورت نہ تھی، کوئی مشہور صحیح حدیث جس پر بعض فقہاء نے عمل کیا ہے، اور جس پر عمل نہ کرنے کا کسی کے پاس کوئی عذر نہیں، یا جمہور صحابہ و تابعین کے اقوال جو ایک دوسرے کے مؤید ہوتے تھے، ان کے لئے کافی تھے، اگر مسئلہ میں ان کو کوئی ایسی چیز نہ ملتی جس سے قلب مطمئن ہوتا، اس وجہ سے کہ روایات متعارض ہیں، یا ترجیح کی وجہ ظاہر نہیں ہے، یا اسی طرح کا کوئی اور اشکال پیش آتا تو فقہائے متقدمین میں سے کسی کے کلام کی طرف رجوع کر لیتے، اگر اس مسئلہ میں دو قول ملتے تو ان میں جو زیادہ قابلِ اعتماد ہوتا، اس کو اختیار کرتے، خواہ وہ اہلِ مدینہ کا قول ہو یا اہلِ کوفہ کا۔

جو ان میں سے اہلِ تخریج ہوتے، وہ ایسے مسئلہ میں جس میں کوئی صراحت نہ پاتے تخریج اور اجتہاد فی المذہب سے کام لیتے اور ان اہلِ تخریج کی ان مذاہب کی طرف نسبت کی جاتی (جس میں وہ تخریج سے کام لیتے) اور کسی کو شافعی اور کسی کو حنفی کہا جاتا، خود محدثین میں سے جس کا کسی مذہب کی طرف زیادہ میلان ہوتا، اور وہ اکثر مسائل میں اس سے اتفاق کرتا، ان مذاہب کی طرف نسبت کی جاتی چنانچہ نسائی اور بیہقی کو شافعی کہا جاتا ہے، اس وقت قضا و افتاء کے منصب پر انہی لوگوں کا تقرر ہوتا جو مجتہد ہوتے، اور فقیہ اس کو کہا جاتا جو اجتہاد کی قابلیت رکھتا تھا۔"[1]

تقلید کی ابتداء اور اس کے اسباب

چوتھی صدی کے بعد سے کچھ تو علماء کے اختلافات اور بحث و مناظرہ کی وجہ سے کچھ ان کے دینی و اخلاقی معیار کے پست ہو جانے کی وجہ سے کچھ علمی انحطاط اور پست ہمتی اور کم محنتی کی وجہ سے اس کی ضرورت پیش آئی اور اسی میں عافیت و حفاظت سمجھی گئی کہ پیشرو ائمہ مجتہدین اور مذاہب مدونہ کی تقلید اختیار کر لی جائے، اور معاصرین کے بجائے متقدمین کے فتوی پر عمل کیا جائے، لیکن عرصہ تک اس میں وہ تعیین والتزام اور تقلید شخصی کی

---

[1] حجۃ اللہ البالغہ حصہ اول صفحہ ۱۲۲ باب حکایت حال الناس قبل المأۃ الرابعۃ و بعد ہا۔

وہ پابندی نہیں پیدا ہوئی تھی، جو بعد کی صدیوں میں نظر آتی ہے، رفتہ رفتہ تعیین و التزام اور تقلید شخصی کو اختیار کیا گیا، لیکن اس کی حیثیت بھی تشریعی نہیں، بلکہ انتظامی تھی، انتشار اور اتباع ہویٰ سے بچانے کے لئے نیز عملی سہولت کی بنا پر ایک مذہب کی تقلید عملاً رائج ہوگئی، اور ایسا ہونا ایک قدرتی امر اور واقعات کے عین مطابق تھا خصوصاً تاتاری یورش کے بعد عالم اسلام پر جو عالمگیر فکری انحطاط اور علمی زوال طاری ہوا، اور ایسی بلند شخصیتوں کا عام فقدان ہوا، جو اجتہاد کی صلاحیت رکھتی ہوں، اور فرقوں اور فتنوں کی گرم بازاری ہوئی تو اسی میں عافیت سمجھی گئی کہ جن مذاہب کا کتاب و سنت کے مطابق ہونا ثابت ہے، اور جو بحث و مباحثہ کے منازل طے کر چکے ہیں، اور ان کی تدوین مکمل ہو چکی ہے، ان پر عمل کیا جائے، یہ خصوصیات مذاہبِ اربعہ میں پورے طور پر پائی جاتی تھیں، اس لئے عام طور پر انہی کو اختیار کیا گیا۔

تقلید کی حیثیت

لیکن اس تقلید کی حیثیت بھی صرف یہ تھی کہ تقلید کرنے والا اس امام پر مذہب معیّن کی تقلید یہ سمجھ کر کرتا تھا کہ وہ دراصل کتاب و سنت پر عمل کر رہا ہے، اور صاحبِ شریعت (صلے اللہ علیہ وسلم) کی پیروی کر رہا ہے، امام اس کے اور پیغمبر کے درمیان اسی طرح واسطہ ہے جیسے کوئی معاصر استاد، اس کی حیثیت محض ترجمان یا شارح کی ہے، مطاع یا شارع کی نہیں، شاہ ولی اللہ رح صاحب کے الفاظ ہیں:۔

لا يدين إلا بقول النبي صلى الله عليه وسلم	وہ مقلد صرف رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے قول کا پابند
ولا يعتقد حلالاً إلا ما أحله الله ورسوله	ہے، حلال اسی کو سمجھتا ہے جس کو اللہ اور رسول حلال کہیں،
ولا حراماً إلا ما حرمه الله ورسوله لكن	اور حرام اسی کو مانتا ہے جس کو اللہ و رسول حرام فرمائیں لیکن
لما لم يكن له علم بما قاله النبي صلى الله عليه	چونکہ آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کے قول کا اس کو براہِ راست
وسلم ولا بطريق الجمع بين المختلفات من	علم نہیں اور آپ سے جو مختلف حدیثیں روایت کی جاتی ہیں،

كلامه ولا بطريق الاستنباط من كلامه اتبع علمًا راشدًا على انه مصيب فی ما يقول ويفتی ظاهرًا متبع سنة رسول الله صلی الله عليه وسلم فان خالف ما يظنه اقلع من ساعته من غير جدال ولا اصرار۔[1]

ان میں تطبیق کی اس کو لیاقت نہیں اور نہ آپ کے کلام سے مسئلہ ثابت کرنے کا اس کو ملکہ ہے، اس شخص نے ایک مختار رشد عالم کی اس بنا پر پیروی کی ہے کہ وہ ظاہری طور پر صحیح فتویٰ دے رہا ہے اور رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی سنت کا پیرو ہے، اگر اس کے اس گمان کے خلاف نکلے گا تو وہ اسی وقت بغیر کسی بحث و اصرار کے اس فتوی اور مذہب کی پیروی سے ہٹ جائے گا (اور حدیث پر عمل کرے گا)۔

ظاہر ہے کہ اس طرح کی تقلید پر (جو محض سنت کی پیروی کی ایک عملی شکل ہے) کسی کو اعتراض نہیں ہو سکتا ایسے عامی آدمی کو اجتہاد یا استنباط مسائل کا مکلّف قرار دینا تکلیف مالا یطاق اور بداہت کا انکار ہے، اس طرح کی تقلید یا کسی غیر معین یا معین فقیہ یا مجتہد کی طرف رجوع کا دستور ہر زمانہ میں رہا ہے، یہ رجوع خواہ احیاناً ہو خواہ دائمی، قابلِ اعتراض نہیں، حضرت شاہ ولی اللہ رح فرماتے ہیں :۔

"استفتاء اور افتاء کا دستور مسلمانوں میں آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کے زمانہ ہی سے چلا آرہا ہے، اس میں کوئی فرق واقع نہیں ہوتا کہ کوئی شخص کسی معین شخص سے ہمیشہ استفتاء کرے، یا کبھی ایک سے کرے اور کبھی دوسرے سے کرے، ایسی حالت میں کہ اس کے خیال میں وہی بات ہے جو ہم نے اوپر ذکر کی ہے (یعنی یہ کہ اصل پیروی جناب پیغمبر خدا صلے اللہ علیہ وسلم کی ہے) اور اس میں کیا اشکال کی بات ہے جب کہ ہم کسی بھی فقیہ پر اس طرح کا ایمان نہیں رکھتے کہ اللہ تعالےٰ نے اس کی طرف علم فقہ کی وحی کی ہے، اور ہم پر اس کی اطاعت فرض کی ہے، اور یہ کہ وہ معصوم ہے، ہم اگر ان فقہا یا ان ائمہ مجتہدین میں سے کسی ایک کی اقتداء کرتے ہیں تو یہ سمجھ کر کہ وہ کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ کا عالم ہے، اور اس کا قول یا تو کتاب و سنت

[1] حجۃ اللہ البالغہ جلد اول ص ۱۵۱

کہ کسی صریح کلام پر مبنی ہوگا، یا ان دونوں میں سے مستنبط ہوگا، یا اس نے قرائن سے یہ سمجھا ہوگا کہ فلاں صورت میں جو حکم شرعی ہے، وہ فلاں علت کے ساتھ متعلق ہے، اور اس کا قلب اس پر مطمئن ہوگیا ہے اور اس نے غیر منصوص کو منصوص پر قیاس کیا تو گویا وہ یہ کہتا ہے کہ میرا یہ خیال ہے کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جہاں کہیں یہ علت پائی جائے وہاں حکم یہ ہوگا۔ اور یہ مسئلہ جس کو مجتہد نے قیاس کیا ہے، وہ اسی عموم کے تحت میں آتا ہے، تو درحقیقت اس سب کی نسبت نبی صلے اللہ علیہ وسلم کی طرف ہوئی لیکن بہرحال اس کے طریق میں کچھ ظنی چیزیں ہیں؛ اور اگر ایسا نہ ہوتا (اور بات بالکل صراحتاً اور نصاً ثابت ہوتی) تو کوئی صاحبِ ایمان کبھی کسی مجتہد کی تقلید نہ کرتا۔ اب اگر ہم کو رسول معصوم کی جن کی اطاعت ہم پر اللہ نے فرض کی ہے کوئی حدیث صحیح سند سے ایسی پہنچ جائے جو اس مذہب کے خلاف دلالت کرتی ہے، اور ہم اس حدیث کو چھوڑ دیں اور اس (فقہ کے قیاس) کی پیروی کریں جو ظنی ہے، اور ایک اندازہ پر مبنی ہے تو ہم سے زیادہ ظالم کون ہوگا اور کل روز قیامت ہم خدا کو کیا جواب دیں گے؟[1]

پچھلی صدیوں کا غلو و انحراف

لیکن رفتہ رفتہ عوام میں جہالت نے اثر کیا، اور کہیں کہیں ائمہ کی حیثیت وسائط و وسائل کے بجائے مقصود اور ایک طرح سے شارع اور مطاع کی پیدا ہوگئی، لوگوں کو ان مذاہب سے بالذات دلچسپی اور ان کی اس درجہ عصبیت پیدا ہوگئی کہ وہ کسی حال میں ان کے ایک شوشہ یا نقطہ سے دستبردار ہونے کے لئے تیار نہیں تھے، اس سلسلہ میں عوام تو زیادہ قابل الزام نہیں کہ انھوں نے ان مذاہب کو سنت کی پیروی سمجھ کر اختیار کیا تھا، اور ان کے لئے ترجیح کے اسباب معلوم کرنا اور ان کے مطابق ترک مذہب یا ایک مذہب سے دوسرے مذہب کی طرف انتقال مشکل بھی تھا، اور خطرناک بھی لیکن بہت سے علماء کی یہ حالت تھی کہ ان کو اگر اپنے امام یا مذہب کے کسی مسئلہ کا حدیث و سنت کے خلاف ہونا ثابت ہو جائے اور اس کا قطعی علم حاصل ہو جائے کہ اس مسئلہ میں اپنے امام کا مسئلہ مرجوح اور دوسرے امام یا مذہب کا مسئلہ راجح اور حدیث

---

[1] حجۃ اللہ البالغہ حصہ اول ص ۱۲۵

وسنت کے مطابق ہے اور اپنے مذہب اور عمل کے خلاف کیسی ہی صحیح وصریح احادیث ملیں تب بھی وہ اس مسئلہ کو ترک کرنے اور احادیث پر عمل کرنے کے لئے تیار نہیں ہوتے اور ان کی طبیعت اس کے لئے منشرح نہیں ہوتی، ایسے ہی لوگوں کے متعلق ساتویں صدی کے مشہور شافعی عالم شیخ الاسلام عز الدین بن عبد السلام لکھتے ہیں :-

ومن العجب العجيب ان الفقهاء المقلدين	حیرت انگیز بات یہ ہے کہ بعض فقہائے مقلدین کو اپنے امام
يقف احدهم على ضعف ماخذ امامه بحيث	کی دلیل کے ایسے ضعف کا علم ہو جاتا ہے جس کا کوئی جواب
لا يجد لضعفه مدفعا وهو مع ذلك يقلده	نہیں اور وہ اس کے باوجود اس مسئلہ میں اسی کی تقلید کرتے ہیں
فيه ويترك من شهد الكتاب والسنة	اور ان کا مذہب چھوڑ دیتے ہیں جن کی تائید میں کتاب وسنت
والأقيسة الصحيحة لمذهبهم جمودا على	اور صحیح قیاسات ہیں، محض اس لئے کہ ان کو امام کی تقلید سے
تقليد امامه بل يتحيل لدفع ظاهر الكتاب	انحراف گوارا نہیں بلکہ کتاب وسنت کے ظاہر مطلب کو دفع
والسنة ويتأولهما بالتاويلات البعيدة	کرنے کے لئے وہ ہزار تدبیریں کرتے ہیں اور اپنے امام کی مدافعت
الباطلة نضالا عن مقلده ؎ ۔	میں ہر طرح کے بعید اور بے بنیاد تاویلوں سے انکو احتراز نہیں ہوتا۔

اسی طرح سے عوام کی ایک جماعت تھی، جو اپنے امام کو معصوم عن الخطاء سمجھتی تھی اور جس کے قلب میں یہ بات راسخ ہو چکی تھی کہ اس کو امام کی تقلید کسی حال میں نہیں چھوڑنا ہے حضرت شاہ ولی اللہ اسی طرح کے عوام کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:-

وفي من يكون عاميا ويقلد رجلا من الفقهاء	(ابن حزم کا یہ کہنا کہ تقلید حرام ہے) اس عامی کی تقلید کے
بعينه يرى انه يمتنع من مثله الخطاء وان ما	بارے میں صحیح ہے جو کسی ایک معین فقیہ کی تقلید کرتا ہے اور
قاله هو الصواب البتة واضمر في قلبه ان	اس کا اعتقاد ہے کہ خطا اس سے ناممکن ہے اور جو کچھ اس نے
لا يترك تقليده وان ظهر الدليل على خلافه	کہہ دیا وہ مطلقاً ویقیناً صحیح ہے اور جس نے دل میں یہ عزم اور
وذلك ما رواه الترمذي عن عدي بن حاتم	فیصلہ کر رکھا ہے کہ وہ اپنے امام یا عالم کی تقلید نہیں چھوڑے گا۔

؎ حجۃ اللہ البالغہ ص ۱۲۴

انه قال سمعته یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یقرأ "اِتَّخَذُوا اَحْبَارَهُمْ وَرُهْبَانَهُمْ اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ" قال انهم لم یکونوا یعبدونهم ولکنهم کانوا اذا احلوا لهم شیئًا استحلوه واذا حرموا علیهم شیئًا حرموه۔[1]

اگرچہ دلیل اس کے خلاف ثابت ہو جائے اسی طرح کی تقلید کے متعلق وہ حدیث وارد ہوئی ہے جو حضرت عدی بن حاتم نے روایت کی ہے کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلعم نے (سورۂ توبہ کی) یہ آیت تلاوت فرمائی "اِتَّخَذُوا اَحْبَارَهُمْ وَرُهْبَانَهُمْ اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ" (ان یہودیوں اور عیسائیوں نے اپنے علماء و مشائخ کو خدا کو چھوڑ کر ارباباً من دون اللہ بنا لیا) آپ نے فرمایا کہ وہ ان کی عبادت نہیں کرتے تھے ان کا معاملہ صرف یہ تھا کہ جس چیز کو یہ علماء و مشائخ حلال کر دیں اس کو حلال سمجھ لیتے تھے اور جس کو وہ حرام کر دیں اس کو حرام بنا لیتے تھے۔

امام ابن تیمیہ کی رائے تقلید و اجتہاد کے بارے میں

اس طرح کی غیر مشروط و غیر مقید تقلید پر جو اتباع و اطاعت رسول کے متوازی و بالمقابل ہے ہر زمانہ کے محققین اور علماءِ راسخین نے اعتراض و انکار کیا ہے، وہ نہ تو ابن حزم اور بعض دوسرے غالی علماء کی طرح تقلید کی حرمت کے قائل ہیں، نہ ایسی غیر مشروط تقلید کی اجازت دیتے ہیں جس میں اور رسول کی اتباع و اطاعت میں کوئی فرق نہ ہو، ان علماء میں جن کی رائے اور تحریر اس مسئلہ میں بڑی متوازن اور معتدل ہے، متقدمین میں شیخ الاسلام ابن تیمیہ اور متاخرین میں شیخ الاسلام حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ ہیں، حافظ ابن تیمیہؒ ایک طرف تو اس واقعہ کا اظہار و اقرار کرتے ہیں کہ عوام اور غیر مجتہد علماء کے لئے فقہاء و مجتہدین کی طرف رجوع کرنے اور ان کی تقلید سے چارہ نہیں اور یہ کہ ائمہ کی حیثیت وسائل اور وسائط کی ہے، اور مذاہب کی پیروی ایک عملی ضرورت اور قدرتی امر ہے چنانچہ ایک جگہ

[1] حجۃ اللہ البالغہ ص ۱۲۴

تحریر فرماتے ہیں :۔

"اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت اور جس کو اللہ اور اس کے رسول نے حلال کیا اس کو حلال سمجھنا اور جس کو اللہ اور اس کے رسول نے حرام کیا اس کو حرام سمجھنا، اور جس کو اللہ اور اس کے رسول نے واجب قرار دیا اس کے ساتھ واجب کا سا معاملہ کرنا تمام انس و جن پر واجب ہے اور ہر شخص پر ہر حال میں سرًّا و علانیۃً فرض ہے لیکن چونکہ بہت سے احکام ایسے ہیں جن کو بہت سے لوگ نہیں جانتے اس لئے لوگوں نے اس بارے میں ان لوگوں کی طرف رجوع کیا جو ان کو ان کی تعلیم دیں اس لئے کہ وہ رسول کی تعلیم سے زیادہ واقف ہیں اور اس کی منشاء و مراد سے زیادہ باخبر ہیں پس ائمۂ مسلمین کی جن کی مسلمانوں نے پیروی کی ہے حیثیت وہی ہے، جو وسائل و دراستوں کی، اور ان رہنماؤں کی ہے، جو لوگوں کو رسول تک پہنچاتے ہیں اس کے کلام کی تبلیغ کرتے ہیں اور اپنے اپنے اجتہاد و استطاعت کے مطابق آپ کی مراد سمجھاتے ہیں، اللہ تعالیٰ ایک عالم کو ایسا علم و فہم عطا فرماتا ہے، جو دوسرے عالم کو حاصل نہیں اس دوسرے عالم کے پاس کسی دوسرے مسئلہ میں ایسا علم ہوتا ہے، جو پہلے عالم کے پاس نہیں اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے" وَدَاوٗدَ وَسُلَيْمٰنَ اِذْ يَحْكُمٰنِ فِي الْحَرْثِ اِذْ نَفَشَتْ فِيْهِ غَنَمُ الْقَوْمِ ۚ وَكُنَّا لِحُكْمِهِمْ شٰهِدِيْنَ ۝ فَفَهَّمْنٰهَا سُلَيْمٰنَ ۚ وَكُلًّا اٰتَيْنَا حُكْمًا وَّعِلْمًا ۚ (الانبیاء۔ ۷۸، ۷۹)

دیکھو داؤد و سلیمان دونوں خدا کے جلیل القدر پیغمبر تھے، دونوں نے ایک مقدمہ میں فیصلہ کیا۔ اللہ تعالیٰ نے ان میں سے ایک (حضرت سلیمانؑ) کو اس مقدمہ میں خصوصی فہم عطا فرمایا لیکن دونوں کی تعریف فرمائی، علماء بھی انبیاء کرام کے وارث ہیں، علماء کا اجتہاد احکام کے بارے میں ایسا ہی ہے جیسے مختلف لوگ (اندھیرے یا کسی نامعلوم جگہ پر، دلائل) و قرآئن سے کعبہ کی سمت متعین کریں اگر چار آدمی ہیں اور ان میں سے ہر ایک اپنے اپنے گروہ کے ساتھ ایک ایک سمت کی طرف نماز پڑھتا ہے اور ہر ایک یہ عقیدہ رکھتا ہے کہ صحیح سمت یہ ہے جس طرف وہ نماز پڑھ رہا ہے تو چاروں کی نماز صحیح ہے اگرچہ جس نے کعبہ کی طرف نماز پڑھی ہے وہ ایک ہی ہوگا، اور یہی وہ اجتہاد کرنے والا ہوگا جس کو دُہرا اجر ملے گا جیسا کہ صحیح حدیث میں آیا ہے،

"اذا اجتهد الحاکم فاصاب فلہ اجران وان اجتہد فاخطأ فلہ اجر" (جب فیصلہ کرنے والا اجتہاد کرتا ہے، اور صحیح فیصلہ پر پہونچ جاتا ہے تو اس کو دو اجر ملتے ہیں اور اگر اجتہاد کرتا ہے، اور اجتہاد میں غلطی واقع ہوتی ہے تو وہ ایک اجر سے محروم نہیں رہتا۔)[1]

آگے چل کر وہ فرماتے ہیں کہ کسی خاص مذہب یا فقہ پر کسی شخص کا نشوونما ہونا اور کسی خاص طریقہ کے مطابق عبادات و احکام شریعت کو بجالانا ایک قدرتی امر ہے، اور ایسا قدیم زمانہ سے ہوتا چلا آیا ہے، لیکن مسلمان کی شان یہ ہے کہ وہ اپنے کو اصلاً خدا اور رسول کا مطیع و فرمانبردار سمجھے، اور اس کے لئے تیار رہے کہ جو کچھ کتاب و سنت سے ثابت ہو جائے گا، وہ بلا تردد اس کی پیروی اختیار کر لے گا۔

"انسان عام طور پر اپنے والدین یا آقا یا اہل شہر کے دین و مذہب پر پلتا، اور بڑھتا ہے، جیسے کہ بچہ دین کے بارے میں اپنے والدین، سرپرستوں اور ہم وطنوں کی پیروی کرتا ہے، لیکن ضروری ہے کہ انسان جب بالغ ہو اور ہوش سنبھالے تو اس وقت اللہ اور رسول کی اطاعت کی پابندی اختیار کرے، خواہ وہ پابندی کسی چیز میں ہو، اور ان لوگوں میں نہ ہو جن کے متعلق ارشاد خداوندی ہے "وَاِذَا قِیْلَ لَھُمُ اتَّبِعُوْا مَآ اَنْزَلَ اللّٰہُ قَالُوْا بَلْ نَتَّبِعُ مَآ اَلْفَیْنَا عَلَیْہِ اٰبَآءَنَا" (اور جب ان سے کہا گیا کہ اللہ نے جو کچھ اتارا ہے، اس کی پیروی کرو تو انھوں نے صاف جواب دیا کہ نہیں ہم تو اسی راستہ پر چلتے رہیں گے جس پر ہم نے اپنے باپ دادا کو پایا ہے) پس جو شخص اللہ و رسول کی اطاعت کے بجائے اپنی اور اپنے والدین کی عادت اور اپنی قوم کے رسم و رواج کی پابندی کرے گا تو وہ ان ہی اہل جاہلیت میں سے ہوگا، جو وعید خداوندی کے مستحق ہیں، اسی طرح جس کے لئے کسی مسئلہ میں وہ صحیح راستہ اور حکم شرعی واضح ہو گیا جس کے ساتھ اللہ تعالےٰ نے اپنے رسول کو مبعوث فرمایا ہے، پھر اس نے اس کو قبول نہیں کیا، اور اپنی عادت کی طرف رجوع کیا تو وہ قابلِ مذمت اور مستحق عقاب ہے۔"[2]

ایسے عالم کے متعلق جو تحقیق و استدلال کی صلاحیت رکھتا ہو، اور یہ معلوم کر سکتا ہو کہ اس مسئلہ میں

---

[1] فتاویٰ شیخ الاسلام جلد ۲ ص ۲۰۱-۲۰۲ [2] ایضاً ص ۲۰۲

راجح قول کس کا ہے، وہ تفصیل کرتے ہوئے لکھتے ہیں :۔

اما القادر علی الاستدلال فقیل یحرم علیہ التقلید مطلقا، وقیل یجوز مطلقا وقیل یجوز عند الحاجۃ کما اذا ضاق الوقت عن الاستدلال وھذا القول اعدل۔[1]	جو شخص استدلال پر قدرت رکھتا ہو اس کے بارے میں ایک قول تو یہ ہے کہ اس کے لئے تقلید مطلقاً حرام ہے، دوسرا قول یہ ہے کہ مطلقاً جائز ہے، تیسرا قول یہ ہے کہ ضرورت کے وقت جائز ہے، مثلاً وقت میں اتنی گنجائش نہ ہو کہ وہ براہِ راست تحقیق کر سکے اور دلیل سے مسئلہ نکال سکے، اور یہی قول زیادہ منصفانہ اور قرین صواب ہے۔

البتہ جس کو اجتہادِ تام پر قدرت حاصل ہو اس کے لئے ان کا فیصلہ ہے کہ اگر کسی جانب اس کو نصوص نظر آئیں اور ان نصوص کا مقابلہ کرنے اور ان کو دفع کرنے والی کوئی وجہ نہ ہو تو اس کو نصوص کی پیروی لازم ہے، فرماتے ہیں :۔

اما اذا قدر علی الاجتہاد التام الذی یعتقد معہ ان القول الآخر لیس معہ ما یدفع بہ النص فھذا یجب علیہ اتباع النصوص، وان لم یفعل کان متبعا للظن وما تھوی الانفس وکان من اکبر العصاۃ للّٰہ ولرسولہ۔[2]	البتہ اگر اس کو ایسے اجتہادِ تام پر قدرت حاصل ہے کہ اس کو یقین حاصل ہو جاتا ہے کہ فلاں مسلک کی کوئی ایسی دلیل نہیں ہے جس سے نص کو دفع کیا جا سکے تو اس پر نصوص کی پیروی واجب ہے، اگر ایسا نہ کرے گا (اور مخالف نص قیاس یا مسلک پر تقلیداً قائم رہے گا) تو وہ اِنْ یَّتَّبِعُوْنَ اِلَّا الظَّنَّ وَمَا تَهْوَى الْاَنْفُسُ (وہ گمان اور خواہش نفس کی پیروی کرتے ہیں) کی وعید قرآنی میں آئے گا، اور اللہ و رسول کا بڑا نافرمان اور عاصی کہلائے گا۔)

---

[1] فتاویٰ شیخ الاسلام جلد ۲ صفحہ ۳۸۴ [2] ایضاً صفحہ ۳۸۵

امام ابن تیمیہ کا عمل اور ان کا فقہی مرتبہ

جہاں تک ان کے عمل کا تعلق ہے انھوں نے بیشتر مسائل میں امام احمد بن حنبل کے مذہب و اصول پر فتویٰ دیا ہے اکثر مسائل میں ان کی رائے اور فتویٰ ائمۂ اربعہ یا ائمۂ ہدیٰ میں سے کسی نہ کسی امام کے اجتہاد و فتویٰ کے مطابق ہے اور بعض مسائل میں انھوں نے اجتہاد سے کام لیا ہے اور کتاب و سنت اور اجماع و قیاس کی روشنی میں انھوں نے فتویٰ دیا ہے ان سب صورتوں کا موازنہ کرتے ہوئے ان کے متعلق صحیح یہ ہے کہ وہ مذہب حنبلی کے مجتہد منتسب[1] تھے۔[2]

امام ابن تیمیہ کی دعوت اور اس کا اثر

امام ابن تیمیہ کا یہ تجدیدی کارنامہ ہے کہ انھوں نے جس طرح کتاب و سنت کو عقائد کا ماخذ بنانے کی پرزور دعوت دی اور خود کامیابی کے ساتھ اس پر عمل کیا، اسی طرح کتاب و سنت کو فقہیات و احکام کا ماخذ بنانے اور ان کو حق کا معیار قرار دینے کی طاقتور دعوت دی اور اپنے زمانہ میں اس پر عمل کرکے دکھایا اور "فَإِنْ تَنَازَعْتُمْ فِي شَيْءٍ فَرُدُّوهُ إِلَى اللَّهِ وَالرَّسُولِ"[3] پر عمل کا نمونہ پیش کیا، ان کی اس دعوت نے ان فقہی دائروں اور امت کے علمی حلقوں میں جن میں عرصہ سے نئے غور و فکر اور احکام و مسائل کے کتاب و سنت سے مقابلہ کرنے کا کام بند ہو گیا تھا اور اجتہاد و استنباط کا سلسلہ عرصہ سے مسدود تھا نئی علمی و فکری حرکت اور براہِ راست کتاب و سنت کی طرف رجوع کی تحریک پیدا ہوئی، اس طرح سے انھوں نے اس صحیح اسلامی فکر کا احیاء کیا جو قرونِ اولیٰ میں پائی جاتی تھی اور مسلمانوں کی زندگی کی بنیاد تھی، اور وہ اپنے ان تمام علمی و عملی کارناموں کی بنا پر تاریخ اسلام کی ان چند شخصیتوں میں سے ہیں جن سے اللہ تعالیٰ نے اس دین کی تجدید و احیاء کا کام لیا۔ ذَٰلِكَ فَضْلُ اللَّهِ يُؤْتِيهِ مَنْ يَشَاءُ وَاللَّهُ ذُو الْفَضْلِ الْعَظِيمِ[4]

---

[1] مجتہد منتسب جو فروع و اصول میں مجتہد ہو لیکن اپنے طریق استدلال و طریق استنباط میں کسی امام کے ساتھ متفق ہو اور عام طور پر اس کے دائرہ سے نہ نکلتا ہو۔ [2] امام ابن تیمیہ کی فقہ کی حیثیت اور ان کی مجتہدانہ درجہ کی تفصیل معلوم کرنے کے لئے ملاحظہ ہو "ابن تیمیہ" از محمد ابو زہرہ ص ۳۵۰-۴۵۲ [3] النساء - ۵۹ [4] الجمعہ - ۴

تلامذہ و منتسبین

شیخ الاسلام حافظ ابن تیمیہؒ کے تلمیذ رشید اور جانشین

حافظ ابن قیم رحمۃ اللہ علیہ

شیخ الاسلام ابن تیمیہ کے تلامذہ و مستفیدین کی تعداد بہت بڑی ہے، ان کی مصروف اور داعیانہ زندگی اور ان کی موثر و بلند شخصیت کا یہ قدرتی نتیجہ ہے کہ وہ اپنے زمانہ پر قوت کے ساتھ اثر انداز ہوں، اور ان کے گرد تلامذہ اور معتقدین کا ایک بڑا گروہ جمع ہو جائے، لیکن ان کے تلامذہ میں سے ان کے مائۂ ناز شاگرد اور ان کے علوم کے مرتب و ناشر حافظ ابن قیم کو جو امتیاز و خصوصیت حاصل ہے، وہ کسی کے حصہ میں نہیں آئی، وہ زندگی بھر اپنے استاد کے شریک حال اور آخری لمحہ تک ان کے رفیق رہے، اور ان کے انتقال کے بعد بھی ان کے مسلک و مشرب پر قائم اور ان کی محبت و عقیدت میں سرشار رہے، ان کی علمی خدمات، ان کی جلالتِ قدر اور ان کے کمالات اس کے مستحق ہیں کہ ان پر مستقل کتاب لکھی جائے، اور ان کی تصنیفات اور علمی تحقیقات پر مفصل تبصرہ ہو، لیکن حیرت کی بات یہ ہے کہ ان کی زندگی کے حالات بہت کم ملتے ہیں، ان کے باکمال و نامور شاگرد حافظ ابنِ رجب حنبلی نے طبقات الحنابلہ کے ذیل میں ان کے جو کچھ حالات لکھ دیئے ہیں، زیادہ تر وہی نقل کئے جاتے رہے ہیں، درحقیقت انھوں نے اپنی زندگی اور شخصیت کو اپنے استاذ اور شیخ کی زندگی میں ایسا گم کر دیا کہ ان کا کوئی مستقل وجود اور شخصیت نظر نہیں آتی، یہاں ان کے وہ حالاتِ زندگی درج کئے جاتے ہیں، جو مل سکے۔

نام و نسب

محمد نام، ابوعبداللہ کنیت، شمس الدین لقب، زرعی نسبت، والد کا نام ابوبکر بن ایوب تھا، دمشق میں پیدا ہوئے، وہیں عمر گذری، اور وہیں مدفون ہوئے ان کے والد مدرسہ جوزیہ کے مہتمم تھے، اس کی نسبت سے وہ ابن قیم الجوزیہ اور اختصاراً ابن القیم کہلاتے ہیں، ابن رجب کا بیان ہے کہ وہ ۶۹۱ھ میں پیدا ہوئے الشہاب النابلسی العابر قاضی تقی الدین سلیمان، فاطمہ بنت جوہر، عیسیٰ بن مطعم، ابوبکر بن عبد الدائم، وغیرہ اساتذۂ وقت سے حدیث کی سماعت کی، اور مذہب حنبلی کی فقہ میں مہارت پیدا کی اور فتویٰ کا کام شروع کیا، پھر شیخ الاسلام ابن تیمیہ کا دامن ایسا پکڑا کہ مرتے وقت تک ان سے جدا نہ ہوئے، علامہ ابن کثیر لکھتے ہیں کہ جب حافظ ابن تیمیہ ۷۱۲ھ میں مصر سے واپس آئے تو حافظ ابن قیم نے ان کی ایسی صحبت اور رفاقت اختیار کی کہ انتقال تک ساتھ نہیں چھوڑا۔[1]

علمی مرتبہ

حافظ ابن رجب لکھتے ہیں کہ تمام علوم اسلامیہ میں دخل تھا، لیکن تفسیر میں ان کی نظیر نہیں تھی، اصول دین میں بھی وہ درجۂ کمال پر پہونچے ہوئے تھے، حدیث، فقہ حدیث اور دقائق استنباط میں ان کا کوئی ہمسر نظر نہیں آتا، فقہ اور اصول فقہ اور عربیت اور علم کلام میں بھی کمال حاصل تھا، علم سلوک اور اہل تصوف کے اشارات و دقائق پر بھی وسیع نظر تھی، میں نے قرآن و سنت کے معانی اور حقائق ایمانی کا ان سے بڑا عالم نہیں پایا، وہ معصوم تو نہیں تھے، لیکن میں نے ان خصوصیات میں ان کا جیسا آدمی نہیں دیکھا۔

علامہ ذہبی فرماتے ہیں کہ ابن القیم کو متون حدیث و رجال حدیث کی طرف بڑی توجہ تھی، وہ فقہ

[1] البدایۃ والنہایۃ۔ ج ۱۴ ص ۲۳۴

کے مطالعہ میں ہی مشغول رہتے تھے، اور اس کے مسائل کو بڑے شرح و بسط سے لکھتے تھے، نحو کی تدریس اور اصولِ حدیث میں بھی اچھی مہارت تھی۔

زہد و عبادت

حافظ ابنِ رجب کا بیان ہے کہ وہ کثیر العبادت اور بڑے شب بیدار تھے، ان کی نماز بڑی طویل اور پرسکون ہوتی تھی، وہ ہر وقت ذاکر شاغل رہتے تھے، اور ان میں محبتِ الٰہی کا ایک جوش اور انابت کی ایک خاص کیفیت تھی، ان کے چہرے پر بارگاہِ خداوندی کی طرف فقر و احتیاج اور عجز و انکسار کا نور نظر آتا تھا، اس کیفیت میں میں نے ان کو بالکل منفرد پایا، انھوں نے کئی حج کئے، اور عرصہ تک مکہ معظمہ میں قیام کیا، اہلِ مکہ ان کی کثرتِ عبادت اور کثرتِ طواف کے ایسے حالات سناتے ہیں جو موجب حیرت ہیں۔

علامہ ابنِ کثیر اپنی تاریخ میں لکھتے ہیں کہ حافظ ابنِ قیم بڑی محبت کے آدمی تھے، نہ کسی سے حسد رکھتے، نہ کسی کو ایذا پہنچاتے، اور نہ کسی میں عیب نکالتے، میں ان کا بڑا رفیق اور محبوب تھا، مجھے نہیں معلوم کہ ہمارے زمانہ میں دنیا میں ان سے زیادہ کوئی عابد اور کثیر النوافل تھا، وہ نماز بڑی طویل پڑھتے تھے، اور رکوع و سجود بڑا لمبا کرتے تھے، بعض اوقات ان کے احباب ان کو ملامت بھی کرتے، لیکن وہ اس کو ترک نہیں کرتے تھے، خلاصۂ کلام یہ ہے کہ مجموعی حیثیت سے اپنے امور و احوال میں ان کی نظیر کم ہوگی۔[1]

ابتلاء و آزمائش

اپنے استاذ و شیخ کی طرح وہ بھی ابتلاء و آزمائش اور مجاہدات کی منازل سے گذرے، آخری بار جب ان کے شیخ ابن تیمیہ قلعہ میں قید کئے گئے تو وہ بھی محبوس ہوئے اور ان سے علیحدہ رکھے گئے، شیخ کے انتقال کے بعد ان کی رہائی

---

[1] البدایۃ والنہایۃ۔ ج ۱۴ ص ۲۳۴-۲۳۵

ہوئی، اس پوری مدتِ اسارت میں وہ تلاوتِ قرآن اور اس کے معانی و تدبر و تفکر میں مشغول رہے، ابن رجب لکھتے ہیں:۔

ففتح علیہ من ذٰلک خیر کثیر وحصل لہ جانب عظیم من الاذواق والمواجید الصحیحۃ وتسلط بسبب ذٰلک علی الکلام فی علوم اھل المعارف والدخول فی غوامضھم وتصانیفہ ممتلئۃ بذٰلک۔

اس سے ان کو بڑا نفع حاصل ہوا، ان کو اذواق و مواجید صحیحہ کا ایسا حصہ ملا جس سے اہلِ معارف کے علوم اور ان کے غوامض و دقائق کا سمجھنا اور سمجھانا ان کے لئے آسان ہو گیا، ان کی تصنیفات ان مضامین سے لبریز ہیں۔

ان کے تلامذہ اور معاصرین کا اعتراف

علماء کی ایک بڑی جماعت نے امام ابن تیمیہ کی زندگی میں اور ان کے انتقال کے بعد ان سے علم حاصل کیا اور استفادہ کیا، فضلائے عصر ان کی بڑی عزت کرتے تھے اور ان کے تلمذ کو شرف سمجھتے تھے، ان کے تلامذہ میں ابن عبدالہادی اور ابن رجب جیسے اکابر ہیں، قاضی برہان الدین زُرعی کا ان کے متعلق مقولہ ہے کہ "اس وقت آسمان کے نیچے ان سے زیادہ وسیع العلم آدمی نظر نہیں آتا۔"

تدریس و تصنیف

حافظ ابن قیم نے عرصہ تک مدرسہ صدریہ میں درس دیا، جوزیہ کی امامت مدت تک ان کے سپرد رہی، انھوں نے اپنے قلم سے بکثرت کتابیں لکھیں، ابنِ رجب کہتے ہیں کہ ان کو کتابت و مطالعہ و تصنیف اور کتابوں کی خریداری کا بڑا شغف تھا، اس شوق کا نتیجہ تھا کہ انھوں نے ایک بڑا کتبخانہ جمع کر لیا جس میں بہت سی کتابیں ان کے ہاتھ کی نقل کی ہوئی تھیں۔

ان کی تصنیفات کی خصوصیت

ان کی تصنیفات حسن ترتیب اور تالیفی سلیقہ میں اپنے شیخ حافظ ابن تیمیہؒ کی تصنیفات سے بھی ممتاز ہیں،

اس کے علاوہ ان کی کتابوں میں تصوف کی حلاوت، عبارت کی سلاست اور دل آویزی زیادہ پائی جاتی ہے، یہ غالباً ان کے مزاج کا نتیجہ ہے جس میں جلال سے زیادہ جمال ہے۔

اہم تصنیفات

ان کی تصنیفات کی فہرست طویل ہے ان میں سے اہم کتابیں حسب ذیل ہیں "تھذیب سنن ابی داؤد" "مدارج السالکین بین منازل ایاک نعبد وایاک نستعین" (یہ شیخ الاسلام عبداللہ انصاری ہروی کی "منازل السائرین" کی شرح ہے اور تصوف وسلوک کی بہترین کتابوں میں ہے) زادالمعاد فی ھدی خیر العباد (ہم اس پر مفصل تبصرہ کریں گے) "جلاء الافہام فی الصلوٰۃ والسلام علی خیر الانام" "اعلام الموقعین عن رب العالمین" (یہ فقہاء و اہلِ فتویٰ وحدیث سے اشتغال رکھنے والوں کے لئے معلومات کا گرانقدر خزانہ اور ان کی بہترین تصنیفات میں سے ہیں) الکافیۃ الشافیہ فی الانتصار للفرقۃ الناجیۃ، الصواعق المرسلۃ علی الجھمیۃ والمعطلۃ، حادی الارواح الی بلاد الافراح (جنت کے وصف اور حالات میں "اعلام الموقعین" کے حاشیہ پر) کتاب الداء والدواء، مفتاح دار السعادۃ، اجتماع الجیوش الاسلامیہ علی غزو المعطلۃ والجھمیہ، عدۃ الصابرین وذخیرۃ الشاکرین، بدائع الفوائد، الکلم الطیب والعمل الصالح، تحفۃ الودود بأحکام المولود، کتاب الروح، شفاء العلیل فی مسائل القضاء والقدر والحکمۃ والتعلیل، نقد الالواح و تحفۃ الافراح، الفوائد، الطرق الحکمیہ فی السیاسۃ الشرعیہ، الجواب الکافی لمن سأل عن الدواء الشافی، روضۃ المحبین ونزھۃ المشتاقین، اغاثۃ اللھفان فی مکائد الشیطان، طریق الھجرتین وباب السعادتین۔

وفات

۲۳ رجب ۷۵۱ھ میں چہارشنبہ کے دن رات کو انتقال کیا، اگلے روز ظہر کی نماز کے بعد جامع مسجد میں

نمازِ جنازہ پڑھی گئی، اور الباب الصغیر کے مقبرہ میں دفن ہوئے رحمہ اللہ ورفع درجاتہ۔

"زاد المعاد"

حافظ ابن قیم کثیر التصانیف علماء میں سے ہیں، کثرتِ تصنیف اور حسنِ تصنیف دونوں ان کی خصوصیات میں سے ہیں، ان کی تصنیفات میں سے متعدد کتابیں اس کی مستحق ہیں کہ ان کا مفصل تعارف کرایا جائے، اور ان کے مضامین اور فوائد کی تلخیص کی جائے، لیکن اس کے لئے ایک مستقل تصنیف درکار ہے، اور اس کا صحیح محل حافظ ابن قیمؒ کی مستقل سیرت وسوانح ہے، ان کی تصنیفات میں سے علمی حیثیت سے اعلام الموقعین اور ذوقی و اصلاحی لحاظ سے "مدارج السالکین" یا "اغاثۃ اللہفان" اس کی مستحق ہے کہ اس پر اس طرح سے تبصرہ اور اس کا مفصل تعارف کرایا جائے، جس طرح ہم نے اس کتاب میں امام ابن تیمیہ کی الجواب الصحیح اور الرد علی المنطقیین کا کیا ہے، لیکن ہم یہاں تعارف و تبصرہ کے لئے ان کی جلیل القدر اور شہرۂ آفاق تصنیف زاد المعاد فی ھدی خیر العباد کو منتخب کرتے ہیں، اس لئے کہ ان کی اکثر تصنیفات کی خصوصیات کی جامع اور بہ یک وقت سیرت، حدیث، فقہ، علم کلام اور تصوف و احسان کی کتاب ہے، عمل و اصلاح کے لئے "احیاء العلوم" کے بعد شاید کوئی ایسی جامع کتاب نہیں لکھی گئی، تحقیق و استناد اور کتاب و سنت سے مطابقت کے لحاظ سے اس کو "احیاء العلوم" ..... پر بھی ترجیح حاصل ہے، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مصنف نے ایک ایسی کتاب کے لکھنے کا ارادہ کیا ہے، جو بڑی حد تک دینیات کے کتب خانہ کی قائم مقامی کر سکے، اور ایک مربّی، مرشد اور فقیہ و محدث کا کام دے سکے، جن لوگوں پر حدیث کا ذوق غالب رہا ہے، اور جن کو سنن و آداب نبوی کے اتباع کی حرص، اور اہتمام رہا ہے، ان کو اس کتاب سے بڑا شغف رہا ہے، اور انھوں نے اس کو اپنا چراغِ راہ، رفیقِ طریق اور زادِ سفر سمجھا ہے[1]، یہ کتاب ہندوستان میں سب سے پہلے ۱۲۹۸ھ اور مصر سے ۱۳۲۴ھ میں شائع ہوئی، ہندوستانی اڈیشن بڑے سائز کے

---

[1] مشہور متبع سنت اور متورع عالم مولانا سید عبداللہ غزنوی کی سیرت میں ہے کہ "زاد المعاد" کی طلب میں دل کے جوش سے زاری کرتے تھے، اور فرماتے تھے "یا ارحم الراحمین" زاد المعاد کو میری آخرت کا توشہ بنا" (ص ۲۴)

۹۳۷ صفحے اور مصری اڈیشن باریک ٹائپ کے ۹۲۴ صفحات میں ختم ہوا ہے کتاب کے شروع میں مصنف نے لکھا ہے :۔

"یہ چند مضامین ہیں جن کی واقفیت ہر اس شخص کے لئے ضروری ہے جس کو اپنے پیغمبر صلے اللہ علیہ وسلم کی معرفت آپ کی سیرت اور آپ کے اخلاق و عادات سے واقف ہونے کا ذرا بھی اہتمام ہو، یہ ایسی حالت میں لکھے گئے ہیں کہ دل تھکا ہوا ہے اور علم کی پونجی قلیل ہے اس کی تحریر کی نوبت قیام کے بجائے سفر کی حالت میں پیش آئی ایسی حالت میں کہ قلب منتشر و پراگندہ، جمعی مفقود، کتابیں جن سے رجوع کیا جاسکے ناپید اور ایسے اہل علم جن سے علمی استفادہ و مذاکرہ کیا جاسکے نایاب ہیں"[1]

مصنف کا یہ بیان اگر کتاب کی ابتداء اور بعض ابواب و فصول کے متعلق ہے تو چنداں موجب حیرت نہیں لیکن اگر پوری کتاب کے متعلق ہے تو یہ نہایت حیرت انگیز بات ہے اس لئے کہ کتاب میں حدیث کے متون و اسانید اور رجال کی جو مفصل بحثیں سیرت و تاریخ کی جو جزئیات اور مسائل و احکام میں جو محدثانہ و فقیہانہ کلام ہے اس سے ایک عام ناظر بھی اندازہ کرسکتا ہے کہ یہ کتاب ایک نہایت وسیع و عظیم الشان کتب خانہ میں بیٹھ کر تصنیف کی گئی ہے اگر یہ صحیح ہے کہ ساری کتاب حالت سفر میں لکھی گئی ہے تو یہ تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ اس کے مصنف کو علوم اسلامیہ بالخصوص حدیث و فقہ پر حیرت انگیز عبور حاصل تھا اور علوم دینیہ کا کتب خانہ ان کے سینہ میں محفوظ تھا، اور وہ اپنی قوت حفظ و استحضار میں محدثین متقدمین کی یادگار اور اپنے باکمال و نادرۂ روزگار استاذ کے صحیح جانشین و نمونہ تھے، حافظ ابن قیمؒ نے اس کتاب کے شروع میں بعثت نبوی اور مراتب وحی کی تفصیل بیان کی ہے، مراتب وحی اور انواع وحی کے سلسلہ میں انھوں نے جو استیعاب کیا ہے وہ سیرت کی عام کتابوں میں نہیں ملتا[2]، پھر وہ مدارج بیان کئے ہیں جن سے آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کی دعوت اسلام گذری، اسمائے مبارک اور ان کے معانی اور نکات پر انھوں نے حسب معمول وسیع و لطیف بحث کی ہے، اس پورے سلسلہ میں اپنی اور اپنے شیخ کی عادت کے مطابق بکثرت

---

[1] زاد المعاد۔ حصہ اول ص۱۵ (نظامی) [2] ایضاً ص۱۸

فقہی ونحوی مسائل ونکات اور بعض وجدانی اور ذوقی مسائل لکھ دیئے ہیں، اسی سلسلہ میں انھوں نے سیرت کے عام معلومات اور ذاتِ نبویؐ سے تعلق رکھنے والی تفصیلات وجزئیات جمع کردی ہیں، اور اخلاق و شمائل، عادات ومعمولات کا اچھا ذخیرہ جمع کردیا ہے[۱]، اس کے بعد انھوں نے آپ کی عبادات ہیئت صلوٰۃ اور اس کے سنن اور عادات کی دقیق تفصیلات پیش کی ہیں، جو ان کے وسیع ودقیق مطالعۂ حدیث کا خلاصہ اور ان کے علم کا نچوڑ ہے، اس سلسلہ میں ان کا محدثانہ رنگ اور محققانہ طرز صاف جھلکتا ہے، اس ضمن میں اصولِ فقہ اور اصولِ حدیث کی بعض نازک بحثیں[۲] اور فنِ رجال کی بعض قیمتی معلومات بھی آگئی ہیں[۳]، کتاب کے یہ ابواب جو عبادات اور ارکانِ اربعہ سے متعلق ہیں، محض کتاب الاحکام یا فقہ وخلاف کی کتاب بن کر نہیں رہ گئے ہیں، ان میں جابجا مصنف نے بڑے وجد انگیز اور ایمان آفریں ذوقی ووجدانی مضامین اور لطیف علمی نکات شامل کردیئے ہیں، زکوٰۃ وصدقہ کے باب میں انھوں نے لکھا ہے کہ "آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم تمام مخلوقات میں سب سے زیادہ منشرح الصدر مطمئن النفس اور مسرور القلب تھے، اس لئے کہ صدقہ اور حسن سلوک کو شرح صدر کے باب میں بڑا دخل ہے، اللہ تعالےٰ نے نبوت ورسالت اور ان کے خصائص و توابع کے لئے آپ کا سینۂ مبارک پہلے ہی کھول دیا تھا، اور حسّی طور پر آپ کا شرح صدر فرمایا تھا، اور سینۂ مبارک سے شیطان کے حصّہ کو بالکل خارج کردیا تھا، ان اخلاق (سخاوت وبذل وایثار) سے اس شرح صدر میں اور اضافہ ہوا" اس کے بعد وہ تفصیل سے سیرت نبوی پر اس لحاظ سے نظر ڈالتے ہیں، اور شرح صدر کے اسباب کا جائزہ لیتے ہوئے لکھتے ہیں :۔

"شرحِ صدر کے بہت سے اسباب ہیں، اور وہ آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کو بدرجۂ کمال وتمام حاصل تھے، شرحِ صدر کا سب سے قوی واہم سبب توحید ہے، وہ جس قدر کامل اور قوی ہوگی، اتنی ہی شرحِ صدر زیادہ ہوگا، اللہ تعالےٰ ارشاد فرماتا ہے "اَفَمَنْ شَرَحَ اللّٰہُ صَدْرَہٗ

[۱] زاد المعاد حصہ اول ص ۲۵ تا ۴۹ (نظامی) [۲] ایضاً ص ۲۹ و ۱۰۵ [۳] ایضاً ص ۲۳ و ۹۹

لِلْاِسْلَامِ فَهُوَ عَلٰی نُوْرٍ مِّنْ رَّبِّہٖ[1] " (بھلا جس کا سینہ کھول دیا، اللہ نے اسلام کے لئے تو وہ اجالے میں ہے اپنے رب کی طرف سے) نیز ارشاد ہے " فَمَنْ يُّرِدِ اللّٰهُ اَنْ يَّهْدِيَهٗ يَشْرَحْ صَدْرَهٗ لِلْاِسْلَامِ ۚ وَمَنْ يُّرِدْ اَنْ يُّضِلَّهٗ يَجْعَلْ صَدْرَهٗ ضَيِّقًا حَرَجًا كَاَنَّمَا يَصَّعَّدُ فِي السَّمَآءِ[2] " (سو جس کو چاہے اللہ کہ راہ دے، کھولدے اس کا سینہ فرمانبرداری کے لئے، اور جس کو چاہے کہ راہ سے بھلادے اس کا سینہ تنگ کردے تنگ، بند، گویا زور سے چڑھتا ہے آسمان پر) پس ہدایت اور توحید شرحِ صدر کے عظیم ترین اسباب میں سے ہے، اور شرک و گمراہی سینہ کی تنگی اور کشمکش اور تکدر کا بہت بڑا سبب ہے اسی طرح شرحِ صدر کا ایک سبب وہ نور ہے، جو اللہ تعالےٰ بندہ کے دل میں داخل فرما دیتا ہے، اور وہ نور ایمان ہے، جو سینہ کو وسیع اور منشرح اور قلب کو شاداں اور فرحاں رکھتا ہے جب یہ نور بندہ کے دل سے غائب ہوجاتا ہے، تو دل میں تنگی اور انقباض پیدا ہوجاتا ہے، اور بندہ کو ایسا محسوس ہونے لگتا ہے کہ وہ ایک تنگ و تاریک قید خانہ میں گرفتار اور ایک تکلیف دہ شکنجہ میں کسا ہوا ہے، ترمذی کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ " اذا دخل النور القلب انفسح وانشرح قالوا وما علامة ذٰلك يا رسول الله قال الانابة الى دار الخلود والتجافی عن دار الغرور والاستعداد للموت قبل نزوله " (جب نور دل میں داخل ہوتا ہے، تو دل کھل جاتا ہے، اور منشرح ہوجاتا ہے، صحابۂ کرام نے عرض کیا یا رسول اللہ اس کی علامت کیا ہے، فرمایا دار بقا کی طرف شوق اور کشش اور دار فنا سے بے رغبتی اور وحشت اور موت کی آمد سے پہلے موت کی تیاری) انسان کو جس قدر اس نور کا حصہ ملتا ہے، اسی کے بقدر وہ شرح صدر کی دولت سے مالا مال ہوتا ہے، اسی طرح حسّی نور سے بھی شرح صدر، اور حسّی ظلمت سے ضیق صدر اور دل میں تنگی اور انقباض پیدا ہوتا ہے، اور ان ہی اسبابِ شرحِ صدر میں ایک علم بھی ہے، وہ سینہ کو منشرح اور وسیع کرتا ہے، یہاں تک کہ عالِم کا سینہ دنیا سے زیادہ وسیع ہوجاتا ہے، اس کے بالمقابل جہل سے دل میں تنگی اور انقباض پیدا ہوتا ہے جس قدر بندہ کا

---

[1] الزمر - ۲۲   [2] الانعام - ۱۲۶

علم وسیع ہوتا ہے اسی قدر اس کا سینہ فراخ اور قلب منشرح ہوتا ہے لیکن یہ دولت ہر عالم کے نصیب میں نہیں یہ صرف اس علم کی خاصیت ہے جو رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم سے بطریق وراثت چلا آرہا ہے اور وہ علم نافع ہے جن لوگوں کو یہ علم نافع حاصل ہوتا ہے وہ سب سے زیادہ منشرح، وسیع القلب، خوش اخلاق اور خوش عیش ہوتے ہیں ایک سبب انابت الی اللہ ہے یعنی پورے دل سے اس کے ساتھ محبت کرنا، اس کی طرف توجہ اور رجوع اور اس کی عبادت سے لطف حاصل کرنا، واقعہ یہ ہے کہ اس سے زیادہ کوئی چیز انشراح اور سرور پیدا کرنے والی نہیں اگر تم کو کبھی یہ دولت نصیب ہو تو تمہاری زبان سے بے اختیار نکل جائے گا کہ اگر جنت میں بھی یہی حالت نصیب ہوئی تو بڑا عیش ہے محبت کو شرح صدر، اطمینان نفس اور عیش قلبی میں بہت بڑا دخل ہے اس کا اندازہ اسی شخص کو ہو سکتا ہے جس نے کبھی اس کا لطف اٹھایا ہو جس قدر محبت قوی اور شدید ہوگی، سینہ فراخ اور منشرح ہوگا، دل اسی وقت تنگ اور مکدر ہوگا جب بیکاروں اور اس دولت سے محروم لوگوں پر نظر پڑے گی، ان کی دید آنکھ کی کھٹک اور ان کی صحبت روح کا بخار ہے، اسی کے بالمقابل انقباض و تکدر کا ایک بہت بڑا سبب اللہ تعالیٰ سے اعراض اور اس کی غیر اللہ کے ساتھ گرفتاری اور اسیری اور ذکر اللہ سے غفلت اور ماسوی اللہ سے محبت ہے اس لئے کہ جس کو جس ماسوی سے محبت ہوتی ہے اسی کے ہاتھوں اس کو دکھ دیا جاتا ہے[1] اور اس کا دل اس غیر کی محبت میں برابر مقید اور گرفتار رہتا ہے اور دنیا میں کوئی شخص اس سے زیادہ بدبخت اس سے زیادہ بدمزہ اور بے لطف اس سے زیادہ محروم و بے نصیب اور اس سے زیادہ خستہ دل اور تفتہ جگر نہیں ہوتا ہے حقیقت میں محبت کی دو قسمیں ہیں ایک محبت وہ ہے جو دنیا کی جنت نفس کا سرور، قلب کی لذت، روح کا عیش اس کی غذا اور دوا بلکہ اس کی زندگی اور اس کی آنکھوں کی ٹھنڈک ہے اور وہ خدائے وحدہٗ لاشریک کی پورے دل کے ساتھ محبت میلان وارادہ کی تمام

---

[1] فَلَا تُعْجِبْكَ أَمْوَالُهُمْ وَلَا أَوْلَادُهُمْ إِنَّمَا يُرِيدُ اللَّهُ لِيُعَذِّبَهُم بِهَا فِي الْحَيَاةِ الدُّنْيَا وَتَزْهَقَ أَنفُسُهُمْ وَهُمْ كَافِرُونَ ۝ (التوبہ - ۵۵)

قوتوں کا اس کی طرف انجذاب اور کشش ہے، اور ایک محبت وہ ہے، جو روح کا عذاب، نفس کی کلفت، قلب کا جیل خانہ اور سینہ کی تنگی، اور درد و حرمان، کلفت و تعب کا سبب ہے، اور وہ ماسوی کی محبت ہے، شرحِ صدر کا ایک سبب ہر حالت اور ہر موقع پر دوامِ ذکر ہے، ذکر کو انشراح صدر میں عجب دخل ہے، اور اس سے دل کو عجیب اطمینان و سرور حاصل ہوتا ہے، اسی طرح غفلت کو دل کی تنگی، انقباض، اور کلفت واذیت میں بڑا دخل ہے، ایک سبب مخلوق پر احسان اور مال وجاہ، بدن، اور انواع احسان سے نفع پہنچانے کی طبیعت ہے، کریم اور محسن انسان بڑا منشرح الصدر، مطمئن النفس ہوتا ہے اور اس کو بڑا قلبی سرور اور سکون حاصل ہوتا ہے، وہ بخیل جس میں احسان کا مادہ نہیں ہے بڑا دل تنگ، بدحال، اور مغموم رہتا ہے، رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے صدقہ کرنے والے صاحبِ ایثار کی مثال دی ہے کہ ایک شخص پر لوہے کی دو زرہیں ہیں، وہ جب صدقہ کا ارادہ کرتا ہے زرہ کھل جاتی ہے اور پھیل جاتی ہے، یہاں تک کہ اس کے کپڑے زمین پر لوٹتے ہیں، اور اس کے قدموں کے نشان مٹتے چلے جاتے ہیں، اور بخیل کا حال یہ ہے کہ زرہ کی ہر کڑی اس کے جسم سے چپٹ جاتی ہے، اور اس میں کوئی وسعت و فراخی نہیں پیدا ہوتی، شرح صدر کا ایک سبب شجاعت ہے، مردِ شجاع بڑا منشرح الصدر فراخ حوصلہ اور وسیع القلب ہوتا ہے، اس کے بالمقابل بزدل بڑے چھوٹے دل کا ہوتا ہے، جس کو فرحت و سرور اور لذت و عیش میں سے صرف اتنا حصہ ملتا ہے، جتنا حیوانات و بہائم کو نصیب ہے، باقی روحانی سرور و لذت اور فرحت و مسرت سے بزدل بالکل ہی محروم ہوتا ہے، جیسے ہر بخیل، اللہ سے اعراض کرنے والا، اس کے ذکر سے غافل، اس کی ذات و اسماء و صفات اور اس کے دین سے بے خبر اور ماسوا اللہ کا گرفتار، اس دولت سے بے نصیب رہتا ہے، یہی عیش و سرور قبر میں جا کر باغ و بہار بن جاتا ہے، اور یہی دل تنگی اور انقباض وہاں پہونچ کر عذاب و جیل خانہ کی شکل میں نظر آتا ہے، انسان کا قبر میں وہی حال ہوگا، جو قلب کا سینہ میں یہاں حال ہے، یہاں کا عیش وہاں کا عیش، یہاں کا عذاب اور گرفتاری وہاں کا

عذاب اور گرفتاری، اور یہاں کی آزادی وہاں کی آزادی ہے، باقی عارضی طور پر اہلِ ایمان و یقین کو یہاں (کسی اتفاقی واقعہ یا خارجی سبب، فقر، مخالفت، امراض وغیرہ کی وجہ سے) جو ایک طبعی تکدر و انقباض حاصل ہوتا ہے، اور اہلِ کفر و غفلت کو (دولت و حکومت اور حیوانی لذتوں کی وجہ سے) جو وقتی سرور، لطف اور لذت حاصل ہوتی ہے، اس کا اعتبار نہیں، اعتبار اس کیفیت کا ہے، جو ملکہ بن جائے اور قلب میں دائمی طور پر پائی جائے، ایک سبب قلب کا ان صفات مذمومہ سے پاک و صاف ہونا ہے، جو دل کی تنگی اور قلبی تکلیف کا سبب ہوتی ہے، اور قلب کی شفاء اور عافیت سے مانع ہوتی ہے، انسان اگر شرحِ صدر کے اور اسباب پیدا کرے، اور ان اوصافِ مذمومہ کو قلب سے خارج نہ کرے تو اس کو شرحِ صدر کی دولت کا کوئی بڑا حصہ حاصل نہیں ہو سکتا، زیادہ سے زیادہ یہ ہو گا کہ اس کے اندر دو مادے باقی رہیں گے جو وقتاً فوقتاً اس کے دل پر حملہ کرتے رہیں گے، ایک سبب یہ ہے کہ انسان غیر ضروری چیزوں کا دیکھنا، غیر ضروری کلام، غیر ضروری باتوں کا سننا اور بے فائدہ اور بے مقصد ملنا جلنا، کھانا پینا، سونا چھوڑ دے اس لئے کہ یہ زوائد قلب کے لئے آلام و مصائب بن جاتے ہیں جو اس کو تنگ اور منقبض کر دیتے ہیں، اور دل ان سے تکلیف پاتا ہے، دنیا اور آخرت کے عذاب کا بڑا حصہ انہی چیزوں کا نتیجہ ہے، سبحان اللہ جو شخص ان تمام وادیوں میں سرپٹ دوڑتا ہے، وہ کیسا بدحال، پراگندہ بال اور تنگ دل رہتا ہے، اس کے بالمقابل اس شخص کی خوشحالی اور خوش دلی کا کیا ٹھکانا ہے، جو خصائل محمودہ میں سے ہر خصلت سے متصف اور ان صفاتِ محمودہ کو ہمیشہ اپنے پیش نظر رکھے، اسی گروہ کی شان میں "اِنَّ الْاَبْرَارَ لَفِیْ نَعِیْمٍ" اور پہلے گروہ کی شان میں "وَاِنَّ الْفُجَّارَ لَفِیْ جَحِیْمٍ" وارد ہوا ہے، ان دونوں حالتوں کے درمیان بہت سے مراتب اور درجے ہیں، اور ان کے درمیان ایسا تفاوت ہے جس کا صحیح اندازہ صرف اللہ تعالیٰ ہی کر سکتا ہے، خلاصۂ کلام یہ ہے کہ جناب رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم ہر اس صفت میں جس سے شرحِ صدر، وسعتِ قلب، خنکیِ چشم اور حیاتِ روح حاصل ہوتی ہے، مخلوقات

خداوندی میں سب سے زیادہ کامل اور سب سے زیادہ بڑھے ہوئے تھے اسی کے ساتھ آپ کو حسّی و جسمانی طور پر بھی وہ شرح صدر حاصل تھا جس میں آپ کا کوئی شریک نہیں،[1] مخلوقات میں جو شخص آپ کا جتنا زیادہ پیرو ہوگا، اور اتباعِ نبوی کی جس میں جتنی زیادہ شان نمایاں ہوگی، اتنی ہی زیادہ اس کو شرح صدر، لذت و انبساط کی دولت حاصل ہوگی، آپ شرح صدر، رفع ذکر اور وضع وزر کے اعلیٰ ترین مقام[2] اور نقطۂ عروج و کمال پر فائز تھے، آپ کے پیروؤں اور متبعین کو آپ کی پیروی اور اتباع کے بقدر اس دولت سے حصّہ ملتا رہے گا۔"[3]

مصنف نے اس کا بھی اہتمام کیا ہے کہ عبادات وارکان واحکام کے مسائل بیان کرنے سے پہلے ان کی حکمت اور ان کے فوائد و اسرار بھی بیان کر دیں، اور اس سلسلہ میں انھوں نے بڑے جامع اور دلنشین طریقہ پر حکمت تشریع اور ان عبادات وارکان کے حِکَم و فوائد اور ان کی تشریع کی تاریخ بیان کی ہے، اس کا ایک نمونہ یہاں پیش کیا جاتا ہے صوم کے متعلق لکھتے ہیں:-

"صیام (روزہ) سے مقصود نفس کا خواہشات نفسانی سے روکنا اور ان چیزوں سے رکنے کی عادت پیدا کرنا ہے جن کا انسان خوگر ہے، اور جن سے وہ مانوس ہے، اور اس کی قوتِ شہوانی میں اتنا اعتدال پیدا کر دینا جس سے اس کے اندر ان چیزوں کے حصول کا جذبہ پیدا ہو جو اس کے لئے باعثِ سعادت اور عیشِ جاودانی کا سبب ہیں، اور ان چیزوں کے قبول کرنے کا جن سے اس کی صفائی اور ترقی ہو، اور جن میں اس کی حیات ابدی ہے، نیز بھوک اور پیاس کا مقابلہ کرنے کی قوت پیدا کرنا ہے، روزہ خالی معدوں کی یاد تازہ کرتا ہے، اور بتلاتا ہے کہ ان مساکین اور فاقہ کشوں پر کیا گزرتی ہے،

---

[1] واضح رہے کہ یہ شرح صدر شق صدر کا ایک لازمی نتیجہ ہے جس کو تمام محققین اہلِ سنت اور علمائے سیرت تسلیم کرتے ہیں، اور جس کا تذکرہ حافظ ابن قیم نے بھی زاد المعاد میں کیا ہے۔ [2] اَلَمْ نَشْرَحْ لَكَ صَدْرَكَ ۝ وَوَضَعْنَا عَنْكَ وِزْرَكَ ۝ الَّذِیْٓ اَنْقَضَ ظَهْرَكَ ۝ وَرَفَعْنَا لَكَ ذِكْرَكَ ۝ (کیا ہم نے نہیں کھول دیا تمہارا سینہ، اور اتار دیا تم سے تمہارا بوجھ جس نے توڑی تھی پیٹھ تمہاری، اور اونچا کیا مذکور تمہارا) [3] صفحہ ۱۵۸ تا ۱۶۰ حصہ اول (نظامی) ص ۱۵۶-۱۵۵ (میمنیہ مصر)

جن کو معدوں کی آگ بجھانے اور اپنے جگر کو ٹھنڈا کرنے کے لئے سامان نصیب نہیں روزہ کھانے
پینے پر پابندی عائد کرنے اور اس کے استعمال کو محدود کر دینے کے ذریعہ شیطان کو انسان کی زندگی میں
تصرّف کرنے اور من مانی کارروائی کرنے سے روک دیتا ہے، اور انسان اس کی برکت سے اپنی طبیعت
کا ایسا تابع فرمان نہیں رہ جاتا کہ ہر دم اس کی پیروی کرتا ہے اور اپنے معاش و معاد کا کچھ خیال
نہ کرے، وہ ہر عضو انسانی میں سکون پیدا کرتا ہے، بہیمی قوت اور سرکشی سے روکتا ہے، انسانی خواہشات کو
لگام دیتا ہے، وہ متقین کی لگام نفس و روح کی معرکہ آرائی میں زرہ اور سپر اور ابرار و مقربین کی ریاضت
ہے، انسان کے تمام اعمال میں وہ ربّ العالمین کا حصۂ خاص ہے، ایک روزہ دار کرتا کیا ہے، یہی کہ اپنی
خواہش اور اپنا کھانا پینا اپنے معبود کی خاطر چھوڑ دیتا ہے، اس لئے روزہ اللہ کی رضا و محبت اور نفس کے
محبوبات اور نفسانی لذتوں کے ترک اور ایک ایثار و قربانی کا نام ہے، اور وہ بندہ اور اللہ کے درمیان
ایک راز ہے جس پر کوئی دوسرا مطلع نہیں ہو سکتا، دوسروں کو اس کا تو پتہ چل سکتا ہے کہ روزہ دار
نے روزہ توڑنے والی چیزوں کو ترک کر دیا، لیکن یہ کہ روزہ دار نے کھانا پینا، اور اپنی خواہشات اپنے
معبود کی خاطر چھوڑی ہیں، یہ ایک قلبی کیفیت ہے، اور بندہ کا ایک راز ہے، جس پر کوئی انسان مطلع
نہیں ہو سکتا، اور یہی صوم کی حقیقت ہے، روزہ کو ظاہری جوارح اور باطنی قویٰ کی حفاظت
میں عجیب دخل ہے، روزہ ان موادِ فاسدہ سے ایک پرہیز ہے، جو جب انسان پر پورا قبضہ و استیلا حاصل
کر لیتے ہیں تو اس میں فساد پیدا کر دیتے ہیں، اسی طرح وہ ان موادِ ردیّہ کو خارج کرتا ہے جو نفس کی صحت میں
مخل ہیں، پس روزہ ایک ہی وقت میں قلب و جوارح کی صحت کی حفاظت بھی کرتا ہے، اور انس کی اس کھوئی
ہوئی صحت کو بھی واپس لاتا ہے، جو خواہشات کے انہماک میں ضائع کر دی تھی، اس لئے وہ تقویٰ
کا بہت بڑا معاون ہے، اور اسی لئے ارشاد ہے: یَآ اَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا كُتِبَ عَلَیْكُمُ الصِّیَامُ كَمَا كُتِبَ عَلَى
الَّذِیْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ[1] "اے ایمان والو حکم ہوا تم پر روزہ کا جیسے حکم ہوا تھا تم سے اگلوں پر

[1] البقرہ-۱۸۳

شاید پرہیزگار بن جاؤ) اور اسی لئے حضرت صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "الصَّوْمُ جُنَّۃٌ" (روزہ ایک ڈھال ہے) اور اسی لئے آپ نے ایسے شخص کو جس پر جنسی خواہش کا غلبہ ہو، اور اس کو نکاح کی مقدرت نہ ہو روزہ رکھنے کا حکم دیا ہے، روزہ کی مصلحتیں اور فوائد جب ایسے ظاہر و باہر ہیں کہ عقل سلیم اور فطرت مستقیم ان کا بآسانی مشاہدہ و احساس کر سکتی ہے تو اللہ تعالے نے روزہ کو اپنے بندوں کے لئے رحمت و احسان اور ایک پرہیز اور محافظ و پہرے دار کی حیثیت سے شروع فرمایا، آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کا طریق عمل اس کے بارے میں بہترین اور مکمل ترین طریق عمل ہے، جو ایک طرف سب سے زیادہ سہل، دوسری طرف حصول مقصد کا سب سے بہتر ذریعہ ہے، چونکہ نفوس انسانی کا اپنے مالوفات و مرغوبات سے رکنا ایک بڑا دشوار کام ہے، اس لئے اس کی فرضیت میں جلدی نہیں کی گئی، بلکہ ہجرت کے بعد وسط اسلام میں اس کی فرضیت نازل ہوئی، جب کہ طبیعتیں توحید و نماز کی خوگر اور احکام قرآنی سے بخوبی مانوس ہو گئی تھیں، روزہ کی فرضیت ۲ھ ہجری میں ہوئی، اس طرح رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی حیاتِ مبارکہ میں نو ایسے رمضان آئے جن میں آپ نے روزہ رکھا، اور اس کی فرضیت میں بھی تدریج و تیسیر سے کام لیا گیا، پہلے وہ اس طرح فرض ہوا کہ مسلمان کو اس کا اختیار تھا کہ چاہے وہ روزہ رکھے، چاہے ایک مسکین کو کھانا کھلاوے، پھر یہ اختیاری حالت جاتی رہی، اور روزہ قطعی طور پر فرض ہو گیا، اور فدیہ کا حکم صرف ایسے بوڑھے اور عورت کے لئے رہا جو روزہ کی طاقت نہیں رکھتے، یہ دونوں روزہ چھوڑ سکتے ہیں، اور ہر دن کے بدلہ میں ایک مسکین کو کھانا کھلا سکتے ہیں[۱]، مریض و مسافر کے لئے اس کی اجازت دی گئی کہ روزہ نہ رکھیں اور قضا کر لیں، اور حاملہ عورت اور دودھ پلانے والی عورت کے لئے بھی رخصت ہے، اگر ان کو اپنے یا اپنے بچہ کی جان کا اندیشہ ہو۔[۲]

کتاب کا معرکۃ الآراء حصہ اور مصنف کے علمی تبحر، وسعتِ نظر اور استحضار کا روشن ثبوت حج کا باب ہے،

---

[۱] تفصیلات و جزئیات کے لئے ملاحظہ ہوں کتب فقہ۔ [۲] ص ۱۶۰-۱۶۱ نظامی

حج اور اس کے متعلقات اور حج نبوی اور اس کے احکام کے متعلق ایسی محققانہ مبسوط بحث اور ایسا بڑا علمی ذخیرہ کسی اور کتاب میں اس کوتاہ نظر کی نظر سے نہیں گزرا، یہ حصہ مصری ایڈیشن کے صفحہ ۱۸۰ سے صفحہ ۳۴۹ تک یعنی ۶۹ صفحات پر پھیلا ہوا ہے، اس سلسلہ میں آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کے حجۃ الوداع کی مفصل کیفیت اور مدینہ کے خروج سے لے کر واپسی تک کی مفصل و مسلسل روداد سفر پیش کردی ہے، اور وہ حدیث کے مختلف ذخیروں کا خلاصہ اور روایات صحیحہ اور جزئیات مختلفہ کا بہترین مجموعہ ہے[۱]، اس باب میں انھوں نے حج کے بہت سے اختلافی مباحث اور مختلف فیہ مسائل پر روشنی ڈالی ہے اور حدیث کی روشنی میں آزادانہ اور مجتہدانہ فیصلہ کیا ہے، اس میں وہ کسی ایک مذہب فقہی کے پابند نہیں معلوم ہوتے، مثلاً باوجود حنبلی ہونے کے وہ بڑے مدلل طریقہ پر ثابت کرتے ہیں کہ آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم نہ مفرد تھے، نہ متمتع، بلکہ قارن تھے[۲]، پھر آپ کے حج قران کی کیفیت میں متقدمین و متاخرین سے جو اختلافات اور اغلاط واقع ہوئے ہیں، ان کی نشاندہی کرتے ہیں، اور ان کا ماخذ اور عذر لکھتے ہیں[۳]، نیز اکابر علماء کو حج نبوی کے بارے میں زمانہ قدیم و جدید میں جو اوہام پیش آئے ہیں، اور بڑے بڑے محققین و علمائے متبحرین کو جو غلط فہمیاں واقع ہوئی ہیں، ان کو ظاہر کیا ہے، اور تحقیقی بات لکھی ہے، اس سلسلہ میں تابعین میں سے طاؤس، متقدمین میں سے طبری اور ائمہ متاخرین میں سے قاضی عیاض اور علامہ ابن حزم جیسے اساطین علم، اور مشاہیر رجال کی غلط فہمیوں اور اوہام کو ظاہر کیا ہے[۴]، اس سے ان کے رسوخ فی العلم اور حیرت انگیز علمی تبحر کا اندازہ ہوتا ہے، حقیقت یہ ہے کہ محض حج کا باب اس کتاب کی عظمت اور اس کے مصنف کی امامت اور جلالتِ قدر کے ثبوت کے لئے کافی ہے، کتاب میں حافظ ابن قیم رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے اور اپنے شیخ کے مذاق اور اپنی تحقیق اور وسعتِ نظر کے مقام کے مطابق کلامی مباحث اور عقائد پر بھی جابجا گفتگو کی ہے، اور روحِ شریعت کی صحیح ترجمانی کی کوشش کی ہے، اس سلسلہ میں توکل کی حقیقت اور توسل بالاسباب کے بارہ میں انھوں نے جو محققانہ بحث کی ہے، وہ دیکھنے کے قابل ہے[۵]۔

---

[۱] ملاحظہ ہو ص ۲۳۶ تا ۲۴۶/۱ (نظامی) [۲] ص ۱۸۵ تا ۱۹۰/۱ (نظامی) [۳] ص ۱۹۵ تا ۲۰۴/۱ (نظامی) [۴] ملاحظہ ہو فصل فی الاوہام ص ۲۴۹ تا ۲۵۱/۱ (نظامی) [۵] ملاحظہ ہو ص ۳۶۴ تا ۳۶۶/۱ (نظامی).

غزواتِ نبوی کا بیان شروع کرنے سے پہلے انھوں نے حقیقت جہاد اور مراتب جہاد پر حسب عادت محققانہ اور عارفانہ کلام کیا ہے[1]، پھر دعوتِ اسلام کی ابتداء مکہ معظمہ کے حالات اور ہجرت مدینہ اور جہاد کی فرضیت اور جہاد مالِ غنیمت، صلح و امان، جزیہ اور معاملہ اہل کتاب و منافقین کے احکام تفصیل سے لکھے ہیں[2]، جہاد کی مشروعیت اور فرضیت کے ذکر کرنے کے موقع پر انھوں نے جنت کی حقیقت اور اس کے مقابلہ میں جان کے بے قیمت ہونے کا تذکرہ بڑے ولولہ انگیز اور دل آویز طریقہ پر کیا ہے اور وہ ان کے زورِ تحریر اور قوتِ ایمانی کا بہت اچھا نمونہ ہے، وہ لکھتے ہیں:۔

"محبت اور جنت کا مہر یہ ہے کہ نفس و مال کو نفس و مال کے اس مالک کی راہ میں خرچ کر دیا جائے، جو ان دونوں کو اہلِ ایمان سے خرید چکا ہے، کسی بزدل، ناقدر، محروم، تہی دست و بے بضاعت کا کیا جگر و حوصلہ کہ اس سودے کا مول تول کرے، قسم بخدا وہ کوئی ایسا گرا پڑا سودا نہیں کہ مفلس و فقیر اس کا مول تول کرنے لگیں اور نہ اس کی ایسی کساد بازاری ہے کہ تنگ دست اس کو قرض لینے کی خواہش کریں، یہ سودا قدر دانوں کے بازار میں فروخت کے لئے پیش کیا گیا تو مالک جان سے کم قیمت پر اس کو فروخت کرنے پر آمادہ نہیں ہوا، بیکار اور باتیں بنانے والے یہ سن کر پیچھے ہٹ گئے، اور عشاق یہ دیکھنے کے لئے آگے بڑھے کہ کس کی جان اس کی قیمت ہو سکتی ہے، سودا برابر گردش میں رہا اور آخر کار ان لوگوں کے ہاتھوں میں جا کر ٹھہر گیا جو مومنین کے حق میں نرم اور کافروں کے حق میں سخت تھے، جب محبت کے مدعیوں کی کثرت ہوئی تو دعوی کی صحت پر ان سے دلیل مانگی گئی، اس لئے کہ اگر ہر شخص کا دعوی تسلیم کر لیا جائے تو عاشق و مدعی میں اور غمزدہ اور بہروپیے میں کوئی فرق نہ رہ جائے، مدعیوں نے مختلف قسم کی گواہیاں پیش کیں، کہا گیا کہ یہ دعوی ثبوت کے بغیر قبول نہیں کیا جا سکتا، "قُلْ اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِىْ يُحْبِبْكُمُ اللّٰهُ"[3] "(اگر تم خدا سے محبت کرتے ہو تو میری پیروی کرو، خدا تمہارا محب بن جائے گا) یہ سن کر سب پیچھے ہٹ گئے، اور وہی لوگ اپنی جگہ پر قائم رہے جو تمام اقوال و افعال عادات و اخلاق میں رسول کے سچے پیرو تھے، اب ان سے

---

[1] صفحہ ۲۹۱ تا ۲۹۴ / ۱ [2] صفحہ ۲۹۵ تا ۳۳۲ / ۱ (نظامی) [3] آل عمران - ۳۱

ثبوت کے صحیح ہونے کا مطالبہ کیا گیا اور کہا گیا کہ اس ثبوت کی صحت و عدالت اس وقت تک تسلیم نہیں کی جا سکتی جب تک کہ وہ لوگ اس کا تزکیہ اور تصدیق نہ کریں جن کی شان میں ہے "یُجَاهِدُوْنَ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ وَلَا یَخَافُوْنَ لَوْمَةَ لَآئِمٍ" (اللہ کے راستہ میں ہر طرح کی کوششیں کرتے ہیں اور کسی ملامت کرنے والے کی ملامت کی پرواہ نہیں کرتے) یہ سن کر محبت کے اکثر مدعی پیچھے ہٹ گئے، اور مجاہدین قائم رہے، ان سے کہا گیا کہ عشاق کی جانیں اور ان کے مال ان کی ملک نہیں پس جس چیز کا سودا ہو گیا اس کو حوالہ کرو "اِنَّ اللّٰہَ اشْتَرٰی مِنَ الْمُؤْمِنِیْنَ اَنْفُسَهُمْ وَاَمْوَالَهُمْ بِاَنَّ لَهُمُ الْجَنَّةَ" (بیشک اللہ تعالیٰ مومنین سے ان کی جانیں اور ان کے مال خرید چکا ہے اس قیمت پر کہ ان کو جنت ملے گی) اور جب بائع و مشتری میں بیع و شراء ہو جائے تو ایک کے لئے مال کی سپردگی، اور دوسرے کے لئے قیمت کی حوالگی ضروری ہے، جب تاجروں نے خریدار کی عظمت و قیمت کی مقدار اور جس کے ہاتھ پر یہ سودا ہوا ہے، اس کی عظمت و شان اور اس کتاب کی حیثیت دیکھی جس میں کہ اس معاملہ کا ذکر ہے تو سمجھ گئے کہ یہ مال بڑی عظمت و شان والا ہے، اس وقت انھوں نے اس میں بڑا نقصان اور گھاٹا سمجھا کہ اس کو وہ اونے پونے چند ایسے سکوں میں بیچ ڈالیں، جن کی لذت فانی اور جن کی حسرت اور وبال باقی ہے اس لئے ایسا کرنے والا بڑا نادان اور کوتاہ نظر ہے، اس وقت انھوں نے خریدار کے ساتھ اپنی رضا و اختیار سے بغیر ثبوت خیار کے بیعت رضوان کا معاملہ کیا، اور انھوں نے کہا کہ بخدا نہ ہم قیمت واپس لیں گے اور نہ ہم اس سے اس بیع کو فسخ کرنے کی درخواست کریں گے، جب یہ بیع و شرا مکمل ہو گئی، اور انھوں نے جنس حوالہ کر دی، تو ان سے کہا گیا کہ تمہاری جانیں اور تمہارے مال ہمارے ہو چکے، اور ہم اب ان کو بہت بڑھا کر اور کئی گنا بنا کر تمہاری طرف واپس کرتے ہیں۔

"وَلَا تَحْسَبَنَّ الَّذِیْنَ قُتِلُوْا فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ اَمْوَاتًا بَلْ اَحْیَاءٌ عِنْدَ رَبِّهِمْ یُرْزَقُوْنَ"[1] (اور ان لوگوں کو جو اللہ کے راستہ میں مارے گئے، مردہ تصور نہ کرو، وہ تو اپنے رب کے یہاں زندہ ہیں، ان کو

[1] آل عمران - ۱۶۹

رزق دیا جاتا ہے) ہم نے تم سے تمہاری جانیں اور تمہارے مال نفع کی لالچ میں نہیں طلب کئے تھے، بلکہ ہمارے جود و کرم کا اظہار ہو کہ ہم کس طرح عیب دار چیز کو قبول کر کے اس پر بڑی سے بڑی قیمت دیتے ہیں، ہم نے تمہاری قیمت اور مال دونوں جمع کر دیئے اس موقع پر حضرت جابرؓ کا قصہ یاد کرو کہ ان سے رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے اونٹ خریدا پھر ان کو پوری پوری قیمت دی، اور اس قیمت میں اضافہ کیا، پھر وہ اونٹ بھی واپس دے دیا۔ ان کے والد غزوۂ احد میں شہید ہوئے تھے آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کے اس معاملہ سے ان کی توجہ اس طرف ہوئی، اللہ تعالےٰ نے ان کے والد کے ساتھ بھی ایسا ہی معاملہ کیا، چنانچہ آنحضرتؐ نے ان کو خبر دی کہ اللہ تعالےٰ نے ان کو زندہ کیا، اور ان سے بلا حجاب گفتگو کی اور کہا کہ اے میرے بندہ مجھ سے مانگ جو کچھ مانگنا ہے، خدا کے جود و کرم تک انسان کا علم کیا پہونچ سکتا ہے، اس نے مال بھی دیا، قیمت بھی دی، اور اس بیع و شرا کے معاملہ کے تکمیل کی توفیق بھی عطا فرمائی اور اس مال کو اس کے عیب و نقص کے باوجود قبول بھی فرمایا، اس پر بڑی سے بڑی قیمت عطا فرمائی، اور اپنے بندہ کو اس نے اپنے ہی دیئے ہوئے مال سے خرید لیا، اور پھر اس کی تعریف بھی کی، اور باوجود اس کے کہ خود ہی توفیق دی تھی، اس کی مدح فرمائی۔

خدا کے داعی نے خدا کی طرف اور دار السلام (جنت) کی طرف غیرت مندوں اور عالی ہمتوں کو بلایا، اور ایمان کے منادی نے کان رکھنے والوں کو سنایا، اور ہر زندہ ضمیر کو گرمایا، جنت کے مسافروں اور رضائے الٰہی کے طالبوں میں ایک صدائے رحیل بلند ہوئی، اور ایک ہنگامۂ رستخیز برپا ہو گیا، اور لوگوں کو منزل پر پہونچے بغیر قرار نہ آیا[1]، اور کیوں نہ ہو؟ شاعر نے کہا ہے ؎

جان کی قیمت دیارِ عشق میں ہے کوئے دوست

اس نویدِ جانفزا سے سر وبالِ دوش ہے

---

[1] ملاحظہ ہو ص۳۱۱ و ۳۱۲ (نظامی)

اس کے بعد انھوں نے آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کے مغازی اور بعوث اور مہمات ترتیب و تسلسل کے ساتھ پیش کئے ہیں، پھر وہ چونکہ حدیث و سیرت پر بیک وقت نظر رکھتے ہیں اور مورخ سے زیادہ نقاد و محدث ہیں، اس لئے ان کے کتاب کا یہ حصہ سیرت کی دوسری کتابوں پر فوقیت رکھتا ہے، اختلافی چیزوں میں ان کا قول قولِ فیصل کا حکم رکھتا ہے، ان مغازی اور واقعات کے سلسلے میں وہ اپنے طرزِ خاص کے ساتھ آیات کی تفسیر اور ان کے لطائف و اسرار بھی بیان کرتے جاتے ہیں[۱] غزوات کا ذکر کرنے کے بعد ان کا معمول ہے کہ اس غزوہ کے متعلق جتنے فقہی احکام ہوتے ہیں، یا اس سے جو مسائل و احکام استنباط کئے جا سکتے ہیں، ان سب کا تذکرہ کر دیتے ہیں، مثلاً غزوۂ خیبر کے بعد انھوں نے مستقل فصل لکھی "فیما کان فی غزوۃ خیبر من الاحکام الفقہیۃ"[۲] غزوۂ فتح کے بعد لکھتے ہیں :- "فصل فی اشارۃ الی ما فی ھذہ الغزوۃ من الفقہ واللطائف"[۳] غزوۂ حنین و اوطاس کے بعد لکھا ہے "فصل" الی اشارۃ ماتضمنت ھذہ الغزوۃ من المسائل الفقہیۃ والنکت الحکمیۃ"[۴] وغیرہ وغیرہ ان میں وہ بہت قیمتی فقہی مواد جمع کر دیتے ہیں۔

ان غزوات و واقعات میں وہ متقدمین اہلِ سیر و مغازی کے مقلد و ناقلِ محض نہیں ہیں، انھوں نے بعض مواقع پر بعض مشہور باتوں سے اختلاف کیا ہے، اور اپنے ذاتی مطالعہ اور فہم سے اپنی ذاتی تحقیق پیش کی ہے، مثلاً عام طور پر کتب سیر و تاریخ میں نقل ہوتا چلا آ رہا ہے اور سمجھا جاتا رہا ہے کہ انصاری بچیوں اور عورتوں کے خیر مقدمی اشعار یہ

طلع البدر علینا | من ثنیات الوداع
وجب الشکر علینا | ما دعا للہ داع
ایہا المبعوث فینا | جئت بالامر المطاع

اس موقع پر پڑھے گئے تھے، جب آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم مکہ معظمہ سے ہجرت کر کے مدینہ طیبہ میں داخل ہو رہے تھے، مگر ان کو اس سے اختلاف ہے، ان کی تحقیق یہ ہے کہ یہ اشعار غزوۂ تبوک (جو شام کی جانب ہے)

---

[۱] ص ۲/۳۵ (نظامی) [۲] ص ۳۹۱ [۳] ص ۴۰ [۴] ص ۴۳۹

سے واپسی کے موقع پر پڑھے گئے، وہ لکھتے ہیں :-

وبعض الرواة يهم في هذا ويقول انما كان ذلك عند مقدمه للمدينة من مكة وهو وهم ظاهر فان ثنيات الوداع انما هي من ناحية الشام لايراها القادم من مكة الى المدينة ولا يمر بها الا اذا توجه الى الشام۔[1]

بعض راویوں کو اس بارہ میں غلط فہمی ہوگئی ہے کہ یہ اشعار آپ کے مکہ معظمہ سے مدینہ طیبہ تشریف آوری کے موقع پر پڑھے گئے یہ ایک کھلا ہوا مغالطہ ہے اس لئے کہ ثنیات الوداع شام کی جانب ہے مکہ سے آنے والا اس کو نہیں دیکھ سکتا، اور جب تک کہ شام کی طرف اس کا رخ نہ ہو وہ ان کے پاس سے نہیں گزرتا۔

غزوۂ تبوک کے بعد بھی انھوں نے اس کے احکام و فوائد تفصیل سے لکھے ہیں، اور ان میں بہت سی کارآمد باتیں، فقہی معلومات، لطیف استنباطات اور اجتماعی اور تمدنی احکام آگئے ہیں[2]، مغازی و بعوث سے فارغ ہو کر انھوں نے وفودِ عرب کی آمد تفصیل سے بیان کی ہے[3]، اور آپ کے وفود و مکاتیب کا تذکرہ کیا ہے، جو آپ نے شاہانِ عالم اور امرائے عرب کو بھیجے تھے[4]۔

کتاب کی جلد ثانی کا ایک بڑا حصہ طبِ نبوی سے مخصوص ہے، اس میں انھوں نے طبِ نبوی کے اسرار و حکم اور ان کی طبی توجیہات پیش کی ہیں، اس میں احکام طبیہ، احکام فقہیہ اور مباحثِ حدیثیہ ساتھ ساتھ ہیں[5]، اس سلسلہ میں انھوں نے ایک بڑی محنت یہ کی ہے کہ حروفِ تہجی کے اعتبار سے ان تمام ادویہ و اغذیہ اور مفردات کو ایک جگہ جمع کر دیا ہے، جن کے بارے میں کوئی صحیح یا ضعیف یا موضوع حدیث بیان کی جاتی ہے اور ان پر طبی حیثیت سے کلام کیا ہے اور ان کے خواص بیان کئے ہیں[6]، امراض و معالجات میں جہاں انھوں نے عشق و محبت کے مرض و علاج محبت کی حقیقت اور اس کے طبعی اسباب، اس کے اقسام و درجات، پھر اس کے علاج و تدبیر کا تذکرہ کیا ہے وہاں ان کی نفسیات سے گہری واقفیت، زندگی کے وسیع مطالعہ اور امراضِ قلب سے آگاہی کا اندازہ ہوتا ہے[7]، اس طب نبوی

---

[1] ص ۴۶۶/۱ (نظامی) [2] ملاحظہ ہو فصل فی الاشارۃ الی بعض ما تضمنتہ ہذہ الغزوۃ من الفقہ والفوائد ص ۴۶۹ تا ۴۸۲ (نظامی)

[3] ایضاً ص ۴۸۳ تا ۵۱۸ [4] ایضاً ص ۵۱۸، ص ۱۴۱-۲/۲ [5] ملاحظہ ہو ص ۲-۱۴۱/۲ [6] ص ۹۸/۲ [7] ص ۹۲-۹۷/۲

کے بارہ میں اگرچہ نکتہ کی بات وہی معلوم ہوتی ہے، جو شیخ الاسلام شاہ ولی اللہ دہلوی نے حجۃ اللہ البالغہ میں لکھی ہے کہ اس کی حیثیت تبلیغی و تشریعی نہیں ہے، اور وہ آپ کے اور اہلِ عرب کے تجارب و عادات پر مبنی ہے[1]، تاہم ان لوگوں کے لئے جو ہر ارشادِ نبوی کو عظمت و محبت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں، اور ہر مشورہ پر یقین و محبت کے ساتھ عمل کرنے کے لئے تیار رہتے ہیں، بیش قیمت مواد یکجا جمع ہوگیا ہے۔

اس حصہ سے فارغ ہوکر انھوں نے آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کے فیصلوں اور آپؐ کے اقضیہ و احکام کی طرف توجہ کی ہے، اس میں مختلف ابوابِ فقہیہ و معاملات پر ایک بڑا وسیع اور بیش قیمت ذخیرہ جمع کردیا ہے، اور گویا فقہ کی ایسی کتاب مرتب کردی ہے، جو احادیث اور احکام و اقضیۂ نبوی پر مبنی ہے[2]، ان ابواب و فصول کے علاوہ اس کتاب میں بہت سے بیش قیمت تفسیری، نحوی، تاریخی، کلامی لطائف و نکات و تحقیقات ہیں، جو اس ایک ہزار صفحہ کی کتاب میں منتشر و متفرق ہیں۔

اس کتاب کا قابلِ تنقید پہلو صرف یہ ہے کہ اس میں سیرت، حدیث، فقہ، تاریخ، کلام، نحو و صرف اور تقریباً تمام علومِ اسلامیہ مخلوط ہیں، اور غالباً اس کتاب کی تالیف کے وقت ان پر ان کے شیخ کی نسبت غالب تھی، اس لئے وہ ذراسی مناسبت سے کسی نحوی، کلامی مسئلہ کو چھیڑ دیتے ہیں، اور پھر پورے شرح و بسط کے ساتھ اس پر کلام کرتے ہیں، اگر اس میں سے سیرت و شمائل کو علیحدہ، مغازی و اہم واقعات کو علیحدہ، فقہ و احکام کو علیحدہ اور نحوی مباحث کو علیحدہ درج کردیا جائے تو اس سے استفادہ آسان ہوجائے[3]، لیکن اس کے باوجود وہ اسلام کی ان اہم تصنیفات میں سے ہے، جو ایک پورے کتب خانہ کی قائم مقام، اور اس کا وجود ایک متبحر و محقق کثیر الفنون عالم کی موجودگی کے مرادف ہے، اور اس سے ہزاروں طالبینِ راہِ خدا متبعینِ سنت نے دینی رہنمائی اور روحانی غذا اور ایمانی حلاوت پائی۔

---

[1] حجۃ اللہ البالغہ باب بیان اقسام علوم النبی صلے اللہ علیہ وسلم ص۱۰۲ جلد ۱ مصری [2] ص ۱۴۲/۲ تا آخر کتاب [3] راقم سطور نے ۱۳۴۷ھ میں مدینہ طیبہ کے قیام کے دوران میں اس کی تجرید و تلخیص کا کام خیر الزاد کے نام سے شروع کیا تھا۔ افسوس ہے کہ وہ ناتمام رہ گیا۔

ابن عبدالہادی

شیخ الاسلام حافظ ابن تیمیہ کے ان تلامذہ و منتسبین میں جن کو حدیث و سنت پر حیرت انگیز عبور تھا، اور جن کی عمر کا بیشتر حصہ علومِ سنت کی اشاعت اور خدمت اور اصلاح و دعوت میں گزرا حافظ ابن قیم کے علاوہ ابن عبدالہادی، ابنِ کثیر اور ابنِ رجب خاص امتیاز اور شہرت رکھتے ہیں۔

ابن عبدالہادی نے چالیس سال سے کم عمر پائی، اہلِ سیر و سوانح کا اندازہ ہے کہ اگر ان کی عمر وفا کرتی تو وہ اکابرِ اہلِ عصر میں سے ہوتے، اور بڑے بڑوں سے بھی سبقت لے جاتے، صفدی کا قول ہے "لو عاش لکان آیۃ" (اگر زندہ رہتے تو عجائبِ روزگار میں سے ہوتے) علامہ ذہبی نے معجم میں ان کو ان الفاظ کے ساتھ یاد کیا ہے:۔

ھُوَ الفقیہ البارعُ المقریُٔ المجوّد المحدّث	وہ بڑے ماہر فقیہ، بہت اچھے قاری، محدث، حافظ
الحافظ النحوی الحاذق، ذوالفُنُون	مبصر نحوی، صاحبِ علوم و فنون ہیں، انھوں نے مجھ سے
کتبَ عنّی واستفدتُ مِنہ۔[1]	حدیث سنی اور کتابت کی اور میں نے بھی ان سے استفادہ کیا۔

علامۂ وقت ابوالحجاج المزّی کا ان کے متعلق اعتراف ہے:۔

ما التقیتُ بہ الا واستفدتُ منہ۔[2]	جب کبھی ان سے ملنا ہوتا کوئی نہ کوئی فائدہ حاصل ہوتا۔

---

[1] الدرر الکامنہ ج ٣ ص ٣٢٢ [2] ایضاً ج ٣ ص ٣٢٢

یہی الفاظ علامہ ذہبی سے بھی منقول ہیں[1]۔ صفدی کہتے ہیں :۔

كنتُ اذا لقيتُهُ سألتُه عن مسائل	میری جب ان سے ملاقات ہوتی تو میں ان سے
ادبية وفوائد عربية	مسائل ادبیہ اور عربیت کے متعلق علمی سوالات
فينحدر كالسَّيل[2]۔	کرتا اور وہ سیلاب کی طرح رواں ہوجاتے ۔

حافظ ابن کثیر (صاحب تاریخ وتفسیر) ان الفاظ میں ان کا تذکرہ کرتے ہیں :۔

حصّل من العلوم ما لا يبلغه الشيوخ	انھوں نے وہ علمی درجہ حاصل کیا جس تک بڑے بڑے
الكبار وتفنن في الحديث والنحو	معمر علماء واساتذہ عام طور پر نہیں پہونچتے، حدیث
والتصريف والفقه والتفسير والاصلين	نحو، صرف، فقہ، تفسیر، اصول فقہ، اصول حدیث
والتاريخ والقرءات، وله مجاميع	تاریخ، قرأت تمام علوم میں ان کو کمال تھا، ان کے
وتاليفُ مفيدةٌ كثيرةٌ وكان	بہت سے مفید مجموعے اور تصنیفات ہیں، وہ اسمائے
حافظاً جيداً لأسماء الرجال وطرق	رجال وطرق حدیث کے بہت اچھے حافظ، جرح
الحديث عارفاً بالجرح والتعديل مُبصراً	وتعدیل کے فن سے خوب واقف، عِلَل حدیث کے
بعلل الحديث حسن الفهم له جيد	مبصر اور اس کی بہت اچھی سمجھ رکھنے والے تھے
المذاكرة صحيح الذهن مستقيماً على	علماء کے ساتھ بہت اچھے طریقہ پر علمی مذاکرہ
طريقة السَّلف واتباع الكتاب والسنة	کرتے، ذہن نہایت سلیم تھا، طریقۂ سلف پر
مثابراً على فعل الخيرات[3]۔	اللہ تعالیٰ نے ان کو استقامت عطا فرمائی تھی،
	اور کتاب وسنت کے اتباع کی توفیق دی تھی،
	اعمالِ صالحہ پر صبر وثبات سے قائم رہے ۔

---

[1] الدرر الکامنہ ج ۳ ص ۳۳۲ [2] ایضاً [3] البدایۃ والنہایہ ج ۱۴ ص ۲۱

مختصر حالات

شمس الدین محمد نام، العماد لقب، ابو عبداللہ اور ابو العباس کنیت، عام طور پر ابن عبدالہادی کے نام سے مشہور ہیں، سلسلۂ نسب اس طرح ہے، محمد بن احمد بن عبدالہادی بن عبدالحمید بن عبدالہادی ابن یوسف بن محمد بن قدامہ، خاندان کا اصل وطن بیت المقدس تھا، پھر وہ دمشق منتقل ہوا، اور دمشق میں محلہ صالحیہ میں قیام اختیار کیا، جہاں ابن عبدالہادی کی ۷۰۴ھ میں پیدائش ہوئی[1]، مختلف روایات سے قرآن مجید کی قرآت حاصل کی، حدیث اور درسی کتابوں کا بڑا حصہ قاضی ابو الفضل سلیمان ابن حمزہ ابوبکر بن عبدالدائم، عیسیٰ بن مطعم حجار، زینب بنت الکمال اور بہت سے اساتذہ اور علماء سے حاصل کیا، حدیث اور فنونِ حدیث سے خاص طور پر اشتغال کیا، اور فنِ رجال اور علل حدیث میں خاص مہارت اور بصیرت پیدا کی، اور مذاہب میں تفقہ حاصل کیا، اصولِ حدیث اور اصولِ فقہ اور علومِ عربیہ میں بھی دستگاہ کامل تھی، ابن رجب لکھتے ہیں:۔

ولازم الشیخ تقی الدین ابن تیمیہ مدۃ	شیخ الاسلام ابن تیمیہ کی صحبت میں عرصہ تک
وقرأ علیہ قطعۃ من الاربعین فی	رہے، اور ان سے رازی کی کتاب الاربعین فی
أصول الدین للرازی۔	اصول الدینؒ کا ایک حصہ پڑھا۔

فقہ میں ان کے خاص استاد شیخ نجم الدین حرانی تھے، مشہور محدث و عالم رجال اور اپنے زمانہ کے عالم حدیث و رجال حافظ ابو الحجاج المزی کی صحبت میں دس برس رہے، علامہ ذہبی سے بھی تحصیل علم کی، اور علامۂ موصوف نے رجال و علل اور علوم میں ان کی مہارت اور تفوق کا اعتراف کیا، حسینی کے بیان کے مطابق عرصہ تک مدرسہ صدریہ و ضیائیہ میں درس دیا، اور صدر مدرس رہے۔[2]

---

[1] ابن رجب، ابن کثیر میں ۷۰۵ھ سنہ ولادت ہے۔ [2] الدرر الکامنہ ج ۳ ص ۳۳۲

ان کے معاصر ابن کثیر ان کی وفات کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ وہ تین مہینے کے قریب پھوڑے اور سل کے بخار میں بیمار رہے، یہ تکلیف بہت بڑھ گئی اور اسہال کی شدت ہوئی آخر بدھ کے روز ۱۰ جمادی الاولیٰ ۷۴۴ھ میں عصر کی اذان سے پہلے انتقال کیا، ابن کثیر کہتے ہیں کہ ان کے والد نے مجھے بتلایا کہ آخری الفاظ جو ان کی زبان پر جاری ہوئے وہ یہ تھے "اَشْهَدُ اَنْ لَّا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَاَشْهَدُ اَنَّ مُحَمَّدًا رَّسُوْلُ اللّٰهِ اَللّٰهُمَّ اجْعَلْنِیْ مِنَ التَّوَّابِیْنَ وَاجْعَلْنِیْ مِنَ الْمُتَطَهِّرِیْنَ" اگلے روز جمعرات کے دن جامع مظفری میں ان کی نماز جنازہ ہوئی جس میں شہر کے قضاۃ، اعیان و مشاہیر علماء و حکام اور تجار و عوام سب شریک ہوئے ابن کثیر لکھتے ہیں :-

وکانت جنازتہ حافلۃ ملیحۃ علیہا ضوءٌ ونورٌ	ان کے جنازہ میں بڑا اژدحام اور ایک خاص طرح کی نورانیت اور رونق تھی۔

روضہ میں السیف بن المجد کے پہلو میں دفن ہوئے[1]۔

تصنیفات

علامہ ابن عبدالہادی نے کم عمر پانے کے باوجود تصانیف کی ایک بڑی تعداد یادگار چھوڑی جو ضخامت اور صفحات کی تعداد کے لحاظ سے بھی اہمیت رکھتی ہیں، اور حسنِ تصنیف اور مواد کے لحاظ سے بھی[2]، ان میں سے متعدد کئی کئی جلدوں میں ہیں، حافظ ابن رجب نے "ذیل طبقات الحنابلہ" میں جن تصانیف کا حوالہ دیا ہے ان میں سے زیادہ اہم تصنیفات کا یہاں تذکرہ کیا جاتا ہے "الاحکام الکبریٰ"، جلد "المحرر فی الاحکام ایک جلد" "کتاب العمدۃ فی الحفاظ" دو جلدیں" "تعلیقۃ للثقات دو جلدیں" "احادیث الصلوٰۃ علی النبی صلی اللہ علیہ وسلم" ایک جلد" "الاعلام فی ذکر مشائخ الائمۃ الاعلام" "اصحاب الکتب الستۃ"

---

[1] البدایۃ والنہایۃ ص ۲۱ ج ۱۴ [2] اس بارے میں ان کو ہندوستان کے مشہور و مقبول عالم و مصنف مولانا عبدالحی لکھنوی سے مشابہت ہے جنھوں نے صرف ۳۹ سال عمر پائی اور تصانیف کا ایک بڑا اور مفید ذخیرہ یادگار چھوڑا۔

متعدد اجزاء، ایک ضخیم کتاب آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کی ولادت کے بارہ میں، تعلیقۃ علی سنن البیہقی ۲ جلدیں، ترجمۃ الشیخ تقی الدین ابن تیمیہ ایک جلد، منتقی من تہذیب الکمال للمزی پانچ جلدیں، منتخب من مسند الامام احمد ۲ جلدیں، منتخب من البیہقی، منتخب من سنن ابی داؤد، شرح الفیہ لابن مالک ایک جلد، امام ذہبی کی تصانیف پر تنقید و تعقبات متعدد اجزاء، الرد علی ابی حیان النحوی، اس کے علاوہ مختلف تعلیقات اور مختلف احادیث کے بارہ میں مستقل رسائل جن کی فہرست طویل ہے، علامہ تقی الدین ابن السبکی نے مسئلہ زیارت پر شیخ الاسلام ابن تیمیہ کی تردید میں جب "شفاء السقام فی زیارۃ خیر الانام" کتاب لکھی تو علامہ ابن عبد الہادی نے الصارم المنکی فی الرد علی السبکی کے نام سے اس کا ناقدانہ و محدثانہ جواب لکھا جو ان کی علمی فضیلت اور حدیث و رجال پر وسعتِ نظر کا گواہ ہے۔[1]

---

[1] یہ کتاب پہلی بار ۱۳۱۹ھ ہجری میں مطبع خیریہ مصر میں شائع ہوئی۔

ابنِ کثیر

عماد الدین اسماعیل بن عمر نام، ابوالفداء کنیت، ابن کثیر کے نام سے شہرت پائی، قیسی الاصل تھے، شہر بُصری (شام) کے نواح میں مَجدَل گاؤں جہاں ان کے والد خطیب تھے ۷۰۱ھ میں پیدا ہوئے، ۷۰۶ھ میں دمشق اپنے والد کے ساتھ منتقل ہوئے، شیخ برہان الدین الفزاری وغیرہ سے فقہ کی تعلیم حاصل کی، ابن السویدی، ابوالقاسم ابن عساکر اور دوسرے شیوخ حدیث سے حدیث کی سماعت و روایت کی، علامہ مزی سے تلمذ خاص تھا، اور ان کی دامادی کا شرف بھی حاصل تھا، بکثرت ان سے روایتیں ہیں، فتویٰ، تدریس، مناظرہ سے اشتغال رہا، فقہ، تفسیر، اور نحو میں خاص دستگاہ تھی، رجال و علل حدیث میں نظر وسیع اور دقیق تھی، مدرسۂ ام الصالح میں مدرس رہے، اور علامہ ذہبی کے انتقال کے بعد مدرسہ تنکزیہ میں بھی درس دیا، علامہ ذہبی کے ان کے متعلق الفاظ ہیں:۔

هُوَ فقیهٌ متقنٌ و محدّثٌ محقّقٌ ومفسّرٌ نقّادٌ ولهٗ تصانیف مُفیدَۃٌ۔	وہ پختہ کار فقیہ، محقق محدث اور نقاد مفسر ہیں، اور مفید تصانیف رکھتے ہیں۔

حافظ ابن حجر عسقلانی کہتے ہیں:۔

کَانَ کثیرَ الاستحضار وسارت تصانیفه فی البلاد فی حیاته وانتفع بهٖ الناس	بڑے حاضر العلم، کثیر المحفوظات تھے، ان کی تصانیف ان کی زندگی ہی میں ملکوں میں پھیل گئی تھیں، اور لوگوں

یعد وفاتہ۔ نے ان کی وفات کے بعد بھی ان سے فائدہ اٹھایا۔

باوجود شافعی ہونے کے شیخ الاسلام ابن تیمیہ کے بڑے گرویدہ اور ان کی عظمت و امامت کے قائل تھے ان سے تلمذ بھی ہے، ابن حجر کہتے ہیں "اخذ عن ابن تیمیۃ ففتن بحبہ وامتحن بسببہ" "البدایۃ والنہایۃ" میں ان کے حالات و واقعات زندگی بڑی تفصیل اور شغف و اہتمام سے لکھے ہیں، اور ان کی طرف سے پوری مدافعت کی ہے، ہماری کتاب میں شیخ الاسلام کے حالات و واقعاتِ زندگی کا بڑا حصہ اسی کتاب سے ماخوذ ہے، تصانیف میں سے التکمیل فی معرفۃ الثقات والضعفاء والمجاھیل پانچ جلدوں میں، اور الھدی والسنن فی احادیث المسانید والسنن، تخریج ادلۃ التنبیہ، مسند الشیخین، علوم الحدیث، طبقات الشافعیہ، وغیرہ ان کی تصانیف ہیں، احکام میں ایک مبسوط کتاب لکھنی شروع کی تھی، لیکن مکمل نہیں ہوئی، مسند امام احمدؒ کو حروف پر مرتب کیا، اور اس میں طبرانی اور ابویعلیٰ کے زوائد بھی شامل کر دیئے لیکن ان کا اصلی تصنیفی کارنامہ دو کتابیں ہیں، جن کو قبولِ عام حاصل ہوا، اور جن سے علمی حلقوں میں اس وقت تک استفادہ کیا جا رہا ہے، ایک ان کی تفسیر جو ان تفاسیر میں جن کی بنیاد منقولات و روایات پر ہے، سب سے زیادہ مقبول اور قابلِ اعتماد سمجھی جاتی ہے، علامہ سیوطی اس کے متعلق لکھتے ہیں "لہ التفسیر الذی لم یؤلف مثلہ" اس تفسیر سے پہلے اہلِ منقول نے جو تفاسیر لکھیں، ان میں محدثانہ احتیاط اور احادیث کے صحیح انتخاب کی بڑی کمی، اور ضعیف احادیث و اسرائیلیات کی بڑی کثرت تھی، حافظ ابن کثیر ایک پختہ کار محدث تھے انھوں نے محدثانہ طریق پر یہ تفسیر مرتب کی اگرچہ وہ اس میں اس بلند محدثانہ معیار کو پورے طور پر قائم نہیں رکھ سکے جس کی ان سے توقع تھی، اور انھوں نے کسی قدر توسع سے کام لیا، اور اسرائیلیات کے ایک حصہ کو قبول کیا، مگر اس میں شبہ نہیں کہ موجودہ تفاسیر میں محدثانہ نقطۂ نظر سے یہ تفسیر سب سے زیادہ قابلِ اعتماد و استفادہ ہے، حال میں مصر کے نامور فاضل و محقق استاد احمد محمد شاکر نے عمدۃ التفسیر عن الحافظ ابن کثیر کے نام سے اس کا خلاصہ شائع کیا ہے جس میں کتاب کی خصوصیات و محاسن کو برقرار رکھتے ہوئے ضعیف احادیث

غیر مستند اسرائیلیات، مکرر اقوال، اور اسانید، اور طویل کلامی مباحث، فقہی فروع اور لغوی و لفظی مناقشات کو حذف کر دیا ہے۔

ان کی دوسری اہم اور مقبول تصنیف "البدایہ والنہایہ" ہے، جو ۱۳۵۱ھ میں ۱۴ جلدوں میں مصر سے شائع ہوئی ہے، یہ عرب مورخین کے دستور کے مطابق ابتدائے آفرینش سے ۷۶۷ھ تک کے واقعات پر مشتمل ہے، علامہ ابن اثیر کی مشہور و مقبول کتاب "الکامل" ۶۲۸ھ تک کے واقعات پر ختم ہو جاتی ہے اس لئے اس کتاب میں ۱۳۹ سال کے حالات اور تاریخ کا اضافہ ہے، تاتاری حملہ اور آٹھویں صدی کی اہمیت کی وجہ سے یہ زمانہ بڑا اہم اور پر از واقعات ہے اس وجہ سے بھی اور تاریخی استناد و تفصیل کی وجہ سے بھی یہ کتاب اکثر مورخین کا مرجع و ماخذ ہے، شعبان ۷۷۴ھ میں حافظ ابن کثیر نے وفات پائی اور دمشق کے مشہور مقبرہ الصوفیہ میں دفن ہوئے۔[۱]

---

[۱] ذیل تذکرۃ الحفاظ (حافظ شمس الدین ابو المحاسن الحسینی) ذیل طبقات الحفاظ (للسیوطی)

حافظ ابن رجب[1]

مختصر حالات

عبدالرحمٰن نام، والد کا نام احمد بن رجب، سلسلۂ نسب اس طرح ہے، عبدالرحمٰن بن احمد بن رجب ابن عبدالرحمٰن بن الحسن محمد بن ابی البرکات مسعود، خاندانی وطن بغداد تھا، وہیں ربیع الاول ۷۳۶ھ میں پیدائش ہوئی، ۷۴۴ھ میں اپنے والد کے ساتھ صغر سنی میں دمشق آئے، محمد بن اسماعیل بن ابراہیم بن الخباز اور ابراہیم بن العطار وغیرہ سے حدیث کی سماعت کی، مصر میں ابوالفتح المیدومی، ابوالحرم القلانسی وغیرہ سے حدیث کی روایت کی، حافظ ابن حجر عسقلانی کا بیان ہے کہ انھوں نے کثرت سے حدیث کی سماعت کی اور حدیث کے ساتھ اشتغال کیا، یہاں تک کہ فن حدیث میں مہارت حاصل کرلی، حافظ ابوالفضل تقی الدین ابن فہد مکی (م ۸۷۱ھ) نے تذکرۃ الحفاظ کے ذیل (لحظ الالحاظ) میں ان کو ان الفاظ سے یاد کیا ہے،

"الامام الحافظ الحجۃ والفقیہ العمدۃ احد العلماء الزھاد والائمۃ العباد مفید المحدثین واعظ المسلمین"[2] وہ ان کے حالات میں لکھتے ہیں کہ "وہ متورع وزاہد پیشوا تھے، اللہ تعالیٰ نے قلوب میں ان کی

---

[1] حافظ ابن رجب اگرچہ براہِ راست شیخ الاسلام ابن تیمیہ کے شاگرد نہیں ہیں، اور وہ ان کی وفات کے ۸ سال بعد پیدا ہوئے مگر وہ حافظ ابن قیم کے شاگرد اور عام طور پر ابن تیمیہ و ابن قیم سے متأثر ہیں، اور چند مسائل کے علاوہ عمومی طور پر وہ ان کے ہم مسلک اور ان کے رجال میں سمجھے جاتے ہیں۔ [2] ص ۱۸۱

محبوبیت پیدا کردی تھی، اور تمام جماعتوں کا ان کی صلاح وفضیلت پر اتفاق تھا، ان کی مجالس وعظ عمومی اور بڑی مفید اور نہایت درجہ موثر تھیں[۱]، الشہاب بن حجی ان کی علمی فضیلت کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:۔

"فن حدیث میں بڑے مبصر اور محقق تھے، اپنے معاصرین میں علل حدیث اور طرقِ حدیث کے سب سے زیادہ واقف تھے، اکثر ہمارے ہم عصر علمائے حنابلہ ان کے شاگرد ہیں"

ماہ رجب ۷۹۵ھ میں انتقال ہوا، اور الباب الصغیر دمشق میں دفن ہوئے[۲]، انتقال سے چند دن پیشتر ایک گورکن کے پاس آئے اور ایک جگہ کی طرف اشارہ کر کے کہا کہ یہاں میرے لئے قبر کھود دو، گورکن کا بیان ہے کہ میں نے قبر کھودی، وہ اس میں اترے اور لیٹے اور کہا کہ اچھی ہے، چند روز کے بعد ان کا انتقال ہوا، اور اسی میں دفن ہوئے[۳]۔

تصنیفات

تصنیفات میں ترمذی کی شرح اور بخاری کے ایک حصہ کی شرح کی ہے، بخاری کی شرح کا نام انھوں نے فتح الباری رکھا تھا، یہ شرح مکمل نہیں ہوسکی، ابن ابی یعلی کی طبقات الحنابلہ کا ذیل لکھا[۴]، ایک کتاب "اللطائف فی وظائف الایام" وعظ کے طریقہ پر ہے، اور فوائد اور قواعد فقہیہ پر مشتمل ہے، امام نووی کی "اربعین" کی شرح کی جس میں بیالیس[۴۲] حدیثیں تھیں، اور آٹھ حدیثوں کا اضافہ کیا، یہ جامع العلوم والحکم شرح خمسین حدیثا من جوامع الکلم" کے نام سے ۱۳۴۶ھ میں مصطفیٰ البابی الحلبی کے مطبع سے شائع ہوئی ہے، حدیث "ما ذئبان جائعان أرسلا فی غنم الخ" کی مستقل شرح کی ہے، ایک رسالہ "فضل علم السلف علی الخلف" ہے، یہ تینوں موخر الذکر کتابیں شائع ہو کر مقبول ہو چکی ہیں، ان کی تصنیفات میں حافظ ابن قیمؒ کی اصلاحیؒ

---

[۱] ص ۱۸۱ [۲] حاشیہ لحظ الالحاظ ص ۱۸۱ [۳] الدرر الکامنہ ص ۳۲۲/۲ [۴] ندوۃ العلماء کے کتب خانہ میں قلمی موجود ہے، چند سال ہوئے دمشق سے شائع بھی ہو گیا ہے۔

دعوتی روح وجذبہ اور ان کی تحریر کی حلاوت وسلاست نظر آتی ہے۔

ان تلامذہ وتلامذۂ تلامذہ کے علاوہ آٹھویں اور نویں صدی کے بعض ایسے جلیل القدر علماء مصنفین اور مصلحین ہیں جن کے متعلق یہ تو معلوم نہیں ہو سکا کہ ان کو شیخ الاسلام یا ان کے کسی تلمیذ سے تلمذ حاصل ہے، مگر ان کی تصنیفات میں واضح طریقہ پر شیخ الاسلام کا فکر، ان کی روح، ان کا علم، اور ان کی دعوت نظر آتی ہے، ان حضرات نے شیخ الاسلام کے تلامذہ یا تصنیفات سے استفادہ کیا ہو یا اس کی نوبت نہ آئی ہو، وہ اتحاد فکر و ذوق کے لحاظ سے اسی دبستانِ فکر کے علماء و مصلحین میں شمار کئے جانے کے مستحق ہیں، ان شخصیتوں میں "الموافقات" کے فاضل مصنف علامہ ابو اسحاق شاطبی (متوفی ۷۹۰ھ) خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں، جن کی کتاب "الاعتصام" اسی اصلاحی سلسلہ کی ایک کڑی معلوم ہوتی ہے جس کی ابتداء اپنے زمانہ میں شیخ الاسلام نے کی، اور جو سنت و بدعت کے موضوع پر سب سے پُرمغز، مکمل، اصولی اور فاضلانہ تصنیف ہے[1]۔

---

[1] صفحات ۶۱۹ مطبوعہ مصر۔

INDEX

اشاریہ

(تاریخ دعوت وعزیمت حصۂ دوم)

مرتبہ

محمد غیاث الدین ندوی

شخصیات

الف

طبقات وقبائل ـ اقوام وخاندان

کتابیات

قرآن مجید

الف

ابن تیمیہ (ابوزہرہ)۔ ۱۳، ۳۷، ۵۲، ۶۵، ۹۰، ۱۰۶، ۱۱۳، ۱۱۷، ۱۲۱، ۲۶۲، ۳۴۳

ابن رجب ۳۶۸

ابن کثیر دیکھئے البدایہ

ابویعلی ۳۷۲

اجتماع الجیوش الاسلامیہ ۳۴۸

الاجوبۃ المرضیۃ ۱۵۸

احادیث الصلوٰۃ علی النبیؐ ۳۶۹

احکام الاحکام ۳۰

الاحکام الکبریٰ ۳۶۹

احیاء العلوم ۳۴۹

اخبار الحکماء ۲۲۰

الاختیارات العلمیۃ ۳۱۸

اربعین (نووی) ۳۷۵

الاربعین (رازی) ۳۶۸

ازالۃ الخفا ۱۴۹

استحباب زیارۃ خیر البریۃ ۲۰۰

اسلام اور غیر اسلامی تہذیب ۳۱۵

اصحاب الکتب الستۃ ۳۶۹

الاعتصام ۳۷۶

اعلام الموقعین ۳۴۸، ۳۴۹

الاعلام فی ذکر مشائخ الائمۃ الاعلام ۳۶۹

اغاثۃ اللہفان ۱۱۲، ۱۷۶، ۳۴۸، ۳۴۹

اقتضاء الصراط المستقیم ۱۳۲، ۳۱۵، ۳۱۶

الفیہ ۱۲۰

انجیل ـ ۲۶۵-۲۶۸، ۲۷۱، ۲۷۲، ۲۷۶، ۲۸۰، ۲۸۲

ب

بائبل ۳۶۱، ۳۶۷

البحر المورود فی المواثیق والعہود ۱۵۸

بخاری شریف ۵۸، ۱۱۶، ۱۵۷، ۲۱۰، ۳۷۵

(ط)

(ع) (غ)

(ف)

(ن)

مقامات

متفرقات

مدارس ومعاہد اور ادارے:

مذاہب وتحریکات ونظریات:

مذہبی واصطلاحی الفاظ:

مساجد و معابد:

علوم:

مطابع:

جنگ، اہم و تاریخی واقعات و حوادث:

تاریخ

دعوت و عزیمت

حصّہ سوم

حضرت خواجہ مُعین الدین چشتی رح
سلطان المشائخ حضرت خواجہ نظام الدین اولیاء رح
حضرت مخدوم شیخ شرف الدین یحییٰ منیری رح
سوانح حیات، صفات و کمالات و تجدیدی و اِصلاحی کارنامے،
تلامذہ و منتسبین و مُسترشدین کا تذکرہ و تعارف

مولانا سیّد ابوالحسن علی ندوی رح

مجلس نشریاتِ اسلام
۱۔کے۔۳ ناظم آباد مینشن۔ ناظم آباد ۱ کراچی ۱۸

مفکر اسلام مولانا سیّد ابو الحسن علی ندویؒ

- ناظم دار العلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ
- رکن مجلس شوریٰ دار العلوم دیوبند
- صدر مجلس تحقیقات و نشریات اسلام لکھنؤ
- رکن مجلس انتظامی و مجلس علمی دار المصنفین اعظم گڑھ
- رکن عربی اکادمی دمشق
- رکن مجلس شوریٰ جامعہ اسلامیہ مدینہ منورہ
- رکن مجلس تاسیس رابطۂ عالم اسلامی مکہ معظمہ
- رکن مجلس عاملہ موتمر عالم اسلامی بیروت
- رکن مجلس انتظامی اسلامک سینٹر جنیوا
- سابق وزیٹنگ پروفیسر دمشق یونیورسٹی و مدینہ یونیورسٹی
- صدر اسلامی سینٹر آکسفورڈ

نام کتاب ـــــــــ تاریخ دعوت وعزیمت
تصنیف ـــــــــ مفکر اسلام مولانا سیّد ابو الحسن علی ندوی
طباعت ـــــــــ احمد برادرز پرنٹنگ پریس۔ کراچی
ضخامت ـــــــــ ۳۳۶ صفحات
ٹیلیفون : 6601817

اسٹاکسٹ : مکتبہ ندوۃ قاسم سینٹر اردو بازار کراچی

ناشر
فضل ربی ندوی

مجلس نشریاتِ اسلام ۱۔ کے۔ ۳ ناظم آباد مینشن۔ ناظم آباد ۱ کراچی ۷۴۶۰۰

فہرست مضامین

باب سوم

۱۰۲ —— ۱۱۲

(اخلاق وصفات)

باب چہارم

۱۱۳ —— ۱۲۵

(اذواق وکیفیات)

باب پنجم

۱۲۶ —— ۱۳۴

(افادات وتحقیقات)

باب ششم

۱۳۵ —— ۱۵۴

(فیوض وبرکات)

سپاہِ تازہ برانگیزم از ولایتِ عشق
کہ در حرم خطرے از بغاوتِ خرد است

(اقبالؒ)

ز

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

حرفِ آغاز

اَلحَمدُ لِلّٰہِ وَسَلَامٌ عَلٰی عِبَادِہِ الَّذِینَ اصطَفٰی

الحمد للہ کہ تاریخ دعوت و عزیمت کا تیسرا حصہ پیش کرنے کی سعادت حاصل ہو رہی ہے دوسرے اور تیسرے حصے کے درمیان اتنا طویل وقفہ پیش آیا کہ مصنّف کی طبیعت افسردہ اور شائقین مایوس سے ہو گئے۔ اس عرصہ میں مصنّف کے کوتاہ قلم سے متعدد کتابیں نکلیں اور شائع ہوئیں، جتنی تاخیر ہوتی جا رہی تھی اتنا ہی یہ اندیشہ بڑھ رہا تھا کہ خدانخواستہ یہ مفید سلسلہ بہت سے قدیم مصنّفین کی اہم کتابوں اور خود اپنے بعض سلسلۂ تصانیف کی طرح ناتمام نہ رہ جائے، شاید ایسا ہی ہوتا اور کم سے کم یہ کہ یہ وقفہ طویل سے طویل تر ہوتا، اگر اس میں ایک قابلِ صد احترام اور واجب التعمیل اشارہ اور تقاضا شامل نہ ہوتا۔

میرے مُربّی رُوحانی حضرت مولانا عبد القادر صاحب رائے پوری دامت برکاتہم نے تاریخ دعوت و عزیمت کو بار بار سن کر اور بار بار اپنی مجالس میں پڑھوا کر، تصنیف اور مصنف کی عزت و ہمت

بڑھائی، ان دُو جلدوں کے بعد حضرت موصوف نے تیسری جلد کا تقاضا فرمایا اور اپنے خادم کو اس کی تکمیل کی بار بار ہدایت فرمائی۔ بارہا ایسا ہوا کہ میں باہر سے حاضرِ خدمت ہوا، تو پہلا سوال یہ ہی فرمایا گیا کہ تیسرا حصہ مکمل کر لیا؟ بعض مرتبہ میں نے اپنی الجھنیں عرض کیں سنتے ہی ارشاد ہوا کہ تیسرا حصہ تو مکمل ہی کر لیجیے! پھر جب حضرت والا کو یہ معلوم ہوا کہ یہ حصہ سلطان المشائخ حضرت خواجہ نظام الدین محبوب الٰہی قدس اللہ سرہٗ کے تذکرہ پر مشتمل ہوگا تو اپنے تعلقِ روحانی اور نسبت خاص کی بنا پر حضرت کی طرف سے اس کا اور بھی تقاضا ہوا، ادھر اس عاجز کا یہ حال ہو گیا تھا گویا اس نے قلم رکھ دیا ہے اور اس موضوع سے مناسبت جاتی رہی ہے یہاں تک کہ جون ۱۶ء میں ایک بار جب حاضرِ خدمت ہوا تو حضرت کی مجلس مبارک میں حضرت خواجہ کا وہ مجموعہ پڑھا جا رہا تھا جو **افضل الفوائد** کے نام سے امیر خسروؒ کی طرف منسوب ہو کر لاہور سے شائع ہوا ہے اور ایک عزیز دوست تحفۃً لائے تھے، یہ مجموعہ ایسے غیر مستند مضامین اور بے اصل روایات پر مشتمل ہے کہ اس کا سننا بھی تحقیقی اور تاریخی ذوق رکھنے والوں پر بلکہ مذاقِ سلیم پر سخت بار ہے، اس کی نسبت امیر خسروؒ کی طرف قطعاً مشکوک ہے۔ حضرت خواجہ گیسو درازؒ جنکے اور سلطان المشائخ کے درمیان صرف ایک ہی واسطہ اور وہ بھی حضرت چراغ دہلیؒ کا ہے اور جو اسی خانوادۂ عالی کے چشم و چراغ اور محرمِ اسرار ہیں۔ صاف فرماتے ہیں کہ **فوائد الفواد** کے علاوہ ملفوظات کے جتنے مجموعے مشہور ہیں یادِ ہوائی ہیںؔ۔ مجلس میں یہ کتاب پڑھی

ؔ "ملفوظ شیخ نظام الدینؒ کہ امیر حسن شاعر جمع کردہ است آں معتبر است و ملفوظہائے دیگر کہ ازاں شیخ نبشتہ اند ہمہ بادِ ہوا است" (جوامع الکلم)

جارہی تھی، حضرت کبھی کبھی اس کے مضامین پر استعجاب کا اظہار فرماتے، نیم باز مگر دلنواز نگاہیں جو کبھی کبھی مصنف پر بھی پڑجاتیں اشارہ اشارہ میں کہتیں کہ اگر کوئی مستند کتاب موجود ہوتی تو ایسی غیر مستند کتابوں کی کیا ضرورت تھی؟ یہ نگاہ دل میں تیر کی طرح پار ہوگئی اور وہیں دل نے فیصلہ کیا کہ پہلی فرصت میں اس کام کو انجام دینا ہے، اور یہ ارمغان پیش کرنا ہے۔

اس کام میں توقف ہونے کا ایک سبب راہ کی دشواریاں بھی تھیں، ہندوستان کے اولیائے کرام، داعیانِ اسلام اور مشائخ عظام کے تذکرہ میں بیشمار کتابیں لکھی گئیں، ان میں بڑی بڑی ضخیم تصنیفات بھی ہیں، لیکن جب اس عصر کا کوئی مصنّف ان کے ایسے حالات جمع کرنے کے بیٹھتا ہے جن سے ان کے اصل کمالات، ان کی دینی دتبلیغی مساعی، ان کی تعلیم وتربیت کے نتائج، ان کے مزاج و مذاق پر روشنی پڑے اور اس زمانہ کے لوگوں کے لئے یہ حالات سبق آموز، شوق انگیز اور ہمت آفریں ہوں، اور بحیثیت ایک جلیل القدر اور کامل انسان کے ان کے حالات منظر عام پر آئیں، اور ان کی سوانح کا صحیح ڈھانچہ سامنے آجائے تو اس کو سخت مایوسی اور پریشانی کا سامنا کرنا پڑتا ہے، بعض اوقات صدہا صفحات کی ایک کتاب سے بلکہ متعدد کتابوں کی مدد سے بھی ایک صفحہ کے بقدر بھی مواد حاصل نہیں ہوتا، عظیم ترین شخصیتوں کے تذکروں اور سوانح حیات میں اتنے بڑے بڑے خلا نظر آتے ہیں جن کو کسی قیاس اور عبارت آرائی سے بھرا نہیں جاسکتا۔ پوری پوری کتاب خوارق وکرامات، محیر العقول واقعات اور عجائبات سے بھری ہوتی ہے اور ضروری معلومات کا افسوسناک فقدان نظر آتا ہے۔ ہندوستان کے ایک بڑے مؤرّخ کو جس نے اپنی علمی اور تصنیفی ضرورت سے ہندوستان کی تاریخ کا ایسا وسیع مطالعہ کیا ہے جس کی نظیر دورِ حاضر میں ملنی مشکل ہے، اور اعیان ومشاہیر ہند کا تذکرہ آٹھ ضخیم جلدوں میں

میں مرتب کیا ہے) اس صورتِ حال پر اس طرح شکوہ سنج پایا گیا:۔

"ملک کی بدمذاقی دیکھئے کہ ابتدا سے اب تک ہندوستان کی سیکڑوں تاریخیں لکھی گئیں اور مختلف عنوانوں سے لکھی گئیں مگر ان میں سے کوئی کتاب تاریخ نویسی کے صحیح معیار پر نہیں اترتی، جس کتاب کو اٹھا کر دیکھئے معلوم ہوتا ہے کہ رزم بزم کا کوئی افسانہ ہے۔ قرنا و کوس کے ذکر سے اگر کوئی صفحہ خالی ملے گا تو چنگ و رباب کے ذکر سے آپ اس کو خالی نہ پائیں گے۔ اگر مقفیٰ عبارتوں اور مسجع فقروں کے خارزار میں آپ کا دامن الجھ گیا تو یہ بھی ملنے کا نہیں، ایسی حالت میں کیا توقع ہو سکتی ہے کہ ہم اپنے اسلاف کی علمی زندگی کی صحیح تصویر ایسے مرقع میں پائیں ــــــ کچھ ان بزرگوں کے حالات میں کتابیں ملتی ہیں جو کسی سلسلۂ طریقت کے ساتھ مربوط تھے، مگر اس بدمذاقی کا کچھ ٹھکانا ہے کہ آپ ان کتابوں سے ان کے نام ونسب، نشوونما، تعلیم و تربیت طریقۂ ماندوبود اور علمی مشاغل کی نسبت تحقیق کرنا چاہیں تو ایک حرف نہ ملیگا، قرنا و کوس کا تو یہاں کچھ کام نہیں، مگر چنگ و رباب یہاں بھی ہاتھ سے نہیں چھوٹتا، مصنّف کا سارا زور انؒ کے کشف وکرامت کے بیان کرنے پر صرف ہوجاتا ہے اور اس کو اس حد تک پہنچانے کی کوشش کی جاتی ہے کہ وہ بنی نوع انسان کے ماوراء کوئی اور ہستی نظر آتے ہیں، وہ کھاتے ہیں نہ پیتے ہیں نہ سوتے ہیں نہ خصائصِ انسانی سے ان کو سروکار ہے نہ علمی مشاغل سے ان کو کچھ واسطہ ہے"

لہ نزہۃ الخواطر عربی ۱۱ ۱ ھ جو پانچ ہزار شخصیتوں کے حالات پر مشتمل ہے۔

ان کا صرف یہ کام ہے کہ وہ قانونِ فطرت کو ہمیشہ توڑتے رہیں اور موالید ثلاثہ و عناصر اربعہ پر اپنی حکومت و خود مختاری کو کسی طرح قائم رکھیں۔[1]

اس وقت کا اگر آپ عملی تجربہ کرنا چاہیں تو ہندوستان میں سلسلۂ چشت کے بانی بلکہ ایک طرح سے اس ملک میں سلسلۂ اسلامی کے بانی خواجہ معین الدین چشتیؒ کے تذکرہ کی کتابوں کا مطالعہ کیجئے اور ان سے حضرت کی کوئی مختصر سوانح مرتب کرنے کی کوشش کیجئے، شاید یہ خیال ہو کہ وہ مسلمانوں کا ابتدائی عہد تھا، تصنیف و تالیف کے دور کا پورے طور پر آغاز نہیں ہوا تھا، اگرچہ یہ صحیح نہیں ہے، اور اسی دور میں ہم کو قاضی منہاج الدین عثمان جوزجانی کی کتاب طبقاتِ ناصری اور نور الدین محمد عوفی کی کتاب لباب الالباب بھی ملتی ہے۔ یہ دونوں کتابیں ساتویں صدی کی تصنیفات ہیں، لیکن اگر اس کو کسی طرح تسلیم بھی کر لیا جائے تو اس کے متعلق کیا کہا جائیگا کہ شیخ الاسلام بہاء الدین زکریا ملتانیؒ (متوفی ۶۶۶ھ) ایک عظیم روحانی پیشوا اور جلیل القدر مصلح تھے جنھوں نے اپنے زمانہ کو متاثر کیا اور ایک ایسے شہر میں زندگی گذاری جو اپنے عہد میں ہندوستان کا سب سے بڑا علمی مرکز تھا، سیاسی حالات میں اعتدال و استقرار بھی پیدا ہو چکا تھا، لیکن اس عظیم الشان شخصیت کی سوانح نگاری اور اس کے کارناموں کی تاریخ مرتب کرنے کے لئے مواد کی بے حد کمی ہے، مگر خوارق و تصرفات اور کشف و کرامات کے واقعات کی کوئی کمی نہیں۔

اس لحاظ سے حضرت سلطان المشائخ خواجہ نظام الدین اولیاءؒ اور حضرت مخدوم الملک

---

[1] یادِ ایام (تاریخ گجرات) ص۵۸ و ص۵۹ از مولانا حکیم سید عبد الحیؒ مصنف نزہۃ الخواطر و گلِ رعنا (م ۱۳۴۱ھ / ۱۹۲۳ء)

شیخ شرف الدین یحییٰ منیریؒ جو آٹھویں صدی کی دو نامور شخصیتیں اور عظیم الشان روحانی مربّی اور مصلح ہیں، خاص امتیاز و انفرادیت رکھتے ہیں، کئی صدیوں تک کسی شیخِ طریقت اور کسی دینی شخصیت کے حالات اتنی روشنی میں نہیں ہیں جتنے ان دونوں بزرگوں کے۔ یہ مواد اس لحاظ سے بھی خصوصیت رکھتا ہے کہ وہ ان حضرات کے ملفوظات اور مکتوبات سے ماخوذ ہے، یا معاصر تاریخوں اور ان کے خدام و مریدین کی کتابوں سے، اس لحاظ سے مؤرّخ کو یہاں کم سے کم دشواری کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ انتخاب و تحقیق کا کام یہاں بھی ضروری ہے کہ واقعات و سنین میں سخت انتشار و تضاد نظر آتا ہے۔

لیکن ان دونوں شخصیتوں کے انتخاب کی وجہ یہ نہیں ہے کہ ان سے متعلق تاریخی مواد آسانی سے دستیاب ہو جاتا ہے، یہ بات اور بھی بہت سی شخصیتوں کو حاصل ہے، اس انتخاب کی وجہ یہ ہے کہ وہ اسلام کی تاریخ دعوت و عزیمت میں ایک ممتاز مقام رکھتے ہیں اور ہندوستان میں (جو ساتویں صدی کے بعد سے عالمِ اسلام کا مرکزِ اعصاب اور احیاء و تجدید کی تحریکوں کا منبع ہے) ان دونوں حضرات نے روحانی و اصلاحی تحریک کی قیادت کی اور اپنے زمانہ اور بعد کی نسلوں کو سب سے زیادہ متاثر کیا۔

حالات و تعلیمات کے انتخاب میں مصنّف نے ہمیشہ ان اجزاء و مضامین کو اہمیت دی ہے جو اس نسل کے لئے مفید، سبق آموز، قابلِ تقلید، عام فہم اور دلنشیں ہوں اور جن سے غلط فہمی اور غلط روی کا کم سے کم اندیشہ ہو، وہ خود بھی فلسفۂ الٰہیات اور فلسفۂ اخلاق سے کم مناسبت رکھتا ہے اور اپنے قارئین کو بھی اس امتحان میں ڈالنا نہیں چاہتا، اس کے نزدیک ایمان و یقین، عشق و محبّت، درد و سوز، جذبۂ اتباعِ سنّت، عزیمت، علوِ ہمّت، ذوقِ دعوت و تبلیغ، اصلاحِ اعمال و اخلاق اور صحیح علوم و دینی حِکَم و معارف ان بزرگوں کا

اصل جوہر اور ان کی سوانح حیات کا اصل پیام ہے۔ راقم سطور نے سیرت سید احمد شہیدؒ کے مقدمہ میں اپنے مسلک کی معذرت اور وضاحت کرتے ہوئے ایک شعر لکھا تھا جو صورتِ حال کی صحیح ترجمانی کرتا ہے، اسی کا اعادہ یہاں بھی مناسب معلوم ہوتا ہے۔ ؎

ہم نے اپنے آشیانے کے لئے
جو چھبے دل میں، وہی تنکے لئے

شاید مصنّف کی دوسری ذمہ داریاں اور نہ ختم ہونے والے مشاغل اتنی جلدی کتاب کی تکمیل کی مہلت نہ دیتے اور اس میں مزید تاخیر ہوتی، مگر اپنے وطن (رائے بریلی) کی سئی ندی کے سیلاب نے ایک گاؤں (میدان پور) میں محصور کرکے اس کا سامان فراہم کردیا کہ جو کام مہینوں میں ہوتا وہ خدا کی مدد سے چند ہفتوں میں ہوگیا۔ وللہ جنود السمٰوات والارض۔

مصنّف کا اخلاقی فرض اور احسان شناسی ہے کہ وہ اپنے محسنین و معاونین کا شکریہ ادا کرے۔ قدیم مآخذ میں مصنّف سب سے زیادہ سیر الاولیاء کے مصنّف امیر خورد اور فوائد الفواد کے مصنّف امیر حسن علاء سنجری کا ممنونِ احسان ہے کہ انھوں نے حضرت خواجہ نظام الدینؒ کی سوانح حیات و تعلیمات کا سب سے زیادہ مفصل اور مستند مواد فراہم کیا۔ حضرت مخدوم الملک بہاریؒ کے حالات میں سیرۃ الشرف سے بڑی مدد اور رہنمائی حاصل ہوئی اور اس سے قدیم تر مآخذ کا پتہ چلا۔ مولانا سید مناظر احسن گیلانیؒ کی تصنیفات اور مضامین ہمیشہ کی طرح بڑے مفید اور مددگار ثابت ہوئے، کاش ان کو دونوں حضرات کی مکمل سوانح حیات مرتب کرنے کا موقع ملتا کہ اللہ تعالیٰ نے ان کو اس موضوع سے فطری مناسبت اور ذوق اور تاریخ ہندوستان کا وسیع علم عطا فرمایا تھا، والد ماجد مولانا حکیم سید عبدالحیؒ کی بیش قیمت تصنیف نزہۃ الخواطر نے حسب معمول تاریخ و تذکرہ

کے ایک دائرۃ المعارف (انسائیکلوپیڈیا) کا کام دیا اور مصنف نے اس سے اس طرح مدد لی اور بار بار رجوع کیا جیسے کوئی طالب علم لغت اور ڈکشنری سے بار بار مدد لیتا ہے اس موضوع پر وسیع مطالعہ کرنے کے بعد اندازہ ہوا کہ ان کی نظر کتنی وسیع و عمیق تھی اور ان کا انتخاب و مذاق کتنا پاکیزہ اور شائستہ ہے۔

اپنے معاونین میں ناچیز مصنف جناب مولوی سید نجم الہدیٰ صاحب ندوی دسنوی اور عزیز گرامی مولوی مراد اللہ صاحب منیری ندوی کا ممنون ہے جنھوں نے حضرت مخدوم الملکؒ کی سوانح حیات اور تصنیفات میں سے بعض نادر چیزیں فراہم کیں۔ عزیزی مولوی شبیر عطا ندوی سلمہٗ (جن کو تاریخی و علمی ذوق اپنے نامور والد سے ورثہ میں ملا ہے) سے بھی بعض ضروری معلومات کے حصول میں مدد ملی۔ عزیز سعید مولوی سید مشرف علی ندوی بھی مصنف کے شکریہ کے بڑے مستحق ہیں۔ مصنف نے کتاب کا بڑا حصہ املا کیا اور آں عزیز نے بڑی ہمت اور محنت سے لکھا۔ مولوی اقبال احمد صاحب اعظمی بھی شکریہ کے مستحق ہیں کہ انھوں نے بھی وقتاً فوقتاً مدد کی۔ اللہ تعالیٰ ان سب بزرگوں اور عزیزوں کو جزائے خیر عطا فرماوے اور ان کے عمل کو قبول کرے۔

وَالْحَمْدُ لِلّٰهِ اَوَّلاً وَّاٰخِراً، وَصَلَّى اللّٰهُ عَلٰى خَيْرِ خَلْقِهٖ مُحَمَّدٍ وَّاٰلِهٖ وَصَحْبِهٖ اَجْمَعِيْنَ

ابوالحسن علی
مرکز دعوت اصلاح و تبلیغ
لکھنؤ

۱۱ر صفر ۱۳۸۲ھ
۲۴ر جولائی ۱۹۶۲ء

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

باب اوّل

ہندوستان میں چشتی سلسلہ اور اسکے اکابر شیوخ

عالمِ اسلام کا نیا رُوحانی وفکری مرکز

چھٹی صدی ہجری (بارھویں صدی عیسوی) اسلامی تاریخ میں خاص اہمیت رکھتی ہے،

اس صدی کے آخر میں وسیع اسلامی دنیا میں ایک ایسے نئے وسیع ملک کا اضافہ ہورہا تھا جو قدرتی خزانوں اور انسانی صلاحیتوں سے مالامال تھا اور جس کے لئے مستقبل قریب میں اسلامی دعوت کا عالمگیر مرکز اور اسلامی علوم کا محافظ وامین بننا مقدر ہوچکا تھا۔

اس صدی کے اوائل میں نیم وحشی تاتاریوں نے عالمِ اسلام پر مور وملخ کی طرح یورش کی، ملک کے ملک ان کی بربریت اور وحشیانہ مظالم سے تاراج اور بڑے بڑے نامی گرامی شہر جو کبھی علم وتہذیب کے علمبردار اور مدارس وخانقاہوں سے یکسر گلزار ہورہے تھے بے چراغ ہوگئے، شہروں کا امن وسکون، زندگی کا نظم ونسق اور شرفاء کی عزت وناموس خاک میں مل گئے، بخارا، سمرقند، رے، ہمدان، زنجان، قزوین، مرو، نیشاپور، خوارزم اور بالآخر مرکزِ خلافت دارالسلام بغداد اس فتنۂ جہاں سوز

کی لپیٹ میں آ گیا اور قدیم تہذیب کا مدفن بن کر رہ گیا۔ اس بلائے ناگہانی سے عالم اسلام کی چولیں ہل گئیں اور پوری قدیم اسلامی دنیا پر سیاسی زوال اور فکری و علمی اضمحلال کے سیاہ بادل چھا گئے۔ اس وقت اس پورے عالم اسلام میں ہندوستان ہی ایک ایسا ملک تھا جو اس فتنۂ عالم آشوب سے محفوظ رہ گیا تھا۔ یہاں تازہ دم، قوی اور پرجوش ترکی النسل خاندانوں کی حکومت تھی، جو ان تاتاریوں اور مغلوں سے بخوبی پنجہ آزمائی کر سکتے تھے اور اپنی ایمانی قوت اور نئے اسلامی جوش کی بنا پر جنگی قوت اور شجاعت میں نہ صرف اُن کے حریف بلکہ ان سے فائق تھے، تاتاری اور مغل بار بار ہندوستان پر حملے کرتے رہے اور پسپا ہوتے رہے، صرف سلطان علاءالدین خلجی کے عہد میں چنگیزی مغلوں نے پانچ بار ہندوستان پر حملہ کیا، پہلا حملہ ۶۹۶ھ میں ہوا، چوتھے اور پانچویں حملے میں سلطان کی طرف سے ملک تغلق (ملک غازی) نے جوہرِ مردانگی دکھائے اور مغلوں کو اس طرح شکستِ فاش دی کہ:۔

"دراں روز بار مغول را ہوس ہندوستان بر دل سرد شدہ و دندان طمع کند گشت[1]" (اس دن سے مغلوں کی ہندوستان کی ہوس سرد ہوگئی، اور اُن کے دندان حرص و آز ہمیشہ کے لئے کھٹے ہو گئے)۔

ان خصوصیات کی بنا پر عالم اسلام کے بہترین خاندان جن کو اپنا ناموس اور ایمان عزیز تھا اور بہترین دل و دماغ جو اپنے بدقسمت وطن میں سکون و اطمینان سے محروم ہوگئے تھے، ہندوستان کے جدید دارالامن اور دارالاسلام کی طرف ہجرت کر آئے۔ لائق ترین انسانوں اور شریف ترین خاندانوں کا یہ سیلاب ایران، ترکستان و عراق کی طرف سے بار بار

---

[1] منتخب التواریخ ص۱۸۶ و تاریخ فیروز شاہی از ضیاء برنی ص۲۵۱ و ص۳۰۲ و ص۳۲۰ و ص۳۲۳۔

امنڈتا رہا اور ان کی وجہ سے دہلی ایک بین الاقوامی شہر اور رشکِ بغداد و قرطبہ بن گئی، نہ صرف دہلی بلکہ ہندوستان کے دوسرے شہر اور قصبات شیراز و یمن کی ہمسری کرنے لگے۔ مورخینِ ہندوستان ضیاء الدین برنی وغیرہ جب ان شریف و نجیب خاندانوں، اساتذۂ وقت، علماء نامدار اور مشائخ کبار کی فہرست سناتے ہیں جو فتنۂ تاتار میں ہجرت کر کے ہندوستان آ گئے تھے اور ہنگامۂ درس و تدریس اور ارشاد و تلقین گرم کئے ہوئے تھے، نیز جنھوں نے سلطنت کی نازک ترین ذمہ داریاں سنبھال رکھی تھیں اور ملک کی زیب و زینت کا باعث تھے، تو معلوم ہوتا ہے کہ سارے عالمِ اسلام کا جوہر شرافت و فضیلت یہیں آ گیا تھا۔[1]

اس انقلاب سے ہندوستان نہ صرف عالمِ اسلام کا ایک اہم حصہ بن گیا تھا، بلکہ تاریخ کا صاف اشارہ تھا کہ وہ اسلام کی فکری و روحانی قوت، علمی تحریکات اور احیاء و تجدید کا نیا مرکز بن رہا ہے، اور فکرِ اسلامی اور دعوت و عزیمت کے مورخین کو اب مسلسل کئی صدیوں تک اپنی توجہ اسی پر مرکوز کرنی پڑے گی۔

اسلامی ہند کے معمار

اسلامی دنیا کے لئے ہندوستان کی دریافت اور یافت "نئی دنیا" کی دریافت سے کم انقلاب انگیز اور عہد آفریں واقعہ نہ تھا، اگرچہ پہلی صدی ہجری ہی میں یہاں اسلام کے حوصلہ مند دستے آنے شروع ہو گئے تھے اور ۹۳ھ میں محمد بن قاسم ثقفی نے سندھ سے ملتان تک کے علاقہ کو اپنی شمشیر و اخلاق سے تسخیر کر لیا تھا، اور اس برِّ صغیر (ہند) میں جا بجا داعیانِ اسلام کے مرکز ہو خانقاہیں چھوٹے چھوٹے جزیروں کی طرح قائم ہو چکی تھیں، جیسے ع

بیاباں کی شبِ تاریک میں قندیلِ رہبانی

---

[1] ملاحظہ ہو تاریخ فیروز شاہی از ضیا برنی ص ۱۱۱ و ص ۱۱۲

لیکن حقیقتاً ہندوستان کی فتح کا سہرا سکندرِ اسلام سلطان محمود غزنوی (م ۴۲۱ھ) کے سَر اور مستحکم و مستقل اسلامی سلطنت کے قیام کی سعادت سلطان شہاب الدین محمد غوری (م ۶۰۲ھ) کے حصے میں تھی اور آخری طور پر اس کی روحانی تسخیر اور اخلاقی و ایمانی فتح حضرت خواجۂ بزرگ شیخ الاسلام معین الدین چشتی رحمہ (م ۶۲۷ھ) کے لئے مقدر ہو چکی تھی۔

ہندوستان کی فتح سے پہلے اسلام کے چاروں مشہور روحانی سلسلے قادریہ، چشتیہ، نقشبندیہ اور سہروردیہ وجود میں آچکے تھے اور عرصہ سے پھل پھول رہے تھے، اپنے اپنے وقت پر ان میں سے ہر ایک کا فیض ہندوستان کو پہنچا اور ہندوستان کی اسلامی تعمیر و تشکیل میں سب کا حصہ ہے۔ شکر اللہ مساعیہم لیکن ہندوستان کی روحانی فتح اور اس سرزمین پر اسلام کا پودا نصب کرنے کے لئے (جس کے سایہ اور پھل سے ایک عالم مستفید ہونے والا تھا) حکمتِ الٰہی نے چشتی سلسلہ کو انتخاب فرمایا۔ وَرَبُّكَ يَخْلُقُ مَا يَشَآءُ وَيَخْتَارُ۔

ان اسرار الٰہی سے قطع نظر جن کو ہماری کوتاہ نظر نہیں پاسکتی، چشتیوں پر اس ملک کا حق ہمسائگی بھی تھا، ان کا سلسلہ اس ملک کے ہمسایہ ملک ایران میں فروغ پا رہا تھا، اپنے دردمند مزاج اور نسبتِ عشقیہ کی بنا پر بھی جو سلسلۂ چشتیہ کا سرمایہ ہے اس سلسلہ کو ہندوستان کا دل جیت لینا اور اس کو اپنی محبت کا اسیر اور عشقِ الٰہی کا نخچیر بنا لینا آسان تھا کہ زمانۂ قدیم سے محبت و درد اس سرزمین کے خمیر میں ہے۔

ہندوستان سے چشتیوں کا پہلا تعلق

غرض ان معلوم و نامعلوم حکمتوں کی بنا پر قدرت الٰہی نے ہندوستان میں اسلام کے تعارف اور اشاعت کے لئے اس سلسلہ کو انتخاب فرمایا اور چشتیوں کو ہندوستان کی طرف رُخ کرنے کا اشارۂ غیبی ہوا۔ سب سے پہلے جس چشتی شیخ نے ہندوستان کی طرف عنانِ عزیمت

موڑی وہ خواجہ ابو محمد چشتی تھے[1]، جن کی دعائیں اور بابرکت ذات سلطان محمود غزنوی کی فتوحات کی پشت پناہ تھی، مولانا جامی "نفحات الانس" میں لکھتے ہیں:۔

وقتے کہ سلطان محمود بہ غزو سومنات[2]	جس وقت سلطان محمود سومنات کی طرف
رفتہ بود خواجہ را در واقعہ نمودند کہ	گیا ہوا تھا خواجہ ابو محمد کو اشارۂ غیبی
بمددگاری وے باید رفت در سن ہفتاد	ہوا کہ اس کی مدد کیلئے جائیں، وہ ستر برس
سالگی با درویشے چند متوجہ شد چوں	کی عمر میں چند درویشوں کیساتھ روانہ
آں جا رسید بہ نفس مبارک خود با مشرکان	ہوئے اور وہاں پہنچ کر بنفس نفیس
وعبدۂ اصنام جہاد کرد[3]	جہاد میں شرکت فرمائی۔

---

[1] خواجہ ابو محمد چشتی (م ۴۰۹ھ یا ۴۱۱ھ) خواجہ ابواحمد کے فرزند وخلیفہ تھے جو خواجہ ابواسحاق شامی کے خلیفۂ اعظم اور خواجہ ناصرالدین ابو یوسف کے شیخ ومرشد تھے، خواجہ ناصرالدین ابو یوسف خواجہ قطب الدین مودود کے شیخ ہیں، اور وہ حاجی شریف زندنی کے۔ حاجی شریف زندنی کے خلیفہ حضرت خواجہ عثمان ہارونیؒ اُن کے خلیفہ حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ۔

[2] سلطان محمود نے سومنات پر حملہ ۴۱۶ھ میں کیا، اگر خواجہ ابو محمدؒ کا سنہ وفات مذکورۂ بالا صحیح ہے تو اس سے پہلے ان کا انتقال ہوچکا تھا، غالباً مولانا جامی کی مراد حملۂ ہندوستان سے ہے، انھوں نے اسکو حملۂ سومنات سے تعبیر کیا ہے کہ ہندوستان سے باہر سب سے زیادہ اسی کارنامہ کی شہرت ہوئی۔ سومنات پر حملہ کرنے سے پہلے ہندوستان پر محمود کے ۸ حملے ہوچکے تھے۔ ان میں سے کسی حملے میں (اغلب ہے کہ پہلے حملے میں) شیخ ابو محمدؒ ساتھ رہے ہوں گے۔

[3] نفحات الانس ص ۲۲۳

حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ

لیکن جس طرح محمود کی سیاسی فتح کی تکمیل اور اسلامی سلطنت کے استحکام و استقلال کی سعادت سلطان شہاب الدین غوری کیلئے مقدر تھی، خواجہ ابو محمد چشتیؒ کے کام کی تکمیل اور اسلام کی عمومی اشاعت اور اسلامی مرکزِ رشد و ہدایت کا قیام اسی سلسلہ کے ایک شیخ، شیخ الشیوخ خواجہ معین الدین سجزیؒ[1] کے لئے مقدر ہو چکا تھا۔

---

[1] خواجہ معین الدین چشتیؒ کی اصل نسبت سجزی ہے، جو کاتبوں کی غلطی اور بولنے والوں کی غلط فہمی سے "سنجری" بن گیا۔ قدیم مسودات و اشعار سے پتہ چلتا ہے کہ ابتدا میں سَجزی ہی لکھا اور بولا جاتا تھا۔

سَجزی نسبت سجستان کی طرف ہے۔ قدیم جغرافیہ نویس عام طور پر اسکو خراسان کا ایک حصہ مانتے ہیں، موجودہ زمانے میں اس کا اکثر حصہ ایران میں شامل ہے اور باقی افغانستان میں۔

اس علاقہ کا پایۂ تخت زَرنج تھا جس کے کھنڈرات زاہدان کے قریب پائے جاتے ہیں۔ ایک زمانہ میں سجستان کے حدود غزنین تک تھے۔ (احسن التقاسیم)

بعض جغرافیہ دانوں کے نزدیک سَجز، سجستان کے ایک خاص مقام کا نام ہے، جس کی طرف نسبت سَجَزی آتی ہے۔ کبھی کبھی پورے سجستان کی طرف بھی سجزی کہہ کر نسبت کرتے ہیں۔

جغرافیہ خلافت مشرقی کے مصنف جی بی اسٹرینج نے ۲۰ صفحوں میں سجستان کا جغرافیہ بیان کیا ہے۔ اس کا خلاصہ یہ ہے کہ سیستان فارسی لفظ سَنگستان سے ماخوذ ہے، عرب اسے سجستان کہتے ہیں۔ اس ملک کی زمین نشیب میں ہے اور جھیل زَرّہ کے گرد اور اسکے مشرق میں واقع ہے، دریائے ہلمند اور جس قدر دریا اس جھیل میں گرتے ہیں، ان سب کے ڈیلٹا اسی زمین میں پڑتے ہیں۔

فارسی میں سیستان کو نیمروز یا جنوبی ملک بھی کہتے ہیں اور جنوبی ملک کہنے کی وجہ یوں بیان ہوئی ہے کہ سیستان خراسان کے جنوب میں واقع ہے ص۵۰۳ و ص۵۰۴

قدیم تر مورخین (جن میں طبقات ناصری کے مصنف قاضی منہاج الدین عثمان جوزجانی بھی شامل ہیں جو حضرت خواجہ کے کمسن معاصر ہیں[1]) کا بیان ہے کہ حضرت خواجہ سلطان شہاب الدین غوری کے اس لشکر کے ساتھ تھے جس نے والی اجمیر رائے پتھورا (پرتھوی راج[2]) کو شکست دی اور ہندوستان کی فتح کی

---

[1] قاضی صاحب کی ولادت ۵۸۹ھ میں ہوئی۔ ۱۲

[2] پرتھوی راج یا رائے پتھورا (۱۱۷۵ - ۱۱۹۲ء) سومیشور کا بیٹا تھا، جو اجمیر کے چوہان حکمراں خاندان کے بانی "اروناراجہ" کا فرزند اور اس خاندان کے نامور فرمانروا دگرہ راجہ عرف ولیل دیو کا بھائی تھا۔ "سومیشور" کا دہلی کے تومر راجپوت حکمراں خاندان اور اجمیر کی چوہان شاخ پر یکساں اقتدار تھا، سومیشور دہلی کے آخری تومر فرمانروا انندپال (انگپال) کا داماد تھا اور اس رشتہ سے پرتھوی راج دہلی کے آخری فرمانروا کا نواسہ ہوتا تھا۔ انندپال کی کوئی اولاد نرینہ نہ تھی اس نے پرتھوی راج کو متبنیٰ کیا تھا، اس کے انتقال پر دہلی کی سلطنت پرتھوی راج کے حصہ میں آئی اور اجمیر کی سلطنت اس نے اپنے باپ سومیشور سے وراثت میں پائی، اس طرح وہ راجپوتوں کی دو طاقتور مرکزی سلطنتوں دہلی و اجمیر کا مالک ہوا، چونکہ اجمیر سے اس کا آبائی اور وطنی تعلق تھا اور وہ اس کی دادھیالی گدی تھی، اس لئے اغلب ہے کہ اس کا زیادہ تر قیام اجمیر میں رہتا تھا، اس وجہ سے اجمیر اس وقت ہندوستان کا سب سے بڑا سیاسی مرکز تھا۔ پرتھوی راج اپنی ذات سے بڑا حوصلہ مند، منچلا فنون سپہ گری میں طاق اور بہادر راجپوت تھا، اس نے بہت سی جنگوں میں نمایاں فتوحات حاصل کیں، جنھوں نے ایک صدی تک اس کے نام کو زندہ اور روشن رکھا۔ قنوج کے راجہ جے چند کی بیٹی کو "سوئمبر" سے لے آنے کی وجہ سے وہ ان داستانوں اور نظموں کا ہیرو بن گیا جو اب تک شمالی ہند میں گائی اور پڑھی جاتی ہیں، وہ اپنی سپہ گری، حوصلہ مندی اور فتوحات کی بنا پر ہندوستان کے دورِ آخر کے بہادر راجپوتوں اور طاقتور رہنماؤں میں شمار کئے جانے کے قابل ہے لیکن اس کی آخری شکست نے اسکی عظمت پر پردہ ڈال دیا، اور تاریخ ہند نے اس کا قصور معاف نہیں کیا۔

(بقیہ حاشیہ صفحۂ آئندہ پر)

تکمیل کی، اس فتح میں ان کی دعاؤں، توجہات اور روحانیت کا بہت بڑا حصہ تھا۔[1]

بعد کے مورخین کے بیانات سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت خواجہ نے شہاب الدین غوری کے حملوں کے درمیان (جو ۵۷۹ھ سے ۶۰۲ھ تک جاری رہے) ابتدائے سنین ہی میں اجمیر میں جو اسوقت راجپوت طاقت وحکومت اور ہندو مذہب و روحانیت کا بہت بڑا مرکز[2] تھا، قیام اختیار

(ص۲۵ کا بقیہ حاشیہ) ۱۱۹۱ء (۵۸۷ھ) میں جب سلطان شہاب الدین محمد غوری نے ہندوستان پر حملہ کیا، پرتھوی راج نے ترائن (حال تلونڈی) کے مقام پر جو تھانیسر سے ۱۴ میل کے فاصلہ پر واقع ہے: ایک منظم فوج کے ساتھ بڑی بہادری سے مقابلہ کیا اور سلطان کو شکست فاش دی۔ اگلے سال ۱۱۹۲ء ۵۸۸ھ میں سلطان نے بڑی تیاری اور نئے عزم کے ساتھ ایک لاکھ بیس ہزار فوج کے ساتھ دوبارہ حملہ کیا، پرتھوی راج تین لاکھ سوار اور تین ہزار ہاتھی میدان میں لایا، ۱۵۰ راجپوت راجگان اپنی فوجوں کے ساتھ تھے۔ پرتھوی راج نے شکست کھائی اور گرفتار ہوا اور قتل کیا گیا۔ اور اس طرح راجپوتوں کی آزاد سلطنت اور ہندوستان کی قدیم فرمانروائی کا خاتمہ ہوا ــــ

(پروفیسر ایشوری پرشاد اور دوسرے مورخین باختصار)

---

[1] طبقات ناصری ص۴۲ + فرشتہ ص۵۷ + منتخب ص۵۰ ؛

[2] اجمیر سے ۷ میل شمال پُشکر، ایک مشہور مذہبی تیرتھ گاہ تھی جس کی یاترا کے لئے دور دور سے لوگ آتے تھے، اسکی جھیل کو جو مذہبی تقدس حاصل تھا اس میں صرف 'مان سرور' کی جھیل اس کی ہمسری کر سکتی ہے۔ پشکر کی جھیل کے متعلق یہ عقیدہ ہے کہ برہما نے یہاں یگ کیا اور یہاں پر سرسوتی اپنے پانچ دھاراؤں سے پرکٹ ہوتی ہیں۔ (اجمیر ڈسٹرکٹ گزیٹیر ص۱۸)

فرمایا تھا۔ ابھی غوری کے حملوں نے ہندوستان کی قسمت کا فیصلہ نہیں کیا تھا اور اسکی ترکتازیاں شمالی مغربی ہندوستان تک محدود تھیں کہ ایک ایسا واقعہ پیش آیا جس نے ہندوستان کی قسمت کا فیصلہ کر دیا، رائے پتھورا نے کسی مسلمان کو (جو غالباً اُس کے دربار سے متعلق تھا) اذیت پہنچائی، حضرت خواجہؒ نے اس کی سفارش کی۔ پتھورا نے متکبرانہ اور توہین آمیز جواب دیا اور کہا کہ "یہ شخص یہاں آیا ہوا ہے اور ایسی اونچی اونچی باتیں کہتا ہے جو کسی نے نہ دیکھیں نہ سنیں۔ حضرت خواجہ نے یہ سن کر ارشاد فرمایا کہ "ہم نے پتھورا کو زندہ گرفتار کرکے (محمد غوری کو) دے دیا" اس کے بعد ہی محمد غوری نے حملہ کیا، پتھورا نے مقابلہ کیا، اور شکست کھائی[1]

بہرحال واقعہ کی جو ترتیب ہو اس میں شک نہیں کہ حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ نے محمد غوری کے حملوں کے درمیان اور اسلامی سلطنت کی عمومیت و استحکام سے پیشتر ہندوستان کے قلب اور قدیم ہندوستان کے عظیم سیاسی و روحانی مرکز اجمیر کو اپنے قیام کے لئے انتخاب فرمایا، یہ فیصلہ ان کی اولوالعزمی عالی ہمتی اور جرأت ایمانی کا ایسا تابناک کارنامہ ہے جس کی مثالیں صرف پیشوایانِ مذاہب اور فاتحین عالم کی تاریخوں میں مل سکتی ہیں۔ ان کے استقلال و اخلاص، ان کے توکل و اعتماد، ان کے زہد و قربانی اور انکے درد و سوز کیوجہ سے ہندوستان کے لئے دارالاسلام بننے کا فیصلہ کر دیا اور جو سرزمین ہزاروں برس صحیح یقین اور صحیح معرفت سے محروم اور توحید کی صدا سے ناآشنا تھی وہ علماء و اولیاء کی سرزمین اور علوم اسلامیہ اور کمالاتِ دینیہ کی محافظ و امین بن گئی اور اس کی فضائیں اذانوں سے اور رد شت و جبل اللہ اکبر کی صداؤں سے اور اسکے شہر و دیار قال اللہ وقال الرسول کے نغموں سے ایسے گونجے کہ صدیوں سے عالمِ اسلام گوش برآواز ہے۔ ع جہانے را دگرگوں کرد یک مرد خود آگاہے۔

---

[1] سیر الاولیاء ص۱۱۲، آثار الکرام

سیر الاولیاء کے مصنف نے بڑی صداقت و بلاغت سے لکھا ہے:۔

مملکت ہندوستان تا حد بر آمدن آفتاب
ہمہ دیار کفر و کافری و بت پرستی بود،
و متمردان ہند ہر یکے دعوئے انا ربکم الاعلیٰ
می کردند و خدائے عز و جل و علا شریک میگفتند
و سنگ و کلوخ و دار و درخت و ستور و گاؤ
مرگیں آں را سجدہ می کردند و ظلمت کفر
قفل دل ایشاں مظلم و محکم بود۔

ہمہ غافل از حکم دین و شریعت
ہمہ بے خبر از خدا و پیمبر
نہ ہرگز کسے دیدہ ہنجار قبلہ
نہ ہرگز شنیدہ کسی اللہ اکبر

وصول قدم مبارک آں آفتاب اہل
یقیں کہ بہ حقیقت معین الدین بود ظلمت ایں دیار
بنور اسلام روشن و منور گشت۔

از تیغ او بجائے صلیب و کلیسا
در دار کفر مسجد و محراب و منبر است
آنجا کہ بود نعرہ و فریاد مشرکاں
اکنوں خروش نعرۂ اللہ اکبر است

ملک ہندوستان اپنے آخری مشرقی
کنارہ تک کفر و شرک کی بستی تھی، اہل
تمرد "انا ربکم الاعلیٰ" کی صدا لگا رہے تھے
اور خدا کی خدائی میں دوسری ہستیوں کو
شریک کرتے تھے، اور اینٹ، پتھر،
درخت، جانور، گائے و گوبر کو سجدہ کرتے تھے
کفر کی ظلمت سے ان کے دل تاریک اور
مقفل تھے، سب دین و شریعت کے حکم سے
غافل، خدا و پیمبر سے بے خبر تھے، نہ ہی
کبھی قبلہ کی سمت پہچانی، نہ کسی نے
اللہ اکبر کی صدا سنی، آفتاب اہل یقین
حضرت خواجہ معین الدینؒ کے قدم مبارک
کا اس ملک میں پہنچنا تھا کہ اس ملک
کی ظلمت نور اسلام سے مبدل ہو گئی
ان کی کوشش و تاثیر سے جہاں شعائر
شرک تھے وہاں مسجد و محراب و منبر نظر
آنے لگے، جو فضا شرک کی صداؤں سے
معمور تھی، وہ نعرۂ اللہ اکبر سے گونجنے لگی۔

وہر کہ ازیں دیار مسلمان شدو تا روز قیامت	اس ملک میں جس کو دولتِ اسلام ملی
مسلمان خواہد شد او فرزندان ایشاں تا	اور قیامت تک جو بھی اس دولت سے
توالدوا تناسلوا امت مسلمان خواہند	مشرف ہوگا نہ صرف وہ بلکہ اس کی
بود و آں طائفہ راکہ بہ تیغ اسلام از	اولاد در اولاد، نسل در نسل سب انکے
دارحرب در دار اسلام خواہند آورد	نامۂ اعمال میں ہوں گے اور اس میں
الی یوم القیٰمۃ، مثوبات آں بیبارگاہ	قیامت تک جو بھی اضافہ ہوتا رہیگا اور
باجاہ شیخ الاسلام معین الدین سجزی	دائرۂ اسلام وسیع ہوتا رہے گا قیامت
قدس اللہ سرہ العزیز بمتابعت حضرت	تک اس کا ثواب شیخ الاسلام معین الدین حسن
او واصل و متواصل خواہند بود	سجزی کی روح کو پہنچتا رہے گا۔
انشاء اللہ العزیز۔[1]	

اس طرح ہندوستان اور ہندوستان میں جو کچھ خدا کا نام لیا اور اسلام کا کام کیا گیا وہ سب چشتیوں اور ان کے مخلص و عالی ہمت بانیِ سلسلہ حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ کے حسنات اور کارناموں میں شمار کئے جانے کے قابل ہے اور اس میں شبہ نہیں کہ اس ملک پر اس سلسلہ کا حق قدیم ہے، مولانا غلام علی آزاد نے صحیح لکھا ہے: —

لاشک بزرگان چشت عنبر سرشت را	اس میں کوئی شک نہیں کہ بزرگانِ
حقی است قدیم بر ولایت ہند۔[2]	سلسلۂ چشت کا ملک ہندوستان پر حق قدیم ہے

اور صاحب سیر الاقطاب کا یہ لکھنا بھی صحیح ہے: —

---

[1] سیر الاولیاء ص۴۷ [2] مآثر الکرام ص۷

بہ ہندوستان برمین قدم میمنت لزومش	ہندوستان میں ان کے دم قدم کی برکت سے
طریقۂ اسلام ظاہر گشت و سیاہی کفر د	اسلام کی اشاعت ہوئی اور کفر کی ظلمت
شرک از عرصۂ روزگار بزود د۔[1]	یہاں سے کافور ہوئی۔

حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ کی حیات ہی میں ہندوستان کی سیاسی مرکزیت اور اقتدار اجمیر سے دہلی منتقل ہو گیا، اور اجمیر نے اپنی اہمیت بہت کچھ کھو دی۔ خواجہ بزرگؒ نے دہلی میں اپنے جانشین و خلیفۂ اعظم خواجہ قطب الدین بختیار کاکیؒ کو بٹھایا اور خود اجمیر ہی میں مقیم رہے جہاں تبلیغ و ارشاد اور تعلیم و تربیت اور مشغولی بحق میں اپنی بقیہ زندگی پوری کر دی، کسی قدیم تاریخی ماخذ میں ان تبلیغی مساعی کی تفصیلات اور ان کے نتائج و اثرات کا مستند و معیّن طریقہ پر تذکرہ نہیں ملتا۔ عام طور پر اتنا ذکر کیا جاتا ہے کہ کثیر و عظیم تعداد میں بندگانِ خدا نے ان سے ایمان و احسان کی دولت پائی اور لوگ جوق در جوق اسلام میں داخل ہوئے ——— ابوالفضل "آئینِ اکبری" میں لکھتا ہے:۔

عزلت گزیں باجمیر شد و فراواں چراغ	اجمیر میں عزلت گزیں ہوئے، اور اسلام
برافروخت، و از دم گیرائے او گروہا گروہا	کا چراغ بڑی آب و تاب سے روشن کیا، انکے
مردم بہرہ برگرفتند	انفاسِ قدسیہ سے جوق در جوق انسانوں نے ایمان
	کی دولت پائی۔

تقریباً نصف صدی ارشاد و تلقینِ اسلام کی اشاعت اور داعیانِ اسلام و اہلِ قلوب کی

---

[1] سیر الاقطاب ص۱۰۱

[2] آئین اکبری (سرسید ایڈیشن) ص۲۷۰

کی تعلیم و تربیت اور یادِ حق میں سرگرمی کے ساتھ مشغول رہ کر ۹۰ سال کی عمر میں ۶۲۷ھ[۱] میں اس وقت رحلت فرمائی جب ہندوستان میں ان کے ہاتھ کا لگایا ہوا پودا جڑ پکڑ چکا تھا اور دار الحکومت دہلی میں ان کا جانشین و تربیت یافتہ شیخِ وقت (خواجہ قطب الدین بختیار کاکیؒ) ارشاد و ہدایت کے کے کام میں سرگرم و منہمک تھا اور ان کا عقیدتمند و حلقہ بگوش سلطان شمس الدین التمش اسلامی حکومت کی توسیع و استحکام اور عدل گستری و خلق پروری میں مشغول تھا۔

خواجہ قطب الدین بختیار کاکیؒ

خواجہ قطب الدین بختیارؒ قصبۂ اوش[۲] (ماوراء النہر) میں پیدا ہوئے۔ ڈیڑھ سال کے تھے کہ باپ کا سایہ سر سے اُٹھ گیا، والدہ ماجدہ نے تربیت کی۔ پانچ سال کی عمر میں مکتب میں داخل ہوئے، مولانا ابو حفص اوشیؒ سے تعلیم حاصل کی، پھر بغداد کا سفر کیا، وہاں اُس خضرِ طریقت سے ملاقات و ملازمت کا شرف حاصل ہوا جس کی رہبری سے کمال و تکمیل کے مدارج تک پہنچنا مقدر تھا اور جس کے ہاتھوں اور جس کی شرکت میں اسلام میں ہندوستان کا چشمۂ حیواں جاری ہونا تھا۔ فقیہ ابو اللیث سمرقندیؒ کی تاریخی و بابرکت مسجد میں ممتاز و جلیل القدر علماء و شیوخ کی موجودگی میں خرقۂ خلافت سے سرفراز ہوئے، ہندوستان تشریف لائے اور اپنے شیخ کے حکم و ہدایت سے دہلی کو اپنا مستقر بنایا جو نوخیز و وسعت پذیر اسلامی سلطنت کا دار الحکومت تھا، اور جو ایک طرف عالی ہمت مسلمانوں

---

[۱] سنہ وفات میں اختلاف ہے۔ عام طور پر تین سنہ لکھے گئے ہیں: ۶۲۷ھ، ۶۳۲ھ، ۶۳۳ھ صاحب سیر الاقطاب نے "آفتابِ ملکِ ہند" سے سنہ وفات ۶۳۳ھ استخراج کیا ہے، صاحب خزینۃ الاصفیاء نے بھی یہی سنہ وفات مانا ہے۔ ۱۲

[۲] یاقوت نے معجم البلدان میں لکھا ہے کہ وہ فرغانہ کے نواح میں ایک بڑا شہر ہے۔

بادشاہوں کی قدر دانی وجوہر شناسی کی وجہ سے، دوسری طرف تاتاری حملوں کی بناء پر علماء، شرفاء و اہلِ کمال کا ملجاو ماویٰ بن گیا تھا، اور عالمِ اسلام کا جوہر وہاں منتقل ہو رہا تھا۔

سلطان شمس الدین التمش نے شایانِ شان پذیرائی کی، آپ نے دربار سے کوئی تعلق رکھنا پسند نہ کیا اور سلطان کی کسی پیشکش (دیہہ وجاگیر) کو قبول نہ فرمایا، اور پہلے کیلوکھری میں، پھر ملک عزالدین کی مسجد کے قریب فقیرانہ و درویشانہ زندگی اختیار کی[1]، سلطان برابر عقیدت کے ساتھ خدمت میں حاضر ہوتا رہا اور اس کی عقیدت برابر ترقی کرتی رہی، اہلِ شہر کا ایسا رجوع عام ہوا کہ شیخ الاسلام وقت شیخ نجم الدین صغریٰؒ کو کبیدگی اور شکایت پیدا ہو گئی، حضرت خواجہ معین الدینؒ اپنے خلیفہ کی ملاقات کے لئے دہلی تشریف لائے تو شیخ نجم الدینؒ نے جو اُن کے قدیم دوست تھے شکایت کی۔ حضرت خواجہؒ نے اپنے مرید رشید سے فرمایا :—

بابا بختیار ہم بیکبار چنیں مشہور شدی کہ	بابا بختیار اتنی جلدی ایسے مشہور ہو گئے
خلق از دست تو شکایت کردن گرفت	کہ بندگانِ خدا کو تم سے شکایت
ازیں جا برخیز و در اجمیر بیا و بنشین	پیدا ہونے لگی۔ یہاں سے چلو اور اجمیر آ کر وہاں
من پیش تو بایستم[2]	قیام اختیار کرو، میں تمہارے سامنے (خادم) کھڑا رہونگا۔

شیخ نے وہ ارشاد فرمایا جو ایک ایسے عالی مرتبت شیخ کو فرمانا چاہیئے جو کمالِ اخلاص و ربانیت کو پہنچ چکا تھا، مردانِ راہ و واصلینِ بارگاہ ادنیٰ مخلوق کی شکایت و آزردگی کو گناہ سمجھتے ہیں، چہ جائیکہ شیخ الاسلام کی کبیدگی کو، پھر آپ مرکزِ اسلام میں انتشار و پراگندگی کو کو پسند نہیں کرتے تھے جس کا اس رنجش سے خطرہ تھا، آپ نے لطیف طریقہ پر یہ تنبیہ بھی فرمادی کہ اگر یہاں کے اہلِ فضل تمہاری قدر و منزلت اور مقام سے واقف نہیں تو

---

[1] فرشتہ ج ۲ صفحہ ۳۷۰ [2] سیر الاولیا صفحہ ۵۴

میں واقف ہوں، اور یہ کہ یہاں خادم و مخدوم و شیخ و مرید کا کوئی امتیاز نہیں، وہاں تم مخدوم رہو گے، میں خادمانہ۔ خواجہ قطب الدینؒ نے وہی جواب دیا جو ایک مرید رشید کو دینا چاہیے عرض کیا:۔

مخدوم مراچہ محل آں باشد کہ پیش	مخدوما! میں تو آپ کے سامنے کھڑے
مخدوم توانم ایستاد فکیف بنشستیم[1]	ہونے کا بھی اہل نہیں، بیٹھنے کی کیا مجال؟

شیخ نے اجمیر چلنے کا حکم دیا اور مرید صادق بے چون و چرا اور بلا تامل تیار ہوگیا، لیکن جب شہر کے باہر قدم نکالا تو شیخ کو معلوم ہوگیا کہ یہ مقبولیت و ہردلعزیزی من جانب اللہ ہے اس میں نفسانیت و انانیت کو دخل نہیں، اور یہ کہ ان کے مرید رشید نے ساری دہلی کو اپنا عاشق دیوانہ بنالیا ہے۔

شیخ قطب الدین ہمراہ شیخ روانہ اجمیر گردید	خواجہ قطب الدین اپنے شیخ کے ساتھ اجمیر
ازیں مقدمہ در تمام شہر دہلی شور افتاد ہمہ	روانہ ہوئے، اس اطلاع سے شہر دہلی میں
اہل شہر مع سلطان شمس الدین دنبال	ایک شور برپا ہوگیا۔ اہل شہر مع سلطان
برآمدند، و ہر جا شیخ قطب الدین قدم	شمس الدین شہر سے نکلکر آپکے پیچھے ہولئے جہاں
می گذاشت خلائق خاک آں زمین بہ تبرک	خواجہ قطب الدین کا پاؤں پڑتا تھا، لوگ خاک پا
برمی داشت و نہایت اضطراب و زاری نمودند۔[2]	کو تبرک بناکر اٹھا لیتے تھے۔ لوگ بڑے بیقرار
	اور آہ و زاری میں مصروف تھے۔

ایک دل کو خوش کرنے کے لئے اور ایک جزئی مصلحت کی خاطر لاکھوں خدا کے بندوں کے دل کو رنجور و زخمی کرنا جائز نہ تھا، مرشد نے مرید رشید کو اجمیر لیجانے کا ارادہ فسخ کیا اور فرمایا:

---

[1] سیر الاولیاء ص۵۴   [2] ایضاً ص۵۴

بابا بختیار ہم دریں مقام باش کہ خلائق از — بابا بختیار! تم یہیں رہو، اسلئے کہ خدا کی

بیرون آمدن تو در اضطراب و خراب است — اتنی مخلوق تمہارے باہر جانے سے تباہ حال

روا نہ دارم کہ چندیں دلہا خراب و کباب — ہے میں اس کو جائز نہیں سمجھتا کہ اتنے دل

باشند برو ایں شہر را در پناہ تو — دکھائے اور جلائے جائیں۔ جاؤ ہم نے

گذاشتیم۔[1] — اس شہر کو تمہاری پناہ میں چھوڑا۔

سلطان شمس الدین نے جس کا دارالحکومت اس نعمت سے محروم ہوا جارہا تھا، شیخ کا شکریہ ادا کیا اور خواجہ قطب الدین شہر دہلی واپس آئے اور خواجہ معین الدینؒ اجمیر واپس ہوئے۔

خواجہ قطب الدینؒ نے دہلی واپس آکر اور اپنے بوریائے فقر پر بیٹھ کر سرگرمی سے ارشاد و تربیت کا کام انجام دینا شروع کیا۔ انھوں نے "سرکار دربار" سے ضابطہ کا کوئی تعلق نہیں رکھا اور نہ صرف اسکو اپنی زندگی کا اصول بنایا بلکہ اپنے سلسلہ کا اصول بنادیا کہ فقر و استغنا کے ساتھ اور "دربار" سے دور رہ کر اپنا کام کرنا ہے، لیکن اس بے تعلقی و بے نیازی کے باوجود عوام و خواص اور شاہ و گدا سب ان کے عقیدتمند و حلقہ بگوش تھے۔

جملگی عالم از صدور و ائمہ بہ دعاگوئی — ساری دنیا، اعیان و اکابر دعاگوئی اور

روئے نہادند[2] — نیازمندی میں مصروف تھے۔

سلطان شمس الدین ہفتہ میں دو بار حاضری دیتا اور اخلاص و عقیدت کا اظہار کرتا[3]۔ دہلی میں جو نہ صرف ہندوستان کا دارالحکومت بلکہ عالمِ اسلام کی نئی طاقت اور دعوت و تجدید اسلام کا نیا مرکز تھا اور جہاں عالم اسلام کے ممتاز ترین علماء و اساتذہ، سادات و شرفاء اور مشائخ داخل

---

[1] سیر الاولیاء (ص ۵۵) [2] اخبار الاخیار (ص ۲۶) [3] تاریخ فرشتہ (ص ۱۹)

سلسلہ اور دنیائے اسلام کے بہترین دل و دماغ جمع تھے، اشاعت طریق و تربیت قلوب اور نئی ابھرتی ہوئی اسلامی سلطنت کی رہنمائی کا کام اپنے دامنِ فقر و استغنا کو ذرہ برابر آلودہ اور ترک کئے بغیر انجام دینا بڑا نازک اور مشکل تھا اور اس کے لئے پہاڑ کی سی استقامت اور ہوا کی سی سُبک روی اور سُبک گامی کی ضرورت تھی۔ جس سے کسی شیشے کو ٹھیس نہ لگے۔ خواجہ صاحب نے بڑی کامیابی اور خوش اسلوبی کے ساتھ اس نازک اور دشوار کام کو انجام دیا، ان کو اس خدمت کے لئے طویل زمانہ نہیں ملا اپنے شیخ کے بعد تو مشکل سے ۴، ۵ سال وہ زندہ رہے، لیکن ان کی ذات سے ہندوستان میں نہ صرف سلسلہ چشتیہ کی بنیاد پڑ گئی، بلکہ جن مقاصد عالیہ کے لئے حضرت خواجہ معین الدینؒ نے ہندوستان کو اپنے قیام اور کام کے لئے انتخاب کیا تھا وہ صدیوں کے لئے محفوظ ہو گئے۔

ابھی ان کی عمر ۵۰ سال یا اس سے کچھ اوپر ہوئی تھی کہ عشق و محبت الٰہی کی وہ آگ جس کو انھوں نے صبر و ضبط کے فانوس میں مقید اور ہدایت و تربیتِ خلق کی مصلحت سے مغلوب کر رکھا تھا بھڑکی اور جذبِ الٰہی کا غلبہ ہوا — ؎

صدائے تیغ تو آمد ببزم زندہ دلاں
کدام سر کہ در و ذوق ایں سرود نماند

ایک مرتبہ شیخ علی سگزیؒ کی خانقاہ میں مجلس سماع گرم تھی۔ قوال نے شعر پڑھا ؎

کشتگانِ خنجرِ تسلیم را
ہر زماں از غیب جانے دیگر است

۱؎ اگر حضرت خواجہ معین الدینؒ کا سنہ وفات ۶۲۷ھ بھی تسلیم کر لیا جائے تو خواجہ قطب الدینؒ کو ان کے بعد صرف ۶ سال ملتے ہیں۔ ۲؎ بعض تذکروں میں سجزی درج ہے۔ ۱۲

خواجہ قطب الدینؒ پر وجد طاری ہوگیا، خانقاہ سے قیام گاہ پر تشریف لائے، وہی مدہوشی اور تحیّر کا عالم تھا، اسی شعر کی فرمائش تھی، فرمائش کی تعمیل کی جاتی تھی۔ چار شبانہ روز عالم تحیّر میں رہے، لیکن جب نماز کا وقت آتا ہوش آجاتا، نماز ادا کرتے، پھر اسی شعر کی فرمائش کرتے، شعر پڑھا جاتا اور عالم تحیّر میں چلے جاتے۔ پانچویں رات کو انتقال کیا۔[1] یہ واقعہ ۶۳۳ھ کا ہے۔[2]

انتقال سے پہلے عید کے روز عید گاہ سے قیام گاہ کی طرف واپس آرہے تھے کہ ایک ایسے میدان سے گزر ہوا جہاں کوئی قبر یا آبادی نہ تھی، خواجہ وہاں ٹھہر گئے اور دیر تک کھڑے رہے کسی خادم نے عرض کیا کہ عید کا دن ہے اور خلقت منتظر، آپنے یہاں کیوں توقف فرمایا؟" ارشاد ہوا۔ مرا ازیں زمیں بوئے دلہا می آید" (مجھے یہاں سے دلوں کی خوشبو آتی ہے) دوسرے وقت زمین کے مالک کو بلاکر اپنے صرف خاص سے اسکو خرید فرمایا اور اس کو اپنے دفن کیلئے تجویز کیا، وہیں مدفون ہوئے۔[3]

حضرت خواجہؒ کے خلفاء کی تعداد (جن کے نام تذکرہ کی کتابوں میں محفوظ ہیں) ۹، ۱۰ سے کم نہ تھی، لیکن آپ کی جانشینی اور حضرت خواجہ معین الدینؒ کے کاموں اور مقاصد کی تکمیل و توسیع کی سعادت حضرت خواجہ فریدالدین گنج شکرؒ کے حصے میں آئی۔

حضرت خواجہ فریدالدین گنج شکرؒ

جس طرح حضرت خواجہ معین الدینؒ ہندوستان میں سلسلہ چشتیہ کے مؤسس و بانی ہیں خواجہ فریدالدینؒ اس کے مجدد اور اس سلسلہ کے آدم ثانی ہیں۔ آپ ہی کے خلفاء سلطان المشائخ

---

[1] سیر الاولیاء بروایت حضرت خواجہ نظام الدینؒ

[2] بعض تذکروں میں ۶۳۴ھ بجائے ۶۳۳ھ کے۔

[3] سیر الاولیاء بروایت حضرت خواجہ نظام الدین اولیاءؒ (ص ۵۵)۔ اب یہ جگہ قطب صاحب کے نام سے مشہور ہے۔ ۱۲

حضرت خواجہ نظام الدین دہلویؒ اور حضرت شیخ علاء الدین علی صابر پیران کلیریؒ کے ذریعہ یہ سلسلہ ہندوستان میں پھیلا اور ان کے خلفاء و اہل سلسلہ کے ذریعہ اب بھی زندہ و قائم ہے ع

خم و خمخانہ با مہر و نشان است

حضرت خواجہؒ کا نام مسعودؒ لقب فرید الدین تھا، عام طور سے گنج شکر کے لقب سے مشہور عالم[۱] ہیں، آپ نسباً فاروقی ہیں، جد بزرگوار قاضی شعیب تاتاریوں کے ہنگامہ میں کابل سے لاہور تشریف لائے، کچھ عرصہ قصور میں قیام فرمایا، قصبہ کھتوال کی قضاۃ و جاگیر عطا ہوئی۔ یہیں ۵۶۹ھ میں آپ کی ولادت ہوئی، صغر سنی میں ملتان کا سفر کیا، جو اُس وقت ہندوستان کا سب سے بڑا علمی و دینی مرکز تھا، شہر کے اساتذہ سے تعلیم حاصل کی، مولانا منہاج الدین ترمذی سے فقہ کی کتاب "النافع" پڑھی، وہیں ۵۸۴ھ میں خواجہ قطب الدین بختیار کاکیؒ کی زیارت ہوئی اور ان سے بیعت کا شرف حاصل ہوا۔ شیخ فرید الدینؒ آپ کے ایسے گرویدہ ہوئے کہ تعلیم کے سلسلہ کو خیرباد کہہ کر ہمرکاب ہو جانے کا عزم کیا۔ شیخ کامل نے منع کیا اور تکمیل کی ہدایت کی۔ ہندوستان اور ہندوستان سے باہر جا کر علوم کی تکمیل کی[۲]۔

تعلیم کی تکمیل کے بعد شیخ کی خدمت میں دہلی حاضر ہوئے۔ شیخ نے ان کے قیام کے لئے غزنین دروازہ کے پاس ایک جگہ منتخب کی، جہاں وہ ریاضت و مجاہدے میں مشغول ہو گئے، سلوک

---

[۱] اس لقب کی حقیقت و تاریخ میں مختلف اقوال ہیں، یقین کے ساتھ کوئی بات نہیں کی جا سکتی۔

[۲] راحت القلوب میں جو آپ کے ملفوظات کا مجموعہ ہے، اس سفر اور دوسری سیاحتوں کی بڑی تفصیل موجود ہے، لیکن چونکہ اس کتاب کی نسبت صحیح نہیں ہے، اس پر اعتماد نہیں کیا گیا۔ بعض دوسری کتابوں میں بھی بعض دوسری تفصیلات ہیں۔ ۱۲

کی تکمیل کے بعد خلافت سے سرفراز ہوئے اور شیخ کی اجازت سے ہانسی میں قیام اختیار کیا جہاں کے مخلص (جو بعد میں خلفائے کبار میں ہوئے) شیخ جمال الدین خطیب ہانسی کا وطن تھا۔ شیخ کا انتقال ہوا تو وہ ہانسی میں تھے، انتقال کے تیسرے روز دہلی پہنچے، مزار شیخ پر فاتحہ پڑھی۔ قاضی حمید الدین ناگوری نے شیخ کی وصیت کے مطابق ان کا خرقہ اور دوسری امانتیں سپرد کیں، یہ گویا جانشینی کا اعلان تھا۔ شیخ نے دوگانہ پڑھ کر اس کو زیب تن کیا اور شیخ کی جگہ پر بیٹھے۔

دہلی کی آمد اور شیخ کی جانشینی کا تیسرا روز تھا کہ ہانسی سے آپ کا ایک آشنائے قدیم معتقد سرہنگا نامی آپ کے اشتیاق میں دہلی آیا۔ خادموں نے اندر جانے نہیں دیا۔ متعقدین و خدام کے ہجوم سے اس درویش کو ملاقات میسر نہ آئی، منتظر تھا کہ ایک روز شیخ باہر تشریف لائے سرہنگا قدموں پہ گر گیا اور رو کر کہا کہ جب تک آپ ہانسی میں تھے آسانی اور بے تکلفی سے مل لیا کرتا تھا، اب یہاں ہم جیسے غریبوں کا کام نہیں! شیخ کے دل پر چوٹ لگی اور سمجھے کہ تنبیہ غیبی ہے، دہلی میں سکون اور عوام و فقراء سے ملنے جلنے کا موقع نہیں۔ اپنی مزید تکمیل ترقی مطلوب تھی۔ آپ نے اسی وقت اپنے دوستوں سے کہا کہ میں ہانسی جاؤں گا۔ حاضرین نے عرض کیا کہ شیخ قطب الدینؒ نے تو آپ کو اس جگہ بٹھایا ہے۔ آپ کہاں جاتے ہیں؟ فرمایا کہ "پیرؒ نے اپنی امانت سپرد کر دی ہے، شہر میں رہوں یا بیابان میں وہ ساتھ ہے"[1]۔

ہانسی کا قیام اس لئے اختیار کیا تھا کہ وہاں سکون اور گمنامی رہے گی۔ یہاں خواجہ قطب الدینؒ کے ایک مرید مولانا نور ترک کی وجہ سے (جنھوں نے اہل ہانسی کو آپ کے مقام و مرتبہ سے آگاہ کر دیا) آپ کی شہرت ہوگئی اور خلق نے ہجوم کیا۔ آپ نے کھتوال کا رخ کیا جو

---

[1] سیر الاولیاء (ص ۷۲)

وطن قدیم تھا۔ کھینوال ملتان سے قریب تھا، اور اُن کی شہرت اور عظمت کا آوازہ اب دُور دُور بلند ہو رہا تھا، آپ نے اجودھن[1] کو اپنے قیام کے لئے انتخاب فرمایا، اور ارشاد ہوا کہ:۔ وہاں کے لوگ دیر اعتقاد اور نا آشنا ہیں اور جگہ بھی غیر معروف ہے' لیکن یہاں بھی بہت جلد رجوع شروع ہو گیا اور خلائق نے ہر طرف سے ہجوم کیا۔ آفتاب شہرت و عظمت نصف النہار پر تھا اور اس کی شعاعیں دور دور پہنچ رہی تھیں اور طالبین خدا کے قلوب کو گرم کر کے کھینچ کھینچ کر لا رہی تھیں۔ تھوڑے دنوں میں مرجعیت یہاں تک بڑھی کہ آنے والوں کا سلسلہ ختم ہونے کو نہ آتا' آدھی رات تک دروازے کھلے رہتے۔

ابتدائے قیام میں عرصہ تک نہایت تنگی اور عسرت و فقر و فاقہ کے ساتھ زندگی گذاری' پیلو کے پھل ابال لئے جاتے اور ان میں کچھ نمک ڈال کر فقرا کو تقسیم کر دیئے جاتے اور خود بدولت اپنے مہمانوں اور خادموں کے ساتھ تناول فرماتے۔ توکل و تجرید کا یہ عالم تھا کہ ایک مرتبہ افطار کیلئے لقمہ اٹھایا، فرمایا: اس میں کچھ بے اصولی معلوم ہوتی ہے؟ خادم نے عرض کیا کہ: نمک نہ تھا، ایک دانگ کا نمک قرض لیکر ڈال دیا۔ فرمایا:۔ تم نے بے اصولی کی، میرے لئے اس کا کھانا روا نہیں[2]۔ کچھ عرصہ کے بعد یہ حال ہوا کہ دن رات مطبخ شاہی گرم رہتا اور رات آدھی رات گئے تک کھانے والوں کا سلسلہ رہتا، جو آتا اس خوانِ نعمت سے حصّہ پاتا۔ جو شخص بھی آتا کسے باشد اپنا حصّہ پاتا[3]۔

شفقت و دلداری سب کے ساتھ یکساں تھی۔ حضرت خواجہ نظام الدینؒ فرماتے ہیں کہ: عجیب قوت اور عجب طرزِ زندگی تھا جس کا تحمل کسی سے ہونا آسان نہیں، نئے آنے والے جو کبھی نہیں آئے اور برسوں کے ساتھ رہنے والے سب کے یکساں لطف و مہربانی اور توجہ و التفات کے ساتھ پیش

---

[1] اجودھن کو اب پاک پٹن کہتے ہیں' اور وہ ضلع منٹگمری (پاکستان) کا ایک قصبہ ہے ۔۱۲

[2] سیر الاولیاء، (صـ۶۶) [3] ایضاً (صـ۶۴)۔

آتے، مولانا بدرالدین اسحٰق فرماتے ہیں کہ:۔ میں خادمِ خاص تھا، جو بات کبھی ہوتی مجھ سے فرماتے تھے، خلوت وجلوت میں یکساں حال تھا، ظاہر و باطن میں کوئی فرق نہ تھا۔ برسوں خدمت کرنے اور ساتھ رہنے کے باوجود کوئی تفاوت نہ دیکھا۔[1]

ایک بار سلطان ناصرالدین محمود کا پورا لشکر جو بادشاہ کے اوچ اور ملتان کے سفر میں ہمرکاب تھا، خواجہؒ کی زیارت کیلئے اجودھن حاضر ہوا۔ حضرت خواجہ نظام الدینؒ اس کا حال بیان کرتے ہیں کہ:۔ "ہجوم قابو سے باہر تھا، آخر کار خدام نے یہ طریقہ اختیار کیا کہ حضرت خواجہؒ کے پیرہن کی آستین بالاخانہ سے لٹکا دی۔ اہلِ لشکر آتے تھے اور اس کو بوسہ دیتے تھے، یہاں تک کہ وہ آستین تار تار ہوگئی۔ مجبوراً آپ مسجد میں تشریف لائے اور خدام سے فرمایا کہ:۔ میرے گرد حلقہ بنالو، کوئی اس حلقہ کے اندر نہ آنے پائے۔ لوگ آتے تھے اور حلقہ کے باہر کھڑے ہوکر سلام کرکے رخصت ہوجاتے تھے۔ اچانک ایک بوڑھا فرّاش حلقہ توڑ کر اندر آگیا اور شیخ کے پاؤں پر گر گیا۔ پاؤں پکڑ کر بوسہ لیا اور کہا:۔ "شیخ فریدؒ! تنگ آگئے؟ اللہ تعالیٰ کے اس انعام کا اس سے زیادہ شکر یہ ادا کرو۔" شیخ نے یہ سُن کر نعرہ مارا اور اس فرّاش کو بہت نوازا اور اس سے معذرت کی۔"[2]

سلطان ناصرالدین نے خود حاضری کا قصد کیا، نائب السلطنت غیاث الدّین بلبن نے جو ہمرکاب تھا، عرض کیا کہ:۔ لشکر بہت ہے اور اجودھن ایک بے آب و گیاہ مقام ہے، اگر فرمان ہو تو میں خدمت میں حاضر ہوجاؤں اور جہاں پناہ کی طرف سے معذرت اور ہدیہ و فتوح پیش کروں چنانچہ کچھ نقد اور چار گاؤں کا فرمان لیکر حاضر ہوا اور نقد اور فرمان پیش کیا۔ شیخؒ نے فرمایا: "یہ کیا ہے؟" غیاث الدین نے کہا کہ: "یہ کچھ نقد ہے اور یہ جاگیر کا فرمان سلطانی" شیخ نے تبسم فرمایا، اور کہا کہ:۔

---

[1] سیرالاولیاء (ص ۶۵) [2] ایضاً (ص ۷۹)

نقد تو ہم کو دے دو اور فرمان واپس لے جاؤ کہ اس کے طالب بہت ہیں، یہ کہہ کر ساری رقم اسی وقت درویشوں میں تقسیم کر دی[1]

سلطان غیاث الدین حضرتؒ سے معتقدانہ تعلق رکھتا تھا، دہلی کی سلطنت کا حصول بھی حضرتؒ کی دعا اور محبت کا نتیجہ سمجھتا تھا اور خدام کی خدمت کو اپنی سعادت تصور کرتا تھا، حضرت خواجہؒ نے ایک مرتبہ ایک شخص کے اصرار سے ایک سفارشی رقعہ لکھا جو سفارش وبے نیازی کا عجیب مجموعہ ہے،[2] فرماتے ہیں:-

"میں اِس شخص کا معاملہ اللہ تعالیٰ اور اس کے بعد آپ کے سامنے پیش کرتا ہوں، اگر آپ اس کو کچھ دینگے تو حقیقی عطا کرنے والا اللہ تعالیٰ ہی ہوگا اور آپ مشکور ہوں گے اور اگر آپ نہ دیں گے تو اس کا مانع اللہ تعالیٰ ہوگا آپ معذور ہوں گے۔"

حضرت شیخ فریدالدینؒ کے اپنے نامور معاصرین اور دوسرے سلسلہ کے مشائخ کبار سے دوستانہ و برادرانہ تعلقات تھے اور ان کے پورے مرتبہ شناس اور قدر دان تھے۔ شیخ الاسلام شیخ بہاء الدین زکریا ملتانیؒ جو سلسلۂ سہروردیہ کے نامور شیخ اور ہندوستان کے عظیم ترین روحانی پیشواؤں اور داعیوں میں گذرے ہیں[3] ان کے ہم عصر تقریباً ہم عمر تھے۔ دونوں کے بڑے مخلصانہ اور دوستانہ تعلقات تھے اور آپس میں بہت دلچسپ اور بے تکلفی کی خط و کتابت ہوتی تھی۔ شیخ فریدالدینؒ شیخ بہاء الدینؒ کو "شیخ الاسلام" کے لقب سے مخاطب

---

[1] سیر الاولیاء ص ۷۹ و ص ۸۰ -۱۲ [2] اخبار الاخیار- اصل رقعہ فصیح عربی میں ہے -۱۲

[3] شیخ الاسلام شیخ بہاء الدین زکریا کی ولادت ۵۶۶ھ کی ہے، اور شیخ کبیر کی ولادت ۵۶۹ھ کی۔۱۲

کرتے تھے۔ دونوں کے خلفاء اور مریدین بھی آپس میں ایک دوسرے سے بڑے خلوص و محبت سے ملتے تھے اور ایک دوسرے کا اعتراف اور بزرگ داشت کرتے تھے۔ شیخ الاسلام کے پوتے شیخ رکن الدین ابوالفتح، اور شیخ کبیرؒ کے خلیفہ سلطان المشائخ نظام الدین اولیاءؒ کے درمیان بڑی محبت اور گہرا تعلق تھا۔

حضرت خواجہ فرید الدینؒ کی زندگی کا اصل جوہر اور معاصرین میں ان کا امتیاز وہ ذوق و شوق اور درد و عشق اور جذب الہٰی (خدا مستی) ہے جس نے حضرت خواجہ نظام الدین و حضرت علاء الدین علی صابر جیسے عاشقوں اور دردمندوں کی تربیت کی، اور جو اجودھن کی اس دکان عشق کا خاص سودا تھا۔ حضرت خواجہ نظام الدینؒ ایک روز کا واقعہ بیان کرتے ہیں کہ شیخ کبیرؒ (حضرت خواجہ فرید الدینؒ) حجرے میں تھے، سر برہنہ تھا اور چہرے کا رنگ متغیر، حجرے میں والہانہ کیفیت میں پھرتے تھے اور یہ اشعار پڑھتے تھے ؎

خواہم کہ ہمیشہ در وفائے تو زیم — خاکے شوم و بزیر پائے تو زیم
مقصود خستہ ز کونین توئی — از بہر تو میرم از برائے تو زیم

(میری آرزو ہے کہ ہمیشہ آپ ہی کا ہو کر جیوں، خاک ہو جاؤں اور آپ کے قدموں کے نیچے زندگی گذرے مجھ مسکین و بیچارے کا دونوں جہاں میں مقصود آپ ہی ہیں آپ ہی کے لئے جیتا ہوں، آپ ہی کے لئے مرتا ہوں)۔

یہ شعر پڑھ کر سجدے میں سر رکھ دیتے تھے، پھر یہی شعر پڑھتے تھے اور حجرے کا چکر لگاتے تھے، پھر سجدے میں پڑ جاتے تھے، دیر تک یہی کیفیت رہی۔[1]

---

[1] سیر الاولیاء ص ۱۳۳

خشیت و رقّت کا بڑا غلبہ تھا، کوئی عبرت انگیز و رقّت خیز بات سنتے یا مجلس میں کوئی عاشقانہ شعر پڑھا جاتا یا کسی بزرگ کا کوئی واقعہ سنتے تو بے اختیار روتے، لبعض اوقات دھاڑیں مار مار کر روتے، ہمیشہ روزہ رکھتے تھے، قرآن مجید کے حفظ کا اہتمام اور تلاوت کا بڑا ذوق تھا اور دونوں چیزیں (روزہ اور حفظِ قرآن) کی اپنے خلفائے خاص و مریدانِ با اختصاص کو وصیت و تاکید فرماتے تھے۔سماع کا بڑا ذوق تھا۔کسی نے کہا کہ علماء کو اس میں اختلاف ہے، فرمایا:۔

سبحان اللہ یکے سوخت و خاکستر شد — سبحان اللہ! ایک جلا بھی اور راکھ بھی

دیگرے ہنوز در اختلاف است[1]۔ — ہوگیا دوسرا ابھی اختلاف ہی کر رہا ہے۔

ساری زندگی کا اصول اہلِ دول و اربابِ حکومت سے بے تعلقی، کنارہ کشی، اخفائے حال اور درویشانہ زندگی تھا۔ اپنے مشائخ کرام کا مسلک جان کر اور اسی میں خلوص کی حفاظت[2] و طریقہ کی اشاعت کا راز سمجھ کر اس روش پر سختی اور مضبوطی سے قائم تھے، ان کے ایک برادرِ طریقت شیخ بدرالدین غزنویؒ نے (جو حضرت خواجہ قطب الدینؒ کے خلفائے کبار میں سے تھے) بعض اعیانِ سلطنت سے خصوصی تعلق رکھا تھا اور اُس نے ان کے لئے دہلی میں خانقاہ تعمیر کی تھی اور ان کی مخصوص طریقے پر خدمت کرتا تھا۔ انقلاب روزگار سے جب وہ امیر عتاب شاہی میں آیا تو شیخ کو بھی زحمت و کلفت پیش آئی، آپ نے شیخ کبیرؒ سے دُعا کی درخواست کی۔ شیخ نے جواب میں لکھا کہ:۔

"جو اپنی روش پر چلے گا وہ ضرور ایسی حالت میں گرفتار ہوگا، جس سے ہمیشہ بے چین رہیگا، آپ تو پیران پاک کے معتقدین میں ہیں، پھر اُن کی روش کے خلاف خانقاہ کیوں بنوائی، اور اس میں کیوں بیٹھے؟ حضرت خواجہ قطب الدینؒ

---

[1] ملاحظہ ہو حالات حضرت سلطان المشائخؒ - ۱۲۔ [2] سیر الاولیاء ۱۲۔

اور حضرت خواجہ معین الدینؒ کا تو یہ طریقہ اور روش نہیں تھی کہ اپنے لئے خانقاہ بنا کر دکان جمائیں، ان کا شیوہ تو گمنامی و بے نشانی تھا۔[1]

ان کے اس طبعی ذوق کی وجہ سے باوجود رجوعِ عام اور امراء و خواص کی عقیدت کے انتقال سے پہلے پھر عسرت اور تنگی کا دور شروع ہو گیا، سیر الاولیاء میں ہے کہ حضرت خواجہ نظام الدینؒ نے فرمایا کہ:-

"حضرت شیخ شیوخ العالمؒ کو آخرِ عمر میں کہ انتقال کا زمانہ قریب تھا تنگی پیش آئی، میں ماہ رمضان میں موجود تھا، اتنا تھوڑا کھانا آیا کرتا تھا کہ موجود لوگوں کو کافی نہ ہوتا تھا۔ کسی رات بھی میں نے ان دنوں سیر ہو کر کھانا نہ کھایا، سامان بھی جو دیکھنے میں آتا تھا بہت معمولی اور برائے نام تھا، میں جب رخصت ہونے لگا تو حضرتؒ نے خرچ کے لئے مجھے ایک سلطانی[2] عطا فرمایا۔ اس روز مولانا بدر الدین الدین اسحٰقؒ کے ذریعہ پیغام پہنچا کہ آج توقف کریں کل جائیں، جب افطار کا وقت ہوا تو حضرت شیخؒ کی خدمت میں گیا اور میں نے عرض کیا کہ حضرتؒ کی بارگاہ سے مجھے ایک سلطانی عطا ہوا تھا اجازت ہو تو اس سے کچھ کھانے کا انتظام کر لیا جائے، حضرت نے اجازت مرحمت فرمائی اور بڑی دعائیں دیں۔"[3]

صاحب سیر الاولیاء حضرت خواجہ نظام الدینؒ کی روایت سے وفات کا حال اس طرح بیان کرتے ہیں:-

---

[1] سیر العارفین ص۸ ماخوذ از بزم صوفیہ [2] سکہ (غالباً اس وقت کا روپیہ)

[3] سیر الاولیاء ص۶۶

"محرم کی پانچ تاریخ کو بیماری میں شدت ہوئی۔ عشاء کی نماز جماعت سے ادا کی، نماز کے بعد بیہوشی طاری ہوگئی۔ ایک گھڑی کے بعد ہوش آیا تو دریافت کیا کہ میں نے عشاء کی نماز پڑھ لی؟ لوگوں نے عرض کیا کہ پڑھ لی ہے۔ فرمایا دوبارہ پڑھ لوں کیا خبر کیا ہو؟ دوبارہ نماز پڑھی اور پھر بیہوش ہو گئے۔ اس مرتبہ بیہوشی زیادہ سخت اور طویل تھی، پھر ہوش آیا اور پوچھا کہ میں نے عشاء کی نماز پڑھ لی؟ عرض کیا گیا کہ دو بار پڑھ چکے ہیں، فرمایا کہ ایک بار اور پڑھ لوں، کون جانے کیا ہو! تیسری مرتبہ پھر پڑھی۔ اسکے بعد واصل بحق ہوئے۔[1]

تاریخ وفات ۵ محرم روز سہ شنبہ ۶۶۴ھ ہے۔[2] اجودھن (پاک پٹن) میں مدفون ہوئے، بعد میں سلطان محمد تغلق نے گنبد تعمیر کیا۔

حضرت خواجہؒ کے پانچ فرزند اور تین صاحبزادیاں تھیں۔ فرزندوں کے نام یہ ہیں۔ شیخ نصرالدین نصراللہ، شیخ شہاب الدین، شیخ بدرالدین سلیمان، خواجہ نظام الدین، شیخ یعقوب۔ صاحبزادیوں کے نام: بی بی مستورہ، بی بی فاطمہ، بی بی شریفہ۔

---

[1] سیرالاولیا ص ۸۹ [2] صاحب سیرۃ الاولیاء نے متعدد مقامات پر ۶۶۹ھ کے ایسے واقعات نقل کئے ہیں جو حضرت خواجہؒ کی زندگی سے متعلق ہیں۔ بعض مقامات پر حضرت خواجہ نظام الدینؒ کی تحریر کا حوالہ ہے کہ حضرت خواجہؒ نے مجھ سے یہ فرمایا، فلاں ہدایت کی؛ اگر ان سنین کو صحیح تسلیم کر لیا جائے تو سنہ وفات ۶۶۴ھ جو عام طور پر مشہور اور زیادہ تر کتابوں میں مذکور ہے مشکوک ہو جاتا ہے اور ماننا پڑتا ہے کہ حضرت خواجہؒ کی وفات اسکے بعد ہوئی، بعض دوسری کتابوں میں بعد کے سنین درج ہیں، ان میں قرین قیاس ۶۷۰ھ ہے جو خزینۃ الاصفیاء میں بحوالہ مخزن الواصلین و تذکرۃ العاشقین درج ہے۔ ۱۲

حضرت خواجہؒ کی وفات کے بعد ان کے تیسرے صاحبزادے شیخ بدرالدین سلیمانؒ بابا کے سجادہ پر بیٹھے ان کے فرزند و سجادہ نشین شیخ علاء الدین اجودھنی تقدس و اتقا میں مشہور تھے۔ محمد تغلق بھی ان کے حلقۂ مریدین میں شامل ہو گیا تھا۔[۱] اللہ تعالیٰ نے روحانی سلسلہ کی طرح حضرت خواجہؒ کی اولاد اور خاندان کو بھی بڑی برکت عطا فرمائی، ہندوستان کے مختلف حصوں میں یہ خاندان آباد ہے اور بالعموم فریدی کہلاتا ہے۔

حضرت خواجہ کے خلفاء میں پانچ حضرات خاص طور پر قابل ذکر ہیں:۔ شیخ جمال الدین ہانسویؒ، شیخ بدرالدین اسحاقؒ، شیخ نظام الدین اولیاء، شیخ علی احمد صابرؒ اور شیخ عارفؒ۔

شیخ جمال الدین (احمد بن محمد) خطیب ہانسوی حضرت خواجہ کے بڑے عزیز خلیفہ و معتمد خاص تھے۔ انہیں کی خاطر حضرت خواجہ نے ۱۲ سال ہانسی میں قیام فرمایا تھا۔ آپ جب کسی کو خلافت نامہ لکھ کر دیتے تھے تو فرماتے تھے کہ ہانسی جاکر شیخ جمال الدین کو دکھا دینا اگر شیخ جمال الدین صاد فرماتے تو آپ بھی اسکو قبول کرتے، اگر وہ صاد نہ کرتے تو آپ بھی نامنظور فرماتے اور فرماتے کہ جمال کا پھاڑا ہوا سیا نہیں جاسکتا۔ فرماتے تھے کہ جمال میرا جمال ہے۔

شیخ جمال الدین نے اپنے شیخ کی زندگی میں ۶۵۹ھ میں انتقال کیا۔ شیخ قطب الدین منورؒ (حضرت خواجہ نظام الدین اولیاءؒ کے عزیز خلیفہ) ان کے پوتے ہیں۔

شیخ بدرالدین اسحٰق بن علی سادات بخارا میں سے تھے۔ حضرت خواجہ فریدالدینؒ کے خلیفہ، خادم اور داماد تھے حضرت خواجہ نظام الدینؒ ان کی بڑی عزت کرتے تھے اپنے شیخ کی

---

[۱] سیرالاولیاء ص ۱۹۶

[۲] نزہۃ الخواطر، ماخوذ از سیرالاولیاء و اخبار الاخیار وغیرہ

صحبت و تعلیم کا نمونہ تھے۔ آنکھیں ہمیشہ پُر آب رہتی تھیں، رقت کا بڑا غلبہ تھا جس سے ضعفِ بصارت ہوگیا تھا کسی نے کہا کہ آپ ذرا آنسو روکیں تو میں آپ کے استعمال کے لئے سرمہ بنا دوں۔ فرمایا کہ آنکھوں پر میرا قابو نہیں، ان کی عبادت و ریاضت کو دیکھ کر شیخ کبیرؒ کی یاد تازہ ہوتی تھی، نہایت جید الاستعداد اور فاضل اجل تھے۔ مدت تک دہلی کی مشہور درسگاہ مدرسۂ معزیہ میں درس دیا، تکمیلِ علم کیلئے بخارا تک کا سفر کیا، فارسی و عربی میں بے تکلف و آبدار شعر کہتے تھے، مضامینِ علمیہ کو نظم کرنے کی خاص قدرت تھی، صرف کے مسائل میں ایک منظوم رسالہ ہے۔ خواجہ محمد امام اور خواجہ محمد موسیٰ جو حضرت خواجہ نظام الدین اولیاء کے امامِ نماز تھے، انھیں کے صاحبزادے تھے، ۱۶ جمادی الاخریٰ ۷۶۹ھ میں وفات پائی[1]

شیخ عارف کو حضرت خواجہؒ نے خلافت دے کر سیوستان روانہ کیا تھا، انھوں نے حضرت خواجہؒ کو خلافت نامہ واپس کیا اور عرض کیا کہ یہ کام بہت نازک ہے، یہ مسکین اس کارِ عظیم کا اہل نہیں، مجھے آپ کی دعا اور عنایت کافی ہے، پھر آپ کی اجازت سے حج بیت اللہ کو گئے اور واپس نہ آئے[2]۔

شیخ کبیر علاء الدین علی بن احمد صابر نسباً اسرائیلی تھے، ترک و تجرید اور زہد و مجاہدہ میں ان کی نظیر نہ تھی، پیران کلیر میں عرصہ تک عبادات و افادہ میں مشغول رہ کر ۱۳ ربیع الاول ۶۸۹ھ یا ۶۹۰ھ میں وفات پائی حضرت شیخ شمس الدین ترک پانی پتی آپ ہی کے خلیفہ تھے[3]۔

---

[1] نزہۃ الخواطر ج ۱ [2] سیر الاولیاء ص ۱۸۴ و ص ۱۸۵

[3] نزہۃ الخواطر ج ۱۔ یہ عجیب بات ہے کہ شیخ علی احمد صابر کے حالات سے معاصر تذکرے اور تاریخیں خاموش ہیں۔ سیر الاولیاء میں امیر خورد نے ان کا تذکرہ ضمناً اس طرح کیا ہے کہ شیخ عبد الحق محدث دہلوی (بقیہ ص ۴۸ پر)

سلطان المشائخ حضرت شیخ نظام الدینؒ پہلے چشتی شیخ ہیں جن کے اثرات ان کی زندگی میں سارے ہندوستان میں پھیلے اور جنھوں نے ہندوستان کے اسلامی معاشرہ اور ہر طبقہ کو متأثر کیا اور حکومت سے لیکر عوام و غربا تک کو اپنے حلقۂ عقیدت و اثر میں لیا، اسی کے ساتھ وہ

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۴۷) ——————— کو شبہ ہے کہ یہ حضرت شیخ علی احمد صابر پیران کلیری کا تذکرہ ہے یا اسی نام کے کسی اور بزرگ کا، امیر خورد لکھتے ہیں:—

بندہ از خدمت والد خود رحمۃ اللہ علیہ سماع دارد کہ درویشے بود بزرگ صاحب نعمت کہ اورا شیخ علی صابر گفتندے و در درویشی قدمے ثابت و نفسے گیرا داشت و ساکن قصبہ دیگری بودے و پیوند بخدمت شیخ شیوخ العالم فرید الحق والدین قدس سرہ العزیز داشت و از حضرت شیخ شیوخ العالم اجازت بیعت بود (ص ۱۸۵)	بندہ نے اپنے والد رحمۃ اللہ علیہ سے سنا ہے کہ ایک عالی مرتبہ درویش تھے جن کو شیخ علی صابر کہتے تھے، درویشی میں راسخ اور صاحب نسبت و تاثیر قصبہ دیگری کے رہنے والے تھے۔ حضرت شیخ فرید الدینؒ سے نسبت ارادت رکھتے تھے، اور آپ نے انکو اجازت بیعت دے رکھی تھی۔

معاصر یا زمانہ قریب کے تذکروں میں خواہ ان کا تذکرہ بالکل نہ ہو یا سرسری و مختصر ہو، ان کے سلسلہ کے مشائخ کبار کے حالات ان کا علو شان ان کے علوم و مقامات، اہل بصیرت کا اس سلسلہ کی مقبولیت پر اتفاق اور عالم میں اُسکے فیوض و برکات و آثار شاہد ہیں کہ بانیٔ سلسلہ نہایت عالی مقام، عالی نسبت اور عنداللہ مقبول تھے، اس سے بڑھ کر خود تاریخ کی شہادت بھی نہیں ہو سکتی اور نہ یہ تاریخ کی پہلی غفلت اور چوک ہے، زمانۂ سابق میں بھی بہت سی باکمال شخصیتیں تاریخ کی تیز نگاہوں سے بچ گئیں اور زاویہ خمول میں رہیں۔

اس سلسلہ (صابریہ چشتیہ) میں بڑے نامور مشائخ عارف و محقق و مصلح پیدا ہوئے مثلاً حضرت مخدوم احمد عبد الحق ردولویؒ

ہندوستان کے پہلے شیخ طریقت اور مرشد روحانی ہیں جن کے حالات سب سے زیادہ تفصیل و وضاحت اور استناد کے ساتھ ملتے ہیں۔ ان کے مشائخ نے نہ کوئی تصنیف کی نہ ان کے خلفاء نے اپنے شیوخ کے ملفوظات و حالات جمع کئے، نہ انھوں نے اپنے شیخ کے ملفوظات و حالات کا کوئی مجموعہ تیار کیا[۴]، لیکن ان کے ملفوظات و حالات جمع کرنے کا

(ص۴۷ کا بقیہ حاشیہ) جن کی ذات بابرکات کو بعض اہل نظر نے نویں صدی کا مجدد بھی شمار کیا ہے حضرت شیخ عبدالقدوس گنگوہیؒ، حضرت شیخ محب اللہ الہ آبادیؒ، شیخ العرب والعجم حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکیؒ، قطب الارشاد حضرت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ، قاسم العلوم حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ (بانی دار العلوم دیوبند) حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانویؒ، حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسن دیوبندیؒ، حضرت مولانا خلیل احمد سہارنپوریؒ، حضرت شاہ عبدالرحیم رائے پوریؒ، حضرت مولانا حسین احمد مدنیؒ، حضرت مولانا محمد الیاس کاندھلویؒ، شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد زکریا کاندھلویؒ، ہمارے اس دور میں اللہ تعالیٰ نے اسی سلسلہ سے حفاظت و تجدید دین کا عالمگیر کام لیا، اور اس وقت سب سے زیادہ وسیع متحرک و فعال یہی سلسلہ ہے، دار العلوم دیوبند و مظاہر العلوم کی تعلیمی خدمت اور مولانا تھانویؒ کی تصنیفات و مواعظ سے اور پھر آخر میں مولانا محمد الیاسؒ کی تحریک دعوت و تبلیغ سے اس سلسلہ کے فیوض عالمگیر ہوئے، پروفیسر خلیق احمد نظامی نے تاریخ مشائخ چشت میں صحیح لکھا ہے کہ:

"گزشتہ صدی میں کسی بزرگ نے چشتیہ سلسلہ کے اصلاحی اصولوں کو اس طرح جذب نہیں کیا جس طرح مولانا محمد الیاسؒ نے کیا تھا" (ص۲۳۴)

آج بھی رائے پور میں حضرت مولانا عبدالقادر صاحب کی خانقاہ سلسلہ چشتیہ کی قدیم خانقاہوں کی یکسوئی، سرگرمی، یاد حق کی مشغولی اور درد و محبت کی یاد تازہ کرتی ہے (افسوس ہے کہ حضرت کی وفات کے بعد یہ خانقاہ بھی گزشتہ خانقاہوں کی فہرست میں شامل ہو گئی، کل شیء ھالک الا وجھہ۔ ع

عالم نشود ویراں تا میکدہ آباد است

---

[۴] حضرت خواجہ نصیر الدین چراغ دہلیؒ کے ملفوظات "خیر المجالس" میں ہے۔ فرمایا میرے حضرت (بقیہ ص۵۰ پر)

خاص اہتمام کیا گیا۔ اس سلسلہ میں دو بڑے قیمتی و مستند ماخذ ہیں، ایک فوائد الفواد جو امیر حسن علا سجزی (م ۷۳۷ھ) کی تالیف ہے، حضرت خواجہ نے اسکو لفظاً لفظاً سنا اور تحسین فرمائی اور حضرت خواجہؒ کے اصحاب و خدام نے اسکی صحت کو عام طور پر تسلیم کیا اور حرز جاں بنایا۔ دوسرا سیر الاولیاء جو امیر خورد سید محمد مبارک علوی کرمانی (م ۷۷۰ھ) کی تصنیف ہے، امیر خورد خورد سالگی میں حضرت خواجہ سے بیعت ہوئے اور ان کی صحبت کی سعادت حاصل کی، پھر حضرت شیخ نصیر الدین چراغ دہلی سے رجوع کیا۔ ان کے والد نور الدین مبارک بن سید محمد کرمانی (م ۷۴۹ھ) حضرت خواجہ نظام الدینؒ کے رفیق قدیم اور مخلص بے تکلف دوستوں میں تھے، اس کتاب میں زیادہ تر انہی کی روایت ہے۔ اپنے شیخ حضرت خواجہ نصیر الدین چراغ دہلی سے بھی سنی ہوئی بہت سی باتیں درج ہیں، اپنے چشم دید حالات اور سنے ہوئے ملفوظات بھی ہیں، حضرت خواجہؒ کے حالات و سوانح اور ان کے خلفاء کبار کے حالات و کمالات کا یہ مفصل و مستند ذخیرہ ہے۔ ان دو کتابوں کی وجہ سے خاص طور پر حضرت خواجہؒ کے حالات، ذوق، رجحانِ طبع، تعلیم و تربیت کے طریقے، اصلاحی و تبلیغی کوشش، ان کے فیوض و برکات اور اثرات محفوظ ہو گئے اور تاریخ کی روشنی اور گرفت میں آ گئے۔

(ص ۴۹ کا بقیہ حاشیہ)

پیر و مرشد جناب سلطان الاولیاء قدس اللہ سرہ العزیز فرماتے تھے: میں نے کوئی کتاب تصنیف نہیں کی اس واسطے کہ خدمت شیخ الاسلام حضرت فرید الدین اور شیخ الاسلام حضرت مولانا قطب الدین رحمۃ اللہ علیہ اور باقی خواجگان چشت وغیرہ مشائخ جو داخل ہمارے شجرے میں ہیں کسی نے کوئی تصنیف نہیں کی۔

(سراج المجالس ترجمہ خیر المجالس)

لہ اس میں ۳ شعبان سے ۹ شعبان تک کی مختلف مجالس کے ملفوظات ہیں۔

اسی شخصیت کی عظمت و تاثیر اور حالات و مآخذ کی سہولت کی وجہ سے دعوت و عزیمت کی ایک مرکزی اور عہد آفریں شخصیت کی حیثیت سے ان کی ذات کو انتخاب کیا گیا، کتاب کے آئندہ ابواب اسی اجمال کی تفصیل کے لئے ہیں۔

باب دوم

سلطان المشائخ حضرت خواجہ نظام الدینؒ

حالات و کمالات

نام و نسب

محمد نام نظام الدین لقب وعرف عام، والد ماجد کا نام احمد بن علی سادات حسینی میں سے تھے، ننہال بھی سادات میں تھا، دادا خواجہ علی اور نانا خواجہ عرب دونوں ہم جد تھے اور دونوں بخارا سے آکر کچھ مدت لاہور رہے، وہاں سے بدایوں آئے۔

۶۳۶ھ[1] میں بدایوں میں آپ کی ولادت ہوئی، بدایوں (قدیم بداؤں) شرفا و سادات کا قدیم مسکن تھا، بہت سے سادات کرام اور مشائخ عظام نے ایران وخراسان سے آکر یہاں سکونت اختیار کرلی تھی۔[2]

---

[1] صاحب سیر الاولیاء نے آپ کی عمر شریف کا حساب لگا کر اس سنہ کی تعیین کی ہے۔ ۱۲

[2] بداؤں روہیل کھنڈ میں دریائے سوتھ کے بائیں کنارے پر واقع ہے۔ اس زمانہ میں بہت آباد (بقیہ صفحہ ۵۳ پر)

ابتدائی تعلیم و تربیت

حضرت نظام الدین پانچ سال کے تھے کہ باپ کا سایہ سر سے اٹھ گیا۔ والدہ ماجدہ نے جو اپنے وقت کی ایک بڑی صالحہ اور باخدا خاتون تھیں، اس دُرِّ یتیم کی پرورش اور دینی و اخلاقی تربیت کا مردانہ ہمت اور پدرانہ شفقت کے ساتھ اہتمام کیا۔ کتابیں پڑھنے کے قابل ہوئے تو مولانا علاء الدین اصولی کے سامنے زانوئے تلمذ تہہ کیا اور فقہ کی ابتدائی کتابوں تک ان سے تعلیم حاصل کی، قدوری ختم کی تو مولانا علاء الدین نے فرمایا کہ مولانا نظام الدین اب دستارِ فضیلت باندھو۔ والدہ صاحبہ سے آکر کہا کہ استاد نے دستار بندی کا حکم فرمایا ہے، میں دستار کہاں سے لاؤں؟ والدہ صاحبہ نے کہا: بابا خاطر جمع رکھو۔ میں اس کی تدبیر کروں گی چنانچہ روئی

(صہ ۵۲ کا بقیہ حاشیہ) اور پُر رونق مقام تھا اور دہلی کے لئے سرحدی شہر کا کام دیتا تھا، چنانچہ پرانی دہلی کے ایک دروازہ کا نام دروازۂ بداؤں تھا۔ (نزہۃ الخواطر)۔

قلعۂ بداؤں کے موجودہ کھنڈر اس کی عظمت اور استحکام کا پتہ دے رہے ہیں ۱۱۹۶ء میں سلطان محمد غوری کے جرنیل قطب الدین ایبک نے اسے فتح کیا اور اپنے غلام ملک شمس الدین کو امیر بداؤں مقرر کیا۔ التمش نے یہاں ۱۲۲۲ء میں ایک خوبصورت اور وسیع مسجد تعمیر کرائی جو اب بھی موجود ہے۔ اس مقام کی اہمیت کا مزید ثبوت درکار ہو تو وہ اس سے ملتا ہے کہ دہلی کے دو بادشاہ التمش اور اس کا بیٹا رکن الدین فیروز شاہ دونوں تخت نشینی سے پہلے بداؤں کے گورنر رہ چکے تھے۔ (انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا بذیل بداؤں) منقول از مقالاتِ دینی و علمی، مولوی محمد شفیع صاحب ایم، اے۔ (جلد اول صہ ۲۴)۔۱۲

لہ مولانا علاء الدین علی الاصولی شیخ جلال الدین تبریزی کے مریدین میں تھے اور اپنے شیخ کے نقش قدم پر اخفارِ حال کا بڑا اہتمام تھا، صبر و رضا کے ساتھ زندگی گزارتے تھے اور اوقات عزیز کو افادہ و عبادت میں مشغول و معمور رکھتے تھے۔ (نزہۃ الخواطر بحوالہ فوائد الفواد)۔

خرید کر اسکو کتوایا اور بہت جلد پگڑی تیار کر کے دی[1]۔ والدہ صاحبہ نے اس تقریب میں علماء و صلحاء وقت کی دعوت کی، خواجہ علی مرید شیخ جلال الدین تبریزیؒ نے ایک پیچ باندھا اور حاضرین مجلس نے علم نافع اور تکمیل کی دعا کی[2]۔

فقر و فاقہ اور والدہ کی تربیت

اس چھوٹے سے شریف گھرانے میں جو سایۂ پدری سے محروم تھا فقر و فاقہ کوئی نئی بات نہ تھی حضرت خواجہ فرماتے ہیں کہ والدہ کا معمول تھا کہ جس روز ہمارے گھر کچھ پکانے کو نہ ہوتا تو فرماتیں کہ آج ہم سب خدا کے مہمان ہیں۔ مجھے یہ بات سن کر بڑا ذوق آتا۔ ایک دن کوئی خدا کا بندہ ایک تنکہ غلہ گھر میں دے گیا، چند دن متواتر اسی سے روٹی ملتی رہی، میں تنگ آگیا اور اس آرزو میں رہا کہ والدہ صاحبہ کب یہ فرمائیں گی کہ ہم سب خدا کے مہمان ہیں، آخر وہ غلہ ختم ہوا اور والدہ صاحبہ نے فرمایا کہ آج ہم خدا کے مہمان ہیں، یہ سنکر مجھے ایسا ذوق اور ایسا سرور حاصل ہوا کہ بیان میں نہیں آسکتا[3]۔

شیخ کبیر سے مناسبت اور قلبی کشش

حضرت خواجہؒ فرماتے ہیں کہ میں چھوٹا تھا۔ بارہ سال کا رہا ہوں یا کچھ کم زیادہ، اس وقت میں لغت پڑھتا تھا۔ ایک شخص جو ابوبکر خراطہ کے نام سے مشہور تھا، ابوبکر قوال بھی کہتے تھے میرے استاد کے پاس آیا، وہ ملتان ہوکر آرہا تھا، اس نے بیان کیا کہ میں حضرت شیخ بہاء الدین زکریا ملتانی کے پاس سے آرہا ہوں، اس نے ان کے فضائل و مناقب بیان کرنے شروع کئے کہ وہاں کے لوگ ایسے ذاکر، شاغل ہیں اور اوراد و نوافل کا ایسا انہماک ہے اور ذکر کی ایسی فضا ہے کہ ماما‌ئیں اور لونڈیاں بھی چکی چلاتے وقت ذکر میں مشغول رہتی ہیں، اسی طرح کی اور بہت سی خصوصیتیں بیان کرتا رہا، مگر کوئی چیز

[1] سراج المجالس ترجمہ خیر المجالس ص۲۳۵ [2] ایضاً ص۹۶ [3] سیر الاولیاء ص۱۱۳)

[4] شیخ کبیر سے مراد اس کتاب میں ہر جگہ شیخ الاسلام حضرت خواجہ فریدالدین گنج شکرؒ کی ذات ہے۔ ۱۲

میرے دل میں نہ جمی، اسکے بعد اس نے بیان کیا کہ وہاں سے اجودھن آیا، وہاں میں نے ایسا بادشاہ دین دیکھا اور اس نے شیخ الاسلام شیخ فریدالدینؒ کا تذکرہ کیا، یہ سنتے ہی میرے دل کو بے اختیار کشش ہوئی، اور ان کی محبت و ارادت میرے دل میں ایسی بیٹھ گئی کہ مجھے ان کا نام لینے میں مزا آنے لگا، اور میں ہر نماز کے بعد مزے لیکر ان کے نام کی رٹ لگاتا۔[۱]

دہلی کا سفر

سولہ سال کی عمر میں حضرت خواجہ بدایوں سے دہلی آگئے[۲]۔

دہلی میں طالب علمی

آپ نے دہلی آکر طالب علمی کا سلسلہ جاری رکھا۔ یہ مدت تین چار سال کی تھی، دہلی میں اس وقت بڑے نامور اساتذہ جمع تھے۔

یہ سلطان ناصرالدین محمود کا عہدِ حکومت اور غیاث الدین بلبن کا عہدِ وزارت تھا اور مولانا شمس الدین خوارزمی جو کہ مستوفی الممالک ہوکر شمس الملک کے لقب سے مشہور روزگار ہوئے استاذ الاساتذہ کی حیثیت رکھتے تھے، سلطنت کے ایک اہم ترین عہدے کی ذمہ داری اور مشغولیت کے ساتھ اس زمانے کے علماء کی طرح درس و تدریس کا مشغلہ بھی جاری تھا،

---

[۱] سیر الاولیاء (ص۱۰۰) فوائد الفواد (ص۱۴۹)

[۲] یہ سیر الاولیاء کا بیان ہے اور یہی صحیح معلوم ہوتا ہے، اس لئے کہ تین چار سال دہلی میں طالب علمی کرنے کے بعد خواجہ صاحب اجودھن گئے اور حضرت خواجہ فریدالدین سے بیعت کی، بیعت کے وقت آپنے اپنی عمر بیس سال بیان کی ہے (سیر الاولیاء ص۱۰۱) اس لئے سیر العارفین کا یہ بیان صحیح نہیں ہے کہ آپ پچیس سال کی عمر میں بدایوں سے لاہور تشریف لے گئے۔

[۳] ملاحظہ ہو تاریخ فیروزشاہی از قاضی ضیاءالدین برنی (ص۱۱۳) - ۱۲

[۴] یہ صدر محاسب یا اکاؤنٹنٹ جنرل کا عہدہ تھا اور بہت بڑے علماء کو دیا جاتا تھا۔

حضرت خواجہؒ ان کے حلقۂ درس میں شامل ہوئے۔

اُستاد کے محبوب

مولانا شمس الدین کو حضرتؒ سے تعلق خاص تھا، اور وہ ان کے محبوب ترین شاگرد تھے، آپ جس حجرۂ خاص میں مطالعہ فرماتے تھے اس میں کسی شاگرد کو آنے کی اجازت نہیں تھی، مگر حضرت خواجہؒ اور ان کے دو رفیق مولانا قطب الدین ناقلہ اور مولانا برہان الدین باقی اس قانون سے مستثنیٰ تھے[1]

خواجہ شمس الملک کی عادت تھی کہ اگر کوئی شاگرد ناغہ کر دیتا تھا یا دیر سے آتا تھا تو فرماتے تھے کہ آخر مجھ سے کیا قصور ہوا تھا کہ آپ نہیں آئے، حضرت خواجہ نے خود یہ قصّہ بیان کرتے ہوئے تبسم فرمایا اور کہا کہ اگر کسی سے مزاح فرماتے تو کہتے کہ مجھ سے کیا قصور ہوا کہ آپ نہیں آئے تاکہ میں پھر دہی قصور کروں لیکن مجھ سے ناغہ ہو جاتا یا دیر میں جاتا تو میرے جی میں آتا کہ آج مجھ سے بھی یہی فرمائیں گے لیکن آپ مجھے دیکھ کر یہ شعر پڑھتے ؎

آخرکم از آنکہ گاہ گاہے　　آئی و بما کنی نگاہے

اس کا تذکرہ کرتے ہوئے خواجہ صاحب آبدیدہ ہو گئے اور سب سننے والوں پر رقت طاری ہو گئی اور یہ بھی فرمایا کہ مجھے اپنے حجرے میں اپنے ساتھ بٹھاتے میں ہزار معذرت کرتا مگر منظور نہ فرماتے[2]

علمی امتیاز و تفوق

حضرت خواجہ نے اپنی ذہانت، مناسبت خداداد اور محنت سے اپنے رفقاء کے درمیان علمی امتیاز اور تفوق پیدا کر لیا۔ علمی مباحثوں اور سوال و جواب میں (جو قدیم نظام تعلیم کا ایک اہم جزاور علمی استعداد و ذکاوت کی علامت سمجھی جاتی تھی) آپ کی طلاقت لسانی اور قوتِ استدلال کا ایسا اظہار ہوا کہ آپ جس علمی مسئلہ پر بحث کرتے طلبہ لاجواب ہو جاتے

---

[1] سیر العارفین۔ ۱۲　　[2] فوائد الفواد ص ۶۸

اور محفل پر آپ کے علم و ذہانت کا سکہ بیٹھ جاتا، چنانچہ آپ کے ساتھی آپ کو مولانا نظام بحّاث اور مولانا نظام الدین محفل شکن کے لقب سے پکارنے لگے[1]

حفظِ مقامات اور اس کا کفارہ

اس زمانہ کے نصاب میں مقامات حریری داخل درس تھی عام طور پر طلبہ سمجھ لینے اور اس کے مشکل الفاظ و مفردات کے یاد کر لینے پر اکتفا کرتے تھے، لیکن حضرت خواجہؒ نے اپنے علمی ذوق اور بلند ہمتی سے اس کے چالیس مقامے حفظ کئے، بعد میں اس کے کفارے میں حدیث کی مشہور کتاب "مشارق الانوار" حفظ کی[2]

حدیث کی اجازت

آپ نے حدیث اپنے زمانہ کے مشہور محدث شیخ محمد المارِیکلی مشہور کمال الدین زاہد (م ۴ ۶۸ھ) سے پڑھی جو مصنف مشارق الانوار علامہ حسن ابن محمد الصغانی کے براہ راست شاگرد تھے۔ فقہ میں ان کو بیک واسطہ صاحب ہدایہ علامہ برہان الدین المرغینانی سے تلمذ تھا، آپ نے ان سے "مشارق الانوار" کا درس لیا اور حدیث کی اجازت حاصل کی[3]

---

[1] سیر الاولیاء ص ۱۰۱ [2] ایضاً

[3] سیر الاولیاء (ص ۱۰۵) اجازت نامہ جو عربی میں ہے اور سیر الاولیاء میں بلفظہ منقول ہے ۲۲ ربیع الاول ۶۷۹ھ تاریخ درج ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ یہ اجازت نامہ آپ کو جب حاصل ہوا ہے اس وقت آپ کی عمر (سنہ ولادت ۶۳۶ھ) کے حساب سے) ۴۳ سال تھی اور یہ واقعہ شیخ کبیر کی وفات (۶۶۴ھ) کے تیرہ سال کے بعد اور اس وقت کا ہے جب آپ مسند ارشاد و تربیت پر متمکن تھے اور آپ کی شہرت دور دور پہونچ چکی تھی۔ اجازت نامہ میں آپ کے لئے "الشیخ الامام العالم الناسک السالک اور مقبول المشائخ الکبار منظور العلماء الاخیار الابرار" کے الفاظ میں اس عمر و شہرت میں حدیث کی تکمیل اور حصول اجازت سے آپ کے علمی ذوق اور علو ہمت کا اندازہ ہوتا ہے۔

قلب کی بےچینی اور انجذاب الی اللہ حضرت خواجہ اگرچہ پورے انہماک کے ساتھ طلبِ علم میں مشغول تھے اور ان کی بلند ہمتی اور عزیمت اس سلسلہ میں کسی کسلمندی اور تساہل کی روادار نہ تھی لیکن دل کسی اور چیز کو ڈھونڈھتا تھا، اس بحث و مباحثہ اور علوم ظاہری کی فضا میں ان کی طبیعت متوحش ہو جاتی تھی، ایک دن فرمایا کہ ایام جوانی میں کہ جب لوگوں کیساتھ نشست و برخاست رکھتا تھا ہمیشہ دل پر گرانی رہتی تھی اور دل ہی دل میں کہتا تھا کہ میں کب ان لوگوں کے بیچ میں سے چلا جاؤں گا۔ اگرچہ یہ سب پڑھنے پڑھانے والے لوگ تھے اور ہمیشہ علمی بحث و مباحثہ میں مشغول رہتے تھے، لیکن اکثر میری طبیعت متوحش ہو جاتی اور میں دوستوں سے کہتا کہ میں ہمیشہ تمہارے درمیان نہیں رہوں گا، میں کچھ دن تمہارے یہاں مہمان ہوں، امیر حسن علا سجزی فرماتے ہیں کہ میں نے عرض کیا کہ یہ حضرت شیخ الاسلام فریدالدینؒ کی خدمت میں حاضر ہونے سے پہلے کا قصہ ہے۔ فرمایا: "ہاں!"

والدہ صاحبہ کا انتقال دہلی کے قیام میں حضرت خواجہ کی والدہ ماجدہ نے انتقال فرمایا۔

والدہ کی یاد ایک روز عرصہ کے بعد حضرت خواجہ نے اپنی والدہ کے انتقال کا ذکر کیا، ذکر کرتے ہوئے اتنا گریہ طاری ہوا کہ جو کچھ فرماتے تھے پورے طور پر سننے میں نہیں آتا تھا، اسی حالت میں یہ شعر پڑھا ؎

افسوس دلم کہ ہیچ تدبیر نکرد　　　بشہائے وصال را بہ زنجیر نکرد[۱]

والدہ کا یقین و توکل حضرت خواجہؒ فرماتے ہیں:- ایک دن نیا چاند دیکھ کر حاضر ہوا اور قدمبوسی کی اور نئے چاند کی مبارکباد معمول کے مطابق پیش کی، فرمایا کہ: آئندہ مہینہ کے چاند کے موقع پر کس کی قدمبوسی کروگے؟ میں سمجھ گیا کہ انتقال کا وقت قریب ہے، میرا دل

---

[۱] فوائد الفواد (ص۴۷)

پھر آیا اور میں رونے لگا۔ میں نے کہا کہ:۔ مخدومہ! مجھ غریب کو آپ کس کے سپرد کرتی ہیں؟ فرمایا:۔ اس کا کل جواب دونگی۔ میں نے اپنے دل میں کہا کہ اس وقت کیوں نہیں جواب دیتیں۔ یہ بھی فرمایا کہ: جاؤ آج رات شیخ نجیب الدین کے یہاں رہو۔ ان کے فرمانے کے مطابق میں وہاں گیا۔ آخر شب میں صبح کے قریب خادمہ دوڑتی ہوئی آئی کہ بی بی تم کو بلا رہی ہیں۔ میں ڈرا اور میں نے پوچھا خیریت ہے؟ کہا ہاں، جب میں حاضر خدمت ہوا تو فرمایا کہ: کل تم نے مجھ سے ایک بات پوچھی تھی۔ میں نے اس کا جواب دینے کا وعدہ کیا تھا اور میں اس کا جواب دیتی ہوں غور سے سنو! فرمایا تمہارا دایاں ہاتھ کون سا ہے، میں نے ہاتھ سامنے کر دیا، میرا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیا اور فرمایا: خدایا! اس کو تیرے سپرد کرتی ہوں۔ یہ کہا اور جان بحق تسلیم ہوئیں، میں نے اس پر خدا کا بہت شکر کیا اور اپنے دل میں کہا کہ اگر والدہ سونے اور موتیوں سے بھرا ایک گھر چھوڑ کر جاتیں تو مجھے اتنی خوشی نہ ہوتی۔[۱]

ایک تمنائے خام

اس وقت دار الحکومت دہلی کی پوری فضا خاص طور پر طلبہ اور علماء کے حلقے قضا وافتاء کے تذکروں، ان منصبوں پر علماء کی تقرری اور قاضیوں اور مفتیوں کے جاہ و جلال اور دولت و ثروت کے قصّوں سے معمور و گرم تھے۔ حضرت خواجہ اپنی فطری سعادت اور اعلیٰ روحانی استعداد کے باوجود اس وقت کم سن اور نوجوان تھے۔ علمی امتیاز اور معاشی تنگ حالی کے ساتھ اگر ان کے دل میں بھی کسی جاہ و منصب کا ولولہ اور امنگ پیدا ہوتی تو فطرت انسانی کے کچھ خلاف نہیں۔ آپ نے ایک دن شیخ نجیب متوکل سے عرض کیا کہ دعا کیجئے کہ میں قاضی ہو جاؤں۔ شیخ نجیب الدین خاموش رہے اور کچھ نہ فرمایا۔ حضرت خواجہ سمجھے کہ انھوں نے سنا نہیں۔ دوبارہ ذرا بلند آواز سے فرمایا کہ:۔ دعا کی درخواست کرتا ہوں کہ کہیں کا قاضی ہو جاؤں۔ شیخ نے فرمایا۔ قاضی مت ہو کچھ اور چیز ہو۔[۲]

---

[۱] سیر الاولیاء (ص۱۵۱)

[۲] فوائد الفواد

اجودھن کی پہلی حاضری

حضرت خواجہؒ اجودھن حاضر ہونے سے پہلے دہلی میں شیخ کبیر کے برادرِ حقیقی خواجہ نجیب الدین متوکل سے متعارف ہو چکے تھے اور کچھ عرصہ ان کے ساتھ رہنا بھی ہوا تھا، ان کی صحبت اور گفتگو نے شیخ کبیر کے ساتھ محبت کی اس چنگاری میں جو کمسنی اور بدایوں کے قیام ہی سے طبیعت میں ودیعت تھی، اشتعال و حرکت پیدا کردی آپ نے شیخ کبیر کی خدمت میں حاضری کا عزم کرلیا اور بالآخر آپ انکی خدمت میں حاضر ہو گئے۔

طالب یا مطلوب؟

اپنی اس ملاقات اور پہلی حاضری کا حال خود ہی بیان فرمایا، ارشاد ہوا کہ میں جب شیخ کبیر کی خدمت میں حاضر ہوا تو آپ نے مجھے دیکھتے ہی یہ شعر پڑھا۔ ؎

اے آتشِ فراقت دلہا کباب کردہ سیلاب اشتیاقت جانہا خراب کردہ

میں نے چاہا کہ پائے بوسی کے اشتیاق کو جو عرصۂ دراز سے بےچین کئے ہوئے تھا ذرا تفصیل سے بیان کردوں، لیکن شیخ کے رعب و جلال سے زبان اور قوتِ گویائی نے ساتھ نہ دیا، اتنا ہی کہہ سکا کہ قدمبوسی کا سخت اشتیاق تھا۔ شیخ نے جب دیکھا کہ بس اتنا مرعوب ہوں تو فرمایا:- "لِكُلِّ دَاخِلٍ دَهْشَةٌ" "ہر نئے آنے والے پر رعب ہوتا ہی ہے"[1]

مرید کی خاطر

شیخ کبیرؒ نے حضرت خواجہ کی بڑی خاطر فرمائی۔ ارشاد ہوا کہ اس پردیسی طالب علم کے لئے جماعت خانہ میں چارپائی بچھائی جائے حضرت خواجہ فرماتے ہیں کہ جب چارپائی بچھ گئی تو میں نے اپنے دل میں کہا کہ میں ہرگز اس چارپائی پر آرام نہ کروں گا، کتنے معزز مسافر کتنے حافظ کلام اللہ کتنے عاشقانِ خدا زمین پر

---

[1] فوائد الفواد (ص ۳۱)

سو رہے ہیں، ہیں چارپائی پہ کیسے لیٹوں ؟ یہ خبر منتظمِ خانقاہ مولانا بدرالدین اسحٰق کو پہنچی، انھوں نے فرمایا کہ ان سے کہہ دو کہ تمھیں اپنے دل کی کرنا ہے یا شیخ کے ارشاد کی تعمیل۔ میں نے عرض کیا کہ شیخ کے ارشاد کی تعمیل کروں گا، فرمایا کہ جاؤ چارپائی پر سوؤ۔[۱]

بیعت اسی حاضری میں کسی وقت حضرت خواجہ جس ارادے سے آئے تھے، اس کی تکمیل کی اور شیخ کبیر سے بیعت ہو گئے، اس وقت آپ کی عمر بیس سال کی تھی۔[۲]

سلسلۂ تعلیم کا اجراء یا انقطاع ؟ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ حضرت خواجہ کی کچھ کتابیں ابھی باقی تھیں، جذب و شوق کا تقاضا تھا کہ اب اس سلسلہ کو ختم کیا جائے اور علمِ حقیقی اور معرفتِ حقیقی میں صرف کیا جائے جو پیدائش کا اصل مقصد اور یہاں کی حاضری کی غرض و غایت ہے۔ گویا سعدیؒ کا یہ شعر حسبِ حال تھا۔ ؎

سعدی بشوے لوح دل از نقش غیر دوست
علمے کہ رہ بحق ننماید جہالت است

تعلیم و تعلم کا طول طویل سلسلہ پہلے بھی قلبِ حساس اور روحِ بیدار پہ بار تھا لیکن اسکو ایک ضرورت سمجھ کر اور اسلئے بھی کہ کوئی دوسرا راستہ سامنے نہ تھا، اختیار کیا تھا، اب جبکہ یقین کا سر رشتہ اور علمِ حقیقی کا سرچشمہ مل گیا اس سلسلۂ دراز کا جاری رکھنا طبیعت پہ سخت بار تھا اور زبانِ حال کہہ رہی تھی ؎

میری نظر میں ہیں تمام میرے گذشتہ روز و شب   مجھ کو خبر نہ تھی کہ ہے علم، نخیلِ بے رطب

لیکن جس شیخ کامل سے تعلق پیدا کر لیا تھا وہ جذبِ کامل کے ساتھ خود بھی کامل العلم تھا اور طریقت کیلئے بقدرِ ضرورت علمِ ظاہر کو ضروری سمجھتا تھا، خود اسکے شیخ نے یہی ہدایت اسکو کی تھی، پھر مولانا نظام الدین سے ارشاد و تربیت کا جو کام لینا تھا اس کی نازک ذمہ داریوں کو

۱؎ سیر الاولیاء ص ۱۰۱ ۲؎ ایضاً ص ۱۰۶ ۳؎ فوائد الفواد ص ۲۵

ادا کرنے کے لئے علم راسخ کی ضرورت تھی، یوں بھی صاحب نظر شیخ طالب کی مناسبت کو دیکھتے ہیں حضرت خواجہ نے بیعت کے بعد فرمایا کہ میں تعلیم ختم کردوں اور اوراد و نوافل میں مشغول ہو جاؤں؟ شیخ کبیرؒ نے فرمایا کہ میں کسی کو تعلیم سے نہیں چھڑاتا، وہ بھی کرو یہ بھی کرو، دیکھو کیا چیز غالب آتی ہے؟ یہ بھی فرمایا کہ: درویش کو تھوڑا علم بھی چاہیئے۔[1]

شیخ کبیرؒ سے درس

شیخ کبیر کی یہ خصوصی عنایت اور اختصاص تھا کہ آپ نے حضرتِ خواجہ کو بنفس نفیس بعض چیزیں پڑھانا شروع کیں۔ فرمایا کہ: نظام تم کو کچھ کتابیں مجھ سے بھی پڑھنی ہوں گی، چنانچہ حضرت شیخ الشیوخ شہاب الدین سہروردیؒ کی تصوف کی مشہور کتاب عوارف المعارف کا درس شروع کیا اور چھ باب اس کے پڑھائے، اسکے علاوہ تمہید ابو شکور سالمی بھی اوّل سے آخر تک سبقاً سبقاً پڑھائی، مزید برآں تجوید کی تعلیم بھی دی، اور چھ پارے کامل تجوید کیساتھ پڑھائے[2]

درس کی لذّت

حضرت خواجہ زمانہ گذر جانے کے بعد بھی اس درس کی لذّت کو یاد فرماتے رہے، فرماتے تھے کہ عوارف کے درس میں جو حقائق اور نکات حضرتؒ کی زبان سے سنے وہ پھر کبھی سننے میں نہ آئیں گے، بیان کی تاثیر کا یہ عالم تھا کہ جب حضرت تقریر فرماتے تھے تو یہ آرزو ہوتی تھی کہ اگر اسی حالت میں موت آجاتی تو بڑا اچھا ہوتا۔[3]

خود شکنی کی تربیت

عوارف کا جو نسخہ درس کے وقت شیخ کبیر کے ہاتھ میں ہوتا تھا وہ کچھ سقیم بھی تھا اور خط بھی باریک تھا، چند اسباق کے بعد ایک ایسا مقام آیا جہاں شیخ کو کچھ دیر تامل رہا، خواجہ نے سادگی اور نوعمری

---

[1] سیر الاولیاء (ص ۱۰۱) ۔ [2] ایضاً ص ۱۰۶ [3] فوائد الفواد ص ۷۵

میں کہا کہ میں نے شیخ نجیب الدین متوکل کے پاس ایک اور نسخہ دیکھا تھا، وہ نسخہ صحیح تھا، شیخ نے فرمایا:۔ "درویش را قوتِ تصحیحِ نسخہ سقیم نیست"۔ (فقیر کو سقیم نسخہ کی تصحیح کی طاقت نہیں) بار بار شیخ نے یہ فقرہ دہرایا، خواجہ فرماتے ہیں کہ شروع میں تو مجھے خیال نہ آیا لیکن بار بار شیخ کی زبان سے یہ الفاظ نکلے تو سبق کے دوسرے ساتھی مولانا بدرالدین اسحٰق نے بتلایا کہ خطاب تمھاری طرف ہے، حضرت خواجہ کے ہوش اڑ گئے، فرماتے ہیں کہ "سر برہنہ کردم و در پائے شیخ افتادم" کہتے جاتے تھے نعوذ باللہ میرا اس سے حضرت پر تعریض کرنا ہرگز مقصود نہ تھا، خواجہ فرماتے ہیں میں نے ہر چند معذرت کی، لیکن حضرت کا ملالِ خاطر نہ گیا۔ فرماتے ہیں میں اُٹھ گیا، لیکن سمجھ میں نہ آتا تھا کہ کیا کروں۔ وہ دن جیسا مجھ پر گذرا اور جس حزن و غم کا پہاڑ مجھ پر ٹوٹا شاید کبھی کسی شخص کو ایسا کبھی پیش آیا ہو۔ سراسیمہ و پریشان باہر آیا، ایک مرتبہ تو یہ جی چاہا کہ کنویں میں گر کر جان دے دوں لیکن کچھ سوچ کر باز رہا، اسی پریشانی اور سراسیمگی کی حالت میں جنگل کو نکل گیا اور بہت رویا۔

شیخ کبیرؒ کے ایک صاحبزادے شہاب الدین نامی سے خواجہ کا خاص میل ملاپ تھا، انھوں نے شیخ کبیرؒ سے خواجہ کا یہ حال کہا جو مقصود تھا پورا ہو چکا تھا، حاضری کی اجازت مرحمت ہوئی۔ "بآمدم سر بر قدم مبارک آوردم" معافی ہوئی۔ دوسرے روز طلب فرمایا اور ارشاد ہوا: یہ سب میں نے تمھاری تکمیل حال کیلئے کیا، پیر مشاطہ مرید ہوتا ہے۔ اس ارشاد کے بعد خلعت و کسوتِ خاص سے سرفراز فرمایا گیا۔[۱]

---

[۱] فوائد الفواد (ص ۳۶) یہاں پر کوئی یہ شبہ نہ کرے کہ شیخ کامل نے تلمیذ رشید کی ایک معمولی سی اطلاع اور معروض پر اتنی برافروختگی اور آزردگی کا اظہار فرمایا، اسلئے کہ جیسا کہ خود شیخ کے جملہ سے معلوم ہوتا ہے یہ سب آزردگی بہ تکلف اور طالبِ رشید کی ترقی باطنی اور خود شکنی کے لئے ہے۔ شیخ مجتہد و مخلص اسکے لئے اپنے مختلف ذرائع اختیار کر سکتا ہے اور اس کے لئے کسی تقریب و موقع کا بھی انتخاب کر سکتا ہے، حضرت کعب بن مالکؓ کے ابتلاء کے واقعہ سے اور انکو اس کوتاہی پر جو ان سے بلا ارادہ سرزد ہوئی تھی جو سرزنش کی گئی اور انکے ساتھ جو رویہ اختیار کیا (بقیہ ص ۶۴ پر)

فیصلہ کُن موقع

حضرت خواجہ نظام الدین کے لئے وہ وقت جب شیخ کبیر ان کے صرف اتنا کہہ دینے پر کہ "میں نے شیخ نجیب الدین کے پاس ایک بہتر نسخہ دیکھا ہے"۔ اپنی کبیدگی اور ناپسندیدگی کا اظہار کیا، ایک بڑا نازک وقت تھا، بظاہر اس معصوم جملہ اور اطلاع پر کہ "میں نے آپ ہی کے بھائی کے پاس ایک بہتر نسخہ دیکھا ہے" اتنی ناراضگی اور احتجاج کی ضرورت نہ تھی لیکن شیخ کامل کو ایک ایسے طالب علم سے جس کو اس کا جانشین بننا تھا اور لوگوں کی خودشکنی کی تربیت کرنی تھی، اتنی خودبینی بھی گوارا نہ تھی، پھر اس مسترشد کو کمال حال کے جس مقام تک پہونچانا تھا اسکے لئے اضطرار و اضطراب، شکستہ دلی و شکستگی کی خاص کیفیت پیدا کرنی مقصود تھی، لیکن ایک ذہین اور صاحب استعداد نوجوان کیلئے جو اپنی علمی تکمیل کرچکا تھا، یہ وقت بڑا نازک اور فیصلہ کن تھا اور اسی پر اس کے مستقبل کا انحصار تھا، مولانا سید مناظر احسن گیلانی نے صحیح لکھا ہے: ـــ

"صادق و کاذب طلب میں امتیاز کا وقت آگیا۔ دنیا دیکھ رہی تھی، اب مولانا نظام الدین کا فیصلہ کیا ہوتا ہے؟ کیا مولانا بحاث اور محفل شکن ہی کے لقب کو لیکر دنیا سے واپس چلے جائیں گے؟ جیسے لاکھوں ہی بحاث و محفل شکن آئے اور چلے گئے، یا مشائخ کے سلطان کا جو تخت خالی ہے اس پر قدم رکھنے کی ہمت کرتے ہیں، اپنے اپنے حوصلہ کی بات ہوتی ہے، ورنہ سچ یہی ہے۔ ؎

تو ہی ناداں چند کلیوں پر قناعت کرگیا
ورنہ گلشن میں علاج تنگیٔ داماں بھی ہے

چند کلیاں جواب تک ان کے ہاتھ میں تھیں وہ پھینک دی گئیں اور اپنی تنگ دامانی

(ص ۶۳ کا بقیہ حاشیہ) اور کرایا گیا اس سے بھی روشنی اور رہنمائی حاصل کیجا سکتی ہے۔ ۱۲

کے علاج کے آخری فیصلہ پر وہ ڈٹ گئے۔ ظرف کے چھوٹے ہوتے تو کہہ سکتے تھے کہ بھلا میرا کیا قصور، میں نے غلطی ہی کیا کی ہے۔ ایک اچھے نسخہ کا علم تھا، اس کا اظہار کیا گیا تھا پھر اس پا اتنی برہمی کے کیا معنی ؛ یہی شورشہ اگر سامنے آجاتا وہی لمبی لکیر بن سکتا تھا۔ اتنی لمبی کہ شیطان کی آنت بھی اس سے چھوٹی ہو۔ بڑھاپے میں دماغی توازن صحیح نہیں رہا ہے، مزاج میں تندی اور غصہ سے آگے بڑھ کر اسی کو "نفسانیت" کا ثبوت بھی قرار دیا جا سکتا تھا بلکہ دین کی آڑ لیکر سلطان جی چاہتے تو "اسوۂ حسنہ نبویہ" کے معیار پر شیخ کبیر کے اس طرز عمل کو کھوٹا بتاکر لوگوں کو دکھا سکتے تھے۔ لیکن ظاہر ہے وہ اپنا علاج کرانے آئے آئے تھے، شیخ کبیر کی کمزوریوں کا علاج اجودھن آنے سے مقصود نہ تھا، اس کو طے کر چکے تھے کہ یہ معالج طبیب ہے، اس کے بعد تنقید کا حق ان کے لیے باقی ہی کب رہا تھا۔[1]

ایک رفیق کی ملامت

خواجہ فرماتے ہیں کہ میں شیخ کبیر کی خدمت میں اجودھن حاضر تھا، ایک عالم بھی جو میرے دوست اور ہم درس تھے اور ہم دونوں ایک ساتھ مذاکرہ کرتے تھے، اجودھن آئے، انھوں نے جب مجھے پھٹے پرانے کپڑوں میں دیکھا تو بڑی حیرت و تأسف سے مجھ سے کہا: "مولانا نظام الدین تم نے اپنا کیا حال بنالیا ہے اگر تم شہر میں درس و تدریس کی خدمت میں مشغول رہتے تو مجتہد زمانہ ہوتے اور بڑی شان و شوکت سے رہتے"، میں نے اپنے دوست کی یہ بات سنی اور ان سے معذرت کر دی، اسکے بعد جب میں شیخ کبیر کی خدمت میں حاضر ہوا، تو انھوں نے خود بخود فرمایا کہ: نظام! اگر تمہارا کوئی دوست تمھیں ملے اور تم سے کہے کہ تم نے اپنا کیا حال بنالیا ہے اور تعلیم و تعلم کا وہ سلسلہ کیوں چھوڑ دیا

---

[1] ہندوستان میں مسلمانوں کا نظامِ تعلیم و تربیت" ج ۲ ص ۹۴-۹۵

جو فارغ البالی اور خوشحالی کا ذریعہ تھا، اور یہاں اس حال میں کیوں ہو، تو تم اسکا کیا جواب دوگے؟ میں نے عرض کیا کہ جو ارشادِ عالی ہو وہی کہدونگا۔ فرمایا اگر کبھی کوئی ایسا سوال کرے تو یہ شعر پڑھ دینا ؎

نہ ہمرہی تو مرا راہ خویش گیر و برو　　ترا سلامتی باد امر نگونساری

اس کے بعد حکم ہوا کہ خانقاہ کے مطبخ سے مختلف قسم کے کھانے ایک خوان میں اپنے سر پہ رکھ کر اس رفیق کے پاس لے جاؤ۔ میں نے تعمیلِ ارشاد کی، میرے دوست نے جب یہ منظر دیکھا تو روتا ہوا دوڑا اور میرے سر سے خوان اتارا اور کہنے لگا کہ تم نے یہ کیا کیا؟ میں نے سارا قصہ سنایا، اس نے یہ سنکر کہا کہ تمھارے شیخ ایسے ہیں کہ انھوں نے تم کو بے نفسی کے اس مقام پر پہنچا دیا ہے، مجھے بھی ان کی خدمت میں لے چلو، جب وہ کھانے سے فارغ ہوئے تو اپنے ملازم سے کہا کہ یہ خوان اٹھاؤ اور ہمارے ساتھ چلو، میں نے کہا کہ نہیں جیسے میں یہ خوان اپنے سر پہ رکھ کر لایا ہوں ویسے ہی سر پہ رکھکر لیجاؤنگا غرض ہم دونوں خدمتِ بابرکت میں پہنچے اور ہمارے دوست نے حضرت کے ہاتھ پہ بیعت و توبہ کی اور آپکے حلقۂ خدام میں داخل ہوئے۔[1]

کتنے بار حاضری کی؟ حضرت خواجہ شیخ اکبر کی زندگی میں تین بار اجودھن حاضر ہوئے پہلی یا کسی اور حاضری میں خلافت سے مشرف ہوئے تذکروں میں اسکی صراحت نہیں ہے[2]

شیخ کی نوازشیں ایک حاضری میں ایک دن ۲۵ رجمادی الاولیٰ کو نمازِ جمعہ[3] کے بعد طلبی ہوئی، شیخ کبیر نے اپنا لعابِ دہن حضرت خواجہ کے دہن میں ڈالا، قرآنِ مجید کے حفظ کی وصیت فرمائی، فرمایا کہ خدا نے دین و دنیا تم کو دی، یہاں سب کچھ یہی ہے، دہلی کی طرف روانہ کیا اور فرمایا:۔۔۔

---

[1] سیر الاولیاء صفحہ ۲۳۹ و صفحہ ۲۴۰　　[2] فوائد الفواد (صفحہ ۴۳)

[3] یہاں سیر الاولیاء میں سنہ تسع وستین وستمائۃ (۶۶۹ھ) یا تو غلط درج ہوگیا ہے اور تسع وخمسین ۶۵۹ھ مراد ہے اسلئے کہ شیخ کبیر کی وفات کا سنہ سیر الاولیاء وغیرہ میں ۶۶۴ھ ہے یا پھر تسلیم کیا جائے کہ آپکا سنہ وفات ۶۷۰ھ ہے جیسا کہ خزینۃ الاصفیاء میں بحوالہ مخبر الواصلین و تذکرۃ العاشقین درج ہے بہر حال سیر الاولیاء کے سنین میں تضاد ہے

"برو ملکِ ہند گیر" نظرۃ منک تکفینی[1]

رخصت اور وصیت

فرمایا کہ دلی جانا تو مجاہدہ میں مشغول رہنا، بیکار رہنا کچھ نہیں (نفلی) روزہ رکھنا نصف راہ ہے، دوسرے اعمال نماز و حج (نفلی) نصف راہ۔

سیر الاولیاء میں ہے کہ خلافت نامہ لکھ کر دیا اور ہدایت کی کہ مولانا جمال الدین کو ہانسی میں اور قاضی منتجب کو دہلی میں دکھا دینا، ارشاد ہوا کہ تم ایک سایہ دار درخت ہوگے جس کے سایہ میں اللہ کی مخلوق آرام پائے گی، استعداد کی ترقی کے لئے مجاہدہ کرتے رہنا۔

حضرت خواجہ فرماتے ہیں کہ ہانسی میں شیخ جمال الدین کو خلافت نامہ دکھایا، بڑا اظہارِ مسرت کیا اور یہ شعر پڑھا۔

خدائے جہاں را ہزاراں سپاس ۔۔۔ کہ گوہر سپردہ بگوہر شناس[2]

ایک دعا کی درخواست

اسی حاضری میں یکم شعبان کو حضرت خواجہ کی طرف سے[3] شیخ کبیر کی خدمت میں اس دعا کی درخواست پیش کی گئی کہ:-

خلق کے در بدر نہ پھرنا پڑے، درخواست قبول ہوئی اور دعا فرمائی گئی۔[3]

ایک موقع پر فرمایا گیا کہ میں نے اللہ سے تمہارے لئے تھوڑی سی دنیا مانگ لی ہے، خواجہ فرماتے ہیں کہ میں یہ سن کر متفکر ہوا کہ بڑے بڑے لوگ دنیا کے سبب سے فتنہ میں پڑ گئے میرا کیا حال ہوگا، شیخ نے فوراً ہی فرمایا کہ تم فتنہ میں نہیں پڑو گے۔ خاطر جمع رکھو۔ اب مجھے اطمینان ہوا۔[4]

---

[1] سیر الاولیاء (ص ۱۲۳) [2] ایضاً ص ۱۱۶ و ص ۱۱۷ اس موقع پر سیر الاولیاء میں جو ۶۶۹ھ پھر دیا گیا ہے اسکے متعلق اوپر گفتگو ہو چکی ہے۔ ۱۲۰ [3] سیر الاولیاء ص ۱۲۳۔ [4] ایضاً ص ۱۳۲

اجودھن سے دہلی کو

خواجہ نظام الدینؒ اب اپنے مرشد و مربی سے رخصت ہو کر ہندوستان کی تسخیر روحانی اور خلق خدا کے ارشاد و تربیت اور تبلیغ و ہدایت کی عظیم و مقدس مہم پر روانہ ہوئے۔ یہ ایک فقیر بے نوا تھا جو ہندوستان بلکہ ساتویں صدی ہجری کے عالم اسلام کی سب سے مستحکم اسلامی دارالسلطنت کو جارہا تھا۔ اس کے پاس اخلاص، اعتماد علی اللہ اور استغناعن الخلق کے سوا کوئی زادِ راہ اور کوئی ہتھیار و سلاح نہ تھا۔ مولانا سید مناظر احسن گیلانیؒ نے خوب لکھا ہے:۔

"ہندگیری کی مہم پر اجودھن سے ہند کے دارالسلطنت دہلی کی طرف روانہ ہوتے ہیں جہاں نیچے سے اوپر تک ہتھیار چھوٹے آلہہ پر اجمائے بیٹھے ہیں، ان میں وہ بھی ہے جسکی زبان کی معمولی حرکت لوگوں کے تن کو سر سے جدا کردیتی ہے وہ بھی ہیں جن کی نیازمندی خاک سے اٹھا کر لوگوں کو امارت و دولت کے افلاک تک پہنچا رہی ہے۔ گلی گلی میں عزت تقسیم ہو رہی ہے، مناصب بٹ رہے ہیں، روپے لٹائے جارہے ہیں، گودیں بھر رہی ہیں اور جن جن ذرائع سے یہ چیزیں حاصل ہوتی ہیں سلطان المشائخ سب سے لیس ہیں۔ آپ پڑھ چکے ہیں کہ اجودھن جانے سے پہلے دہلی کی علمی محفلوں کی محفل شکنی میں ان کی عام شہرت ہو چکی ہے، کچھ نہیں تو قضا کے عہدے سے لیکر شیخ الاسلامی و صدر جہانی کی خدمات تک کی ساری راہیں اپنے سامنے کھلی پا رہے ہیں، لیکن اب خالق کی صورت میں جو الٰہ ان کو مل چکا تھا، سینہ اسی کے وزن سے اتنا معمور تھا کہ کسی مخلوق کی کوئی گنجائش ان کے قلب میں باقی نہ تھی، قلب کی اسی کیفیت کی تعبیر تھی جس کا اظہار وہی کبھی کبھی ان مشہور تیز الفاظ میں فرمایا کرتے تھے:۔

"ایمان کس تمام نہ شود تا ہمہ خلق　　در نزدیکی او ہم چو پشک شتر نہ نماید"[۱]

---

[۱] سیر الاولیاء صفحہ ۵۵

مجلسِ مبارک میں دمشق کے ایک شخص کا ذکر ہو رہا تھا جو شیخ الاسلامی کی خدمت کے لئے ساری ساری رات نماز پڑھتا تھا، اپنی انھیں نمازوں کو نگاہِ خلق میں حصولِ عزت کا ذریعہ بنا رہا تھا۔ جامع ملفوظات راوی ہیں کہ:-

دریں میان خواجہ ذکر اللہ بالخیر	یہ سُنکر حضرت خواجہؒ کی آنکھوں میں
چشم پر آب کردہ برلب مبارک راند	آنسو آ گئے اور فرمایا کہ پہلے شیخ الاسلامی
بسوز اوّل شیخ الاسلامی را، پس	کو جلاؤ، پھر آگ لگاؤ خانقاہ کو،
خانقاہ را، بعد ازاں خود را[1]	پھر اپنی خودی کو جلا کر خاک کر دو۔

الغرض اس شان کے ساتھ سب کچھ جلا کر بھسم کر کے وہ اجودھن سے روانہ ہوئے .... اور جس علاقہ کی ولایت آپ کے سپرد ہوئی تھی اسی کے پایۂ تخت میں آپ پہونچ گئے[2]"

تصفیۂ حقوق

شیخ کبیرؒ نے ارادت و خلافت کے ساتھ کئی بار یہ تاکید کی تھی کہ مخالفین کو خوش کرنے کی پوری کوشش کرنا اور اہلِ حقوق کو راضی کرنے میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہ کرنا۔ خواجہ فرماتے ہیں کہ میں جب دہلی چلا تو مجھے یاد آیا کہ مجھے ۲۰ جیتل[3] ایک شخص کے دینے ہیں، اور ایک کتاب میں نے کسی سے مستعار لی تھی وہ کھو گئی ہے، میں نے بدایوں کے قیام میں یہ عزم کر لیا تھا کہ میں جب دہلی پہنچوں گا

---

۱ فوائد الفواد (ص ۲۳)

۲ ہندوستان میں مسلمانوں کا نظامِ تعلیم و تربیت (ص ۱۵)

۳ جیتل یا چیتل تانبہ کا ایک سکہ تھا، ایک تنکہ کے (دو روپیہ) چونسٹھ جیتل اور ایک جیتل کے چار فلوس یعنی دھیلے تھے

تو ان اہل معاملہ کو راضی کرنے کی کوشش کروں گا، جب میں اجودھن سے دہلی واپس آیا تو جس شخص کے بیس جیتل مجھے دینے تھے وہ بزاز تھا، میں نے اس سے کپڑا خریدا تھا، کسی وقت بیس جیتل میرے پاس جمع نہیں ہوئے کہ میں اسکو پہنچا دیتا، معاش کی بڑی تنگی تھی، کبھی پانچ جیتل ہاتھ آئے، کبھی دس، ایک مرتبہ دس جیتل ملے میں اُس بزاز کے دروازہ پر پہنچا، اسکو آواز دی، وہ باہر آیا تو میں نے اس سے کہا کہ تمھارے بیس جیتل میرے ذمہ ہیں، ایک مرتبہ تو مجھے دینے کی مقدرت نہیں، یہ دس جیتل لایا ہوں، اس کو لے لو، دس انشاء اللہ اسکے بعد پہنچا دوں گا۔ اس شخص نے یہ سنکر کہا کہ ہاں معلوم ہوتا ہے کہ تم مسلمانوں کے پاس سے آرہے ہو، اس نے وہ دس جیتل تو لے لئے اور کہا کہ بقیہ دس جیتل معاف کئے۔

اس کے بعد میں اس شخص کے پاس گیا جس کی کتاب میں نے لی تھی، اس نے مجھے پہچانا نہیں، میں نے کہا کہ صاحب میں نے آپ سے ایک کتاب مستعار لی تھی، وہ کھو گئی، اب میں اس کی نقل تیار کر کے آپ کو دوں گا، میں بالکل اسی طرح لکھوا کر آپ کو پہنچا دوں گا۔ اس شخص نے کہا کہ ہاں تم جہاں سے آرہے ہو وہاں کا یہی نتیجہ ہونا چاہئے، اسکے بعد اس نے کہا کہ میں نے وہ کتاب تم کو بخشی[1]

دہلی کی قیام گاہیں

خواجہ صاحبؒ اہل دہلی بلکہ اہلِ ہند کی خدمت کے لئے جب دہلی پہنچے تو باوجود اس کے کہ دہلی کا کوچہ کوچہ مخلوں اور ایوانوں سے آباد تھا اور روزنئی نئی عمارتیں بن رہی تھیں، خواجہ صاحبؒ کے قیام کا کوئی ٹھکانا نہ تھا جب تک کہ غیاث پور کا قیام اختیار نہیں فرمایا، آپ نے اتنی قیامگاہیں اختیار کیں اور اتنے مقامات تبدیل کئے کہ معلوم ہوتا ہے کہ شہر میں اس فقیر کے لئے اپنا درویشانہ سامان رکھنے اور اپنا بوریہ بچھانے کے لئے جگہ نہیں تھی۔

سیر الاولیاء کے مصنف میر خورد اپنے والد سید مبارک محمد کرمانی کی زبانی جو حضرت خواجہؒ کے دوست

---

[1] فوائد الفواد (ص ۱۴۱)

اور رفیق تھے، اس نقل مکانی کی تفصیل بیان کرتے ہیں جو ناظرین کی عبرت کے لئے یہاں نقل کی جاتی ہے ۔سیّد مبارک محمدؒ کرمانی فرماتے ہیں:۔

" جتنے سال سلطان المشائخ شہر دلی میں رہے کوئی مکان آپ کی ملکیت میں نہ تھا اور ساری عمر آپ نے کوئی جگہ اپنے اختیار سے انتخاب نہیں فرمائی۔ جب آپ بدایوں سے آئے تو سرائے میاں بازار میں جس کو نمک کی سرائے بھی کہتے ہیں، اُترے، والدہ اور ہمشیرہ کو وہاں رکھا اور خود ایک قواس (کمان گر) کی بارگاہ میں جو سرائے مذکور کے سامنے تھی، مقیم ہوئے۔ امیر خسروؒ کا بھی اسی محلہ میں مکان تھا، کچھ عرصہ کے بعد راوت عرض کا مکان خالی ہوا، اس کے لڑکے علاقوں میں چلے گئے۔ امیر خسروؒ کی معرفت جو راوت عرض کے نواسے تھے سلطان المشائخؒ کو یہ مکان قیام کے لیے مل گیا، آپ دو سال اس مکان میں رہے، یہ مکان شہر پناہ کے متصل منڈ دروازہ و منڈھ پل کے نزدیک تھا، اس طرح سے کہ شہر پناہ کا بُرج اس عمارت کے اندر آ گیا تھا، مکان کے ایوان و رواق بڑے بلند اور شاندار تھے، اس عرصہ میں راوت عرض کے لڑکے آ گئے، سلطان المشائخؒ کو اس مکان سے منتقل ہو جانا پڑا، آپ کی کتابیں جن کے سوا کوئی اور سامان نہ تھا ہم سروں پر رکھ کر چھپر والی مسجد میں (جو سراج بقال کے سامنے تھی) لے آئے۔ دوسرے روز سعد کاغذی نے جو شیخ صدر الدین کے مریدین میں تھے، یہ قصہ سنا اور سلطان المشائخؒ کے پاس آکر بڑی عزت و توقیر اور خوشامد سے اپنے مکان پر لے گیا۔ بالا خانہ پر ایک بہت اچھی بارگاہ بنی ہوئی تھی، وہاں آپ کو ٹھہرایا۔ سلطان المشائخؒ ایک مہینہ وہاں ٹھہرے، اسکے بعد وہاں سے بھی اُٹھے، رکابدار کی سرائے میں جو قیصر پل کے

متصل تھی۔ سرائے کے درمیان ایک مکان تھا، وہاں مقیم ہوئے۔ ایک مدت کے بعد وہاں سے بھی منتقل ہو کر شادی گلابی کے مکان میں جو محمد میوہ فروش کی دکانوں کے درمیان واقع تھا، قیام اختیار کیا۔ اس درمیان میں شمس الدین شرابدار[1] کے لڑکے اور اعزہ جو آپ کے معتقد تھے آپ کو بڑی عزت اور احترام کے ساتھ شمس الدین شرابدار کے مکان میں لے آئے۔ کئی سال سلطان المشائخ اس مکان میں رہے۔ اس مکان میں بڑی راحت اور سکونِ خاطر میسر آیا۔"[2]

فقر و فاقہ

خواجہ صاحب دہلی تشریف لائے تو ابتلا و تربیت کا وہ دور شروع ہوا جو اس راہ کے ان سالکوں کو جو آگے چل کر مرجع خلائق و سرچشمۂ فیوض بنتے ہیں عادتاً پیش آیا کرتا ہے۔ یہ وہ وقت تھا کہ سارے ہندوستان کی دولت اور زر و جواہر دہلی امراء کے گھر آ رہے تھے اور ارزانی کا یہ عالم تھا کہ ایک جیتل میں دو سیر میدے کی پکی پکائی روٹیاں مل جاتی تھیں اور دو جیتل میں ایک من خربوزہ آ جاتا تھا، لیکن خواجہ صاحب کے فقر و فاقہ کا یہ حال تھا کہ فرماتے ہیں کہ: ۔ میرے پاس ایک دانگ بھی نہ ہوتا کہ اس سے میں روٹیاں خرید کر خود کھاؤں اور والدہ و ہمشیرہ اور گھر کے ان لوگوں کو کھلاؤں جو میری کفالت میں تھے، خربوزہ کی اس ارزانی و فراوانی کے باوجود پوری پوری فصل گذر جاتی اور خربوزہ چکھنا نصیب نہ ہوتا لیکن اپنے اس حال میں خوش رہتا اور آرزو کرتا کہ جتنی فصل باقی ہے وہ بھی گذر جائے اور میں اسی حال میں ہوں۔[3]

۱؎ بادشاہ کو پانی پلانے کا عہدہ - ۱۲

۲؎ سیر الاولیاء (ص۱۰۸)

۳؎ سیر الاولیاء (ص۱۱۳)

غیر کے واسطہ کے بغیر

اسی زمانہ میں جبکہ آپ شہر پناہ کے اس برج میں مقیم تھے جو مندہ دروازہ کے متصل ہے کئی روز گذر گئے اور کھانے کو کوئی چیز میسر نہیں آئی۔ ایک طالبعلم کو اس کا علم تھا کہ کئی روز سے حضرت کو فاقہ ہے، اس طالبعلم نے بعض ہمسایوں کو جو نور باف تھے اس کی اطلاع کی، وہ کھانا تیار کرکے لائے۔ کھانے کیلئے ہاتھ دھلاتے وقت کھانا لانے والوں میں سے ایک بولا خدا طالبعلم کا بھلا کرے کہ اسنے ہمیں خبر کردی۔ خواجہ نے ہاتھ روک لئے اور فرمایا:۔ کیا خبر کی؟ اس نے کہا کہ:۔ فلاں طالبعلم نے ہمیں بتلایا کہ کہ آپ کئی روز سے فاقہ سے ہیں، چنانچہ ہم یہ کھانا تیار کرکے لائے۔ آپنے فرمایا: معاف رکھو۔ کتنی ہی ان لوگوں نے کوشش کی، آپ نے کھانا قبول نہیں کیا۔[1]

شیخ کبیرؒ کی وفات

آخری بار آپ شیخ کبیرؒ کی خدمت میں تین چار مہینے قبل گئے تھے۔ فرماتے ہیں کہ:۔ ۵ محرم کو شیخ کبیرؒ نے وفات پائی اور شوال کے مہینہ میں مجھے حضرت نے دہلی بھیجدیا۔ بیماری کی ابتدا ہوچکی تھی۔ رمضان کا مہینہ تھا اور آپ بیماری کی وجہ سے روزہ نہیں رکھ رہے تھے، ایک روز کہیں سے خربوزہ آیا تھا خربوزہ کاٹ کر میں نے شیخ کے سامنے رکھا شیخ نے تناول فرمایا اور ایک قاش مجھے عنایت فرمائی۔ میرے دل میں آیا کہ یہ دولت اب کب ملیگی کہ اپنے دست مبارک سے مجھے عنایت فرمارہے ہیں، میں کھالوں اور دو مہینے مسلسل روزے رکھکر (فرض روزہ توڑ دینے) کا کفارہ ادا کردونگا۔ فرمایا کہ نہیں نہیں میرے لئے تو شریعت کی اجازت ہے، تمہارے لئے جائز نہیں۔[2][3]

فرمایا کہ انتقال کے وقت مجھے یاد فرمایا اور فرمایا کہ: نظام الدین تو دہلی میں ہیں۔ یہ بھی فرمایا کہ میں بھی اپنے شیخ قطب الدین بختیار کاکیؒ کی رحلت کے وقت حاضر نہ تھا، ہانسی میں تھا۔ فوائد الفواد

۱؎ جوامع الکلم (ملفوظات حضرت خواجہ سید محمد گیسو درازؒ) ص ۲۹۶ ۲؎ سنہ ۶۶۴ھ ۳؎ فوائد الفواد (ص ۵۳)

میں ہے کہ یہ تذکرہ کرتے وقت آپ پر ایسا گریہ طاری ہوا کہ تمام حاضرین کے دل متاثر ہوئے۔[1]

وفات کے بعد آپ اجودھن حاضر ہوئے۔ مولانا بدرالدین اسحٰقؒ نے شیخ کبیرؒ کی وصیت کے مطابق جامہ مصلّٰی اور عصا سپرد کیا جو حضرت خواجہ کو دینے کے لئے شیخ کبیرؒ نے مولاناؒ کے حوالہ کیا تھا۔[2]

غیاث پور کا قیام

فوائد الفواد میں ہے کہ ایک روز آپ نے شہر کے شور و شر کا تذکرہ کرتے ہوئے بیان کیا کہ ابتدائی زمانہ میں بھی میرا شہر میں دل نہیں لگتا تھا۔ ایک روز قتلغ خاں کے حوض پر تھا، ان دنوں میں قرآن مجید یاد کر رہا تھا، وہاں ایک درویش یادِ خدا میں مشغول تھا، میں اسکے پاس گیا اور اس سے پوچھا کہ آپ اسی شہر کے رہنے والے ہیں؟ انھوں نے کہا: ہاں! میں نے کہا: اپنی مرضی سے اس شہر میں رہتے ہیں؟ اس نے کہا: یہ بات تو نہیں ہے۔ اسکے بعد اس درویش نے واقعہ بیان کیا کہ ایک مرتبہ میں نے ایک اچھے درویش کو دیکھا، بیرون کمال دروازہ، اس احاطہ میں جو لبِ خندق ہے اس دروازے کے قریب ایک بلند زمین ہے جس پر شہداء کی چار دیواری بنی ہوئی ہے، وہ درویش بیٹھا ہوا ہے۔ اس درویش نے مجھ سے کہا کہ اگر ایمان کی خیر چاہتے ہو تو اس شہر سے چلے جاؤ۔ میں نے اسی وقت سے اس شہر سے چلے جانے کا مصمم ارادہ کر لیا۔ لیکن موانع پیدا ہوتے رہے، آج پچیس سال ہوگئے کہ میرا ارادہ باقی ہے لیکن جانے کی نوبت نہیں آتی۔ حضرت خواجہ نے یہ حکایت بیان کر کے فرمایا کہ میں نے جب اس درویش کی یہ بات سنی تو اپنے دل میں یہ طے کر لیا کہ میں اس شہر میں نہ رہوں گا۔ کئی جگہ کا خیال آتا تھا کہ میں وہاں چلا جاؤں۔ کبھی دل میں آتا تھا کہ قصبہ پٹیالی[3] چلا جاؤں، وہاں ان دنوں ایک ترک تھا۔ کبھی دل کرتا تھا کہ بسنالہ جاؤں، وہ ایک پاک صاف جگہ ہے، چنانچہ

۱؎ فوائد الفواد ص ۵۳ ۲؎ سیر الاولیاء، ص ۱۲۲

۳؎ ضلع ایٹہ میں ایک قصبہ ہے جو خسروؔ کا ننہال یہیں تھا اور اسی تقریب سے وہ وہاں رہتے تھے۔ ۱۲

تشنا لے چلا گیا، تین برس وہاں رہا، کوئی مکان نہیں ملا، نہ کرایہ کا نہ بقیمت، ان تین برسوں روزانہ کسی ایک کا مہمان رہتا تھا، جب وہاں سے واپس آیا تو یہی خیال لگا رہا کہ ایک روز حوض رانی کی طرف گیا ہوا تھا، وہاں ایک باغ میں جس کو "باغِ جسرت" کہتے ہیں، اللہ سے مناجات کی۔ طبیعت متوجہ تھی۔ میں نے عرض کیا کہ خداوندا! میں اس شہر سے چلا جانا چاہتا ہوں، لیکن کوئی جگہ اپنی مرضی سے اختیار نہیں کرونگا جہاں آپ کی مرضی ہو وہاں چلا جانا چاہتا ہوں، اس درمیان میں ایک غیبی آواز "غیاث پور" کے نام کی آئی۔ میں نے کبھی غیاث پور دیکھا نہیں تھا، اور یہ بھی نہیں جانتا تھا کہ غیاث پور کہاں ہے، میں نے جب آواز سنی تو ایک دوست کے پاس گیا۔ وہ دوست ایک نیشاپوری نقیب تھا، جب میں اس کے گھر گیا اور اسکو دریافت کیا تو معلوم ہوا کہ وہ غیاث پور گیا ہوا ہے، میں نے اپنے دل میں کہا کہ وہی غیاث پور ہے، الغرض غیاث پور آیا، اس وقت تک یہ مقام ایسا آباد نہیں تھا، ایک غیر معروف جگہ تھی، آدمی بھی کم تھے۔ میں آیا، میں نے وہاں سکونت اختیار کر لی، جب کیقباد[1] نے کیلوکھری[2] کو اپنی فرودگاہ بنایا تو وہاں ہجومِ خلائق ہوا۔ امراء اور اعیانِ سلطنت اور ان کے متعلقین کی آمد و رفت شروع ہوگئی۔ جب میں نے یہ اژدہام دیکھا تو اپنے دل میں کہا کہ اب یہاں سے بھی چلا جانا چاہئیے، اسی خیال میں تھا کہ ایک بندۂ خدا جو میرے استاد بھی تھے، شہر میں انتقال ہوا، میں نے اپنے دل میں کہا کہ جب میں ان کے فاتحہ میں جاؤں گا تو پھر کسی طرف کا قصد کروں گا، اپنے دل میں اس کو طے کر لیا۔

اسی روز نمازِ عصر کے وقت ایک جوان آیا حسین لیکن نحیف، خدا جانے مردانِ غیب میں سے

لہ سلطان معز الدین کیقباد (۶۸۶ھ ۔ ۶۸۹ھ) بغرا خاں کا لڑکا اور غیاث الدین بلبن کا پوتا تھا، ۳ سال حکومت کی ۱۲

لہ سرسید احمد خاں آثار الصنادید میں لکھتے ہیں: معز الدین کیقباد نے ۶۸۶ھ میں ایک قلعہ بنوایا اور کیلوکھری اسکا نام رکھا اگرچہ اس قلعہ کا اب نشان نہیں لیکن اسی جگہ ہمایوں کے مقبرے کے پاس موضع کیلوکھری موجود ہے، اور دس پانچ جھونپڑے موجود ہیں ۱۲
(آثار الصنادید باب ۳، ص ۴)

تھا یا کون تھا، اس نے آتے ہی مجھے خطاب کر کے یہ شعر پڑھا۔ ؎

آں روز کہ مہ شدی نمی دانستی　　　　کہ انگشت نمائے جہاں خواہی شد

(جس روز خدا نے تم کو چاند بنایا تھا، اسی روز سمجھنا چاہیئے تھا کہ ساری دنیا کی انگلیاں تمہاری طرف اٹھیں گی)

حضرت خواجہؒ نے فرمایا کہ اس نے کچھ اور باتیں بھی کہیں جس کو میں نے لکھ لیا ہے، اسکے بعد اس نے یہ کہا کہ پہلی مرتبہ آدمی کو مشہور نہیں ہونا چاہیئے، اور جب کوئی شخص مشہور ہو جائے تو پھر ایسا بننا چاہیئے کہ کل روزِ قیامت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے شرمندہ نہ ہونا پڑے۔

اس کے بعد اس نے کہا کہ یہ کیا ہمّت وحوصلہ ہے کہ خلقِ خدا سے بھاگ کر گوشہ گیری اختیار کی جائے اور یادِ خدا میں مشغول ہوا جائے۔ اس کا مقصود یہ تھا کہ قوت و حوصلہ کی بات تو یہ ہے کہ مخلوق کے باوجود یادِ خدا میں مشغول ہو۔ جب اس نے اپنی بات ختم کی تو میں نے کچھ کھانا لاکر اسکے سامنے رکھا، اس نے ہاتھ نہیں بڑھایا، اسی وقت میں نے اپنے دل میں نیت کی کہ میں یہیں رہوں گا جب میں نے یہ نیت کر لی، تو اس نے تھوڑا سا کھانا کھایا اور چلا گیا۔[1]

رجوعِ عام | غیاث پور کے دورانِ قیام میں خلقِ خدا اور طالبین کا رجوع شروع ہوا اور فتوحات کا دروازہ کھل گیا

تذکروں سے یہ نہیں معلوم ہوتا کہ غیاث پور میں کتنی مدت گزرنے کے بعد آپ کی ذات بابرکات کو مرجعیت، اور غیاث پور کی خانقاہ کو شہرت عام حاصل ہوئی۔ اتنا پتہ چلتا ہے کہ غیاث پور کا قیام اختیار کرنے کے بعد بھی ایک عرصہ تک عسرت اور بے اسبابی کا دور گذرا، یہاں تک کہ ایک عرصہ

---

[1] سیر الاولیاء (ص ۱۲۹)

تک آپ سخت گرمیوں اور لو دھوپ کے زمانہ میں جامع مسجد کو جو خاصہ فاصلہ پر تھی جمعہ کے دن پیادہ پا تشریف لیجاتے تھے، یہاں تک کہ اس "عُسر" کے بعد "یسر" کا دور آگیا[1] اور وہ رجوع عام شروع ہوا کہ اسکے سامنے سلاطین دہلی کے درباروں کی عظمت ماند پڑگئی، امیر خسروؒ کے ان اشعار کی تصویر سامنے آگئی۔

در حجرۂ فقر بادشاہی ——— در عالم دل جہاں پناہی
شاہنشہے بے سریر بے تاج ——— شاہاں ہمہ خاک پائے محتاج

فقر و منعم

صاحب سیر الاولیاء لکھتے ہیں کہ:۔ وارد و صادر میں سے پردیسی ہو یا شہری جو آتا اور سعادت قدمبوسی حاصل کرتا کسی کو محروم نہ فرماتے، پوشاک، نقد، تحائف جو بھی خدا بھیجتا سب ہی ان آنے جانے والوں پر صرف ہوتا، جو بھی آتا اور جس وقت بھی آتا محروم نہ جاتا۔[2]

حضرت خواجہ نصیر الدین چراغ دہلی نے فرمایا:۔

"فتوحات کا یہ حال تھا کہ دولت کا دریا آگے دروازے کے بہتا تھا، کوئی دن فتوحات سے خالی نہ ہوتا، صبح سے شام تک لوگ آتے بلکہ عشا تک، مگر لینے والے لانے والوں سے زیادہ ہوا کرتے اور جو کچھ کوئی لاتا اس سے زیادہ حضرتؒ کی عنایت سے پاتا۔"[3]

---

[1] انّ مع العسر یُسرًا۔ انّ مع العسر یُسرا ——— بیشک دشواری کے ساتھ آسانی ہے، بیشک دشواری کے ساتھ آسانی ہے۔ ۱۲

[2] سیر الاولیاء۔

[3] سراج المجالس (ترجمہ خیر المجالس) ملفوظات حضرت خواجہ نصیر الدین چراغ دہلیؒ (صـ۲۰۲)

بیداری پر پہلا سوال

عادتِ مبارک تھی کہ جب قیلولہ سے اٹھتے تو دو باتیں سب سے پہلے پوچھتے، ایک یہ کہ زوال ہو گیا۔ دوسرے یہ کہ کوئی آیا تو نہیں، تاکہ اسکو انتظار نہ کرنا پڑے۔[۱]

دنیا سے تنفر اور بذل وعطا

دنیا کا جس قدر رجوع بڑھتا گیا آنکی طبیعت اس سے متنفر ہوتی گئی، اکثر گریہ فرماتے، جتنی بڑی فتوحات ہوتیں اتنی ہی زیادہ گریہ کرتے اور اتنی ہی زیادہ کوشش فرماتے کہ جو کچھ آیا ہے جلد تقسیم ہو جائے، تھوڑی تھوڑی دیر کے بعد آدمی کو بھیجکر ہدایت فرماتے کہ جو کچھ ہو تقسیم کر دیا جائے، جب سب تقسیم ہو جاتا اور ضرورتمندوں کو پہنچ جاتا تو سکونِ خاطر ہوتا۔ ہر جمعہ کو حجروں اور انبار خانوں کو اس طرح خالی کرا دیتے جیسے جھاڑو دے دی گئی ہو، اس کے بعد مسجد جاتے، اگر بادشاہوں یا شہزادوں میں سے کوئی آستانہ پر حاضر ہوتا اور ان کی نذر اور آمد آمد کی خبر پہنچتی تو ٹھنڈی سانس بھر کر فرماتے کہ: کہاں آئے ہیں، فقیر کا وقت غارت کرتے ہیں۔[۲]

زمین و جائداد سے پرہیز

امیر حسن علاسنجری فرماتے ہیں کہ میں ایک مرتبہ حاضر تھا، ان دنوں میں ایک امیر نے باغ اور بہت سی زمین اور اسکے سازو سامان کی دستاویز حضرتؒ کی خدمت میں بھیجی تھی اور اپنی عقیدت و اخلاص کا اظہار کیا تھا، حضرتؒ نے قبول نہ فرمایا، متبسم ہوکر فرمایا کہ اگر میں اسکو قبول کر لوں تو پھر لوگ کہا کرینگے کہ شیخ باغ کی سیر کو گئے ہیں اور اپنی کھیتی اور زمین دیکھنے تشریف لے گئے ہیں۔ میرے کام سے اس کو کیا مناسبت؟ میرے بزرگوں اور مشائخ میں سے کسی نے زمین و جائداد قبول نہیں کی۔[۳]

---

[۱] سیر الاولیاء ص ۱۳۶ ۔ [۲] ایضاً ص ۱۲۹ [۳] فوائد الفواد ج ۱ ص ۹۹

فقیر کا شاہی دسترخوان

خود دائم الصوم تھے، لیکن دونوں وقت شاہی دسترخوان لگتا اور انواع و اقسام کے کھانے وافر مقدار میں چنے جاتے، امیر و غریب، شاہ و گدا، شہری و پردیسی، صالح و گناہگار کسی کی تفریق نہ تھی، سب ایک جگہ بیٹھ کر کھانا کھاتے، لے جانے کی بھی اجازت تھی۔ بعض لوگ کھاتے اور باندھ کر بھی لے جاتے، یہ شاہی دسترخوان اپنی نوعیت میں یکتا تھا۔ اسی دسترخوان پر بیٹھ کر سیکڑوں ہزاروں غرباء کو وہ کھانے نصیب ہوتے جن کے انھوں نے نام ہی نام سنے تھے، بڑے بڑے امراء دربار اور اعیان سلطنت کو بھی اس دسترخوان پر حاضری کی آرزو ہوتی تھی اور اس کھانے کی لذت کو وہ یاد کرتے تھے، ہدایت وارشاد اور سلوک و تربیت کے فیض عام کے علاوہ (جس کا ہر وقت دروازہ کھلا رہتا تھا) حضرت خواجہؒ کا یہ بھی فیض تھا جو دلی میں اپنی پوری روانی کے ساتھ جاری تھا اور جو ہزاروں بندگانِ خدا کی پرورش کا ذریعہ تھا، مولانا مناظر احسن گیلانی نے درویش کے اس خوانِ "سلطانی" کا ذکر کرتے ہوئے خوب لکھا ہے:۔

"آج جن چیزوں پر ایوانِ نعمت کے قصوں کے ساتھ غریبوں کا دکھڑا رو دیا جاتا ہے گویا یہ بھی ایک قسم کی حدیث المائدہ (ٹیبل ٹاک) اور ہضم کرنے کا چورن ہے ان کو کیا معلوم کہ اسلامی تاریخ میں غریبوں اور امیروں کے درمیان صوفیۂ اسلام کی یہی خانقاہیں درمیانی کڑی کا کام دیتی تھیں، ان بزرگوں کا دربار وہ دربار تھا جہاں سلاطین بھی خراج داخل کرتے تھے۔ خود سلطان المشائخ کا کیا حال تھا، گذر چکا کہ دلی عہدِ سلطنت خضر خاں تک اسی دربار کا حلقہ بگوش تھا۔ علاء الدین جو سارے ہندوستان سے خراج وصول کرتا تھا، لیکن ایک خزانہ وہ بھی تھا جس میں اسے بھی مالگزاری داخل کرنی پڑتی تھی"[1]

---

[1] نظامِ تعلیم (ص ۲۱۴)

یہی خانقاہیں تھیں جن کے ذریعہ سے ملک کے عام غربا، فقرا تک ان کا حصہ پہنچ جاتا تھا' اور یہی مطلب ہے اس مشہور فقرہ کا کہ :-

"مالِ صوفی سبیل است[1]"

عزت و امارت کا یہ سنگم یعنی صوفیہ صافیہ کا یہ طبقہ جہاں امرا و غربا دونوں ایک حیثیت سے حاضر ہوتے تھے اس سے غریب اور حاجتمند مسلمانوں کی کتنی حاجت روائیاں ہوتی تھیں، واقعہ یہ ہے کہ اسلامی عہد کا کوئی زمانہ اور ان دونوں ہندوستان کا شاید ہی کوئی صوبہ کوئی علاقہ ایسا ہو گا جہاں

توخذ من اغنیاءھم — انکے دولتمندوں سے لیا جائے اور ان کے

وترد علیٰ فقراءھم — ضرورتمندوں کو پہونچا دیا جائے۔

کے نبوی فرمان کی تعمیل میں ارباب صدق و صفا کا یہ طبقہ مشغول نہ تھا، خصوصاً جن بزرگوں کا کسی خاص وجہ سے امرا اور ارباب ثروت پر اثر قائم ہو جاتا تھا، یوں سمجھئے کہ غربا کی قسمت جاگ اٹھتی تھی[2]۔

اسلام کے ان اکابر کا حال پڑھئے اور اس پر غور کیجئے، آپ کو نظر آئے گا کہ امرا اور غربا کے درمیان ان بزرگوں کا وجود باجود حلقۂ اتصال بنا ہوا تھا ـــــ اور میرا خیال ہے کہ ان کی خانقاہوں کے لنگر خانے جہاں اپنے اندر دوسری اغراض رکھتے تھے ایک بڑا کام ان سے یہ بھی نکلتا تھا کہ ملک کے غریبوں، بے وسیلوں کی پناہ گاہ یہ خانقاہیں بنی ہوئی تھیں، بلکہ ان ہی کے

---

[1] نظام تعلیم (صفحہ ۲۱۴) [2] ایضاً (صفحہ ۲۲۰)

ذریعہ سے غریبوں تک بھی وہ نعمتیں پہنچ جاتی تھیں جن کا نام بھی اس زمانہ کے غریبوں نے شاید نہ سنا ہو"[1]

شیخ کی غذا شیخ خود کھانے میں شریک ہوتے لیکن اس شاہی دسترخوان پر جس پر انواع و اقسام کے کھانے اور الوانِ نعمت ہوتے، ان کی غذا عام طور پر ایک یا آدھی روٹی اور کچھ کریلہ وغیرہ کی سبزی یا تھوڑے سے چاول[2] ہوتے۔ آپکے ایک مرید باختصاص مولانا شمس الدین یحییٰ اپنا مشاہدہ بیان کرتے ہیں:-

"میں ایک مرتبہ دسترخوان پر موجود تھا افطار کے وقت میری نظر سلطان المشائخ پر تھی، میں نے دیکھا کہ کھانا شروع ہونے کے وقت آپ نے لقمہ لینے کے لئے جو ہاتھ پیالہ کیطرف بڑھایا تھا وہ آخر تک وہیں رہا، منہ تک آنے کی نوبت نہ آئی کہ دسترخوان بڑھا دیا گیا"[3]

ترتیب دسترخوان پر بیٹھنے کا قاعدہ اور ترتیب یہ تھی کہ سب سے آگے مخدوم زادگان (مرشد سے نسبتِ قرابت رکھنے والے) ہوتے، پھر علماء، پھر رؤسا و اشراف[4]

سلاطین عہد سے بے تعلقی سلسلۂ چشتیہ کی بنیاد سلطنتِ ہندوستان کی دینی رہنمائی بلکہ سلطنتِ اسلامی کی تاسیس، اسلامی معاشرہ کی اصلاح اور اس میں روحانیت و انابت کی روح پھونکنے کے ساتھ ساتھ ابتدا ہی سے سلاطین وقت سے بے تعلقی کے اصول پر پڑی تھی، اور یہ اس سلسلہ کا ایک شعار اور مشائخ چشتیہ کا مقدس ترکہ اور امانت بن گئی تھی۔ مشائخ چشت نے اس "شیشہ و آہن" کو جمع کرنے میں اپنا پورا کمال دکھا دیا تھا۔ ایک طرف وہ دربار کے غلط رجحانات کی اصلاح اور وقت کے فتنوں کے استیصال سے غافل اور علم

---

[1] نظامِ تعلیم ص ۲۲۸ [2] سیر الاولیاء ص ۱۲۵ [3] ایضاً ص ۱۲۵ [4] ایضاً ص ۲۰۲

اسلام سے خالی اور اس ملک میں مسلمانوں کے مستقبل سے بے فکر نہ تھے، دوسری طرف وہ ایک اصول اور عقیدے کے طور پر یہ طے کرچکے تھے کہ ان کو دربار سے براہ راست کوئی تعلق رکھنا نہیں ہے۔

حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ سے لیکر خواجہ نظام الدین تک یہ گویا ایک طے شدہ حقیقت تھی کہ ان کو دربار میں جانا ہے اور نہ سلاطینِ وقت سے ملاقات کرنی ہے، اس اصول پر یہ سب حضرات سختی سے کاربند رہے، اس کا نتیجہ تھا کہ سیاست کے خارزار میں ان کا دامن کبھی نہیں اُلجھا، اور انقلاباتِ سلطنت کا ان مرکزوں اور ان کی سرگرمیوں پر کوئی اثر نہیں پڑا۔ ان کا اخلاص، ان کی بے لوثی اور بے غرضی تمام سیاسی اختلافات کے باوجود مُسلّم رہی اور اسی کا نتیجہ تھا کہ ہندوستان کی اسلامی تاریخ میں سب سے طویل عرصہ تک اس سلسلہ کو اپنا کام جاری رکھنے اور ہندوستان پر اثر انداز ہونے کا موقع ملا اور شاید اسی کا نتیجہ تھا کہ اس سلسلہ کو قبول عام اور بقائے دوام حاصل ہوا۔

حضرت شیخ نظام الدینؒ جب سے شیخ کبیر کے پاس سے ہندوستان کی تسخیر روحانی اور تبلیغ و ارشاد پر مامور ہو کر آئے تھے دہلی کے تخت پر یکے بعد دیگرے پانچ بادشاہ بیٹھے اور انھوں نے بڑے جاہ و جلال کیساتھ سلطنت کی، لیکن سوائے ایک موقع کے جبکہ دینی ضرورت در پیش تھی (سماع کی حلت و حرمت کی مجلسِ مناظرہ) وہ کبھی نہ دربار میں گئے اور نہ بادشاہِ وقت کو اپنے یہاں آنے کی اجازت دی۔ غیاث الدّین بلبن کے عہدِ سلطنت میں ان کا آفتاب شہرت و قبولیت نصف النہار پر نہیں پہنچا تھا، اس لئے غیاث الدّین کو ان کی طرف توجہ نہیں ہوئی، معز الدین کیقباد لہو و لعب اور سیر و شکار میں مشغول رہا۔

جلال الدّین خلجی پہلا بادشاہ تھا جو صاحب علم و حلم، جوہر شناس اور ارباب کمال کا قدردان تھا اور حضرت خواجہ کی شہرت بھی اپنے عروج پر پہنچ چکی تھی۔ جلال الدین نے کئی بار حاضری کی اجازت چاہی لیکن کبھی منظور نہیں ہوئی۔ آخر سلطان نے امیر خسروؒ کے ساتھ (جو سلطان کے مصحف بردار تھے) یہ منصوبہ بنایا کہ ایک مرتبہ بلا اطّلاع حضرت کی خدمت میں حاضر ہو جانا ہے۔ امیر خسروؒ نے مناسب جانا کہ اپنے مرشد کو اس کی اطلاع دے دی جائے، اس لئے کہ اگر میں نے اسکی اطلاع نہ دی تو شاید

میرے حق میں یہ اچھا نہ ہو، اگرچہ بادشاہ نے اس بارے میں امیر خسروؒ کو اپنا رازدار بنایا تھا لیکن اپنے مرشدؒ سے راز داری امیر خسرو کو مناسب نہ معلوم ہوئی ۔امیر نے حضرت خواجہؒ سے جا کر عرض کیا کہ کل بادشاہ آپ کی خدمت میں حاضر ہوگا ۔حضرت خواجہ نے یہ سنتے ہی اپنے مرشد کی قبر کی زیارت کی نیت سے اجودھن کا رخ فرمالیا اور روانہ ہوگئے، بادشاہ کو جب اسکی اطلاع ملی تو امیر خسروؒ پر ناراض ہوا کہ تم نے میرا راز فاش کردیا اور حضرت خواجہؒ کی قدمبوسی کی سعادت سے محروم کردیا۔ امیر خسروؒ نے کہا کہ بادشاہ کی رنجش سے جان جانے کا خوف تھا لیکن مرشدؒ کی رنجش سے سلب ایمان کا خوف تھا۔ بادشاہ حلیم و فرزانہ تھا اس نے اس جواب کو پسند کیا اور خاموش ہوگیا۔

سلطان علاء الدین کا امتحان اور عقیدت

سلطان علاء الدین خلجی جو ہندوستان قدیم کا سب سے باجبروت اور اقبال مند بادشاہ اور سکندر ثانی ہے اپنے چچا جلال الدین کے بعد تخت سلطنت پر بیٹھا۔ ابتدا میں اسکو حضرت خواجہ سے نہ کوئی خاص عقیدت تھی نہ تنفر تھا، بعض لوگوں نے سلطان کو حضرت خواجہ کی طرف سے بدگمان کرنے کی کوشش کی اور ان کی مقبولیت اور رجوع عام سے سلطنت کیلئے خطرات ثابت کئے۔ سلطان علاء الدین نے امتحاناً ایک عریضہ آپ کی خدمت میں اپنے بیٹے اور ولیعہد خضر خاں کے ہاتھ بھیجا جس میں آپ سے انتظام سلطنت کے بارے میں مشورے اور نصائح کی درخواست کی گئی تھی، جب خضر خاں یہ خط لیکر خواجہ کی خدمت میں آیا آپ نے وہ کاغذ ہاتھ میں لے لیا اور اس کا مضمون بھی نہیں پڑھا۔ حاضرین مجلس سے فرمایا کہ ہم دعا کرتے ہیں، اسکے بعد ارشاد ہوا کہ درویشوں کا بادشاہوں سے کیا کام، بس ایک فقیر آدمی ہوں، شہر کا ایک گوشہ اختیار کر رکھا ہے، بادشاہ اور مسلمانوں کیلئے دعاگوئی میں مشغول ہوں، اگر اس وجہ سے بادشاہ کو مجھ سے تعرض کرنا ہے میں یہاں سے بھی چلا جاتا ہوں، اللہ کی زمین وسیع ہے سلطان علاء الدین اس جواب سے بہت خوش ہوا، اور کہا کہ میں جانتا تھا کہ حضرت خواجہؒ کو امور سلطنت و سیاست

ل سیر الاولیار ص ۱۳۵

کوئی سروکار نہیں، لیکن بدخواہ چاہتے ہیں کہ مجھے مردان خدا سے لڑادیں اور اس طرح ملک تباہ ہو جائے۔[1]

بادشاہ کے آنے سے معذرت سلطان نے حضرت خواجہؒ سے بڑی معذرت کی اور کہلوایا کہ میں آں مخدوم کا معتقد ہوں۔ مجھ سے گستاخی ہوئی۔ معاف کیا جائے اور حاضری کی اجازت دیجائے کہ قدمبوسی کی سعادت حاصل کردں۔" حضرت خواجہؒ نے ارشاد فرمایا کہ: "آنے کی حاجت نہیں، میں غائبانہ دعا کرتا ہوں اور غائبانہ دعا بڑی موثر ہوتی ہے۔[2]

گھر کے دو دروازے سلطان نے اس کے بعد بھی ملاقات کیلئے بڑا اصرار کیا حضرت نے فرمایا کہ اس فقیر کے گھر میں دو دروازے ہیں، بادشاہ ایک دروازے سے آئے گا، میں دوسرے دروازے سے باہر چلا جاؤں گا۔[3]

غمِ اسلام اگرچہ علاء الدین حضرت خواجہؒ کی خدمت میں حاضر نہ ہو سکا، لیکن اس کو آپ سے برابر عقیدت رہی اور وہ مہماتِ سلطنت اور فکر و تردد کے موقع پر حضرت خواجہؒ سے رجوع کرتا رہا۔ ایسے موقع پر آپ سے دعا کی درخواست کرتا اور آپ اہتمام کے ساتھ دعا فرماتے۔

قاضی ضیاء الدین برنی لکھتے ہیں کہ: "جب ملک نائب (کافور) ورنگل کے محاصرے میں مشغول تھا، تلنگانہ کا راستہ پرخطر ہو گیا تھا، راستہ کے تھانے اور چوکیاں بھی اٹھ گئیں تھیں، چالیس روز سے زیادہ ہو گئے تھے کہ لشکر کی سلامتی اور خیریت کی اطلاع سلطان تک نہیں پہنچی تھی، سلطان کو بڑا تردد تھا۔ اکثر اعیان و امراءِ دربار کا خیال ہونے لگا تھا کہ لشکر کسی حادثہ یا فتنہ کی نذر ہو گیا کہ سلسلہ رسل و رسائل منقطع ہو گیا ہے۔ اسی فکر و تردد کے ایام میں ایک روز سلطان نے ملک قرابیگ اور قاضی مغیث الدین بیانوی کو حضرت خواجہؒ کی خدمت میں بھیجا اور کہلایا کہ لشکرِ اسلام کی خیریت نہ معلوم ہونے سے مجھے سخت تردد ہے

---

[1] سیر الاولیاء ص ۱۳۴ [2] ایضاً ص ۳۵ [3] ایضاً ص ۱۳۵

آپ کو اسلام کا غم اور فکر مجھ سے زیادہ ہی ہے اگر نورِ باطن سے آپ کو لشکر کا کوئی حال معلوم ہو تو مجھے مطمئن و مسرور فرمائیں، سلطان نے پیغام لے جانے والوں کو ہدایت کی کہ حضرتؒ کی زبان سے اس موقع پر جو کچھ نکلے اس کو محفوظ رکھیں، اس میں کوئی کمی بیشی نہ کریں۔ وہ دونوں حضرات شیخؒ کی خدمت میں حاضر ہوئے سلطان کا پیغام پہنچایا، آپ نے پیغام سننے کے بعد بادشاہ کی فتح و نصرت کا حال بیان کرنا شروع کیا اور فرمایا کہ "یہ فتح کیا ہے، ہم اور فتوحات کی بھی امید رکھتے ہیں" یہ سنکر ملک قرابیگ اور قاضی مغیث الدین شاداں و فرحاں واپس آئے اور سلطان کو جواب سُنایا، سلطان یہ جواب سنکر بہت خوش ہوا، اس کو یقین ہو گیا کہ ورنگل فتح ہو چکا ... اسی روز نماز عصر سے فارغ ہوئے تھے کہ ملک نائب کے قاصد پہنچے اور ورنگل کا فتح نامہ لائے، جمعہ کے دن وہ فتح نامہ منبروں پر سے پڑھکر سنایا گیا، صحن میں خوشی کا نقارہ بجا اور خوشیاں منائی گئیں، سلطان کا اعتقاد دوگنا بڑھ گیا۔[1]

ایک دوسری مرتبہ جب مغل دہلی پر حملہ آور ہوئے سلطان بنفس نفیس جنگ میں شریک تھا، اس نے حضرت خواجہؒ کی خدمت میں عرض کروایا کہ یہ بڑا اہم موقع ہے آپ متوجہ رہیں، حضرت خواجہ نے تمام اہل خانقاہ سے ارشاد فرمایا کہ: متوجہ الی اللہ رہیں اور خدا سے مسلمانوں کی فتح کی دعا کریں۔ چنانچہ سب مشغول رہے اور تھوڑے ہی عرصہ میں فتح کی خبر آئی، مغلوں نے شکستِ فاش کھائی۔[2]

قاضی ضیاء الدین سلطان علاء الدین کے اہل دربار میں سے تھے، کہتے ہیں کہ: اپنے پورے عہدِ حکومت میں کبھی سلطان کی زبان سے حضرت خواجہؒ کے بارے میں کوئی خلافِ شان بات نہیں نکلی۔ اگرچہ دشمن اور حاسدین شیخؒ کی شاہانہ داد و دہش، رجوعِ خلائق اور شاہی لنگر کو سلطان سے رنگ آمیزی اور ایسے طریقے پر بیان کرتے کہ سلطان بدگمان ہو جائے، لیکن سلطان نے کبھی اس کی طرف التفات نہیں کیا اور خاص طور پر اپنے آخر عہد میں اسکو حضرتؒ سے غایت درجہ کا اخلاص و اعتقاد پیدا ہو گیا تھا، اس سب کے باوجود کبھی ملاقات کی نوبت نہ آئی

---

[1] تاریخ فیروز شاہی ص۳۳۲ [2] سیر الاولیاء ص۱۶۰

سلطان قطب الدین کی مخالفت اور اُسکا قتل

سلطان علاءالدین کے بعد اس کا دوسرا بیٹا قطب الدین مبارک شاہ ولی عہد سلطنت خضر خاں کو محروم و کحول کر کے غاصبانہ تخت سلطنت پر بیٹھا۔

"خضر خاں چونکہ حضرت والا کا مرید تھا اور وہی علاءالدین کا ولی عہد تھا جس سے قطب الدین نے حکومت غصب کی تھی، اس لئے قطب الدین حضرتؒ سے بھی ناراض رہتا تھا، اس نے اپنی ایک نئی جامع مسجد "جامع میری" کے نام سے بنوائی تھی اور تمام مشائخ و علماء کو حکم تھا کہ اسی میں آ کر نماز جمعہ ادا کریں۔ سلطان المشائخ نے کہلا بھیجا کہ: "ما مسجد نزدیک داریم و آں احق است ہمیں جا خواہیم گزارد" (ہمارے قریب ایک مسجد ہے اس کا حق زیادہ ہے ہم وہیں نماز پڑھیں گے) اور وہ جامع میری نہیں گئے۔ بادشاہ سخت برافروختہ ہوا۔ اسی کے ساتھ ہر نوچندی کو اعیان اور مشاہیر شہر میں دربار شاہی میں پیش ہو کر نذر گزارتے تھے، سلطان المشائخ اس تقریب میں بھی شریک نہیں ہوتے تھے، ادائے رسم کیلئے اپنے خادم اقبال کو بھیج دیتے تھے اس سے بھی وہ برہم تھا، اس نے اپنے تمام امراء و وزراء کو حکم دیا کہ:—

"کسے بزیارت شیخ غیاث پور نہ رود"

(کوئی شیخ کی زیارت کے لئے غیاث پور نہ جائے)

امیر خسروؒ نے لکھا ہے کہ: "بارہا می گفت کہ ہر کہ سر شیخ بر دہزار تنکا او را دہم" (جو شیخ کا سر لائے گا اس کو ہزار تنکہ دوں گا) ایک روز شیخ ضیاءالدین رومی کی درگاہ میں سلطان جی اور قطب الدین کا آمنا سامنا بھی ہو گیا، سلطان جی نے بحیثیت ایک مسلمان ہونے کے سلام کیا، قطب الدین نے جواب نہ دیا۔ یوں

مسلسل واقعات قطب الدین کی حکومت کے چار سالہ مدت میں پیش آتے رہے۔[1]

نوحیندی کی حاضری پر اصرار کا قصہ سب سے آخر میں پیش آیا۔ قطب الدین نے بھرے دربار میں اعلان کیا کہ: "اگر در غرۂ ماہ آئندہ نیا مد بیاریم چنانکہ دانیم" گویا کہ یہ اسکی دھمکی تھی کہ بزور حکومت دربار میں گھسیٹوا کر بلواؤں گا۔ شاید قتل ہی کا ارادہ ہو۔ سلطان جی کو بادشاہ کے اس عزم مصمم کی خبر پہنچی۔ سلطان المشائخ ہیچ نگفت۔ اب مہینہ ایک ایک دن کر کے ختم ہوتا جا رہا تھا۔ "ہر چند ماہ نزدیک رسید التفات مخلصاں را روئے بتیتری داد" (مہینہ جتنا نزدیک آتا جاتا تھا اہل تعلق کا فکر و تردد بڑھتا جا رہا تھا) چاند مغرب کے بعد دیکھا گیا، کل پہلی تاریخ ہے، شہر کے اعیان و امرار دربار میں جائیں گے، لیکن سلطان المشائخ یہی طے کئے ہوئے ہیں کہ میں نہیں جاؤں گا۔ قطب الدین یہ فیصلہ کئے ہوئے ہے کہ:۔ "اگر نیا مد بیاریم چنانکہ دانیم"۔ "صرف شب درمیان است"۔ دلّی میں کھلبلی مچی ہوئی ہے، دُنیا اور دین کے دو بادشاہوں کا کل معرکہ ہے۔ رات گذرنے بھی نہ پائی کہ: "ہم دریں شب ماہ بلائے از آسمان بر جان بادشاہ نازل شد" (اسی شب ماہ میں بادشاہ کی جان پر آفت آسمانی نازل ہوئی) یعنی "خسرو خاں موئے سر سلطان را گرفت و باہم در آویختند پہلوئے سلطان را بہ خنجر شگافتہ بر زمین انداخت و سر آں مشوم را از تن جدا کردہ از بام ہزار ستون بزیر افگند" (طباطبائی) خسرو خاں نے بادشاہ کے سر کے بال پکڑے، دونوں باہم دست و گریبان ہوئے۔ خسرو خاں نے سلطان کے پہلو کو خنجر سے چیر کر زمین پر ڈال دیا اور اس شامت زدہ کا سر تن سے جدا

---

[1] نظام التعلیم صـ ۲۲

کر کے بامِ ہزار ستون سے نیچے زمین پر پھینک دیا۔[1]"

غیبی لنگر

اسی زمانہ میں جب سلطان قطب الدین کی طرف سے اس بات کی خاص روک تھام تھی کہ امراءِ دربار اور اعیانِ سلطنت کی طرف سے حضرت خواجہ کی خدمت میں کوئی نذر پیشکش نہ ہونے پائے، تاکہ دیکھا جائے کہ یہ شاہانہ لنگرخانہ کس طرح چلتا ہے، آپ نے خاص طور پر تاکید فرما رکھی تھی کہ اس زمانہ میں کھانا زیادہ پکایا جائے اور دسترخوان وسیع سے وسیع تر کر دیا جائے۔ حضرت شیخ نصیر الدین چراغ دہلیؒ نے فرمایا:-

"ایک بار سلطان قطب الدین کو کسی بدخواہ نے کہا کہ شیخ ہماری فتوحات قبول نہیں کرتے اور امراء و سرداروں کی لائی ہوئی فتوحات قبول کرتے ہیں، آخر وہ سب بھی تو آپ ہی کے یہاں سے لے جاتے ہیں۔ سلطان قطب الدین نے یہ بات سچ جان کر حکم کیا کہ:- کوئی امیر یا

---

[1] نظام تعلیم و تربیت صفحہ ۳۳ سیر الاولیاء میں یہ واقعہ منقول ہے۔ مگر تاریخ و ماہ و سنہ درج نہیں صفحہ ۱۵ وصفحہ ۱۵۱ تاریخ فرشتہ جلد اول میں بضمن تذکرۂ سلطان قطب الدین، سلطان کے قتل کی تاریخ شب پنجم ربیع الاول ۷۲۱ھ مذکور ہے جس کے ساتھ نوجیندی کے سلام کی روایت اور چاندرات میں بادشاہ کے قتل کا واقعہ میل نہیں کھاتا (صفحہ ۲۲۳)۔ پھر اسی کتاب کی جلد دوم میں جہاں حضرت سلطان المشائخ کا تذکرہ ہے وہاں سلطان کے قتل کی تاریخ ۲۹ رشوال لکھی ہے اور سنہ کا تذکرہ نہیں (صفحہ ۴۰۰ وصفحہ ۴۱۷ جلد ۲) لیکن اس سلسلہ میں سب سے قدیم تر اور قابلِ اعتماد ماخذ امیر خسروؒ کی مثنوی "تغلق نامہ" ہے، جو سلطان غیاث الدین تغلق کے عہد کی تصنیف اور امیرؒ کی مستند اور مشہور مثنوی ہے۔ اس میں انھوں نے نہایت صراحت سے لکھا ہے کہ:- قطب الدین کا قتل جمادی الثانی ۷۲۰ھ کی عین چاندرات کو واقع ہوا۔ وہ فرماتے ہیں ؎

چوں تاریخ عرب شد ہفتصد و بیست ۔۔۔ ثباتِ قطب شد کم جانب زیست
جمادِ دومیں را شد پدیدار ۔۔۔ ہلالِ تیرہ و تاریک دیدار
مہ باریک بود از حالت تلخ ۔۔۔ بناخن کردہ خود را پیش از اں سلخ
شد آں مہ بہ ہمہ گیہاں مبارک ۔۔۔ نگو بر طالعِ سلطاں مبارک

(تغلق نامہ صفحہ ۱۹ طبع حیدرآباد)

ان اشعار سے تاریخ کا بھی صحیح تعین ہو گیا اور واقعہ کی نوعیت و اہمیت کی بھی تصدیق ہو گئی۔ ۱۲

سردار شیخ کے یہاں نہ جاوے، دیکھو وہ اس قدر دعوت لوگوں کی کہاں سے کرتے ہیں اور جاسوس مقرر کئے کہ دیکھتے رہیں جو امیر وہاں جاوے مجھے آکر اطلاع کریں۔ جناب شیخ نے سنا فرمایا:۔ کھانا آج سے زیادہ پکایا جاوے۔ ایک مدت بعد سلطان نے لوگوں سے دریافت کیا کہ خانقاہ شیخ کا کیا حال ہے؟ انھوں نے عرض کی کہ سابق جسقدر پکتا تھا اب اس سے دوگنا پکتا ہے بادشاہ یہ سنکر پشیمان ہوا کہا میں غلطی پر تھا، آپ کا معاملہ عالم غیب سے ہے[1]۔

غیاث الدین تغلق کا عہد اور سرکاری مجلس مناظرہ

قطب الدین مبارک شاہ کے بعد چند مہینے خسرو خاں نے غاصبانہ سلطنت کی اور شعائر اسلام کو سرنگوں کر کے اسلام کی تذلیل کی۔ ۷۲۱ھ میں غیاث الدین تغلق (الملک غازی) نے خسرو خاں کو قتل کر کے تغلق خاندان کی سلطنت کی بنیاد ڈالی۔ سلطان غیاث الدین اگرچہ صاحب علم نہ تھا لیکن شریعت اور علماء کا احترام کیا کرتا تھا۔ حضرت خواجہ سماع سنتے تھے انکی وجہ سے دہلی میں اس کا عام ذوق اور رواج ہو گیا تھا۔ ایک شخص شیخ زادہ حسام الدین فرجام نامی جو ایک عرصہ تک حضرت خواجہ کے سایۂ عاطفت میں رہا تھا اور باوجود مجاہدوں کے ذوق و شوق اور عشق کی دولت سے فیضیاب نہیں ہو سکا تھا نیز قاضی جلال الدین الولوالجی نائب حاکم مملکت کو بھی اہل درد و محبت سے ایک طرح کی کد تھی۔ قاضی صاحب اور دوسرے علماء نے شیخ زادہ حسام کو آمادہ کیا اور اس نے بادشاہ کو متوجہ کیا کہ خواجہ نظام الدین مقتدائے زمانہ ہیں اور وہ سماع سنتے ہیں جو امام اعظمؒ کے مذہب میں حرام ہے اور ان کی وجہ سے ہزارہا مخلوق اس فعل ممنوع کا ارتکاب کرتی ہے، سلطان اس مسئلہ سے بے خبر تھا[2] اسکو تعجب ہوا کہ ایسے بزرگ جو مقتدائے عالم ہیں

---

[1] خیر المجالس ماخوذ از ترجمہ صـ۲۰۳ [2] سماع کی حقیقت، اغراض و مقاصد اور اسکے آداب و احکام کی بحث چوتھے باب "اذواق و کیفیات میں ملاحظہ ہو۔ ۱۲

ایسا نامشروع کام کیسے کرتے ہیں۔ لوگوں نے سماع کی حلت کے فتوے اور کتب شرعیہ کی روایات بادشاہ کے سامنے پیش کیں، بادشاہ نے کہا کہ چونکہ علمائے دین نے سماع کی حرمت کا فتویٰ دیا ہے اور وہ اسکو منع کرتے ہیں اسلئے حضرت خواجہ اور تمام علمائے شہر اور صدور و اکابر کو طلب کیا جائے اور ایک مجلس منعقد کی جائے تاکہ یہ تحقیق ہو جائے کہ حق کیا ہے۔ میر خورد کی زبان سے اسکی تفصیل سنئے:۔

"قصر شاہی میں حضرت خواجہؒ کی طلبی ہوئی۔ حضرت خواجہؒ قاضی محی الدین کاشانی اور مولانا فخر الدین زرادی کی معیت میں کہ دونوں سر آمد علماء اور اساتذۂ وقت تھے محل میں تشریف لے گئے۔ پہلے قاضی جلال الدین نائب حاکم نے حضرت خواجہؒ کو وعظ و نصیحت شروع کی اور نامناسب طریقے پر آپ سے خطاب کیا، یہاں تک کہا کہ اگر اسکے بعد آپنے سماع کی حلت کا دعویٰ کیا اور سماع سنا تو میں حاکم شرع ہوں، میں آپ کو سزا دوں گا۔ یہ سنکر حضرت خواجہؒ کو جلال آگیا اور فرمایا کہ:۔ جس منصب کے بھروسہ پر تم یہ بات کہہ رہے ہو اس سے معزول ہو جاؤ گے۔ چنانچہ ٹھیک بارہ روز بعد قاضی اپنے منصب سے معزول ہو کر دہلی سے روانہ ہو گئے۔ خلاصہ یہ کہ اس مجلس مباحثہ میں تمام علماء و اکابر صدور و امراء اور ارکانِ سلطنت حاضر تھے بادشاہ اور سب حاضرینِ مجلس کی توجہ حضرت خواجہ کی طرف تھی اور سب آپ کی تعظیم کرتے تھے۔ شیخ زادہ حسام نے کہا کہ آپ کی مجلس میں سماع ہوتا ہے، لوگ رقص کرتے ہیں، آہ و نعرہ لگاتے ہیں، اسی طرح اور بہت سی باتیں کہیں، حضرت خواجہ نے شیخ زادہ کی طرف دیکھا اور فرمایا، شور مت کرو، زیادہ بولنے کی ضرورت نہیں پہلے یہ بتلاؤ سماع کی تعریف کیا ہے؟ شیخ زادہ حسام نے کہا کہ میں نہیں جانتا، البتہ اتنا جانتا ہوں کہ علماء سماع کو حرام کہتے ہیں۔ حضرت خواجہؒ نے فرمایا کہ: جب

تم کو سماع کے معنی ہی نہیں معلوم تو مجھے تم سے کچھ کہنا نہیں ہے اور نہ کہنا چاہیئے
شیخ زادہ حسام شرمندہ ہوا، بادشاہ پوری توجہ سے آپ کی تقریر سن رہا تھا، جب
کوئی زور سے بات کرتا تو کہتا کہ شور مت کرو، سنو کہ شیخ کیا فرماتے ہیں۔
حاضر الوقت علماء میں مولانا حمیدالدین اور مولانا شہاب الدین ملتانی خاموش تھے
مولانا حمیدالدین نے اتنا فرمایا کہ یہ مدعی حضرت خواجہ کی مجلس کا جو حال بیان
کرتے ہیں یہ واقعہ کے خلاف ہے۔ میں نے خود دیکھا ہے اور بہت سے مشائخ اور
درویشوں کو بھی میں نے دیکھا ہے۔ اسی دوران میں شیخ الاسلام شیخ
بہاءالدین زکریا ملتانیؒ کے نواسے مولانا علم الدین آ گئے۔ بادشاہ نے ان سے کہا
کہ آپ بھی عالم ہیں اور سیاح بھی، اس وقت سماع کی بحث درپیش ہے، میں
آپ سے پوچھتا ہوں کہ سماع سننا حرام ہے یا حلال؟ مولانا علم الدین نے کہا کہ
میں نے اس باب میں ایک رسالہ تصنیف کیا ہے، اس میں اس کی حرمت و حلت
کے دلائل نقل کئے ہیں۔ تحقیق یہ ہے کہ جو دل سے سنتے ہیں ان کے لئے حلال ہے
اور جو نفس سے سنتے ہیں ان کے لئے حرام۔ اس کے بعد بادشاہ نے مولانا علم الدین
سے پوچھا کہ آپ بغداد و شام و روم ہر جگہ پھر چکے ہیں، وہاں کے مشائخ سماع سنتے
ہیں یا نہیں، اور وہاں کوئی منع کرتا ہے؟ مولانا علم الدین نے فرمایا کہ:- ان سب
شہروں میں بزرگ و مشائخ سماع سنتے ہیں اور بعض دف و شبانہ کے ساتھ بھی،
کوئی مانع نہیں ہوتا اور سماع مشائخ کے درمیان حضرت جنیدؒ و شبلیؒ کے وقت
سے مروّج چلا آ رہا ہے، بادشاہ مولانا علم الدین کی زبان سے یہ سن کر خاموش
ہو گیا اور اس نے کچھ نہیں کہا۔ مولانا جلال الدین نے عرض کیا کہ بادشاہ

سماع کی حرمت کا فرمان صادر کریں اور امام اعظمؒ کے مذہب کی پاسداری فرمائیں۔ اس پر حضرت خواجہؒ نے بادشاہ سے کہا کہ میں چاہتا ہوں کہ آپ اس بارے میں کوئی فرمان جاری نہ کریں، بادشاہ نے آپ کا یہ مشورہ قبول کیا اور اس بارے میں کوئی فیصلہ صادر نہیں کیا۔ مولانا فخرالدین (جو مجلس میں حاضر تھے) کا بیان ہے کہ ابتدائے چاشت سے زوال تک یہ بحث جاری رہی، اہلِ مجلس تحریم کی کوئی دلیل نہیں دے سکے اور آخر میں اس پر بحث آکر ختم ہوگئی کہ اس کا ترک اولیٰ ہے یا اس کا فعل۔ دوسری روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ بادشاہ نے فیصلہ کیا کہ حضرت خواجہؒ سماع سن سکتے ہیں اور کسی کو ان کے منع کرنے کی اجازت نہیں، لیکن یہ روایت مرجوح ہے ـــ انھیں دنوں میں کسی نے حضرت خواجہؒ سے کہا کہ اب تو سماع کے لئے فرمانِ سلطانی ہوگیا ہے کہ آپ جس وقت چاہیں سماع سنیں وہ حلال ہے۔ حضرت خواجہؒ نے فرمایا کہ اگر وہ حرام ہے تو کسی کے کہنے سے حلال نہیں ہوسکتا اور اگر حلال ہے تو کسی کے کہنے سے حرام نہیں ہوسکتا۔ مجلس کے اختتام پر بادشاہ نے خواجہ کو بڑی تعظیم وتکریم کے ساتھ رخصت کیا۔"[۱]

مجلس مناظرہ کا حال حضرت خواجہ کی زبان سے

قاضی ضیاءالدین برنی اپنی کتاب "حسرت نامہ" میں لکھتے ہیں کہ:۔ جب حضرت خواجہ اس مجلس سے فارغ ہوکر مکان پر تشریف لائے تو آپ نے نمازِ ظہر کے وقت مولانا محی الدین کاشانی

---

[۱] سیر الاولیاء باختصار صـ۵۲۷ تا صـ۵۳۲

اور امیر خسرو کو طلب فرمایا، ارشاد ہوا کہ دہلی کے علماء عداوت و حسد سے بھرے ہوئے تھے، انھوں نے وسیع میدان پایا، اور دشمنی کی بہت سی باتیں کیں، عجائب بات یہ دیکھی کہ صحیح احادیث نبویہ کا سننا ان کو گوارا نہیں، ان کے جواب میں یہی کہتے تھے کہ ہمارے شہر میں فقہ پر عمل حدیث پر مقدم ہے، یہ باتیں وہی کہہ سکتے ہیں جن کا احادیث نبویہ پر اعتقاد نہ ہو، میں جب کوئی حدیث صحیح پڑھتا تو وہ ناراض ہوتے اور کہتے تھے کہ اس حدیث سے امام شافعی استدلال کرتے ہیں اور وہ ہمارے علماء کے دشمن ہیں، ہم نہیں سنیں گے، معلوم نہیں کہ یہ با اعتقاد ہیں یا نہیں، اولوالامر کے سامنے ایسی زبردستی سے کام لیتے تھے، اور احادیث صحیح کو روکتے تھے، میں نے کوئی عالم ایسا دیکھا نہ سنا کہ اسکے سامنے احادیث صحیحہ پڑھی جائیں اور وہ کہے کہ میں نہیں سنتا، میں نہیں سمجھتا کہ یہ کیا قصہ ہے اور وہ شہر جہاں ایسی جرأت اور زبردستی کی جاتی ہے وہ کیسے آباد رہ سکتا ہے، تعجب نہیں کہ اگر اس کی اینٹ سے اینٹ بج جائے اس کے بعد بادشاہ اور امراء اور عوام جب قاضی شہر اور علماء شہر سے یہ سنیں گے کہ اس شہر میں حدیث پر عمل نہیں ہوتا تو ان کا حدیث نبوی پر اعتقاد کیسے رہیگا۔ مجھے ڈر ہے کہ علماء شہر کی اس بدعقیدگی کی نحوست سے آسمان سے بلاد جلاء و قحط و وبا نہ برسے[1]

دہلی کی تباہی اس واقعہ کے ٹھیک چھٹے سال حضرت خواجہ کی وفات کے بعد سلطان غیاث الدین تغلق کے فرزند اور جانشین محمد تغلق نے دلی کو بالکل خالی کر دینے اور دیوگیر (دولت آباد) منتقل ہو جانے کا فرمان جاری کیا اور اس میں ایسی ضد اور عجلت سے کام لیا کہ حقیقتاً شہر کی اینٹ سے اینٹ بج گئی اور دلی سا گلزار و آباد شہر جس میں پہلے رہنے کو جگہ نہیں ملتی تھی ایسا خالی ہوا کہ سوائے جنگلی جانوروں اور درندوں کے وہاں کسی متنفس کی شکل نظر نہیں آتی تھی۔

محمد قاسم تاریخ فرشتہ میں لکھتا ہے :۔

---

[1] سیر الاولیاء ص۵۲۷، ص۵۳۲

احدے از مردم دہلی را کہ آب و ہوائے	کارپردازن حکومت نے کسی ایک شخص کو
آں جا خوگرفتہ بودند، بحال خود	بھی جو دہلی کی آب و ہوا کا خوگر تھا اپنی
نگذاشتہ طراً بدولت آباد فرستاد	جگہ نہیں چھوڑا، سب کو کابتہً دولت آباد
و دہلی بنوعے ویراں گشت کہ آواز	(دیوگیر) بھیج دیا اور دہلی اس طرح ویران
ہیچ تنفس بجز شغال و روباہ جانوران	ہوئی کہ کسی ایک جاندار کی آواز بھی سوائے گیدڑ
صحرائی بگوش نمی رسید[1]	لومڑی اور جنگلی جانوروں کے کان میں نہیں آتی تھی

وہ تمام علماء جو اس مجلس میں موجود تھے اور دوسرے بھی ان کی بدولت دولت آباد جلاوطن ہوئے، دولت آباد پہنچے تو وہاں سخت قحط اور وبا کا سامنا کرنا پڑا، ہزاروں راستہ میں لقمۂ اجل بن گئے اور ہزاروں وہاں پہنچ کر قحط اور بیماریوں کا شکار ہوئے اور حضرت خواجہؒ کی پیشین گوئی حرف بحرف پوری ہوئی۔

نظام الاوقات

امیر خورد نے حضرت خواجہ کا نظام الاوقات اس طرح لکھا ہے:-

"روزہ افطار کرنے کے بعد (جو اہل جماعت کے ساتھ ہوتا تھا) اپنے بالاخانہ کے قیام گاہ پر تشریف لے جاتے تھے۔ احباب و خدام جو شہر اور اطراف سے آئے ہوتے تھے مغرب و عشاء کے درمیان اوپر ہی بلا لئے جاتے تھے۔ ایک گھڑی وہاں ہم نشینی اور ملاقات کا شرف حاصل ہوتا، ہر قسم کے تر و خشک میوے اور کھانے پینے کی لطیف و لذیذ چیزیں حاضر کی جاتی تھیں، حاضرین مجلس تناول کرتے، آپ ہر ایک کی دلداری فرماتے اور خیریت و حالات دریافت فرماتے[2]"

امیر خسرو کی خصوصیت

عشاء کی نماز پڑھنے کے لئے پھر نیچے تشریف لاتے، جماعت کے ساتھ نماز پڑھ کر پھر بالاخانہ پر تشریف لیجاتے، کچھ دیر مشغول

---

[1] تاریخ فرشتہ (جلد اوّل) ص ۲۴۳ [2] سیر الاولیاء ص ۱۲۵

رہتے پھر آرام کرنے کے لئے چارپائی پر تشریف لیجاتے، اس وقت خدام تسبیح لاکر آپ کے ہاتھ میں دیتے، اس وقت سوائے امیر خسروؒ کے کسی کو آنے کی ہمت نہ ہوتی تھی،[۱] وہ سامنے بیٹھ کر ہر طرح کے قصّے اور باتیں کرتے، آپ پسندیدگی میں سر مبارک کو حرکت دیتے، وقتاً فوقتاً ارشاد ہوتا کہ ترک کیا خبر ہے؟ امیر خسروؒ اتنی بات سنکر طویل گفتگو کا موقع نکال لیتے، اگر آپ ایک نکتہ پوچھتے تو وہ ساری داستان سناتے،[۲] اس موقع پر بعض کم سن اعزہ اور بعض پروردہ جو صاحب خانہ تھے حاضر ہوتے اور قدمبوسی کرتے۔ ؎

نخفت خسروِ مسکیں ازیں ہوس شبہا
کہ دیدہ بر کفِ پایت نہد بخواب شود

شب کی تیاری

جب امیر خسروؒ اور صاحبزادگان اجازت لیکر رخصت ہوتے تو اقبال خادم آتے اور پانی کے بھرے ہوئے چند آفتابے آپ کے وضو کیلئے رکھ کر باہر چلے جاتے، اس کے بعد حضرت خواجہ خود اٹھتے اور دروازہ کو زنجیر لگاتے، پھر وہاں کی خبر اللہ کے سوا کسی کو نہیں، خدا ہی جانتا ہے کہ تمام رات کیا راز و نیاز ہوتے اور اپنے مالک سے کیا ذوق و شوق کی

---

[۱] امیر خسروؒ کو حضرت خواجہؒ سے جو والہانہ و عاشقانہ تعلق تھا وہ ان کے سوانح اور دیوان سے معلوم ہوتا ہے، بلبل کو گل سے اور پروانہ کو شمع سے جو تعلق ہوتا ہے، اسی طرح کا تعلق امیر خسروؒ کو اپنے مرشد سے تھا، حضرت خواجہ کو بھی اس عاشق صادق سے ایسا تعلق تھا کہ فرماتے تھے کہ: "من از ہمہ تنگ آیم و از تو تنگ نیایم"، مجھے بعض اوقات ہر ایک سے وحشت ہونے لگتی ہے لیکن اس حالت میں بھی تم سے نہیں ہوتی مزید براں ایک بار فرمایا: "از ہمہ کس تنگ آیم تا حدے کہ از خود تنگ آیم و از تو تنگ نیایم" بعض اوقات اپنے سے بھی اکتانے لگتا ہوں مگر تم سے نہیں اکتاتا (سیر الاولیاء ص ۳۰۲) ایک بار ارشاد فرمایا کہ ایک شخص نے مجھ سے کہا کہ آپ امیر خسروؒ کو جس نظر سے دیکھتے ہیں ایک بار وہ نظر مجھ پر ڈال دیجئے، میں نے اس کو تو کوئی جواب نہیں دیا لیکن میرے دل میں آیا کہ اس سے کہوں کہ وہ قابلیت تو لاؤ (ص ۳۰۲) ۱۲

[۲] من از شوق حضوری طول دادم داستانے را　　بحرفے می تواں گفتن تمنائے جہانے را

باتیں ہوتیں۔ حضرت خواجہؒ کے ہاتھ کے لکھے ہوئے یہ دو شعر دیکھے ہیں جو بالکل حسبِ حال ہیں۔ ؎

تنہا منم و شب و چراغی   مونس شدہ تا پگاہ روزم
کاہش ز آہ سـرد بکشتم   گاہ از تف سینہ بر فروزم

کبھی کبھی یہ شعر بھی آپ کی زبانِ مبارک سے سنا گیا ہے اور حکایتِ حال ہے۔ ؎

بارے بہ تماشائے من و شمع بیا
کز من دمکے نماند و از وے دودے

سحری سحر کا وقت ہوتا تو خادم آتا اور باہر سے دروازہ پر دستک دیتا، حضرت خواجہ دروازہ کھول دیتے سحری جس میں ہر قسم کی چیزیں ہوتیں سامنے رکھتا، آپ اس میں سے بہت کم تناول فرماتے، باقی کیلئے ارشاد ہوتا کہ بچوں کے لئے حفاظت سے رکھ لو۔ خواجہ عبدالرحیم جن کے ذمہ سحر کا لے جانا تھا بیان کرتے ہیں کہ اکثر ہوتا کہ حضرت خواجہ سحری میں سے کچھ نہ کھاتے، میں عرض کرتا کہ حضرت نے الا افطار کے وقت بھی بہت کم کھاتے ہیں اگر سحری بھی کچھ نہ کریں گے تو ضعف بہت بڑھ جائیگا، اس پر گریہ فرماتے اور کہتے کہ کتنے غریب اور بیکس مسجدوں کے کونوں اور چبوتروں پر بھوکے پڑے ہوئے ہیں اور فاقہ سے رات گذار دیتے ہیں، یہ کھانا میرے حلق سے کیسے اتر سکتا ہے چنانچہ اکثر ایسا ہوتا کہ سحری میں جیسی لاتا ویسی ہی اٹھا کر لے جاتا۔

صبح کے وقت جب دن ہوتا جس کی جمال مبارک پر نظر پڑتی دیکھتا کہ کھلی ہوئی مستی ہے اور آنکھیں بیداری سے سرخ ہیں، ایسے شدید مجاہدوں سے بھی آپ کے اندر کوئی ضعف نظر نہ آتا اور آپ کی کسی ہیئت میں جو آپ کی معمول تھی تغیر نہ ہوتا۔ کوئی کہہ نہیں سکتا تھا کہ آپ چار سو یا پانچ سو رکعت نماز پڑھتے ہیں یا اتنی تسبیح کا معمول ہے۔ عمر عزیز ان باطنی مشغولیتوں میں گذرتی جن کا حال اللہ کے سوا کسی کو معلوم نہیں اور دلجوئی اور قلوب کے تفقد و دریافت میں مشغول رہتے، جس سے افضل کوئی کام نہیں۔ ع

"دل بدست آور کہ حج اکبر است"

دن میں دن میں تمام روز اپنے مشائخ کے سجادہ پر قبلہ رو باطنی طور پر مشغول، مُتَوَجِّهًا اِلَی اللہ تعالیٰ کَاَنَّہٗ یَنْظُرُ اِلَیْہِ (اللہ کی طرف متوجہ ہوکر گویا وہ روبرو ہے) بیٹھ کر گذار دیتے۔ آنے والوں میں مختلف طبقوں کے لوگ ہوتے، علماء و مشائخ، صدور و اکابر، وضیع و شریف ہر ایک کے علم و مرتبہ کے مطابق جس کا جو فن ہوتا اسی میں اس سے گفتگو کرتے اور اس کی دلجوئی فرماتے ظاہری طور پر ان میں مشغول ہوتے اور باطن میں پورے طور پر مشغول بحق ہوتے[۱]

دلداری و تربیت نماز ظہر کا وقت ہوتا، نماز ادا کرنے کے بعد جو عزیز قدمبوسی کے لئے آئے ہوئے ہوتے ان کو طلب فرمایا جاتا اور ان سے گفتگو و دلداری میں کچھ وقت گذرتا عبادات و سلوک و محبت الٰہی کے بارے میں ان کی رہنمائی کی جاتی، اکابر علماء و صلحاء کی (جو اس مجلس میں حاضر ہوتے) ہمت نہ ہوتی کہ سر اٹھا کر چہرۂ مبارک کو دیکھتے، ایسا رعب اور من جانب اللہ عظمت تھی کہ آپ کے چہرے پر نظر کرنا مشکل تھا۔

قربِ سفر عمر مبارک جب اسّی سے متجاوز ہوئی تو سفر آخرت کے آثار نمایاں ہوئے ایک روز ارشاد فرمایا کہ:۔ میں نے خواب میں حضرت سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت کی۔ ارشاد ہوا:۔ نظام ہم کو تمھارا بڑا اشتیاق ہے[۲]۔

خلفائے کبار کو اجازت نامے اور ان کی محبت و مواخات بیماری کے دوران میں آپ نے متعدد حضرات کو خلافت عطا فرمائی اور اجازت نامے لکھ کر دیئے۔ مولانا فخر الدین زرادی نے

---

[۱] سیر الاولیاء صـ۱۲۵ و صـ۱۲۹ [۲] ایضاً صـ۱۴۱

ان کا مضمون مرتب کیا، اور سید حسین کرمانی نے ان کی کتابت کی، آپ نے ان پر اپنے دستخط مبارک ثبت کیے، دستخط کے الفاظ یہ تھے :۔ "من الفقیر محمد بن احمد بن علی البداؤنی البخاری" ان اجازت ناموں پر ۲۰ ذی الحجہ ۷۲۴ھ درج ہے، گویا یہ وفات سے تین مہینے ۲۷ دن پہلے لکھے گئے ہیں۔[1]

جن حضرات کیلئے یہ اجازت نامے تھے ان کو جہاں جہاں وہ تھے پہنچادیئے گئے، جو حضرات موجود تھے ان کو بلا کر خود عطا کیے گئے۔ پہلے شیخ قطب الدین منور کی طلبی ہوئی، سلطان المشائخ نے خلعت خلافت عطا فرمایا اور وصیت فرمائی، اجازت نامہ ان کو مرحمت ہوا اور ارشاد ہوا کہ جاؤ دوگانہ ادا کرو۔ دوستوں نے مبارکباد دی، اسی دوران میں شیخ نصیر الدین محمود (چراغ دہلی) کو یاد فرمایا گیا، ان کو بھی خرقۂ خلافت اور اجازت نامہ عطا ہوا اور وصیت فرمائی گئی۔ شیخ نصیر الدین محمود ابھی کھڑے ہوئے تھے کہ شیخ قطب الدین منور کی دوبارہ طلبی ہوئی، وہ آئے تو ارشاد ہوا کہ شیخ نصیر الدین محمود کو خلافت کی مبارکباد دو، پھر شیخ نصیر الدین سے ارشاد ہوا کہ شیخ منور کو مبارکباد دو، دونوں نے ایک دوسرے کو مبارکباد دی، پھر دونوں کو ایک دوسرے سے بغلگیر ہونے کا حکم ہوا، پھر فرمایا کہ تم دونوں بھائی بھائی ہو، تقدیم و تاخیر کا کچھ خیال نہ کرنا۔[2]

وفات کا حال

وفات سے ۴۰ روز پیشتر استغراق و تحیر کی کیفیت پیدا ہوگئی۔ امیر خورد نے تفصیل سے وفات کا حال لکھا ہے، ان کا بیان ہے :۔

"جمعہ کا دن تھا، سلطان المشائخ پر ایک کیفیت تھی، نور تجلّی سے ان کا باطن منور معلوم ہو رہا تھا، نماز کے اندر بار بار سجدے فرماتے تھے۔ اسی حالت تحیر میں مکان تشریف لائے، گریہ میں ترقی ہوگئی۔

---

[1] حضرت خواجہؒ کی وفات ۱۸ ربیع الآخر ۷۲۵ھ کو ہوئی

[2] سیر الاولیاء صفحہ ۲۳ و صفحہ ۲۲۱ و صفحہ ۲۲۲ و صفحہ ۲۴۸ و صفحہ ۲۴۹

روزانہ کئی کئی بار غیبوبت و استغراق ہوجاتا تھا، پھر توجہ ہوجاتی تھی، یہی فرماتے تھے کہ آج جمعہ کا دن ہے، دوست کو دوست کا وعدہ یاد آتا ہے اور وہ اس کیفیت میں غرق ہوجاتا ہے۔ اس حالت میں دریافت فرماتے کہ نماز کا وقت ہوگیا ہے اور میں نماز پڑھ چکا ہوں؟ اگر جواب دیا جاتا کہ آپ نماز پڑھ چکے ہیں تو فرماتے کہ پھر پڑھ لیں، ہر نماز کو مکرر ادا کرتے جتنے دن اس عالم میں رہے یہ دو باتیں مکرر فرماتے:۔ آج جمعہ کا دن ہے؟ ہم نماز پڑھ چکے ہیں؟ اور کبھی یہ مصرع پڑھتے۔

ع "می رویم و می رویم و می رویم"

اسی دوران میں ایک روز تمام خدام و مریدین کو جو حاضر تھے طلب فرمایا اور ان کی طرف متوجہ ہوکر فرمایا کہ:۔
"تم گواہ رہنا کہ اگر اقبال (خادم) نے کوئی چیز بھی گھر میں جنس میں سے بچالی ہے تو کل روز قیامت اسکو خدا کے سامنے جواب دینا ہوگا" اقبال (خادم) نے عرض کیا کہ میں نے کچھ نہیں چھوڑا ہے، سب آپ پر صدقہ کردیا ہے۔ واقعی اس جوانمرد نے ایسا ہی کیا تھا، سوائے اس غلہ کے جو چند دن کے لئے فقرائے خانقاہ کو کفایت کرتا سب کچھ تقسیم کردیا تھا میرے چچا سید حسین نے اطلاع دی کہ غلہ کے سوا ہر چیز محتاجوں کو پہنچ گئی، سلطان المشائخ اقبال سے ناراض ہوئے انکو طلب کیا اور فرمایا کہ اس مردار ریت کو کیوں رکھ چھوڑا ہے؟ اقبال نے عرض کیا کہ غلہ کے سوا جو کچھ موجود تھا سب کچھ تقسیم ہوگیا۔ آپنے فرمایا کہ خلقت کو بلاؤ۔ جب لوگ حاضر ہوئے تو فرمایا کہ غلہ کے انبار خانے توڑ ڈالو اور تمام غلہ بے تکلف اٹھالے جاؤ اور وہاں جھاڑو دے دو۔ ذرا سی دیر میں خلقت جمع ہوگئی اور اسنے غلہ کو لوٹ لیا۔

اس بیماری میں کچھ احباب اور خدمتگار حاضر ہوئے اور انھوں نے پوچھا کہ:۔ آں مخدوم کے بعد ہم مسکینوں کا کیا حال ہوگا؟ فرمایا کہ: یہاں اتنا ملتا رہے گا جس سے تمہارا گذر ہوجائے۔ میں نے بعض معتبر مشائخ سے سنا ہے کہ لوگوں نے عرض کیا کہ ہمارے درمیان کون نصیب ور ہوگا؟[1] فرمایا: جس کی قسمت یاوری کرےگی۔ بعض دوستوں اور خادموں نے میرے نانا شمس الدین دامغانی سے عرض کیا کہ وہ سلطان المشائخ سے پوچھیں کہ ہر شخص نے اپنے

---

[1] غالبًا جانشینی وخلافت کے متعلق سوال تھا ۔۱۲

اعتقاد کے مطابق آپ کے احاطہ میں بلند بلند عمارتیں بنالی ہیں اور سب کی نیت یہ ہے کہ آپ اُس کی عمارت میں آرام فرمائیں، اگر وہ ناگزیر وقت آگیا تو آپ کو کس عمارت میں دفن کریں تاکہ کوئی خود رائی سے کام نہ کرے۔ مولانا شمس الدین نے یہ پیغام پہنچایا تو ارشاد ہوا کہ:۔ میں کسی عمارت کے نیچے دفن ہونا نہیں چاہتا، میں جنگل میں آسودہ خاک ہوں گا۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا کہ آپ کو باہر میدان میں دفن کیا گیا، بعد میں سلطان محمد تغلق نے اس پر گنبد تعمیر کرایا۔

وفات سے ۴۰ روز پہلے سے غذا بالکل ترک فرمادی تھی، کھانے کی خوشبو بھی گوارا نہ تھی، گریہ اس شدت سے غالب تھا کہ ایک گھڑی کیلئے بھی آنسو نہیں تھمتے تھے۔ ؎

گر نہ بینی گریۂ زارم ندانی فرق کرد
کاب چشم است اینکہ بیشت می رود یا آب جو

اسی درمیان میں اخی مبارک ایک روز مچھلی کا شوربہ لائے۔ مخلصین نے بڑی کوشش کی کہ آپ تھوڑا سا تناول فرمالیں۔ سلطان المشائخؒ نے پوچھا کہ:۔ یہ کیا ہے؟ عرض کیا گیا کہ:۔ تھوڑا سا مچھلی کا شوربہ ہے۔ فرمایا:۔ بہتے ہوئے پانی میں ڈال دو۔" آپ نے کچھ تناول نہیں فرمایا۔ میرے چچا سید حسین نے عرض کیا کہ کئی دن ہو گئے ہیں کہ آں مخدوم نے کھانا .... بالکل چھوڑ دیا ہے اس کا کیا نتیجہ ہوگا؟ فرمایا:۔ سید جو حضرت رسالتمآب صلی اللہ علیہ وسلم کی ملاقات کا مشتاق ہو اس سے دنیا میں کھانا کیسے کھایا جائے!۔ الغرض ۴۰ روز کی مدت میں جس طرح کھانا تناول نہیں فرمایا۔ اسی طرح بات بھی بہت کم کی۔ آخر چہار شنبہ کے دن تک جس دن آپ کی وفات ہوئی یہی حال رہا۔

۱۸ ربیع الآخر ۷۲۵ھ کو طلوع آفتاب کے بعد زہد و عبادت، حقیقت و معرفت، رشد و ہدایت و ارشاد کا یہ آفتاب غروب ہو گیا

لے یعنی مدفون ہوں۔ ۱۲

نمازِ جنازہ شیخ الاسلام رکن الدین نبیرۂ شیخ الاسلام بہاء الدین زکریا ملتانی نے پڑھائی نماز کے بعد شیخ الاسلام رکن الدین نے فرمایا کہ :-

" مجھے اب معلوم ہوا کہ مجھے ۴ سال تک دہلی میں اسلئے رکھا گیا کہ مجھے اس نمازِ جنازہ کی امامت کا شرف حاصل ہو "[1]

ساری عمر تجرد میں گذری اسلئے کوئی اولاد نہیں تھی، روحانی سلسلہ سارے ہندوستان میں پھیلا، اور ابھی تک جاری ہے۔

---

[1] سیر الاولیاء (ص ۱۵۲) تا (ص ۱۵۵)

۳

باب سوم

اخلاق وصفات

جامع اوصاف حضرت خواجہ نظام الدینؒ کے اوصاف وخصوصیات کا خلاصہ اور ان کا صحیح ترین و جامع ترین تعارف ان الفاظ میں ہے جو عطائے خلافت کے وقت ان کے صاحب نظر شیخ و مرشد (شیخ کبیر حضرت خواجہ فریدالدین گنج شکرؒ) کی زبان سے نکلے۔ انھوں نے فرمایا:۔

باری تعالیٰ ترا علم وعقل وعشق دادہ است	اللہ تعالیٰ نے تم کو علم وعقل وعشق کی دولت عطا
وہر کہ بدیں صفت موصوف باشد ازو	کی ہے اور جو ان صفات کا جامع ہو وہ
خلافت مشائخ نیکو آید۔[1]	مشائخ کی خلافت کی فرائض خوب ادا کرسکتا ہے

حضرت خواجہؒ کی سیرت اسی جامعیت کا مرقع ہے، یہاں علم وعقل وعشق تینوں پہلو بہ پہلو نظر آتے ہیں۔ محبت ومعرفت حقیقی اور مشائخ کبار کی تربیت وصحبت جو بہترین اثرات ونتائج پیدا کرتی ہے اور جن کے بہترین مجموعہ کا نام دورِ آخر میں "تصوف" پڑ گیا ہے، یعنی اخلاص و اخلاق اُسکی بہترین نمونہ انکی زندگی میں نظر آتے

---

[1] سیر الاولیاء (ص ۳۴۸)

اخلاص ان کی زندگی کا بہترین جوہر جس نے ان کو اپنے معاصرین ہی میں نہیں بلکہ مشائخ اسلام میں ایک بلند مقام اور اپنے زمانہ ہی میں نہیں بلکہ تاریخ اسلام کے مختلف ادوار میں قبول عام اور بقائے دوام عطا کیا ہے اور ان کو محبوبیت کے خاص انعام سے نوازا، وہ توحید، اخلاص کی وہ خاص کیفیت اور ذوق ہے جس میں محبت و رضائے الٰہی کے سوا کوئی چیز مطلوب و مقصود نہیں رہی، محبت و یقین کے شعلہ نے ہر طرح کے خس و خاشاک کو جلا کر راکھ کر دیا تھا۔ حُبّ دنیا، حبّ جاہ اور اس طرح کی تمام محبتوں اور طلبوں کا استیصالِ کلی ہو چکا تھا ؎

شاد باش اے عشق خود سودائے ما ؛ اے طبیبِ جملہ علت ہائے ما

اے دوائے نخوت و ناموس ما ؛ اے تو افلاطون و جالینوس ما

عشق آں شعلہ است کو چوں بر فروخت ؛ ہر چہ جز معشوق باقی جملہ سوخت

ماند الا اللہ باقی جملہ رفت ؛ شاد باش اے عشق شرکت سوز رفت[1]

امیر حسن علا سجزی راوی ہیں کہ ایک مرتبہ مجلس میں یہ ذکر ہو رہا تھا کہ کچھ لوگ مسجد میں قیام کرتے ہیں اور وہاں قرآن مجید کی تلاوت اور نوافل پڑھتے ہیں میں نے عرض کیا کہ اگر اپنے گھر ہی رات کو قیام کریں تو کیسا ہے؟ فرمایا: آدمی اپنے گھر میں ایک پارہ پڑھے وہ مسجد میں ایک قرآن ختم کرنے سے بہتر ہے، اس پر یہ ذکر آ گیا کہ گذشتہ زمانے میں ایک صاحب جامع مسجد دمشق میں رات بھر عبادت میں مشغول رہتے تھے، اس لالچ میں کہ اس کی عام شہرت ہو گی اور شیخ الاسلامی کے عہدے پر جو اس زمانہ میں خالی تھا، ان کا تقرر ہو جائے گا، یہ سنکر حضرت خواجہؒ کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے اور آپ نے فرمایا:-

بسوز اول شیخ الاسلامی را وپس خانقاہ را ؛ آگ لگاؤ ایسی شیخ الاسلامی کو پھر خانقاہ کو

---

[1] مولانا رومؒ

ولعبد ازاں خود را۔[1]　　　　پھر اپنے کو خاک کر کے رکھ دو

حضرت خواجہؒ کی ساری زندگی اسی "دل سوختگی" اور "خود باختگی" کا نمونہ ہے اور اسی چیز نے ان کی صحبت میں کیمیا اور اکسیر کی خاصیت پیدا کر دی تھی۔ انھیں کے سلسلہ کے ایک سوختہ دل شیخ تھے[2] (جو نویں صدی میں نظامی سلسلہ کے مقتدیٰ تھے) یہ دو شعر منقول ہیں جو اس صورتِ حال اور جذبہ کی صحیح ترجمانی کرتے ہیں

مارا نہ مرید و رُدہ خواں می باید　　　نے زاہد نے حافظِ قرآں می باید
صاحب دردے سوختہ جاں می باید　　　آتش زدہ بہ خانماں می باید

اپنے ہی بارے میں نہیں، اپنے خلفاء اور جانشینوں کے بارے میں بھی (جن سے تہذیب، اخلاق اور تزکیۂ نفس کا کام لینا تھا) اس کا لحاظ فرماتے تھے کہ وہ اخلاص کے اس مقام پر پہنچ گئے ہیں کہ حُبِّ جاہ کا ان کے دل سے خاتمہ ہو چکا ہے۔ مولانا فصیح الدین نے سوال کیا کہ مشائخ کی خلافت کا اہل کون ہوتا ہے؟ فرمایا:۔

"کسے را کہ در خاطر او توقع خلافت نباشد"[3]　　　وہ شخص جو خلافت کا متوقع اور منتظر بھی نہ ہو۔

صاحب سیرالاولیاء کا بیان ہے کہ ایک مرتبہ آپ کو اپنے ایک ممتاز خادم کے متعلق جن کو اجازت دی جا چکی تھی معلوم ہوا کہ وہ کئی کمبل تہہ کر کے بچھا کر اس پر مشائخ کی طرح بیٹھتے ہیں اور امراء، عوام و خواص ان کی خدمت میں معتقدانہ حاضر ہوتے ہیں، آپ اس سے اتنے آزردہ ہوئے کہ جب وہ آئے تو آپ نے

---

[1] فوائد الفواد (ص ۲۴)

[2] حضرت شاہ محمد مینا (محمد بن قطب) لکھنوی (م ۸۷۴ھ)

[3] سیرالاولیاء (ص ۳۴۵)

ان سے منہ پھیر لیا اور ان کو اجازت سے محروم کر دیا، عرصہ تک ان سے ایسی ہی بے رُخی رہی جبتک کہ ان کا عذر ظاہر نہیں ہوا اور انھوں نے معافی نہیں مانگی، ان پر نظر عنایت مبذول نہیں ہوئی۔[1]

دشمن نوازی

اخلاص و فنائیت اور بے نفسی کے اس مقام پر پہنچ کر سالک کے دل سے رنج و شکایت انتقام کا جذبہ اور ایذا کی صلاحیت ہی ختم ہوجاتی ہے، وہ نہ صرف آشنا پرور و دوست نواز ہوتا ہے بلکہ دشمن کا احسانمند اور دشمن کے حق میں دعاگو بن جاتا ہے، گویا دشمنی کوئی احسان ہے کوئی نادر تحفہ اور زخم دل کا مرہم ہے جس پر بے اختیار دل سے دعا نکلتی ہے اور منہ سے پھول جھڑتے ہیں۔ امیر علاء سنجری راوی ہیں کہ حضرت نے ایک مرتبہ یہ مصرع پڑھا۔ ع

"ہر کہ مارا رنج دادہ راحتش بسیار باد"

(جو ہم کو رنج دے خدا اس کو بہت راحت پہنچائے)

اسکے بعد یہ شعر ارشاد ہوا ——— ہ

ہر کہ او خارے نہد در راہِ ما از دشمنی
ہر گُلِ کز باغِ عمرش بشگفد بے خار باد[2]

سیر العارفین میں ہے کہ خواجہ نصیر الدین چراغ دہلی فرماتے تھے کہ حصار اندرپت میں (جو موضع غیاث پور کے قریب ہے) جھجو نامی ایک شخص تھا جس کو بے وجہ حضرت سے دشمنی تھی، برا بھلا بھی کہتا رہتا تھا اور آپ کو تکلیف و ایذا پہنچانے کی فکر میں رہتا تھا، اس کا انتقال ہوگیا حضرت شیخ نے اسکے جنازے میں شرکت کی، دفن کے بعد اس کی بالیں پر دو رکعت نماز پڑھی اور دعا فرمائی کہ خدایا! اس شخص نے

---

[1] سیر الاولیاء میں اس واقعہ کی تفصیل ہے۔ ۱۲ [2] فوائد الفواد ص۲۶ (ترجمہ) جو ہمارے راستہ میں کانٹے بچھائے اللہ کرے اسکے گلشنِ حیات میں جو پھول کھلے بے خار رہے۔ ۱۲

جو کچھ کہا ہو یا برا سوچا ہو میں نے اس کو بخش دیا تو میری وجہ سے اس کو سزا نہ دینا۔[1]

ایک مرتبہ حاضرین میں سے ایک صاحب نے ذکر کیا کہ بعض آدمی جناب والا کو منبر پر اور دوسرے موقعوں پر برا بھلا کہتے ہیں، ہم سے سنا نہیں جاتا۔ حضرت خواجہؒ نے فرمایا کہ میں نے سب کو معاف کیا تم بھی معاف کرو اور ایسے آدمی سے جھگڑا نہ کرو۔ اسکے بعد آپ نے فرمایا کہ اگر دو آدمیوں کے درمیان رنجش ہو تو اس رنجش کو دور کرنے کا طریقہ یہ ہے کہ آدمی اپنے باطن کو عداوت سے خالی کرے، دوسرے کی طرف سے بھی آزار کم ہو جائے گا۔ فرمایا کہ: آخر لوگ برا بھلا کہنے سے کیوں رنجیدہ ہوتے ہیں۔ مشہور یہ ہے کہ مال صوفی سبیل است و خون او مباح"۔ (صوفی کا مال وقف ہے اور اس کا خون روا) جب معاملہ یہ ہے تو کسی برا بھلا کہنے والے سے کیوں جھگڑا کیا جائے؟[2]

ایک دن فرمایا کہ دنیا کا عام اصول تو یہ ہے کہ نیکوں کے ساتھ نیکی اور بدوں کے ساتھ بدی کی جائے، لیکن مردانِ خدا کا اصول یہ ہے کہ بدی کا بدلہ بھی نیکی سے دیا جائے۔ فرمایا:-

یکے خارے نہد و تو ہم خار نہی ایں خار خار باشد ..... میانِ مردمان ہمچنین است بانغزاں نغزی و باکوزان کوزی، اما میان درویشان ہمچنین است کہ بانغزاں نغزی باکوزاں ہم نغزی[3]	اگر کوئی کانٹا رکھے اور تم بھی کانٹا رکھ دو تو کانٹے ہی کانٹے جمع ہو جائیں گے لوگوں کے درمیان عام اصول یہی ہے کہ سیدھوں کے ساتھ سیدھا اور ٹیڑھوں کے ساتھ ٹیڑھا لیکن درویشوں کا اصول یہ ہے کہ سیدھوں کے ساتھ سیدھا اور ٹیڑھوں کے ساتھ بھی سیدھا۔

حضرت خواجہ کا اس بارے میں معیار اتنا بلند تھا کہ برا کہنا تو بڑی چیز ہے وہ برا چاہنے کو بھی روا نہیں رکھتے تھے، ایک مرتبہ فرمایا:-

---

[1] سیر العارفین (قلمی) [2] فوائد الفواد ص ۹۵ [3] ایضاً ص ۸۷

بد گفتن اندک است اما بدخواستن | برا کہنا بھی برا ہے لیکن برا چاہنا
ازاں بدتر است۔[1] | اس سے کہیں برا ہے۔

جب یہ معاملہ آپ کا سب کے ساتھ تھا تو اپنے شیخ کے عزیزوں اور تعلق والوں کے ساتھ کیوں نہ ہوتا جن کے احسان سے آپ کا رواں رواں تر تھا۔

سیر العارفین میں ہے کہ حضرت شیخ نجیب الدین متوکل کے نواسے خواجہ عطاء اللہ ایک لاابالی و بیباک آدمی تھے۔ ایک دن قلم دوات لیکر آئے اور کہا کہ میرے لئے فلاں سردار کو ایک خط لکھ دیجئے تاکہ مجھے وہ کوئی اچھی رقم دیدے۔ شیخ نے فرمایا کہ: نہ میری اس سردار سے کبھی ملاقات ہوئی ہے، نہ وہ کبھی یہاں آیا ہے، جس شخص سے جان پہچان نہ ہو اسکو رقعہ کس طرح لکھا جائے؛ صاحبزادے کو غصہ آگیا اور انھوں نے سخت سست کہنا شروع کیا کہ ہمارے ہی نانا کے مرید ہوا اور ہمارے ہی خاندان کا صدقہ پایا ہے اب ایسے احسان فراموش ہو گئے ہو کہ میرے لئے ایک رقعہ تم سے نہیں لکھا جاتا، یہ تم نے کیا پیری مریدی کا جال بچھایا ہے اور خلق خدا کو دھوکے دے رہے ہو؛ یہ کہکر دوات زمین پر پٹک دی اور اٹھکر چلے، حضرتؒ نے دامن پکڑ لیا اور فرمایا کہ ناراض ہو کر کیوں جاتے ہو، خوش ہو کر جاؤ۔ اسکے بعد ایک رقم سامنے رکھی اور رضامند کر کے رخصت کیا۔[2]

پردہ پوشی و نکتہ نوازی

سیر الاولیاء میں ہے کہ اکثر معمول تھا کہ جو لوگ باہر سے آتے وہ کوئی شیرینی یا تحفہ خرید کر اپنے ساتھ لاتے اور پیش کرتے۔ ایک مرتبہ کچھ لوگ اسی ارادہ سے آرہے تھے، ایک مولوی صاحب بھی ساتھ تھے، انھوں نے سوچا کہ لوگ مختلف تحائف پیش کرینگے اور وہ اکٹھا حضرت کے سامنے رکھیں گے، خادم سب کو اٹھا کر لے جائے گا، کیا پتہ چلے گا کہ کون لایا؛ انھوں نے تھوڑی سی مٹی راستہ سے اٹھا کر کاغذ میں باندھ لی۔ جب سلطان المشائخؒ کی خدمت

---

[1] سیر الاولیاء ص ۵۵۳ [2] سیر العارفین (قلمی)

میں حاضر ہوئے ہر ایک نے اپنی چیز سامنے رکھی، مولوی صاحب نے بھی اپنی پڑیا سامنے رکھدی، خادم وہ سب چیزیں اٹھاکر لے جانے لگا، پڑیا کو بھی اٹھانا چاہا۔ حضرتؒ نے فرمایا "اس کو یہیں چھوڑ دو، یہ میری آنکھ کا سرمہ ہے۔" یہ اخلاق و عالی ظرفی دیکھ کر ان عالم صاحب نے توبہ کی اور مرید ہوئے۔[1]

شفقت و تعلق

اللہ تعالیٰ نے حضرت خواجہؒ کو عام انسانوں اور خصوصیت کے ساتھ مسلمانوں اور اپنے اہل تعلق کے ساتھ ایسی شفقت و محبت عطا فرمائی تھی جس کو اگر ماں کی شفقت سے تشبیہ یا اس پر بھی ترجیح دی جائے تو واقعات کے لحاظ سے اس میں کوئی مبالغہ اور شاعری نہ ہوگی۔ شیوخ کاملین کی یہ شفقت دراصل نبیؐ کی اس شفقت کی وراثت اور نیابت ہے جس کی حقیقت اس آیت میں بیان کی گئی ہے:۔

لَقَدْ جَآءَكُمْ رَسُوْلٌ مِّنْ اَنْفُسِكُمْ	اے لوگو! تمہارے پاس ایسا پیغمبر آیا جو تمھاری
عَزِيْزٌ عَلَيْهِ مَا عَنِتُّمْ حَرِيْصٌ عَلَيْكُمْ	جنس سے ہے جس کو تمہاری تکلیف ومضرت کی بات
بِالْمُؤْمِنِيْنَ رَءُوْفٌ رَّحِيْمٌ ۝	گراں گذرتی ہے جو تمھاری منفعت کا بڑا خواہشمند رہتا ہے
(التوبہ ع ۱۶)	ایمانداروں کے ساتھ بڑا ہی شفیق و مہربان ہے۔

اور اس حکم کی تعمیل ہے جس کا خطاب رسولؐ سے ہے:۔

وَاخْفِضْ جَنَاحَكَ لِمَنِ اتَّبَعَكَ	ان لوگوں کے ساتھ فروتنی کے ساتھ پیش آؤ جو
مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ ۝ (شعراء ع ۱۱)	مسلمانوں میں داخل ہو کر تمھاری راہ پر چلیں۔

اس شفقت اور تعلق نے وہ "اتحاد" پیدا کر دیا تھا کہ دوسروں کی جسمانی اذیت سے اپنے کو جسمانی طور پر اذیت اور دوسروں کی قلبی راحت سے اپنے کو قلبی راحت ملتی تھی۔ امیر حسن علاء سجزی راوی ہیں کہ ایک مرتبہ مجلس ہو رہی تھی، سایہ میں جگہ نہ ہونے کی وجہ سے بعض لوگ دھوپ میں بیٹھے تھے، آپ نے سایہ میں بیٹھنے والوں سے فرمایا:۔

---

[1] سیر الاولیا، ص ۱۴۲

"بھائی ذرا مل کر بیٹھو تاکہ ان بھائیوں کیلئے بھی جگہ ہو جائے، دھوپ میں یہ بیٹھے ہیں اور میں جلا جا رہا ہوں۔"[1]

ایک مرتبہ آپ نے کسی بزرگ کا مقولہ نقل کیا جو درحقیقت اپنے ہی حال کی ترجمانی تھی کہ "خدا کی مخلوق میرے سامنے کھانا کھاتی ہے اور میں اس کھانے کو اپنے حلق میں پاتا ہوں، جیسے وہ کھانا میں ہی کھا رہا ہوں۔"[2]

امیر حسن علاء سنجری فرماتے ہیں کہ میں ایک مرتبہ بے وقت حاضر ہوا اور عرض کیا کہ میں اس طرف عزیزوں سے ملنے آیا ہوا تھا، حاضری کو جی چاہا۔ بعض دوستوں نے کہا کہ اگر کوئی شخص کسی اور کام سے آیا ہو اور شروع سے حاضری کی نیت نہ کی ہو تو شیخ کی خدمت میں نہیں حاضر ہونا چاہیئے۔ میں نے دل میں کہا کہ اگرچہ قاعدہ یہی ہے لیکن دل نہیں مانتا کہ یہاں آ کر حضرتؒ کی زیارت کے بغیر واپس چلا جاؤں۔ میں آج قاعدہ کے خلاف ہی کروں گا۔ حضرتؒ نے فرمایا "اچھا کیا"، پھر یہ شعر پڑھا۔ ؎

در کوئے خرابات و سرائے او باش

معنے نبود بیا و بنشیں و بہ باش

پھر فرمایا کہ مشائخ کا معمول یہی ہے کہ کوئی انکے پاس اشراق سے پہلے اور عصر کی نماز کے بعد نہیں جاتا، لیکن میرے یہاں یہ قاعدہ نہیں جس وقت جس کا جی چاہے آئے۔"[3]

غمخواریٔ عام یہ اہل قلوب غم دنیا سے فارغ البال لیکن دنیا والوں کے غم اور خلقِ خدا کی فکروں سے نڈھال اور خستہ حال رہتے ہیں، وہ اپنا غم بھلا دیتے ہیں اور ساری دنیا کا غم اپنا غم بنا لیتے ہیں۔ یہ کہنے کا حق درحقیقت انھیں کو ہے کہ۔ ع

سارے جہاں کا درد ہمارے جگر میں ہے

خواجہ نصیر الدین چراغ دہلی کے نواسے خواجہ شرف الدینؒ سے کسی مجلس میں کسی صوفی نے کہا کہ خواجہ نظام الدینؒ

---

[1] فوائد الفواد صـ۹۱ [2] سیر الاولیاء صـ۷۷ [3] فوائد الفواد (ج ۱) صـ۹۵

عجیب تھا۔ فارغ البال بزرگ ہیں، مجرد ہیں، اہل و عیال و اطفال کا کوئی تردد ان کو نہیں ہے ان کو ایسا فراغِ خاطر حاصل ہے کہ ایک ذرۂ غم بھی ان کو چھو نہیں گیا ہے۔ وہ عزیز اس مجلس سے اٹھے تو حضرت خواجہؒ کی خدمت میں حاضر ہوئے چاہتے تھے کہ خود اس کا ذکر کریں۔ حضرت خواجہؒ نے خود ہی ارشاد فرمایا:۔

"میاں شرف الدین وہ رنج و غم جو میرے دل کو وقتاً فوقتاً ہوتا رہتا ہے شاید ہی کسی دوسرے شخص کو اس سے زیادہ ہوتا ہو، جو شخص میرے پاس آتا ہے اپنا حال مجھ سے بیان کرتا ہے اُس سے دو چند فکر و تردد اور غم و الم مجھے ہوتا ہے، بڑا سنگدل ہے وہ جس پر اپنے دینی بھائی کا غم اثر نہ کرے، اسکے علاوہ یہ جو کہا گیا ہے:۔

"المخلصون علی خطر عظیم" (مخلصین کو بڑا خطرہ در پیش رہتا ہے)

اس سے بھی سمجھ سکتے ہو کہ۔ ع

نزدیکاں را بیش بود حیرانی[1]

حضرت خواجہؒ کے نزدیک مسلمان کا دل خوش کرنا اور اس کی دلجوئی و راحت رسانی افضل ترین عمل اور تقرب الی اللہ کا بہترین ذریعہ تھا۔ سیر الاولیاء میں ہے کہ فرمایا:۔

"مجھے خواب میں ایک کتاب دی گئی اس میں لکھا تھا کہ جہاں تک ہو سکے دلوں کو راحت پہنچاؤ کہ مومن کا دل اسرارِ ربوبیت کا مقام ہے"، کسی بزرگ نے خوب کہا ہے۔ ؎

می کوش کہ راحت بجانے برسد   یا دست شکستہ بنانے برسد

(کوشش کرو کہ کسی انسانی جان کو تم سے آرام پہنچے، یا جو دست شکستہ ہو اسکو تمھارے ذریعہ سے روٹی ملے)

---

[1] سیر العارفین (قلمی)

ایک مرتبہ فرمایا، کہ:۔

"قیامت کے بازار میں کسی سودے کی اتنی قیمت اور چلن نہ ہوگا جتنا دل کا خیال رکھنے اور دل خوش کرنے کا۔"[1]

چھوٹوں پر شفقت حضرت خواجہؒ اپنے قیمتی مشاغل اور اعلیٰ کیفیاتِ باطنی کے ساتھ بچوں اور چھوٹوں پر بڑے شفیق تھے، اور وہ اپنی شدید مصروفیات کے باوجود اُن کی دلجوئی و ملاطفت کے لئے وقت نکال لیتے تھے، ان عظیم ذمہ داریوں اور باطنی مشغولیت کے باوجود ان بچوں کی پوری رعایت فرماتے اور چھوٹی چھوٹی باتوں کا دھیان رکھتے۔

خواجہ رفیع الدین ہارون آپ کے حقیقی بھانجے کے صاحبزادے تھے، اگر کبھی کھانے کے وقت وہ موجود نہ ہوتے، تو اگرچہ بڑے بڑے بزرگ دسترخوان پر بیٹھے ہوتے، لیکن آپ ان صاحبزادے کا انتظار کرتے۔ آپ اپنے بچے کی طرح خلوت و جلوت میں ان کی تربیت و دلداری فرماتے۔[2]

خواجہ رفیع الدین کو تیر و کمان اور پیراکی و کشتی کا بڑا شوق تھا، حضرت سلطان المشائخ بڑی شفقت کے ساتھ ان سے انھیں فنوں کی باتیں کرتے تھے، ان کی ہمت افزائی اور تشویق فرماتے، ان فنوں کی باریکیوں اور نکتوں کی تعلیم دیتے، تاکہ یہ خوش ہوں۔[3]

جو شریف النسب اور ذی استعداد نوجوان اپنے زمانہ کے شوقین لوگوں کے جیسا لباس پہنتے اور ان میں نوجوانی کے تقاضے سے لباس میں تجمل پیدا ہوتا (جس کو بعض سخت گیر ثقاہت و متانت کے خلاف سمجھ کر اعتراض کرتے ہیں) حضرت خواجہؒ ان کی بھی دلجوئی فرماتے، اور اس کو جوانی اور زمانہ کا تقاضا سمجھ کر نظر انداز فرماتے اور اپنے اخلاق و محبت سے ان کی اصلاح و تربیت کی کوشش فرماتے۔

---

[1] سیر الاولیاء صـ ۱۲۸ [2] ایضاً صـ ۲۰۳ [3] ایضاً صـ ۲۰۳

سیرالاولیاء کے مصنف امیر خورد لکھتے ہیں کہ میرے چچا سید حسین کرمانی کی نوجوانی کا زمانہ تھا۔ وہ اس زمانہ کے شوقین نوجوانوں کے لباس اور وضع میں ایک روز تشریف لائے حضرت خواجہؒ نے ان کو دیکھ کر فرمایا۔

سید بیا و بنشیں و سعادت ببر[1] | سید آؤ، بیٹھو اور سعادت میں حصہ لو۔

اللہ ہی بہتر جانتا ہے کہ اس شفقت و ملاطفت اور اس دلجوئی و دلنوازی سے کتنے نوجوانوں کی اصلاح و تربیت ہوئی ہوگی اور کتنے "آہوئے وحشی" اسیر دام محبت ہوئے ہوں گے، اور ان کا شمار خدا کے مقبول بندوں اور شیوخ کاملین میں ہوا ہوگا۔

حضرت خواجہؒ کے ان اخلاق و صفات اور صوفیہ صافیہ کی سیرت کو دیکھ کر امام غزالی کی اس رائے اور شہادت کی تصدیق ہوتی ہے جس کا انھوں نے "تلاش حق" کے طویل سفر اور مختلف گروہوں اور انسانی طبقات کے عمیق مطالعہ کے بعد اظہار کیا ہے:۔

"مجھے یقینی طور پر معلوم ہو گیا کہ صوفیہ ہی اللہ کے راستہ کے سالک ہیں، انکی سیرت بہترین سیرت، ان کا طریق سب سے زیادہ مستقیم اور ان کے اخلاق سب سے زیادہ تربیت یافتہ اور صحیح ہیں، اگر عقلاء کی عقل، علماء کی حکمت اور شریعت کے رمز شناسوں کا علم مل کر بھی اُن کی سیرت و اخلاق سے بہتر لانا چاہے تو ممکن نہیں، انکے تمام ظاہری و باطنی حرکات و سکنات مشکوٰۃ نبوت سے ماخوذ ہیں اور نور نبوت سے بڑھ کر روئے زمین پر کوئی نور نہیں جس سے روشنی حاصل کیجائے۔"[2]

---

[1] سیرالاولیاء صفحہ ۲۰۳ [2] المنقذ من الضلال

باب چہارم

اذواق وکیفیات

محبت و ذوق

حضرت خواجہ کی سیرت اور زندگی کا مرکزی نقطہ جو ان کے تمام اخلاق و احوال و اعمال کا محور ہے وہ عشق الٰہی کی نعمت خداداد ہے جو ان میں ابتدائے حال سے نمایاں تھی، محبت کی یہ چنگاری جو ازل سے ان کی فطرت میں ودیعت تھی شیخ کبیر کی صحبت اور طریقۂ چشتیہ کی نسبت سے شعلۂ جاں سوز بن گئی اور اسنے مدت العمر ان کو اور نصف صدی سے زائد دہلی اور اسکے ماحول کو گرم اور منور رکھا اور اس کی وجہ سے صدیوں تک ہندوستان کی فضا عشق الٰہی کی حرارت سے گرم اور گداز رہی ان کے تمام حالات و اشغال گفتگو اور مجالس، اشعار اور انکے انتخاب، واقعات اور ان کی تمثیل، غرض ہر چیز سے اسی سوزِ باطن اور اسی حرارتِ عشق کا اظہار ہوتا ہے ؎

شعلہا آخر ز ہر مویم دمید
از رگِ اندیشہ ام آتش چکید

فوائد الفواد میں ہے کہ ایک روز اولیاء اللہ کے دمِ واپسیں کے واقعات بیان ہو رہے تھے، حاضرین میں سے ایک نے ایک بزرگ کی حکایت بیان کی کہ ان کا انتقال ہو رہا تھا اور آہستہ آہستہ اللہ کا نام

ان کی زبان پر جاری تھا، حضرت خواجہؒ آبدیدہ ہو گئے اور یہ رباعی پڑھی۔ ؎

آیم بسر کوئے تو پویاں پویاں — رخسارہ بآبِ دیدہ شویاں شویاں
بیچارہ نہ وصل تو جویاں جویاں — جاں می دہم و نام تو گویاں گویاں[1]

(ترجمہ) آپ کی گلی میں چلا آ رہا ہوں خراماں خراماں، آنسوؤں سے اپنے رخسار کو دھوتا ہوں، آپکے وصل کا جویا اور طالب بن کر جان دے رہا ہوں، آپکا نام بھی لئے جا رہا ہوں)

اس محبت کا نتیجہ یہ تھا کہ دل میں محبوب کے سوا کسی کے خیال کی جگہ نہیں رہی تھی، کسی دوسری طرف توجہ بھی دل پر بار تھی

ہر چہ جز معشوق باقی جملہ سوخت

امیر حسن علاء سجزی راوی ہیں کہ ایک مرتبہ فرمایا کہ اگر کبھی اتفاق سے میں ان کتابوں کا مطالعہ کرنے لگتا ہوں جو میں نے پڑھی ہیں تو طبیعت میں وحشت پیدا ہونے لگتی ہے اور اپنے دل میں کہتا ہوں کہ کہاں پڑ گیا، اس پر حضرت خواجہ ابوسعید ابوالخیر کا واقعہ بیان کیا کہ وہ کمال حال پر پہنچ گئے تو وہ کتابیں جو وہ پڑھ چکے تھے اور ان کو کونے میں رکھ دیا تھا۔ ان کو سامنے رکھ کر ایک روز مطالعہ کرنے لگے۔ غیبی آواز آئی اے ابوسعید ہمارا عہد نامہ واپس کر دے کہ اب تو دوسری چیز میں مشغول ہو گیا، خواجہ جب اس مقام پر پہنچے تو رو پڑے اور یہ شعر پڑھا ؎

توسایۂ دشمنے کجا در گنجی — جائے کہ خیال دوست زحمت باشد[2]

(ترجمہ) کسی دشمن کا سایہ بھی کہاں سما سکتا ہے، جہاں دوست کا خیال بھی حجاب بنے)

اسی "سرورِ عشق" کا نتیجہ یہ تھا کہ شب کی خلوت اور رات کے راز و نیاز کے بعد جب دن میں تشریف لاتے تو بقول امیر خورد معلوم ہوتا کہ شراب چھلک رہی ہے، رات کی بیداری سے آنکھیں سرخ ہوتیں۔ امیر خسرو

---

[1] فوائد الفواد صنث — [2] فوائد الفواد صن۹

نے یہی دیکھ کر کہا ہے :۔ ؎

توشبانہ می نمائی بہ برِ کہ بودی امشب
کہ ہنوز چشم مستت اثرِ خمار دارد[1]

اور اسی حرارتِ عشق اور سرور و مستی کا نتیجہ تھا کہ پیرانہ سالی میں برابر روزہ رکھتے تقلیلِ غذا، طویل شب بیداری اور سخت مجاہدات کے باوجود ضعف و ناطاقتی ظاہر نہ ہوتی تھی، اسی سال سے عمر متجاوز ہونے کے باوجود چہرے پر وہی سرخی اور نشاط و انبساط کی وہی کیفیت پائی جاتی تھی جو جوانی میں ہی ہوگی بلکہ اس میں روز افزوں اضافہ تھا[2]

سماع — محبت کی یہی حرارت اور تپش تھی جس کی تسکین کا ایک ذریعہ سماع تھا[3] یعنی عشقِ الٰہی کے اشعار اور عارفانہ ابیات کا سننا جس سے قلب کو اپنی آتش نکالنے اور آنسوؤں کے چھینٹوں سے اس کی گرمی کو کم کرنے کا موقع ملے اور اسی کے ساتھ مجاہدات سے تھکا ہوا جسم اور طبیعت اور

---

[1] سیر الاولیاء ص ۱۲۸   [2] سیر الاولیاء

[3] مسئلہ سماع (بلا مزامیر) کی موافقت مخالفت میں بہت کچھ لکھا گیا ہے، اس میں نقطۂ اعتدال یہ معلوم ہوتا ہے کہ نہ وہ مطلقاً حرام ہے نہ کوئی عبادت و طاعت و امر مقصود، اعتدال اور خاص شرائط کے ساتھ ایک تدبیر و علاج ہے اور اصحاب ضرورت و اہلیت کے لئے بقدر ضرورت مباح اور بعض اوقات مفید، اس سلسلہ میں مشہور چشتی شیخ قاضی حمید الدین ناگوری کا قول بڑا جامع و معتدل معلوم ہوتا ہے۔ ایک مجلس میں سماع کی حلت و حرمت پر بحث تھی، قاضی صاحب نے فرمایا کہ :۔

"میں ہوں حمید الدین کہ سماع سنتا ہوں اور مباح کہتا ہوں علماء کی روایت کی بنا پر اسلئے کہ درد دل کا مریض ہوں اور سماع اسکی دوا ہے۔ امام ابوحنیفہؒ نے شراب سے علاج کرنے کی ایسے وقت میں اجازت دے دی ہے جبکہ ازالہ مرض کے لئے اور کوئی دوا ہی نہ ہو، اور حکیموں کا بھی اس پر اتفاق ہو کہ صحت شراب کے بغیر ناممکن ہے۔ اس تقریر پر میرے مرض کی دوا چونکہ لاعلاج ہے سرود کا سننا ہے لہٰذا اسکا سننا ہمارے لئے مباح اور تم پر حرام ہے" (سیر الاقطاب قلمی)

نفی کی چوٹ کھایا ہوا دماغ غذا اور تازگی حاصل کر سکے۔ مولانا رومؒ جو ایک بڑے صاحب سماع تھے اسی لئے فرماتے ہیں ؎

پس غذائے عاشقاں آمد سماع — کہ از و باشد خیالِ اجتماع
قوتے گیرد خیالاتِ ضمیر — بلکہ صورت گردد از بانگ صفیر
آتشِ عشق از نواہا گردتیز — آں چناں کہ آتش آں جوز ریز

خود حضرت خواجہؒ نے اپنی زبان سے سماع کی یہی حکمت بیان کی ہے:-

سماع حق مریدان و معتقدان و اصحاب ریاضت است، چوں نفس و تن ہلاک شود، او را حق البیت "ان لنفسک علیک حقا" یعنی بدرستی کہ برائے نفس برابر تو حق است چوں نفس بلند از سماع بیاساید باز او را بر کارے بہ برند[1]

سماع مریدین صادقین اور اہل عقیدت اور اصحاب ریاضت کا کام ہے۔ جب طبیعت پوسی چوٹ کھا جائے تو ان کا حق ہے کہ سماع سے قوت و تازگی حاصل کریں (حدیث میں آتا ہے کہ ان لنفسک علیک حقا تمہارے اوپر تمہارے جسم کا حق ہے۔ جب ایک مدت تک نفس سماع کے ذریعہ آرام حاصل کر لیتا ہے تو پھر اسکو کام میں لگاتے ہیں

ایک بزرگ مولانا کاشانی فرماتے ہیں:-

اصحاب ریاضت و ارباب مجاہدہ از کثرتِ معاملات گاہ گاہ اتفاق افتد کہ کلالتے و ملالتے در قلوب و نفوس حادث شود و قبض

اصحاب ریاضت و ارباب مجاہدہ کے قلوب و نفوس احوال و کیفیات کے کثرت سے پیش آنے کی وجہ سے کبھی کبھی اکتا جاتے ہیں اور انکو

---

[1] سیر الاولیاء ص ۱۹۸

بسطے کہ موجب فتور اعمال و قصور احوال بود
طاری گردد پس مشائخ متاخر از برائے دفع
ایں عارضہ و دفع ایں حادثہ ترکیبے روحانی
از سماع اصوات طیبہ و الحان متناسبہ و
اشعار و اشعار مہیجہ و مشوقہ بر وجہے کہ شرع
بود نمودہ اند[1]

تکان و ضعف محسوس ہونے لگتا ہے اور
ان پر وہ قبض و بسط جو اعمال و احوال میں سستی
اور کوتاہی کا باعث ہوتا ہے طاری ہوجاتے ہیں
اس بنا پر مشائخ متاخرین نے اچھی آوازوں مناسب
نغموں اور شوق انگیز اشعار کے سننے کو اس
طرح پر کہ حدود شرع سے باہر نہ ہوں ایک
علاج روحانی کے طور پر تجویز کیا ہے۔

سماع کی اس حکمت کے علاوہ، اس کی ایک دوسری حکمت ان حضرات کے نزدیک یہ تھی کہ اس سے حضوری کی ایک کیفیت درد کی لذت اور ذوق و شوق پیدا ہوتا ہے اور یہ لمحات بقیہ اوقات کو بھی اپنے دامن میں لیکر پاک اور نورانی بنا دیتے ہیں۔ ارشاد ہوا کہ:۔

مردم را ہمہ روز حضور کجا میسر شود اگر در روزے
وقتے خوش دریافت ہمہ اوقات متفرقہ آں
روز در پناہ آں وقت باشد و اگر در جمعے
صاحب نعمتے باشد جملہ اشخاص در پناہ
آں شخص باشد[2]

فرمایا، آدمی کو ہر روز حضوری کہاں میسر
آتی ہے اگر کسی دن کوئی وقت اچھا ہاتھ
آجائے تو اس دن کے تمام متفرق اوقات اس
وقت کی پناہ میں ہوتے ہیں، دیکھو اگر کسی مجمع میں
ایک صاحب ذوق اور صاحب نعمت ہوتا ہے،
تمام حاضرین اس کی پناہ میں ہوتے ہیں۔

پس یہ سماع، حضرت خواجہ اور ان مشائخ کی (جو اسی کیفیت کے حامل اور آتشِ محبت سے

---

[1] مصباح الہدایت ص۱۸۰ و ص۱۸۲ [2] سیر الاولیاء ص۵۲۳

سے جل رہے ہوں) طبعی کیفیت کا نتیجہ، تسکین کا سامان، قوت و غذا اور رقت و حضوری کا ذریعہ تھا جسکو وہ حضرات علاجاً اور ضرورتاً اختیار کرتے تھے اور علاج اور ضرورت کے بقدر ہی اس سے کام لیتے تھے نہ وہ کوئی عبادت، تقرب الی اللہ کا ذریعہ تھا، نہ مستقل سلوک اور شب و روز کا مشغلہ تھا۔

اسی کے ساتھ حضرت خواجہؒ نے سماع کو ان تمام خلافِ شرع منکرات و بدعات اور اسبابِ لہو و لعب سے جو غیر مسلموں کے اثر سے خاص طور پر ہندوستان میں اہل ہوا نے یا خام کار صوفیوں نے سماع میں شامل کر لئے تھے خود بھی دور رکھا اور اپنے متبعین کو ان سے اجتناب کی انتہائی تاکید فرمائی ہے۔ آپ نے سماع کے آداب اس طرح بیان فرمائے :۔

آپ نے فرمایا :۔

"سماع کی چار قسمیں ہیں :۔ حلال، حرام، مکروہ، مباح۔ اگر صاحبِ وجد کا میلان محبوبِ حقیقی کی طرف زیادہ ہو تو سماع مباح ہے، اور اگر محبوب مجازی کی طرف زیادہ ہے، تو مکروہ ہے، اگر محبوب مجازی کی طرف میلانِ کلی ہے تو حرام ہے، اگر محبوبِ حقیقی کی طرف میلانِ کلی ہے تو حلال ہے، پس جس کو سماع کا ذوق ہے، اس کو چاہیئے کہ وہ ان چاروں درجوں کو جانتا ہو۔"

نیز ارشاد فرمایا کہ :۔

"سماع مباح کے لئے چند چیزیں چاہیئیں :۔ مُسمع (سنانیوالا) مستمع (سننے والے) مسموع (جو کچھ پڑھا جا رہا ہے) آلۂ سماع (ذریعہ) مستمع کے لئے شرط یہ ہے کہ وہ پوری عمر کا آدمی ہو، کم سن نہ ہو، عورت نہ ہو۔ مستمع کیلئے ضروری ہے کہ جو کچھ وہ سن رہا ہے وہ یادِ حق سے خالی نہ ہو۔ مسموع کے لئے شرط ہے کہ وہ بے حیائی اور ہنسی مذاق کا کلام نہ ہو۔ آلۂ سماع سے مراد مزامیر ہے، جیسے چنگ و رباب کہ یہ درمیان

میں نہ ہو۔"[1]

مزامیر سے نفرت و ممانعت

حضرت خواجہ مزامیر (آلات غنا او رباجے وغیرہ سے) سختی سے منع فرماتے تھے اور جب کبھی اس بارے میں کسی بے احتیاطی کی اطلاع ملتی تو نہایت ناراض ہوتے اور اس بارے میں کسی عذر کو قبول نہ فرماتے سیرالاولیاء میں ہے:۔

" مجلس میں ایک مرتبہ ایک شخص نے حضرت سلطان المشائخ سے عرض کیا کہ ان دنوں بعض حاضر باش درویشوں نے ایک ایسی مجلس میں جس میں چنگ و رباب اور مزامیر تھے شرکت کی اور رقص کیا۔ فرمایا:۔ اچھا نہیں کیا، جو خلاف شرع ہے وہ ناپسندیدہ ہے۔ اس پر ایک شخص نے عرض کیا کہ یہ لوگ جب باہر آئے اور لوگوں نے ان سے کہا کہ یہ آپ نے کیا کیا، اس مجلس میں مزامیر تھے، آپ نے سماع کس طرح سنا اور رقص کیا؟ انھوں نے جواب دیا کہ ہم سماع میں ایسے مستغرق تھے کہ ہمیں کچھ پتہ نہ چلا کہ مزامیر ہیں یا نہیں۔ حضرت سلطان المشائخ نے سنکر فرمایا کہ:۔ یہ جواب بھی کچھ نہیں، یہ بات تو ہر معصیت کے متعلق کہی جا سکتی ہے۔"[2]

حضرت خواجہؒ مزامیر کی ممانعت میں بڑی شدت اور مبالغہ فرماتے تھے۔ فرماتے تھے کہ:۔

" جب عورت کو نماز میں امام کی غلطی پر تنبیہ کرنے کے لئے دستک دیتے وقت اس کی ممانعت ہے کہ ہتیلی پر ہتیلی ماری جائے کہ اس سے تالی کی آواز پیدا ہوتی ہے اور یہ لہو ہے، جب لہو ولعب سے اتنا پرہیز آیا ہے تو سماع میں بطریق اولیٰ مزامیر کی ممانعت ہونی چاہیئے۔"[3]

---

[1] سیرالاولیاء صـ۴۹۱ و صـ۴۹۲ [2] ایضاً صـ۵۲۰ و صـ۵۲۱ [3] ایضاً صـ۵۲۲

سماع میں آپ کی کیفیت

حضرت خواجہؒ فرماتے تھے کہ جس شخص کو اللہ تعالیٰ نے درد و ذوق عطا فرمایا ہے اس کو بغیر مزامیر کے ایک ہی شعر سنکر رقت پیدا ہو جاتی ہے لیکن جسے عالمِ ذوق کی خبر نہیں، اس کے سامنے پڑھنے والے کتنا ہی پڑھیں اور کیسے ہی مزامیر کیوں نہ ہوں اس پر کوئی اثر نہیں ہوتا، اسلئے کہ وہ اہلِ درد میں سے نہیں ہے، اس کام کا تعلق درد سے ہے نہ کہ مزامیر وغیرہ سے[1]

چنانچہ حضرت خواجہؒ کا حال یہ تھا کہ عارفانہ اور عاشقانہ اشعار سنتے ہی آپ پر سخت رقت طاری ہوتی تھی لیکن اس طرح کہ لوگوں کو خبر نہ ہوتی، خدام رومال دیتے جاتے اور وہ آپ کے آنسوؤں سے تر ہوتے جاتے، یہ دیکھ کر لوگ سمجھتے کہ آپ پر گریہ طاری ہے[2]

امیر خورد (جو خود بھی اپنی کمسنی میں ان مجالس سماع میں شریک ہوتے تھے اور زیادہ تر اپنے والد اور چچا سے ان پرکیف مجلسوں اور ان وجد انگیز اشعار کا ذکر کرتے ہیں جو وہاں پڑھے گئے) کہتے ہیں کہ بعض مرتبہ بہت سے شعر پڑھے جاتے لیکن کیفیت نہ پیدا ہوتی، یکایک کوئی ہندی کا دوہا یا فارسی کا کوئی شعر پڑھ دیتا اور مجلس مکیف ہو جاتی۔

کہتے ہیں کہ ایک مرتبہ ایک شاہی امیر قیر بک نے ایک مجلس آراستہ کی مشائخ و صدورِ شہر کا اجتماع تھا، سماع شروع ہوا، کہنے والے بہت کچھ سناتے رہے کچھ اثر نہیں ہوا، آخر حسن بہدی قوال نے یہ شعر پڑھا ؎

در کلبۂ درویشی در محنت بیخویشی
مگذار مرا با من ہر سوئے مکن افسانہ

اس شعر کا پڑھنا تھا کہ حضرت سلطان المشائخ پر گریہ اور ایک حالت طاری ہوئی اور اس کیفیت کا تمام حاضرینِ مجلس پر اثر ہوا، اور سب مکیف ہو گئے[3]

۱؎ سیر الاولیاء ص ۵۲۳ ۲؎ ایضاً ص ۵۱۴ ۳؎ ایضاً ص ۵۱۴

ایک دوسری مجلس کا ذکر ہے، بالاخانہ پر مجلس ہو رہی تھی، امیر خسرو کھڑے تھے اور سلطان المشائخ ناسازیٔ طبع کی وجہ سے چارپائی پر تشریف رکھتے تھے، حسن بہدی نے سعدیؒ کا یہ شعر پڑھا ؎

سعدی تو کیستی کہ درآئی دریں کمند

چنداں فتادہ اند کہ ماصید لاغریم

حضرت خواجہؒ پر گریہ طاری ہوا اور اس میں ڈوب گئے۔ خواجہ اقبال رومال بڑھاتے جاتے تھے اور آپ آنسو پونچھ کر حسن بہدی کی طرف اُن کو بڑھاتے تھے۔ کچھ دیر کے بعد سماع ختم ہوا، امیر حاجی فرزند امیر خسرو نے امیر خسرو ہی کی غزل پڑھنی شروع کی جس کا ایک شعر یہ تھا ؎

خسرو تو کیستی کہ درآئی دریں شمار

کیں عشق تیغ بر سر مردان دین زدہ است

حضرت خواجہ پر پھر وہی کیفیت طاری ہوئی اور گریہ کا غلبہ ہوا[1]

ایک مرتبہ امیر خسرو نے غزل پڑھی جس کا مطلع تھا ؎

رخ جملہ را نمود، مرا گفت تو مبیں

زیں ذوق مست بیخبرم کیں سخن چہ بود

آپ نے گوشۂ چشم سے امیر خسرو کو دیکھا، اور کیفیت طاری ہوئی[2]۔

عام طور پر جس شعر پر حضرت خواجہؒ کو ذوق آتا تھا، دہلی کی مجلسوں اور شہر کی گلیوں میں عرصہ تک اس کا چرچا رہتا تھا اور لوگ اس سے لطف لیتے تھے اور ذوق حاصل کرتے رہتے تھے[3] سلطان علاء الدین نے بھی اہل دربار اور حضرت خواجہؒ کے یہاں آنے جانے والوں کو تاکید کر رکھی تھی کہ: جس

---

[1] سیر الاولیاء ص۵۱۵ [2] ایضاً ص۵۱۶ [3] ایضاً ص۱۸ه

شعر پر حضرت خواجہ کو ذوق آئے اس کو یاد رکھا جائے اور بادشاہ کو سنایا جائے۔ اکثر جب بادشاہ نے وہ شعر سنا جس پر حضرت خواجہ کو ذوق آیا تھا تو بڑی تعریف کی اور دیر تک ذوق لیتا رہا۔

ذوقِ قرآن قرآن مجید کا ذوق، اسکے حفظ کا اہتمام اور تلاوت کی کثرت مشائخ چشت کا خصوصی ذوق اور ان کی قدیم روایت ہے۔ خواجۂ بزرگ معین الدین چشتیؒ سے لیکر حضرت خواجہ نظام الدینؒ تک سب کے یہاں قرآن مجید کا خصوصی ذوق اور شغف ملتا ہے اور ہر ایک نے اپنے خلفاء خاص اور مریدین باختصاص کو حفظ قرآن اور اشتغال بالقرآن کی تاکید کی ہے۔[1]

خلافت دیتے وقت شیخ کبیر نے حضرت خواجہ کو حفظ قرآن کی وصیت کی تھی حضرت خواجہ نے یہ وصیت پوری کی اور دہلی پہنچتے ہی اس کا سلسلہ شروع کر دیا حضرت خواجہ اپنے مریدین اور اصحاب خاص کو بھی اس کی ترغیب دیتے رہتے تھے اور تاکید فرماتے تھے۔ امیر حسن علاء سجزی جب حضرت خواجہ سے متعلق ہوئے تو وہ بوڑھے تھے اور شعر و شاعری زندگی بھر کا مشغلہ تھا حضرت خواجہ نے ان کو ہدایت کی کہ قرآنی ذوق کو شعر و شاعری کے ذوق پر غالب کریں۔ امیر فوائد الفواد میں فرماتے ہیں:۔

بارہا از لفظ مبارک مخدوم شنیدہ ام می باید کہ قرآن خواندن بر شعر گفتن غالب آید۔[2]	بارہا آں مخدوم کی زبان مبارک سے میں نے یہ لفظ سنے ہیں کہ چاہیئے کہ قرآن کا پڑھنا شعر کہنے پر غالب آجائے۔

پھر ان کو حفظ قرآن کی ہدایت ہوئی۔ انھوں نے ایک ثلث یاد کر لیا تو ارشاد ہوا۔

دیگرہا اندک اندک یاد گیر و یاد گرفتہ پیشینہ مکرر می کن۔[3]	تھوڑا تھوڑا یاد کرو اور اگلا یاد کیا ہوا دہراتے رہو۔

---

[1] تفصیل کیلئے ملاحظہ ہو "مسلمانوں کا نظام تعلیم و تربیت" از مولانا مناظر احسن گیلانی (جلد دوم) ۱۲۰۔

[2] فوائد الفواد ص ۲۴۹ [3] فوائد الفواد ص ۹۳

مولانا بدرالدین اسحٰق کے صاحبزادے خواجہ محمد حضرت خواجہؒ کی کفالت پرورش میں تھے ان کو بھی قرآن مجید یاد کرایا۔ خواجہ محمد امام بڑے اچھے حافظ و خوش الحان تھے، ان کو آپ نے نماز کا امام بنایا تھا ان کی قرأت سے آپ بڑے محظوظ ہوتے اور آپ کو ان کی قرات سن کر بڑی رقت اور ذوق آتا۔ ان کے دوسرے بھائی خواجہ موسیٰ بھی حافظ و قاری تھے معمول تھا کہ جب دسترخوان پر بیٹھتے تو پہلے خواجہ محمد اور خواجہ موسیٰ کچھ قرآن شریف پڑھتے، اسکو دعائے مائدہ کہتے تھے۔ اس کے بعد کھانا شروع ہوتا تھا۔ اپنے نواسوں (خواہرزادہ کے صاحبزدگان) خواجہ رفیع الدین وغیرہ کو بھی قرآن حفظ کرایا۔ خود بھی نوافل میں قرآن شریف پڑھتے اور خاص خدام سے دریافت فرماتے کہ ان کا کیا معمول ہے؟

شیخ سے تعلق

یوں تو جو شخص جس سے کوئی نعمت پاتا ہے (اگر اس کی طبیعت میں شرافت اور احسانمندی کا جذبہ ہے) اس کا گرویدہ ہوتا ہے اور اسکو اپنا محسن سمجھتا ہے لیکن حضرت خواجہ کو اپنے محسن سے عاشقانہ اور والہانہ تعلق تھا اور انکے اختصاص امتیاز اور روحانی ترقیات میں اسکو خاص دخل تھا۔ اس محبت کا نتیجہ یہ تھا کہ جب کسی محبوب کی تعریف ہوتی تو انکو اپنے شیخ کی یاد تازہ ہوجاتی اور وہ انھیں کو اسکا مصداق سمجھتے۔ فرماتے ہیں کہ ایک مرتبہ شیخ کی زندگی میں ایک مجلس میں قوال نے یہ شعر پڑھا۔

مخرام بدیں صفت مبادا
کز چشم بدت رسد گزندی

فرماتے ہیں کہ مجھے شیخ کے اخلاق و اوصاف ان کا فضل و کمال اور ان کی لطافت و زیبائی یاد آگئی۔ ایسی کیفیت طاری ہوئی کہ بیان نہیں ہوسکتی۔ قوال نے چاہا کہ آگے بڑھے، میں نے بار بار وہی شعر پڑھوایا، یہ کہ

لہ سیرالاولیاء صـ۲۰۰   ۲ہ سیرالاولیاء صـ۱۹۹

۳ہ سیرالاولیاء صـ۲۰۳

کرکے گریہ طاری ہوگیا۔ فرمایا اسکے بعد زیادہ دن نہیں گذرے کہ حضرت نے انتقال کیا۔[۱]

جماعت کا اہتمام اور بلند ہمتی

ضعف پیری اور سخت مجاہدات کے باوجود جماعت سے نماز پڑھنے کا بیحد اہتمام تھا۔ صاحب سیر الاولیا لکھتے ہیں:۔

"عمر شریف اسی سے متجاوز ہوگئی۔ جب بھی پانچوں وقت جماعت سے نماز پڑھنے کے لئے بالاخانہ سے (جو بہت بلند تھا) جماعت خانہ میں اتر کران درویشوں اور ساتھیوں کے ساتھ جو وہاں موجود ہوتے تھے جماعت کے ساتھ نماز ادا کرتے تھے۔ اس کبرسنی کے باوجود ہمیشہ روزہ رکھتے، کم افطار کرتے۔"[۲]

شریعت کی پابندی اور اتباع سنت کا اہتمام

حضرت خواجہ خود بھی اتباع سنت کا اہتمام بلیغ رکھتے تھے کہ بقول سعدیؒ

محال است سعدی کہ راہِ صفا
تواں رفت جز در پئے مصطفےٰ

اور اپنے اصحاب و خدام کو بھی بڑی تاکید فرماتے تھے۔ سنن کے علاوہ تاکید تھی کہ مستحبات و آداب تک فوت نہ ہوں۔ سیر الاولیاء میں آپ کا ارشاد منقول ہے:۔

استقامت می باید کہ بر متابعت	رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی پیروی
رسول علیہ السلام والصلوٰۃ باشد	واتباع پر مضبوطی و ثابت قدمی دکھانی
و ہیچ مستحبے و آدابے فوت نہ شود۔[۳]	چاہیئے اور کوئی مستحب اور ادب بھی فوت نہ ہونے پائے۔

---

[۱] فوائد الفواد ص۹۶
[۲] سیر الاولیاء ص۱۲۵
[۳] سیر الاولیاء ص۳۱۸

مشائخ کے لئے اور جس کو پیری مریدی کرنا ہو، شریعت کا علم ضروری سمجھتے تھے تاکہ اس سے کوئی عمل خلاف شریعت نہ صادر ہو۔ نہ دوسرے کو کسی خلاف شرع امر کی تلقین کرے۔ فرماتے ہیں:-

"پیر آں چناں باید کہ در احکام شریعت و طریقت و حقیقت عالم باشد و چوں ایں چنیں باشد او خود ہیچ نامشروع نہ فرماید[1]"	پیر ایسا چاہیئے کہ احکام شریعت و طریقت و حقیقت کا (ضروری) علم رکھتا ہو اور جب ایسا ہوگا تو وہ کسی خلاف شرع کام کے لئے نہ کہے گا۔

---

[1] فوائد الفواد ص ۱۴۷

باب پنجم

افادات و تحقیقات

علمی پایہ

حضرت خواجہؒ باطنی کمالات کے ساتھ علوم ظاہری میں بھی بلند پایہ رکھتے تھے، اپنے زمانہ کے تمام مروجہ علوم کو بلند ہمتی، محنت اور اہتمام سے پڑھا تھا، ان کے اساتذہ میں اس عہد کے نامور ترین فضلا اور شیوخ ہیں، ادب اور علوم دینیات کی تعلیم انھوں نے مستوفی الممالک شمس الملک مولانا شمس الدین خوارزمی سے پائی تھی، حدیث کا درس مولانا کمال الدین زاہد محمد ابن احمد ماریکلی سے لیا جو صاحب مشارق الانوار امام حسن ابن محمد الصغانی کے شاگرد اور بیک واسطہ صاحب ہدایہ کے شاگرد تھے۔ کچھ کتابوں کو شیخ کبیر حضرت فرید الدین گنج شکرؒ سے پڑھ کر علم میں مزید جلا حاصل کی۔

علمی و ادبی مناسبت

اگرچہ اپنی مناسبت فطری اور شیخ کی نسبت باطنی کے اثر سے روز بروز الفاظ کے مقابلہ میں معانی اور معانی کے مقابلہ میں حقائق و احوال اور "اسم" سے زیادہ "مسمیٰ" میں مشغولیت بڑھتی گئی، پھر بھی علم و ادب سے مناسبت اور علمی ذوق آخر تک قائم رہا۔

سیر الاولیاء میں ہے کہ مولانا رکن الدین چغر نے کشاف اور مفصل اور ان کے علاوہ بعض کتابیں حضرت سلطان المشائخ کی خاطر نقل کر کے خدمت میں پہنچائیں۔ یہ دونوں کتابیں مشہور معتزلی فاضل علامہ محمود جار اللہ

---

[1] سیر الاولیاء ص ۲۱۷

زمخشری (متوفی ۵۳۸ھ) کی تصنیف ہیں۔ پہلی کتاب تفسیر میں ہے اور دوسری نحو میں، اس سے بھی آپ کے علمی ذوق اور وسعت نظر کا اندازہ ہوتا ہے۔ اسی سیر الاولیاء میں ہے کہ سید خاموش ابن سید محمد کرمانی مجلس خلوت میں "خمسۂ نظامی" حضرت خواجہؒ کی خدمت میں پڑھتے تھے[۱]۔ آپ کا ادبی ذوق اتنا بلند اور پاکیزہ تھا کہ امیر خسرو جیسے سرآمد روزگار شاعر (جو اپنے طرز میں بے نظیر اور فارسی کے صف اوّل کے شعراء میں ہیں) کو شاعری میں مشورہ دیا اور رہنمائی فرمائی۔ سیر الاولیاء میں ہے کہ ابتدا میں امیر خسرو جو غزل کہتے تھے اس کو حضرت سلطان المشائخ کی خدمت میں نظر اصلاح پیش کرتے تھے۔ ایک روز حضرت نے ان سے کہا کہ صفاہانیوں کے طرز میں کہا کرو[۲]۔

حدیث و فقہ پر نظر

سلطان غیاث الدین تغلق کے دربار میں جو مجلس مناظرہ ہوئی تھی اس میں حضرت خواجہؒ نے مسئلہ پر جو تقریر اور اس کی تنقیح فرمائی اس سے بھی حضرت کے علمی مرتبہ اور وسعت نظر کا اندازہ ہوتا ہے۔

ہندوستان میں حضرت شیخ عبدالحق محدث دہلویؒ کے عہد سے پہلے کتب صحاح متداول نہیں ہوئی تھیں اور صحیحین تک سے لوگ زیادہ مانوس اور آشنا نہیں تھے۔ حدیث میں مشارق الانوار اور مشکوٰۃ سرمایۂ علمی اور حدیث کا منتہی سمجھی جاتی تھی[۳]۔ بکثرت موضوع اور ضعیف احادیث صوفیوں کی زبان پر جاری اور بزرگوں کے ملفوظات مجالس میں بے تکلف منقول ہیں۔ نقد حدیث اور موضوعات کا علم علامہ محمد طاہر پٹنی سے پہلے یہاں نظر نہیں آتا۔ حضرت خواجہؒ کے ملفوظات اور سوانح سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ ایسی بہت سی بے اصل روایات سے (جو زبان زد خلائق ہیں) استدلال نہیں فرماتے تھے اور آپ کی اس پر نظر تھی کہ احادیث صحیحہ کا سب سے مستند مجموعہ صحیحین ہیں۔ فوائد الفواد میں ہے کہ کسی نے دریافت کیا کہ یہ

---

[۱] سیر الاولیاء ص ۲۱۹ [۲] سیر الاولیاء ص ۳۰۱

[۳] تفصیل کیلئے ملاحظہ ہو "الثقافۃ الاسلامیۃ فی الھند" کا باب حدیث۔ ۱۲

حدیث کیسی ہے: السخی حبیب اللہ وان کان کافراً" فرمایا: کسی کا مقولہ ہے، ایک شخص نے عرض کیا کہ:۔ یہ اربعین (چہل حدیث) کی حدیث ہے۔ فرمایا:۔ جو کچھ صحیحین میں ہے وہ صحیح ہے۔[۱]

اہمیتِ علم | اپنے مشائخ کرام کی طرح آپ کی نظر میں بھی علم کی بڑی اہمیت اور عظمت تھی اور اسکو سالکین اور ان لوگوں کیلئے جو ارشاد و تربیت کا کام کریں آپ بہت ضروری سمجھتے تھے۔

---

[۱] فوائد الفواد صد ۱۰۳

اس موقعہ پر اس کا اظہار ضروری ہے کہ باوجود اسکے کہ آپ صحیحین کے مرتبہ سے واقف تھے لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ صحاح ستہ کے عام طور پر اور صحیحین کے خاص طور پر ہندوستان میں متداول نہ ہونے کی وجہ سے ان علماء و مشائخ کا اشتغال نہیں تھا خود آپنے بھی (اگر مجلس مناظرہ کی روداد صحیح ہے) مجلس مناظرہ میں جن حدیثوں کو حلت سماع کی دلیل کے طور پر پیش کیا ہے وہ صحاح کی احادیث نہیں ہیں اور محدثین کے نزدیک ان کا پایہ کچھ بلند نہیں ہے فریق مقابل کے علماء نے بھی جو اکابر علماء اور اعیان قضاۃ میں سے تھے جس طرح گفتگو اور استدلال کیا ہے اس سے علمِ حدیث سے نہ صرف ان کی بے خبری کا ثبوت ملتا ہے بلکہ ایک عالم دین کو اسکے بارے میں جو رویہ اختیار کرنا چاہیئے اس کی کمی کا بھی احساس ہوتا ہے۔ کتب صحاح اور نقد حدیث اور جرح و تعدیل کے فن کے شائع نہ ہونے کی وجہ سے خانقاہوں میں بہت سی ایسی رسوم یہاں تک کہ سجدۂ تعظیمی رائج تھی اور بہت سے ایسے اوقات وایام کے فضائل کی روایات مشہور تھیں اور مشائخ کے ملفوظات میں ان کا بڑی آب وتاب سے ذکر آتا ہے۔ جن کا احادیث کے صحیح مجموعوں میں کوئی وجود نہیں اور محدثین ان پر سخت کلام کرتے ہیں اسکو پیش نظر رکھتے ہوئے حضرات محدثین اور ان مخلصین کی کوششوں کی قدر ہوتی ہے جنھوں نے ہندوستان میں فن احادیث کی اشاعت کی اور صحیح وضعیف احادیث میں امتیاز پیدا کیا۔ شکر اللہ مساعیھم

بنگال کے ایک نہایت عالی استعداد نوجوان جو بعد میں اخی سراج الدین کے نام سے مشہور ہوئے اور جو پنڈوہ کی مشہور عالم چشتی خانقاہ کے بانی اور سرِ حلقہ ہیں۔ لکھنوتی سے بہ نیت ارادت دہلی آئے، حضرت خواجہؒ کے مرید ہوئے۔ آپ نے مولانا فخرالدینؒ زرادی سے فرمایا کہ "یہ جوان بڑی قابلیت رکھتا ہے، اگر کچھ علم ظاہر بھی رکھتا ہوتا تو درویشی میں مستحکم ہوتا" یہ بات سنکر مولانا فخرالدین نے عرض کیا کہ:- اگر اجازت ہو تو میں اس کو کچھ عرصہ اپنی صحبت میں رکھکر ضروری مسائل یاد کرادوں۔ فرمایا کہ: یہ آپ کی صحبت کا بڑا مستحق ہے مولانا فخرالدین ان کو اپنے ساتھ لے گئے اور عرصۂ قلیل میں علم سے مناسبت پیدا کرادی۔ حضرت خواجہؒ کی وفات کے بعد بھی وہ تکمیلِ علم کے لئے کچھ عرصہ دہلی میں ٹھہرے رہے، پھر وطن واپس آگئے اور مشرق و بنگالہ میں سلسلہ چشتیہ کی اشاعت کا ذریعہ بنے[۱]

بلندِ علوم و مضامین

علم ظاہر و باطن کی اس جامعیت اخلاص اور تفکر و مجاہدات کی بنا پر آپ کو ان بلند اور صحیح علوم اور حقائق و معارف سے حصۂ وافر ملا جو اولیاء کاملین اور کبار مخلصین ہی کو ملا کرتا ہے اور جو صفائے باطن، طہارت اخلاق اور اخلاص کا نتیجہ ہے اور جس کو اہلِ تصوف علومِ لدنیہ سے تعبیر کرتے ہیں۔ صاحبِ سیرالاولیاء لکھتے ہیں کہ کسی علم میں گفتگو ہوتی یا کوئی اشکال پیش آتا، آپ اپنے نورِ باطن سے ان کا جواب شافی عطا فرماتے ؎

اے لقائے تو جوابِ ہر سوال
مشکل از تو حل شود بے قیل و قال

آپ اس مسئلہ پر ایسی بلیغ تقریر فرماتے کہ تمام حاضرینِ مجلس حیرت میں رہ جاتے اور ایک دوسرے سے کہتے کہ یہ کتابی جوابات نہیں ہیں۔ یہ الہامِ ربانی اور علمِ لدنی کے فیوض ہیں، اسی بنا پر شہر کے چوٹی کے علماء جو تصوف کے منکر اور اہلِ تصوف کے مخالف مشہور تھے حضرت خواجہؒ کے حلقہ بگوش اور اپنے علمی غرور اور زعم پر نادم ہوئے اور آپ کے خدام اور ارادتمندوں میں شامل ہوگئے۔

[۱] سیرالعارفین وغیرہ ۱۲۰۔

علومِ صحیحہ شرعیہ

اس علمی رسوخ، اتباعِ سنّت اور استقامت علی الشریعت نے آپ کے ذہن کو ایسا سلیم اور مستقیم بنا دیا تھا کہ اہلِ تصوّف میں جو باتیں عرصۂ دراز سے ظاہرِ شریعت کے خلاف چلی آتی تھیں اور بہت جگہ اہلِ تصوّف کا شعار بن گئی تھیں، آپ اپنی سلامتیٔ ذہن سے اُن کو قبول نہیں کرتے تھے اور آپ کا ذوق اور تحقیق اُن کے خلاف تھی۔

تصوّف کے حلقوں میں بہت عرصہ سے اس خیال کا اظہار ہو رہا تھا کہ ولایت نبوت سے افضل اور اولیار کو انبیار پر فضیلت حاصل ہے اسلئے کہ ولایت عبارت ہے حضرت حق کے ساتھ مشغولیت اور ماسوی اللہ سے انقطاع سے اور نبوت میں (دعوت وتبلیغ کی وجہ سے) مخلوق کے ساتھ مشغولی ہوتی ہے، پھر اس میں کئی مذہب پیدا ہوگئے اور کسی نے یہ تاویل کی کہ انبیار کی ولایت ان کی نبوت سے افضل ہے، لیکن آپ اسکو تسلیم نہیں کرتے۔ فوائد الفواد میں ہے کہ حضرت خواجہؒ نے فرمایا کہ: "یہ مذہب باطل ہے، اس سبب سے کہ اگرچہ انبیار مخلوق کے ساتھ مشغول ہوتے ہیں لیکن جس وقت کہ وہ حق کے ساتھ مشغول ہوتے ہیں اس مشغولیت کا قلیل سے قلیل زمانہ بھی اولیار کے تمام اوقات پر فضیلت رکھتا ہے"[۲]

حلال مانع راہ خدا نہیں

تصوّف کے متعلق عام طور پر یہ سمجھا اور مشہور کیا گیا ہے کہ تصوّف تعطّل اور بیکاری و بےعملی کا نام ہے اور ہر اشتغال وصول اللہ سے مانع

---

[۱] سیر الاولیار صفحہ ۱۳۰

[۲] فوائد الفواد صفحہ ۱۲۰ امام ربّانی حضرت مجدّد الف ثانی رحمہ نے اتنا مزید اضافہ کیا کہ انبیاء عین مشغولی بخلق کی حالت میں بھی اولیار سے (عین اس وقت جب وہ حق کے ساتھ مشغول ہوتے ہیں) زیادہ متوجہ الی اللہ اور مشغول باللہ ہوتے ہیں) ان کی مشغولیت بخلق چونکہ حکم الٰہی سے ہوتی ہے اسلئے وہ عین مشغولیت بحق اور امر الٰہی کا امتثال ہوتا ہے۔ ۱۲

اور راہِ سلوک کا رہزن ہی۔ حضرت خواجہ معرفت و تحقیق کے جس مقام پر فائز تھے اور رسائل و رسوم سے بلند ہو کر مقاصد اور لب لباب پر جس طرح آپ کی نظر تھی اس کا مقتضا یہ تھا کہ آپ اس مقام سے آگے بڑھ چکے تھے اور فعل حلال و مشروع کی نورانیت اور اس کا ذریعۂ قرب ہونا آپ کی نظر میں تھا حضرت خواجہ سیّد محمد گیسو دراز کے ملفوظات "جوامع الکلم" میں ہے کہ حضرت خواجہ نظام الدین نے فرمایا:۔

ہیچ کسے (چیزے) کہ حلال است مانع	کوئی چیز جو حلال ہے راہ خدا کی مانع
راہ خدائی نیست و قاطع سلوک نیست	اور قاطع سلوک نہیں ورنہ مشروع و
دگرنہ مشروع و حلال نبودی[1]	حلال نہ ہوتی۔

قلب متوجہ الی اللہ کے لبعد کوئی چیز مضر نہیں

ایک مرتبہ ارشاد فرمایا کہ خدا کی طرف متوجہ دل اور پاک نفس چاہیئے اسکے بعد جس کام میں رہنا ہو رہو، تمھیں کوئی نقصان نہ ہوگا۔[2]

ترکِ دُنیا کی حقیقت

ترکِ دنیا اور حقیقی زہد و درویشی کی حقیقت بیان کرتے ہوئے ایک مرتبہ ارشاد فرمایا:۔

ترکِ دنیا آں نیست کہ کسے خود را	ترکِ دنیا کے معنی یہ نہیں میں کہ کوئی
برہنہ کند مثلاً لنگوٹہ بابند د و بنشیند،	اپنے کو ننگا کر دے مثلاً لنگوٹہ باندھ کر
ترکِ دنیا آں است کہ لباس بپوشد	بیٹھ جائے، صحیح معنی میں ترکِ دنیا یہ
و طعام بخورد و آنچہ برسد روا دارد	ہے کہ کپڑے پہنے، کھانا کھائے اور
و بجمع او میل نکند و خاطر را متعلق	جو کچھ میسّر آئے اُس کو استعمال کرے،

---

[1] جوامع الکلم ص ۱۶۰ [2] یعنی مشروع وجوہ معاشی اور ظاہری مشاغل وغیرہ۔ [3] سیر الاولیاء ص ۱۶۰

بہ چیزے ندارد ترک دنیا است[1] لیکن اسکے جمع کرنے کی طرف متوجہ نہ ہو اور
اپنے دل کو کسی چیز میں پھنسائے نہیں یہی ترک دنیا ہے

طاعت لازم و متعدی

فرمایا:- طاعت کی دو قسمیں ہیں لازم اور متعدی۔ طاعتِ لازمی اسے کہتے ہیں جس کی منفعت طاعت کرنے والے کو پہنچے، جیسے نماز، روزہ، حج، اوراد و تسبیحات وغیرہ۔ طاعت متعدی وہ ہے جس کی منفعت اور راحت دوسرے کو پہنچے، مثلاً دو مسلمانوں میں اتفاق کرا دینا، شفقت، دوسروں کے ساتھ مہربانی وغیرہ، اس کو طاعت متعدی کہتے ہیں اور اس کا ثواب بے حد و بے اندازہ ہے۔

طاعتِ لازمی کی قبولیت کے لئے بڑے اخلاص کی ضرورت ہے اور طاعتِ متعدی جس طرح بھی کرے گا ثواب ملے گا[2]۔

کشف و کرامات حجابِ راہ

ارشاد ہوا کہ اولیاء سے جو کچھ اظہار ہوتا ہے وہ ان کی سکر و مستی کا نتیجہ ہے، اسلئے کہ وہ اصحاب سکر ہیں، اسکے برخلاف انبیاء اصحاب صحو ہیں، سالک کیلئے کشف و کرامات حجابِ راہ ہیں، محبت سے استقامت پیدا ہوتی ہے[3]۔

علومِ انبیاء و اولیاء

فرمایا کہ:- تین مرتبے ہیں- ایک مرتبہ جس کو طورِ حس کہنا چاہئے، دوسرا طورِ عقل اور تیسرا طورِ قدس۔ طورِ حس میں مطعومات (کھانے پینے کی چیزیں) مشمومات (جن کی خوشبو محسوس ہوتی ہے) وغیرہ محسوسات معلوم ہوتی ہیں، اسکے بعد طورِ عقل ہے اس کا تعلق دو علموں سے ہے کسبی اور بدیہی، لیکن عالم قدس میں پہنچ کر عقل سے حاصل کئے ہوئے کسبی علوم بھی بدیہی معلوم ہونے لگتے ہیں- پھر فرمایا کہ بدیہی بھی علمِ قدس نہیں ہو کسبی کا کیا ذکر؟ وہ انبیاء و اولیاء کے علوم ہیں- اسکے بعد فرمایا کہ جس پر عالمِ قدس کا دروازہ کھلتا ہے اسکی علامت کیا ہو سکتی ہے؟ جو شخص

---

[1] فوائد الفواد ج ۱ ص۶ [2] ایضاً ج ۱ ص۱۴۱ [3] فوائد الفواد ج ۱ ص۳۳

عالمِ عقل میں ہوتا ہے اور وہ کسی مسئلہ کو بدیہی یا کسبی علم سے حل کرتا ہے اور اس سے اس کو ایک فرحت حاصل ہوتی ہے وہ عالمِ قدس میں راہ نہیں پاتا۔ اس درمیان میں کسی بزرگ کا واقعہ بیان کیا کہ وہ فرماتے تھے کہ غیب سے کچھ علوم اور واردات دل پر گذرتے ہیں انشاء اللہ ان کو قلم بند کروں گا، اسکے بعد بہت کچھ لکھا۔ پھر فرمایا کہ بہت کچھ لکھا گیا لیکن جو کچھ مقصود تھا وہ ضبطِ تحریر میں نہیں آسکا[1]۔

دنیا کی محبّت اور عداوت ایک دن اس کا ذکر ہورہا تھا کہ کسی کو دنیا کی محبت ہوتی ہے اور کسی کو اس سے نفرت۔ فرمایا کہ:۔ تین طرح کے لوگ ہیں جو دنیا کو دوست رکھتے ہیں اور دن رات اس کی یاد اور فکر میں رہتے ہیں ایسے لوگ بہت ہیں۔ کچھ دوسرے لوگ ہیں جو دنیا سے نفرت کرتے ہیں اور اس کا حقارت کے ساتھ ذکر کرتے ہیں اور ہمیشہ اسکی دشمنی میں رہتے ہیں۔ تیسری قسم ان لوگوں کی ہے جن کو نہ دنیا سے محبت ہوتی ہے نہ نفرت اور اس کا ذکر محبت یا عداوت کے ساتھ نہیں کرتے، یہ پہلی دونوں قسموں سے بہتر ہے۔ اس کے بعد آپنے حکایت سنائی کہ:۔ ایک شخص حضرت رابعہ بصریؒ کے پاس آیا اور دنیا کی سخت مذمت کرنے لگا۔ حضرت رابعہ بصریؒ نے اس سے کہا کہ:۔ برائے مہربانی آپ اسکے بعد نہ آئیے گا۔ آپ کو دنیا سے محبت معلوم ہوتی ہے اس لئے کہ آپ اسکا بہت ذکر کرتے ہیں[2]۔

مراتبِ تلاوتِ قرآن ایک مرتبہ آپنے تلاوت قرآن پاک کے مراتب اس طرح بیان فرمائے کہ: پہلا مرتبہ یہ ہے کہ جو کچھ پڑھے اسکے معانی دل پر گزارے۔ دوسرا مرتبہ یہ ہے کہ پڑھنے والے کا دل حق تعالیٰ کے ساتھ متعلق و مشغول ہو۔

فرماتے کہ قرآن پڑھتے ہوئے تو کم از کم اس شعور کو ہر شخص میں ہونا چاہیئے کہ میں اس نعمت کے

---

[1] فوائد الفواد ج ۱ ص ۶۹ [2] ایضاً ج ۱ ص ۱۸۹

لائق کہاں تھا اور میرے نصیب ایسے کہاں تھے کہ مجھے یہ دولت ملے، اگر یہ سب حاصل نہ ہو تو پڑھنے پر جس ثواب اور جزا کا وعدہ ہے اسکو ذہن میں تازہ اور مستحضر رکھا جائے[۶]۔

اگرچہ حضرت خواجہؒ نے جیسا کہ انھوں نے کئی بار ارشاد فرمایا کوئی تصنیف نہیں کی، لیکن آپ کی سب سے بڑی تصنیفات آپ کے تربیت کئے ہوئے اور آپ کی صحبت پائے ہوئے وہ خلفائے کبار اور اصحابِ نامدار ہیں جو عملِ صحیح اور علمِ صحیح کا نمونہ تھے اور جن کے دل کی راستی علم کی گہرائی اور فہم کی پختگی "راسخین فی العلم" کے شایانِ شان تھی۔ امیر حسن علاء سنجری کی فوائد الفواد اور امیر خورد کی سیر الاولیاء میں آپ کے بہت سے اقوال و ملفوظات منقول ہیں جو آپ کی شانِ تحقیق کا مظہر ہیں۔

---

۵ فوائد الفواد ص۱۷

۶ فوائد الفواد ص۴۵ و خیر المجالس ص۳۵

باب ششم

فیوض و برکات

تجدید ایمان و توبۂ عام

قبل اس کے کہ اُن فیوض و برکات کا ذکر کیا جائے جو حضرت خواجہ نظام الدینؒ کے ساتھ تعلق اور ان کے ہاتھ پر توبہ و بیعت کے ذریعہ لاکھوں مسلمانوں کو پہنچے، اور ایک ایسے زمانہ میں جب مسلمانوں کی حکومت اپنے پورے عروج پر تھی اور غفلت، خدا فراموشی اور نفس پرستی کے اسباب و محرکات پورے شباب پر تھے، ایک ایسی دینی اور روحانی لہر پیدا ہوئی جس کو ہر محسوس کرنے والے نے محسوس کیا۔ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ مشائخ طریقت کی بیعت عام اور ارشاد و تلقین توبہ کی حکمت اور ضرورت بیان کر دی جائے، تاکہ معلوم ہو کہ کن حالات و ضروریات کے ماتحت اس طریقے کو اختیار کیا گیا اور اس سے کیا دینی فوائد پہنچے، راقم سطور نے تاریخ دعوت و عزیمت کے حصۂ اول میں حضرت سیدنا عبدالقادر جیلانیؒ کے تذکرہ کے ضمن میں جو کچھ لکھا تھا پہلے اسی کو کسی قدر اختصار و ترمیم کے ساتھ نقل کیا جاتا ہے:۔

"خیر القرون کے بعد اسلامی آبادی کا پھیلاؤ اور زندگی کی ذمہ داریاں اور

معاشی تفکرات اتنے بڑھ گئے تھے کہ خصوصی تعلیم و تربیت کے ذرائع سے عمومی اصلاح و تربیت کا کام نہیں لیا جاسکتا تھا اور کسی بڑے پیمانہ پر کسی دینی اور روحانی انقلاب کی توقع نہیں کی جاسکتی تھی، پھر اس کی کیا صورت تھی کہ مسلمانوں کی بڑی تعداد اپنے ایمان کی تجدید کرے، دینی ذمہ داریوں و پابندیوں کو اور شعور و احساس ذمہ داری کیساتھ دوبارہ قبول کرے، اس میں پھر اپنی ایمانی کیفیات اور دینی جذبات پیدا ہوں، اُسکے افسردہ و مردہ دل میں پھر محبت کی گرمی پیدا ہو اور اُسکے مضمحل قویٰ میں پھر حرکت و نشاط پیدا ہو، اسکو کسی مخلص خداشناس پر اعتماد ہو اور اس سے وہ اپنے امراض روحانی و نفسانی میں علاج اور دین کی صحیح روشنی اور رہنمائی حاصل کرے۔ ناظرین کو اس کا اندازہ ہو چکا ہے کہ اسلامی حکومتیں جن کا یہ اصلی فرض تھا اسلئے کہ جس نبی کی نیابت و نسبت پر وہ قائم تھیں بقول سیدنا عمر بن عبدالعزیزؒ وہ ہدایت کیلئے مبعوث ہوا تھا (جبایت "تحصیل وصول" کے لئے نہیں) نہ صرف اس فریضہ سے غافل اور کنارہ کش ہو چکی تھیں بلکہ اپنے سربراہوں اور عمّالِ حکومت کے اعمال و کردار کے لحاظ سے اس کام کیلئے مضر اور اس کے راستہ میں مزاحم تھیں، دوسری طرف وہ اس قدر بدگمان، توہّم پرست اور شکّی واقع ہوئی تھیں کہ کسی نئی تنظیم اور نئی دعوت کو جس میں قیادت و سیادت کی آمیزش پائیں برداشت نہیں کرسکتی تھیں۔ اسکو وہ فوراً کچل کر رکھ دیتیں۔ ایسی صورت میں مسلمانوں میں نئی دینی زندگی، نیا نظم و ضبط اور نئے سرے سے حرکت و عمل پیدا کرنے کیلئے اسکے علاوہ کیا شکل تھی کہ خدا کا کوئی مخلص بندہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے طریقے پر ایمان و عمل اور اتباعِ شریعت کیلئے بیعت لے اور مسلمان اس کے ہاتھ پر اپنی سابقہ غفلت و جاہلیت کی زندگی سے توبہ اور ایمان کی تجدید کریں اور پھر وہ نائب پیغمبر انکی دینی نگرانی

وتربیت کرے، اپنی کیمیا اثر صحبت، اپنے شعلۂ محبت، اپنی استقامت اور اپنے نَفَسِ گرم سے پھر ایمانی حرارت، گرمیٔ محبت، خلوص وللٰہیت، جذبۂ اتباعِ سنّت اور شوقِ آخرت پیدا کر دے، اُن کو اس نئے تعلق سے محسوس ہو کہ انھوں نے ایک زندگی سے توبہ کی ہے اور ایک نئی زندگی میں قدم رکھا ہے، اور کسی اللہ کے بندے کے ہاتھ میں ہاتھ دے دیا ہے، وہ بھی یہ سمجھے کہ ان بیعت کرنے والوں کی اصلاح وتربیت اور ان کی دینی خدمت اللہ نے میرے سپرد کی ہے اور اس محبت و اعتقاد کا مجھ پر نیا حق قائم ہو گیا ہے، پھر اپنے تجربوں و اجتہاد اور کتاب و سنت کے اصول و تعلیمات کے مطابق ان میں صحیح روحانیت و تقویٰ اور ان کی زندگی میں ایمان و احتساب و اخلاص اور ان کے اعمال و عبادات میں ایمانی کیفیات اور روح پیدا کرنے کی کوشش کرے، یہی حقیقت ہے اس بیعت تربیت کی جس سے دین کے مخلص داعیوں نے اپنے اپنے وقت میں احیاء و تجدیدِ دین اور اصلاح مسلمین کا کام لیا ہے اور لاکھوں بندگانِ خدا کو حقیقتِ ایمان اور درجۂ احسان تک پہنچا دیا ہے[۱]۔"

بیعت ایک عہد و معاہدہ یہ بیعت پچھلے گناہوں سے توبہ اور خدا و رسول کے احکام کی تعمیل اور اتباعِ شریعت کا ایک معاہدہ ہوتا تھا۔ سلطان المشائخؒ بیعت لیتے وقت بیعت کرنے والے سے کیا الفاظ کہلواتے تھے اور آئندہ کیلئے اس سے کیا عہد لیتے تھے کسی تذکرہ میں اسکے صحیح الفاظ نظر سے نہیں گزرے، لیکن حضرت خواجہ نے خود اپنے شیخ و مرشد شیخ کبیر حضرت خواجہ فریدالدین گنج شکرؒ کے بیعت لینے کا طریقہ اور ان کی تلقین کا ذکر کیا ہے اور ان کو اپنے شیخ سے جو والہانہ تعلق اور ان کی پیروی کا جو جذبہ تھا، اس سے یہی قیاس کیا جا سکتا ہے

[۱] تاریخِ دعوت و عزیمت حصۂ اوّل ص۲۰۲

کہ وہ بھی اسی طرح اپنے نئے مریدین کو تلقین فرماتے ہوں گے - ارشاد ہے:-

"جب کوئی شخص شیخ شیوخ العالم فرید الدین والحق کی خدمت میں بہ نیت ارادت آتا فرماتے پہلے ایک بار سورۂ فاتحہ اور سورۂ اخلاص پڑھو، اسکے بعد سورۂ بقر کا آخری رکوع آمن الرسول سے آخر تک پڑھتے، اسکے بعد شھد اللہ انہ لا الٰہ الا ھو ...... ان الدین عند اللہ الاسلام تک پڑھتے، اسکے بعد فرماتے کہ تم نے بیعت کی اس ضعیف کے ہاتھ پر، اسکے شیخ اور شیخ کے مشائخ کے ہاتھ پر اور حضرت پیغمبر علیہ الصلوٰۃ والسلام کے دستِ مبارک پر اور حضرت عزت (جل مجدہٗ) سے عہد کیا کہ اپنے ہاتھ پاؤں اور آنکھوں کی حفاظت اور شریعت کے راستہ اور طریقے پر قائم رہو گے[1]"

بیعت کی اس تلقین میں اسلام کے بنیادی عقائد آگئے، سمع وطاعت (سننے اور ماننے) کا وعدہ اور ارادہ بھی آگیا، یہ بات بھی آگئی کہ اللہ کے یہاں قابلِ قبول دین صرف دینِ اسلام ہے اس کا احساس بھی پیدا اور تازہ کردیا گیا کہ یہ بیعت دراصل دستِ مبارک نبوی پر ہے اور شیخ کا ہاتھ اس دستِ مبارک کا قائم مقام ہے۔ ربّ العزت سے اس کا بھی عہد کیا گیا کہ ہاتھ پاؤں اور آنکھوں کی معصیتوں سے حفاظت کی جائے گی اور راہِ شریعت پر قائم رہا جائیگا۔ تجدیدِ ایمان اور خدا و رسول سے اپنا پرانا عہد استوار کرنے کا اس سے بہتر اور عام فہم طریقہ کیا ہو سکتا ہے؟ یہ تو نہیں کہا جاسکتا کہ بیعت کرنے والے سو فی صدی اس عہد پر قائم رہتے تھے لیکن اس میں کوئی شبہ نہیں کہ بیعت کرنے والوں میں سے ایک بڑی تعداد اس اقرار اور عہد کی شرم اور لاج رکھتی اور ہزاروں اور لاکھوں بندگانِ خدا کے لئے یہ تجدیدِ ایمان اور انقلابِ حال کا ذریعہ بن جاتی۔

---

[1] سیر الاولیاء ص ۳۲۳

عمومِ بیعت کی حکمت

بیعت و ارشاد میں ان حضرات نے جو وسعت و اذنِ عام فرما رکھا تھا اور جس طرح بغیر کسی امتحان اور امتیاز کے لوگوں کو اجازت تھی کہ وہ بیعت کریں اور حلقۂ ارادت میں داخل ہو جائیں، خاص طور پر حضرت خواجہ کے یہاں اس باب میں جو وسعت و رعایت تھی، اس پر بعض لوگوں کو یہ کھٹک پیدا ہو سکتی ہے کہ جب بیعت ایک معاہدہ ہے اور اس کا تعلق پوری زندگی سے ہے تو اس میں اتنی وسعت کیوں روا رکھی گئی ہے؟ حضرت خواجہ نے ایک موقع پر خود ہی اس اشکال کا جواب دیا ہے اور اس عمومیت کی حکمت بیان کی ہے۔

مولانا ضیاء الدین برنی (مصنفِ تاریخ فیروز شاہی) فرماتے ہیں کہ میں ایک دن حضرت سلطان المشائخ کی خدمت میں حاضر تھا، اشراق سے چاشت تک آپ کی روح پرور جان نواز باتیں سنتا رہا، اس روز خاص طور پر بہت کثرت سے لوگ بیعت ہوئے، یہ دیکھ کر میرے دل میں آیا کہ مشائخ متقدمین نے مرید کرنے میں بڑی احتیاط سے کام لیا ہے۔ سلطان المشائخ نے اپنی فیاضی و عنایت سے اس کا اذن عام دے دیا ہے اور آپ خاص و عام سب کو مرید کر لیتے ہیں، میں نے چاہا کہ میں اس بارے میں سوال کروں سلطان المشائخ اپنے کشف سے میرے خطرے پر مطلع ہو گئے، فرمایا:۔

"مولانا ضیاء الدین! تم ہر طرح کی باتیں پوچھتے ہو، یہ نہیں پوچھتے کہ میں بغیر تحقیق کے آنے والوں کو کیوں مرید کر لیتا ہوں؟"

یہ سنکر مجھ پر لرزہ سا طاری ہو گیا اور میں نے آپ کے قدم لیکر عرض کیا کہ ایک عرصے سے میرے دل میں یہ اشکال تھا آج بھی یہ وسوسہ آیا تھا، اللہ نے آپ کے دل میں یہ بات ڈال دی، حضرت نے فرمایا:۔

"حق تعالیٰ نے ہر زمانہ میں اپنی حکمتِ بالغہ سے ایک خاصیت رکھی ہے، اس کا نتیجہ یہ ہے کہ ہر زمانہ کے لوگوں کی راہ و رسم اور عادتیں الگ ہوتی ہیں اور ان کے مزاج و طبیعت پچھلے لوگوں کے اخلاق و طبائع سے میل نہیں کھاتے، تھوڑے لوگ اس سے

مستثنیٰ ہوتے ہیں اور یہ ایک تجربہ کی بات ہے۔ ارادت کی اصل یہ ہے کہ مرید ماسوی اللہ سے منقطع اور مشغول مع اللہ ہو جائے، جیسا کہ کتبِ تصوف میں تفصیل کے ساتھ درج ہے۔ مشائخ متقدمین جب تک طالبِ ارادت میں انقطاعِ کلی نہ دیکھ لیتے بیعت کا ہاتھ نہیں بڑھاتے تھے، لیکن سلطان ابو سعید ابوالخیر کے عہد سے لیکر شیخ سیف الدین باخرزی کے زمانے تک اور شیخ الشیوخ شیخ شہاب الدین سہروردی سے لیکر شیخ شیوخ العالم فرید الحق والدین قدس سرہ العزیز کے وقت تک کہ یہ سب حضرات سرآمد روزگار اور آیۃ من آیات اللہ تھے، خلقِ خدا کا ان کے دروازوں پہ ہجوم ہوا اور ہر طبقہ کے لوگوں نے اژدحام کیا، ان بندگانِ خدا نے آخرت کی ذمہ داریوں سے ڈر کر ان عاشقانِ خدا کا دامن تھامنا چاہا اور ان مشائخ کبار نے بھی خاص و عام کو اپنی بیعت میں قبول کیا، اور خرقہ، توبہ و تبرک عطا کیا، ہر شخص ان محبوبانِ خدا کے معاملات پر اپنے کو قیاس نہیں کر سکتا کہ شیخ ابوسعید، شیخ سیف الدین باخرزی، شیخ شہاب الدین سہروردی اور شیخ شیوخ العالم فرید الحق والدین قدس اللہ اسرارہم نے جس طرح لوگوں کو مرید کیا، میں بھی مرید کروں اس لئے کہ اگر خدا کا کوئی محبوب گناہگاروں میں سے ایک عالم کو اپنے دامن عاطفت میں لے لے تو لے سکتا ہے — اب میں تمہارے سوال کا جواب لیتا ہوں کہ میں مرید کرنے میں کیوں زیادہ احتیاط سے کام نہیں لیتا اور اپنا اطمینان نہیں کرتا ایک وجہ تو یہ ہے کہ میں علی سبیل التواتر سُن رہا ہوں کہ بہت سے مرید ہونے والے معصیت سے تائب ہو جاتے ہیں، نماز باجماعت ادا کرنے لگتے ہیں اور اوراد و نوافل میں مشغول ہو جاتے ہیں، اگر میں بھی شروع ہی سے اس بات کی شرط کروں کہ ان میں ارادت کی حقیقت یعنی انقطاعِ کلی پایا جاتا ہے کہ نہیں، اور ان کو توبہ و تبرک کا خرقہ (جو خرقہ،

ارادت کی جگہ یہ ہے) نہ دوں تو وہ خیر کی اس مقدار سے بھی جو ان اللہ کے بندوں سے وجود میں آ رہی ہے محروم ہو جائیں گے، دوسرا سبب یہ ہے کہ بغیر اسکے کہ میرے دل میں خیال آئے یا میں اسکی درخواست اور التماس کروں یا کوئی وسیلہ اور سفارش اختیار کروں شیخ کامل و مکمل (شیخ کبیر) نے مجھے بیعت لینے کی اجازت دی ہے میں دیکھتا ہوں کہ ایک مسلمان بڑی عاجزی و درماندگی اور بڑی مسکنت و بیچارگی کے ساتھ میرے پاس آتا ہے اور کہتا ہے کہ میں نے تمام گناہوں سے توبہ کی، میں یہ سمجھ کر کہ شاید اسکی بات سچ ہو، اسکو بیعت کر لیتا ہوں، خاص طور پر اسلئے کہ بہت سے معتبر لوگوں سے سنتا ہوں کہ بہت سے بیعت کرنے والے اس بیعت کی وجہ سے معاصی سے باز آ جاتے ہیں[1]"

عمومی زندگی پر اثر

اس بیعت و تعلق کا جس سے مسلمانوں کے ہر طبقہ کے لوگ یکساں مستفیض ہوئے، عام زندگی و معاشرت، لوگوں کے اخلاق و عادات، اشغال و اوقات اور اہلِ حکومت سے لیکر اہلِ حرفہ تک کے حالات پر کیا اثر پڑا، اور دار الحکومت دہلی میں جو شوکت، قوت دولت و ثروت اور عیش و عشرت کا گہوارہ تھا اور مال غنیمت اور سینکڑوں ہزاروں برس کے خزانوں کے زر و جواہر، صناعوں کی مصنوعات اور ملک کے اطراف و جوانب کے تحائف و عجائبات روزانہ سیلِ رواں کی طرح وہاں امنڈ رہے تھے۔ دینداری، خدا طلبی، عشقِ الٰہی، توبہ و انابت اور رجوع الی اللہ صفائی معاملات، راست گفتاری اور دیانت داری کی کیا کیفیت پیدا ہو گئی تھی اس کی تفصیل اُس عہد کے صاحبِ نظر اور معتبر مؤرخ ضیاء الدین برنی کی زبان سے سنیئے وہ سلطان علاء الدین خلجی کے زمانہ کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں[2]:-

---

[1] سیر الاولیاء ص ۳۴۶ و ص ۳۴۸ بحوالہ حسرت نامہ مولانا ضیاء الدین برنی [2] تاریخ فیروز شاہی کے اقتباس کا یہ ترجمہ سید صباح الدین عبد الرحمٰن ایم اے (رفیق دار المصنفین) کی کتاب "بزمِ صوفیہ" سے حذف و اختصار کیساتھ نقل کیا گیا ہے۔ ص ۱۹۹ و ص ۲۰۲

"سلطان علاء الدین کے زمانہ کے مشائخ میں سے سجادۂ تصوف شیخ الاسلام نظام الدین شیخ الاسلام علاء الدین اور شیخ الاسلام رکن الدین سے آراستہ تھا، ایک دنیا اُن کے انفاسِ متبرکہ سے روشن ہوئی اور ایک عالم نے اُن کی بیعت کا ہاتھ پکڑا اور اُن کی مدد سے گناہگاروں نے توبہ کی اور ہزاروں بدکاروں اور بے نمازیوں نے بدکاریوں سے ہاتھ اٹھا لیا، اور ہمیشہ کے لئے پابندِ نماز ہوگئے اور باطنی طور پر دینی مشغلے کی طرف رغبت ظاہر کی اور توبہ صحیح ہوگئی اور عباداتِ لازمہ اور متعدیہ کا معمول ہوگیا، اور دنیا کی حرص و محبت جو انسانوں کے قواعد اور فرمانبرداری کی بنیاد ہے، ان مشائخ کے اخلاقِ حمیدہ اور ترک و تجرید کے معاملات کے دیکھنے سے دلوں سے کم ہوگئی اور سالکوں کو نوافل اور وظائف کی کثرت اور اوصافِ عبودیت کی پابندی سے کشف و کرامات کی آرزو دل میں پیدا ہونے لگی، اور ان بزرگوں کی عبادات و معاملات کی برکت سے لوگوں کے دلوں میں سچائی پیدا ہوگئی، اور ان کے مکارمِ اخلاق و مجاہدہ و ریاضت کے دیکھنے سے اللہ والوں کے دلوں میں اخلاق کے بدلنے کی خواہش پیدا ہوئی اور ان دینی بادشاہوں کی محنت اور اخلاق کے اثر سے خداوند تعالیٰ کے فیض کی بارش دنیا میں ہونے لگی اور آسمانی مصیبتوں کے دروازے بند ہوگئے اور ان کے زمانہ کے لوگ قحط و وبا کی مصیبت میں مبتلا اور گرفتار نہیں ہوئے اور ان کی مخلصانہ اور عاشقانہ عبادت گزاری کی برکت سے مغلوں کا فتنہ جو سب سے بڑا فتنہ تھا ایسا فرو ہوا اور یہ تمام ملاعین اس قدر آوارہ و تباہ ہوئے کہ اس سے زیادہ تباہ نہیں ہوسکتے تھے اور یہ تمام باتیں جو ان تینوں بزرگوں کے وجود سے ان کے معاصرین کو نظر آئیں، وہ شعارِ اسلام کی بلندی کا ذریعہ بن گئیں اور احکام شریعت و طریقت کو جو رونق و رواج حاصل ہوا اس کا کیا کہنا، کتنا عجیب زمانہ وہ تھا، جو سلطان علاء الدین کے آخری دس سال میں نظر آیا، ایک

طرف سلطان علاء الدین نے ملک کی بہتری کے لئے تمام منشی اور ممنوع چیزوں کو اور فسق و فجور کے اسباب کو قہر و غلبہ تعزیر و تشدد اور قید و بند سے روک دیا اور مال جو دینی اور ملکی فساد کا ذریعہ اور ہوا پرستوں کیلئے گناہوں کا آلہ اور حریصوں، بخیلوں اور تاجروں کیلئے سود، ذخیرہ اندوزی کا سامان اور فتنہ پردازوں کے لئے بغاوت کی استعداد اور نیکوں کے لئے کبر، مفاخرت، غفلت اور کسلمندی پیدا کرنے والا ہے اور عبادت گذاروں کے لئے نسیان و فراموشی کا باعث ہے، سلطان علاء الدین ہر بہانہ سے کہ جو اسکو ملتا مالداروں اور حکام سے سختی سے لے لیتا اور بازار والوں کو کہ دنیا کی تمام قوموں میں سب سے زیادہ جھوٹ بولنے والی اور سب سے زیادہ فریب کرنے والی قوم ہے سچائی اختیار کرنے، سچائی کے ساتھ مال بیچنے اور سچ کہنے کے لئے خون خرابہ میں رکھتا تھا۔

دوسری طرف اسی زمانہ میں شیخ الاسلام نظام الدین نے بیعت کا عام دروازہ کھول رکھا تھا، اور گناہگاروں کو خرقہ پہناتے اور ان سے توبہ کراتے تھے اور اپنی مریدی میں قبول کرتے تھے، اور خاص و عام، غریب و دولتمند، بادشاہ و فقیر، عالم و جاہل شریف و رذیل، شہری اور دیہاتی، غازی و مجاہد، آزاد و غلام، سب کو طاقیہ، توبہ اور پاکی کی تعلیم دیتے تھے اور یہ تمام لوگ چونکہ اپنے کو شیخ کا مرید سمجھتے تھے، بہت سے گناہوں سے باز آتے تھے، اور اگر شیخ کے کسی مرید سے لغزش ہو جاتی بھی تو پھر از سر نو بیعت کر لیتے، اور توبہ کا خرقہ عطا کرتے تھے اور شیخ کی مریدی کی شرم تمام لوگوں کو بہت سی ظاہری و باطنی برائیوں سے روک دیتی تھی اور عام طور پر لوگ تقلید و اعتقاد کی وجہ سے عبادت کی طرف رغبت کرتے تھے، مرد و عورت بوڑھے، جوان، بازاری، عامی، غلام اور نوکر سب کے سب نماز ادا کرتے تھے،

اور زیادہ تر مرید چاشت و اشراق کے پابند ہو گئے تھے آزاد اور نیک کام کرنے والوں نے شہر سے غیاث پور تک چند تفریحی مقامات پر چبوترے تعمیر کر دیئے تھے، چھپر ڈال دیئے تھے، کنوئیں کھدوا دیئے تھے، پانی سے بھرے ہوئے گھڑے اور مٹی کے لوٹے رکھوا دیئے تھے، چٹائیاں بچھوا دی تھیں، ہر چبوترہ اور ہر چھپر میں ایک چوکیدار اور ایک ملازم مقرر کر دیا تھا، تاکہ مرید اور توبہ کرنے والے نیک لوگوں کو شیخ کے آستانے تک آنے جانے میں نماز ادا کرنے کے وقت وضو کرنے کے لئے کوئی تردد نہ ہو اور ہر چبوترہ اور چھپر میں نفل پڑھنے والے نمازیوں کا ہجوم دیکھا جاتا تھا، ارتکاب گناہ لوگوں کے درمیان کم ہو گیا تھا، اور اکثر آدمیوں کے درمیان چاشت، اشراق، اوابین، تہجد اور زوال کے وقت رکعات نماز کی تحقیقات زیادہ تھی کہ ان نوافل میں ہر وقت کتنی رکعتیں ادا کرتے ہیں اور ہر رکعت میں کلام پاک کی کون سی سورۃ اور کون سی آیت پڑھتے ہیں ...... پنجگانہ نمازوں اور ہر نفل سے فارغ ہونے کے بعد کون کون سی دعائیں آتی ہیں۔ اکثر نئے مرید شیخ کے قدیم مریدوں سے غیاث پور کی آمد و رفت کے وقت پوچھتے تھے کہ شیخ رات کی نماز میں کتنی رکعتیں پڑھتے ہیں اور ہر رکعت میں کیا پڑھتے ہیں اور عشاء کی نماز کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر کتنی بار درود بھیجتے ہیں، اور شیخ فرید اور شیخ بختیار رات دن میں کتنی بار درود بھیجتے تھے اور کتنی بار سورۃ اخلاص پڑھتے تھے، نئے مرید شیخ کے قدیم مریدوں سے اسی قسم کے سوالات کرتے تھے، روزے، نوافل اور تقلیل طعام کے متعلق پوچھتے تھے، اس نیک زمانہ میں اکثر آدمیوں کو حفظ قرآن کا ذوق پیدا ہو گیا تھا، نئے مرید شیخ کے پرانے مریدوں کی صحبت میں رہتے تھے، پرانے مریدوں کو اطاعت، عبادت،

ترکِ تعلق، تصوف کی کتابوں کے پڑھنے مشائخ کے اوصافِ حمیدہ اور ان کے معاملات کے بیان کرنے کے سوا کوئی دوسرا کام نہ تھا، دنیا اور دنیاداروں کا ذکر ان کی زبان پر نہیں آتا تھا، کسی دنیادار کے گھر کی طرف اپنا رخ نہیں کرتے تھے، دنیا اور اہلِ دنیا کے میل جول کی حکایتیں نہیں سنتے تھے اور اس کو عیب اور گناہ جانتے تھے ۔۔۔ کثرتِ نوافل اور اسکی پابندی کا معاملہ اس بابرکت زمانہ میں اس حد تک پہنچ گیا تھا کہ بادشاہ نے محل میں بہت سے امراء، سلاحدار، لشکری، شاہی نوکر شیخ کے مرید ہوتے تھے اور چاشت و اشراق کی نمازیں ادا کرتے تھے، ایامِ بیض اور عشرہ ذی الحجہ کے روزے رکھتے تھے اور کوئی محلہ ایسا نہیں تھا جس میں ایک مہینہ بیس دن کے بعد صلحا کا اجتماع نہیں ہوتا تھا، اور صوفیوں کی محفلِ سماع نہیں ہوتی تھی اور باہم گریہ وزاری نہیں کرتے تھے۔ شیخ کے چند مرید تراویح کی نمازیں مسجدوں اور گھروں میں ختمِ قرآن کرتے، وہ لوگ جو مستقیم الحال ہو چکے تھے، رمضان، جمعہ اور تہواروں کی راتوں میں قیام کرتے اور صبح تک بیدار رہتے، پلک کو پلک سے نہیں لگنے دیتے، شیخ کے مریدوں میں سے بڑے درجہ کے مرید تمام سال رات کے ایک یا دو تہائی حصے تہجد کی نمازیں گذارتے، بعض عبادت گذار عشاء کی نماز کے وضو سے فجر کی نماز ادا کرتے، شیخ کے مریدوں میں سے چند آدمیوں کو میں جانتا ہوں کہ شیخ کے فیضِ نظر سے صاحبِ کشف و کرامات ہو گئے تھے، شیخ کے مبارک وجود، ان کے انفاس کی برکت، ان کی مقبول دعاؤں کی وجہ سے اس ملک کے اکثر مسلمان عبادت، تصوف اور زہد کی طرف مائل اور شیخ کی ارادت کی طرف راغب ہو گئے تھے ۔۔۔ سلطان علاءالدین اپنے تمام گھر والوں کے ساتھ شیخ کا معتقد اور مخلص ہو گیا تھا، خواص و عوام کے دلوں نے نیکی اختیار کر لی تھی، عہدِ علائی کے چند آخری سالوں میں شراب، معشوق، فسق و

فجور، جوا، فحاشی وغیرہ کا نام اکثر آدمیوں کی زبان پر نہیں آنے پاتا، بڑے بڑے گناہ لوگوں کے نزدیک کفر کے مشابہ معلوم ہونے لگے تھے، مسلمان ایک دوسرے کی شرم سے سود خواری اور ذخیرہ اندوزی کے کھلم کھلا مرتکب نہیں ہو سکتے تھے، بازار والوں سے جھوٹ بولنے، کم تولنے اور آمیزش کرنے کا رواج اٹھ گیا تھا، اکثر طالب علموں اور بڑے بڑے لوگوں کی رغبت جو شیخ کی خدمت میں رہتے تھے تصوف اور احکامِ طریقت کی کتابوں کے مطالعہ کی طرف ہو گئی تھی، قوت القلوب، احیاء العلوم، ترجمۂ احیاء العلوم، عوارف، کشف المحجوب، شرح تعرف، رسالہ قشیری، مرصاد العباد، مکتوبات عین القضاۃ، لوائح و لوامع قاضی حمید الدین ناگوری، فوائد الفواد، میر حسن سجزی کے بہت سے خریدار پیدا ہو گئے تھے، زیادہ تر لوگ، کتب فروشوں سے سلوک و حقائق کی کتابوں کے بارے میں دریافت کرتے تھے، کوئی پگڑی ایسی نہ تھی جس میں مسواک اور کنگھی لٹکی نظر نہ آتی تھی، صوفیوں کی کثرت خریداری کی وجہ سے لوٹے اور چرمی طشت گراں ہو گئے تھے، حاصل کلام یہ کہ خداوند تعالیٰ نے شیخ نظام الدینؒ کو پچھلی صدی میں شیخ جنیدؒ اور شیخ بایزیدؒ کے مثل پیدا کیا تھا۔"[1]

عشق کا "روز بازار"

توبہ، تجدید ایمان اور اصلاحِ حال کے اس عام ذوق و رجحان کے علاوہ جس سے دہلی کا کوچہ کوچہ متاثر ہو رہا تھا اور ایوانِ شاہی اور "بامِ ہزار ستون" تک اس کی لہریں پہنچی تھیں، ایک نئی تبدیلی یہ تھی کہ دماغی نخوت اور قلبی افسردگی کی

---

[1] تاریخ فیروز شاہی ضیاء الدین برنی ص ۳۴۶ و ص ۳۴۱

اس دنیا میں جہاں نائے و نوش اور "عیش کوش" کے سوا عرصہ سے کوئی صدا بلند نہیں ہوئی تھی، جذبۂ الٰہی کی ایک ہوا چلنے لگی اور عشق کا سودا عام ہو گیا، ہر جگہ درد و محبت کا تذکرہ، حقیقت و معرفت کی باتیں اور عارفانہ و عاشقانہ اشعار کی گونج تھی۔ امیر خورد مصنف سیر الاولیاء نے خوب لکھا ہے:-

کار محبت و عشق را رونق بازارے	محبت و عشق کے کاروبار کا زمانہ
در جہاں پیدا آمدے ...... و خلق	میں ایک بازار لگ گیا، لوگوں کو
را در آں زماں راحت جز حکایت	سماع کی حکایات، سننے، اخلاص و
سماع و اخلاص و نیازمندی و شفقت	نیازمندی، شفقت و نرمی، دلجوئی
و لینت و دل دریافتن و سر در زیر	اور اہلِ دل کے قدموں پر سر رکھ دینے
پائے اہل دلان نہادن کارے دیگر	کے علاوہ کسی اور بات سے راحت
نبودے[5]	نہیں حاصل ہوتی تھی۔

خلفاء کی تربیت

اس سلسلۂ ارشاد و تربیت اور طریقۂ عشق و محبت کو ہندوستان میں دور دور تک پھیلانے اور دیر تک قائم رکھنے کے لئے آپ نے اپنے عالی استعداد، سراپا اخلاص خلفاء کا بڑا اہتمام فرمایا، ان میں وہ سب اوصاف و کمالات پیدا کرنے کی کوشش فرمائی جو مشائخ کاملین کے لئے ضروری ہیں، ان سے مجاہدات کرائے، ان کے قلوب کی نگرانی کی، ان میں جو اعلیٰ استعداد رکھتے تھے، لیکن زیورِ علم سے عاری تھے اُن کی تعلیم و تکمیل کا بندوبست کیا، ان میں سے جن کے دلوں سے ابھی تک بحث و مناظرے کا نشہ نہیں گیا تھا، ان کی اصلاح فرمائی جو خلق خدا کی رہنمائی اور اجتماعی زندگی کے اہل تھے، لیکن انھیں گوشہ نشینی، عزلت گزینی

---

۵ سیر الاولیاء، ص ۳۰۶

اور انفرادی عبادات و مجاہدات کا ذوق تھا، ان کو اجتماعی زندگی اختیار کرنے اور "خلق خدا کی جفا وقفا" کو برداشت کرنے پر مجبور کیا، اصلاح و تربیت کا جو عالمگیر کام آپ کے پیش نظر تھا اور اپنے خواص اصحاب سے دین کی دعوت کا جو کام لینا تھا اس میں جو چیز حارج اور مزاحم نظر آئی آپ نے اسکو ترک کر دیا۔

سیر الاولیاء میں ہے کہ ایک بلند حیثیت کے دوستوں اور خدام نے جن کا وطنی تعلق اودھ سے تھا آپس میں طے کیا کہ سلطان المشائخ سے پڑھنے پڑھانے اور بحث و مذاکرہ کرنے کی اجازت طلب کریں، اگرچہ ان دوستوں میں سے ہر ایک عالم متبحر تھا لیکن سلطان المشائخ کے فیض صحبت سے یادِ حق میں مشغول تھا، مگر جس کام میں عمر گذاری تھی اس کا شوق بالآخر اس کا محرک ہوا۔ مولانا جلال الدین کو لوگوں نے آگے کیا اور خدمت میں حاضر ہوئے۔ حضرت سلطان المشائخ پر یاد الٰہی کی ایسی کچھ تجلی تھی کہ لوگوں کو بات کرنے کی ہمت نہیں ہوتی تھی۔ مولانا جلال الدین کو کچھ جرأت تھی، انھوں نے عرض کیا کہ حضرت اگر اجازت ہو تو احباب کسی وقت بحث کر لیا کریں، سلطان المشائخ سمجھ گئے کہ یہ ان سب علماء کا عندیہ ہے اور مولانا جلال الدین ان کے نمائندہ ہیں۔ فرمایا کہ:۔ میں کیا کروں مجھے تو ان سے تو دوسرا ہی کام لینا مقصود ہے۔ [1]

مولانا سید نصیر الدین محمود جو بعد میں حضرت خواجہؒ کے خلیفہ اعظم اور اصل جانشین ہوئے اور چراغ دہلی کے نام سے ان کا نام تمام دنیا میں روشن ہے، اس بات کے بڑے خواہشمند تھے کہ وہ کسی جنگل یا پہاڑ پر بیٹھ کر خدا کی یاد کریں۔ انھوں نے ایک دن امیر خسرو کو واسطہ بنایا اور کہلوایا کہ یہ ناچیز اودھ میں رہتا ہے، خلق کے ہجوم سے اپنی مشغولیت میں فرق پڑتا ہے اگر اجازت ہو تو میں کسی صحرا یا پہاڑ پر رہ کر فراغ خاطر کے ساتھ خدا کی عبادت کروں۔

---

[1] سیر الاولیاء ص ۳۰۶

امیر خسرو نے جب یہ پیغام عرض کیا تو ارشاد ہوا:۔

او را بگو ترا درمیان خلق می باید بود	اُن سے کہہ دو کہ تمکو مخلوق ہی کے درمیان
و جفا و قفائے خلق می باید کشید	رہنا ہوگا" اور مخلوق کی بے مروّتی اور
و مکافاتِ آں ببذل وایثار و عطا	بے رخی کو برداشت کرنا ہوگا! اور اس
می باید کرد[1]	کا بدلہ سخاوت و ایثار سے دینا ہوگا۔

مولانا حسام الدین ملتانی نے خلافت کے بعد عرض کیا کہ:۔ اگر اجازت ہو تو شہر چھوڑ دوں اور کسی چشمہ کے کنارے سکونت اختیار کروں، اس لئے کہ شہر میں کنوؤں کا پانی ملتا ہے اور اس سے وضو کرنے میں دل کو اطمینان نہیں ہوتا،[2] ارشاد ہوا کہ نہیں شہر ہی میں رہو اور ایک عام آدمی کی طرح رہو سہو، نفس چاہتا ہے کہ تم کو ایک آرام کی جگہ لیجائے اور ایسی جگہ رکھے کہ تمہیں جمیعت خاطر نصیب نہ ہو، جب تم شہر سے باہر چلے جاؤ گے اور کسی چشمہ کے کنارے سکونت اختیار کرو گے تو پردیسی اور شہری تمھارا سراغ لگا کر پہنچیں گے اور مشہور ہوگا کہ فلاں درویش فلاں جگہ مقیم ہے اور پھر تمھارا وقت خراب کرے گا، اس کے علاوہ کنوئیں کے پانی میں علماء کا اختلاف ہے اور شریعت نے اس میں وسعت دی ہے۔

چشتی خانقاہیں

اللہ تعالیٰ نے حضرت خواجہ کو بڑے جلیل القدر خلفاء عطا فرمائے تھے جن میں سے حسب ذیل خاص طور پر مشہور و ممتاز ہوئے:۔

(۱) مولانا شمس الدین یحییٰ	(۲) شیخ نصیر الدین محمود
(۳) شیخ قطب الدین منور ہانسوی	(۴) شیخ حسام الدین ملتانی
(۵) مولانا فخر الدین زرادی	(۶) مولانا علاء الدین نیلی

---

[1] سیر الاولیاء ص ۲۴۷ [2] یہ پانی بھرنے والوں کی بے احتیاطی کی وجہ سے اور کسی چیز کے گرنے پڑنے کے خیال سے۔

(۷) مولانا برہان الدین غریب (۸) مولانا یوسف چندیری

(۹) مولانا سراج الدین اخی سراج (۱۰) مولانا شہاب الدین

مریدین با اختصاص

(۱) خواجہ ابوبکر (۲) مولانا محی الدین کاشانی

(۳) مولانا وجیہ الدین پائلی (۴) مولانا فخر الدین مروزی

(۵) مولانا فصیح الدین (۶) امیر خسرو

(۷) مولانا جلال الدین (۸) خواجہ کریم الدین سمرقندی

(۹) امیر حسن علا سنجری (۱۰) قاضی شرف الدین

(۱۱) مولانا بہار الدین ادہمی (۱۲) شیخ مبارک گوپاموی

(۱۳) خواجہ موید الدین کردی (۱۴) خواجہ تاج الدین داوری

(۱۵) خواجہ ضیار الدین برنی (۱۶) خواجہ موید الدین انصاری

(۱۷) خواجہ شمس الدین خواہرزادہ (۱۸) مولانا نظام الدین شیرازی

(۱۹) خواجہ سالار (۲۰) مولانا فخر الدین میرٹھی

ان میں حضرت شیخ نصیر الدین چراغ دہلی کو آپ نے خلافت خاص عطا فرمائی اور اپنا جانشین بنایا۔ وہ اپنے شیخ کے قدم بقدم تھے، انھوں نے نہایت ناسا عد حالات اور سخت سیاسی طوفانوں میں رشد و ہدایت کا یہ چراغ روشن رکھا۔ بقول شاعر ؎

ہوا ہے گو تند و تیز لیکن، چراغ اپنا جلا رہا ہے
وہ مرد درویش جس کو حق نے دیئے ہیں انداز خسروانہ

فیروز تغلق کی تخت نشینی اور اس سے ہندوستان کو جو فیوض و برکات پہنچے اُس میں حضرت سید نصیر الدین ہی کا ہاتھ تھا، پورے تینتیس[۱] سال تک انھوں نے سلسلہ چشتیہ کا مرکزی نظام دارالحکومت دہلی میں بیٹھ کر کامیابی کیساتھ چلایا، پھر اس چراغ سے دوسرا چراغ روشن ہوا، جس نے جنوبی ہند ہی نہیں سارے ہندوستان کو عشق و محبت کی حرارت سے گرم اور اس کی خوشبو سے مُعطّر کردیا، یعنی حضرت سید محمد گیسو دراز[۲] مدفون گلبرگہ (م ۸۲۵ھ) جن کے متعلق کسی صاحب نظر نے کہا ہے ؎

ہر کو مرید سید گیسو دراز شد
واللہ خلاف نیست کہ او عشق باز شد

حضرت سید نصیر الدین چراغ دہلی کے دوسرے خلیفہ علامہ کمال الدین (م ۷۵۶ھ) تھے، جن کی اولاد اور خلفاء نے اس سلسلہ کو اس صدی تک آب و تاب کیساتھ قائم رکھا، اس سلسلہ میں حضرت یحییٰ مدنی، شاہ کلیم اللہ جہان آبادی، مولانا شاہ فخر الدین دہلوی، خواجہ نور محمد مہاروی، شاہ نیاز احمد بریلوی اور خواجہ سلیمان تونسوی جیسے اکابر روزگار گذرے جنھوں نے عشق الٰہی کا بازار گرم رکھا، اور لاکھوں بندگانِ خدا کے دلوں میں محبت الٰہی اور خدا طلبی کی آگ بھڑ کا دی[۳]۔

حضرت چراغ دہلی کے خلفاء میں شیخ عبد المقتدر کندی، شیخ احمد تھانیسری اور شیخ جلال الدین حسین بخاری معروف بمخدوم جہانیاں جہاں گشت خاص طور پر قابل ذکر ہیں ــــ ان میں ہر ایک شیخ وقت اور مرجع خلائق تھا۔

---

[۱] ملاحظہ ہو تاریخ فیروز شاہی، از سراج عفیف۔

[۲] حضرت خواجہ سید محمد گیسو دراز کے حالات و کمالات کیلئے مستقل تصنیف کی ضرورت ہے۔

[۳] ان بزرگوں کے مفصل حالات کیلئے ملاحظہ ہو "تاریخ مشائخ چشت" از پروفیسر خلیق احمد نظامی۔

دہلی کی مرکزی خانقاہ کے بعد جس کے مسند ارشاد پر یکے بعد دیگرے دو شیخ اجل حضرت خواجہ نظام الدینؒ اور حضرت سید نصیر الدین چراغ دہلیؒ متمکن رہے:۔ ہندوستان کے مختلف مقامات پنڈوہ، لکھنوتی، دولت آباد، گلبرگہ، برہان پور، زین آباد، مانڈو، احمد آباد، صفی پور، مانک پور، سلون میں چشتی خانقاہیں قائم ہوئیں، جنھوں نے صدیوں تک چراغ سے چراغ روشن رکھا اور عشق و محبت، صدق و اخلاص، علو ہمت و عزیمت، خدمت خلق، ایثار و قربانی، بذل و عطا، فقر و زہد، علم و معرفت کی شمع روشن رکھی، اور ہندوستان کی فضا کو جس پر پے در پے مادیت اور غفلت کے حملے ہوتے رہے اور کسی وقت ایسا محسوس ہوا کہ سارا ملک تنکے کی طرح غفلت و تعیش کے سیلاب میں بہ جائے گا اور متاع درد جس کشتی میں ہے وہ بھی غرق ہو جائے گی، لیکن ان سوختہ سامانوں اور سوختہ دلوں نے اس متاع کی حفاظت کی اور یہ آگ کہیں نہ کہیں سلگتی رہی، ان میں ہر خانقاہ اور اسکے دینی و اصلاحی کارناموں کیلئے ایک مستقل ضخیم کتاب درکار ہے، خاص طور پر بنگال میں شیخ علاء الحق پنڈوی[۱]، حضرت نور قطب عالم پنڈوی[۲]

---

[۱] شیخ علاء الدین علاء الحق پنڈوی کا اصل نام عمر ہے، آپکے والد اسعد لاہوری بنگال میں منصب وزارت پر فائز تھے۔ شیخ علاء الحق حضرت محبوب الٰہی کے مشہور خلیفہ مولانا سراج الدین عثمانی اودی معروف باخی سراج (۵۸ء) کے خلیفہ اور پنڈوہ کی مشہور عالم چشتی خانقاہ کے بانی ہیں۔ سید اشرف جہانگیر سمنانی کچھوچھوی (م ۸۰۸ھ) آپ ہی کے خلیفہ ہیں ۸۰۰ھ میں وفات پائی۔

[۲] نور الدین احمد نام، نور الحق اور قطب عالم لقب، اپنے والد شیخ علاء الحق پنڈوی کے خلیفہ و جانشین تھے اللہ تعالیٰ نے بڑی مقبولیت و مرجعیت عطا فرمائی، آپکے زمانہ میں پنڈوہ کی خانقاہ ہندوستان کی سب سے بڑی خانقاہ تھی۔ مجاہدات، خدمت خلق اور بے نفسی و خود شکنی اور علوم و حقائق میں مرتبۂ عالی رکھتے تھے خلفاء میں حضرت شیخ حسام الدین حسام الحق مانکپوری (م ۸۵۳ھ) خاص طور پر قابل ذکر ہیں، جن کی ذات سے بہار اور اودھ میں سلسلۂ چشتیہ نظامیہ کی بڑی اشاعت ہوئی۔ ۸۱۸ھ میں وفات پائی، تصنیفات میں "مونس الفقراء" "انیس الغرباء" اور مکاتیب کا مجموعہ یادگار ہے۔ ملفوظات و مکتوبات میں غضب کی سادگی اور تاثیر ہے۔ (ملاحظہ ہو نزہۃ الخواطر ج ۳)

دکن میں شیخ برہان الدین غریب۔ اُن کے خلفاء میں شیخ زین الدین، شیخ یعقوب، شیخ کمال الدین ناگوری نتنی، پھر ان کے خلیفہ قطب عالم عبداللہ بن محمود بن الحسین (م ۸۵۷) اور ان کے فرزند و خلیفہ شاہ عالم گجراتی نے بوریائے فقر پر بیٹھ کر اپنے اپنے زمانہ میں بادشاہی کی ہے۔

مالوہ میں شیخ وجیہ الدین یوسف، شیخ کمال الدین، مولانا مغیث الدین وغیرہ اودھ میں حضرت شیخ محمد مینا لکھنوی، شیخ سعد الدین قدوائی خیرآبادی، شیخ عبدالصمد عرف صفی الدین صفی پوری، شیخ حسام الحق مانک پوری، شیخ عبدالکریم مانک پوری اور شاہ پیر محمد سلونی اور شاہ پیر محمد لکھنوی خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں، یہ سب سلسلۂ نظامیہ کے شیوخ کبار ہیں جنھوں نے اپنی اپنی جگہ ارشاد و ہدایت اور تعلیم و تربیت کا سلسلہ سرگرمی کے ساتھ جاری رکھا۔ ان سے فیض پانے والوں کی تعداد کو خدا کے سوا کوئی شمار نہیں کر سکتا۔

ان خالص چشتی خانقاہوں کے علاوہ ہندوستان میں جابجا ایسی نامور خانقاہیں بھی قائم تھیں جن کے مشائخ کبار اور بانیانِ سلسلہ کو سلسلۂ نظامیہ کے مشائخ چشت سے نسبتِ خاص اور اجازتِ عام حاصل تھی اور وہ چشتی ذوق اور نسبت کے حامل تھے، ان میں سے جونپور کی خانقاہ رشیدی اور پھلواری شریف کی خانقاہ مجیبی خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ خانقاہ رشیدی کے بانی حضرت علامہ محمد رشید جونپوری (م ۱۰۸۳ھ) کو اپنے شیخ طیب بنارسی اور سید احمد الحکیم حسینی مانکپوری سے سلسلۂ حسینیہ نظامیہ میں اجازت حاصل تھی، خانقاہ مجیبی کے بانی تاج العارفین حضرت شاہ محمد مجیب اللہ قادری پھلواروی (م ۱۱۹۱ھ) کو سلسلہ چشتیہ نظامیہ اپنے پیر بیعت حضرت خواجہ عماد الدین قلندر اور حضرت شاہ معین الدین کرجوی کے واسطے سے پہونچا ہے۔ شاہ معین الدین کرجوی حضرت شیخ پیر محمد سلونی کے خلیفہ تھے۔

آخر میں حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکی کی ذات سلسلۂ نظامیہ و صابریہ اور ان کی خصوصیتوں

اور برکتوں کی جامع تھی۔ حضرت حاجی صاحب کو سلسلہ نظامیہ سے نسبت حضرت شیخ عبدالقدوس گنگوہی کے طریق سے حاصل تھی، جن کو حضرت درویش بن محمد قاسم اودھی سے سلسلہ نظامیہ میں اجازت تھی۔ حضرت درویش کو تین طریقوں سے سلسلۂ نظامیہ پہونچا تھا۔[1]

---

[1] تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو "تذکرۃ الرشید" ج ۲ (ص ۱۰۶)

باب ہفتم

حضرت خواجہؒ کی تعلیم و تربیت کے اثرات
آپ کے خلفاء کی دینی و اصلاحی خدمات

حضرت سلطان المشائخ نے اپنے خلفاء اور مریدین کی بڑے اہتمام اور توجہ سے تربیت فرمائی تھی۔ سلطان علاء الدین خلجی کے امراء دربار اور ارکانِ سلطنت میں سے ایک بڑے عہدہ دار خواجہ مؤید الدین تھے، ان کو حضرت خواجہؒ سے تعلق پیدا ہو گیا، اور یہ تعلق اتنا بڑھا کہ اُن کی طبیعت "سرکار دربار" سے اُچاٹ ہو گئی اور وہ حضرت خواجہؒ کی خدمت میں رہ پڑے۔ سلطان ان کا بڑا قدردان تھا اور اُن کی ضرورت محسوس کرتا تھا۔ اس نے ایک حاجب کے ذریعہ حضرت خواجہؒ سے شکایت کی اور کہا کہ: حضرت ہر ایک کو اپنا جیسا بنانا چاہتے ہیں۔ حضرت خواجہؒ نے جواب میں فرمایا کہ ہم اپنے جیسا کیا، اپنے سے بہتر بنانا چاہتے ہیں۔[1]

حضرت خواجہؒ کی صحبت و تربیت سے صرف عبادت و ریاضت کا ذوق اور اپنی اصلاح و ترقی ہی کی فکر نہیں پیدا ہوئی تھی، بلکہ دعوت و تبلیغ کا جذبہ، امر بالمعروف، نہی عن المنکر کی ہمت اور حوصلہ،

---

[1] سیر الاولیاء (ص ۳۱۱)

سلاطینِ وقت کے سامنے کلمۂ حق کہنے کی جرأت اور بے خوفی و شجاعت بھی پیدا ہوگئی تھی، اور یہ خدا کے نام اور مردانِ خدا کی صحبت کا لازمی نتیجہ ہے۔ جس دل میں اللہ کا خوف سما جائے گا اُس دل سے غیراللہ کا خوف قدرتی طور پر نکل جائیگا اور جو دل طمع دنیا سے آزاد ہوجائے گا اُس پر کسی کا رعب اور اس کو کسی سے ہراس نہیں ہوسکتا، جس پر خالق کی عظمت اور مخلوق کی صحیح حیثیت کا انکشاف ہوگیا، وہ سلاطینِ عالم کے کرّ و فر، ان کے درباروں کے تزک و احتشام اور اُن کے غلاموں اور افسروں کی صف بندیوں اور "نگاہ روبرو" اور "دور باش" کو بچوں کے کھیل اور گڑیوں کے گھروندوں سے زیادہ وقعت نہیں دے سکتا اور جاہ و جلال کی کسی نمائش پر کلمۂ حق کہنے سے کبھی باز نہیں رہ سکتا، یہی توحید و تجرید کا طبعی نتیجہ، حقیقی تصوّف کا خاصّہ اور مردانِ خدا اور درویشانِ کامل کا شیوہ ہے۔ ؎

دارا و سکندر سے وہ مردِ فقیر اولیٰ ۔۔۔ ہو جس کی فقیری میں بُوئے اسد اللّٰہی

آئینِ جواں مرداں حق گوئی و بیباکی ۔۔۔ اللہ کے شیروں کو آتی نہیں روباہی

حضرت خواجہؒ کے تربیت یافتہ خدام و مریدین نے اس "اسد اللّٰہی" اور اس حق گوئی و بیباکی کے ایسے نمونے پیش کئے جن کی نظیر ملنی آسان نہیں۔

سلاطینِ وقت سے بے رعبی اور حق گوئی کے نمونے

سلطان محمد تغلق کے شوکت و جبروت سے تاریخ کا ہر طالب علم واقف ہے۔ سلطان کا ایک مرتبہ ہانسی کے پاس سے گزر ہوا، وہاں سے چار کوس کے فاصلہ پر نسبی مقام میں خیمۂ شاہی و خرگاہ نصیب ہوا، سلطان نے مخلص الملک نظام الدین ندرباری کو جو اپنے ظلم و قساوت میں اس زمانہ میں مشہور تھا ہانسی کے حصار کے معائنہ کے لئے بھیجا، وہ جب حضرت شیخ قطب الدین منور (نبیرہ حضرت شیخ جمال الدین ہانسوی و خلیفہ حضرت سلطان المشائخ) کے مکان کے پاس پہنچا تو دریافت کیا کہ یہ مکان کس کا ہے؟ لوگوں نے کہا شیخ قطب الدین منور کا جو حضرت سلطان المشائخ کے خلیفہ ہیں

کہا کہ عجیب بات ہے کہ بادشاہ اس جوار میں آئے اور شیخ اسکے سلام کو حاضر نہ ہوں، مخلص الملک نے واپسی پر سب کیفیت عرض کی اور یہ بھی کہا کہ سلطان المشائخ کے ہانسی میں ایک خلیفہ ہیں جو جہاں پناہ کے سلام کیلئے حاضر نہیں ہوئے۔ بادشاہ کو یہ سنکر غصہ آیا، اسی وقت حسن سر برہنہ کو جو ایک بڑا مغرور وجاہ پسند شخص تھا شیخ قطب الدین کو لانے کے لئے بھیجا، حسن سر برہنہ جب مکان کے قریب پہنچا تو تنہا پیادہ پا شیخ کی دہلیز میں آکر عاجزانہ طریقے پر بیٹھ گیا۔ شیخ نے بلایا حسن نے جاکر عرض کیا کہ آپ کی بادشاہ کے یہاں طلبی ہے۔ فرمایا کہ اس میں مجھے کچھ اختیار ہے یا نہیں؟ اُس نے کہا مجھے فرمانِ سلطانی ہے کہ میں آپ کو بہر حال لے آؤں۔ شیخ نے فرمایا الحمد للہ کہ میں اپنے اختیار سے نہیں جا رہا ہوں۔ پھر گھر والوں کی طرف رخ کیا اور فرمایا کہ تم کو خدا کے سپرد کیا، یہ کہا اور مصلّی کاندھے پر ڈالا، لاٹھی ہاتھ میں لی اور پیادہ پا روانہ ہو گئے، حسن نے سواری کے لئے عرض کیا: فرمایا: ۔نہیں مجھ میں قوت ہے، میں پیدل چل سکتا ہوں۔ جب ہنسی پہنچے تو سلطان کو خبر ہوئی، سلطان نے حکم دیا کہ دہلی چلیں۔ دہلی پہنچ کر دربارِ شاہی میں طلب کیا۔ شیخ نے فیروز شاہ سے جو اُس زمانہ میں نائب باربک تھے کہا کہ ہم فقیر لوگ ہیں بادشاہوں کی مجلس کے آداب سے واقف نہیں، جیسا آپ کا مشورہ ہو ویسا کیا جائے۔ فیروز نے جو فقیر دوست اور صحیح الاعتقاد شخص تھا کہا کہ لوگوں نے آپ کے متعلق بادشاہ کے کان بہت بھرے ہیں، اگر آپ کچھ تعظیم اور تواضع سے کام لیں تو بہتر ہے۔ ایوانِ شاہی کی دہلیز میں قدم رکھا تو امراء و ملوک اور نقیب و چاؤش دو رویہ کھڑے تھے۔ صاحبزادہ نور الدین جو ہانسی سے ہمرکاب آئے تھے، کم عمر تھے اور انھوں نے کبھی بادشاہوں کی بارگاہ نہیں دیکھی تھی، ان پر ایک ہیبت سی طاری ہوئی۔ شیخ قطب الدین منور نے ان سے پکار کر کہا کہ:

بابا نور الدین! العظمۃ والکبریاء للہ" صاحبزادہ کا بیان ہے کہ یہ سنتے ہی میرے اندر ایک قوت پیدا ہوئی، سارا رعب جاتا رہا اور یہ جو امراء و ملوک وہاں کھڑے تھے وہ مجھے بالکل بکریوں کی طرح معلوم ہونے لگے۔ جب سلطان کو یہ اندازہ ہوا کہ شیخ آرہے ہیں تو وہ کھڑا ہو گیا اور کمان ہاتھ میں لیکر تیر اندازی

ین مشغول ہوگیا۔ شیخ قریب آئے تو اُس نے خلافِ معمول تعظیم کی اور مصافحہ کیا۔ شیخ نے بہت مضبوطی سے بادشاہ کا ہاتھ پکڑا۔ بادشاہ نے کہا کہ میں آپکے جوار میں پہنچا، آپ نے میری کوئی تربیت نہ فرمائی اور اپنی ملاقات سے عزت نہ بخشی، شیخ نے فرمایا کہ یہ درویش اپنے کو اس کا اہل نہیں سمجھتا کہ بادشاہوں سے ملاقات کرے، ایک کونے میں پڑا ہوا بادشاہ اور اہلِ اسلام کی دعاگوئی میں مصروف ہے۔ اسکو معذور سمجھا جائے۔ بادشاہ بہت متاثر ہوا اور اپنے بھائی فیروز شاہ سے کہا کہ شیخ کی جیسی مرضی ہو ویسا کرو۔ شیخ منور نے فرمایا کہ مجھ فقیر کا مقصود و مطلوب یہی ہے کہ اپنے دادا اور باپ کے گوشۂ عافیت میں واپس جائے۔ فیروز شاہ نے اس کی تعمیل کی۔ شیخ کی واپسی کے بعد بادشاہ نے ایک امیر سے کہا کہ مجھے جن بزرگوں سے مصافحہ کرنے کا اتفاق ہوا ہے جس نے مجھ سے ہاتھ ملایا اُس کے ہاتھ میں کپکپی تھی لیکن شیخ منور نے اتنی مضبوطی سے مصافحہ کیا کہ ان پر ذرا اثر نہیں معلوم ہوتا تھا۔

بادشاہ نے فیروز شاہ اور مولانا ضیاء الدین برنی کو ایک لاکھ تنکے[1] کے ساتھ شیخ منور کی خدمت میں بھیجا شیخ نے فرمایا نعوذ باللہ کہ یہ درویش ایک لاکھ تنکہ قبول کرے۔ انھوں نے واپس آکر سلطان سے عرض کیا۔ سلطان نے کہا کہ اگر ایک لاکھ قبول نہیں کرتے تو پچاس ہزار پیش کرو۔ شیخ نے اسکو بھی قبول نہ کیا۔ سلطان نے فرمایا اگر شیخ یہ بھی قبول نہ کریں گے تو خلقت مجھے کیا کہے گی۔ یہاں تک کہ بات دو ہزار تک پہنچی۔ فیروز شاہ اور مولانا ضیاء الدین نے عرض کیا کہ اس سے کم کا ہم بادشاہ کے سامنے تذکرہ نہیں کر سکتے، شیخ نے فرمایا کہ سبحان اللہ! درویش کو تو دو سیر چاول دال ایک دانگ کا گھی کافی ہے، وہ ان ہزاروں دیبوں کو کیا کرے گا، بڑی کوششوں اور حیلوں سے یہ کہہ کر بادشاہ در پے آزار ہو جائے گا آپنے دو ہزار تنکے قبول کئے اور وہ بھی اپنے برادران طریقت اور اہلِ حاجت میں تقسیم کرکے ہانسی واپس آگئے[2]۔

جس زمانہ میں سلطان محمد تغلق نے دہلی کی آبادی کو دیوگیر منتقل ہو جانے کا حکم دیا، اس زمانہ میں اس نے عزم کیا کہ ترکستان اور خراسان کو بھی اپنے قبضہ میں لائے اور چنگیز خان کی اولاد کا قلع قمع کرے[3]، اسی زمانہ میں حکم ہوا کہ دہلی اور

---

[1] تنکا یا تنگا، اس عہد میں ہندوستان کا روپیہ تھا، اس میں ایک تولہ چاندی ہوتی تھی، یہ ترکی زبان کا لفظ ہے اسکے معنی سفید کے ہیں یعنی نقرئی سکہ۔ [2] سیر الاولیاء ص ۲۵۳ تا ص ۲۵۵

اطرافِ دہلی کے تمام صدور و اکابر حاضر ہوں بڑے بڑے خیمے نصب کریں، ان خیموں میں منبر رکھے جائیں اور ان ممبروں پر چڑھ کر حضرات علماء تقریر کریں اور جہاد کی ترغیب دیں۔ اس روز حضرت خواجہ نظام الدینؒ کے خلفاء خاص مولانا فخرالدین زرادی، مولانا شمس الدین یحییٰ اور شیخ نصیرالدین محمود کی بھی طلبی ہوئی۔ شیخ قطب الدین دبیر[1] جو حضرت سلطان المشائخؒ کے ایک راسخ الاعتقاد مرید اور مولانا فخرالدین زرادی کے شاگرد تھے مولانا فخرالدین کو سب سے پہلے بارگاہ سلطانی میں لائے۔ مولانا کو سلطان کی ملاقات سے بہت اجتناب تھا۔ کئی بار فرمایا کہ میں اپنے سر کو اس شخص کے دربار میں کٹا ہوا اور پڑا ہوا دیکھتا ہوں، یعنی میں کلمۂ حق کہنے سے باز نہیں رہوں گا اور یہ شخص مجھے معاف نہیں کرے گا۔ جب مولانا سراپردۂ سلطانی میں داخل ہوئے تو شیخ قطب الدین دبیر نے مولانا کی جوتیاں اٹھالیں اور خدمتگاروں کی طرح بغل میں لیکر کھڑے ہو گئے، سلطان نے ان سے کچھ نہیں کہا اور مولانا فخرالدین سے بات چیت میں مشغول ہو گیا۔ سلطان نے کہا کہ میرا خیال ہے کہ میں چنگیز خاں کی اولاد کا قلع قمع کروں، آپ اس کام میں ہمارا ساتھ دیں گے؟ مولانا نے فرمایا انشاء اللہ تعالیٰ۔ سلطان نے کہا کہ یہ شک کا کلمہ ہے۔ مولانا نے فرمایا کہ مستقبل کے متعلق ایسا ہی کہا جاتا ہے، سلطان نے یہ سنکر پیچ و تاب کھایا اور کہا کہ ہمیں کچھ نصیحت کیجئے؟ مولانا نے فرمایا کہ غصہ دبا دیئے۔ سلطان نے کہا کون سا غصہ۔ مولانا نے فرمایا غضب سبعی (درندوں والا غصہ) اس پر سلطان کو ایسا غصہ آیا کہ چہرہ پر ظاہر ہو گیا مگر کچھ کہا نہیں۔ کہا کہ کھانا لاؤ، خاصہ شاہی لگا، سلطان اور مولانا دونوں ایک ہی پلیٹ میں کھا رہے تھے، مولانا ایسی ناگواری کے ساتھ کھانا کھا رہے تھے کہ معلوم ہوتا تھا کہ وہ سلطان کے ساتھ ہم پیالہ ہونا پسند نہیں کرتے، سلطان اور زیادہ اظہارِ تعلق کیلئے ہڈی سے گوشت نکال نکال کر مولانا کے سامنے رکھتا تھا، مولانا بڑی ناگواری کے ساتھ تھوڑا تھوڑا کھاتے تھے پھر دسترخوان بڑھایا گیا، اور سلطان نے مولانا کو رخصت کیا۔ رخصت کے وقت ایک ادنیٰ پوشاک اور ایک روپیہ کی تھیلی پیش کی، لیکن اس سے پہلے کہ خلعت اور کیسہ مولاناؒ کے ہاتھ میں آئے شیخ قطب الدین دبیر نے

---

[1] دبیر کا عہدہ سکریٹری کا سمجھنا چاہیئے ۱۲

ہاتھ بڑھا کر اُن کو لے لیا، اُن کے رخصت ہونے کے بعد سلطان نے شیخ قطب الدین دبیر سے کہا کہ اے فریبی آدمی تو نے یہ کیا حرکت کی، پہلے فخرالدین کی جوتیاں اپنے بغل میں لیں، پھر ان کی خلعت اور کیسہ سنبھال لیا اور اُس کو میری تلوار سے بچا لیا۔ اور بلا اپنے سر لے لی۔ شیخ قطب الدین دبیر نے کہا کہ مولانا فخرالدین میرے استاد اور میرے مرشد کے خلیفہ ہیں، اور میرے لئے مناسب تو یہ تھا کہ میں ان کی جوتیاں تعظیماً سر پر رکھتا، بغل میں لینا تو کوئی بڑی بات نہیں اور یہ خلعت و کیسہ کیا بڑی چیز ہے؟ سلطان نے کہا کہ ان کفر آمیز عقیدوں کو چھوڑ دو ورنہ میں قتل کر دوں گا۔ اخیر وقت جب مولانا فخرالدین زرّادیؒ کا ذکر سلطان کی مجلس میں آتا تو سلطان ہاتھ مل کر کہتا کہ افسوس فخرالدین میری خون آشام تلوار سے بچ گئے۔[1]

اسلامی سلطنت کی رہنمائی و نگرانی

مشائخ چشت نے اگرچہ سلاطینِ وقت سے بے تعلق اور "سرکار، دربار" سے دُور رہنے کا فیصلہ کیا تھا اور اس کو اپنے اور اپنے پورے سلسلہ کے لئے دائمی اصول بنا دیا تھا، لیکن وہ سلاطینِ وقت کی رہنمائی و نگرانی سے غافل نہیں تھے اور جب کبھی ان کو صحیح مشورہ یا کسی بہتر انتخاب یا اپنا روحانی اثر استعمال کرنے کا موقع ملتا تو وہ اس زرّیں موقع کو کبھی ہاتھ سے نہ جانے دیتے۔ ہندوستان کی مرکزی سلطنت کے متعدد فرمانروا اور صوبوں کی خود مختار سلطنتوں کے متعدد حکمراں ان مشائخ چشت سے عقیدت و محبت کا تعلق رکھتے تھے اور اس تعلق سے بہت سے مفاسد کا ازالہ، بہت سے منکرات کا سدّباب، بہت سے احکام شریعت اور عدل گستری اور خلق پروری کا رواج ہوا۔

ہندوستان کے سلاطین میں سلطان فیروز تغلق کو اپنی حُسنِ سیرت، نیک نفسی، رعیت پروری، رحم دلی، امن پسندی، رفاہ عامہ، ازالۂ مظالم اور تبلیغِ اسلام کے ذوق، مدارس کے قیام وغیرہ میں جو امتیاز و خصوصیت حاصل تھی اس میں مشکل ہی سے ہندوستان کا کوئی دوسرا فرمانروا اس کا سہیم و شریک ہوگا۔ سراج عفیف کی تاریخ فیروز شاہی سے اس بادشاہ کے تعمیری کارناموں اور اس کے زمانہ کی خیر و برکت، امن و امان اور سرسبزی کا کچھ اندازہ ہو سکتا ہے۔

---

[1] سیر الاولیاء، ص ۲۷۱ و ص ۲۷۲

تاریخ فرشتہ کا مصنف لکھتا ہے :۔

او بادشاہے بود فاضل و عادل و کریم و	وہ ایک فاضل، منصف مزاج، شریف و
حلیم و رعیت و سپاہی ازو راضی بودند و	مہربان، رحم دل و بردبار بادشاہ تھا، رعیت
ہیچ کس در عہد او یارائے ظلم نہ داشت[1]	اور فوج سب اس سے راضی تھی کسی کو اسکے
	عہدِ حکومت میں ظلم کرنے کی مجال نہ تھی۔

مصنف نے اُس کے آئینِ حکومت کی تین بڑی خصوصیتیں لکھی ہیں، اُس نے کسی مسلمان یا ذمی کی سیاست[2] و تعزیر نہیں کی، انعامات، عطیوں اور تالیف قلب کی وجہ سے لوگوں کو سیاست کی ضرورت نہیں رہی۔

۲۔ خراج و محاصل کو رعایا کی استطاعت کے مطابق وصول کیا، اضافہ و توفیر کو جو سلاطینِ ماضی کا دستور تھا، موقوف کیا، رعایا کے بارے میں کسی مفسد کی شکایت کی سماعت نہیں کی، اس کی بدولت ملک آباد اور رعایا مرفہ الحال رہی۔

۳۔ حکومت کے عہدوں اور علاقوں کی صوبہ داری پر دیندار و خدا ترس لوگوں کو مامور کیا، کسی فساد انگیز و بدنفس کو عہدہ نہیں دیا۔ "الناس علیٰ دین ملوکھم" کے اصول کے مطابق حکام و امراء اور کارپردازان حکومت نے بھی اسکی پیروی کی[3]۔

لیکن بہت سے لوگوں کو یہ معلوم ہوگا کہ فیروز شاہ کی تخت نشینی اور اس کے انتخاب میں خواجہ نصیر الدین چراغ دہلیؒ کا خاص ہاتھ[4] تھا اور اسکی فیروزمندی اور کامیابیوں میں ان کی دعائیں اور توجہات کا بہت بڑا حصہ تھا۔

---

[1] تاریخ فرشتہ (جلد اول) ص ۲۷۸

[2] تعزیر و تعذیب کے وہ نئے نئے طریقے جو سلاطینِ سابق نے ایجاد کئے تھے۔

[3] تاریخ فرشتہ (جلد اول) ص ۲۷۱

[4] تاریخ فرشتہ ص ۲۵۹ (ج ۱)

سراج عفیف لکھتے ہیں :—

"چوں سلطان محمد دنبال طغی در ٹھٹھہ رفت خدمت شیخ نصیر الدین را برابر خود ببرد، چوں سلطان محمد در ٹھٹھہ نقل کرد و سلطان فیروز شاہ در بادشاہی نشست، خدمت شیخ نصیر الدین بر سلطان فیروز شاہ پیغام کردہ کہ بایں خلق عدل و انصاف خواہی کرد یا برائے ایں مشتے مسکینان والی دیگر از اللہ تبارک و تعالیٰ التماس کردہ آید، سلطان فیروز جواب فرستاد کہ بابندگانِ خدائے تعالیٰ حلم و رزم و اتفاق کنم، چوں خدمت شیخ ایں لفظ شنید، بر سلطان فیروز جواب فرستاد اگر با خلق ایں چنیں خلق خواہی کرد، ما ہم برائے تو از اللہ تبارک و تعالیٰ بچہل سال ملک خواستہ ایم، عاقبت ہم چناں شد، سلطان فیروز تا چہل سال ملک راند۔"[1]

جب سلطان محمد تغلق ٹھٹھہ ملک طغی کی بغاوت فرو کرنے گیا ہوا تھا، حضرت شیخ نصیر الدین کو اپنے ساتھ لے گیا تھا، سلطان کا جب انتقال ہوا اور سلطان فیروز شاہ دربار شاہی میں بیٹھا، حضرت شیخ نصیر الدین نے فیروز شاہ کو پیغام بھیجا کہ خدا کی اس مخلوق کیساتھ تم عدل و انصاف کرو گے یا میں ان غریبوں کیلئے اللہ سے کوئی دوسرا حاکم مانگوں۔ سلطان فیروز نے جواب دیا کہ "بابندگانِ خدائے تعالیٰ حلم و رزم و اتفاق کنم"، جب حضرت شیخ نے یہ جواب سنا تو کہلوا بھیجا کہ اگر مخلوق کیساتھ اسی طرح معاملہ کرو گے تو میں نے اللہ تعالیٰ سے تمہارے لئے چالیس سال مانگ لئے ہیں، اور واقعہ بھی یہی ہے کہ سلطان فیروز نے چالیس سال حکومت کی

سلطان محمد شاہ بہمنی (۷۵۹، ۷۷۶ء) کو تمام مشائخ دکن نے بادشاہ تسلیم کر لیا تھا اور اسکے ہاتھ پر حاضرانہ اور غائبانہ بیعت کر لی لیکن حضرت شیخ برہان الدین غریب کے خلیفہ و جانشین حضرت شیخ زین الدین (م ۸۰۱ھ)

---

[1] تاریخ فیروز شاہی ص ۲۸

نے اس بنا پر انکار کر دیا کہ بادشاہ شراب نوشی اور منہیاتِ شرعی کا مرتکب ہے اور فرمایا :-

سزاوارِ پادشاہیِ خلق کسے ہست کہ در حفظ | خلق خدا پر حکومت کرنے کا اہل وہ شخص
شعار ملّت محمدیؐ کوشیدہ سرّاً و علانیۃ | ہے جو شعائر اسلام کی حفاظت میں کوشش کیے
پیرامون مناہی نگردد | اور خلوت و جلوت کسی حالت میں بھی ممنوعات شرعی کے قریب نہ جائے۔

۷۶۶ھ میں جب سلطان دولت آباد میں فاتحانہ داخل ہوا تو حضرت شیخ کو پیغام بھیجا کہ یا تو آپ میرے دربار میں حاضر ہوں یا میری خلافت کی تحریر اپنے دستِ خاص کی میرے پاس بھیجیں۔ شیخ نے اسکے جواب میں فرمایا کہ ایک مرتبہ کسی تقریب سے ایک عالم، ایک سیّد اور ایک ہیجڑا کافروں کے ہاتھ پڑ گئے، انھوں نے یہ فیصلہ کیا کہ یہ تینوں بُت خانہ میں جائیں، جو بت کو سجدہ کرے گا اس کی جان بخشی ہوگی اور جو انکار کرے گا وہ قتل کر دیا جائیگا، پہلے عالم کو لے گئے، انھوں نے قرآن کی رخصت پر عمل کیا[1] اور بت کا سجدہ کر کے اپنی جان بچا لی، سیّد نے عالم کی تقلید کی، جب ہیجڑے کی باری آئی اس نے کہا میری تمام زندگی ناشائستہ کاموں میں گذری، میں نہ عالم ہوں نہ سیّد کہ ان میں سے کسی فضیلت کی پناہ میں ایسا کام کروں، اس نے قتل ہو جانا منظور کر لیا اور بت کا سجدہ نہیں کیا، میرا قصہ بھی اسی ہیجڑے کے قصہ سے مشابہت رکھتا ہے، میں تمھارے ہر قسم کے ظلم کو برداشت کروں گا، لیکن نہ دربار میں حاضر ہوں گا اور نہ تمھارے ہاتھ پر بیعت کروں گا۔ بادشاہ کو سخت غصہ آیا اور شہر سے نکل جانے کا حکم دیا، شیخ نے بلا توقف اپنی جائے نماز کاندھے پر ڈالی اور شیخ برہان الدین کے مقبرے میں جا کر ان کی قبر کی پائنتی اپنی لاٹھی گاڑ دی اور جائے نماز بچھا کر بیٹھ گئے اور کہا کہ اب کوئی مرد ہو تو مجھے اپنی جگہ سے ہلائے۔ بادشاہ نے شیخ کی یہ مضبوطی اور استقامت دیکھی تو پشیمان ہوا اور اپنے ہاتھ سے یہ مصرع کاغذ پر لکھ کر صدر شریف کے ہاتھ بھیجا

---

[1] الا ان تتقوا منھم تقاۃ (سورہ آل عمران، رکوع ۳) مگر ایسی صورت میں کہ تم ان سے کسی قسم کا (قوی) اندیشہ رکھتے ہو۔

ع "از من زانِ تو ام تو زانِ من باش"

شیخ نے فرمایا کہ اگر سلطان محمد شاہ غازی شریعت کے طور و طریق کی حفاظت و ترویج کی کوشش کرے اور ممالکِ محروسہ سے شراب خانے یک قلم اٹھا دے، اپنے باپ کی سنّت پر عمل کرے اور لوگوں کے سامنے شراب نہ پیئے، اور قضاۃ و علماء و صدور کو حکم دے کہ امر بالمعروف و نہی عن المنکر میں سعیٔ بلیغ سے کام لیں تو فقیر زین الدین سے بڑھ کر بادشاہ کا کوئی دوسرا دوست و خیر خواہ نہ ہوگا۔ نیچے یہ شعر اپنے قلمِ مبارک سے تحریر فرمایا ؎

تا من بزیم بجز نکوئی نہ کنم | جز نیک دلی و نیک خوئی نہ کنم
آنہا کہ بجائے ما بدیہا کردند | تا دست رسد بجز نکوئی نہ کنم

(ترجمہ) جب تک جان میں جان ہے سوائے اچھائی، نیک دلی اور نیک خوئی کے مجھ سے کچھ سرزد نہ ہوگا۔ جن لوگوں نے ہمارے ساتھ برائی کی، جب موقع ملے گا ہم ان کے ساتھ سوائے بھلائی کے کچھ نہ کریں گے)

سلطان محمد شاہ اپنے نام کے ساتھ غازی کا خطاب دیکھ کر بہت خوش ہوا اور فرمان جاری کیا کہ القاب شاہی کیساتھ اس کا بھی اضافہ کیا جائے، قبل اسکے کہ سلطان کی حضرت شیخ سے ملاقات ہو سلطان نے مرہٹ واڑہ کی حکومت مسندِ عالی خان محمدؐ کے حوالہ کی اور خود بدولت گلبرگہ پہنچا اور شراب کی دکانوں کو اپنی پوری حکومت سے ختم کر کے شریعت کی ترویج و اشاعت میں اپنی کوشش مبذول کی، دکن کے چوروں و فسادیوں کو جو تمرد و سرکشی میں مشہور تھے اور جنھوں نے رہزنی کو اپنا شیوہ بنالیا تھا، ختم کرنے کا انتظام کیا، چھ سات مہینے کے اندر اندر ملک ان سے پاک ہو گیا۔ ایک روایت کے مطابق چھ مہینے کی مدّت میں چوروں، رہزنوں کے بیس ہزار سر کاٹ کر اطراف و جوانب سے گلبرگہ میں لائے گئے۔ سلطان اس عرصہ میں حضرت شیخ زین الدین سے برابر خط و کتابت کرتا رہا اور اخلاص و عقیدت کی راہ دسیم بڑھاتا رہا۔ شیخ نے بھی اسکی ہمت افزائی، قدر دانی اور ہدایات اور مشوروں سے دریغ نہیں کیا۔[۱]

---

[۱] تاریخ فرشتہ (جلد اوّل) از صفحہ ۵۶۱ تا صفحہ ۵۶۲، طبع پونا ۱۸۳۲ء - ۱۲

چشتیوں کی بڑی بڑی خانقاہیں ہندوستان کے جن حصّوں اور صوبوں میں قائم ہوئیں، انھوں نے وہاں کی اسلامی حکومتوں اور سلاطین وقت کی رہنمائی اور اسلامی حکومت کی حفاظت وتقویت سے غفلت نہیں کی۔ بنگال کی مشہور عالم خانقاہ جو پنڈوہ میں تھی وہاں کی اسلامی حکومت کے لئے قوت اور پشت پناہی کا ذریعہ تھی، جب وہاں سے اسلامی اقتدار ختم ہونے لگا تو ان درویشوں نے اسکی فکر کی اور اس کو دوبارہ بحال کرنے کی امکانی کوشش کی[۱]۔ پروفیسر خلیق احمد نظامی تاریخ مشائخ چشت میں لکھتے ہیں :۔

"حضرت نور قطب عالم شیخ علاء الحق کے فرزند رشید تھے، جس زمانہ میں وہ مسندِ ارشاد پر جلوہ افروز تھے، بنگال کی سیاست بڑے نازک دور سے گذر رہی تھی، راجہ کنس (جو بھوریہ ضلع راج شاہی کا جاگیردار تھا) بنگال کے تخت پر قابض ہوگیا تھا اور مسلمانوں کی قوت کا خاتمہ کرنے پر تلا ہوا تھا، حضرت نور قطب عالم نے براہِ راست اور سیّد اشرف جہانگیر سمنانی کی وساطت سے سلطان ابراہیم شرقی کو بنگال پر حملہ کرنے کی دعوت دی، سیّد اشرف جہانگیر کے مجموعے میں وہ دلچسپ خطوط خاص طور سے مطالعہ کے قابل ہیں، جن میں اس سیاسی کشمکش کی تفصیل درج ہے۔ سیّد اشرف جہانگیر نے جو خط حضرت نور قطب عالم کے مکتوب کے جواب میں لکھا وہ بنگال میں صوفیائے کرامؒ کے کارناموں پر کافی روشنی ڈالتا ہے۔"[۲]

ان چند واقعات سے جو تاریخ کے وسیع انبار میں سے "مشتے نمونہ از خروارے" کے طور پر بغیر کسی تاریخی ترتیب کے جمع کر دیئے گئے، اندازہ ہوگا کہ مشائخ چشت کا تصوّف، محض عزلت وخلوت نفس کشی اور ترکِ دنیا

---

[۱] تفصیل کیلئے ملاحظہ ہو ریاض السّلاطین تاریخ بنگالہ تصنیف غلام حسین سلیم صـ۱۱۱ عنوان مسلّط شدن راجہ کانس زمیندار تا صـ۱۱۶ [۲] تاریخ مشائخ چشت صـ۲۰۲

اور اقبال کے الفاظ میں "سربزیری اور گوسفندی و میشی" نہیں تھا، انھوں نے اپنے اپنے دور میں زمانہ کے دھارے کو بدلنے اور حالاتِ زمانہ سے پنجہ آزمائی کی بھی کوشش کی۔ جابر سلاطین کے روبرو کلمۂ حق کہنے، اُن کے غلط رجحانات کا مقابلہ کرنے اور ان کو صلاح و مشورہ دینے سے بھی پس و پیش نہیں کیا، اور جب کبھی اُن کے اولوالعزم مشائخ کو موقع ملا انھوں نے اصلاح و انقلاب کی کوششوں سے بھی دریغ نہیں کیا۔

اشاعتِ اسلام سلسلۂ چشتیہ کی بنیاد ہندوستان میں پہلے ہی دن سے اشاعت و تبلیغِ اسلام پر پڑی تھی اور اس کے عالی مرتبت بانی حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ کے ہاتھ پر اس کثرت سے لوگ مسلمان ہوئے کہ تاریخ کے اس اندھیرے میں ان کا اندازہ لگانا مشکل ہے عام طور پر تسلیم کیا جاتا ہے کہ ہندوستان میں مسلمانوں کی تعداد کی یہ کثرت بہت کچھ حضرت خواجہؒ کی کوششوں اور روحانیت کی رہینِ منت ہے، ان میں سے ایک بڑی تعداد حضرت خواجہؒ کی روحانی قوت، اشراقی کمال اور عند اللہ مقبولیت کے واقعات سے مسلمان ہوئی، اس وقت تک ہندوستان جوگ و اشراقیت کا ایک بڑا مرکز تھا۔ یہاں کے بہت سے فقیر و سنیاسی اشراقی اور قلبی قوت میں بڑا کمال رکھتے تھے، ریاضیاتِ شاقہ اور مختلف مشقوں سے انھوں نے کشف و تصرف کی بڑی قوت بڑھا رکھی تھی، اُن میں بہت سے لوگ اس نووارد مسلمان فقیر کے امتحان اور اُس کو زک دینے کے لئے اُس کے پاس آئے، لیکن ان کو بہت جلد معلوم ہو گیا کہ یہ غریب الوطن درویش اُن سے اپنی قلبی قوت اور اشراقیت میں بڑھا ہوا ہے اور ساحرینِ فرعون کی طرح ان کو یہ اندازہ ہو گیا کہ اُس کے کمالات اور قوتوں کا منبع اور سرچشمہ کچھ اور ہے، اسی کے ساتھ اُن کے اخلاق کی پاکیزگی، صاف ستھری زاہدانہ اور بے طمع زندگی، ایمان و یقین کی قوت، خلقِ خدا کے ساتھ ہمدردی اور بلا تفریق مذہب و ملت انسان سے محبت اور انسانیت کا احترام دیکھ کر مخالفین بھی معتقد، اور دشمن بھی دوست ہو گئے۔ تذکرہ و تصوف کی کتابوں میں اس سلسلہ میں جوگیوں و سنیاسیوں کے ساتھ مقابلہ اور حضرت خواجہؒ کی اشراقی قوت اور کشف و تصرفات کے جو واقعات کثرت کے ساتھ نقل کئے گئے ہیں، اگرچہ ان کو تاریخی سند سے اور قدیم تر معاصر ماخذ کے ذریعہ ثابت کرنا مشکل ہے لیکن ہندوستان کے

اُس وقت کے ذوق و رجحان اور اجمیر کی دینی و روحانی مرکزیت کو دیکھتے ہوئے یہ واقعات خلافِ قیاس نہیں، دراصل جس چیز نے حضرت خواجہؒ کا گرویدہ اور اسلام کا حلقہ بگوش بنایا وہ تنہا ان کی قلبی قوت تھی، بلکہ ان کی روحانیت، اخلاص و اخلاق اور اُن کا وہ طرزِ زندگی تھا جس کا ہندوستان کے اہلِ فن اور عوام نے اس سے پہلے کبھی تجربہ نہیں کیا تھا۔

خواجہ بزرگ کے اہلِ سلسلہ میں سے حضرت خواجہ فریدالدین گنج شکرؒ کی کوششوں اور توجہات کو اشاعتِ اسلام کے سلسلہ میں خاص اہمیت حاصل ہے۔ ان کی مجالس اور خانقاہ میں ہر مذہب و ملّت کے آدمی اور ہر طبقہ کے لوگ آتے تھے۔ حضرت خواجہ نظام الدین اولیاؒ فرماتے ہیں:۔

بخدمت شیخ الاسلام فریدالدین از ہر جنس درویش وغیر آں برسید[1]	حضرت خواجہ فریدالدینؒ کی خدمت میں ہر صنف و نوع کے لوگ درویش و غیر درویش پہنچتے تھے۔

حضرت خواجہؒ کو اللہ تعالیٰ نے جو عالی استعداد قلبی قوت عطا فرمائی تھی اسکے پیشِ نظر بعید نہیں کہ اشاعتِ اسلام میں وہ بھی معین ہوئی ہو اور نومسلموں کی بہت بڑی تعداد ان کی روحانیت اور کشف و کرامات دیکھکر مسلمان ہوئی ہو۔ پنجاب اور پاک پٹن کے اطراف میں بہت سی مسلمان برادریاں اور خاندان اپنے اسلاف کے قبولِ اسلام کو حضرت خواجہؒ کی توجہ اور تبلیغ کا نتیجہ سمجھتے ہیں اور اپنی نسبت اُن کی طرف کرتے ہیں۔ پروفیسر آرنلڈ اپنی کتاب (PREACHING OF ISLAM) میں لکھتا ہے:۔

"پنجاب کے مغربی صوبوں کے باشندوں نے خواجہ بہاءالحق ملتانی اور بابا فرید پاک پٹنی کی تعلیم سے اسلام قبول کیا۔ یہ دونوں بزرگ تیرھویں صدی عیسوی کے قریب خاتمہ اور چودھویں صدی عیسوی کے شروع میں گذرے ہیں۔ بابا فرید شکر گنجؒ کا تذکرہ جس مصنف نے

---

[1] فوائدالفواد ص۵

لکھاہے، اس نے تحریر کیاہے کہ سولہ[1] قوموں کو انھوں نے تعلیم و تلقین سے مشرف باسلام کیا۔ لیکن افسوس ہے اس مصنّف نے ان قوموں کے مسلمان ہونے کا مفصل حال نہیں لکھا۔

حضرت خواجہ نظام الدینؒ کو اہلِ ہند میں اشاعت اسلام سے بڑی دلچسپی تھی، لیکن وہ یہ سمجھتے تھے کہ محض تقریر اور کہنے سننے سے کسی شخص کا اپنے قدیم عقیدے سے ہٹنا اور نئے دین کو قبول کرلینا، بالخصوص ہندو قوم کا جو اپنی پختگی، قدامت پرستی اور ذات پات اور چھوت چھات کی پابندی میں خاص امتیاز رکھتی ہو، محض حسنِ تقریر اور وعظ و نصیحت سے مسلمان کرلینا آسان نہیں، اس کے لیے اُن کے لئے موثر و طویل صحبت کی ضرورت تھی۔

فوائدالفواد میں ہے کہ ایک غلام جو مسلمان تھا حضرت کی مجلسِ مبارک میں حاضر ہوا اور اپنے ایک ہندو دوست کو اپنے ساتھ لایا اور کہا کہ یہ میرا بھائی ہے۔ حضرت خواجہؒ نے اس غلام سے فرمایا کہ: ـ تمھارا یہ بھائی کچھ اسلام کی طرف بھی میلان رکھتا ہے؟ غلام نے عرض کیا کہ: ـ اس کو حضرت کے قدموں میں اسی لیے لایا ہوں کہ آپ کی نظرِ کیمیا اثر کی برکت سے یہ مسلمان ہو جائے۔ یہ سنکر حضرت خواجہؒ کی آنکھوں میں آنسو آگئے، فرمایا کہ کسی کے کہنے سننے سے اس قوم کا دل نہیں پھرتا، ہاں اگر اسکو کسی نیک بندے کی صحبت میسر آجائے تو امید ہوتی ہے کہ اس کی صحبت کی برکت سے وہ مسلمان ہو جائے[2]۔

اس میں کوئی شبہ نہیں کہ اس پچاس برس کے عرصہ میں جس میں حضرت خواجہ نظام الدینؒ دہلی جیسے مرکزی مقام میں مسندِ ہدایت و ارشاد پر متمکن رہے اور ان کی خانقاہ کا دروازہ ہر انسان کیلئے کھلا رہا، یہ وہ زمانہ تھا جب ہندوستان کے دور دراز گوشوں سے مختلف ضرورتوں اور تقریبوں سے لاکھوں کی تعداد میں غیر مسلم آتے تھے اور اپنی خوش اعتقادی کی بنا پر حضرت خواجہؒ کی زیارت کو بھی حاضر ہوتے تھے، بڑی تعداد میں لوگ مسلمان ہوئے۔ میوات کا علاقہ جو حضرت خواجہؒ کے مرکز غیاث پور سے جانبِ جنوب متصلاً واقع ہے اور

---

[1] دعوت اسلام، ترجمہ مولوی عنایت اللہ دہلوی ص ۲۹۷ [2] فوائدالفواد ص ۱۸۲

جہاں کے رہنے والوں کی رہزنی اور شورہ پشتی کی وجہ سے کچھ عرصہ پہلے سلطان ناصر الدین محمود کے زمانہ میں شہر پناہ دہلی کے دروازے سرِ شام ہی سے بند ہو جاتے تھے اور جن کی کئی بار غیاث الدین بلبن کو تادیب کرنی پڑی حضرت خواجہؒ کے فیوض و برکات اور اُن کی تعلیم و تربیت سے ضرور مستفید ہوا ہوگا اور عجب نہیں کہ اتنی بڑی تعداد میں میواتی انھیں کے زمانہ میں مسلمان ہوئے ہوں۔

چشتی خانقاہوں نے اپنے اپنے حلقۂ اثر میں بالواسطہ اور بلاواسطہ گرد و پیش کی غیر مسلم آبادیوں کو اپنے اخلاق، روحانیت اور مساوات و اخوت سے جس کی فضا ان خانقاہوں میں قائم تھی ضرور متاثر کیا، اور اُن قوموں کو جو کشف و کرامت اور روحانیت سے خاص طور پر متاثر ہوتی ہیں اسلام میں داخل کرنے کا ذریعہ بنے، پنڈوہ کی چشتی خانقاہ اور احمد آباد اور گلبرگہ کے چشتی مشائخ کے اثر سے غیر مسلموں کی ایک بڑی تعداد کا مسلمان ہونا بالکل قرینِ قیاس ہے، گیارھویں صدی میں سلسلۂ چشتیہ کے مجدد حضرت شاہ کلیم اللہ جہاں آبادی کو اشاعتِ اسلام کا بڑا اہتمام تھا، انھوں نے اپنے خلیفہ و جانشین شیخ نظام الدین اورنگ آبادی کو جو خطوط لکھے ہیں، ان میں جا بجا اس کی تاکید و ہدایت ہے، ان کے مطالعہ سے ان کی اس مسئلہ میں بے چینی اور فکر کا اندازہ ہوتا ہے۔ ایک مکتوب میں لکھتے ہیں:۔

درآں کوشید کہ صورت اسلام وسیع گردد و ذاکرایں کثیر۔[1]	اسکی کوشش کرو کہ اسلام کا دائرہ وسیع اور اسکے حلقہ بگوش کثیر ہوں۔

دوسرے مکتوب میں لکھتے ہیں:۔

بہر حال کلمۃ الحق کوشید وازمشرق تا
مغرب ہمہ حقیقی برکنید[2]

[1] مکتوبات کلیمی، مکتوب نمبر ۶، ص۶۰ [2] ایضاً نمبر ۸۰ ص۶۲

پروفیسر خلیق احمد نظامی لکھتے ہیں :-

"شیخ نظام الدین صاحبؒ کی تبلیغی کوششوں کا نتیجہ یہ ہوا کہ بہت سے ہندو گرویدۂ اسلام ہو گئے۔ بعض اپنے رشتہ داروں کے ڈر سے مسلمان ہونے کا اظہار نہیں کرتے تھے لیکن دل سے مسلمان ہو چکے تھے۔"

شاہ کلیم اللہ صاحب ایک مکتوب میں تحریر فرماتے ہیں :-

"و دیگر مرقوم بود بہیہ دیارام و ہندوہائے دیگر بسیار در ربقۂ اسلام آمدہ اند، امابا مردم قبیلہ پوشیدہ می مانند"

ساتھ ہی ساتھ اس چیز کو بھی پسند نہیں کرتے تھے کہ کوئی شخص مسلمان ہونے کے بعد اپنے مسلمان ہونے کو مخفی رکھے، مبادا بعدِ موت اُسکے ساتھ وہ معاملہ کیا جائے جو غیر مسلموں کے ساتھ کیا جاتا ہے۔

"برادرِ من اہتمام نمایند کہ آہستہ آہستہ ایں امرِ جلیل از بطون بظہور انجامد کہ موت در عقب است، مبادا احکامِ اسلام بعد از رحلت بجا نیارند و مسلمان حقیقت را ہنود انند دیارام اگر خطے می نویسد، خطے نوشتہ خواہد شد۔"[1]

افسوس ہے کہ کسی نے مشائخ ہندوستان اور بالخصوص سلسلۂ چشتیہ کے مشائخ کی تبلیغی کوششوں کی تاریخ در روئداد مرتب کرنے کی زحمت گوارا نہیں کی، لیکن تمام مورخین کے نزدیک ہندوستان میں اشاعتِ اسلام کا سب سے بڑا ذریعہ صوفیائے کرام و فقرائے اسلام ہیں، اور ظاہر ہے کہ ان سلاسلِ تصوف میں سلسلۂ چشتیہ اور اُس کے مشائخ کو اولیت اور اہمیت حاصل ہے، اور اس کام میں اُن کا حصہ تناسب سے زیادہ ہے۔

خدمت و اشاعتِ علم

حضرت خواجہ نظام الدین اولیاءؒ اور اُن کے خلفاء اور اہلِ سلسلہ کو علم کی تحصیل و تکمیل کا جتنا اہتمام تھا اُسکا اندازہ حضرت خواجہ فریدالدینؒ

۱؎ مکتوب ۲۱ ص ۴۱

کے مقتدا اور خود حضرت خواجہ نظام الدین کے شیخ سراج الدین عثمان اودھی (اخی سراج) بانیِ خانقاہ پنڈوہ کے ساتھ دور یہ سے ہو سکتا ہے کہ انھوں نے انکو اس وقت تک اجازت نہیں دی جب تک کہ انھوں نے علم کی تحصیل و تکمیل نہیں کر لی، اس کا نتیجہ یہ تھا کہ رشد و ارشاد اور درس و تدریس اور علم کی اشاعت و ترویج دونوں اس سلسلہ کی تاریخ میں ساتھ ساتھ چلتے رہے اور یہ رفاقت دورِ انحطاط تک قائم رہی حضرت خواجہؒ کے ایک خلیفۂ اجل مولانا شمس الدین یحییٰ تھے جو اس عصر کے بہت سے علماء اور اساتذہ کے استاد تھے۔ شیخ نصیر الدین چراغ دہلیؒ کا مشہور شعر ہے: ؎

سألتُ العلمَ من احیاکَ حقّاً

فقال العلمُ شمس الدّین یحییٰ

میں نے علم سے پوچھا کہ تمھیں حقیقی حیات کس نے بخشی؟ اس نے مولانا شمس الدین یحییٰؒ کا نام لیا۔

شیخ نصیر الدین چراغ دہلیؒ کے مخصوص ارادت مندوں و مسترشدین میں قاضی عبد المقتدر کندی (م ۷۹۱ھ) ان کے شاگرد رشید شیخ احمد تھانیسری (م ۸۲۰ھ) اور مولانا خواجگی دہلوی (م ۸۰۹ھ) ہندوستان کے نامور ترین علماء استاد الاساتذہ و مجددین علم میں سے ہیں۔ قاضی عبد المقتدر اور مولانا خواجگی کے شاگرد رشید شیخ شہاب الدین احمد بن عمر دولت آبادی (م ۸۴۹ھ) فخر ہندوستان اور نادرۂ روزگار تھے اور ملک العلماء قاضی شہاب الدین کے نام سے ہندوستان کی علمی تاریخ میں زندۂ جاوید ہیں، اُن کی شرح کافیہ (جو شرح ہندی کے نام سے عرب و عجم میں مشہور ہوئی) کے محشیوں میں ملا عبدالغفور لاری، ملا عصام الدین اسفرائنی اور میر غیاث الدین منصور شیرازی جیسی بلند شخصیتیں ہیں، یہ وہی ہیں جنکی علالت کے موقع پر سلطان ابراہیم شرقی نے پانی کا پیالہ بھر کر اُن پر سے تصدق کیا اور دعا کی کہ ملک العلماء میری سلطنت کی آبرو ہیں اگر اُن کی موت مقدر ہی ہے تو اُن کے بجائے مجھے قبول کر لیا جائے۔

اسی سلسلہ کے ایک عالم جلیل مولانا جمال الاولیاء شبلی لوردی (م ۸۴۲ھ)

جن کے نامور شاگردوں میں مولانا لطف اللہ کوروی، سید محمد ترمذی کالپوری، شیخ محمد رشید جونپوری اور شیخ لیسین بنارسی جیسے علمائے کبار و شیوخ عصر تھے مولانا لطف اللہ کوروی کے شاگرد ہندوستان کے مشہور عالم مولانا احمد امیٹھوی عرف حمید احمد اور قاضی علیم اللہ کچھندوی اور مولانا علی اصغر قنوجی تھے جنھوں نے درس و تدریس کا ہنگامہ گرم رکھا اور بڑے بڑے نامور عالم و مدرس اُن کے حلقۂ درس سے تیار ہو کر نکلے۔ ٹیلے والی مسجد کا شہرۂ آفاق دار العلوم جس کے مسند نشین حضرت شاہ پیر محمد لکھنوی (م ۱۰۸۵ھ) تھے اسی سلسلہ سے تعلیمی روحانی نسبت رکھتا تھا خود درسِ نظامی (جس کی جہانگیری مسلّم ہے) کے بانی ملا نظام الدین (م ۱۱۶۱ھ) اور اُن کے نامور جانشین اور اہلِ خاندان اس سلسلہ سے نسبتِ روحانی رکھتے تھے، اس کے علاوہ عام طور پر بھی مشائخ چشت کا علمی ادبی ذوق، تبحر اور علمی شغف ایک تاریخی حقیقت ہے، جو حضرت نور قطب عالم، حضرت جہانگیر اشرف سمنانی، حضرت شاہ کلیم اللہ جہاں آبادی کے مکتوبات اور پنڈوہ، گلبرگہ، مانک پور، سلون وغیرہ کی خانقاہوں کی علمی سرگرمیوں اور دلچسپیوں سے عیاں ہے۔

خاتمۂ کلام

قبل اسکے کہ سلسلۂ چشتیہ کی تاریخ کا یہ صفحۂ زرّیں ختم کیا جائے، ایک تلخ حقیقت کی طرح اس کا اظہار ضروری ہے کہ زمانہ کے مرور و انقلاب کے ساتھ اس سلسلہ اور اسکے بانیانِ کرام اور اسلافِ عظام کی خصوصیتوں میں انحطاط و زوال رونما ہوا، تصوف و روحانیت کی تاریخ بتاتی ہے کہ ہر سلسلہ کا آغاز جذب قوی سے ہوا، پھر اس نے سلوک اور آخر میں رسوم کی شکل اختیار کر لی، یہاں بھی جس سلسلہ کا آغاز عشق، درد و محبت، زہد و ایثار، فقر و استغنا، ریاضات و مجاہدات اور دعوت و تبلیغ سے ہوا تھا اس میں بتدریج ایسی تبدیلی ہوئی کہ آخر میں اسکے نظام کے تین نمایاں عناصر ترکیبی رہ گئے۔

(۱) وحدت الوجود کے عقیدہ میں غلو اس کی اشاعت کا انہماک اور اس کے باریک و دقیق مضامین

(۲) محافلِ سماع کی کثرت، وجد و رقص کا زور۔

(۳) اعراس کا اہتمام اور ان کی رونق و گرم بازاری جو شرعی حدود و قیود سے بے نیاز ہے۔

وہ اعمال و رسوم اور عقائد جن کی اصلاح کیلئے دین خالص کے یہ اولوالعزم داعی ایران و ترکستان کے دور دراز مقامات سے آئے تھے، خانقاہوں کا ایسا دستور العمل بن گئے کہ غیر مسلم آبادی کے لئے یہ ایک معمہ اور سوال بن گیا کہ اسلام اور دوسرے مذاہب میں (جن کی اصلاح کے لئے یہ مبلغین اسلام بحر و بر طے کر کے تشریف لائے تھے) عملاً کیا فرق ہے؟ توحید کے لفظ کا استعمال اور دعوت "توحید وجود" کے معنی میں محدود ہو کر رہ گئی۔ سنت اور اتباع شریعت جس پر ان مشائخ نے اتنا زور دیا تھا، اہلِ ظاہر کا شعار اور حقیقت ناشناسوں کی علامت بن کر رہ گیا، شریعت و طریقت دو الگ الگ کوچے تسلیم کئے گئے جن میں صرف مغائرت تھی، بلکہ تضاد، مزامیر و آلاتِ سماع جن کی مشائخ متقدمین نے اتنی شدت سے ممانعت کی تھی، داخل طریق بن گئے، درد و عشق کی جنس جو طریقۂ چشتیہ کا سرمایہ تھا اس بازار میں ایسی نایاب ہوئی کہ طالبِ صادق کو حسرت سے کہتے ہوئے سنا گیا کہ۔ ع

وہ جو بیچتے تھے دوائے دل وہ دکان اپنی بڑھا گئے

فقر جو اس طریق کا فخر تھا شانِ امیری اور شکوہِ خسروی سے تبدیل ہو گیا۔

اس سے بڑھ کر انقلاب اور تاریخ کا سانحہ یہ ہے کہ جن بندگان خدا کا مقصدِ حیات ہی خدا کے سب بندوں کا سر دنیا کے تمام آستانوں ——————— سے اٹھا کر خدائے واحد کے آستانہ پر جھکانا اور "ماسوی" میں اٹکے ہوئے اور پھنسے ہوئے دلوں کو نکال کر ایک خدا سے اٹکانا تھا اور جن کی دعوت اور زندگی انبیاء علیہم السلام کی زندگی کی تصویر اور ان آیات کی تفسیر تھی:—

ما کان لبشر ان یؤتیہ اللہ الکتٰب کسی بشر سے یہ بات نہیں ہو سکتی کہ اللہ تو اس کو

والحکم والنبوۃ ثم یقول	کتاب اور دین کی فہم اور نبوت عطا فرمائے اور پھر
للناس کونوا عِبَادًا لی	وہ لوگوں سے کہنے لگے کہ میرے بندے بن جاؤ خدا تعالیٰ
من دون اللّٰہ ولکن کونوا	کی توحید کو چھوڑ کر لیکن وہ یہ کہے گا کہ تم اللہ والے
ربانیین بما کنتم تعلمون	بن جاؤ بوجہ اس کے کہ تم کتاب الٰہی اوروں کو بھی
الکتاب وبما کنتم تدرسونؔ	سکھاتے ہو اور بوجہ اسکے کہ خود بھی اسکو پڑھتے ہو
ولا یامرکم ان تتخذوا الملٰئکۃ	اور نہ وہ یہ بات بتلائے گا کہ تم فرشتوں کو اور
والنّبیین اربابًا ایأمرکم	نبیوں کو رب قرار دے لو۔ بھلا وہ تم کو کفر کی
بالکفر بعد اذ انتم مسلمون۝	بات بتلادے گا بعد اس کے کہ تم
(اٰل عمران - ع ۸)	مسلمان ہو۔

انقلاب زمانہ سے خود اُن کی ذات مطلوب و مقصود اور خود اُن کا آستانہ مسجود و معبود بن گیا۔

مخدوم الملکؒ

شیخ شرف الدین یحییٰ منیری

رحمۃ اللہ علیہ

(۶۶۱ھ ——— ۷۸۶ھ)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

باب اوّل

حالاتِ زندگی

ولادت سے بیعت و اجازت تک

خاندان احمد نام، شرف الدین لقب، مخدوم الملک بہاری خطاب؛ والد کا نام شیخ یحییٰ تھا جو زبیر بن عبدالمطلب کی اولاد میں تھے، اس طرح آپ کا خاندان ہاشمی قریشی ہے۔ آپ کے پردادا مولانا محمد تاج فقیہ اپنے زمانہ کے بڑے علماء و مشائخ میں سے تھے۔ الخلیل[1] (شام) سے نقل سکونت کر کے بہار کے قصبہ منیر[2] میں قیام پذیر ہوئے، بعض مصنفین نے آپ کو شہاب الدین غوری کا ہمعصر بتایا ہے۔

---

[1] اب یہ شہر مملکت ہاشمیہ اُردنیہ کا ایک شہر ہے جو بیت المقدس سے تقریباً ۱۵، ۱۶ میل پر واقع ہے، اس کو حضرت ابراہیم خلیل اللہ کے مدفن ہونے کا شرف حاصل ہے۔ شرفاء اور صلحاء کی یہ قدیم بستی ہے؛ اپنی آب و ہوا کی لطافت اور اپنے ساکنین کی نرم خوئی، میزبانی اور حسنِ اخلاق میں مشہور رہا ہے۔

[2] اس وقت عام طور پر قصبہ منیر کے نام سے مشہور ہے، لیکن قدیم مآخذ و روایات سے معلوم ہوتا ہے (بقیہ صفحہ ۸ پر)

مولانا محمد تاج فقیہؒ کی ذات سے منیر اور اسکے مضافات میں اسلام کی بہت اشاعت ہوئی، کچھ عرصہ آپ نے منیر میں قیام کرکے وطن کو مراجعت فرمائی اور زندگی کا بقیہ حصہ خلیل ہی میں بسر کیا۔ آپ کا خاندان بدستور منیر میں رہا۔

شیخ احمد شرف الدینؒ کے نانا شیخ شہاب الدین جگ جوتؒ سہروردی سلسلہ کے مشائخ میں تھے۔ آبائی وطن کاشغر تھا، ہندوستان تشریف لائے اور موضع جھٹلی میں قیام فرمایا جو پٹنہ سے تین میل کے فاصلہ پر ہے۔ شیخ الشیوخ حضرت شہاب الدین سہروردی کے مریدین میں سے تھے۔ زہد و ورع اور استقامت میں پایہ بلند رکھتے تھے، اور اسی وجہ سے جگ جوت (دنیا کی روشنی) کے لقب سے مشہور تھے، ان کی ایک صاحبزادی کے بطن سے شیخ احمد شرف الدینؒ اور دوسری صاحبزادی سے شیخ احمد چرم پوشؒ جیسے نامور مشائخ پیدا ہوئے۔ آپ حسینی سادات میں سے تھے، اس طرح شیخ احمد شرف الدینؒ کا سلسلہ مادری سادات میں سے ہے۔

(صفحہ کا بقیہ حاشیہ) اسکا اصلی تلفظ مُنیَر تھا فرہنگ ابراہیمی جس کے دوسرے نام شرف نامہ ابراہیمی اور شرف نامہ احمد منیری بھی ہیں اور جو ۸۶۲ھ اور ۸۶۰ھ کے درمیان کی تصنیف ہے، کے مقدمہ میں اسکے مصنف ابراہیم قوام فاروقی نے اپنا ایک مصرع میں کتاب کا نام اسطرح منظوم کیا ہے۔ ع "شرف نامہ احمد مُنیری" یہ مصرع جب ہی موزوں ہوتا ہے جب مُنیَری پڑھا جائے۔ اس کتاب کے تذکرہ کے ذیل میں انڈیا آفس لائبریری کی فہرست میں اس کو انگریزی میں بھی اسی طرح ضبط کیا گیا ہے یعنی مُنیَری (MUNYARI) -۱۲

لہ سیرۃ الشرف میں ہے کہ یہ قصبہ ۵۷۶ھ میں مسلمانوں کے ہاتھ فتح ہوا۔ مصنف نے ایک قطعۂ تاریخ نقل کیا ہے جو حسب ذیل ہے: ؎

یافت چوں بر راجۂ منیر ظفر | داد امام از دین جہانے را نوی
۵۷۶
ہست منقول از بزرگان سلف | سال آں دین محمد شد قوی

(بقیہ صفحہ ۱۷۹ پر)

ولادت شعبان کے آخری جمعہ ۶۶۱ھ میں قصبۂ مُنیر میں آپ کی پیدائش ہوئی۔ "شرف آگیں" تاریخ ولادت ہے۔ آپ کے تین بھائی اور تھے: شیخ خلیل الدین، شیخ جلیل الدین اور شیخ حبیب الدین۔

تعلیم جب آپ کی عمر پڑھنے کے قابل ہوئی تو آپ کو مکتب میں بٹھایا گیا۔ اس زمانہ میں بہت سے ممالک اسلامیہ میں عام طور پر دستور تھا کہ درسی کتابوں کے متون لفظ بلفظ یاد کرائے جاتے تھے اور کچھ لغت کی مختصر کتابیں بھی، تاکہ الفاظ کا ذخیرہ بچپن سے محفوظ ہو جائے۔ شیخ نے اس طرزِ تعلیم پر اپنی بعض بعض تحریروں میں تنقید فرمائی ہے اور قوتِ حافظہ اور وقت کے اس غلط استعمال پر افسوس ظاہر کیا ہے، کہ بجائے قرآن مجید کے ایسی کتابیں رٹائی جاتی ہیں جو دین کے لئے کچھ زیادہ مفید نہیں۔ معدن المعانی کے باب ششم میں فرماتے ہیں:-

درایام خوردگی چندیں کتابہا مارا یاد گردانیدند	بچپن میں اُستادوں نے بہت سی کتابیں یاد
چنانکہ مصادر و مفتاح اللغات و جز آں در	کرائیں، مثلاً مصادر، مفتاح اللغات وغیرہ
کتابہا۔ و مفتاح اللغات جزوے بیستے	مفتاح اللغات بیس جزو کی کتاب ہوگی بقدر
خواہد بود مقدار یک جلد یاد کرانیدند ہر بار	ایک جلد کے یاد کرائی، ہر مرتبہ زبانی سنتے
یاد تمام می شنیدند بائیست بجائے آں	تھے، اس کے بجائے قرآن مجید یاد
قرآن یاد می کرانیدند۔[1]	کرانا چاہئے تھا۔

افسوس ہے کہ تذکروں میں آپ کے ابتدائی اساتذہ کے نام اور ان کتابوں اور علوم کی تفصیل نہیں ہے

(صفحہ ۱۷۸ کا بقیہ حاشیہ) اس طرح یہ ماننا پڑتا ہے کہ فتح منیر شہاب الدین غوری کی فتح ہندوستان (۵۸۸ھ) سے قبل کا واقعہ ہے، کیا مسلمان غزنویوں کے عہد ہی میں بہار و بنگال کی حدود میں پہنچ گئے تھے، اور انھوں نے جا بجا اسلامی عملداری اور قبضہ کی بنیاد ڈال دی تھی؟ تاریخی حیثیت سے یہ مسئلہ تحقیق طلب ہے۔ [1] معدن المعانی مطبع شرف الاخبار ص ۴۳

جن کی آپ نے وطن میں رہ کر تحصیل کی۔ اتنا اندازہ ہوتا ہے کہ آپ نے منیر میں رہ کر متوسطات تک تعلیم حاصل کی اور وقت کے بڑے اساتذہ سے تعلیم حاصل کرنے کے قابل ہوگئے۔

مولانا شرف الدین ابو توامہ سے تلمذ اور سنار گاؤں کا سفر

وطن میں رہ کر علم کی تحصیل کے جو مواقع حاصل تھے، جب آپ نے اُن سے فراغت حاصل کرلی تو اللہ تعالیٰ نے آپ کی علمی تکمیل و ترقی کے لئے ایک دوسرا انتظام فرمایا۔ دہلی کے اساتذہ میں سے مولانا شرف الدین ابو توامہ جو شمس الدین التمش کے عہدِ دولت ہی سے علم و تدریس کے نظامِ شمسی کے ایک روشن ستارہ تھے۔ غالباً غیاث الدین بلبن کے عہد میں[۱] رجوعِ عام اور بعض حاسد دل کی ریشہ دوانیوں کی بناء پر اشارۂ سلطانی سے ترکِ وطن پر مجبور ہوئے اور اس وقت ہندوستان کی اسلامی مملکت کے آخری سرحدی شہر سنار گاؤں[۲] کا قصد فرمایا۔ راستہ میں بہار سے گذرتے ہوئے آپ نے چند روز منیر میں قیام فرمایا، جو غالباً اس وقت دہلی سے سنار گاؤں جاتے ہوئے ایک کارواں سرائے اور آبادبستی تھی، اہلِ قصبہ

---

[۱] اگر یہ تسلیم کرلیا جائے کہ مولانا شرف الدین ابو توامہ کے منیر تشریف آوری کے وقت شیخ شرف الدین احمد کم سے کم ۱۲ سال کے تھے تو یہ ۶۷۳ھ ہوگا، اس طرح یہ زمانہ غیاث الدین بلبن کا ہے جس نے ۶۶۴ھ سے لیکر ۶۸۶ھ تک سلطنت کی، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ مولانا ابو توامہؒ نے سلطان غیاث الدین بلبن کے اشارہ سے ہجرت اختیار کی تھی۔ ع

"رموزِ مملکتِ خویش خسرواں دانند"

[۲] سنار گاؤں مسلمانوں کے عہد میں مشرقی بنگال کا دارالحکومت تھا، اب یہ ایک غیر معروف مقام ہے جو کس مپرسی میں پڑا ہوا ہے اور پنام (PAINAM) کے نام سے ضلع ڈھاکہ میں شامل ہے، دریا برہم پتر اُس سے ڈھائی کوس کے فاصلہ پر بہتا ہے۔ سنار گاؤں کے اطراف میں کثیر تعداد میں ویران مسجدوں کے نشانات پائے جاتے ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ کسی زمانہ میں یہ ایک بڑا اسلامی شہر تھا، یہ اُس شاہی سڑک کا منتہیٰ تھا جس کو شیر شاہ نے بنایا تھا۔ ۱۲

سکّے اور بانٹ

ساز

مدرسے، خانقاہیں اور کتب خانے

سلسلے

مطابع

مقاماتِ وعمارات

کتابیات

و

ہ

تاریخ دعوت و عزیمت

حصہ سوم

حضرت خواجہ معین الدین چشتی رح
سلطان المشائخ حضرت خواجہ نظام الدین اولیاء رح
حضرت مخدوم شیخ شرف الدین یحییٰ منیری رح
سوانح حیات، صفات و کمالات و تجدیدی و اصلاحی کارنامے،
تلامذہ و منتسبین و مسترشدین کا تذکرہ و تعارف

مولانا سید ابوالحسن علی ندوی رح

مجلس نشریاتِ اسلام
۱۔ کے۔۳ ناظم آباد مینشن۔ ناظم آباد ۱ کراچی ۱۸

مفکر اسلام مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ

- ناظم دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ • رکن مجلس شوریٰ دارالعلوم دیوبند
- صدر مجلس تحقیقات ونشریات اسلام لکھنؤ • رکن مجلس انتظامی ومجلس عاملہ دارالمصنفین اعظم گڑھ
- رکن عربی اکادمی دمشق • رکن مجلس شوریٰ جامعہ اسلامیہ مدینہ منورہ
- رکن مجلس تاسیس رابطۂ عالم اسلامی مکہ معظمہ • رکن مجلس عاملہ موتمر عالم اسلامی بیروت
- رکن مجلس انتظامی اسلامک سینٹر جنیوا
- سابق وزیٹنگ پروفیسر دمشق یونیورسٹی ومدینہ یونیورسٹی
- صدر اسلامی سینٹر آکسفورڈ

نام کتاب ———— تاریخ دعوت وعزیمت
تصنیف ———— مفکر اسلام مولانا سید ابوالحسن علی ندوی
طباعت ———— احمد برادرز پرنٹنگ پریس۔ کراچی
ضخامت ———— ۳۳۶ صفحات
ٹیلیفون : 6601817

اسٹاکسٹ : مکتبہ ندوۃ قاسم سینٹر اردو بازار کراچی

ناشر

فضل ربی ندوی

مجلس نشریات اسلام ۱۔کے۔۳ ناظم آباد مینشن۔ ناظم آباد ۱۔ کراچی ۷۴۶۰۰

فہرست مضامین

باب سوم (۳)

۱۰۲ —— ۱۱۲

(اخلاق وصفات)

باب چہارم (۴)

۱۱۳ —— ۱۲۵

(اذواق وکیفیات)

باب پنجم (۵)

۱۲۶ —— ۱۳۴

(افادات وتحقیقات)

باب ششم (۶)

۱۳۵ —— ۱۵۴

(فیوض وبرکات)

سپاہِ تازہ برانگیزم از ولایتِ عشق
کہ در حرم خطرے از بغاوتِ خرد است

(اقبالؒ)

ز

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

حرفِ آغاز

اَلحَمدُ لِلّٰہِ وَسَلَامٌ عَلٰی عِبَادِہِ الَّذِینَ اصطَفٰی

الحمد للہ کہ تاریخ دعوت وعزیمت کا تیسرا حصہ پیش کرنے کی سعادت حاصل ہو رہی ہے دوسرے اور تیسرے حصے کے درمیان اتنا طویل وقفہ پیش آیا کہ مصنف کی طبیعت افسردہ اور شائقین مایوس سے ہوگئے۔ اس عرصہ میں مصنف کے کوتاہ قلم سے متعدد کتابیں نکلیں اور شائع ہوئیں، جتنی تاخیر ہوتی جارہی تھی اتنا ہی یہ اندیشہ بڑھ رہا تھا کہ خدانخواستہ یہ مفید سلسلہ بہت سے قدیم مصنفین کی اہم کتابوں اور خود اپنے بعض سلسلۂ تصانیف کی طرح ناتمام نہ رہ جائے، شاید ایسا ہی ہوتا اور کم سے کم یہ کہ یہ وقفہ طویل سے طویل تر ہوتا، اگر اس میں ایک قابلِ صد احترام اور واجب التعمیل اشارہ اور تقاضا شامل نہ ہوتا۔

میرے مُربّی رُوحانی حضرت مولانا عبدالقادر صاحب رائے پوری دامت برکاتہم نے تاریخ دعوت وعزیمت کو بار بار سن کر اور بار بار اپنی مجالس میں پڑھوا کر، تصنیف اور مصنف کی عزت و

بڑھائی، ان دُو جلدوں کے بعد حضرت موصوف نے تیسری جلد کا تقاضا فرمایا اور اپنے خادم کو اس کی تکمیل کی بار بار ہدایت فرمائی۔ بارہا ایسا ہوا کہ میں باہر سے حاضرِ خدمت ہوا، تو پہلا سوال یہی فرمایا گیا کہ تیسرا حصّہ مکمّل کر لیا؟ بعض مرتبہ میں نے اپنی الجھنیں عرض کیں سنتے ہی ارشاد ہوا کہ تیسرا حصّہ تو مکمّل ہی کر لیجئے! پھر جب حضرت والا کو یہ معلوم ہوا کہ یہ حصّہ سلطان المشائخ حضرت خواجہ نظام الدین محبوب الٰہی قدس اللہ سرہٗ کے تذکرہ پر مشتمل ہوگا تو اپنے تعلقِ روحانی اور نسبت خاص کی بنا پر حضرت کی طرف سے اس کا اور بھی تقاضا ہوا، ادھر اس عاجز کا یہ حال ہوگیا تھا گویا اس نے قلم رکھ دیا ہے اور اس موضوع سے مناسبت جاتی رہی ہے یہاں تک کہ جون ۱۶ء میں ایک بار جب حاضرِ خدمت ہوا تو حضرت کی مجلس مبارک میں حضرت خواجہ کا وہ مجموعہ پڑھا جا رہا تھا جو **افضل الفوائد** کے نام سے امیر خسرو کی طرف منسوب ہوکر لاہور سے شائع ہوا ہے اور ایک عزیز دوست تحفتہً لائے تھے، یہ مجموعہ ایسے غیر مستند مضامین اور بے اصل روایات پر مشتمل ہے کہ اس کا سننا بھی تحقیقی اور تاریخی ذوق رکھنے والوں پر بلکہ مذاقِ سلیم پر سخت بار ہے، اس کی نسبت امیر خسروؒ کی طرف قطعاً مشکوک ہے۔ حضرت خواجہ گیسو دراز جنکے اور سلطان المشائخ کے درمیان صرف ایک ہی واسطہ اور وہ بھی حضرت چراغ دہلیؒ کا ہے اور جو اسی خانوادۂ عالی کے چشم و چراغ اور محرمِ اسرار ہیں۔ صاف فرماتے ہیں کہ **فوائد الفواد** کے علاوہ ملفوظات کے جتنے مجموعے مشہور ہیں یادِ ہوائی ہیں[۱]۔ مجلس میں یہ کتاب پڑھی

---

[۱] "ملفوظ شیخ نظام الدین کہ امیر حسن شاعر جمع کردہ است آں معتبر است و ملفوظہائے دیگر کہ از اں شیخ بمشتہ اند ہمہ بادہوا است۔" (جوامع الکلم)

جارہی تھی، حضرت کبھی کبھی اس کے مضامین پر استعجاب کا اظہار فرماتے، نیماز نگر دلنواز نگاہیں جو کبھی کبھی مصنف پر بھی پڑجاتیں اشارہ اشارہ میں کہتیں کہ اگر کوئی مستند کتاب موجود ہوتی تو ایسی غیر مستند کتابوں کی کیا ضرورت تھی ؟ یہ نگاہ دل میں تیر کی طرح پار ہوگئی اور وہیں دل نے فیصلہ کیا کہ پہلی فرصت میں اس کام کو انجام دینا ہے' اور یہ ارمغان پیش کرنا ہے۔

اس کام میں توقف ہونے کا ایک سبب راہ کی دشواریاں بھی تھیں، ہندوستان کے اولیائے کرام، داعیانِ اسلام اور مشائخ عظام کے تذکرہ میں بیشمار کتابیں لکھی گئیں، ان میں بڑی بڑی ضخیم تصنیفات بھی ہیں، لیکن جب اس عصر کا کوئی مصنّف ان کے ایسے حالات جمع کرنے کے بیٹھتا ہے جن سے ان کے اصل کمالات، ان کی دینی د تبلیغی مساعی، ان کی تعلیم و تربیت کے نتائج، ان کے مزاج و مذاق پر روشنی پڑے اور اس زمانہ کے لوگوں کے لئے یہ حالات سبق آموز، شوق انگیز اور ہمت آفریں ہوں' اور بحیثیت ایک جلیل القدر اور کامل انسان کے ان کے حالات منظرِ عام پر آئیں' اور ان کی سوانح کا صحیح ڈھانچہ سامنے آجائے تو اس کو سخت مایوسی اور پریشانی کا سامنا کرنا پڑتا ہے، بعض اوقات صدہا صفحات کی ایک کتاب سے بلکہ متعدد کتابوں کی مدد سے بھی ایک صفحہ کے بقدر بھی مواد حاصل نہیں ہوتا، عظیم ترین شخصیتوں کے تذکروں اور سوانح حیات میں اتنے بڑے بڑے خلا نظر آتے ہیں جن کو کسی قیاس اور عبارت آرائی سے بھرا نہیں جا سکتا۔ پوری پوری کتاب خوارق و کرامات، محیر العقول واقعات اور عجائبات سے بھری ہوتی ہے اور ضروری معلومات کا افسوسناک فقدان نظر آتا ہے۔ ہندوستان کے ایک بڑے مؤرخ کو (جس نے اپنی علمی اور تصنیفی ضرورت سے ہندوستان کی تاریخ کا ایسا وسیع مطالعہ کیا ہے جس کی نظیر دورِ حاضر میں ملنی مشکل ہے، اور اعیان و مشاہیر ہند کا تذکرہ آٹھ ضخیم جلدوں

میں مرتب کیا ہے) اس صورتِ حال پر اس طرح شکوہ سنج پایا گیا:۔

"ملک کی بدمذاقی دیکھئے کہ ابتدا سے اب تک ہندوستان کی سیکڑوں تاریخیں لکھی گئیں اور مختلف عنوانوں سے لکھی گئیں مگر ان میں سے کوئی کتاب تاریخ نویسی کے صحیح معیار پر نہیں اترتی، جس کتاب کو اٹھا کر دیکھیے معلوم ہوتا ہے کہ رزم بزم کا کوئی افسانہ ہے۔ قرنا و کوس کے ذکر سے اگر کوئی صفحہ خالی ملے گا تو چنگ و رباب کے ذکر سے آپ اس کو خالی نہ پائیں گے۔ اگر مقفیٰ عبارتوں اور مسجع فقروں کے خارزار میں آپ کا دامن الجھ گیا تو یہ بھی ملنے کا نہیں۔ ایسی حالت میں کیا توقع ہو سکتی ہے کہ ہم اپنے اسلاف کی علمی زندگی کی صحیح تصویر ایسے مرقع میں پائیں ـــــ کچھ ان بزرگوں کے حالات میں کتابیں ملتی ہیں جو کسی سلسلۂ طریقت کے ساتھ مربوط تھے، مگر اس بدمذاقی کا کچھ ٹھکانا ہے کہ آپ ان کتابوں سے ان کے نام و نسب، نشوونما، تعلیم و تربیت طریقۂ ماندو بود اور علمی مشاغل کی نسبت تحقیق کرنا چاہیں تو ایک حرف نہ ملیگا، قرنا و کوس کا تو یہاں کچھ کام نہیں، مگر چنگ و رباب یہاں بھی ہاتھ سے نہیں چھوٹتا، مصنف کا سارا زور ان کے کشف و کرامت کے بیان کرنے پر صرف ہو جاتا ہے اور اس کو اس حد تک پہنچانے کی کوشش کی جاتی ہے کہ وہ بنی نوعِ انسان کے ماوراء کوئی اور ہستی نظر آتے ہیں، وہ کھاتے ہیں نہ پیتے ہیں نہ سوتے ہیں نہ خصائصِ انسانی سے ان کو سروکار ہے نہ علمی مشاغل سے ان کو کچھ واسطہ ہے"

لے نزہۃ الخواطر عربی ۱۱ ۱۳ھ جو پانچ ہزار شخصیتوں کے حالات پر مشتمل ہے۔

ان کا صرف یہ کام ہے کہ وہ قانونِ فطرت کو ہمیشہ توڑتے رہیں اور موالید ثلاثہ و عناصر اربعہ پر اپنی حکومت و خود مختاری کو کسی طرح قائم رکھیں۔"

اس وقت کا اگر آپ عملی تجربہ کرنا چاہیں تو ہندوستان میں سلسلۂ چشت کے بانی بلکہ ایک طرح سے اس ملک میں سلسلۂ اسلامی کے بانی خواجہ معین الدین چشتیؒ کے تذکرہ کی کتابوں کا مطالعہ کیجئے اور ان سے حضرت کی کوئی مختصر سوانح مرتب کرنے کی کوشش کیجئے، شاید یہ خیال ہو کہ وہ مسلمانوں کا ابتدائی عہد تھا، تصنیف و تالیف کے دور کا پورے طور پر آغاز نہیں ہوا تھا، اگرچہ یہ صحیح نہیں ہے، اور اسی دور میں ہم کو قاضی منہاج الدین عثمان جوزجانی کی کتاب طبقاتِ ناصری اور نور الدین محمد عوفی کی کتاب لباب الالباب بھی ملتی ہے۔ یہ دونوں کتابیں ساتویں صدی کی تصنیفات ہیں، لیکن اگر اس کو کسی طرح تسلیم بھی کر لیا جائے تو اس کے متعلق کیا کہا جائیگا کہ شیخ الاسلام بہاء الدین زکریا ملتانیؒ (متوفی ۶۶۶ھ) ایک عظیم روحانی پیشوا اور جلیل القدر مصلح تھے جنھوں نے اپنے زمانہ کو متاثر کیا اور ایک ایسے شہر میں زندگی گذاری جو اپنے عہد میں ہندوستان کا سب سے بڑا علمی مرکز تھا، سیاسی حالات میں اعتدال و استقرار بھی پیدا ہو چکا تھا، لیکن اس عظیم الشان شخصیت کی سوانح نگاری اور اس کے کارناموں کی تاریخ مرتب کرنے کے لئے مواد کی بے حد کمی ہے، مگر خوارق و تصرفات اور کشف و کرامات کے واقعات کی کوئی کمی نہیں۔

اس لحاظ سے حضرت سلطان المشائخ خواجہ نظام الدین اولیاءؒ اور حضرت مخدوم الملک

۱؎ یاد ایام (تاریخ گجرات) ص۵۵ و ص۵۹ از مولانا حکیم سید عبدالحیؒ مصنف نزہۃ الخواطر و گلِ رعنا (م ۱۳۴۱ھ / ۱۹۲۳ء)

شیخ شرف الدین یحییٰ منیریؒ جو آٹھویں صدی کی دو نامور شخصیتیں اور عظیم الشان روحانی مربّی اور مصلح ہیں، خاص امتیاز و انفرادیت رکھتے ہیں، کئی صدیوں تک کسی شیخ طریقت اور کسی دینی شخصیت کے حالات اتنی روشنی میں نہیں ہیں جتنے ان دونوں بزرگوں کے، یہ مواد اس لحاظ سے بھی خصوصیت رکھتا ہے کہ وہ ان حضرات کے ملفوظات اور مکتوبات سے ماخوذ ہے، یا معاصر تاریخوں اور ان کے خدام و مریدین کی کتابوں سے، اس لحاظ سے مؤرّخ کو یہاں کم سے کم دشواری کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ انتخاب و تحقیق کا کام یہاں بھی ضروری ہے کہ واقعات و سنین میں سخت انتشار و تضاد نظر آتا ہے۔

لیکن ان دونوں شخصیتوں کے انتخاب کی وجہ یہ نہیں ہے کہ ان سے متعلق تاریخی مواد آسانی سے دستیاب ہو جاتا ہے، یہ بات اور بھی بہت سی شخصیتوں کو حاصل ہے، اس انتخاب کی وجہ یہ ہے کہ وہ اسلام کی تاریخ دعوت و عزیمت میں ایک ممتاز مقام رکھتے ہیں اور ہندوستان میں (جو ساتویں صدی کے بعد سے عالم اسلام کا مرکزِ اعصاب اور احیا و تجدید کی تحریکوں کا منبع ہے) ان دونوں حضرات نے روحانی و اصلاحی تحریک کی قیادت کی اور اپنے زمانہ اور بعد کی نسلوں کو سب سے زیادہ متاثر کیا۔

حالات و تعلیمات کے انتخاب میں مصنّف نے ہمیشہ ان اجزاء و مضامین کو اہمیت دی ہے جو اس نسل کے لئے مفید، سبق آموز، قابلِ تقلید، عام فہم اور دلنشیں ہوں اور جن سے غلط فہمی اور غلط روی کا کم سے کم اندیشہ ہو، وہ خود بھی فلسفۂ الٰہیات اور فلسفۂ اخلاق سے کم مناسبت رکھتا ہے اور اپنے قارئین کو بھی اس امتحان میں ڈالنا نہیں چاہتا، اس کے نزدیک ایمان و یقین، عشق و محبّت، درد و سوز، جذبۂ اتباعِ سنّت، عزیمت، علوِ ہمّت، ذوقِ دعوت و تبلیغ، اصلاحِ اعمال و اخلاق اور صحیح علوم و دینی حِکَم و معارف ان بزرگوں کا

اصل جوہر اور ان کی سوانح حیات کا اصل پیام ہے۔ راقم سطور نے سیرت سید احمد شہیدؒ کے مقدمہ میں اپنے مسلک کی معذرت اور وضاحت کرتے ہوئے ایک شعر لکھا تھا جو صورتِ حال کی صحیح ترجمانی کرتا ہے، اسی کا اعادہ یہاں بھی مناسب معلوم ہوتا ہے۔ ؎

ہم نے اپنے آشیانے کے لئے
جو چبھے دل میں وہی تنکے لئے

شاید مصنف کی دوسری ذمہ داریاں اور نہ ختم ہونے والے مشاغل اتنی جلدی کتاب کی تکمیل کی مہلت نہ دیتے اور اس میں مزید تاخیر ہوتی، مگر اپنے وطن (رائے بریلی) کی ندی کے سیلاب نے ایک گاؤں (میدان پور) میں محصور کر کے اس کا سامان فراہم کر دیا کہ جو کام مہینوں میں ہوتا وہ خدا کی مدد سے چند ہفتوں میں ہو گیا۔ وللہ جنود السمٰوات والارض۔

مصنف کا اخلاقی فرض اور احسان شناسی ہے کہ وہ اپنے محسنین و معاونین کا شکریہ ادا کرے۔ قدیم مآخذ میں مصنف سب سے زیادہ سیر الاولیاء کے مصنف امیر خورد اور فوائد الفواد کے مصنف امیر حسن علاء سنجری کا ممنونِ احسان ہے کہ انھوں نے حضرت خواجہ نظام الدینؒ کی سوانح حیات و تعلیمات کا سب سے زیادہ مفصل اور مستند مواد فراہم کیا۔ حضرت مخدوم الملک بہاریؒ کے حالات میں سیرۃ الشرف سے بڑی مدد اور رہنمائی حاصل ہوئی اور اس سے قدیم تر مآخذ کا پتہ چلا۔ مولانا سید مناظر احسن گیلانیؒ کی تصنیفات اور مضامین ہمیشہ کی طرح بڑے مفید اور مددگار ثابت ہوئے، کاش ان کو دونوں حضرات کی مکمل سوانح حیات مرتب کرنے کا موقع ملتا کہ اللہ تعالیٰ نے ان کو اس موضوع سے فطری مناسبت اور ذوق اور تاریخ ہندوستان کا وسیع علم عطا فرمایا تھا، والد ماجد مولانا حکیم سید عبدالحیؒ کی بیش قیمت تصنیف نزہۃ الخواطر نے حسب معمول تاریخ و تذکرہ

کے ایک دائرۃ المعارف (انسائیکلو پیڈیا) کا کام دیا اور مصنف نے اس سے اس طرح مدد لی اور بار بار رجوع کیا جیسے کوئی طالب علم لغت اور ڈکشنری سے بار بار مدد لیتا ہے اس موضوع پر وسیع مطالعہ کرنے کے بعد اندازہ ہوا کہ ان کی نظر کتنی وسیع و عمیق تھی اور ان کا انتخاب و مذاق کتنا پاکیزہ اور شائستہ ہے۔

اپنے معاونین میں ناچیز مصنف جناب مولوی سید نجم الہدیٰ صاحب ندوی دسنوی اور عزیز گرامی مولوی مراد اللہ صاحب منیری ندوی کا ممنون ہے جنھوں نے حضرت مخدوم الملک کی سوانح حیات اور تصنیفات میں سے بعض نادر چیزیں فراہم کیں۔ عزیزی مولوی شبیر عطا ندوی سلّمہٗ (جن کو تاریخی و علمی ذوق اپنے نامور والد سے ورثہ میں ملا ہے) سے بھی بعض ضروری معلومات کے حصول میں مدد ملی۔ عزیز سعید مولوی سید مشرف علی ندوی بھی مصنف کے شکریہ کے بڑے مستحق ہیں، مصنف نے کتاب کا بڑا حصہ املا کیا اور آں عزیز نے بڑی ہمت اور محنت سے لکھا۔ مولوی اقبال احمد صاحب اعظمی بھی شکریہ کے مستحق ہیں کہ انھوں نے بھی وقتاً فوقتاً مدد کی۔ اللہ تعالیٰ ان سب بزرگوں اور عزیزوں کو جزائے خیر عطا فرمادے اور ان کے عمل کو قبول کرے۔

وَالْحَمْدُ لِلّٰهِ اَوَّلاً وَّاٰخِرًا، وَصَلَّى اللّٰهُ عَلٰى خَيْرِ خَلْقِهٖ مُحَمَّدٍ وَّاٰلِهٖ وَصَحْبِهٖ اَجْمَعِيْنَ

ابوالحسن علی

مرکز دعوت اصلاح و تبلیغ

لکھنؤ

۱۱ صفر ۱۳۸۲ھ
۲۴ جولائی ۱۹۶۲ء

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

باب اوّل

ہندوستان میں چشتی سلسلہ اور اسکے اکابر شیوخ

عالمِ اسلام کا نیا رُوحانی و فکری مرکز

چھٹی صدی ہجری (بارھویں صدی عیسوی) اسلامی تاریخ میں خاص اہمیت رکھتی ہے،

اس صدی کے آخر میں وسیع اسلامی دنیا میں ایک ایسے نئے وسیع ملک کا اضافہ ہو رہا تھا جو قدرتی خزانوں اور انسانی صلاحیتوں سے مالامال تھا اور جس کے لئے مستقبل قریب میں اسلامی دعوت کا عالمگیر مرکز اور اسلامی علوم کا محافظ و امین بننا مقدر ہو چکا تھا۔

اس صدی کے اوائل میں نیم وحشی تاتاریوں نے عالمِ اسلام پر مور و ملخ کی طرح یورش کی، ملک کے ملک ان کی بربریت اور وحشیانہ مظالم سے تاراج اور بڑے بڑے نامی گرامی شہر جو کبھی علم و تہذیب کے علمبردار اور مدارس و خانقاہوں سے یکسر گلزار ہو رہے تھے بے چراغ ہو گئے شہروں کا امن و سکون، زندگی کا نظم و نسق اور شرفاء کی عزت و ناموس خاک میں مل گئے، بخارا، سمرقند، رے، ہمدان، زنجان، قزوین، مرو، نیشاپور، خوارزم اور بالآخر مرکزِ خلافت دارالسلام بغداد اس فتنۂ جہاں سوز

کی لپیٹ میں آگیا اور قدیم تہذیب کا مدفن بن کر رہ گیا۔ اس بلائے ناگہانی سے عالم اسلام کی چولیں ہل گئیں اور پوری قدیم اسلامی دنیا پر سیاسی زوال اور فکری وعلمی اضمحلال کے سیاہ بادل چھاگئے۔ اس وقت اس پورے عالم اسلام میں ہندوستان ہی ایک ایسا ملک تھا جو اس فتنۂ عالم آشوب سے محفوظ رہ گیا تھا۔ یہاں تازہ دم، قوی اور پرجوش ترکی النسل خاندانوں کی حکومت تھی، جو اُن تاتاریوں اور مغلوں سے بخوبی پنجہ آزمائی کر سکتے تھے اور اپنی ایمانی قوت اور نئے اسلامی جوش کی بنا پر جنگی قوت اور شجاعت میں نہ صرف اُن کے حریف بلکہ ان سے فائق تھے، تاتاری اور مغل بار بار ہندوستان پر حملے کرتے رہے اور پسپا ہوتے رہے، صرف سلطان علاء الدین خلجی کے عہد میں چنگیزی مغلوں نے پانچ بار ہندوستان پر حملہ کیا، پہلا حملہ ۶۹۶ھ میں ہوا، چوتھے اور پانچویں حملے میں سلطان کی طرف سے ملک تغلق (ملک غازی) نے جوہر مردانگی دکھائے اور مغلوں کو اس طرح شکستِ فاش دی کہ:۔

"دراں روز بار مغول را ہوس ہندوستان بر دل سرد شد، و دندانِ طمع کند گشت[1]" (اس دن سے مغلوں کی ہندوستان کی ہوس سرد ہوگئی، اور اُن کے دندان حرص و آز ہمیشہ کے لئے کھٹے ہو گئے)۔

ان خصوصیات کی بنا پر عالمِ اسلام کے بہترین خاندان جن کو اپنا ناموس اور ایمان عزیز تھا اور بہترین دل و دماغ جو اپنے بدقسمت وطن میں سکون و اطمینان سے محروم ہوگئے تھے، ہندوستان کے جدید دارالامن اور دارالاسلام کی طرف ہجرت کر آئے۔ لائق ترین انسانوں اور شریف ترین خاندانوں کا یہ سیلاب ایران، ترکستان و عراق کی طرف سے بار بار

---

[1] منتخب التواریخ ج۱ ص۱۸۶ و تاریخ فیروز شاہی از ضیاء برنی ص۲۵۱ و ص۳۰۲ و ص۳۲۰ و ص۳۲۳۔

امنڈتا رہا اور ان کی وجہ سے دہلی ایک بین الاقوامی شہر اور رشکِ بغداد و قرطبہ بن گئی، نہ صرف دہلی بلکہ ہندوستان کے دوسرے شہر اور قصبات شیراز و یمن کی ہمسری کرنے لگے۔ مورخینِ ہندوستان ضیاء الدین برنی وغیرہ جب ان شریف و نجیب خاندانوں، اساتذۂ وقت، علماء نامدار اور مشائخ کبار کی فہرست سناتے ہیں جو فتنۂ تاتار میں ہجرت کر کے ہندوستان آ گئے تھے اور ہنگامۂ درس و تدریس اور ارشاد و تلقین گرم کئے ہوئے تھے، نیز جنھوں نے سلطنت کی نازک ترین ذمہ داریاں سنبھال رکھی تھیں اور ملک کی زیب و زینت کا باعث تھے، تو معلوم ہوتا ہے کہ سارے عالمِ اسلام کا جوہرِ شرافت و فضیلت یہیں آگیا تھا۔[1]

اس انقلاب سے ہندوستان نہ صرف عالمِ اسلام کا ایک اہم حصّہ بن گیا تھا، بلکہ تاریخ کا صاف اشارہ تھا کہ وہ اسلام کی فکری و روحانی قوت، علمی تحریکات اور احیاء و تجدید کا نیا مرکز بن رہا ہے، اور فکرِ اسلامی اور دعوت و عزیمت کے مورخین کو اب مسلسل کئی صدیوں تک اپنی توجہ اسی پر مرکوز کرنی پڑے گی۔

اسلامی ہند کے معمار

اسلامی دنیا کے لئے ہندوستان کی دریافت اور یافت "نئی دنیا" کی دریافت سے کم انقلاب انگیز اور عہد آفریں واقعہ نہ تھا، اگرچہ پہلی صدی ہجری ہی میں یہاں اسلام کے حوصلہ مند دستے آنے شروع ہو گئے تھے اور ۹۳ھ میں محمد بن قاسم ثقفی نے سندھ سے ملتان تک کے علاقہ کو اپنی شمشیر و اخلاق سے تسخیر کر لیا تھا، اور اس برِّ صغیر (ہند) میں جا بجا داعیانِ اسلام کے مرکز و خانقاہیں چھوٹے چھوٹے جزیروں کی طرح قائم ہو چکی تھیں، جیسے ع

بیاباں کی شبِ تاریک میں قندیلِ رہبانی

---

[1] ملاحظہ ہو تاریخ فیروز شاہی از ضیا برنی ص ۱۱۱ و ص ۱۱۲

لیکن حقیقتاً ہندوستان کی فتح کا سہرا سکندرِ اسلام سلطان محمود غزنوی (م ۴۲۱ھ) کے سَر اور مستحکم و مستقل اسلامی سلطنت کے قیام کی سعادت سلطان شہاب الدین محمد غوری (م ۶۰۲ھ) کے حصّے میں تھی اور آخری طور پر اس کی روحانی تسخیر اور اخلاقی و ایمانی فتح حضرت خواجۂ بزرگ شیخ الاسلام معین الدین چشتیؒ (م ۶۲۷ھ) کے لئے مقدر ہو چکی تھی۔

ہندوستان کی فتح سے پہلے اسلام کے چاروں مشہور روحانی سلسلے قادریہ، چشتیہ، نقشبندیہ اور سُہروردیہ وجود میں آچکے تھے اور عرصہ سے پھل پھول رہے تھے، اپنے اپنے وقت پر ان میں سے ہر ایک کا فیض ہندوستان کو پہنچا اور ہندوستان کی اسلامی تعمیر و تشکیل میں سب کا حصّہ ہے۔ شکر اللہ مساعیہم۔ لیکن ہندوستان کی روحانی فتح اور اس سرزمین پر اسلام کا پودا نصب کرنے کے لئے (جس کے سایہ اور پھل سے ایک عالم مستفید ہونے والا تھا) حکمتِ الٰہی نے چشتی سلسلہ کو انتخاب فرمایا۔ وَرَبُّكَ يَخْلُقُ مَا يَشَآءُ وَيَخْتَارُ۔

ان اسرارِ الٰہی سے قطع نظر جن کو ہماری کوتاہ نظر نہیں پا سکتی، چشتیوں پر اس ملک کا حق ہمسائگی بھی تھا، ان کا سلسلہ اس ملک کے ہمسایہ ملک ایران میں فروغ پا رہا تھا، اپنے درد مند مزاج اور نسبتِ عشقیہ کی بنا پر بھی جو سلسلۂ چشتیہ کا سرمایہ ہے اس سلسلہ کو ہندوستان کا دل جیت لینا اور اس کو اپنی محبت کا اسیر اور عشقِ الٰہی کا نخچیر بنا لینا آسان تھا کہ زمانۂ قدیم سے محبت و درد اس سرزمین کے خمیر میں ہے۔

ہندوستان سے چشتیوں کا پہلا تعلّق

غرض ان معلوم و نامعلوم حکمتوں کی بنا پر قدرتِ الٰہی نے ہندوستان میں اسلام کے تعارف اور اشاعت کے لئے اس سلسلہ کو انتخاب فرمایا اور چشتیوں کو ہندوستان کی طرف رُخ کرنے کا اشارۂ غیبی ہوا۔ سب سے پہلے جس چشتی شیخ نے ہندوستان کی طرف عنانِ عزیمت

موڑی وہ خواجہ ابو محمد چشتی تھے[1]، جن کی دعائیں اور بابرکت ذات سلطان محمود غزنوی کی فتوحات کی پشت پناہ تھی، مولانا جامی "نفحات الانس" میں لکھتے ہیں:۔

وقتے کہ سلطان محمود بہ غزو سومنات[2]	جس وقت سلطان محمود سومنات کی طرف
رفتہ بود خواجہ را در واقعہ نمودند کہ	گیا ہوا تھا خواجہ ابو محمد کو اشارۂ غیبی
بمدد گاری وے باید رفت در سن ہفتاد	ہوا کہ اس کی مدد کیلئے جائیں، وہ ستر برس
سالگی با درویشے چند متوجہ شد چوں	کی عمر میں چند درویشوں کیساتھ روانہ
آں جا رسید بہ نفس مبارک خود با مشرکان	ہوئے اور وہاں پہنچ کر بنفس نفیس
وعبدۂ اصنام جہاد کرد[3]	جہاد میں شرکت فرمائی۔

---

[1] خواجہ ابو محمد چشتی (م ۴۰۹ھ یا ۴۱۱ھ) خواجہ ابو احمد کے فرزند و خلیفہ تھے جو خواجہ ابو اسحاق شامی کے خلیفۂ اعظم اور خواجہ ناصر الدین ابو یوسف کے شیخ و مرشد تھے، خواجہ ناصر الدین ابو یوسف خواجہ قطب الدین مودود کے شیخ ہیں، اور وہ حاجی شریف زندنی کے۔ حاجی شریف زندنی کے خلیفہ حضرت خواجہ عثمان ہارونیؒ اُن کے خلیفہ حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ۔

[2] سلطان محمود نے سومنات پر حملہ ۴۱۶ھ میں کیا، اگر خواجہ ابو محمدؒ کا سنہ وفات مذکورۂ بالا صحیح ہے تو اس سے پہلے ان کا انتقال ہو چکا تھا، غالباً مولانا جامی کی مراد حملۂ ہندوستان سے ہے، انھوں نے اسکو حملۂ سومنات سے تعبیر کیا ہے کہ ہندوستان سے باہر سب سے زیادہ اسی کارنامہ کی شہرت ہوئی۔ سومنات پر حملہ کرنے سے پہلے ہندوستان پر محمود کے ۸ حملے ہو چکے تھے۔ ان میں سے کسی حملے میں (اغلب ہے کہ پہلے حملے میں) شیخ ابو محمدؒ ساتھ رہے ہوں گے۔

[3] نفحات الانس ص ۲۲۳

حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ

لیکن جس طرح محمود کی سیاسی فتح کی تکمیل اور اسلامی سلطنت کے استحکام و استقلال کی سعادت سلطان شہاب الدین غوری کیلئے مقدر تھی، خواجہ ابو محمد چشتیؒ کے کام کی تکمیل اور اسلام کی عمومی اشاعت اور اسلامی مرکز رشد و ہدایت کا قیام اسی سلسلہ کے ایک شیخ، شیخ الشیوخ خواجہ معین الدین سجزیؒ[1] کے لئے مقدر ہو چکا تھا۔

---

[1] خواجہ معین الدین چشتیؒ کی اصل نسبت سجزی ہے، جو کاتبوں کی غلطی اور بولنے والوں کی غلط فہمی سے "سنجری" بن گیا۔ قدیم مسودات و اشعار سے پتہ چلتا ہے کہ ابتدا میں سَجَزی ہی لکھا اور بولا جاتا تھا۔ سَجَزی نسبت سجستان کی طرف ہے۔ قدیم جغرافیہ نویس عام طور پر اسکو خراسان کا ایک حصہ مانتے ہیں، موجودہ زمانے میں اس کا اکثر حصہ ایران میں شامل ہے اور باقی افغانستان میں۔

اس علاقہ کا پایۂ تخت زرنج تھا جس کے کھنڈر اب زاہدان کے قریب پائے جاتے ہیں۔ ایک زمانہ میں سجستان کے حدود غزنین تک تھے۔ (احسن التقاسیم)

بعض جغرافیہ دانوں کے نزدیک سَجَز، سجستان کے ایک خاص مقام کا نام ہے، جس کی طرف نسبت سَجَزی آتی ہے۔ کبھی کبھی پورے سجستان کی طرف بھی سجزی کہہ کر نسبت کرتے ہیں۔

جغرافیہ خلافت مشرقی کے مصنف جی بی اسٹرینج نے ۳۰ صفحوں میں سجستان کا جغرافیہ بیان کیا ہے۔ اس کا خلاصہ یہ ہے کہ سیستان فارسی لفظ سنگستان سے ماخوذ ہے، عرب اسے سجستان کہتے ہیں۔ اس ملک کی زمین نشیب میں ہے اور جھیل زرہ کے گرد اور اسکے مشرق میں واقع ہے، دریائے ہلمند اور جس قدر دریا اس جھیل میں گرتے ہیں، ان سب کے ڈیلٹا اسی زمین میں پڑتے ہیں۔

فارسی میں سیستان کو نیمروز یا جنوبی ملک کہتے ہیں اور جنوبی ملک کہنے کی وجہ یوں بیان ہوئی ہے کہ سیستان خراسان کے جنوب میں واقع ہے ص۵۰۳ و ص۵۰۴

قدیم تر مورخین (جن میں طبقات ناصری کے مصنف قاضی منہاج الدین عثمان جوزجانی بھی شامل ہیں جو حضرت خواجہ کے کمسن معاصر ہیں[1]) کا بیان ہے کہ حضرت خواجہؒ سلطان شہاب الدین غوری کے اس لشکر کے ساتھ تھے جس نے والی اجمیر رائے پتھورا (پرتھوی راج[2]) کو شکست دی اور ہندوستان کی فتح کی

---

[1] قاضی صاحب کی ولادت ۵۸۹ھ میں ہوئی -۱۲

[2] پرتھوی راج یا رائے پتھورا (۱۱۷۵ - ۱۱۹۲ء) سومیشور کا بیٹا تھا، جو اجمیر کے چوہان حکمران خاندان کے بانی "اروناراجہ" کا فرزند اور اس خاندان کے نامور فرمانروا وگرہ راجہ عرف وسیل دیو کا بھائی تھا۔ "سومیشور" کا دہلی کے تومر راجپوت حکمراں خاندان اور اجمیر کی چوہان شاخ پر یکساں اقتدار تھا، سومیشور دہلی کے آخری تومر فرمانروا انندپال (اننگ پال) کا داماد تھا اور اس رشتے سے پرتھوی راج دہلی کے آخری فرمانروا کا نواسہ ہوتا تھا۔ انندپال کی کوئی اولاد نرینہ نہ تھی اس نے پرتھوی راج کو متبنیٰ کیا تھا، اس کے انتقال پر دہلی کی سلطنت پرتھوی راج کے حصہ میں آئی اور اجمیر کی سلطنت اسے اپنے باپ سومیشور سے وراثت میں پائی، اس طرح وہ راجپوتوں کی دو طاقتور مرکزی سلطنتوں دہلی و اجمیر کا مالک ہوا، چونکہ اجمیر سے اس کا آبائی اور وطنی تعلق تھا اور وہ اس کی دادھیالی گدی تھی، اس لئے اغلب ہے کہ اس کا زیادہ تر قیام اجمیر میں رہتا تھا، اس وجہ سے اجمیر اس وقت ہندوستان کا سب سے بڑا سیاسی مرکز تھا۔ پرتھوی راج اپنی ذات سے بڑا حوصلہ مند منچلا فنون سپہ گری میں طاق اور بہادر راجپوت تھا، اس نے بہت سی جنگوں میں نمایاں فتوحات حاصل کیں، جنھوں نے ایک صدی تک اس کے نام کو زندہ اور روشن رکھا۔ قنوج کے راجہ جے چند کی بیٹی کو "سوئمبر" سے لے آنے کی وجہ سے وہ ان داستانوں اور نظموں کا ہیرو بن گیا جو اب تک شمالی ہند میں گائی اور پڑھی جاتی ہیں، وہ اپنی سپہ گری، حوصلہ مندی اور فتوحات کی بنا پر ہندوستان کے دورِ آخر کے بہادر راجپوتوں اور طاقتور رہنماؤں میں شمار کئے جانے کے قابل ہے لیکن اس کی آخری شکست نے اس کی عظمت پر پردہ ڈال دیا، اور تاریخ ہند نے اس کا قصور معاف نہیں کیا۔

(بقیہ حاشیہ صفحہ آئندہ پر)

تکمیل کی، اس فتح میں ان کی دعاؤں، توجہات اور روحانیت کا بہت بڑا حصہ تھا۔[1]

بعد کے مورخین کے بیانات سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت خواجہ نے شہاب الدین غوری کے حملوں کے درمیان (جو ۵۶۹ھ سے ۶۰۲ھ تک جاری رہے) ابتدائے سنین ہی میں اجمیر جو اسوقت راجپوت طاقت و حکومت اور ہندو مذہب[2] و روحانیت کا بہت بڑا مرکز تھا[2] قیام اختیار

(صفحہ کا بقیہ حاشیہ) ۱۱۹۱ء (۵۸۷ھ) میں جب سلطان شہاب الدین محمد غوری نے ہندوستان پر حملہ کیا، پرتھوی راج نے ترائن (حال تلونڈی) کے مقام پر جو تھانیسر سے ۱۴ میل کے فاصلہ پر واقع ہے، ایک منظم فوج کے ساتھ بڑی بہادری سے مقابلہ کیا اور سلطان کو شکست فاش دی۔ اگلے سال ۱۱۹۲ء ۵۸۸ھ میں سلطان نے ٹڈی تیاری اور نئے عزم کے ساتھ ایک لاکھ بیس ہزار فوج کے ساتھ دوبارہ حملہ کیا، پرتھوی راج تین لاکھ سوار اور تین ہزار ہاتھی میدان میں لایا، ۱۵۰ راجپوت راجگان اپنی فوجوں کے ساتھ تھے۔ پرتھوی راج نے شکست کھائی اور گرفتار ہوا اور قتل کیا گیا۔ اور اس طرح راجپوتوں کی آزاد سلطنت اور ہندوستان کی قدیم فرمانروائی کا خاتمہ ہوا ــــ (پروفیسر ایشوری پرشاد اور دوسرے مورخین با ختصار)

---

[1] طبقات ناصری ص۲۲ + فرشتہ ص۵۷ + منتخب ص۵۰

[2] اجمیر سے ۷ میل شمال پشکر، ایک مشہور مذہبی تیرتھ گاہ تھی جس کی یاترا کے لئے دور دور سے لوگ آتے تھے، اسکی جھیل کو جو مذہبی تقدس حاصل تھا اس میں صرف مان سرور کی جھیل اس کی ہمسری کر سکتی ہے۔ پشکر کی جھیل کے متعلق یہ عقیدہ ہے کہ برہما نے یہاں یگ کیا اور یہاں پر سرسوتی اپنے پانچ دھاراؤں سے پرکٹ ہوتی ہیں۔ (اجمیر ڈسٹرکٹ گزیٹیر ص۱۸)

فرمایا تھا۔ ابھی غوری کے حملوں نے ہندوستان کی قسمت کا فیصلہ نہیں کیا تھا اور اسکی ترکتازیاں شمالی مغربی ہندوستان تک محدود تھیں کہ ایک ایسا واقعہ پیش آیا جس نے ہندوستان کی قسمت کا فیصلہ کر دیا، رائے پتھورا نے کسی مسلمان کو (جو غالباً اُس کے دربار سے متعلق تھا) اذیت پہنچائی، حضرت خواجہ نے اس کی سفارش کی۔ پتھورا نے متکبرانہ اور توہین آمیز جواب دیا اور کہا کہ "یہ شخص یہاں آیا ہوا ہے اور ایسی اونچی اونچی باتیں کہتا ہے جو کسی نے نہ دیکھیں نہ سنیں۔ حضرت خواجہ نے یہ سن کر ارشاد فرمایا کہ "ہم نے پتھورا کو زندہ گرفتار کر کے (محمد غوری کو) دے دیا" اس کے بعد ہی محمد غوری نے حملہ کیا، پتھورا نے مقابلہ کیا، اور شکست کھائی[ل]

بہر حال واقعہ کی جو ترتیب ہو اس میں شک نہیں کہ حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ نے محمد غوری کے حملوں کے درمیان اور اسلامی سلطنت کی عمومیت و استحکام سے پیشتر ہندوستان کے قلب اور قدیم ہندوستان کے عظیم سیاسی و روحانی مرکز اجمیر کو اپنے قیام کے لئے انتخاب فرمایا، یہ فیصلہ ان کی اولوالعزمی عالی ہمتی اور جرأت ایمانی کا ایسا تابناک کارنامہ ہے جس کی مثالیں صرف پیشوایانِ مذاہب اور فاتحین عالم کی تاریخوں میں مل سکتی ہیں۔ ان کے استقلال و اخلاص، ان کے توکل و اعتماد، ان کے زہد و قربانی اور انکے درد و سوز کی وجہ سے ہندوستان کے لئے دارالاسلام بننے کا فیصلہ کر دیا اور جو سرزمین ہزاروں برس صحیح یقین اور صحیح معرفت سے محروم اور توحید کی صدا سے ناآشنا تھی وہ علماء و اولیاء کی سرزمین اور علوم اسلامیہ اور کمالاتِ دینیہ کی محافظ و امین بن گئی اور اس کی فضائیں اذانوں سے اور دشت و جبل اللہ اکبر کی صداؤں سے اور اسکے شہر و دیار قال اللہ و قال الرسول کے نغموں سے ایسے گونجے کہ صدیوں سے عالم اسلام گوش برآواز ہے۔ ع جہانے را دگرگوں کرد یک مرد خود آگاہے۔

ل سیر الاولیاء ص۴۷، آثار الکرام

سیر الاولیاء کے مصنف نے بڑی صداقت و بلاغت سے لکھا ہے:۔

مملکت ہندوستان تا حد بر آمدن آفتاب
ہمہ دیار کفر و کافری و بت پرستی بود
و متمردان ہند ہر یکے دعوئے انا ربکم الاعلیٰ
می کردند و خدائے را جل و علا شریک میگفتند
و سنگ و کلوخ و دار و درخت و ستور و گاؤ
و سرگیں آں را سجدہ می کردند و ظلمت کفر
قفل دل ایشاں مظلم و محکم بود۔

ہمہ غافل از حکم دین و شریعت
ہمہ بے خبر از خدا و پیمبر
نہ ہرگز کسے دیدہ ہنجار قبلہ
نہ ہرگز شنیدہ کسی اللہ اکبر

وصول قدم مبارک آں آفتاب اہل
یقیں کہ بحقیقت معین الدین بود ظلمت ایں دیار
بنور اسلام روشن و منور گشت۔

از تیغ او بجائے صلیب و کلیسا
در دار کفر مسجد و محراب و منبر است
آنجا کہ بود نعرہ و فریاد مشرکاں
اکنوں خروش نعرۂ اللہ اکبر است

ملک ہندوستان اپنے آخری مشرقی کنارہ تک کفر و شرک کی بستی تھی، اہل تمرد "انا ربکم الاعلیٰ" کی صدا لگا رہے تھے اور خدا کی خدائی میں دوسری ہستیوں کو شریک کرتے تھے، اور اینٹ، پتھر، درخت، جانور، گائے و گوبر کو سجدہ کرتے تھے کفر کی ظلمت سے ان کے دل تاریک اور مقفل تھے، سب دین و شریعت کے حکم سے غافل، خدا و پیمبر سے بے خبر تھے، نہ کسی نے کبھی قبلہ کی سمت پہچانی، نہ کسی نے اللہ اکبر کی صدا سنی، آفتاب اہل یقین حضرت خواجہ معین الدینؒ کے قدم مبارک کا اس ملک میں پہنچنا تھا کہ اس ملک کی ظلمت نور اسلام سے مبدل ہو گئی ان کی کوشش و تاثیر سے جہاں شعائر شرک تھے وہاں مسجد و محراب و منبر نظر آنے لگے، جو فضا شرک کی صداؤں سے معمور تھی، وہ نعرۂ اللہ اکبر سے گونجنے لگی۔

ہر کہ ازیں دیار مسلمان شد و تا روز قیامت
مسلمان خواہد شد او فرزندان ایشاں تا
توالدوا تناسلوا است مسلمان خواہند
بود و آں طائفہ را کہ بہ تیغ اسلام از
دار حرب در دار اسلام خواہند آورد
الی یوم القیامۃ، مثوبات آں ببارگاہ
با جاہ شیخ الاسلام معین الدین سجزی
قدس اللہ سرہ العزیز بمتابعت حضرت
او واصل و متواصل خواہند بود
انشاء اللہ العزیز۔[1]

اس ملک میں جس کو دولتِ اسلام ملی
اور قیامت تک جو بھی اس دولت سے
مشرف ہوگا نہ صرف وہ بلکہ اس کی
اولاد در اولاد، نسل در نسل سب انکے
نامۂ اعمال میں ہوں گے اور اس میں
قیامت تک جو بھی اضافہ ہوتا رہیگا اور
دائرۂ اسلام وسیع ہوتا رہے گا قیامت
تک اس کا ثواب شیخ الاسلام معین الدین حسن
سجزی کی روح کو پہنچتا رہے گا۔

اس طرح ہندوستان اور ہندوستان میں جو کچھ خدا کا نام لیا اور اسلام کا کام کیا گیا وہ سب چشتیوں اور ان کے مخلص و عالی ہمت بانیِ سلسلہ حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ کے حسنات اور کارناموں میں شمار کئے جانے کے قابل ہے اور اس میں شبہ نہیں کہ اس ملک پر اس سلسلہ کا حق قدیم ہے، مولانا غلام علی آزاد نے صحیح لکھا ہے:۔

لاشک بزرگان چشت عنبر سرشت را
حقی است قدیم بر ولایت ہند۔[2]

اس میں کوئی شک نہیں کہ بزرگانِ
سلسلۂ چشت کا ملک ہندوستان پر حق قدیم ہے۔

اور صاحب سیر الاقطاب کا یہ لکھنا بھی صحیح ہے:۔

۱؎ سیر الاولیاء ص ۴۷ ۲؎ مآثر الکرام ص ۷

بہ ہندوستان برہمن قدم میمنت لزومش	ہندوستان میں انکے دم قدم کی برکت سے
طریقۂ اسلام ظاہر گشت و سیاہی کفر و	اسلام کی اشاعت ہوئی اور کفر کی ظلمت
شرک از عرصۂ روزگار بزود[1] ۔	یہاں سے کافور ہوئی ۔

حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ کی حیات ہی میں ہندوستان کی سیاسی مرکزیت اور اقتدار اجمیر سے دہلی منتقل ہو گیا، اور اجمیر نے اپنی اہمیت بہت کچھ کھو دی۔ خواجہ بزرگؒ نے دہلی میں اپنے جانشین و خلیفۂ اعظم خواجہ قطب الدین بختیار کاکیؒ کو بٹھایا اور خود اجمیر ہی میں مقیم رہے جہاں تبلیغ و ارشاد اور تعلیم و تربیت اور مشغولی حق میں اپنی بقیہ زندگی پوری کر دی، کسی قدیم تاریخی ماخذ میں ان تبلیغی مساعی کی تفصیلات اور ان کے نتائج و اثرات کا مستند و معین طریقہ پر تذکرہ نہیں ملتا۔ عام طور پر اتنا ذکر کیا جاتا ہے کہ کثیر و عظیم تعداد میں بندگانِ خدا نے ان سے ایمان و احسان کی دولت پائی اور لوگ جوق در جوق اسلام میں داخل ہوئے ——— ابو الفضل "آئینِ اکبری" میں لکھتا ہے: ۔

عزلت گزیں باجمیر شد و فراواں چراغ	اجمیر میں عزلت گزیں ہوئے، اور اسلام
برافروخت، و از دم گیرائے او گروہا گروہا	کا چراغ بڑی آب و تاب سے روشن کیا، انکے
مردم بہرہ برگرفتند	انفاسِ قدسیہ سے جوق در جوق انسانوں نے ایمان
	کی دولت پائی۔

تقریباً نصف صدی ارشاد و تلقینِ اسلام کی اشاعت اور داعیانِ اسلام و اہلِ قلوب کی

---

[1] سیر الاقطاب ص۱۰۱

[2] آئینِ اکبری (سر سید ایڈیشن) ص۲۷۰

کی تعلیم و تربیت اور یادِ حق میں سرگرمی کے ساتھ مشغول رہ کر ۹۰ سال کی عمر میں ۶۲۶ھ[1] میں اس وقت رحلت فرمائی جب ہندوستان میں ان کے ہاتھ کا لگایا ہوا پودا جڑ پکڑ چکا تھا اور دارالحکومت دہلی میں ان کا جانشین و تربیت یافتہ شیخ وقت (خواجہ قطب الدین بختیار کاکیؒ) ارشاد و ہدایت کے کام میں سرگرم و منہمک تھا اور ان کا عقیدتمند و حلقہ بگوش سلطان شمس الدین التمش اسلامی حکومت کی توسیع و استحکام اور عدل گستری و خلق پروری میں مشغول تھا۔

خواجہ قطبُ الدین بختیار کاکیؒ

خواجہ قطب الدین بختیارؒ قصبۂ اوش[2] (ماوراء النہر) میں پیدا ہوئے۔ ڈیڑھ سال کے تھے کہ باپ کا سایہ سر سے اُٹھ گیا، والدہ ماجدہ نے تربیت کی۔ پانچ سال کی عمر میں مکتب میں داخل ہوئے، مولانا ابوحفص اوشیؒ سے تعلیم حاصل کی، پھر بغداد کا سفر کیا، وہاں اُس خضرِ طریقت سے ملاقات و ملازمت کا شرف حاصل ہوا جس کی رہبری سے کمال و تکمیل کے مدارج تک پہنچنا مقدر تھا اور جس کے ہاتھوں اور جس کی شرکت میں اسلام میں ہندوستان کا چشمۂ حیواں جاری ہونا تھا۔ فقیہ ابوالیث سمرقندیؒ کی تاریخی و بابرکت مسجد میں ممتاز و جلیل القدر علماء و شیوخ کی موجودگی میں خرقۂ خلافت سے سرفراز ہوئے، ہندوستان تشریف لائے اور اپنے شیخ کے حکم و ہدایت سے دہلی کو اپنا مستقر بنایا جو نوخیز و وسعت پذیر اسلامی سلطنت کا دارالحکومت تھا، اور جو ایک طرف عالی ہمت مسلمانوں

---

[1] سنہ وفات میں اختلاف ہے۔ عام طور پر تین سنہ لکھے گئے ہیں: ۶۲۶ھ، ۶۳۲ھ، ۶۳۳ھ۔ صاحب سیر الاقطاب نے "آفتابِ ملکِ ہند" سے سنہ وفات ۶۳۳ھ استخراج کیا ہے، صاحب خزینۃ الاصفیاء نے بھی یہی سنہ وفات مانا ہے۔ ۱۲

[2] یاقوت نے معجم البلدان میں لکھا ہے کہ وہ فرغانہ کے نواح میں ایک بڑا شہر ہے۔

بادشاہوں کی قدر دانی و جوہر شناسی کی وجہ سے ، دوسری طرف تاتاری حملوں کی بناء پر علماء شرفاء و اہلِ کمال کا ملجا و ماویٰ بن گیا تھا، اور عالمِ اسلام کا جوہر وہاں منتقل ہو رہا تھا۔

سلطان شمس الدین التمش نے شایانِ شان پذیرائی کی، آپ نے دربار سے کوئی تعلق رکھنا پسند نہ کیا اور سلطان کی کسی پیشکش (روپیہ و جاگیر) کو قبول نہ فرمایا، اور پہلے کیلو کھڑی میں، پھر ملک عزالدین کی مسجد کے قریب فقیرانہ و درویشانہ زندگی اختیار کی[۱]، سلطان برابر عقیدت کے ساتھ خدمت میں حاضر ہوتا رہا اور اس کی عقیدت برابر ترقی کرتی رہی، اہل شہر کا ایسا رجوع عام ہوا کہ شیخ الاسلام وقت شیخ نجم الدین صغریٰ کو کبیدگی اور شکایت پیدا ہو گئی حضرت خواجہ معین الدینؒ اپنے خلیفہ کی ملاقات کے لئے دہلی تشریف لائے تو شیخ نجم الدینؒ نے جو اُن کے قدیم دوست تھے شکایت کی۔ حضرت خواجہؒ نے اپنے مرید رشید سے فرمایا :۔

بابا بختیار ہم بکبار چنیں مشہور شدی کہ	بابا بختیار اتنی جلدی ایسے مشہور ہو گئے
خلق از دست تو شکایت کردن گرفت	کہ بندگانِ خدا کو تم سے شکایت
ازیں جا برخیز و در اجمیر بیا و بنشیں	پیدا ہونے لگی۔ یہاں سے چلو اور اجمیر آ کر وہاں
من پیشِ تو بایستم[۲]	قیام اختیار کرو، میں تمہارے سامنے (خادم کی طرح) کھڑا ہونگا۔

شیخ نے وہ ارشاد فرمایا جو ایک ایسے عالی مرتبت شیخ کو فرمانا چاہیئے جو کمالِ اخلاص و ربانیت کو پہنچ چکا تھا، مردانِ راہ و واصلینِ بارگاہ ادنیٰ مخلوق کی شکایت و آزردگی کو گناہ سمجھتے ہیں، چہ جائیکہ شیخ الاسلام کی کبیدگی کو، پھر آپ مرکزِ اسلام میں انتشار و پراگندگی کو کو پسند نہیں کرتے تھے جس کا اس رنجش سے خطرہ تھا، آپ نے لطیف طریقہ پر یہ تنبیہ بھی فرمادی کہ اگر یہاں کے اہلِ فضل تمہاری قدر و منزلت اور مقام سے واقف نہیں تو

۱؎ فرشتہ صفحہ ۲۰۶ ج ۲ ۲؎ سیر الاولیاء صفحہ ۵۴

میں واقف ہوں، اور یہ کہ یہاں خادم و مخدوم و شیخ و مرید کا کوئی امتیاز نہیں، وہاں تم مخدوم رہو گے، میں خادمانہ۔ خواجہ قطب الدینؒ نے وہی جواب دیا جو ایک مرید رشید کو دینا چاہیے عرض کیا:—

مخدوم مرا چہ محل آں باشد کہ پیش مخدوم توانم ایستاد فکیف بنشستیم[1]	مخدوما! میں تو آپ کے سامنے کھڑے ہونے کا بھی اہل نہیں، بیٹھنے کی کیا مجال؟

شیخ نے اجمیر چلنے کا حکم دیا اور مرید صادق بے چون وچرا اور بلا تامل تیار ہو گیا، لیکن جب شہر کے باہر قدم نکالا تو شیخ کو معلوم ہو گیا کہ یہ مقبولیت و ہر دلعزیزی من جانب اللہ ہے اس میں نفسانیت و انانیت کو دخل نہیں، اور یہ کہ ان کے مرید رشید نے ساری دہلی کو اپنا عاشق و پروانہ بنالیا ہے۔

شیخ قطب الدین ہمراہ شیخ روانہ اجمیر گردید ازیں مقدمہ در تمام شہر دہلی شور افتاد ہمہ اہل شہر مع سلطان شمس الدین دُنبال برآمدند، و ہر جا شیخ قطب الدین قدم می گذاشت خلائق خاک آں زمین بہ تبرک بری داشت و بنہایت اضطراب و زاری می نمودند۔[2]	خواجہ قطب الدین اپنے شیخ کے ساتھ اجمیر روانہ ہوئے، اس اطلاع سے شہر دہلی میں ایک شور برپا ہو گیا۔ اہل شہر مع سلطان شمس الدین شہر سے نکل کر آپ کے پیچھے ہوئے جہاں خواجہ قطب الدین کا پاؤں پڑتا تھا، لوگ خاک پا کو تبرک بنا کر اٹھا لیتے تھے۔ لوگ بڑے بیقرار اور آہ و زاری میں مصروف تھے۔

ایک دل کو خوش کرنے کے لئے اور ایک جزئی مصلحت کی خاطر لاکھوں خدا کے بندوں کے دل کو رنجور و زخمی کرنا جائز نہ تھا۔ مرشد نے مرید رشید کو اجمیر لیجانے کا ارادہ فسخ کیا اور فرمایا:

---

[1] سیر الاولیاء ص ۵۳ [2] ایضاً ص ۵۴

بابا بختیار! شہر دریں مقام باش کہ خلائق از	بابا بختیار! تم یہیں رہو، اسلئے کہ خدا کی
بیرون آمدن تو در اضطراب و خراب است	اتنی مخلوق تمہارے باہر جانے سے تباہ حال
روا نہ دارم کہ چندیں دلہا خراب و کباب	ہے میں اس کو جائز نہیں سمجھتا کہ اتنے دل
باشند، بروایں شہر را در پناہ تو	دکھائے اور جلائے جائیں۔ جاؤ ہم نے
گذاشتیم ۔[۱]	اس شہر کو تمہاری پناہ میں چھوڑا۔

سلطان شمس الدین نے جس کا دارالحکومت اس نعمت سے محروم ہوا جارہا تھا، شیخ کا شکریہ ادا کیا اور خواجہ قطب الدین شہر دہلی واپس آئے اور خواجہ معین الدینؒ اجمیر واپس ہوئے۔

خواجہ قطب الدینؒ نے دہلی واپس آکر اور اپنے بوریائے فقر پر بیٹھ کر سرگرمی سے ارشاد و تربیت کا کام انجام دینا شروع کیا۔ انھوں نے "سرکار دربار" سے ضابطہ کا کوئی تعلق نہیں رکھا اور نہ صرف اسکو اپنی زندگی کا اصول بنایا بلکہ اپنے سلسلہ کا اصول بنا دیا کہ فقر و استغنا کے ساتھ اور "دربار" سے دور رہ کر اپنا کام کرنا ہے، لیکن اس بے تعلقی و بے نیازی کے باوجود عوام و خواص اور شاہ و گدا سب ان کے عقیدتمند و حلقہ بگوش تھے۔

جملگی عالم از صدور و ائمہ بہ دعاگوئی	ساری دنیا، اعیان و اکابر دعاگوئی اور
روئے نہادند[۲]	نیازمندی میں مصروف تھے۔

سلطان شمس الدین ہفتہ میں دو بار حاضری دیتا اور اخلاص و عقیدت کا اظہار کرتا۔[۳] دہلی میں جو نہ صرف ہندوستان کا دارالحکومت بلکہ عالمِ اسلام کی نئی طاقت اور دعوت و تجدید اسلام کا نیا مرکز تھا اور جہاں عالم اسلام کے ممتاز ترین علماء و اساتذہ، سادات و شرفاء اور مشائخ و اہلِ

---

۱ سیر الاولیاء (ص ۵۵) ۲ اخبار الاخیار (ص ۲۶) ۳ تاریخ فرشتہ (ص ۱۹۱)

سلسلہ اور دنیائے اسلام کے بہترین دل و دماغ جمع تھے، اشاعت طریق و تربیت قلوب اور نئی ابھرتی ہوئی اسلامی سلطنت کی رہنمائی کا کام اپنے دامنِ فقر و استغنا کو ذرّہ برابر آلودہ اور ترکِ بغیر انجام دینا بڑا نازک اور مشکل تھا اور اس کے لئے پہاڑ کی سی استقامت اور ہوا کی سی سُبک روی اور سُبک گامی کی ضرورت تھی۔ جس سے کسی شیشے کو ٹھیس نہ لگے۔ خواجہ صاحب نے بڑی کامیابی اور خوش اسلوبی کے ساتھ اس نازک اور دشوار کام کو انجام دیا، ان کو اس خدمت کے لئے طویل زمانہ نہیں ملا اپنے شیخ کے بعد تو مشکل سے ۴، ۵ سال وہ زندہ رہے، لیکن ان کی ذات سے ہندوستان میں نہ صرف سلسلۂ چشتیہ کی بنیاد پڑ گئی، بلکہ جن مقاصد عالیہ کے لئے حضرت خواجہ معین الدینؒ نے ہندوستان کو اپنے قیام اور کام کے لئے انتخاب کیا تھا وہ صدیوں کے لئے محفوظ ہو گئے۔

ابھی ان کی عمر ۵۰ سال یا اس سے کچھ اوپر ہوئی تھی کہ عشق و محبت الٰہی کی وہ آگ جس کو انھوں نے صبر و ضبط کے فانوس میں مقید اور ہدایت و تربیتِ خلق کی مصلحت سے مغلوب کر رکھا تھا بھڑکی اور جذبِ الٰہی کا غلبہ ہوا ؎

صدائے تیغ تو آمد بہ بزمِ زندہ دلاں
کدام سر کہ درو ذوق ایں سرود نماند

ایک مرتبہ شیخ علی سکزیؒ کی خانقاہ میں مجلس سماع گرم تھی۔ قوال نے شعر پڑھا ؎

کشتگانِ خنجرِ تسلیم را
ہر زماں از غیب جانے دیگر است

لہ اگر حضرت خواجہ معین الدینؒ کا سنہ وفات ۶۲۷ھ بھی تسلیم کر لیا جائے تو خواجہ قطب الدینؒ کو ان کے بعد صرف ۶ سال ملتے ہیں۔ لہ بعض تذکروں میں سجزی درج ہے۔ ۱۲

خواجہ قطب الدینؒ پر وجد طاری ہو گیا، خانقاہ سے قیام گاہ پر تشریف لائے، وہی مدہوشی اور تحیر کا عالم تھا، اسی شعر کی فرمائش تھی، فرمائش کی تعمیل کی جاتی تھی۔ چار شبانہ روز عالمِ تحیر میں رہے، لیکن جب نماز کا وقت آتا ہوش آجاتا، نماز ادا کرتے، پھر اسی شعر کی فرمائش کرتے، شعر پڑھا جاتا اور عالمِ تحیر میں چلے جاتے۔ پانچویں رات کو انتقال کیا[1]۔ یہ واقعہ ۶۳۳ھ کا ہے[2]۔

انتقال سے پہلے عید کے روز عیدگاہ سے قیام گاہ کی طرف واپس آرہے تھے کہ ایک ایسے میدان سے گزر ہوا جہاں کوئی قبر یا آبادی نہ تھی، خواجہ وہاں ٹھہر گئے اور دیر تک کھڑے رہے کسی خادم نے عرض کیا کہ عید کا دن ہے اور خلقت منتظر، آپ نے یہاں کیوں توقف فرمایا؟" ارشاد ہوا۔ "مرا ازیں زمیں بوئے دلہا می آید" (مجھے یہاں سے دلوں کی خوشبو آتی ہے) دوسرے وقت زمین کے مالک کو بلا کر اپنے صرف خاص سے اسکو خرید فرمایا اور اس کو اپنے دفن کیلئے تجویز کیا، وہیں مدفون ہوئے[3]۔

حضرت خواجہؒ کے خلفاء کی تعداد (جن کے نام تذکرہ کی کتابوں میں محفوظ ہیں) ۹، ۱۰ سے کم نہ تھی، لیکن آپ کی جانشینی اور حضرت خواجہ معین الدینؒ کے کاموں اور مقاصد کی تکمیل و توسیع کی سعادت حضرت خواجہ فریدالدین گنج شکرؒ کے حصے میں آئی۔

حضرت خواجہ فریدالدین گنج شکرؒ

جس طرح حضرت خواجہ معین الدینؒ ہندوستان میں سلسلہ چشتیہ کے مؤسس و بانی ہیں خواجہ فریدالدینؒ اس کے مجدد اور اس سلسلہ کے آدم ثانی ہیں۔ آپ ہی کے خلفاء سلطان المشائخ

---

[1] سیر الاولیاء بروایت حضرت خواجہ نظام الدینؒ

[2] بعض تذکروں میں ۶۳۴ھ بجائے ۶۳۳ھ کے۔

[3] سیر الاولیاء بروایت حضرت خواجہ نظام الدین اولیاءؒ (ص ۵۵)۔ اب یہ جگہ قطب صاحب کے نام سے مشہور ہے۔ ۱۲

حضرت خواجہ نظام الدین دہلویؒ اور حضرت شیخ علاء الدین علی صابر پیران کلیریؒ کے ذریعہ یہ سلسلہ ہندوستان میں پھیلا اور ان کے خلفاء و اہل سلسلہ کے ذریعہ اب بھی زندہ و قائم ہے ؏

خم و خمخانہ با مہر و نشان است

حضرت خواجہؒ کا نام مسعودؒ لقب فریدالدین تھا، عام طور سے گنج شکر کے لقب سے مشہور عالم ہیں،[1] آپ نسباً فاروقی ہیں، جد بزرگوار قاضی شعیب تاتاریوں کے ہنگامہ میں کابل سے لاہور تشریف لائے، کچھ عرصہ قصور میں قیام فرمایا، قصبہ کھتوال کی قضاۃ و جاگیر عطا ہوئی۔ یہیں ۵۶۹ھ میں آپ کی ولادت ہوئی، صغر سنی میں ملتان کا سفر کیا، جو اُس وقت ہندوستان کا سب سے بڑا علمی و دینی مرکز تھا، شہر کے اساتذہ سے تعلیم حاصل کی، مولانا منہاج الدین ترمذی سے فقہ کی کتاب "النافع" پڑھی، وہیں ۵۸۴ھ میں خواجہ قطب الدین بختیار کاکیؒ کی زیارت ہوئی اور ان سے بیعت کا شرف حاصل ہوا۔ شیخ فریدالدینؒ آپ کے ایسے گرویدہ ہوئے کہ تعلیم کے سلسلہ کو خیرباد کہہ کر ہمرکاب ہو جانے کا عزم کیا۔ شیخ کامل نے منع کیا اور تکمیل کی ہدایت کی۔ ہندوستان اور ہندوستان سے باہر جاکر علوم کی تکمیل کی۔[2]

تعلیم کی تکمیل کے بعد شیخ کی خدمت میں دہلی حاضر ہوئے۔ شیخ نے ان کے قیام کے لئے غزنین دروازہ کے پاس ایک جگہ منتخب کی، جہاں وہ ریاضت و مجاہدے میں مشغول ہو گئے، سلوک

---

[1] اس لقب کی حقیقت و تاریخ میں مختلف اقوال ہیں، بالیقین کے ساتھ کوئی بات نہیں کی جا سکتی۔

[2] راحت القلوب میں جو آپ کے ملفوظات کا مجموعہ ہے، اس سفر اور دوسری سیاحتوں کی بڑی تفصیل موجود ہے، لیکن چونکہ اس کتاب کی نسبت صحیح نہیں ہے، اس پر اعتماد نہیں کیا گیا۔ بعض دوسری کتابوں میں بھی بعض دوسری تفصیلات ہیں۔ ۱۲

کی تکمیل کے بعد خلافت سے سرفراز ہوئے اور شیخ کی اجازت سے ہانسی میں قیام اختیار کیا جو ان کے مخلص (جو بعد میں خلفائے کبار میں ہوئے) شیخ جمال الدین خطیب ہانسی کا وطن تھا۔ شیخ کا انتقال ہوا تو وہ ہانسی میں تھے انتقال کے تیسرے روز دہلی پہنچے، مزار شیخؒ پر فاتحہ پڑھی۔ قاضی حمید الدین ناگوریؒ نے شیخ کی وصیت کے مطابق ان کا خرقہ اور دوسری امانتیں سپرد کیں، یہ گویا جانشینی کا اعلان تھا۔ شیخ نے دوگانہ پڑھ کر اس کو زیب تن کیا اور شیخ کی جگہ پر بیٹھے۔

دہلی کی آمد اور شیخ کی جانشینی کا تیسرا روز تھا کہ ہانسی سے آپ کا ایک آشنائے قدیم و معتقد سرہنگا نامی آپ کے اشتیاق میں دہلی آیا۔ خادموں نے اندر جانے نہیں دیا۔ معتقدین و خدام کے ہجوم سے اس درویش کو ملاقات میسر نہ آئی، منتظر تھا کہ ایک روز شیخ باہر تشریف لائے سرہنگا قدموں پہ گر گیا اور رو کر کہا کہ جب تک آپ ہانسی میں تھے آسانی اور بے تکلفی سے مل لیا کرتا تھا، اب یہاں ہم جیسے غریبوں کا کام نہیں، شیخ کے دل پر چوٹ لگی اور سمجھے کہ تنبیہ غیبی ہے، دہلی میں سکون اور عوام و فقراء سے ملنے جلنے کا موقع نہیں۔ اپنی مزید تکمیل ترقی مطلوب تھی۔ آپ نے اسی وقت اپنے دوستوں سے کہا کہ میں ہانسی جاؤں گا۔ حاضرین نے عرض کیا کہ شیخ قطب الدینؒ نے تو آپ کو اس جگہ بٹھایا ہے۔ آپ کہاں جاتے ہیں؟ فرمایا کہ "پیرؒ نے اپنی امانت سپرد کر دی ہے، شہر میں رہوں یا بیابان میں وہ ساتھ ہے"۔[1]

ہانسی کا قیام اس لئے اختیار کیا تھا کہ وہاں سکون اور گمنامی رہے گی۔ یہاں خواجہ قطب الدینؒ کے ایک مرید مولانا نور ترک کی وجہ سے (جنھوں نے اہل ہانسی کو آپ کے مقام و مرتبہ سے آگاہ کر دیا) آپ کی شہرت ہو گئی اور خلق نے ہجوم کیا۔ آپ نے کھتوال کا رُخ کیا جو

---

[1] سیر الاولیاء (ص ۷۲)

وطن قدیم تھا۔ کھینوال ملتان سے قریب تھا، اور اُن کی شہرت اور عظمت کا آوازہ اَب دُور دُور بلند ہو رہا تھا، آپ نے اجودھن[1] کو اپنے قیام کے لئے انتخاب فرمایا، اور ارشاد ہوا کہ:- وہاں کے لوگ دیر اعتقاد اور ناآشنا ہیں اور جگہ بھی غیر معروف ہے، لیکن یہاں بھی بہت جلد رجوع شروع ہو گیا اور خلائق نے ہر طرف سے ہجوم کیا۔ آفتاب شہرت و عظمت نصف النہار پر تھا اور اس کی شعاعیں دور دور پہنچ رہی تھیں اور طالبین خدا کے قلوب کو گرم کر کے کھینچ کھینچ کر لا رہی تھیں۔ تھوڑے دنوں میں مرجعیت یہاں تک بڑھی کہ آنے والوں کا سلسلہ ختم ہونے کو نہ آتا، آدھی رات تک دروازے کھلے رہتے۔

ابتدائے قیام میں عرصہ تک نہایت تنگی اور عُسرت[2] فقر و فاقہ کے ساتھ زندگی گذاری، پیلو کے پھل ابال لئے جاتے اور ان میں کچھ نمک ڈال کر فقراء کو تقسیم کر دیئے جاتے اور خود بدولت اپنے مہمانوں اور خادموں کے ساتھ تناول فرماتے۔ توکّل و تجرید کا یہ عالم تھا کہ ایک مرتبہ افطار کیلئے لقمہ اٹھایا، فرمایا: اس میں کچھ بے اصولی معلوم ہوتی ہے؟ خادم نے عرض کیا کہ: نمک نہ تھا، ایک دانگ کا نمک قرض لیکر ڈال دیا۔ فرمایا:- تم نے بے اصولی کی، میرے لئے اس کا کھانا روا نہیں[2]۔ کچھ عرصہ کے بعد یہ حال ہوا کہ دن رات مطبخ شاہی گرم رہتا اور رات آدھی رات گئے تک کھانے والوں کا سلسلہ رہتا، جو آتا اس خوانِ نعمت سے حصّہ پاتا۔ جو شخص بھی آتا کسے باشد اپنا حصّہ پاتا[3]۔

شفقت و دلداری سب کے ساتھ یکساں تھی۔ حضرت خواجہ نظام الدینؒ فرماتے ہیں کہ: عجیب قوت اور عجیب طرز زندگی تھا جس کا تحمّل کسی سے ہونا آسان نہیں، نئے آنے والے جو کبھی نہیں آئے اور برسوں کے ساتھ رہنے والے سب سے یکساں لطف و مہربانی اور توجّہ و التفات کے ساتھ پیش

---

[1] اجودھن کو اَب پاک پٹن کہتے ہیں، اور وہ ضلع منٹگمری (پاکستان) کا ایک قصبہ ہے -۱۲

[2] سیر الاولیاء، (ص۶۶) [3] ایضاً (ص۶۴)۔

آتے، مولانا بدرالدین اسحٰق فرماتے ہیں کہ:۔ میں خادمِ خاص تھا، جو بات کبھی ہوتی مجھ سے فرماتے تھے، خلوت و جلوت میں یکساں حال تھا، ظاہر و باطن میں کوئی فرق نہ تھا۔ برسوں خدمت کرنے اور ساتھ رہنے کے باوجود کوئی تفاوت نہ دیکھا[1]۔

ایک بار سلطان ناصرالدین محمود کا پورا لشکر جو بادشاہ کے اوچ اور ملتان کے سفر میں ہمرکاب تھا، خواجہؒ کی زیارت کیلئے اجودھن حاضر ہوا۔ حضرت خواجہ نظام الدینؒ اس کا حال بیان کرتے ہیں کہ:۔

"ہجوم قابو سے باہر تھا، آخر کار خدام نے یہ طریقہ اختیار کیا کہ حضرت خواجہؒ کے پیرہن کی آستین بالاخانے سے لٹکا دی۔ اہلِ لشکر آتے تھے اور اس کو بوسہ دیتے تھے، یہاں تک کہ وہ آستین تارتار ہوگئی۔ مجبوراً آپ مسجد میں تشریف لائے اور خدام سے فرمایا کہ:۔ میرے گرد حلقہ بنالو، کوئی اس حلقہ کے اندر نہ آنے پائے۔ لوگ آتے تھے اور حلقہ کے باہر کھڑے ہوکر سلام کرکے رخصت ہوجاتے تھے۔ اچانک ایک بوڑھا فرّاش حلقہ توڑکر اندر آگیا اور شیخ کے پاؤں پر گر گیا۔ پاؤں پکڑکر بوسہ لیا اور کہا:۔ "شیخ فریدؒ! تنگ آگئے؟ اللہ تعالیٰ کے اس انعام کا اس سے زیادہ شکریہ ادا کرو"۔ شیخ نے یہ سُن کر نعرہ مارا اور اس فرّاش کو بہت نوازا اور اس سے معذرت کی"[2]۔

سلطان ناصرالدین نے خود حاضری کا قصد کیا، نائب السلطنت غیاث الدین بلبن نے جو ہمرکاب تھا، عرض کیا کہ:۔ لشکر بہت ہے اور اجودھن ایک بے آب و گیاہ مقام ہے، اگر فرمان ہو تو میں خدمت میں حاضر ہوجاؤں اور جہاں پناہ کی طرف سے معذرت اور ہدیہ و فتوح پیش کروں چنانچہ کچھ نقد اور چار گاؤں کا فرمان لیکر حاضر ہوا اور نقد اور فرمان پیش کیا۔ شیخؒ نے فرمایا: "یہ کیا ہے؟" غیاث الدین نے کہا کہ: "یہ کچھ نقد ہے اور یہ جاگیر کا فرمان سلطانی"۔ شیخ نے تبسم فرمایا، اور کہا کہ:۔

---

[1] سیرالاولیاء (ص۶۵) [2] ایضاً (ص۷۹)

نقد تو ہم کو دے دو اور فرمان واپس لے جاؤ کہ اس کے طالب بہت ہیں، یہ کہہ کر ساری رقم اسی وقت درویشوں میں تقسیم کر دی[1]

سلطان غیاث الدین حضرتؒ سے معتقدانہ تعلق رکھتا تھا، دہلی کی سلطنت کا حصول بھی حضرتؒ کی دعا اور محبّت کا نتیجہ سمجھتا تھا اور خدّام کی خدمت کو اپنی سعادت تصوّر کرتا تھا، حضرت خواجہؒ نے ایک مرتبہ ایک شخص کے اصرار سے ایک سفارشی رقعہ لکھا جو سفارش و بے نیازی کا عجب مجموعہ ہے، فرماتے ہیں:۔

"میں اِس شخص کا معاملہ اللہ تعالیٰ اور اس کے بعد آپ کے سامنے پیش کرتا ہوں، اگر آپ اس کو کچھ دینگے تو حقیقی عطا کرنے والا اللہ تعالیٰ ہی ہوگا اور آپ مشکور ہوں گے اور اگر آپ نہ دیں گے تو اس کا مانع اللہ تعالیٰ ہوگا آپ معذور ہوں گے۔"[2]

حضرت شیخ فریدالدینؒ کے اپنے نامور معاصرین اور دوسرے سلسلہ کے مشائخ کبار سے دوستانہ و برادرانہ تعلقات تھے اور ان کے پورے مرتبہ شناس اور قدر دان تھے۔ شیخ الاسلام شیخ بہاء الدین زکریا ملتانیؒ جو سلسلۂ سہروردیہ کے نامور شیخ اور ہندوستان کے عظیم ترین روحانی پیشواؤں اور داعیوں میں گذرے ہیں، ان کے ہم عصر تقریباً ہم عمر تھے۔[3] دونوں کے بڑے مخلصانہ اور دوستانہ تعلقات تھے اور آپس میں بہت دلچسپ اور بے تکلفی کی خط وکتابت ہوتی تھی۔ شیخ فریدالدینؒ شیخ بہاءالدینؒ کو "شیخ الاسلام" کے لقب سے مخاطب

---

[1] سیر الاولیاء ص ۷۹ و ص ۸۰۔ ۱۲ [2] اخبار الاخیار۔ اصل رقعہ فصیح عربی میں ہے۔ ۱۲

[3] شیخ الاسلام شیخ بہاء الدین زکریا کی ولادت ۵۶۶ھ کی ہے، اور شیخ کبیرؒ کی ولادت ۵۶۹ھ کی۔ ۱۲

کرتے تھے۔ دونوں کے خلفاء اور مریدین بھی آپس میں ایک دوسرے سے بڑے خلوص و محبت سے ملتے تھے اور ایک دوسرے کا اعتراف اور بزرگ داشت کرتے تھے۔ شیخ الاسلامؒ کے پوتے شیخ رکن الدین ابوالفتحؒ، اور شیخ کبیرؒ کے خلیفہ سلطان المشائخ نظام الدین اولیاءؒ کے درمیان بڑی محبت اور گہرا تعلق تھا۔

حضرت خواجہ فرید الدینؒ کی زندگی کا اصل جوہر اور معاصرین میں ان کا امتیاز وہ ذوق و شوق اور درد عشق اور جذب الہٰی (خدا مستی) ہے جس نے حضرت خواجہ نظام الدین و حضرت علاء الدین علی صابر جیسے عاشقوں اور دردمندوں کی تربیت کی، اور جو اجودھن کی اس دکان عشق کا خاص سودا تھا۔ حضرت خواجہ نظام الدینؒ ایک روز کا واقعہ بیان کرتے ہیں کہ شیخ کبیرؒ (حضرت خواجہ فرید الدینؒ) حجرے میں تھے، سر برہنہ تھا اور چہرے کا رنگ متغیر، حجرے میں والہانہ کیفیت میں پھرتے تھے اور یہ اشعار پڑھتے تھے ؎

خواہم کہ ہمیشہ در وفائے تو زیم   خاکے شوم و بزیر پائے تو زیم
مقصودِ خستہ ز کونین توئی   از بہر تو میرم از برائے تو زیم

(میری آرزو ہے کہ ہمیشہ آپ ہی کا ہو کر جیوں، خاک ہو جاؤں اور آپ کے قدموں کے نیچے زندگی گذر رے مجھ مسکین و بیچارے کا دونوں جہاں میں مقصود آپ ہی ہیں آپ ہی کے لئے جیتا ہوں، آپ ہی کے لئے مرتا ہوں)۔

یہ شعر پڑھ کر سجدے میں سر رکھ دیتے تھے، پھر یہی شعر پڑھتے تھے اور حجرے کا چکر لگاتے تھے، پھر سجدے میں پڑ جاتے تھے، دیر تک یہی کیفیت رہی۔[1]

---

[1] سیر الاولیاء، ص ۱۳۳

خشیت و رقت کا بڑا غلبہ تھا، کوئی عبرت انگیز و رقت خیز بات سنتے یا مجلس میں کوئی عاشقانہ شعر پڑھا جاتا یا کسی بزرگ کا کوئی واقعہ سنتے تو بے اختیار روتے، بعض اوقات دھاڑیں مار مار کر روتے، ہمیشہ روزہ رکھتے تھے، قرآن مجید کے حفظ کا اہتمام اور تلاوت کا بڑا ذوق تھا اور دونوں چیزیں (روزہ اور حفظ قرآن) کی اپنے خلفائے خاص و مریدانِ با اختصاص کو وصیت و تاکید فرماتے تھے۔ سماع کا بڑا ذوق تھا۔ کسی نے کہا کہ علماء کو اس میں اختلاف ہے، فرمایا:۔

سبحان اللہ یکے سوخت و خاکستر شد — سبحان اللہ! ایک جل بھی اور راکھ بھی
دیگرے ہنوز در اختلاف است[۱]۔ — ہو گیا دوسرا ابھی اختلاف ہی کر رہا ہے۔

ساری زندگی کا اصول اہلِ دول و اربابِ حکومت سے بے تعلقی، کنارہ کشی، اخفائے حال اور درویشانہ زندگی تھا۔ اپنے مشائخ کرام کا مسلک جان کر اور اسی میں خلوص کی حفاظت[۱] و طریقہ کی اشاعت کا راز سمجھ کر اس روش پر سختی اور مضبوطی سے قائم تھے، ان کے ایک برادرِ طریقت شیخ بدرالدین غزنویؒ نے (جو حضرت خواجہ قطب الدینؒ کے خلفائے کبار میں سے تھے) بعض اعیانِ سلطنت سے خصوصی تعلق رکھا تھا اور اس نے ان کے لئے دہلی میں خانقاہ تعمیر کی تھی اور ان کی مخصوص طریقے پر خدمت کرتا تھا۔ انقلاب روزگار سے جب وہ امیر عتاب شاہی میں آیا تو شیخ کو بھی زحمت و کلفت پیش آئی، آپ نے شیخ کبیرؒ سے دعا کی درخواست کی۔ شیخ نے جواب میں لکھا کہ :۔

"جو اپنی روش پر چلے گا وہ ضرور ایسی حالت میں گرفتار ہوگا، جس سے ہمیشہ بے چین رہیگا، آپ تو پیران پاک کے معتقدین میں ہیں، پھر اُن کی روش کے خلاف خانقاہ کیوں بنوائی، اور اس میں کیوں بیٹھے؟ حضرت خواجہ قطب الدینؒ

---

[۱] ملاحظہ ہو حالات حضرت سلطان المشائخؒ - ۱۲۔ [۲] سیر الاولیاء ۱۲۔

اور حضرت خواجہ معین الدینؒ کا تو یہ طریقہ اور روش نہیں تھی کہ اپنے لئے خانقاہ بنا کر دُکان جمائیں، ان کا شیوہ تو گمنامی و بے نشانی تھا۔[1]

ان کے اس طبعی ذوق کی وجہ سے باوجود رجوعِ عام اور امراء و خواص کی عقیدت کے انتقال سے پہلے پھر عسرت اور تنگی کا دور شروع ہو گیا، سیر الاولیاء میں ہے کہ حضرت خواجہ نظام الدینؒ نے فرمایا کہ:۔

"حضرت شیخ شیوخ العالم کو آخر عمر میں کہ انتقال کا زمانہ قریب تھا تنگی پیش آئی، میں ماہ رمضان میں موجود تھا، اتنا تھوڑا کھانا آیا کرتا تھا کہ موجود لوگوں کو کافی نہ ہوتا تھا۔ کسی رات بھی میں نے ان دنوں سیر ہو کر کھانا نہ کھایا، سامان بھی جو دیکھنے میں آتا تھا بہت معمولی اور برائے نام تھا، میں جب رخصت ہونے لگا تو حضرتؒ نے خرچ کے لئے مجھے ایک سلطانی[2] عطا فرمایا۔ اس روز مولانا بدر الدین اسحٰق کے ذریعہ پیغام پہنچا کہ آج توقف کریں کل جائیں، جب افطار کا وقت ہوا تو حضرت شیخؒ کی خدمت میں گیا اور میں نے عرض کیا کہ حضرتؒ کی بارگاہ سے مجھے ایک سلطانی عطا ہوا تھا اجازت ہو تو اس سے کچھ کھانے کا انتظام کر لیا جائے؟ حضرت نے اجازت مرحمت فرمائی اور بڑی دعائیں دیں۔"[3]

صاحب سیر الاولیاء حضرت خواجہ نظام الدینؒ کی روایت سے وفات کا حال اس طرح بیان کرتے ہیں:۔

---

[1] سیر العارفین ص۸ ماخوذ از بزم صوفیہ [2] سکّہ (غالباً اس وقت کا روپیہ)
[3] سیر الاولیاء ص۶۶

" محرم کی پانچ تاریخ کو بیماری میں شدت ہوئی۔ عشاء کی نماز جماعت سے ادا کی، نماز کے بعد بیہوشی طاری ہوگئی۔ ایک گھڑی کے بعد ہوش آیا تو دریافت کیا کہ میں نے عشاء کی نماز پڑھ لی؟ لوگوں نے عرض کیا کہ پڑھ لی ہے۔ فرمایا دوبارہ پڑھ لوں کیا خبر کیا ہو؟ دوبارہ نماز پڑھی اور پھر بیہوش ہوگئے۔ اس مرتبہ بیہوشی زیادہ سخت اور طویل تھی، پھر ہوش آیا اور پوچھا کہ میں نے عشاء کی نماز پڑھ لی؟ عرض کیا گیا کہ دو بار پڑھ چکے ہیں، فرمایا کہ ایک بار اور پڑھ لوں، کون جانے کیا ہو؟ تیسری مرتبہ پھر پڑھی۔ اسکے بعد واصل بحق ہوئے۔[1]

تاریخ وفات ۵ محرم روز سہ شنبہ ۶۶۴ھ[2] ہے۔ اجودھن (پاک پٹن) میں مدفون ہوئے، بعد میں سلطان محمد تغلق نے گنبد تعمیر کیا۔

حضرت خواجہؒ کے پانچ فرزند اور تین صاحبزادیاں تھیں۔ فرزندوں کے نام یہ ہیں۔ شیخ نصرالدین نصراللہ، شیخ شہاب الدین، شیخ بدرالدین سلیمان، خواجہ نظام الدین، شیخ یعقوب۔ صاحبزادیوں کے نام: بی بی مستورہ، بی بی فاطمہ، بی بی شریفہ۔

---

[1] سیرالاولیاء ص ۸۹ [2] صاحب سیرۃ الاولیاء نے متعدد مقامات پر ۶۶۹ھ کے ایسے واقعات نقل کئے ہیں جو حضرت خواجہؒ کی زندگی سے متعلق ہیں۔ بعض مقامات پر حضرت خواجہ نظام الدینؒ کی تحریر کا حوالہ ہے کہ حضرت خواجہؒ نے مجھ سے یہ فرمایا، فلاں ہدایت کی۔ اگر ان سنین کو صحیح تسلیم کرلیا جائے تو سنہ وفات ۶۶۴ھ جو عام طور پر مشہور اور زیادہ تر کتابوں میں مذکور ہے مشکوک ہوجاتا ہے اور ماننا پڑتا ہے کہ حضرت خواجہؒ کی وفات اسکے بعد ہوئی، بعض دوسری کتابوں میں بعد کے سنین درج ہیں، ان میں قرین قیاس ۶۷۰ھ ہے جو خزینۃ الاصفیاء میں بحوالہ مخزن الواصلین و تذکرۃ العاشقین درج ہے۔ ۱۲

حضرت خواجہؒ کی وفات کے بعد ان کے تیسرے صاحبزادے شیخ بدرالدین سلیمانؒ باپ کے سجادہ پر بیٹھے ان کے فرزند و سجادہ نشین شیخ علاءالدین اجودھنی تقدس و اتقا میں مشہور تھے۔ محمد تغلق بھی ان کے حلقۂ مریدین میں شامل ہوگیا تھا[1]۔ اللہ تعالیٰ نے روحانی سلسلہ کی طرح حضرت خواجہؒ کی اولاد اور خاندان کو بھی بڑی برکت عطا فرمائی، ہندوستان کے مختلف حصوں میں یہ خاندان آباد ہے اور بالعموم فریدی کہلاتا ہے۔

حضرت خواجہ کے خلفا میں پانچ حضرات خاص طور پر قابل ذکر ہیں:۔ شیخ جمال الدین ہانسویؒ، شیخ بدرالدین اسحٰقؒ، شیخ نظام الدین اولیاء، شیخ علی احمد صابرؒ اور شیخ عارفؒ۔

شیخ جمال الدین (احمد بن محمد) خطیب ہانسوی حضرت خواجہ کے بڑے عزیز خلیفہ و معتمد خاص تھے۔ انہیں کی خاطر حضرت خواجہ نے ۱۲ سال ہانسی میں قیام فرمایا تھا۔ آپ جب کسی کو خلافت نامہ لکھ کر دیتے تھے تو فرماتے تھے کہ ہانسی جا کر شیخ جمال الدین کو دکھا دینا اگر شیخ جمال الدین صاد فرماتے تو آپ بھی اسکو قبول کرتے، اگر وہ صاد نہ کرتے تو آپ بھی نامنظور فرماتے اور فرماتے کہ جمال کا پھاڑا ہوا سیا نہیں جا سکتا۔ فرماتے تھے کہ جمال میرا جمال ہے۔

شیخ جمال الدین نے اپنے شیخ کی زندگی میں ۶۵۹ھ میں انتقال کیا۔ شیخ قطب الدین منورؒ (حضرت خواجہ نظام الدین اولیاءؒ کے عزیز خلیفہ) ان کے پوتے ہیں۔

شیخ بدرالدین اسحٰق بن علی سادات بخارا میں سے تھے۔ حضرت خواجہ فریدالدینؒ کے خلیفہ، خادم اور داماد تھے۔ حضرت خواجہ نظام الدینؒ ان کی بڑی عزت کرتے تھے اپنے شیخ کی

---

[1] سیرالاولیاء ص ۱۹۶

[2] فوائد الخواطر، ماخوذ از سیرالاولیاء و اخبار الاخیار وغیرہ

صحبت و تعلیم کا نمونہ تھے۔ آنکھیں ہمیشہ پُرآب رہتی تھیں، رقت کا بڑا غلبہ تھا جس سے ضعفِ بصارت ہو گیا تھا، کسی نے کہا کہ آپ فرا آنسو روکیں تو میں آپ کے استعمال کے لئے سرمہ بنا دوں، فرمایا کہ آنکھوں پر میرا قابو نہیں، ان کی عبادت و ریاضت کو دیکھ کر شیخ کبیرؒ کی یاد تازہ ہوتی تھی، نہایت جید الاستعداد اور فاضلِ اجل تھے، مدت تک دہلی کی مشہور درسگاہ مدرسۂ معزیہ میں درس دیا، تکمیلِ علم کیلئے بخارا تک کا سفر کیا، فارسی و عربی میں بے تکلف و آبدار شعر کہتے تھے، مضامینِ علمیہ کو نظم کرنے کی خاص قدرت تھی، صرف کے مسائل میں ایک منظوم رسالہ ہے۔ خواجہ محمد امام اور خواجہ محمد موسیٰ جو حضرت خواجہ نظام الدین اولیاء کے امامِ نماز تھے، انھیں کے صاحبزادے تھے، ۱۶ جمادی الاخریٰ سنہ ۷۱۹ھ میں وفات پائی[1]

شیخ عارف کو حضرت خواجہؒ نے خلافت دے کر سیوستان روانہ کیا تھا، انھوں نے حضرت خواجہؒ کو خلافت نامہ واپس کیا اور عرض کیا کہ یہ کام بہت نازک ہے، یہ مسکین اس کارِ عظیم کا اہل نہیں، مجھے آپ کی دعا اور عنایت کافی ہے، پھر آپ کی اجازت سے حج بیت اللہ کو گئے اور واپس نہ آئے[2]۔

شیخ کبیر علاء الدین علی بن احمد صابر نسباً اسرائیلی تھے، ترک و تجرید اور زہد و مجاہدہ میں ان کی نظیر نہ تھی، پیران کلیر میں عرصہ تک عبادات و افادہ میں مشغول رہ کر ۱۳ ربیع الاول سنہ ۶۸۹ھ یا سنہ ۶۹۰ھ میں وفات پائی حضرت شیخ شمس الدین ترک پانی پتی آپ ہی کے خلیفہ تھے[3]۔

---

[1] نزہۃ الخواطر ج ۱   [2] سیر الاولیاء ص ۱۸۴ و ص ۱۸۵

[3] نزہۃ الخواطر ج ۱۔ یہ عجیب بات ہے کہ شیخ علی احمد صابر کے حالات سے معاصر تذکرے اور تاریخیں خاموش ہیں۔ سیر الاولیاء میں امیر خورد نے ان کا تذکرہ ضمناً اس طرح کیا ہے کہ شیخ عبد الحق محدث دہلوی (بقیہ ص ۴۸ پر)

سلطان المشائخ حضرت شیخ نظام الدینؒ پہلے چشتی شیخ ہیں جن کے اثرات ان کی زندگی میں سارے ہندوستان میں پھیلے اور جنھوں نے ہندوستان کے اسلامی معاشرہ اور ہر طبقہ کو متأثر کیا اور حکومت سے لیکر عوام وغربا تک کو اپنے حلقۂ عقیدت واثر میں لیا، اسی کے ساتھ وہ

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۴۷) ـــــــــــــــ کو شبہ ہے کہ یہ حضرت شیخ علی احمد صابر پیران کلیری کا تذکرہ ہے یا اسی نام کے کسی اور بزرگ کا، امیر خورد لکھتے ہیں :۔

بندہ از خدمت والد خود رحمۃ اللہ علیہ سماع	بندہ نے اپنے والد رحمۃ اللہ علیہ سے سنا ہے
دارد کہ درویشے بود بزرگ صاحب نعمت کہ	کہ ایک عالی مرتبہ درویش تھے جن کو شیخ علی صابر
اورا شیخ علی صابر گفتندے و در درویشی قدمے	کہتے تھے، درویشی میں راسخ اور صاحب
ثابت و نفسے گیرا داشت و ساکن قصبۂ دیگری بودے	نسبت وتاثیر قصبہ دیگری کے رہنے والے تھے۔
و پیوند بخدمت شیخ شیوخ العالم فرید الحق	حضرت شیخ فرید الدینؒ سے نسبت ارادت
والدین قدس سرہ العزیز داشت او را از حضرت	رکھتے تھے اور آپ نے انکو اجازت بیعت
شیخ شیوخ العالم اجازت بیعت بود (ص۱۸۵)	دے رکھی تھی۔

معاصر یا زمانہ قریب کے تذکروں میں خواہ ان کا تذکرہ بالکل نہ ہو یا سرسری ومختصر ہو ان کے سلسلہ کے مشائخ کبار کے حالات ان کا علو شان ان کے علوم ومقامات، اہل بصیرت کا اس سلسلہ کی مقبولیت پر اتفاق اور عالم میں اسکے فیوض وبرکات وآثار شاہد ہیں کہ بانیٔ سلسلہ نہایت عالی مقام، عالی نسبت اور عند اللہ مقبول تھے، اس سے بڑھ کر خود تاریخ کی شہادت بھی نہیں ہو سکتی اور نہ یہ تاریخ کی پہلی غفلت اور چوک ہے، زمانۂ سابق میں بھی بہت سی باکمال شخصیتیں تاریخ کی تیز نگاہوں سے بچ گئیں اور نادیہ گمنام ہیں رہیں۔

اس سلسلہ (صابریہ چشتیہ) میں بڑے نامور مشائخ عارف ومحقق ومصلح پیدا ہوئے مثلاً حضرت مخدوم احمد عبدالحق ردولوی

ہندوستان کے پہلے شیخ طریقت اور مرشد روحانی ہیں جن کے حالات سب سے زیادہ تفصیل و وضاحت اور استناد کے ساتھ ملتے ہیں۔ ان کے مشائخ نے نہ کوئی تصنیف کی نہ ان کے خلفاء نے اپنے شیوخ کے ملفوظات و حالات جمع کئے، نہ انھوں نے اپنے شیخ کے ملفوظات و حالات کا کوئی مجموعہ تیار کیا[۱]، لیکن ان کے ملفوظات و حالات جمع کرنے کا

(ص۴۷ کا بقیہ حاشیہ) جن کی ذات با برکات کو بعض اہل نظر نے نویں صدی کا مجدد بھی شمار کیا ہے حضرت شیخ عبدالقدوس گنگوہیؒ، حضرت شیخ محب اللہ الہ آبادیؒ، شیخ العرب والعجم حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکیؒ، قطب الارشاد حضرت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ، قاسم العلوم حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ (بانی دارالعلوم دیوبند) حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانویؒ، حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسن دیوبندیؒ، حضرت مولانا خلیل احمد سہارنپوریؒ، حضرت شاہ عبدالرحیم رائے پوریؒ، حضرت مولانا حسین احمد مدنیؒ، حضرت مولانا محمد الیاس کاندھلویؒ، شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد زکریا کاندھلویؒ، ہمارے اس دور میں اللہ تعالیٰ نے اسی سلسلہ سے حفاظت و تجدید دین کا عالمگیر کام لیا، اور اس وقت سب سے زیادہ وسیع متحرک و فعال یہی سلسلہ ہے، دارالعلوم دیوبند و مظاہر العلوم کی تعلیمی خدمت اور مولانا تھانوی کی تصنیفات و مواعظ سے اور پھر آخر میں مولانا محمد الیاسؒ کی تحریک دعوت و تبلیغ سے اس سلسلہ کے فیوض عالمگیر ہوئے، پروفیسر خلیق احمد نظامی نے تاریخ چشت مشائخ میں صحیح لکھا ہے کہ:

"گزشتہ صدی میں کسی بزرگ نے چشتیہ سلسلہ کے اصلاحی اصولوں کو اس طرح جذب نہیں کیا جس طرح مولانا محمد الیاسؒ نے کیا تھا" (ص۲۳۴)

آج بھی رائے پور میں حضرت مولانا عبدالقادر صاحب کی خانقاہ سلسلہ چشتیہ کی قدیم خانقاہوں کی یکسوئی، سرگرمی، یادِ حق کی مشغولی اور درد و محبت کی یاد تازہ کرتی ہے (افسوس ہے کہ حضرت کی وفات کے بعد یہ خانقاہ بھی گزشتہ خانقاہوں کی فہرست میں شامل ہو گئی، کل شیئ ھالک الا وجھہ۔ ع

عالم نشود ویراں تا میکدہ آباد است

[۱] حضرت خواجہ نصیر الدین چراغ دہلیؒ کے ملفوظات خیر المجالس میں ہے۔ فرمایا میرے حضرت (بقیہ ص۵۰ پر)

خاص اہتمام کیا گیا۔ اس سلسلہ میں دو بڑے قیمتی و مستند ماخذ ہیں، ایک فوائد الفواد جو امیر حسن علا سجزی (م ۷۳۷ھ) کی تالیف ہے جسے حضرت خواجہ نے اسکو لفظاً لفظاً سنا اور تحسین فرمائی اور حضرت خواجہؒ کے اصحاب و خدام نے اسکی صحت کو عام طور پر تسلیم کیا اور حرز جاں بنایا۔ دوسرا سیر الاولیاء جو امیر خورد سید محمد مبارک علوی کرمانی (م ۷۷۰ھ) کی تصنیف ہے، امیر خورد خورد سالگی میں حضرت خواجہ سے بیعت ہوئے اور ان کی صحبت کی سعادت حاصل کی، پھر حضرت شیخ نصیر الدین چراغ دہلی سے رجوع کیا۔ ان کے والد نور الدین مبارک بن سید محمد کرمانی (م ۷۴۹ھ) حضرت خواجہ نظام الدینؒ کے رفیق قدیم اور مخلص و بے تکلف دوستوں میں تھے، اس کتاب میں زیادہ تر انہی روایت ہے۔ اپنے شیخ حضرت خواجہ نصیر الدین چراغ دہلی سے بھی سنی ہوئی بہت سی باتیں درج ہیں، اپنے چشم دید حالات اور سنے ہوئے ملفوظات بھی ہیں، حضرت خواجہؒ کے حالات و سوانح اور ان کے خلفاء کبار کے حالات و کمالات کا یہ مفصل و مستند ذخیرہ ہے۔ ان دو کتابوں کی وجہ سے خاص طور پر حضرت خواجہؒ کے حالات، ذوق، رجحانِ طبع، تعلیم و تربیت کے طریقے، اصلاحی و تبلیغی کوشش، ان کے فیوض و برکات اور اثرات محفوظ ہو گئے اور تاریخ کی روشنی اور گرفت میں آگئے۔

(ص ۴۹ کا بقیہ حاشیہ)

پیر و مرشد جناب سلطان الاولیاء قدس اللہ سرہ العزیز فرماتے تھے: میں نے کوئی کتاب تصنیف نہیں کی اس واسطے کہ حضرت شیخ الاسلام حضرت فرید الدین اور شیخ الاسلام حضرت مولانا قطب الدین رحمۃ اللہ علیہ اور باقی خواجگان چشت وغیرہ مشائخ جو داخل ہمارے شجرے میں ہیں کسی نے کوئی تصنیف نہیں کی۔

(سراج المجالس ترجمہ خیر المجالس)

[1] اس میں ۳ر شعبان سے ۹ر شعبان تک کی مختلف مجالس کے ملفوظات ہیں۔

اسی شخصیت کی عظمت و تاثیر اور حالات و مآخذ کی سہولت کی وجہ سے دعوت و عزیمت کی ایک مرکزی اور عہد آفریں شخصیت کی حیثیت سے ان کی ذات کو انتخاب کیا گیا، کتاب کے آئندہ ابواب اسی اجمال کی تفصیل کے لئے ہیں۔

باب دوم ۲

سُلطان المشائخ حضرت خواجہ نظام الدینؒ

حالات وکمالات

نام ونسب محمد نام نظام الدین لقب وعرف عام، والد ماجد کا نام احمد بن علی سادات حسینی میں سے تھے، ناناہال بھی سادات میں تھا، دادا خواجہ علی اور نانا خواجہ عرب دونوں ہم جد تھے اور دونوں بخارا سے آکر کچھ مدت لاہور رہے، وہاں سے بدایوں آئے۔

۶۳۶ھ میں بدایوں میں آپ کی ولادت[1] ہوئی، بدایوں (قدیم بداؤں) شرفاء وسادات کا قدیم مسکن تھا، بہت سے سادات کرام اور مشائخ عظام نے ایران وخراسان سے آکر یہاں سکونت اختیار کرلی تھی۔[2]

---

[1] صاحب سیر الاولیاء نے آپ کی عمر شریف کا حساب لگا کر اس سنہ کی تعیین کی ہے۔ ۱۲

[2] بداؤں روہیل کھنڈ میں دریائے سوتھ کے بائیں کنارے پر واقع ہے۔ اُس زمانہ میں بہت آباد (بقیہ ص۵۳ پر)

ابتدائی تعلیم و تربیت

حضرت نظام الدین پانچ سال کے تھے کہ باپ کا سایہ سر سے اٹھ گیا۔ والدہ ماجدہ نے جو اپنے وقت کی ایک بڑی صالحہ اور باخدا خاتون تھیں، اس دُرِّ یتیم کی پرورش اور دینی و اخلاقی تربیت کا مردانہ ہمت اور پدرانہ شفقت کے ساتھ اہتمام کیا۔ کتابیں پڑھنے کے قابل ہوئے تو مولانا علاء الدین اصولی[1] کے سامنے زانوئے تلمذ تہہ کیا اور فقہ کی ابتدائی کتابوں تک ان سے تعلیم حاصل کی، قدوری ختم کی تو مولانا علاء الدین نے فرمایا کہ مولانا نظام الدین اب دستارِ فضیلت باندھو۔ والدہ صاحبہ سے آکر کہا کہ استاد نے دستار بندی کا حکم فرمایا ہے، میں دستار کہاں سے لاؤں؟ والدہ صاحبہ نے کہا: بابا خاطر جمع رکھو۔ میں اس کی تدبیر کروں گی چنانچہ روئی

(صفحہ ۵۲ کا بقیہ حاشیہ) اور پُر رونق مقام تھا اور دہلی کے لئے سرحدی شہر کا کام دیتا تھا، چنانچہ پرانی دہلی کے ایک دروازہ کا نام دروازۂ بداؤں تھا۔ (نزہتہ الخواطر)۔

قلعۂ بداؤں کے موجودہ کھنڈر اس کی عظمت اور استحکام کا پتہ دے رہے ہیں ۱۱۹۶ء میں سلطان محمد غوری کے جرنیل قطب الدین ایبک نے اسے فتح کیا اور اپنے غلام ملک شمس الدین کو امیر بداؤں مقرر کیا۔ التمش نے یہاں ۱۲۲۲ء میں ایک خوبصورت اور وسیع مسجد تعمیر کرائی جو اب بھی موجود ہے۔ اس مقام کی اہمیت کا مزید ثبوت درکار ہو تو وہ اس سے ملتا ہے کہ دہلی کے دو بادشاہ التمش اور اس کا بیٹا رکن الدین فیروز شاہ دونوں تخت نشینی سے پہلے بداؤں کے گورنر رہ چکے تھے۔ (انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا بذیل بداؤں) منقول از مقالاتِ دینی و علمی، مولوی محمد شفیع صاحب ایم، اے۔ (جلد اول ص ۲۴۱) ۱۲۔

[1] مولانا علاء الدین علی الاصولی شیخ جلال الدین تبریزی کے مریدین میں تھے اور اپنے شیخ کے نقش قدم پر اخفاء حال کا بڑا اہتمام تھا، صبر و رضا کے ساتھ زندگی گزارتے تھے اور اوقات عزیز کو افادہ و عبادت میں مشغول و معمور رکھتے تھے۔ (نزہتہ الخواطر بحوالہ فوائد الفواد)۔

خرید کر اسکو کتوایا اور بہت جلد پگڑی تیار کر کے دی۔[1] والدہ صاحبہ نے اس تقریب میں علماء و صلحاء وقت کی دعوت کی، خواجہ علی مرید شیخ جلال الدین تبریزیؒ نے ایک پیچ باندھا اور حاضرین مجلس نے علم نافع اور تکمیل کی دعا کی۔[2]

فقر و فاقہ اور والدہ کی تربیت

اس چھوٹے سے شریف گھرانے میں جو سایۂ پدری سے محروم تھا فقر و فاقہ کوئی نئی بات نہ تھی حضرت خواجہ فرماتے ہیں کہ والدہ کا معمول تھا کہ جس روز ہمارے گھر کچھ پکانے کو نہ ہوتا تو فرماتیں کہ آج ہم سب خدا کے مہمان ہیں۔ مجھے یہ بات سن کر بڑا ذوق آتا۔ ایک دن کوئی خدا کا بندہ ایک تنکہ غلہ گھر میں دے گیا، چند دن متواتر اس سے روٹی ملتی رہی، میں تنگ آگیا اور اس آرزو میں رہا کہ والدہ صاحبہ کب یہ فرمائیں گی کہ ہم سب خدا کے مہمان ہیں، آخر وہ غلہ ختم ہوا اور والدہ صاحبہ نے فرمایا کہ آج ہم خدا کے مہمان ہیں، یہ سنکر مجھے ایسا ذوق اور ایسا سرور حاصل ہوا کہ بیان میں نہیں آسکتا۔[3]

شیخ کبیر سے مناسبت اور قلبی کشش

حضرت خواجہؒ فرماتے ہیں کہ میں چھوٹا تھا۔ بارہ سال کا رہا ہوں یا کچھ کم زیادہ، اس وقت میں لغت پڑھتا تھا۔ ایک شخص جو ابوبکر خراطہ کے نام سے مشہور تھا، ابوبکر قوال بھی کہتے تھے میرے استاد کے پاس آیا، وہ ملتان ہو کر آرہا تھا، اس نے بیان کیا کہ میں حضرت شیخ بہاء الدین زکریا ملتانی کے پاس سے آرہا ہوں، اس نے ان کے فضائل و مناقب بیان کرنے شروع کئے کہ وہاں کے لوگ ایسے ذاکر و شاغل ہیں اور اوراد و نوافل کا ایسا انہماک ہے اور ذکر کی ایسی فضا ہے کہ مائیں اور لونڈیاں بھی چکی چلاتے وقت ذکر میں مشغول رہتی ہیں، اسی طرح کی اور بہت سی خصوصیتیں بیان کرتا رہا، مگر کوئی چیز

---

[1] سراج المجالس ترجمہ خیر المجالس صفحہ ۱۴۵ [2] ایضاً صفحہ ۹۶ [3] سیر الاولیاء (صفحہ ۱۱۳)

[4] شیخ کبیر سے مراد اس کتاب میں ہر جگہ شیخ الاسلام حضرت خواجہ فرید الدین گنج شکرؒ کی ذات ہے۔ ۱۲

میرے دل میں نہ جمی، اسکے بعد اس نے بیان کیا کہ وہاں سے اجودھن آیا، وہاں میں نے ایسا بادشاہ دین دیکھا اور اس نے شیخ الاسلام شیخ فریدالدینؒ کا تذکرہ کیا، یہ سنتے ہی میرے دل کو بے اختیار کشش ہوئی، اور ان کی محبت و ارادت میرے دل میں ایسی بیٹھ گئی کہ مجھے ان کا نام لینے میں مزا آنے لگا، اور میں ہر نماز کے بعد مزے لیکر ان کے نام کی رٹ لگا تا۔[۱]

دہلی کا سفر

سولہ سال کی عمر میں حضرت خواجہ بدایوں سے دہلی آگئے۔[۲]

دہلی میں طالب علمی

آپ نے دہلی آکر طالب علمی کا سلسلہ جاری رکھا۔ یہ مدت تین چار سال کی تھی، دہلی میں اس وقت بڑے نامور اساتذہ جمع تھے۔ یہ سلطان ناصرالدین محمود کا عہدِ حکومت اور غیاث الدین بلبن کا عہدِ وزارت تھا اور مولانا شمس الدین خوارزمی جو کہ مستوفی الممالک ہو کر شمس الملک کے لقب سے مشہور روزگار ہوئے استاذ الاساتذہ کی حیثیت رکھتے تھے، سلطنت کے ایک اہم ترین عہدے کی ذمہ داری اور مشغولیت کے ساتھ اس زمانے کے علماء کی طرح درس و تدریس کا مشغلہ بھی جاری تھا،

---

۱ سیر الاولیاء (صـ۱۰۱) فوائد الفواد (صـ۱۴۹)

۲ یہ سیر الاولیاء کا بیان ہے اور یہی صحیح معلوم ہوتا ہے، اس لئے کہ تین چار سال دہلی میں طالب علمی کرنے کے بعد خواجہ صاحب اجودھن گئے اور حضرت خواجہ فریدالدین سے بیعت کی، بیعت کے وقت آپنے اپنی عمر بیس سال بیان کی ہے (سیر الاولیاء صـ۱۰۱) اس لئے سیر العارفین کا یہ بیان صحیح نہیں ہے کہ آپ پچیس سال کی عمر میں بدایوں سے لاہور تشریف لے گئے۔

۳ ملاحظہ ہو تاریخ فیروزشاہی از قاضی ضیاء الدین برنی (صـ۱۱۲) - ۱۲

۴ یہ صدر محاسب یا اکاؤنٹنٹ جنرل کا عہدہ تھا اور بہت بڑے علماء کو دیا جاتا تھا۔

حضرت خواجہؒ ان کے حلقۂ درس میں شامل ہوئے۔

اُستاد کے محبوب مولانا شمس الدین کو حضرتؒ سے تعلق خاص تھا، اور وہ ان کے محبوب ترین شاگرد تھے، آپ جس حجرۂ خاص میں مطالعہ فرماتے تھے اس میں کسی شاگرد کو آنے کی اجازت نہیں تھی، مگر حضرت خواجہؒ اور ان کے دو رفیق مولانا قطب الدین ناقلہ اور مولانا برہان الدین باقی اس قانون سے مستثنیٰ تھے۔[۱]

خواجہ شمس الملک کی عادت تھی کہ اگر کوئی شاگرد ناغہ کر دیتا تھا یا دیر سے آتا تھا تو فرماتے تھے کہ آخر مجھ سے کیا قصور ہوا تھا کہ آپ نہیں آئے، حضرت خواجہ نے خود یہ قصہ بیان کرتے ہوئے تبسم فرمایا اور کہا کہ اگر کسی سے مزاح فرماتے تو کہتے کہ مجھ سے کیا قصور ہوا کہ آپ نہیں آتے تا کہ میں پھر وہی قصور کروں لیکن مجھ سے ناغہ ہو جاتا یا دیر میں جاتا تو میرے جی میں آتا کہ آج مجھ سے بھی یہی فرمائیں گے لیکن آپ مجھے دیکھ کر یہ شعر پڑھتے ؎

آخر کم از آنکہ گاہ گاہے　　آئی و بما کنی نگاہے

اس کا تذکرہ کرتے ہوئے خواجہ صاحب آبدیدہ ہو گئے اور سب سننے والوں پر رقت طاری ہو گئی اور یہ بھی فرمایا کہ مجھے اپنے حجرے میں اپنے ساتھ بٹھاتے، میں ہزار معذرت کرتا مگر منظور نہ فرماتے۔[۲]

علمی امتیاز و تفوق حضرت خواجہ نے اپنی ذہانت، مناسبت خداداد اور محنت سے اپنے رفقاء کے درمیان علمی امتیاز اور تفوق پیدا کر لیا۔ علمی مباحثوں اور سوال و جواب میں (جو قدیم نظام تعلیم کا ایک اہم جزاور علمی استعداد و ذکاوت کی علامت سمجھی جاتی تھی) آپ کی طلاقت لسانی اور قوت استدلال کا ایسا اظہار ہوا کہ آپ جس علمی مسئلہ پر بحث کرتے طلبہ لاجواب ہو جاتے

---

[۱] سیر العارفین - ۱۲　　[۲] فوائد الفواد ص ۶۸

اور محفل پر آپ کے علم وذہانت کا سکہ بیٹھ جاتا، چنانچہ آپ کے ساتھی آپ کو مولانا نظام بحاث اور مولانا نظام الدین محفل شکن کے لقب سے پکارنے لگے[1]

حفظِ مقامات اور اس کا کفارہ

اس زمانہ کے نصاب میں مقامات حریری داخل درس تھی عام طور پر طلبہ سمجھ لینے اور اس کے مشکل الفاظ ومفردات کے یاد کر لینے پر اکتفا کرتے تھے، لیکن حضرت خواجہؒ نے اپنے علمی ذوق اور بلند ہمتی سے اس کے چالیس مقامے حفظ کئے، بعد میں اس کے کفارے میں حدیث کی مشہور کتاب "مشارق الانوار" حفظ کی[2]

حدیث کی اجازت

آپ نے حدیث اپنے زمانہ کے مشہور محدث شیخ محمد المالکی مشہور کمال الدین زاہد (م ۶۸۴ھ) سے پڑھی جو مصنف مشارق الانوار علامہ حسن ابن محمد الصغانی کے براہ راست شاگرد تھے۔ فقہ میں ان کو بیک واسطہ صاحب ہدایہ علامہ برہان الدین المرغینانی سے تلمذ تھا، آپ نے ان سے "مشارق الانوار" کا درس لیا اور حدیث کی اجازت حاصل کی[3]

---

[1] سیر الاولیاء (ص ۱۰۱)　　[2] ایضاً

[3] سیر الاولیاء (ص ۱۰۵) اجازت نامہ جو عربی میں ہے اور سیر الاولیاء میں بلفظہ منقول ہے، ۲۲ ربیع الاول ۶۷۹ھ تاریخ درج ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ یہ اجازت نامہ آپ کو جب حاصل ہوا ہے اس وقت آپ کی عمر (سنہ ولادت ۶۳۶ھ) کے حساب سے ۴۳ سال تھی اور یہ واقعہ شیخ کبیر کی وفات (۶۶۴ھ) کے تیرہ سال کے بعد اور اس وقت کا ہے جب آپ مسند ارشاد وتربیت پر متمکن تھے اور آپ کی شہرت دور دور پہونچ چکی تھی۔ اجازت نامہ میں آپ کے لئے "الشیخ الامام العالم الناسک السالک اور مقبول المشائخ الکبار منظور العلماء الاخیار الابرار" کے الفاظ ہیں اس عمر وشہرت میں حدیث کی تکمیل اور حصول اجازت سے آپ کے علمی ذوق اور علو ہمت کا اندازہ ہوتا ہے۔

قلب کی بیچینی اور انجذاب الی اللہ حضرت خواجہ اگرچہ پورے انہماک کے ساتھ طلب علم میں مشغول تھے اور ان کی بلند ہمتی اور عزیمت اس سلسلہ میں کسی کسلمندی اور تساہل کی روادار نہ تھی لیکن دل کسی اور چیز کو ڈھونڈھتا تھا، اس بحث و مباحثہ اور علوم ظاہری کی فضا میں ان کی طبیعت متوحش ہو جاتی تھی، ایک دن فرمایا کہ ایام جوانی میں کہ جب لوگوں کیساتھ نشست و برخاست رکھتا تھا ہمیشہ دل پر گرانی رہتی تھی اور دل ہی دل میں کہتا تھا کہ میں کب ان لوگوں کے بیچ میں سے چلا جاؤں گا۔ اگرچہ یہ سب پڑھنے پڑھانے والے لوگ تھے اور ہمیشہ علمی بحث و مباحثہ میں مشغول رہتے تھے، لیکن اکثر میری طبیعت متوحش ہو جاتی اور میں دوستوں سے کہتا کہ میں ہمیشہ تمہارے درمیان نہیں رہوں گا، میں کچھ دن تمہارے یہاں مہمان ہوں، امیر حسن علا سجزی فرماتے ہیں کہ میں نے عرض کیا کہ یہ حضرت شیخ الاسلام فریدالدینؒ کی خدمت میں حاضر ہونے سے پہلے کا قصہ ہے۔ فرمایا: "ہاں!"

والدہ صاحبہ کا انتقال دہلی کے قیام میں حضرت خواجہ کی والدہ ماجدہ نے انتقال فرمایا۔

والدہ کی یاد ایک روز عرصہ کے بعد حضرت خواجہ نے اپنی والدہ کے انتقال کا ذکر کیا، ذکر کرتے ہوئے اتنا گریہ طاری ہوا کہ جو کچھ فرماتے تھے پورے طور پر سننے میں نہیں آتا تھا۔ اسی حالت میں یہ شعر پڑھا ؎

افسوس دلم کہ ہیچ تدبیر نکرد بشہائے وصال را بہ زنجیر نکرد[1]

والدہ کا یقین و توکل حضرت خواجہؒ فرماتے ہیں:- ایک دن نیا چاند دیکھ کر حاضر ہوا اور قدمبوسی کی اور نئے چاند کی مبارکباد معمول کے مطابق پیش کی، فرمایا کہ ۔ آئندہ مہینہ کے چاند کے موقع پر کس کی قدمبوسی کرو گے؟ میں سمجھ گیا کہ انتقال کا وقت قریب ہے، میرا دل

---

[1] فوائد الفواد (ص۲۴)

پھر آیا اور میں رونے لگا۔ میں نے کہا کہ:۔ مخدومہ! مجھ غریب کو آپ کس کے سپرد کرتی ہیں؟ فرمایا:۔ اس کا کل جواب دونگی۔ میں نے اپنے دل میں کہا کہ اس وقت کیوں نہیں جواب دیتیں۔ یہ بھی فرمایا کہ: جاؤ آج رات شیخ نجیب الدین کے یہاں رہو۔ ان کے فرمانے کے مطابق میں وہاں گیا۔ آخر شب میں صبح کے قریب خادمہ دوڑتی ہوئی آئی کہ بی بی تم کو بلا رہی ہیں۔ میں ڈرا اور میں نے پوچھا خیریت ہے؟ کہا ہاں، جب میں حاضر خدمت ہوا تو فرمایا کہ: کل تم نے مجھ سے ایک بات پوچھی تھی۔ میں نے اس کا جواب دینے کا وعدہ کیا تھا اور میں اس کا جواب دیتی ہوں غور سے سنو! فرمایا تمہارا دایاں ہاتھ کون سا ہے، میں نے ہاتھ سامنے کر دیا میرا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیا اور فرمایا: خدایا! اس کو تیرے سپرد کرتی ہوں۔ یہ کہا اور جان بحق تسلیم ہوئیں، میں نے اس پر خدا کا بہت شکر کیا اور اپنے دل میں کہا کہ اگر والدہ سونے اور موتیوں سے بھرا ہوا ایک گھر چھوڑ کر جاتیں تو مجھے اتنی خوشی نہ ہوتی[۱]

ایک تمنائے خام

اس وقت دار الحکومت دہلی کی پوری فضا خاص طور پر طلبہ اور علماء کے حلقے قضا وافتاء کے تذکروں، ان منصبوں پر علماء کی تقرری اور قاضیوں اور مفتیوں کے جاہ و جلال اور دولت و ثروت کے قصّوں سے معمور و گرم تھے۔ حضرت خواجہؒ اپنی فطری سعادت اور اعلیٰ روحانی استعداد کے باوجود اس وقت کم سن اور نوجوان تھے۔ علمی امتیاز اور معاشی تنگ حالی کے ساتھ اگر ان کے دل میں بھی کسی جاہ و منصب کا ولولہ اور امنگ پیدا ہوتی تو فطرت انسانی کے کچھ خلاف نہیں۔ آپ نے ایک دن شیخ نجیب متوکّل سے عرض کیا کہ دعا کیجئے کہ میں قاضی ہو جاوں۔ شیخ نجیب الدین خاموش رہے اور کچھ نہ فرمایا۔ حضرت خواجہ سمجھے کہ انھوں نے سنا نہیں۔ دوبارہ ذرا بلند آواز سے فرمایا کہ:۔ دعا کی درخواست کرتا ہوں کہ کہیں کا قاضی ہو جاؤں۔ شیخ نے فرمایا۔ قاضی مت ہو کچھ اور چیز ہو۔[۲]

---

[۱] سیر الاولیاء (ص ۱۵۱)

[۲] فوائد الفواد

اجودھن کی پہلی حاضری

حضرت خواجہؒ اجودھن حاضر ہونے سے پہلے دہلی میں شیخ کبیر کے برادرِ حقیقی خواجہ نجیب الدین متوکل سے متعارف ہو چکے تھے اور کچھ عرصہ ان کے ساتھ رہنا بھی ہوا تھا، ان کی صحبت اور گفتگو نے شیخ کبیر کے ساتھ محبت کی اس چنگاری میں جو کمسنی اور بدایوں کے قیام ہی سے طبیعت میں ودیعت تھی، اشتعال و حرکت پیدا کر دی آپ نے شیخ کبیر کی خدمت میں حاضری کا عزم کر لیا اور بالآخر آپ انکی خدمت میں حاضر ہو گئے۔

طالب یا مطلوب؟

اپنی اس ملاقات اور پہلی حاضری کا حال خود ہی بیان فرمایا، ارشاد ہوا کہ میں جب شیخ کبیر کی خدمت میں حاضر ہوا تو آپ نے مجھے دیکھتے ہی یہ شعر پڑھا۔ ؎

اے آتشِ فراقت دلہا کباب کردہ　　سیلاب اشتیاقت جانہا خراب کردہ

میں نے چاہا کہ پائے بوسی کے اشتیاق کو جو عرصۂ دراز سے بےچین کئے ہوئے تھا ذرا تفصیل سے بیان کروں، لیکن شیخ کے رعب و جلال سے زبان اور قوتِ گویائی نے ساتھ نہ دیا، اتنا ہی کہہ سکا کہ قدمبوسی کا سخت اشتیاق تھا۔ شیخ نے جب دیکھا کہ بس اتنا مرعوب ہوں تو فرمایا: "لِکُلِّ دَاخِلٍ دَهْشَةٌ" ہر نئے آنے والے پر رعب ہوتا ہی ہے۔[1]

مرید کی خاطر

شیخ کبیرؒ نے حضرت خواجہ کی بڑی خاطر فرمائی۔ ارشاد ہوا کہ اس پردیسی طالب علم کے لئے جماعت خانہ میں چارپائی بچھائی جائے حضرت خواجہ فرماتے ہیں کہ جب چارپائی بچھ گئی تو میں نے اپنے دل میں کہا کہ میں ہرگز اس چارپائی پر آرام نہ کروں گا، کتنے معزز مسافر کتنے حافظ کلام اللہ کتنے عاشقانِ خدا زمین پر

---

[1] فوائد الفواد (ص ۳۱)

سورہے ہیں، ہیں چارپائی پر کیسے لیٹوں ؟ یہ خبر منتظمِ خانقاہ مولانا بدرالدین اسحٰق کو پہنچی، انھوں نے فرمایا کہ ان سے کہہ دو کہ تمھیں اپنے دل کی کرنا ہے یا شیخ کے ارشاد کی تعمیل۔ میں نے عرض کیا کہ شیخ کے ارشاد کی تعمیل کروں گا، فرمایا کہ جاؤ چارپائی پر سو رہو۔[۱]

بیعت اسی حاضری میں کسی وقت حضرت خواجہ جس ارادے سے آئے تھے، اس کی تکمیل کی اور شیخ کبیر سے بیعت ہو گئے، اس وقت آپ کی عمر بیس سال کی تھی۔[۲]

سلسلۂ تعلیم کا اجراء یا انقطاع ؟ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ حضرت خواجہ کی کچھ کتابیں ابھی باقی تھیں، جذب و شوق کا تقاضا تھا کہ اب اس سلسلہ کو ختم کیا جائے اور علمِ حقیقی اور معرفتِ حقیقی میں صرف کیا جائے جو پیدائش کا اصل مقصد اور یہاں کی حاضری کی غرض و غایت ہے۔ گویا سعدیؒ کا یہ شعر حسب حال تھا۔

سعدی بشوے لوح دل از نقش غیر دوست

علمے کہ رہ بحق ننماید جہالت است

تعلیم و تعلم کا طول طویل سلسلہ پہلے بھی قلب حساس اور روح بیدار پر بار تھا لیکن اسکو ایک ضرورت سمجھ کر اور اسلئے بھی کہ کوئی دوسرا راستہ سامنے نہ تھا، اختیار کیا تھا، اب جبکہ یقین کا سررشتہ اور علمِ حقیقی کا سرچشمہ مل گیا اس سلسلۂ دراز کا جاری رکھنا طبیعت پر سخت بار تھا اور زبانِ حال کہہ رہی تھی ؎

میری نظر میں ہیں تمام میرے گذشتہ روز و شب — مجھ کو خبر نہ تھی کہ ہے علم، نخیل بے رطب

لیکن جس شیخ کامل سے تعلق پیدا کر لیا تھا وہ جذبِ کامل کے ساتھ خود بھی کامل العلم تھا اور طریقت کیلئے بقدر ضرورت علمِ ظاہر کو ضروری سمجھتا تھا، خود اسکے شیخ نے یہی ہدایت اسکو کی تھی،[۳] پھر مولانا نظام الدین سے ارشاد و تربیت کا جو کام لینا تھا اس کی نازک ذمہ داریوں کو

---

[۱] سیر الاولیاء ص۱۰۱ [۲] ایضاً ص۱۰۶ [۳] فوائد الفواد ص۵۵

ادا کرنے کے لئے علم راسخ کی ضرورت تھی، یوں بھی صاحب نظر شیخ طالب کی مناسبت کو دیکھتے ہیں حضرت خواجہ نے بیعت کے بعد فرمایا کہ میں تعلیم ختم کردوں اور اوراد و نوافل میں مشغول ہو جاؤں؟ شیخ کبیرؒ نے فرمایا کہ میں کسی کو تعلیم سے نہیں چھڑاتا، وہ بھی کرو یہ بھی کرو، دیکھو کیا چیز غالب آتی ہے؟ یہ بھی فرمایا کہ: درویش کو تھوڑا علم بھی چاہیئے[1]۔

شیخ کبیرؒ سے درس شیخ کبیر کی یہ خصوصی عنایات اور اختصاص تھا کہ آپ نے حضرتِ خواجہ کو بنفس نفیس بعض چیزیں پڑھانا شروع کیں۔ فرمایا کہ: نظام تم کو کچھ کتابیں مجھ سے بھی پڑھنی ہوں گی، چنانچہ حضرت شیخ الشیوخ شہاب الدین سہروردیؒ کی تصوف کی مشہور کتاب عوارف المعارف کا درس شروع کیا اور چھ باب اس کے پڑھائے، اسکے علاوہ تمہید ابو شکور سالمی بھی اوّل سے آخر تک سبقاً سبقاً پڑھائی، مزید برآں تجوید کی تعلیم بھی دی، اور چھ پارے کامل تجوید کیساتھ پڑھائے[2]۔

درس کی لذّت حضرت خواجہ زمانہ گذرجانے کے بعد بھی اس درس کی لذّت کو یاد فرماتے رہے، فرماتے تھے کہ عوارف کے درس میں جو حقائق اور نکات حضرتؒ کی زبان سے سنے وہ پھر کبھی سننے میں نہ آئیں گے، بیان کی تاثیر کا یہ عالم تھا کہ جب حضرت تقریر فرماتے تھے تو یہ آرزو ہوتی تھی کہ اگر اسی حالت میں موت آجاتی تو بڑا اچھا ہوتا[3]۔

خود شکنی کی تربیت عوارف کا جو نسخہ درس کے وقت شیخ کبیر کے ہاتھ میں ہوتا تھا وہ کچھ سقیم بھی تھا اور خط بھی باریک تھا، چندی اسباق کے بعد ایک ایسا مقام آیا جہاں شیخ کو کچھ دیر تامل رہا۔ خواجہ نے سادگی اور نوعمری

---

[1] سیر الاولیاء (ص۱۰۱)۔ [2] ایضاً ص۱۰۶ [3] فوائد الفواد ص۷۵

میں کہا کہ میں نے شیخ نجیب الدین متوکل کے پاس ایک اور نسخہ دیکھا تھا، وہ نسخہ صحیح تھا، شیخ نے فرمایا:۔ "درویش را قوتِ تصحیحِ نسخہ سقیم نیست"۔ (فقیر کو سقیم نسخہ کی تصحیح کی طاقت نہیں) بار بار شیخ نے یہ فقرہ دہرایا، خواجہ فرماتے ہیں کہ شروع میں تو مجھے خیال نہ آیا لیکن بار بار شیخ کی زبان سے یہ الفاظ نکلے تو سبق کے دوسرے ساتھی مولانا بدرالدین اسحٰق نے بتلایا کہ خطاب تمہاری طرف ہے، حضرت خواجہ کے ہوش اڑ گئے، فرماتے ہیں کہ "سر برہنہ کردم و در پائے شیخ افتادم" کہتے جاتے تھے نعوذ باللہ میرا اس سے حضرت پر تعریض کرنا ہرگز مقصود نہ تھا، خواجہ فرماتے ہیں میں نے ہر چند معذرت کی، لیکن حضرت کا ملالِ خاطر نہ گیا۔ فرماتے ہیں میں اُٹھ گیا، لیکن سمجھ میں نہ آتا تھا کہ کیا کروں۔ وہ دن جیسا مجھ پر گذرا اور جس حزن و غم کا پہاڑ مجھ پر ٹوٹا شاید کبھی کسی شخص کو ایسا کبھی پیش آیا ہو۔ سراسیمہ و پریشان باہر آیا، ایک مرتبہ تو یہ جی چاہا کہ کنویں میں گر کر جان دے دوں لیکن کچھ سوچ کر باز رہا، اسی پریشانی اور سراسیمگی کی حالت میں جنگل کو نکل گیا اور بہت رو دیا۔

شیخ کبیرؒ کے ایک صاحبزادے شہاب الدین نامی سے خواجہ کا خاص میل ملاپ تھا، انھوں نے شیخ کبیرؒ سے خواجہ کا یہ حال کہا جو مقصود تھا پورا ہو چکا تھا، حاضری کی اجازت مرحمت ہوئی۔ "آمدم سر بر قدم مبارک آوردم" معافی ہوئی۔ دوسرے روز طلب فرمایا اور ارشاد ہوا: یہ سب میں نے تمہاری تکمیل حال کیلئے کیا، پیر مشاطہ مرید ہوتا ہے۔ اس ارشاد کے بعد خلعت و کسوتِ خاص سے سرفراز فرمایا گیا۔[1]

---

[1] فوائد الفواد (ص۲۶) یہاں پر کوئی یہ شبہ نہ کرے کہ شیخ کامل نے تلمیذ رشید کی ایک معمولی سی اطلاع اور معروض پر اتنی بافر وختگی اور آزردگی کا اظہار فرمایا، اسلئے کہ جیسا کہ خود شیخ کے جملہ سے معلوم ہوتا ہے یہ سب آزردگی بہ تکلف اور طالب رشید کی ترقی باطنی اور خود شکنی کے لئے ہے۔ شیخ مجتہد و مخلص اسکے لئے اپنے مختلف ذرائع اختیار کر سکتا ہے اور اس کے لئے کسی تقریب و موقع کا بھی انتخاب کر سکتا ہے، حضرت کعب بن مالک کے ابتلا کے واقعہ سے اور اُنکو اس کوتاہی پر جو ان سے بلا ارادہ سرزد ہوئی تھی جو سرزنش کی گئی اور انکے ساتھ جو رویہ اختیار کیا القیہ ص۲۶ پر)

فیصلہ کن موقع

حضرت خواجہ نظام الدین کے لئے وہ وقت جب شیخ کبیر ان کے صرف اتنا کہہ دینے پر کہ "میں نے شیخ نجیب الدین کے پاس ایک بہتر نسخہ دیکھا ہے"۔ اپنی کبیدگی اور ناپسندیدگی کا اظہار کیا، ایک بڑا نازک وقت تھا' بظاہر اس معصوم جملہ اور اطلاع پر کہ "میں نے آپ ہی کے بھائی کے پاس ایک بہتر نسخہ دیکھا ہے" اتنی ناراضگی اور احتیاج کی ضرورت نہ تھی لیکن شیخ کامل کو ایک ایسے طالب علم سے جس کو اس کا جانشین بننا تھا اور لوگوں کی خود شکنی کی تربیت کرنی تھی، اتنی خرد بینی بھی گوارا نہ تھی، پھر اس مسترشد کو کمال حال کے جس مقام تک پہونچانا تھا' اسکے لئے اضطرار و اضطراب' شکستہ دلی و شکستگی کی خاص کیفیت پیدا کرنی مقصود تھی' لیکن ایک ذہین اور صاحب استعداد نوجوان کیلئے جو اپنی علمی تکمیل کر چکا تھا' یہ وقت بڑا نازک اور فیصلہ کن تھا اور اسی پر اس کے مستقبل کا انحصار تھا، مولانا سید مناظر احسن گیلانی نے صحیح لکھا ہے : —

"صادق و کاذب طلب میں امتیاز کا وقت آگیا۔ دنیا دیکھ رہی تھی' اب مولانا نظام الدین کا فیصلہ کیا ہوتا ہے؟ کیا مولانا بحاث اور محفل شکن ہی کے لقب کو لیکر دنیا سے واپس چلے جائیں گے؛ جیسے لاکھوں ہی بحاث و محفل شکن آئے اور چلے گئے' یا مشائخ کے سلطان کا جو تخت خالی ہے اس پر قدم رکھنے کی ہمت کرتے ہیں' اپنے اپنے حوصلہ کی بات ہوتی ہے' ورنہ سچ یہی ہے۔ ؎

تو ہی ناداں چند کلیوں پر قناعت کر گیا
ورنہ گلشن میں علاج تنگیٔ داماں بھی ہے

چند کلیاں جواب تک ان کے ہاتھ میں تھیں وہ پھینک دی گئیں اور اپنی تنگ دامانی

(ص ۶۳ کا بقیہ حاشیہ) دور کرایا گیا اس سے بھی روشنی اور رہنمائی حاصل کیجا سکتی ہے۔ ۱۲

کے علاج کے آخری فیصلہ پر وہ ڈٹ گئے۔ ظرف کے چھوٹے ہوتے تو کہہ سکتے تھے کہ بھلا میرا کیا قصور، میں نے غلطی ہی کیا کی ہے۔ ایک اچھے نسخہ کا علم تھا، اس کا اظہار کیا گیا تھا پھر اس بات پر بہی کے کیا معنی؛ یہی شوشہ اگر سامنے آجاتا تو ہی لمبی لکیر بن سکتا تھا۔ اتنی لمبی کہ شیطان کی آنت بھی اس سے چھوٹی ہو۔ بڑھاپے میں دماغی توازن صحیح نہیں رہا ہے، مزاج میں تندی اور غصہ سے آگے بڑھ کر اسی کو "نفسانیت" کا ثبوت بھی قرار دیا جاسکتا تھا بلکہ دین کی آڑ لیکر سلطان جی چاہتے تو "اسوۂ حسنہ نبویہ" کے معیار پر شیخ کبیر کے اس طرز عمل کو کھوٹا بتا کر لوگوں کو دکھا سکتے تھے، لیکن ظاہر ہے وہ اپنا علاج کرانے آئے تھے، شیخ کبیر کی کمزوریوں کا علاج اجودھن آنے سے مقصود نہ تھا، اس کو طے کر چکے تھے کہ یہ معالج طبیب ہے، اس کے بعد تنقید کا حق ان کے لیے باقی ہی کب رہا تھا۔[۱]

ایک رفیق کی ملامت

خواجہ فرماتے ہیں کہ میں شیخ کبیر کی خدمت میں اجودھن حاضر تھا، ایک عالم بھی جو میرے دوست اور ہم درس تھے اور ہم دونوں ایک ساتھ مذاکرہ کرتے تھے، اجودھن آئے، انھوں نے جب مجھے پھٹے پرانے کپڑوں میں دیکھا تو بڑی حیرت و تاسف سے مجھ سے کہا: "مولانا نظام الدین تم نے اپنا کیا حال بنالیا ہے اگر تم شہر میں درس و تدریس کی خدمت میں مشغول رہتے تو مجتہد زمانہ ہوتے اور بڑی شان و شوکت سے رہتے"۔ میں نے اپنے دوست کی یہ بات سنی اور ان سے معذرت کردی، اسکے بعد جب میں شیخ کبیر کی خدمت میں حاضر ہوا، تو انھوں نے خود بخود فرمایا کہ: نظام! اگر تمہارا کوئی دوست تمھیں ملے اور تم سے کہے کہ تم نے اپنا کیا حال بنا لیا ہے اور تعلیم و تعلم کا وہ سلسلہ کیوں چھوڑ دیا

---

[۱] "ہندوستان میں مسلمانوں کا نظام تعلیم و تربیت" ج ۲ صفحہ ۹۴-۹۵

جو فارغ البالی اور خوشحالی کا ذریعہ تھا، اور یہاں اس حال میں کیوں ہو، تو تم اسکا کیا جواب دوگے؟ میں نے عرض کیا کہ جو ارشاد عالی ہو وہی کہدونگا۔ فرمایا اگر کبھی کوئی ایسا سوال کرے تو یہ شعر پڑھ دینا ؎

نہ ہمرہی تو مرا راہ خویش گیر و برو ‏ ‏ ‏ ‏ ترا سلامتی باد امر نگونساری

اس کے بعد حکم ہوا کہ خانقاہ کے مطبخ سے مختلف قسم کے کھانے ایک خوان میں اپنے سر پر رکھ کر اس رفیق کے پاس لے جاؤ، میں نے تعمیل ارشاد کی میرے دوست نے جب یہ منظر دیکھا تو روتا ہوا دوڑا اور میرے سر سے خوان اتارا اور کہنے لگا کہ تم نے یہ کیا کیا؟ میں نے سارا قصہ سنایا، اس نے یہ سنکر کہا کہ تمھارے شیخ ایسے ہیں کہ انھوں نے تم کو بے نفسی کے اس مقام پر پہنچا دیا ہے، مجھے بھی ان کی خدمت میں لے چلو، جب وہ کھانے سے فارغ ہوئے تو اپنے ملازم سے کہا کہ یہ خوان اٹھاؤ اور ہمارے ساتھ چلو، میں نے کہا کہ نہیں، جیسے میں یہ خوان اپنے سر پر رکھ کر لایا ہوں ویسے ہی سر پر رکھکر لیجاؤنگا غرض ہم دونوں خدمت بابرکت میں پہنچے اور ہمارے دوست نے حضرت کے ہاتھ پر بیعت[۱] و توبہ کی اور آپکے حلقۂ خدام میں داخل ہوئے[۲]۔

کتنے بار حاضری ہوئی؟ حضرت خواجہ شیخ اکبر کی زندگی میں تین بار اجودھن حاضر ہوئے پہلی یا کسی اور حاضری میں خلافت سے مشرف ہوئے، تذکروں میں اسکی صراحت نہیں ہے۔

شیخ کی نوازشیں ایک حاضری میں ایک دن ۲۵ رجمادی الاولی کو ۶۵۵ھ[۳] نماز جمعہ کے بعد طلبی ہوئی، شیخ کبیر نے اپنا لعاب دہن حضرت خواجہ کے دہن میں ڈالا، قرآن مجید کے حفظ کی وصیت فرمائی، فرمایا کہ خدا نے دین و دنیا تم کو دی، یہاں سب کچھ ہی ہے، دہلی کی طرف روانہ کیا اور فرمایا:۔

---

[۱] سیر الاولیاء صـ۲۳۹ و صـ۲۴ ‏ ‏ [۲] فوائد الفواد (صـ۴۳)

[۳] یہاں سیر الاولیاء میں سنہ تسع و ستین و ستمائۃ (۶۶۹ھ) یا تو غلط درج ہو گیا ہے اور تسع و خمسین ۶۵۹ مراد ہے اسلئے کہ شیخ کبیر کی وفات کا سنہ سیر الاولیاء وغیرہ میں ۶۶۴ھ ہے یا پھر تسلیم کیا جائے کہ آپکا سنہ وفات ۶۷۰ھ ہے جیسا کہ خزینۃ الاصفیاء میں بحوالہ مخبر الواصلین و تذکرۃ العاشقین درج ہے بہر حال سیر الاولیاء کے سنین میں تضاد ہے

"بروملک ہندگیر" نظرۃ منک تکفینی[1]

رخصت اور وصیت فرمایا کہ دلی جانا تو مجاہدہ میں مشغول رہنا، بیکار رہنا کچھ نہیں (نفلی) روزہ رکھنا نصف راہ ہے، دوسرے اعمال نماز و حج (نفلی) نصف راہ۔

سیر الاولیاء میں ہے کہ خلافت نامہ لکھ کر دیا اور ہدایت کی کہ مولانا جمال الدین کو ہانسی میں اور قاضی منتجب کو دلی میں دکھا دینا، ارشاد ہوا کہ تم ایک سایہ دار درخت ہو گے جس کے سایہ میں اللہ کی مخلوق آرام پائے گی، استعداد کی ترقی کے لئے مجاہدہ کرتے رہنا۔

حضرت خواجہ فرماتے ہیں کہ ہانسی میں شیخ جمال الدین کو خلافت نامہ دکھایا، بڑا اظہارِ مسرت کیا اور یہ شعر پڑھا۔

خدائے جہاں را ہزاراں سپاس　　　کہ گوہر سپردہ بگوہر شناس[2]

ایک دعا کی درخواست اسی حاضری میں یکم شعبان کو حضرت خواجہ کی طرف سے شیخ کبیر کی خدمت میں اس دعا کی درخواست پیش کی گئی کہ:- خلق کے در بدر نہ پھرنا پڑے، درخواست قبول ہوئی اور دعا فرمائی گئی۔[3]

ایک موقع پر فرمایا گیا کہ میں نے اللہ سے تمہارے لئے تھوڑی سی دنیا مانگ لی ہے، خواجہ فرماتے ہیں کہ میں یہ سن کر متفکر ہوا کہ بڑے بڑے لوگ دنیا کے سبب سے فتنہ میں پڑگئے میرا کیا حال ہوگا، شیخ نے فوراً ہی فرمایا کہ تم فتنہ میں نہیں پڑو گے۔ خاطر جمع رکھو۔ اب مجھے اطمینان ہوا۔[4]

---

[1] سیر الاولیاء (ص ۱۲۳) [2] ایضاً ص ۱۱۶ و ص ۱۱۷ اس موقع پر سیر الاولیاء میں جو ۶۶۹ھ بھر دیا گیا ہے اسکے متعلق اوپر گفتگو ہو چکی ہے۔ ۱۲ [3] سیر الاولیاء ص ۱۲۳۔ [4] ایضاً ص ۱۳۲

اجودھن سے دہلی کو خواجہ نظام الدینؒ اب اپنے مرشد و مربیؒ سے رخصت ہو کر ہندوستان کی تسخیر روحانی اور خلق خدا کے ارشاد و تربیت اور تبلیغ و ہدایت کی عظیم و مقدس مہم پر روانہ ہوئے۔ یہ ایک فقیر بے نوا تھا جو ہندوستان بلکہ ساتویں صدی ہجری کے عالم اسلام کی سب سے مستحکم اسلامی دارالسلطنت کو جارہا تھا۔ اس کے پاس اخلاص، اعتماد علی اللہ اور استغناء عن الخلق کے سوا کوئی زادِ راہ اور کوئی ہتھیار و سلاح نہ تھا۔ مولانا سید مناظر احسن گیلانیؒ نے خوب لکھا ہے :۔

"ہندگیری کی مہم پر اجودھن سے ہند کے دارالسلطنت دہلی کی طرف روانہ ہوتے ہیں جہاں نیچے سے اوپر تک بشیار چھوٹے آلہہ پر اجیائے بیٹھے ہیں، ان میں وہ بھی ہے جسکی زبان کی معمولی حرکت لوگوں کے تن سر سے جدا کر دیتی ہے وہ بھی ہیں جن کی نیازمندی خاک سے اٹھا کر لوگوں کو امارت و دولت کے افلاک تک پہنچا رہی ہے۔ گلی گلی میں عزت تقسیم ہو رہی ہے، مناصب بٹ رہے ہیں، روپے لٹائے جا رہے ہیں، گودیں بھر رہی ہیں اور جن جن ذرائع سے یہ چیزیں حاصل ہوتی ہیں سلطان المشائخ سب سے لیس ہیں۔ آپ پڑھ چکے ہیں کہ اجودھن جانے سے پہلے دہلی کی علمی محفلوں کی محفل شکنی میں ان کی عام شہرت ہو چکی ہے، کچھ نہیں تو قضا کے عہدے سے لیکر شیخ الاسلامی و صدر جہانی کی خدمات تک کی ساری راہیں اپنے سامنے کھلی پا رہے ہیں، لیکن اب خالق کی صورت میں جو اِلٰہ ان کو مل چکا تھا، سینہ اسی کے وزن سے اتنا معمور تھا کہ کسی مخلوق کی کوئی گنجائش ان کے قلب میں باقی نہ تھی۔ قلب کی اسی کیفیت کی تعبیر تھی جس کا اظہار وہی کبھی کبھی ان مشہور تیز الفاظ میں فرمایا کرتے تھے :۔

"ایمان کس تمام نہ شود تا ہمہ خلق — در نزدیکی او ہم چو پشک شتر نہ نماید"[1]

---

[1] سیر الاولیاء صفحہ ۵۵

مجلسِ مبارک میں دمشق کے ایک شخص کا ذکر ہو رہا تھا جو شیخ الاسلامی کی خدمت کے لئے ساری ساری رات نماز پڑھتا تھا، اپنی انھیں نمازوں کو نگاہِ خلق میں حصولِ عزت کا ذریعہ بنا رہا تھا۔ جامع ملفوظات راوی ہیں کہ:-

دریں میاں خواجہ ذکرالله بالخیر	یہ سُنکر حضرت خواجہؒ کی آنکھوں میں
چشم پرآب کردہ برلب مبارک راند	آنسو آ گئے اور فرمایا کہ پہلے شیخ الاسلامی
بسوزا اوّل شیخ الاسلامی را، پس	کو جلاؤ، پھر آگ لگاؤ خانقاہ کو،
خانقاہ را، بعد از اں خود را[1]	پھر اپنی خودی کو جلا کر خاک کردو۔

الغرض اس شان کے ساتھ سب کچھ جلا کر بھسم کر کے وہ اجودھن سے روانہ ہوئے .... اور جس علاقہ کی ولایت آپ کے سپرد ہوئی تھی اسی کے پایۂ تخت میں آپ پہونچ گئے[2]"

تصفیۂ حقوق شیخ کبیرؒ نے ارادت وخلافت کے ساتھ کئی بار یہ تاکید کی تھی کہ مخالفین کو خوش کرنے کی پوری کوشش کرنا اور اہلِ حقوق کو راضی کرنے میں کوئی دقیقہ فرو گذاشت نہ کرنا۔ خواجہ فرماتے ہیں کہ میں جب دہلی چلا تو مجھے یاد آیا کہ مجھے ۲۰ جیتل[3] ایک شخص کے دینے ہیں، اور ایک کتاب میں نے کسی سے مستعار لی تھی وہ کھو گئی ہے، میں نے بدایوں کے قیام میں یہ عزم کر لیا تھا کہ میں جب دہلی پہنچوں گا

---

[1] فوائدالفواد (ص۲۳)

[2] ہندوستان میں مسلمانوں کا نظامِ تعلیم وتربیت (ص۱۵)

[3] جیتل یا چیتل تانبہ کا ایک سکہ تھا، ایک تنکہ کے (روپیہ) چونسٹھ جیتل اور ایک جیتل کے چار فلوس یعنی دھیلے تھے

تو اِن اہلِ معاملہ کو راضی کرنے کی کوشش کروں گا، جب میں اجودھن سے دہلی واپس آیا تو جس شخص کے بیس جیتل مجھے دینے تھے وہ بزاز تھا، میں نے اس سے کپڑا خریدا تھا، کسی وقت بیس جیتل میرے پاس جمع نہیں ہوئے کہ میں اسکو پہنچا دیتا، معاش کی بڑی تنگی تھی، کبھی پانچ جیتل ہاتھ آئے، کبھی دس، ایک مرتبہ دس جیتل ملے میں اُس بزاز کے دروازہ پر پہنچا، اسکو آواز دی، وہ باہر آیا تو میں نے اس سے کہا کہ تمھارے بیس جیتل میرے ذمہ ہیں، ایک مرتبہ تو مجھے دینے کی مقدرت نہیں، یہ دس جیتل لایا ہوں، اس کو لے لو، دس انشاء اللہ اسکے بعد پہنچا دوں گا۔ اس شخص نے یہ سنکر کہا کہ ہاں معلوم ہوتا ہے کہ تم مسلمانوں کے پاس سے آرہے ہو، اس نے وہ دس جیتل تو لے لئے اور کہا کہ یہ دس جیتل معاف کئے۔

اس کے بعد میں اس شخص کے پاس گیا جس کی کتاب میں نے لی تھی، اس نے مجھے پہچانا نہیں، میں نے کہا کہ صاحب میں نے آپ سے ایک کتاب مستعار لی تھی، وہ کھو گئی، اب میں اس کی نقل تیار کر کے آپ کو دوں گا، میں بالکل اسی طرح لکھوا کر آپ کو پہنچا دوں گا۔ اس شخص نے کہا کہ ہاں تم جہاں سے آرہے ہو وہاں کا یہی نتیجہ ہونا چاہیئے، اسکے بعد اس نے کہا کہ میں نے وہ کتاب تم کو بخشی۔[1]

دہلی کی قیام گاہیں

خواجہ صاحبؒ اہلِ دہلی بلکہ اہلِ ہند کی خدمت کے لئے جب دہلی پہنچے تو باوجود اس کے کہ دہلی کا کوچہ کوچہ محلوں اور ایوانوں سے آباد تھا اور روزنئی نئی عمارتیں بن رہی تھیں، خواجہ صاحبؒ کے قیام کا کوئی ٹھکانا نہ تھا، جب تک کہ غیاث پور کا قیام اختیار نہیں فرمایا، آپ نے اتنی قیامگاہیں اختیار کیں اور اتنے مقامات تبدیل کئے کہ معلوم ہوتا ہے کہ شہر میں اس فقیر کے لئے اپنا درویشانہ سامان رکھنے اور اپنا بوریہ بچھانے کے لئے جگہ نہیں تھی۔

سیر الاولیاء کے مصنف میر خورد اپنے والد سید مبارک محمد کرمانی کی زبانی جو حضرت خواجہؒ کے دوست

---

[1] فوائد الفواد (صـ۱۴)

اور رفیق تھے، اس نقل مکانی کی تفصیل بیان کرتے ہیں جو ناظرین کی عبرت کے لئے یہاں نقل کی جاتی ہے۔ سید مبارک محمد کرمانی فرماتے ہیں:۔

"جتنے سال سلطان المشائخ شہر دہلی میں رہے کوئی مکان آپ کی ملکیت میں نہ تھا اور ساری عمر اپنے کوئی جگہ اپنے اختیار سے انتخاب نہیں فرمائی۔ جب آپ بدایوں سے آئے تو سرائے میاں بازار میں جس کو نمک کی سرائے بھی کہتے ہیں، اُترے، والدہ اور ہمشیرہ کو وہاں رکھا اور خود ایک قواس (کمان گر) کی بارگاہ میں جو سرائے مذکور کے سامنے تھی، مقیم ہوئے۔ امیر خسروؒ کا بھی اسی محلہ میں مکان تھا کچھ عرصہ کے بعد راوت عرض کا مکان خالی ہوا، اس کے لڑکے علاقوں میں چلے گئے۔ امیر خسرو کی معرفت جو راوت عرض کے نواسے تھے سلطان المشائخ کو یہ مکان قیام کے لئے مل گیا، آپ دو سال اس مکان میں رہے، یہ مکان شہر پناہ کے متصل منڈر دروازہ و مندھ پل کے نزدیک تھا، اس طرح سے کہ شہر پناہ کا برج اس عمارت کے اندر آ گیا تھا، مکان کے ایوان و رواق بڑے بلند اور شاندار تھے، اس عرصہ میں راوت عرض کے لڑکے آ گئے، سلطان المشائخ کو اس مکان سے منتقل ہو جانا پڑا، آپ کی کتابیں جن کے سوا کوئی اور سامان نہ تھا ہم سروں پر رکھ کر چھپر والی مسجد میں (جو سراج بقال کے سامنے تھی) لے آئے۔ دوسرے روز سعد کاغذی نے جو شیخ صدرالدین کے مریدین میں تھے، یہ قصہ سنا اور سلطان المشائخ کے پاس آ کر بڑی عزت و توقیر اور خوشامد سے اپنے مکان پر لے گیا۔ بالاخانہ پر ایک بہت اچھی بارگاہ بنی ہوئی تھی، وہاں آپ کو ٹھہرایا۔ سلطان المشائخ ایک مہینہ وہاں ٹھہرے، اسکے بعد وہاں سے بھی اُٹھے، رکابدار کی سرائے میں جو قیصر پل کے

منتقل تھی۔ سرائے کے درمیان ایک مکان تھا، وہاں مقیم ہوئے۔ ایک مدت کے بعد وہاں سے بھی منتقل ہو کر شادی گلابی کے مکان میں جو محمد میوہ فروش کی دکانوں کے درمیان واقع تھا، قیام اختیار کیا۔ اس درمیان میں شمس الدین شرابدار[1] کے لڑکے اور اعزہ جو آپ کے معتقد تھے آپ کو بڑی عزت اور احترام کے ساتھ شمس الدین شرابدار کے مکان میں لے آئے۔ کئی سال سلطان المشائخ اس مکان میں رہے۔ اس مکان میں بڑی راحت اور سکونِ خاطر میسر آیا۔"[2]

فقر و فاقہ خواجہ صاحب دہلی تشریف لائے تو ابتلاء و تربیت کا وہ دور شروع ہوا جو اس راہ کے ان سالکوں کو جو آگے چل کر مرجع خلائق و سرچشمۂ فیوض بنتے ہیں عادتاً پیش آیا کرتا ہے۔ یہ وہ وقت تھا کہ سارے ہندوستان کی دولت اور زر و جواہر دہلی امنڈ کر آرہے تھے اور ارزانی کا یہ عالم تھا کہ ایک جیتل میں دو سیر میدے کی پکی پکائی روٹیاں مل جاتی تھیں اور دو جیتل میں ایک من خربوزہ آجاتا تھا، لیکن خواجہ صاحب کے فقر و فاقہ کا یہ حال تھا کہ فرماتے ہیں کہ:- میرے پاس ایک دانگ بھی نہ ہوتا کہ اس میں روٹیاں خرید کر خود کھاؤں اور والدہ و ہمشیرہ اور گھر کے ان لوگوں کو کھلاؤں جو میری کفالت میں تھے، خربوزہ کی اس ارزانی و فراوانی کے باوجود پوری پوری فصل گذر جاتی اور خربوزہ چکھنا نصیب نہ ہوتا لیکن اپنے اس حال میں خوش رہتا اور آرزو کرتا کہ جتنی فصل باقی ہے وہ بھی گذر جائے اور میں اسی حال میں رہوں۔[3]

---

[1] بادشاہ کو پانی پلانے کا عہدہ۔ ۱۲

[2] سیر الاولیاء (ص ۱۰۸)

[3] سیر الاولیاء (ص ۱۱۳)

غیر کے واسطہ کے بغیر اسی زمانہ میں جبکہ آپ شہر پناہ کے اس برج میں مقیم تھے جو مندہ دروازہ کے متصل ہے کئی روز گذر گئے اور کھانے کو کوئی چیز میسر نہیں آئی۔ ایک طالبعلم کو اس کا علم تھا کہ کئی روز سے حضرت کو فاقہ ہے، اس طالبعلم نے بعض ہمسایوں کو جو نور باف تھے اس کی اطلاع کی، وہ کھانا تیار کرکے لائے۔ کھانے کیلئے ہاتھ دھلاتے وقت کھانا لانے والوں میں سے ایک بولا خدا طالبعلم کا بھلا کرے کہ اسنے ہمیں خبر کر دی۔ خواجہ نے ہاتھ روک لئے اور فرمایا: کیا خبر کی ؟ اس نے کہا کہ: فلاں طالبعلم نے ہمیں بتلایا کہ کہ آپ کئی روز سے فاقہ سے ہیں، چنانچہ ہم یہ کھانا تیار کرکے لائے۔ آپنے فرمایا: معاف رکھو۔ کتنی ہی ان لوگوں نے کوشش کی، آپ نے کھانا قبول نہیں کیا۔[1]

شیخ کبیرؒ کی وفات آخری بار آپ شیخ کبیرؒ کی خدمت میں تین چار مہینے قبل گئے تھے۔ فرماتے ہیں کہ: ۵محرم کو شیخ کبیرؒ نے وفات پائی اور شوال کے مہینہ میں مجھے حضرت نے دہلی بھیجدیا۔ بیماری کی ابتدا ہو چکی تھی۔ رمضان کا مہینہ تھا اور آپ بیماری کی وجہ سے روزہ نہیں رکھ رہے تھے، ایک روز کہیں سے خربوزہ آیا تھا خربوزہ کاٹ کر میں نے شیخ کے سامنے رکھا شیخ نے تناول فرمایا اور ایک قاش مجھے عنایت فرمائی۔ میرے دل میں آیا کہ یہ دولت اب کب ملیگی کہ اپنے دست مبارک سے مجھے عنایت فرما رہے ہیں، میں کھالوں اور دو مہینے مسلسل روزے رکھکر (فرض روزہ توڑ دینے) کا کفارہ ادا کر دونگا۔ فرمایا کہ نہیں نہیں میرے لئے تو شریعت کی اجازت ہے، تمہارے لئے جائز نہیں۔[3]

فرمایا کہ انتقال کے وقت مجھے یاد فرمایا اور فرمایا کہ: نظام الدین تو دہلی میں ہیں۔ یہ بھی فرمایا کہ میں بھی اپنے شیخ قطب الدین بختیار کاکیؒ کی رحلت کے وقت حاضر نہ تھا، ہانسی میں تھا، فوائد الفواد

---

[1] جوامع الکلم (ملفوظات حضرت خواجہ سید محمد گیسودرازؒ) ص ۲۹۶ [2] ۶۶۴ھ [3] فوائد الفواد (ص ۵۳)

میں ہے کہ یہ تذکرہ کرتے وقت آپ پر ایسا گریہ طاری ہوا کہ تمام حاضرین کے دل متاثر ہوئے۔[1]

وفات کے بعد آپ اجودھن حاضر ہوئے۔ مولانا بدرالدین اسحٰق نے شیخ کبیرؒ کی وصیت کے مطابق جامہ مصلیٰ اور عصا سپرد کیا جو حضرت خواجہ کو دینے کے لئے شیخ کبیرؒ نے مولانا کے حوالہ کیا تھا۔[2]

غیاث پور کا قیام

فوائد الفواد میں ہے کہ ایک روز آپ نے شہر کے شور و شر کا تذکرہ کرتے ہوئے بیان کیا کہ ابتدائی زمانہ میں بھی میرا شہر میں دل نہیں لگتا تھا۔ ایک روز قتلغ خاں کے حوض پر تھا، ان دنوں میں قرآن مجید یاد کر رہا تھا، وہاں ایک درویش یادِ خدا میں مشغول تھا، میں اسکے پاس گیا اور اس سے پوچھا کہ آپ اسی شہر کے رہنے والے ہیں؟ انھوں نے کہا: ہاں! میں نے کہا: اپنی مرضی سے اس شہر میں رہتے ہیں؟ اس نے کہا: یہ بات تو نہیں ہے۔ اسکے بعد اس درویش نے واقعہ بیان کیا کہ ایک مرتبہ میں نے ایک اچھے درویش کو دیکھا بیرون کمال دروازہ، اس احاطہ میں جو لبِ خندق ہے اس دروازے کے قریب ایک بلند زمین ہے جس پر شہداء کی چار دیواری بنی ہوئی ہے، وہ درویش بیٹھا ہوا ہے۔ اس درویش نے مجھ سے کہا کہ اگر ایمان کی خیر چاہتے ہو تو اس شہر سے چلے جاؤ۔ میں نے اسی وقت سے اس شہر سے چلے جانے کا مصمم ارادہ کر لیا۔ لیکن موانع پیدا ہوتے رہے، آج پچیس سال ہو گئے کہ میرا ارادہ باقی ہے لیکن جانے کی نوبت نہیں آتی۔ حضرت خواجہ نے یہ حکایت بیان کر کے فرمایا کہ میں نے جب اس درویش کی یہ بات سنی تو اپنے دل میں یہ طے کر لیا کہ میں اس شہر میں نہ رہوں گا۔ کئی جگہ کا خیال آتا تھا کہ میں وہاں چلا جاؤں۔ کبھی دل میں آتا تھا کہ قصبہ پٹیالی[3] چلا جاؤں، وہاں ان دنوں ایک ترک تھا۔ کبھی دل کرتا تھا کہ بسنالہ جاؤں، وہ ایک پاک صاف جگہ ہے، چنانچہ

---

[1] فوائد الفواد ص ۵۳ — [2] سیر الاولیاء، ص ۱۲۲

[3] ضلع ایٹہ میں ایک قصبہ ہے جو خسروؒ کا ننہال یہیں تھا اور اسی تقریب سے وہ وہاں رہتے تھے۔ ۱۲

نشنالہ چلا گیا، تین روز وہاں رہا، کوئی مکان نہیں ملا، نہ کرایہ کا نہ بقیمت، ان تین دنوں روزانہ کسی ایک کا مہمان رہتا تھا، جب وہاں سے واپس آیا تو یہی خیال لگا رہا کہ ایک روز حوض رانی کی طرف گیا ہوا تھا، وہاں ایک باغ میں جس کو "باغِ حیرت" کہتے ہیں، اللہ سے مناجات کی۔ طبیعت متوجہ تھی۔ میں نے عرض کیا کہ خداوندا! میں اس شہر سے چلا جانا چاہتا ہوں، لیکن کوئی جگہ اپنی مرضی سے اختیار نہیں کروں گا جہاں آپ کی مرضی ہو وہاں چلا جانا چاہتا ہوں، اس درمیان میں ایک غیبی آواز "غیاث پور" کے نام کی آئی۔ میں نے کبھی غیاث پور دیکھا نہیں تھا، اور یہ بھی نہیں جانتا تھا کہ غیاث پور کہاں ہے، میں نے جب آواز سنی تو ایک دوست کے پاس گیا۔ وہ دوست ایک نیشاپوری نقیب تھا، جب میں اس کے گھر گیا اور اسکو دریافت کیا تو معلوم ہوا کہ وہ غیاث پور گیا ہوا ہے، میں نے اپنے دل میں کہا کہ یہی غیاث پور ہے، الغرض غیاث پور آیا، اس وقت تک یہ مقام ایسا آباد نہیں تھا، ایک غیر معروف جگہ تھی، آدمی بھی کم تھے۔ میں آیا، میں نے وہاں سکونت اختیار کر لی، جب کیقباد[1] نے کیلوکھری[2] کو اپنی فرودگاہ بنایا تو وہاں ہجومِ خلائق ہوا۔ امراء اور اعیانِ سلطنت اور ان کے متعلقین کی آمد و رفت شروع ہو گئی۔ جب میں نے یہ اژدحام دیکھا تو اپنے دل میں کہا کہ اب یہاں سے بھی چلا جانا چاہیئے، اسی خیال میں تھا کہ ایک بزرگ کا جو میرے استاد بھی تھے، شہر میں انتقال ہوا، میں نے اپنے دل میں کہا کہ جب میں ان کے فاتحہ میں جاؤں گا تو پھر کسی طرف کا قصد کروں گا، اپنے دل میں اس کو طے کر لیا۔ اسی روز نمازِ عصر کے وقت ایک جوان آیا حسین لیکن نحیف، خدا جانے مردانِ غیب میں سے

---

[1] سلطان معز الدین کیقباد (۶۸۶ھ - ۶۸۹ھ) بغرا خاں کا لڑکا اور غیاث الدین بلبن کا پوتا تھا، ۳ سال حکومت کی۔ ۱۲

[2] سر سید احمد خاں آثار الصنادید میں لکھتے ہیں: معز الدین کیقباد نے ۶۸۶ھ میں ایک قلعہ بنوایا اور کیلوکھری اسکا نام رکھا اگرچہ اس قلعہ کا اب نشان نہیں لیکن اسی جگہ ہمایوں کے مقبرے کے پاس موضع کیلوکھری موجود ہے اور دس پانچ جھونپڑے موجود ہیں ۱۲۔ (آثار الصنادید باب ۳، ص ۲)

تھا یا کون تھا، اس نے آتے ہی مجھے خطاب کر کے یہ شعر پڑھا۔ ؎

آں روز کہ مہ شدی نمی دانستی   کہ انگشت نمائے جہاں خواہی شد

(جس روز خدا نے تم کو چاند بنایا تھا، اسی روز سمجھنا چاہیئے تھا کہ ساری دنیا کی انگلیاں تمھاری طرف اٹھیں گی)

حضرت خواجہؒ نے فرمایا کہ اس نے کچھ اور باتیں بھی کہیں جس کو میں نے لکھ لیا ہے، اسکے بعد اس نے یہ کہا کہ پہلی مرتبہ آدمی کو مشہور نہیں ہونا چاہیئے، اور جب کوئی شخص مشہور ہو جائے تو پھر ایسا بننا چاہیئے کہ کل روزِ قیامت رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم کے سامنے شرمندہ نہ ہونا پڑے۔

اس کے بعد اس نے کہا کہ یہ کیا ہمّت و حوصلہ ہے کہ خلقِ خدا سے بھاگ کر گوشہ گیری اختیار کی جائے اور یادِ خدا میں مشغول ہوا جائے۔ اس کا مقصود یہ تھا کہ قوت و حوصلہ کی بات تو یہ ہے کہ مخلوق کے باوجود یادِ خدا میں مشغول ہو۔ جب اس نے اپنی بات ختم کی تو میں نے کچھ کھانا لاکر اسکے سامنے رکھا، اس نے ہاتھ نہیں بڑھایا، اسی وقت میں نے اپنے دل میں نیت کی کہ میں یہیں رہوں گا جب میں نے یہ نیت کر لی، تو اس نے تھوڑا سا کھانا کھایا اور چلا گیا۔[1]

رجوعِ عام

غیاث پور کے دورانِ قیام میں خلقِ خدا اور طالبین کا رجوع شروع ہوا اور فتوحات کا دروازہ کھُل گیا

تذکروں سے یہ نہیں معلوم ہوتا کہ غیاث پور میں کتنی مدت گزرنے کے بعد آپ کی ذات بابرکات کو مرجعیت، اور غیاث پور کی خانقاہ کو شہرتِ عام حاصل ہوئی۔ اتنا پتہ چلتا ہے کہ غیاث پور کا قیام اختیار کرنے کے بعد بھی ایک عرصہ تک عسرت اور بے اسبابی کا دور گذرا، یہاں تک کہ ایک عرصہ

---

[1] سیر الاولیاء (ص ۱۲۹)

تک آپ سخت گرمیوں اور لودھوپ کے زمانہ میں جامع مسجد کو جو خاصہ فاصلہ پر تھی جمعہ کے دن پیادہ پا تشریف لیجاتے تھے، یہاں تک کہ اس "عسر" کے بعد "یسر" کا دور آگیا[1] اور وہ رجوع عام شروع ہوا کہ اسکے سامنے سلاطینِ دہلی کے درباروں کی عظمت ماند پڑگئی، امیر خسرو کے ان اشعار کی تصویر سامنے آگئی۔

درحجرۂ فقر بادشاہی در عالمِ دل جہاں پناہی
شاہنشہے بے سریر بے تاج شاہانش بہ خاک پائے محتاج

فقر و منعم

صاحب سیر الاولیاء لکھتے ہیں کہ:- وارد وصادر میں سے پردیسی ہو یا شہری جو آتا اور سعادت قدمبوسی حاصل کرتا کسی کو محروم نہ فرماتے، پوشاک، نقد، تحائف جو کبھی خدا بھیجتا سب ہی ان آنے جانے والوں پر صرف ہوتا، جو کبھی آتا اور جس وقت بھی آتا محروم نہ جاتا۔[2]

حضرت خواجہ نصیر الدین چراغ دہلی نے فرمایا:-

"فتوحات کا یہ حال تھا کہ دولت کا دریا آگے دروازے کے بہتا تھا، کوئی دن فتوحات سے خالی نہ ہوتا، صبح سے شام تک لوگ آتے بلکہ عشاء تک، مگر لینے والے لانے والوں سے زیادہ ہوا کرتے اور جو کچھ کوئی لاتا اس سے زیادہ حضرتؒ کی عنایت سے پاتا۔"[3]

---

[1] انّ مع العسر یُسرًا۔ ان مع العسر یُسرا ـــــ بیشک دشواری کے ساتھ آسانی ہے، بیشک دشواری کے ساتھ آسانی ہے۔ ۱۲

[2] سیر الاولیاء۔

[3] سراج المجالس (ترجمہ خیر المجالس) ملفوظات حضرت خواجہ نصیر الدین چراغ دہلیؒ (ص ۲۰۲)

بیداری پر پہلا سوال

عادتِ مبارک تھی کہ جب قیلولہ سے اٹھتے تو دو باتیں سب سے پہلے پوچھتے، ایک یہ کہ زوال ہو گیا۔ دوسرے یہ کہ کوئی آیا تو نہیں، تاکہ اسکو انتظار نہ کرنا پڑے[1]۔

دنیا سے تنفر اور بذل وعطا

دنیا کا جس قدر رجوع بڑھتا گیا انکی طبیعت اس سے متنفر ہوتی گئی۔ اکثر گریہ فرماتے، جتنی بڑی فتوحات ہوتیں اتنی ہی زیادہ گریہ کرتے اور اتنی ہی زیادہ کوشش فرماتے کہ جو کچھ آیا ہے جلد تقسیم ہو جائے، تھوڑی تھوڑی دیر کے بعد آدمی کو بھیجکر ہدایت فرماتے کہ جو کچھ ہو تقسیم کر دیا جائے، جب سب تقسیم ہو جاتا اور ضرورتمندوں کو پہنچ جاتا تو سکونِ خاطر ہوتا۔ ہر جمعہ کو حجروں اور انبار خانوں کو اس طرح خالی کرا دیتے جیسے جھاڑو دے دی گئی ہو، اس کے بعد مسجد جاتے، اگر بادشاہوں یا شہزادوں میں سے کوئی آستانہ پر حاضر ہوتا اور ان کی نذر اور آمد آمد کی خبر پہونچتی تو ٹھنڈی سانس بھر کر فرماتے کہ: کہاں آئے ہیں، فقیر کا وقت غارت کرتے ہیں[2]۔

زمین و جائداد سے پرہیز

امیر حسن علا سنجری فرماتے ہیں کہ میں ایک مرتبہ حاضر تھا، ان دنوں میں ایک امیر نے باغ اور بہت سی زمین اور اسکے سازو سامان کی دستاویز حضرتؒ کی خدمت میں بھیجی تھی اور اپنی عقیدت و اخلاص کا اظہار کیا تھا، حضرتؒ نے قبول نہ فرمایا، متبسم ہو کر فرمایا کہ اگر میں اسکو قبول کر لوں تو پھر لوگ کہا کرینگے کہ شیخ باغ کی سیر کو گئے ہیں اور اپنی کھیتی اور زمین دیکھنے تشریف لے گئے ہیں۔ میرے کام سے اس کو کیا مناسبت؟ میرے بزرگوں اور مشائخ میں سے کسی نے زمین و جائداد قبول نہیں کی[3]۔

---

[1] سیر الاولیاء ص ۱۳۶ - [2] ایضاً ص ۱۲۹ [3] فوائد الفواد ج ۱ ص ۹۹

فقیر کا شاہی دسترخوان

خود دائم الصوم تھے، لیکن دونوں وقت شاہی دسترخوان لگتا اور انواع و اقسام کے کھانے وافر مقدار میں چنے جاتے، امیر و غریب، شاہ و گدا، شہری و پردیسی، صالح و گناہگار کسی کی تفریق نہ تھی، سب ایک جگہ بیٹھ کر کھانا کھاتے، لے جانے کی بھی اجازت تھی۔ بعض لوگ کھاتے اور باندھ کر بھی لے جاتے، یہ شاہی دسترخوان اپنی نوعیت میں یکتا تھا۔ اسی دسترخوان پر بیٹھ کر سیکڑوں ہزاروں غرباء کو وہ کھانے نصیب ہوتے جن کے انھوں نے نام ہی نام سنے تھے، بڑے بڑے امراء دربار اور اعیان سلطنت کو بھی اس دسترخوان پر حاضری کی آرزو ہوتی تھی اور اس کھانے کی لذت کو وہ یاد کرتے تھے، ہدایت و ارشاد اور سلوک و تربیت کے فیض عام کے علاوہ (جس کا ہر وقت دروازہ کھلا رہتا تھا) حضرت خواجہؒ کا یہ بھی فیض تھا جو دلّی میں اپنی پوری روانی کے ساتھ جاری تھا اور جو ہزاروں بندگانِ خدا کی پرورش کا ذریعہ تھا، مولانا مناظر احسن گیلانی نے درویش کے اس خوانِ "سلطانی" کا ذکر کرتے ہوئے خوب لکھا ہے:۔

> "آج جن چیزوں پر ایوانِ نعمت کے قصوں کے ساتھ غریبوں کا دکھڑا رو دیا جاتا ہے، گویا یہ بھی ایک قسم کی حدیث المائدہ (ٹیبل ٹاک) اور ہضم کرنے کا چورن ہے ان کو کیا معلوم کہ اسلامی تاریخ میں غریبوں اور امیروں کے درمیان صوفیۂ اسلام کی یہی خانقاہیں درمیانی کڑی کا کام دیتی تھیں، ان بزرگوں کا دربار وہ دربار تھا جہاں سلاطین بھی خراج داخل کرتے تھے۔ خود سلطان المشائخؒ کا کیا حال تھا، گذر چکا کہ ولی عہد سلطنت خضر خاں تک اسی دربار کا حلقہ بگوش تھا۔ علاء الدین جو سارے ہندوستان سے خراج وصول کرتا تھا، لیکن ایک خزانہ وہ بھی تھا جس میں اسے بھی مالگزاری داخل کرنی پڑتی تھی"[1]

---

[1] نظام تعلیم (ص ۲۱۴)

یہی خانقاہیں تھیں جن کے ذریعہ سے ملک کے عام غربا، فقرا تک ان کا حصہ پہنچ جاتا تھا اور یہی مطلب ہے اس مشہور فقرہ کا کہ :-

"مالِ صوفی سبیل است[1]"

عزت و امارت کا یہ سنگم یعنی صوفیہ صافیہ کا یہ طبقہ جہاں امراء، غربا دونوں ایک حیثیت سے حاضر ہوتے تھے اس سے غریب اور حاجتمند مسلمانوں کی کتنی حاجت روائیاں ہوتی تھیں، واقعہ یہ ہے کہ اسلامی عہد کا کوئی زمانہ اور ان دونوں ہندوستان کا شاید ہی کوئی صوبہ کوئی علاقہ ایسا ہو گا جہاں

تو خذ من اغنیاء ھم — انکے دولتمندوں سے لیا جائے اور ان کے

و ترد علٰی فقراء ھم — ضرورتمندوں کو پہونچا دیا جائے۔

کے نبوی فرمان کی تعمیل میں ارباب صدق و صفا کا یہ طبقہ مشغول نہ تھا، خصوصاً جن بزرگوں کا کسی خاص وجہ سے امراء اور ارباب ثروت پر اثر قائم ہو جاتا تھا، یوں سمجھئے کہ غرباء کی قسمت جاگ اٹھتی تھی[2]۔

اسلام کے ان اکابر کا حال پڑھئے اور اس پر غور کیجئے، آپ کو نظر آئے گا کہ امراء اور غرباء کے درمیان ان بزرگوں کا وجود باجود حلقۂ اتصال بنا ہوا تھا ——

اور میرا خیال ہے کہ ان کی خانقاہوں کے لنگر خانے جہاں اپنے اندر دوسری اغراض رکھتے تھے ایک بڑا کام ان سے یہ بھی نکلتا تھا کہ ملک کے غریبوں، بے وسیلوں کی پناہ گاہ یہ خانقاہیں بنی ہوئی تھیں، بلکہ ان ہی کے

---

[1] نظام تعلیم (ص ۲۱۴) [2] ایضاً (ص ۲۲۰)

ذریعہ سے غریبوں تک بھی وہ نعمتیں پہنچ جاتی تھیں جن کا نام بھی اس زمانہ کے غریبوں نے شاید نہ سنا ہو"[1]

شیخ کی غذا شیخ خود کھانے میں شریک ہوتے لیکن اس شاہی دسترخوان پر جس پر انواع و اقسام کے کھانے اور الوانِ نعمت ہوتے، ان کی غذا عام طور پر ایک یا آدھی روٹی اور کچھ کریلہ وغیرہ کی سبزی یا تھوڑے سے چاول ہوتے۔ آپ کے ایک مرید باختصاص مولانا شمس الدین یحییٰ اپنا مشاہدہ بیان کرتے ہیں:-

"میں ایک مرتبہ دسترخوان پر موجود تھا افطار کے وقت میری نظر سلطان المشائخ پر تھی، میں نے دیکھا کہ کھانا شروع ہونے کے وقت آپ نے لقمہ لینے کے لئے جو ہاتھ پیالہ کی طرف بڑھایا تھا وہ آخر تک وہیں رہا، منہ تک آنے کی نوبت نہ آئی کہ دسترخوان بڑھا دیا گیا"[2]

ترتیب دسترخوان پر بیٹھنے کا قاعدہ اور ترتیب یہ تھی کہ سب سے آگے مخدوم زادگان (مرشد سے نسبتِ قرابت رکھنے والے) ہوتے، پھر علماء، پھر رؤسا و اشراف[3]

سلاطین عہد سے بے تعلقی سلسلۂ چشتیہ کی بنیاد سلطنتِ ہندوستان کی دینی رہنمائی بلکہ سلطنتِ اسلامی کی تاسیس، اسلامی معاشرہ کی اصلاح اور اس میں روحانیت و انابت کی روح پھونکنے کے ساتھ ساتھ ابتدا ہی سے سلاطین وقت سے بے تعلقی کے اصول پر پڑی تھی، اور یہ اس سلسلہ کا ایک شعار اور مشائخ چشتیہ کا مقدس ترکہ اور امانت بن گئی تھی۔ مشائخ چشت نے اس "شیشہ و آہن" کو جمع کرنے میں اپنا پورا کمال دکھا دیا تھا۔ ایک طرف وہ دربار کے غلط رجحانات کی اصلاح اور وقت کے فتنوں کے استیصال سے غافل اور علم

---

[1] نظامِ تعلیم ص ۲۲۸ [2] سیر الاولیاء ص ۱۲۵ [3] ایضاً ص ۱۲۵ [4] ایضاً ص ۲۰۲

اسلام سے خالی اور اس ملک میں مسلمانوں کے مستقبل سے بے فکر نہ تھے، دوسری طرف وہ ایک اصول اور عقیدے کے طور پر یہ طے کرچکے تھے کہ ان کو دربار سے براہ راست کوئی تعلق رکھنا نہیں ہے۔

حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ سے لیکر خواجہ نظام الدین تک یہ گویا ایک طے شدہ حقیقت تھی کہ ان کو دربار میں جانا ہے اور نہ سلاطینِ وقت سے ملاقات کرنی ہے، اس اصول پر یہ سب حضرات سختی سے کار بند رہے، اس کا نتیجہ تھا کہ سیاست کے خارزار میں ان کا دامن کبھی نہیں اُلجھا، اور انقلاباتِ سلطنت کا ان مرکزوں اور ان کی سرگرمیوں پر کوئی اثر نہیں پڑا۔ ان کا اخلاص، ان کی بے لوثی اور بے غرضی تمام سیاسی اختلافات کے باوجود مُسلّم رہی اور اسی کا نتیجہ تھا کہ ہندوستان کی اسلامی تاریخ میں سب سے طویل عرصہ تک اس سلسلہ کو اپنا کام جاری رکھنے اور ہندوستان پر اثر انداز ہونے کا موقع ملا اور شاید اسی کا نتیجہ تھا کہ اس سلسلہ کو قبول عام اور بقائے دوام حاصل ہوا۔

حضرت شیخ نظام الدینؒ جب سے شیخ کبیر کے پاس سے ہندوستان کی تسخیر روحانی اور تبلیغ و ارشاد پر مامور ہو کر آئے تھے دہلی کے تخت پر یکے بعد دیگرے پانچ بادشاہ بیٹھے اور انھوں نے بڑے جاہ و جلال کیساتھ سلطنت کی، لیکن سوائے ایک موقع کے جبکہ دینی ضرورت درپیش تھی (سماع کی حلت و حرمت کی مجلسِ مناظرہ) وہ کبھی نہ دربار میں گئے اور نہ بادشاہِ وقت کو اپنے یہاں آنے کی اجازت دی۔ غیاث الدین بلبن کے عہدِ سلطنت میں ان کا آفتاب شہرت و قبولیت نصف النہار پر نہیں پہنچا تھا، اس لئے غیاث الدین کو ان کی طرف توجہ نہیں ہوئی، معز الدین کیقباد لہو و لعب اور سیر و شکار میں مشغول رہا۔

جلال الدین خلجی پہلا بادشاہ تھا جو صاحب علم و حلم، جوہر شناس اور ارباب کمال کا قدردان تھا اور حضرت خواجہ کی شہرت بھی اپنے عروج پر پہنچ چکی تھی۔ جلال الدین نے کئی بار حاضری کی اجازت چاہی لیکن کبھی منظور نہیں ہوئی۔ آخر سلطان نے امیر خسروؒ کے ساتھ (جو سلطان کے مصحف دار تھے) یہ منصوبہ بنایا کہ ایک مرتبہ بلا اطلاع حضرت کی خدمت میں حاضر ہو جاتا ہے۔ امیر خسروؒ نے مناسب جانا کہ اپنے مرشد کو اس کی اطلاع دے دی جائے، اس لئے کہ اگر میں نے اسکی اطلاع نہ دی تو شاید

میرے حق میں یہ اچھا نہ ہو، اگرچہ بادشاہ نے اس بارے میں امیر خسرو کو اپنا رازدار بنایا تھا لیکن اپنے مرشدؒ سے رازداری امیر خسرو کو مناسب نہ معلوم ہوئی۔ امیر نے حضرت خواجہؒ سے جا کر عرض کیا کہ کل بادشاہ آپ کی خدمت میں حاضر ہوگا۔ حضرت خواجہ نے یہ سنتے ہی اپنے مرشد کی قبر کی زیارت کی نیت سے اجودھن کا رخ فرمالیا اور روانہ ہوگئے۔ بادشاہ کو جب اسکی اطلاع ملی تو امیر خسروؒ پر ناراض ہوا کہ تم نے میرا راز فاش کر دیا اور حضرت خواجہؒ کی قدمبوسی کی سعادت سے محروم کر دیا۔ امیر خسروؒ نے کہا کہ بادشاہ کی رنجش سے جان جانے کا خوف تھا لیکن مرشدؒ کی رنجش سے سلب ایمان کا خوف تھا۔ بادشاہ حلیم و فرزانہ تھا اس نے اس جواب کو پسند کیا اور خاموش ہوگیا۔

سلطان علاء الدین کا امتحان اور عقیدت

سلطان علاء الدین خلجی جو ہندوستان قدیم کا سب سے باجبروت اور اقبالمند بادشاہ اور سکندر ثانی ہے اپنے چچا جلال الدین کے بعد تخت سلطنت پر بیٹھا۔ ابتدا میں اسکو حضرت خواجہ سے نہ کوئی خاص عقیدت تھی نہ تنفر تھا، بعض لوگوں نے سلطان کو حضرت خواجہ کی طرف سے بدگمان کرنے کی کوشش کی اور ان کی مقبولیت اور رجوع عام سے سلطنت کیلئے خطرات ثابت کئے۔ سلطان علاء الدین نے امتحاناً ایک عریضہ آپ کی خدمت میں اپنے بیٹے اور ولیعہد خضر خاں کے ہاتھ بھیجا جس میں آپ سے انتظام سلطنت کے بارے میں مشورے اور نصائح کی درخواست کی گئی تھی، جب خضر خاں یہ خط لیکر خواجہ کی خدمت میں آیا آپ نے وہ کاغذ ہاتھ میں لے لیا اور اس کا مضمون بھی نہیں پڑھا۔ حاضرین مجلس سے فرمایا کہ ہم دعا کرتے ہیں، اسکے بعد ارشاد ہوا کہ درویشوں کا بادشاہوں سے کیا کام ہے، میں ایک فقیر آدمی ہوں شہر کا ایک گوشہ اختیار کر رکھا ہے، بادشاہ اور مسلمانوں کیلئے دعا گوئی میں مشغول ہوں، اگر اس وجہ سے بادشاہ کو مجھ سے تعرض کرنا ہے میں یہاں سے بھی چلا جاتا ہوں، اللہ کی زمین وسیع ہے سلطان علاء الدین اس جواب سے بہت خوش ہوا، اور کہا کہ میں جانتا تھا کہ حضرت خواجہؒ کو امور سلطنت و سیاست

لہ سیر الاولیاء صفحہ ۱۳۵

کوئی سروکار نہیں، لیکن بدخواہ چاہتے ہیں کہ مجھے مردان خدا سے لڑادیں اور اس طرح ملک تباہ ہو جائے۔[1]

بادشاہ کے آنے سے معذرت

سلطان نے حضرت خواجہؒ سے بڑی معذرت کی اور کہلوایا کہ میں آں مخدوم کا معتقد ہوں، مجھ سے گستاخی ہوئی، معاف کیا جائے اور حاضری کی اجازت دی جائے کہ قدم بوسی کی سعادت حاصل کروں۔ حضرت خواجہؒ نے ارشاد فرمایا کہ: "آنے کی حاجت نہیں، میں غائبانہ دعا کرتا ہوں اور غائبانہ دعا بڑی موثر ہوتی ہے۔"[2]

گھر کے دو دروازے

سلطان نے اس کے بعد بھی ملاقات کیلئے بڑا اصرار کیا۔ حضرت نے فرمایا کہ اس فقیر کے گھر میں دو دروازے ہیں، بادشاہ ایک دروازے سے آئے گا، میں دوسرے دروازے سے باہر چلا جاؤں گا۔[3]

غمِ اسلام

اگرچہ علاء الدین حضرت خواجہؒ کی خدمت میں حاضر نہ ہو سکا، لیکن اس کو آپ سے برابر عقیدت رہی، اور وہ مہماتِ سلطنت اور فکر و تردد کے موقع پر حضرت خواجہؒ سے رجوع کرتا رہا۔ ایسے موقع پر آپ سے دعا کی درخواست کرتا اور آپ اہتمام کے ساتھ دعا فرماتے۔

قاضی ضیاء الدین برنی لکھتے ہیں کہ: جب ملک نائب (کافور) ورنگل کے محاصرے میں مشغول تھا، تلنگانہ کا راستہ پرخطر ہو گیا تھا، راستہ کے تھانے اور چوکیاں سبھی اٹھ گئی تھیں، چالیس روز سے زیادہ ہو گئے تھے کہ لشکر کی سلامتی اور خیریت کی اطلاع سلطان تک نہیں پہنچی تھی، سلطان کو بڑا تردد تھا، اکثر اعیان، امراء و دربار کا خیال ہونے لگا تھا کہ لشکر کسی حادثہ یا فتنہ کی نذر ہو گیا کہ سلسلۂ رسل و رسائل منقطع ہو گیا ہے۔ اسی فکر و تردد کے ایام میں ایک روز سلطان نے ملک قرابیگ اور قاضی مغیث الدین بیانوی کو حضرت خواجہؒ کی خدمت میں بھیجا اور کہلایا کہ لشکرِ اسلام کی خیریت نہ معلوم ہونے سے مجھے سخت تردد ہے

---

[1] سیر الاولیاء ص ۱۳۴ [2] ایضاً ص ۱۳۵ [3] ایضاً ص ۱۳۵

آپ کو اسلام کا غم اور فکر مجھ سے زیادہ ہی ہے، اگر نورِ باطن سے آپ کو لشکر کا کوئی حال معلوم ہو تو مجھے مطمئن و مسرور فرمائیں، سلطان نے پیغام لے جانے والوں کو ہدایت کی کہ حضرتؒ کی زبان سے اس موقع پر جو کچھ نکلے اس کو محفوظ رکھیں، اس میں کوئی کمی بیشی نہ کریں۔ وہ دونوں حضرات شیخؒ کی خدمت میں حاضر ہوئے سلطان کا پیغام پہنچایا، آپ نے پیغام سننے کے بعد بادشاہ کی فتح و نصرت کا حال بیان کرنا شروع کیا اور فرمایا کہ "یہ فتح کیا ہے، ہم اور فتوحات کی بھی امید رکھتے ہیں"۔ یہ سنکر ملک قرابیگ اور قاضی مغیث الدین شادمان فرحاں واپس آئے اور سلطان کو جواب سُنایا، سلطان یہ جواب سنکر بہت خوش ہوا، اس کو یقین ہو گیا کہ ورنگل فتح ہو چکا ...... اسی روز نمازِ عصر سے فارغ ہوئے تھے کہ ملک نائب کے قاصد پہنچے اور ورنگل کا فتح نامہ لائے، جمعہ کے دن وہ فتح نامہ منبروں پر سے پڑھکر سنایا گیا، صحن میں خوشی کا نقارہ بجا اور خوشیاں منائی گئیں، سلطان کا اعتقاد اور بڑھ گیا۔[1]

ایک دوسری مرتبہ جب مغل دہلی پر حملہ آور ہوئے، سلطان بنفس نفیس جنگ میں شریک تھا، اس نے حضرت خواجہؒ کی خدمت میں عرض کروایا کہ یہ بڑا اہم موقع ہے آپ متوجہ رہیں، حضرت خواجہ نے تمام اہلِ خانقاہ سے ارشاد فرمایا کہ: متوجہ الی اللہ رہیں اور خدا سے مسلمانوں کی فتح کی دعا کریں، چنانچہ سب مشغول رہے اور تھوڑے ہی عرصہ میں فتح کی خبر آئی، مغلوں نے شکستِ فاش کھائی۔[2]

قاضی ضیاء الدین سلطان علاء الدین کے اہلِ دربار میں سے تھے، کہتے ہیں کہ: اپنے پورے عہدِ حکومت میں کبھی سلطان کی زبان سے حضرت خواجہؒ کے بارے میں کوئی خلافِ شان بات نہیں نکلی۔ اگرچہ دشمن اور حاسدین شیخؒ کی شاہانہ داد و دہش، رجوعِ خلائق اور شاہی لنگر کو سلطان سے رنگ آمیزی اور ایسے طریقے پہ بیان کرتے کہ سلطان بدگمان ہو جائے، لیکن سلطان نے کبھی اس کی طرف التفات نہیں کیا اور خاص طور پر اپنے آخر عہد میں اسکو حضرتؒ سے غایت درجہ کا اخلاص و اعتقاد پیدا ہو گیا تھا، اس کے باوجود کبھی ملاقات کی نوبت نہ آئی

---

[1] تاریخ فیروز شاہی صـ ۳۳۳ [2] سیر الاولیاء صـ ۱۶۰

سلطان قطب الدین کی مخالفت اور اسکا قتل

سلطان علاء الدین کے دوسرا بیٹا قطب الدین مبارک شاہ ولی عہد سلطنت خضر خاں کو محروم کر کے غاصبانہ تخت سلطنت پر بیٹھا۔

"خضر خاں چونکہ حضرت والا کا مرید تھا اور وہی علاء الدین کا ولی عہد تھا جس سے قطب الدین نے حکومت غصب کی تھی، اس لئے قطب الدین حضرتؒ سے بھی ناراض رہتا تھا، اس نے اپنی ایک نئی جامع مسجد "جامع میری" کے نام سے بنوائی تھی اور تمام مشائخ وعلماء کو حکم تھا کہ اسی میں آکر نماز جمعہ ادا کریں۔ سلطان المشائخ نے کہلا بھیجا کہ: "ما مسجد نزدیک داریم و ایں احق است ہمیں جا خواہیم گزار" (ہمارے قریب ایک مسجد ہے اس کا حق زیادہ ہے، ہم وہیں نماز پڑھیں گے) اور وہ جامع میری نہیں گئے۔ بادشاہ سخت برافروختہ ہوا۔ اسی کے ساتھ ہر نوچندی کو اعیان اور مشاہیر شہر میں دربار شاہی میں پیش ہو کر نذر گزارتے تھے، سلطان المشائخ اس تقریب میں بھی شریک نہیں ہوتے تھے، ادائے رسم کیلئے اپنے خادم اقبال کو بھیج دیتے تھے اس سے بھی وہ برہم تھا، اس نے اپنے تمام امراء و وزراء کو حکم دیا کہ:۔۔۔

"کسے بزیارت شیخ غیاث پور نہ رود"

(کوئی شیخ کی زیارت کے لئے غیاث پور نہ جائے)

امیر خسروؒ نے لکھا ہے کہ:۔ "بارہا می گفت کہ ہر کہ سر شیخ برد ہزار تنکا او رادہم" (جو شیخ کا سر لائے گا اس کو ہزار تنکہ دوں گا) ایک روز شیخ ضیاء الدین رومی کی درگاہ میں سلطان جی اور قطب الدین کا آمنا سامنا بھی ہو گیا، سلطان جی نے بحیثیت ایک مسلمان ہونے کے سلام کیا، قطب الدین نے جواب نہ دیا۔ یوں

مسلسل واقعات قطب الدین کی حکومت کے چار سالہ مدّت میں پیش آتے رہے۔[1]

نوحیندی کی حاضری پر اصرار کا قصّہ سب سے آخر میں پیش آیا۔ قطب الدین نے بھرے دربار میں اعلان کیا کہ: "اگر در غرۂ ماہ آئندہ نیامد بیارم چنانکہ دانیم" گویا کہ یہ اسکی دھمکی تھی کہ بزور حکومت دربار میں گھسٹوا کر بلواؤں گا۔ شاید قتل ہی کا ارادہ ہو۔ سلطان جی کو بادشاہ کے اس عزم مصمم کی خبر پہنچی۔ سلطان المشائخ ہیچ نگفت۔ اب مہینہ ایک ایک دن کر کے ختم ہوتا جا رہا تھا۔ "ہر چند ماہ نزدیک رسید التفات مخلصاں را روئے بتیزی می داد" (مہینہ جتنا نزدیک آ رہا تھا اہل تعلق کا فکر و تردد بڑھتا جا رہا تھا) چاند مغرب کے بعد دیکھا گیا، کل پہلی تاریخ ہے، شہر کے اعیان وامرار دربار میں جائیں گے، لیکن سلطان المشائخ یہی طے کئے ہوئے ہیں کہ میں نہیں جاؤں گا۔ قطب الدین یہ فیصلہ کئے ہوئے ہے کہ:- اگر نیامد بیارم چنانکہ دانیم"۔ "صرف شب درمیان است۔" دلّی میں کھلبلی مچی ہوئی ہے، دُنیا اور دین کے دو بادشاہوں کا کل معرکہ ہے۔ رات گذرنے بھی نہ پائی کہ: "ہم دریں شب ماہ بلائے از آسمان بر جان بادشاہ نازل شد" (اسی شب ماہ میں بادشاہ کی جان پر آفتِ آسمانی نازل ہوئی) یعنی "خسرو خاں موئے سر سلطان را گرفت و باہم درآویختند پہلوئے سلطان را بہ خنجر شگافتہ بر زمین انداخت و سر آں مشئوم را از تن جدا کردہ از بام ہزار ستون بزیر افگند" (طباطبائی) خسرو خاں نے بادشاہ کے سر کے بال پکڑے، دونوں باہم دست و گریبان ہوئے۔ خسرو خاں نے سلطان کے پہلو کو خنجر سے چیر کر زمین پر ڈال دیا اور اس شامت زدہ کا سر تن سے جدا

---

[1] نظام تعلیم صفحہ ۲۲

کر کے بام ہزار ستون سے نیچے زمین پر پھینک دیا۔"[1]

غیبی لنگر

اسی زمانہ میں جب سلطان قطب الدین کی طرف سے اس بات کی خاص روک تھام تھی کہ امراء دربار اور اعیان سلطنت کی طرف سے حضرت خواجہ کی خدمت میں کوئی نذر پیشکش نہ ہونے پائے، تاکہ دیکھا جائے کہ یہ شاہانہ لنگرخانہ کس طرح چلتا ہے، آپنے خاص طور پر تاکید فرما رکھی تھی کہ اس زمانہ میں کھانا زیادہ پکایا جائے اور دسترخوان وسیع سے وسیع تر کر دیا جائے۔ حضرت شیخ نصیر الدین چراغ دہلیؒ نے فرمایا:-

"ایک بار سلطان قطب الدین کو کسی بدخواہ نے کہا کہ شیخ ہماری فتوحات قبول نہیں کرتے اور امراء و سرداروں کی لائی ہوئی فتوحات قبول کرتے ہیں، آخر وہ سب بھی تو آپ ہی کے یہاں سے لے جاتے ہیں۔ سلطان قطب الدین نے یہ بات سچ جان کر حکم کیا کہ: کوئی امیر یا

---

[1] نظام تعلیم و تربیت ص۳۳ سیر الاولیاء میں یہ واقعہ منقول ہے۔ مگر تاریخ و ماہ و سنہ درج نہیں ص۱۵۰ و ص۱۵۱ تاریخ فرشتہ جلد اول میں بضمن تذکرۂ سلطان قطب الدین سلطان کے قتل کی تاریخ شب پنجم ربیع الاول ۷۲۱ھ مذکور ہے جسکے ساتھ نوحیندی کے سلام کی روایت اور چاندرات میں بادشاہ کے قتل کا واقعہ میل نہیں کھاتا (ص۱۲۳)۔ پھر اسی کتاب کی جلد دوم میں جہاں حضرت سلطان المشائخ کا تذکرہ ہے وہاں سلطان کے قتل کی تاریخ ۲۹ شوال لکھی ہے اور سنہ کا تذکرہ نہیں (ص۴۰۰ و ص۴۰۱ جلد ۲) لیکن اس سلسلہ میں سب سے قدیم تر اور قابل اعتماد ماخذ امیر خسروؒ کی مثنوی "تغلق نامہ" ہے، جو سلطان غیاث الدین تغلق کے عہد کی تصنیف اور امیرؒ کی مستند اور مشہور مثنوی ہے۔ اس میں انھوں نے نہایت صراحت سے لکھا ہے کہ: قطب الدین کا قتل جمادی الثانی ۷۲۰ھ کی عین چاندرات کو واقع ہوا۔ وہ فرماتے ہیں ؎

چوں تاریخ عرب شد ہفتصد و بیست ثبات قطب شد کم جانب زیست

جمادی دومیں را شد پدیدار ہلال تیرہ و تاریک دیدار

مہ باریک بود از حالت تلخ بناخن کردہ خود را بیش از اں سلخ

شد آں مہ بہ ہمہ گیہاں مبارک مگر بر طالع سلطاں مبارک

(تغلق نامہ ص۱۹ طبع حیدرآباد)

ان اشعار سے تاریخ کا بھی صحیح تعین ہو گیا اور واقعہ کی نوعیت و اہمیت کی بھی تصدیق ہو گئی۔ ۱۲-

سردار شیخ کے یہاں نہ جاوے، دیکھو وہ اس قدر دعوت لوگوں کی کہاں سے کرتے ہیں اور جاسوس مقرر کئے کہ دیکھتے رہیں جو امیر وہاں جاوے مجھے آکر اطلاع کریں۔ جناب شیخ نے سنا فرمایا۔ کھانا آج سے زیادہ پکایا جاوے' ایک مدت بعد سلطان نے لوگوں سے دریافت کیا کہ خانقاہ شیخ کا کیا حال ہے؟ انھوں نے عرض کی کہ سابق جسقدر پکتا تھا اب اس سے دوگنا پکتا ہے بادشاہ یہ سنکر پشیمان ہوا کہا میں غلطی پر تھا، آپ کا معاملہ عالم غیب سے ہے لہ"

غیاث الدین تغلق کا عہد اور سرکاری مجلس مناظرہ

قطب الدین مبارک شاہ کے بعد چند مہینے خسرو خاں نے غاصبانہ سلطنت کی اور شعائر اسلام کو سرنگوں کرکے اسلام کی تذلیل کی۔ بسنہ ۷۲۱ھ میں غیاث الدین تغلق (ملک غازی) نے خسرو خاں کو قتل کرکے تغلق خاندان کی سلطنت کی بنیاد ڈالی۔ سلطان غیاث الدین اگرچہ صاحب علم نہ تھا لیکن شریعت اور علماء کا احترام کیا کرتا تھا۔ حضرت خواجہ سماع سنتے تھے انکی وجہ سے دہلی میں اس کا عام ذوق اور رواج ہوگیا تھا۔ ایک شخص شیخ زادہ حسام الدین فرجام نامی جو ایک عرصہ تک حضرت خواجہ کے سایہ عاطفت میں رہا تھا اور باوجود مجاہدوں کے ذوق و شوق اور عشق کی دولت سے فیضیاب نہیں ہو سکا تھا نیز قاضی جلال الدین الولوالجی نائب حاکم مملکت کو بھی اہل درد و محبت سے ایک طرح کی کد تھی۔ قاضی صاحب اور دوسرے علماء نے شیخ زادہ حسام کو آمادہ کیا اور اس نے بادشاہ کو متوجہ کیا کہ خواجہ نظام الدین مقتدائے زمانہ ہیں اور وہ سماع سنتے ہیں جو امام اعظمؒ کے مذہب میں حرام ہے اور ان کی وجہ سے ہزارہا مخلوق اس فعل ممنوع کا ارتکاب کرتی ہے، سلطان اس مسئلہ سے بے خبر تھا' اسکو تعجب ہوا کہ ایسے بزرگ جو مقتدائے عالم ہیں

لہ خیر المجالس ماخوذ از ترجمہ ص۲۰۳ ٹہ سماع کی حقیقت، اغراض و مقاصد اور اسکے آداب و احکام کی بحث چوتھے باب "اذواق و کیفیات" میں ملاحظہ ہو۔ ۱۲

ایسا نامشروع کام کیسے کرتے ہیں۔ لوگوں نے سماع کی حلت کے فتوے اور کتب شرعیہ کی روایات بادشاہ کے سامنے پیش کیں، بادشاہ نے کہا کہ چونکہ علمائے دین نے سماع کی حرمت کا فتویٰ دیا ہے اور وہ اسکو منع کرتے ہیں اسلئے حضرت خواجہ اور تمام علمائے شہر اور صدور واکابر کو طلب کیا جائے اور ایک مجلس منعقد کی جائے تاکہ یہ تحقیق ہو جائے کہ حق کیا ہے۔ میر خورد کی زبان سے اسکی تفصیل سنئے:۔

"قصر شاہی میں حضرت خواجہؒ کی طلبی ہوئی۔ حضرت خواجہؒ قاضی محی الدین کاشانی اور مولانا فخر الدین زرادی کی معیت میں کہ دونوں سرآمد علماء اور اساتذۂ وقت تھے محل میں تشریف لے گئے۔ پہلے قاضی جلال الدین نائب حاکم نے حضرت خواجہؒ کو وعظ و نصیحت شروع کی اور نامناسب طریقے پر آپ سے خطاب کیا، یہاں تک کہا اگر اسکے بعد آپنے سماع کی حلت کا دعویٰ کیا اور سماع سنا تو میں حاکم شرع ہوں، میں آپ کو سزا دوں گا۔ یہ سنکر حضرت خواجہؒ کو جلال آگیا اور فرمایا کہ:۔ جس منصب کے بھروسہ پر تم یہ بات کہہ رہے ہو اس سے معزول ہو جاؤ گے۔ چنانچہ ٹھیک بارہ روز بعد قاضی اپنے منصب سے معزول ہو کر دہلی سے روانہ ہو گئے۔ خلاصہ یہ کہ اس مجلس مباحثہ میں تمام علماء واکابر صدور و امراء اور ارکانِ سلطنت حاضر تھے بادشاہ اور سب حاضرینِ مجلس کی توجہ حضرت خواجہ کی طرف تھی اور سب آپ کی تعظیم کرتے تھے۔ شیخ زادہ حسام نے کہا کہ آپ کی مجلس میں سماع ہوتا ہے، لوگ رقص کرتے ہیں، آہ و نعرہ لگاتے ہیں، اسی طرح اور بہت سی باتیں کہیں، حضرت خواجہ نے شیخ زادہ کی طرف دیکھا اور فرمایا، مشورہ مت کرو، زیادہ بولنے کی ضرورت نہیں پہلے یہ بتلاؤ سماع کی تعریف کیا ہے؟ شیخ زادہ حسام نے کہا کہ میں نہیں جانتا، البتہ اتنا جانتا ہوں کہ علماء سماع کو حرام کہتے ہیں۔ حضرت خواجہؒ نے فرمایا کہ: جب

تم کو سماع کے معنی ہی نہیں معلوم تو مجھے تم سے کچھ کہنا نہیں ہے اور نہ کہنا چاہیئے شیخ زادہ حسام شرمندہ ہوا، بادشاہ پوری توجہ سے آپ کی تقریر سن رہا تھا، جب کوئی ندر سے بات کرتا تو کہتا کہ شور مت کرو، سنو کہ شیخ کیا فرماتے ہیں۔ حاضر الوقت علماء میں مولانا حمید الدین اور مولانا شہاب الدین ملتانی خاموش تھے مولانا حمید الدین نے اتنا فرمایا کہ یہ مدعی حضرت خواجہ کی مجلس کا جو حال بیان کرتے ہیں یہ واقعہ کے خلاف ہے۔ میں نے خود دیکھا ہے اور بہت سے مشائخ اور درویشوں کو بھی میں نے دیکھا ہے ۔ اسی دوران میں شیخ الاسلام شیخ بہاء الدین زکریا ملتانیؒ کے نواسے مولانا علم الدین آگئے۔ بادشاہ نے ان سے کہا کہ آپ بھی عالم ہیں اور سیاح بھی، اس وقت سماع کی بحث درپیش ہے، میں آپ سے پوچھتا ہوں کہ سماع سننا حرام ہے یا حلال؟ مولانا علم الدین نے کہا کہ میں نے اس باب میں ایک رسالہ تصنیف کیا ہے، اس میں اس کی حرمت و حلت کے دلائل نقل کئے ہیں۔ تحقیق یہ ہے کہ جو دل سے سنتے ہیں ان کے لئے حلال ہے اور جو نفس سے سنتے ہیں ان کے لئے حرام۔ اس کے بعد بادشاہ نے مولانا علم الدین سے پوچھا کہ آپ بغداد و شام و روم ہر جگہ پھر چکے ہیں، وہاں کے مشائخ سماع سنتے ہیں یا نہیں؟ اور وہاں کوئی منع کرتا ہے؟ مولانا علم الدین نے فرمایا کہ:۔ ان سب شہروں میں بزرگ و مشائخ سماع سنتے ہیں اور بعض دف و شبانہ کے ساتھ بھی، کوئی مانع نہیں ہوتا اور سماع مشائخ کے درمیان حضرت جنیدؒ و شبلیؒ کے وقت سے مروّج چلا آرہا ہے، بادشاہ مولانا علم الدین کی زبان سے یہ سن کر خاموش ہو گیا اور اس نے کچھ نہیں کہا۔ مولانا جلال الدین نے عرض کیا کہ بادشاہ

سماع کی حرمت کا فرمان صادر کریں اور امام اعظمؒ کے مذہب کی پاسداری فرمائیں۔ اس پر حضرت خواجہؒ نے بادشاہ سے کہا کہ میں چاہتا ہوں کہ آپ اس بارے میں کوئی فرمان جاری نہ کریں، بادشاہ نے آپ کا یہ مشورہ قبول کیا اور اس بارے میں کوئی فیصلہ صادر نہیں کیا۔ مولانا فخرالدین (جو مجلس میں حاضر تھے) کا بیان ہے کہ ابتدائے چاشت سے زوال تک یہ بحث جاری رہی، اہلِ مجلس تحریم کی کوئی دلیل نہیں دے سکے اور آخر میں اس پر بحث آکر ختم ہوگئی کہ اس کا ترک اولیٰ ہے یا اس کا فعل۔ دوسری روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ بادشاہ نے فیصلہ کیا کہ حضرت خواجہؒ سماع سن سکتے ہیں اور کسی کو ان کے منع کرنے کی اجازت نہیں، لیکن یہ روایت مرجوح ہے۔ انھیں دنوں میں کسی نے حضرت خواجہؒ سے کہا کہ اب تو سماع کے لئے فرمانِ سلطانی ہوگیا ہے کہ آپ جس وقت چاہیں سماع سنیں وہ حلال ہے۔ حضرت خواجہؒ نے فرمایا کہ اگر وہ حرام ہے تو کسی کے کہنے سے حلال نہیں ہوسکتا اور اگر حلال ہے تو کسی کے کہنے سے حرام نہیں ہوسکتا۔ مجلس کے اختتام پر بادشاہ نے خواجہ کو بڑی تعظیم و تکریم کے ساتھ رخصت کیا۔[۱]"

مجلس مناظرہ کا حال حضرت خواجہ کی زبان سے

قاضی ضیاءالدین برنی اپنی کتاب "حسرت نامہ" میں لکھتے ہیں کہ:۔ جب حضرت خواجہ اس مجلس سے فارغ ہوکر مکان پر تشریف لائے تو آپ نے نمازِ ظہر کے وقت مولانا محی الدین کاشانی

---

[۱] سیر الاولیاء، باختصار ص۵۲۷ تا ص۵۳۲

اور امیر خسرو کو طلب فرمایا، ارشاد ہوا کہ دہلی کے علماء عداوت و حسد سے بھرے ہوئے تھے، انھوں نے وسیع میدان پایا، اور دشمنی کی بہت سی باتیں کیں، عجائب بات یہ دیکھی کہ صحیح احادیث نبویہ کا سننا ان کو گوارا نہیں، ان کے جواب میں یہی کہتے تھے کہ ہمارے شہر میں فقہ پر عمل حدیث پر مقدم ہے، یہ باتیں وہی کہہ سکتے ہیں جن کا احادیث نبویہ پر اعتقاد نہ ہو، میں جب کوئی حدیث صحیح پڑھتا تو وہ ناراض ہوتے اور کہتے تھے کہ اس حدیث سے امام شافعی استدلال کرتے ہیں اور وہ ہمارے علماء کے دشمن ہیں، ہم نہیں سنیں گے، معلوم نہیں کہ یہ با اعتقاد ہیں یا نہیں، اولوالامر کے سامنے ایسی زبردستی سے کام لیتے تھے، اور احادیث صحیح کو روکتے تھے، میں نے کوئی عالم ایسا دیکھا نہ سنا کہ اسکے سامنے احادیث صحیحہ پڑھی جائیں اور وہ کہے کہ میں نہیں سنتا، میں نہیں سمجھتا کہ یہ کیا قصہ ہے اور وہ شہر جہاں ایسی جرأت اور زبردستی کی جاتی ہے وہ کیسے آباد رہ سکتا ہے، تعجب نہیں کہ اگر اس کی اینٹ سے اینٹ بج جائے اس کے بعد بادشاہ اور امراء اور عوام جب قاضی شہر اور علماء شہر سے یہ سنیں گے کہ اس شہر میں حدیث پر عمل نہیں ہوتا تو ان کا حدیث نبوی پر اعتقاد کیسے رہیگا۔ مجھے ڈر ہے کہ علماء شہر کی اس بدعقیدگی کی نحوست سے آسمان سے بلا و جلاء و قحط و وبا نہ برسے[1]

دہلی کی تباہی

اس واقعہ کے ٹھیک چھٹے سال حضرت خواجہ کی وفات کے بعد سلطان غیاث الدین تغلق کے فرزند اور جانشین محمد تغلق نے دلی کو بالکل خالی کر دینے اور دیوگیر (دولت آباد) منتقل ہو جانے کا فرمان جاری کیا اور اس میں ایسی ضد اور عجلت سے کام لیا کہ حقیقتاً شہر کی اینٹ سے اینٹ بج گئی اور دلی سا گلزار و آباد شہر جس میں پہلے رہنے کو جگہ نہیں ملتی تھی ایسا خالی ہوا کہ سوائے جنگلی جانوروں اور درندوں کے وہاں کسی متنفس کی شکل نظر نہیں آتی تھی۔

محمد قاسم تاریخ فرشتہ میں لکھتا ہے:-

---

[1] سیر الاولیاء ص ۵۲۷، ص ۵۳۲

احدے از مردم دہلی را کہ آب و ہوائے	کارپردازن حکومت نے کسی ایک شخص کو
آں جا خوگرفتہ بودند، بحال خود	بھی جو دہلی کی آب و ہوا کا خوگر تھا اپنی
نگذاشتہ طراً بدولت آباد فرستاد	جگہ نہیں چھوڑا، سب کو کابتّہ دولت آباد
و دہلی بنوعے ویراں گشت کہ آواز	روانہ کر دیا بھیج دیا اور دہلی اس طرح ویران
ہیچ متنفس بجز شغال و روباہ جانوراں	ہوئی کہ کسی ایک جاندار کی آواز بھی سوائے گیدڑ
صحرائی بگوش نمی رسید[۱]	لومڑی اور جنگلی جانوروں کے کان میں نہیں آتی تھی

وہ تمام علماء جو اس مجلس میں موجود تھے اور دوسرے بھی ان کی بدولت دولت آباد جلاوطن ہوئے، دولت آباد پہنچے تو وہاں سخت قحط اور وبا کا سامنا کرنا پڑا، ہزاروں راستہ میں لقمۂ اجل بن گئے اور ہزاروں وہاں پہنچ کر قحط اور بیماریوں کا شکار ہوئے اور حضرت خواجہؒ کی پیشین گوئی حرف بحرف پوری ہوئی۔

نظام الاوقات

امیر خورد نے حضرت خواجہ کا نظام الاوقات اس طرح لکھا ہے:۔
"روزہ افطار کرنے کے بعد (جو اہل جماعت کے ساتھ ہوتا تھا) اپنے بالاخانہ کے قیامگاہ پر تشریف لے جاتے تھے۔ احباب خدام جو شہر اور اطراف سے آئے ہوتے تھے مغرب و عشاء کے درمیان اوپر ہی بلا لئے جاتے تھے۔ ایک گھڑی وہاں ہم نشینی اور ملاقات کا شرف حاصل ہوتا، ہر قسم کے تر و خشک میوے اور کھانے پینے کی لطیف و لذیذ چیزیں حاضر کی جاتی تھیں، حاضرین مجلس تناول کرتے، آپ ہر ایک کی دلداری فرماتے اور خیریت و حالات دریافت فرماتے"[۲]

امیر خسرو کی خصوصیت

عشاء کی نماز پڑھنے کے لئے پھر نیچے تشریف لاتے، جماعت کے ساتھ نماز پڑھکر پھر بالاخانہ پر تشریف لیجاتے، کچھ دیر مشغول

---

[۱] تاریخ فرشتہ (جلد اوّل) ص ۲۴۳   [۲] سیر الاولیاء ص ۱۲۵

رہتے پھر آرام کرنے کے لئے چارپائی پر تشریف لیجاتے، اس وقت خدام تسبیح لاکر آپ کے ہاتھ میں دیتے، اس وقت سوائے امیر خسروؒ کے کسی کو آنے کی ہمت نہ ہوتی تھی[1]، وہ سامنے بیٹھ کر ہر طرح کے قصے اور باتیں کرتے، آپ پسندیدگی میں سر مبارک کو حرکت دیتے، وقتاً فوقتاً ارشاد ہوتا کہ ترک کیا خبر ہے؟ امیر خسروؒ اتنی بات سنکر طویل گفتگو کا موقع نکال لیتے، اگر آپ ایک نکتہ پوچھتے تو وہ ساری داستان سناتے[2]، اس موقع پر بعض کم سن اعزہ اور بعض پروردہ جو صاحب خانہ تھے حاضر ہوتے اور قدمبوسی کرتے۔ ؎

نخفت خسروؔ مسکیں ازیں ہوس شبہا
کہ دیدہ برکفِ پایت نہد بخواب شود

شب کی تیاری

جب امیر خسروؔ اور صاحبزادگان اجازت لیکر رخصت ہوتے تو اقبال خادم آتے اور پانی کے بھرے ہوئے چند آفتابے آپ کے وضو کیلئے رکھ کر باہر چلے جاتے، اس کے بعد حضرت خواجہ خود اٹھتے اور دروازہ کو زنجیر لگاتے، پھر وہاں کی خبر اللہ کے سوا کسی کو نہیں، خدا ہی جانتا ہے کہ تمام رات کیا راز و نیاز ہوتے اور اپنے مالک سے کیا ذوق و شوق کی

---

[1] امیر خسروؔ کو حضرت خواجہؒ سے جو والہانہ و عاشقانہ تعلق تھا وہ انکے سوانح اور دیوان سے معلوم ہوتا ہے، بلبل کو گل سے اور پروانہ کو شمع سے جو تعلق ہوتا ہے، اسی طرح کا تعلق امیر خسروؔ کو اپنے مرشد سے تھا، حضرت خواجہ کو بھی اس عاشق صادق سے ایسا تعلق تھا کہ فرماتے تھے کہ: "من از ہمہ تنگ آیم و از تو تنگ نیایم"، مجھے بعض اوقات ہر ایک سے وحشت ہونے لگتی ہے لیکن اس حالت میں بھی تم سے نہیں ہوتی، مزید برآں ایک بار فرمایا: "از ہمہ کس تنگ آیم تا حدے کہ از خود تنگ آیم و از تو تنگ نیایم" بعض اوقات اپنے سے بھی اکتانے لگتا ہوں مگر تم سے نہیں اکتاتا (سیر الاولیاء ص۳۰۲) ایک بار ارشاد فرمایا کہ ایک شخص نے مجھ سے کہا کہ آپ امیر خسروؔ کو جس نظر سے دیکھتے ہیں ایک بار وہ نظر محمد پر ڈال دیجئے، میں نے اس کو تو کوئی جواب نہیں دیا لیکن میرے دل میں آیا کہ اس سے کہوں کہ وہ قابلیت تو لاؤ (ص۳۰۲) ۱۲

[2] بحرفے می تواں گفتن تمنائے جہانے را — من از شوق حضوری طول دادم داستانے را

باتیں ہوتیں۔ حضرت خواجہؒ کے ہاتھ کے لکھے ہوئے یہ دو شعر دیکھے ہیں جو بالکل حسب حال ہیں۔ ؎

تنہا منم و شب و چراغی مونس شدہ تا پگاہ روزم

کاہش ز آہ سرد بکشتم گاہ از تف سینہ بر فروزم

کبھی کبھی یہ شعر بھی آپ کی زبانِ مبارک سے سنا گیا ہے اور حکایتِ حال ہے۔ ؎

بارے بہ تماشائے من و شمع بیا

کز من دمکے نماند و از وے دودے

سحری سحر کا وقت ہوتا تو خادم آتا اور باہر سے دروازہ پر دستک دیتا۔ حضرت خواجہ دروازہ کھول دیتے سحری جس میں ہر قسم کی چیزیں ہوتیں سامنے رکھتا، آپ اس میں سے بہت کم تناول فرماتے، باقی کیلئے ارشاد ہوتا کہ بچوں کے لئے حفاظت سے رکھ لو۔ خواجہ عبدالرحیم جن کے ذمہ سحر کا لے جانا تھا بیان کرتے ہیں کہ اکثر ہوتا کہ حضرت خواجہ سحری میں سے کچھ نہ کھاتے، میں عرض کرتا کہ حضرت الافطار کے وقت بھی بہت کم کھاتے ہیں اگر سحری بھی کچھ نہ کریں گے تو ضعف بہت بڑھ جائیگا، اس پر گریہ فرماتے اور کہتے کہ کتنے غریب اور بیکس مسجدوں کے کونوں اور چبوتروں پر بھوکے پڑے ہوئے ہیں اور فاقہ سے رات گذار دیتے ہیں، یہ کھانا میرے حلق سے کیسے اتر سکتا ہے چنانچہ اکثر ایسا ہوتا کہ سحری میں جیسی لاتا ویسی ہی اٹھا کر لے جاتا۔

صبح کے وقت جب دن ہوتا جس کی جمال مبارک پر نظر پڑتی دیکھتا کہ کھلی ہوئی مستی ہے اور آنکھیں بیداری سے سرخ ہیں، ایسے شدید مجاہدوں سے بھی آپ کے اندر کوئی ضعف نظر نہ آتا اور آپ کی کسی ہیئت میں جو آپ کی معمول تھی تغیر نہ ہوتا۔ کوئی کہہ نہیں سکتا تھا کہ آپ چار سو یا پانچ سو رکعت نماز پڑھتے ہیں یا اتنی تسبیح کا معمول ہے۔ عمر عزیز ان باطنی مشغولیتوں میں گذرتی جن کا حال اللہ کے سوا کسی کو معلوم نہیں اور دلجوئی اور قلوب کے تفقد و دریافت میں مشغول رہتے، جس سے افضل کوئی کام نہیں۔ ع

"دل بدست آور کہ حجِ اکبر است"

دن میں | دن میں تمام روز اپنے مشائخ کے سجادہ پر قبلہ رو باطنی طور پر مشغول، مُتَوَجِّهًا اِلَی اللّٰہ تعالیٰ کَاَنَّہٗ یَنْظُرُ اِلَیْہِ (اللہ کی طرف متوجہ ہو کر گویا وہ روبرو ہے) بیٹھ کر گذار دیتے۔ آنے والوں میں مختلف طبقوں کے لوگ ہوتے، علماء و مشائخ، صدور و اکابر، وضیع و شریف ہر ایک کے علم و مرتبہ کے مطابق جس کا جو فن ہوتا اسی میں اس سے گفتگو کرتے اور اس کی دلجوئی فرماتے ظاہری طور پر ان میں مشغول ہوتے اور باطن میں پورے طور پر مشغول بحق ہوتے[1]

دلداری و تربیت | نماز ظہر کا وقت ہوتا، نماز ادا کرنے کے بعد جو عزیز قدمبوسی کے لئے آئے ہوئے ہوتے ان کو طلب فرمایا جاتا اور ان سے گفتگو و دلداری میں کچھ وقت گذرتا عبادات و سلوک و محبّت الٰہی کے بارے میں ان کی رہنمائی کی جاتی، اکابر علماء و صلحاء کی (جو اس مجلس میں حاضر ہوتے) ہمّت نہ ہوتی کہ سر اٹھا کر چہرۂ مبارک کو دیکھتے، ایسا رعب اور من جانب اللہ عظمت تھی کہ آپ کے چہرے پر نظر کرنا مشکل تھا۔

قربِ سفر | عمر مبارک جب اسّی سے متجاوز ہوئی تو سفر آخرت کے آثار نمایاں ہوئے ایک روز ارشاد فرمایا کہ:۔ میں نے خواب میں حضرت سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت کی۔ ارشاد ہوا:۔ نظام ہم کو تمہارا بڑا اشتیاق ہے[2]۔

خلفائے کبار کو اجازت نامے اور ان کی محبّت و مواخات | بیماری کے دوران میں آپ نے متعدد حضرات کو خلافت عطا فرمائی اور اجازت نامے لکھ کر دیئے۔ مولانا فخر الدین زرادی نے

---

[1] سیر الاولیا ص ۱۲۵ و ص ۱۲۹ [2] ایضاً ص ۱۴۱

ان کا مضمون مرتب کیا، اور سید حسین کرمانی نے ان کی کتابت کی، آپ نے ان پر اپنے دستخط مبارک ثبت کئے، دستخط کے الفاظ یہ تھے :۔ "من الفقیر محمد بن احمد بن علی البداؤنی البخاری" ان اجازت ناموں پر ۲۰ ذی الحجہ ۷۲۴ھ درج ہے، گویا یہ وفات سے تین مہینے ۲۷ دن پہلے لکھے گئے ہیں۔[1]

جن حضرات کیلئے یہ اجازت نامے تھے ان کو جہاں جہاں وہ تھے پہنچا دیئے گئے، جو حضرات موجود تھے ان کو بلا کر خود عطا کئے گئے۔ پہلے شیخ قطب الدین منور کی طلبی ہوئی، سلطان المشائخؒ نے خلعت خلافت عطا فرمایا اور وصیت فرمائی، اجازت نامہ ان کو مرحمت ہوا اور ارشاد ہوا کہ جاؤ دوگانہ ادا کرو۔ دوستوں نے مبارکباد دی، اسی دوران میں شیخ نصیر الدین محمود (چراغ دہلی) کو یاد فرمایا گیا، ان کو بھی خرقۂ خلافت اور اجازت نامہ عطا ہوا اور وصیت فرمائی گئی۔ شیخ نصیر الدین محمود ابھی کھڑے ہوئے تھے کہ شیخ قطب الدین منور کی دوبارہ طلبی ہوئی، وہ آئے تو ارشاد ہوا کہ شیخ نصیر الدین محمود کو خلافت کی مبارکباد دو، پھر شیخ نصیر الدین سے ارشاد ہوا کہ شیخ منور کو مبارکباد دو، دونوں نے ایک دوسرے کو مبارکباد دی، پھر دونوں کو ایک دوسرے سے بغلگیر ہونے کا حکم ہوا، پھر فرمایا کہ تم دونوں بھائی بھائی ہو، تقدیم و تاخیر کا کچھ خیال نہ کرنا۔[2]

وفات کا حال

وفات سے ۴۰ روز پیشتر استغراق و تحیر کی کیفیت پیدا ہو گئی۔ امیر خورد نے تفصیل سے وفات کا حال لکھا ہے، ان کا بیان ہے :۔

"جمعہ کا دن تھا، سلطان المشائخؒ پر ایک کیفیت تھی، نور تجلی سے ان کا باطن منور معلوم ہو رہا تھا، نماز کے اندر بار بار سجدے فرماتے تھے۔ اسی حالت تحیر میں مکان تشریف لائے، گریہ میں ترقی ہو گئی۔

---

[1] حضرت خواجہؒ کی وفات ۱۸ ربیع الآخر ۷۲۵ھ کو ہوئی

[2] سیر الاولیاء، صفحہ ۲۳۰ و صفحہ ۲۳۱ و صفحہ ۲۳۲ و صفحہ ۲۴۸ و صفحہ ۲۴۹

روزانہ کئی کئی بار غیوبت و استغراق ہوجاتا تھا، پھر توجہ ہوجاتی تھی، یہی فرماتے تھے کہ آج جمعہ کا دن ہے، دوست کو دوست کا وعدہ یاد آتا ہے اور وہ اس کیفیت میں غرق ہوجاتا ہے۔ اس حالت میں دریافت فرماتے کہ نماز کا وقت ہوگیا ہے اور میں نماز پڑھ چکا ہوں؟ اگر جواب دیا جاتا کہ آپ نماز پڑھ چکے ہیں تو فرماتے کہ پھر پڑھ لیں، ہر نماز کو مکرر ادا کرتے جتنے دن اس عالم میں رہے یہ دو باتیں مکرر فرماتے:۔ آج جمعہ کا دن ہے؟ ہم نماز پڑھ چکے ہیں؟ اور کبھی یہ مصرع پڑھتے۔

ع "می رویم و می رویم و می رویم"

اسی دوران میں ایک روز تمام خدام و مریدین کو جو حاضر تھے طلب فرمایا اور ان کی طرف متوجہ ہوکر فرمایا کہ:۔ "تم گواہ رہنا کہ اگر اقبال (خادم) نے کوئی چیز بھی گھر میں جنس میں سے بچالی ہے تو کل روز قیامت اسکو خدا کے سامنے جواب دینا ہوگا"۔ اقبال (خادم) نے عرض کیا کہ میں نے کچھ نہیں چھوڑا ہے، سب آپ پر صدقہ کردیا ہے اور واقعی اس جوانمرد نے ایسا ہی کیا تھا، سوائے اس غلہ کے جو چند دن کے لئے فقرائے خانقاہ کو کفایت کرتا سب کچھ تقسیم کردیا تھا میرے چچا سید حسین نے اطلاع دی کہ غلہ کے سوا ہر چیز محتاجوں کو پہنچ گئی۔ سلطان المشائخ اقبال سے ناراض ہوئے انکو طلب کیا اور فرمایا کہ اس مردار ریت کو کیوں رکھ چھوڑا ہے؟ اقبال نے عرض کیا کہ غلہ کے سوا جو کچھ موجود تھا سب کچھ تقسیم ہوگیا۔ آپ نے فرمایا کہ خلقت کو بلاؤ۔ جب لوگ حاضر ہوئے تو فرمایا کہ غلہ کے انبار خانے توڑ ڈالو اور تمام غلہ بے تکلف اٹھالے جاؤ اور وہاں جھاڑو دے دو۔ ذرا سی دیر میں خلقت جمع ہوگئی اور اسنے غلہ کو لوٹ لیا۔

اس بیماری میں کچھ احباب اور خدمتگار حاضر ہوئے اور انھوں نے پوچھا کہ:۔ آں مخدوم کے بعد ہم مسکینوں کا کیا حال ہوگا؟ فرمایا کہ: یہاں اتنا ملتا رہے گا جس سے تمھارا گذر ہوجائے۔ میں نے بعض معتبر مشائخ سے سنا ہے کہ لوگوں نے عرض کیا کہ ہمارے درمیان کون نصیب ور ہوگا؟[1] فرمایا: جس کی قسمت یاوری کریگی۔ بعض دوستوں اور خادموں نے میرے نانا شمس الدین دامغانی سے عرض کیا کہ وہ سلطان المشائخ سے پوچھیں کہ ہر شخص نے اپنے

---

[1] غالباً جانشینی و خلافت کے متعلق سوال تھا۔ ۱۲

اعتقاد کے مطابق آپکے احاطہ میں بلند بلند عمارتیں بنالی ہیں اور سب کی نیت یہ ہے کہ آپ اُس کی عمارت میں آرام فرمائیں، اگر وہ ناگزیر وقت آگیا تو آپ کو کس عمارت میں دفن کریں تاکہ کوئی خود رائی سے کام نہ کرے۔ مولانا شمس الدین نے یہ پیغام پہنچایا تو ارشاد ہوا کہ :- میں کسی عمارت کے نیچے دفن ہونا نہیں چاہتا۔ میں جنگل میں آسودہ خاک ہوں گا۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا کہ آپ کو باہر میدان میں دفن کیا گیا، بعد میں سلطان محمد تغلق نے اس پر گنبد تعمیر کرایا۔

وفات سے ۴۰ روز پہلے سے غذا بالکل ترک فرمادی تھی، کھانے کی خوشبو بھی گوارا نہ تھی، گریہ اس شدت سے غالب تھا کہ ایک گھڑی کیلئے بھی آنسو نہیں تھمتے تھے۔ ؎

گر نہ بینی گریۂ زارم ندانی فرق کرد
کاب چشم است اینکہ بیشت می رود یا آب جو

اسی درمیان میں اخی مبارک ایک روز مچھلی کا شوربہ لائے۔ مخلصین نے بڑی کوشش کی کہ آپ تھوڑا سا تناول فرمالیں۔ سلطان المشائخ نے پوچھا کہ :- یہ کیا ہے؟ عرض کیا گیا کہ :- تھوڑا سا مچھلی کا شوربہ ہے۔ فرمایا :- بہتے ہوئے پانی میں ڈال دو" آپ نے کچھ تناول نہیں فرمایا۔ میرے چچا سید حسین نے عرض کیا کہ کئی دن ہو گئے ہیں کہ آں مخدوم نے کھانا . . . . بالکل چھوڑ دیا ہے اس کا کیا نتیجہ ہوگا؟ فرمایا :- سید جو حضرت رسالتمآب صلی اللہ علیہ وسلم کی ملاقات کا مشتاق ہو اس سے دنیا میں کھانا کیسے کھایا جائے!۔ الغرض ۴۰ روز کی مدت میں جس طرح کھانا تناول نہیں فرمایا۔ اسی طرح بات بھی بہت کم کی۔ آخر چہار شنبہ کے دن تک جس دن آپ کی وفات ہوئی یہی حال رہا۔

۱۸ ربیع الآخر ۷۲۵ھ کو طلوع آفتاب کے بعد زہد و عبادت، حقیقت و معرفت اور ہدایت و ارشاد کا یہ آفتاب غروب ہوگیا۔

لے یعنی مدفون ہوں۔ ۱۲

نمازجنازہ شیخ الاسلام رکن الدین نبیرۂ شیخ الاسلام بہاء الدین زکریا ملتانی نے پڑھائی نماز کے بعد شیخ الاسلام رکن الدین نے فرمایا کہ:۔

"مجھے اب معلوم ہوا کہ مجھے ۴ سال تک دہلی میں اسلئے رکھا گیا کہ مجھے اس نماز جنازہ کی امامت کا شرف حاصل ہو"[۱]

ساری عمر تجرد میں گذری اسلئے کوئی اولاد نہیں تھی، روحانی سلسلہ سارے ہندوستان میں پھیلا، اور ابھی تک جاری ہے۔

---

[۱] سیر الاولیاء (ص۱۵۴) تا (ص۱۵۵)

۳

باب سوم

اخلاق وصفات

جامع اوصاف

حضرت خواجہ نظام الدینؒ کے اوصاف وخصوصیات کا خلاصہ اور ان کا صحیح ترین وجامع ترین تعارف ان الفاظ میں ہے جو عطائے خلافت کے وقت ان کے صاحب نظر شیخ ومرشد (شیخ کبیر حضرت خواجہ فریدالدین گنج شکرؒ) کی زبان سے نکلے۔ انھوں نے فرمایا:-

باری تعالیٰ ترا علم وعقل وعشق دادہ است	اللہ تعالیٰ نے تم کو علم وعقل وعشق کی دولت عطا
وہر کہ بدیں صفت موصوف باشد ازو	کی ہے اور جو ان صفات کا جامع ہو وہ
خلافت مشائخ نیکو آید۔[1]	مشائخ کی خلافت کی ذمہ داریاں خوب ادا کرسکتا ہے

حضرت خواجہؒ کی سیرت اسی جامعیت کا مرقع ہے، یہاں علم وعقل وعشق تینوں پہلو بہ پہلو نظر آتے ہیں۔ محبت ومعرفت حقیقی اور مشائخ کبار کی تربیت وصحبت جو بہترین اثرات ونتائج پیدا کرتی ہے اور جن کے بہترین مجموعہ کا نام دورِ آخر میں "تصوف" پڑگیا ہے، یعنی اخلاص اخلاق اس کی بہترین نمونہ انکی زندگی میں نظر آتی ہے۔

---

[1] سیرالاولیاء (ص ۲۴۸)

اخلاص ان کی زندگی کا بہترین جوہر جس نے ان کو اپنے معاصرین ہی میں نہیں بلکہ مشائخ اسلام میں ایک بلند مقام اور اپنے زمانہ ہی میں نہیں بلکہ تاریخ اسلام کے مختلف ادوار میں قبول عام اور بقائے دوام عطا کیا ہے اور ان کو محبوبیت کے خاص انعام سے نوازا، وہ توحید و اخلاص کی وہ خاص کیفیت اور ذوق ہے جس میں محبت و رضائے الٰہی کے سوا کوئی چیز مطلوب و مقصود نہیں رہی، محبت و یقین کے شعلہ نے ہر طرح کے خس و خاشاک کو جلا کر راکھ کر دیا تھا۔ حُبِ دنیا، حبِّ جاہ اور اس طرح کی تمام محبتوں اور طلبوں کا استیصالِ کلی ہو چکا تھا ؎

شاد باش اے عشقِ خوش سودائے ما ؛ اے طبیبِ جملہ علت ہائے ما

اے دوائے نخوت و ناموس ما ؛ اے تو افلاطون و جالینوسِ ما

عشق آں شعلہ است کو چوں برفروخت ؛ ہر چہ جز معشوق باقی جملہ سوخت

ماند الا اللہ باقی جملہ رفت ؛ شاد باش اے عشق شرکت سوز رفت[1]

امیر حسن علا سجزی راوی ہیں کہ ایک مرتبہ مجلس میں یہ ذکر ہو رہا تھا کہ کچھ لوگ مسجد میں قیام کرتے ہیں اور وہاں قرآن مجید کی تلاوت اور نوافل پڑھتے ہیں، میں نے عرض کیا کہ اگر اپنے گھر ہی رات کو قیام کریں تو کیسا ہے؟ فرمایا: آدمی اپنے گھر میں ایک پارہ پڑھے وہ مسجد میں ایک قرآن ختم کرنے سے بہتر ہے، اس پر یہ ذکر آگیا کہ گذشتہ زمانے میں ایک صاحب جامع مسجد دمشق میں رات بھر عبادت میں مشغول رہتے تھے، اس لالچ میں کہ اس کی عام شہرت ہو گی اور شیخ الاسلامی کے عہدے پر (جو اس زمانہ میں خالی تھا) ان کا تقرر ہو جائے گا، یہ سنکر حضرت خواجہؒ کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے اور آپ نے فرمایا:۔

سبوزاول شیخ الاسلامی را وپس خانقاہ را ؛ آگ لگاؤ ایسی شیخ الاسلامی کو پھر خانقاہ کو

[1] مولانا رومؒ

ولعد ازاں خود را[1]۔ پھر اپنے کو خاک کر کے رکھ دو

حضرت خواجہؒ کی ساری زندگی اسی "دل سوختگی" اور "خود باختگی" کا نمونہ ہے اور اسی چیز نے ان کی صحبت میں کیمیا اور اکسیر کی خاصیت پیدا کر دی تھی۔ انھیں کے سلسلہ کے ایک سوختہ دل شیخ تھے[2] (جو نویں صدی میں نظامی سلسلہ کے مقتدیٰ تھے) یہ دو شعر منقول ہیں جو اس صورتِ حال اور جذبہ کی صحیح ترجمانی کرتے ہیں

ما را نہ مرید و ورد خواں می باید — نے زاہد نے حافظِ قرآں می باید
صاحب دردے سوختہ جاں می باید — آتش زدہ بہ خانماں می باید

اپنے ہی بارے میں نہیں، اپنے خلفاء اور جانشینوں کے بارے میں بھی (جن سے تہذیب، اخلاق اور تزکیۂ نفس کا کام لینا تھا) اس کا لحاظ فرماتے تھے کہ وہ اخلاص کے اس مقام پر پہنچ گئے ہیں کہ حُبِّ جاہ کا ان کے دل سے خاتمہ ہو چکا ہے۔ مولانا نصیح الدین نے سوال کیا کہ مشائخ کی خلافت کا اہل کون ہوتا ہے؟ فرمایا:-

"کسے را کہ در خاطر او توقع خلافت نباشد"[3] وہ شخص جو خلافت کا متوقع اور منتظر بھی نہ ہو۔

صاحب سیر الاولیاء کا بیان ہے کہ ایک مرتبہ آپ کو اپنے ایک ممتاز خادم کے متعلق جن کو اجازت دی جا چکی تھی معلوم ہوا کہ وہ کئی کمبل تہہ کر کے بچھا کر اس پر مشائخ کی طرح بیٹھتے ہیں اور امراء و عوام و خواص ان کی خدمت میں معتقدانہ حاضر ہوتے ہیں، آپ اس سے اتنے آزردہ ہوئے کہ جب وہ آئے تو آپ نے

---

[1] فوائد الفواد (ص ۲۴)

[2] حضرت شاہ محمد مینا (محمد بن قطب) لکھنوی (م ۸۷۴ھ)

[3] سیر الاولیاء (ص ۳۴۵)

ان سے منھ پھیر لیا اور ان کو اجازت سے محروم کر دیا، عرصہ تک ان سے ایسی ہی بے رخی رہی جبتک کہ ان کا عذر ظاہر نہیں ہوا اور انھوں نے معافی نہیں مانگی، ان پر نظر عنایت مبذول نہیں ہوئی۔[1]

دشمن نوازی

اخلاص و فنائیت اور بے نفسی کے اس مقام پر پہنچ کر سالک کے دل سے رنج و شکایت انتقام کا جذبہ اور ایذا کی صلاحیت ہی ختم ہوجاتی ہے، وہ نہ صرف آشنا پرور و دوست نواز ہوتا ہے بلکہ دشمن کا احسانمند اور دشمن کے حق میں دعاگو بن جاتا ہے، گویا دشمنی کوئی احسان ہے کوئی نادر تحفہ اور زخم دل کا مرہم ہے جس پر بے اختیار دل سے دعا نکلتی ہے اور منھ سے پھول جھڑتے ہیں۔ امیر علاء سنجری راوی ہیں کہ حضرت نے ایک مرتبہ یہ مصرع پڑھا۔ ع

"ہر کہ ما را رنج دادہ راحتش بسیار باد"

(جو ہم کو رنج دے خدا اس کو بہت راحت پہنچائے)

اسکے بعد یہ شعر ارشاد ہوا[2]

ہر کہ او خارے نہد در راہ ما از دشمنی
ہر گلے کز باغ عمرش بشگفد بے خار باد

سیر العارفین میں ہے کہ خواجہ نصیر الدین چراغ دہلی فرماتے تھے کہ حصار اندر پت میں (جو موضع غیاث پور کے قریب ہے) چھجو نامی ایک شخص تھا جس کو بے وجہ حضرت سے دشمنی تھی، برا بھلا بھی کہتا رہتا تھا اور آپ کو تکلیف و ایذا پہنچانے کی فکر میں رہتا تھا، اس کا انتقال ہو گیا۔ حضرت شیخؒ نے اسکے جنازے میں شرکت کی، دفن کے بعد اس کی بالیں پر دو رکعت نماز پڑھی اور دعا فرمائی کہ خدایا! اس شخص نے

---

[1] سیر الاولیاء میں اس واقعہ کی تفصیل ہے۔ ۱۲ [2] فوائد الفواد ص۸۶ (ترجمہ) جو ہمارے راستہ میں کانٹے بچھائے اللہ کرے اسکے گلشن حیات میں جو پھول کھلے بے خار رہے۔ ۱۲

جو کچھ کہا ہو یا برا سوچا ہو میں نے اس کو بخش دیا تو میری وجہ سے اس کو سزا نہ دینا۔[1]

ایک مرتبہ حاضرین میں سے ایک صاحب نے ذکر کیا کہ بعض آدمی جناب والا کو منبر پر اور دوسرے موقعوں پر بُرا بھلا کہتے ہیں ہم سے سنا نہیں جاتا۔ حضرت خواجہؒ نے فرمایا کہ میں نے سب کو معاف کیا تم بھی معاف کرو اور ایسے آدمی سے جھگڑا نہ کرو۔ اسکے بعد آپ نے فرمایا کہ اگر دو آدمیوں کے درمیان رنجش ہو تو اس رنجش کو دور کرنے کا طریقہ یہ ہے کہ آدمی اپنے باطن کو عداوت سے خالی کرے، دوسرے کی طرف سے بھی آزار کم ہو جائے گا۔ فرمایا کہ: آخر لوگ برا بھلا کہنے سے کیوں رنجیدہ ہوتے ہیں۔ مشہور یہ ہے کہ مال صوفی سبیل است و خون او مباح" (صوفی کا مال وقف ہے اور اس کا خون روا) جب معاملہ یہ ہے تو کسی برا بھلا کہنے والے سے کیوں جھگڑا کیا جائے؟[2]

ایک دن فرمایا کہ دنیا کا عام اصول تو یہ ہے کہ نیکوں کے ساتھ نیکی اور بدوں کے ساتھ بدی کی جائے، لیکن مردانِ خدا کا اصول یہ ہے کہ بدی کا بدلہ بھی نیکی سے دیا جائے۔ فرمایا:۔

یکے خار نہد و تو ہم خار نہی ایں خار خار	اگر کوئی کانٹا رکھے اور تم بھی کانٹا رکھ دو
باشد ..... میانِ مردماں ہمچنین	تو کانٹے ہی کانٹے جمع ہو جائیں گے لوگوں کے
است بانغزاں نغزی و با کوزاں کوزی	درمیان عام اصول یہی ہے کہ سیدھوں کے ساتھ
اما میان درویشان ہمچنین است کہ	سیدھا اور ٹیڑھوں کیساتھ ٹیڑھا لیکن
بانغزاں نغزی با کوزاں ہم نغزی[3]	درویشوں کا اصول یہ ہے کہ سیدھوں کیساتھ
	سیدھا اور ٹیڑھوں کیساتھ بھی سیدھا۔

حضرت خواجہ کا اس بارے میں معیار اتنا بلند تھا کہ برا کہنا تو بڑی چیز ہے وہ برا چاہنے کو بھی روا نہیں رکھتے تھے، ایک مرتبہ فرمایا:۔

---

[1] سیر العارفین (قلمی) [2] فوائد الفواد ص ۹۵ [3] ایضاً ص ۸۷

بد گفتن اندک است امابد خواستن — برا کہنا بھی برا ہے لیکن بُرا چاہنا

ازاں بدتر است[2] ۔ — اس سے کہیں بُرا ہے۔

جب یہ معاملہ آپ کا سب کے ساتھ تھا تو اپنے شیخ کے عزیزوں اور تعلق والوں کے ساتھ کیوں نہ ہوتا جن کے احسان سے آپ کا رواں رواں تر تھا۔

سیر العارفین میں ہے کہ حضرت شیخ نجیب الدین متوکل کے نواسے خواجہ عطاء اللہ ایک لا ابالی و بیباک آدمی تھے۔ ایک دن قلم دوات لیکر آئے اور کہا کہ میرے لئے فلاں سردار کو ایک خط لکھ دیجئے تاکہ مجھے وہ کوئی اچھی رقم دیدے۔ شیخ نے فرمایا کہ: نہ میری اس سردار سے کبھی ملاقات ہوئی ہے، نہ وہ کبھی یہاں آیا ہے، جس شخص سے جان پہچان نہ ہو اسکو رقعہ کس طرح لکھا جائے؛ صاحبزادے کو غصہ آگیا اور انھوں نے سخت سست کہنا شروع کیا کہ ہمارے ہی نانا کے مرید ہو اور ہمارے ہی خاندان کا صدقہ پایا ہے، اب ایسے احسان فراموش ہو گئے ہو کہ میرے لئے ایک رقعہ تم سے نہیں لکھا جاتا، یہ تم نے کیا پیری مریدی کا جال بچھایا ہے اور خلق خدا کو دھوکے دے رہے ہو؛ یہ کہکر دوات زمین پر پٹک دی اور اٹھکر چلے، حضرت نے دامن پکڑ لیا اور فرمایا کہ ناراض ہوکر کیوں جا رہے ہو، خوش ہو کر جاؤ، اسکے بعد ایک رقم سامنے رکھی اور رضامند کرکے رخصت کیا[2]۔

پردہ پوشی و نکتہ نوازی

سیر الاولیاء میں ہے کہ اکثر معمول تھا کہ جو لوگ باہر سے آتے وہ کوئی شیرینی یا تحفہ خرید کر اپنے ساتھ لاتے اور پیش کرتے۔ ایک مرتبہ کچھ لوگ اسی ارادہ سے آ رہے تھے، ایک مولوی صاحب بھی ساتھ تھے، انھوں نے سوچا کہ لوگ مختلف تحائف پیش کرینگے اور وہ اکٹھا حضرت کے سامنے رکھیں گے، خادم سب کو اٹھا کر لے جائے گا، کیا پتہ چلے گا کہ کون لایا؟ انھوں نے تھوڑی سی مٹی راستہ سے اٹھا کر کاغذ میں باندھ لی، جب سلطان المشائخ کی خدمت

---

[1] سیر الاولیاء ص ۵۵۲ — [2] سیر العارفین (قلمی)

میں حاضر ہوئے ہر ایک نے اپنی چیز سامنے رکھی، مولوی صاحب نے بھی اپنی پڑیا سامنے رکھدی، خادم وہ سب چیزیں اٹھا کر لے جانے لگا، پڑیا کو بھی اٹھانا چاہا۔ حضرتؒ نے فرمایا "اس کو یہیں چھوڑ دو، یہ میری آنکھ کا سرمہ ہے"۔ یہ اخلاق وعالی ظرفی دیکھ کر ان عالم صاحب نے توبہ کی اور مرید ہوئے۔[1]

شفقت و تعلق

اللہ تعالیٰ نے حضرت خواجہؒ کو عام انسانوں اور خصوصیت کے ساتھ مسلمانوں اور اپنے اہل تعلق کے ساتھ ایسی شفقت و محبت عطا فرمائی تھی جس کو اگر ماں کی شفقت سے تشبیہ یا اس پر بھی ترجیح دی جائے تو واقعات کے لحاظ سے اس میں کوئی مبالغہ اور شاعری نہ ہوگی، شیوخ کاملین کی یہ شفقت دراصل نبیؐ کی اس شفقت کی وراثت اور نیابت ہے جس کی حقیقت اس آیت میں بیان کی گئی ہے:۔

لَقَدْ جَآءَكُمْ رَسُوْلٌ مِّنْ اَنْفُسِكُمْ	اے لوگو! تمہارے پاس ایسا پیغمبر آیا جو تمھاری
عَزِيْزٌ عَلَيْهِ مَا عَنِتُّمْ حَرِيْصٌ عَلَيْكُمْ	جنس سے ہے جس کو تمہاری تکلیف و مضرت کی بات
بِالْمُؤْمِنِيْنَ رَءُوْفٌ رَّحِيْمٌ ۝	گراں گذرتی ہے جو تمھاری منفعت کا بڑا خواہشمند ہے
(التوبہ ع ۱۶)	ایمانداروں کے ساتھ بڑا ہی شفیق و مہربان ہے۔

اور اس حکم کی تعمیل ہے جس کا خطاب رسولؐ سے ہے:۔

وَاخْفِضْ جَنَاحَكَ لِمَنِ اتَّبَعَكَ	ان لوگوں کے ساتھ فروتنی کے ساتھ پیش آؤ جو
مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ ۝ (شعراء ع ۱۱)	مسلمانوں میں داخل ہو کر تمھاری راہ پر چلیں۔

اس شفقت اور تعلق نے وہ "اتحاد" پیدا کر دیا تھا کہ دوسروں کی جسمانی اذیت سے اپنے کو جسمانی طور پر اذیت اور دوسروں کی قلبی راحت سے اپنے کو قلبی راحت ملتی تھی، امیر حسن علاء سجزی راوی ہیں کہ ایک مرتبہ مجلس ہو رہی تھی، سایہ میں جگہ نہ ہونے کی وجہ سے بعض لوگ دھوپ میں بیٹھے تھے، آپ نے سایہ میں بیٹھنے والوں سے فرمایا:۔

[1] سیر الاولیاء ص ۱۴۲

بھائی ذرا مل کر بیٹھو تاکہ ان بھائیوں کیلئے بھی جگہ ہو جائے' دھوپ میں یہ بیٹھے ہیں اور میں جلا جا رہا ہوں۔[ا]

ایک مرتبہ آپ نے کسی بزرگ کا مقولہ نقل کیا جو درحقیقت اپنے ہی حال کی ترجمانی تھی کہ "خدا کی مخلوق میرے سامنے کھانا کھاتی ہے اور میں اس کھانے کو اپنے حلق میں پاتا ہوں' جیسے وہ کھانا میں ہی کھا رہا ہوں"[ا]

امیر حسن علاء سنجری فرماتے ہیں کہ میں ایک مرتبہ بے وقت حاضر ہوا اور عرض کیا کہ میں اس طرف عزیزوں سے ملنے آیا ہوا تھا، حاضری کو جی چاہا بعض دوستوں نے کہا کہ اگر کوئی شخص کسی اور کام سے آیا ہو اور شروع حاضری کی نیت نہ کی ہو تو شیخ کی خدمت میں نہیں حاضر ہونا چاہیئے۔ میں نے دل میں کہا کہ اگرچہ قاعدہ یہی ہے لیکن دل نہیں مانتا کہ یہاں آ کر حضرتؒ کی زیارت کے بغیر واپس چلا جاؤں' میں آج قاعدہ کے خلاف ہی کروں گا۔ حضرتؒ نے فرمایا "اچھا کیا" پھر یہ شعر پڑھا۔ ؎

در کوئے خرابات درائے او باش

معنے بود بیا و بنشیں و بہ باش

پھر فرمایا کہ مشائخ کا معمول یہی ہے کہ کوئی انکے پاس اشراق سے پہلے اور عصر کی نماز کے بعد نہیں جاتا، لیکن میرے یہاں یہ قاعدہ نہیں جس وقت جس کا جی چاہے آئے۔[۳]

غمخواری عام یہ اہل قلوب غم دنیا سے فارغ البال لیکن دنیا والوں کے غم اور خلق خدا کی فکروں سے نڈھال اور خستہ حال رہتے ہیں' وہ اپنا غم بھلا دیتے ہیں اور ساری دنیا کا غم اپنا غم بنا لیتے ہیں۔ یہ کہنے کا حق درحقیقت انھیں کو ہے کہ۔ ع

سارے جہاں کا درد ہمارے جگر میں ہے

خواجہ نصیر الدین چراغ دہلی کے نواسے خواجہ شرف الدینؒ سے کسی مجلس میں کسی صوفی نے کہا کہ خواجہ نظام الدینؒ

[ا] فوائد الفواد ص۹۱ [۲] سیر الاولیاء ص۱۷۷ [۳] فوائد الفواد ج ۱ ص۹۸

عجیب فارغ البال بزرگ ہیں، مجرد ہیں، اہل و عیال و اطفال کا کوئی تردد ان کو نہیں ہے ان کو ایسا فراغِ خاطر حاصل ہے کہ ایک ذرۂ غم بھی ان کو چھو نہیں گیا ہے۔ وہ عزیز اس مجلس سے اٹھے تو حضرت خواجہؒ کی خدمت میں حاضر ہوئے چاہتے تھے کہ خود اس کا ذکر کریں۔ حضرت خواجہؒ نے خود ہی ارشاد فرمایا:۔

"میاں شرف الدین وہ رنج و غم جو میرے دل کو وقتاً فوقتاً ہوتا رہتا ہے شاید ہی کسی دوسرے شخص کو اس سے زیادہ ہوتا ہو، جو شخص میرے پاس آتا ہے اپنا حال مجھ سے بیان کرتا ہے اُس سے دو چند فکر و تردد اور غم و الم مجھے ہوتا ہے، بڑا سنگدل ہے وہ جس پر اپنے دینی بھائی کا غم اثر نہ کرے، اسکے علاوہ یہ جو کہا گیا ہے:۔

"المخلصون علی خطرعظیم" (مخلصین کو بڑا خطرہ در پیش رہتا ہے)

اس سے بھی سمجھ سکتے ہو کہ ۔ ع

نزدیکاں را بیش بود حیرانی [1]

حضرت خواجہؒ کے نزدیک مسلمان کا دل خوش کرنا اور اس کی دلجوئی و راحت رسانی افضل ترین عمل اور تقرب الی اللہ کا بہترین ذریعہ تھا۔ سیرالاولیا، میں ہے کہ فرمایا:۔

"مجھے خواب میں ایک کتاب دی گئی اس میں لکھا تھا کہ جہاں تک ہوسکے دلوں کو راحت پہنچاؤ کہ مومن کا دل اسرار ربوبیت کا مقام ہے"۔ کسی بزرگ نے خوب کہا ہے۔ ؎

می کوش کہ راحت بجانے برسد   یا دست شکستہ بنانے برسد

(کوشش کرو کہ کسی انسانی جان کو تم سے آرام پہنچے، یا جو دست شکستہ ہو اسکو تمھارے ذریعے سے روٹی ملے)

---

[1] سیر العارفین (قلمی)

ایک مرتبہ فرمایا، کہ:۔

"قیامت کے بازار میں کسی سودے کی اتنی قیمت اور چلن نہ ہوگا جتنا دل کا خیال رکھنے اور دل خوش کرنے کا۔"[1]

چھوٹوں پر شفقت

حضرت خواجہؒ اپنے قیمتی مشاغل اور اعلیٰ کیفیاتِ باطنی کے ساتھ بچوں اور چھوٹوں پر بڑے شفیق تھے، اور وہ اپنی شدید مصروفیات کے باوجود اُن کی دلجوئی و ملاطفت کے لئے وقت نکال لیتے تھے، ان عظیم ذمہ داریوں اور باطنی مشغولیت کے باوجود ان بچوں کی پوری رعایت فرماتے اور چھوٹی چھوٹی باتوں کا دھیان رکھتے۔

خواجہ رفیع الدین ہارون آپ کے حقیقی بھانجے کے صاحبزادے تھے، اگر کبھی کھانے کے وقت وہ موجود نہ ہوتے، تو اگرچہ بڑے بڑے بزرگ دسترخوان پر بیٹھے ہوتے، لیکن آپ ان صاحبزادے کا انتظار کرتے۔ آپ اپنے بچے کی طرح خلوت و جلوت میں ان کی تربیت و دلداری فرماتے۔[2]

خواجہ رفیع الدین کو تیر و کمان اور پیراکی و کشتی کا بڑا شوق تھا، حضرت سلطان المشائخ بڑی شفقت کے ساتھ ان سے انھیں فنوں کی باتیں کرتے تھے، ان کی ہمت افزائی اور تشویق فرماتے، ان فنوں کی باریکیوں اور نکتوں کی تعلیم دیتے، تاکہ یہ خوش ہوں۔[3]

جو شریف النسب اور ذی استعداد نوجوان اپنے زمانہ کے شوقین لوگوں کے جیسا لباس پہنتے اور ان میں نوجوانی کے تقاضے سے لباس میں تجمل پیدا ہوتا (جس کو بعض سخت گیر ثقاہت و متانت کے خلاف سمجھ کر اعتراض کرتے ہیں) حضرت خواجہؒ ان کی بھی دلجوئی فرماتے، اور اس کو جوانی اور زمانہ کا تقاضا سمجھ کر نظر انداز فرماتے اور اپنے اخلاق و محبت سے ان کی اصلاح و تربیت کی کوشش فرماتے۔

---

[1] سیر الاولیاء صـ ۱۲۸ [2] ایضاً صـ ۲۰۳ [3] ایضاً صـ ۲۰۳

سیر الاولیاء کے مصنف امیر خورد لکھتے ہیں کہ میرے چچا سید حسین کرمانی کی نوجوانی کا زمانہ تھا۔ وہ اس زمانہ کے شوقین نوجوانوں کے لباس اور وضع میں ایک روز تشریف لائے حضرت خواجہؒ نے ان کو دیکھ کر فرمایا:۔

سید بیا و بنشیں وسعادت ببر۔[1] | سید آؤ، بیٹھو اور سعادت میں حصہ لو۔

اللہ ہی بہتر جانتا ہے کہ اس شفقت و ملاطفت اور اس دلجوئی و دلنوازی سے کتنے نوجوانوں کی اصلاح و تربیت ہوئی ہوگی اور کتنے "آہوئے وحشی" اسیر دام محبت ہوئے ہوں گے، اور ان کا شمار خدا کے مقبول بندوں اور شیوخ کاملین میں ہوا ہوگا۔

حضرت خواجہؒ کے ان اخلاق و صفات اور صوفیہ صافیہ کی سیرت کو دیکھ کر امام غزالی کی اس رائے اور شہادت کی تصدیق ہوتی ہے جس کا انھوں نے "تلاش حق" کے طویل سفر اور مختلف گروہوں اور انسانی طبقات کے عمیق مطالعہ کے بعد اظہار کیا ہے:۔

"مجھے یقینی طور پر معلوم ہوگیا کہ صوفیہ ہی اللہ کے راستہ کے سالک ہیں، انکی سیرت بہترین سیرت، ان کا طریق سب سے زیادہ مستقیم اور ان کے اخلاق سب سے زیادہ تربیت یافتہ اور صحیح ہیں، اگر عقلاء کی عقل، علماء کی حکمت اور شریعت کے رمز شناسوں کا علم مل کر بھی اُن کی سیرت و اخلاق سے بہتر لانا چاہے تو ممکن نہیں، انکے تمام ظاہری و باطنی حرکات و سکنات مشکوٰۃ نبوت سے ماخوذ ہیں اور نور نبوت سے بڑھ کر روئے زمین پر کوئی نور نہیں جس سے روشنی حاصل کیجائے"۔[2]

---

[1] سیر الاولیاء ص ۲۰۳ [2] المنقذ من الضلال

باب چہارم

اذواق وکیفیات

محبّت و ذوق حضرت خواجہ کی سیرت اور زندگی کا مرکزی نقطہ جوان کے تمام اخلاق واحوال واعمال کا محور ہے وہ عشق الٰہی کی نعمت خداداد ہے جوان میں ابتدائے حال سے نمایاں تھی، محبت کی یہ چنگاری جو ازل سے ان کی فطرت میں ودیعت تھی شیخ کبیر کی صحبت اور طریقۂ چشتیہ کی نسبت سے شعلۂ جاں سوز بن گئی اور اسنے مدّت العمر ان کو اور نصف صدی سے زائد دہلی اور اسکے ماحول کو گرم اور منور رکھا اور اس کی وجہ سے صدیوں تک ہندوستان کی فضا عشق الٰہی کی حرارت سے گرم اور گداز رہی ان کے تمام حالات واشغال گفتگو اور مجالس، اشعار اور انکے انتخاب، واقعات اور ان کی تمثیل، غرض ہر چیز سے اسی سوز باطن اور اسی حرارت عشق کا اظہار ہوتا ہے ؎

شعلہا آخر ز ہر مویم دمید
از رگ اندیشہ ام آتش چکید

فوائد الفواد میں ہے کہ ایک روز اولیاء اللہ کے دم واپسیں کے واقعات بیان ہو رہے تھے، حاضرین میں سے ایک نے ایک بزرگ کی حکایت بیان کی کہ ان کا انتقال ہو رہا تھا اور آہستہ آہستہ اللہ کا نام

ان کی زبان پر جاری تھا، حضرت خواجہؒ آبدیدہ ہو گئے اور یہ رباعی پڑھی۔ ؎

آیم بسر کوئے تو پویاں پویاں　　رخسارہ بآبِ دیدہ شویاں شویاں

بیچارہ نہ وصل تو جویاں جویاں　　جاں می دہم و نام تو گویاں گویاںؔ[1]

(ترجمہ) آپ کی گلی میں چلا آرہا ہوں خراماں خراماں، آنسوؤں سے اپنے رخسار کو دھوتا ہوں، آپکے وصل کا جویا اور طالب بن کر جان دے رہا ہوں، آپکا نام بھی لئے جا رہا ہوں)

اس محبت کا نتیجہ یہ تھا کہ دل میں محبوب کے سوا کسی کے خیال کی جگہ نہیں رہی تھی، کسی دوسری طرف توجہ بھی دل پر بار تھی

ہر چہ جز معشوق باقی جملہ سوخت

امیر حسن علاء سجزی راوی ہیں کہ ایک مرتبہ فرمایا کہ اگر کبھی اتفاق سے میں ان کتابوں کا مطالعہ کرنے لگتا ہوں جو میں نے پڑھی ہیں تو طبیعت میں وحشت پیدا ہونے لگتی ہے اور اپنے دل میں کہتا ہوں کہ کہاں پڑ گیا، اس پر حضرت خواجہ ابوسعید ابوالخیر کا واقعہ بیان کیا کہ وہ کمال حال پر پہنچ گئے تو وہ کتابیں جو وہ پڑھ چکے تھے اور ان کو کونے میں رکھ دیا تھا۔ ان کو سامنے رکھ کر ایک روز مطالعہ کرنے لگے۔ غیبی آواز آئی اے ابوسعید ہمارا عہد نامہ واپس کرو کہ اب تو دوسری چیز میں مشغول ہو گیا، خواجہ جب اس مقام پر پہنچے تو رو پڑے اور یہ شعر پڑھا ؎

توسایۂ دشمنے کجا در گنجی　　جائے کہ خیال دوست زحمت باشدؔ[2]

(ترجمہ) کسی دشمن کا سایہ بھی کہاں سما سکتا ہے، جہاں دوست کا خیال بھی حجاب بنے)

اسی "سرور عشق" کا نتیجہ یہ تھا کہ شب کی خلوت اور رات کے راز و نیاز کے بعد جب دن میں تشریف لاتے تو بقول امیر خورد معلوم ہوتا کہ شراب چھلک رہی ہے، رات کی بیداری سے آنکھیں سرخ ہوتیں۔ امیر خسرو

---

[1] فوائد الفواد ص۔　　[2] فوائد الفواد ص۹

نے یہی دیکھ کر کہا ہے :۔ ؎

توشبانہ می نمائی بہ برِ کہ بودی امشب
کہ ہنوز چشم مستت اثرِ خمار دارد[1]

اور اسی حرارتِ عشق اور سُرور و مستی کا نتیجہ تھا کہ پیرانہ سالی میں برابر روزہ رکھتے تقلیلِ غذا، طویل شب بیداری اور سخت مجاہدات کے باوجود ضعف و ناطاقتی ظاہر نہ ہوتی تھی، اسّی سال سے عمر متجاوز ہونے کے باوجود چہرے پر وہی سرخی اور نشاط و انبساط کی وہی کیفیت پائی جاتی تھی جو جوانی میں رہی ہوگی بلکہ اس میں روز افزوں اضافہ تھا[2]

سماع [3] محبت کی یہی حرارت اور تپش تھی جس کی تسکین کا ایک ذریعہ سماع تھا یعنی عشقِ الٰہی کے اشعار اور عارفانہ ابیات کا سننا جس سے قلب کو اپنی آنچیں نکالنے اور آنسوؤں کے چھینٹوں سے اس کی گرمی کو کم کرنے کا موقع ملے اور اسی کے ساتھ مجاہدات سے تھکا ہوا جسم اور طبیعت اور

---

[1] سیر الاولیا رص ۱۲۸ [2] سیر الاولیار

[3] مسئلہ سماع (بلا مزامیر) کی موافقت مخالفت میں بہت کچھ لکھا گیا ہے، اسمیں نقطۂ اعتدال یہ معلوم ہوتا ہے کہ نہ وہ مطلقاً حرام ہے نہ کوئی عبادت و طاعت و امر مقصود، اعتدال اور خاص شرائط کے ساتھ ایک تدبیر و علاج ہو اور اصحاب ضرورت و اہلیت کے لئے بقدر ضرورت مباح اور بعض اوقات مفید، اس سلسلہ میں مشہور چشتی شیخ قاضی حمید الدین ناگوری کا قول بڑا جامع و معتدل معلوم ہوتا ہے۔ ایک مجلس میں سماع کی حلت و حرمت پر بحث تھی، قاضی صاحب نے فرمایا کہ :۔

"میں ہوں حمید الدین کہ سماع سنتا ہوں اور مباح کہتا ہوں علما کی روایت کی بنا پر اسلئے کہ درد دل کا مریض ہوں اور سماع اسکی دوا ہے۔ امام ابو حنیفہؒ نے شراب سے علاج کرنے کی ایسے وقت میں اجازت دی ہو جبکہ ازالہ مرض کے لئے اور کوئی دوا ہی نہ ہو، اور حکیموں کا بھی اس پر اتفاق ہو کہ صحت شراب کے بغیر ناممکن ہو۔ اس تقریر پر میرے مرض کی دوا جو کہ لاعلاج ہے سرود کا سننا ہے' لہٰذا اسکا سننا ہمارے لئے مباح اور تم پر حرام ہو۔" (سیر الاقطاب قلمی)

نفی کی چوٹ کھایا ہوا دماغ غذا اور تازگی حاصل کرسکے۔ مولانا رومؒ جو ایک بڑے صاحب سماع تھے اسی لئے فرماتے ہیں ؎

پس غذائے عاشقاں آمد سماع ۔۔۔ کہ ازو باشد خیالِ اجتماع

قوتے گیرد خیالاتِ ضمیر ۔۔۔ بلکہ صورت گردد از بانگ صفیر

آتش عشق از نواہا گردتیز ۔۔۔ آں چنانکہ آتش آں جوز ریز

خود حضرت خواجہؒ نے اپنی زبان سے سماع کی یہی حکمت بیان کی ہے:۔

سماع حق مریدان و معتقدان و اصحاب ریاضت است، چوں نفس و تن ہلاک شود، او را حق البیت "ان لنفسک علیک حقا" یعنی بدرستی کہ برائے نفس برابر تو حق است چوں نہ بلندا از سماع بیاساید باز او را برکارے بہ برند[1]

سماع مریدین صادقین اور اہل عقیدت اور اصحاب ریاضت کا کام ہے۔ جب طبیعت پوسی چوٹ کھاجائے تو ان کا حق ہے کہ سماع سے قوت و تازگی حاصل کریں، حدیث میں آتا ہے کہ ان لنفسک علیک حقا تمہارے اوپر تمہارے جسم کا حق ہے۔ جب ایک مدت تک نفس سماع کے ذریعہ آرام حاصل کرلیتا ہے تو پھر اسکو کام میں لگاتے ہیں

ایک بزرگ مولانا کاشانی فرماتے ہیں:۔

اصحاب ریاضت و ارباب مجاہدہ از کثرتِ معاملات گاہ گاہ اتفاق افتد کہ کلالتے وملالتے در قلوب و نفوس حادث شود و قبض

اصحاب ریاضت و ارباب مجاہدہ کے قلوب و نفوس احوال و کیفیات کے کثرت سے پیش آنے کی وجہ سے کبھی کبھی اکتا جاتے ہیں اور انکو

---

[1] سیر الاولیاء ص۱۹۸

بسطے کہ موجب فتور اعمال و قصور احوال بود طاری گردد پس مشائخ متاخر از برائے دفع این عارضہ و دفع این حادثہ ترکیبے روحانی از سماع اصوات طیبہ و الحان متناسبہ و استماع اشعار مہیجہ و مشوقہ بر وجہے کہ مشروع بود نمودہ اند[1]

تکان و ضعف محسوس ہونے لگتا ہے اور ان پر وہ قبض و بسط جو اعمال و احوال میں سستی اور کوتاہی کا باعث ہوتا ہے طاری ہو جاتے ہیں اس بنا پر مشائخ متاخرین نے اچھی آوازوں، مناسب نغموں اور شوق انگیز اشعار کے سننے کو اس طرح پر کہ حدودِ شرع سے باہر نہ ہوں ایک علاج روحانی کے طور پر تجویز کیا ہے۔

سماع کی اس حکمت کے علاوہ، اس کی ایک دوسری حکمت ان حضرات کے نزدیک یہ تھی کہ اس سے حضوری کی ایک کیفیت، درد کی لذت اور ذوق و شوق پیدا ہوتا ہے اور یہ لمحات بقیہ اوقات کو بھی اپنے دامن میں لیکر پاک اور نورانی بنا دیتے ہیں۔ ارشاد ہوا کہ:۔

مردم را ہر روز حضور کجا میسر شود اگر در روزے وقتے خوش دریافت ہمہ اوقات متفرقہ آں روز در پناہ آں وقت باشد و اگر در جمعے صاحب نعمتے باشد جملہ اشخاص در پناہ آں شخص باشد[2]

فرمایا، آدمی کو ہر روز حضوری کہاں میسر آتی ہے اگر کسی دن کوئی وقت اچھا ہاتھ آ جائے تو اس دن کے تمام متفرق اوقات اس وقت کی پناہ میں ہوتے ہیں، دیکھو اگر کسی مجمع میں ایک صاحب ذوق اور صاحب نعمت ہو تو پھر، تمام حاضرین اس کی پناہ میں ہوتے ہیں۔

پس یہ سماع، حضرت خواجہ اور ان مشائخ کی (جو اسی کیفیت کے حامل اور آتش محبت سے

---

[1] مصباح الہدایت ص۱۸۰ و ص۱۸۲ [2] سیر الاولیاء ص۵۲۳

سے چل رہے ہوں) طبعی کیفیت کا نتیجہ، تسکین کا سامان، قوت و غذا اور رقت و حضوری کا ذریعہ تھا جسکو وہ حضرات علاجاً اور ضرورتاً اختیار کرتے تھے اور علاج اور ضرورت کے بقدر رہی اس سے کام لیتے تھے نہ وہ کوئی عبادت، تقرب الی اللہ کا ذریعہ تھا، نہ مستقل سلوک اور شب و روز کا مشغلہ تھا۔

اسی کے ساتھ حضرت خواجہؒ نے سماع کو ان تمام خلافِ شرع منکرات و بدعات اور اسبابِ لہو و لعب سے جو غیر مسلموں کے اثر سے خاص طور پر ہندوستان میں اہل ہوا نے یا خام کار صوفیوں نے سماع میں شامل کر لئے تھے خود بھی دور رکھا اور اپنے متبعین کو ان سے اجتناب کی انتہائی تاکید فرمائی ہے۔ آپ نے سماع کے آداب اس طرح بیان فرمائے :۔

آپ نے فرمایا :۔

" سماع کی چار قسمیں ہیں :۔ حلال، حرام، مکروہ، مباح۔ اگر صاحبِ وجد کا میلان محبوبِ حقیقی کی طرف زیادہ ہو تو سماع مباح ہو، اور اگر محبوب مجازی کی طرف زیادہ ہے، تو مکروہ ہے، اگر محبوب مجازی کی طرف میلانِ کلی ہے تو حرام ہو، اگر محبوبِ حقیقی کی طرف میلانِ کلی ہو تو حلال ہو، پس جس کو سماع کا ذوق ہو، اس کو چاہیئے کہ وہ ان چاروں درجوں کو جانتا ہو "

نیز ارشاد فرمایا کہ :۔

" سماع مباح کے لئے چند چیزیں چاہیئیں :۔ مُسمع (سنانیوالا) مستمع (سننے والے) مسموع (جو کچھ پڑھا جا رہا ہے) آلۂ سماع (ذریعہ) مسمع کے لئے شرط یہ ہے کہ وہ پوری عمر کا آدمی ہو، کم سن نہ ہو، عورت نہ ہو۔ مستمع کیلئے ضروری ہے کہ جو کچھ وہ سن رہا ہے وہ یادِ حق سے خالی نہ ہو۔ مسموع کے لئے شرط ہے کہ وہ بے حیائی اور ہنسی مذاق کا کلام نہ ہو۔ آلۂ سماع سے مراد مزامیر ہے، جیسے چنگ و رباب کہ یہ درمیان

میں نہ ہو"[1]

مزامیر سے نفرت و ممانعت

حضرت خواجہ مزامیر (آلات غنا اور باجے وغیرہ سے) سختی سے منع فرماتے تھے اور جب کبھی اس بارے میں کسی بے احتیاطی کی اطلاع ملتی تو نہایت ناراض ہوتے اور اس بارے میں کسی عذر کو قبول نہ فرماتے سیر الاولیاء میں ہے:۔

"مجلس میں ایک مرتبہ ایک شخص نے حضرت سلطان المشائخ سے عرض کیا کہ ان دنوں بعض حاضر باش درویشوں نے ایک ایسی مجلس میں جس میں چنگ و رباب اور مزامیر تھے شرکت کی اور رقص کیا۔ فرمایا:۔ اچھا نہیں کیا، جو خلاف شرع ہے وہ ناپسندیدہ ہے۔ اس پر ایک شخص نے عرض کیا کہ یہ لوگ جب باہر آئے اور لوگوں نے ان سے کہا کہ یہ آپ نے کیا کیا، اس مجلس میں مزامیر تھے، آپ نے سماع کس طرح سنا اور رقص کیا؟ انھوں نے جواب دیا کہ ہم سماع میں ایسے مستغرق تھے کہ ہمیں کچھ پتہ نہ چلا کہ مزامیر ہیں یا نہیں۔ حضرت سلطان المشائخ نے سنکر فرمایا کہ:۔ یہ جواب بھی کچھ نہیں، یہ بات تو ہر معصیت کے متعلق کہی جا سکتی ہے"[2]

حضرت خواجہؒ مزامیر کی ممانعت میں بڑی شدت اور مبالغہ فرماتے تھے۔ فرماتے تھے کہ:۔

"جب عورت کو نماز میں امام کی غلطی پر متنبہ کرنے کے لئے دستک دیتے وقت اس کی ممانعت ہے کہ ہتیلی پر ہتیلی ماری جائے کہ اس سے تالی کی آواز پیدا ہوتی ہے اور یہ لہو ہے، جب لہو و لعب سے اتنا پرہیز آیا ہے تو سماع میں بطریق اولیٰ مزامیر کی ممانعت ہونی چاہیئے"[3]

---

[1] سیر الاولیاء ص ۴۹۱ و ص ۴۹۲ [2] ایضاً ص ۵۲۰ و ص ۵۲۱ [3] ایضاً ص ۵۲۲

سماع میں آپ کی کیفیت

حضرت خواجہؒ فرماتے تھے کہ جس شخص کو اللہ تعالیٰ نے درد و ذوق عطا فرمایا ہے اس کو بغیر مزامیر کے ایک ہی شعر سنکر رقت پیدا ہو جاتی ہے لیکن جسے عالمِ ذوق کی خبر نہیں، اس کے سامنے پڑھنے والے کتنا ہی پڑھیں اور کیسے ہی مزامیر کیوں نہ ہوں اس پر کوئی اثر نہیں ہوتا، اسلئے کہ وہ اہلِ درد میں سے نہیں ہے، اس کام کا تعلق درد سے ہے نہ کہ مزامیر وغیرہ سے[1]

چنانچہ حضرت خواجہؒ کا حال یہ تھا کہ عارفانہ اور عاشقانہ اشعار سنتے ہی آپ پر سخت رقت طاری ہوتی لیکن اس طرح کہ لوگوں کو خبر نہ ہوتی، خدام رومال دیتے جاتے اور وہ آپ کے آنسوؤں سے تر ہوتے جاتے، یہ دیکھ کر لوگ سمجھتے کہ آپ پر گریہ طاری ہے[2]

امیر خورد (جو خود بھی اپنی کمسنی میں ان مجالس سماع میں شریک ہوتے تھے اور زیادہ تر اپنے والد اور چچا سے ان پُرکیف مجلسوں اور ان وجدان انگیز اشعار کا ذکر کرتے ہیں جو وہاں پڑھے گئے) کہتے ہیں کہ بعض مرتبہ بہت سے شعر پڑھے جاتے لیکن کیفیت نہ پیدا ہوتی، یکایک کوئی ہندی کا دوہا یا فارسی کا کوئی شعر پڑھ دیتا اور مجلس مکیّف ہو جاتی۔

کہتے ہیں کہ ایک مرتبہ ایک شاہی امیر قیر بیک نے ایک مجلس آراستہ کی مشائخ و صدور شہر کا اجتماع تھا، سماع شروع ہوا، کہنے والے بہت کچھ سناتے رہے کچھ اثر نہیں ہوا، آخر حسن بہدی قوال نے یہ شعر پڑھا ؎

در کلبۂ درویشی در محنت بیخویشی
مگذار مرا با من ہر سوئے مکن افسانہ

اس شعر کا پڑھنا تھا کہ حضرت سلطان المشائخ پر گریہ اور ایک حالت طاری ہوئی اور اس کیفیت کا تمام حاضرینِ مجلس پر اثر ہوا، اور سب مکیّف ہو گئے[3]

---

[1] سیر الاولیاء ص ۵۲۳ [2] ایضاً ص ۵۱۴ [3] ایضاً ص ۵۱۴

ایک دوسری مجلس کا ذکر ہے، بالاخانہ پر مجلس ہو رہی تھی، امیر خسرو کھڑے تھے اور سلطان المشائخ ناسازی طبع کی وجہ سے چارپائی پر تشریف رکھتے تھے، حسن بہدی نے سعدیؒ کا یہ شعر پڑھا ؎

سعدی تو کیستی کہ در آئی در ایں کمند

چنداں فتادہ اند کہ ما صید لاغریم

حضرت خواجہؒ پر گریہ طاری ہوا اور اس میں ڈوب گئے۔ خواجہ اقبال رومال بڑھاتے جاتے تھے اور آپ آنسو پونچھ کر حسن بہدی کی طرف اُن کو بڑھاتے تھے۔ کچھ دیر کے بعد سماع ختم ہوا، امیر حاجی فرزند امیر خسرو نے امیر خسرو ہی کی غزل پڑھنی شروع کی جس کا ایک شعر یہ تھا ؎

خسرو تو کیستی کہ در آئی دریں شمار

کیں عشق تیغ بر سر مردانِ دیں زدہ است

حضرت خواجہ پر پھر وہی کیفیت طاری ہوئی اور گریہ کا غلبہ ہوا[1]

ایک مرتبہ امیر خسرو نے غزل پڑھی جس کا مطلع تھا ؎

رخ جلوہ نمود مرا گفت تو مبیں

زیں ذوق مست بیخبرم کیں سخن چہ بود

آپ نے گوشہ چشم سے امیر خسرو کو دیکھا، اور کیفیت طاری ہوئی[2]۔

عام طور پر جس شعر پر حضرت خواجہؒ کو ذوق آتا تھا، دہلی کی مجلسوں اور شہر کی گلیوں میں عرصہ تک اس کا چرچا رہتا تھا اور لوگ اس سے لطف لیتے تھے اور ذوق حاصل کرتے رہتے تھے[3] سلطان علاء الدین نے بھی اہل دربار اور حضرت خواجہؒ کے یہاں آنے جانے والوں کو تاکید کر رکھی تھی کہ: جس

---

[1] سیر الاولیاء ص۵۱۵ [2] ایضاً ص۵۱۶ [3] ایضاً ص۵۱۰

شعر پر حضرت خواجہ کو ذوق آئے اس کو یاد رکھا جائے اور بادشاہ کو سنایا جائے۔ اکثر جب بادشاہ نے وہ شعر سنا جس پر حضرت خواجہ کو ذوق آیا تھا تو بڑی تعریف کی اور دیر تک ذوق لیتا رہا۔

ذوقِ قرآن | قرآن مجید کا ذوق، اسکے حفظ کا اہتمام اور تلاوت کی کثرت مشائخ چشت کا خصوصی ذوق اور ان کی قدیم روایت ہے۔ خواجۂ بزرگ معین الدین چشتیؒ سے لیکر حضرت خواجہ نظام الدینؒ تک سب کے یہاں قرآن مجید کا خصوصی ذوق اور شغف ملتا ہے اور ہر ایک نے اپنے خلفاءِ خاص اور مریدین با اختصاص کو حفظ قرآن اور اشتغال بالقرآن کی تاکید کی ہے۔[۱]

خلافت دیتے وقت شیخ کبیر نے حضرت خواجہ کو حفظ قرآن کی وصیت کی تھی حضرت خواجہ نے یہ وصیت پوری کی اور دہلی پہنچتے ہی اس کا سلسلہ شروع کر دیا حضرت خواجہ اپنے مریدین اور اصحاب خاص کو بھی اس کی ترغیب دیتے رہتے تھے اور تاکید فرماتے تھے۔ امیر حسن علاء سنجری جب حضرت خواجہ سے متعلق ہوئے تو وہ بوڑھے تھے اور شعر و شاعری زندگی بھر کا مشغلہ تھا۔ حضرت خواجہ نے ان کو ہدایت کی کہ قرآنی ذوق کو شعر و شاعری کے ذوق پر غالب کریں۔ امیر فوائد الفواد میں فرماتے ہیں:۔

بارہا از لفظ مبارک مخدوم شنیدہ ام می باید	بارہا اُن مخدوم کی زبان مبارک سے میں نے
کہ قرآن خواندن بر شعر گفتن غالب	یہ لفظ سنے ہیں کہ چاہیئے کہ قرآن کا پڑھنا
آید۔[۲]	شعر کہنے پر غالب آجائے۔

پھر ان کو حفظ قرآن کی ہدایت ہوئی۔ انھوں نے ایک ثلث یاد کر لیا تو ارشاد ہوا۔

دیگر ہا اندک اندک یاد گیر و یاد	تھوڑا تھوڑا یاد کرو اور اگلا یاد کیا ہوا
گرفتہ پیشینہ مکرر می کن[۳]	دہراتے رہو۔

---

[۱] تفصیل کیلئے ملاحظہ ہو مسلمانوں کا نظام تعلیم و تربیت" از مولانا مناظر احسن گیلانی (جلد دوم)۔۱۲

[۲] فوائد الفواد ص ۲۴۹ [۳] فوائد الفواد ص ۹۳

مولانا بدرالدین اسحٰق کے صاجزادے خواجہ محمد حضرت خواجہؒ کی کفالت و پرورش میں تھے ان کو بھی قرآن مجید یاد کرایا. خواجہ محمد امام بڑے اچھے حافظ و خوش الحان تھے، ان کو آپ نے نماز کا امام بنایا تھا ان کی قرأت سے آپ بڑے محظوظ ہوتے اور آپ کو ان کی قرات سن کر بڑی رقت اور ذوق آتا.[1] ان کے دوسرے بھائی خواجہ موسیٰ بھی حافظ و قاری تھے معمول تھا کہ جب دستر خوان پر بیٹھتے تو پہلے خواجہ محمد اور خواجہ موسیٰ کچھ قرآن شریف پڑھتے، اسکو دعائے مائدہ[2] کہتے تھے۔ اس کے بعد کھانا شروع ہوتا تھا۔ اپنے نواسوں (خواہرزادہ کے صاحبزدگان) خواجہ رفیع الدین وغیرہ کو بھی قرآن حفظ کرایا[3]۔ خود بھی نوافل میں قرآن شریف پڑھتے اور خاص خدام سے دریافت فرماتے کہ ان کا کیا معمول ہے؟

شیخ سے تعلق یوں تو جو شخص جس سے کوئی نعمت پاتا ہے (اگر اس کی طبیعت میں شرافت اور احسانمندی کا جذبہ ہے) اس کا گرویدہ ہوتا ہے اور اسکو اپنا محسن سمجھتا ہے لیکن حضرت خواجہ کو اپنے محسن سے عاشقانہ اور والہانہ تعلق تھا اور انکے اختصاص و امتیاز اور روحانی ترقیات میں اسکو خاص دخل تھا۔ اس محبت کا نتیجہ یہ تھا کہ جب کسی محبوب کی تعریف ہوتی تو انکو اپنے شیخ کی یاد تازہ ہوجاتی اور وہ انھیں کو اسکا مصداق سمجھتے۔ فرماتے ہیں کہ ایک مرتبہ شیخ کی زندگی میں ایک مجلس میں قوال نے یہ شعر پڑھا۔

خرام بدیں صفت مبادا
کز چشم بدت رسد گزندی

فرماتے ہیں کہ مجھے شیخ کے اخلاق و اوصاف ان کا فضل و کمال اور ان کی لطافت و زیبائی یاد آگئی۔ ایسی کیفیت طاری ہوئی کہ بیان نہیں ہو سکتی۔ قوال نے چاہا کہ آگے بڑھے میں نے بار بار وہی شعر پڑھوایا، یہ کر

---

[1] سیر الاولیاء ص ۲۰۰ — [2] سیر الاولیاء ص ۱۹۹
[3] سیر الاولیاء ص ۲۰۳

کر کے گریہ طاری ہوگیا۔ فرمایا اسکے بعد زیادہ دن نہیں گذرے کہ حضرت نے انتقال کیا[1]۔

جماعت کا اہتمام اور بلند ہمتی

ضعف پیری اور شدید مجاہدات کے باوجود جماعت سے نماز پڑھنے کا بیحد اہتمام تھا۔ صاحب سیرالاولیا لکھتے ہیں:۔

عمر شریف اسی سے متجاوز ہوگئی۔ جب بھی پانچوں وقت جماعت سے نماز
پڑھنے کے لئے بالاخانہ سے (جو بہت بلند تھا) جماعت خانہ میں اتر کران
درویشوں اور ساتھیوں کے ساتھ جو وہاں موجود ہوتے تھے جماعت کے ساتھ نماز
ادا کرتے تھے۔ اس کبرسنی کے باوجود ہمیشہ روزہ رکھتے، کم افطار کرتے[2]۔"

شریعت کی پابندی اور اتباع سُنّت کا اہتمام

حضرت خواجہ خود بھی اتباع سنت کا اہتمام بلیغ رکھتے تھے کہ بقول سعدیؒ

محال است سعدی کہ راہِ صفا
تواں رفت جز در پئے مصطفیٰ

اور اپنے اصحاب و خدام کو بھی بڑی تاکید فرماتے تھے۔ سنن کے علاوہ تاکید تھی کہ مستحبات و آداب تک فوت نہ ہوں۔ سیرالاولیاء میں آپ کا ارشاد منقول ہے:۔

استقامت می باید کہ بر متابعت	رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی پیروی
رسول علیہ السلام والصلوٰۃ باشد	و اتباع پر مضبوطی و ثابت قدمی دکھانی
و ہیچ مستحبے و آدابے فوت نہ شود[3]۔	چاہیئے اور کوئی مستحب اور ادب بھی فوت نہ ہونے پائے۔

---

[1] فوائد الفواد ص ۹۶

[2] سیرالاولیاء ص ۱۲۵

[3] سیرالاولیاء، ص ۳۱۸

مشائخ کے لئے اور جس کو پیری مریدی کرنا ہو، شریعت کا علم ضروری سمجھتے تھے تاکہ اس سے کوئی عمل خلاف شریعت نہ صادر ہو۔ نہ دوسرے کو کسی خلاف شرع امر کی تلقین کرے۔ فرماتے ہیں:۔

"پیر آں چناں باید کہ در احکام شریعت و طریقت و حقیقت عالم باشد و چوں ایں چنیں باشد او خود ہیچ نامشروع نہ فرماید[1]	پیر ایسا چاہیئے کہ احکام شریعت و طریقت و حقیقت کا (ضروری) علم رکھتا ہو اور جب ایسا ہوگا تو وہ کسی خلاف شرع کام کے لئے نہ کہے گا۔

---

[1] فوائد الفواد ص ۱۴۷

بابِ پنجم

افادات و تحقیقات

علمی پایہ

حضرت خواجہؒ باطنی کمالات کے ساتھ علوم ظاہری میں بھی بلند پایہ رکھتے تھے، اپنے زمانہ کے تمام مروجہ علوم کو بلند ہمتی، محنت اور اہتمام سے پڑھا تھا، ان کے اساتذہ میں اس عہد کے نامور ترین فضلا اور شیوخ ہیں، ادب اور علوم دینیات کی تعلیم انھوں نے مستوفی الممالک شمس الملک مولانا شمس الدین خوارزمی سے پائی تھی، حدیث کا درس مولانا کمال الدین زاہد محمد ابن احمد ماریکلی سے لیا جو صاحب مشارق الانوار امام حسن ابن محمد الصغانی کے شاگرد اور بیک واسطہ صاحب ہدایہ کے شاگرد تھے۔ کچھ کتابوں کو شیخ کبیر حضرت فرید الدین گنج شکرؒ سے پڑھ کر علم میں مزید جلا حاصل کی۔

علمی و ادبی مناسبت

اگرچہ اپنی مناسبتِ فطری اور شیخ کی نسبتِ باطنی کے اثر سے روز بروز الفاظ کے مقابلہ میں معانی اور معانی کے مقابلہ میں حقائق و احوال اور "اسم" سے زیادہ "مسمیٰ" میں مشغولیت بڑھتی گئی، پھر بھی علم و ادب سے مناسبت اور علمی ذوق آخر تک قائم رہا۔

سیر الاولیاء میں ہے کہ مولانا رکن الدین چیغر نے کشاف اور مفصل اور ان کے علاوہ بعض کتابیں حضرت سلطان المشائخ کی خاطر نقل کر کے خدمت میں پہنچائیں۔ یہ دونوں کتابیں مشہور معتزلی فاضل علامہ محمود جار اللہ

لہ سیر الاولیاء ص ۳۱۷

زمخشری (متوفی ۵۳۸ھ) کی تصنیف ہیں۔ پہلی کتاب تفسیر میں ہے اور دوسری نحو میں، اس سے بھی آپ کے علمی ذوق اور وسعت نظر کا اندازہ ہوتا ہے۔ اسی سیر الاولیاء میں ہے کہ سید خاموش ابن سید محمد کرمانی مجلس خلوت میں "خمسۂ نظامی" حضرت خواجہؒ کی خدمت میں پڑھتے تھے[1]۔ آپ کا ادبی ذوق اتنا بلند اور پاکیزہ تھا کہ امیر خسرو جیسے سرآمد روزگار شاعر (جو اپنے طرز میں بے نظیر اور فارسی کے صف اول کے شعراء میں ہیں) کو شاعری میں مشورہ دیا اور رہنمائی فرمائی۔ سیر الاولیاء میں ہے کہ ابتدا میں امیر خسرو جو غزل کہتے تھے اس کو حضرت سلطان المشائخ کی خدمت میں نظر اصلاح پیش کرتے تھے۔ ایک روز حضرت نے ان سے کہا کہ صفاہانیوں کے طرز میں کہا کرو[2]۔

حدیث و فقہ پر نظر سلطان غیاث الدین تغلق کے دربار میں جو مجلس مناظرہ ہوئی تھی اس میں حضرت خواجہؒ نے مسئلہ پر جو تقریر اور اس کی تنقیح فرمائی اس سے بھی حضرت کے علمی مرتبہ اور وسعت نظر کا اندازہ ہوتا ہے۔

ہندوستان میں حضرت شیخ عبدالحق محدث دہلویؒ کے عہد سے پہلے کتب صحاح متداول نہیں ہوئی تھیں اور صحیحین تک سے لوگ زیادہ مانوس اور آشنا نہیں تھے۔ حدیث میں مشارق الانوار اور مشکوٰۃ سرمایۂ علمی اور حدیث کا منتہی سمجھی جاتی تھی[3]۔ بکثرت موضوع اور ضعیف احادیث صوفیوں کی زبان پر جاری اور بزرگوں کے ملفوظات مجالس میں بے تکلف منقول ہیں۔ نقد حدیث اور موضوعات کا علم علامہ محمد طاہر پٹنی سے پہلے یہاں نظر نہیں آتا۔ حضرت خواجہؒ کے ملفوظات اور سوانح سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ ایسی بہت سی بے اصل روایات سے (جو زبان زد خلائق ہیں) استدلال نہیں فرماتے تھے اور آپ کی اس پر نظر تھی کہ احادیث صحیحہ کا سب سے مستند مجموعہ صحیحین ہیں۔ فوائد الفواد میں ہے کہ کسی نے دریافت کیا کہ یہ

---

[1] سیر الاولیاء ص ۲۱۹ [2] سیر الاولیاء ص ۳۰۱

[3] تفصیل کیلئے ملاحظہ ہو "الثقافۃ الاسلامیۃ فی الہند" کا باب حدیث ۔ ۱۲

حدیث کیسی ہے: "السخی حبیب اللّٰہ وان کان کافراً" فرمایا: کسی کا مقولہ ہے، ایک شخص نے عرض کیا کہ: یہ اربعین (چہل حدیث) کی حدیث ہے۔ فرمایا: جو کچھ صحیحین میں ہے وہ صحیح ہے۔[1]

اہمیت علم اپنے مشائخ کرام کی طرح آپ کی نظر میں بھی علم کی بڑی اہمیت اور عظمت تھی اور اسکو سالکین اور ان لوگوں کیلئے جو ارشاد و تربیت کا کام کریں آپ بہت ضروری سمجھتے تھے۔

---

[1] فوائد الفواد ص ۱۰۳

اس موقعہ پر اس کا اظہار ضروری ہے کہ باوجود اسکے کہ آپ صحیحین کے مرتبہ سے واقف تھے لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ صحاح ستہ کے عام طور پر اور صحیحین کے خاص طور پر ہندوستان میں متداول نہ ہونے کی وجہ سے ان علماء و مشائخ کا اشتغال نہیں تھا خود آپ نے بھی (اگر مجلس مناظرہ کی روداد صحیح ہے) مجلس مناظرہ میں جن حدیثوں کو حلت سماع کی دلیل کے طور پر پیش کیا ہے وہ صحاح کی احادیث نہیں ہیں اور محدثین کے نزدیک ان کا پایہ کچھ بلند نہیں ہے فریق مقابل کے علماء نے بھی جو اکابر علماء اور اعیان قضاۃ میں سے تھے جس طرح گفتگو اور استدلال کیا ہے اس سے علم حدیث سے نہ صرف ان کی بے خبری کا ثبوت ملتا ہے بلکہ ایک عالم دین کو اسکے بارے میں جو رویہ اختیار کرنا چاہیئے اس کی کمی کا بھی احساس ہوتا ہے۔ کتب صحاح اور نقد حدیث اور جرح و تعدیل کے فن کے شائع نہ ہونے کی وجہ خانقاہوں میں بہت سی ایسی رسوم، یہاں تک کہ سجدۂ تعظیمی رائج تھیں اور بہت سے ایسے اوقات و ایام کے فضائل کی روایات مشہور تھیں اور مشائخ کے ملفوظات میں ان کا بڑی آب و تاب سے ذکر آتا ہے۔ جن کا احادیث کے صحیح مجموعوں میں کوئی وجود نہیں اور محدثین ان پر سخت کلام کرتے ہیں اسکو پیش نظر رکھتے ہوئے حضرات محدثین اور ان مخلصین کی کوششوں کی قدر ہوتی ہے جنھوں نے ہندوستان میں فن احادیث کی اشاعت کی اور صحیح و ضعیف احادیث میں امتیاز پیدا کیا۔ شکر اللّٰہ مساعیہم

بنگال کے ایک نہایت عالی استعداد نوجوان جو بعد میں اخی سراج الدین کے نام سے مشہور ہوئے اور جو پنڈوہ کی مشہور عالم چشتی خانقاہ کے بانی اور رہبر حلقہ ہیں، لکھنوتی سے بہ نیت ارادت دہلی آئے، حضرت خواجہؒ کے مرید ہوئے۔ آپ نے مولانا فخرالدین زرادی سے فرمایا کہ "یہ جوان بڑی قابلیت رکھتا ہے، اگر کچھ علم ظاہر بھی رکھتا ہوتا تو درویشی میں مستحکم ہوتا"۔ یہ بات سنکر مولانا فخرالدین نے عرض کیا کہ:- اگر اجازت ہو تو میں اس کو کچھ عرصہ اپنی صحبت میں رکھکر ضروری مسائل یاد کرادوں۔ فرمایا کہ: یہ آپ کی صحبت کا بڑا مستحق ہے مولانا فخرالدین ان کو اپنے ساتھ لے گئے اور عرصۂ قلیل میں علم سے مناسبت پیدا کرادی۔ حضرت خواجہؒ کی وفات کے بعد بھی وہ تکمیل علم کے لئے کچھ عرصہ دہلی میں ٹھہرے رہے، پھر وطن واپس آگئے اور مشرق و بنگال میں سلسلہ چشتیہ کی اشاعت کا ذریعہ بنے[۱]

بلند علوم و مضامین علم ظاہر و باطن کی اس جامعیت اخلاص اور تفکر و مجاہدات کی بنا پر آپ کو ان بلند اور صحیح علوم اور حقائق و معارف سے حصۂ وافر ملا جو اولیاء کاملین اور کبار مخلصین ہی کو ملا کرتا ہے اور جو صفائے باطن، طہارت اخلاق اور اخلاص کا نتیجہ ہے اور جس کو اہل تصوف علوم لدنیہ سے تعبیر کرتے ہیں۔ صاحب سیر الاولیاء لکھتے ہیں کہ کسی علم میں گفتگو ہوتی یا کوئی اشکال پیش آتا، آپ اپنے نورِ باطن سے ان کا جواب شافی عطا فرماتے ؎

اے لقائے تو جوابِ ہر سوال
مشکل از تو حل شود بے قیل و قال

آپ اس مسئلہ پر ایسی بلیغ تقریر فرماتے کہ تمام حاضرینِ مجلس حیرت میں رہ جاتے اور ایک دوسرے سے کہتے کہ یہ کتابی جوابات نہیں ہیں۔ یہ الہامِ ربانی اور علمِ لدنّی کے فیوض ہیں، اسی بنا پر شہر کے چوٹی کے علماء جو تصوف کے منکر اور اہلِ تصوف کے مخالف مشہور تھے، حضرت خواجہؒ کے حلقہ بگوش اور اپنے علمی غرور اور زعم پر نادم ہوئے اور آپ کے خدام اور ارادتمندوں میں شامل ہوگئے۔

[۱] سیر العارفین وغیرہ ۔ ۱۲

علومِ صحیحہ شرعیہ

اس علمی رسوخ، اتباعِ سنت اور استقامت علی الشریعت نے آپ کے ذہن کو ایسا سلیم اور مستقیم بنا دیا تھا کہ اہلِ تصوف میں جو باتیں عرصۂ دراز سے ظاہر شریعت کے کے خلاف چلی آتی تھیں اور بہت جگہ اہلِ تصوف کا شعار بن گئی تھیں، آپ اپنی سلامتیٔ ذہن سے اُن کو قبول نہیں کرتے تھے اور آپ کا ذوق[1] اور تحقیق اُن کے خلاف تھی۔

تصوف کے حلقوں میں بہت عرصہ سے اس خیال کا اظہار ہو رہا تھا کہ ولایت نبوت سے افضل اور اولیاء کو انبیاء پر فضیلت حاصل ہے اسلئے کہ ولایت عبارت ہے حضرت حق کے ساتھ مشغولیت اور ماسوی اللہ سے انقطاع سے اور نبوت میں (دعوت وتبلیغ کی وجہ سے) مخلوق کے ساتھ مشغولی ہوتی ہے، پھر اس میں کئی مذہب پیدا ہوگئے اور کسی نے یہ تاویل کی کہ انبیاء کی ولایت ان کی نبوت سے افضل ہے، لیکن آپ اسکو تسلیم نہیں کرتے۔ فوائد الفواد میں ہے کہ حضرت خواجہؒ نے فرمایا کہ: یہ مذہب باطل ہے، اس سبب سے کہ اگرچہ انبیاء مخلوق کے ساتھ مشغول ہوتے ہیں لیکن جس وقت کہ وہ حق کے ساتھ مشغول ہوتے ہیں اس مشغولیت کا قلیل سے قلیل زمانہ بھی اولیاء کے تمام اوقات پر فضیلت رکھتا ہے۔[2]

حلال مانع راہِ خدا نہیں

تصوف کے متعلق عام طور پر یہ سمجھا اور مشہور کیا گیا ہے کہ تصوف تعطل اور بیکاری وبےعملی کا نام ہے اور ہر اشتغال وصول اللہ سے مانع

---

[1] سیر الاولیاء ص ۱۳۰

[2] فوائد الفواد ص ۱۲۰ امام ربانی حضرت مجدد الف ثانیؒ نے اتنا مزید اضافہ کیا کہ انبیاء عین مشغولی بخلق کی حالت میں بھی اولیاء سے (یعنی اس وقت جب وہ حق کے ساتھ مشغول ہوتے ہیں) زیادہ متوجہ الی اللہ اور مشغول باللہ ہوتے ہیں) ان کی مشغولیت بخلق چونکہ حکم الٰہی سے ہوتی ہے اسلئے وہ عین مشغولیت بحق اور امر الٰہی کا امتثال ہوتا ہے۔ ۱۲

اور راہِ سلوک کا رہزن ہو۔ حضرت خواجہ معرفت و تحقیق کے جس مقام پر فائز تھے اور رسائل و رسوم سے بلند ہو کر مقاصد اور لب لباب پر جس طرح آپ کی نظر تھی اس کا مقتضا یہ تھا کہ آپ اس مقام سے آگے بڑھ چکے تھے اور فعل حلال و مشروع کی نورانیت اور اس کا ذریعۂ قرب ہونا آپ کی نظر میں تھا۔ حضرت خواجہ سید محمد گیسو دراز کے ملفوظات "جوامع الکلم" میں ہے کہ حضرت خواجہ نظام الدین نے فرمایا:۔

ہیچ کسے (چیزے) کہ حلال است مانع	کوئی چیز جو حلال ہے راہ خدا کی مانع
راہ خدائی نیست و قاطع سلوک نیست	اور قاطع سلوک نہیں ورنہ مشروع
وگرنہ مشروع و حلال نبودی[1]	حلال نہ ہوتی۔

قلب متوجہ الی اللہ کے لیے کوئی چیز مضر نہیں

ایک مرتبہ ارشاد فرمایا کہ خدا کی طرف متوجہ دل اور پاک نفس چاہیئے اس کے بعد جس کام میں رہنا ہو رہو، تمھیں کوئی نقصان نہ ہوگا۔[3]

ترکِ دُنیا کی حقیقت

ترکِ دنیا اور حقیقی زہد و درویشی کی حقیقت بیان کرتے ہوئے ایک مرتبہ ارشاد فرمایا:۔

ترکِ دنیا آں نیست کہ کسے خود را	ترکِ دنیا کے معنی یہ نہیں ہیں کہ کوئی
برہنہ کند مثلاً لنگوٹہا بندد و بنشیند	اپنے کو ننگا کر دے مثلاً لنگوٹہ باندھ کر
ترکِ دنیا آں است کہ لباس بپوشد	بیٹھ جائے، صحیح معنی میں ترکِ دنیا یہ
و طعام بخورد و آنچہ برسد روا بدارد	ہے کہ کپڑے پہنے، کھانا کھائے اور
و بجمع او میل نکند و خاطر را متعلق	جو کچھ میسّر آئے اُس کو استعمال کرے،

---

[1] جوامع الکلم ص۱۶۰ [2] یعنی مشروع وجوہ معاش اور ظاہری مشاغل وغیرہ۔ [3] سیر الاولیاء ص۱۶۰

بہ بچیزے ندارد ترک دنیا است[1]   لیکن اسکے جمع کرنے کی طرف متوجہ نہ ہو اور اپنے دل کو کسی چیز میں پھنسائے نہیں یہی ترکِ دنیا ہے

طاعت لازم و متعدی فرمایا:- طاعت کی دو قسمیں ہیں لازم اور متعدی۔ طاعتِ لازمی اسے کہتے ہیں جس کی منفعت طاعت کرنے والے کو پہنچے، جیسے نماز، روزہ، حج، اوراد و تسبیحات وغیرہ۔ طاعت متعدی وہ ہے جس کی منفعت اور راحت دوسرے کو پہنچے، مثلاً دو مسلمانوں میں اتفاق کرا دینا، شفقت، دوسروں کے ساتھ مہربانی وغیرہ، اس کو طاعت متعدی کہتے ہیں اور اس کا ثواب بے حد و بے اندازہ ہے۔

طاعتِ لازمی کی قبولیت کے لئے بڑے اخلاص کی ضرورت ہے اور طاعتِ متعدی جس طرح بھی کرے گا ثواب ملے گا[2]۔

کشف و کرامات حجابِ راہ ارشاد ہوا کہ اولیاء سے جو کچھ اظہار ہوتا ہے وہ ان کی سُکر و مستی کا نتیجہ ہے، اسلئے کہ وہ اصحاب سکر ہیں، اسکے برخلاف انبیاء اصحابِ صحو ہیں، سالک کیلئے کشف و کرامات حجابِ راہ ہیں، محبت سے استقامت پیدا ہوتی ہے[3]۔

علومِ انبیاء و اولیاء فرمایا کہ:- تین مرتبے ہیں۔ ایک مرتبہ جس کو طورِ حس کہنا چاہیئے، دوسرا طورِ عقل اور تیسرا طورِ قدس۔ طورِ حس میں مطعومات (کھانے پینے کی چیزیں)، مشمومات (جن کی خوشبو محسوس ہوتی ہے) وغیرہ محسوسات معلوم ہوتی ہیں، اسکے بعد طورِ عقل ہے اس کا تعلق دو علموں سے ہے کسبی اور بدیہی، لیکن عالم قدس میں پہنچ کر عقل سے حاصل کئے ہوئے کسبی علوم بھی بدیہی معلوم ہونے لگتے ہیں۔ پھر فرمایا کہ بدیہی بھی علمِ قدس نہیں ہو کسبی کا کیا ذکر؟ وہ انبیاء و اولیاء کے علوم ہیں۔ اسکے بعد فرمایا کہ جس پر عالمِ قدس کا دروازہ کھلتا ہے اسکی علامت کیا ہو سکتی ہے؟ جو شخص

---

[1] فوائد الفواد ج ۱ ص ۔ [2] ایضاً ج ۱ ص ۱۲۔ [3] فوائد الفواد ج ۱ ص ۳۳

عالمِ عقل میں ہوتا ہے اور وہ کسی مسئلہ کو بدیہی یا کسبی علم سے حل کرتا ہے اور اس سے اس کو ایک فرحت حاصل ہوتی ہے وہ عالمِ قدس میں راہ نہیں پاتا۔ اس درمیان میں کسی بزرگ کا واقعہ بیان کیا کہ وہ فرماتے تھے کہ غیب سے کچھ علوم اور واردات دل پر گذرتے ہیں انشاء اللہ ان کو قلم بند کروں گا، اسکے بعد بہت کچھ لکھا۔ پھر فرمایا کہ بہت کچھ لکھا گیا لیکن جو کچھ مقصود تھا وہ ضبطِ تحریر میں نہیں آسکا[1]۔

دنیا کی محبت اور عداوت

ایک دن اس کا ذکر ہو رہا تھا کہ کسی کو دنیا کی محبت ہوتی ہے اور کسی کو اس سے نفرت۔ فرمایا کہ:۔ تین طرح کے لوگ ہیں جو دنیا کو دوست رکھتے ہیں اور رو دن رات اس کی یاد اور فکر میں رہتے ہیں ایسے لوگ بہت ہیں۔ کچھ دوسرے لوگ ہیں جو دنیا سے نفرت کرتے ہیں اور اس کا حقارت کے ساتھ ذکر کرتے ہیں اور ہمیشہ اسکی دشمنی میں رہتے ہیں۔ تیسری قسم ان لوگوں کی ہے جن کو نہ دنیا سے محبت ہوتی ہے نہ نفرت اور اس کا ذکر محبت یا عداوت کے ساتھ نہیں کرتے، یہ پہلی دونوں قسموں سے بہتر ہے۔ اس کے بعد آپ نے حکایت سنائی کہ:۔ ایک شخص حضرت رابعہ بصریؒ کے پاس آیا اور دنیا کی سخت مذمت کرنے لگا۔ حضرت رابعہ بصریؒ نے اس سے کہا کہ:۔ برائے مہربانی آپ اسکے بعد نہ آئیے گا۔ آپ کو دنیا سے محبت معلوم ہوتی ہے اس لئے کہ آپ اسکا بہت ذکر کرتے ہیں[2]۔

مراتبِ تلاوتِ قرآن

ایک مرتبہ آپ نے تلاوت قرآن پاک کے مراتب اس طرح بیان فرمائے کہ: پہلا مرتبہ یہ ہے کہ جو کچھ پڑھے اسکے معانی دل پر گزارے۔ دوسرا مرتبہ یہ ہے کہ پڑھنے والے کا دل حق تعالیٰ کے ساتھ متعلق و مشغول ہو۔

فرماتے کہ قرآن پڑھتے ہوئے تو کم از کم اس شعور کو ہر شخص میں ہونا چاہیئے کہ میں اس نعمت کے

---

[1] فوائد الفواد ج ۱ ص ۶۹ [2] ایضاً ج ۱ ص ۱۸۹

لائق کہاں تھا اور میرے نصیب ایسے کہاں تھے کہ مجھے یہ دولت ملے، اگر یہ سب حاصل نہ ہو تو پڑھنے پر جس ثواب اور جزا کا وعدہ ہے اسکو ذہن میں تازہ اور مستحضر رکھا جائے۔ [۱]

اگرچہ حضرت خواجہؒ نے جیسا کہ انھوں نے کئی بار ارشاد فرمایا کوئی تصنیف نہیں کی، لیکن آپ کی سب سے بڑی تصنیفات آپ کے تربیت کئے ہوئے اور آپ کی صحبت پائے ہوئے وہ خلفائے کبار اور اصحابِ نامدار ہیں جو عملِ صحیح اور علمِ صحیح کا نمونہ تھے اور جن کے دل کا راستی علم کی گہرائی اور فہم کی پختگی "راسخین فی العلم" کے شایانِ شان تھی۔ امیر حسن علاء سنجری کی فوائد الفواد اور امیر خورد کی سیر الاولیاء میں آپ کے بہت سے اقوال و ملفوظات منقول ہیں جو آپ کی شانِ تحقیق کا مظہر ہیں۔

سے فوائد الفواد ص۱۷

[۱] فوائد الفواد ص۲۵ و خیر المجالس ص۳۵

باب ششم

فیوض و برکات

تجدید ایمان و توبۂ عام

قبل اس کے کہ اُن فیوض و برکات کا ذکر کیا جائے جو حضرت خواجہ نظام الدینؒ کے ساتھ تعلق اور ان کے ہاتھ پر توبہ و بیعت کے ذریعہ لاکھوں مسلمانوں کو پہنچے اور ایک ایسے زمانہ میں جب مسلمانوں کی حکومت اپنے پورے عروج پر تھی اور غفلت، خدا فراموشی اور نفس پرستی کے اسباب و محرکات پورے شباب پر تھے، ایک ایسی دینی اور روحانی لہر پیدا ہوئی جس کو ہر محسوس کرنے والے نے محسوس کیا۔ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ مشائخ طریقت کی بیعت عام اور ارشاد و تلقین توبہ کی حکمت اور ضرورت بیان کر دی جائے، تاکہ معلوم ہو کہ کن حالات و ضروریات کے ماتحت اس طریقے کو اختیار کیا گیا اور اس سے کیا دینی فوائد پہنچے، راقم سطور نے تاریخ دعوت و عزیمت کے حصۂ اول میں حضرت سیدنا عبدالقادر جیلانیؒ کے تذکرہ کے ضمن میں جو کچھ لکھا تھا پہلے اسی کو کسی قدر اختصار و ترمیم کے ساتھ نقل کیا جاتا ہے:۔

"خیر القرون کے بعد اسلامی آبادی کا پھیلاؤ اور زندگی کی ذمہ داریاں اور

معاشی تفکرات اتنے بڑھ گئے تھے کہ خصوصی تعلیم و تربیت کے ذرائع سے عمومی اصلاح و تربیت کا کام نہیں لیا جا سکتا تھا اور کسی بڑے پیمانہ پر کسی دینی اور روحانی انقلاب کی توقع نہیں کی جا سکتی تھی، پھر اس کی کیا صورت تھی کہ مسلمانوں کی بڑی تعداد اپنے ایمان کی تجدید کرے، دینی ذمہ داریوں و پابندیوں کو اور شعور و احساس ذمہ داری کیساتھ دوبارہ قبول کرے، اس میں پھر اپنی ایمانی کیفیات اور دینی جذبات پیدا ہوں، اُسکے افسردہ و مردہ دل میں پھر محبت کی گرمی پیدا ہو، اور اُسکے مضمحل قوی میں پھر حرکت و نشاط پیدا ہو، اسکو کسی مخلص خدا شناس پر اعتماد ہو اور اس سے وہ اپنے امراض روحانی و نفسانی میں علاج اور دین کی صحیح روشنی اور رہنمائی حاصل کرے۔ ناظرین کو اس کا اندازہ ہو چکا ہے کہ اسلامی حکومتیں جن کا یہ اصلی فرض تھا اسلئے کہ جس نبی کی نیابت و نسبت پر وہ قائم تھیں بقول سیدنا عمر بن عبدالعزیزؒ وہ ہدایت کیلئے مبعوث ہوا تھا۔ "جبایت" (تحصیل وصول" کے لئے نہیں) نہ صرف اس فریضہ سے غافل اور کنارہ کش ہو چکی تھیں بلکہ اپنے سربراہوں اور عمالِ حکومت کے اعمال و کردار کے لحاظ سے اس کام کیلئے مضر اور اس کے راستہ میں مزاحم تھیں، دوسری طرف وہ اس قدر بدگمان، توہم پرست اور شکی واقع ہوئی تھیں کہ کسی نئی تنظیم اور نئی دعوت کو جس میں قیادت و سیادت کی آمیزش پائیں برداشت نہیں کر سکتی تھیں۔ اسکو وہ فوراً کچل کر رکھ دیتیں۔ ایسی صورت میں مسلمانوں میں نئی دینی زندگی، نیا نظم و ضبط اور نئے سرے سے حرکت و عمل پیدا کرنے کیلئے اسکے علاوہ کیا شکل تھی کہ خدا کا کوئی مخلص بندہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے طریقے پر ایمان و عمل اور اتباعِ شریعت کیلئے بیعت لے اور مسلمان اس کے ہاتھ پر اپنی سابقہ غفلت و جاہلیت کی زندگی سے توبہ اور ایمان کی تجدید کریں اور پھر وہ نائب پیغمبر انکی دینی نگرانی

وتربیت کرے، اپنی کیمیا اثر صحبت، اپنے شعلۂ محبت، اپنی استقامت اور اپنے نفسِ گرم سے پھر ایمانی حرارت، گرمیِ محبت، خلوص وللّٰہیت، جذبۂ اتباعِ سنّت اور شوقِ آخرت پیدا کر دے، اُن کو اس نئے تعلق سے محسوس ہو کہ انھوں نے ایک زندگی سے توبہ کی ہے اور ایک نئی زندگی میں قدم رکھا ہے، اور کسی اللہ کے بندے کے ہاتھ میں ہاتھ دے دیا ہے، وہ بھی یہ سمجھے کہ ان بیعت کرنے والوں کی اصلاح وتربیت اور ان کی دینی خدمت اللہ نے میرے سپرد کی ہے اور اس محبت و اعتقاد کا مجھ پر نیا حق قائم ہو گیا ہے، پھر اپنے تجربوں و اجتہاد اور کتاب و سنّت کے اصول وتعلیمات کے مطابق ان میں صحیح روحانیت و تقویٰ اور ان کی زندگی میں ایمان احتساب و اخلاص اور ان کے اعمال وعبادات میں ایمانی کیفیات اور روح پیدا کرنے کی کوشش کرے، یہی حقیقت ہے اس بیعت تربیت کی جس سے دین کے مخلص داعیوں نے اپنے اپنے وقت میں احیاء وتجدیدِ دین اور اصلاح مسلمین کا کام لیا ہے، اور لاکھوں بندگانِ خدا کو حقیقتِ ایمان اور درجۂ احسان تک پہنچا دیا ہے[۱]؛"

بیعت ایک عہد و معاہدہ یہ بیعت پچھلے گناہوں سے توبہ اور خدا و رسول کے احکام کی تعمیل اور اتباعِ شریعت کا ایک معاہدہ ہوتا تھا، سلطان المشائخ بیعت لینے وقت بیعت کرنے والے سے کیا الفاظ کہلواتے تھے اور آئندہ کیلئے اس سے کیا عہد لیتے تھے کسی تذکرہ میں اسکے صحیح الفاظ نظر سے نہیں گزرے، لیکن حضرت خواجہ نے خود اپنے شیخ و مرشد شیخ کبیر حضرت خواجہ فریدالدین گنج شکرؒ کے بیعت لینے کا طریقہ اور ان کی تلقین کا ذکر کیا ہے اور ان کو اپنے شیخ سے جو والہانہ تعلق اور ان کی بڑی کا جو جذبہ تھا، اس سے یہی قیاس کیا جا سکتا ہے

---

[۱] تاریخِ دعوت و عزیمت حصۂ اوّل ص۲۰۲

کہ وہ بھی اسی طرح اپنے نئے مریدین کو تلقین فرماتے ہوں گے - ارشاد ہے:-

"جب کوئی شخص شیخ شیوخ العالم فریدالدین والحق کی خدمت میں بہ نیت ارادت آتا فرماتے پہلے ایک بار سورۂ فاتحہ اور سورۂ اخلاص پڑھو، اسکے بعد سورۂ بقر کا آخری رکوع آمن الرسول سے آخر تک پڑھتے، اسکے بعد شھد اللّٰہ انہ لا الٰہ الا ھو ...... ان الدین عند اللّٰہ الاسلام تک پڑھتے، اسکے بعد فرماتے کہ تم نے بیعت کی اس ضعیف کے ہاتھ پر، اسکے شیخ اور شیخ کے مشائخ کے ہاتھ پر اور حضرت پیغمبر علیہ الصّلوٰۃ والسّلام کے دستِ مبارک پر اور حضرت عزت (جل مجدہٗ) سے عہد کیا کہ اپنے ہاتھ پاؤں اور آنکھوں کی حفاظت اور شریعت کے راستہ اور طریقہ پر قائم رہو گے[1]"

بیعت کی اس تلقین میں اسلام کے بنیادی عقائد آگئے، سمع وطاعت (سننے اور ماننے) کا وعدہ اور ارادہ بھی آگیا، یہ بات بھی آگئی کہ اللہ کے یہاں قابلِ قبول دین صرف دینِ اسلام ہے اس کا احساس بھی بیدار و تازہ کر دیا گیا کہ یہ بیعت در اصل دستِ مبارک نبوی پر ہے اور یہ شیخ کا ہاتھ اس دستِ مبارک کا قائم مقام ہے۔ ربّ العزّت سے اس کا بھی عہد کیا گیا کہ ہاتھ پاؤں اور آنکھوں کی معصیتوں سے حفاظت کی جائے گی اور راہِ شریعت پر قائم رہا جائیگا، تجدیدِ ایمان اور رضا و رسول سے اپنا پرانا عہد استوار کرنے کا اس سے بہتر اور عام فہم طریقہ کیا ہو سکتا ہے؟ یہ تو نہیں کہا جا سکتا کہ بیعت کرنے والے سو فی صدی اس عہد پر قائم رہتے تھے لیکن اس میں کوئی شبہ نہیں کہ بیعت کرنے والوں میں سے ایک بڑی تعداد اس اقرار و عہد کی شرم اور لاج رکھتی اور ہزاروں اور لاکھوں بندگانِ خدا کے لئے یہ تجدیدِ ایمان اور انقلابِ حال کا ذریعہ بن جاتی۔

---

[1] سیر الاولیاء ص ۳۲۳

عمومِ بیعت کی حکمت

بیعتِ ارشاد میں ان حضرات نے جو وسعتِ اذنِ عام فرما رکھا تھا اور جس طرح بغیر کسی امتحان اور امتیاز کے لوگوں کو اجازت تھی کہ وہ بیعت کریں اور حلقۂ ارادت میں داخل ہو جائیں، خاص طور پر حضرت خواجہ کے یہاں اس باب میں جو وسعت و رعایت تھی، اس پر بعض لوگوں کو یہ کھٹک پیدا ہو سکتی ہے کہ جب بیعت ایک معاہدہ ہے اور اس کا تعلق پوری زندگی سے ہے تو اس میں اتنی وسعت کیوں روا رکھی گئی ہے؟ حضرت خواجہ نے ایک موقع پر خود ہی اس اشکال کا جواب دیا ہے اور اس عمومیت کی حکمت بیان کی ہے۔

مولانا ضیاء الدین برنی (مصنف تاریخ فیروزشاہی) فرماتے ہیں کہ میں ایک دن حضرت سلطان المشائخ کی خدمت میں حاضر تھا، اشراق سے چاشت تک آپ کی روح پرور جان نواز باتیں سنتا رہا اس روز خاص طور پر بہت کثرت سے لوگ بیعت ہوئے، یہ دیکھ کر میرے دل میں آیا کہ مشائخ متقدمین نے مرید کرنے میں بڑی احتیاط سے کام لیا ہے۔ سلطان المشائخ نے اپنی فیاضی و عنایت سے اس کا اذن عام دے دیا ہے اور آپ خاص و عام سب کو مرید کر لیتے ہیں، میں نے چاہا کہ میں اس بارے میں سوال کروں سلطان المشائخ اپنے کشف سے میرے خطرے پر مطلع ہو گئے، فرمایا:-

"مولانا ضیاء الدین! تم ہر طرح کی باتیں پوچھتے ہو، یہ نہیں پوچھتے کہ میں بغیر تحقیق کے آنے والوں کو کیوں مرید کر لیتا ہوں۔"

یہ سنکر مجھ پر لرزہ سا طاری ہو گیا اور میں نے آپ کے قدم لیکر عرض کیا کہ ایک عرصے سے میرے دل میں یہ اشکال تھا آج بھی یہ وسوسہ آیا تھا، اللہ نے آپ کے دل میں یہ بات ڈال دی حضرت نے فرمایا:-

"حق تعالیٰ نے ہر زمانہ میں اپنی حکمتِ بالغہ سے ایک خاصیت رکھی ہے، اس کا نتیجہ یہ ہے کہ ہر زمانہ کے لوگوں کی راہ و رسم اور عادتیں الگ ہوتی ہیں اور ان کے مزاج و طبیعت پچھلے لوگوں کے اخلاق و طبائع سے میل نہیں کھاتے، تھوڑے لوگ اس سے

مستثنیٰ ہوتے ہیں اور یہ ایک تجربہ کی بات ہے۔ ارادت کی اصل یہ ہے کہ مرید ماسوی اللہ سے منقطع اور مشغول مع اللہ ہو جائے، جیسا کہ کتب تصوف میں تفصیل کے ساتھ درج ہے۔ مشائخ متقدمین جب تک طالب ارادت میں انقطاع کلی نہ دیکھ لیتے بیعت کا ہاتھ نہیں بڑھاتے تھے لیکن سلطان ابوسعید ابوالخیر کے عہد سے لیکر شیخ سیف الدین باخرزی کے زمانے تک اور شیخ الشیوخ شیخ شہاب الدین سہروردی سے لیکر شیخ شیوخ العالم فرید الحق والدین قدس سرہ العزیز کے وقت تک کہ یہ سب حضرات سرآمد روزگار اور آیۃ من آیات اللہ تھے، خلق خدا کا ان کے دروازوں پر ہجوم ہوا اور ہر طبقہ کے لوگوں نے اژدحام کیا، ان بندگان خدا نے آخرت کی ذمہ داریوں سے ڈر کر ان عاشقان خدا کا دامن تھامنا چاہا اور ان مشائخ کبار نے بھی خاص و عام کو اپنی بیعت میں قبول کیا، اور خرقہ، توبہ و تبرک عطا کیا، ہر شخص ان محبوبان خدا کے معاملات پر اپنے کو قیاس نہیں کر سکتا کہ شیخ ابوسعید، شیخ سیف الدین باخرزی، شیخ شہاب الدین سہروردی اور شیخ شیوخ العالم فرید الحق والدین قدس اللہ اسرارہم نے جس طرح لوگوں کو مرید کیا، میں بھی مرید کروں اس لئے کہ اگر خدا کا کوئی محبوب گناہگاروں میں سے ایک عالم کو اپنے دامن عاطفت میں لے لے تو لے سکتا ہے ـــ اب میں تمہارے سوال کا جواب دیتا ہوں کہ میں مرید کرنے میں کیوں زیادہ احتیاط سے کام نہیں لیتا اور اپنا اطمینان نہیں کرتا ایک وجہ تو یہ ہے کہ میں علی سبیل التواتر سن رہا ہوں کہ بہت سے مرید ہونے والے معصیت سے تائب ہو جاتے ہیں، نماز باجماعت ادا کرنے لگتے ہیں اور اوراد و نوافل میں مشغول ہو جاتے ہیں، اگر میں بھی شروع ہی سے اس بات کی شرط کروں کہ ان میں ارادت کی حقیقت یعنی انقطاع کلی پایا جاتا ہے کہ نہیں، اور ان کو توبہ و تبرک کا خرقہ (جو خرقہ،

ارادت کی جگہ پر ہے) نہ دوں تو وہ خیر کی اس مقدار سے بھی جو ان اللہ کے بندوں سے وجود میں آرہی ہے محروم ہو جائیں گے، دوسرا سبب یہ ہو کہ بغیر اسکے کہ میرے دل میں خیال آئے یا میں اسکی درخواست اور التماس کروں یا کوئی وسیلہ اور سفارش اختیار کروں شیخ کامل و مکمل (شیخ کبیر) نے مجھے بیعت لینے کی اجازت دی ہے میں دیکھتا ہوں کہ ایک مسلمان بڑی عاجزی و درماندگی اور بڑی مسکنت و بیچارگی کے ساتھ میرے پاس آتا ہے اور کہتا ہے کہ میں نے تمام گناہوں سے توبہ کی، میں یہ سمجھ کر کہ شاید اسکی بات سچ ہو، اسکو بیعت کر لیتا ہوں، خاص طور پر اسلئے کہ بہت سے معتبر لوگوں سے سنتا ہوں کہ بہت سے بیعت کرنیوالے اس بیعت کی وجہ سے معاصی سے باز آجاتے ہیں[۱]"

عمومی زندگی پر اثر

اس بیعت و تعلق کا جس سے مسلمانوں کے ہر طبقہ کے لوگ یکساں مستفیض ہوئے، عام زندگی و معاشرت، لوگوں کے اخلاق و عادات، اشغال و اوقات اور اہل حکومت سے لیکر اہل حرفہ تک کے حالات پر کیا اثر پڑا، اور دار الحکومت دہلی میں جو شوکت و قوت دولت و ثروت اور عیش و عشرت کا گہوارہ تھا اور مال غنیمت اور سینکڑوں ہزاروں برس کے خزانوں کے زر و جواہر، صناعوں کی مصنوعات اور ملک کے اطراف و جوانب کے تحائف و عجائبات روزانہ سیل رواں کی طرح وہاں امنڈ رہے تھے۔ دینداری، خدا طلبی، عشق الٰہی، توبہ و انابت اور رجوع الی اللہ صفائی معاملات، راست گفتاری اور دیانت داری کی کیا کیفیت پیدا ہو گئی تھی اس کی تفصیل اُس عہد کے صاحب نظر اور معتبر مؤرخ ضیاء الدین برنی کی زبان سے سُنیئے وہ سلطان علاء الدین خلجی کے زمانہ کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں[۲]:۔

---

[۱] سیر الاولیاء صـ۳۴۶ و صـ۳۴۷ بحوالہ حسرت نامہ مولانا ضیاء الدین برنی [۲] تاریخ فیروز شاہی کے اقتباس کا یہ ترجمہ سیّد صباح الدین عبد الرحمٰن ایم، اے (رفیق دار المصنفین) کی کتاب "بزم صوفیہ" سے حذف و اختصار کیساتھ نقل کیا گیا ہے۔ صـ۱۹۹ و صـ۲۰۱

”سلطان علاء الدین کے زمانہ کے مشائخ میں سے سجادۂ تصوف شیخ الاسلام نظام الدین، شیخ الاسلام علاء الدین اور شیخ الاسلام رکن الدین سے آراستہ تھا، ایک دنیا اُن کے انفاسِ متبرکہ سے روشن ہوئی اور ایک عالم نے اُن کی بیعت کا ہاتھ پکڑا اور اُن کی مدد سے گناہگاروں نے توبہ کی اور ہزاروں بدکاروں اور بے نمازیوں نے بدکاریوں سے ہاتھ اٹھا لیا، اور ہمیشہ کے لئے پابندِ نماز ہوگئے اور باطنی طور پر دینی مشغلے کی طرف رغبت ظاہر کی اور توبہ صحیح ہوگئی اور عباداتِ لازمہ اور متعدیہ کا معمول ہوگیا، اور دنیا کی حرص و محبت جو انسانوں کے فوائد اور فرمانبرداری کی بنیاد ہے، ان مشائخ کے اخلاقِ حمیدہ اور ترکِ تجرید کے معاملات کے دیکھنے سے دلوں سے کم ہوگئی اور سالکوں کو نوافل اور وظائف کی کثرت اور اوصافِ عبودیت کی پابندی سے کشف و کرامات کی آرزو دل میں پیدا ہونے لگی اور ان بزرگوں کی عبادات و معاملات کی برکت سے لوگوں کے دلوں میں بھلائی پیدا ہوگئی، اور ان کے مکارمِ اخلاق و مجاہدہ و ریاضت کے دیکھنے سے اللہ والوں کے دلوں میں اخلاق کے بدلنے کی خواہش پیدا ہوئی اور ان دینی بادشاہوں کی محنت اور اخلاق کے اثر سے خداوند تعالیٰ کے فیض کی بارش دنیا میں ہونے لگی اور آسمانی مصیبتوں کے دروازے بند ہوگئے اور ان کے زمانہ کے لوگ قحط و وبائی مصیبت میں مبتلا اور گرفتار نہیں ہوئے اور ان کی مخلصانہ اور عاشقانہ عبادت گزاری کی برکت سے مغلوں کا فتنہ جو سب سے بڑا فتنہ تھا ایسا فرو ہوا اور یہ تمام ملاعین اس قدر آوارہ و تباہ ہوئے کہ اس سے زیادہ تباہ نہیں ہوسکتے تھے اور یہ تمام باتیں جو ان تینوں بزرگوں کے وجود سے ان کے معاصرین کو نظر آئیں وہ شعارِ اسلام کی بلندی کا ذریعہ بن گئیں اور احکامِ شریعت و طریقت کو جو رونق و رواج حاصل ہوا اس کا کیا کہنا، کتنا عجیب زمانہ وہ تھا، جو سلطان علاء الدین کے آخری دسویں سال میں نظر آیا، ایک

طرف سلطان علاء الدین نے ملک کی بہتری کے لئے تمام نشّی اور ممنوع چیزوں کو اور فسق و فجور کے اسباب کو قہر و غلبہ تعزیر و تشدد اور قید و بند سے روک دیا اور مال جو دینی اور ملکی فساد کا ذریعہ اور ہوا پرستوں کیلئے گناہوں کا آلہ اور حریصوں، بخیلوں اور تاجروں کیلئے سود، ذخیرہ اندوزی کا سامان اور فتنہ پردازوں کے لئے بغاوت کی استعداد اور نیکیوں کے لئے کبر، مفاخرت، غفلت اور کسلمندی پیدا کرنے والا ہے اور عبادت گذاروں کے لئے نسیان و فراموشی کا باعث ہے، سلطان علاء الدین ہر بہانہ سے کہ جو اسکو ملتا مالداروں اور حکام سے سختی سے لے لیتا اور بازار والوں کو کہ دنیا کی تمام قوموں میں سب سے زیادہ جھوٹ بولنے والی اور سب سے زیادہ فریب کرنے والی قوم ہے سچائی اختیار کرنے، سچائی کے ساتھ مال بیچنے اور سچ کہنے کے لئے خون خرابہ میں رکھتا تھا۔

دوسری طرف اسی زمانہ میں شیخ الاسلام نظام الدین نے بیعت کا عام دروازہ کھول رکھا تھا، اور گناہگاروں کو خرقہ پہناتے اور ان سے توبہ کراتے تھے اور اپنی مریدی میں قبول کرتے تھے، اور خاص و عام، غریب و دولت مند، بادشاہ و فقیر، عالم و جاہل شریف و رذیل، شہری اور دیہاتی، غازی و مجاہد، آزاد و غلام، سب کو طاقیہ، توبہ اور پاکی کی تعلیم دیتے تھے اور یہ تمام لوگ چونکہ اپنے کو شیخ کا مرید سمجھتے تھے، بہت سے گناہوں سے باز آتے تھے، اور اگر شیخ کے کسی مرید سے لغزش ہو جاتی بھی تو پھر از سر نو بیعت کر لیتے، اور توبہ کا خرقہ عطا کرتے تھے اور شیخ کی مریدی کی شرم تمام لوگوں کو بہت سی ظاہری و باطنی برائیوں سے روک دیتی تھی اور عام طور پر لوگ تقلید و اعتقاد کی وجہ سے عبادت کی طرف رغبت کرتے تھے، مرد و عورت بوڑھے، جوان، بازاری، عامی، غلام اور نوکر سب کے سب نماز ادا کرتے تھے،

اور زیادہ تر مرید چاشت و اشراق کے پابند ہو گئے تھے آزاد اور نیک کام کرنیوالوں نے شہر سے غیاث پور تک چند تفریحی مقامات پر چبوترے قائم کر دیئے تھے، چھپر ڈال دیئے تھے، کنوئیں کھدوا دیئے تھے، پانی سے بھرے ہوئے گھڑے اور مٹی کے لوٹے رکھوا دیئے تھے، چٹائیاں بچھوا دی تھیں، ہر چبوترہ اور ہر چھپر میں ایک چوکیدار اور ایک ملازم مقرر کر دیا تھا، تاکہ مرید اور توبہ کرنے والے نیک لوگوں کو شیخ کے آستانے تک آنے جانے میں نماز ادا کرنے کے وقت وضو کرنے کے لیئے کوئی تردد نہ ہو، اور چبوترہ اور چھپر میں نفل پڑھنے والے نمازیوں کا ہجوم دیکھا جاتا تھا، ارتکاب گناہ لوگوں کے درمیان کم ہو گیا تھا، اور اکثر آدمیوں کے درمیان چاشت، اشراق، اوابین، تہجد اور زوال کے وقت رکعات نماز کی تحقیقات زیادہ تھی کہ ان نوافل میں ہر وقت کتنی رکعتیں ادا کرتے ہیں اور ہر رکعت میں کلام پاک کی کون سی سورۃ اور کون سی آیت پڑھتے ہیں۔ ۔ ۔ ۔ ۔ پنجگانہ نمازوں اور ہر نفل سے فارغ ہونے کے بعد کون کون سی دعائیں آتی ہیں۔ اکثر نئے مرید شیخ کے قدیم مریدوں سے غیاث پور کی آمد و رفت کے وقت پوچھتے تھے کہ شیخ رات کی نماز میں کتنی رکعتیں پڑھتے ہیں اور ہر رکعت میں کیا پڑھتے ہیں اور عشاء کی نماز کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر کتنی بار درود بھیجتے ہیں، اور شیخ فرید اور شیخ بختیار رات دن میں کتنی بار درود بھیجتے تھے اور کتنی بار سورۃ اخلاص پڑھتے تھے، نئے مرید شیخ کے قدیم مریدوں سے اسی قسم کے سوالات کرتے تھے، روزے، نوافل اور تقلیل طعام کے متعلق پوچھتے تھے، اس نیک زمانہ میں اکثر آدمیوں کو حفظ قرآن کا ذوق پیدا ہو گیا تھا، نئے مرید شیخ کے پرانے مریدوں کی صحبت میں رہتے تھے، پرانے مریدوں کو طاعت، عبادت،

ترکِ تعلق، تصوف کی کتابوں کے پڑھنے، مشائخ کے اوصافِ حمیدہ اور ان کے معاملات کے بیان کرنے کے سوا کوئی دوسرا کام نہ تھا، دنیا اور دنیاداروں کا ذکر ان کی زبان پر نہیں آتا تھا، کسی دنیادار کے گھر کی طرف اپنا رخ نہیں کرتے تھے، دنیا اور اہلِ دنیا کے میل جول کی حکایتیں سنتے تھے اور اس کو عیب اور گناہ جانتے تھے ــــ کثرتِ نوافل اور اس کی پابندی کا معاملہ اس بابرکت زمانہ میں اس حد تک پہنچ گیا تھا کہ بادشاہ کے محل میں بہت سے امرا، سلاحدار، لشکری، شاہی نوکر شیخ کے مرید ہوتے تھے اور چاشت و اشراق کی نمازیں ادا کرتے تھے، ایامِ بیض اور عشرۂ ذی الحجہ کے روزے رکھتے تھے اور کوئی محلہ ایسا نہیں تھا جس میں ایک مہینہ بیس دن کے بعد صلحا کا اجتماع نہیں ہوتا تھا، اور صوفیوں کی محفلِ سماع نہیں ہوتی تھی اور باہم گریہ وزاری نہیں کرتے تھے۔ شیخ کے چند مرید تراویح کی نمازیں مسجدوں اور گھروں میں ختمِ قرآن کرتے، وہ لوگ جو مستقیم الحال ہو چکے تھے، رمضان، جمعہ اور تہواروں کی راتوں میں قیام کرتے اور صبح تک بیدار رہتے، پلک کو پلک سے نہیں لگنے دیتے، شیخ کے مریدوں میں سے بڑے درجہ کے مرید تمام سال رات کے ایک یا دو تہائی حصے تہجد کی نماز میں گذارتے، بعض عبادتگذار عشا کی نماز کے وضو سے فجر کی نماز ادا کرتے، شیخ کے مریدوں میں سے چند آدمیوں کو میں جانتا ہوں کہ شیخ کے فیضِ نظر سے صاحبِ کشف و کرامات ہو گئے تھے، شیخ کے مبارک وجود، ان کے انفاس کی برکت، ان کی مقبول دعاؤں کی وجہ سے اس ملک کے اکثر مسلمان عبادت، تصوف اور زہد کی طرف مائل اور شیخ کی ارادت کی طرف راغب ہو گئے تھے ــــ سلطان علاءالدین اپنے تمام گھر والوں کے ساتھ شیخ کا معتقد اور مخلص ہو گیا تھا، خواص و عوام کے دلوں نے نیکی اختیار کر لی تھی، عہدِ علائی کے چند آخری سالوں میں شراب، معشوق، فسق و

فجور، جوا، فحاشی وغیرہ کا نام اکثر آدمیوں کی زبان پر نہیں آنے پاتا، بڑے بڑے گناہ لوگوں کے نزدیک کفر کے مشابہ معلوم ہونے لگے تھے، مسلمان ایک دوسرے کی شرم سے سودخواری اور ذخیرہ اندوزی کے کھلم کھلا مرتکب نہیں ہوسکتے تھے، بازار والوں سے جھوٹ بولنے، کم تولنے اور آمیزش کرنے کا رواج اٹھ گیا تھا، اکثر طالبعلموں اور بڑے بڑے لوگوں کی رغبت جو شیخ کی خدمت میں رہتے تھے، تصوف اور احکامِ طریقت کی کتابوں کے مطالعہ کی طرف ہوگئی تھی، قوت القلوب، احیاء العلوم، ترجمۂ احیاء العلوم، عوارف، کشف المحجوب، شرح تعرف، رسالہ قشیری، مرصاد العباد، مکتوبات عین القضاۃ، لوائح ولوامع قاضی حمید الدین ناگوری، فوائد الفواد، میر حسن سجزی کے بہت سے خریدار پیدا ہوگئے تھے، زیادہ تر لوگ، کتب فروشوں سے سلوک وحقائق کی کتابوں کے بارے میں دریافت کرتے تھے، کوئی پگڑی ایسی نہ تھی جس میں مسواک اور کنگھی لٹکی نظر نہ آتی تھی، صوفیوں کی کثرت خریداری کی وجہ سے لوٹے اور چرمی طشت گراں ہوگئے تھے، ماحصل کلام یہ کہ خداوند تعالیٰ نے شیخ نظام الدینؒ کو پچھلی صدی میں شیخ جنیدؒ اور شیخ بایزیدؒ کے مثل پیدا کیا تھا۔"[1]

عشق کا "روز بازار"

توبہ، تجدید ایمان اور اصلاحِ حال کے اس عام ذوق ورجحان کے علاوہ جس سے دہلی کا کوچہ کوچہ متاثر ہو رہا تھا اور ایوانِ شاہی اور "بامِ ہزار ستون" تک اس کی لہریں پہنچی تھیں، ایک نئی تبدیلی یہ تھی کہ دماغی نخوت اور قلبی افسردگی کی

---

[1] تاریخ فیروز شاہی ضیاء الدین برنی ص ۳۴۶ و ص ۳۴۴

اس دنیا میں جہاں نائے ونوش اور "عیش کوش" کے سوا عرصہ سے کوئی صدا بلند نہیں ہوتی تھی، جذبۂ الٰہی کی ایک ہوا چلنے لگی اور عشق کا سودا عام ہوگیا، ہر جگہ درد و محبّت کا تذکرہ، حقیقت و معرفت کی باتیں اور عارفانہ و عاشقانہ اشعار کی گونج تھی۔ امیر خورد مصنف سیر الاولیا نے خوب لکھا ہے:-

کار محبت و عشق را رونق بازارے	محبت و عشق کے کاروبار کا زمانہ
در جہاں پیدا آمدے ...... و خلق	میں ایک بازار لگ گیا، لوگوں کو
را در آں زماں راحت جز حکایت	سماع کی حکایات، سننے، اخلاص و
سماع و اخلاص و نیاز مندی و شفقت	دنیازمندی، شفقت و نرمی، دلجوئی
و لینت و دل دریافتن و سر در زیر	اور اہلِ دل کے قدموں پر سر رکھ دینے
پائے اہل دلان نہادن کارے دیگر	کے علاوہ کسی اور بات سے راحت
نبود[۱]	نہیں حاصل ہوتی تھی۔

خلفاء کی تربیت

اس سلسلۂ ارشاد و تربیت اور طریقۂ عشق و محبت کو ہندوستان میں دور دور تک پھیلانے اور دیر تک قائم رکھنے کے لئے آپ نے اپنے عالی استعداد، سراپا اخلاص خلفاء کا بڑا اہتمام فرمایا، ان میں وہ سب اوصاف و کمالات پیدا کرنے کی کوشش فرمائی جو مشائخ کاملین کے لئے ضروری ہیں، ان سے مجاہدات کرائے، ان کے قلوب کی نگرانی کی، ان میں جو اعلیٰ استعداد رکھتے تھے، لیکن زیورِ علم سے عاری تھے اُن کی تعلیم و تکمیل کا بندوبست کیا، ان میں سے جن کے دلوں سے ابھی تک بحث و مناظرے کا نشہ نہیں گیا تھا، ان کی اصلاح فرمائی، جو خلق خدا کی رہنمائی اور اجتماعی زندگی کے اہل تھے، لیکن انھیں گوشہ نشینی، عزلت گزینی

---

[۱] سیر الاولیا، ص ۳۰۶

اور انفرادی عبادات و مجاہدات کا ذوق تھا، ان کو اجتماعی زندگی اختیار کرنے اور "خلق خدا کی جفا وقفا" کو برداشت کرنے پر مجبور کیا، اصلاح و تربیت کا جو عام لمبا کام آپ کے پیش نظر تھا اور اپنے خواص اصحاب سے دین کی دعوت کا جو کام لینا تھا اس میں جو چیز حارج اور مزاحم نظر آئی آپ نے اسکو ترک کر دیا۔

سیر الاولیاء میں ہے کہ ایک دن بلند حیثیت کے دوستوں اور خدام نے جن کا وطنی تعلق اودھ سے تھا آپس میں طے کیا کہ سلطان المشائخ سے پڑھنے پڑھانے اور بحث و مذاکرہ کرنے کی اجازت طلب کریں، اگرچہ ان دوستوں میں سے ہر ایک عالم متبحر تھا لیکن سلطان المشائخ کے فیض صحبت سے یاد حق میں مشغول تھا، مگر جس کام میں عمر گذاری تھی اس کا شوق بالآخر اس کا محرک ہوا۔ مولانا جلال الدین کو لوگوں نے آگے کیا اور خدمت میں حاضر ہوئے۔ حضرت سلطان المشائخ پر یاد الٰہی کی ایسی کچھ تجلّی تھی کہ لوگوں کو بات کرنے کی ہمت نہیں ہوتی تھی۔ مولانا جلال الدین کو کچھ جرأت تھی، انھوں نے عرض کیا کہ حضرت اگر اجازت ہو تو احباب کسی وقت بحث کر لیا کریں، سلطان المشائخ سمجھ گئے کہ یہ ان سب علماء کا عندیہ ہے اور مولانا جلال الدین ان کے نمائندہ ہیں۔ فرمایا کہ:۔ میں کیا کروں مجھے تو ان سے تو دوسرا ہی کام لینا مقصود ہے۔[1]

مولانا سید نصیر الدین محمود جو بعد میں حضرت خواجہؒ کے خلیفہ اعظم اور اصل جانشین ہوئے اور چراغ دہلی کے نام سے ان کا نام تمام دنیا میں روشن ہے، اس بات کے بڑے خواہشمند تھے کہ وہ کسی جنگل یا پہاڑ پر بیٹھ کر خدا کی یاد کریں۔ انھوں نے ایک دن امیر خسرو کو واسطہ بنایا اور کہلوایا کہ یہ ناچیز اودھ میں رہتا ہے، خلق کے ہجوم سے اپنی مشغولیت میں فرق پڑتا ہے اگر اجازت ہو تو میں کسی صحرا یا پہاڑ پر رہ کر فراغ خاطر کے ساتھ خدا کی عبادت کروں۔

---

[1] سیر الاولیاء ص ۳۰۶

امیر خسرو نے جب یہ پیغام عرض کیا تو ارشاد ہوا :۔

او را بگو ترا درمیان خلق می باید بود	اُن سے کہدو کہ تمکو مخلوق ہی کے درمیان
وجفا و قفائے خلق می باید کشید	رہنا ہوگا، اور مخلوق کی بے مروتی اور
و مکافات آں ببذل وایثار و عطا	بے رخی کو برداشت کرنا ہوگا اور اس
می باید کرد[1]	کا بدلہ سخاوت و ایثار سے دینا ہوگا۔

مولانا حسام الدین ملتانی نے خلافت کے بعد عرض کیا کہ :۔ اگر اجازت ہو تو شہر چھوڑ دوں اور کسی چشمہ کے کنارے سکونت اختیار کروں، اس لئے کہ شہر میں کنوؤں کا پانی ملتا ہے اور اس سے وضو کرنے میں دل کو اطمینان نہیں ہوتا[2]، ارشاد ہوا کہ نہیں شہر ہی میں رہو اور ایک عام آدمی کی طرح رہو سہو، نفس چاہتا ہے کہ تم کو ایک آرام کی جگہ لیجائے اور ایسی جگہ رکھے کہ تمہیں جمیعت خاطر نصیب ہو، جب تم شہر سے باہر چلے جاؤ گے اور کسی چشمہ کے کنارے سکونت اختیار کروگے تو پردیسی اور شہری تمہارا سراغ لگا کر پہنچیں گے اور مشہور ہوگا کہ فلاں درویش فلاں جگہ مقیم ہے اور پھر تمہارا وقت خراب کرے گا، اس کے علاوہ کنویں کے پانی میں علماء کا اختلاف ہے اور شریعت نے اس میں وسعت دی ہے۔

چشتی خانقاہیں

اللہ تعالیٰ نے حضرت خواجہ کو بڑے جلیل القدر خلفاء عطا فرمائے تھے جن میں سے حسب ذیل خاص طور پر مشہور و ممتاز ہوئے :۔

(۱) مولانا شمس الدین یحییٰ
(۲) شیخ نصیر الدین محمود
(۳) شیخ قطب الدین منور ہانسوی
(۴) شیخ حسام الدین ملتانی
(۵) مولانا فخر الدین زرادی
(۶) مولانا علاء الدین نیلی

---

[1] سیر الاولیاء ص ۲۳۷ [2] یہ پانی بھرنے والوں کی بے احتیاطی کی وجہ سے اور کسی چیز کے گرنے پڑنے کے خیال سے۔

(۷) مولانا برہان الدین غریب (۸) مولانا یوسف چندیری

(۹) مولانا سراج الدین اخی سراج (۱۰) مولانا شہاب الدین

مریدین با اختصاص

(۱) خواجہ ابوبکر (۲) مولانا محی الدین کاشانی

(۳) مولانا وجیہ الدین پائلی (۴) مولانا فخر الدین مروزی

(۵) مولانا فصیح الدین (۶) امیر خسرو

(۷) مولانا جلال الدین (۸) خواجہ کریم الدین سمرقندی

(۹) امیر حسن علا سنجری (۱۰) قاضی شرف الدین

(۱۱) مولانا بہار الدین ادہمی (۱۲) شیخ مبارک گوپاموی

(۱۳) خواجہ موید الدین کردی (۱۴) خواجہ تاج الدین داوری

(۱۵) خواجہ ضیار الدین برنی (۱۶) خواجہ موید الدین انصاری

(۱۷) خواجہ شمس الدین خواہر زادہ (۱۸) مولانا نظام الدین شیرازی

(۱۹) خواجہ سالار (۲۰) مولانا فخر الدین میرٹھی

ان میں حضرت شیخ نصیر الدین چراغ دہلی کو آپ نے خلافت خاص عطا فرمائی اور اپنا جانشین بنایا۔ وہ اپنے شیخ کے قدم بقدم تھے، انھوں نے نہایت ناساعد حالات اور سخت سیاسی طوفاں میں رشد و ہدایت کا یہ چراغ روشن رکھا۔ بقول شاعر ؎

ہوا ہے گو تند و تیز لیکن چراغ اپنا جلا رہا ہے
وہ مرد درویش جس کو حق نے دیئے ہیں انداز خسروانہ

فیروز تغلق کی تخت نشینی اور اس سے ہندوستان کو جو فیوض و برکات پہنچے اُس میں حضرت سیّد نصیر الدین ہی کا ہاتھ تھا، پورے تیئیس[1] سال تک انھوں نے سلسلہ چشتیہ کا مرکزی نظام دارالحکومت دہلی میں بیٹھ کر کامیابی کیساتھ چلایا، پھر اس چراغ سے دوسرا چراغ روشن ہوا، جس نے جنوبی ہند ہی نہیں سارے ہندوستان کو عشق و محبت کی حرارت سے گرم اور اس کی خوشبو سے مُعطّر کردیا، یعنی حضرت سیّد محمد گیسو درازؒ مدفون گلبرگہ (م ۸۲۵ھ)[2] جن کے متعلق کسی صاحب نظر نے کہا ہے ؎

ہر کو مرید سیّد گیسو دراز شد
واللہ خلاف نیست کہ او عشق باز شد

حضرت سیّد نصیر الدین چراغ دہلی کے دوسرے خلیفہ علامہ کمال الدین (م ۷۵۶ھ) تھے، جن کی اولاد اور خلفاء نے اس سلسلہ کو اس صدی تک آب و تاب کیساتھ قائم رکھا، اس سلسلہ میں حضرت یحییٰ مدنی، شاہ کلیم اللہ جہان آبادی، مولانا شاہ فخر الدین دہلوی، خواجہ نور محمد مہاروی شاہ نیاز احمد بریلوی اور خواجہ سلیمان تونسوی جیسے اکابر روزگار گذرے، جنھوں نے عشق الٰہی کا بازار گرم رکھا، اور لاکھوں بندگانِ خدا کے دلوں میں محبت الٰہی اور خدا طلبی کی آگ بھڑکادی[3]۔

حضرت چراغ دہلی کے خلفاء میں شیخ عبد المقتدر کندی، شیخ احمد تھانیسری اور شیخ جلال الدین حسین بخاری معروف بمخدوم جہانیاں جہاں گشت خاص طور پر قابل ذکر ہیں — ان میں ہر ایک شیخ وقت اور مرجع خلائق تھا۔

---

[1] ملاحظہ ہو تاریخ فیروز شاہی، از سراج عفیف۔

[2] حضرت خواجہ سیّد محمد گیسو درازؒ کے حالات و کمالات کیلئے مستقل تصنیف کی ضرورت ہے۔

[3] ان بزرگوں کے مفصل حالات کیلئے ملاحظہ ہو "تاریخ مشائخ چشت" از پروفیسر خلیق احمد نظامی۔

دہلی کی مرکزی خانقاہ کے بعد جس کے مسند ارشاد پر یکے بعد دیگرے دو شیخ اجل حضرت خواجہ نظام الدینؒ اور حضرت سید نصیر الدین چراغ دہلیؒ متمکن رہے: ہندوستان کے مختلف مقامات پنڈوہ، لکھنوتی، دولت آباد، گلبرگہ، برہان پور، زین آباد، مانڈو، احمد آباد، صفی پور، مانک پور، سلون میں چشتی خانقاہیں قائم ہوئیں، جنھوں نے صدیوں تک چراغ سے چراغ روشن رکھا اور عشق و محبت، صدق و اخلاص، علو ہمت و عزیمت، خدمت خلق، ایثار و قربانی، بذل و عطا، فقر و زہد، علم و معرفت کی شمع روشن رکھی، اور ہندوستان کی فضا کو جس پر پے در پے مادیت اور غفلت کے حملے ہوتے رہے اور کسی وقت ایسا محسوس ہوا کہ سارا ملک تنکے کی طرح غفلت و تعیش کے سیلاب میں بہ جائے گا اور متاع درد جس کشتی میں ہے وہ بھی غرق ہو جائے گی، لیکن ان سوختہ سامانوں اور سوختہ دلوں نے اس متاع کی حفاظت کی اور یہ آگ کہیں نہ کہیں سلگتی رہی، ان میں ہر خانقاہ اور اسکے دینی و اصلاحی کارناموں کیلئے ایک مستقل ضخیم کتاب درکار ہے، خاص طور پر بنگال میں شیخ علاء الحق پنڈوی[1]، حضرت نور قطب عالم پنڈوی[2]

---

[1] شیخ علاء الدین علاء الحق پنڈوی کا اصل نام عمر ہے، آپ کے والد اسعد لاہوری بنگال میں منصب وزارت پر فائز تھے۔ شیخ علاء الحق حضرت محبوب الٰہی کے مشہور خلیفہ مولانا سراج الدین عثمانی اودھی معروف بہ اخی سراج (م ۷۵۸ھ) کے خلیفہ اور پنڈوہ کی مشہور عالم چشتی خانقاہ کے بانی ہیں۔ سید اشرف جہانگیر سمنانی کچھوچھوی (م ۸۰۸ھ) آپ ہی کے خلیفہ ہیں ۸۰۰ھ میں وفات پائی۔

[2] نور الدین احمد نام، نور الحق اور قطب عالم لقب، اپنے والد شیخ علاء الحق پنڈوی کے خلیفہ و جانشین تھے، اللہ تعالیٰ نے بڑی مقبولیت و مرجعیت عطا فرمائی، آپکے زمانہ میں پنڈوہ کی خانقاہ ہندوستان کی سب سے بڑی خانقاہ تھی۔ مجاہدات، خدمت خلق اور بے نفسی و خود شکنی اور علوم و حقائق میں مرتبۂ عالی رکھتے تھے۔ خلفاء میں حضرت شیخ حسام الدین حسام الحق مانکپوری (م ۸۵۳ھ) خاص طور پر قابل ذکر ہیں، جن کی ذات سے بہار اور اودھ میں سلسلۂ چشتیہ نظامیہ کی بڑی اشاعت ہوئی۔ ۸۱۸ھ میں وفات پائی، تصنیفات میں "مونس الفقراء" "انیس الغرباء" اور مکاتیب کا مجموعہ یادگار ہے۔ ملفوظات و مکتوبات میں غضب کی سادگی اور تاثیر ہے۔ (ملاحظہ ہو نزہۃ الخواطر ج ۳)

دکن میں شیخ برہان الدین غریب اُن کے خلفاء میں شیخ زین الدین، شیخ یعقوب، شیخ کمال الدین ناگوری نتنی، پھر ان کے خلیفہ قطب عالم عبداللہ بن محمود بن الحسین (م ۸۵۷ھ) اور ان کے فرزند خلیفہ شاہ عالم گجراتی نے بوریائے فقر پر بیٹھ کر اپنے اپنے زمانہ میں بادشاہی کی ہے۔

مالوہ میں شیخ وجیہ الدین یوسف، شیخ کمال الدین، مولانا مغیث الدین وغیرہ اودھ میں حضرت شیخ محمد بینا لکھنوی، شیخ سعد الدین قدوائی خیرآبادی، شیخ عبدالصمد عرف صفی الدین صفی پوری، شیخ حسام الحق مانک پوری، شیخ عبدالکریم مانک پوری اور شاہ پیر محمد سلونی اور شاہ پیر محمد لکھنوی خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں، یہ سب سلسلۂ نظامیہ کے شیوخ کبار ہیں جنھوں نے اپنی اپنی جگہ ارشاد و ہدایت اور تعلیم و تربیت کا سلسلہ سرگرمی کے ساتھ جاری رکھا۔ ان سے فیض پانے والوں کی تعداد کو خدا کے سوا کوئی شمار نہیں کر سکتا۔

ان خالص چشتی خانقاہوں کے علاوہ ہندوستان میں جابجا ایسی نامور خانقاہیں بھی قائم تھیں جن کے مشائخ کبار اور بانیانِ سلسلہ کو سلسلۂ نظامیہ کے مشائخ چشت سے نسبتِ خاص اور اجازتِ عام حاصل تھی اور وہ چشتی ذوق اور نسبت کے حامل تھے، ان میں سے جونپور کی خانقاہ رشیدی اور پھلواری شریف کی خانقاہ مجیبی خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ خانقاہ رشیدی کے بانی حضرت علامہ محمد رشید جونپوری (م ۱۰۸۳ھ) کو اپنے شیخ طیب بنارسی اور سید احمد الحکیم حسینی مانکپوری سے سلسلۂ حسینیہ نظامیہ میں اجازت حاصل تھی، خانقاہ مجیبی کے بانی تاج العارفین حضرت شاہ محمد مجیب اللہ قادری پھلواروی (م ۱۱۹۱ھ) کو سلسلہ چشتیہ نظامیہ اپنے پیر بیعت حضرت خواجہ عماد الدین قلندر اور حضرت شاہ معین الدین کرجوی کے واسطہ سے پہونچا ہے۔ شاہ معین الدین کرجوی حضرت شیخ پیر محمد سلونی کے خلیفہ تھے۔

آخر میں حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکی کی ذات سلسلۂ نظامیہ وصابریہ اور ان کی خصوصیتوں

اور برکتوں کی جامع تھی۔ حضرت حاجی صاحب کو سلسلہ نظامیہ سے نسبت حضرت شیخ عبدالقدوس گنگوہی کے طریق سے حاصل تھی، جن کو حضرت درویش بن محمد قاسم اودھی سے سلسلہ نظامیہ میں اجازت تھی۔ حضرت درویش کو تین طریقوں سے سلسلۂ نظامیہ پہونچا تھا۔[1]

---

[1] تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو "تذکرۃ الرشید" ج ۲ (ص ۱۰۶)

بابِ ہفتم

حضرت خواجہؒ کی تعلیم و تربیت کے اثرات
آپ کے خلفاء کی دینی و اصلاحی خدمات

حضرت سلطان المشائخ نے اپنے خلفاء اور مریدین کی بڑے اہتمام اور توجہ سے تربیت فرمائی تھی۔ سلطان علاء الدین خلجی کے امراء دربار اور ارکان سلطنت میں سے ایک بڑے عہدہ دار خواجہ مؤیدالدین تھے، ان کو حضرت خواجہؒ سے تعلق پیدا ہوگیا، اور یہ تعلق اتنا بڑھا کہ اُن کی طبیعت سرکار دربار سے اُچاٹ ہوگئی اور وہ حضرت خواجہؒ کی خدمت میں رہ پڑے۔ سلطان ان کا بڑا قدردان تھا اور اُن کی ضرورت محسوس کرتا تھا۔ اس نے ایک حاجب کے ذریعہ حضرت خواجہؒ سے شکایت کی اور کہا کہ: حضرت ہر ایک کو اپنا جیسا بنانا چاہتے ہیں۔ حضرت خواجہؒ نے جواب میں فرمایا کہ "اپنے جیسا کیا، اپنے سے بہتر"۔[1]

حضرت خواجہؒ کی صحبت و تربیت سے صرف عبادت و ریاضت کا ذوق اور اپنی اصلاح و ترقی ہی کی فکر نہیں پیدا ہوئی تھی، بلکہ دعوت و تبلیغ کا جذبہ، امر بالمعروف، نہی عن المنکر کی ہمت اور حوصلہ،

---

[1] سیر الاولیاء (ص۳۱۱)

سلاطینِ وقت کے سامنے کلمۂ حق کہنے کی جرأت اور بے خوفی و شجاعت بھی پیدا ہوگئی تھی، اور یہ خدا کے نام اور مردانِ خدا کی صحبت کا لازمی نتیجہ ہے۔ جس دل میں اللہ کا خوف سما جائے گا اُس دل سے غیر اللہ کا خوف قدرتی طور پر نکل جائیگا اور جو دل طمع دنیا سے آزاد ہو جائے گا اُس پر کسی کا رعب اور اس کو کسی سے ہراس نہیں ہو سکتا، جس پر خالق کی عظمت اور مخلوق کی صحیح حیثیت کا انکشاف ہو گیا، وہ سلاطین عالم کے کرّ و فر، ان کے دربار کے تزک و احتشام اور اُن کے غلاموں اور افسروں کی صف بندیوں اور "نگاہ روبرو" اور "دورباش" کو بچوں کے کھیل اور گڑیوں کے گھروندوں سے زیادہ وقعت نہیں دے سکتا اور جاہ و جلال کی کسی نمائش پر کلمۂ حق کہنے سے کبھی باز نہیں رہ سکتا، یہی توحید و تجرید کا طبعی نتیجہ، حقیقی تصوّف کا خاصّہ اور مردانِ خدا اور درویشانِ کامل کا شیوہ ہے۔ ؎

دارا و سکندر سے وہ مردِ فقیر اولیٰ ہو جس کی فقیری میں بُوئے اسد اللّٰہی

آئینِ جواں مرداں حق گوئی و بیباکی اللہ کے شیروں کو آتی نہیں روباہی

حضرت خواجہؒ کے تربیت یافتہ خدام و مریدین نے اس "اسد اللّٰہی" اور اس حق گوئی و بیباکی کے ایسے نمونے پیش کئے جن کی نظیر ملنی آسان نہیں۔

سلاطینِ وقت سے بے رعبی اور حق گوئی کے نمونے

سلطان محمد تغلق کے شوکت و جبروت سے تاریخ کا ہر طالب علم واقف ہے۔ سلطان کا ایک مرتبہ ہانسی کے پاس سے گزر ہوا، وہاں سے چار کوس کے فاصلہ پر نسبی مقام میں خیمۂ شاہی و خرگاہ نصیب ہوا، سلطان نے مخلص الملک نظام الدین ندرباری کو جو اپنے ظلم و قساوت میں اس زمانہ میں مشہور تھا ہانسی کے حصار کے معائنہ کے لئے بھیجا، وہ جب حضرت شیخ قطب الدین منور (نبیرہ حضرت شیخ جمال الدین ہانسوی و خلیفہ حضرت سلطان المشائخ) کے مکان کے پاس پہنچا تو دریافت کیا کہ یہ مکان کس کا ہے؟ لوگوں نے کہا شیخ قطب الدین منور کا جو حضرت سلطان المشائخ کے خلیفہ ہیں

کہا کہ عجیب بات ہے کہ بادشاہ اس جوار میں آئے اور شیخ اسکے سلام کو حاضر نہ ہوں، مخلص الملک نے واپسی پر سب کیفیت عرض کی اور یہ بھی کہا کہ سلطان المشائخ کے ہانسی میں ایک خلیفہ ہیں جو جہاں پناہ کے سلام کیلئے حاضر نہیں ہوئے۔ بادشاہ کو یہ سنکر غصہ آیا، اسی وقت حسن سر برہنہ کو جو ایک بڑا مغرور وجاہ پسند شخص تھا شیخ قطب الدین کو لانے کے لئے بھیجا، حسن سر برہنہ جب مکان کے قریب پہنچا تو تنہا پیادہ پا شیخ کی دہلیز میں آکر عاجزانہ طریقے پر بیٹھ گیا۔ شیخ نے بلایا حسن نے جاکر عرض کیا کہ آپ کی بادشاہ کے یہاں طلبی ہے۔ فرمایا کہ اس میں مجھے کچھ اختیار ہے یا نہیں؟ اس نے کہا مجھے فرمانِ سلطانی ہے کہ میں آپ کو بہرحال لے آؤں۔ شیخ نے فرمایا الحمدللہ کہ میں اپنے اختیار سے نہیں جا رہا ہوں۔ پھر گھر والوں کی طرف رخ کیا اور فرمایا کہ تم کو خدا کے سپرد کیا، یہ کہا اور مصلٰی کاندھے پر ڈالا، لاٹھی ہاتھ میں لی اور پیادہ پا روانہ ہوگئے، حسن نے سواری کے لئے عرض کیا: فرمایا:- نہیں مجھ میں قوت ہے، میں پیدل چل سکتا ہوں۔ جب ہنسی پہنچے تو سلطان کو خبر ہوئی، سلطان نے حکم دیا کہ دہلی چلیں۔ دہلی پہنچ کر دربارِ شاہی میں طلب کیا۔ شیخ نے فیروز شاہ سے جو اس زمانہ میں نائب باربک تھے کہا کہ ہم فقیر لوگ ہیں بادشاہوں کی مجلس کے آداب سے واقف نہیں، جیسا آپ کا مشورہ ہو ویسا کیا جائے۔ فیروز نے جو فقیر دوست اور صحیح الاعتقاد شخص تھا کہا کہ لوگوں نے آپ کے متعلق بادشاہ کے کان بہت بھرے ہیں، اگر آپ کچھ تعظیم اور تواضع سے کام لیں تو بہتر ہے۔ ایوانِ شاہی کی دہلیز میں قدم رکھا تو امراء و ملوک اور نقیب و چاؤش دو رویہ کھڑے تھے۔ صاحبزادہ نورالدین جو ہانسی سے ہمرکاب آئے تھے، کم عمر تھے اور انہوں نے کبھی بادشاہوں کی بارگاہ نہیں دیکھی تھی، ان پر ایک ہیبت سی طاری ہوئی۔ شیخ قطب الدین منور نے ان سے پکار کر کہا کہ:

بابا نورالدین! العظمۃ والکبریاء للہ" صاحبزادہ کا بیان ہے کہ یہ سنتے ہی میرے اندر ایک قوت پیدا ہوئی، سارا رعب جاتا رہا اور یہ جو امراء و ملوک وہاں کھڑے تھے وہ مجھے بالکل بکریوں کی طرح معلوم ہونے لگے۔ جب سلطان کو یہ اندازہ ہوا کہ شیخ آرہے ہیں تو وہ کھڑا ہوگیا اور کمان ہاتھ میں لیکر تیراندازی

میں مشغول ہوگیا۔ شیخ قریب آئے تو اُس نے خلافِ معمول تعظیم کی اور مصافحہ کیا۔ شیخ نے بہت مضبوطی سے بادشاہ کا ہاتھ پکڑا۔ بادشاہ نے کہا کہ میں آپکے جوار میں پہنچا، آپ نے میری کوئی تربیت نہ فرمائی اور اپنی ملاقات سے عزت نہ بخشی، شیخ نے فرمایا کہ یہ درویش اپنے کو اس کا اہل نہیں سمجھتا کہ بادشاہوں سے ملاقات کرے، ایک کونے میں پڑا ہوا بادشاہ اور اہلِ اسلام کی دعاگوئی میں مصروف ہے۔ اسکو معذور سمجھا جائے۔ بادشاہ بہت متاثر ہوا اور اپنے بھائی فیروز شاہ سے کہا کہ شیخ کی جیسی مرضی ہو ویسا کرو۔ شیخ منور نے فرمایا کہ مجھ فقیر کا مقصود و مطلوب یہی ہے کہ اپنے دادا اور باپ کے گوشۂ عافیت میں واپس جائے۔ فیروز شاہ نے اس کی تعمیل کی۔ شیخ کی واپسی کے بعد بادشاہ نے ایک امیر سے کہا کہ مجھے جن بزرگوں سے مصافحہ کرنے کا اتفاق ہوا ہے جس نے مجھ سے ہاتھ ملایا اُس کے ہاتھ میں کپکپی تھی لیکن شیخ منور نے اتنی مضبوطی سے مصافحہ کیا کہ ان پر ذرا اثر نہیں معلوم ہوتا تھا۔

بادشاہ نے فیروز شاہ اور مولانا ضیاءالدین برنی کو ایک لاکھ تنکے[1] کے ساتھ شیخ منور کی خدمت میں بھیجا شیخ نے فرمایا نعوذ باللہ کہ یہ درویش ایک لاکھ تنکہ قبول کرے۔ انھوں نے واپس آکر سلطان سے عرض کیا۔ سلطان نے کہا کہ اگر ایک لاکھ قبول نہیں کرتے تو پچاس ہزار پیش کرو۔ شیخ نے اسکو بھی قبول نہ کیا۔ سلطان نے فرمایا اگر شیخ یہ بھی قبول نہ کریں گے تو خلقت مجھے کیا کہے گی۔ یہاں تک کہ بات دو ہزار تک پہنچی۔ فیروز شاہ اور مولانا ضیاءالدین نے عرض کیا کہ اس سے کم کا ہم بادشاہ کے سامنے تذکرہ نہیں کر سکتے، شیخ نے فرمایا کہ سبحان اللہ! درویش کو تو دو سیر چاول دال ایک ٹانگ کا گھی کافی ہے، وہ ان ہزاروں روپیوں کو کیا کرے گا، بڑی کوششوں اور حیلوں سے یہ کہہ کر کہ بادشاہ درپے آزار ہو جائے گا آپنے دو ہزار تنکے قبول کئے اور وہ بھی اپنے برادران طریقت اور اہلِ حاجت میں تقسیم کرکے ہانسی واپس آگئے[2]۔

جس زمانہ میں سلطان محمد تغلق نے دہلی کی آبادی کو دیوگیر منتقل ہو جانے کا حکم دیا، اس زمانہ میں اس نے عزم کیا کہ ترکستان اور خراسان کو بھی اپنے قبضہ میں لائے اور چنگیز خان کی اولاد کا قلع قمع کرے، اسی زمانہ میں حکم ہوا کہ دہلی اور

---

[1] تنکہ یا تنگا، اس عہد میں ہندوستان کا روپیہ تھا، اس میں ایک تولہ چاندی ہوتی تھی، یہ ترکی زبان کا لفظ ہے اسکے معنی سفید کے ہیں یعنی نقرئی سکہ۔ [2] سیر الاولیاء ص ۲۵۳ تا ص ۲۵۵

اطراف دہلی کے تمام صدور و اکابر حاضر ہوں بڑے بڑے خیمے نصب کریں، ان خیموں میں منبر رکھے جائیں اور ان ممبروں پر چڑھ کر حضرات علماء تقریر کریں اور جہاد کی ترغیب دیں۔ اس روز حضرت خواجہ نظام الدینؒ کے خلفاء خاص مولانا فخرالدین زرادی، مولانا شمس الدین یحییٰ اور شیخ نصیرالدین محمود کی بھی طلبی ہوئی۔ شیخ قطب الدین دبیرؒ جو حضرت سلطان المشائخؒ کے ایک راسخ الاعتقاد مرید اور مولانا فخرالدین زرادی کے شاگرد تھے مولانا فخرالدین کو سب سے پہلے بارگاہ سلطانی میں لائے۔ مولانا کو سلطان کی ملاقات سے بہت اجتناب تھا۔ کئی بار فرمایا کہ میں اپنے سر کو اس شخص کے دربار میں کٹا ہوا اور پڑا ہوا دیکھتا ہوں، یعنی میں کلمۂ حق کہنے سے باز نہیں رہوں گا اور یہ شخص مجھے معاف نہیں کرے گا۔ جب مولانا سراپردۂ سلطانی میں داخل ہوئے تو شیخ قطب الدین دبیر نے مولانا کی جوتیاں اٹھالیں اور خدمتگاروں کی طرح بغل میں لیکر کھڑے ہو گئے، سلطان نے ان سے کچھ نہیں کہا اور مولانا فخرالدین سے بات چیت میں مشغول ہو گیا۔ سلطان نے کہا کہ میرا خیال ہے کہ میں چنگیز خاں کی اولاد کا قلع قمع کروں، آپ اس کام میں ہمارا ساتھ دیں گے؟ مولانا نے فرمایا انشاء اللّٰہ تعالیٰ۔ سلطان نے کہا کہ یہ شک کا کلمہ ہے۔ مولانا نے فرمایا کہ مستقبل کے متعلق ایسا ہی کہا جاتا ہے، سلطان نے یہ سنکر پیچ و تاب کھایا اور کہا کہ ہمیں کچھ نصیحت کیجئے؟ مولانا نے فرمایا کہ غصہ بادئے۔ سلطان نے کہا کون سا غصہ۔ مولانا نے فرمایا غضب سبعی (درندوں والا غصہ) اس پر سلطان کو ایسا غصہ آیا کہ چہرہ پر ظاہر ہو گیا مگر کچھ کہا نہیں۔ کہا کہ کھانا لاؤ، خاصہ شاہی لگا، سلطان اور مولانا دونوں ایک ہی پلیٹ میں کھا رہے تھے، مولانا ایسی ناگواری کے ساتھ کھانا کھا رہے تھے کہ معلوم ہوتا تھا کہ وہ سلطان کے ساتھ ہم پیالہ ہونا پسند نہیں کرتے، سلطان اور زیادہ اظہار تعلق کیلئے ہڈی سے گوشت نکال نکال کر مولانا کے سامنے رکھتا تھا، مولانا بڑی ناگواری کے ساتھ تھوڑا تھوڑا کھاتے تھے پھر دسترخوان بڑھایا گیا، اور سلطان نے مولانا کو رخصت کیا۔ رخصت کے وقت ایک اونی پوشاک اور ایک روپیہ کی تھیلی پیش کی، لیکن اس سے پہلے کہ خلعت اور کیسہ مولاناؒ کے ہاتھ میں آئے شیخ قطب الدین دبیر نے

لے دبیر کا عہدہ سکریٹری کا سمجھنا چاہیئے۔ ۱۲

ہاتھ بڑھا کر اُن کو لے لیا، اُن کے رخصت ہونے کے بعد سلطان نے شیخ قطب الدین دبیر سے کہا کہ اے فریبی آدمی تو نے یہ کیا حرکت کی، پہلے فخرالدین کی جوتیاں اپنے بغل میں لیں، پھر ان کی خلعت اور کیسہ سنبھال لیا اور اُس کو میری تلوار سے بچا لیا۔ اور بلا اپنے سر لے لی۔ شیخ قطب الدین دبیر نے کہا کہ مولانا فخرالدین میرے استاد اور میرے مرشد کے خلیفہ ہیں، اور میرے لئے مناسب تو یہ تھا کہ میں ان کی جوتیاں تعظیماً سر پر رکھتا، بغل میں لینا تو کوئی بڑی بات نہیں اور یہ خلعت وکیسہ کیا بڑی چیز ہے؟ سلطان نے کہا کہ ان کفر آمیز عقیدوں کو چھوڑ دو ورنہ میں قتل کر دوں گا۔ اخیر وقت جب مولانا فخرالدین زرادیؒ کا ذکر سلطان کی مجلس میں آتا تو سلطان ہاتھ مل کر کہتا کہ افسوس فخرالدین میری خون آشام تلوار سے بچ گئے۔[1]

اسلامی سلطنت کی رہنمائی ونگرانی

مشائخ چشت نے اگرچہ سلاطینِ وقت سے بے تعلق اور "سرکار دربار" سے دُور رہنے کا فیصلہ کیا تھا اور اس کو اپنے اور اپنے پورے سلسلہ کے لئے دائمی اصول بنا دیا تھا، لیکن وہ سلاطینِ وقت کی رہنمائی ونگرانی سے غافل نہیں تھے اور جب کبھی ان کو صحیح مشورہ یا کسی بہتر انتخاب یا اپنا روحانی اثر استعمال کرنے کا موقع ملتا تو وہ اس زرّیں موقع کو کبھی ہاتھ سے نہ جانے دیتے۔ ہندوستان کی مرکزی سلطنت کے متعدد فرمانروا اور صوبوں کی خود مختار سلطنتوں کے متعدد حکمراں ان مشائخ چشت سے عقیدت ومحبت کا تعلق رکھتے تھے اور اس تعلق سے بہت سے مفاسد کا ازالہ، بہت سے منکرات کا سدِّباب، بہت سے احکامِ شریعت اور عدل گستری اور خلق پروری کا رواج ہوا۔

ہندوستان کے سلاطین میں سلطان فیروز تغلق کو اپنی حُسنِ سیرت، نیک نفسی، رعیت پروری، رحم دلی امن پسندی، رفاہ عامہ، ازالۂ مظالم اور تبلیغ اسلام کے ذوق، مدارس کے قیام وغیرہ میں جو امتیاز وخصوصیت حاصل تھی اس میں مشکل ہی سے ہندوستان کا کوئی دوسرا فرمانروا اس کا سہیم وشریک ہوگا۔ سراج عفیف کی تاریخ فیروز شاہی سے اس بادشاہ کے تعمیری کارناموں اور اسکے زمانہ کی خیر وبرکت، امن وامان اور سرسبزی کا کچھ اندازہ ہو سکتا ہے۔

---

[1] سیر الاولیاء، ص ۲۷۱ و ص ۲۷۲

تاریخ فرشتہ کا مصنف، لکھتا ہے :—

او بادشاہے بود فاضل و عادل و کریم و	وہ ایک فاضل، منصف مزاج، شریف و
حلیم و رعیت و سپاہی از و راضی بودند و	مہربان، رحم دل و بردبار بادشاہ تھا، رعیت
ہیچ کس در عہد او یارائے ظلم نداشت[1]	اور فوج سب اس سے راضی تھی کسی کو اسکے

عہدِ حکومت میں ظلم کرنے کی مجال نہ تھی۔

مصنف نے اُس کے آئینِ حکومت کی تین بڑی خصوصیتیں لکھی ہیں، اُس نے کسی مسلمان یا ذمی کی سیاست[2] و تعزیر نہیں کی، انعامات، عطیوں اور تالیف قلب کی وجہ سے لوگوں کو سیاست کی ضرورت نہیں رہی۔

۲۔ خراج و محاصل کو رعایا کی استطاعت کے مطابق وصول کیا، اضافہ و توفیر کو جو سلاطینِ ماضی کا دستور تھا، موقوف کیا، رعایا کے بارے میں کسی مفسد کی شکایت کی سماعت نہیں کی، اس کی بدولت ملک آباد اور رعایا مرفہ الحال رہی۔

۳۔ حکومت کے عہدوں اور علاقوں کی صوبہ داری پر دیندار و خدا ترس لوگوں کو مامور کیا، کسی فساد انگیز و بدنفس کو عہدہ نہیں دیا۔ "الناس علیٰ دین ملوکھم" کے اصول کے مطابق حکام و امراء اور کارپردازانِ حکومت نے بھی اسکی پیروی کی۔[3]

لیکن بہت سے لوگوں کو یہ معلوم ہوگا کہ فیروز شاہ کی تخت نشینی اور اس کے انتخاب میں خواجہ نصیر الدین چراغ دہلیؒ کا خاص ہاتھ[4] اور اسکی فیروزمندی اور کامیابیوں میں ان کی دعاؤں اور توجہات کا بہت بڑا حصہ تھا۔

---

[1] تاریخ فرشتہ (جلد اوّل) ص۲۷۸

[2] تعزیر و تعذیب کے وہ نئے نئے طریقے جو سلاطینِ سابق نے ایجاد کئے تھے۔

[3] تاریخ فرشتہ (جلد اوّل) ص۲۷۱

[4] تاریخ فرشتہ ص۲۵۹ (ج ۱)

سراج عفیف لکھتے ہیں :-

چوں سلطان محمد دنیال طغی در ٹھٹھہ رفت	جب سلطان محمد تغلق ٹھٹھہ ملک طغی کی بغاوت
خدمت شیخ نصیر الدین را برابر خود برد چوں	فرو کرنے گیا ہوا تھا، حضرت شیخ نصیر الدین کو
سلطان محمد در ٹھٹھہ نقل کرد و سلطان فیروز شاہ	اپنے ساتھ لے گیا تھا، سلطان کا جب انتقال
در بارشاہی نشست، خدمت شیخ نصیر الدین	ہوا اور سلطان فیروز شاہ دربارشاہی میں بیٹھا،
بر سلطان فیروز شاہ پیغام کرده که بایں خلق عدل و	حضرت شیخ نصیر الدین نے فیروز شاہ کو پیغام
انصاف خواہی کرد یا برائے ایں مشتے مسکینان	بھیجا کہ خدا کی اس مخلوق کیساتھ تم عدل و انصاف
والی دیگر از اللہ تبارک و تعالیٰ التماس کرده	کرو گے یا میں ان غریبوں کیلئے اللہ سے کوئی
آید، سلطان فیروز جواب فرستاد که با بندگان	دوسرا حاکم مانگوں۔ سلطان فیروز نے جواب
خدائے تعالیٰ حلم و رزم و اتفاق کنم، چوں	دیا کہ" بابندگان خدائے تعالیٰ حلم و رزم و
خدمت شیخ ایں لفظ شنید، بر سلطان فیروز	اتفاق کنم"، جب حضرت شیخ نے یہ جواب سنا
جواب فرستاد اگر با خلق ایں چنیں خلق	تو کہلوا بھیجا کہ اگر مخلوق کیساتھ اسی طرح معاملہ
خواہی کرد، ما ہم برائے تو از اللہ تبارک و تعالیٰ	کرو گے تو میں نے اللہ تعالیٰ سے تمھارے لئے
چہل سال ملک خواستہ ایم، عاقبت ہم چناں	چالیس سال مانگ لئے ہیں، اور واقعہ بھی
شد، سلطان فیروز تا چہل سال ملک راند[1]	یہی ہے کہ سلطان فیروز نے چالیس سال حکومت کی

سلطان محمد شاہ بہمنی (۷۵۹ء، ۷۷۶ء) کو تمام مشائخ دکن نے بادشاہ تسلیم کر لیا تھا اور اسکے ہاتھ پر حاضرانہ اور غائبانہ بیعت کر لی لیکن حضرت شیخ برہان الدین غریب کے خلیفہ و جانشین حضرت شیخ زین الدین (م ۱۰۰۸ھ)

---

[1] تاریخ فیروز شاہی ص ۴۸

نے اس بنا پر انکار کر دیا کہ بادشاہ شراب نوشی اور منہیاتِ شرعی کا مرتکب ہے اور فرمایا :-

سزاوارِ پادشاہیِ خلق کسے ہست کہ در حفظ	خلقِ خدا پر حکومت کرنے کا اہل وہ شخص
شعارِ ملتِ محمدی کوشیدہ سرّا و علانیۃ	ہے جو شعائرِ اسلام کی حفاظت میں کوشش کرے
پیرامونِ مناہی نہ گردد	اور خلوت و جلوت کسی حالت میں بھی ممنوعاتِ شرعی کے قریب نہ جائے۔

۷۴۱ھ میں جب سلطان دولت آباد میں فاتحانہ داخل ہوا تو حضرت شیخ کو پیغام بھیجا کہ یا تو آپ میرے دربار میں حاضر ہوں یا میری خلافت کی تحریر اپنے دستِ خاص کی میرے پاس بھیجیں۔ شیخ نے اسکے جواب میں فرمایا کہ ایک مرتبہ کسی تقریب سے ایک عالم، ایک سیّد اور ایک ہیجڑا کافروں کے ہاتھ پڑ گئے، انھوں نے یہ فیصلہ کیا کہ یہ تینوں بُت خانہ میں جائیں، جو بت کو سجدہ کرے گا اس کی جان بخشی ہوگی اور جو انکار کرے گا وہ قتل کر دیا جائیگا، پہلے عالم کو لے گئے، انھوں نے قرآن کی رخصت پر عمل کیا[1] اور بت کا سجدہ کر کے اپنی جان بچا لی، سیّد نے عالم کی تقلید کی، جب ہیجڑے کی باری آئی اس نے کہا میری تمام زندگی ناشائستہ کاموں میں گذری، میں نہ عالم ہوں نہ سیّد کہ ان میں سے کسی فضیلت کی بناء میں ایسا کام کروں، اس نے قتل ہو جانا منظور کر لیا اور بت کا سجدہ نہیں کیا، میرا قصہ بھی اسی ہیجڑے کے قصہ سے مشابہت رکھتا ہے، میں تمہارے ہر قسم کے ظلم کو برداشت کروں گا، لیکن نہ دربار میں حاضر ہوں گا اور نہ تمہارے ہاتھ پر بیعت کروں گا۔ بادشاہ کو سخت غصہ آیا اور شہر سے نکل جانے کا حکم دیا، شیخ نے بلا توقف اپنی جائے نماز کاندھے پر ڈالی اور شیخ برہان الدین کے مقبرے میں جا کر ان کی قبر کی پائنتی اپنی لاٹھی گاڑ دی اور جائے نماز بچھا کر بیٹھ گئے اور کہا کہ اب کوئی مرد ہو تو مجھے اپنی جگہ سے ہلائے۔ بادشاہ نے شیخ کی یہ مضبوطی اور استقامت دیکھی تو پشیمان ہوا اور اپنے ہاتھ سے یہ مصرع کاغذ پر لکھ کر صدر شریف کے ہاتھ بھیجا

---

[1] الا ان تتقوا منھم تقاۃ (سورہ آل عمران، رکوع ۳) مگر ایسی صورت میں کہ تم ان سے کسی قسم کا (قوی) اندیشہ رکھتے ہو۔

ع "از من زانِ تو ام تو زانِ من باش"

شیخ نے فرمایا کہ اگر سلطان محمد شاہ غازی شریعت کے طور وطریق کی حفاظت و ترویج کی کوشش کرے اور ممالکِ محروسہ سے شراب خانے یک قلم اٹھادے، اپنے باپ کی سنت پر عمل کرے اور لوگوں کے سامنے شراب نہ پیئے اور قضاۃ و علماء و صدور کو حکم دے کہ امر بالمعروف و نہی عن المنکر میں سعیٔ بلیغ سے کام لیں تو فقیر زین الدین سے بڑھ کر بادشاہ کا کوئی دوسرا دوست و خیر خواہ نہ ہوگا۔ نیچے یہ شعر اپنے قلمِ مبارک سے تحریر فرمایا ؎

تا من بزیم بجز نکوئی نہ کنم　　　جز نیک دلی و نیک خوئی نہ کنم
آنہا کہ بجائے ما بدیہا کردند　　　تا دست رسد بجز نکوئی نہ کنم

(ترجمہ) جب تک جان میں جان ہے سوائے اچھائی، نیک دلی اور نیک خوئی کے مجھ سے کچھ سرزد نہ ہوگا۔ جن لوگوں نے ہمارے ساتھ برائی کی، جب موقع ملے گا ہم ان کے ساتھ سوائے بھلائی کے کچھ نہ کریں گے)

سلطان محمد شاہ اپنے نام کے ساتھ غازی کا خطاب دیکھ کر بہت خوش ہوا اور فرمان جاری کیا کہ القابِ شاہی کے ساتھ اس کا بھی اضافہ کیا جائے۔ قبل اسکے کہ سلطان کی حضرت شیخ سے ملاقات ہو، سلطان نے مرہٹ واڑہ کی حکومت مسند عالی خان محمد کے حوالہ کی اور خود بدولت گلبرگہ پہنچا اور شراب کی دکانوں کو اپنی پوری حکومت سے ختم کر کے شریعت کی ترویج و اشاعت میں اپنی کوشش مبذول کی، دکن کے چوروں و فسادیوں کو جو مُدّہ در مشہور تھے اور جنھوں نے رہزنی کو اپنا شیوہ بنالیا تھا، ختم کرنے کا انتظام کیا، چھ سات مہینے کے اندر اندر ملک ان سے پاک ہوگیا۔ ایک روایت کے مطابق چھ مہینے کی مدت میں چوروں، رہزنوں کے بیس ہزار سر کاٹ کر اطراف و جوانب سے گلبرگہ میں لائے گئے۔ سلطان اس عرصہ میں حضرت شیخ زین الدین سے برابر خط وکتابت کرتا رہا اور اخلاص و عقیدت کی راہ و رسم بڑھاتا رہا۔ شیخ نے بھی اسکی ہمت افزائی، قدردانی اور ہدایات اور مشوروں سے دریغ نہیں کیا۔[1]

---

[1] تاریخ فرشتہ (جلد اوّل) از ص۵۶۱ تا ص۵۶۲، طبع پونا ۱۸۳۲ء)۔ ۱۲

چشتیوں کی بڑی بڑی خانقاہیں ہندوستان کے جن حصوں اور صوبوں میں قائم ہوئیں، انھوں نے وہاں کی اسلامی حکومتوں اور سلاطینِ وقت کی رہنمائی اور اسلامی حکومت کی حفاظت و تقویت سے غفلت نہیں کی، بنگال کی مشہور عالم خانقاہ جو پنڈوہ میں تھی وہاں کی اسلامی حکومت کے لئے قوت اور پشت پناہی کا ذریعہ تھی، جب وہاں سے اسلامی اقتدار ختم ہونے لگا تو ان درویشوں نے اس کی فکر کی اور اس کو دوبارہ بحال کرنے کی امکانی کوشش کی[1]۔ پروفیسر خلیق احمد نظامی تاریخ مشائخ چشت میں لکھتے ہیں :۔

"حضرت نور قطب عالم شیخ علاء الحق کے فرزند رشید تھے، جس زمانہ میں وہ مسند ارشاد پر جلوہ افروز تھے، بنگال کی سیاست بڑے نازک دور سے گذر رہی تھی، راجہ کنس (جو بھوریہ ضلع راج شاہی کا جاگیر دار تھا) بنگال کے تخت پر قابض ہوگیا تھا اور مسلمانوں کی قوت کا خاتمہ کرنے پر تلا ہوا تھا، حضرت نور قطب عالم نے براہِ راست اور سید اشرف جہانگیر سمنانی کی وساطت سے سلطان ابراہیم شرقی کو بنگال پر حملہ کرنے کی دعوت دی، سید اشرف جہانگیر کے مجموعے میں وہ دلچسپ خطوط خاص طور سے مطالعہ کے قابل ہیں، جن میں اس سیاسی کشمکش کی تفصیل درج ہے۔ سید اشرف جہانگیر نے جو خط حضرت نور قطب عالم کے مکتوب کے جواب میں لکھا وہ بنگال میں صوفیائے کرام کے کارناموں پر کافی روشنی ڈالتا ہے"[2]

ان چند واقعات سے جو تاریخ کے وسیع انبار میں سے "مشتے نمونہ از خروارے" کے طور پر بغیر کسی تاریخی ترتیب کے جمع کر دیئے گئے، اندازہ ہوگا کہ مشائخ چشت کا تصوف، محض عزلت و خلوت، نفس کشی اور ترکِ دنیا

---

[1] تفصیل کیلئے ملاحظہ ہو ریاض السلاطین تاریخ بنگالہ تصنیف غلام حسین سلیم ص۱۱۱ عنوان مسلّط شدن راجہ کانس زمیندار تا ص۱۱۶ [2] تاریخ مشائخ چشت ص۲۰۲

اور اقبال کے الفاظ میں "سربزیری اور گوسفندی و میشی" نہیں تھا، انھوں نے اپنے اپنے دور میں زمانہ کے دھارے کو بدلنے اور حالاتِ زمانہ سے پنجہ آزمائی کی بھی کوشش کی۔ جابر سلاطین کے روبرو کلمۂ حق کہنے، اُن کے غلط رجحانات کا مقابلہ کرنے اور ان کو صلاح و مشورہ دینے سے بھی پس و پیش نہیں کیا، اور جب کبھی اُن کے اولو العزم مشائخ کو موقع ملا انھوں نے اصلاح و انقلاب کی کوششوں سے بھی دریغ نہیں کیا۔

اشاعتِ اسلام

سلسلۂ چشتیہ کی بنیاد ہندستان میں پہلے ہی دن سے اشاعت و تبلیغِ اسلام پر پڑی تھی اور اس کے عالی مرتبت بانی حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ کے ہاتھ پر اس کثرت سے لوگ مسلمان ہوئے کہ تاریخ کے اس اندھیرے میں ان کا اندازہ لگانا مشکل ہے عام طور پر تسلیم کیا جاتا ہے کہ ہندوستان میں مسلمانوں کی تعداد کی یہ کثرت بہت کچھ حضرت خواجہؒ کی کوششوں اور روحانیت کی رہینِ منت ہے، ان میں سے ایک بڑی تعداد حضرت خواجہؒ کی روحانی قوت، اشراقی کمال اور عند اللہ مقبولیت کے واقعات سے مسلمان ہوئی، اسوقت تک ہندستان جوگ و اشراقیت کا ایک بڑا مرکز تھا۔ یہاں کے بہت سے فقیر و سنیاسی اشراقی اور قلبی قوت میں بڑا کمال رکھتے تھے، ریاضیاتِ شاقہ اور مختلف مشقوں سے انھوں نے کشف و تصرف کی بڑی قوت بڑھا رکھی تھی، اُن میں بہت سے لوگ اس نووارد مسلمان فقیر کے امتحان اور اُسکو زک دینے کے لئے اُس کے پاس آئے، لیکن ان کو بہت جلد معلوم ہو گیا کہ یہ غریب الوطن درویش اُن سے اپنی قلبی قوت اور اشراقیت میں بڑھا ہوا ہے اور ساحرینِ فرعون کی طرح ان کو یہ اندازہ ہو گیا کہ اُس کے کمالات اور قوتوں کا منبع اور سرچشمہ کچھ اور ہے، اسی کے ساتھ اُن کے اخلاق کی پاکیزگی، صاف ستھری زاہدانہ اور بے طمع زندگی، ایمان و یقین کی قوت، خلقِ خدا کے ساتھ ہمدردی اور بلا تفریقِ مذہب و ملت انسان سے محبت اور انسانیت کا احترام دیکھ کر مخالفین بھی معتقد، اور دشمن بھی دوست ہو گئے۔ تذکرہ و تصوف کی کتابوں میں اس سلسلہ میں جوگیوں و سنیاسیوں کے ساتھ مقابلہ اور حضرت خواجہؒ کی اشراقی قوت اور کشف و تصرفات کے جو واقعات کثرت کیساتھ نقل کئے گئے ہیں، اگرچہ ان کو تاریخی سند سے اور قدیم ترمعاصر ماٰخذ کے ذریعہ ثابت کرنا مشکل ہے لیکن ہندستان کے

اُس وقت کے ذوق و رجحان اور اجمیر کی دینی و روحانی مرکزیت کو دیکھتے ہوئے یہ واقعات خلافِ قیاس نہیں، در اصل جس چیز نے حضرت خواجہؒ کا گرویدہ اور اسلام کا حلقہ بگوش بنایا وہ تنہا ان کی قلبی قوت تھی، بلکہ ان کی روحانیت، اخلاص و اخلاق اور اُن کا وہ طرزِ زندگی تھا جس کا ہندوستان کے اہلِ فن اور عوام نے اس سے پہلے کبھی تجربہ نہیں کیا تھا۔

خواجہ بزرگؒ کے اہلِ سلسلہ میں سے حضرت خواجہ فریدالدین گنج شکرؒ کی کوششوں اور توجہات کو اشاعتِ اسلام کے سلسلہ میں خاص اہمیت حاصل ہے۔ ان کی مجالس اور خانقاہ میں ہر مذہب و ملت کے آدمی اور ہر طبقہ کے لوگ آتے تھے۔ حضرت خواجہ نظام الدین اولیاءؒ فرماتے ہیں:۔

بخدمت شیخ الاسلام فریدالدین از ہر جنس درویش وغیر آں بر سیدے[۱]	حضرت خواجہ فریدالدینؒ کی خدمت میں ہر صنف و نوع کے لوگ درویش و غیر درویش پہنچتے تھے۔

حضرت خواجہؒ کو اللہ تعالیٰ نے جو عالی استعداد قلبی قوت عطا فرمائی تھی اسکے پیشِ نظر بعید نہیں کہ اشاعتِ اسلام میں وہ بھی معین ہوئی ہو، اور نومسلموں کی بہت بڑی تعداد ان کی روحانیت اور کشف و کرامات دیکھ کر مسلمان ہوئی ہو۔ پنجاب اور پاک پٹن کے اطراف میں بہت سی مسلمان برادریاں اور خاندان اپنے اسلاف کے قبولِ اسلام کو حضرت خواجہؒ کی توجہ اور تبلیغ کا نتیجہ سمجھتے ہیں اور اپنی نسبت اُن کی طرف کرتے ہیں۔ پروفیسر آرنلڈ اپنی کتاب (PREACHING OF ISLAM) میں لکھتا ہے:۔

"پنجاب کے مغربی صوبوں کے باشندوں نے خواجہ بہاؤالحق ملتانی اور بابا فرید پاک پٹنی کی تعلیم سے اسلام قبول کیا۔ یہ دونوں بزرگ تیرھویں صدی عیسوی کے قریب خاتمہ اور چودھویں صدی عیسوی کے شروع میں گذرے ہیں۔ بابا فرید شکر گنجؒ کا تذکرہ جس مصنف نے

---

[۱] فوائد الفواد ص ۵

لکھا ہے، اس نے تحریر کیا ہے کہ سولہ[1] قوموں کو انھوں نے تعلیم و تلقین سے مشرف باسلام کیا۔ لیکن افسوس ہے اس مصنف نے ان قوموں کے مسلمان ہونے کا مفصل حال نہیں لکھا۔[1]

حضرت خواجہ نظام الدینؒ کو اہلِ ہند میں اشاعت اسلام سے بڑی دلچسپی تھی، لیکن وہ یہ سمجھتے تھے کہ محض تقریر اور کہنے سننے سے کسی شخص کا اپنے قدیم عقیدے سے ہٹنا اور نئے دین کو قبول کر لینا، بالخصوص ہندو قوم کا جو اپنی پختگی، قدامت پرستی اور ذات پات اور چھوت چھات کی پابندی میں خاص امتیاز رکھتی ہے، محض حسنِ تقریر اور وعظ و نصیحت سے مسلمان کر لینا آسان نہیں، اس کے لئے اُن کے لئے موثر و طویل صحبت کی ضرورت تھی۔

فوائد الفواد میں ہے کہ ایک غلام جو مسلمان تھا حضرت کی مجلسِ مبارک میں حاضر ہوا اور اپنے ایک ہندو دوست کو اپنے ساتھ لایا اور کہا کہ یہ میرا بھائی ہے۔ حضرت خواجہؒ نے اس غلام سے فرمایا کہ: تمہارا یہ بھائی کچھ اسلام کی طرف بھی میلان رکھتا ہے؟ غلام نے عرض کیا کہ: اس کو حضرت کے قدموں میں اسی لئے لایا ہوں کہ آپ کی نظرِ کیمیا اثر کی برکت سے یہ مسلمان ہو جائے۔ یہ سنکر حضرت خواجہؒ کی آنکھوں میں آنسو آ گئے، فرمایا کہ کسی کے کہنے سننے سے اس قوم کا دل نہیں پھرتا۔ ہاں اگر اسکو کسی نیک بندے کی صحبت میسر آ جائے تو امید ہوتی ہے کہ اس کی صحبت کی برکت سے وہ مسلمان ہو جائے۔[2]

اس میں کوئی شبہ نہیں کہ اس پچاس برس کے عرصہ میں جس میں حضرت خواجہ نظام الدینؒ دہلی جیسے مرکزی مقام میں مسندِ ہدایت و ارشاد پر متمکن رہے اور ان کی خانقاہ کا دروازہ ہر انسان کیلئے کھلا رہا، یہ وہ زمانہ تھا جب ہندوستان کے دور دراز گوشوں سے مختلف ضرورتوں اور تقریبوں سے لاکھوں کی تعداد میں غیر مسلم آتے تھے اور اپنی خوش اعتقادی کی بنا پر حضرت خواجہؒ کی زیارت کو بھی حاضر ہوتے تھے، بڑی تعداد میں لوگ مسلمان ہوئے۔ میوات کا علاقہ جو حضرت خواجہؒ کے مرکز غیاث پور سے جانبِ جنوب متصلاً واقع ہے اور

---

[1] دعوت اسلام، ترجمہ مولوی عنایت اللہ دہلوی ص ۲۹۶ [2] فوائد الفواد ص ۱۸۲

جہاں کے رہنے والوں کی رہزنی اور شورہ پشتی کی وجہ سے کچھ عرصہ پہلے سلطان ناصر الدین محمود کے زمانہ میں شہر پناہ دہلی کے دروازے سرِ شام ہی سے بند ہو جاتے تھے اور جن کی کئی بار غیاث الدین بلبن کو تادیب کرنی پڑی حضرت خواجہؒ کے فیوض و برکات اور اُن کی تعلیم و تربیت سے ضرور مستفید ہوا ہوگا اور عجب نہیں کہ اتنی بڑی تعداد میں میواتی انھیں کے زمانہ میں مسلمان ہوئے ہوں۔

چشتی خانقاہوں نے اپنے اپنے حلقۂ اثر میں بالواسطہ اور بلاواسطہ گرد و پیش کی غیر مسلم آبادیوں کو اپنے اخلاق، روحانیت اور مساوات و اخوت سے جس کی فضا ان خانقاہوں میں قائم تھی ضرور متاثر کیا، اور اُن قوموں کو جو کشف و کرامت اور روحانیت سے خاص طور پر متاثر ہوتی ہیں اسلام میں داخل کرنے کا ذریعہ بنے، پنڈوہ کی چشتی خانقاہ اور احمد آباد اور گلبرگہ کے چشتی مشائخ کے اثر سے غیر مسلموں کی ایک بڑی تعداد کا مسلمان ہونا بالکل قرینِ قیاس ہے، گیارھویں صدی میں سلسلۂ چشتیہ کے مجدد حضرت شاہ کلیم اللہ جہاں آبادی کو اشاعتِ اسلام کا بڑا اہتمام تھا، انھوں نے اپنے خلیفہ و جانشین شیخ نظام الدین اورنگ آبادی کو جو خطوط لکھے ہیں اُن میں جا بجا اس کی تاکید و ہدایت ہے، ان کے مطالعہ سے ان کی اس مسئلہ میں بے چینی اور فکر کا اندازہ ہوتا ہے۔ ایک مکتوب میں لکھتے ہیں:۔

درآں کوشید کہ صورت اسلام وسیع گردد وذاکر ایں کثیر۔[1]	اسکی کوشش کرو کہ اسلام کا دائرہ وسیع اور اسکے حلقہ بگوش کثیر ہوں۔

دوسرے مکتوب میں لکھتے ہیں:۔

بہر حال کلمۃ الحق کوشید و از مشرق تا مغرب ہمہ حقیقی برکنید[2]

---

[1] مکتوبات کلیمی، مکتوب نمبر ۶، صفحہ ۶ [2] ایضاً نمبر ۸۰ صفحہ ۶۲

پروفیسر خلیق احمد نظامی لکھتے ہیں :۔

"شیخ نظام الدین صاحبؒ کی تبلیغی کوششوں کا نتیجہ یہ ہوا کہ بہت سے ہندو گرویدۂ اسلام ہو گئے بعض اپنے رشتہ داروں کے ڈر سے مسلمان ہونے کا اظہار نہیں کرتے تھے لیکن دل سے مسلمان ہو چکے تھے۔"

شاہ کلیم اللہ صاحب ایک مکتوب میں تحریر فرماتے ہیں :۔

"و دیگر مرتوم بود بہیہ دیارام و ہندو ہائے دیگر بسیار در ربقۂ اسلام آمدہ اند، اما با مردم قبیلہ پوشیدہ می مانند۔"

ساتھ ہی ساتھ اس چیز کو بھی پسند نہیں کرتے تھے کہ کوئی شخص مسلمان ہونے کے بعد اپنے مسلمان ہونے کو مخفی رکھے، مبادا بعدِ موت اُسکے ساتھ وہ معاملہ کیا جائے جو غیر مسلموں کے ساتھ کیا جاتا ہے۔

"برادرِ من اہتمام نمایند کہ آہستہ آہستہ آہستہ ایں امرِ جلیل از بطون بظہور انجامد کہ موت در عقب است، مبادا احکامِ اسلام بعد از رحلت بجا نیارند و مسلمان حقیقت را بسوزانند دیارام اگر خطے می نویسد، خطے نوشتہ خواہد شد۔"[1]

افسوس ہے کہ کسی نے مشائخ ہندوستان اور بالخصوص سلسلۂ چشتیہ کے مشائخ کی تبلیغی کوششوں کی تاریخ دروئداد مرتب کرنے کی زحمت گوارا نہیں کی، لیکن تمام مورخین کے نزدیک ہندوستان میں اشاعتِ اسلام کا سب سے بڑا ذریعہ صوفیائے کرام و فقرائے اسلام ہیں، اور ظاہر ہے کہ ان سلاسلِ تصوف میں سلسلۂ چشتیہ اور اس کے مشائخ کو اولیت اور اہمیت حاصل ہے، اور اس کام میں اُن کا حصہ تناسب سے زیادہ ہے۔

خدمت و اشاعتِ علم

حضرت خواجہ نظام الدین اولیاءؒ اور اُن کے خلفاء اور اہلِ سلسلہ کو علم کی تحصیل و تکمیل کا جتنا اہتمام تھا اُسکا اندازہ حضرت خواجہ فریدالدینؒ

---

[1] مکتوب ۲۱ ص ۴۱

کے متولد اور خود حضرت خواجہ نظام الدین کے شیخ سراج الدین عثمان اودھی (اخی سراج) بانیِ خانقاہ پنڈوہ کے ساتھ رویہ سے ہو سکتا ہے کہ انھوں نے انکو اس وقت تک اجازت نہیں دی جب تک کہ انھوں نے علم کی تحصیل و تکمیل نہیں کرلی، اس کا نتیجہ یہ تھا کہ رشد و ارشاد اور درس و تدریس اور علم کی اشاعت و ترویج دونوں اس سلسلہ کی تاریخ میں ساتھ ساتھ چلتے رہے اور یہ رفاقت دورِ انحطاط تک قائم رہی، حضرت خواجہؒ کے ایک خلیفۂ اجل مولانا شمس الدین یحییٰ تھے جو اس عصر کے بہت سے علماء اور اساتذہ کے استاد تھے۔ شیخ نصیر الدین چراغ دلیؒ کا مشہور شعر ہے: ؎

سألتُ العلمَ من احیاكَ حقًّا

فقال العلمُ شمس الدّین یحیٰی

میں نے علم سے پوچھا کہ تمھیں حقیقی حیات کس نے بخشی؟ اُس نے مولانا شمس الدین یحییٰؒ کا نام لیا۔

شیخ نصیر الدین چراغ دلیؒ کے مخصوص ارادتمندوں و مسترشدین میں قاضی عبد المقتدر کندی (م ۷۹۱ھ) اُن کے شاگرد رشید شیخ احمد تھانیسری (م ۸۲۰ھ) اور مولانا خواجگی دہلوی (م ۸۱۹ھ) ہندوستان کے نامور ترین علماء استاد الاساتذہ و مجددین علم میں سے ہیں۔ قاضی عبد المقتدر اور مولانا خواجگی کے شاگرد رشید شیخ شہاب الدین احمد بن عمر دولت آبادی (م ۸۴۹ھ) فخر ہندوستان اور نادرۂ روزگار تھے اور ملک العلماء قاضی شہاب الدین کے نام سے ہندوستان کی علمی تاریخ میں زندۂ جاوید ہیں، اُن کی شرح کافیہ (جو شرح ہندی کے نام سے عرب و عجم میں مشہور ہوئی) کے محشیوں میں علامہ گازرونی اور میر غیاث الدین منصور شیرازی جیسی بلند شخصیتیں ہیں، یہ وہی ہیں جنکی علالت کے موقع پر سلطان ابراہیم شرقی نے پانی کا پیالہ بھر کر اُن پر سے تصدق کیا اور دعا کی کہ ملک العلماء میری سلطنت کی آبرو ہیں اگر اُن کی موت مقدر رہی ہے تو اُن کے بجائے مجھے قبول کرلیا جائے۔

اسی سلسلہ کے ایک عالم جلیل مولانا جمال الاولیاء شبلی لورری (م ۱۰۴۷ھ)

جن کے نامور شاگردوں میں مولانا لطف اللہ کوروی، سید محمد ترمذی کالپوری، شیخ محمد رشید جونپوری اور شیخ لیسین بنارسی جیسے علمار کبار و شیوخ عصر تھے مولانا لطف اللہ کوروی کے شاگرد ہندوستان کے مشہور عالم مولانا احمد امیٹھوی عرف حمید احمد اور قاضی علیم اللہ کچھندری اور مولانا علی اصغر قنوجی تھے جنھوں نے درس و تدریس کا ہنگامہ گرم رکھا اور بڑے بڑے نامور عالم و مدرس ان کے حلقہ درس سے تیار ہو کر نکلے۔ ٹیلے والی مسجد کا شہرہ آفاق دار العلوم جس کے مسند نشین حضرت شاہ پیر محمد لکھنوی (م ۱۰۸۵ھ) تھے اسی سلسلہ سے تعلیمی روحانی نسبت رکھتا تھا خود درس نظامی (جس کی جہانگیری مسلّم ہے) کے بانی ملا نظام الدین (م ۱۱۶۱ھ) اور ان کے نامور جانشین اور اہلِ خاندان اس سلسلہ سے نسبتِ روحانی رکھتے تھے، اس کے علاوہ عام طور پر بھی مشائخ چشت کا علمی ادبی ذوق، تبحر اور علمی شغف ایک تاریخی حقیقت ہے، جو حضرت نور قطب عالم، حضرت جہانگیر اشرف سمنانی، حضرت شاہ کلیم اللہ جہاں آبادی کے مکتوبات اور پنڈوہ، گلبرگہ، مانک پور، سلون وغیرہ کی خانقاہوں کی علمی سرگرمیوں اور دلچسپیوں سے عیاں ہے۔

خاتمۂ کلام

قبل اسکے کہ سلسلۂ چشتیہ کی تاریخ کا یہ صفحۂ زریں ختم کیا جائے، ایک تلخ حقیقت کی طرح اس کا اظہار ضروری ہے کہ زمانہ کے مرور و انقلاب کے ساتھ اس سلسلہ اور اسکے بانیانِ کرام اور اسلافِ عظام کی خصوصیتوں میں انحطاط و زوال رونما ہوا (۱) تصوف و روحانیت کی تاریخ بتاتی ہے کہ ہر سلسلہ کا آغاز جذب قوی سے ہوا، پھر اس نے سلوک اور آخر میں رسوم کی شکل اختیار کرلی، یہاں بھی جس سلسلہ کا آغاز عشق، درد و محبت، زہد و ایثار، فقر و استغنار، ریاضات و مجاہدات اور دعوت و تبلیغ سے ہوا تھا اس میں بتدریج ایسی تبدیلی ہوئی کہ آخر میں اسکے نظام کے بعض نمایاں عناصر ترکیبی رہ گئے۔

(۱) وحدت الوجود کے عقیدہ میں غلو اس کی اشاعت کا انہماک اور اس کے باریک و دقیق مضامین

کا اعلان و تذکرہ۔

(۲) محافلِ سماع کی کثرت، وجد و رقص کا زور۔

(۳) اعراس کا اہتمام اور ان کی رونق و گرم بازاری جو شرعی حدود و قیود سے بے نیاز ہے۔

وہ اعمال و رسوم اور عقائد جن کی اصلاح کیلئے دینِ خالص کے یہ اولوالعزم داعی ایران و ترکستان کے دور دراز مقامات سے آئے تھے، خانقاہوں کا ایسا دستور العمل بن گئے کہ غیر مسلم آبادی کے لئے یہ ایک معمہ اور سوال بن گیا کہ اسلام اور دوسرے مذاہب میں (جن کی اصلاح کے لیے یہ مبلغین اسلام بحر و بر طے کر کے تشریف لائے تھے) عملاً کیا فرق ہے؟ توحید کے لفظ کا استعمال اور دعوت توحیدِ وجودی کے معنی میں محدود ہو کر رہ گئی، سنت اور اتباع شریعت جس پر ان مشائخ نے اتنا زور دیا تھا، اہلِ ظاہر کا شعار اور حقیقت ناشناسوں کی علامت بن کر رہ گیا، شریعت و طریقت دو الگ الگ کوچے تسلیم کیے گئے جن میں نہ صرف مغائرت تھی بلکہ تضاد، مزامیر و آلاتِ سماع جن کی مشائخ متقدمین نے اتنی شدت سے ممانعت کی تھی، داخل طریق بن گئے، درد و عشق کی جنس جو طریقہ چشتیہ کا سرمایہ تھا اس بازار میں ایسی نایاب ہوئی کہ طالبِ صادق کو حسرت سے کہتے ہوئے سنا گیا کہ۔ ع

وہ جو بیچتے تھے دوائے دل، وہ دکان اپنی بڑھا گئے

فقر جو اس طریق کا فخر تھا، شانِ امیری اور شکوہِ خسروی سے تبدیل ہو گیا۔

اس سے بڑھ کر انقلاب اور تاریخ کا سانحہ یہ ہے کہ یہی بندگانِ خدا کا مقصدِ حیات ہی خدا کے سب بندوں کا سرِ دنیا کے تمام آستانوں ______ سے اٹھا کر خدائے واحد کے آستانہ پر جھکانا اور "ماسوی" میں اٹکے ہوئے اور پھنسے ہوئے دلوں کو نکال کر ایک خدا سے اٹکانا تھا اور جن کی دعوت اور زندگی انبیاء علیہم السلام کی زندگی کی تصویر اور ان آیات کی تفسیر تھی:۔

ما کان لبشر ان یؤتیہ اللہ الکتاب — کسی بشر سے یہ بات نہیں ہو سکتی کہ اللہ تو اس کو

والحکم والنبوۃ ثم یقول	کتاب اور دین کی فہم اور نبوت عطا فرمائے اور پھر
للناس کونوا عبادًا لی	وہ لوگوں سے کہنے لگے کہ میرے بندے بن جاؤ خدا کی
من دون اللہ ولکن کونوا	کی توحید کو چھوڑ کر لیکن وہ یہ کہے گا کہ تم اللہ والے
ربانیین بما کنتم تعلمون	بن جاؤ بوجہ اس کے کہ تم کتاب الٰہی اوروں کو بھی
الکتاب وبما کنتم تدرسون	سکھاتے ہو اور بوجہ اس کے کہ خود بھی اس کو پڑھتے ہو
ولا یامرکم ان تتخذوا الملٰئکۃ	اور نہ وہ یہ بات بتلاوے گا کہ تم فرشتوں کو اور
والنبیین اربابًا ایأمرکم	نبیوں کو رب قرار دے لو۔ بھلا وہ تم کو کفر کی
بالکفر بعد اذ انتم مسلمون ۝	بات بتلاوے گا بعد اس کے کہ تم
(آل عمران - ع ۸)	مسلمان ہو۔

انقلابِ زمانہ سے خود اُن کی ذات مطلوب و مقصود اور خود اُن کا آستانہ مسجود و معبود بن گیا۔

مخدوم الملکؒ

شیخ شرف الدین یحییٰ منیری

رحمۃ اللہ علیہ

(۶۶۱ھ ——— ۷۸۶ھ)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

باب اوّل[1]

حالاتِ زندگی

ولادت سے بیعت و اجازت تک

خاندان احمد نام، شرف الدین لقب، مخدوم الملک بہاری خطاب؛ والد کا نام شیخ یحییٰ تھا جو زبیر بن عبدالمطلب کی اولاد میں تھے، اس طرح آپ کا خاندان ہاشمی قریشی ہے۔ آپ کے پردادا مولانا محمد تاج فقیہ اپنے زمانہ کے بڑے علماء و مشائخ میں سے تھے۔ الخلیل[1] (شام) سے نقل سکونت کرکے بہار کے قصبہ منیر[2] میں قیام پذیر ہوئے، بعض مصنّفین نے آپ کو شہاب الدین غوری کا ہمعصر بتایا ہے۔

---

[1] اب یہ شہر مملکت ہاشمیہ اُردنیہ کا ایک شہر ہے جو بیت المقدس سے تقریباً ۱۵، ۱۶ میل پر واقع ہے، اس کو حضرت ابراہیم خلیل اللہ کے مدفن ہونے کا شرف حاصل ہے۔ شرفاء اور صلحاء کی یہ قدیم بستی ہے، اپنی آب و ہوا کی لطافت اور اپنے ساکنین کی نرم خوئی، میزبانی اور حسنِ اخلاق میں مشہور رہا ہے۔

[2] اس وقت عام طور پر قصبہ منیر کے نام سے مشہور ہے، لیکن قدیم مآخذ و روایات سے معلوم ہوتا ہے (بقیہ صفحہ ۸ پر)

مولانا محمد تاج فقیہؒ کی ذات سے منیر اور اسکے مضافات میں اسلام کی بہت اشاعت ہوئی، کچھ عرصہ آپ نے منیر میں قیام کرکے وطن کو مراجعت فرمائی اور زندگی کا بقیہ حصہ خلیل ہی میں بسر کیا۔ آپ کا خاندان بدستور منیر میں رہا۔

شیخ احمد شرف الدینؒ کے نانا شیخ شہاب الدین جگ جوتؒ سہروردی سلسلہ کے مشائخ میں تھے، آبائی وطن کاشغر تھا، ہندوستان تشریف لائے اور موضع جیٹھلی میں قیام فرمایا جو پٹنہ سے تین میل کے فاصلہ پر ہے۔ شیخ الشیوخ حضرت شہاب الدین سہروردی کے مریدین میں سے تھے۔ زہد و ورع اور استقامت میں پایہ بلند رکھتے تھے، اور اسی وجہ سے جگ جوت (دنیا کی روشنی) کے لقب سے مشہور تھے، ان کی ایک صاحبزادی کے بطن سے شیخ احمد شرف الدینؒ اور دوسری صاحبزادی سے شیخ احمد چرم پوشؒ جیسے نامور مشائخ پیدا ہوئے۔ آپ حسینی سادات میں سے تھے، اس طرح شیخ احمد شرف الدینؒ کا سلسلہ مادری سادات میں سے ہے۔

(ص ۱۶۷ کا بقیہ حاشیہ) اسکا اصل تلفظ مُنیَر تھا، فرہنگ ابراہیمی جس کے دوسرے نام شرف نامہ ابراہیمی اور شرف نامہ احمد منیری بھی ہیں اور جو ۸۶۲ھ اور ۸۷۸ھ کے درمیان کی تصنیف ہے، کے مقدمہ میں اسکے مصنف ابراہیم قوام فاروقی نے اپنے ایک مصرع میں کتاب کا نام اسطرح منظوم کیا ہے۔ ع "شرف نامہ احمد مُنیری" یہ مصرع جب ہی موزوں ہوتا ہے جب مُنیری پڑھا جائے۔ اس کتاب کے تذکرہ کے ذیل میں انڈیا آفس لائبریری کی فہرست میں اس کو انگریزی میں بھی اسی طرح ضبط کیا گیا ہے یعنی مُنیری (MUNYARI) -۱۲

لہ سیرۃ الشرف میں ہے کہ یہ قصبہ ۵۷۶ھ میں مسلمانوں کے ہاتھ فتح ہوا۔ مصنف نے ایک قطعۂ تاریخی نقل کیا ہے جو حسب ذیل ہے: ؎

یافت چوں برراجۂ منیر ظفر — داد امام از دین جہانے را زِی
۵۷۶
ہست منقول از بزرگان سلف — سال آں دین محمد شد قوی

(بقیہ ص ۱۶۹ پر)

ولادت شعبان کے آخری جمعہ ۶۶۱ھ میں قصبۂ مُنیر میں آپ کی پیدائش ہوئی "شرف آگین" تاریخ ولادت ہے۔ آپ کے تین بھائی اور تھے: شیخ خلیل الدین، شیخ جلیل الدین اور شیخ حبیب الدین۔

تعلیم جب آپ کی عمر پڑھنے کے قابل ہوئی تو آپ کو مکتب میں بٹھایا گیا۔ اس زمانہ میں بہت سے ممالک اسلامیہ میں عام طور پر دستور تھا کہ درسی کتابوں کے متون لفظ بلفظ یاد کرائے جاتے تھے اور کچھ لغت کی مختصر کتابیں بھی، تاکہ الفاظ کا ذخیرہ بچپن سے محفوظ ہو جائے۔ شیخ نے اس طرزِ تعلیم پر اپنی بعض بعض تحریروں میں تنقید فرمائی ہے اور قوتِ حافظہ اور وقت کے اس غلط استعمال پر افسوس ظاہر کیا ہے، کہ بجائے قرآن مجید کے ایسی کتابیں رٹائی جاتی ہیں جو دین کے لئے کچھ زیادہ مفید نہیں۔ معدن المعانی کے باب ششم میں فرماتے ہیں: -

درایام خوردگی چندیں کتابہا مرا یاد گردانیدند	بچپن میں اُستادوں نے بہت سی کتابیں یاد
چنانکہ مصادر و مفتاح اللغات و جز آں در	کرائیں، مثلاً مصادر، مفتاح اللغات وغیرہ
کتابہا۔ و مفتاح اللغات جزوے بیستے	مفتاح اللغات بیس جزو کی کتاب ہوگی بقدر
خواہد بود بمقدار یک جلد یاد کرانیدند ہر بار	ایک جلد کے یاد کرائی، ہر مرتبہ زبانی سنتے
یاد تمام می شنیدند بائیست بجائے آں	تھے، اس کے بجائے قرآن مجید یاد
قرآن یاد می کرانیدند[1]۔	کرانا چاہئے تھا۔

افسوس ہے کہ تذکروں میں آپ کے ابتدائی اساتذہ کے نام اور ان کتابوں اور علوم کی تفصیل نہیں ہے

(صفحہ ۱۷۸ کا بقیہ حاشیہ) اس طرح یہ ماننا پڑتا ہے کہ فتح منیر شہاب الدین غوری کی فتح ہندوستان (۵۸۸ھ) سے قبل کا واقعہ ہے، کیا مسلمان غزنویوں کے عہد ہی میں بہار و بنگال کی حدود میں پہنچ گئے تھے، اور انھوں نے جا بجا اسلامی عملداری اور قبضہ کی بنیاد ڈال دی تھی؟ تاریخی حیثیت سے یہ مسئلہ تحقیق طلب ہے۔ [1] معدن المعانی مطبع شرف الاخبار صفحہ ۴۳

جن کی آپ نے وطن میں رہ کر تحصیل کی۔ اتنا اندازہ ہوتا ہے کہ آپ نے منیر میں رہ کر متوسطات تک تعلیم حاصل کی اور وقت کے بڑے اساتذہ سے تعلیم حاصل کرنے کے قابل ہو گئے۔

مولانا شرف الدین ابو توامہ سے تلمذ اور سنار گاؤں کا سفر

وطن میں رہ کر علم کی تحصیل کے جو مواقع حاصل تھے، جب آپ نے اُن سے فراغت حاصل کر لی تو اللہ تعالیٰ نے آپ کی علمی تکمیل و ترقی کے لئے ایک دوسرا انتظام فرمایا، دہلی کے اساتذہ میں سے مولانا شرف الدین ابو توامہ جو شمس الدین التمش کے عہدِ دولت ہی سے علم و تدریس کے نظامِ شمسی کے ایک روشن ستارہ تھے۔ غالباً غیاث الدین بلبن کے عہد میں[1] رجوعِ عام اور بعض حاسدوں کی ریشہ دوانیوں کی بنا پر اشارۂ سلطانی سے ترکِ وطن پر مجبور ہوئے اور اس وقت ہندوستان کی اسلامی مملکت کے آخری سرحدی شہر سنار گاؤں[2] کا قصد فرمایا۔ راستہ میں بہار سے گذرتے ہوئے آپ نے چند روز منیر میں قیام فرمایا، جو غالباً اس وقت دہلی سے سنار گاؤں جاتے ہوئے ایک کارواں سرائے اور آباد بستی تھی، اہلِ قصبہ

---

[1] اگر یہ تسلیم کر لیا جائے کہ مولانا شرف الدین ابو توامہ کے منیر تشریف آوری کے وقت شیخ شرف الدین احمد کم سے کم ۱۲ سال کے تھے تو یہ سنہ ۶۷۳ھ ہوگا، اس طرح یہ زمانہ غیاث الدین بلبن کا ہے جس نے سنہ ۶۶۴ھ سے لیکر سنہ ۶۸۶ھ تک سلطنت کی، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ مولانا ابو توامہؒ نے سلطان غیاث الدین بلبن کے اشارہ سے ہجرت اختیار کی تھی۔ ع

"رموزِ مملکتِ خویش خسرواں دانند"

[2] سنار گاؤں مسلمانوں کے عہد میں مشرقی بنگال کا دار الحکومت تھا، اب یہ ایک غیر معروف مقام ہے جو کس مپرسی میں پڑا ہوا ہے، اور پینام (PAINAM) کے نام سے ضلع ڈھاکہ میں شامل ہے، دریا برہم پترا اس سے دو کوس کے فاصلہ پر بہتا ہے۔ سنار گاؤں کے اطراف میں کثیر تعداد میں ویران مسجدوں کے نشانات پائے جاتے ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ کسی زمانہ میں یہ ایک بڑا اسلامی شہر تھا، یہ اُس شاہی سڑک کا منتہیٰ تھا جس کو شیر شاہ نے بنایا تھا ۱۲۔

تاریخ دعوت وعزیمت

(حصّہ چہارم)

اردو ——————— لکھنؤ، کراچی
انگریزی ——————— لکھنؤ
عربی ——————— کویت وبیروت

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

ثُمَّ اَوْرَثْنَا الْكِتٰبَ الَّذِيْنَ اصْطَفَيْنَا مِنْ
عِبَادِنَا ۚ فَمِنْهُمْ ظَالِمٌ لِّنَفْسِهٖ ۚ وَمِنْهُمْ
مُّقْتَصِدٌ ۚ وَمِنْهُمْ سَابِقٌۢ بِالْخَيْرٰتِ
بِاِذْنِ اللّٰهِ ؕ ذٰلِكَ هُوَ الْفَضْلُ الْكَبِيْرُ ﴿۳۲﴾

(سورۂ فاطر۔۳۲)

فہرست عناوین

تاریخ دعوت وعزیمت (حصّہ چہارم)

باب سوم

باب چہارم

باب پنجم

باب ششم

باب ہفتم

اکبر سے جہانگیر تک

باب ہشتم

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

عرضِ مدّعا

الحمد للہ رب العالمین والصلاۃ والسلام علی سید المرسلین وخاتم النبیین محمد وآلہ وصحبہ أجمعین ومن تبعہم باحسان ودعا بدعوتہم إلی یوم الدین

غالباً ۳۵-۱۹۳۶ء کی بات ہے، میرے مربّی وولی نعمت برادر معظم مولوی حکیم ڈاکٹر سید عبد العلی صاحب مرحوم (سابق ناظم ندوۃ العلماء) نے مجھے ہدایت کی کہ میں "مکتوبات امام ربانی مجدد الف ثانی" کا مطالعہ کروں، میری عمر اس وقت ۲۲، ۲۳ سال سے زیادہ نہ تھی، اور تازہ تازہ دار العلوم ندوۃ العلماء میں تدریسی خدمات پر مامور ہوا تھا، معرفت وحقیقت کے گہرے مضامین کے مطالعہ سے ناآشنا اور تصوف وسلوک کی اصطلاحات سے یکسر نابلد تھا، ذہن ومذاق پر ادب (بالخصوص ادب عربی) اور تاریخ کی حکمرانی تھی، مصر وبیروت کے اعلیٰ مطابع کی خوبصورت چھپی ہوئی کتابوں کے مطالعہ کی عادت تھی، بھائی صاحب جن کے دامن عاطفت اور آغوش تربیت میں ذہنی وعلمی نشوونما ہوا تھا، اس حقیقت سے خوب واقف تھے، لیکن شاید وہ اقبالؔ کے الفاظ میں کہنا چاہتے تھے کہ ؎

جس گھر کا مگر چراغ ہے تو ہے اس کا مذاق عارفانہ

کم سے کم تین ۳ سو برس سے ہمارے خاندان کو روحانی و فکری طور پر حضرت مجدد الف ثانی اور حضرت شاہ ولی اللہ صاحب کے خانوادۂ عالی سے نسبت رہی ہے، والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے ذخیرۂ کتب میں جو گھر میں محفوظ تھا مطبع احمدی دہلی کا چھپا ہوا مکتوبات کا نسخہ تھا، جو تین دفتروں پر مشتمل تھا، بھائی صاحب کے احترام اور تعمیل ارشاد میں اس کا مطالعہ شروع کیا لیکن کئی بار ہمت نے جواب دے دیا، اور کتاب رکھ دی، خاص طور پر وہ مکاتیب جو اپنے مرشد حضرت خواجہ باقی باللہ کے نام ہیں، اور جن میں اپنے روحانی تجربات اور واردات بیان کئے گئے ہیں، سب سے زیادہ ہمت شکن ثابت ہوئے لیکن بھائی صاحب کی طرف سے برابر ہدایت رہی کہ میں کسی طرح مکتوبات، حضرت شاہ ولی اللہ صاحب کی "ازالۃ الخفاء" حضرت سید احمد شہیدؒ کی "صراط مستقیم" اور شاہ اسمٰعیل شہیدؒ کی "منصب امامت" پڑھ لوں، آخر کمر ہمت باندھ کر اس "ہفت خواں" کو سر کرنے کے لئے تیار ہو گیا، غیرت بھی آئی اور جوش بھی آیا کہ ایک شفیق بھائی کی ہدایت پر عمل نہیں کرتا، اور ایک ایسی متبرک کتاب کے مطالعہ سے محروم ہوں جس کو بڑے بڑے علماء و مشائخ نے حرز جاں بنایا ہے، توفیق الٰہی نے بھی یاوری کی جس قدر آگے بڑھتا گیا دل لگتا گیا، اور بقدر استعداد و توفیق کتاب بھی سمجھ میں آتی گئی، پھر تو کتاب خود دامن گیر ہو گئی، اور اس کے پڑھنے میں ایسی حلاوت و لذت محسوس ہونے لگی جو اچھی اچھی ادبی کتابوں میں محسوس نہیں ہوتی تھی، یہ دور بعض حیثیتوں سے میری زندگی کا نازک ترین دور تھا، بعض شدید آزمائشیں اور شدید قسم کی ذہنی کشمکش درپیش تھی، کتاب نے اس مرحلہ پر ایک کامل مرشد کا کام دیا، صاف محسوس ہوتا تھا کہ قلب سکینت سے معمور بلکہ مخمور ہے، غالباً ایسی سکینت کا احساس اس سے پہلے نہیں ہوا تھا، یہ سفر جو محض سعادت و اطاعت میں شروع کیا گیا تھا، اور جس میں تعمیل ارشاد اور غیرت کا جذبہ کام کر رہا تھا، بڑی فرحت و بشاشت پر ختم ہوا۔

اس کے کچھ عرصہ کے بعد مکتوبات کو دوبارہ اس ارادہ سے پڑھنا شروع کیا کہ اس کے منتشر و مکرر مضامین کو الگ الگ عنوانات کے تحت جمع کیا جائے اس کے لئے کتاب کے مضامین کا ایک انڈکس بنانے کے کام کی ابتدا کی، مثلاً توحید خالص اور رد شرک کا مضمون کہاں کہاں آیا ہے، مکتوبات کے نمبروں کے حوالے سے ان کے صفحات ایک جگہ نوٹ کر لئے، رسالت و نبوت پر کس کس جگہ کلام کیا گیا ہے، سنت و بدعت پر کن مکاتیب میں گفتگو ہے، یہ مضمون کتنے مقامات پر ہے کہ بدعت حسنہ کا وجود نہیں، وحدۃ الوجود و وحدۃ الشہود پر کن مکاتیب میں بحث کی گئی ہے، عقل خالص اور کشف خالص پر تحقیقی بحثیں کہاں کہاں ہیں؟ وغیرہ وغیرہ، ہفتوں کی محنت سے یہ پورا انڈکس تیار ہو گیا، اور وہ مکتوبات کے اسی نسخہ میں رکھ دیا گیا کہ پھر اس کی مدد سے مضامین کو علیحدہ علیحدہ عنوانات کے تحت مرتب کیا جائے گا لیکن شاید وہ نسخہ کسی نے پڑھنے کے لئے لیا اور وہ واپس نہیں آیا، نسخہ کے ضائع ہونے سے (جس کا بدل مل سکتا تھا) زیادہ افسوس اس محنت و عرق ریزی کے ضائع ہونے کا تھا، جو اس انڈکس کی تیاری میں کی گئی تھی "وکان امر اللہ قدرًا مقدورًا"۔

اس کے کئی سال کے بعد غالباً ۴۵-۱۹۴۶ء میں یہ خیال آیا کہ مکتوبات کو مضامین و مطالب کے لحاظ سے مرتب کیا جائے، اور اس کو اس نئی ترتیب و تعارف و تشریح کے ساتھ پیش کیا جائے کہ وہ نئی نسل کے جدید ذہن رکھنے والے تعلیم یافتہ نوجوانوں کے لئے قابل استفادہ اور شوق انگیز ہو، اور اس سے حضرت مجدد صاحب کے تجدیدی کارنامے اور مجتہدانہ مقام پر بھی روشنی پڑے، چنانچہ اس التزام کے ساتھ یہ کام شروع کیا کہ پہلے ایک تمہیدی مضمون ہو جس میں آنے والے اقتباسات کا مرکزی فکر، ان علوم و تحقیقات کا جوہر و لب لباب آجائے جو ایک ہی عنوان کے تحت ہیں، لیکن سارے مکتوبات میں پھیلے ہوئے ہیں، پھر ایک معنوی ترتیب کے ساتھ مکتوبات کے اقتباسات پیش کئے جائیں،

ایک طرف فارسی متن ہو، اور دوسری طرف اس کا اردو ترجمہ، پھر حاشیہ پر حل طلب الفاظ و اصطلاحات کی تشریح اور احادیث کی تخریج ہو، پھر مستند علمائے امت و محققین اسلام کے تائیدی مضامین اور عبارتیں، اس کام کا پیمانہ اتنا وسیع تھا، اور اس میں اتنے پہلوؤں کی رعایت تھی کہ اس کام کا مجھ جیسے کم عمر و نوخیز اور مصروف انسان سے جو تدریس، تصنیف، تبلیغ، تینوں کوچوں میں قدم رکھتا تھا، سرانجام پانا بہت مشکل تھا، نتیجہ یہ ہوا کہ توحید و رسالت و نبوت کی منزل تک یہ کام پہنچا تھا کہ دوسرے مشاغل نے اس کی مہلت نہ دی، لیکن جتنا کام ہو گیا تھا، وہ بھی بہت بیش قیمت اور مفید تھا، اس مضمون کی چار قسطیں رفیق محترم مولانا محمد منظور نعمانی صاحب نے اپنے رسالۂ "الفرقان" میں ۶۶-۶۷ھ (۴۷-۴۸ء) میں شائع کیں۔

اس سلسلہ کے منقطع ہو جانے کے کئی سال کے بعد جب "تاریخ دعوت و عزیمت" کا سلسلہ شروع ہوا تو بجائے مکتوبات کی نئی ترتیب اور نئی خدمت کے حضرت مجدد کی مستقل سیرت لکھنے کا داعیہ پیدا ہوا، اور اس کی تیسری جلد جو آٹھویں صدی ہجری کے ہندوستان کے دو جلیل القدر روحانی پیشوا سلطان المشائخ حضرت خواجہ نظام الدین اولیاءؒ اور مخدوم الملک حضرت شیخ شرف الدین یحییٰ منیریؒ کے تعارف و تذکرہ پر مشتمل تھی، مرتب و شائع ہو گئی تو ضروری ہو گیا کہ حضرت مجدد الف ثانیؒ کی سیرت کی طرف توجہ کی جائے اور اس سے کتاب کی چوتھی جلد کو زینت بخشی جائے کہ اس عہد انقلاب اور اس پرفتن دور میں بعض حیثیتوں سے اس کے سامنے آنے کی زیادہ ضرورت ہے، حضرت مجدد کے اس اس طریقۂ کار و حکمت عملی کو واضح و روشن کرنے کی اس زمانہ میں (جس میں آسانی کے ساتھ اور پہلے ہی مرحلہ پر حکومتوں اور طاقتوں کو اپنا مدمقابل اور حریف بنا لیا جاتا ہے، اور کام کے راستہ میں بے ضرورت مشکلات کا پہاڑ کھڑا کر لیا جاتا ہے) جتنی ضرورت

ہے، شاید کسی زمانہ میں نہ تھی، آخر وہ کیا طریقہ تھا کہ ایک فقیر بے نوا نے ایک گوشہ میں بیٹھ کر سلطنت و ملک کا رخ بدل دیا؟ اس حقیقت کی طرف توجہ سب سے پہلے اپنے برادر معظم کی گفتگو اور مجلسوں سے ہوئی پھر مولانا سید مناظر احسن گیلانی ؒ کا وہ فاضلانہ و ولولہ انگیز مضمون پڑھ کر جو انھوں نے "الفرقان" کے مجدد نمبر کے لئے سپرد قلم کیا تھا، اس کا یقین واذعان پیدا ہوا، خود میں نے اپنے متعدد عربی مضامین اور خطبات[1] میں اس حقیقت کو متعدد بار واضح کیا اور اس حقیقت پر اطمینان و انشراح قلبی برابر بڑھتا ہی جا رہا ہے۔

لیکن جب مکمل و مستقل سیرت کا خیال آتا تو دو باتیں اس راہ میں حائل ہو جاتیں، پہلی یہ کہ مجدد صاحب کی کوئی سیرت فلسفۂ وحدۃ الوجود اور نظریۂ وحدۃ الشہود کی تفہیم و تشریح اور ان کے محاکمہ، علمی دلائل اور ناقدانہ بحث و نظر کے ساتھ آخر الذکر کی ترجیح اور اس کے اثبات کے بغیر ممکن نہیں، لیکن جب اس کا خیال آتا تو ہمت ٹوٹ جاتی، اولاً اس لئے کہ اس پر اتنا عظیم کتب خانہ تیار ہو گیا ہے، جس کی تلخیص و انتخاب بھی مشکل ہے، دوسرے ان دقیق فلسفیانہ مباحث، مقدمات اور ان نازک اصطلاحات کے سمجھے اور سمجھائے بغیر اس پر قلم ہی نہیں اٹھایا جا سکتا، پھر آخر میں یہ مسئلہ علمی اور ذوقی ہے، اور ذاتی تجربات و احساسات پر مبنی ہے، اور مصنف اس کوچہ سے یکسر نابلد، کتاب کے پڑھنے والوں کی بڑی تعداد بھی نہ صرف اس سے ناآشنا بلکہ متوحش ہے، اس لئے یہ سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ اس "ہفت خواں" کو کس طرح سر کیا جائے اور اگر کتاب اس بحث سے (جو بعض حضرات کے نزدیک مجدد صاحب

---

[1] مثلاً راقم سطور کا وہ مضمون جو اس نے جمعیۃ الشبان المسلمین قاہرہ کے ایک استقبالیہ جلسہ میں علمائے مصر اور اساتذۂ جامع ازہر کے سامنے پڑھا تھا، اور "الدعوۃ الاسلامیۃ فی الھند وتطوراتھا" کے عنوان سے علیحدہ شائع ہو گیا ہے، یا جامعۂ اسلامیہ مدینہ منورہ کی وہ تقریر جو "منھج أفضل فی الاصلاح للدعاۃ والعلماء" کے نام سے شائع ہوئی۔

کی تجدید کا اصل میدان اوران کی تجدیدی عظمت کا راز ہے) خالی ہو تو وہ کس طرح ان کی مکمل سوانح اور تذکرہ کہی جا سکتی ہے؟ دوسرا خیال جو قلم کا عناں گیر اور مصنف کا دامن کش ہوتا تھا، وہ یہ کہ اس موضوع پر اتنا کام ہو چکا ہے، اور اتنی کتابیں لکھی جا چکی ہیں کہ مصنف کے لئے ان میں اضافہ کرنا اور نئی تصنیف کا جواز پیدا کرنا مشکل ہے۔

جہاں تک پہلے خیال کا تعلق ہے بڑے غور و فکر کے بعد ذہن نے اس کا حل سوچ لیا، وہ یہ کہ "مالا یدرک کلہ لایترک کلہ" کے اصول پر اس مسئلہ کو قارئین کے سامنے شیخ اکبر کے دبستان فکر کے بعض مستند فضلا اور معتبر شارح و ترجمان حضرات کی تشریحات اور خود مکتوبات کی مدد سے اس طرح پیش کیا جا سکتا ہے کہ ان کو اس نظریہ کا اجمالی طور پر علم و تصور ہو جائے، پھر جن کو شوق و ہمت ہو وہ اصل مآخذ کی طرف رجوع کریں یا اس موضوع کے اختصاصی عالموں اور اس دریا کے شناوروں سے مدد لیں، جو اس مسئلہ پر علمی طور پر حاوی اور عملی طور پر ذوق آشنا ہیں "وقلیل ماھم"۔

جہاں تک دوسری رکاوٹ کا تعلق ہے، اس کے سلسلہ میں علامہ اقبال کے ایک شعر نے رہبری کی اور مصنف کے محدود تصنیفی تجربہ نے بھی اس کی تائید کی اور اس کے لئے شہادتیں مہیا کیں، ترجمان حقیقت نے فرمایا ہے ؎

گماں مبر کہ بپایاں رسید کار مغاں
ہزار بادۂ ناخوردہ در رگ تاک است

حضرت مجدد اور ان کے تجدیدی کارنامہ پر بہت کچھ لکھا گیا ہے لیکن اب بھی بہت کچھ لکھا جا سکتا ہے، اور بہت کچھ لکھنا باقی ہے۔

پھر زبان و اسلوب، سوالات و حالات، معیار و اقدار، اور طریقۂ تفہیم و تعبیر کی تبدیلی

سے بعض مرتبہ کچھ عرصہ پہلے لکھی ہوئی کتابیں ایسی ہو جاتی ہیں کہ وہ گویا دوسری زبان میں تھیں، اب ان کے ترجمہ کی ضرورت ہے، پھر مقدمات و واقعات سے نتائج نکالنے اور اسباب و نتائج کے درمیان ربط پیدا کرنے اور اپنے زمانہ کے حالات پر منطبق کرنے کا طریقہ بھی ہر مصنف کا جدا ہوتا ہے، مصنف کے دل نے گواہی دی کہ اگر یہ کام خلوص و محنت سے انجام دیا گیا تو نہ صرف یہ کہ وہ فائدہ سے خالی نہیں ہوگا، بلکہ کیا عجب ہے کہ چودھویں صدی ہجری کے اختتام پر پندرھویں صدی کے لئے (جو اس کتاب کی اشاعت کے فوراً بعد شروع ہونے والی ہے) وہ ایک قابل قدر تحفہ، ایک حیات آفریں پیغام، اور اللہ کے ایک مخلص و مقبول بندے کے ایک ایسے کام کی روداد بن جائے جو نہایت خاموشی، تواضع اور عجز و مسکنت کے ساتھ انجام دیا گیا، لیکن اس کے اثرات ایک صدی سے متجاوز ہو کر ہزارۂ دوم (الف ثانی) پر محیط ہو رہے ہیں، اور ہماری اس صدی کے لئے بھی جس کے زمین و آسمان بظاہر بدل گئے ہیں، اپنے اندر عبرت و موعظت کا وافر سامان رکھتا ہے۔

"ناچیز راقم سطور کا قلم اور قلب دونوں آستان خداوندی پر سربسجود اور ترانۂ حمد و شکر سے رطب اللسان ہیں کہ ۱۸ سال کے طویل وقفہ کے بعد[1] مصنف کو "تاریخ دعوت و عزیمت" کا سلسلہ پھر شروع کرنے اور اس کا چوتھا حصہ لکھنے کی سعادت و توفیق حاصل ہو رہی ہے، یہ وقفہ اتنا طویل ہوا کہ خود مصنف کو اس کا خطرہ لاحق ہو گیا کہ کہیں موت کا پیام آجائے، اور یہ اہم سلسلہ جس کو مصنف کی تصنیفات میں اللہ تعالیٰ نے خاص قبولیت سے نوازا ناتمام نہ رہ جائے، اس چوتھے حصہ کا تعلق چونکہ اس ذات گرامی سے ہے، جس کی تجدید دین نے ایک طرف وہ شہرت و قبولیت حاصل کی جو تاریخ دعوت و اصلاح میں کسی داعی و مصلح

[1] "تاریخ دعوت و عزیمت" کی تیسری جلد ۱۳۸۳ھ کے اوائل ۱۹۶۲ء کے وسط میں شائع ہوئی۔

کے حصہ میں نہیں آئی، یہاں تک کہ یہ لقب اس کے نام کا قائم مقام ہوگیا، اور بہت سے تعلیم یافتہ اصحاب بھی نام سے زیادہ اس لقب سے واقف ہیں، دوسری طرف اس کی تجدیدی مساعی نے وہ کامیابی حاصل کی اور اس کے ایسے ظاہر و باہر نتائج نکلے جن کی مثال اسلام کی تاریخِ دعوت وعزیمت اور تجدید و احیاء دین میں ملنی مشکل ہے، اس لئے خود طبیعت پر بھی تقاضا تھا، اور "تاریخ دعوت وعزیمت" کا مطالعہ کرنے والوں اور قدر دانوں کا سالہا سال سے اصرار تھا کہ اس حصہ کو جلد سے جلد مرتب ہو جانا چاہئے، بلکہ بہت سے مخلص صاحبِ نظر اور صاحبِ ذوق احباب اور بزرگوں کا مطالبہ اور حکم تھا کہ میں تمام تصنیفی مشاغل اور دوسرے موضوعات پر اس کام کو ترجیح دوں، اور کچھ دنوں کے لئے اپنے کو اس کے لئے فارغ کر لوں، لیکن یہ کام اتنا آسان نہ تھا، جتنا سمجھا جا رہا تھا، عصر حاضر کے تقاضوں، جدید ذہنوں، اور بحث و تحقیق کے جدید معیاروں اور پیمانوں کے مطابق اتنا کافی نہ تھا کہ جو کچھ لکھا گیا ہے، اور قدیم تاریخوں اور تذکروں میں جو مواد موجود ہے، اس کو معمولی انتخاب اور تلخیص کے ساتھ پیش کر دیا جائے، مجدد صاحب نے جس عہد اور ماحول میں یہ تجدیدی کام انجام دیا، اس کا علمی اور تاریخی، فکری و سیاسی، اخلاقی و اجتماعی اور اعتقادی و کلامی طریقہ پر مؤرخانہ و ناقدانہ جائزہ لینے کی ضرورت ہے، اس وقت کیا تحریکیں کام کر رہی تھیں، ہندوستان اور اس کے ہمسایہ ملکوں میں کیا ذہنی و دینی بے چینی پائی جاتی تھی، اسلام اور شریعت اسلامی کے خلاف علمی اور عقلی حلقوں میں کس بغاوت کے آثار تھے، اور کن سازشوں کی تیاریاں ہو رہی تھیں، اسلام کی تاریخ میں پہلے ایک ہزار سال کی تکمیل کے قرب نے حوصلہ مندوں اور طالع آزماؤں کے دلوں میں کیسی کیسی امیدوں اور امنگوں کے چراغ روشن کر دیئے تھے، اور متشکک اور متردد طبیعتوں میں کیسے کیسے شکوک و شبہات پیدا کر دیئے تھے،

ایک طرف فلسفہ اور علوم عقلیہ، دوسری طرف اشراق و باطنیت نے نبوت و رسالت کی عظمت و مقام کے گھٹانے اور عقل و تفلسف یا ریاضت و مجاہدہ اور نفس کشی کو معرفت الٰہی، اور وصول الی اللہ اور نجات و ترقی درجات کے لئے کافی سمجھنے کا کیسا فتنہ برپا کر دیا تھا، وحدۃ الوجود کے غالی عقیدہ نے کیسی آزادی اور بے قیدی بلکہ الحاد و زندقہ کا دروازہ کھول دیا تھا؛[1]

سنت و شریعت کی اہمیت علماء راسخین کی ایک قلیل تعداد اور شروح حدیث تک محدود ہو کر رہ گئی تھی، اور بدعات نے اکثر کھلے طریقہ پر اور بعض مرتبہ "بدعت حسنہ" کے نام اور نقاب سے پورے معاشرہ اور مسلمانوں کی عملی زندگی پر پورا تسلط حاصل کر لیا تھا، اور کوئی اس "بدعت حسنہ" کے خلاف آواز بلند کرنے کی جرأت نہیں کر رہا تھا، اور سب سے بڑھ کر یہ کہ عالم اسلام کی دوسری سب سے عظیم سلطنت[2] اور اس میں بسنے والے وسیع مسلم معاشرہ کا رخ چند ذاتی رجحانات، شخصی اغراض، خارجی اثرات اور موہوم سیاسی مصالح کی بنا پر دین حجازی سے وابستگی، نبوت محمدی کی پیروی اور اسلامی تہذیب کی نمایندگی سے بدل کر ہندی فلسفہ،

---

[1] واوین کے درمیان کی عبارت سے مصنف نے ۲۴ مارچ ۱۹۷۸ء کو عزیز گرامی مولوی معین اللہ صاحب ندوی نائب ناظم ندوۃ العلماء کی تحریک و تحریض سے (جو پیام انسانیت کے اس دورۂ مشرقی پنجاب میں شریک تھے) حضرت مجدد الف ثانی کے مزار سے متصل خانقاہ کی مسجد میں بیٹھ کر اس تصنیف کا آغاز کیا، مصنف بول رہا تھا، اور اس کے رفیق سفر و معاون عزیز مولوی اسحاق جلیس ندوی مرحوم مدیر "تعمیر حیات" لکھ رہے تھے، تبرکاً اس عبارت کو اس مقدمہ میں شامل و تحلیل کر دیا گیا ہے، اصل کتاب کے شروع کرنے میں پھر بھی تقریباً ڈیڑھ سال کا وقفہ ہوا، کتاب ۹ ذی الحجہ ۱۳۹۹ھ (۳۱ اکتوبر ۱۹۷۹ء) کو عملاً شروع ہوئی دو بیرونی سفروں کی وجہ سے اس میں طویل طویل وقفے آتے رہے، کل مدت تصنیف ۲-۳ مہینے سے زیادہ نہیں ہوگی۔

[2] سلطنت عثمانیہ کے بعد اپنے رقبہ، فوجی طاقت، وسائل و ذخائر کے لحاظ سے ہندوستان عالم اسلام کے نقشہ پر سب سے بڑی مسلم سلطنت تھی جس کے حدود مشرقی بنگال سے افغانستان کے مغربی حدود تک وسیع تھے۔

ہندی تہذیب اور "وحدتِ ادیان" کی طرف موڑا جا رہا تھا، اور اس کوشش و سازش میں اس عہد کے بعض ذہین ترین اور لائق ترین افراد شامل تھے، اور بانگ دہل "نیا دور نیا آئین" "نیا ہزارہ نئی امامت" کا نعرہ بلند کیا جا رہا تھا۔

اس صورتِ حال کو کس طرح بدلنے کی کوشش کی گئی، اس کے لئے کیا طریقۂ کار اختیار کیا گیا، اور اس میں کہاں تک کامیابی ہوئی، پھر ایک گوشۂ عزلت میں بیٹھ کر کس طرح "آدم گری" و "مردم سازی" روحانی تزکیہ و تربیت کا وہ کام انجام دیا گیا جس کے نتیجہ میں وہ مردانِ کار تیار ہوئے جنھوں نے ہندوستان کے مختلف مرکزی مقامات میں بیٹھ کر اور پھر افغانستان و ترکستان اور پھر عراق و شام و ترکی و حجاز میں پھیل کر یادِ خدا کی سرگرمی، اعلاءِ کلمۃ اللہ کی کوشش، مردہ سنتوں کے احیاء، حمایتِ شریعت و اماتتِ بدعت کا عظیم الشان کام انجام دیا، وحدۃ الوجود کے غالی داعیوں اور آزاد مشرب صوفیوں کے اثرات کا ازالہ کیا، اور مختصراً خدا طلبی اور احترامِ شریعت کا صور پھونک دیا، اور کم سے کم تین صدیوں تک اس کام کو اس قوت و عزیمت اور اس انہماک و مصروفیت کے ساتھ جاری رکھا کہ پورے عالم اسلام میں ہر جگہ وہی وہی نظر آتے ہیں، اور یہ تین صدیاں انھیں کی روحانی و علمی قیادت کی صدیاں کہلانے کی مستحق ہیں، اور اس عالمگیر اثر کو دیکھ کر ایک حقیقت پسند انسان یہ کہنے پر مجبور ہوجاتا ہے کہ ؎

جہانے را دگرگوں کرد یک مردِ خود آگاہے

اس سلسلہ میں دو اور پہلو بھی قابلِ لحاظ تھے، ایک تو یہ کہ حضرت مجدد صاحب کے عہد کی تصویر کشی اور دورِ اکبری کا نقشہ پیش کرنے کے سلسلہ میں ملا عبد القادر بدایونی کی "منتخب التواریخ" اور ان تاریخی مآخذ پر انحصار نہ رکھا جائے جو خاص دینی جذبات یا ایک خاص نقطۂ نظر کے حامل اور عہدِ اکبری کی تاریک سے تاریک تر تصویر پیش کرنے کے عادی ہیں، اس سلسلہ میں

ان غیر جانبدار مصنفین یا درباراکبری کے ان اہلِ قلم کی تحریر و بیانات سے مواد حاصل کیا جائے جو نہ صرف یہ کہ اکبر کے مخالف نہ تھے، بلکہ اس کے وکیل و نقیب اور اس کے خیالات و مقاصد کے ترجمان اور اس کے آئینِ سلطنت اور اس کے خداداد کمالات کے معترف و معرّف تھے، اسی طرح ان تبدیلیوں کا بھی مؤرخانہ و مبصرانہ جائزہ لیا جائے جو جہانگیر کے دور سے شروع ہو کر عالمگیر کے عہدِ سلطنت پر جا کر مکمل ہوئیں، اور اس سلسلہ میں بھی خاندانِ مجددیہ کے مصنفین کے بیانات اور خوش اعتقاد مؤرخوں کی شہادتوں کے بجائے غیر جانبدار مؤرخین ہندوستان کی کتابوں سے مواد اخذ کیا جائے اور ان کی روشنی میں اس دعوے کا ثبوت مہیا کیا جائے۔

نیز اس کی بھی ضرورت تھی کہ اس ربع صدی میں ہندوستان اور ہندوستان سے باہر اردو اور انگریزی میں مجدد صاحب اور ان کے دور پر جو کتابیں لکھی گئی ہیں، جن میں بہت سے مشہورات و مسلّمات کو چیلنج کیا گیا ہے، نئے سوالات اٹھائے گئے ہیں، اور واقعات و معلومات یا اپنے اخذ کردہ نتائج کی مدد سے بالکل ایک نئی تصویر پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے (جو اس تابناک اور درخشاں تصویر سے بہت مختلف ہے، جو ابھی تک پیش کی جاتی رہی ہے) ان کو بھی سامنے رکھا جائے، اور خواہ ان کے ایک ایک دعویٰ کا نام لے لے کر تردید نہ کی جائے لیکن مجدد صاحب کی یہ نئی سیرت اور ان کے کارناموں اور ان کے دور کا یہ جائزہ خود بخود ان کتابوں کا جواب اور ان دعوؤں اور اعتراضات کی تردید ہو جائے۔

اپنی شدید مصروفیت، کثیر ملکی و بیرونی اسفار، صحت کی کمزوری اور معاونوں کی کمی[1] کے ساتھ

---

[1] اس موقع پر ناسپاسی ہوگی، اگر رفیق عزیز مولوی شمس تبریز خاں (رفیق "مجلس تحقیقات و نشریات اسلام") کا شکریہ نہ ادا کیا جائے جنھوں نے فارسی کی بعض قدیم کتابوں سے مواد مہیا کرنے اور لمبی لمبی فارسی عبارتوں کا ترجمہ کرنے میں مصنف کی بیش قیمت مدد کی، نیز عزیزی ناصر الاسلام ندوی بھی شکریہ کے مستحق ہیں کہ کتاب کی تسوید اور مآخذ سے استفادہ میں ان سے عملی مدد ملی۔

کوشش کی گئی ہے کہ تاریخ دعوت وعزیمت کا یہ حصہ جو حضرت مجدد الف ثانیؒ کی سیرت اور ان کی خدمات و کارناموں پر مشتمل ہے بعض نئے معلومات اور ایسے مواد کے ساتھ جن سے ابھی تک کام نہیں لیا گیا تھا، اور بعض اہم اور غور طلب نتائج اور دعوت فکر و عمل کے ساتھ جلد منظر عام پر آجائے شاید ہم اس سے اس زمانہ کے تقاضوں سے عہدہ برآہونے اور آنے والی پندرہویں صدی کا استقبال کرنے میں (جس کا عالم اسلام کے مختلف حصوں میں استقبال کیا بھی جاچکا ہے) کچھ مدد حاصل کرسکیں" وماتوفیقی إلا باللہ علیہ توکلت والیہ انیب "

آخر میں اس کا اعتراف و شکریہ بھی ضروری ہے کہ مجددی خاندان کی شاخوں اور مجددی سلسلہ کے مشائخ کبار کے سلسلہ میں مخدوم محترم مولانا ابوالحسن زید فاروقی مجددی (فرزند گرامی حضرت شاہ ابوالخیر مجددیؒ) سے وہ بیش قیمت معلومات حاصل ہوئیں جن کا حصول کسی اور ذریعہ سے بظاہر نہایت دشوار تھا، فاضل گرامی پروفیسر خلیق احمد نظامی بھی مصنف کے شکریہ کے مستحق ہیں کہ ان کے ذاتی کتابی ذخیرہ میں بعض ضروری قلمی کتابیں اور مفید مواد حاصل ہوا، اور انھوں نے بڑی فراخدلی سے ان سے استفادہ کی اجازت دی۔ مصنف ڈاکٹر نذیر احمد صاحب (مسلم یونیورسٹی علی گڑھ) کی علمی اعانت کا بھی شکرگزار ہے۔

ابوالحسن علی ندوی

دائرہ شاہ علم اللہؒ رائے بریلی

۲۶ رجمادی الاولیٰ ۱۴۰۰ھ
۱۳ راپریل ۱۹۸۰ء

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

باب اوّل

عالم اسلام دسویں صدی میں

دسویں صدی (ہجری) کے تاریخی مطالعہ کی اہمیت

حضرت مجدد الف ثانیؒ کی ولادت شوال ۹۷۱ھ اور وفات صفر ۱۰۳۴ھ میں ہوئی، اس طرح ان کا عہد دسویں صدی کے آخری انتیس ۲۹ سال، اور گیارہویں صدی کے تقریباً تینتیس ۳۳ سال ہیں، ان کے عہد کے مؤرخ اور ان کی شخصیت کے سوانح نگار کو اصلاً اسی ترسٹھ ۶۳ سال کی مدت سے سروکار ہونا چاہئے جو ہجری تقویم کی ان دو صدیوں کے آخری اور ابتدائی ثلث سے تعلق رکھتی ہے۔

لیکن حقیقتاً کسی کی ولادت سے خواہ وہ کتنی عظیم شخصیت ہو یکایک کسی ایسے نئے عہد کا آغاز نہیں ہو جاتا جو اچانک کتم عدم سے عالم وجود میں آئے اور اس پر ان واقعات و حوادث، ان تاریخی عوامل، اس سیاسی، اخلاقی، علمی پس منظر، اور ان سلطنتوں اور طاقتوں کا اثر نہ ہو جو اس کی پیدائش سے پہلے سے کارفرما اور ماحول و معاشرہ پر اثر انداز ہو رہی تھیں، اس لئے ہم کو حضرت مجدد کی سیرت و سوانح کی ترتیب اور ان کے اصلاحی و تجدیدی کارنامہ کے تذکرہ، ان کے عہد کا مزاج سمجھنے اور ان کے کام کی دشواریوں

آسانیوں کا صحیح اندازہ اور تقابل کرنے کے لئے اس عہد کے عالم اسلام کا سیاسی، دینی، علمی اور اخلاقی حیثیت سے تاریخی جائزہ لینے کی ضرورت ہوگی جس سے ان کو بدوِ شعور سے واسطہ پڑا، اور جس میں ان کو اپنا وہ انقلاب انگیز اور عہد آفریں تجدیدی و اصلاحی کارنامہ انجام دینا تھا، جس کی بنا پر وہ بجا طور پر مجدد الف ثانی کہلائے۔

اس جائزہ میں ہم کو اس تاریخی حقیقت کو بھی پیشِ نظر رکھنا ہوگا کہ ایک عہد اور اس عہد کی دنیا اور انسانی معاشرہ ایک بہتے ہوئے دریا کی طرح ہوتا ہے، جس کی ہر موج دوسری موج سے مربوط و متصل ہوتی ہے، اس لئے کوئی ملک خواہ وہ باقی دنیا سے کتنا ہی کٹا ہوا اور الگ تھلگ زندگی گذار رہا ہو، گرد و پیش کی دنیا میں پیش آنے والے اہم واقعات انقلابات، باہم نبرد آزما طاقتوں اور طاقتور تحریکوں سے یکسر غیر متاثر اور غیر متعلق نہیں رہ سکتا، خاص طور پر جب یہ واقعات و انقلابات اس کے ہم جنس، ہم مسلک اور ہم عقیدہ پڑوسی ممالک میں پیش آرہے ہوں، اس بنا پر اس تاریخی جائزہ میں ہندوستان کے دائرہ کے اندر محدود رہنا درست نہیں ہوگا، ہم کو دسویں صدی ہجری کی پوری دنیائے اسلام، اور خاص طور پر گرد و پیش کے مسلم ممالک پر بھی نظر ڈالنی ہوگی، جن سے اگرچہ ہندوستان کے سیاسی روابط نہ تھے، لیکن دینی، تہذیبی اور علمی روابط تھے، اور وہاں جو سرد و گرم ہوائیں چلتی تھیں، ان کے جھونکے بُعدِ مسافت کے باوجود ہندوستان تک بھی پہونچ جاتے تھے۔

سیاسی حالت

دسویں صدی کے اوائل میں عرصہ کے بعد (غالباً سلطان صلاح الدین ایوبی

متوفی ۵۸۹ھ کے بعد) عالم اسلام کے مرکزی حصہ (مشرق وسطی) کو سیاسی استحکام حاصل ہوا تھا، اور مغربی ایشیا کے عرب ممالک ایک ایسے جھنڈہ کے نیچے جمع ہوئے تھے، جس کے بلند کرنے والے اپنے کو حامی اسلام، خادم الحرمین الشریفین اور مسلمانوں کا پاسبان کہتے تھے، اور جنھوں نے (خواہ اپنی سیاسی مصلحتوں کی بنا پر) خلافت کو بھی زندہ کر دیا تھا، جو آخری عباسی خلیفہ مستعصم باللہ کی تاتاریوں کے ہاتھوں شہادت (۶۵۶ھ) کے بعد سے مصر میں "عیسوی پاپائیت" کی طرح رہ گئی تھی، یا دوز سلطان سلیم اول بانی خلافت عثمانیہ (۹۱۸ھ-۹۲۶ھ) نے ۹۲۲ھ میں شام اور ۹۲۳ھ میں مصر فتح کیا، جو ڈھائی سو برس[۲۵] سے سلاطین مملوک کے زیر حکومت چلا آرہا تھا، سلیم کے حملہ کے وقت اس کا حکمراں قانصوہ غوری تھا، اسی ۹۲۳ھ میں سلطان سلیم نے خلافت اور اس کے بعد حرمین شریفین کی تولیت وخدمت کا اعلان کیا، جزیرۃ العرب پھر رفتہ رفتہ شمالی افریقہ کے مسلم وعرب ممالک (باستثناء مراکش) سلطان سلیم پھر اس کے جانشین سلیمان اعظم قانونی (۹۲۶ھ-۹۷۴ھ) (جس کو مغربی مصنفین "سلیمان ذی شان" کے لقب سے یاد کرتے ہیں) کے زیر حکومت آگئے، سلیمان اعظم کا عہد حکومت (جس کی وفات سے تین سال پہلے حضرت مجدد کی ولادت ہوئی) سلطنت عثمانیہ کے اوج اقبال کا زمانہ ہے، ایک طرف یورپ میں آسٹریا اور ہنگری میں اس کے فتح واقبال کا جھنڈا نصب تھا، دوسری طرف ایران میں اس کی فوجیں فاتحانہ طریقہ پر یلغار کر رہی تھیں، مصر و شام کے ساتھ عراق (عرب) بھی اس کی وسیع مملکت میں شامل ہو گیا تھا، اس وقت وہ دنیا کی سب سے بڑی مملکت (ایمپائر) کا فرمانروا تھا، مراد ثالث (۹۸۲ھ-۱۰۰۴ھ) کے زمانہ میں جزیرۂ قبرص، صوبۂ تونس سلطنت ایران کے بعض زرخیز صوبے اور یمن دولت عثمانیہ میں شامل تھے، اسی کے زمانہ میں ۹۸۴ھ میں حرم مکی کی تعمیر کی تکمیل ہوئی، یہ مجدد صاحب کے شعور کا

زمانہ تھا، ان کو ضرور ان اہم واقعات کا علم ہوگا، اس عہد کے مسلمان (خواہ وہ ہندوستان کے باشندے ہوں) عثمانی ترکوں کی (جو متصلب قسم کے سنی حنفی تھے) ان فتوحات و وسعتِ سلطنت سے ضرور مسرور ہوتے ہوں گے۔

اسی صدی کی ابتدا (۹۰۵ھ) میں ایران و خراسان میں صفوی خاندان کا ظہور ہوا اس سلطنت کا بانی شاہ اسماعیل صفوی تھا (۹۰۵ھ-۹۳۰ھ) اس خاندان نے رفتہ رفتہ اس پورے علاقہ پر اپنا مستحکم اقتدار قائم کرلیا، یہ سلطنت عثمانیہ کے متوازی سلطنت تھی، جس نے سلطنت عثمانیہ کے بالمقابل مذہب اثنا عشری جعفری کو حکومت کا سرکاری مذہب قرار دیا تھا، حکومت کے اقتدار اور وسائل سے پورا فائدہ اٹھاتے ہوئے اس نے پورے ایران میں اس مذہب کی اشاعت و ترویج کا بیڑہ اٹھایا، اور اس میں اس نے حیرت انگیز کامیابی حاصل کی، اس طرح یہ حکومت اپنے حدود پر مذہبی اختلاف کی بنا پر ایک انسانی دیوار کھڑی کرکے عثمانیوں (جن کے ہم مذہب (سنّی حنفی) قسطنطنیہ سے لے کر لاہور و دہلی تک پھیلے ہوئے تھے) کی وسیع مملکت (ایمپائر) میں تحلیل ہونے سے محفوظ ہوگئی، اس خاندان کی حکومت بغداد سے ہرات تک تھی۔

اس خاندان کا سب سے باعظمت حکمراں شاہ عباس (۹۹۵ھ-۱۰۳۷ھ-جو تاریخ میں شاہ عباس اعظم کے نام سے ملقب ہے اور جس کو اپنے تعمیری کارناموں کی بنا پر اس خاندان کا شاہجہاں کہا جاسکتا ہے) حضرت مجدد صاحب کا معاصر ہے، صفوی حکومت شاہ عباس اول کے زمانہ میں انتہائی عروج کو پہونچی، اس نے ترکوں سے لڑ کر نجف اور کربلا کو حاصل کرلیا، وہ اکبر اور جہانگیر کا معاصر تھا، شاہ عباس کے بعد اس خاندان کا زوال شروع ہوگیا۔

دنیائے اسلام کا دوسرا اہم مشرقی خطّہ ترکستان تھا، جو صدیوں تک اسلامی تہذیب اور اسلامی علوم وفنون کا مرکز رہا، اور جس کو قدیم ادبیات میں ماوراء النہر کے نام سے یاد کیا جاتا ہے، اور جس نے فقہ حنفی کی تدوین میں (عراق کے بعد) سب سے بڑا حصہ لیا، اور اس کی متعدد زندہ جاوید کتابیں جو ہندوستان کے نصاب میں ابھی تک داخل ہیں، وہیں تصنیف ہوئیں[۱]، نیز سلسلۂ نقشبندیہ (جس سے حضرت مجدد اور ان کے مشائخ کا تعلق ہے) وہیں پیدا ہوا، پھلا پھولا، اور وہیں سے دنیا میں پھیلا، یہ زرخیز و مردم خیز ملک دسویں صدی کی ابتدا (۹۰۵ھ) ہی سے ازبکوں کے شیبانی خاندان کے قبضہ و اقتدار میں آگیا، اور ۹۱۶ھ کے ایک مختصر وقفہ کے علاوہ (جس میں بابر نے صفویوں کی مدد سے ماوراء النہر پر حملہ کیا تھا، اور اس وقت کے دارالسلطنت سمرقند پر قابض ہوگیا تھا) اٹھارویں صدی عیسوی کے وسط (روس کے انقلاب تک) انھیں کے زیرنگیں رہا، دسویں صدی میں شیبانی خاندان کے دو حکمراں عبیداللہ بن محمد (۹۱۸ھ-۹۴۶ھ) اور عبیداللہ بن اسکندر (۹۶۴ھ-۱۰۰۶ھ) کا دارالسلطنت بخارا تھا، ان کی بدولت بخارا دوبارہ فکری وسیاسی زندگی کا مرکز بن گیا۔

ہندوستان کا سب سے قریبی ہمسایہ ملک جو اس کے مغرب میں واقع ہے، افغانستان ہے، یہ ملک دسویں صدی کی ابتدا میں ترکستان کے ازبکوں اور ایران کے صفویوں، اور درمیان درمیان میں مقامی حوصلہ مندوں کی تاخت میں رہا، کابل و قندھار پر کبھی مغل اور کبھی ایرانی قابض ہوجاتے تھے، اور ہرات ایران کے حدود پہ ہونے کی وجہ سے اکثر صفوی سلطنت کے زیر اثر رہا، ۹۲۸ھ میں بابر نے قندھار کو فتح کیا، پھر جب اس نے

---

[۱] مثلاً، شرح وقایہ، ہدایہ۔

ہندوستان میں تیموری سلطنت کی بنیاد ڈالی تو اپنا مستقر ہندوستان کو بنایا، جہاں سے وہ کابل، بدخشاں و قندھار تک حکومت کرتا تھا، اس وقت افغانستان، ہندوستان و ایران کی دو بڑی سلطنتوں کے زیر اثر ایک نسبتاً منظم اور پرامن دور میں داخل ہوا، وہ ان دونوں سلطنتوں کے درمیان اس طرح بٹ گیا تھا کہ ہرات و سیستان کے صوبے ایران کے پاس رہے (اگرچہ ان پر وقتاً فوقتاً ازبکوں کے حملے ہوتے رہتے تھے) کابل سلطنت مغلیہ کا جزبنا رہا، اور قندھار پر کبھی مغل کبھی ایرانی قابض ہوجاتے، کوہستان کے شمال میں بابر کے چچازاد بھائی سلیمان مرزا نے (جسے بابر نے بدخشاں کا والی بنایا تھا) ایک نیم آزاد شاہی خاندان کی بنیاد قائم کرلی، ملک کے باقی ماندہ اقطاع شیبانیوں کے زیرنگیں رہے، ۹۶۵ھ میں طہماسپ شاہ ایران نے قندھار پر قبضہ کرلیا، اور ۱۰۰۳ھ تک یہ شہر ایرانیوں کے قبضہ میں رہا، ۱۰۰۳ھ میں شہزادہ مظفر حسین نے اسے اکبر کے حوالہ کیا، اس وقت سے افغانستان کا ملک ہندوستان کی مغل سلطنت کا ایک صوبہ رہا، اور یہ سلسلہ بارہویں صدی کے وسط تک قائم رہا، یہاں تک کہ ۱۱۵۱ھ میں نادر شاہ افشار کے ہاتھوں آل بابر کی دوسو چالیس (۲۴۰) سال کی حکومت افغانستان سے اٹھ گئی۔

دسویں صدی شروع ہوئی تو ہندوستان میں لودھی خاندان کی حکومت تھی، جس کا آخری حکمراں ابراہیم لودھی ۹۳۲ھ میں بانیٔ سلطنتِ مغلیہ ظہیرالدین محمد بابر گورگانی (۸۸۸ھ-۹۳۹ھ) کے ہاتھ سے قتل ہوا، اور سلطنت مغلیہ کی بنیاد پڑی، جو ہندوستان کی مسلم سلطنتوں میں سب سے وسیع مستحکم و منظم اور طویل العمر سلطنت تھی، لودھی خاندان اپنی افغانی نسل و روایات کی بنا پر اسلام کا حلقہ بگوش، مذہب حنفی کا پابند تھا، جو تجدد پسندی اور نامذہبی (سیکولر) سیاست سے ناآشنا تھا، اس خاندان کا سب سے دیندار،

معارف نواز اور علماء کا قدر دان و سرپرست بادشاہ سکندر لودھی (م ۹۲۳ھ) تھا اسی صدی کے پانچ خوش نصیب سال (۹۴۶ھ۔۹۵۲ھ) شیر شاہ سوری کے زیر حکومت گذرے جس سے زیادہ تنظیم و دستور سازی کی صلاحیت اور رفاہی کاموں کی توفیق رکھنے والا مسلمان بادشاہ اور صاحب علم اور دیندار حکمراں اس سے پہلے کی ہندوستان کی اسلامی تاریخ میں نہیں گزرا، شیر شاہ کے انتقال کے بعد سے اکبر کی تخت نشینی تک ہندوستان کو سیاسی و انتظامی استحکام، اور حکومت کو استقرار، اور اہل ملک کو فارغ البالی حاصل نہیں ہوئی، شیر شاہ سوری کا جانشین سلیم شاہ اپنے عبقری (GENIUS) باپ سے کوئی مناسبت نہیں رکھتا تھا، بابر کا جانشین نصیر الدین ہمایوں (۹۳۷ھ۔۹۶۳ھ) ہندوستان میں اطمینان کے ساتھ سلطنت نہ کرسکا، اور شیر شاہ کے فاتحانہ حملوں اور بھائیوں کی بے وفائی سے پریشان اور سرگرداں رہا، اور جب تک ایران کے بادشاہ طہماسپ صفوی سے مدد لے کر نہیں آیا، اس کو استقرار نصیب نہیں ہوا، ۹۶۳ھ میں اکبر تخت نشین ہوا، اور پوری نصف صدی تک بڑے کروفر سے حکومت کی۔

مجدد صاحب کے زمانہ ہی میں جب ان کی عمر ۴۳ سال کی تھی، نورالدین جہانگیر تخت نشین ہوا، اور اسی کے عہد میں مجدد صاحب نے وفات پائی، اس مرکزی سلطنت کے علاوہ جس کا پایہ تخت دہلی تھا، گجرات، بیجاپور، گولکنڈہ، اور احمد نگر میں علاقائی حکومتیں قائم تھیں، جو خود مختار طریقہ پر سلطنت کررہی تھیں، ان میں سے تین آخرالذکر شیعہ مذہب رکھتی تھیں۔

مذہبی و روحانی حالت

اس وقت پوری دنیائے اسلام کے ذہن پر مذہب کی گرفت مضبوط تھی، عوام عام طور پر (اپنی علمی و اخلاقی کمزوریوں کے باوجود) راسخ الاعتقاد مسلمان، دین پسند اور اسلام دوست تھے، ان میں خاص دینی حمیت اور اسلامی جوش پایا جاتا تھا، اگرچہ بہت سی بدعات اور خلاف اسلام افعال کے مرتکب ہوتے رہتے تھے، لیکن عام طور پر کفر و الحاد سے بیزار و متنفر تھے۔

ان کے اس عمومی دینی ذوق اور مزاج کی وجہ سے سلاطین اسلام کو بھی (جو بڑی سے بڑی مخالف طاقت کی پرواہ نہیں کرتے تھے، اور جن کی فوجی طاقت نے یورپ کو بھی لرزہ براندام کر رکھا تھا) شعائر اسلام کا احترام، اور دین کی حمایت و نصرت کا اظہار و اعلان کرنا پڑتا تھا، اور عوام کے دلوں پر اس وقت تک ان کی عظمت و محبت کا نقش قائم نہیں ہونے پاتا تھا جب تک کہ وہ اپنے اس دینی پہلو کو نمایاں نہ کریں، سلطان سلیم اول کی سلطنت میں اس وقت تک استحکام نہیں پیدا ہوا جب تک کہ اس نے خلیفۃ المسلمین اور خادم الحرمین الشریفین کا لقب اختیار نہیں کیا، اس نے اپنے دمشق کے قیام کے دوران مقامات مقدسہ سے اپنی نیازمندی اور عقیدت کا برملا اظہار کیا، ذی الحجہ ۹۲۳ھ میں سلیم نے حاجیوں کا ایک قافلہ دمشق سے روانہ کیا جس کے ساتھ پہلی مرتبہ ترکی سلطان کی طرف سے بطور ہدیہ غلاف کعبہ بھیجا گیا، اس وقت سے...... سلاطین ترکی خادم الحرمین الشریفین کا خطاب استعمال کرنے لگے جس کی وجہ سے انھیں اسلامی دنیا میں بڑا وقار حاصل ہوا، سلیمان اعظم کی زندگی میں تواضع اور خاکساری

اور گہرے دینی جذبات کی متعدد مثالیں ملتی ہیں، اس نے قرآن مجید کے آٹھ نسخے اپنے ہاتھ سے لکھے جو سلیمانیہ میں محفوظ ہیں، وہ اپنے دیوان کی غزلوں اور نظموں سے ایک راسخ الاعتقاد مسلمان ظاہر ہوتا ہے، اس نے مفتی ابوالسعود (م ۹۵۲ھ) (صاحب تفسیر ابوالسعود) کے فتوے کی سند پر کعبۃ اللہ کی از سر نو تعمیر کی، اور مکہ مکرمہ کی پختہ کاریزیں بنوائیں، سلطان مراد نے ۹۸۴ھ میں کعبۃ اللہ کی عمارت کی تکمیل کی، (جس پر وہ اس وقت تک قائم ہے) یہ سب دسویں صدی کے سلاطین آل عثمان کے کارنامے ہیں۔

ایران کی (شیعی) سلطنت میں بھی عوام کا ذہن مذہبی، اور ذوق دینی خوش عقیدگی کا تھا، اور سلاطین صفویہ اس کو غذا پہونچا کر اور مذہب، اور اہل بیت سے اپنی عقیدت و محبت کا اظہار کر کے اس سے ملک میں سیاسی استحکام، اور عوام میں مقبولیت حاصل کرنے کا کام لیتے تھے، ایران کے سب سے عظیم حکمراں شاہ عباس اول نے صرف زیارت کی غرض سے اصفہان سے مشہد تک پیدل آٹھ سو میل کا سفر کیا، اور نجف میں حاضر ہو کر روضۂ مرتضوی پر جھاڑو دی۔

شاہ عباس سے ایرانیوں کی عقیدت غلو اور وہم پرستی کی حد تک پہونچ گئی تھی، اور لوگوں میں عجیب عجیب روایات مشہور تھیں۔

ترکستان و افغانستان کے لوگوں کی راسخ الاعتقادی، دینی صلابت، سنیت اور مذہب حنفی کی پابندی میں تصلّب ضرب المثل ہے، ان کے حکمراں اور سربراہانِ مملکت، ارکان سلطنت، اور خواص و امراء بھی (اپنی سطح اور معیار زندگی کے مطابق) بہت حد تک ان کے ہم رنگ اور ہم آہنگ تھے۔

ہندوستان میں مسلم سلطنتوں کی بنیاد ترکی و افغانی النسل خاندانوں اور حکمرانوں

کے ہاتھ سے پڑی، اس لئے شروع سے یہاں بھی مذہب کا اثر گہرا لیکن سیدھے سادہ رنگ کا تھا، جو ترکی وافغانی ذہنیت و مذاق کا خاصّہ ہے، یہاں شروع سے طریقۂ اہل سنت والجماعۃ، اور مذہب حنفی کی (چند سواحلی مقامات اور جنوبی ہند کے علاقہ مالا بار کو مستثنیٰ کرکے) پابندی رہی، اور شروع سے وہی مملکت کا دستور اور عدالتوں کا قانون رہا، یہاں فقہ حنفی کی بعض اہم کتابیں "فتاویٰ تاتارخانی" اور "فتاویٰ قاضی خاں" لکھی گئیں[1]۔

ہندوستان کی اسلامی تاریخ میں متعدد بادشاہ اپنی حمایتِ سنت و شریعت، کفروالحاد سے بیزاری، بدعات و منکرات کی مخالفت و ازالہ، اور دینی حمیت میں ممتاز نظر آتے ہیں، آٹھویں صدی میں محمد تغلق، و فیروز تغلق اور دسویں صدی میں سلطان سکندر لودھی کا نام لینا کافی ہے، "طبقات اکبری" "تاریخ فرشتہ"، اور "تاریخ داودی" کے مصنفین کے بیان کے مطابق سلطان سکندر کے عہد میں مذہب کی پابندی ایسی پیدا ہوگئی تھی کہ یہ معلوم ہوتا تھا کہ زندگی کا ایک نیا طریقہ پیدا ہوگیا ہے، وہ اپنے نفس سے نفس اسلام کو زیادہ عزیز رکھتا تھا، ان کے بقول سلطان کو اپنی ابتدائے عمر سے تعصبِ مذہبی دامنگیر تھا، بادشاہ کو تذکرۂ علمی کا شوق تھا، اس کے عہد میں ہندوؤں کے فارسی پڑھنے کا آغاز ہوا، کائستوں نے بادشاہ کا مشورہ قبول کیا، سلطان نے سالار مسعود کی چھڑیاں جو سالانہ جاتی تھیں اپنی مملکت میں بالکل موقوف کردیں، مزارات پر زیارت کے لئے عورتوں کے جانے کی سخت ممانعت کردی، بعض مؤرخ لکھتے ہیں، کہ تعزیوں کے نکلنے اور (چیچک کی دیوی) سیتلا کی پوجا کو بھی سختی سے روکا[2]، مشتاقی نے لکھا ہے کہ

---

[1] یہ فتاویٰ عالمگیری کی تدوین سے بہت پہلے کا زمانہ ہے جس نے عالم اسلام میں شہرت حاصل کی، اور فتاویٰ ہندیہ کے نام سے مصر و شام و عراق میں مشہور ہے۔ [2] تاریخ ہندوستان از مولوی ذکاء اللہ دہلوی جلد دوم صہ ۳۷۴

" قبور بلا میت رانہر ساختہ" بہت سی جعلی قبریں جو اس زمانہ میں وجود میں آگئی تھیں، وہاں نہریں جاری کر کے ان کا نام و نشان مٹا دیا۔[1]

سلطان سلیم شاہ سوری مساجد میں خود نماز پڑھاتا تھا، مسکرات سے سختی سے مجتنب تھا۔

یہ دور تصوف اور سلاسل وطرق صوفیہ کے انتہائی عروج کا تھا، عالم اسلام کا کوئی ملک اور خطہ ایسا نہ تھا جہاں کوئی سلسلہ پایا نہ جاتا ہو، گھر گھر اس کا چرچا تھا، اس سلسلہ میں ترکستان کے دو مشہور شہر اور علمی و روحانی مرکز بخارا اور سمرقند، افغانستان میں ہرات اور بدخشاں، مصر میں اسکندریہ اور طنطا، یمن میں تعز اور صنعاء، حضرموت میں تریم، شحر اور سیون علماء اور صوفیاء اور مشائخ کا بڑا مرکز تھے، حضرموت میں باعلوی عیدروس خاندان بڑا مقبول اور صاحبِ کمال خاندان تھا، اسی دور میں ان اطراف میں الشیخ ابوبکر بن عبداللہ بن ابوبکر بہت عالی مرتبہ شیخ اور قطب دوراں سمجھے جاتے تھے، تریم سادات آل باعلوی کا مستقر تھا، اس زمانہ کے مشہور اولیاء میں شیخ سعد بن علی السوینی باندحج السعید تھے، شیخ محی الدین عبدالقادر عیدروسی (۹۷۸ھ-۱۰۳۷ھ) نے اپنی مشہور کتاب "النور السافر فی رجال القرن العاشر"[2] کو انھیں کے تذکرہ پر ختم کیا ہے، جو ص۴۶۶ سے ص۴۸۰ تک پھیلا ہوا ہے۔

ہندوستان میں دسویں صدی میں اگرچہ سلسلۂ قادریہ اور سلسلۂ چشتیہ کی دونوں شاخیں (نظامیہ اور صابریہ) پھیلی ہوئی تھیں، اور ان میں متعدد باکمال اور صاحبِ حال شخصیتیں پائی جاتی تھیں، لیکن حقیقتاً یہ صدی سلسلۂ عشقیۂ شطاریہ کی صدی ہے جس نے

---

[1] واقعات مشتاقی [2] یہ کتاب ۱۰۱۲ھ میں احمد آباد میں لکھی گئی۔

(جدید تعبیر کے مطابق) ہندوستان کے صاحب ولایت سلسلۂ چشتیہ سے اس ملک کا روحانی چارج لیا، اور سارے ہندوستان کو تسخیر کر لیا۔[1]

طریقۂ شطّاریہ کے بانی شیخ عبداللہ شطّار خراسانی ہیں، جو غالباً نویں صدی کے اوائل میں ہندوستان تشریف لائے، اور مانڈو میں سکونت اختیار کی، ۸۳۲ھ میں ان کی وفات ہوئی، اور مانڈو میں اندرون قلعہ مدفون ہوئے، وہ امیرانہ ٹھاٹ سے رہتے تھے، صاحبِ جذب قوی تھے، خلق کثیر نے ان سے فائدہ اٹھایا اور تیزی سے ان کا سلسلہ ہندوستان میں پھیل گیا، اس طریقہ کی دو شاخیں ہیں، ایک شاخ کا تعلق شیخ محمد غوث گوالیاری سے ہے، ان کے اور شیخ عبداللہ شطاری کے درمیان تین واسطے ہیں، دوسری شاخ کے بانی شیخ علی بن قوام جونپوری (شیخ علی عاشقاں سرائے میری) ہیں، ان کے اور شیخ عبداللہ شطاری کے درمیان دو واسطے ہیں، اس سلسلہ نے غالباً پہلی مرتبہ جوگ کو تصوف کے ساتھ ملایا، اور ان کے سلوک کے بعض طریقے اور اذکار، اور بعض آسن اور حبس دم کا طریقہ اختیار کیا اور اپنے مریدین کو ان کی تعلیم دی، نیز علم سیمیا کو بھی شامل کیا، ان آسنوں کی تشریح اور اس کے اذکار کی تفصیل "رسالہ شطاریہ" مصنفہ بہاء الدین ابن ابراہیم الانصاری القادری میں موجود ہے،[2] شیخ محمد شطاری کی تصنیف "کلید مخازن" میں مصنف کا ایک مستزاد ہے،

---

[1] اس صدی میں سلسلۂ مداریہ بھی جس کے بانی شیخ بدیع الدین مدار مکن پوری (م ۸۴۴ھ) تھے، ہندوستان میں پایا جاتا تھا، اس سلسلہ کا مدار و شعار وحدۃ الوجود کے افکار و مضامین کا برملا اظہار و اعلان، تجرید ظاہری (اس حد تک کہ محض شرمگاہ کے چھپانے پر اکتفا کیا جائے) اور توکل محض ہے، مرور ایام کے ساتھ اس سلسلہ میں انحطاط اور بے قیدی بڑھتی گئی، یہاں تک کہ "مداری" بازیگر کا مرادف قرار پایا، دسویں صدی میں یہ سلسلہ خواص کے حلقہ میں اپنی مقبولیت کھو چکا تھا "نزہۃ الخواطر" کے حصۂ چہارم میں (جس میں ہر سلسلہ کے مشائخ کا استیعاب کیا گیا ہے) تلاش سے صرف دو اشخاص ملے جن کو سلسلۂ مداریہ میں بھی بیعت تھی۔

[2] ملاحظہ ہو نسخۂ قلمی موجود کتب خانہ ندوۃ العلماء فن تصوف ۴۸، ص ۴۷-۴۹

جس سے وحدۃ الوجود، بت خانہ و مسجد، اور شیخ و برہمن کی مساوات کا، اور ان سب چیزوں میں خدا کی تجلی، بلکہ ظہور کا صاف صاف اظہار ہوتا ہے کہ یہ سب اسی وحدت کے الوان و مظاہر ہیں، آخر کا شعر ہے ؎

عشقی شد و در مشرب شطّار برآمد۔ خود غوث جہاں شد[1]

"رسالہ عشقیہ" میں کافری کو "جلال عشق" اور مسلمانی کو "جمال عشق" کہا گیا ہے، اور یہ شعر ملتا ہے ؎

کفر و ایمان قرین یک دگراند
ہر کہ را کفر نیست ایماں نیست[2]

ایک جگہ لکھا ہے:۔

"العلم حجاب اکبر گشت، مراد ازیں علم عبودیت کہ حجاب اکبر است، ایں حجاب اکبر اگر از میان مرتفع شود کفر بہ اسلام و اسلام بہ کفر آمیزد، وعبادت خدائی وبندگی برخیزد"[3]

اس سلسلہ کے سب سے نامور و بااثر شطّاری شیخ محمد غوث گوالیاری تھے (م ۹۷۰ھ) جن کو رجوع عام اور قبول تام حاصل ہوا، اور جن کی شان و شوکت وزراء و امراء کے درباروں سے چشمک کرتی تھی، ان کی جاگیر کی آمدنی نو لاکھ سکہ نقرئی[4]، ان کے فیل خانہ میں چالیس ہاتھی اور خدم و حشم کا ایک بڑا لشکر تھا، آگرہ کے بازار میں نکلتے تو ٹھٹھ لگ جاتے، ہر ایک کو جھک جھک کر سلام کرتے زین پر سیدھا بیٹھنا مشکل ہو جاتا، ملا عبدالقادر بدایونی کے بیان کے مطابق شیخ محمد غوث نے اکبر کو ترکیب سے اپنا مرید بنا لیا تھا، لیکن بادشاہ نے جلد اس حلقۂ ارادت کو اپنی گردن سے دور کر دیا، اس امیرانہ بلکہ شاہانہ شان کے

---

[1] "کلید مخازن" ص ۱۹۶-۱۹۹ [2] "رسالہ عشقیہ" ص ۱۷ [3] ایضاً ص ۲۳ [4] بعض روایات میں ایک کروڑ تک ہے۔

باوجود ملک میں ان کے فقر کی دھوم مچی ہوئی تھی، سلام کرنے کے وقت تا بحدّ رکوع جھک جاتے تھے، چاہے مسلمان ہو یا غیر مسلم، علماء کو اس پر اعتراض تھا، ان کی تصنیفات میں "جواہر خمسہ" "معراجیہ"[1] "کنز الوحدۃ" اور "بحر الحیاۃ"[2] ہے، ہندوستان پر ان کا بڑا اثر پڑا، اور طریقۂ چشتیہ شطاریہ عام ہوا[3]، مجدد صاحب ان کے انتقال کے ایک سال بعد پیدا ہوئے۔

اس سلسلہ میں شیخ علی بن قوام جونپوری معروف بہ علی عاشقان سرائے میری (م ۹۵۵ھ) شیخ لشکر محمد برہانپوری (م ۹۹۳ھ) شیخ اللہ بخش گڈھ مکتیسری (م ۱۰۰۲ھ) بڑے جلیل القدر مشائخ تھے، جن سے ایک عالم نے رجوع کیا، علی عاشقاں سرائے میری کے متعلق بعض تذکرہ نگاروں نے لکھا ہے کہ حضرت شیخ عبدالقادر جیلانیؒ کے بعد کسی سے ایسی کرامات کا ظہور نہیں ہوا جیسے ان سے[4]، شیخ محمد غوث گوالیاری کے خلفت و خلیفہ شیخ ضیاء اللہ اکبر آبادی (م ۱۰۰۵ھ) علامہ وجیہ الدین کے شاگرد تھے، پینتیس[5] سال اکبر آباد میں (جو اکبر کا دار الحکومت تھا) رہے، بڑی مقبولیت حاصل کی، دربار اکبری میں کئی بار طلب کئے گئے، ملا عبدالقادر بدایونی نے لکھا ہے کہ میں نے ان کو سلام مسنون کیا، تو ان کو

---

[1] انھوں نے اپنے لئے معراج کا دعویٰ کیا تھا جس پر علمائے گجرات میں بڑا ہنگامہ ہوا، لیکن ملک العلماء شیخ وجیہ الدین گجراتی نے (جو اس وقت کے اکثر علماء کے استاد تھے) اس کی علمی توجیہ کی جس سے ہنگامہ فرو ہوا۔

[2] یہ کتاب امرت کنڈ کا ترجمہ ہے، شیخ محمد اکرام اپنی کتاب رود کوثر میں اس کے متعلق لکھتے ہیں:۔

"اس میں ہندو یوگیوں اور سنیاسیوں کے اطوار و اشغال کی تفصیل کو فارسی میں منتقل کیا ہے، اپنی ابتدائی تصنیف "جواہر خمسہ" میں ان کی ایک آدھ جھلک دکھائی، اس سے شطاریہ طریقہ کے اصل رتباط پر روشنی پڑتی ہے، جو اس کو ہندو یوگا سے تھا"۔ (ص ۳۴-۳۶)

[3] مشائخ شطاریہ کے تفصیلی حالات کے لئے ملاحظہ ہو "نزہۃ الخواطر" جلد ۴۔

[4] تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو "العاشقیہ" تصنیف عارف علی، یا "نزہۃ الخواطر" جلد پنجم۔

گراں گزرا، اور اس میں انھوں نے اپنی توہین محسوس کی، اور اس شعار اسلام اور سنت خیر الانام کی تضحیک کی، بدایونی نے ان کا اچھا نقشہ نہیں کھینچا ہے، اور ان کے استہزاء کے واقعات لکھے ہیں[1]۔

ان حضرات کے علاوہ شاہ عبداللہ سندیلوی (۹۲۴ھ - ۱۰۱۰ھ) اور شیخ عیسیٰ بن قاسم سندی خلیفہ حضرت شیخ لشکر محمد عارف باللہ (جو حضرت مجدد صاحب کے معاصر اور قریب العمر ہیں) نامور مشائخ عشقیہ شطاریہ میں تھے[2]۔

سلسلۂ عشقیہ شطاریہ کے ان نامور مشائخ کے علاوہ ہندوستان میں دوسرے جلیل القدر مشائخ بھی موجود تھے، جن کا دوسرے سلسلوں سے تعلق تھا، ان میں سے ایک شیخ چائیں لدہ سہنوی[3] (م ۹۹۸ھ) ہیں، وہ "فصوص" اور "نقد النصوص" کا درس دیتے تھے، اکبر ان کا معتقد تھا، ایک دن ان کو صلوٰۃ معکوس پڑھتے دیکھا تو چلا گیا[4]، دوسرے شاہ عبدالرزاق جھنجھانوی (۸۸۶ھ - ۹۴۹ھ) قادری چشتی تھے، وہ صاحب تدریس و تصنیف عالم ہونے کے باوجود اپنے عہد میں وحدۃ الوجود اور شیخ اکبر کے مسلک کے سب سے بڑے علمبردار تھے، ان کے اس موضوع پر کئی رسائل ہیں، شیخ عبدالعزیز شکر بار (۸۵۸ھ - ۹۷۵ھ) بھی وحدۃ الوجود کے قائل اور صاحب حال بزرگ تھے، وہ بھی "فصوص الحکم" اور اس کی شروح کا درس دیتے تھے، یہ حضرت شاہ ولی اللہ صاحب کے اجداد مادری میں بھی ہیں۔

اسی صدی میں حضرت شیخ عبدالقدوس گنگوہی (م ۹۴۴ھ) کا آفتابِ ارشاد نصف النہار پر پہونچا، اور ان سے سلسلۂ چشتیہ صابریہ کو نئی تازگی اور طاقت حاصل

---

[1] تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو "منتخب التواریخ" ملا عبدالقادر، یا "نزہۃ الخواطر" جلد ۵۔ [2] ملاحظہ ہو "نزہۃ الخواطر" جلد ۵

[3] سہنہ ضلع گڑگانوہ (مشرقی پنجاب) میں ایک قصبہ ہے جہاں کا گرم چشمہ مشہور ہے۔ [4] "نزہۃ الخواطر" جلد ۴۔

ہوئی، وہ وحدۃ الوجود کے اسرار برملا زبان سے کہتے اور اس کے داعی تھے، جونپور میں شیخ قطب الدین بینا دل (۷۷۶ھ۔۹۲۵ھ) طریقۂ قلندریہ میں، اور کنتھل (ضلع انبالہ) میں شیخ کمال الدین (م ۹۷۱ھ) سلسلۂ قادریہ کے سرحلقہ اور صدر نشین تھے، جن سے ان دونوں طریقوں نے نئی آب و تاب پائی، شیخ کمال کیتھلی کے متعلق حضرت مجدد صاحب نے اپنے والد ماجد حضرت شیخ عبدالاحد سے نقل کیا ہے کہ انھوں نے ارشاد فرمایا کہ "جب نظر کشفی سے دیکھا جاتا ہے تو اس سلسلۂ عالیہ (قادریہ) میں پیران پیر حضرت شیخ عبدالقادر کے بعد ان سے بلند مرتبہ و باکمال شیخ نظر نہیں آتا"[1] اودھ میں شیخ نظام الدین امیٹھوی معروف بہ بندگی میاں (۹۰۰ھ ۹۷۹ھ) سلسلۂ چشتیہ کے بڑے شیخ، حامی شریعت اور متبع سنت بزرگ تھے، "احیاء العلوم" اور "عوارف" و "رسالہ مکیہ" پر ان کا عمل تھا، ایک شخص کے ہاتھ میں "فصوص" دیکھی تو اس کو چھین لیا، اور دوسری کتاب مطالعہ کو دی، ان کے سلسلہ میں اگرچہ سماع عام تھا، لیکن وہ اس سے محترز تھے۔[2]

یہ تھی اس وقت دنیائے اسلام کی مذہبی و روحانی صورت حال، اور یہ تھے ہندوستان کے مختلف المشرب اور متفاوت الدرجات شیوخ طریقہ اور اصحاب سلسلہ جو دسویں صدی ہجری میں مختلف مقامات پر اپنے روحانی اور تربیتی مرکز قائم کئے ہوئے تھے اور ہندوستان میں گہرا دینی رجحان رکھنے والے طالب خدا اور محب الفقراء عوام و خواص ان سے کسی نہ کسی درجہ میں وابستہ اور ان کے حلقہ بگوش تھے، اس کو تفصیل کے ساتھ اس لئے بیان کیا گیا، تاکہ مجدد صاحب کے عہد کی فضا، مذاق، رجحان، اور اس عہد میں دین کے احیاء و تجدید کے کام کے امکانات اور مشکلات دونوں کا اندازہ ہو۔

---

[1] زبدۃ المقامات ص۱۰۰ [2] تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو "نزہۃ الخواطر" جلد ۴

علمی حالت

دسویں صدی ہجری اگرچہ علمی اختراع وابتکار، مجتہدانہ فکر ونظر، علوم کی تدوینِ جدید، اور ان میں وقیع اضافہ کی صدی نہیں تھی، یہ خصوصیات آٹھویں صدی کے وسط تک نمایاں نظر آتی ہیں، جس میں شیخ الاسلام حافظ ابن تیمیہؒ (م ۷۲۸ھ) شیخ الاسلام تقی الدین ابن دقیق العید (م ۷۰۲ھ)، علامہ علاء الدین الباجی (م ۷۱۴ھ) علامہ جمال الدین ابوالحجاج المزی (م ۷۴۲ھ) اور علامہ شمس الدین الذہبی (م ۷۴۸ھ) علامہ ابوحیان نحوی (م ۷۴۵ھ) جیسے سرآمد روزگار علماء پیدا ہوئے، جنھوں نے حدیث، اصول وعلم کلام، فن رجال، اور علوم عربیت میں بلند پایہ اور گرانقدر تصنیفات یادگار چھوڑیں، امام فنِ حدیث علامہ ابن حجر العسقلانی صاحبِ "فتح الباری" (م ۸۵۲ھ) کا دور بھی گذر چکا تھا، جن کی بے نظیر شرح بخاری کے متعلق کہا گیا ہے کہ "لا هجرة بعد الفتح"۔

دسویں صدی زیادہ تر جمع وترتیب، اور تسہیل وتلخیص کی صدی تھی، پھر بھی اس کے اوائل میں علامہ شمس الدین سخاوی (م ۹۰۲ھ) اور علامہ جلال الدین سیوطی (م ۹۱۱ھ) جیسے علوم دینیہ کے بحرِ زخار، اور اسلام کے مصنفین کبار گزرے ہیں، علامہ سخاوی کے متعلق بعض علماء کا قول ہے کہ امام شمس الدین ذہبی کے بعد علم حدیث، فن رجال اور تاریخ میں ان کے پایہ کا شخص پیدا نہیں ہوا، ان کے بعد فن حدیث کا زوال شروع ہوگیا، اصول ومصطلحات الحدیث میں ان کی کتاب "فتح المغیث بشرح الفیۃ الحدیث" اور تذکرہ رجال میں "الضوء اللامع لأهل القرن التاسع" اپنے موضوع پر بے نظیر سمجھی جاتی ہیں، علامہ سیوطی تعریف وتعارف سے مستغنی ہیں کہ ان کا شمار تاریخ اسلام کے عظیم مصنفین میں ہے،

اوران کی بعض کتابیں اپنے موضوع پر دائرۃ المعارف (انسائیکلوپیڈیا) کی حیثیت رکھتی ہیں، اور تفسیر جلالین کے نصف اول نے جوان کی تصنیف ہے، اور صدیوں سے درس میں داخل چلی آرہی ہے، ان کے نام کو اس وقت تک زندہ اور تابندہ رکھا ہے۔

اس صدی میں مصر وشام وعراق میں فن حدیث وعلم رجال، ایران میں علوم حکمیہ، (منطق وفلسفہ) ترکستان وہندوستان میں علم فقہ (حنفی) کا زور تھا، اور یہی معیار فضیلت اور درجۂ کمال سمجھے جاتے تھے، مصر میں علامہ احمد بن محمد قسطلانی، صاحب شرح صحیح البخاری (م ۹۲۳ھ) اور شیخ الاسلام زکریا انصاری (م ۹۲۵ھ) ترکی میں علامہ ابوالسعود صاحبِ تفسیر (م ۹۵۲ھ) حجاز میں علامہ ابن حجر ہیتمی صاحب "الصواعق المحرقة" وکتب کثیرہ (م ۹۷۴ھ) اور علامہ علی متقی صاحب کنز العمال (م ۹۷۵ھ) رونق افروز تھے، اور ایک عالم کو اپنے درس سے مستفید کر رہے تھے، مشہور محقق ومنصف حنفی عالم ومصنف ملا علی قاری اگرچہ ہرات افغانستان میں پیدا ہوئے، لیکن مکہ مکرمہ میں سکونت اختیار کر کے ایک عالم کو اپنے علم سے فیضیاب کر رہے تھے، ان کا انتقال اگرچہ گیارہویں صدی کے اوائل (۱۰۱۴ھ) میں ہوا، لیکن ان کی علمی وتصنیفی خدمات کا زمانہ دسویں صدی ہجری ہی ہے، اسی صدی کے آخر میں ادیب ومؤرخ علامہ قطب الدین نہروالی[۱] مکی (صاحب "الاعلام فی اخبار بیت اللہ الحرام) نے ۹۹۰ھ میں انتقال کیا، جن کا خمیر ہندوستان کی سرزمین سے اٹھا تھا، اور جن کے کمال کی قدر ترکی وحجاز کے سلاطین وامراء نے کی۔

ایران کی سرزمین علامہ جلال الدین دوانی (م ۹۱۸ھ) ملا عماد بن محمود طارمی (م ۹۴۱ھ) اور علامہ غیاث الدین منصور (م ۹۴۸ھ) کی ذات پر مفتخر ونازاں تھی، جنھوں نے

---

[۱] نہروالا انہلواڑہ کی تعریب ہے جو پٹن (گجرات) کا پرانا نام ہے، اور جس کو ۴۱۶ھ میں محمود غزنوی نے فتح کیا۔

علم وحکمت کے دریا بہا دیئے تھے، جن کی موجیں ہندوستان تک پہونچیں، اس عہد کے آخر کے بہت بڑے علماء میں شیخ محمد بن الشیخ ابی الحسن صدیقی شافعی اشعری مصری تھے، جن کو الاستاذ الاعظم، اور قطب العارفین کے لقب سے یاد کیا جاتا تھا، مضامین عجیبہ اور نکات غریبہ بیان کرنے میں فرد فرید تھے، اور ربط آیات اور تفسیر وحدیث وفقہ میں اپنی نظیر نہیں رکھتے تھے، جامع ازہر میں درس دیتے تھے، شائقین علم پروانوں کی طرح ٹوٹے پڑتے تھے، اسی کے ساتھ بڑے صاحبِ باطن، شیخ طریقت اور شاعر وادیب تھے[۱] ۹۹۳ھ میں ان کا انتقال ہوا، اسی طرح مشہور ہندی محدث رحمۃ اللہ بن عبد اللہ سندھی حنفی (م ۹۹۴ھ) جنھوں نے حجاز میں بیٹھکر حدیث کی دولت عام کی، اور اپنی مہارت فن اور استادی کا دلوں پر سکہ بٹھا دیا، ملک العلماء علامہ وجیہ الدین ابن نصر اللہ گجراتی جنھوں نے نصف صدی علوم دینیہ وعقلیہ کا درس دیا، اور جن کے تلامذہ نے ایک صدی سے زائد درس وتدریس کا ہنگامہ گرم رکھا، اسی صدی کے نصف آخر کی زینت تھے، اور اسی صدی کی انتہا پر ۹۹۸ھ میں سفر آخرت اختیار کیا، اس وقت یمن روایت واسناد حدیث کا سب سے بڑا مرکز بنا ہوا تھا، اور وہاں محدث یمن طاہر بن حسین بن عبد الرحمٰن الاہدل مسند آرائے درس تھے، اور اسی سال ۹۹۸ھ میں انھوں نے وفات پائی[۲]۔

اس عہد میں ہندوستان میں فضلائے ایران کی آمد شروع ہوگئی تھی، جو علامہ جلال الدین دوانی، ملا عماد ابن محمود طارمی، اور میر غیاث الدین منصور کے فیض یافتہ تھے، ہمایوں کے زمانہ میں مولانا زین الدین محمود کمان گر بہدائی، تلمیذ مولانا جامی ومولانا عبد الغفور لاری، ہندوستان آئے اور بادشاہ نے ان کی بڑی تعظیم وتکریم کی، اکبر کے زمانہ میں حکیم ابو الفتح گیلانی، حکیم ہمایوں

---

[۱] تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو "النور السافر" ص ۴۱۳-۴۳۹ [۲] حالات وکمالات کے لئے ملاحظہ ہو علامہ محمد بن علی شوکانی کی کتاب البدر الطالع

(حکیم ہمام) اور نورالدین قراری تینوں فاضل بھائی گیلان سے آئے، اور دربار میں رسوخ پیدا کیا، کچھ عرصہ کے بعد ملا محمد یزدی ولایت (ایران) سے آئے، اور امیر فتح اللہ شیرازی بھی بیجاپور ٹھہرتے ہوئے دربار اکبری کی رونق و زینت بنے، وہ میر غیاث الدین منصور کے شاگرد تھے، ۹۹۳ھ میں صدر ہوئے، ہندوستان میں علمائے ایران کی تصنیفات وہی لائے، انھوں نے یہاں کے نصاب اور طریقۂ درس پر ایسا گہرا اثر ڈالا جس نے بالآخر درس نظامی کی ترقی یافتہ شکل اختیار کی، اور جو ہندوستان کے علمی و درسی حلقوں پر ابھی تک غالب اور حاوی ہے۔[۱]

اس عہد میں بالخصوص جنوبی ہند میں نیشاپور، استرآباد، جرجان، مازندران، اور گیلان، کے بہت سے فضلاء اور ادباء کے نام ملتے ہیں، جو درباروں میں رسوخ رکھتے تھے۔[۲]

افغانستان بھی اپنی سپہ گری اور سیف زنی کے ساتھ علم و درس کی دولت سے محروم نہ تھا، قاضی محمد اسلم ہروی جن کا انتقال ہندوستان میں ۱۰۶۱ھ میں ہوا، ہرات میں پیدا ہوئے اور افغانستان ہی میں مولانا محمد فاضل بدخشانی سے تحصیل علم کی، مولانا محمد صادق حلوائی بھی اس وقت افغانستان کے بڑے علماء میں تھے، ہرات ایران کی سرحد پر ہونے کی وجہ سے علوم حکمت کا مرکز تھا، اور اس کے فرزندوں میں قاضی محمد اسلم ہروی اور ان کے نامور و باکمال فرزند مولانا محمد زاہد نے (جو میر زاہد کے نام سے ہندوستان کے مدرسی حلقہ میں معروف و مشہور ہیں) علوم حکمیہ میں بڑا نام پیدا کیا، عرصہ تک مؤخرالذکر کے تین حواشی جو "زواہد ثلاثہ" کے نام سے مشہور ہیں، اساتذہ و علماء کے مرکز توجہ اور معیار فضیلت بنے رہے۔

---

[۱] تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو "الثقافۃ الاسلامیۃ فی الهند" یا اس کا ترجمہ "اسلامی علوم و فنون ہندوستان میں" اور مضمون "ہندوستان کا نصاب درس" از مولانا حکیم سید عبدالحی حسنیؒ۔ [۲] تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو "نزہۃ الخواطر" جلد ۴۔

علمائے ہند کے تلمذ و استفادہ کا یہ تعلق صرف ایرانی فضلاء، اور ولایت کے اساتذۂ فن ہی سے جاری نہیں تھا، فضلاء و محدثین مصر و حجاز اور یمن سے بھی قائم تھا، شیخ راجح بن داؤد گجراتی (م ۹۰۴ھ) نے علامہ سخاوی سے حدیث میں استفادہ کیا تھا، علامہ سخاوی نے ان کو شیخ العلاء البخاری الحنفی کی ابن عربی کے بارے میں رائے اور مسلک بتایا، تاکہ وہ ہندوستان کے علماء و مشائخ کو اس سے باخبر کریں، اور شیخ اکبر کے بارے میں ان کی جو خوش فہمی ہے، وہ زائل ہو[1]، علامہ سخاوی نے "الضوء اللامع" میں اپنے ان ہندی شاگرد کا تذکرہ لکھا ہے، اور ان کے علمی کمالات کا اعتراف کیا ہے، اپنے زمانہ کے امام فن حدیث شیخ علی بن حسام الدین المتقی صاحب "کنز العمال" جن کے متعلق کہا جاتا ہے کہ "سیوطی کا احسان ساری دنیا پر ہے، اور علی متقی کا احسان خود سیوطی پر ہے" علامہ ابوالحسن الشافعی البکری مدرس حرم مکی، اور علامہ شہاب الدین احمد بن حجر مکی مفتی و محدث مکّہ کے تلمیذ رشید تھے۔

سطور بالا سے اس کا اندازہ ہو گیا ہوگا کہ ہندوستان سمندر اور فلک بوس پہاڑوں سے گھرے ہوئے ہونے کے باوجود (جس میں باہر کی دنیا سے رابطہ کا ذریعہ بلوچستان کا درۂ بولان اور شمالی مغربی سرحد کا درۂ خیبر تھا) علمی اور ثقافتی طور پر باہر کی دنیا سے کلی طور پر کٹا ہوا نہیں تھا، اس کے استفادہ و افادہ کا سلسلہ جاری تھا، اگرچہ یہ واقعہ ہے کہ اس کا استفادہ افادہ سے، اور "درآمد" کا عمل "برآمد" کے عمل سے بڑھا ہوا تھا، اور ایسا ہونا قدرتی امر بھی تھا، کہ ہندوستان میں دین اور علم دونوں ترکستان و ایران کے راستہ ہی سے پہونچے تھے۔

---

[1] "نزہۃ الخواطر" جلد ۴

ذہنی بےچینی اور اعتقادی انتشار خیال

لیکن دسویں صدی کا سیاسی، دینی وعلمی جائزہ نامکمل رہے گا، اگر اس ذہنی بےچینی اور اعتقادی انتشار خیال کا ذکر نہ کیا جائے، جو اس دور میں ہندوستان اور اس کے ہمسایہ ممالک میں کہیں کہیں پایا جاتا تھا، تاکہ اس صدی کی صحیح صورت حال سامنے آجائے، اور یہ غلط فہمی نہ ہو کہ زندگی کے دریا میں جو ہزاروں میل کی مسافت میں بہہ رہا تھا، کامل سکون تھا، جس میں دین کی تعلیم واشاعت، اور اخلاق وروحانیت کی تربیت وترقی کی کشتی پورے اطمینان کے ساتھ چلائی جاسکتی تھی، اور اس کو کسی تلاطم یا بھنور کا کوئی اندیشہ نہ تھا، اگر ایسا ہوتا تو "احیاء وتجدید دین" کے بجائے اس دور کے لئے "تعلیم وتربیت" اور "نشر واشاعت" کا عنوان زیادہ موزوں تھا، ہندوستان کے اسلام کے دینی و ثقافتی مرکز (حجاز مقدس اور مصر وشام وعراق) سے دور ہونے، اسلام کے یہاں ترکستان وایران کا چکر کاٹ کر پہونچنے، عربی زبان کے رائج نہ ہونے، اور خاص طور پر علم حدیث کی (جس سے دین کی صحیح روح، سنت وبدعت کا فرق، امر بالمعروف، نہی عن المنکر کی ضرورت کا احساس، اور صحیح دینی احتساب کی صلاحیت پیدا ہوتی ہے) عدم اشاعت، حج اور طلب علم کے لئے باہر کے ملکوں کے سفر کی دشواریوں، اور اسلام کے حلقہ بگوشوں کا غیر مسلم اکثریت سے گھرے رہنے نے (جو اپنے مذہب میں سخت راسخ الاعتقاد، غیر اسلامی رسم و رواج کی سختی سے پابند اور حد درجہ توہم پرست تھی) ہندوستان کے مسلمانوں کو انتشار پسند دعوتوں، گمراہ کن فرقوں اور طالع آزما مذہبی پیشہ وروں کی آسان چراگاہ بنا دیا تھا۔

اسی سلسلہ کی ایک کڑی تشیع کی وہ غالی اور جارحانہ شکل تھی، جو ایرانیوں کے اثر سے

جنوبی ہند کے بعض مقامات اور کشمیر میں پیدا ہوئی، دسویں صدی کے وسط میں احمد نگر کے والیٔ سلطنت برہان نظام شاہ نے شیخ طاہر بن رضی اسماعیلی قزوینی کے اثر سے (جو ایران سے شاہ اسماعیل صفوی کے خوف سے بھاگ کر احمد نگر آئے تھے) تشیع قبول کیا، اور اس میں بڑا مبالغہ کیا، یہاں تک کہ مساجد، خانقاہوں، بازاروں اور سڑکوں پر خلفاءِ ثلاثہ پر علی الاعلان تبرّا کرنے کا حکم دیا، اس خدمت کے انجام دینے والوں کے بڑے بڑے مشاہرے مقرر کئے، اہل سنت میں سے بہت سے ر ئوں کو قتل اور گرفتار کیا[1]، دوسری طرف میر شمس الدین عراقی کی کوشش سے کشمیر میں تشیع پھیلا، انھوں نے اپنے مذہب کی اشاعت میں بڑی سرگرمی دکھائی، کہتے ہیں کہ چونتیس [۳۴] ہزار ہندو شیعہ ہوگئے، یہ بھی کہا جاتا ہے کہ انھوں نے ایک جدید مذہب بھی ایجاد کیا جس کا نام نوربخشی تھا، اور فقہ میں ایک کتاب بھی تصنیف کی جس کے مسائل نہ تو اہلِ سنت کے مسائل سے اتفاق رکھتے ہیں، نہ فرقۂ امامیہ کے مسائل کے مطابق ہیں، یہ بھی کہا جاتا ہے کہ کشمیر میں ایک نئے فرقہ کی بنیاد پڑی جس کا اعتقاد تھا کہ سید محمد نوربخش مہدی موعود تھے[2]۔

سنہ ۹۵۰ھ میں فوجی مدد اور سلطنت ایران کی حمایت حاصل کرنے کے لئے ہمایوں عازم ایران ہوا، اس وقت ایران میں شاہ طہماسپ تخت نشین تھا، شاہ ایران نے ہمایوں سے مذہب تشیع قبول کرنے کی فرمائش کی، ہمایوں نے کہا کہ ایک پرچہ پر تمام معتقدات لکھ دیئے جائیں، بادشاہ نے بطریق نقل اس کو پڑھ دیا[3]، بادشاہ کے تبدیلی مذہب کی اگرچہ کوئی مستند شہادت نہیں ہے لیکن اس میں شبہہ نہیں کہ ایران کے قیام، شہنشاہ ایران کی فیاضانہ میزبانی و مسافر نوازی اور فراخدلانہ فوجی مدد سے ممنونیت و تشکر کے نتیجہ میں اس کے دل

---

[1] تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو "تاریخ فرشتہ" از محمد قاسم بیجاپوری (مصنف فرقۂ اثنا عشریہ سے تعلق رکھتا تھا)

[2] ملاحظہ ہو "تاریخ فرشتہ" از محمد قاسم بیجاپوری۔ [3] منتخب التواریخ حصۂ اول ص ۴۴۵

میں مذہب اثنا عشری کے لئے وہ نرم گوشہ ضرور پیدا ہو گیا ہو گا، جو اس کے راسخ الاعتقاد تیموری اسلاف کے دل میں (جو راسخ الاعتقاد سنی حنفی تھے، اور ان میں سے بعض کا بعض مشائخ نقشبندیہ سے ارادت کا تعلق بھی تھا) پایا نہیں جاتا تھا، ہمایوں کی مدد کے لئے ایران سے امرائے قزلباش آئے تھے، ہمایوں خود نیک دل، شائستہ و مہذب انسان تھا، ہر وقت باوضو رہتا تھا، اللہ رسول کا نام بغیر طہارت کے نہیں لیتا تھا، کتب خانہ کے زینے سے جہاں اذان سن کر بیٹھ گیا تھا، پھسل کر گرا، اور ۱۵ ربیع الاول ۹۶۳ھ کو وفات پائی۔

اس کے امرائے خاص، اور ارکان سلطنت میں بیرم خانخاناں بڑی خوبیوں اور کمالات کا امیر و سردار تھا، رقیق القلب، جمعہ و جماعت کا پابند، علماء و مشائخ کا قدردان تھا، لیکن تفضیلی تھا، اس کا مشہور شعر ہے ؎

شہے کہ بگذرد از نہ سپہر، افسرِ او
اگر غلامِ علی نیست، خاک بر سرِ او

میر شریف آملی علوم حکمت میں مہارت تامہ رکھتا تھا، وہ اکبر کے عہد میں ہندوستان آیا، اکبر نے اس کی بڑی پذیرائی کی، پہلے ۹۹۳ھ میں کابل، پھر ۹۹۹ھ میں بنگالہ کی صدارت کے عہدہ پر سرفراز کیا، اور اس کو اجمیر اور موہان میں جاگیر دی، "مآثر الامراء" کے مصنف خوافی خاں کے بیان کے مطابق وہ ملحدانہ خیالات رکھتا تھا، تصوف کو فلسفہ سے مخلوط کیا اور عینیت کا قائل تھا۔

ہندوستان میں دو تحریکیں سخت انتشار انگیز اور اسلامیت کے لئے خطرناک اور باعث تخریب تھیں، ان میں سے ایک ذکری عقیدہ اور فرقہ تھا جس کی بنیاد نبوت محمدی کے الفِ اول پر اختتام، اور الف ثانی سے ایک نئی نبوت اور ہدایت کے آغاز پر ہے،

یہ تحریک بلوچستان میں پھلی پھولی، لیکن وہ جس شخص کو پیغمبر مانتی ہے، اس کے بقول اس کا ظہور ۹۷۷ھ میں بمقام اٹک ہوا، اس فرقہ کی کتاب "ذکری کون ہیں؟" کا مصنف بانی فرقۂ ذکریہ ملا محمد کا ذکر کرتے ہوئے لکھتا ہے:۔

"آپ شب دوشنبہ بوقت بام (صبح) قطب شہر سے بطرف زمین بصورت انسانی ولباس فقیری اٹک کے پہاڑی علاقہ میں ایک اونچی پہاڑی پر ۹۷۷ھ میں قدم مبارک رکھ کر آشکار ہوئے[1]"

ذکری ملا محمد موصوف کو خاتم النبیین اور افضل الرسل، اور نور اولین وآخرین مانتے ہیں، موسیٰ نامہ قلمی میں ہے:۔

"حق تعالےٰ گفت اے موسیٰ بعد از مہدی پیغمبر دیگر نیا فریدم، ز اولین و آخرین ہمیں است کہ پیدا خواہم کرد[2]"

اس فرقہ کی کتابوں "معراج نامہ قلمی" "ثنائے مہدی" (مطبوعہ) "سفر نامہ مہدی" "ذکر الٰہی" وغیرہ میں ایسی صریح عبارتیں آئی ہیں، جن سے ملا محمد موصوف کی تنزیہ وتقدیس اور ان کے بارے میں ایسے مبالغہ آمیز عقائد کا اظہار ہوتا ہے، جن سے ان کی تمام انبیاء پر ترجیح اور آنحضرت صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم پر فضیلت، اور جرأت افترا وتخلیق، اور دجل وتلبیس کے عجیب نمونے ظاہر ہوتے ہیں، انھوں نے اپنا ایک مستقل کلمہ بھی وضع کیا تھا، جو "لا الٰہ الا اللہ نور پاک محمد مہدی رسول اللہ" تھا، نماز پڑھنے والوں کی تکفیر وتضحیک کرتے تھے[3] اسی طرح روزہ، حج، اور زکوٰۃ کے وہ منکر ہیں، بجائے حج بیت اللہ کے حج کوہ مراد کو ضروری سمجھتے تھے[4] تاریخ خوانین بلوچ میں ہے کہ بلوچستان کے کچھ

---

[1] "ذکری کون ہیں؟" ص۱۳ [2] ایضاً ص۱۱ [3] اعتقاد نامہ قلمی [4] ملاحظہ ہو ذکری مصنفین کی تصنیفات "ذکر توحید" (مطبوعہ) "میں ذکری ہوں" "تفسیر ذکر اللہ" (مطبوعہ) اور تصنیفات مذکورۃ الصدر، نیز ملاحظہ ہو بلوچستان ڈسٹرکٹ گزیٹیر جس میں اس کی صراحت کی گئی ہے کہ ان کے اور اہل سنت کے عقائد میں بنیادی اختلاف ہے (ص۱۱۶ مطبوعہ)

علاقوں میں ذکری جیسا خلاف اسلام مذہب جاری و ساری تھا، اور وہ لوگ مسلمانوں کو نمازی کہہ کر قابلِ گردن زدنی گردانتے تھے، میر نصیر خاں اعظم نے ایک طرف شرع محمدی کا نفاذ اور اجرا فرمایا اور دوسری طرف ذکریوں کی اسلام دشمنی اور شرک پروری کے خلاف خون آشام سلسلۂ جہاد جاری رکھا تا آنکہ بڑے بڑے خون ریز اور فیصلہ کن معرکوں کے بعد اس بدعت کی مکمل طور پر بیخ کنی کی گئی۔[1] الخ

ہندوستان میں دوسرا مشتبہ فرقہ فرقۂ روشنائیہ تھا، افغانوں کی زوال پذیر طاقت کو سہارا دینے اور مغلوں کے بڑھتے ہوئے اقتدار کو روکنے کے لئے فرقۂ روشنائیہ نے جو اہم کردار ادا کیا،[2] اس نے اس عہد کے مصنفین کے بیانات کو محلِ غور اور محتاجِ تحقیق بنا دیا ہے کہ ان میں سیاسی اغراض کہاں تک کارفرما ہیں، اور تاریخی حقیقت کتنی ہے؟ اس فرقہ کے معتقدوں اور حامیوں اور اس کے مخالفین کے بیانات میں اتنا تضاد ہے کہ ایک بانی فرقہ کو "پیرِ روشن" کے نام سے یاد کرتا ہے، اور دوسرا "پیرِ تاریک" کہتا ہے، اس فرقہ کے بانی بایزید انصاری تھے، جو پیر روشاں (یا روشن) بھی کہلاتے ہیں، ان کے والد کا نام عبداللہ تھا، جالندھر میں ۹۳۱ھ میں (بابر کی سلطنت سے ایک سال قبل) پیدا ہوئے، ان کا بچپن اور عنفوانِ شباب خاندانی کشمکش اور بزرگوں کی بے توجہی میں گزرا، اور اس کی وجہ سے تعلیم ادھوری رہ گئی، کسی سفر کے

---

[1] تاریخ بلوچ، اس مضمون میں رسالہ "الحق" (اکوڑہ خٹک) کے ۱۹۷۹ء کے شمارہ کے ایک مضمون سے استفادہ کیا گیا ہے، جو مولانا عبدالحق صاحب صدر مدرس دارالعلوم تربت بلوچستان کے قلم سے ہے، نیز ملاحظہ ہو ذکری مذہب کا تفصیلی جائزہ "الحق" جنوری ۱۹۸۰ء

[2] اس عہد میں تصوف کا جو اثر اور اس کی غیر معمولی مقبولیت تھی، اس کو دیکھتے ہوئے بعض دور اندیشوں اور حوصلہ مندوں کا یہ خیال مستبعد نہیں قرار دیا جا سکتا کہ اس کو پٹھانوں کی شیرازہ بندی کا ذریعہ بنا کر اور انھیں ایک مذہبی تحریک کے پرچم تلے جمع کر کے مغلیہ حکومت کے خلاف آمادۂ جنگ کیا جا سکتا ہے، اور اس سے افغانوں کے زائل شدہ اقتدار کو واپس لایا جا سکتا ہے۔

دوران (بعض روایات کے مطابق) ان کی ملاقات سلیمان اسماعیلی سے ہوئی، جوگیوں کی صحبت کا حاصل ہونا بھی بیان کیا جاتا ہے، ان کے تذکرہ نگاروں کے بیان کے مطابق انھیں خواب نظر آنے لگے اور عالم غیب سے آوازیں سنائی دینے لگیں، وہ ذکر خفی میں منہمک ہوگئے، اور کچھ عرصہ کے بعد اسم اعظم کے ورد میں ان کو استغراق ہوا، جب وہ اکتالیسویں برس کو پہونچے تو انھیں ہاتف نے ندا دی کہ اب انھیں طہارت شرعی کو ترک کر دینا چاہئے، اور مسلمانوں کی نماز کی جگہ انبیاء کی نماز پڑھنا چاہئے[1]، اس کے بعد وہ سب کو مشرک و منافق سمجھنے لگے، اور چلہ کشی شروع کر دی، اس کے بعد انھیں علانیہ طور پر تبلیغ کرنے کا حکم ملا، دعوائے مہدویت اور الہام ربانی کا بھی ان پر الزام ہے[2]، ان کے مریدوں کی تعداد میں روز افزوں ترقی ہونے لگی، انھوں نے بعض کو اپنا خلیفہ مقرر کیا، تاکہ وہ تبلیغ کے کام کو اور زیادہ وسیع کریں۔

لیکن ان کی تصنیف "صراط التوحید" میں ان کی جو تعلیمات آئی ہیں، وہ تصوف کی مائل بافراط تعلیمات اور غالی خود شناسی کا نتیجہ معلوم ہوتی ہیں، جو کسی شیخ کامل اور کتاب و سنت کے علم راسخ کے بغیر اکثر بطور خود ریاضت کرنے والوں میں پیدا ہو جاتی ہے، اور ان کے بعض اصول و عقائد بیان کئے گئے ہیں، وہ غالباً ان کے ضوابط جنگ ہیں، جو اس زمانہ سے متعلق ہیں، جب وہ مغلوں اور اپنے مخالف افغان قبائل سے برسرپیکار تھے۔

انھوں نے پشاور کے علاقہ میں متعدد افغانی قبائل کو اپنا معتقد و مرید بنا لیا، ہندیوں میں اپنا تبلیغی کام شروع کیا، سندھیوں اور بلوچیوں میں بھی ان کا اثر پھیلنا شروع ہوا، پیرو

---

[1] لیکن خود شیخ بایزید نے اپنی کتاب "مقصود المؤمنین" میں لکھا ہے کہ "شریعت درخت کی چھال کی مانند ہے، اور درخت کی بقا چھال کے بغیر ناممکن ہے" ص ۴۴ نسخہ قلمی کتب خانہ جامعہ پنجاب۔ [2] شیخ بایزید نے خود اس بات کی تردید کی ہے کہ وہ مہدی ہیں، جیسا کہ اس مباحثہ کی سرگذشت میں موجود ہے، جو ان کے اور کابل کے قاضی خاں کے درمیان ہوا تھا، نسخہ قلمی جامعہ پنجاب۔

اور علماء کی انتہائی مخالفت کے باوجود ان کو حیرت انگیز کامیابی ہوئی، شیخ بایزید نے اپنے داعی اور مبلغ ہمسایہ ممالک کے حکمرانوں، امراء و علماء کے پاس بھیجے، ان میں سے ایک شہنشاہ اکبر کے دربار میں بھی آیا، ان کی زندگی کے آخری ڈھائی سال مغلوں سے جنگ میں گزرے اور ۹۸۰ھ میں کالا پانی کے مقام پر ان کا انتقال ہوگیا، اور ہشت نگر میں دفن ہوئے، ان کی تصنیفات میں سے تین کتابیں (خیرالبیان، مقصود المؤمنین، صراط التوحید) موجود ہیں، جس میں انھوں نے اپنے بنا کردہ فرقہ کے اصول و عقائد کو بیان کیا ہے، ان میں سے "خیرالبیان" اور "مقصود المؤمنین" ان کے ماننے والوں کے نزدیک نیم مقدس کتابوں کا حکم رکھتی تھیں، ان کے سب سے بڑے مخالف اخوند درویزہ تھے، جو سید علی ترمذی المعروف بہ پیر بابا (م ۹۹۱ھ) کے مرید تھے، انھوں نے ان کی تردید میں کتاب "مخزن الاسلام" لکھی، "حال نامہ پیر دستگیر" (فارسی) شیخ بایزید کی خود نوشت سوانح حیات ہے، اس کو علی محمد مخلص نے اضافوں کے ساتھ مرتب کیا۔

اندرونی اور بیرونی جنگوں کی وجہ سے خستہ حال ہوکر نیز علماء کی شدید مخالفت کے باعث اور اس لئے بھی کہ وہ ہندوستان کے مختلف حصوں میں تتر بتر ہوگئے، اس فرقہ کے افراد کم ہوتے ہوتے بالآخر تقریباً ناپید ہوگئے۔[1]

"داستان ترکتازان ہند" کا مصنف مرزا نصر اللہ خاں فدائی دولت یار جنگ اس فرقہ کا تعارف کراتے ہوئے لکھتا ہے:۔

"روشنائی اس فرقہ کا نام ہے جس کی بایزید نامی ایک شخص نے جو اہل ہند میں سے تھا بنیاد ڈالی، اس نے افغانوں میں جاکر پیغمبری کا دعویٰ کیا، اور اپنے کو پیغمبر روشنائی کہلایا، اور ان کو اپنا پیرو

---

[1] مستفاد از مقالہ پروفیسر ڈاکٹر مولوی محمد شفیع صاحب مرحوم مشمولہ اردو دائرۂ معارف اسلامیہ جلد ۴۔

بنایا، انھوں نے آسمانی صحیفوں کو جواب دیا اور خدا کی عبادت ترک کی، اس کے اقوال سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ وحدۃ الوجود کا قائل تھا[۱] اور اس کا عقیدہ تھا کہ اس واجب الوجود کے سوا کسی کا وجود نہیں، پیغمبر عربی صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تعریف کرتا تھا، وہ لوگوں کو بشارت سناتا تھا کہ وہ دن قریب ہے کہ پورا کرۂ ارض ان کے زیر تصرف ہوگا۔

حالنامہ نوشتۂ بایزید سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کو الہام ہوتا تھا، اور جبریل ان پر نزول کرتے تھے، اللہ نے ان کو نبوت سے سرفراز کیا، وہ خود اپنے کو نبی سمجھتے تھے، نماز پڑھتے تھے، لیکن قبلہ کا تعین ضروری نہیں سمجھتے تھے "فأینما تولوا فثمّ وجہ اللہ" سے استدلال کرتے تھے، پانی سے غسل کرنے کی ضرورت نہیں سمجھتے تھے، اپنے مخالفین کا قتل جائز سمجھتے تھے"[۲]

مصنف نے اس سلسلہ میں ان کے بعض ایسے اقوال بھی نقل کئے ہیں، جو عارفانہ اور متصوفانہ ہیں، اور جن میں کوئی قدح نہیں کی جاسکتی، لیکن اسی کے ساتھ خلاف اسلام خیالات بھی ہیں:۔

"ان کے یہاں خود شناسی وخدا شناسی سب سے اہم چیز تھی، اگر ہندو کو خود شناس دیکھتے تو مسلمان پر ترجیح دیتے، مسلمانوں سے جزیہ لیتے، خمس بیت المال میں داخل کرتے اور اہل حاجت پر تقسیم کرتے، ان کے سب فرزند فسق وفجور سے مجتنب، اور ظلم وستم سے بہت دور تھے، عربی، فارسی، ہندی، اور پشتو میں ان کی متعدد تصانیف ہیں، ان کی ایک کتاب "خیر البیان" ہے، جو چار زبانوں میں ہے، اور وہ حق تعالیٰ کا براہ راست ان کو خطاب اور ان کے عقیدہ میں آسمانی کتاب ہے"[۳]

۱؎ اس عہد میں یہ کوئی نئی بات نہ تھی، صوفیا ومشائخ کی اکثریت (کم سے کم ہندوستان میں) اس عقیدہ میں غلو رکھتی تھی۔ (مصنف) ۲؎ ص ۳۰۴-۳۰۵ ۳؎ منقول از حالنامہ بایزید در دبستان مذاہب ملا محسن خانی ص ۳۰۶-۳۰۹۔

معاصر تاریخوں سے معلوم ہوتا ہے کہ پیر بایزید نے افغانوں کی ایک بڑی طاقت مہیا کر لی تھی، اور کوہ سلیمان کو مستقر بنا کر درۂ خیبر پر بھی قبضہ کر لیا تھا، اور پاس پڑوس پر بھی حملہ کرنے لگے تھے، اس فتنہ کی سرکوبی کے لئے اکبر نے ایک فوج بھیجی لیکن وہ اس کا استیصال نہ کر سکی بایزید کے انتقال کے بعد اس کے فرزند اور جانشین سلطنت مغلیہ کے لئے خطرہ بنے رہے، راجہ مان سنگھ، بیربل اور زین خاں بھی ان کے مقابلہ میں کامیاب نہیں ہوئے، اور بیربل تو ایک مقابلہ میں مارا گیا، مان سنگھ ۹۹۵ھ کے حملہ میں بھی روشنائیوں کے مقابلہ میں ناکام رہا، یہ فتنہ شاہجہاں کے عہد ۱۰۵۰ھ میں ختم ہوا[1]۔

مہدویت

اس عہد کی سب سے زلزلہ انگیز تحریک، تحریک مہدویت تھی، جس کے بانی سید محمد (ابن یوسف) جونپوری (ولادت ۸۴۷ھ) کی وفات اگرچہ دسویں صدی کی ابتدا (۹۱۰ھ) میں ہو گئی تھی، لیکن اس کے اثرات دسویں صدی کے اخیر تک باقی رہے، غیر جانب دارانہ تاریخی مطالعہ کی روشنی میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ دو تین صدیوں کے اندر کوئی دینی دعوت اور تحریک اس تحتی بر اعظم (بشمول افغانستان) میں اتنے وسیع پیمانہ، اور اتنے گہرے اور طاقتور طریقہ پر مسلم معاشرہ پر اثر انداز نہیں ہوئی جتنی کہ یہ دعوت و تحریک، موافقت و مخالفت میں معاصر اور بعد کے مؤرخین و مصنفین نے جو کچھ لکھا ہے، اس کے مطالعہ سے ہم ان نتائج تک پہونچتے ہیں :-

(۱) سید محمد جونپوری باطنی اور خلقی طور پر ان عالی استعداد اور قوی الباطن لوگوں

---

[1] ملخص از داستان ترکتازان ہند۔

میں تھے، جو زمانۂ دراز کے بعد پیدا ہوتے ہیں، وہ عنفوانِ شباب ہی میں بڑے جری و شجاع، اپنے ماحول اور دَور کے حالات سے غیر مطمئن، بے محابا امر بالمعروف نہی عن المنکر، اور منکراتِ شرعی پر زجر و توبیخ کرنے والے تھے، اور اسی وجہ سے اسی زمانہ میں ان کو اسد العلماء کا خطاب دیا گیا تھا، سلوک کی تعلیم شیخ دانیال[1] سے حاصل کی، اور شدید ریاضت و مجاہدہ کیا، پہاڑوں اور وادیوں میں عرصہ تک گوشہ نشینی اختیار کی، جس کا اکثر نتیجہ (بالخصوص جب شیخ کامل کی نگرانی اور رہنمائی حاصل نہ ہو) ایسے واردات و اشارات ہوتے ہیں، جن سے لغزش کا اندیشہ، اور بعض اوقات غلط الیقین کا حصول ہوتا ہے، اور ایسا شخص جو مقامِ تحقیق و رسوخ کو نہ پہونچا ہو، الفاظ کو غلط محمل پر حمل، اور اشاراتِ غیبی کو غلط معنی میں سمجھ سکتا ہے، چنانچہ انھوں نے اسی دوران کسی سفر میں مہدی ہونے کا دعویٰ کیا، اس کے بعد بھی متعدد بار مختلف مقامات پر اپنے "مہدیِ موعود" ہونے کا اعلان کیا، اور اس پر ایمان لانے کی دعوت دی۔

(۲) وہ کثرتِ ریاضت، قوتِ باطنی اور جذبۂ امر بالمعروف کی وجہ سے اعلیٰ درجہ کے صاحبِ تاثیر تھے، ان کی شخصیت و صحبت، ان کی گفتگو اور بیان سامعین و حاضرین پر جادو کا اثر رکھتا تھا، اور سلاطین و امراء سے لے کر عوام و خواص تک سب پر بےخودی، اور خود فراموشی طاری ہو جاتی تھی، اور ان کے لئے بڑے سے بڑے منصبوں اور جاہ و حشمت کو خیرباد کہہ کے، ترکِ دنیا اور ترکِ وطن کر کے ان کے ہم رکاب ہو جانا، اور اپنے کو ان کے حوالہ کر دینا آسان ہو جاتا تھا، دار الحکومت مانڈو میں یہی غیاث الدین شاہ خلجی کے ساتھ پیش آیا، اور یہی جانپانیر گجرات میں محمود شاہ گجراتی پر اثر ہوا، یہی احمد نگر، احمد آباد، بیدر

---

[1] افسوس ہے کہ کتب تراجم و تذکرہ میں ان کے حالات نہیں ملتے۔

اور گلبرگہ میں دیکھنے میں آیا، ایک خلقت نے ان کے ہاتھ میں ہاتھ دے دیا، اور ہزاروں آدمی ان کے قافلہ میں شامل ہوگئے، سندھ کے علاقہ میں بھی ایک شہر آشوب کا منظر نظر آیا، اور لوگوں کو تھامنا مشکل ہوگیا، قندھار میں بھی ان کے بیان نے قیامت برپا کردی، اور حاکم قندھار مرزا شاہ بیگ کا ان کی طرف میلان ہوگیا۔

(۳) ان کی زندگی ترک و تجرید، زہد و استغناء، قطع ماسوی اللہ کی زندگی تھی، اور سفر و حضر میں ان کے "دائرہ" میں اسی زہد و ایثار، اور ذکر و عبادت کی فضا نظر آتی تھی، کھانا اور ہر چیز برابر برابر کسی کی خصوصیت کا لحاظ کئے بغیر تقسیم ہوتی تھی، اور اس میں خود ان کی اور ان کے گھر کے افراد کی رعایت نہیں ہوتی تھی، اس فضا سے کوئی نووارد متاثر ہوئے بغیر نہیں رہتا تھا۔

(۴) اس دعوت نے متعدد ایسے بے لوث، سرفروش و خود فراموش داعی پیدا کردیئے تھے، جنھوں نے "کلمۃ حق عند سلطان جائر" کا فریضہ بڑی شجاعت اور قوت کے ساتھ ادا کیا، امر بالمعروف نہی عن المنکر کے سلسلہ میں سخت اذیتیں برداشت کیں، اور اس راہ میں ہنسی خوشی جان دی، انسان ان کے حالات پڑھ کر متاثر ہوئے اور سید محمد جونپوری کی تربیت اور صحبت کی تاثیر کا اعتراف کئے بغیر نہیں رہ سکتا۔

مثال کے طور پر شیخ علا ابن حسن البیانوی (شیخ علائی) (م ۹۵۷ھ) کے حالات ملاحظہ ہوں، جنھوں نے سلطان سلیم شاہ ابن شیر شاہ سوری کے دربار میں دعوت و تذکیر کا فرض انجام دیا، اور آداب شاہی اور کورنش کے بجائے سلام مسنون پر اکتفا کیا، اور دوسری مرتبہ سفر کی خستگی، اور طاعون کی بیماری کی حالت میں کوڑے کھائے، اور اس سے جانبر نہ ہونے پر ان کا جسم ہاتھی کے پاؤں سے باندھ دیا گیا، اور لشکر میں اس کو پھرایا گیا۔[1]

---

[1] تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو ترجمہ شیخ علا ابن حسن البیانوی "نزہۃ الخواطر" جلد ۴، یا منتخب التواریخ از ملا عبدالقادر بدایونی،
(باقی ص ۵۵ پر)

(۵) ان کی دعوت کے پانچ ارکان تھے (۱) ترکِ دنیا (۲) عزلت عن الخلق (۳) ہجرت عن الوطن (۴) صحبت صدیقین (۵) دوام ذکر (حفظ انفاس کے طریقہ پر) وہ مشاہدہ الٰہی کو (خواہ وہ بچشم سر ہو یا بطریق قلب، بیداری میں ہو یا خواب میں) ضروری اور شرط ایمان قرار دیتے تھے۔

(۶) حالت سُکر میں، یا مفہوم و مراد صحیح طور پر نہ سمجھنے کی بنا پر ان سے اپنی ذات کے متعلق متعدد بار اور صریح طریقہ پر ایسے اقوال اور دعاوی صادر ہوئے[۱] جن کی تاویل و توجیہ مشکل ہے اور جنھوں نے ان کے متبعین کو (ابتدا میں ان کی نیت کتنی ہی صحیح اور ان کا جذبۂ دینی کتنا ہی قابل قدر ہو) آسانی کے ساتھ ایک مخالف جمہور، اور مخالف اہل سنت فرقہ کی شکل دے دی، جس نے ان اقوال کا سہارا لیا، اور ان پر اپنے عقیدہ کی بنیاد رکھی، بعد کے آنے والوں اور غالی معتقدین نے (جیسا کہ قاعدہ ہے) ان میں اور اضافہ کیا، اور ان کی تقدیس و تعظیم میں اتنا غلو سے کام لیا کہ ان کو انبیاء کا ہمسر اور بعض سے افضل و برتر بنا دیا اور بعض بعض انتہا پسندوں اور غالیوں نے رسول اللہ صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم سے بھی ہمسری و مساوات کے عقیدہ تک پہونچا دیا (اگرچہ سید محمد ان کے نزدیک بھی آپ کے پیرو اور دینِ محمدی کے تابع تھے) اور بعض نے یہاں تک غلو کیا، کہ "اگر کتاب و سنت ان کے کسی قول و فعل کے مخالف ہوں تو کتاب و سنت کا اعتبار نہیں" اسی طرح سے اس بارے میں بھی بہت غلو کیا گیا کہ جو مسلمان انوارِ الٰہی کا مشاہدہ اپنی آنکھ یا دل سے سوتے یا جاگتے

(باقی ص۵۴ کا) مولانا ابوالکلام آزاد نے اپنے مخصوص ادبی انداز میں شیخ علائیؒ کی شہادت کی دل دوز داستان مفصل و موثر طریقہ پر بیان کی ہے (ملاحظہ ہو "تذکرہ" ص۵۳ تا ۶۱)

[۱] اور ایسے اقوال بہت سے غالی صوفیوں، اور شدید ریاضت کرنے والے عابدوں سے منقول ہیں۔

کبھی نہ کرے وہ مومن نہیں ہے، عام مسلمانوں اور اس فرقے کے درمیان یہ خلیج مرورِ زمانہ سے وسیع سے وسیع تر ہوتی چلی گئی، یہاں تک کہ مہدوی ایک الگ فرقہ بن کر اہل سنت والجماعت سے کٹ گئے، اور وہ مقاصد فوت ہو گئے جن کے لئے یہ تحریک شروع ہوئی تھی، اور جو غالباً اس تحریک کے بانی کے پیش نظر تھے۔

دسویں صدی کے وسط تک اس جماعت کے اثرات ہندوستان اور افغانستان پر قائم رہے، اور دکن میں اس کے پیروؤں کی کئی سلطنتیں قائم ہوئیں، دسویں صدی کے آخر میں مہدویوں کی طاقت اور تعداد میں جو اضافہ ہو چکا تھا، اس کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ اسماعیل نظام شاہ بن برہان نظام شاہ ثانی کے زمانۂ حکومت (۹۹۶ - ۹۹۸ھ) میں جمال خاں مہدوی نے جو منصب داران صدہ میں سے تھا، احمد نگر میں مہمات شاہی کی باگ اپنے ہاتھ میں لی، اسماعیل نظام شاہ کو بھی (جو خوردسال تھا) اپنے مذہب میں لے آیا، تھوڑے زمانہ میں ہندوستان کے اطراف و جوانب سے طائفہ مہدویہ جمع ہو گیا، جمال خاں کے گرد و پیش دس ہزار کے قریب مہدوی جمع ہو گئے، اور اس نے احمد نگر کی سلطنت پر پورا تسلط حاصل کر لیا، جب برہان نظام شاہ جو باہر چلا گیا تھا، احمد نگر ۹۹۸ھ میں واپس ہوا تو اس نے مذہب مہدویہ کو جس کا رواج ہو گیا تھا، خارج کیا، اور سابق کی طرح مذہب اثنا عشری نے رواج پایا۔[1]

دسویں صدی کے اخیر میں مہدویت کی تحریک میں نمایاں ضعف پیدا ہوا، اس دعوت اور سید محمد جونپوری کے دعاوی اور زیادہ تر ان کے غالی معتقدین کے تشدد سے عقائد میں ایک تزلزل اور مسلم معاشرہ میں ایک انتشار اور اضطراب پیدا ہو رہا تھا، اس سے

[1] ملخص از تاریخ ہندوستان جلد چہارم از مولوی ذکاء اللہ صاحب دہلوی۔

اس عہد کے علماء راسخین جو کتاب و سنت پر گہری نظر اور علوم دینیہ میں رسوخ تام رکھتے تھے، پریشان اور فکر مند تھے، اور وہ اس کو ایک بڑی ضلالت اور فتنہ کا پیش خیمہ سمجھنے لگے تھے، چنانچہ اس عہد کے سب سے بڑے عالم حدیث و سنت علامہ محمد طاہر پٹنی (۹۱۳ھ بہ ۹۸۶ھ) مصنف "مجمع بحار الانوار" نے اس کی تردید اور انسداد کا بیڑا اٹھایا، اور یہ عہد کیا کہ جب تک اس بدعت کا (جس کے اثر میں پورا گجرات آگیا تھا) خاتمہ نہیں ہو جائے گا، وہ اس وقت تک پگڑی نہیں باندھیں گے، اکبر نے ۹۸۰ھ میں جب گجرات فتح کیا، اور علامہ محمد طاہر کی ملاقات ہوئی تو اپنے ہاتھ سے ان کے دستار باندھی، اور کہا کہ "دین کی وہ نصرت و حمایت، اور اس نئے فرقہ کا استئصال (جس کا آپ نے بیڑا اٹھایا تھا) میرے ذمہ ہے" اس نے مرزا عزیز الدین کو (جو اس کا رضاعی بھائی تھا) گجرات کا حاکم مقرر کیا، اور اس نے اس کام میں ان کی مدد کی، اور اس کے زمانہ میں ان کا زور کم ہو گیا، لیکن جب مرزا عزیز اپنے اس منصب سے سبکدوش ہوا، اور اس کی جگہ پر عبدالرحیم خانخاناں کو گجرات کی عملداری ملی تو مہدویوں کو پھر طاقت حاصل ہو گئی، اور وہ میدان میں آگئے، پھر علامہ محمد طاہر نے پگڑی اتار دی اور دارالحکومت کا قصد کیا، لیکن ان کے پیچھے پیچھے مہدویوں کی ایک جماعت بھی روانہ ہوئی، اور اُجّین پہونچتے پہونچتے ان کو شہید کر دیا۔[۱]

بے چینی اور انتشار خیال کے اسباب

تاریخ و فلسفۂ تاریخ کا مطالعہ بتاتا ہے کہ یہ ذہنی بے چینی، ردعمل کی جارحانہ تحریکیں، اور انتشار خیال پیدا ہونے کے قوی اسباب و محرکات عام طور پر حسب ذیل ہوا کرتے ہیں۔

---

[۱] "نزہۃ الخواطر" جلد ۴

(۱) معاشرہ کے قول و عمل اور عقیدہ و زندگی میں عدم مطابقت اور تضاد، جو بیچین اور ذکی الحس طبیعتوں میں شدید بے اطمینانی پیدا کرتا ہے، اور وہ ایک خاص مرحلہ پر پہونچ کر باغیانہ دعوتوں اور تحریکوں میں پناہ لیتی ہیں، اور اگر وہ خود کوئی تحریک نہیں پیدا کرسکتی ہیں، تو تشکک وارتیاب کا شکار ہوجاتی ہیں، عام طور پر یہ تحریکیں بہت جلد غلو اور انتہا پسندی اختیار کرلیتی ہیں، اور خود اس فاسد اور کمزور معاشرہ سے زیادہ دینی حیثیت سے گمراہ، سیاسی حیثیت سے خطرناک، اور معاشرہ کے لئے انتشار انگیز بن جاتی ہیں۔

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ دسویں صدی میں مال و دولت کی فراوانی، عہدوں اور منصبوں کی طمع اور ان میں مسابقت کے جذبہ نے یہ تضاد پیدا کردیا تھا، اور دنیا داروں اور دنیا پرستوں کا ایک بڑا گروہ پیدا ہوگیا تھا، جو دینی اور اخلاقی تعلیمات و اصول کو بالائے طاق رکھ کر حصول جاہ و منصب، یا لذت و تمتّع کے لئے ہر طرح کی بے عنوانی اور بے راہ روی اختیار کرنے لگا تھا، یہ طبقہ عام طور پر ایسے زمانہ میں پیدا ہوتا ہے، جب وسیع اور مستحکم سلطنتیں قائم ہوجاتی ہیں، اور امن و استقرار کا دور آتا ہے، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ سوری خاندان کی حکومت کے آخری دور اور مغلیہ سلطنت کے قیام کے بعد ہندوستانی معاشرہ میں یہی کیفیت نمایاں ہوگئی تھی، اور بہت سے خلاف اسلام اور خلاف شریعت اعمال و رسوم اور آئین جاری ہوگئے تھے[۱] سلطنت اموی اور سلطنت عباسی میں بھی یہ طبقہ نمایاں طور پر ظاہر ہوا تھا، اور اسی کو پہلی صدی ہجری کے آخر کے سب سے بڑے مصلح و داعی حضرت حسن بصری (م ۱۱۰ھ) "منافقین"

---

[۱] تاریخ سے معلوم ہوتا ہے کہ سلطان سلیم شاہ (یا اسلام شاہ) کے زمانۂ حکومت میں ہر ولایت (یا سرکار) کے مستقر پر جمعہ کے دن تمام شاہی عہدیدار امراء جمع ہوتے تھے، اور ایک بلند شامیانہ میں کرسی پر سلطان سلیم شاہ کی جوتی رکھ کر اس کے روبرو سر جھکاتے تھے، اور مجموعۂ قوانین شاہی پڑھا جاتا تھا۔ (تاریخ ہند سید ہاشمی فرید آبادی جلد سوم صفحہ ۴۲)

کے لقب سے یاد کرتے ہیں۔

(۲) سلاطین وحکام کا استبداد، ان کی مطلق العنانی، جبر و تعدی، احکام شریعت سے چشم پوشی، اور کھلی ہوئی نفس پرستی، جو دینی حوصلہ مندوں کو انقلابی تحریک اور بغاوت پر آمادہ کر دیتی ہے۔

(۳) رسمیت اور ظاہر پرستی جب اپنی انتہا کو پہونچ جاتی ہے، معاشرہ اخلاقی و ذہنی انحطاط اور علمی حلقے سخت ترین جمود کا شکار ہو جاتے ہیں[1] اور نظام تعلیم بے روح، حقیقت پسندی سے دور، اور ذہنی طبیعتوں کو تسکین و تسلی دینے کی صلاحیت سے محروم ہو جاتا ہے، تو لوگ ایسی تحریکوں میں اپنے ذہن کی تسکین کا سامان پاتے ہیں (جو غلط یا صحیح طریقہ پر) اس محدود دائرہ سے باہر قدم نکالتی ہیں، کتاب وسنت کی تعلیم سے غفلت اور حدیث سے ناواقفیت بھی اس کا ایک اہم سبب اور قوی محرک ہے، جس سے ہر دور میں دین کا صحیح مزاج پیدا ہوتا ہے، اور جس سے اس کا صحیح اندازہ ہوتا ہے کہ امت کے فہم و عمل میں اصل دین

لہ پروفیسر خلیق احمد نظامی نے اس عہد کی تصویر کھینچتے ہوئے اور مرض کی صحیح تشخیص کرتے ہوئے صحیح لکھا ہے کہ :-

"مسلمانوں کی عام سماجی اور اخلاقی حالت تیزی کے ساتھ زوال پذیر ہو رہی تھی، افسانۂ شاہان اور تاریخ داؤدی میں جن قصوں کو عجائب روزگار بنا کر پیش کیا گیا ہے، وہ اخلاقی پستی اور اعتقاد کی زبوں حالی کے آئینہ دار ہیں، فقیروں کی عیاشانہ زندگی، طالب علموں کی بے راہ روی، تعویذ گنڈوں میں بے جا اعتقاد، جنوں اور دیووں کے قصے، چراغ سلیماں کی داستانیں کسی مضبوط معاشرہ یا محکم اخلاقی نظام میں اس طرح عام نہیں ہو سکتی تھیں، حقیقت میں مہدوی تحریک اسی ذہنی انحطاط اور مذہبی جمود کو دور کرانے کی ایک کوشش تھی"

("سلاطین دہلی کے مذہبی رجحانات" صا۴۵)

اسوۂ رسول اور طریقۂ صحابہ و تابعین سے کتنا بُعد اور انحراف پیدا ہوگیا۔

(۴) کسی ایسی دینی شخصیت کا فقدان جو ذہنی و باطنی دونوں حیثیتوں سے عام سطح سے بلند، طاقتور و دلآویز شخصیت اور مؤثر و طاقتور روحانیت کی مالک ہو، اور جو ذہن کی بے چینی، روح کی بیتابی کو دور، اور معاشرہ کے تنِ مردہ میں ایک نئی روح پھونک سکے، اور اسلام کی ابدیت، شریعت محمدی کی صداقت اور کمال و ترقی کے وسیع امکانات پر نیا یقین و اعتماد پیدا کر سکے۔

دسویں صدی کی تاریخ کے مطالعہ سے، (تراجم و تذکرے کی کتابوں، اور حوادث و واقعات کی روئیدادوں کی مدد سے) معلوم ہوتا ہے کہ کم سے کم ہندوستان میں اس بے چینی اور انتشارِ خیال کے یہ قدرتی اسباب پچھلی صدیوں کے مقابلہ میں بڑھ گئے تھے، اور اسی کا نتیجہ تھا کہ ذہنی بے چینی، اور انتشار انگیز تحریکیں اس صدی میں زیادہ نمایاں نظر آتی ہیں۔

دسویں صدی کا فتنۂ کبریٰ

"الف ثانی" سے ایک نئے نظام عالم کے آغاز کا مغالطہ

الف ثانی کا مغالطہ

دسویں صدی ہجری اس لحاظ سے بڑی اہمیت رکھتی ہے کہ اس کے اختتام پر اسلامی تقویم کے ایک ہزار سال کی تکمیل اور دوسرے ہزار سال (الف ثانی) کا آغاز ہوتا ہے، عام حالات میں یہ تبدیلی کوئی اہمیت نہیں رکھتی، دنیا کی طویل عمر، اور حیات انسانی کی وسیع تقویم میں جس طرح ہر صدی پر ایک ورق الٹتا ہے، ایک ہزار سال پر بھی گیارہویں صدی کا نیا ورق الٹنے والا تھا، لیکن جب ذہنوں میں شدید قسم کا انتشار، عقائد میں عظیم تزلزل، دین کی صحیح تعلیم اور کتاب و سنت کے علم سے نہ صرف غفلت وجہالت بلکہ وحشت ونفرت ہو، اہلِ یونان کے علوم کو عقلِ انسانی کی آخری منزل قرار دیا جائے، اور انھیں کا نام "حکمت" "علوم دانشمندی" اور انسانی علوم وکمالات کے وسیع آفاق میں "الافق المبین"[1] قرار دیا جائے، بات کا بتنگڑ بنا لینا، اور رائی کا پربت کھڑا کر لینا، نظام تعلیم، نصابِ درس اور علمی حلقوں کا کمال سمجھا جائے، علوم نبوت، صحف آسمانی، وحی وتنزیل اور نصوص قرآنی کی تضحیک وتحقیر کی جائے، اور ان پر ایمان لانے کو

---

[1] ملا باقر داماد کی کتاب "الافق المبین" کی تلمیح۔

جہل، کورانہ تقلید، اور عقل دشمنی کا مرادف قرار دیا جائے، پھر اس کے ساتھ اس وقت کی حکومتوں اور سیاسی نظاموں سے (جو غلط اور صحیح طریقہ پر مذہب کا سہارا لیتے تھے، اور اس کو اپنے اقتدار کا پشت پناہ سمجھتے تھے) بیزاری بھی بغاوت و اشتعال کی حد تک پہونچ گئی ہو، پھر سونے پر سہاگہ جب ایسے حوصلہ مند اور طالع آزما افراد پیدا ہو جائیں، جو ذہانت اور اس وقت کے علم و حکمت سے مسلح بھی ہوں، اور وہ نئے دور کا بانی و رہنما، اور احترام و اقتدار کا مالک ہونے کے سہانے خواب بھی دیکھنے لگیں، اور ان کے دل و دماغ میں یہ تمنا کروٹیں لینے لگے، کہ ماہ و سال کی گردش سے وہ بھی وہی فائدہ اٹھائیں جو پچھلے پیشوایانِ مذاہب نے (ان کے بقول) اٹھایا، اور ان کی تحریک و دعوت سے قوموں اور ملکوں کی تاریخ میں ایک نئی تقویم کا آغاز ہوا، جس کی ان کے خیال میں سب سے کامیاب اور مکمل شکل اس عہد کا آغاز تھا، جو بعثت محمدی اور ظہور اسلام سے عرب میں شروع ہوتا ہے اور ساری دنیا کو اپنے سایہ میں لے لیتا ہے، ان کے نزدیک اس دین کی تاریخ اور دنیا کی تقویم میں الف اول کا ختم ہونا اور الف ثانی کا شروع ہونا ایک اہم حادثہ اور ایسا زرّیں موقعہ ہے، جو جلد جلد اور بار بار ہاتھ نہیں آتا، اور اگر اس کو گنوا دیا جائے گا تو پھر ایک ہزار سال کا انتظار کرنا پڑے گا، اس لئے اس موقعہ کو کسی طرح سے جانے نہیں دینا چاہیئے، ورنہ صدیوں کفِ افسوس ملنا پڑے گا۔

دسویں صدی کے نصف آخر میں ہمیں عالمِ اسلام کے مختلف حصوں میں اور خاص طور پر اس کے سب سے بے چین، طباع، اور تخلیقی و اختراعی صلاحیت رکھنے والے خطہ ایران میں (جس کو بہت سی مماثلتوں کی بنا پر مشرق کا یونان کہنا صحیح ہوگا) اس خیال کے عکس نظر آتے ہیں، ظہور اسلام کے بعد یہ پہلا موقعہ تھا کہ ایک ہزار سال پورے ہو رہے تھے، اور دوسرا ہزار شروع ہونے کو جا رہا تھا، ہر صدی کے سرے پر مجدّد کا ظاہر ہونا، حدیث سے ثابت ہوتا ہے، اور

تاریخ بھی اس کا ثبوت فراہم کرتی ہے، اس لئے بعض ذہین لوگ دوسرے ہزار سال کے شروع ہونے پر مجدد سے زیادہ دینِ جدید کے موسس اور عالم کے نئے دور کے فاتح کے ظہور کے خواب دیکھنے لگے تھے، اور ان میں بہت سے منچلے لوگوں نے اپنا نام اس منصب کے امیدواروں کی فہرست میں لکھانے کی کوشش بھی شروع کر دی تھی، افسوس ہے کہ اس دور کی کوئی ذہنی و فکری تاریخ مرتب نہیں کی گئی، جس میں اس عہد کے قلب و دماغ، جذبات و خیالات، تمناؤں اور آرزوؤں کی پرچھائیاں نظر آئیں، پہلے اور پچھلے دوروں کی طرح سب تاریخیں "سرکار دربار" کے گرد گھومتی ہیں، اور ان میں زیادہ تر انقلابات سلطنت، فتح و ہزیمت، بادشاہوں کی داد و دہش، اہلکاران سلطنت کے عزل و نصب، اور امراء کے عیش و عشرت کی داستانیں، اور رزم و بزم کے افسانے ملتے ہیں، اگر دسویں صدی کے عالم اسلام کی کوئی فکری تاریخ ہوتی تو ہمیں صاف نظر آتا کہ الف ثانی کے قرب نے کتنے دلوں میں تمنائے خام کے چراغ روشن کر دیئے تھے، اور انھوں نے ایک نئی مسندِ پیشوائی اور ایک نئی سیادت و قیادت کا خیمہ نصب کرنے کے لئے چوب اور طنابیں مہیا کرنی شروع کر دی تھیں۔

صفوی حکومت کے قیام کے بعد جس نے شیعیت کو حکومت کی طاقت اور اقبال سے سارے ایران کا مذہب بنا دیا تھا، اور اگرچہ اس سلطنت کے بانیوں کے مورث اعلیٰ شیخ صفی الدین مسلکاً و ذوقاً صوفی تھے، لیکن شیعیت کو چونکہ تصوف سے بیر ہے، اس کے دور اقتدار میں اس ایران میں جس نے امام غزالی طوسی، شیخ فریدالدین عطار نیشاپوری، مولانا جلال الدین رومی[1]، اور مولانا عبدالرحمٰن جامی جیسے عارف و محقق پیدا کئے تھے، اور جس سے بغداد و دہلی و اجمیر کو پیران پیر سیدنا عبدالقادر جیلانی، شیخ الشیوخ شیخ شہاب الدین سہروردی، خواجۂ بزرگ شیخ معین الدین چشتی، اور شہید عشق خواجہ قطب الدین بختیار کعکی اوشی میسر آئے تھے، تصوف کا چراغ بالکل گل ہو گیا، دوسری طرف کتاب و سنت کا

---

[1] آپ اصلاً بلخ واقع خراسان کے رہنے والے تھے، حال واقع ملک افغانستان۔

وہ علم اور فنِ حدیث جس کا ایران بڑا مرکز رہ چکا تھا، اور جس نے تاریخ اسلام کو مسلم بن الحجاج القشیری نیشاپوری، ابو عیسیٰ ترمذی، ابو داؤد سجستانی، ابن ماجہ قزوینی اور حافظ ابو عبدالرحمٰن نسائی جیسے امام حدیث اور مصنفین صحاح عطا کئے، وہ اب کتاب و سنت اور علم حدیث سے بالکل بیگانہ اور تہی دامن تھا، اب اس کے علم کا تمام تر سرمایہ اور اس کے امتیاز و تفوق کا میدان یونانی علوم و حکمت (فلسفہ و منطق) تھے، اس انقلاب نے جس نے نبی عربیؐ کے صحابۂ کرام، اور ان کی سنت و احادیث سے اس مردم خیز اسلامی ملک کا رشتہ پہلے ہی کاٹ دیا تھا، ملک کے ذہین اور طباع طبقہ کا رابطہ نبوت محمدی، عقیدۂ ختم نبوت اور دین اسلام کے خلود و بقاء کے عقیدہ سے اگر منقطع نہیں کیا تو کمزور ضرور کر دیا، اور اگر اہلِ بیت کرام سے (تشیعیت کی بنیاد پر) عقیدت و نسبت نہ ہوتی تو اس ملک کا مجوسیت، ماقبل اسلام کی تہذیب اور شاہنامۂ فردوسی کے رستم و اسفندیار کے دور کی طرف واپس چلے جانے کا خطرہ تھا۔

ایسی حالت میں نویں اور دسویں صدی کے ایران میں انتشار انگیز تحریکوں، اور اسلام کے خلاف عقلی و فلسفی سازشوں کا پیدا ہونا خلاف قیاس اور خلاف توقع نہیں، جس کی سب سے ترقی یافتہ مثال نویں صدی کے اخیر اور دسویں صدی کے ابتدا کی نقطوی تحریک ہے، جو ایران کی اس بے چین روح کا بہترین مظہر ہے، جس نے کبھی مزدک کی شکل میں کبھی مانی کے روپ میں، اور کبھی حسن بن صبّاح کے لباس میں ظہور کیا تھا، اور جو خالصاً ایک ملحدانہ تحریک ہے، بقول اسکندر منشی کے :-

آں طائفہ بمذہب حکماء عالم را قدیم	یہ فرقہ حکماء کے مذہب کے مطابق
شمردہ اند، و اصلاً اعتقاد بحشر اجساد و	عالم کو قدیم مانتا ہے، اجسام انسانی
قیامت ندارند، و مکافات حسن و قبح	کے دوبارہ زندہ ہونے اور حشر و نشر کا

اعمال را در عافیت و مذلت دنیا قرار دادہ، بہشت و دوزخ ہمانرامی شمارند[1]۔

مطلق عقیدہ نہیں رکھتا، اعمال کے حُسن و قُبح کی جزا و سزا کو دنیا کی راحت و ذلت کی شکل میں اسی کو بہشت و دوزخ سمجھتا ہے۔

شاہ نواز خاں ان کے متعلق لکھتا ہے:۔

علم نقطۂ الحاد و زندقہ و اباحت و توسیع مشرب است مثل حکماء بقدم عالم گردند، و انکار حشر و قیامت نمایند، و مکافات حسن و قبح اعمال و جنت و نار در عافیت و مذلت دنیا قرار دہند[2]۔

علم نقطۂ الحاد و زندقہ اباحت (سب کچھ جائز ہے) اور وسیع المشربی (سب صحیح ہے) کا نام ہے، حکماء قدیم کی طرح وہ قدم عالم کے قائل اور حشر و قیامت کے منکر ہیں، اعمال کے حسن و قبح کا انعام و سزا، اور جنت و دوزخ اسی دنیا کی خوشحالی اور تنگ حالی کو سمجھتے ہیں۔

وہ نظریۂ ارتقاء کے قائل ہیں، اور ان کا عقیدہ ہے کہ جمادات و نباتات ترقی کرتے کرتے انسان کے درجہ تک پہونچ جاتے ہیں[3]، نباتات کے اگنے میں قدرت خداوندی کا کوئی دخل نہیں، وہ محض کواکب و عناصر کی ترکیب کا عمل ہے[4]، قرآن پاک کو نبی کریم کی تصنیف

---

[1] تاریخ عالم آرائے عباسی جلد ۲ صـ ۳۲۵ [2] مآثر الامراء جلد ۲ صـ ۶۱۹

[3] دبستان مذاہب صـ ۳۰۰

[4] مبلغ الرجال ورق ۲۷ الف نسخہ قلمی موجود مولانا آزاد کلیکشن مولانا آزاد لائبریری، مسلم یونیورسٹی علی گڑھ۔

سمجھتے ہیں، اور مسائل شریعت کو اہل الرائے کا طبع زاد، اس فرقہ کے پیرو نماز، حج، اور قربانی کا مذاق اڑاتے ہیں[١]، ماہ رمضان کا نام انھوں نے "ماہ گرسنگی و تشنگی" رکھا ہے، طہارت وغسل کے مسائل کی بھی تضحیک کرتے ہیں[٢]، اور محرمات ابدیہ کی حرمت کے بھی قائل نہیں، وہ نقلیات کے منکر اور عقلیات کے داعی ہیں[٣]۔

اس فرقہ کا بانی محمود پسیخوانی[٤] کو بتایا جاتا ہے، اس فرقہ نے دسویں صدی ہجری میں ہندوستان وایران کے ہزاروں لوگوں کو متأثر کیا، اور ایران میں اس کے پیروؤں کی تعداد ہزاروں تک پہونچ گئی، نقطویوں کا یہ عقیدہ تھا کہ اول ظہور سے محمود پسیخوانی تک آٹھ ہزار[٥] سال کی مدت ہوتی ہے، یہ دور عربوں کی سیادت کا دور تھا، کیونکہ اس مدت میں پیغمبر صرف عربوں ہی میں پیدا ہوتے رہے ہیں۔

---

١ ایضاً ٢ ایضاً

٣ ایضاً، اس مضمون میں پروفیسر محمد اسلم کی کتاب "دین الہٰی اور اس کا پس منظر" نیز ڈاکٹر نذیر احمد مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ کی کتاب "تاریخی وادبی مطالعے" سے استفادہ کیا گیا ہے، مزید تفصیل اور مستند معلومات کے لئے ملاحظہ ہو "نقطویان یا پسیخوانیان" از دکتر صادق کیا، ٤ محمود پسیخوانی یا پسیخانی گیلانی نے استرآباد میں ۸۰۰ھ میں اس نئے مذہب کا اعلان کیا، ۸۳۲ھ میں اس کی وفات ہوئی، اس فرقہ کی بنیاد ایران میں نویں صدی ہجری کی بالکل ابتدا میں ہوئی، رفتہ رفتہ اس نے بڑا زور پکڑا، یہاں تک کہ دسویں صدی اور گیارہویں صدی میں ایران اور ہندوستان میں اس فرقہ کے پیروؤں کی تعداد ہزاروں تک پہونچ گئی تھی، اس فرقہ کو ملاحدہ تناسخیہ اور اہل زندقہ کے نام سے ایرانی مورخین اور مسلمان مصنفین نے یاد کیا ہے، اور چونکہ محمود کے نزدیک ہر چیز کی تخلیق خاک سے ہوئی ہے، اور وہ خاک کو نقطہ کہتا ہے، یا اس لئے کہ اس نے مطالب قرآن کو اپنے خیال کو بیان کرنے میں حرفوں اور نقطوں کی تعداد سے مدد لی ہے، اس فرقہ کو نقطوی یا اہل نقطہ کہتے ہیں، (ماخوذ باختصار از مضمون "فرقہ نقطوی پر ایک طائرانہ نظر" مشمولہ "تاریخی وادبی مطالعے" از ڈاکٹر نذیر احمد)۔

محمود پسیخوانی کے ظہور سے عربوں کی سیادت ختم ہوگئی ہے[۱]، لہذا آئندہ آٹھ ہزار سال تک پیغمبر عجمیوں ہی میں پیدا ہوا کریں گے[۲]۔

نقطویوں کے عقائد کے سلسلہ میں جن کا کسی قدر یہاں بیان ہوا، ان کا یہ نظریہ بنیادی اور انقلابی اہمیت رکھتا ہے (اور ہماری اس بحث اور مجدد صاحب کے تجدیدی کارنامہ کا اس سے خاص تعلق ہے) کہ "مذہب اسلام منسوخ ہوچکا ہے اس لئے محمود کالایا ہوا دین قبول کئے بغیر چارہ نہیں"، "دین اسلام کی میعاد ختم ہوچکی ہے، اس لئے اب نئے دین کی ضرورت ہے[۳]"۔ دسویں صدی میں اس عقیدہ کا ظہور واعلان صاف اشارہ کرتا ہے کہ وہ اس عقیدہ الفی کے قائل ہیں اور الف ثانی سے اپنا کام زور شور سے شروع کرنے والے ہیں، شاہ عباس صفوی نے ایران میں نقطوی مذہب کی پیروی کے الزام میں ہزاروں نقطویوں کو موت کے گھاٹ اتار دیا، بادشاہ اس معاملہ میں اپنے پیشروؤں سے زیادہ سخت واقع ہوا تھا، بادشاہ کی نظر میں اس سے زیادہ خطرناک کوئی دوسرا گروہ نہ تھا چنانچہ ۱۰۰۲ھ میں اس نے بڑے وسیع پیمانہ پر ان کا قتل عام کیا، اس قتل وغارتگری کا یہ نتیجہ ہوا کہ بہت سے نقطوی جان بچا کر ہندوستان بھاگ آئے، اس میں مولانا حیاتی کاشی بھی تھے، جو دو سال تک قید میں رہنے کے بعد شیراز آئے اور ۹۸۶ھ میں وطن میں کچھ دن قیام کرکے بالآخر ہندوستان چلے آئے، ۹۹۳ھ میں وہ احمد نگر میں موجود تھے، شریف آملی جو بڑا باکمال عالم تھا، اس فرقہ کے اکابر سے تعلق رکھتا تھا، وہ اپنے زمانہ کی سخت گیریوں سے تنگ آکر ہندوستان چلا آیا تھا، اکبر بادشاہ اس کے ساتھ

---

[۱] محمود یا اس کے کسی پیرو کا شعر ہے ؎

رسید نوبت رندان عاقبت محمود　　　گذشت آنکہ کہ عرب طعنہ بر عجم میزد

[۲] دبستان مذاہب ص۳۰۱　　[۳] ایضاً ص۳۰۰

پیر جیسا سلوک کرتا تھا۔ بعض محققین کا خیال ہے کہ میر شریف آملی نے محمود بسیخوانی کی تحریروں سے ثبوت پیش کر کے اکبر کو دین نو کے اختراع کی ترغیب دی، اس نے محمود کی پیشگوئی بیان کی کہ ۹۹۰ھ میں ایک شخص ظاہر ہوگا جو دین باطل مٹا کر دین حق قائم کرے گا۔

بدایونی اور خواجہ کلاں[۱] دونوں اس بات پر متفق ہیں کہ شریف آملی نے ایران سے بھاگ کر بلخ میں مولانا محمد زاہد نبیرۂ شیخ حسین خوارزمی کی خانقاہ میں پناہ لی، اور صوفیوں کی طرح رہنے لگا، اس کی طبیعت کو چونکہ درویشی سے کوئی مناسبت نہ تھی، اس لئے اس نے ہرزہ سرائی اور شطاحی کو اپنا شعار بنا لیا، جب مولانا محمد زاہد کو اس کے عقائد معلوم ہوئے تو انھوں نے اس کو اپنی خانقاہ سے نکال دیا، اور وہ دکن چلا گیا۔

دکن میں ان دنوں شیعیت کا دور دورہ تھا، اس لئے لوگوں نے شریف آملی کو شیعی عالم سمجھتے ہوئے ہاتھوں ہاتھ لیا، جب لوگوں کو اس کے عقائد معلوم ہوئے تو وہ اس کے درپئے آزار ہوئے، بدایونی کے الفاظ میں :-

حکام دکن می خواستند کہ لوح ہستی	دکن کے حکام اس کا نقش حیات ہی
اوراز نقش حیات پاک سازند،	مٹا دینا چاہتے تھے لیکن بعد ازاں
عاقبت برسوائی خرقرار یافتہ برسوائی	انھوں نے یہ فیصلہ کیا کہ اسے گدھے پر
تشہیرش نمودند[۲]	بٹھا کر اس کی تشہیر کی جائے۔

اکبر نے ہزاری منصب دے کر اسے اپنے مقربین کے زمرہ میں شامل کر لیا[۳]، بنگالہ میں اس کو دین الٰہی کا داعی مقرر کیا، اور وہ اکبر کے چار مخلص یاروں میں شامل تھا، دین الٰہی کے

۱؎ خواجہ عبید اللہ فرزند خواجہ باقی باللہ مصنف مبلغ الرجال ۔ ۲؎ منتخب التواریخ جلد ۲ ص ۲۴۶

۳؎ مبلغ الرجال ورق ۳۲ ب

مریدوں اور معتقدوں کے سامنے اکبر کی وہ نیابت بھی کرتا تھا[۱]" مآثر الامراء" میں ہے "تصوف وحقائق بسیار ورزیدہ والحاد و زندقہ را بداں خلط دادہ، دعوائے "ہمہ اوست" می کرد و ہمہ را اللہ می گفت[۲]"۔ ابوالفضل علامی کے متعلق بعض معاصر تاریخ نویسوں کا بیان ہے کہ وہ نقطوی تحریک سے متأثر تھا، شاہ عباس صفوی نے نصر آباد کاشان میں ممتاز ترین نقطوی داعی اور ذمہ دار میر سید احمد کاشی کو جب قتل کیا تو اس کے کاغذات کے ذخیرہ میں جن نقطویوں کے خطوط ملے، ان میں ابوالفضل کا بھی ایک خط تھا، معاصر تاریخ نویس اسکندر منشی "تاریخ عالم آرائے عباسی" میں لکھتا ہے:۔

"ہندوستان سے آنے جانے والوں سے معلوم ہوا کہ ابوالفضل پسر شیخ مبارک بھی جو ہندوستان کے فضلاء میں ہے اور دربار اکبری میں بہت زیادہ تقرب حاصل کر چکا ہے اسی مذہب کا پیرو ہے اس نے اکبر بادشاہ کو وسیع المشرب بنا کر جادۂ شریعت سے منحرف کر دیا ہے، اس کا خط جو میر احمد کاشی کے نام لکھا گیا تھا، اور جو میر مذکور کے کاغذات میں دستیاب ہوا ابوالفضل کے نقطوی ہونے پر دلالت کرتا ہے[۳]"۔

خواجہ کلاں اپنی کتاب "مبلغ الرجال" میں محمود پسیخوانی کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:۔

"شیخ ابوالفضل ناگوری بساط آں آئین خسارت قرین را در مملکت ہندوستان گسترد[۴]"۔

ان تاریخی شہادتوں کے بعد اندازہ ہوتا ہے کہ نقطوی فرقہ یا تحریک کے داعیوں اور علمبرداروں نے ہندوستان آکر الف ثانی کے لئے نئے دور، نئے دین اور نئے آئین کے لئے کس طرح ایک تخت اور مسند تیار کر رکھی تھی، جس پر مسند آرا ہونے کے لئے ایک بااختیار و طاقتور موزوں شخصیت درکار تھی، اور اس کے لئے ان کی نظر میں اکبر سے زیادہ کوئی اہل نہ تھا۔

۱؎ منتخب التواریخ جلد ۲ ص ۲۴۵-۲۴۸ ۲؎ مآثر الامراء جلد ۳ ص ۲۸۵ ۳؎ مستفاد از مضمون "فرقہ نقطوی پر ایک طائرانہ نظر" مندرجہ کتاب "تاریخی و ادبی مطالعے" از ڈاکٹر نذیر احمد ص ۲۶۱ ۴؎ مبلغ الرجال ورق ۳۱ نیز ملاحظہ ہو ورق ۳۱-۳۲

باب دوم

اکبری عہد حکومت اور اس کے دو متضاد دور

اکبر کی مذہبی اور دیندارانہ زندگی

عہد اکبری اور ہندوستان کے تمام مؤرخین اس پر متفق ہیں کہ اکبر کی تخت نشینی اور ابتدائی عہدِ حکومت نہ صرف ایک راسخ العقیدہ مسلمان کی حیثیت سے شروع ہوا، بلکہ خوش عقیدگی اور مذہبی غلو اور تقشُّف کے ساتھ اس کا آغاز ہوا، اس کے ثبوت کے لئے "دربار اکبری" کے مشہور مصنف وعالم اور عہد اکبری کے مورخ ملا عبدالقادر بدایونی (م ۱۰۰۴ھ) کی شہرۂ آفاق کتاب "منتخب التواریخ" سے منتخب کر کے عہد اکبری کے اس دور کے چند متفرق واقعات اور بادشاہ کے حالات نقل کئے جاتے ہیں، جب وہ اپنے اسلاف کی طرح ایک سیدھا سادہ خوش اعتقاد مسلمان تھا، اور دینی تعلیم بلکہ مطلق تعلیم نہ ہونے، ماحول کے اثر اور اپنے عہد کے رواج کے مطابق (جس میں مشائخ و مزارات کے بارے میں غلو، حد سے بڑھی ہوئی خوش عقیدگی اور بدعات عام تھیں) بزرگوں کے مزارات کے لئے طول طویل سفر (شدّ رحال) کرتا تھا، بدعقیدگی اور خلاف جمہور عقائد کے الزام پر سخت سزا دیتا تھا، اولیاء اللہ کے مزارات پر نذر گزرانتا تھا، خود ذکر میں انہماک کے ساتھ مشغول رہتا، علماء اور صلحاء کی صحبت میں وقت گزارتا،

اور مجلس سماع میں شرکت کرتا تھا۔

اکبر کی دینداری اور مذہبی غلو کی شہادت میں ملا عبدالقادر بدایونی کے بیانات نقل کرنے میں کوئی حرج نہیں کہ اس پر تمام مؤرخین کا اتفاق ہے، اور اس سے اکبر کی تعریف نکلتی ہے، اور اس بارہ میں ملا عبدالقادر بدایونی کی تاریخ و تصنیف میں کسی مخالفانہ جذبہ کے کام کرنے یا عناد کا کوئی سوال نہیں، البتہ اکبر کی زندگی کے دوسرے دور (دین الٰہی کے نظریہ کی اشاعت وحدت ادیان کے عقیدہ، اسلام سے بُعد و وحشت، مذاہب غیر کے بارہ میں حد سے بڑھی ہوئی رواداری اور اسلام کے بارے میں معاندانہ رویہ) کی شرح و تفصیل میں ہم ملا عبدالقادر کے بیانات نقل کرنے میں (جن کی صحت و استناد، اور ان کی تاریخی غیر جانبداری کے سلسلہ میں ان اخیر برسوں میں بعض حلقوں کی طرف سے بڑا شک و اشتباہ پیدا کر دیا گیا ہے[1])

[1] اکبر کے دور ثانی کے بارے میں ملا عبدالقادر بدایونی کے بیانات اور شہادتوں کو ان کے دینی تعصب اور اکبر سے ذاتی عناد و مخالفت پر محمول کرنے اور ان کی کتاب "منتخب التواریخ" کو مجروح و ساقط الاعتبار کرنے کی پچھلے برسوں سے جو مہم شروع ہوئی ہے، اس کی کوئی مثبت علمی بنیاد اور تاریخی ثبوت نہیں، اس الزام کی بنیاد بھی محض جذبات تحت اکبر کی عظمت اور اس کو ہر طرح کے الزامات سے بری کرنے کے جذبہ (جو خاص تعلیم و تربیت اور ماحول و زمانہ کا نتیجہ اور ایک مقصد کے ماتحت تاریخ نویسی کا اثر ہے) سوء ظن اور منفی رویہ پر ہے، جو شخص بھی خالی الذہن ہو کر "منتخب التواریخ" کا مطالعہ کرے گا، وہ مصنف کے خلوص و صداقت، دردمندی اور جرأت مندانہ حق گوئی کا اعتراف کئے بغیر نہیں رہ سکتا، کتب تاریخ کا وسیع مطالعہ کرنے والے کو تاریخ و افسانہ میں امتیاز کرنے اور مصنف اور اس کی کتاب کے پایہ کے سمجھنے کی صلاحیت پیدا ہو جاتی ہے، اور وہ خود صراف کی طرح کھرے کھوٹے کا فرق سمجھنے لگتا ہے۔

الیٹ "منتخب التواریخ" پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتا ہے کہ "بہت کم ایسے واقعہ نگار ہیں، جو بدایونی کی طرح

(باقی ص ۷۳ پر)

...احتیاط برتیں گے، اور تنہا ان کے بیانات پر انحصار نہیں کریں گے، بلکہ ان کو اکبر کے مخلص وفادار ارکان سلطنت، مؤرخین دربار اور اس عہد کے غیر جانبدار مؤرخوں کے بیانات اور شہادتوں کی محض تائید میں پیش کریں گے۔

"منتخب التواریخ" کے حسب ذیل بیانات ملاحظہ ہوں:-

"شہزادہ سلیم کی ولادت کے شکرانہ میں بادشاہ نے اجمیر کا پیادہ پا سفر کیا، واپسی میں دہلی میں پڑاؤ ڈالا، اور اولیائے دہلی کے مزارات کی زیارت کی۔"[1]

"اجودھن جا کر حضرت شیخ المشائخ فریدالدین گنج شکر کی زیارت کی، مرزا مقیم اصفہانی کو میر یعقوب کشمیری کے ساتھ رفض کے الزام میں سزا ملی۔"[2]

"اوائل شعبان میں بادشاہ نے اجمیر کا سفر کیا، سات کوس سے پیادہ پا مزار پر حاضر ہوا، نقارہ نذر گزرانا، اہل اللہ علماء اور صلحاء کے ساتھ صحبت اور مجلس سماع گرم رہی۔"[3]

"عبادت خانہ میں "یاہو" اور "یا ہادی" کے ذکر میں انہماک رہتا تھا، (سنہ ۹۸۰ھ میں... عبادت خانہ کی تین عمارتوں کی تعمیر کا تفصیلی ذکر)"[4]

"عبادت خانہ میں ہر شب جمعہ کو سادات ومشائخ، علماء وامراء کی طلبی ہوتی، بادشاہ خود ایک حلقہ میں آتا، اور مسائل کی تحقیق کرتا۔

اسی زمانہ میں قاضی جلال اور دوسرے علماء کو حکم ہوا کہ قرآن مجید کی تفسیر بیان کی جائے۔"[5]

(باقی ص۷۱ کا) اپنے جذبات کا اظہار کرنا چاہتے ہیں، خصوصاً جو شاہی کانوں کو ناگوار ہوں، یا جو اپنی غلطیوں اور لغزشوں کو اس صفائی اور بے پروائی کے ساتھ آشکارا کر دیتے ہوں" (الیٹ جلد ۵ صفحہ ۴۸۰)

[1] منتخب التواریخ جلد ۲ ص۱۲۳ [2] ایضاً ص۱۲۴ [3] ایضاً ص۱۸۵ [4] ایضاً صفحہ ۲۰۰-۲۰۱ [5] ایضاً ص۲۱۱

۹۸۶ھ کے واقعات میں فتح پور سیکری میں عبادت خانہ میں علماء و مشائخ کی صحبت شب جمعہ کی شب بیداری کا ذکر آتا ہے۔

"جب خان زماں نے اکبر کے خلاف بغاوت کی تو اس کے مقابلہ پر نکلنے سے پہلے بادشاہ دہلی کے تمام اولیاء اللہ کے مزارات پر بغرض دعا حاضر ہوا[1]۔"

ماہم آنکہ کے تعمیر کردہ مدرسہ خیر المنازل کے پاس سے گزرتے ہوئے، فولاد نامی ایک شخص نے (شرف الدین حسین کے ایماء سے) بادشاہ پر ایک تیر چلایا، بادشاہ کو معمولی سا زخم آیا، جو چند روز کی مرہم پٹی سے درست ہو گیا، اس ناگہانی حملہ سے بچ نکلنے کو بقول بدایونی "از تنبیہات غیبی و کرامات پیران حضرت دہلی دانستہ" اولیاء دہلی کی کرامت سمجھا[2]۔"

"ایک بار اجمیر جاتے ہوئے اس عہد کے مشہور بزرگ شیخ نظام نارنولی کی (جن کے زہد و اتقا کی شہرت دور دور تک پھیلی ہوئی تھی) خدمت میں حاضر ہوا[3]۔"

"۹۸۰ھ میں اجمیر میں سید حسین خنگ سوار کے مزار پر اور اس کے چند سال بعد ہانسی میں حضرت قطب جمال کے مزار پر بڑی عقیدت و نیاز کے ساتھ حاضر ہو کر فاتحہ پڑھی[4]۔"

"شیخ سلیم چشتی کے ساتھ عقیدت خاص تھی، ان کا روضہ بڑے اہتمام سے تعمیر کرایا، اور اس عقیدت و محبت کی بناء پر ولی عہد سلطنت (جہانگیر) کا جو کہا جاتا ہے کہ ان کی دعا سے پیدا ہوا سلیم نام رکھا، بادشاہ نے سلیم کی ولادت سے قبل رانی جودھا بائی کو شیخ کے گھر بھیج دیا تھا تاکہ ان کی توجہ اور دعا رانی کے شامل حال رہے[5]۔"

"اسی طرح شہزادہ مراد کی ولادت بھی شیخ ہی کے گھر میں ہوئی تھی[6]۔"

---

[1] منتخب التواریخ جلد ۲ ص۲۵۲ [2] ایضاً ص۲۶۲ [3] ایضاً ص۲۵۲
[4] ایضاً ص۲۳۲ [5] ایضاً ص۱۰۰ [6] ایضاً ص۱۲۳

"شہزادہ سلیم جب مکتب نشینی کے قابل ہوا تو اس کی رسم تسمیہ خوانی کے لئے اپنے عہد کے مشہور محدث مولانا میر کلاں ہروی کو زحمت دی اور انھوں نے بادشاہ اور عمائدین سلطنت کی موجودگی میں شہزادہ کی بسم اللہ کرائی[1]"

"جب شہزادہ لکھنے پڑھنے کے قابل ہو گیا تو اسے حکم دیا کہ شیخ عبدالنبی کے گھر جا کر ان سے حدیث کی تعلیم حاصل کرے اور اس نے مولانا جامی کی چہل حدیث ان سے پڑھی[2]" اکبر کو شیخ عبدالنبی (نبیرۂ حضرت شیخ عبدالقدوس گنگوہی و صدر جہاں عہد اکبری) سے اتنی عقیدت تھی کہ اکثر وہ ان کے گھر جا کر ان کے درس میں شرکت کرتا، ایک دو مرتبہ ان کی جوتیاں بھی سیدھی کیں[3]"

"اکبر نے ان کے لئے کارخانہ شاہی میں خصوصی دوشالہ تیار کروایا، اور ملا عبدالقادر کے ہاتھ ان کی خدمت میں بھیجا، اور کہا کہ یہ آپ ہی کے لئے شاہی کارخانہ میں تیار ہوا ہے[4]"

"اس عہد کے مشہور شطاری شیخ شیخ محمد غوث گوالیاری کے گزارہ کے لئے ایک کروڑ (دام) سالانہ آمدنی کی جاگیر مخصوص کر دی، ان کے انتقال کے بعد ان کے فرزند شیخ ضیاء اللہ کے ساتھ بھی نیازمندانہ طریقہ پر پیش آتا[5]"

"بزرگوں سے یہ عقیدت مندی اکبر کو موروثی طریقہ پر ملی تھی، اس کے تیموری آباء و اجداد خواجہ ناصر الدین عبید اللہ احرار کے ساتھ عقیدت رکھتے تھے، بابر کا دادا سلطان ابو سعید پاپیادہ ان کی خدمت میں جایا کرتا تھا، اور ان کے مشورہ کے بغیر کوئی کام نہیں کرتا تھا، بابر کے والد عمر شیخ مرزا کو بھی خواجہ صاحب سے بڑی عقیدت تھی، خود بابر بھی اپنی تزک میں ان کا ذکر بڑے احترام سے کرتا ہے، اکبر کے خاندان کی خواتین و بیگمات کے رشتے نقشبندیہ خاندان کے بزرگوں سے ہوئے، حضرت خواجہ عبید اللہ احرار کے اخلاف میں سے ایک بزرگ خواجہ یحییٰ ہندوستان

---

[1] ایضاً ص ۱۰۱ [2] ایضاً ص ۲۰۴ [3] ایضاً ص ۲۰۴ [4] ایضاً ص ۲۳۷ [5] ایضاً ص ۲۰۲

تشریف لائے تو اکبر نے ان کا بڑا اعزاز کیا، ان کے مصارف کے لئے ایک جاگیر عطا کی، اور انھیں امیر حج بنا کر مکہ مکرمہ روانہ کیا، واپسی پر انھیں مستقل طور پر آگرہ میں ٹھہرالیا[۱]۔"

"اکبر نے ہفتہ کے سات دنوں کے لئے سات امام مقرر کر رکھے تھے، جو باری باری مقررہ دن میں نماز کی امامت کرتے تھے، بدھ کے روز کی امامت ملا عبدالقادر بدایونی سے متعلق تھی[۵۲]۔"

"ہر سال ایک بڑی تعداد کو سرکاری خرچ سے حج کے لئے بھیجتا تھا، امیر حاج کے ہاتھ شریف مکہ کے لئے تحائف اور اہل حرم کے لئے نقد و جنس بھیجتا تھا[۵۳]، قافلہ کی روانگی کے دن حاجیوں کی طرح احرام باندھ کر سر کے بال تھوڑے سے ترشوا کر تکبیر کہتا ہوا، ننگے سر، برہنہ پا دو ز نک انھیں رخصت کرنے جاتا، اِس منظر سے ایک شور برپا ہوتا، اور لوگوں پر رقت طاری ہوتی[۵۴]۔"

جب ہندوستان میں شاہ ابوتراب حجاز سے قدم رسول لے کر تشریف لائے، اور وہ آگرہ کے قریب پہونچے تو بادشاہ امراء، علماء کی ایک بڑی جمعیت کے ساتھ شہر سے چار کوس باہر نکل کر استقبال کے لئے گیا۔

آخر میں اس کی دینداری کی شہادتوں کو ہم عہد سلطنت مغلیہ کے مشہور مورخ میر عبدالرزاق خافی خاں معروف بہ صمصام الدولہ شاہنواز خاں (۱۱۱۱ھ۔۱۱۷۱ھ) کی مشہور کتاب "مآثر الامراء" کے اس بیان پر ختم کرتے ہیں، وہ لکھتے ہیں:۔

اکبر بادشاہ بہ ترغیب شیخ در اجراء احکام	اکبر بادشاہ احکام شرعیہ وامر معروف
شرعی وامر معروف و نہی منکر فراواں	و نہی منکر کے سلسلہ میں بڑی کوشش
جہدمی فرمود و خود اذان می گفت	کرتا تھا خود اذاں کہتا اور امامت
و امامت می کرد حتی بقصد ثواب	کرتا حتی کہ ثواب کی نیت سے مسجد

---

[۱] ایضاً ج ۳ ص ۱۰۰ — [۵۲] ایضاً ج ۲ ص ۲۲۷ — [۵۳] ایضاً ص ۲۵۱ — [۵۴] ایضاً ص ۲۳۹

بمسجد جاروب می زد۔ [1]　　　　میں جھاڑو بھی دیتا تھا۔

اکبر کے مزاج میں تغیر اور عہد اکبری کا دور ثانی [2]

اکبر کی دینداری اور مذہبی شغف کی اوپر جو مثالیں دی گئی ہیں، پڑھنے والے ان سے اندازہ کر سکتے ہیں کہ وہ ایسی سطحی اور عامیانہ قسم کی مذہبیت تھی، جس کی بنیاد دین کے صحیح فہم، کتاب وسنت سے واقفیت اور براہ راست علم و مطالعہ پر نہیں تھی، اور وہ بجائے علمائے راسخین کی تعلیم اور صحیح دینی صحبت و تربیت کی رہین منت ہونے کے محض مذاق زمانہ، مزاج سپاہیانہ اور وسط ایشیاء کے دین سے ناواقف امراء و اہل حکومت کی تقلید و نقالی، اور خوش عقیدگی بلکہ ضعیف الاعتقادی پر مبنی تھی، اس دینداری کا رکن اعظم مزارات پر حاضری دینا، کوسوں پیادہ پا چل کر وہاں آنا، وہاں کے سجادہ نشینوں کے ساتھ (جو اکثر بے علم، اسلاف کے کمالات سے عاری اور صحیح روحانیت سے خالی ہوتے تھے) اپنی نیازمندی اور فدویت کا اظہار، خانقاہوں کی جاروب کشی، مجالس ذکر و سماع میں شرکت اور "درباری سرکاری" علماء و مشائخ کی

---

[1] مآثر الامراء ج ۲ ص ۵۶۱

[2] بیان کیا جاتا ہے کہ جہانگیر نے چھوٹی توزک میں اکبر کے انتقال کا جو حال لکھا ہے، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کو اپنی غلط روی کا احساس ہو گیا تھا، اور اس نے کلمۂ شہادت پڑھ کر اس حالت میں جان دی کہ سورۂ یٰسین اور دعا پڑھی جا رہی تھی، ہم کو اس باب میں اس سے بحث نہیں کہ خدا کا معاملہ اس کے ساتھ کیا رہا، اور وہ دنیا سے کس حال میں رخصت ہوا، ہمیں اس کے ان اقدامات اور کارروائیوں سے بحث ہے جو اس نے نئے دین و آئین کے جاری کرنے میں کیں اور ان اثرات سے جو ان کے نتیجہ میں اسلام اور مسلمانوں پر مرتب ہوئے۔

توقیر و تعظیم تھی، اکبر کے حالات سے یہ معلوم ہو گیا ہے کہ وہ ناخواندۂ محض تھا[1]، تیموری خاندان کے مزاجوں میں عام طور پر غلو، انتہا پسندی، اور حد سے بڑھی ہوئی خوش عقیدگی داخل ہے، ہمایوں کے متعلق تاریخ میں آتا ہے کہ وہ محنت کرنے، میدان جنگ کی سختیاں اٹھانے اور ناسازگار حالات کا مقابلہ کرنے پر آتا تھا تو معلوم ہوتا تھا کہ گوشت پوست کا نہیں لوہے کا بنا ہوا ہے اور انسان نہیں، جن ہے، لیکن جب آرام کرنے پر آتا تو سب بھول جاتا، اور معلوم نہیں ہوتا تھا کہ میدان جنگ کا ایک جانباز سپاہی ہے، جہانگیر میں بھی یہ تضاد اور بے اعتدالی نظر آئے گی۔

پھر یہ بات بھی نہیں بھولنا چاہئے کہ جن ناہموار اور غیر معمولی حالات میں اس کا بچپن اور عنفوان شباب گزرا تھا، چچاؤں کی جس بے مروتی، بے مہری، اور خون کے سفید ہو جانے کا اس نے مشاہدہ کیا تھا، اور جو کڑوے بلکہ زہر آلود گھونٹ اس نے باپ کی شکست اور سفر ایران کے زمانہ میں پئے تھے، پھر بیرم خاں کے ساتھ جو کچھ پیش آیا تھا، اس سب نے اس کی طبیعت میں انسانی فطرت کی طرف سے بدگمانی، بڑے سے بڑے اور اچھے سے اچھے آدمی کے خلوص و وفاداری کے بارہ میں شک اور مزاج میں ایک طرح کا تلون پیدا کر دیا تھا۔

---

[1] اکبر جب چار سال چار ماہ چار دن کا ہوا تو رواج زمانہ کے مطابق اس کی مکتب نشینی کی رسم ادا ہوئی اور ملا زادہ عصام الدین ابراہیم اتالیق مقرر ہوئے، لیکن ملا کو اندازہ ہوا کہ اکبر کو تعلیم کی طرف رغبت نہیں، اسے معلم کی ناکامی اور بے توجہی پر محمول کیا گیا، اور ملا زادہ کی جگہ مولانا بایزید کا تقرر ہوا، مگر اس سے بھی کچھ فائدہ نہ ہوا، آخر بادشاہ نے مولانا عبد القادر بدایونی کو منتخب کیا، مگر بلند اقبال شہزادہ کی طبیعت تعلیم پر مائل نہ ہوئی، سیاسی حالات اور ان کے نتیجہ میں سرگردانی و نقل مکانی نے اس کو اور ہوا دی، اور اکبر تعلیمی لحاظ سے بے سواد اور ناخواندہ رہ گیا۔
(ملخص از تواریخ عہد اکبری)

مذاہب کا تقابل و تحقیق اور مجالس مناظرہ، اور ان کا اثر

اِس صورت حال کی اصلاح، اس کی ان کمزوریوں پر غلبہ حاصل کرنے اور اس کو اسلام سے وابستہ اور دین سے منسلک رکھنے بلکہ بہت سے سلاطین اسلام کی طرح (جن میں سے بعض اس کے خاندان میں بھی پیدا ہوئے) دین کا حامی و ناصر بنائے رکھنے کے لئے موزوں صورت یہ ہو سکتی تھی کہ اکبر اس حقیقت کا اعتراف کرتے ہوئے کہ وہ غیر تعلیم یافتہ اور ناخواندہ ہے، (اور یہ ایسی کمزوری تھی، جو بابر سے لے کر سلطنت مغلیہ میں بہادر شاہ تک کسی میں پائی نہیں گئی) مہمات سلطنت اور توسیع مملکت پر اپنی توجہ مرکوز کر دیتا، جس کی اس کے اندر خداداد صلاحیت اور غیر معمولی لیاقت تھی، وہ مذہبی امور میں دخل نہ دیتا، ایک سیدھے سادھے مسلمان اور سپاہی کی طرح مذہبی امور کو علماء اور ذی علم ارکان سلطنت کے حوالہ کرتا، جیسا کہ بابر اور ہمایوں نے (تعلیم یافتہ ہونے اور علمی ادبی ذوق رکھنے کے باوجود) کیا تھا، اور خاص طور پر نازک اعتقادی و کلامی مسائل، مذاہب کے تقابل، اور ماوراء الطبیعاتی (غیبی) حقائق کی تحقیق کے میدان میں قدم نہ رکھتا، جہاں ذرا سی غلطی یا بے احتیاطی سے آدمی کفر و الحاد کی سرحد میں داخل ہو جاتا ہے، اور دین و ایمان کا سرمایہ کھو بیٹھتا ہے، اور جس کے مبادی و مقدمات سے بھی اکبر ناآشنائے محض تھا، اور جو سیاسی مصالح اور ایسے بادشاہ کے مفاد کے بھی خلاف تھا، جس نے چار سو (۴۰۰) برس کی مسلمان سلطنتوں سے ملک کا چارج لیا تھا، ان نازک اعتقادی اور کلامی مسائل میں دخل دینے اور اس میں سلطنت کے اثر و رسوخ کے استعمال کرنے کی غلطی مامون الرشید (۱۷۰ھ – ۲۱۸ھ) جیسے عالم و ذہین خلیفہ کو بھی راس نہ آئی، اور وہ اس سے کوئی مفید نتیجہ حاصل نہ کر سکا۔[1]

---

[1] تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو "تاریخ دعوت و عزیمت" حصہ اول "فتنۂ خلق قرآن" ص ۹۴ تا ۱۰۱

لیکن اکبر نے بے چین طبیعت اور متجسس دماغ پایا تھا، اِدھر اقبال مندی اور مسلسل کامیابیوں اور فتوحات نے اس کو اپنے بارہ میں کسی قدر خوش فہمی اور فریب میں مبتلا کر دیا تھا، وہ سمجھنے لگا تھا کہ جس طرح وہ سیاسی گتھیوں کو سلجھاتا اور ملکی مسائل کو حل کرتا ہے، اسی طرح وہ مذہب وعقائد کی پُرخار وادیوں میں بھی کامیاب تُرکتازیاں کر سکتا ہے۔

دوسری طرف بعض شاطر ارکانِ دربار نے کچھ تو اپنا ذہنی تفوق ظاہر کرنے کے لئے اور کچھ بادشاہ کی تفریح طبع اور رونق مجلس کے لئے بجائے مرغوں اور بٹیروں کی پالیوں اور سانڈوں اور ہاتھیوں کی لڑائی کے (جو مشرقی سلاطین وامراء کی قدیم تفریح تھی) مختلف مذاہب اور فرقوں کے علماء کے دنگل قائم کئے، اور اس کو تحقیق مذہبی اور علمی مباحثہ کا نام دیا، یہ بالکل بدیہی حقیقت ہے (اور مذاہب وافکار کی تاریخ میں اس کا سیکڑوں بار تجربہ ہو چکا ہے) کہ اگر ان مناظروں، علماء، اور مذاہب کے وکلاء کی "بیت بازیوں" کا سننے والا گہرا اور وسیع علم اور دقیقہ رس دماغ نہیں رکھتا اور اس سے بھی بڑھ کر یہ کہ توفیق الٰہی اس کا ساتھ نہیں دیتی، تو اس کا تشکک وارتیاب، سوفسطائیت اور لاادریت کی وادی میں بھٹکنا یا الحاد وزندقہ کی عمیق خندق میں گر جانا بالکل قدرتی امر ہے۔

جہانگیر جس کی اکبر کے بارہ میں شہادت سے زیادہ کوئی شہادت معتبر نہیں ہو سکتی، تزک میں لکھتا ہے۔

پدر من در اکثر اوقات با دانایان ہر	والد ماجد اکثر ہر دین و مذہب کے
دین و مذہب صحبت می داشتند،	دانشوروں سے ملاقات کرتے تھے،
خصوصاً با پنڈتاں و دانایان ہندو	خصوصاً ہندستانی فاضلوں اور
باآنکہ اُمّی بودند از کثرت مجالست	پنڈتوں سے، اور امّی ہونے کے باوجود

با دانایان و ارباب فضل در گفتگوہا چناں	کثرت مجالست کے سبب علماء و
ظاہر می شد کہ ہیچ کسے پے بامّی بودن ایشاں	فضلا کے ساتھ گفتگو میں کسی کو ان کے
نمی برد و بدقائق نظم و نثر چناں می	امی و ناخواندہ ہونے کا احساس نہیں
رسیدند کہ ما فوقے براں تصور نہ بود۔[1]	ہوتا تھا نظم و نثر کی باریکیوں کو اس طرح
	سمجھتے تھے کہ اس سے زیادہ ممکن نہیں۔

اسلام ہندو مذہب اور ہندوستان کے دوسرے مذاہب و فرق ہی کے نمائندوں، وکیلوں ہی پر اس بارہ میں اکتفا نہیں کیا گیا، بلکہ نوبت دانایان فرنگ تک پہونچی، خود ابوالفضل لکھتا ہے کہ "دربار کی طرف سے توریت و انجیل و زبور کے ترجمے اور ان کے مطالب کو بادشاہ تک پہونچانے کا اہتمام کیا گیا، اور اس کے لئے ایک درباری فاضل سید مظفر کو متعین کیا گیا، اور بعض عیسائی اہل سلطنت کو لکھا گیا۔

در اوقات طیبہ با دانایان جمیع ادیان	ہم فارغ اوقات میں تمام مذاہب
صحبت داشتہ از کلمات نفیسہ و مقاصد	کے دانشوروں سے ملتے اور ان کے
عالیہ ہر کدام مستفید و مستفیض می شویم	کلمات پاکیزہ اور بلند خیالات سے
چوں تباین السنہ و تغایر لغات درمیان	مستفید ہوتے ہیں، زبانوں کی اجنبیت
ست، لائق آں کہ بار سال ایں طور	حائل ہے، اس لئے کسی ایسے شخص کو
کسی کہ آں مطالب عالیہ با حسن عبارت	بھیج کر مسرور کریں جو ان مطالب
خاطر نشاں کند مسرور سازند و بسمع ہمایوں	عالیہ کو اچھی عبارت کے ذریعہ
رسیدہ کہ کتب سماوی مثل توریت و	دلنشیں کرے سمع ہمایوں تک یہ بات

[1] تزک جہانگیری ص ۱۵

انجیل و زبور بزبان عربی و فارسی	پہنچی ہے کہ کتب سماوی، توریت،
درآوردہ اند اگر آں کتب مترجم یا غیر	انجیل و زبور کے ترجمے عربی فارسی میں
آں کہ نفع آں عام و فائدہ آں تام	ہوئے ہیں، اگر وہ مترجم کتابیں اس
باشد دراں ولایت بودہ باشد	ملک میں ہوں تو افادۂ عام کے لئے
فرستند در ینولا بجہت تاکید مراسم	انھیں بھیج دیں، رسم محبت کی تجدید
وداد و تشیید مبانیٔ اتحاد سیادت	اور بنیاد اتحاد کی پختگی کے خیال سے
مآب فضائل اکتساب صادق العقیدہ	ہم نے سیادت مآب سید مظفر کو (جو
والاخلاص سید مظفر را کہ بمزید التفات	ہماری عنایات سے سرفراز ہیں) ان
عنایت سرفراز و مخصوص بودہ فرستادیم	تراجم کے چند نسخوں کے لئے بھیجا ہے،
نسخہ چند بالمشافہ خواہد گفت اعتماد	وہ آپ سے بالمشافہ گفتگو کریں گے،
نمایند و ہموارہ ابواب مکاتبات و	آپ اُن پر اعتماد کریں اور برابر خط و
مراسلات را مفتوح دارند۔[1]	کتابت کرتے رہیں۔

ترجمہ کے علاوہ خود عیسائی پادری دربار میں حاضر ہوئے اور انھوں نے اپنے مذہب کو بادشاہ کے سامنے پیش کیا اور عقیدۂ تثلیث اور عیسائیت کو دلائل سے ثابت کیا، ملا صاحب لکھتے ہیں۔

دانایان مرتاض ملک فرنجہ کہ ایشاں	دربار میں ملک فرنگ کے مرتاض دانشمندوں
را پادری و مجتہد ایشاں را پاپا می	کا بھی ایک گروہ تھا، ان لوگوں کو پادری
گوئند انجیل آوردو بر ثالث ثلثہ	کہتے ہیں اور ان کے بڑے مجتہد کا نام

[1] انشائے ابوالفضل ص ۳۹

دلائل گزرانیدہ و حقیقت نصرانیت اثبات کردہ ۔[1]	پاپا (پوپ) ہے ان لوگوں نے انجیل پیش کی اور ثالث ثلثہ کے متعلق دلائل پیش کیے اور نصرانیت کو حق ثابت کیا۔

مجالس مناظرہ کا پرانا تجربہ ہے کہ کسی مذہب کی صداقت اور اس کی ترجیح کا فیصلہ کرنے کے لئے ہمیشہ دلائل کی قوت اور علمی ثبوت کافی اور فیصلہ کن نہیں ہوتا، اس کا بہت کچھ دارومدار اس مذہب کے وکیلوں اور نمائندوں کی چرب زبانی اور قوت بیانی پر ہے' بعض مرتبہ ایک کمزور مذہب کے وکیل زیادہ قادر الکلام، خوش بیان، نفسیات انسانی سے واقف اور موقع شناس ہوتے ہیں' وہ سننے والے کو متاثر اور معتقد بنا لیتے ہیں' ایک صحیح مذہب کے ترجمان (کسی وجہ سے) ان خصوصیات سے عاری اور ان کلامی اسلحہ سے خالی ہوتے ہیں' اور وہ اپنے اس نقص کی وجہ سے بازی ہار جاتے ہیں' اس میں بہت شبہ ہے کہ اکبر کے دربار میں اسلام کی نمائندگی اور ترجمانی کرنے والے جو علماء موجود تھے' اور جو ان دانایان فرنگ کے مقابلہ میں کھڑے کیے جاتے تھے' ان کا تورات و انجیل اور مذہب عیسوی کا مطالعہ اور اس کی کمزوریوں سے واقفیت اور اسلام کو عقلی و علمی طور پر پیش کرنے کی صلاحیت اس درجہ کی تھی کہ وہ ان کو ان مغربی فضلاء کا مدمقابل بنا سکے اور وہ اسلام کی ترجمانی کا حق ادا کر سکیں' اس صورت حال سے یہ بات بعید از قیاس نہیں کہ ان غیر ملکی عیسائی فضلاء کی علمی و عقلی برتری کا نقش قائم ہو گیا ہو اور علماء ے اسلام (جو اس میدان کے مرد نہ تھے) اس کی نظر سے گر گئے ہوں۔

اس کا نتیجہ وہی نکلا جو نکلنا چاہئے تھا، ملا عبد القادر لکھتے ہیں :۔

اہل بدع و اہوا بمقتضائی آرائی	اہل بدعت اور ہوا پرست اپنی غلط آراء

---

[1] منتخب التواریخ ۲/۲۶۰ -

فاسدہ وشبہات باطلہ از کمیں بر آمدہ	اور باطل شبہات کے سبب کمین گاہوں
باطل را بصورت حق وخطا را بلباس	سے نکل آئے اور باطل کو حق کی صورت
صواب جلوہ دادہ، پادشاہی را کہ	میں اور خطا کو صواب کے لباس میں پیش
جوہری نفیس وطالب حق بود اما عامی	کرنے لگے، اور بادشاہ کو جو جوہر ذاتی
محض ومتالّف ومتأنس بکفرہ	رکھتا تھا، اور طالب حق مگر امّی محض
وارا ذل، در شک انداختہ حیرت	اور کافروں سے مانوس تھا، شک میں
بر حیرت افزودو مقصود از میاں	مبتلا کردیا، اور اس کی حیرت میں اضافہ
رفت، وسد سدید شرع مبین ودین متین	کردیا اور مقصد فوت ہوگیا اور شریعت
شکست وبعد از پنج شش سال خود	کا بندھ ٹوٹ گیا، اور پانچ چھ سال
اثری از اسلام نماند وقضیہ منعکس شد[1]	کے بعد اسلام کا کوئی اثر نہ رہ گیا اور
	معاملہ بالکل الٹ گیا۔

دوسری جگہ لکھتے ہیں:۔

در ہر رکنے از ارکان دین وعقیدہ از	ارکان دین کے ہر رکن اور اسلامی عقائد کے
عقیدۂ اسلامیہ چہ در اصول وچہ در	ہر عقیدہ کے متعلق خواہ ان کا تعلق اصول سے
فروع مثل نبوت وکلام ورویت و	ہو یا فروع سے مثلاً نبوت مسئلہ کلام، دیدار الٰہی،
تکلیف وتکوین، وحشر ونشر شبہات	انسان کا مکلف ہونا، عالم کی تکوین حشر ونشر
گوناگوں بہ تمسخر واستہزاء آوردہ[2]۔	وغیرہ کے متعلق تمسخر اور ٹھٹھے کے ساتھ
	طرح طرح کے شکوک وشبہات پیدا کئے جانے لگے۔

---

[1] منتخب التواریخ جلد دوم ص ۲۵۵ [2] ایضاً ص ۳۰۷

اس پر طرہ یہ ہوا کہ تفسیر و تاریخ جیسے نازک مضمون جن میں ناخدا ترس اور غیر راسخ العلم لوگوں کو ذہنی انتشار پیدا کرنے کی بڑی گنجائش ہے، اس امی بادشاہ کے دربار اور ایک غیر سنجیدہ اور بے باک فضا میں پڑھے جانے لگے۔

ملا عبدالقادر بدایونی لکھتے ہیں :-

و دریں ایام قاضی جلال و دیگراں	انہی دنوں میں قاضی جلال اور دوسرے
را از علماء فرمودند تا تفسیر قرآن مجید	علماء کو حکم ہوا کہ تفسیر قرآن بیان کریں
می گفتہ باشند، و در میان علماء بر سر آں	اور خود علماء کے درمیان اس معاملہ
غوغائی بود۔ و دیب چند مسخرہ راجہ	میں بڑی کشمکش تھی، دیپ چند مسخرہ
منجھولہ می گفت کہ اگر گاؤ نزد حق تعالٰے	راجہ منجھولہ کہتا تھا کہ اگر حق تعالے
معظم نبودی در اول سورہ قرآنی چرا	کے نزدیک گائے محترم نہ ہوتی تو قرآن
مذکور شدی، و چوں تاریخ خواندہ می شد	کی پہلی سورہ میں کیوں مذکور ہوتی؟ اور
روز بروز اعتقاد از اصحاب فاسد شدن	جب تاریخ پڑھی جانے لگی تو روز بروز صحابہ
گرفت و گام فراخ تر نہادند و نماز	لوگوں کا اعتقاد خراب ہونے لگا اور
و روزہ و جمیع نبوات تقلیدیات	سر سے آگے بڑھ کر، نماز روزہ اور تمام نبوی
نام نہادند یعنی غیر معقول و مدار دین	تعلیمات کو تقلیدیات کا نام دینے لگے یعنی
بر عقل گزاشتند نہ نقل، و آمد و رفت	انھیں غیر معقول کہنے لگے اور دین کا
فرنگیاں نیز شد و بعضی اعتقادیات	مدار بجائے نقل کے عقل پر رکھنے لگے،
عقلی ایشاں را فرا گرفتند۔[1]	فرنگیوں کی آمد و رفت بھی ہونے لگی،

[1] منتخب التواریخ جلد دوم ص ۲۱۲

چنانچہ ان کے بھی بعض اعتقادات
قبول کر لئے۔

اکبر کے تغیرِ مزاج و انحراف میں علمائے دربار و ارکان سلطنت کی ذمہ داری

اکبر کو اسلام کی صراطِ مستقیم پر قائم رکھنے، اور اس کے مزاج کو بے اعتدالی اور انحراف سے بچانے میں علمائے دربار و ارکان سلطنت بھی بڑا بنیادی اور مفید کردار ادا کر سکتے تھے، لیکن اس کے لئے ایک طرف ایسے علماء کی ضرورت تھی، جو حکمتِ دین اور "تفقّہ" کا جوہر رکھتے ہوں، ان کی نظر جزئیات سے زیادہ کلیات پر ہو، وسائل سے زیادہ مقاصد پر اور "فصل" سے زیادہ "وصل" کی اہمیت و ضرورت پر ہو، اخلاق عالیہ سے متصف، بے لوث اور بے غرض، جاہ طلبی اور حبِ دنیا سے امکانی حد تک دور ہوں، اور ان کا کسی درجہ میں "تزکیۂ نفس" ہو چکا ہو، وہ اس عظیم نوخیز اسلامی سلطنت کی اہمیت و نزاکت کو خوب سمجھتے ہوں جو اس غیر مسلم اکثریت سے (جس میں اب بھی اپنے سلطنت و اقتدار سے محرومی کا احساس باقی ہے، اور جس کے تعاون کے بغیر کوئی سلطنت قائم نہیں رہ سکتی) گھری ہوئی ہے، اور یہ کہ ان کو جس تیموری سلطنت کی خدمت و رہنمائی کا زریں اور تاریخی موقع ملا ہے، وہ اِس وقت ترکی کی عثمانی سلطنت کے بعد مملکت کی وسعت، وسائل کی کثرت، انسانی طاقت اور مذہبی جذبہ کی حکمرانی ہر لحاظ سے دنیا کی سب سے بڑی مسلم سلطنت ہے، اس لئے اس کی حفاظت، اس کا اسلام سے رشتہ قائم رکھنے، اس کے سربراہ کو ان نازک حالات میں اس "شیشہ و آہن" اور اس "پنبہ و آتش" کو جمع رکھنے میں مدد دینا وقت کی سب سے بڑی عبادت اور دین و ملک کی سب سے بڑی خدمت ہے۔

دوسری طرف ایسے ارکان سلطنت اور مشیران دربار کا مہیا ہو جانا ضروری تھا،

جو اس دین پر (جس کو بابر نے رانا سانگا (۹۳۳ھ) کے مقابلہ میں میدان جنگ میں منہیاتِ شرعیہ سے توبہ کرکے اور خدا سے بندگی کا عہد استوار کرکے سلطنت کی بنیاد بنا دیا تھا[۱]) خود بھی مستحکم عقیدہ رکھتے ہوں، اور بادشاہ کے لئے بھی اسی کو پسند کرتے ہوں، وہ ہر قسم کے ذہنی انتشار سے محفوظ اور ان تخریبی اور ملحدانہ تحریکوں سے دور ہوں، جو دسویں صدی میں ایران و ہندوستان میں پیدا ہوگئی تھیں، اور جو سلطنت و معاشرہ کا رابطہ کمزور کرنے والی، اعتقادی و اخلاقی انارکی پھیلانے والی تھیں، ان میں سلطنت کے نظم ونسق اور دستور سازی کی صلاحیت کے ساتھ اخلاقی بلندی، دینی استقامت اور مذہبی پابندی بھی پائی جاتی ہو۔

اگر یہ دونوں عنصر اکبر اور اس کی سلطنت کو میسّر آجاتے تو اس میں کوئی شبہ نہیں کہ یہ سلطنت مشرق میں حمایت اسلام اور خدمت دین کا وہی کردار ادا کرتی جو مغرب میں آل عثمان کی سلطنت نے ادا کیا بقول اقبال ؎

نہ تھے ترکان عثمانی سے کم ترکان تیموری

لیکن یہ بڑی بدقسمتی تھی کہ اکبر کو (اس کی اقبال مندی اور خوش نصیبی کے ساتھ) ان دونوں جماعتوں میں سے جو عنصر ملا وہ اتنا ہی نہیں کہ وہ اِس معیار پر پورا نہیں اترتا تھا بلکہ افسوسناک بات یہ ہے کہ وہ اس سلسلہ میں خدمت کے بجائے بدخدمتی، اکبر کو دین سے قریب کرنے کے بجائے اس کو دین سے دور، متوحش و متنفر بنانے اور ان مخالف اسلام دعوتوں اور تحریکوں سے دور رکھنے یا ان کے استئصال پر آمادہ کرنے کے بجائے اس کو ان دعوتوں اور تحریکوں کا علمبردار بلکہ ان کا رمز ونشان بنانے کی خدمت انجام دینے والے تھے۔

---

[۱] تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو تاریخ فرشتہ۔

علمائے دربار

ہم پہلے عنصر علمائے دربار کو پہلے لیتے ہیں، جن کا اکبر شروع سے غاشیہ بردار رہا تھا، اور جن پر اس نے سب سے زیادہ اعتماد کیا، اور جن کو خود بھی دربار میں سب سے پہلے تقرب حاصل ہوا، اور جو اسلام کے ایک بڑے عالم و مبصر حضرت عبداللہ بن مبارک کی نظر میں تین[۳] عناصر فساد میں سے ایک اہم عنصر ہیں ؎

وھل افسد الدین الا الملوک   واحبار سوء ورھبانھا

دین کو سلاطین، علمائے سوء اور زاہدان دنیا دار کے سوا کس نے بگاڑا ہے؟

ہم اس موقع پر بھی ملا عبدالقادر بدایونی کی شہادتیں نقل کرتے ہیں، جو خود ارکانِ دربار میں سے تھے، اور ان کے ان بیانات میں بھی جو انھوں نے ایک تاریخی شہادت کے طور پر خود اپنی جماعت اور رفقاء کے متعلق دیئے ہیں، ان کی کوئی ذاتی غرض اور عناد معلوم نہیں ہوتا، علمائے دربار کی تصویر کشی انھوں نے اس طرح کی ہے :۔

"عبادت خانہ میں ہر شب جمعہ کو سادات و مشائخ اور علماء و امراء کی طلبی ہوتی، آگے پیچھے بیٹھنے میں مشائخ و علماء سے نفسانیت کا اظہار ہوا، ہر ایک دوسرے سے آگے اور ممتاز جگہ بیٹھنا چاہتا تھا، بادشاہ نے اس مشکل کو اس طرح حل کیا کہ حکم دیا کہ امراء جانبِ مشرق بیٹھیں، سادات جانب مغرب، علماء جنوب میں، اور مشائخ شمال میں، بادشاہ خود ایک حلقہ میں آتا، اور مسائل کی تحقیق کرتا۔"[۱]

ملا صاحب لکھتے ہیں کہ ایک رات علماء بڑے زور زور سے بولنے اور بحث کرنے لگے،

---

[۱] منتخب التواریخ جلد دوم ص۲۰۲

بادشاہ کو اس سے تنغّص پیدا ہوا، اور اس نے اس کو بے تمیزی اور دنیا داری پر محمول کیا۔[۱]

بایک دیگر تیغ زباں کشیدہ در مقام	باہم دگر تیغ زبان کھینچ کر مدّمقابل ہوگئے
تنافی و تقابل بودند، و اختلاف بجائے	اختلاف یہاں تک بڑھ گیا کہ ایک
ایں رسید کہ تکفیر و تضلیل ہم دیگری نمودند،	دوسرے کی تکفیر و تضلیل پر اتر آئے
رگِ گردن علماءِ زماں برآمد، آوازہائے	اس وقت کے علماء کی گردنوں کی
بلند و دمدمہ بسیار ظاہر شد، ایں معنی	رگیں پھولی ہوئیں اور آوازیں بہت
برخاطرِ اشرف گراں آمدہ۔	بلند تھیں، اس بات سے خاطرِ اشرف پر گرانی ہوئی۔

اکبر نے اس پر آزردہ اور مکدّر ہو کر ملا عبدالقادر سے کہا کہ جو عالم اس مجلس میں بدتمیزی کا مظاہرہ کرے اسے وہاں سے اٹھا دیا جائے۔

اعلیٰ دینی عہدہ داروں میں ایک اہم رکن ملا عبداللہ سلطانپوری تھے[۲] جن کا عہدہ اور خطاب مخدوم الملک تھا، انھوں نے محض اس لئے کہ حج نہ کرنا پڑے فریضۂ حج کے اسقاط کا فتویٰ دیا تھا، زکوٰۃ کے سلسلہ میں بھی حیلۂ شرعی[۳] سے کام لیتے تھے، اور اس کی فرضیت سے بچ جاتے تھے، انھوں نے عہد اکبری اور اپنے عروج کے زمانہ میں اتنی دولت جمع کر لی تھی کہ سونے سے بھرے ہوئے چند صندوق ان کے آبائی قبرستان سے برآمد ہوئے، جنھیں مُردوں کے

---

[۱] ایضاً ص ۲۰۳ [۲] یہ سلطان پور مشرقی پنجاب میں جالندھر کے قریب ہے، ان کے تفصیلی حالات کے لئے ملاحظہ ہو "نزہتہ الخواطر" جلد ۵۔

[۳] یعنی حولان حول ہونے (ایک سال گزر جانے) سے پہلے وہ رقم جس پر زکوٰۃ فرض ہو رہی تھی، اہلیہ یا کسی دوسرے عزیز کو دے دیتے، وہ لینے کے بعد واپس کر دیتا، اس طرح وہ اس سال زکوٰۃ سے بچ جاتے کہ حولان حول کی شرط ہے، آئندہ سال بھی یہی عمل کرتے۔

بہانہ سے انھوں نے دفن کر دیا تھا۔[1]

مخدوم الملک کے بعد دوسرا درجہ صدر الصدور مولانا عبد النبی کا تھا[2] جو اس وقت ہندوستان کے سب سے بڑے عالم اور خاص طور پر فن حدیث کے ماہر سمجھے جاتے تھے، لیکن "منتخب التواریخ" کی بعض روایات سے اندازہ ہوتا ہے کہ ان کا علمی پایہ کچھ بلند نہ تھا، اور عربی کے بعض الفاظ کی تصحیح و تحقیق بھی پورے طور پر نہ تھی،[3] اکبر نے ان کو صدر الصدور کا عہدہ دیا، اور ان کو ایسا جاہ و جلال اور اختیار و اقتدار حاصل ہوا کہ ان کے سامنے اچھے اچھے ارکان سلطنت کا چراغ نہیں جلتا تھا، بادشاہ نے کئی بار اپنے ہاتھوں سے ان کو جوتے پہنائے، بڑے بڑے علماء شرف باریابی حاصل کرنے کے لئے گھنٹوں ان کے دروازے پر کھڑے رہتے، سارے ہندوستان کے علماء و مشائخ اور سجادہ نشینوں کو جاگیریں عطا کرنا، معافیاں دینا، اور وظائف جاری کرنا ان کا کام تھا، اور اس میں انھوں نے ایسی دریادلی سے کام لیا کہ پچھلی سلطنتوں میں بھی اس کی مثال ملنی مشکل ہے۔

لیکن ملا عبد القادر کے بیان کے مطابق (جو ان کے معاصر دوست اور شریک دربار تھے) معلوم ہوتا ہے کہ وہ علماء کے اعلیٰ اخلاق، اپنے خاندان کی بہترین روایات و خصوصیات بلکہ عام تہذیب اور موقع شناسی سے بھی عاری تھے، ممکن ہے کہ اس اعلیٰ عہدہ نے ان میں یہ تبدیلی

لہ ایک روایت ہے کہ ان قبروں سے تین کروڑ روپئے مالیت سونے کی اینٹیں برآمد ہوئیں۔

۲ہ شیخ عبد النبی شیخ احمد گنگوہی کے صاحبزادہ اور حضرت شاہ عبد القدوس گنگوہی کے پوتے تھے، لیکن علمائے حجاز سے حدیث کی تعلیم حاصل کرنے کی وجہ سے ان کو اپنے خاندانی مسلک وحدۃ الوجود اور سماع سے اختلاف ہو گیا تھا، اور ان کے تعلقات اپنے والد سے اچھے نہیں رہے تھے، حالات کے لئے ملاحظہ ہو "نزہۃ الخواطر" جلد ۵۔ ۳ہ علمائے حجاز بالخصوص علامہ شہاب الدین احمد بن حجر ہیتمی مکی جیسے اساتذۂ وقت سے علم حدیث حاصل کرنے اور صاحبِ تصنیف ہونے کے ساتھ یہ بات قرین قیاس نہیں معلوم ہوتی کہ وہ معمولی عربی الفاظ کو غلط (مثلاً مُجَمّر کو جس میں پہلے جیم منقوط ہے، مجمر جس میں پہلے حائے مہملہ ہے) پڑھیں، واللہ اعلم بالصواب"۔

پیدا کردی ہو، ان کا اخلاقی اثر بھی بادشاہ ارکان دربار پر اچھا نہیں پڑتا تھا، ملا عبدالقادر ان کو اپنے عہدہ ورسوخ کا غلط استعمال کرنے اور اس سے ناجائز فائدہ اٹھانے کا الزام دیتے ہیں، وہ لکھتے ہیں کہ "انھوں نے سارے ہندوستان کے مذہبی جاگیرداروں کو دوڑانا شروع کیا، لوگ شیخ کے وکیلوں ان کے فراشوں ودربانوں، سائیسوں، حلال خوروں (مہتروں) تک کو رشوت دینے پر مجبور ہو گئے کہ اس کے بغیر کاربرآری نہیں ہوتی تھی[۱]"

امر بالمعروف ونہی عن المنکر اور دینی احتساب کرنے میں وہ حکمت وموقع ومحل کی رعایت سے بالکل کام نہیں لیتے تھے، اور بعض اوقات خود بادشاہ اس کی زد میں آجاتا تھا، "مآثر الامراء" کی ایک روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ "اکبر کی ایک سالگرہ کے موقعہ پر امراء، علماء ومشائخ بادشاہ کو مبارکباد دے رہے تھے، بادشاہ کے بدن پر زعفرانی رنگ کا لباس تھا، شیخ نے اس لباس پر اعتراض کیا، اور دوسرا لباس پہننے کی تاکید کی، لیکن یہ تاکید اس جوش سے کی کہ ان کے عصا کا سرا بادشاہ کے لباس شاہی کو جا لگا، بادشاہ نے اس کو برداشت کر لیا لیکن اس کو بڑی سخت ہتک محسوس ہوئی، اور جب وہ حرم میں گیا تو اپنی والدہ سے شیخ کی شکایت کی، والدہ نے جو ایک بزرگ خاندان کی بیٹی تھیں بادشاہ کو سمجھایا کہ اس وقت اس کا یہ تحمل تاریخ میں اس کے مناقب میں لکھا جائے گا کہ ایک عالم نے جو رعیت میں سے تھا، جہاں پناہ کو عصا مارا اور وہ محض شریعت کے احترام میں خاموش رہا[۲]"

اس کے علاوہ مصیبت یہ پیش آئی کہ مخدوم الملک اور شیخ عبدالنبی دونوں ایک دوسرے کے حریف ورقیب ہو گئے، مخدوم الملک شیخ عبدالنبی کو الزام دیتے تھے، اور شیخ عبدالنبی مخدوم الملک کی تجہیل وتکفیر کرتے تھے، اور ان کے حامی ایک دوسرے کے صف آرا بن جاتے

۱؎ منتخب التواریخ جلد ۲ ص۲۰۵ ۲؎ مآثر الامراء جلد ۲ ص۵۶۱

تھے، مخدوم الملک اور صدر شیخ عبدالنبی کے حالات سے (اگر وہ بالکل اسی طرح ہیں، جو تاریخ میں آئے ہیں) اندازہ ہوتا ہے کہ یہ دونوں حضرات علم و حکمتِ دینی اور تہذیب اخلاق و تزکیۂ نفس کسی لحاظ سے اس نازک زمانہ (عہدِ اکبری) اور اس اہم اور پیچیدہ ماحول (دربارِ اکبری) میں دین کی صحیح نمائندگی اور نیابت رُسُل کے کام کے لئے موزوں نہ تھے، اس کے لئے اگر سلیمان بن عبدالملک خلیفہ اموی کے مشیر و وزیر رجاء بن حیوۃ اور خلیفہ ہارون رشید کے دینی مشیر و قاضی القضاۃ قاضی ابویوسف کے درجہ کا عالم و متقی اور فرزانہ و مدبر نہ ہوتا تو کم سے کم عبدالعزیز آصف خاں اور قاضی شیخ الاسلامؒ جیسے صاحب کمال، عالی دماغ اور زاہد و متقی مشیر سلطنت ہوتے، اکبر کے دربار میں جیسا کہ آگے آئے گا' ایران و ہندوستان کے جو ذہین و متبحر علمائے معقولی اور ادیب جمع ہو گئے تھے، ان کا مقابلہ کرنے کے لئے ان دونوں سے کہیں بہتر صلاحیتوں، دین و شریعت کے نمائندوں اور سلطنت کے مذہبی محافظوں اور مشیروں کی ضرورت تھی۔

اکبر نے جو (ملا عبدالقادر کے بیان کے مطابق) ان علماء کو جو اس کے عہد کی زینت تھے، غزالی و رازی سے بہتر سمجھتا تھا، جب ان کی یہ سخیف حرکتیں دیکھیں تو علمائے سلف کو بھی انھیں پر قیاس کر کے سرے سے علماء ہی کا منکر ہو گیا۔

ارکان سلطنت و مشیران دربار

ارکان سلطنت کے بارے میں اکبر کی بدقسمتی علمائے دربار سے کم نہ تھی، علم و ثقافت سے سادہ لوح ہونے کی بنا پر اس پر ہر زبان آور ذہین و طبّاع کا جادو چل جاتا تھا، خاص طور پر جب وہ ولایت (ایران) سے آیا ہو، جس کو ہندوستان و افغانستان کے رہنے والے یونان کا

لہ ان دونوں کے حالات کے لئے ملاحظہ ہو یاد ایام (تاریخ گجرات) از مولانا حکیم سید عبدالحی صاحب حسنی مرحوم

درجہ دیتے تھے، اسی زمانہ میں جب اکبر کے قدم دین کے میدان میں لڑکھڑا رہے تھے، ایران سے تین بھائی حکیم ابوالفتح گیلانی، حکیم ہمایوں (حکیم ہمام) اور نورالدین قراری آئے، اور دربار میں اونچی جگہ پائی، کچھ عرصہ کے بعد ملا یزدی ولایت سے آئے اور صحابۂ کرام کے حق میں بیباکانہ زبانِ طعن کھولی، حکیم ابوالفتح نے قدم آگے بڑھایا اور حقائق دینی (وحی، نبوت، معجزات) وغیرہ کا برملا انکار کیا[1]، اسی عرصہ میں شریف آملی کی ایران سے آمد ہوئی، جو (جیسا کہ اوپر کہا گیا) محمود بسیخوانی کے نقش قدم پر تھا، اور ملحدانہ عقائد رکھتا تھا۔

ان ایرانی فضلاء و اہل کمال کے علاوہ اعتقادی تزلزل اور ذہنی انتشار کے اسی دور میں کالپی کا رہنے والا ایک حاضر جواب علم مجلسی میں کمال رکھنے والا اور بذلہ سنج اور لطیفہ گو ہندو برہم داس نامی دربار میں داخل ہوا اور بہت جلد بادشاہ کے مزاج میں دخیل اور دربار میں کرسی نشیں ہو گیا، اور مصاحب خاص کا اعزاز پاکر راجہ بیربر کے نام سے مشرف و مفتخر ہوا[2]، اس نے ہوا کا رخ دیکھ کر مذہبی معاملات میں اور نازک اسلامی عقائد و مسائل میں بیباکانہ اور استہزائی رویہ اختیار کیا، اور چونکہ یہی "سکۂ رائج الوقت" تھا، اس لئے ہر طرف سے داد پائی، بادشاہ کے مزاج کو دین کے معاملہ میں غیر سنجیدہ بنانے میں اس کو بھی بڑا دخل ہے[3]۔

ملا مبارک اور ان کے فرزند فیضی و ابوالفضل

اس پر طرفہ یہ ہوا کہ دربار میں ملا مبارک ناگوری کی آمد و رفت شروع ہوئی[4]، اور اس کے

---

[1] منتخب التواریخ جلد ۲ ص ۲۱۱ [2] راجہ بیربل کے اخلاق و کیرکٹر کا اندازہ کرنے کے لئے ملاحظہ ہو دربار اکبری از محمد حسین آزاد ص ۳۳۶ تا ۳۸۳ [3] تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو منتخب التواریخ جلد ۲ ص ۱۶۱

[4] ابوالفضل نے اکبر نامہ میں ملا مبارک کے اول مرتبہ دربار میں پہونچنے کو بارہویں سال کے واقعات میں بیان کیا ہے۔

دونوں بیٹوں فیضی اور ابوالفضل کو بادشاہ کے مزاج میں ایسا درخور اور دربار میں ایسا اعزاز حاصل ہوا جو اس سے پہلے کسی کو حاصل نہ ہوا تھا، ملا مبارک اور ابوالفضل، فیضی تینوں کے حالات کا غیر جانبدارانہ مطالعہ کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ نہ صرف ہندوستان بلکہ اپنے عہد کے نہایت ذکی، اعلیٰ علمی استعداد اور تبحر رکھنے والے، علوم عقلیہ وادبیہ پر حاوی، فارسی کے شاعر و انشا پرداز، غرض یہ کہ اس زمانہ کے نظام تعلیم، طرز تدریس و تحقیق اور رائج و مقبول علوم وفنون کے لحاظ سے لائق فاضل و "دانشمند" تھے، اگر اس تبحر و تفنن علمی ذہن کی درّاکی، طبیعت کی موزونیت اور زبان وقلم کی ہم زبانی کے ساتھ، ان باپ بیٹوں میں دین میں استقامت رسوخ فی الدین، خدا ترسی و آخرت کوشی اور اخلاص وللّٰہیت بھی ہوتا تو وہ اس عہد کی ایسی خدمت انجام دے سکتے تھے، اور اس کو وقت کے فتنوں سے محفوظ رکھ سکتے تھے، جس کی نظیر ملنی مشکل ہوتی، لیکن ان کے حالات اور خود ابوالفضل وفیضی کے تصنیفات کے مطالعہ سے حسب ذیل حقائق کا علم ہوتا ہے:۔

(۱) ملا مبارک (جو اس مثلّث کا نقطۂ آغاز تھے) کی طبیعت میں بے چینی اور دماغ میں فطرتاً شورش تھی، مذاہب اربعہ اور ان کے اختلافات سے واقف ہونے کے بعد ان کے اندر بجائے جمع وتطبیق اور تاویل وتوجیہ کے سب سے انکار و بیزاری کا رجحان پیدا ہو گیا، اور وہ اس پورے فقہی ذخیرے، اسلاف کی محنت سے بے اعتقاد ہو گئے، ادھر شیراز کے مشہور فاضل معقولات ابوالفضل گازرونی کے حلقہ میں شریک ہو کر ان پر تفلسف کا غلبہ ہوا، بجائے مشائخ وائمہ فن سے سلوک وتزکیہ میں کسب فیض کرنے اور مکائد شیطان اور امراض نفس سے واقف ہونے کے تصوف واشراق کی کتابوں کا براہ راست مطالعہ کر کے غلط فہمی میں مبتلا ہو گئے اور ان سب کوچوں سے گزرنے کے بعد ان کے اندر ایک تلوّن وانتشار پیدا ہو گیا، اور ان میں ہر رنگ میں

رنگ جانے اور "چلو تم ادھر کو ہوا ہو جدھر کی" پر عمل کرنے کی صلاحیت پیدا ہو گئی۔ حضرت خواجہ باقی باللہ کے صاحبزادہ خواجہ کلاں جن کی تربیت شیخ مبارک کی بیٹی کے گھر میں ہوئی تھی[1] ان کے متعلق لکھتے ہیں:-

دربہر عصر ہم مشرب و مذہب شعار	ہر زمانے کا وہ مروجہ مذہب و مشرب
وقت خودمی ساخت کہ ملوک و امرائے عصر	اپنا لیتے تھے جس سے امراء و ملوک
بداں مذہب رغبت داشتند[2]	بھی رغبت رکھتے تھے۔

سر ولیزلی ہیگ لکھتا ہے کہ "شیخ مبارک مختلف ادوار میں سنی، شیعہ، صوفی اور مہدوی کے علاوہ خدا جانے کیا کیا رہ چکا تھا۔"[3]

(۲) طبیعت میں حوصلہ مندی اور جاہ طلبی تھی، اس لئے علم و درس کے محدود دائرہ میں محبوس رہنا ان کی مواج طبیعت کو گوارہ نہ ہوا، ان کو سرکار دربار پر اپنے علم و ذہانت کا سکہ بٹھانے کا شوق ہوا، اور وہ اکبر کے سایہ میں (جو سایۂ ہما کی طرح سمجھا جانے لگا تھا) آ گئے اور خود تو نہیں لیکن اپنے دونوں بیٹوں کو دخیل بنا دیا۔

(۳) ایسا معلوم ہوتا ہے کہ علمائے زمانہ (اور خاص طور پر مخدوم الملک اور شیخ عبدالنبی جو دربار پر حاوی تھے) نے ان کو وہ مقام نہیں دیا تھا جس کے وہ اپنی ذہانت اور فضیلت کی بنا پر اہل تھے، اور ان کے بعض عقائد و خیالات اور تلون مزاجی کی بنا پر ان کی دینی حلقوں میں مخالفت کی گئی یا ان سے بے اعتنائی برتی گئی، اس کا زخم ان کے دل پر گہرا لگا، مولوی محمد حسین آزاد

---

[1] خواجہ کلاں نے حضرت خواجہ حسام الدین کے گھر میں تربیت پائی تھی، خواجہ حسام الدین کی اہلیہ ملا مبارک کی دوسری بیٹی تھیں (تاریخ ہندوستان جلد ۵ ص۹۴۷) [2] مبلغ الرجال ورق ۳۳ الف

[3] کیمبرج ہسٹری آف انڈیا جلد ۴ ص۱۸۱

کے ادیبانہ الفاظ میں "شیخ مبارک نے ان لوگوں کے تیرِ ستم بھی اتنے کھائے کہ دل چھلنی ہو رہا تھا شیخ (ابو الفضل) اور شیخ کے باپ ملا مبارک نے مخدوم اور صدر وغیرہ کے ہاتھوں برسوں تک زخم کھائے تھے، جو عمروں میں بھرنے والے نہ تھے"[1] دوسری جگہ لکھتے ہیں "شیخ مبارک پر جو جو مصیبتیں مخدوم کے ہاتھوں گزری تھیں، بیٹوں کو بھولی نہ تھیں، انھوں نے ان کے تدارک کی فکر کرکے اکبر کے کان بھرنے شروع کئے اور اکبر کے خیالات بھی بدلنے لگے"[2] مولوی محمد حسین آزاد، آزاد خیال ہونے کے باوجود بھی لکھتے ہیں کہ "فیضی اور ابو الفضل کا معاملہ ان کے باپ کی طرح گومگو رہا"۔

علماء کی اس مخالفت اور زمانہ کی اِس ناانصافی نے اس پورے گھرانہ کے اندر "احساس کہتری" پیدا کر دیا، جو مختلف شکلوں میں اور اکثر اوقات "احساس برتری" کی شکل میں ظاہر ہوا کرتا ہے، اور انھوں نے یہ ثابت کر دیا کہ ان کے علم و ذہانت کے سامنے کسی کا چراغ جل نہیں سکتا، اِس کوشش میں اسلام اور پورا دینی نظام زد میں آگیا، یہاں تک کہ جب سب چراغ ان دونوں بھائیوں کے علم و ذہانت کے چراغ کے سامنے گُل یا ماند پڑ چکے تھے، اور اس مملکت میں انھیں کا طوطی بول رہا تھا لیکن اس کے ساتھ ہی چمنِ اسلام ان کی آنکھوں کے سامنے جل رہا تھا تو (ملا عبد القادر کے بیان کے مطابق) ابو الفضل کی زبان پر یہ دو شعر تھے، جو بالکل حسب حال تھے ؎

آتش بدو دست خویش در خرمن خویش — چو خود زدہ ام چہ نالم از دشمن خویش

کس دشمن من نیست منم دشمن خویش — اے وائے من و دست من و دشمن خویش

ملا مبارک کے دو لائق و باکمال فرزند تھے، ابو الفیض فیضی (ولادت سنہ ۹۵۴ھ) اور ابو الفضل علامی (ولادت سنہ ۹۵۸ھ)۔

---

[1] دربار اکبری ص ۴۹-۵۰
[2] ایضاً ص ۳۸۹

فیضی علوم ادبیہ میں کمال رکھتا تھا، اور اس کی فارسی شاعری اور اس کے استاد ہونے میں دو رائیں نہیں، مولانا شبلی نے "شعر العجم" میں صحیح لکھا ہے کہ "فارسی شاعری نے چھ سو برس کی وسیع مدت میں ہندوستان میں صرف دو شخص پیدا کئے جن کو اہل زبان کو بھی چار و ناچار ماننا پڑا خسرو اور فیضی"۔

"فیضی کو خواجہ حسین مروی سے تلمذ تھا، اور اس نے ہر فن میں کمال پیدا کیا، ۹۷۴ھ ۱۲ جلوس میں وہ دربار میں پہونچا اور شان نوازش سے بہرہ یاب ہوا فیضی کا تقرب روز بروز بڑھتا گیا لیکن اس نے دربار کی کوئی خدمت اختیار نہیں کی، طبیب تھا مصنف تھا، شاعر تھا، اور انھیں مشغلوں میں بسر کرتا تھا شہزادوں کی تعلیم و تربیت کا کام بھی اس سے متعلق تھا، چنانچہ ۱۲ جلوس میں شہزادہ دانیال کی تعلیم و تربیت سپرد ہوئی، اور تھوڑے ہی دنوں میں فیضی نے اس کو ضروری مراتب سکھا دیئے، اِس سن میں اکبر نے اجتہاد و امامت کے دعوی سے مسجد میں جاکر خطبہ پڑھا۔ خطبہ فیضی نے لکھا تھا، اکبر نے شیخ عبد النبی کا زور توڑ کر صدارت کے ٹکڑے کر دیئے تھے، چنانچہ ۹۹۰ھ میں آگرہ، کالنجر اور کالپی کی صدارت فیضی کو دی گئی، ۹۹۳ھ میں جب یوسف زئی پٹھانوں پر اکبر نے فوجیں بھیجیں تو فیضی بھی اس مہم میں مامور کیا گیا، ۹۹۶ھ میں جو اکبر کی تخت نشینی کا ۳۳واں سال تھا فیضی کو ملک الشعراء کا خطاب ملا، ۳۶ جلوس مطابق ۹۹۹ھ میں فیضی کو خاندیس کی سفارت پر متعین کیا گیا، اور اس نے بڑی کامیابی سے یہ خدمت انجام دی، صفر ۱۰۰۴ھ ۴۰ جلوس میں انتقال کیا"۔[1]

ادبی تصنیفات سنسکرت کے تراجم اور منظومات اور دیوان کے علاوہ اس کی سب سے مشہور تصنیف "سواطع الالہام"[2] ہے، جو قرآن مجید کی غیر منقوط تفسیر ہے، دو سال کی مدت

---

[1] ملخص از شعر العجم حصۂ سوم (ص ۲۸-۴۲) [2] فیضی نے یہ تفسیر جس میں اس کی پابندی کی ہے کہ کوئی نقطہ والا (باقی صفحہ ۹۷ پر)

میں ۱۰۰۲ھ میں مکمل ہوئی، اکبر نے اس کے صلہ میں فیضی کو دس ہزار روپے دیئے[۱]، فیضی کو اس تصنیف پر ناز تھا، اور اس سے عربی زبان و لغت پر اس کی قدرت کا اندازہ ہوتا ہے، بدایونی اختلاف مذہبی کے باوجود اس کے کمال علمی اور تبحر کی شہادت دیتے ہیں، لکھتے ہیں :۔

در فنون جزئیہ از شعر و معمہ و عروض و	فنونِ جزئیہ یعنی شعر و معمہ، عروض و
قافیہ و تاریخ و لغت و طب و انشاء	قافیہ، تاریخ و لغت، طب و انشاء
عدیل در روزگار نداشت۔	میں یکتائے روزگار تھا۔

کتابوں کا نہایت شائق تھا، ایک گراں مایہ کتب خانہ جمع کیا تھا، جس میں ۴ ہزار ۶ کتابیں تھیں، اور اکثر خود مصنف کی یا اس کے زمانہ کی لکھی ہوئی تھیں۔

ملا عبدالقادر بدایونی اور اس زمانہ کے وہ تمام لوگ جن کے دل میں اسلام کی حمیت تھی،

(باقی ص۹۶ کا) حرف نہ آنے پائے، اور جس کی اس کے زمانہ اور اس کے زمانہ کے بعد دھوم مچ گئی، اپنی قابلیت کا ثبوت اور اس الزام کی تردید میں لکھی کہ اس کو علوم دینیہ سے اشتغال نہیں ہے، لیکن اس کام سے اس کی عربی زبان پر قدرت کا کتنا ہی اظہار ہو اس میں کوئی علمی و عملی افادیت نہیں، یہ ایسا ہی ہے جیسے بعض خطاط چاول پر قل ہو اللہ لکھ کر اپنی باریک نویسی اور خطاطی کا ہنر ظاہر کرتے تھے، اس تکلف کی وجہ سے تحریر میں نمک اور کلام میں کوئی لطف اور رونق نہیں ہے۔

شائد اس سے زیادہ مفید اور قابل قدر علمی کارنامہ وہ قرار پائے گا جو اسی زمانہ کے ایک شامی عالم محمد بدرالدین معروف بابن الغزّی الدمشقی (م ۹۸۴ھ) نے انجام دیا، انھوں نے قرآن مجید کی تفسیر ایک لاکھ اسی ہزار اشعار میں کی، اس کا ایک منظوم خلاصہ بھی تیار کیا، اور اس کو سلیمان اعظم کی خدمت میں پیش کیا، سلیمان نے علماء کو دکھایا کہ اس میں کوئی چیز جمہور کے عقیدہ کے خلاف یا تحریف کی تو نہیں ہے، علماء نے اس کی تصدیق و تعریف کی سلیمان نے اس پر مصنف کو بڑا انعام دیا، الکواکب السائرہ نجم الدین الغزی نیز البدر الطالع بمحاسن من بعد القرن السابع للعلامہ محمد بن علی الشوکانی الیمنی صاحب نیل الاوطار (م ۱۲۵۰ھ) جزء ثانی ترجمہ محمد بن محمد الغزی ص ۲۵۲)

[۱] مآثر الامراء جلد ۲ ص ۵۸۷

اور عہد اکبری کی اس صورت حال سے سخت مغموم و بیزار تھے، اس بات پر متفق ہیں کہ فیضی بھی اپنے والد کی طرح عقائد میں تزلزل اور ذہنی انتشار میں مبتلا تھا، اور اس کو اکبر کو لامذہب و ملحد بنانے میں خاص دخل ہے، مولانا عبدالقادر نے "منتخب التواریخ" میں فیضی کی جو تصویر کھینچی ہے، اس میں سے مبالغہ اور انشاء پردازی کے حصہ کو نکالنے کے بعد بھی اس کی آزاد خیالی میں کوئی شک باقی نہیں رہتا، مولانا شبلی نے "شعر العجم" میں اس کی طرف سے پورا دفاع کیا ہے، پھر بھی لکھتے ہیں کہ "بایں ہمہ وہ فراخ مشرب اور آزاد خیال تھا، اور جانتا تھا کہ متعصب مولویوں نے مذہب کی جو صورت بنا رکھی ہے، وہ اسلام کی اصل تصویر نہیں، شیعہ سنیوں کے جھگڑوں کو وہ اصل مذہب سے غیر متعلق سمجھتا تھا، ان خانہ جنگیوں کی ہنسی اڑاتا تھا" پھر مولانا نے اس کی عرضداشت کے چند اقتباسات پیش کئے ہیں، جن میں تمسخر اور استہزاء کا انداز ہے[1]، مولانا لکھتے ہیں کہ "فیضی اور ابوالفضل نے علمی مجلسیں قائم کرائیں جن میں درباریوں کو علانیہ نظر آیا کہ ان متعصبوں کے پاس لعن و تکفیر کے سوا کوئی اوزار نہیں"۔

معلوم ہوتا ہے کہ فیضی کی زندگی ہی میں اس کے ملحدانہ خیالات کی شہرت ہو گئی تھی، لوگوں نے اس کی وفات کی جو تاریخیں نکالی ہیں، اس سے اسی کا اظہار ہوتا ہے، اس کے انتقال کی روایت بھی بڑی عبرت انگیز ہے[2]۔

ابوالفضل بھی اپنی ذہانت، طبّاعی اور تفنن علمی میں نوادر روزگار میں سے تھا، اور جس طرح اس کے بڑے بھائی فیضی کو شاعری میں دستگاہ کامل حاصل تھی، وہ تحریر و انشا پردازی میں ید طولیٰ رکھتا تھا، اکبر نامہ جلد سوم صفحہ ۸۴-۸۳ میں وہ لکھتا ہے کہ کمسنی ہی میں اپنی خود بینی اور

---

[1] شعر العجم حصہ سوم صفحہ ۴۹-۵۰ [2] منتخب التواریخ جلد ۲ صفحہ ۴۰۶-۴۰۵ فیضی کے مذہب پر تبصرہ مولوی محمد حسین آزاد کے قلم سے دربار اکبری صفحہ ۴۷۱ پر ملاحظہ ہو۔

خوشتن آرائی ظاہر بینی اور تقلید کے خلاف اس کو جنون پیدا ہو گیا تھا۔[۵۱]

۹۸۱ھ میں وہ آگرہ میں دربار میں باریاب ہوا، اور اس نے آیۃ الکرسی کی تفسیر بادشاہ کو پیش کی، پھر ۹۸۲ھ میں سورۃ الفتح کی تفسیر کا ہدیہ گزرانا اس وقت اس کا تقرب برابر بڑھتا گیا، یہاں تک کہ وزارت جلیلہ و وکالت مطلقہ کے منصب پر سرفراز ہوا، اس کا سب سے بڑا کارنامہ "آئین اکبری" ہے، "آئین اکبری" کو تیموری دور کے ملکی، حربی، صنعتی، زراعتی، اقتصادی، معاشرتی، تمدنی، خانگی، علمی اور مذہبی حالات و واقعات کا آئینہ سمجھنا چاہیئے، اس کی دوسری مایہ ناز تصنیف "اکبر نامہ" ہے،[۵۲] جو ہندوستان کے تیموری سلاطین کے حالات پر مشتمل ہے، اس کے علاوہ انشائے ابوالفضل کے نام سے اس کے خطوط کا مجموعہ اور دوسری تصنیفات ہیں، ۱۰۱۱ھ میں جہانگیر کے اشارہ سے بر سنگ دیو نے اس کو قتل کر دیا، اکبر کو اس کا بڑا رنج ہوا اور اس نے آنسو بہائے۔

ڈاکٹر محمد باقر اپنے مضمون "ابوالفضل" مشمولہ اردو دائرہ معارف اسلامیہ میں لکھتے ہیں:۔

> "ابوالفضل نے اکبر کے مذہبی عقائد میں اچھا خاصا دخل پیدا کیا، چنانچہ جب اکبر نے ۹۸۲ھ ۱۵۷۵ء میں فتح پور سیکری میں مذہبی علماء کے مباحثے سننے کے لئے عبادت خانہ قائم کیا، تو ابوالفضل علماء کے ان باہمی مباحثوں میں شریک ہوتا اور ہمیشہ اکبر کے عقائد کی طرفداری کرتا، یہاں تک کہ اس نے اکبر کو یہ سمجھایا کہ مذہب کے متعلق اس کے نظریات معاصر علماء سے کہیں افضل اور برتر ہیں اور ۱۵۷۹ء میں دربار شاہی سے ایک محضر جاری کیا، اس کی رو سے مذہبی علماء کے اختلافات

---

[۵۱] بزم تیموریہ ص ۱۶۳   [۵۲] اکبر نامہ کے متعلق مشہور فرانسیسی فاضل کارا ڈی واکس لکھتا ہے کہ "وہ ایک ایسی علمی دستاویز ہے، جس پر مشرقی تمدن کو فخر کرنے کا حق حاصل ہے، جن انسانوں کی ذہانتوں نے اس ضخیم کتاب کے ذریعہ اپنا تعارف کرایا ہے، وہ حکومت اور انتظام کے فن میں اپنے زمانہ سے بہت آگے معلوم ہوتے ہیں۔"

CARRA DE VAUX ; LES PENSEURS DE L'ISLAM _ PARIS 1921

نپٹانے کے لئے آخری حکم اکبر کو بنا دیا گیا، عبادت خانہ کے مناظروں کے درمیان ہی میں اکبر کو ایک نیا مذہب ایجاد کرنے کا شوق چرّایا، اور اس نے ۱۵۸۲ء میں دین الٰہی کی بنیاد رکھی، اسے ابوالفضل نے بھی قبول کیا۔[۱]

"مآثر الامراء" میں ہے کہ جنت مکانی یعنی جہانگیر بادشاہ خود لکھتا ہے کہ "شیخ ابوالفضل نے میرے والد کو یہ ذہن نشین کرا دیا تھا کہ جناب ختمی پناہ میں بڑی فصاحت تھی، قرآن انھیں کا کلام ہے، اس لئے جب وہ دکن سے آرہا تھا، تو میں نے نرسنگھ دیو سے کہا کہ وہ اس کو قتل کردے، اس کے بعد میرے والد اس عقیدہ سے باز آگئے۔"[۲]

لیکن اس بارہ میں سب سے معتبر شہادت خود ابوالفضل کی ایک عبارت ہے، اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس نے اپنے علم و ذہانت سے کام لے کر بادشاہ کی خواہشات کو علمی جامہ پہنانے اور اس کو علمی اسلحہ فراہم کرنے اور اکبر کو فرمانروائے سلطنت کی سطح سے امام زماں اور ہادئ دوراں کے منصب رفیع تک پہونچانے میں جو کردار ادا کیا تھا،[۳] اس پر اس کا ضمیر مطمئن نہیں تھا، اور وہ کبھی کبھی اپنی زندگی و بیداری کا ثبوت دیتا تھا، وہ اپنے ایک خط میں جو اُس نے خانخاناں کو لکھا ہے، اپنے بارہ میں لکھتا ہے:۔

"و شمۂ از آلام و اسقام این قصۂ پر غصہ کہ راقم سطور	اس دردناک کہانی کا ایک معمولی المیہ یہ ہے کہ
در ہاویۂ مشاغل لایعنی منہمک شدہ از عبد اللّٰہی	راقم سطور مشاغل لایعنی کے جہنم میں پھنس کر بندۂ خدا

---

[۱] اردو دائرہ معارف اسلامیہ جلد ۱ ص ۸۸۹-۸۹۰ [۲] ص ۶۱۷، سید صباح الدین عبد الرحمٰن صاحب لکھتے ہیں کہ "تزک جہانگیری" کے نولکشور ایڈیشن میں تو جہانگیر کا یہ بیان نہیں ہے، لیکن تزک جہانگیری کے اس انگریزی ترجمہ سے اس کی تصدیق ہوتی ہے، جو میجر ڈیوڈ پرائس نے کیا تھا ص ۵۳-۵۴ (بزم تیموریہ ص ۱۶۶)

[۳] ابوالفضل اپنی تصنیفات میں اکبر کے لئے امام معصوم، خلیفۃ اللہ، واقف اسرار خفی و جلی اور قاسم ارزاق بندگانِ الٰہی کے جیسے مبالغہ آمیز الفاظ بے تکلف استعمال کرتا ہے، اور ان خوارق و کرامات کی نسبت کرتا ہے، جو اس کو مافوق الفطرت انسان ثابت کرتی ہیں۔ (ملاحظہ ہو مقدمہ مہابھارت فارسی)

بعبد الطبعی درآمد، در شرف آں شد کہ عیاذاً باللہ از عبد اللّٰہی بعبد الدراہمی والدنانیری موصوف گردد در قید عبارت در آوردہ ماتم زدگی خود را ظاہر سازد ولکن از تردد آں محاربات ناقصانہ بے توزکانہ کہ در فطرت و طبیعت درین سی و چہار سال دنیا خصوصاً درین دوازدہ سال کہ در کشمکش ابنائے زمان افتادہ است نہ قدرت شکیب و نہ قوت گریز و نہ طاقت پرہیز دارد بعبارت درآوردہ اعلام آں استظہار الانامی نماید

کے مرتبہ سے گر کر بندۂ فطرت ہو گیا اور اس کے قریب پہونچ گیا کہ خدا کی بندگی کے بجائے بندۂ درہم و دینار کہا جانے لگے...... وہ اس تحریر میں اپنا غم ظاہر کر رہا ہے اور سمجھتا ہے کہ دنیا میں گزرے ہوئے ان تینتالیس (۴۳) برسوں کی احمقانہ دوڑ دھوپ اور خصوصاً اس بارہ سالہ کشمکش سے جو ابنائے زمانہ کی صحبت میں رہی مجھ میں نہ طاقت صبر ہے نہ قوت گریز و پرہیز میں اس چیز کو قید تحریر میں لا کر اس کا

صبرے نہ کہ از عشق بہ پرہیزم من — بختے نہ کہ با دوست درآمیزم من
دستے نہ کہ با قضا آویزم من — پائے نہ کہ از میانہ بگریزم من [1]

راجپوت رانیوں کا اثر

اکبر کے لئے ایک بڑی آزمائش کی بات اور اسلام سے اس کے مزاج کے منحرف ہونے کا ایک قوی سبب یہ تھا کہ اس نے استحکام سلطنت کے لئے راجپوت راجاؤں کے ساتھ رشتے ناطے کئے اور ان کا اعلیٰ ترین مناصب پر تقرر کیا اور ان کا پورا اعتماد حاصل کرنے اور ان کو شیر و شکر کرنے کے لئے بہت سے ایسے کام کئے جو اس کے پیشرو سلاطین نے ابھی تک نہیں کئے تھے، مثلاً ذبح گاؤ کی ممانعت، آفتاب کے رخ بیٹھ کر جھروکا درشن، ڈاڑھی منڈوانا، بھدرا کروانا، قشقہ لگوانا، ہندو رانیوں کے ساتھ مل کر تمام ہندوانہ رسموں میں حصہ لینا، اکبر کی ایک بیوی راجہ بہاری مل کی بیٹی اور راجہ بھگوان داس کی بہن تھی، دوسری جودھ بائی جودھ پور کی رانی .... ان ہندو رانیوں کا اور ان کے واسطہ اور رشتہ سے ان کے بھائیوں اور عزیزوں کا اکبر پر خاصا اثر تھا، اور یہ بالکل قدرتی بات تھی، دین کے ایوان میں سب سے پہلا

[1] انشائے ابو الفضل دفتر دوم ص۱۰۱ (لکھنؤ ۱۸۸۳ء)

تزلزل جو واقع ہوا، وہ اسی تعلق کا نتیجہ تھا۔

اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ متھرا کے قاضی عبدالرحیم نے ایک مسجد کی تعمیر کے لئے سامان جمع کیا، لیکن قریب کے ایک برہمن نے راتوں رات وہ سامان اٹھا کر مندر کی تعمیر میں لگا دیا، جب مسلمانوں نے اس سے باز پرس کی تو وہ اسلام اور سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کی شان میں گستاخیاں کرنے لگا، قاضی عبدالرحیم نے شیخ عبدالنبی صدر الصدور کی عدالت میں مرافعہ کیا، شیخ عبدالنبی نے اس کی طلبی کا فرمان جاری کیا، تحقیق سے واقعہ کی تصدیق ہوئی، اور صدر الصدور نے سزائے موت کا حکم جاری کیا، لیکن وہ برہمن، رانی جودھ بائی کا پروہت تھا، رانی اکبر پر دباؤ ڈال رہی تھی کہ وہ اس برہمن کو سزا سے بچالے، بادشاہ عدالتی کارروائی میں مداخلت، اور صدر الصدور کو ناراض نہیں کرنا چاہتا تھا، صدر الصدور نے سزا کا نفاذ کیا، لیکن یہ معاملہ بجائے ختم ہونے کے اور بھی نازک صورت اختیار کر گیا، اور بقول بدایونی:۔

> "دختران راجہائے عظیم ہند نے بادشاہ کے کان بھرے کہ اس نے ملاؤں کو ایسا سر چڑھالیا کہ وہ منشاء سلطانی کی بھی پروا نہیں کرتے، دربار میں یہ سوال اٹھا کہ مذہب حنفی میں شاتم رسول کی سزا موت نہیں ہے، اس لئے یہ اقدام اس مذہب کے بھی خلاف ہے، جس کا قانون اس ملک میں چلتا ہے۔"

محضر اجتہاد و امامت

یہی موقعہ تھا جب ملا مبارک نے بادشاہ کی دستگیری کی اور وہ اہم اور تاریخی محضر تیار کیا، جو اکبر اور اس کی مملکت کے رُخ کے پھیرنے میں سنگ بنیاد ثابت ہوا، اور جو ذہنی و تہذیبی ارتداد کے پورے قصر کا صدر دروازہ کہا جا سکتا ہے[1]، اس محضر میں صاف صاف کہا گیا ہے کہ:۔

---

[1] اس محضر کا پورا متن منتخب التواریخ جلد ۲ صفحہ ۲۷۱-۲۷۲ طبقات اکبری، صفحہ ۳۴۳-۳۴۴ میں ملاحظہ ہو نزہۃ الخواطر میں اس کا پورا عربی ترجمہ

"خدا کے نزدیک سلطان عادل کا مرتبہ مجتہد کے مرتبہ سے زیادہ ہے، اور حضرت سلطان کہف الانام امیر المومنین ظل اللہ علی العالمین ابو الفتح جلال الدین محمد اکبر بادشاہ غازی سب سے زیادہ عدل والے عقل والے اور علم والے ہیں، اس بنیاد پر ایسے دینی مسائل میں جن میں مجتہدین باہم اختلاف رکھتے ہیں اگر وہ اپنے ذہن ثاقب اور رائے صائب کی روشنی میں بنی آدم کی آسانیوں کے مد نظر کسی ایک پہلو کو ترجیح دے کر اسی کو معین کر دیں، اور اس کا فیصلہ کریں تو ایسی صورت میں بادشاہ کا یہ فیصلہ قطعی اور اجماعی قرار پائے گا، اور رعایا اور برایا کے لئے اس کی پابندی حتمی و ناگزیر ہوگی۔"

یہ محضر نامہ رجب ۹۸۷ھ میں تیار کیا گیا اور اس کا مملکت میں نفاذ ہوا، بادشاہ کے ایماء پر تمام علماء نے اس محضر پر دستخط کئے اور اس کی رو سے بادشاہ امام مجتہد واجب الاطاعت اور خلیفۃ اللہ قرار پایا اور یہی اس سفر کا نقطۂ آغاز ہے جو نہ صرف دین اسلام سے انحراف بلکہ اس سے عناد و اختلاف پر جا کر مکمل ہوا۔

محضر پر ایک نظر

سلاطین وقت اور اصحاب اقتدار کی غیر مشروط تائید و حمایت، ان کی لغزشوں اور بے عنوانیوں کی توجیہ و تاویل اور ان کے احکام جائزہ (اور بعض اوقات اسلام کو صریح طور پر نقصان پہونچانے اور اس کو بدنام کرنے والے) غلط اقدامات اور منصوبوں کے لئے علمی دلائل اور فقہی و کلامی سندیں فراہم کرنے کی نظیروں سے مسلم سلطنتوں کی طویل تاریخ خالی نہیں علمائے وقت سے بارہا لغزشیں اور غلطیاں سرزد ہوئی ہیں، اور انھوں نے (کسی اختیاری مصلحت یا کسی اضطراری ضرورت کی بناء پر) اپنے منصب و مقام کے خلاف کام کیا ہے، لیکن ایسے شاہان وقت کی پشت پناہی بلکہ دین و شریعت کے خلاف منصوبہ بندی کے سلسلے میں اس محضر کی

جس کو شیخ مبارک نے اکبر کے لئے تیار کیا تھا، مشکل سے نظیر ملے گی، اس میں ایک ایسے جوان[1] سال بادشاہ کو مجتہد سے اونچا درجہ دیا گیا ہے، اور اس کو مجتہدین کے اختلافی مسائل میں ترجیح اور انتخاب کا حق عطا کیا گیا ہے، اور اس کو اعدل و اعقل و اعلم باللہ مانا گیا ہے جو نا خواندۂ محض ہے، جس کی طبیعت میں پہلے سے بے قیدی اور حد سے بڑھی ہوئی آزادی ہے، جس کا علمائے اسلام اور شارحین دین و شریعت پر سے اعتقاد و اعتماد اٹھ چکا ہے، اور اپنے گھر اور دربار کے ہندوانہ ماحول سے بشدت متأثر اور تیزی کے ساتھ ہندوانہ خیالات و رسوم و عادات کے اختیار کرنے کی طرف مائل ہے، جو مطلق العنان سلطنت اور کامل اختیارات کا مالک ہے، اس کا فائدہ صرف اہل ہویٰ و ہوس کو یا ان درباری علماء کو پہونچتا تھا، جو بادشاہ کے نام سے اور اس کے احکام و فرامین کے پردہ میں آزادی و بے قیدی کی فضا پیدا کرنا چاہتے تھے، شریعت اسلامی کو بازیچۂ اطفال بنانا چاہتے تھے، یا اپنے پرانے دشمنوں یا حریفوں سے انتقام لینے کا خواب دیکھ رہے تھے، شیخ مبارک جیسے ذہین و فطین انسان سے اس اقدام کے عواقب و نتائج مخفی نہیں رہ سکتے تھے، اس لئے اس کی توجیہ بڑی مشکل ہے کہ اس محضر کے پیچھے کیا منصوبہ کام کر رہا تھا؟ ایک بالغ نظر مؤرخ جس کی اس طرح کے اقدامات کے نتائج و عواقب پر نظر ہے، آج ملا مبارک کی روح کو مخاطب کر کے کہہ سکتا ہے ؎

فان کنتَ لاتدری، فتلک مصیبۃٌ وان کنتَ تدری، فالمصیبۃُ اعظمُ[2]

مخدوم الملک اور صدر الصدور کا زوال

اس محضر کے صدور اور ملا مبارک کی علمی پشت پناہی اور اس کے باکمال فرزندوں فیضی اور

---

[1] اس محضر کے صدور کے وقت اکبر کی عمر ۳۸ سال کی تھی۔ [2] اگر تم کو اس طرز عمل کا قدرتی نتیجہ معلوم نہیں تھا، تو یہ ایک افسوسناک بات ہے، اور اگر معلوم تھا، اور تم نے دانستہ یہ کام کیا تو معاملہ اور زیادہ افسوسناک اور حیرت انگیز ہے۔

ابوالفضل کے دربار میں آنے جانے کے بعد مخدوم الملک ملا عبداللہ سلطانپوری اور صدرالصدور مولانا عبدالنبی گنگوہی کا زوال شروع ہوگیا، مخدوم الملک اور شیخ عبدالنبی کو جو دربار کا یہ رنگ دیکھ کر خانہ نشین ہوگئے تھے، ایک دن زبردستی لایا گیا اور جوتوں کی صف میں بٹھایا گیا[۱] مخدوم الملک کو حجاز جانے کا حکم ہوا، ۹۸۶ھ میں وہ حجاز گئے، وہاں کے اکابر علماء نے ان کا بڑا استقبال کیا، اور استاذ العلماء شیخ شہاب الدین احمد بن حجر ہیتمی کی بڑی تعظیم سے پیش آئے، مکہ معظمہ میں تقریباً تین سال قیام کر کے وہ ہندوستان واپس ہوئے، لیکن گجرات پہونچے تھے کہ ان کو زہر دے دیا گیا، اور وہیں ۹۹۰ھ یا ۹۹۱ھ میں انھوں نے انتقال کیا، اس بات کے پورے قرائن موجود ہیں کہ زہرخورانی کا یہ عمل اشارۂ سلطانی سے ہوا، خوافی نے "مآثر الامراء" میں اس کی تصریح کی ہے[۲]۔

شیخ عبدالنبی نے بھی حجاز کا قصد کیا، کچھ مدت وہاں قیام بھی کیا، لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ان کو اپنا جاہ و جلال اور عہد رفتہ کی یاد بھولی نہ تھی، وہ ہندوستان آئے اور بادشاہ سے عفو و درگزر کی درخواست کی، ملا عبدالقادر کا بیان ہے کہ بادشاہ نے راجہ ٹوڈرمل کو حکم دیا کہ ان سے حساب فہمی کرے، راجہ نے ان کو محبوس کر لیا، اور ان سے سخت دار و گیر کی، اسی دار و گیر میں ان کا انتقال ہوگیا، لیکن "مآثر الامراء" میں ہے کہ بادشاہ نے ان کا معاملہ ابوالفضل کے سپرد کیا، اسی نے ان کو گلا گھونٹ کر مار دیا[۳]۔

الف ثانی کی تیاری اور دین الٰہی کا اجراء

بادشاہ کو مجتہد مطلق، اور مطاع برحق بنا دینے کے بعد دوسرا قدم یہ تھا کہ ظہور اسلام پر ایک ہزار سال گزر رہے ہیں، اور دوسرے ہزار سال کا آغاز ہو رہا ہے، اس نئے ہزار سال سے

۱؎ منتخب التواریخ حصہ ۳ ص ۷۹-۸۳ ۲؎ "نزہۃ الخواطر" جلد ۴ ۳؎ ایضاً

دنیا کی ایک نئی عمر شروع ہو گی، اس کے لئے ایک نیا دین، ایک نیا آئین، اور ایک نیا شارع اور نیا حاکم چاہئے، اور اس کے لئے اکبر جیسے صاحب تاج و نگیں اور امام عادل اور عاقل سے بڑھ کر کوئی موزوں نہیں، ملا عبدالقادر لکھتے ہیں :۔

چوں در زعم خویش مقرر ساختند کہ	بادشاہ کے ذہن میں چونکہ یہ بات
ہزار سال از زمانہ بعثت پیغمبر اسلام	راسخ ہو گئی تھی کہ پیغمبر اسلام کی بعثت
علیہ السلام کہ مدت بقاءِ ایں دین بود	کی مدت کے ہزار سال پورے ہو چکے
تمام شد و ہیچ مانع برائے اظہار دواعی	جو اس دین کی عمر طبعی ہے اور اب کوئی
خفیہ کہ در دل داشتند نماند۔[1]	مانع ان پوشیدہ دلی تقاضوں کے
	اظہار میں نہیں رہا۔

اس فیصلہ کے بعد وہ تمام تبدیلیاں شروع کر دی گئیں جن سے یہ خیال مملکت میں عام اور پختہ ہو جائے، چنانچہ سکّہ پر (جو ہر ایک کے ہاتھ میں جاتا ہے اور جس سے بڑھ کر کوئی اشتہار نہیں) الف کی تاریخ ثبت کر دی گئی[2] تاریخ عالم میں ایک حد فاصل قائم کرنے کے لئے اور اس کو دو دوروں میں تقسیم کرنے کے لئے تاریخ الفی کے نام سے ایک نئی تاریخ کی تدوین کا کام علماء کے ایک بورڈ کے سپرد ہوا، اس میں سنین میں بجائے ہجرت کے رحلت کا ذکر کیا گیا، لوگوں کے ذہن میں یہ بات بٹھانے کی کوشش کی گئی تھی کہ :۔

"اس صاحب زماں کا وقت آگیا ہے جو ہندو مسلمان کے بہتّر فرقوں کے اختلاف کا مٹانے والا ہو گا اور وہ بادشاہ کی ذات قدسی صفات ہے[3]"

اسی سے دین الٰہی اکبر شاہی کا آغاز ہوا، جس میں توحید کے بجائے (عبادت آفتاب کی

---

[1] منتخب التواریخ ص ۳۰۱ [2] ایضاً [3] ایضاً ص ۲۷۹

شکل میں) شرکِ صریح، کواکب پرستی، ایمان بالبعث کے بجائے عقیدۂ تناسخ تھا، اکبر باقاعدہ بیعت لیتا تھا، اس دین میں داخل ہونے والوں سے جو کلمہ پڑھوایا جاتا تھا، اس میں لا الٰہ الا اللہ کے ساتھ اکبر خلیفۃ اللہ بھی شامل کیا جاتا تھا، کلمہ کے ساتھ ایک اقرار نامہ بھی ہوتا تھا، جس میں کہا جاتا تھا کہ:-

"میں اپنی خواہش اور رغبت و دلی شوق کے ساتھ مجازی و تقلیدی دین اسلام سے جو باپ دادؤں سے سنا اور دیکھا تھا علیحدگی اور جدائی اختیار کرتا ہوں، اور اکبر شاہی دین الٰہی میں داخل ہوتا ہوں' اور اس دین کے اخلاص کے چاروں مرتبوں، یعنی ترک مال، ترک جان، ترک ناموس و عزت، ترک دین کو قبول کرتا ہوں[1]"

اس دین میں سود، جوئے، اور شراب' اور لحم خنزیر کی حلت تھی' اور ذبیحۂ گاؤ کی ممانعت قانون نکاح میں ترمیمات کی گئی تھیں' پردہ اور رسم ختنہ کی ممانعت تھی، جسم فروشی کے کاروبار کو منظم کردیا گیا تھا، اور اس کی جگہ مقرر کردی گئی تھی، اور اس کے لئے قانون بنا دیا گیا تھا، تدفین کے طریقہ میں بھی ترمیم کردی گئی تھی، غرض ایک مستقل ہندی اکبری دین کی تدوین ہوئی تھی، جس میں فطرت انسانی کے قانون قدیم کے مطابق اس دین اور طریقۂ زندگی کا پلڑا جھکا ہوا تھا، جس کی طرف طبعی میلان اور تسکین نفس کا سامان تھا، اور خارجی و ملی و سیاسی مصالح اس کی ترجیح کے حق میں تھے[2]۔

---

[1] منتخب التواریخ ص۲۷۳ [2] اس رواداری اور صلح کل تحریک یا نئے دین و آئین میں اسلام اور ہندو مذہب کے ساتھ مساویانہ برتاؤ قائم نہیں رہ سکا، قدرتاً اس مذہب اور فرقہ کا پلڑا جھک گیا جس کا دربار میں رسوخ اور طبیعت میں رجحان تھا، مختصر تاریخ ہند کے مصنفین، ڈبلیو، ایچ، مورلینڈ اور اے، سی، چٹرجی نے اس کا اعتراف کیا ہے کہ "اکبر نے ہندوؤں کو خوش کرنے کے لئے گاؤ کشی بھی بند کردی تھی' اور اس کے اس حکم کی (باقی ص۱۰۸ پر)

اکبر کے دینی و مزاجی انحراف و اختلال کا نقطۂ عروج

اکبر کا یہ دینی و مزاجی انحراف و اختلال کس نقطہ تک پہونچ گیا تھا، اس کے لئے ہم سب سے پہلے اکبر کے عقل کُل اور نفس ناطقہ ابوالفضل علامی کے اقتباسات پیش کریں گے، یہ اس ہمہ گیر تبدیلی اور انحراف کی متفرق کڑیاں ہیں، جو ابوالفضل کے بیانات میں پائی جاتی ہیں، ان کو جمع کر کے اس زنجیر آتشیں کا کچھ تصور کیا جا سکتا ہے، جو اس وقت اسلام کے گلے میں ڈال دی گئی تھی۔ ع

تو خود حدیث مفصّل بخواں ازیں مجمل

آتش پرستی

گیہان فروز روشن دل، نور دوستی را ایزد پرستی شمارد، و ستائش الٰہی اندیشد، نادان تیرہ خاطر داور فراموشی و آذر پرستی خیال کند۔[1]	جہاں پناہ اپنی روشن ضمیری سے روشنی کو بیحد عزیز رکھتے ہیں، اور اس کی تعظیم و تکریم کو خدا پرستی اور ستائش الٰہی خیال فرماتے ہیں، نادان کور باطن اس کو خدا فراموشی و آتش پرستی کہتے ہیں۔

(بانی صـ۱۰۷ کا) خلاف ورزی کرنے والوں کو سخت سزائیں دیں، اکبری قوانین دین اسلام سے زیادہ ہندو مذہب کی موافقت اور حمایت میں ہوتے تھے، اس کی یہ حکمت عملی کامیاب رہی۔

A SHORT HISTORY OF INDIA. کا اردو ترجمہ از مولانا محمد یوسف کوکن صـ۲۵۱

[1] آئین اکبری جلد ۱ صـ۲۸ (طبع لکھنؤ ۱۸۸۲ء)

وچوں روشنی بخش جہاں، نورِ خویش
برگیرد، خدمت گزاران سعادت
گرائے در دوازدہ لگن ہائے زریں
وسیمیں کافوری شمعہا افروختہ در پیشگاہ
حضور آورند و یکے از سرایندگان
شیوہ زبان شکر دست، ایزدی سپاس
برگزارد و بگوناگوں نمط سراید و بسیں
دعائے دولت روز افزوں برخواند۔[1]

آفتاب کے غروب ہونے کے بعد خدمت
گزار بارہ کافوری شمعیں روشن کرتے
ہیں، ——— اور ہر چراغ چاندی اور
سونے کی لگن میں رکھ کر بادشاہ کے حضور
میں لاتے ہیں اور ان میں سے ایک شیریں
زبان، خوش گلو خادم شمع کو ہاتھ میں لئے
مختلف دلکش سروں میں خدا کی حمد کے
اشعار گاتا ہے اور آخر میں خود جہاں پناہ
کے ازدیاد عمر و دولت کی دعا کرتا ہے۔

آفتاب پرستی

دو آشیانہ منزل، ایزد پرستش دریں
نزہت کدہ شود، دنیایش خورشید والا
ازیں جا لیش آغاز باشد۔[2]
می فرمودند خورشید والا را بفرمانروایان
عنایت ست خاص وازیں رو نیایشگری
بدو نمایند والٰہی پرستش برشمرند و
کوتاہ بین در بدگمانی در افتد۔

دو آشیانہ منزل نام کی عمارت میں
ایزد پرستی ہوتی تھی اور یہیں سے آفتاب
کی تعظیم کی ابتدا ہوتی تھی۔
فرماتے ہیں کہ آفتاب کی سلاطین کے
حال پر ایک خاص عنایت ہے، اسی
وجہ سے اس کی عبادت خدا کی عبادت
خیال کی جاتی ہے، لیکن کوتاہ بیں شخص

[1] ج ۱ ص ۲۹
[2] ج ۱ ص ۳۲

می فرمودند عامہ بخیال نفع چگونہ خواستہ داران (مالداران) سیہ دروں را بزرگ دارند و از نابینائی در احترام این چشمۂ نور کوتہی رود و بر نیایشگر زبان پیغارہ (طعن) برکشایند اگر خرد را آفتے نرسیدہ سورۂ والشمس چرا از یاد رفت[1]۔

بدگمانی میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ عوام کس لئے سیہ دل دولتمندوں کی اپنے نفع کی غرض سے عزت کرتے ہیں اور اپنی نابینائی کی وجہ سے اس چشمۂ نور کے احترام میں کوتاہی کرتے ہیں، اور عبادت گزار پر طعنہ زنی کرتے ہیں، اگر خود ان کی عقل پر آفت نہ آگئی ہے تو سورۂ والشمس کیوں فراموش کردی گئی ہے۔

گنگا جل

در سفر و حضر آب گنگ برآشامد و چندے از راستان سعادت گرائے بر ساحل آن باشند باحتیاط برگیرند و کوزہ ہا سربمہر آید۔

درآں ہنگام کہ مرکب اقبال در دارالخلافت آگرہ و فتحپور بود، از قصبۂ سوروں می آوردند امروز کہ عرصۂ پنجاب بقدوم شاہنشاہی آرامگاہ، از ہردواری آرند

بادشاہ سفر و حضر ہر وقت گنگا کا پانی نوش فرماتے ہیں، معتمد ملازمین کا ایک گروہ دریا کے کنارے مامور ہے جو سربمہر کوزوں میں پانی بھر کر لاتا ہے۔

جب جہاں پناہ آگرہ اور فتحپور میں قیام فرماتے ہیں تو قصبہ سوروں سے پانی لایا جاتا تھا، اس زمانہ میں جب کہ شاہی خیمہ لاہور میں نصب ہے ہردوار

---

[1] ج ٣ ص ١٨٤

و در خورش پختن آب جمنا و چناب و آب باراں بخرج رود و لختے از و (گنگا) نیز برآمیزند۔[1]

کے عمدہ پانی سے آبدار خانہ سیراب ہے باورچی خانہ میں جمنا اور چناب کا پانی یا آب باراں صرف ہوتا ہے لیکن ان میں تھوڑا پانی گنگا کا ملایا جاتا ہے۔

تصویر کشی

برقدسی زبان رفت آنکہ برخے نکوہش ایں پیشہ نمایند دل برنتابد و بخاطر چناں رسد کہ در خداشناسی افزوں تر از بسیارے بود چہ ہرگاہ جانور نگار رو عضو عضو برکشد و از ینکہ روحانی پیوند نیارد، داد بہ نیرنگی جاں آفریں گراید و شناسائی اندوزد۔[2]

ایک روز قبلۂ عالم نے خلوت کدے میں جہاں صرف مریدان سعادتمند کا مجمع تھا، فرمایا کہ ایک گروہ فن تصویر کشی کا دشمن ہے اور اس پیشے کے معائب بیان کرتا ہے لیکن اس کے اقوال و دلائل کو دل قبول نہیں کرتا بلکہ قرین قیاس و عقل یہ ہے کہ مصور اکثر طبقات انسانی سے زیادہ خداشناس ہو سکتا ہے اس لئے کہ یہ شخص جانور کی تصویر اتارنے میں اس کے ہر عضو کی شبیہ کھینچتا ہے اور تصویر کو تمام کر کے جب دیکھتا ہے کہ باوجود اس ظاہری سحر نگاری کے وہ اس میں

[1] آئین اکبری، ج ۱ ص ۳۳ [2] ج ۱ ص ۷۸

روح پھونکنے سے عاجز ہے تو اس کو
خالق مطلق کی قدرت کاملہ کا اندازہ
ہوتا ہے، اور صانع باکمال کے آگے
سربسجدہ ہو جاتا ہے۔

اوقات عبادت

سحرگاہ کہ دیباچۂ بہروزی و عنفوان
نور پاشی است و نیمۂ روز کہ فروغ آفتاب
عالمتاب جہاں را در گیرد و سرمایۂ نشاط
گوناگوں فروغ آید و شامگاہ مایہ دہ
روشنیہا از چشم خاکیاں پنہاں شود۔[1]

صبح جو مبارک دن کا آغاز اور نور پاشی
کی ابتدا ہے، دوپہر جبکہ آفتاب عالمتاب
کی روشنی تمام عالم کو محیط ہوتی ہے اور
لوگوں میں گوناگوں نشاط پیدا ہو جاتا
ہے اور شام جبکہ سرچشمہ روشنی (آفتاب)
لوگوں کی نظروں سے پوشیدہ ہوتا ہے۔

سجدۂ تعظیمی

بندگان ارادت گرائے سجود نیایش
افزایند و آنرا سجدۂ ایزدی بر شمارند۔[2]

بندگان عقیدتمند سجدۂ تعظیمی کرتے
اور اسے سجدۂ ایزدی شمار کرتے ہیں۔

بیعت و ارشاد

جویائے آگہی دستار برکف سر نقدسی

جویائے آگہی ہاتھ میں دستار لے کر

---

[1] ج ۱ ص ۱۰۵

[2] ج ۱ ص ۱۰۷

پائے برنہد و بزبان حال چناں سراید
کہ بیاوری بخت بیدار و رہنموئی
ستارہ خود آرائی و خویشتن گزینی کہ بنگاہ
گوناگوں گزند بود از سر افگندہ روئے
دل بہ نیایش گرمی آورد م۔[۱] الخ

سر کو پائے اقدس پر رکھتا اور زبانِ حال
سے اس طرح کہتا ہے کہ بخت بیدار
کی یاوری اور ستارۂ خود آرائی و خویشتن
گزینی کی رہنمائی میں (جو گوناگوں
نقصانات کا سبب تھا) میں دل کی
توجہ بادشاہ کی اطاعت کی طرف
مبذول کرتا ہوں۔ الخ

آداب ملاقات

ہنگام دیدار ہم یکے اللہ اکبر آید و
دیگرے جل جلالہ سراید۔[۲]

ملاقات کے وقت ایک آدمی اللہ اکبر
کہتا اور دوسرا جل جلالہ کہتا ہے۔

تاریخ ہجری سے تنفر

از دیر باز سر پیرائے اقبال براں
بود کہ در آباد بوم ہندوستان تازہ سال
و مہ بروئے کار آید و دشواری بآسانی
گراید و نیز از تاریخ ہجری کہ از ناکامی
آگہی بخشد سر گرانی داشتند لیکن

عرصۂ دراز سے قبلۂ عالم کا ارادہ تھا کہ
ملک ہندوستان میں جدید سال و ماہ
جاری فرما کر دقتیں رفع کریں اور سہولتیں
بہم پہونچائیں، جہاں پناہ سنہ ہجری
کو بوجہ اس کے نقائص کے پسند نہیں فرماتے

---

[۱] ج ۱ ص ۱۱۰ [۲] ج ۱ ص ۱۱۱

ازانبوہ کوتاہ بینان کارنشناس کہ
روائی تاریخ راناگزیردین پندارند،
شاہنشاہ مدارا پژوہ پیوند دلہا گرامی
شمردہ اندیشہ بیروں نمی فرستاد۔[1]

لیکن ناعاقبت اندیش وکم فہم افراد
کی کثرت کی وجہ سے جو تاریخ وسنہ
کے اجراء کو بھی ایک دینی مسئلہ سمجھتے ہیں
حضرت کی خاطر پرور طبیعت نے
گوارہ نہ کیا کہ اس گروہ کی دل شکنی فرمائیں
اور یہی وجہ تھی کہ قبلۂ عالم ابتدا میں اپنے
خیال کو عملی جامہ نہ پہنا سکے۔

غیر اسلامی تہوار اور عیدین

ودرلوازم جشن نوروزی وعیدہا اہتمام
نمایند، عید بزرگ نوروز است کہ
ابتدائے آں در وقت تحویل نیز
نوربخش عالم در برج حمل است و
آغاز ماہ فروردین است عید دیگر
نوزدہم ماہ مذکور کہ روز شرف است،
وعید دیگر سوم ماہ اردی بہشت، و
عید دیگر ششم ماہ خرداد، عید دیگر
سیزدہم ماہ تیر است، عید دیگر ہفتم

پہلا جشن جشن نوروزی کے نام سے
موسوم ہے، جب آفتاب سال کا دورہ
تمام کرکے برج حمل میں داخل ہوتا
ہے، اور اپنی برکات سے اہل عالم کو
مستفید کرتا ہے تو انیس (19) روز کامل
عشرت ونشاط کی ہنگامہ آرائی ہوتی
ہے، اس زمانہ میں دوروز عید کا تہوار
منایا جاتا ہے، اور بے شمار نقد اور
طرح طرح کی اشیاء بطور صدقہ اور

[1] ج ۱ ص ۱۹۳

ماہ مرداد ست، عید دیگر چہار دہم
ماہ شہریور ست، عید دیگر شانزدہم
ماہ مہر ست عید دیگر دہم ماہ آبان ست،
عید دیگر نہم ماہ آذر ست، و درد ی
ماہ سہ عید ست، ہشتم و پانزدہم و
بست و سوم، عید دیگر دوم ماہ بہمن
ست، عید دیگر پنجم ماہ اسفندار ست،
و عید ہائے متعارف را بدستور میکردہ
باشند، و شب نوروز و شب شرف
بطریق شب برأت چراغاں کنند و در
اول شبے کہ صباح آں عید باشد نقارہ
نوازند و روز ہائے عید بر سر ہر شہر
نقارہ نوازند۔[1]

تحفہ اور ہدیہ تقسیم کی جاتی ہیں، یکم فروردین
اور انیس ۱۹ فروردین جو یوم شرف ہیں،
عید کے لئے مخصوص ہیں، پارسیوں کا
دستور ہے کہ ہر ماہ کے اس روز جو ماہ
کا ہمنام ہوتا ہے بعید مبارک خیال
کرتے ہیں، اور اس روز جشن عشرت
منعقد کرکے بعید نغمہ نوازی و سامان
ضیافت وغیرہ کرتے ہیں، قبلۂ عالم
نے بھی اس رسم کی تقلید کی اور ہر شمسی
ماہ ایک خاص جشن کے لئے مخصوص
ہوگیا، ان ایام کی فہرست مندرجہ ذیل ہے
انیس ۱۹ فروردین، تیسری ۳ اردی بہشت
چھٹی ۶ خورداد، تیرہ ۱۳ تیر، ساتویں ۷ امرداد
چوتھی ۴ شہریور، سولہ ۱۶ مہر، دس ۱۰ آبان،
نویں ۹ آذر، آٹھویں ۸، پندرھویں ۱۵ اور
تیئس ۲۳ دے، دوسری ۲ بہمن، پانچویں ۵
اسفندار۔

ان ایام میں جشن منعقد ہوتا ہے، اور ہر جشن میں انواع واقسام کی زیب وزینت و

[1] ص ۶۴

آرائش کی جاتی ہے، حاضرین فرطِ مسرت سے بے اختیار ہو کر نعرہ ہائے نشاط بلند کرتے ہیں۔

ہر پہر کے آغاز پر نقارہ نوازی ہوتی ہے، اور اربابِ نشاط اپنی نغمہ سرائی اور اپنے ساز سے ہنگامۂ عیش برپا کرتے ہیں۔

فرمان در منع زکوٰۃ

متصدیانِ حال واستقبال، وکارفرمایان
کل وجزءِ ممالک محروسہ بدانند کہ دریں
ہنگام سعادت انتظام کہ از ابتدائے
جلوس براورنگ جہاں بانی کہ سنہ
سابع ست از قرنِ ثانی (دی سال
سی وہفتم، چہ مراد از قرن دریں جا سی
سال است) وآغاز ابتسام بہار
دولت واقبال وزمانِ انکشاف
صبح جلال وجمال است، فرمان
عدالت نشور افاضت بنیان
بارقۂ بروزِ اشعۂ ظہور یافت کہ
چوں ناموس اکبر وقانون اعظم سلطنت
کہ ابد پیوند الٰہی جل جلال قدسہ
بمقتضائے حکمت بالغۂ ازلی کہ

ملازمانِ حال واستقبال اور ممالک
محروسہ کے کارپردازوں کو معلوم ہونا
چاہئے کہ اس دورِ سعادت میں جس کی
ابتدا اس جلوس سے ہے، اور جو قرن
ثانی کا ساتواں سال ہے (یعنی ۳۷ واں
کیونکہ قرن سے یہاں تیس ۳۰ سال مراد
ہیں) اور جو بہارِ دولت واقبال اور
صبح جلال وجمال کے ظہور کا عہد ہے
یہ فرمان صادر ہوا، کہ سلطنت کی
حکمت عملی کا تقاضا ہے کہ حکومت و
سیاست جو مقیم ومہاجر اور ملازم و
تاجر طبقہ کے مفاد کی حفاظت کا نام
ہے، اور جو خراج کا ایک ذریعہ ہے،
جس پر نظام عساکر کا مدار ہے،

سلسلہ جنبان دارو گیر عالم ایجاد
و تعبیہ پرداز کن فیکون دائرۂ کون و فساد
ست چناں اقتضا کردہ کہ ریاست
ممالک و سیاست مدن کہ عبارت
ست از ارتباط احوال مقیم و مہاجر
و انتساق مصالح کاسب و تاجر
بدستیاری پادشاہان عادل و دیدبانیٔ
شہریاران دریا دل جلوہ نما و صورت
پذیر باشد و یکے از وجوہ خراج کہ مدار علیہ
نظام عساکر نصرت و جنود اقبال کہ حارسان
اعمار و اموال و حافظان عقائد و احوال
خلائق اند باج اشیاست کہ در بازار
بیع و شراء و چار سوئے چوں و چرا در آمدہ
کہ اگر سنجیدہ میزان اعتدال ارباب
صیانت و دیانت کہ نقادان نقود و
اجناس کونی الٰہی و مقومان اعراض نفسی
و آفاقی اند گردد، سر آئینہ جمیع مصالح
بمفاسد انجامد، تمامی محامد بذمائم کشد
للہ الحمد کہ از مبادی احوال نصفت

جو جان و مال اور عقائد کی حفاظت
اور بازاروں کی نگرانی کرتے ہیں،
اگر ان اصحاب امانت و دیانت
کی میزان غلط ہو جائے جو نقد و جنس
کے پرکھنے والے ہیں، تو تمام
مصالح مفاسد سے اور اچھائیاں
برائیوں سے بدل جائیں، الحمد للہ
کہ شروع ہی سے ما بدولت کی
توجہ رفاہِ عام اور رعایا کی پرورش
کی طرف رہی ہے، جو بادشاہ
کی اولاد معنوی اور امانت
خداوندی ہیں، المنۃ للہ کہ
ہندوستان اور دیگر ممالک
محروسہ عدل و خوشحالی کا گہوارہ
اور مسافران عالم کی فرودگاہ
ہیں۔

حال ہی میں مراحم خسروانہ
سے یہ حکم صادر ہوا کہ اصناف
غلہ و نباتات، غذائیں اور

اشتمال ہمگی توجہ خاطر عدالت مناظر وتدبیر
باطن جلادت مواطن مادر رفاہیت عموم
بریت ومراسم تربیت خصوصی رعیت کہ
فی الحقیقت فرزندان معنوی وودائع
خداوندی اند معروف بودہ المنۃ للہ کہ
باضاءت لوامع عدالت سواد اعظم ہندوستان
ست، ودیگر ممالک محروسہ منہل اصناف
نازونعیم ومامن مسافران ہفت اقلیم ست،
درینولا بموجب توسعۂ مراحم ذاتی وتکملۂ
مکارم فکری حکم نافذ وامر جازم شرف
اصدار وعزت ایراد یافت کہ از اصناف
حبوبات وغلات ونباتات از اغذیہ و
ادویہ وروغن ونمک ومشک واقسام عطریات
کرپاس وپنبہ، واسباب پشمینہ، وادوات
چرمینہ وآلات مسیہ وظروف چوب وہمیہ
ونے وکاہ ودیگر اشیا واسباب وامتعہ و
اجناس کہ مدار معاش جمہور انام وملاک
معشیت خواص وعوام است سوائے
اسپ وفیل وشتر وگوسفند وبز واسلحہ و

دوائیں، نمک ومشک، اقسام
عطریات، کپڑے اور روئی،
اسباب پشمینہ، چرمی سامان
وتانبہ اور لکڑی کے ظروف،
بانس اور گھانس، اور دیگر اشیأ
واجناس سے کہ مدار زندگی ہیں،
سوائے ہاتھی، گھوڑے،
اونٹ، بکری، اسلحہ اور ضروری
سامان کے (جو پہلے سے مستثنیٰ
ہیں) تمام ممالک محروسہ میں
زکوٰۃ اور چھوٹے بڑے تمام
ٹیکس معاف کئے جاتے ہیں۔

قماش کہ در تمامی ممالک محروسہ تمغا و باج
و زکوٰۃ و صد یک و آنچہ از قلیل و کثیر
می گرفتہ اند معاف و مرفوع القلم
بودہ باشد۔[1]

ہندو موحّد ہیں

روشن شد کہ آنچہ زبان زد روزگار است
کہ ہنود ایزد بے ہمال را انباز گیرد فروغ
راستی ندارد، اگرچہ در برتے مطالب
و لختے دلائل جائے آویزش لیکن خدا پرستی
و وحدت گزینیٔ ایں طائفہ دلنشین آمد۔[2]

ہم پر روشن ہوا کہ یہ جو بات زبان زد
عام ہے کہ ہنود خدائے واحد کا شریک
ٹھہراتے ہیں صحیح نہیں، اگرچہ بہت سی
باتیں اور دلیلیں قابل اعتراض ہیں،
لیکن اس قوم کی وحدت گزینی اور
خدا پرستی کا یقین ہے۔

گوشت خوری

می فرمودند اگر دشوار زندگی بخاطر
نیامدے مردم را از گوشت خوردن
باز داشتمے، و آنکہ خود بیک بارگی نمی
گزاریم از آں ست کہ بسیارے کام ناکام

فرماتے ہیں کہ اگر دشوار زندگی میرے
ذہن نشین نہ ہو جاتی تو میں انسانوں کے
گوشت خوری سے مانع ہوتا اور میں
اس لحاظ سے اس پر یکبارگی عمل کرنا

[1] طبقات اکبری ص۶۷-۶۸ [2] آئین اکبری ج ۳ ص ۲

خواہد گذاشت و بہ تنگنائے غم کالیوہ (دیوانہ) خواہند شد.....

نہیں چاہتا کہ بہت سے کام ناتمام رہ جائیں گے اور انسان اس سخت غم میں دیوانے ہو جائیں گے۔

می فرمودند قصاب و ماہی گیر و مانند آں جز جان شکاری پیشہ ندارند بنگاہ ایناں از دیگر مردم جدا باشد و از آمیزندہ تاواں گیرند[1]۔

فرماتے ہیں کہ قصاب اور ماہی گیر اور مثل ان کے دیگر اشخاص جن کا پیشہ جاں شکنی ہے، ان کی قیام گاہ کو عام آبادی سے علیحدہ کر دیا جائے، اور ان سے ملنے والوں سے تاوان وصول کیا جائے۔

خنزیر

می فرمودند اگر سرمایۂ حرمت خوک بے غیرتی باشد بایستے شیر و مانند آن حلال بودے[2]۔

فرماتے ہیں کہ اگر سور کی حرمت کا باعث اس کی بے غیرتی ہے تو لازم ہے کہ شیر یا مثل اس کے دوسرے جانور حلال ہوں

شراب نوشی

در جشن ایں ماہ بادۂ ہوش فزای پیمودند میر صدر جہاں مفتی، میر عدل، میر عبد الحی، نیز ساغرے در کشید گیتی خدیو را ایں بیت برزبان رفتہ ؎

اس ماہ کے جشن میں بادۂ ہوش افزا نوش فرماتے تھے، میر صدر جہاں مفتی، میر عدل اور میر عبد الحی نے بھی بادہ پیمائی کی اور بادشاہ کی زبان پر یہ شعر آیا ؎

---

[1] آئین اکبری ج ۳ ص ۱۸۹ [2] ایضاً ج ۳ ص ۱۸۶

در دور پادشاہ خطا بخش و جرم پوش
قاضی قرابہ کش شد و مفتی پیالہ نوش[1]

رسم ہندوانہ

مادر خان اعظم مرزا کوکہ بسخت رنجوری درگذشت و جہاں سالار راغم در گرفت در سوگواری موئے سرو بروت ستردند ہر چند کوشش رفت کہ جز فرزندان آں مہین بانو دیگر نستردبندگان اخلاص سرشت پیروی کردند[2]۔

والدہ خان اعظم مرزا کوکہ سخت بیماری کے سبب چل بسیں اور جہاں پناہ کو ایسا غم ہوا کہ ماتم میں سر اور مونچھیں منڈوا دیں، ہر چند کوشش ہوئی کہ سوا اس مرحومہ کے بڑے فرزندوں کے کوئی بال نہ منڈائے مگر بندگان مخلص نے بادشاہ کی پیروی کی۔

سنین الٰہی کا اجراء

"۹۹۲ھ میں شاہنشاہی تنویر عقل و دانش نے علم و کمال کی وہ نورانی شمع جلائی جس نے اپنی بابرکت روشنی سے تمام عالم کو تاباں و درخشاں کر دیا، خوش نصیب و حق پسند گروہ نے بالیدن ناکامی سے سر اٹھایا، اور بیہودہ گو، شکستہ رائے افراد نے گوشۂ گمنامی میں منہ چھپایا، قبلہ عالم کے نیک ارادہ نے عملی جامہ پہنا اور یادگار حکماء میر فتح اللہ شیرازی نے اس کام کو انجام دینے پر کمر ہمت باندھی، علامہ شیرازی نے جدید زیج گورگانی کو پیش نظر رکھ کر جہاں پناہ کے سال جلوس

---

[1] آئین اکبری ج ۳ ص ۶۰۶ (اردو) [2] اکبر نامہ ج ۳ ص ۸۳۰

کو سنہ الٰہی کی ابتدا قرار دی[۱]"۔

ان بنیادی حقائق کے بعد جن سے اکبر کے دینی فکر کا پورا ڈھانچہ تیار ہو جاتا ہے، اب کوئی حرج نہیں کہ ہم ملا عبدالقادر بدایونی کی دی ہوئی بعض تفصیلات و جزئیات سے اس ڈھانچہ کو اور مکمل و مشکل کر دیں، اور دین اسلام سے انحراف نے اسلام اور صاحب شریعت اسلامیہ سے جو بُعد و وحشت بلکہ تنفر و عناد پیدا کر دیا تھا، اس کا صحیح نقشہ بھی لوگوں کے سامنے آسکے۔

دین اسلامی کی تحقیر

ملت اسلام ہمہ نامعقول وحادث وواضع آں فقراء عربان بودند کہ جملہ مفسداں وقطاع الطریق، وآں دو بیت شاہنامہ کہ فردوسی طوسی بطریق نقل آوردہ متمسک می ساختند۔	ملت اسلامی کا سارا سرمایہ حادث و بدعقلی کا مجموعہ ٹھہرایا گیا اور اس کے بنانے والے (العیاذ باللہ) عرب کے وہ چند مفلس بدو قرار پائے جن میں سب کے سب مفسد اور راہزن تھے، اور شاہنامۂ فردوسی کے دو مشہور شعروں سے سند پکڑی گئی جو اس نے بطور نقل کہے تھے ؎

ز شیر شتر خوردن و سوسمار
عرب را بجائے رسید ست کار
کہ ملک عجم را کنند آرزو
تفو باد بر چرخ گرداں تفو[۲]

۱؎ آئین اکبری ج ۱ ص ۵۶۴ (اردو ترجمہ فدا علی طالب حیدر آباد ۱۹۳۸ء) ۲؎ منتخب التواریخ ص ۳۰۷

اسراء و معراج کا استہزاء

ایں معنی را عقل چہ گونہ قبول کند کہ
شخصے دریک لحظہ با گرانی جسم از خواب
بآسماں رود و نود ہزار سخن گو مگوئے
با خدائے تعالیٰ کند و بسترش ہنوز
گرم باشد، و مردم بآں دعوی بگرایند
ہم چنیں شق و قمر و امثال آں۔

آخر اس بات کو عقل کس طرح مان سکتی
ہے کہ ایک شخص بھاری جسم رکھنے کے
باوجود یکایک نیند سے آسمان پر چلا جاتا
ہے اور اللہ کے ساتھ طرح طرح کی نوے ہزار باتیں
کرتا ہے، لیکن اس کا بستر اس وقت تک
گرم ہی رہتا ہے اور لوگ اس دعویٰ
کو مان لیتے ہیں، اور اسی طرح شق القمر
وغیرہ جیسی باتوں کو بھی مان لیتے ہیں۔

پھر اپنی اٹھی ہوئی ٹانگ کی طرف حاضرین کو مخاطب کر کے سوال کرتا ہے۔

ممکن نیست کہ تا پائے دیگر بر جا ماند
استادہ توانیم ایں چہ حکایتہاست؟[1]

ناممکن ہے کہ جب تک دوسرا پاؤں
زمین سے ٹکا نہ ہو میں کھڑا نہیں ہو سکتا
آخر یہ ہیں کیا قصے؟

مقام نبوت کی اہانت

زدن قافلہ قریش در اوائل ہجرت
وچہار دہ زن خواستن و تحریم شہد کردن

یعنی اوائل ہجرت میں قریش کے قافلہ
کا لوٹنا چودہ[14] عورتوں سے نکاح کرنا

---

[1] منتخب التواریخ ص ۳۱۷ جلد سوم

برائے خوشنودی زنان[1] | اور بیویوں کی رضامندی کے لئے شہد کو حرام کرنا (ان سے نبوت پر اعتراض کرنا تھا)

اسمائے نبوی سے وحشت و گرانی

نام احمد و محمد و مصطفیٰ و امثال آں بہ جہت کافران بیرونی و زنان اندرونی گراں می آمد تا بہ مرور ایام اسامی چند را از مقرباں کہ بایں نام مسمیٰ بودند تغیر دادہ مثلاً یار محمد محمد خاں را رحمت می خواندند و می نوشتند[2]

احمد و محمد و مصطفیٰ وغیرہ نام بیرونی کافروں کی خاطر سے اور اندرونی عورتوں کی وجہ سے بادشاہ پر گراں گزرنے لگے آخر کچھ دن کے بعد اپنے خاص لوگوں کے نام ـــــ بدل بھی ڈالے مثلاً یار محمد اور محمد خاں کو وہ رحمت ہی کے نام سے پکارتا بھی تھا، اور لکھنے کے وقت بھی ان کو اسی نام سے موسوم کرتا تھا۔

نماز کی عدم اجازت

در دیوان خانہ ہیچ کسے یارائے آں نداشت کہ علانیہ ادائے صلاۃ کند[3]

دیوان خانہ میں کسی کی مجال نہ تھی کہ علانیہ نماز ادا کر سکے۔

ایک جگہ لکھتے ہیں:۔

نماز و روزہ و حج پیش ازاں ساقط | نماز و روزہ اور حج تو اس سے پہلے

---

[1] منتخب التواریخ ج ۲ ص ۳۰۸ [2] ایضاً ج ۲ ص ۳۱۴ [3] ایضاً ص ۳۱۵ ج ۲

شدہ بود۔[1] | ہی ساقط ہو چکے تھے۔

ارکان اسلام کی توہین واستہزاء

پسر ملا مبارک شاگرد ابو الفضل رسائل درباب قدح وتمسخر ایں عبادات بہ دلائل ... وبمقبول افتادہ باعث تربیت گشت۔[2]

ملا مبارک کے ایک بیٹے نے جو ابو الفضل کا شاگرد تھا، اسلامی عبادات کے متعلق اعتراض اور تمسخر کے پیرایہ میں چند رسالے تصنیف کئے (شاہی جناب) میں اس کے ان رسالوں نے بڑی مقبولیت حاصل کی اور اس کی سرپرستی کا ذریعہ یہی رسالے بن گئے۔

ہندوستان کی اسلامی تاریخ کا سنگین اور خطرناک موڑ

غرض یہ کہ اس وقت ہندوستان جس میں دین فطرت کے شجرۂ طیبہ کے نصب اور بارآور کرنے کے لئے چار سَو برس تک مسلسل بہترین انسانی توانائیاں، دماغی صلاحیتیں اور اہل قلوب اور اصحاب صفا کی روحانیتیں صرف ہوئی تھیں، ایک ہمہ جہتی، دینی، ذہنی اور تہذیبی ارتداد کے راستہ پر پڑ رہا تھا جس کی پشت پر اس عہد کی ایک عظیم ترین سلطنت اور فوجی طاقت تھی، جس کو اپنے زمانہ کے متعدد ذہین وفاضل انسانوں کی علمی وذہنی کمک بھی حاصل تھی، اس وقت اگر حالات کی رفتار یہی رہتی اور اس کا راستہ روک کر کھڑی ہو جانے والی

---

[1] ایضاً ص۲۵۱ [2] ایضاً

کوئی طاقتور شخصیت یا کوئی انقلاب انگیز واقعہ پیش نہ آتا تو اس ملک کا انجام گیارہویں صدی ہجری میں بظاہر وہی ہوتا جو نویں صدی ہجری میں اسلامی اندلس کا (جس کو دنیا اب صرف اسپین کے نام سے جانتی ہے) یا چودہویں صدی ہجری میں (انقلاب روس کے بعد) ترکستان کا ہوا لیکن۔ ع

مردے از غیب بروں آید و کارے بکند

ہم اس باب کو سیرت نگار نبوی اور مؤرخ اسلام مولانا سید سلیمان ندوی کی اس بلیغ عبارت پر ختم کرتے ہیں، جو انھوں نے "ہندوستان کے غربت کدہ میں مسافر اسلام" کی داستان سفر سناتے ہوئے لکھی ہے:۔

"اس غفلت کی نیند پر چار سو برس گزر گئے، اور مسافر کے آغاز سفر پر ہزارواں برس گزر رہا تھا، یہ اکبر کا دور تھا جب عجم کے ایک جادوگر نے آکر بادشاہ کے کان میں یہ منتر پھونکا کہ دین عربی کی ہزار سالہ عمر پوری ہوگئی، اب وقت ہے کہ ایک شاہنشاہ امی کے ذریعہ نبی امی علیہ الصلاۃ والسلام کا دین منسوخ ہو کر دین الٰہی کا ظہور ہو، مجوسیوں نے آتش کدے گرمائے، عیسائیوں نے ناقوس بجائے برہمنوں نے بت آراستہ کئے، اور جوگ اور تصوف نے مل کر کعبہ اور بت خانہ کو ایک ہی چراغ سے روشن کرنے پر اصرار کیا، اس بے میل تحریک کا جو اثر ہوا اس کی تصویر اگر کوئی دیکھنا چاہے تو "دبستان مذاہب" کا مطالعہ کرے، کتنے زنارداروں کے ہاتھوں میں تسبیح اور کتنے تسبیح خوانوں کے گلوں میں زنار نظر آئیں گے! بادشاہی آستانہ پر کتنے امیروں کے سر سجدہ میں پڑے اور شہنشاہ کے دربار میں کتنے دستار بند کھڑے دکھائی دیں گے، اور مسجدوں کے منبر سے یہ صدا سنائی دے گی:۔

اللہ اکبر - تعالیٰ شانہٗ

یہ ہو ہی رہا تھا کہ سرہند کی سمت سے ایک پکارنے والے کی آواز آئی: "راستہ صاف کرو کہ راستہ کا چلنے والا آتا ہے" ایک فاروقی مجدد، فاروقی شان سے ظاہر ہوا یہ احمد سرہندی تھے۔"[1]

---

[1] مقدمہ سیرت سید احمد شہیدؒ ص ۳۰-۳۱

باب سوم

حضرت مجدد الف ثانیؒ

حالات زندگی، از ولادت تا خلافت

خاندان

حضرت مجدد صاحب نسباً فاروقی ہیں[۱]، آپ کا سلسلۂ نسب[۲] ۳۱ واسطوں سے

۱؎ حضرت مجدد کو حضرت فاروق اعظم سے اس نسبت پر فخر تھا، اور وہ دینی حمیت کو اس کا تقاضا اور قدرتی نتیجہ سمجھتے تھے، جمہور اہل سنت اور عقائد اسلامیہ کے خلاف ایک عارف شیخ عبدالکبیر یمنی کی ایک تحقیق کو سن کر ان کے قلم سے بے اختیار یہ الفاظ نکلے ہیں، "مخدوما! ایں فقیر را تاب استماع امثال ایں سخناں نیست، بے اختیار رگ فاروقیم درحرکت می آید" مکتوب ۱۰۰ (دفتر اول بنام ملا حسن کشمیری) ایک دوسرے مکتوب میں یہ سن کر کہ قصبہ سامانہ میں خطیب نے خطبۂ جمعہ میں خلفائے راشدین کا ذکر عمداً ترک کردیا تحریر فرمایا "چوں استماع ایں خبر وحشت انگیز در شورش آورد و رگ فاروقیم را حرکت داد، بچند کلمات اقدام نمود"۔ (مکتوب نمبر ۱۵ حصۂ ششم دفتر دوم)

۲؎ سلسلۂ نسب کے بارے میں ہم نے اسی خاندان والاشان کے ذی علم وصاحب تحقیق فرزند مولانا شاہ ابوالحسن زید فاروقی کی اس محققانہ بحث پر اعتماد کیا ہے، جو انھوں نے مجدد صاحب کے سلسلۂ نسب کے بارے میں اپنی تصنیف "مقامات خیر" میں "حضرات آباء واجداد کرام" کے عنوان سے (ص ۲۶-۳۳ میں) کی ہے، ان کی تحقیق یہ ہے کہ اٹھائیسویں (باقی ص ۱۲۸ پر)

امیرالمؤمنین فاروق اعظم حضرت عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ تک پہونچتا ہے، سلسلۂ نسب اس طرح ہے۔

حضرت شیخ احمد (مجدد الف ثانی) بن مخدوم عبدالاحد بن زین العابدین بن عبدالحی بن محمد بن حبیب اللہ بن امام رفیع الدین بن نصیر الدین بن سلیمان بن یوسف بن اسحاق بن عبداللہ بن شعیب بن احمد بن یوسف بن شہاب الدین علی فرخ شاہ بن نورالدین بن نصیر الدین بن محمود بن سلیمان بن مسعود بن عبداللہ الواعظ الاصغر بن عبداللہ الواعظ الاکبر بن ابوالفتح بن اسحاق بن ابراہیم بن ناصر بن عبداللہ بن عمر بن حفص بن عاصم بن حضرت عبداللہ بن حضرت عمر الفاروق رضؓ۔

آپ کے پندرہویں جد شہاب الدین علی فرخ شاہ کابلی، اس سلسلہ کے نامور جد امجد اور مورث اعلیٰ ہیں، ہندوستان کے اکثر باکمال اور شہرۂ آفاق فاروقی النسب فضلاء اور مصلحین مشائخ و اصحاب سلسلہ مثلاً حضرت بابا فریدالدین گنج شکر وغیرہ آپ ہی کے سلسلۂ نسب میں ہیں، افسوس ہے کہ افغانستان کے علماء و مشائخ کے حالات میں کسی مبسوط تذکرہ اور کتب طبقات کے نہ ہونے کی وجہ سے ان کے تفصیلی حالات نہیں ملتے، ان کے جو کچھ حالات ملتے ہیں، ان کا ماخذ وہی کتابیں ہیں جو مجدد صاحب اور ان کے خاندان کے حالات میں لکھی گئی ہیں[۱]، موصوف

(باقی ص۱۲۷ کا) واسطہ عمر کے بعد جس کو امیرالمؤمنین عمر بن الخطاب سمجھا گیا ہے چار واسطے عام طور سے کتب انساب میں ساقط ہو گئے، اور وہ حفص، عاصم، حضرت عبداللہ اور حضرت عمر الفاروق ہیں، غالباً ستائیسویں واسطہ عبداللہ کے بعد عمر کا نام دیکھ کر مصنفین کو مغالطہ ہوا کہ یہی مشہور عبداللہ بن عمر صحابی بن صحابی ہیں، لیکن چونکہ ان عبداللہ بن عمر کے کسی فرزند کا نام ناصر نہ تھا، اس لئے یہ اشکال پیدا ہوا، اور تحقیق کی ضرورت سمجھی گئی، اس خاندان کے ایک بڑے باخبر و محقق بزرگ شاہ محمد حسن مجددی (سائیں داد سندھ) اور محمود احمد صاحب عباسی کی بھی یہی تحقیق ہے اور احمد حسین خاں نے "جواہر معصومی" میں بھی یہی لکھا ہے۔

[۱] مثلاً زبدۃ المقامات، حضرات القدس وغیرہ۔

شیخ نورالدین کے صاحبزادہ اور شیخ نصیرالدین کے پوتے تھے، اسی لئے ان کے خاندان کو بھی کابل کی نسبت سے یاد کیا جاتا ہے، وہ اوصاف محمودہ سے متصف تھے، اسلام کی اشاعت و ترویج اور شعائر کفر و شرک کی اہانت و تذلیل میں خاص امتیاز اور خصوصی ذوق رکھتے تھے[1]۔

والد ماجد کے انتقال کے بعد تخت نشین ہوئے اور افغانوں اور مغلوں کے تنازعات ختم کرنے میں انھوں نے سعی محمود فرمائی، دنیاوی وجاہت و سیادت کے ساتھ دولت باطنی سے بھی حصۂ وافر رکھتے تھے، ایک کثیر تعداد نے آپ سے اکتساب فیض کیا، وفات سے پیشتر زمام حکومت صاحبزادۂ والاقدر شیخ یوسف کے حوالہ کر کے ایک درہ میں جو آپ کی نسبت سے درۂ فرخ شاہ کہلاتا ہے، اور کابل سے ساٹھ میل مسافت پر جانب شمال واقع ہے، عزلت وانزوا کی زندگی اختیار کی، اور وہیں آسودۂ خاک ہوئے۔

شیخ یوسف نے تحصیل علوم ظاہری کے بعد اپنے والد بزرگوار سلطان فرخ شاہ سے تربیت باطنی حاصل کی، اور ان کے ترک سلطنت کے بعد ان کی جانشینی کی، عدل و صلاح اور دینداری میں نیک نام اور مقبول خاص و عام تھے، آپ کے ضمیر میں بھی عشق الٰہی کی وہی چنگاری تھی، جو آپ کے آباء کرام کو وقتاً فوقتاً مولانا روم کے اس شعر پر کاربند ہونے پر آمادہ کرتی رہی تھی ؎

ملکِ دنیا تن پرستاں را حلال
ما غلامِ ملکِ عشق لا یزال

آپ نے بھی آخری عمر میں سلطنت و اقتدار سے دست کش ہو کر خلوت گاہ حق کو اختیار کیا، اور ان کے صاحبزادہ شیخ احمد نے سلطنت کا کاروبار سنبھالا، وہ بھی اپنے

---

[1] زبدۃ المقامات ص ۸۸، ۸۹

والد ماجد کی طرح صاحب علم و تقویٰ اور لباس شاہی میں درویش صفت بزرگ تھے، آپ پر جذب الٰہی نے ایسا غلبہ کیا کہ سلطنت کو بالکل ہی خیرباد کہا اور اولاد کو بھی اس سے دور رہنے کی وصیت کی، تھوڑا سا اثاثہ اہل و عیال کے لئے رکھ کر باقی تمام مال فقراء میں تقسیم کر دیا، آپ نے اپنے والد بزرگوار کے علاوہ شیخ الشیوخ حضرت شیخ شہاب الدین سہروردی قدس سرہ سے بھی باطنی استفادہ کیا تھا، اور خلافت سے سرفراز ہوئے تھے۔

ان کے بعد خاندان کے اکابر بھی صاحب فقر و ارشاد تھے، اور اپنے اپنے زمانہ کے مقبول و عالی مرتبہ مشائخ سے تربیت سلوک اور فیض باطنی حاصل کرتے رہے، خواہ وہ کسی سلسلۂ عالیہ سے تعلق رکھتے ہوں۔

امام رفیع الدین جو مجدد صاحب کے جد سادس اور شیخ شہاب الدین علی فرخ شاہ کی نویں پشت میں ہیں، صاحب "زبدۃ المقامات" کے بیان کے مطابق علوم ظاہری و باطنی دونوں کے جامع تھے، تربیت باطنی اور تعلیم سلوک حضرت مخدوم جہانیاں جہاں گشت سید جلال الدین بخاری (م ۷۸۵ھ) سے حاصل کی تھی، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ آٹھویں صدی کے آخر یا نویں صدی کی ابتدا کے بزرگ تھے، اس خاندان کے یہ پہلے بزرگ ہیں، جو کابل سے ہندوستان تشریف لائے، اور سرہند کی اقامت اختیار کی جس کا قدیم نام سہرند تھا، یہ جگہ غیر آباد اور جنگلی جانوروں کا مسکن تھی، اور اس کے اور سامانہ کے درمیان جہاں شاہی خزانہ جایا کرتا تھا، کوئی اور بستی نہ تھی، اس بنا پر اس کے نواح و اطراف کے رہنے والے باشندوں خصوصاً قریۂ سرالیس کے ساکنوں نے جو وہاں سے ۶، ۷ کوس پر واقع ہے حضرت مخدوم جہانیاں کی خدمت میں حاضر ہو کر (جن سے سلطان فیروز شاہ ارادت و عقیدت رکھتا تھا) التماس کیا کہ دارالحکومت تشریف لے جا کر وہاں شہر آباد کرنے کی تحریک فرمائیں، سلطان نے آپ کی اس خواہش و فرمائش

کی تعمیل کی، اور خواجہ فتح اللہ کو جو امام رفیع الدین کے بڑے بھائی اور مقربان سلطانی میں تھے، اس پر تعینات فرمایا، اور خواجہ صاحب دو ہزار[۲۰۰۰] سواروں کے ساتھ تشریف لائے، اور قلعہ کی تعمیر فرمائی، حضرت مخدوم جہانیاں نے امام رفیع الدین کو جو آپ کے خلیفہ اور امام نماز تھے، اور قصبۂ سنام میں مقیم تھے، ارشاد فرمایا کہ وہ اس قلعہ کا سنگ بنیاد رکھیں اور اس شہر میں سکونت اختیار کریں کہ وہ وہاں کے صاحب ولایت ہیں، اس وقت سے آپ کا خاندان وہاں سکونت پذیر ہے[۱]، قلعہ کی بنیاد اور سرہند کی آبادی کا آغاز ۷۶۰ھ بتایا جاتا ہے[۲]۔

اس طرح حضرت مجدد کی ولادت سے دو سو[۲۰۰] برس پہلے سے سرہند آباد چلا آرہا تھا[۳]،

---

[۱] تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو "زبدۃ المقامات" ص ۸۹-۹۰

[۲] جہاں تک قدیم تاریخ کا تعلق ہے یہ شہر کبھی ضلع ستلج کا صدر مقام تھا، مشہور چینی سیاح ہیون سانگ (HIUN SONG) نے بھی (جس نے ساتویں صدی مسیحی میں ہندوستان کا سفر کیا تھا) اس کا ذکر کیا ہے، اور اپنے سفرنامہ میں لکھا ہے کہ اس کے اردگرد سونا دستیاب ہوتا ہے، ہندی میں "سہ" شیر کو کہتے ہیں، اور "اند" کے معنی ہیں جنگل، ایک زمانہ میں ہندوؤں اور غزنویوں کے لئے یہ سرحد کا کام دیتا تھا، اور اس سے آگے ہند شروع ہوتا تھا، غالباً اس لئے اس کا نام "سرہند" مشہور ہوگیا، جو سہرند کا قریب المخرج ہے ۵۸۶ھ (۱۱۹۱ء) میں سلطان محمد غوری نے سرہند فتح کیا، فیروز شاہ تغلق کی تخت نشینی تک سلاطین دہلی نے سرہند کو چنداں اہمیت نہیں دی، اس کے بجائے سامانہ زیادہ مورد توجہ رہا، فیروز شاہ تغلق کے زمانہ سے سرہند کی طرف از سر نو توجہ شروع ہوئی اس کے بعد سے اہم امرائے سلطنت سرہند و فیروزپور کے ناظم بنتے رہے، فوجی نقطۂ نگاہ سے بھی اس کی اہمیت میں معتدبہ اضافہ ہوا، بابر کئی بار سرہند آیا گیا، ہمایوں بھی سرہند آیا اور یہیں سے وہ دہلی آکر دوبارہ تخت و تاج کا مالک بنا، عہد مغلیہ میں شہر کی خوشحالی اور رونق کا یہ عالم تھا کہ یہاں ۳۶۰ مساجد، سرائے، کنویں اور مقبرے پائے جاتے تھے۔ (ملخص از دائرۃ معارف اسلامیہ مضمون سرہند شریف)

[۳] حضرت مجدد نے اپنے وطن سرہند کے متعلق مکتوبات میں بڑے بلند کلمات فرمائے ہیں، اور اس میں خاص نورانیت و سکینت کا ذکر کیا ہے، ملاحظہ ہو مکتوب ۲۲ مکتوبات دفتر دوم

تذکرہ وتراجم کی کتابوں سے معلوم ہوتا ہے کہ وہاں شرفاء وعلماء کے خاندان آباد ہوگئے تھے، اور اس خاک سے کئی باکمال پیدا ہوئے[1] ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس کا عروج اور اسلامی علوم وفنون سے رشتہ دسویں صدی ہجری کے ابتدا میں قائم ہوا، آٹھویں اور نویں صدی میں حضرت مجدد کے خاندان کے چند برگزیدہ افراد کے علاوہ کسی بڑے سرہندی عالم کا نام کتب تذکرہ وتراجم میں نہیں آتا لیکن دسویں صدی کے شروع ہونے کے بعد سرہند میں علمی ودینی بیداری اور درس وتدریس کی گرم بازاری نظر آتی ہے اور متعدد اہلِ کمال اور سربرآوردہ علماء کے نام نظر آتے ہیں، جو مسند درس وارشاد پر متمکن اور مصروف افادہ وافاضہ تھے، ان میں سب سے پہلے مشہور صاحبِ درس وافادہ مولانا الٰہ داد بن صالح سرہندی (م ۹۲۷ھ) کا نام ملتا ہے، ان کے بعد مولانا شیر علی قادری (م ۹۸۵ھ) اور مولانا علی شیر (م ۹۸۵ھ)[2] مفتی احمد سرہندی، (م ۹۸۶ھ) الحاج ابراہیم سرہندی تلمیذ علامہ شہاب الدین ابن حجر ہیتمی مکی (م ۹۹۴ھ) مولانا عبد اللہ نیازی مہدوی[3] (م ۱۰۰۰ھ) اور چند ان فضلاء کے نام نظر آتے ہیں جن کا سن وفات معلوم نہیں مثلاً مشہور استاذ زمانہ مخدوم الملک ملا عبد اللہ سلطانپوری کے استاد مولانا عبد القادر، مولانا عبد الصمد حسینی مرید شیخ علی عاشقاں جونپوری، مولانا امان اللہ، مولانا قطب الدین اور مولانا مجد الدین، آخر الذکر کے متعلق مولانا یعقوب کشمیری استاد حضرت مجددؒ کی شہادت ہے کہ وہ اپنے زمانہ کے سب سے متبحر عالم تھے، بابر سے سرہند میں ان کی ملاقات ہوئی اور بابر نے ان کا بڑا اعزاز کیا مولانا میر علی اور مولانا بدر الدین سرہندی بھی خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔[4]

---

[1] تاریخ وتراجم کی کتابوں میں صرف تاریخ مبارک شاہی کے مصنف یحییٰ بن احمد کا نام ملتا ہے، جو نویں صدی کے مصنفین میں ہیں، انھوں نے "تاریخ مبارک شاہی" ۸۳۸ھ کے حدود میں لکھی، وہ اپنے آپ کو اسیہرندی لکھا کرتے تھے، (اردو دائرہ معارف اسلامیہ)

[2] ممکن ہے کہ دونوں ایک ہی شخصیت ہوں، "گلزار ابرار" و "نزہۃ الخواطر" میں دونوں کا نام معکوس ترتیب سے آیا ہے۔

[3] کہا جاتا ہے کہ انھوں نے آخر عمر میں مہدوی عقیدہ سے رجوع کر لیا تھا۔

[4] یہ سب نام "نزہۃ الخواطر" جلد چہارم سے انتقاط کئے گئے ہیں، کتاب میں ان کے حالات دیکھے جا سکتے ہیں۔

حضرت مخدوم شیخ عبدالاحد

خواجہ محمد ہاشم کشمی نے "زبدۃ المقامات" میں حضرت مخدوم شیخ عبدالاحد کا کسی قدر تفصیل سے تذکرہ کیا ہے، چونکہ حضرت خواجہ حضرت مجدد کی خدمت میں مسلسل تین ۳ سال حاضر رہے، اور ان کی معلومات کا زیادہ تر ماخذ وہ اقوال اور ارشادات ہیں، جو انھوں نے حضرت مجدد کی زبان سے وقتاً فوقتاً سنے، ان میں اگر کوئی اضافہ ہے تو صاحبزادگان والاشان سے حاصل کئے ہوئے معلومات کا ہے، اس لئے ان کے بیان کو ہر طرح مستند اور با لواسطہ حضرت مجدد کے ارشادات کا مجموعہ سمجھنا چاہئے، یہاں اس کا خلاصہ درج کیا جاتا ہے۔

حضرت شیخ عبدالاحد پر عنفوان شباب اور اثنائے تحصیل علم میں طلب مولیٰ اور حصول علم الیقین کا ایسا غلبہ ہوا کہ تکمیل علوم کا انتظار کئے بغیر اس عہد کے شہرۂ آفاق چشتی (صابری) شیخ حضرت شیخ عبدالقدوس گنگوہی کی خدمت میں حاضر ہوگئے، اور ان سے ذکر واذکار کی تلقین اور سلوک کی تعلیم حاصل کی، جب حضرت شیخ...... کے آستانہ پر پڑ رہنے۔ ع

یا جاں رسد بجاناں، یا جاں زتن برآید

کے شوق و عزم کا اظہار کیا، تو پیر روشن ضمیر نے اس کو منظور نہ فرمایا اور علوم دین و شریعت کی تحصیل و تکمیل کی تاکید کی، اور فرمایا کہ "علم کے بغیر جو درویشی ہوتی ہے، اس میں کچھ آب و نمک نہیں ہوتا"، مخدوم نے حضرت شیخ کی کبرسنی کا لحاظ کرتے ہوئے عرض کیا کہ مجھے شبہ ہے کہ علوم دینیہ کی تکمیل کے بعد جب اس آستانہ پر حاضر ہوں گا تو یہ دولت جاوید پاؤں گا یا نہ پاؤں گا؟[1] شیخ نے فرمایا کہ اگر مجھے نہ پاؤ تو میرے فرزند رکن الدین سے وہ دولت حاصل کر لینا، مخدوم نے

---

[1] اشارہ تھا حضرت شیخ کے دنیا سے رحلت فرماجانے کی طرف۔

تعمیل ارشاد کی اور تحصیل علم میں مشغول ہو گئے۔

تقدیری بات کہ آپ کو جس کا اندیشہ تھا وہی ہوا، اور فراغت سے پہلے شیخ نے رخت سفر باندھ لیا، مخدوم نے علوم مروجہ کی تکمیل کرنے کے بعد کچھ دن مختلف مقامات کی سیر و سیاحت کی اور وہاں کے بزرگوں سے استفادہ کیا، پھر حضرت شیخ رکن الدین کی خدمت میں حاضر ہوئے، منازل سلوک طے کئے اور چشتیہ و قادری سلسلہ میں خرقۂ خلافت اور تلقین و تربیت کی اجازت سے سرفراز ہوئے[۱]۔

ان دو بزرگوں شیخ عبد القدوس اور شیخ رکن الدین پر وحدۃ الوجود، غیبت و بیخودی، سکر و شورش اور استغراق کا غلبہ تھا، اور وہ صاحب وجد و سماع تھے، خاص طور پر شیخ عبد القدوس وحدۃ الوجود کے اظہار و اعلان پر اپنے کو مامور سمجھتے تھے، اور اس کے پرجوش داعی و مبلغ تھے، بایں ہمہ اتباع سنت اور عمل بالعزیمت میں قدم راسخ رکھتے تھے، نیستی و بے نفسی کا غلبہ تھا، نہایت رقیق القلب کثیر العبادت بزرگ تھے، موت کو ہمیشہ یاد کرتے تھے، اور خاتمہ کی فکر غالب رہتی تھی[۲]۔

اپنے پیر بیعت شیخ عبد القدوس اور شیخ رکن الدین کے علاوہ مخدوم شیخ عبد الاحد کا قادری سلسلہ کے مشہور بزرگ حضرت شاہ کمال کیتھلی سے بھی ربط خاص تھا، حضرت شاہ کمال اپنے زمانہ کے بڑے باکمال اور صاحب حال بزرگ تھے[۳]۔

شیخ عبد الاحد کا یہ قول گزر چکا ہے کہ "نظر کشفی سے کام لیا جاتا ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ

---

[۱] شیخ رکن الدین نے آپ کو جو خلافت نامہ دیا وہ "زبدۃ المقامات" میں من و عن درج ہے ص۹۲-۹۶ اس کا بڑا حصہ عربی میں ہے۔ [۲] کمالات اور اذواق و مواجید کے لئے ملاحظہ ہو لطائف قدوسی تالیف شیخ رکن الدین فرزند حضرت شیخ و "زبدۃ المقامات" از خواجہ محمد ہاشم کشمی، ص۹۷-۱۰۱ و نزہۃ الخواطر ج ۴۔

[۳] ان کے حالات کے لئے ملاحظہ ہو "نزہۃ الخواطر" ج ۴۔

سلسلہ علیہ قادریہ میں بانی سلسلہ پیران پیر حضرت شیخ عبدالقادر جیلانی کے بعد اس مرتبہ کا آدمی کم تر نظر آتا ہے" ان کے پوتے شاہ سکندر بھی بڑے عالی مرتبت شیخ تھے، اور حضرت مخدوم نے ان سے بھی استفادہ کیا۔

حضرت مخدوم جب اکتساب علوم سے فارغ ہوئے تو مردانِ خدا کی تلاش میں مختلف شہروں کا سفر کیا، سفر کرتے وقت عزم کیا کہ جہاں بدعت کے آثار نظر آئیں گے، وہاں ارادت تو درکنار صحبت سے بھی پرہیز کریں گے، اس سفر میں شیخ الہ داد کی صحبت سے بھی مستفید ہوئے، رہتاس میں شیخ الہ داد اور مولانا محمد بن فخر صاحبِ "توضیح الحواشی" سے بھی ملاقات کی اور ان کے درس میں شریک ہوئے، بنگالہ بھی تشریف لے گئے، اور جونپور بھی چند دن حضرت سید علی قوام (علی عاشقاں) کی خدمت میں رہے، اس سفر سے واپس سرہند تشریف لائے، پھر سفر آخرت تک یہیں مقیم رہے، اور کہیں کا سفر نہیں کیا، معقولات اور منقولات کی کتب متداولہ بڑی پابندی سے اور بڑی تحقیق و تدقیق کے ساتھ پڑھاتے تھے، حضرت مجدد صاحب فرماتے تھے کہ تمام علوم میں دستگاہ کامل رکھتے تھے، لیکن فقہ و اصول فقہ میں ان کی نظیر نہیں تھی، جب "اصول بزدوی" کا درس دیتے تھے، تو امام ابوحنیفہؒ کی فقہ میں علو شان اور ان کی جلالت و امامت عیاں و نمایاں ہو جاتی تھی، کتب تصوف کا بھی درس دیتے تھے، خاص طور پر "تعرف" "عوارف المعارف" اور "فصوص الحکم" کے مطالب اور دقیق مضامین کو حل کرنے میں ید طولیٰ رکھتے تھے، تحقیقاً و ذوقاً بھی شیخ اکبر کے مشرب پر تھے، لیکن خداداد عالی ظرفی اور ضبط و احترامِ شریعت کی وجہ سے کبھی زبان سے سکر و شطحیات کی کوئی بات نہ نکلتی، بے نفسی اور تفرید کا بڑا غلبہ تھا، تلامذہ کی کثرت کے باوجود کبھی کسی سے خدمت نہ لیتے گھر کی ضرورت کی چیزیں خود بازار سے لاتے، اتباع سنت کا بڑا اہتمام تھا، حتی الامکان کوئی سنت فروگذاشت نہ ہوتی، امور عادیہ،

لباس و پوشاک میں بھی اتباع سنت کا اہتمام کرتے، عزیمت پر عمل کرتے، اور رخصت سے اجتناب، اگرچہ بیعت و خلافت سلسلۂ چشتیہ اور قادریہ میں تھی، اور ان طرق میں نسبت عالی رکھتے تھے، لیکن آپ کے اخلاص اور عالی ہمتی کی دلیل یہ ہے کہ سلسلۂ نقشبندیہ کا بڑا اشتیاق ظاہر کرتے تھے، اور اس کے متعلق بڑے بلند کلمات فرماتے تھے، مثلاً "اس کی دعا کرتا ہوں کہ یہ سلسلۂ عالیہ ہمارے ملک میں پہونچے، یا خدا ہمیں اس کے مرکز میں پہونچائے کہ اس سے استفادہ کیا جاسکے"، صاحب تصنیف بھی تھے، "کنوز الحقائق" اور "اسرار التشہد" آپ کی تصنیفات میں سے ہیں۔[1]

حضرت مجدد فرماتے ہیں کہ میں نے بارہا والد ماجد کو یہ کہتے ہوئے سنا کہ اہل بیت کرام کی محبت کو ایمان کی حفاظت اور حسن خاتمہ میں بڑا دخل ہے، جب والد صاحب کو سکرات شروع ہوئے تو میں نے آپ کو یاد دلایا، فرمایا الحمد للہ والمنۃ کہ میں اس محبت میں سرشار اور اس دریائے احسان میں غرق ہوں ؎

الٰہی بحقّ بنی فاطمہ
کہ بر قول ایماں کنی خاتمہ[2]

اثنائے سفر میں جب سکندرہ[3] کے مقام پر پہونچے اور وہاں کچھ دن قیام کیا تو وہاں آپ کی شرافت و نجابت اور صلاح و تقویٰ اور علم و عمل کی جامعیت دیکھ کر ایک شریف خاندان نے

---

[1] خواجہ محمد ہاشم کشمی نے "زبدۃ المقامات" میں "اسرار التشہد" کے کچھ مضامین نقل کئے ہیں، ص۱۱۸-۱۲۰ حضرت مجدد کی زبانی حضرت مخدوم کے بعض فوائد اور تحقیقات بھی نقل کئے ہیں ص۱۲۰-۱۲۲

[2] زبدۃ المقامات ص۱۲۳ [3] صاحب زبدۃ المقامات نے اس کو اٹاوہ کے قریب بتایا ہے، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ موجودہ صوبہ اتر پردیش میں واقع تھا۔

خود رشتہ کی پیش کش کی اور اس خاندان کی ایک نیک سیرت صالحہ خاتون سے آپ کا عقد کر دیا، حضرت مخدوم کی سب اولاد انہی سے ہوئی۔

حضرت مخدوم کو اللہ تعالیٰ نے ان کے مرشد ہی کی طرح سات فرزند عطا فرمائے تھے، جن کے نام معلوم ہو سکے وہ یہ ہیں، شاہ محمد، شیخ محمد مسعود، شیخ غلام محمد، شیخ مودود[۱] دو بھائیوں کے نام اور کچھ تفصیل معلوم نہ ہو سکی، ان میں واسطۃ العقد حضرت مجدد رحمۃ اللہ علیہ تھے، بقیہ فرزند بھی صاحبِ علم اور صاحب استعداد تھے، اور انھوں نے بھی علوم رسمیہ اور سلوک کی تعلیم اپنے والد یا مشائخ عصر سے حاصل کی تھی۔

حضرت مخدوم نے اسّی سال کی عمر میں ۱۷ رجب ۱۰۰۷ھ کو اس دار فانی سے رحلت فرمائی[۲]، قبر مبارک شہر سرہند سے مغربی جانب تقریباً ایک میل پر واقع ہے[۳]۔

حضرت مخدوم کی سیرت کا جوہر خاص حق پسندی، انصاف، شریعت و سنت کی تعظیم و احترام اور ان پر عمل کرنے کی کوشش و اہتمام، حمیّت دینی اور ترقیاتِ باطنی میں عالی ہمتی اور بلند حوصلگی کہا جا سکتا ہے، اور یہی جوہر ان کے لختِ جگر کے ضمیر میں (جس کے لئے دین کی تجدید اور ہندوستان میں سرمایۂ ملت کی نگہبانی کی سعادت مقدر ہو چکی تھی) ودیعت ہوا تھا، جس کو فضل ربانی نے چمکا کر اور دوسرے وہبی کمالات عطا فرما کر آفتابِ عالمتاب بنا دیا۔

۱۔ شیخ غلام محمد اور شیخ مودود کے نام حضرت مجدد صاحب کے مکتوبات ہیں۔ (ملاحظہ ہو جلد اول)

۲۔ زبدۃ المقامات ص۱۲۲ بعض حضرات نے تاریخ وفات ۱۷ رجب اور بعض نے ۲۷ جمادی الآخرہ لکھی ہے ۱۰۰۷ھ پر سب کا اتفاق ہے۔ ۳۔ زبدۃ المقامات ص۱۲۲

ولادت وحالات

ولادت وتعلیم

شبِ جمعہ ۱۴ شوال ۹۷۱ھ ۱۵۶۳ء کو شہر سرہند میں آپ کی ولادت ہوئی، شیخ احمد نام رکھا گیا، لفظ "خاشع" سے سن ولادت نکلتا ہے، صغر سنی ہی سے آپ میں رشد وسعادت کے آثار نمایاں تھے ؎

بالائے سرش ز ہوشمندی
می تافت ستارۂ بلندی

صلحائے وقت بالخصوص حضرت شاہ کمال کیتھلی کی (جن سے والد بزرگوار کو نسبت باطنی تھی) آپ کی طرف خاص توجہ اور شفقت تھی، اور وہ آپ کے ساتھ خصوصی معاملہ فرماتے تھے[۱]، آپ کی عمر سات سال کی تھی کہ شیخ کمال نے رحلت کی آپ کو ان کا حلیۂ مبارک یاد تھا، اور جس گھر میں والد صاحب کے ساتھ جا کر زیارت کی تھی، اس کا نقشہ بھی ذہن میں موجود تھا۔

تعلیم کی ابتدا حفظ قرآن سے ہوئی، اور تھوڑی ہی مدت میں آپ نے اس کی تکمیل کر لی، پھر والد ماجد کی خدمت میں تعلیم کا سلسلہ شروع کیا، تھوڑے ہی دنوں میں آپ کے ذہن خداداد کے جوہر کھلنے لگے، دقیق مضامین کے جلد اخذ کر لینے اور ان کو اپنے الفاظ میں سلجھے طریقہ پر پیش کرنے میں آپ کا امتیاز ظاہر ہوا، بیشتر علوم کی والد بزرگوار سے اور چند کی

---

[۱] تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو، زبدۃ المقامات ص ۱۲۷-۱۲۸

اپنے عہد کے بعض علمائے کبار سے تحصیل کی، کچھ عرصہ کے بعد سیالکوٹ جو اس زمانہ کا بڑا علمی و تعلیمی مرکز تھا، تشریف لے گئے اور مولانا کمال کشمیری سے جن کو منطق و فلسفہ، علم کلام و اصول فقہ میں کمال حاصل تھا، اور جن کی ذکاوت و حافظہ، کثرت مطالعہ اور قوت تدریس کا شہرہ تھا[۱]، اور جن کے شاگردوں میں علامہ عبدالحکیم سیالکوٹی جیسے سرآمد روزگار علماء اور مدرسین پیدا ہوئے اس وقت کے نصاب تعلیم کی بعض انتہائی اور اعلیٰ کتابیں (مثلاً عضدی) پڑھیں، حدیث کی بعض کتابیں شیخ یعقوب صرفی کشمیری سے پڑھیں، جو حدیث میں مسند وقت شیخ شہاب الدین احمد بن حجر ہیتمی مکی کے شاگرد تھے، اور جن کی تصنیفات میں صحیح بخاری کی بھی ایک شرح ہے[۲]۔

شیخ یعقوب کو بڑے بڑے محدثین اور مصنفین سے کتب حدیث و تفسیر اور ان کی تالیفات کی اجازت حاصل تھی، آپ نے اپنے زمانہ کے مشہور عالم ربانی قاضی بہلول بدخشانی سے جو علم حدیث و تفسیر میں پایہ بلند رکھتے تھے، اور حدیث میں شیخ وقت عبدالرحمٰن بن فہد کے تلمیذ رشید تھے، صحیح بخاری، مشکوٰۃ المصابیح، شمائل ترمذی اور دوسری کتب حدیث ثلاثیات بخاری اور حدیث مسلسل کی سند حاصل کی، نیز متقدمین کے دستور کے مطابق کتب تفسیر وغیرہ

---

[۱] مولانا کمال الدین بن موسیٰ ۹۷۱ھ میں کشمیر سے سیالکوٹ منتقل ہوئے، اور تقریباً نصف صدی درس و تدریس میں مصروف رہ کر ۱۰۱۷ھ میں لاہور میں وفات پائی اور وہیں مدفون ہوئے (نزہۃ الخواطر ج ۵ ص ۳۱۶)

[۲] مولانا یعقوب بن الحسن الصرفی کشمیری کی ۹۰۸ھ میں کشمیر میں ولادت ہوئی، تحصیل علم اور حصول طریقہ کے لئے سمرقند کا سفر کیا، جہاں شیخ حسین خوارزمی سے طریقہ کبرویہ حاصل کیا، اور ایک عرصہ تک ان کی صحبت میں رہے، حجاز جا کر علم حدیث حاصل کیا اور وہاں سے فقہ، حدیث و تفسیر کی نفیس کتابیں اپنے ساتھ لائے، ۱۲ ذی قعدہ ۱۰۰۳ھ میں ان کی وفات ہوئی (نزہۃ الخواطر ج ۵ ص ۴۳۹) اس طرح اپنے استاذ مولانا یعقوب کے ذریعہ حضرت مجدد کو صحاح کے مطالعہ اور امہات کتب حدیث سے متعارف ہونے کا موقع ملا ہوگا۔

کی سند بھی ان کے مصنفین تک پہونچائی،[1] سترہ سال کی عمر میں آپ فارغ التحصیل ہوگئے۔

آپ جب علوم عقلیہ ونقلیہ اور اصول وفروع سے فارغ ہوئے تو درس وتدریس کے کام کا آغاز کیا، اور عربی وفارسی میں کچھ رسائل بھی لکھے جن میں "رسالۂ تہلیلیہ" "رسالہ ردِ مذہب شیعہ" شامل ہے؛ آپ دارالحکومت اکبرآباد (آگرہ) بھی گئے، وہاں ابوالفضل وفیضی سے صحبتیں رہیں، لیکن اختلاف ذوق ومسلک کی وجہ سے ان سے مناسبت نہ ہوئی بعض مرتبہ کچھ ردّوکد کی بھی نوبت آئی اور ابوالفضل کے بعض بے باکانہ الفاظ پر ناگواری کا اظہار فرمایا، اور آمد ورفت موقوف کردی؛ ابوالفضل نے آدمی بھیج کر بلوایا اور معذرت کی، ایک مرتبہ فیضی کو جو اُس زمانہ میں تفسیر غیر منقوط (سواطع الالہام) لکھنے میں مصروف تھے، ایک جگہ مناسب (غیر منقوط) لفظ ملنے میں اور مطلب کے ادا کرنے میں دقت پیش آئی اور قلم رک گیا، حضرت مجدد سے انھوں نے تذکرہ کیا آپ نے مشکل کشائی فرمائی اور فیضی کو آپ کے طبع رسا اور وفور علم کا اعتراف کرنا پڑا۔

آگرہ میں آپ کا قیام کچھ طویل ہوگیا، والد ماجد کو شوق ملاقات ہوا، باوجود کبرسنی اور بُعدِ مسافت کے آگرہ تشریف لے گئے، حضرت مجدد نے والد ماجد کے ساتھ وطن مراجعت فرمائی، دہلی وسرہند کے درمیان جب شہر تھانیسر سے گزر ہوا تو شیخ سلطان جو وہاں کے رؤسا وعمائد اور اسی کے ساتھ علماء وفضلاءِ وقت میں تھے، اور ان کو تقرب سلطانی بھی حاصل تھا، اور اس وقت علاقۂ تھانیسر کے حاکم تھے، اعزاز واکرام کے ساتھ پیش آئے، اور اپنے یہاں مہمان رکھا اور ایک اشارۂ غیبی کی بنا پر اور حضرت مجدد کے اخلاق وخصوصیات کو دیکھ کر ان سے نسبت مصاہرت قائم کرنے کی خواہش کی، والد صاحب نے اس رشتہ کو منظور فرمایا اور وہیں عقد مسنون انجام پایا، اور آپ بہو کو رخصت کرکے سرہند تشریف لائے۔

---

[1] حدیث مسلسل اور دوسری اسانید "زبدۃ المقامات" میں موجود ہیں۔

سلوک کی تربیت و تکمیل اور حضرت خواجہ باقی باللہ سے بیعت و استفادہ

اس موقع پر تصوف و سلوک کی ضرورت اور اس کے شرعی و علمی ثبوت پر خامہ فرسائی کی ضرورت نہیں کہ "تاریخ دعوت و عزیمت" کے سلسلہ کے (جس کا یہ چوتھا حصہ ہے) قارئین کو اس کی پہلی جلد کے مطالعہ ہی سے جس میں حضرت خواجہ حسن بصری، سیدنا عبدالقادر جیلانی، اور مولانا جلال الدین رومی کے تذکرے موجود ہیں، اور تیسری جلد تو سراسر ہندوستان کے مشائخ کبار ہی کے تذکرہ پر مشتمل ہے، اس مضمون سے واسطہ پڑ چکا ہے، اگر اس سلسلہ میں مزید تشفی اور اطمینان کی ضرورت ہو تو مصنف کی کتاب "تزکیہ و احسان یا تصوف و سلوک" کا مطالعہ کیا جائے۔

یہاں صرف اتنا کہنا ضروری معلوم ہوتا ہے کہ جس ماحول اور عہد میں حضرت مجدد کو اپنا نازک و دشوار تجدیدی اور اصلاحی کارنامہ انجام دینا تھا، اس میں تصوف، اسلامی معاشرہ اور ماحول میں اس طرح گھل مل گیا تھا کہ وہ اس کا مزاج و مذاق بن گیا تھا، خواص تو خواص عوام بھی کسی عالم، معلّم یا مصلح کے اُس وقت تک قائل، اس کے عقیدت کیش اور اس کے خطاب و تفہیم سے منتفع نہیں ہوتے تھے، جب تک کہ وہ تصوف و سلوک کے کوچہ سے آشنا اور کسی مقبول و مستند سلسلہ سے وابستہ اور مشائخ کا صحبت یافتہ نہ ہو، یوں بھی کسی نہ کسی درجہ میں تزکیۂ نفس، اخلاص و یقین اور درد و سوز کے بغیر (جو عموماً کثرتِ ذکر و صحبت کے بغیر حاصل نہیں ہوتا) محض وفورِ علم اور زورِ تقریر سے کوئی حقیقی انقلاب برپا نہیں ہوتا، غرض یہ کہ اس عہد و ماحول میں تصوف و سلوک اور قوت روحانی اور نور باطنی کے بغیر اصلاح و انقلاب کی کوشش کرنا بالکل ایسا ہی تھا جیسا کہ ہتھیاروں اور سپہ گری کی مشق و تربیت کے بغیر کوئی شخص میدانِ جنگ میں اتر آئے، اور کسی تربیت یافتہ اور مسلح فوج کا مقابلہ کرے، یا کوئی ایسا شخص جو قوتِ گویائی

سے فطرتاً محروم ہو، تعلیم و تفہیم کا کام انجام دینا چاہے، یہ عین حکمت و تدبیرالٰہی کا تقاضا تھا کہ اس میدان اصلاح و انقلاب میں اترنے سے پہلے اللہ تعالیٰ نے حضرت شیخ احمد السرہندی کو تصوف و سلوک کا نہ صرف رمز آشنا اور محرم راز بنایا بلکہ اہل کمال و تکمیل کی صحبت و تربیت سے پھر موہبت ربّانی اور اجتبائے خاص سے ان کو اس میں درجۂ امامت و اجتہاد تک پہونچایا تاکہ وہ اس کار عظیم کو پوری تیاری اور پورے اعتماد کے ساتھ انجام دیں اور اس کا اثر دنیا کے دور دراز گوشوں اور بعد کی صدیوں تک قائم رہے" ذلك تقدير العزيز العليم"۔

سرہند پہونچ کر آپ والد ماجد کی حیات تک اُنہی کی خدمت میں رہے، ان سے بیش بہا فوائد باطنی حاصل کئے اور سلسلۂ چشتیہ و قادریہ کا سلوک طے کیا، اسی کے ساتھ علوم ظاہری کی تعلیم کا مشغلہ بھی جاری تھا۔

اس زمانہ میں حج بیت اللہ اور زیارت مدینہ کے شوق نے غلبہ کیا اور وہاں کی کشش نے مضطرب و بے آرام بنا دیا، لیکن چونکہ والد ماجد کبیر السن تھے، اور بظاہر ان کی رحلت کا زمانہ قریب تھا، اس لئے ایسی حالت میں ان کو چھوڑ کر جانا مناسب نہ معلوم ہوا، جب ۱۰۰۷ھ میں ان کا واقعۂ ارتحال پیش آگیا تو اب آپ کو کوئی مانع نہ رہا اور ۱۰۰۸ھ میں آپ نے حرمین شریفین کی حاضری اور ادائے حج بیت اللہ کے لئے رخت سفر باندھ لیا، اور سرہند سے کوچ کرکے دہلی پہونچ گئے، وہاں کے علماء و فضلاء جن کے کانوں تک آپ کا آوازۂ فضل و کمال پہونچ چکا تھا، ملاقات کے لئے آئے، ان میں مولانا حسن کشمیری بھی تھے، جن سے حضرت کا پرانا تعارف تھا، انھوں نے دوران گفتگو حضرت خواجہ باقی اللہ کے علوم، تبہ، اور قوتِ باطنی کا تذکرہ کیا جن کا کچھ ہی عرصہ پہلے دہلی میں ورود ہوا تھا، حضرت مجدّد اپنے والد ماجد سے سلسلۂ نقشبندیہ کا ذکر اور اس کا اشتیاق سن چکے تھے، اس لئے آپ کو بھی ملاقات کا شوق ہوا، اور اس کو حرمین شریفین کی

حاضری کی تیاری اور اس کی ایک سوغات سمجھ کر حاضری کا قصد فرمالیا، اور مولانا حسن کشمیری[۱] کی معیت میں وہاں حاضر ہو گئے، اس وقت ہاتف غیب نے صدا دی ہوگی ۔ ع

آمد آں یارے کہ ما می خواستیم !

قبل اس کے کہ اس "قران السعدین" کا حال بیان کیا جائے اور اس کے بعد کے واقعات لکھے جائیں، حضرت خواجہ کا تعارف کرادینا ضروری ہے[۲]، اس سلسلہ میں ہم وہ مضمون نقل کرتے ہیں جو مصنفِ "نزہۃ الخواطر" نے (جلد پنجم) حضرت خواجہ قدس سرہٗ کے تذکرہ میں تحریر فرمایا ہے کہ وہ "ما قلّ ودلّ" کا مصداق ہے اور اس میں مستند کتابوں اور تذکروں کا لُبِّ لباب آگیا ہے۔

حضرت شیخ عبدالباقی نقشبندی دہلوی (خواجہ باقی باللہ)

شیخ اجل، قطب الاقطاب، امام الأئمہ رضی الدین ابوالمؤید عبدالباقی بن عبدالسلام بدخشی مشہور بہ باقی باللہ کابلی ثم دہلوی، آپ کا وجود دنیا کے لئے باعث برکت و زینت، آپ کی حیات طیّبہ مقصدِ آفرینش و غایت خلق کا مظہر[۳]، آپ کی زبان حقیقت ترجمان، اور آپ کی ذات خلاصۂ عرفان تھی، علم و معرفت میں اللہ کی کھلی نشانی، اور ولایت و روحانیت کے منارۂ نورانی،

---

[۱] حضرت مجدد مدۃ العمران کے احسان مند اور شکر گزار رہے کہ ان کے ذریعہ آپ کو یہ دولتِ جاوید حاصل ہوئی ملاحظہ ہو مکتوب ۲۷۹ دفتر اول۔ [۲] سلسلۂ نقشبندیہ کے مشائخ کبار بالخصوص بانی سلسلہ حضرت خواجہ بہاء الدین نقشبند کے حالات اور سلسلہ کی خصوصیات اور نسبت خاصہ کی اجمالی واقفیت کے لئے اسی سلسلہ کے گلِ سرسبد حکیم الاسلام حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی کی تصنیفات بالخصوص "الانتباہ فی سلاسل اولیاء اللہ" اور "ھمعات" کا مطالعہ کیا جائے۔

[۳] یعنی آیت " وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْإِنْسَ إِلَّا لِيَعْبُدُونِ " (میں نے جن وانس کو اسی لئے پیدا کیا ہے کہ وہ میری عبادت کریں) کی عملی تفسیر اور روشن تصویر۔

۱-۹۷۲ھ کے حدود میں کابل میں پیدا ہوئے اور مولانا محمد صادق حلوائی سے تلمذ اختیار کیا اور ان کے ساتھ ماوراء النہر کا سفر کیا اور ایک مدت تک ان کے ساتھ رہے، پھر ان کے دل میں طریقۂ صوفیہ میں داخل ہونے کا داعیہ پیدا ہوا جس کے نتیجہ میں آپ نے رسمی علوم کی تحصیل چھوڑ دی اور بلاد ماوراء النہر کے بہت سے مشائخ کبار کی مجلسوں میں حاضر ہوتے رہے، آپ نے سب سے پہلے شیخ خواجہ عبید خلیفہ مولانا لطف اللہ خلیفۂ مخدوم اعظم دہبیدی کے دست حق پرست پر توبہ کی، مگر جب آثار استقامت ظاہر نہ ہوئے تو شیخ افتخار کی سمرقند آمد کے موقع پر ان کے ہاتھ پر دوبارہ توبہ کی جو شیخ احمد یسوی کے سلسلہ کے بزرگ تھے، جب دوبارہ اپنی عزیمت و استقامت میں کمی محسوس کی تو اضطراری حالت میں امیر عبداللہ بلخی کے ہاتھ پر تیسری بار توبہ کی، اور کچھ عرصہ حفظ حدود کے پابند رہے، مگر آخری بار یہ توبہ بھی ٹوٹ گئی، اسی عرصہ میں ان کو خواب میں حضرت خواجہ بہاء الدین نقشبندؒ کی زیارت ہوئی اور اہل اللہ کے طریقہ کی طرف رجحان پیدا ہوا، جہاں آپ کے لئے ممکن ہوتا وہاں جاتے رہتے تھے، یہاں تک کہ کشمیر میں شیخ بابا کبروی کی خدمت میں پہونچے اور ان سے مستفید ہوئے، ان کی صحبت میں ان ربانی فیوض کی بارش ہوئی اور اس سلسلہ کی معروف غیبت و فنائیت کے آثار ظاہر ہوئے، شیخ مذکور کی وفات کے بعد آپ شہروں میں پھرتے رہے، اور سیاحت و استفادہ کا عرصہ گزرنے کے بعد حضرت خواجہ عبیداللہ احرارؒ کی روح نے ظاہر ہو کر آپ کو نقشبندی طریقہ کی تعلیم دی اور آپ کی تکمیل ہو گئی، اس کے بعد ماوراء النہر گئے، جہاں شیخ محمد امکنکی سے ملاقات ہوئی، جنھوں نے تین دن کے بعد اجازت و رخصت عطا کی، جس کے بعد آپ ہندوستان واپس ہوئے، اور لاہور میں ایک سال ٹھہرے جہاں بہت سے علماء نے آپ سے استفادہ کیا، پھر وہاں سے ہندوستان کے دار السلطنت دہلی تشریف لائے اور قلعۂ فیروزی میں قیام فرمایا، جس میں ایک بڑی نہر اور ایک بڑی مسجد تھی، آپ وہاں اپنی وفات

تک مقیم رہے۔

آپ اعلیٰ درجہ کے صاحبِ وجد و ذوق، نہایت متواضع و منکسر مزاج تھے، اغیار اور نامحرموں سے اپنے احوال رفیعہ کو چھپانے کی کوشش کرتے اور اپنے کو مقام ارشاد کا مستحق نہیں سمجھتے تھے، اور اگر کوئی آپ کے پاس باطنی استفادہ کے لئے حاضر ہوتا تو آپ اس سے فرماتے کہ میرے پاس تو کچھ نہیں اس لئے آپ کسی اور بزرگ سے رجوع کریں اور اگر آپ کو کوئی شخصیت مل جائے تو مجھے بھی خبر کر دیں، غرض آپ ادّعا سے دور رہ کر آنے والوں کی خدمت و تالیفِ قلب میں مشغول رہتے تھے، اور کسی ضرورت یا دقیق مسئلہ کی وضاحت ہی کے لئے لب کشائی کرتے اور مخاطب کی رہنمائی کے لئے مسئلہ کی پوری وضاحت فرماتے تھے، اپنے احباب کو قیام تعظیمی سے منع فرماتے اور اپنے کو انھیں جیسا سمجھتے تھے، اور تمام حالات میں ان سے مساوات کا معاملہ فرماتے تھے، تواضع و مسکنت کے خیال سے ننگی زمین پر بھی بیٹھ جاتے تھے۔

آپ کو عجیب و غریب کیفیت روحانی اور قوت تاثیر حاصل تھی، جس پر آپ کی نظر پڑ جاتی اس کے حالات بدل جاتے اور پہلی ہی صحبت میں اُسے ذوق و شوق اور اہل معرفت کی روحانی کیفیات حاصل ہو جاتیں اور پہلی ہی توجہ و تلقین میں طالبین کا قلب جاری ہو جاتا تھا، آپ کا فیض اور مخلوق پر شفقت سب کے لئے اس قدر عام تھی کہ سخت جاڑے کی ایک رات میں آپ کسی کام سے بستر سے اٹھ کر گئے اور جب واپس ہوئے تو اپنے لحاف میں ایک بلّی کو سوتا دیکھ کر اسے جگانے اور ہٹانے کے بجائے صبح تک بیٹھے رہے، اسی طرح آپ کے قیام لاہور کے زمانہ میں قحط پڑا تو اس عرصہ میں آپ نے کچھ نہیں کھایا، آپ کے پاس جو کھانا آتا اسے محتاجوں میں تقسیم کر دیتے تھے، لاہور سے دہلی جاتے ہوئے راستہ میں ایک معذور شخص کو دیکھ کر سواری سے اتر پڑے اور اُسے سوار کر کے اور پہچاننے والوں سے بچنے کے لئے

چہرہ چھپائے ہوئے اس کی منزل مقصود تک پیدل گئے اور پھر سوار ہوئے، غلطی کے اعتراف اور اپنے کو خطاکار سمجھنے میں کوئی تأمّل نہ کرتے تھے، اور اپنے اصحاب ہی سے نہیں بلکہ عوام سے بھی اپنے کو ممتاز نہیں سمجھتے تھے۔

کہا جاتا ہے کہ آپ کے پڑوس میں رہنے والا ایک نوجوان ہر قسم کی برائیوں کا ارتکاب کرتا تھا، مگر باخبر ہونے کے باوجود آپ اسے برداشت کرتے رہے، کسی موقع پر ان کے مرید خواجہ حسام الدین دہلوی نے حکام سے اس کی شکایت کی اور انھوں نے اسے پکڑ کر بند کر دیا، جب شیخ کو معلوم ہوا تو وہ اپنے ان مرید پر ناراض ہوئے، اور ان سے باز پرس کی، انھوں نے عرض کیا "حضرت وہ بڑا ہی فاسق ہے" اس پر آپ نے ایک آہ سرد بھری اور فرمایا کہ جی ہاں! آپ لوگ اہل صلاح و تقویٰ تھے، اس لئے آپ نے اس کا فسق و فجور محسوس کر لیا، مگر ہم تو اپنے کو اس سے بہتر نہیں سمجھتے، اس لئے اپنی ذات کو چھوڑ کر حکام تک اس کی شکایت نہیں لے گئے، پھر آپ کی کوشش سے حکام نے اسے رہا کیا، اور وہ تائب ہو کر اہلِ صلاح میں سے ہو گیا۔

جب آپ کے کسی مرید سے کوئی غلطی ہوتی تو اس کے بارے میں فرماتے کہ یہ میری ہی غلطی تھی، جو بالواسطہ اس سے ظاہر ہوئی، عبادات و معاملات میں احتیاطی پہلو اختیار کرتے اس لئے ابتدا میں امام کے پیچھے سورۂ فاتحہ پڑھتے تھے، کیونکہ اس سلسلہ میں بہت سی حدیثیں اور قوی دلیلیں ہیں۔

یہ چند چیزیں ان کے فضائل و کمالات کا صرف ایک معمولی حصہ اور ان کے بحر شمائل کا صرف ایک قطرہ ہیں، اسی وجہ سے دیکھا جاتا ہے کہ قلیل مدت میں کتنے انسانوں کو آپ سے فیض باطنی پہونچا، جہاں تک ہندوستان کا تعلق ہے، اس سلسلۂ مبارکہ کو آپ ہی کے ذریعہ

فروغ حاصل ہوا، جسے آپ سے پہلے کوئی جانتا بھی نہ تھا۔[۱]

شیخ محمد بن فضل اللہ برہانپوری کہتے ہیں کہ آپ وعظ وارشاد میں اپنی نظیر نہیں رکھتے تھے کیونکہ کل تین ۳ چار ۴ سال کی مدت میں اپنے افادات کے ذریعہ دنیا میں روشنی پھیلا دی، اس کی تفصیل ملا ہاشم کشمی کی "زبدۃ المقامات" میں ہے، آپ نے کل چالیس ۴۰ سال کی عمر پائی اور ہندوستان آنے کے بعد کل چار ۴ سال حیات رہے، اور اس تھوڑی مدت میں آپ کے اصحاب ورفقاء کمالات کے اعلیٰ مدارج پر پہونچ گئے یہاں تک کہ انھوں نے گذشتہ سلسلوں کے آثار محو کر دیئے، اور طریقۂ نقشبندیہ تمام سلسلوں پر غالب آگیا۔

محمد بن فضل اللہ محبّی نے "خلاصۃ الاثر" میں لکھا ہے کہ "حضرت شیخ اللہ کی ایک نشانی و روشنی اور سرّ الٰہی اور علم ظاہر وباطن اور تصرفات کے حامل تھے، خاموش طبع، متواضع اور ایسے خوش اخلاق تھے کہ لوگوں میں اپنے کو ذرا بھی ممتاز نہیں کرتے تھے، حتیٰ کہ اپنے احباب کو بھی قیام تعظیمی سے روکتے اور معمولی سلوک کی تلقین کرتے تھے۔"

محبّی کا کہنا ہے کہ آپ سے بڑے تصرفات ظاہر ہوئے، جس پر آپ کی نظر پڑ جاتی یا داخل سلسلہ ہوتا تو اس پر محویت وفنائیت کا غلبہ ہو جاتا، اگرچہ اسے اس راہ سے پہلے کوئی مناسبت نہ ہوتی، لوگ آپ کے دروازہ پر مدہوشوں کی طرح پڑے رہتے، بعض لوگوں

---

[۱] سلسلۂ نقشبندیہ ہندوستان دو طریق سے پہونچا، ایک امیر ابو العلاء اکبرآبادی کے ذریعہ جن کو اپنے چچا عبداللہ احراری سے طریقۂ نقشبندیہ میں اجازت وخلافت تھی، اس طریق میں چشتیت ونقشبندیت باہم مخلوط ہیں، کالپی، مارہرہ، داناپور وغیرہ کا ابو العلائی سلسلہ انہی سے چلتا ہے، دوسرا طریق حضرت خواجہ باقی باللہ کا ہے، اصلاً اس سلسلہ کی ہندوستان میں اشاعت حضرت خواجہ کی آمد اور حضرت مجدد کے اس سلسلہ میں داخل ہونے سے ہوئی، پھر وہ سارے عالم میں پھیل گیا۔ ("الثقافۃ الاسلامیۃ فی الہند" تالیف مولانا سید عبدالحی "مصنف نزہۃ الخواطر")۔

پر پہلے ہی وہلہ میں عالم ملکوت منکشف ہو جاتا جو غیبی کشش کا نتیجہ تھا۔

آپ کے مریدوں میں طریقۂ مجددیہ کے امام و بانی حضرت مجدد الف ثانیؒ، حضرت شیخ تاج الدین بن سلطان عثمانی سنبھلی، شیخ حسام الدین بن شیخ نظام الدین بدخشی، شیخ اللہ داد دہلوی جیسے جلیل القدر مشائخ اور مرجع خلائق بزرگ تھے۔

آپ کی تصنیفات میں نادر رسالے، قیمتی مکاتیب اور پاکیزہ اشعار ہیں، جن میں کتاب "سلسلۃ الأحرار" ہے جس میں آپ نے فارسی میں اپنی عرفانی رباعیات کی شرح کی ہے۔

چہار شنبہ ۱۴ رجمادی الآخرۃ ۱۰۱۲ھ کو دہلی میں چالیس سال چار ماہ کی عمر میں انتقال فرمایا، آپ کی قبر مغربی دہلی میں قدم رسولؐ کے قریب ہے اور زیارت گاہ خلائق ہے۔

بیعت و تکمیل

حضرت مجددؒ حضرت خواجہ کی خدمت میں حاضر ہوئے وہ گویا آپ کے انتظار ہی میں بیٹھے تھے، بڑی شفقت و مہربانی کے ساتھ پذیرائی فرمائی، حضرت خواجہ کی طبیعت بڑی غیور اور دیر آشنا واقع ہوئی تھی، کسی کو خود اپنی طرف متوجہ نہیں فرماتے تھے، لیکن یہاں طالب خود مطلوب تھا، اور خدا کو حضرت خواجہ کے ذریعہ حضرت مجدد کی روحانی تکمیل کر کے اور اُس نسبت خاص کو عطا کر کے جس کا طریقۂ نقشبندیہ اس عہد میں حامل تھا، اور جس کی سلوک باطنی کی دنیا اور ہندوستان کے اِس روحانی ماحول میں ضرورت تھی، ایک نئی نوعیت وطرز سے دین کی تجدید کا کام لینا، طریقت کو شریعت کے تابع بنانا، منازل سلوک کو طے کرانا اور وسائل سے مقاصد تک پہونچانا مقصود تھا، حضرت خواجہ نے خلاف معمول فرمایا کہ "آپ چند روز ہمارے مہمان رہیں، ایک ماہ ایک ہفتہ ہی سہی"۔

حضرت خواجہ نے ہندوستان آنے کا ارادہ کیا تو استخارہ کیا تھا، استخارہ کے بعد معلوم ہوا کہ ایک خوبصورت طوطی جو بہت میٹھی باتیں کرتا ہے، ان کے ہاتھ پر آکر بیٹھ گیا، وہ اپنا لعاب دہن اس کے منہ میں ڈالتے ہیں، اور وہ اپنے منقار سے ان کے منہ میں شکر دے رہا ہے، حضرت خواجہ نے اپنے پیر و مرشد حضرت خواجہ امکنگی سے یہ واقعہ بیان کیا تو انھوں نے فرمایا کہ "طوطی ہندوستان کا جانور ہے، ہندوستان میں تمہاری تربیت سے کوئی ایسا شخص تیار ہوگا جس سے ایک عالم منور ہو جائے گا، اور تم کو بھی اس سے حصہ ملے گا۔"[1]

حضرت مجدد کے لئے اس ارشاد کے بعد انکار و معذرت کی کیا گنجائش تھی کہ ان کے اندر خود خضر طریق اور چشمۂ حیواں کی طلب موجود تھی، آپ نے یہ دعوت قبول فرمائی اور رفتہ رفتہ یہ قیام ایک ماہ دو ہفتہ کو منجر ہوا، اس صحبت میں طریقۂ نقشبندیہ کے اکتساب و تحصیل کا ایسا جذبہ طاری ہوا کہ بیعت کی درخواست کی، حضرت خواجہ نے بلا تامل قبول فرمایا اور خلوت میں لے جاکر ذکر قلبی کی تلقین کی، اور آپ کی توجہ سے اسی وقت ذکر قلبی جاری ہوگیا اور ایسی حلاوت و لذت محسوس ہوئی جو یوماً فیوماً بلکہ آناً فاناً ترقی کرتی رہی، حضرت خواجہ نے ان حالات اور برق رفتار ترقی کو دیکھ کر یہ سمجھا کہ یہی وہ طوطی خوشنوا ہے، جو خواب میں دکھایا گیا تھا، اور اسی کی خوش نوائی و خوش ادائی سے ہندوستان کے چمن بلکہ چمن اسلام میں نئی بہار آئے گی۔

جہانے را دگرگوں کرد یک مردِ خود آگاہے

اس دو ڈھائی مہینہ میں حضرت مجدد کو جو باطنی کیفیات و ترقیات حاصل ہوئیں اور جو مراحل سلوک طے ہوئے ان کا بیان کرنا اور الفاظ کے ذریعہ ان کا سمجھنا یا سمجھانا ممکن نہیں ہے[2]۔

---

[1] زبدۃ المقامات ص۱۴۰-۱۴۱، حضرات القدس ص۲۶-۲۷ [2] اگر کسی کو اس کے دیکھنے کا شوق ہو تو وہ مکتوب ۲۹۶ دفتر اول حصہ چہارم بنام حضرت خواجہ عبید اللہ اور خواجہ عبد اللہ فرزندان حضرت خواجہ باقی باللہ، نیز مکتوب نمبر ۲۹۰ دفتر اول حصہ پنجم بنام مولانا محمد ہاشم کشمی کا مطالعہ کرے۔

اکنوں کرا دماغ کہ پرسد ز باغباں
بلبل چہ گفت و گل چہ شنید و صبا چہ کرد

حضرت مجدد اس کے بعد سرہند تشریف لے گئے، اس پہلی مرتبہ ہی حضرت خواجہ نے خوشخبری سنائی کہ تم کو نسبت نقشبندیہ کامل طور پر حاصل ہو گئی اور یوماً فیوماً ترقی ہونے کی امید ہے، دوسری مرتبہ جب دہلی حاضری ہوئی تو خلعت خلافت عطا فرمایا اور طالبانِ خدا کو تعلیم طریقت اور ارشاد و ہدایت کی اجازت دی، اور اپنے مخصوص ترین اصحاب کو تعلیمِ طریقت کے لئے آپ کے سپرد کیا۔

حضرت مجدد اس کے بعد تیسری اور آخری مرتبہ حضرت خواجہ کی خدمت میں حاضر ہوئے، حضرت خواجہ نے بہت دور باہر نکل کر استقبال کیا اور بڑی بشارتیں دیں، اپنے حلقۂ توجہ میں آپ کو سرِ حلقہ بنایا اور مریدوں سے فرمایا کہ ان کی موجودگی میں کوئی شخص میری طرف متوجہ نہ ہوا کرے، رخصت کرتے وقت فرمایا کہ "اب ضعف بہت معلوم ہوتا ہے، امیدِ حیات بہت کم ہے" اور اپنے دونوں صاحبزادوں حضرت خواجہ عبید اللہ اور حضرت خواجہ عبد اللہ کو جو اس وقت شیر خوار تھے، اپنے سامنے آپ سے توجہ دلائی اور فرمایا کہ ان کی ماؤں کو بھی غائبانہ توجہ دیجئے، چنانچہ آپ نے توجہ دی اور توجہ کا اثر بھی اسی وقت ظاہر ہوا۔[1]

حضرت مجددؒ کے علوِ مرتبہ کی شہادت حضرت خواجہ کی زبان سے

حضرت خواجہ نے اپنے ایک مخلص کو اس تعلق کے بعد ایک خط میں تحریر فرمایا کہ "شیخ احمد نے جو سرہند کے باشندہ کثیر العلم قوی العمل بزرگ ہیں، فقیر کے ساتھ چند دن نشست و برخاست

[1] زبدۃ المقامات ص۱۵۵

کی فقیر کے مشاہدہ میں ان کے عجیب کمالات واوصاف آئے، امید ہے کہ وہ ایک ایسا چراغ بنیں گے جس سے ایک عالم روشن ہو جائے گا، ان کے احوال کاملہ پر میرا یقین استوار ہے۔"

خود حضرت مجدد کو پہلی ہی توجہ و تلقین سے یقین ہو گیا کہ وہ اس راہ کے مدارج عالیہ تک پہونچیں گے، اسی کے ساتھ دید قصور اور اپنی نفی بھی دل میں راسخ تھی، اسی کے ساتھ یہ شعر بھی وردِ زبان تھا ؎

ازیں نورے کہ از تو بر دلم تافت
یقین دانم کہ آخر خواہمت یافت [۱]

حضرت مجدد ان ترقیات باطنی اور فضائل علمی و عملی کے ساتھ اپنے شیخ و مرشد کا نہایت درجہ ادب کرتے تھے، کسی وقت اگر شیخ نے ان کو طلب فرمایا تو چہرہ کا رنگ متغیر ہو جاتا اور جسم پر لرزہ طاری ہو جاتا [۲]، ادھر شیخ کا معاملہ ان کے ساتھ یہ ہو گیا جو کم تر کسی شیخ کا اپنے مسترشد کے ساتھ ہوا ہوگا، ایک مرتبہ فرمایا کہ "شیخ احمد آفتاب است کہ مثل ما ہزاراں سیارگان در ضمن ایشاں گم اند [۳]"
(شیخ احمد وہ آفتاب ہیں، جن کی روشنی میں ہم جیسے ہزاروں ستارے گم ہیں۔)

۱؎ زبدۃ المقامات ص۱۴۵ ۲؎ ایضاً ص۱۴۹ ۳؎ ایضاً ص۲۳۰

باب چہارم

اہم واقعات وحالات، ارشاد وتربیت کی سرگرمی، وفات

سرہند کا قیام

اس اکتساب فیض اور تکمیل کے بعد حضرت مجدد نے سرہند میں گوشہ نشینی اختیار فرمائی، ایک عرصہ تک آپ طالبین کی تربیت سے احتراز فرماتے رہے، اور آپ کو اپنی ذات میں کمی کا بہ شدت احساس ہوتا رہا، ترقیات باطنی تیزی کے ساتھ ہو رہی تھیں، اور طبیعت عروج کی طرف مائل تھی، ایسی صورت میں طالبین کی تعلیم وتربیت کی طرف توجہ مشکل تھی جس کے لئے نزول شرط ہے، جو ابھی تک نہیں ہوا تھا، ایک خط میں تحریر فرماتے ہیں کہ (اس حالت میں) "اپنے نقص کا علم روشن ہو گیا جو طالب میرے پاس جمع تھے سب کو جمع کر کے اپنا نقص ان سے بیان کیا اور سب کو رخصت کر دیا، لیکن طالب اس بات کو کسر نفسی سمجھتے ہوئے اپنے عقیدے سے نہ پھرے کچھ مدت کے بعد حق سبحانہ وتعالیٰ نے اپنے حبیب صلے اللہ علیہ وسلم کے طفیل احوال منتظرہ عطا فرما دیئے"۔[1]

آخر وہ وقت آگیا کہ آپ کا فیض عام ہو، اور طالبین کی تکمیل اور ارشاد کا کام

[1] مکتوبات، مکتوب ۲۹۰ دفتر اول۔

شروع ہو، مجدد صاحب اپنے احوال مسترشدین اور برادران طریقت کی ترقیات باطنی کی تفصیل شیخ کو لکھتے رہے، ایسی بشارتیں منامات اور کیفیات بھی ظاہر ہوئیں جن سے آپ کو یقین ہو گیا کہ اللہ تعالیٰ کو آپ سے کوئی بڑا کام لینا ہے اور آپ سے دین کی کوئی عظیم الشان خدمت وجود میں آئے گی، [۱] تیسری حاضری کے بعد حضرت خواجہ کی صحبت میسر نہ ہو سکی۔

لاہور کا سفر

حضرت مجدد نے کچھ عرصہ سرہند مقیم رہ کر شیخ کے اشارہ وارشاد پر لاہور کا سفر اختیار فرمایا، لاہور اس وقت دہلی کے بعد ہندوستان کا دوسرا علمی و دینی مرکز تھا، اور وہاں بکثرت علماء ومشائخ تھے، ان میں سے ایک جم غفیر نے آپ کی آمد کی خبر سن کر آپ کا پرجوش استقبال کیا اور بڑی تعظیم وتکریم سے پیش آئے، [۲] مولانا طاہر لاہوری (جو بعد میں حضرت مجدد کے اجلّۂ خلفاء میں ہوئے) مولانا حاجی محمدؒ، مولانا جمال الدین تلوی آپ کے حلقۂ ارادت وبیعت میں داخل ہوئے، ذکر ومراقبہ کا حلقہ قائم ہوتا اور مجالس صحبت گرم رہتیں۔ [۳]

حضرت مجدد ابھی لاہور ہی میں مقیم تھے کہ حضرت خواجہ کی رحلت کی اطلاع ملی، حضرت پر بڑا اثر ہوا، ایک اضطرابی واضطراری حالت میں دہلی کی طرف عنان سفر موڑ دی، راستہ میں سرہند پڑتا تھا، لیکن گھر نہ گئے پہلے اپنے شیخ ومرشد کے مزار پر حاضر ہوئے، مرشد زادوں اور برادران طریقت سے تعزیت کی اور ان کی خواہش پر ان کی تسکین خاطر کے لئے چند روز دہلی میں قیام

۱؎ ملاحظہ ہو مکتوب ۲۴۲ دفتر دوم　　۲؎ زبدۃ المقامات ص ۱۵۷

۳؎ زبدۃ المقامات ص ۱۵۸، روضۃ القیومیہ میں ہے کہ اس سفر میں خان خاناں اور مرتضیٰ خاں (سید فرید) بھی حلقۂ ارادت وبیعت میں داخل ہوئے ص ۱۱۷

فرمایا، اور تربیت وارشاد کی محفل جو حضرت خواجہ کے ارتحال سے سونی ہو گئی تھی، دوبارہ آباد اور مغموم ومجروح دل شگفتہ اور تازہ ہو گئے[۱]

کچھ روز قیام فرما کر آپ سرہند تشریف لے آئے، اس کے بعد صرف ایک مرتبہ دہلی اور دو تین مرتبہ آگرہ جانے کا اتفاق ہوا، آخر عمر میں تین سال تک شاہی لشکر کے ہمراہ (جس کا ذکر آگے آئے گا) بعض شہروں اور مقامات سے آپ کا گذر ہوا، تو وہاں کے اہل طلب اور اہل شوق آپ کی صحبت سے مستفید ہوئے[۲]

تبلیغ ودعوت اور ارشاد وتربیت کے وسیع انتظامات اور رجوع عام

۱۰۲۶ھ میں آپ نے اپنے بہت سے خلفاء تبلیغ وہدایت کے لئے مختلف مقامات پر بھیجے، ان میں سے ستر مولانا محمد قاسم کی قیادت میں ترکستان کی طرف روانہ کئے گئے، چالیس حضرات مولانا فرخ حسین کی امارت میں عرب، یمن، شام اور روم کی طرف بھیجے گئے، دس ذمہ دار اور تربیت یافتہ حضرات مولانا محمد صادق کابلی کے ماتحت کاشغر کی طرف اور تیس خلفاء مولانا شیخ احمد برکی کی سرداری میں توران، بدخشاں، اور خراسان گئے، اور ان حضرات کو اپنے اپنے مقامات میں بڑی کامیابی حاصل ہوئی، اور بندگان خدا نے ان سے فائدہ اٹھایا[۳]

بہت سے نامی گرامی علماء ومشائخ جو اپنے اپنے مقامات پر بڑی عزت واحترام کی نظر سے دیکھے جاتے تھے، سفر کی دشوار گزار منزلیں طے کر کے سرہند حاضر ہوئے، اور بیعت واستفادہ سے مشرف ہوئے، ان میں شاہ بدخشاں کے معتمد علیہ شیخ طاہر بدخشی طالقان کے

---

۱ زبدۃ المقامات ص ۱۵۸ ۲ ایضاً ص ۱۵۹ ۳ روضۃ القیومیۃ ص ۱۶۶-۱۶۷

جید عالم شیخ عبدالحق شادمانی، مولانا صالح کولابی، شیخ احمد برسی، مولانا یار محمد، اور مولانا یوسف خاص طور پر قابل ذکر ہیں، آپ نے ان میں سے اکثر حضرات کو خلافت واجازت عطا فرما کر دعوت وارشاد کے لئے اپنے اپنے مقامات کو واپس کیا[۱]۔

ہندوستان میں بھی آپ نے جا بجا اپنے خلفاء کو دعوت وارشاد پر مامور فرمایا، خواجہ میر محمد نعمان کو خلافت عطا فرما کر دکن بھیجا، ان کی خانقاہ میں کئی کئی سو سوار اور بے شمار پیادہ ذکر ومراقبہ کے لئے حاضر ہوتے تھے، شیخ بدیع الدین سہارنپوری کو خلافت عطا فرما کر پہلے سہارنپور پھر شاہی لشکر گاہ (معسکر) آگرہ میں متعین کیا، ان کو وہاں قبول عام حاصل ہوا، بہت سے ارکان سلطنت ان کے حلقہ بگوش ہوئے، لشکر کے ہزارہا آدمی مرید ہوئے، ہر روز اس قدر ہجوم ہوتا کہ بڑے بڑے امراء کو مشکل سے شیخ کی زیارت کی نوبت آتی، میر محمد نعمان کشمی کو جو حضرت خواجہ باقی باللہ کے خلفاء میں تھے، تجدید بعیت واجازت نامہ مرحمت فرما کر برہان پور روانہ فرمایا اور آپ وہاں مرجع طالبین بن گئے، اور لوگوں کی بڑی اصلاح ہوئی، شیخ طاہر لاہوری کو شہر لاہور کے (جو ہندوستان کا دوسرا علمی وسیاسی مرکز تھا) طالبان معرفت کی رہنمائی کے لئے روانہ فرمایا، اور ان سے اس دیار میں بڑا فیض پہونچا، شیخ نور محمد پٹنی کو اجازت مرحمت فرما کر شہر پٹنہ روانہ فرمایا اور ان سے ان دیار میں ارشاد و ہدایت اور افادۂ علوم دینیہ کا سلسلہ جاری ہوا، شیخ حمید بنگالی کو منازل سلوک طے کرا کے اور تعلیم وطریقت کی اجازت دے کر بنگالہ روانہ کیا، شیخ طاہر بدخشی کو تکمیل حال کے بعد تعلیم وطریقت کی اجازت دے کر جونپور روانہ کیا، مولانا احمد برکی تعلیم وتربیت میں مجاز ہونے کے بعد برک

---

[۱] تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو روضۃ القیومیہ ص۱۲۸، ۱۲۹ "حضرات القدس" میں بھی خلفاء کے ضمن میں متفرق طور پر ان کے مختلف مقامات کی طرف روانہ کرنے اور ارشاد وتربیت پر مامور کرنے کا ذکر آیا ہے۔ ملاحظہ ہو حضرات القدس ص۲۹۹ تا ۳۶۸

پہونچ کر ارشاد و تربیت میں مشغول ہو گئے، اور اپنے مریدوں کے احوال بذریعۂ مکاتیب حضرت کی خدمت میں لکھتے رہے، شیخ عبد الحی حصار شادماں (علاقۂ اصفہان) کے باشندہ تھے، مکتوبات کا دفتر ثانی آپ ہی کا ترتیب دیا ہوا ہے، حضرت نے آپ کو تعلیم و طریقت کی اجازت دے کر شہر پٹنہ روانہ فرمایا، شیخ عبد الحی شہر کے درمیان تشنگان طریقت کی پیاس بجھاتے تھے، اور شیخ نور محمد دریائے گنگا کے کنارے ارشاد و تربیت کا چشمہ جاری کئے ہوئے تھے، شیخ حسن برکی بھی اپنے وطن میں اشاعت طریق و سنت پر مامور تھے، سید محب اللہ مانکپوری کو خلافت عطا کر کے مانکپور روانہ کیا، پھر حضرت کی اجازت سے وہ الہ آباد منتقل ہو گئے، شیخ کریم الدین بابا حسن ابدالی توجہات خصوصی سے سرفراز ہو کر وطن واپس ہو گئے[1] ۱۰۲۷ھ مکمل نہیں ہوا تھا کہ حضرت مجدد کی جلالت شان اور قوت ارشاد و حسن تربیت کا آوازہ بیرون ہند تک پہونچ چکا تھا، لوگ جوق در جوق زیارت و استفادہ کے لئے آنے لگے، ماوراء النہر، بدخشاں، کابل اور بعض دوسرے عجمی ممالک کے بہت سے شہروں میں آپ کے خلفاء موجود تھے، اور عرب ممالک تک بھی آپ کی شہرت پہونچ گئی تھی، ہندوستان میں تو مشکل سے کوئی شہر ہوگا جہاں آپ کے نائبین اور دعوت الی اللہ دینے والے موجود نہ ہوں۔

سلطانِ وقت جہانگیر کا رویہ

۱۰۱۴ھ میں جلال الدین اکبر بادشاہ کا انتقال ہوا، اور نور الدین جہانگیر تخت سلطنت پر بیٹھا، اکبر کے دور میں اسلام اور مسلمانوں پر جس طرح عرصۂ حیات تنگ ہوا، اور اس عظیم ملک میں (جس کو مسلمان فاتحین کے خون، مصلحین اور خادمین اسلام کے پسینہ، اور اہل باطن و

[1] حضرات القدس الحضرۃ الثانیۃ عشرۃ فی بیان احوال خلفائہ، و دیگر کتب۔

اہلِ قلوب کے اشک سحرگاہی سے سیراب و بار آور کیا گیا تھا) اسلام کی بیخ کنی کا کام جس قوت اور منصوبہ بندی کے ساتھ کیا گیا تھا، وہ آپ کے دردمند دل اور غیور اسلامی طبیعت کو مضطرب کرنے کے لئے کافی تھا، لیکن کچھ تو اپنی تکمیل حال اور باطنی تیاریوں میں مشغولیت کی بنا پر اور کچھ اس لئے کہ وہ فتنہ اپنے شباب پر تھا، اور ابھی وہ سرا ہاتھ میں نہیں آیا تھا، جس کے ذریعہ آپ سلطنت اور اس کے رجحان اور اسلام اور مسلمانوں کے بارے میں اس کی سیاست پر اثرانداز ہو سکیں، آپ نے اپنا تجدیدی و اصلاحی کام پوری قوت کے ساتھ شروع نہیں فرمایا، اور اگر فرمایا تو تاریخوں میں زیادہ تفصیل نہیں ملتی اتنا پتہ چلتا ہے کہ آپ نے خانِ خاناں سید صدر جہاں اور مرتضیٰ خاں وغیرہ کے ذریعہ بادشاہ کو نصیحت آمیز پیغامات بھیجے ان حضرات کو بادشاہ کا تقرب و اعتماد حاصل تھا، اور حضرت مجدد کی عظمت و عقیدت بھی ان کے دل میں گھر کر چکی تھی۔

جہانگیر کو نہ صرف یہ کہ اسلام سے کوئی عناد نہ تھا، بلکہ ایک طرح کی سلامت روی اور حسن اعتقاد تھا، اور اس کو کسی نئے دین و آئین کے جاری کرنے سے کوئی دلچسپی نہ تھی، اس کا عمل اپنے جدامجد کی اس ہدایت پر تھا کہ ؎

بابر بعیش کوش کہ عالم دوبارہ نیست

آپ نے بادشاہ کی اس سادہ طبیعت سے فائدہ اٹھا کر ہندوستان سے ان اثرات کو ختم کرنے کا ارادہ کیا جو سابقہ سلطنت میں پیدا ہوئے تھے، اور جس کی تفصیل آئندہ ایک مستقل باب میں آئے گی۔

لیکن قبل اس کے کہ آپ یہ انقلاب انگیز کام شروع کریں، گوالیار کی اسیری کا واقعہ پیش آگیا جو کئی حیثیتوں سے حضرت مجدد کی حیات اور اس عہد کی اصلاحی و تجدیدی تاریخ کا ایک اہم واقعہ ہے،

بعض سیر و سوانح کی عام کتابوں میں بیان کیا گیا ہے کہ جہانگیر کے سامنے مکتوبات کے وہ نازک مضامین پیش کئے گئے، جن کا سمجھنا تصوف کی اصطلاحات و دقائق اور لکھنے والے کے غرض و منشاء کے سمجھنے پر موقوف ہے، اور جو درحقیقت وہ عبوری مکشوفات و محسوسات تھے، جو سالک کو اپنے سیر و سلوک میں عارضی طور پر پیش آتے ہیں، اور جن کی اپنے شیخ و مربی کو اطلاع دینی ضروری ہے۔[۱]

جہانگیر کے لئے ان مضامین میں جو اس کے فہم سے بالاتر تھے، اور جن میں ایک سادہ لوح سنّی العقیدہ مسلمان کے لئے جو کشف، واقعہ اور عبور و استقرار کے فرق کو نہیں جانتا، وحشت و تشویش کے پورے اسباب موجود تھے، اس نے ان میں بڑے حیرت و استعجاب کا اظہار کیا، اور ان کو جمہور مسلمین و اہل سنت کے مسلمہ عقائد کے خلاف سمجھا اور ادعاء و خود پرستی پر محمول کیا، اپنی توزک میں اس نے جہاں واقعہ کا ذکر کیا ہے، اس میں اس کی حیرت و استعجاب صاف جھلکتا ہے، مجدد صاحب کا ذکر اس نے بہت نامناسب انداز اور کسی قدر تحقیر آمیز طریقہ پر کیا ہے،[۲]

---

[۱] ملاحظہ ہو مکتوب نمبر ۱۱ دفتر اول بنام حضرت مرشد خواجہ باقی باللہ۔

"جہانگیر کے علاوہ جو اس کوچہ سے نابلد تھا بعض اچھے راسخ العلم حضرات کو بھی ان مضامین کو پڑھ کر بڑا اشکال پیش آیا، ان میں اس عہد کے نامور عالم ناشر علم حدیث اور جامع شریعت و طریقت حضرت شیخ عبدالحق بخاری دہلوی خاص طور پر قابل ذکر ہیں، عرصہ تک ان کو اس بارہ میں بڑا تردد رہا، اور ان کی اور حضرت مجدد کی مراسلت بھی ہوئی، آخر میں ان کو اس بارے میں اطمینان و شرح صدر ہو گیا جس کا اظہار انھوں نے اپنے ایک مکتوب میں فرمایا، ان کے صاحبزادے شیخ نورالحق کی روایت ہے کہ "یہ بات پایۂ تحقیق کو پہونچی ہے کہ ایک شخص حسن خاں نامی پٹھان جو حضرت شیخ (مجدد) کے مریدوں میں تھا کسی بات پر آزردہ اور ناراض ہو کر چلا گیا اور شیخ کے مکتوبات میں جن کا ایک قلمی مجموعہ اس کے پاس تھا تحریف و اضافہ کر کے مسخ شدہ حالت میں جا بجا پھیلا دیا۔" (مناقب العارفین از شاہ فتح محمد فتحپوری چشتی ص ۱۲۶)

غلط فہمی اور اس ہنگامہ کی بنیاد یہ تحریف شدہ مکاتیب بھی ہو سکتے ہیں۔ [۲] ملاحظہ ہو توزک جہانگیری ص ۲۷۲-۲۷۳ وقائع سنہ جلوس ۱۴ / سنہ ۱۰۲۸ھ

اس سے بھی اندازہ ہوتا ہے کہ وہ مجدد صاحب کے مرتبہ و مقام سے بالکل بے خبر ہے، اور وہ ایک تورانی مغل امیر کے قلم سے جو مسلمانوں کے عام عقائد کے سوا کچھ نہیں جانتا، اور اپنے کو ان کا حامی و محافظ سمجھتا ہے، بے تکلف اظہار خیال کر رہا ہے۔

شیخ بدیع الدین سہارنپوری کو لشکر شاہی میں جو قبولیت حاصل ہوئی تھی، اور اعیان سلطنت کی ان کے یہاں بکثرت آمد و رفت شروع ہو گئی تھی، اس کو بھی لوگوں نے بڑھا چڑھا کر پیش کیا، اور اس سے خطرہ ظاہر کیا، یہ بھی کہا گیا کہ حضرت مجدد شیخ کے ذریعہ فوج سے ساز باز کر رہے ہیں، اور بغاوت کا منصوبہ تیار کر رہے ہیں، اس سلسلہ میں شیخ بدیع الدین سے اپنے جوش عقیدت میں بھی بعض بے احتیاطیاں ہوئیں، اور انھوں نے اپنے بعض وقائع و کشوف "کلموا الناس علی قدر عقولھم" کی نصیحت پر عمل نہ کرتے ہوئے ایسے بیان کئے، جو خواص کالعوام اور عوام کالانعام کے فہم و ادراک سے بالاتر اور محل قیل و قال تھے[1]، اس کا اثر حضرت مجدد تک بھی پہونچا، جہانگیر اس کوچہ سے بالکل ناآشنا تھا، اور دربار میں اس کے کان بھرنے والے بھی موجود تھے، اور چونکہ مجدد صاحب تشیّع کے ان اعتقادی اور عملی اثرات کا مقابلہ کرتے تھے، جو ایرانی عنصر کے ہندوستان میں آنے اور دربار پر حاوی ہو جانے کے بعد سے مسلم معاشرہ پر چھائے چلے جا رہے تھے، اور عقائد اہل سنت کی صاف صاف تبلیغ فرماتے تھے، اس سے اگر دربار کے بارسوخ ایرانی عنصر نے اس موقع سے فائدہ اٹھانا چاہا ہو تو تعجب نہیں، مسئلہ کو سیاسی رنگ دینے کے بعد اس کی اہمیت اور بڑھ گئی، اور جہانگیر نے اس سلسلہ میں کوئی قدم اٹھانے کا فیصلہ کیا۔

یہ وہ زمانہ تھا کہ حضرت مجدد کا آفتاب ارشاد نصف النہار پر تھا، اور آپ کی سرگرمی و مصروفیت اور اسی کے ساتھ شہرت و مقبولیت نقطۂ عروج پر، شاید اس میں بھی

[1] زبدۃ المقامات ص ۳۴۸

حکمت الٰہی تھی کہ اس عظمت و عروج کے عین شباب کے زمانہ میں آپ کو اس ابتلاء و امتحان میں ڈال کر وہ مقامات عبدیت طے کرائے جائیں، اور روحانی ترقی کے اس مقام پر پہونچایا جائے جو عادۃً اس مجاہدہ و امتحان کے بغیر حاصل نہیں ہوتا۔

گوالیار کی اسیری کے اسباب

تاریخ و سوانح کی عام کتابوں میں اسیری اور قلعۂ گوالیار میں نظر بند کئے جانے کا سبب اسی خاص مکتوب کے (جو حضرت نے اپنے شیخ و مرشد کو لکھا تھا) وہ نازک مضامین، مکاشفات اور سیر و سلوک کے سلسلہ کی ان دقیق باتوں ہی کو ٹھہرایا گیا ہے جن سے کہ آپ کا بہت سے اکابر امت سے عالی مقام ہونا ثابت ہوتا ہے۔

لیکن راقم سطور کو اس میں بہت شبہ ہے کہ حضرت مجدد کو یہ ابتلاء محض اس غلط فہمی میں پیش آیا، اور اس کا سبب جہانگیر کی دینی حمیت اور جمہور اہل سنت کے عقائد و مسلمات کی حمایت تھی، یا یہ محض علمائے دربار یا اس عہد کے قابل احترام علماء و مشائخ کے اصرار و تقاضہ سے کیا گیا، جہانگیر کسی زمانہ میں بھی اس دینی مزاج کا آدمی نہیں تھا، اور اس کی دینی حس کبھی اتنی تیز اور نازک نہیں تھی کہ وہ ایک ایسے مسئلہ میں جو اس کے فہم سے بالاتر تھا، اور جس کا امور سلطنت اور سیاست سے کوئی تعلق نہیں تھا، ایک ایسی بلند پایہ دینی شخصیت کے خلاف اتنا بڑا اقدام کرے جو ہزاروں آدمیوں کی محبت و عقیدت کا مرکز تھی۔

اس سے پہلے اس کے والد اور دادا کے زمانہ میں شیخ محمد غوث گوالیاری معراج کا دعویٰ کر چکے تھے، اور اس کی وجہ سے علماء کے حلقہ میں شورش و ہیجان تھی[1]، اور ان پر فتوے

[1] تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو پروفیسر محمد مسعود صاحب کی کتاب "شاہ محمد غوث گوالیری" مطبوعہ کراچی

لگائے جا رہے تھے، لیکن نہ ہمایوں نے ان کے خلاف کوئی کارروائی کی اور نہ اکبر نے، خود جہانگیر کے زمانہ میں بہت سے مشائخ وحدۃ الوجود کے آخری حدود "عینیت" اور "مساوات" تک پہونچ گئے تھے، اور اس کا برملا اظہار کرتے تھے، اسی کے زمانہ میں شیخ محب اللہ الہ آبادی[1] نے عربی میں کتاب "التسویۃ" لکھی اور فارسی میں اس کی شرح کی لیکن جہانگیر نے ان تحقیقات وعزیب اقوال کا کوئی نوٹس نہیں لیا، یہ بات بھی پیش نظر رہے کہ متنازعہ فیہ مکتوب ۱۱ (جس کو اس پورے قصہ کی بنیاد بنایا گیا ہے) حضرت خواجہ کے نام ۱۰۱۲ھ کا لکھا ہوا ہے، اور گرفتاری سولہ[16] سال بعد ۱۰۲۸ھ میں عمل میں آئی۔

راقم سطور کے نزدیک اس کی اصل وجہ یہ تھی کہ حضرت مجدد کے ارکان سلطنت اور امرائے دربار سے خصوصی تعلقات ہو گئے تھے، اور ان کو حضرت سے گہری عقیدت تھی، جو ایک ایسے ذکی الحس حکمراں کے لئے جو اپنے والد کے خلاف علم بغاوت بلند کر چکا تھا، اور بیٹوں سے زور آزمائی کر کے تخت سلطنت پر بیٹھا تھا، وسوسہ اندازی کے لئے کافی تھا، یہ بھی ممکن ہے کہ جہانگیر کو ان موثر اور ولولہ انگیز خطوط کا بھی علم ہو گیا ہو، جو حضرت مجدد نے ان ارکانِ سلطنت کو اصلاح حال اور حکومت کو اسلام کی حمایت اور دین کی حمیت کے سلسلہ میں تحریر فرمائے تھے۔

ان امرائے دربار اور اراکین سلطنت میں خان اعظم مرزا عزیز الدین، خان جہاں خاں لودھی، خان خاناں مرزا عبدالرحیم، مرزا داراب، قلیج خاں وغیرہ تھے۔[2]

مغل سلاطین مشائخ سے عوام کی حد سے بڑھی ہوئی عقیدت، رجوع عام اور ان کے گرد لوگوں کے پروانہ وار جمع ہو جانے سے ہمیشہ خائف رہے ہیں... مجدد صاحب کے خلیفۂ کبیر حضرت سید آدم بنوری کے ساتھ یہی پیش آیا، وہ جب ۱۰۵۲ھ میں لاہور تشریف لے گئے تو ان کی

---

[1] متوفی ۱۰۵۸ھ [2] اس خیال کی تائید اس سے بھی ہوتی ہے کہ جہانگیر تزک میں خود لکھتا ہے کہ شیخ کے خلفاء ہر دیار اور ہر قریہ میں متعین ہیں (ص ۲۷۲) نیز یہ کہ اس گرفتاری کی مصلحت یہ ہے کہ "شورش عوام نیز فرو شود" (ص ۲۷۳)

ہم کابلی میں دس ہزار سادات ومشائخ اور مختلف طبقوں کے عقیدت مند تھے، اس وقت شاہجہاں لاہور ہی میں تھا، اس کو اس سے خطرہ محسوس ہوا اور اس نے ایسے اسباب پیدا کئے کہ آپ نے ہندوستان کو خیر باد کہا اور حرمین شریفین کی طرف ہجرت کی، غالباً یہی وجہ تھی کہ جہانگیر نے گوالیار کی نظر بندی ختم کرنے کے بعد ایک طویل عرصہ تک حضرت کو اپنے لشکر میں سفر وحضر میں ساتھ رکھا تا کہ وہ امراء وارکان سلطنت کے تعلقات کی نوعیت کا مطالعہ کر سکے، اور اس کا اطمینان کرے کہ آپ سے سلطنت واقتدار کے لئے کوئی خطرہ نہیں، اور نہ آپ سے کوئی مخالف عنصر یا حوصلہ مند یا طالع آزما فائدہ اٹھا سکے گا، اس کو جب حضرت کے طرزِ عمل سے اس کا اطمینان ہو گیا، اور اس نے آپ کے اخلاص، للّٰہیت، بے لوثی، اور بے غرضی اور علو مقام کا مشاہدہ کیا، اور اس کو بچشم خود دیکھ لیا کہ آپ دنیا کی شوکت وحشمت کو خس وخاشاک کے برابر نہیں سمجھتے، تو اس نے آپ کو سرہند میں آزادانہ طریقہ پر قیام کی اجازت دی۔

قلعۂ گوالیار کی نظر بندی

بہر حال جہانگیر نے حضرت مجدد کو اپنے مستقر پر طلب کیا اور حاکم سرہند کو تاکید کی کہ جس طرح ہو سکے آپ کو وہاں بھجوا دے، آپ حاضر الوقت پانچ مریدوں کو ہمراہ لے کر روانہ ہو گئے، بادشاہ نے جب آپ کی تشریف آوری کی خبر سنی تو امراء کو آپ کے استقبال کے لئے بھیجا، اپنے محل کے قریب خیمہ نصب کرایا، اور ملاقات کے لئے آپ کو دربار میں طلب کیا، آپ دربار میں تشریف لے گئے تو آداب شاہی جو خلاف شرع تھے، آپ نے ادا نہ کئے، ایک ناخدا ترس درباری نے بادشاہ کو متوجہ کیا اور کہا کہ جہاں پناہ شیخ نے آداب سلطنت کی کوئی رعایت نہیں کی، بادشاہ نے وجہ دریافت کی، آپ نے فرمایا کہ میں نے آج تک خدا اور

رسول کے بتائے ہوئے آداب واحکام کی پابندی کی ہے، اس کے علاوہ مجھے کوئی آداب نہیں آتے، بادشاہ نے ناراض ہو کر کہا مجھے سجدہ کرو،[1] آپ نے فرمایا میں نے سوائے خدا کے نہ کسی کو سجدہ کیا اور نہ کروں گا، بادشاہ اس پر ناراض ہوا اور گوالیار کے قلعہ میں نظر بند کرنے کا حکم دے دیا۔[2]

اس واقعہ سے پہلے شاہ جہاں نے (جس کو حضرت سے عقیدت و خلوص تھا) علامہ افضل خاں اور خواجہ عبدالرحمٰن مفتی کو کتب فقہ اور اس پیغام کے ساتھ حضرت مجدد کے پاس بھیجا تھا کہ سجدۂ تحیہّ سلاطین کے لئے آیا ہے، اگر آپ سجدہ کرلیں تو میں اس بات کا ضامن و ذمہ دار ہوں کہ آپ کو کوئی گزند نہیں پہونچے گا، آپ نے فرمایا کہ یہ محض رخصت ہے، عزیمت یہی ہے کہ غیر اللہ کو سجدہ نہ کیا جائے۔[3]

گرفتاری کا یہ افسوسناک واقعہ ربیع الثانی ۱۰۲۸ھ کی کسی تاریخ کو پیش آیا، اس لئے کہ جہانگیر نے اسی مہینہ کے واقعات میں اس کا ذکر کیا ہے، قید کرنے کے بعد آپ کی حویلی، سرائے، کنواں، باغ اور کتابیں ضبط کر لی گئیں، اور متعلقین کو وہاں سے دوسری جگہ منتقل کر دیا گیا۔[4]

زندان گوالیار میں سنت یوسفی

گوالیار کی یہ نظر بندی اللہ تعالیٰ کی بہت سی حکمتوں اور دینی مصالح پر مبنی تھی، اور ترقیات باطنی و ازدیاد مقبولیت و محبوبیت کا موجب، یہاں اس یوسف زندانی نے یوسف کنعانی کی طرح اپنے رفقائے زنداں میں تبلیغ و ارشاد کا کام پوری سرگرمی سے

---

[1] یہ درباری سجدہ اکبر کے زمانہ سے رائج تھا، اور شاہی آداب میں شامل تھا، اورنگ زیب نے اس کو ختم کیا۔

[2] حضرات القدس ص ۱۱۷ [3] ایضاً ص ۱۱۶ [4] تزک جہانگیری ص ۲۷۲-۲۷۳ و مکتوب ۲ دفتر سوم۔

شروع کر دیا، اور پسِ زندان "یَا صَاحِبَیِ السِّجْنِ أَأَرْبَابٌ مُتَفَرِّقُونَ خَیْرٌ اَمِ اللّٰهُ الْوَاحِدُ الْقَهَّارُ" کی آواز اس بلند آہنگی سے بلند کی کہ قلعہ کے درو دیوار گونج اٹھے، اور ان کی آواز باہر بھی سنی گئی، کہا جاتا ہے کہ کئی ہزار غیر مسلم قیدی آپ کی دعوت تبلیغ اور صحبت و تربیت کے فیض سے مشرف بہ اسلام ہوئے، اور سیکڑوں قیدی ارادت و صحبت سے سرفراز ہو کر درجاتِ عالیہ تک پہونچے، ڈاکٹر آرنلڈ کی کتاب (PREACHING OF ISLAM) میں ہے:۔

"شہنشاہ جہانگیر (۱۶۰۵ - ۱۶۲۸ء) کے عہد میں ایک سنی عالم شیخ احمد مجدد نامی تھے، جو شیعی عقائد کی تردید میں خاص طور پر مشہور تھے، شیعوں کو اس وقت دربار میں رسوخ حاصل تھا، ان لوگوں نے کسی بہانہ سے انھیں قید کرا دیا، دو برس وہ قید میں رہے، اور اس مدت میں انھوں نے اپنے رفقائے زنداں میں سے سیکڑوں بت پرستوں کو حلقہ بگوش بنا لیا"

(ص۴۱۲ طبع ثالث)

اس طرح انسائیکلوپیڈیا آف ریلیجن اینڈ اتھکس (ENCYCLOPEDIA OF RELIGION-AND ETHICS)-(مذہب و اخلاقیات کا دائرۃ المعارف) میں تبلیغ اسلام کے سلسلہ میں ہے:۔

"ہندوستان میں سترہویں صدی میں ایک عالم جن کا نام شیخ احمد مجدد تھا، جو ناحق قید کر دیئے گئے تھے، ان کے متعلق روایت ہے کہ انھوں نے قید خانہ کے ساتھیوں میں سے کئی سو بت پرستوں کو مسلمان بنا لیا"[1]

ج ۸ ص۷۴۸

---

[1] ماخوذ از مضمون "حضرت مجدد الف ثانی یورپ کی نظر میں" بقلم مولانا عبد الماجد دریابادی "الفرقان" مجدد نمبر ۱۳۵۷ھ۔

دورانِ اسیری کی نعمتیں اور لذتیں

زندان گوالیار کے اس چند روزہ مہمانی سے حضرت مجدد پر انعامات الٰہیہ کی جو بارش ہوئی اور آپ کو جو باطنی ترقیات حقیقی شکستگی اور وارستگی کی لذت اور خلوت میں جلوت کی جو نعمت حاصل ہوئی، اس کا حضرت نے اپنے خاص خدام کے نام خطوط میں تحدیث بالنعمت کے طور پر بڑے مزے لے لے کر ذکر کیا ہے، میر محمد نعمان کے نام ایک طویل مکتوب میں جو قلعۂ گوالیار سے بھیجا گیا ہے، تحریر فرماتے ہیں:۔

"اگر محض فضل خداوندی سے فیوض و واردات الٰہی کا تسلسل اور اس کے غیر متناہی انعامات وعطیات کا پے در پے ظہور اس محنت کدہ میں مجھ جیسے شکستہ پر کے شامل حال نہ ہوتا تو قریب تھا کہ معاملہ یاس و ناامیدی کی حد کو پہونچ جاتا، اور رشتۂ امید شکستہ ہو جاتا، حمد ہے اس خداوند کی جس نے مجھ کو عین بلا میں عافیت عطا فرمائی، اور ظلم و جفا میں عزت بخشی، مشقت و تکلیف میں مجھ پر احسان کیا، اور راحت و مصیبت میں شکر کی توفیق دی، اور انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام کی پیروی کرنے والوں اور اولیائے کرام کے نقش قدم پر چلنے والوں اور علماء و صلحاء سے محبت رکھنے والوں میں داخل فرمایا، اس سبحانہ وتعالیٰ کی رحمتیں اور برکتیں نازل ہوں انبیاء کرام پر اولاً اور ان کے متبعین پر ثانیاً۔"[1]

معلوم ہوتا ہے کہ حضرت کے حکم سلطانی سے محبوس ہونے کی شہرت جب عام ہوئی تو اس پر طرح طرح کے تبصرے شروع ہوئے، لوگوں نے اس پر حاشیے چڑھائے، اور

[1] مکتوب ۵ دفتر سوم حصہ ہشتم، اردو ترجمہ حضرت مولانا عبدالشکور صاحب کے مضمون "امام ربانی" سے ماخوذ ہے۔

قیاس آرائیاں کیں، خدام و محبین کو اس سے قدرتاً اذیت پہونچی، اس تنقید و ملامت خلق کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اپنے ایک دوسرے مخلص شیخ بدیع الدین کو اسی قید خانہ سے لکھتے ہیں :-

"جب یہ فقیر اس قلعہ میں پہونچا تو اوائل حال ہی میں محسوس ہوتا تھا کہ ملامتِ خلق کے انوار شہروں اور دیہاتوں سے نورانی بادلوں کی طرح پے درپے پہونچ رہے ہیں، اور میرے معاملہ کو پستی سے بلندی کی طرف لئے جا رہے ہیں، برسوں تربیت جمال سے میری منزلیں طے کرائی گئیں، اب تربیت جلال سے قطع مسافت کرائی جارہی ہے، لہذا آپ مقام صبر بلکہ مقام رضا میں رہیں، اور جمال و جلال کو مساوی جانیں[1]"

حضرت صاحبزادگان والاشان کو بھی قید خانہ سے صبر و تسکین اور شکر و رضا کی ہدایت فرماتے رہے، اور توجہ الی اللہ، دعا و مناجات اور ذکر و تلاوت اور ماسوا اللہ کی نفی اور اپنی تعلیم و تکمیل میں مشغول رہنے کی تاکید فرماتے رہے[2]۔

بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت مجدد کے اس حبس بے جا کا اثر ہندوستان کے صحیح الاعتقاد امراء اور اراکین سلطنت پر بُرا پڑا، بعض جگہ شورش اور انتشار کے آثار بھی ظاہر ہوئے[3]، عبدالرحیم خانِ خاناں، خان اعظم، سید صدر جہاں، خان جہاں لودھی وغیرہ بھی جہانگیر کے اس اقدام سے آزردہ تھے، اس شورش و انتشار کی معاصر تاریخ سے زیادہ شہادتیں نہیں ملتیں، اور وثوق کے ساتھ نہیں کہا جا سکتا کہ ان کا حضرت مجدد کی

---

[1] مکتوب ۷۶ دفتر سوم حصہ ہشتم [2] مکتوب ۲۷ دفتر سوم حصہ ہشتم بنام حضرت خواجہ محمد سعید و خواجہ محمد معصوم۔

[3] اس سلسلہ میں مہابت خاں کی بغاوت کا بھی حوالہ دیا گیا ہے لیکن یاد رہے کہ مہابت خاں کی بغاوت کا واقعہ ۱۰۳۵ھ کا ہے، جب کہ حضرت مجدد کی رہائی کو ۴-۵ برس ہو چکے تھے، اور آپ اس دار فانی سے رحلت فرما چکے تھے۔

اسیری سے کتنا تعلق تھا۔

بہرحال بادشاہ کو (کسی وجہ سے بھی[1]) اپنے اس اقدام سے ندامت ہوئی یا اس نے اتنی مدت کی اسیری کو کافی سمجھا اور آپ کی ملاقات کا اشتیاق ظاہر کرکے تشریف لانے کی دعوت دی حضرت مجدد کامل ایک سال قلعۂ گوالیار میں رہے، اس طرح آپ کی رہائی جمادی الآخرہ ۱۰۲۹ھ (مئی ۱۶۲۰ء) میں ہوئی ہوگی۔

لشکر شاہی اور بادشاہ کی رفاقت اور اس کے دینی اثرات و برکات

حضرت مجدد بڑی عزت و احترام کے ساتھ قلعہ سے باہر تشریف لائے، تین یوم سرہند قیام فرماکر معسکر شاہی آگرہ میں تشریف لے گئے، ولی عہد شہزادہ خرّم اور وزیر اعظم نے آپ کا استقبال کیا، مگر بادشاہ نے حکم دیا کہ چند روز آپ ہمارے لشکر میں رہیں، آپ نے منظور فرمایا' اس رفاقت سے بادشاہ اور اہل لشکر کو بہت نفع پہونچا، جہانگیر نے اپنی توزک میں لکھا ہے کہ میں نے خلعت اور ہزار روپیہ خرچ عنایت کیا، اور جانے اور ساتھ رہنے کا اختیار دیا، انھوں نے ہمرکابی کو ترجیح دی۔

حضرت مجدد نے لشکر کی اس رفاقت اور اس کے فوائد و برکات کے متعلق صاحبزادوں کو لکھا ہے کہ لشکر میں اس طرح بے اختیار و بے رغبت رہنا بہت ہی غنیمت جانتا ہوں، اور اس عرصہ کی ایک ساعت کو دوسری جگہوں کی بہت سی ساعتوں سے بہتر تصور کرتا ہوں۔[2]

---

[1] کہا جاتا ہے کہ بادشاہ کو خواب میں زیارت نبویؐ ہوئی اور اس نے دیکھا کہ سرور کائنات صلے اللہ علیہ وسلم بطور تأسف اپنی انگلی دانتوں میں دبائے ہوئے فرما رہے ہیں کہ "جہانگیر تو نے کتنے بڑے شخص کو قید کر دیا"۔

[2] مکتوب ۱۰۳ دفتر سوم۔

ایک دوسرے مکتوب میں تحریر فرماتے ہیں :۔

"الحمد للہ وسلامٌ علیٰ عبادہ الذین اصطفےٰ، اس طرف کے احوال واوضاع حمد کے لائق ہیں، عجیب وغریب صحبتیں گزر رہی ہیں، اور اللہ تعالیٰ کی عنایت سے امور دینیہ اور اصول اسلامیہ کی ان گفتگوؤں میں سرِ مُو سستی اور مداہنت دخل نہیں پاتی۔

اللہ تعالیٰ کی توفیق سے ان محفلوں میں وہی باتیں بیان ہوتی ہیں، جو خاص خلوتوں اور مجلسوں میں بیان ہوا کرتی ہیں، اگر ایک مجلس کا حال لکھا جائے تو اس کے لئے ایک دفتر چاہیئے۔"[1]

ایک شاہی مجلس کے بارے میں جو اسی زمانہ میں پیش آئی تھی، ایک دوسرے مکتوب میں تحریر فرماتے ہیں :۔

"فرزندان گرامی کا صحیفۂ شریفہ پہونچا، اللہ تعالیٰ کی حمد ہے کہ صحت وعافیت سے ہے، ایک تازہ معاملہ جو آج ظاہر ہوا ہے لکھتا ہوں، اچھی طرح سماعت کریں، آج شنبہ کی رات کو بادشاہی مجلس میں گیا تھا، ایک پہر رات گزرے وہاں سے واپس آیا، اور تین سی پارہ قرآن مجید حافظ سے سنا، دو پہر سے زیادہ رات گزر چکی تھی کہ نیند میسر ہوئی۔"[2]

ایک دوسرے مکتوب میں جو خواجہ حسام الدین کو لکھا گیا ہے، تحریر فرماتے ہیں :۔

"برخورداران ورفقاء میں سے جو بھی ساتھ ہے، ان سب کو وابستگی حاصل ہے اور ان کے احوال میں ترقی ہے، ان کے واسطے یہ چھاؤنی گویا کہ خانقاہ بن گئی ہے۔"[3]

لشکر شاہی کے ساتھ لاہور پہونچے، وہاں سے سرہند کوچ ہوا، سرہند میں حضرت نے بادشاہ کی ضیافت فرمائی، حضرت کی خواہش سرہند رہ جانے کی تھی لیکن بادشاہ نے

---

[1] مکتوب ۱۰۶ دفتر سوم [2] مکتوب ۹۲ دفتر سوم، عبارتوں کے تراجم "حضرت مجدد الف ثانیؒ" تالیف مولانا سید زوار حسین سے ماخوذ ہیں۔ [3] مکتوب ۷۲ دفتر سوم۔

آپ کی جدائی گوارا نہ کی وہاں سے دہلی روانگی ہوئی، دہلی سے بنارس، پھر اجمیر قیام رہا۔

جہانگیر پر اثر

بعض کتابوں میں جو زمانۂ حال میں حضرت مجدد کی سوانح حیات میں لکھی گئی ہیں جہانگیر کی حضرت کے ساتھ گہری عقیدت اور باقاعدہ بیعت وارادت کو دکھایا گیا ہے لیکن اس کا کوئی مستند تاریخی ثبوت نہیں ملتا، توزک میں جہانگیر نے کئی مقامات پر جس انداز میں حضرت کا ذکر کیا ہے اس سے اس بیان کی تصدیق نہیں ہوتی، وہ نشۂ سلطانی میں کتنا ہی مست ہو اور اس کا انداز تحریر کیسا ہی شاہانہ ہو وہ اپنے شیخ کا اس انداز میں ذکر نہیں کرسکتا، پروفیسر فریان نے اپنی کتاب (ص ۳۵،۳۶) میں بھی یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ جہانگیر کی ارادت ثابت نہیں اور اس میں کوئی بڑا تغیر نہیں ہوا، دوسرے قدیم سوانح نگاروں نے نہ جہانگیر کی بیعت کا ذکر کیا ہے، نہ شاہ جہاں کی، البتہ اس سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ جہانگیر نے اس رفاقت سے فائدہ اٹھایا، اس کے اندر نئے دینی رجحان پیدا ہونے، منہدم مساجد کی دوبارہ تعمیر، اور مفتوحہ علاقوں میں دینی مدارس کے قیام سے دلچسپی میں اس کو بہت دخل تھا، ۱۰۳۱ھ میں قلعہ کانگڑہ کی فتح کے موقعہ پر اس نے جس طرح اپنی اسلامیت کا اظہار کیا، اور وہاں شعائر اسلام کا اجراء کرایا[1] اس سے بھی اس تبدیلی اور دینی ترقی کا پتہ چلتا ہے، جس کو مجدد صاحب کی شرف ہمرکابی کا فیض کہا جاسکتا ہے۔

---

[1] ملاحظہ ہو توزک جہانگیری ص ۳۴۰ [2] تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو باب ہفتم

قُربِ سفر اور اس کے انتظامات

خواجہ محمد کشمی لکھتے ہیں کہ ۱۰۳۲ھ تھا، اور آپ اجمیر میں تشریف رکھتے تھے، آپ نے فرمایا کہ سفر آخرت کے دن قریب ہیں، مخدوم زادگان کو جو اس وقت سرہند میں تھے، ایک خط میں تحریر فرمایا کہ "ایام انقراض عمر نزدیک و فرزندان دور" (زندگی کے اختتام کے دن قریب ہیں اور فرزند دور) صاحبزادگان اس خط کو پاتے ہی اجمیر حاضر ہوئے ایک دن خلوت میں دونوں فرزندوں (خواجہ محمد سعید اور خواجہ محمد معصوم) سے فرمایا کہ "مجھے اب اس دنیا سے کسی طرح کی دلچسپی اور اس کی طرف التفات نہیں، اب اس عالم کا خیال غالب ہے، اور سفر کے دن قریب معلوم ہوتے ہیں"[1]

حضرت مجدد کا قیام لشکر سے واپسی پر سرہند میں دس ماہ ۸ یا ۹ دن رہا[2]، جب اجمیر سے سرہند معاودت فرمائی تو وہاں پہونچ کر تمام تعلقات سے انقطاع فرما لیا اور خلوت اختیار کرلی، سوائے مخدوم زادوں اور دو تین مخصوص خادموں[3] کے کسی کو آنے کی اجازت نہ تھی، سوائے نماز پنجگانہ اور جمعہ کے باہر تشریف نہیں لاتے تھے، سارا وقت ذکر و استغفار اور ظاہری و باطنی مشغولی میں گزرتا جو "وَتَبَتَّلْ إِلَيْهِ تَبْتِيلًا" (اور سب سے منقطع ہو کر

---

[1] زبدۃ المقامات ص ۲۸۲ [2] "حضرت مجدد اور ان کے ناقدین" ص ۱۶۴-۱۶۵

[3] انہی خوش نصیبوں میں خواجہ محمد ہاشم کشمی بھی تھے لیکن وہ وفات سے سات ماہ پہلے رجب ۱۰۳۳ھ میں اپنے اہل و عیال کو دکن سے لانے کے لئے (جہاں اس زمانہ میں بدامنی و انتشار تھا) چلے گئے، اس عرصہ میں شیخ بدرالدین سرہندی حاضر خدمت رہے، اور زندگی کے آخری ایام کے حالات "زبدۃ المقامات" میں انہی کے حوالہ سے نقل کئے گئے ہیں، اس میں صاحبزادگان والاشان کی دی ہوئی معلومات بھی ہیں۔

اسی کے ہو رہو) کی تفسیر تھی۔

وسط ذی الحجہ سے ضیق النفس کے عارضہ میں شدت ہوئی، گریہ کا غلبہ ہوتا، اور جب ضعف کی شدت ہوتی تو "اللهم الرفيق الأعلىٰ" زبان پر جاری ہوتا، اسی عرصہ میں چند دن صحت کے ساتھ گزرے، اور مغموم و مجروح دلوں کو کچھ تسکین ہوئی، اسی حالت میں فرماتے تھے کہ "ضعف کی شدت میں وہ حلاوت ولذت محسوس ہوتی تھی جس کا اس چند روزہ صحت میں پتہ نہیں"، اس حالت میں بکثرت صدقہ اور خیرات فرمائی، ۱۲ محرم کو فرمایا کہ "مجھے بتایا گیا ہے کہ پینتالیس دن کے اندر تمہیں اس عالم سے دوسرے عالم کا سفر کرایا جائے گا، اور مجھے قبر کی جگہ بھی دکھائی گئی ہے" ایک دن صاحبزادگان نے دیکھا کہ آپ پر گریہ غالب ہے، انھوں نے سبب دریافت کیا، فرمایا کہ شوق وصال! صاحبزادوں نے کہا کہ ہمارے حق میں اس قدر (خلاف معمول) بے مہری و بے التفاتی کیوں ہے؟ فرمایا کہ "اللہ کی ذات تم سے زیادہ محبوب ہے"۔

۲۲ صفر کو خدام و اعزہ سے فرمایا کہ آج چالیس دن پورے ہو گئے، دیکھنا چاہیے کہ اس سات، آٹھ دن میں کیا پیش آتا ہے؟ اس کے بعد اللہ تعالیٰ کی عنایات بے غایات اور انعامات بے حساب کا تذکرہ فرماتے رہے، ۲۳ صفر کو اپنی تمام پوشاکیں اور کپڑے خدام کو تقسیم کر دیئے، جسم مبارک پر چونکہ کوئی روئی دار کپڑا نہ تھا، ٹھنڈی ہوا کا اثر ہوا، اور دوبارہ بخار ہو گیا[1]، اور جیسا کہ حضرت سرور کائنات صلے اللہ علیہ وسلم کا مزاج مبارک بیماری سے قلیل افاقے کے بعد دوبارہ ناساز ہوا، یہ سنت بھی ادا ہوئی۔

اس ضعف کی حالت میں علوم عالیہ کا افاضہ شدت کے ساتھ تھا، صاحبزادہ عالی قدر

---

[1] یہ مہینہ غالباً نومبر کا تھا، اس لئے کہ انتقال دسمبر کے مہینہ میں ہوا ہے، اس علاقہ میں یہ مہینہ سردی کا ہے۔

خواجہ محمد سعید نے عرض کیا کہ حضرت کا ضعف اس گفتگو کا متحمل نہیں، ان حقائق و معارف کے بیان کو کسی اور وقت کے لئے ملتوی رکھیں! فرمایا کہ فرزند عزیز! اب وقت و فرصت کس کو ہے کہ دوسرے وقت پر ان مضامین کو اٹھا رکھا جائے؟ غلبۂ ضعف کے ان دنوں میں بھی نماز بغیر جماعت کے ادا نہیں فرمائی، صرف زندگی کے آخری چار پانچ دنوں میں لوگوں کے کہنے سننے سے تنہا پڑھی، ادعیہ اوراد ماثورہ اور ذکر و مراقبہ میں کوئی فتور واقع نہیں ہوا، شریعت و طریقت کے آداب و احکام میں سے کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کیا' ایک رات ثلث اخیر میں اٹھ کر وضو فرمایا، تہجد کھڑے ہو کر پڑھی، فرمایا کہ یہ ہماری آخری تہجد کی نماز ہے، اور یہی ہوا کہ اس کے بعد تہجد کی نوبت نہیں آئی۔

وصال سے کچھ پیشتر غیبت اور استغراق کا غلبہ ہوا، مخدوم زادوں نے عرض کیا کہ یہ استغراق و غیبت آپ کو ضعف کی وجہ سے ہے یا استغراق کی وجہ سے؟ فرمایا استغراق کی وجہ سے، بعض معاملات و حقائق درپیش ہیں، اس حالتِ ضعف و شدت و علالت میں سنت کی پابندی، بدعت سے اجتناب اور دوام ذکر و مراقبہ کی وصیت فرماتے تھے، ارشاد فرماتے تھے کہ سنت کو دانتوں سے پکڑنا چاہئے، فرمایا کہ صاحبِ شریعت علیہ الصلاۃ والسلام نے "الدین النصیحۃ" کے مطابق امت کی خیرخواہی اور نیک صلاح کا کوئی دقیقہ اٹھا نہیں رکھا، دین کی معتبر کتابوں سے متابعت کامل کا راستہ حاصل کرنا اور اس پر کاربند ہونا چاہئے، فرمایا کہ میری تجہیز و تکفین میں سنت پر پورا عمل کیا جائے کوئی سنت ترک نہ کی جائے' اہلیہ محترمہ سے فرمایا کہ چونکہ میری رحلت تمہاری رحلت سے پہلے ہوتی معلوم ہوتی ہے' اس لئے میرے کفن کا سامان اپنے مہر سے کرنا، یہ بھی فرمایا کہ میری قبر کسی گمنام جگہ پر بنائی جائے، مخدوم زادوں نے عرض کیا کہ پہلے تو حضرت کی

وصیت تھی کہ ہمارے برادر اکبر خواجہ محمد صادق[1] جہاں دفن ہیں وہیں دفن کیا جائے، اب حضرت یوں فرماتے ہیں، فرمایا کہ ہاں، اس وقت مجھ پر یہی شوق غالب ہے، جب آپ نے دیکھا کہ صاحبزادے یہ سن کر خاموش ہوگئے اور ان کو اس میں تردد ہے تو فرمایا، اگر ایسا نہ کر سکو تو بیرون شہر والد بزرگوار کے پاس یا باغ میں کہیں دفن کر دینا، میری قبر کو خام رکھنا تاکہ تھوڑے دنوں میں اس کا نشان باقی نہ رہے' اس پر بھی جب دیکھا کہ صاحبزادے سوچ میں پڑ گئے تو مسکرا کر فرمایا کہ تمہیں اختیار ہے۔ ہاں مناسب سمجھو سپرد خاک کر دینا۔

سہ شنبہ کی شب اور ۲۷ر صفر کی تاریخ تھی جس کے اگلے روز سفر آخرت تھا، ان خدّام سے جنھوں نے راتوں کو جاگ کر خدمت اور تیمارداری کی تھی، فرمایا کہ تم نے بڑی محنت کی بس اس رات کی محنت اور رہ گئی ہے، پھر فرصت! آخر شب میں فرمایا" اصبح لیلا" (رات کسی طرح صبح کر) دن ہوا تو چاشت کے وقت پیشاب کے لئے طشت منگوایا جس میں ریت نہیں تھی، چھینٹیں آنے کے خیال سے اس کو واپس کر دیا، کسی نے کہا کہ حکیم کو قارورہ دکھانا چاہئے، فرمایا میں وضو شکست نہیں کرتا، مجھے بستر پر لٹا دو، آپ کو گویا اس کا انکشاف ہوگیا کہ اب کچھ ہی دیر کے بعد اس عالم سے کوچ ہے' وضو کی فرصت نہ ہوگی، جب بستر پر لٹا دیا گیا تو طریقۂ مسنون کے مطابق دائیں رخسارے کے نیچے دایاں ہاتھ رکھ کر ذکر میں مشغول ہوگئے، مخدوم زادوں نے سانس کی تیزی دیکھ کر عرض کیا کہ مزاج مبارک کیسا ہے؟ فرمایا کہ ہم اچھے ہیں! فرمایا کہ میں نے جو دو رکعت نماز پڑھی ہے کافی ہے' اس کے بعد سوائے اسم ذات کے ذکر کے کوئی بات نہیں فرمائی' ایک لمحہ کے بعد جان جاناں کو سپرد کر دی' یہ واقعہ روز سہ شنبہ چاشت کے وقت ۲۸ر ماہِ صفر ۱۰۳۴ھ کا ہے۔[2]

---

[1] حضرت مجدد کے فرزند اکبر جن کا انتقال ۹ر ربیع الاول ۱۰۲۵ھ میں ہوا۔

[2] مطابق ۱۰ر دسمبر ۱۶۲۴ء (حضرت مجدد اور ان کے ناقدین)۔

صفر کا وہ مہینہ ۲۹ کا تھا، اگلے دن ربیع الاول کا مہینہ شروع ہو رہا تھا کہ روح نے قفص عنصری سے اپنے آشیانہ کی طرف پرواز کی "یٰاَیَّتُهَا النَّفْسُ الْمُطْمَئِنَّةُ ارْجِعِیْ اِلٰی رَبِّکِ رَاضِیَةً مَّرْضِیَّةً" اس وقت عمر مبارک ترسٹھ (۶۳) سال تھی۔[1]

جب غسل کے لئے لایا گیا تو لوگوں نے دیکھا کہ آپ نماز کے طریقہ پر ہاتھ باندھے ہوئے بائیں ہاتھ کی کلائی پر داہنے ہاتھ کے انگوٹھے اور چھنگلیا سے حلقہ کئے ہوئے ہیں، مخدوم زادوں نے انتقال کے بعد ہاتھ پھیلا دیئے، لیکن غسل کے بعد لوگوں نے دیکھا کہ آپ کے دونوں دست مبارک پہلی ہیئت کے مطابق حالت نماز کی طرح بندھ گئے اور یہ حالت آخر تک قائم رہی، دیکھنے سے معلوم ہوتا تھا کہ تبسم فرما رہے ہیں گویا ؎

ہم چناں زی کہ وقت رفتن تو
ہمہ گریاں شوند تو خنداں

ہاتھوں کو کتنا ہی الگ کیا جاتا وہ نماز کی کیفیت میں ایک دوسرے پر خود بخود آجاتے، تجہیز و تکفین کا سامان سب سنت کے مطابق کیا گیا، فرزند کلاں خواجہ محمد سعید نے نماز جنازہ کی امامت کی اور جسد مبارک کو آخری آرامگاہ میں پہونچا دیا گیا۔[2]

عادات و معمولات

خواجہ محمد ہاشم کشمی نے جو حضرت مجدد کی خدمت میں ان کی آخری حیات میں تین (۳) سال سفر و حضر میں ساتھ رہے ہیں، حضرت کے عادات و معمولات کو تفصیل سے قلمبند کیا ہے۔[3]

---

[1] مولانا زید ابو الحسن صاحب کی تحقیق ہے کہ عمر شریف قمری حساب سے باسٹھ (۶۲) سال چار (۴) ماہ چودہ (۱۴) دن اور شمسی حساب سے ساٹھ (۶۰) سال چھ (۶) ماہ پانچ دن کی ہوئی (حضرت مجددؒ اور ان کے ناقدین) ص ۲۳ [2] ملخصاً از زبدۃ المقامات ص ۲۵۶-۳۰۰ [3] ملاحظہ ہو زبدۃ المقامات ص ۱۹۲-۲۱۵

یہاں اس کا خلاصہ لکھا جاتا ہے، قدرے اضافہ مولانا بدرالدین سرہندی کی کتاب "حضرات القدس" سے کیا گیا ہے۔[1]

"حضرت کو بارہا یہ فرماتے ہوئے سنا کہ ہمارا عمل اور کوشش بھی کیا چیز ہے جو کچھ ہے، وہ سب فضل خداوندی ہے، لیکن اگر اس کا کوئی ذریعہ کہا جا سکتا ہے تو وہ سید الاولین والآخرین صلے اللہ علیہ وسلم کی متابعت ہے جس پر مدار کار سمجھتا ہوں، اللہ تعالیٰ نے جو کچھ بھی عطا فرمایا ہے، اسی پیروی اور اتباع کی راہ سے عطا فرمایا ہے، جزئیاً وکلیاً، اور جو کچھ نصیب نہیں ہوا، وہ محض اس وجہ سے کہ بحکم بشریت اتباع کامل میں نقص وفتور ہونے کی وجہ سے ایک روز فرمایا کہ ایک دن سہواً جائے ضرور میں داخل ہوتے وقت دایاں پاؤں پہلے رکھ دیا، اس دن بہت سے احوال سے محرومی رہی، ایک مرتبہ صالح ختلانی سے فرمایا کہ ہماری تھیلی سے تھوڑی سی لونگیں لے آؤ! وہ گئے اور چھ لونگیں لے آئے، آپ نے دیکھ کر ناگواری سے فرمایا کہ ہمارے صوفی کو ابھی تک یہ خبر نہیں کہ حدیث میں آتا ہے کہ "اللہ وتر یحب الوتر" رعایت وتر مستحب ہے، مستحب کو لوگوں نے کیا سمجھا ہے، اگر دنیا و آخرت کو کسی ایسے نیک عمل کے بدلے میں دے دیا جائے جو اللہ کو پسند ہے تو اس کی بھی کوئی حیثیت نہیں، ایک خادم کہتے ہیں کہ میں نے شیخ محمد بن فضل اللہ قدس سرہ سے پوچھا کہ آپ نے سرہند میں کیا دیکھا، کچھ ہمیں بھی سنایئے، انھوں نے کہا کہ مجھ بے بصیرت کو کیا نظر آ سکتا ہے، لیکن میں نے اتنا دیکھا کہ سنت کے آداب اور اس کی باریک باتوں میں سے کسی چھوٹی سے چھوٹی چیز کو بھی فروگذاشت نہیں فرماتے، کسی اور سے اتنا اہتمام نہایت مشکل ہے۔

---

[1] حضرات القدس کی عبارت واوین " " کے درمیان کر دی گئی ہے، اور اس کے صفحات کا حوالہ دے دیا گیا ہے، اس کے علاوہ جو کچھ مضمون ہے وہ زبدۃ المقامات سے ماخوذ ہے۔

ایک دوسرے حاضر باش نے کہا کہ ان حضرات کے احوال باطنی ہمارے ادراک سے بالاتر ہیں، لیکن اتنا کہہ سکتا ہوں کہ حضرت کے حالات دیکھ کر اولیائے متقدمین کے حالات پر (جو کتابوں میں لکھے گئے ہیں) یقین آگیا، اور معلوم ہوا کہ ان میں مبالغہ نہیں تھا، بلکہ احساس ہوا کہ لکھنے والوں نے کم لکھا ہے، سارا دن اسی شغولی میں گزرتا، ایک خادم خاص نے (جس سے وضو جانماز اور عبادات کے سلسلہ کی خدمات متعلق تھیں) کہا کہ صرف قیلولہ کے وقت اور رات کے ثلث دوم میں مجھے کچھ فرصت ملتی ہے، اپنے خدام و رفقاء کو بھی بکثرت دوام ذکر حضور اور مراقبہ کی تاکید فرماتے رہتے تھے، اور ارشاد ہوتا تھا کہ یہ دنیا دار العمل ہے، اور مزرعۂ آخرت حضور باطن کو آداب و اعمال ظاہری کے ساتھ جمع رکھنا چاہئے، حضرت صلے اللہ علیہ وسلم کے (باوجود محبوبیت اور علو مرتبہ کے) پائے مبارک کثرت عبادت سے متورم ہو جاتے تھے۔

اگرچہ حضرت کو مسائل فقہیہ کا استحضار تھا، اور اصول فقہ میں ملکۂ تامہ رکھتے تھے، لیکن بربنائے احتیاط مسائل میں معتبر کتابوں کی طرف رجوع فرماتے، اور سفر و حضر میں ان کو ساتھ رکھتے، عمل مُفتیٰ بہ قول اور فقہائے کبار کے ترجیح دیئے ہوئے مسئلہ پر ہوتا، اکثر خود امامت فرماتے، اور اس کی حکمت ایک مرتبہ ارشاد فرمائی کہ "حضرات شافعیہؒ و مالکیہؒ کے یہاں قرأت فاتحہ کے بغیر نماز نہیں ہوتی، اس لئے وہ امام کے پیچھے بھی فاتحہ پڑھتے ہیں، اور بہت سی احادیث صریحہ بھی اس پر دلالت کرتی ہیں، لیکن ہمارے امام ابوحنیفہؒ کے یہاں مقتدی کے لئے فاتحہ پڑھنا جائز نہیں، اور جمہور فقہائے حنفیہؒ کا بھی یہی مذہب ہے، چونکہ میں مذاہب کے جمع کرنے کی کوشش کرتا ہوں اس لئے اس کی آسان صورت یہی معلوم ہوئی کہ خود امامت کروں[1]"

---

[1] خواجہ محمد ہاشم کشمی نے اسی فصل میں دوسری جگہ لکھا ہے "وفاتحہ خلف الامام ہمی خواندند وآں را مستحسن ہمی شمردند" ص۲۰۹۔

گرمی ہو سردی ہو حضرت کا سفر و حضر میں معمول یہ تھا کہ اکثر رات کو نصف اخیر میں اور کبھی ثلث اخیر میں بستر سے اٹھ جاتے اس وقت کے لئے احادیث میں جو دعائیں آئی ہیں، وہ پڑھتے، وضو بڑے اہتمام واحتیاط (اسباغ وضو) کے ساتھ فرماتے کہ پانی اعضاء کو پورے طور پر پہونچ جائے، دوسرے کو اس کی اجازت نہ دیتے کہ وہ پانی ڈالے، وضو کرتے وقت قبلہ کی طرف منہ ہوتا، البتہ پائے مبارک دھوتے وقت اس کو شمال یا جنوب کی طرف موڑ لیتے، مسواک کی بڑی پابندی فرماتے، اور جو دعائیں حدیث میں آئی ہیں، وہ پڑھتے، پھر بڑے حضور وجمعیت اور طول قرأت کے ساتھ نوافل پڑھتے، نوافل سے فارغ ہونے کے بعد خشوع واستغراق کے ساتھ مراقبہ میں مشغول ہو جاتے، فجر سے کچھ پہلے سنت کے مطابق جھپکی لے لیتے اور صبح صادق کے طلوع ہونے سے پہلے اٹھ جاتے، تازہ وضو فرماتے، فجر کی سنت دولت خانہ ہی پر ادا فرماتے "سنت وفرض کے درمیان سرّی طریقہ پر" سبحان اللہ وبحمدہٖ - سبحان اللہ العظیم" پڑھتے رہتے، فجر کی نماز آخر غلس (اندھیرے) اور اول اسفار (روشنی) میں ادا کرتے تاکہ غلس و اسفار کے بارے میں دونوں مذہبوں پر عمل ہو جائے، خود امامت کرتے اور نماز فجر میں طوال مفصل[1] (جیسا کہ احادیث سے ثابت ہے) پڑھتے تھے[2]، فجر کی نماز کے بعد سے اشراق کے وقت تک حلقہ فرماتے، پھر طویل نماز اشراق پڑھ کر اور تسبیحات وادعیۂ ماثورہ سے فارغ ہو کر دولت خانہ میں تشریف لاتے، اور اہل خانہ و متعلقین کی خیر خبر لیتے، اور جو امور روزمرہ کی زندگی سے تعلق رکھتے ہیں، ان کے متعلق ہدایات دیتے، پھر خلوت میں تشریف لے جاتے، اور پوری توجہ کے ساتھ تلاوت قرآن میں مشغول ہو جاتے، تلاوت کے بعد طالبین کو طلب فرما کر ان کے حالات کی تحقیق و ہدایات فرماتے، اسی وقت اخص اصحاب کو بلا کر مضامین و علوم خاصہ سے

---

[1] سورۂ حجرات سے سورۃ البروج تک کی سورتیں طوال مفصل کہلاتی ہیں [2] حضرات القدس ص ۸۲

ان کو مستفید فرماتے اور ان کو توجہ دیتے، اور وہ اپنے حالات و کیفیات سے مطلع کرتے، اور آپ ان کو علو ہمت، اتباع سنت، اور دوام ذکر حضور اور اخفائے حال کی تاکید فرماتے، کلمہ لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ کی عظمت بیان کرتے ہوئے فرمایا کہ ساری کائنات اس کے مقابلے میں وہ حیثیت بھی نہیں رکھتی جو ایک قطرہ کی دریائے محیط کے سامنے ہے، خدام وحاضرین کو کتب فقہ کے مطالعہ کی تاکید اور علماء سے احکام شریعت کی تحقیق کی ترغیب فرماتے۔

فرماتے تھے کہ کشف میں ایسا نظر آتا ہے کہ سارا عالم بدعات کے گرداب ظلمانی میں ڈوب گیا ہے، اور اس میں سنت کا نور کرمک شب تاب (جگنو) کی طرح چمک رہا ہے، غیبت اور مسلمانوں کی عیب چینی سے سخت احتراز تھا، خدام بھی آپ کے احترام وہیبت سے آپ کے سامنے کسی کی غیبت نہیں کرسکتے تھے، اپنے حالات و کیفیات کا بے انتہا اخفاء فرماتے تھے، میں نے دو سال کی مدت میں صرف تین چار بار ایسا دیکھا کہ اشک کے چند قطرے چہرۂ مبارک پر ٹپک پڑے ایسے تین چار بار مضامین عالیہ بیان کرتے وقت رخسار مبارک اور آنکھوں میں سرخی دیکھی۔

"ضحوۂ کبریٰ"[1] اور نماز چاشت کے بعد حرم سرا تشریف لے جاتے اور گھر والوں کے ساتھ کھانا تناول فرماتے، صاحبزادوں یا اہل تعلق میں سے اگر کوئی چیز تیار کرتا تو پیش کرتا فرزندوں اور خدام میں سے اگر کوئی اس وقت موجود نہ ہوتا تو اس کا حصہ الگ رکھوا دیتے" کھانے میں اکثر کھلانے میں مشغولی رہتی اور زیادہ وقت دوسروں کی خبرگیری اور خاطر میں گزرتا بعض اوقات برائے نام تناول فرماتے، معلوم ہوتا تھا جیسے کھانے کی احتیاج نہیں، محض سنت کی پیروی

---

[1] ضحوۂ کبریٰ صبح صادق اور غروب آفتاب کے ٹھیک بیچ کا وقت (انتصاف النهار الشرعي) وهو الضحوة الكبرىٰ) شامی ج ۱ ص ۲۴۸

مقصود ہے[1]"آخری زندگی میں جب گوشہ نشینی اختیار کی اور روزہ رکھتے تو کھانا بھی خلوت خانہ میں تناول فرماتے، کھانے کے بعد فاتحہ پڑھنے کا (جیسا کہ عام طور پر رواج ہے) معمول نہیں تھا، اس لئے کہ صحیح احادیث میں نہیں آیا ہے" فرائض کے بعد بھی فاتحہ پڑھنے کا جیسا کہ بعض مشائخ کے یہاں دستور ہے معمول نہیں تھا"

دوپہر کا کھانا تناول کرنے کے بعد سنت کے مطابق قیلولہ فرماتے، موذن ظہر کے اول وقت اذان دیتا، آپ وضو کر کے سنت زوال پڑھتے، ظہر کی نماز سے فارغ ہو کر کسی حافظ سے ایک پارہ یا کم وبیش سنتے، اور اگر درس ہوتا تو درس دیتے، نماز عصر بھی مثلین ہوجانے کے بعد اول وقت میں ادا فرماتے، عصر کے بعد غروب تک اصحاب وخدام کے ساتھ سکوت ومراقبہ میں مشغول اور خدام کی باطنی کیفیات کی طرف متوجہ رہتے، نماز مغرب کی سنت کے بعد اوابین ادا کرتے، کبھی چار رکعت کبھی چھ رکعت، نماز عشاء شفق ابیض کے زوال کے بعد فوراً پڑھ لیتے، وتر کی دعائے قنوت میں احناف وشوافع کی دعائے قنوت کو جمع کر کے پڑھ لیتے، نماز وتر کے بعد کبھی دو رکعت بیٹھ کر کبھی کھڑے ہو کر ادا فرماتے، آخر زمانہ میں شاذ ونادر یہ دو رکعتیں پڑھیں، وتر کے بعد دو سجدے جو متعارف ہیں نہیں فرماتے تھے۔

رمضان کے آخری عشرہ میں اعتکاف کرتے، نماز عشاء اور وتر کے بعد جلد آرام فرمانے کے لئے لیٹ جاتے اور ادعیۂ ماثورہ پڑھنے میں مشغول ہوجاتے، درود کثرت سے پڑھتے، خاص طور پر شب جمعہ اور روز جمعہ، شب دوشنبہ اور روز دوشنبہ تلاوت کے وقت چہرۂ مبارک اور پڑھنے کے انداز سے سامعین کو ایسا محسوس ہوتا کہ اسرار قرآنی وبرکات آیات کا فیضان ہو رہا ہے، نماز اور بیرون نماز میں خوف کی آیات پڑھتے، یا جن آیات میں تعجب و استفہام آیا ہے

[1] حضرات القدس ص ۸۷

اس کا انداز و لہجہ پیدا ہو جاتا، نماز میں تمام سنن و مندوبات اور آداب کی رعایت فرماتے، تحیۃ الوضوء اور تحیۃ المسجد کا بھی اہتمام کرتے، تراویح کے علاوہ کوئی نفل نماز جماعت سے ادا نہ کرتے، لوگوں کو شب عاشورا یا شب قدر میں جماعت کے ساتھ نوافل ادا کرنے سے منع فرماتے۔

مریضوں کی عیادت کے لئے جاتے اور اس موقع پر جو دعائیں آئی ہیں وہ پڑھتے، زیارت قبور کے لئے بھی تشریف لے جاتے بعض اعلیٰ دینی کتابوں (مثلاً تفسیر بیضاوی، صحیح بخاری مشکوٰۃ المصابیح، فقہ، و اصول و کلام میں ہدایہ، بزدوی، مواقف اور تصوف میں عوارف العوارف کا درس دیتے لیکن اس میں بحث و مباحثہ اور قیل و قال نہ ہوتا، اخیر عمر میں درس سے اشتغال کم رہ گیا تھا، طلباء کو تحصیل علوم دینی کی تاکید فرماتے اور تحصیل علم کو سلوک و طریقہ پر مقدم رکھتے، کثرت سے حمد و استغفار کرتے اور تھوڑی سی نعمت پر بہت زیادہ شکر ادا کرتے۔

رمضان کا بڑا اہتمام فرماتے، تین سے کم ختم قرآن نہ کرتے، خود حافظ قرآن تھے اس لئے غیر رمضان میں بھی زبانی تلاوت فرماتے اور مختلف حلقوں میں بھی سنتے رہتے[1] افطار میں جیسا کہ احادیث میں آیا ہے تعجیل اور سحور میں تاخیر سے کام لیتے اور اس کا اہتمام فرماتے۔[2]

"ادائے زکوٰۃ میں طریقہ یہ تھا کہ جب کہیں سے کوئی ہدیہ یا نذر آتی تو حولان حول یا سال گزرنے کا انتظار نہ کرتے، ان فتوحات کے وقت فوراً حساب کر کے زکوٰۃ ادا کر دیتے، اور ان میں اہل اصلاح، بیوگان اور اہل قرابت کو ترجیح دیتے، حج کا کئی بار عزم مصمم فرمایا، لیکن نوبت نہ آئی ہمیشہ اس شوق میں رہے اور اسی شوق میں اس دنیا سے سفر کیا۔

اخلاق و تواضع، اور خلق اللہ پر شفقت، رضا و تسلیم کی خو انتہا درجہ پر پہونچی ہوئی تھی،

---

[1] زبدۃ المقامات ملخصاً از ص ۱۹۲-۲۱۵   [2] حضرات القدس ص ۹۱

آپ کے اعزہ اور اہل تعلق کو ظالم حاکموں سے بڑی ایذاء پہونچی، لیکن تسلیم و رضا سے کام لیا، اور کبھی اس کی شکایت زبان پر نہیں آئی، اگر کوئی آپ سے ملاقات کے لئے آتا تو تعظیماً کھڑے ہوجاتے، اور صدر مجلس میں اس کو جگہ دیتے، اور اسی کے ذوق و مناسبت کی باتیں کرتے، غیر مسلموں کی تعظیم خواہ وہ حاکم ہوں اور جاہ و اقتدار رکھتے ہوں نہیں کرتے تھے، سلام میں ہمیشہ سبقت فرماتے تھے، یاد نہیں آتا کہ کسی نے سلام میں آپ سے سبقت کی ہو، اہل حقوق کی حد درجہ رعایت فرماتے۔ کسی کے انتقال کی خبر آتی تو متاثر ہوتے اور کلمۂ ترجیع (انا للہ وانا الیہ راجعون) پڑھتے، اور نماز جنازہ میں شرکت کرتے، اور دعا و ایصال ثواب فرماتے۔[1]

"آپ کا لباس ایک کرتہ جس کے دونوں کاندھوں پر چاک ہوتا تھا، اس کے اوپر ایک عبا، لیکن گرمیوں میں اکثر کرتہ ہوتا، دستار سر پر لپیٹ لیتے، جیسا کہ سنت ہے، اور شملہ دونوں کاندھوں کے درمیان پیٹھ پر پڑا ہوتا (سوائے استنجا اور قضائے حاجت کے وقت) پائجامہ ٹخنوں سے اوپر ہوتا، جمعہ اور عیدین میں لباس فاخر پہنتے تھے، جب نیا جوڑا زیب تن کرتے تو پہلا کسی خادم یا عزیز یا مہمان کو دے دیتے، آپ کی خدمت میں پچاس ساٹھ بلکہ سو آدمیوں کے قریب ہمیشہ علماء، عارفین، مشائخ، حفاظ و شرفاء و سادات میں سے رہتے تھے، اور سب کو آپ ہی کے مطبخ سے کھانا پہونچتا تھا"[2]

حلیۂ مبارک

شیخ بدر الدین سرہندی نے جو حضرت کے خلفاء میں ہیں اور سترہ سال آپ کی صحبت میں رہے "حضرات القدس" میں آپ کا حلیہ اس طرح لکھا ہے :۔

---

[1] حضرات القدس از شیخ بدر الدین سرہندی مطبوعۂ محکمۂ اوقاف پنجاب ۱۹۷۱ء ص ۹۱-۹۲ [2] ایضاً ص ۹۲

"حضرت کا رنگ گندم گوں مائل بہ بیاض تھا، پیشانی اور رخسار پر ایسا نور معلوم ہوتا تھا کہ آنکھیں خیرہ ہو جاتی تھیں، کشادہ ابرو تھے، ابرو کمان کی طرح جھکی ہوئی، دراز، سیاہ اور باریک، آنکھیں فراخ اور کشادہ جن میں سیاہی کی جگہ بہت سیاہی اور سفیدی کی جگہ بہت سفیدی، بینی مبارک بہت باریک، لب سرخ نازک، دہانہ نہ دراز نہ کوتاہ، دانت ایک دوسرے سے جڑے ہوئے، اور لعل بدخشاں کی طرح چمکتے ہوئے، ڈاڑھی گھنی، باوقار، دراز و مربع تھی، رخساروں پر ریش مبارک کے بال حد سے بڑھے ہوئے نہیں، میانہ قد، نازک اندام تھے"[1]

اولادِ امجاد

حضرت مجدد کو اللہ تعالٰی نے سات فرزند عطا فرمائے تھے، ان میں دو صغر سنی میں حضرت کی حیات ہی میں فوت ہو گئے، شیخ محمد فرخ، شیخ محمد عیسیٰ، اور شیخ محمد اشرف جو زمانۂ شیر خوارگی میں داغ مفارقت دے گئے، فرزند کلاں خواجہ محمد صادق تکمیل علوم و سلوک کے بعد ۱۰۲۵ھ میں پچیس ۲۵ سال کی عمر میں راہی ملک بقا ہوئے، تین صاحبزادگان عالی قدر خواجہ محمد سعید، خواجہ محمد معصوم، اور خواجہ محمد یحییٰ، رونق بخش حیات رہے، ان چاروں کے متعلق یہ کہنا صحیح ہوگا ؎

ایں سلسلہ از طلائے ناب ست
ایں خانہ تمام آفتاب ست

حضرت خواجہ باقی باللہ نے ان کو دیکھ کر بلند الفاظ فرمائے تھے، اور "جواہر علویہ" اور "شجرۂ طیبہ" سے تعبیر کیا، اور فرمایا تھا "فقرائے باب اللہ اند دلہائے عجیب دارند"۔

فرزند اول حضرت خواجہ محمد صادق، حضرت مجدد کے سامنے ہی درجۂ کمال کو پہونچ گئے تھے،

---

[1] ایضاً ص ۱۵۵

حضرت نے ان کے متعلق بڑے بلند کلمات ارشاد فرمائے ہیں، اور ان کی اعلیٰ علمی و باطنی استعداد کی شہادت دی ہے، ایک مکتوب میں تحریر فرمایا ہے کہ "فرزند عزیز فقیر کے معارف کا مجموعہ اور جذب وسلوک کے مقامات کا صحیفہ ہے"[1]

فرزند دوم حضرت خواجہ محمد سعید ۱۰۰۵ھ میں پیدا ہوئے اور ۲۷ جمادی الآخرہ ۱۰۷۰ھ میں راہی ملک بقا ہوئے، انھوں نے بھی حضرت مجدد کے سلسلہ کی اشاعت اور اہل ارادت واہل طلب کی تعلیم و تربیت میں خاصہ حصہ لیا۔[2]

فرزند سوم حضرت خواجہ محمد معصوم تھے، جو اپنے والد نامدار کے علوم کے حامل و شارح، رازدار و امین اور خلیفہ و جانشین تھے، آپ سے طریقۂ مجددیہ اور اس کی تعلیم و اثرات کی ایسی عالمگیر اشاعت ہوئی کہ کہنے والے نے صحیح کہا ہے ؎

چراغِ ہفت کشور خواجہ معصوم
منوّر از فروغش ہند تا روم

دہلی کی مشہور عالم خانقاہ جو مرجع عرب و عجم تھی (اور جس کی مسند ارشاد پر اپنے اپنے وقت میں خواجہ سیف الدین، مرزا مظہر جان جاناں، حضرت شاہ غلام علی، اور حضرت شاہ احمد سعید متمکن رہے) آپ ہی کے سلسلہ کی تھی، اسی خانقاہ سے مولانا خالد رومی کردی حضرت شاہ غلام علی صاحب سے سلسلہ کو لے کر شام و ترکی پہونچے، جن کا سلسلہ عراق، شام، کردستان اور ترکی میں شہر شہر اور گھر گھر پھیل گیا۔[3]

---

[1] مکتوب ۲۷۷ دفتر اول، فضائل و کمالات کے لئے ملاحظہ ہو، زبدۃ المقامات ص ۳۰۳-۳۰۶

[2] آپ کے حالات و کمالات کے لئے ملاحظہ ہو "زبدۃ المقامات" ص ۳۰۸-۳۱۵

[3] ملاحظہ ہو ان کے مناقب میں علامہ شامی صاحب "شرح در مختار" کی کتاب "سل الحسام الہندی لنصرۃ مولانا خالد النقشبندی" (باقی ص ۱۸۴ پر)

آپ کے مکاتیب ہر سہ اجزاء "مکتوبات امام ربانی" کی ایک طرح سے شرح اور تفصیل اور علوم و نکات کا ایک خزانہ ہے، آپ کے حالات و کمالات کے لئے ایک مستقل کتاب درکار ہے ع

سفینہ چاہیئے اس بحر بیکراں کے لئے

سلطان محی الدین اورنگ زیب کو آپ سے شرف بیعت حاصل تھا، اور آپ ہی کے صاحبزادہ خواجہ سیف الدین نے اس کی سلوک میں تربیت کی، آپ نے اس کو ہندوستان کا مسلمان حکمراں بننے اور اکبری اثرات سے پورے طور پر پاک کرانے کے لئے تیار فرمایا تھا، اور آپ اس کو اپنے مکتوبات میں "شہزادۂ دین پناہ" کے نام سے یاد فرماتے ہیں۔

آپ کی ولادت ۱۱ر شوال ۱۰۰۷ھ میں ہوئی اور وفات ۹ ربیع الاول ۱۰۷۹ھ کو۔[1]

چوتھے صاحبزادہ خواجہ محمد یحییٰ تھے، امام ربانی کی وفات کے وقت آپ کی عمر ۹ سال کی تھی، تحصیل علوم اور تکمیل طریقت اپنے بھائیوں سے کی، وفات ۱۰۹۶ھ میں ہوئی۔[2]

(باقی ص۱۸۳ کا) اس وقت بھی اس سلسلہ کے مشائخ شام و عراق، ترکی اور کردستان میں موجود ہیں، راقم سطور نے ان میں سے متعدد کی زیارت کی ہے، ان میں شیخ ابراہیم غلاییني، شیخ ابوالخیر میدانی، شیخ محمد بنہان، خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

[1] کتاب کے آخر میں آپ کا مستقل تذکرہ (نزہۃ الخواطر) سے ماخوذ و مقتبس ملاحظہ ہو۔

[2] بھوپال کے حضرت شاہ رؤف احمد اور ان کے پوتے حضرت شاہ پیر ابو احمد اور ان کے پڑپوتے حضرت شاہ محمد یعقوب انہی کی اولاد میں ہیں۔

باب پنجم

حضرت مجدد کے دائرۂ "تجدید" کا مرکزی نقطہ

نبوت محمدی پر ایمان واعتماد کی تجدید

حضرت مجدد کا اصل تجدیدی کارنامہ کیا تھا؟

ان تمام اہل نظر اور انصاف پسند حضرات کا جنکی گیارھویں صدی (جس سے الف ثانی ہزارۂ دوم کا آغاز ہوتا ہے) کی اسلامی تاریخ پر عمومی اور ہندوستان کی اسلامی تاریخ پر خصوصی نظر ہے[1]، اس پر اتفاق ہے کہ حضرت شیخ احمد سرہندی سے اسلام کی حفاظت و تقویت کا وہ تاریخ ساز اور عہد آفریں کام انجام پایا جس کو حدیث کی سادہ و معروف اصطلاح میں "تجدید" کہا گیا ہے[2]، اور جس نے ان کے سلسلہ میں ایسی شہرت حاصل کی ہے

---

[1] جس پر کتاب کے پہلے دو ابواب میں اجمالی نظر ڈالی جا چکی ہے۔

[2] سنن ابی داؤد کی مشہور روایت ہے "ان الله عزوجل يبعث لهذه الامة على رأس كل مئة سنة من يجدد لها دينها" (اللہ تعالیٰ ہر صدی کے سرے پر ایسے کو اٹھائے گا جو اس امت کے لئے اس کے دین کو تازہ کردے گا (ابوداؤد وغیرہ) اس حدیث کی شرح اور تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو! کتاب "جامع المجددین" (از مولانا عبدالباری ندوی) پر مولانا سید سلیمان ندویؒ کا فاضلانہ مقدمہ ص ۱۶-۲۴

کہ وہ ان کے نام کا قائم مقام بن گیا ہے، اور جس کی مثال اس سے پہلے نہیں ملتی۔

یہ کام کیا تھا؟ روح و فکرِ اسلامی کی جلاو تازگی، وقت کے اہم ترین اور سنگین فتنوں کا سدِ باب اور استیصال، نبوتِ محمدی اور شریعتِ اسلامی کی صداقت و ابدیت پر از سرِ نو اعتقاد و اعتماد بحال کرنا، ریاضت و اشراقیت پر مبنی اس روحانی تجربہ اور تلاشِ حقیقت اور خدارسی کی کوشش کی طلسم شکنی جو محمد عربی صلے اللہ علیہ وسلم کی پیروی اور اتباع سے بے نیاز ہو، "ہمہ اوست" اور وحدۃ الوجود کے عقیدہ اور نظریہ کی پردہ کشائی جو اپنے غلو و مبالغہ اور اشاعت و مقبولیت کے نقطۂ عروج پر پہونچ چکا تھا، اور جس سے عقائد میں تزلزل اور مسلم معاشرہ میں انتشار پیدا ہو رہا تھا، اور اس کے متوازی "وحدۃ الشہود" کے مسلک و نظریہ کو مدلل و مرتب شکل میں پیش کرنا، بدعات (جنھوں نے ایک مستقل تشریع کی شکل اختیار کر لی تھی) کی کھلی ہوئی تردید و مخالفت حتیٰ کہ "بدعتِ حسنہ" کے وجود سے بھی انکار، اور پھر آخر میں ہندوستان میں اسلام کے اکھڑتے ہوئے قدموں کے جمانے، اکبری عہد کے مخالفِ اسلام اثرات کے ختم کرنے، اور ہندوستان میں ایک ایسا تجدیدی دینی انقلاب لانے کی حکیمانہ اور کامیاب کوشش جس کے نتیجہ میں ایک طرف اکبر کے تخت پر محی الدین اورنگ زیب عالمگیر متمکن ہوتا ہے، دوسری طرف حکیم الاسلام حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی اور ان کے خلفاء و تلامذہ کا وہ سلسلہ وجود میں آتا ہے جو روحانی اور باطنی طور پر اسی سلسلہ سے وابستہ اور منسوب ہے، اور جس نے اشاعت و ترویج کتاب و سنت، ان کی تفہیم و ترجمانی، اور ان کے سلسلۂ درس و تدریس، مدارس کے قیام، تزکیہ و تربیتِ باطنی، اصلاحِ عقائد و رسوم کے عظیم الشان کام، اور پھر آخر میں جہاد و سعیِ اعلاءِ کلمۃ اللہ کے ذریعہ نہ صرف یہ کہ ہندوستان میں اسلام کو قائم اور شجرِ اسلام کو پھلتا پھولتا رکھا، بلکہ اس کو عالمِ اسلام میں دینی علوم (بالخصوص علمِ حدیث) اور فکر و دعوتِ اسلامی کا مرکز بنا دیا۔

لیکن اس عظیم و وسیع تجدیدی دائرۂ عمل کا نقطۂ مرکزی اور حضرت مجدد کا وہ اصل تجدیدی کارنامہ کیا تھا، جس کو ان کے سارے تجدیدی کارناموں پر اولیت و فوقیت حاصل ہے؟ لوگوں نے اپنے اپنے ذوق و رجحان کے مطابق اس کا جواب دیا ہے۔ ع

وللناس فیما یعشقون مذاهبُ

ان میں تین گروہ خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

ا۔ ایک گروہ جو کہتا ہے کہ وہ اس لئے مجدد الف ثانی کہلانے کے مستحق ہیں کہ انھوں نے ہندوستان کو اسلام کے لئے دوبارہ بازیاب کیا، اور اس کو برہمنیت یا وحدت ادیان کی گود میں جانے کے بجائے دوبارہ محمد عربی صلے اللہ علیہ وسلم اور دین حجازی کی تولیت و نگرانی میں دیا، اور اس کو گیارہویں صدی ہجری (سولہویں صدی عیسوی) کی اہم صدی میں اس انجام اور حشر سے بچالیا جو اس کا تیرہویں صدی ہجری (انیسویں صدی عیسوی) میں ہونے والا تھا' بلکہ درحقیقت ہندوستان کی ملت اسلامیہ کو اس ہمہ گیر اعتقادی، ذہنی، اور تہذیبی ارتداد کے فوری خطرہ سے محفوظ کر دیا جو اکبر کی جیسی با عزم اور قوی الارادہ شخصیت اور اس کے یگانۂ روزگار مشیروں (ملا مبارک، فیضی اور ابوالفضل) کی ذہانت سے ایک امر واقعہ بن کر سامنے آگیا تھا، یہ معنوی و روحانی انقلاب اور یہ ذہنی و تہذیبی ارتداد اس سیاسی زوال اور اقتدار کے خاتمہ سے کہیں زیادہ سنگین، دیرپا اور دور رس تھا، جو اٹھارہویں صدی کے اواخر میں ہندوستان کی نوخیز غیر مسلم طاقتوں کے ابھرنے سے اور انیسویں صدی کے اوائل میں انگریزوں کے تسلط اور اقتدار سے پیش آیا، شاید اقبالؒ نے اپنے اس مشہور شعر میں اسی طرف اشارہ کیا ہے ؎

وہ ہند میں سرمایۂ ملت کا نگہبان　　اللہ نے بروقت کیا جس کو خبردار

۲۔ دوسرے گروہ کے نزدیک ان کا اصل تجدیدی کارنامہ یہ ہے کہ انھوں نے طریقت پر شریعت کی فوقیت و بالادستی کو ایسے پُراز اعتماد، مبصرانہ و تجربہ کارانہ انداز، اور اس قوت و وضاحت کے ساتھ بیان کیا جو اس سے پہلے کسی نے نہیں کیا تھا، اور اس سے طریقت کا شریعت کے تابع بلکہ خادم ہونا روز روشن کی طرح واضح ہو گیا، اور سلوک و طریقت کے حلقہ میں شریعت سے استغناء بلکہ کہیں کہیں انحراف، اور ریاضت و مجاہدہ اور باطنی حواس اور طاقتوں پر کُلّی اعتماد کا جو فتنہ شروع ہو گیا تھا، اور جس کا (جوگ اور سنیاس کا ایک اہم مرکز ہونے کی بنا پر) ہندوستان سب سے بڑا نشانہ تھا رک گیا، اور ان کے بعد پھر کسی کو کھل کر یہ کہنے کی ہمت نہیں ہوئی کہ "شریعت و طریقت کے کوچے الگ الگ ہیں، اور طریقت پر شریعت کے پہرے نہیں بٹھائے جا سکتے۔"

۳۔ تیسرا گروہ وہ ہے، جو ان کا اصل تجدیدی کارنامہ یہ سمجھتا ہے کہ انھوں نے "وحدۃ الوجود" کے عقیدہ و نظریہ پر وہ کاری ضرب لگائی جو اس سے پہلے کسی نے نہیں لگائی تھی، اور پھر اس کے بڑھتے ہوئے اس سیلاب کو روک دیا، بلکہ اس کا منہ پھیر دیا جس نے آخری صدیوں میں پوری علمی و روحانی دنیا کو اپنی لپیٹ میں لے لیا تھا، اور جس کے خلاف کسی پڑھے لکھے آدمی کا لب کشائی کرنا بھی اپنی جہالت کا ثبوت دینا اور نصف النہار میں دن ہونے کا انکار کرنا تھا مولانا سید مناظر احسن گیلانی مرحوم نے اپنے معرکۃ الآراء مضمون "ہزارۂ دوم یا الف ثانی کا تجدیدی کارنامہ" میں صحیح لکھا ہے کہ:۔

"وحدۃ الوجود اور وحدۃ الشہود کی فنی نکتہ نوازیوں یا شریعت و طریقت کی مُلّایانہ و صوفیانہ معرکہ آرائیوں کے ہنگاموں میں حضرت شیخ احمد فاروقی سرہندی رحمۃ اللہ علیہ کے واقعی اور حقیقی تجدیدی کارنامے کچھ اس طرح رل مل گئے ہیں کہ آج حضرت قدس سرہ العزیز کو

مجدد الف ثانی کہنا بجز ایک روایتی خوش اعتقادی کے بظاہر اور کسی امر مہم پر مبنی نہیں معلوم ہوتا"۔[1]

نبوت محمدی اور اس کی ابدیت اور ضرورت پر اعتماد کی بحالی

لیکن حقیقت میں ان کا اصل کارنامہ جس کے جلو میں ان کے سارے تجدیدی کارنامے چلتے پھرتے نظر آتے ہیں، اور ان کی تجدید کا اصل سرچشمہ جس سے ان کی تمام انقلابی و اصلاحی کاموں کے چشمے پھوٹتے ہیں، اور دریا بن کر سارے عالم اسلام میں رواں دواں ہو جاتے ہیں، وہ نبوتِ محمدی اور اس کی ابدیت و ضرورت پر امت میں اعتقاد و اعتماد بحال کرنے اور مستحکم کرنے کا وہ تجدیدی و انقلابی کارنامہ ہے، جو ان سے پہلے اس تفصیل و وضاحت و قوت کے ساتھ ہمارے علم میں کسی مجدد نے انجام نہیں دیا، شاید یہ اس لئے بھی کہ اس کے زمانہ میں اس کی ضرورت پیش نہیں آئی، اور اس کے خلاف کوئی منظم تحریک یا فلسفہ سامنے نہیں آیا تھا،[2]

اس تجدیدی اقدام سے ان تمام فتنوں کا سدباب ہوتا ہے جو اس وقت عالم اسلام میں منہ پھیلائے ہوئے اسلام کے شجرۂ طیبہ اور اس کے پورے اعتقادی، فکری اور روحانی نظام کو نگل لینے کے لئے تیار تھے، ان میں ایران کی وہ نقطوی تحریک اور اس کے پیرو بھی شامل ہیں، جنھوں نے نبوتِ محمدی اور اس کے بقا و دوام کے خلاف کھلے طریقہ پر علم بغاوت بلند کیا تھا، اور اعلان کیا تھا کہ "نبوتِ محمدی کا ایک ہزار سالہ دور ختم ہوا، اور اب دینی رہنمائی

---

[1] "تذکرہ امام ربانی مجدد الف ثانی قدس سرہ" مرتبہ مولانا محمد منظور نعمانی ص ۲۷

[2] اس سلسلہ میں سب سے زیادہ وضاحت شیخ الاسلام ابن تیمیہؒ کے یہاں ملتی ہے، خاص طور پر ان کی جلیل القدر کتاب "النبوات" اور "نقض المنطق" اور "الرد علی المنطقیین" ہیں، لیکن وہ چیز بھی اشارات و اجمال سے آگے نہیں بڑھ سکی کہ نکل مقام مقال۔

اور زندگی کی تشکیل جدید اور آئین سازی کا وہ دور شروع ہوتے جا رہا ہے جس کی اساس عقلیت و فلسفہ پر ہوگی جس کی قیادت محمود بسیخوانی اور اس کی جماعت کے ہاتھ میں اور جس کا مرکز ایران و ہندوستان ہوگا"۔ ان فتنوں میں اکبر کا "دین اکبری" اور "آئین جدید" بھی شامل ہے، جو ہندوستان میں نبوت و شریعت محمدی کی جگہ لینے اور اس کا بدل بننے کا مدعی تھا، دینی زندگی، اعمال و عبادات، اور معاشرہ و تمدن کی وہ دینی بدعات بھی داخل ہیں، جو ایک متوازی شریعت بنتی جا رہی تھیں، اور جن کی ایک مستقل "فقہ" مدون ہو رہی تھی، اور وہ بھی درحقیقت محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی خاتمیت کے لئے ایک چیلنج اور منصب تشریع کی مدعی تھی۔

اس سلسلہ میں وحدۃ الوجود کا فلسفہ بھی آتا ہے، جو اپنے داعیوں اور علمبرداروں کے بقول کشفی حقائق پر مبنی تھا، اور جس کے متعلق اس کے غالی معتقدین بھی اس بات کے مدعی نہیں ہیں کہ خاتم النبیین صلے اللہ علیہ وسلم نے اس کی بالاعلان تبلیغ کی، اور آپ نے صحابۂ کرام کو اور صحابۂ کرام نے اپنے بعد کے لوگوں کو اس کی دعوت دی، یہ فلسفہ اور دعوت بھی نبوت کی پیش کی ہوئی دعوت، اس کی واضح تعلیمات اور اس کے مقاصد کا (دانستہ یا نادانستہ طریقہ پر) حریف بنتی جا رہی تھی اور اس کو جس قدر کامیابی حاصل ہوتی تھی، اور اس کی جڑیں دل و دماغ اور اسلامی معاشرہ میں پیوست ہوتی جاتی تھیں، احکام شریعت پر عمل کرنے، اسلام کے واحد دینِ حق اور ذریعۂ نجات ہونے کے عقیدہ میں ضعف پیدا ہوتا اور الحاد و زندقہ، حریت و اباحیت تعطل و بے عملی کے لئے راہیں کھلتی تھیں، خواہ اس کے محتاط و متقی قائل صوفیہ و مشائخ خود شریعت کے کتنے ہی پابند اور اس کا کتنا ہی احترام

لے ملاحظہ ہو کتاب کا باب اول۔ مضمون "دسویں صدی کا فتنۂ کبریٰ"۔

کرتے ہوں، اور اس طرزِ عمل کے کتنے ہی مخالف ہوں۔

اس ضمن میں فرقۂ امامیہ کا گروہ بھی آتا ہے جس کے اساسی عقائد میں امامت کا عقیدہ بھی ہے اور جو امام کی ایسی تعریف کرتا ہے، اور اس کے ایسے صفات و خصوصیات بیان کرتا ہے، جو اس کو قریب قریب نبی کا ہمسر و مساوی بنا دیتی ہیں[1]، اسی طرح صحابۂ کرام کی ایک بڑی جماعت کے متعلق ایسی رائے رکھتا ہے جس سے ذات نبوی کی تاثیر صحبت، اس کی انقلاب انگیزی اور کیمیا اثری پر دھبہ آتا ہے، اور جو "هُوَ الَّذِي بَعَثَ فِي الْأُمِّيِّينَ رَسُولًا مِّنْهُمْ يَتْلُو عَلَيْهِمْ آيَاتِهِ وَيُزَكِّيهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ" کے منافی ہے[2]، اس فرقہ کے اثرات مختلف سیاسی و علمی وجوہ سے ہندوستان میں تیزی سے پھیل رہے تھے، اور مسلم معاشرہ (جس کی

---

[1] فرقۂ امامیہ کی معتبر کتابوں سے "امام" کے بارے میں جو کچھ ثابت ہوتا ہے اس کا خلاصہ یہ ہے کہ "امام ظاہراً و باطناً معصوم عن الخطا و طاہر و مطہر ہوتا ہے، اس کی اطاعت فرض ہوتی ہے، اس کے ہاتھوں معجزات کا ظہور ہوتا ہے، اس کو متعلقات شریعت کا علم محیط (جس سے کوئی چیز خارج نہیں) علم لدنی کے طور پر حاصل ہوتا ہے، اور وہ قیامت تک اللہ کی حجت کے طور پر ہر زمانہ میں ظاہر ہوگا۔ (مقتبس از کتاب الشافی للشریف المرتضیٰ، تلخیص الشافی للطوسی، واصل الشیعۃ واصولہا للعلامۃ الشیخ محمد حسین آل کاشف الغطاء)۔

علامہ محمد ابو زہرہ اپنی فاضلانہ کتاب تاریخ المذاہب الاسلامیۃ (ج ۱) میں ان اقوال پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ "فرقۂ امامیہ کے تمام علماء اس پر متفق ہیں، ان کے نزدیک "امام" کے مرتبہ کے نبی کے مرتبہ کے قریب ہونے میں کوئی اختلاف نہیں انھوں نے اس کی صراحت کی ہے کہ "وصی" اور "نبی" میں صرف اتنا فرق ہے کہ "وصی" پر وحی نہیں آتی"۔ (ص ۵۹)

[2] سورۂ جمعہ آیت ۲ (ترجمہ) وہ پاک ذات جس نے ناخواندوں میں انھیں میں سے ایک رسول کو مبعوث کیا جو ان کو اس کی آیات پڑھ کر سناتا ہے (ان کے اخلاق و نفوس کو) سنوارتا اور بناتا ہے، اور ان کو کتاب و حکمت کی تعلیم دیتا ہے۔

اکثریت سنی العقیدہ تھی) اس کے عقائد تصورات، افکار و خیالات اور رسوم و عادات سے گہرے طریقہ پر متأثر ہو رہا تھا۔

اس طرح انھوں نے "نبوت محمدی پر ایمان و اعتماد کی تجدید" کی شاہ کلید سے وہ سارے بھاری اور پیچیدہ قفل کھول دیئے جو یونانی و ایرانی فلسفہ اور مصری[1] و ہندوستانی اشراقیت نے ایجاد کئے تھے، ایک تیر سے ان سب فتنوں کو شکار کیا، جن کا مسلمانوں کا ذہین طبقہ نشانہ بنا ہوا تھا۔

عقل و کشف کا غیبی اور مابعد الطبیعی حقائق کے ادراک میں عاجز و ناکام رہنا

مجدد صاحب کا تجدیدی کارنامہ یہ ہے کہ انھوں نے عقل و کشف دونوں کو "غیبیات" ماوراء عقل علوم، ذات و صفات الٰہی کی صحیح معرفت، لاریبی علم اور قطعی الثبوت حقائق کے یقینی ادراک سے عاجز اور قاصر ثابت کیا، اور یہ کہ ان کے حاصل کئے ہوئے نتائج شک و ریب اور خطاء لغزش اور غلط فہمی سے مبرا نہیں، اللہ کی معرفتِ صحیح انبیاء ہی کے ذریعہ حاصل ہوتی ہے، جس طرح "عقل" کا مرتبہ "حواس" سے ماوراء ہے، اسی طرح "نبوت" کا مرتبہ "عقل" سے ماوراء ہے، خدا کی تعظیم کا صحیح طریقہ معلوم کرنا نبوت پر منحصر اور انبیاء کی اطلاع و تعلیم پر موقوف ہے، معرفت الٰہی میں عقلائے یونان نے سخت ٹھوکریں کھائی ہیں، اور مضحکہ خیز غلطیاں کی ہیں، جس طرح عقل خالص اور عقل مجرد کا وجود نہیں، کشف خالص اور کشف مجرد بھی، (جو اندرونی خواہشات اور خارجی اثرات سے محفوظ ہو) نہایت دشوار بلکہ عنقا صفت ہے، اور اہل اشراق و صفائی نفس نے اسی طرح ٹھوکریں کھائی ہیں، اور وہم و جہالت کا شکار ہوئے ہیں، جیسے مدعیان عقل و فلسفہ، عقل و اشراق دونوں حصول الیقین

---

[1] مصر افلاطونیت جدیدہ (NEO PLATIONISM) کا بڑا مرکز تھا، جس میں فلاطینس (POLOTINUS) پارفری (PARPHYRY) پراکلس (PROCLUS) وغیرہ پیدا ہوئے اور ایک نئے مذہب "افلاطونیت جدیدہ" کی بنیاد پڑی۔

اور وصول الی اللہ کے لئے ناکافی ہیں، بعثت ہی اللہ کی ذات وصفات اور احکام کی معرفت کا واحد ذریعہ ہے۔

انھوں نے اعلان کیا کہ عقل کا خالص و بے آمیز ہونا ممکن نہیں، اور وہ بھی داخلی عقائد و مسلّمات اور خارجی عوامل واثرات سے متأثر ہوتی ہے، اور اس کے بہت سے فیصلے اور نتائج ان خارجی رنگوں سے رنگین و ممزوج ہو کر سامنے آتے ہیں، جو اس کے اندرون و بیرون میں پائے جاتے ہیں، انھوں نے ثابت کیا کہ عقل حجت ہونے میں ناقص ہے، حجت کامل انبیاء کی بعثت ہے، بعثت کے بغیر حقیقی تزکیہ ممکن ہی نہیں۔

انھوں نے صفائی نفس اور صفائی قلب میں حدّ فاصل قائم کی اور دونوں کا فرق بتایا، انھوں نے ثابت کیا کہ انبیاء کی رسالت کا تصدیق کرنے والا اصحاب استدلال میں سے ہے، انبیاء کی اطلاعات کو اپنی عقل کا پابند بنانا نبوت کا انکار ہے، انھوں نے اس نکتہ کی وضاحت کی کہ مخالف عقل ہونا اور چیز ہے، اور ماورائے عقل ہونا اور چیز۔

مجدد صاحب کی یہ تحقیقات جو عقل و کشف دونوں پر مبنی ہیں، اور جن میں تائید الٰہی اور مشکوٰۃ نبوت سے اخذ کیا ہوا نور شامل ہے، علمی و روحانی دنیا میں ہلچل ڈال دینے والے، فکر و تعقل کا ایک نیا دروازہ کھولنے والے، عقلی و علمی دنیا کے بہت سے رائج الوقت سکّوں کو کھوٹا ثابت کرنے والے، نبوات و شرائع سماویہ کی صداقت و عظمت کا اعلان کرنے والے، اور ان پر از سر نو اعتماد بحال کرنے والے علوم و معارف اور ایک ایسا تجدیدی و انقلابی اور علمی و تحقیقی کارنامہ ہے، جو تنہا اس وقت کے نظام تعلیم، علمی ماحول اور دماغی کاوشوں کا نتیجہ نہیں ہو سکتا تھا، اس لئے کہ ان میں وہ باتیں کہی گئی ہیں، جن میں سے بعض تک فلسفہ اور فکر کی دنیا صدیوں کے بعد پہونچی ہے، اور جن کی صداقت پر بالآخر علم اور روحانی

تجربہ نے مہرِ تصدیق ثبت کر دی ہے، یہ محض اس تائیدِ الٰہی اور ہدایتِ ربانی کا کرشمہ تھا، جس نے ان کو "ہزارۂ دوم" کے آغاز پر تجدیدِ دین اور نبوت و شریعتِ محمدی کے دفاع کے لئے انتخاب کیا، اور اس اخلاص، حمیّتِ دینی اور رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے اتباعِ کامل کا فیض جس پر وہ شروع سے گامزن تھے۔

اس اجمال کی تفصیل اور ان اشارات کی توضیح کے لئے اس پس منظر اور صورتِ حال کو سمجھنے کی ضرورت ہے جس میں ان تحقیقات کی قدر و قیمت پورے طور پر واضح ہو گی۔

بنیادی سوالات، اور ان کے جواب کی مختلف کوششیں، اور ان کا جائزہ

دین و دنیا کے اہم ترین اور اولین سوالات جن کے صحیح جواب پر اس زندگی کی درستی اور صحیح انتظام اور آخرت کی نجات کا دار و مدار ہے، یہ ہیں کہ دنیا کا بنانے والا کون ہے؟ اس کے صفات کیا ہیں؟ اس کا ہم سے کیا تعلق ہے، اور ہمارا اس سے کیا اور کیسا تعلق ہونا چاہیئے؟ اس کی پسندیدگی اور خوشی کی چیزیں کیا ہیں اور ناپسندیدگی اور ناراضگی کی کیا؟ کیا اس زندگی کے بعد کوئی اور زندگی بھی ہے، اگر ہے تو اس کی نوعیت کیا ہے، اور اس کے لئے اس زندگی میں کیا ہدایات ہیں۔؟

ان سوالات کے جواب کی تفصیل میں اللہ تعالٰی کی ذات و صفات و افعال، عالم کے حدوث و قدم، آخرت، جنت، دوزخ، وحی اور فرشتوں کے وجود کی بحث اور بعض وہ دوسرے مابعد الطبیعاتی مباحث پیش آجاتے ہیں، جو عقائد اور مذہب کے اصول کا درجہ رکھتے ہیں۔

ان سوالات کے جواب اور ان مسائل کے حل کے عموماً دنیا میں دو تجربے کئے گئے ہیں، ایک عقلی دوسرا اشراقی، پہلے کا نتیجہ فلسفہ ہے، اور دوسرے کا نتیجہ اشراقی تصوف۔

لیکن اصولی اور تنقیدی حیثیت سے یہ دونوں تجربے اور کوششیں بنیادی طور پر غلط اور چند ابتدائی غلط فہمیوں پر مبنی ہیں، مکتوبات کے اقتباسات سے پہلے تمہید کے طور پر اس کی مختصر تشریح مناسب معلوم ہوتی ہے

عقل محض اور کشف خالص کی تنقید کا انقلابی کارنامہ

عقل کے متعلق سب سے پہلے یہ حقیقت یاد رکھنی چاہئے کہ وہ اپنا طبعی فریضہ (اکتشاف وتحقیق اور استدلال) انجام دینے میں آزاد نہیں ہے، اس کو اپنے سے کمتر چیزوں کی احتیاج ہے، اس کا کام یہ ہے کہ محسوسات اور معلومات اور تجربات کے ذریعہ غیر محسوس اور غیر معلوم چیزوں کا علم حاصل کرے، اور اپنے ذخیرۂ معلومات اور مبادی و مقدمات کی مدد سے اور ان کو علمی طور پر مرتب کر کے وہ اس نتیجہ تک پہونچے جو اس کو ابھی تک حاصل نہیں تھا، اور محض حواس و تجربہ سے حاصل نہیں ہو سکتا تھا، تمام معقولات کی تحلیل اور ان کا تجزیہ کرنے سے یہی حقیقت ظاہر ہوگی کہ عقل ان حقائق اور بلند معلومات تک انھیں حقیر محسوسات اور ابتدائی معلومات کی مدد سے پہونچی ہے، جو بلا کسی عقلی اور علمی ترتیب کے ان عظیم الشان نتائج تک نہیں پہونچا سکتے تھے۔

پس صاف ظاہر ہے کہ جہاں انسان کے حواس قطعاً کام نہ کر سکتے ہوں، جہاں اس کے پاس معلومات کا سرے سے کوئی ذخیرہ نہ ہو، اور جس کے مبادی سے بھی وہ بالکل محروم ہو، جہاں کی حقیقت حال کا اس کو کوئی اندازہ و تجربہ نہ ہو، اور جہاں قیاس کی بنیادی موجود نہ ہو، وہاں اس کی عقل و ذہانت اور اس کا قیاس کیا کام کر سکتا ہے؟ وہاں اس کی عقل اسی طرح بے بس ہوتی ہے جس طرح انسان کشتی کے بغیر سمندر کو عبور نہیں کر سکتا، اور طیارہ کے بغیر پرواز سے عاجز ہے، ذہین آدمی اعداد سے واقفیت کے بغیر ریاضی کا کوئی سوال حل نہیں کر سکتا، جس شخص نے کسی زبان کا رسم الخط نہیں سیکھا اور وہ اس کے حروف تہجی

(ALPHABET) سے بھی نا آشنا ہے کتنا ہی ذہین اور جینیس (عبقری) ہو اور ہزار عقل و قیاس اور عرق ریزی سے کام لے اس زبان کی ایک سطر نہیں پڑھ سکتا، بعینہٖ اسی طرح مندرجہ بالا سوالات محض عقل سے حل نہیں کئے جا سکتے کیونکہ اس کے مبادی بھی انسان کو حاصل نہیں، نہ وہاں قیاس کی کوئی گنجائش ہے۔

دوسری حقیقت یہ ہے کہ عقل کی قوت اور اس کا عمل محدود ہے، اس کا ایک دائرہ ہے، جس سے وہ باہر نہیں جا سکتی، جس طرح انسان کے حواس کے علاحدہ علاحدہ دائرے ہیں اور ان کا عمل ان کے اندر محدود ہے، حاسۂ بصارت سے ہزاروں مبصرات کا ادراک ہو سکتا ہے، لیکن ایک آواز بھی وہ اخذ نہیں کر سکتا، اسی طرح دوسرے حواس، پھر اپنے ان مخصوص محسوسات اور دائرۂ عمل میں بھی ان حواس کی قوت اور ان کا عمل غیر محدود نہیں۔

اسی طرح عقل اگرچہ اس کا میدان ان حواس ظاہری سے زیادہ وسیع ہے لیکن بہرحال محدود ہے، ابن خلدون کے عالمانہ الفاظ میں :-

"عقل ایک صحیح ترازو ہے، اس کے فیصلے یقینی ہیں، جن میں کوئی دروغ نہیں، لیکن تم اس ترازو میں امور توحید امور آخرت، حقیقت نبوت، حقائق صفات الٰہی، اور وہ تمام امور و حقائق جو ماوراء عقل ہیں، تول نہیں سکتے، یہ لاحاصل کوشش ہوگی، اس کی مثال ایسی ہے کہ ایک شخص نے ایک ترازو دیکھی جو سونے کا وزن کرنے کے لئے ہے اس کو اس ترازو میں پہاڑوں کے تولنے کا شوق پیدا ہوا ہو نا ممکن ہے، اس سے ترازو کی صحت پر کوئی حرف نہیں آتا لیکن اس کی گنجائش کی ایک حد ہے، اسی طرح عقل کے عمل کا بھی ایک دائرہ ہے جس سے باہر وہ قدم نہیں نکال سکتی وہ اللہ اور اس کے صفات کا احاطہ نہیں کر سکتی کہ وہ اس کے وجود کا ایک ذرہ ہے۔"[1]

---

[1] مقدمہ ابن خلدون ص ۴۷۳

تیسری بات یہ ہے کہ عقل میں پوری بے آمیزی اور اس کے فیصلوں اور نتائج میں مکمل غیر جانبداری بہت مشکل ہے، اہل حقیقت جانتے ہیں کہ "عقل خالص" اور "عقل مجرد" سے زیادہ عنقا صفت چیز دنیا میں مشکل سے کوئی ہوگی، جذبات و خواہشات، ماحول، خاص تعلیم و تربیت مخصوص اعتقادات و نظریات، وہم و خیال، سہو و نسیان کے اثر سے وہ مشکل سے آزاد ہوتی ہے، اس لئے اس کے فیصلوں میں ہمیشہ صداقت اور اس کے نتائج میں قطعیت پیدا ہونا اتنا آسان اور عمومی نہیں جتنا سمجھا جاتا ہے۔

لیکن حیرت انگیز امر یہ ہے کہ فلاسفہ نے ان تمام حقیقتوں کو نظر انداز کرتے ہوئے اپنے موضوع کے تعین میں غلطی کی اور خدا کی ذات و صفات اور اس کے متعلقات پر بلا کسی سامان و اسباب اور بلا کسی علم و روشنی کے ایسی تفصیل و تدقیق اور ایسے وثوق و علم سے بحث کی جو ماہر کیمیا اپنے کیمیاوی تجربوں اور تحلیل و تجزیہ کے بعد کرتا ہے، ان کے یہ مباحث و تحقیقات تمام تر فرضیات و تخمینات، اور خیالی طلسمات کا مجموعہ ہیں، اور محض قیاس بر قیاس پر مبنی ہیں، یہ "الٰہیات" کا ایک اچھا خاصا "طلسم ہوشربا" اور "فسانۂ عجائب"[۱] ہے، جس کا کچھ نمونہ آئندہ آئے گا۔

اس عقلیت و فلسفہ کے مقابلہ میں ایک دوسری کوشش ہے جس کا نام "اشراق" ہے، اس کا اصول یہ ہے کہ حق اور یقین کی دریافت کے لئے عقل، علم اور برہان و استدلال مفید نہیں، بلکہ مُضر ہیں، صداقت و حقیقت کے یقینی حصول کے لئے مشاہدہ شرط ہے، اور یہ مشاہدہ صرف نور باطن، صفائی نفس اور ایک اندرونی حاسہ کو بیدار کرنے سے ممکن ہے، جو روحانیات اور ماوراء طبیعیات کا اسی طرح ادراک کرتا ہے جس طرح یہ ظاہری آنکھیں ظاہری چیزوں کا ادراک کرتی ہیں، اور یہ حاسہ اسی وقت پیدا ہو سکتا ہے، جب مادیت کو بالکل فنا اور حواس ظاہری کو مردہ کر دیا جائے، حقائق کی تحصیل اسی خالص و بے آمیز

[۱] اردو کی دو مشہور افسانوی کتابیں جو انیسویں صدی عیسوی میں لکھی گئیں۔

عقل (حکمت اشراق) اور اسی اندرونی روشنی (نورِ باطن) سے ممکن ہے، جو ریاضتوں، نفس کشی، مراقبہ اور تفکر سے پیدا ہوتی ہے۔

یہ بالکل صحیح ہے کہ انسان میں یہ حاسۂ باطنی موجود ہے، ممکن ہے ایسے اور دوسرے حواس بھی ہوں لیکن بہر حال یہ ایک انسانی حاسہ ہی ہے، اسی طرح کمزور اور محدود، خطاپذیر اور متأثر ہونے والا، جس طرح انسان کی ساری طاقتیں اور انکشاف علم کے سارے ذرائع، اس کے محسوسات اور مشاہدات میں بھی غلطی اور خود فریبی ہوتی ہے، جیسے دوسرے حواس کے نتائج میں ہوتی ہے، اگر ایسا نہ ہوتا تو اہل اشراق و مشاہدہ کے مکاشفات و تحقیقات میں وہ عظیم الشان تعارض و تناقض اور بڑے بڑے اہم مسائل میں لغزش اور غلط روی ممکن نہ ہوتی، جو غیر مسلم اور مسلمان اشراقیوں کے یہاں ملتی ہے۔[1]

بہر حال عقل کی طرح اس "عقل خاص" کا خالص ہونا بھی بہت مشکل ہے، اس پر بھی اسی طرح خارجی اثرات اور ظاہری اور باطنی چیزوں کا عکس اور پرتو پڑتا ہے، اور یہ آئینہ بھی حقیقت کی صحیح تصویر پیش نہیں کرتا، اشراقیوں کے ماحول، ان کے عقائد و مسلمات کا ان کے مشاہدات پر یہی اثر پڑتا ہے، یہی وجہ ہے کہ بہت سے حکمائے اشراق کو اپنے کشف و مشاہدہ میں بہت سے ان یونانی اور مصری اوہام و خیالات کی تائید نظر آتی تھی، جن کا کوئی سر پیر نہ تھا اور بہت سے ایسے مفروضات حقیقت بن کر نظر آتے تھے، جن کا عالم خارجی میں کہیں وجود نہیں۔[2]

پھر جس طرح مندرجہ بالا سوالات فلسفہ کے موضوع و حدود سے خارج ہیں، اسی طرح

---

[1] تفصیل اور مثالوں کے لئے ملاحظہ ہو مصنف کی کتاب "مذہب و تمدن" باب اول عنوان "اشراقیت"۔

[2] ملاحظہ ہو "مذہب و تمدن"۔

اشراق کے حدود سے بھی، اس سے صرف عالم ارواح کے اسرار و عجائبات کی سیر ہوتی ہے، کچھ صورتیں نظر آتی ہیں، کچھ رنگ نظر آتے ہیں، کچھ آوازیں سننے میں آتی ہیں، لیکن اللہ تعالیٰ کے منشا کا تفصیلی علم، اس کے قوانین شریعت، عالم آخرت کی منزلیں، اور اس کے احوال سے وہ اسی طرح بے خبر ہیں جس طرح عام انسان۔

درحقیقت فلسفہ اور اشراق میں ایک ہی روح اور ایک ہی ذہنیت کام کرتی ہے، دونوں حقیقت کو اپنی کوشش سے پیغمبروں کے واسطہ کے بغیر معلوم کرنا چاہتے ہیں، منزل دونوں کی ایک ہے، طریقۂ سفر مختلف ہے، ایک ہوا میں اڑ کر (خیالی پرواز سے) وہاں پہونچنا چاہتا ہے، اور ایک کسی مخفی زمین دوز راستہ سے (روحانی طریقہ سے)۔

لیکن حقیقت اور علم کا لُبّ لباب یہ ہے کہ یہ حقائق پیغمبروں کے واسطہ کے بغیر معلوم نہیں ہوسکتے، جن کو اللہ منصب رسالت سے سرفراز فرماتا ہے، ان کو اپنی ذات و صفات اور "ملکوت السمٰوٰت والارض" زمین و آسمان کی بادشاہی کا سب سے بڑا علم بخشتا ہے، اور اپنی پسندیدگی اور اور ناپسندیدگی اور احکام کا براہ راست علم عطا کرتا ہے، اور ان کو اپنے اور انسانوں کے درمیانی واسطہ بناتا ہے، ان کی رسالت و نبوت دنیا کے لئے اللہ کی سب سے بڑی نعمت ہے، ذات و صفات الٰہی کا جو عظیم الشان علم وہ بلا زحمت اور بلا قیمت عطا کرتے ہیں، اس کے ایک ذرہ کو بھی ہزاروں برس کی فلسفیانہ غور و فکر اور بحث و استدلال اور سالہا سال کے مجاہدہ و مراقبہ و تزکیۂ نفس سے نہیں حاصل کیا جا سکتا۔ "ذالك من فضل الله علينا وعلى الناس ولكن اكثر الناس لا يشكرون"

یہ بالکل صحیح فرمایا کہ "ولکن اکثر الناس لا یشکرون" فلاسفہ اور حکمائے اشراق اس نعمت نبوت کی ناقدری و ناشکری کرتے ہیں، اور ان حقائق تک اپنی محنتوں سے پہونچنا

چاہتے ہیں، جن سے اللہ نے ان کو مستغنی کیا تھا، ہزاروں برس کی ان کاوشوں اور مجاہدوں کا نتیجہ وہ متعارض و متناقض اور مضحکہ خیز اقوال و تحقیقات ہیں، جو "الٰہیات" کا سرمایہ ہیں، اور جنھوں نے اپنے مشتغلین اور متبعین کو خدا سے بجائے قریب و متعلق کرنے کے خدا سے اور زیادہ دور اور اس کی ذات و صفات سے ناآشنا اور اس سے بیگانہ اور مستغنی کیا........

"اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ بَدَّلُوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ كُفْرًا وَّاَحَلُّوْا قَوْمَهُمْ دَارَ الْبَوَارِ"

حضرت مجدد رحمۃ اللہ علیہ فلسفہ و روحانیت دونوں کوچوں سے اچھی طرح واقف ہیں، دوسری طرف علوم نبوت کے وارث اور وحی و رسالت کے مرتبہ شناس ہیں، آپ نے حکماء اور اشراقیوں کے اس طرز عمل کی بڑی مبصرانہ تنقید کی ہے، جو آپ کی جامعیت اور رسوخ فی العلم کی دلیل ہے، یہ مبحث آپ کی تجدید کا مرکزی و بنیادی شعبہ ہے اس لئے کہ پوری شریعت الٰہی اور پورے نظام دینی کی بنیاد اسی بحث کے فیصلہ پر ہے کہ علم قطعی اور حصول یقین کا ذریعہ اور سرچشمہ اور انسان کے لئے اللہ تعالےٰ کی ذات و صفات اپنے آغاز و انجام اور اپنی فلاح و نجات کے ضروری علم کا صحیح مأخذ کیا ہے؟ آیا وہ غور و فکر اور عقلی بحث و استدلال (جس کا نمائندہ فلسفہ ہے) یا اندرونی روشنی، نفس کشی... صفائی اور مشاہدہ اور علم جو باطنی حواس اور روحانی طاقتوں سے حاصل ہوتا ہے جس کو "حکمت اشراق" کہتے ہیں، یا ان دونوں کے برخلاف انبیاء علیہم السلام کی تقلید اور ان پر ایمان، یہی وہ نقطۂ آغاز ہے، جہاں سے راستے ایک دوسرے سے کٹ کر تین مختلف سمتوں کی طرف جاتے ہیں، اور جو آگے جا کر پھر کہیں نہیں ملتے، "وَاَنَّ هٰذَا صِرَاطِىْ مُسْتَقِيْمًا فَاتَّبِعُوْهُ ۚ وَلَا تَتَّبِعُوا السُّبُلَ فَتَفَرَّقَ بِكُمْ عَنْ سَبِيْلِهٖ ۚ ذٰلِكُمْ وَصّٰىكُمْ بِهٖ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ ۝"

اس سلسلہ میں مجدد صاحب کے قلم سے جو نادر تحقیقات اور اعلیٰ علوم و معارف نکلے ہیں،

اوران کے مکتوبات کے ضخیم دفتر میں منتشر ہیں، ان کا ترجمہ مختلف عنوانوں کے ماتحت پیش کیا جاتا ہے۔

عقل کا عجز صانع عالم کے اثبات اور اس کے کمالات کی معرفت میں

"اس اللہ کا شکر ہے جس نے ہم پر انعام کیا اور ہمیں اسلام کی طرف رہنمائی کی، اور محمد علیہ الصلوٰۃ والسلام کی امت میں بنایا انبیاء علیہم الصلوٰۃ والتسلیمات دنیا والوں کے لئے رحمت ہیں، کیونکہ حضرت حق سبحانہ وتعالیٰ نے ان حضرات کی بعثت کے ذریعہ ہم ناقص عقل والوں اور عاجز فہم رکھنے والوں کو اپنی ذات وصفات کی خبر دی ہے، اور ہماری کوتاہ فہم کے اندازہ سے اپنے ذاتی وصفاتی کمالات کی اطلاع بخشی ہے، اور اپنی پسندیدگی اور ناپسندیدگی کی چیزوں کو علیحدہ علیحدہ اور ہمارے دنیوی اور اخروی منافع اور مضرات کو ممتاز فرما دیا ہے، اگر ان حضرات کے وجود گرامی کا واسطہ درمیان میں نہ ہوتا تو انسانی عقلیں کارخانۂ عالم کے بنانے والے کے ثابت کرنے میں درماندہ ہوتیں، اور اس ذات اقدس کے کمالات کے پہچاننے میں عاجز و ناکام ثابت ہوتیں، قدیم فلاسفہ جو اپنے کو سب سے بڑا عقلمند اور حکیم سمجھتے تھے، عالم کے بنانے والے کے منکر تھے، اور اپنی عقل کی کوتاہی سے اشیاء کو زمانہ کی طرف منسوب کرتے تھے، زمین وآسمان کے پیدا کرنے والے کے بارے میں نمرود کا مباحثہ حضرت ابراہیم (علیٰ نبینا وعلیہ الصلوٰۃ والسلام) سے مشہور ہے، اور قرآن مجید میں بھی مذکور ہے، فرعون بدبخت کہتا تھا "مَا عَلِمْتُ لَكُمْ مِّنْ اِلٰهٍ غَيْرِيْ" (اے اہل مصر مجھے اپنے سوا تمہارے کسی حاکم ومعبود کا علم نہیں) نیز اس نے حضرت موسیٰ (علیٰ نبینا وعلیہ الصلوٰۃ والسلام) سے خطاب کر کے کہا "لَئِنِ اتَّخَذْتَ اِلٰهًا غَيْرِيْ لَاَجْعَلَنَّكَ مِنَ الْمَسْجُوْنِيْنَ" (اے موسیٰ اگر تم نے میرے سوا کوئی اپنا معبود وحاکم

ٹھہرایا تو میں تم کو بھی قیدی بنا دوں گا) ہامان سے اسی بدبخت نے کہا "یٰهَامٰنُ ابْنِ لِیْ صَرْحًا لَّعَلِّیْٓ اَبْلُغُ الْاَسْبَابَ ۔ اَسْبَابَ السَّمٰوٰتِ فَاَطَّلِعَ اِلٰٓی اِلٰهِ مُوْسٰی وَاِنِّیْ لَاَظُنُّهٗ كَاذِبًا" (اے ہامان میرے لئے ایک اونچا محل تیار کر تا کہ میں پہونچوں رستوں میں آسمانوں کے پھر جھانک دیکھوں موسیٰ کے معبود کو اور میں تو اس کو خیال کرتا ہوں جھوٹا) خلاصہ یہ ہے کہ عقل اس دولت عظمیٰ کے ثابت کرنے سے قاصر اور ان حضرات انبیاء کی ہدایت کے بغیر اس دولت سرا کا راستہ پانے سے عاجز ہے[1]"۔

معرفت الٰہی میں عقلائے یونان کی بے عقلیاں

خالق و مدبر کائنات کے وجود جس کو فلاسفۂ یونان مبدأ اول کے نام سے یاد کرتے ہیں، اور اس کے عمل خلق اور کائنات کے وجود میں آنے کے متعلق ان فلاسفہ نے جو عقلی موشگافیاں کی ہیں، اور تخیلات و مفروضات کا جو نقشہ تیار کیا ہے، اور پھر اس ہوائی بنیاد پر جو فلک بوس عمارتیں تعمیر کی ہیں، ان کی تشریح و تفصیل تو فلسفہ کی کتابوں میں اور ان پر تبصرہ و تنقید عقائد و علم کلام کی کتابوں میں دیکھی جا سکتی ہے، یہاں اس کی گنجائش نہیں۔

لیکن حضرت مجدد کے افکار و علوم عالیہ کے سمجھنے کے لئے اور یہ معلوم کرنے کے لئے کہ ان تخیلات و مفروضات کی تردید میں جو محض یونانی ذہن کی تخلیق اور قوت متخیلہ کی ایجاد ہے، ان کے قلم میں اتنا زور اور ان کے بیان میں اتنا جوش کیوں پیدا ہو جاتا ہے، عقل فعال کا جو فلاسفۂ یونان کے نزدیک درحقیقت عالم کی مدبر اور کائنات کے اندر موثر ہے "نسب نامہ" پیش کر دیا جاتا ہے، جو ان حکماء نے تجویز کیا ہے، اور جس پر انھوں نے سارے خلق و امر کی

---

[1] مکتوب ۲۳ بنام خواجہ ابراہیم قبادیانی۔

بنیاد رکھی ہے، اس کے ایک ایک لفظ پر موافق اور مخالف دلائل کا انبار ہے، لیکن یہاں صرف فہرست شجرہ پر اکتفا کی جاتی ہے:۔

"مبدأ اول (واجب الوجود) چونکہ تمام وجوہ سے واحد ہے، اور یہ مسلّم ہے کہ واحد سے صرف واحد کا صدور ہوسکتا ہے، اور عالم مختلف چیزوں سے مرکب ہے، اس لئے اس کا صدور اس سے نہیں ہوسکتا، اس کے وجود سے اس کے بلاارادہ واختیار اور علم، عقل اول کا اس طرح فیضان ہوا، جس طرح چراغ سے روشنی کا فیضان ہوتا ہے، اور انسان کے ساتھ سایہ ہوتا ہے، عقل اول ایک ایسا موجود ہے، جو اپنی ذات سے قائم ہے، نہ تو وہ جسم ہے، اور نہ کوئی جسم اس کا محل ہے، اس کو اپنے نفس کی معرفت ہے، اور اپنے مبدأ کی بھی، اس کا نام خواہ فرشتہ رکھا جائے، خواہ عقل اول، خواہ کچھ اور، اس کے وجود سے تین چیزیں لازم آتی ہیں، عقل ثانی اور فلک اعلیٰ (یا فلک الافلاک) (جو نواں آسمان ہے) کا نفس اور اس فلک کا جرم، پھر عقل ثانی سے عقل ثالث اور فلک کواکب کا نفس اور اس کا جرم وجود میں آیا، پھر اس عقل ثالث سے عقل رابع اور فلک زحل کا نفس اور اس کا جرم وجود میں آیا، پھر عقل رابع سے عقل خامس اور فلک مشتری کا نفس اور اس کا جرم وجود میں آیا، پھر عقل خامس سے عقل سادس اور فلک مریخ کا نفس اور اس کا جرم وجود میں آیا، پھر عقل سادس سے عقل سابع اور فلک شمس کا نفس اور اس کا جرم وجود میں آیا، پھر عقل سابع سے عقل ثامن اور فلک زہرہ کا نفس اور اس کا جرم وجود میں آیا، پھر عقل ثامن سے عقل تاسع اور فلک عطارد کا نفس اور اس کا جرم وجود میں آیا، پھر عقل تاسع سے عقل عاشر اور فلک قمر کا نفس اور اس کا جرم وجود میں آیا، یہی عقل اخیر ہے جس کا نام عقل فعّال ہے، اس سے فلک قمر کا حشو لازم آیا جو ایک مادہ ہے، جو عقل فعال اور طبائع افلاک کے اثر سے کون و فساد کو قبول کرتا ہے، پھر ان مواد میں کواکب کی حرکات کے سبب مختلف طرح کے امتزاج ہوتے ہیں، جن سے معادن، نباتات اور حیوانات پیدا ہوتے ہیں، یہ عقول عشرہ

اور افلاک تسعہ ہیں"۔

یہ دراصل یونانیوں کا وہ علم الاصنام ہے جس کا نام انھوں نے فلسفہ اور الٰہیات رکھ دیا' اور لوگوں نے اس پر سنجیدگی سے غور و فکر اور مباحثہ شروع کردیا یا محض فرضی داستان گوئی اور افسانہ آرائی ہے، جس پر بے اختیار قرآن کی یہ آیت یاد آتی ہے:۔

مَآ اَشْهَدْتُّهُمْ خَلْقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ	میں نے ان کو آسمان و زمین کی پیدائش پر اور
وَلَا خَلْقَ اَنْفُسِهِمْ ۖ وَمَا كُنْتُ مُتَّخِذَ	خود ان کی پیدائش پر گواہ نہیں بنایا اور میں
الْمُضِلِّيْنَ عَضُدًا ○	گمراہ کرنے والوں کو اپنا دست و بازو بنانے
(الکہف ۵۱)	والا نہیں ہوں۔

امام غزالیؒ نے (اس نقشہ کو نقل کرنے کے بعد) سچ لکھا ہے کہ" یہ محض دعاوی و تحکمات ہیں، بلکہ درحقیقت "ظلمات فوق ظلمات" تاریکیوں پر تاریکیاں ہیں، اگر کوئی شخص اپنا ایسا خواب ہی دیکھنا بیان کرے تو اس کے سوءِ مزاج کی دلیل ہوگی"۔[1]

دوسری جگہ لکھتے ہیں" مجھے حیرت ہے کہ دیوانہ آدمی بھی ان خودساختہ باتوں پر کیسے قانع ہوسکتا ہے چہ جائیکہ وہ عقلاء جو اپنے خیال میں معقولات میں بال کی کھال نکالتے ہوں"۔[2]

ان فلاسفہ نے اللہ سے تمام صفات کمال اور تمام مخلوقات کی خلق و صنعت کی نفی کی اور اس کو بالکل معطل و غیر مختار ثابت کیا اور یہ سب اپنے نزدیک ذات واجب الوجود کی تعظیم و تنزیہ کے لئے کیا، امام غزالیؒ اس موقع پر بے اختیار ہو کر لکھتے ہیں:۔

"جو اس پر قانع ہو کہ اللہ کے بارے میں اس کے قول کا حاصل یہ مرتبہ ہو تو اس نے اس کو ہر اس موجود سے بھی زیادہ حقیر قرار دیا جس کو اپنے نفس کا بھی شعور ہے اس لئے کہ جس کو دوسرکا

---

[1] تہافت الفلاسفہ ص۳۰ [2] ایضاً ص۳۳

اور اپنا شعور ہو گا وہ اس مرتبہ میں بلند ہو گا جس کو اپنے سوا کسی چیز کا شعور نہ ہو، تعظیم میں یہ موشگافی ان کو یہاں تک لے گئی کہ انھوں نے عظمت کے تمام معانی اور مفہومات کو باطل کر دیا اور اس کو ایسے مردہ کے درجہ کو پہونچا دیا جس کو کچھ خبر نہیں کہ دنیا میں کیا ہو رہا ہے، بس صرف اتنا فرق ہے کہ اس کو اپنا شعور ہے (مردہ کو یہ بھی نہیں ہوتا) اللہ اس طرح لوگوں کو سزا دیتا ہے، جو اس کے راستہ سے بھٹک جاتے ہیں، اور ہدایت کے راستہ سے کترا کر چلتے ہیں، اللہ تعالیٰ کے اس قول "مَا اَشْهَدْتُّهُمْ خَلْقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ" (میں نے ان کو آسمان و زمین کی پیدائش پر گواہ نہیں کیا) کے منکر ہیں، جو اللہ کے ساتھ برا گمان رکھتے ہیں، جن کا اعتقاد ہے کہ امور ربوبیت کی حقیقت و گہرائی کو انسانی طاقتیں پورے طور پر پا سکتی ہیں، جو اپنی عقلوں پر نازاں ہیں جن کا خیال ہے کہ عقل کے ہوتے ہوئے انبیاء اور ان کے متبعین کی تقلید کی ضرورت نہیں، اس کا لامحالہ نتیجہ یہی ہونا تھا کہ ان کو اعتراف کرنا پڑتا ہے کہ ان کے "معقولات" کا لب لباب وہ نکلا کہ اگر خواب کے طور پر بھی بیان کیا جائے تو تعجب ہو۔[1]

ان سب چیزوں کو دیکھ کر نعمت رسالت کی قدر آتی ہے کہ "مَا كُنَّا لِنَهْتَدِيَ لَوْلَا اَنْ هَدٰنَا اللّٰهُ لَقَدْ جَآءَتْ رُسُلُ رَبِّنَا بِالْحَقِّ" یہ عقل کی بے بسی اور عقلاء و حکماء (جن کی حکمت و عقل علوم ریاضیہ اور علوم عملیہ میں کامیاب ہوئی) کی ان مسائل الٰہیہ میں ناکامی کا پُرعبرت نمونہ ہے کہ انھوں نے اللہ کی طرف کس طرح ان چیزوں کی نسبت کی جن کی نسبت وہ اپنی طرف اور حقیر ترین مخلوقات کی طرف پسند نہیں کرتے اور اس کو کس طرح معطل، بے اختیار اور لاعلم قرار دیا، اور اس کو اس کی تعظیم کا عین تقاضا سمجھا، "سُبْحَانَ رَبِّكَ رَبِّ الْعِزَّةِ عَمَّا يَصِفُوْنَ وَسَلَامٌ عَلَى الْمُرْسَلِيْنَ وَالْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ"

---

[1] تہافت الفلاسفہ ص۳۱

اب حضرت مجدد کے مندرجہ ذیل ارشادات پر نظر ڈالئے جو ان کے مختلف مکاتیب سے اقتباس کئے گئے ہیں فرماتے ہیں:۔

"عقل اگر معرفت الٰہی کے مسئلہ میں کافی ہوتی تو فلاسفۂ یونان جنھوں نے عقل کو اپنا مقتدی بنایا ہے گمراہی کے بیابان میں نہ بھٹکتے، اور حق تعالےٰ کو اور دوسروں کے مقابلہ میں زیادہ پہچانتے، حالانکہ اللہ تعالےٰ کی ذات و صفات کے معاملہ میں جاہل ترین شخص یہی لوگ ہیں کہ انھوں نے حق سبحانہ کو بیکار و معطل سمجھ لیا اور سوائے ایک چیز (عقل فعال) کے اس کو کسی چیز کا فاعل اور خالق نہیں مانتے اور وہ بھی (ان کے خیال کے مطابق) اس سے اضطراراً نہ کہ اختیاراً وجود میں آئی ہے، انھوں نے اپنی طرف سے عقل فعال تراشی ہے، حوادث کو زمین و آسمان کے خالق سے ہٹا کر اس کی طرف منسوب کرتے ہیں، اور اثر کو موثر حقیقی سے روک کر اپنی تراشیدہ چیز (عقل فعال) کا اثر مانتے ہیں، اس لئے کہ ان کے نزدیک معلول علت قریبہ کا نتیجہ ہوتا ہے، علت بعیدہ کے لئے معلول کے حصول میں وہ کوئی دخل و اثر نہیں مانتے، اور اپنی نادانی سے ان اشیاء کی اللہ کی طرف نسبت نہ ہونے کو اللہ کی صفت کمال جانتے ہیں، اور اس کو بیکار و معطل ماننے کو اس کی تعظیم سمجھتے ہیں حالانکہ اللہ تعالےٰ اپنے کو خود زمین و آسمان کا خالق کہتا ہے، اور "رَبُّ الْمَشْرِقِ وَرَبُّ الْمَغْرِبِ" کے ساتھ اپنی تعریف بیان کرتا ہے۔

ان بے عقلوں کو اپنے خیال کے مطابق اللہ تعالےٰ کی کچھ احتیاج نہیں، اور نہ اس کے سامنے کچھ عجز و نیاز ہے، مجبوری اور ضرورت کے وقت چاہئے کہ یہ اپنی "عقل فعال" کی طرف رجوع کریں، اور اپنی ضرورتوں کی تکمیل اسی سے چاہیں، اس لئے کہ اصل قدرت اور اصل اختیار ان کے نزدیک اسی کا ہے، بلکہ "عقل فعال" بھی ان کے خیال کے مطابق اپنا عمل کرنے میں مجبور اور غیر مختار ہے، اس لئے اس سے بھی اپنی ضرورت کی تکمیل چاہنا غیر معقول بات ہے،

اصل یہ ہے جیسا کہ قرآن مجید میں ہے "اَنَّ الْكٰفِرِيْنَ لَا مَوْلٰى لَهُمْ" (ان کافروں کا کوئی سرپرست اور کارساز نہیں) ان کا بھی کوئی حامی و ناصر نہیں، خدا بھی نہیں اور عقل فعال بھی نہیں، عقل آخر کیا چیز ہے، جو چیزوں کا انتظام کرتی ہے، اور حوادث کے ظہور و خلق کی اس کی طرف نسبت کی جاتی ہے محض اس کے ثابت ہونے اور اس کی ہستی میں ہزاروں اعتراض و کلام ہیں، کیونکہ اس کا ثبوت و وجود محض فلسفہ کے گڑھے ہوئے مقدمات پر مبنی ہے، جو اسلام کے قواعد صحیحہ کی رُو سے نامکمل اور ناقص ہیں، کوئی احمق ہی ہوگا جو اشیاء کو قادر و مختار جل شانہٗ سے ہٹا کر اسے محض ایک فرضی اور موہوم چیز کی طرف منسوب کرے گا، بلکہ خود ان چیزوں کو اس بات سے ہزار ہزار ننگ و عار ہے کہ وہ اپنے خلق میں فلسفہ کی ایک تراشی ہوئی بے حقیقت چیز کی طرف منسوب ہوں، بلکہ یہ چیزیں اپنے نابود ہونے پر راضی و مسرور ہوں گی، اور ان کو موجود ہونے کی کوئی خواہش نہ ہوگی، اس بات کے مقابلہ میں کہ ان کے وجود کی نسبت ایک بے حقیقت فرضی شیئ کی طرف ہو اور وہ قادر و مختار کی قدرت کی طرف منسوب ہونے کی سعادت سے محروم ہو جائیں (قرآن مجید میں ہے) "كَبُرَتْ كَلِمَةً تَخْرُجُ مِنْ اَفْوَاهِهِمْ اِنْ يَّقُوْلُوْنَ اِلَّا كَذِبًا" (بڑی بات ہے جو ان کے منہ سے نکل رہی ہے، یہ محض جھوٹ کہتے ہیں) دارالحرب کے کافر اپنی بت پرستیوں کے باوجود اس جماعت (فلاسفہ) سے بہتر ہیں کہ حضرت حق سبحانہ و تعالیٰ سے مشکل کے وقت التجا کرتے ہیں، اور بتوں کو اس کے حضور میں شفاعت کے لئے وسیلہ بناتے ہیں۔

اس سے زیادہ عجیب بات یہ ہے کہ ایک گروہ ان احمقوں (حکمائے یونان) کو حکماء کے لقب سے یاد کرتا ہے، اور حکمت کی طرف ان کو منسوب کرتا ہے، ان (فلاسفہ) کے اکثر مسائل خصوصاً الٰہیات میں (جو مقصد اعلیٰ ہے) غلط ہیں، اور کتاب و سنت کے مخالف،

حکماء کا ان کو لقب دینا جن کا سرمایہ جہل مرکب ہے، آخر کس لحاظ سے ہے؟ ہاں البتہ طنز و مذاق کے طور پر ہو سکتا ہے یا اس طرح جس طرح نابینا کو بینا کہا جائے[1]۔"

عقل حقائق دینی کے ادراک میں ناکافی ہے

"اس اللہ کا شکر ہے جس نے ہم کو اس کی طرف ہدایت کی اور ہم کو ہدایت نہیں ہو سکتی تھی اگر اللہ خود ہماری ہدایت نہ کرتا، بیشک ہمارے پروردگار کے پیغمبر حق کے ساتھ آئے، انبیاء علیہم الصلوٰت والتسلیمات کے بھیجنے کے احسان کا شکر کس زبان سے بجا لایا جائے، اور کس دل سے اس... محسن کا اعتقاد کیا جائے اور وہ اعضاء و جوارح کہاں ہیں کہ اعمال حسنہ کے ذریعہ اس نعمت عظمیٰ کی مکافات کی جائے، اگر ان حضرات کا وجود مبارک نہ ہوتا تو ہم کوتاہ فہم انسانوں کو زمین و آسمان بنانے والے کے وجود اور اس کی یکتائی کی طرف کون رہنمائی کرتا، متقدمین فلاسفۂ یونان باوجود اپنی ذہانتوں کے زمین و آسمان کے بنانے والے (جل شانہ) کے وجود کی طرف راستہ نہ پا سکے، اور کائنات کے وجود کو انھوں نے "دہر" (زمانہ) سے منسوب کیا اور جب روز بروز انبیاء علیہم الصلوات والتسلیمات کی دعوت روشن ہوتی چلی گئی، متاخرین فلاسفہ نے ان انوار کی برکت سے قدماء کے مذہب کی تردید کی اور صانع جل شانہ کے وجود کے قائل ہو گئے اور اس کی توحید کا بھی اقرار کیا، پس ہماری عقلیں انوار نبوت کی امداد کے بغیر اس کام سے بے بس اور ہمارا فہم انبیاء علیہم الصلوات والتسلیمات کے وجود کے توسط کے بغیر اس معاملہ سے دور ہے[2]۔"

---

[1] مکتوب ۲۳/۳ بنام خواجہ ابراہیم قبادیانی۔

[2] مکتوب ۲۵۹/۱ بنام مخدوم زادہ خواجہ محمد سعید۔

نبوت کا طور عقل و فکر کے طور سے ماوراء ہے

"نبوت کا طریق عقل و فکر کے طور سے ماوراء ہے جن امور کے ادراک میں عقل قاصر ہے، ان کا ثبوت نبوت کے طریق سے ہوتا ہے، اگر عقل کافی ہوتی تو انبیاء کس لئے مبعوث ہوتے "صلوات اللہ تعالیٰ وتسلیماتہ علیہم اجمعین" اور آخرت کے عذاب کو کیوں ان کی بعثت کے ساتھ وابستہ کیا جاتا اللہ تعالیٰ فرماتا ہے، "وَمَا كُنَّا مُعَذِّبِيْنَ حَتّٰى نَبْعَثَ رَسُوْلًا" (ہم اس وقت تک عذاب کرنے والے نہیں ہیں، جب تک کسی پیغمبر کو نہ بھیجیں) عقل اگرچہ حجت ہے، لیکن حجت بالغہ نہیں ہے، اور اپنے حجت ہونے میں کامل نہیں ہے، حجت بالغہ انبیاء علیہم الصلوات والتسلیمات کی بعثت سے ثابت ہوئی ہے، اور اس نے مکلفین کی زبان عذر بند کر دی ہے، اللہ تعالیٰ فرماتا ہے "رُسُلًا مُّبَشِّرِيْنَ وَمُنْذِرِيْنَ لِئَلَّا يَكُوْنَ لِلنَّاسِ عَلَى اللّٰهِ حُجَّةٌۢ بَعْدَ الرُّسُلِ وَكَانَ اللّٰهُ عَزِيْزًا حَكِيْمًا" (پیغمبر جو بشارت دینے والے ہیں اور ڈرانے والے ہیں، تاکہ لوگوں کے لئے اللہ کے اوپر کوئی حجت باقی نہ رہے، انبیاء کی بعثت کے بعد اور اللہ غالب اور حکمت والا ہے) جب بعض مسائل میں عقل کے ادراک کا عجز اور کوتاہی ثابت ہو گئی، پس تمام احکام شرعیہ کو عقل کی ترازو میں تولنا مستحسن نہیں، ہمیشہ ان مسائل و احکام کو عقل سے مطابق کرنے کی کوشش اور اس کی پابندی عقل کے کافی ہونے کا فیصلہ کرنا ہے، اور نبوت کے طریق کا انکار، اللہ ہم کو اس سے پناہ میں رکھے۔"[1]

---

[1] مکتوب ۳۶ بنام میر محمد نعمان۔

عقل کا خالص و بے آمیز ہونا ممکن نہیں اور وہ حقائق الٰہیہ کی دریافت کے لئے (خواہ اس کو اشراق اور صفائی نفس کی مدد حاصل ہو) مفید نہیں

حیرت انگیز بات یہ ہے (جس کی تائید الٰہی اور اعلیٰ درجہ کی سلامت فکر کے سوا کوئی توجیہ ممکن نہیں) کہ اس دسویں صدی ہجری (سولہویں صدی عیسوی) میں جب ساری دنیا پر اور خاص طور پر ایران اور ہندوستان پر فلسفہ و حکمت کی اس تعلیم کے اثر سے جس کا انحصار فلسفۂ یونانی پر تھا اور جس نے افلاطون و ارسطو کو مقام تقدس اور درجۂ عصمت تک پہونچا دیا تھا، دماغوں پر عقلیت کا ایسا سکہ بیٹھا ہوا تھا کہ مقدمات عقلیہ سے منطقی طریقہ پر کسی نتیجہ کو ثابت کر دینے پر اور فلاسفۂ یونان نے جن چیزوں کو بدیہی اور قطعی بتایا ہے، ان کا نام لے لینے کے بعد زبانیں گنگ اور نگاہیں خیرہ ہو جاتی تھیں، بلکہ پرستاران حکمت و عقلیت ان مزعومہ "حقائق" کے سامنے سجدہ ریز ہو جاتے تھے۔

مجدد صاحب نے (ہمارے علم میں کم سے کم علماء اسلام میں) پہلی مرتبہ یہ آواز بلند کی کہ عقل کا خالص و بے آمیز ہونا جسم عنصری کے تعلق اور ماحول میں پھیلے ہوئے اوہام و تخیلات، عقائد و مسلمات نیز باطنی رجحانات اور راسخ اخلاق اور خواہشات سے آزاد ہونا تقریباً محال ہے، یہاں تک کہ اگر اس کو اشراق و صفائی نفس کی رفاقت و مدد بھی حاصل ہو تب بھی اس کا باطنی و خارجی اثرات تعلیم و تربیت اور معاشرہ یا ماحول میں جن چیزوں نے مسلمات کا درجہ حاصل کر لیا ہے، ان کے اثر سے آزاد ہو کر حقیقت نفس الامری تک پہونچنا اور بے لاگ فیصلہ صادر کرنا "استاذ کالمعدوم" کا حکم رکھتا ہے اور جس کا کچھ اعتبار نہیں، مجدد صاحب کی یہ تحقیق اور اپنے مکتوبات میں بار بار اس پر

زور دینا یہ اس عہد اور ان کے ماحول کے لحاظ ہی سے نہیں، بلکہ علمی و فکری دنیا میں ایک دریافت اور ایک ایسا انقلابی اور جرأت مندانہ اعلان ہے جس کی قدر و قیمت اور اہمیت کا اندازہ صحیح طور پر ابھی تک نہیں کیا گیا، حالانکہ وہ اس کا مستحق تھا کہ اس کو بحث و تحقیق اور شرح و تفصیل کا موضوع بنایا جاتا۔

عجیب توارد اور حیرت انگیز بات ہے کہ مجدد صاحب سے تقریباً دو سو سال بعد جرمنی کے مشہور فلسفی امینول کانٹ (IMMANUEL KANT. 1724-1804) نے عقل کے خالص اور مجرد ہونے اور اس کے ماحول، ورثہ اور عادات و معتقدات سے آزاد ہو کر بے لاگ فیصلہ کرنے کی صلاحیت پر علمی اور تحقیقی بحث کا آغاز کیا، اس نے عقل کے حدود کی جرأت و وضاحت کے ساتھ تعیین کی اور ۱۷۸۱ء میں اپنی معرکۃ الآراء کتاب "تنقید عقل محض" (CRITIQUE OF PURE REASON) شائع کی[1]، جس نے دنیائے فکر و فلسفہ میں ہلچل ڈال دی اور ڈاکٹر سر محمد اقبال کے الفاظ میں "روشن خیالوں کے کارناموں کو خاک کا ڈھیر کر دیا"[2] مغرب میں اس کے اس کارنامہ کی عظمت کا شاندار طریقہ پر اعتراف کیا گیا، اور کہنے والوں نے یہاں تک کہا کہ وہ جرمن قوم کے لئے خدا کا سب سے بڑا عطیہ تھا، تاریخ فلسفہ جدید کا مصنف ڈاکٹر ہیرلڈ ہوفڈنگ اس کی کتاب پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتا ہے کہ "یہ کتاب فلسفہ کا ایک غیر فانی کمال پارہ ہے جس نے فکر انسانی کی ہر زہ گردیوں میں انگشت رہنما کا کام کیا"[3]

---

[1] اس کتاب کا ترجمہ جو اصلاً جرمن زبان میں تھی، "تنقید عقل محض" کے نام سے ہندوستان کے مشہور اہل قلم اور کامیاب مترجم ڈاکٹر سید عابد حسین صاحب نے کیا، اور "انجمن ترقی اردو ہند" دہلی نے ۱۹۴۱ء میں شائع کیا۔

[2] THE RECONSTRUCTION OF RELIGIOUS THOUGHT IN ISLAM. P.5

[3] تاریخ فلسفہ جدید ترجمہ ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم جلد دوم ص ۳۸

کانٹ کے نزدیک فکر اپنا عمل ادعائی طور پر شروع کرتا ہے، اسے غیر ارادی طور پر اور اکثر سادہ لوحی سے اپنے قویٰ اور اپنے مفروضات و مقدمات کی صحت پر اعتماد ہوتا ہے، اسے یقین ہوتا ہے کہ میں تمام مسائل کو حل کرسکتا ہوں اور کائنات کی کنہ تک میری رسائی ہوسکتی ہے...... اس کے بعد ایک زمانہ آتا ہے جس میں یہ معلوم ہوجاتا ہے کہ یہ تعمیرات فکر افلاک تک نہیں پہونچ سکتیں اور ہندسوں میں ان کے نقشوں کے متعلق اتفاق رائے نہیں ہوسکتا یہ تشکیک کا زمانہ ہے، اس نے دیکھا کہ ابھی ایک ایسا کام باقی ہے جسے ادعائیین اور تشکگین دونوں نے نظر انداز کردیا تھا، وہ یہ کہ ہم اپنی عقل اور اپنے علم کی ماہیت کے متعلق تحقیق کریں اور دریافت کریں کہ ہمارے اندر فہم اشیاء کے لئے کس قسم کے صور و قوی پائے جاتے ہیں، اور ان کی مدد سے ہم کہاں تک جاسکتے ہیں[1]۔

اب اس کے بعد ایک مسلمان عالم و مفکر کا (جو ہندوستان کے محدود علمی و مدرسی ماحول میں رہا اور جس نے حکمت و فلسفہ کے بجائے علوم نبوت اور معرفت و رضائے الٰہی کے حصول کو اپنا مقصد زندگی قرار دیا، عقل خالص کی تنقید میں فلسفہ کے پیچ و خم سے دور رہتے ہوئے عام فہم و دل نشین بیان پڑھئے۔ مجدد صاحب اس سوال کا جواب دیتے ہوئے کہ "عقل اپنی ذات سے اگرچہ احکام الٰہی میں ناقص و ناتمام ہے، مگر یہ کیوں نہیں ہوسکتا کہ صفائی نفس اور تزکیہ کے بعد عقل کو ایک مناسبت اور ذات الٰہی سے ایک بے کیف اتصال پیدا ہوجائے جس کے ذریعہ سے وہ وہاں سے احکام اخذ کرے اور بعثت کی ضرورت جو فرشتہ کے واسطہ سے ہوتی ہے نہ پڑے"۔

---

[1] ایضاً ص ۳۰-۳۱

تحریر فرماتے ہیں:-

"(جواب) عقل خواہ وہ مناسبت و اتصال پیدا کرے مگر جو تعلق وہ جسم عنصری سے رکھتی ہے، وہ کلیتہً زائل نہیں ہوتا، اور مکمل آزادی و بے آمیزی وہ نہیں پیدا کر سکتی، واہمہ ہمیشہ اس کا دامنگیر رہتا ہے، اور متخیلہ اس کے خیال کو کبھی نہیں چھوڑتا، غصہ اور خواہش کی قوتیں سایہ کی طرح اس کے ساتھ رہتی ہیں، اور حرص و ہوس کی صفاتِ مذموم کا چولی دامن کا ساتھ ہے، بھول چوک جو انسان کے لوازم میں سے ہے اس سے علیحدہ نہیں ہوتے، خطا اور غلطی جو اس زندگی کے خواص میں سے ہیں، اس سے جدا نہیں ہوتے، پس عقل اعتماد کے لائق نہیں، اور اس کے اخذ کئے ہوئے احکام وہم و تصرف اور خیال کے اثر و اقتدار سے آزاد نہیں، اور بھول چوک کی آمیزش اور غلطی کے شبہ سے محفوظ نہیں، بخلاف فرشتہ کے جو ان صفات سے پاک ہے، اور ان نقائص سے بری، پس لامحالہ وہ اعتبار کے لائق ہے، اور اس کے اخذ کئے ہوئے احکام وہم و خیال کی آمیزش اور نسیان و غلطی کے شبہ سے محفوظ ہیں، بعض اوقات محسوس ہوتا ہے کہ وہ علوم جن کو اس نے روحانی اخذ و تحصیل کے ذریعہ حاصل کیا ہے، قوی اور حواس تک ان کو پہونچانے میں بعض ایسے مقدمات جو اس کے نزدیک مُسلّم ہیں (لیکن غیر واقعی ہیں، اور وہم و خیال یا کسی اور طریقہ سے حاصل ہوئے ہیں) بے اختیار ان علوم کے ساتھ اس طرح شامل ہو جاتے ہیں کہ اس وقت بالکل اس کی تمیز نہیں ہونے پاتی، دوسرے وقت کبھی اس کا امتیاز عطا ہوتا ہے، اور کبھی نہیں ہوتا، پس لامحالہ ان علوم میں ان مقدمات کی شمولیت کی وجہ سے غیر واقعیت اور عدم صداقت کی شکل پیدا ہو جاتی ہے، اور وہ اعتبار کے لائق نہیں رہتے۔"[1]

---

[1] مکتوب ۲۶۶/۱ بنام خواجہ عبداللہ و خواجہ عبیداللہ۔

اہل اشراق و صفائی نفس

حصول یقین علم صحیح، تہذیب اخلاق و تزکیۂ نفس اور اس کے ذریعہ انسانی معاشرہ کی تنظیم اور صالح تمدن کی تعمیر کا ایک بے خطا اور معصوم ذریعہ قدیم زمانہ سے اشراقیت و روحانیت کو سمجھا گیا، زمانۂ قدیم میں مصر و ہندوستان اس کا بہت بڑا مرکز تھے، اس تحریک کے فروغ اور اس کی سحر دلعزیزی میں وہ ردِّ عمل بھی کام کر رہا تھا، جو ایک طرف غالیانہ عقل پرستی دوسری طرف مجنونانہ حواس پرستی کے خلاف یونان و روم میں پیدا ہو گیا تھا، اور بالآخر اس نے اسکندریہ (مصر) کو جو مشرقی و مغربی عقلیت و مذاہب کا سنگم تھا اپنا مرکز بنایا۔

اس فلسفہ اور تحریک کے داعیوں اور پیروؤں کا کہنا یہ ہے کہ حصول یقین و علم صحیح کا سب سے بڑا ذریعہ مشاہدہ ہے، اور وہ نور باطن صفائی نفس اور باطنی حاسہ کو بیدار کرنے سے حاصل ہوتا ہے، حقائق کا حصول اسی خالص و بے آمیز عقل (حکمت اشراق) اور اسی اندرونی روشنی (نور باطن) سے ممکن ہے، جو ریاضت، مخالفتِ نفس اور مراقبہ سے پیدا ہوتی ہے۔

اگر یہ قول تسلیم کر لیا جائے تو اس کا ماحصل یہ ہے کہ انسان کے اندر حواس خمسہ کے علاوہ ایک چھٹا حاسہ (باطنی) عمل کرنے لگتا ہے، اور اس کے عمل کے نتائج (مشاہدات) غیر مرئی انوار غیر مسموع اصوات اور پہلے سے غیر معلوم حقائق ظاہر ہونے لگتے ہیں، لیکن اس کی کیا ضمانت ہے کہ یہ حاسہ انسان کے دوسرے حواس کی طرح محدود اور غلطی و غلط فہمی میں مبتلا ہونے والا نہیں؟ اگر ایسا ہوتا تو اس کے نتائج میں تعارض و تضاد کا وجود اور شک و احتمال نہ پایا جاتا، لیکن اشراقیت کی تاریخ بتاتی ہے کہ اس حاسۂ باطنی کے محسوسات اور وہ جن نتائج و عقائد

تک پہونچا تا ہے، ان میں اسی طرح سے تعارض و اختلاف پایا جاتا ہے، جیسا کہ فلاسفۂ یونان اور مشرق کے حکماء و عقلیین میں پایا جاتا ہے، اشراقیت قدیم کو چھوڑ کر (جس کی تاریخ محفوظ نہیں) اشراقیت جدیدہ (NEO - PLATONISM) کو لے لیجئے اس کے پیشواؤں کے مذہبی عقائد پر مرتب ہونے والے اعمال میں کھلا تضاد پایا جاتا ہے، پلاٹینس (PLOTINUS) اپنے زمانہ کے مذہبی نظام اور مروجہ عبادات کا قائل نہیں، اور آزاد مشرب فلسفی ہے، جو عمل کے بجائے تفکر اور مراقبہ پر زور دیتا ہے، لیکن اس کا شاگرد رشید پارفری (PORPHYRY) ایک زاہد خشک صوفی ہے، PLOTINUS انسانی روح کے جانوروں کے جیون میں ظاہر ہونے کا قائل ہے، لیکن PORPHYRY اس کا منکر ہے، اس مسلک کا تیسرا نامور پیشوا پراکلس (PROCLUS) پورے مصری رسوم، دینی و مذہبی تقریبات کا پابند تھا، اور دن میں تین دفعہ سورج کی پرستش کرتا تھا، اس کا مذہب مختلف مذاہب و اعتقادات کا معجون مرکب تھا، اور یہ سب اہل مشاہدہ اور یقین تھے۔[1]

PORPHYRY نے مسیحیت کی مخالفت کی اور رومی بت پرستی اور جاہلیت (PAGANISM) کے احیاء کی تحریک میں شہنشاہ روم کی تائید کی، اور اس کو نور باطن نے شرک و بت پرستی کے اس ڈوبتے ہوئے جہاز کے ساتھ اپنی قسمت وابستہ کر دینے سے روکا نہیں۔

مسلمانوں میں بھی جن کو اشراق اور قوت کشفیہ پر پورا اعتماد تھا، ان کے باطنی محسوسات و مکشوفات میں بھی بکثرت تعارض ملتا ہے، ایک صاحبِ کشف دوسرے صاحبِ کشف سے اختلاف کرتا ہے، اس کے کشف کو امر واقعی کے خلاف بتاتا ہے، اور کبھی اس کو سُکر اور غلبۂ حال پر محمول کرتا ہے، عقول (جن کا ذہن اور کتب فلسفہ کے علاوہ) کہیں وجود خارجی نہیں، ان سے یہ اہل کشف مصافحہ کرتے ہیں، اور ان سے اپنی ملاقات ثابت کرتے ہیں، وغیرہ وغیرہ، تصوف

---

[1] تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو مذہب و اخلاق کا انسائیکلوپیڈیا عنوان (NEO - PLATONISM)

کی تاریخ اس کی مثالوں سے بھری ہوئی ہے۔

شیخ الاشراق شہاب الدین سہروردی مقتول

ان مسلمان اہل اشراق میں چھٹی صدی ہجری (بارہویں صدی عیسوی) کا اشراقی حکیم شیخ الاشراق شہاب الدین سہروردی (۵۴۹ - ۵۸۷ھ) معروف بالمقتول، خاص شہرت رکھتا ہے، جو اپنے مخالف اسلام اور انتشار انگیز عقائد و خیالات کی بنا پر الملک الظاہر کے حکم سے ۵۸۷ھ کو قتل کیا گیا، وہ اپنے کو مشائی و صوفی کہتا تھا، اس کے یہاں مشائی تصورات کے ساتھ بقول (S. V. DEN BERGH) "وہ سارا متصوفانہ فلسفہ موجود ہے جو مسلمانوں نے یونانی نظریۂ تطبیق معتقدات اور اتحاد مذاہب سے اخذ کیا" انسائیکلوپیڈیا آف اسلام کے مذکورہ بالا مقالہ نگار کے بقول "دراصل یہ نوافلاطونی نظریۂ نور ہے، جس کو اشیاء کی بنیادی حقیقت تصور کیا جاتا ہے"۔[1]

شہرزوری لکھتے ہیں" وہ دونوں فلسفے یعنی فلسفۂ ذوقیہ (اشراقیہ) اور فلسفۂ بحثیہ (فلسفہ مشائیہ) کا جامع تھا" اس کی اہم کتاب "حکمت الاشراق" ہے، جس کی شرح علامہ قطب الدین شیرازی نے کی اور وہ "شرح حکمت الاشراق" کے نام سے علمی و درسی حلقوں میں مشہور ہے۔

شیخ الاشراق کے نزدیک عقول کی تعداد دس میں محدود نہیں بلکہ ہر نوع کے لئے ایک عقل ہے، جو اس کی حفاظت کرتی ہے، شیخ الاشراق ان کو انوار مجردہ کہتا ہے، شیخ الاشراق کے نزدیک آسمان ایک زندہ مخلوق ہے، اس میں نفس مجردہ پایا جاتا ہے، جو اس کو حرکت دیتا ہے، وہ عدم و فساد سے محفوظ ہے، آسمان میں نفس ناطقہ پایا جاتا ہے، اس لئے اس میں حواس بھی پائے جاتے ہیں، اس کے نزدیک کل آسمان ایک زندہ مخلوق ہیں، اور انوار عالیہ یعنی عالم مجردات کا

[1] دائرۂ معارف اسلامیہ۔

اثرات پرستاروں کے ذریعہ سے پڑتا ہے اور انہی کے ذریعہ سے قوائے جسمانیہ حرکت میں آتے ہیں سب سے بڑا ستارہ سورج ہے، اشراقیین کے مذہب میں اس کی تعظیم واجب ہے، عالم کائنات میں بالذات و بالواسطہ نور ہی نور کی حکومت ہے، حرکت و حرارت نور سے پیدا ہوتی ہے، اور آگ میں یہ دونوں اوصاف اور عناصر سب سے زیادہ پائے جاتے ہیں، جس طرح نفس عالم ارواح کو روشن کرتا ہے، اسی طرح آگ عالم اجسام کو روشن کرتی ہے، خدا نے ہر عالم میں اپنا ایک خلیفہ مقرر کیا ہے، عالم عقول میں عقل اول، عالم افلاک میں ستارے اور ان کے نفس ناطقہ، عالم عناصر میں نفوس بشریہ اور ستاروں کی شعاعیں اور آگ بالخصوص (رات کی تاریکی میں) اس کے خلیفہ ہیں، یعنی اس کی اصلاح و تدبیر کرتی ہے، خلافت کبریٰ انبیاء کے نفوس کاملہ کو حاصل ہوتی ہے، خلافت صغریٰ آگ سے تعلق رکھتی ہے، کیونکہ تاریک راتوں میں وہ انوار علویہ اور ستاروں کی شعاعوں کی قائم مقامی کرتی ہے، غذا اور خام چیزوں کو پختہ کرتی ہے، شیخ الاشراق کے نزدیک عالم قدیم ہے، زمانہ ازلی وابدی ہے، وہ تناسخ کا قائل نہیں لیکن اس کا انکار بھی نہیں کرتا (کیونکہ اس مسئلہ میں فریقین کے دلائل تسلی بخش نہیں ہیں[1])

اس طرح اپنے وقت کا ممتاز اشراقی حکیم جس نے مشرق میں شیخ الاشراق کا لقب پایا، اور جس کی ذہانت، تبحر علمی اور زہد و تجرد اس کے معاصرین کو بھی تسلیم ہے، اس کو اس کی اشراقیت وصفائے نفس، یونانی مفروضات اور ایرانی و مجوسی مزخرفات کے اختیار کرنے سے باز نہیں رکھ سکی، وہ بعثت محمدی اور اس پر مرتب ہونے والی ہدایت، فلاح دینی و دنیوی اور معرفت صحیحہ سے محروم رہا، اس نے ایک غیر متوازن، انتشار و اضطراب سے بھری ہوئی ناکام زندگی گزاری اور وہ اپنے پیچھے ہدایت اور نفع خلائق کا کوئی نظام چھوڑے بغیر دنیا سے رخصت ہوا۔

---

[1] تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو "حکمائے اسلام" ج ۲ از مولانا عبدالسلام ندوی مرحوم۔

عقل وکشف دونوں ایک کشتی کے سوار ہیں

کانٹ (KANT) نے عقل خالص کے وجود میں بہت شبہ ظاہر کیا ہے، اور ثابت کیا کہ اس کا بے آمیز اور اندرونی و بیرونی اثرات سے آزاد ہونا تقریباً ناممکن ہے، لیکن وہ کشف و علم باطنی کی دنیا سے ناآشنا تھا، اس لئے وہ اس سے آگے کچھ نہ کہہ سکا، مجدد صاحبؒ جو اس دریا کے بھی غواص تھے، ایک قدم آگے بڑھ کر کشف خالص اور الہام خالص کے مشکل اور نادر الوجود ہونے پر مفصل روشنی ڈالی ہے، اور ثابت کیا ہے کہ اشراق اور صفائی نفس کے ذریعہ بھی ان غیبی حقائق اور لاریبی علوم تک رسائی ممکن نہیں جو انبیاء علیہم السلام اور ان کی بعثت کے راستہ سے عوام و خواص کو حاصل ہوتے ہیں، اس طرح بعثت کے بغیر نہ وصول الی المعرفت ہوتا ہے، نہ حصولِ نجات، نہ حقیقی تزکیہ اس سلسلہ میں ان کے چند مکتوبات کے اقتباسات پڑھیے!

"ان نادانوں (حکماء) کے ایک گروہ نے انبیاء علیہم الصلوات والتسلیمات کے راستہ کی پابندی کے بغیر صوفیہ الٰہیّہ (جو ہر زمانہ میں انبیاء کے پیرو اور متبع رہے ہیں) کی تقلید میں ریاضت اور مجاہدہ کا راستہ اختیار کیا ہے، اور اپنے وقت کی صفائی پر فریب کھایا، اور اپنے خواب وخیال پر اعتماد کیا، اور اپنے خیالی کشف وکشوف کو اپنا مقتدیٰ بنایا، "ضلّوا فاضلّوا" (خود گمراہ ہوئے اور دوسروں کو گمراہ کیا) یہ نہیں جانتے کہ یہ صفائی نفس کی صفائی ہے جو گمراہی کی طرف راستہ دکھاتی ہے، نہ کہ صفائی قلب جو کہ ہدایت کا دریچہ ہے، اس لئے کہ قلب کی صفائی انبیاء علیہم الصلوٰات والتسلیمات کی پیروی سے وابستہ ہے، اور نفس کا تزکیہ (اصلاح وتصفیہ) قلب کی صفائی کے ساتھ مربوط ہے، "اس شرط کے ساتھ کہ وہ نفس کی اصلاح وتربیت کرے" قلب جو ذاتِ باری تعالیٰ کے انوار کا مظہر ہے، اس کی ظلمت کے ساتھ نفس جو صفائی پیدا کرے گا اس کا حکم اس چراغ کا سا ہے جس کو اس لئے روشن کیا گیا ہو تاکہ

پوشیدہ دشمن یعنی ابلیس لعین (اس کی روشنی میں) گھر کو تاراج و برباد کر دے۔

حاصل کلام یہ ہے کہ مجاہدہ اور ریاضت کا طریقۂ نظر و استدلال کے رنگ میں اس وقت اعتبار و اعتماد پیدا کرے گا، جب وہ انبیاء علیہم الصلوات والتسلیمات کی تصدیقات کے ساتھ ہو جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے تبلیغ فرماتے ہیں، اور اس کی مدد ان کی امداد کرتی ہے، ان حضرات کا نظام ایسے ملائکہ کے نزول کی وجہ سے (جو غلطی اور گناہ سے محفوظ ہیں) دشمن لعین کے مکر سے محفوظ ہے، اللہ تعالیٰ ان کے متعلق فرماتا ہے کہ "إِنَّ عِبَادِي لَيْسَ لَكَ عَلَيْهِمْ سُلْطَانٌ" (بے شک میرے خاص بندے تیرا (اے ابلیس) ان پر کوئی زور نہیں) اور یہ بات دوسروں کو میسر نہیں اور اس لعین کے نامبارک حال سے ان کی رہائی متصور نہیں، سوائے اس کے جو ان حضرات کی پیروی کرے، اور ان کے نقش قدم پر چلے۔

شیخ سعدی علیہ الرحمۃ نے سچ کہا ہے ؎

محالست سعدی کہ راہ صفا
تواں رفت جز بر پئے مصطفیٰ

"سعدی سلامتی کے راستہ پر محمد مصطفیٰ صلے اللہ علیہ وسلم کی پیروی کے بغیر چلنا محال ہے" اللہ کا درود و سلام ہو، ان پر اور ان کی آل اور ان کے تمام برادران انبیاء پر۔[۱]

کشف میں آمیزش

"یہ سمجھ لینا چاہیئے کہ کشف کی غلطی ہمیشہ القاء شیطانی ہی کی بنا پر نہیں ہوتی، اکثر ایسا ہوتا ہے کہ بعض غیر واقعی اور صداقت سے عاری احکام متخیلہ میں جاگزیں ہو جاتے ہیں، وہاں شیطان کا کوئی دخل نہیں ہوتا لیکن (یہ خیالات) خارج میں متمثل ہو کر آتے ہیں، اسی سلسلہ کی

[۱] مکتوب ۲۳ بنام خواجہ ابراہیم قبادیانی

یہ چیز ہے کہ بعض لوگوں کو خواب میں آں حضرت صلے اللہ علیہ وسلم کی زیارت ہوتی ہے' اور وہ آپ سے بعض ایسے احکام اخذ کرتے ہیں' (جو شریعت کے ثابت شدہ مسائل اور احادیث صحیحہ کے خلاف ہوتے ہیں) اس صورت میں القاء شیطانی متصور نہیں ہے' علماء کی تحقیق یہ ہے کہ شیطان آپ کی صورت میں متمثل نہیں ہوتا تو اس صورت میں صرف متخیلہ کا تصور ہوتا ہے' جس نے خلاف واقع کو واقع سمجھ لیا ہے[۱]"

ایک دوسرے مکتوب میں فرماتے ہیں:۔

"نفس خواہ تزکیہ کے ذریعہ نفس مطمئنہ بن گیا ہو' لیکن وہ اپنی صفات سے پورے طور سے مجرد نہیں ہوتا اس لئے غلطی کو اس کے اندر بھی راہ پا جانے کا موقع ملتا ہے[۲]"

فلاسفہ اور انبیاء کی تعلیم کا تضاد

اتنا تحریر فرمانے کے بعد آپ فلاسفہ و انبیاء کی تعلیمات کے درمیان اس کھلے تضاد کی طرف اشارہ کرتے ہوئے جو صدیوں سے چلا آرہا ہے' اور جن میں تطبیق ممکن نہیں اور یہ کہ ان کی عقلی مساعی اور بلند پروازیاں "کوہ کندن و کاہ برآوردن" کے مرادف ہیں۔

ارشاد فرماتے ہیں:۔

"فلاسفہ کی عقل ناقص گویا نبوت سے بالکل ضد اور مقابل سرے پر واقع ہوئی ہے' ابتدائے عالم کے بارے میں بھی اور آخرت کے بارے میں بھی' ان کے مسائل و مباحث انبیاءؑ علیہم الصلوات والتسلیمات کی تعلیمات کے بالکل مخالف ہیں' انھوں نے نہ ایمان باللہ درست کیا نہ ایمان بالآخرت' عالم کے قدیم ہونے کے قائل ہیں' حالانکہ تمام اہل ادیان و

---

[۱] مکتوب ۱۰۷ بنام محمد صادق کشمیریؒ۔ [۲] مکتوب ۱۲۱ بنام شیخ درویش۔

اہل ملل کا اجماع ہے کہ عالم حادث ہے اپنے تمام اجزاء کے ساتھ، اسی طرح آسمانوں کے پھٹ جانے، تاروں کے جھڑ جانے، پہاڑوں کے ریزہ ریزہ ہونے، سمندروں کے بہ پڑنے کے قائل نہیں جس کا بروز قیامت وعدہ ہے، اسی طرح اجسام کے دوبارہ زندہ ہونے کے منکر ہیں، اور قرآن کی تصریحات کا انکار کرتے ہیں، ان کے متأخرین جو اپنے کو اہل اسلام کے گروہ میں شامل کرتے ہیں، اسی طرح اپنے فلسفی اصول پر جمے ہوئے ہیں، اور افلاک و کواکب اور اسی طرح دوسری چیزوں کے قدیم ہونے کے قائل ہیں، اور ان کے فنا و ہلاک نہ ہونے کے مدعی، ان کی خوراک قرآنی تصریحات کی تکذیب، اور ان کا رزق دین کے اصولی مسائل کا انکار ہے، عجب طرح کے مومن ہیں کہ خدا اور رسول پر ایمان لاتے ہیں، لیکن خدا اور رسول نے جو کچھ فرمایا ہے اس کو قبول نہیں کرتے، اس سے بڑھ کر حماقت نہیں ہو سکتی، کسی شاعر نے خوب کہا ہے کہ ؎

فلسفہ چوں اکثرش باشد سفہ پس کُلّ آں
ہم سفہ باشد کہ حکم کل حکم اکثر است

فلسفہ چوں کہ اس کے لفظ کا بڑا حصہ "سفہ" (حماقت ہے) اس لئے وہ کل حماقت ہی ہے کیونکہ اصول یہ ہے کہ اکثر کُل کا حکم رکھتا ہے۔

اس جماعت نے اپنی عمر ایسے آلہ (منطق) سیکھنے سکھانے میں صرف کی جو فکری غلطی سے محفوظ رکھنے والا ہے، اور اس بارے میں انھوں نے بڑی زحمتیں اٹھائیں، مگر جب ذات و صفات و افعال باری تعالےٰ کی بحث کو پہونچے جو مقصد اعلیٰ ہے تو انھوں نے ہاتھ پاؤں چھوڑ دیئے، اور اس آلہ کو جو غلطی سے محفوظ رکھنے والا ہے، ہاتھ سے دیکر ٹھوکریں کھانے لگے، اور گمراہی کے دشت و بیابان میں بھٹکنے لگے، جیسے کہ ایک شخص برسوں جنگ کے سامان و آلات کو

تیار کرتا رہتا ہے' اور عین جنگ کے وقت ہاتھ پاؤں چھوڑ دیتا ہے' اور اس سے کچھ بنتا نہیں۔

لوگ علوم فلسفہ کو بہت باقاعدہ اور منظم سمجھتے ہیں' اور غلطی و خطا سے محفوظ جانتے ہیں' اگر اس کو تسلیم بھی کر لیا جائے تو یہ حکم ان علوم کے بارے میں ہوگا جن میں عقل تنہا کافی ہو سکتی ہے' جو یہاں مبحث سے خارج ہے' اور مالایعنی (غیر مفید مطلب) کے حکم میں ہے' اور آخرت سے جو دائمی ہے، کچھ واسطہ نہیں رکھتے اور نجات اخروی ان سے وابستہ نہیں گفتگو ان علوم کے بارے میں ہے' کہ عقل ان کے ادراک میں عاجز و قاصر ہے' اور وہ طریقۂ نبوت سے مربوط ہیں' اور نجات اخروی ان سے وابستہ ہے" پھر آگے تحریر فرماتے ہیں:۔

"علم منطق جو ایک ایسا علم ہے جو (بعد کے علوم عالیہ کے لئے) ایک آلہ کے طور پر ہے' اور اس کے متعلق لوگوں نے کہا ہے کہ وہ خطا سے حفاظت کرنے والا ہے' ان کو کام نہیں آتا' اور مقصد اعلیٰ میں ان کو خطا اور غلطی سے اس نے باہر نہیں نکالا، وہ ان کے کام نہ آیا تو دوسروں کے وہ کیا کام آئے گا، اور غلطی سے کسی طرح نکالے گا؟

(اللہ تعالےٰ سے اسی کے الفاظ میں دعا ہے) "رَبَّنَا لَا تُزِغْ قُلُوْبَنَا بَعْدَ اِذْ هَدَيْتَنَا وَهَبْ لَنَا مِنْ لَّدُنْكَ رَحْمَةً اِنَّكَ اَنْتَ الْوَهَّابُ" (اے ہمارے پروردگار ہمارے دلوں کو کج نہ کر اس کے بعد کہ تو نے ہمیں ہدایت دی' اور ہمیں اپنے پاس سے رحمت بخش بے شک تو بڑا بخشنے والا ہے۔)

بعض آدمی جو علوم فلسفہ میں کچھ "دخل در معقولات" رکھتے ہیں' اور فلسفیانہ ملمع سازی کے فریب میں ہیں' اس جماعت کو حکماء جان کر انبیاء علیہم الصلوات والتسلیمات کا ہمسر اور مقابل سمجھتے ہیں' بلکہ قریب ہے کہ ان کے جھوٹے علوم کو سچا جان کر انبیاء علیہم الصلوات والتسلیمات کی شریعتوں پر مقدم رکھیں، اللہ ہم کو برے اعتقاد سے بچائے، تو ہاں حسن وقت

ان کو حکماء جانتے ہیں؛ اور ان کے علم کو حکمت کہتے ہیں، خواہ مخواہ اس بلا میں گرفتار ہوتے ہیں، اس لئے کہ حکمت نام ہے کسی شیئ کے اس علم کا جو حقیقت واقعی کے مطابق ہو، پس جو علوم (مثلاً انبیاء کی شریعتیں) ان علوم حکمت کے مخالف ہوں گے، وہ ان حکماء کے خیال میں حقیقت واقعی کے خلاف ہوں گے۔

خلاصہ یہ ہے کہ ان کی تصدیق اور ان کے علوم کی تصدیق انبیاء کی تکذیب اور انبیاءؑ علیہم الصلوات والتسلیمات کے علوم کی تکذیب ہے، اس لئے کہ یہ دونوں (حکماء اور انبیاء کے) علوم ایک دوسرے سے بالکل مقابل سرے پر واقع ہوئے ہیں، ایک کی تصدیق دوسرے کی تکذیب کو مستلزم ہے، جو چاہے انبیاء کے دین کا پابند ہو جائے اور اللہ تعالیٰ کی جماعت میں سے ہو اور اہل نجات میں سے ہو اور جس کا جی چاہے فلسفی ہو جائے، اور شیطان کے گروہ میں سے ہو اور نامراد و ناکامیاب ہو، اللہ تعالیٰ فرماتا ہے "فَمَنْ شَآءَ فَلْيُؤْمِنْ وَّمَنْ شَآءَ فَلْيَكْفُرْ إِنَّآ أَعْتَدْنَا لِلظّٰلِمِيْنَ نَارًا أَحَاطَ بِهِمْ سُرَادِقُهَا وَإِنْ يَّسْتَغِيْثُوْا يُغَاثُوْا بِمَآءٍ كَالْمُهْلِ يَشْوِى الْوُجُوْهَ بِئْسَ الشَّرَابُ وَسَآءَتْ مُرْتَفَقًا" (جس کا جی چاہے ایمان لائے اور جس کا جی چاہے کافر ہو جائے بیشک ہم نے ظالموں کے لئے ایسی آگ تیار کی ہے جس کی قناتوں نے ان کو گھیر لیا ہے، اور اگر وہ پیاس سے فریاد کریں گے تو ان کی دادرسی ایسے پانی سے کی جائے گی جو پگھلے سیسے کی طرح ہو گا جو منہ کو جلا دے گا اور وہ بری چیز ہو گی) اور سلامتی ہو اس پر جس نے ہدایت کی پیروی کی اور محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے اتباع کی پابندی کی، ان پر اور ان کے برادران انبیاء کرام و ملائکہ عظام پر کمل ترین اور اعلیٰ ترین درود و سلام ہو۔[1]

---

[1] مکتوب ۲۳ بنام خواجہ ابراہیم قبادیانی۔

بعثت کے بغیر حقیقی تزکیہ ممکن نہیں

"ہم یہ کہتے ہیں کہ تصفیہ وتزکیہ ان نیک اعمال سے وابستہ ہیں، جو مولیٰ جل شانہ کو پسندیدہ اور اس کے یہاں مقبول ہوں اور یہ بات جیسا کہ اوپر بیان کیا گیا بعثت پر موقوف ہے پس بعثت کے بغیر صفائی اور تزکیہ کی حقیقت نصیب نہیں ہوتی۔"[1]

انبیاء کی بعثت کی ضرورت اور عقل کا ناکافی ہونا

مجدد صاحب بعثت انبیاء و رسل کی ضرورت، ہدایت کے لئے اس کے ناگزیر ہونے اور تنہا عقل کے (خواہ وہ کتنی بلند پایہ ہو) ناکافی ہونے پر روشنی ڈالتے ہوئے ایک دوسرے مکتوب میں تحریر فرماتے ہیں:-

"انبیاء علیہم الصلوات والتسلیمات کی بعثت دنیا والوں کے لئے رحمت ہے اگر ان حضرات کے وجود کا ذریعہ نہ ہوتا تو ہم گمراہوں کو اللہ تعالیٰ (جو واجب الوجود ہے) کی ذات وصفات کی پہچان کی طرف کون رہنمائی کرتا، اور اس کی پسندیدگی و ناپسندیدگی کے کاموں میں کون امتیاز پیدا کرتا؟

ہماری ناقص عقلیں ان حضرات انبیاء کی دعوت کی روشنی کی مدد کے بغیر اس مطلب سے عاجز اور ہماری ناتمام سمجھ ان حضرات کی تقلید کے بغیر اس معاملہ میں بے بس اور درماندہ ہے۔

ہاں عقل ضرور حجت ہے لیکن حجت ہونے میں نامکمل اور تاثیر و تکمیل کے درجہ کو

---

[1] مکتوب ۲۶۶/۱ بنام خواجہ عبداللہ و خواجہ عبیداللہ۔

نہیں پہونچتی حجت بالغہ صرف انبیاء علیہم الصلوات والتسلیمات کی بعثت ہے جس سے دائمی عذاب و ثواب اخروی وابستہ ہے[۱]۔"

بعثت اللہ کی ذات و صفات و احکام کی معرفت کا واحد ذریعہ ہے

"بعثت رحمت ہے اس لئے کہ وہ اللہ تعالےٰ کی ذات وصفات کی پہچان حاصل کرنے کا سبب ہے، جو تمام دینوی و اخروی سعادتوں پر مشتمل ہے بعثت کی اسی دولت سے اس بات کا علم و امتیاز ہوتا ہے کہ جناب باری تعالےٰ کے مناسب شان کیا ہے، اور نامناسب کیا ہے، اس لئے کہ ہماری بے بصیرت اور عاجز عقل جو امکان اور حدوث کے داغ اور نقص سے داغدار ہے، اس کو کیا معلوم کہ حضرت باری جو قدیم ہے کون سے اسماء صفات اور افعال اس کی شان کو مناسب ہیں، جن کا اطلاق کیا جائے اور کون سے نامناسب جن سے احتراز کیا جائے، بلکہ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ اپنے نقص کی وجہ سے ہماری عقل کمال کو نقص اور نقص کو کمال جانتی ہے، یہ امتیاز (جو نبوت پیدا کرتی ہے) خاکسار کے نزدیک تمام ظاہری و باطنی نعمتوں سے بڑھ کر ہے، بڑا بدبخت ہے جو نامناسب امور اور ناشائستہ اشیاء کی اس ذاتِ عالی سے نسبت کرے، بعثت ہی ہے، جس نے باطل کو حق سے جدا کیا اور اس میں جو عبادت کا مستحق نہیں ہے، اور جو عبادت کا مستحق ہے، امتیاز پیدا کر دیا ہے، بعثت ہی کے ذریعہ یہ حضرات انبیاء اللہ تعالےٰ کے راستہ کی طرف دعوت دیتے ہیں، اور بندگان خدا کو قرب الٰہی اور وصال مولیٰ کی سعادت سے مشرف کرتے ہیں، اور اسی بعثت کے ذریعہ مالک جلّ وعلا کے مرضیات کا علم حاصل ہوتا ہے، جیسے کہ اوپر بیان ہوا اور اس کی تمیز ہوتی ہے کہ اس کے

---

[۱] مکتوب ۲۶۶/۱ بنام خواجہ عبداللہ و خواجہ عبیداللہ۔

ملک میں کس چیز میں تصرف جائز ہے اور کس میں جائز نہیں، بعثت کے اس طرح کے فوائد بہت ہیں پس ثابت ہوا کہ انبیاء کی بعثت رحمت ہے، جو شخص نفس امارہ کی خواہشات کا پیرو ہو کر شیطان لعین کے حکم سے بعثت کا انکار کرے، اور بعثت کے احکام و مقتضا پر عمل نہ کرے تو اس میں بعثت کا کیا گناہ ہے اور بعثت کیوں رحمت نہ ہو[1]؟

اللہ کی معرفت انبیاء ہی کے ذریعہ سے حاصل ہوتی ہے

"چونکہ انبیاء علیہم الصلوات والتسلیمات کے تواتر و تسلسل کی وجہ سے خدا کی طرف (جو زمین و آسمان کا خالق ہے جل شانہ) ان کی دعوت دینے کی شہرت ہوئی، اور ان حضرات کی بات اور پیغام بلند ہوا تو ہر زمانہ کے بے عقل جو صانع عالم کے ثبوت کے بارے میں تردد کرتے تھے، اپنی غلطی پر مطلع ہو کر بے اختیار صانع کے وجود کے قائل ہو گئے، اور اشیاء و مخلوقات کو اس کی طرف منسوب کیا، یہ روشنی حضرات انبیاء ہی کے انوار سے ماخوذ ہے، اور یہ دولت انبیاء ہی کے خوان نعمت سے ملی ہے، اللہ کا درود و سلام ہو ان پر قیامت بلکہ ابد الآباد تک۔

اسی طرح وہ تمام منقولات جو ہم تک انبیاء علیہم الصلوات والتسلیمات کے پہونچانے سے پہونچے ہیں، مثلاً ذات الٰہی کے صفات کمالیہ، انبیاء کی بعثت، ملائکہ کا معصوم ہونا، علیہم الصلوات والتسلیمات والبرکات، حشر و نشر، بہشت و دوزخ کا وجود اور جنت کی دائمی راحت و عیش اور جہنم کا دائمی عذاب، یہ اور اسی طرح کی دوسری چیزیں جن کی شریعت خبر دیتی ہے، عقل ان کو پالینے سے قاصر ہے، اور ان حضرات (انبیاء) سے سنے بغیر ان کے ثابت کرنے میں ناقص اور تنہا ناکافی ہے[2]۔"

---

[1] مکتوب ۲۶۶/۱ بنام خواجہ عبداللہ و خواجہ عبیداللہ۔ [2] ۲۳/۳ بنام خواجہ ابراہیم قبادیانی۔

صحیح ترتیب

"سب سے پہلے رسول پر ایمان لانے کی فکر کرنی چاہئے، اور اس کی رسالت کی تصدیق کرنی چاہئے تاکہ تمام احکام میں اس کو سچا جانا جائے اور اس کے ذریعہ سے شکوک وشبہات کی تاریکیوں سے نجات میسر ہو، جڑ کو پہلے معقول ومعلوم کرلینا چاہئے، تاکہ سب فروع اور شاخیں بے تکلف معقول ومعلوم ہوجائیں، ہر شاخ وہر فرع کو اصل کے ثابت کئے بغیر معقول بنانا بڑا مشکل ہے۔

اس تصدیق تک پہونچنے اور اطمینان قلب کے حاصل کرنے کا قریب ترین راستہ ذکر الٰہی ہے، اللہ تعالیٰ فرماتا ہے "اَلَا بِذِكْرِ اللّٰهِ تَطْمَئِنُّ الْقُلُوْبُ ۝ اَلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ طُوْبٰى لَهُمْ وَحُسْنُ مَاٰبٍ ۝" (یاد رکھو اللہ کے ذکر سے دلوں کو اطمینان ہوتا ہے جو لوگ ایمان لائے اور جنھوں نے نیک عمل کئے ان کے لئے خوشحالی ہے اور اچھا ٹھکانہ) غور و استدلال کے راستہ سے اس بلند مقصد تک پہونچنا دور ہے۔ بقول شاعر ؎

پائے استدلالیاں چوبیں بود
پائے چوبیں سخت بے تمکیں بود"

(اہل استدلال کا پاؤں لکڑی کا ہے اور لکڑی کا پاؤں بے قابو و بے ثبات ہوتا ہے)[1]

انبیاء کی رسالت کی تصدیق کرنے والا اصحاب استدلال میں سے ہے

"معلوم ہونا چاہئے کہ انبیاء کرام کی تقلید کرنے والا ان کی نبوت کے ثابت کرنے

---

[1] مکتوب ۳۶ بنام میر محمد نعمانؒ۔

کے بعد اور ان کی رسالت کی تصدیق کے بعد اس کا شمار صاحب استدلال لوگوں میں ہے، اس کا ان حضرات کی باتوں کو بے دلیل ماننا اس وقت (ان کی نبوت کو استدلال کے ساتھ مان لینے کے بعد) عین استدلال ہے، مثلاً ایک شخص نے اصول کو استدلال سے ثابت کر لیا ہے، اس وقت جتنے فروع اس اصل سے پیدا ہوتے ہیں، وہ اسی (پہلے) استدلال کے ساتھ متعلق ہوں گے، اور وہ شخص اس اصل کے استدلال کے ساتھ ان تمام فروع کے اثبات میں صاحب استدلال ہوگا "اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِیْ هَدَانَا لِهٰذَا وَمَا كُنَّا لِنَهْتَدِیَ لَوْلَآ اَنْ هَدَانَا اللّٰهُ لَقَدْ جَآءَتْ رُسُلُ رَبِّنَا بِالْحَقِّ وَالسَّلَامُ عَلٰی مَنِ اتَّبَعَ الْهُدٰی" (اس اللہ کا شکر ہے، جس نے ہم کو اس کی ہدایت دی اور ہم ہدایت پانے والے نہ تھے، اگر ہمیں ہدایت نہ دیتا بیشک ہمارے پروردگار کے پیغمبر حق کے ساتھ آئے اور سلام ہو اس پر جس نے ہدایت کی پیروی کی"[1]

انبیاء کی اطلاعات کو اپنی عقل کا پابند بنانا طریق نبوت کا انکار ہے

"حساب، میزان، صراط، حق ہے، اس لئے کہ سچے خبر دینے والے (علیہ وعلی آلہ الصلوات والتسلیمات) نے اس کی خبر دی ہے، طریق نبوت کے بعض ناواقفوں کا ان کے وجود کو مستبعد سمجھنا درجۂ اعتبار سے ساقط ہے، اس لئے کہ نبوت کا طریق عقل کے طریق سے ماوراء ہے، انبیاء کی دی ہوئی سچی اطلاعات کو عقل کے طریق بحث ونظر سے موافق کرنا درحقیقت نبوت کے طریق کا انکار کرنا ہے (ان مسائل ماوراء عقل میں) دار ومدار انبیاء کی باتوں کے بے دلیل ماننے پر ہے"[2]

---

[1] مکتوب ۳۶/۳ بنام میر محمد نعمان۔ [2] مکتوب ۲۶۶/۱

مخالف عقل اور ماوراء عقل میں بڑا فرق ہے

"یہ نہ سمجھیں کہ نبوت کا طریق کچھ عقل کے طریق کے مخالف ہے بلکہ بات یہ ہے کہ عقل کا طریق (علم واستدلال) انبیاء کی تقلید کے بغیر اس مقصد عالی تک پہونچ نہیں سکتا' مخالفت دوسری چیز ہے' اور نارسائی دوسری چیز، اس لئے کہ مخالفت پہونچنے کے بعد متصور ہو سکتی ہے"۔[1]

خدا کی تعظیم کا طریقہ معلوم کرنا نبوت پر منحصر اور انبیاء کی اطلاع و تعلیم پر موقوف ہے،

"پس انبیاء کے وجود سے چارہ نہیں' تاکہ محسن حقیقی جل سلطانہ (جس کی ہستی عقل سے لازماً ثابت وضروری ہے) کے شکر کے طرف رہنمائی کریں اور ان احسانات کے کرنے والے کی علمی وعملی تعظیم کو اس کی طرف سے معلوم کر کے ظاہر کریں، اس لئے کہ اس کی تعظیم جو اس کے یہاں سے معلوم نہ کی جائے' اس کے شکر کے شایان شان نہیں، اس لئے کہ انسانی قوت اس کے ادراک کرنے سے عاجز ہے، بلکہ بسا اوقات انسان غیر تعظیم کو وہ تعظیم سمجھنے لگتا ہے' اور شکر سے ہجو کی طرف چلا جاتا ہے، اور اس سے اس کی تعظیم کا معلوم کرنا نبوت پر منحصر ہے' اور انبیاء علیہم الصلوات والتسلیمات کی اطلاع و تعلیم پر موقوف ہے' اولیاء کو جو الہام ہوتا ہے، وہ بھی انوار نبوت سے ماخوذ ہے' اور انبیاء علیہم الصلوات والتسلیمات کے اتباع و پیروی کے فیوض و برکات میں سے ہے"۔[2]

---

[1] مکتوب بنام پیرزادگان خواجہ عبداللہ خواجہ عبیداللہ فرزندان گرامی حضرت خواجہ باقی باللہ ۲۶۶/۱

[2] مکتوب ۲۳/۳ بنام خواجہ ابراہیم قبادیانی۔

جس طرح عقل کا مرتبہ حواس سے ماوراء ہے اسی طرح نبوت کا مرتبہ عقل سے ماوراء ہے

"اور جس طرح سے کہ عقل کا مرتبہ حواس کے مرتبہ سے ماوراء ہے کہ جس چیز کا حواس سے ادراک نہیں کیا جا سکتا عقل اس کا ادراک کرتی ہے، اسی طرح سے نبوت کا طریقہ عقل کے طریقہ اور مرتبہ سے ماوراء ہے جس کا عقل سے ادراک نہیں کیا جا سکتا، وہ نبوت کے وسیلہ سے ادراک میں آتا ہے، جو شخص عقل کے طریقہ کے علاوہ حصول علم کے لئے کوئی اور طریقہ تسلیم نہیں کرتا، وہ فی الحقیقت طریقۂ نبوت کا منکر اور ہدایت کا مخالف ہے[1]۔"

مقامِ نبوت

یونان کے علوم حکمت و فلسفہ میں (جو صدیوں تک انبیاء کی دعوت اور نور نبوت سے دور دور برگ و بار لاتے رہے ہیں) شب و روز مشغول رہنے اور اسی کو علم و دانش کا سِدرۃُ المنتہیٰ سمجھنے، دوسری طرف کتاب و سنت کی رہنمائی اور ان سے ضروری واقفیت اور حدیث و سیرت سے شغف کے بغیر جسمانی ریاضتوں نفس کُشی اور چلّہ کشی میں ہمہ تن منہمک رہنے کی بنا پر پچھلی صدیوں میں (جن کا واضح طور پر آغاز آٹھویں صدی سے ہوجاتا ہے) مقامِ نبوت سے نہ صرف ایک ناآشنائی اور بے اُنسی بلکہ ایک طرح کی اجنبیت اور وحشت پیدا ہونے لگی تھی، اور چونکہ انبیاء علیہم السلام کے حالات اور خود سیرت نبوی ان حکماء اور اشراقیین کے سامنے اس طرح آتی تھی کہ یہ نفوس قدسیہ عام انسانوں کی طرح زندگی گزارتے تھے، شادی بیاہ کرتے تھے، آل و اولاد رکھتے تھے، بازاروں میں چلتے پھرتے تھے، بعض اوقات

---

[1] مکتوب ۲۳ بنام خواجہ ابراہیم قبادیانی۔

انھون نے تجارت بھی کی، جانور بھی چرائے، جنگوں میں حصہ لیا، واقعات سے متأثر ہوتے تھے، خوشی کی بات پر خوش ہوتے تھے، اور رنج و قلق کی بات پر محزون و مغموم ہوتے تھے، نہ ان کے یہاں ایسی عبادات شاقہ تھیں، نہ صوم دائمی، نہ چلہ کشی، جن کا ذکر متوسط درجہ کے اولیاء و مرتاضین کے یہاں ملتا ہے، پھر دعوت و تبلیغ رسالت کے کام میں ان کو خلق خدا کی طرف توجہ کرنی پڑتی تھی، جس کے بغیر یہ فریضہ ادا نہیں ہو سکتا، اور ایک توجہ دوسری توجہ سے عام طور سے مانع ہوتی ہے، اس لئے اشراق و روحانیت کے ان حلقوں میں جہاں علومِ دینیہ بالخصوص حدیث سے اشتغال نہیں تھا، اور جہاں اولیاء متقدمین اور اشراقیین کے عروج روحانی، تجرید و تفرید کامل اور فنائیت و غیبوبت کے واقعات دن رات وردِ زبان رہتے تھے، یہ خیال عام ہوتا جارہا تھا کہ ولایت کا مقام نبوت کے مقام سے افضل ہے، اور یہ کہ ولایت تمام تر توجہ الی الحق اور انقطاع عن الخلق کا نام ہے، اور نبوت کا موضوع دعوت ہے، جس کا تعلق خلائق سے ہے، ولی "رو بحق" ہوتا ہے، اور نبی "رو بخلق" اور "رو بحق" ہونے کی حالت بہر حال "رو بخلق" ہونے کی حالت سے اعلیٰ و افضل ہے، بعض لوگوں نے اس میں اتنی احتیاط برتی کہ انھوں نے یہ کہا کہ ولایت مطلقاً نبوت سے افضل نہیں، جنھوں نے ایسا کہا ہے، ان کا مطلب یہ ہے کہ نبی کی ولایت اس کی نبوت سے افضل ہے، اور نبی جب مشغول بالخالق ہوتا ہے تو اس کی یہ حالت اس حالت سے افضل ہوتی ہے، جب وہ دعوت کے سلسلہ میں مشغول بالخلق ہوتا ہے، لیکن یہ طرز فکر اس پر ضرور دلالت کرتا ہے کہ مقام ولایت کی عظمت اور اس کے کمالات و ترقیات سے مرعوبیت مسلمانوں کے بھی ایک وسیع دینی حلقہ میں پیدا ہوتی جارہی تھی، جو امت کے اپنے اصل سرچشمہ، نبوت و شریعت کے ساتھ ربط پر اثر انداز ہو رہی تھی، اور یہ ایک خطرہ تھا، جس کا مقابلہ مجدد دین اسلام اور

نائبین انبیاء کو کرنا ضرور تھا۔

ہمارے علم میں اس سلسلہ میں سب سے پہلے پُرزور مدلل اور وجد انگیز طریقہ پر آٹھویں صدی ہجری کے وسط میں ہندوستان کے مشہور عارف و محقق صوفی حضرت شیخ شرف الدین یحییٰ منیری (۶۶۱-۷۸۶ھ) نے آواز بلند کی اور اپنے مکتوبات میں اس کی پُرزور تردید کی،[1] انھوں نے یہاں تک لکھا کہ انبیاء کی ایک سانس اولیاء کی پوری زندگی سے افضل ہے، انبیاء کا جسم خاکی اپنی صفائی و پاکیزگی اور قربِ خداوندی میں اولیاء کرام کے دل اور ان کے سر اور راز و نیاز کے برابر ہے۔[2]

حضرت مخدوم بہاری کے بعد پھر حضرت مجدد الف ثانی ہی اس علم عظیم اور اس طریق قویم کے مجدد اور خاتم ہوئے، انھوں نے اپنے مکاتیب میں ثابت کیا کہ انبیاء کرام اعتقادی، روحانی، ذہنی اور خلقی طور پر اللہ تعالیٰ کی صنعت اور صفتِ جود کا بہترین نمونہ ہوتے ہیں، ان کو ایسا تعلق مع اللہ حاصل ہوتا ہے، جس میں کوئی توجہ اور مصروفیت حاجب نہیں ہوتی، اور یہ اس شرح صدر کا نتیجہ ہے جس سے اللہ تعالیٰ ان کو خاص کرتا ہے، ان کی عالی ظرفی، قوت تحمل، وسعت صدر اور ان کے پیغام اور کام کا (جو ان کے سپرد کیا جاتا ہے) تقاضا "صحو دائم" ہر وقت کی بیداری، حاضر دماغی اور ہوش ہے، جو اہلِ ولایت و اہل سُکر کو حاصل نہیں، ان کی جہاں سے ابتدا ہوتی ہے، وہ اولیاء کی انتہا ہے، نبوت کی پیروی میں قرب بالفرائض حاصل ہوتا ہے، جس کو قرب بالنوافل کبھی نہیں پہونچ سکتا، کمالاتِ ولایت کمالات نبوت کے مقابلہ میں وہی نسبت رکھتے ہیں جو قطرہ کو سمندر کے ساتھ ہے، اب قارئین مجدد صاحب کی زبانِ قلم سے ان حقائق اور علوم عالیہ کو سنیں: !

[1] تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو "تاریخ دعوت و عزیمت" حصہ سوم باب دہم ص ۲۹۸-۳۰۲ [2] ایضاً ص ۳۰۲

انبیاء بہترین موجودات ہیں، اور بہترین دولت ان کے سپرد کی گئی ہے

"انبیاء تمام موجودات میں بہترین ہیں، اور بہترین دولت ان کے حوالہ کی گئی ہے، ولایت جزءِ نبوت ہے، نبوت کُل ہے، لامحالہ نبوت ولایت سے افضل ہو گئی، خواہ نبی کی ولایت ہو خواہ ولی کی، پس صحو بھی سُکر سے افضل ہے، اس لئے کہ صحو میں سُکر مندرج ہے، جیسے کہ ولایت نبوت میں مندرج ہے، باقی تنہا ہوش و بیداری جو عوام الناس کو رہتی ہے خارج از بحث ہے، اس عامیانہ صحو پر ترجیح دینا کوئی معنیٰ نہیں رکھتا، وہ صحو جو سُکر پر مشتمل ہے، وہ ضرور سُکر سے افضل ہے، علوم شریعت جن کا ماخذ و سرچشمہ مرتبہ نبوت ہے، سراسر صحو ہے، ان علوم کے مخالف جو کچھ ہوگا وہ سُکر ہے، صاحب سُکر معذور ہے، تقلید کے لائق علوم صحو ہیں نہ کہ علوم سُکر۔"[1]

انشراحِ صدر کی وجہ سے انبیاء کی توجہِ خلق توجہِ حق سے مانع نہیں ہوتی

"بعض مشائخ نے سُکر و مستی کے وقت فرمایا ہے کہ ولایت نبوت سے افضل ہے، اور بعض دوسرے صاحبوں نے فرمایا کہ اس ولایت سے نبی کی ولایت مراد ہے، تاکہ ولی کی نبی پر افضلیت کا وہم دور ہو جائے، لیکن فی الحقیقت معاملہ اس کے برعکس ہے، اس لئے کہ نبی کی نبوت اس کی ولایت سے افضل ہے، ولایت میں سینہ کی تنگی کی وجہ سے خلق کی طرف پوری توجہ نہیں ہو سکتی، اور نبوت میں سینہ کی انتہائی فراخی اور کشائش کی وجہ سے نہ توجہِ حق توجہِ خلق سے مانع ہوتی ہے، اور نہ توجہِ خلق توجہِ حق میں حائل ہوتی ہے، نبوت میں تنہا خلق کی

---

[1] مکتوب ۹۵/۱ سید احمد بجواڑہ۔

طرف توجہ نہیں ہوتی کہ ولایت کو (جس کا رخ اور توجہ حق کی طرف ہوتی ہے) ترجیح دی جائے عیاذاً باللہ سبحانہٗ، تمامتر توجہ خلق عوام کالانعام کا مرتبہ ہے، نبوت کی شان اس سے بلند و برتر ہے، اس حقیقت کا سمجھنا ارباب سُکر کے لئے دشوار ہے، یہ معرفت صاحب استقامت اہلِ ہوش کا حصہ ہے۔ ع

هنيئاً لأرباب النعيم نعيمها[1]

نبی کا باطن حق کے ساتھ ہوتا ہے اور ظاہر خلق کے ساتھ

"بعض اہل سُکر علم ولایت کو جو سُکر کی طرف رخ رکھتا ہے، علم نبوت پر جو صحو کا رنگ رکھتا ہے، ترجیح دیتے ہیں، اسی عالم سکر کا یہ مقولہ بھی ہے کہ "الولاية افضل من النبوة" (ولایت نبوت سے افضل ہے) اس بنا پر کہ ولایت میں توجہ حق تعالےٰ کی طرف ہوتی ہے، اور نبوت میں خلق کی طرف، اور اس میں شبہ نہیں کہ "رو بحق" "رو بخلق" سے افضل ہے، اور بعض اس کی توجیہ میں کہتے ہیں کہ نبی کی ولایت اس کی نبوت سے افضل ہے۔

خاکسار کے نزدیک اس طرح کی باتیں دوراز کار ہیں، اس لئے کہ نبوت میں خلق ہی کی طرف توجہ نہیں ہوتی، بلکہ اس توجہ کے ساتھ حق کی طرف بھی رخ ہوتا ہے، صاحب مقامِ نبوت کا باطن حق کے ساتھ ہوتا ہے، اور ظاہر خلق کے ساتھ، جو تمام تر خلق کی طرف متوجہ ہو وہ مدبّروں اور برگشتہ لوگوں میں سے ہے۔[2]"

"اولیاء کی ابتداء انبیاء کی انتہا ہے" کے مقولہ کی تردید

"کسی کا یہ مقولہ بالکل بے معنیٰ بات ہے کہ اولیاء کی ابتداء انبیاء کی انتہا ہے، اور

---

[1] مکتوب ۱۰۱ میاں سید احمد بجواڑی [2] مکتوب ۹۵ سید احمد بجواڑہ

اولیاء کی ابتداء اور انبیاء کی انتہا سے مراد ان کے نزدیک شریعت ہے، ہاں اس عزیب کو چونکہ حقیقت حال سے آگاہی نہیں اس لئے یہ خلاف ظاہر بات زبان سے نکالی، ان حقائق کو اگرچہ کسی نے بیان نہیں کیا، بلکہ اکثر لوگوں نے اس کے بالکل برعکس اظہار خیال کیا ہے، اور یہ بعید از فہم باتیں معلوم ہوتی ہیں، لیکن وہ منصف جو انبیاء علیہم الصلوات والتسلیمات کی بزرگی کا پہلو دیکھتا ہے اور شریعت کی عظمت اس پر مستولی ہے وہ ان دقیق اسرار کو قبول کر سکتا ہے، اور اس کو قبول کرنے کو زیادتیٔ ایمان کا وسیلہ بنا سکتا ہے۔[۱]"

انبیاء نے دعوت کو عالم خلق پر منحصر کیا ہے اور صرف قلب سے بحث کی ہے

"اے فرزند سنو! کہ انبیاء علیہم الصلوات والتسلیمات نے دعوت کو عالم خلق پر منحصر رکھا ہے، حدیث شریف میں ہے کہ اسلام کی بنیاد پانچ چیزوں (شہادت توحید، نماز، روزہ، زکوٰۃ حج) پر ہے، اور چونکہ قلب کو عالم خلق سے زیادہ مناسبت ہے، اس لئے قلب کی تصدیق کی بھی دعوت دی، اور قلب کے ماوراء کو نہیں چھیڑا اور اس سے بحث نہیں کی، اور اس کو مقاصد میں شمار نہیں کیا، دیکھو بہشت کے عیش، دوزخ کی تکلیفیں، دولت دیدار اور محرومی کی بے دولتی یہ سب عالم خلق سے وابستہ ہیں، عالم امر کو ان سے تعلق نہیں۔[۲]"

نبوت کی پیروی میں قرب بالفرائض حاصل ہوتا ہے

"اسی طرح فرض، واجب اور سنت کے اعمال کی ادائیگی کا تعلق قالب سے ہے، جو عالم خلق سے ہے، جو عالم امر کا حصہ ہے وہ اعمال نافلہ میں سے ہے، جو قرب ان اعمال کی

۱؎ مکتوب ۲۶۰ بمخدوم زادہ میاں شیخ محمد صادق ۲؎ ایضاً

ادائیگی کا ثمرہ ہے، وہ اعمال کے مطابق ہوتا ہے، پس لامحالہ جو قرب اداءِ فرائض کا ثمرہ ہے، وہ عالم خلق کا حصہ ہے، اور جو قرب ادائے نوافل کا ثمرہ ہے وہ عالم امر کا حصہ ہے، اور اس میں شک نہیں کہ نفل کا فرض کے مقابلہ میں کوئی شمار و حساب نہیں، اس کو وہ نسبت بھی تو نہیں جو قطرہ کو سمندر سے ہوتی ہے، بلکہ نفل کو سنت کے مقابلہ میں بھی یہی نسبت ہے اگرچہ سنت و فرض کے درمیان بھی قطرہ و دریا کی نسبت ہے، اس بات سے دونوں قرب کا باہمی تفاوت میں قیاس کیا جا سکتا ہے، اور عالم خلق کی فضیلت و خصوصیت عالم امر پر اس فرق سے سمجھی جا سکتی ہے۔"[۱]

کمالات ولایت کمالات نبوت کے مقابلہ میں کوئی حیثیت نہیں رکھتے

"اس فقیر پر اللہ تعالیٰ نے واضح کر دیا ہے کہ کمالات ولایت کا کمالات نبوت کے مقابلہ میں کوئی شمار نہیں، وہ نسبت بھی تو نہیں جو قطرہ کو سمندر سے ہوتی ہے پس جو فضیلت و خصوصیت نبوت کی راہ سے حاصل ہوتی ہے، وہ اس فضیلت سے کئی گنا زیادہ ہوتی ہے، جو ولایت کی راہ سے حاصل ہوتی ہے، پس افضلیت مطلق انبیاء ہی کو حاصل ہے (علیہم الصلوات والتسلیمات) ملائکہ کرام کو جزئی فضیلت حاصل ہے، اس لئے جمہور علماء ہی کا قول درست ہے، اس تحقیق سے ظاہر ہوا کہ کوئی ولی نبی کے درجہ کو نہیں پہونچ سکتا (علیہم الصلوات والتسلیمات) بلکہ اس ولی کا سر اس نبی کے قدم کے نیچے ہوگا۔"[۲]

علماء کے علوم و تحقیقات کی صحت و فوقیت کی وجہ

"جس مسئلہ میں علماء اور صوفیاء کے درمیان اختلاف ہے، اگر تم غور سے دیکھو گے تو

---

[۱] مکتوب ۲۶۰/۱ بمخدوم زادہ میاں شیخ محمد صادق [۲] مکتوب ۲۶۶/۱ بنام خواجہ عبداللہ و عبیداللہ۔

حق علماء کی جانب نظر آئے گا، اس کا راز یہ ہے کہ انبیاء کی پیروی کی وجہ سے علماء کی نظر کمالاتِ نبوت اور ان کے علوم تک نفوذ کر جاتی ہے، اور صوفیہ کی نظر کمالاتِ ولایت اور ان کے علوم و معارف پر مقصور رہتی ہے، پس لامحالہ جو علم مشکوٰۃ نبوت سے ماخوذ ہوگا، وہ زیادہ صحیح اور حق ہوگا بمقابلہ اس کے جو مرتبۂ ولایت سے ماخوذ ہوگا۔"[1]

"فقیر نے اپنی کتابوں اور خطوط میں لکھا ہے، اور تحقیق کی ہے کہ کمالاتِ نبوت سمندر کا حکم رکھتے ہیں، اور کمالاتِ ولایت ان کے مقابلہ میں ایک حقیر قطرہ ہیں، لیکن کیا کیا جائے، ایک جماعت نے کمالاتِ نبوت تک نہ پہونچنے کی وجہ سے کہا ہے "الولایۃ افضل من النبوۃ" (ولایت نبوت سے افضل ہے) ایک دوسرے گروہ نے اس کی تاویل اس طرح کی ہے کہ نبی کی ولایت اس کی نبوت سے افضل ہے، ان دونوں گروہوں نے حقیقتِ نبوت کو نہ جاننے کی وجہ سے غائب پر حکم لگایا ہے، اسی حکم کے قریب سُکر کو صحو پر ترجیح دینا بھی ہے، اگر صحو کی حقیقت ان کو معلوم ہوتی تو ہرگز سُکر کو صحو سے کچھ نسبت بھی نہ دیتے۔ ع

چہ نسبت خاک را با عالمِ پاک

شاید انھوں نے خواص کے صحو کو عوام کی ہوشیاری و بیداری کے مثل سمجھ کر سُکر کو اس پر ترجیح دی ہے تو خواص کے سُکر کو عوام کے نشہ و مستی کا مماثل قرار دے کر یہی حکم لگاتے عقلاء کے نزدیک ثابت ہے کہ صحو سکر سے بہتر ہے، اگر صحو و سُکر مجازی ہے، تو بھی یہی حکم ہے، اور اگر حقیقی ہے تو بھی یہی حکم ثابت ہے۔"[2]

انبیاء کی عظمت نبوت کی وجہ سے ہے

"اتنا ضرور سمجھ لینا چاہئے کہ انبیاء علیہم الصلوات والتسلیمات نے جو کچھ عظمت و بزرگی

---

[1] ایضاً

[2] مکتوب ۲۶۸ بنام خانخاناں

پائی ہے، وہ نبوت کی راہ سے پائی ہے نہ کہ ولایت کی راہ سے، ولایت کی حیثیت نبوت کے لئے ایک خادم سے زیادہ نہیں، اگر ولایت کو نبوت پر ترجیح ہوتی تو ملاءِ اعلیٰ کے ملائکہ جن کی ولایت تمام ولایات سے زیادہ کامل ہے، انبیاء علیہم الصلوات والتسلیمات سے افضل ہوتے، اس جماعت کے ایک گروہ نے چونکہ ولایت کو نبوت سے افضل مانا اس لئے ملاءِ اعلیٰ کی ولایت کو انبیاء کی ولایت سے اکمل سمجھا اور لامحالہ ملائکہ ملاءِ اعلیٰ کو انبیاء علیہم الصلوات التسلیمات سے افضل گردانا، اور جمہور اہل سنت سے علیحدہ ہو گئے، یہ سب حقیقت نبوت سے بے خبری ولاعلمی کا نتیجہ ہے، چونکہ عہد نبوت کے بُعد کی وجہ سے لوگوں کی نگاہ میں کمالاتِ نبوت کمالاتِ ولایت کے مقابلہ میں حقیر نظر آتے ہیں، اس لئے اس مضمون کو میں نے اس باب میں تفصیل و وضاحت سے لکھا، اور حقیقت حال کا ایک شمہ بیان کیا، "رَبَّنَا اغْفِرْ لَنَا ذُنُوبَنَا وَإِسْرَافَنَا فِي أَمْرِنَا وَثَبِّتْ أَقْدَامَنَا وَانْصُرْنَا عَلَى الْقَوْمِ الْكَافِرِينَ"[1]

ایمان بالغیب انبیاء ان کے اصحاب اور علماء و عام مومنین کا حصہ ہے

"حمد و صلوٰۃ کے بعد سیادت پناہ اخوی و اعزی میر محب اللہ کو معلوم ہو کہ وجودِ واجب تعالیٰ اور اس کی تمام صفات پر ایمان بالغیب انبیاء علیہم الصلوات والتسلیمات اور ان کے اصحاب کا حصہ ہے، اور ان اولیاء کا جو بتمام و کمال (خلق کو خالق جل و علا کی طرف دعوت دینے کے لئے) بازگشت فرماتے ہیں، اور ان کی نسبت بھی (پیغمبروں کے) اصحاب کی نسبت ہوتی ہے، اگرچہ وہ کمتر بلکہ اقل قلیل ہیں، اور یہ ایمان بالغیب علماء اور عام مومنین کا بھی حصہ ہے، اور ایمان شہودی عام صوفیاء کا حصہ ہے، ارباب عزلت (خلق خدا سے یکسو

---

[1] مکتوب ۲۶۸/۱ بنام خانخاناں۔

ہوں، یا ارباب عشرت (اصحاب اختلاط) ہوں، اس لئے کہ ارباب عشرت اگرچہ مرجوع (بازگشت کرنے والے) ہیں لیکن تمام و کمال ان کا بازگشت نہیں ہوتا، ان کا باطن اسی طرح اوپر کی طرف نگراں رہتا ہے، وہ بظاہر خلق کے ساتھ ہوتے ہیں، اور بباطن حق جل شانہ کے ساتھ، اس لئے ہر وقت ایمان شہودی ان کے حصہ میں ہوتا ہے، اور انبیاء علیہم الصلوات والتسلیمات چونکہ تمام و کمال بازگشت فرما چکے ہوتے ہیں، اور ظاہر و باطن سے خلق کو حق جل وعلا کی طرف دعوت دینے میں متوجہ ہوتے ہیں، اس لئے ایمان غیب ان ہی کا حصہ ہوتا ہے۔[1]"

انبیاء کی بازگشت کامل نہایۃ النہایہ تک پہونچ جانے کی علامت ہے

"اس فقیر نے اپنے بعض خطوط میں ثابت کیا ہے کہ بازگشت کے باوجود بلندی کی طرف آنکھوں کا لگا رہنا نقص کی علامت ہے، اور انجام کار تک نہ پہونچنے کا ثبوت ہے، اور تمام و کمال بازگشت نہایۃ النہایہ (انتہا کی انتہا) تک پہونچ جانے کی علامت ہے، صوفیاء نے دونوں توجہات (توجہ بخلق و توجہ بحق) کی جامعیت کو کمال سمجھا ہے، اور تشبیہ و تنزیہ کے جامع کو کاملین میں شمار کیا ہے۔ ع

آں ایشانند و من چنینم یا رب[2]"

شریعت کی حمایت و نصرت اصلاح عقائد اور ردِ شرک و رسوم جاہلیت

تعلق مع اللہ کی تقویت و استواری، غفلت و مادیت سے حفاظت اور امراض نفسانی کے علاج کا وہ طریقہ جس کا نام مرور زمانہ اور بعض اسباب و محرکات کی بنا پر بعد میں تصوف

---

[1] مکتوب ۲۷۲/۱ بنام میر سید محب اللہ مانکپوری۔ [2] ایضاً

پڑ گیا، حقیقت میں قرآنی اصطلاح کے مطابق "تزکیہ" اور حدیث صحیح کی تعبیر کے مطابق "احسان" ہی کا وہ دینی شعبہ تھا، جس کو قرآن مجید میں بعثت محمدیؐ کے مقاصد چہارگانہ میں شمار کیا گیا ہے۔

هُوَ الَّذِیْ بَعَثَ فِی الْاُمِّیّٖنَ رَسُوْلًا مِّنْهُمْ یَتْلُوْا عَلَیْهِمْ اٰیٰتِهٖ وَ یُزَكِّیْهِمْ وَ یُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَ الْحِكْمَةَ ۗ وَ اِنْ كَانُوْا مِنْ قَبْلُ لَفِیْ ضَلٰلٍ مُّبِیْنٍ ۝ (الجمعہ ـ ۲)

وہی ہے جس نے (عرب کے) ناخواندہ لوگوں میں ان ہی (کی قوم) میں سے (یعنی عرب میں سے) ایک پیغمبر بھیجا، جو ان کو اللہ کی آیتیں پڑھ پڑھ کر سناتے ہیں اور ان کو (عقائد باطلہ و اخلاق ذمیمہ) سے پاک کرتے ہیں، ان کو کتاب اور دانشمندی (کی باتیں) سکھلاتے ہیں اور یہ لوگ (آپ کی بعثت کے) پہلے سے کھلی گمراہی میں تھے۔

امت کی یہ خدمت اور دین کو اس کے قالب و قلب، جسم و روح اور ضابطہ و رابطہ کے ساتھ قائم رکھنے کا کام خاتم النبیین صلے اللہ علیہ وسلم کے خلفائے راشدین اور نائبین برحق کے ذمہ تھا، اور وہ شریعت محمدی کے ساتھ اس "طب نبوی" کی بھی حفاظت و تجدید کرتے رہے اور فقہ ظاہر کے ساتھ فقہ باطن کی بھی اشاعت و تبلیغ میں سرگرم رہے، ان کا یہ کام تفصیل کے بجائے اجمال، اور فروع سے زیادہ اصول پر مبنی تھا، لیکن قلمرو خلافت اور فتوحات اسلامی کی توسیع، وسیع پیمانہ پر اشاعت اسلام، دولت اور وسائل عیش و عشرت کی فراوانی، زمانۂ نبوت سے بُعد اور بمصداق "فَطَالَ عَلَیْهِمُ الْاَمَدُ فَقَسَتْ قُلُوْبُهُمْ" جب شیطان کے مکائد، مادیت کے فتنے اور امراض نفسانی و روحانی نئی نئی شکلوں میں اور نئے نئے فلسفوں کے ساتھ ظہور پذیر ہوئے تو تزکیہ و احسان کا فن بھی "تصوف" کی حادث اصطلاح کے ساتھ اسی طرح ایک مدون فن بن گیا، جس طرح عجمی قوموں کے اختلاط نے قواعد زبان (صرف و نحو) اور فن معانی و بیان کو (جن کے اصول و مبادی عربی اللسان قوموں کی فطرت میں داخل تھے) نحو و بلاغت کے وسیع و دقیق فن کی شکل میں منتقل کر دیا اور اس کے ماہرین خصوصی پیدا ہونے شروع ہو گئے، جنھوں نے مستقل "مدارس" و "جامعات" قائم کئے اور ان کے لئے مستقل نصاب

وضع کیے، اور ان کی طرف ان علوم کے طالبین اور ان مقاصد کے شائقین کا رجوع عام شروع ہوا۔

ابتدائی صدیوں میں اس طریقۂ علاج (تزکیہ یا تصوف) کا مدار کتاب و سنت، اسوۂ رسولؐ کی پیروی اور شمائل و اخلاق نبوی کے تتبع پر تھا لیکن زمانہ کے اثرات عجمی اور نومسلم قوموں کے اختلاط، عجمی زہاد و نساک کی صحبت و عقیدت کے نتیجہ میں تصوف میں بدعات، زہد و عبادت میں غلو، تجرد و رہبانیت کے جراثیم، اشخاص و معتقد فیہ لوگوں کی حد سے بڑھی ہوئی تعظیم و تقدیس کی رسم اور بہت سے خود ساختہ اعمال و رسوم داخل ہونے شروع ہو گئے، یہاں تک کہ یہ غیر اسلامی اور سر تا سر اجنبی و بیرونی اعتقاد بھی بعض روحانی حلقوں اور سلسلوں میں دبے پاؤں چلا آیا کہ "اخلاص و انہماک اور پوری دقیقہ رسی کے ساتھ ایک عرصہ تک عبادت میں مشغول رہنے اور فرائض و سنن کی پابندی کرنے اور عرفان کامل حاصل ہونے کے بعد ایک منزل ایسی آتی ہے، جب سالک ان فرائض شرعی اور عبادات راتبہ کا مکلف نہیں رہتا اور وہ ان کی پابندی سے مستثنیٰ ہو جاتا ہے" اسی کا نام "سقوطِ تکلیف" ہے اور اس اعتقاد کے لوگ قرآن مجید کی مشہور آیت "وَاعْبُدْ رَبَّكَ حَتّٰى يَاْتِيَكَ الْيَقِيْنُ"[1] (اور آپ اپنے رب کی عبادت کرتے رہئے یہاں تک کہ آپ کو موت آجائے) سے استدلال کرتے ہیں، یہ ایک عظیم فتنہ تھا، جو پورے نظامِ شریعت کو معطل اور سالک کو بے قید اور عبادات کی پابندیوں سے آزاد کر دیتا تھا۔

ایسا اندازہ ہوتا ہے کہ چوتھی صدی کی ابتدا سے جب عباسی خلافت اپنے اوجِ شباب پر اور عظیم اسلامی شہر اپنے تمدن و ترقی کے نقطۂ عروج پر تھے، بدعات و تحریفات کا یہ سلسلہ

---

[1] یہاں یقین سے باتفاق مفسرین و اہل لغت موت مراد ہے۔ (الحجر-۹۹)

واضح طریقہ پر شروع ہوگیا تھا، تصوف کی سب سے قدیم کتاب جو اس وقت تک زیور طبع سے آراستہ ہوئی ہے، شیخ ابوالنصر سراج (م ۳۷۸ھ) کی "کتاب اللمع" ہے، اس کا ایک حصہ کتاب الاسوۃ والاقتداء برسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم" سے موسوم ہے[1]، اس کے بعد حضرت سید علی ہجویری[2] (م ۴۶۵ھ) کی کتاب "کشف المحجوب" میں غالباً اسی بنا پر اقامت حقیقت بے حفظ شریعت محال.......
وحقیقت بے شریعت نفاق" کے آگاہی دینے والے الفاظ آئے ہیں، امام ابوالقاسم قشیری متوفی ۴۶۵ھ کا "رسالہ قشیریہ" تصوف کا سب سے قدیم ہدایت نامہ اور دستورالعمل تھا، ان کے زمانہ ہی میں تصوف میں اتنا تنزل ہوگیا تھا کہ وہ "رسالہ قشیریہ" میں لکھتے ہیں :۔

وارتحل عن القلوب حرمة الشريعة	دلوں سے شریعت کی حرمت رخصت ہوگئی
فعدّوا قلة المبالاة بالدين اوثق	انھوں نے دین سے لاپرواہی کو ایک بڑا قابل
ذريعة .... واستخفّوا بأداء	اعتماد ذریعہ سمجھ لیا، عبادات کے اداء کرنے کو
العبادات واستهانوا بالصوم والصلوة[3]	کوئی اہمیت نہیں دی اور صوم وصلوٰۃ کو
	معمولی چیز سمجھا۔

ان کی کتاب کے باب اول کا عنوان ہی تعظیم شریعت سے متعلق ہے، اور اس میں انھوں نے قدیم صوفیاء اور مشائخ کی تعظیم شریعت اور اتباع سنت کے حالات لکھے ہیں، آخری باب (۵۴) میں جو "باب وصیۃ المریدین" کے عنوان سے ہے، تحریر فرماتے ہیں کہ :۔

بناء هذا الامر وملاكه على حفظ آداب	اس معاملہ کی بنیاد اور دار ومدار آداب شریعت
الشريعة۔	کی حفاظت پر ہے۔

---

[1] "کتاب اللمع"، ص۹۳-۱۰۴ مطبوعہ لندن ۱۹۱۴ء [2] پورا نام ابوالحسن علی بن عثمان بن ابی علی الجلّابی ہے، عام طور پر داتا گنج بخش کے نام سے مشہور ہیں، لاہور میں مزار ہے۔ [3] رسالہ قشیریہ ص۱ مطبوعۂ مصر۔

پوری کتاب حقائق شرعیہ وعلوم صحیحہ کے مطابق ہے اور محققین صوفیاء نے اس کو ایک مستند درسی کتاب کی سی اہمیت دی ہے۔

مشائخ طریقت وائمۂ حقیقت میں شریعت کے سب سے بڑے حامی وناصر سیدنا شیخ عبدالقادر جیلانی ہوئے ہیں، ان کی تعلیمات میں سب سے زیادہ زور پابندی سنت واتباعِ شریعت پر تھا، اور ان کی پوری زندگی اسی کا جلوہ اور نمود تھی "غُنیۃ الطالبین" لکھ کر انھوں نے طریقت کا پلو شریعت کے دامن سے باندھ دیا ہے، ان کے مواعظ "فتوح الغیب" کا مقالۂ دوم اتباع سنت وترک بدعت ہی سے مخصوص ہے، اس کا آغاز اس طرح ہوتا ہے:۔

اتبعوا ولا تبتدعوا — پیروی سنت کرتے رہو اور راہ بدعت نہ اختیار کرو!

طریقت کو شریعت کا خادم وتابع بنانے کے کام میں ان کو مجدد کا درجہ حاصل ہے، وہ پہلے فرائض پھر سنن پھر نوافل سے مشغول ہونے کی ہدایت فرماتے ہیں، اور اول کو چھوڑ کر دوسرے سے مشغول ہونے کو حمق ورعونت بتاتے ہیں۔

تصوف کی مقبول ترین ومستند ترین کتاب شیخ شہاب الدین سہروردی (م ۶۳۲ھ) کی "عوارف المعارف" ہے، جس کو محققین صوفیاء نے ہر دور میں حرز جان بنا کر رکھا، اور بہت سی خانقاہوں میں اس کا درس ہوتا تھا، اس کتاب کی جلد ثانی ارکان شریعت کے آداب واسرار کے بیان میں ہے، شیخ نے کتاب میں نتیجہ یہ نکالا ہے کہ "تصوف نام ہے قولاً فعلاً حالاً ہر حیثیت سے اتباع رسول صلے اللہ علیہ وسلم کا، اور اسی پر مداومت رکھنے سے اہل تصوف کے نفوس مقدس ہو جاتے ہیں، حجابات اٹھ جاتے ہیں، اور ہر شئ میں اتباع رسول ہونے لگتا ہے"۔[1]

نویں صدی ہجری میں شیخ محی الدین ابن عربی اور ان کے تلامذہ کے برقی اثر سے جو

---

[1] تفصیل اور مزید مثالوں کے لئے ملاحظہ ہو "تصوف اسلام" از مولانا عبدالماجد دریابادی مرحوم۔

عالم اسلام میں ایک تیز لہر کی طرح پھیل رہا تھا تصوف ایک فلسفہ بن گیا، جس میں یونانی فلسفۂ الٰہیات کی بہت سی اصطلاحیں اور مسائل شامل ہو گئے، وحدۃ الوجود اہل تصوف کا شعار اور سرمایۂ افتخار بن گیا، اور خانقاہوں سے لے کر مدرسوں تک اسی کا دم بھرا جانے لگا، کتاب و سنت سے عدم اشتغال، اور فن حدیث سے ناواقفیت' اور اس کی صحیح اور اس کی مستند کتابوں سے محرومی کی بنا پر، خانقاہیں' ایسے عقائد و اعمال کی آماجگاہ بن گئیں، جن کی سند دین کے اصلی ماخذ و سے ملنا مشکل اور جن سے قرون اولیٰ کے مسلمان یکسر ناآشنا تھے۔

ادھر ہندوستان میں جو ہزاروں برس سے جوگ اور سنیاس کا مرکز تھا، مسلمان صوفیوں کا واسطہ ان مرتاض جوگیوں سے پڑا جنھوں نے اپنے خیال اور نفس کی قوت حبس دم اور آسنوں کے ذریعہ بہت بڑھالی تھی، بعض مسلمان صوفیوں نے ان سے یہ علم حاصل کیا، دوسری طرف (گجرات کو مستثنیٰ کر کے جہاں علمائے عرب کی تشریف آوری اور حرمین شریفین کی آمد و رفت کی وجہ سے حدیث کی اشاعت ہو چکی تھی،' اور علامہ علی متقی برہان پوری اور ان کے نامور شاگرد علامہ محمد طاہر پٹنی پیدا ہوئے تھے) یہ ملک صحاح ستہ اور ان مصنفین کی کتابوں سے ناآشنا تھا' جنھوں نے نقد حدیث اور ردّ بدعت کا کام کیا، اور سنت صحیحہ اور احادیث ثابتہ کی روشنی میں زندگی کا نظام العمل پیش کیا، ہندوستان کے ان مقامی روحانی فلسفوں اور تجربوں کا اثر اپنے زمانہ کے مشہور و مقبول شطاری شیخ محمد غوث گوالیاری کی مقبول کتاب "جواہر خمسہ" میں دیکھا جا سکتا ہے' جس کی بنیاد زیادہ تر بزرگوں کے اقوال اور اپنے تجربات پر ہے، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ صحیح احادیث سے ثابت ہونے یا معتبر کتب شمائل و سیر سے اخذ کرنے کو ضروری نہیں سمجھا گیا، اس میں نماز احزاب، صلوٰۃ العاشقین، نماز تنویر القبر اور مختلف مہینوں کی مخصوص نمازیں اور دعائیں ہیں، جن کا حدیث و سنت سے کوئی ثبوت نہیں ہے' "جواہر دوم" میں

اسماءِ اکبریہ خاص شیخ کے جمع کئے ہوئے ہیں، جن میں فرشتوں کے عبرانی و سریانی نام ہیں، اور حرف ندا سے ان کو خطاب کیا گیا ہے، جس سے استعانت بغیر اللہ کا شبہ ہوتا ہے، ایک دعائے بششخ بھی آتی ہے، جس میں عبرانی و سریانی اسماء حرف ندا کے ساتھ ہیں، ساری کتاب کی بنیاد دعوت اسماء پر ہے، ان اسماء کے موکل مانے گئے ہیں، جو اس کی اصل ماہیت سے واقف ہیں، حروف تہجی اور ان کے موکلوں کا بھی ذکر کیا گیا ہے، اور "نادِ علیاً مظہر العجائب" کی دعا بھی ہے۔

سنت و بدعت، شریعت و فلسفہ اور تصوف (اسلامی) اور جوگ کے اس اختلاط کے زمانہ میں حضرت مجدد الف ثانی کا تجدیدی کام شروع ہوا، اس صورت حال کی تصویر کھینچتے ہوئے، وہ خود اپنے مخدوم زادہ خواجہ محمد عبد اللہ کو ایک مکتوب میں تحریر فرماتے ہیں:۔

دریں وقت عالم بواسطہ کثرت ظہور بدعت در رنگ دریائے ظلمات بنظر می در آید و نور سنت باغربت و ندرت در آں دریائے ظلمانی در رنگ کرمکہائے شب افروز محسوس می گردد۔[1]	اس وقت عالم میں بدعات کا اس کثرت سے ظہور ہے کہ معلوم ہوتا ہے کہ ظلمات کا دریا امنڈ رہا ہے، اور سنت کا نور اس مواج دریا میں اس کے مقابلہ میں اس طرح ٹمٹما رہا ہے کہ معلوم ہوتا ہے کہ رات کے اندھیرے میں کہیں کہیں جگنو اپنی چمک دکھا رہے ہیں۔

حضرت مجدد نے اس نازک دور میں کہ ہندوستان میں مسلمان سلطنت کے ہاتھوں اسلام کی بیخ کنی اور خانقاہوں میں سنت کی ناقدری کی جا رہی تھی، اور صاف صاف کہا جا رہا تھا کہ "طریقت و شریعت دو الگ الگ کوچے ہیں، جن کی راہ و رسم ایک دوسرے سے جدا اور

---

[1] مکتوب ۲۳ بنام مخدوم زادۂ خواجہ محمد عبد اللہ۔

جن کا قانون ایک دوسرے سے الگ ہے" اور جہاں کسی صاحبِ علم طالب حق کو جو کبھی کسی امر کا شرعی ثبوت پوچھنے کی جرأت کر دیتا تھا، یہ کہہ کر خاموش کر دیا جاتا تھا ؎

بے سجادہ رنگیں کن گرت پیر مغاں گوید
کہ سالک بے خبر نہ بود ز راہ و رسم منزلہا

پوری بلند آہنگی سے آواز لگائی کہ "طریقت تابع و خادم شریعت ہے، کمالات شریعت احوال و مشاہدات پر مقدم ہیں، ایک حکم شرعی پر عمل ہزار سالہ ریاضت سے زیادہ نافع ہے، اتباعِ سنت میں خواب نیمروز (قیلولہ) احیائے لیل (شب بیداری) سے افضل ہے، حلت و حرمت میں صوفیاء کا عمل سند نہیں، کتاب و سنت اور کتب فقہ کی دلیل چاہیئے، اہل ضلالت کی ریاضتیں موجب قُرب نہیں باعث بُعد ہیں، صور و اشکال غیبی داخل لہو و لعب ہیں، تکلیف شرعی کبھی ساقط نہیں ہوتی۔"

اب اس کے بعد مکتوبات کے وہ اقتباسات پڑھیئے جو انھیں حقائق پر مشتمل ہیں:۔

"شریعت تمام دنیوی و اخروی سعادتوں کی ضامن ہے، کوئی مطلوب ایسا نہیں کہ اس کی تکمیل کے لئے شریعت کے علاوہ کسی اور چیز کی احتیاج واقع ہو، طریقت و حقیقت جو صوفیاء کا مابہ الامتیاز ہے، دونوں شریعت کے خادم اور اخلاص کے حصول میں معاون ہیں، اس طرح طریقت و حقیقت کے حصول کا مقصد محض شریعت کو اس کی اصل روح کے ساتھ عمل میں لانے کا ذریعہ ہے، نہ کہ کوئی اور بات جو شریعت کے دائرہ سے خارج ہو، وہ حالات، وجد کی کیفیات اور علوم و معارف جو صوفیاء کو سلوک کے درمیان حاصل ہوتے ہیں، مقاصد میں داخل نہیں، وہ کچھ اشکال و خیالات ہیں، جن کے ذریعہ اطفال طریقت کے دل بہلائے اور ان کی ہمت بڑھائی جاتی ہے، ان سب سے گزر کر مقام رضا پر پہونچنا چاہیئے جو مقامات و

سلوک وجذبہ کی انتہا ہے"۔[1]

اسی مکتوب میں لکھتے ہیں:۔

"کوتاہ اندیش، احوال ومواجید کو مقاصد اور شاہدات وتجلیات کو مطالب میں شمار کرتے ہیں، اس کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ وہم وخیال کے زندان میں گرفتار ہیں، اور کمالات شریعت سے محروم۔

كَبُرَ عَلَى الْمُشْرِكِيْنَ مَا تَدْعُوْهُمْ اِلَيْهِ	مشرکین کو وہ بات بڑی گراں گزرتی ہے جس کی طرف آپ ان کو
اَللّٰهُ يَجْتَبِيْٓ اِلَيْهِ مَنْ يَّشَآءُ وَيَهْدِيْٓ	بلا رہے ہیں، اللہ اپنی طرف جس کو چاہے کھینچ لیتا ہے اور جو شخص
اِلَيْهِ مَنْ يُّنِيْبُ"۔[2]	(خدا کی طرف) رجوع کرے اس کو اپنے تک رسائی دیدیتا ہے

ایک دوسرے مکتوب میں نوافل پر فرائض کی تقدیم وترجیح بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں:۔

"جن اعمال سے تقرب خداوندی حاصل کیا جاتا ہے، وہ یا تو فرائض ہیں یا نوافل، نوافل کی فرائض کے مقابلہ میں کوئی حیثیت نہیں، اپنے وقت پر کسی فرض کی ادائیگی ایک ہزار سال کے نوافل سے بہتر ہے، اگرچہ وہ نیت خالص سے ادا کئے جائیں"۔[3]

ایک دوسرے مکتوب میں کہ نفس کی اصلاح اور اس کے امراض کے ازالہ میں بھی احکام شریعت پر عمل ہزاروں ریاضتوں اور مجاہدوں سے کہیں زیادہ مفید ہے، فرماتے ہیں:۔

"احکام شرعیہ میں سے کسی حکم پر عمل ہوائے نفسانی کے ازالہ میں ایک ہزار سال کی ان ریاضتوں اور مجاہدوں سے زیادہ اثر کرتا ہے جو اپنی طرف سے کئے جائیں، بلکہ یہ ریاضات ومجاہدات جو شریعت غراء کے تقاضے سے واقع نہ ہوں نفسانی خواہشات وامراض کو اور زیادہ قوت پہونچانے والے ہیں، برہمنوں اور جوگیوں نے ریاضت ومجاہدہ میں کوئی کسر نہیں اٹھا رکھی، لیکن وہ ان کے لئے کچھ مفید نہ ہوئے، اور سوائے نفس کو اور موٹا کرنے اور اس کو

---

[1] مکتوب ۳۶/۱ بنام ملا حاجی محمد لاہوری [2] ایضاً [3] مکتوب ۲۹/۱ بنام شیخ نظام تھانیسری۔

غذا پہونچانے کے کچھ اور کام نہ آئے"۔

ایک دوسرے مکتوب میں کمالات شریعت کی اہمیت بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:۔

"دنیا کے اکثر لوگ خواب وخیال میں مست اور بادام واخروٹ پر اکتفا کئے ہوئے ہیں، ان کو کمالات شریعت کی کیا خبر اور طریقت وحقیقت کی اصل حقیقت کا کیا علم؟ شریعت کو وہ پوست (چھلکا) اور حقیقت کو مغز (گودا) سمجھتے ہیں، وہ نہیں جانتے کہ حقیقت حال کیا ہے، صوفیاء کی سطحی باتوں پر فریب کھائے ہوئے، اور ان کے احوال ومقامات پر فریفتہ ہیں[1]"۔

ایک مکتوب میں ایک سنت نبوی پر عمل کرنے کی فضیلت بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:۔

"فضیلت تمام تر سنت سنیہ کی پیروی سے وابستہ اور امتیاز واعزاز شریعت پر عمل کرنے سے مربوط ہے، مثلاً دوپہر کا سونا جو اتباع سنت کی نیت سے واقع ہو کروڑوں شب بیداریوں سے افضل اور زکوٰۃ کا ایک پیسہ ادا کرنا سونے کے پہاڑ خرچ کر دینے سے جو اپنی طرف سے ہو افضل ہے[2]"۔

ایک دوسرے مکتوب میں فرماتے ہیں کہ:۔

"صوفیائے خام ذکر وفکر کو اہم المہام سمجھ کر فرائض وسنن کی ادائیگی میں تساہلی برتتے ہیں، چلوں اور ریاضتوں کو اختیار کر کے جمعہ وجماعت ترک کر دیتے ہیں، وہ نہیں جانتے کہ جماعت کے ساتھ ایک فرض نماز کی ادائیگی، ان کے ہزاروں چلوں سے بہتر ہے، ہاں ذکر وفکر جو آداب شرعی کے مراعات کے ساتھ ہوں بہت بہتر اور ضروری ہے، ناقص علماء بھی نوافل کی ترویج میں کوشاں رہتے ہیں اور فرائض کو خراب وابتر رکھتے ہیں[3]"۔

میر محمد نعمان کے نام ایک مکتوب میں تحریر فرماتے ہیں:۔

"اس گروہ (صوفیاء) میں ایک جماعت ہے، جو نماز کی حقیقت سے آگاہ اور اس کے کمالات

---

[1] مکتوب ۴۴/۱ بنام شیخ محمد چتری۔ [2] مکتوب ۱۱۴/۱ بنام صوفی قربان [3] مکتوب ۲۶۰/۱ بنام مخدوم زادہ شیخ محمد صادق

مخصوصہ سے واقف نہیں ہوسکی، وہ اپنے امراض کا علاج دوسری چیزوں سے ڈھونڈتی اور اپنے مقاصد کا حصول دوسرے امور سے مربوط سمجھتی ہے، بلکہ ان میں سے ایک گروہ نماز کو دوراز کار سمجھتے ہوئے اور اس کو غیر و غیریت پر مبنی سمجھتے ہوئے روزے کو نماز سے افضل سمجھتے ہیں کہ اس میں صفت صمدیت کا ظہور ہے، اور ایک جم غفیر اپنے اضطراب کی تسکین سماع و نغمہ ـــ وجد و تواجد سے تلاش کرتی ہے، اور رقص و رقاصی کو بھی کمال سمجھ لیا ہے، کیا انھوں نے نہیں سنا کہ "ما جعل اللہ فی الحرام شفاءً" (اللہ تعالیٰ نے حرام چیز میں شفا نہیں رکھی) اگر ان پر ان کمالات کا جو نماز سے حاصل ہوتے ہیں، ایک شمہ بھی منکشف ہو جاتا تو وہ سماع و نغمہ کا دم نہ بھرتے اور وجد و تواجد کو یاد نہ کرتے۔ ع

چوں نہ دیدند حقیقت رہ افسانہ زدند[1]

ایک جگہ اس صفائی نفس کا ذکر کرتے ہوئے جو غیر مسلموں اور فسق و فجور میں مشغول رہنے والے مرتاضوں کو حاصل ہوتی ہے، تحریر فرماتے ہیں:۔

"حقیقی تصفیہ و تزکیہ اعمال صالحہ کے کرنے پر موقوف ہے، جو مالک کی مرضیات میں شامل ہوں اور یہ بات بعثت پر موقوف ہے، جیسا کہ اوپر گزر چکا ہے، پس بغیر بعثت کے حقیقی تصفیہ و تزکیہ میسر نہیں آسکتا، وہ صفائی جو کفار و اہل فسق کو حاصل ہوتی ہے، وہ نفس کی صفائی ہے، قلب کی صفائی نہیں، صفائی نفس سوائے ضلالت کے کسی اور چیز کو نہیں بڑھاتی، اور سوائے خسارے کے کوئی اور راستہ نہیں دکھاتی، باقی بعض امور غیبی کا کشف جو کفار و اہل فسق کو صفائی نفس کے وقت کبھی حاصل ہو جاتا ہے، وہ استدراج ہے، جس کا حاصل بربادی اور خسارہ کے علاوہ اس جماعت کے حق میں کچھ نہیں۔"[2]

سالک و عارف سے تکلیف شرعی کے سقوط اور فرائض و احکام شریعت کی پابندی سے اس کو چھٹی مل جانے کے خطرناک عقیدہ کی جو پوری شریعت کو ختم کر دینے کے لئے ایک آتش گیر مادہ

---

[1] مکتوب ۲۶۱/۱ بنام میر محمد نعمان [2] مکتوب ۲۶۶/۱ بنام خواجہ عبداللہ و خواجہ عبیداللہ۔

یا سرنگ کا کام انجام دے سکتا تھا، کی تردید کرتے ہوئے ۔۔۔ ایک مکتوب میں تحریر فرماتے ہیں :۔

"متصوفین خام اور ملحدین بے سرانجام اس فکر میں ہیں کہ اپنی گردنوں کو شریعت کی طوقِ غلامی سے آزاد اور احکام شرعیہ کو عوام کے ساتھ مخصوص بنادیں' ان کا خیال ہے کہ خواص صرف معرفت کے مکلف ہوتے ہیں' جیسا کہ امراء وسلاطین محض عدل و انصاف کے مکلف ہیں، وہ کہتے ہیں کہ شریعت پر عمل کرنے کا مقصد حصول معرفت ہے' جب معرفت میسر آگئی تکلیفات شرعیہ ساقط ہوگئیں اور اپنے استدلال میں یہ آیت پڑھتے ہیں :۔

"وَاعْبُدْ رَبَّكَ حَتّٰى يَاْتِيَكَ الْيَقِيْنُ"[1] اور آپ اپنے رب کی عبادت کرتے رہیے یہاں تک کہ آپ کو موت آجائے۔

ایک مکتوب میں ارشاد فرماتے ہوئے کہ حلت و حرمت میں صوفیاء کا عمل سند نہیں تحریر فرماتے ہیں:

"صوفیاء کا عمل حلت و حرمت میں سند نہیں' کیا اتنا کافی نہیں کہ ہم ان کو معذور رکھیں اور ملامت نہ کریں' اور ان کا معاملہ اللہ تعالیٰ کے سپرد کردیں' اس معاملہ میں تو امام ابوحنیفہؒ امام ابویوسف اور امام محمد کا قول معتبر ہے' نہ کہ ابوبکر شبلی' ابوالحسن نوری کا عمل' اس زمانہ کے صوفیاء خام نے اپنے پیروں کے عمل کو بہانہ بنا کر سرود و رقص کو اپنے دین و ملت کے طور پر اختیار کیا ہے' اور اس کو طاعت و عبادت بنالیا ہے" اِتَّخَذُوْا دِيْنَهُمْ لَهْوًا وَّلَعِبًا" (انھوں نے اپنے دین کو کھیل تماشا بنا رکھا ہے)[2]"

مجدد صاحب کی یہ حمایتِ شریعت حمیت کے درجہ تک پہونچ گئی تھی' اور جب وہ کتاب و سنت اور جمہور اہل سنت کے عقیدہ کے خلاف کوئی صوفیانہ تحقیق یا حال سنتے اور اس کی سند تصوف کی کسی کتاب یا بزرگوں کے احوال و اقوال سے لائی جاتی تو ان کی رگِ فاروقی حرکت میں آجاتی اور ان کے قلم سے حمایت شریعت اور غیرت سنت کا طوفان امنڈ پڑتا،

---

[1] مکتوب ۲۶ ح۱ بنام میاں شیخ بدیع الدین [2] مکتوب ۲۶۶ ح۱ بنام خواجہ عبداللہ و عبیداللہ۔

تاریخ

دعوت و عزیمت

حصّہ چہارم

تذکرہ مجدّد الف ثانی حضرت شیخ احمد سرہندیؒ

مجدّد الف ثانی حضرت شیخ احمد سرہندیؒ کی مفصّل سوانح حیات، ان کا عہد اور ماحول، ان کے عظیم تجدیدی اور انقلابی کارنامے کی اصل نوعیت کا بیان، ان کا اور ان کے سلسلہ کے مشائخ کا اپنی اور بعد کی صدیوں پر گہرا اثر اور ان کی اصلاحی تربیتی خدمات۔

مفکر اسلام مولانا سیّد ابوالحسن علی ندویؒ

مجلس نشریاتِ اسلام

۱۔کے۔۳ ناظم آباد مینشن۔ ناظم آباد ۱ کراچی ۱۸

مفکر اسلام مولانا سیّد ابوالحسن علی ندویؒ

اپنی حیات میں مندرجہ ذیل اداروں کے ذمہ دار رہے

• ناظم دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ • رکن مجلس شوریٰ دارالعلوم دیوبند
• صدر مجلس تحقیقات و نشریات اسلام لکھنؤ • صدر مجلس انتظامی و مجلس عاملہ دارالمصنفین اعظم گڑھ
• رکن عربی اکادمی دمشق • رکن مجلس شوریٰ جامعہ اسلامیہ مدینہ منورہ
• رکن مجلس تاسیس رابطۂ عالم اسلامی مکہ معظمہ • رکن مجلس عاملہ موتمر عالم اسلامی بیروت
• صدر آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ • صدر رابطۃ الادب الاسلامی العالمیۃ
• رکن مجلس انتظامی اسلامک سینٹر جنیوا
• سابق وزیٹنگ پروفیسر دمشق یونیورسٹی و مدینہ یونیورسٹی
• صدر آکسفورڈ سینٹر فار اسلامک اسٹڈیز آکسفورڈ یونیورسٹی آکسفورڈ۔

نام کتاب	ـــــــــــ تاریخ دعوت و عزیمت (حصہ چہارم)
تصنیف	ـــــــــــ مفکر اسلام مولانا سیّد ابوالحسن علی ندویؒ
طباعت	ـــــــــــ احمد برادرز پرنٹنگ پریس۔ کراچی
ضخامت	ـــــــــــ ۴۳۶ صفحات

ٹیلیفون : ۶۶۰۱۸۱۷

اسٹاکسٹ : مکتبہ ندوہ قاسم سینٹر اردو بازار کراچی

ناشر

فضل ربی ندوی

مجلس نشریاتِ اسلام ۱۔کے۔۳ ناظم آباد مینشن۔ ناظم آباد نمبر ۱ کراچی ۷۴۶۰۰

کسی خادم نے کسی بزرگ (شیخ عبدالکبیر یمنی) کا کوئی ایسا ہی شاذ اور وحشت انگیز قول نقل کیا تھا، مجدد صاحب اس کی تاب نہ لاسکے، اور ان کے قلم سے بے اختیار یہ فقرے نکل گئے :-

"مخدوما! فقیر کو ایسی باتوں کے سننے کی تاب نہیں، بے اختیار میری رگ فاروقی حرکت میں آجاتی ہے، اور تاویل وتوجیہ کا موقع نہیں دیتی، ایسی باتوں کے قائل شیخ کبیر یمنی ہوں یا شیخ اکبر شامی، ہمیں کلام محمد عربی علیہ وعلیٰ آلہ والصلوٰۃ والسلام درکار ہے، نہ کہ کلام محی الدین بن عربی[1]، صدرالدین قونوی اور شیخ عبدالرزاق کاشی، ہم کو نص سے کام ہے نہ کہ فص سے[2] ــــ فتوحات مدنیہ نے فتوحات مکیہ سے مستغنی بنا دیا ہے[3]"

حضرت مجدد کے نزدیک شریعت غرّاء کے مطابق جو عمل کیا جائے وہ داخل ذکر ہے، ایک مکتوب میں فرماتے ہیں کہ :-

"تمام اوقات کو ذکر الٰہی جل شانہ میں مشغول رکھنا چاہیئے، جو عمل بھی شریعت غراء کے موافق ہوگا، وہ داخل ذکر ہے، اگرچہ بیع وشراء ہو، پس تمام حرکات وسکنات میں احکام شرعیہ کی مراعات ہونی چاہیئے تاکہ وہ سب ذکر ہوجائے، اس لئے کہ ذکر نام ہی ہے غفلت دور کرنے کا اور جب ہو تمام افعال میں اوامر ونواہی شرعیہ کی مراعات کی جائے گی تو کرنے والے کو ان کا حکم دینے والے (خدائے واحد) سے جو حقیقی آمر وناہی ہے، غفلت سے نجات حاصل ہوجائے گی اور اس کو دوام ذکر کی دولت میسر آئے گی[4]"

---

[1] شیخ محی الدین ابن عربی مراد ہیں، جن کا انتقال دمشق میں ہوا، اور وہیں مدفون ہوئے۔

[2] نص سے مراد نص شرعی ہے فص سے مراد شیخ اکبر کی کتاب "فصوص الحکم" کا کوئی حصہ (فص)۔

[3] مکتوب $\frac{100}{2}$ بنام ملا حسن کشمیری۔

[4] مکتوب $\frac{25}{2}$ بنام خواجہ محمد شرف الدین حسین۔

اس حمایت وحمیت شرعی کی بنا پر مجدد صاحب نے سجدۂ تعظیمی پر سخت نکیر کی، جو بعض مشائخ کے یہاں رائج ہونے لگا تھا، اور اپنے بعض اہل تعلق کو جن کے متعلق اس بارے میں تساہلی کی اطلاع ملی تھی سخت تنبیہ فرمائی[1] نیز مشرکانہ اعمال ورسوم کی تردید ومذمت میں (جن میں اس زمانہ میں تساہل شروع ہوگیا تھا) مراسم شرک کی تعظیم، غیر اللہ سے استمداد وطلب حوائج کے مشرکانہ عقیدہ، اہل کفر کے تہواروں کی تعظیم اوران کے رسوم وعادات کی تقلید، بزرگوں کے لئے حیوانات کو نذر وذبح کرنے، پیروں، بیبیوں کی نیت سے روزہ رکھنے کی تردید ومذمت کے سلسلہ میں حضرت مجدد کی کھلی تصریحات اور واضح تنبیہات اس طویل مفصل مکتوب میں ملاحظہ ہوں، جو ایک ارادت رکھنے والی نیک خاتون کے نام لکھا گیا ہے۔[2]

یہ اصلاح عقائد، ردّ شرک وبدعت اور دین خالص کی دعوت کا وہ عظیم الشان تجدیدی کام تھا جو عرصۂ دراز کے بعد حضرت مجدد نے ہندوستان کی سرزمین پر شروع کیا، (جس کی مسلمان آبادی غیر مسلم اکثریت کے درمیان گھری ہونے اور اسلام کے حدیث العہد ہونے کی بنا پر مشرکانہ جاہلیت کے خطرہ سے ہر وقت دوچار تھی) اور پھر اس کی تکمیل وتوسیع انھیں کے سلسلہ کے نامور مشائخ حکیم الاسلام حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی اور ان کے خاندان[3] اور حضرت سید احمد شہیدؒ اور ان کی جماعت نے زبان وقلم، رسائل وتصنیفات، ترجمۂ قرآن وحدیث اور اپنے وسیع تبلیغی دوروں کے ذریعہ کی۔

---

[1] ملاحظہ ہو مکتوب ۹۲/۲ بنام سیادت پناہ میر محمد نعمان، ومکتوب ۲۹/۱ بنام شیخ نظام الدین تھانیسری۔

[2] مکتوب ۴۱/۳ بصالحہ از اہل ارادت۔

[3] جن میں ان کے نامور پوتے مولانا محمد اسماعیل شہید (۱۲۴۶ھ) خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

سنت کی ترویج اور بدعتِ حسنہ کی تردید

کسی ایسی چیز کو جس کو اللہ و رسول نے دین میں شامل نہیں کیا اور اس کا حکم نہیں دیا، دین میں شامل کر لینا، اس کا ایک جزء بنا دینا، اس کو ثواب اور تقرب الی اللہ کے لئے کرنا، اور اس کے خود ساختہ شرائط و آداب کی اسی طرح پابندی کرنا جس طرح ایک شرعی حکم کی پابندی کی جاتی ہے بدعت ہے، بدعت بحقیقت دین الٰہی کے اندر شریعت انسانی کی تشکیل ہے، اس شریعت کی الگ فقہ ہے، اور مستقل فرائض و واجبات اور سنن و مستحبات، جو بعض اوقات شریعت الٰہی کے متوازی اور بعض اوقات تعداد اور اہمیت میں اس سے بڑھ جاتے ہیں، بدعت اس حقیقت کو نظر انداز کرتی ہے کہ شریعت مکمل ہو چکی جس کا تعین ہونا تھا، اس کا تعین ہو گیا، اور جس کو فرض و واجب بننا تھا، وہ فرض و واجب بنایا جا چکا، دین کی ٹکسال بند کر دی گئی، اب جو نیا سکہ اس کی طرف منسوب کیا جائے گا وہ جعلی ہوگا، امام مالک نے خوب فرمایا:۔

من ابتدع فی الاسلام بدعة یراھا	جس نے اسلام میں کوئی بدعت پیدا کر دی اور
حسنة فقد زعم ان محمدًا صلی اللہ	اس کو وہ اچھا سمجھتا ہے، وہ اس بات کا اعلان
علیہ وسلم خان الرسالة، فان اللہ	کرتا ہے کہ محمد صلے اللہ علیہ وسلم نے (نعوذ باللہ) پیغام
سبحانہ یقول "اَلْیَوْمَ اَکْمَلْتُ لَکُمْ دِیْنَکُمْ"	پہونچانے میں خیانت کی، اس لئے کہ اللہ فرماتا ہے کہ میں نے
فما لم یکن یومئذٍ دینًا فلا یکون	تمہارے لئے تمہارا دین مکمل کر دیا، پس جو بات عہد رسالت
الیوم دینًا۔	میں دین نہیں تھی، وہ آج بھی دین نہیں ہو سکتی۔

شریعت منزّل من اللہ کی خصوصیت اس کی سہولت اور اس کا ہر ایک کے لئے ہر زمانہ میں قابل عمل ہونا ہے، اس لئے کہ جو دین کا شارع ہے، وہ انسان کا خالق بھی ہے، وہ انسان کی ضروریات،

اس کی فطرت اور اس کی طاقت و کمزوری سے واقف ہے۔

اَلَا یَعْلَمُ مَنْ خَلَقَ، وَھُوَ اللَّطِیْفُ الْخَبِیْرُ (سورۃ الملک۔۱۴) (اور بھلا) کیا وہ نہ جانے گا جس نے پیدا کیا ہے، اور وہ باریک بیں (اور) پورا باخبر ہے۔

اس لئے تشریع الٰہی اور شریعت سماوی میں ان سب چیزوں کی رعایت ہے، مگر جب انسان خود شارع بن جائے گا تو اس کا لحاظ نہیں رکھ سکتا، بدعات کی آمیزشوں اور وقتاً فوقتاً اضافوں کے بعد دین اس قدر دشوار، پیچیدار اور طویل ہو جاتا ہے کہ لوگ مجبور ہو کر ایسے مذہب کا قلادہ اپنی گردن سے اتار دیتے ہیں، اور "مَا جَعَلَ عَلَیْکُمْ فِی الدِّیْنِ مِنْ حَرَجٍ" (خدا نے تمہارے لئے تمہارے دین میں کوئی تنگی نہیں رکھی) کی نعمت سلب کر لی جاتی ہے، اس کا نمونہ عبادات و رسوم اور فرائض و واجبات کی اس طویل فہرست میں دیکھا جا سکتا ہے، جس میں بدعت کو آزادی کے ساتھ اپنا عمل کرنے کا موقع ملا ہے۔

دین و شریعت کی ایک خصوصیت ان کی عالمگیر یکسانی ہے، وہ ہر زمانہ اور ہر دور میں ایک ہی رہتے ہیں، دنیا کے کسی حصہ کا کوئی مسلمان باشندہ دنیا کے کسی دوسرے حصہ میں چلا جائے تو اس کو دین و شریعت پر عمل کرنے میں نہ کوئی دقت پیش آئیگی، نہ کسی مقامی ہدایت نامہ اور رہبر کی ضرورت ہوگی، اس کے برخلاف بدعات میں یکسانی اور وحدت نہیں پائی جاتی، وہ ہر جگہ کے مقامی سانچہ اور ملکی یا شہری ٹکسال سے ڈھل کر نکلتی ہیں، وہ خاص تاریخی اور مقامی اسباب اور شخصی و انفرادی مصالح و اغراض کا نتیجہ ہوتی ہیں، اس لئے ہر ملک بلکہ اس سے آگے بڑھ کر بعض اوقات ایک ایک صوبہ اور ایک ایک شہر کے بدعات اور پھر محلوں اور گھروں کی دینی ایجادیں انہی کے ساتھ مخصوص ہوتی ہیں، اور اس طرح شہر شہر اور گھر گھر کا دین مختلف ہو سکتا ہے۔

انہی ابدی و عالمی مصالح کی بنا پر رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے اپنی امت کو بدعت سے

بچنے اور سنت کی حفاظت کی تاکید بلیغ فرمائی، آپ نے فرمایا:۔

من احدث فی امرنا ھذا ما لیس	جو ہمارے دین میں کوئی ایسی نئی بات پیدا کرے جو
منہ فھو رد۔	اس میں داخل نہیں تھی تو وہ بات مسترد ہے۔
ایاکم والبدعۃ فان کل بدعۃ	بدعت سے ہمیشہ بچو! اس لئے کہ ہر بدعت گمراہی
ضلالۃ وکل ضلالۃ فی النار۔	ہے اور ہر گمراہی جہنم میں ہوگی۔

اور یہ حکیمانہ پیش گوئی بھی فرمائی:۔

ما احدث قوم بدعۃ الا رفع بھا	جب کچھ لوگ دین میں کوئی نئی بات پیدا کرتے ہیں
مثلھا من السنۃ۔	تو اس کے بقدر کوئی سنت ضرور اٹھ جاتی ہے۔

صحابۂ کرام اور ان کے بعد ائمہ وفقہائے اسلام اور اپنے اپنے وقت کے مجددین و مصلحین اور علماءِ ربانی نے ہمیشہ اپنے اپنے زمانہ کی بدعات کی سختی سے مخالفت کی اور اسلام کے معاشرہ اور دینی حلقوں میں ان بدعات کو مقبول ورواج پذیر ہونے سے روکنے کی اپنے مقدور بھر کوشش کی، ان بدعات میں عوام وخوش عقیدہ لوگوں کے لئے جو مقناطیسی کشش ہر زمانہ میں رہی ہے اور ان سے ان پیشہ ور دنیادار مذہبی گروہوں اور افراد کے جو ذاتی مفادات وابستہ رہے ہیں جن کی تصویر اللہ تعالٰے نے قرآن مجید کی اس معجزانہ آیت میں کھینچی ہے:۔

یَا اَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا اِنَّ کَثِیْرًا مِّنَ	اے ایمان والو! اکثر احبار اور رہبان
الْاَحْبَارِ وَالرُّھْبَانِ لَیَاْکُلُوْنَ اَمْوَالَ	لوگوں کے مال نامشروع طریقہ سے کھاتے
النَّاسِ بِالْبَاطِلِ وَیَصُدُّوْنَ عَنْ	ہیں، اور اللہ کی راہ سے باز رکھتے
سَبِیْلِ اللّٰہِ (سورۂ توبہ۔۳۴)	ہیں۔

اس کی بنا پر ان کو سخت مخالفتوں اور اذیتوں کا سامنا کرنا پڑا لیکن انھوں نے اس کی پرواہ

نہیں کی، اور اس کو اپنے وقت کا جہاد اور شریعت کی حفاظت کا اور دین کو تحریف سے بچانے کا مقدس کام سمجھا، ان مخالفین بدعت اور حاملین لواءِ سنت کو اپنے زمانہ کے عوام یا خواص کالعوام سے "جامد" "روایت پرست" "مذہب دشمن" وغیرہ کے خطابات ملے، لیکن انھوں نے کوئی پرواہ نہیں کی، ان کے اس لسانی و قلمی جہاد، احقاقِ حق اور ابطالِ باطل سے بہت سی بدعات کا اس طرح خاتمہ ہوا کہ ان کا تمدن کی بعض تاریخوں ہی میں ذکر رہ گیا ہے، اور جو باقی ہیں، ان کے خلاف علمائے حقانی اب بھی صف آرا ہیں:۔

مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ رِجَالٌ صَدَقُوْا مَا عَاهَدُوا	ان مومنین میں کچھ لوگ ایسے بھی ہیں کہ انھوں نے جس بات
اللّٰهَ عَلَيْهِ فَمِنْهُمْ مَنْ قَضٰى نَحْبَهٗ وَمِنْهُمْ	کا اللہ سے عہد کیا تھا، اس میں سچے نکلے، پھر بعضے تو ان میں
مَنْ يَّنْتَظِرُ وَمَا بَدَّلُوْا تَبْدِيْلًا	وہ ہیں جو اپنی نذر پوری کر چکے، اور بعضے ان میں مشتاق
(سورۂ احزاب - ۲۳)	ہیں، اور انھوں نے ذرا تغیر و تبدل نہیں کیا۔

اس سلسلہ میں سب سے بڑا مغالطہ بدعت حسنہ کا مغالطہ تھا، لوگوں نے بدعت کی دو قسمیں بنا رکھی تھیں، بدعت سیئہ، اور بدعت حسنہ، وہ کہتے تھے کہ ہر بدعت سیئہ نہیں ہوتی، بہت سی بدعات، بدعات حسنہ ہیں، جو حدیث کے اطلاق "کل بدعة ضلالة" سے مستثنیٰ ہیں۔[1]

حضرت مجدد صاحب نے اس تقسیم اور بدعت حسنہ کے خلاف جس زور سے علم جہاد بلند کیا، اور

[1] ان لوگوں کی سب سے بڑی دلیل حضرت عمرؓ کا قول ہے جو انھوں نے جماعت کے ساتھ تراویح پڑھنے والوں کو دیکھ کر فرمایا تھا "نعمت البدعة هذه" (یہ بڑی اچھی بدعت ہے) حالانکہ اس پر اتفاق ہے کہ یہاں محض لغوی حیثیت سے اس کو بدعت کہا گیا ہے، ورنہ تراویح کا پڑھنا احادیث صحیحہ سے ثابت اور متواتر ہے، بدعت کی تعریف کے لئے امام شاطبی کی کتاب "الاعتصام بالسنة" اور مولانا اسماعیل شہیدؒ کی کتاب "ایضاح الحق الصریح فی احکام المیت والضریح" جو اس موضوع پر بہترین کتاب ہے، مطالعہ کرنی چاہیئے۔

جس اعتماد و قوت اور علمی استدلال کے ساتھ اس کا انکار کیا اس کی نظیر دور تک اور دیر تک نہیں ملتی، اس سلسلہ میں مکتوبات کے چند اقتباسات ملاحظہ ہوں:۔

سنن نبویہ کی ترویج و اشاعت کی تحریض اور بدعات کے انسداد کی ترغیب دیتے ہوئے اپنے مخدوم زادہ خواجہ محمد عبداللہ کو ایک مکتوب میں تحریر فرماتے ہیں:۔

"یہ وہ وقت ہے کہ حضرت خیر البشر علیہ و علیٰ آلہ الصلوٰۃ والسلام کی بعثت پر ہزار سال گزر چکے ہیں، اور علامات قیامت ظاہر ہونا شروع ہوگئی ہیں، عہد نبوت کے بُعد کی وجہ سے سنت مستور اور چونکہ زمانہ کذب و دروغ کا ہے، بدعت رائج و مقبول ہو رہی ہے، کسی شہباز کی ضرورت ہے، جو سنت کی نصرت و حمایت کرے اور بدعت کو پسپا اور مغلوب کرے، بدعت کی ترویج، دین کی تخریب کے مرادف ہے اور مبتدع کی تعظیم قصر اسلام کو منہدم کرنے کے ہم معنیٰ۔ حدیث میں آتا ہے:۔

من وقّر صاحب بدعة فقد اعان	جو کسی بدعت والے کی توقیر کرے گا اس نے
علی هدم الاسلام۔	اسلام کے منہدم کرنے کے کام میں حصہ لیا۔

پورے عزم و ہمت کے ساتھ اس کی طرف توجہ کرنے کی ضرورت ہے کہ سنتوں میں سے کسی سنت کو رواج دیا جائے اور بدعتوں میں سے کسی بدعت کا ازالہ کیا جائے، یہ کام ہر وقت ضروری تھا لیکن ضعف اسلام کے اس زمانہ میں کہ مراسم اسلام کا قیام، سنت کی ترویج اور بدعت کی تخریب کے ساتھ وابستہ ہو گیا ہے، اور بھی ضروری ہے"!

اس کے بعد اسی مکتوب میں بدعت میں ـــــ کسی قسم کے حُسن و جمال ہونے اور بدعتِ حسنہ کی تعبیر و اصطلاح کی مخالفت کرتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں:۔

"گزشتہ لوگوں میں سے بعض نے بدعت میں کچھ حسن دیکھا کہ بدعت کی بعض قسموں کو

انھوں نے مستحسن قرار دیا، لیکن اس فقیر کو اس مسئلہ میں ان سے اتفاق نہیں، وہ کسی بھی بدعت کو حسنہ نہیں سمجھتا اور اس میں اس کو سوائے ظلمت و کدورت کے کچھ اور محسوس نہیں ہوتا، آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں:۔

"کل بدعۃ ضلالۃ"[1] ہر بدعت گمراہی ہے۔

ایک دوسرے مکتوب میں جو عربی میں میر محب اللہ کے نام ہے تحریر فرماتے ہیں:۔

"سمجھ میں نہیں آتا کہ لوگوں نے کہاں سے کسی ایسے کام میں حسن ہونے کا فیصلہ کیا جو اسلام کے دین کامل اور خدا کے پسندیدہ و مقبول مذہب میں اتمام نعمت کے بعد ایجاد کیا گیا ہو، کیا ان کو یہ موٹی بات معلوم نہیں کہ اتمام و اکمال اور قبولیت کے بعد کسی دین میں کوئی نئی بات ایجاد کی جائے تو اس میں حسن نہیں ہو سکتا "فَمَاذَا بَعْدَ الْحَقِّ اِلَّا الضَّلَالُ" (حق کے بعد صرف ضلال ہی کا درجہ رہ جاتا ہے)۔ اگر ان کو یہ معلوم ہوتا کہ دین کامل میں کسی نو پیدا شدہ چیز کے حسن کا فیصلہ کرنا اس کے عدم کمال کو مستلزم ہے، اور اس بات کا اعلان کہ نعمت الٰہی تمام نہیں ہوئی تو وہ کبھی اس کی جرأت نہ کرتے"۔[2]

ایک دوسرے مکتوب میں اسی استثنا پر کلام کرتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں:۔

"جب (دین میں) ہر نو ایجاد چیز بدعت ہوگی اور ہر بدعت ضلالت تو کسی بدعت میں حسن پائے جانے کا کیا مطلب؟ اور جب احادیث سے صاف طریقہ پر یہ مفہوم ہوتا ہے کہ ہر بدعت رافع سنت ہوتی ہے، اور اس میں کوئی تخصیص نہیں تو اس کا صاف مطلب یہ ہے کہ ہر بدعت سیئہ ہے، حدیث میں آتا ہے:۔

ما احدث قوم بدعۃ الا رفع مثلها	جب کوئی قوم کوئی بدعت نکالتی ہے تو اسی کے
من السنۃ، فتمسک بسنۃ خیر من	بقدر سنت اٹھالی جاتی ہے، پس سنت سے
احداث بدعۃ۔	وابستگی بدعت کی ایجاد کرنے سے بہتر ہے۔

[1] مکتوب ۲۳/۲ بنام مخدوم زادہ خواجہ محمد عبداللہ۔ [2] مکتوب ۱۹/۲ بنام میر محب اللہ۔

حضرت حسانؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:۔

ماابتدع قوم بدعۃ فی دینھم الانزع	جب بھی کوئی قوم اپنے دین میں کوئی بدعت پیدا
اللہ من سنتھم مثلھا، ثم لایعیدھا	کرے گی تو ضرور اللہ تعالےٰ ان سنتوں میں سے جن پر
الیھم الی یوم القیامۃ۔	وہ عمل پیرا ہیں کوئی سنت ضرور سلب کرے گا
	پھر قیامت تک وہ ان کو واپس نہ دے گا۔

جاننا چاہیئے کہ بعض بدعتیں جن کو علماء و مشائخ نے حسنہ سمجھا ہے، جب ان پر اچھی طرح سے غور کیا جاتا ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ وہ بھی رافع سنت ہیں[۱]۔"

اسی مکتوب میں بدعت حسنہ کے وجود کا بالکل انکار کرتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں:۔

"لوگوں نے کہا ہے کہ بدعت کی دو قسمیں ہیں، بدعت حسنہ اور بدعت سیئہ، اس نیک عمل کو بدعت حسنہ کہتے ہیں، جو عہد رسالت اور خلفائے راشدین کے زمانہ کے بعد پیدا ہوا ہو، اور اس سے کوئی سنت نہ اٹھتی ہو، اور بدعت سیئہ وہ ہے، جو رافع سنت ہو، اس فقیر کو ان بدعات میں سے کسی بدعت میں حسن و نورانیت نظر نہیں آتی، اور اس میں سوائے ظلمت و کدورت کے کچھ محسوس نہیں ہوتا، فرض بھی کر لیا جائے کہ آج کسی عمل مبتدع میں ضعف بصارت کی وجہ سے تازگی اور صفائی نظر آتی ہے تو کل جب نظر تیز اور دوربیں ہو گی تو خسارہ کے احساس اور ندامت کے سوا کوئی نتیجہ نہ نکلے گا ؎

بوقت صبح شود ہم چو روز معلومت
کہ با کہ باختۂ عشق در شب دیجور

سید البشر صلے اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں:۔

---

[۱] مکتوب ۱۸۶ بنام خواجہ عبدالرحمٰن مفتی کابلی۔

من احدث فی امرنا ھذا ما لیس منہ فھو رد[1]

جو ہمارے اس دین میں کوئی ایسی چیز پیدا کرے گا جو اس کے اصل میں نہیں ہے تو وہ رد ہے (مقبول نہیں)

ان بدعات حسنہ میں جو اس زمانہ میں رواج پذیر ہو رہی تھیں، ایک محفل میلاد بھی تھی، اس کے مقصد اور عالی انتساب کی وجہ سے اس کا بدعت کہنا اور اس کی مخالفت بڑا نازک اور دشوار کام تھا، اور اس سے عوام میں غلط فہمی پیدا ہونے اور اس کو بے ادبی اور محبت کی کمی پر محمول کرنے کا خطرہ تھا، لیکن حضرت مجددؒ نے جن کو اس بارے میں کامل شرحِ صدر حاصل تھا، کہ جس چیز کا ثبوت خیر القرون میں نہیں ہے، اس میں دین کی ترقی اور امت کی فلاح نہیں ہے، اور اس میں مرورِ زمانہ کے ساتھ مختلف مفاسد کا اندیشہ ہے، آپ سے استفسار کیا گیا کہ اگر محفلِ میلاد محظورات سے خالی ہو تو اس میں کیا حرج ہے؟ جواب میں ارشاد ہوا:۔

"مخدوما! اس فقیر کے ذہن میں یہ آتا ہے کہ جب تک کہ اس کا دروازہ مطلقاً نہ بند کر دیا جائے گا، اہل ہوس اس سے باز نہیں رہیں گے، اگر ذرا بھی اس کے جواز کا فتویٰ دیا جائے گا تو رفتہ رفتہ بات کہیں سے کہیں پہونچ جائے گی "قلیلہ یفضی الی کثیرہ[2]"

اس طرح حضرت مجدد کے اس مبصرانہ وجرأتمندانہ اقدام (بدعات کی عمومی مخالفت اور بدعت حسنہ کے وجود سے اختلاف) سے ایک بڑے خطرہ کا انسداد اور ایک بڑے دینی انتشار کا سدّباب ہو گیا، جو غیر محقق علماء کی تائید، خانقاہوں کی سرپرستی اور خوش اعتقاد امراء و رؤساء کی دلچسپی اور حمایت کی وجہ سے اسلامی معاشرہ میں پھیلتا جا رہا تھا، فجزاہ اللہ عن الاسلام والمسلمین خیر الجزاء۔

---

[1] مکتوب ۱۸۶/۱ بنام خواجہ عبدالرحمٰن مفتی کابلی۔ [2] مکتوب ۲۷۳ بنام خواجہ حسام الدین۔

باب ششم

وحدۃ الوجود یا وحدۃ الشہود؟

شیخ اکبر محی الدین ابن عربی اور مسئلۂ وحدۃ الوجود کی تفصیل و تدوین

متقدمین صوفیاء کی زبان سے جو مغلوب الاحوال ہوتے تھے "اتحاد نما" اقوال جو وحدۃ الوجود پر دلالت کرتے ہیں، صادر ہوئے ہیں، ان میں مشہور شیخ و عارف حضرت بایزید بسطامی کا (جو اکثر سلاسل طریقت کے مشائخ کبار میں ہیں) قول "سبحانی ما اعظم شأنی" اور "لیس فی جبّتی الا اللہ" اور حسین بن منصور حلاّج کا نعرۂ أنا الحق خاص طور پر مشہور ہے۔

لیکن شیخ محی الدین بن عربی (م ۶۳۸ھ) جو شیخ اکبر کے نام سے شہرۂ آفاق ہیں، اس ذوق اور مسلک کے مجدد و خاتم اور علمی طور پر بانی و مؤسس ہیں، اور انھیں کے زمانے سے اس کی شہرت و مقبولیت اس درجہ کو پہونچی کہ وہ اہل تصوف میں موسمی اثر کی طرح سرایت کر گئی، جس سے قوی مزاج سے قوی مزاج بھی کلّی طور پر محفوظ نہیں رہتا، یہاں تک کہ وہ اہل ذوق و تحقیق کا شعار اور ان کا "کلمۂ جامعہ" بن گیا، اور اس کا انکار کرنا اپنی جہالت کا ثبوت دینا یا بزم تصوف میں نامحرم و طفیلی ہونے کا اعلان کرنا تھا، بقول حضرت مجدد:-

"انھوں نے اس کے اس طرح ابواب و فصول مقرر کئے جس طرح علم نحو و صرف

میں دستور ہے[1]"شیخ اکبر کے نزدیک وحدۃ الوجود کی حقیقت کیا ہے، وہ اس کو کس طرح پیش کرتے ہیں، اس پر کیا دلائل قائم کرتے ہیں، اور اس کو کس طرح ایک بدیہی حقیقت، ایک عملی تجربہ اور کشف ومشاہدہ کا معاملہ بنا دیتے ہیں، پھر اس نے کس طرح ایک مستقل فلسفہ اور "مدرسہ" کی حیثیت اختیار کر لی، اور اس پر اتنا بڑا کتب خانہ تیار ہو گیا، جس کا اجمالی جائزہ لینے کے لئے بھی ایک ضخیم دفتر درکار ہے، پیش نظر کتاب میں اس کا ضمنی واجمالی تذکرہ بھی مشکل ہے، یہ مسئلہ چونکہ فلسفہ اور تصوف دونوں کا دقیق ترین مسئلہ ہے، جس کے لئے فلسفہ اور تصوف کی دقیق اصطلاحات کا جاننا ضروری ہے، اور اس کا باطنی تجربات اور عملی سیر وسلوک سے بھی گہرا تعلق ہے، اس لئے اس مختصر باب میں اس کا احاطہ مشکل ہے، قارئین میں سے جن حضرات کو اس کو علمی طور پر سمجھنے کا ذوق ہو وہ شیخ اکبر کی مشہور تصانیف "فتوحات مکیّہ" اور "فصوص الحکم" کی طرف رجوع کریں[2]، حضرت مجدد صاحب نے وحدۃ الشہود کے اثبات میں طویل مکتوبات تحریر فرمائے ہیں، ان میں شیخ اکبر کے مسلک کو جس طرح پیش کیا ہے، اور اس کی جو تلخیص وترجمانی فرمائی ہے، ان سے بھی اس مسلک اور اس کے مقصود ومراد کے سمجھنے میں مدد ملے گی، ان کے ضروری اقتباسات اس مضمون میں اپنی جگہ پر آئیں گے۔

ہم یہاں پر علامہ عبد العلی بحر العلوم لکھنوی (م ۔ ۱۲۲۵ھ) کے رسالہ وحدۃ الوجود کے چند اقتباسات پیش کرتے ہیں، مصنف علوم حکمت واصول کے بحر زخار ہونے کے ساتھ شیخ اکبر کے نظریۂ وحدۃ الوجود کے شارح وترجمان ہیں، اور ان کی تصنیفات بالخصوص "فتوحات مکیہ"

---

[1] مکتوب ۸۹ بنام قاضی اسمٰعیل فرید آبادی۔ [2] اس سلسلہ میں سید شاہ عبد القادر مہربان فخری میلاپوری (م ۱۲۰۴ھ) کی کتاب "اصل الاصول فی بیان مطابقۃ الکشف بالمعقول والمنقول" (مطبوعہ مدراس یونیورسٹی ۱۹۵۹ء) کا مطالعہ بھی مفید ہوگا، جو اس موضوع پر بڑی جامع کتاب ہے۔

اور "فصوص الحکم" کے غواص وشناور، ان اقتباسات سے کسی قدر شیخ اکبر کے منشا ومراد کے سمجھنے میں مدد ملے گی، اگرچہ ان میں بھی ایسے متعدد اصطلاحات اور تعبیرات آئی ہیں، جن سے اہل فن اور وہی حضرات واقف ہیں جو اس سلسلہ کے عارفین کی زبان وطرزِ بیان سے مانوس ہیں، اس سے مختصر وواضح ترجمانی ہم کو نہیں مل سکی، اس لئے اس سے مدد لی گئی :۔

"اللہ تعالیٰ کے سوا جو کچھ ہے، وہ عالم شیونات وتعینات ہے، تمام شیونات وتعینات اس کے مظاہر ہیں، اور وہ ان میں ظاہر اور ساری ہے، اس کی سرایت وہ نہیں جس کے حلولی قائل ہیں یا جس کا بیان اتحادی کرتے ہیں، بلکہ یہ سریان مثل اس سریان کے ہے جو گنتی کے اعداد میں ایک کی ہے، گنتی کے تمام اعداد بجز اکائیوں کے اور کچھ نہیں، عالم میں ایک ہی عین یعنی ایک ہی ذات کا ظہور ہے، کثرت میں وہی ظاہر ہے، اپنی ذات سے کثرت کا وجود نہیں ہے، اللہ کی پاک ذات کے وجود سے اس کا ظہور ہوا ہے، اللہ ہی کی ذات اس کثرت میں ظاہر ہے، اللہ ہی اول ہے، اللہ آخر ہے، اللہ ہی ظاہر ہے، اللہ ہی باطن ہے، اللہ ان کے شریک بنانے سے پاک ہے۔"

"اللہ تعالیٰ کے نام بغیر کسی مظہر کے ظاہر نہیں ہوتے، وہ مبارک نام چاہے تنزیہی ہوں چاہے تشبیہی، اب جب کہ اسماء مظاہر پر موقوف ہوئے اور بغیر مظاہر کے ان کا کمال متصوّر ہی نہیں ہو سکتا، تو اللہ تعالیٰ نے اعیانِ عالم کو موجود کیا، تاکہ وہ اعیان اس کے مظاہر ہوں اور اس کے اسماء کا کمال پوری طرح ظاہر ہو۔

اللہ تعالیٰ اپنے ذاتی کمال میں قطعاً غنی ہے، لیکن اسمائی کمال کے مرتبہ میں عالم کے وجودِ خارجی سے غنی نہیں ہے۔ حافظ شیرازی کہتے ہیں :۔

پرتوِ معشوق گر افتاد بر عاشق چہ شد   ما بدو محتاج بودیم او بما مشتاق بود

یعنی اگر معشوق کا سایہ اور پرتو عاشق پر پڑ گیا تو کیا بات ہوئی ہم اس کے محتاج تھے، اور وہ ہمارا مشتاق تھا، یہ بیان اس حدیث قدسی سے ثابت ہے "کنت کنزاً مخفیاً فأحببت ان اعرف فخلقت الخلق" میں ایک مخفی خزانہ تھا، میں نے چاہا کہ میں پہچان لیا جاؤں لہذا خلق کو میں نے پیدا کیا تاکہ میرا ظہور ہو اور مخلوقات مظہر ہو میرا اور میرے اسماء کا۔"

"جو دو وجود کا قائل ہوا کہ ایک اللہ کا وجود ہے اور ایک ممکن کا تو وہ شرک کر رہا ہے، اور اس کا یہ شرک، شرک خفی ہے، اور جو شخص صرف ایک وجود کا قائل ہوا، اور اس نے کہا کہ وجود صرف اللہ ہی کا ہے، اس کے سوا جو کچھ ہے، وہ اس کے مظاہر ہیں اور مظاہر کی کثرت اس کی وحدت کے منافی نہیں تو یہ شخص موحّد ہے۔"

"تم حق کے عین نہیں ہو کیونکہ حق تعالیٰ وجود مطلق ہے اور تم مقید او متعین ہو اور متعین کسی طرح بھی عین مطلق نہیں ہو سکتا، ہاں تم اپنی حقیقت سے عین حق ہو، حق تعالیٰ تم میں متعین ہوا ہے، تم اللہ کو عین موجودات بن تعین کی قید سے آزاد اور تعین کی قید سے مقید پا رہے ہو، یعنی اللہ تعالیٰ کو متعین میں ظاہر دیکھ رہے ہو، "لا موجود ولا الٰہ الا اللہ" اللہ کے سوا نہ کوئی موجود ہے، اور نہ کوئی معبود ہے۔"[1]

اس مسئلہ کا اثر شیخ اکبر کے زمانہ کے بعد اتنا ہمہ گیر بلکہ عالمگیر تھا کہ کہا جا سکتا ہے کہ صوفیاء فلاسفہ اور شعراء میں ننانوے ۹۹ فیصد اس مسئلہ کے قائل یا اس سے مرعوب ہو کر اس کے ہمنوا بن گئے ہیں، شیخ سے اختلاف کرنے والے زیادہ تر محدثین، فقہاء اور وہ علماء ہیں جن کو علمائے ظاہر کہا جاتا ہے، ان میں حافظ ابن حجر عسقلانی، علامہ سخاوی، ابو حیان مفسر،

---

[1] رسالہ "وحدۃ الوجود" تالیف بحر العلوم علامہ عبد العلی انصاری لکھنوی، مترجمہ مولانا شاہ زید ابو الحسن فاروقی مجددی شائع کردہ ندوۃ المصنفین دہلی ص ۲۹-۵۶

شیخ الاسلام عز الدین ابن عبد السلام، حافظ ابوزرعہ، شیخ الاسلام سراج الدین البلقینی، ملا علی قاری علامہ سعد الدین تفتازانی، جیسے نامور علماء اور ائمۂ فن تھے۔

یہ حضرات اگرچہ اپنے علم وفضل، کتاب وسنت پر وسیع اور گہری نظر اور علوم دینیہ میں تبحر کے لحاظ سے بہت فائق تھے، لیکن ایک دو کو مستثنیٰ کر کے اہل تصوف وحقائق کو ان میں سے کسی کا حقائق وعلوم باطنی کا رمز آشنا ہونا تسلیم نہیں، اس لئے ان کی مخالفت کو "الناس اعداء ما جھلوا" (لوگ جس کو جانتے نہیں اس کے دشمن ہوجاتے ہیں) کے عام اصول پر محمول کیا گیا۔

شیخ الاسلام ابن تیمیہؒ اور عقیدۂ وحدۃ الوجود کی مخالفت وتنقید

مسئلہ وحدۃ الوجود کی مخالفت کے سب سے بڑے علمبردار اور اس پر کتاب وسنت کی بنیاد پر اور ان اثرات ونتائج کی روشنی میں جو قریبی عرصہ میں اس مسئلہ وتحقیق کے اختیار کرنے کی وجہ سے تصوف کے حلقہ میں اور عوام میں ظاہر ہونے شروع ہو گئے تھے، تنقید وتبصرہ اور اس کا تحلیل وتجزیہ کرنے میں شیخ الاسلام تقی الدین حافظ ابن تیمیہؒ (۶۶۱ــ ۷۲۸ھ) کا نام سب سے زیادہ روشن ہے، وہ شیخ اکبر کی وفات (۶۳۸ھ) سے تئیس سال بعد پیدا ہوئے، شیخ اکبر کی وفات جس شہر (دمشق) میں ہوئی اور جس کو ان کی آخری آرامگاہ اور مدفن بننے کا شرف حاصل ہوا، وہیں امام ابن تیمیہؒ نے ہوش سنبھالا، تعلیم وتربیت حاصل کی اور یگانہ علمی و ذہنی کمالات کو پہونچے، ان کا شعور جب بالغ ہوا اور وہ جب ماحول پر ناقدانہ نظر ڈالنے کے قابل ہوئے تو شیخ اکبر کی وفات کو ۴۰۔ ۴۵ سال سے زیادہ عرصہ نہیں گذرا تھا، مصر و شام کی فضا ان کی علمی نادر تحقیقات کے شور سے گونج رہی تھی، اور علم ومعرفت کے خم خانے

ان کے ذوق توحید سے مخمور تھے، مصر میں شیخ ابوالفتح نصر المنبجی، شیخ اکبر کے غالی معتقدین میں تھے، اور سلطنت کا مدار المہام اور سیاہ وسفید کا مالک رکن الدین بیبرس الجاشنگیر، شیخ نصر المنبجی کا معتقد و مرید تھا، شام میں اور اسی طرح بیشتر عرب ممالک میں شیخ کی کتابیں خصوصاً "فتوحاتِ مکیہ" اور "فصوص الحکم" عام طور پر متداول تھیں، اور لوگ ان کو پڑھ پڑھ کر سر دھنتے تھے، خود امام ابن تیمیہؒ نے اعتراف کیا ہے کہ "فتوحات مکیہ" "کنہ المحکم المربوط" "الدُّرَّة الفاخرة" "ومطالع النجوم" وغیرہ میں بڑے اچھے علمی فوائد و نکات ملتے ہیں، شیخ اکبر کے مسلک کے حاملین میں ابن سبعین، صدر الدین قونوی، (جو شیخ اکبر کے براہ راست شاگرد تھے) بلیانی اور تلمسانی خاص طور پر شہرۂ آفاق تھے، امام ابن تیمیہؒ نے اس پوری جماعت میں شیخ اکبر کو ان سب پر ترجیح دی ہے، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے انصاف و تحقیق کا دامن ہاتھ سے جانے نہیں دیا ہے، اور "اِذَا حَکَمْتُمْ بَیْنَ النَّاسِ اَنْ تَحْکُمُوْا بِالْعَدْلِ" پر عمل کیا ہے، وہ کہتے ہیں:-

"ابن عربی ان لوگوں میں اسلام سے قریب تر ہیں، اور ان کا کلام بہت سے مقامات پر نسبتاً بہتر ہے، اس لئے کہ وہ مظاہر...... اور ظاہر میں فرق کرتے ہیں، امر و نہی اور شرائع و احکام کو اپنی جگہ رکھتے ہیں، مشائخ نے جن اخلاق و عبادات کی تاکید کی ہے، ان کے اختیار کرنے کا مشورہ دیتے ہیں، اس لئے بہت سے عابد و صوفی ان کے کلام سے سلوک کو اخذ کرتے ہیں، اگرچہ وہ ان کے حقائق کو اچھی طرح نہیں سمجھتے، ان میں سے جو ان حقائق کو سمجھ لیتے ہیں، اور ان کی موافقت کرتے ہیں، ان پر ان کے کلام کی حقیقت منکشف ہو جاتی ہے۔"[1]

دوسری جگہ ایک بلند مرتبہ مسلمان سے حسن ظن اور اپنے حکم لگانے کی نازک ذمہ داری کا احساس کرتے ہوئے لکھتے ہیں:-

---

[1] مکتوب شیخ الاسلام بنام شیخ نصر المنبجی مندرجہ "جلاء العینین" ص ۵۷

"اللہ تعالیٰ ہی کو علم ہے کہ ان کا خاتمہ کس چیز پر ہوا، اللہ تعالیٰ تمام مسلمان مردوں اور عورتوں زندہ و مردہ کی مغفرت فرمائے" رَبَّنَا اغْفِرْ لَنَا وَلِإِخْوَانِنَا الَّذِينَ سَبَقُونَا بِالْإِيمَانِ وَلَا تَجْعَلْ فِي قُلُوبِنَا غِلًّا لِّلَّذِينَ آمَنُوا رَبَّنَا إِنَّكَ رَءُوفٌ رَّحِيمٌ (ہمارے پروردگار ہماری اور ہمارے ان بھائیوں کی مغفرت فرما جو ہم سے پہلے ایمان کے ساتھ چلے گئے اور ہمارے دلوں میں اہلِ ایمان کی طرف سے کھوٹ نہ رکھ اے ہمارے پروردگار تو بہت شفقت والا مہربان ہے)"۔[1]

عقیدۂ وحدۃ الوجود کے غالی مبلغ و داعی اور ان کے اثرات و نتائج

لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس تحقیق کے خاص مزاج و مذاق، اس کی عمومی تبلیغ و اشاعت اور اس کی تعلیم و تلقین میں زیادہ جوش سے کام لینے اور احتیاط ملحوظ نہ رکھنے کی وجہ سے خود شام میں جو علوم دینیہ کا بڑا مرکز اور مصر کی مسلم ترکی النسل حکومت کا ایک اہم صوبہ تھا' ایک طرح کا ذہنی و اخلاقی انتشار پیدا ہونے لگا تھا، لوگ شریعت، عقل اور اخلاق کے حدود پھلانگنے لگے تھے، اور ایک بحرانی کیفیت اسلامی معاشرہ میں رونما تھی، ایک حکیم کے قول کے مطابق "درخت اپنی جڑ سے نہیں اپنے پھل سے پہچانا جاتا ہے" عقیدۂ وحدۃ الوجود کا درخت جس طرح کے برگ و بار لانے لگا تھا، وہ ایک حامی شریعت' اور غیور عالم و داعی کے لئے باعث تشویش اور موجب نقد تھے۔

امام ابن تیمیہؒ ناقل ہیں (اور وہ نقول میں عام طور پر محتاط ہیں) کہ تلمسانی (جو اس معرفت کے علم میں سب سے بڑھے ہوئے تھے) مسلک وحدۃ الوجود کے صرف قائل ہی نہیں بلکہ اس پر عامل بھی تھے، شراب پیتے تھے' اور محرمات کا ارتکاب کرتے تھے (کہ جب موجود

---

[1] ایضاً

ایک ہے تو حلال و حرام کی تفریق کیسی؟) امام ابن تیمیہؒ لکھتے ہیں:۔

"مجھ سے ایک معتبر آدمی نے بیان کیا کہ وہ تلمسانی سے فصوص الحکم کا درس لیتے تھے اور اس کو اولیاء اللہ اور عارفین کا کلام سمجھتے تھے، جب انھوں نے فصوص کو پڑھا اور دیکھا کہ اس کے مضامین تو قرآن شریف کے صریح مخالف ہیں تو انھوں نے تلمسانی سے کہا کہ یہ کلام تو قرآن کے خلاف ہے، تو اس نے جواب دیا کہ قرآن تو سارا شرک سے بھرا ہوا ہے، اس لئے کہ وہ رب و عبد کے درمیان فرق کرتا ہے، توحید تو ہمارے کلام میں ہے، اس کا یہ بھی مقولہ ہے کہ کشف کے ذریعہ وہ ثابت ہوا ہے، جو صریح عقل کے خلاف ہے[1]۔"

وہ مزید لکھتے ہیں:۔

"ایک شخص نے جو تلمسانی اور اس کے ہم خیال کے ساتھ تھا، مجھے خود سنایا کہ ہمارا گذر ایک مردہ کتے کے پاس سے ہوا جس کو خارش تھی، تلمسانی کے رفیق نے کہا کہ یہ بھی ذاتِ خداوندی ہے؟ اس نے جواب دیا کہ کیا کوئی چیز اس کی ذات سے خارج ہے، ہاں سب کے سب اسی کی ذات کے اندر ہیں[2]۔"

وہ اپنی دوسری کتاب "الرد الأقوم علی فصوص الحکم" میں لکھتے ہیں:۔

"بعض لوگوں سے کہا گیا کہ جب وجود ایک ہے تو بیوی کیوں حلال اور ماں حرام ہے؟ اس محقق نے جواب دیا کہ ہمارے نزدیک سب ایک ہیں، لیکن ان محجوبین نے (جو توحید حقیقی سے نا آشنا ہیں) کہا کہ ماں حرام ہے، ہم نے بھی کہا کہ ہاں تم (محجوبین) پر حرام ہے[3]۔"

یہ نہیں کہا جا سکتا کہ ان بیباکانہ اقوال اور اباحیت و فوضویت (اخلاقی انارکی)

---

[1] الفرقان بین الحق والباطل ص ۱۴۵ [2] ایضاً [3] ایضاً ص ۴۲

کی ذمہ داری شیخ اکبر جیسے عارف ومحقق پر یا ان کی کتابوں پر عاید ہوتی ہے، جو بنایت درجہ متبع سنت[1]، عابد وزاہد، مرتاض ومجاہد اور نفس سے شدید محاسبہ کرنے والے مکاید شیطان اور غوائل نفس سے بدرجۂ تمام واقف تھے[2]، لیکن ان کے یہاں اس طرح کے عزیب اور موحش اقوال ملتے ہیں، جن سے رائی کا پربت بنا لینے والوں کو مسالہ ہاتھ آتا ہے، مثلاً یہ کہ "عہد موسوی کے گوسالہ پرستوں نے درحقیقت خدا ہی کی پرستش کی تھی، موسیٰؑ نے ہارونؑ کو جو ٹوکا تھا، تو اس بات پر کہ انہوں نے گوسالہ پرستی کی (جو دراصل خدا پرستی تھی اس لئے کہ موجود تو ایک ہی ہے) مخالفت کیوں کی؟ ان کے نزدیک موسیٰؑ ان عارفین میں سے تھے، جو ہر چیز میں حق کا مشاہدہ کرتے ہیں، اور اس کو ہر چیز کا عین سمجھتے ہیں، ان کے نزدیک فرعون اپنے اس دعویٰ میں برسرحق تھا کہ "أنا ربکم الأعلیٰ" بلکہ وہ عین تھا، فرعون کو چونکہ تکوینی طور پر منصب حکومت حاصل تھا، اور وہ صاحب حق تھا، تو اس نے بجا طور پر "أنا ربکم الأعلیٰ" کہا، اس لئے کہ جب سب کسی نہ کسی نسبت میں رب ہیں تو میں ان میں سب سے اعلیٰ ہوں، کیوں کہ مجھے ظاہر میں تم پر حکومت کرنے اور فیصلہ کرنے کا اختیار دیا گیا ہے، وہ کہتے ہیں کہ جادوگروں کو جب فرعون کی صداقت کا علم ہوا تو انھوں نے اس کی مخالفت نہیں کی، بلکہ اس کا اعتراف کیا اور کہا کہ "إقض ما أنت قاض إنما تقضي هذه الحياة الدنيا" (جو تمہیں فیصلہ کرنا ہو کر و تم اس دنیا کی زندگی پر حکم چلا سکتے ہو) اس لئے فرعون کا یہ کہنا بالکل بجا تھا کہ "أنا ربکم الأعلیٰ" وہ حضرت نوحؑ پر تنقید کرتے ہیں، اور ان کی کافر قوم کی تصویب وتعظیم، جنھوں نے پتھروں کی پرستش کی، وہ کہتے ہیں، کہ ان بت پرستوں نے درحقیقت اللہ ہی کی

---

[1] شیخ اکبر امام داؤد ظاہری کے مذہب ظاہری کے پیرو تھے، جو قیاس کے قائل نہیں اور ظاہر حدیث پر عمل کرتے ہیں۔ [2] مثال کے طور پر ملاحظہ ہو ان کا رسالہ "روح القدس"۔

عبادت کی تھی، اور طوفانِ نوحؑ دراصل معرفتِ الٰہی کی طغیانی اور اس کے سمندر کا جوش تھا جس میں وہ غرق ہوئے۔[1]

اسی بنا پر بہت سے ایسے مشائخ و عارفین جو شیخ اکبر کے علوم مرتبہ کے قائل تھے اور ان کو مقبولین میں سمجھتے تھے، وہ اپنے اہل تعلق کو ان کی کتابوں کے عام مطالعہ سے سختی سے منع کرتے تھے، شیخ محی الدین عبدالقادر عیدروسی مصنف "النور السافر" اپنے شیخ علامہ بحرق سے روایت کرتے ہیں کہ ان کے مرشد شیخ وقت شیخ ابوبکر عیدروسی نے بیان کیا کہ مجھے یاد نہیں کہ میرے والد (شیخ عبداللہ ابن ابی بکر حضرمی) نے مجھے کبھی مارا یا جھڑکا ہو، یہ واقعہ ایک ہی مرتبہ پیش آیا، اور اس کی وجہ یہ تھی کہ انھوں نے میرے ہاتھ میں شیخ اکبرؒ کی "فتوحات مکیہ" کا ایک جز دیکھا، ان کو سخت غصہ آیا، میں نے اس دن سے ان کتابوں کو ہاتھ نہیں لگایا، وہ کہتے تھے کہ میرے والد شیخ کی دونوں کتابوں 'فتوحات' اور 'فصوص' کے مطالعہ سے شدت سے منع کرتے تھے، لیکن اسی کے ساتھ شیخ سے حسن ظن رکھنے کی تاکید بھی کرتے تھے، اور اس کا عقیدہ رکھنے کی ہدایت کرتے تھے کہ وہ اکابر اولیاء اللہ اور کبار عارفین میں تھے۔[2]

عقیدۂ وحدۃ الوجود ہندوستان میں

آٹھویں صدی میں جب یہ عقیدہ ہندوستان آیا تو اس وجہ سے کہ ہندوستان خود

---

[1] شیخ اکبر کے یہ سب اقوال "الرد الأقوم علی ما فی کتاب فصوص الحکم" اور "الفرقان بین الحق والباطل" سے ماخوذ ہیں، اور امام نے ان کو "فصوص الحکم" سے اقتباس کرکے لکھا ہے، یہاں اس بات کا بھی اظہار ضروری ہے کہ شیخ اکبر کے علوم سے اشتغال رکھنے والوں کی ایک جماعت اس بات کی قائل ہے کہ شیخ کی کتابوں بالخصوص "فصوص الحکم" میں کثرت سے الحاقات و اضافات کئے گئے ہیں۔

[2] النور السافر ص ۳۴۶

اس مسلک و ذوق کا قدیم ترین اور پرجوش ترین قائل و داعی رہ چکا تھا، اور بعض مورخینِ تصوف کے قول کے مطابق متصوفین اسلام نے جو ایران، عراق اور مغرب میں پیدا ہوئے توحیدِ وجودی کا سبق ہندوستان ہی سے لیا تھا، اسلام کی آمد کے بعد بھی بلا کسی انقطاع کے یہ ملک اس مسلک و عقیدہ کا علمبردار "ہمہ اوست" کا قائل ہے، اور آرین نسلوں کے مزاج اور یہاں کے مذاہب اور فلسفوں کی (جو سامی اقوام اور انبیاء کے مرزبوم میں پیدا ہونے والے مذاہب کے برخلاف تعینات و قیود سے گریزاں اور وحدت وجود اور وحدت ادیان کے ہزاروں برس سے قائل ہیں) اطلاق پسندی کی وجہ سے اس مشرب نے اور گہرا اور شوخ رنگ اختیار کر لیا، اور یہاں آکر اس فلسفہ کے مزاج نے مقامی مزاج سے ہم آہنگ و ہم آغوش ہو کر ایک نیا جوش اور ایک نیا مکتبِ خیال پیدا کر لیا، یہاں کے مشائخ میں ایک بڑی تعداد اس مشرب کی حامی و حامل اور مبلغ و داعی نظر آتی ہے، ان میں خاص طور پر سلسلۂ چشتیہ صابریہ کے نامی و گرامی شیخ شاہ عبدالقدوس گنگوہیؒ (م ۹۴۴ھ) شیخ عبدالرزاق جھنجھانوی (م ۹۴۹ھ) شیخ عبدالعزیز دہلوی معروف بہ شکر بار (م ۹۷۵ھ) شیخ محمد ابن فضل اللہ برہان پوری (م ۱۰۲۹ھ) اور شیخ محب اللہ الہ آبادی (م ۱۰۵۸ھ) میں سے ہر ایک اپنے عہد و عصر کا ابن عربی اور اپنے شہر و مصر کا ابن فارض تھا، ان میں سے اکثر حضرات حضرت مجدد سے کچھ پیشتر یا ان کے زمانہ سے قریب یا متصلاً مسند آرائے تحقیق وارشاد ہوئے۔

شیخ علاء الدولہ سمنانی اور وحدۃ الوجود کی مخالفت

جیسا کہ اوپر کہا گیا مسلک وحدۃ الوجود کی تردید اور شیخ اکبر پر تنقید کرنے والے زیادہ تر علوم ظاہر کے دریا کے غواص اور حقیقت و معرفت کے کوچہ، ریاضت و مجاہدہ کی دنیا اور

معارف وحقائق اور علمی تجربات اور ذوق سے ناآشنا تھے، اس لئے اس مشرب کے ذوق آشنا ان کی تنقیدات کو یہ کہہ کر نا قابل اعتناء قرار دے دیتے تھے کہ۔ ع

لذّتِ مے نشناسی بخدا تا نچشی

اور۔ ع،

چوں نہ دیدند حقیقت رہِ افسانہ زدند

پہلے محقق اور مسلم صوفی اور عارف جنھوں نے خصوصیت واہتمام کے ساتھ اس مشرب کی تنقید اور تردید کی وہ شیخ رکن الدین ابوالمکارم علاء الدولہ سمنانی ہیں[1]۔

علاء الدولہ السمنانی (۶۵۹-۷۳۶ھ) خراسان میں سمنان کے ایک دولت مند اور مشہور گھرانہ میں پیدا ہوئے جس کے افراد حکومت و وزارت کے اعلیٰ عہدوں پر فائز تھے، انھوں نے شیخ نورالدین عبدالرحمٰن الکسرقی الاسفرائنی سے کبروی سلسلہ میں باطنی استفادہ کیا اور اجازت پائی، شیخ اکبر کے وحدۃ الوجود کے نظریہ کے خلاف انھوں نے مسلسل مناظرات جاری رکھے، اور اپنے خطوط میں بھی جا بجا ذکر کیا، ان کے نزدیک سالکِ طریقت کی انتہائی منزل "توحید" نہیں بلکہ "عبودیت" ہے، ان کے ملفوظات ان کے مرید اقبال ابن سالق سیستانی نے مرتب کئے جس کے کئی نسخے "چہل مجلس" یا ملفوظات شیخ علاء الدولہ السمنانی وغیرہ کے ناموں سے کتب خانوں میں محفوظ ہیں، جامی کے "نفحات الانس" ص۵۰۴-ص۵۱۵ کا بیشتر حصہ بھی انہی ملفوظات پر مبنی ہے[2]۔

وحدۃ الشہود

ہمارے علم و مطالعہ میں دو نامور شخصیتیں ایسی گذری ہیں، جن کے یہاں وحدۃ الوجود

---

[1] مکتوبات امام ربانی مکتوب ۸۹ دفتر سوم [2] مقالہ F. MEIER مندرجہ "اردو دائرہ معارف اسلامیہ"۔

کے متوازی وحدۃ الشہود کا ذکر اور اس کی طرف اشارات ملتے ہیں، ان دونوں میں اختلافِ ذوق بلکہ متباین راستوں کے باوجود صرف ایک (حسن نیت، سلامت ذوق، اور اخلاص) کی وحدت ہے جس پر ہدایت کے ابواب کے مفتوح ہونے کا وعدۂ قرآنی "وَالَّذِیْنَ جَاھَدُوْا فِیْنَا لَنَھْدِیَنَّھُمْ سُبُلَنَا" کے الفاظ ہیں، موجود ہے، ایک شیخ الاسلام حافظ ابن تیمیہ جو اصلاً محدث، متکلم اور فقیہہ تھے، دوسرے مخدوم الملک شیخ شرف الدین یحییٰ منیریؒ جو اصلاً عارف و محقق اور امام تصوف و حقیقت تھے، اول الذکر کی کتاب "العبودیۃ" سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ وہ وحدۃ الشہود کے کوچہ سے آشنا ہیں، اور اس حقیقت سے واقف ہیں کہ سالکین کو اثنائے سلوک میں یہ مقام پیش آتا ہے، اور وہ انبیاء علیہم السلام اور ان کے متبعین کاملین صحابۂ کرام وغیرہم کی معرفت سے فروتر لیکن وحدۃ الوجود کے مقام سے بہتر و بلند تر ہے[۱]، لیکن چونکہ یہ ان کا اصل میدان نہیں اس لئے وہ صرف اشارات پر اکتفا کرتے ہیں۔

لیکن مخدوم بہاری (م ۷۸۲ھ) نے اپنے مکتوبات میں بڑی خوبی کے ساتھ اس مسئلہ کو پیش کیا ہے، وہ اپنے ذاتی تجربہ اور اس مقام کی تحقیق کی روشنی میں جو ان کو حاصل تھا کہتے ہیں کہ "عام طور پر جس کو وحدۃ الوجود اور غیر حق کا عدم محض اور فناءِ کامل سمجھا جاتا ہے، وہ دراصل وجود حقیقی کے سامنے دوسرے موجودات کا اس طرح ماند پڑ جانا اور مغلوب ہو جانا ہے جس طرح آفتاب کی روشنی کے سامنے ستاروں کی روشنی ماند اور ذرات کا وجود بے حقیقت ہو جاتا ہے" وہ دو لفظوں میں اس حقیقت کو اس طرح بیان کرتے ہیں "نابودن دیگر و نادیدن دیگر" کسی چیز کا معدوم و نابود ہو جانا اور چیز ہے، اور نظر نہ آنا اور چیز، اور فرماتے ہیں، یہ ایک ایسا نازک مقام ہے، جہاں اچھے اچھوں کے قدم لڑکھڑا گئے، اور توفیق الٰہی

---

[۱] ملاحظہ ہو "رسالۃ العبودیۃ" ص ۸۵-۸۸ "واما النوع الثانی فھو الغناء عن شھود السوی" الخ (المکتب الاسلامی، دمشق)

اور خضر کامل کے بغیر جادۂ حقیقت پر قائم رہنا مشکل ہے۔[1]

ایک نئی تجدیدی شخصیت کی ضرورت

لیکن اس مسئلہ کی تنقیح، اس سلسلہ میں اتمام حجت کے لئے ایک ایسی شخصیت کی ضرورت تھی جو سیر وسلوک کی ان پرخار وادیوں اور ان اعلیٰ منازل سے گذر چکا ہو، دریائے حقیقت کا غواص ہو اور جو ان عملی تجربات کے امواج اور طوفانی سمندر سے گذر کر ساحل حقیقت پر پہونچا ہو، وہ عدم علم کو عدم شئی کی دلیل نہ بنائے بلکہ ایک عینی مشاہد اور ایک بلند ہمت و بلند نظر مسافر کی طرح پوری خود اعتمادی کے ساتھ علی وجہ البصیرۃ یہ کہے کہ جہاں تک توحید وجودی کا تعلق ہے ؎

ہوں اس کوچہ کے ہر ذرہ سے آگاہ
ادھر سے مدتوں آیا گیا ہوں

لیکن اس کے ساتھ یہ بھی کہے۔ ع

ستاروں سے آگے جہاں اور بھی ہیں

وحدۃ الوجود کے سلسلہ میں اس وقت تک اثبات و نفی کرنے والوں کے تین مسلک رہے ہیں۔

۱۔ وحدۃ الوجود کا مکمل اثبات اور یہ کہ وہ ایک بدیہی حقیقت ہے، اور تحقیق و معرفت کی آخری منزل ہے۔

۲۔ وحدۃ الوجود کا مکمل انکار اور یہ کہ وہ وہم و خیال، قوت متخیلہ کی کارفرمائی اور باطنی مشاہدہ کے سوا کچھ نہیں۔

---

[1] ملاحظہ ہو مکتوب اول مکتوبات سرصدی اور اس کا اقتباس مندرجہ "تاریخ دعوت و عزیمت" حصہ سوم ص ۲۸۴-۲۸۶

۳۔ وحدۃ الوجود کے متوازی وحدۃ الشہود کا نظریہ اور یہ کہ حقیقت میں سالک کو جو کچھ نظر آتا ہے، اور جو حقیقت نفس الامری ہے، وہ یہ نہیں کہ وجود واحد ہے، اور واجب الوجود کے سوا ہر وجود حقیقتاً منتفی و معدوم ہے، بلکہ واقعہ یہ ہے کہ موجودات اپنی جگہ پر موجود اور قائم ہیں، لیکن واجب الوجود کے وجود حقیقی کے نور نے ان پر ایسا پردہ ڈال دیا ہے کہ وہ معدوم نظر آتے ہیں، اور جس طرح ستارے آفتاب کے طلوع کے بعد اس کے نور کے سامنے اس طرح ماند پڑ جاتے ہیں کہ اگر کوئی کہے کہ ستارے نہیں ہیں تو وہ کاذب نہیں ہوگا، اسی طرح موجودات اس وجود کامل و حقیقی کے سامنے ایسے بے حقیقت نظر آتے ہیں کہ گویا ان کا سرے سے وجود ہی نہیں۔

مجدد صاحب کا اضافہ اور تجدیدی کارنامہ

مجدد صاحب نے ان تین مسلکوں کے مقابلہ میں ایک چوتھا مسلک اختیار کیا، وہ یہ کہ وحدۃ الوجود سالک کے سیر و سلوک کی ایک منزل ہے، اس کو عیاناً و مشاہدۃً نظر آتا ہے کہ وجود حقیقی و کامل کے علاوہ کسی چیز کا وجود نہیں، جو کچھ ہے، وہ سب ایک ہی وجود ہے، باقی سب اس کی "تلوینات و تنوعات" ہیں، یا شیخ اکبر اور اس مشرب وجودی کے عارفین کے بقول "تنزلات" ہیں

لیکن اگر توفیق الٰہی شامل حال اور شریعت کا چراغ رہنما ہوتا ہے، اور سالک کی ہمت بلند ہوتی ہے تو دوسری منزل بھی سامنے آتی ہے، اور وہ وحدۃ الشہود کی منزل ہے۔

اس طرح حضرت مجدد وحدۃ الوجود (جو صدیوں تک عالی استعداد سالکین و عارفین اور دقیقہ رس حکماء اور غواصین کا مسلک رہا ہے) کی نفی اور اس کے سب سے بڑے علمبردار و شارح

شیخ اکبر محی الدین ابن عربی (جن کے علوم و معارف نکات و اسرار اور کمالاتِ روحانی کا انکار مکابرہ ہے) کے علوِّ مقام، مقبولیت عند اللہ اور اخلاص کا انکار کئے بغیر بلکہ بلند الفاظ میں اس کا اعتراف کرتے ہوئے ایک اضافہ فرماتے ہیں، اور ایک نئی یافت و دریافت کا اعلان کرتے ہیں، جو ایک طرف عقیدۂ جمہور مسلمین، کتاب و سنت اور شریعت حقہ کے مطابق ہے، دوسری طرف وہ پیچھے کی طرف لے جانے اور ایک بڑے گروہ کے علوم و تحقیقات پر خط نسخ پھیرنے کے بجائے ایک ایسی چیز کا اضافہ کرتا ہے، جس سے نصوص شرعیہ، اصولِ قطعیہ اور سیرِ انفُس و آفاق کے آخری کشوفات و تحقیقات میں مطابقت پیدا ہو جاتی ہے۔

ذاتی تجربہ و مشاہدہ

اس تمہید کے بعد حضرت مجدد کے چند بلند پایہ مکتوبات کے (جو زیادہ واضح اور سہل الفہم ہیں) اقتباسات پڑھئے:۔

اپنے روحانی ارتقاء اور وحدۃ الوجود کے مشرب سے وحدۃ الشہود تک پہونچنے کا حال اپنے ایک اہل تعلق "شیخ صوفی" کو ایک خط میں لکھتے ہیں:۔

"مخدوم مکرم! کمسنی سے اس فقیر کا اعتقاد اہل توحید کا مشرب تھا، فقیر کے والد قدس سرہٗ ظاہراً اسی مشرب پر تھے، اور مستقلاً اسی طریق سے اشتغال رکھتے تھے، ....

بحکم "ابن الفقیہ نصف الفقیہ" فقیر کو بھی اس نسبت سے علمی طور پر حظ وافر حاصل تھا، اور وہ اس میں بڑی لذت پاتا تھا، یہاں تک کہ حق سبحانہ و تعالیٰ نے محض اپنے کرم سے ارشاد پناہ، حقائق و معارف آگاہ مؤید الدین شیخ راشد رہنمائے راہ خدا محمد الباقی قدس سرہٗ کی خدمت میں پہونچایا، اور آں جناب نے اس فقیر کو طریقۂ علیہ نقشبندیہ کی تعلیم دی، اور اس کے

حال پر توجہ بلیغ ملحوظ رکھی، اس طریق علیہ کے اشتغال و ممارست کے بعد تھوڑی مدت میں اس پر توحید وجودی کا انکشاف ہوا، اور اس انکشاف میں ایک طرح کا غلو پیدا ہو گیا، اس مقام کے علوم و معارف کا بکثرت فیضان ہوا، اور اس مرتبہ کے دقائق میں شاید ہی کوئی بات رہی ہو جو منکشف نہ کر دی گئی ہو۔

شیخ محی الدین ابن عربی کے نازک و دقیق علوم جیسا چاہئے تھا، سامنے آئے اور تجلیِ ذاتی جس کو صاحبِ فصوص نے بیان کیا ہے، اور اس کا وہ انتہائی عروج حاصل ہوا جس کے متعلق وہ کہتے ہیں کہ "مابعد ھذا الا العدم المحض" یہ بھی مشرف کیا گیا، اور اس تجلی کے وہ علوم و معارف جس کو شیخ خاتم الولایت کے ساتھ مخصوص سمجھتے ہیں، تفصیل علم میں آئے، اس توحید میں سکر و غلبۂ حال اس حد تک پہونچا کہ اپنے بعض عرائض میں جو حضرت خواجہ کو لکھے تھے، ایسے سکر کے اشعار لکھ دیئے۔

اس حال نے مدت مدید تک طول کھینچا اور مہینوں سے برسوں کی نوبت آئی کہ ناگاہ حضرت حق کی عنایت بے غایت نے دریچۂ غیب سے منہ نکالا، وہ عرصۂ ظہور میں آئی اور بے چونی و بے چگونی "لیس کمثلہ شئی" کے چہرہ پر جو پردہ پڑا تھا، اس کو ہٹا دیا اور سابق کے وہ علوم جو اتحاد اور وحدۃ الوجود کی خبر دیتے تھے، روبزوال ہوئے، اور احاطہ اور سریان اور قرب و معیتِ ذاتی جو اس مقام میں منکشف ہوئی تھی، روپوش ہو گئی، اور یقین الیقین سے معلوم ہو گیا کہ صانع جل شانہ، اس عالم کے ساتھ ان نسبتوں میں سے کوئی نسبت نہیں رکھتا، اس کا احاطہ و قرب علمی ہے، جیسا کہ اہل حق کا عقیدہ ہے، "شکر اللہ سعیھم" وہ پاک ذات کسی چیز کے ساتھ متحد نہیں، وہ بے چون و بے چگون ہے، اور عالم سراسر اس داغ سے داغدار ہے، جو بے کیف ہے وہ باکیف کا عین اور مثل کیسے کہا جا سکتا ہے، واجب کو عین ممکن کیسے کہہ سکتے

ہیں؟ قدیم عین حادث کبھی نہیں ہو سکتا، ممتنع العدم عین جائز العدم نہیں ہو سکتا، انقلاب حقائق محال ہے عقلاً و شرعاً اور ایک کا دوسرے پر محمول کرنا کبھی صحیح نہیں ہو سکتا، اصلاً و راساً، تعجب ہے کہ شیخ محی الدین اور ان کے تابعین، ذات واجب تعالٰی کو مجہول مطلق کہتے ہیں، اور اس کو کسی حکم کا محکوم علیہ نہیں سمجھتے، پھر اس کے باوجود احاطۂ ذاتی اور قرب و معیت ذاتی کو ثابت کرتے ہیں، اس بارے میں صحیح بات وہی ہے، جو علماء اہل سنت نے کہی ہے کہ سارا معاملہ قرب علمی اور احاطۂ علمی کا ہے۔

مشرب توحید وجودی کے منافی ان علوم و معارف کے حصول کے زمانہ میں اس فقیر پر سخت اضطراب کا زمانہ گذرا اس لئے کہ وہ اس توحید سے بالاتر کسی اور امر کو نہیں سمجھتا تھا وہ بڑے تضرع و زاری کے ساتھ دعا کرتا تھا کہ یہ معرفت زائل نہ ہو، یہاں تک کہ سارے حجابات جو اس حقیقت پر پڑے ہوئے تھے، اٹھ گئے اور حقیقت نفس الامری منکشف ہو گئی، اور معلوم ہوا کہ عالم اگرچہ اللہ تعالٰی کے کمالات صفاتی کے لئے آئینہ کی حیثیت رکھتا ہے، لیکن مظہر (آئینہ میں جو عکس پڑ رہا ہے) وہ عین ظاہر (صاحب عکس) نہیں اور سایہ اپنی اصل کا (جس کا وہ سایہ ہے) عین نہیں ہو سکتا، جیسا کہ توحید وجودی کے قائلوں کا مسلک ہے۔

اس مسئلہ کو ایک مثال سے واضح کیا جاتا ہے، مثلاً ایک جامع علوم و فنون عالم کی خواہش ہوئی کہ وہ اپنے کمالات گوناگوں کو عرصۂ ظہور میں لائے، اور اپنے مخفی محاسن و کمالات کو منظر عام پر لائے، تو اس نے حروف و اصوات کی ایجاد کی تاکہ ان کے آئینوں میں اپنے کمالات مخفی کو ظاہر کرے، ایسی صورت میں یہ نہیں کہا جا سکتا کہ یہ حروف و اصوات جو ان کمالات مخفی کی جلوہ گاہ اور آئینہ ہیں، ان کمالات کا عین یا ان کمالات کو محیط ہیں، یا ان کے قریب ہیں، یا معیت ذاتیہ رکھتے ہیں، بلکہ ان کے درمیان وہی نسبت ہو گی جو دال و مدلول کے

درمیان ہوتی ہے، حروف واصوات ان کمالات کی دلیل ہونے سے زیادہ اور کچھ نہیں، اور جو نسبت پیدا ہوئی ہے، وہ وہمی اور تخیلی ہے، فی الحقیقت ان نسبتوں (عینیت، اتحاد، احاطۂ قرب، معیت بالذات) میں سے کوئی بھی نسبت ثابت نہیں، لیکن چونکہ ان کمالات اور ان حروف واصوات کے درمیان ظاہر و مظہر اور مدلول و دال ہونے کی نسبت متحقق ہے، اس وجہ سے بعض لوگوں کو بعضے عوارض کی بنا پر ان وہمی نسبتوں کا حصول ہو جاتا ہے لیکن نفس الامر میں وہ کمالات ان تمام نسبتوں سے معرّا و مبرّا ہیں، حق اور خلق کے درمیان بھی اس دالّیت و مدلولیت اور ظاہریت و مظہریت کے سوا کوئی علاقہ نہیں ....

بعض حضرات کو مراقبۂ توحید کی کثرت ان وہمی احکام کے لگانے کے باعث ہو جاتی ہے، ان مراقبات کی صورت قوت خیالیہ میں منقش ہو جاتی ہے، بعض دوسرے لوگوں کو علم توحید اور اس کے اعادہ و تکرار سے ان احکام کا ایک طرح کا ذوق حاصل ہو جاتا ہے، بعض لوگوں کے اس طرف مائل ہونے کا سبب (اور وحدۃ الوجود کے قائل ہونے کا باعث) غلبۂ محبت ہے، اس لئے کہ محبوب کی محبت کے غلبہ کی بنا پر محب کی نظر سے غیر محبوب نکل جاتا ہے، اور وہ محبوب کے سوا کسی کو نہیں دیکھتا، واقعہ یہ نہیں ہے کہ نفس الامر میں غیر محبوب کا وجود نہیں ہے، اس لئے کہ یہ مخالف حسّ و عقل و شرع ہے، اور کبھی یہی محبت احاطہ و قرب ذاتی کا حکم لگانے پر آمادہ کرتی ہے، .... اور توحید کی یہ قسم پہلی دونوں قسموں سے اعلیٰ ہے، اور احوال کے دائرہ میں داخل ہے، اگرچہ نفس الامر کے مطابق اور عقل کے موافق نہیں ہے، شریعت اور نفس الامر کے ساتھ اس کی تطبیق کی کوشش تکلف محض ہے، غایت مافی الباب یہ خطائے کشفی ہے، جو خطائے اجتہادی کا حکم رکھتی ہے کہ ملامت و عتاب اس سے اٹھ جاتا ہے بلکہ ایک حیثیت سے حال و مغلوبیت ہونے کی وجہ سے اس کی تصویب کی جا سکتی ہے۔[1]

[1] مکتوب ۳۱، ۱، بنام شیخ صوفی۔

توحید شہودی

ایک دوسرے مکتوب میں جو شیخ فرید بخاری کو لکھا گیا ہے، تحریر فرماتے ہیں:۔

"وہ توحید جو سلوک کے دوران حضرات صوفیاء کو حاصل ہوتی ہے اس کی دو قسمیں ہیں، توحید شہودی و توحید وجودی، توحید شہودی نام ہے ایک دیکھنے کا یعنی سالک کا مشہود سوائے ایک کے نہ ہو، اور توحید وجودی نام ہے ایک کو موجود جاننے کا اور غیر کو معدوم سمجھنے کا۔"

آگے چل کر فرماتے ہیں:۔

"مثلاً ایک شخص کو آفتاب کے وجود کا یقین پیدا ہو گیا، اس یقین کا غلبہ اس بات کو مستلزم نہیں ہے کہ ستاروں کو اس وقت منتفی و معدوم جانے لیکن جس وقت کہ وہ آفتاب کو دیکھے گا ستاروں کو نہ دیکھے گا، اس کا مشہود سوائے آفتاب کے کوئی نہ ہوگا، اور جس وقت وہ ستاروں کو نہیں دیکھے گا، اس وقت بھی وہ جانے گا کہ ستارے معدوم نہیں ہیں، بلکہ وہ جانے گا کہ وہ ہیں لیکن مستور ہیں، اور آفتاب کی روشنی کے پرتو اور غلبہ سے مغلوب ہیں۔"[1]

آگے لکھتے ہیں:۔

"حضرت قبلہ گاہی حضرت خواجہ باقی باللہؒ کچھ عرصہ تک توحید وجودی کا مشرب رکھتے تھے، انھوں نے اپنے رسائل و مکتوبات میں اس کا اظہار بھی فرمایا ہے، لیکن آخر میں کمال عنایت خداوندی نے ان کو اس مقام سے ترقی عطا فرمائی اور ایسی شاہراہ پر ڈال دیا، جس سے اس معرفت کی تنگی سے خلاصی حاصل ہو گئی۔"[2]

ایک مکتوب میں شیخ اکبر اور ان کے متبعین کا مسلک بیان کرتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں کہ

---

[1] مکتوب ۴۳/۱ بنام شیخ فرید بخاری۔ [2] ایضاً۔

"وہ وحدۃ الوجود کے قائل ہیں، ان کا خیال ہے کہ خارج میں ایک ہی موجود ہے، اور بس! اور وہ ذات حق ہے، عالم کا خارج میں قطعاً کوئی وجود نہیں، البتہ وہ اس کے ثبوت علمی کے قائل ہیں، اور کہتے ہیں کہ "الأعیان ماشمت رائحۃ الوجود" (یعنی اشیاء خارجی نے ہستی اور وجود کی بو کبھی نہیں سونگھی ہے) وہ عالم کو حق سبحانہ تعالےٰ کا ظل سمجھتے ہیں، لیکن ان کے نزدیک یہ وجود ظلی محض مرتبۂ حس میں ہے، نفس الامر اور خارج میں عدم محض ہے۔"[1]

اسی مکتوب میں وحدۃ الوجود سے اپنی ترقی کی حکایت سناتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں:۔

"راقم سطور اولاً توحید وجودی کا عقیدہ رکھتا تھا، زمانۂ طفولیت سے اس کو اس توحید کا علم حاصل تھا، اور اس کے دل میں اس کا یقین راسخ تھا، اگرچہ اس معاملہ میں اس وقت صاحب حال نہ تھا، اس نے راہ سلوک پر قدم رکھا تو اول (توحید وجودی) کا طریق منکشف ہوا اور اس نے مدت تک اس مقام کے منازل و مراتب میں جولانی کی، اور بہت سے علوم جو اس مقام کے مناسب تھے، اس پر فائز ہوئے، اور وہ مشکلات وواردات جو ارباب توحید پر وارد ہوتے ہیں، وہ ان مکاشفات اور علوم فیضانی سے حل ہوئے، ایک مدت کے بعد دوسری نسبت کا اس فقیر پر غلبہ ہوا، اور اس غلبہ کی حالت میں اس کو توحید وجودی کے بارے میں توقف لاحق ہوا، لیکن یہ توقف حسن ظن کے ساتھ تھا، انکار کے ساتھ نہیں، مدت تک وہ متوقف رہا، آخرالامر معاملہ انکار تک پہونچ گیا، اور اس کو دکھایا گیا کہ یہ مرتبہ (وحدت وجود کی منزل) فروتر ہے، اور وہ مقام ظلّیت تک پہونچا جو اس سے بالاتر ہے، اس انکار کے معاملہ میں وہ بے اختیار تھا، وہ نہیں چاہتا تھا کہ اس مقام سے باہر نکلے اس لئے کہ بڑے بڑے مشائخ اسی مقام پر طرح اقامت ڈال چکے تھے، لیکن جب وہ مقام ظلّیت تک

---

[1] مکتوب ۱۶۰ بنام یار محمد الجدید البدخشی الطالقانی۔

پہونچا، اور اس نے اپنے کو اور عالم کو ظل پایا تو اس کو یہ آرزو ہوئی کہ اس کو اس مقام سے جدا نہ کیا جائے اس لئے کہ وہ کمال وحدۃ الوجود ہی میں سمجھتا تھا، اور یہ مقام فی الجملہ اس سے مناسبت رکھتا ہے لیکن تقدیری بات کہ کمال عنایت اور غریب نوازی سے اس کو اس مقام سے بھی اوپر لے جایا گیا، اور مقام عبدیت تک پہونچا یا گیا، اس وقت اس مقام کا کمال نظر میں آیا، اور اس کی بلندی واضح ہوئی اور وہ مقامات گذشتہ سے توبہ و استغفار کرنے لگا، اگر اس عاجز کو اس راستہ تک نہ لے جاتے اور ایک مقام کی دوسرے مقام پر فوقیت نہ ظاہر کرتے، تو وہ اس مقام میں اپنا تنزل سمجھتا، اس لئے کہ اس کے نزدیک توحید وجودی سے بالاتر کوئی مقام نہ تھا،" وَاللّٰهُ يَقُوْلُ الْحَقَّ وَهُوَ يَهْدِي السَّبِيْلَ "[1]

شیخ اکبر کے بارہ میں منصفانہ و معتدل مسلک

اس اختلاف کے باوجود شیخ اکبر کے بارے میں اپنا مسلک بیان کرتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں:۔

"یہ فقیر شیخ محی الدین کو مقبولین میں سمجھتا ہے، لیکن ان کے وہ علوم (جو جمہور کے عقائد اور کتاب و سنت کے ظواہر کے خلاف ہیں) ان کو خطا اور مضر سمجھتا ہے .... لوگوں نے ان کے بارے میں افراط و تفریط کی راہ اختیار کی ہے، اور وہ میانہ روی سے دور جا پڑے ہیں، ایک جماعت شیخ پر زبان طعن و ملامت دراز کرتی ہے، اور ان کے معارف و حقائق کی بھی تغلیط کرتی ہے، دوسری جماعت نے شیخ کی مکمل تقلید اختیار کی ہے، اور ان کے تمام معارف و حقائق کو برسرِ حق سمجھتی ہے، اور دلائل و شواہد سے ان کی حقیقت ثابت کرتی ہے، اس میں شک نہیں کہ دونوں فریقوں نے افراط و تفریط کی راہ اختیار کی ہے، اور وہ میانہ روی سے دور جا پڑے ہیں ...... عجیب معاملہ ہے کہ

---

[1] مکتوب ۱۶۰ بنام شیخ یار محمد الجدید البدخشی الطالقانی۔

شیخ محی الدین مقبولین حق میں نظر آتے ہیں، اور ان کے اکثر معارف و تحقیقات جو اہل حق کے خلاف ہیں خطا و ناصواب نظر آتے ہیں[۱]۔"

ایک جگہ اپنا اور توحید وجودی کے منکرین و مخالفین کا فرق بیان کرتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں کہ:

"اس فقیر کا توحید وجودی کے قائلین سے اختلاف کشف و شہود کی راہ سے ہے، علماء ان امور (وحدۃ الوجود اور غیر اللہ کے وجود کی مطلق نفی) کی قباحت کے قائل ہیں، اس فقیر کو توحید وجودی کے ان اقوال و احوال کے حسن میں کوئی اشکال نہیں بشرطیکہ ان سے عبور واقع ہو جائے[۲]۔"

توحید وجودی کی مخالفت کی ضرورت

یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ جب توحید وجودی سلوک کی ایک منزل اور سالک کے لئے ایک عبوری مرحلہ ہے جس پر سالکین و منتہیین کا ایک جم غفیر ہر زمانہ میں پہونچا ہے، ان میں سے ایک بڑی جماعت اس مرحلہ پر پہونچ کر رک گئی، اور کسی کو توفیق الٰہی نے اس سے آگے بڑھا کر توحید شہودی تک پہونچا دیا، تو اس میں کیا قباحت ہے، اور حضرت مجدد اس شد و مد سے اس کی مخالفت کیوں فرماتے ہیں، اور اس کے مقابلہ میں اس زور و شور سے توحید شہودی کے اثبات اور اس کی ترجیح پر کیوں خامہ فرسائی فرماتے ہیں؟

اس کا جواب یہ ہے کہ توحید وجودی کے قائلین اور اس کے مبلغوں اور داعیوں میں (حضرت مجدد صاحب کے زمانہ میں بھی) ایک بڑی تعداد ایسی پیدا ہو گئی تھی جس نے اپنے کو قیود شرعی اور فرائض و واجبات اسلامی سے آزاد سمجھ لیا تھا، اور یہ سمجھ کر کہ جب سب

---

[۱] مکتوب ۲۶۶/۱ بنام حضرت خواجہ عبد اللہ و خواجہ عبید اللہ [۲] مکتوب ۴۲/۲ بنام خواجہ جمال الدین حسین۔

حق کی طرف سے ہے، بلکہ سب حق ہے، تو پھر حق و باطل کی تفریق اور کفر و ایمان کے امتیاز کا کیا سوال؟[1] انھوں نے شریعت اور اس پر عمل درآمد کو عوام کے درجہ کی ایک چیز سمجھ لیا تھا، ان کے نزدیک مقصود اصلی (توحید وجودی) اس سے بلند تر مقام اور اس سے آگے کی منزل تھی جو کاملین راہ اور واصلین بارگاہ کو حاصل ہوتی ہے، دسویں صدی ہجری میں جو حضرت مجدد کے ذہنی و روحانی ارتقاء کا زمانہ ہے اس توحید وجودی کا رنگ ہندوستان پر ایسا چھایا ہوا تھا کہ عارفانہ ذوق رکھنے والے شعراء سب اسی کے گیت گاتے تھے، اور کفر و ایمان کو مساوی قرار دیتے تھے، بلکہ بعض اوقات کفر کو ایمان پر ترجیح دینے کی سرحد میں داخل ہو جاتے تھے، اس زمانہ میں ایسے بہت سے اشعار زبان زد خلائق تھے، جن میں صاف صاف یہ مضمون بیان کیا گیا ہے، مثلاً ؎

کفر و ایمان قرین یک دگرند

ہر کہ را کفر نیست ایمان نیست

پھر اس کی تشریح کرتے ہوئے ایک کتاب میں لکھا گیا ہے۔

"پس ازیں معنی اسلام در کفر ست و کفر در اسلام، یعنی "تُولِجُ اللَّيْلَ فِي النَّهَارِ وَتُولِجُ النَّهَارَ فِي اللَّيْلِ" مراد از لیل کفر ست و مراد از نہار اسلام[2]۔

دوسری جگہ یہ شعر نقل کرتے ہیں ؎

عشق را با کافری خویشی بود

کافری در عین درویشی بود

---

[1] تیرہویں صدی ہجری کے اردو کے مشہور و مقبول شاعر مرزا غالب نے انہی لوگوں کی ترجمانی اپنے شعر میں کی ہے ؎

ہم موحد ہیں ہمارا کیش ہے ترک رسوم ملتیں جب مٹ گئیں اجزائے ایماں ہو گئیں

[2] رسالہ عشقیہ ص ۱۷

آگے چل کر لکھتے ہیں :۔

"العلم حجاب اکبر گشت، مراد ازیں علم عبودیت کہ حجاب اکبرست، ایں حجاب اکبر اگر از میاں مرتفع شود کفر بہ اسلام و اسلام بہ کفر آمیزد و عبارت خدائی و بندگی برخیزد۔"[1]

مجدد صاحب کے لئے جن کو اللہ تعالٰی نے حمیّت دینی اور غیرت فاروقی کا حصۂ وافر عطا فرمایا تھا، اور جن کی ذات سے حدیث مشہور کی پیش گوئی کا ظہور ہونا مقدر ہو چکا تھا جس میں فرمایا گیا ہے کہ :۔

یحمل ھذا العلم من کل خلف	اس علم کے ہر نسل میں ایسے عادل و متقی حامل
عدولہ ینفون عنہ تحریف	و وارث ہوں گے جو اس دین سے غلو پسند
الغالین وانتحال المبطلین	لوگوں کی تحریف، اہل باطل کے غلط انتساب
وتاویل الجاھلین۔[2]	اور دعوے اور جاہلوں کی دور از کار تاویلات
	کو دور کرتے رہیں گے۔

یہی چیز اس عقیدہ اور دعوت کی علمی و دینی احتساب کا باعث ہوئی جس کی تبلیغ و اشاعت میں اس عصر میں اور خاص طور پر ہندوستان میں پورے جوش و خروش اور عمومیت اور اطلاقیت سے کام لیا جا رہا تھا اور مجدد صاحب مشاہدہ فرما رہے تھے کہ اس کے اثر سے شریعت کی گرفت طبیعتوں پر سے ڈھیلی اور اس کا تقدس و احترام نگاہوں میں کم ہوتا جا رہا تھا، مجدد صاحب خود اپنے ایک مکتوب میں تحریر فرماتے ہیں :۔

اکثر ابنائے ایں وقت بعضے بہ تقلید و	اکثر ابنائے زمانہ بعض تقلید کی
بعضے بمجرد علم و بعضے دیگر بعلم ممتزج	بنا پر بعض محض اپنے علم کے زور پر

[1] رسالہ عشقیہ ص ۷۳ [2] مشکوٰۃ فصل ثانی۔ (کتاب العلم)

بذوق دلوفی الجملہ وبعضے بالحاد و
زندقہ دست بدامن ایں توحید وجودی
زدہ اند وہمہ راازحق میدانند بلکہ
حق میدانند وگردنہائے خود را
از ربقۂ تکلیف شرعی بالجملہ میکشانید
ومداہنات دراحکام شرعیہ مینما بند
وباین معاملہ خوشوقت وخورسند اند
واتیان اوامر شرعیہ رااگراعتراف
دارند طفیلے میدانند مقصود اصلی
ورائے شریعت خیال می کنند حاشا و
کلاثم حاشا وکلا، نعوذ باللہ سبحانہ
من ھذا الاعتقاد السوء۔[1]

اور بعض ایسے علم کی بنا پر جس میں ذوق
کی شمولیت ہے (خواہ کسی محدود مقدار
میں) اور بعض نے الحاد وزندقہ کی
بنا پر اس توحید وجودی کا دامن تھام
لیا ہے، اور وہ ہر چیز کو حق کی طرف سے
جانتے ہیں بلکہ حق ہی جانتے ہیں اور
وہ اپنی گردنوں کو کسی نہ کسی ترکیب سے
تکلیف شرعی کے طوق سے آزاد کر لیتے
ہیں، اور احکام شرعیہ کے بارے میں
تساہل ومداہنت سے کام لیتے ہیں
اور اس معاملہ میں بڑے مسرور اور
مطمئن نظر آتے ہیں، یہ لوگ اوامر شرعیہ
پر عمل کرنے کی ضرورت کا اگر اعتراف
بھی کرتے ہیں تو اس کو ضمنی اور تبعی بات
سمجھتے ہیں، وہ مقصود اصلی شریعت
کے ماوراء خیال کرتے ہیں، حاشا وکلا
ثم حاشا وکلا ہم اللہ تعالیٰ سے ایسے
اعتقاد فاسد سے پناہ مانگتے ہیں۔

---

[1] مکتوبات دفتر اول مکتوب ۲۴۳ بنام شیخ فرید بخاری۔

اسی مکتوب میں ایک دوسرے موقع پر تحریر فرمایا ہے :-

دریں زمان بسیارے ازیں طائفہ کہ بزی صوفیاں خود را وامی نمایند توحید وجودی را شائع ساختہ اند و کمال را جز آں نمی دانند و بعلم از عین باز ماندہ اند و آں اقوال مشائخ را بمعانی متخیلہ خود فرود آوردہ مقتدائے روزگار خود ساختہ اند و بازار کاسد خود را باین تخیلات رائج داشتہ اند[1] ۔

اس زمانہ میں اس گروہ کے بہت سے ایسے لوگ جو صوفیوں کے لباس میں اپنے کو ظاہر کرتے ہیں توحید وجودی کا برسرِ عام اعلان کرنے لگے ہیں، اور اس کے سوا وہ کسی چیز کو کمال نہیں جانتے، علم کے ذریعہ حقیقت سے دور رہ گئے ہیں، مشائخ کے اقوال کو اپنے ذہن کے پیدا کئے ہوئے مضامین پر اتار لائے ہیں، اور ان کو اپنا مقتدیٰ بنا رکھا ہے، اور ان تخیلات سے اپنے بازار کاسد کو گرم کر رکھا ہے۔

مجدد صاحب کی انفرادیت و امتیاز

مجدد صاحب کا تجدیدی کارنامہ محض یہ نہیں ہے کہ انھوں نے وحدۃ الوجود کے مقبول عام نظریہ اور سکۂ رائج الوقت کے متعلق ثابت کر دیا کہ وہ "نقد کامل عیار" اور سلوک و معرفت کی منزل آخری نہیں ہے، بلکہ اس باب میں ان کی انفرادیت و امتیاز کا راز یہ ہے کہ انھوں نے اس پر اپنے ذاتی تجربہ اور مشاہدہ کی روشنی میں تنقید کی اور

---

[1] ایضاً۔

یہ ثابت کردیا کہ وہ اس دریا میں غوطہ لگا کر اور اس کی تہہ تک پہونچ کر ابھرے ہیں، اور تائیدالٰہی سے انھوں نے اپنے زورق معرفت وتحقیق کو ساحل مراد تک پہونچایا ہے، اور اس باب میں مشکل سے ان کا کوئی ہمسر اور ہمسفر ملے گا، مغربی مصنف پیٹر ہارڈی (PETER HARDY) نے جوان مسائل میں سند کا درجہ نہیں رکھتا بہر حال یہ صحیح لکھا ہے کہ:-

"شیخ احمد سرہندی کی بڑی کامیابی یہی ہے کہ انھوں نے ہندی اسلام کو متصوفانہ انتہا پسندی سے خود تصوف کے ذریعہ نجات دلائی، شاید اس کی وجہ یہ ہو کہ جس نظریہ کی انھوں نے تردید کی اس کے مطلب ومفہوم اور قدر وقیمت کا ان کو ذاتی طور پر عمیق ادراک تھا[1]"

مجدد صاحب کے بعد توحید وجودی کے بارے میں مشائخ وعلماء کا "مصالحانہ" رویہ

قبل اس کے کہ اس باب کو ختم کیا جائے، ایک غیر جانبدار مورخ کی حیثیت سے اس حقیقت کا اظہار بھی ضروری معلوم ہوتا ہے کہ حضرت مجدد کے بعد (ان کے اس خاص سلسلہ کو چھوڑ کر جو حضرت خواجہ محمد معصوم کے ذریعہ ہندوستان اور ہندوستان کے باہر پھیلا) وحدۃ الوجود کے بارے میں وہ واضح قطعی اور فیصلہ کن رجحان اور وحدۃ الشہود پر وہ یقین واذعان باقی نہیں رہا، جس کا مجدد صاحب نے علم بلند کیا تھا، اور جس پر وہ علی وجہ البصیرۃ قائم اور اس کے داعی تھے، ان کی رحلت کے بعد ہی سے تصوف ومعرفت کے حلقوں میں اور بعض ان حلقوں میں بھی جو اپنا

---

[1] SOURCES OF INDIAN TRADITION, N.Y. P-449

ان کی طرف انتساب کرتے تھے، وحدۃ الوجود اور وحدۃ الشہود کے درمیان مفاہمت و مطابقت کا رجحان نمایاں ہوگیا، اور بعض بلند پایہ علماء اور محققین نے یہاں تک لکھ دیا کہ "یہ اختلاف محض نزاع لفظی تھا" بعض حضرات نے یہاں تک لکھا کہ مجدد صاحب سے اس بارہ میں تسامح ہوا اور شیخ اکبر کی تمام تصنیفات ان کی نظر سے نہیں گذریں" اسی بنا پر سلسلۂ مجددیہ کے نامور شیخ حضرت مرزا مظہر جانِ جاناں رحمۃ اللہ علیہ کے ایماء پر ان کے مرید رشید مولانا غلام یحییٰ بہاری (م ۱۱۸۰ھ) نے کلمۃ الحق کے نام سے ایک کتاب لکھی جس میں مجدد صاحب کی تحقیق اور مسلک کو واشگاف طریقہ پر بیان کیا، اور اس تطبیقی رجحان کی تردید کی جو خود سلسلۂ مجددیہ کے بعض حلقوں میں نظر آنے لگا تھا۔

حضرت سید احمد شہید مجدد صاحب کے نقش قدم پر

اس سلسلۂ عالیہ میں مجدد صاحب کے بعد اگر کسی شیخ طریقت اور عارف و محقق کے یہاں وحدۃ الشہود کا واضح اور بے آمیز نظریہ اور تلقین پائی جاتی ہے، اور وہ اس بارے میں حضرت مجدد کے نقش قدم پر نظر آتے ہیں، تو وہ سلسلہ مجددیہ احسنیہ[1] کے مشہور شیخ طریقت داعی الی اللہ اور مجاہد فی سبیل اللہ حضرت سید احمد شہیدؒ رائے بریلوی (ش ۱۲۴۶ھ) ہیں[2]، جن کے یہاں وحدۃ الوجود کی کوئی پرچھائیں اور

---

[1] حضرت سید آدم بنوری خلیفہ حضرت مجدد کا مخصوص سلسلہ جو سلسلۂ آدمیہ اور سلسلۂ احسنیہ کہلایا جاتا ہے۔

[2] یہ ان کے خاندانی ذوق کا نتیجہ بھی ہوسکتا ہے کہ ان کے جدِّ رابع حضرت شاہ سید علم اللہ، (باقی صفحہ ۲۹۰ پر)

تاویل واعتذار کا کوئی عکس نظر نہیں آتا۔[1]

(باقی ص۲۸۹ کا) حضرت سید آدم بنوری کے خلیفۂ ارشد ہیں اور خود ان کے مقام تحقیق واجتہاد کا بھی نتیجہ ہو سکتا ہے جس پر وہ فائز تھے۔

[1] ملاحظہ ہو "صراط مستقیم" ہدایت رابعہ دربیان ثمرات حب عشقی افادہ ۱ ص ۱۲ مطبوعہ مکتبہ سلفیہ لاہور۔

باب ہفتم

اکبر سے جہانگیر تک

سلطنت کو راہ راست پر لانے کے لئے آپ کی خاموش جدوجہد

عہد اکبری و جہانگیری کے جرأتمند اور حق گو علماء و مشائخ

قبل اس کے کہ ہم حضرت مجدد کی ان مساعی جمیلہ کا تذکرہ کریں جنھوں نے سلطنت کا رخ موڑ دیا، اس حقیقت کا اظہار ضروری اور قرین قیاس سمجھتے ہیں کہ دور اکبری کے متعلق یہ تخیل صحیح نہیں ہے کہ ہندوستان میں ایک سرے سے دوسرے سرے تک سناٹا تھا، اور اکبر کو اس کے طرز عمل پر ٹوکنے والا اور حدیث :-

من رأى منكم منكرا فليغيره بيده فان لم يستطع فبلسانه، فان لم يستطع فبقلبه وذلك اضعف الايمان[1] ۔	تم میں سے جو کوئی خلاف شرع کام یا امر منکر دیکھے تو اس کو اپنے ہاتھ سے بدل دینا چاہئے اگر ایسا نہ کرسکے تو زبان سے (اس کا انکار و تردید کرنی چاہئے) اگر ایسا بھی نہ ہوسکے تو دل سے اس کو برا سمجھنا چاہئے اور یہ ایمان کا سب سے کمزور درجہ ہے۔

---

[1] صحیحین

کے دوسرے اور تیسرے درجہ پر بھی کسی نے عمل نہیں کیا۔

عہد اکبری کے حسب ذیل حضرات کے متعلق تاریخ اور تذکروں میں شہادت ملتی ہے کہ انھوں نے اپنے اپنے دائرہ میں رہ کر اور اپنے امکان بھر اس صورت حال پر اپنی ناگواری اور اپنے اسلامی جذبات کا اظہار کیا۔

شیخ ابراہیم محدث اکبر آبادی (م ۱۰۰۱ھ) ایک مرتبہ اکبر کے عبادت خانہ میں اس کی دعوت پر آئے اور بادشاہ کے لئے غیر شرعی آداب و تعظیم بجا نہیں لائے انھوں نے اپنی تقریر میں ترغیب و ترہیب سے کام لیا اور جلال شاہی سے ذرا مرعوب نہیں ہوئے، شیخ حسین اجمیری جنھوں نے ۱۰۰۹ھ کے بعد وفات پائی، اکبر کے اجمیر آنے پر ناراض ہو کر وہاں سے چلے گئے، اکبر نے ان کو خانقاہ اور درگاہ کی تولیت سے معزول کیا اور حجاز چلے جانے کا حکم دیا، ہندوستان واپسی پر بھی انھوں نے سجدۂ تعظیمی نہیں کیا، بادشاہ ناراض ہو گیا اور ان کو بکھر کے قلعہ میں قید کر دیا، جہاں وہ کئی سال تک رہے، رہائی پر بھی وہ آداب شاہی سے محترز رہے، اور انھوں نے عطیہ سلطانی قبول کرنے سے انکار کیا، شیخ سلطان تھانیسری جو مقربین دربار میں سے تھے، اور جنھوں نے بادشاہ کے حکم سے مہابھارت کا فارسی میں ترجمہ کیا تھا، ذبح گاؤ کے الزام میں بادشاہ کے معتوب بنے اور ان کو بکھر جلا وطن کر دیا گیا، پھر عبدالرحیم خان خاناں کی سفارش پر ان کو تھانیسر قیام کی اجازت دی گئی اور کروڑ گیری (تحصیل وصول) پر مامور کیا گیا، کچھ عرصہ بعد بادشاہ کو پھر ان کی شکایات پہونچیں جو ان کے اسلامی طرز عمل پر مبنی تھیں، اور اس نے سزائے موت کا حکم دیا یہ واقعہ ۱۰۰۷ھ[1] کا ہے۔

---

[1] منتخب التواریخ، آپ حضرت مجدد کے خسر تھے۔

اس سلسلہ میں سب سے جرأتمندانہ اور مردانہ اقدام شہباز خاں کنبوہ (م ۱۰۰۰ھ) کا ہے، جو اکبر کے امرائے کبار میں تھے، اور آخر میں میر بخشی کے عہدہ سے سرفراز ہوئے، وہ بادشاہ کے سامنے کلمۂ حق کہنے سے کبھی باز نہیں رہے، نہ انھوں نے داڑھی کترائی، نہ شراب کے قریب گئے نہ اکبر کے ایجاد کردہ دین الٰہی کی طرف میلان ظاہر کیا، شاہ نواز خاں مصنف "مآثر الامراء" کی روایت ہے کہ بادشاہ ایک دن عصر و مغرب کے درمیان فتح پور سیکری میں ایک تالاب کے کنارے سیر کر رہا تھا، شہباز خاں حاضر تھے، بادشاہ نے ان کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا اور چہل قدمی اور ان سے گفتگو میں مصروف ہو گیا، لوگوں کا خیال تھا کہ شہباز خاں بادشاہ سے اپنا ہاتھ نہیں چھوڑا سکتے، اور آج ان کی مغرب کی نماز ضرور قضا ہو گی، ان کا یہ بھی معمول تھا کہ عصر کے بعد مغرب تک کسی سے بات نہیں کرتے تھے، شہباز خاں نے جب دیکھا کہ آفتاب غروب ہو رہا ہے تو انھوں نے بادشاہ سے نماز کی اجازت مانگی، بادشاہ نے از راہ بے تکلفی کہا، مجھے تنہا نہ چھوڑو نماز قضا کر لینا، شہباز خاں نے اپنا ہاتھ چھوڑا لیا اور اپنی چادر زمین پر بچھا کر نماز کی نیت باندھ لی، نماز سے فارغ ہو کر اپنے روزمرہ کے اوراد میں مشغول ہو گئے بادشاہ ان کے سامنے کھڑا رہا اور سخت الفاظ کہتا رہا، امیر ابوالفتح اور حکیم علی گیلانی اس موقع پر موجود تھے، انھوں نے موقع کی نزاکت محسوس کی، وہ آگے بڑھے اور بادشاہ کو متوجہ کرنے کے لئے کہا کہ "آخر ہم بھی تو توجہات شاہانہ کے مستحق ہیں؟" بادشاہ کا غصہ کچھ ٹھنڈا ہوا اور وہ شہباز خاں کو چھوڑ کر ان کے ساتھ ہو گیا۔

شیخ عبدالقادر اچی بھی انہی جری لوگوں میں تھے جنھوں نے خلاف شرع امور میں بادشاہ کی موافقت نہیں کی، ایک دن بادشاہ نے افیون ان کو پیش کی انھوں نے کھانے سے انکار کر دیا، اس سے بادشاہ کو ناگواری ہوئی، ایک دن وہ عبادت خانہ میں نماز فرض کے بعد

نوافل میں مشغول تھے کہ بادشاہ محل سے برآمد ہوا اس نے کہا کہ آپ کو نفلیں اپنے گھر میں پڑھنی چاہئیں، مولانا عبدالقادر نے جواب دیا کہ حضور والا! (یہاں عبادت خانہ میں) آپ کی سلطنت نہیں ہے، بادشاہ کو بہت غصہ آیا اور کہا کہ آپ کو میری سلطنت گوارہ نہیں تو یہاں سے چلے جائیے، وہ اسی وقت شہر اُچ کی طرف روانہ ہو گئے اور عبادت اور افادۂ خلائق میں مشغول ہو گئے، انہی کے ہم نام شیخ عبدالقادر لاہوری (م ۱۰۲۲ھ) کو بھی اکبر کے حکم سے جو ان سے ان کی دینی صلابت کی بنا پر ناراض تھا، حجاز کا سفر کرنا پڑا، مرزا عزیز الدین دہلوی کوکہ (م ۱۰۳۳ھ) جو اکبر کے ہم عمر اور دودھ شریک بھائی تھے، اور جن سے اکبر کو بڑی محبت تھی، ..شرع اور دینی مسائل میں اکبر کا بالکل لحاظ نہیں کرتے تھے، اور صاف گوئی سے کام لیتے تھے، اسی بنا پر اکبر نے ان کو گجرات کی صوبیداری سے معزول کیا پھر بنگالہ اور بہار کی صوبیداری دی، اور خان اعظم کا خطاب دیا، لیکن اس تقرب کے باوجود انھوں نے سجدۂ تعظیمی، ریش تراشی وغیرہ میں بادشاہ کی موافقت نہیں کی، انہی لوگوں میں شیخ منور عبدالحمید لاہوری (م ۱۰۱۵ھ) بھی تھے، جن کو اکبر نے ۹۸۵ھ میں صدارت کے عہدہ پر مقرر کیا، لیکن وہ بھی اپنی دینی استقامت کی وجہ سے بادشاہ کے معتوب اور مورد غضب بنے، بادشاہ نے ان کے مال و املاک یہاں تک کہ کتابوں تک کے لوٹ لینے کا حکم دیا، پھر آگرہ طلب کر کے ان کو سخت قید میں رکھا، اور وہیں ان کا انتقال ہوا[1]۔

جہانگیر کی جانشینی عمل میں آئی تو عرصہ تک عہد اکبری کے رسوم و آئین جاری رہے، اسلام کی علانیہ مخالفت چھوڑ کر باقی وہی طور طریقے سلطنت میں رائج تھے، اور اس وقت تک رائج رہے، جب تک کہ جہانگیر کا خود میلان شرع محمدی کی تعظیم اور شعائر اسلام کے احترام کی طرف

---

[1] یہ سب نام اور اکبر کی مخالفت کے واقعات "نزہۃ الخواطر" ج ۵ سے اخذ کیے گئے ہیں۔

نہیں ہوا، اس دور میں بھی متعدد علماء و مشائخ نے خطرہ مول لے کر ان خلاف شرع بلکہ منافی دین و شریعت، آداب و رسوم کے ادا کرنے سے انکار کیا، شریعت کے حدود سے تجاوز کرنے پر آمادہ نہیں ہوئے، اور کلمۂ حق کہنے سے دریغ نہیں کیا، انہی میں ہندوستان کے شمال مغربی حدود کے ایک صاحب طریقت بزرگ احمد بن محمد بن الیاس حسینی غزغشتی تھے، جن کو جہانگیر نے دربار میں طلب کیا، انھوں نے آداب رسوم کے مطابق سلام و آداب بجالانے سے انکار کردیا، جہانگیر نے ان کو قلعۂ گوالیار میں قید کردیا، جہاں وہ تین سال تک رہے، پھر ۱۰۳۰ھ میں ان کو آزادی کا پروانہ ملا، اور جہانگیر ان کو اپنے ساتھ آگرہ لایا۔[1]

لیکن واقعہ یہ ہے کہ سلطنت کی بے راہ روی کی منظم مخالفت اور اس کو راہ راست پر لانے کی مکمل اور حکیمانہ کوشش کا سہرا حضرت مجدد کے سر ہے، اور حفاظت دین اور نصرت اسلام و مسلمین کا کارنامہ انہی کے لئے مقدر تھا، اور انہی نے اس کو تکمیل تک پہونچا کر ہندوستان میں وہ خاموش انقلاب برپا کیا، جس کی نظیر دوسرے اسلامی ملکوں اور سلطنتوں کی تاریخ میں ملنی مشکل ہے، اور جس کے نتیجہ میں اکبر کے بعد سلطنت مغلیہ کے تخت پر جو فرمانروا آیا وہ اپنے پیشرو سے بہتر، اسلام کی مخالفت کے جرائم سے محفوظ اور دین کے احترام اور حمیتِ اسلام میں فائق و ممتاز تھا، یہاں تک کہ اس سلسلۂ زرّیں کی تکمیل محی الدین اورنگ زیب عالمگیر کی ذات پر ہوئی۔

جہانگیر کی تخت نشینی اور مجدد صاحب کے اصلاح سلطنت کے کام کا آغاز

جلال الدین اکبر بادشاہ کا انتقال (۱۰۱۴ھ کو) ہوا، اس وقت حضرت مجدد کی عمر

[1] نزہۃ الخواطر ج ۵۔

تینتالیس[۴۳] سال کی تھی، اکبر کی سلطنت کا آخری دور جس میں ہندوستان میں اسلام کی باعزت زندگی، آزادی اور اس ملک میں غالب و با اقتدار رہنے کے لئے کھلا خطرہ پیدا ہو گیا تھا، مجدد صاحب کے روحانی تکمیل و ارتقاء کا زمانہ تھا، ارکان سلطنت سے ان کے کوئی مراسم و تعلقات نہیں تھے، اور نہ ابھی وہ وقت آیا تھا کہ وہ ان کے علوم مرتبہ، اخلاص وللّٰہیت اور باطنی کمالات سے واقف ہوں، اس لئے حقیقت میں وہ سرا ہاتھ میں نہیں آیا تھا، جس سے وہ دربار شاہی تک اپنے احساسات و تاثرات پہونچا سکتے، یا دین و آئین کے بارے میں حکومت کی عام پالیسی پر اثر انداز ہو سکتے، اس وقت فرمانروائے سلطنت کے مزاج و مذاق سرکار دربار اور نظم و نسق پر وہ لوگ حاوی تھے، جو کسی مخلص و دیندار کو بادشاہ کے قریب آنے نہیں دیتے تھے، اور انھوں نے اس کے گرد ایک ایسا آہنی حصار قائم کر رکھا تھا جس سے باہر کی تازہ اور بے آمیز ہوا کا کوئی جھونکا اور اہل ملک کی پسند و ناپسند کا کوئی اندازہ اندر نہیں آسکتا تھا، اس وقت اسلام اور مسلمانوں کا اس وسیع ملک میں جہاں ان کی آزاد سلطنتیں تسلسل کے ساتھ قائم رہ چکی تھیں، وہی حال تھا، جس کا قرآن مجید نے ان الفاظ میں نقشہ کھینچا ہے۔

ضَاقَتْ عَلَيْهِمُ الْاَرْضُ بِمَا رَحُبَتْ	زمین باوجود اپنی فراخی کے ان پر تنگی کرنے لگی، اور
وَضَاقَتْ عَلَيْهِمْ اَنْفُسُهُمْ وَظَنُّوْٓا	وہ خود اپنی جان سے تنگ آگئے، اور انھوں نے
اَنْ لَّا مَلْجَاَ مِنَ اللّٰهِ اِلَّآ اِلَيْهِ ؕ	سمجھ لیا کہ خدا (کی گرفت) سے کہیں پناہ نہیں
(التوبہ - ۱۱۸)	مل سکتی بجز اس کے کہ اسی کی طرف رجوع کیا جاوے

لیکن جہانگیر کی تخت نشینی (۱۰۱۴ھ) پر یہ صورت باقی نہیں رہی، جہانگیر کے اندر اگر (اس مخصوص تعلیم و تربیت کی بنا پر جو اس نے باپ کے زیر سایہ پائی تھی) کوئی نمایاں دینی صلاح،

تشرع، فرائض اسلام کی پابندی اور کھلا ہوا دینی رجحان نہیں پایا جاتا تھا تو اس کے اندر اسلام سے کوئی بُعد و وحشت، کسی دوسرے مذہبی فلسفہ یا قومی تہذیب سے مرعوبیت اور شیفتگی اور کسی نئے دین و آئین کے اجراء کا شوق بھی نہیں پایا جاتا تھا، دوسرے لفظوں میں اگر وہ حامی اسلام نہیں تھا تو ماحیِ اسلام بھی نہیں تھا، عام طور پر جو صاحب تخت و تاج فرمانروا عیش و عشرت کے دلدادہ ہوتے ہیں، وہ کسی مقبول عام نظام کے ازالہ اور تنسیخ اور کسی نئے نظام کے اجراء کا دردِ سر مول نہیں لیتے، وہ صرف کام و دہن کی لذت اور حکومت و اقتدار کی عزت سے سروکار رکھتے ہیں، عام طور پر دیکھنے میں آیا ہے کہ ایسے لوگوں کے اندر ان ہستیوں کے ساتھ ایک مخفی عقیدت اور احترام پایا جاتا ہے، جو اس مادی سطح سے بلند اور ان دنیاوی مظاہر و مناصب سے مستغنی ہوتے ہیں، اور ان لوگوں کے مقابلہ میں جو کسی منصب کے مدعی یا کسی نئی تحریک و فلسفہ کے داعی ہوتے ہیں، ان میں قبول حق کی زیادہ استعداد و صلاحیت پائی جاتی ہے۔

جہانگیر فرمانروایانِ سلطنت کی اسی قسم سے تعلق رکھتا تھا، اور وہ جب تختِ سلطنت پر متمکن ہوا تو اہلِ نظر نے سمجھ لیا کہ اب سلطنت کا رخ بدلنے اور تدریجی طور پر اس کو راہ راست پر لانے کا وقت آگیا ہے۔

صحیح طریق کار

اس وقت حضرت مجددؒ اور ان سب حضرات کے لئے جو علم دین اور کمال باطن سے آراستہ، خود مشغول اور سیر فی اللہ کی دولت سے مالا مال اور دینی حمیت و غیرت کے نشہ سے سرشار تھے، اس صورت حال کے سامنے جو اس وقت قلم و سلطنت پر سایہ فگن تھی، تین[۳] راستے تھے:۔

۱۔ سلطنت اور ملک کو اپنے حال پر چھوڑ کر اپنے لئے کسی ایسے گوشہ کا انتخاب، جہاں اطمینان کے ساتھ یادِ خدا میں مشغولی، طالبین کی تربیت اور ذکر و عبادت کی یکسوئی اور سرگرمی میسر آسکتی تھی، یہ وہ طرزِ عمل تھا، جو حضرت مجدد کے عہد میں بیسیوں بلکہ صدہا علماء ومشائخ نے اختیار کیا، ملک کے چپہ چپہ پر ان کی خانقاہیں تھیں، اور وہ پوری یکسوئی اور خاموشی کے ساتھ کام کر رہے تھے، اور خلق خدا کو ان سے بیش بہا روحانی وایمانی فوائد پہونچ رہے تھے۔

۲۔ ہندوستان کی برائے نام مسلم سلطنت اور اس کے فرمانروا کو (جس کو صرف مسلمان خاندان میں پیدا ہونے کا شرف حاصل تھا) اسلام کا مخالف اور معاند سمجھ کر (جس کے ثبوت کے لئے بہت سے آئین وضوابط اور ذاتی اعمال واخلاق مل سکتے تھے) اس کی اصلاح سے یکسر مایوس ہو جانا، اس کے خلاف ایک دینی محاذ قائم کر لینا، اور اسلام کا اس کو مستقل حریف اور مقابل سمجھ کر اس کی مستقل مخالفت اور اس کے خلاف صف آرائی۔

اور اگر اس سے کام نہ چلے تو دینی حمیت، جہاد و سرفروشی کا جذبہ رکھنے والے اور موجودہ صورت حال سے بیزار، معتقدین و مریدین و رفقاء کو مجتمع کرنا اور کسی فوجی وسیاسی کارروائی کے ذریعہ سلطنت میں انقلاب لانا اور تخت سلطنت پر کسی زیادہ صالح اور دیندار شخص کو (خواہ وہ خاندان مغلیہ ہی سے تعلق رکھتا ہو اور بابر کی اولاد میں ہو) بٹھانے کی کوشش کرنا جو پوری سلطنت کا رخ موڑ دے اور حالات میں یکسر تبدیلی ہو جائے۔

۳۔ ارکان سلطنت و امرائے دربار سے تعلقات پیدا کر کے اور جن سے پہلے سے تعلق ہے، اور وہ آپ کی ذات سے عقیدت اور آپ کے خلوص اور دلسوزی پر پورا اعتماد رکھتے ہیں، ان میں دینی جذبہ اور حمیت ابھار کر اور ان کے دلوں کے خاکستر میں جو ایمانی چنگاریاں

دبی ہوئی ہیں ان کو فروزاں کر کے بادشاہ کو نیک مشورہ دینے پر آمادہ کرنا اس کی رگ اسلامیت کو جو اپنے باایمان اسلاف و اجداد سے اس کو ورثہ میں ملی ہے جنبش میں لانا، اس کو اسلام کی حمایت، مسلمانوں کے مجروح دلوں کی چارہ سازی اور گزشتہ دور کی تلافی پر آمادہ کرنا، خود ہر طرح کے جاہ ومنصب سے بلکہ اس کے سایہ سے بھی دور رہنا، مکمل زہد واستغناء کا ثبوت دینا، سلطنت کو اہل سلطنت اور مناصب ومراتب کو اہل مناصب و مراتب کے حوالہ کرنا، ایسی عالی نظری اور بے لوثی کا اظہار کہ کوئی شدید سے شدید مخالف اور حاسد بھی جاہ طلبی یا حصول اقتدار کی تہمت نہ لگا سکے اور کوئی مخالفانہ سازش بھی اس سلسلہ میں کامیاب نہ ہوسکے۔

جہاں تک پہلے نمبر کا تعلق ہے، وہ حضرت مجدد کی افتاد طبع، ان کی شان عزیمت اور اس رفیع منصب سے جس سے اللہ نے ان کو سرفراز کیا تھا، کوئی مناسبت نہیں رکھتا، حضرت مجدد کو اپنی باطنی تکمیل وتربیت کے بعد ہی اس بات کا اذعان پیدا ہو گیا تھا کہ اللہ تعالیٰ کو ان سے کوئی دوسرا ہی کام لینا منظور ہے، اور وہ محض لازمی وانفرادی عبادات وترقیات اور پیری ومریدی کے لئے پیدا نہیں کئے گئے، انھوں نے اپنے سلسلہ ہی کے ایک رفیع المرتبت شیخ اور امام سلسلہ حضرت خواجہ عبید اللہ احرار (م ۸۹۵ھ) کا یہ مقولہ نقل کر کے "حدیث دیگراں" میں "سر دلبراں" کہہ دیا ہے کہ حضرت خواجہ احرار فرماتے تھے :-

اگر من شیخی کنم ہیچ در عالم مرید نیابد اما مرا کار دیگر فرمودہ اند، وآں ترویج شریعت وتائید ملت است۔	اگر میں خالی پیری مریدی کرنے پر آجاؤں تو دنیا میں کسی پیر کو کوئی مرید نہ ملے لیکن خدا نے مجھے کچھ اور ہی کام سپرد کیا ہے، اور وہ ترویج شریعت اور تائید ملت ہے۔

پھر اس جملہ کی تشریح کرتے ہوئے فرماتے ہیں :۔

لاجرم بصحبت سلاطین می رفتند و	آپ بادشاہوں کی مجلسوں میں تشریف
بتصرف خود ایشاں را منقاد می	لے جاتے تھے، اور اپنی قوت باطنی اور
ساختند و بتوسل ایشاں ترویج	تاثیر روحانی سے ان کو اپنا مطیع و
شریعت می فرمودند[1]	منقاد بنالیتے تھے، پھر ان کے ذریعہ
	شریعت کو رواج دیتے تھے۔

جہاں تک نمبر دو[2] کا تعلق ہے، یہ ایک سیاسی ذہنیت رکھنے والے کوتاہ نظر داعی یا قائد کا طرزِ عمل ہوسکتا ہے، جو اپنا کام شک و بدگمانی سے شروع کرتا ہے، اور اپنی عجلت پسندی، حکمت دعوت اور جذبۂ خیر خواہی و نصیحت پر محاذ آرائی کو ترجیح دینے کے نتیجہ میں حکومت و اقتدار کو اپنا حریف اور مدمقابل بنالیتا ہے، اور دین کے غلبہ کے امکانات اور میدان کو اور زیادہ تنگ کرلیتا ہے، ایک داعی الی اللہ اور مؤید من اللہ کا طریق کار نہیں ہوتا جس کا مقصد اپنی ذات یا جماعت کے لئے حصول اقتدار نہیں صرف دین کا غلبہ اور احکام شریعت کا نفاذ و اجراء ہوتا ہے، خواہ وہ کسی کے ہاتھ سے ہو۔

جہاں تک عملی اقدام کا تعلق ہے، وہ سخت خطرات سے بھرا ہوا تھا، اور ہندوستان کے اس وقت کے سیاسی نقشہ اور ماحول میں اسلام کے بارے میں ایک طرح سے خودکشی کا اقدام تھا، سلطنت مغلیہ میں جس کو بابر نے اپنے مضبوط ہاتھوں سے قائم کیا تھا، ہمایوں نے اس کے لئے ایران کا ہفت خواں طے کیا تھا، اور اکبر نے اپنی پے در پے فتوحات اور تسخیر ملک سے اس کو مستحکم کیا تھا، ابھی تک ضعف کے کوئی آثار ظاہر نہیں ہوئے تھے،

---

[1] مکتوبات دفتر اول مکتوب ۶۵ بنام خانِ اعظم

شیر شاہ سوری جیسے اولوالعزم بادشاہ کا جانشین سلیم شاہ اس کو ختم کرنے میں کامیاب نہیں ہوسکا مختلف وقتوں میں ملک میں رونما ہونے والی بغاوتیں سب ناکام ہو چکی تھیں، پھر اگر مغل فرمانروا کو تخت سلطنت سے اتارنے کی کوشش کامیاب بھی ہو جاتی تو اس کا قوی اندیشہ تھا کہ راجپوت جنھوں نے اکبر کے زمانہ میں خاص طور پر اعلیٰ مناصب حاصل کر لئے تھے، اور جن کی فوجی طاقت خود فرمانروائے سلطنت کے لئے سب سے زیادہ قابل اعتماد سرمایہ تھا، حکومت پر حاوی ہو جاتے، اور اس ملک میں مسلم اقتدار ہمیشہ کے لئے ختم ہو سکتا تھا۔

پھر یہ تجربہ اس سے پہلے ناکام ہو چکا تھا اکبر کے زمانہ میں شیخ بایزید کی جو پیر روشن اور پیر تاریک کے متضاد ناموں سے مشہور ہیں، قیادت میں ایک بڑی دینی تحریک اور تنظیم فرقۂ روشنائیہ کے نام سے شروع ہوئی تھی، اس نے سالہاسال سلطنت مغلیہ کی افواج قاہرہ کا پامردی سے مقابلہ کیا اس نے کوہ سلیمان کو مستقر بنا کر درۂ خیبر پر بھی قبضہ جمالیا اور قرب وجوار کے علاقوں پر بھی حملہ آور ہوئی اکبر نے ان کے مقابلہ کے لئے راجہ مان سنگھ اور راجہ بیربل اور زین خاں کو بھیجا، لیکن وہ سب ناکام رہے، بیربل ایک مقابلہ میں مارا گیا، روشنائیوں نے ایک بڑے لشکر کی مدد سے غزنی پر بھی قبضہ کر لیا، یہ فتنہ جہانگیر کے عہد ہی میں فرو ہو سکا اور اس کا پورا خاتمہ شاہجہاں کے زمانہ میں ہوا، لیکن اس سب کے باوجود اس بغاوت کا سوائے انتشار کے کوئی نتیجہ نہ نکلا اور بالآخر اس کو منظم و مستحکم مغل سلطنت کے سامنے سپر ڈالنی پڑی اور تاریخ میں صرف اس کا نام رہ گیا۔

اس طرح کے فوجی اقدامات جو کسی اصلاح کے نام سے کئے جاتے ہیں سلطنتوں اور اصحاب اقتدار کی مختلف بدگمانیوں کا نشانہ بن جاتے ہیں، اور وہ دین کو اپنا حریف ورقیب سمجھ کر اس کے استئصال اور اس کے ہم خیالوں اور پیرووں کی تلاش وجستجو کر کے

ان کا قلع قمع کرنے کے کام میں مصروف ہو جاتے ہیں، غالباً اسی بنا پر گوالیار کی اسیری اور لشکر کی ہمراہی سے رہائی پانے کے چار پانچ سال بعد ۱۰۳۵ھ میں عہد جہانگیری کے مشہور امیر و وزیر مہابت خاں نے بغاوت کی تو اہلِ بصیرت نے اس کو اس اقدام سے باز رکھنے کی کوشش کی، مجدد صاحب کی فراست ایمانی کی بہت بڑی دلیل اور توفیق الٰہی کا یہ روشن ثبوت تھا کہ انھوں نے حالات میں انقلاب لانے کے لئے پرخطر اور مشتبہ راستہ اختیار نہیں کیا اور تخریب کے بجائے تعمیر، نفی کے بجائے اثبات و ایجاب، اور ازالہ کے بجائے امالہ کا راستہ اختیار کیا جو ہر طرح کے خطرات سے محفوظ اور ایک بے ضرر راستہ تھا۔

اب مجدد صاحب کے سامنے ایک ہی راستہ رہ جاتا تھا، اور وہ یہی کہ ان ارکانِ سلطنت سے رابطہ قائم کریں جو بہر حال مسلمان تھے، حضرت مجدد صاحب کو اپنی گہری واقفیت اور خداداد ذہانت سے معلوم تھا کہ دورِ اکبری کے مخالفِ اسلام منصوبہ میں وہ شریک نہیں تھے، وہ اکبر کے بہت سے اقدامات کو ناپسند کرتے تھے، لیکن مجبور تھے، ان میں متعدد اسلام کی محبت اور دین کی حمیت سے بھی خالی نہ تھے، ان میں سے کئی ان کے مرشد حضرت خواجہ باقی باللہ اور خود ان سے اگر ارادت کا نہیں تو محبت و عقیدت کا تعلق رکھتے تھے، وہ حضرت مجدد کے اخلاص و بے غرضی اور اسلام کے لئے دلسوزی اور دردمندی سے واقف تھے، ان میں حسب ذیل حضرات ممتاز تھے، نواب سید مرتضیٰ عرف شیخ فرید (م ۱۰۲۵ھ) خان اعظم مرزا کوکہ (م ۱۰۳۳ھ) خان جہاں لودھی (م ۱۰۴۰ھ) صدر جہاں پہانوی (م ۱۰۲۷ھ) لالہ بیگ جہانگیری۔

ہر چہ از دل برخیزد بر دل ریزد

مجدد صاحب نے انھیں امرائے کبار اور ارکان سلطنت کو اپنا مخاطب بنایا،

ان سے مراسلت کا سلسلہ شروع کیا اور صفحۂ قرطاس پر اپنے دل کے ٹکڑے اتار کر رکھ دیئے، یہ خطوط اپنے درد و اخلاص، جوش و تاثیر، زورِ قلم اور قوت انشاء کے لحاظ سے ان خطوط و مکاتیب کے مجموعہ میں جو دنیا کی کسی زبان میں اور کسی دینی اصلاح و تحریک کی تاریخ میں سپرد قلم کئے گئے ہیں، خاص امتیاز رکھتے ہیں، اور سیکڑوں برس گزر جانے کے بعد بھی آج بھی ان میں اثر و دلآویزی پائی جاتی ہے[1]، اندازہ ہوتا ہے کہ انھوں نے اپنے مکتوب الیہم کے دلوں پر کیا اثر ڈالا ہوگا، حقیقت میں یہی خطوط مجدد صاحب کی دعوت و تبلیغ کے قاصد، ان کے زخمی دل کے صحیح ترجمان، ان کے قطرات اشک اور ان کے لختہائے جگر ہیں، اور دسویں صدی میں ہندوستان کی عظیم سلطنت مغلیہ میں جو عظیم انقلاب رونما ہوا اس میں ان کا بنیادی حصہ اور سب سے بڑا دخل ہے۔

امرائے سلطنت کے نام تحریضی و دعوتی خطوط

ان تحریضی و دعوتی خطوط کی ایک بڑی تعداد نواب سید فرید[2] کے نام ہے جو ارکانِ سلطنت

---

[1] مکتوبات کے ادبی پایہ اور حیثیت کے متعلق مصنف کا وہ تبصرہ دوبارہ پڑھ لیا جائے جو اس نے "تاریخ دعوت وعزیمت" کے حصہ سوم میں حضرت مخدوم شیخ شرف الدین یحییٰ منیری کے مکتوبات رصدی اور مکتوبات امام ربانی کے ذیل میں لکھا ہے، ملاحظہ ہو "تاریخ دعوت وعزیمت" حصہ سوم ص ۲۴۰-۲۴۵

[2] امیر کبیر نواب مرتضیٰ ابن احمد بخاری معروف بسید فرید کی شخصیت عجیب جامع کمالات و مختلف الجہات تھی، سیاست و انتظام، سخاوت و کرم، تواضع و اخلاق، دین و اہل دین سے محبت اور عالی ہمتی اور بلند نظری کا عجیب نمونہ، عہد اکبری ہی میں میر بخشی گری کے عہدہ تک پہونچ گئے تھے، جب جہانگیر تخت نشین ہوا تو ان کے منصب میں اضافہ کیا اور صاحب سیف و قلم اور مرتضیٰ خاں کا لقب دیا اور پہلے گجرات کا پھر پنجاب کا صوبیدار بنایا (باقی ص ۳۰۴ پر)

اور صوبیدارانِ مملکت میں نمایاں مقام رکھتے تھے، اور اکبر کے عہد سلطنت سے سلطنت کے مقرب و معتمد علیہ تھے، حضرت خواجہ باقی باللہ سے عقیدت و تعلق رکھتے تھے، ان کی سیادت اور دینی حمیت سے حضرت مجدد نے فائدہ اٹھاکر اور اس کا واسطہ دے کر ان کو اپنا فرض دینی اور خاندانی ادا کرنے پر آمادہ کیا اور یہ کہ وہ جہانگیر کو نیک مشورہ دے کر سلطنت کا رخ اکبر کے ڈالے ہوئے راستے پر چلتے رہنے اور اسلام کے تقاضوں سے چشم پوشی اور بے تعلقی، اسلام اور مسلمانوں کی کسمپرسی سے حمایت دین اور شعائر و احکامِ اسلام کے احترام کی طرف موڑنے کی کوشش کریں۔

افسوس ہے کہ ان مکاتیب پر تاریخ کا اندراج نہیں ہے، ورنہ حکمت دعوت اور تدریجی ارتقاء کے کئی اہم گوشے سامنے آتے اور معلوم ہوتا کہ آپ نے کس طرح اپنے مکتوب الیہ اور مکتوب الیہ نے کس طرح بادشاہ کو پھر بادشاہ نے کس طرح سلطنت کے رخ کو حمایت اسلام کے راستہ پر ڈالا، اور پچھلی حکومت کے اثرات کس طرح بتدریج مضمحل ہونے اور ان کی جگہ اسلام دوستی اور اسلام شناسی نے لینا شروع کیا، ہم اپنے اندازہ کے مطابق ان خطوط کے اقتباسات کو کسی قدر ترتیب کے ساتھ پیش کرتے ہیں۔

نواب سید فرید بخاری کے ایک مکتوب میں جو غالباً جہانگیر کی تخت نشینی کے بعد جلد ہی

(باقی ص۳۰۳ کا) جس پر وہ مدۃ العمر فائز رہے، جود وسخا میں اپنی نظیر نہیں رکھتے تھے، کبھی اپنے کپڑے تک اتار کر سائلوں کو دے دیتے تھے، بیواؤں، متوکلین اور اہل حاجت کے روزینہ اور سالانہ مقرر کر رکھے تھے، یتیم بچوں پر ماں باپ کی طرح شفقت کرتے، شادی کے قابل غریب لڑکیوں کی شادی اور جہیز کا انتظام کرنا ان کا محبوب ترین مشغلہ تھا، ان کے دستر خوان پر ڈیڑھ ہزار آدمیوں کے قریب روزانہ کھانا کھاتے، شہر فریدآباد انہی کے نام سے منسوب ہے، ۱۰۲۵ھ میں وفات پائی (نزہۃ الخواطر ج ۵ مختصراً)۔

لکھا گیا ہے، تحریر فرماتے ہیں۔

اپنے آبائے کرام اور خاص طور پر سید الکونین صلے اللہ علیہ وسلم کے جادۂ مستقیم پر ثابت قدم رہنے کی دعا دینے کے بعد لکھتے ہیں :۔

"بادشاہ کو عالم سے وہی نسبت ہے جو دل کو بدن سے ہے، اگر دل صحیح و صالح ہے تو بدن بھی صحیح و صالح ہوگا، اور اگر وہ فاسد ہے تو بدن بھی فاسد ہوگا، بادشاہ کا صلاح عالم کا صلاح ہے اور اس کا فساد عالم کا فساد ہے۔

آپ کو خوب معلوم ہے کہ قرن ماضی (عہد اکبری) میں اہل اسلام کے سر پر سے کیا مصیبت گذر گئی، اس سے پہلے کی صدیوں میں غربت اسلام کے باوجود اہل اسلام کی ذلت و خواری اس سے زیادہ نہ ہوئی تھی، اس زمانہ میں زیادہ سے زیادہ یہ تھا کہ مسلمان اپنے دین پر رہیں اور اہلِ کفر اپنے طریق پر "لَكُمْ دِيْنُكُمْ وَلِيَ دِيْنِ" لیکن قرن ماضی میں اہل کفر غالب آکر برملا دارالاسلام میں احکام کفر کا اجراء کرتے تھے، اور مسلمان اسلام کے احکام کے اظہار سے بھی مجبور تھے، اگر کوئی ہمت بھی کرتا تھا تو موت کی سزا پاتا تھا" واویلاہ، وامصیبتاہ، واُحزناہ، واحسرتاہ" محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کے (جو محبوبِ رب العالمین ہیں) ماننے والے ذلیل و خوار تھے، اور آپ کے نبوت کا انکار کرنے والے باعزت وبااعتبار مسلمان اپنے زخمی دلوں کے ساتھ اسلام کی نوحہ خوانی میں مصروف تھے، اور معاندین تمسخرو استہزاء کے ساتھ ان کے زخموں پر نمک پاشی کر رہے تھے، آفتاب ہدایت گمراہی کے پردہ... میں مستور اور نورِ حق باطل کے حجابات میں مخفی اور روپوش تھا۔

آج جبکہ اسلام کے غلبہ و اقبال سے جو چیز مانع تھی، اس کے دور ہوجانے اور بادشاہِ اسلام کے سر برآرائے سلطنت ہونے کا مژدہ خاص و عام کے کانوں تک پہونچا ہے، اہل اسلام

نے اپنی ذمہ ضروری سمجھا کہ وہ بادشاہ کے مدد و معاون بنیں اور شریعت کی ترویج اور ملت کی تقویت کا راستہ دکھائیں، یہ امداد و تقویت خواہ زبان سے میسر آئے خواہ ہاتھ سے"۔

پھر چند سطروں کے بعد گذشتہ عہد کے مرض کی صحیح تشخیص کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:۔

"قرن ماضی میں جو مصیبت بھی سر پر آئی وہ علماء سوء کی جماعت کی نحوست سے پیش آئی، بادشاہوں کو یہی لوگ راہ راست سے ہٹا دیتے ہیں، ملت میں جو بہتّر فرقے بنے اور انھوں نے جو راہ ضلالت اختیار کی، ان کے مقتدی یہی علماء سوء تھے، علماء میں سے کم ایسے گمراہ ہوں گے جن کی ضلالت دوسروں پر اثر کرے، اس زمانہ کے اکثر جہلائے صوفی نما بھی علمائے سوء کا اثر رکھتے ہیں، ان کا فساد بھی متعدی فساد ہے، اگر کوئی شخص اس کارِ خیر (اعانت دین) میں اعانت دین کی استطاعت رکھتا ہے، اگر اس میں کوتاہی سے کام لیتا ہے، اور کارخانۂ اسلام میں فتور واقع ہوتا ہے وہ کوتاہی کرنے والا بھی قابل شکایت ہوگا، اس بنا پر یہ حقیر قلیل البضاعت بھی چاہتا ہے کہ وہ سلطنت اسلام کی مدد کرنے والوں کے جرگہ میں شامل ہو، اور اپنی بساط بھر ہاتھ پاؤں مارے کہ "من کثّر سواد قوم فھو منھم" کیا عجیب ہے کہ اس بے استطاعت کو اس عالی جماعت میں شامل کرلے، وہ اپنی مثال اس ضعیفہ کی طرح سمجھتا ہے، جس نے کچھ رسّیاں بٹ کر اپنے کو خریداران یوسف کے سلک میں منسلک کرنا چاہا تھا، امید ہے کہ جلد ہی یہ فقیر آپ کی خدمت میں حاضر ہوگا، آپ سے اس کی توقع ہے کہ چونکہ آپ کو بادشاہ کا قرب خاص حاصل ہے، اور ان باتوں کے گوش گذار کرنے کے مواقع میسر ہیں، خلوت و جلوت میں شریعت محمدی کی ترویج کی کوشش کریں گے اور مسلمانوں کو اس غربت و بیکسی سے نکالیں گے"[1]

---

[1] مکتوب ۴۷ دفتر اول۔

سید فرید کے نام ایک دوسرے مکتوب میں تحریر فرماتے ہیں:۔

"اس وقت غریب اہل اسلام جو اس گرداب میں گرفتار ہیں، نجات کی امید اہل بیت ہی کے سفینہ سے لگائے ہوئے ہیں، آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے، "مثل اهل بيتي كمثل سفينة نوح من ركبها نجا ومن تخلف عنها هلك[1]" ہمت عالی کو اس مقصد عالی پر مرکوز کردیں کہ یہ سعادت عظمیٰ ہاتھ آئے، اللہ کی عنایت سے ہر طرح کا جاہ و جلال اور عظمت و شوکت آپ کو میسّر ہے، اس شرف ذاتی (سیادت خاندانی) کے ساتھ اگر یہ سعادت بھی شامل ہوجائے تو سب سعادتمندوں سے بازی لے جائیں، یہ حقیر اسی طرح کی باتوں کے عرض معروض کے لئے جن کا مقصد تائید و ترویج شریعت ہے آپ کی خدمت میں آنے کا ارادہ رکھتا ہے[2]۔"

ایک تیسرے مکتوب میں ارشاد فرماتے ہیں:۔

"سیادت پناہا مکرما! آج کے دن اسلام بڑا بیکس اور غریب الوطن ہے، ایک پیسہ بھی جو اس وقت اسلام کی تقویت میں صرف کیا جائیگا، کروڑوں میں خریدا جائے گا، دیکھنا چاہئے کہ کون شہباز ہے جس کو اس دولت عظمیٰ سے مشرف فرمائیں گے، ترویج دین و تقویتِ ملّت کا کام جس زمانہ میں جس شخص سے بھی وقوع میں آئے مستحسن ہے اور خوشنما لیکن اس وقت ... اسلام غریب الوطن ہے، اور آپ جیسے سادات سے زیبا تر و رعنا تر ہے کہ یہ دولت آپ کے خاندان کے لئے خانہ زاد ہے، آپ کے لئے وہ بالذات ہے، اور دوسروں کے لئے بالواسطہ، اس سعادت کے حصول میں اپنے جد امجد کا وارث ہونا بڑی قیمت رکھتا ہے، آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم نے صحابہ کرام کو مخاطب کرکے ایک مرتبہ فرمایا کہ تم ایسے زمانہ

---

[1] مشکوٰۃ عن ابی ذرؓ از مسند احمد [2] مکتوب ۵۱ دفتر اول۔

میں ہو کہ اوامر و نواہی کا دسواں حصہ چھوڑ دو تو ہلاک ہو جاؤ، تمہارے بعد ایک گروہ ایسا آئے گا کہ اگر اوامر و نواہی کے دسویں حصہ پر عمل کریں گے تو نجات پائیں گے، یہ وقت وہی وقت ہے اور یہ گروہ وہی گروہ ہے

گوئے توفیق و سعادت درمیاں افگندہ اند
کس بہ میداں درنمی آید سواراں راچہ شد"

سید فرید کے بعد حضرت مجدد کی نظر انتخاب سلطنت مغلیہ کے دوسرے رکن رکین خان اعظم[1] پر پڑی جو شاہی خاندان سے قرابت قریبہ رکھتے تھے، جہانگیر کو بھی ان کی اہمیت و قدر و منزلت کا احساس تھا، مشائخ نقشبندیہ سے بھی ان کو عقیدت و محبت تھی، جہانگیر کی تخت نشینی کے بعد ہی غالباً حضرت مجدد نے ان کو مکتوب ذیل تحریر فرمایا ہے:۔

"أیدکم اللہ سبحانہ ونصرکم علی أعداء الاسلام فی إعلاء الاسلام" رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی حدیث "الاسلام بدأ غریباً وسیعود کما بدأ فطوبیٰ للغرباء" (اسلام کا آغاز مسافرانہ بیکسی سے ہوا، اور پھر وہ اسی مسافرانہ بیکسی کو پہونچ جائے گا تو مبارک ہو

---

[1] مرزا عزیز الدین نام اکبر کے رضاعی بھائی ہونے کی وجہ سے کوکا خطاب تھا، غزنی پھر دہلی وطن تھا، ۹۸۰ھ میں گجرات کے صوبیدار تھے ان کو محمد حسین مرزا کے محاصرہ سے چھڑانے کے لئے اکبر نے آگرہ سے احمد آباد ایک ہزار چار سو میل کا سفر نو ۹ دن میں کیا، گجرات کے بعد بنگال و بہار کے صوبیدار ہوئے خان اعظم خطاب ملا، دوبارہ ۹۹۷ھ میں گجرات کی صوبیداری ملی، اس قرب و اختصاص کے باوجود اکبر کے غیر شرعی امور پر صاف صاف نکیر کرتے تھے، اس کے باوجود مہر شاہی مہر اوزک ان کے سپرد کی گئی، اور ان کو وکیل مطلق کا عہدہ دیا گیا، جہانگیر نے بھی اہم مناصب حکومت سپرد کئے اور گجرات کی صوبیداری عطا کی، ۱۰۳۳ھ میں انتقال کیا (نزہۃ الخواطر مختصراً)۔

ان لوگوں کو جو اس کے شریک حال ہوں) اسلام کی بیکسی اس حد کو پہونچ گئی ہے کہ کفار برملا اسلام پر طعن اور مسلمانوں کی مذمت کرتے ہیں، اور بے تکلف احکام کفر کے اجراء اور کوچہ و بازار میں اس کی مدح وثنا سے نہیں شرماتے، اس کے مقابلہ میں مسلمان احکام اسلام کے اجراء سے مجبور اور اگر ان پر عمل کر لیتے ہیں تو مذموم و مطعون ہوتے ہیں ؎

پری نہفتہ رخ و دیو در کرشمۂ و ناز
بسوخت عقل ز حیرت کہ این چہ بوالعجبی است،،

آگے چل کر لکھتے ہیں:۔

''آج کے دن جناب کی ہستی کو ہم مغتنم سمجھتے ہیں اور ہاری ہوئی بازی میں آپ کے سوا کسی کو مرد میدان نہیں پاتے، اللہ آپ کا مؤید و ناصر ہو" بحرمة النبی وآلہ الأمجاد علیہ وعلیہم الصلوٰت والتحیات والتسلیمات والبرکات" حدیث میں آتا ہے" لن یومن احدکم حتی یقال انہ مجنون" اس وقت وہ جنون جس کا مبنیٰ فرط غیرت اسلام ہے آپ ہی کی طبیعت میں محسوس ہوتا ہے" الحمد للہ سبحانہ علی ذلک" آج کا دن وہ دن ہے کہ عمل قلیل کو اجر جزیل کے بدلہ میں بڑی قدر کے ساتھ قبول فرماتے ہیں، اصحاب کہف سے سوائے علی ہجرت کے کوئی اور نمایاں عمل ثابت نہیں، جس کو اتنی اہمیت دی جائے، دشمنوں کے غلبہ کے وقت اگر وفادار سپاہی تھوڑی سی مستعدی دکھائیں تو بڑی عزت پاتے ہیں، بخلاف اس وقت کہ جب امن کا زمانہ ہوتا ہے اور دشمن اپنی جگہ پر ہوتے ہیں، جہاد قولی کا یہ موقع جو آج آپ کو میسّر ہے، جہاد اکبر ہے، اس کو غنیمت سمجھئے اور" ھل من مزید" کہئے، اس جہادِ لِسان کو جہاد سیف و سنان سے بھی اس وقت افضل سمجھیں، ہم فقیر لوگ بے دست و پا اس دولت سے محروم ہیں۔

هنیئاً لأرباب النعیم نعیمها — وللعاشق المسکین ما یتجرع

دادیم ترا ز گنج مقصود نشاں — گرما نہ رسیدیم تو شاید برسی"

پھر چند سطروں کے بعد تحریر فرماتے ہیں:۔

"سلطنت سابقہ میں دین مصطفوی کے ساتھ جو عناد نظر آتا تھا ظاہراً اس سلطنت میں وہ عناد نہیں ہے، اگر ہے بھی تو لاعلمی کی وجہ سے ہے، اندیشہ ہے کہ کہیں یہاں بھی معاملہ اس عناد تک پہونچ جائے اور مسلمانوں پر عرصۂ حیات تنگ ہوجائے۔ ع

جو بید برسر ایمان خویش می لرزم"[1]

دربار جہانگیری کے ایک دوسرے اعلیٰ عہدہ دار خانِ جہاں[2] کے نام یہی مضمون مختصراً لکھتے ہیں:۔

"آپ جس خدمت پر فائز ہیں، اگر اس کو شریعت مصطفوی پر عمل کرنے کے ساتھ جمع کرلیں تو انبیاء علیہم السلام والا کام کریں گے علیہم الصلوات والتسلیمات، اور دین متین کو منور و معمور کردیں گے ہم فقیر اگر سالہا سال جان کھپائیں تو اس عمل میں آپ جیسے شہبازوں کے گرد کو نہیں پہونچ سکتے ؎

گوئے توفیق وسعادت درمیاں افگندہ اند

کس بہ میداں درنمی آید سواراں راچہ شد"[3]

---

[1] مکتوب ۶۵ دفتر اول [2] امیر کبیر خانِ جہاں ابن دولت خاں لودھی، جہانگیر کو ان پر بڑا اعتماد تھا، اور وہ ان سے بڑی محبت کرتا تھا، بڑے علم دوست اور علماء پرور تھے، عام لوگوں سے بھی اچھا سلوک تھا، شاہجہاں کے عہد میں بغاوت کی اور ۱۰۴۰ھ میں قتل کرادیئے گئے (نزہۃ الخواطر ج ۵)۔

[3] مکتوب ۵۴ دفتر سوم۔

ایک دوسرے مفصل مکتوب میں تحریر فرماتے ہیں :-

"وہ دولت جس سے حضرت حق سبحانہ و تعالیٰ نے آپ کو سرفراز فرمایا ہے، اور لوگ اس کی قدر و قیمت سے ناواقف (اور اندیشہ ہے کہ آپ بھی اس سے پورے طور پر آگاہ نہ ہوں) ہیں، یہ ہے کہ بادشاہ وقت سات پشت سے مسلمان چلا آرہا ہے، وہ اہل سنت میں سے ہے، اور حنفی المذہب ہے، اگرچہ چند سال سے اس زمانہ میں کہ قرب قیامت ہے، اور عہد نبوت سے بُعد ہو چکا ہے، بعض لکھے پڑھے لوگوں نے طمع کی نحوست سے جو خرابیٔ باطن کا نتیجہ ہے، حکام و سلاطین سے تقرب حاصل کر کے ان کی خوشامد میں آکر دین متین میں شکوک و شبہات پیدا کر دیئے ہیں، اور سادہ لوح لوگوں کو راستہ سے ہٹا دیا ہے، جہانگیر جیسا بادشاہ عظیم الشان جب آپ کی بات غور و التفات کے ساتھ سنتا ہے، اور اس کو وقعت دیتا ہے تو کیسا نادر موقع ہے کہ آپ صراحتاً یا اشارۃً کلمۂ حق (کلمۂ اسلام) کو جو اہل سنت والجماعت کے اعتقاد کے مطابق ہے، (شکر اللہ تعالیٰ سعیھم) گوش گذار کر دیں، اور جس قدر گنجائش سمجھیں اہل حق کی باتوں کو پیش کرتے رہیں بلکہ برابر اس بات کے جویا اور نگراں رہیں کہ کوئی ایسی تقریب پیدا ہو کہ مذہب و ملت کی بات درمیان میں آئے تاکہ اسلام کی حقانیت اور کفر کے بطلان و شناعت کے اظہار کا موقع ملے۔"[1]

ان ارکان سلطنت کے علاوہ آپ نے ایک دوسرے عہدہ دار سلطنت لالہ بیگ کو بھی اسی مضمون کے خط لکھے جو اکبر بادشاہ کے لڑکے سلطان مراد کے بخشی تھے، اور بہار کے گورنر بھی رہے تھے، تحریر فرماتے ہیں :-

"زادنا اللہ سبحانہ وایاکم حمیۃ الاسلام، اسلام کی غربت و بیکسی سو برس ہو رہے ہیں،

[1] مکتوب ۶۷ دفتر دوم۔

اس حد کو پہونچ گئی ہے کہ بلاد اسلام میں اہل کفر محض احکام کفر کے اجراء پر راضی نہیں ہوتے، چاہتے ہیں کہ اسلامی احکام بالکلیہ زائل ہو جائیں، اور مسلمانوں اور مسلمانی کا کوئی اثر باقی نہ رہے، معاملہ کو اس سرحد تک پہونچا دیا ہے کہ اگر کوئی مسلمان کسی اسلامی شعائر (مثلاً ذبح بقر) کا اظہار کرتا ہے تو قتل کی سزا کو پہونچ جاتا ہے۔"

آگے چل کر لکھتے ہیں:۔

"ابتدائے بادشاہت میں اگر مسلمانی رواج پا جائے اور مسلمان کچھ عزت پیدا کر لیں فبہا، اور اگر عیاذاً باللہ سبحانہ اس معاملہ میں توقف ہوا تو معاملہ مسلمانوں کے لئے بہت مشکل ہو جائے گا "الغیاث الغیاث ثم الغیاث الغیاث" دیکھئے کون صاحب اقبال اس سعادت سے سرفراز ہوتا ہے، اور کون سا شہباز اس دولت کو حاصل کرتا ہے" ذالك فضل الله يؤتيه من يشاء والله ذو الفضل العظيم[1]

سلطنت جہانگیری کے ایک اور امیر صدر جہاں تھے[2] ان کو ایک مکتوب میں تحریر فرمایا ہے:۔

"یقین ہے کہ مقتدائے اسلام، سادات عظام، علمائے کرام ..... خفیہ و علانیہ دین متین کی ترقی و تقویت اور اس صراط مستقیم کی تکمیل میں مشغول ہوں گے، یہ بے سروسامان اس معاملہ میں کیا دراز نفسی سے کام لے[3]"

[1] مکتوب ۸۱ دفتر اول [2] مفتی صدر جہاں پیہانی (حال ضلع ہردوئی) کے رہنے والے تھے، علوم عربیت میں خاص امتیاز رکھتے تھے، پہلے لشکر شاہی میں مفتی مقرر ہوئے، پھر صدارت کے عہدہ پر ان کا انتخاب ہوا، جہانگیر کو ان سے تلمذ حاصل تھا، اور اس نے چہل حدیث ان سے حفظ کی تھی، جہانگیر نے چار ہزاری منصب اور وسیع جاگیر عطا کی تھی، ایک سو بیس سال کی عمر پائی اس کے باوجود ہوش و حواس سلامت تھے، ۱۰۲۷ھ میں وفات پائی (نزہۃ الخواطر ج ۵) [3] مکتوب ۱۹۴ دفتر اول۔

گذشتہ غلطی کا اعادہ نہ کیا جائے

آخر وہ مبارک وقت آگیا کہ جہانگیر کو غلطی کا احساس ہوا اور اس نے (اپنی حکومت وانتظام کے عام اصول کے مطابق) یہ چاہا کہ علماء کی ایک جماعت دینی امور میں مشورہ دینے اور غلطیوں سے بچانے کے لئے دربار میں موجود رہے، اس نے دیندار ارکان سلطنت سے فرمائش کی کہ چار دیندار علماء کو تلاش کرکے دربار میں ہر وقت حاضر رہنے پر آمادہ کردیں، جو مسائل شرعیہ کی وضاحت کریں، اور ان سے رہنمائی حاصل کی جاتی رہے، مجدد صاحبؒ جن کو اللہ تعالٰی نے فراستِ صادقہ اور اعلٰی دینی بصیرت عطا فرمائی تھی، اور سابق سلطنت کے انحراف کی تاریخ اور اس کے اسباب پر ان کی گہری نظر تھی، یہ اطلاع سن کر بجائے مسرور ہونے کے فکرمند اور پریشان ہوگئے، اور انھوں نے ایک خط شیخ فرید کو اور ایک خط نواب صدر جہاں کو اس مضمون کا لکھا کہ:۔

"خدارا... ایسی غلطی نہ کریں، بجائے متعدد علمائے ظاہر کے ایک مخلص، بے لوث عالم ربانی کا انتخاب کریں"۔

شیخ فرید کے نام مکتوب میں تحریر فرماتے ہیں:۔

"ثبتکم اللہ سبحانہ علی جادۃ آباءکم الکرام، سنا گیا ہے کہ بادشاہ اسلام نے اپنے حسن فطرت اور اسلامیت کی بنا پر جو اس کی طبیعت میں ودیعت کی گئی ہے، آپ سے فرمایا ہے کہ چار علمائے دیندار کی خدمات حاصل کریں جو دربار میں رہیں، اور مسائل شرعیہ کو بیان کریں تاکہ بادشاہ کا کوئی حکم یا عمل خلاف شرع واقع نہ ہو، الحمد للہ سبحانہ علی ذالک" مسلمانوں کے لئے اس سے بہتر کیا خوشخبری اور ماتم زدوں کے لئے اس سے

بہتر کیا نوید مسرت ہو سکتی ہے، لیکن یہ فقیر ضرورتاً اور مجبوراً اس سلسلہ میں کچھ عرض کرنا چاہتا ہے امید ہے کہ معذور قرار دیں گے کہ صاحب الغرض مجنون۔

عرض یہ ہے کہ ایسے علماء دیندار اول تو خود ہی اقل قلیل ہیں، جو حب جاہ وحُبِّ اقتدار سے بلند ہو چکے ہوں اور ترویج شریعت اور تائید ملت کے سوا کوئی غرض نہ رکھتے ہوں، اگر حُبِّ جاہ کی بنا پر ان علماء میں سے کوئی ایک پہلو اختیار کرلے گا اور اپنی فضیلت وبرتری کا اظہار کریگا، اختلافی مسائل درمیان میں لائے گا اور اس کے ذریعہ سے بادشاہ کا قرب اور اس کے یہاں امتیاز واعزاز حاصل کرنا چاہے گا، لامحالہ دین کا کام ابتر ہوگا، قرن سابق میں علماء کے اختلافات ہی نے عالم کو مصیبت میں ڈال دیا تھا، اور اب پھر وہی خطرہ درپیش ہے، ترویج دین کا کیا ذکر یہ امر تخریب دین کا باعث ہوگا، "العیاذ باللہ سبحانہ من ذلک ومن فتنۃ العلماء السوء" (اگر بجائے ان چار کے) ایک عالم کا اس مقصد کے لئے انتخاب کیا جائے تو بہتر ہوگا، اگر وہ علمائے آخرت میں سے ہوگا تو کیا کہنا کہ اس کی صحبت کبریتِ احمر ہے، اور اگر علمائے آخرت میں سے کوئی نہ ملے تو اس طبقہ علماء میں سے بہتر سے بہتر آدمی کا انتخاب کیا جائے کہ "مالا یدرک کلہ لایترک کلہ"

اس کے بعد لکھتے ہیں کہ:۔

"سمجھ میں نہیں آتا کہ کیا لکھا جائے، جیسے کہ خلائق کی خلاصی علماء کے ساتھ وابستہ ہے، عالم کا نقصان بھی انہی کے ساتھ مربوط ہے، علماء میں جو بہترین ہیں، وہ عالم میں بہترین ہیں، اور جو ان میں بدترین ہیں وہ مخلوقات میں بدترین ہیں، ہدایت واضلال کو اسی گروہ کے ساتھ مربوط کر دیا گیا ہے، کسی بزرگ نے ابلیس لعین کو دیکھا کہ فارغ وبیکار بیٹھا ہوا ہے، انھوں نے اس کا سبب پوچھا کہنے لگا کہ اس وقت کے علماء ہمارا کام کر رہے ہیں،

اور اغواء و اضلال کا کام کر رہے ہیں ؎

عالم کہ کامرانی وتن پروری کند
او خویشتن گم است کرا رہبری کند

غرض کہ اس معاملہ میں پورے غور و تأمل اور فکرِ صحیح سے کام لے کر قدم اٹھائیں جب معاملہ ہاتھ سے نکل جاتا ہے تو کوئی علاج کارگر نہیں ہوتا مجھے شرم آتی ہے کہ ایسی باتیں زیرک و دانا (جیسے کہ آپ ہیں) حضرات کے سامنے کی جائیں، لیکن اس کو اپنے لئے وسیلۂ سعادت سمجھ کر باعث تصدیع ہوا۔[1]"

عقیدتمند ارکانِ سلطنت اور ان سے خط و کتابت

ان مکتوب الیہم کے علاوہ جن کے نام کے مکاتیب میں حضرت مجددؒ اسلام کی غربت و بیکسی، احکام و شعائرِ اسلام کی بے حرمتی اور مسلمانوں کی مجبوری پر خون کے آنسو روئے ہیں اور ان کو اپنے قرب و اعتماد، خدمات جلیلہ اور منصب و عہدہ کے اثر سے کام لیتے ہوئے، بادشاہ کو صورتِ حال کی طرف متوجہ کرنے اور اس کی موروثی و خاندانی رگِ اسلامیت کو حرکت میں لانے کی کوشش کی طرف توجہ دلائی ہے، کچھ امرائے کبار اور ارکین سلطنت کے نام آپ کے مکاتیب کی ایک بڑی تعداد ہے، جو اصلاحی و تربیتی ہیں، اور جن میں سلوک و تصوف کے بعض غوامض کو حل فرمایا گیا ہے، دنیائے دنی کی طرف سے بے رغبتی اور نعیم اخروی اور ترقیات باطنی کے حصول کی طرف توجہ دلائی گئی ہے، یہ خطوط امیر الامراء عبدالرحیم خانِ خاناں (م ۱۰۳۶ھ) قلیج خاں اندجانی اکبری (م ۱۰۲۳ھ) خواجہ جہاں

---

[1] مکتوب ۵۳ دفتر اول، صدر جہاں کے نام مکتوب ۱۹۴ دفتر اول میں بھی اسی مضمون کو مختصراً تحریر فرمایا ہے۔

(م ۱۰۲۹ھ)، مرزا داراب ابن خانِ خاناں جہانگیری (م ۱۰۳۴ھ) اور شرف الدین حسین بدخشی کے نام ہیں، جن سے اندازہ ہوتا ہے کہ ان امراءِ کبار کو حضرت سے گہری عقیدت و محبت تھی، یہ خطوط ایسے ہی ہیں جیسے ایک شیخ اپنے زیرِ تربیت مریدین کو لکھتا ہے، ان کی لغزشوں پر متنبہ بھی کرتا ہے، ان کو وعظ و نصیحت بھی کرتا ہے، اور ان کی دینی ترقی اور روحانی استعداد و مناسبت پر خوشی کا اظہار بھی کرتا ہے، اس سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ اس قوی تعلق اور گہری عقیدت کے بعد ان امرائے کبار نے حضرت مجدد کے اصلاحِ سلطنت کے منشاء کے مطابق بادشاہ کے سامنے کلمۂ حق کہنے اور اسلام کی خیر خواہی اور ہمدردی میں کوئی کوتاہی نہ کی ہوگی اور انھوں نے اس کام میں اپنے مخدوم و شیخ کی تمنا پوری کرنے اور دوسرے امراءِ سلطنت کے ساتھ (جن کو آپ نے اس مقصدِ عظیم کے لئے خطوط لکھے تھے) تعاون کرنے سے دریغ نہ کیا ہوگا۔

اصلاحِ حال میں حضرت مجدد کا ذاتی اثر اور فیض

ابھی تک جو کچھ تفصیل بیان کی گئی اس کا تعلق حضرت مجدد کی بالواسطہ کوششوں سے تھا، یعنی انھوں نے امرائے کبار اور ارکانِ سلطنت کو دین کی نصرت و حمایت، بادشاہ کو احترامِ دین و شریعت اور اصلاحِ حال پر اپنے مکاتیب کے ذریعہ جن میں حمیتِ اسلامی کی بجلیاں کوندتی نظر آتی ہیں، کس طرح پے در پے خطوط لکھے اور ان سے اس مقصد کی تکمیل میں کس طرح کام لیا، یہ سعی یقیناً رائیگاں نہیں گئی، اور ان مکتوب الیہم نے اور خاص طور پر نواب سید فرید نے حکومت کا رخ بدلنے میں بنیادی و مرکزی کردار ادا کیا۔

لیکن ابھی فرمانروائے سلطنت جہانگیر کے مزاج و طبیعت میں وہ تبدیلی نہیں پیدا

ہوئی تھی، جس کی اس عظیم الشان اور دشوار کام کے لئے ضرورت تھی، شخصی و موروثی سلطنتوں میں بادشاہ کی ذات وہ مرکزی نقطہ ہوتی ہے جس کے گرد حکومت کا سارا نظام گردش کرتا ہے، اس کا کسی بات کے لئے ارادہ کر لینا اور اس کے ذہن کا کسی امر کو قبول کر لینا خدا کے کسی مخلص اور بے لوث بندے سے اس کے دل میں عقیدت و محبت کا پیدا ہو جانا اور اس کے اخلاص پر اعتماد کہ ہزاروں میل کے فاصلہ کو گھنٹوں اور منٹوں میں طے کرا دیتا ہے، اور بعض اوقات بظاہر ناممکن العمل چیز کو نہ صرف ممکن بلکہ واقعہ بنا دیتا ہے، ابھی تک جہانگیر حضرت مجدد کے روحانی و علمی مقام سے ناآشنا تھا، وہ ان اہل علم و اہل مشیخت میں نہیں تھے، جو درباروں میں آتے جاتے ہیں، اب اس کی کیا صورت تھی کہ جہانگیر کو براہ راست ان سے واسطہ پڑے، وہ ان کے علو مقام سے (اپنی صلاحیت و استعداد کے مطابق) واقف ہو، حکمت الٰہی نے اس کا بھی عجیب و غریب طریقہ پر انتظام کیا جو ﴿عَسٰى اَنْ تَكْرَهُوْا شَيْئًا وَّهُوَ خَيْرٌ لَّكُمْ﴾ (ممکن ہے کہ تم کسی چیز کو ناپسند کرو اور وہ تمہارے حق میں بہتر ہو) کی تفسیر ہے۔

جہانگیر کا تأثر

باب سوم میں قارئین قلعہ گوالیار کی اسیری اور لشکر شاہی کی نظر بندی کی داستان پڑھ چکے ہیں، لشکر شاہی کے ساتھ حضرت مجدد ۳½ سال تک رہے[1]، بادشاہ سے صحبتیں رہیں، مسائل دینیہ پر مذاکرہ و گفتگو رہی، بادشاہ نے حضرت مجدد کی دینی صلابت اور

---

[1] قلعہ گوالیار سے رہائی جمادی الثانی ۱۰۲۹ھ میں ہوئی تھی، اور لشکر شاہی سے رخصتی ذی الحجہ ۱۰۳۲ھ میں ہوئی اس طرح ساڑھے تین سال بنتے ہیں۔

استقامت کا نمونہ سجدۂ تعظیمی اور آداب شاہی سے انکار اور گوالیار کی اسیری میں پوری خودداری اور عزت نفس کے ساتھ رہنے اور معافی نہ مانگنے کی شکل میں دیکھا حضرت مجدد کے روحانی فیوض و برکات اور ان کی صحبت کی تاثیر کو سیکڑوں غیر مسلموں کے قبول اسلام کی شکل میں دیکھا، پھر لشکر شاہی کی طویل رفاقت میں ان کے زہد و استغناء اور ان کی عبادت و معمولات کی پابندی کو بھی دیکھا، مجلس کی گفتگو میں ان کے رسوخ فی العلم کا بھی تجربہ کیا اور یقیناً وہ ایک سلیم الطبع، ذہین اور ہوشمند فرمانروائے سلطنت کی حیثیت سے جس کو امراء و علماء و مشائخ، دنیاداروں اور دینداروں کی ایک بڑی تعداد کے حالات کا اپنے والد اکبر کے دور سے اس وقت تک مطالعہ کرنے کا موقع ملا تھا، اور اس سے اس میں مردم شناسی کی وہ صلاحیت پیدا ہوگئی تھی، جو ان لوگوں کو حاصل نہیں ہوسکتی جن کو کھرے اور کھوٹے کے پرکھنے کا اتنا طویل موقع نہیں ملتا، مجدد صاحب کے متعلق ضرور سمجھ گیا ہوگا کہ وہ ان لوگوں سے بہت مختلف ہیں جو ابھی تک دربار کی زینت یا بوریائے فقر کے مسند نشین تھے۔

واقعہ ذیل میں جو جہانگیر نے خود تفصیل اور ایک حد تک شکر و فخر کے اظہار کے ساتھ لکھا ہے حضرت مجدد کی صحبت و جذبات کا اثر صاف جھلکتا ہے جہانگیر کے اس اقدام کی اہمیت اور بھی بڑھ جاتی ہے اگر یہ واقعہ سامنے رکھا جائے کہ یہ قلعہ آزمودہ کار مسلمان سپہ سالاروں کے بجائے راجہ بکرماجیت کے ہاتھوں فتح ہوا تھا۔

جہانگیر لکھتا ہے :-

بتاریخ بست و چہارم ماہ مذکور متوجہ سیر قلعہ کانگڑہ شدم و حکم کردم کہ قاضی و میر عدل و دیگر علماء اسلام در رکاب بودہ آنچہ شعار اسلام و شرائط دین محمدی است در قلعہ مذکور بعمل آرند، بالجملہ قریب بیک کروہ	ماہ مذکور (دی) کی ۲۴ تاریخ[1] کو قلعہ کانگڑہ کی سیر کے ارادہ سے نکلا، میں نے حکم دیا کہ قاضی و میر عدل اور دیگر علمائے اسلام ہمرکاب رہیں جو اسلامی شعائر اور دین محمدی کے شرائط ہیں، وہ اس قلعہ مذکور میں عمل میں لائیں مختصراً

[1] مطابق یکم ربیع الاول ۱۰۳۱ھ

طی نمودہ برفراز قلعہ برآمدہ شد، بتوفیق ایزد سبحان
بانگ نماز و خواندن خطبہ و کشتن گاؤ وغیرہ کہ از ابتدائے
بناء ایں قلعہ تا حال نشدہ بود ہمہ را در حضور خود
بعمل آوردم، سجدات شکر ایں موہبت عظمیٰ کہ ہیچ
بادشاہی توفیق برآں نیافتہ بود بتقدیم رسانیدہ
حکم فرمودم کہ مسجد عالی درون قلعہ بنا نہند۔[۱]

ایک کوس کی مسافت طے کر کے قلعہ کی بلندی پر پہونچا
توفیق الٰہی سے اپنی موجودگی میں اذان دلوائی خطبہ پڑھا
گیا اور ذبیحہ گاؤ پر جس پر اس قلعہ کی تعمیر کے وقت سے کبھی
عمل نہیں ہوا تھا) اپنے سامنے عمل کرایا، اس انعام الٰہی پر کہ کسی
بادشاہ کو کبھی اس کی توفیق نہیں ہوئی تھی شکر کے سجدے بجا
لایا، میں نے حکم دیا کہ ایک بلند و بالا مسجد قلعہ کے اندر تعمیر کی جائے۔

اس بالواسطہ اور بلاواسطہ کوشش سے اولاً سلطنت کا رخ اسلام کی طرف سے تغافل بلکہ تجاہل (اور اس سے آگے بڑھ کر مخالفت) سے ہٹ کر اسلام کے احترام اور شعائر اسلام کی بلندی اور بادشاہ اسلام کی اسلام سے دلچسپی کی طرف تبدیل ہوا، جس کا سلسلہ جہانگیر کے آخری دور سے شروع ہو کر صاحبقران ثانی شاہجہاں کے عہد سلطنت پر سایہ فگن ہوا۔

شاہجہاں کا دور

صاحبقران ثانی شاہجہاں بادشاہ غازی (۱۰۳۷ھ-۱۰۶۸ھ) کا دور جس کا عہد سلطنت ۱۰۳۶ھ سے شروع ہو کر بڑی شان و شوکت کے ساتھ ۳۱ سال رہا اور جو حضرت مجدد کی وفات کے دو سال بعد تختِ سلطنت پر بیٹھا ایک غیر محسوس تدریجی اصلاح و بہتری کا دور تھا، شاہجہاں کے متعلق اس بات کا کوئی قابل اعتماد تاریخی ثبوت نہیں ہے کہ وہ حضرت مجدد یا ان کے فرزند ارجمند خواجہ محمد معصوم سے باقاعدہ بیعت وارادت کا تعلق رکھتا تھا لیکن اس میں کوئی شبہ نہیں کہ اس کے دل میں ہمیشہ حضرت مجدد کے لئے نرم گوشہ اور احترام واخلاص رہا، چنانچہ جب حضرت مجدد نے بادشاہ کی طلبی پر دربار میں آنے کا ارادہ کیا، اور یہ معلوم تھا کہ حضرت مجدد سجدۂ تعظیمی اور دربار کے آداب قبول نہیں کریں گے،

[۱] توزک جہانگیری، جشن شانزدھمیں نوروز، صفحہ ۳۴۰

تو شاہجہاں نے افضل خاں اور مفتی عبدالرحمٰن کو (جو شاہزادہ کے مصاحبین و متوسلین میں تھے) بعض کتب فقہیہ کے ساتھ آپ کے پاس بھیجا اور کہلایا کہ "سجدۂ تعظیمی سلاطین کے لئے جائز ہے، اور فقہاء نے خاص حالات میں اس کی اجازت دی ہے، اگر آپ ملاقات کے وقت بادشاہ کے لئے یہ آداب بجا لائیں تو میں اس کی ذمہ داری لیتا ہوں کہ آپ کو کسی قسم کا نقصان نہیں پہنچے گا" حضرت مجدد نے اس کو قبول نہیں کیا، اور فرمایا کہ یہ رخصت ہے، عزیمت یہی ہے کہ غیر اللہ کو کسی حال میں سجدہ نہ کیا جائے[1]۔

شاہجہاں کے متعلق مورخین کا اتفاق ہے کہ وہ ایک نیک دل بادشاہ شریعت کا احترام کرنے والا، عظیم مساجد کی تعمیر کا خاص شوق رکھنے والا، اور اپنی ذات سے فرائض شرعی کا پابند تھا، علماء اور صلحاء کو اپنے قریب رکھتا تھا، اور ان پر اعتماد کرتا تھا، اس کے وزیر با تدبیر جملۃ الملک سعد اللہ خاں علامی (م ۱۰۶۶ھ) اپنے عہد کے ایک ممتاز عالم اور صاحب درس تھے[2]، اس ذاتی دینداری و خدا ترسی کے ساتھ (جو ایک وسیع سلطنت رکھنے والے خود مختار بادشاہ کی زندگی میں غنیمت سمجھی جانی چاہئے) شاہجہاں نے عہد پیشیں کی بعض خلاف شرع رسوم و آداب کو بھی بند کیا، شمس العلماء مولوی ذکاء اللہ صاحب فارسی کی معاصر تاریخوں بادشاہ نامہ وغیرہ کے بیانات کی بنا پر لکھتے ہیں:۔

> "جب شاہجہاں نے تخت سلطنت پر جلوس کیا تو اس کو مراسم ملت مصطفوی اور شریعت محمدی کا جس میں کچھ خلل پڑ گیا تھا، ایسا پاس و لحاظ تھا کہ اول اس نے حکم دیا کہ سجدہ کرنے کی تعظیم کا معبود حقیقی سزاوار ہے، اب آئندہ کوئی دوسرے کے لئے اپنی پیشانی کو خاک مذلت پر نہ رکھے، مہابت خاں کے کہنے سے اس کی جگہ پر زمیں بوس مقرر کیا، مگر اس میں بھی سجدہ کے ساتھ مشابہت

---

[1] تفصیل کے لئے کتاب کا باب سوم ملاحظہ ہو۔ [2] مفصل حالات کے لئے ملاحظہ ہو "نزہۃ الخواطر" جلد ۵

ہوتی تھی، اس کو بھی موقوف کر کے تسلیم چہارم مقرر کی۔"[1]

سر رچرڈ برن (SIR RICHARD BURN) **لکھتا ہے کہ:-**

"شاہجہاں اسلامی عقائد کو سختی سے دوبارہ نافذ کرنا چاہتا تھا لیکن دوسرے مذاہب کے ماننے والوں سے متعرض بھی نہیں ہونا چاہتا تھا، اس نے جلد ہی تخت شاہی کو سجدہ کرنے کی رسم دربار سے اٹھا دی ...... الہٰی سنہ بھی جسے اکبر نے رائج کیا تھا، اس کا سرکاری کاغذات اور سکّوں پر استعمال شاہجہاں کی تخت نشینی کے چند سال بعد ختم ہو گیا...... ۱۶۳۴ء میں ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان مناکحت جو پنجاب و کشمیر میں عام تھی، ممنوع قرار دے دی گئی۔"[2]

مولوی ذکاء اللہ صاحب لکھتے ہیں:-

"سرکار خاصہ سے قاضی و معلم مقرر ہوئے کہ احکام شریعت و آداب عبادت کی تعلیم کریں..... شیخ محمود گجراتی مقرر ہوا کہ تحقیق و ثبوت کے بعد مسلمان عورتوں کو ہنود کے تصرف سے نکالے اور ان کی عمارات و مساجد کو جدا کرے، اس نے حکم مذکور کے مطابق عمل کیا، کئی ایک مسجدوں کو جو ہنود کے زیر تصرف تھیں، ان کو جدا کیا اور ہنود سے جرمانہ لے کر ان کو تعمیر کرایا، جن ہنود نے قرآن شریف کی بے ادبی کی تھی، ان کو بعد ثبوت .... عبرتناک سزا دی، پھر بادشاہ نے حکم دیا کہ تمام ولایت پنجاب میں جس جگہ یہ صورت ہوئی ہو اس کو مہمات شرعی کے متکفل تحقیق کریں۔"[3]

لیکن اس احترام شریعت اور قدرے دینی حمیت کے ساتھ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ شاہجہاں اپنے متشرع، صاحب علم اور صاحب صلاحیت فرزند اورنگ زیب کے مقابلہ میں اپنے صلح کل، آزاد مشرب بڑے بیٹے دارا شکوہ کو ترجیح دیتا تھا، اور اسی کو تخت و تاج کا وارث اور اپنا جانشین بنانا چاہتا تھا، اور یہی شخصی و موروثی سلطنتوں اور "دین و سیاست کی تفریق"

---

[1] تاریخ ہندوستان جلد ۸، ص ۵۵-۵۶ باختصار [2] CAMBRIDGE HISTORY OF INDIA VOL. IV P. 217
[3] تاریخ ہندوستان جلد ۸، ص ۱۷۵-۱۷۶ باختصار۔

کے اصول پر کاربند فرمانروایانِ سلطنت کی وہ خصوصیت ہے، جہاں ان کی ذاتی دینداری امورِ سلطنت پر اثرانداز اور کسی غلط یا مضر جانشیں کے انتخاب میں مانع نہیں بنتی۔

شاہزادہ داراشکوہ

عہدِ عالمگیری میں جو تاریخیں مرتب کی گئیں ہیں، محض ان کے اعتماد پر ہم داراشکوہ کے متعلق کوئی فیصلہ نہیں کرسکتے نہ اس کے قطعی طور پر بے دین و بدعقیدہ ہونے کا حکم لگا سکتے ہیں، اور نہ یہ کہہ سکتے ہیں کہ تخت و تاج کے لئے بھائیوں کی یہ جنگ خالصتاً دو فلسفوں، دو طریق فکر اور دین و لادینیت کی جنگ تھی، لیکن غیر مسلم اور غیر جانبدار مؤرخوں کے بیانات سے بھی اتنا معلوم ہوتا ہے کہ وہ اپنے پردادا اکبر کے رنگ سے قریب تر، اور وحدت ادیان کے نظریہ سے متاثر اور شریعت و ویدانت میں مطابقت ثابت کرنے کے لئے کوشاں تھا، فرانسیسی ڈاکٹر برنیر لکھتا ہے کہ "یوزی صاحب فلیمش پادری کے مواعظ دینیہ کو بہت رغبت سے سنتا تھا، ہندو مسلمان کو ایک مذہب کرنا چاہتا تھا"، دائرۂ معارف اسلامیہ کے مقالہ نگار کے بقول:۔

"وہ تصوف سے خاصی دلچسپی رکھتا تھا، اور ہندو فلسفہ کے زیر اثر تھا، اس نے مسلمان صوفیا اور ہندو سنیاسیوں سے گہرے تعلقات قائم کرلئے تھے، ان میں (مسلمان صوفیوں اور علماء کے ساتھ) سرمدؔ مشہور آزاد مشرب وجودی، اور بابا لال داس بیراگی، کبیر کا پیرو بھی تھا۔"

"دارا کی بعض متاخر تصانیف سے مترشح ہوتا ہے کہ وہ نظریہ وحدۃ الوجود کا پیرو تھا، وہ ہندو فلسفہ اور صنمیات سے متاثر تھا، جس کی وجہ سے وہ متعدد ایسے ملحدانہ خیالات کی طرف مائل ہوگیا جن کے واضح مماثل ہندو فلسفہ میں پائے جاتے ہیں، اور جن کی اسلام میں کوئی گنجائش نہیں.......... دارا اس نتیجہ پر پہنچا تھا کہ ویدانت اور تصوف جن کے ذریعہ "حق"

کا ادراک کرنا چاہیئے، وہ باہم مخالف نہیں، فرق صرف لفظوں کا ہے "اوپنشدوں" کے ترجمہ میں جسے وہ "وحدت" کا سرچشمہ بیان کرتا تھا، دارا نے دو بڑے مذاہب اسلام اور ہندومت کے پیروؤں کے مشترک نظریات کو ہم آہنگ کرنے کی کوشش کی نیز اس نے یہ چاہا کہ ہندؤں کے اعتقادات سے مسلمانوں کو شناسا کرائے۔"[1]

دارا کے ان افکار و خیالات، رجحانات و جذبات کی بنا پر جو اس وقت کے ہندوستانی مسلم معاشرے سے مخفی نہیں رہ سکتے تھے، اور جس کا بیدار مغز شہزادے اورنگ زیب نے پورا فائدہ اٹھایا ہوگا، ذرا بھی محل استعجاب نہیں کہ ہندوستان کے دیندار حلقے علماء دین اور متبع شریعت شیوخ طریقت اور ان کے متبعین نے جو اکبر کے دور میں اسلام کی بے بسی و بے دخلی کا منظر دیکھ چکے تھے یا انھوں نے اپنے بزرگوں سے سنا تھا، اس جنگ برادران میں داراشکوہ کے مقابلہ میں، حامیٔ اسلام، پابند مذہب و شریعت شاہزادہ اورنگ زیب کی نصرت و حمایت اور اپنی دعاؤں اور ترغیب و تحریض سے اس کی پوری مدد کی ہو۔[2]

اس کشمکش کا نتیجہ سب کو معلوم ہے کہ اورنگ زیب نے داراشکوہ پر فتح پائی اور ۱۰۶۸ھ میں سریرآرائے سلطنت ہوا اور پوری نصف صدی بڑے کروفر کے ساتھ حکومت کی۔

محی الدین اورنگ زیب عالمگیر اور اس کی دینی حمیت و حمایت

اورنگ زیب عالمگیر نے (جس کو حضرت مجدد کے خاندان سے عقیدت اور ان کی

---

[1] مقالہ داراشکوہ اردو دائرۂ معارف اسلامیہ جلد ۹ مقالہ نگار (ستیش چندر [وادارہ]) نیز ملاحظہ ہو "AURANGZEB" از ظہیرالدین فاروقی ص ۳۸-۴۷

[2] تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو پروفیسر محمد اسلم کا مقالہ "اورنگ زیب کی تخت نشینی میں علماء و مشائخ کا کردار" مشمولہ "تاریخی مقالات" از پروفیسر محمد اسلم ص ۲۳۶-۲۴۳

دعوت و مسلک سے شروع سے مناسبت تھی) حضرت خواجہ محمد معصوم سے بیعت و ارادت کا تعلق قائم کر لیا تھا[1]، اس بات کے متعدد شواہد و قرائن ہیں کہ بادشاہ کا تعلق حضرت خواجہ سے محض غائبانہ عقیدت اور عام نیازمندی کا نہ تھا، بلکہ اس نے باضابطہ اصلاح و تربیت کا تعلق بھی حضرت سے قائم کر لیا تھا، حضرت خواجہ محمد معصوم کی اورنگ زیب کی شہزادگی کے وقت سے اُس پر نظرِ خاص تھی، اور وہ اس کو شہزادۂ دین پناہ (جو ایک پیشین گوئی اور فالِ نیک تھی) کے لقب سے یاد فرماتے ہیں، حضرت خواجہ سیف الدین اپنے والد ماجد حضرت خواجہ محمد معصوم کو ایک مکتوب میں لکھتے ہیں:۔

"بادشاہ (اورنگ زیب) دین پناہ را	بادشاہ دین پناہ کا حضرت کے ساتھ
در خدمت حضرت اخلاص بہ نوع	اخلاص اور ہی طرح کا ہے، لطائف ستہ
دیگر است، از ذکر لطائف و ذکر سلطانی	اور سلطان الاذکار کے ذکر سے گذر کر
گزشتہ بذکر نفی و اثبات مقید است،	اس وقت نفی و اثبات کے ذکر کی منزل
و ظاہر می سازد کہ بعضے اوقات خطرہ	پر ہیں، ان کا بیان ہے کہ بعض اوقات
مطلقاً نمی آید، و گاہے کہ می آید استقرار	وسوسہ مطلق نہیں آتا اور کبھی آتا بھی
نمی کند از یں راہ خیلے محفوظ است	ہے تو اس کو استقرار نہیں ہوتا، وہ اس چیز
و می گوید کہ پیش از یں من از ہجوم	سے بہت محفوظ ہیں، فرماتے ہیں کہ اس سے
خواطر دل تنگ بودم و شکر ایں نعمت	پہلے میں وساوس و خطرات کے ہجوم
بجا می آرد"[2]	سے پریشان ہو جاتا تھا، وہ اس نعمت
	کا شکر بجا لاتے ہیں۔

---

[1] مکتوبات سیفیہ مکتوب ۸۳ بنام صوفی سعد اللہ افغانی [2] ایضاً مکتوب ۲

خواجہ سیف الدین کے اس خط کے جواب میں حضرت خواجہ محمد معصوم نے جو مکتوب تحریر فرمایا، اس میں آپ نے خدا کا شکر ادا کیا ہے جس نے بادشاہ کو روحانی مراتب عطا فرمائے اس خط سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ بادشاہ کو فنائے قلبی کا مقام حاصل ہو چکا تھا، جو سلوک میں ایک بلند مقام ہے[1]۔

ابوالفتح آداب عالمگیری" میں لکھتا ہے کہ :۔

"اورنگ زیب کی تخت نشینی کے فوراً بعد خواجہ محمد معصوم اور ان کے برادر بزرگ خواجہ محمد سعید دربار شاہی میں تشریف لائے اورنگ زیب نے اس موقعہ پر تین سو طلائی مہریں نذر کیں[2]"۔

پروفیسر محمد اسلم صاحب نے اپنے مضمون "اورنگ زیب کی تخت نشینی میں علماء و مشائخ کا کردار" میں "مرآت العالم" اور "فتوحات عالمگیری[3]" کے حوالہ سے متعدد واقعات نقل کئے ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ بادشاہ کے اس خاندان اور حضرت مجدد کے فرزندوں سے گہرے روابط تھے[4]، یہ حضرات بادشاہ سے ملاقات کرتے تھے، اور بادشاہ ان کی خدمت میں

---

[1] مکتوبات خواجہ محمد معصوم مکتوب ۲۲۰ [2] ابوالفتح آداب عالمگیری" قلمی نسخہ انڈیا آفس لائبریری لندن ایتھے ۲۱ ورق ۱۳۱ب ، محمد کاظم، عالمگیر نامہ، مطبوعہ کلکتہ ۱۸۶۸ء ص ۲۹۳ (منقول از تاریخی مقالات از پروفیسر محمد اسلم)

[3] یہ دونوں کتابیں انڈیا آفس لائبریری اور برٹش میوزیم لندن کے کتب خانہ میں ہیں۔ [4] حضرت خواجہ سیف الدین کے مکتوبات کا جو بادشاہ عالمگیر کے نام ہیں، اور مکتوبات سیفیہ کے نام سے شائع ہوئے ہیں، اگر بنظر غائر مطالعہ کیا جائے تو اندازہ ہو گا کہ بادشاہ کا تعلق حضرت خواجہ سیف الدین سے علی الخصوص اور خاندان مجددی سے علی العموم محض احترام و عقیدت کا نہیں تھا جیسا کہ دیندار اور خوش اعتقاد بادشاہوں کا اپنے عہد اور مملکت کے علماء و مشائخ سے رہا ہے، بلکہ یہ تعلق ضابطہ سے زیادہ رابطۂ عقیدت سے زیادہ تربیت و استفادہ کا تھا، حضرت خواجہ سیف الدین اپنے والد نامدار کے نام ایک مکتوب میں تحریر فرماتے ہیں، جو ترتیب میں تیسرا مکتوب ہے:۔

حضرت سلامت دریں روزہا صحبتہائے طولانی واقع می شود   حضرت سلامت! ان دنوں طویل طویل صحبتیں اور مجلسیں ہوتی ہیں،

(باقی ص ۳۲۶ پر)

قیمتی تحائف پیش کرتا تھا، دہلی سے لاہور جاتے اور واپس آتے وقت وہ کئی بار سرہند میں حضرت خواجہ محمد معصوم اور خاندان مجددی کے دوسرے افراد سے ملا۔

مفتی غلام سرور صاحب "خزینۃ الأصفیاء" کی روایت کے مطابق بادشاہ نے حضرت خواجہ محمد معصوم سے متعدد بار استدعا کی کہ وہ سفر و حضر میں اس کے ساتھ رہا کریں، لیکن انھوں نے اپنے والد بزرگوار کی نصیحت کے مطابق بادشاہ کے ساتھ رہنا پسند نہیں فرمایا، اور اپنی جگہ اپنے فرزند گرامی قدر خواجہ سیف الدین کو دہلی بھیج دیا۔ "مکتوبات معصومیہ" میں دو مکتوب ایک ۲۲۱ دوسرا ۲۴۷ بادشاہ کے نام ہیں، اور ان سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ بادشاہ کا حضرت خواجہ سے ارادت و تربیت کا تعلق ہے، ان کے اور بادشاہ کے روابط اور بادشاہ کے ان سے اثر پذیر

(باقی صفحہ ۳۲۵ کا)

وبعضے مکاتب غامضہ مذکور می گردد و با خلاص تمام می شنود۔	بعض دقیق مکاتیب کا مذاکرہ بھی ہوتا ہے اور بادشاہ پورے اخلاص کے ساتھ سماعت فرماتے ہیں۔

مکتوب نمبر ۱۴۲ میں جو شیخ محمد باقر لاہوری کے نام ہے، تحریر فرماتے ہیں:۔

بادشاہ دیں پناہ شب شنبہ کہ شب سوم ایں ماہ باشد بمنزل فقرا آمد و از قسم اطعمہ بے تکلف از آں چہ حاضر بود تناول فرمودند و صحبت طولانی گشت و مجلس سکوت نیز در میان آمد .... بالجملہ ترویج طریقۂ عالیہ امید است کہ موافق خواہش مخلصانہ بظہور آید۔ صفحہ ۱۶۸-۱۶۹	بادشاہ دیں پناہ شنبہ کی رات کو جو اس مہینہ کی تیسری رات تھی غریب خانہ پر تشریف لائے، جو بے تکلف کھانے حاضر تھے ان کو تناول فرمایا، صحبت نے طول کھینچا، درمیان میں سکوت کی مجلس بھی پیش آئی، مختصراً یہ کہ امید ہے کہ مخلصین کی خواہش کے مطابق طریقۂ عالیہ کی ترویج بھی ظہور میں آئے گی۔

تعلقات و اثرات کا یہ سلسلہ عالمگیر کی وفات کے بعد تک جاری رہا، چشتی نظامی سلسلہ کے مشہور شیخ جن سے اس طریقہ کو حیات نو حاصل ہوئی شاہ کلیم اللہ جہان آبادی (م ۱۱۴۳ھ) نے اپنے خلیفۂ خاص حضرت شیخ نظام الدین اورنگ آبادی کو جو خطوط لکھے ہیں، ان میں بعض خطوط میں ہدایت کی ہے کہ چونکہ اس وقت بادشاہ کے ساتھ اورنگ آباد میں مجددی خاندان کے صاحبزادے بھی ہیں، اس لئے سماع و قوالی کی مجلسیں منعقد کرنے میں احتیاط برتی جائے کہ مبادا ان حضرات کو گرانی اور تکدر ہو، جس سے صاف پتہ چلتا ہے کہ دکن کی مہمات اور وہاں کے طویل قیام میں اس خاندان کے عالی مرتبہ افراد وقتاً فوقتاً بادشاہ کے شریک صحبت اور دعا و توجہات سے معاون و شریک حال رہا کرتے تھے۔

لہ تاریخ مشائخ چشت، از پروفیسر خلیق احمد نظامی، صفحہ ۴۱۸-۴۱۹

ہوتے اور ان کی ہدایتوں پر عمل کرنے کا تذکرہ باب ہشتم میں خواجہ سیف الدین کے تذکرہ میں آئے گا، خواجہ سیف الدین بادشاہ کے ساتھ رہ کر ترویجِ شریعت و احیاءِ سنت کے کام میں برابر ساعی و سرگرم رہے، ان کے خطوط کے مجموعہ "مکتوبات سیفیہ" میں بادشاہ کے نام اٹھارہ[1] مکتوبات ہیں، جن میں بادشاہ کی توجہ، ازالۂ بدعات، احیائے سنت اور اعلاء کلمۃ اللہ کی طرف مبذول کرائی گئی ہے۔

کسی فرمانروائے سلطنت اور خود مختار بادشاہ کے پورے اعمال و اخلاق، اس کے فیصلوں اور اقدامات کی ذمہ داری لینی مشکل ہے، اور ان سب کو اسلامی تعلیمات اور احکام شریعت کے مطابق ثابت کرنا ممکن نہیں، یہ بات تو صرف خلفائے راشدین اور ایسے چند حکمرانوں کے متعلق کہی جا سکتی ہے، جو اموی خلیفہ حضرت عمر بن عبد العزیز کی طرح خلافت علی منہاجِ النبوۃ کے قائل و عامل تھے، پھر یہ متنازع فیہ اقدامات اور سیاسی و انتظامی کارروائیاں کن مجبوریوں اور مصلحتوں کے پیش نظر عمل میں آئیں، اور مؤرخین نے ان کی جو تصویر پیش کی ہے وہ کس حد تک واقفیت پر مبنی تھی، طویل زمانہ گذر جانے کے بعد اور صحیح شہادتوں کی غیر موجودگی میں ان کے بارے میں فیصلہ کرنا آسان نہیں، پھر بھی عالمگیر کے متعلق جو مستند تاریخی مواد موجود ہے، اس کی بنا پر پورے وثوق کے ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ بادشاہ حضرت مجدد صاحب کی اصلاحی و تجدیدی تحریک، سلطنت کو "ہادم اسلام" کے بجائے "خادم اسلام" بنانے کی انقلاب انگیز مگر خاموش کوششوں اور ان کے فرزندوں اور خاندان کی گہری و بے لوث روحانیت اور دلآویز شخصیتوں سے پورے طور پر متاثر تھا، اور اس نے حضرت مجدد کی دعوت و مقاصد سے ہم آہنگی پیدا کر لی تھی، وہ نظامِ سلطنت اور معاشرہ میں جرأت مندا

---

[1] مکتوب نمبر ۲۰-۲۲-۲۳-۲۶-۳۵-۳۹-۵۶-۵۷-۵۹-۶۰-۶۷-۷۲-۷۴-۷۶-۷۷-۸۰-۱۶۱-۱۶۴-۱۶۵- (مکتوبات سیفیہ)

اور دور رس تبدیلیاں لانا چاہتا تھا، اور اس نے پہلی مرتبہ بعض ایسی اصلاحات نافذ کی تھیں، جن سے اگرچہ حکومت کا مالیہ متاثر ہوتا تھا لیکن شریعت کے بعض صریح احکام کا نفاذ ہوتا تھا۔

ہم اس کی ذاتی زندگی کو اس وقت چھوڑتے ہوئے جس کے متعلق تمام مؤرخین کا اتفاق ہے کہ وہ ایک متشرع، پابند مذہب بلکہ متقی مسلمان کی زندگی تھی، اور جس کے لئے بطور مثال کے چند نمونے کافی ہیں:۔

"رمضان کا مہینہ تھا، لوئیں چلتی تھیں، دن بڑے ہوتے تھے، بادشاہ دن کو روزہ رکھتا وظائف پڑھتا، تلاوت و کتابت اور حفظ کلام مجید کرتا، اور اپنی عدالت و سلطنت کے کاموں کو انجام دیتا، شام کو افطار کرکے "مسجد غسلخانہ" (موتی مسجد) میں نماز و تراویح اور نفل پڑھتا، آدھی رات کو کچھ قلیل غذا کھاتا، رات کو بہت کم سوتا، اکثر عبادت کرتا، بعض متبرک راتوں کو ساری رات عبادت ہی میں گذارتا، اسی طرح سارا مہینہ گذارا۔"[1]

انتقال کا حال بیان کرتے ہوئے مؤرخ لکھتا ہے:۔

"سال پنجاہ و یک (جلوس) ۱۱۱۸ھ تپ بڑی شدت سے چڑھی چار روز تک باوجود اشتداد مرض بسبب کمال تقوی کے پانچ وقت کی نماز جماعت کے ساتھ پڑھی ایک وصیت نامہ تھا کہ جس میں اس نے اپنی تجہیز و تکفین کے متعلق لکھا تھا کہ ساڑھے چار روپیہ جو میرے ہاتھ کی محنت کی ٹوپیوں کی سلائی سے بچے ہیں، اس میں تجہیز و تکفین ہو اور آٹھ سو پانچ روپئے جو قرآن نویسی کی اجرت سے حاصل ہوئے ہیں، مساکین میں تقسیم ہوں، روز جمعہ ۲۸ ذی قعدہ ۵۱ جلوس مطابق ۱۱۱۸ھ کو بادشاہ نے صبح کی نماز پڑھ کے کلمۂ توحید کا ذکر شروع کیا،

[1] "تاریخ ہندوستان" جلد ہشتم، از شمس العلماء مولوی محمد ذکاء اللہ دہلوی مرحوم ص ۲۱۴ (ماخوذ از مآثر عالمگیری وغیرہ)

ایک پہر دن چڑھے اس دارفنا سے روضۂ جناں کو تشریف فرما ہوا[۱]"

ہم یہاں پر عالمگیر کے صرف ان احکام و فرامین کا ذکر کریں گے جن کا تعلق شعائرِ اسلام کے احترام اور احکام شریعت کے نفاذ و اجراء سے ہے۔

۱۰۶۹ھ اور جلوس کے سال دوم کے واقعات کا ذکر کرتے ہوئے مؤرخ لکھتا ہے:۔

"جلال الدین محمد اکبر شاہ کے عہد سے دفتر و جلوس کے سال و ماہ کی بنا غرۂ فروردی پر رکھی گئی تھی، اس تاریخ میں آفتاب برج حمل میں داخل ہوتا ہے، بہار کا موسم ہوتا ہے اس بادشاہ کے جلوس کی تاریخ بھی اس تاریخ کے قریب تھی، تو اس نے سارا حساب فروردی سے لے کر اسفندار[۲] کے مہینوں تک مقرر کیا تھا، اور مہینہ کا نام ماہ الٰہی رکھا تھا، چونکہ یہ طریقہ آتش پرست بادشاہوں اور مجوسیوں کے مشابہ تھا، اس لئے بادشاہ نے شریعت کا پاس کر کے جلوس و جشن اور دفتر کے حسابوں کے لئے سال و ماہ قمری عربی کا حساب مقرر کیا، اور حکم دیا کہ سال شمسی پر عربی سال و ماہ مقدم ہوں، اور جشن نوروز بالکل موقوف ہو ....

سب جانتے ہیں کہ ہمیشہ موسموں میں قمری ماہ بدلتے رہتے ہیں، قمری سال و ماہ کے حساب رکھنے میں بڑی دقتیں پیش آتی ہیں، لیکن اس دیندار بادشاہ نے کچھ حساب کی آسانی پر خیال نہیں کیا، فقط آتش پرستوں اور مجوسیوں کی مشابہت کی وجہ سے نوروز کے جشن کو موقوف کیا اور جلوس ثانی کی تاریخ غرۂ رمضان مقرر کر کے اس نے جلوس کا نیا سال مقرر کیا، اور جشن نوروز کی جگہ جشن عید الفطر مقرر کیا[۳]"

ایک بڑی سرکاری آمدنی کے ذریعہ کی جو نامشروع تھی، موقوفی کا ذکر کرتے ہوئے مؤرخ لکھتا ہے:۔

---

[۱] ایضاً ص۴۶۵ [۲] فروردی، اسفندار قدیم ایرانی تقویم کے مہینے ہیں۔ [۳] ایضاً ص۸۳-۸۴

"بادشاہ نے راہداری کی معافی کا حکم کیا، یہ راہداری ہر سرگذر و سرحد معتبر پہ لی جاتی تھی، اور ...

اس آمدنی کا سب روپیہ خزانہ میں داخل ہوتا تھا، پاندری جس کو تہ بازاری کہتے ہیں۔ ...... اور

یہ آمدنی لاکھوں روپئے سے زیادہ خزانۂ شاہی میں داخل ہوتی تھی اور ابواب مشروع ونامشروع

مسکرات وخرابات خانہ وجرمانہ وشکرانہ وغیرہ وغیرہ جن کی آمدنی کا کروڑوں روپیہ خزانۂ سرکار میں

داخل ہوتا تھا، ان سب کو قلمرو ہندوستان سے معاف کرایا[۱]۔"

محتسب کا عہدہ شرعی حکومتوں کا ایک اہم عہدہ اور خلافت اسلامی کا ایک شعار تھا، بہت سے علماء نے اس عہدہ کی نوعیت، اس کے فرائض پر "الحسبۃ فی الاسلام" کے نام سے کتابیں لکھی ہیں، ہندوستان کی مسلم سلطنتوں میں عرصہ سے یہ عہدہ موقوف اور یہ کام معطل تھا، بادشاہ نے اس سنت کو بھی زندہ کیا، مؤرخ لکھتا ہے:۔

"بادشاہ نے ایک عالم عوض وجیہ کو محتسب مقرر کیا، اس کو حکم تھا، کہ وہ خلق کو منہیات و

محرمات سے خصوصاً شرب خمر اور بنگ بوزہ اور تمام مسکرات و فواحش سے منع کرے، اور

حتی المقدور بُرے کاموں سے خلق کو روکے[۲]۔"

سال یازدہم لغایۃ بلبیست ویکم ۱۰۸۰ھ کے واقعات درج کرتے ہوئے مؤرخ لکھتا ہے:۔

"روز بروز امور شرعی کے اجراء اور اوامر و نواہی الٰہی کی پاسداری میں بادشاہ کی تقیید بڑھتی جاتی

تھی، مفصل احکام جاری ہوتے تھے کہ راہداری و پاندری وغیرہ موقوف کی جائے جس سے لاکھوں

روپئے کی آمدنی ہر سال سرکار کو حاصل ہوتی تھی[۳]، وہ مسکرات کے رواج و خرابات خانوں کو

موقوف کرتا تھا۔"

---

[۱] ایضاً ص ۹۰ [۲] ایضاً ص ۹۲ [۳] صاحب "نزہۃ الخواطر" نے فارسی تاریخوں کے حوالہ سے لکھا ہے کہ عالمگیر نے ۱۰۶۹ھ میں قسم قسم کے ناجائز محاصل (ٹیکس) موقوف کر دیئے جس سے خزانہ شاہی کو تیس لاکھ سالانہ کی آمدنی ہوتی تھی۔

آگے چل کر لکھتا ہے:۔

"بادشاہ نے سرود و رقاصی کے منع کا حکم صادر کیا...... جھروکہ درشن کو بھی نامشروع جان کر جھروکہ میں خود بیٹھنا اور جھروکہ کے نیچے آدمیوں کے جمع ہونے کو موقوف کر دیا[1]"

اہل ہند کے قدیم دستور و اعتقاد کے مطابق مسلمان بادشاہ بھی علم نجوم اور منجموں پر بہت زیادہ اعتبار کرتے تھے، اور انھیں کے حسابات اور فیصلوں کے مطابق کاموں کے لئے دن مقرر کرتے تھے، عالمگیر نے اس کو بھی موقوف کیا، اور سب سے بڑھ کر یہ کہ عدالتی فیصلوں کا تمام تر انحصار امراء و حکام کی عدالتوں اور ان کے فیصلوں پر تھا، عالمگیر نے شرعی قاضی مقرر کئے، اور ان کو اعلیٰ اختیارات دیئے۔

"شاعر و منجم جو بہت زیادہ اعتبار رکھتے تھے، خصوصاً شاہجہاں کے عہد میں موقوف ہوئے، امور ملکی و مقدمات جزئی و کلی میں قضاۃ مقرر ہوئے، اور وہ ایسے مستقل ہوئے کہ امیران عہدہ صاحب مدار سلطنت کو ان پر رشک و حسد ہوا[2]"

پوری سلطنت میں شرعی قانون و آئین جاری کرنے کے لئے اور قضاۃ کی آسانی کے لئے مسائل فقہیہ کی تدوین و ترتیب کا نیا بیڑہ اٹھایا، اور مستند علماء کی ایک جماعت کو اس کے لئے مامور کیا کہ وہ آسان عبارت میں مسائل جزئیہ کو ایک جگہ جمع کر دیں، اور ظاہر الروایہ پر اکتفا کریں، اور سوائے خاص حالات کے "نوادر" کی طرف توجہ نہ دیں، اور جو عبارت جہاں سے لی جائے اس کا حوالہ دیں، اس کے لئے اوائل سلطنت ہی میں مولانا نظام الدین برہانپوری کو ذمہ دار بنایا، انھوں نے ان علمائے کبار سے مدد لی جو فقہ حنفی میں

---

[1] ایضاً ص ۲۷۵-۲۷۶ باختصار [2] ایضاً ص ۲۷۷ نیز ملاحظہ ہو ظہیر الدین فاروقی صاحب کی کتاب "اورنگ زیب" کا باب A REFORMER ص ۵۵۹-۵۶۲

امتیاز رکھتے تھے[1]، یہ کام ۶ جلدوں میں مکمل ہوا اور اس پر شاہی خزانے کے دو لاکھ روپئے (جو اس زمانے کے لحاظ سے خطیر رقم ہے) صرف ہوئے، یہ ہندوستان میں "فتاویٰ عالمگیری" کے نام سے، اور مصر و شام و ترکی میں "الفتاویٰ الهندیہ" کے نام سے مشہور ہے، اور اس کو بعض خصوصیات کی بنا پر بڑی اہمیت حاصل ہے۔

اس سے زیادہ جرأت مندانہ اقدام یہ تھا کہ بادشاہ نے اپنے خلاف بھی رعیت کو استغاثہ کرنے اور شریعت کے مطابق فیصلہ کرانے کی اجازت دی اور اس کام کے لئے وکیل شرعی مقرر کئے، مؤرخ ہندوستان لکھتا ہے:۔

"۱۰۸۲ھ میں بادشاہ نے حکم فرمایا کہ حضور میں اور شہروں میں منادی کریں کہ جس کسی کا دعویٰ شرعی بادشاہ پر ہو وہ حاضر ہو کر وکیل بادشاہ سے رجوع کرے، اور اثبات کے بعد اپنا حق لے لے، اور حکم دیا کہ بادشاہ کی طرف سے وکیل شرعی حضور میں اور بلاد نزدیک و دور میں مقرر ہو، تاکہ جو حضور میں آنے کی دسترس نہیں رکھتے وہ ان کے ذریعہ سے اپنی حق رسی کا دعویٰ کریں[2]"۔

مغل دربار میں اور شاہان مغلیہ کے لئے عام طور پر کورنش و آداب کے طریقے رائج تھے، جن میں مبالغہ آمیز تعظیم اور خلاف شریعت اعمال شامل تھے، سلام مسنون کا تو درباروں کا کیا ذکر امراء و رؤساء بلکہ بہت سے علماء و مشائخ کی مجلسوں میں بھی رواج نہیں رہا تھا، بادشاہ نے اس کی بھی اصلاح فرمائی، اور سلام مسنون پر اکتفا کرنے کی تاکید کی، مؤرخ لکھتا ہے:۔

---

[1] مولانا حکیم سید عبدالحی مصنف "نزہۃ الخواطر" نے اپنی گرانقدر کتاب "الثقافۃ الاسلامیۃ فی الہند" میں بڑی تحقیق و تلاش سے ان لوگوں کے نام جمع کئے ہیں، جو علماء کے اس بورڈ میں شامل تھے، انھوں نے بیس ایسے نام لکھے ہیں جو پورے ہندوستان کے علمی حلقے کی نمائندگی کرتے تھے، ملاحظہ ہو "الثقافۃ الاسلامیۃ فی الہند" مطبوعہ دمشق اکیڈمی ص ۱۱۰-۱۱۱ [2] ایضاً ص ۳۰۰

"انھیں دنوں میں حکم ہوا کہ جب مسلمان بادشاہ سے ملاقات کریں تو سلام شرعی سلام علیک پر اکتفا کریں کفار کی طرح سر پر ہاتھ نہ رکھیں، حکام بھی خاص و عام کے ساتھ یہی طریقہ برتیں"[1]

انھیں جذبات و اقدامات کی بنا پر ہندوستان کے دینی حلقوں نے بادشاہ عالمگیر کو "محی الدین" کا لقب دیا، علامہ اقبال کے نزدیک بھی (جن کی ہندوستان کے رجحانات اور فلسفوں اور ویدانت اور شریعت کی صف آرائی، اور ہندوستان کے مستقبل کی صورت گری میں قسمت آزمائی پر گہری نظر تھی) عالمگیر کا شمار ان چند شخصیتوں میں تھا جن کے سر اس ملک میں اسلام کی حفاظت کا سہرا ہے، راقم سطور نے اپنی ایک طویل ملاقات کی (جو ۲۲ نومبر ۱۹۳۷ء کو لاہور میں ان کے دولت خانہ پر ہوئی تھی) روداد قلمبند کرتے ہوئے اپنے مضمون "عارف ہندی کی خدمت میں چند گھنٹے" میں لکھا تھا:۔

"ہندوستان میں اسلام کے تجدید و احیاء کی بات نکلی تو علامہ نے مجدد الف ثانی حضرت شیخ احمد سرہندی، حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی، اور سلطان محی الدین عالمگیر کی بڑی تعریف کی، اور فرمایا کہ میں ہمیشہ کہتا ہوں کہ اگر ان کا وجود اور ان کی جد و جہد نہ ہوتی تو ہندو تہذیب و فلسفہ اسلام کو اپنے اندر تحلیل کر لیتے"

انھوں نے اسی یقین و تحقیق کی بنا پر عالمگیر کی شان میں حسب ذیل پر جوش اور فکر انگیز شعر کہے ؎

شاہ عالمگیر گردوں آستاں — اعتبار دودمان گورگاں
پایۂ اسلامیاں برتر از و — احترام شرع پیغمبر از و
درمیانِ کارزار کفر و دیں — ترکش ما را خدنگ آخریں
تخم الحادے کہ اکبر پرورید — باز اندر فطرت دارا دمید

[1] عالمگیر کے کھلے ہوئے دینی رجحان اور مملکت میں دور رس تبدیلیوں کی تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو جادو ناتھ سرکار کی کتاب AURANGZIB (OXFORD) P. 64-66 - نیز اسٹینلی لین پول کی کتاب HISTORY OF AURANGZIB VOL III PP. 81-90

شمع دل در سینہ ہا روشن نبود ملت ما از فساد ایمن نبود
حق گزید از ہند عالمگیر را آں فقیرِ صاحب شمشیر را
از پئے احیائے دیں مامور کرد بہر تجدید یقیں مامور کرد
برق تیغش خرمن الحاد سوخت شمع دیں در محفل ما برفروخت
کور ذوقاں داستانہا ساختند وسعت ادراک او نشناختند
شعلۂ توحید را پروانہ بود چوں براہیم اندریں بتخانہ بود

در صفِ شاہنشہاں یکتاستے
فقر او از ترکشش پیداستے[1]

بالآخر حضرت مجدد کے دو خلیفۂ اجل اور جانشین برحق، حضرت خواجہ محمد معصوم اور حضرت سید آدم بنوری اور ان کے مخلص و باعظمت خلفاء اور جانشینوں کی کوششیں اس ملک میں بار آور ہوئیں اور رفتہ رفتہ بارہویں صدی ہجری میں یہ ملک پوری دنیائے اسلام (جس پر فکری و علمی اضمحلال کے بادل چھائے ہوئے تھے) کا روحانی و علمی مرکز بن گیا، اور دنیائے اسلام کے دور دراز گوشوں سے لوگ یہاں اپنی روحانی و علمی پیاس بجھانے، تزکیہ و احسان کی منزلیں طے کرنے اور حدیث کا درس لینے کے لئے آنے لگے، یہاں جا بجا مجددی خانقاہیں اور کتاب و سنت کی تعلیم اور درس حدیث کے مرکز قائم ہو گئے، اور ایک عالم نے ان سے فیض اٹھایا۔

---

[1] رموز بیخودی کلیات فارسی ص ۹۸

حضرت مجددؒ کی مخالفت و تضلیل کی تحریک اور اس کے نمایاں افراد

یہ باب نامکمل رہے گا اور ناظرین کے سامنے صرف ایک ہی پہلو آئے گا (جو اگرچہ بہت درخشاں اور روشن ہے، اور مجدد صاحب کی سیرت و تاریخ میں یہی پہلو غالب اور نمایاں ہو کر رہا) اگر ہم اس مخالفانہ تحریک اور مہم کا ذکر نہ کریں، جو مجدد صاحب کی زندگی کے آخری دور ہی میں شروع ہو گئی تھی، اور جو ہندوستان کے حدود سے متجاوز ہو کر حرمین شریفین تک پہونچی، اور جس کی بنیاد مجدد صاحب کی بعض تحریرات، اور مکتوبات کی بعض عبارتوں اور مضامین پر تھی۔

اللہ تعالیٰ نے حضرت مجدد صاحب کو ان کی زندگی میں جو قبول عام اور مرجعیت تام عطا فرمائی، اور ان کا اہل ذکر و علم سے لے کر اہل حکومت تک پر جو اثر قائم ہوا، اور چند سال کے عرصہ میں سلسلۂ نقشبندیہ مجددیہ کو ہندوستان اور بیرون ہند میں جو فروغ نصیب ہوا، نیز انھوں نے جن نئے علوم و تحقیقات کا اپنے مکتوبات اور مجالس کے ذریعہ افاضہ فرمایا جن میں سے بہت سے عوام تو عوام خواص کے لئے بھی نامانوس اور ایک حد تک (اگر موجب وحشت نہیں تو) موجب حیرت ضرور تھے، اور ان میں بہت سے ان حلقوں کے مسلّمات کے خلاف

تھے، جو نسل در نسل منتقل ہوتے چلے آرہے تھے، اور یہ معاملہ اکثر ان نادرۂ روزگار شخصیتوں کے ساتھ پیش آیا ہے، جو کسی علم و فن کی مجتہد، اور کسی سلسلۂ و طریق کی بانی، اور اپنے زمانہ کی عام علمی ذہنی و باطنی سطح سے بلند ہوتی ہیں، اور جن کو اللہ تعالیٰ علوم و کمالاتِ وہبی سے نوازتا ہے، اور وہ عام اصطلاحات اور قدیم تعبیرات کے دائرہ سے باہر قدم نکالتی ہیں، پھر آپ نے بدعتِ حسنہ کے خلاف جو قلمی جہاد شروع فرمایا، مشائخ کے لئے سجدۂ تعظیمی، وجد و سماع، لفظی طور پر نماز کی نیت کرنے، جماعت کے ساتھ نماز تہجد ادا کرنے اور محفل میلاد کی مخالفت کی، یا مکاشفات کے حجت نہ ہونے اور مشائخ طرق و اولیائے کبار کے بجائے ائمۂ مجتہدین کے قول کے حجت ہونے کو ثابت کیا، اور کشف کی صحت و قطعیت میں کلام کیا، اور اپنے عہد و دیار کے بہت سے سلسلوں اور خانقاہوں کے مروجہ اور متعارف معمولات کے مخالف سنت ہونے کو ظاہر کیا، پھر اس سب سے بڑھ کر وحدۃ الوجود سے (جس کو ایک بدیہی حقیقت اور محققین صوفیہ کا ایک اجماعی مسئلہ سمجھا جاتا تھا) اور شیخ اکبر کے علوم و تحقیقات سے جن کو علم و معرفت کا "سدرۃ المنتہیٰ" قرار دیا گیا تھا، قدم آگے بڑھایا، اور اس کے متوازی وحدۃ الشہود کا نظریہ پیش کیا، اس کے بعد آپ کے بارے میں زبانوں اور قلموں کا یکسر خاموش رہنا، اور کسی مخالفانہ اور تردیدی بلکہ تضلیلی تحریک و مہم کا آپ کے آخر زمانہ میں یا آپ کے ارتحال کے فوراً بعد پیدا نہ ہونا، نہ صرف تاریخ اصلاح و تجدید، بلکہ تاریخ علم و تدوین کا بھی ایک نادر واقعہ ہوتا۔

ان اختلافات یا مخالفتوں کو ہم دو قسموں میں تقسیم کر سکتے ہیں، ایک وہ مخالفت جو مخالفین کی کسی غلط بیانی کی بنیاد پر، یا کسی غلط فہمی کے نتیجہ میں پیدا ہوئی، اور اس غلط بیانی اور سازش کا پردہ چاک ہونے، یا اس غلط فہمی کے دور ہو جانے کے بعد رفع ہو گئی، دوسری وہ مخالفت جو اختلافِ عقیدہ و مسلک، یا کسی عصبیت یا ذاتی عناد پر مبنی تھی۔

پہلی قسم میں ہم حضرت شیخ عبدالحق محدث دہلوی (م ۱۰۵۲ھ) کے اختلاف کو لیتے ہیں، جن کا علمی و دینی پایہ، خلوص و للّٰہیت، اور دینی حمیت مسلّم ہے، اور جو حضرت مجدد کے پیر بھائی بھی تھے، اور اپنے پیر کے خلیفہ و مجاز بھی، انھوں نے حضرت مجدد سے اختلاف کیا، ان کے بعض اقوال و تحقیقات پر سخت حیرت اور وحشت کا اظہار کیا، اور ایک مکتوب میں جو حضرت مجدد کے نام ہے، اس کا برملا اظہار بھی کردیا[1]، حضرت شیخ عبدالحق کے اس طویل مکتوب میں حضرت مجدد کی جو باتیں نقل کی گئی ہیں، ان کے بارے میں مجددی سلسلہ کے بہت سے اہل علم و اہل نظر کی تحقیق ہے کہ وہ محرّف اور غلط ہیں، یہ ایک نجی مکتوب تھا، حضرت شیخ نے اس کو اپنی کتاب "المکاتیب والرسائل" میں درج نہیں کیا، حضرت مرزا مظہر جانِ جاناں کے ارشاد کے مطابق شیخ نے اس مکتوب کو ضائع کرنے کی وصیت کی۔

اس مکتوب کی تحریر میں اصلاً جو جذبہ کام کر رہا ہے (اور وہ فی ذاتہ محمود ہے) وہ شیخ کا یہ خیال ہے کہ مجدد صاحب کے بعض اقوال و تحقیقات سے بعض ایسے بزرگوں کی تنقیص اور تخطیہ کا پہلو نکلتا ہے، جن کی جلالت قدر پر امت کا اتفاق ہے، لیکن اس کا مکتوبات کے غوّاص و شارح اور حضرت مجدد صاحب کے مقاصد کے رمز آشنا بارہا جواب دے چکے ہیں، اور خود مکتوبات کا مطالعہ اور حضرت مجدد کی زندگی اس کی تردید کرتی ہے، اس مکتوب کا

---

[1] یہ مکتوب پروفیسر خلیق احمد نظامی کی کتاب "حیات شیخ عبدالحق" کے آخر میں مکمل طریقہ پر درج ہے، ملاحظہ ہو ص ۳۱۲-۳۴۴، اس مکتوب کے جواب میں بکثرت رسالے لکھے گئے، جن میں شیخ بدرالدین سرہندیؒ، شیخ محمد یحییٰؒ (فرزند اصغر حضرت مجدد) شیخ محمد فرخؒ، شاہ عبدالعزیز محدث دہلویؒ، قاضی ثناء اللہ پانی پتیؒ اور حضرت شاہ غلام علی دہلویؒ کا نام لیا جا سکتا ہے، مولانا وکیل احمد سکندرپوری نے "ہدیۂ مجددیہ" کے نام سے ایک مستقل کتاب اسی کے رد میں لکھی ہے جو ۲۳۶ صفحات پر مشتمل ہے۔

ایک بڑا محرک حضرت شیخ کی سیدنا عبدالقادر جیلانی قدس سرہٗ کے ساتھ وہ یگانہ عقیدت بھی ہے، جو عشق و فنائیت کے درجہ تک پہونچی ہوئی تھی، اور وہ ہر طرح سے نہ صرف قابلِ تحسین بلکہ قابلِ رشک ہے، اور اس میں امت کا ایک بڑا طبقہ ہر عہد و ملک میں ان کا شریک ہے، حضرت شیخ کا خیال ہے کہ حضرت مجدد صاحب کے کلام سے ان پر ـــــ اپنی ترجیح ثابت ہوتی ہے، اس کا بھی ان تردیدی رسائل میں تشفی بخش جواب دیا جاچکا ہے، یہاں اس مکتوب کے مختلف اجزا اور مشتملات کا تفصیلی جائزہ لینا مقصود نہیں، اس کے لئے ان رسائل کی طرف مراجعت کرنے کی ضرورت ہے، جن کا اوپر تذکرہ ہوا، اس مکتوب میں حضرت مجدد کی طرف بعض ایسے اقوال منسوب کئے گئے ہیں، جو بداہتہً بے اصل ہیں، اور معاندین کی افترا پردازی ہے، حیرت ہوتی ہے کہ حضرت شیخ نے ان کو کیسے باور کیا اور مکتوب میں درج فرمایا، حضرت شاہ غلام علی دہلوی کے قلم سے جو مجسم وقار و سکینت تھے، اسی بنا پر اس طرح کی عبارتوں کو نقل کرنے کے بعد بے اختیار نکل گیا ہے۔

"العیاذ باللہ این چہ خلاف نویسی است، و این چہ بے تحقیق گوئی است، در ہیچ مکتوب ایشاں این چنیں عبارت نیست یا شیخ عفا اللہ عنک" (پناہ بخدا! یہ کیا بے اصل و بے تحقیق کلام ہے، (حضرت مجدد کے) کسی مکتوب میں اس طرح کی عبارت نہیں، حضرت شیخ! اللہ آپ کو معاف کرے!)۔

لیکن چونکہ حضرت شیخ مخلص تھے، اور ان کے قلم سے ان اقوال و بیانات پر جو حضرت مجدد کی طرف منسوب کئے گئے تھے، جس تحیّر و تاثر کا اظہار ہوا، اس کی محرک ان کی دینی حمیت اور علمی مقام تھا، اس لئے جب ان کو اس غلط بیانی کا علم ہوا، حضرت مجدد کے بارے میں غلط فہمی رفع ہوئی، اور آپ کا علوئے مقام اُن پر منکشف ہوا تو انھوں نے اس کی

تلافی کرنے میں قطعاً تقصیر و تاخیر سے کام نہیں لیا، اور بڑے بلند الفاظ میں حضرت مجدد کے ساتھ خلوص و محبت کا اظہار کیا، جو ان کے جیسے عالم ربانی ہی کے شایان شان ہے، انھوں نے حضرت خواجہ حسام الدین احمد دہلوی کو حسب ذیل مکتوب تحریر فرمایا:۔

سلمکم اللہ وأبقاکم علی رؤس المحبین الطالبین المخلصین دریں دو سہ روزہ کہ از احوال شریف خبر نہ گرفت یا بہ جہت تقصیر ے کہ در جبلت بشر است یا بہ قصد آں کہ مطلقاً از آلائش ضعف و فترت پاک شدہ باشند تا بہ خبر مسرت اثر صحت کلی و عافیت تام مشرف و مسرور گردد و امید کہ بہ اعلام آں مشرف گردانند۔	اللہ تعالےٰ آپ کو سلامت اور چاہنے والے مخلص طالبوں کے سروں پر باقی رکھے، اس دو تین دن کے عرصہ میں آپ کے احوال شریفہ کی خبر نہ معلوم کرنے کی وجہ یا تو وہ کوتاہی ہو سکتی ہے، جو انسان کی فطرت میں ہے، یا پھر وہ ارادہ ہو سکتا ہے کہ کامل صحت ہو جائے اور پھر خبر مسرت سننے میں آئے، امید ہے کہ صحت کی خبر سے آگاہ کریں گے۔
دیدۂ محبت در راہ انتظار وصول اخبار مسرت آثار بندگی حضرت میاں شیخ احمد دو چار است، امید وار است کہ دعائے محبان بہ اجابت رسیدہ اثر عظیم آرد، نسبت ایں فقیر درایں ایام و صفائے باطن بہ خدمت ایشاں از حد منتہا و زا است و اصلاً پردۂ بشریت	بندگی حضرت میاں شیخ احمد کے اخبار مسرت آثار پر چشم شوق لگی ہوئی ہے، امید ہے چاہنے والوں کی دعا قبول ہو، بڑا اثر پیدا کرے گی، آج کل ان سے فقیر کا قلبی تعلق بے حد زیادہ ہے، بشریت کا کوئی پردہ یا افتاد طبع کا کوئی اثر بالکل حائل نہیں رہا ہیں خود

وغشاوۂ جبلت درمیان نماندہ نمی داند کہ از کجا است باقطع نظر از رعایت طریقۂ انصاف و حکم عقل کہ بہ ایں چنیں عزیزان و بزرگان بد نباید بود، و در باطن بہ طریق ذوق و وجدان و غلبہ چیزے افتادہ است کہ زبان از تقریر آں لال است، سبحان اللہ مقلب القلوب، و مبدل الاحوال شاید کہ ظاہر بیناں دریں جا استبعاد کنند، من نمی دانم کہ حال چیست و بہ چہ منوال است، زیادہ چہ گوید و چہ نویسد" واللہ اعلم بحقیقۃ الحال"[1]

نہیں جانتا کہ یہ کس بناء پر ہے۔ اس سے قطع نظر کرتے ہوئے کہ طریقۂ انصاف کی رعایت اور حکم عقل کا تقاضا ہے کہ ایسے عزیزوں اور بزرگوں کے ساتھ بُرا گمان نہ ہونا چاہئے، میرے دل میں ذوق و وجدان اور غلبہ کی بناء پر کچھ ایسی کیفیت پیدا ہوگئی ہے کہ اس کے بیان سے زبان قاصر ہے، پاک ہے اللہ دلوں کا پلٹنے اور احوال کا بدلنے والا، ظاہر بین شاید اس پر یقین نہ کریں، میں خود بھی نہیں جانتا کہ کیا حال ہے اور کیوں ہے، زیادہ کیا کہوں، اور کیا لکھوں، حقیقت حال کا پورا علم اللہ کو ہے۔

دوسری قسم میں سے ہم سب سے پہلے بارہویں صدی کے ایک حجازی عالم شیخ حسن عجیمی ثم المکی (جو مدینہ منورہ میں حدیث کا درس دیتے تھے، اور اس عہد کے مشہور حنفی عالم تھے، اور حضرت شاہ ولی اللہ صاحب کے استاد حدیث شیخ ابو طاہر کردی کے استاد تھے[2]) کی کتاب

---

[1] بشارات مظہریہ، از شاہ نعیم اللہ بہرائچی، مخطوطہ کتب خانہ ندوۃ العلماء ۱۲۸۱ھ [2] حضرت شاہ ولی اللہ صاحب نے "انفاس العارفین" میں ان کا ذکر کیا ہے، لکھا ہے کہ وہ حدیث میں شیخ کا درجہ رکھتے تھے، مختلف علوم اور دقائق میں دخل

(باقی ص ۳۴۱ پر)

"التمام الهندی فی جواب سؤال عن کلمات السرهندی"[1] پر ایک نظر ڈالتے ہیں، اس کتاب کی تمہید میں کہا گیا ہے کہ ہندوستان سے حرمین شریفین میں ۱۰۹۳ھ میں شیخ احمد سرہندی اور ان کے ان بعض نامناسب کلمات کے بارے میں جو ان کے مکتوبات سے نقل کئے گئے ہیں، ایک سوال آیا، اور علمائے حرمین شریفین سے استفتاء کیا گیا کہ جو ایسے کلمات کو اپنی زبان سے نکالے، یا ان پر اس کا اعتقاد ہو، یا وہ ان کی ترویج و اشاعت میں حصہ لے، اس کا حکم شرعی کیا ہے؟ اس کے بعد جامع کتاب نے لکھا ہے کہ میرے قابلِ احترام استاد و شیخ مولانا الشیخ ملا ابراہیم بن حسن کورانی نے مجھے ہدایت کی کہ میں اس کا جواب دوں، اور علمائے حرمین کی اِس بارے میں رائے اور فتوے نقل کروں، مؤلف کتاب نے اس مجموعہ میں دو عالموں ایک مذکور الصدر ملا ابراہیم کورانی مدنی، دوسرے علامہ جمال الدین محمد ابن عبدالرسول البرزنجی کے

(باقی صـ۳۴۰ کا) رکھتے، فصیح اللسان اور قوی الحافظ تھے، ان کی زیادہ تر صحبت و استفادہ شیخ عیسیٰ مغربی سے ہے، شیخ احمد قشاشی، شیخ محمد بن العلاء بابلی، اور شیخ زین العابدین ابن عبدالقادر طبری مفتی شافعیہ کی بھی صحبت اٹھائے ہوئے تھے، شاہ نعمت اللہ قادری جیسے اہل طرق سے بھی ملاقات کی تھی، اور دعوت اسماء کا بھی شغل رہا تھا، ان کے درس حدیث میں شاہ ولی اللہ صاحب کے استاذ شیخ ابو طاہر کردی مدنی عام طور سے قاری ہوتے تھے، آخر عمر میں مکہ کی سکونت موقوف کرکے طائف میں گوشہ نشینی اختیار کرلی تھی، وہیں ۱۱۱۳ھ میں وفات پائی، اور سیدنا عبداللہ بن عباس کے قریب جگہ پائی (انفاس العارفین صـ۱۸۶-۱۸۷) خیر الدین الزرکلی نے "الاعلام" میں ان کو العجیمی لکھا ہے، والد کا نام علی بن یحییٰ تھا، ابوالبقاء کنیت تھی، یمانی الاصل ہیں ۱۰۴۹ھ میں ولادت ہوئی۔ (جلد ۲ ۔صـ۲۲۳)

[1] عربی مخطوطہ خدابخش خاں لائبریری بانکی پور پٹنہ نمبر ۲۷۵۳۔ یہ کتاب ۱۰۹۴ھ میں مکمل ہوئی خدابخش خاں لائبریری کا مخطوطہ نسخہ مصنف کے نسخہ سے شیخ سلیمان جیتوانے نقل کیا اس لئے وہ ہر طرح قابل اعتبار ہے

یہ کتاب کتب خانۂ آصفیہ کے مخطوطات میں بھی موجود ہے (شامل کتاب قدح الزند نمبر ۲۲۴ فن کلام ورق ۸) لیکن (باقی صـ۳۴۲ پر)

فتاویٰ نقل کئے ہیں۔

سب سے پہلے اس استفتاء کے دو مجیب ملا ابراہیم کورانی مدنی، اور جمال الدین محمد ابن عبدالرسول برزنجی کی شخصیت سے واقفیت کی ضرورت ہے، اول الذکر کا تذکرہ حضرت شاہ ولی اللہ صاحب نے "انفاس العارفین" (صفحہ ۱۸۴–۱۸۶) پر کیا ہے، یہ شاہ ولی اللہ صاحب کے اصل استادِ حدیث شیخ ابوطاہر کردی کے والد اور شیخ ہیں، اس زمانہ کے ایک شیخ اور بزرگ شیخ یحییٰ شاوی کے بارے ہیں ان کی اس رائے سے جو شاہ ولی اللہ صاحب نے ذکر کی ہے، اور جس میں شیخ نے ان پر تجسیم کا فتویٰ صادر کیا، اور جس کی وجہ سے وزیرِ سلطنتِ ترکی نے جو ان کا معتقد تھا، ان کو اہانت کے ساتھ مجلس سے نکالدیا، اس بات کا اظہار ہوتا ہے کہ ان کے مزاج میں کسی قدر خشونت اور رائے قائم کرنے میں عجلت تھی، سید محمد برزنجی[1] جو اس مجموعہ کے دوسرے مفتی ہیں، کا تذکرہ کرتے ہوئے شاہ ولی اللہ صاحب نے لکھا ہے کہ "فی الجملہ یُبس مزاج داشت" (ص۱۸۴)، (مزاج میں کسی قدر خشکی تھی)۔

(باقی ص۳۴۱ کا) اس کا نام صرف "العصب الہندی" سرورق پر درج ہے، مصنف کے قلم سے کتاب کے نام کا کہیں ذکر نہیں ہے۔

کتب خانۂ آصفیہ کے مخطوطات میں اس موضوع (حضرت مجدد کے اقوال و تحقیقات کی تردید) پر دو اور کتابیں پائی جاتی ہیں:۔

۱۔ قدح الزند و قدح الہند فی رد ضلالات أہل سرہند للسید محمد البرزنجی (نمبر کتاب ۲۲۴ فن کلام ورق ۳۴)

۲۔ الناشرۃ الناجرۃ للفرقۃ الناصرہ للکلمات الفاجرہ للسید محمد البرزنجی (نمبر ۲۲۳ فن کلام ورق ۲۶ کتابت ۱۰۹۵ھ)

[1] سید محمد برزنجی ان کا پورا نام محمد بن عبدالرسول ابن عبدالسید الحسنی البرزنجی ہے، ۱۰۴۰ھ میں ولادت اور ۱۱۰۳ھ میں وفات پائی، شہرزور میں ولادت ہوئی، آخر میں مدینہ طیبہ میں قیام اختیار کرلیا تھا، ان کی ایک کتاب "حل مشکلات ابن العربی" بھی ہے، یہ وہ برزنجی نہیں ہیں، جن کا مولود دیارِ عرب میں مشہور ہے، (الأعلام للزرکلی جلد ۷، ص۵۷) مجدد صاحب کی تردید میں ان کی مستقل کتاب "قدح الزند" بھی ہے، تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو "المختصر من کتاب نشر النور والزہر" جزء اول تالیف الشیخ عبداللہ مرداد ابوالخیر۔

اس سب کے بعد فتاویٰ اور علماء کے آراء، اور حکم شرعی کے بیان و اعلان کی تاریخ میں اس تاریخی حقیقت کو فراموش نہیں کرنا چاہئے کہ علماء اور اہل افتاء کے سامنے واقعہ کی جیسی صورت بیان کی جاتی ہے، اور جس طرح کے منقولات و اقتباسات پیش کئے جاتے ہیں، انھیں کو سامنے رکھ کر، اور انھیں کے پیشِ نظر فتویٰ صادر کیا جاتا اور حکم شرعی بیان کیا جاتا ہے، مثل مشہور ہے "تنہا پیش قاضی روی راضی بیائی" (اکیلے قاضی صاحب کے پاس چلے جاؤ، اور اپنے مطلب کا فتویٰ لکھوا کر آجاؤ) یہ علماء و اہلِ افتاء نہ اس بات کے مکلف ہوتے ہیں، اور نہ ان کے پاس اتنا وقت ہوتا ہے کہ وہ ان اقوال و بیانات کے سیاق و سباق کو دیکھیں، اور اس کی تصدیق کریں کہ یہ نقول صحیح ہیں، اور ان کو سیاق و سباق سے علیحدہ کر کے "لا تقربوا الصلوٰۃ" کے مشہور عوام لطیفہ کے مطابق اپنی تائید میں نہیں پیش کیا گیا ہے، اس بات کے پورے قرائن موجود ہیں کہ جواب تحریر کرنے والے حضرات نے مکتوبات کا براہ راست مطالعہ نہیں کیا ہوگا، اور نہ ان کو درس و افتاء سے اتنی فرصت ملی ہوگی، کہ وہ مزید اس کی تحقیق کرتے، نیز اس وقت حرمین شریفین میں اس سلسلہ کے ایسے اہل علم حضرات بھی موجود نہیں رہے ہوں گے، جو حقیقت حال سے آگاہ کر سکتے۔

جہاں تک مستفتی کے فہم و امانت اور احساس ذمہ داری کا تعلق ہے، اس کے لئے صرف ایک ہی مثال کافی ہے کہ حضرت مجددؒ نے حقیقت کعبہ کے بارے میں جو دقیق عارفانہ کلام کیا ہے، اس کو اس بات پر محمول کیا گیا ہے کہ آپ اس بات کے قائل ہیں کہ موجودہ معروف عمارت کعبہ نہیں ہے، اور یہ بات کفر کو متلزم ہے۔ مصنف لکھتے ہیں:۔

ومنها انكاره مما تواتر أن الكعبة هي البنية المعروفة وذلك كفر.	اور انھیں کفریات میں سے ان کا اس بات سے انکار کرنا ہے کہ کعبہ یہی موجودہ معروف عمارت ہے۔

اب اس کے مقابلہ میں اس مکتوب کو پڑھیے، جو شیخ تاج الدین سنبھلی کے نام ہے، جو تازہ تازہ حج بیت اللہ سے واپس آئے تھے، مجدد صاحب بیت اللہ شریف کے حالات سننے کے اشتیاق و بے چینی کا اظہار کرتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں کہ:۔

"فقیر کے نزدیک جس طرح صورت کعبۂ ربانی خلائق کے صور و اجسام کے لئے (کیا بشر اور کیا ملک) مسجود الیہا ہے، اس کی حقیقت ان صور و اجسام کے حقائق کا بھی مسجود الیہا ہے، اس طرح یہ حقیقت تمام حقائق کے اوپر اور اس سے جو کمالات متعلق ہیں، ان تمام کمالات پر جو دوسرے حقائق سے متعلق ہیں، فوقیت رکھتی ہے، گویا یہ حقیقت حقائق کونی، اور حقائق الٰہی کے درمیان برزخ ہے[1]۔"

اس ایک مثال سے ان دانستہ یا نادانستہ فتوئ تکفیر کی حقیقت و ماہیت کا اندازہ ہو سکتا ہے، جو ان نقول و اقتباسات پر جاری کیا گیا ہے، اس کے باوجود بھی مصنف نے آخر میں یہ احتیاط کی ہے کہ لکھا ہے:۔

"یہ بھی بعید نہیں کہ اللہ تعالےٰ نے ان اقوال کے قائل اور ان تحریرات کے لکھنے والے پر فضل فرمایا ہو، اور ان کا خاتمہ بالخیر ہوا ہو، جیسا کہ اس کا معاملہ اپنے بندوں کے ساتھ رہا ہے، اور اس کی شانِ کریمی کا بارہا اظہار ہوا ہے، اور اس کا ایک یہ بھی قرینہ ہے کہ ان کی صلبی اولاد میں سے بعض حضرات جب حرمین شریفین حاضر ہوئے، تو انھوں نے حدیث کی سند لینے کا شوق ظاہر کیا، اور انھوں نے بتایا کہ ان کے طریقہ کی بنیاد اتباع سنت محمدی، اور نقش قدم نبوی پر چلنے پر ہے، انھوں نے مشائخ حدیث مثلاً امام زین العابدین طبری سے حدیث کی سند لی، اور ہمارے شیخ عیسیٰ محمد بن المغربی جعفری کو ایسا مطمئن و مانوس کیا کہ انھوں نے

[1] مکتوب نمبر ۲۶۳ دفتر اول۔

شیخ محمد معصوم سے طریقۂ نقشبندیہ کی تحصیل کی تاکہ ان کو اس کے عالی مرتبہ مشائخ کی برکت حاصل ہو۔[1]

مصنف کے اس بیان سے جو انھوں نے ازراہ دیانت درج کیا ہے، صاف طریقہ پر اس بات کا اظہار ہوتا ہے کہ یہ فتاویٰ محض ان نقول کے اعتماد پر لکھے گئے تھے، جو پیش کی گئیں اور مفتی صاحبان خود ان کے بارے میں متردد تھے، مجددی خاندان کے عالی مرتبہ افراد کے حرمین شریفین میں حاضر ہونے اور خاص طور پر حضرت خواجہ محمد معصوم کی سیرتِ اخلاق اور احوال رفیعہ دیکھنے کے بعد نہ صرف یہ غلط فہمی رفع ہو گئی ہوگی، بلکہ خود مصنف کے ایک جلیل القدر شیخ عیسیٰ مغربی نے حضرت خواجہ محمد معصوم سے بیعت کی اور طریقۂ مجددیہ نقشبندیہ کی نسبت پیدا کی، شاہ ولی اللہ صاحب نے "انفاس العارفین" میں ان کی تعریف کی ہے، اور لکھا ہے کہ:-

"بالجملہ یکے از علمائے متقنین بود و وے استاد جمہور اہل حرمین است و یکے از اوعیۂ حدیث وقراءت سید عمر بالحسن بہ حق وے، گفتی "من أراد أن ينظر إلى شخص لا يبتلك في ولاية فلينظر إلى هذا"[2]

ترکستان کے ایک مجددی فاضل محمد بیگ الازبکی ان فتاویٰ کے بعد حجاز آئے، انھوں نے اپنی کتاب "عطیۃ الوهّاب، الفاصلة بين الخطأ والصواب" لکھ کر یہ ثابت کیا کہ یہ فتاویٰ، مکتوبات کی عبارتوں کے غلط تراجم پر مبنی ہیں، اور دانستہ ایسی تحریف کی گئی ہے، انھوں نے غلط ترجمہ کی متعدد مثالیں دیں، اس توضیح سے متاثر ہو کر بہت سے علماء نے اپنی رائے سے رجوع کر لیا، اور بعض نے امام ربانی کی تائید و دفاع میں کتاب لکھی،

---

[1] الصارم الہندی (مخطوطہ) ص ۲ — [2] انفاس العارفین ص ۱۸۳

ان میں حسن بن محمد مراد اللہ التونسی المکی بھی ہیں، جنھوں نے "العرف الندی فی نصرۃ الشیخ أحمد السرہندی" لکھی جس میں انھوں نے اس کا اظہار کیا ہے کہ حضرت مجدد کے خلاف جو مہم شروع کی گئی تھی، اس کی بنیاد غلط و محرف تراجم پر تھی، دوسرے صاحب احمد البشیشی المصری الشافعی الازہری ہیں، انھوں نے اس بات کا صفائی سے اظہار کیا ہے کہ حضرت مجدد کی تکفیر صرف تصوف کی اصطلاحات و نظریات کے صحیح طور پر نہ سمجھنے یا غلط سمجھنے کی بناء پر ہو سکتی ہے، جو انھوں نے استعمال کئے ہیں، محمد بیگ نے علمائے حجاز کے ساتھ اس موضوع پر مباحثے بھی کئے، اور رُو در رُو گفتگو اور مذاکرات بھی، جس کی وجہ سے البرزنجی کو اپنی کتاب "الناشرۃ الناجرۃ" لکھنی پڑی جس میں محمد بیگ کا بڑے حقارت آمیز اور تجہیل کے ساتھ تذکرہ کیا گیا۔

ہندوستان میں حضرت مجدد صاحب کی مخالفت اور ان پر اعتراضات کی ایک قابلِ توجہ تاریخی دستاویز جو مخالفین و معترضین کی ذہنیت اور طرزِ فکر کی واضح ترجمانی اور اس گروہ کی کسی درجہ میں نمائندگی کرتی ہے، وہ شیخ عبداللہ خویشگی قصوری (۱۰۴۳ - ۱۱۰۶ھ) کی کتاب "معارج الولایۃ" ہے، جو ایک ضخیم تصنیف ہے[1]، عبداللہ خویشگی کے (جو اختصاراً عبدی کے نام سے بھی یاد کئے جاتے ہیں) حالات سے معلوم ہوتا ہے[2] کہ وہ کثیر التصانیف بزرگ ہیں، اپنے زمانہ کے مروجہ علوم میں دخل رکھتے ہیں، تصوف میں سلسلۂ چشتیہ سے ان کا تعلق ہے اور ذوقاً و مشرباً وجودی ہیں، بلکہ اندازہ ہوتا ہے کہ وحدۃ الوجود میں ان کو غلو ہے،

---

[1] اس کتاب کے قلمی نسخہ کا راقم سطور نے پروفیسر خلیق احمد صاحب نظامی کے ذاتی کتب خانہ میں مطالعہ کیا ہے، معلوم ہوا کہ اس کا ایک نسخہ لاہور میں بھی ہے۔ [2] تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو "احوال و آثار عبداللہ خویشگی قصوری" تالیف محمد اقبال مجددی، شائع کردہ دار المؤرخین لاہور۔

ان کے اساتذہ اور معتقد فیہ اشخاص بھی زیادہ تر حضرت مجدد کے مخالفین اور وحدۃ الوجودی صوفیہ ہیں، اور ان میں سے بعض (مثلاً شیخ نعمت لاہوری اور قاضی نورالدین، قاضی قصوری) مجدد صاحب کے فتوئ تکفیر پر دستخط کرنے والوں میں ہیں، ایسا اندازہ ہوتا ہے کہ وہ سید محمد برزنجی مؤلف "قدح الزند" کے متعلقین سے بھی متاثر ہوئے ہیں، جو اورنگ آباد میں مقیم تھے[1] جہاں ۱۰۹۶ھ میں خویشگی نے اس کتاب کی تکمیل کی ہے، اس کتاب کا ایک ماخذ اس عہد کی ایک دوسری تصنیف "کاسر المخالفین" ہے، جو حضرت مجدد اور آپ کے متبعین کے رد میں لکھی گئی تھی۔

قصوری کے طرز فکر اور مبلغ علم کا اندازہ اس سے ہوسکتا ہے کہ انھوں نے مجدد صاحب کی قابلِ اعتراض چیزوں میں نماز کی زبان سے نیت نہ کرنے کو بھی شمار کیا ہے، وہ لکھتے ہیں:۔

چوں برائے تحریمۂ نماز برخاستے اغلب
اوقات نیت را بدل کردے وزبان را
ساکت گردانیدے وگفتے کہ رسول اللہ
صلے اللہ علیہ وسلم نیت بدل کردہ
نہ بزبان، زیراکہ نیت فعل قلب
است نہ فعل لسان۔

جب نماز کے لئے کھڑے ہوتے
اکثر اوقات دل سے نیت کرتے
زبان کو حرکت نہ دیتے اور کہتے کہ
رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کا بھی
یہی معمول تھا، کیونکہ نیت دل کا
فعل ہے نہ کہ زبان کا۔

خویشگی نے مکتوبات کا مطالعہ کس نظر غائر سے کیا تھا، اور ان کے اندر کس درجہ میں ذمہ داری کا احساس اور کسی کی طرف اقوال وخیالات کی نسبت کرنے میں کتنی احتیاط تھی، اس کا اندازہ ان کی اس عبارت سے ہوسکتا ہے:۔

[1] اندازہ ہوتا ہے کہ اورنگ آباد گیارہویں صدی کے آخر میں اس تحریکِ مخالفت کا بڑا مرکز تھا اور وہیں سے یہ مسئلہ حجاز پہونچا۔

بعض مشائخ متقدمین ہر کہ قائل
بہ وحدۃ وجود شدہ چنانچہ حسین
منصور، و شیخ محی الدین عربی و امثال
آں او را ملحد زندیق گفتہ، در مکتوبات
خود کہ مجلد بسہ مجلد است، در اکثر
مواضع شیخ محی الدین عربی را تکفیر
نمودہ و در بعضے محال نسبتِ مذاہب
اعتزال بہ وے ثابت نمودہ، و بایں
ہمہ او را از جملہ مقبولان شمردہ۔

مشائخ متقدمین میں سے جو لوگ
وحدۃ الوجود کے قائل تھے، مثلاً
حسین منصور، اور شیخ محی الدین عربی
وغیرہ (شیخ احمد سرہندی) ان کو
ملحد و زندیق کہتے تھے، اپنے مکتوبات
میں جو تین جلدوں پر مشتمل ہے، اکثر
مقامات پر شیخ محی الدین عربی کی
تکفیر کی ہے، اور بعض مقامات پر
مذاہب اعتزال کی ان سے
نسبت کی ہے، اور اس سب کے
باوجود ان کو مقبولین الٰہی میں شمار
کیا ہے۔

ان اعتراضات کے ساتھ حضرت مجدد کی تعریف بھی کرتے ہیں، فرماتے ہیں:-

بہ دعوت طالبان حق ارشاد کردہ
پس وے اکثر طالبان (را) ہدایت
نمودے، و بہ جانب حق دلالت
فرمودے، و بر اجرائے شرائع تقید
فرمودے، و تارک شرائع را توبیخ
و زجر کردے، و مرتکب شرائع را

(حضرت خواجہ باقی باللہ نے) آپ کو
دعوت طالبان حق کی اجازت دی،
چنانچہ طلبگاران حق کو آپ ہدایت
کرتے، اللہ کی طرف رہبری فرماتے
احکام شرعیہ کی پیروی کی تاکید
فرماتے، تارک شریعت کو زجر و توبیخ

دوست داشتے۔	کرتے، شریعت پر عمل کرنے والے سے خوش ہوتے۔

مجدد صاحب کی طرف سے تاویل بھی کرتے ہیں، اور حسن ظن بھی ظاہر کرتے ہیں، مخالفین نے جن عبارتوں اور الفاظ پر اعتراض کیا ہے، ان کو نقل کرنے کے بعد لکھا ہے :-

وقتے لازم آید کہ مراد ازیں الفاظ معنی ظاہری بود فاما اگر مراد از معنی باطنی بود چناں کہ گزشت ہیچ تکفیر و تشنیع لازم نیابد۔	لیکن یہ ضروری ہے کہ ان الفاظ سے معنی ظاہری ہی مراد ہوں لیکن اگر ان سے معنی باطنی مراد ہوں جیسا کہ اوپر گزرا، تب ... اس سے کوئی تکفیر و تشنیع لازم نہیں آتی۔

لیکن پھر وہ خیال جو صحبت و ماحول کے اثر، اور افواہوں کی کثرت سے ان کے ذہن میں جاگزیں ہوگیا ہے، غالب آتا ہے، اور وہ لکھتے ہیں :-

ولیکن حق آنست کہ ایراد کلامے کہ موہم بہ نقص بود بجناب نبوی خالی از نقص و قصور نیست کما لا یخفی۔	لیکن حق یہ ہے کہ ایسے کلام کا لانا جس سے بارگاہ نبوی میں تنقیص کا وہم پیدا ہوتا ہو نقص و قصور سے خالی نہیں۔

اس کتاب کی زیادہ تر اہمیت اور شہرت اس وجہ سے ہوئی کہ اس میں قاضی شیخ الاسلام[1] کا... مراسلہ درج کیا گیا ہے، جو انھوں نے اورنگ آباد کے قاضی، قاضی ہدایت اللہ

---

[1] قاضی شیخ الاسلام قاضی القضاۃ عبدالوہاب گجراتی کے بیٹے، اور عہد عالمگیری کے نامور قضاۃ میں تھے ۱۰۸۶ھ میں عالمگیر نے ان کو اقضی القضاۃ کا عہدہ دیا، ۱۰۹۴ھ میں اس عہدۂ جلیلہ سے استعفا دیا اور حج کے لئے روانہ

(باقی ص ۳۵۰ پر)

کے نام بھیجا ہے اور اس کے متعلق مصنف کا بیان ہے کہ وہ بادشاہ اسلام (اورنگ زیب عالمگیر) کے حکم سے جاری کیا گیا، اور اس پر قاضی شیخ الاسلام کی مہر تھی، مصنف کے بیان کے مطابق اس پر ۲۷ شوال ۱۰۹۰ھ کی تاریخ درج ہے، یہ مراسلہ یا فرمان مصنف نے کتاب "کاسر المعاندین"[1] سے نقل کیا ہے اور یہاں بعینہٖ نقل کیا جاتا ہے:-

از قرار بتاریخ بست و ہفتم شہر شوال
سنہ یک ہزار و نود ہجری آنکہ
شریعت پناہ فضائل و کمالات
دستگاہ فقاہت انتباہ، قاضی
ہدایت اللہ بعافیت باشند۔
دریں ولا بعرض مقدس معلی رسید کہ
بعضے مواضع مکتوبات شیخ احمد سرہندی
ظاہر در مخالفت عقائد اہل سنت و
جماعت است، و معتقدان شیخ
مذکور کہ در بلاد اورنگ آباد خجستہ بنیاد
سکونت دارند و ترویج آں بتشیر دہند
و تدریس می نمایند اعتقاد حقیقت
عقائد باطلہ مذکورہ دارند۔

۲۷ ماہ شوال ۱۰۹۰ھ ...... قاضی
ہدایت اللہ کو معلوم ہو کہ اس زمانہ میں
سمع مبارک تک یہ بات پہونچی کہ
مکتوبات شیخ احمد سرہندی کے
بعض مقامات ظاہراً عقائد اہل سنت
کے مخالف ہیں، شیخ مذکور کے معتقد
جو شہر اورنگ آباد میں سکونت رکھتے
ہیں، ان کی اشاعت کرتے ہیں، ....
اور ان کا درس دیتے ہیں، اور ان
عقائد باطلہ مذکورہ کی حقیت پر
اعتقاد رکھتے ہیں، حکم والا شرف
صدور لایا کہ یہ خادم شریعت پناہ کو
لکھے کہ ان کو رشد (؟) اور ان مضامین

(باقی ص ۳۴۹ کا) ہوگئے، عالمگیر کے اصرار کے باوجود انھوں نے دوبارہ یہ عہدہ قبول نہیں کیا۔ یاد ایام" (تاریخ گجرات) از مولانا حکیم سید عبدالحی صاحب مرحوم ص ۷۸-۷۹۔ منقول از "مآثر الامراء" وغیرہ۔

[1] افسوس ہے کہ کتاب کے مصنف کے حالات معلوم نہیں ہوسکے۔

حکم والا اشرف صدور یافت کہ	کے درس و تدریس سے روک دیا جائے
ایں خادم شریعت با شریعت پناہ	اور جس کے متعلق معلوم ہو کہ وہ ان
بنویسد کہ آنہارا از رشد و درس آں	عقائد باطلہ پر اعتقاد رکھتا ہے ،
منع بکنند، کسے کہ معلوم شود کہ معتقد	اس کو سزائے شرعی دی جائے،
عقائد باطلہ مذکورہ است، او را	اس لئے اس کو تحریر میں لایا گیا،
بہ سزائے شرعی رسانند، لہذا نگارش	چاہیئے کہ اس حکم واجب الاتباع
شد، باید کہ بر طبق حکم مطاع واجب	کے مطابق عمل کیا جائے اور حقیقت
الاتباع بعمل آرند و حقیقت بر نگارند۔[۱]	لکھی جائے۔

اس "فرمان شاہی" کو زمانۂ حال کی بعض تصنیفات میں بڑی اہمیت دی گئی ہے اور گویا یہ ایک عظیم تاریخی انکشاف ہے، جو عالمگیر کے مجددی تحریک سے تاثر اور حضرت مجدد اور ان کے خاندان سے عقیدتمندانہ تعلق اور روابط کی پوری عمارت کو منہدم کر دیتا ہے۔[۲]

لیکن اگر بنظر غائر دیکھا جائے تو وہ اتنا "سنسنی خیز" اور ہوش ربا نہیں ہے جتنا سمجھا گیا ہے، پہلی بات یہ ہے کہ اس میں جہاں مکتوبات کا ذکر کیا گیا ہے وہاں "ظاہر در مخالفت عقائد اہل سنت والجماعۃ" کہا گیا ہے، دوسری بات یہ ہے کہ جس بات پر تشویش ظاہر کی گئی ہے، وہ ان مضامین کی ترویج و تدریس ہے، اور جس چیز سے روکا گیا ہے، وہ یہی عمومی اشاعت

---

[۱] معارج الولایۃ ص۶۰۰

[۲] مثلاً یہودی فاضل YOHANAN FRIEDMANN کی کتاب SHAYKH AHMAD SIRHINDI-AN OUT-LINE OF HIS THOUGHT & A STUDY OF HIS IMAGE IN THE EYES OF POSTERITY, مطبوعہ (MCGILL UNIVESITY, MONTREAL & LONDON, 1971)

اور درس و تدریس ہے، ظاہر ہے کہ ان دقیق و غامض مضامین کی (جن کا فہم محققین کی اصطلاحات سے واقفیت، اور سلوک و تصوف کے عملی تجربات و ممارست پر موقوف ہے) عام اشاعت، اور ان کا حلقۂ درس میں لانا جس میں مبتدی و منتہی سب شریک ہوتے ہیں، انتشارِ خیال کا موجب، اور اختلاف کا باعث ہو سکتا ہے، اور ایک حامی شریعت بادشاہ کو جس کے پیش نظر اپنے ملک کے معاشرہ کا ہر قسم کے انتشار سے محفوظ رہنا ہے، اور بزرگوں کے معاملہ میں زبان طعن دراز کرنے سے احتیاط کرنا ہے، اور جس کو اپنی اس دعوت اور اس خاندان والاشان سے قلبی و مخلصانہ روابط پر اعتماد ہے، اور جو اپنے اثر و اقتدار سے اس کو کامیاب بنانے میں ساعی و سرگرم ہے، انتظاماً ایسی پابندی عائد کرنے، اور احتیاطی تدابیر اختیار کرنے کا حق ہے، اگر اس فرمان کو عالمگیر کی ذاتی زندگی، اس کے حقیقی رجحانات و جذبات، اور اس خاندان کے ساتھ اس کے ان روابط و تعلقات کے (جن کی تفصیل اوپر گذر چکی ہے) سیاق و سباق میں دیکھا جائے، تو اس کے چند جملوں میں اس پوری تاریخ، اور عالمگیر کے اس طرزِ عمل کی تردید کا کوئی سامان نہیں ہے، جس نے بالآخر سلطنت مغلیہ کا رخ ہندوستان سے اسلامی اثرات کے ختم کرنے سے ہٹا کر شریعت اسلامی کے نفاذ، اور اسلامی تہذیب کے اجراء پر ڈال دیا، اور جس میں بلاشبہ حضرت مجدد الف ثانی اور ان کے خاندان، خلفاء، اور متبعین کا بنیادی حصہ ہے۔

بہر حال واقعہ کچھ بھی ہو، ہندوستان اور ہندوستان کے باہر حضرت مجدد کی وفات کے بعد ان کے مکتوبات، اور ان کی بعض تحقیقات و نکات کی بنیاد پر مخالفت و تضلیل کی جو مہم شروع کی گئی تھی، اور جس میں علماء و اہل افتاء کی بھی ایک تعداد شریک ہو گئی تھی، اس نے بارہویں صدی کے ربع اول ہی میں دم توڑ دیا، اور اب وہ صرف تاریخ کے (اور وہ بھی بعض قلمی کتابوں کے

سہارے پر) اوراق میں مدفون ہو کر رہ گئی ہے، بارہویں صدی کے نصف اول ہی میں ہندوستان سے ترکستان تک مجددی خانقاہیں، اور رہدایت وارشاد کے مرکز قائم ہو چکے تھے، سلسلۂ مجددیہ کے مشائخ اور علماء نے مکتوبات کے مستند عربی ترجمے کرکے بیشتر اسلامی ممالک میں پھیلا دیئے تھے، شیخ محمد مراد مکی قزانی نے حضرت مجددؒ اور ان کی اولاد و احفاد اور ان کے سلسلہ کے عرب و ترک مشائخ کا عربی میں تعارف کرایا جو "ذیل الرشحات" کے نام سے شائع ہوا ہے، نیز مکتوبات کا ترجمہ بھی کیا، جو "الدرر المکنونات النفیسۃ" کے نام سے شائع ہوا، نیز شیخ محمد نور الدین بیگ الأوزبکی کا عربی رسالہ "عطیۃ الوھّاب' الفاصلۃ بین الخطأ والصواب" بھی شائع ہوا، اور مکتوبات کی ممالک عربیہ اور ترکی میں ایسی اشاعت ہوئی کہ تمام غلط فہمیاں رفع ہوئیں[1]، سرآمد علمائے روزگار علامہ شہاب الدین محمود آلوسی بغدادی (م ۱۲۷۰ھ) اپنی شہرۂ آفاق تفسیر "روح المعانی" میں مجدد صاحب کا بڑے احترام سے نام لیتے ہیں، اور مکتوبات کے بکثرت اقتباسات پیش کرتے ہیں، اور اب کہیں بھی علماء کے حلقہ سے مخالفت اور تضلیل کی کوئی تحریک یا مہم جاری نہیں۔

فَاَمَّا الزَّبَدُ فَيَذْهَبُ جُفَآءً وَاَمَّا	میل کچیل کا جھاگ (جو کسی کام کا نہیں ہوتا)
مَا يَنْفَعُ النَّاسَ فَيَمْكُثُ فِي الْاَرْضِ	رائیگاں جاتا ہے، اور جس چیز میں انسان کے
كَذٰلِكَ يَضْرِبُ اللّٰهُ الْاَمْثَالَ۔	لئے نفع ہوتا ہے، وہ زمین میں رہ جاتی ہے،
(سورۃ الرعد۔ ۱۷)	اسی طرح اللہ (لوگوں کی سمجھ بوجھ کے لئے)
	مثالیں بیان کرتا ہے۔

حکمت الٰہی کی یہ عجیب کارفرمائی ہے کہ مخالفت و تضلیل کی اس مہم میں سب سے بڑا حصہ حجاز کے ان علماء نے لیا تھا، جو کردی الاصل تھے، شیخ ابراہیم الکورانی کردی ہیں، اور سید محمد برزنجی بھی شہر زور میں پیدا ہوئے، اللہ تعالیٰ نے سلسلۂ مجددیہ نقشبندیہ کی تبلیغ واشاعت

[1] جن حضرات نے رجوع کیا یا حضرت مجددؒ اور ان کے سلسلہ کے دفاع کا فرض انجام دیا ان کے نام "نزہۃ الخواطر" ج ۵ ص ۴۲۸ پر ملاحظہ ہوں۔

کے لئے ایک کردی عالم مولانا خالد شہر زوری کا انتخاب فرمایا، جن کی مساعی جمیلہ اور قوتِ نسبت سے یہ سلسلہ عراق، شام، کردستان، اور ترکی میں اس طرح پھیلا جس کی نظیر ملنی مشکل ہے۔[1] "وَلِلّٰهِ جُنُوْدُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ"

---

[1] تفصیل باب ہشتم میں آئے گی۔

باب ہشتم

حضرت مجددؒ کے دو خلفائے کبار اور ان کے منتسبین کے ذریعہ آپ کے تجدیدی کام کی توسیع و تکمیل

مشاہیر خلفاء

حضرت مجددؒ کے خلفائے عظام کے ناموں اور کارناموں کا استقصاء دشوار ہی نہیں بلکہ تقریباً ناممکن ہے کہ ان کی تعداد کئی ہزار بتائی جاتی ہے، اور وہ تمام دنیا میں منتشر اور سرگرم عمل رہے، خلفاء میں متعدد اصحاب کے نام جن کو آپ نے بعض بیرونی ممالک میں اصلاح و تربیت کا کام تفویض کر کے روانہ فرمایا تھا، یا ہندوستان کے بعض اہم مقامات میں اس خدمت پر مامور فرمایا تھا، گذشتہ اوراق میں گذر چکے ہیں، یہاں پر حروف تہجی کے اعتبار سے ان میں سے مشاہیر کی فہرست درج کر دی جاتی ہے، پھر دو اہم ترین خلفاء (حضرت خواجہ محمد معصوم اور حضرت سید آدم بنوری) کا تذکرہ قدرے تفصیل کے ساتھ پیش کیا جائے گا، پھر ان کے خلفائے کبار اور ان کے سلسلوں کی اشاعت اور ان کے ذریعہ سے اصلاح و تربیت کا جو کام انجام پایا، جن اہم روحانی و تربیتی مراکز کی بنیاد پڑی اور ان سے عوام و خواص کو جو فائدہ پہنچا اس کا اجمالاً تذکرہ آئے گا، جس سے اندازہ ہو سکے گا کہ اللہ تعالیٰ

نے حضرت مجددؒ کے سلسلہ کو کس طرح قبول عام عطا فرمایا اوران کی اصلاحی وتجدیدی مساعی کو کیسا بارآور اور پُرثمر فرمایا، اور یہ سب ارادۂ خداوندی، تائیدِ غیبی، قبولیت عند اللہ غایت اخلاص اور اتباعِ سنت کے بغیر نہیں ہوسکتا کہ ؎

این سعادت بزورِ بازو نیست

تا نہ بخشد خدائے بخشندہ

(۱) حضرت سید آدم بنوری (۲) مولانا احمد برکی (۳) مولانا احمد دیبنی (۴) مولانا امان اللہ لاہوری (۵) مولانا بدرالدین سرہندی (۶) شیخ بدیع الدین سہارنپوری (۷) شیخ حسن برکی (۸) شیخ حمید بنگالی (۹) حاجی خضر خاں افغانی (۱۰) میر صغیر احمد رومی (۱۱) شیخ طاہر بدخشی (۱۲) شیخ طاہر لاہوری (۱۳) خواجہ عبید اللہ عرف خواجہ کلاں (۱۴) خواجہ عبداللہ عرف خواجہ خورد (۱۵) شیخ عبدالحی حصاری (۱۶) مولانا عبدالواحد لاہوری (۱۷) شیخ عبدالہادی فاروقی بداؤنی (۱۸) مولانا فرخ حسین ہروی (۱۹) مولانا قاسم علی (۲۰) شیخ کریم الدین بابا حسن ابدالی (۲۱) سید محب اللہ مانکپوری (۲۲) شیخ محمد صادق کابلی (۲۳) مولانا محمد صالح کولابی (۲۴) مولانا محمد صدیق کشمی (۲۷) شیخ مزمل (۲۸) حافظ محمود لاہوری (۲۹) شیخ نور محمد پٹنی (۳۰) مولانا یار محمد جدید بدخشی طالقانی (۳۱) مولانا یار محمد قدیم (۳۲) شیخ یوسف برکی (۳۳) مولانا یوسف سمرقندی[1]۔

---

[1] حروف تہجی کی رعایت سے یہ فہرست مولانا سید زوار حسین کی تالیف "حضرت مجدد الف ثانیؒ" (شائع کردہ ادارۂ مجددیہ کراچی) سے ماخوذ ہے، ان کے حالات کے لئے مذکورہ بالا کتاب از ص۲۴۲ تا ص۸۰۸ اور تذکرہ امام ربانی مجدد الف ثانیؒ مرتبہ مولانا محمد منظور نعمانی کا مقالہ "تذکرہ خلفائے مجدد الف ثانیؒ" از مولانا نسیم احمد فریدی ص۳۱۰ تا ص۳۵۱ ملاحظہ ہو۔

حضرت خواجہ محمد معصوم[1]

شیخ طریقت و امامِ وقت، فاضل اجل حضرت معصوم بن احمد بن عبد الاحد العدوی العمری یعنی خواجہ محمد معصوم نقشبندی سرہندی، اپنے والد کی چہیتی اولاد صورۃً مشابہ، اقرب ترین پیروی و اتباع میں فائق، آپ کے علوم کے حامل خصوصی، فرزندان گرامی میں سب سے زیادہ مشہور اور ان میں سب سے زیادہ بابرکت تھے۔

۱۱ شوال ۱۰۰۷ھ میں پیدا ہوئے، اور بعض کتب درسیہ اپنے بڑے بھائی خواجہ محمد صادق سے اور بیشتر کتابیں اپنے والد ماجد اور شیخ محمد طاہر لاہوری سے پڑھیں، اپنے والد کی خدمت میں رہ کر تحصیل طریقت کی اور تین ماہ میں قرآن مجید حفظ کر لیا، نسبت پدری کی تحصیل میں آپ کا حال صدر الشریعۃ صاحب شرح وقایہ جیسا تھا، جو اپنے دادا صاحب کی تحریروں کو ان کے لکھے جانے کے ساتھ ہی حفظ کرتے جاتے تھے، اسی لئے اس مرتبہ کو پہنچے جہاں آپ کے والد کے اصحاب میں سے کوئی نہیں پہنچا، چنانچہ آپ کے والد ماجد نے "قیومیت" وغیرہ جیسے بلند مقامات کی بشارت دی، والد ماجد کی وفات کے بعد مسند ارشاد پر بیٹھے اور حرمین شریفین کا سفر کر کے حج و زیارت سے مشرف ہوئے، اور خاصی مدت تک مدینہ منورہ میں مقیم رہ کر ہندوستان واپس ہوئے، اور درس و افادہ میں عمر صرف کر دی، تفسیر بیضاوی، مشکوٰۃ، ہدایہ، عضدی، و تلویح زیادہ تر درس میں رہی۔

شیخ مراد بن عبد اللہ قزانی "ذیل رشحات" میں لکھتے ہیں کہ آپ اپنے والد ماجد کی طرح اللہ کی نشانیوں میں سے ایک نشانی تھے، آپ نے دنیا کو روشن کر دیا، اور اپنے نوجہات اور

---

[1] حضرت خواجہ محمد معصوم کا یہ تذکرہ جس میں اکثر ضروری باتیں آگئی ہیں، "نزہۃ الخواطر" ج ۵ سے ماخوذ ہے۔

بلند حالات کی برکت سے جہالت و بدعت کی تاریکیوں کو کافور کر دیا، ہزاروں انسان اسرارِ الٰہی کے محرم ہوئے اور آپ کے شرف صحبت کے سبب بلند حالات تک پہنچے، کہا جاتا ہے کہ نو لاکھ انسانوں نے آپ سے بیعت کی جن میں آپ کے خلفاء کی تعداد سات ہزار ہے، جن میں شیخ حبیب اللہ بخاریؒ بھی تھے، جو اپنے زمانے میں خراسان و ماوراء النہر کے سب سے بڑے شیخ تھے، آپ کی وجہ سے بخارا کی فضائیں بدعت کی تاریکیوں کے بعد سنت کی روشنیوں سے معمور ہو گئیں آپ نے چار ہزار مریدوں کو باکمال بنا کر خلافت و اجازت سے سرفراز کیا۔

شیخ محمد معصومؒ کے مکتوبات تین جلدوں میں ہیں، اور والد ماجد (حضرت مجدد الف ثانیؒ) کے مکتوبات ہی کی طرح اسرار و رموز اور لطائف و اشارات پر مشتمل ہیں، اور اکثر مجدد صاحب کے دقیق علوم و معارف کی تفسیر و تشریح کی حیثیت رکھتے ہیں۔

۹ ربیع الاول ۱۰۷۹ھ کو شہر سرہند میں انتقال فرمایا جہاں دفن ہوئے، قبر مبارک مشہور اور زیارت گاہ خلائق ہے۔

حضرت سید آدم بنوریؒ [1]

شیخ عارف، ولیٔ کبیر حضرت آدم بن اسماعیل بن بہوہ بن یوسف بن یعقوب بن حسین حسینی کاظمی بنوری، سلسلۂ نقشبندیہ کے مشائخ کبار میں ہیں، آپ کے والد ماجد کو خواب میں آپ کی پیدائش کی بشارت نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم کی زبان مبارک سے ملی تھی، سرہند کے قریۂ بنّور (بفتح با و تشدید نون) میں آپ کی ولادت و نشو و نما ہوئی۔

آپ نے حضرت مجدد صاحبؒ کے ایک مرید حاجی خضر روغانی سے ملتان میں روحانی

---

[1] حضرت شیخ آدم بنوری کا تذکرہ "نزہۃ الخواطر" ج ۵ سے ماخوذ ہے، جو اس سلسلہ میں "ماقلّ و دلّ" کا مصداق ہے۔

استفادہ کیا اور دو ماہ ان کی خدمت میں رہ کر شیخ کے حکم سے حضرت مجدد صاحبؒ کی خدمت میں حاضر ہو کر اور ان کے پاس مدت تک مقیم رہ کر طریقت کی تحصیل کی" خلاصۃ المعارف" میں ہے کہ شیخ محمد طاہر لاہوری کی خدمت میں آپ کو ربانی کشش حاصل ہوئی جو انھیں اپنے شیخ اسکندر سے اور انھیں اپنے دادا شیخ کمال الدین کیتھلی سے حاصل ہوئی تھی، فی الجملہ آپ اس رتبے کو پہنچے جہاں آپ کے بہت سے معاصر مشائخ نہیں پہنچ سکے، آپ کا طریقہ شریعت محمدیہ اور سنت نبویہ کا اتباع تھا، جس سے اپنے اقوال و افعال میں سرمو انحراف نہیں کرتے تھے۔

آپ سے ایک خلق نے استفادہ کیا کہا جاتا ہے کہ آپ سے چار لاکھ مسلمانوں نے بعیت کی اور ان میں سے ایک ہزار نے علم و معرفت کا وافر حصہ پایا، کہتے ہیں کہ آپ کی خانقاہ میں ایک ہزار آدمیوں سے کم تعداد شاید ہی کسی دن رہتی ہو، سب لوگ آپ کے مہمان ہوتے اور آپ سے استفادہ کرتے تھے" تذکرہ آدمیہ" میں ہے کہ حضرت سید آدم جب ۱۰۵۲ھ میں لاہور تشریف لے گئے ہیں تو آپ کے ساتھ دس ہزار اعیان و مشائخ اور ہر طبقہ کے افراد تھے، شاہجہاں بادشاہ بھی ان دنوں لاہور ہی میں تھا، جسے ان کی مقبولیت سے تشویش پیدا ہوئی اور اس نے اپنے وزیر سعد اللہ خاں کو شیخ کے پاس بھیجا، مگر اس ملاقات میں بدمزگی کے سبب، وزیر مذکور نے بادشاہ سے شیخ کی شکایت کی، جس کے نتیجے میں بادشاہ نے انھیں حرمین شریفین کے سفر کا حکم دے دیا، چنانچہ آپ نے اپنے عزیزوں اور دوستوں کے ساتھ حجاز کا رخ کیا اور حج سے فارغ ہو کر مدینہ منورہ میں مقیم ہوئے اور وہیں انتقال فرمایا۔

حقائق و معارف میں شیخ آدم بنوریؒ کی متعدد کتب و رسائل ہیں، جن میں فارسی میں دو جلدوں میں" خلاصۃ المعارف" نامی کتاب ہے جس کی ابتداء اس طرح ہوئی ہے؛

"الحمد للہ رب العالمین حمداً کثیراً بقدر کمالات اسمائہ و آلائہ[1] الخ" ان کی کتابوں میں "نکات الاسرار" بھی ہے۔

شیخ آدم بنوریؒ امّی تھے، انھوں نے کسی سے علمی تحصیل نہیں کی تھی، آپ نے ۲۳ شوال ۱۰۵۳ھ میں مدینہ منورہ میں انتقال فرمایا اور جنت البقیع میں قبۂ سیدنا عثمانؓ کے پاس دفن ہوئے۔

سلسلۂ مجددیہ معصومیہ اور اس کے مشائخ کبار

ہم پہلے حضرت خواجہ محمد معصوم کے سلسلہ کے مشائخ کبار کا اجمالی تذکرہ کرتے ہیں جس سے ان کی مقبولیت اور مرجعیت، ان کے افادہ و افاضہ کے دائرہ کی وسعت ان کی طرف رجوع عام اور خلق خدا کے پروانہ وار ہجوم و ازدحام اور اس وقت کے اسلامی معاشرہ اور مسلمانوں کی زندگی پر ان کے وسیع و عمیق اثرات کا کسی قدر اندازہ ہو سکے گا، ان کے مفصل حالات و سوانح کے لئے ان کتابوں کی طرف رجوع کرنے کی ضرورت ہے جو مستقلاً ان کے حالات میں لکھی گئیں یا ان کتب و تراجم کی طرف جن میں ان کا اجمالاً تذکرہ آیا ہے، جہاں تک ہندوستان کا تعلق ہے، اس کے لئے مولانا حکیم سید عبدالحیؒ کی شہرۂ آفاق کتاب "نزہۃ الخواطر" کی جلد پنجم، ششم اور ہفتم پر ایک نظر ڈالنا کافی ہوگا۔

حضرت خواجہ سیف الدین سرہندی

حضرت خواجہ محمد معصومؒ کے طریقہ کی اشاعت اور بانی سلسلہ حضرت مجدد الف ثانیؒ

---

[1] مصنف نے تحدیث بالنعمۃ کے طور پر لکھا ہے کہ یہ کتاب ان کے ذاتی کتب خانہ میں موجود ہے۔

کے مقاصد کی تکمیل (جن میں تعلق مع اللہ کی تجدید، اتباع سنت کا رواج اور ازالۂ بدعات و منکرات خاص اہمیت رکھتا ہے) حضرت خواجہ محمد معصوم کے خلف الرشید اور خلیفۂ راشد حضرت خواجہ سیف الدین سرہندی (۱۰۴۹-۱۰۹۶ھ) سے ہوئی جنھوں نے اپنے والد ماجد کے حکم سے دارالسلطنت دہلی میں طرح اقامت ڈالی، آپ کے ہاتھوں اس مرجع عالم خانقاہ کی بنیاد پڑی جس کو بعد میں حضرت مرزا مظہر جانِ جاناں اور حضرت شاہ غلام علی دہلوی نے تربیت روحانی کا عالمگیر مرکز بنا دیا، اور جس کے انوار سے ایک طرف افغانستان و ترکستان، دوسری طرف عراق و شام و ترکی منور ہوئے اور شاعر کا یہ کہنا حرف بحرف صادق آیا ؎

چراغ ہفت کشور خواجہ معصوم
منور از فروغش ہند تا روم

سلطان اورنگ زیب عالمگیر نے (جس نے جیسا کہ اوپر گذرا ہے حضرت خواجہ محمد معصوم کے ہاتھ پر بیعت کی تھی) حضرت خواجہ سیف الدینؒ سے روحانی تربیت حاصل کی، حضرت خواجہ کے محل شاہی میں جانے اور دیواروں پر کندہ تصویروں پر اعتراض کرنے اور بادشاہ کے اسی وقت ان کے ختم کرنے کا حکم دینے کا تذکرہ تاریخ میں آتا ہے۔[1] خواجہ سیف الدین نے اپنے والد نامدار کو اس کی اطلاع دی اور خواجہ نے (بادشاہ کے نام ایک مکتوب میں) اس پر مسرت کا اظہار فرمایا، تحریر فرماتے ہیں:۔

چہ نعمتے ست کہ بایں ہمہ طمطراق	یہ کیسی بڑی نعمت ہے کہ شاہانہ شان
بادشاہی و دبدبۂ سلطانی کلمۂ حق	و شوکت اور بادشاہی دبدبہ کے باوجود

[1] ذیل الرشحات۔ تالیف شیخ محمد مراد القزانی ص ۴۸ المطبعۃ المیریہ بمکۃ المحمیہ سنہ ۱۳۰۷ھ۔

بہ سمع قبول افتد وگفتہ نامرادے موثر شود۔[1]	کلمۂ حق قبول کیا جائے اور ایک نامراد کا کہنا موثر ہو۔

خواجہ سیف الدین نے بادشاہ میں آثار ذکر ظاہر ہونے اور بادشاہ کے بعض منازل سلوک طے کرنے کی بھی اطلاع دی اور خواجہ محمد معصوم نے اس پر بھی اپنی مسرت و اطمینان کا اظہار فرمایا، ایک مکتوب میں تحریر فرماتے ہیں :۔

"بادشاہ دین پناہ کے جو احوال تم نے ذکر کیے مثلاً لطائف میں ذکر کا سرایت کرنا اور سلطان ذکر اور رابطہ کا حاصل ہونا خطرات کی قلت کلمۂ حق قبول کرنا بعض منکرات کا رفع ہونا اور لوازم طلب کا زائل ہونا یہ سب بوضاحت معلوم ہوئے، اللہ تعالٰے کا شکر بجالانا چاہئے، بادشاہوں کے طبقے میں یہ باتیں عنقا کی طرح نایاب ہیں[2]"

بادشاہ نے ان سے رابطۂ روحانی قائم رکھا "مآثر عالمگیری" کے مصنف محمد ساقی مستعد خاں نے سال دوازدہم ۱۰۸۰ھ (۱۳ محرم) کے واقعات میں بادشاہ کے ایک پہر رات گئے باغ حیات بخش سے حضرت خواجہ کے دولت خانہ میں تشریف لے جانے اور ایک گھڑی بیٹھ کر ان کی صحبت بابرکت اور کلمات طیبہ سے مستفید ہونے اور ان کا اعزاز و اکرام کرنے کے بعد دولت خانہ شاہی میں مراجعت کا ذکر کیا ہے۔[3]

حضرت خواجہ کا خاص ذوق امر بالمعروف ونہی عن المنکر کا تھا، اور اس میں وہ بڑے سرگرم تھے، "ذیل الرشحات" کے مصنف شیخ مراد بن عبداللہ القزانی کے بیان کے مطابق "ان کی ان مساعی کا اثر یہ ہوا کہ قریب تھا کہ سرزمین ہندوستان سے بدعات کا

---

[1] مکاتیب حضرت خواجہ محمد معصوم ج ۳ مکتوب ۲۲۷ [2] ایضاً ج ۳ مکتوب ۲۲۰

[3] مآثر عالمگیری شائع کردہ ایشیاٹک سوسائٹی آف بنگال ۱۸۷۱ء ص ۸۴

خاتمہ ہوجائے اسی بنا پر ان کے والد ماجد نے ان کو محتسب الامۃ کا خطاب دیا، نہایت قوی التاثیر، صاحبِ جذب و تصرف تھے، لوگ ایک اضطراب و استغراق کی حالت میں ان کی خانقاہ میں پڑے رہتے تھے، اسی کے ساتھ بڑے دبدبہ اور عظمت کے شیخ تھے، سلاطین و اُمراء ان کی مجلس میں مؤدب کھڑے رہتے تھے اور ان کو ان کے سامنے بیٹھنے کی ہمت نہیں ہوتی تھی، رجوعِ عام کا یہ حال تھا کہ روزانہ چودہ ۱۴۰۰ سو آدمی دونوں وقت ان کے مطبخ سے اپنی خواہش و ذوق کے مطابق کھانا پاتے تھے۔[1]

خواجہ سیف الدین کے بعد ان کے خلیفہ سید نور محمد بدایونی (م ۱۱۳۵ھ) نے ان کی جگہ کو آباد اور ان کی خانقاہ کو نورِ محمدی سے منور رکھا ان کے بعد حضرت مرزا مظہر جانِ جاناںؒ نے ان کی مسندِ ارشاد کو زینت بخشی جن کا تذکرہ بعد میں آئے گا۔[2]

خواجہ محمد زبیرؒ سے مولانا فضل رحمٰن گنج مرادآبادیؒ تک

حضرت خواجہ محمد معصوم کے دوسرے صاحبزادے حضرت خواجہ محمد نقشبند تھے (۱۰۳۴ھ-۱۱۱۴ھ) جو حجۃ اللہ نقشبند کے نام سے مشہور ہیں، حضرت خواجہ محمد معصوم نے ان کو اپنا جانشین و خلیفہ بنایا تھا، اور ان کی وفات کے بعد وہ ہمہ تن ارشاد و تلقین میں مصروف ہو گئے۔

ان کے خلفاء میں خواجہ محمد زبیر (ابن ابی العلا ابن خواجہ محمد معصوم، م ۱۱۵۱ھ) تھے، جن کی طرف طالبین کا ایسا رجوع ہوا جو اس عہد میں کمتر کسی کی طرف ہوا ہوگا، جب آپ مکان سے مسجد تشریف لاتے تھے، تو امراء اپنے دوشالے اور پگڑیاں مکان سے مسجد تک

[1] ذیل الرشحات ص ۴۸-۴۹ [2] چتلی قبر کی موجودہ خانقاہ اصلاً حضرت شاہ غلام علیؒ کے زمانہ میں قائم ہوئی جنھوں نے اس مکان کو جس میں حضرت مرزا صاحب کی تدفین ہوئی تھی، خرید کر مسجد و خانقاہ کی تعمیر کی۔

بچھاتے تھے تاکہ قدم مبارک زمین پر نہ پڑے، اور اگر کسی مریض کی عیادت یا دعوت میں جانے کے لئے سوار ہوتے تو بادشاہوں کے مثل آپ کی سواری جاتی تھی۔[1]

حضرت خواجہ محمد زبیر نے بڑے بڑے خلفاء یادگار چھوڑے ان میں تین بڑے نامور ہوئے، حضرت شاہ ضیاء اللہ جن کے خلفاء میں حضرت شاہ محمد آفاق ہیں، دوسرے حضرت خواجہ محمد ناصر عندلیب جن کے فرزند و خلیفہ خواجہ میر درد دہلوی ہوئے، تیسرے حضرت خواجہ عبدالعدل جن کے خلیفہ حضرت شاہ عبدالقادر دہلویؒ مترجم قرآن و فرزند حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ ہیں۔

حضرت خواجہ ضیاء اللہ بڑے پایہ کے شیخ طریقت و صاحب نسبت تھے، حضرت شاہ غلام علی فرماتے تھے کہ جس نے نسبت مجددی مجسم نہ دیکھی ہو، وہ حضرت خواجہ ضیاء اللہ کو دیکھے۔[2]

ان کے خلیفہ حضرت شاہ محمد آفاق (۱۱۶۰ـ۱۲۵۱ھ) کو اللہ تعالیٰ نے قبول عام عطا فرمایا، اور شہرۂ آفاق بنایا، دہلی سے کابل تک لوگوں نے آپ سے فیض اٹھایا کابل تشریف لے گئے تو زماں شاہ، شاہِ افغانستان نے بیعت کا شرف حاصل کیا۔

حضرت شاہ محمد آفاق کے خلیفۂ ارشد اویس زمانہ حضرت مولانا فضل رحمٰن گنج مرادآبادیؒ (۱۲۰۸ـ۱۳۱۳ھ) تھے، جن کے جذبِ قوی، نفس گرم، زہد و تجرید، اتباع شریعت، علمِ سنت و حدیث اور عشق الٰہی و حب نبوی نے نصف صدی سے زائد تک ہندوستان (بالخصوص شمالی ہند) کی فضا کو گرم اور منور رکھا اور خود انھیں کے الفاظ میں عشق کی

---

[1] "درالمعارف" ملفوظات حضرت شاہ غلام علی۔

[2] ایضاً ص۱۶

دکان کی گرم بازاری رہی"[1]

ہندوستان کے وسیع النظر و محتاط مؤرخ اور تذکرہ نگار مولانا حکیم سید عبدالحی مصنفِ "نزہۃ الخواطر" کے بقول :-

"عقیدت مندوں نے پروانوں کی طرح ہجوم کیا اور تحائف و ہدایا کی بارش ہوئی، بڑے بڑے امراء اور رؤساء دور دراز اور دشوار گذار علاقوں سے عقیدت مندانہ حاضر ہوئے اور آپ کی ذات مرجع خلائق بن گئی، اور ایسی مقبولیت اور ہر دلعزیزی حاصل ہوئی، جو اس زمانہ میں کسی شیخ طریقت کو حاصل نہیں تھی۔

جہاں تک آپ کے کشف و کرامات کا تعلق ہے، وہ حدِ تواتر کو پہونچ گئی ہیں، اور اس بارہ میں اولیاءِ متقدمین میں بھی حضرت سیدنا عبدالقادر جیلانیؒ کے علاوہ اور کوئی نظیر نہیں ملتی"[2]

مفصل تذکرہ کے لئے ملاحظہ ہو راقم سطور کی کتاب "تذکرہ حضرت مولانا فضل رحمٰن گنج مرادآبادی"۔

---

[1] ندوۃ العلماء کے اکثر بانی و ناظم حضرت مولانا کے مرید و مسترشد تھے، مثلاً مولانا سید محمد علی مونگیری بانی و ناظم اول ندوۃ العلماء، مولانا مسیح الزماں خاں شاہجہاں پوری (استاد اعلیٰ حضرت محبوب علی خاں نظام دکن) مولانا سید ظہور الاسلام فتحپوری، مولانا سید تجمل حسین بہاری، مولانا حکیم سید عبدالحیؒ ناظم ندوۃ العلماء، نواب صدر یار جنگ مولانا حبیب الرحمٰن خاں شروانی (صدر الصدور امور مذہبی حیدرآباد دکن) حسام الملک صفی الدولہ نواب سید علی حسن خاں ناظم ندوہ، مولانا کے سلسلہ کی اشاعت اول الذکر مولانا سید محمد علی مونگیریؒ سے بڑے وسیع پیمانے پر ہوئی۔

[2] نزہۃ الخواطر ج ۸ ۔

مرزا مظہر جانِ جاناں اور حضرت شاہ غلام علی

حضرت سید نور محمد بدایونی کے خلیفہ حضرت مرزا مظہر جانِ جاناں شہیدؒ[1] (۱۱۱۱ھ، ۱۱۱۳ھ۔ ۱۱۹۵ھ) تھے، جنھوں نے پینتیس ۳۵ سال تک اپنے انفاس قدسیہ سے دلوں کو گرم و منور رکھا اور دارالسلطنت دہلی میں عشق کا زور بازار اپنے عروج پر رہا، حکیم الاسلام حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی جیسے صاحبِ نظر معاصر کی ان کے متعلق شہادت ہے۔

"ہندوستان کے لوگوں کے حالات ہم سے پوشیدہ نہیں کہ یہیں کی پیدائش ہے، اور یہیں عمر بسر ہوئی ملک عرب کو خود دیکھا ہے، اور اس کی سیاحت کی ہے، افغانستان و ایران کے لوگوں کے حالات وہاں کے معتبر لوگوں کی زبانی سنے ہیں، اس سب کے بعد اس نتیجہ پر پہونچنا ہوا کہ کوئی ایسا بزرگ جو جادۂ شریعت اور طریقت پر اور کتاب و سنت کی پیروی میں ان کی طرح استوار و مستقیم ہو اور طالبین کی رہنمائی میں اس کا پایہ اتنا بلند اور اس کی توجہ اتنی قوی ہو ہمارے دور میں ان ملکوں میں سے کسی ملک میں جن کا اوپر ہم نے تذکرہ کیا پایا نہیں جاتا، دور ماضی اور بزرگان سلف میں بیشک ہو سکتا ہے، بلکہ سچ پوچھئے تو ہر زمانہ میں ایسے بزرگ زیادہ تعداد میں پائے نہیں جاتے چہ جائیکہ ایسے زمانہ میں جو فتنہ و فساد سے پُر ہے"[2]

حضرت مرزا مظہر جانِ جاناں کے خلفاء میں حضرت مولانا نعیم اللہ بہرائچی (۱۱۵۳ھ۔ ۱۲۱۸ھ) مصنف "معمولات مظہریہ" اور بیہقی وقت حضرت قاضی ثناء اللہ پانی پتی (م ۱۲۲۵ھ) مصنف "التفسیر المظہری" و "مالابدمنہ" اور مولانا غلام یحییٰ بہاری (۱۱۸۰ھ) جیسے سرآمدروزگار

---

[1] اصل نام شمس الدین حبیب اللہ تھا، مظہر تخلص تھا، والد کا نام مرزا جان تھا، اسی نسبت سے عالمگیر مرحوم نے جانِ جاں نام رکھا کہ فرزند جانِ پدر ہوتا ہے خلائق کی زبان پر جانِ جاناں جاری ہوگیا۔ [2] کلمات طیبات ص ۱۶۴۔۱۶۵

علماء و مشائخ تھے[1] لیکن مرزا صاحب کے سلسلہ بلکہ طریقہ مجدّدیہ کی عالمگیر اشاعت ان کے خلیفۂ ارشد حضرت شاہ غلام علی بٹالوی[2] (۱۱۵٦ھ تا ۱۲۴۰ھ) کے لئے مقدّر تھی، ان کو سلسلۂ مجددیہ کا مجدد بلکہ تیرھویں صدی میں سلوک الی اللہ اور تزکیہ و احسان (جس کا معروف نام تصوف ہے) کا مجدد کہنا صحیح ہوگا، جن پر عجم و عرب کے طالبین نے پروانوں کی طرح ہجوم کیا، ہندوستان کا کوئی شہر ایسا نہ ہوگا، جہاں آپ کا کوئی خلیفہ نہ ہو صرف ایک انبالہ شہر میں آپ کے پچاس۵۰ خلفاء تھے، سرسید احمد خاں مرحوم "آثار الصنادید" میں لکھتے ہیں :۔

"میں نے حضرت کی خانقاہ میں اپنی آنکھ سے روم اور شام اور بغداد اور مصر چین اور حبش کے لوگوں کو دیکھا ہے کہ حاضر ہو کر بیعت کی اور خدمت خانقاہ کو سعادت ابدی سمجھے اور قریب قریب کے شہروں کا مثل ہندوستان، پنجاب اور افغانستان کا تو کچھ ذکر نہیں کہ ٹڈی دل کی طرح امنڈتے تھے حضرت کی خانقاہ میں پانچ سو۵۰۰ فقیر سے کم نہیں رہتا تھا، اور سب کا روٹی کپڑا آپ کے ذمہ تھا"[3]

شاہ رؤف احمد مجددیؒ دُرّ المعارف میں صرف ایک روز کے طالبین کے مقامات کی فہرست لکھتے ہیں، جو ۲۸ جمادی الاولی ۱۲۳۱ھ کو دہلی کی اس خانقاہ میں استفادہ کے لئے حاضر تھے:

"سمرقند، بخارا، غزنی، تاشقند، حصار، قندھار، کابل، پشاور، کشمیر، ملتان، لاہور، سرہند، امروہہ سنبھل، رامپور، بریلی، لکھنؤ، جائس، بہرائچ، گورکھپور، عظیم آباد، ڈھاکہ، حیدرآباد، پونا وغیرہ"[4]

ان کے اس فیض عام کو دیکھ کر ان کے مسترشد مولانا خالد رومی کا فارسی کا یہ شعر بالکل واقعہ کی تصویر ہے ؎

---

[1] خلفاء و مریدین کبار کے لئے ملاحظہ ہو مقامات مظہری۔ ازص ۶۴ا اس میں جن خلفاء کے نام دیئے ہیں ان کی تعداد ۴۳ ہے
[2] آپ کا اصل نام عبداللہ تھا، شاہ غلام علی کے نام سے شہرۂ آفاق ہوئے [3] آثار الصنادید باب چہارم ص ۴ [4] در المعارف ص ۱۰٦ مطبع نامی

خبر از من دہید آں شاہ خوباں را بہ پنہانی
کہ عالم زندہ شد بار دگر از ابر نیسانی[۵۱]

حضرت شاہ غلام علیؒ کے بڑے بڑے جلیل القدر خلفاء ہوئے ان میں سے حضرت شاہ سعد اللہ جن کے خلیفہ شاہ محمد نعیم معروف بہ مسکین شاہ صاحب (م ۱۲۶۴ھ) تیرہویں صدی کے وسط میں حیدرآباد تشریف لائے اور طویل قیام فرمایا، آصف جاہ ششم اعلیٰ حضرت میر محبوب علی خاں ان کے ارادت مند تھے،[۵۲] شاہ سعد اللہ صاحب کے دوسرے خلیفہ سید محمد پادشاہ بخاری (م ۱۳۲۸ھ) تھے[۵۳] حضرت شاہ غلام علی صاحب کے ایک خلیفہ حضرت شاہ رؤف احمد صاحب مجددی (۱۲۰۱ھ تا ۱۲۶۶ھ) نے بھوپال میں خانقاہ مجددیہ کی بنیاد ڈالی،[۵۴] بہرائچ میں مولانا شاہ بشارت اللہ بہرائچی (م ۱۲۵۴ھ) نے سلسلۂ مجددیہ نقشبندیہ کی اشاعت کی، بخارا میں شیخ گل محمد شیخ الکل بنے ہوئے تھے، اور انھوں نے سلسلۂ مجددیہ کا فیض عام کر رکھا تھا،[۵۵] شیخ احمد بغدادی قادری نے بغداد سے آکر بیعت و اجازت حاصل کی۔[۵۶]

مولانا خالد رومی

عراق و شام اور ترکی میں حضرت شاہ غلام علی صاحب کے سلسلہ کی اشاعت کا کام اللہ نے ایک کردی فاضل اجل مولانا خالد رومی سے لیا، جو اپنے ملک میں حضرت کے فیض و ارشاد

---

۵۱ یہ ۵۹ شعر کا قصیدہ ہے جو شاہ عبد الغنی محدث دہلوی نے پورا نقل کیا ہے ۵۲ مخبر دکن مدراس ۱۰ جنوری ۱۸۹۶ء ۵۳ جن کے خلیفہ مولانا سید عبد اللہ شاہ صاحب (م ۱۳۸۴ھ) مصنف "زجاجۃ المصابیح" مدت دراز تک حیدرآباد میں سرگرم تربیت و ارشاد رہے۔ ۵۴ جس کو پیر ابو احمد صاحب اور ان کے فرزند ارجمند مولانا شاہ محمد یعقوب صاحبؒ نے اپنے اپنے وقت میں آباد کیا۔ ۵۵ در المعارف ص ۱۲۵ ۵۶ ایضاً ص ۱۴۴

کا آوازہ سن کر ہمہ تن شوق و بے قراری بن کر منزلوں پر منزلیں طے کرتے ہوئے ایک سال میں دہلی پہونچے اور آستانہ پر آ کر ایسے پڑے کہ تکمیل سلوک کی منزلیں طے کر کے اجازت وخلافتِ خاصہ سے مشرف ہوئے، اس عرصہ میں ان کی یکسوئی کا عالم یہ تھا کہ دہلی کے علماء ومشائخ جو ان کے فضل و کمال کی شہرت برسوں سے سنتے تھے ملنے آتے تو فرما دیتے کہ فقیر جس مقصد کے لئے آیا ہے، اس کے حصول کے بغیر کسی طرف متوجہ نہیں ہوسکتا، مسندِ وقت سراج الہند حضرت شاہ عبدالعزیز صاحب آئے کہ القادم یُزار (باہر سے آنے والے سے خود ملنے جاتے ہیں) اور حضرت شاہ ابوسعید صاحب نے جو ان کے شاگرد رشید تھے، عرض کیا کہ استاد الہند آپ کی ملاقات کے لئے آئے ہیں، فرمایا کہ سلام کہو اور کہو کہ مقصد براری کے بعد میں خود حاضر ہوں گا۔

وطن واپس گئے تو طالبینِ خدا پروانہ وار ٹوٹ پڑے اور ایسا رجوع ہوا کہ باید و شاید، مولانا شاہ رؤف احمد صاحب مجددی اپنی کتاب دُرّ المعارف میں جمعہ ۲۴ رجب ۱۲۳۱ھ کی روداد میں لکھتے ہیں کہ "ایک مغربی بزرگ حضرت کا نامِ مبارک سن کر منزلوں پر منزلیں قطع کر کے بغداد میں مولانا خالد رومی سے ملتے ہوئے حاضر ہوئے، انھوں نے مولانا کی مقبولیت و مرجعیت کا حال بیان کیا کہ تقریباً ایک لاکھ آدمی حلقہ بگوشِ ارادت اور بیعت سے مشرف ہو چکے ہیں، ایک ہزار عالم متبحر داخل طریقہ ہو کر مولانا کے سامنے دست بستہ کھڑے رہتے ہیں"[1] خود مولانا خالد نے حضرت شاہ ابوسعید کے نام جو خط لکھا ہے اس میں تحدیث بالنعمة کے طور پر تحریر فرماتے ہیں:۔

"تمام مملکت روم وعرب اور حجاز وعراق اور بعض ممالکِ عجم اور سارا کردستان طریقۂ عالیہ نقشبندیہ

---

[1] در المعارف ص ۱۰۷

کی تاثیرات و جذبات سے سرشار ہے اور شب و روز تمام محافل و مجالس، مساجد و مدارس میں حضرت امام ربّانی مجدّد و منوّر الف ثانی کے محاسن و محامد کا ذکر اس طرح ہر چھوٹے بڑے کی زبان پر ہے کہ اس کا گمان نہیں ہو سکتا کہ کبھی کسی ملک میں اور کسی وقت میں گوشِ زمانہ نے ایسا زمزمہ سنا ہو یا چشم فلک نے ایسی رغبت اور ایسا اجتماع دیکھا ہو........ اگرچہ اس قسم کی باتوں کا تذکرہ ایک طرح کی گستاخی اور خود بینی ہے، یہ فقیر اس پر شرمندہ ہے محض دوستوں کے حق کو مقدم جان کر اس نے بے ادبی کی جرأت کی ہے[1]

علامہ ابن عابدین مشہور بہ علامۂ شامی مصنف "ردّالمحتار شرح الدر المختار" مولانا خالد رومی کے شاگرد و دست گرفتہ تھے، انھوں نے ان کے مناقب میں پورا رسالہ "سلّ الحسام الہندی لنصرۃ مولانا خالد النقشبندی" کے نام سے تصنیف کیا ہے[2] جو اصلاً ایک رسالہ کی تردید میں ہے جو بعض حاسدین نے مولانا خالد کی مخالفت و تضلیل میں لکھا تھا، رسالہ کے آخر میں مختصر حالات لکھے گئے ہیں، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ سلیمانیہ کے قریب قصبہ قرہ داغ کے رہنے والے تھے، ۱۱۹۰ھ میں ولادت ہوئی اساتذہ وقت سے علوم مروجہ کی تعلیم حاصل کی اور معقولات، ریاضیات، ہیئت وغیرہ میں بھی کمال پیدا کیا، پھر سلیمانیہ واپس آکر حکمت، علم کلام و بلاغت کی انتہائی کتابیں پڑھائیں ۱۲۲۰ھ میں حج بیت اللہ و زیارت سے مشرف ہوئے، مکہ معظمہ میں دہلی جانے کا اشارہ غیبی پایا، پہلے شام واپس آئے، وہاں ایک ہندوستانی سے حضرت شاہ غلام علی صاحب کا ذکر سنا اس کی بنا پر ۱۲۲۴ھ میں ایران اور افغانستان ہوتے ہوئے، اور ہر جگہ اپنے علم کا سکہ منواتے ہوئے لاہور کے

---

[1] ترجمہ ماخوذ از مقالہ مولانا عبدالشکور صاحب مشمولہ تذکرہ امام ربانی مجدد الف ثانیؒ۔

[2] شامل مجموعہ رسائل ابن عابدین طبع جدید سہیل اکیڈمی لاہور پاکستان۔

راستہ سے پورے ایک سال کی مدت میں دہلی پہونچے، دہلی پہونچ کر عربی میں قصیدۂ شوقیہ کہا جس کا مطلع ہے ؎

کملت مسافۃ کعبۃ الآمال

حمدا لمن قد منّ بالاکمال

ایک سال نہیں گذرا تھا کہ طرق خمسہ میں اجازت و خلافت سے مشرف ہوئے اور پھر اپنے مرشد کے حکم موکد سے وطن کی طرف واپس ہوئے، بغداد پہونچ کر تربیت و ارشاد کا سلسلہ شروع کیا، پانچ مہینے وہاں قیام کر کے وطن واپس ہوئے، ۱۲۲۸ھ میں پھر بغداد واپس ہوئے وہاں ان کی قبولیت اور رجوع عام دیکھ کر لوگوں کو حسد ہوا، اور ان کے خلاف ایک فتنہ کھڑا کیا گیا، والیِ بغداد سعید پاشا کی طرف سے بعض علماء کو اس کی تردید کا ایما ہوا، علمائے بغداد نے اپنی مہروں سے مزین کر کے ان کی برأت اور ان کے عالی مرتبہ ہونے کا فتویٰ دیا، کردوں، اہل کرکوک، اربل، موصل، عمادیہ، عنتیاب، حلب، شام، مدینۂ منورہ، مکۂ معظمہ اور بغداد کے ہزاروں آدمیوں نے ان سے نفع اٹھایا۔

مصنف نے اس کے بعد ان کے اخلاق فاضلہ کا ذکر اور ان کی تصنیفات کی فہرست پیش کی ہے، انھوں نے اپنے زمانہ کے مشہور ادیب اور شاعر شیخ عثمان سند کی بھی ایک تصنیف کا ذکر کیا ہے، جو مولانا خالد کے حالات میں لکھی گئی ہے، اور اس کا نام ہے "أصفى الموارد فی ترجمۃ حضرۃ سیدنا خالد" آخر میں مولانا خالد نے شام کو اپنا مستقر بنا لیا انھوں نے ۱۲۳۸ھ میں اپنے خلفاء و مریدین کے ایک جم غفیر کے ساتھ شام کا سفر فرمایا، اور ملک شام گویا ان پر امنڈ آیا، سلوک و ارشاد کے ساتھ علوم شرعیہ کی اشاعت، مساجد کی دوبارہ آبادی و رونق کی طرف بھی متوجہ رہے، بالآخر ۱۲۴۲ھ کے طاعون میں ۱۴؍ ذی القعدہ کو شہادت حاصل کی

اور قاسیون کے دامن میں مدفون ہوئے، مولانا نسباً عثمانی تھے، مؤلف رسالہ نے ان سے اپنا خواب بیان کیا کہ میں نے دیکھا کہ سیدنا عثمان بن عفان کا انتقال ہوگیا ہے، اور میں ان کی نماز جنازہ پڑھا رہا ہوں، انھوں نے فرمایا کہ یہ میری رحلت کا اشارہ ہے، میں ان کی اولاد ہوں، یہ خواب انھوں نے مغرب کے وقت بیان کیا تھا، اور مولانا خالد نے عشاء کی نماز پڑھ کر وصیت فرمائی، اور جانشین بنایا، گھر میں تشریف لے گئے اسی رات طاعون کا حملہ ہوا، اور انتقال فرما گئے[1]۔

حضرت شاہ احمد سعید اور ان کے خلفاء

حضرت شاہ غلام علی صاحب کے اصل جانشین اور ان کے سلسلہ کو چار دانگ عالم میں پھیلانے والے ان کے خاص تربیت یافتہ خاندان مجددی کے چشم و چراغ حضرت شاہ احمد سعید ابن شاہ ابو سعید (۱۲۱۷ھ تا ۱۲۷۷ھ) تھے[2]، جنھوں نے اپنے والد حضرت شاہ ابو سعید کی وفات کے بعد ۱۲۵۰ھ میں حضرت شاہ غلام علی اور حضرت مرزا مظہر جانِ جاناں کے سجادہ کو رونق بخشی اور کامل ۲۳ برس (۱۲۵۰ھ تا ۱۲۷۳ھ) تک سرگرمی سے سلسلۂ مجددیہ کی اشاعت میں سرگرم رہے، اور اسی سال (۱۸۵۷ء) میں مجبوراً ہندوستان اپنے آبا و اجداد کی خانقاہ کو خیرباد کہا، اور محرم ۱۲۷۴ھ میں دہلی سے روانہ ہو کر شوال ۱۲۷۴ھ میں مکۂ مکرمہ پہونچے، پھر مدینۂ طیبہ میں مستقل طور پر قیام اختیار کیا اور دو سال بقید حیات رہ کر وہیں آسودۂ خاک ہوئے، دو سال کے اس قلیل عرصہ میں ترک اور عرب سیکڑوں کی تعداد میں آپ سے بیعت ہوئے ایک شاہد عینی کے بقول "اگر آپ کی حیات وفا کرتی، اور یہ سلسلہ جاری رہتا تو آپ کے

---

[1] سل الحسام الہندی ص ۳۱۸-۳۲۵، مولانا کا سلسلہ شام و ترکی میں اب تک موجود ہے میں نے دمشق و حلب اور ترکی میں اس سلسلہ کے متعدد مشائخ کبار کی زیارت کی ہے۔ [2] مفصل حالات کے لئے ملاحظہ ہو "نزہۃ الخواطر" ج ۷، مقامات خیر از مولانا شاہ ابو الحسن زید فاروقی۔

مریدوں کی تعداد لاکھوں تک پہونچ جاتی ہے![1]

حضرت شاہ احمد سعید صاحب کے خلفاء کا استقصاء بہت دشوار ہے "مناقب احمدیہ"[2] میں اسّی حضرات کے نام مذکور ہیں، ہندوستان میں ان کے سلسلہ کی اشاعت ایک طرف شیخ دوست محمد قندھاری کے ذریعہ ہوئی، جن کے خلیفۂ اعظم خواجہ عثمان دامانی (م ۱۳۱۴ھ) نے ڈیرہ اسماعیل خاں کے قصبہ موسیٰ زئی میں بیٹھ کر فضا کو عشق کی حرارت اور نسبتِ نقشبندیہ کی سکینت سے معمور و مخمور کردیا ان کے خلیفۂ اعظم خواجہ سراج الدین (م ۱۳۳۳ھ) نے اس سلسلہ کو دور تک پہونچا دیا، اللہ نے ان کو وجاہت عظیم عطا فرمائی، اور انھوں نے ارشاد و تربیت اور عزم استقامت و اشتغال بالحدیث کے ساتھ اپنے اسلافِ کرام کے سجادہ کو آباد رکھا، خواجہ سراج الدین کے خلیفہ مفسر قرآن اور داعی الی التوحید، واں بھچراں[3] کے مولانا حسین علی شاہ صاحب (۱۲۸۳ھ۔ ۱۳۶۳ھ) ہوئے، ان سے اس پیمانہ پر اصلاحِ عقائد کا کام ہوا، اور توحید خالص کا آوازہ بلند ہوا جس کی نظیر اس زمانہ میں مشکل ہے۔

اسی زمانہ میں سلسلہ مجددیہ کے ایک بڑے شیخ شاہ امام علی (۱۲۱۲ھ۔ ۱۲۸۲ھ) مکانوی[4] تھے، جن کے رجوع عام و مقبولیت کا حال یہ تھا کہ ان کے باورچی خانہ میں روزانہ مہمانوں کے لئے تین سو بکرے ذبح ہوتے تھے[5]۔ ان کا سلسلہ حضرت عبدالاحد صاحبؒ معروف بشاہ گل کے ذریعہ حضرت مجددؒ تک پہونچتا ہے۔

حضرت شاہ احمد سعید صاحب کے ایک جلیل القدر خلیفہ مولانا شاہ سید عبدالسلام صاحب واسطی ہسوی (۱۲۳۴ھ۔ ۱۲۹۹ھ) تھے جو بڑے عالی نسبت و صاحبِ استقامت شیخ تھے، اور جن سے صوبجات متحدہ میں طریقہ کی اشاعت ہوئی[6]۔

---

[1] مکتوب شاہ محمد عمر بن شاہ احمد سعیدؒ بنام مولانا سید عبدالسلام ہسویؒ۔ [2] تالیف شاہ محمد مظہر [3] ضلع میانوالی مغربی پنجاب [4] مکان شریف ضلع گرداسپور میں ایک قصبہ ہے جس کا پرانا نام رز چھتر ہے۔ [5] تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو تذکرۂ بے مثل راجگان راجور از مرزا ظفر اللہ خاں ص ۵۰۸-۵۲۱ [6] تفصیلی حالات کے لئے ملاحظہ ہو "نزہۃ الخواطر" ج ۷

حضرت شاہ احمد سعید صاحب کے ایک فرزند حضرت شاہ عبد الرشید تھے (۱۲۳۷ھ۔۱۲۸۷ھ) (جن سے نواب کلب علی خاں والیِ رامپور نے تربیت حاصل کی) اپنے والد ماجد کے بعد مدینۂ منورہ میں ان کے جانشین و قائم مقام ہوئے آخر میں مکہ مکرمہ آگئے تھے اور وہاں طالبین کی تربیت میں مشغول رہ کر راہی ملک بقا اور جنت المعلاۃ میں آسودۂ خاک ہوئے، آپ کے صاحبزادہ شاہ محمد معصوم (۱۲۶۳ھ۔۱۳۴۱ھ) نے رامپور میں خانقاہ معصومی کی بنیاد رکھی، ۳۲ سال رامپور میں قیام رہا اور ۱۳۴۱ھ میں مکۂ معظمہ میں وفات پائی[1]۔

حضرت شاہ احمد سعید صاحب کے دوسرے فرزند شاہ محمد مظہر (۱۲۴۸ھ۔۱۳۰۱ھ) بڑے قوی النسبت اور کثیر الارشاد بزرگ تھے، سمرقند، بخارا، قزان، ارض روم، افغانستان و ایران، جزیرۃ العرب اور شام کے صدہا طالبین راہِ خدا فیض یاب ہوئے، ۱۲۹۰ھ میں مدینۂ منورہ میں نہایت عمدہ سہ منزلہ خانقاہ تعمیر کی جو رباط مظہری کے نام سے مشہور ہے، یہ باب النساء اور جنت البقیع کے درمیان واقع ہے۔

تیسرے صاحبزادہ شاہ محمد عمر تھے (۱۲۴۴ھ۔۱۲۹۸ھ) ان کے صاحبزادہ حضرت شاہ ابوالخیر مجددی تھے۔

حضرت شاہ عبد الغنی

حضرت شاہ احمد سعید صاحب کے برادر خورد لیکن عالی مرتبت بھائی، محدث جلیل حضرت شاہ عبد الغنی (۱۲۳۵ھ۔۱۲۹۶ھ) جنھوں نے درسِ حدیث اور سلوک و تصوف کو اس طرح جمع کیا جس کی نظیر حضرت شاہ عبد العزیز دہلوی کی ذات کو مستثنیٰ کر کے ملنی مشکل ہے،

---

[1] آپ کے فرزند مولانا ابوسعید بقید حیات ہیں۔

دولت باطنی اور نسبت مجددی کے حامل اور شیخ کامل ہونے کے ساتھ وہ حدیث میں استاد الہند اور شیخ وقت تھے، جن کے حلقۂ تدریس میں مولانا محمد قاسم نانوتوی مولانا رشید احمد گنگوہی جیسے علمائے اعلام تیار ہوئے اور ہندوستان میں حدیث کا سکہ رواں ہوا اور دیوبند و مظاہر علوم کے جیسے عظیم مدارس تدریسِ حدیث کے مرکز قرار پائے ۱۸۵۷ء کے ہنگامۂ رستخیز میں وہ بھی اپنے برادرِ معظم کے ساتھ ہندوستان سے ہجرت کر گئے اور مدینۂ طیبہ میں مستقل اقامت اختیار کی اور علامہ شیخ علی متقی صاحبِ "کنز العمال" کی سنت کو زندہ کر کے حرمین شریفین میں مدت العمر خدمت حدیث میں مشغول رہے، اور عرب و عجم کو فیض پہونچا کر بقیع میں آسودۂ خاک ہوئے۔[۱]

شاہ عبد الغنی صاحب کے تین نامور خلفاء مولانا عبد الحق الہ آبادی مہاجر مکی جو صاحبُ الدلائل کے نام سے مشہور ہیں (م ۱۳۳۳ھ) شاہ ابو احمد مجددی بھوپالی (م ۱۳۴۲ھ) اور حضرت شاہ رفیع الدین دیوبندی مہتمم اول دار العلوم دیوبند (م ۱۳۰۸ھ) (جن سے حضرت مفتی عزیز الرحمٰن صاحب دیوبندی (م ۱۳۴۷ھ) کو خلافت حاصل تھی) انھیں کے خلیفہ و مجاز تھے، حضرت شاہ احمد سعید اور حضرت شاہ عبد الغنی صاحب کے ہندوستان سے ہجرت کر جانے کے بعد یہ خانقاہِ والا شان جو نصف صدی سے زیادہ مدت تک آباد و معمور تھی خالی ہو گئی،[۲] بالآخر

---

[۱] ان کے شاگرد رشید شیخ محمد یحییٰ ترہتی نے ان کے اور ان کے مشائخ کے حالات میں عربی میں مستقل کتاب لکھی ہے، اس کا نام "الیانع الجنی فی اسانید الشیخ عبد الغنی" ہے، اور وہ ایک ہندوستانی اہل قلم کی عربیت و انشا کا بہترین نمونہ ہے۔

[۲] مصنف کی نظر سے مولانا سید عبد السلام ہسوی کا ایک خط گذرا ہے جو موصوف نے ایک ایسے صاحب کو جواب میں لکھا تھا جنھوں نے ان حضرات کے تشریف لے جانے کے بعد خانقاہ کے خالی ہو جانے کا شکوہ کیا ہے حضرت شاہ عبد الغنی صاحب نے مدینۂ طیبہ سے جواب دیا کہ مولانا عبد السلام صاحب ہسوی کو لے جاؤ اور ہماری جگہ پر بٹھاؤ اس وقت وہ اس جگہ پر بیٹھنے کے سب سے زیادہ اہل ہیں

اسی خاندان والاشان کے چشم و چراغ اور اس سلسلہ کے ایک جلیل القدر شیخ حضرت شاہ ابوالخیر مجددی (۱۲۷۲ھ۔۱۳۴۱ھ) نے جو شاہ احمد سعید صاحب کے صاحبِ نسبت و باکمال پوتے تھے، اس کو آباد کیا، اور جلد وہ خانقاہ پھر مرجع خلائق بن گئی[1]

حضرت مجدد کا خاندان والاشان چوتھی پانچویں پشت کے بعد سرہند سے نکل کر اطرافِ عالم میں منقسم ہو گیا، اس میں اسلاف کرام کی قبور کی مجاوری سے حفاظت کے علاوہ (جس کے بہت سے مفاسد تجربہ اور مشاہدہ میں آچکے ہیں) حضرت مجدد کے طریق کی اشاعت اور دعوت و تبلیغ کے بہت سے مصالح مضمر تھے، چنانچہ ایک شاخ کابل میں (جس کا آخری مرکز قلعۂ جواد تھا[2]) عزت و وقار اور افادہ و ارشاد کے ساتھ مقیم رہی، حضرت نور المشائخ شیخ فضل عمر مجددی معروف بہ شیر آغا اسی شاخ سے تعلق رکھتے تھے، جن کے مریدوں کی تعداد سیکڑوں سے متجاوز تھی، اور ہند و پاکستان میں پھیلے ہوئے تھے[3]، ان کے برادر اصغر شیخ محمد صادق مجددی مشرق وسطی میں افغانستان کے سابق سفیر اور رابطہ عالم اسلامی کی مجلس تاسیسی کے رکن اپنے علم و صلاح و تقویٰ اور اسلامی مسائل سے دلچسپی کی وجہ سے عرب ممالک میں عزت کی نگاہ سے دیکھے جاتے تھے، اس عوامی تحریک میں ان دونوں بھائیوں نے مرکزی و قائدانہ کردار ادا کیا تھا، جس کے نتیجہ میں امیر امان اللہ خاں کو تخت و تاج سے دست بردار ہونا پڑا اور نادر شاہ تخت نشین ہوئے[4]۔

---

[1] تفصیلی حالات کے لئے ملاحظہ ہو "مقامات خیر" از مولانا شاہ ابوالحسن زید فاروقی سجادہ نشین خانقاہ حضرت شاہ ابوالخیرؒ۔

[2] افسوس ہے کہ روسی افواج کی یلغار اور اشتراکیت نواز افغانی حکومتوں کی دستبرد سے یہ مرکز تاراج اور اس کے آباد رکھنے والے علماء و مشائخ اسیر و جلاوطن ہوئے، خاکسار مصنف نے ۱۹۷۳ء کے دورۂ افغانستان و ایران میں اس مرکز کو آباد و گلزار دیکھا تھا، اور مولانا محمد ابراہیم نور المشائخ کی بزرگانہ عنایتوں سے مشرف ہوا تھا۔ [3] ۲۵ محرم الحرام ۱۳۷۶ھ میں ان کا انتقال ہوا، راقم الحروف نے مکۂ معظمہ اور لاہور میں ان کی زیارت کی ہے [4] دریائے کابل سے دریائے یرموک تک، از مصنف ص ۴۲-۴۳

سندھ میں بھی اس خاندان کی ایک موقر شاخ قصبہ ٹنڈہ سائیں داد حیدرآباد سندھ میں مقیم تھی، اسی شاخ میں خواجہ محمد حسن مجددی اور ان کے صاحبزادہ حافظ محمد ہاشم جان مجددی معروف وممتاز تھے،[1] مدینہ طیبہ اور مکہ مکرمہ میں بھی مجددی خاندان کی شاخیں موجود ہیں، اور وہ وضع داری اور اپنی خاندانی روایات کے ساتھ معاش ومعاد کے شریفانہ مشاغل میں مشغول اور نیک نام ہیں۔

سلسلۂ احسنیہ اور اس کے شیوخ کبار

حضرت سید آدم بنوری اگرچہ حضرت مجددؒ کے طریقۂ عالیہ کے خوشہ چیں اور ان کے آغوش تربیت کے پروردہ ہیں، لیکن اپنی استعداد عالی اور فطرت ارجمند کی بنا پر سلسلہ مجددیہ نقشبندیہ میں بھی ایک خاص رنگ کے حامل اور ایک (ذیلی) طریقہ کے بانی ہیں، جس کو بہت سی مجتہدانہ خصوصیات کی بناء پر "طریقۂ احسنیہ" کے نام سے موسوم کیا گیا ہے، حکمتِ الٰہی کی یہ جلوہ گری تھی کہ جس خانوادہ عالی کی بنیاد ایک امی کے ہاتھ سے پڑی اس کے حصہ میں ہندوستان کے ممتاز ترین علماء، محدثین، اساتذۂ وقت، ناشرین کتاب وسنت، داعی ومصلح، عظیم مدارسِ دینیہ کے بانی اور مصنف ومحقق آئے اور وہ اس بارے میں بھی اپنے جدامجد کی سنت کے پیرو اور ان کی میراث کے وارث ہیں، حکیم الاسلام حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ، سراج الہند حضرت شاہ عبدالعزیز، داعی الی اللہ ومجاہد فی سبیل اللہ حضرت سید احمد شہیدؒ اور مولانا محمد اسمٰعیل شہید، مسند الہند حضرت شاہ اسحٰق دہلوی، بانئ دارالعلوم دیوبند مولانا محمد قاسم نانوتوی، عالم ربانی مولانا رشید احمد گنگوہی،

---

[1] راقم نے ۱۹۴۴ء میں حضرت شاہ محمد حسن مجددی کی ان کے قصبہ اور خانقاہ میں زیارت کی وہ صاحب علم وتصنیف بزرگ تھے، مولانا حافظ ہاشم جان کی نظام الدین دہلی میں آمد ورفت تھی، اور راقم کے وطن دائرۂ شاہ علم اللہؒ رائے بریلی میں بھی ایک بار تشریف لائے ہیں، رحمہ اللہ کابل و ٹنڈہ سائیں داد کی دونوں مجددی شاخیں حضرت شیخ غلام محمد معصوم مشہور بہ معصوم ثانی پر جا کر مل جاتی ہیں، جو حضرت خواجہ محمد معصوم کے پوتے تھے۔

اسی سلسلہ احسنیہ کے شیوخ کبار کے ذریعہ طریقۂ مجددیہ نقشبندیہ میں داخل اور اس میں صاحب اجازت و خلافت ہیں۔

حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی جیسے طُرق تصوف کے مبصر اور نسبتوں کے رمز شناس حضرت سید آدم بنوری کے متعلق بڑے بلند الفاظ لکھتے ہیں، اور ان کو سلوک و احسان کے فن کے مجتہدین اور مستقل سلسلوں کے بانیوں میں شمار کرتے ہیں۔

حضرت سید آدم بنوری کے خلفاء کی تعداد بہت زیادہ تھی، اور ان کا استقصاء اس مختصر باب میں مشکل ہے "نزہۃ الخواطر" میں حسب ذیل حضرات کے نام آئے ہیں، جن کو حضرت سید آدم بنوریؒ سے نسبت وارادت اور بعض کو خلافت و اجازت حاصل تھی، دیوان خواجہ احمد نصیر آبادی (م ۱۰۸۰ھ) شیخ بایزید قصوری (م ۱۰۹۰ھ) شاہ فتح اللہ سہارنپوری (م ۱۱۰۰ھ) شیخ سعد اللہ بلخاری لاہوری (م ۱۱۰۸ھ) لیکن ان کے سلسلہ کی اشاعت حسب ذیل چار خلفاء سے ہوئی جو ان کی مجتہدانہ تربیت و تعلیم کا نمونہ اور ان کی یادگار تھے حضرت سید شاہ علم اللہ حسنی (۱۰۳۳ھ-۱۰۹۶ھ) حضرت شیخ سلطان بلیاوی حضرت حافظ سید عبد اللہ اکبر آبادی شیخ محمد شریف شاہ آبادی۔[1]

حضرت سیّد شاہ علم اللہ اور ان کا خاندان

حضرت سید شاہ علم اللہ[2] کے متعلق حضرت سید نے ہجرت کے وقت فرمایا تھا کہ "سیّد

---

[1] ان کے ایک بڑے خلیفہ عبد النبی (شام چوراسی ضلع جالندھر) تھے جو اپنے زمانہ کے بڑے عارف قوی النسبت شیخ تھے، اور جن کی ولایت و جلالت شان پر اُس زمانہ کے لوگوں کا اتفاق ہے شاہ ولی اللہ صاحبؒ نے "انتباہ فی سلاسل اولیاء اللہ" میں ان کا ایک لطیف مکتوب نقل کیا ہے، تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو "نزہۃ الخواطر" ج ۶

[2] مفصل حالات کے لئے ملاحظہ ہو "سید احمد شہیدؒ" از مولانا غلام رسول مہر حصۂ اول "سیرت سید احمد شہیدؒ" حصۂ اول از مصنف "تذکرہ شاہ علم اللہ" از مولوی محمد الحسنی مرحوم حضرت شاہ ولی اللہ صاحبؒ نے "انفاس العارفین" میں بھی ان کا تذکرہ کیا ہے ملاحظہ ہو ص ۱۲

خاطر جمع ہو کر جاؤ اور اپنی جگہ پر بیٹھ جاؤ تمہاری نسبت مشائخ اودھ میں ایسی ہوگی جیسی ستاروں میں آفتاب کی" خواجہ محمد امین بدخشی کی جو حضرت سید آدم بنوری کے مجاز و مقرب ہیں، ان کے متعلق شہادت ہے کہ "دنیا کی بو بھی اپنے پاس نہیں آنے دیتے ہندوستان وعرب میں بھی ان کے تقویٰ واستقامت کا غلغلہ ہے......... اکثر لوگ ان کو دیکھ کر کہتے ہیں کہ شاید صحابہ کرامؓ ایسے ہی ہوں گے[1]"، صاحب "بحر زخار" نے آپ کے تذکرہ میں یہ لفظ لکھے ہیں "مجاہداتیکہ ازاں یگانۂ زمانہ درباب نفرت دنیا باتباع طریقۂ نبویہ بظہور آمدہ بعداز صحابہ کرام در دیگر اولیاء امت متاخرین کم تر یافتہ می شود" ان کا بیان ہے، (جب آپ نے سفر حج فرمایا تو) مکہ معظمہ اور مدینۂ منورہ کے لوگ آپ کی اس قوت عمل، کمالِ اتباع اور عزیمت کو دیکھ کر کہا کرتے تھے کہ "ھذا کأبی ذرؓ" یعنی شاہ علم اللہ صاحبؒ اس زمانے میں ابوذر غفاریؓ کا نمونہ ہیں، اور یہ فقرہ حرمین میں زبان زد ہو گیا تھا، اس اتباع کامل کا نتیجہ تھا کہ انتقال کی شب کو عالمگیرؒ نے خواب دیکھا کہ آج کی رات جناب رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے وفات پائی، بادشاہ کو اس خواب سے بہت تشویش ہوئی، علماء سے تعبیر دریافت کی تو انھوں نے کہا کہ اس رات سید شاہ علم اللہ کی وفات ہوئی ہوگی کہ وہ اتباع سنت میں رسول اللہؐ کے قدم بقدم تھے، سرکاری وقائع نگار کی اطلاع سے معلوم ہوا کہ اس شب کو جناب ممدوح نے انتقال کیا[2]۔

آپ کے خاندان میں سلسلہ احسنیہ مسلسل طریقہ پر جاری رہا جس میں آپ کے فرزند چہارم حضرت سید محمد (م ۱۱۵۶ھ) ان کے صاحبزادہ حضرت سید محمد عدل عرف شاہ لعل صاحب (م ۱۱۹۲ھ) حضرت سید محمد صابر بن سید آیت اللہ بن شاہ علم اللہ (م ۱۱۶۳ھ)

---

[1] نتائج الحرمین بحوالہ شیخ عبدالحکیم [2] بحر زخار (از شیخ وجیہ الدین اشرف) میں مفصلاً اور درالمعارف مجموعہ ملفوظات حضرت شاہ غلام علی مرتبہ حضرت شاہ رؤف احمد مجددی ص ۲۶ میں مجملاً اس رویائے صادقہ کا ذکر ہے۔

حضرت شاہ ابوسعید ابن سید محمد ضیاء ابن سید آیت اللہ بن علم اللہ (م ۱۱۹۳ھ) حضرت سید محمد واضح ابن[1] سید محمد صابر مولانا سید محمد ظاہر حسنی (م ۱۲۷۸ھ) مولانا سید خواجہ احمد بن یٰسین نصیر آبادی (م ۱۲۸۹ھ) اور حضرت شاہ ضیاء النبی (م ۱۳۲۶ھ) بڑے پائے کے بزرگ اور عالی مرتبت مشائخ گذرے ہیں جن سے ہزارہا انسانوں کو ایمان و احسان کی دولت علم با شریعت اور اتباعِ سنت کی توفیق حاصل ہوئی[2]۔

شیخ سلطان بلیاوی

حضرت سید آدم بنوری کے دوسرے خلیفۂ اجل حضرت شیخ سلطان بلیاوی تھے[3]، "نتائج الحرمین" سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت سید آدم کے خلفاء کبار میں تھے، اکثر ان کا نام حضرت شاہ علم اللہ صاحبؒ کے ساتھ آتا ہے[4]۔

حافظ سید عبداللہ اکبر آبادی اور سلسلہ ولی اللّٰہیہ

حضرت سید آدم بنوری کے تیسرے خلیفۂ اجل جن سے ان کے سلسلہ کی سب سے زیادہ اشاعت ہوئی حافظ سید عبداللہ اکبر آبادی تھے، حکیم الاسلام حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی کے والد بزرگوار حضرت شاہ عبدالرحیم فاروقی (م ۱۱۳۱ھ) انھیں کے خلیفہ و

---

[1] آپ کی وفات تیرہویں صدی کی ابتدا میں ہوئی۔ [2] حالات کے لئے ملاحظہ ہو "نزہۃ الخواطر" ج ۶-۷

[3] یہ بلیا صوبہ بہار میں گنگا کے کنارہ آباد تھا اب یہ جگہ کھمیا (ضلع بیگوسرائے) کے نام سے معروف ہے، مونگیر کے مقابل دریا کے دوسرے کنارہ پر ہے۔ [4] افسوس ہے کہ ان کے حالات و ملفوظات محفوظ نہیں رہے اب اس قصبہ میں ان کا خاندان آباد ہے۔

تربیت یافتہ تھے[۱] حضرت شاہ ولی اللہ اور شاہ عبدالعزیز کا سلسلہ جس میں حضرت سید احمد شہیدؒ اور پھر ان کے توسط سے حضرت حاجی عبدالرحیم شہید ولایتی، میاں جی نور محمد جھنجھانوی اور ان کے توسط سے شیخ العرب والعجم حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکی اور ان کے خلفاء مولانا محمد قاسم نانوتوی حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی، حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانوی، پھر مولانا رشید احمد گنگوہی کے وساطت سے حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسن دیوبندی، حضرت شاہ عبدالرحیم رائے پوری، حضرت مولانا خلیل احمد سہارنپوری اور حضرت مولانا سید حسین احمد مدنی، حضرت شاہ عبدالرحیم کے خلفاء میں حضرت مولانا عبدالقادر رائے پوری، اور مولانا خلیل احمد صاحب کے خلفاء میں حضرت مولانا محمد الیاس کاندھلوی بانی سلسلہ تبلیغ نظام الدین اور حضرت شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا صاحبؒ کو سلسلہ احسنیہ مجددیہ سے انتساب ہے اور وہ اس طریقہ میں مجاز و صاحب ارشاد ہیں۔

حضرت شاہ ولی اللہ اور شاہ عبدالعزیز صاحب کے متعلق اس باب میں کچھ لکھنا تو ممکن نہیں کہ

سفینہ چاہئے اس بحر بے کراں کے لئے

ان کا تذکرہ تاریخ دعوت و عزیمت کی ایک مکمل جلد کا طالب ہے جو شاید اس سلسلہ کی پانچویں جلد ہو، حضرت مرزا مظہر جانِ جاناں کے متعلق شاہ ولی اللہ صاحب کی شہادت گذر چکی ہے، شاہ ولی اللہ صاحب کے متعلق حضرت شاہ غلام علی صاحب نے "مقامات مظہری" میں مرزا صاحب کا یہ قول نقل کیا ہے کہ:۔

"شاہ ولی اللہ صاحب نے ایک نئے طریقہ کی وضاحت فرمائی ہے، حقائق و معارف کے اسرار اور

۱ۃ حافظ سید عبداللہ اکبر آبادی کے فضائل و مناقب کے لئے ملاحظہ ہو "انفاس العارفین" ص۶ تا ۱۵ حضرت شاہ عبدالرحیم کے حالات و کمالات کے لئے حضرت شاہ ولی اللہ صاحب نے "انفاس العارفین" تصنیف فرمائی اور تفصیل کے ساتھ ان کا اور ان کے خاندان کا تذکرہ فرمایا، یہ کتاب ۱۳۳۵ھ مطبع مجتبائی میں طبع ہوئی ملاحظہ ہو ص ۱۵ تا ۸۷

علوم کے دقائق و غوامض کے بیان کرنے میں ان کا ایک خاص اسلوب ہے، علماء میں وہ ربانی کے لقب کے مستحق ہیں، .... ان صوفیاء محققین میں بھی .... جو علم ظاہر و باطن کے جامع تھے ایسے لوگ انگلیوں پر شمار کرنے کے قابل ہیں جنھوں نے ان کی طرح نئے علوم و مضامین کے بارہ میں زبان کھولی۔"[1]

امام معقولات علامہ فضل حق خیر آبادی نے جب شاہ صاحب کی تصنیف "ازالۃ الخفا" دیکھی تو اپنے تلامذہ کے سامنے برملا کہا کہ "اس کتاب کا مصنف ایک بحر زخار ہے جس کا ساحل نظر نہیں آتا" عالم جلیل مفتی عنایت احمد کاکوروی کا مقولہ ہے کہ "شاہ ولی اللہ صاحب کی مثال شجرۂ طوبیٰ کی ہے جس کی جڑ ان کے گھر میں ہے اور اس کی شاخ ہر مسلمان کے گھر ہیں"[2] جہاں تک حضرت شاہ عبدالعزیزؒ کا تعلق ہے ان کی جامعیت معقولات، منقولات، فنون ادبیہ میں یکساں مہارت، قوت تدریس، اشاعت علم حدیث، افاضۂ باطنی، حسن تربیت، قدرت تصنیف، حلاوت کلام، وسعت اخلاق، ملت اسلامیہ ہندیہ کے لئے دلسوزی و دردمندی اور کثرت فیضان میں ان کی نظیر دور دور مشکل ہے۔[3]

حضرت سید احمد شہیدؒ اور ان کی جماعت

جہاں تک حضرت سید احمد شہیدؒ کا تعلق ہے جن کا خصوصی تعلق سلسلۂ احسنیہ مجددیہ سے تھا، تو ان کے حالات پر ضخیم کتابیں تیار ہو چکی ہیں، جن میں "سید احمد شہیدؒ" از مولانا غلام رسول مہر (۱، ۲، ۳، ۴) اور "سیرت سید احمد شہیدؒ" از مصنف (۱، ۲) کا مطالعہ کافی

---

[1] مقامات مظہری مطبوعہ مطبع احمدی صفحہ ۶۰، ۶۱

[2] تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو نزہۃ الخواطر ج ۶

[3] حالات و کمالات کی قدرے تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو نزہۃ الخواطر ج ۷۔

ہے[1]، ان کا اس عہد اور ہندوستان کی تاریخ پر جو گہرا اثر پڑا، اور ان سے اللہ تعالیٰ نے ہدایت خلق، اشاعت اور حفاظت اسلام کا جو عظیم الشان کام لیا اس کے متعلق چند شہادتوں پر اکتفا کیا جاتا ہے۔ اس عہد کے ایک صاحب نظر عالم مولوی عبد الاحد صاحب لکھتے ہیں:۔

"حضرت سید صاحب کے ہاتھ پر چالیس ہزار (۴۰۰۰۰) سے زیادہ ہندو وغیرہ کفار مسلمان ہوئے، اور تیس لاکھ مسلمانوں نے آپ کے ہاتھ پر بیعت کی اور جو سلسلۂ بیعت آپ کے خلفاء اور خلفاء کے خلفاء کے ذریعہ روئے زمین پر جاری ہے، اس سلسلہ میں کروڑوں آدمی آپ کی بیعت میں داخل ہیں۔"[2]

مشہور عالم ربانی مجاہد فی سبیل اللہ مولانا ولایت علی عظیم آبادی (م ۱۲۶۹ھ) تحریر فرماتے ہیں:۔

"ہزارہا انسان اپنا دین چھوڑ کر اسلام سے مشرف ہوئے اور ہزار ہا لوگوں نے مذاہب باطلہ سے توبہ کی، پانچ چھ برس کے عرصہ میں ہندوستان کے تیس لاکھ آدمیوں نے حضرت سے بیعت کی اور سفر حج میں تقریباً لاکھ آدمی بیعت سے مشرف ہوئے۔"[3]

ہندوستان کے شہرۂ آفاق مصنف و مؤلف نواب سید صدیق حسن خاں والئ بھوپال (م ۱۳۰۷ھ) جنھوں نے آپ کی تعلیم و تربیت کے اثرات کو خود دیکھا تھا، اور ان کے دیکھنے والوں کی ایک بڑی جماعت کا زمانہ پایا تھا "تقصار جیود الاحرار" میں لکھتے ہیں:۔

"خلق خدا کی رہنمائی اور خدا کی طرف رجوع کرنے میں وہ خدا کی ایک نشانی تھے، ایک بڑی خلقت اور ایک بڑی دنیا آپ کی قلبی و جسمانی توجہ سے درجۂ ولایت کو پہونچی، آپ کے خلفاء کے مواعظ نے سرزمین ہند کو شرک و بدعت کے خس و خاشاک سے پاک کر دیا، اور کتاب و سنت کی شاہراہ پر ڈال دیا، ابھی تک ان کے وعظ و پند کے برکات جاری و ساری ہیں۔"

---

[1] مصنف کے مختصر رسالہ "تحقیق و انصاف کی عدالت میں ایک مظلوم مصلح کا مقدمہ" کا مطالعہ بھی اس سلسلہ میں مفید ہوگا۔

[2] سوانح احمدی [3] رسالہ دعوت مشمولہ مجموعۂ رسائل تسعہ از مولانا ولایت علی عظیم آبادی ص ۶۵

آگے چل کر لکھتے ہیں:۔

"خلاصہ یہ ہے کہ اس زمانہ میں دنیا کے کسی ملک میں بھی ایسا صاحبِ کمال سُنا نہیں گیا، اور جو فیوض اس گروہِ حق سے خلقِ خدا کو پہونچے ان کا عشرِ عشیر بھی اس زمانہ کے علماء و مشائخ سے نہیں پہونچا۔"

جیسا کہ پہلے لکھا جا چکا ہے، سید صاحب ہی کے واسطہ سے اکابر دیوبند و بزرگانِ صادقپور[1] سلسلہ مجددیہ نقشبندیہ میں داخل اور صاحبِ اجازت و خلافت ہیں، ان حضرات سے اِس تختی برِاعظم میں علوم دینیہ کی جو اشاعت، مدارس کا جو قیام اور دعوت و اصلاح کا جو عظیم الشان کام عمل میں آیا اور جس سے کوئی صاحبِ انصاف انکار نہیں کر سکتا، وہ سب بھی حضرت مجدد الف ثانیؒ کی تجدید و اصلاح کے نتائج اور اس کے ثمرات و برکات کی فہرست میں شامل ہیں، کہ انھوں نے ہی گیارہویں صدی کے پُر آشوب دور کے آغاز میں اس کا راستہ ہموار کیا، اس کے لئے سازگار حالات اور فضا پیدا کی دلوں میں اس کا جذبہ اور ولولہ بیدار کیا، اور ایک ایسی جماعت یادگار چھوڑی جس نے اپنے سوزِ دروں اور نورِ باطن سے دین کی اس شمع کو روشن و فروزاں رکھا اور پھر دیئے سے دیا جلتا رہا، اور اس ملک میں پھر کفر و جہالت اور شرک و بدعت کی تاریکی اس طرح پھیلنے نہیں پائی، جیسی کہ دسویں صدی کے آخر میں دیکھنے والوں کو نظر آرہی تھی، ان سے بلاواسطہ اور بالواسطہ نسبت رکھنے والی جماعت کو یہ کہنے کا حق ہوا کہ ؎

آغشتہ ایم ہر سرِ خارے بخونِ دل ۔۔۔ قانونِ باغبانیٔ صحرا نوشتہ ایم

---

[1] صادقپور پٹنہ کا ایک مشہور محلہ ہے جو سید صاحب علیہ الرحمہ کی تحریک جہاد و اصلاح کا سب سے بڑا مرکز تھا اور جس نے اس کام کو آخر وقت تک جاری رکھا اور اس سلسلہ میں سب سے زیادہ قربانیاں دیں، حضرت مولانا ولایت علی عظیم آبادی مولانا یحییٰ علی مولانا احمد اللہ، مولانا عنایت علی غازی، مولانا عبداللہ امیر جماعت مجاہدین (رحمہم اللہ) اور مولانا عبدالرحیم صادقپوری اس کے ممتاز فرد تھے "من المومنین رجال صدقوا ما عاهدوا الله عليه فمنهم من قضى نحبه ومنهم من ينتظر وما بدلوا تبديلا"۔

حضرت مجدد کی تصنیفات و رسائل

ہم آخر میں حضرت مجدد کی تصنیفات کی فہرست پیش کرنے پر اکتفا کرتے ہیں، ان کے مفصل تعارف کے لئے ناظرین کو مولانا سید زوار حسین شاہ کی فاضلانہ تصنیف "حضرت مجدد الف ثانیؒ" کے مضمون[1] "حضرت مجدد الف ثانی قدس سرہ کی تصانیف عالیہ" کے مطالعہ کا مشورہ دیں گے جس میں فاضل مصنف نے ان تصانیف عالیہ میں سے ہر ایک کا مفصل تعارف کرایا ہے، اور ان کے متعلق بیش قیمت مواد جمع کر دیا ہے[2]۔

۱۔ **"اثبات النبوۃ"** (عربی) اس کے قلمی نسخے مجددی خاندان کے کتب خانوں اور خانقاہوں میں محفوظ چلے آرہے تھے، کتب خانہ ادارہ مجددیہ ناظم آباد کراچی نے ۱۳۸۳ھ میں اصل عربی متن اور اردو ترجمہ کے ساتھ شائع کیا، پھر ادارہ سعدیہ مجددیہ لاہور نے ۱۳۸۵ھ میں دیگر رسائل کے ساتھ اصل متن بغیر اردو ترجمہ کے شائع کیا۔

۲۔ **"ردّ روافض"** یہ رسالہ بعض ایرانی شیعہ علماء کے رسالہ کے جواب میں ہے، یہ رسالہ غالباً ۱۰۰۱ھ کے قریب لکھا گیا ہے، اس رسالہ کے بعض مضامین دفتر اول مکتوب ۸۰ اور ۲۰۲ میں بھی ملتے ہیں، اس رسالہ کا فارسی متن مکتوبات شریف فارسی کے آخر میں بہت سے مطابع نے شائع کیا، حشمت علی خاں صاحب نے ۱۳۸۴ھ میں رامپور سے اس کا فارسی متن پروفیسر ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خاں کے اردو ترجمہ کے ساتھ شائع کیا، پھر ادارہ سعدیہ مجددیہ لاہور نے فارسی متن علیحدہ اور اردو ترجمہ علیحدہ شائع کیا، حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی نے اس رسالہ کی شرح لکھی ہے، جو طبع نہیں ہوئی۔

---

[1] شائع کردہ ادارۂ مجددیہ ۵/۲ ایچ ناظم آباد ۳ کراچی [2] ص ۶۷۶-۶۸۶

۳۔"رسالہ تہلیلیہ" (عربی) یہ رسالہ ۱۰۱۰ھ میں مرتب ہوا، اس کے صرف قلمی نسخے پائے جاتے تھے، ادارہ مجددیہ ناظم آباد کراچی نے ۱۳۸۴ھ میں عربی متن مع اردو ترجمہ اور ادارہ سعدیہ مجددیہ لاہور نے ۱۳۸۵ھ میں صرف عربی متن دیگر رسائل کے ساتھ شائع کیا۔

۴۔"شرح رباعیات" اس میں حضرت خواجہ باقی باللہ کی دو رباعیوں کی حضرت خواجہ کے قلم سے شرح اور حضرت مجدد صاحب کے قلم سے شرح الشرح ہے، ادارہ سعدیہ مجددیہ لاہور اور ادارۂ مجددیہ ناظم آباد کراچی کی طرف سے علی الترتیب ۱۳۸۵ھ اور ۱۳۸۶ھ میں شائع ہوا، اس شرح رباعیات کی حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی نے بھی شرح فرمائی ہے، "جو کشف الغین فی شرح رباعتین" کے نام سے مطبع مجتبائی دہلی سے ۱۳۱۰ھ میں شائع ہوئی ہے۔

۵۔"معارف لدنیہ" (فارسی) یہ حضرت مجدد کے معارف خاصہ اور سلوک وطریقت کے اہم مباحث پر مشتمل ہے جس کو خود حضرت ہی نے ۱۰۱۵ھ یا ۱۰۱۶ھ میں مرتب فرمایا تھا، ہر مضمون کو "معرفت" کا عنوان دیا گیا ہے، ان معارف کی مجموعی تعداد اکتالیس ۴۱ ہے، اس رسالہ کا فارسی متن سب سے پہلے حافظ محمد علی خاں شوق نے مطبع احمدی رامپور سے دسمبر ۱۸۹۸ء میں شائع کیا، پھر مجلس علمی ڈابھیل، حکیم عبدالمجید سیفی، ادارۂ سعدیہ مجددیہ اور ادارۂ مجددیہ ناظم آباد کراچی لاہور نے مختلف سنین میں شائع کیا۔

۶۔"مبدا و معاد" (فارسی) یہ رسالہ حضرت مجدد کے علوم ومعارف پر مشتمل ہے، اس کے مضامین متفرق مسودات کی شکل میں تھے، جن کو حضرت مجدد کے خلیفہ مولانا محمد صدیق کشمی نے ۱۰۱۹ھ میں مدون ومرتب فرمایا، اور اس کے مضامین کو "منہا" کا عنوان دے کر الگ الگ کر دیا، ان مضامین کی مجموعی تعداد اکسٹھ ۶۱ ہے، مطبوعہ نسخوں میں سب سے قدیم فارسی نسخہ مطبع انصاری دہلی ۱۳۰۷ھ کا مطبوعہ ہے، پھر متعدد بار مختلف سنین میں شائع ہوتا رہا، آخری بار ۱۳۸۸ھ میں

ادارۂ مجددیہ ناظم آباد کراچی نے فارسی متن مولانا سید زوار حسین شاہ کے اردو ترجمہ کے ساتھ شائع کیا، اس رسالہ "مبدا و معاد" کا عربی ترجمہ شیخ مراد مکی کے قلم سے مکتوبات معرب مطبوعہ کے حاشیہ پر موجود ہے۔

۷۔ "**مکاشفات عینیہ**" یہ مجموعہ حضرت مجدد کے ایسے مسودات پر مشتمل ہے، جو بعض خلفاء نے محفوظ کر لئے تھے، حضرت مجدد کی وفات کے بعد مولانا محمد ہاشم کشمی نے ۱۰۵۱ھ میں ان کو مرتب فرمایا، یہ رسالہ پہلی مرتبہ ادارۂ مجددیہ ناظم آباد کراچی نے فارسی متن اور اردو ترجمہ کے ساتھ ۱۳۸۴ھ میں شائع کیا۔

۸۔ "**مکتوبات امام ربانی**" یہ حضرت مجدد کی سب سے بڑی علمی، اصلاحی و تجدیدی یادگار اور ان وہبی کمالات مجتہدانہ و مجددانہ، مقام تحقیق و معرفت، اور ان کے دلی جذبات و احساسات کا آئینہ ہے، جن کی بنا پر ان کو مجدد الف ثانی کا لقب دیا گیا، اس کے علمی مقام کو واضح کرنے اور ہندوستان کے فارسی ادب میں (جس کی اہمیت کو "سبک ہندی" کا طنزیہ نام دے کر کم نہیں کیا جا سکتا) اس کا مقام متعین کرنے اور اس کے علوم و معارف کی نقاب کشائی کے لئے ایک مستقل تصنیف درکار ہے، یہ کتاب ہندوستان کی ان منفرد تصنیفات میں شامل ہے، جن سے بیرونِ ہند کے بلند پایہ فضلاء اور راسخین فی العلم نے پورا اعتنا کیا، اس کے عربی و ترکی زبان میں ترجمے ہوئے، علمی و روحانی مرکزوں کے نصاب درس میں شامل ہوی، اہل علم اور اہل سلوک نے اس کو حرزِ جان بنایا اور اس کی تازگی میں ابھی تک کوئی فرق نہیں آیا۔

مکتوبات کی مجموعی تعداد ۵۳۶ ہے، وہ تین دفتروں پر مشتمل ہے، دفتر اول ۳۱۳ مکتوبات پر مشتمل ہے، اس دفتر کو حضرت مجدد الف ثانی کے ایماء سے آپ کے خلیفہ حضرت مولانا

یار محمد جدید بدخشی طالقانی نے ۱۰۲۵ھ میں مرتب فرمایا، دفتر دوم ننانوے ۹۹ مکتوبات پر مشتمل ہے اور اس کو مولانا عبدالحی حصاری شادمانی نے حضرت خواجہ محمد معصوم کے ارشاد پر ۱۰۲۸ھ میں مرتب کیا، دفتر سوم ایک سو چودہ ۱۱۴ مکتوبات پر مشتمل ہے، اس کو آپ کے مشہور خلیفہ مولانا محمد ہاشم کشمی نے ۱۰۳۱ھ میں مرتب کیا، بعد میں ...... دس ۱۰ مکاتیب جو بعد کے زمانہ میں لکھے گئے ہیں، اس میں شامل کر دیئے گئے، اور اس دفتر کے جملہ مکتوبات کی تعداد ۱۲۴ ہو گئی۔

مکتوبات کے متعدد ایڈیشن مختلف وقتوں میں شائع ہوئے، پہلا ایڈیشن غالباً مطبع نولکشور لکھنؤ کا ہے، اس کے بعد متعدد ایڈیشن اسی پریس سے شائع ہوئے اس کے بعد مطبع احمدی دہلی، مطبع مرتضوی دہلی سے بار بار شائع ہوا، ۱۳۲۹ھ میں مولانا نور احمد امرتسری نے بڑے اہتمام سے اس کا ایک عمدہ ایڈیشن شائع کیا جو بہت سی خصوصیات کا حامل ہے۔[1]

---

[1] ملخص و مقتبس از کتاب "حضرت مجدد الف ثانی رح" از مولانا سید زوار حسین شاہ۔

INDEX

اشاریہ

(انڈکس: "تاریخ دعوت وعزیمت" حصۂ چہارم)

مرتبہ

محمد غیاث الدین ندوی

شخصیات

(الف)

چ

ح

(ر)

(ز)

(س)

ط

ظ

ع

غ

اقوام وقبائل، طبقات اور ملتیں

کتابیات

ب پ

ت

(ث)

مقامات

متفرقات

قلعے، پہاڑ اور دریا:

سلطنتیں، عہد و حکومت اور دربار:

سوسائٹیاں، تعلیمی ادارے اور درسگاہیں:

علوم و نظریات:

علمی و نشریاتی ادارے اکیڈمیاں اور مطابع:

کتب خانے اور لائبریریاں:

مذاہب و ادیان، عقائد و فلسفے اور تحریکات:

طرق و سلاسلِ سلوک و تصوف:

مذہبی، اسلامی اور اصطلاحی الفاظ و رسوم:

زبان:

سکّے:

مقبرے و مزارات:

خانقاہیں و رباط:

اہم واقعات و حادثات:

دیگر متفرقات :

تاریخ

دعوت و عزیمت

حصّہ پنجم

تذکرہ حضرت شاہ ولی اللہ محدّث دہلویؒ

احیاء دین، اشاعت کتاب و سنت، اسرار و مقاصد شریعت کی توضیح و تنقیح، تربیت و ارشاد اور ہندوستان میں ملت اسلامی کے تحفظ اور تشخص کے بقا کی ان عہد آفریں کوششوں کی روداد جن کا آغاز حکیم الاسلام حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ اور ان کے اخلاف و خلفاء کے ذریعہ ہوا،

مولانا سیّد ابوالحسن علی ندویؒ

مجلس نشریات اسلام
۱۔کے۔۳ ناظم آباد مینشن۔ ناظم آباد ۱ کراچی ۱۸

مفکر اسلام مولانا سیّد ابوالحسن علی ندویؒ
اپنی حیات میں مندرجہ ذیل اداروں کے ذمہ دار رہے

- ناظم دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ
- رکن مجلس شوریٰ دارالعلوم دیوبند
- صدر مجلس تحقیقات ونشریات اسلام لکھنؤ
- صدر مجلس انتظامی ومجلس علمیہ دارالمصنفین اعظم گڑھ
- رکن عربی اکادمی دمشق
- رکن مجلس شوریٰ جامعہ اسلامیہ مدینہ منورہ
- رکن مجلس تاسیس رابطۂ عالم اسلامی مکہ معظمہ
- رکن مجلس عاملہ موتمر عالم اسلامی بیروت
- صدر آل انڈیا مسلم پرسنل لابورڈ
- صدر رابطۃ الادب الاسلامی العالمیۃ
- رکن مجلس انتظامی اسلامک سینٹر جنیوا
- سابق وزیٹنگ پروفیسر دمشق یونیورسٹی ومدینہ یونیورسٹی
- صدر آکسفورڈ سینٹر فار اسلامک اسٹڈیز آکسفورڈ یونیورسٹی آکسفورڈ۔

نام کتاب ——————— تاریخ دعوت وعزیمت (حصۂ پنجم)
تصنیف ——————— مفکر اسلام مولانا سیّد ابوالحسن علی ندویؒ
طباعت ——————— احمد برادرز پرنٹنگ پریس۔ کراچی
ضخامت ——————— ۴۸۴ صفحات
ٹیلیفون : ٦٦٠١٨١٧

اسٹاکسٹ: مکتبہ ندوہ قاسم سینٹر اردو بازار کراچی

ناشر

فضل ربی ندوی

مجلس نشریاتِ اسلام ۱۔کے۔۳ ناظم آباد مینشن۔ ناظم آباد ۱ کراچی ۷۴۶۰۰

تاریخ دعوت
و
عزیمت

حصۂ پنجم ۵

اردو ______ لکھنؤ و کراچی

عربی بنام " رجال الفکر والدعوۃ فی الاسلام " الجزء الرابع

انگریزی بنام "SAVIOURS OF ISLAMIC SPIRIT VOL. IV"

فہرست عناوین

"تاریخ دعوت و عزیمت حصۂ پنجم"

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

پیش لفظ

الحمد للہ رب العالمین والصلاۃ والسلام علی سید المرسلین

وخاتم النبیین محمد وآلہ وصحبہ اجمعین ومن تبعھم باحسان

ودعا بدعوتھم الی یوم الدین

مصنف کتاب کا قلب "تاریخ دعوت و عزیمت" کے پانچویں حصہ کی تسوید سے فارغ ہو کر پیش لفظ کی ان سطور کے لکھتے وقت جذبۂ حمد و شکر سے معمور اور اس کا قلم اپنے اور کاتب کے خالق کے حضور میں سربسجود ہے کہ اس نے اس سلسلہ کو اس حصہ تک جو حکیم الاسلام حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ اور ان کے اخلاف و خلفاء کی دینی و علمی خدمات اور ان کے مجددانہ و مجاہدانہ کارناموں کی تاریخ و روئیداد سے مخصوص ہے، پہونچانے کی توفیق عطا فرمائی۔

محرم ۱۳۷۲ھ (ستمبر ۱۹۵۲ء) میں چند تقریروں کی ایک مختصر یادداشت کو سامنے رکھ کر جب "تاریخ دعوت و عزیمت" کے سلسلہ کا آغاز کیا گیا تھا، اور اس کو سیدنا امام حسن بصریؒ اور خلیفۃ المسلمین حضرت عمر بن عبد العزیزؒ سے شروع کیا گیا تھا، تو اس وقت اس کا تصور کرنا بھی مشکل تھا کہ یہ سلسلہ پہلی دوسری صدی کے مصلحین و مجدّدین سے لے کر تمام درمیانی مراحل اور عالم اسلام کی زمانی و مکانی وسعت و رقبہ کو طے کرتا ہوا گیارہویں و بارہویں صدی

کی دو عظیم تجدیدی شخصیتوں حضرت مجدّد الف ثانیؒ اور حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ تک پہونچ سکے گا، عمر کی بے ثباتی، صحت کے نشیب و فراز، حوادث کی کثرت، مشاغل کے ہجوم، عزم و ہمت کی کوتاہی، اسفار کے تسلسل، نئی نئی ضرورتوں اور محرّکات کے پیش آنے پھر نگاہ کی اس کمزوری اور معذوری کے باوجود (کہ مصنّف مسلسل چودہ ۱۴ سال تک براہ راست مطالعہ اور خود لکھنے سے معذور رہا) یہ سلسلہ اس منزل تک پہونچے گا، یہ محض قدرت و توفیق الٰہی کا کرشمہ ہے، جس پر مصنف خدا کا جتنا بھی شکر ادا کرے کم ہے، مصنف اس سے زیادہ اور کچھ نہیں کر سکتا کہ قرآن مجید کی اس آیت کے ذریعہ یہ فرض ادا کرنے کی کوشش کرے:۔

رَبِّ اَوْزِعْنِیْٓ اَنْ اَشْکُرَ نِعْمَتَکَ	اے پروردگار! مجھے توفیق عطا فرما کہ
الَّتِیْٓ اَنْعَمْتَ عَلَیَّ وَعَلٰی وَالِدَیَّ	جو احسان تونے مجھ پر اور میرے ماں باپ
وَاَنْ اَعْمَلَ صَالِحًا تَرْضٰىهُ	پر کئے ہیں ان کا شکر کروں، اور ایسے
وَاَدْخِلْنِیْ بِرَحْمَتِکَ فِیْ عِبَادِکَ	نیک کام کروں کہ تو ان سے خوش
الصّٰلِحِیْنَ ۝	ہو جائے، اور مجھے اپنی رحمت سے
(النمل - ۱۹)	اپنے نیک بندوں میں داخل فرما۔

نیز حدیث کے یہ الفاظ دہرائے:۔

الحمد للہ الذی بعزّتہ وجلالہ	اس خدا کا شکر ہے جس کی عزت و جلال
تتمّ الصّالحات۔	سے نیک کاموں کی توفیق و تکمیل ہوتی ہے۔

اس جلد پر حقیقتاً صالحین کے تذکرہ کے اس سلسلہ کا اور اس حیثیت سے اس عمل صالح کا اتمام ہوتا ہے کہ یہ حصہ بارہویں صدی ہجری کی ان اصلاحی و تجدیدی کوششوں اور کارناموں پر مشتمل ہے، جن کے مبارک اثرات ابھی تک باقی ہیں، اور کم سے کم برّ صغیر ہند کے

دینی ادارے، علوم دینیہ کے مراکز، اسلام کی سربلندی کی کوششیں اور تحریکات، اور دینی، علمی و تصنیفی سرگرمیاں ان مساعی کے نتائج سے ابھی تک متمتع ہو رہی ہیں، اور ان کے سایہ میں اپنا سفر طے کر رہی ہیں، اور اس لئے بھی یہ بات خلافِ واقعہ نہیں ہے کہ مصنفِ "سیرت سید احمد شہیدؒ" (۱-۲) کی تالیف کے ذریعہ جو ۱۹۳۹ء میں پہلی بار شائع ہوئی تھی، اس سلسلہ کو تیرھویں صدی کے آخر تک (اور جہاں تک اس تحتی برّ اعظم کا تعلق ہے) چودھویں صدی کی کئی دینی شخصیتوں اور داعیوں (جن میں حضرت مولانا محمد الیاس صاحبؒ خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں) کی سوانح مرتب کر کے اس سلسلہ کو اپنے زمانہ تک پہونچا چکا ہے، اس طرح درحقیقت "تاریخ دعوت و عزیمت" کا چھٹا حصہ بھی اور ساتویں حصہ کا بڑا حصہ بھی مرتب ہو چکا ہے، اب یہ اس کے بعد کے مصنفین اور تحقیقی کام کرنے والوں کا کام ہے کہ تیرھویں صدی ہجری کے عالم اسلام کے علمبردارانِ اصلاح و دعوت اور دینی قائدین کی خدمات اور کارناموں پر روشنی ڈالیں، جو عالم اسلام کے مختلف حصوں میں پیدا ہوئے، اور انھوں نے دعوت و اصلاح اور جہاد فی سبیل اللہ کا کام انجام دیا، پھر چودھویں صدی ہجری کی (عالم اسلام کے پیمانہ اور سطح پر) اصلاحی علمی و فکری اور دعوتی کوششوں کا جائزہ لیں، اور اس کی روئیداد مرتب کریں کہ "تاریخ دعوت و عزیمت" کا موضوع کسی خاص عہد اور ملک سے مخصوص نہیں، اس کا سلسلہ دعوتی و اصلاحی کوششوں، فکرِ اسلامی کی تجدید، علوم دینیہ کے احیاء و اشاعت، اپنے اپنے زمانہ کے مغالطوں اور تحریفات کا پردہ چاک کرنے اور دین کی حقیقت، روح اور جوہر کو بے نقاب کرنے، اپنے اپنے زمانہ کے فتنوں اور ضلالتوں کے مقابلہ اور ان کے ازالہ کی کوششوں کے ساتھ اس وقت تک چلتا رہے گا، جب تک یہ دین

باقی ہے' اور یہ دنیا قائم ہے' اس لئے کوئی شخص بھی یہ دعویٰ نہیں کر سکتا کہ اس نے اس موضوع کا حق ادا کر دیا، اور اس سلسلہ کو اختتام تک پہونچا دیا کہ حدیث کے الفاظ ہیں:۔

یحمل ھذا العلم من کل خلف	اس علم کے ہر نسل میں ایسے عادل
عدولہٗ ینفون عنہ تحریف	و متّقی حامل و وارث ہوں گے، جو
الغالین، وانتحال المبطلین،	اس دین سے غلو پسند لوگوں کی تحریف
وتأویل الجاھلین۔[1]	اہل باطل کے غلط انتساب و دعوے
	اور جاہلوں کی دوراز کار تاویلات کو
	دور کرتے رہیں گے۔

حضرت شاہ ولی اللہ صاحبؒ کی اصلاح و تجدید کا دائرہ چونکہ اپنے اندر بڑی وسعت اور تنوّع رکھتا تھا، اور اس میں علمی و فکری رنگ غالب تھا، اس کے حدود میں تدریس و تصنیف' اشاعتِ کتاب و سنت، تطبیق بین العقل والنقل اور توفیق بین المذاھب الفقھیۃ، اسرار و مقاصدِ شریعت کی توضیح، آنے والے عقلی دور کی رعایت' تربیت و ارشاد، ہندوستان میں اسلامی اقتدار کی حفاظت' سیاسی تبدیلیوں اور ابھرتی ہوئی طاقتوں کا حقیقت پسندانہ جائزہ اور ان میں ملت کے تحفّظ اور تشخّص کے بقا کی ممکنہ تدبیریں، علوم اسلامیہ میں مجتہدانہ فکر و نظر اور اس کی طبقۂ علماء کی طرف منتقلی کی کوششیں' سب شامل تھیں' اس لئے مصنف کو اس میں اس مطالعہ و فکر و نظر کی ضرورت پیش آئی جو کم حصوں میں پیش آئی تھی' اسی کے ساتھ دوسری مصروفیتیں اور

---

[1] مشکوٰۃ شریف۔

ذمہ داریاں بھی عناں گیر رہیں، پھر بھی خدا کا شکر ہے کہ اس حصہ کی تکمیل میں وہ طویل وقفہ نہیں ہوا، جو اس سے پہلے دو حصوں کے درمیان عموماً پیش آتا تھا۔

مصنف اپنے اُن عزیز رفقائے کار و معاونین کا شکر گذار ہے، جنھوں نے مآخذ کی فراہمی بعض طویل فارسی و عربی عبارتوں کے ترجمہ اور کتاب کی تسوید و تبییض اور نظر ثانی میں مدد کی، نیز مطبوعہ اور قلمی کتابوں اور ان کے ایڈیشنوں کی تحقیق میں ان کی محنت اور کوشش شامل ہے' ان میں مولوی شمس تبریز خاں رفیق" مجلس تحقیقات و نشریات اسلام" مولانا محمد برہان الدین سنبھلی استاذ تفسیر و حدیث دار العلوم ندوۃ العلماء، مولوی عتیق احمد صاحب مدرس دار العلوم ندوۃ العلماء، مولانا ابو العرفان صاحب ندوی استاد دار العلوم ندوۃ العلماء، مولوی سید محمد مرتضیٰ صاحب نقوی ناظر کتب خانہ ندوۃ العلماء، اور مولوی محمد ہارون سلمہٗ انچارج شعبۂ مخطوطات کتب خانہ ندوۃ العلماء، اور عزیزی مولوی نثار الحق ندوی خاص طور پر قابل ذکر و شکر ہیں، عزیز گرامی مولوی نور الحسن راشد صاحب کاندھلوی خاص طور پر شکریہ کے مستحق ہیں کہ انھوں نے شاہ صاحبؒ کے خاندانی حالات و اخلاف کے سلسلہ میں بعض قیمتی معلومات فراہم کیں' اور بعض مآخذ کی نشاندہی کی، عزیزان مولوی غفران ندوی و مولوی غیاث الدین ندوی نے حسب سابق کتابت و طباعت کی تکمیل اور انڈکس کی تیاری میں پوری ذمہ داری اور انہماک کے ساتھ حصہ لیا، فجزاهم الله خیراً۔

آخر میں مصنف کی یہ دعا اور تمنا ہے کہ یہ حصہ کسی درجہ میں بھی (یہ تو کہنے کی جرأت نہیں کی جا سکتی کہ اس بلند و بالا شخصیت کے شایان شان ہو جس سے اس کا تعلق ہے) موضوع و مقصد کے لحاظ سے مفید، ہمت آفریں، فکر انگیز، مزید مطالعہ اور تحقیق کے لئے محرک اور سعی و جہد کے لئے شوق انگیز ہو کہ اس دورِ انقلاب اور اس عہد پُر فتن میں

اس سے خاص طور پر رہنمائی حاصل کی جا سکتی ہے۔

وما ذٰلک علی اللہ بعزیز

ابوالحسن علی ندوی
۹۔ بے نظیر بلڈنگ، بائی کلہ، بمبئی

۱۲؍ ربیع الثانی ۱۴۰۴ھ
۱۶؍ جنوری ۱۹۸۴ء
دوشنبہ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

بابِ اوّل

عالمِ اسلام بارہویں صدی ہجری میں

بارہویں صدی کے اسلامی ممالک کے حالات اور انقلابات کے مطالعہ کی اہمیت

"تاریخ دعوت و عزیمت" کی جلد چہارم کے آغاز میں (جو مجدد الف ثانی حضرت شیخ احمد سرہندیؒ (۹۷۱ھ - ۱۰۳۴ھ) کی سوانح حیات، ان کے عہد اور ان کے عظیم تجدیدی و انقلابی کارنامہ کی شرح و تفصیل کے ساتھ مخصوص ہے) دسویں صدی ہجری کے (جس میں حضرت کی ولادت ہوئی اور آپ کا ذہنی و علمی نشو و نما ہوا) تاریخی مطالعہ کی اہمیت بیان کرتے ہوئے مصنف نے لکھا تھا:-

"ہم کو اس تاریخی حقیقت کو بھی پیش نظر رکھنا ہوگا کہ ایک عہد اور اس عہد کی دنیا، اور انسانی معاشرہ ایک بہتے ہوئے دریا کی طرح ہوتا ہے جس کی ہر موج دوسری موج سے مربوط و متصل ہوتی ہے، اس لئے کوئی ملک خواہ وہ باقی دنیا سے کتنا ہی کٹا ہوا اور الگ تھلگ زندگی گذار رہا ہو، گرد و پیش کی دنیا میں پیش آنے والے اہم واقعات، انقلابات، باہم نبرد آزما طاقتوں، اور طاقتور تحریکوں سے یکسر غیر متاثر اور غیر متعلق نہیں رہ سکتا، خاص طور پر جب یہ واقعات، و انقلابات اس کے ہم جنس، ہم مسلک اور ہم عقیدہ پڑوسی ممالک میں پیش آرہے ہوں، اس بنا پر اس تاریخی جائزہ میں ہندوستان کے دائرہ کے اندر محدود رہنا درست نہیں ہوگا، ہم کو دسویں صدی ہجری کی پوری دنیائے اسلام اور خاص طور پر

گرد و پیش کے مسلم ممالک پر بھی نظر ڈالنی ہوگی، جن سے اگرچہ ہندوستان کے سیاسی روابط نہ تھے لیکن دینی، تہذیبی اور علمی روابط تھے، اور وہاں جو سرد و گرم ہوائیں چلتی تھیں، ان کے جھونکے بُعدِ مسافت کے باوجود ہندوستان تک بھی پہونچ جاتے تھے۔[1]

حضرت شاہ ولی اللہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے تذکرہ اور ان کے تجدیدی کارنامہ پر روشنی ڈالنے کے سلسلہ میں اس تاریخی حقیقت کو پیش نظر رکھنے اور اس اصول پر عمل کرنے کی اور بھی زیادہ ضرورت ہے کہ ان کی ذہنی و علمی تربیت میں حجاز مقدّس کا بنیادی حصہ تھا، جہاں انھوں نے (۱۱۴۳ھ تا ۱۱۴۴ھ) ایک سال سے زیادہ[2] قیام فرمایا، اور اس وقت کے فن حدیث میں مرجع خلائق اور امام فن شیخ ابوطاہر محمد بن ابراہیم کُردی مدنی سے فن حدیث کی تکمیل کی، جن کے حلقۂ درس میں بلاد و امصار کے طالبین حدیث مجتمع تھے، اور علمائے حرمین سے (جو مختلف ممالک اسلامیہ اور عربیہ سے تعلق رکھتے تھے) ان کی طویل صحبتیں رہیں، اس وقت حجاز سلطنت عثمانیہ کی تولیت اور انتظام میں تھا، اور شرفائے مکہ سلاطین آل عثمان کے نائب کی حیثیت سے امارت کے منصب پر سرفراز تھے، حج کے علاوہ بھی (جو ہر سال عالم اسلام کے بہترین دل و دماغ اور شمع حرم کے پروانوں کو ایک جگہ جمع کر لیتا ہے) اس دور میں حرمین شریفین اور خاص طور پر مدینہ طیبہ علم حدیث کا سب سے بڑا مرکز بنا ہوا تھا جہاں اس علم کے شائقین دنیا کے گوشہ گوشہ سے اکٹھا ہوتے تھے، وہاں بیٹھ کر پورے عالم اسلام کی روحانی، علمی، اخلاقی، تمدنی، معاشرتی اور سیاسی حالت کا جائزہ بآسانی لیا جا سکتا تھا، ان تمام حیثیتوں سے مختلف ممالک اسلامیہ و عربیہ کی ترقی و انحطاط اور عروج و زوال کا بآسانی اندازہ کیا جا سکتا تھا، اور وہاں کی مختلف شخصیتوں، باکمال افراد، اصلاحی تحریکوں و دعوتوں اور

---

[1] "تاریخ دعوت و عزیمت" حصہ چہارم ص ۲۴

[2] شاہ صاحب ۱۱۴۳ھ کے آخر میں حجاز پہونچے تھے، اور ۱۱۴۵ھ کے آغاز میں مراجعت فرمائی، شاہ صاحب نے دو حج کئے۔

انتشار انگیز کوششوں اور سازشوں سے واقفیت حاصل کی جا سکتی تھی، بلکہ عالم اسلام کی نبض حیات کی رفتار اور قلب اسلام کی دھڑکنوں کو سنا جا سکتا تھا، اور شاہ ولی اللہ صاحب کے سے بیدار مغز اور دردمند دل رکھنے والے انسان نے جس کو تدبیر الٰہی تجدید و احیائے دین کے کار عظیم کے لئے تیار کر رہی تھی، اس سے ضرور فائدہ اٹھایا اور اثر لیا ہوگا، اور انھوں نے اس سے اپنے فکر و نظر کی توسیع اور اپنی دعوت اور فلسفہ کی آفاقیت میں پورا کام لیا ہوگا۔

مزید برآں ہند ان صدیوں سے وسط ایشیا کی تورانی و افغانی نسل کے ترک تازوں کی جولان گاہ اور سیاسی و انتظامی حیثیت سے ان کے زیر اثر رہ چکا تھا اور وقتاً فوقتاً اسکے نظم و نسق کے ڈھانچہ اور اس کی حکومتوں کے اثر پذیر جسم میں وہیں سے تازہ اور گرم خون آتا اور اس کے رو بزوال انتظامیہ اور فوجی طاقت میں نئی توانائی اور رعنائی پیدا کرتا تھا، اور جب ہندوستان میں مدت دراز سے حکومت کرنے والا خاندان "پیری و صد عیب" کی منزل پر پہونچ جاتا، تو درۂ خیبر یا درۂ بولان کے راستہ سے ایک تازہ دم عسکری طاقت ہندوستان میں قدم رکھتی، اور اس سلسلۂ حکومت میں، جس کا ایک ہی دین (اسلام)، ایک ہی مذہب (اہل سنّت والجماعۃ)، ایک ہی آئین (شرع محمدی) ایک ہی زبان (ترکی و فارسی) اور ایک ہی تہذیب (عربی، ایرانی، ترکی، ہندوستانی اثرات کا آمیزہ) تھی، طاقت کا ایک انجکشن دیتی اور اس کو زندگی کی ایک نئی قسط عطا کر دیتی۔

پھر اس حقیقت کو بھی نہیں بھولنا چاہیئے کہ بابر کے تسخیر ملک، اور سلطنت مغلیہ کے قیام کے بعد سے افغانستان اور اس کے اہم ترین صوبے کابل و قندھار عظیم ہندوستانی مسلمان سلطنت کا ایک حصہ اور اس کا بیرونی قلعہ اور "بالاحصار" رہے ہیں، شاہ صاحب ہی کے عہد میں نادر شاہِ ایران کی ہندوستان میں آمد اور دہلی پر حملہ ہوا، اور آپ ہی کے عہد میں والئ قندھار احمد شاہ ابدالی نے کئی بار ہندوستان کا رخ کیا، اور بالآخر ۱۱۷۴ھ (۱۷۶۱ء) میں پانی پت کے

میدان میں مرہٹوں کو شکست فاش دے کر واقعات کا دھارا اور تاریخ کا رُخ بدل دیا، اور سلطنت مغلیہ کو سنبھلنے، اور ہندوستان کے مسلم معاشرہ اور طبقۂ امراء کو نیا کردار ادا کرنے کا موقعہ دیا جس کو وہ اپنی نااہلی سے ادا نہیں کرسکے، یہ سب واقعات نہ صرف شاہ صاحب کے عہد کے ہیں، بلکہ آخرالذکر واقعہ میں ان کی رہنمائی شامل ہے[1]، یہ دونوں حملہ آور ایران و افغانستان سے تعلق رکھتے تھے، اس لئے شاہ صاحب کے عہد اور بارہویں صدی کے جائزہ میں ان دونوں کے حالات اور انقلابات سلطنت کو نظرانداز نہیں کیا جاسکتا۔

ہندوستان پر ایران کے ثقافتی وتہذیبی اثرات

پھر جس طرح ہندوستان پانچویں صدی ہجری سے سیاسی اور فوجی حیثیت سے ترکستان وافغانستان کے زیرِ اثر رہا ہے، اسی طرح وہ علمی، ادبی، ثقافتی، تہذیبی اور فکری حیثیت سے کم وبیش ایران کے زیرِ اثر رہا ہے، وہاں کا ادب وشاعری، تصوف کے سلاسل وطرق، اور آخر میں وہاں کا نصاب درس اور طریقۂ تعلیم، اور وہاں کے علماء اور اساتذۂ فن کی تصنیفات ہندوستان کے ذہن ودماغ پر سایہ فگن رہی ہیں، بالخصوص ہمایوں کے ایران جانے اور وہاں کی مدد سے سلطنتِ ہندوستان کے دوبارہ حصول کے بعد سے، پھر دورِ اکبری میں امیر فتح اللہ شیرازی اور حکیم علی گیلانی کی آمد کے بعد سے ہندوستان اپنے نصاب، طریقۂ تعلیم، معیارِ فضیلت کے تعیّن اور "معقولات" و "علوم حکمت" کے میدان میں ایران کا کُلّیۃً خوشہ چیں بلکہ باج گذار اور غاشیہ بردار بن گیا، اور اس سلسلہ میں حقیقتاً ایران کا ہندوستان پر "اقتدارِ اعلیٰ" قائم ہوگیا۔ اس حقیقت کے پیش نظر ہم اس تاریخی جائزہ میں ایران اور اس میں پیش آنے والے واقعات سے کسی طرح صرفِ نظر نہیں کرسکتے۔

---

[1] اس کی تفصیل بعد کے ابواب میں آئیگی۔

سلطنت عثمانیہ کی عظمت واہمیت

افغانستان وایران کے پڑوسی ملکوں کے ماسوا اہم اس سلطنت عثمانیہ سے بھی (جس نے دسویں صدی کے اوائل سے خلافت کا منصب سنبھال رکھا تھا) آنکھیں نہیں بند کرسکتے، جس کا مستقر اگرچہ جغرافیائی اعتبار سے ہندوستان سے بہت دور یورپ اور ایشیائے کوچک میں واقع تھا، لیکن تقریباً تمام عرب ممالک (مصر، شام، عراق، یمن، نجد و حجاز اور شمالی افریقہ کا ایک بڑا حصہ) اس کے ماتحت تھے، حرم ومقامات مقدسہ کے پاسبان ومتولی ہونے، خلافت اسلامی کے حامل وامین، ایک بڑی طاقت اور شہنشاہی کی حیثیت سے بھی اور مغرب اور مخالف اسلام طاقتوں کی نگاہ میں اسلامی طاقت کا نشان اور بہت سے اسلامی مفادات کا محافظ وپاسبان ہونے کی بناء پر بھی تمام دنیا کے مسلمان اس کو عزت واحترام کی نظر سے دیکھتے تھے، اور وہاں پیش آنے والے واقعات سے نہ صرف دلچسپی رکھتے تھے، بلکہ اثر لیتے تھے، حضرت شاہ ولی اللہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ جیسا عالمی ذہن رکھنے والا انسان جس کی تاریخ اسلام پر گہری نظر تھی، سلطنتِ عثمانیہ سے صرفِ نظر نہیں کرسکتا تھا، وہ خلافت کی شرعی حیثیت اور سیاسی واجتماعی اہمیت کے رمز آشنا تھے، اور دین واخلاق اور صالح معاشرہ اور صحت مند تمدّن ومعیشت کے لئے آزاد حکومت وغیر فاسد سیاسی طاقت کو ضروری سمجھتے تھے، اور مسلمانوں کو نہ صرف اپنے ملک بلکہ بساط عالم پر ایک مؤثر اور صاحب امر ونہی طاقت کے طور پر دیکھنے کے آرزومند تھے، وہ مسلمانوں کی سب سے بڑی سلطنت کے عروج وزوال اور اس کے داخلی سکون وانتشار کی طرف سے کیسے آنکھیں بند کرسکتے تھے، خصوصاً جبکہ وہ ایک سال سے زائد اس کے محبوب ترین اور معزز ترین دائرہ حکومت حجاز میں کھلی ہوئی آنکھوں، بیدار دماغ اور حسّاس دل کے ساتھ قیام کرچکے تھے، اور اس کے مقبوضات اور زیر انتظام ملکوں مصر وشام وعراق سے آنے والوں کی زبانی ان اثرات کا جائزہ لے چکے تھے، جو سلاطین آل عثمان، ان کے وزراء

شیوخ اسلام اور علمائے ترکی کے رجحانات و نفسیات کے نتیجہ میں ان ملکوں کے علمی و دینی حلقوں پر پڑ رہے تھے، اس لئے ہمیں بارہویں صدی ہجری (اٹھارویں صدی عیسوی) میں سلطنت عثمانیہ، اس کے اپنے پڑوس کے عیسائی مغربی ممالک سے تعلقات، شکست و ریخت، عزل و نصب اور سیاسی طاقت کے مد و جزر پر بھی ایک اجمالی نگاہ ڈالنی ہوگی۔

عالم اسلام کی سیاسی حالت

ہم پہلے اس وقت کے عالم اسلام کی سیاسی حالت، حکومتوں کے انقلابات اور اہم حوادث پر نظر ڈالیں گے، پھر عالم اسلام کا علمی، دینی، اخلاقی روحانی جائزہ لیں گے۔

سلطنت عثمانیہ بارہویں صدی میں

شاہ صاحب ۱۱۱۴ھ میں پیدا ہوئے اور ۱۱۷۶ھ میں انھوں نے وفات پائی، اس عرصہ (۶۲ سال) میں سلطنت عثمانیہ کے تخت پر پانچ سلاطین، مصطفےٰ ثانی (م ۱۱۱۵ھ) احمد ثالث (م ۱۱۴۳ھ) محمود اول (م ۱۱۶۷ھ) عثمان ثالث (م ۱۱۷۱ھ) اور مصطفےٰ ثالث (۱۱۷۱ھ–۱۱۸۷ھ / ۱۷۵۷ء–۱۷۷۴ء) آئے اور گئے۔

شاہ صاحب کے زمانۂ شعور اور فکر و عمل میں احمد ثالث، محمود اول، عثمان ثالث اور مصطفےٰ ثالث نے عنان سلطنت و خلافت سنبھالی، لیکن اہم مدت (شاہ صاحب کے آخری پانچ سال کا زمانہ) مصطفےٰ ثالث کے عہد میں گذری۔

مصطفےٰ ثالث نے سولہ برس آٹھ مہینے حکومت کی، ان کے زمانہ میں سلطنت عثمانیہ اور روس کے درمیان جنگ چھڑی، سلطنت عثمانیہ کو اس جنگ (۱۷۶۹ء) میں شکست ہوئی، جس میں روس کا کوئی

کارنامہ نہ تھا بعض حوادث اور انتظامات کی کمی کو دخل تھا[۱]، الفنسٹن روسی جنرل نے قسطنطنیہ پر بھی حملہ کا ارادہ کیا لیکن اس کو باز رکھا گیا، مصطفےٰ خاں نے فوج کی تقویت اور عسکری اصلاحات کی طرف بھی قدم اٹھایا اور کچھ فوجی کامیابیاں بھی حاصل کیں، روس نے صلح کے لئے کچھ شرطیں پیش کیں، جو توہین آمیز تھیں، بخارسٹ میں ۱۳ رشعبان ۱۱۸۶ھ (شاہ ولی اللہ صاحبؒ کی وفات کے دس سال بعد) ۹ر نومبر ۱۷۷۲ء میں کانفرنس ہوئی جس میں کچھ شرطیں پیش کی گئیں، سلطنت عثمانیہ نے ان کو ٹھکرادیا، اور ترکی افواج کو جنگ شروع کرنے کا حکم دیا، جنگ کے نتیجہ میں روس کو شکست فاش ہوئی، روسیوں کی مرعوبیت کا یہ حال تھا کہ عثمانی افواج جب بازارجق (اب جو TOBULKHIN کہلاتا ہے) سے گذریں تو شہر کی پوری آبادی شہر چھوڑ کر چلی گئی، مؤرخ ہمر (HEMER) لکھتا ہے کہ "عثمانیوں نے آگ پر چڑھی ہوئی ہانڈیاں پائیں جن میں گوشت تھا" ۸ر ذی قعدہ ۱۱۸۶ھ (۲۱ر جنوری ۱۷۷۴ء) کو سلطان مصطفےٰ ثالث نے وفات پائی، مؤرخین اس کے عدل اور امور خیر کی خواہش و کوشش کی تعریف کرتے ہیں، اس نے اپنے زمانہ میں بہت سے مدارس اور خانقاہیں قائم کیں[۲]۔

شاہ صاحبؒ کا عہدِ شباب تھا کہ سلطنت عثمانیہ میں مطبعوں کا رواج ہوا، اور پہلا مطبع قسطنطنیہ میں قائم ہوا، اسی عہد میں نجد و حجاز میں شیخ محمد بن عبدالوہاب (۱۱۱۵ھ - ۱۲۰۶ھ) کی تحریک نے فروغ پایا[۳]، عثمان ثالث کے

---

[۱] تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو "تاریخ الدولۃ العلیّۃ العثمانیۃ" از محمد فرید بک المحامی۔ طبع بیروت

[۲] "تاریخ الدولۃ العلیّۃ العثمانیۃ" ص ۳۲۹-۳۴۰

[۳] بعد میں سعود بن عبدالعزیز (۱۱۶۳ھ - ۱۲۲۹ھ) امیر نجد نے اسی دعوت مجاہدانہ جوش اور فوجی تنظیم کی طاقت سے ۱۲۱۸ھ میں حجاز اور جزیرۃ العرب کے بڑے حصہ پر قبضہ کرلیا، ۱۲۳۴ھ میں خدیو محمد علی والی مصر کی کوشش سے اس حصہ پر دوبارہ ترکی سلطنت کا مکمل قبضہ ہوا، نجدی امیر عبداللہ بن سعود بن عبدالعزیز قسطنطنیہ بھیج دیئے گئے، جہاں وہ قتل کر دیئے گئے۔

زمانہ میں علی بے (الملقّب بہ شیخ البلد) مصر کی حکومت وانتظامات پر پورے طور پر حاوی ہو گئے، انھوں نے روسی جنرل کے ساتھ جو بحرِ روم پر متعین تھا، سازش کرلی اور شرط کی کہ وہ ذخائر اور اسلحہ سے ان کی مدد کرے گا، تاکہ مصر خود مختار ہو جائے، اس کی مدد سے علی بے غزّہ، نابلس، قدس، یافہ اور دمشق پر قبضہ کرنے میں کامیاب ہوا، وہ اناطولیہ کے حدود کی طرف رخ کرنے کی تیاری کر رہا تھا کہ مملوک سرداروں میں سے ایک سردار محمد بے مشہور بأبی الذہب نے اس کے خلاف علمِ بغاوت بلند کیا، جس کی وجہ سے علی بے کو مصر واپس آنا پڑا، اور اس نے شکست کھائی، اس اندرونی جنگ اور انتشار کے نتیجہ میں بیروت پر روسی جہازوں نے آتش باری کی جس سے تین سو کے قریب مکانات برباد ہو گئے، مصر میں محرم ۱۱۸۷ھ میں علی بے اور محمد بے کی فوجوں کا مقابلہ ہوا، ابوالذہب کامیاب ہوا، اور علی بے گرفتار ہوا، اور زخمی حالت میں اس نے انتقال کیا، اس کا سر کاٹ کر چار روسی افسروں کے ساتھ عثمانی گورنر خلیل پاشا کے پاس بھیج دیا گیا، جس نے ان کو قسطنطنیہ روانہ کر دیا، اور مصر دوبارہ سلطنت عثمانیہ کے کلّی قبضہ میں آگیا۔

حجاز کی صورت حال

شاہ صاحب نے جب حجاز کا سفر کیا، اور حرمین شریفین میں طویل قیام فرمایا، تو اس وقت سلطان محمود اول (۱۱۴۳ھ۔۱۱۶۷ھ) کی سلطنت وخلافت کا زمانہ تھا، اس وقت حجاز میں سلطنت عثمانیہ کے نائب و نمائندہ امیرِ حجاز (جو شریف مکہ کہلاتے تھے) محمد بن عبداللہ[1] بن سعید بن زید بن محسن الحسنی (م ۱۱۶۹ھ) والیِ حجاز تھے، جو اپنے والد کی وفات پر ۱۱۴۳ھ میں امارتِ حجاز

---

[1] بعض کتابوں میں ان کا نام محمد بن عبداللہ بھی آیا ہے، شاید لفظی مماثلت سے بچنے کے لئے ادباً ایسا کیا گیا۔

پر متعین ہوئے[1]، ان کا زمانہ خانہ جنگیوں اور امارت کے لئے خاندانی کشمکش کا زمانہ تھا، ۱۱۴۵ھ ہی میں ان کے چچا مسعود بن سعید نے ان کو ہٹا کر امارت حجاز پر قبضہ کر لیا، لیکن ۱۱۴۶ھ میں انھوں نے دوبارہ یہ منصب حاصل کیا، لیکن پھر چچا نے ان کو معزول کر دیا، اور ۱۱۶۵ھ تک حینِ حیات وہی اس پر قابض و متصرّف رہے، ان کے زمانہ میں حجاز میں سکون اور امن و امان قائم رہا، مورخین ان کو بیدار مغز اور سیاسی سوجھ بوجھ کا آدمی بتاتے ہیں[2]۔

بارہویں صدی کے اس عہد وسطی میں راستوں کی بدامنی، بدوؤں کی غارت گری، اور بدانتظامی کی شکایت تاریخ کی کتابوں اور حج کے سفرناموں میں عام طور پر ملتی ہے، جو سلطنت کے مرکز (قسطنطنیہ) کی دوری، ترکوں کی حجاز کے اندرونی معاملات میں امکانی حد تک دخل دینے سے احتراز کی پالیسی اور شرفائے مکہ کے (جو مسلّم النسب حسنی سادات میں سے تھے) معاملہ میں ضرورت سے زیادہ لحاظ و مروّت، عربوں کے معاملہ میں غلو کی حد تک احترام و عقیدت، اور ان کی زیادتیوں سے

---

[1] امرائے مکہ کا (جو حسنی سادات میں سے منتخب ہوتے تھے، اور اس کی وجہ سے ان کو "اشراف" کے لقب سے یاد کیا جاتا تھا) سلسلہ چوتھی صدی ہجری کے ثلث اول سے شروع ہو گیا تھا، پہلے شریف مکہ کا تقرر عباسی خلیفہ المطیع للہ (۳۳۴ھ تا ۳۶۳ھ) کے عہد میں ہوا، سلطان سلیم کے شام و مصر پر قبضہ اور حرمین شریفین کو اپنی تولیت و انتظام میں لینے کے وقت تک شرفائے مکہ کا تقرر مصر کے ملوک خاندان کے فرمانرواؤں کی طرف سے ہوتا تھا، سلطان سلیم نے اس وقت کے شریف مکہ السید برکات، اور ان کے فرزند سید ابونمی کو اپنے منصب پر برقرار رکھا، اور وہ بدستور امیر مکہ رہے، اس کے بعد سے یہ سلسلہ شریف حسین کی امارت تک جاری رہا، جنھوں نے (جون ۱۹۱۶ء) شعبان ۱۳۳۴ھ میں عثمانیوں کے خلاف بغاوت کی اور جنوری ۱۹۲۶ء میں سلطان ابن سعود کے قبضہ کے بعد حجاز سے بے دخل ہوئے۔ [2] الاعلام ج ۸ ص ۱۱۱-۱۱۲ (بحوالہ خلاصۃ الکلام و عنوان المجد) و تذییل شفاء الغرام لأخبار البلد الحرام ج ۲ ص ۳۰۹-۳۱۰ "باب ولاۃ مکۃ"

چشم پوشی کی سیاست، پھر مزید برآں امارت حجاز کے موروثی اور ایک ہی خاندان میں محدود ہونے کا قدرتی نتیجہ تھا، یقینی طور پر کہا جا سکتا ہے کہ شاہ صاحب نے ان غیر اطمینان بخش حالات، منصبِ امارت کے لئے رقیبانہ و حریفانہ کشمکش اور نظم و نسق کی کمزوری کو اپنی چشم بصیرت سے دیکھا بھی ہوگا، اور دینی حمیت سے معمور قلب سے محسوس بھی کیا ہوگا، چچا بھتیجہ کی منصب امارت کے لئے معرکہ آرائی جو ۱۱۴۵ھ میں پیش آئی عجب نہیں کہ ان کے زمانۂ قیام میں ہوئی ہو، اور انھوں نے اس سے دور رس نتائج اور اخلاقی زوال کے شواہد اخذ کئے ہوں۔

یمن

یمن میں بھی تقریباً اسی طرح کا نظام نافذ تھا کہ سیاسی و خارجہ پالیسی کے اعتبار سے سلطنت عثمانیہ کے ماتحت، اور والی ترکی (گورنر) کے جو سلطنت کی طرف سے متعین کیا جاتا تھا، موجود ہونے کے ساتھ وہاں امامت کا نظام نافذ تھا، جو یمن میں تیسری صدی ہجری کے وسط سے چلا آرہا تھا، اور جس پر نسباً سادات اور مذہباً زیدی[1] حضرات فائز ہوتے تھے، اہل یمن ان کے

---

[1] علامہ محمد ابو زہرہ نے اپنی کتاب "تاریخ المذاهب الإسلامية" میں یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ زیدی شیعہ فرقوں میں اہل سنت والجماعت سے قریب تر اور معتدل ہیں، انھوں نے ائمہ کو مرتبۂ نبوت تک نہیں پہونچایا، رسول اللہ صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بعد صرف ان کی افضلیت کے قائل ہیں، وہ صحابہؓ کی تکفیر نہیں کرتے، ان کا یہ بھی خیال ہے کہ جس امام کی آپؐ نے وصیت فرمائی تھی، اس کی تعیین نام و شخصیت سے نہیں کی تھی، بلکہ اوصاف بیان کئے تھے، جو حضرت علیؓ پر منطبق ہوتے ہیں، علامہ ابو زہرہ کی تحقیق ہے کہ اس فرقہ کے بانی امام زید ابن امام زین العابدین، شیخین (حضرت ابو بکرؓ و عمرؓ) کی امامت کے قائل تھے، اور ان کی خلافت کو صحیح مانتے تھے (ص ۴۷-۴۹)

ہاتھ پر خلافت کی بیعت کرتے تھے، اور وہ امام کہلاتے تھے، جو اس منصب پر فائز ہو اس کا درجۂ اجتہاد تک پہونچا ہوا ہونا، اور اپنے مذہب کا مسلّم و متبحّر عالم ہونا مفروغ عنہ سمجھا جاتا تھا، یمن سلطان سلیمان قانونی ابن یاؤز سلیم کے زمانۂ حکومت میں سلطنت عثمانیہ میں شامل ہوا، اس وقت ائمۂ یمن کے فرزند و جانشین السید المطہر (ابن الامام شرف الدین (م ۹۸۰ھ) حاکم و امام یمن تھے، ترکی حاکم اور قائد سنان پاشا اور ان کے درمیان جنگ ہوئی، اور یمن سلطنت عثمانیہ کے زیرنگین ہو گیا[1]، لیکن ترکوں نے حجاز کی طرح یہاں بھی امارت کا نظام قائم رکھا، اور ایک طرح کی داخلی خودمختاری دے دی، حضرت شاہ ولی اللہ صاحبؒ جب حجاز میں تھے، تو اس وقت یمن میں الامام المنصور باللہ الحسین بن المتوکل علی اللہ قاسم بن حسین امام یمن تھے، جن کا عہد امامت و حکومت ۱۱۳۹ھ سے ۱۱۶۱ھ تک قائم رہا، مذہب زیدی کی حکومت اور فروغ کے باوجود رعایا زیادہ تر سنّی اور مذہباً شافعی تھی، یمن بارہویں اور تیرہویں صدی میں علم حدیث کا اہم مرکز رہا ہے، جہاں بارہویں صدی میں محمد بن اسماعیل الامیر (م ۱۱۴۲ھ) صاحبِ "سُبل السلام"، اور تیرہویں صدی میں علامہ محمد بن علی الشوکانی (م ۱۲۵۵ھ) صاحبِ "نیل الاوطار" پیدا ہوئے، حجاز کے قیام میں شاہ صاحبؒ قربِ مکانی اور روابط علمی کی بناء پر علمائے یمن کی تصنیفات اور ان کی محدثانہ خدمات سے ضرور واقف ہوں گے۔

ایران

ایران میں خاندان صفوی کی سلطنت پر دو صدیاں گذر چکی تھیں، اور قانونِ قدرت

---

[1] تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو "البرق الیمانی فی الفتح العثمانی" از علامہ قطب الدین نہروالی (مکّی) حنفی

کے مطابق اس پر پیری و اضمحلال کا وہ دور آگیا تھا جو فلسفی مؤرخ ابن خلدون کے بقول "آنے کے بعد جانے کا نام نہیں لیتا" "إن الهرم اذا نزل بدولة لا يرتفع"[1] اس حالت کو دیکھ کر ہمسایہ ملک افغانستان نے فائدہ اٹھایا، اور اپنے حوصلہ مند حکمران محمود خاں غلزئی کی قیادت میں ۱۱۳۴ھ میں ایران پر حملہ کیا اور اصفہان کو فتح کر لیا، حسین شاہ گرفتار ہوا، افغانوں نے باقی ملک کو بھی فتح کرنے کا ارادہ کیا، لیکن ان کی تعداد اس قدر نہ تھی کہ پورے ملک کو اپنے قبضہ میں رکھ سکتے، محمود خاں تین سال سلطنت کرنے کے بعد ۱۱۳۷ھ ۱۷۲۴ء میں راہیِ ملکِ بقا ہوا، اس کے جانشین اشرف خاں کے زمانہ میں ملک میں بدنظمی پھیل گئی، اس وقت روس کے فرمانروا پیطر اعظم نے ایران کے شمالی اضلاع پر حملہ کیا، صلح کے نتیجہ میں ایران کو اپنے بہت سے زرخیز اور اہم اضلاع سے دستبردار ہونا پڑا، شاہ ایران قید میں تھا، خوش قسمتی سے اس کے شاہزادہ طہماسپ کو ایک لائق صاحبِ عزم و نظم قائد مل گیا، جو خاندانی طور پر معمولی حیثیت کا مالک ہونے کے باوجود اپنی صلاحیتوں کی بناء پر اس گروہ میں شامل تھا، جو نئی سلطنتوں کی بنیاد رکھتے ہیں، یہ نادر شاہ افشار تھا۔

نادر شاہ افشار

نادر نے طہماسپ کو اس کے آبائی تخت پر بٹھا دیا، دولت صفویہ زوال سے دوچار تھی، اور اس کے دوبارہ عروج کے آثار نہ تھے، سارے ملک میں انتشار اور بے اعتمادی پھیلی ہوئی تھی، نادر نے اس صورت حال سے فائدہ اٹھا کر ایک نئی عسکری طاقت کی تنظیم کی، اس کی حوصلہ مندی اور مردانگی نے ایرانیوں میں ایک نئی روح پھونک دی، وہ آندھی پانی کی طرح اٹھا اور سارے ملک پر چھا گیا، اس نے ۱۱۴۳ھ ۱۷۳۰ء میں افغانوں کو ایران سے بالکل بے دخل کر دیا، ۱۱۴۶ھ ۱۷۳۴ء میں اس نے

---

[1] جب کسی سلطنت پر بوڑھاپے کا دور آتا ہے تو پھر اس کی جوانی واپس نہیں آتی۔ (مقدمہ ابن خلدون)

روسیوں کو بحیرۂ خزر (CASPIAN SEA) پر روک کر باعزت اور خود دارانہ صلح کی، اہل عرب کو ملک کے مغربی حدود پر روک دیا، سلطان روم کو شمال سے پسپا ہونے پر مجبور کیا، اور قدیم سلطنت ایران کے صوبے غیر ملکیوں سے واپس لئے، ۱۱۴۸ھ ۱۷۳۵ء میں ایران کی سلطنت کو ایسی وسعت حاصل ہو گئی کہ اس کی سرحدیں اپنے قدیمی صورت پر واپس آگئیں، اور ۱۱۵۰ھ ۱۷۳۶ء میں خاندان صفویہ کا خاتمہ ہو گیا، نادر شاہ افشار اس وقت ایران کا واحد تاجدار تھا۔[1]

انسائیکلوپیڈیا تاریخ عالم کے مصنّف کے بیان کے مطابق[2] نادر نے تخت سلطنت اس شرط پر قبول کیا تھا کہ ایرانی شیعیت سے دستبردار ہو جائیں، وہ خود نسلاً ترک اور مذہباً سنّی تھا لیکن ایرانیوں سے سنّیت قبول کرانے میں وہ کامیاب نہ ہو سکا، اس کے جرنیلوں نے ۱۷۳۷ء میں بلوچستان اور بلخ لئے، ۱۷۳۸ء میں قندھار پر قبضہ کیا، وہاں سے تسخیر ہند کے لئے روانہ ہو کر کابل پشاور اور لاہور کو تسخیر کیا، ۱۷۳۹ء میں دہلی کے قریب کرنال میں مغل شاہنشاہ کی بہت بڑی فوج کو شکست دی، دہلی پر قبضہ کیا اور وہاں خوفناک قتل عام کرایا،[3] نادر نے مغل بادشاہ سے تخت نہیں لیا، مگر پچاس کروڑ ڈالر کا تاوان وصول کیا، نیز دریائے سندھ کے شمال و مغرب میں جتنے علاقے تھے اپنی سلطنت میں شامل کر لئے، بخارا و خوارزم (خیوہ) کی (سنہ ۱۷۴۰ء میں) تسخیر عمل میں آئی، یہ اس کے مقبوضات میں وسعت کی آخری حد تھی، اور یہیں سے اس کی زندگی میں انقلاب شروع ہوا، وہ بلاشبہ بہت بڑا سالار تھا لیکن نہ حقیقی تدبر جانتا تھا، اور نہ اس میں کوئی انتظامی قابلیت تھی، شیعیت کو ختم کرنے کے لئے اس کی کوششوں[4] کا نتیجہ یہ ہوا کہ بے چینی بڑھنے لگی، اور اسے دبانے کے لئے وہ ظلم و جور سے

---

[1] ملخص از کتب تاریخ ایران و ہندوستان۔ [2] ان واقعات کی تفصیل بعد کے صفحات میں دیکھی جائے۔
[3] مغربی مورخین اور بعض مسلمان مصنفین کے اس بیان میں کہ نادر شاہ نے ایران سے شیعیت کے خاتمہ کی سنجیدہ اور باعزم کوشش کی اور یہ کہ وہ اصلاً سنّی تھا، اس شبہ کی گنجائش ہے کہ یہ عقیدہ کی تبدیلی کا معاملہ تھا یا سیاسی تدبیر، دہلی پر حملا اور وہاں کے قیام کے دوران نادر شاہ کی کسی بات سے یہ ظاہر نہیں ہوا کہ وہ مذہباً سنّی ہے اور ایران کو سنیت کے جھنڈے کے تلے لانا چاہتا ہے۔

کام لینے کا عادی بنتا گیا، انجام کار اس نے اپنے گرانقدر محصولوں اور جابرانہ تحصیلات سے ملک کو تباہ کر ڈالا۔ ۱۷۴۷ء میں نادر شاہ اپنے ہی قبیلہ کے ایک آدمی کے ہاتھ سے مارا گیا۔[1]

ایران نادر شاہ کی وفات کے بعد

نادر شاہ کی موت کے بعد ایران میں ابتری پھیل گئی، اور طوائف الملوکی کا دور دورہ ہوا، اس کی فوج کے سالار اپنی اپنی سلطنت کے قیام کا خواب دیکھنے لگے، اس کی وفات کے بعد اس کا بھتیجہ علی قلی عادل شاہ (۱۷۴۷ء اور ۱۷۴۸ء) تخت نشین ہوا، اس نے اپنے خاندان کو قتل کروادیا، صرف شہزادہ شاہ رُخ مرزا بچا جس کی عمر اس وقت چودہ[14] برس تھی، عادل شاہ ایک سال کے اندر اندر اپنے بھائی ابراہیم کے ہاتھوں معزول ہوا، اور اندھا کر دیا گیا، لیکن ابراہیم کی فوج میں بغاوت ہو گئی، فوجی افسروں نے اس کو شکست دے کر قید پھر قتل کر دیا، اس کے بعد عادل شاہ کو بھی قتل کر دیا گیا، اس کے بعد ژند خاندان ایران پر غالب آیا، اور کریم خاں ژند (۱۱۶۴ھ / ۱۷۵۰ء — ۱۱۹۳ھ / ۱۷۷۹ء) نے انیس[19] برس تک ایران پر حکومت کی، اس نے شیراز کو اپنا پایہ تخت بنایا، وہ انصاف اور رحم دلی کی صفات سے متصف تھا، اس نے ایران کو خونریز جنگوں کے بعد سکون و آرام کا موقعہ دیا، اس لئے اس کی موت پر بڑا سوگ منایا گیا، متعدد کمزور جانشینوں کے بعد لطف علی کے عہد میں خاندان ژند کا زوال مکمل ہو گیا، لطف علی ۱۲۰۹ھ / ۱۷۹۴ء میں قتل ہوا، اور ایران کا تخت خاندان قاچار کے لئے خالی ہوا، چونکہ یہ عہد شاہ صاحب کے بعد کا ہے اس لئے ہم اس سے تعرض نہیں کرتے۔

---

[1] انسائیکلوپیڈیا تاریخ عالم جلد اول تالیف ولیم ایل لینگر، ترجمہ و تہذیب مولانا غلام رسول مہر۔

افغانستان اور احمد شاہ ابدالی

اٹھارویں صدی سے پیشتر افغانستان کا ایک حصہ ایران کے ماتحت تھا، دوسرا ہندوستان کے ماتحت، اور تیسرے حصہ پر بخارا کے خوانین حکمراں تھے، ۱۷۰۶ء میں قندھار آزاد ہو کر خود مختار ہو گیا، ۱۷۳۷ء میں نادر شاہ نے افغانوں کو قندھار کی حکومت سے بے دخل کیا، اور افغانستان نیز مغربی ہند پر قبضہ کر لیا۔

اس وقت ایک شخص احمد خاں نامی جنگی قیدی کی حیثیت سے اس کے پاس لایا گیا، نادر شاہ اس سے بہت متاثر ہوا اور اس کو اپنے ذاتی خدمت گاروں میں شامل کر لیا، احمد خاں برابر ترقی کرتا گیا، اور بادشاہ کا اعتماد اس نے بیش از بیش حاصل کیا، نادر کے قتل پر اس نے افغانی صوبوں کی عنان حکومت سنبھال لی، وہ ابدالی قبیلہ کے دُرّانی (سدوزئی) شاخ سے تعلق رکھتا تھا، اس نے دُرِّ دوراں کا لقب اختیار کیا، اور اسی نسبت سے اس کا خاندان دُرّانی کہلایا۔

احمد شاہ نے دُرّانی خاندان کی حکومت اور دُرّانی سلطنت کی بنیاد رکھی، اس کی وفات پر افغان سلطنت مشرقی ایران (مشہد) پورے افغانستان مکمل بلوچستان اور مشرقی سمت میں کشمیر اور پنجاب پر مشتمل تھی، وہ حقیقتاً اٹھارویں صدی کے وسط کے عظیم بانیانِ سلطنت، آزمودہ کار اور عالی ہمت سپہ سالاروں، اور خدا ترس و کریم النفس حکمرانوں میں شامل کئے جانے کے قابل اور بحیثیت مجموعی (ماحول، ابتدائی زندگی اور بے سروسامانی کو سامنے رکھتے ہوئے) عبقری (GENIUS) شخصیتوں میں شمار کئے جانے کا مستحق ہے، ۱۷۴۷ء سے ۱۷۶۹ء تک اس نے محمود غزنوی کی طرح ہندوستان کو اپنی ترک تازیوں کا میدان بنایا، اس کے تدبر،

عسکری صلاحیت، مذہبیت، علم دوستی، اور شرافتِ نفس کا اعتراف اس کے متعدد نامور معاصرین نے کیا ہے، اس نے عرصۂ دراز کے بعد افغان علاقہ کو جو اس وقت چھوٹی چھوٹی اکائیوں پر مشتمل تھا، ایک مضبوط طاقت میں منسلک کر کے ایک بڑی اور مضبوط اکائی میں تبدیل کر دیا۔[1]

افغانستان، احمد شاہ ابدالی کے بعد

احمد شاہ ابدالی نے ۱۱۸۶ھ (۲۳ راکتوبر ۱۷۷۲ء) کو قندھار میں وفات پائی، افسوس ہے کہ عالمگیر اعظم کی طرح اس کے جانشین بھی کمزور نااہل تھے (اور یہ المیہ اکثر عظیم بانیانِ سلطنت اور کامیاب فاتحین و حکمرانوں کے ساتھ پیش آیا ہے) تیمور شاہ کو جو اس کا جانشین اور اس نوخیز اور عظیم سلطنت کا وارث ہوا، اپنے نامور اور صاحب عزم باپ سے کوئی نسبت نہ تھی، بیس[2] سال کمزوری کے ساتھ سلطنت کرنے کے بعد جس میں اس جواں سال سلطنت کے اندر زوال کے آثار نمایاں ہو چکے تھے، ۱۷۹۳ء میں اس نے انتقال کیا، اس کے فرزند محمود کی بادشاہی کے زمانہ ہی میں سلطنت بارک زئی خاندان میں منتقل ہو گئی،[2] جو انقلاب افغانستان ۱۹۷۵ء تک افغانستان میں حکمراں رہا۔[3]

عالم اسلام کی علمی و دینی حالت

عالم اسلام کا سیاسی و انتظامی جائزہ لینے کے بعد اب ہم اس کا علمی و دینی جائزہ

---

[1] مزید تفصیل باب نہم میں احمد شاہ ابدالی کے تذکرہ میں آئیگی۔ [2] تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو "سیرت سید احمد شہیدؒ" حصہ اول "درّانی خاندان کا زوال اور اس کے اسباب" صفحہ ۴۲۲-۴۲۳ [3] اسی خاندان کے حکمرانوں سے حضرت سید احمد شہیدؒ اور ان کے رفقاء کو سابقہ پڑا، اور اسی کی آخری شاخ ظاہر شاہ پر ۱۹۷۵ء میں ختم ہوئی۔

لیتے ہیں کہ اس کا شاہ صاحب کی زندگی، ان کے موضوع و ذوق اور ان کے کار تجدید و اصلاح سے قریبی تعلق ہے۔

بارہویں صدی کے اہل کمال

مسلمانوں کی علمی و فکری تاریخ، اور ان کی تصنیفی و تحقیقی سرگرمیوں کی طویل روداد کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کی علمی و فکری زندگی و نشاط، اور ان کی تصنیفی و تحقیقی سرگرمیاں، سیاسی عروج اور سلطنتوں کی ترقی و فتوحات سے مربوط و وابستہ نہیں رہی ہیں، جیسا کہ اکثر غیر مسلم اقوام و ملل کی تاریخ میں نظر آتا ہے کہ ان کے سیاسی زوال، انقلاب سلطنت اور بدنظمی و انتشار کے ساتھ ان کو علمی زوال اور قحط الرجال سے بھی واسطہ پڑتا ہے، سلطنتوں کی ہمت افزائی و سرپرستی، اور قوموں میں خود اعتمادی و احساس برتری کے فقدان کے ساتھ ان کے ذہن و فکر کے سوتے خشک، مسابقت کا جذبہ سرد، اور محرکاتِ عمل کمزور پڑ جاتے ہیں۔

مسلمانوں کا معاملہ اس سے مختلف ہے، بارہا ان کے سیاسی زوال اور اندرونی انتشار کے زمانہ میں ایسے ممتاز اہل کمال پیدا ہوئے، جو دور زوال و انحطاط کی پیداوار نہیں معلوم ہوتے، ساتویں صدی کے آخر میں سقوط بغداد اور تاتاریوں کے ان حملوں کے بعد جنھوں نے مشرقی دنیائے اسلام کو زیر و زبر کر دیا تھا، اور ان ممالک میں خاک اڑ گئی تھی جو صدیوں سے علم کا مرکز چلے آ رہے تھے، آٹھویں صدی کے اوائل ہی میں شیخ الاسلام تقی الدین ابن دقیق العید (م ۷۰۲ھ) جیسے محدث علامہ علاء الدین الباجی (م ۷۱۴ھ) جیسے اصولی و متکلم، شیخ الاسلام ابن تیمیہ (م ۷۲۸ھ) جیسے امام و مجتہد، علامہ شمس الدین الذہبی (م ۷۴۸ھ) جیسے محدّث و مورّخ، اور علّامہ ابوحیّان نحوی (م ۷۴۵ھ) جیسے ماہر فن علماء نظر آتے ہیں۔

اس کی وجہ یہ ہے کہ علوم دینیہ میں کمال پیدا کرنے اور ان کی خدمت و اشاعت کے محرّکات اس امت کے اندرون اور باطن میں پائے جاتے ہیں، نہ کہ بیرون (حکومتوں کی سرپرستی و قدردانی) میں، اور وہ محرکات ہیں رضائے الٰہی کا حصول، نیابتِ انبیاء کے فرض کی ادائیگی، اور دین کی حفاظت کی ذمہ داری کا احساس، اس لئے یہ عہد اگرچہ مجموعی طور پر سیاسی انتشار کا عہد ہے، اور بڑی بڑی مسلم حکومتوں حتیٰ کہ سلطنت عثمانیہ کے زوال کے آثار شروع ہو گئے تھے، ملکوں یہاں تک کہ مرکز اسلام حجاز تک میں حکومت و امارت کے حصول کے لئے باہمی کشمکش اور نبرد آزمائی تھی، لیکن مصر، شام، عراق، حجاز و یمن، ایران و ہندوستان میں ہر جگہ علماء درس و تدریس میں مشغول، علمی ذوق رکھنے والے تصنیف و تالیف میں سرگرم، اور مشائخ طریقت تزکیۂ نفس و اصلاح باطن میں منہمک، اور کمالات روحانی، اور ترقیات باطنی سے آراستہ و متصف تھے، اور ان میں سے بعض بعض نے ایسا امتیاز پیدا کیا تھا، کہ اس کی نظیر ماضی قریب میں بھی دور تک نہیں ملتی۔

فن حدیث کو لیجئے تو اس میں علامہ ابوالحسن السندی الکبیر (م ۱۱۳۸ھ) جیسے محدث نظر آتے ہیں، جنھوں نے مدت تک حرم شریف میں حدیث کا درس دیا، صحاح ستہ پر ان کے حواشی الهوامش الستة کے نام سے مشہور ہیں، مولانا محمد حیات سندی (م ۱۱۶۳ھ) بھی اسی عہد کی زیب و زینت ہیں، شام میں شیخ اسماعیل العجلونی المشہور بالجراحی (م ۱۱۶۲ھ) پایہ کے محدث تھے، ان کی کتاب "کشف الخفاء ومزيل الالباس، عمّا اشتهر من الأحاديث على ألسنة الناس" (ج ۱-۲) بڑی مفید اور جامع کتاب ہے، جو ضعیف و موضوع احادیث کا غالباً سب سے بڑا مجموعہ ہے[1]، کتاب سے ان کی وسعت نظر اور انصاف کا اندازہ ہوتا ہے، ضعیف و موضوع احادیث کے علاوہ وہ حدیثیں بھی ہیں جو زبان زد خلائق ہیں، اور ان کی تخریج عام طور پر معلوم نہیں۔

---

[1] یہ کتاب مکتبۃ التراث الاسلامی حلب نے شائع کی ہے۔

تدریس حدیث کا بڑا مرکز حرمین شریفین تھے، جہاں شیخ ابو الطاہر الکورانی الکردی، و شیخ حسن العجیمی درس دیتے تھے، یمن میں سلیمان بن یحییٰ الاہدل (م ۱۱۹۷ھ) دیار یمن کے محدث جلیل اور اپنے عہد کے بڑے خادم و ناشر حدیث تھے، محمد بن احمد السفارینی (م ۱۱۸۸ھ) حدیث اور اصول کے بڑے عالم اور "الدُّرر المصنوعات فی الأحادیث الموضوعات" کے مصنف تھے، یمن میں الامیر محمد بن اسماعیل الحسنی الصنعانی (م ۱۱۴۲ھ) جلیل القدر محدث و محقق تھے، جن کی یادگار "بلوغ المرام" کی مشہور شرح "۔۔ السلام" اور "تنقیح الانظار" کی شرح "توضیح الافکار" ہے، اسی صدی میں علامہ محمد سعید السنبل (م ۱۱۷۵ھ) کا نام نظر آتا ہے، جن کے اوائل کتب حدیث پر[1] شیوخ حدیث کی اجازت حدیث کا اکثر و بیشتر اعتماد و انحصار ہے، مورخین نے علامہ محمد بن عبد الباقی الزُّرقانی (م ۱۱۲۲ھ) کو "خاتمۃ المحدثین بالدیار المصریۃ" لکھا ہے[2]۔

علمی تبحّر، کثرتِ تدریس و افادہ و کثرتِ تصنیف و تالیف کے لحاظ سے شیخ عبد الغنی النابلسی (م ۱۱۴۳ھ) اس عہد میں نمایاں ہیں، جن کے تلامذہ اور مسترشدین کثرت سے نظر آتے ہیں، اور ان کو الاستاذ الاعظم کا خطاب دیتے ہیں، ان کی تصنیفات کی تعداد دو سو تیئیس ۲۲۳ بتائی جاتی ہے، اسی عہد میں علامہ اسماعیل حقّی (م ۱۱۲۷ھ) بھی تھے، جو "روح البیان فی تفسیر القرآن" کے مصنف ہیں، جو تفسیر حقّی کے نام سے مشہور ہے، بغداد کے علماء میں عبد اللہ بن حسین السُّویدی (م ۱۱۷۴ھ) صاحبِ تصانیف کثیرہ ہیں[3]۔

جامع ازہر مصر، جامع الزیتونۃ تونس، اور جامعۃ القرویین فاس کے قدیم مدارس کے

---

[1] الاوائل السنبلیۃ فی اوائل کتب الحدیث [2] ان معلومات کا ماخذ "البدر الطالع بمحاسن من بعد القرن السابع" (تصنیف علامہ محمد بن علی الشوکانی صاحب نیل الاوطار) اور "سلک الدرر فی اعیان القرن الثانی عشر" للمرادی ہے۔ [3] سلک الدرر، البدر الطالع۔

علاوہ مدارس میں دمشق کے مدرسۂ حافظیہ، المدرسۃ الشلّیۃ اور المدرسۃ العذراویۃ کے نام ملتے ہیں[1]، طرق میں سے نقشبندی، خلوتی، شاذلی، قادری، رفاعی کا باربار تذکرہ آتا ہے، اور ان کے مشائخ ترکی سے لے کر انڈونیشیا تک پھیلے ہوئے نظر آتے ہیں۔

عالم اسلام کے علمی ادبی و روحانی ذوق پر ایک نظر

اس زمانہ کے اہل علم پر غالب ذوق ادب، شاعری، علم مجلسی، اور الغاز[2] و لطائف کا ہے، اس میں بھی کوئی بڑا تفوّق اور ندرت نہیں معلوم ہوتی، سجع اور قوافی کی کثرت اور تکلفات عام ہیں، ترکی حکومت کے اثرات[3] علمی و ادبی حلقہ پر بھی نمایاں ہیں، کوئی بڑا محقق اور صاحب نظر ڈھونڈھنے سے نظر آتا ہے، مرادی کی "سلک الدرر" کی چار جلدیں قصائد، غزلیات، اور ابیات و مقطوعات سے بھری ہوئی ہیں، مکاشفات، خوش عقیدگی اور کرامات کا بہت تذکرہ ملتا ہے، سلطنت عثمانیہ کے ماتحت ممالک کے علماء اور اہل کمال دار الخلافۃ (قسطنطنیہ) جاتے ہیں، اور حکومت کے مناصب پر فائز ہوتے ہیں، معقولات، حساب و ہندسہ، علوم بلاغت، فقہ و حدیث نصاب کے اہم اجزاء ہیں، تعویذ و نقوش کا رواج عام ہے، بعض علماء نے فقہی متون قدوری وغیرہ کو نظم کیا ہے، متعدد عرب اہل علم فارسی اور ترکی سے بھی واقف تھے، سلطنت کی زبان ہونے کی وجہ سے ترکی سے (بالخصوص شام میں) لوگوں کو مناسبت تھی، ترک علماء کی ایک بڑی تعداد تھی، جو شام میں مقیم تھی، وہ فصیح عربی بولتے تھے، جامع اموی دمشق میں مسند درس پر بیٹھنا بڑے فخر

---

[1] سلک الدرر   [2] معمّے اور پہیلیاں   [3] ترک مزاجاً و فطرتاً سیاسی، منتظم اور فوجی قوم (MARTIAL RACE) ہیں، ان کے طویل دور اقتدار میں علامہ ابو السعود، طاش کبری زادہ، خلیفہ چلپی جیسے چند ممتاز عالم و محقق و مصنف نظر آتے ہیں۔

کی بات سمجھی جاتی تھی، بعض شائخ وعلماء "فتوحات مکیہ" کا، اور بعض اساتذہ "فصوص الحکم" کا درس دیتے تھے، شرح جامی، اور مختصر المعانی شام میں بھی پڑھی جاتی تھی تصوف کا مذاق عام تھا، حتیٰ کہ علماء و محدثین میں بھی، شیخ عبدالغنی النابلسی اور متعدد علماء و شائخ وحدۃ الوجود کا ذوق رکھتے تھے۔[1]

ایران میں علوم عقلیہ کا غلبہ اور اس کا ہمسایہ ممالک پر اثر

دسویں صدی ہجری کی ابتداہی میں اسماعیل صفوی (۹۰۵ ـ ۹۳۰ھ) نے ایران میں عظیم الشان صفوی حکومت قائم کی، اور پہلی مرتبہ شیعیت کو ملکی مذہب بنایا، اور سنی مذہب کو تقریباً ایران سے مٹا کر رکھدیا، ایران جس نے امام مسلم، امام ابوداؤد، امام نسائی، امام ابن ماجہ، جیسے مسلّم امام فن اور ایوان حدیث کے چار ستون، دوسری طرف بلندپایہ فقیہ اور متبحر عالم علامہ ابواسحاق شیرازی، امام الحرمین ابوالمعالی عبدالملک جوینی، اور حجۃ الاسلام ابوحامد محمد الغزالی جیسی سرآمد روزگار شخصیتیں پیدا کیں، تقریباً سوا دو سو برس کی باجبروت سلطنت میں اس کا رابطہ حدیث وفقہ اور علوم نافعہ سے منقطع ہو کر رہ گیا، شاہان ایران کا رجحان فلسفہ وحکمت کی طرف زیادہ تھا کہ شیعیت کو شروع ہی سے اعتزال وعقلیت اور فلسفہ سے مناسبت رہی ہے، مشہور حکیم و ریاضی داں خواجہ نصیرالدین طوسی (م ۶۷۲ھ) مصنف "شرح اشارات ابن سینا" جو خود شیعہ اور معتزلی تھے، ہلاکو خاں کے خاص معتمد و مشیر تھے،[2] اس شاہی تقرب واعتماد کی وجہ سے پوری تاتاری قلمرو میں (جس میں ترکستان، ایران و عراق

---

[1] ملاحظہ ہو "سلک الدرر" ۱ ـ ۲ ـ ۳ ـ ۴

[2] ملاحظہ ہو: تاریخ اخبار وآثار خواجہ نصیرالدین طوسی" شائع کردہ طہران یونیورسٹی۔

شامل تھے) فلسفہ وحکمت وریاضیات کا رجحان غالب آگیا، صفوی سلطنت کے دوسرے ہی حکمراں شاہ طہماسپ (م ۹۸۴ھ) کے زمانہ ہی میں میر غیاث الدین منصور (م ۹۴۸ھ) کا ستارۂ اقبال بلند ہوا، جو ایک اشراقی حکیم اور فلسفی[1]، اور شیراز کے مدرسۂ منصوریہ کے بانی تھے، شاہ طہماسپ صفوی کے زمانہ میں ان کو عرصہ تک منصب صدارت تفویض رہا، ہندوستان تک ان کے تلامذہ اور تلامذہ کے تلامذہ پھیل گئے، انھیں کے شاگرد امیر فتح اللہ شیرازی (م ۹۹۷ھ) دسویں صدی کے آخر میں ہندوستان آئے، اکبر نے ان کو صدارت کا منصب دیا، انھوں نے ہندوستان کے نصاب درس اور طریق تعلیم پر عقلیت کی ایسی گہری چھاپ لگا دی جو تیرہویں صدی ہجری تک باقی رہی، مولانا آزاد بلگرامی کے بقول وہی صدرالدین شیرازی، میر غیاث الدین منصور اور فاضل مرزا جان (م ۹۹۴ھ) کی تصنیفات ہندوستان لائے، اور ان کو داخل نصاب کیا۔

گیارہویں صدی کے وسط میں میر باقر داماد (م ۱۰۴۱ھ) کی شخصیت اُبھری، جس نے ایران سے لے کر ہندوستان تک کے علمی و تعلیمی حلقہ پر اپنی ذہانت، عقلیت وادبیت کا سکّہ قائم کر دیا، شاہ عباس صفوی (م ۱۰۳۷ھ) کے دربار میں وہ نہایت قدر ومنزلت کی نگاہ سے دیکھے جاتے تھے، ان کی کتاب "الافق المبین" درسی حلقوں کی بلند پروازیوں کا منتہیٰ سمجھا جانے لگا، ان کے بعد ہی علّامہ صدرالدین شیرازی (م ۱۰۵۰ھ) کی شخصیت نمایاں ہوئی، جو اشراقی حکیم اور آزاد خیال فلسفی تھے، ان کی دو کتابیں "الاسفار الأربعة" اور "شرح هداية الحكمة"

---

[1] انھوں نے شہاب الدین سہروردی مقتول کی کتاب "هیاکل النور" کی شرح اشراق هیاکل النور کے نام سے لکھی ہے، اس میں محقق دوانی کا بہت رد کیا ہے۔

معروف بصدرا[1]، عالمگیر شہرت رکھتی ہیں، ایران کے نسلی ذوق نے جو صدیوں سے رائی کا پربت اور بات کا بتنگڑ بنانے کا عادی تھا، اس عقلی رجحان کا پورا ساتھ دیا، اور لفظی موشگافیاں، اور دعاوی و مفروضات کی بھول بھلیاں، ایران کی مغربی سرحد سے لے کر ہندوستان کی مشرقی سرحد تک پھیلا دیں، جو "کوہ کندن وکاہ برآوردن" کے مرادف تھیں، دسویں صدی کے عجم سے بارھویں صدی کے عرب تک تدریسی و تصنیفی حلقہ پر "علوم حکمت" کی حکومت قائم تھی، اور ان مصنفین کی عبارتوں کے سمجھنے اور ان کے شرح و تحشیہ کے سوا اظہار کمال، بلکہ اپنی ذہانت کا ثبوت دینے کا کوئی ذریعہ نہ تھا، اور ان کی افادیت میں ادنیٰ قیل وقال غباوت وجہالت کا ثبوت دینا تھا۔

ایران کا اثر قدرتی طور پر افغانستان پر اور افغانستان کے بھی مغربی شہر ہرات پر پڑا وہاں اس شہر کے ایک عالم قاضی محمد اسلم ہروی کابلی (م ۱۰۶۱ھ) منطق وحکمت میں اساتذۂ ایران اور ائمۂ فن کے اس ملک میں سفیر تھے، ان کے صاحبزادہ قاضی محمد زاہد مشہور بہ میرزاہد[2] (م ۱۱۰۱ھ) نے اس کمال میں اور چار چاند لگائے، انھوں نے اپنی عمر کا بیشتر حصہ ہندوستان میں گزارا "شرح مواقف" "شرح تہذیب" اور "رسالہ قطبیہ" پر ان کے تین[3] حواشی نے جو "زواہد ثلاثہ" کے نام سے مشہور ہیں، ہندوستان کے درس وتدریس کے حلقوں میں بڑی مقبولیت حاصل کی، علوم عقلیہ میں اس کمال کے باوجود وہ فقہ وحدیث اور علوم دینیہ میں پایۂ بلند نہیں رکھتے تھے، یہاں تک کہ "شرح وقایہ" جیسی فقہ کی متوسط کتاب کے درس میں بھی ان کو اپنے اوپر پورا اعتماد نہیں تھا، شاہ عبدالعزیز صاحبؒ کے

۱؎ صدرا ہندوستان کے نصابِ درس میں گیارھویں صدی ہجری سے داخل ہے اس کے حصول اور اس میں مہارت کے بغیر طالب علم فارغ التحصیل اور فاضل نہیں سمجھا جاتا تھا۔ ۲؎ صحیح زاہد

ملفوظات میں ہے کہ :۔

امیرے شرح وقایہ می خواند بے حضور جدّ بزرگوار سبق نمی فرمود۔[1]	ایک امیر میرزاہد سے شرح وقایہ پڑھتا تھا (لیکن فقہ میں اپنے اوپر اعتماد نہ ہونے کی وجہ سے) وہ اس وقت تک سبق نہیں پڑھاتے تھے، جب تک کہ دادا صاحب (شاہ عبدالرحیم صاحب جو معقولات میں خود ان کے شاگرد تھے) نہ آجاتے۔

اس کے مقابلہ میں معقولات میں ایسا توغّل تھا کہ فرماتے تھے :۔

تقریر مرزا جان جان من است،	مرزا جان کی تقریر تو میری جان ہے،
و تقریر اخوند جان جان من است[2]،	اور اخوند کی تقریر میری جان جاناں ہے

ایران کا یہ اثر نہ صرف افغانستان اور ہندوستان پر، بلکہ شام و عراق تک پر پڑ رہا تھا، اور وہاں بھی معقولات کے علماء کو عزت و احترام کی نظر سے دیکھا جاتا تھا، اور ان علوم کا ذہن پر رعب و اثر تھا، اور اس کی کتابیں نصاب تعلیم میں شامل ہوتی جاتی تھیں۔

عام اخلاقی، معاشرتی اور اعتقادی حالت

علمی اشتغال، کثیر التعداد اہل کمال، سلاسل و طرق کی مقبولیت، حدیث نبوی سے اغنیاء، اور ... سے حکّام کی دینداری، اور ان مسلم حکومتوں کی موجودگی میں جن کا

---

[1] ملفوظات - ۸۲ [2] ایضاً - ۸۳

عقیدہ اسلام پر اور عملی زندگی کے بہت سے شعبوں اور عائلی قانون میں شریعت پر تھا، مدارس آباد اور مسجدیں معمور تھیں، جمہور اور عوام اسلام پسند، دین دوست، علماء کے قدردان، مشائخ اور بزرگوں کے معتقد، دین کے ارکان و فرائض پر عامل تھے، اور ان کے دل حمیتِ اسلامی سے بھی خالی نہ تھے، عالم اسلام میں عمومی طور پر جمود و تنزل پایا جاتا تھا، اخلاق و معاشرت میں فساد آچکا تھا، اہل عجم اور غیر مسلموں کے بہت سے شعائر اور ان کے عادات مسلمانوں نے اختیار کر لئے تھے، حکام میں خود سری، اور سلطنتوں میں مطلق العنانی پائی جاتی تھی، امراء اور اغنیاء کا طبقہ دولت اور تموّل کے بُرے اثرات سے متاثر اور بہت جگہ "مترفین" کے اخلاق و رجحانات کو اختیار کر چکا تھا، معاشرہ کے بہت سے طبقوں پر کسل مندی، تعطّل، سرکار دربار سے وابستگی اور تملّق و خوشامد کی عادت غالب آگئی تھی، بہت سے حلقوں میں توہمات کا زور تھا، توحید خالص کے حدود سے تجاوز، اولیاء کی تقدیس اور حد سے بڑھی ہوئی تعظیم اور قبر پرستی، اور کہیں کہیں شرک جلی کے نمونے بھی نظر آتے تھے۔

امریکی مصنف ڈاکٹر لوتھراپ اسٹاڈرڈ (LOTHROP STODDARD) نے اپنی شہرۂ آفاق کتاب (NEW WORLD OF ISLAM) (جدید دنیائے اسلام) میں اٹھارویں صدی کی اسلامی دنیا کا نقشہ کھینچا ہے، جس میں اگرچہ کہیں کہیں مبالغہ اور بے اعتدالی پائی جاتی ہے، لیکن مجموعی طور پر وہ اس وقت کے عالم اسلام کی یکسر غلط تصویر نہیں ہے[1]، اور اس میں اس کے وہ بہت سے گوشے آگئے ہیں، جو اندر رہنے والوں اور ہر وقت کے دیکھنے والوں کو اکثر نظر نہیں آتے،

---

[1] نامور مسلمان مبصر و مورخ امیر شکیب ارسلان نے اس کتاب کے عربی ترجمہ (جو "حاضر العالم الاسلامی" کے نام سے شائع ہوا ہے) کے شہرۂ آفاق حواشی میں عالم اسلام کے اس عمومی جائزہ اور تصویر کشی کی تصویب و تحسین کی ہے، اور اس کو واقعہ کے مطابق بتایا ہے۔

اور نئے آنے والے اور پہلی بار دیکھنے والے کو اپنی طرف ملتفت کر لیتے ہیں، اس کی صحت کی پوری ذمہ داری لئے بغیر اس کا یہاں نقل کرنا غلط اور بے محل نہ ہوگا، وہ لکھتا ہے:۔

"اٹھارویں صدی تک اسلامی دنیا اپنے ضعف کی انتہا کو پہونچ چکی تھی، صحیح قوت کے آثار کسی جگہ نہیں پائے جاتے تھے، ہر جگہ جمود و تنزل نمایاں تھے، آداب و اخلاق قابل نفرت تھے، عربی تہذیب کے آخری آثار مفقود ہو کر ایک قلیل تعداد وحشیانہ عشرت میں اور عوام وحشیانہ ذلت میں زندگی بسر کرتے تھے تعلیم مردہ ہو گئی تھی، اور چند درسگاہیں، جو ہولناک زوال میں باقی تھیں، وہ افلاس و غربت کی وجہ سے دم توڑ رہی تھیں، سلطنتیں مطلق العنان تھیں، اور ان میں بدنظمی اور خون ریزی کا دور دورہ تھا، جگہ جگہ کوئی بڑا خود مختار جیسے سلطانِ ٹرکی یا ہند کے شاہان مغلیہ کچھ شاہی شان قائم کئے ہوئے تھے، اگرچہ صوبہ جات کے امرا اپنے آقاؤں کی طرح آزاد سلطنتیں جو ظلم و استحصال بالجبر پر مبنی تھیں، قائم کرنے کے بہت کوشاں تھے، اسی طرح امراء متواتر سرکش، مقامی رئیسوں اور قطاع الطریق کی جماعتوں کے خلاف جو ملک کو آزار پہونچاتے تھے، برسرِ پیکار رہتے تھے، اس منحوس طرز حکومت میں رعایا لوٹ مار اور ظلم و پامالی سے نالاں تھی، دیہاتیوں اور شہریوں میں محنت کے محرکات مفقود ہو گئے تھے، لہٰذا تجارت و زراعت دونوں اس قدر کم ہو گئی تھیں کہ محض سدِ رمق کے لئے کی جاتی تھیں۔

مذہب بھی دیگر امور کی طرح پستی میں تھا، تصوف کے طفلانہ توہمات کی کثرت نے خالص اسلامی توحید کو ڈھک لیا تھا، عوام و جہال تعویذ، گنڈے اور مالائیں پہن کر گندے فقراء اور دیوانے درویشوں سے اعتقاد رکھتے تھے، اور بزرگوں کے مزاروں پر زیارت کو جاتے تھے، اور ان کی پرستش بارگاہ ایزدی کے شفیع و ولی کے طور پر کی جاتی تھی،

کیونکہ ان جہاں کا خیال تھا کہ خدا ایسا برتر ہے کہ وہ اس کی طاعات بلا واسطہ نہیں ادا کر سکتے، قرآن مجید کی اخلاقی تعلیم کو نہ صرف پس پشت ڈال رکھا تھا، بلکہ اس کی خلاف ورزی بھی کی جاتی تھی، افیون اور شراب خوری عام ہو رہی تھی، زنا کاری کا زور تھا، اور ذلیل ترین اعمال قبیحہ کھلم کھلا بے حیائی کے ساتھ کئے جاتے تھے"۔[1]

---

[1] "سیرت سید احمد شہید" جلد اول ص ۶۹-۷۰، مقتبس از "جدید دنیائے اسلام" مترجمہ جمیل الدین صاحب بدایونی علیگ۔

بابِ دوم

ہندوستان

سیاسی حالت

حضرت شاہ ولی اللہ صاحب کی ولادت سلطان اورنگ زیب عالمگیر کی وفات (۱۱۱۸ھ) سے چار سال پہلے (۱۱۱۴ھ میں) ہوئی، عالمگیر اس تحتی برّاعظم کا اس ملک کی معلوم و محفوظ تاریخ کی روشنی میں اشوک کے بعد (اگر اس کی سلطنت کی وسعت و عظمت سے متعلق بیانات صحیح اور قابلِ اعتماد ہیں) ہندوستان کا سب سے بڑا فرمانروا، اور اس کی سلطنت ہندوستان میں قائم ہونے والی سلطنتوں میں سب سے زیادہ وسیع تھی، کیمبرج ہسٹری کے مصنفین لکھتے ہیں کہ:۔

"اس کی حکومت غزنی سے چٹاگانگ تک اور کشمیر سے کرناٹک تک وسیع تھی۔"[۱]

دوسرے مؤرخ لکھتے ہیں:۔

"قدیم زمانہ سے انگریزوں کے عروج تک ہندوستان میں اتنی طویل و عریض حکومت کبھی قائم نہیں ہوئی تھی۔"[۲]

اسی کے عہد میں اور اسی کے ایماء پر میر جُملہ نے صدیوں کے بعد پہلی مرتبہ آسام کو (جو اپنی زبان،

---

[۱] CAMBRIDGE HISTORY OF INDIA, V. 4 P 316
MUSLIM RULE IN INDIA, D.P. MAHAJAN, DELHI. 1971

[۲] CAMBRIDGE HISTORY OF THE WORLD, P. 175, DELHI, 1970

تہذیب، مذہب اور نسل میں ہندوستان سے الگ ایک آزاد منطقہ رہا ہے) فتح کر کے ایک بار سلطنتِ مغلیہ میں شامل کر لیا[1]۔ تمام مغربی اور غیر مسلم ہندوستانی مؤرخین کے ان تنقیدی و اختلافی تبصروں کے باوجود جن کا محرک دراصل اورنگ زیب کی حمیّت وحمایت اسلام ہے[2]، اس کی بے نظیر قوتِ ارادی، استقلالِ طبیعت، انتظامی صلاحیت، سادہ بلکہ زاہدانہ زندگی اور شجاعت وبہادری ایک مسلّم تاریخی حقیقت ہے[3]۔

اورنگ زیب عالمگیر

اورنگ زیب نے زمامِ سلطنت ہاتھ میں لینے کے بعد اپنی پوری توجہ عہدِ اکبری کے مخالفِ اسلام اثرات کو مٹانے، تشیعیت کے اثر کو کم کرنے (جس کا بڑا مرکز جنوب تھا، اور اسی لئے اس نے اپنی زندگی اور توانائی کا بڑا حصہ اس کی تسخیر میں صرف کیا) ایران کے ان مجوسیت آمیز تہذیبی اثرات کو جو دورِ اکبری میں قائم ہو گئے تھے، اور جو ایرانی تقویم اور جشنِ نوروز کی شکل میں پائے جاتے تھے، ختم کرنے کے اقدامات کئے، محتسب کا شرعی عہدہ قائم کیا، تاکہ وہ خلقِ خدا کو منہیّات ومحرّمات سے منع کرے، حکومت کی بیش قرار نامشروع آمدنیاں موقوف کیں، سرود ورقّاصی اور جھروکہ درشن کو بند کیا، شرعی قاضی مقرر کئے اور ان کو اعلیٰ اختیارات دیئے، پوری سلطنت میں شرعی قانون وآئین جاری کرنے، اور قاضیوں کی آسانی کے لئے مسائل فقہیہ کی تدوین وترتیب کا بیڑا اٹھایا جس کے نتیجہ میں "فتاویٰ عالمگیری" کے نام سے ایک ایسا مجموعہ تیار ہوا جو مصر، شام وترکی میں بھی

---

[1] تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو "مآثرِ عالمگیری" از محمد ساقی مستعد خاں ص ۳۹-۴۰، کلکتہ ۱۸۷۱ء، نیز وقائع سیر وسیاحت ڈاکٹر برنیر DR. BERNIER ص ۲۹۴ [2] تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو "تاریخ دعوت وعزیمت" حصہ چہارم ص ۲۲۳-۲۲۴

[3] ملاحظہ ہو اسٹینلی لین پول کی کتاب "اورنگ زیب" AURANGZEB، اور ظہیر الدین فاروقی کی کتاب AURANGZEB & HIS AGE، نیز جادوناتھ سرکار کی کتاب HISTORY OF AURANGZEB، اور مولانا شبلی کے مضامین عالمگیر۔

(جہاں وہ الفتاوی الھندیۃ کے نام سے مشہور ہے) قانون اسلامی کا ایک بڑا اور مستند ماخذ سمجھا گیا، کورنش و آداب کے غیر اسلامی اور غیر موحّدانہ طریقے منسوخ کئے، اور سلام مسنون کا اجرا کیا قصہ مختصر بقول اقبال ؎

شعلۂ توحید را پروانہ بود

چوں براہیم اندریں بت خانہ بود

ن اصلاحی و انقلابی کارناموں کے ماسوا جو دینی قدر و قیمت کے حامل ہیں اس کی سب سے نمایاں صفت اس کی بیدار مغزی، مستعدی، فرض شناسی اور امور سلطنت میں جزو کل سے واقفیت اور نظم و نسق پر کلّی طور پر حاوی ہونے کی کوشش ہے جو اس خداداد وسیع سلطنت کے فرماں روا کے لئے شرط اول ہے، اس نے اپنے والد شاہجہاں بادشاہ کو ایک خط میں لکھا تھا، اور تاریخ اس کی تصدیق کرتی ہے کہ "کاہل وجودی کا الزام مجھ پر عائد نہیں ہوسکتا"[1] ایک امیر کو جواب دیتے ہوئے (جس نے یہ مشورہ دیا تھا کہ شہنشاہ کاروبار سلطنت میں محنت شاقہ سے کام نہ لیں کہ اس سے اندیشہ ہے کہ ان کی صحت پر بُرا اثر پڑے) کہا تھا کہ "مجھ کو پروردگار نے دوسروں کے واسطے محنت کرنے کے لئے بھیجا ہے" اور شیخ سعدیؒ کا یہ شعر پڑھا ؎

الا تا بغفلت نہ خسپی کہ نوم

حرام است بر چشم سالار قوم[2]

مملکت کی اس وسعت کے باوجود اس کے نظم و نسق پر بذات خود مطلع اور حاوی ہونا اسی شخص کا کام ہے، جو آہنی عزم، فولادی جسم، حد درجہ کا احساس ذمہ داری اور خوف خدا رکھتا ہو، حیرت کی بات یہ ہے کہ اس کی نظر جتنی ملکی کلیات اور مہمات سلطنت پر تھی اتنی ہی

---

[1] ملاحظہ ہو ظفرنامہ شاہجہاں [2] اورنگ زیب از اسٹینلی لین پول ص ۷۲-۷۳

جزئیات پر، وہ دکن میں تھا، مگر شمال مغرب اور مشرق کی خبر رکھتا تھا، اپنی ذاتی اطلاعات اور پرچہ نویسوں کی مدد سے امور انتظامی کی باریک سے باریک تفصیلات جانچتا تھا، جس کی وجہ سے عمّالِ سلطنت جہاں بھی رہتے چوکنا اور مستعد رہتے، وہ ادنیٰ ادنیٰ محرّروں کا تقرر خود کرتا تھا[1]، اس کا یہ شعر اس کے دل کی صحیح ترجمانی اور اس کے احساس ذمہ داری اور اس کے نتیجہ میں اس کی مشکلات کی صحیح تصویر ہے، وہ اکثر اپنا ہی یہ شعر پڑھتا تھا ؎

غمِ عالم فراوان است و من یک غنچہ دل دارم
چساں در شیشۂ ساعت کنم ریگ بیاباں را[2]

کبھی کبھی یہ شعر بھی پڑھتا اور اس پر اس کا عمل تھا ؎

من نمی گویم زیاں کن یا بفکرِ سود باش
اے ز فرصت بے خبر در ہر چہ باشی زود باش

اورنگ زیب کے کمزور جانشین

لیکن اورنگ زیب کے بعد اس کے عظیم اور پُر جلال تخت پر (جو ماحیِ دین بننے کے بجائے حامیِ دین اور ہادمِ ملت کے بجائے خادمِ ملت بن گیا تھا) اس کی اولاد میں وہ لوگ آئے جنھوں نے گویا قسم کھائی تھی کہ عالمگیر سے حمایت و حفاظتِ اسلام، احیاءِ دین اور اجراءِ سنت کی جو "غلطی" ہوئی تھی، وہ اس کی تلافی کریں گے، نیز اس نے سلطنت کے حدود میں جو توسیع کی تھی، ہندوستان کے نظم و نسق کو اپنی بیدار مغزی، مستعدی، اور فرض شناسی سے جو استحکام بخشا تھا، عوام اور فتنہ پردازوں پر جو رعب و اثر قائم کیا تھا، وہ اپنی تعیّش پسندی

---

[1] اورنگ زیب از اسٹینلی لین پول ص۶۹   [2] تاریخ ہندوستان ص۴۷۵ ج ۸

کاہلی و نااہلی، اندرونی اختلاف و کشمکش، خود غرض و جاہ پسند ارکانِ سلطنت و وزراء پر کُلّی اعتماد، اور امور سلطنت سے غفلت کے ذریعہ اس "گناہ" کا جو عالمگیر اعظم سے سرزد ہوا تھا، مسلسل کفّارہ ادا کرتے رہیں گے، چنانچہ یہ مُغل سلطنت ہی نہیں، ملت اسلامیہ ہی نہیں، ہندوستان کی بدقسمتی تھی کہ اس کے تختِ سلطنت پر یکے بعد دیگرے کمزور و نااہل حکمراں آتے رہے اور تاریخ کی یہ بوالعجبی اور خدا کی شان بے نیازی و کبریائی کا ظہور تھا کہ اس کا پہلا ہی جانشین (شاہ عالم بہادر شاہ اول) اپنے نامور باپ کا بالکل ضد تھا۔

حضرت شاہ ولی اللہ صاحبؒ کے عہد (۱۱۱۴ھ - ۱۱۷۶ھ) میں اورنگ زیب کے بعد گیارہ مغل بادشاہ تخت نشین ہوئے، جن کے نام حسب ذیل ہیں:۔

۱۔ محمد معظّم بہادر شاہ (ملقّب بشاہ عالم بہادر شاہ اول)

۲۔ مُعزّ الدین جہاندار شاہ۔

۳۔ فرخ سیر ابن عظیم الشان۔

۴۔ نیکوسیر۔

۵۔ رفیع الدرجات ابن رفیع القدر۔

۶۔ رفیع الدولہ بن رفیع القدر۔

۷۔ محمد شاہ ابن جہاں شاہ۔

۸۔ احمد شاہ ابن محمد شاہ۔

۹۔ عزیز الدین عالمگیر ابن جہاندار شاہ۔

۱۰۔ محی السنّہ بن کام بخش بن عالمگیر۔

۱۱۔ شاہ عالم ابن عزیز الدین۔

گویا نصف صدی کی مدت میں گیارہ[11] بادشاہ تخت نشین ہوئے، ان میں سے کسی کی مدت حکومت صرف دس مہینے[1]، کسی کی چار مہینے[2] سے کم، کسی کی سلطنت برائے نام[3]، کسی کی چند دن کی حکومت رہی[4]، ہم یہاں پر اس کے جانشین اول شاہ عالم بہادر شاہ، فرخ سیر ابن عظیم الشان، محمد شاہ اور شاہ عالم ثانی کے عہد اور ان اہم واقعات وحوادث پر تبصرہ کریں گے جنھوں نے ہندوستان کی تاریخ، اور ہندوستانی مسلمانوں کی تقدیر بنانے میں خاص حصہ لیا۔

شاہ عالم بہادر شاہ اول ۱۱۱۸ھ - ۱۱۲۴ھ

یہ عالمگیر کا سب سے بڑا بیٹا تھا جو دوسرے فرزند محمد اعظم شاہ کو شکست دے کر تخت نشین ہوا، عالمگیر کے مزاج و مسلک سے اس کے اختلاف کا سب سے بڑا اور پہلا ثبوت یہ ہے کہ اس نے شیعی مسلک اختیار کیا، جو نہ صرف عالمگیر کے عقیدہ و مزاج و مذاق کے خلاف تھا، بلکہ پورے تیموری سلسلۂ فرمانروایان سلطنت کے عقیدہ و مذہب اور طرز و مسلک کے خلاف تھا، اور اس سلطنت کے مصالح کے بھی مخالف تھا (جس کی مسلمان آبادی کا نوے[90] پچانوے[95] فی صدی حصہ ہندوستان کے مشرقی حدود بنگالہ سے لے کر سلطنت کے مغربی حدود کابل و قندھار تک سنی فرقہ اور حنفی مذہب کا پیرو کار تھا) اور جس کی ہندوستان میں کامیابی اور مقبولیت کے کوئی امکانات نہ تھے، "سیر المتاخرین" کے مصنف غلام حسین طباطبائی کے بیان کے مطابق (جو خود اثنا عشری فرقہ سے تعلق رکھتے ہیں، اور جن کی شیعیت تاریخی سیاق و سباق

---

[1] معز الدین جہاندار شاہ [2] رفیع الدرجات ابن رفیع القدر، مدت حکومت تین ماہ دس روز

[3] رفیع الدولہ ابن رفیع القدر [4] محی السنۃ ابن کام بخش ابن عالمگیر۔

کے اندر سے بھی جھلکتی نظر آتی ہے) بہادر شاہ کے شیعہ مذہب اختیار کرنے، اس مسئلہ پر علماء اہل سنت سے مباحثہ و مناظرہ کرنے، خطبہ میں کلمہ "علیؑ ولی اللہ وصی رسول اللہ" کے داخل کرنے کا حکم دینے پر لاہور میں جہاں بادشاہ کا قیام تھا، شورش برپا ہوئی، بلوا ہوا، انھوں نے خود اس کے رواج نہ پکڑنے کا ذکر کیا ہے، وہ لکھتے ہیں:۔

بہادر شاہ بدستور اصرار باین کار داشتہ	بادشاہ بدستور اس بات پر اصرار کرتا رہا
در ترویج و تقویت مذہب شیعی کوشید،	اور مذہب شیعہ کی ترویج و تقویت میں
ومدت ہائے دراز در مباحثہ بعلماء بازبود	ساعی و سرگرم رہا، مدتوں تک علماء
اما فائدہ برآں مترتب نمی شد۔[1]	کے ساتھ مباحثہ کا دروازہ کھلا رہا،
	لیکن اس سے کچھ فائدہ مترتب نہیں ہوا۔

اس تبدیلی کا نتیجہ عوام اور خود فوج میں نیم دلی بلکہ بددلی کی شکل میں نکلا، اور اس میں وہ مذہبی جوش نہیں رہا، جو گزشتہ مغل بادشاہوں کے دور میں ایک بڑی قوتِ محرکہ تھی، اس حقیقت کا احساس بعض غیر مسلم مورخوں تک کو ہوا ہے، ڈاکٹر ستیش چندر لکھتے ہیں کہ "حکومت کی پالیسی پر مذہب کا اثر کمزور پڑ گیا۔"[2]

مولوی ذکاء اللہ صاحب تاریخ ہندوستان میں لکھتے ہیں:۔

"عالمگیر کے مرنے کے بعد سلطنت کے کاموں میں انقلابات عظیم ہو گئے تھے، اور تمام تعلقات کی صورت بدل گئی تھی، اور مرہٹوں سے جو سلطنت تیموریہ کے تعلقات تھے، وہ بالکل کایا پلٹ ہو گئے تھے، .... سلطنت مغلیہ کمزور ہو کر قریب المرگ تھی،

---

[1] "سیر المتاخرین" ج ۲ ص ۳۸۱

[2] DR. SATISH CHANDRA PARTIES AND POLITICS IN THE MUGHAL COURT, 1707–40. ALIGARH, 1959. P. 40

مگر مرتے دم تک اپنی نخوت و تکبر سے ہاتھ نہیں اٹھایا۔"[1]

وہ عالمگیر جو اورنگ آباد میں ہوتا تو دہلی کا کیا ذکر بہار و بنگال میں بھی کارکنانِ سلطنت پر، اس کی ہیبت طاری رہتی، وہ جزئیاتِ سلطنت سے باخبر رہتا، اور بروقت مناسب احکام جاری کرنے میں ذرا سی تاخیر سے کام نہ لیتا، اب اس کے جانشین کا حال یہ تھا کہ بقول مؤرخ ہندوستان:۔

"باضابطہ و بے ضابطہ اجراءِ کار میں فوراً تفاوت ہوتا، بادشاہ کی دستخط کا اعتبار نہیں رہا، بادشاہ اپنے متصدّیوں سے فرمایا کرتا کہ سب اہل کار آپس میں مل گئے ہیں، جو بہتر جانتے ہیں عمل میں لاتے ہیں، ہمارا فقط اعتبار رہ گیا ہے، خلق کے مطلب قبول کرنے کے سوا ہم کو کوئی اور چارہ نہیں ہے۔"[2]

نیز وہ لکھتے ہیں:۔

"ظریف شوخ طبعوں نے اس کی تاریخ جلوس "شہہ بے خبر" کہی ہے، راتوں کو جاگتا، دوپہر دن چڑھے تک سوتا جس کے سبب سے خلق اللہ کو سفر کے دن تکلیف ہوتی کہ ان کو اپنے خیموں کی شکل نہ ملتی۔"[3]

نیز:۔

"تیسرا کام اس نے اپنے آئین کے خلاف یہ کیا کہ علماء پر عتاب و خطاب کیا، اور جابجا محبوس کیا، پھر مزاج پر خفقان کا غلبہ ایسا ہوا کہ دارالسلطنت لاہور میں ۱۹ محرم ۱۱۲۴ھ ہجری کو جہان فانی سے رخصت ہوا۔"[4]

طباطبائی بھی شاہ عالم بہادر شاہ کے اخیر عمر میں اختلالِ دماغ، کتّوں کے مارنے کا حکم اور سحر کے اندیشہ کا ذکر کرتے ہیں[5]۔

---

[1] "تاریخ ہندوستان" مولوی ذکاء اللہ دہلوی۔ ج ۹ ص ۳۳ [2] ایضاً ص ۳۸ [3] ایضاً [4] ایضاً [5] سیر المتاخرین ص ۳۸۱-۳۸۲

اس طرح عالمگیر کے پہلے ہی جانشین کے زمانہ اور صرف ۶ برس کی مدت سلطنت میں عظیم سلطنت مغلیہ کی چولیں ہل گئیں، اور اس کی وہ ساکھ اور دھاک ختم ہوگئی جو مخالف طاقتوں، فتنہ پردازوں، اور عوام و خواص کے دماغ پر بابر کے زمانہ سے بیٹھی ہوئی تھی۔

فرّخ سیر

فرّخ سیر (۱۱۲۵ھ سے ۱۱۳۱ھ) کے زمانہ میں حسین علی خاں، عبداللہ خاں (جن میں سے اول الذکر امیر الامراء کے لقب سے اور ثانی الذکر قطب الملک کے لقب سے ملقّب تھے) کا اقتدار بادشاہ اور پوری سلطنت پر قائم ہوگیا، فرّخ سیر ان کے ہاتھ میں کھلونا تھا، آخر انھوں نے فرخ سیر کو قید کیا، پھر قید حیات سے بھی رہا کر دیا، مصنف "تاریخ ہندوستان" لکھتا ہے:۔

"اگرچہ محمد فرّخ سیر وسیع الاخلاق اور قدردان تھا، ہر ایک کی خدمت اور تردد کے مقابل میں چاہتا تھا کہ بقدر امکان منصب و عمدہ خدمات عنایت کر کے ہم چشموں میں ممتاز کرے، مگر اختیار نہیں رکھتا تھا، اور نہ آزمودہ کار جوان تھا، امور سلطنت سے بے خبر، خورد سالی سے صوبہ بنگالہ میں باپ دادا سے دور نشوونما پایا، استقامت مزاج اور رائے صائب نہیں رکھتا تھا، اوروں کی رائے پر چلتا تھا، قسمت سے تاج و سلطنت مل گیا تھا، خاندان تیموریہ کا جوہر شجاعت تھا، وہ اس کے خلاف جُبن ذاتی رکھتا تھا، صاحبِ غرض کی سخن کی تہہ پر نہ پہونچتا، ابتدا سے اپنی سلطنت کا مادّۂ فساد خود ہی بنا۔"[1]

بادشاہ کے یہاں راجہ رتن سنگھ (دیوانِ سید عبداللہ خاں) تمام متصدیوں کے تعلّق میں دخل دیتا، کسی کا اصلاً اعتبار و استقلال اس نے نہیں رکھا تھا، خصوصاً مقدمات مالی میں......

---

[1] ایضاً ص ۱۰۹

بادشاہ کی عیاشی، خلوت نشینی علاوہ بے دماغی کے زیادہ ہوگئی تھی، خلق اللہ کا کاربند تھا۔[1]

بالآخر دونوں بھائیوں (قطب الملک و امیر الامراء) نے فرخ سیر کی آنکھوں میں سلائی پھیری اور قلعہ کے اندر حبس خانہ میں جو قبر کی صورت تھا، بادشاہ کو قید کیا اور ۶ سال ۴ ماہ حکومت کر کے وہ اس دنیا سے رخصت ہوا، ان واقعات نے پورے ملک میں تخت مغلیہ کے جانشینوں کی بے احترامی اور سلطنت کی بے اعتباری پیدا کر دی۔

محمد شاہ بادشاہ (م ۱۱۶۱ھ)

محمد شاہ نے ۲۹ سال ۶ مہینے حکومت کی اس کا عہد پُر از حوادث و واقعات ہے، اسی کے زمانہ میں نادر شاہ کا دہلی پر تاریخی حملہ ہوا لیکن اس وقت سلطنت پر حاوی اور اس کے سیاہ سپید کے مالک یہی دونوں سادات بارہہ قطب الملک عبداللہ خاں اور امیر الامراء حسین علی خاں تھے، اس وقت اہل دربار کا تاثر یہ تھا کہ "اُن دونوں کے تسلّط سے بادشاہ کو سوائے نماز جمعہ کے کسی احکام کے جاری کرنے کا مقدور نہیں ...... دونوں بھائی تمام خاندان ایران و توران کی بے آبروئی پر کمر باندھے بیٹھے ہیں، اور ترک منصب اور گوشہ نشینی میں رستگاری نہیں، اور تمام موروثی خانہ زادوں، اور دور و نزدیک جاں نثار نوکروں کا دل نہایت افسردہ ہو رہا ہے کہ وارث تخت و تاج بے اختیار ہے، اور نماز جمعہ اور اجرائے احکام شرع پر قادر نہیں، آگرہ کے نزدیک سے کنارۂ دریائے شور تک ہنود بُت خانے بنا رہے ہیں، اور گاؤکشی کو منع کر رہے ہیں۔"[2]

"کل امور مالی و ملکی میں رتن چند کے اختیار سے جو سوائے قوم بارہہ اور قوم بقّال

---

[1] ایضاً ص ۱۳۰ [2] تاریخ ہندوستان۔ ج ۹ ص ۱۶۶

کے کسی پر نوازش نہیں کرتا تھا، سب چھوٹے بڑے متنفر تھے، اور ہر دیار کے شرفاء خواری و بے اعتباری سے زیست کرتے تھے۔"[1]

"سیر المتاخرین" کا مصنف طباطبائی لکھتا ہے:-

"بادشاہ چون جوان بے عزم و کم جرأت	بادشاہ چونکہ بے عزم اور کم جرأت
بود مشغول عیش و طرب گردید در امرے کہ	جوان تھا، عیش و عشرت میں مشغول
اشد ضرور بود توجہ می نمود......	ہو کر صرف اسی کام پر توجہ دیتا
باین سبب اندک اندک خوف و ہراس	جو اشد ضروری ہوتا، اس سبب سے
از دل امراء و رؤساء ہر فرقہ بلکہ	تھوڑا تھوڑا کر کے خوف و ہراس
عوام الناس برخواستہ ہرکس در دماغ	ہر فرقہ کے امراء و رؤسا بلکہ عوام الناس
خود خیالے می پخت، و بجائے خود نشستہ	کے دل سے نکل گیا، ہر شخص اپنے
در باطن دم در استقلال می زد۔"[2]	دماغ میں ایک خیال پختہ کئے ہوئے
	اپنی جگہ بیٹھا ہوا، اپنی آزادی و
	خود مختاری کا دم بھرتا تھا۔

اس وقت دربار و اراکین سلطنت میں نظام الملک آصف جاہ ہی کی ایک ایسی ہستی تھی، جو صاحبِ عزم، عالی ہمت ہونے کے ساتھ صاحب تخت کی وفادار، مخلص اور خیر خواہ تھی، لیکن سادات اور ایرانی عنصر کسی طرح ان کی بات چلنے نہیں دیتا تھا، یہ دیکھ کر کہ ان کی وفاداری اور خلوص کی کوئی قدر نہیں ہے، اور یہاں رہنا وقت ضائع کرنا، اور اپنے کو ہر وقت خطرہ میں مبتلا کرنا ہے، انھوں نے عرصہ ہوا دکن کا رخ کیا تھا، اور دہلی کا میدان

---

[1] تاریخ ہندوستان۔ ج ۹ ص ۱۸۲ — [2] سیر المتاخرین۔ ج ۲ ص ۴۵۸

اہلِ غرض کے لئے خالی ہو گیا تھا۔

اس کے بعد محمد شاہ پر تعیُّش کا وہ غلبہ ہوا کہ انھوں نے اس سے پہلے کے عیش پسندوں کو مات کر دیا، اور ان کے واقعات بھلا دیئے، ہندوستان کے مؤرخین لکھتے ہیں کہ :-

"محمد شاہ بادشاہ نے مذہب تو نہیں بدلا لیکن مشرب بدل دیا، ابر سیاہ ان کا نقیب قرار پایا، عام حکم تھا کہ ادھر ہمالیہ کے دامن سے گھٹا اٹھے، بادل گرجے کہ میرا خیمہ و خرگاہ صحرا زوانہ ہو ؂

می دید صبح کلہ بستہ سحاب — الصبوح الصبوح یا اصحاب
ژالہ بارید بر رُخ لالہ — المدام المدام یا احباب

کا شور تھا۔"

بالآخر امیر الامراء سید حسین اور قطب الملک نواب عبد اللہ خاں (حسن علی خاں) سادات بارہہ کے اقتدار کا خاتمہ اور زندگی کا جام لبریز ہوا لیکن اس سے بھی سلطنت مغلیہ کی قسمت نہیں بدلی، اس لئے کہ بادشاہ حکمرانی کی ہر صلاحیت اور خطرات کے سمجھنے کی معمولی بصیرت سے بھی محروم تھا۔

سید ہاشمی فرید آبادی اپنی تاریخ ہند میں لکھتے ہیں :-

"بادشاہ گر سادات کے خاتمے اور محمد شاہ کی قوت و اختیار حاصل کرنے کی ملک میں عام طور پر خوشی منائی گئی لیکن یہ خوشی اگر جذبۂ بادشاہ پرستی پر نہیں بلکہ آئندہ نظم و نسق کی بہتری، اور ملکی رفاہ و بہبود کی امیدوں پر مبنی تھی تو اس کا انجام رنج و مایوسی کے سوا کچھ نہ تھا، کیونکہ اکبر و اورنگ زیب کا نیا جانشین، درحقیقت اپنے اقبال مند اجداد کی شاہانہ صفات سے عاری تھا

اسے اپنے عیش و عشرت کے مشغلوں میں معاملات ملک پر توجہ کرنے کی فرصت نہ تھی، وہ محل سرائے شاہی کی بیگمات سے بھی زیادہ سلطنت کے حالات سے بے خبر اور اس کی خرابی کی طرف سے بے پرواہ تھا حتیٰ کہ اس کی دادی (شاہ عالم بہادر شاہ کی ملکہ مہر پرور) کی نسبت ہم جا بجا پڑھتے ہیں کہ وہ بھی اپنے مدہوش پوتے کو بار بار اس خواب غفلت سے بیدار کرنے کی کوشش کرتی تھی، جس کا صریح نتیجہ زوال و ادبار تھا۔"[1]

اس موقعہ پر ہم کو جادو ناتھ سرکار کی اس رائے کو بھی ملحوظ رکھنا چاہیے جو انھوں نے محمد شاہ کی کمزوریوں پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا ہے، وہ لکھتے ہیں :-

"محمد شاہ اگرچہ عزت کا مستحق نہیں، مگر رحم کا مستحق ضرور ہے، حالات نے اسے ایسی جگہ لا کھڑا کیا تھا، جہاں کسی عبقری (GENIUS) کی ضرورت تھی، مگر وہ ایک معمولی انسان تھا، مؤرخ اسے اس بات پر ملامت کرتے ہیں کہ اس نے کاروبار حکومت انجام دینے کے بجائے تعیُّش میں اپنا وقت صرف کیا، لیکن حالات کی ٹریجڈی یہ تھی کہ اس کے جیسا آدمی اگر کاروبار حکومت پر پوری توجہ دیتا تب بھی وہ حالات کا رخ نہیں موڑ سکتا تھا، رفیع الدرجات اور رفیع الدولہ جیسے لوگ کٹھ پتلیوں کی طرح اپنی ذلت کے احساس سے بھی عاری تھے لیکن محمد شاہ میں بدترین حالات، اور انھیں سدھارنے میں اپنی لاچاری دونوں کا احساس موجود تھا۔"[2]

---

[1] تاریخ ہند از فرید آبادی کتاب سوم صـ۲۶۱

[2] FALL OF THE MUGHAL EMPIRE P. 373-74

غرض وہ سلطنت جو بابر کے عزم جہاں کشا اور اس کے استقلال اور جفاکشی سے قائم ہوئی تھی، اور جس کو اس کے جانشینوں نے اورنگ زیب تک اپنے جوہر شجاعت اور غیرت تیموری سے قائم رکھا تھا، اس عیش کوشی اور غفلت اور خود فراموشی کی منزل پر پہونچ گئی، جو موروثی اور مطلق العنان سلطنتوں کی تاریخ بلکہ تقدیر بن گئی ہے، اقبالؔ نے صحیح کہا ہے ؎

میں تجھ کو بتاتا ہوں تقدیر امم کیا ہے
شمشیر و سناں اول، طاؤس و رباب آخر

آخر اس کا نتیجہ وہی نکلا جس کو خود محمد شاہ نے ۔ ع

شامتِ اعمال ما صورت نادر گرفت

کے بلیغ مصرعہ میں ادا کیا، ۱۱۵۱ھ میں نادر شاہ نے دہلی کا رخ کیا، اس نے اس سے پہلے محمد شاہ کو کئی خط لکھے تھے، لیکن بقول مؤرخ :۔

"یہاں اِن دنوں عیش و عشرت کا زور شور تھا، محمد شاہ بہادر صاحب سریر تھا تن آسانی کے سوا کسی کام سے کام نہ تھا، ہر وقت ہاتھ میں جام اور بغل میں دل آرام تھا، کس کو دماغ تھا کہ نامہ کا جواب لکھتا"[1]

نادر شاہ کے حملہ کی تفصیلات ہندوستان کی تاریخوں میں پڑھی جائیں، اس کے حملہ کے بعد دہلی کی جو حالت ہوئی (ذہن میں رہے کہ اس وقت حضرت شاہ ولی اللہ صاحبؒ کی عمر ۲۷ سال کی تھی، اور وہ حجاز سے واپس تشریف لا چکے تھے) اس کا نقشہ مصنف تاریخ ہندوستان کی زبان سے سنا جائے:۔

"نادر شاہ کے جانے کے بعد شہر مُردوں سے پُر تھا، اور زندوں سے خالی تھا، مکانوں پر ویرانی برستی تھی، محلے کے محلے جلے پڑے تھے، مُردوں کی سڑاند سے بھیجا نکلا جاتا تھا،

---

[1] تاریخ ہندوستان۔ ج ۹ ص ۲۵۱

نہ کوئی کسی کو کفن دینے والا تھا، اور نہ گور میں دفن کرنے والا تھا، مگر ہندو مسلمان ایک ہو گئے، ڈھیروں میں جل کر خاکستر ہو گئے، یہ تو شہر کی کیفیت تھی، دربار کا حال یہ تھا کہ کچھ دنوں تو وہ بھاری نیند سوتا رہا، اور جب اٹھا تو اس کی آنکھوں میں اس قدر چیپڑ لگا ہوا تھا کہ دیکھنے سے گھن آتی تھی، خزانہ میں پھوٹا با دام نہ تھا، محاصل اور خراج کا کہیں پتہ نہ تھا، سپاہ تباہ اور خستہ حال تھی، اس پر مرہٹوں کا بھی خوف بالکل نہیں گیا تھا، جو صوبے ان کے قبضہ میں چلے گئے تھے، وہ ان کے ہاتھ سے تباہ ہوئے تھے، ان سب مصیبتوں اور آفتوں پر درباریوں کا جھگڑا نہ چکا، وہی ایک فریق تورانی امیروں کا تھا جن کے سرتاج آصف جاہ اور قمرالدین خاں وزیر تھے، دوسرا گروہ ان امیروں کا تھا، جو ان کو خارج کرنا چاہتا تھا، اور ان میں بادشاہ بھی شمار ہوتے، اگر بیچ میں مرہٹوں کا جھگڑا نہ آن پڑتا تو ان امیروں نے سلطنت کے ٹکڑے کرکے کبھی کے آپس میں تقسیم کر لئے ہوتے، اور خاندان تیموریہ کو بے نام و نشان کر دیا ہوتا۔[1]

جب نادر شاہ ہندوستان سے چلا گیا تو اول اس کا اثر یہ ہوا کہ سلطنت دہلی سے تین زرخیز صوبے بنگال، بہار، اڑیسہ علیحدہ ہو گئے، اور ان میں جدا ہی علی وردی خاں کی ایک ریاست قائم ہو گئی۔[2]

۲۶ ربیع الثانی ۱۱۶۱ھ (اپریل ۱۷۴۸ء) کو محمد شاہ مرض اسہال میں مبتلا ہو کر دنیا سے رخصت ہوا، اور بقول مصنف "تاریخ ہندوستان" کہ تیس سال سلطنت کرکے خاندان تیموریہ ہی کو تباہی کے کنارہ پر پہونچا گیا۔[3]

---

[1] تاریخ ہندوستان۔ ج ۹ صـ ۲۴۲ [2] ایضاً صـ ۲۶۲ [3] ایضاً صـ ۲۸۴۔

شاہ عالم ثانی

محمد شاہ کے زمانہ میں اگر سلطنت مغلیہ کو اخلاقی و انتظامی طور پر زوال ہوا، اور ہندوستانی معاشرہ اور طبقۂ امراء کا رجحان الناس علیٰ دین ملوکھم کے اصول کے مطابق عیش و عشرت، تن آسانی اور لذت اندوزی کی طرف تیزی کے ساتھ ہوا، تو شاہ عالم ثانی کے زمانہ میں جو ۱۱۷۳ھ (۱۷۵۹ء) میں تخت نشین ہوا، سیاسی طور پر زوال اپنے آخری مرحلہ تک پہونچ گیا، وہ اپنے ۴۸ سالہ عہد حکومت میں دوسروں کے ہاتھوں میں کٹھ پتلی بنا رہا، بکسر کی لڑائی میں اودھ کے نواب وزیر شجاع الدولہ اور میر قاسم کی انگریزوں کے ہاتھوں شکست کھانے کے بعد ۱۷۶۴ء میں شاہ عالم نے انگریزوں کی اطاعت قبول کرلی، اور ایک معاہدہ پر دستخط کر دیئے، جس کی رو سے وہ انگریزوں کا وظیفہ خوار ہو گیا، ۱۷۶۵ء میں اس نے انگریزوں سے ایک معاہدہ کیا جس کی رو سے بنگال، بہار، اور اڑلیسہ کی دیوانی کے اختیارات، محاصل کی تحصیل وصول کا انتظام ایسٹ انڈیا کمپنی کے ہاتھ میں آگیا، شاہ عالم نے خود کو مرہٹوں کی پناہ میں دے دیا، اور الٰہ آباد اور کڑہ کے اضلاع اُن کی طرف منتقل کر دیئے۔

شاہ عالم ثانی کے عہد سے بہت پیشتر سے پورا ملک مرہٹوں، سکھوں اور دہلی و آگرہ اور راجپوتانہ جاٹوں کے رحم و کرم پر تھے، جو آندھی پانی کی طرح آتے اور پورے علاقہ کو تاراج کر جاتے، ملک میں کوئی طاقت امن و قانون قائم کرنے کے قابل نہ تھی،[۱] احمد شاہ ابدالی نے ۱۴؍ جنوری ۱۷۶۱ء کو پانی پت کے میدان میں مرہٹوں کو شکست فاش دے کر ملک کو ان کے خطرہ سے محفوظ کر دیا، اس نے شاہ عالم کو دہلی بلانے کی بڑی کوشش کی اور اپنا آدمی بھیجا، مجبور ہو کر اس کی والدہ نواب زینت محل سے بھی خط لکھوایا، اگر سلطنت مغلیہ میں تھوڑی سی بھی جان اور شاہ عالم میں سلطنت کی

---

[۱] تفصیل کتاب کے باب نہم میں ملاحظہ ہو۔

صلاحیت ہوتی تو وہ جنگ پانی پت کے نتیجہ سے فائدہ اٹھا کر ہندوستان میں اپنا اقتدار بحال کر لیتا لیکن سلطنت بے روح، اور بادشاہ عزم و ہمت ہی نہیں، حمیت اور غیرت سے بھی عاری تھا بقول اقبال۔ ع

حمیّت نام ہے جس کا، گئی تیمور کے گھر سے

بادشاہ پورے دس برس کے بعد ۱۷۷۱ء میں الٰہ آباد سے دہلی آیا، وقت گذر چکا تھا، اس لئے وہ پانی پت کی اس عظیم الشان فتح اور مرہٹوں کی شکست سے کوئی فائدہ نہیں اٹھا سکا وہ یہاں آکر نئے فتنوں، امراء کے جوڑ توڑ، روہیلوں کی نئی طاقت اور سکھوں کے حملوں سے دوچار ہوا، بالآخر نجیب الدولہ کے پوتے غلام قادر روہیلہ نے ۱۷۸۸ء میں دہلی پر قبضہ کر لیا، شاہی محل لوٹا، شہزادیوں کو کوڑے لگوائے اور سلطنت تیموری کے وارث مغل شہنشاہ کی آنکھیں نوک خنجر سے نکال لیں سلطنتِ مغلیہ اور اس کے مالک و وارث کی بے حرمتی و بے آبروئی اس سے پہلے ایسی کبھی نہیں ہوئی تھی۔

۱۷۸۹ء میں سندھیہ نے غلام قادر کو بڑے دردناک طریقہ پر قتل کیا، اور شاہ عالم کو دوبارہ تخت پر بٹھایا، نو لاکھ روپیہ سالانہ اس کے اخراجات کے لئے مقرر کیا، متعدد لڑائیوں کے بعد ۱۸۰۳ء میں لارڈ لیک انگریزی فوج کے ساتھ دہلی میں داخل ہوا، مرہٹوں کو نکال دیا، اور بادشاہ کی پنشن ایک لاکھ روپیہ سال مقرر کر دی[۱]، شاہ عالم ۴۵ برس تخت نشین اور ۱۸ سال نابینا رہ کر ۱۸۰۶ء میں راہی ملک بقا ہوا۔

علمی و روحانی حالت

سیاسی انتشار، اجتماعی بد نظمی اور انحطاط کے باوجود یہ دور انفرادی طور پر علمی کمالات،

---

[۱] تاریخ ہندوستان۔ ج ۹ ص ۳۴۳، بعض انگریزی تاریخوں میں نو سے ہزار بیان کی گئی ہے۔

تدریسی و تصنیفی انہماک، روحانی یکسوئی، باطنی ترقی اور نفوس کے تزکیہ و اصلاح کا دور تھا جس میں متعدد ایسی باکمال اور ممتاز شخصیتیں پیدا ہوئیں جن کو اس دورِ انحطاط سے کوئی مناسبت اور جن پر حالات سے یاس و ہراس کا کوئی اثر نہیں معلوم ہوتا، کہتے ہیں کہ بہت سے علمی و ادبی شاہکار ان افراد کی کوششوں اور کاوشوں کا نتیجہ ہیں، جو کسی مزمن مرض میں مبتلا، یا کسی معذوری اور اندرونی صدمہ کا شکار تھے، علمائے نفسیات اس کی یہ توجیہ کرتے ہیں کہ ایسی حالت میں قوتِ مقابلہ اور اس مجبوری کی تلافی کا عزم ابھر آتا ہے اور آدمی سے ایسے کام کرا لیتا ہے جو معتدل (NORMAL) حالات میں نہیں ہوتا، ہندوستان کے اس دور کا علمی اور روحانی پہلو، اور اس دورِ انحطاط میں ایسی قدآور شخصیتوں کا ظہور، ایک مریض اور بر سرِ انحطاط معاشرہ کی اندرونی قوتِ مقابلہ کا ثبوت اور اسلام کی مرد آفرینی اور آدم سازی کی صلاحیت کی دلیل ہے۔

وفورِ علم، ذہانت، قوتِ تدریس اور حسنِ تصنیف کے لحاظ سے ہمیں اس دور میں مولانا احمد بن ابو سعید عرف ملا جیون امیٹھوی (سنہ ۱۰۴۷ھ - سنہ ۱۱۳۰ھ) صاحب "نور الانوار" اور "التفسیرات الاحمدیہ" ملا حمد اللہ سندیلوی (م سنہ ۱۱۶۰ھ) صاحبِ "شرح سلم" مشہور بحمد اللہ، مولانا محمد حسن معروف بملا حسن فرنگی محلی صاحبِ شرح سلم مشہور بملا حسن (م سنہ ۱۱۹۹ھ)، مولانا رستم علی قنوجی (م سنہ ۱۱۷۸ھ) شیخ صفۃ اللہ خیر آبادی (م سنہ ۱۱۵۵ھ) شیخ علی اصغر قنوجی (م سنہ ۱۱۴۰ھ)، مولانا غلام علی آزاد بلگرامی (سنہ ۱۱۱۰ھ - سنہ ۱۲۰۰ھ) مولانا غلام نقشبند لکھنوی (م سنہ ۱۱۲۶ھ) قاضی محب اللہ بہاری (م سنہ ۱۱۱۹ھ) مصنف "سلم العلوم" و "مسلم الثبوت" (جنھوں نے تقریباً ایک صدی تک ہندوستان کے علماء و مدرسین کو ان دونوں کتابوں کی شرح و تحشیہ میں مشغول رکھا، اور ان کی کتابیں مصر تک کے علماء کبار اور اساتذۂ ازہر کی مرکزِ توجہ رہیں) قاضی مبارک گوپاموی (م سنہ ۱۱۶۲ھ) مصنف شرح سلم معروف بقاضی، مولانا محمد اعلیٰ تھانوی مصنف کشاف اصطلاحات الفنون (جو اپنے موضوع پر بے نظیر کتاب

ہے) اور سب سے اول و آخر میں ملا نظام الدین لکھنوی (م ۱۱۶۱ھ) جن کے ترتیب دیئے ہوئے درس کا سکہ ہندوستان سے بخارا اور سمرقند تک رواں ہے اور جن کو مصنف "نزہۃ الخواطر" نے "غیث الإفادة الهتون، العالم بالرسم المسکون، أستاذ الأساتذة وإمام الجهابذة" کے القاب سے یاد کیا ہے، جیسے سرآمد روزگار، اور فخر بلاد و امصار عالم، مدرس، مصنف اور پوری پوری علمی تحریک اور سلسلۂ تدریس و تربیت کے بانی اسی صدی کے رجال و اعیان میں تھے۔[1]

سلوک و طریقت کے لحاظ سے دیکھئے تو اس صدی میں حضرت مرزا مظہر جان جاناںؒ (۱۱۱۱ھ۔۱۱۹۵ھ) سلسلۂ نقشبندیہ مجددیہ کی ہستی موجود تھی، جن کے متعلق خود حضرت شاہ ولی اللہ صاحبؒ کی شہادت ہے کہ "ہر زمانہ میں ایسے بزرگ زیادہ تعداد میں پائے نہیں جاتے، چہ جائیکہ ایسے زمانہ میں جو فتنہ و فساد سے پر ہے۔"[2]

سلسلہ قادریہ کے مشہور بزرگ اور ملا نظام الدین بانی درس نظامی کے مرشد حضرت سید عبدالرزاق بانسوی (م ۱۱۳۶ھ) سلسلۂ چشتیہ نظامیہ کے مجدد شاہ کلیم اللہ جہان آبادی (م ۱۱۴۲ھ) اور اسی سلسلہ کے ناشر و امام شاہ فخر الدین (شاہ فخر دہلوی) (م ۱۱۹۹ھ)، سلسلۂ قادریہ کے مشہور شیخ شاہ محمد غوث قادری لاہوری (م ۱۱۵۴ھ)، سلسلہ نقشبندیہ کے شیوخ کاملین شیخ محمد عابد سنامی (م ۱۱۶۰ھ) خواجہ محمد ناصر عندلیب (والد خواجہ میر درد) (م ۱۱۷۲ھ) شاہ منیب اللہ بالاپوری اور حضرت شاہ نور محمد بدایونی[3] (م ۱۱۳۵ھ) اس عہد میں مسند آرا اور فیض رساں نظر آتے ہیں، غرض یہ زمانہ سلاسل ثلاثہ قادریہ، چشتیہ، نقشبندیہ کے شیوع و انتشار کا زمانہ تھا، اور تینوں سلسلوں کے شیوخ کاملین موجود تھے، حضرت شاہ عبدالعزیز

---

[1] مستفاد از "نزہۃ الخواطر" ج ۶۔ [2] "کلمات طیبات" ص ۶۵۔ [3] یہ اسمائے گرامی، ان کے سنین وفات اور امتیازی خصوصیات "نزہۃ الخواطر" تصنیف مولانا حکیم سید عبدالحی حسنی، جلد ششم سے اخذ کئے گئے ہیں۔

رحمۃ اللہ علیہ کا ملفوظ ہے :-

درعہد محمد شاہ بادشاہ بست ودو بزرگ صاحب ارشاد از ہر خانوادہ در دہلی بودند، وایں چنیں اتفاق کم می شود۔[1]	محمد شاہ بادشاہ کے زمانہ میں بائیس[22] بزرگ صاحب ارشاد مختلف خانوادوں سے تعلق رکھنے والے دہلی میں موجود تھے، اور ایسا اتفاق کم ہوتا ہے۔

اخلاقی و معاشرتی پستی

لیکن ان نامور اہل کمال، اور مسیحا نفس شیوخ کاملین کی موجودگی میں واقعہ یہ ہے کہ ہندوستان کا مسلم معاشرہ اور خاص طور پر طبقۂ امراء سلطنت کے اثر، سیاسی زوال، دولت کی فراوانی، اور ایرانی تہذیب کے اثر سے اخلاقی زوال کے نقطۂ عروج کو پہونچ گیا تھا، اور اسی وجہ سے وہ اس کردار کے ادا کرنے سے قاصر تھا، جو طبقۂ امراء نے ہر دور میں انقلاب سلطنت کے موقعہ پر ادا کیا ہے، اسی طبقہ میں سے (جو SECOND LINE رہا ہے) وہ افراد سامنے آئے ہیں جنھوں نے اس خلا کو پُر کر دیا ہے، جو سیاسی وانتظامی میدان میں پیدا ہو جاتا تھا، سید ہاشمی فرید آبادی نے صحیح لکھا ہے :-

"ہندوستان کی دولت وثروت نے خود اس طبقۂ امراء کو نہایت عیش پسند اور تن آسان بنا دیا تھا، .... ہم ان امیروں کی ساری کوشش و قابلیت ادنیٰ اغراض کے لئے سازش اور ریشہ دوانی میں صرف ہوتے دیکھتے ہیں، انقلاب سلطنت اور حصولِ پادشاہی تو درکنار، کسی مسلمان امیر کو اپنے اپنے مقام پر علانیہ خود مختاری کا اعلان کرنے کی بھی جسارت نہ ہوتی، اور اس عرصہ میں ادھر تو نظم و نسق کی اندرونی خرابیاں

---

[1] ملفوظات عزیزیہ ص۱۰۶

بڑھتی رہیں، اور ادھر حکمراں طبقہ کے افراد سے انتظام حکومت اور اشتراک عمل کی صلاحیت ہی رفتہ رفتہ مفقود ہوگئی۔[۱]

شاہ عبدالعزیز صاحبؒ فرماتے ہیں:۔

بخانۂ قمرالدین خاں عورات غسل اخیر را	نواب قمرالدین خاں کے گھر میں عورتیں
از گلاب می کردند، وخانۂ دیگر نواب برصد	اخیر کا غسل گلاب سے کرتی تھیں، دوسرے
روپیہ گل وپان برائے عورات می رفت۔[۲]	نواب کے گھر میں تین سو روپے کے پھول اور
	پان عورتوں کے لئے جاتے تھے۔

مولانا غلام علی آزاد بلگرامی "مآثر الکرام" میں لکھتے ہیں کہ:۔

"اورنگ آباد کے لوگ بالاتفاق بیان کرتے ہیں کہ امیرالامراء (حسین علی خاں) کے عہد میں شہر کے اکثر لوگ اپنے گھر میں کھانا نہیں پکاتے تھے، امیرالامراء کی سرکار کے باورچی اپنا حصہ بیچ ڈالتے تھے، پُرتکلف پلاؤ کی ایک قاب چند پیسوں میں لوگوں کو مل جاتی تھی۔"[۳]

اعتقادی کمزوری اور شرک و بدعات کا زور

اس معاشرتی اور اخلاقی پستی سے زیادہ خطرناک، اور خدا کی نصرت سے محروم، اور حقیقی طاقت سے عاری کرنے والی خرابی ضعیف الاعتقادی، قرآن مجید کے اعلان "اَلَا لِلّٰہِ الدِّیْنُ الْخَالِصُ"[۴] کے خلاف بکثرت عوام کی زندگی، مسلم معاشرہ میں بدعات کا زور، ہندوؤں اور شیعوں کے بہت سے رسوم وعادات کی تقلید تھی، شرک جلی کی ایسی متعدد صورتیں بہت سے مقامات اور حلقوں میں پائی جاتی تھیں،

---

[۱] تاریخ ہند کتاب سوم از مولوی سید ہاشمی فریدآبادی ص۲۶۲-۲۶۳، حیدرآباد ۱۹۲۱ء۔

[۲] ملفوظات عزیزی۔ [۳] مآثر الکرام۔ ج ۱ ص ۱۷۰ [۴] الزمر۔ ۳

جن کی کوئی علمی توجیہ ممکن نہیں کھلی ہوئی قبر پرستی، مشائخ کے لئے سجدۂ تعظیمی، مزارات اور اس کے قرب و جوار کا حرم کی طرح احترام، قبروں پر چادریں چڑھانا، منّتیں ماننا، بزرگوں کے نام پر قربانیاں کرنا، مزارات کا طواف، وہاں میلہ لگانا، تہوار منانا، گانا بجانا اور چراغاں کرنا، اور مختصر الفاظ میں ان کو قبلہ وکعبہ اور ملجا وماویٰ سمجھنا، کوئی ایسا واقعہ اور منظر نہ تھا جس کو دیکھنے کے لئے بہت دور جانے اور بہت دیر انتظار کرنے کی ضرورت ہوتی، شیخ سدّو کا بکرا، سید احمد کبیر کی گائے، غازی میاں کے جھنڈے اور چھڑیاں، محرم کے تعزیئے، غیر اسلامی تہواروں کو شان و شوکت سے منانا، بیماریوں کے دفع کرنے میں ارواح خبیثہ اور بعض اوقات دیوی دیوتاؤں کی رضاجوئی اور خوف، چیچک کی بیماری میں سیتلا کی تعظیم، اولیاء وصالحین کے لئے منّتیں ماننا اور قربانیاں کرنا، اولیاء اور نیک بیبیوں کے نام سے روزے کی نیت کرنا اور ان سے اپنی حاجت براری اور مقاصد کی تکمیل کو وابستہ کرنا، اور اس سلسلہ میں خاص دن، خاص کھانے (بی بی کی صحنک، مخدوم صاحب کا توشہ وغیرہ) اور ان میں خاص آداب کی پابندی، یہ اور ایسے بہت سے عنوانات ہیں، جن کے ماتحت توہمات، عقائد فاسدہ، رسوم جاہلیت اور التزامات اور پابندیوں کا ایک طویل سلسلہ ہے، علی بخش، حسین بخش، پیر بخش، مدار بخش، اور سالار بخش، نام عام تھے۔

ایک بڑے دائرہ میں عقیدۂ توحید اس مفہوم میں محدود ہو کر رہ گیا تھا کہ بلا شبہ اللہ تعالیٰ ہی زمین و آسمان اور کائنات کا حقیقی خالق اور صانع ہے، اور وہی معبود حقیقی ہے، اور بڑے بڑے امور وہی انجام دیتا ہے لیکن اس نے سلاطین عالم کی طرح اپنی سلطنت کے بہت سے شعبے اور محکمے اپنے مقبول بندوں کے سپرد کر دیئے ہیں، جو ان کے مالک و مختار ہیں، اور سیاہ سپید کرتے رہتے ہیں، اب ان کو راضی کئے اور ان سے رابطہ قائم کئے بغیر اس سلسلہ میں کوئی کامیابی اور کار براری نہیں ہو سکتی، شرک صرف یہ ہے کہ خدا کے سوا کسی اور ہستی کو اس دنیا کا صانع و خالق اور مالک حقیقی سمجھا جائے،

اور اس کو براہ راست عبادت و سجدہ کا (بلا توسل اور شفاعت کے خیال کے) مستحق سمجھا جائے۔[1]

غرض بارہویں صدی کا ہندوستان سیاسی، انتظامی، اخلاقی، اور بہت حد تک اعتقادی حیثیت سے انحطاط و پستی کے اس نقطہ پر پہونچ گیا تھا، جو اسلامی ملکوں کے زوال، اور مسلم معاشرہ کی پستی کا افسوسناک اور خطرناک مرحلہ ہوتا ہے، مولانا سید سلیمان ندویؒ نے اس مجموعی صورت حال کا نقشہ اپنے ایک مضمون میں بڑی بلاغت و اختصار کے ساتھ کھینچا ہے، وہ لکھتے ہیں:۔

"مغلیہ سلطنت کا آفتاب لب بام تھا، مسلمانوں میں رسوم و بدعات کا زور تھا، جھوٹے فقراء اور مشائخ اپنے بزرگوں کی خانقاہوں میں مسندیں بچھائے، اور اپنے بزرگوں کی مزاروں پر چراغ جلائے بیٹھے تھے، مدرسوں کا گوشہ گوشہ منطق و حکمت کے ہنگاموں سے پرشور تھا، فقہ و فتاویٰ کی لفظی پرستش ہر مفتی کے پیش نظر تھی، مسائل فقہ میں تحقیق و تدقیق مذہب کا سب سے بڑا جرم تھا، عوام تو عوام خواص تک قرآن پاک کے معانی و مطالب، اور احادیث کے احکامات و ارشادات، اور فقہ کے اسرار و مصالح سے بے خبر تھے"[2]

---

[1] اس تصور توحید اور نقطۂ خیال کی توضیح، شاہ صاحب کے اعتقادی اصلاح و تجدید کے باب میں تفصیل سے آئیگی وہاں ملاحظہ کی جائے۔ [2] مقالات سلیمانی ص۲۴۴

بابِ سوم

شاہ صاحب کے اجداد و والد بزرگوار

شاہ صاحب کے اجداد

شاہ صاحب کے اجداد اولین کا زمانہ (جو شیخ شمس الدین مفتی کے زمانہ سے شہر رہتک میں قیام پذیر رہے) ہندوستان کی علمی و تصنیفی تاریخ کا وہ عہد ہے، جب یہاں تذکرے و تراجم کی تصنیف کا دور عام طور پر شروع نہیں ہوا تھا، زیادہ تر نامور مشائخ طریقت کے انفرادی تذکرے تھے، جن میں محبوبِ الٰہی سلطان المشائخ خواجہ نظام الدین اولیاء کا تذکرہ سیر الاولیاء (مرتبہ امیر خورد) خاص امتیاز رکھتا ہے، یا صلحاء و مشائخ وقت کے ملے جلے تذکرے تھے، جن میں دو کتابیں خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں، ایک شاہ محمد بن حسن غوثی مندوی کی گلزارِ ابرار (جس میں زیادہ تر مانڈو و مالوہ کے صلحاء و مشائخ کا تذکرہ ہے) دوسرے حضرت شیخ عبدالحق محدث دہلوی کی اخبار الاخیار، اہلِ کمال اور نامور اشخاص کے تذکروں کی کمی تھی، جن میں مختلف خاندانوں کے برگزیدہ اشخاص یا مختلف علاقوں کی ممتاز شخصیتوں کا (جو کسی سلسلہ کی بانی یا اس کی اہم کڑی نہیں تھیں) تعارف و تذکرہ ہو، ان تذکروں میں بھی قدرتاً مرکزی یا علاقائی دار السلطنت اور اس کے اطراف، اور ہندوستان کے مرکزی و تاریخی شہروں کی نامور شخصیتوں کا تذکرہ زیادہ ہے، جن کے حالات و کمالات سے واقفیت کے ذرائع مصنف کو

آسانی سے میسّر تھے، شاہ صاحبؒ کا خاندان شیخ شمس الدین مفتی کے وقت سے جدّ بزرگوار شیخ وجیہ الدینؒ کے عہد تک رہتک میں رہا، جس کو یہ مرکزیت واہمیت حاصل نہ تھی، اس لئے ان تذکروں میں بھی ان کے حالات و وقائع عام طور پر نہیں ملتے۔

یہ باب بالکل تشنہ رہتا اور شاہ صاحبؒ کے تذکرہ نویس یا اس خاندان کی تاریخ لکھنے والے کو سخت زحمت پیش آتی، اگر خود شاہ صاحب اپنے اجداد کے تذکرہ میں امداد فی مآثر الاجداد کے نام سے ایک مختصر رسالہ خود قلم بند نہ فرما دیتے[1]، اس میں بھی اجداد اولین کا تعارف و تذکرہ نہایت اجمال و اختصار کے ساتھ اور جدّ امجد شیخ وجیہ الدین کا (بوجہ قرب زمانہ اور قلت وسائط) نسبتاً تفصیل کے ساتھ کرایا گیا ہے، انھیں اشارات کو لے کر مصنف حیات ولی مولوی حافظ محمد رحیم بخش مرحوم دہلوی نے اپنی انشا پردازی سے بہت پھیلا کر لکھا ہے، جو کتاب کے ۱۱۳ صفحات میں آیا ہے، انھوں نے شاہ صاحبؒ کے اس بنیادی تذکرہ میں (جو سب سے مستند اور قابل اعتماد ماخذ ہے) دوسری معاصر تاریخوں اور کتابوں سے جو مضامین اضافہ کئے ہیں، ان میں صفحات تو علیحدہ رہے، کتاب اور مصنف کا نام بھی کہیں نہیں ہے، اس وجہ سے ہم صرف مآثر الاجداد ہی پر اکتفا کریں گے۔

شجرۂ نسب

شاہ صاحبؒ نے جو فاروقی النسب ہیں، اس رسالہ کے شروع میں حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ تک اپنا شجرہ نسب درج کر دیا ہے، شمس الدین مفتی جو اس خاندان میں سب سے پہلے رہتک آئے،

---

[1] یہ رسالہ متوسط تقطیع پر دس صفحات میں آیا ہے، اور شاہ صاحبؒ کے پانچ رسائل کے مجموعہ میں شامل ہے جس کا پہلا رسالہ "انسان العین" ہے..... مطبوعہ مطبع احمدی دہلی، "انفاس العارفین" میں سات رسائل کا جو اضافہ ہے اس میں بھی شامل ہے۔

اور طرح اقامت ڈالی ان کے ایک بھائی سالار حسام الدین تھے، ان کی اولاد میں شاہ ارزانی بدایونی ایک بزرگ گذرے ہیں، ان کے خاندان کے نسب ناموں سے بھی اس کی تصدیق ہوتی ہے، یہاں پر یہ شجرۂ نسب من وعن درج کیا جاتا ہے۔

"شاہ ولی اللہ بن الشیخ عبدالرحیم بن الشہید وجیہ الدین بن معظم بن منصور بن احمد بن محمود بن قوام الدین عرف قاضی قاذن بن قاضی قاسم بن قاضی کبیر عرف قاضی بدہ بن عبدالملک بن قطب الدین بن کمال الدین بن شمس الدین بن شیر ملک بن محمد عطا ملک بن ابوالفتح ملک بن عمر حاکم ملک بن عادل ملک بن فاروق بن جرجیس بن احمد بن محمد شہریار بن عثمان بن ماہان بن ہمایون بن قریش ابن سلیمان بن عفان بن عبداللہ بن محمد بن عبداللہ بن عمر بن الخطاب[1]"

اس نسب نامہ میں کئی ناموں کے ساتھ "ملک" خطاب آتا ہے، شاہ صاحب تحریر فرماتے ہیں،

"یہ زمانۂ قدیم میں تعظیمی لقب تھا، جیسے ہمارے زمانہ میں خان"

خاندان کی ہندوستان آمد

شاہ صاحبؒ کی روایت کے مطابق ان کے خاندان کے پہلے بزرگوار جنھوں نے رہتک میں قیام اختیار کیا، (اور غالباً وہی ہندوستان میں سب سے پہلے آئے) وہ شیخ شمس الدین مفتی تھے، ان واسطوں اور پشتوں کی تعداد اور ان کی طبعی اور تقریبی عمروں کے حساب سے اندازہ ہوتا ہے کہ شیخ شمس الدین مفتی ساتویں صدی کے آخر یا آٹھویں صدی ہجری کے اوائل میں ہندوستان آئے ہوں گے۔

---

[1] الامداد فی مآثر الاجداد مشمولہ مجموعۂ رسائل حضرت مولانا شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ مطبوعہ مطبع احمدی دہلی؛ انفاس العارفین مطبوعہ مطبع مجتبائی (۱۳۳۵ھ) میں الامداد فی مآثر الاجداد کا جو نسخہ شامل ہے (ص ۱۵۸ - ص ۱۶۸) اس میں جو شجرۂ نسب درج ہے اس میں متعدد اغلاط اور نقائص ہیں جو غالباً طباعت کی غلطی اور تصحیح کی بے توجہی کا نتیجہ ہے، مذکورہ بالا نسخہ مشمولہ مجموعہ رسائل تنہا قابل اعتماد ہے، اور اسی سے شجرہ نقل کیا گیا۔

جب تاتاریوں کے حملے سے عالمِ اسلام کا مشرقی حصہ زیر و زبر، خاندانوں کی عزتیں برباد، ان کے علمی اندوختے غارت، اور ایران و ترکستان کے نامی گرامی شہر تاراج و بے چراغ ہو رہے تھے، تاریخ فیروز شاہی اور دوسری تاریخوں سے معلوم ہوتا ہے کہ اسی زمانہ میں عراق، ایران، و ترکستان کے شریف و نجیب خاندان اور ذی علم و باکمال خانوادے کثرت سے ہندوستان آئے، جہاں ترکی النسل سلمان خاندانوں کی حکومت تھی، اور جنھوں نے تاتاری حملہ آوروں کو ترکی بہ ترکی جواب دے کر ہندوستانی سرحدوں سے پسپا اور اس ملک کو نہ صرف ان کی غارت گری سے محفوظ بلکہ اپنی دین پروری اور معارف نوازی سے دارالعلم اور ایک وسیع مدرسہ بنا دیا تھا، جہاں جا بجا درس کے حلقے، یادالٰہی اور تزکیۂ نفس کے مرکز، اور اہلِ قلم اور اہلِ تحقیق کے لئے سکون و اطمینان کے ساتھ اپنا کام کرنے کے مواقع تھے[1]۔

رُہتک کا قیام

ایسا معلوم ہوتا ہے اور شاہ صاحبؒ کے بیان سے بھی ظاہر ہوتا ہے کہ رُہتک اُس وقت کی نئی اسلامی سلطنت کا ایک اہم شہر، اور مغرب سے دہلی کی طرف آنے والی اسلامی افواج، مجاہدین، داعیانِ اسلام اور مشائخ و علماء کی دہلی سے پہلے کی ایک اہم منزل اور فرودگاہ تھی، شاہ صاحبؒ فرماتے ہیں کہ قریش کی نسل سے پہلے جو بزرگ اس شہر میں آئے، اور ان کی وجہ سے اسلامی شعائر کا غلبہ اور کفر و جاہلیت کا زوال ہوا، وہ شیخ شمس الدین مفتی ہی تھے، شاہ صاحب نے ان کی بعض کرامتوں کا بھی ذکر کیا ہے، جو ان کی بزرگی اور اس زمانہ کے حالات کے لحاظ سے باعث استعجاب نہیں، اس زمانہ میں جو صاحب علم و فضل

---

[1] تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو "تاریخ دعوت و عزیمت" حصہ سوم ص ۱۹-۲۱

مسلمان اس شہر میں قیام کرتا تھا، اس کو قضا و احتساب کا عہدہ اور شہر کا نظم و نسق بھی سپرد ہو جاتا تھا، لیکن اس زمانہ میں اس کو قاضی و محتسب کے لقب سے یاد نہیں کرتے تھے۔

شیخ شمس الدین مفتی سے شیخ وجیہ الدین تک

شیخ شمس الدین مفتی کے انتقال کے بعد ان کی اولاد میں سب سے بزرگ فرد کمال الدین مفتی، ان کے بعد ان کے صاحبزادہ قطب الدین، ان کے بعد ان کے فرزند عبد الملک ان عہدوں پر فائز اور ان ذمہ داریوں کو پورا کرتے رہے، ان حضرات کے بعد قضاۃ کا باقاعدہ ان اطراف میں تعیّن ہونے لگا، شیخ عبد الملک کے صاحبزادہ قاضی بدہ نے اپنے خاندان کی اس روایت اور وجاہت کو قائم رکھا، ان کے دو لڑکوں سے ان کی نسل چلی، اس خاندان کی شادیاں رُہتک کے صدّیقیوں اور سونی پت کے سادات میں ہوئیں، شیخ محمود کی (جو شاہ ولی اللہ صاحبؒ کے جدّ خامس ہوتے ہیں، اور جنھوں نے عہدہ قضا ترک کر کے حکومت کے عہدوں کو سنبھالا) شادی سونی پت کے سادات میں ہوئی، جن سے ایک صاحبزادہ شیخ احمد پیدا ہوئے، شیخ احمد نے صغر سنی میں رہتک کو خیرباد کہا، اور شیخ عبد الغنی بن شیخ عبد الحکیم کے ساتھ سونی پت میں بود و باش اختیار کی، شیخ عبد الغنی نے اپنی صاحبزادی سے ان کا عقد کر دیا، اور مدت تک ان کی تربیت کی، اس کے بعد وہ رُہتک آئے، اور قلعہ کے باہر ایک عمارت بنائی، اور اپنے اہل تعلق کو مجتمع کیا، ان کے صاحبزادہ شیخ منصور وجاہت شجاعت اور حکومت کے فضائل کے جامع تھے، ان کی پہلی شادی شیخ عبد اللہ بن شیخ عبد الغنی کی صاحبزادی سے ہوئی، ان کے صاحبزادہ شیخ معظم اسم با مسمّٰی اور با ہیبت و وجاہت بزرگ تھے، شجاعت کا بڑا جوہر رکھتے تھے،

واقعات عجیبہ کا ان سے صدور ہوا، شاہ صاحبؒ اپنے والد حضرت شاہ عبدالرحیمؒ کی زبانی بیان کرتے ہیں کہ شیخ منصور کی ایک راجہ سے جنگ ہوئی، لشکر کا میمنہ شیخ معظم کے سپرد کیا گیا، اس وقت ان کی عمر بارہ[۱۲] سال کی تھی، سخت معرکہ پیش آیا، اور دونوں طرف کے بہت سے لوگ مقتول ہوئے، اس درمیان میں کسی نے شیخ معظم سے کہہ دیا کہ ان کے والد شیخ منصور نے شربت شہادت نوش فرمایا، اور لشکر اسلامی کو شکست ہوئی، یہ سن کر ان کی غیرتِ اسلامی اور رگِ فاروقی حرکت میں آئی، وہ مردانہ وار حریف لشکر میں گھس گئے اور صفیں درہم برہم کرتے ہوئے بڑی کوشش کے بعد راجہ کے ہاتھی تک پہونچ گئے، ایک بڑا مخالف سردار مقابلہ میں آیا، انھوں نے تلوار کے ایک وار سے اس کے دو[۲] ٹکڑے کر دیئے، اس کے ساتھیوں نے شیخ معظم کو گھوڑے پر سے اتار لیا، لوگوں نے ان پر ہجوم کیا، اس راجہ نے سب کو ڈانٹا اور منع کیا، اور کہا کہ ایسا نوعمر ایسی جواں مردی اور جرأت دکھائے، یہ تو عجائبات زمانہ میں سے ہے، راجہ نے ان کے دونوں ہاتھ لے کر چومے اور بڑے احترام سے پیش آیا، اور پوچھا کہ اتنا غصہ کیوں ہے؟ کہا کہ مجھے یہ اطلاع ملی کہ میرے والد شہید ہو گئے، میں نے ارادہ کیا کہ میں حملہ کروں اور مخالف لشکر کے سردار کو جب تک ٹھکانہ نہ لگا دوں دم نہ لوں، میں نے تہیہ کر لیا تھا کہ یا ماروں یا مر جاؤں، راجہ نے کہا جس نے تم کو یہ اطلاع دی اس نے جھوٹ کہا، تمہارے والد زندہ ہیں اور ان کے جھنڈے وہ نظر آرہے ہیں، اس وقت راجہ نے شیخ منصور کے پاس کسی کو بھیجا کہ ہم نے اِس لڑکے کی خاطر صلح کر لی، اور جو کہا گیا اس کو منظور کیا اور واپس گیا۔

شاہ صاحبؒ اپنے والد صاحبؒ کی زبانی موضع شکوہ پور کے (جو شیخ معظم کی تعلقہ داری میں تھا) ایک معمر زمیندار کی یہ روایت بھی بیان کرتے ہیں کہ ایک مرتبہ تیس[۳۰] ڈاکو اس گاؤں کے مویشیوں کو لوٹ لے گئے، اس وقت شیخ معظم تنہا وہاں تھے، ان کے عزیزوں اور

فرزندوں میں سے کوئی نہ تھا، ان کو اس واقعہ کی اطلاع کی گئی، اس وقت دستر خوان لگ گیا تھا، اور کھانا چن دیا گیا تھا، انھوں نے کسی عجلت اور پریشانی کا اظہار نہیں کیا، پورے اطمینان اور معمول کے مطابق کھانے سے فراغت کی، ہاتھ دھوئے، پھر کہا ہمارے ہتھیار اور گھوڑا لے آؤ، جب سوار ہو کر چلے تو زمینداروں میں سے بھی کچھ لوگ ہتھیار لگا کر ساتھ ہوئے، شیخ معظم نے سب کو واپس کیا، اور فرمایا کہ میں اتنی تیزی سے جاؤں گا کہ تم میرے گھوڑے کی گرد کو بھی نہ پہونچو گے، البتہ اس قصہ کے راوی کو جو دوڑنے میں گھوڑے کے برابر تھا، ساتھ لے لیا تاکہ وہ واقعہ کی اطلاع دے سکے، پھر گھوڑا دوڑا کر ان ڈاکوؤں کو جو کئی منزلیں طے کر چکے تھے، جالیا، اور ان کو غیرت دلا کر میدان میں مقابلہ کے لئے اتارا اور تیر اندازی شروع کی، ان کی قادر اندازی اور تیر افگنی دیکھ کر اس پورے گروہ پر رعب طاری ہو گیا، انھوں نے فریاد کی کہ ہم توبہ کرتے ہیں، ہمیں معاف کیا جائے، شیخ نے فرمایا کہ تمہاری توبہ یہ ہے کہ اپنے ہتھیار خود اتارو، ہر ایک دوسرے کا ہاتھ باندھے، اسی حالت میں مویشیوں اور سلاح اور اس دست بستہ گروہ کو گاؤں تک لائے، ان لوگوں کے مذہب کے مطابق ان سے قسم لی کہ اس بستی پر کبھی نظر نہ اٹھائیں گے، انھوں نے اس کی تعمیل کی۔

شیخ معظم کے سید نور الجبار سونی پتی کی صاحبزادی سے تین صاحبزادے پیدا ہوئے شیخ جمال شیخ فیروز، شیخ وجیہ الدین، شیخ وجیہ الدین شاہ صاحب کے حقیقی دادا ہیں۔

شاہ صاحب کے دادا شیخ وجیہ الدین شہید

شاہ صاحب نے اپنے حقیقی دادا شیخ وجیہ الدین شہید کے حالات قدرے تفصیل سے لکھے ہیں، وہ فرماتے ہیں، ان میں تقویٰ اور شجاعت کی دونوں صفتیں جمع تھیں، والد صاحب (شاہ عبد الرحیم صاحب) فرماتے تھے کہ میرے والد (شیخ وجیہ الدین) نے دن رات میں قرآن کے

ڈیڑھ سیپارے پڑھنے کا وظیفہ مقرر کر رکھا تھا، جس کو وہ سفر و حضر، اور چستی و کسل مندی دونوں حالتوں میں کبھی ترک نہیں کرتے تھے، جب عمر زیادہ ہوئی اور بصارت کمزور تو خط جلی کا ایک قرآن شریف اپنے ساتھ رکھتے تھے، سفر میں بھی کسی وقت اپنے سے جدا نہیں کرتے تھے، یہ بھی فرماتے تھے کہ وہ اپنے گھوڑے کو کبھی کسی کی کھیتی میں گھسنے نہیں دیتے تھے، خواہ تمام لشکر کاشت کی ہوئی زمین میں گھوڑے دوڑاتا ہو، بعض اوقات اس بناء پر متعارف راستہ سے مشقت برداشت کر کے الگ چلتے، یہ بھی فرماتے تھے کہ کسی جنگ میں اگر سامان رسد کم ہو جاتا، اور کھانے پینے کی چیزیں مہیا نہ ہوتیں، تو ساتھی گاؤں کے مویشیوں کو زبردستی پکڑ کر کے ان سے اپنی غذا حاصل کر لیتے، لیکن وہ ان سے مجتنب رہتے، جب دو دو تین تین فاقوں کی نوبت آ جاتی، اور قوت جواب دے جاتی تو رزاق حقیقی رزق مہیا فرما دیتا، بعض مرتبہ وہ فکر میں ہوتے، زمین پر چابک پٹختے وہاں سے چنے بقدر خوراک کے نکل آتے، وہ اس کو دھو کر اور پاک کر کے بھگو لیتے اور تناول فرماتے، فرماتے تھے کہ میرے والد کا معاملہ شاگرد پیشہ لوگوں، اور بھوسہ چارہ بیچنے والوں کے ساتھ ایسی نرمی اور انصاف کا تھا کہ بڑے بڑے متقیوں سے بھی ایسا کم دیکھنے میں آیا، یہ بھی فرماتے تھے کہ ایک سفر میں انھوں نے بعض آثار ولایت کا مشاہدہ کیا، بیعت کی اور اشغال صوفیہ کے ساتھ مشغول ہوئے، تقلیل کلام اور قلت اختلاط بالانام کو (جو صوفیائے باصفا کا شیوہ ہے) اپنا شعار بنایا، اور اس کی ایسی پابندی کی جو اس زمانہ کے صوفیوں میں بھی کم دیکھی گئی ہے۔

شاہ صاحبؒ فرماتے ہیں کہ والد صاحب ان کی شجاعت کا بہت ذکر کیا کرتے تھے، اس موقعہ پر شاہ صاحب نے والد صاحب کی زبانی ان کی نمایاں شجاعت اور تہوّر کے متعدد واقعات لکھے ہیں، بعض مرتبہ تنہا انھوں نے پورے پورے گروہ کا مقابلہ کیا، وہ لشکر شاہی میں مالوہ تک تشریف لے جاتے تھے، اپنے زمانہ کے اچھے اچھے شہ سواروں اور سورماؤں سے انھوں نے مقابلہ کیا،

اور بعض مرتبہ اپنے ساتھیوں یا افسروں کو جو مخالف کی زد میں آگئے تھے، عین موقعہ پر بچا لیا، ایک مرتبہ انھوں نے تین جنگ آزما مبارز طلبوں کو جو کسی کو خاطر میں نہیں لاتے تھے، زیر کیا، وہ فنون سپہ گری میں طاق تھے[1]۔

جنگِ برادران میں وہ عالمگیر بادشاہ کے ساتھ تھے، جب شاہ شجاع نے بنگالہ میں خروج کیا تو وہ عالمگیر کے لشکر میں تھے، اور انھوں نے کارِ نمایاں انجام دیا، اور ولی نعمت کے ساتھ پوری وفاداری اور استقامت کا ثبوت دیا[2]، ان کی مردانگی سے اس معرکہ میں عالمگیر کو فتح ہوئی، فتح کے بعد بادشاہ نے چاہا کہ منصب میں اضافہ کر دے، انھوں نے از روئے استغنا قبول نہیں کیا، بعض مرتبہ انھوں نے اپنے خاص احباب و رفقاء کے ساتھ حق دوستی ادا کیا اور خطرہ مول لے کر ان کی امداد کی[3]، شاہ عبدالرحیم صاحب نے ان کی قوت قلبی، بلند ہمتی اور مہم جوئی اور خطر پسندی کے متعدد واقعات بیان کئے ہیں، اسی کے ساتھ ان کی ہمدردی و دلجوئی اور غریب پروری کے واقعات بھی لکھے ہیں۔

شیخ وجیہ الدین کی شادی شیخ رفیع الدین محمد کی دختر نیک اختر سے ہوئی، شیخ رفیع الدین قطب العالم کے فرزند تھے، اور وہ حضرت شیخ عبدالعزیز شکر بار[4] کے صاحبزادہ، ان کے

---

[1] تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو، آثار الاجداد ص ۶-۷ [2] ایضاً ص ۸ [3] ایضاً ص ۸-۹

[4] شیخ عبدالعزیز عباسی جونپوری ثم دہلوی (۸۹۸ھ - ۹۷۵ھ) کا شمار کبار مشائخ چشتیہ میں ہے، شیخ قاضی خاں ظفرآبادی اور شیخ تاج محمود جونپوری سے طریقۂ چشتیہ میں اجازت حاصل تھی، بے نفسی اور تواضع کا پیکر تھے، اور اخلاق عالیہ سے متصف، وحدۃ الوجود کا مذاق رکھتے تھے، خطوط میں اپنے نام سے پہلے "ذرۂ ناچیز" لکھا کرتے تھے، (جس سے ان کے مذاق کا اظہار ہوتا ہے) عجیب اتفاق ہے کہ اسی سے ان کی تاریخ وفات نکلتی ہے "فَسُبْحٰنَ الَّذِیْ بِیَدِهٖ مَلَکُوْتُ کُلِّ شَیْءٍ وَّاِلَیْهِ تُرْجَعُوْنَ" (یٰس - ۸۳) پر طائر روح نے قفس عنصری سے پرواز کی، حضرت شاہ ولی اللہ صاحبؒ کا ان کے حالات میں رسالہ "النبذۃ الابریزیۃ فی اللطیفۃ العزیزیۃ" اسی مجموعہ رسائل میں شامل ہے۔ (نزہۃ الخواطر ج ۴ باختصار)

تین صاحبزادے پیدا ہوئے، شیخ ابوالرضا محمد، شیخ عبدالرحیم، شیخ عبدالحکیم۔

شاہ عبدالرحیم صاحب کہتے ہیں کہ میرے والد (شیخ وجیہ الدین) ایک شب تہجد کی نماز پڑھ رہے تھے، ایک سجدہ میں اتنی دیر تک سربسجود رہے کہ خیال ہوا کہ شاید روح پرواز کر گئی، جب سر اٹھایا تو آپ سے اتنی دیر تک ساکت وصامت پڑے رہنے کے بارے میں میں نے دریافت کیا، فرمایا غیبوبت کی حالت پیدا ہو گئی تھی، اس میں شہید کے درجہ اور ثواب کا حال معلوم ہوا، میں نے حق تعالیٰ سے شہادت کی تمنا کی اور اس میں اتنے الحاح وزاری سے کام لیا کہ اس کی قبولیت کا انکشاف ہوا، دکن کی جانب اشارہ ہوا کہ وہ شہادت کی جگہ ہوگی، والد صاحب فرماتے ہیں کہ اس واقعہ کے بعد اگرچہ فوج کی ملازمت ترک فرمادی تھی، اور اس شغل سے طبیعت کو نفرت ہو گئی تھی، لیکن ازسرنو اسباب سفر مہیا کئے، گھوڑا خریدا اور دکن کی جانب متوجہ ہوئے، ان کا خیال تھا کہ یہ واقعہ سیوارا میں پیش آئے گا، جو اس وقت سلطنت اہل اسلام کے حدود سے خارج تھا، اور وہاں کا حاکم مسلمانوں کے قاضی کے ساتھ بڑی بے حرمتی کے ساتھ پیش آیا تھا، لیکن جب بُرہانپور پہونچے تو وہاں منکشف ہوا کہ شہادت کی جگہ تو پیچھے چھوڑ آئے، وہیں سے واپس ہوئے، راستہ میں بعض سوداگروں کی جو صلاح وتقویٰ سے آراستہ معلوم ہوتے تھے، صحبت وہمراہی اختیار کی، قصبہ ہنڈیا سے چاہتے تھے کہ ہندوستان واپس آئیں کہ ایک دن ایک ضعیف العمر آدمی ملا کہ افتاں وخیزاں بھاگا جاتا تھا، ان کو اس کے حال پر رحم آیا، انھوں نے وجہ پوچھی، کہا کہ میں دہلی جانا چاہتا ہوں، فرمایا، روزانہ تین پیسے ہماری ملازمت سے لے لیا کرو، وہ بڈھا اصل میں کفار کا جاسوس تھا، جب نوبریا کی سرائے میں پہونچے تو جاسوس نے اپنے ساتھیوں کو خبر کردی (کہ سوداگروں کا قافلہ اس سرائے میں ٹھہرا ہوا ہے) ڈاکوؤں کی ایک جماعت کثیر اس سرائے میں آئی، شیخ وجیہ الدین اس وقت تلاوت میں مشغول تھے، ان میں سے دو تین آدمی سامنے آئے

اور کہا کہ وجیہ الدین کون ہیں، انھوں نے فرمایا کہ میں ہوں، انھوں نے کہا کہ تم سے ہمیں کوئی کام نہیں ہم جانتے ہیں کہ تمہارے پاس کچھ مال نہیں، اور تمہارا ہمارے گروہ میں سے ایک پر حق نمک بھی ہے لیکن ان سوداگروں کو جن کے پاس ساز و سامان ہے ہم نہیں چھوڑیں گے، چونکہ آپ کی غرض اصلی ہی اس سفر سے شہادت تھی، آپ رفاقت چھوڑنے پر راضی نہ ہوئے، اور حملہ آوروں کے مقابلہ میں آگئے، آپ کو بائیس [۲۲] زخم آئے، آخری زخم میں سر مبارک جسد سے جدا ہو گیا، اس حالت میں بھی دیر تک تکبیر زبان پر جاری رہی، اور کچھ دور کفار کا تعاقب بھی کیا،[۱] بالآخر ایک جگہ گرے اور وہیں مدفون ہوئے، اللہ تعالیٰ نے شاہ عبدالرحیم صاحب کو یہ واقعہ دکھایا، انھوں نے دیکھا کہ وہ اپنے زخم دکھا رہے ہیں، شاہ صاحب نے جسد مبارک کو منتقل کرنے کا ارادہ بھی کیا، مگر اشارۂ غیبی نے ان کو اس سے باز رکھا۔

شاہ صاحب کے نانا شیخ محمد پھلتی

شاہ صاحب کے نانا حضرت شیخ محمد پھلتی[۲] تھے، ان کے خاندان کا وطن اول سنہ صور ہے،[۳] سلطان سکندر لودھی کے زمانہ میں یہ خاندان پھلت منتقل ہوا، آپ کے والد کا نام شیخ محمد عاقل تھا، وہ بچپن سے بڑے ہونہار اور زمانہ کے صلحا اور اہل دل کے منظور نظر تھے، حضرت سید آدم بنوری کے خلیفہ شیخ جلال نے ان کی ولادت بیان کے مراتب عالیہ کی بشارت دی تھی، تعلیم انھوں نے اولاً شاہ صاحب کے چچا شیخ ابو الرضا محمد بن شیخ وجیہ الدین سے حاصل کی، اس کے بعد شاہ عبدالرحیم صاحب کے پاس گئے، ان سے بڑی مناسبت معلوم ہوئی، وہاں سے علم کی تحصیل کر کے

---

[۱] ایسے واقعات بعض اور شہداء کے متعلق بھی کتابوں میں دیکھنے میں آئے ہیں۔ [۲] ان کے حالات میں شاہ صاحب کا مستقل رسالہ "العطیۃ الصمدیۃ فی الانفاس المحمدیۃ" کے نام سے اسی مجموعہ رسائل میں شامل ہے [۳] حال ضلع بارہ بنکی۔

پھر پھلت واپس آئے، بذل وسخا، خودشکنی وفنا میں پایہ بلند رکھتے تھے، قوی التاثیر وصاحب ارشاد تھے، شاہ صاحب نے ان کی اپنے استاد ومربی شاہ عبدالرحیم صاحب کے ساتھ اطاعت وانقیاد اور تسلیم ورضا کے متعدد واقعات لکھے ہیں[1]، ان کو شاہ صاحب سے اجازت بھی حاصل ہوئی، ان کے صاحبزادہ شیخ عبیداللہ تھے، جو شاہ صاحب کے ماموں اور خسر اور شاہ صاحب کے خلیفۂ اجل حضرت شیخ محمد عاشق پھلتی کے والد ماجد تھے[2]، شاہ صاحب نے حضرت شیخ محمد پھلتی کی قوت تاثیر اور افادہ وافاضہ کے متعدد واقعات لکھے ہیں[3]، شیخ محمد کی وفات ۸ جمادی الآخرہ ۱۱۲۵ھ کو ہوئی[4]

شاہ صاحب کے عم محترم شیخ ابوالرضا محمد

حضرت شیخ ابوالرضا محمد حضرت شیخ وجیہ الدین کے فرزند اکبر اور شاہ صاحب کے بڑے چچا ہیں، شاہ صاحب نے انفاس العارفین میں اپنے والد بزرگوار کے بعد ان کا مستقل تذکرہ لکھا ہے، ان کو امام الطریقۃ والحقیقۃ کے بلند الفاظ سے یاد کیا ہے، شاہ صاحب کے نزدیک (اگرچہ انھوں نے اساتذۂ وقت سے تعلیم پائی تھی) ان کے علوم زیادہ تر وہبی تھے، اپنے والد صاحب کی اجازت وایماء سے ایک امیر کی سرکار میں آمد ورفت شروع کی، کہ ناگاہ جاذبۂ توفیق الٰہی نے ان کو اس سے باز رکھا اور تجرید تام اور توکّلِ کلّی اور عمل بالسنۃ کو اپنا شعار بنایا، زوجۂ محترمہ کو بھی "اِنْ كُنْتُنَّ تُرِدْنَ الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا وَزِيْنَتَهَا"[5] پر عمل کرتے ہوئے اختیار دیا کہ اگر فقر وفاقہ برداشت ہے تو ہمارے ساتھ رہو، ورنہ میکہ چلی جاؤ، انھوں نے بھی

---

[1] صفحہ ۳۰ [2] حضرت شیخ محمد عاشق پھلتی کے حالات کے لئے ملاحظہ ہو "نزہۃ الخواطر" ج ۶

[3] صفحہ ۲۲-۲۵ [4] صفحہ ۲۵ [5] الاحزاب - ۲۸

ازواج مطہرات کی سنت پر عمل کرتے ہوئے فقر وفاقہ کو ترجیح دی، اور رفاقت نہیں چھوڑی، اکثر متواتر دو تین فاقے ہوجاتے، سیدنا عبدالقادر جیلانیؒ سے نسبتِ خاص حاصل تھی، اور سیدنا علی مرتضیٰ سے محبتِ خاص اور مناسبت باختصاص حاصل تھی،[1] عالمگیر بادشاہ نے کئی مرتبہ زیارت کا ارادہ کیا قبول نہیں فرمایا، امراء و اہل دُوَل کی طرف بالکل التفات نہیں تھا، البتہ جوتے بنانے والوں، اور لپائی کا کام کرنے والوں اور ایسے ہی پیشہ وروں کی طرف بڑی توجہ فرماتے تھے، اگر وہ چار پانچ پیسے ہدیۃً نذر کرتے تو بڑی خوشی سے قبول فرماتے۔

شاہ صاحب نے ان کے تعارف میں قوی العلم، فصیح اللسان، عظیم الورع، وسیع المعرفہ کے الفاظ استعمال کئے ہیں، زیبا صورت، طویل القامت تھے، رنگ گورا، داڑھی ہلکی، نرم کلام تھے، جمعہ کی نماز کے بعد وعظ کہتے تھے، اور تین حدیثیں زبانی سناتے تھے، پھر فارسی میں اس کے بعد ہندی (ریختہ) میں ان کا ترجمہ کرتے تھے، اور ان احادیث کے مطالب پر روشنی ڈالتے تھے، لیکن اعتدال و اختصار کے ساتھ، پہلے ہر فن کی ایک کتاب پڑھاتے تھے، اور لوگ ان کی تقریر کے ذوق میں بہت جمع ہوجاتے تھے، آخر میں صرف دو سبق رہ گئے تھے، ایک بیضاوی کا ایک مشکوٰۃ کا، وحدۃ الوجود کے قائل تھے، اور اس بارے میں صاحبِ تحقیق تھے، صوفیا کے متعلق ملفوظات کی خوب شرح کرتے تھے، مستجاب الدعوات تھے، شاہ صاحب نے ان کی محبوبیت و اجتبائی شان کے بہت سے واقعات لکھے ہیں،[2] سنتوں کے ادا کرنے کا بڑا اہتمام تھا، ہندی کے عارفانہ دوہے کبھی کبھی پڑھتے تھے، شاہ صاحب نے ان کے کشف و کرامات کے متعدد واقعات لکھے ہیں،[3] شاہ صاحب نے بڑی تفصیل سے ان کے ملفوظات درج کئے ہیں، جن کا سمجھنا اور

---

[1] انفاس العارفین ص۸۶-۸۸ [2] ایضاً ص۸۹-۹۰ [3] ایضاً ص۹۰-۹۴

ان سے فائدہ اٹھانا بھی اس زمانہ میں مشکل ہے اس لئے ان کو ترک کیا جاتا ہے[1]، عمر پچاس[5] اور ساٹھ کے درمیان تھی، کہ ۷، ارمحرم الحرام ۱۱۰۱ھ کو نماز عصر کے بعد سفر آخرت اختیار کیا، آفتاب کے لفظ سے تاریخ وفات نکلتی ہے[2]۔

والد بزرگوار حضرت شاہ عبدالرحیم رح

حضرت شاہ ولی اللہ صاحب نے اپنے والد بزرگوار حضرت شاہ عبدالرحیم صاحب کے حالات، کمالات وکرامات میں خود ایک مفصل کتاب تحریر فرمائی ہے، جس کا نام عربی میں "بوارق الولایۃ" اور مشہور نام "انفاس العارفین"[3] ہے، ایک باکمال فرزند کے قلم سے باکمال پدر بزرگوار کے حالات میں مؤرخانہ اور ذمہ دارانہ طریقہ پر مستقل کتاب لکھنے کی اسلام کی علمی تاریخ میں زیادہ مثالیں نہیں ملتیں، اس سلسلہ میں علامہ تاج الدین سبکی کا اپنی شہرۂ آفاق کتاب "طبقات الشافعیۃ الکبریٰ" میں اپنے والد نامدار علامہ شیخ تقی الدین السبکی کا مفصل تذکرہ[4] اور فخر المتاخرین ابوالحسنات مولانا عبدالحی صاحب فرنگی محلی کا اپنے والد بزرگوار مولانا عبدالحلیم لکھنوی کے حالات میں مستقل رسالہ "حسرۃ العالم بوفاۃ مرجع العالم" کو بطور نمونہ پیش کیا جا سکتا ہے۔

اس کتاب میں سے زیادہ تر وہ حالات وواقعات انتخاب کئے جائیں گے، جو ان کی شخصیت پر روشنی ڈالتے ہیں، اور جن سے ان کے علمی، دینی اور روحانی پایہ کا کچھ اندازہ

---

[1] انفاس العارفین ص ۹۴-۱۱۹ [2] ایضاً ص ۱۵۵

[3] پہلی مرتبہ مطبع احمدی دہلی میں زیور طبع سے آراستہ ہوئی دوبارہ مطبع مجتبائی دہلی سے شائع ہوئی حوالہ اول الذکر طباعت پیش نظر ہے [4] یہ باریک ٹائپ کے ۱۸ صفحات میں پھیلا ہوا ہے۔

ہو سکتا ہے' اور خود شاہ صاحب کی زندگی اور رجحان اور مزاج و مذاق کی تشکیل میں انھوں نے جو بنیادی کردار ادا کیا ہوگا، اس کے تعین میں مدد مل سکتی ہے' کرامات وکشوف' روحانی تجربات وترقیات کا (جس کا وہ خاص دور اور صاحب تذکرہ کو اس سے خاص مناسبت تھی) زیادہ ذکر نہیں کیا جائیگا کہ ان کا فہم وادراک بھی اس زمانہ کے لوگوں کے لئے مشکل ہے' اس کے لئے اصل کتاب کی طرف رجوع مناسب ہوگا، صرف اجمالاً اتنا لکھنا ضروری ہے کہ شاہ صاحب کے حالات ایک عالی روحانی استعداد اور فطری وباطنی کمال پر دلالت کرتے اور اولیائے متقدمین کی یاد تازہ کرتے ہیں، جن کی استعدادیں نہایت قوی، زمانہ نہایت مساعد اور ماحول نہ صرف سازگار بلکہ محرک ومشوق تھا، اور "كُلَّ يَوْمٍ هُوَ فِي شَأْنٍ[1]" کے بموجب اس میدان میں اللہ تعالیٰ کی قدرت' اس کی تربیت' اور اس کی تجلیات کا ظہور تھا، اور "كُلًّا نُّمِدُّ هَٰؤُلَاءِ وَهَٰؤُلَاءِ مِنْ عَطَاءِ رَبِّكَ ۚ وَمَا كَانَ عَطَاءُ رَبِّكَ مَحْظُورًا[2]" (ان کو اور ان کو سب کو تمہارے پروردگار کی بخشش سے بھر بھر کر دیتے ہیں' اور تمہارے پروردگار کی بخشش (کسی سے) رکی ہوئی نہیں ہے) کی تفسیر۔

شاہ عبدالرحیم صاحب کے نانا (جو خود بڑے پایہ کے بزرگ تھے) شیخ رفیع الدین نے اپنی زندگی کے آخری ایام میں اپنا اثاثہ اپنے وارثوں کے درمیان تقسیم کر دیا، اپنی اولاد میں ہر ایک کو اس کے حسب حال سامان دیا، شاہ عبدالرحیم صاحب کی والدہ ان کی سب سے چھوٹی اولاد تھیں' جب ان کی باری آئی تو ان کو طریقت کے فوائد واوراد اور مشائخ کا شجرہ عنایت فرمایا، شاہ رفیع الدین صاحب کی اہلیہ محترمہ نے کہا کہ ابھی اس بچی کی شادی بھی نہیں ہوئی' اس کو جہیز کا سامان دینا چاہئے تھا، نہ کہ یہ رسائل' فرمایا کہ یہ رسائل ہمیں اپنے بزرگوں سے ترکہ میں ملے ہیں' اس بچی کا ایک فرزند ہوگا جو ہماری اس معنوی میراث کا مستحق ثابت ہوگا، جہاں تک

---

[1] سورۃ الرحمٰن — ۲۹ [2] سورۃ الاسراء — ۲۰

جہیز و شادی کے سامان کا تعلق ہے، اللہ اس کا انتظام فرمائے گا، ہمیں اس کی فکر نہیں، شاہ عبدالرحیم صاحب فرماتے ہیں کہ جب میں پیدا ہوا، اور کچھ سیانا ہوا تو میری نانی نے وہ سامان میرے حوالہ کیا، اور میں نے اس سے فائدہ اٹھایا[1]۔

شاہ عبدالرحیم صاحب کی ولادت کا سنہ کہیں صراحتاً نہیں ملتا، لیکن چونکہ انھوں نے ۱۱۳۱ھ میں وفات پائی، اور ۷۷ برس کی عمر ہوئی، اس لئے سنہ ولادت ۱۰۵۴ھ ہونا چاہیئے[2]۔

شاہ عبدالرحیم صاحب تین بھائی تھے، شیخ ابوالرضا محمد، شیخ عبدالحکیم اور شاہ عبدالرحیم۔

شاہ عبدالرحیم صاحب فرماتے ہیں کہ میں صغر سنی ہی میں سر پر پگڑی باندھ کر سر بہ زانو بیٹھتا، وضو میں تمام اعضاء کو پورے طور پر دھوتا، اور وضو کی سنتوں کا اہتمام کرتا، میرے ماموں شیخ عبدالحی جو خود صالح بزرگ تھے، دیکھ کر خوش ہوتے، اور فرماتے کہ اس کو دیکھ کر اطمینان ہوتا ہے کہ اسلاف کی یہ دولت ہماری نسل میں باقی رہے گی، اگر پوتوں کو نہ ملی تو کیا حرج ہے، نواسے اس کے حامل و محافظ ہوں گے[3]۔

شاہ عبدالرحیم صاحب کی بچپن ہی سے طبیعت دین کی طرف مائل اور دنیا کی دولت و عزت سے اچاٹ تھی، جو بزرگ کوئی ایسا وظیفہ بتانا چاہتے جس سے دنیا کا کوئی مقصد حاصل ہوتا، اس کی طرف توجہ نہ کرتے اور کہتے مجھے اس کی ضرورت نہیں، ایک نقشبندی بزرگ نے جن کا نام خواجہ ہاشم تھا، اور بخارا سے تشریف لا کر شاہ صاحب کے محلہ ہی میں فروکش تھے، ان کی طبیعت کا یہ انداز دیکھ کر ان کو اشکتا[4] کا

---

[1] انفاس العارفین ص۴۲   [2] ایضاً ص۵۸   [3] ایضاً ص۴۲

[4] مشائخ لوحِ دل پر اللہ کا نام نقش کرنے کے لئے کاغذ پر اسم ذات کو کثرت سے لکھواتے ہیں، تاکہ وہ ذہن پر منقش ہو جائے، یہ یادِ الٰہی کے لیے ایک طریقہ علاج تھا۔

طریقہ تلقین کیا، شاہ صاحب فرماتے تھے کہ مجھ پر اس کا ایسا غلبہ ہوا کہ میں نے ملا عبد الحکیم کا حاشیہ (یہ شرح عقائد پر ملا عبد الحکیم کا حاشیہ ہے) نقل کرنا شروع کیا، پورے ایک جزء پر اسم ذات لکھتا چلا گیا، اور مجھے شعور نہ ہوا۔[1]

شاہ صاحب حضرت خواجہ باقی باللہ کے صاحبزادہ شیخ عبد اللہ مشہور بخواجہ خورد کی خدمت میں حاضر ہوتے تھے، جو بڑے عارف تھے، بعض غیبی اشارات اور روحانی بشارات کی بناء پر انھوں نے ان سے بیعت کی درخواست کی، انھوں نے خیر خواہانہ مشورہ دیا کہ سید آدم بنوریؒ کے خلفاء میں سے کسی ایسے شیخ سے جو تشرّع اور ترک دنیا اور تہذیب نفس میں راسخ القدم ہو اس سے بیعت کر لو، میں نے کہا کہ ہمارے جوار میں حضرت کے خلفاء میں حافظ سید عبد اللہ[2] تشریف رکھتے ہیں، فرمایا بہت غنیمت ہیں، جلد ان سے بیعت ہو جاؤ، میں ان کی خدمت میں حاضر ہوا اگرچہ ان پر اخفا و خمول (بے نشانی) کا غلبہ تھا، انھوں نے پہلی درخواست پر بیعت فرمایا، میں دونوں بزرگوں خواجہ خورد اور سید عبد اللہ کی خدمت میں حاضر ہوتا رہا، اور ان کے فیض صحبت سے مستفیض، حافظ سید عبد اللہ کی بھی توجہ من جانب اللہ شاہ عبد الرحیم صاحب کی جانب تھی، ایک مرتبہ فرمایا، تم بچہ تھے اور بچوں میں کھیل رہے تھے، میری طبیعت کی تمہاری طرف کشش ہوئی، میں نے دعا کی کہ خدایا اس بچہ کو اولیاء میں شامل فرما، اور اس کا کمال میرے ہاتھ سے ظاہر ہو، الحمد للہ کہ اس دعا کا ثمرہ ظاہر ہوا۔[3]

تعلیم

شاہ عبد الرحیم صاحب نے چھوٹے رسائل سے شرح عقائد اور حاشیہ خیالی تک اپنے برادر بزرگ

---

[1] ایضاً ص۵ [2] حافظ سید عبد اللہ کے حالات کے لئے ملاحظہ ہو "انفاس العارفین" از ص۶-۱۵ [3] ایضاً ص۱۱

ابوالرضا محمد سے پڑھے، بقیہ کتابیں مرزا زاہد ہروی (مشہور بہ میر زاہد) سے پڑھیں، فرماتے تھے کہ "شرح مواقف" اور اصول کی ساری کتابیں مرزا زاہد سے پڑھیں، ان کی مجھ پر خصوصی توجہ تھی، یہاں تک کہ اگر میں کسی دن کہتا کہ آج میں نے مطالعہ نہیں کیا ہے تو فرماتے کہ ایک دو سطر پڑھ لو، تاکہ ناغہ نہ ہو، خواجہ خورد سے بھی حاشیہ خیالی وغیرہ کے مشکل مقامات میں رجوع کیا اور تشفی ہوئی، بعض اوقات ایسا ہوا کہ کسی کتاب کا ابتدائی حصہ پڑھا اور آخر تک اس کا درس خود دیا، خواجہ خورد شاہ عبدالرحیم صاحب کے نانا شیخ رفیع الدین کے شاگرد تھے، اور خواجہ خورد نے ان سے علمی و باطنی دونوں طرح کا استفادہ کیا تھا، اس لئے وہ ان کے ساتھ بڑی خصوصیت اور احترام کے ساتھ پیش آتے تھے۔

حافظ سید عبداللہ کی وفات کے بعد شاہ عبدالرحیم صاحب نے سلسلۂ ابوالعلائیہ احراریہ کے ایک بلند مرتبہ خلیفہ شیخ ابوالقاسم اکبرآبادی[1] سے رجوع کیا، امیر نور العلا سے بھی استفادہ کیا، خلیفہ ابوالقاسم نے شاہ صاحب کو اجازت بھی دی، خلیفہ صاحب شاہ عبدالرحیم صاحب کی تعظیم اور خصوصی خیال اس لئے بھی کرتے تھے کہ ان کو شاہ عبدالرحیم صاحب کے جدِّ مادری شیخ عبدالعزیز شکربار سے بھی خصوصی نسبت تھی۔

شاہ صاحب نے "انفاس العارفین" میں شاہ عبدالرحیم صاحب کے اپنے زمانہ کے مشائخ و اولیاء اور مجاذیب سے ملاقاتوں، ان کی توجہ خصوصی کے بہت سے واقعات لکھے ہیں کہ

---

[1] شیخ ابوالقاسم شیخ ولی محمد نارنولی کے خلیفہ تھے، اور وہ امیر ابوالعلاء حسینی اکبرآبادی کے، شیخ ابوالقاسم نے ابوالعلاء کا زمانہ پایا، اور ان کی صحبت اٹھائی، لیکن اجازت شیخ ولی محمد نارنولی سے پائی، وفات ۱۰۸۹ھ، واضح رہے کہ ابوالعلائی احراری سلسلہ میں چشتیت و نقشبندیت کا امتزاج ہے، کالپی کا مشہور سلسلہ جس کے شیخ سید محمد ترمذی تھے، اس سلسلہ سے تعلق رکھتا ہے۔ (تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو "نزہۃ الخواطر" ج ۵ ص ۲۲)

یہ زمانہ جذب وسلوک، خدا طلبی، عشق الٰہی اور درویشی کا گویا موسم بہار تھا، اور ایسے حضرات کی کثرت تھی جو اس کا ذوق رکھتے تھے، اور روحانی اور باطنی کمالات سے آراستہ تھے[1]، اور انھوں نے شاہ صاحب پر خاص توجہ فرمائی، اور ان سے شاہ صاحب کی اچھی صحبتیں رہیں، شاہ صاحب نے حضرت شاہ عبدالرحیم صاحب کے کشف ارواح وغیرہ کے بہت سے واقعات لکھے ہیں، جن سے ان کی باطنی قوت کا اندازہ ہوتا ہے[2]، اسی طرح ان کے اشراقات اور کرامات کے واقعات درج کئے ہیں، اس کے بعد شاہ صاحب نے بہت تفصیل سے ان کے ملفوظات درج کئے ہیں[3]، ملفوظات سے ان کی دقتِ نظر، غیر معمولی ذہانت، اور اعلیٰ استعداد علمی کا اندازہ ہوتا ہے۔

شاہ صاحب فرماتے ہیں، والد صاحب کا عمل اکثر امور میں مذہب حنفی کے موافق تھا، لیکن بعض مسائل میں حدیث کے مطابق یا اپنے وجدان سے کسی دوسرے مذہب فقہی کو بھی ترجیح دیتے تھے، ان تفردات یا استثناءات میں امام کے پیچھے سورہ فاتحہ کا پڑھنا، جنازہ میں بھی سورہ فاتحہ پڑھنا تھا۔

کم سنی سے خواجہ خورد کی خدمت میں حاضر ہونے اور ان سے روحانی و علمی استفادہ اور ان کی شخصیت و باطنی کمالات سے متاثر ہونے، نیز خواجہ ابوالقاسم اکبر آبادی سے بھی روحانی تربیت حاصل کرنے کی بنا پر (جو اس سلسلۂ ابوالعلائیہ میں صاحبِ اجازت تھے، جو حضرت مجدد الف ثانی اور حضرت خواجہ باقی باللہ کے واسطہ کے بغیر خواجہ عبیداللہ احرار اور سلسلۂ نقشبندیہ کے مشائخ کبار تک پہونچتا تھا) نیز انھوں نے امیر نورالعلاء بن امیر ابوالعلاءؒ

---

[1] ملاحظہ ہو "ذکر ملاقات حضرت ایشاں باسائر اہل اللہ از مجاذیب وغیر آں"، ص ۲۹-۳۴

[2] ملاحظہ ہو "انفاس العارفین" ص ۳۵-۵۰ [3] ایضاً ص ۵۰-۶۵ [4] ایضاً ص ۶۶-۸۵

اکبر آبادی سے بھی استفادہ کیا تھا، شاہ عبدالرحیم صاحب پر حضرت سید آدم بنوری کی نسبت خاص کے مقابلہ میں جو مسلک وحدۃ الشہود میں راسخ القدم تھے، حضرت خواجہ باقی باللہ کی نسبت غالب تھی، جو عرصہ تک توحید وجودی کے ذوق و مسلک پر رہے، اور یہ کہنا مشکل ہے کہ اس سے بالکلیہ انقطاع عمل میں آیا، یہ بھی فراموش نہیں کرنا چاہیئے کہ ان کے قریب کے اجداد مادری میں حضرت شیخ عبدالعزیز شکر بار (م ۹۷۵ھ) بھی گزرے ہیں جن پر توحید وجودی کا غلبہ تھا، ان موروثی و تربیتی اسباب کی بنا پر حضرت شاہ عبدالرحیم صاحب توحید وجودی کا ذوق اور شیخ اکبر سے عقیدت، اور ان کی تحقیقات سے ایسا ذوق و شغف رکھتے تھے، جو جادۂ شریعت اور دائرۂ علم سے متجاوز نہیں ہونے پاتا تھا۔[1]

شاہ صاحب لکھتے ہیں کہ والد صاحب شیخ محی الدین ابن عربی کا نام بڑی تعظیم سے لیتے تھے، فرماتے تھے اگر میں چاہوں تو فصوص الحکم کا منبر پر کھڑے ہو کر بیان کروں، اور اس کے تمام مسائل کو آیات و احادیث کے ساتھ مبرہن کروں، اور اس طرح بیان کروں کہ کسی کو شبہ نہ رہے، لیکن اسی کے ساتھ وحدۃ الوجود کی صراحت کرنے سے احتراز کرتا ہوں کہ اس زمانہ کے اکثر لوگ اس کو سمجھ نہیں سکیں گے، اور الحاد و زندقہ کے گڑھے میں گر جائیں گے۔

شاہ عبدالرحیم صاحب فتاویٰ عالمگیری کو ترتیب دینے والی جماعت علماء میں شامل تھے، جو ملک کے ممتاز ترین فقہ حنفی کے عالم و صاحبِ نظر و صاحبِ درس فقیہ تھے، اس جماعت کے نگراں کار اور صدر شیخ نظام الدین برہان پوری تھے، سلطان اورنگ زیب عالمگیر نے اس کام پر دو لاکھ روپیہ صرف کیئے،[2] مصنف "الثقافۃ الاسلامیۃ فی الھند" نے بڑے تفحص و تحقیق

---

[1] شاہ عبدالرحیم صاحب کے اس ذوق نے حضرت شاہ ولی اللہ صاحب تک منتقل ہو کر وحدۃ الوجود اور وحدۃ الشہود میں تطبیق کا رنگ اختیار کر لیا۔ [2] اس زمانہ کے لحاظ سے پچاس لاکھ روپے سے کم نہیں ہوں گے۔

کے بعد اس کے مرتبین کے نام درج کئے ہیں، جن کی تعداد اکیس[۲۱] ہوتی ہے، حضرت شاہ عبدالرحیم صاحب بھی اس جماعت کے ایک رکن تھے۔[۱]

حضرت شاہ ولی اللہ صاحب "انفاس العارفین" میں لکھتے ہیں کہ اس زمانہ میں عالمگیر کو اس کتاب کی ترتیب و تدوین کا بڑا اہتمام تھا، ملا نظام (افسر سررشتۂ تدوین) روزانہ ایک صفحہ بادشاہ کے سامنے پڑھا کرتے تھے، ایک دن انھوں نے وہ حصہ پڑھا جو ملا حامد کے سپرد تھا، انھوں نے ایک ہی مسئلہ کے متعلق دو کتابوں کی دو متفرق عبارتوں کو جمع کر کے عبارت میں گنجلک پیدا کر دی تھی، شاہ عبدالرحیم صاحب (جو ان کے دوست تھے) کی نظر جب اس مقام پر پڑی تو اس کی تحقیق کی معلوم ہوا کہ دو کتابوں کی مختلف المعنی عبارتیں جمع کر دی ہیں، آپ نے مسودہ کے حاشیہ پر عربی کی عبارت لکھدی کہ "من لم یتفقہ فی الدین قد خلط فیہ، ھذا غلط وصوابہ کذا" (یعنی تفقہ نہ ہونے کی وجہ سے کاتب سے یہاں خلطِ مبحث ہو گیا ہے، صحیح یوں ہے۔)

ملا نظام نے متن کی عبارت کے ساتھ شاہ عبدالرحیم صاحب کا حاشیہ بھی پڑھ دیا، وہ تو روانی میں پڑھتے گئے لیکن بادشاہ جو پوری توجہ سے سنتے تھے، چونک پڑے اور فرمایا "ایں عبارت چیست"؟ ملا نظام گھبرائے کہ انھوں نے اس کا مطالعہ نہیں کیا تھا، پھر سنبھل کر کہا کہ میں نے اس مقام کا مطالعہ نہیں کیا، کل تفصیل سے اس کا مطلب عرض کروں گا، گھر آئے تو ملا حامد سے شکایت کی کہ میں نے یہ حصہ تمہارے اعتماد پر چھوڑ دیا تھا، تمہاری وجہ سے مجھے بادشاہ کے سامنے خفت اٹھانی پڑی، ملا حامد نے اس وقت تو کچھ نہیں کہا، شاہ صاحب سے اس کی شکایت کی، شاہ صاحب نے کتابیں کھول کر ان کو دکھایا کہ عبارت میں خلل اور انتشار پیدا ہو گیا ہے، اس سے بعض معاصرین

---

[۱] "الثقافۃ الاسلامیۃ فی الہند" از مولانا حکیم سید عبدالحی حسنی رحمۃ اللہ علیہ۔ طبع المجمع العلمی دمشق۔ ص۱۱۱

اور رفقاء کو حسد پیدا ہوا، اور شاہ صاحب کچھ عرصہ اس کام میں شریک ہونے کے بعد اس سے علیحدہ ہو گئے۔[1]

اخلاق و شمائل و معمولات

شاہ صاحب لکھتے ہیں کہ وہ خصائل حمیدہ اور اخلاق ستودہ کے جامع تھے، شجاعت و فراست اور غیرت اُن میں بدرجۂ اتم موجود تھی، عقل معاد کی طرح عقل معاش بھی کامل اور وافر طور پر رکھتے تھے، ہر معاملہ میں توسّط و اعتدال کو پسند کرتے تھے، زہد و عبادت میں نہ اتنا تعمّق اور غلو تھا کہ رہبانیت سے اس کے حدود مل جائیں، اور نہ اتنی بے تکلفی اور وسعت کہ تساہل تک بات پہونچ جائے، لباس میں تکلف نہیں تھا، نرم اور سخت لباس جو میسر آتا استعمال فرماتے، یہ الگ بات ہے کہ اللہ تعالےٰ نے ہمیشہ ان کو اچھا ہی لباس مرحمت فرمایا، اللہ تعالےٰ ان کی سب ضرورتیں پوری فرما دیتا تھا، بازار جا کر کسی چیز کے خریدنے کی مشکل ہی سے نوبت آتی، امراء اور رؤساء کے گھروں پر تشریف نہیں لے جاتے تھے، اس دروازہ کو کلیۃً بند کر رکھا تھا، ہاں اگر اس طبقہ کے لوگ خود زیارت کے لئے آتے تو آپ بڑی خندہ پیشانی اور اخلاق سے پیش آتے، ان میں جو زیادہ معزز ہوتا اس کا اسی طرح اعزاز کرتے، اور اگر وہ نصیحت کی فرمائش کرتے، تو بڑی نرمی کے ساتھ نصیحت فرماتے، اور امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا فرض انجام دیتے، ہمیشہ علم و علماء کی تعظیم کرتے، جہالت اور جاہلوں سے نفور رہتے، ہر حال میں آثار نبوی کا تتبّع کرتے، استقامت کی بات یہ ہے کہ کبھی ساری زندگی بغیر عذر کے جماعت فوت نہیں ہوئی، بچپن و جوانی میں کبھی منہیات کی طرف میلان نہیں ہوا، ضروری امور میں بیع و شراء سے بھی احتراز نہ کرتے، نہ متقشّف علماء کی پرتکلف ہیئت کی

---

[1] انفاس العارفین ص ۲۴

پابندی کرتے، نہ آزاد فقراء وصوفیاء کے بے قید لباس کی، بے تکلف زندگی گذارتے تھے، بغیر ضرورت کے قرض لینا پسند نہیں کرتے تھے، جو لوگ تنعّم وتفکّہ (لذت اندوزی اور لطف) کے لئے قرض لیتے اس کو ناپسند فرماتے اور ملامت کرتے، طب میں بھی ذہن رسا پایا تھا۔

روزانہ ایک ہزار بار درود شریف، ایک ہزار بار نفی اثبات، کچھ حصہ جہر اور کچھ حصہ خفا کے ساتھ، بارہ ہزار بار اسم ذات روزانہ کا معمول تھا، اپنے بھائی ابوالرضا محمد کے انتقال کے بعد مشکوٰۃ، تنبیہ الغافلین، غنیۃ الطالبین کو سامنے رکھ کر وعظ فرماتے، آخر میں تفسیر کا سلسلہ شروع کیا تھا، زہراوین (سورہ بقر وآل عمران) سے فارغ ہوئے تھے کہ ضعف کا غلبہ ہوا، اور یہ سلسلہ موقوف ہوگیا۔

حمیّت اسلامی

حضرت شاہ عبدالرحیمؒ میں بھی اپنی خاندانی روایت کے مطابق، اور پدر بزرگوار شہیدؒ (شیخ وجیہ الدین) کی وراثت میں مجاہدانہ جذبات اور حمیت اسلامی پورے طور پر موجود تھی، اور یہ بات بالکل قرین قیاس ہے کہ ان کے خاندان والاشان میں نسلاً بعد نسل جہاد وعزیمت کا سلسلہ منقطع نہیں ہونے پایا تھا، غیرت وشجاعت ان کو خاندانی ورثہ میں ملی تھی، اگرچہ شخصی وجسمانی طور پر کسی معرکۂ جہاد میں شرکت کا ذکر نہیں ملتا، مگر "انفاس العارفین" میں درج واقعات سے ان کے علوِّ ہمت، عمل بالعزیمت اور دینی غیرت کا اظہار ہوتا ہے، اور یہی دولت ہے، جو ان کی اولاد میں منتقل ہوئی۔

ازدواج واولاد

شاہ عبدالرحیمؒ صاحب کا پہلا نکاح اپنے والد صاحب کی زندگی میں ہوا تھا، جن سے ایک صاحبزادہ صلاح الدین نام پیدا ہوئے، جو کچھ بڑے ہو کر فوت ہو گئے[1]، زوجہ محترمہ عرصہ تک حیات رہیں اور حضرت شاہ ولی اللہ صاحبؒ کی شادی کے بعد ۱۱۲۸ھ یا ۱۱۲۹ھ میں وفات پائی[2]۔

دوسرا نکاح کبرسنی میں بعض بشارات و اشارات غیبی کی بناء پر شیخ محمد پھلتی صدیقی کی صاحبزادی سے ہوا، جن سے دو صاحبزادے تولد ہوئے، شاہ ولی اللہؒ اور شاہ اہل اللہ۔

وفات

۷۷ سال کی عمر میں رمضان میں آخری بار روزے رکھے، شوال میں بیمار ہو گئے، اور امید زیست منقطع ہو گئی لیکن اس کے بعد صحت عود کر آئی لیکن اوائل صفر میں مرض پھر غالب آیا، صبح صادق سے پہلے آثار موت ظاہر ہوئے تو پوری توجہ اس طرف تھی کہ نماز فجر فوت نہ ہو، اس ضعف کی حالت میں کئی بار پوچھا کہ صبح ہو گئی یا نہیں، حاضرین مجلس نے کہا کہ ابھی نہیں ہوئی، جب وقت آخر بالکل قریب آگیا، تو ان جواب دینے والوں کو سختی سے جواب دیا کہ اگر تمہاری نماز کا

---

[1] القول الجلی سے معلوم ہوتا ہے کہ شاہ ولی اللہ صاحبؒ کے علاتی بھائی شیخ صلاح الدین جوانی کی عمر تک پہونچے، القول الجلی (قلمی)۔ [2] شاہ صاحب "الجزء اللطیف" میں لکھتے ہیں کہ ۱۴ سال کی عمر میں میرے والد نے میرا نکاح کر دیا، اور بڑی عجلت فرمائی، جو لوگ مہلت چاہتے تھے، ان سے فرمایا کہ اس میں مصلحت ہے، شادی کے بعد ہی متعدد خاندانی حادثے پیش آئے کہ ان میں سے کوئی حادثہ پیش آتا تو شادی ملتوی ہو جاتی، ان حوادث میں آخری حادثہ کے طور پر اپنے بڑے بھائی صلاح الدین کی والدہ صاحبہ کی وفات کا ذکر کیا۔ ص۲

وقت نہیں آیا تو ہماری نماز کا وقت آگیا، فرمایا میرا رخ قبلہ کی طرف کردو، اس وقت اشارہ سے نماز پڑھی حالانکہ وقت میں شک تھا، اس کے بعد زیر لب اسم ذات کے ذکر میں مشغول ہو گئے، اور جان جان آفریں کے سپرد کی، یہ واقعہ چہار شنبہ ۱۲ صفر ۱۱۳۱ھ کا ہے، یہ فرخ سیر کی حکومت کے آخر کا دور ہے، آپ کے انتقال کے بعد فرخ سیر پچاس دن محبوس رہا اور شہر میں بڑا اضطراب پیدا ہوا، انتقال کے وقت عمر شریف ۷۷ سال تھی[1]۔

حضرت شاہ عبدالرحیم صاحبؒ شاہ ولی اللہ صاحبؒ کی نظر میں

حضرت شاہ عبدالرحیم صاحبؒ کی اگرچہ کوئی اہم تصنیف جس سے ان کا علمی مرتبہ ظاہر ہو (سوائے ایک رسالہ کے) موجود نہیں، ان کی شہرت زیادہ تر اپنے لائق اور باکمال فرزند ہی کے ذریعہ ہے، اور انھیں نے ان کا تعارف "انفاس العارفین" کے ذریعہ کرایا، جہاں تک علم ہے، ان کے حالات میں ان کے کسی اور مسترشد کی کوئی کتاب نہیں، لیکن شاہ صاحبؒ کی تصنیفات بالخصوص "انفاس العارفین" سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ ان کے علوئے مرتبہ، قوتِ باطنی، مقبولیت عند اللہ، اور علم وسلوک میں ان کے مراتب عالیہ سے علی وجہ البصیرۃ اس سے زیادہ معتقد اور متاثر ہیں، جتنا کہ ایک سعادت مند فرزند عام طور پر اپنے باکمال باپ کے کمالات واحسانات کا معترف اور مداح ہوتا ہے، شاہ صاحب کو ان کے کمالات باطنی وعلمی کے بارے میں علم الیقین اور وجدانی کیفیت، اور ان کے تذکرہ میں ایک شکر اور سرشاری کی کیفیت معلوم ہوتی ہے، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ شاہ صاحبؒ کی تعلیم وتربیت، کمالات علمی وباطنی کے حصول، اور علم وسلوک میں درجۂ امامت ــــــ واجتہاد تک پہونچنے میں والد بزرگوار کی

---

[1] انفاس العارفین ص ۸۳-۸۵

نسبتِ باطنی، قوتِ تاثیر اور شفقت اور دعاؤں کا بڑا حصہ ہے۔

ہندوستان کے عربی النسل خاندان اور ان کی خصوصیات اور روایات

شاہ صاحبؒ کے اجداد کرام کے مختصر تذکرہ سے (جس کا خلاصہ ان صفحات میں پیش کیا گیا ہے) اندازہ ہوتا ہے کہ ان میں تین[۳] نمایاں صفتیں قدر مشترک کے طور پر بالعموم متوارث رہیں۔

۱۔ ایک علم و دین، ورع و تقویٰ اور قضا و افتاء سے عمومی تعلق[۱]، جو علم و دین سے نسلی و خاندانی مناسبت اور عزیمت و علو ہمت کی بناء پر (جس کو خاندانی روایات و واقعات اور مخلص و بلند ہمت سرپرستوں اور مربیوں کی تعلیم و تربیت غذا پہونچاتی رہتی تھی) بعید از قیاس نہیں، اسلاف کے کارناموں اور ان کی صلاح و تقویٰ کی بناء پر اللہ تعالیٰ نے بہت سے خاندانوں کی حفاظت فرمائی ہے، اور دولت دین کی حفاظت کا ان میں اسی طرح سے انتظام فرمایا ہے، جیسا کہ ان دو یتیموں کی دیوار کو اپنے ایک مقبول بندہ کے ذریعہ گرنے سے بچایا اور مستحکم کردیا، جن کا باپ صلاح و دینداری سے متصف تھا "وَكَانَ اَبُوْهُمَا صَالِحًا"[۲] (ان دونوں کا باپ نیک تھا) ہندوستان کے بیسیوں خاندانوں کی تاریخ اس تسلسل اور حفاظت و عنایتِ خداوندی کی شہادت دیتی ہے، جن میں صدیوں تک علم و دین، قضاء و افتاء، تدریس و تصنیف اور ارشاد و ہدایت کا سلسلہ جاری و قائم رہا۔

۲۔ دوسری حفظ انساب، خاندانی شجروں کی ترتیب و نگہداشت اور "کفاءت" کا

---

[۱] ظاہر ہے کہ یہ کوئی کُلّیہ نہیں جس میں کسی استثناء کی گنجائش نہ ہو، شرفاء و اہل فضل کے خاندانوں کی طرح اس کو "اکثریہ" ہی کہا جا سکتا ہے۔

[۲] ملاحظہ ہو سورۂ کہف کی آیات "وَاَمَّا الْجِدَارُ فَكَانَ لِغُلٰمَيْنِ يَتِيْمَيْنِ (الی) رَحْمَةً مِّنْ رَّبِّكَ" (الکہف ۸۲)

وہ معیار و اہتمام جو بلادِ عربیہ اور قدیم اسلامی ممالک میں بھی اس درجہ میں نہیں تھا، غالباً اس کی وجہ دیارِ عجم میں اپنے اس نسب کی حفاظت کا جذبہ (جو یہ خاندان بلادِ عربیہ سے لے کر آیا تھا) اور خود ہندوستان کے طبقاتی نظام اور خاندانی تفاخر کا اثر بھی اس کا باعث تھا، باوجود اس کے کہ شریعت نے اس اہتمام کا مکلّف نہیں کیا ہے' اور اس میں بعد کی صدیوں اور غیر عرب ملکوں میں غلو پیدا ہو گیا ہے' لیکن اس کے ساتھ اس کا یہ نتیجہ ضرور قابلِ لحاظ ہے کہ صدیوں تک ان خاندانوں میں نسلی خصوصیات قائم رہیں' اور وہ عجمی اور غیر اسلامی ملک کے معاشرہ اور تہذیب میں تحلیل نہ ہونے پائے۔

۳۔ تیسری صفت جلادت و شجاعت' سپہ گری کے صفات جس کو عربی میں "فروسیۃ" اور "فُتوّۃ" (شہ سواری و مردانگی) کے لفظ سے ادا کیا جاتا ہے، جو نسل عرب اور قبیلۂ قریش کی نسلی و موروثی صفت ہے' اور جس کے نمونے شیخ معظّم اور شیخ وجیہ الدین کے حالات میں واضح طور پر گذر چکے ہیں، اور اس کا ظہورِ اتم خود شاہ صاحب کے پوتے مولانا شاہ محمد اسماعیل صاحب شہیدؒ کی زندگی میں دیکھنے میں آتا ہے۔

ان نمایاں صفات کے ظہور و توارث کے نفسیاتی و عقلی اسباب بھی ہیں' جو عربی النسل خاندان تاریخ کے مختلف دوروں میں حجاز، عراق، اور ایران و ترکستان سے ہندوستان منتقل ہوتے رہے' ان میں سے اکثر کی ہجرت اور ہندوستان میں توطّن کا سبب یا اپنے دین و ایمان کی حفاظت یا عزت و ناموس بچانے کا جذبہ تھا کہ وہ تاتاری حملہ سے خطرہ میں پڑ گئے تھے، یہ مقصد بعد کی کئی پشتوں تک لوگوں کو یاد رہا، اور ان کو بھی اس کی لاج تھی' اللہ تعالیٰ نے بھی اس کی برکت سے ان کے دینی حالات میں ترقی دی کہ وہ " فَالَّذِيْنَ هَاجَرُوْا وَاُخْرِجُوْا مِنْ دِيَارِهِمْ وَاُوْذُوْا فِيْ سَبِيْلِيْ وَقٰتَلُوْا وَقُتِلُوْا " (آل عمران ـ ۱۸۵) کا مصداق تھے۔

یا جہاد فی سبیل اللہ اور دعوت الی اللہ کا جذبہ تھا جس کا اس وقت (چھٹی ساتویں صدی ہجری کی دنیا میں) ہندوستان میں سب سے بڑا میدان تھا، اس وسیع ملک کے جس کو برّصغیر کہنا صحیح ہوگا، بہت سے حصے سلطنت اہل اسلام کے ابھی زیرنگیں نہیں آئے تھے، اور وہاں مختلف حاکم و راجہ حکومت کر رہے تھے، اور بعض اوقات احکام شرعی کی تعمیل اور شعائر اسلام کے اظہار میں خلل انداز ہوتے تھے، ان میں سے بہت سے وقتاً فوقتاً سرکشی اور بغاوت بھی کرتے رہتے تھے، ہر جگہ لشکر سلطانی کا پہونچنا مشکل بھی تھا، بیرون ہند سے آنے والے ان شریف ونجیب اور حوصلہ مند اور جہاد وغزا کے شائق عربی النسل خاندانوں اور ان کے سربرآوردہ افراد کے لئے ان علاقوں کا فتح کرنا اور ان کو مرکزی سلطنت کے حوالہ کرنا ان کی حوصلہ مندیوں کی تسکین کا سامان بھی تھا، دینی جذبات کی آسودگی کا ذریعہ بھی، اور دنیاوی وجاہت و امارت کا وسیلہ بھی، ان کو ان علاقوں میں معافیاں دی جاتی تھیں، ان کے افراد منصب قضا ونیابت پر مامور بھی ہوتے تھے، چنانچہ ان عربی و ایرانی النسل خاندانوں کی تاریخوں میں بکثرت ایسے واقعات ملتے ہیں کہ ان کے پیش روؤں نے ہندوستان کے بعض ایسے دور دراز علاقے اور مجہول اور غیر اہم مقامات فتح کئے، جو باقاعدہ ممالک محروسہ میں داخل نہیں ہو سکے تھے[1]۔

---

[1] اس کی ایک مثال امیر کبیر سید قطب الدین محمد المدنی (م ۶۷۷ھ) ہیں جو اودھ کے خاندان قطبی حسنی کے بانی اور حضرت سید احمد شہیدؒ کے جد امجد ہیں، وہ غزنی کے راستہ سے ساتویں صدی ہجری کے اوائل میں اعزہ وسادات اور غزنی کے رؤسا وشرفاء ومجاہدین کی ایک بڑی جماعت کے ساتھ دہلی تشریف لائے، دہلی سے پورب کا قصد کیا اور اول قنوج، پھر مانک پور اور کڑہ پر (جو اس زمانہ میں ایک مستقل حکومت کا مرکز تھا) حملہ کیا اور اس تمام علاقے کو فتح کر کے اسلامی حکومت میں شامل کیا۔ (سیرت سید احمد شہیدؒ اول ص ۴۹)

ان خاندانوں کو اس کا احساس تھا کہ ہم ہندوستان میں ایک بلند مقصد کے لئے آئے تھے، ہمارے دین، ہماری تہذیب اور ہماری سعادت کا اصل سرچشمہ مرکز اسلام جزیرۃ العرب اور حجاز مقدس ہے، ہم کو اپنی اس اصل سے کُلّی طور پر کبھی منقطع نہیں ہونا چاہئے، اور اپنے نسلی، تہذیبی، اور اخلاقی امتیازات کو ہر قیمت پر برقرار رکھنا چاہئے، ہم جب ہی دنیا کے اس دور افتادہ حصہ اور بیگانہ تہذیب و ماحول میں جو اپنے اندر ایسی تحلیلی طاقت اور ایک طرح کا تیزاب رکھتا ہے، جس نے باہر سے آنے والی قوموں اور نسلوں کو اپنے اندر کُلّی طور پر جذب اور ان کی خصوصیات کو فنا اور سوخت کر دیا، محفوظ اور باعزت رہ سکتے ہیں، اس احساس نے ان کے اندر دینی و نسلی غیرت اور خارجی اثرات کے مقابلہ میں غیر معمولی قوتِ مقابلہ پیدا کر دی جس سے ان کی انفرادی شخصیت بہت حد تک محفوظ اور ان کی خصوصیات صدیوں تک نسل در نسل منتقل ہوتی رہیں۔

اس حقیقت کا اظہار بڑے واضح طریقہ پر خود حضرت شاہ ولی اللہ صاحب کے اِس وصیت نامہ میں ہوا ہے، جو "المقالۃ الوضیۃ فی النصیحۃ والوصیۃ" کے نام سے انھوں نے قلم بند فرمایا، جس میں ان کے مخاطب سب سے پہلے ان کے خاندان کے لوگ ہیں، پھر تمام اہلِ تعلق اور ملت اسلامیہ ہندیہ، شاہ صاحب تحریر فرماتے ہیں:۔

"ہمیں یہ نہیں بھولنا چاہئے کہ ہم پردیسی لوگ ہیں، ہمارے اجداد نے ہندوستان ہجرت کی، نسب اور زبان کی عربیت ہمارے لئے دو بڑی فخر کی باتیں ہیں، یہی ہم کو سیّد الاولین والآخرین، افضل الانبیاء والمرسلین، مفخر کائنات و فخر موجودات محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم سے قریب کرتی ہیں، اس نعمت عظمیٰ کے شکریہ کا تقاضا ہے کہ ہم امکانی حد تک ــــــ

ان عربِ اولین کے عادات وروایات سے یکسر بے تعلق نہ ہونے پائیں جن میں رسول اللہ صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کا نشو ونما ہوا تھا، اور عجمیوں کے رسوم اور ہندوؤں کے طور طریق کو اپنے اندر پھیلنے نہ دیں۔"

آگے چل کر فرماتے ہیں :۔

"ہم میں خوش نصیب وہ ہے جس کو عربی زبان میں کچھ درخور حاصل ہو، صَرف، نحو، ادب میں دخل ہو اور حدیث و قرآن سے واقفیت رکھتا ہو، ہمیں حرمین شریفین میں بھی حاضری دیتے رہنا چاہیئے، اور اس سے قلبی وابستگی رہنی چاہیئے، اس میں ہماری سعادت کا راز ہے، اور اس سے اعراض و روگردانی کرنے میں شقاوت و محرومی پنہاں ہے[1]۔"

عربی النسل اور عالی نسب ہونے کے ماسوا اس خاندان کو فاروقیت کا شرف بھی حاصل تھا، دیارِ عجم میں اس خاندان سے اللہ تعالےٰ نے بارہا حفاظت دین، شعائرِ اسلام کے اعلاء اور دشمن اسلام تحریکوں کے مقابلہ کا مجدّدانہ کام لیا، جس میں فاروقی غیرت کا بھی دخل تھا، اور فاروق اعظم سے نسبت و نسبی تعلق کا احساس و افتخار بھی کام کرتا ہوگا، جو ایک طاقتور نفسیاتی محرک بھی ہے، دسویں صدی ہجری میں اسی خاندان کے ایک فرد فرید نے اکبری فتنہ کا استیصال کیا، اور ہندوستان کو کفر و الحاد، وحدت ادیان کے فتنہ اور "نیا دور نیا آئین" نیا ہزارہ" "نئی امامت" کی خطرناک سازش کا شکار بننے سے بچا لیا[2]، حضرت شیخ احمد فاروقی (مجدد الف ثانی) کو اس نسبت پر فخر تھا، اور وہ

---

[1] "المقالة الوضية في النصيحة والوصية" فارسی، طبع دہلی ۱۲۶۸ھ

[2] تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو "تاریخ دعوت وعزیمت" حصہ چہارم ص۶۱-۹۳ اور ص۱۰۵-۱۰۸

دینی حمیت کو اس کا تقاضہ اور قدرتی نتیجہ سمجھتے تھے، جمہور اہلِ سنت اور عقائد اسلامیہ کے خلاف ایک مشہور عارف و شیخ کی ایک تحقیق سن کر ان کے قلم سے بے اختیار یہ الفاظ نکلے ہیں۔

"مخدوما! ایں فقیر را تابِ استماع امثال ایں سخنان نیست، بے اختیار رگِ فاروقیم در حرکت می آید"[1]	مخدومی! یہ فقیر اس طرح کی باتوں کے سننے کی تاب نہیں رکھتا، بے اختیار میری فاروقی رگ حرکت میں آجاتی ہے۔

اسی طرح یہ سن کر کہ قصبہ سامانہ میں خطیب نے خطبہ جمعہ میں خلفائے راشدین کا ذکر عمداً ترک کر دیا، تحریر فرمایا:-

"چوں استماع ایں خبر وحشت انگیز در شورش آورد و رگ فاروقیم را حرکت داد، بچند کلمات اقدام نمود"[2]	جب اس خبر وحشت اثر سے طبیعت میں اضطراب پیدا ہوا، اور اس نے میری فاروقی رگ کو حرکت دی، یہ چند لفظ میرے قلم سے نکل گئے۔

حضرت شاہ ولی اللہ صاحب کی تجدید و احیاء دین کے وسیع اور کثیر الانواع کام میں، (جس میں اصلاح عقائد، ردِ شرک و بدعت، اشاعت کتاب و سنت، ترویج فن حدیث، اثبات خلافت خلفاء راشدین، اور رفض و شیعیت کی تردید شامل ہے) یقیناً یہ نسبت اور اس کے شرف و ذمہ داری کے احساس کو بھی دخل ہوگا، جو نفسیات، علم الحیاۃ، اور نسلی اصول و تجربات کے لحاظ سے (جس کے شواہد بکثرت نسلوں اور

---

[1] مکتوب ۲۰ دفتر اول بنام ملا حسن کشمیری۔

[2] مکتوب ۱۵ حصہ ششم دفتر دوم۔

خاندانوں کی تاریخ میں پائے جاتے ہیں) ہر طرح قرین قیاس اور مطابق عقل ہے، حدیث میں بھی آتا ہے کہ "الناس معادن کمعادن الذهب والفضة، خیارهم فی الجاهلیة خیارهم فی الاسلام اذا فقهوا"[1]

---

[1] لوگ اسی طرح سے (جواہرات کی) کانیں ہیں، جیسے سونے چاندی کی کانیں ہوتی ہیں، جو ان میں جاہلیت کے زمانہ میں بہتر تھے، وہ اسلام میں بھی بہتر ہیں، بشرطیکہ وہ (دین کی) سمجھ حاصل کریں۔

(روایت صحیح مسلم)

بابِ چہارم

مختصر حالاتِ زندگی[1]

ولادت

شاہ صاحب کی ولادت چہار شنبہ کے دن ۴ شوال ۱۱۱۴ھ طلوع آفتاب کے وقت اپنے نانیہال قصبہ پھلت (حال ضلع مظفر نگر) میں ہوئی، تاریخ ولادت عظیم الدین سے نکلتی ہے[2]، شاہ ولی اللہ صاحب کی ولادت کے وقت آپ کے والد ماجد حضرت شاہ عبدالرحیم صاحبؒ کی عمر ساٹھ سال تھی، شاہ عبدالرحیم صاحبؒ کو اس مبارک فرزند کی ولادت سے پہلے بہت سے مبشرات نظر آئے تھے، شاہ عبدالرحیم صاحب نے ساٹھ سال کی عمر میں پہلی اہلیہ کی موجودگی میں جو شیخ صلاح الدین کی والدہ تھیں، شادی کا ارادہ کیا، اس میں اشارات غیبی اور بشارات کو دخل تھا، جب شیخ محمد پھلتی کو معلوم ہوا تو

---

[1] خوش قسمتی سے حضرت شاہ صاحب کے قلم سے اختصار کے ساتھ اپنی زندگی کے ضروری حالات، تعلیم و تعلیمی نصاب جو انھوں نے پڑھا، والد صاحب کی تعلیم و تربیت کے بعض خصوصی انداز، بیعت و اجازت، سفر حجاز اور وہاں کے مشائخ سے استفادہ، ان کا تعارف و تذکرہ اور زندگی کے بعض اہم واقعات محفوظ ہو گئے ہیں، ان مواد و معلومات کے دو بڑے ماخذ ہیں "الجزء اللطیف فی ترجمۃ العبد الضعیف" اور رسالہ "انسان العین فی مشائخ الحرمین" شاہ صاحب کی زندگی کے مختصر حالات انھیں دونوں کتابوں "الجزء اللطیف" اور "انسان العین" سے ماخوذ اور مقتبس ہیں، کہیں کہیں "انفاس العارفین" اور "القول الجلی" سے استفادہ کیا گیا ہے۔

[2] الجزء اللطیف ص ۲ مطبوعہ لاہور۔

انھوں نے اپنی صاحبزادی کو نکاح میں دینے کا فیصلہ کیا[1]، اور اوائل ۱۱۱۴ھ میں یہ مبارک عقد ہوگیا۔

"القول الجلی" سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کا اسم گرامی فخر النساء تھا، اور وہ علوم دینیہ میں ایسا درک رکھتی تھیں، جس کا خواتین کو بہت کم موقعہ اور شرف حاصل ہوتا ہے، کتاب کے مصنف شیخ محمد عاشق پھلتی لکھتے ہیں، جو ان کے حقیقی بھائی کے فرزند تھے، وصاحب البیت أدریٰ بمافیہ۔

والدۂ شریفۂ شاں کہ بعلم شریعت از تفسیر و حدیث عالمہ، و بآداب طریقت متادبہ، و باسرار حقیقت عارفہ، و بمصداق اسم خود فخر النساء بودند۔[2]

آپ کی والدۂ ماجدہ تفسیر وحدیث جیسے علوم شرعیہ کی عالم، آداب طریقت سے آراستہ پیراستہ، اسرار حقیقت کی معرفت رکھنے والی، اور ان وجوہ سے حقیقتاً طبقۂ اناث کے لئے باعث فخر اور اسم بامسمّٰی تھیں۔

ولادت سے پہلے شاہ عبدالرحیم صاحب نے خواجہ قطب الدین بختیار کعکی رح کی خواب میں زیارت کی انھوں نے فرزند کی بشارت دی، اور فرمایا کہ اس کا نام میرے نام پر قطب الدین احمد رکھنا، شاہ صاحب فرماتے ہیں کہ میری ولادت ہوئی تو والد صاحب کے ذہن میں یہ بات نہیں رہی، اور انھوں نے ولی اللہ نام رکھا، کچھ مدت کے بعد یاد آیا تو میرا دوسرا نام قطب الدین احمد تجویز کیا۔[3]

شاہ صاحب سات سال کے تھے کہ والدین کے ساتھ تہجد میں شریک ہوئے، اور دعا کرتے وقت ان دونوں کے ہاتھوں میں اپنے ہاتھ دیئے، اور اس طرح وہ خواب پورا ہوا، جو ان کے والد ماجد نے ان کی ولادت سے قبل دیکھا تھا۔[4]

---

[1] انفاس العارفین ص ۶۲-۶۳ [2] القول الجلی (قلمی) محفوظ کتب خانہ خانقاہ کاظمیہ کاکوری [3] انفاس العارفین ص ۲۴۴ [4] ایضاً ص ۶۳

تعلیم

شاہ صاحب کی عمر جب پانچ سال کی ہوئی تو مکتب میں داخل کئے گئے[1]، سات سال کی عمر میں سنت ابراہیمی ادا ہوئی اور ختنہ ہوا، اور اسی عمر سے نماز کی عادت ڈال دی گئی، اس سال کے آخر میں قرآن مجید کے حفظ سے فراغت ہوئی، اور فارسی کتابیں اور عربی کے مختصرات پڑھنا شروع کئے[2]، اور کافیہ ختم کی، دس سال کی عمر میں شرح جامی شروع کی، فرماتے ہیں کہ مجھ میں بالجملہ مطالعہ کی استعداد پیدا ہوگئی[3]، چودہ سال کی عمر میں بیضاوی کا ایک حصہ پڑھا، پندرہ سال کی عمر میں ہندوستان میں رائج علوم متداولہ سے فراغت کی، والد صاحب نے اس خوشی میں بہت بڑی دعوت کی اور بڑے پیمانہ پر کھانا تیار کیا، جس میں خواص و عوام شریک ہوئے[4]۔

اسی پندرہ برس کی عمر میں والد صاحب سے مشکوٰۃ کا درس لیا، جس کا صرف تھوڑا حصہ (کتاب البیوع سے آداب تک) رہ گیا، کتاب کی قراءت دوسرے ساتھی نے کی تھی، جو حصہ رہ گیا تھا، اس کی بھی اجازت والد صاحب سے حاصل ہوئی، والد صاحب ہی سے صحیح بخاری کتاب الطہارت تک، شمائل ترمذی مکمل، تفسیر مدارک و بیضاوی کا کچھ کچھ حصہ پڑھا[5]، فرماتے ہیں کہ خدا کا ایک بڑا انعام یہ ہوا کہ والد صاحب کے درس قرآن میں کئی بار شریک ہوا، جس سے معانی قرآن کا ایک دروازہ کھل گیا[6]۔

شاہ صاحب کا پڑھا ہوا نصاب

شاہ صاحب نے الجزء اللطیف میں اپنے پڑھے ہوئے نصاب کا تفصیل سے ذکر کیا ہے،

---

[1] الجزء اللطیف ص٢ [2] ایضاً [3] ایضاً [4] ایضاً ص٣ [5] ایضاً [6] ایضاً۔

فقہ میں شرح وقایہ اور ہدایہ (کچھ حصہ چھوڑ کر) اصول فقہ میں حسامی اور توضیح وتلویح کا بڑا حصہ، منطق میں شرح شمسیہ مکمل، اور ایک حصہ شرح مطالع کا، علم کلام میں شرح عقائد مکمل، خیالی کے حاشیہ کے ایک حصہ کے ساتھ، کچھ حصہ شرح مواقف کا پڑھا، سلوک میں ایک حصہ عوارف اور رسائل نقشبندیہ وغیرہ کا، حقائق میں شرح رباعیات مولانا جامی اور لوائح، مقدمہ شرح اللمعات، مقدمہ نقد النصوص، خواص اسماء وآیات میں وہ مجموعہ جو خاص اس موضوع پر ہے، اور الفوائد المأۃ وغیرہ، والد صاحب نے کئی بار مجھے ان خواص وفوائد کی اجازت دی۔

طب میں موجز، فلسفہ میں شرح ہدایۃ الحکمۃ وغیرہ، معانی میں مطول کا بڑا حصہ، مختصر المعانی کا اتنا حصہ جس میں ملّا زادہ کا حاشیہ ہے، ہندسہ اور حساب میں بعض مختصر رسائل۔

شاہ صاحب کے اس نصاب میں ان کے والد ماجد اور استاد حقیقی شاہ عبدالرحیم صاحب کے اجتہاد و انتخاب کو بھی کچھ دخل تھا، ساتویں صدی ہجری سے ہندوستان میں جو نصاب درس رائج تھا، اور جس میں نویں صدی ہجری کے آخر میں شیخ عبداللہ اور شیخ عزیز اللہ کے ملتان سے دہلی آنے پر علم کلام و بلاغت و معقولات کی بعض کتابوں کا اضافہ ہوا، پھر دسویں صدی میں امیر فتح اللہ شیرازی کی آمد ہندوستان پر ایران کے علمائے متاخرین محقق دوانی، میر صدرالدین شیرازی، اور میر غیاث الدین منصور، اور مرزا جان کی تصنیفات داخل نصاب ہوئیں، غالبًا شاہ عبدالرحیم صاحب کی حقیقت پسندی، اور اپنے ہونہار فرزند کی ذکاوت پر اعتماد کر کے ان میں سے کئی کتابوں کو (جن میں اکثر مکرر مضامین تھے) حذف کر دیا گیا، مثلاً نحو میں مصباح، لُبّ الالباب (مصنفہ قاضی ناصر الدین بیضاوی) ارشاد (مصنفہ قاضی شہاب الدین دولت آبادی) کے بجائے صرف کافیہ، اور شرح جامی پڑھائی گئی، اصول فقہ میں منار اور اس کے شروح، اور اصول بزدوی کے بجائے حسامی، اور توضیح وتلویح کا کچھ حصہ، تفسیر میں کشاف ترک کر دی گئی،

حدیث میں "مشارق الانوار" شامل نہیں ہے، ادب میں مقامات حریری کا عام رواج تھا، اور بعض بزرگوں کے حفظ کرنے کا بھی ذکر آتا ہے، لیکن شاہ صاحب کے نصاب درس میں وہ نظر نہیں آتی، یہ ممکن ہے کہ ان میں سے بہت سی کتابیں بارہویں صدی کے اوائل تک بہت سے حلقہائے درس میں متروک ہو گئی ہوں۔

واضح رہے کہ بارہویں صدی ہجری ہی میں استاد العلماء ملا نظام الدین سہالوی فرنگی محلی نے جو حضرت شاہ صاحب کے کبیر السن معاصر تھے، اور جنھوں نے شاہ صاحب کی وفات سے پندرہ[۱۵] سال پہلے ۱۱۶۱ھ میں رحلت کی، اس نصاب درس میں بہت عظیم اضافہ کیا، خاص طور پر صرف و نحو، منطق و فلسفہ، ریاضی و بلاغت، اور علم کلام میں کثیر التعداد کتابوں کا اضافہ کیا، جن میں مزید اضافہ کے بعد (جو ان کے تلامذہ اور تلامذہ کے تلامذہ کے دور میں بغیر کسی منصوبہ کے ہوا) اس نصاب نے درس نظامی کی وہ آخری شکل اختیار کی جو ابھی تک قدیم مدارس میں رائج ہے۔[۱]

شاہ صاحب کے بیان کئے ہوئے نصاب درس میں ادب عربی کی کوئی کتاب نظر نہیں آتی، حالانکہ شاہ صاحب کی عربی تالیفات بالخصوص "حجۃ اللہ البالغہ" شہادت دیتی ہے کہ ان کو عربی زبان اور اس میں تحریر و انشاء پر نہ صرف قدرت تھی، بلکہ (جہاں تک حجۃ اللہ البالغہ کا تعلق ہے) وہ اس میں ایک ایسے طرز و اسلوب کے بانی ہیں، جو علمی مضامین و مقاصد کے شرح و بیان کے لئے موزوں ترین اسلوب ہے، اور جس میں علامہ ابن خلدون کے بعد ان کا کوئی

---

[۱] نصاب درس کی عہد بعہد تبدیلیوں، معیار فضیلت کے بدلنے اور ایک ہی کتاب کے متعدد شروح و حواشی کے اضافہ اور ان کے اسباب و محرکات سے واقف ہونے کے لئے والد ماجد مولانا حکیم سید عبدالحی رحمۃ اللہ علیہ کی کتاب "الثقافۃ الاسلامیۃ فی الہند" مطبوعہ المجمع العلمی دمشق، اور اردو میں ان کا پُر مغز اور محققانہ مضمون "ہندوستان کا نظام درس اور اس کے تغیرات" مطبوعہ دارالعلوم ندوۃ العلماء ملاحظہ ہو۔

ہم پایہ اور ہمسر نظر نہیں آتا، معلوم ہوتا ہے کہ شاہ صاحب نے بطور خود عربی ادب اور نثر و نظم کی ان قدیم معیاری کتابوں کا مطالعہ کیا، جو سلاست و حلاوت کا نمونہ تھیں اور جو عجمی عربی کے اثرات سے بہت کچھ محفوظ تھیں، اور حجاز کے قیام میں خاص طور پر عربی میں اس عظیم تصنیفی کام کی تیاری کی جس کو تدبیر الٰہی نے شاہ صاحب کے لئے مخصوص کر رکھا تھا[۱]، اگر مقامات حریری کا ذکر سہواً نہیں چھوٹ گیا ہے، تو اس کے شاہ صاحب کے نصاب میں داخل نہ ہونے سے بجائے نقصان کے فائدہ ہوا ہوگا کہ متاخرین عام طور پر اس کے زخم خوردہ ہیں، اور اس کی وجہ سے سجع و قوافی کے ایسے پابند کہ بے تکلفی اور روانی کے ساتھ مطالب عالیہ کے ادا کرنے اور اظہار ما فی الضمیر سے عام طور پر قاصر نظر آتے ہیں، حریری کے بعد جس نے بھی کسی مضمون پر قلم اٹھایا حریری ہی کے قلم سے لکھا جس کا قط پرانا ہو گیا تھا، رسائل و خطوط اور کتابوں کی تقریظیں حتیٰ کہ فتاوے کی طویل عبارتیں بھی حریری کے اس اثر سے آزاد نہیں۔

شاہ صاحب فرماتے ہیں کہ طالب علمی ہی کے زمانہ میں مضامین عالیہ ذہن میں آتے تھے، جن میں برابر ترقی محسوس ہوتی تھی[۲]، والد صاحب کی وفات کے بعد بارہ سال تک دینی کتب اور عقلی علوم کی کتابیں پڑھانے کی پابندی کی، اور ہر علم میں غور و خوض اور اشتغال کا موقعہ ملا۔

والد ماجد کی شفقت و تربیت اور اجازت و خلافت

شاہ صاحب فرماتے ہیں کہ والد صاحب کی شفقت میرے حال پر ایسی تھی کہ کم کسی

۱ؔ صاحب "الیانع الجنی" لکھتے ہیں "وقد اقام بالحجاز سنین و زاحم العرب وسمع من اھل البادیۃ وھم یومئذ احسن حالا منھم فی زماننا" (حجاز میں کئی سال قیام فرمایا، عربوں سے اختلاط و صحبت رہی اور اہل بادیہ سے جو اس زمانہ کے مقابلہ میں بہتر تھے صحیح و فصیح زبان سنی) ص۸۳ ۲ؔ الجزء اللطیف ص۳

باپ کی بیٹے پر، کسی استاد کی شاگرد پر، اور کسی شیخ کی مرید پر ہوگی[1]، حضرت شاہ عبدالرحیم صاحب کی تربیت کا انداز بھی بڑا حکیمانہ تھا، شاہ صاحب فرماتے ہیں کہ ایک روز زمانۂ طفولیت میں احباب و اعزہ کی ایک جماعت کے ساتھ ایک باغ کی سیر کو چلا گیا، جب واپس آیا تو والد صاحب نے فرمایا، ولی اللہ! تم نے اس دن رات میں وہ کیا حاصل کیا جو باقی رہے؟ ہم نے اس مدت میں اتنا درود پڑھا، شاہ صاحب فرماتے ہیں، یہ سن کر میرا دل باغات کی سیر و تفریح سے بالکل سرد ہوگیا، اس کے بعد پھر اس کا شوق نہیں پیدا ہوا[2]، شاہ صاحب فرماتے ہیں کہ والد صاحب مجھے حکمت عملی، آداب مجلس اور تہذیب و دانش مندی کی باتیں بہت سکھاتے تھے، اور اکثر یہ شعر پڑھتے ؎

آسائشِ دو گیتی تفسیر ایں دو حرف است

بادوستاں تلطّف بادشمناں مدارا[3]

فرماتے تھے کہ مجھے ہدایت فرمائی کہ جو لوگ مرتبہ میں کم ہوں ان سے ہمیشہ سلام میں سبقت کرنا، اور ان سے ہمیشہ خوش اخلاقی سے پیش آنا، اور ان کی خیریت و احوال دریافت کرنا، اور اس کو معمولی بات نہ سمجھنا ؎

صد ملکِ دل بہ نیم نگہ می تواں خرید

خوباں دریں معاملہ تقصیر می کنند

یہ بھی فرماتے تھے کہ بعض لوگ کسی خاص پوشاک یا عادت کے پابند ہو جاتے ہیں، کوئی تکیہ کلام مقرر کر لیتے ہیں، بعض کھانوں سے ایسے متنفر ہو جاتے ہیں، کہ ان کی وہ چڑھ مقرر ہو جاتی ہے، ان سب چیزوں سے پرہیز کرنا چاہیئے، اپنی کسی خواہش کی تکمیل میں

---

[1] الجزء اللطیف ص۳ [2] انفاس العارفین ص۶۳ [3] ایضاً ص۸۳

صرف لذّت جوئی مقصود نہ ہو، اس میں کسی ضرورت کی تکمیل، کسی فضیلت کا حصول، یا ادائے سنت مقصود ہونی چاہیئے، چال ڈھال، نشست و برخاست، کسی سے ضعف یا کسل مندی کا اظہار نہیں ہونا چاہیئے، شاہ عبدالرحیم صاحبؒ شاہ صاحب کے بیان کے مطابق شجاعت، فراست، خوش انتظامی اور غیرت کے اوصاف عالیہ سے متّصف تھے، عقل معاش بھی عقل معاد کی طرح کامل و وافر رکھتے تھے، ہر معاملہ میں اعتدال کو پسند کرتے تھے، شاہ صاحب کی سیرت و اخلاق میں انھیں چیزوں کا پر تو تھا۔[۱]

والد صاحب ہی سے چودہ[۱۴] سال کی عمر میں بیعت کی اور اشغال صوفیہ بالخصوص مشائخ نقشبندیہ کے اشغال میں مشغول ہوئے، توجہ اور تلقین حاصل کی، والد صاحب نے آداب طریقت کا ایک حصہ تعلیم کیا، اور خرقہ پہنایا[۲]، شاہ صاحب کی عمر سترہ[۱۷] سال کی تھی، کہ حضرت شاہ عبدالرحیم صاحبؒ نے اس دنیا سے رحلت فرمائی، آپ نے مرض موت میں بیعت وارشاد کی اجازت دی، اور بار بار فرمایا کہ یدہٗ کیدی (اس کا ہاتھ میرے ہاتھ کی طرح ہے۔)[۳]

شادی

شاہ ولی اللہ صاحبؒ کی عمر چودہ[۱۴] سال کی تھی کہ آپ کے والد ماجد نے آپ کی شادی آپ کے ماموں شیخ عبیداللہ صدیقی پھلتی کی صاحبزادی سے کر دی، سسرال والوں نے جب مہلت کا تقاضا کیا تو شاہ عبدالرحیم صاحب نے معذرت کی اور کہا کہ اسی میں مصلحت ہے، بعد کے پے در پے خاندانی حوادث نے ثابت کر دیا کہ اگر اس زمانہ میں شادی نہ ہو جاتی تو اس کو

---

[۱] انفاس العارفین ص۱۸۳   [۲] الجزء اللطیف ص۲   [۳] ایضاً ص۳

بہت دنوں کے لئے ملتوی کرنا پڑتا[1]۔ان زوجہ سے آپ کے بڑے صاحبزادہ شیخ محمد پیدا ہوئے، جنھوں نے آپ ہی سے تعلیم پائی، شاہ صاحب نے ان کے لئے ایک ابتدائی رسالہ بھی تصنیف فرمایا تھا، شمائل ترمذی کے درس میں شاہ عبدالعزیزؒ کے شریک اور قاری تھے[2]، شاہ صاحب کی وفات کے بعد قصبہ بڑھانہ منتقل ہوگئے، اور مدۃ العمر وہیں رہ کر ۱۲۰۸ھ میں وفات پائی اور قصبہ کی جامع مسجد کے صحن میں مدفون ہوئے[3]،اسی بناء پر شاہ صاحب ابو محمد کنیت کرتے تھے[4]،شیخ محمد کے دو صاحبزادوں کا تذکرہ جو ان کے ساتھ ہی مدفون ہیں، مقالات طریقت میں آتا ہے، لیکن کتابوں میں ان کو منقطع العقب لکھا ہے، حضرت شاہ عبدالعزیز صاحب نے حضرت شاہ ابوسعید حسنیؒ رائے بریلوی کے نام تین خطوط میں برادر بزرگ شیخ محمد بن شاہ ولی اللہ صاحبؒ کا سلام لکھا ہے، ان میں کہیں "برادر صاحب بزرگ شیخ محمد صاحب" اور کسی خط میں "الشیخ الکبیر محمد" کے نام سے سلام لکھا ہے، ان خطوط سے بھائیوں کی باہمی مُوَدَّت و تعلق کا بھی اندازہ ہوتا ہے[5]۔

دوسرا عقد

شاہ صاحب کا دوسرا عقد پہلی اہلیہ کی وفات کے بعد سید ثناء اللہ سونی پتی کی

---

[1] شاہ صاحب لکھتے ہیں کہ چند ہی دنوں کے بعد میری ہونے والی خوشدامن نے انتقال کیا، تھوڑے ہی دنوں کے بعد ان کی نانی نے پھر میرے چچا زاد بھائی شاہ فخر العالم نے پھر میری پہلی والدہ (برادر صلاح الدین کی ماں) نے انتقال کیا۔ [2] نزہۃ الخواطر ج ۶ [3] ایضاً [4] الارشاد فی مہمات الاسناد
[5] مکتوب المعارف (قلمی) ص۱۶-۱۷-۱۸

صاحبزادی بی بی ارادت سے ہوا جو سونی پت کے رہنے والے تھے اور سید ناصرالدین شہید سونی پتی[1] کی اولاد میں تھے، ان زوجہ محترمہ سے آپکے چاروں نامور صاحبزادے (حضرت شاہ عبدالعزیزؒ، شاہ رفیع الدینؒ، شاہ عبدالقادرؒ و شاہ عبدالغنیؒ) تولد ہوئے، جو ہندوستان میں

---

[1] سید ناصرالدین شہید کا تذکرہ کتاب "قصر عارفان" تالیف مولوی احمد علی خیرآبادی میں (جو ڈاکٹر محمد باقر کے اہتمام میں ۱۹۶۵ء میں شائع ہوئی ہے) ص ۲۸۰-۲۹۰ میں ملتا ہے، مصنف نے ان کو امام باقر بن امام زین العابدینؒ کا فرزند اور امام جعفر صادق کا بھائی لکھا ہے، مصنف نے ان کا سفر شہر واسط سے خراسان اور خراسان سے غزنی پھر غزنی سے چھیاسٹھ ۶۶ سواروں کے ساتھ (جن کے مصنف نے نام بھی دیئے ہیں) قنوج کی طرف رخ کرنے کا حال لکھا ہے، مصنف کے بیان کے مطابق ۱۴۶ھ میں ان کا سونی پت میں ورود ہوا، یہ سلطان شہاب الدین غوری کا زمانہ اور امیر الممالک نصیر الدین کی حکومت کا دور تھا، حاکم دیار ارجن دیو نے عربی گھوڑوں کی خریداری کی پیش کش کی جس کو امام نے قبول نہیں کیا، بعد میں گفتگو نے طول کھینچا اور جنگ کی نوبت آئی، امام کے رفقاء نے ارجن دیو کو شکست دی لیکن اس کے بھائی ہر ہر دیو کے مقابلہ میں ۱۲ محرم ۱۴۷ھ میں امام عالی مقام نے اپنے رفقاء جاں نثار کے ساتھ جام شہادت نوش فرمایا۔

یہ بیان اور ۱۴۷ھ میں خاندان اہل بیت کے کسی فرد جلیل کا شمالی ہند کے مقام سونی پت تک پہونچنا اور شہادت حاصل کرنا درایت اور تاریخی مسلّمات کے خلاف ہے کہ مسلمان حوصلہ مندوں اور غازیوں کی رسائی اس وقت تک سندھ و ملتان کے آگے نہیں لنی نہ اس وقت تک اسلامی حکومت سندھ و ملتان سے آگے بڑھنے پائی تھی، منصورہ تیسری صدی کے آخر اور چوتھی صدی کی ابتدا میں اسلامی سلطنت کا مرکز بنا، خود محمود غزنوی ۳۸۸ھ میں اورنگ نشین ہوا، اس کا پہلا حملہ ہندوستان ۳۹۱ھ میں ہوا، جہاں تک شہاب الدین محمد غوری کا تعلق ہے جس کے عہد میں امام ناصرالدین کی مہم بتائی جاتی ہے اس نے ۵۷۲ھ میں پہلی مرتبہ ہندوستان کا رخ کیا، اور ۵۸۸ھ میں پرتھوی راج کو مکمل شکست دے کر ہندوستان میں مستقل حکومت قائم کی، مزید یہ کہ امام محمد باقر کے صاحبزادوں میں کسی کا نام کتب انساب میں امام ناصرالدین نہیں ملتا، بعض مرتبین شجرہ نے ان کو امام کی بائیسویں ۲۲ پشت میں دکھایا ہے، اس لئے مصنف "قصر عارفان" کا بیان واقعات و مسلمات

(باقی ص ۱۰۷ پر)

دین کی نشأۃ ثانیہ کے "ارکان اربعہ" ہیں رحمہم اللہ تعالیٰ، اور ایک صاحبزادی امۃ العزیز بھی پیدا ہوئیں، ان کا عقد مولوی محمد فائق ابن مولانا محمد عاشق پھلتی سے ہوا، وہ صاحب اولاد تھیں، ان کا سلسلہ جاری رہا۔

سفرِ حج

شاہ صاحبؒ کی علمی، فکری اور دعوتی و تجدیدی زندگی میں حجاز مقدس کا سفر اور قیام ایک تاریخ ساز واقعہ اور ان کی کتاب زندگی کا ایک نیا باب اور حد فاصل ہے، حجاز کے اسی طویل قیام میں جو ایک سال سے زیادہ رہا، ان کے ملکات ذہنی و علمی نے ارتقاء کے وہ منازل طے کئے جو بظاہر ہندوستان میں ممکن نہ تھے، اور اس کے لئے حرمین ہی جیسی مرکزی و عالمی جگہ درکار تھی، اسی سفر میں انھوں نے علم حدیث کا وسیع اور گہرا مطالعہ کیا، اور اس کے شیوخ کاملین سے جو دیار و امصار سے وہاں جمع ہوئے تھے، اس فن شریف کی تکمیل کی، جو ان کی تجدید و اصلاح کے ایوان بلند میں حجر الزاویۃ (کونہ کے پتھر) کی حیثیت رکھتا ہے، اور جس سے وہ تحقیق و اجتہاد کے اس مقام پر پہونچے، جس پر ان آخری صدیوں میں کم لوگ (اور جہاں تک مقاصد و اسرار شریعت اور تطبیق بین الفقہ والحدیث کا تعلق ہے) کئی صدیوں سے کوئی نہیں پہونچا تھا۔

(باقی صفحہ ۱۰۶ کا) کے خلاف اور مشہور تاریخ سے کھلا تضاد رکھتا ہے، اور قابل اعتبار نہیں، البتہ امام ناصر الدین کی شہادت (جس کے سنہ کا تعین مشکل ہے) ایک تاریخی حقیقت ہے، جو تواتر کے ساتھ اس جوار میں چلی آرہی ہے، حضرت شاہ ولی اللہ صاحبؒ کے خاندان کی اس خاندان والا شان سے قرابتیں قدیم سے چلی آرہی تھیں اور آپ کی دوسری شادی جیسا کہ اوپر گذرا اسی خاندان میں ہوئی۔

سفر حج کے وقت شاہ صاحبؒ کی عمر تیس[۳] سال تھی،[۱] اس وقت کے سیاسی حالات، راستوں کے امن وامان کی کیفیت، بعض غیر ملکی طاقتوں کے تسلط، برّی اور بحری خطرات اور قزّاقی کے پیش نظر یہ سفر ان کی عالی ہمتی، شوق علم اور حرمین شریفین سے قلبی وابستگی کی روشن دلیل ہے، نیز ان کی حمیّتِ اسلامی، دور بینی وبلند نگاہی پر بھی دلالت کرتا ہے کہ ہندوستان میں حفاظت دین اور ملت اسلامیہ ہندیہ کے عروج واستقلال کے لئے ان کی نگاہ ہندوستان ہی کے حالات کے مطالعہ اور وہیں اس کی تدبیر وعلاج کی تلاش میں محدود نہیں تھی، وہ قرآن مجید کے اشارۂ بلیغ "لِيَشْهَدُوْا مَنَافِعَ لَهُمْ"[۲] پر عمل کرکے عالم اسلام کے اس قلب ومرکز اور دنیا کے گوشہ گوشہ سے آئے ہوئے وفود الاسلام وضیوف الرحمٰن کے علوم ومعارف، عقول واذہان اور تجربات ومساعی سے فائدہ اٹھانا چاہتے تھے۔

اس وقت سورت ہندوستان کی بندرگاہ اور باب مکہ تھا، راستہ کے مقامات بالخصوص مالوہ وگجرات مرہٹوں کی غارت گری اور استحصال کی آماج گاہ بنے ہوئے تھے، شمالی ہند سے جنوبی ہند تک کے اس طویل راستہ کو اس وقت کی سواریوں، بہلیوں اور اونٹ گاڑیوں سے طے کرنا آسان نہ تھا،[۳] بحر ہند اور بحر احمر کے تمام سواحل، پرتگیزی ولندیزی (ڈچ) قزّاقوں اور

---

[۱] "القول الجلی" سے معلوم ہوتا ہے کہ شاہ صاحبؒ نے اس سفر حج سے پہلے جو مکمل ہوا، ایک مرتبہ بیس سال کی عمر میں اچانک سفر کا ارادہ اور ہجرت کا عزم فرمایا تھا، اور مخفی طور پر بے زاد وراحلہ کوچ فرمایا، جب ساحل سمندر پر پہونچے تو معلوم ہوا کہ جہاز روانہ ہوچکے ہیں، اب کوئی جہاز باقی نہیں، مجبوراً شہر کھمبات میں قیام فرمایا، ایک مرتبہ مراقبہ میں ایک ایسی کیفیت طاری ہوئی کہ دل سفر سے سرد ہوگیا، اور واپسی کا فیصلہ فرمالیا، اس میں کچھ بارگاہ رسالت پناہ کا اشارہ بھی شامل تھا۔ (القول الجلی نسخۂ مخطوطہ خانقاہ کاظمیہ قلندریہ، کاکوری) [۲] الحج - ۲۸

[۳] شاہ عبدالعزیز صاحب کے ملفوظات سے معلوم ہوتا ہے کہ شاہ صاحب اس سفر میں راجپوتانہ سے بھی گذرے تھے۔ ص۳۲

فرنچ وانگریز، ملک گیروں کے بحری حملوں کے خطرہ سے محفوظ نہ تھے، حُجّاج کی ان مصیبتوں اور حوادث کی تفصیل اس وقت کے سفرناموں میں (جو بہت کم مرتب و محفوظ رہ سکے ہیں) دیکھی جاسکتی ہے، خود ہندوستان کے راستہ کا حال یہ تھا کہ رات کو اگر کوئی ساتھی کسی گاؤں یا آبادی میں چھوٹ جاتا تھا تو شاہ صاحب یا بدیع العجائب یا بدیع العجائب کا وظیفہ شروع کر دیتے تھے۔

سورت سے جدّہ پینتالیس (۴۵) روز میں پہونچنا ہوا، ۱۵ ر ذیقعدہ کو داخل مکہ معظمہ ہوئے، علماء اور طلبہ کی درخواست پر مسجد حرام میں مصلے حنفی کے پاس درس شروع کیا، جس میں بہت ہجوم ہوا۔[۱]

شاہ صاحب "الجزء اللطیف" میں لکھتے ہیں کہ ۱۱۴۳ھ میں حرمین شریفین کی زیارت کے شوق کا غلبہ ہوا، ۱۱۴۳ھ کے آخر (ذی الحجہ) میں حج سے مشرف ہوا، ۱۱۴۴ھ تک بیت اللہ کی مجاورت کی، اور زیارت مدینہ سے مشرف ہوا، شیخ ابو طاہر مدنی اور دوسرے مشائخ حرمین سے حدیث کی روایت کی، علمائے حرمین سے مجالس رہیں، شیخ ابو طاہر مدنی نے خرقہ پہنایا، جو غالباً صوفیہ کے تمام خرقوں کا جامع ہے، اس سال ۱۱۴۴ھ کے اختتام پر دوبارہ مناسک حج ادا کئے، اور ۱۱۴۵ھ کے اوائل میں ہندوستان روانہ ہوا، اور ۱۰ ر رجب ۱۱۴۵ھ کو جمعہ کے دن صحت و سلامتی کے ساتھ اپنے مستقر (دہلی) پر پہونچا۔[۲]

شاہ صاحب کے مشائخ و اساتذۂ حرمین

شاہ صاحب نے مشائخ و اساتذۂ حرمین کے تعارف اور تذکرہ میں مستقل رسالہ "انسان العین فی مشائخ الحرمین" تصنیف فرمایا، اس رسالہ میں اپنے شیخ خاص اور اپنے محسن و محبوب استاد شیخ ابو طاہر محمد بن ابراہیم الکردی المدنی کا قدرے تفصیل سے تعارف کرایا، چونکہ

[۱] القول الجلی (قلمی) [۲] الجزء اللطیف ص ۵

خصوصی اساتذہ ومشائخ کی عالی استعداد تلامذہ پر گہری چھاپ ہوتی ہے اور ان کے رجحانات وتحقیقات کا ان شاگردانِ رشید پر انقلاب انگیز اثر ہوتا ہے اس لئے ان کا قدرے تفصیل ہی کے ساتھ تذکرہ مناسب ہے۔

شاہ صاحب لکھتے ہیں کہ شیخ ابوطاہر محمد بن ابراہیم نے اپنے والد شیخ ابراہیم الکردی سے علم الحدیث کی تحصیل کی، اس کے بعد شیخ حسن عُجیمی[1] سے زیادہ تر استفادہ کیا، اس کے بعد احمد نخلی، شیخ عبداللہ بصری سے شمائل نبوی، اور مسند امام احمد دو مہینے سے کم میں پڑھی، حرمین میں آنے والے علماء سے استفادہ کرتے رہے، شیخ عبداللہ لاہوری سے ملا عبدالحکیم سیالکوٹی اور شیخ عبدالحق محدث دہلوی کی کتابوں کی روایت کی اجازت پائی، شیخ سعید کوکنی سے بعض کتب عربیہ اور فتح الباری کا ایک ربع پڑھا[2]۔

"الیانع الجنی" میں علامہ محسن بن یحییٰ ترہتی نے لکھا ہے کہ شیخ ابوطاہر کہا کرتے تھے کہ شیخ ولی اللہ مجھ سے لفظ کی سند لیتے ہیں، اور میں ان سے حدیث کے مطالب میں استفادہ کرتا ہوں، اپنی اجازت میں بھی ایسا ہی لکھا ہے[3]۔

شیخ ابوطاہر (محدث کبیر ہونے کے باوجود) صوفیہ کے بڑے معتقد اور ان پر تنقید کرنے سے محترز تھے، شاہ صاحب فرماتے ہیں کہ میں شیخ ابوطاہر سے رخصت ہونے گیا تو انھوں نے یہ شعر پڑھا ؎

نسیتُ کلّ طریقٍ کنتُ أعرفہ　　إلّا طریقًا یؤدّینی لربعکم

(میں چلنے کا ہر راستہ بھول گیا سوائے اس راستہ کے جو آپ کے گھر تک پہونچاتا ہے)

---

[1] شاہ صاحب نے "انسان العین" میں ان کا لقب عجمی لکھا ہے، جو غالباً طباعت کی غلطی ہے، تذکرہ کی عام کتابوں میں ان کو العجیمی (تصغیر کے ساتھ) یاد کیا گیا ہے (ملاحظہ ہو زرکلی کی الاعلام جلد ۲ ص ۲۲۳) [2] انسان العین ص ۱۳

[3] الیانع الجنی فی اسانید الشیخ عبدالغنی، مجموعہ کشف الاستار عن رجال معانی الآثار، برحاشیہ، مطبوعہ دارالاشاعت والتدریس، دیوبند

یہی جواب شاہ صاحب کا بھی تھا، شاہ عبدالعزیز صاحب فرماتے ہیں کہ میرے والد صاحب جب مدینہ طیبہ سے رخصت ہونے لگے تو استاد محترم سے عرض کیا اور وہ یہ سن کر خوش ہوئے کہ میں نے جو کچھ پڑھا تھا سب بھلا دیا سوائے علم دین وحدیث کے۔[1]

شاہ صاحبؒ کی بعد کی زندگی اور مشاغل نے (جس کی تفصیل آئندہ اوراق میں آئیگی) اس کی تصدیق کردی کہ انھوں نے جو کچھ کہا تھا اس کو کرکے دکھادیا "مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ رِجَالٌ صَدَقُوْا مَا عَاهَدُوا اللّٰهَ عَلَيْهِ" (سورۃ الاحزاب ۔۲۳)

رمضان ۱۱۴۵ھ میں شیخ ابوطاہر نے اس دار فانی سے رحلت فرمائی، گویا شاہ صاحب کی مدینہ طیبہ سے روانگی کے کچھ عرصہ اور ان کے دہلی پہونچنے کے ڈیڑھ دو مہینے بعد[2] ان کی وفات ہوئی، اور شاہ صاحب کی آمد ہندوستان کے بعد ان کو افادہ وتربیت کا بہت مختصر وقت ملا "وَذٰلِكَ تَقْدِيْرُ الْعَزِيْزِ الْعَلِيْمِ"

ان کے تذکرہ میں یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ ان کے والد شیخ ابراہیم کورانی[3] امام ابن تیمیہؒ کی طرف سے مدافعت کیا کرتے تھے، علامہ سید نعمان خیرالدین آلوسی بغدادی اپنی مشہور کتاب "جلاء العینین فی محاکمۃ الاحمدین" میں لکھتے ہیں:۔

وكان سلفي العقيدة ذابًّا عن	وہ سلفی العقیدہ تھے، شیخ اسلام ابن تیمیہ
شيخ الاسلام ابن تيمية وكذا	کی طرف سے مدافعت کرتے تھے،
يذبّ عمّا وقع في كلمات	اسی طرح سے ان صوفیہ کے ان الفاظ
الصوفية مما ظاهره الحلول	کی تاویل کرتے تھے، جن سے ظاہری طور پر

---

[1] ملفوظات حضرت شاہ عبدالعزیز ص۹۳ [2] انسان العین ص۱۴

[3] ولادت ۱۰۲۵ھ وفات ۱۱۰۱ھ۔ شیخ ابراہیم اسّی سے زائد کتابوں کے مصنف ہیں۔

اوالاتحاد أوالعینیۃ۔[1] حلول واتحاد یاعینیت کا اظہار ہوتا تھا۔

اس سے یہ نتیجہ نکالا جاسکتا ہے کہ شیخ الاسلام کی کتابوں سے تعارف، ان کی حمایت ومدافعت کا جو اظہار شاہ صاحب کی تحریروں سے ہوا، نیز اس تطبیقی رجحان میں جو شاہ صاحب کی خاندانی روایت و وراثت تھی، شیخ ابوطاہر کی گفتگو کا بھی اثر اور حصہ ہوگا جس کا رجحان انھوں نے اپنے والد ماجد شیخ ابراہیم کورانی سے وراثتاً پایا ہوگا۔

شاہ صاحب کے دوسرے شیخ جن سے شاہ صاحب کو اجازت حاصل ہوئی، شیخ تاج الدین قلعی حنفی مفتی مکہ تھے، حدیث میں ان کی اکثر تعلیم شیخ عبداللہ بن سالم مصری سے ہوئی، صحیحین شیخ عجیمی سے پڑھی، اور ان سے اجازت مطلقہ حاصل ہوئی، ان کو شیخ احمد نخلی وغیرہ سے بھی اجازت ہے، شاہ صاحب نے تین ۳ روز ان کے درس بخاری میں شرکت کی، کتب ستہ کے اطراف اور مؤطا کا ایک حصہ، مسند دارمی، امام محمدؒ کی کتاب الآثار، اور مؤطا ان سے سنی، شیخ نے ان سب کتابوں کی اہل مجلس کو اجازت دی، شاہ صاحب بھی شریک تھے، شاہ صاحب نے حدیث مسلسل بالاوّلیۃ بھی ان سے سنی۔[2]

شاہ صاحب نے حافظ حدیث اور جامع کمالات شیخ محمد بن محمد بن سلیمان المغربی کے (جو نسخۂ بتونیہ کے مالک تھے، اور اس کو استنبول سے حرمین میں لائے تھے، اور جمہور اہل حرمین کے استاد تھے) صاحبزادہ شیخ محمد وفداللہ سے بھی اپنے والد کی تمام مرویات کی اجازت حاصل کی، اس کے علاوہ مؤطا یحییٰ بن یحییٰ کا ملاً ان سے پڑھی اور اس کی اجازت لی۔[3]

---

[1] جلاء العینین مطبوعہ مطبعۃ المدنی، مصر ص۲۱ [2] انسان العین ص۱۵-۱۶ [3] ایضاً ص۷

شاہ صاحب زمانۂ تعلیم ہندوستان میں اپنے زمانہ کے امام حدیث شیخ محمد فضل سیالکوٹی کے درس میں بھی شریک ہوئے تھے[1] جنھوں نے حدیث کی سند شیخ سالم بن عبداللہ بصری سے حاصل کی تھی، اور ان سے حدیث پڑھی تھی، وہ شیخ عبدالاحد ابن خواجہ محمد سعید سرہندی کے بھی شاگرد تھے، غازی الدین خاں کے مدرسہ میں دہلی میں حدیث کا درس دیتے تھے، حضرت مرزا مظہر جانِ جاناںؒ نے حدیث و سلوک دونوں میں ان سے استفادہ کیا[2]۔

اس سفر میں آپ کے ماموں شیخ عبیداللہ بارہوی اور ماموں زاد بھائی شیخ محمد عاشق پھلتی (مصنف القول الجلی) بھی ساتھ تھے، شاہ صاحب نے اپنی والدہ ماجدہ کی خبر وفات اسی سفر حج میں واپسی پر مکہ معظمہ میں سنی[3]۔

شاہ صاحب کے لئے فن حدیث کے خصوصی ذوق، حرمین میں اس کی تدریس واشاعت کے آسان مواقع اور وہاں بیٹھ کر مختلف ممالک سے آنے والے طالبین علم اور علماء کو مستفید کرنے کا امکان، پھر مجاورت بیت اور جوار نبویؐ کی برکت و سعادت اور ہندوستان کے غیر یقینی حالات، سلطنت اسلام کے اکھڑتے ہوئے قدم، اور غیر ملکی طاقتوں کے روز افزوں تسلط کا علم، حجاز میں مستقل قیام و ہجرت کی نیت کے قوی اسباب و محرکات تھے، اور نہ صرف اس کے جواز کے دلائل بلکہ دینی و علمی مصالح کی تائید بھی فراہم کرتے تھے، لیکن آپ نے ہندوستان کی واپسی کا وہ فیصلہ کیا جس میں اللہ تعالے نے وہ خیر مقدر فرما رکھی تھی، جس کا آپ کے تجدیدی و اجتہادی کارنامہ میں ظہور ہوا، اور اس بشارت نبویؐ کا تحقق جو آپ کو مدینہ طیبہ کے قیام میں حاصل ہوئی تھی۔

اِنّ مراد الحق فیك أن یجمع   خدا کا ارادہ ہو چکا ہے کہ تمہارے

---

[1] نزہتہ الخواطر ج ۶   [2] ایضاً   [3] القول الجلی (قلمی)

شملاً من شمل الأمة المرحومة بك[1]۔	ذریعہ امت مرحومہ کی ایک خاص شیرازہ بندی ہو۔

شاہ صاحب کے نہ صرف اپنے بارے میں، بلکہ اپنے خواص اصحاب کے بارے میں بھی رجحان یہی تھا کہ وہ ہندوستان کو اپنی سرگرمیوں اور علمی و دینی خدمات کا مرکز بنائیں، جس ملک پران کے اسلاف نے اپنی بہترین علمی و دینی صلاحیتیں اور توانائیاں صرف کیں؛ اور جس نے ہر دور میں محقق و عارف پیدا کئے، اور اس کو مستقبل میں علم حدیث، اور دوسرے علوم دینیہ کا مرکز بنا تھا، آپ کے ایک تلمیذ خاص مخدوم معین الدین سندھی نے حجاز جاکر جب وہیں رہ جانے کا ارادہ ظاہر کیا، تو شاہ صاحب نے ان کو اس سے منع کیا اور لکھا:۔

أما عزم ترك الرجوع إلى الوطن فلا تستبق وإليه حتى يشرح الله صدركم أو صدر رجل لأجلكم[2]۔	جہاں تک وطن کی طرف مراجعت نہ کرنے کے ارادہ کا تعلق ہے، تو ابھی اس بارے میں قطعی فیصلہ اور اس پر اصرار نہ کیجئے، یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ آپ کا یا آپ کے کسی خاص تعلق والے کا شرح صدر نہ فرمادے۔

شاہ صاحب کا درس حدیث

شاہ صاحب نے حجاز سے واپس آنے کے بعد اپنے والد صاحب کے مدرسہ رحیمیہ میں

---

[1] فیوض الحرمین، مطبع احمدی، دہلی ص۶۲ [2] حیات ولی (مکتوبات حضرت شاہ ولی اللہ صاحب المکتوب العاشر) ص۵۳۶ مطبوعہ مسیح ۔ لاہور۔

جو اس وقت پرانی دلی میں اس محلہ میں جو اب مہندیاں کہلاتا ہے، واقع تھا، درس شروع کر دیا لیکن چند ہی دنوں میں اطراف و اکناف سے طلباء کھنچ کھنچ کر پہونچنے لگے، اس وقت یہ جگہ ناکافی ثابت ہوئی، اللہ تعالےٰ نے یہ سعادت (بہت سی بے توفیقیوں اور کمزوریوں کے ساتھ) محمد شاہ بادشاہ کے مقدر میں رکھی تھی، اس نے شاہ صاحب کو شہر میں ایک عالی شان مکان دے کر شہر میں بلا لیا، اور آپ نے وہاں درس شروع کر دیا[1]۔ مولوی بشیر الدین لکھتے ہیں:۔

"یہ مدرسہ زمانہ میں نہایت عالی شان اور خوبصورت تھا اور بڑا دارالعلوم سمجھا جاتا تھا، غدر تک وہ اپنی اصلی حالت پر قائم تھا، غدر میں مکانات لوٹ لئے گئے، کڑی تختے تک لوگ اٹھا لے گئے۔"

مولوی صاحب مزید لکھتے ہیں:۔

"اب متفرق لوگوں کے مکانات اس جگہ بن گئے ہیں، مگر محلہ شاہ عبدالعزیز صاحب کے مدرسہ کے نام سے آج تک پکارا جاتا ہے۔"

شاہ عبدالعزیز صاحب کے ملفوظات میں ایک جگہ اس مدرسہ کی مسجد کا تذکرہ ہے، شاہ صاحب نے فرمایا:۔

درآں ہنگام بزرگان بسیار و اولیاء	(میری ولادت کے وقت) بہت سے
بسیار از یاران والد ماجد مثل شاہ	بزرگ و اولیاء جو والد ماجد کے احباب
محمد عاشق و مولوی نور محمد وغیرہ معتکف	و خواص میں سے تھے مثلاً شاہ محمد عاشق
مسجد ہذا می بودند[2]۔	و مولوی نور محمد وغیرہ اس مسجد میں معتکف ہوا کرتے تھے۔

---

[1] "دارالحکومت دہلی" جلد ۲ صفحہ ۲۸۶ مؤلفہ مولوی بشیر الدین۔

[2] ملفوظات شاہ عبدالعزیز صاحب (فارسی) صفحہ ۱۰۹ مطبع مجتبائی، میرٹھ

مولانا حکیم سید عبدالحی صاحب مصنف "نزہۃ الخواطر" نے ۱۳۱۲ھ/۱۸۹۴ء میں دہلی اور اس کے اطراف کا سفر کیا تھا، ۲۶ رجب کے روزنامچہ میں تحریر فرماتے ہیں:۔

"میاں سید نذیر حسین صاحب کے درس سے آنے کے بعد میں نے ارادہ کیا کہ حضرت مولانا ومولیٰ الکل، مقتدائے اربابِ تمیز شاہ عبدالعزیز صاحب روّح اللہ روحہ کے مدرسہ کی زیارت کروں جس میں ہمارے بزرگوں نے یکے بعد دیگرے استفادہ کیا ہے اور جس کی خاکروبی کو فخر وسعادت سمجھا ہے[1]، یہاں سے جامع مسجد اور اس کے آگے چتلی قبر تک گیا، چتلی قبر سے دو راستے ہیں، ایک داہنے ہاتھ کو وہ سیدھا خانقاہ کو گیا ہے[2]، دوسرا بائیں ہاتھ کو، اس راستہ پر بہت دور تک چلا گیا، آگے بڑھ کر بائیں ہاتھ کو کوچۂ فولاد خاں کو سڑک گئی ہے، وہ سیدھی کلاں محل تک چلی گئی ہے، کلاں محل میں ہمارے شیخ المشائخ مولانا ومقتدانا رحمہ اللہ تعالیٰ کا مدرسہ ہے، اس کی حالت کو دیکھ کر "خَاوِيَةٌ عَلٰى عُرُوْشِهَا ۚ قَالَ اَنّٰى يُحْيٖ هٰذِهِ اللّٰهُ بَعْدَ مَوْتِهَا"[3] کی آیت یاد آئی، اللہ اللہ کیا کارخانۂ قدرت کی نیرنگیاں ہیں، ایک وہ دن تھا کہ عرب وعجم کے لوگ اس مدرسہ میں رہتے تھے، اور فائدہ حاصل کرتے تھے، اور آج اس کی یہ حالت ہے کہ ویران اور خراب پڑا ہے، کوئی رہنے والا نہیں[4]۔"

پھر اسی خاندان کی ایک یادگار مولوی سید ظہیر الدین احمد صاحب کی روایت سے نقل کیا ہے کہ

---

[1] اس جگہ مولانا نے اپنے خاندان حسنی قطبی کے متعدد بزرگوں کے نام لکھے ہیں، جو حضرت شاہ ولی اللہ صاحب کے وقت سے حضرت شاہ عبدالعزیزؒ کے وقت تک یہاں آتے اور استفادہ کرتے رہے۔

[2] اس سے مراد حضرت شاہ غلام علی صاحبؒ کی خانقاہ ہے، اس محلہ کو اب شاہ ابوالخیر مارگ کے نام سے یاد کرتے ہیں۔

[3] البقرہ-۲۵۹ [4] "دہلی اور اس کے اطراف" مطبوعہ انجمن ترقی اردو ص ۶۳-۶۴

مہندیوں میں جہاں ان حضرات کے مزار ہیں، وہاں مدرسہ بھی تھا، شاہ عبدالرحیم صاحبؒ کے بعد شاہ ولی اللہ صاحبؒ نئے شہر میں تشریف لائے یہ مدرسہ ان کو دیا گیا اور وہ یہیں رہ پڑے[1]۔

حضرت شاہ عبدالعزیز صاحبؒ کی زبانی حضرت شاہ صاحبؒ کے بعض خصائص و معمولات

افسوس ہے کہ کوئی معاصر تذکرہ، سفرنامہ یا روزنامچہ ایسا سامنے نہیں ہے جس سے شاہ صاحبؒ کے خصائص، معمولات، نظام الاوقات اور نشست و برخاست کے حالات تفصیل سے معلوم ہوں، ملفوظات حضرت شاہ عبدالعزیز صاحبؒ[2] (فارسی) میں کہیں کہیں کچھ اشارے آئے ہیں۔

فرمایا کہ میں نے اپنے والد ماجد کا جیسا قوی الحفظ نہیں دیکھا، سننے کا انکار تو نہیں کر سکتا، لیکن مشاہدہ میں نہیں آیا[3]، علوم و کمالات کے ماسوا ضبط اوقات میں بھی اپنی مثال نہیں رکھتے تھے، اشراق کے بعد جو نشست رکھتے تو دو پہر تک نہ زانو بدلتے نہ کھجاتے نہ تھوکتے[4]، ہر فن میں ایک ایک آدمی کو تیار کر دیا تھا، اس فن کے طالب کو اسی کے سپرد فرما دیتے، اور خود بیان حقائق و معارف اور ان کی تدوین و تحریر میں مصروف رہتے، حدیث کا مطالعہ اور درس فرماتے تھے، جس چیز کا کشف ہوتا تھا اس کو لکھ لیتے تھے، بیمار بہت کم ہوتے تھے[5]، جد بزرگوار اور عم محترم (جو طبیب بھی تھے) لوگوں کا علاج کرتے تھے، والد صاحبؒ نے اس شغل کو موقوف کیا، البتہ طب کی کتابوں کا مطالعہ کرتے تھے[6]، طبیعت میں بچپن سے نظافت و لطافت تھی، اشعار صوفیانہ کم پڑھتے، کبھی کبھی ضرور کوئی شعر پڑھتے[7]۔

---

[1] "دہلی اور اس کے اطراف" مطبوعہ انجمن ترقی اردو ص ۶۷ [2] کتاب کے طابع و ناشر محمد بشیر الدین صدیقی صاحب کو جامع ملفوظات کا مسودہ کی بوسیدگی و کرم خوردگی کی وجہ سے نام نہیں معلوم ہو سکا لیکن کتاب میں ایسی داخلی شہادتیں موجود ہیں کہ ان ملفوظات کی نسبت میں کسی شک کی گنجائش نہیں رہ جاتی۔ [3] ملفوظات ص ۱۱
[4] ایضاً ص ۴۳ [5] ایضاً ص ۸۰ [6] ایضاً ص ۲۲ [7] ایضاً ص ۴۳

وفات

بالآخر اس بیش قیمت و بابرکت مدت حیات کے جس کا ایک ایک لمحہ قیمتی، اسلام اور مسلمانوں کے لئے مفید، اور احیاء سنت، قرآن وحدیث کی نشر واشاعت تعلیم وتربیت، یاد الٰہی اور اعلاء کلمۃ اللہ کی فکر میں مصروف تھا، خاتمہ بالخیر کا دن آ گیا، جس سے "کُلُّ نَفْسٍ ذَآئِقَةُ الْمَوْتِ"[1] کے اعلان و وعدہ کے مطابق نہ کوئی نبی مستثنیٰ ہے، نہ کوئی ولی، نہ مجدد نہ مجاہد، ۱۱۷۶ھ شروع ہوا تھا، محرم کی آخری تاریخ تھی کہ یوم موعود آپہونچا، اور حضرت شاہ صاحب نے مختصر علالت کے بعد باسٹھ[۶۲] سال کی عمر میں[2] اس دار فانی کو خیرباد کہا، اور جان جان آفریں کے سپرد کی۔

چیست ازیں خوب تر در ہمہ آفاق کار
دوست رسد نزد دوست یار بہ نزدیک یار

کسی تذکرہ میں علالت اور واقعۂ وفات کی تفصیلات نہیں ملتیں، ناچیز مصنف کے لئے یہ بات قابل فخر وشکر ہے کہ اس سلسلہ میں جو کچھ معلومات وتفصیلات ملتی ہیں، ان کا واحد ذریعہ رائے بریلی کے سادات حسنی قطبی اور خاندان علم اللّٰہی کے ایک ممتاز فرد سید محمد نعمان حسنی کا مکتوب ہے، جو انھوں نے اسی خاندان کے دوسرے بزرگ و نامور فرد حضرت شاہ سید ابو سعیدؒ کے نام شاہ صاحبؒ کی وفات کے عین بعد دہلی سے لکھا تھا، کاتب حضرت سید محمد نعمان[3] مجاہد کبیر

---

[1] آل عمران ۱۸۵ [2] ملفوظات شاہ عبدالعزیزؒ اردو میں شاہ صاحبؒ کی زبانی بیان کیا گیا ہے کہ عمر شریف اکسٹھ[۶۱] برس چار[۴] ماہ کی ہوئی، چوتھی شوال ۱۱۱۴ھ کو پیدا ہوئے اور انتیسویں[۲۹] محرم ۱۱۷۶ھ کو وفات پائی، وفات کی تاریخ امام اعظم وین ہے (ملفوظات ص ۵۶ مطبوعہ مطبع ہاشمی میرٹھ) [3] سید محمد نعمان حضرت شاہ علم اللہؒ کے پرپوتے ہیں، ان کا شجرہ اس طرح ہے نعمان بن نور بن ہدیٰ بن علم اللہ حسنی الحسینی، خاندان کے وطن قدیم نصیر آباد ضلع رائے بریلی میں ولادت ہوئی، کچھ عرصہ مقامی علماء سے تعلیم حاصل کی پھر لکھنؤ جا کر مولانا عبداللہ امیٹھوی سے درسیات کی تکمیل کی، پہلے حضرت شاہ علم اللہؒ کے عالی نسبت صاحبزادہ حضرت سید محمدؒ سے بیعت وتربیت حاصل کی،

(باقی ص ۱۱۹ پر)

حضرت سید احمد شہیدؒ کے حقیقی چچا اور مکتوب الیہ (حضرت شاہ سید ابو سعیدؒ) حضرت سید صاحبؒ کے حقیقی نانا تھے، حضرت شاہ ابو سعیدؒ شاہ صاحبؒ کے مریدین اور اصحاب با اختصاص میں سے تھے، جن کے نام شاہ صاحب کے خود متعدد مکاتیب موجود ہیں، یہ خط بجنسہٖ خاندانی مجموعۂ مکاتیب "مکتوب المعارف" (قلمی) سے نقل کیا جاتا ہے:۔

الحمد للہ علی النعماء والرضاء	باسمہ سبحانہ تعالےٰ شانہ۔ اللہ تعالےٰ
علی القضاء، والصبر علی المصیبۃ	کا شکر ہے اس کی نعمتوں اور تقدیر
والبلاء، والصلاۃ والسلام علی	پر راضی رہنے اور بلاء و مصیبت میں
سید الشاکرین وزبدۃ الراضین	صبر کی توفیق پر، صلوٰۃ وسلام ہو سید
وقدوۃ الصابرین شفیع المذنبین	الشاکرین وزبدۃ الراضین، قدوۃ
ورحمۃ للعالمین محمد وآلہ وصحبہ	الصابرین، شفیع المذنبین اور رحمۃ للعالمین
الطیبین الطاہرین وعلی ورثتہ	محمد رسول اللہ اور ان کی آل واصحاب
العلماء الراسخین والاولیاء	پر جو طیبؓ طاہر تھے، اور آپ کے وارث
المرشدین إلی یوم الدین	علمائے راسخین اور اولیائے مرشدین پر
بعد ہٰذا اگر شرح سوگواری وبیان	قیامت تک اس کے بعد عرض ہے کر

(باقی ص ۱۱۸ کا) ان کے انتقال کے بعد ان کے عالی مرتبت صاحبزادہ حضرت سید محمد عدل عرف شاہ لعل صاحبؒ سے استفادہ اور اخذ فیض کیا، ان کے انتقال کے بعد رخت سفر باندھا اور حضرت شاہ علم اللہؒ کے خلفائے نامدار اور حضرت شاہ ولی اللہ صاحبؒ سے فیوض وبرکات حاصل کئے، خوش قسمتی سے حضرت شاہ صاحبؒ کی وفات کے وقت موجود اور ان کی توجہات خاصہ سے محظوظ تھے، شاہ صاحبؒ کی وفات کے بعد سفر حج اختیار کیا، حج وزیارت کے بعد بیت المقدس اور مدینۃ الخلیل (حضرت ابراہیمؑ خلیل اللہ کا مسکن ومدفن) کا رخ کیا، راستہ میں وقت موعود آپہونچا، اور سرزمین انبیاءؑ بیت المقدس میں مدفون ہوئے، یہ واقعہ ۱۱۹۳ھ کا ہے (نزہۃ الخواطر ۶)

عزای وماتم داری واقعہ ارتحال امام
سنت وجماعت ومقتدای ارباب کرامت
پیشوای عرفاء زمان سرآمد اولیاء جہان
قطب ربانی محبوب سبحانی سیدنا ومرشدنا
ولی اللہ فاروقی مجدد مأۃ دوم الف ثانی
رضی اللہ عنہ ازیں عالم پرملال بصوب
دارالافضال بوصال ذوالجلال بر صفحہ
روزگار ثبت باید ہر آئینہ مانند حال ماغریبان
غمزدگان سزد ؎

چہ بخاطر رسید یار مرا
کہ بہجراں کشید کار مرا

وامصیبتاہ ایں چہ بے نیازی ونیرنگ
سازی است کہ ہمچنیں روح مقتدای
رادر کمتر وقت بعمر شصت ودو سالگی بنداء
"ارْجِعِي إِلَىٰ رَبِّكِ رَاضِيَةً مَّرْضِيَّةً"
(الفجر-۲۸) دادند واصحاب بدع
ضلال را عشرت آگیں نمودند واصحاب
دین را اندوہ گیں کردند یعنی بتاریخ
سلخ محرم الحرام سنہ ۱۱۷۶ھ یک ہزار

امام اہل سنت وجماعت مقتدائے
ارباب کرامت، پیشوائے عرفائے
زماں، سرآمدِ اولیائے جہاں
قطب زمانی، محبوب سبحانی سیدنا
ومرشدنا شاہ ولی اللہ فاروقی
مجدد قرنِ دوازدہم رضی اللہ عنہ
کے واقعۂ ارتحال کی تفصیل اگر
صفحۂ روزگار پر ثبت ہو تو ہم مسکینوں
کے حسب حال ہے ؎

چہ بخاطر رسید یار مرا
کہ بہجراں کشید کار مرا

وامصیبتاہ! اللہ تعالیٰ کی یہ عجیب
شانِ بے نیازی ہے کہ ایسے مقتدیٰ کی
روح کو صرف ۶۲ سال کی مختصر عمر میں
"ارْجِعِي إِلَىٰ رَبِّكِ رَاضِيَةً مَّرْضِيَّةً"
(الفجر-۲۸) کی پکار سنا دی گئی اور اہلِ
بدعت وضلالت کو خوش اور دینداروں
کو اندوہ گیں کر دیا گیا، یعنی محرم کی آخری
تاریخ سنہ ۱۱۷۶ھ شنبہ کے دن، ظہر کے

وبکصد و ہفتاد و شش یوم السبت
وقت الظہر بامر داعی برحق روح مطہر
الحضرت از قالب عنصری مفارقت
نمودہ باوجِ علیین نشیمن ساختہ
وبمقتضائی "وَلَلْآخِرَةُ خَيْرٌ لَّكَ
مِنَ الْأُولَىٰ ○ وَلَسَوْفَ يُعْطِيكَ
رَبُّكَ فَتَرْضَىٰ ○ (الضحیٰ۔۴،۵)
ای لقاء رفیق اعلیٰ دران پرداختہ
اما حالت تمام اصحاب واحباب
از مفارقت آنجناب چناں تباہ و
خراب بود کہ از حیز تحریر بیرونست
یقینیکہ استیلاء وکاہش آلام
بر منتسبان مہجوران ستہا ۔ یافتہ
باشد رضینا بقضاء اللہ انا للہ
وانا الیہ راجعون رحمۃ اللہ
علیہ وعلی من بجنابہ یتوسلون"
آمدیم برانیکہ از فضل الٰہی وتصدق
جناب حضرت رسالت پناہی
صلے اللہ علیہ وعلی آلہ جاذبہ

وقت حق تعالےٰ کے حکم سے حضرت
کی روح پاک نے قالب عنصری کو
چھوڑ کر اوجِ علیین پر اپنا نشیمن
بنا لیا..... تمام اصحاب و احباب
کی حالت آنجناب کی فرقت سے
ایسی تباہ و خراب تھی جو احاطۂ
تحریر سے باہر ہے إنا للہ وانا
الیہ راجعون اللہ کی رحمت
آپ پر اور آپ کے متوسلین پر
نازل ہو، مقصد تحریر یہ ہے کہ
فضل الٰہی اور حضرت رسالت
پناہی صلے اللہ علیہ وعلی آلہ وسلم
کے صدقے میں حضرتؒ کی کشش
نے اپنی [illegible]ت کھینچا، ذی قعدہ کے
مہینے میں بڈھانہ جا کر آستاں بوسی
کی سعادت حاصل کی اور جناب
قدسی القاب کی صحبت سے مشرف ہوا
اور اپنے حال پر حضرت کی بلند توجہات
میں بہت اضافہ دیکھا، وہاں سے

حضرت ایشان علیہ الرحمۃ ابن عاصی
را بسوی خود کشید بشہر ذیقعدہ در بڈھانہ
رفتہ بتقبیل آستانہ متبرکہ استسعاد
یافتہ و بملازمت جناب قدسے
القاب مشرف گردیدہ بر حالات خود
توجہات عالیات بیش از بیش یافتہ،
از آنجا حضرت ایشان جہت تداوی
و تدابیر در ماہ ذی الحجہ تاریخ نہم بشہر
دہلی بمکان بابا فضل اللہ در مسجد روشن
الدولہ بچوک سعد اللہ خاں نزول
فرمودند از فرزندان گرامی میاں محمد صاحب
و میاں عبد العزیز و میاں رفیع الدین
مدظلہم العالی و میاں محمد عاشق صاحب
و میاں اہل اللہ صاحب و میاں محمد فائق
و میاں محمد جواد و محمد امین وغیرہ یاران
حاضر خدمت بودند و ایں غلام
و میر محمد عتیق و میر قاسم علی کہ در وقت
آخرین شرف انتساب بیعت یافتہ
ہر روز بشرف حضور پرنور و خدمت گاری

حضرت دوا علاج کے سلسلے میں
۹ر ذی الحجہ کو دہلی میں بابا فضل اللہ
کے مکان پر مسجد روشن الدولہ کے
احاطے میں (جو چوک سعد اللہ خاں
میں ہے) مقیم ہوئے، فرزندانِ گرامی
میں سے میاں محمد صاحب، میاں عبد العزیز
و میاں رفیع الدین مدظلہم العالی (اور
مریدین و متعلقین میں سے) میاں
محمد عاشق صاحب، میاں محمد فائق،
میاں محمد جواد، اور خواجہ محمد امین وغیرہ
احباب حاضر خدمت تھے، یہ غلام
اور میر محمد عتیق، اور میر قاسم علی
(جنھوں نے حضرت سے ان کے
آخری ایام میں شرف بیعت
حاصل کیا تھا) ہر روز حاضری
و خدمت گزاری کی سعادت حاصل
کرتے تھے، مشفق من! یہ آخری
مجلسیں عجب پرفیض مجلسیں تھیں،
ملائکہ وارواح طیبہ کا برابر نزول

وسیلہ حضور در حضور سعادت اندوز
می شدیم شفقا این مجلس آخرین عجب
مجلسے بود پر فیض دائما ہبط ملاء ملکوت
و نزول ارواح طیبہ ارکان عالم ناسوت
میگردید و نفحات انس و رحمت و رشحات
قدس و برکت بمثال نزول غیث
می بارید اکثر یاران اہل نسبت بوجدان
صحیحہ خود می دریافتند و احرار اہل اللہ
و عرفاء لا ازال در ہر زمان پیدا شوند
اما ایں چنیں مرد باجمعیت اوصاف حمیدہ
و علم بکتاب و سنت باجتہاد مطلق و در
حقائق و معارف بحر مواج و در علوم
دیگر محض فیاض پس از صدہا سال
بوجود می آید ؎

دورہا باید کہ تا یک مرد صاحب دل شود
بایزید اندر خراساں یا سہیل اندر یمن

یاراں را می باید کہ مصابرت و شکیبائی
ورزیدہ نسبت رابطہ حضرت شیخ را
بجامع ہمت در تصور نہادہ بمراقبات

محسوس ہوتا تھا، نفحات انس و رحمت
اور رشحات قدس و برکت بارش
کی طرح برستے تھے، اکثر اہل نسبت
احباب اپنے وجدانِ صحیح سے
اس کو محسوس کرتے تھے، و احرار
اہل اللہ اور عارفین ہر زمانے
میں ہوتے ہیں، مگر ایسا مرد حقانی
جو ایک طرف اوصاف حمیدہ کا
جامع ہو دوسری طرف کتاب
و سنت کے علم میں مجتہد مطلق کا
درجہ رکھتا ہو، حقائق و معارف
کا بحر مواج اور دیگر علوم کا
دریائے فیاض ہو، کہیں صدیوں
میں پیدا ہوتا ہے ؎

دورہا باید کہ تا یک مرد صاحب دل شود
بایزید اندر خراساں یا سہیل اندر یمن

دوستوں کو چاہئے کہ صبر و شکیبائی
اختیار کرکے حضرت شیخ کی نسبتِ رابطہ کو
پوری ہمت کے ساتھ تصور میں رکھ کر مراقبات

معلومہ مشغول باشد انشاء اللہ تعالیٰ
فیض صحبت و رابطہ برابر خواہد بود
کما یفیض من بعض رسائلہ
رحمۃ اللہ علیہ۔
والحمد للہ رضامندی حضرت صاحب
قدس سرہ ازاں صاحب و توجہات عالیات
بحال ایشاں زیادہ از حد بیان یافتہ
اکثر اوقات استفسار احوال سامی
میفرمودند و ماجرای غارتگری ابدالیاں
و رسیدن آنصاحب در عین رستخیز و انطفاء
یافتن التہاب بسبب قدوم گرامی
از زبان دُر فشاں مودّی ساختند و
شاید منظور لقای آخریں بضمیر منیر بودہ
باشد مرۃ فرمودند کہ میر ابو سعید ارادۂ
آمدن دارند اگر زود برسند بہتر
باشد۔
صاحب من ظاہر صحبت ایشاں
رعاستتار کشیدہ تصنیفات آنحضرت

معلومہ میں مشغول ہوں، انشاء اللہ
فیض صحبت و رابطہ برابر جاری
رہے گا، جیسا کہ حضرتؒ کے بعض
رسائل سے معلوم ہوتا ہے۔
الحمد للہ کہ حضرت قدس سرہٗ کی آپ سے
رضامندی اور آپکے حال پر توجہات عالیہ کو
حد بیان سے باہر پایا، اکثر اوقات جناب کے
حالات دریافت فرماتے تھے، ابدالیوں کی
جنگ اور آپکے عین معرکہ میں پہنچنے اور فتنہ
کی آگ سے آپکے قدوم گرامی سے فرو ہوجانے
کے واقعات زبان دُر فشاں سے بیان فرماتے
تھے[1]، شاید آپکے آخری ملاقات کی
تمنا حضرت کے دل میں تھی، کیونکہ
ایک بار فرمایا کہ "میر ابو سعید آنے کا
ارادہ رکھتے ہیں اگر جلد آجائیں تو
بہتر ہو"
صاحب من! حضرت کی ظاہری
صحبت سے تو اب محرومی ہے،

[1] اس میں جس واقعہ کی طرف اشارہ ہے، اس کی تفصیل معلوم نہ ہوسکی۔

قریب نود یل زیادہ در ہر علوم دین
از تفسیر واصول و فقہ وکلام وحدیث
مثل حجۃ اللہ البالغہ واسرار فقہ منصور
وازالۃ الخفاعن خلافۃ الخلفاء،
وترجمہ قرآن کہ ہر واحد قریب ہشتاد
ونود جز کلاں بحجم خواہد بود ودیگر رسایل
در حقائق ومعارف مثل لطائف القدس
وہمعات وفیوض الحرمین وانفاس
العارفین وغیرہم کہ نشان از صحبت
وبرکت خدمت سید ہندی باید کہ
عزیمت بریں آرند کہ ہر ہمہ را
نویسایندہ رائج نمایند، باندک
توجہات سرانجام خواہد یافت،
ومثل ایں چنیں تصنیفات واللہ
اعلم در اسلام تصنیف شدہ
باشد یا نہ، چنانچہ ارباب بصیرت
عبرت یافتہ اعتراف دارند وکلام
ایشاں در ہر باب کہ نوشتہ اند

البتہ حضرت کی تصنیفات کی تعداد
نوّے بلکہ اس سے بھی زیادہ ہے،
علوم دین یعنی تفسیر واصول، فقہ و
کلام اور حدیث میں حجۃ اللہ البالغہ،
اسرار فقہ منصور[1]، ازالۃ الخفاعن
خلافۃ الخلفاء اور ترجمۂ قرآن کہ
ان میں سے ہر ایک کی ضخامت اسّی
نوّے جز کی ہوگی، حقائق ومعارف میں
دیگر رسالے جیسے الطاف القدس، ہمعات
فیوض الحرمین اور انفاس العارفین
وغیرہ جو حضرت کی صحبت وبرکت کی
نشاندہی کرتی ہیں، ان کے بارے میں آپ
ہمت کریں کہ ان سب کو لکھوا کر رائج
کریں، یہ کام تھوڑی سی توجہ سے انجام
پا جائے گا، اللہ ہی بہتر جانتا ہے کہ
تاریخ اسلام میں ایسی کتابیں لکھی گئی ہیں
یا نہیں جیسا کہ ارباب بصیرت ان کا
اعتراف کرتے ہیں، حضرت نے

---

[1] اس سے کونسی کتاب مراد ہے اس کی وضاحت نہ ہوسکی۔

اصول است "اللهم ارزقنا
حلاوة منهم"
ویقین این فقیر و دیگر صاحبزادہا
و یاران حضرت بملاحظہ فرط محبت
سامی بجناب حضرت اینست کہ بمجرد
شنیدن این حادثۂ عظیمہ جہت
فاتحہ روحانیت و زیارت مرقد
مطہر راہی این صوب خواہند شد
لہذا منتظر قدوم ہستم اگر زود تشریف
بیارند باری بملاقات سامی مسرور
الوقت شوم، واگر توقف در آمدن
باشد اعلام نمایند کہ فقیر ہم عزم
مراجعت وطن دارد۔
و دیگر آنکہ میاں محمد عاشق صاحب
بعد سلام فرمودہ اند کہ میر ابوسعید
جیو را بنویسند کہ ہر مکاتیب کہ حضرت
ایشاں بجانب آنصاحب شرف
صدور یافتہ باشد نقل آنہا البتہ
بفرستند کہ داخل مکاتیب نمودہ شود۔

جس مضمون پر بھی لکھا ہے، وہ اصولی
حیثیت رکھتا ہے۔
اس فقیر اور صاحبزادگان اور حضرت
کے احباب کو (حضرت سے آپ کے غایت
تعلق کو دیکھتے ہوئے) یہ یقین ہے کہ
آپ اس حادثۂ عظیمہ کی خبر سنتے ہی
فاتحہ خوانی اور مرقد مطہر کی زیارت
کے لئے دہلی کے لئے روانہ ہو جائیں گے،
اسی لئے میں منتظر قدوم ہوں اگر جلد تشریف لائیں
تو ملاقات سامی سے میں بھی خوش وقت
ہو جاؤں گا اگر آنے میں دیر ہو تو اطلاع
فرمائیں کہ فقیر بھی وطن واپسی کا ارادہ
رکھتا ہے۔
دوسری بات یہ کہ میاں محمد عاشق
صاحب نے بعد سلام کے فرمایا ہے کہ
میر ابوسعید کو لکھ دیجئے کہ آپ کے
نام حضرت کے جتنے بھی مکتوبات ہوں
ان کی نقل ضرور بھیج دیں تاکہ انھیں
مکاتیب کے مجموعے میں داخل کیا جائے،

از حضرت میاں اہل اللہ صاحب	حضرت میاں اہل اللہ صاحب
و دیگر یاران و صاحبزادہا سلام اسم	دوسرے احباب اور صاحبزادگان
باسم مطالعہ فرمایند و کیفیت ارتحال	کی طرف سے نام بہ نام سلام پہنچے
و وصال مرحومی مغفوری غفران پناہ	بھائی محمد معین کی کیفیت
بھائی محمد معین صاحب[۱] رحمۃ اللہ علیہ	ارتحال و وصال کو میں نے حضرت
رحمۃ واسعۃ بجناب عالی حضرت	سے بڈھانہ میں عرض کر دیا تھا
صاحب قبلہ در مقام بڑھانہ عرض	حضرتؒ نے ان کی روح کو
کردم فاتحہ بروحانیت خواندند	ثواب بخشا تھا، اور افسوس کا
و تاسفہا نمودند۔[۲]	اظہار کیا تھا۔[۳]

شاہ صاحبؒ کی وفات ۲۹ رمحرم ۱۱۷۶ھ بروز شنبہ (۲۱ راگست ۱۷۶۲ء) بوقت ظہر ہوئی، جیسا کہ مکتوب مذکور الصدر سے معلوم ہوا، شاہ عبدالعزیز صاحبؒ کے ملفوظ میں ہے۔

کہ در بست نہم محرم وفات یافت	۲۹ رمحرم کو وفات پائی آپکی تاریخ
..... تاریخ وفات او بود امام اعظم دین	وفات "او بود امام اعظم دین" اور

۱؎ سید محمد معین بن سید محمد ضیاء بن آیت اللہ بن شاہ علم اللہؒ حضرت شاہ ابوسعید صاحب کے علاتی بھائی اور عمر میں بڑے تھے، ۱۱۷۶ھ کی کسی تاریخ میں انتقال ہوا، ان کا سلسلۂ اولاد خاندان میں چل رہا ہے۔

۲؎ مکتوب المعارف (فارسی) ص ۱۹-۲۰ (قلمی)

۳؎ ترجمہ از فارسی بقلم مولوی شمس تبریز خاں صاحب۔

دیگر: ہائے دل روزگار رفت[۱] "ہائے دل روزگار رفت" سے

بست نہم محرم وقت ظہر[۲] نکلتی ہے' ۲۹ محرم وقت ظہر

وفات کا دن اور وقت تھا۔

مدفن

تدفین دلّی دروازہ کے بائیں جانب اس مقام پر ہوئی، جو منہدیاں کہلاتا ہے[۳]، جس جگہ یہ قبرستان واقع ہے' یہاں کبھی حضرت شاہ عبدالرحیمؒ کے جد مادری شیخ عبدالعزیز شکر بار کی خانقاہ تھی' اب بھی ان کا مزار اس سے کچھ فاصلہ پر ہے' بعد میں شیخ رفیع الدین صاحبؒ نے یہیں قیام اختیار کیا، خاندان ولی اللٰہی کے مکانات بھی اسی جگہ تھے' شاہ ولی اللہ صاحبؒ نے اس جگہ قیام ترک کر کے اندرون شاہجہان آباد قیام اختیار کیا' یہیں منہدیوں

---

۱ صحیح "ہائے ولی روزگار رفت" ہے جس سے صحیح سنہ وفات نکلتا ہے (مقالہ مولوی نورالحسن راشد کاندھلوی' برہان جولائی ۱۹۸۳ء) ۲ ملفوظات حضرت شاہ عبدالعزیزؒ، ص ۴۲ (مطبع مجتبائی میرٹھ ۱۳۱۴ھ) ۳ سرسید احمد خاں "آثار الصنادید" میں لکھتے ہیں۔

"یہ ایک عمارت تھی، نیچے تو مکانات اور درسے بنے ہوئے تھے اور اوپر چاروں کونوں پر چار برجیاں تھیں' کچھ نہیں معلوم ہوتا کہ یہ عمارت کیا چیز بنی اور کب بنی تھی اور کس نے بنائی تھی' مگر عوام الناس میں یہ مشہور ہے کہ کوئی نواب تھے کہ جناب حضرت غوث الاعظمؓ کی منہدیاں کیا کرتے ہیں یعنی کھمبیوں کی ایک برجی اونچی سی بنا کر اور کاغذ سے منڈھ کر اس کو روشن کرتے ہیں۔ ان نواب صاحب کے یہاں یہی مہندی روشن ہونے کی رسم تھی جب سے اس عمارت کا نام مہندیاں کرکے مشہور ہوگیا مگر نہیں معلوم کہ وہ نواب کون تھے جنھوں نے یہ مہندی بنائی تھی" (آثار الصنادید ص ۵۱-۵۰ طبع لکھنؤ ۱۸۷۶ء)

کے قبرستان میں شاہ صاحبؒ کے چاروں صاحبزادگان خود شاہ صاحبؒ کے والد محترم حضرت شاہ عبدالرحیمؒ کی قبور ہیں، جن پر کتبے نصب ہیں، جن میں ان کے سنین وفات ہیں، ان حضرات کے علاوہ خاندان کے دوسرے افراد ذکور و اناث کی قبریں ہیں، متصل مسجد ہے، جس کے قرب و جوار میں بہت سے علماء و صالحین، اور خاندان ولی اللہی کے عقیدت مندوں کی کثیر التعداد قبریں ہیں، جن میں اضافہ ہی ہوتا جا رہا ہے۔

بابِ پنجم

شاہ ولی اللہ صاحبؒ کے تجدیدی کارنامے

اصلاحِ عقائد و دعوت الی القرآن

شاہ صاحبؒ کے دائرۂ تجدید کی وسعت اور تنوّع

شاہ صاحبؒ سے اللہ تعالیٰ نے تجدید و اصلاح امت، دین کے فہم صحیح کے احیاء، علوم نبوت کی نشر و اشاعت اور اپنے عہد و ملت کے فکر و عمل میں ایک نئی زندگی اور تازگی پیدا کرنے کا جو عظیم الشان کام لیا، اس کا دائرہ ایسا وسیع اور اس کے شعبوں میں اتنا تنوّع پایا جاتا ہے، جس کی مثال معاصر ہی نہیں، دور ماضی کے علماء و مصنفین میں بھی کم نظر آتی ہے، اس کی وجہ (توفیق اور تقدیر الٰہی کے ماسوا) اس عہد کے حالات کا تقاضا بھی ہو سکتا ہے، جو شاہ صاحب کے حصہ میں آیا، اور وہ جامعیت، علوئے ہمت اور مخصوص تعلیم و تربیت بھی جو شاہ صاحب کے خصائص میں سے ہے، اس سب کا نتیجہ تھا کہ شاہ صاحب نے علم و عمل کے اتنے میدانوں میں تجدیدی و اصلاحی کارنامے انجام دیا کہ ان کے سوانح نگار اور اسلام کی تاریخِ دعوت و عزیمت پر قلم اٹھانے والے کے لئے، ان کا احتواء اور ان سب کا تفصیلی و تحلیلی جائزہ لینا دشوار ہو گیا ہے، اور جو اس کا ارادہ کرے اس کی زبان بے اختیار فارسی کے اس مشہور شعر کے ساتھ

شکوہ سنج ہوجاتی ہے ؎

دامانِ نگہ تنگ و گلِ حُسنِ تو بسیار
گلچینِ بہارِ توزداماں گلہ دارد

ہم ان کو اگر علیحدہ علیحدہ بیان کریں تو ان کے حسب ذیل عنوانات ہوں گے۔

۱۔ اصلاح عقائد و دعوت الی القرآن۔

۲۔ حدیث وسنت کی اشاعت وترویج، اور فقہ وحدیث میں تطبیق کی دعوت وسعی

۳۔ شریعت اسلامی کی مربوط ومدلّل ترجمانی اور اسرار ومقاصدِ حدیث وسنت کی نقاب کشائی۔

۴۔ اسلام میں خلافت کے منصب کی تشریح، خلافت راشدہ کے خصائص اور اس کا اثبات اور ردّ رفض۔

۵۔ سیاسی انتشار اور حکومت مغلیہ کے دور احتضار میں شاہ صاحبؒ کا مجاہدانہ وقائدانہ کردار۔

۶۔ امت کے مختلف طبقات کا احتساب اور ان کو دعوتِ اصلاح وانقلاب۔

۷۔ علمائے راسخین اور مردانِ کار کی تعلیم وتربیت جو ان کے بعد اصلاح امت اور اشاعت دین کا کام جاری رکھیں۔

ہم سب سے پہلے اصلاح عقائد و دعوت الی القرآن کے عنوان کو لیتے ہیں کہ تجدید دین واصلاحِ امت کا کام کسی دور اور کسی ملک میں بھی شروع کیا جائے تو اس کو اوّلیت حاصل ہوگی اور اس کے بغیر احیائے دین وملت کی جو کوشش بھی کی جائے گی وہ نقش برآب اور عمارت بے اساس ہوگی، قرآن نے انبیاء علیہم السلام کے واقعات ومکالمات سے اور مستند تاریخ نے نائبینِ انبیاء اور علماء ربّانیین کے طرز عمل اور ترتیب کار سے اسی حقیقت کو ثابت کیا ہے،

اور قیامت تک یہ ہر اس اصلاح و تجدید کا دستور العمل رہے گا، جس کا مزاج نبویؐ اور جس کا نظام قرآنی ہوگا۔

عقائد کی اہمیت

مُصنّف یہاں پر اپنی ایک سابقہ تحریر کا اقتباس پیش کرنے پر اکتفا کرتا ہے:۔

"اس دین کا سب سے پہلا امتیاز اور نمایاں شعار عقیدہ پر زور اور اصرار، اور سب سے پہلے اس کا مسئلہ حل کر لینے کی تاکید ہے، حضرت آدم علیہ السلام سے لے کر خاتم النبیین محمد صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم تک تمام انبیاءے کرام ایک معیّن عقیدہ کی (جو ان کو وحی کے ذریعہ ملا تھا) دعوت دیتے، اور اس کا مطالبہ کرتے رہے، اور اس کے مقابلہ میں کسی مفاہمت یا دست برداری پر تیار نہ ہوئے، ان کے نزدیک بہتر سے بہتر اخلاقی زندگی، اور اعلیٰ سے اعلیٰ اسلامی کردار کا حامل، نیکی و صلاح، سلامت روی اور معقولیت کا زندہ پیکر اور مثالی مجسّمہ، خواہ اس سے کسی بہتر حکومت کا قیام، کسی صالح معاشرہ کا وجود، اور کس مفید انقلاب کا ظہور ہوا ہو[1]، اس وقت تک کوئی قدر و قیمت نہیں رکھتا، جب تک وہ اس عقیدہ کا ماننے والا نہ ہو، جس کو وہ لے کر آئے، اور جس کی دعوت ان کی زندگی کا نصب العین ہے، اور جب تک اس کی یہ ساری کوششیں اور کاوشیں صرف اس عقیدہ کی بنیاد پر نہ ہوں، یہی وہ حدِّ فاصل، واضح اور روشن خط ہے جو انبیاءے کرام علیہم الصلوٰۃ والسلام کی دعوت، اور قومی رہنماؤں، سیاسی لیڈروں، انقلابیوں اور ہر اس شخص کے

---

[1] اگرچہ اس میں بڑا شبہ ہے کہ صحیح عقیدہ کی اساس کے بغیر ایسا ممکن بھی ہے۔

درمیان کھینچ دیا گیا ہے، جس کا سرچشمۂ فکر و نظر انبیاء کرام کی تعلیمات اور ان کی سیرتوں کے بجائے کوئی اور ہو۔[۱]

"حقیقت یہ ہے کہ انبیائے کرام علیہم الصلوٰۃ والسلام کے ذریعہ جو علوم و معارف انسانوں تک پہونچے ہیں، ان میں سب سے اعلیٰ اور ضروری واہم علم خدا تعالیٰ کی ذات، صفات اور افعال کا علم اور اس مخصوص تعلق کا تعین ہے، جو خالق و مخلوق اور عبد و معبود کے درمیان ہونا چاہیئے، یہ علم سب سے برتر و افضل علم ہے، اس لئے کہ اس پر انسانوں کی سعادت و فلاح دنیوی اور نجات اخروی موقوف ہے، اور یہی عقائد و اعمال اور اخلاق و تمدن کی بنیاد ہے، اسی کے ذریعہ انسان اپنی حقیقت سے واقف ہوتا، کائنات کی پہیلی بوجھتا اور زندگی کا راز معلوم کرتا ہے، اسی سے اس عالم میں اپنی حیثیت کا تعین کرتا، اور اس کی بنیاد پر اپنے ہم جنسوں سے اپنے تعلقات استوار کرتا ہے، اور اپنے مسلکِ زندگی کے بارے میں فیصلہ اور پورے اعتماد و بصیرت اور وضاحت کے ساتھ اپنے مقاصد کا تعین کرتا ہے۔"[۲]

خصوصیت کے ساتھ اللہ تعالیٰ کا اس امت کے ساتھ جو خصوصی رابطہ اور تائید و نصرت، رضا و محبت، اور غلبہ و عزت کا جو مؤکد وعدہ ہے، وہ محض عقائد صحیحہ، ایمانی صفات و خصوصیات اور خاص طور پر خالص اور بے آمیز عقیدۂ توحید کی بناء پر ہے، ارشاد ہے:۔

وَلَا تَهِنُوْا وَلَا تَحْزَنُوْا وَاَنْتُمُ	اور (دیکھو) بے دل نہ ہونا اور
الْاَعْلَوْنَ اِنْ كُنْتُمْ	نہ کسی طرح کا غم کرنا اگر تم مومن (صادق)

---

[۱] دستور حیات ص۲۱-۲۲ کتاب میں آیات قرآنی اور انبیاء علیہم السلام کے اسوہ کی مدد سے اس کے شواہد و دلائل پیش کئے گئے ہیں، اور حدیث و سیرت کے واقعات سے اس کو مدلل کیا گیا ہے۔ [۲] ایضاً ص۶۰

مُّؤْمِنِيْنَ ٥ (آل عمران - ۱۳۹) ہو تو تم ہی غالب ہو گے۔

نیز کھلے لفظوں میں فرمایا گیا ہے :-

وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ	جو لوگ تم میں سے ایمان لائے اور
وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ	نیک کام کرتے رہے ان سے خدا کا
فِي الْاَرْضِ كَمَا اسْتَخْلَفَ الَّذِيْنَ	وعدہ ہے کہ ان کو ملک کا حاکم بنادیگا
مِنْ قَبْلِهِمْ وَلَيُمَكِّنَنَّ لَهُمْ	جیسا ان سے پہلے لوگوں کو حاکم بنایا
دِيْنَهُمُ الَّذِي ارْتَضٰى لَهُمْ	تھا، اور ان کے دین کو جسے اس نے
وَلَيُبَدِّلَنَّهُمْ مِّنْ بَعْدِ خَوْفِهِمْ	ان کے لئے پسند کیا ہے مستحکم و پائدار
اَمْنًا يَعْبُدُوْنَنِيْ لَا يُشْرِكُوْنَ	کرے گا اور خوف کے بعد ان کو امن
بِيْ شَيْئًا وَمَنْ كَفَرَ بَعْدَ ذٰلِكَ	بخشے گا، وہ میری عبادت کریں گے
فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْفٰسِقُوْنَ ٥	(اور) میرے ساتھ کسی اور کو شریک
(النور - ۵۵)	نہ بنائیں گے اور جو اس کے بعد کفر کرے
	تو ایسے لوگ بدکردار ہیں۔

انبیاء کے نائبین برحق، اور علمائے ربانی جو دین اللہ کی فطرت اور اس کے مزاج سے واقف ہوتے ہیں، وہ اس کو کسی جگہ پر قائم کرنے کے لئے پہلے زمین کو پورے طور پر صاف و ہموار کرتے ہیں، وہ شرک اور جاہلیت کی جڑیں اور رگیں (خواہ وہ وثنیت قدیمہ کی یادگار ہوں یا قومی و مقامی اثرات کا نتیجہ) چن چن کر نکالتے اور ان کا ایک ایک بیج بن بن کر پھینکتے ہیں اور مٹی کو بالکل الٹ پلٹ دیتے ہیں، چاہے ان کو اس کام میں کتنی ہی دیر لگے، اور کیسی ہی زحمت اٹھانی پڑے، وہ نتیجہ کے حصول میں کبھی عجلت اور بے صبری سے کام نہیں لیتے۔

"شرک (مختلف شکلوں میں) نوع انسانی کی سب سے خطرناک اور پرانی بیماری ہے، وہ اللہ کی غیرت اور اس کے غضب کو بھڑکانے کے ماسوا، بندوں کے روحانی، اخلاقی اور تمدنی ترقی کی راہ کا سب سے بڑا روڑا ہے، وہ انسان کی قوتوں کا گلا گھونٹ دیتا ہے، ان کی صلاحیتوں کا خون کرتا ہے، قادر مطلق پر اس کے یقین، اس کی خود اعتمادی اور خودشناسی کا خاتمہ کر دیتا ہے اور سمیع و بصیر اور صاحب قدرت و علم، صاحب جود و عطا اور مغفرت و محبت والے خدا کی محفوظ و مستحکم پناہ سے نکال کر اور اس کے لامحدود صفات، اور نہ ختم ہونے والے خزانوں کے فوائد سے محروم کر کے کمزور و عاجز، فقیر و حقیر مخلوقات کے زیر سایہ پناہ لینے پر مجبور کر دیتا ہے، جن کی جھولی میں کچھ نہیں[1]۔"

عقیدۂ توحید کی ازسرِ نو تبلیغ و تشریح کی ضرورت

مصنف نے "تاریخ دعوت و عزیمت" کے حصۂ دوم میں جو شیخ الاسلام حافظ ابن تیمیہؒ کے ساتھ مخصوص ہے، امام ابن تیمیہؒ کے زمانہ میں مشرکانہ عقائد و رسوم کے عنوان کے ذیل میں لکھا تھا:۔

"غیر مسلم و عجمی اقوام کے اختلاط، اسماعیلی و باطنی حکومت کے نفوذ و اثر، نیز جاہل و گمراہ صوفیوں کی تعلیم و عمل سے عام مسلمانوں میں مشرکانہ عقائد و رسوم کا رواج ہو چلا تھا، بہت سے مسلمان اپنے دینی پیشواؤں، مشائخ طریقت اور اولیاء و صالحین کے بارے میں اسی طرح کے غالیانہ اور مشرکانہ خیالات اور عقیدہ رکھنے لگے تھے، جو یہود و نصاریٰ حضرت عزیر و مسیح اور اپنے احبار و رہبان کے

---

[1] "منصب نبوت اور اس کے عالی مقام حاملین" از مصنف ص۲۰۷۔

متعلق رکھتے تھے، بزرگان دین کے مزارات پر جو کچھ ہونے لگا تھا، وہ ان سب اعمال ورسوم کی ایک کامیاب نقل تھی، جو غیر مسلموں کی عبادت گاہوں اور مقدس شخصیتوں کی قبروں پر ہوتے تھے، اہل قبور سے صاف صاف استعانت واستغاثہ کا معاملہ ہونے لگا تھا، ان سے فریاد اور ان کی دوہائی دینے، سوال اور دعا کرنے کا رواج ہوگیا تھا، ان کی قبور پر بڑی بڑی مسجدیں تعمیر کرنے اور خود قبور کو سجدہ گاہ بنانے، ان پر سال بہ سال میلہ لگانے اور دور دور سے سفر کرکے وہاں آنے کا عام دستور تھا، کھلی قبر پرستی، خدا سے بے خوفی، اور صاحب مزار سے خوف وخشیت، اللہ اور شعائر اللہ سے استہزاء واستخفاف بے باکی اور شوخ چشمی، بزرگوں کے ساتھ اعتقاد الوہیت کے درجہ تک مشاہد ومزارات کا حج، اور بعض اوقات حج بیت اللہ پر اس کی ترجیح، کہیں کہیں مساجد کی ویرانی اور کس مپرسی اور مشاہد کے رونق واہتمام، اس زمانہ کی جاہلانہ زندگی کے وہ خط وخال تھے، جن کے دیکھنے کے لئے بہت دور جانے اور بہت غور سے کام لینے کی ضرورت نہ تھی۔"[لہ]

یہ مصر وشام وعراق جیسے ممالک کا حال تھا جن کو صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم نے اپنے مبارک ہاتھوں سے فتح کیا تھا جو مرکز اسلام، مہبط وحی، اور مسکن رسول اللہ صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم سے بہت قریب اور مربوط تھے، جہاں کی زبان عربی تھی، جس میں قرآن مجید نازل ہوا، جہاں قرآن وحدیث کے درس کا سلسلہ ایک دن کے لئے موقوف نہیں ہوا، اور جہاں علوم حدیث اور شرح حدیث پر عظیم ترین کتابیں لکھی گئیں۔

لہ "تاریخ دعوت وعزیمت" حصہ دوم ص۲۰۴-۲۱۵ باختصار وترمیم۔

اس کے مقابلہ میں ہندوستان (وہ بھی بارھویں صدی کے ہندوستان) کا اندازہ لگانا کچھ مشکل نہیں ہے، جہاں اسلام ترکستان، ایران اور افغانستان کا چکر کاٹ کر اور اپنی بہت کچھ تازگی اور توانائی کھو کر ان لوگوں کے ذریعہ پہونچا جو براہ راست فیضانِ نبوت سے مستفیض نہیں ہوئے تھے، اور جن میں سے بہت سے اپنے نسلی اور قومی اثرات سے بالکلیہ آزاد نہیں ہو سکے تھے، پھر ہندوستان میں ہزاروں برس سے ایک ایسا مذہب، فلسفہ اور تہذیب حکمرانی کر رہے تھے، جن کے رگ و پے میں وثنیت اور شرک جاری و ساری تھا، اور جو ان آخری صدیوں میں وثنیت کا سب سے بڑا نمائندہ، اور جاہلیت قدیم کا امین و محافظ رہ گیا تھا، یہاں برہمنیت اور دوسرے مشرکانہ ماحول سے منتقل ہو کر ہندوستان کی مسلمان آبادی کا ایک بڑا حصہ آغوشِ اسلام میں آیا تھا، پھر یہ بھی ذہن میں تازہ رہے کہ اس ملک کا (طویل تر مدت میں) قرآن و حدیث سے براہ راست وہ رابطہ نہیں رہا تھا، جو ایران کے اثر سے علوم حکمت اور فلسفۂ یونان سے رہا، علوم دینیہ میں اگر اس کا علمی و درسی طور پر رابطہ رہا تو فقہ، اصول فقہ و علم کلام سے جن کا موضوع اور میدانِ بحث، مسائل و جزئیات اور اصولِ استنباط مسائل اور عقائد پر فلسفیانہ بحث سے ہے، عقائد کی اصلاح اور توحید کی ابتدائی دعوت نہیں۔

ہندوستان کے مذاہب، فلسفوں اور یہاں کے رسوم و عادات کا دسویں ہی صدی میں مسلم معاشرہ پر جو اثر پڑ چکا تھا، اس کا اندازہ حضرت مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ کے اس مکتوب سے لگایا جا سکتا ہے، جو انھوں نے اپنی ایک ارادت مند نیک خاتون کے نام لکھا ہے[1]، جس سے مراسم شرک کی تعظیم، غیر اللہ سے استمداد اور طلب حوائج کے مشرکانہ عقیدہ،

---

[1] ملاحظہ ہو مکتوب ۴۱ بصالحہ از اہل ارادت۔

اہل کفر کے تہواروں کی تعظیم، اور ان کے رسوم و عادات کی تقلید، بزرگوں کے لئے حیوانات کو نذر و ذبح کرنے، پیروں اور بیبیوں کی نیت سے روزے رکھنے، اور سیتلا سے خوف اور اس کی تعظیم (جس کو چیچک کی بیماری کی ذمہ دار دیبی سمجھا جاتا تھا) تک کی ہندوانہ ذہنیت اور توہّم پرستی کا اندازہ ہوتا ہے، جو مسلمانوں کے گھروں میں داخل ہو چکی تھی، اس عہد پر اور سوَبرس گزر جانے کے بعد، اور قرآن و حدیث سے براہ راست قوی اور عام رابطہ نہ پیدا ہونے کی وجہ سے عقائد میں جو خلل غیر اسلامی بلکہ منافی اسلام، عقائد و اعمال کا جو اثر اچھے اچھے گھرانوں پر پڑا ہو، اس کا اندازہ کرنا کچھ مشکل نہیں۔

شاہ صاحبؒ کے زمانہ میں غیر مسلموں کے اثرات، قرآن و حدیث سے ناواقفیت، اور دوری اور نتائج و خطرات اور عوام کی پسندیدگی اور ناپسندیدگی سے آنکھیں بند کر کے موثر کوشش کے طویل خلا نے ہندوستان میں جو صورت حال پیدا کر دی تھی، اور دین حنیفی کے (جس میں شرک کی کسی پرچھائیں کی گنجائش نہ تھی) متوازی جو نظام عقائد اور مسلم معاشرہ کی زندگی کے میدان میں جاہلیت کا جو سبزۂ خودرو پیدا ہو گیا تھا، اس کا کچھ اندازہ خود شاہ صاحب کی کتابوں کے بعض اقتباسات سے ہو سکتا ہے۔

"تفہیمات" میں ایک جگہ فرماتے ہیں:-

> "نبی کریم صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کی حدیث ہے کہ تم مسلمان بھی آخر کار اپنے سے پہلے کی امتوں کے طریقے اختیار کر لوگے، اور جہاں جہاں انھوں نے قدم رکھا ہے، وہاں تم بھی قدم رکھو گے حتیّٰ کہ وہ اگر کسی گوہ کے بل میں گھسے ہیں تو تم بھی ان کے پیچھے جاؤ گے، صحابہؓ نے پوچھا یا رسول اللہ صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم پہلی امتوں سے آپ کی مراد یہود و نصاریٰ ہیں؟

حضور صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا اور کون؟ اس حدیث کو بخاری اور مسلم نے روایت کیا ہے۔

سچ فرمایا اللہ کے رسول صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم نے، ہم نے اپنی آنکھوں سے وہ ضعیف الایمان مسلمان دیکھے ہیں، جنھوں نے صلحاء کو ارباب من دون اللہ بنالیا ہے، اور یہود و نصاریٰ کی طرح اپنے اولیاء کی قبروں کو سجدہ گاہ بنا رکھا ہے، ہم نے ایسے لوگ بھی دیکھے ہیں، جو کلام شارع میں تحریف کرتے ہیں، اور نبی کریم صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کی طرف یہ قول منسوب کرتے ہیں کہ نیک لوگ اللہ کے لئے ہیں، اور گنہگار میرے لئے، یہ اسی قسم کی بات ہے جیسی یہودی کہتے تھے کہ "لَنْ تَمَسَّنَا النَّارُ اِلَّا اَیَّامًا مَّعْدُوْدَةً" (البقرہ ۔ ۸۰) (ہم دوزخ میں نہ جائیں گے اور گئے بھی تو بس چند روز کے لئے) سچ پوچھو تو آج ہر گروہ میں دین کی تحریف پھیلی ہوئی ہے، صوفیہ کو دیکھو تو ان میں ایسے اقوال زبان زد ہیں، جو کتاب و سنت سے مطابقت نہیں رکھتے، خصوصاً مسئلۂ توحید میں اور معلوم ایسا ہوتا ہے کہ شرع کی انھیں بالکل پرواہ نہیں ہے"[1]

اپنے شہرۂ آفاق رسالہ" الفوز الکبیر" میں تحریر فرماتے ہیں:۔

"اگر تم کو (عہد جاہلیت کے) مشرکین کے عقائد و اعمال کے اس بیان[2] کے صحیح تسلیم کرنے میں کچھ توقف ہو، تو چاہیئے کہ اس زمانہ کے تحریف کرنے والوں کو علی الخصوص جو دار الاسلام کے نواح میں رہتے ہیں، دیکھو کہ انھوں نے

---

[1] التفہیمات الالٰہیہ جلد دوم ص ۱۳۴-۱۳۵ [2] شاہ صاحب نے اس سے پہلے مشرکین جاہلیت کے شرک کی حقیقت و نوعیت اور اس کے مظاہر کا تذکرہ کیا ہے۔

ولایت کی نسبت کیا خیال باندھ رکھا ہے، وہ لوگ باوجود دیگر اولیائے متقدمین کی ولایت کے معترف ہیں، مگر اس زمانہ میں اولیاء کے وجود کو قطعاً محال شمار کرتے ہیں، اور قبروں اور آستانوں پر پھرتے ہیں، اور طرح طرح کے شرک میں مبتلا ہیں، اور تحریف و تشبیہ نے ان کے اندر کس قدر رواج پکڑ لیا ہے، موافق حدیث صحیح "لتتبعنّ سُنَنَ من کان قبلکم" (تم اپنے پیشرو لوگوں کے نقش قدم پر چلوگے) ان آفات میں سے کوئی آفت بھی نہیں رہی، جس پر آج مسلمانوں کی کوئی نہ کوئی جماعت کاربند، اور اس کے مانند دیگر امور کی معتقد نہ ہو" عافانا اللّٰہ سبحانہ عن ذٰلک![1]

مرض کا علاج اور اصلاحِ حال کا مؤثر طریقہ، اشاعتِ قرآن

شاہ صاحبؒ نے اس مرض بلکہ وبائے عام کے علاج کے لئے قرآن مجید کے مطالعہ و تدبّر اور اس کے فہم کو سب سے مؤثر علاج سمجھا، اور یہ بات محض ذہانت، قوتِ مطالعہ اور قیاس پر مبنی نہیں تھی، بلکہ ایک ایسی بدیہی حقیقت تھی، جس پر قرآن مجید خود شاہد، اور نہ صرف عہد بعثت کی تاریخ بلکہ اسلام کی پوری تاریخِ دعوت اور سرگزشتِ اصلاح و تجدید گواہ ہے، خاص طور پر حقیقتِ توحید، اور حقیقتِ شرک کو ظاہر کرنے کے لئے اس سے زیادہ واضح، اس سے زیادہ طاقتور، اور دل نشین ذریعہ کا تصور نہیں ہو سکتا، ترجمانِ قرآن شاہ عبدالقادر صاحبؒ نے اپنے مقدمہ "موضح القرآن" میں جتنے سادہ اور دل نشین انداز میں اس حقیقت کا اظہار کیا ہے، اس سے زیادہ مشکل ہے، فرماتے ہیں :-

---

[1] الفوز الکبیر ص۔۹ مکتبہ محمدی۔

• بتلانے والے بہتیرا بتائیں جیسا خدا تعالےٰ نے قرآن شریف میں آپ بتایا ہے، ویسا کوئی نہیں بتا سکتا، اور جیسا اثر اور راہ پانا خدا کے کلام میں ہے کسی کے کلام میں نہیں[۱]"

حجاز مقدّس کے قیام میں شاہ صاحبؒ کو ہندوستان کی اس دینی صورت حال اور اس کے تعلیمات قرآن، اور تعلیمات اسلام سے بُعد اور منافات کا احساس اور شدّت سے پیدا ہوا ہوگا، اور وہاں کی نورانی، روحانی اور قرآنی فضائیں جہاں سے توحید کا زمزمہ سب سے پہلے بلند ہوا، شاہ صاحبؒ کے قلب بیدار میں اس کا داعیہ کہ وہ ہندوستان میں قرآن مجید کی دولت کو عام کریں ایسی وضاحت اور شدت سے پیدا ہوا ہوگا جس کو اس الہام اور اشارۂ غیبی سے تعبیر کر سکتے ہیں، جو نفوس زکیّہ پر ہر عہد میں کسی ضروری دینی کام کی تکمیل کے لئے وارد ہوا کرتا ہے، اور جس کی مقاومت اور جس پر غلبہ پانا ناممکن ہوجاتا ہے، اسی لئے ہم دیکھتے ہیں کہ شاہ صاحب نے قرآن مجید کے فارسی ترجمہ کا کام جس نے "فتح الرحمٰن" کے نام سے تکمیل پائی حجاز سے واپسی پر شروع فرمایا[۲]۔

---

[۱] مقدمہ "موضح القرآن" حضرت شاہ عبدالقادر رحمۃ اللہ علیہ، [۲] مصنف "حیات ولی" نے ایک معاصر کے حوالہ سے ترجمۂ قرآن کے قصور میں علماء کی شورش اور مفسدوں کے شاہ صاحب پر قاتلانہ حملہ کی پُر اثر کہانی بیان کی ہے اور اس سے یہ نتیجہ نکالا ہے کہ شاہ صاحبؒ نے اس شورش سے بچنے کے لئے حجاز کا سفر اختیار کیا، (ص ۴۱۸-۴۲۳)

لیکن کسی اور تاریخی ماخذ سے اس کی تائید نہیں ہوتی، خود "فتح الرحمٰن" کے مقدمہ میں اس کی تصریح ہے کہ شاہ صاحبؒ نے ترجمہ کا کام ۱۰ ذی الحجہ سنہ ۱۱۵۰ھ کو شروع کیا اور ۱۱۵۱ھ میں اس کی تکمیل ہوئی، جس سے صاف طریقہ پر ثابت ہوتا ہے کہ شاہ صاحبؒ کا یہ مبارک اقدام سفر حجاز سے واپسی کے بھی چار پانچ سال بعد کا ہے، ہمارے خاندانی ذخیرۂ کتب میں فتح الرحمٰن کا ایک قلمی نسخہ دو جلدوں میں محفوظ ہے، یہ نسخہ خود شاہ صاحبؒ نے ہمارے خاندان کے (باقی ص ۱۴۲ پر)

اس وقت ہندوستان کیا تقریباً تمام عجمی ممالک میں جن میں ترکستان وایران اور افغانستان ہندوستان کے قریبی ہمسایہ تھے ________ اور انھیں کے رجحانات، مشاغل، ذوق اور تسلیم شدہ حقائق کا سایہ ہندوستان کی علمی و دینی حلقوں پر پڑتا تھا، یہ تسلیم کرلیا گیا تھا کہ قرآن مجید اخص الخواص طبقہ کے مطالعہ، غور وفکر اور فہم وتفہیم کی کتاب ہے، جس کا سمجھنا ایک درجن سے زیادہ علوم پر موقوف ہے، اس کو عوام میں لانا، عوام کو براہ راست اس کے مطالعہ سے واقفیت پیدا کرنے اور اس سے ہدایت اور روشنی حاصل کرنے کی دعوت دینا سخت خطرناک، ایک بڑی گمراہی اور فتنہ کا دروازہ کھولنے کے مرادف ہے، اور عوام میں ذہنی انتشار، خودرائی، اور علماء سے بے نیازی، بلکہ بغاوت اور سرکشی کی دعوت دینا ہے، اس طرز خیال اور دلیل کو ایک مختصر رسالہ "تحفۃ الموحدین"[۱] میں بڑی خوبی سے بیان کیا گیا ہے:-

"بعض لوگ کہہ بیٹھتے ہیں کہ قرآن مجید اور حدیث کو وہی شخص سمجھ سکتا ہے، جو بہت سے

(باقی صد ۱۴۱ کا) ایک متوسّل میاں محمد اعظم عثمانی نصیر آبادی کو جو شاہ صاحب سے ارادت کا تعلق رکھتے تھے، ہدیہ فرمایا، میاں محمد اعظم حضرت سید محمد نعمان (عمّ حقیقی حضرت سید احمد شہیدؒ) کے پروردہ اور تربیت یافتہ تھے، یہ نسخہ مولانا سید قطب الہدیٰ محدث شاگرد حضرت شاہ عبدالعزیزؒ کی ملکیت میں آیا، اور منتقل ہوتے ہوئے والد ماجد مولانا حکیم سید عبدالحئیؒ کے پاس پہونچا، اس نسخہ کی کتابت ۱۱۶۵ھ میں مکمل ہوئی یعنی شاہ صاحب کی وفات سے گیارہ سال پہلے، یہ بھی اس بات کا ثبوت ہے کہ فتح الرحمٰن کی تکمیل سفر حجاز سے واپسی کے بعد کا کارنامہ ہے، سفر حجاز سے پیشتر صرف سورۂ بقر و نساء کا ترجمہ ہوا تھا۔

[۱] یہ رسالہ شاہ صاحبؒ کے نام اور نسبت کے ساتھ شائع ہوا ہے، لیکن چونکہ شاہ صاحب کی تصنیفات ورسائل کے قدیم تذکروں اور فہرست تالیفات میں عام طور پر اس کا نام نہیں آتا، اس لئے ہم جزم و وثوق سے نہیں کہہ سکتے کہ وہ شاہ صاحب کے قلم سے ہے، البتہ جو مضمون نقل کیا جارہا ہے وہ اس طرز خیال کی صحیح ترجمانی ہے جو عام طور پر پھیلا ہوا تھا، اور اس میں اس کا جواب شافی بھی موجود ہے۔

علم اور بے شمار کتابیں پڑھا ہوا ہو، اور اپنے زمانہ کا علامہ ہو، ان کے جواب میں

اللہ تعالےٰ فرماتا ہے "هُوَ الَّذِیْ بَعَثَ فِی الْاُمِّیّٖنَ رَسُوْلًا مِّنْهُمْ یَتْلُوْا عَلَیْهِمْ

اٰیٰتِهٖ وَ یُزَكِّیْهِمْ وَ یُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَ الْحِكْمَةَ ۗ وَ اِنْ كَانُوْا مِنْ قَبْلُ لَفِیْ ضَلٰلٍ

مُّبِیْنٍ ۙ" (الجمعہ - ۲) (خدا تعالےٰ وہ ہے جس نے اَن پڑھوں میں پیغمبر بھیجا انھیں

اَن پڑھوں میں سے، پڑھتا ہے وہ پیغمبر اُن اَن پڑھوں پر خدا کی آیتیں، اور ان کو

گناہ کے میل سے پاک کرتا، اور کتاب اور اس کی تدبیر سکھاتا ہے) یعنی رسول خدا

صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم بھی اَن پڑھ اور آپؐ کے اصحاب بزرگوار بھی اَن پڑھ تھے، مگر

جب رسول خدا صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنے اصحابؓ کے سامنے قرآن کی آیتیں پڑھیں،

تو وہ ان کو سُن کر ہر قسم کی بُرائی اور بگاڑ سے پاک صاف ہو گئے، پس اگر ناخواندہ آدمی

قرآن وحدیث نہیں سمجھ سکتا، اور اس کی سمجھ کی استعداد نہیں رکھتا تو صحابہؓ بُرائی اور

عیبوں سے کیونکر پاک صاف ہو گئے؟ اس قوم پر سخت افسوس ہے، جو "صدرہ" سمجھنے اور

"قاموس" جاننے کا تو دعویٰ کرتے ہیں، مگر قرآن وحدیث کو سمجھنے میں اپنے آپ کو محض نادان

ظاہر کرتے ہیں، اور بعضے یوں کہتے ہیں کہ ہم پچھلے لوگ ہیں، رسول اللہ صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم

کے زمانہ کی برکت اور صحابہ رضوان اللہ علیہم اجمعین کے دل کی سلامت کہاں سے

لائیں، جو قرآن وحدیث کے معنی بخوبی سمجھ سکیں، ان کے جواب میں حق تعالےٰ فرماتا ہے،

"وَّ اٰخَرِیْنَ مِنْهُمْ لَمَّا یَلْحَقُوْا بِهِمْ ؕ وَ هُوَ الْعَزِیْزُ الْحَكِیْمُ ۝" (الجمعہ - ۳) یعنی

پچھلے لوگ خواہ پڑھے ہوئے ہوں، یا اَن پڑھ مگر جبکہ وہ مسلمان ہوں، اور اصحاب کے

طریقہ کی پیروی کا ارادہ کریں، اور قرآن وحدیث کو سنیں تو انھیں بھی پاک کرنے کے لئے

یہی قرآن وحدیث کافی ہو سکتی ہیں، اور فرماتا ہے "وَ لَقَدْ یَسَّرْنَا الْقُرْاٰنَ

لِلذِّكۡرِ فَهَلۡ مِن مُّدَّكِرٍ" (القمر ۲۲) (اور البتہ ہم نے قرآن کو نصیحت کے واسطے آسان کر دیا، پس کیا کوئی نصیحت لینے والا ہے؟) ؟ یہ کیونکر آسانی ہو سکتی ہے کہ "کافیہ" پڑھنے والے اور "شافیہ" جاننے والے تو اس کے معنی سمجھنے سے عجز ظاہر کرتے، اور عرب کے جنگلی لوگ اس کی حقیقت سے بہرہ ور ہوتے ہیں، اس کے علاوہ ایک جگہ یوں فرمایا ہے "اَفَلَا يَتَدَبَّرُوۡنَ الۡقُرۡاٰنَ" (محمد ۲۴) کہ (قرآن میں کیوں نہیں فکر کرتے) پس اگر قرآن مجید آسان نہ ہو تو اس میں فکر کیونکر کیا جائے "اَمۡ عَلٰى قُلُوۡبٍ اَقۡفَالُهَا" (محمد ۲۴) (یا ان کے دلوں پر قفل لگے ہوئے ہیں) یعنی باوجودیکہ دلوں پر قفل نہیں لگے ہوئے ہیں، پھر بھی کیسی گمراہی ہے قرآن کے فکر میں زور نہیں لگاتے"۔[1]

لیکن بقول شاعر ؎

نوا را تلخ تر می زن چوں ذوقِ نغمہ کمیابی

حُدی را تیز تر می خواں چوں محمل را گراں بینی

شاہ صاحب نے اس بدمذاقی، بے توفیقی اور غلط اندیشی کو دیکھ کر جس کے حدود "وَيَصُدُّوۡنَ عَنۡ سَبِيۡلِ اللّٰهِ" (الاعراف ۱۴۵) سے مل جاتے تھے، فیصلہ کیا کہ قرآن مجید کا اس سلیس فارسی زبان میں ضرور ترجمہ کرنا چاہئے، جو ہندوستان میں قیامِ حکومت اسلامیہ کے بعد سے ملک کی دفتری، علمی، تصنیفی، اور خط و کتابت کی زبان تھی، اور تقریباً ہر پڑھا لکھا مسلمان اگر اس میں بول لکھ نہیں سکتا تھا، تو اس کو سمجھتا ضرور تھا، ہندوستان میں فارسی زبان کی اس طویل عملداری میں جس کی مدت ساڑھے صدیوں سے کم نہ تھی، قرآن مجید کے فارسی میں ایک درجن بھی

---

[1] تحفۃ الموحدین ص ۵-۶-۷ مطبوعہ المکتبۃ السلفیۃ، شیش محل روڈ۔ لاہور۔

ترجمے ہوتے تو تعجب کی بات نہ تھی، لیکن حسن بن محمد علقمی المشتہر بنظام نیشاپوری ثم دولت آبادی کے ترجمہ سے پہلے جو آٹھویں صدی ہجری کے علماء میں تھے، کسی فارسی ترجمہ کا سُراغ نہیں لگتا نیشاپوری کا یہ فارسی ترجمہ ان کی عربی تفسیر "غرائب القرآن" میں شامل ہے[1]۔

ہندوستان میں شیخ سعدیؒ کے ترجمہ کے نام سے ایک ترجمہ مشہور تھا، اور اگرچہ وہ بھی شیخ کی مقبول "تصنیفات" "گلستان" اور "بوستان" کی طرح رائج اور متداول نہیں تھا لیکن پھر بھی کہیں کہیں پایا جاتا تھا، مگر اس کا انتساب شیخ سعدیؒ کی طرف صحیح نہیں ہے، تحقیقی بات یہ ہے کہ وہ علامہ سید شریف علی الجرجانی (م ۸۱۶ھ) کا کیا ہوا ہے، تفسیر حقانی کے مؤلف مولانا عبدالحق حقانی کا چشم دید بیان ہے کہ:-

"جس کو آج کل جہلاء سعدیؒ کا ترجمہ کہتے ہیں، وہ دراصل سید شریف کا ترجمہ ہے، صاحبِ مطبع نے میرے سامنے رواج دینے کے لئے سعدیؒ کی طرف منسوب کردیا ہے[2]"۔

الغرض شاہ صاحب نے سفر حجاز سے واپسی کے پانچ سال بعد (غالباً اصلاح عقائد کی ان کوششوں کا نتیجہ دیکھنے کے بعد جو خصوصی درس وتدریس اور وعظ وارشاد کے ذریعہ ہو رہی تھیں) یہ فیصلہ کیا کہ ہدایتِ عام، اصلاحِ عقائد اور اللہ تعالیٰ سے طاقتور رابطہ پیدا کرنے کا کوئی ذریعہ قرآن مجید کی ہدایت وتعلیمات کی براہ راست اشاعت وتبلیغ سے زیادہ مؤثر نہیں ہوسکتا، اور اس کا ایک ہی طریقہ ہے، اور وہ قرآن مجید کا فارسی ترجمہ اور اس کی اشاعت، خود شاہ صاحب کی زبان سے اس کے محرکات واسباب

---

[1] "جائزہ تراجم قرآنی" شائع کردہ مجلس معارف القرآن، دارالعلوم دیوبند، ص ۱۳-۱۴

[2] البیان فی علوم القرآن مقدمہ تفسیر حقانی از مولانا عبدالحق صاحب حقانی ص ۵۰۷

اور اس اقدام کی تاریخ سنئے "تفسیر فتح الرحمٰن" کے مقدمہ میں فرماتے ہیں:۔

"یہ زمانہ جس میں کہ ہم لوگ موجود ہیں، اور یہ ملک جس کے ہم باشندہ ہیں اس میں مسلمانوں کی خیر خواہی تقاضا کرتی ہے کہ (ترجمۂ قرآن سلیس اور بامحاورہ فارسی میں بغیر اظہار فضیلت اور عبارت آرائی کے اور متعلق قصوں اور توجیہات کے ذکر کئے ہوئے بغیر) کیا جائے، تاکہ عوام و خواص یکساں طور پر سمجھ سکیں، اور چھوٹے بڑے سبھی معانئ قرآن کا ادراک کرسکیں، اس لئے اس اہم کام کا داعیہ فقیر کے دل میں ڈالا گیا، اور اس کے لئے مجبور کیا گیا۔

پہلے ترجموں پر غور کیا گیا تاکہ جس ترجمہ کو معیار کے مطابق پایا جائے اس کی ترویج کی جائے، اور یہ ترجمہ حتی الامکان اہل زمانہ کے ذوق کے مناسب ہو، مگر ان ترجموں میں یا تو بے کیف طوالت ہے یا مخل انداز تفصیر و اجمال ہے، اس عرصہ میں زہراوین (سورہ بقر و نساء) کا ترجمہ ہو گیا، اس کے بعد سفر حرمین کا اتفاق ہو گیا، اور وہ سلسلہ ختم ہو گیا، کئی سال بعد ایک عزیز ترجمۂ قرآن پڑھنے لگے اور یہ کام اس گزشتہ عزم کا محرک بن گیا، اور یہ فیصلہ ہوا کہ سبق کے بقدر ترجمہ لکھ لیا جائے، جب ثلث قرآن مجید تک ترجمہ ہو گیا، تو ان عزیز کو سفر پیش آ گیا اور ترجمہ پھر موقوف ہو گیا، ایک مدت کے بعد پھر ایک تقریب پیدا ہوئی اور وہ پرانا خیال تازہ ہوا اور دو ثلث تک ترجمہ ہو گیا۔

بعض دوستوں کو مسودہ صاف کرنے کے لئے کہا گیا اور یہ کہ اس کے ساتھ متن قرآن بھی لکھ دیں تاکہ مستقل نسخہ تیار ہو جائے، ان سعادت مند دوست نے عید الاضحی ۱۱۵۰ھ سے تبییض شروع کی اس کے بعد پھر اس عزم کو تحریک ہوئی،

اور اخیر تک ترجمہ مکمل ہو گیا، اور اوائل شعبان میں تسوید ختم ہوئی، اور ۱۱۵۱ھ میں سودہ صاف ہو گیا، اور ۱۱۵۶ھ میں برادر دینی عزیز القدر خواجہ محمد امین اکرمہ اللہ تعالیٰ بشہودہ کے اہتمام سے اس کتاب کی ترویج ہوئی اور اس کا درس شروع ہوا، اور اس کے متعدد نسخے تیار ہو گئے، اور معاصرین اس طرف متوجہ ہوئے ؎

للہ الحمد کہ آں نقش کہ خاطر می بست
آمد آخر ز پس پردۂ تقدیر پدید[1]

شاہ صاحب نے ترجمہ اور تفسیر فتح الرحمٰن کے علاوہ اصول ترجمہ پر ایک مقدمہ بھی لکھا ہے، جو مختصر ہونے کے باوجود بڑا البصیرت افروز اور عالمانہ ہے، ابتدا میں لکھتے ہیں:۔

"یقول الفقیر الی رحمۃ اللہ الکریم ولی اللہ بن عبد الرحیم
ایں رسالہ ایست در قواعد ترجمہ مسماۃ بالمقدمۃ فی قوانین الترجمۃ
کہ در وقت تسوید ترجمۂ قرآن قلم بہ ضبط آں جاری شد"[2]

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ترجمہ اور قرآن مجید کی تبلیغ عام کے راستہ میں جو چٹان حائل ہو گئی تھی، شاہ صاحب جیسی عظیم المرتبت ہستی کے (جس کے علمی تبحّر، جامعیت، باطنی مرتبے اور اخلاص پر تقریباً اس عہد کے صحیح الخیال اور صاحبِ علم طبقہ کا اتفاق تھا) اقدام سے یہ چٹان ہٹ گئی، اور راستہ صاف ہو گیا، اسلام کی تاریخ میں مسلسل ایسا ہوتا رہا ہے کہ کسی مسلّم الثبوت اور بلند شخصیت کے کسی کام کے آغاز کر دینے سے غلط فہمیوں اور

---

[1] دیباچہ فتح الرحمٰن مطبوعہ دہلی ۱۲۹۴ھ۔ [2] مخطوطہ محفوظہ کتب خانہ ندوۃ العلماء مشتمل بر شش صفحات تقطیع کلاں۔

بدگمانیوں کا بادل چھنٹ گیا ہے، اور شاہ راہ عام کھل گئی ہے، امام ابوالحسن اشعری کا متکلمانہ مباحث میں حصہ لینا اور عقلی استدلال سے کام لینا، حجۃ الاسلام امام غزالیؒ کا فلسفہ کا مطالعہ اور اس کی تنقیح و تردید، اور ایسے بہت سے اقدامات جو اپنے عہد کی ضرورت کے مطابق اسلام کی حفاظت یا مدافعت میں کئے گئے، اس کی روشن مثالیں ہیں۔

شاہ صاحب کے بعد کے اردو تراجم

شاہ صاحب کے فارسی ترجمہ کے بعد بہت جلد اردو میں ترجمۂ قرآن کی ضرورت محسوس ہوئی کہ بارہویں صدی کے آخری ہی حصہ میں اردو نے فارسی کی جگہ لینی شروع کر دی تھی، اور اردو میں تحریر و تصنیف کا کام شروع ہو گیا تھا[1]، اس ضرورت اور انقلابِ حال کو سب سے پہلے خود شاہ صاحب کے فرزند ارجمند حضرت شاہ عبدالقادر صاحبؒ دہلوی (م ۱۲۳۰ھ) نے محسوس کیا، اور ۱۲۰۴-۵ھ میں گویا شاہ صاحب کے ترجمہ کے پچاس برس بعد انھوں نے بامحاورہ اردو میں اس کا ایسا ترجمہ کیا جس کے متعلق یہ کہا جا سکتا ہے کہ قرآن مجید کا کسی غیر عربی زبان میں ایسا کامیاب اور شگفتہ ترجمہ جس میں زیادہ سے زیادہ قرآنی الفاظ کی روح آ گئی ہو ابھی تک علم میں نہیں، شاہ صاحبؒ اپنے ترجمہ کی تمہید میں لکھتے ہیں:۔

"اس بندۂ عاجز عبدالقادر کے خیال میں آیا کہ جس طرح ہمارے بابا صاحب بہت بڑے حضرت شاہ ولی اللہ عبدالرحیم کے بیٹے سب حدیثیں جاننے والے ہندوستان کے رہنے والے نے فارسی زبان میں قرآن کے معنی آسان کر کے لکھے، الحمد للہ کہ

[1] ملاحظہ ہو تاریخ نثر اردو از مولوی احسن مارہروی ح ۱ ص ۷۶-۷۷

یہ آرزو ۱۲۰۵ھ/۱۷۹۰ء میں حاصل ہوئی۔[1]

شاہ عبدالقادر صاحبؒ کے بعد انھیں کے برادر بزرگ شاہ رفیع الدین (م ۱۲۳۳ھ) نے قرآن مجید کا تحت اللفظ ترجمہ کیا، جو اپنی احتیاطوں اور مصنف کے علمی تبحر و اخلاص کی وجہ سے بہت مقبول ہوا، اور بعض حلقوں میں شاہ عبدالقادر صاحبؒ کا بامحاورہ ترجمہ اور بعض حلقوں میں شاہ رفیع الدین صاحبؒ کا تحت اللفظ ترجمہ رائج اور قابل ترجیح قرار پایا۔

یہ دونوں ترجمے مسلمانوں کے گھروں میں ایسے عام ہوئے اور قرآن مجید کی تلاوت کے ساتھ اس کے پڑھنے کا ایسا رواج ہوا جس کی مثال کسی دوسری دینی کتاب کے بارے میں نہیں مل سکتی، جہاں تک اصلاح عقائد اور عقیدۂ توحید کی اشاعت کا تعلق ہے، ان دونوں ترجموں سے فائدہ اٹھانے والوں کی کوئی تعداد نہیں بیان کی جا سکتی کہ وہ لاکھوں سے متجاوز ہوگی، حقیقت میں کوئی اسلامی حکومت بھی اپنے وسائل کے ساتھ دعوت و اصلاح کا اتنا بڑا کام انجام نہیں دے سکتی تھی جو ان تین ترجموں نے انجام دیا، جو ایک ہی شجرۂ طوبیٰ کی شاخیں ہیں "وَذٰلِكَ فَضْلُ اللّٰهِ يُؤْتِيْهِ مَنْ يَّشَآءُ"۔

اس کے بعد اردو ترجموں کا ایک سیلاب رواں ہوگیا جس کی تعداد کا استقصاء ایک دشوار کام اور مستقل تحقیقی بحثوں کا طالب ہے۔[2]

---

[1] موضح القرآن جلد اول ص ۲

[2] اس وقت ہمارے سامنے "جائزۂ تراجم قرآنی" کے نام کی کتاب ہے، اس میں شاہ عبدالقادر صاحبؒ اور شاہ رفیع الدین صاحبؒ کے ترجموں کے بعد کے جن ترجموں کا جائزہ لیا گیا اور مختصر تعارف کرایا گیا ہے، ان کی تعداد پچپن ۵۵ ہے۔

درس قرآن

قرآن مجید کے ان اردو تراجم کے علاوہ جو اسی خاندان والا شان کے دو برگزیدہ افراد حضرت شاہ عبدالقادر دہلویؒ اور حضرت شاہ رفیع الدین دہلویؒ نے کئے، اور ہندوستان میں جہاں جہاں اردو بولی جاتی تھی گھر گھر پڑھے جانے لگے، قرآن مجید کے ذریعہ تطہیر عقائد اور اصلاحِ اعمال و اخلاق کی سب سے طویل، سنجیدہ و عمیق اور مؤثر و وسیع کوشش خاندانِ ولی اللّٰہی کے سب سے بڑے فرد اور حضرت شاہ ولی اللہ صاحب کے کاموں کی تکمیل و توسیع کی سعادت حاصل کرنے والے بزرگ حضرت شاہ عبدالعزیزؒ (م ۱۲۳۹ھ) کے ذریعہ انجام پائی، جنھوں نے تقریباً ۶۲-۶۳ سال تک دہلی جیسے مرکزی شہر اور تیرھویں صدی ہجری جیسے اہم زمانہ میں درس قرآن کا سلسلہ جاری رکھا، اس کو خواص و عوام میں جو مقبولیت حاصل ہوئی، اور اس سے اصلاحِ عقائد کا جو عظیم الشان کام انجام پایا ہمارے علم میں اس کی کوئی مثال نہیں ملتی۔

"الفوز الکبیر"

دعوت الی القرآن اور خواص و اہل علم کے حلقہ میں تدبّر قرآن کی صلاحیت پیدا کرنے اور اس کے ذریعہ سے امت کی اصلاح کا جذبہ بیدار کرنے کے سلسلہ میں شاہ صاحب کی ایک تجدیدی و انقلابی خدمت اور کارنامہ "الفوز الکبیر" کی تصنیف ہے، جو اپنے موضوع پر (ہمارے علم میں پورے اسلامی کتب خانہ میں) منفرد کتاب ہے۔

اصول تفسیر پر کوئی چیز عام طور پر نہیں ملتی، صرف چند اصول و قواعد تفاسیر کے

مقدمہ میں یا اپنا طرزِ تصنیف بیان کرنے کے لئے بعض مصنفین چند سطروں میں لکھ دیتے ہیں، شاہ صاحب کی کتاب "الفوز الکبیر فی اصول التفسیر" بھی اگرچہ مختصر ہے لیکن پوری کتاب سراسر نکات و کلیات ہے اور در حقیقت ایک جلیل القدر عالم کی جس کو فہم قرآن کے مشکلات کا علمی تجربہ ہے ایک قیمتی اور نادر بیاض ہے۔

اس کی قدر وہی لوگ جان سکتے ہیں، جن کو ان مشکلات سے واسطہ پڑا ہو بعض بعض اصول جو شاہ صاحب نے اپنے ذوق و وجدان اور فہم قرآن کی بنا پر لکھ دیئے ہیں، دوسری کتابوں کے سیکڑوں صفحات کے مطالعہ سے نہیں حاصل ہو سکتے، اسی رسالہ کے مقدمہ میں شاہ صاحب کا یہ فرمانا حرف بحرف صحیح ہے کہ :-

میگوید فقیر ولی اللہ بن عبد الرحیم	فقیر ولی اللہ بن عبد الرحیم (اللہ ان کے ساتھ
عاملہما اللہ تعالیٰ بلطفہ العظیم چوں	اپنے لطف عظیم کا معاملہ فرمائے) کہتا ہے کہ
بریں فقیر درے از فہم کتاب اللہ	جب اللہ نے اس فقیر پر کتاب اللہ کے
کشادند خواست کہ بعضے نکات	فہم کا دروازہ کھولا تو اس کی خواہش
نافعہ کہ در تدبر کلام اللہ یاراں را	ہوئی کہ بعض مفید نکات (جن سے
بکار آید در رسالہ مختصرے مضبوط	لوگوں کو تدبرِ قرآن میں مدد ملے گی)
نماید امید واری از عنایت حضرت	ایک مختصر رسالے میں لکھ دیئے جائیں
باری آں است کہ طالب علماں را	عنایت خداوندی سے امید ہے کہ
بہ مجرد فہم ایں قواعد راہے واسع	طالب علموں کے لئے ان قواعد کے
در فہم معانی کتاب اللہ کشادہ گردد کہ	فہم کے بعد فہم مطالب قرآن کی
اگر عمرے در مطالعہ تفاسیر یا گزرانیدن	ایسی کشادہ راہ مل جائے گی کہ اگر

آنہا بر مفسران علیٰ انهم اقل قلیل فی هذا الزمان بسر برند بآن ضبط و ربط بدست نیارند"[1]	مطالعۂ تفاسیر اور مفسرین (جن کی تعداد آجکل بہت ہی کم ہے) سے رجوع کرنے میں ایک عمر بھی گزار دیں گے تب بھی فہم قرآن سے ایسا ربط وضبط نہ پیدا کرسکیں گے۔

قرآن کے مضامین و مقاصد، اس کے طرز و اسلوب کی خصوصیت اور انسانی تالیفات خصوصاً متاخرین کی کتب درسیہ سے اس کے اختلاف و امتیاز اور شانِ نزول کے متعلق چند لفظوں میں جو کچھ لکھا ہے آج اس میں ممکن ہے کوئی ندرت نہ معلوم ہو لیکن بارہویں صدی میں یہ قطعاً نئے خیالات تھے اور آج بھی کتنے حلقوں میں یہ خیالات نامانوس ہیں، شانِ نزول کی روایتوں کی کثرت اور ان کی اہمیت پر زیادہ زور دینے سے (جو قرون متاخرہ کا شعار بن گیا تھا) قرآن کریم کے مضامین و قصص اور مواعظ و عبر سے ہر زمانہ میں جو فائدہ اٹھایا جانا چاہیئے اور اپنے اپنے زمانہ اور حالات پر ان کا جس طرح انطباق ہونا چاہیئے، اس میں بڑا فرق ہو گیا تھا، شاہ صاحب کی اس تحقیق و تنقیح سے وہ پردہ ہٹ جاتا ہے اور قرآن مجید کا جمالِ جہاں آرا سامنے آجاتا ہے "الفوز الکبیر" کے باب اول میں شاہ صاحب لکھتے ہیں:۔

"عام مفسّرین نے ہر ایک آیت کو خواہ مباحثہ کی ہو یا احکام کی ایک قصے کے ساتھ ربط دیا ہے، اور اس قصے کو اس آیت کے لئے سببِ نزول مانا ہے لیکن حق یہ ہے کہ نزول قرآنی سے مقصودِ اصلی نفوس بشریہ کی تہذیب اور ان کے باطل عقائد اور فاسد اعمال کی تردید ہے، اس لئے آیات مناظرہ کے نزول کے لئے متکلمین میں

---

[1] الفوز الکبیر

عقائدِ باطلہ کا وجود اور آیاتِ احکام کے لئے ان میں اعمالِ فاسدہ اور مظالم کا شیوع،
اور آیاتِ تذکیر کے نزول کے لئے ان کا بغیر ذکر آلاء اللہ و ایام اللہ اور موت
و واقعات بعد الموت کے بیدار نہ ہونا، اصلی سبب ہوا، خاص واقعات کو جن کے
بیان کرنے کی عام مفسرین نے زحمت اٹھائی ہے، اسبابِ نزول میں چنداں دخل
نہیں ہے، مگر سوائے چند آیات کے جن میں کسی ایسے واقعہ کی جانب اشارہ ہے، جو
رسول اللہ ﷺ کے زمانے میں یا اس سے پیشتر واقع ہوا ہو۔[1]

قرآن مجید نے جن فرقوں کی تردید کی ہے، ان کے اصلی اور صحیح خیالات و عقائد اور کمزوریوں کا بیان ان کی گمراہیوں اور غلط فہمیوں کے حقیقی اسباب اور ان کی تاریخ، نفاق کی تشریح اور مسلمانوں کی بعض جماعتوں پر ان کی تطبیق، فہمِ قرآن کی اساس ہے، جو اختصار کے باوجود اس وضاحت کے ساتھ کسی بڑی سے بڑی تفسیر میں نہیں ملے گی۔

نسخ میں متقدمین و متاخرین کے اصطلاحی فرق کی توضیح اور منسوخ و ناسخ آیات میں تطبیق، صحابہ و تابعین کے تفسیری اختلافات کا حل شاہ صاحبؒ کی عمدہ تحقیقات میں سے ہے۔

نحو کے مشہور اور ظاہری قواعد کی بعض آیات سے بظاہر عدم مطابقت کی جو توجیہ شاہ صاحب نے کی ہے، اس کی قدر وہ لوگ کر سکتے ہیں، جو نحو کی تدوین کی تاریخ سے واقف اور بصرہ و کوفہ کے دبستان کے اختلافات پر نظر رکھتے ہیں، رسالہ کا بڑا امتیاز یہ ہے کہ اس کو پڑھ کر ادیان سابقہ، فرقِ ضالّہ اور اقوام و ملل کی پرانی بیماریوں اور کمزوریوں کی نشاندہی ہوتی ہے اور اس کی توفیق ملتی ہے کہ قرآن کے آئینہ میں مسلمانوں کی نسلیں اور اپنے اپنے عہد کا مسلم معاشرہ اور طبقاتِ امت اپنا چہرہ دیکھیں اور اس کی فکر کریں کہ مذاہب و فرق کی سابقہ بیماریاں اور کمزوریاں دبے پاؤں ان میں تو

---

[1] الفوز الکبیر باب اول ص۳۳-۳۴

داخل نہیں ہوگئی ہیں :-

لَقَدْ اَنْزَلْنَآ اِلَیْکُمْ کِتٰبًا فِیْہِ ذِکْرُکُمْ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ ۝ (سورۂ انبیاء - ۱۰)	ہم نے تمہاری طرف ایسی کتاب نازل کی ہے جس میں تمہارا تذکرہ ہے کیا تم نہیں سمجھتے۔

مسئلہ توحید کی علمی تنقیح و تحقیق

حضرت شاہ ولی اللہ صاحبؒ نے اصلاح عقائد اور توحید خالص کی دعوت کے سلسلہ میں قرآن مجید کے ترجمہ اور درس قرآن ہی پر اکتفا نہیں کیا، بلکہ ایک عالم و محقق کے انداز سے اس کا حقیقت پسندانہ جائزہ لیا، عقیدۂ توحید ملت ابراہیمیؑ کا سب سے بڑا شعار اور حضرت ابراہیمؑ کی دعوت اور جدوجہد کا سب سے بڑا مقصد خاتم الرسل صلے اللہ علیہ و آلہ وسلم کی دعوت کی بنیاد اور ابتدا اور انتہا تھی، سارا قرآن اور احادیث کا دفتر اور سیرت نبویؐ اس پر شاہد ہے آپ نے توحید و شرک کے درمیان ایسا خطِ امتیاز کھینچا، توحید کی حقیقت کو اس طرح عیاں کیا، شرک کے ادنیٰ سے ادنیٰ شائبہ اور اس کی ہلکی سے ہلکی پرچھائیں کے خلاف ایسا جہاد کیا، امت کے عقائد میں شرک کے داخل ہو جانے اور عقائد میں فتور واقع ہونے کے ذرائع کا ایسا سدِ باب کیا جس سے زیادہ کا تصور ممکن نہیں[1]، یہ سب حقائق ایسے متواتر اور بدیہی ہیں جن کے لئے دلائل اور مثالوں کی ضرورت نہیں جس کی قرآن و حدیث پر ذرا بھی نظر ہے،

---

[1] قبور کی تشئید، ان پر اجتماعات اور اعیاد کے اہتمام، سجدۂ تعظیمی، حلف بغیر اللہ کی ممانعت کے احکام، ایک بدو کے اِنْ شَآءَ اللّٰہُ وَ شِئْتَ (اگر اللہ چاہے اور آپ چاہیں) کہنے پر سخت ناگواری اور یہ فرمانا کہ "تو نے مجھے خدا کا ہمسر بنا دیا؟ نہیں تنہا جو اللہ چاہے" اور ایسی ہی بیسیوں مثالیں اس بات کی شاہد ہیں۔

وہ اس کا قائل ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔

پھر اس امت میں قرونِ مشہود لہا بالخیر کے گزرنے، نئے نئے ملکوں کے فتح ہونے، وہاں کی آبادی کے قبول اسلام، غیر مسلم اقوام کی مخالطت و مجاورت اور مرورِ زمانہ کے اثر سے عوام کے ایک بڑے طبقہ میں یہ مشرکانہ عقائد و اعمال کہاں سے داخل ہو گئے، اور ان کو توحید کے بہت سے شعائر و علامات کے ساتھ مسلم معاشرہ میں اپنی جگہ بنا لینے کا کیسے موقعہ مل گیا اور بہت سے مدّعیان علم کو ان کی تاویل اور توجیہ کی اور ان کو گوارہ کرنے اور جائز قرار دینے کی جرءت کیسے ہوئی، اور بہت سے پڑھے لکھے مسلمان کیسے اس مغالطہ کے شکار ہو گئے۔؟

شاہ صاحبؒ کے نزدیک اس کی وجہ توحید کی حقیقت اور مشرکین جاہلیت اور اہل عرب کے خدا کے خالق کائنات اور مدبّر امورِ عظام ہونے کے بارے میں عقیدہ کو صحیح طور پر نہ سمجھنا ہے، عوام کے ایک بڑے طبقہ نے شرک کی حقیقت یہ سمجھی کہ کسی ہستی کو (خواہ وہ زندہ ہو یا فوت شدہ) خدا کا بالکل ہمسر اور ہم پایہ بنا لیا جائے، خدا کی تمام صفات اور افعال اس کی طرف منسوب کئے جائیں، اسی کو خالق، رازق، اور مُحیی و مُمیت (زندہ کرنے والا اور مارنے والا) حقیقتاً و اصالتاً سمجھ لیا جائے، باقی اللہ تعالیٰ کی بعض صفات کا اس کے کسی مقبول بندہ کی طرف منسوب کرنا اور بعض افعال کا (جو خدا کے ساتھ مخصوص ہیں) ان سے صدور ماننا، قدرت کے بعض کارخانوں کا ان سے متعلق ہو جانا، اور اللہ کا اپنی مرضی سے اپنے بعض اختیارات ان کے سپرد کر دینا، یہ توحید کے منافی اور شرک کے مرادف نہیں، اسی طرح کسی کی محض تقرّب الی اللہ، اور شفاعت عند اللہ کے لئے ایسی حد سے بڑھی ہوئی تعظیم کرنا اور ان کے ساتھ ایسے اعمال و حرکات سے پیش آنا جو عبادت کے حدود میں داخل ہیں، داخل شرک نہیں کہ یہ محض رضائے خداوندی کے حصول کا ایک ذریعہ اور اس بارگاہ بے چون و بے چگوں تک

پہونچنے کا (جس کے یہاں معمولی بشر کی رسائی نہیں) ایک مفید اور مؤثر طریقہ ہے، کفار عرب کہتے تھے :-

مَا نَعْبُدُهُمْ اِلَّا لِيُقَرِّبُوْنَآ اِلَى اللّٰهِ زُلْفٰى ۭ (الزمر-۳)

(وہ کہتے ہیں کہ) ہم ان کو اس لئے پوجتے ہیں کہ ہم کو خدا کا مقرب بنا دیں۔

یہ وہ مغالطہ اور التباس تھا، جس کی وجہ سے اس امت کے بھی کثیر التعداد افراد شرک کی ارضِ ممنوعہ میں جا پڑے تھے، اور اس سرحدی لکیر کو پار کر گئے تھے، جو توحید و شرک کی حد فاصل (LINE OF DEMARCATION) ہے، اس لئے سب سے پہلی اور اہم ضرورت یہ تھی کہ معلوم کیا جائے کہ اہل جاہلیت اور مشرکین عرب کا عقیدہ اللہ تعالیٰ کے بارے میں کیا تھا، وہ اس کی ذات وصفات کے بارے میں کن کن چیزوں کے قائل تھے، اللہ تعالیٰ کو فاطرِ کائنات، خالقِ ارض وسماوات، اور قادرِ مطلق سمجھنے کے باوجود اللہ کے رسول نے ان کو کیوں مشرک گردانا، اور قرآن نے ان کے مشرک ہونے کا کیوں اعلان کیا؟

شاہ صاحبؒ اپنی بے نظیر کتاب "الفوز الکبیر فی اصول التفسیر" میں لکھتے ہیں:-

"شرک یہ ہے کہ ماسوا اللہ کے لئے ان صفات کو ثابت مانا جائے جو خدا تعالیٰ کے ساتھ مختص ہوں، مثلاً عالم کے اندر تصرفاتِ ارادی جس کو کُنْ فیکون سے تعبیر کرتے ہیں، یا علم ذاتی جس کا اکتساب نہ حواس کے ذریعہ سے ہو نہ عقل کی رہنمائی سے اور نہ خواب اور الہام وغیرہ کے واسطہ سے، یا مریضوں کو شفا دینا یا کسی شخص پر لعنت کرنا اور اس سے ناراض ہونا جس کے باعث اس کو تنگ دستی اور بیماری اور شقاوت گھیر لیں، یا رحمت بھیجنا جس سے اس کو فراخ دستی، تندرستی اور سعادت حاصل ہو۔

مشرکین بھی جواہر (اجسام) اور عظیم الشان امور کے پیدا کرنے میں کسی کو خدا تعالیٰ کا شریک نہیں جانتے تھے، ان کا اعتقاد تھا کہ جب خدا تعالیٰ کسی کام کے کرنے کا ارادہ کرلیتا ہے تو کسی میں اس کے روکنے کی قدرت نہیں ہے، ان کا شرک فقط ایسے امور کی نسبت تھا، جو کہ بعض بندوں کے ساتھ مخصوص تھے، ان لوگوں کا گمان تھا کہ جیسے شاہان عظیم القدر اپنے مقربان خاص کو ملک کے مختلف حصوں کا فرماں روا مقرر کرتے ہیں، اور بعض امور خاصّہ کے فیصل کرنے میں (جب تک کوئی شاہی حکم صریح موجود نہ ہو) ان کو مختار بنا دیتے ہیں، اور اپنی رعایا کی چھوٹی چھوٹی باتوں کا خود انتظام نہیں کرتے، اور اپنی کل رعایا کو حکّام کے سپرد کر دیتے ہیں، اور حکام کی سفارش ان کے ماتحت ملازمین اور متوسلین کے حق میں قبول کی جاتی ہے، ایسے ہی بادشاہ علی الاطلاق جلّ مجدہٗ نے بھی اپنے خاص بندوں کو رتبۂ الوہیت کے خلعت سے سرفراز کیا ہے، اور ایسے لوگوں کی رضامندی و ناراضی دوسرے بندوں کے حق میں مؤثر ہے، اس لئے وہ ان بندگان خاص کے تقرّب کو ضروری خیال کرتے تھے، تاکہ بادشاہ حقیقی کی درگاہ میں مقبولیت کی صلاحیت پیدا ہو جائے، اور جزائے اعمال کے وقت ان کے حق میں شفاعت درجۂ قبولیت حاصل کرے، اور ان خیالی ضرورتوں کو دیکھتے ہوئے وہ لوگ ان کو سجدہ کرنا اور ان کے لئے قربانی کرنا اور ان کے نام کی قسم کھانا، اور ضروری امور میں ان کی قدرت کُن فیکون سے مدد لینا جائز سمجھتے تھے، انھوں نے پتھر، پیتل اور سیسہ وغیرہ کی مورتیں بنا کر ان (بندگان خاص) کی روحوں کی طرف متوجہ ہونے کا ایک وسیلہ قرار دیا تھا،

لیکن رفتہ رفتہ جہلاء نے ان پتھروں ہی کو اپنا اصلی معبود سمجھنا شروع کر دیا اور خلط عظیم واقع ہوا"[1]

نیز "حجۃ اللہ البالغہ" میں لکھتے ہیں :-

"شرک کی حقیقت یہ ہے کہ انسان کسی ایسے شخص کے بارے میں جو قابلِ تعظیم سمجھا جاتا ہے، یہ عقیدہ رکھے کہ اس سے جو غیر معمولی افعال و واقعات ظہور پذیر ہوتے ہیں، وہ اس بناء پر ہیں کہ وہ شخص صفات کمال میں سے کسی ایسی صفت کے ساتھ متّصف ہے، جس کا مشاہدہ نوع انسانی کے افراد میں نہیں ہوا، وہ صفت واجب الوجود جلّ مجدہٗ کے ساتھ مخصوص ہے، اس کے سوا کسی میں نہیں پائی جاتی، اس کی چند ہی شکلیں ہو سکتی ہیں، ایک یہ کہ وہ واجب الوجود اپنے کسی مخلوق کو خلعت الوہیت سے سرفراز کرے، یا وہ مخلوق ذات الہٰی میں فنا ہو کر باقی باللہ بن کر رہ جائے، یا اسی طرح کی کوئی شکل جو اس عقیدہ کے حامل نے اپنی طرف سے گڑھ لی ہو، حدیث میں مشرکین کے جس تلبیہ (حج میں لبّیک لبّیک کہنا) کے الفاظ نقل کئے گئے ہیں وہ اسی عقیدہ کا ایک نمونہ اور اس کی مثال ہے، حدیث میں آتا ہے کہ مشرکین عرب (جاہلیت میں اور اسلام قبول کرنے سے پہلے) ان لفظوں میں لبیک کہتے تھے:

لبّیك لبّیك لاشریك لك،	خدایا! حاضر ہوں، حاضر ہوں!
إلّا شریكاً هو لك، تملکہ	تیرا کوئی شریک نہیں، سوائے اس
وماملك۔	شریک کے جو تیرا بندۂ خاص ہے تو

---

[1] الفوز الکبیر ماخوذ از ترجمہ مولوی رشید احمد صاحب انصاری ص ۷-۸

اس کا بھی مالک ہے اور اس کی مملوکات

کا بھی مالک۔

اسی بناء پر یہ معتقد اس ہستی کے لئے (جس کو وہ خدا کے بعض صفات کا حامل اور

خلعت الوہیت سے سرفراز سمجھتا ہے) اپنے انتہائی تذلل اور فروتنی کا اظہار کرتا

ہے اور اس کے ساتھ وہ معاملہ کرتا ہے، جو بندوں کو خدا کے ساتھ کرنا چاہئے"۔[1]

حجۃ اللہ البالغہ میں ایک دوسری جگہ مشرکین کے شرک کی حقیقت بیان کرتے ہوئے

اور اس بات کی وضاحت فرماتے ہوئے کہ اللہ تبارک و تعالیٰ کے بارے میں ان کے اور

مسلمانوں کے درمیان (جو صحیح عقیدہ کے حامل ہیں) کئی باتوں پر اتفاق تھا، مشرکین عرب

وجود باری اور اس کی یگانہ شان اور قدرت مطلقہ کے منکر نہیں تھے، صرف بعض صفات اور

اختیارات میں وہ (خدا ہی کی مرضی اور منشا سے) اس کے بعض مقربین و محبوبین کو شریک اور

صاحب اختیار سمجھتے تھے اور اس لئے ان کے ساتھ عبودیت اور بندگی کا معاملہ کرتے تھے، باب التوحید

کے عنوان کے ماتحت تحریر فرماتے ہیں:۔

"مشرکین اس بارے میں مسلمانوں ہی کے ہم خیال اور ہم عقیدہ تھے کہ امور عظام

کے سرانجام اور جس چیز کا اللہ تعالیٰ فیصلہ فرمالیں اور اس کا ارادہ قطعی ہو جائے

تو اس میں کسی غیر کا اختیار باقی نہیں رہتا، باقی دوسرے امور میں انھوں نے

مسلمانوں سے الگ راستہ اختیار کیا تھا، ان کا خیال تھا کہ زمانۂ ماضی کے صلحاء

نے عبادت کی کثرت کی اور خدا کا قرب حاصل کیا تو اللہ تعالیٰ نے ان کو الوہیت

کا خلعت عطا فرمایا، اس بناء پر وہ خدا کے دوسرے بندوں کی عبادت کے

---

[1] حجۃ اللہ البالغہ ج ۱ ص ۶۱ باب اقسام الشرک۔

مستحق بن گئے، جیسے شہنشاہ کا کوئی (مزاج داں) غلام بادشاہ کی خدمت کا حق ادا کردے تو شہنشاہ اس کو بادشاہی کا خلعت عطا فرماتا ہے، اور اپنے ملک کے کسی شہر کا انتظام اس کے سپرد کردیتا ہے، تو اس طرح وہ شہر کے باشندوں کی سننے اور بات ماننے کا مستحق ہوجاتا ہے، وہ اس بات کے قائل تھے کہ خدا کی بندگی جب ہی قبول ہوسکتی ہے، جب ایسے مقبول اور برگزیدہ بندوں کی غلامی بھی اس میں شامل ہو، بلکہ واقعہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ انسانوں سے اس قدر بالاو برتر ہے کہ براہ راست اس کی عبادت کچھ کارگر اور اس کی وہاں رسائی نہیں ہے، ضروری ہے کہ ان مقربان بارگاہ الٰہی کی عبادت کی جائے، تاکہ وہ اللہ تک پہونچادیں، وہ کہتے تھے کہ یہ (مقربین) سنتے، دیکھتے اور اپنے بندوں کی سفارش کرتے ہیں، اور ان کے معاملات کا انتظام کرتے اور ان کی مدد کرتے ہیں، انھوں نے ان کے ناموں پر پتھر تراشے، اور ان کو اپنا قبلۂ توجہ بنالیا، بعد میں وہ لوگ آئے جو ان بتوں اور جن کے نام پر یہ بُت تھے، ان کے درمیان فرق کو نہیں سمجھ سکے، اور انھوں نے ان کو بذات خود معبود سمجھ لیا[1]۔"

ایک دوسری جگہ لکھتے ہیں:۔

"مشرکین عرب اس کے قائل تھے کہ اللہ تعالیٰ کا آسمانوں اور زمین کے پیدا کرنے میں کوئی شریک نہیں، اسی طرح ان دونوں کے درمیان جو اجسام و اشیاء ہیں ان کی خلقت میں بھی کوئی اس کا شریک نہیں، نیز اہم امور کے سرانجام میں بھی کسی کی شرکت نہیں، اس کے فیصلہ کو کوئی ٹالنے والا، اور اس کے حکم قطعی کو کوئی

---

[1] حجۃ اللہ البالغہ۔ ج ۱ ص ۵۹ باب التوحید۔

روکنے والا نہیں، اللہ تعالیٰ قرآن مجید میں فرماتا ہے:۔

وَلَئِنْ سَاَلْتَهُمْ مَّنْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ لَيَقُوْلُنَّ اللّٰهُ ۔ (لقمٰن ۔ ۲۵)
اگر تم ان مشرکین سے پوچھو کہ آسمان و زمین کس نے پیدا کیا تو وہ یقیناً کہیں گے کہ اللہ نے۔

قرآن خود شہادت دیتا ہے کہ یہ مشرکین خدا کو مانتے تھے، اور اس سے دعا بھی کرتے تھے۔

بَلْ اِيَّاهُ تَدْعُوْنَ ۔ (الانعام ۔ ۴۱) بلکہ اسی سے مانگتے ہو۔

نیز فرماتا ہے:۔

ضَلَّ مَنْ تَدْعُوْنَ اِلَّا اِيَّاهُ ۔ (الاسراء ۔ ۶۷)
اسی سے دعا کرنا کام بناتا ہے، دوسروں سے دعا بیکار جاتی ہے۔

حقیقت میں ان مشرکین کی گمراہی اور بے دینی یہ تھی کہ ان کا اعتقاد تھا کہ کچھ فرشتے اور ارواح ہیں جو (بڑے امور کو چھوڑ کر) اپنے پرستار کے ان جزئی و ضمنی معاملات کو سنبھال لیتے ہیں، اور ان کا کام کر دیتے ہیں، جن کا تعلق اس کی ذات، اولاد، اموال و املاک سے ہے، ان کے نزدیک ان کا خدا کے ساتھ ایسا ہی تعلق ہے جیسے کسی ناز پروردہ غلام کا شہنشاہ سے، اور سفارشیوں اور مصاحبوں کا باجبروت بادشاہ سے ہوتا ہے، شرائع الٰہی میں جو کہیں اس بات کا تذکرہ آیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے بعض کام بعض فرشتوں کے سپرد کر دیئے ہیں، یا یہ کہ مقربین کی دعائیں قبول ہوتی ہیں، ان جاہلوں نے اسی کو بنیاد بنا کر ان کو ایسا صاحب اختیار او صاحب تصرّف مان لیا، جیسے خود بادشاہ بنفس نفیس ہوتے ہیں، حالانکہ یہ قیاس الغائب علی الشاہد تھا، اور اسی سے ساری خرابی

پیدا ہوئی"[1]

اسی طرح شاہ صاحبؒ نے عوام اور خواص مشابہ بعوام کے بہت سے مشرکانہ عقائد واعمال کی جڑ پکڑلی اور اس مغالطہ کا پردہ چاک کیا، جس کی وجہ سے بہت سے جہلاء اور مدّعیان علم ان اعمال و رسوم، شعائر شرک، نذر و ذبح لغیر اللہ، بزرگوں کے نام پر روزے رکھنے، اولیاء و صالحین سے دعا و التجا، خوف و رجا، استمداد و استعانت، ان کے مقامات دفن، اور ان سے نسبت رکھنے والی چیزوں کی حرم شریف اور بیت اللہ کی طرح تعظیم کرنے اور ان کے لئے انھیں آداب کو مرعی رکھنے، ان کے جزئی تصرّف فی الکائنات، انسان کی شقاوت و سعادت، مرض و صحت، فراخی رزق و تنگی میں مؤثر ہونے کے عقیدۂ مشرکانہ میں گرفتار اور "فَاعْبُدِ اللّٰهَ مُخْلِصًا لَّهُ الدِّيْنَ"[2] پر عمل کرنے، اور انابت واخبات، توکّل علی اللہ اور انقطاع الی اللہ کی جیسی بیش بہا دولت سے محروم تھے، اور جن کے بعض احوال سن کر اور اعمال دیکھ کر بے اختیار قرآن مجید کی آیت یاد آتی تھی:۔

وَمَا يُؤْمِنُ أَكْثَرُهُمْ بِاللّٰهِ	اور یہ اکثر خدا پر ایمان نہیں رکھتے مگر
إِلَّا وَهُمْ مُشْرِكُوْنَ ○ (یوسف۔۱۰۶)	(اس کے ساتھ) شرک کرتے ہیں۔

شاہ صاحبؒ اور ان کے اخلاف کا اگر اس عقیدۂ توحید کی تجدید، اس کی تنقیح و توضیح اس کی اشاعت و ترویج اور اس کے سلسلہ کی غلط فہمیوں کے رفع کرنے کے سوا کوئی کارنامہ نہ ہوتا، تو تنہا یہی کارنامہ ان کو مجدّدین امت میں شمار کرنے کے لئے کافی تھا، چہ جائیکہ ان کے اور متعدد کارنامے ہیں، جن کی آئندہ صفحات میں وضاحت کی جائیگی۔

---

[1] حجۃ اللہ البالغہ باب ماکان علیہ حال أھل الجاھلیۃ فاصلحہ اللہ ج ۱ ص ۱۲۵

[2] الزمر۔۲

عقائد کی تفہیم وتشریح کتاب وسنت کی روشنی میں اور صحابہؓ وسلف کے مسلک کے مطابق

شاہ صاحبؒ کے اس بنیادی تجدیدی کارنامہ کے ماسوا جس کا تعلق عامۃ المسلمین اور پورے مسلم معاشرہ سے تھا، اور جس کے بغیر ہدایت ونجات مشتبہ اور نصرت وتائید الٰہی محال تھی، ایک ضمنی، علمی واصلاحی کارنامہ یہ تھا کہ آپ نے عقائد کی تشریح وتفہیم کا کام کتاب وسنت کی روشنی میں انجام دیا اور اس بارے میں صحابہؓ اور سلف کے مسلک وذوق کے مطابق عمل کرنے کی دعوت دی، اور خود اس کا آغاز کرکے اس کا علمی نمونہ پیش کیا، عالم اسلام کے علمی حلقوں کو عرصہ سے ایسے نابغۂ روزگار مفکرین اور پابند نصوص مجتہدین کی ضرورت تھی، جو فلسفہ اور فلسفیوں کے آراء ونظریات سے (جن کا خود علم کلام پر پورا اثر پڑ چکا تھا) آنکھیں ملا کر بات کریں، قرآن پر اس طرح ان کا ایمان ہو، جس طرح وہ نازل ہوا، خدا تعالیٰ کے صفات وافعال کو وہ بغیر کسی تحریف وتاویل کے ویسا ہی مانتے ہوں جیسا وہ خود ان کے بارے میں فرماتا ہے، اور ان حقائق کی ایسی تفسیر کرتے ہوں جن کا ایک طرف علم ودلائل شرعی مؤید ہوں، دوسری طرف عقل ومنطق بھی ان کو تسلیم کرتے ہوں، یہ دانش کدۂ قرآنی، اور دبستان علوم نبویؐ سے فیض پانے والے علمائے حق ہی ہو سکتے تھے، جو علوم حکمت اور متکلمانہ موشگافیوں سے پوری طرح واقف ہونے کے ساتھ عقائد میں کتاب اللہ اور سنتِ متواترہ کے پابند تھے، اور خدا تعالیٰ پر انھیں صفات کے ساتھ ایمان وعقیدہ رکھتے تھے، جو اس نے اپنی کتاب میں بیان فرمائی ہیں، ایک حدیث میں علمائے حق کی جو تعریف آئی ہے، وہ ان پر پورے طور پر صادق تھی۔

ینفون عن ھذا الدین تحریف　　　وہ غالی لوگوں کی تحریف، باطل پرستوں

الغالین، وانتحال المبطلین — کے غلط انتساب، اور جاہلوں کی تاویلات
وتاویل الجاھلین[1] — سے دین کی حفاظت کرتے ہیں۔

ان علمائے اسلام سے کوئی دور خالی نہیں رہا، ان نمایاں شخصیتوں میں آٹھویں صدی ہجری کے عالم جلیل شیخ الاسلام حافظ ابن تیمیہؒ حرّانی (م ۷۲۸ھ) ان کے بعد ان کے تلمیذ رشید علامہ ابن قیم جوزیہ صاحب "زاد المعاد" (م ۷۵۱ھ) اور اس مسلک پر چلنے والے بعض دوسرے جلیل القدر علماء ہیں، جن کی فہرست زیادہ طویل نہیں۔

امام ابن تیمیہؒ کے بعد اگر اس سلسلہ میں کسی کا نام پورے اعتماد کے ساتھ لیا جا سکتا ہے، اور اس کا کام اہل علم کے سامنے ہے تو وہ حضرت شاہ ولی اللہؒ ہیں، وہ عقائد کی تشریح و تفہیم اور اس کو سلف کے فہم و مسلک کے مطابق پیش کرنے کی پوری صلاحیت رکھتے تھے، اس لئے کہ انھوں نے ایک طرف یونانی فلسفہ کا گہرا اور وسیع مطالعہ کیا تھا، اور علم کلام کا پورا سرمایہ ان کی نظر کے سامنے بلکہ ان کی دسترس میں تھا، دوسری طرف وہ قرآن کے دقیق النظر مفسر، علم حدیث کے ماہر خصوصی اور اسرار و مقاصد شریعت کے راز داں تھے، اس لئے وہ "لفظیت" اور "تاویل" کے درمیان راہ اعتدال پر قائم ہیں، ان کی کتاب "العقیدۃ الحسنۃ"[2] مطالعہ کی گہرائی

---

[1] بروایت بیہقی، حدیث کے الفاظ یوں ہیں: "یحمل ھذا العلم من کل خلف عدولہ ینفون عنہ تحریف الغالین الخ"۔ [2] یہ کتاب "العقیدۃ الحسنۃ" کے نام سے فارسی میں مطبع مفید عام آگرہ سے طبع ہوئی، دار العلوم ندوۃ العلماء کے فاضل استاذ تفسیر مولانا محمد اویس ندوی نگرامی مرحوم نے اس کو اپنی شرح اور مفید حواشی کے ساتھ (جو خود شاہ صاحبؒ کی دوسری تصنیفات سے ماخوذ ہیں) اس کو "العقیدۃ السنیۃ" کے نام سے مرتب کیا، اور راقم سطور کے مقدمہ کے ساتھ مطبع دار العلوم ندوۃ العلماء سے ۱۳۸۲ھ/۱۹۶۲ء میں شائع ہوئی، مصنف کی کتاب "العقیدۃ والعبادۃ والسلوک" اور اس کے (باقی ص ۱۶۵ پر)

اورعبارت کی سلاست وروانی دونوں کی جامع ہے، یہ کتاب علم توحید (جس کو عام طور پر علم کلام سے موسوم کیا جاتا ہے) کا ایک ایسا متن ہے، جس میں اہل سنت کے عقائد کا وہ لُبِّ لباب آگیا ہے، جس سے ہر اس تعلیم یافتہ مسلمان کو واقف ہونا چاہیئے، جو اپنے تئیں اہل سنت میں شمار کرتا ہو، اور ان کے عقائد کو اپنا شعار بنانا چاہتا ہو۔

شاہ صاحبؒ اپنے رسالہ "وصایا" میں (جو فارسی زبان میں ہے) لکھتے ہیں :-

اول وصیت ایں فقیر چنگ زدن است بکتاب و سنت دراعتقاد وعمل، پیوستہ بتدبیر ہر دو مشغول شدن ...... و در عقائد مذہب قدماء اہل سنت اختیار کردن وآں را تفصیل و تفتیش انچہ سلف تفتیش نکردند اعراض نمودن وبہ تشکیکات خام معقولیان التفات نکردن۔[1]	اس فقیر کی پہلی وصیت یہ ہے کہ اعتقاد وعمل میں کتاب وسنت کو مضبوط ہاتھوں سے تھاما جائے اور ہمیشہ ان پر عمل کیا جائے، عقائد میں متقدمین اہل سنت کے مذہب کو اختیار کیا جائے اور (صفات وآیات متشابہات) کے سلسلہ میں سلف نے جہاں تفصیل و تفتیش سے کام نہیں لیا، ان سے اعراض کیا جائے، اور معقولیان خام

(باقی ص ۱۶۴ کا) ترجمۂ "دستورحیات" میں اس کا خلاصہ آگیا ہے۔ "تفہیمات" میں "العقیدۃ الحسنۃ" کا مضمون پورا آگیا ہے، غالباً اسی سے لے کر اس کو علیحدہ رسالہ کی شکل میں شائع کیا گیا (ملاحظہ ہو "التفہیمات الإلٰهیة" ج ا ص ۱۴۴-۱۴۸) [1] شاہ صاحبؒ نے اس رسالہ کا نام جو فارسی میں ہے "المرأة الوضیة فی النصیحة والوصیة" رکھا تھا، یہ شاہ صاحبؒ کے بعض دوسرے رسائل کے مجموعہ میں بھی شامل ہے۔

کی تشکیکات کی طرف التفات

نہ کیا جائے۔

شاہ صاحب کے اسماء وصفات کے بارے میں ذوق ومسلک کا کسی قدر اندازہ

اس اقتباس سے ہوگا جو یہاں پیش کیا جاتا ہے:۔

"خدا اس سے بالا اور برتر ہے کہ وہ عقل یا حواس سے دریافت ہوسکے، یا اس میں صفتیں اس طرح موجود ہوں کہ جس طرح عوارض جوہر میں ہوکر پائے جاتے ہیں، یا وہ اس طرح ہوں جن کو عام عقلیں ادراک کرسکیں یا متعارف الفاظ ان کو ادا کرسکیں، یا اینہمہ یہ بھی ضروری ہے کہ لوگوں کو بتا بھی دیئے جائیں، تاکہ جہاں تک انسانیت کی تکمیل ہوسکتی ہے ہوجائے، ایسی حالت میں اس سے چارہ نہیں کہ ان صفتوں کا استعمال ان معنوں میں کیا جائے کہ ان کے نتائج اور لوازم سمجھ لئے جائیں مثلاً ہم خدا کے لئے "رحمت" ثابت کرتے ہیں، اس سے مقصود احسانات کا فیضان ہے، دل کی خاص کیفیت نہیں (جس کو اصل میں رحمت کہتے ہیں) اسی طریقہ سے خدا کی وسعتِ قدرت کے اظہار کے لئے مجبوراً ہم کو وہ الفاظ استعارةً استعمال کرنے پڑیں گے جو انسانوں کی قدرت وقوت کے لئے بولے جاتے ہیں، کیونکہ ان معانی کے ادا کرنے کے لئے ہمارے پاس اس سے بہتر الفاظ نہیں اور اسی طرح تشبیہاً بہت سے الفاظ بولے جائیں گے لیکن اس شرط کے ساتھ کہ ان سے حقیقی معنی مراد نہ ہوں، بلکہ وہ معانی جو خدا کی ذات کے لائق اور مناسب ہیں...... تمام آسمانی مذاہب کا اس پر اتفاق ہے کہ صفات اسی طریقہ پر

بولے گئے ہیں، اور اس پر کہ یہ الفاظ اسی طرح بولے جائیں، اور اس کے علاوہ کوئی اور بحث و کاوش نہ کی جائے، اور یہی مذہب اس زمانہ کا تھا جس کے خیر و برکت کی شہادت دی گئی ہے (یعنی تبع تابعین کے عہد تک) اس کے بعد کچھ ایسے لوگ مسلمانوں میں پیدا ہو گئے، جنھوں نے بغیر کسی نصِ قطعی اور دلیلِ مستحکم کے ان مسائل میں فکر و کاوش شروع کر دی[1]۔"

صدیوں سے عالمِ اسلام میں بالخصوص ان ملکوں میں جو علمی، عقلی اور درسی طور پر ایران کے زیرِ اثر تھے، جن متکلمانہ موشگافیوں، صفات کی دور از کار تاویلات جن سے نتیجۃً وہ معطّل اور بے معنی بن کر رہ جاتی ہیں، اور فلسفۂ یونان سے ذہنی غلامی کی حد تک مرعوبیت کا دور دورہ تھا، اور سلف کے متعلق ان کا خیال استخفاف تک پہونچا ہوا تھا، جو بہت احتیاط و انصاف سے کام لیتے تھے وہ کہتے تھے "مذهب السلف أسلم ومذهب الخلف اعلم" (سلف کے مسلک میں احتیاط اور خلف کی تحقیقات میں علم کی شان ہے) اس پس منظر میں شاہ صاحبؒ کی یہ خدمت و جرأت ایک مجتہدانہ اور مجدّدانہ کارنامہ ہے۔

اسماء و صفات کے بارے میں سلف کے مسلک کی تائید، فلاسفہ متکلمین سے (جنھوں نے دور از کار تاویلات سے کام لیا اور ان کے اقوال صفات کے بارے میں وہ تعطیل و نفیٔ صفات کے حدود کو چھوتے ہوئے بعض اوقات نظر آتے ہیں) عدمِ مناسبت اور حدیث و سنت کی محبت و تعظیم نے ان کو شیخ الاسلام ابن تیمیہؒ کی طرف سے دفاع اور ان کی جلالتِ شان کے اعتراف پر آمادہ کیا، جن کی ذات ان آخری صدیوں میں بڑی متنازع فیہ بلکہ

---

[1] حجۃ اللہ البالغہ۔ جلد اول ص ۶۳ باب الایمان بصفات اللہ۔ ترجمہ منقول از رسالہ اہل السنۃ والجماعۃ از مولانا سید سلیمان ندوی ص ۴۴-۴۵

مطاعن اور شبہات کا ہدف بن گئی تھی، شاہ صاحبؒ نے بڑے بلند الفاظ میں ان کی تعریف فرمائی، اور ان کی طرف سے دفاع کیا، وہ "تفہیمات الٰہیہ" میں فرماتے ہیں :۔

ولیس شئ منہا الّا ومعہ دلیلہ	شیخ الاسلام کے اقوال میں کوئی چیز
من الکتاب والسنۃ وآثار السلف	ایسی نہیں ہے جس کے لئے ان کے پاس
فمثل ھذا الشیخ عزیز الوجود	کتاب و سنت اور آثار سلف میں سے
فی العالم، ومن یطیق أن	کوئی دلیل نہ ہو، ایسا عالم دنیا میں
یلحق شأوہ فی تحریرہ وتقریرہ	عزیز الوجود ہے، کون ایسا شخص ہے،
والذین ضیّقوا علیہ ما بلغوا	جو تحریر و تقریر میں ان کے مرتبہ کو
معشار ما آتاہ اللہ تعالیٰ۔[1]	پہونچنے کی قابلیت رکھتا ہو، جن
	لوگوں نے ان پر اعتراضات کی بوچھار
	کی ہے ان کو ان کے کمالات کا
	دسواں حصہ بھی نصیب نہیں۔

---

[1] جلاء العینین ص۴۶ بحوالہ تفہیمات الٰہیہ۔

بابِ ششم

حدیث وسنت کی اشاعت وترویج، اور فقہ وحدیث میں تطبیق کی دعوت وسعی

حدیث کی اہمیت اور ہر ملک و ہر دور میں اس کی ضرورت

ہندوستان کے تحتی براعظم، بلکہ حقیقتاً دورِ اخیر میں (جو بارہویں صدی ہجری کے وسط سے شروع ہو کر اس وقت تک قائم ہے) شاہ صاحبؒ نے حدیث کی ترویج واشاعت درس حدیث کے احیاء، فن حدیث کے ساتھ اعتناء، اور اس موضوع پر اپنی محققانہ ومبصّرانہ تصنیفات کے ذریعہ ایسا عظیم تجدیدی کارنامہ انجام دیا جو ان کے صحیفۂ تجدید اور کتابِ زندگی کا ایک اہم اور روشن باب ہے، اور جو ان کے دوسرے علمی کمالات اور دینی خدمات پر ایسا غالب آیا کہ "محدّث دہلویؒ" ان کے نام کا جزء اور ان کے تعارف کا عنوان بن گیا، اور زبان وقلم پر "حضرت شاہ ولی اللہ محدّث دہلویؒ" جاری اور ساری ہو گیا۔

لیکن اس کارنامہ کی تاریخ اور تفصیل بیان کرنے سے پہلے اس کارنامہ کی عظمت سمجھنے کے لئے، اس کی ضرورت ہے کہ پہلے یہ معلوم کیا جائے کہ حدیث، دین شریعت کے نظام، اسلام کو اپنی صحیح شکل میں باقی رکھنے کی کوششوں، اور اسلامی مزاج وماحول کی

تشکیل و حفاظت میں کیا حیثیت رکھتی ہے؟ اس کی اشاعت و حفاظت ہر دور اور ہر ملک میں (جہاں مسلمان آباد ہوں) کیوں ضروری ہے، اور اس سے تغافل، جہل یا انکار کن خطرات کا حامل اور کیسے عظیم نقصانات کو اپنے جلو میں لئے ہوئے ہے، اس علم کا کسی عہد یا ملک سے ختم یا فراموش ہو جانا کون سا خلاء پیدا کرتا ہے، جو کسی اور چیز سے پُر نہیں ہو سکتا، اس کی وضاحت کے لئے مصنف اپنے ہی ایک رسالہ کا ایک اقتباس پیش کرے گا، جس میں اس حقیقت کو پورے طور پر واضح اور ثابت کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔[1]

حدیث امت کے لئے صحیح میزان و معیار

"حدیث نبوی ایک ایسی صحیح میزان ہے، جس میں ہر دور کے مصلحین و مجددین اس امت کے اعمال و عقائد، رجحانات و خیالات کو تول سکتے ہیں، اور امت کے طویل تاریخی و عالمی سفر میں پیش آنے والے تغیرات و انحرافات سے واقف ہو سکتے ہیں، اخلاق و اعمال میں کامل اعتدال و توازن اس وقت تک پیدا نہیں ہو سکتا جب تک قرآن و حدیث کو بیک وقت سامنے نہ رکھا جائے، اگر

---

[1] یہ رسالہ جس کا نام عربی میں "دور الحدیث فی تکوین المناخ الاسلامی وصیانتہ" ہے، اور اردو میں اس کا ترجمہ "اسلامی مزاج و ماحول کی تشکیل و حفاظت میں حدیث کا بنیادی کردار" کے نام سے شائع ہوا ہے، حقیقتاً وہ مضمون ہے جس سے مصنف نے سنہ ۱۴۰۱ھ کے رابطہ عالم اسلامی کے دورِ محاضرات کا مکہ معظمہ میں افتتاح کیا، اور وہ مضمون ۱۶ ذی قعدہ سنہ ۱۴۰۱ھ (۱۳ ستمبر سنہ ۱۹۸۱ء) کو مکہ معظمہ میں اہل علم کے ایک مجمع کے سامنے پڑھا گیا انگریزی میں بھی یہ رسالہ ROLE OF HADITH IN THE PROMOTION OF ISLAMIC — CLIMATE & ATTITUDES کے نام سے "مجلس تحقیقات و نشریات اسلام" کی طرف سے شائع ہو گیا ہے۔

حدیث نبویؐ کا وہ ذخیرہ نہ ہوتا جو معتدل، کامل و متوازن زندگی کی صحیح نمائندگی کرتا ہے، اور وہ حکیمانہ نبویؐ تعلیمات نہ ہوتیں، اور یہ احکام نہ ہوتے جن کی پابندی رسول اللہ صلے اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے اسلامی معاشرہ سے کرائی، تو یہ امت افراط و تفریط کا شکار ہو کر رہ جاتی، اور اس کا توازن برقرار نہ رہتا، اور وہ عملی مثال نہ موجود رہتی جس کی اقتداء کرنے کی خدا تعالےٰ نے اپنے اس فرمان میں ترغیب دی ہے۔

لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِي رَسُوْلِ اللّٰهِ أُسْوَةٌ حَسَنَةٌ (الاحزاب - ۲۱)

یقیناً تمہارے لئے رسول اللہ صلے اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی ذات اسوۂ حسنہ ہے۔

اور یہ فرما کر آپ کے اتباع کی دعوت دی ہے:۔

قُلْ إِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِيْ يُحْبِبْكُمُ اللّٰهُ وَيَغْفِرْ لَكُمْ ذُنُوْبَكُمْ ۝ (آل عمران - ۳۱)

آپ کہہ دیجئے کہ اگر تمہیں اللہ سے محبت ہے تو میری اتباع کرو، اللہ تم سے محبت کرے گا، اور تمہارے گناہ معاف کردے گا۔

یہ ایک ایسا عملی نمونہ ہے جس کی انسانوں کو ضرورت ہے، اور جس سے وہ زندگی اور قوت و اعتماد حاصل کرسکتا ہے، اور یہ اطمینان کرسکتا ہے کہ دینی احکام کا زندگی پر نفاذ نہ صرف آسان، بلکہ ایک امر واقعہ ہے۔

حدیث نبویؐ زندگی، قوت، اور اثر انگیزی سے بھرپور ہے، اور ہمیشہ اصلاح و تجدید کے کام، فساد اور خرابیوں اور بدعتوں کے خلاف صف آرا، اور برسرِجنگ ہونے اور معاشرہ کا احتساب کرنے پر ابھارتی رہی ہے، اور اس کے اثر سے ہر دور اور ہر ملک میں

ایسے افراد پیدا ہوتے رہے، جنھوں نے اصلاح وتجدید کا جھنڈا بلند کیا، کفن بردوش ہو کر میدان میں آئے اور بدعتوں وخرافات اور جاہلی عادتوں سے کھلی جنگ کی، اور دین خالص اور صحیح اسلام کی دعوت دی، اسی لئے حدیث نبویؐ امت اسلامیہ کے لئے ایک ناگزیر حقیقت اور اس کے وجود کے لئے ایک لازمی شرط ہے، اس کی حفاظت، ترتیب وتدوین، حفظ اور نشر واشاعت کے بغیر امت کا یہ دینی وذہنی، عملی واخلاقی دوام وتسلسل برقرار نہیں رہ سکتا تھا۔

تاریخ اسلام میں اصلاح وتجدید کی تحریکیں علم حدیث سے وابستہ ہیں

سنت نبویؐ اور حدیث نبویؐ کے مجموعے ہمیشہ اصلاح وتجدید، اور امت اسلامیہ میں صحیح اسلامی فکر کا سرچشمہ رہے ہیں، انھیں سے اصلاح کا بیڑا اٹھانے والوں نے تاریخ کے مختلف دوروں میں صحیح علم دین اور خالص فکر اسلامی اخذ کیا، انھیں احادیث سے انھوں نے استدلال کیا اور دین واصلاح کی دعوت میں وہی ان کی سند اور ان کا ہتھیار اور سپر تھی، بدعتوں، فتنوں اور شر وفساد سے جنگ ومقابلہ کے معاملہ میں وہی قوتِ محرکہ ودافعہ تھی، آج جو بھی مسلمانوں کو دین خالص اور اسلامِ کامل کی طرف آنے کی پھر دعوت دینا چاہتا ہے، اور ان کے اور نبوی زندگی اور کامل اسوہ کے درمیان تعلق استوار کرنے کا ارادہ رکھتا ہے، اور جس کو بھی ضرورت اور زمانہ کے تغیرات نئے احکام کے استنباط کرنے پر مجبور کرتے ہیں، وہ اس سرچشمہ سے بے نیاز نہیں ہو سکتا۔

اس حقیقت پر اسلام اور مسلمانوں کی تاریخ شاہد ہے کہ جب بھی حدیث وسنت کی

کتابوں سے مسلمانوں کے تعلق اور واقفیت میں کمی آئی، اور طویل مدت تک یہ کمی باقی رہی تو داعیوں اور اخلاق کی تربیت، نفوس کا تزکیہ کرنے والے روحانی مربیوں کی کثرت، دنیا میں زہد اختیار کرنے اور کسی حد تک سنت پر عمل کرنے کے باوجود۔ اس مسلم معاشرہ میں جو علوم اسلامیہ کے ماہرین، اور فلسفہ و حکمت کے اساتذۂ فن اور ادباء و شعراء سے مالامال تھا، اور اسلام کے قوت و غلبہ اور مسلمانوں کی حکمرانی میں زندگی گذار رہا تھا، نت نئی بدعتوں، عجمی رسم و رواج، اور اجنبی ماحول کے اثرات نے اپنا تسلّط قائم کر لیا، یہاں تک کہ اندیشہ ہونے لگا کہ وہ جاہلی معاشرہ کا دوسرا ایڈیشن اور اس کا مکمل عکس بن جائیگا، اور رسول اللہ صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کی پیشین گوئی اور حدیث حرف بحرف صحیح ثابت ہوئی۔

لتتبعُنّ سنن من کان قبلکم شبرًا بشبرٍ و ذراعًا بذراعٍ۔ (مستدرک حاکم)	تم پچھلی امتوں کے راستوں پر قدم بقدم چلوگے۔

اس وقت اصلاح کی آواز خاموش، اور علم کا چراغ ٹمٹمانے لگا۔

دسویں صدی ہجری میں ہندوستان کے دینی حالات، اور مسلمانوں کی زندگی کا جائزہ لیجئے جبکہ برصغیر ہند کے علمی و دینی حلقوں کا حدیث شریف اور سنت کے صحیح مآخذ و مراجع سے تعلق تقریبًا منقطع ہو گیا تھا، علم دین کے مراکز، اور حجاز و یمن، مصر و شام کے ان مدارس سے جہاں حدیث شریف کا درس ہوتا تھا، کوئی رابطہ نہ تھا، اور کتب فقہ، اصول اور ان کی شروح اور فقہی باریکیوں اور موشگافیوں اور حکمت و فلسفہ کی کتابوں کا عام چلن تھا، بآسانی دیکھا جا سکتا ہے کہ کس طرح بدعتوں کا دور دورہ تھا، منکرات عام ہو گئے تھے، اور عبادتوں اور تقرب الی اللہ

کی کتنی نئی شکلیں اور نئے طریقے ایجاد کرلئے گئے تھے۔

راقم الحروف نے "تاریخ دعوت وعزیمت" کے حصہ چہارم میں دسویں صدی ہجری کے ایک مشہور ومقبول شیخ طریقت شیخ محمد غوث گوالیاریؒ کی کتاب "جواہر خمسہ" کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھا ہے:۔

"گجرات کو مستثنیٰ کرکے جہاں علمائے عرب کی تشریف آوری، اور حرمین شریفین کی آمد ورفت کی وجہ سے حدیث کی اشاعت ہوچکی تھی، اور علامہ علی متقی برہان پوری اوران کے نامور شاگرد علامہ محمد طاہر پٹنی پیدا ہوئے تھے (دسویں صدی ہجری میں ہندوستان صحاح ستہ، اوران مصنفین کی کتابوں سے ناآشنا تھا، جنھوں نے نقد حدیث اور ردّ بدعت کا کام کیا، اور سنت صحیحہ اور احادیث ثابتہ کی روشنی میں زندگی کا نظام العمل پیش کیا، ہندوستان کے ان مقامی روحانی فلسفوں وَ تجربوں کا اثر اپنے زمانہ کے مشہور ومقبول شطاری بزرگ شیخ محمد غوث گوالیاریؒ کی مقبول کتاب "جواہر خمسہ" میں دیکھا جاسکتا ہے جس کی بنیاد زیادہ تر بزرگوں کے اقوال اور اپنے تجربات پر ہے، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ صحیح احادیث کے ثابت ہونے یا معتبر کتب شمائل وسیر سے اخذ کرنے کو ضروری نہیں سمجھا گیا، اس میں نماز احزاب، صلوٰۃ العاشقین، نماز تنویر القبر، اور مختلف مہینوں کی مخصوص نمازیں اور دعائیں ہیں، جن کا حدیث وسنت سے کوئی ثبوت نہیں ہے[1]۔"

یہ صرف "جواہر خمسہ" کی خصوصیت نہیں، بزرگوں کے ملفوظات کے غیر مستند مجموعوں میں اس کی متعدد مثالیں مل سکتی ہیں، مشائخ کے لئے سجدۂ تعظیمی کا

---

[1] تاریخ دعوت وعزیمت حصہ چہارم ص ۲۴۴

عام رواج تھا، قبروں کو کھلے طریقہ پر سجدہ گاہ بنا لیا گیا تھا، ان پر چراغ جلائے جاتے تھے، چادریں چڑھائی جاتی تھیں، ان کے گرد وپیش کا ادب حرمِ مکی کی طرح کیا جاتا تھا، عرس و فاتحہ کے نام سے طرح طرح کے جشن منائے جاتے تھے، جن میں بہت بڑی تعداد عورتوں کی ہوتی تھی، صلوٰۃ غوثیہ، صلوٰۃ معکوس، نذر لغیر اللہ اولیائے و صلحاء کے نام پر اور ان کی رضامندی کی نیت سے ذبح و قربانی، غیر اللہ کے نام پر روزہ، اور ایسی کتنی بدعات (جن کے حدود شرک سے مل جاتے تھے) مقبول عام و خاص تھیں، اولیاء و صالحین کے ایام پیدائش و وفات پر جلسے کئے جاتے تھے، اور میلے لگتے تھے۔

اگر علمائے اسلام کی دسترس میں کتب حدیث نہ ہوتیں، اور سنتوں و بدعتوں میں تفریق و امتیاز کا یہ معتبر و سہل ذریعہ نہ ہوتا تو شیخ الاسلام ابن تیمیہؒ (م ۷۲۸ھ) کے عہد سے حکیم الاسلام شاہ ولی صاحب (م ۱۱۷۶ھ) کے عہد تک مصلحینِ امت اور دین خالص کے مبلّغین کا یہ سلسلہ وجود میں نہ آتا، اور مصلحین روزگار اور تصحیح عقائد و اصلاح رسوم کے علمبردار نظر نہ آتے۔

دسویں اور گیارہویں صدی ہجری میں افغانستان (کابل و ہرات و غزنی) کے علماء کے حالات پڑھیئے، اور ان کی تصنیفات دیکھیئے، حمایت سنت، اور ردّ بدعت، علمی تحقیق اور مسائل کی تنقیح کا رنگ بہت کم نظر آئیگا، دفعتہً علامہ ملّا علی قاری (علی بن سلطان محمد ہروی م ۱۰۱۴ھ) کی شخصیت سامنے آتی ہے، جنھوں نے حجاز جا کر وہاں کے محدثین عظام اور اساتذہ کبار سے کتب حدیث کا درس لیا، اور اس میں کمال پیدا کیا، کتب حدیث و فقہ کی شرح، مسائل کی

ترجیح، اور اپنے زمانہ کی بعض بدعات کی بلا رُورعایت تردید میں ان کا یہ مصلحانہ و محققانہ رنگ صاف جھلکتا ہے، ان کو ان کے مطالعہ و تحقیق، اور حق گوئی اور انصاف پسندی نے اس مقام تک پہونچا دیا کہ انھوں نے شیخ الاسلام ابن تیمیہؒ کی حمایت کی، اور اس کی شہادت دی کہ وہ اکابر اہل سنت وجماعت اور اولیائے امت میں سے تھے[۱] یہی حال متعدد عرب ممالک عراق، شام، مصر، تونس، الجزائر، مراکش وغیرہ کا ہے[۲]۔

علم حدیث اور عرب

فلسفۂ تاریخ اسلام کا یہ نکتہ ہے کہ جن ملکوں میں اسلام عربوں کے ذریعہ سے پہونچا، وہاں حدیث کا علم بھی اسلام کے ساتھ پھیلا اور پھلا پھولا کہ اس کو عربوں کے مزاج، ان کی قوت حفظ، ان کی عملیت، حقیقت پسندی، اور ذات نبویؐ سے گہری وابستگی سے خاص مناسبت تھی، وہ جہاں گئے اپنے ساتھ علم حدیث بھی لیتے گئے، اور ان کی قیادت کے دور اور اثر ونفوذ کے حلقہ میں اس کے ساتھ پورا اعتنا کیا گیا، اور اس کے درس اور اس کے مختلف پہلوؤں پر تصنیف و تالیف کا سلسلہ پوری سرگرمی سے جاری رہا، یمن، حضرموت، مصر وشام، عراق شمالی افریقہ اور اندلس (اسپین) جیسے ملکوں کا یہی حال ہے، خود ہندوستان میں صوبۂ گجرات اس کی ایک مثال ہے، جس نے شیخ علی متقی برہان پوری (صاحب کنز العمال) (م ۹۷۵ھ) اور شیخ محمد طاہر پٹنی (صاحب مجمع بحار الانوار) (م ۹۸۶ھ) جیسے بلند پایہ محدث پیدا کئے، اس کی وجہ وہی ہے، جو ہم نے اوپر بیان کی کہ گجرات کا تعلق حجاز مقدس سے دوسرے صوبوں کے

---

[۱] مرقاۃ شرح مشکوٰۃ ج ۴ ص ۲۷ [۲] رسالہ حدیث کا بنیادی کردار ص ۳۸-۳۵

مقابلہ میں زیادہ رہا، اور وہاں علمائے عرب کی آمد ورفت کا سلسلہ برابر جاری رہا۔

لیکن جن ملکوں میں اہل عجم کے ذریعہ اسلام پہونچا وہاں کا یہ حال نہیں، ہندوستان میں ترکی النسل یا افغانی النسل خاندانوں نے حکومتیں قائم کیں، اور ان مشائخ اور داعیانِ اسلام کے ذریعہ اسلام کی تبلیغ اور اشاعت ہوئی جن میں بیشتر عجمی نژاد اور ایران و ترکستان کے باشندے تھے، پھر جب ہندوستان میں درس و تدریس، مدارس کے قیام اور نصاب کی ترتیب کا زمانہ آیا، تو اس پر عجمی فضلاء اور "دانشمندان ایران" کا پورا اثر پڑ چکا تھا، باب اول میں بتایا جا چکا ہے کہ ایران میں صفوی حکومت کے قیام اور شیعیت کے سرکاری مذہب ہو جانے کے بعد سے (جو دسویں صدی ہجری کے ابتداہی کا واقعہ ہے) ایران کا (جس نے ایوان حدیث کے اہم ستون پیدا کئے تھے) حدیث سے رشتہ ٹوٹ چکا تھا، اس لئے اس کے ذریعہ سے ہندوستان میں علم حدیث کی اشاعت اور اس کی اہمیت وعظمت قائم ہونے کا کوئی امکان نہ تھا، اس کے برعکس جس قدر اس کا اثر ہندوستان کے علمی حلقوں پر گہرا ہوتا جاتا تھا، حدیث سے بے اعتنائی بڑھتی جاتی تھی، بارہویں صدی ہجری جس میں شاہ ولی اللہ صاحبؒ کا ظہور ہوا، اس کا نقطۂ ارتقا تھا۔

ہندوستان میں علم حدیث کا عروج وزوال

ہندوستان میں علم حدیث کے عروج وزوال کا جائزہ لینے کے لئے ہم یہاں مولانا حکیم سید عبدالحی صاحبؒ کی کتاب "الثقافة الاسلامية فی الهند" کا ایک اقتباس پیش کرتے ہیں، جس میں سیکڑوں صفحات کے مطالعہ کا نچوڑ آگیا ہے:۔

"جب سندھ میں عربوں کی حکومت ختم ہوگئی اور ان کے بجائے غزنوی اور

غوری سلاطین سندھ پر قابض ہوئے اور خراسان اور اء النہر سے سندھ میں علماء آئے، تب علم حدیث اس علاقہ میں کم ہوتا گیا یہاں تک کہ معدوم ہوگیا، اور لوگوں میں شعر و شاعری، فن نجوم، فن ریاضی اور علوم دینیہ میں فقہ و اصول فقہ کا رواج زیادہ ہوگیا، یہ صورت حال عرصہ تک قائم رہی یہاں تک کہ علمائے ہند کا خاص شغلہ یونانی فلسفہ رہ گیا اور علم تفسیر و حدیث سے غفلت بڑھ گئی، مسائل فقہیہ کے سلسلہ سے جو تھوڑا سا تذکرہ کتاب و سنت میں آجاتا تھا بس اسی مقدار پر قانع تھے، فن حدیث میں امام صغانی کی "مشارق الانوار" کا رواج تھا، اگر کوئی شخص اس فن میں زیادہ ترقی کرتا تھا تو امام بغوی کی مصابیح السنۃ یا مشکوٰۃ پڑھ لیتا تھا، اور ایسے شخص کے بارے میں یہ سمجھا جاتا تھا کہ وہ محدث ہوگیا، اور یہ سب محض اس لئے تھا کہ لوگ عام طور پر ہندوستان میں اس فن کی اہمیت و مرتبت سے ناواقف تھے، وہ لوگ اس علم کی طرف سے بالکل غافل تھے، نہ اس علم کے ائمہ کے حال سے واقف تھے اور نہ اس علم کا ان کے درمیان کوئی چرچا تھا، محض تبرکاً مشکوٰۃ شریف پڑھا کرتے تھے، ان کے لئے سب سے زیادہ سرمایہ علم فقہ کی تحصیل تھا، اور وہ بھی تقلید کے طور پر، تحقیق کے طور پر نہیں، اسی وجہ سے اس زمانہ میں فتاوے اور روایات فقہیہ کا رواج بڑھ گیا تھا، نصوص محکمات متروک ہوگئی تھیں، مسائل فقہیہ کی صحت کو کتاب و سنت سے جانچنا اور فقہی اجتہادات کو احادیث نبویہ سے تطبیق دینے کا طریقہ متروک ہوگیا تھا۔

پھر ایک زمانہ ایسا آیا کہ اللہ تعالیٰ نے ہندوستان میں اس علم کی اشاعت کا

انتظام فرمایا، دسویں صدی ہجری میں بعض علماء ہندوستان آئے، اور ان کے ذریعہ یہ علم ہندوستان میں رواج پذیر ہوا، مثلاً

شیخ عبدالمعطی مکی بن حسن بن عبداللہ باکثیر متوفی باحمد آباد ۹۸۹ھ۔

شہاب احمد مصری بن بدرالدین، متوفی باحمد آباد ۹۹۲ھ۔

شیخ محمد فاکہی حنفی بن احمد بن علی متوفی باحمد آباد ۹۹۲ھ۔

شیخ محمد مالکی مصری بن محمد عبدالرحمٰن متوفی باحمد آباد ۹۱۹ھ۔

شیخ رفیع الدین چشتی شیرازی متوفی باکبر آباد ۹۵۴ھ۔

شیخ ابراہیم بغدادی بن احمد بن حسن۔

شیخ ضیاء الدین مدنی مدفون کاکوری ضلع لکھنؤ۔

شیخ بہلول بدخشی، خواجہ میر کلاں ہروی متوفی باکبر آباد ۹۸۱ھ۔

اور بہت سے علمائے کرام۔

ہندوستان کے کچھ علمائے کرام نے حرمین شریفین کا سفر اختیار فرمایا، اور وہاں انھوں نے فن حدیث شریف حاصل کیا، اور اس فن کو لے کر ہندوستان واپس تشریف لائے، اور عرصہ دراز تک گجرات میں درس حدیث دیتے رہے، پھر دوبارہ حجاز ہجرت کر گئے، شیخ یعقوب بن حسن کشمیری متوفی ۱۰۰۳ھ، شیخ جوہر کشمیری متوفی ۱۰۲۶ھ، شیخ عبدالنبی گنگوہی بن احمد، شیخ عبداللہ سلطان پوری بن شمس الدین، شیخ قطب الدین عباسی گجراتی، شیخ احمد بن اسماعیل مانڈوی، شیخ راجح بن داؤد گجراتی، شیخ علیم الدین مانڈوی، شیخ معمر ابراہیم بن داؤد مانیپوری مدفون باکبر آباد، شیخ محمد بن طاہر بن علی پٹنی مصنف "مجمع بحارالانوار"

سید عبدالاول حسینی بن علی بن العلاء الحسینی اور دوسرے علمائے کرامؒ[۱]

مصنف "الثقافة الاسلامیة فی الهند" آگے چل کر لکھتے ہیں :۔

شیخ عبدالحق محدث دہلویؒ کا کارنامہ

"اس کے بعد فن حدیث کی نشر و اشاعت کے لئے اللہ تعالیٰ نے شیخ عبدالحق محدث دہلویؒ بن سیف الدین بخاری متوفی ۱۰۵۲ھ کو منتخب فرمایا، ان کے ذریعہ علم حدیث کی اشاعت بہت عام ہوئی، انھوں نے دارالسلطنت دہلی میں مسند درس آراستہ فرمائی، اور اپنی ساری کوشش و صلاحیت اس علم کی نشر و اشاعت پر صرف فرمائی، ان کی مجلس درس سے بہت سے علماء نے فن حدیث کی تکمیل کی، اور بہت سی کتابیں بھی فن حدیث میں تصنیف فرمائیں، شیخ عبدالحق محدث دہلویؒ نے اس علم کی نشر و اشاعت میں بڑی جد و جہد کی، ان کی ذات اور ان کے علم سے اللہ کے بندوں کو بہت نفع پہونچا، فن حدیث کی نشر و اشاعت میں ان کی جد و جہد اور کوششیں اپنے پیشروؤں سے اس قدر نمایاں و ممتاز رہیں کہ لوگوں نے یہاں تک کہہ دیا کہ فن حدیث کو ہندوستان میں سب سے پہلے لانے والے یہی شیخ عبدالحق محدث دہلویؒ ہیں، حالانکہ جیسا میں نے اوپر بتلایا تاریخی حیثیت سے یہ بات صحیح نہیں ہے۔

شیخ عبدالحق محدث دہلویؒ کے بعد ان کے صاحبزادہ شیخ نورالحق متوفی ۱۰۷۳ھ نے اس علم کی خدمت اور نشر و اشاعت کا بیڑا اٹھایا، اور ان کے بعض تلامذہ

---

[۱] "اسلامی علوم و فنون ہندوستان میں" ص ۱۹۵-۱۹۶

اور اولاد نے بھی اس فن کی خدمت کی ہے، مثلاً شیخ الاسلام شارح بخاری اور شیخ نور الحق کے صاحبزادہ مولانا سلام اللہ مصنف "مُحلّی" و "کمالین"[1]

پروفیسر خلیق احمد نظامی نے صحیح لکھا ہے کہ:۔

"بہر حال حضرت شیخ عبد الحق محدث دہلویؒ نے جس وقت مسند درس بچھائی تھی، اس وقت شمالی ہندوستان میں حدیث کا علم تقریباً ختم ہو چکا تھا، انھوں نے اس تنگ و تاریک ماحول میں علوم دینی کی ایسی شمع روشن کی کہ دور دور سے لوگ پروانوں کی طرح کھنچ کر ان کے گرد جمع ہونے لگے، درس حدیث کا ایک نیا سلسلہ شمالی ہندوستان میں جاری ہوگیا، علوم دینی خصوصاً حدیث کا مرکز نقل گجرات سے منتقل ہو کر دہلی آگیا"[2]

ایک مُجدّد کی ضرورت

حضرت شیخ عبد الحق محدث دہلویؒ کے صدق و اخلاص اور برکت انفاس سے حدیث کی طرف توجہ شروع ہوئی اور انھوں نے اس کے درس و مطالعہ، تدریس اور شرح و تحشیہ کا ایک نیا ذوق اور ایک نئی تحریک پیدا کردی، امید تھی کہ ان کے جانشین و افرادِ خاندان جو اپنی اپنی جگہ پر محدث، مدرس اور صاحبِ تصنیف تھے، اس سلسلہ کو اس طرح جاری رکھیں گے کہ اس فن شریف کو ہندوستان کے نظامِ تعلیم، نصابِ درس اور علمی و تصنیفی سرگرمیوں میں شایانِ شان مقام حاصل ہوگا، خود ان کے صاحبزادۂ گرامی قدر علامہ مفتی نور الحق دہلوی (م ۱۰۷۳ھ) جنھوں نے صحیح بخاری کی فارسی میں چھ جلدوں میں شرح لکھی اور شمائل ترمذی

---

[1] "اسلامی علوم و فنون ہندوستان میں" ص ۱۹۷-۱۹۸ [2] حیات شیخ عبد الحق محدث دہلویؒ ص ۱۴۳

پر بھی ان کی شرح ہے، اس سلسلہ میں ان کے شروع کئے ہوئے کام کی تکمیل فرما سکتے تھے، لیکن غالباً عہدۂ قضا کی وجہ سے جس پر وہ اکبرآباد (آگرہ) جیسے مرکزی شہر میں فائز تھے، ان کو زیادہ درس و تدریس و اشاعت علم حدیث کا موقع نہیں مل سکا، ان کے نبیرہ مولانا شیخ الاسلام دہلویؒ بھی بڑے محدث تھے، جن کی صحیح بخاری پر فارسی میں مبسوط شرح ہے۔

لیکن بعض معلوم اور بعض نامعلوم اسباب کی بناء پر ان حضرات کی انفرادی مساعی سے ہندوستان میں حدیث کی طرف وہ رجوع عام اور اس کی اشاعت و درس و تدریس میں وہ جوش و سرگرمی نہیں پیدا ہوئی جس کی توقع تھی، شاید اس وجہ سے بھی کہ ان حضرات پر حدیث کے ذریعہ مذہب حنفی کی تائید کا جذبہ و رجحان غالب تھا، دوسرا سبب یہ بھی تھا کہ بارہویں صدی کے وسط ہی میں تعلیم و تعلّم کا مرکزِ ثقل دہلی سے لکھنؤ منتقل ہو رہا تھا، اور وہاں استاد العلماء ملا نظام الدین سہالوی (م ۱۱۶۱ھ) کے بابرکت اور طاقتور ہاتھوں سے نئے نصاب کی تشکیل ہو رہی تھی، اس نصاب کے واضعین و مصنفین کا علمی رابطہ حرمین شریفین اور ان مقامات سے قائم نہیں ہو سکا تھا، جو حدیث کے درس و تدریس و خدمت و اشاعت کے مرکز تھے، اور ان پر (جیسا کہ درس نظامی کی تاریخ اور کتب سوانح و تذکرہ سے ظاہر ہوتا ہے) علوم حکمت اور علوم دینیہ میں سے اصول فقہ کا غلبہ تھا۔

بہر حال ہندوستان کا علمی و دینی حلقہ ایک ایسی شخصیت کا منتظر اور محتاج تھا، جو حدیث سے عشق و فریفتگی کا تعلق رکھتی ہو اور اس کے نشر و اشاعت کو اس نے اپنی زندگی کا مقصدِ اوّلیں قرار دیا ہو، ہندوستان کو یہ شخصیت بارہویں صدی کے وسط میں حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی کی ذات میں حاصل ہوئی جنھوں نے صحیح معنی میں اس شعر پر عمل کیا۔ ؏

ما آنچہ خواندہ ایم فراموش کردہ ایم　　　الا حدیث دوست کہ تکرار می کنیم

مصنف "الثقافۃ الاسلامیۃ فی الھند" نے ان حضرات کا تذکرہ کرنے کے بعد جنھوں نے گیارہویں اور بارہویں صدی کے اوائل میں ہندوستان میں علم حدیث کی نشر و اشاعت میں حصہ لیا، اور اپنے درس و تصنیف سے بڑے حلقہ کو فیض پہونچایا حضرت شاہ ولی اللہ صاحبؒ کی خدمت حدیث کا ذکر کیا ہے، جو اس ملک ہی میں نہیں اس دور آخر میں تجدیدی و اجتہادی شان اور احیاء کا رنگ رکھتی ہے، اور جس سے اس ملک میں حدیث کا سکہ رائج الوقت کی طرح چلن ہوگیا، وہ نصاب درس کا ضروری جزء اور معیار فضیلت قرار پائی، درس حدیث کے مستقل حلقے قائم ہوئے، مدارس میں صحاح ستہ کے درس بالخصوص کتب اربعہ بخاری، مسلم، ابوداؤد و ترمذی کو تحقیق کے ساتھ پڑھنے کا رواج ہوا، (جو اب عرب ممالک میں بھی مفقود ہے) شروح حدیث کا دور شروع ہوا، اور دیکھتے ہی دیکھتے اس پر ایک وسیع و عظیم کتب خانہ تیار ہوگیا، جس کی مثال ممالک عربیہ میں بھی نظر نہیں آتی[1]، کتب حدیث کے تراجم ہوئے، جن سے عامۃ المسلمین اور غیر عربی دانوں کو نیز مسلمان خواتین کو بیش بہا فائدہ پہونچا، اور عمل کی تحریک اور اتباع سنت کا شوق ہوا، اجازت حدیث اور سند کا شوق ہوا، اور ہندوستان اس فن شریف کا ایسا مرکز بن گیا کہ مصر کے جلیل القدر عالم علامہ سید رشید رضا مدیر "المنار" کے قلم سے حسب ذیل الفاظ نکلے :-

ولولا عناية إخواننا علماء الهند — اگر ہمارے بھائیوں علمائے ہندوستان نے

---

[1] شاہ صاحب کی تعلیم و تربیت اور دعوت و تحریک کے اثر سے ہندوستان میں حدیث کے اساتذہ، شارحین و مصنفین کی جو جماعت کثیر پیدا ہوئی، اور اس کے نتیجہ میں حدیث اور علوم حدیث پر جو عظیم کتب خانہ وجود میں آیا اس کی وسعت اور تنوع کا اندازہ کرنے کے لئے ملاحظہ ہو مولانا حکیم سید عبدالحی صاحبؒ کی کتاب "الثقافۃ الاسلامیۃ فی الھند" باب ثانی کی فصل رابع "مصنفات أهل الهند فی الحدیث" ص ۱۴۳-۱۶۰، یا اس کا اردو ترجمہ "اسلامی علوم و فنون ہندوستان میں" از مولانا ابوالعرفان ندوی شائع کردہ دارالمصنفین۔ اعظم گڑھ۔

بعلوم الحديث في هذا العصر	اس زمانہ میں علوم حدیث کے ساتھ
لقضي عليها بالزوال من امصار	اعتناء نہ کیا ہوتا تو مشرقی ممالک میں
الشرق، فقد ضعفت في مصر	مکمل طور پر ان کا زوال ہو چکا ہوتا،
والشام والعراق والحجاز منذ القرن	اس لئے کہ مصر، شام، عراق و حجاز
العاشر للهجرة، حتى بلغت	میں دسویں صدی ہجری ہی سے ان میں
منتهى الضعف في أوائل هذا	ضعف پیدا ہو گیا تھا، جو اس چودھویں
القرن الرابع عشر[1]	صدی ہجری کے اوائل میں اپنی انتہا کو
	پہونچ گیا۔

حدیث کے بارے میں شاہ صاحبؒ کے خیالات وجذبات

شاہ صاحبؒ کے لئے کون سا جذبہ اس علم کے ساتھ اشتغال، پھر اس کی نشر واشاعت کی سرگرمی، اور اس کے لئے اپنی زندگی اور صلاحیتیں وقف کر دینے کا محرک ہوا، اس کو معلوم کرنے کے لئے خود شاہ صاحبؒ ہی کی تحریرات کی طرف رجوع کرنا چاہئے کہ یہ ان کے خیالات کا صحیح آئینہ ہے "حجۃ اللہ البالغۃ" کے مقدمہ کے پہلے ہی صفحہ پر لکھتے ہیں:۔

إن عمدة العلوم اليقينية	علوم یقینیہ کا معتمد علیہ سرمایہ و سرتاج
ورأسها، ومبنى الفنون الدينية	اور فنون دینیہ کی اصل و اساس
وأساسها، هو علم الحديث	علم حدیث ہے جس میں افضل المرسلین
الذي يذكر فيه ما صدر من	صلے اللہ علیہ وسلم کے قول و فعل

---

[1] مقدمہ "مفتاح کنوز السنۃ"

أفضل المرسلين صلى الله عليه وآله وسلم وأصحابه أجمعين من قول أو فعل أو تقرير، فهي مصابيح الدجى ومعالم الهدى وبمنزلة البدر المنير، من انقاد لها ووعى فقد رشد واهتدى، وأوتي الخير الكثير، ومن أعرض وتولى فقد غوى وهوى، وما زاد نفسه إلا التخسير، فإنه صلى الله عليه وآله وسلم نهى وأمر، وأنذر وبشر، وضرب الأمثال وذكر، وإنها لمثل القرآن أو أكثر[1]

یا کسی بات پر آپ کے سکوت و رضامندی کا ذکر خیر ہوتا ہے، اس لئے یہ حدیثیں تاریکی میں روشن چراغ، رشد و ہدایت کا سنگِ میل، اور بدر کامل کا حکم رکھتی ہیں، جو شخص ان پر عمل پیرا ہوتا اور ان کی نگہداشت کرتا ہے تو وہ ہدایت یاب اور خیر کثیر سے فیض یاب ہوتا ہے اور جو بدبخت اس سے اعراض و روگردانی کرتا ہے، وہ گمراہ اور ہلاک ہوتا ہے، اور اپنا ہی نقصان کرتا ہے، اس لئے کہ آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کی زندگی امر و نہی، انذار و تبشیر اور نصیحت و تذکیر سے معمور ہے، اور آپ کی حدیثوں میں یہ چیزیں قرآن ہی کی طرح یا اس سے (مقدار میں) کچھ زیادہ ہی ہیں۔

ایک جگہ تحریر فرماتے ہیں:-

اول چیزے کہ عقل آزا بر خود دش

پہلی چیز جس کو عقل اپنے اوپر

---

[1] مقدمہ حجۃ اللہ البالغۃ ص ۲

واجب میگردد آنست کہ تتبع اخبار
آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم دربیان
احکام الٰہی، و پیروی آن اخبار
بدل وجوارح باید نمود، زیراکہ کلام
در شخصے است کہ تصدیق کردہ
است بتکلیف اللہ تعالےٰ عباد خود
را باحکام، و قصد خروج از عہدۂ تکلیف
مصمم ساختہ۔[1]

واجب قرار دیتی ہے یہ ہے کہ
آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کے
حالات وارشادات کا تتبع کیا
جائے کہ آپؐ نے احکام الٰہی کے
بارے میں کیا ارشاد فرمایا اور کس طرح
ان پر عمل کیا، پھر قلب و جوارح سے
ان اقوال واحوال کی پیروی کی جائے
اس لئے کہ ہماری گفتگو اس شخص کے
بارے میں ہے جس نے یہ حقیقت تسلیم
کر لی ہے کہ اللہ تعالےٰ نے اپنے بندوں
کو اپنے احکام کا مکلّف بنایا ہے
اور اس شخص نے تکلیف شرعی کی
اس ذمہ داری سے عہدہ برآہونے کا
عزم مصمم کرلیا ہے۔

ہندوستان میں علم حدیث سے بے اعتنائی کا شکوہ

شاہ صاحبؒ کے لئے ہندوستان میں علم حدیث کے احیاء اور اشاعت و ترویج کا
دوسرا محرک ہندوستان کی وہ صورت حال تھی جس کا ذکر کتاب کے باب دوم میں تفصیل سے

[1] کلمات طیبات ص۱۷۲

گزر چکا ہے، دینی حلقوں پر بدعات، رسوم جاہلیت، غیر مسلموں کی تقلید اور غیر اسلامی شعائر اختیار کرنے کا دھواں چھایا ہوا تھا جس کے اندر سے اصل اسلام کی صورتِ زیبا دیکھنی مشکل تھی، علمی و درسی حلقوں پر یونان سے آئے ہوئے یونانی علوم جن کو وہ "فنون دانشمندی" کہتے تھے، اور علوم آلیہ اور فنون بلاغت، اور علم کلام کا غلبہ تھا، اور دونوں حلقوں میں علوم شرعیہ بالخصوص علم حدیث بار نہیں پانے پاتا تھا، اگر علوم دینیہ کی طرف توجہ بھی ہوتی تھی تو معاملہ فقہ اور اصول فقہ اور اس کی موشگافیوں سے آگے نہیں بڑھنے پاتا تھا، اس صورت حال کو دیکھ کر شاہ صاحب فرط تاثر اور شدت تأسف میں لکھتے ہیں :۔

"میں ان طالبان علم سے کہتا ہوں جو اپنے آپ کو علماء کہتے ہیں کہ اللہ کے بندو! تم یونانیوں کے علوم کے طلسم اور صرف و نحو و معانی کے دلدل میں پھنس کر رہ گئے، تم نے سمجھ لیا کہ علم اسی کا نام ہے، حالانکہ علم یا تو کتاب اللہ کی آیت محکم ہے یا رسول اللہ صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کی سنت ثابتہ، تمہیں چاہیئے تھا کہ تمہیں یہ یاد رہتا کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم نے کیسے نماز پڑھی، آپ کیسے وضو فرماتے تھے، قضائے حاجت کے لئے کس طرح جاتے تھے، کیسے روزہ رکھتے تھے، کیسے حج کرتے تھے، کیسے جہاد کرتے تھے، آپ کا انداز گفتگو کیا تھا، حفظِ لسان کا طریقہ کیا تھا، آپ کے اخلاق عالیہ کیا تھے؟ تم آپ کے اسوہ پر چلو اور آپ کی سنت پر عمل کرو، اس بناء پر کہ وہ آپ کا طریق زندگی اور سنت نبوی ہے، اس بناء پر نہیں کہ وہ فرض و واجب ہے، تمہیں چاہیئے تھا کہ تم دین کے احکام و مسائل سیکھو، باقی سیر و سوانح اور صحابہؓ اور تابعین کی وہ حکایات جو آخرت کا شوق پیدا کریں تو وہ ایک تکمیلی چیز اور امر زائد ہے، اس کے مقابلہ میں

تمہارے مشاغل اور جن باتوں پر تم پوری توجہ صرف کرتے ہو، وہ آخرت کے علوم نہیں ہیں، دنیاوی علوم ہیں۔

تم اپنے سے پہلے کے فقہاء کے استحسانات اور ان کی تفریعات میں غوطہ لگاتے ہو اور یہ نہیں جانتے کہ حکم وہ ہے جو اللہ اور اس کا رسولؐ دے، تم میں کتنے آدمی ہیں، جب ان کو رسول اللہ صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کی کوئی حدیث پہونچتی ہے تو اس پر عمل نہیں کرتے اور کہتے ہیں کہ ہمارا عمل تو فلاں کے مذہب پر ہے حدیث پر نہیں ہے، پھر تم نے یہ خیال کر رکھا ہے کہ حدیث کا فہم اور اس کے مطابق فیصلہ کاملین اور ماہرین کا کام ہے حضرات ائمہ سے یہ حدیث مخفی نہیں ہو سکتی، پھر انھوں نے جو اس کو چھوڑا تو کسی وجہ سے جو ان پر منکشف ہوئی، مثلاً نسخ یا مرجوحیت۔

یاد رکھو کہ اس کا دین سے کچھ تعلق نہیں، اگر تمہارا اپنے نبیؐ پر ایمان ہے تو اس کی پیروی کرو، وہ تمہارے مذہب کے موافق ہو یا مخالف، خدا کی مرضی تو یہ تھی کہ تم کتاب اللہ اور سنت رسول اللہؐ کے ساتھ شروع سے اشتغال کرتے، اگر ان دونوں پر عمل کرنا تمہارے لئے آسان ہو تو کیا کہنا، اور اگر تمہارے فہم اس سے قاصر ہوں تو پھر کسی سابق عالم کے اجتہاد سے مدد لو، اور جس کو زیادہ صحیح، صریح اور سنت کے موافق پاؤ اس کو اختیار کرو، علوم آلیہ سے اس ذہن کے ساتھ اشتغال کرو کہ وہ آلات و وسائل ہیں، ان کی مستقل حیثیت اور مقصود کا درجہ نہیں، کیا خدا نے تمہارے اوپر یہ واجب نہیں کیا کہ تم علم کی اشاعت کرو، یہاں تک کہ مسلمانوں کے ملک میں شعائر اسلام

ظاہر وغالب ہوں، تم نے شعائر کا تو اظہار نہیں کیا، اور لوگوں کو زوائد میں مشغول کر دیا۔[1]

شاہ صاحبؒ کو حدیث کے ذکر میں جو سرشاری کی کیفیت اور ائمہ حدیث کی ذات کے ساتھ جو گہری عقیدت تھی اس کا کچھ نمونہ اس مکتوب میں دیکھا جا سکتا ہے، جو انھوں نے امام بخاریؒ کے مناقب میں اپنے ایک مسترشد کو لکھا ہے[2]۔

خدمت و اشاعتِ حدیث کی سرگرمی

اوپر گزر چکا ہے کہ شاہ ولی اللہ صاحبؒ جب اپنے استاد و شیخ ابوطاہر مدنی سے رخصت ہونے لگے تو انھوں نے یہ شعر پڑھا ؎

نسیتُ کل طریق کنت أعرفہ　　إلّا طریقاً یؤدینی لربعکم

(میں چلنے کا ہر راستہ بھول گیا سوائے اس راستہ کے جو آپ کے گھر تک پہونچاتا ہے)

شاہ صاحب نے بھی چلتے وقت فرمایا کہ "میں نے جو کچھ پڑھا تھا، سب بھلا دیا سوائے علم دین حدیث کے"۔

شاہ صاحب کی پوری زندگی اس کی تصدیق کرتی ہے کہ وہ حدیث شریف ہی کی تشریح وتفہیم، تدریس و تعلیم اور اشاعت و تعمیم میں مصروف رہے، بقول شاعر ؎

جو تجھ بن نہ جینے کو کہتے تھے ہم
سو اس عہد کو ہم وفا کر چلے

---

[1] تفہیمات الہیہ مطبوعہ المجلس العلمی ڈابھیل ۱۹۳۶ء حصہ اول ص ۲۱۴-۲۱۵

[2] ملاحظہ ہو "کلمات طیبات" ص ۱۶۸-۱۷۱

ہندوستان واپس آتے ہی انھوں نے حدیث کی نشر واشاعت کے لئے گویا کمر کس لی۔ بہت جلد ان کا مدرسہ رحیمیہ ہندوستان کے طول وعرض میں حدیث کی سب سے بڑی درسگاہ بن گئی، جہاں ہندوستان کے گوشہ گوشہ سے تشنگانِ علم حدیث نے پروانہ وار ہجوم کیا، ان مقامات میں سندھ[1] اور کشمیر[2] جیسے دور دراز مقامات بھی تھے، دہلی اور اس کے اطراف اور شمالی ہند کا تو کچھ کہنا نہیں، مسند الہند حضرت شاہ عبدالعزیزؒ کے ماسوا کہ وہ فرزند ارجمند اور شاہ صاحبؒ کے کاموں کی توسیع وتکمیل کرنے والے تھے، اسی درسِ حدیث سے فائدہ اٹھانے والے فخر ہندوستان علامہ سید مرتضیٰ بلگرامی مشہور بہ زَبیدی (۱۱۴۵ھ-۱۲۰۵ھ) صاحب "تاج العروس" شرح قاموس اور "اتحاف السادة المتقین شرح احیاء علوم الدین" تھے، جن کے تبحر وتحدیث کی عالم عربی میں دھوم مچ گئی، اور جن کی مجلس قاہرہ میں سلاطین کے درباروں سے چشمک کرتی تھی، انھیں تلامذہ میں بیہقیِ وقت قاضی ثناء اللہ پانی پتیؒ (م ۱۲۲۵ھ) خلیفۂ ارشد حضرت مرزا مظہر جانِ جاناںؒ، ومصنف تفسیر مظہری وما لابد منہ بھی تھے[3]۔

---

[1] سندھ کے مولانا محمد معین دہلی آئے، اور حضرت شاہ ولی اللہ صاحبؒ سے حدیث کا درس لیا اور استفادہ کیا، ان کی مشہور تصنیف "دراسات اللبیب فی الأسوة الحسنة بالحبیب" ہے، جس میں شاہ صاحب کی تحقیقات اور ذوق کا عکس صاف نظر آتا ہے، سنہ ۱۱۶۱ھ میں وفات ہوئی (ملاحظہ ہو نزہۃ الخواطر ج ۶)

[2] شاہ ولی اللہ صاحبؒ کے خاص تلامذہ اور ان کی تحقیقات واذواق کے حامل ومبلغ خواجہ محمد امین کشمیری (م ۱۱۸۷ھ) تھے، جو محمد امین الولی اللّٰہی کے نام سے مشہور ہیں، حضرت شاہ عبدالعزیز صاحبؒ ان کے شاگرد تھے، شاہ صاحب نے ان کے لئے اپنے بعض رسائل بھی تصنیف فرمائے (ملاحظہ ہو "نزہۃ الخواطر" ج ۶)

[3] ملاحظہ ہو نزہۃ الخواطر ج ۷۔

اس طرح ہندوستان میں صدیوں کے بعد (غالباً پہلی مرتبہ) علم حدیث کا ایسا چرچا اور اس کی طرف ایسا رجوع ہوا کہ ہندوستان، یمن کا ہمسر بن گیا، اور اس کے جانفزا جھونکے خود سرزمین حجاز تک پہونچنے لگے۔[1] نواب سید صدیق حسن خاں مرحوم نے شاہ صاحبؒ کی خدمت واشاعت حدیث کی سرگرمیوں کو ذکر کرتے ہوئے، عربی کے دو بلیغ شعر لکھے ہیں، جو حقیقت حال کی صحیح تصویر ہیں ؎

من زار بابك لم تبرح جوارحه ۔۔۔ تروی أحادیث ما أولیت من منن

فالعین عن قرة، والکف عن صلة ۔۔۔ والقلب عن جابر، والسمع عن حسن

(جو تمہارے دروازہ پر آیا اس کے اعضاء وجوارح تمہارے احسانات کی روایتِ حدیث میں مشغول ہو گئے)

(آنکھ کہتی ہے کہ (قُرّۃ) سے مجھے ٹھنڈک ملی، ہاتھ کہتے ہیں کہ ہم (صلہ) سے مالامال ہوئے، دل راوی ہے کہ اس کو (جابر کے ذریعہ) سکون کی دولت حاصل ہوئی، کانوں کی روایت ہے کہ وہ (حَسَن کی بدولت) اچھی اچھی باتوں سے معمور ہوئے۔)

لطف یہ ہے کہ ان اعضاء نے جن احسانات کا تذکرہ کیا ہے، اور ان کے سلسلہ میں جن محسنین کے نام لئے ہیں، وہ سب راویانِ حدیث اور شیوخ کاملین ہیں، مثلاً قرۃ بن خالد السدوسی، صلۃ بن اشیم العدوی، حضرت جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہ، اور امام حسن بصریؒ۔

---

[1] اسی مدرسہ ولی اللّٰہی کے فضلاء اور شاہ صاحب کے تلامذہ کے تلامذہ شاہ اسحٰق صاحب دہلوی، اور شاہ عبدالغنی صاحب مجددی نے حرمین شریفین میں خدمت و درس حدیث کی بساط بچھائی ... عرب وعجم کو فیض پہونچایا، تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو نزہۃ الخواطر ج ۷۔

شاہ صاحبؒ کی تصنیفی خدمات

شاہ صاحب نے حدیث اور علوم حدیث پر جو تصنیفات کیں، ان کے نام حسب ذیل ہیں،

۱۔ مصفّٰی (مؤطا امام مالکؒ کی فارسی شرح)

۲۔ مسوّٰی (مؤطا کی عربی شرح)

شاہ صاحبؒ فقہ حدیث اور درس حدیث کا جو طریقہ رائج کرنا چاہتے تھے، یہ دونوں کتابیں اس کا نمونہ ہیں، اور ان سے شاہ صاحبؒ کی علوم حدیث اور فقہ حدیث میں محققانہ اور مجتہدانہ شان کا اظہار ہوتا ہے، وہ مؤطا کو صحاح ستہ میں پہلے درجہ پر رکھتے تھے، اور اس کو ان میں ابن ماجہ کی جگہ پر شمار کرتے تھے[۱]، وہ مؤطا کے بے حد قائل اور اس کے ساتھ اعتناء کرنے اور اس کو درس حدیث میں اوّلیت دینے کے پرجوش داعی اور مبلغ ہیں[۲]

شاہ صاحبؒ اپنے وصیت نامہ میں تحریر فرماتے ہیں:۔

چوں قدرت بزبان عربی یافت	جب عربی زبان پر قدرت حاصل
مؤطا بروایت یحییٰ بن یحییٰ مصمودی	ہو جائے مؤطا کے اس نسخہ کو جو
بخوانانند و ہرگز آں را معطل	یحییٰ بن یحییٰ مصمودی کی روایت
نگذارند کہ اصل علم حدیث	سے ہے پڑھائیں، ہرگز اس سے
ہست و خواندن آں فیضہا دارد ما را	پہلوتہی نہ کریں کہ وہ علم حدیث کی

۱؎ تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو مولانا عبیداللہ سندھیؒ کا مقالہ "الفرقان" شاہ ولی اللہؒ نمبر ص ۲۹۲-۲۹۸

۲؎ ملاحظہ "مقدمہ مصفّٰی" نیز "الفائدة الثانية فى درجة المؤطا من بين كتب الحديث" مقدمہ اوجز المسالک از حضرت شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا صاحب ص ۳۲-۳۳ مطبوعہ مطبعۃ السعادۃ مصر ۱۳۹۳ھ

سماع جمیع آں مسلسل است[1] اصل ہے اور اس کا پڑھنا بڑے فیوض کا حامل ہے، ہم کو مکمل مؤطا کی سماعت مسلسل طریقہ پر حاصل ہے۔

۳۔ شرح تراجم ابواب صحیح بخاری، صحیح بخاری کے تراجم والواب کی جو ہر زمانہ میں درس بخاری کے سلسلہ کی دقیق ترین چیز سمجھی گئی ہے اور ہر زمانہ میں بخاری کے شرّاح اور اساتذہ نے اس میں اپنی ذہانت اور دقیقہ سنجی کے نمونے پیش کئے ہیں، یہ رسالہ عربی میں ہے، پہلے ۱۳۲۳ھ میں دائرۃ المعارف، حیدرآباد سے شائع ہوا، پھر اصح المطابع، دہلی کے صحیح بخاری کے نسخے کے شروع میں بطور مقدمہ شامل کیا گیا[2]۔

۴۔ مجموعہ رسائل اربعہ چار مختصر رسائل کا مجموعہ ہے جن میں "ارشاد الیٰ مهمات الاسناد" اور تراجم البخاری (یہ شرح تراجم ابواب بخاری کے علاوہ ہے اور صرف ایک ورق پر ہے) شاہ صاحبؒ کی تصنیف ہیں۔

۵۔ "الفضل المبین فی المسلسل من حدیث النبی الأمین" "النوادر من حدیث سید الأوائل والأواخر" اربعین، شاہ صاحبؒ نے اس فضیلت کے حصول کے لئے جو چالیس[۴۰] احادیث جمع کرنے کے بارے میں وارد ہوئی ہے، اور مختلف زمانوں میں علماء نے اس پر عمل کیا ہے، یہ رسالہ تصنیف کیا، یہ احادیث عام طور پر بہت مختصر قلیلۃ المبنی کثیرۃ المعنی ہیں، اور رسالہ اس قابل ہے کہ زبانی یاد کیا جائے، اور نصاب میں داخل کیا جائے۔

---

[1] وصیت نامہ فارسی ص۱۱

[2] شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا صاحب سہارن پوری (م ۱۴۰۲ھ) کے رسالہ "تراجم ابواب بخاری" میں بھی وہ شامل ہے۔

۶۔ مسلسلات۔

وہ کتابیں جو براہ راست فن حدیث پر نہیں ہیں، مگر ان کا بالواسطہ حدیث سے تعلق ہے، اور وہ مقدمات علم حدیث کے طور پر پڑھی جانی چاہئیں، اور ان سے شاہ صاحب کی علم حدیث پر گہری نظر، فقہ و حدیث میں تطبیق اور مذاہب کے محاکمہ میں انصاف و وسعتِ قلب طبقات محدثین اور طبقات کتب حدیث کے بارے میں ان کی وسیع نظر اور عمومی طور پر ان کے اس توازن و اعتدال کا اندازہ ہوتا ہے جس سے اللہ تعالےٰ نے ان کو نوازا تھا، یہ کتابیں حسب ذیل ہیں:۔

۱۔ "الانصاف فی بیان اسباب الاختلاف"

"حجۃ اللہ البالغہ" میں تتمہ ۲ کے عنوان سے چند عناوین و مضامین ہیں جو صفحہ ۱۴۰-۱۶۲ تک پھیلے ہوئے ہیں[۱]، یہ تتمہ چار ابواب پر منقسم ہے، ناشر کی تحقیق ہے کہ یہ تتمہ صرف ایک ہی نسخہ میں پایا گیا، اس باب کے آخر میں شاہ صاحبؒ لکھتے ہیں کہ:۔

"میں نے ایک مستقل کتاب کی تالیف کا عزم کیا جس کا نام "غایۃ الانصاف فی بیان اسباب الاختلاف" رکھوں گا، اور اس میں تفصیل سے اسباب اختلاف پر بحث، اور اس کے شواہد و امثال بھی پیش کروں گا، لیکن اس وقت تک اس کام کے لئے فرصت نہیں ملی، جب اس کتاب (حجۃ اللہ البالغہ) میں اس مقام تک بحث پہونچی تو میں نے مناسب سمجھا کہ جو کچھ اس وقت ذہن میں ہے، اور اس کا قلم بند کرنا آسان ہے، اس کو پیش کر دوں[۲]۔"

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ بعد میں شاہ صاحبؒ کو اس کا موقعہ ملا اور حجۃ اللہ کے

---

[۱] نسخہ مکتبۂ سلفیہ لاہور [۲] حجۃ اللہ البالغہ ص ۱۶۱ (سلفیہ)

اس مضمون کو لے کر کچھ اضافوں کے ساتھ علیحدہ رسالہ میں "الانصاف فی بیان اسباب الاختلاف" کے نام سے مکمل کردیا، اس لئے اس رسالہ اور حجۃ اللہ کے تتمہ دوم میں کہیں کہیں اختلاف اور خفیف حذف و اضافہ نظر آتا ہے۔

یہ رسالہ الانصاف (جو اپنے موضوع پر منفرد ہے) ہندوستان اور بیرون ہند میں کئی مرتبہ شائع ہوا، جن میں کہیں کہیں الفاظ کا اختلاف پایا جاتا تھا، ۱۳۲۷ھ میں "شرکۃ المطبوعات العلمیہ مصر کی طرف سے پہلی مرتبہ، اور "مکتبۃ المنصورۃ" مصر کی طرف سے دوسری مرتبہ رسالہ عربی ٹائپ میں شائع ہوا، اس وقت ہمارے سامنے "دارالنفائس" بیروت کا عمدہ ٹائپ کا چھپا ہوا نسخہ ہے، جو چھوٹے سائز کے ایک سو گیارہ صفحات میں آیا ہے، عصر حاضر کے محدّث جلیل شیخ عبدالفتاح ابو غُدّہ نے اس کے مقابلہ اور تصحیح کی خدمت انجام دی اور اس پر حواشی کا اضافہ کیا۔

۲۔ عقد الجید فی احکام الاجتہاد والتقلید۔

۳۔ حجۃ اللہ البالغۃ کا المبحث السابع[1]۔

درحقیقت حجۃ اللہ البالغہ کے پہلے حصہ کے القسم الثانی فی بیان اسرار ما جاء عن النبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تفصیلاً سے لے کر دوسرے جز کے آخری حصہ "الفتن والمناقب" تک حدیث ہی کی حکیمانہ اور متکلمانہ شرح اور اس کے اسرار و حکم، اور اس کی عملی تطبیق کی وہ مجتہدانہ کوشش ہے جو شاہ صاحب ہی کا حصہ تھا، اور جس میں ان کو سبقت و اولیت حاصل ہے، افسوس ہے کہ حجۃ اللہ البالغۃ کا مطالعہ کرنے والے اور اس کا درس دینے والے بھی (علی أنهم أقل قليل) اس حصہ کو غیر اہم سمجھ کر

---

[1] حجۃ اللہ البالغہ از ص ۱۲۸ تا ۱۵۴

نظر انداز کر دیتے ہیں۔

تطبیق بین الفقہ والحدیث

عرصہ سے عالم اسلام کے بہت سے علمی، تدریسی اور تصنیفی حلقوں میں فقہ و حدیث کے دو متوازی سلسلے چلے آرہے تھے، جن میں سے ہر ایک اپنی جگہ پر (جب سے اس کا اجرا ہوا تھا) دوسرے سے مستغنی و بے نیاز ہو کر اپنا سفر طے کر رہا تھا، اور اکثر اوقات ایک دوسرے سے جدا ہو کر پھر وہ کسی نقطہ پر جا کر ہمکنار نہیں ہوتے تھے، بہت سے فقہی مسلکوں میں حدیث اسی وقت زیر بحث آتی، جب مسئلہ کی تائید اور دوسرے مذہب فقہی کے نمائندوں کے اس اعتراض کو دفع کرنا ہوتا کہ یہ مسئلہ حدیث کے خلاف ہے، یا دوسرے مذہب پر اس کی ترجیح ثابت کرنی ہوتی، صحاح کے درس میں یا تو ان احادیث کی تاویل کی جاتی جو اپنے مذہب کے خلاف پڑتیں یا دوسری کتابوں کی ان احادیث کو پیش کیا جاتا جو اپنے مذہب کی تائید میں ہیں، اگر کسی مذہب فقہی کی کسی مستند و معیاری کتاب میں احادیث سے استدلال کیا گیا ہے تو بعض اوقات اس مذہب کے ان علماء نے جن کی فن حدیث پر وسیع نظر تھی اور محدثانہ ذوق رکھتے تھے، ان احادیث کی تخریج کی کوشش کی ہے اور ان پر محدثانہ کلام کیا ہے، جن سے اس کتاب میں استدلال کیا گیا ہے[۱]، تو یہ سعی محمود بھی اس مذہب فقہی کی تائید و نصرت اور اس کو مطابق حدیث ثابت کرنے کا ایک طریقہ اور اس مذہب کی ایک عالمانہ اور محققانہ خدمت تھی، جو قابل قدر اور مستحق شکر ہے، نفس مسائل پر نظر ثانی کرنے اور فقہ و حدیث میں تطبیق کی کوشش نہیں تھی۔

---

[۱] اس کی ایک روشن مثال علامہ زیلعی کی کتاب "نصب الرایۃ فی تخریج احادیث الھدایۃ" ہے۔

مذاہب فقہیہ کے کچھ ایسے آہنی سانچے بن گئے تھے، جن کا ٹوٹ جانا تو ممکن تھا[۱] پھیلنا ممکن نہیں تھا، ہر مذہب کے پیرو اپنے مذہب کے متعلق یہ خیال قائم کئے ہوئے تھے کہ ان کے مذہب کا سو فیصدی صحیح ہونا تو اصل حقیقت ہے باقی بشریت کی بناء پر غلطی کا امکان ضرور ہے، کسی نے اس طرز فکر کو بڑے بلیغ انداز میں اس جملہ سے ادا کیا ہے، "مذھبنا صوابٌ یحتمل الخطاء ومذھب غیرنا خطاءٌ یحتمل الصواب" (ہمارا مذہب اصل میں تو درست اور حق ہے خطا کا احتمال ہے، اور دوسرے کا مذہب (فقہی) اصلاً ناصواب ہے، صحت کا احتمال ہے) اس طرز فکر کا نتیجہ یہ تھا کہ مذاہب اربعہ (حنفی، مالکی، شافعی، حنبلی) کے درمیان (جن کو امت نے عام طور پر سند قبول عطا کی اور جن کے متعلق اہل حق و اہل علم کے درمیان شروع سے یہ اصولی طور پر تسلیم کیا جاتا رہا ہے کہ حق ان میں دائر ہے، ان کے بانی اور مؤسس ائمۃ الہدیٰ اور امت کے پیشوا تھے، اور یہ مذاہب حقانی ہیں) خلیج روز بروز عمیق اور وسیع ہوتی چلی جارہی تھی، ان پر عمل کرنے والوں کے درمیان اختلاف منافرت تک، اور بحث و مناظرہ بعض اوقات مجادلہ اور مقاتلہ تک پہونچ جاتا تھا، اس سے زیادہ سخت معاملہ ان اہل علم کے ساتھ ہوتا تھا،

---

[۱] یعنی اس مذہب کو ترک کر کے دوسرے مذہب کو اختیار کر لینے، حنفیت سے شافعیت یا بالعکس، یا عمل بالحدیث کا مسلک اختیار کر لینے کی مثالیں ہر زمانہ میں ملیں گی، لیکن ایک ہی مذہب کے دائرہ میں رہ کر بعض مسائل سے جزئی طور پر عدول اور کسی دوسرے مذہب کے مسئلہ کو اختیار کر لینے، یا کسی مسئلہ میں حدیث پر عمل کرنے کی مثالیں بہت کم ملیں گی، اس لئے کہ بہت سے حضرات کے نزدیک "تجزیٔ تقلید" صحیح نہیں، یعنی کسی مذہب و امام کا مقلد کسی مسئلہ میں بھی اگر دوسرے مذہب و امام کی تقلید اور اس کے مسئلہ پر عمل کرے تو وہ اپنے امام کی تقلید کے دائرہ سے خارج ہو جاتا ہے۔

جو کلی یا جزئی طور پر عبادات میں حدیث پر عمل شروع کر دیتے تھے، اس کی ایک مثال اسی بارہویں صدی کے ایک سلفی عالم و محدّث مولانا شیخ محمد فاخر زائرؔ الٰہ آبادی (۱۱۲۰ھ ۔ ۱۱۶۴ھ) ہیں، جو (بعض مصنفین کی روایت کے مطابق) اپنے اتباع حدیث و سلفیت کی وجہ سے عوام کی ناراضگی کا نشانہ بنے۔[۱]

حضرت شاہ ولی اللہ صاحبؒ کے مجددانہ کارناموں میں ایک کارنامہ اور خدمتِ حدیث اور انتصار للسنۃ ہی کے سلسلہ زریں کی ایک اہم کڑی ان کی فقہ و حدیث میں تطبیق کی اور پھر مذاہب اربعہ میں جمع و تالیف کی کوشش تھی، اس سے اس بشارت نبویؐ کی تصدیق ہوتی ہے جس میں کہا گیا تھا کہ "تم سے خدا اس امت کی شیرازہ بندی کے ایک خاص نوع کا کام لے گا"۔[۲]

جہاں تک ہندوستان کے تحتی برّاعظم کا تعلق ہے، اس میں اس طرز فکر اور جمع و تطبیق کی اس کوشش کا سراغ نہیں ملتا اور اس کے تاریخی و علمی اسباب ہیں، یہ تحتی برّاعظم شروع سے ان فاتحین اور بانیان سلطنت کے زیر نگین رہا جو یا ترکی النسل تھے یا افغانی النسل، اور یہ دونوں قومیں تقریباً اپنے اسلام قبول کرنے کے زمانہ سے مذہب حنفی کی حلقہ بگوش بلکہ اس کی حمایت اور نشر و اشاعت میں سرگرم اور پر جوش رہیں، یہاں اسلام کی تقریباً آٹھ سو سال کی تاریخ میں مذہب مالکی اور مذہب حنبلی کو تو قدم بھی رکھنے کا موقعہ نہیں ملا، شافعی مذہب سواحل تک محدود رہا، یا جنوبی ہند مدراس اور شمالی کنارے (موجودہ کرناٹک کے) بعض حصوں بھٹکل وغیرہ اور کیرالا میں محدود رہا، ان میں بھی مالابار (قدیم بلاد المعبر) کو مستثنیٰ کرکے جہاں زیادہ تر شافعی مسلک کے داعیان اسلام، تجّار، مشائخ اور فقیہ و عالم آئے، شیخ مخدوم

---

[۱] شیخ فاخر الٰہ آبادی کے تذکرہ کے لئے ملاحظہ ہو "نزہۃ الخواطر" ج ۶ [۲] فیوض الحرمین ص ۶۲

فقیہ علی مہائمی (م ۸۳۵ھ) صاحب تفسیر تبصیر الرحمان وتیسیر المنان، اور مالابار کے شیخ مخدوم اسماعیل فقیہ السکری الصدیقی (م ۹۴۹ھ) نیز مخدوم شیخ زین الدین ملیباری (م ۹۲۸ھ) صاحب فتح المعین کے علاوہ ہمارے محدود علم میں اس پایہ کے شافعی فقیہ و محدث نہیں پیدا ہوئے[1] جو ہندوستان (بالخصوص شمالی ہند کے) علمی حلقوں پر گہرا اثر ڈالتے، اور علماء حنفیہ کو فقہ شافعی پر عمیق نظر ڈالنے اور اس سے استفادہ پر آمادہ کرتے، ہندوستان سے جو علماء اور طالبانِ علم حدیث وفقہ حجاز جاتے (جو ترکی سلطنت کے زیر انتظام تھا، اور ترک ہر دور میں سو فیصدی سنی اور حنفی رہے ہیں) وہ بھی زیادہ تر اپنے ہی مذہب کے علماء اور خصوصیت کے ساتھ اپنے ہم وطن اساتذۂ فقہ وحدیث سے رابطہ رکھتے، جو وہاں ہندوستان یا افغانستان سے ہجرت کر کے چلے گئے تھے، اور ان کے شاگردوں کا بڑا حلقہ تھا[2]۔

شاہ ولی اللہ صاحبؒ پہلے شخص تھے، جن کا حرمین شریفین میں اصل تلمذ اور استفادہ ایک جلیل القدر شافعی محدث شیخ ابو طاہر کردی مدنی سے تھا، وہ ان کے علم، ان کی شخصیت اور ان کے باطنی کمالات، وسعت نظر اور وسعت قلب سے بھی متاثر ہوئے، شاہ صاحب نے "انسان العین" میں اپنے جن مشائخ حرمین کا تعارف کرایا، ان میں صرف ایک شیخ تاج الدین قلعی حنفی عالم و محدث تھے، ان مشائخ میں شیخ محمد وفد اللہ بن شیخ محمد بن محمد بن سلیمان مالکی المذہب تھے، جس دور میں شاہ صاحب نے حرمین میں قیام کیا ہے، اس دور میں حجاز کی علمی قیادت اور تعلیم و تدریس کے میدان (بالخصوص فنِ حدیث کی تعلیم) میں سربراہی اور پیشوائی علماء و محدثین یمن یا کردی النسل علماء

---

[1] تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو کتاب "عرب و دیار ہند" تالیف مولانا خواجہ بہاء الدین اکرمی ندوی بھٹکلی۔

[2] مثلاً علامہ شیخ علی متقی برہانپوری، صاحب کنز العمال، علامہ قطب الدین نہروالی، ملا علی قاری ہروی مکی، شیخ عبدالوہاب متقی اور شیخ محمد حیاۃ سندی وغیرہ۔

کے ہاتھ میں تھی، اور وہ بالعموم شافعی تھے؛ ان تمام اسباب کی بناء پر شاہ صاحب کو فقہ شافعی کے اصول و قواعد؛ اس کی خصوصیات اور بعض مابہ الامتیاز چیزوں سے واقف ہونے کا پورا موقعہ ملا، اور اسی طرح فقہ مالکی اور فقہ حنبلی سے بھی باخبر ہونے کا وہ موقعہ ملا جو علمائے ہندوستان کو طویل عرصہ سے (تاریخی، جغرافیائی، سیاسی، اور تمدنی اسباب کی بناء پر) میسر نہیں آیا تھا، اور اس طرح مذاہب اربعہ کا تقابلی مطالعہ (الفقہ المقارن) ان کے لئے ممکن اور آسان ہوا، جو ان علماء کے لئے دشوار تھا، جن کو یہ مواقع حاصل نہیں ہوئے تھے۔

شاہ صاحب ۱۱۴۳ھ میں تیس ۳۰ سال کی عمر میں جب وہ تقریباً بارہ ۱۲ سال ہندوستان میں درس دے چکے تھے عازم حجاز ہوئے، لیکن اللہ تعالےٰ نے ان کی طبیعت میں فطری طور پر جو جامعیت نظر و قلب میں وسعت؛ اور فطرتاً تطبیقی ذوق؛ اور عارف رومیؒ کی اس وصیت پر عمل کرنے کا فطری رجحان پیدا کیا تھا کہ ؎

تو برائے وصل کردن آمدی
نے برائے فصل کردن آمدی

اس کی بناء پر سفر حجاز سے پہلے ہی ان کے اندر تطبیق بین الفقہ والحدیث کا جذبہ اور فقہائے محدثین کے مسلک کو ترجیح دینے اور اس کو اپنی زندگی کا وتیرہ بنانے کا عزم پیدا کر دیا گیا تھا۔ "الجزء اللطیف فی ترجمۃ العبد الضعیف" میں خود تحریر فرماتے ہیں:۔

بعد ملاحظۂ کتب مذاہب اربعہ	مذاہب اربعہ اور ان کے اصولِ فقہ
و اصول فقہ ایشاں و احادیثے کہ	کی کتابوں کے مطالعہ اور جن احادیث
متمسک ایشاں است قرار داد	سے وہ استدلال کرتے ہیں؛ ان پر غور
خاطر بمدد نور غیبی روش فقہائے محدثین	و فکر کرنے کے بعد طبیعت میں فقہائے محدثین

افتاد، بعد ازاں شوق زیارت حرمین محترمین در سر افتاد۔[1]	کی روش کی پسندیدگی قرار پذیر ہوئی، اس میں نور غیبی کی مدد بھی شامل تھی، اس کے بعد حرمین محترمین کی زیارت کا شوق دامن گیر ہوا۔

شاہ صاحبؒ نے غالی فقہاء (جو اپنے مذہب سے سر مو انحراف کرنے کے لئے تیار نہیں) اور فرقۂ ظاہریہ (جو مطلقاً فقہ کا منکر اور ان فقہاء کی شان میں لب کشائی کرتا ہے جو حاملین علم کے سرتاج اور اہل دین کے امام و پیشوا ہیں) کی روش پر سخت تنقید کی ہے، اور دونوں کے غلو و انتہا پسندی کو ناپسند کیا ہے، اور صاف لکھا ہے کہ "إنَّ الحقَّ أمرٌ بین بین" معاملہ بین بین ہے، نہ پہلا فریق سَو فیصدی حق پر ہے، نہ دوسرا فریق۔

شاہ صاحبؒ اپنی معرکۃ الآراء کتاب "حجۃ اللہ البالغہ" میں تحریر فرماتے ہیں:۔

"ایک طرف کلام فقہاء پر تخریج، دوسری طرف احادیث کے الفاظ کا تتبع، دونوں کی دین میں مستحکم اصل موجود ہے، اور ہر زمانہ کے علمائے محققین ان دونوں اصولوں پر عمل کرتے رہے ہیں، بعض ایسے ہیں جن کا تخریج کے بارے میں قدم پیچھے اور حدیث کے الفاظ کے تتبع میں قدم آگے ہے، اور بعض اس کے برعکس، ان میں سے کسی ایک اصول سے بھی مطلقاً صرفِ نظر مناسب نہیں، جیسا کہ فریقین کے عوام کا شیوہ ہے، اس بارے میں صراط مستقیم یہی ہے کہ دونوں کے درمیان تطبیق کی کوشش کی جائے، اور ایک کی کمی دوسرے سے پوری کی جائے، اور یہی امام حسن بصریؒ کا قول ہے۔[2]"

---

[1] الجزء اللطیف فی ترجمۃ العبد الضعیف شمولہ انفاس العارفین مطبع مجتبائی ص ۲۰۳-۲۰۴ [2] حجۃ اللہ البالغہ ص ۱۶۱ جزء اول تفصیل کے لئے پوری بحث "حکایۃ حال الناس قبل المأۃ الرابعۃ وبعدھا" میں دیکھی جائے۔

اپنے فارسی وصیت نامہ میں تحریر فرماتے ہیں:۔

در فروع پیروی علماء محدثین کہ جامع باشند میاں فقہ و حدیث کردن ودائماً تفریعات فقہیہ را بر کتاب وسنت عرض نمودن۔	مسائل فروعی میں ایسے علماء محدثین کی پیروی کرنی چاہیئے جو فقہ و حدیث دونوں کے عالم ہوں، مسائل فقہیہ کو کلام اللہ اور حدیث رسول اللہ صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم سے ملاتے رہنا چاہیئے۔

آگے تحریر فرماتے ہیں:۔

امت را ہیچ وقت از عرض مجتہدات برکتاب وسنت استغناء حاصل نیست[۱]	امت کے لئے قیاسی مسائل کا کلام اللہ اور حدیث رسول اللہ صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم سے تقابل کرتے رہنا ضروری ہے، اس سے کبھی بے نیازی نہیں ہوسکتی۔

شاہ صاحب کا سارا علمی نشوونما فقہ حنفی واصول فقہ حنفی کے ماحول میں ہوا تھا، اور وہ مذہب حنفی کی خصوصیات سے اتنا ہی واقف اور ان کے اتنا ہی قائل تھے، جتنا کہ کوئی بڑے سے بڑا حنفی عالم ہوسکتا ہے، وہ اس حقیقت سے واقف تھے، اور جا بجا اس کا اظہار کرتے ہیں کہ مختلف تاریخی، علمی، سیاسی و تمدنی اسباب کی بناء پر جتنی فقہ حنفی (نیز فقہ شافعی) کی خدمت ہوئی ہے، اور ان کی نوک پلک درست کی گئی ہے، ان کے متون کی شرح اور اصول کی تفریع کی گئی ہے،

---

[۱] وصیت نامہ فارسی ص۲-۳

کسی دوسرے مذہب کے سلسلہ میں پیش نہیں آیا، وہ امام ابوحنیفہ رح کے متعلق لکھتے ہیں:۔

كان عظيم الشان في التخريج على مذهب ابراهيم وأقرانه دقيق النظر في وجوه التخريجات مقبلا على الفروع اتم إقبال[1]۔	امام ابوحنیفہ کا مرتبہ ابراہیم نخعی اور ان کے ہم مرتبہ علماء کے مذہب پر اجتہاد و استنباط کے سلسلہ میں بہت بلند تھا، ان تخریجات کے وجوہ و اشکال میں وہ بڑی دقت نظر رکھتے تھے، مسائل جزئیہ اور فروع کے استخراج میں ان کا انہماک بہت بڑھا ہوا تھا۔

لیکن اس کے ساتھ وہ امام مالک رح کی عظمت اور خاص طور پر مؤطا کی صحت، اس کے رتبہ و مقام، اور اس کی برکت کے نہ صرف قائل بلکہ داعی ہیں، اور اس کو حدیث کی اساسی کتاب مانتے ہیں[2]، دوسری طرف مذہب شافعی کے منقح و مصفّٰی اور حدیث سے اقرب ہونے کا ذکر بلند الفاظ میں کرتے ہیں، اور امام شافعی کی دقیق النظری کے بڑے قائل ہیں[3]۔

پھر اس کے ساتھ امام احمد بن حنبل رح کا تذکرہ کرتے ہوئے حجۃ اللہ البالغہ میں لکھتے ہیں:۔

وكان اعظمهم شأنا وأوسعهم رواية، وأعرفهم للحديث مرتبة وأعمقهم فقها احمد بن حنبل ثم اسحاق بن راهويه[4]۔	ان فقہا و محدثین میں سب سے عالی مرتبہ وسیع الروایۃ، حدیث سے باخبر، اور تفقہ میں عمیق النظر امام احمد بن حنبل رح پھر اسحاق بن راہویہ ہیں۔

---

[1] "الانصاف فی بیان أسباب الاختلاف" طبع دار النفائس، بیروت ص۳۹ [2] ملاحظہ ہو مقدمہ مصفّٰی۔

[3] ملاحظہ ہو الخیر الکثیر ص۱۲۴ و کتاب قرۃ العینین ص۲۳۲ [4] حجۃ اللہ البالغہ ج ۱ ص۱۵۰

ان ائمہ اربعہ کے علوّ شان، وسعت علم، دقّت نظر اور امت پر احسان سے (ان کتابوں اور تاریخ وتراجم کے ذریعہ) براہ راست واقفیت اور ان سے دلی عقیدت کی بناء پر شاہ صاحب میں وہ جامعیت اور فقہ وحدیث کے تقابلی مطالعہ میں وہ توازن واعتدال پیدا ہوگیا، جس کی قدرۃً ان علماء ومصنفین سے توقع نہیں کی جاسکتی، جن کا مطالعہ اور ذہنی وابستگی ایک ہی مذہب فقہی اور اس کے بانی ومؤسّس سے تھی، اور ان کو اس دائرہ سے باہر نکلنے کی (بہت سے طبعی وشخصی اسباب کی بناء پر) نوبت نہیں آتی۔

اجتہاد وتقلید کے درمیان نقطۂ اعتدال

حضرت شاہ صاحبؒ کے ان وہبی کمالات اور تجدیدی امتیازات میں سے جن سے اللہ تعالیٰ نے ان کو خاص طور پر نوازا تھا، وہ متوازن ومعتدل مسلک اور وہ نقطۂ اعتدال ہے، جو انھوں نے اجتہاد وتقلید کے درمیان اختیار کیا، اور جو ان کی طبع سلیم، ذوق صحیح اور حقیقت پسندی کا بہترین مظہر ہے، ایک طرف وہ لوگ تھے، جو ہر مسلمان کو خواہ عامی ہو یا خاص براہ راست کتاب وسنت پر عمل کرنے اور ہر معاملہ میں وہیں سے احکام حاصل کرنے کا مکلّف قرار دیتے تھے، اور تقلید کی مطلق حرمت کے قائل تھے، اگر ان کے کلام میں اس کی صراحت نہیں ملتی تو ان کے طرز عمل اور ان کی تحریروں سے قدرتی طور پر یہ نتیجہ نکالا جاسکتا ہے، اس گروہ میں متقدمین میں علّامہ ابن حزمؒ پیش پیش نظر آتے ہیں، لیکن یہ بالکل ایک غیر عملی بات ہے، اور اس کا ہر مسلمان کو مکلّف قرار دینا تکلیف مالایطاق ہے۔

دوسری طرف وہ گروہ تھا جو تقلید کو اسی طرح ہر مسلمان پر واجب قرار دیتا تھا، اور اس کے تارک کو سخت فقہی احکام "فاسق" اور "ضال" سے یاد کرتا تھا جیسا کہ پہلا گروہ مقلدین

اور کسی خاص مذہب فقہی کے متبعین کو، یہ گروہ اس حقیقت کو بھول جاتا تھا کہ تقلید عوام کو نفسانیت اور خودرائی سے بچانے، مسلم معاشرہ کو انتشار اور فوضویت (انارکی) سے محفوظ رکھنے، دینی زندگی میں وحدت و نظم پیدا کرنے، اور احکام شریعت پر بسہولت عمل کرنے کا موقعہ دینے کی ایک انتظامی تدبیر ہے، لیکن انھوں نے اس انتظامی عمل کو تشریعی عمل کا درجہ دے دیا، اور اس پر اس شدت سے اصرار کیا جس نے اس کو ایک مذہب فقہی اور مسئلہ اجتہادی کے بجائے منصوص اور قطعی عمل اور مستقل دین کا درجہ دے دیا۔

شاہ صاحبؒ نے اس بارے میں جو مسلک اختیار کیا، اور اس کی جو تعبیر کی وہ روح شریعت سے قریب تر، قرن اول کے عمل سے زیادہ ہم آہنگ، فطرت انسانی سے زیادہ مطابق اور عملی زندگی سے سازگار ہے، اس سلسلہ میں شاہ صاحبؒ چوتھی صدی ہجری سے پیشتر کے طرز عمل کا ذکر کرتے ہیں، اور بتاتے ہیں کہ لوگوں کو اپنی دینی زندگی میں، عبادات و معاملات میں جو نئے نئے مسائل و مشکلات پیش آتے تھے، ان کو وہ کس طرح حل کرتے تھے، اور اس سلسلہ میں وہ کیا راستہ اختیار کرتے تھے "حجۃ اللہ البالغۃ" کے باب "حکایۃ حال الناس قبل المائۃ الرابعۃ وبعدھا" (چوتھی صدی ہجری سے پیشتر اور اس کے بعد کے لوگوں کا مسائل دینی کی تحقیق و عمل کے بارے میں کیا طرز عمل تھا؟) میں تحریر فرماتے ہیں:۔

قرون اولیٰ میں مسلمانوں کا طرز عمل

"معلوم ہونا چاہئے کہ چوتھی صدی سے قبل کے لوگ کسی ایک معیّن مذہب (فقہی) کی پابندی اور اس کی مکمل تقلید پر اجماع کئے ہوئے نہیں تھے، ابوطالب مکیؒ (اپنی مشہور کتاب) "قوت القلوب" میں لکھتے ہیں: کہ تصنیفی انداز کی کتابیں (اور

فقہی مسائل کے مجموعے) اس زمانہ کے بعد کی باتیں ہیں، لوگوں کی کہی ہوئی باتوں کا کہنا کسی ایک مذہب پر فتویٰ دینا، اس کے قول کو دستور العمل بنا لینا اور اسی کو نقل کرنا اور اسی مذہب کے اصولوں اور بنیادوں پر تفقّہ کا پہلی اور دوسری صدی میں وجود نہیں تھا۔

میں اس میں اضافہ کر کے کہتا ہوں کہ دو ابتدائی صدیوں کے بعد تخریج کا کسی قدر سلسلہ شروع ہوا لیکن یہ بات مسلّم ہے کہ چوتھی صدی کے لوگ ایک ہی مذہب کے دائرہ میں رہ کر تقلید خالص کے پابند اور اسی کے مطابق مسائل و احکام میں تفقّہ اور اسی مذہب کے تحقیقات و اجتہادات کی نقل و روایت کے عادی نہیں تھے، جیسا کہ تتبّع سے معلوم ہوتا ہے۔

امت اور (مسلم معاشرہ) میں دو طبقے تھے ایک علماء کا ایک عوام کا۔

عوام کا تو قصہ یہ ہے کہ وہ ان اجماعی مسائل میں جن میں مسلمانوں یا جمہور مجتہدین کے درمیان کوئی اختلاف نہیں ہے، وہ صرف صاحب شرع (صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی تقلید کرتے تھے، وہ وضو، غسل کرنے اور نماز و زکوٰۃ ادا کرنے کا طریقہ اور اسی طرح کی عبادات و فرائض، اپنے والدین یا اپنے شہر کے استادوں، عالموں سے اخذ کرتے تھے، اور اسی کے مطابق عمل کرتے تھے، اور اگر کوئی نئی بات پیش آتی تو اس کے بارے میں کسی مفتی سے بھی جس تک ان کی رسائی ہوتی تھی، کسی خاص مذہب کے تعین کے بغیر رجوع کر لیتے تھے، اور اس سے مسئلہ پوچھ لیتے تھے۔

جہاں تک خواص کا تعلق ہے ان کا معاملہ یہ تھا کہ جن کا فن حدیث تھا، وہ حدیث سے اشتغال رکھتے تھے، ان کو احادیث نبویہ اور آثار صحابہؓ کا اتنا ذخیرہ

مل جاتا تھا، کہ اس کی موجودگی میں ان کو اس مسئلہ میں کسی اور چیز کی ضرورت نہیں پڑتی تھی، ان کے پاس کوئی نہ کوئی ایسی حدیث جو درجۂ شہرت، استفاضہ یا صحت کو پہونچی ہوتی تھی، یا صحیح حدیث ہوتی تھی، موجود تھی، جس پر فقہاء اور علمائے کبار میں کسی نہ کسی نے عمل کیا ہوتا تھا، اور کسی کے پاس اس کو ترک کرنے کا کوئی معقول عذر نہیں ہوتا تھا، یا جمہور صحابہؓ اور تابعین کے پے در پے ایک دوسرے کی تائید کرنے والے اقوال ان کے پاس ہوتے تھے، جن سے اختلاف کرنے کی کوئی گنجائش نہیں ہوتی تھی، اگر ان میں سے کسی کو مسئلہ میں کوئی ایسی چیز نہ ملتی جس سے اس کا قلب مطمئن ہوتا، نقول کے تعارض یا ترجیح کے اسباب کے عدم وضاحت کی وجہ سے یا کسی اور معقول سبب سے تو پھر وہ اپنے پیشرو فقہاء اور علماء کے کلام کی طرف رجوع کرتا تھا، اگر اس کے بارے میں اس کو دو قول ملتے، تو ان میں سے وہ اس کو اختیار کر لیتا جو زیادہ قوی اور مُدلّل ہوتا، چاہے یہ قول علمائے مدینہ کا ہوتا، یا علمائے کوفہ کا، جو تخریج (اجتہاد و استنباط) کی اہلیت رکھتے تھے، وہ ایسے مسئلہ میں جس میں ان کو کوئی صراحت نہیں ملتی تھی، تخریج و اجتہاد سے کام لیتے تھے، یہ لوگ اپنے اساتذہ یا اہل گروہ کی طرف منسوب کئے جاتے تھے، مثلاً کہا جاتا تھا کہ فلاں شافعی ہے، فلاں حنفی، علمائے حدیث میں بھی جو کسی مذہب سے زیادہ اتفاق کرتا تھا، اس کی طرف منسوب ہو جاتا تھا، مثلاً نسائی اور بیہقی کی نسبت امام شافعیؒ کی طرف کی جاتی تھی، اس زمانہ میں قضاء و افتاء پر اسی کا تقرر کیا جاتا تھا، جس میں اجتہاد کی صلاحیت ہوتی تھی، فقیہ بھی وہی کہلاتا جو مجتہد ہوتا، پھر ان صدیوں کے بعد دوسری طرح کے لوگ

پیدا ہوئے جنھوں نے چپ و راست کا راستہ اختیار کیا"۔[1]

تقلید کی جائز اور فطری شکل

شاہ صاحبؒ غایتِ انصاف اور حقیقت پسندی سے کام لیتے ہوئے ایسے شخص کو تقلید کے بارے میں معذور سمجھتے ہیں جو کسی مذہب فقہی یا معیّن امام کا مقلّد تو ضرور ہے لیکن اس کی نیت محض صاحب شریعت کی پیروی اور اتباع نبویؐ ہے لیکن وہ اپنے اندر اس کی اہلیت نہیں پاتا کہ وہ حکم شرعی اور جو چیز کتاب و سنت سے ثابت ہے اس تک براہ راست پہونچ جائے، اس کے کئی اسباب ہو سکتے ہیں، مثلاً وہ عامی شخص ہے، یا اس کے پاس براہ راست تحقیق کرنے کے لئے وقت و فرصت نہیں، یا ایسے وسائل (علم و تحقیق) حاصل نہیں جن سے وہ نصوص کا خود پتہ چلا لے، یا ان سے مسئلہ استنباط کر لے، شاہ صاحبؒ علامہ ابن حزم کا یہ قول نقل کرنے کے بعد کہ تقلید حرام ہے اور کسی مسلمان کے لئے جائز نہیں کہ وہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کے علاوہ کسی کے قول کو بلا دلیل قبول کرے، تحریر فرماتے ہیں:۔

"ابن حزم کے قول کا مصداق وہ شخص نہیں جو رسول اللہ صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کے قول کے علاوہ کسی کو اپنے لئے واجب الاطاعت نہیں سمجھتا، وہ حلال اسی کو گردانتا ہے جس کو اللہ اور اس کے رسولؐ نے حلال کیا، اور حرام اسی کو مانتا ہے جس کو اللہ اور اس کے رسولؐ نے حرام کیا، لیکن چونکہ اس کو براہ راست آں حضرت صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم (کے اقوال و احوال) کا علم حاصل نہیں، اور وہ آپ کے مختلف اقوال میں تطبیق دینے کی صلاحیت اور آپ کے کلام سے

---

[1] حجۃ اللہ البالغہ ص ۱۵۲-۱۵۳

مسائل استنباط کرنے کی قدرت نہیں رکھتا، وہ کسی خداترس عالم کا دامن پکڑ لیتا ہے' یہ سمجھتے ہوئے کہ وہ صحیح بات کہتا ہے' اور اگر مسئلہ بیان کرتا ہے تو اس میں وہ محض سنت نبویؐ کا پیرو اور ترجمان ہوتا ہے' جیسے ہی اس کو یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس کا یہ خیال صحیح نہیں تھا، اسی وقت وہ بغیر کسی بحث و اصرار کے اس کا دامن چھوڑ دیتا ہے' بھلا ایسے آدمی کو کوئی کیسے مطعون کرے گا، اور اس کو دشریعت کا مخالف قرار دے گا؟!

سب کو معلوم ہے کہ استفتاء اور افتاء کا سلسلہ عہد نبویؐ سے لے کر برابر چلتا رہا ہے' اور ان دونوں میں کیا فرق ہے کہ ایک آدمی ہمیشہ ایک سے فتویٰ لیتا ہے' یا کبھی ایک سے فتویٰ لیتا ہے کبھی دوسرے سے' ایسی حالت میں کہ اس کا ذہن صاف ہے' اس کی نیت سلیم ہے' اور وہ صرف اتباع شریعت چاہتا ہے' یہ بات کیسے جائز نہیں؟ جبکہ کسی فقیہ کے بارے میں ہمارا یہ ایمان نہیں ہے کہ اللہ نے اس پر آسمان سے فقہ اتاری' اور ہم پر اس کی اطاعت فرض کی ہے' اور یہ کہ وہ معصوم ہے تو اگر ہم نے ان فقہاء اور ائمہ میں سے کسی کی اقتداء کی تو محض اس بناء پر کہ ہم یہ جانتے ہیں کہ وہ کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ کا عالم ہے' اس کا قول (فتویٰ) دو حالتوں میں سے کسی ایک حالت سے خالی نہیں' یا وہ کتاب و سنت کے صریح حکم پر مبنی ہے' یا وہ استنباط کے اصولوں میں سے کسی اصول کے مطابق اس سے مستنبط کیا ہوا ہے' یا اس نے قرائن سے یہ سمجھ لیا ہے کہ حکم فلاں علّت کے ساتھ وابستہ ہے (اور وہ علّت یہاں پائی جاتی ہے) اور اس کا قلب اس بات پر مطمئن ہو گیا ہے'

اس بناء پر اس نے غیر منصوص کو منصوص پر قیاس کیا، گویا وہ زبان حال سے کہتا ہے کہ میں سمجھتا ہوں کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم نے یہ فرمایا کہ جہاں یہ علت پائی جائے، وہاں حکم یہ ہوگا، اور یہ قیاسی مسئلہ اس عموم اور کلیہ میں شامل ہے' اس طرح اس حکم کی نسبت بھی آں حضرت صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کی طرف کی جا سکتی ہے' لیکن ظنّی طریقہ پر' اگر صورت حال یہ نہ ہوتی تو کوئی صاحبِ ایمان کسی مجتہد کی تقلید نہ کرتا، اگر ہمیں رسول معصوم صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم جن کی طاعت کو اللہ تعالےٰ نے ہم پر فرض کیا ہے کوئی حدیث قابلِ وثوق سند سے پہونچے جو اس مجتہد یا امام کے فتوے اور قول کے خلاف ہو' اور ہم اس حدیث کو چھوڑ دیں اور اس ظنّی طریقہ کی پیروی کریں' تو ہم سے بڑھ کر نارو اطریقہ اختیار کرنے والا کون ہوگا، اور کل ہمارا خدا کے سامنے کیا عذر ہوگا؟"[1]

مذاہب اربعہ کی خصوصیت

اس منصفانہ اور محققانہ تجزیہ کے بعد شاہ صاحبؒ ان چار فقہی مذاہب (حنفی' مالکی، شافعی، حنبلی) کے بارے میں جن پر عالم اسلام میں عام طور پر عمل کیا جا رہا ہے' اپنے رسالہ "عقد الجيد فی أحكام الاجتهاد والتقليد" میں جو "بہ قامت کہتر بقیمت بہتر" کا مصداق ہے، تحریر فرماتے ہیں:—

"یاد رکھو کہ ان مذاہب اربعہ کے اختیار کرنے میں بڑی مصلحت ہے، اور

---

[1] حجۃ اللہ البالغہ ص۱۵۵-۱۵۶

ان چاروں کو بالکل نظرانداز کردینے میں بڑا مفسدہ ہے، اس کے کئی وجوہ واسباب ہیں، ایک یہ کہ امت کا اس پر اتفاق رہا ہے کہ شریعت کے معلوم کرنے کے بارے میں وہ سلف متقدمین پر اعتماد کرے، تابعین نے اس بارے میں صحابہؓ پر اعتماد کیا اور تبع تابعین نے تابعین پر و علی ہذا القیاس ہر دور کے علماء نے اپنے پیشروؤں پر اعتماد کیا، عقل سے بھی اس کا مستحسن ہونا ثابت ہوتا ہے، اس لئے کہ شریعت کے علم کا ذریعہ نقل اور استنباط ہے، اور نقل جب ہی ممکن ہے، جب ہر طبقہ اپنے اس پہلے طبقہ سے جو اس سے متصل ہے اخذ کرے، استنباط میں بھی یہ ضروری ہے کہ متقدمین کے مذاہب معلوم ہوں تاکہ ان کے اقوال کے دائرہ سے خارج ہو کر خرق اجماع نہ ہو جائے، اس لئے ان اقوال کے جاننے اور سابقین سے مدد لینے کی ضرورت ہے، دوسرے علوم و فنون اور ہنروں اور پیشوں کا بھی یہی حال ہے، صرف نحو، طب، شاعری، لوہاری، نجاری، رنگریزی سب اسی وقت حاصل ہوتے ہیں، جب ان کے استادوں اور ان کے ساتھ اشتغال رکھنے والوں کی صحبت اختیار کی جائے، اس کے بغیر مہارت حاصل ہو جائے ایسا بہت کم پیش آتا ہے، اگرچہ عقلاً ایسا ممکن ہے لیکن واقعۃً ہوتا نہیں۔

جب یہ بات متعین ہو گئی کہ سلف کے اقوال و تحقیقات پر اعتماد ضروری ہے تو پھر یہ ضروری ہو گیا کہ جن اقوال پر اعتماد کیا جا رہا ہے، وہ سند صحیح سے مروی، مشہور کتابوں میں مدوّن ہوں، اور ان پر ایسا کام ہوا ہو کہ اس میں راجح اور مرجوح اور عام و خاص کا امتیاز آسان ہو، جہاں اطلاق پایا جاتا ہے، وہاں

یہ پتہ چل سکے کہ اس میں مفید کیا ہے؟ مختلف اقوال میں تطبیق دی جاچکی ہو اور احکام کے علل پر روشنی ڈالی جاچکی ہو، نہیں تو ایسے مذاہب و اجتہادات پر اعتماد صحیح نہیں ہوگا، ان پچھلے ادوار میں کوئی مذہب (فقہی) بھی ایسا نہیں ہے، جس میں یہ صفات پائے جاتے ہوں، اور یہ شرطیں پوری ہوتی ہوں سوائے ان مذاہب اربعہ کے"[1]

اس طرح شاہ صاحب نے اجتہاد و تقلید کے درمیان وہ نقطۂ اعتدال اختیار کیا ہے، جو مقاصد شریعت، فطرت انسانی اور واقعات کی دنیا سے پورے طور پر مطابق ہے، انھوں نے تقلید کے ساتھ یہ شرط لگا دی ہے کہ اس بارے میں ذہن صاف اور نیت درست ہو کہ مقصود صاحب شریعت صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کا اتباع اور کتاب و سنت کی پیروی ہے، اور یہ اس اعتماد پر ہے کہ ہم جس کو واسطہ بنا رہے ہیں، وہ کتاب و سنت کا عالم اور شریعت اسلامی کا محض نمائندہ اور ترجمان ہے، نیز یہ کہ ذہن اس کے لئے تیار رہے، (خواہ اس کا موقعہ مدتوں میں آئے) کہ جب اس بات کا یقین پیدا ہو جائیگا کہ صورت حال اس سے مختلف ہے، اور سنت سے ثابت حکم دوسرا ہے تو ایک صاحب ایمان کو دوسری شکل کے اختیار کرنے میں کبھی تامل نہ ہوگا۔

فَلَا وَرَبِّكَ لَا يُؤْمِنُونَ حَتّٰى يُحَكِّمُوْكَ	تمہارے پروردگار کی قسم یہ لوگ جب تک
فِيْمَا شَجَرَ بَيْنَهُمْ ثُمَّ لَا يَجِدُوْا فِيْٓ	اپنے تنازعات میں تمہیں منصف نہ بنائیں
اَنْفُسِهِمْ حَرَجًا مِّمَّا قَضَيْتَ	اور جو فیصلہ تم کر دو اس سے اپنے دل میں
وَيُسَلِّمُوْا تَسْلِيْمًا ۝	تنگ نہ ہوں بلکہ اس کو خوشی سے
(سورۂ نساء - ۶۵)	مان لیں تب تک مومن نہیں ہوں گے۔

---

[1] عقد الجید ص ۳۶-۳۸

ہر زمانہ میں اجتہاد کی ضرورت

مذاہب اربعہ کی خصوصیات اور فقہائے محدثین کی خدمات اور ان کی عظمت کا پورا اعتراف کرتے ہوئے اور اس فقہی و حدیثی ذخیرہ کو بیش قیمت اور قابل استفادہ قرار دیتے ہوئے اور اس سے بے نیازی و استغناء کو مضر و محرومی کا سبب مانتے ہوئے شاہ صاحب اس کے قائل ہیں کہ اجتہاد (اپنی شرطوں اور ضروری احتیاطوں کے ساتھ) ہر دور کی ضرورت، حیات انسانی اور تمدن و معاشرت کی تغیر پذیری، اور نمو و ارتقا کی صلاحیت اور انسانی ضروریات، حوادث و تغیرات کے تسلسل کا فطری تقاضا اور شریعت اسلامی کی وسعت، اس کے من جانب اللہ ہونے اور قیامت تک انسانوں کی رہنمائی اور معاشرہ کے جائز تقاضوں کی تکمیل کی صلاحیت رکھنے کا ثبوت ہے، جس کا اظہار اور ثبوت ہر دور میں ضروری اور حاملین شریعت کا فرض ہے۔

مقدمہ مصفّٰی میں لکھتے ہیں:۔

"اجتہاد ہر زمانہ میں فرض بالکفایہ ہے، یہاں اجتہاد سے مراد اجتہاد مستقل نہیں، جیسا کہ امام شافعیؒ کا اجتہاد تھا، جو جرح و تعدیل، زبان دانی وغیرہ میں کسی دوسرے کے محتاج نہ تھے، اور اسی طرح اپنی مجتہدانہ درایت میں (اپنے پورے اقسام کے ساتھ) وہ دوسرے کے تابع نہ تھے، مقصود اجتہاد منتسب ہے، اور وہ نام ہے احکام شرعی کو ان کے تفصیلی ادلّہ کے ذریعہ جاننے کا، اور مجتہدین کے طریقہ پر تفریع مسائل اور ترتیب احکام کا، خواہ وہ کسی صاحب مذہب کی رہنمائی سے ہو۔

اور ہم جو یہ کہتے ہیں کہ اجتہاد اس زمانہ میں فرض ہے (اور یہ محققین اہل علم کا اجماعی مسئلہ ہے) اس کی وجہ یہ ہے کہ مسائل کثیر الوقوع ہیں جن کا حصر ممکن نہیں، اور ان کے بارے میں اللہ کے حکم کا جاننا واجب ہے، اور جو تحریر و تدوین میں آچکا ہے وہ ناکافی ہے، اور ان کے بارے میں اختلافات بہت ہیں، جن کا حل کرنا دلائل کی طرف رجوع کئے بغیر ممکن نہیں، ائمہ مجتہدین سے جو مسائل کی روایات منقول ہیں، ان میں اکثر میں انقطاع ہے کہ قلب ان پر اطمینان کے ساتھ اعتماد نہیں کرسکتا، اس لئے ان کو قواعد اجتہاد پر پیش کئے اور تحقیق کئے بغیر معاملہ بنتا نہیں[1]"

---

[1] مقدمہ مصفّٰی (فارسی) ص۱۲ مطبع فاروقی دہلی۔

بابِ ہفتم

شریعتِ اسلامی کی مربوط و مدلّل ترجمانی اور اسرار و مقاصدِ شریعت کی نقاب کشائی

حجۃ اللہ البالغۃ کے آئینہ میں

حجۃ اللہ البالغہ کا امتیاز و انفرادیت

شاہ صاحبؒ کی سب سے معرکۃ الآراء کتاب اور علمی کارنامہ "حجۃ اللہ البالغہ" ہے جس میں دین و نظامِ شریعت کا ایک ایسا مربوط، جامع اور مدلّل نقشہ پیش کیا گیا ہے، جس میں ایمانیات، عبادات، معاملات، اخلاق، علم الاجتماع و تمدن، سیاست و "احسان" کو ایک ایسے ربط و تعلق اور صحیح تناسب کے ساتھ پیش کیا گیا ہے کہ وہ ایک ہار کے موتی اور ایک زنجیر کی کڑیاں معلوم ہوتی ہیں، اور ان میں اصول و فروع، مقاصد و وسائل اور دائمی و موقّت کا فرق نگاہوں سے اوجھل نہیں ہونے پاتا، جو ان بہت سی تصنیفات و تحقیقات کی قدیم کمزوری ہے جو کسی غلو یا ناانصافی کے ردّ عمل یا کسی جذبہ یا جوش کے ماتحت لکھی گئی ہیں، اس ربط و تناسب کی وجہ (شاہ صاحب کی فطری سلامتِ طبع و اعتدال کے علاوہ) ان کا علم حدیث کا گہرا اور وسیع مطالعہ اور وہ مخصوص مزاج ہے جو حدیث اور سیرت کے اشتغال یا مزاجِ نبویؐ سے مناسبت رکھنے والے کسی "عالم ربّانی" کی صحبت و تربیت میں پیدا ہوتا ہے، اسلام کی یہ مربوط و جامع ترجمانی جو حجۃ اللہ کے صفحات میں دیکھنے میں آتی ہے،

بہت کم دینی تصنیفات میں نظر آئیگی،[1] اس طرح حجۃ اللہ البالغہ اس دور عقلیت کے لئے ایک نیا علم کلام بن گیا ہے، جس میں ایک حق پسند و سلیم الطبع انسان کے لئے (جس کو علمی استعداد اور دقّت نظر کا بھی کچھ حصہ ملا ہو) تشفی کا وافر سامان ہے، ہمارے علم میں کسی مذہب کی تائید اور اس کی حکیمانہ توجیہ و تشریح میں (ان زبانوں میں جن سے ہم واقف ہیں) اس پایہ کی کتاب نہیں لکھی گئی، اور اگر لکھی گئی تو اس وقت علمی دنیا کے سامنے نہیں ہے۔

بارہویں صدی کے کچھ بعد ہی ہندوستان اور پورے عالم اسلام میں (مختلف تعلیمی، تمدنی، علمی و عقلی اسباب کی بناء پر) ایک خاص طرح کی "عقلیت" کا جو دور شروع ہونے والا تھا، اور احکام شریعت کے اسرار و مصالح کی جستجو کا جو عام ذوق پیدا ہونے والا تھا اور اس کی وجہ سے بہت سے ذہن بھٹکنے اور بہت سے قلم بہکنے کے لئے تیار تھے، خاص طور پر حدیث اور سنت (خاص اسباب کی بناء پر) اعتراضات و شبہات کا سب سے زیادہ نشانہ بننے والی تھی[2]، ان نئے تقاضوں سے صحیح طور پر وہی شخص عہدہ برآ ہو سکتا تھا جو کتاب و سنت علوم حکمت، علم کلام، علم الاخلاق، علم النفس (اور اپنے زمانہ کے حدود کے اندر) علم الاقتصاد علم المعیشت اور علم السیاست سے واقف ہو، پھر ان سب کے ساتھ احسان اور تزکیہ کے

---

[1] معاصر عرب فضلاء و اہل نظر میں راقم سطور نے زعیم مغرب علامہ علال الفاسی مراکشی مصنف "مقاصد الشریعۃ الاسلامیہ و مکارمہا" اور معالی الاستاد محمد المبارک سابق عمید کلیۃ الشریعۃ و وزیر شام کو شاہ صاحب کی مدح اور حجۃ اللہ البالغہ کی تعریف میں ہمیشہ رطب اللسان پایا، وہ خاص طور پر اسی پہلو سے متاثر تھے کہ اس کتاب میں دین کے تمام شعبوں یہاں تک کہ اخلاق اور تزکیۂ نفس و احسان تک کی نمائندگی و ترجمانی ہے۔

[2] اس کی تفصیل مصنف کے رسالہ "اسلامی مزاج و ماحول کی تشکیل و حفاظت میں حدیث کا بنیادی کردار" میں دیکھی جا سکتی ہے، ملاحظہ ہو ص ۴۱-۴۵

فن کے جوہر و حقیقت سے نہ صرف آگاہ بلکہ اس میں درجۂ اجتہاد پر فائز ہو۔

اس سب کا اقتضاء تھا کہ اس دور کے شروع ہونے سے پہلے بارہویں صدی کے امام کے قلم سے ایسی کتاب لکھوا دی جائے، جو اس ضرورت کو اس بڑی حد تک پورا کرے، جو کسی ایسے انسان کے قلم سے ممکن ہے، جو بہرحال انسان ہے، وہ نہ معصوم ہے، نہ اس کا علم سارے زمانوں، مقامات، اور معلومات پر محیط ہے، اس پر اپنے زمانہ کی (کم سے کم درجہ میں) چھاپ اور اس نظام تعلیم و تربیت کا اثر بھی ہے، جس میں اس نے نشو و نما پایا ہے، پھر بھی وہ اصلاً دانش کدۂ قرآنی اور درس گاہ حدیث و سنت کا فیض یافتہ اور ان کا ترجمان نظر آتا ہے۔

شاہ صاحبؒ کتاب کی تصنیف کے محرّکات و دواعی کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:۔

> "علومِ حدیث میں سب سے باریک، دقیق و عمیق، رفیع و بدیع علم، اسرارِ دین کا وہ علم ہے، جس میں احکام کی حکمتیں اور ان کے لِمّیات اور خواص اعمال کے اسرار و نکات بیان کئے جائیں، جن کے ذریعہ انسان شریعت کی لائی ہوئی چیزوں کے بارے میں صاحبِ بصیرت بن جاتا اور خلط و خبط سے محفوظ رہتا ہے[۱]۔"

موضوع کی نزاکت

لیکن حقائقِ دینی اور احکامِ شرعی کی حکمتوں، مصالح اور اسباب و علل کے بیان کرنے کا موضوع بڑا نازک ہے، ذرا سی بے اعتدالی، کسی خاص رُجحان کے غلبہ یا زمانہ کے اثر سے پڑھنے والے کا ذہن شرائع سماوی اور تعلیمات نبویؐ کی پٹری سے اتر کر جس میں اصل مقصود رضائے الٰہی، قربِ خداوندی اور نجاتِ اخروی کو قرار دیا گیا ہے، مادّی منافع زندگی کی

---

[۱] مقدمہ حجۃ اللہ البالغہ ص۳

بہتر تنظیم اور تمدنی فوائد یا سیاسی مقاصد کے حصول کی پٹری پر پڑجاتا ہے اور سعی وجہد کے پورے سلسلہ سے ایمان واحتساب[1] کی روح یا تو بالکل نکل جاتی ہے یا بہت کمزور و مجروح ہو کر رہ جاتی ہے، مثال کے طور پر نماز کی حکمت و مصلحت یہ بیان کی جاسکتی ہے کہ وہ ایک فوجی پریڈ ہے اور اس سے نظم واطاعتِ امیر اور حکومت اسلامی کے قیام میں مدد ملتی ہے، روزہ صحت کے لئے مفید ترین طریقہ ہے، زکوٰۃ اہل دولت پر غریبوں کا ٹیکس ہے، حج ایک سالانہ بین الاقوامی اسلامی مؤتمر (کانفرنس) ہے، جس میں ملت کے مفاد میں مسائل پر غور و مشورہ کیا جاتا ہے۔

ان خطرات کے پیش نظر (جنھوں نے امکانات واحتمالات سے بڑھ کر واقعات اور عملی مثالوں کی جگہ لے لی ہے) اس موضوع سے صحیح طور پر وہی عالم عہدہ برآ ہو سکتا تھا، جس کے ہاتھ میں دین و شریعت کا اصل سر رشتہ ہو، جو شرائع الٰہی کے نزول اور انبیاء کی بعثت کے مقصد سے آگاہ ہو، اور جس کے رگ و پے میں ایمان واحتساب کی روح سرایت کرچکی ہو اور جس کا ذہنی و علمی نشو و نما کتاب و سنت اور ایمان واحتساب کے ماحول میں اور ان کے زیر سایہ ہوا ہو، اور شاہ صاحب (جیسا کہ ان کے حالات سے معلوم ہو چکا ہے) اس نازک موضوع پر قلم اٹھانے کے لئے موزوں ترین شخصیت تھے۔

---

[1] حدیث و سنت کی اصطلاح میں کسی عمل کو اجر و ثواب کی لالچ اور شوق اور اس پر اللہ کی طرف سے جو وعدے ہیں، ان کے یقین کے ساتھ کرنے کو "احتساب" کہتے ہیں، صحیح حدیث میں آتا ہے "من صام رمضان ایمانًا واحتسابًا غُفِرَلَه ماتقدم من ذنبه" (بخاری) (جو رمضان کے روزے اللہ کے وعدوں پر یقین کرتے ہوئے اور اس کے اجر و ثواب کے شوق و طمع میں رکھے گا اس کے سب پچھلے گناہ معاف ہو جائیں گے) قیام لیلۃ القدر کے بارے میں بھی ایسی ہی حدیث وارد ہوئی ہے۔

مستقل تالیف کی ضرورت اور علمائے متقدمین کی ابتدائی کوششیں

شاہ صاحبؒ اس موضوع پر متقدمین کی مختصر کاوشوں کا ذکر کرتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں:

"متقدمین نے ان مصالح کی نقاب کشائی کی ہے جن کی ابواب شرعی میں رعایت کی گئی ہے، بعد کے محققین نے بعض بڑے قیمتی نکتے بھی بیان کئے ہیں لیکن اس کی مقدار اتنی ہی ہے کہ اب اس موضوع پر کلام کرنا خرق اجماع نہیں رہا، کسی نے اس موضوع پر مستقل تصنیف نہیں کی، اور اس کے اصول و فروع کو پورے طور پر مرتب نہیں کیا"[1]

اس سلسلہ میں شاہ صاحب نے امام غزالیؒ، علامہ خطابی، اور شیخ الاسلام عزّ الدین بن عبدالسلام کا حوالہ دیا ہے، جن کی کتابوں اور تحریروں میں جستہ جستہ ایسے مضامین اور اشارے ملتے ہیں[2]، شاہ صاحب نے اس دعوے کی تردید کے سلسلہ میں کہ احکام شرعی مصالح پر مشتمل نہیں ہیں، اور اعمال و جزا میں مناسبت کا ہونا کچھ ضروری نہیں ہے' ان آیات و احادیث سے استدلال کیا ہے جن میں اعمال اور ان کے نتیجہ میں ربط بتایا گیا ہے' بعض احکام کی علت و مصلحت بھی بیان کی گئی ہے' نیز ان احادیث کا بھی ذکر کیا ہے جن میں کسی عبادت یا عمل کی مشروعیت کا سبب یا تعیّنات کے اسرار بیان کئے گئے ہیں' نیز بعض ممانعتوں کے ان اسباب اور حکمتوں کی مثالیں بھی دی ہیں جو حضرت عمرؓ اور دیگر صحابہؓ سے منقول ہیں[3]، اور ان خیالات و ظنون کی تردید فرمائی ہے' اور ان کا جواب دیا ہے، جو اس نازک عمل کی تدوین کو ناممکن یا غیر مفید یا "فعلِ جدید" بتاتے ہیں' اور اس کی وضاحت کی ہے کہ اس موضوع کی طرف اس وقت پوری توجہ نہ ہونے کے

---

[1] مقدمہ حجۃ اللہ البالغہ ص۳ [2] ایضاً ص۶ [3] ایضاً ص۵-۶

کیا اسباب تھے[۱]

اس فن کی تدوین کی ضرورت و حکمت بیان کرتے ہوئے شاہ صاحب نے لکھا ہے کہ بعض ایسی احادیث کو جو بظاہر ہر طرح سے مخالفِ قیاس معلوم ہوتی ہیں، بعض فقہاء نے مخالف عقل بتا کر ان کو رد کرنا جائز سمجھا، اس لئے بھی احادیث کے مطابق عقل و قیاس ہونے کو ثابت کرنا ضروری ہو گیا[۲]، امت کے مختلف طبقات کا متعارض طرزِ عمل بعض کا عقل و قیاس سے بالکل آنکھیں بند کر لینا بعض کا تاویل اور ایسے موقعہ پر "صرف عن الظاھر" کا بے تکلف عمل کرنا جہاں احادیث اصول عقلیہ کے مخالف نظر آئیں اور اس بارے میں بہت سی جماعتوں کی بے اعتدالی، شاہ صاحب کے نزدیک اس فن کی تدوین جدید کو نہ صرف جائز و مفید قرار دیتی ہے، بلکہ اس کو دین کی عظیم ترین خدمت اور وقت کی اہم ضرورت ثابت کرتی ہے[۳]۔

ضرورت کے اس احساس، عملی تجربے اور وقت کے تقاضے کے ماسوا شاہ صاحب کو اس کام کی تکمیل کے لئے بعض بشارات غیبی اور بارگاہِ رسالتؐ سے ایک ایسا اشارہ بھی معلوم ہوا جس سے اندازہ ہوا کہ دین کی ایک نئی نوعیت کی شرح مطلوب ہے، شاہ صاحبؒ فرماتے ہیں کہ "میں نے سینہ میں ایک ایسی روشنی پائی جو برابر بڑھتی رہی، مکہ معظمہ کے زمانۂ قیام میں امام حسنؓ اور امام حسینؓ کو خواب میں دیکھا کہ انھوں نے مجھے قلم عطا کیا اور کہا کہ یہ ہمارے نانا رسول اللہ صلے اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کا قلم ہے[۴]"۔

شاہ صاحب کے تلامذہ اور اصحاب میں سب سے زیادہ ان کے ماموں زاد بھائی، برادر نسبتی، سفر حضر کے رفیق اور تلمیذ رشید شیخ محمد عاشق پھلتی کا اس کام کی تکمیل کے لئے سب سے زیادہ تقاضا و اصرار تھا، جو شاہ صاحب کے سب سے بڑے مزاج داں اور ان کے علوم و کمالات سے سب سے زیادہ واقف تھے[۵]۔

---

۱ مقدمہ حجۃ اللہ البالغہ ص ۲ ۲ ایضاً ص ۹ ۳ ایضاً ۴ ایضاً ص ۳ ۵ ایضاً ص ۲

بہر حال اللہ تعالےٰ نے شاہ صاحب کو اس اہم کام کی تکمیل کی توفیق عطا فرمائی اور ان کے قلم سے یہ جلیل القدر کتاب نکل کر اہل علم کے ہاتھوں تک پہونچی[1]۔

تمہیدی و بنیادی مضامین تکلیف و مجازات

کتاب کے ابتدائی حصہ میں شاہ صاحب نے ان تمہیدی مباحث کو شامل کیا ہے جن سے ہدایتِ ربّانی، تعلیماتِ آسمانی اور انبیاء کی بعثت اور ان کی تعلیم و تربیت کی ضرورت ثابت ہو، اس میں بڑی اصولی

---

[1] حجۃ اللہ البالغہ سب سے پہلے بھوپال کے عالم و باخدا وزیر و منتظم ریاست مدار المہام مولانا جمال الدین (م ۱۲۹۹ھ) کے ایماء و ہدایت پر انھیں کے مصارف سے مولانا محمد احسن صدیقی (م ۱۳۱۲ھ) کے اہتمام میں مطبع صدیقی بریلی میں ۱۲۸۶ھ میں طبع ہوئی، دوسری مرتبہ امیر الملک والاجاہ نواب سید صدیق حسن خان بہادر (م ۱۳۰۷ھ) کے حکم سے ۱۲۹۶ھ میں مطبع بولاق مصر سے اس کی اشاعت ہوئی، مصر سے اس کے دو ایڈیشن اور نکلے ۱۳۹۹ھ (۱۹۷۸ء) میں مولانا عطاء اللہ حنیف صاحب کے اہتمام میں المکتبۃ السلفیہ لاہور نے اس کا ایک ایڈیشن نکالا جو مصری ایڈیشن کا آفسٹ ہے مصر سے حال میں اس کا چوتھا ایڈیشن نکلا ہے جو مشہور مصری عالم اور اخوانی رہنما سید سابق کی تحقیق و مراجعت مفصل مقدمہ اور مصنف علام کے تعارف اور سوانح کے ساتھ دار الکتب الحدیثۃ قاہرہ اور مکتبۃ المثنیٰ بغداد کی طرف سے شائع ہوا ہے، لیکن کتاب کی تصحیح و تحشیہ، تخریج احادیث اور اشارات کی توضیح کے ذریعہ جو خدمت ہونی چاہئے تھی وہ ابھی تک نہیں ہوئی۔

اردو میں اس کے دو ترجمے شائع ہوئے، پہلا ترجمہ اپنے عہد کے فاضل جلیل و عالم متبحر مولانا عبد الحق حقانی کے قلم سے "نعمۃ اللہ السابغۃ" کے نام سے دو حصوں میں مکمل ہوا، یہ ترجمہ ۱۳۰۲ھ میں مکمل ہوا تھا اور ۱۳۱۳ھ میں مطبع احمدی پٹنہ سے شائع ہوا بعد میں نور محمد اصح المطابع آرام باغ کراچی سے دوبارہ شائع ہوا، دوسرا ترجمہ مولانا خلیل احمد صاحب اسرائیلی کے قلم سے آیات اللہ الکاملہ کے نام سے مطبع اسلامی کی طرف سے شائع ہوا۔

لیکن یہ کتاب ان کتابوں میں نہیں ہے جن کا محض کسی زبان میں منتقل کر دینا اور لفظی ترجمہ کر دینا کافی ہو، اس لئے اردو خواں اصحاب ان ترجموں سے خاطر خواہ فائدہ نہیں اٹھا سکے، اور ان کو اس کتاب کے مضامین کی بلندی اور افادیت کا صحیح اندازہ نہیں ہوا۔

اور بنیادی بحث وہ ہے جو انھوں نے "باب سرّ التکلیف" کے عنوان کے ماتحت پیش کی ہے اور جس میں ثابت کیا ہے کہ "تکلیف"[1] نوعِ انسانی کے فطری تقاضوں میں سے ہے، انسان اپنی زبانِ استعداد سے سوال کرتا ہے کہ خدا اس پر ایسی چیز واجب کرے جو قوتِ ملکیہ کے مناسب ہو، پھر اس پر ثواب دے، اور اس پر قوتِ بہیمیہ میں انہماک کو (جو اس کے اندر ودیعت ہے) حرام کرے اور اس کو سزا دے[2]، اس سلسلہ میں شاہ صاحب کے حیوانات، نباتات اور نوعِ انسانی کے وسیع اور دقیق مطالعہ کا اظہار ہوتا ہے، نیز طبیعیات وطب اور نباتات سے واقفیت بھی ظاہر ہوتی ہے، شاہ صاحب نے عقلی طور پر یہ ثابت کیا ہے کہ انسانوں کو حیوانات ونباتات سے جو امتیاز حاصل ہے، اور ان میں جو استعدادیں اور فطری طلب رکھی گئی ہے، وہ زبانِ حال سے تکلیفِ شرعی اور ہدایتِ ربّانی کا سوال کرتی ہے، شاہ صاحب اس کو "التکفّف الحالی" (زبانِ حال سے بھیک مانگنا اور ہاتھ پھیلانا) کے بلیغ الفاظ سے تعبیر کرتے ہیں، اس کے ساتھ التکفّف العلمی (علمی دریوزہ گری) کا اضافہ کرتے ہیں۔

ان کے نزدیک انسان کے اندر (عقل ونطق کے علاوہ) دو چیزیں اور ہیں "زیادۃ القوۃ العقلیۃ" اور "براعۃ القوۃ العملیۃ" اس میں انسان کے اندر صرف قوتِ عقلیہ اور قوتِ عملیہ کا وجود ہی نہیں، بلکہ ان کی ترقی، بلند ہمتی، طلبِ کمال، ناآسودگی بھی اس کی فطرت میں ہے، شاہ صاحب کے نزدیک خلقِ ملائکہ، حوادثِ عظیمہ اور ارسالِ رُسل اسی کا نتیجہ ہے، وہ یہ سب (عنایۃ بالنوع) اس اعتنا واہتمام کا کرشمہ ہے جو پوری نوعِ انسانی کے شاملِ حال ہے، اور یہ سب ربوبیت ورحمتِ الٰہی کی تجلّیات ہیں، ان کے نزدیک

---

[1] خدا کا اپنے بندوں کو مخاطب کرنا اور اوامر واحکام پر عمل کرنے اور مناہی سے بچنے کا مکلّف بنانا جس کو قرآن مجید میں "الأمانۃ" کے لفظ سے ادا کیا گیا ہے "إِنَّا عَرَضْنَا الْأَمَانَةَ" (الأحزاب-۷۲) کی تفسیر ملاحظہ ہو حجۃ اللہ البالغہ ص ۱۹
[2] ایضاً صفحہ ۲۰

عبادات اور عمل بالشرائع نوعِ انسان کا ایسا ہی نوعی تقاضا ہے، جیسا درندوں کا گوشت کھانا، بہائم کا گھاس چرنا، اور شہد کی مکھیوں کا اپنے سردار (یعسوب) کی فرماں برداری کرنا، البتہ حیوانات کے علوم الہامِ جبلّی سے تعلق رکھتے ہیں، اور انسان کے علوم، اعمال، کسب، نظر یا وحی یا اتباع سے تعلق رکھتے ہیں۔[1]

اس کے بعد پھر شاہ صاحب مجازات (جزا و سزا) کو تکلیف شرعی کا قدرتی تقاضا بتاتے ہیں، ان کے نزدیک اس کے چار[4] اسباب ہیں (۱) صورت نوعیہ کا تقاضا (۲) ملأ اعلیٰ کے اثرات[2] (۳) شریعت کا مقتضیٰ (۴) نبی کی بعثت کا نتیجہ و تقاضا اور اللہ تعالیٰ کے اس کی قبولیت و نصرت کے فیصلہ کا لازمہ،[3] پھر انسانوں میں اپنی جبلّت میں اختلاف کی وجہ سے اخلاق و اعمال اور مراتب کمال میں بھی اختلاف ہوتا ہے، اس موقعہ پر شاہ صاحب نے "ملکیت" اور "بہیمیت" کے اجتماع، ان کے غلبہ و ضعف کے تناسب اور ان کے باہمی تعلق کی نوعیت کی (جن کو وہ "تجاذب" و "اصطلاح" کے الفاظ سے ادا کرتے ہیں) آٹھ شکلیں اور ان کے خواص بیان کئے ہیں، اور ان میں جن کو ترجیح حاصل ہے اس کا ذکر کیا ہے، یہ بحث اور تفریع شاہ صاحب کی قوتِ استقراء اور ذہانت کا نمونہ اور کتاب کی خصوصیات میں ہے،[4] اور ان سے انسانوں کے احوال و فطرت کا دقیق مطالعہ معلوم ہوتا ہے۔[5]

اعمال کی اہمیت اور ان کے اثرات

شاہ صاحبؒ اعمال کی اہمیت، ان کا ملکاتِ انسانی پر اثر، ان اعمال کے دنیا اور

---

[1] باب انشقاق التکلیف من التقدیر ص ۲۰-۲۴ [2] شاہ صاحب نے کتاب کے شروع ہی میں عالم مثال اور ملأ اعلیٰ کو ثابت کیا ہے کہ ان دونوں کے حوالہ کی باربار ضرورت پیش آئیگی، اور بہت سی احادیث و آیات کا ان دونوں کے بغیر سمجھنا مشکل ہے، ملاحظہ ہو ص ۱۳-۱۵ [3] ایضاً ص ۲۵ [4] ایضاً

آخرت میں اثرات مرتب ہونے کی تشکیلیں بیان کرتے ہیں[1]، وہ فرماتے ہیں کہ ایک وقت ایسا آتا ہے کہ اعمال میں (ملأ اعلیٰ کی پسندیدگی یا ناپسندیدگی کی وجہ سے) وہ اثر پیدا ہو جاتا ہے، جو ان تعویذوں اور نقوش میں ہوتا ہے، جو ایسی ہیئت خاصہ اور شرائط کے ساتھ سلف سے منقول ہیں[2]۔

اس طرح یہ ابتدائی مباحث کتاب کے مطالعہ کرنے والے کے ذہن کو آگے کے ان مباحث کے لئے تیار کر دیتے ہیں، جن کی بنیاد ہی انسان کے نوعی تقاضوں کے سمجھنے، تکلیفات شرعی کے اسباب اور ان پر مرتب ہونے والی مجازات، ربوبیت و رحمت کے تقاضوں اعمال کی اہمیت اور ان کے انسانوں کی ہیئتِ اجتماعی اور حیاتِ انسانی سے ربط و تعلق و ان غیبی حقائق اور غیر مرئی عوالم و اشیاء کے وجود کے تسلیم کرنے پر منحصر ہے۔

ارتفاقات

حجۃ اللہ کے مطالعہ سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ شاہ صاحب کی دوربین نگاہ اور بدلتے ہوئے حالات کے عمیق اور حقیقت پسندانہ مطالعہ نے (تائید الٰہی کی مدد سے) یہ دیکھ لیا تھا کہ جلد وہ زمانہ آنے والا ہے جس میں ایک طرف لوگ احکام شریعت بالخصوص حدیث و سنت کی تعلیمات اور ارشادات نبویؐ کے حکم و اسرار کے سمجھنے کی کوشش کریں گے اور ان کے تمدنی، اجتماعی، معاشرتی اور عملی فوائد معلوم کرنا چاہیں گے، دوسری طرف وہ دین و زندگی میں ربط معلوم کرنا چاہیں گے اور دینی تعلیمات اور آسمانی ہدایات کو زندگی کے وسیع دائرہ (CANVAS) اور انسانوں کے باہمی روابط اور اسباب و نتائج کے باہمی تعلق کے سیاق و سباق (CONTEXT) میں سمجھنے اور ان کی افادیت معلوم کرنے کی کوشش کریں گے۔

---

[1] ایضاً ص ۲۹-۳۲ [2] ایضاً ص ۳۰

اس لئے شاہ صاحب نے "حجۃ اللہ البالغہ" کو جو اصلاً شریعت کے اسرار و حِکَم اور حدیث و سنت کی عقلی تشریح کے لئے لکھی گئی، نظام تشریعی سے شروع کرنے سے پہلے جو ان اوامر و نواہی پر مشتمل ہوتا ہے جن کا اصلاً تعلق ثواب و عقاب، نجات و فلاح اخروی اور شاہ صاحب کی اصطلاح میں "مبحث البرّ والاثم" سے ہے، کتاب کو ان مباحث سے شروع کیا ہے جن کا تعلق دنیا کے نظامِ تکوینی اور حیاتِ انسانی سے ہے، اور جن کی پابندی سے ایک صحت مند ہیئتِ اجتماعی، اور ایک صالح تمدّن وجود میں آتا ہے، شاہ صاحب نے اس کے لئے "ارتفاقات"[۱] کی اصطلاح استعمال کی ہے، جو ہمارے علم میں اس سے پہلے مسلمان متکلمین، فلاسفہ اور علمائے اجتماع نے (کم سے کم اس وضاحت اور تسلسل سے) استعمال نہیں کی۔

ارتفاق کی اہمیت

ارتفاق سے شاہ صاحب کی مراد افراد کا ایک دوسرے سے جائز انتفاع، تعاون، اشتراکِ عمل، اور معتدل و متوازن شہری زندگی کے قیام کے لئے "تدبیرات نافعہ" ہیں[۲]۔

اس طرح شاہ صاحب نے انسانی سعادت کے انفرادی و اجتماعی دونوں پہلوؤں اور دنیوی و اخروی دونوں زندگیوں سے بحث کی ہے، شاہ صاحب کے نزدیک یہ نظامِ تکوینی انبیاء علیہم السلام کے لائے ہوئے نظامِ تشریعی کے نہ صرف مطابق ہونا چاہئے، بلکہ اس کے لئے

---

[۱] عربی زبان کے سب سے بڑے لغت "لسان العرب" میں رفق کے مادہ میں ہے "یقال للمتطبّب متَرفّق و رفیق، والرِّفق والمِرفق والمَرفِقُ والمَرْفَقُ ما استُعین بہ، وقد ترفّق بہ وارتفق، وفی التنزیل "وَيُهَيِّئْ لَكُم مِّنْ أَمْرِكُم مِّرْفَقًا" وھو ما ارتفقت وانتفعت بہ، وقد ترفّق علیہ وارتفق توکّأ، وقال عزّ وجلّ "نِعْمَ الثَّوَابُ وَحَسُنَتْ مُرْتَفَقًا" وترافق القوم وارتفقوا صاروا رفقاء۔ (لسان العرب باختصار)

[۲] مولانا عبدالحق حقانی نے ارتفاقات کا ترجمہ اسی طرح کیا ہے۔

ممد ومعاون اوران کے مقاصد کا خادم بن کر رہنا چاہئے، انھوں نے (علمائے اخلاق اور ماہرین اقتصادیات میں) پہلی مرتبہ اقتصادیات وعلم المعیشت کا علم الاخلاق سے گہرا ربط ثابت کیا ہے، شاہ صاحب کے نزدیک یہ ربط جب ٹوٹ جاتا ہے تو معاشیات اور اخلاقیات دونوں کو شدید بحران سے واسطہ پڑتا ہے جس کا اثر مذہب واخلاق، پُرسکون زندگی، انسانوں کے باہمی روابط اور تمدن وتہذیب سب پر پڑتا ہے، ان کے نزدیک انسانوں کے اجتماعی اخلاق اس وقت بالکل برباد ہو جاتے ہیں، جب کسی جبر سے ان کو اقتصادی تنگی پر مجبور کر دیا جائے، اس وقت انسان (جن کے اندر اللہ نے اعلیٰ روحانی ملکات اور ترقی کے امکانات ودلیعت فرمائے ہیں) گدھے اور بیل کی طرح سے روٹی حاصل کرنے کے لئے سرگرداں رہنے لگتے ہیں اور ہر طرح کی سعادتوں اور ترقیوں سے محروم ہو جاتے ہیں۔

شہری واجتماعی زندگی کی اہمیت اور ان کی شکلیں

شاہ صاحب شہری اور اجتماعی زندگی کی (جس کے مرکز کو وہ "المدینۃ" سے تعبیر کرتے ہیں) تعریف ایسے علمی انداز میں کرتے ہیں، جس سے بہتر اور جامع تعریف اس زمانہ تک (مصنفین وحکماء کے یہاں) نہیں کی گئی تھی" باب سیاسۃ المدینۃ " میں لکھتے ہیں:۔

وأعنی بالمدینۃ جماعۃ متقاربۃ تجری بینھم المعاملات ویکونون أھل منازل شتی۔[1]	المدینہ (شہر) سے ہماری مراد انسانوں کی وہ جماعت ہے جس میں کسی نوع کی قربت ہو اور ان کے درمیان معاملات میں اشتراک ہو اور وہ مختلف ٹھکانوں میں رہتے ہوں

---

[1] حجۃ اللہ البالغہ ص ۴۴

وہ سیاستہ المدینہ کی تعریف ان الفاظ میں کرتے ہیں:۔

ھی الحکمۃ الباحثۃ عن کیفیۃ حفظ الربط الواقع بین أھل المدینۃ۔[1]	سیاست مُدُن سے ہماری مراد وہ حکمت ہے جو اس شہری زندگی کے افراد کے درمیان اس ربط و تعلق کی حفاظت کے طریقوں سے بحث کرے جو ان کے درمیان موجود ہے۔

پھر اس تمدنی زندگی یا المدینہ کی مزید تعریف کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ:۔

المدینۃ شخص واحد من جھۃ ذلک الربط مُرکّبٌ من اجزاء وھیئۃ اجتماعیۃ۔[2]	شہر کو اس ربط کی وجہ سے جو اس کے افراد کے درمیان پایا جاتا ہے، شخص واحد تصور کرنا چاہیئے، جو مختلف اجزاء اور ایک ہیئت اجتماعیہ سے مرکّب ہے۔

ان کے نزدیک "ارتفاق" کی دو قسمیں ہیں:۔

۱۔ ابتدائی اور ضروری، جو اہل بادیہ کو بھی حاصل ہوتا ہے۔

۲۔ اجتماعی یا ترقی یافتہ، جو اہل مصر (شہریت و تمدن والوں کو) حاصل ہوتا ہے۔

ان دو کے بعد تیسری قسم آتی ہے، وہ سیاست و انتظام کی ہے، پھر اس کے نتیجہ میں چوتھی قسم خلافتِ عامہ کی ہے، ارتفاق رابع میں شاہ صاحب اہل اقالیم (ملک کے متفرق اور دور دراز علاقوں) کے باہمی ربط کی حفاظت پر زور دیتے ہیں، یہ ربط (مختلف علاقوں کے درمیان)

---

[1] حجۃ اللہ البالغہ ص۴۴ [2] ایضاً

اتنا ہی ضروری ہے، جتنا کہ ایک شہر کے افراد کے درمیان ابتدائی اور محدود حالت میں ضروری تھا۔[1]

مکاسب اور وجوہ معاش کی محمود و مذموم شکلیں

ارتفاقات کے سلسلہ میں حصولِ مکاسب اور وجوہِ معاش بیان کرتے ہوئے شاہ صاحبؒ غیر طبعی اور غیر اخلاقی ذرائع معاش کا ذکر فراموش نہیں کرتے، فرماتے ہیں:۔

وبقيت نفوسٌ أعيت بهم المذاهب الصالحة فالحدروا إلى أكساب ضارة بالمدينة كالسرقة والقمار والتكدّي۔[2]	بہت سی طبیعتیں ایسی ہوتی ہیں جن کو جائز اور صحت مند راستوں سے کسبِ معیشت مشکل معلوم ہوتا ہے تو وہ ایسے ذرائع معاش کی پستی کی طرف اتر آتی ہیں جو شہری و اجتماعی زندگی کے لئے ضرر رساں ہوتے ہیں، مثلاً چوری، جُوا، دریوزہ گری (بھیک مانگنا) اور غیر قانونی و اخلاقی طریقۂ مبادلہ۔

اس موضوعِ ارتفاقات کے باب میں شاہ صاحبؒ کے قلم سے بعض ایسے حقائق نکل گئے ہیں، جن سے تمدن و معاشرہ اور انسانیت کے عروج و زوال کی تاریخ پر ان کی گہری نظر معلوم ہوتی ہے، فرماتے ہیں:۔

كلما رقّت النفوس وأمعنت	جب طبیعتوں میں غیر طبعی نزاکت،

---

[1] حجۃ اللہ البالغہ ص۴۷ [2] ایضاً ص۴۳

فی حُبِّ اللذّۃ الرفاھیۃ تفرّعت	حدِّ اعتدال سے بڑھی ہوئی لذت پسندی
حواشی المکاسب واختصّ	اور غلو کی حد تک پہونچی ہوئی خوشحالی
کُلُّ رجلٍ بکسبٍ۔[1]	اور فارغ البالی پیدا ہو جاتی ہے تو
	کسبِ معیشت کی باریکیاں اور ذیلی
	قسمیں پیدا ہو جاتی ہیں، اور ہر شخص
	ایک خاص ذریعۂ معاش کا اجارہ دار
	بن جاتا ہے۔

شاہ صاحب شہری زندگی کو نقصان پہونچانے والی چیزوں میں اس کا بھی ذکر کرتے ہیں کہ سب اہل شہر ایک ہی ذریعۂ معاش اختیار کر لیں، مثلاً سب تجارت شروع کر دیں زراعت چھوڑ دیں، یا جنگ کے ذریعہ کسب معاش حاصل کریں، ان کے نزدیک زراعت بمنزلۂ طعام کے ہے، اور صنعت و تجارت اور نظم و نسق بمنزلۂ نمک کے ہے، اسی سلسلہ میں شاہ صاحبؒ ایک بڑے نکتہ کی بات لکھتے ہیں، اور فرماتے ہیں کہ ملک کی تباہی کے اس زمانہ میں دو بڑے سبب ہیں۔

۱۔ بیت المال پر بغیر کسی محنت کے بار بننا۔[2]

---

[1] حجۃ اللہ البالغہ ص۴۳ [2] ان بار بننے والوں میں بطور مثال کے شاہ صاحبؒ نے ان سپاہیوں، عالموں، زہد پیشہ صوفیوں اور شعراء اور ان دوسرے گروہوں کو شامل کیا ہے جو ملک میں سلطنت کی کسی خدمت کے بغیر جاگیروں کے مالک اور مفت کی کمائی اور انعامات و اکرامات کے عادی ہو جاتے ہیں، اس میں وہ نظام جاگیرداری بھی آ گیا جس نے سلطنت کے مالیہ کو سخت نقصان پہونچایا تھا اور مفت خوروں اور تن آسانوں کا ایک لشکر پیدا کر دیا تھا، اس سے شاہ صاحبؒ کی سیاسی بصیرت اور زوال سلطنت مغلیہ کے اسباب سے گہری واقفیت کا اندازہ ہوتا ہے۔

۲۔ اہل زراعت وتجارت اور اہل حرفہ واہل ہنر پر بھاری ٹیکس لگانا، آخر میں فرماتے ہیں:

فلینتبہ أھل الزمان لھذہ النکتۃ۔[1] — ہمارے زمانہ کے لوگوں کو اس حقیقت کو سمجھ لینا چاہیئے اور ہوشیار ہوجانا چاہیئے۔

تمدن و معاشرہ میں فساد پیدا کرنے والے اسباب میں شاہ صاحب تفریحات کی کثرت کو بھی شمار کرتے ہیں، جس سے معاش و معاد دونوں تغافل کا شکار ہوتے ہیں، ان میں شطرنج میں انہماک، شکار کی کثرت اور کبوتر پالنے کو شامل کرتے ہیں[2]، اسی طرح سے اخلاقی جرائم اور ایسے اعمال کو برداشت کرنا جن کو عام طور پر سلیم الفطرت لوگ اپنی ذات کے لئے برداشت نہیں کر سکتے ہیں، اور ان کو تمدن کے لئے مضر سمجھتے ہیں، ان کے نزدیک اس سے حکومتوں کا زوال ظہور میں آتا ہے۔[3]

سعادت اور اس کے اصول چہارگانہ

کتاب کا مبحثِ رابع مبحث السعادۃ ہے، اس میں بتایا گیا ہے کہ سعادت کا حصول انسان کے لئے سب سے اہم ہے، اور وہ تہذیب نفس اور قوت بہیمیہ کو قوت ملکیہ کے تابع بنانے سے حاصل ہوتی ہے۔[4]

شاہ صاحبؒ کے نزدیک سعادت کے اصل اصول چار ہیں، جن کے لئے انبیاء کی بعثت ہوئی اور ان کی تفصیل شرائع سماوی ہیں، یہ درحقیقت ادیان و شرائع کی بنیادی شعبوں کے جامع عنوانات اور مقاصد بعثت کی تکمیل کے مؤثر ذرائع ہیں۔

---

[1] ایضاً ص۴۵ [2] ایضاً ص۴۹ [3] ایضاً ص۵۰ [4] ملاحظہ ہو ص۵۱

۱۔ طہارت (جسمانی پاکیزگی جو انسان کو توجہ الی اللہ و تعلق باللہ کے لئے تیار کر دیتی ہے)

۲۔ اخبات الی اللہ تعالےٰ (انابت و توجہ الی اللہ اور عجز و تواضع)

۳۔ سماحت، مکارمِ اخلاق و معالی امور۔

۴۔ عدالت[1] (ایسا نفسانی ملکہ جس کے افعال کی وجہ سے شہر و قوم کا انتظام بسہولت قائم ہو جاتا ہے۔)

اس طرح شاہ صاحب نے انسان کی شخصیت کی تکمیل تعلق مع اللہ کی تحصیل اور ایک صحت مند اور متعاون معاشرہ کی تشکیل کی بنیادوں پر روشنی ڈالی ہے، جو شریعت آسمانی اور بعثتِ انبیاء کے مقاصد میں ہے۔

اس کے بعد ان خصالِ اربعہ کے اکتساب کا طریقہ بتایا ہے[2]، پھر ان حجابات کا ذکر کیا ہے، جو فطرت کے ظہور سے مانع ہیں، ان میں تین[3] قسموں کو لیا ہے، (۱) حجاب الطبع (بشری و نفسانی تقاضوں کا غلبہ) (۲) حجاب الرسم (خارجی حالات و ماحول کا مضر اثر) (۳) حجاب سوء المعرفۃ (غلط تعلیم و تربیت اور پھیلے ہوئے فاسد عقائد کا اثر)، پھر ان کے رفع کرنے کے طریقے بتائے ہیں[4]۔

عقائد و عبادات

کتاب کا اصل مضمون المبحث الخامس "مبحث البر والاثم" سے شروع ہوتا ہے، حقیقت میں کتاب کا یہی موضوع و مقصد ہے[5]۔

اصولِ بر میں شاہ صاحب نے سب سے پہلے توحید کو لیا ہے اس لئے کہ اسی پر اخبات و انابت کا

---

[1] ان اصول کی تعریف ص۵۴ پر دیکھی جائے۔ [2] ص۵۵-۵۶ [3] تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو ص۵۶

[4] ص۵۷-۵۸ پر ان کی تشریح ملاحظہ کی جائے۔ [5] ص۵۸

انحصار ہے، جو سعادت کے حصول کا سب سے بڑا ذریعہ ہے اس سلسلہ میں شاہ صاحب نے توحید کے چار[۱] مراتب بیان کئے ہیں اور مشرکین عرب کے شرک کی حقیقت واضح کی ہے[۲]، توحید کے بعد صفات خداوندی پر ایمان، ایمان بالقدر اور شعائر اللہ کی تعظیم کے (جن میں شاہ صاحب کے نزدیک قرآن، کعبہ، نبی اور صلوٰۃ سب سے واضح اور اہم شعائر ہیں) ذکر کے بعد شاہ صاحبؒ عبادات و فرائض پر آجاتے ہیں، اور وضو و غسل کے اسرار، اسرار الصلاۃ، اسرار الزکاۃ، اسرار الصوم اور اسرار الحج پر اجمالی طور پر بحث کرتے ہیں[۳]، یہ مباحث اگرچہ اصولی اور اجمالی ہیں، پھر بھی ان میں بعض ایسے نکتے آگئے ہیں، جن کا دوسری جگہ ملنا مشکل ہے۔

مثلاً اسرار الصلاۃ میں شاہ صاحب لکھتے ہیں کہ عبادت کا یہ طریقہ اوضاع ثلاثہ، قیام رکوع، سجود کا جامع ہے، اس میں بجائے اعلیٰ سے ادنیٰ کی طرف منتقل ہونے کے ادنیٰ سے اعلیٰ کی طرف (قیام سے رکوع، رکوع سے سجود کی طرف) ترقی رکھی گئی ہے، اور یہی عقل و فطرت کے مطابق ہے، پھر شاہ صاحب نے عبادت کے سلسلہ میں اللہ کی عظمت میں تفکّر و مراقبہ اور دوامِ ذکر پر اقتصار نہ کرنے کی (جو اشراقیین، حکماء اور ہندوستانیوں کا طریقہ رہا ہے اور بعض بے قید صوفیوں نے بھی اس کو اختیار کیا) وجہ بیان کی ہے اور بتایا ہے کہ یہ تفکّر و مراقبہ انھیں لوگوں کے لئے ممکن و مفید تھا جن کی طبیعتیں ان سے مناسبت رکھتی تھیں، اور وہ ان کے ذریعہ سے ترقی کر سکتے تھے، نماز فکر و عمل، ذہنی توجہ اور جسمانی مشغولیت کا معجون مرکّب ہے، وہ ہر طبقہ کے لئے مفید اور تریاق قوی الاثر ہے، غوائل رسم (ماحول کے خراب اثرات) سے نفع دینے اور طبیعت کے عقل کے تابع ہونے کی مشق کے لئے نماز سے زیادہ کوئی مفید و مؤثر طریقہ نہیں[۳]۔

۱؎ یہ بحث اس کتاب کے باب پنجم میں گذر چکی ہے۔ ۲؎ تفصیل کتاب کے حصۂ دوم میں آئی ہے جس میں احادیث کو سامنے رکھ کر ان پر علیحدہ علیحدہ تفصیل سے گفتگو کی گئی ہے۔ ۳؎ ص ۳۱

جہاں تک روزہ و حج کا تعلق ہے ان کے بارہ میں اگرچہ اس مبحث میں بھی اشارے کئے گئے ہیں، لیکن کتاب کے حصۂ دوم میں ان کے مقاصد اور اسرار و حکمتوں پر جو لکھا گیا ہے، اس کی نظیر اس سے پہلے کسی کتاب میں دیکھنے میں نہیں آئی، اس کا ذکر آئندہ صفحات میں اپنی جگہ آئیگا۔

سیاساتِ ملّی اور انبیاء کی ضرورت

المبحث السادس کا عنوان "مبحث السّیاسات الملّیۃ" ہے، یہ کتاب کا بہت اہم مبحث ہے[۱] اس کے پہلے باب میں شاہ صاحب نے بڑی نکتہ سنجی اور حقیقت پسندی کے ساتھ بتایا ہے کہ انسانی نسلوں کو ہادیانِ طریق اور مقیمینِ ملل (انبیاء) کی ضرورت کیوں پیش آتی رہی ہے اس کے لئے ان کی فطرت سلیم اور عقل عام کیوں کافی نہیں تھی؟ پھر اس گروہ کے صفات اور ضروری شرائط سے بحث کی ہے، اور یہ کہ وہ کب اور کس طرح اپنے مقصد کی تکمیل کر سکتا اور اس میں کامیاب ہو سکتا ہے، یہ باب علم الکلام کی کتابوں میں اثباتِ نبوت کی عام بحثوں سے بالکل الگ نظر آتا ہے، اور اس میں عقلِ عام اور عقل سلیم کو مطمئن کرنے کا وہ سامان ہے جو علمِ کلام اور عقائد کی کتابوں میں عام طور پر نہیں ملتا، اس مبحث میں منصبِ نبوت اور اس کے خواص پر جو باب ہے، وہ شاہ صاحب کی روحِ شریعت اور حقیقت مزاجِ نبوت سے واقفیت نفسِ انسانی کے گہرے مطالعہ اور اخلاق کے اندرونی سرچشموں سے باخبری پر دلالت کرتا ہے، اس باب میں بعثت انبیاء کے اسباب سے تفصیل سے بحث کی گئی ہے۔

---

[۱] ص ۸۳-۸۴

بعثت مقرونہ

شاہ صاحب نے لکھا ہے کہ سب سے کامل بعثت اس نبی کی ہوتی ہے جس کی بعثت "مقرون" ہوتی ہے یعنی اس کی بعثت کے ساتھ ایک پوری قوم تبلیغ و دعوت پر مامور اور اس کے فیضِ صحبت سے تیار ہو کر دوسرے انسانوں کی تعلیم و تربیت کا ذریعہ بنتی ہے، نبی کی بعثت بالاصالت ہوتی ہے (اور اس کو نبوت کہتے ہیں) امت کی ماموریت اور تفویضِ خدمت کی نوعیت بالواسطہ و بالنیابۃ ہوتی ہے، آنحضرت صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بعثت ایسی ہی جامع بعثت تھی جس کے ساتھ ایک پوری امت کو آپ کے منصبِ نبوت کی خدمت و اشاعت کے لئے "جارحہ" اور آلۂ کار بنایا گیا، اور اس کے لئے بعثت اور بعثت کے ہم معنی الفاظ استعمال کئے گئے ہیں، قرآن مجید میں فرمایا گیا ہے :-

كُنْتُمْ خَيْرَ أُمَّةٍ أُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ	جتنی امتیں پیدا ہوئیں تم ان میں
تَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَتَنْهَوْنَ	سب سے بہتر ہو لوگوں کو نیک کام کرنے کو
عَنِ الْمُنْكَرِ۔ (آل عمران ـ ۱۱۰)	کہتے ہو اور بُرے کاموں سے منع کرتے ہو۔

اور حدیث میں بعثت ہی کا لفظ استعمال کیا گیا ہے، آپ نے صحابہ کرامؓ کو مخاطب کر کے فرمایا:-

فانما بعثتم میسرین ولم تبعثوا	تم تیسیر (آسانی پیدا کرنے کے لئے)
معسرین۔[1]	پیدا کئے گئے ہو تعسیر (مشکلات پیدا
	کرنے کے لئے) نہیں مبعوث کئے گئے ہو۔

اس باب کا خاص مضمون وہ ہے جس میں انبیاء علیہم السلام کی سیرت اور ان کے

---

[1] ص ۸۴

مذاق و مزاج اور ان کے طریق دعوت اور طرز خطاب و تفہیم کو بیان کیا گیا ہے، اس سے شاہ صاحبؒ کی دقیق النظری اور خصائص نبوت اور انبیاء کے گہرے مطالعہ اور قرآن مجید کے عمیق تدبر کا اندازہ ہوتا ہے۔[1]

ایرانی و رومی تمدن میں اخلاقی و ایمانی قدروں کی پامالی اور انسانیت کی زبوں حالی

عہد جاہلیت اگرچہ عرب کے ساتھ مخصوص نہیں تھا، وہ ایک عالمگیر اعتقادی، اخلاقی، معاشرتی اور اقتصادی و سیاسی بحران تھا جو ساری دنیا پر محیط تھا لیکن ایرانی اور رومی اس کے قائد اور اصل ذمہ دار تھے کہ انھیں کا تمدن اس وقت دنیا میں معیاری سمجھا جاتا تھا، اور اسی کی تقلید ہر جگہ کی جاتی تھی، اور انھیں کے ممالک مرکزی شہر اور معاشرہ سب سے زیادہ اس کی زد میں تھا۔

اس صورت حال کا جو نقشہ شاہ صاحب نے کھینچا ہے اور اس کے جو اسباب بیان کئے ہیں، اس سے بہتر نقشہ سیرت و تاریخ کی کسی کتاب میں جو دور ماضی میں لکھی گئی اور فلسفۂ تاریخ اور علوم عمرانیہ کے کسی فاضل کے قلم سے دیکھنے میں نہیں آیا، یہاں پر آکر شاہ صاحب کا قلم اپنے پورے جوہر دکھاتا ہے، اور ان کی قوت تحریر اور حسن انشا اپنے نقطۂ عروج پر نظر آتا ہے[2]۔

یہ مضمون یہاں نقل کیا جاتا ہے کہ اس سے شاہ صاحب کی تاریخ پر گہری نظر حقیقت تک پہونچنے کی صلاحیت، اور صورت حال کے صحیح تجزیہ کی خداداد قابلیت کا اندازہ ہوتا ہے، شاہ صاحبؒ تحریر فرماتے ہیں:۔

---

[1] ص ۸۶ [2] یہ حصہ سلاست، زور بیان، حسن انشاء کا ایک نمونہ ہے، اسی بناء پر مصنف نے اس کو عربی ادب کے منتخبات کے مجموعہ "مختارات" میں ایک نمونہ کے طور پر شامل کیا ہے۔

"صدیوں سے آزادانہ حکومت کرتے کرتے اور دنیا کی لذتوں میں منہمک رہنے، آخرت کو یکسر بھول جانے اور شیطان کے پورے اثر میں آجانے کی وجہ سے ایرانیوں اور رومیوں نے زندگی کی آسانیوں اور سامانِ راحت میں بڑی موشگافی اور نازک خیالی پیدا کرلی تھی، اور اس میں ہر قسم کی ترقی اور نفاست میں ایک دوسرے سے سبقت لے جانے اور فخر کرنے کی کوشش کرتے تھے، دنیا کے مختلف گوشوں سے ان مرکزوں میں بڑے بڑے صنّاع، اہلِ ہنر اور اہلِ کمال جمع ہو گئے تھے، جو اس سامانِ آرائش و راحت میں نزاکتیں پیدا کرتے تھے، اور نئی نئی تراش خراش نکالتے تھے، ان پر عمل فوراً شروع ہو جاتا تھا، اور اس میں برابر اضافے اور جدّتیں ہوتی رہتی تھیں، اور ان باتوں پر فخر کیا جاتا تھا، زندگی کا معیار اتنا بلند ہو گیا تھا کہ امراء میں سے کسی کا ایک لاکھ درہم سے کم کا پٹکا باندھنا اور تاج پہننا سخت معیوب تھا، اگر کسی کے پاس عالی شان محل، فوارہ، حمّام، باغات، خوش خوراک اور تیار جانور، خوش رُو جوان اور غلام نہ ہوتے، کھانے میں تکلّفات اور لباس و پوشاک میں تجمّل نہ ہوتا تو ہم چشموں میں اس کی کوئی عزت نہ ہوتی، اس کی تفصیل بہت طویل ہے، اپنے ملک کے بادشاہوں کا جو حال دیکھتے اور جانتے ہو اس سے قیاس کر سکتے ہو۔[1]

یہ تمام تکلفات ان کی زندگی اور معاشرت کا جزء بن گئے تھے، اور ان کے دلوں میں اس طرح رَچ بَس گئے تھے کہ کسی طرح نکل نہیں سکتے تھے، اس کی وجہ سے ایک ایسا لاعلاج مرض پیدا ہو گیا تھا جو ان کی پوری شہری زندگی اور ان کے

---

[1] شاہانِ دہلی اور مغل بادشاہوں کی طرف اشارہ ہے۔

پورے نظامِ تمدن میں سرایت کرگیا تھا، یہ ایک مصیبت عظمیٰ تھی جس سے عام وخاص اور امیر وغریب میں سے کوئی محفوظ نہیں رہا تھا، ہر شہری پر یہ پُرتکلف اور امیرانہ زندگی ایسی مسلط ہوگئی تھی جس نے اس کو زندگی سے عاجز کر دیا تھا، اور اس کے سر پر غم وافکار کا ایک پہاڑ ہر وقت رکھا رہتا تھا۔

بات یہ تھی کہ یہ تکلفات بیش قرار رقمیں صرف کئے بغیر حاصل نہیں ہوسکتے تھے، اور یہ رقمیں اور بے پایاں دولت کاشتکاروں، تاجروں اور دوسرے پیشہ وروں پر محصول اور ٹیکس بڑھانے اور ان پر تنگی کئے بغیر دستیاب نہیں ہوسکتی تھیں اگر وہ ان مطالبات کے ادا کرنے سے انکار کرتے تو ان سے جنگ کی جاتی اور ان کو سزائیں دی جاتیں، اور اگر وہ تعمیل کرتے تو ان کو گدھے اور بیلوں کی طرح بنا لیتے، جن سے آبپاشی اور کاشت کاری میں کام لیا جاتا، اور صرف خدمت کرنے کے لئے ان کو پالا جاتا ہے، اور محنت ومشقت سے ان کو کسی وقت چھٹی نہیں ملتی۔

اس پُرمشقت اور حیوانی زندگی کا نتیجہ یہ ہوا کہ ان کو کسی وقت سر اٹھانے اور سعادتِ اُخروی کا خیال بھی کرنے کا موقعہ اور مہلت نہیں ملتی تھی، بسا اوقات پورے پورے ملک میں ایک فردِ بشر بھی ایسا نہ ملتا جس کو اپنے دین کی فکر اور اہمیت ہوتی۔"[1]

بعض دوسری مفید بحثیں

اس کے بعد یہ بحث آتی ہے کہ دین کی اصل ایک ہے اور شرائع مناہج میں کسی خاص

---

[1] حجۃ اللہ البالغہ، باب اقامۃ الارتفاقات واصلاح الرسوم، ج ۱ ص ۱۰۴-۱۰۷

عصر و قوم کی رعایت سے اختلاف ہوتا ہے، پھر اس کی تشریح فرماتے ہیں کہ دین کی ایک اصل ہونے کے باوجود ان مناہج پر مؤاخذہ کیوں ہوتا ہے؟

تیسیر، ترغیب و ترہیب کے اسرار وغیرہ کی ذیلی بحثوں کے بعد شاہ صاحب ایسے دین کی ضرورت ثابت فرماتے ہیں، جو تمام ادیان کا ناسخ ہو، اور یہ کہ دین کو تحریف سے کیسے بچایا جا سکتا ہے، تحریف کن کن دروازوں، اور ناکوں سے دین میں داخل ہوتی ہے، وہ کن کن شکلوں میں جلوہ گر ہوتی ہے، اور کیسے کیسے قالب اختیار کرتی ہے؟ اور شریعت نے اس کے سدِّباب کے لئے کیا راستے اختیار کئے ہیں، اور کیا انتظامات کئے ہیں؟ پھر تفصیل سے بیان کیا ہے کہ عہد بعثت میں عہد جاہلیت کا کیا حال تھا، جس کی آنحضرت صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اصلاح فرمائی۔؟

حدیث و سنّت کا مقام اور ان کے بارہ میں امت کا طرز عمل

مبحث سابع کا عنوان ہے "مبحث الشرائع من حدیث النبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم" یہاں پر وہ مباحث آتے ہیں، جن کا براہ راست حدیث و سنت کے فہم، اس سے استنباط مسائل، علوم نبویؐ کے اقسام، نبی سے شریعت کے اخذ کی کیفیات اور طریقوں، کتب حدیث کے طبقات، کتاب و سنت سے شرعی مطالب کے اخذ کے طریقوں اور مختلف احادیث میں جمع و تطبیق یا ترجیح سے تعلق ہے، اس سلسلہ میں غایت نکتہ سنجی اور دقیقہ رسی سے بحث کرتے ہوئے شاہ صاحب فروع میں صحابہؓ اور تابعین کے اختلاف کے اسباب بیان کرتے ہیں، ان کی مثالیں دینے کے بعد فقہاء کے مذاہب میں اختلاف اور اہل حدیث و اصحاب الرائے کے اختلاف کے فرق کو بیان کرتے ہیں، جو چوتھی صدی سے پہلے

اور اس کے بعد لوگوں کے مسائل دریافت کرنے اور ان پر عمل کرنے اور اس بارے میں عوام و خواص کا رویہ اور طرز کیا تھا؟ اس کی تفصیل سے وضاحت فرماتے ہیں جو بڑی دقیق و عمیق بحثوں پر مشتمل ہے اور جن کا علم کلام یا اصول فقہ کی کسی کتاب میں ملنا بہت مشکل ہے۔

فرائض و ارکان کے اسرار و حِکَم

شاہ صاحب نے عقائد سے لے کر عبادات، معاملات، احسان و تزکیہ، مقامات، واحوال، کسب معیشت کے طرق، تبرّع و تعاون، تدبیر منزل، خلافت، قضا، جہاد، آداب طعام، آداب صحبت، معاشرت اور آخر میں فتن، حوادث مابعد اور علامات قیامت تک کی احادیث سے بحث کی ہے اور اس سلسلہ میں سیرت نبوی کا خلاصہ بھی پیش کر دیا ہے، اور ان مختلف ابواب کے اسرار و مقاصد اس طرح بیان فرمائے ہیں کہ ان مسائل کا ربط زندگی، تمدن اور اخلاقیات سے کہیں ٹوٹنے نہیں پاتا، اور حقیقت میں کتاب کا یہی مرکزی مضمون ہے، شاہ صاحب کا منشا تھا کہ حدیث کی تدریس انھیں حِکَم و اسرار کی روشنی میں عمل و اخلاق، تمدن و معاشرت، انسانی سعادت اور باہمی روابط کے تعلق کے ساتھ ہو تاکہ ان کا زندگی، عمل و اخلاق، تمدن و معاشرت پر پورا اثر پڑے، عقل و نقل کا تطابق ثابت ہو اور معترضین کو ان پر اعتراض کرنے اور حدیث و سنت کی قیمت و افادیت اور ان کی اہمیت و ضرورت کو کم کرنے (جس کو شاہ صاحبؒ کی دوربین اور حقیقت رس نگاہ نے دیکھ لیا تھا) اور ذہنی انتشار پیدا کرنے کا موقعہ نہ ملے، عملی ارکان اور فرائض چہارگانہ پر شاہ صاحب نے جو کچھ لکھا ہے، وہ انھیں کا حصہ اور "حجۃ اللہ" کے خصائص میں سے ہے، یہاں بطور نمونہ کے صرف روزہ (صیام) اور حج کے مقاصد و اسرار اور ان کی اسلامی و شرعی شکل کی حکمت پر

شاہ صاحب نے جو کچھ لکھا ہے اس کو پیش کیا جاتا ہے۔

صوم پر کلام کرتے ہوئے اور اس کی مقدار اور روزوں کی تعداد کے تعین کی حکمت (جو شریعت اسلامی کے ساتھ مخصوص ہے) اور اس کے شرعی احکام پر گفتگو کرتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں:

"روزہ میں (وقت اور تعداد و مقدار کا) اختیار دے دینے سے تاویل اور فرار کا دروازہ کھل جائیگا، امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا دروازہ بند ہو جائے گا اور اسلام کی یہ سب سے بڑی اطاعت غفلت کا شکار ہو جائیگی۔"[1]

اس کے بعد اس کی مقدار و تعداد کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:۔

"اس کی (مدت کی) تعیین بھی ضروری تھی تاکہ اس میں افراط و تفریط کا موقعہ نہ ہو، اگر ایسا نہ ہوتا تو کوئی اس پر اتنا عمل کرتا کہ جس سے اس کو کوئی فائدہ نہ پہونچتا اور کوئی اثر مرتب نہ ہوتا، اور کوئی اتنے غلو سے کام لیتا اور اتنی کثرت کرتا کہ اس کی ناطاقتی اور کمزوری حد کو پہونچ جاتی، اور وہ نیم مردہ ہو کر رہ جاتا، اصل میں روزہ تریاق ہے جو نفس کے زہر کو مارنے کے لئے مہیا کیا جاتا ہے، اس لئے اس میں ضرورت کی رعایت ضروری ہے۔"[2]

پھر روزہ کی دونوں قسموں (یعنی ایک وہ روزہ جس میں کھانے پینے اور ان تمام چیزوں سے جو روزہ کے منافی ہیں، مکمل پرہیز کیا جاتا ہے، اور دوسرے وہ روزہ جس میں بعض چیزوں سے پرہیز کیا جاتا ہے اور بعض سے نہیں) کے درمیان موازنہ کرتے ہوئے اوّل الذکر کو ترجیح دیتے ہیں اور تجربہ، تحلیل علمی اور علم النفس کی روشنی میں اس کی افضلیت بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:۔

---

[1] حجۃ اللہ البالغہ ج ۲ ص ۳۷ [2] ایضاً

"تقلیلِ غذا کے دو طریقے ہیں، ایک یہ کہ خوراک کی مقدار کو کم کردیا جائے، دوسرے یہ کہ کھانوں کے درمیان وقفہ اتنا طویل کردیا جائے کہ یہ مقصد پورا ہوسکے، شریعت میں یہی آخر الذکر صورت اختیار کی گئی ہے، اس لئے کہ اس سے بھوک اور پیاس کا صحیح اندازہ ہوتا ہے، حیوانی خواہشات پر چوٹ پڑتی ہے، اور محسوس طور پر نظر آتا ہے کہ اس میں کمی آئی ہے، اس کے برخلاف اول الذکر صورت میں ... اس کے کہ آدمی پر کوئی خاص اثر مرتب ہو، غذا کے تسلسل کی وجہ سے یہ بات پیدا نہیں ہو پاتی، دوسرے یہ کہ اول الذکر کے لئے کوئی عمومی قانون بنانا بہت مشکل بات ہے، اس لئے کہ لوگ مختلف حالات رکھتے ہیں، ایک آدمی ایک پاؤ کھاتا ہے، دوسرا آدھ سیر کھاتا ہے، چنانچہ اس قسم کے تعین سے اگر ایک کا بھلا ہوگا تو دوسرے کا نقصان بھی ہوگا۔"[1]

وہ کہتے ہیں کہ اس تعین اور اوقات کی پابندی میں اعتدال ضروری ہے، لکھتے ہیں:-

"یہ بھی ضروری تھا کہ یہ مدت تکلیف مالا یُطاق میں مبتلا کرنے والی نہ ہو، مثلاً تین دن تین راتیں، اس لئے کہ یہ شریعت کے موضوع سے خارج اور اس کے مقصد کے خلاف ہے، اور عام طور پر اس پر عمل بھی ناممکن ہے۔"[2]

حج کے متعلق جو کچھ تحریر فرمایا ہے، وہ بالکل منفرد اور یگانہ بحث ہے، شاہ صاحبؒ فرماتے ہیں:-

"(حج کے مقاصد میں) اس میراث کی حفاظت بھی ہے، جو سیدنا ابراہیمؑ اور سیدنا اسمٰعیلؑ نے ہمارے لئے چھوڑی ہے، اس لئے کہ یہ دونوں ملّتِ حنیفی کے امام اور عرب میں اس کے مؤسّس اور بانی کہے جا سکتے ہیں، حضور صلے اللہ

---

[1] حجۃ اللہ البالغہ ج ۲ ص ۳۷ [2] ایضاً ص ۳۱

علیہ وآلہ وسلم کی بعثت بھی اسی لئے ہوئی تھی کہ ملت حنیفی آپؐ کے ذریعہ دنیا میں غالب آئے، اور اس کا پرچم بلند ہو۔

اللہ تعالےٰ کا ارشاد ہے "مِلَّۃَ اَبِیۡکُمۡ اِبۡرٰهِیۡمَ" (ملت ہے تمہارے باپ ابراہیمؑ کی) اس لئے یہ ضروری ہے کہ اس ملت کے امام سے جو چیزیں ہم کو ورثہ میں ملی ہیں مثلاً خصائلِ فطرت[۲]، اور مناسک حج، اس کی ہم حفاظت کریں، رسول اللہ صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ارشاد ہے۔

قفوا علی مشاعرکم فانکم علی	اپنے مشاعر (مقامات حج) پر ٹھہرو
إرث من إرث أبیکم۔	اس لئے کہ تم اپنے باپ کی ایک وراثت کے وارث ہو۔[۳]

نیز اس کی ایک دوسری حکمت بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:۔

"جس طرح حکومت کو ہر تھوڑے عرصہ کے بعد ایک عام جائزہ اور معائنہ کی ضرورت ہوتی ہے، تا کہ اس کو معلوم ہو جائے کہ کون وفادار ہے، کون باغی، کون فرض شناس ہے کون کام چور؟ نیز اس کے ذریعہ اس کی ایمانداری کی شہرت ہو اور اس کا نام اونچا رہے، اس کے کارندے اور باشندے ایک دوسرے سے تعارف حاصل کریں، اسی طرح ملت کو حج کی ضرورت ہے، تاکہ منافق و غیر منافق

---

[۱] سورہ حج۔ ۷۸ [۲] ان خصائلِ فطرت سے مراد یہ دس چیزیں ہیں، مونچھیں ترشوانا، داڑھی بڑھانا، مسواک کرنا، پانی سے ناک صاف کرنا، ناخن کاٹنا، انگلی کے پوروں کا دھونا، بغل کے بال اکھاڑنا، موئے زیر ناف صاف کرنا، پانی سے استنجا کرنا، ختنہ کرنا، ابوداؤد بروایت حضرت عائشہؓ (دسویں چیز کے بارے میں راوی کہتے ہیں، میں بھول گیا شاید وہ کُلّی ہے لیکن قاضی عیاضؒ اور امام نوویؒ نے دسویں چیز ختنہ بتائی ہے) [۳] حجۃ اللہ البالغہ ج ۲ ص ۴۲

میں تمیز ہو سکے، اللہ تعالٰی کے دین میں اور اللہ تعالٰی کے دربار میں جوق جوق جماعتیں حاضر ہوں، لوگ ایک دوسرے سے تعارف حاصل کریں اور ہر شخص اس چیز میں جو اس کے پاس نہیں ہے دوسرے سے استفادہ کرے، اس لئے کہ بہترین و مرغوب اشیاء بالعموم صحبت و رفاقت سے اور ایک دوسرے کو دیکھ کر ہی حاصل ہوتی ہیں۔"[1]

نیز وہ فرماتے ہیں:۔

"حج چونکہ ایک ایسا موقعہ ہے جس میں سبھی جمع ہوتے ہیں، اس لئے وہ غلط قسم کے رسوم[2] سے حفاظت کے لئے بہت مفید ہے، ملت کے اپنے اماموں اور پیشواؤں کے حالات یاد کرنے اور ان کی اتباع کا جذبہ دل میں پیدا کرنے کے لئے کوئی چیز اس درجہ کی نہیں جو اس کا مقابلہ کر سکے۔"[3]

ایک اور جگہ لکھتے ہیں:۔

"(حج کے) مقاصد میں وہ بات بھی ہے جس کے لئے حکومتیں نمائش یا سرکاری جشن کیا کرتی ہیں، جس کو دیکھنے کے لئے قریب و دور ہر جگہ کے آدمی جمع ہوتے ہیں، ایک دوسرے سے ملتے ہیں، اپنی حکومت اور اپنی ملت کی تعلیمات سے آشنا ہوتے ہیں، اور اس کے مقدس مقامات کی تعظیم بجا لاتے ہیں، اسی طرح حج مسلمانوں کی نمائش یا سرکاری جشن ہے جس میں ان کی شوکت ظاہر ہوتی ہے، ان کی قوتیں مجتمع ہوتی ہیں، ان کی ملت کا نام روشن ہوتا ہے۔"

---

[1] حجۃ اللہ البالغہ ج ۱ ص ۵۹-۶۰ [2] اس میں دینی تحریف، بدعات، اور مقامی اضافے اور جدتیں سب شامل ہیں۔ [3] ایضاً ص ۵۹-۶۰

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے :-

وَإِذْ جَعَلْنَا الْبَيْتَ مَثَابَةً لِّلنَّاسِ وَأَمْنًا[1]

اور (وہ وقت بھی یاد کرو) جب ہم نے خانہ (کعبہ) کو لوگوں کے لیے ایک مقامِ رجوع اور مقامِ امن مقرر کیا۔[2]

کتاب کی جامعیت

اس کتاب کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ فقہ، حدیث، عقائد، عبادات و معاملات سے تعلق رکھنے والے ابواب و مباحث کے ماسوا اس میں تدبیر منزل، خلافت و قضا، ابوابِ معیشت اور آدابِ صحبت کے مباحث بھی ہیں، جو اخلاق و معاشرت اور تمدن و معیشت سے تعلق رکھتے ہیں، اور عام طور پر کسی فقہی یا کلامی کتاب میں ان کی توقع نہیں کی جا سکتی۔

احسان و تزکیۂ نفس

پھر اس پر مستزاد شاہ صاحب نے اس میں حدیث و سیرت کی روشنی میں احسان و تزکیہ کا ایسا نظام مرتب کر کے پیش کر دیا ہے جس پر چل کر انسان قربِ خداوندی کے اعلیٰ سے اعلیٰ مدارج، مراتبِ ولایت اور مقامات و احوال تک پہونچ سکتا ہے، احسان کا یہ باب کتاب کے ص۶۶ سے ص۱۰۱ تک پھیلا ہوا ہے، اس باب میں شاہ صاحب نے انھیں وسائل سے بحث کی ہے جو احادیث صحیحہ میں آئے ہیں، صرف ان میں استحضار، عزم و نیت اور کیفیات باطنی اور قالب کے ساتھ روح کی طرف توجہ کرنے پر زور دیا ہے، ساتھ ہی ساتھ ان عوارض

---

[1] سورہ بقرہ ـ ۱۲۵ [2] حجۃ اللہ البالغہ ج ۲ ص۴۳

وامراض کا جو پیش آتے رہتے ہیں، علاج انھیں طُرقِ مشروعہ اور انھیں فرائض وعبادات واذکار سے تجویز کیا ہے، اس کے ساتھ اخلاق رذیلہ کے علاج اور اخلاق فاضلہ کے حصول کا طریقہ بھی شریعت وسنت کے منصوص طریقوں سے بتایا ہے۔

اس مبحث میں اذکار ماثورہ، ادعیہ مشروعہ، اور استغفار کے اہم صیغے بھی جمع کردیئے ہیں، اور مؤثر اور مقبول دعا کا طریقہ اور اس کے شرائط بھی بتائے ہیں، اس سلسلہ میں طبعی تقاضوں اور زندگی کی ضرورتوں اور دینی اعمال کو نیت کے استحضار کے ساتھ ادا کرنے پر زور دیا ہے، اور ان کے اثر و کیفیت کے جُدا ہونے کو واضح کیا ہے، فرماتے ہیں:۔

اعلم ان النیۃ روح والعبادۃ جسد، ولاحیاۃ للجسد بدون الروح، والروح لھا حیاۃ بعد مفارقۃ البدن، ولکن لایظھر آثار الحیاۃ کاملۃ بدونہ	یہ اچھی طرح سمجھ لو کہ نیت روح ہے، اور عبادت جسد، جسد کی حیات روح کے بغیر ممکن نہیں، روح بدن کی مفارقت کے بعد بھی زندہ رہتی ہے، لیکن آثار حیات کا کامل طور پر بدن کے بغیر ظہور نہیں ہوتا۔
ولذلک قال اللہ تعالیٰ "لَنْ یَّنَالَ اللّٰہَ لُحُوْمُھَا وَلَادِمَآؤُھَا وَلٰکِنْ یَّنَالُہُ التَّقْوٰی مِنْکُمْ" (الحج۔۳۷)	اسی لئے اللہ تعالیٰ فرماتا ہے، اللہ تک ان قربانیوں کے گوشت اور خون نہیں پہونچیں گے، وہاں پہونچنے والی چیز تمہارا تقویٰ ہے۔
وقال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم "اِنَّمَا الْاَعْمَالُ بِالنِّیَّاتِ"	اور رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، اعمال کا دارومدار نیات پر ہے۔

پھر نیت کی تعریف ان الفاظ میں کرتے ہیں :۔

واعنی بالنیۃ المعنی الباعث علی	نیت سے ہماری مراد تصدیق کی وہ
العمل من التصدیق بما أخبر بہ	ذہنی کیفیت ہے جو اس عمل پر آمادہ
اللہ علی ألسنۃ الرسل من ثواب	کرے، تصدیق اس بات کی کہ اللہ تعالےٰ
المطیع وعقاب العاصی أوحث	نے اپنے انبیاء کے ذریعہ اطاعت
امتثال حکم اللہ فیما أمر ونھی۔[1]	کرنے والے کو ثواب اور نافرمانی
	کرنے والے کو سزا کا جو وعدہ کیا ہے
	وہ اس حکم کی تعمیل اور اس معصیت
	سے احتراز کا سبب ہے۔

اس باب کے آخر میں شاہ صاحب نے اخلاق فاضلہ کے حصول، حقوق العباد کی ادائگی اور حسن معاشرت کے سلسلہ میں کچھ حدیثوں کا انتخاب فرما کر نقل کر دیا ہے، جن پر عمل کرنے سے انسان احسان وتزکیہ کے اعلیٰ درجہ پر پہونچ سکتا ہے، پھر ان مقامات واحوال کا ذکر کیا ہے جو احسان وتزکیہ کے نتیجہ میں حاصل ہوتے ہیں، اور نور باطنی، قلب کی بیداری اور نفس کی صفائی، رضائے خداوندی اور ملأ اعلیٰ کی تائید ومسرت کا نتیجہ ہیں۔

جہاد

اس کتاب میں جہاد پر بھی پورا ایک باب ہے[2]، اور اس کو شاہ صاحب نے ان فکر انگیز اور چونکا دینے والے الفاظ سے شروع کیا ہے، جو ادیان وملل کی پوری تاریخ، مقاصد خلق انسانی

---

[1] ایضاً جلد دوم ص ۸۳-۸۴ [2] ایضاً ص ۱۷۰-۱۷۸

اورخالق کائنات کے نظام مطلوب پر گہری نظر رکھنے والا عارف ہی لکھ سکتا ہے :۔

اعلم ان أتم الشرائع وأكمل — یاد رکھو کہ مکمل ترین شریعت اور
النواميس هو الشرع الذى — کامل ترین قانون وہ شریعت ہے
يؤمر فيه بالجهاد۔[1] — جس میں جہاد کا حکم دیا گیا ہو۔

اس کے بعد اس کی تشریح کی ہے، اس کو عقلاً نقلاً ثابت کیا ہے، پھر فضائل جہاد کے اصول واسباب بیان کئے ہیں۔[2]

غرض یہ کتاب اپنی جامعیت، عمق، دین وشریعت کی وسیع لیکن مربوط ترجمانی اور ان صدہا بیش قیمت نکات وتحقیقات کی بناء پر جو کتاب کے صفحات پر جا بجا پھیلے ہوئے ہیں، اسلامی کتاب خانہ میں متعدد حیثیتوں سے بالکل ایک انفرادی شان رکھتی ہے، اور اس کی تصدیق کرتی ہے کہ "كم ترك الأول للآخر" مولانا شبلیؒ نے اپنی مشہور کتاب علم الکلام میں صحیح لکھا ہے :۔

"ابن تیمیہؒ اور ابن رشد کے بعد بلکہ خود انھیں کے زمانہ میں مسلمانوں میں جو عقلی تنزل شروع ہوا، اس کے لحاظ سے یہ امید نہیں رہی تھی کہ پھر کوئی صاحبِ دل ودماغ پیدا ہوگا، لیکن قدرت کو اپنی نیرنگیوں کا تماشا دکھلانا تھا، کہ اخیر زمانہ میں جبکہ اسلام کا نفس باز پسیں تھا، شاہ ولی اللہؒ جیسا شخص پیدا ہوا جس کی نکتہ سنجیوں کے آگے غزالی، رازی، ابن رشد کے کارنامے بھی ماند پڑ گئے۔"

آگے چل کر لکھتے ہیں :۔

"شاہ صاحبؒ نے علم الکلام کے عنوان سے کوئی تصنیف نہیں کی اور اس بناء پر

---

[1] ایضاً ص ۱۷۰ [2] ایضاً

ان کو متکلمین کے زمرہ میں شمار کرنا بظاہر موزوں نہیں لیکن ان کی کتاب حجۃ اللہ البالغہ جس میں انھوں نے شریعت کے حقائق اور اسرار بیان کئے ہیں، درحقیقت علم کلام کی روح رواں ہے[1]"۔

فاضل عصر مولانا عبدالحق صاحب حقّانی (صاحب تفسیر حقانی، وعقائد الاسلام) حجۃ اللہ البالغہ کے ترجمہ نعمۃ اللہ السابغہ کے مقدمہ میں لکھتے ہیں:۔

"جس فن میں یہ کتاب ہے آپ سے پہلے کسی نے اس کو ایک جگہ جمع نہ کیا تھا، اس فن کا موضوع نظام تشریعی محمدی "من حیث المصلحۃ المفیدۃ" ہے، اور غایت اس کی یہ ہے کہ انسان کو یہ معلوم ہو جائے کہ خدا اور اس کے رسولؐ کے احکام میں نہ کچھ تنگی ہے، نہ وہ خلاف فطرت سلیمہ ہیں، تاکہ ان پر انسان کو پورا وثوق ہو جائے اور ان کو فطرت پر مبنی باتیں سمجھ کر دل ان کی طرف کھنچ آئے اور کسی مشکک کے بہکانے سے دل میں شبہ نہ پڑ جائے اور حد اس کی یہ ہے کہ وہ علم جس میں قوانین دینیہ اور احکام شرعیہ کی حکمت معلوم ہوتی ہے، اور مبادی اس کے تمام علوم ہیں[2]"۔

---

[1] علم الکلام ص ۱۰۹-۱۱۱ [2] مقدمہ نعمۃ اللہ السابغہ۔

باب ہشتم

نظامِ خلافت کی ضرورت و افادیت، خلفائے راشدین کی خلافت کا ثبوت اور انکے احسانات کتاب "ازالۃ الخفاء عن خلافۃ الخلفاء" کے آئینہ میں

کتاب "ازالۃ الخفا" کی اہمیت و انفرادیت

"ازالۃ الخفا" شاہ صاحبؒ کی (حجۃ اللہ البالغہ کے بعد) دوسری معرکۃ الآرا تصنیف ہے، اور اپنی بہت سی خصوصیات کی بنا پر اپنے موضوع پر منفرد اور یگانہ کتاب ہے، پوری کتاب وجد آفریں اور ولولہ انگیز علمی اور ذوقی نکات سے لبریز ہے، خاص طور پر شاہ صاحبؒ کے قرآن مجید میں طویل تدبّر، وہبی مناسبت، انکی دقیق و عمیق فہم آیات کے اشارات و مضمرات کی طرف انتقالِ ذہنی، اور دقّت استنباط اور وفورِ ذکاوت کے ایسے نمونے ملتے ہیں کہ ایک انصاف پسند اور سلیم الطبع انسان خود بخود اس نتیجہ پر پہونچ جاتا ہے کہ یہ علم محض کتابی اور اکتسابی نہیں ہے، اس کتاب کا مصنف اپنے زمانہ کے مروّجہ نصاب درس، کتب تفسیر، اصول فقہ و علم کلام کا ساختہ پرداختہ اور ان کا خوشہ چین اور زلّہ ربا نہیں ہے، اس علم کا تعلق موہبتِ خداوندی اور افاضۂ ربّانی سے ہے، خود شاہ صاحبؒ کے قلم سے بے اختیار کتاب کے آغاز ہی میں یہ الفاظ نکل گئے ہیں :-

لاجرم نور توفیق الٰہی در دل ایں　　　واقعہ یہ ہے کہ توفیق الٰہی کے نور نے

بندۂ ضعیف علمے رامشروح ومبسوط گردانید، تا آنکہ بعلم الیقین دانستہ شد کہ اثبات خلافت ایں بزرگواراں اصلیست از اصول دین تا وقتیکہ ایں اصل رامحکم نگیرند، ہیچ مسئلہ از مسائل شریعت محکم نشود۔[1]

اس بندۂ ضعیف کے دل میں (ایک مستقل علم کو) اس شرح وبسط کے ساتھ القا کیا کہ اس کو علم الیقین کے ساتھ معلوم ہوگیا کہ ان حضرات (خلفائے راشدین) کی خلافت کا اثبات اصول دین میں سے ایک اصل عظیم ہے، جب تک اس اصل کو پوری مضبوطی کے ساتھ تسلیم نہیں کیا جائیگا، شریعت کے مسائل میں سے کسی مسئلہ کو استحکام حاصل نہیں ہوگا۔

اُن صاحبِ کمال علماء کی بھی جو بہت سے مسائل میں شاہ صاحبؒ سے اختلاف رکھتے تھے، اور جن کو علوم عقلیہ میں توغل، بلکہ درجۂ امامت حاصل تھا، جب اس کتاب پر نظر پڑی تو وہ مصنف کے تبحر علمی اور ژرف نگاہی کی داد دیئے بغیر نہیں رہ سکے، مولانا محسن بن یحییٰ ترہتی صاحبِ "الیانع الجنی" کہتے ہیں کہ میں نے اپنے استاد مولانا فضل حق خیرآبادی (م ۱۲۷۸ھ) کو دیکھا کہ جو وقت خالی ہوتا تھا اس میں کسی کتاب کے مطالعہ میں منہمک ومستغرق ہیں، ہم لوگ خلاف معمول ان کے اس استغراق کو دیکھ کر متعجب ہوئے اور تجسس پیدا ہوا کہ یہ کیا کتاب ہے؟ اور کس کی تصنیف ہے؟ انھوں نے خود ہی فرمایا کہ "اس کتاب کا مصنف ایسا بحر زخّار ہے جس کا کوئی کنارہ نہیں" معلوم ہوا کہ یہ شاہ ولی اللہ صاحبؒ کی تصنیف "ازالۃ الخفا" ہے جس کا ایک نسخہ

---

[1] ازالۃ الخفا (مطبوعہ سہیل اکیڈمی لاہور) ص۱

مولانا کے ہاتھ آگیا ہے"[1]

فخر المتاخرین ابوالحسنات مولانا عبدالحی فرنگی محلی (م ۱۳۰۴ھ) جن کا تبحرِ علمی نادرۂ روزگار جامعیت اور وسعتِ نظر مشہور و مسلّم ہے، اپنی مشہور کتاب "التعلیق الممجّد علی مؤطّا الامام محمد" میں "ازالۃ الخفا" کا ذکر کرتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں "کتاب عدیم النظیر فی بابہٖ"[2] (کتاب اپنے موضوع پر بے نظیر اور عدیم المثال ہے۔)

"حجۃ اللہ" اور "ازالۃ الخفا" کا باہمی تعلق

حجۃ اللہ البالغہ کی تصنیف کے بعد جس میں اسلام کا جامع و مربوط نظام اس طرح پیش کیا گیا ہے کہ زندگی اور معاشرہ و تمدن سے اس کا ربط و تعلق ثابت ہوتا ہے، اور یہ بات صاف ہو جاتی ہے کہ اسلام کے پیش کئے ہوئے عقائد و عبادات اور اجتماعی زندگی کے احکام پر عمل کئے بغیر کسی صحت مند معاشرہ، صالح تمدن، اور معتدل و متوازن اجتماعیت کے وجود کی توقع نہیں کی جا سکتی، اس مقصد کی توضیح و تکمیل اور اس مرحلہ کو عالمانہ و محققانہ شان کے ساتھ (جس میں قریبی زمانہ میں آنے والے دور انقلاب کی عقلیت پسند طبیعتوں اور دماغوں کی تسکین و تشفی کا سامان تھا) اس کی ضرورت تھی کہ خود اسلام کے نظامِ اجتماعی کے مزاج و خصوصیات اور مقاصد و دائرۂ عمل پر، نیز اس کے عالمگیر و دائمی، اور صریح و منصوص ادارۂ "خلافت" پر اسی شرح و بسط نقل و عقل کی مدد، تاریخ کی شہادت، اور سب سے بڑھ کر کتاب و سنت کی روشنی میں قلم اٹھایا جائے، نیز ان غلط فہمیوں اور گمراہیوں کا

---

[1] "الیانع الجنی" ص ۹۳ مطبوعہ علی رجال الطحاوی، و نزہۃ الخواطر ج ۶ ترجمہ حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ۔

[2] التعلیق الممجّد مطبع یوسفی ص ۲۵

پردہ چاک کیا جائے، جو اس سلسلہ میں زمانۂ قدیم سے رونما ہوئی ہیں، اور ان کی بنیاد پر ایک بڑے فرقہ کا وجود عمل میں آیا ہے، جس نے خاص طور پر شاہ صاحب کے دور میں ایرانی عنصر کے غلبہ کی بناء پر ایک ایسا ذہنی انتشار پیدا کر دیا تھا، جس کا اثر عقائد و اعمال کے حدود سے آگے بڑھ کر نظام حکومت اور ہندوستان میں مسلمانوں کے اقتدار اعلیٰ پر بھی پڑا تھا، اور اس نے اس ملک میں مسلمانوں کے مستقبل کو مشکوک و مشتبہ بنا دیا تھا۔

اس کی حیثیت (ان لوگوں کی نظر میں جو اس مذہب کی تاریخ اس کے بنیادی عقائد اور اس کے دین کے تصور و فہم سے واقف تھے، اور جنھوں نے براہ راست اس کی مستند کتابوں اور اصلی مآخذ کا مطالعہ کیا تھا) محض ایک اجتہادی اختلاف یا دائرۂ شریعت کے اندر ایک ذیلی فرقہ کی نہیں تھی، بلکہ وہ اس فہم دین کے متوازی جس کی بنیاد کتاب و سنت، منصب نبوت کی عظمت اور ختم نبوت کے عقیدہ پر تھی ایک مستقل فکر اور دینی تصور تھا، اس کا کسی قدر اندازہ فرقہ اثنا عشریہ کے عقیدۂ امامت سے ہو سکتا ہے، جس کے نزدیک امامت نبوت کے ہم پلّہ ہے، بلکہ بعض حیثیتوں سے اس سے بھی فائق ہے۔[1]

---

[1] حال میں انقلاب ایران کے قائد روح اللہ خمینی صاحب جو "آیت اللہ العظمیٰ الامام الخمینی" کے نام سے مشہور ہیں، کی کتاب "الحکومۃ الإسلامیۃ" مطالعہ میں آئی، اس میں صفحہ ۵۲ پر "الولایۃ التکوینیۃ" کے عنوان سے یہ لکھنے کے بعد کہ ائمہ کو خلافت تکوینی حاصل ہوتی ہے، اور اس عالم کے تمام ذرات ان کی حکومت و اقتدار کے تابع اور فرماں بردار ہوتے ہیں، حسب ذیل عبارت آئی ہے:

وإنّ من ضروریات مذهبنا أن لأئمتنا مقاماً لا یبلغه ملك مقرب ولا نبي مرسل، وبموجب ما لدینا من الروایات والأحادیث فإن الرسول الأعظم (ص) والأئمة (ع) كانوا قبل هذا العالم أنواراً فجعلهم الله بعرشه محدقین، وجعل لهم من المنزلة والزلفى ما لا یعلمه إلا الله۔
(الحكومة الإسلامیة۔ کتابخانۂ بزرگ اسلامی۔ ایران)

ہمارے دین کے قطعی الثبوت مسائل میں سے یہ ہے کہ ہمارے اماموں کو وہ مقام حاصل ہے جس کو نہ کوئی مقرب فرشتہ پہونچ سکتا ہے نہ نبی جس کی بعثت ہوئی، اور ہماری روایات اور احادیث کے بموجب رسول اعظم (صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم) اور ائمہ (علیہم السلام) اس عالم سے پہلے انوار (روشنیاں) تھے، اللہ نے ان کو اپنے عرش کا احاطہ کرنے والا بنا دیا اور ان کو ایسا مرتبہ اور قرب عطا فرمایا جس کا علم صرف اللہ کو ہے۔

شاہ صاحبؒ کتاب کی تالیف کی اولین غرض و غایت بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:۔

می گوید فقیر حقیر ولی اللہ عفی عنہ کہ دریں	فقیر حقیر ولی اللہ عفی عنہٗ کہتا ہے کہ
زمان بدعت تشیّع آشکار شد و نفوس	اس زمانہ میں تشیّع کی بدعت کا
عوام بشبہات ایشان متشرب گشت،	شیوع ہوا، عوام کی طبیعتیں ان کے
واکثر اہل ایں اقلیم در اثبات خلافتِ	پیدا کئے ہوئے شبہات سے گہرے
خلفائے راشدین رضوان اللہ تعالےٰ	طریقہ پر متاثر ہوئیں، اس علاقہ کے
علیہم اجمعین شکوک بہم رسانیدند۔[1]	اکثر باشندوں کے دل میں خلفائے
	راشدین رضوان اللہ تعالےٰ علیہم
	اجمعین کے ثبوت خلافت کے
	بارے میں طرح طرح کے شکوک
	واعتراضات پیدا ہوگئے۔

شاہ صاحبؒ کی نظر اس تشکیکی فتنہ کی ظاہری سطح ہی پر نہیں تھی، اس کی تہہ میں جو گہری سازش کام کر رہی تھی، اور اس کے جو دور رس نتائج ظاہر ہونے والے تھے، (مثلاً اسلام کا اپنے اولین و بہترین دور میں ناکام ثابت ہونا اور صحبت و تربیت نبوی کی بے اثری صحابۂ کرام کے ذریعہ خیر القرون میں قرآن کی حفاظت، سنّت کی اشاعت اور جن امور پر اتفاق ہوا اس سب پر بے اعتمادی) ان کو بھی دیکھ رہی تھی، چنانچہ فرماتے ہیں:۔

ہر کہ در شکستن ایں اصل سعی می کند	جو شخص بھی خلافت راشدہ کی صحت
بحقیقت ہدم جمیع فنون دینیہ	کے اصول کو توڑنے کی کوشش کرتا ہے

---

[1] ازالۃ الخفا ص۱

می خواہد۔[1] اور دین کے اس اصل کا انکار کرتا ہے، وہ حقیقت میں تمام فنون دینیہ کو منہدم کر دینا چاہتا ہے۔

آگے تحریر فرماتے ہیں کہ:۔

"خلفائے راشدین آنحضرت صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم اور آپ کی امت کے درمیان قرآن مجید کے اخذ و تلقّی میں واسطہ ہیں"[2]

اس کے بعد وہ اس دائرہ میں ان علوم اور شعبوں کو بھی شامل کرتے ہیں جن کی دولت خلفائے راشدین ہی کے ذریعہ امت کو حاصل ہوئی، مثلاً علم حدیث، علم فقہ اور اس سے بڑھ کر مجتہد فیہ مسائل میں کسی ایک خاص شکل پر اجماع کا انعقاد اور اختلاف امت کا خاتمہ نیز علم احسان (جس کا نام بعد کے زمانہ میں علم سلوک پڑ گیا) اس کے بعد مراتبِ علم حکمت، اخلاقِ فاضلہ اور اخلاقِ رذیلہ کی وضاحت اور ان کا فرق، تدبیرِ منزل اور سیاستِ مدن شاہ صاحب کے نزدیک یہ سب علوم و کمالات امت کو خلفائے راشدین ہی کی تعلیم اور طریق عمل سے حاصل ہوئے، اور امت اس بارے میں ان کی رہینِ منت ہے۔[3]

اس لئے یہ عین مناسب تھا کہ حجۃ اللہ البالغہ کے بعد جو گویا اسلام کی علمی و نظری تفہیم و تشریح ہے یہ دکھایا جائے کہ واقعات کی دنیا میں نبوت کے بعد کے متصل دور میں کس طرح کامیابی کے ساتھ ان اصول و تعلیمات کو عملی شکل دی گئی، زندگی پر کس خوش اسلوبی کے ساتھ ان کا انطباق ہوا، معاشرۂ انسانی پر اس کے کیا اثرات مرتب ہوئے، دو قدیم باجبروت اور صاحب اقتدار تمدن (جنھوں نے متمدن دنیا آپس میں تقسیم کر رکھی تھی اور جن کی

---

[1] ازالۃ الخفا ص ۱ [2] ایضاً ص ۲۴ [3] تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو ص ۶ ۔ ۲

تاریخ صدیوں کی پرانی تھی) جن سلطنتوں (دولت ساسانیہ اور دولت روما) کے سایہ میں اوران کی رہنمائی اور سرپرستی میں پھل پھول رہے تھے، اور حیات انسانی پر اثر انداز ہو رہے تھے، وہ کس طرح نیست و نابود ہوئیں[1]۔

چند قدیم تصنیفات

اسلام کے نظام اجتماعی، سلطنت اور اس کے دائرۂ عمل پر (مرتبہ اور کیفیت سے قطع نظر تعداد و کمیّت کے لحاظ سے بھی) ہمیں قدیم ذخیرۂ کتب میں بہت کم کتابیں ملتی ہیں، اس موضوع پر امام ابو یوسفؒ (۱۱۳ھ سے ۱۸۲ھ) جو امام اعظم امام ابو حنیفہؒ کے شاگرد رشید اور خلافت عباسیہ کے قاضی القضاۃ تھے، کی "کتاب الخراج" بنیادی حیثیت رکھتی ہے لیکن اس کا دائرۂ بحث سلطنت اسلامیہ کے ذرائع آمدنی، مالیات اور نظام محاصل تک محدود ہے۔

اس سلسلہ میں سب سے پہلی قابل ذکر کتاب قاضی القضاۃ علامہ ابو الحسن علی ابن محمد بن حبیب الماوردی (۳۶۴ھ سے ۴۵۰ھ) کی تالیف "الأحكام السلطانية والولايات الدينية" ہے، یہ متوسط سائز کے ۲۵۹ صفحات میں آئی ہے، اس کا مرکزی موضوع امامت اور اس کا حکم شرعی، شرائط، کیفیتِ انعقاد، اس کے تفویض کئے ہوئے مناصب اور امام کے فرائض و واجبات، قضاۃ کے تقرر کے احکام، امامت، ولایت صدقات، اور جزیہ و خراج وغیرہ کے احکام ہیں، اور حدود نیز احتساب وغیرہ کا بیان ہے، خلافتِ راشدہ کی

---

[1] تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو "ازالۃ الخفا" عنوان "برہم شدنِ دولت ساسانیہ" ص ۵۴/۲ - ص ۵۹/۲ و عنوان "برہم شدن دولت رومیۃ" ص ۵۹/۲ - ص ۶۳/۲

صحت وثبوت، اور خلفائے راشدین کے فضائل ومناقب اور کارناموں سے کوئی بحث نہیں۔

اس موضوع پر سب سے بڑی کتاب "الغیاثی" ہے، اس کا پورا نام "غیاث الامم فی التیاث الظلم" ہے کتاب کے مصنف امام غزالیؒ کے نامور استاد اور اپنے زمانہ کے استاذ الاساتذہ امام الحرمین ابوالمعالی عبدالملک الجوینی، (۴۱۹ھ ۔ ۴۷۸ھ) ہیں، یہ کتاب[۱] اصلاً دولت سلجوقیہ کے نامور وزیر باتدبیر نظام الملک طوسی (۴۰۶ھ ۔ ۴۸۵ھ) (بانی مدرسہ نظامیہ بغداد و نیشاپور) کے مشورہ وملاحظہ کے لئے تصنیف کی گئی ہے، جو ضابطہ سے ملک الپ ارسلان اور ملک شاہ سلجوقی کے وزیر اور مدار المہام سلطنت تھے، لیکن حقیقتاً اس عظیم سلطنت بلکہ شہنشاہی کے کرتا دھرتا تھے[۲]، کتاب درحقیقت امامت کے شرعی احکام، صفات اور فرائض پر ہے، قسم اول میں ائمہ، ولاۃ رعیت اور قضاۃ کے اوصاف بیان کئے گئے ہیں، اس پر بھی بحث کی گئی ہے کہ اگر کسی زمانہ میں کوئی امام نہ ہو تو کیا کرنا چاہیئے، نیز مفتیوں ووالیوں کے اوصاف وفضائل بیان کئے گئے ہیں، ان کی غیر موجودگی میں امت کے فرائض کیا ہو جاتے ہیں، اگر منصب امامت پر کوئی نااہل بزور شمشیر مسلط ہو جائے، تو مسلمانوں کو کیا کرنا چاہیئے؟ اگر زمانہ مفتیوں سے خالی ہو تو امت کا کیا فرض ہے؟ خلع امام کے کیا اسباب ہیں؟ پھر تفصیل سے وہ فقہی احکام بیان کئے گئے ہیں جو مفتیوں کے نہ ہونے کی صورت میں امت کو جاننے چاہئیں، اور ان پر عمل کرنا چاہیئے، یہاں پہونچکر

---

[۱] یہ کتاب ڈاکٹر عبدالعظیم الدیب کی تحقیق سے شیخ عبداللہ ابن ابراہیم الانصاری کی توجہ اور اہتمام سے حکومت قطر کے "الشئون الدینیۃ" کے مصارف پر ۱۴۰۰ھ میں طبع ہوئی، کتاب کی ضخامت بڑی تختی پر ۶۱۱ صفحات ہیں۔ [۲] ابن خلکان، طبقات الشافعیہ وغیرہ، نظام الملک کے حالات وکمالات کے لئے (اردو میں) ملاحظہ ہو "نظام الملک طوسی" از مولوی عبدالرزاق صاحب کانپوری مرحوم۔

یہ کتاب فقہ (شافعی) کی کتاب بن جاتی ہے، کتاب میں خلفائے راشدین کی خلافت کی صحت و اہمیت سے بحث نہیں، وہ درحقیقت امامت کے شرعی احکام، صفات و فرائض پر ہے، کتاب میں جابجا ماوردی کی کتاب "الاحکام السلطانیہ" پر تعریض اور مولف پر اعتراضات بھی ہیں۔

تیسری قابل ذکر کتاب شیخ الاسلام ابن تیمیہؒ (۶۶۱ھ۔۷۲۸ھ) کی کتاب "السیاسۃ الشرعیۃ فی اصلاح الراعی والرعیۃ" ہے، مصنف علامؒ نے کتاب کے خطبہ میں صراحت سے کہدیا ہے کہ یہ مختصر رسالہ ہے جس میں سیاست الٰہیہ اور نیابت نبویہ کے وہ چند اصول و احکام بیان کئے جائیں گے جن سے راعی اور رعیت کوئی بھی مستغنی نہیں، کتاب درحقیقت آیت قرآنی :۔

اِنَّ اللّٰہَ یَاْمُرُکُمْ اَنْ تُؤَدُّوا	خدا تم کو حکم دیتا ہے کہ امانت
الْاَمٰنٰتِ اِلٰٓی اَھْلِھَا وَاِذَا حَکَمْتُمْ	والوں کی امانتیں ان کے حوالہ کر دیا
بَیْنَ النَّاسِ اَنْ تَحْکُمُوْا بِالْعَدْلِ	کرو، اور جب لوگوں میں فیصلہ کرنے
(الیٰ قولہ تعالیٰ) ذٰلِکَ خَیْرٌ	لگو تو انصاف سے فیصلہ کیا کرو۔
وَّاَحْسَنُ تَاْوِیْلًا ؀	یہ بہت اچھی بات ہے اور اس کا
(سورۃ النساء۔۵۸۔۵۹)	مآل بھی اچھا ہے

کی تفسیر و تفصیل ہے۔

قسم اول میں باب اول کا عنوان "الولایات" ہے، باب دوم کا "الأموال" ہے، اور قسم ثانی میں پہلے حدود اللہ اور حقوق اللہ سے بحث کی گئی ہے، پھر حقوق العباد سے کتاب متوسط سائز کے ۱۶۸ صفحات پر آئی ہے، [1]

---

[1] ہمارے سامنے اس کا چوتھا ایڈیشن ہے جو ۱۹۶۹ء میں دار الکتاب العربی مصر کی طرف سے شائع ہوا۔

اس کتاب میں بھی خلافت راشدہ اور خلفائے راشدین کے سلسلہ کی اصولی، کلامی اور تاریخی بحثوں سے کوئی تعرض نہیں کیا گیا، جس کے بارہ میں کتاب کے جلیل القدر مصنف سند اور امام کا درجہ رکھتے تھے، اور اگر وہ اس کی طرف توجہ فرماتے تو وہ اسلام کے تحقیقی ذخیرۂ کتب اور مباحث میں گرانقدر اضافہ ہوتا، اس موضوع پر ان کے وسیع علم اور رواں قلم نے "منہاج السنۃ" کے صفحات پر اپنا اصلی جوہر دکھایا ہے، اور اس میں ان کے دریائے علم کی طغیانی اور رہوار قلم کی جولانی کا تماشا دیکھنے میں آتا ہے۔[1]

اسلام میں خلافت کی حیثیت و مقام

قرآن مجید اور حدیث نبویؐ میں دعوت اسلامی اور دین محمدیؐ کے قبول کرنے، اور ان پر ایمان لانے والوں کا تصور ایک منظم اور مربوط جماعت ہی کی تشکل میں کیا گیا ہے، اس کے لئے "امت"، "ملت"، "جماعت" کے جو الفاظ استعمال کئے گئے ہیں، وہ سب اسی حقیقت پر دلالت کرتے ہیں، اہل بصیرت جانتے ہیں کہ یہ الفاظ کتاب وسنت کی لغت و اصطلاح میں محض تعداد کی کثرت، اور انسانوں کے انبوہ کے جیسے سطحی مفہوم اور معنی کے لئے استعمال نہیں کئے گئے، جن کا ادیان و ملل کی تاریخ میں بھی، اور قوموں اور تہذیبوں کی تقدیریں بھی کوئی وزن اور اثر نہیں ہے، بلکہ سارا قرآن مجید کہیں امم سابقہ کے واقعات کے سلسلہ میں اور کہیں قوت وضعف اور غلبہ وہزیمت کے اسباب کے تذکرے میں، تعداد کی کثرت کی بے اثری، انسانی انبوہ کی بے وزنی اور صالح ترین افراد کی موجودگی میں فساد کے غلبہ، انسانوں کی مظلومیت اور دین حق کی مغلوبیت کے تذکرہ سے بھرا ہوا ہے، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ

---

[1] تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو "منہاج السنۃ" پر تبصرہ "تاریخ دعوت وعزیمت" حصۂ دوم صفحہ ۲۸۴-۳۱۲

میزان عدل اور میزان عقل دونوں میں منتشر افراد کی (جن کی تعداد خواہ کتنی ہی زائد ہو) کوئی بڑی اہمیت وافادیت نہیں۔

اسلام کے پیش نظر جو عظیم مقاصد ہیں، ان میں عبد ومعبود کے تعلق کی اصلاح وتنظیم، پھر اس کی ترویج وتوسیع، انسانی زندگی کو اس کے قالب میں ڈھالنے کی سعی، افراد وجماعت کے باہمی تعلقات کی استواری اور خوشگواری بھی ہے، ایک ایسی شائستہ، خوش اسلوب پُرسکون اور پُرامن زندگی کے لئے فضا ہموار کرنا بھی ہے، جس میں خالق کے فرائض، مخلوق کے حقوق، دونوں کے ادا کرنے کا پورا موقعہ، اور ان کمالات وارتقائی منازل تک پہونچنے کا پورا امکان پایا جائے، جن کی صلاحیت انسان کی فطرت میں ودیعت کی گئی ہے، اس نے کوشش کی ہے کہ اس کی قوت عمل اور ذہانت، ان خطرات کا مقابلہ کرنے، ان نقصانات سے بچنے اور ان مفاسد کے دور کرنے میں ضائع نہ ہو، جو کبھی غیر منظّم زندگی سے پیدا ہوتے ہیں، کبھی خود ساختہ قوانین سے، کبھی مطلق العنانی اور جاہ واقتدار کی ہوس سے، اس کے لئے ایک منزّل من اللہ قانون، آسمانی شریعت، اور خدا کی الوہیت وحاکمیت کے عقیدہ پر ایک نظامِ خلافت وامارت ضروری ہے، جہاں تک شریعت الٰہی کا تعلق ہے، اس کے منزّل من اللہ، معصوم عن الخطاء، اغراض ومفادات، تعصّبات اور جنبہ داریوں سے بلند وبالاتر ہونے کا عقیدہ ضروری ہے اور جہاں تک خلافت وامارت کا تعلق ہے، اس کا اس شریعت کے صحیح ترجمان ونمائندہ، اور انسانی طاقت وارادہ کی حد تک بے جا حمایت وعصبیت، مداہنت اور عدم مساوات سے دور رہنا ضروری ہے۔

ان مقاصد کی تکمیل اور ان نتائج کے ظہور کے لئے ابتداء ہی سے صاحب شریعت (صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے ایسے احکام وہدایات صادر فرمائیں جن کی موجودگی میں مسلمان

ایک ایسی منظم اور مربوط جماعت کی شکل اختیار کرنے پر مجبور ہو جاتے ہیں، جو ایک ایسے صاحب امر فرد کے حکم و انتظام کی تابع ہے، جو بہت سی خصوصیات میں ان سے امتیاز رکھتا ہے، ان کے مصالح، مفادات اور ضروریات کا نگراں ہے، اور انھوں نے اس کو شریعت کے وسیع و لچکدار رہنما اصولوں کی روشنی میں انتخاب کیا ہے، اگر وہ امامت کبریٰ کے منصب پر فائز ہے تو اس کو خلیفۃ المسلمین، امیر المؤمنین، یا امام کہیں گے، اور اگر وہ اس کا نائب اس کا نامزد کیا ہوا ہے، یا شریعت کے احکام کے نفاذ، فصل خصومات، اور منظم دینی زندگی گذارنے کے لئے مسلمانوں نے اس کو (جزئی اور مقامی طور پر) انتخاب کیا ہے، تو اس کو امیر کہیں گے۔

خلیفہ کا انتخاب ایسے دینی فرائض میں سے تھا کہ سب سے بڑے عاشق رسول اور جاں نثار رفیق حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ اور سب سے بڑے عشاق و جاں نثاروں کے گروہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے (مع اہل بیت عظام کے) اس مسئلہ کا تصفیہ، اور خلیفۃ المسلمین کے انتخاب کو جسد اطہر و انور کی تدفین پر مقدم رکھا، اور تقریباً یہی معمول ہر خلیفہ کے انتقال پر رہا، صدیق اکبر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے انتخاب ۱۱ھ سے لے کر خلیفہ مستعصم باللہ عباسی کی شہادت ۶۵۶ھ تک عالم اسلام خلیفۂ اسلام سے کبھی محروم نہیں رہا، صرف خلیفۂ مسترشد باللہ جو سلطان مسعود سلجوقی کے ہاتھوں ۱۰ رمضان ۵۲۹ھ میں گرفتار ہوا تھا، کی غیبت و اسیری کے قلیل وقفہ میں جو تین مہینے سات دن سے متجاوز نہیں تھا، عالم اسلام خلیفۂ اسلام کے بغیر رہا، لیکن یہ عالم اسلام کے لئے ایک ایسا انوکھا تجربہ، اور المناک واقعہ تھا جس کی وجہ سے وہ سیاہ پوش اور سوگوار، اور بغداد زیر و زبر ہو گیا، ابن کثیرؒ کے الفاظ میں:-

"بغداد کے باشندوں میں ظاہر و باطن ہر لحاظ سے ایک زلزلہ سا آ گیا، عوام نے مسجد کے منبروں تک کو توڑ ڈالا، اور جماعتوں میں شریک ہونا بھی چھوڑ دیا، عورتیں

سر سے دوپٹہ ہٹا کر نوحہ خوانی کرتی ہوئی باہر نکل آئیں، اور خلیفہ کے قید اور اس کی پریشانیوں اور مصیبتوں کا ماتم کرنے لگیں، دوسرے علاقے بھی بغداد ہی کے نقش قدم پر چلے، اس کے بعد یہ فتنہ اتنا بڑھا کہ کم و بیش تمام علاقے اس سے متاثر ہو گئے ملک سنجر نے یہ ماجرا دیکھ کر اپنے بھتیجہ کو معاملہ کی نزاکت اور اہمیت سے آگاہ اور خبردار کیا، اور اس کو حکم دیا کہ خلیفہ کو بحال کر دے، ملک مسعود نے اس حکم کی تعمیل کی۔[1]

خلیفہ مستعصم باللہ کی شہادت پر شیخ سعدیؒ نے جو مرکز خلافت سے بہت دور شیراز میں رہتے تھے، جو دل دوز و جگر سوز مرثیہ کہا ہے، اور جس کا مطلع ہے ؎

آسماں را حق بود گر خوں ببارد بر زمیں
بر زوالِ امر مستعصم امیر المؤمنیں

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ مسلمان خلافت اور خلیفہ کو کس نظر سے دیکھتے تھے، اور عالم اسلام کی ان سے محرومی پر کن جذبات کا اظہار کرتے تھے۔

خلافت کی جامع و مانع تعریف

شاہ صاحبؒ نے جن کی نظر کتاب و سنت، فقہ، عقائد اور علم کلام اور سیرت و تاریخ پر نہایت وسیع اور گہری تھی، اور وہ مقاصد شریعت کے رمز آشنا تھے، خلافت کی ایسی جامع و مانع تعریف کی ہے جس سے بہتر پیش کرنی مشکل ہے، اس تعریف کا ہر لفظ اپنے ساتھ معانی و مطالب اور مثالوں کا ایک دفتر رکھتا ہے، وہ تحریر فرماتے ہیں:۔

الخلافة هي الرياسة العامة   خلافت اس عمومی سربراہی اور

---

[1] ابن کثیر جلد ۱۲ ص ۲۰۸

في التصدي لإقامة الدين	ریاست عامہ کا نام ہے جو "اقامتِ
بإحياء العلوم الدينية وإقامة	دین" کے کام کی تکمیل کے لئے وجود
أركان الإسلام والقيام بالجهاد	میں آئے، اس "اقامتِ دین" کے
وما يتعلق به من ترتيب الجيوش	دائرۂ کار میں علوم دینیہ کا احیاء،
والفرض للمقاتلة وإعطائهم	ارکان اسلام کا قیام، جہاد اور
من الفئ، والقيام بالقضاء،	اس کے متعلقات کا انتظام، مثلاً
وإقامة الحدود، ورفع المظالم،	لشکروں کی ترتیب، جنگ میں حصہ
والأمر بالمعروف والنهي عن	لینے والوں کے حِصَص و مالِ غنیمت
المنكر، نيابةً عن النبي صلى الله	میں ان کا حق، نظامِ قضا کا اجراء،
عليه وآله وسلم۔[1]	حدود کا قائم کرنا، مظالم و شکایات کا
	ازالہ، امر بالمعروف اور نہی عن المنکر
	کے فرض کی ادائیگی شامل ہے، اور
	یہ سب آنحضرت صلے اللہ علیہ وآلہ
	وسلم کی نیابت اور نمائندگی میں ہونا چاہیئے۔

پھر اقامت دین کی مزید تشریح و تعریف کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ :۔

"ہم جب معاملات کو استقرائی نظر سے دیکھتے ہیں، جزئیات سے کلّیات اور کلّیات سے ایک ہی کُلّیہ کی طرف جو سب پر حاوی ہو منتقل ہوتے ہیں، تو اس نتیجہ پر پہونچتے ہیں کہ ان معاملات، جزئیات متشتتہ اور کلّیات کثیرہ کی جنس اعلیٰ اور

---

[1] ازالۃ الخفا ص۲ ج۱

(گویا کلیۃ الکلیات) وہ حقیقت ہے جس کا عنوان "اقامت دین" ہے، جس کے ماتحت دوسری انواع و اجناس آتی ہیں، جن میں سے ایک احیاءِ علوم دین ہے، جس میں قرآن و سنت کی تعلیم اور تذکیر و موعظت شامل ہے، اللہ تعالےٰ کا ارشاد ہے :-

هُوَالَّذِي بَعَثَ فِي الْأُمِّيِّينَ	وہی تو ہے جس نے اَن پڑھوں میں
رَسُولًا مِّنْهُمْ يَتْلُوا عَلَيْهِمْ آيٰتِهٖ	انھیں میں سے (محمدؐ کو) پیغمبر بنا کر
وَيُزَكِّيهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ	بھیجا جو ان کے سامنے اس کی آیتیں
وَالْحِكْمَةَ وَإِنْ كَانُوا مِنْ قَبْلُ	پڑھتے اور ان کو پاک کرتے اور انھیں
لَفِي ضَلٰلٍ مُّبِينٍ ۝[1]	(خدا کی) کتاب اور دانائی سکھاتے
(سورۃ الجمعۃ - ۲)	ہیں اور اس سے پہلے تو یہ لوگ صریح
	گمراہی میں تھے۔

خلفائے راشدین کی خلافت پر قرآن سے استدلال

کتاب کا سب سے وجد انگیز حصہ وہ ہے جس میں شاہ صاحبؒ نے قرآن مجید کی متعدد آیات سے خلفائے راشدین کی خلافت کے انعقاد اور ان کے خلیفۂ راشد ہونے اور ان کے ذریعہ سے منشائے الٰہی کی تکمیل، اور امر تکوینی کے تحقّق پر استدلال کیا ہے، اور آیات کے ایسے اشارات بلکہ تصریحات کی طرف توجہ دلائی ہے جن سے بدیہی طور پر (بلکہ بعض مقامات پر ریاضی کے نتائج کے رنگ میں) یہ ثابت ہوتا ہے کہ ان حضرات کے سوا ان آیات کا کوئی اور مصداق اور مراد

---

[1] ازالۃ الخفا ص ۲-۳ / ۱

نہیں ہوسکتا، اور ان پیشین گوئیوں کا انطباق ان کی ذات کے سوا کسی پر، اور ان وعدوں کا تحقق ان کے دور خلافت کے سوا کسی دور میں وقوع پذیر نہیں ہوا، اگر ان کی شخصیتوں اور ان کے عہد کو بیچ میں سے نکال لیا جائے تو یہ صفات بغیر کسی مصداق کے اور یہ وعدے تشنۂ تکمیل رہ جاتے ہیں۔

ان آیات میں جو شاہ صاحبؒ نے پیش کی ہیں، ہم بطور نمونہ کے صرف دو آیتیں انتخاب کرتے ہیں، ان میں سے ایک سورۂ نور کی آیت ہے، اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:۔

وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ	جو لوگ تم میں سے ایمان لائے اور
وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ	نیک کام کرتے رہے ان سے خدا کا
فِي الْاَرْضِ كَمَا اسْتَخْلَفَ الَّذِيْنَ	وعدہ ہے کہ ان کو ملک کا حاکم بنادے گا
مِنْ قَبْلِهِمْ ۠ وَلَيُمَكِّنَنَّ لَهُمْ دِيْنَهُمُ	جیسا ان سے پہلے لوگوں کو حاکم بنایا
الَّذِي ارْتَضٰى لَهُمْ وَلَيُبَدِّلَنَّهُمْ	تھا اور ان کے دین کو جسے اس نے
مِّنْۢ بَعْدِ خَوْفِهِمْ اَمْنًا ۭ يَعْبُدُوْنَنِيْ	ان کے لئے پسند کیا ہے مستحکم و پائیدار
لَا يُشْرِكُوْنَ بِيْ شَيْـــًٔا ۭ وَمَنْ كَفَرَ	کرے گا اور خوف کے بعد ان کو امن
بَعْدَ ذٰلِكَ فَاُولٰۗىِٕكَ هُـــمُ	بخشے گا وہ میری عبادت کریں گے،
الْفٰسِقُوْنَ ۝	(اور) میرے ساتھ کسی اور کو شریک
(سورۂ النور۔ ۵۵)	نہ بنائیں گے اور جو اس کے بعد کفر
	کرے تو ایسے لوگ بدکردار ہیں۔

شاہ صاحبؒ فرماتے ہیں کہ یہ وعدہ (استخلاف و تمکین فی الارض، اور خوف کے بعد امن کا) ان لوگوں کے ساتھ کیا گیا ہے، جو سورۂ نور کے نزول کے وقت موجود،

اسلام اور صحبت نبویؐ سے مشرف، اور دین کی نصرت و تائید میں شریک تھے، شاہ صاحبؒ صفائی سے لکھتے ہیں کہ اس وعدہ کا اطلاق حضرت معاویہ، بنوامیہ اور بنوعباس پر نہیں ہوتا، جو اس وقت یا تو اسلام نہیں لائے تھے، یا مدینہ میں موجود نہیں تھے۔

پھر لکھتے ہیں کہ یہ بات نہ تو ممکن ہے نہ معقول کہ اس پوری جماعت مسلمین کو خلافت فی الارض سے سرفراز کیا جائے، اور وہ سب بیک وقت منصبِ خلافت پر فائز ہوں، اس لئے اس سے کچھ خاص افراد ہی مراد لئے جا سکتے ہیں، فرماتے ہیں:۔

"لَیَسْتَخْلِفَنَّهُمْ یعنی لیستخلفن جمعاً منھم، و "انقیاد" لوازم اوست"
یعنی ان میں سے ایک جماعت کو خلیفہ بنایا جائیگا، اور انقیاد و طاعت اس کے لئے شرط ہے، پھر یہ کہ جب اس وعدہ کا تحقق ہوگا، تو دین علی اکمل الوجوہ ظہور میں آئیگا، اور اس کو پورا اقتدار اور اختیار حاصل ہوگا، ایسا نہیں، جیسے اثنا عشری حضرات کہتے ہیں کہ خدا کو جو دین پسند ہے وہ ہمیشہ مستور و مختفی رہا ہے، اور اسی بناء پر ائمۂ اہلِ بیت نے ہمیشہ تقیہ سے کام لیا، اور ان کو اپنے دین کے کھلّم کھلا اعلان کی کبھی قدرت حاصل نہیں ہوئی "وَلَيُمَكِّنَنَّ لَهُمْ دِينَهُمُ الَّذِي ارْتَضَىٰ لَهُمْ" (ان کے لئے اللہ تعالٰے اس دین کو قوت و غلبہ عطا فرمائیگا، جس کو اس نے ان کے لئے پسند کر لیا ہے) اس سے معلوم ہوا کہ وہ دین خدا کا پسندیدہ اور منتخب دین نہیں جس کا اس زمانۂ خلافت میں اعلان و اظہار نہ کیا جا سکے[1]

اسی طرح فرماتا ہے "وَلَيُبَدِّلَنَّهُم مِّن بَعْدِ خَوْفِهِمْ أَمْنًا" اس زمانۂ اختلاف

---

[1] ازالۃ الخفا ص ۲/۱

میں اللہ تعالیٰ خوف و ہراس کی فضا کے بجائے امن و اطمینان کی فضا پیدا کر دے گا، اس سے بھی ثابت ہوتا ہے کہ یہ مستخلفین اور بقیہ مسلمان اس وعدہ کی تکمیل کے وقت امن و اطمینان کے ساتھ ہوں گے، نہ ان کو مختلف الادیان کفار کا کوئی ڈر ہوگا، اور نہ کسی اور جماعت یا طاقت کا اندیشہ، برخلاف اس کے فرقۂ امامیہ کے لوگ کہتے ہیں کہ ائمۂ اہل بیت ہمیشہ ترساں و ہراساں رہے، انھوں نے تقیہ سے کام لیا، ان کو اور ان کے ساتھیوں کو ہمیشہ مسلمانوں سے اذیت اور تکلیف پیش آئی اور وہ اہانت و ذلت کا سامنا کرتے رہے، اور کبھی مؤید و منصور نہیں رہے[1] استخلاف اور تمکین فی الارض کے وعدہ کا ظہور انھیں مہاجرین اولین اور نزول آیت استخلاف کے وقت موجود رہنے والے حضرات کے ذریعہ ہوا، اور اگر یہ لوگ خلیفہ نہیں تھے، تو اس وعدہ کا ظہور ہی نہیں ہوا، اور نہ قیامت تک ہونے والا ہے " تعالی اللہ عن ذٰلک علوًا کبیرًا "[2]

دوسری آیت " قُل لِّلْمُخَلَّفِينَ مِنَ الْأَعْرَابِ " الخ سورۃ الفتح (آیت ۱۶) کی ہے، شاہ صاحبؒ نے اس آیت پر مفصل بحث کی ہے، جس کا خلاصہ یہ ہے کہ آنحضرت صلے اللہ علیہ و آلہ وسلم نے ۶ھ میں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی ایک بڑی جماعت کے ساتھ اس خواب کی بناء پر جو آپ نے دیکھا تھا، عمرہ کے قصد سے مکہ معظمہ کی طرف کوچ فرمایا، واقعہ کی اہمیت، مکہ معظمہ کے حالات اور قریش کی مخالفت کے خطرہ کی بناء پر صحابہ کرامؓ بڑی تعداد میں ہمرکاب ہوئے، لیکن اعراب (بادیہ کے ساکنین) خوف و نفاق کی بناء پر ساتھ نہیں ہوئے،

---

[1] ازالۃ الخفا ص ۲۱ ج ۱ [2] ایضاً ص ۲۳ ج ۱

حُدَیبیہ میں فسخ عزیمت اور قریش کے ساتھ صلح کا وہ تاریخ ساز واقعہ پیش آیا جو حدیث اور سیرت کی کتابوں میں تفصیل کے ساتھ ملتا ہے، وہیں وہ بیعت رضوان ہوئی جس میں شریک ہونے والوں کو اللہ تعالےٰ نے اپنی خوشنودی کا خاص پروانہ عطا فرمایا، اور قریبی زمانہ کی فتح کا مژدہ سنایا[1]، پھر اسی سورہ فتح میں یہ بھی اعلان فرمادیا کہ اس فتح قریب (فتح خیبر) میں (جو محرم ۷ھ کا واقعہ ہے) ان اعراب کو ساتھ نہیں لیا جائیگا، جو حدیبیہ کے موقعہ پر موجود نہیں تھے، اور جنھوں نے اس عظیم وخطرناک مہم میں رفاقت سے پہلوتہی کی تھی، اللہ تعالےٰ فرماتا ہے:-

سَيَقُوْلُ الْمُخَلَّفُوْنَ اِذَا انْطَلَقْتُمْ اِلٰى مَغَانِمَ لِتَاْخُذُوْهَا ذَرُوْنَا نَتَّبِعْكُمْ ۚ يُرِيْدُوْنَ اَنْ يُّبَدِّلُوْا كَلٰمَ اللّٰهِ ۗ قُلْ لَّنْ تَتَّبِعُوْنَا كَذٰلِكُمْ قَالَ اللّٰهُ مِنْ قَبْلُ ۚ فَسَيَقُوْلُوْنَ بَلْ تَحْسُدُوْنَنَا ۗ بَلْ كَانُوْا لَا يَفْقَهُوْنَ اِلَّا قَلِيْلًا ○ (سورۃ الفتح ـ ۱۵)	جب تم لوگ غنیمتیں لینے چلوگے تو جو لوگ پیچھے رہ گئے تھے وہ کہیں گے ہمیں بھی اجازت دیجئے کہ آپ کے ساتھ چلیں یہ چاہتے ہیں کہ خدا کے قول کو بدل دیں کہدو کہ تم ہرگز ہمارے ساتھ نہیں چل سکتے اسی طرح خدا نے پہلے سے فرما دیا ہے پھر کہیں گے (نہیں) تم تو ہم سے حسد کرتے ہو بات یہ ہے کہ یہ لوگ سمجھتے ہی نہیں مگر بہت کم

لیکن اس کے بعد ہی ان متخلفین سے فرمایا گیا کہ اس فتح قریب (فتح خیبر) میں

[1] سورۂ فتح ـ ۱۸

تو تمہیں شرکت اور اس کے مغانم سے فائدہ اٹھانے کی اجازت نہیں ہے لیکن عنقریب تم کو ایسے لوگوں سے قتال کرنے کے لئے مدعو کیا جائیگا جن کی ایک صفت تو یہ ہے کہ وہ بڑی شجاعت اور طاقت کے مالک ہیں، دوسرے ان کی خصوصیت یہ ہوگی کہ ان سے یا تو قتال کیا جائیگا یا وہ اسلام لے آئیں گے، درمیان کی کوئی چیز (جزیہ) نہیں ہے، اور یہ دعوتِ قتال اللہ کو ایسی محبوب اور اس کا داعی ایسا معتبر اور واجب الاطاعت ہوگا کہ اگر تم اس کی دعوت قبول اور اس کے حکم کی بجا آوری کروگے تو اللہ تعالےٰ تم کو اجرِ حسن سے نوازے گا، اور اگر پہلے کی طرح روگردانی کروگے، تو عذابِ الیم میں مبتلا کرے گا۔

اللہ تعالےٰ فرماتا ہے :-

قُلْ لِّلْمُخَلَّفِيْنَ مِنَ الْاَعْرَابِ	جو گنوار پیچھے رہ گئے تھے ان سے
سَتُدْعَوْنَ اِلٰى قَوْمٍ اُولِىْ بَاْسٍ	کہدو کہ تم ایک سخت جنگجو قوم کے
شَدِيْدٍ تُقَاتِلُوْنَهُمْ اَوْ يُسْلِمُوْنَ ۚ	(ساتھ لڑائی کے) لئے بلائے جاؤگے
فَاِنْ تُطِيْعُوْا يُؤْتِكُمُ اللّٰهُ اَجْرًا حَسَنًا ۚ	ان سے تم (یا تو) جنگ کرتے رہوگے
وَاِنْ تَتَوَلَّوْا كَمَا تَوَلَّيْتُمْ مِّنْ قَبْلُ	یا وہ اسلام لے آئیں گے اگر تم حکم
يُعَذِّبْكُمْ عَذَابًا اَلِيْمًا ۝	مانوگے تو خدا تم کو اچھا بدلہ دے گا
(سورۃ الفتح - ۱۶)	اور اگر منہ پھیر لوگے جیسے پہلی دفعہ
	پھیرا تھا تو وہ تم کو بڑی تکلیف کی
	سزا دے گا۔

شاہ صاحبؒ فرماتے ہیں کہ "سَتُدْعَوْنَ" (عنقریب تم بلائے جاؤگے) سے بطریق اقتضاء ثابت ہوتا ہے کہ زمانۂ مستقبل میں کوئی ایسا داعی (بلانے والا) ہوگا جو اعراب

(بادیہ کے رہنے والوں کو جو صلح حُدیبیہ کے موقعہ پر لشکرِ اسلام کے ساتھ نہیں گئے تھے) کو ایسی قوم سے جنگ کرنے کے لئے دعوت دے گا جس کے لئے دو ہی شکلیں ہیں یا قتال، یا اسلام (اور جس کا مصداق عرب کے مرتد قبائل ہی ہو سکتے ہیں، جن سے جزیہ لینا جائز نہ تھا، وہ یا تو جنگ میں مارے جاتے یا اسلام قبول کرتے) اور یہ شکل صرف حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے زمانہ میں پیش آئی جنھوں نے مرتدین عرب سے قتال کیا، ان کا حکم شرعی یہی تھا، اس سے مراد نہ رومی ہو سکتے ہیں، نہ ایرانی، جن کے لئے تین شکلیں تھیں قتال، اسلام اور جزیہ، اس لئے اس سے بداہتہً حضرت صدیق اکبرؓ کی خلافت ثابت ہوتی ہے جنھوں نے مرتدین سے جنگ کرنے کے لئے حضرت خالدؓ کی ماتحتی میں فوج بھیجی اور اعراب کو اس کی دعوت دی، پھر اس دعوت کے قبول کرنے پر اجر کا ملنا اور نہ قبول کرنے پر عذاب کا مستحق ہونا ایک خلیفۂ راشد ہی کا مقام و منصب ہے۔[1]

کتاب کے دوسرے قیمتی مضامین

خلفائے راشدین کی خلافت کے اثبات کے دلائل اور خلفائے اربعہ کے مآثر و مناقب،

---

[1] تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو ازالۃ الخفا ص ۳۸-۳۹ ج ۱ شاہ صاحب کے اس استدلال کی تائید علامہ شہاب الدین محمود الآلوسی (م ۱۲۷۰ھ) کی مشہور تفسیر روح المعانی سے بھی ہوتی ہے، وہ لکھتے ہیں:-

"المراد بالمغانم مغانم خیبر کما علیہ عامۃ المفسرین"[1]

"ستدعون الی قوم اولی بأس شدید" وھم علی ما اخرج ابن المنذر والطبرانی عن الزھری بنو حنیفۃ مسیلمۃ وقومہ اھل الیمامۃ. وعن رافع بن خدیج انا کنا نقرأ ھذہ الآیۃ فیما مضی ولا نعلم من ھم حتی دعا ابوبکر رضی اللہ عنہ الی قتال بنی حنیفۃ فعلمنا انھم أریدوا بھا.[2]

وشاع الاستدلال بالآیۃ علی صحۃ امامۃ ابی بکر رضی اللہ عنہ.[3]

---

[1] روح المعانی ص ۱۰۱ [2] ایضاً ص ۱۰۳ [3] ایضاً ص ۱۰۴

ان کے زمانہ کے کارناموں اور ان کے بہت سے قیمتی کلمات اور ارشادات کے علاوہ اس کتاب میں اور بھی بیش بہا فوائد تحقیقات نادرہ، اور وہ قیمتی مواد ہے، جو نہ عقائد وعلمِ کلام کی کتابوں میں عام طور پر ملتا ہے، نہ تاریخ اور سیر میں، ان میں سے ایک قرونِ ثلاثہ کی توضیح[1]، خلافت و سلطنت کا فرق اور اس کی تفصیلات[2]، ملک عضوض (مطلق العنان فرمانروائی) کی تشریح اور اس بات کی تصریح ہے کہ بنی اُمیّہ کی سلطنت اور مطلق العنان فرمانروائی خلافت نہ تھی، ان کے نزدیک اگرچہ خلافت راشدہ حضرت علی مرتضیٰ پر ختم ہو گئی، لیکن وہ حضرت معاویہ کے بارے میں (ان مناقب کی بناء پر جو ان کے بارہ میں وارد ہوئے ہیں) سوءِ ظن اور طعن و تشنیع سے احتراز کی تلقین کرتے ہیں[3]، لیکن ان کے بعد کے خلفاء بنی مروان کے متعلق صاف لکھتے ہیں :-

چوں عبد الملک تسلط یافت فرقت	جب عبد الملک (بن مروان) نے اقتدار
از میان رفت و احکام خلافت جابرہ	حاصل کر لیا، تو انتشار ختم ہو گیا، اور خلافت
کہ آنحضرت صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم	جابرہ کے احکام جن کی آنحضرت صلے اللہ
در چندیں احادیث تشریح آں فرمودہ	علیہ وآلہ وسلم نے متعدد احادیث میں
بودند، بر منصۂ ظہور آمد[4]	تشریح فرمائی تھی منظر عام پر آ گئے۔

اس کتاب کی ایک خصوصیت فاروق اعظم رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے مذہب، ان کے فتاویٰ اور احکام پر وہ مفصل مواد ہے جس کو اس میں جمع کر دیا گیا ہے[5] اور جس سے ایک پوری

---

[1] ازالۃ الخفا ص ۱۲۱-۱۲۲ ج ۱ [2] ایضاً ص ۱۲۶ ج ۱ [3] ایضاً ص ۱۴۶ ج ۱

[4] ایضاً ص ۱۴۳ ج ۱ یزید کے متعلق "حجۃ اللہ البالغہ" میں صفائی سے لکھتے ہیں " دعاۃ الضلال یزید بالشام ومختار بالعراق" ترجمہ۔ ضلالت کے داعی دو تھے، یزید شام میں اور مختار عراق میں (حجۃ اللہ البالغہ ج ۲ ص ۲۱۳) اسی طرح مناقب کی بحث میں یزید کو منافق یا فاسق لکھا ہے۔ ص ۲۱۵

فقہ فاروقی سامنے آگئی ہے۔[1]

فقہ فاروقی کو یگانہ حیثیت سے پیش کرنے اور حضرت عمرؓ کے اجتہادات اور فتاویٰ کو جمع کرنے کا شاید یہ پہلا مبارک اقدام تھا جس کو شاہ صاحبؒ نے دوسری اولیات کے ساتھ انجام دیا، اس موضوع پر کوئی جامع منفرد کتاب اب تک تصنیف نہیں ہوئی، حال میں (۱۴۰۱ھ - ۱۹۸۱ء) ڈاکٹر محمد رواس قلعہ جی نے "موسوعۃ فقہ عمر بن الخطاب" (حضرت عمرؓ کی فقہ کا دائرۃ المعارف، انسائیکلوپیڈیا) کے نام سے ایک ضخیم مفصل کتاب مرتب کی جو مکتبۃ الفلاح کویت کی طرف سے شائع ہوئی یہ کتاب بڑے سائز کے، ۶۹۸ صفحات پر آئی ہے۔

خلفائے ثلاثہ (رضوان اللہ علیہم اجمعین) کی خلافت کے اثبات، اور ان کے فضائل و مناقب، مآثر اور خدمات کے ایسے تفصیلی تذکرہ کے ساتھ جس میں شاہ صاحبؒ کا ذوق و جوش صاف جھلکتا ہے، اور جو اس ضرورت کی تکمیل ہے، جو اس زمانہ کا تقاضا اور کتاب کی تصنیف کا اصل محرک ہے، انھوں نے امیر المومنین سیدنا علی مرتضیٰ کرم اللہ وجہہ کے مآثر و فضائل بیان کرنے میں تأمل و تحفظ سے کام نہیں لیا ہے، ان کو بھی انھوں نے پوری عقیدت، ان کے حقوق کے اعتراف اور اہل بیت کرام کے ساتھ محبت کے جذبہ اور پورے توسّع کے ساتھ بیان کیا ہے،[2] مآثر سیدنا علیؓ بن ابی طالب کو حسب ذیل الفاظ سے شروع کرتے ہیں "مآثر امیر المومنین و امام الاشجعین اسد اللہ الغالب علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ" اسی طرح حضرات حسنینؓ بالخصوص سبط اکبر سیدنا حسن مجتبیٰ کا ذکر پوری عظمت و محبت کے ساتھ کرتے ہیں، وفات نبویؐ کے بعد حوادث مہمّہ میں حضرت عثمانؓ کی شہادت کو

---

[1] ملاحظہ ہو ص ۸۵-۱۴۲ ج ۲ [2] ایضاً ص ۲۵۱-۲۸۳ ج ۲

فتنۂ اولیٰ شمار کیا ہے[1] اور فتنۂ ثانیہ میں جگر گوشۂ رسول حضرت امام حسینؓ کی شہادت کو لیا ہے، اور مشکوٰۃ شریف کی ایسی روایت (جو بیہقی سے ماخوذ ہے) نقل کی ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت امامؓ کو آنحضرت صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم سے وہی نسبت ہے جو ایک مضغۂ گوشت کو جسم سے ہوتی ہے اور آپ نے اس کی خبر دی ہے کہ امت ان کو شہید کرے گی[2] اسی فتنہ میں واقعۂ ہائلہ حرّہ کو بھی شمار کیا ہے، جس میں یزید کے زمانہ میں اس کے لشکر کے ہاتھوں مدینہ طیبہ میں قتل ونہب کا شرمناک واقعہ پیش آیا، اور مدینہ و اہل مدینہ کی سخت بے حرمتی ہوئی[3] شاہ صاحبؒ نے بنی امیہ کے بارے میں جابجا کھلی تنقید سے کام لیا ہے[4] اس طرح کتاب میں وہ توازن اور اعتدال پورے طور پر موجود ہے، جو اہل سنت والجماعت کا شعار وافتخار ہے۔

وفات نبویؐ کے بعد کے تغیرات وفتن کی نشاندہی

اس کتاب کی ایک بڑی خصوصیت یہ ہے کہ اس میں اسلام کی دینی تاریخ، اور ذہنی و مذہبی انقلاب و تغیر کا ایک مختصر ابھرا ہوا خاکہ بھی آگیا ہے، اسلام کی سیاسی و علمی تاریخیں تو بے شمار ہیں، لیکن ایسی تاریخ کہیں نہیں ملتی جس میں اسلام کے سیاسی و تمدنی تاریخی تسلسل کے درمیان نئی ذہنی، علمی اور اخلاقی تبدیلیوں کے نشان (خواہ وہ ایسے ہلکے اور پھیکے رنگ کے ہوں جو صحیح اسلامی مزاج کی واقفیت کی خوردبین کے بغیر دیکھے نہ جاسکیں) نظر آئیں، کتابوں میں تھوڑا سا منتشر مواد ملتا ہے، لیکن کسی نے اس کو اپنی بحث کا عنوان نہیں بنایا، شاہ صاحبؒ خیر القرون سے متصلاً اس کے بعد کے فتنے[5] خیر القرون اور شر القرون کے احکام کا اختلاف[6]، اور تغیرات کلیہ کے ضمن میں ان معنوی اور فکری تغیرات کا تذکرہ کرتے ہیں، جو عہد رسالت اور خیر القرون کے بعد پیش آئے، ان کے عنوانات شاہ صاحبؒ

---

[1] ملاحظہ ہو ص ۱۵۴/۱ [2] ص ۱۵۴/۱ [3] ص ۱۵۴/۱ [4] ص ۱۵۴-۱۵۵/۱ [5] ص ۱۲۲/۱ [6] ص ۱۳۶/۱

کے یہاں حسب ذیل ہیں۔

ظہور کذب، تجوید قرآن کے سلسلہ میں تعمق و مبالغہ، قراءت اور تلاوت پر اکتفا اور تدبّر فی القرآن اور تفقہ کی کمی، فقہی مسائل میں موشگافی اور مسائل کی فرضی شکلوں پر جو وقوع پذیر نہیں ہوئیں پہلے سے بحث و مباحثہ، متشابہات قرآن کی تاویل اور اس میں دور کی کوڑی لانا، عقائد و الٰہیات میں نئے نئے سوالات کا پیدا کرنا، تقرب الی اللہ کی نیت سے نئے نئے اوراد و احزاب کی ایجاد، جو سنت ماثورہ پر اضافہ کرتے ہیں، مستحبات کی ایسی پابندی اور التزام جیسی واجبات کی ہونی چاہیئے، فتوے دینے کے بارے میں اجتماعی مشورہ اور علمائے صالحین سے رجوع کے سلسلہ کا ختم ہو جانا، نئے نئے فرقوں قدریہ اور مرجیۂ وغیرہ کا پیدا ہونا، مسلمانوں کے باہمی اعتماد و امن کا اٹھ جانا، ایسے لوگوں کا حکومت پر متمکن ہو جانا جو یا تو سرے سے حکومت کا استحقاق نہیں رکھتے، یا درجہ دوّم سوّم کے لوگ ہیں، ارکان اسلام کے قیام میں سستی اور فتور کا واقع ہونا۔[1]

کتاب کی طباعت و اشاعت

کتاب ازالۃ الخفا پہلی مرتبہ مولوی محمد احسن صدیقی کے اہتمام میں منشی جمال الدین خاں صاحب مدارالمہام ریاست بھوپال کے حکم و ہدایت پر ۱۲۸۶ھ بریلی میں مطبع صدیقی میں چھپی، اس وقت تین ۳ نسخے فراہم ہو سکے، جن سے تصحیح و مقابلہ کا کام کیا گیا، ایک منشی صاحب کا بھوپال کا نسخہ، دوسرا مولوی احمد حسن صاحب امروہی کا نسخہ، تیسرا مولوی نور الحسن صاحب کاندھلوی کا، قرینہ ہے کہ مصنف علّام کتاب پر نظر ثانی نہیں فرما سکے۔

---

[1] ص ۱۳۳/۱

کتاب کا دوسرا ایڈیشن سہیل اکیڈمی لاہور پاکستان سے ۱۳۹۶ھ / ۱۹۷۶ء کو شائع ہوا، جو پہلے ایڈیشن کا آفسٹ ہے[۱]، کتاب کا عربی ترجمہ المجلس العلمی ڈابھیل کے اہتمام میں تیار ہوا، لیکن اس کی کماحقہ ممالک عربیہ میں اشاعت نہیں ہو سکی، امام اہل سنت مولانا عبدالشکور صاحب فاروقیؒ لکھنوی نے کتاب کا اردو ترجمہ کیا، جو کتاب کی فصل اول سے فصل پنجم (ص۱۵۵) تک پر مشتمل ہے، اس کا نام کشف الغطاء عن السنۃ البیضاء رکھا، اس مطبوعہ حصہ کی ضخامت ۳۳۶ صفحات ہے، ۱۳۲۹ھ میں عمدۃ المطابع لکھنؤ سے شائع ہوا۔

---

[۱] یہی ایڈیشن اس باب کی تحریک، نت پیش نظر رہا ہے اور اسی کے صفحات کا حوالہ دیا گیا ہے۔

باب نہم

سیاسی انتشار اور حکومتِ مغلیہ کے دورِ احتضار میں شاہ صاحب کا مجاہدانہ وقائدانہ کردار

تین نوخیز جنگجو طاقتیں

کتاب کے باب دوم[1] میں گزر چکا ہے کہ بارہویں صدی (ہجری) کا ہندوستان سیاسی انتظامی اور اخلاقی حیثیت سے انحطاط وپستی، بدنظمی وطوائف الملوکی، اور انتشار واضطراب کے اس نقطہ پر پہونچ گیا تھا جس کو کسی معاشرہ ونظام کا دمِ واپسیں یا حالتِ احتضار سے تعبیر کیا جا سکتا ہے، مغلیہ سلطنت ایک حکمراں مسلمان خاندان کے طویل ترین اور قوی ترین اقتدار کی علامت (SYMBOL) بن کر رہ گئی تھی جس کے پیچھے نہ کوئی طاقت تھی، نہ سلیقہ، نہ حوصلہ۔

بظاہر اس وقت سلطنتِ مغلیہ ہی نہیں پورے ملک کی قسمت کا فیصلہ کرنے والی تین نوخیز جنگجو طاقتیں تھیں، علی الترتیب مرہٹہ، سکھ، جاٹ۔

مرہٹے

مرہٹے جن کی سرگرمیاں پہلے دکن میں محدود تھیں، اور جن کی حیثیت ایک منظم قانونی

---

[1] ہندوستان (سیاسی حالت)۔

حکومت کے خلاف ایک احتجاجی گروہ (AGITATORS) اور چھاپہ مار (GUERRILLA) طاقت سے زیادہ نہ تھی، مرکزی حکومت کی روزافزوں کمزوری، طالع آزما سرداروں کی باہمی زور آزمائی، اور امرائے سلطنت کی کوتاہ نظری کی وجہ سے (جو اپنے حریف کو زک دینے یا زیچ کرنے کی نیت سے مرہٹوں سے کام لیتے رہتے تھے) ایک ایسی ہندگیر طاقت بن گئے، جو دہلی کے تخت پر قبضہ کرنے اور اس خلا کو پُر کرنے کا خواب دیکھنے لگے جو مغلوں کی فوجی طاقت کی کمزوری اور ان کی انتظامی نااہلی نے پیدا کر دیا تھا۔

سنہ ۱۱۷۰ھ / ۱۷۵۶ء میں[1] ملہار راؤ ہولکر اور رگھوناتھ راؤ نے شمالی ہند پر اپنا تسلط قائم کرنے کا فیصلہ کیا، اور جاٹوں کی مدد سے ۱۱۷۱ھ / ۱۷۵۷ء کو دہلی پر حملہ کر دیا، نجیب الدولہ کو مجبور ہو کر صلح کرنی پڑی، اس کے بعد انھوں نے پنجاب کا رخ کیا جو اس اہم جنگی علاقہ کا دروازہ تھا، جس سے فاتح ہندوستان میں داخل ہوتے رہے، اور جو ابھی تک کسی غیر اسلامی طاقت کے زیرنگیں نہیں رہا تھا، انھوں نے اپریل ۱۷۵۸ء میں لاہور پر قبضہ کر لیا، اور آدینہ بیگ کو اپنی طرف سے پنجاب کا حاکم مقرر کیا، آدینہ بیگ کے مرنے پر انھوں نے ساباجی سندھیا کو پنجاب کا حاکم (گورنر) مقرر کیا۔

صفدر جنگ کے اشارہ اور مدد سے پہلے مرہٹے دوآبہ میں (جو ان علماء و مشائخ کا مرکز تھا، جو خود دہلی کی زیب و زینت تھے) داخل ہوئے، اب داتا جی سیندھیا نے ۱۷۵۸ء میں دکن سے آکر سارے ہندوستان کے فتح کر لینے کا بیڑا اٹھایا، پہلے روہیلکھنڈ ۱۷۵۸ء اور اودھ کا رخ کیا، اور اس ارادہ سے جمنا کو عبور کیا ۱۱۷۲ھ / ۱۷۵۹ء میں جب دریا قابل عبور ہوئے، اس سے گوبند رائے بندیلہ کو بیس ہزار لشکر کے ساتھ روہیلکھنڈ میں

---

[1] حضرت شاہ ولی اللہ صاحبؒ کی وفات سے ۵-۶ سال پیشتر۔

اتار دیا، اس نے رام گنگا سے اتر کر امروہہ تک (جو دہلی سے زیادہ فاصلہ پر نہیں ہے) ملک کو لوٹ لیا۔

۲۴ر جون ۱۷۶۰ء (۹ر ذی الحجہ ۱۱۷۳ھ) کو مرہٹے پایہ تخت دہلی میں داخل ہوئے یعقوب علی خاں قلعہ دار نے قلعہ حوالہ کر دیا، بھاؤ نے قلعہ کی قلعہ داری شنکر راؤ کے سپرد کی اس نے دیوان خاص کی نقرئی و سیمیں چھت کو اتار لیا اور ٹکسال میں بھیج دیا، قدم شریف اور حضرت نظام الدین اولیاءؒ کی درگاہ میں سونے چاندی کا جو سامان تھا لے لیا۔ ۱۰ر نومبر ۱۷۶۰ء (۲۹ر صفر ۱۱۷۴ھ) کو شاہ جہاں ثانی کو معزول کر کے مرزا جوان بخت خلف شاہ عالم عالی گہر کو تخت پر بٹھایا، چاہتا تھا کہ خود تیموری تخت پر جلوہ افروز ہو، اور وہ ایسا کر سکتا تھا، مگر لشکر کے دانشمندوں نے اس کو اس ارادہ سے باز رکھا کہ اس سے پورے ملک میں شورش برپا ہو جائیگی، اور رعایا تخت بابری پر کسی مرہٹہ سردار کو بیٹھا دیکھ کر آسانی سے برداشت نہیں کر سکے گی، اس وقت مرہٹوں کی عملداری کو جو وسعت حاصل تھی، وہ نہ اس سے پہلے کبھی ہوئی تھی، نہ اس کے بعد ہوئی، اس کی شمالی سرحد اٹک اور ہمالیہ کے پہاڑ تھے، جنوب میں جزیرہ نمائے دکن کے پچھلے سرے یعنی سمندر تک پھیلی ہوئی تھی، جو علاقے ان حدود کے اندر آزاد تھے، وہ اس کے باج گزار تھے، ان کے پاس آزمودہ کار سپہ سالار ملازم تھے، دس ہزار سپاہ فرنگستان کی قواعد دان ان کے پاس موجود تھی، پانی پت کی لڑائی میں ان کے پاس پچپن ۵۵ ہزار سوار جرار اور پندرہ ۱۵ ہزار پیادے تھے، دو سو توپیں (علاوہ قلعہ شکن توپوں کے) ساتھ تھیں، راجپوتوں کی فوج بھی ساتھ ہو گئی تھی، اس طرح سب مل کر تین لاکھ لڑنے والے سپاہی ان کے جھنڈے کے نیچے اور زیر قیادت تھے۔

بایں ہمہ مرہٹوں کا مزاج شاہانہ اور ذمہ دارانہ نہ تھا، ہندوستان کے ایک مؤرخ کے بقول "وہ آدھے بادشاہ آدھے راہ زن تھے"[1] رعایا پروری، ہمدردیٔ خلائق اور انسانی جان و مال، عزت و آبرو کی حفاظت کی قدیمی و موروثی روایات (جو رعونت و نفسانیت کے موقعوں پر بھی خود مختار حاکموں اور بادشاہوں کی کسی حد تک حفاظت کرتی، اور عناں گیر ہوتی رہی ہیں) نیز شاندار تاریخی پس منظر (BACK GROUND) نہ ہونے اور اعلیٰ اور واضح تعمیری و سیاسی مقاصد کے مفقود ہونے کی وجہ سے پھر اس سب کے علاوہ ہندو مذہب و تہذیب کے احیاء کے جذبہ (HINDU REVIVALISM) نے ان میں جارحیت، فیصلوں میں عجلت اور عدم رواداری کی صفت پیدا کر دی تھی، لوٹ کا مال، اور اس کی محبت ان کی قومی کمزوری تھی۔

مرہٹوں کی ہنگامہ آرائیوں سے ہندو مسلمان سبھی متاثر ہوتے تھے، دیہاتوں کو بے دردی سے لوٹنا، لوگوں کے ہاتھ ناک کان کاٹ لینا کوئی غیر معمولی بات نہ تھی، حملہ آوروں کی نفسانی ہوس کا شکار بلا تفریق مذہب و ملت عورتوں کا پورا طبقہ بنتا تھا، اس میں بھی ہر طرح کے حدود سے تجاوز کر کے بہیمانہ و وحشیانہ عمل کا مظاہرہ کیا جاتا رہا، بنگال کے مشہور شاعر گنگا رام نے بنگال پر ان کے حملوں پر تبصرہ کرتے ہوئے ان تاثرات کا اظہار کیا ہے[2]۔

پرتگالی مصنفوں نے بھی مرہٹوں کی اخلاق سوز حرکتوں پر اپنے استعجاب کا اظہار

---

[1] تاریخ ہندوستان از مولوی ذکاء اللہ دہلوی ص۳۰۴ ج ۹

[2] تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو جادو ناتھ سرکار کی کتاب FALL OF THE MOGHAL EMPIRE, P. 87

کیا ہے[1]، مرہٹوں کے اقتدار کا عوام پر بڑا اقتصادی اثر پڑا، مولانا غلام علی آزاد بلگرامی کے بقول "ان کی نیت یہ ہے کہ جہاں تک ان کی دسترس ہو خلق خدا کے معاشی ذرائع مسدود کرکے اپنے قبضہ میں کرلیں" مرہٹے مغلیہ سلطنت کے ان دور افتادہ علاقوں سے چوتھ[2] وصول کرتے تھے، جو ان کے رحم و کرم پر تھے۔

مرہٹوں کی تاخت صرف فوجی حدود اور عوام کے استحصال ہی کے دائرہ میں محدود نہ تھی، وہ ہندو مذہب و تہذیب کی "احیائیت" (REVIVALISM) پر بھی مبنی تھی، اس تحریک کے قائدِ اول شیواجی کے متعلق ماونٹ سٹوارٹ الفنسٹن (گورنر بمبئی) اپنی تاریخ ہند میں لکھتا ہے:-

"اس کی طبیعت نے ہندوانہ تعصبوں سے تربیت پائی تھی ......
اس طبیعت پر مجبول ہونے سے وہ مسلمانوں اور ان کے رسم و رواج سے سخت نفرت، اور ہندؤں اور ان کے طور طریقوں سے بڑی رغبت رکھتا تھا، اور یہ ترقی روز افزوں تھی، اس کا یہ مزاج تدبیر ملکی سے ایسا راس آیا تھا کہ اس نے بھگتوں کی صورت بنائی، اور اوتاروں کی کرامتوں، اور دیوتاؤں کی عنایتوں کا دعویٰ کیا"[3]

---

[1] PISSURLEN: PORTUGUESES, II, P. 49

[2] سب سے پہلے شیواجی نے چوتھ وصول کیا جو لگان کا چوتھائی تھا، چوتھ دوسری ریاستوں سے ان کی حفاظت یا حملہ نہ کرنے کے لئے وصول کرتے تھے، جبکہ اپنی مملکت میں کسانوں سے پیداوار کا ۳۰ تیس فی صد لیا کرتے تھے، جو بعد میں بڑھ کر ۴۰ چالیس فی صد ہوگیا تھا۔

[3] تاریخ ہند (اردو ترجمہ) ص۱۰۴۰ (علی گڑھ ۱۸۶۷ء)

پانی پت کے میدان میں آخری فیصلہ ہونے سے پہلے اور حالات کی نزاکت کا خیال کرکے انھوں نے نواب شجاع الدولہ کی معرفت (جو اس سے پہلے مرہٹوں کے لئے اپنے دل میں نرم گوشہ رکھتے تھے) کوشش کی کہ شاہ ابدالی سے صلح ہو جائے، شجاع الدولہ نے ان مسلسل تجربوں اور تلخ حقیقتوں کی بناء پر ان کو جو جواب دیا، اس سے مرہٹوں کے قومی مزاج اور ان کی فتح مندی اور غلبہ کے اثرات ونتائج پر اچھی روشنی پڑتی ہے۔

نواب شجاع الدولہ نے کہا:-

"دکن کے برہمن ہندوستان پر مدت سے متسلط ہیں، ان کے سر پر وفور طمع وحرص وبدعہدی وبدقولی کے سبب سے یہ بلا شاہ درانی کی آئی ہے، ایسوں کے ساتھ کیا کوئی صلح کرے جو کسی کی آبرو اور آسائش کے روادار نہ ہوں، سب چیزیں اپنے اور اپنی قوم کے لئے جانتے ہوں، آخر سب ان کے ہاتھوں سے ایسے عاجز ہوئے کہ انھوں نے اپنے پاس ناموس اور حفظ آبرو اور رفاہ خلائق کے لئے شاہ ابدالی کو منتیں کرکے ولایت سے بلایا ہے، اور اس کے صدمات کو مرہٹوں کی ایذا رسانی سے سہل سمجھا"[1]

بالآخر ۱۴ر جنوری ۱۷۶۱ء (۶ رجمادی الآخرہ ۱۱۷۴ھ) کو پانی پت کے میدان میں احمد شاہ ابدالی کی افغانی فوجوں، نواب نجیب الدولہ کے روہیلہ سپاہیوں اور نواب شجاع الدولہ کے لشکر کی متحدہ طاقت سے مرہٹوں کو شکست فاش ہوئی، اور بقول ایک مورخ کے "مرہٹوں کی طاقت چشم زدن میں کافور کی طرح اڑ گئی"! احمد شاہ ابدالی کی آمد کے محرکات اور پس منظر اور اس فیصلہ کن جنگ کی مزید تفصیلات جس نے تاریخ کے

---

[1] تاریخ ہندوستان۔ ج ۹ ص ۳۰۵

دھارے کو موڑ دیا، شاہ صاحب کے قائدانہ کارنامہ کے سلسلہ میں آئندہ صفحات میں آئیگی۔

سکھ

سکھ پنجاب کا ایک مذہبی گروہ تھا جس کی بنیاد پندرہویں صدی عیسوی میں گرو بابا نانک (۱۴۶۹ء تا ۱۵۳۹ء) کے ہاتھوں پڑی، وہ نفس کشی، اخلاقیات اور سچائی کی تعلیم دیتے تھے "سیر المتاخرین" کے بیان کے مطابق بابا نانک نے فارسی اور دینیات کی تعلیم ایک بزرگ سید حسن سے حاصل کی تھی، اور ان کی بابا نانک پر خصوصی نظر تھی۔[1] تیسرے گرو امر داس نے سکھوں کی مذہبی اور معاشرتی تنظیم کے سلسلہ میں سب سے پہلے قدم اٹھایا، اکبر بادشاہ ان کے مکان پر ان سے ملنے گیا، اور انھیں ایک بڑی جاگیر عطا کی، انھوں نے اخلاقیات کی تعلیم میں گرو نانک کی تعلیمات کی روح کو قائم رکھا، اور ہندوؤں کی اوہام پرستی خصوصاً رسم ستی کی کھلم کھلا مخالفت کی اور نکاح بیوگان کے احکام جاری کئے، اکبر نے ۱۵۷۷ء میں انھیں ایک وسیع قطعہ آراضی عنایت کیا، انھیں کے زمانہ میں امرتسر کے مذہبی مرکز کی بنیاد پڑی، اس طرح سکھوں کی قومی زندگی کے لئے ایک روحانی مرکز تیار ہوگیا۔

۱۵۱۸ء میں گرو ارجن اپنے باپ کے جانشین ہوئے، انھوں نے سکھوں کو

---

[1] بعض روایات کے مطابق بابا گرو نانک متعدد مسلمان درویشوں اور فقیروں کی صحبت میں رہے، ان میں پیر جلال، میاں مٹھا، شاہ شرف الدین، پیر عبدالرحمٰن اور پاک پٹن کے فرید ثانی اور شاہ ابراہیم کے نام خاص طور پر لئے گئے ہیں، بعض روایات کے مطابق بابا نانک نے بغداد، حرمین شریفین کا سفر بھی کیا، شیخ فرید پاک پٹن سے ان کا خاص ارتباط تھا۔

ایک فرقہ کی حیثیت سے منظم کرنے کی مزید کوشش کی، اور گرنتھ کی تدوین عمل میں لائے، گرو ارجن نے اپنے آپ کو "سچا بادشاہ" کے نام سے ملقب کیا جو ان کے سیاسی اقتدار کی ہوس کا پتہ دیتا ہے، جہانگیر کے حکم سے گرو کو لاہور میں قید کر دیا گیا، اس لئے کہ انھوں نے اس کے باغی شہزادہ خسرو کی مالی امداد کی تھی، وہاں ان کو قتل کر دیا گیا[1]، ان کے جانشین ہرگوبند نے علانیہ عملی بغاوت و مزاحمت کا طرز عمل اختیار کیا جس سے سکھوں کی فوجی زندگی کا آغاز ہوا، انھوں نے جلد ہی شاہانہ منصب اختیار کر لیا، وہ شہنشاہ جہانگیر کے خلاف دشمنی کے جذبات رکھتے تھے، اور اپنے باپ کی موت کا اس کو ذمہ دار سمجھتے تھے، انھوں نے ہرگوبند پور کا ایک مضبوط قلعہ بنایا جہاں سے نکل کر وہ میدانی علاقوں پر تاخت کرتے تھے، جہانگیر نے انھیں گوالیار کے قلعہ میں نظر بند کر دیا، لیکن کچھ عرصہ کے بعد رہا کر دیا، اور ان کا بڑا اعزاز کیا، شاہجہاں کی تخت نشینی کے فوراً بعد انھوں نے کھلم کھلا سرکشی اختیار کر لی اور حکومت کے خلاف علم بغاوت بلند کیا، اخیر میں وہ پہاڑیوں کی طرف نکل گئے اور ۱۶۴۵ء میں انتقال کیا۔

۱۶۶۴ء میں اورنگ زیب کے زمانہ میں ہرگوبند کے بیٹے تیغ بہادر گرو منتخب ہوئے، انھوں نے مفروروں اور قانون شکنوں کو پناہ دی، ان کا اقتدار ملک کی ترقی میں حائل ہوا[2]، شاہی دستوں نے ان پر چڑھائی کی اور انھیں قید کر کے دہلی لے آئے

---

[1] گرو ارجن کو حقیقت میں چندو لال نے ذاتی مخالفت کی بناء پر قتل کرایا تھا، جو جہانگیر کے یہاں رسوخ رکھتا تھا، تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو "تاریخ ہندوستان" ج ۹ ص ۵۲

[2] ملاحظہ ہو J. D. CUNNINGHAUM, A HISTORY OF THE SIKHS GUARD. 1918, P. 64

جہاں انھیں اورنگ زیب کے حکم سے ۱۶۷۵ء میں سزائے موت دی گئی،[1] ان کی موت کے بعد ان کے بیٹے گووند رائے کو گرو تسلیم کیا گیا، انھوں نے سکھوں کو جو ابتدا میں محض ایک "مذہبی گن گیان" والی جماعت تھی، ایک جنگجو قوم بنا دیا، انھوں نے سکھوں میں جمہوری مساوات کے جذبات کو ابھارا، اور انھیں ایک قوم کی صورت میں منظم کرنے کا کام کیا، اورنگ زیب کے انتقال تک وہ زندہ رہے، اورنگ زیب کے جانشین بہادر شاہ نے گرو کے ساتھ مفاہمت کی کوشش کی اور انھیں دکن کی فوجی کمان عطا کر دی لیکن انھوں نے اکتوبر ۱۷۰۸ء میں ایک افغان ملازم کے زخم سے جانبر نہ ہوتے ہوئے انتقال کیا، انھوں نے کسی کو اپنا جانشین نامزد نہیں کیا، اور اپنے پیروؤں کو حکم دیا کہ گرنتھ کو وہ اپنا آئندہ گرو، اور خدا کو اپنا واحد محافظ تصور کریں۔

ہرگووند کا جانشین بندہ بیراگی ہوا جس کی اصل حیثیت سکھوں کے فوجی قائد کی تھی، (وہ اصلاً کشمیری راجپوت تھا جس نے سکھ مت اختیار کر لیا تھا) اس نے پنجاب میں وسیع پیمانہ پر رہزنی کی وارداتیں شروع کر دیں، اورنگ زیب کی وفات کے بعد سلطنت مغلیہ پر بہت سرعت سے زوال آنا شروع ہو گیا، اس کے بیٹوں اور پوتوں کے مابین تخت کے لئے متواتر لڑائی جھگڑے شروع ہو گئے، جن کی وجہ سے سکھوں کو کھلم کھلا اپنی طاقت میں اضافہ کرنے کا موقعہ مل گیا، بندہ بیراگی مسلمانوں کو ہزاروں کی تعداد میں بے رحمی سے قتل کرتا اور قصبہ بقصبہ لوٹتا ہوا دہلی کے عین قرب وجوار میں جا پہونچا، مئی ۱۷۱۰ء میں اس نے سرہند پر دھاوا بول دیا، اور لوٹ مار اور قتل وغارت گری کے لئے کھلا چھوڑ دیا، قصبہ کے

---

[1] گرو تیغ بہادر کے قتل کی بھی تنہا اورنگ زیب پر ذمہ داری نہیں، اس میں ان کے مخالفوں کا ہاتھ ہے۔

(نہنگ سنگ سندیس ۲۵ر دسمبر ۱۹۵۱ء)

باشندوں پر (بلا تمیز عمر و صنف) ہیبت ناک مظالم توڑے گئے، بہادر شاہ نے پنجاب کا رخ کیا، شاہی فوجوں نے بندہ کو شکست دی، لیکن بندہ پہاڑیوں کی طرف نکل گیا، فرخ سیر کی تخت نشینی کے بعد سیاسی انتشار اور شاہی خاندان کی خانہ جنگی سے فائدہ اٹھا کر بندہ بیراگی نے دوبارہ دہشت انگیزی سے کام لینا شروع کیا، بالآخر ۱۷۱۶ء میں اسے دہلی میں لا کر قتل کر دیا گیا، سکھوں کے نزدیک بھی وہ کوئی محترم و محبوب شخصیت نہیں تھا، اس نے سکھ مذہب کے عقائد و عبادات میں بھی کچھ تبدیلیاں کیں، اس کی قیادت میں سکھ ایک فوجی طاقت بن گئے، فرخ سیر کے عہد میں پنجاب کے مغل گورنر معین الملک نے (جو میر منّو کے نام سے زیادہ مشہور ہے) فرخ سیر کی تعزیری حکمت عملی کو جاری رکھا، مگر سلطنت مغلیہ کے زوال کی رفتار بہت تیز تھی، پنجاب کی حکومت احمد شاہ ابدالی کے پے در پے حملوں کی وجہ سے زیادہ کمزور ہو گئی تھی، سکھوں کو دوبارہ اٹھنے اور ابھرنے کا موقعہ ملا، وہ نہ صرف احمد شاہ درّانی کے فرزند شاہزادہ تیمور کو جو پنجاب کا حاکم تھا، اور جس نے امرتسر پر حملہ کر کے ہرمندر کو منہدم اور مذہبی تالاب کو ملبہ سے پُر کر دیا تھا، نکالنے میں کامیاب ہوئے، بلکہ لاہور پر عارضی طور پر قبضہ بھی کر لیا، اور ان کے فوجی سردار جسا سنگھ کلال نے اپنے نام کا سکہ بھی جاری کر دیا، لیکن رگھوبا کے زیر کمان مرہٹوں کی آمد (۱۷۵۸ء) پر وہ لاہور سے نکل گئے، احمد شاہ نے پانچویں بار پنجاب کا رخ کیا، پانی پت کی مشہور لڑائی کے بعد جس نے مرہٹہ طاقت کی کمر توڑ دی جونہی اس نے پنجاب چھوڑا، سکھ پھر نکل آئے، اور انھوں نے اپنی کھوئی ہوئی سلطنت دوبارہ حاصل کر لی، احمد شاہ پھر واپس آیا، اور لدھیانہ میں (۱۷۶۲ء میں) اس نے سکھوں کو شکست فاش دی، لیکن اس کے جانے کے بعد ۱۷۶۳ء میں سکھوں نے سرہند کو تخت و تاراج کر کے ویران کر دیا، اور ایک بار پھر لاہور پر قبضہ کر کے خالصہ حکومت

کا اعلان کر دیا، اس کے بعد سکھ متعدد ریاستوں اور گروہوں میں جس کو مسلین کہتے تھے، منقسم ہو گئے، ان پر کوئی حاکم اعلیٰ متعین نہیں تھا، اور مذہب کے سوا ان کے درمیان کوئی چیز مشترک نہیں تھی، تیس۳۰ سال کی اس غیر مستقل صورتِ حال کے بعد پنجاب میں رنجیت سنگھ کا ستارۂ اقبال بلند ہوا، جنھوں نے ان مخالف گروہوں کو ایک مضبوط سلطنت کی شکل میں متحد کر دیا۔

سکھ مذہب کا نصب العین ہندوؤں کے مذہبی عقائد کی تطہیر تھا، اس میں کچھ شبہ نہیں کہ بابا نانک اسلامی تعلیمات سے متاثر تھے، چنانچہ ان کا عقیدۂ توحید، بنی نوع انسان کی مساوات، اور بت پرستی سے اجتناب وغیرہ اسلام کے اثر کا نتیجہ ہیں[1]۔

سکھوں کے مذہبی ادب کی زبان پر فارسی کے بڑے اثرات ہیں، خصوصاً ادی گرنتھ میں فارسی و اسلامی، دینی و صوفیانہ الفاظ کی بڑی آمیزش ہے[2]۔

اس کے پورے قرائن موجود تھے کہ یہ اصلاحی تحریک (اگر اپنے اصولوں پر سختی سے قائم رہتی اور ہندو مذہب و تہذیب میں تحلیل نہ ہو جاتی) ہندوستانی معاشرہ میں کوئی انقلابی خدمت انجام دیتی اور سکھ ہندوؤں سے الگ ایک مستقل و متمیز فرقہ ہوتا جس کی اساس توحید و مساوات پر ہوتی، اور اس طرح وہ مسلمانوں کے قریب تر مذہبی گروہ ہوتا، لیکن حکومتِ وقت کے ساتھ تصادم، اور سیاسی عمل و ردِّ عمل کے بے ضمیر چکر نے جو مذہبی و اخلاقی نتائج سے بے پروا ہو کر وقت کے تقاضوں اور جماعتوں کے مفادات کی تکمیل کرتا ہے،

---

[1] ملاحظہ ہو جپ جی، نیز MACAULFFE ۲: ۳۴۷

[2] تاریخی مواد و معلومات کا بنیادی حصہ "دائرہ معارف اسلامیہ" ج ۱۱ کے مقالہ سکھ سے ماخوذ ہے، جو پروفیسر محمد اقبال کے قلم سے ہے۔

سکھوں کو مسلم حکومتوں ہی نہیں مسلم عوام سے دور و نفور اور ان سے برسرِ پیکار بنا دیا، اور خصوصیت کے ساتھ بارہویں صدی ہجری اور اٹھارویں صدی عیسوی کے وسط میں ان کو ہندوستان کی انتشار انگیز طاقتوں میں ایک اضافہ اور بڑے بڑے شہروں کے پر امن شہریوں کے لئے ایک دہشت انگیز اور زلزلہ خیز طاقت میں تبدیل کر دیا، ان کے دورِ حکومت میں اکثر اور مہاراجہ رنجیت سنگھ کے دور اقتدار میں خاص طور پر[1] مساجد و مقابر کی بے حرمتی ہوئی، عبادات میں خلل ڈالا گیا، اور وہ صورتِ حال پیدا ہوئی جس کی ترجمانی علامہ اقبال نے اپنے اس شعر میں کی ہے ؎

خالصہ شمشیر و قرآن را ببرد
اندراں کشور مسلمانی بمرد

اس صورت حال کے خلاف تیرہویں صدی کے تقریباً وسط، اور انیسویں صدی کے ثلث اول میں حضرت سید احمد شہیدؒ (۱۲۴۶ھ / ۱۸۳۰ء) اور مولانا اسماعیل شہیدؒ (۱۲۴۶ھ / ۱۸۳۰ء) نے جو شاہ ولی اللہ صاحبؒ کی دانش گاہ کے تعلیم یافتہ اور ان کے فرزند اکبر شاہ عبد العزیزؒ کے تربیت یافتہ تھے، رنجیت سنگھ کی فوجی حکومت کے خلاف علم جہاد بلند کیا، اور اس سے اپنے اس وسیع و عمیق منصوبہ اور مہم کا آغاز کیا، جو ہندوستان کو غیر ملکی اقتدار سے آزاد کرانے حکومت شرعی کے قیام اور مسلم معاشرہ کی اصلاح و تطہیر اور احیائے دین کے لئے شروع کی تھی[2]۔

---

[1] تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو "سیرت سید احمد شہیدؒ" جلد اول سترہواں[17] باب عنوان "پنجاب میں مسلمانوں کی حالت" ص ۲۱۳-۲۱۹۔

[2] ملاحظہ ہو "سیرت سید احمد شہیدؒ" ۱-۲

جاٹ

جاٹ مرہٹوں کی طرح نہ کوئی منظم فرقہ تھے۔ نہ سکھوں کی طرح کوئی مذہبی گروہ، لیکن مغل سلطنت کی کمزوری، سیاسی انتشار اور عام آبادی کے عدم تحفظ کے احساس نے ان میں ایک طرح کی سلبی و جارحانہ تنظیم پیدا کر دی تھی، اور وہ ایک تخریبی اور انتشار انگیز طاقت بن گئے تھے، جس کا مقصد قیام سلطنت اور کوئی سیاسی انقلاب نہ تھا محض بگڑے ہوئے حالات سے عارضی فائدہ اٹھانا، استحصال اور اقتصادی مقاصد کی تکمیل تھی۔

پروفیسر خلیق احمد نظامی اپنی کتاب "شاہ ولی اللہ دہلویؒ کے سیاسی مکتوبات" میں لکھتے ہیں:۔

"جمنا کے جنوبی علاقہ میں آگرہ سے دہلی تک جاٹ آباد تھے، ان کی مشرقی سرحد چنبل تھی، اس علاقہ میں ان کی ہنگامہ آرائی کا یہ عالم تھا کہ مرکزی حکومت کا ناک میں دم آگیا تھا، بقول سرکار، دہلی اور آگرہ کی سڑک پر ایسا کانٹا برداشت نہیں کیا جاسکتا تھا (FALL, VOL I.P 369) دہلی سے آگرہ نقل و حرکت میں بڑی احتیاط برتنی پڑتی تھی، دکن کو اجمیر ہوتی ہوئی جو فوجیں جاتی تھیں، وہ اسی علاقہ سے گذرتی تھیں۔

بہادر شاہ کے زمانہ میں اس سڑک کی مخدوش حالت کا اندازہ "دستور الانشاء" کے مطالعہ سے ہوتا ہے (ملاحظہ ہو دستور الانشاء از یار محمد ص ۱۳۰) ۱۷۱۲ء میں جب ڈچ نمائندے اس علاقہ سے گذرے تو انھوں نے بھی ان ہنگاموں کو دیکھا۔ (.ATER MUGHALS, I.,P. 321)

جان سرمن (JOHN SURMAN) جون ۱۷۱۵ء میں یہاں سے گذرا تھا اس نے جاٹوں کی امن سوز حرکتوں کا ذکر اپنی ڈائری میں کیا ہے:۔

(ORME COLLECTIONS, P. 1694)

شاہ جہاں کے عہد میں جاٹوں نے ایک مرتبہ زبردست شورش برپا کی تھی، ۱۰۴۷ھ/۱۶۳۷ء میں متھرا کا فوجدار مرشد قلی خاں ان سے لڑتا ہوا مارا گیا تھا۔

سرجدو ناتھ سرکار تاریخ اورنگ زیب جلد پنجم ص ۲۹۶ پر لکھتے ہیں:۔

اورنگ زیب کی شمالی ہندوستان سے غیر حاضری کا فائدہ دو نئے جاٹ لیڈروں راجہ رام اور رام چہرہ نے اٹھایا........ راجہ رام کی قانون شکن حرکتوں کو آگرہ کا گورنر خانی خاں بھی نہ روک سکا، جاٹوں نے راستے بند کر دیئے، اور بہت سے علاقوں کو لوٹا، اور اکبر کے مقبرہ کو لوٹنے کے لئے سکندرہ کا رخ کیا، لیکن میر ابوالفضل نے جو وہاں کا فوجدار تھا، بہادری سے مقابلہ کیا، اور باغی کو آگے نہ بڑھنے دیا، راجہ رام نے مشہور تورانی افسر اصغر خاں کا سامان لوٹا، .... اصغر خاں جاٹوں سے لڑتا ہوا مارا گیا"[1]

ہرچرن داس مصنف چہار گلزار شجاعی کا بیان ہے کہ جب جاٹوں نے پرانی دہلی کو لوٹنا شروع کیا تو دہلی کے باشندے گھبراہٹ اور پریشانی میں گھر سے نکل کھڑے ہوئے، وہ دربدر گلی بہ گلی مارے مارے پھرتے تھے، بالکل اس طرح جیسے کوئی ٹوٹا ہوا جہاز ظالم موجوں کے رحم و کرم پر ہو، پاگلوں کی طرح ہر شخص پریشان حال اور گھبرایا ہوا نظر آتا تھا۔" (قلمی نسخہ ص ۱۸۱[2])

---

[1] شاہ ولی اللہ صاحب کے سیاسی مکتوبات، از پروفیسر خلیق احمد نظامی ص ۱۷۵ [2] ایضاً ص ۱۷۷

مولوی ذکاء اللہ صاحب ۱۷۶۵ء کے واقعات میں لکھتے ہیں :-

"آگرہ کے قلعہ میں جاٹوں کا تسلط تھا، دہلی سے سو میل پر جاٹوں کا عمل دخل تھا راجہ سورج مل بڑا ہوشیار صف آرائی میں ماہر اور ملک ستانی میں کارداں تھا اس نے آگرہ سے مرہٹہ سردار کو نکال دیا، اور میوات پر قبضہ کر لیا، چار قلعے نہایت مستحکم بنائے، اس نے دلّی کی سلطنت سے ایسی درخواستیں کرنی شروع کیں، جن سے سلطنت کا نا ... نہ رہے، نجیب الدولہ نے اپنی حسن تدبیر اور بلوچوں کی مدد سے جاٹوں پر فتح حاصل کی، راجہ سورج مل نجیب الدولہ کے مقابلہ میں دہلی کے قریب مارا گیا، اس کے بعد جاٹوں کی ریاست میں بہت سے جھگڑے برپا ہوئے، سورج مل کے دو بیٹے مارے گئے تیسرا بیٹا رنجیت سنگھ راجہ ہوا، اس کے عہد میں جاٹوں کی ریاست کا بڑا عروج ہوا، جس ملک پر وہ فرماں روائی کرتے تھے، اس کے شمال مغرب میں الور اور جنوب مغرب میں آگرہ تھا، اس کی آمدنی دو کرور روپے کی تھی، ساٹھ ہزار فوج ان کے پاس تھی"[1]

دہلی کی حالت

مرہٹوں، سکھوں، اور جاٹوں کے حملوں سے جو گویا روزانہ کا معمول بن گیا تھا، اور حفاظت و دفاع کی ہر قسم کی طاقت اور اہلیت کے فقدان سے دہلی ایک ایسا پر ثمر اور غیر محفوظ درخت بن گیا تھا، جس پر ہر طرف سے غول بیابانی حملہ کرتا اور اس کو برگ و بار سے محروم کر دیتا، دہلی کے باشندے جو ساری سلطنت میں نہ صرف عزت و احترام کی

[1] مختصراً از "تاریخ ہندوستان" از مولوی ذکاء اللہ صاحب دہلوی۔ جلد نہم ص ۳۱۶ - ۳۱۸

نگاہ سے دیکھے جاتے تھے، بلکہ علم، زبان، تہذیب، شرافت اور عادات و اطوار میں بھی معیار سمجھے جاتے تھے، حملہ آوروں کے لئے "خوان یغما" بن گئے تھے، اس عہد کے علماء و مشائخ کے (جن کا شعار انقطاع الی اللہ اور رضا بالقضاء ہے) خطوط سے بھی جو انھوں نے اپنے معتقدین و احباب کو لکھے ہیں، اس بدامنی، بے اطمینانی اور بے یقینی کا اندازہ ہوتا ہے، یہاں پر صرف حضرت شاہ ولی اللہ صاحب کے نامور معاصر، اور سلسلۂ نقشبندیہ مجدّدیہ کے گلِ سرسبد حضرت مرزا مظہر جان جاناں (۱۱۱۱ھ - ۱۱۹۵ھ) کے خطوط کے چند اقتباسات پیش کئے جاتے ہیں، ایک مکتوب میں لکھتے ہیں:-

از تشویشات ہر روزہ دہلی تنگ آمدہ ام[1]۔	دہلی کے روزمرہ کے ہنگاموں اور بے اطمینانی سے تنگ آ گیا ہوں۔

ایک دوسرے مکتوب میں فرماتے ہیں:-

از ہر طرف فتنہ قصد دہلی می کند[2]۔	ہر طرف سے فتنہ دہلی کا رخ کرتا ہے۔

ایک اور مکتوب میں دارالسلطنت کی بدامنی اور اہل شہر کی پریشان حالی کا تذکرہ فرماتے ہوئے کہتے ہیں:-

احوال مردم شہر از بیماری عام و نا ایمنی تا کجا نویسد، خدا از یں بلدہ مورد غضب الٰہی برآرد کہ نسقے در امور سلطنت نماندہ خدا خیر کند[3]۔	عام بیماری اور بدامنی سے اہل شہر کی پریشانی کا حال کہاں تک لکھا جائے، خدا اس شہر سے جو غضب الٰہی کا مورد ہو رہا ہے باہر نکالے کہ امور سلطنت میں کوئی نظم باقی نہیں رہا

[1] کلمات طیبات، مکتوب ۱۴۰ [2] ایضاً ۵۴ [3] ایضاً ۸۶

خدا اپنا فضل فرمائے۔

حملۂ نادری

شاہ صاحب ۱۱۴۵ھ میں حجاز سے دلّی پہونچے تھے، پانچ سال ہی گزرے تھے کہ ۱۱۵۱ھ ۱۷۳۸ء میں نادر شاہ کا دلی پر وہ حملہ ہوا، جس نے سلطنت مغلیہ کی رہی سہی چولیں ہلا دیں اور دلّی کی خاک اڑادی۔ اس حملہ نے دلّی کے غیرت مند شہریوں اور شریف خاندانوں کے دل و دماغ پر وہ اثر ڈالا کہ وہ زندگی سے بیزار و شرمسار اور اپنے ہاتھوں اپنی موت کا سامان کرنے کے لئے تیار تھے، شاہ عبدالعزیز صاحبؒ کے ملفوظات میں ہے کہ آپ نے اس کا تذکرہ کرتے ہوئے فرمایا کہ اس قتل عام اور عزت و ناموس کی بربادی کے موقعہ پر پرانی دلّی کے شرفاء، پرانے راجپوتوں کے دستور کے مطابق "جوہر"[1] کا قطعی طور پر ارادہ کر چکے تھے، اس موقعہ پر والد ماجد (شاہ ولی اللہ صاحبؒ) مسلمانوں کو واقعۂ کربلا، اور سیدنا حسینؓ کے مصائب یاد دلا کر اس ارادہ سے باز رکھا کہ انھوں نے ان لرزہ خیز اور ناقابل تصور مصائب کے باوجود صبر و رضا کی راہ اختیار کی اور خاکم بدہن، خویش کشی اور خودکشی کا ارادہ نہیں کیا۔

ناساعد و زلزلہ انگیز حالات میں تدریس و تصنیف کی یکسوئی

مرہٹہ گردی، جاٹ گردی، سکھ گردی اور نادر گردی کے ہوش رُبا مصائب اور زلزلوں

---

[1] جب راجپوت شرفاء ہر طرف سے گھر جاتے تھے اور باعزت زندگی کا کوئی امکان باقی نہیں رہتا تھا تو اپنے اہل و عیال کو تہہ تیغ کر کے جلتی ہوئی آگ میں پھاند جاتے تھے۔

کے درمیان جو دلّی کو زیر و زبر کر کے رکھ دیتے تھے، اور جن میں بعض اوقات نقل مکانی بھی کرنا پڑا، "القول الجلی" سے معلوم ہوتا ہے کہ ۱۱۷۳ھ کے دُرّانی فتنہ میں شاہ صاحب خدام کی استدعا پر وطن مالوف سے مع اہل خانہ و متعلقین منتقل ہو کر قصبہ بڈھانہ میں تشریف لائے، جب رمضان کا مہینہ آیا، تو معمول قدیم کے مطابق ایک چلّہ کا اعتکاف بھی فرمایا[1]، شاہ صاحبؒ درس، تصنیف، دعوت الی اللہ، تزکیۂ نفوس و تربیتِ طالبین کا کام اس جمعیت خاطر اور اس اہتمام و انصرام کے ساتھ کرتے رہے کہ معلوم ہوتا ہے کہ دلّی ہی نہیں سارے ہندوستان میں معتدل و پُرسکون حالات ہیں، اور وہ ایک گوشۂ عافیت میں بیٹھے ہوئے علمی تحقیق، فکری رہنمائی اور اخلاقی تربیت اور احیائے ملت کے کام میں ہمہ تن مصروف ہیں، مولانا سید سلیمان ندویؒ نے بڑی خوبی اور بلاغت کے ساتھ اس حقیقت کی طرف اشارہ کیا ہے، وہ لکھتے ہیں:۔

> "ایسے کم مصنّف گزرے ہیں جن کی تصانیف میں ان کے زمانہ کی روح نہ ہو، یا اس میں زمان و مکان کی جھلک نہ ہو، اور کم از کم یہ کہ اپنے زمانہ کی علمی ناقدر شناسی اور اضطراب احوال کا ذکر نہ ہو، مگر شاہ صاحب کی تصانیف کا یہ حال ہے کہ وہ زمان و مکان کی قید سے بالکل پاک اور گلۂ و شکایت اور حرف و حکایت سے سراپا بے نیاز ہیں، یہ معلوم ہی نہیں ہوتا، کہ یہ کتابیں اس زمانہ میں لکھی گئی ہیں، جب امن و اطمینان اس ملک سے حرف غلط کی طرح مٹ گیا تھا، سارا ملک طوائف الملوکی، خانہ جنگی، سیاسی بدامنی، اور ہر طرح کے شور و شر میں مبتلا تھا، دلّی کی سیاسی مرکزیت مٹ چکی تھی، ہر شمشیر زن اپنی بادشاہی کا خواب دیکھ رہا تھا، سکھ ایک طرف، مرہٹے دوسری طرف، جاٹ تیسری طرف، اور روہیلے چوتھی طرف، ملک میں ہر طرف اودھم مچا رہے تھے،

---

[1] القول الجلی (قلمی)

اور نادر شاہ اور احمد شاہ جیسے پرجوش سپہ سالار خیبر کے دروازہ کے پاس کھڑے جب چاہتے تھے، آندھی کی طرح آجاتے اور سیلاب کی طرح نکل جاتے تھے، اس درمیان میں دلّی خدا جانے کتنی دفعہ لٹی اور کتنی دفعہ بنی، مگر اللہ رے دلّی کے تاجدارِ علم کا امن و اطمینان کہ یہ سب کچھ آنکھوں کے سامنے ہوتا رہا، مگر نہ دل کو اضطراب، نہ خیال میں انتشار، نہ قلم میں اضطرار، نہ زبان پر زمانہ کا گلہ، نہ قلم سے بے اطمینانی کا اظہار، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ بلندی کے جس آسمان یا صبر و رضا کے جس لامکان میں تھے، وہاں تک زمین کی آندھیاں نہیں پہونچتیں، اور زمان و مکان کی گردشیں وہاں اپنا کام نہیں کرتیں، اس سے معلوم ہو سکتا ہے کہ سچے اہل علم کی شان کتنی بلند، اور اصحاب تسلیم و رضا کا منصب کتنا اونچا ہے۔

اَلَا بِذِکۡرِ اللّٰہِ تَطۡمَئِنُّ الۡقُلُوۡبُ ﴿۲۸﴾ ہاں اللہ کی یاد ہی سے دل اطمینان پاتے ہیں۔ (الرعد-۲۸)

صحیح علم کی صحیح خدمت بھی ذکر اللہ کی دوسری شکل ہے، اس لئے اگر وہ بھی قلب میں اطمینان، اور روح میں سکون پیدا کرے تو عجب نہیں، شاہ صاحب کی تصنیفات کے ہزاروں صفحے پڑھ جایئے، آپ کو یہ معلوم بھی نہ ہوگا کہ یہ بارہویں صدی ہجری کے پُر آشوب زمانہ کی پیداوار ہے، جب ہر چیز بے اطمینانی اور بدامنی کی نذر تھی، صرف یہ معلوم ہوگا، کہ علم و فضل کا ایک دریا ہے جو کسی شور و غل کے بغیر سکون و آرام کے ساتھ بہہ رہا ہے، جو زمان و مکان کے خس و خاشاک کی گندگی سے پاک و صاف ہے[1]"

---

[1] شاہ ولی اللہ نمبر "الفرقان" ص۳۴۸-۳۴۹

سیاسی انتشار اور حکومت مغلیہ کے دورِ احتضار میں مجاہدانہ وقائدانہ کردار

صرف یہی نہیں کہ شاہ صاحب مصائب و حوادث کے اس گرد و غبار، بلکہ ان کی موسلا دھار بارش کے درمیان زیرِ آسمان بیٹھے ہوئے تصنیف و تحقیق اور درس و تعلیم میں اس طرح منہمک تھے کہ نہ ہوا کے تیز جھونکے سے زیرِ تسوید کتاب کا کوئی ورق الٹتا تھا، نہ بارش کا کوئی قطرہ اس کے کسی نقش کو مٹاتا تھا، بلکہ وہ ان حالات کو تبدیل کرنے، اس ملک میں مسلمانوں کے اقتدار کو دوبارہ واپس لانے، اور ایک فرض شناس، حقیقت پسند، احکامِ شریعت پر عمل کرنے والی، عام شہریوں کی عزت و ناموس کی محافظ، انتشار انگیز طاقتوں کو ختم کرنے والی مستحکم و خوش حال سلطنت کے قیام کے لئے بھی ساعی اور سرگرم تھے، اور اس سلسلہ میں بھی وہ ایسا قائدانہ کردار ادا کر رہے تھے، جو بڑے سے بڑا سیاسی مُبصّر ادا کر سکتا تھا، جس کو تصنیف و تالیف، اور درس و تحقیق سے ادنیٰ مناسبت اور ذرّہ برابر فرصت نہ ہو۔

مجدّدین اور داعیانِ اسلام، اور محققین و مصنّفین میں اگر کسی کی زندگی میں یہ مماثلت نظر آتی ہے تو شیخ الاسلام ابن تیمیہؒ کی زندگی میں، جنھوں نے ۷۰۰ھ میں شام کے مسلمانوں کو خون آشام تاتاریوں کا مقابلہ کرنے کی دعوت دی اور ان کے اکھڑتے ہوئے قدم جمائے، پھر جب سلطانِ مصر محمد بن قلاوؤن نے شام آکر تاتاریوں سے جنگ کرنے کا ارادہ ملتوی کیا اور اہلِ شام میں سخت انتشار اور اضطراب پیدا ہوا، تو وہ خود مصر گئے اور سلطان کو ملکِ شام کی حفاظت اور تاتاریوں سے مقابلہ پر آمادہ کیا، اور سلطان کے ساتھ جہاد میں شرکت کی، اور تاتاریوں کو ایسی شکست فاش ہوئی جس کی مثال ان کی گزشتہ تاریخ میں ملنی مشکل ہے۔[1]

---

[1] تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو "تاریخ دعوت و عزیمت" جلد ۲ ص ۴۷-۵۴

شاہ صاحب نے بھی اپنے علمی مشاغل اور احیاء و تجدید کی مساعی کے ساتھ ایسے سیاسی تدبّر اور ایسی ذہانت اور بلند نگاہی سے کام لیا کہ اگر مغلوں میں کچھ بھی صلاحیت یا امرائے سلطنت میں ہمت اور سیاسی شعور ہوتا تو ہندوستان نہ صرف تنگ نظر اور انتشار پسند ملکی حوصلہ آزماؤں سے محفوظ ہو جاتا، بلکہ انگریزوں کے اس تسلّط سے بھی محفوظ ہو جاتا، جس نے انیسویں صدی کے وسط میں ہندوستان کو کمزور اور میدان کو خالی پاکر اپنے قدم جمالئے، اور اس کو برطانوی سلطنت میں نہ صرف شامل کیا، بلکہ اس سے وہ قوت اور وسائل حاصل کئے، جس نے دنیا کی پوری سیاست پر اثر ڈالا، اور مسلم اور عرب ممالک پر اپنا اقتدار جمایا۔

شاہ صاحب کی اس جمعیتِ خاطر، ہمت و استقامت، بلند نگاہی و اولوالعزمی اور اس کے مقابلے میں ملک کی زلزلہ انگیز فضا کو دیکھتے ہوئے (جس میں نہ کسی سنجیدہ اور عمیق و مسلسل مشغولیت کی گنجائش معلوم ہوتی ہے، نہ کسی انقلابِ حال اور عروج بعد زوال کی امید) اقبال کا یہ شعر حقیقت حال کی سچی تصویر معلوم ہوتا ہے ؎

ہَوا ہے گو تُند و تیز لیکن چراغ اپنا جلا رہا ہے
وہ مردِ درویش جس کو حق نے دیئے ہیں انداز خسروانہ

شاہ صاحبؒ کا احساس و اضطراب

شاہ صاحب جنھوں نے ابتدائے سن شعور میں اورنگ زیب عالمگیر کے دبدبۂ حکومت و اقبال سلطنت کے آثار دیکھے تھے، اور اس سے پہلے کے (جب سلطنت مغلیہ کا ستارۂ اقبال بلند اور جاہ و جلال قائم تھا) قصے دہلی کے بزرگوں اور اہل خاندان سے سُنے تھے، اور جن کے قلم سے خلافتِ راشدہ کے کارنامے اور تاریخ اسلام کے عہد زرّیں کے تابناک نقوش،

اسلامی حکومت کے فرائض و ذمہ داریوں اور اس کے ساتھ خدا کی مدد اور نصرت کی تفصیل ازالۃ الخفا کے صفحات پر ثبت ہوئی تھی، ان کی آنکھوں نے مغلیہ سلطنت کے عہد زوال اور فرخ سیر اور محمد شاہ کے زمانہ کی بدنظمی، طوائف الملوکی، مرہٹوں کی پامالی [illegible] مذہب و ملت اہل ملک کی جان و مال، عزت و آبرو کا عدم تحفظ اور انسانی خون کی ارزانی، شعائر اسلام کی بے حرمتی اور مسلمانوں کی (جو چھ سو سال سے اس ملک پر حکومت کر رہے تھے) مجبوری اور بے بسی کا نظارہ دیکھا تو ان کا حساس و دردمند دل خون کے آنسو رویا، اور خون کے یہ قطرے ان کے گوہر بار قلم سے ان خطوط کے صفحات پر جو انھوں نے اپنے زمانہ کے بعض اہل دول اور معتمدین کو لکھے ہیں ٹپک پڑے، یہاں پر اس کے چند نمونے پیش کئے جاتے ہیں، ایک معاصر بادشاہ کے نام[1] سورج مل جاٹ کے دور دورہ اور اسلام کی غربت کا حال بیان کرتے ہوئے ایک خط میں لکھتے ہیں :۔

ازان باز شوکت سورج مل فزونی	اس کے بعد سے سورج مل کی شوکت
یافت وازدو کروہ دہلی گرفتہ	ترقی پاگئی دہلی سے دو کوس کے فاصلے
تا اقصیٰ اکبر آباد طولاً واز حدود	سے لے کر آگرہ کے آخر تک طول میں
میوات تا فیروز آباد و شکوہ آباد	اور میوات کے حدود سے فیروز آباد
عرضاً متصرف شد و اذان و صلاۃ	اور شکوہ آباد تک عرض میں سورج مل
مقدور کسے نہ کہ برپا دارد[2]۔	قابض ہوگیا کسی کی طاقت نہیں کہ
	وہاں اذان و نماز جاری کر سکے۔

---

[1] جیسا کہ آگے آئیگا اس بات کے پورے قرائن موجود ہیں کہ یہ خط احمد شاہ ابدالی کے نام لکھا گیا ہے۔

[2] مکتوب بہ بعض سلاطین (شاہ ولی اللہ دہلویؒ کے سیاسی مکتوبات — پروفیسر خلیق احمد نظامی ص۱۵)

اسی مکتوب میں ایک آباد و مردم خیز شہر بیانہ کی ویرانی کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:۔

شہر بیانہ را کہ شہر قدیم اسلام بود	شہر بیانہ جو کہ اسلام کا قدیم شہر
و علماء و مشائخ از مدت ہفت صد	تھا اور جہاں پر علماء و مشائخ
سال در آں جا اقامت داشتند	سات سو سال سے اقامت پذیر
قہرًا و جبرًا متصرف گشتہ ہمہ	تھے، اس شہر پر قہرًا و جبرًا قبضہ
مسلمانان را بخواری اخراج نمودند[1]	کر کے مسلمانوں کو ذلت و خواری
	کے ساتھ وہاں سے نکال دیا۔

ملازمین شاہی جن کی تعداد لاکھ سے اوپر تھی کی خستہ حالی کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:۔

چوں خزانۂ پادشاہ نماند نقدی	جب خزانۂ بادشاہ نہیں رہا،
ہم موقوف شد آخر حال ہمہ از	نقدی بھی موقوف ہو گئی، آخر کار
ہم پاشیدند، و کاسۂ گدائی در	سب ملازمین تتر بتر ہو گئے، اور
دست گرفتہ اند، و از سلطنت	کاسۂ گدائی اپنے ہاتھ میں لے لیا،
بجز نامے باقی نماند۔[2]	سلطنت کا بجز نام کے اور کچھ
	باقی نہ رہا۔

مسلمانوں کے مختلف طبقوں کا حال لکھتے ہوئے ان کے قلم سے یہ موثر جملہ نکل گیا ہے:۔

بالجملہ ایں جماعت مسلمین قابل ترحم	غرض کہ جماعت مسلمین قابل رحم
اند۔[3]	ہے۔

نواب نجیب الدولہ کے نام ایک خط میں تحریر فرماتے ہیں:۔

---

[1] ایضاً ص۹ [2] ایضاً ص۱۱ [3] ایضاً ص۱۱

مسلمانانِ ہندوستان چہ دہلی وچہ غیرآں چندیں صدمات دیدہ اند وچند بار نہیب وغارت آزمودہ کارد باستخواں رسیدہ است جائے ترحم است[1] .	مسلمانانِ ہندوستان نے خواہ وہ دہلی کے ہوں خواہ اس کے علاوہ کسی اور جگہ کے کئی صدمات دیکھے ہیں اور چند بار لوٹ مار کے شکار ہوئے ہیں "چاقو ہڈی تک پہونچ گیا ہے" رحم کا مقام ہے .

شاہ صاحب حقائق و واقعات اور مؤثر اور طاقتور اسباب پر نظر کر کے یقینی نتائج اور مستقبل قریب کی اس طرح پیشین گوئی کرتے ہیں جس میں قیاس و ذہانت کا دخل نہیں محض حالات کا غیر جانبدارانہ اور حقیقت پسندانہ جائزہ ہے :-

اگر غلبۂ کفر معاذ اللہ بہمیں مرتبہ ماند مسلماناں اسلام فراموش کنند واندکے از زماں نہ گذرد کہ قومے شوند کہ نہ اسلام را دانند نہ کفر را[2] .	اگر غلبۂ کفر معاذ اللہ اسی انداز پر رہا تو مسلمان اسلام کو فراموش کر دیں گے اور تھوڑا ہی زمانہ گذرے گا کہ یہ مسلم قوم ایسی قوم بن جائیگی کہ اسلام اور غیر اسلام میں تمیز نہ کر سکے گی .

مغل بادشاہوں اور ارکان سلطنت کو نصیحت و مشورہ

شاہ صاحبؒ نے خاندان مغلیہ کے سلاطین کے عروج و زوال اور ان کے اسباب کا

[1] مکتوب ہفتم بطرف نجیب الدولہ ص۲۲-۲۳ [2] ایضاً ص۱۳

بغور مطالعہ فرمایا تھا، (جیسا کہ حجۃ اللہ البالغہ کے اس مضمون سے ظاہر ہوتا ہے جو باب ہفتم میں گزر چکا ہے) سلطنت مغلیہ کے علاوہ انھوں نے دوسری اسلامی سلطنتوں کی تاریخ بھی دقت نظر سے پڑھی تھی، اور اس سے انھوں نے وہ حکیمانہ نتائج اخذ کئے تھے، جو قرآن مجید کا ایسا ہی حامل اور عالم اخذ کر سکتا ہے، جو خدا کے قانون مجازاۃ اور سنت اللہ سے واقف ہے، ان سے یہ حقیقت مخفی نہ تھی کہ اس خاندان کا مزاج طویل موروثی سلطنت، اسباب عیش و عشرت کی فراوانی، اور خود غرض، مصاحبین، اور مشیران سلطنت کی کوتاہ نظری سے فاسد ہو گیا ہے، اور بیماریاں اس کے جسم میں جڑ پکڑ گئی ہیں، وہ عرب فلسفی مورخ علامہ ابن خلدون کے اس حکیمانہ مقولہ سے بھی بے خبر نہ تھے کہ "إن الهرم إذا نزل بالدولة لا يرتفع"[1] (جب کوئی سلطنت بوڑھاپے کے مرحلہ میں داخل ہو جاتی ہے تو اس کا از سر نو جوان ہونا (عام طور پر) ممکن نہیں ہوتا۔)

لیکن صحیح فکرمندی، سچی طلب اور دل سے لگی ہوئی بات انسان کو ایسی جگہ بھی قسمت آزمائی پر آمادہ کرتی ہے، جہاں کامیابی کی امید موہوم بھی ہو، جس مسافر پر تشنگی کا غلبہ ہوتا ہے، اور جان لبوں پر آجاتی ہے، ہزار عقل و دانائی اور تجربوں کے باوجود بھی اس کے قدم پانی کی امید میں چشمۂ سراب کی طرف بے اختیارانہ اُٹھ جاتے ہیں کہ عقل کی خود فریبی سچی پیاس کی علامت ہے، عرفی نے کیا خوب کہا ہے ؎

زنقصِ تشنہ لبی داں بہ عقل خویش مناز

دلت فریب گراز جلوۂ سراب نخورد

(سچی پیاس کی کمی کو اس کا سبب سمجھ، اپنی عقل پر ناز نہ کر اگر تیرے دل نے (جان بوجھ کر بھی)

---

[1] ملاحظہ ہو مقدمۃ ابن خلدون فصل إن الهرم إذا نزل بالدولة لا يرتفع ص ۲۰۶

سراب کی ظاہری چمک دمک سے دھوکا نہیں کھایا۔)

لیکن انسانؑ پھر ایک ایسے خاندان کا معاملہ جس نے صدیوں جاہ و جلال سے حکومت کی تھی، ایک بے جان اور جامد سراب سے بہر حال مختلف ہے، اور اس سے یہ توقع کرنی بے جا نہیں کہ اس میں پھر کوئی باحمیّت اور صاحبِ عزیمت مردِ میدان پیدا ہو سکتا ہے، جو حالات کا رُخ بدل دے اور جاں بلب سلطنت میں زندگی کی نئی روح پھونک دے شاہ صاحب اپنے عہد کے قرآن مجید کے بڑے رمز شناس اور غوّاص تھے، ان کے سامنے قرآن کی یہ آیت تھی:۔

تُولِجُ اللَّيْلَ فِي النَّهَارِ وَتُولِجُ النَّهَارَ	تو ہی رات کو دن میں داخل کرتا اور
فِي اللَّيْلِ وَتُخْرِجُ الْحَيَّ مِنَ الْمَيِّتِ	تو ہی دن کو رات میں داخل کرتا ہے
وَتُخْرِجُ الْمَيِّتَ مِنَ الْحَيِّ وَتَرْزُقُ	اور تو ہی بے جان سے جاندار پیدا
مَنْ تَشَاءُ بِغَيْرِ حِسَابٍ ۝	کرتا ہے، اور تو ہی جاندار سے بے جان
(آل عمران ۔ ۲۷)	پیدا کرتا ہے اور تو ہی جس کو چاہتا ہے
	بے شمار رزق بخشتا ہے۔

اسی بنا پر شاہ صاحب نے قلعۂ معلّٰی کے حالات کو اچھی طرح جانتے ہوئے بھی اپنے زمانہ کے ایک مغل بادشاہ[1] کو خط لکھا ہے، جس میں اس کو اصلاحِ حال، تقویتِ سلطنت، اور خدا کی رحمت و نصرت کو اپنی طرف متوجہ کرنے کے لئے ایسے حکیمانہ اور دانشمندانہ مشورے دیئے گئے ہیں، جو اعلیٰ درجہ کی حکمت دین، تاریخ و سیاست اور نظم مملکت کے عمیق و وسیع مطالعہ پر مبنی ہے، شروع ہی میں لکھا ہے کہ:۔

امیدواری از فضل حضرت باری   اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے

---

[1] افسوس ہے کہ اس مغل بادشاہ کا نام (جس کے نام یہ اہم خط لکھا گیا ہے) معلوم نہیں ہو سکا۔

آنست کہ اگر بموجب ایں کلمات	امید ہے کہ اگر ان کلمات کے بموجب
عمل کنند تقویت امور سلطنت	عمل کریں گے تو امور سلطنت کی
وبقائے دولت، ورفع منزلت	تقویت، حکومت کی بقاء اور
بظہور می رسد فرد ؎	عزت کی بلندی ظہور پذیر ہو گی۔
درپس آئینہ طوطی صفتم داشتہ اند	شاعر کہتا ہے۔
انچہ استاد ازل گفت ہماں می گویم[1]	کہ مجھکو آئینہ کے پیچھے طوطی کے مانند
	رکھا ہے، جو کچھ استاد ازل نے کہا ہے
	وہی کہتا ہوں۔

اس خط میں جو بادشاہ وقت، اس کے وزیرا ور امراء سلطنت کو لکھا گیا ہے، چند نہایت دانشمندانہ، سیاسی وانتظامی مشوروں کے بعد جن کے بغیر سلطنت کا قیام، رعیت کا رفاہِ عام اور لوگوں کا اعتماد بحال نہیں ہو سکتا، آخر میں لکھا ہے کہ قاضی اور محتسب ایسے لوگوں کو بنایا جائے جن کو رشوت ستانی کی تہمت نہ لگی ہو، اور وہ مذہب اہل سنت والجماعت کے ہوں، نیز یہ کہ ائمہ مساجد کو اچھے طریقہ پر تنخواہ دی جائے، نماز باجماعت کی حاضری کی تاکید کی جائے، اور اس کا پورے اہتمام کے ساتھ اعلان کیا جائے کہ ماہ رمضان کی بے حرمتی نہ ہونے پائے، آخر میں یہ کہ بادشاہ اسلام اور امرائے عظام ناجائز عیش وعشرت میں مشغول نہ ہوں، گذشتہ گناہوں سے سچے دل سے توبہ کریں اور آئندہ گناہوں سے بچتے رہیں، اگر ان کلمات پر عمل کیا جائیگا تو مجھے امید ہے کہ بقائے سلطنت، تائید غیبی اور نصرت الٰہی میسر ہو گی" وما توفیقی إلا باللہ علیہ توکلت والیہ أنیب[2]"

---

[1] شاہ ولی اللہ دہلویؒ کے سیاسی مکتوبات، مکتوب اول بجانب بادشاہ ووزیر وامراء۔

[2] ملاحظہ ہو سیاسی مکتوبات ص۱۰-۱۸

اس طرح شاہ صاحبؒ نے اپنا وہ فرض ادا کر دیا جو ایک جیّد عالم دین، شارحِ قرآن وحدیث اور وقت کے مصلح اور مجدّد کو ادا کرنا چاہیئے تھا، جو اپنے فرائض اور ذمہ داریوں سے آگاہ اور ان خطرات سے باخبر ہے جو صرف حکمراں خاندان ہی کے سر پر نہیں، پورے اہل ملک کی گردنوں پر ننگی تلوار کی طرح لٹک رہے تھے، شاہ صاحبؒ نے اپنے اسلاف کے اتباع اور ربّانیین امت کے دستور کے مطابق سرکار دربار سے براہ راست کوئی تعلق نہیں رکھا تھا، اور اپنے بوریائے فقر پر متمکّن رہے تھے، لیکن حضرت خواجہ نظام الدین اولیاءؒ اور ان کے جانشین حضرت سید نصیر الدین چراغ دہلیؒ کی طرح ان کا دل حکومتِ وقت اور اس کی صحیح رہنمائی کے لئے دعا میں مشغول تھا، اور ان لوگوں کو جو اس مرکز علمی وروحانی سے تعلق رکھتے تھے، وہ زبان وقلم سے صحیح مشورہ دینے میں کسی بخل اور احتیاط سے کام نہیں لیتے تھے، ایک دوبار ایسا بھی ہوا کہ بادشاہ خود اچانک شاہ صاحب کی خدمت میں حاضر ہو گیا اور دعا کی درخواست کی، اپنے محبوب ومعتمد مرید مسترشد اور برادر نسبتی شاہ محمد عاشق پھلتیؒ کو ایک خط میں تحریر فرماتے ہیں:-

”جمعرات کے دن بادشاہ حضرت نظام الدین اولیاء اور دیگر مشائخ کے مزارات کی زیارت کرنے کے لئے سوار ہو کر گیا تھا[1]، مجھے پہلے سے اطلاع دیئے بغیر کابلی دروازہ سے سادہ تخت پر سوار ہو کر غریب خانہ پر وارد ہوا، فقیر کو کوئی اطلاع ہی نہ تھی، مسجد میں بوریوں پر آ کر بیٹھ گیا، اس قدر توقیر سلطان کرنا لازم ہوئی کہ فقیر جس مصلّے پر بیٹھتا ہے اور نماز ادا کرتا ہے، اس کو اس طریقہ سے بچھا دیا گیا کہ اس کی ایک جانب بیٹھ گیا اور دوسری جانب بادشاہ، بادشاہ نے اول مصافحہ کیا بڑی تعظیم کے ساتھ بعد ازاں کہا، میں مدت سے آپ کی ملاقات کا مشتاق تھا، لیکن آج اس جوان کی رہنمائی میں

---

[1] افسوس ہے کہ مکتوب میں اس بادشاہ کا نام درج نہیں، اور نہ کسی اور ذریعہ سے اس کی وضاحت ہو سکی۔

یہاں پہونچا ہوں' اشارہ وزیر کی طرف کیا پھر کہا کہ غلبۂ کفر، اور رعیت کا تفرّق و انتشار اس درجہ پر پہونچ گیا ہے کہ سب کو معلوم ہے، چنانچہ مجھے تو سونا، اور کھانا پینا دوبھر اور تلخ ہوگیا ہے' اس بارہ میں آپ سے دعا مطلوب ہے' میں نے کہا کہ پہلے بھی میں دعا کرتا تھا اور اب تو انشاء اللہ اور زیادہ دعا میں مشغول رہوں گا۔

اسی دوران میں وزیر نے مجھ سے کہا کہ حضرت بادشاہ پانچوں وقت کی نماز کا بڑا اہتمام فرماتے ہیں' میں نے کہا الحمد للہ! یہ وہ بات ہے کہ ایک مدت کے بعد سننے میں آرہی ہے' ورنہ ماضی قریب کے بادشاہوں میں سے کسی میں یہ نماز کی پابندی سننے میں نہیں آئی تھی"[1]

آخر میں شاہ صاحبؒ نے بادشاہ کو حضرت ابوبکر صدیقؓ کی وہ وصیت سنائی جو انھوں نے حضرت عمر فاروقؓ کو خلیفہ بناتے وقت فرمائی تھی:۔

"خلیفہ کو بھی عجیب عجیب مشکلات درپیش ہوتی ہیں' اعدائے دین کی طرف سے بھی اور موافقین کی طرف سے بھی' ان تمام مشکلات کا بس ایک ہی علاج ہے کہ مرضیاتِ حق کو اپنا نصب العین بنا کر حق تعالیٰ سے ہی مدد طلب کی جائے' اور اس کے غیر سے قطع نظر کر لی جائے"[2]

شیخ محمد عاشق کے نام ایک اور خط میں تحریر فرماتے ہیں:۔

"بادشاہ[3] اور اس کی والدہ آئے تھے' پہلے مسجد میں زنانہ کا انتظام کیا گیا، اس صورت سے بادشاہ کے آنے کی غرض یہ تھی کہ بے تکلف ہو کر کچھ دیر ٹھہرے'

---

[1] سیاسی مکتوبات ص۱۳۵-۱۳۶ [2] ایضاً ص۱۳۶-۱۳۷ [3] یہاں بادشاہ سے احمد شاہ مراد ہے جو محمد شاہ کا فرزند و جانشین تھا ۱۱۶۱ھ میں تخت نشین ہوا۔

تقریباً [illegible] [illegible] گذر [illegible] [illegible] [illegible] کبھی [illegible] اس کی زیادہ تر باتیں مخلوق خدا کی

بھلائی [illegible] [illegible] سے متعلق نہیں"[1]

[illegible] ظاہر ہے کہ حکمراں خاندان کا زوال طویل موروثی سلطنت کے اثرات اور بیرونی مخالفتیں اور سازشیں اس درجہ کو پہونچ گئی تھیں کہ کوئی بڑے سے بڑا صاحب عزم اورنگ نشین بھی تنہا اس زوال کو عروج سے، کمزوری کو نئی طاقت اور توانائی سے بدل کر پورے ملک کے حالات میں انقلاب نہیں لا [illegible] تاریخ سے ثابت ہوتا ہے کہ جب کسی سلطنت کا زوال اپنے آخری حدود تک پہونچ جاتا ہے اور مخالفتوں اور سازشوں کی سرنگیں سلطنت کو بارود کی طرح اڑانے کے لئے تیار ہوتی ہیں، تو بڑے سے بڑا قوی الارادہ جفاکش اور صاحبِ صلاح بادشاہ بھی سلطنت کے جسم میں زندگی کی نئی روح پھونکنے میں ناکام رہتا ہے، متعدد بار ایسا پیش آیا کہ حکمراں خاندان کا آخری آدمی جس کے زمانہ میں سلطنت کا انقراض پیش آیا، اپنے بہت سے پیشروؤں سے بہتر تھا، اور اس نے سلطنت کو سقوط سے بچانے کی جانبازانہ کوشش کی لیکن کامیاب نہ ہوسکا، بنی مروان کے خاندان اور بنی امیہ کی سلطنت کے آخر میں مروان ابن محمد معروف بمروان الحمار (م ۱۳۲ھ) اور خلفائے عباسیہ کے خاندان کا آخری فرمانروا مستعصم باللہ (م ۶۵۶ھ) اور کسی حد تک تیموری خاندان کا آخری فرمانروا ابوظفر بہادر شاہ (م ۱۲۷۹ھ / ۱۸۶۲ء) اس کی چند مثالیں ہیں۔

اس لئے ضرورت تھی کہ شاہ صاحبؒ کا جیسا بالغ نظر مصلح، وسیع النظر مؤرخ اور فراست ایمانی کا حامل برائے نام مغل فرمانرواؤں اور ان کے امرائے دربار سے رابطہ قائم کرنے ان کے اندر... حمیتِ ملّی وغیرتِ دینی بیدار کرنے، بگڑے ہوئے حالات اور

---

[1] سیاسی مکتوبات ص۱۱۱

انتشار انگیز طاقتوں سے پنجہ آزمائی پر آمادہ اور تیار کرنے پر اکتفا نہ کرے، شاہ صاحبؒ نے درباری امراء کے محدود حلقہ سے باہر نکل کر ان امرائے سلطنت آزمودہ کار قائدین افواج اور عالی حوصلہ سرداروں سے خط و کتابت کی جن کے خاکستر میں ان کو دینی حمیت اور قومی عزت کی کوئی دبی ہوئی چنگاری نظر آئی، ان میں حسب ذیل امرائے سلطنت اور قائدین تھے، وزیر مملکت آصف جاہ[۱]، نواب فیروز جنگ نظام الملک احمد شاہی[۲]، عماد الملک وزیر، تاج محمد خاں بلوچ، نواب مجد الدولہ بہادر[۳]، نواب عبید اللہ خاں کشمیری، میاں نیاز گل خاں، سید احمد روہیلہ۔

لیکن شاہ صاحب کی نگاہ انتخاب و اختصاص (جس کے ساتھ فراست ایمانی اور الہام ربانی شامل معلوم ہوتا ہے) اس عہد کی دو عظیم شخصیتوں پر پڑی جن میں سے ایک ہندوستان کے اندر کی تھی اور ایک باہر کی، ہماری مراد امیر الامراء نواب نجیب الدولہ اور احمد شاہ ابدالی والیٔ افغانستان سے ہے۔

نواب نجیب الدولہ

نواب نجیب الدولہ[۴] میں وہ تمام صفات و خصائص پائے جاتے تھے، جو عہد قدیم میں بانیان سلطنت کی خصوصیت ہیں، اور جنھوں نے شخصی سلطنتوں اور خاندانوں کے عروج و اقتدار کے عہد میں (جب ذاتی جوہر اور وفاداروں کی جمعیت کا فراہم ہو جانا

۱و۲ مجموعۂ مکتوبات حضرت شاہ عبد الرحیم و حضرت شاہ ولی اللہؒ (قلمی) محفوظ عثمانیہ یونیورسٹی لائبریری حیدرآباد مخطوطات ص۲۱۴ ۳ ان کے نام چار خط ہیں ملاحظہ ہوں حضرت شاہ ولی اللہ صاحب کے سیاسی مکتوبات' ص۷۰-۶۶ ۴ تفصیلی حالات کے لئے ملاحظہ ہو "نجیب التواریخ" از نصیر الدین (قلمی نسخہ حبیب گنج) مختصر حالات کے لئے "شاہ ولی اللہ صاحب کے سیاسی مکتوبات" ص۲۳۴-۲۳۱

فتح اور قیام سلطنت کے لئے کافی ہوتا تھا) اہم کردار ادا کیا ہے' اور ان کے ہاتھوں کسی فتح و تسخیر کے کسی کارنامہ کا ظہور ہوا ہے' ان کے اندر اپنے ولیِ نعمت کے ساتھ وفاداری کا جوہر اپنے رفیقوں اور ماتحتوں کے ساتھ شرافت و احسان کی خو، سپہ گری کا جوہر و شجاعت اور قائدانہ صلاحیت کوٹ کوٹ کر بھری تھی، لیکن تاریخی تجربہ یہ ہے کہ یہ صفات و کمالات جنگی طاقتوں کو شکست دینے اور ملک فتح کرنے میں تو کامیاب ہو جاتی ہیں، لیکن ایسے ماحول میں جس میں غداری اور کورنگی کو "فنِ شریف" کا درجہ دیا جائے' بے اصولی و بے کرداری کو اعلیٰ درجہ کی سیاست سمجھا جائے' اور موقع سے فائدہ اٹھانے کو دانشمندی اور دوراندیشی تصور کیا جائے' اکثر مفید بننے کے بجائے کامیابی میں حارج اور مشکلات پیدا ہونے کا باعث بنتی ہیں، بدقسمتی سے نواب نجیب الدولہ اور آصف جاہ نظام الملک کو ایسا ہی فاسد ماحول ملا تھا، مؤرخین اس کے اعلیٰ کردار اور سپاہیانہ و قائدانہ صلاحیت کی تعریف میں یک زبان ہیں سر جادو ناتھ سرکار لکھتا ہے :-

"ایک مؤرخ کی سمجھ میں یہ نہیں آتا کہ اس کی کس خوبی کی سب سے زیادہ تعریف کرے میدان جنگ میں اس کی حیرت انگیز قیادت کی، یا مشکلات میں اس کی تیز نگاہ یا صحیح رائے کی، یا اس کی اس فطری صلاحیت کی جو اس کو انتشار و ابتری میں ایسی راہ دکھاتی تھی جس سے نتیجہ اس کے موافق نکل آتا تھا"[1]

مولوی ذکاء اللہ دہلوی تاریخ ہندوستان میں لکھتے ہیں :-

"نجیب الدولہ ایسا عاقل، ہوشیار و دانشمند تھا کہ کمتر ہوتے ہیں، امانت داری

---

[1] SARKAR: FALL OF THE MUGHAL EMPIRE, VOL-II. P. 416

(ماخوذ از سیاسی مکتوبات ص۲۳۲)

ایمانداری تو اس وقت میں اس پر ختم تھی' وہ اپنے پرانے آقاؤں نواب دوندے خاں روہیلا اور نواب شجاع الدولہ کی فرمانبرداری کئے جاتا تھا، ملہر راؤ ہلکر سے بھی اس کا ساز باز چلا جاتا تھا، یاد ہوگا یہ مرہٹہ پانی پت کی لڑائی سے اپنے ہم وطنوں کو چھوڑ کر بھاگ گیا تھا، غرض یہ جوانمرد اس ٹوٹی پھوٹی سلطنت کو نباہ رہا تھا۔"[1]

شاہ عبدالعزیز صاحب فرماتے ہیں :۔

نزد نجیب الدولہ نہ صد عالم بود	نجیب الدولہ کے یہاں نو سو
ادنی پنج روپیہ اعلیٰ پنج صد روپیہ[2]	عالم تھے جن میں سے سب سے نیچے درجہ والے کو پانچ روپیہ اور اعلیٰ کو پانچ سو روپیہ ملتے تھے۔

پروفیسر خلیق احمد نظامی کے بقول ۱۷۶۱ء سے ۱۷۷۰ء تک وہ دہلی کی سب سے بڑی شخصیت تھی' تمام سیاست اس کے گرد گھومتی تھی اور وہ سارا نظام حکومت اپنے کاندھوں پر سنبھالے ہوئے تھا۔"[3]

شاہ صاحبؒ نے جن کو اللہ تعالیٰ نے مردم شناسی و حقیقت پسندی کا وہ ملکہ عطا فرمایا تھا جو ان لوگوں کو عطا ہوا کرتا ہے جو تاریخ اصلاح و تجدید اور کارِ آدم گری و مردم سازی میں کوئی بڑا کام کرتے ہیں، قحط الرجال کے اس عہد میں جو حوصلہ مندوں اور طالع آزماؤں سے بھرا ہوا تھا اپنے کام کی تکمیل و مدد لینے میں نجیب الدولہ کا انتخاب کیا اور ان کی دوربین و باریک بین نگاہ نے اس جوہر قابل اور اس کے اندر دینی حمیت کو دیکھ لیا،

---

[1] تاریخ ہندوستان جلد نہم ص ۳۱۵ [2] ملفوظات ص ۱۰۸ [3] سیاسی مکتوبات ص ۲۳۲

شاہ صاحب نے ان سے مراسلت شروع کی اوران چنگاریوں کو فروزاں کرنے کی کوشش کی جوان کی خاکستر میں دبی ہوئی تھیں، وہ ان کے نام اپنے مکتوب میں لکھتے ہیں:-

خدائے عز وجل آں امیر المجاہدین را	خدائے عز وجل امیر المجاہدین کو
بنصر ظاہر وتائید باہر مشرف کناد،	نصرت ظاہر اور تائید واضح کے ساتھ
وایں عمل را بعز قبول رسانیدہ	مشرف کرے اور اس عمل کو قبولیت کے
ثمرات عظیم وبرکات جسیم برآں مرتب	درجہ میں پہونچا کر بڑی بڑی برکتیں
گرداناد۔	اور رحمتیں اس پر مرتب کرے۔
از فقیر ولی اللہ عفی عنہ بعد سلام	فقیر ولی اللہ عفی عنہ کی جانب سے
محبت شام واضح آنکہ دعائے نصر	بعد سلام محبت شام واضح ہو کہ نصرت
مسلمین کردہ می شود واز سروش غیبی	مسلمین کے لئے یہاں دعا کی جارہی
نفحات قبول شنیدہ می شود امید	ہے اور سروش غیبی سے آثار قبول
انست کہ خدائے تعالٰی بردست	محسوس ہوتے ہیں امید یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ
ایشاں احیاء طریقۂ جہاد فرمودہ	آپ کے ہاتھ پر دینی جہد وجہاد کو زندہ
برکات آن عاجلاً وآجلاً نصیب	کرکے اس کے برکات اس دنیا اور آخرت
کند۔	میں عطا فرمائے گا۔
إنہ قریب مجیب۔[1]	إنہ قریب مجیب۔

ایک دوسرے خط میں ان کو "امیر الغزاۃ اور رئیس المجاہدین" کے لقب سے یاد فرماتے ہیں،[2]
ایک اور مکتوب میں تحریر فرماتے ہیں کہ:-

۱؎ سیاسی مکتوبات ص۱۹ ۲؎ ایضاً ص۲۰

"معلوم ہوتا ہے کہ اس دور میں تائید ملت اسلامیہ اور امداد امت مرحومہ کا کام آپ ہی کے ذریعہ انجام پائے گا جو اس کار خیر کا سرچشمہ اور ذریعہ ہے آپ کسی طرح کے وساوس و خیالات کو دل میں جمنے نہ دیں انشاء اللہ تمام کام دوستوں کی مرضی اور خواہش کے مطابق انجام پائیں گے۔"[1]

شاہ صاحب نواب نجیب الدولہ کے نام خطوط میں دعا و تہنیت پر اکتفا نہیں کرتے ان کو بڑے مفید بنیادی مشورے بھی دیتے ہیں، اور ان غلطیوں اور واقعات کے اعادہ سے محتاط و محترز رہنے کی تلقین بھی فرماتے ہیں جو اس سے پہلے حملہ آوروں اور مسلمان افواج سے ظہور پذیر ہوئے اور جو خدا کی نصرت و تائید سے مانع بن جاتے ہیں ایک مکتوب میں تحریر فرماتے ہیں کہ :-

"جب افواج شاہی کا گذر دہلی میں ہو تو اس وقت اس بات کا پورا انتظام و اہتمام ہونا چاہیئے کہ شہر سابق کی طرح ظلم سے پامال نہ ہو جائے، دہلی والے کئی مرتبہ لوٹ مار، ہتک عزت، اور بے آبروئی کا تماشہ دیکھ چکے ہیں، اسی وجہ سے مطلب برآری اور مقاصد میں تاخیر پیش آرہی ہے آخر میں مظلوموں کی آہ بھی اثر رکھتی ہے اگر اس بار آپ چاہتے ہیں کہ وہ کام جو تشنۂ تکمیل تھے، وہ مکمل ہو جائیں تو اس بات کی پوری تاکید و پابندی ہونی چاہیئے کہ کوئی فوجی دہلی کے مسلمانوں اور غیر مسلموں سے جو ذمی کی حیثیت رکھتے ہیں تعرض نہ کرے۔"[2]

شاہ صاحب متعدد خطوط میں ہندوستان کی، ان تین انتشار پسند اور جنگجو طاقتوں کے خطرہ اور ملک کو ان کے گزند سے محفوظ کر دینے کی ضرورت کی طرف بار بار متوجہ فرماتے ہیں (جن کا ذکر اس باب کے آغاز میں موجود ہے) کہ اس کے بغیر ملک میں نظم و نسق، امن و امان، شعائر دینی و معابد کی حفاظت اور معتدل معمول کے مطابق (NORMAL) زندگی گزاری نہیں جا سکتی،

---

[1] سیاسی مکتوبات ص۲۸ [2] ایضاً ص۲۱

ان کی وجہ سے سارا ملک مستقل طور پر حالت جنگ اور عسکری نظام کی صورت میں زندگی گذار رہا ہے[۱]

شاہ صاحبؒ کو نواب نجیب الدولہ سے ایسا تعلق خاطر معلوم ہوتا ہے اور وہ ان سے ایسی توقعات رکھتے ہیں کہ بار بار اس کی تاکید فرماتے ہیں کہ جب وہ اس مقصد کے لئے عنان عزیمت اٹھائیں تو شاہ صاحب کو اس کی ضرور اطلاع کریں تاکہ وہ دعا میں مشغول ہو جائیں[۲]، نیز ان کو بار بار فتح و کامیابی کی امید دلاتے ہیں اور اس کی پیشین گوئی فرماتے ہیں، لکھتے ہیں کہ:-

"فقیر کو اس بارے میں کوئی شک و شبہ نہیں ہے[۳]"

شاہ صاحبؒ نے نواب نجیب الدولہ ہی کو احمد شاہ ابدالی کو ہندوستان بلانے کے لئے خاص ذریعہ بنایا ان کے نام براہ راست خط لکھنے کے علاوہ جو آئندہ صفحات میں آرہا ہے ان سے بھی خطوط لکھوائے اور ان کو بار بار تاکید کی، نواب نجیب الدولہ نے شاہ صاحبؒ کی وفات کے آٹھ سال بعد رجب ۱۱۸۴ھ (۳۱ اکتوبر ۱۷۷۰ء) کو انتقال کیا پروفیسر خلیق احمد نظامی لکھتے ہیں کہ:-

"اس کی عدل گستری و بالغ نظری کا یہ واقعہ ہمیشہ تاریخ میں یادگار رہے گا کہ وہ جس وقت بستر مرگ پر آخری سانس لے رہا تھا تو اس نے اپنے فوجوں کو (جو اس کے ساتھ ہاپڑ کے مقام پر تھیں اور گڈھ کا میلہ ہو رہا تھا) حکم دیا کہ گنگا کے میلہ میں آنے جانے والے ہندو یاتریوں کے جان و مال کی پوری حفاظت کی جائے[۴]"

---

[۱] ملاحظہ ہو مکتوب ششم و ہفتم سیاسی مکتوبات ص ۲۱-۲۰ [۲] ملاحظہ ہو مکتوب ہشتم و نہم سیاسی مکتوبات ص ۲۵-۲۷ [۳] مکتوب ہشتم ص ۲۴-۲۵ و مکتوب نہم ص ۲۶

[۴] سیاسی مکتوبات ص ۲۳۴ بحوالہ سرکار ج م ص ۴۱۵

احمد شاہ ابدالی

شاہ صاحبؒ نے اپنی بالغ نظری، ہندوستان کی صورت حال کے حقیقت پسندانہ مطالعہ، ارکان سلطنت اور امراء دربار کی بے کرداری اور حکمراں خاندان کی روز افزوں نااہلی سے دو حقیقتیں ایسی سمجھ لی تھیں جو روز روشن کی طرح صاف تھیں، ایک تو یہ کہ ملک کی پہلی ضرورت اس بے نظمی اور طوائف الملوکی کو دور کرنا ہے، جس سے نہ اہل ملک کی جان و مال عزت و آبرو محفوظ ہے نہ کسی تعمیری کام اور بہتر نظم و نسق کی گنجائش ہے، جیسا کہ گذشتہ صفحات میں گذر چکا ہے، اس افراتفری، بے یقینی اور سراسیمگی کی دائمی فضا کی ذمہ داری ان تین انتشار پسند اور جنگجو گروہوں پر تھی، جو نہ تو کسی ایسے ملک میں حکومت کا تجربہ رکھتے تھے جس میں مختلف مذاہب، قومیں و تہذیبیں صدیوں سے پائی جاتی تھیں، اور جس کے انتظام کی ذمہ داری سنبھالنے کے لئے اعلیٰ درجہ کا احساسِ ذمہ داری، قوت ضبط وتحمل، وسیع النظری اور فراخ دلی ضروری تھی، نہ ان کے پاس ملک کو اعتدال و سکون عطا کرنے، اہل ملک کا اعتماد بحال کرنے اور نظم و نسق کو بہتر بنانے کے لئے کوئی منصوبہ تھا نہ کوئی تخیل، اس لئے پہلا کام یہ تھا کہ ان تینوں طاقتوں بالخصوص مرہٹوں کے غلبہ کے خطرہ سے ملک کو محفوظ کر دیا جائے جس سے ہندوستان کے اس مرکزی حصہ کو جو حکومتوں کا مستقر رہا ہے، یعنی لاہور سے دہلی اور صوبجات متحدہ تک کے علاقہ کو کسی وقت اطمینان نہیں تھا کہ کس وقت میدان جنگ میں تبدیل اور گلزار و پر رونق شہر ایک آزاد شکارگاہ میں مبتدل ہو جائیں گے، جہاں شکاریوں کو پرامن شہریوں کو چڑیوں اور جانوروں کی طرح مارنے کی اجازت ہوگی اور ان کا پشتوں اور نسلوں کا اندوختہ دیکھتے دیکھتے تاراج ہو جائیگا، اس سے دوسرے درجہ پر وہ خطرہ تھا جو سکھوں اور جاٹوں کی شکل میں تہذیب و تمدن

اور دولت و ثروت کے ان مرکزوں کو بلائے ناگہانی کی طرح پیش آتا رہتا تھا۔

دوسری حقیقت یہ تھی کہ اس خطرہ کو دور کرنے کے لئے کسی ایسے تجربہ کار عسکری قائد اور منظّم سپاہ کی ضرورت ہے جو نئی جنگی طاقت سے معمور تو ہو لیکن مخمور نہ ہو، اس کے اندر سپہ گری کے جوہر اور شجاعت و بہادری کے ماسوا... ایمانی غیرت و دینی حمیّت بھی ہو، نیز وہ ان ذیلی و ضمنی اختلافات رقابتوں اور پرانے کینوں اور دشمنیوں سے محفوظ ہو جو دہلی کے ایوان سلطنت اور ملک کے اہل سیاست کو گھن کی طرح کھا رہی تھیں، اور جن کی موجودگی میں کسی ایسے بلند تر مقصد کی تکمیل کی توقع نہیں کی جا سکتی تھی جس میں بجائے کسی نسلی عنصر، مذہبی گروہ یا ذاتی فتح مندی کے حصول کے ملت کا فائدہ اسلام کی تقویت اور ملک کی حفاظت مقصود و پیش نظر ہو، شاہ صاحب کی نظر میں ایک ذریعہ اور واسطہ کی حیثیت سے تو امیر الامراء نواب نجیب الدولہ کی (جیسا کہ اوپر گذرا) ضرورت و افادیت تھی لیکن وہ حالات کی سنگینی کے پیش نظر تنہا کافی نہیں تھے اور ان کے ذریعہ ان طاقتوں کا زور نہیں توڑا جا سکتا تھا جنھوں نے اپنی فوجی طاقت اتنی بڑھا لی تھی کہ ملک کی کوئی واحد فوجی طاقت ان کو شکست نہیں دے سکتی تھی، اس کے لئے ایک تازہ دم بیرونی فوجی قائد کی ضرورت تھی جو اس ملک کے لئے مطلقاً اجنبی اور نووارد نہ ہو، وہ اس ملک کے نشیب و فراز، باشندگان ملک کی راہ رسم، اور یہاں کے حریف اور نبرد آزما گروہوں کے مزاج اور کمزوریوں سے بھی واقف ہو، اور جو اس کا حوصلہ اور ظرف بھی رکھتا ہو کہ اس ملک کو ان فوری خطروں سے محفوظ کر کے عنان حکومت یہیں کے قدیم حکمراں خاندان کے کسی اہل اور باصلاحیت فرد، وفادار و صاحب کردار امیر یا وزیر کے حوالہ کر کے واپس چلا جائے، کہ یہی حقیقت پسندی، ملی مفاد اور حب الوطنی کا تقاضا ہے۔

اس نازک اور دشوار کام کے لئے (جس میں ہر نازک و دشوار کام کی طرح حضرت

ومنفعت کے پہلو ہوا کرتے ہیں) شاہ صاحب کی نظر انتخاب احمد شاہ درّانی (۱۱۳۶ھ/۱۷۲۳ء تا ۱۱۸۶ھ/۱۷۷۲ء) والیٔ قندھار پر پڑی، جو ہندوستان کے لئے اجنبی اور نووارد نہیں تھا، وہ ملتان میں پیدا ہوا[1]، یہاں تک ایک سڑک ابدالی روڈ کہلاتی ہے، اس نے مختلف حالات و مقاصد کے تحت ۱۷۴۷ء سے ۱۷۶۹ء تک ہندوستان پر نو حملے کئے، شاہ صاحب اور نواب نجیب الدولہ کی دعوت اور پانی پت کے معرکہ سے پہلے وہ چھ مرتبہ ہندوستان آچکا تھا، وہ ملک کے نشیب و فراز، طریقۂ جنگ، فوجی طاقتوں کے تناسب، اور امراء اور ارکین سلطنت کے رجحانات سے واقف تھا، وہ اٹھارویں صدی عیسوی اور بارہویں صدی ہجری کے وسط کے ان ممتاز ترین فوجی قائدین میں تھا، جو عرصۂ دراز کے بعد پیدا ہوتے ہیں، اور مستقل حکومتوں کی بنیاد رکھتے ہیں، اُس نے بڑی خوبی و کامیابی کے ساتھ منتشر افغانوں کی شیرازہ بندی کی، منصفانہ قوانین جاری کئے، محکمۂ احتساب قائم کیا، وہ سپہ گری، مکارم اخلاق اور شرافت نفس کی صفات کا جامع تھا، علم و ادب کا ذوق رکھتا تھا، وقار و رعب کے ساتھ اپنی قوم میں محبوب و مانوس بھی تھا، دیندار، پابند مذہب اور علماء اور صلحاء کی مجالست کا خواہش مند، سادات و مشائخ کا ادب کرنے والا اپنے مذہبی معلومات میں اضافہ اور علمی تبادلۂ خیال کا شائق، رحم دل و فیاض، مساوات اور مذہبی رواداری پر عامل تھا، اس نے بعض ایسی سنتوں کا احیاء کیا جن کا افغانی ماحول میں نام لینا بھی مشکل تھا، مثلاً بیوگان کا نکاح ثانی، وہ خود بھی تعلیم یافتہ اور اہل قلم تھا، اپنی روحانی ترقی کا متمنی رہتا تھا[2]، فیریر نے لکھا ہے کہ:-

---

[1] مقالہ (C. COLLIN DAVIES) انسائیکلوپیڈیا آف اسلام

[2] احمد شاہ ابدالی کے حالات میں ملاحظہ ہو ڈاکٹر گنڈا سنگھ کی کتاب AHMAD SHAH DURRANI - FATHER OF MODERN AFGHANISTAN, ASIA PUBLISHING HOUSE, 1949

"مشرقی ممالک کی بہت سی خرابیوں سے احمد شاہ مبرّا تھا، شراب نوشی، افیون وغیرہ سے اجتناب کلّی کرتا تھا، لالچ اور منافقانہ حرکتوں سے پاک تھا، مذہب کا سخت پابند تھا، اس کی سادہ لیکن باوقار عادتیں اس کو ہر دلعزیز بنا دیتی تھیں، اس تک پہونچنا آسان تھا، وہ انصاف کا خاص خیال رکھتا تھا، کبھی کسی نے اس کے فیصلہ کی شکایت نہیں کی"[1]

احمد شاہ دُرّانی شاہ صاحبؒ کے زمانہ میں چھ مرتبہ ہندوستان آکر اور مقامی اور وقتی ضرورتوں کو پورا کر کے واپس جاچکا تھا، ان حملوں میں اپنی فوجی طاقت کے مظاہرہ اور وقتی ضروریات کی تکمیل کے علاوہ اس نے کوئی اور مفید کام انجام نہیں دیا تھا، اس کی فوج نے ان اسلامی تعلیمات و آداب کی پابندی بھی نہیں کی تھی جن کی ایک پابند شریعت مسلمان سے توقع کی جاتی ہے، اس کے بعض حملوں سے شاہ صاحبؒ اور ان کے متعلقین کو بھی پریشانی و مصائب برداشت کرنے پڑے تھے، لیکن ان کمزوریوں اور تلخ تجربات کے باوجود وہی ایک ستارۂ امید تھا جو اس تاریک افق پر نظر آتا تھا، مولانا محمد عاشق صاحب پھلتی کا بیان ہے کہ اس سب کے بعد بھی شاہ صاحبؒ یہی فرماتے تھے "وے را دریں دیار غلبہ شدنی است" (اس کا اس علاقہ پر غلبہ ہوگا) ایک مرتبہ بہادر خاں بلوچ کے سوال کے جواب میں فرمایا "دریں ملک غلبہ کلّی وے خواہد شد" (اس ملک پر اس کا پورا غلبہ ہوگا) ایک مرتبہ اس کی موت کی افواہ گرم ہوئی شیخ محمد عاشق کے دریافت کرنے پر فرمایا:-

آنچہ معلوم شدہ اینست کہ احمد شاہ	جو معلوم ہوتا ہے وہ یہ ہے کہ احمد شاہ
درّانی باز دریں ملک می آید و ایں	درّانی اس ملک میں پھر آئیگا اور

---

[1] HISTORY OF THE AFGHANS ماخوذ از سیاسی مکتوبات ص ۲۲۵-۲۲۶

کفار را بر انداز دو ویراں باوجود ایں — ان کفار کو زیر و زبر کر دے گا باوجود
او زار ظلم برائے ہمیں کار گذاشتہ — مظالم کے جو وہ کر رہا ہے اس کو
اند[1] — اسی لئے اب تک اللہ نے باقی رکھا
ہے وہ یہی کام ہے۔

شاہ صاحبؒ کو امید تھی کہ اللہ تعالیٰ شاہ ابدالی کے حالات کی اصلاح فرمائیگا اور اس سے وہ کام لے گا جو بظاہر اسباب، کسی دوسرے امیر یا قائد کے بس کا نہیں ہے' حکیم ابوالوفاء کشمیری سے ایک مرتبہ فرمایا کہ ابدالی کو حصول مقصد میں جو دشواریاں پیش آرہی ہیں وہ اس وبال ظلم کی بنا پر ہیں' جو اس نے (اپنے پہلے حملوں میں) ہندوستان کے شہروں پر کئے ہیں بعد کو اس کے حالات ٹھیک ہو جائیں گے[2]۔

شاہ صاحبؒ احمد شاہ ابدالی سے ملک کو اس غیر یقینی صورت حال اور افراتفری سے محفوظ کر دینے اور سلطنت کو شاہی خاندان کے کسی نسبتاً لائق تر آدمی کے حوالہ کر دینے کا کام لینا چاہتے تھے، شاہ صاحبؒ نے اس کی آمد سے پہلے پیشین گوئی کی تھی' اور فرمایا تھا کہ ابدالی یہاں ٹھہرے گا نہیں بلکہ اولاد ملوک میں سے کسی کے حوالہ کر کے چلا جائیگا[3]۔

بالآخر شاہ صاحبؒ نے احمد شاہ ابدالی کو نجیب الدولہ سے خطوط لکھوائے پھر براہ راست ایک پُر زور و پُر اثر خط لکھا جو شاہ صاحب کی سیاسی بصیرت' دینی حمیّت' اخلاقی جرأت اور زور انشاء کا آئینہ دار ہے[4]، اس خط میں ہندوستان کی موجودہ صورت حال' اس کا قدیم طرز حکومت اس کے مختلف صوبوں کا نظم و نسق، ملک کی مختلف نسلی و مذہبی گروہوں

---

[1] ماخوذ از سیاسی مکتوبات ص۲۶-۲۷ [2] ایضاً ص۳۰ [3] ایضاً

[4] پورا خط ملاحظہ ہو مکتوب دوم بعض سلاطین کے عنوان سے شاہ ولی اللہ دہلوی کے سیاسی مکتوبات ص۶-۱۷

کی تعداد و طاقت کا تناسب' ان کے بارے میں مسلمان بادشاہوں کی سیاسی غلطیوں اور کوتاہ نظری' ان کا تدریجی طور پر طاقت پکڑ لینا اور اقتدار حاصل کرنا اس سلسلہ میں مرہٹہ اور جاٹ کا خصوصیت کے ساتھ ذکر کیا گیا ہے' اور ان کے اقتدار' بار بار کے حملوں سے غربتِ اسلام اور مسلمانوں کی مظلومیت کا دلدوز نقشہ کھینچا گیا ہے' اور اس باحمیت مسلمان قائد کو جو اس وقت ہندوستان سے لے کر ایران تک سب سے بڑی منظم فوجی طاقت کا مالک تھا، اس صورت حال کا مقابلہ کرنے اور سلطنت مغلیہ کو اپنے پاؤں پر کھڑے ہونے اور ملک کی ذمہ داری سنبھالنے کا موقع دینے پر آمادہ کیا گیا ہے' اور صفائی کے ساتھ لکھا گیا ہے :-

دریں زمانہ پادشاہ صاحب اقتدار	اس زمانہ میں ایسا بادشاہ جو
و شوکت باشد و قادر شکست لشکر	صاحبِ اقتدار اور شوکت ہو اور
کفار و دور اندیش جنگ آزمائی غیر آں	لشکر مخالفین کو شکست دے سکتا ہو
ملازمان آنحضرت موجود نیست۔[1]	دور اندیش و جنگ آزما ہو سوائے
	آنجناب کے کوئی اور موجود نہیں ہے۔

آگے لکھتے ہیں :-

ما بندگان الٰہی رسول خدا صلے اللہ	ہم بندگان الٰہی حضرت رسول اللہ
علیہ وسلم شفیع می آریم' و بنام خدائے	صلے اللہ علیہ وسلم کو شفیع بناتے ہیں
عز و جل سوال می نمائیم کہ ہمت	اور خدائے عز و جل کے نام پر التماس
با نہمت را، بجانب جہاد کفار	کرتے ہیں کہ ہمت مبارک کو

---

[1] سیاسی مکتوبات صـ۱۲

ایں نواحی مصروف فرمانید تا در پیش	اس جانب متوجہ فرما کر مخالفین سے
خدائے عز وجل ثوابِ جمیل در نامہ	مقابلہ کریں تاکہ خدائے تعالےٰ کے
اعمال آنحضرت ثبت شود و در دیوان	یہاں بڑا ثواب جناب کے نامۂ اعمال
مجاہدین فی (سبیل) اللہ نام نامی	میں لکھا جائے اور مجاہدین فی سبیل اللہ
نوشتہ شود، و در دنیا غنائم بے حساب	کی فہرست میں نام درج ہو جائے
بدست غازیانِ اسلام افتد و	دنیا میں بے حساب غنیمتیں ملیں، اور
مسلمانان از دست کفار نجات یابند۔[1]	مسلمان دست کفار سے خلاصی
	پا جائیں۔

اسی خط میں انھیں سیاسی بصیرت اور حالات سے گہری واقفیت کی بنا پر ہندوستان کی ان نوخیز طاقتوں کے بارے میں جن کی کسی مقابل منظم طاقت کے نہ ہونے کی وجہ سے شجاعت وطاقت کی دھاک بیٹھی ہوئی تھی، اور ان کو ناقابل شکست سمجھا جاتا تھا، صحیح اندازہ پیش کیا ہے جو ایک تجربہ کار قائد اور سیاسی مبصّر ہی پیش کر سکتا ہے، مرہٹوں کے متعلق تحریر فرماتے ہیں:۔

"قوم مرہٹہ کا شکست دینا آسان کام ہے بشرطیکہ غازیان اسلام کمر ہمت باندھ لیں حقیقت یہ ہے قوم مرہٹہ خود قلیل ہے، لیکن ایک گروہ کثیر ان کے ساتھ ملا ہوا ہے ایک گروہ میں سے ایک صف کو بھی اگر درہم برہم کر دیا جائے تو یہ قوم منتشر ہو جائیگی اور اصل قوم اسی شکست سے ضعیف ہو جائیگی، چونکہ یہ قوم قوی نہیں ہے، اس لئے ان کا تمام تر سلیقہ ایسی کثیر فوج جمع کرنا ہے جو چیونٹیوں اور ٹڈیوں سے زیادہ ہو، دلاوری اور سامان حرب کی بہتات ان کے یہاں نہیں ہے۔"[2]

---

[1] سیاسی مکتوبات صـ۱۳۰ [2] ایضاً صـ۸۶

شاہ صاحب کی ہدایت کے مطابق نجیب الدولہ نے احمد شاہ ابدالی کو جو خطوط لکھے پھر شاہ صاحب نے جو طویل و مؤثر خط براہ راست لکھا (جس کا کچھ اقتباس اوپر گذرا) وہ بے اثر نہیں رہا، احمد شاہ ابدالی نے ۱۱۷۳ھ (۱۷۵۹ء) میں مرہٹوں کا زور توڑنے اور نجیب الدولہ اور شجاع الدولہ کی مدد کرنے کے لئے (جنھوں نے اس موقع پر سیاسی شعور اور اسلامی اتحاد کا ثبوت دیا تھا) ہندوستان کا قصد کیا ایک سال ذیلی جنگوں اور جھڑپوں میں گذر گیا بالآخر ۱۱۷۴ھ (۱۴ر جنوری ۱۷۶۱ء) کو پانی پت کے میدان میں مرہٹوں اور افغانوں اور ہندوستانی اسلامی متحدہ محاذ کے درمیان وہ فیصلہ کن جنگ ہوئی جس نے ہندوستان کی تاریخ کا رخ بدل دیا، اور مرہٹوں کو ہندوستان کے نئے ابھرتے ہوئے سیاسی نقشہ سے باہر نکال دیا، اس جنگ کا مختصر حال اور نتیجہ مولوی ذکاء اللہ صاحب مؤلف "تاریخ ہندوستان" کے الفاظ میں لکھا جاتا ہے[1]:۔

"لڑائی میں بڑا گھمسان ہو گیا مگر اب بھی مرہٹوں کا پلہ بھاری تھا، احمد شاہ نے اپنے بھگوڑے سپاہیوں کو گھیر کر قتل کرنے کا حکم سنایا اور یہ کہدیا جو بھاگے گا مارا جائے گا، بعد اس کے اس نے اپنی صف کو آگے بڑھنے کا حکم دیا، ایک سپاہ کو اپنے بائیں طرف دشمن کے بازو پر حملہ کا حکم دیا، اس تدبیر کا تیر ٹھیک نشانہ پر بیٹھا، قلب سپاہ میں بھاؤ، بسواس راؤ گھوڑوں پر سوار لشکر کو لڑا رہے تھے، خنجر اور کھانڈے بازی ہو رہی تھی کہ یکایک خدا معلوم کیا ہوا کہ مرہٹوں کے لشکر کا قدم میدان جنگ سے اُٹھ گیا، قدم کا اٹھنا تھا کہ میدان جنگ کا ان کے مُردوں سے بھرنا تھا، لشکر اسلامیہ نے ان کا تعاقب بڑے جوش و خروش سے ہر جانب میں پندرہ، پندرہ، بیس بیس میل تک کیا،

[1] تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو تاریخ ہندوستان جلد نہم ص ۳۰۵-۳۰۹

اور مرہٹوں کو مار مار کر ڈھیر لگا دیا، جو مرہٹے ان دشمنوں کے ہاتھ سے بچ گئے، ان کو گنواروں نے مار ڈالا۔ بسواس راؤ اور بھاؤ مارے گئے، جن کو جی سیندھیا کو کسی درانی نے چھپا رکھا تھا، وہ بھی تلاش کرنے سے پکڑا گیا اور مارا گیا، ابراہیم خاں گاردی بھی قید ہوا، ایک ہفتہ کی موت نے اس کے زخموں پر بھی مرہم رکھا شمشیر بہادر بھی بھاگتے ہوئے مارے گئے، مالوہ میں ملہار راؤ جان بچا کر نکل گیا، آپا جی سیندھیا بھی لنگڑا ہو کر وہاں جا پہونچا، ان دو سرداروں کے سوا کوئی اور نامور سردار نہیں بچا، مرہٹوں کو ایسی شکست کبھی نہیں ہوئی تھی نہ ایسی مصیبت پڑی تھی، اس سے ساری قوم کا دل پژمردہ و افسردہ ہو گیا، اس صدمہ سے بالا جی بھی تھوڑے دنوں کے بعد مر گیا جب سے شکست کی خبر سنی تھی، ایک مندر میں بیٹھ کر سنسکرت پڑھانا اختیار کر لیا تھا۔"[1]

بقول ایک مؤرخ کے "مرہٹوں کی طاقت چشم زدن میں کافور کی طرح اڑ گئی، سر جدو ناتھ سرکار نے لکھا ہے کہ مہاراسٹر میں کوئی گھر ایسا نہ تھا جس میں صف ماتم نہ بچھ گئی ہو، لیڈروں کی پوری نسل ایک ہی معرکہ میں غائب ہو گئی۔"[2]

شاہ صاحبؒ کے نقشہ کے مطابق احمد شاہ ابدالی نے وقت کا یہ ضروری کام انجام دے کر قندھار کی طرف عنان عزیمت موڑی، مولوی ذکاء اللہ لکھتے ہیں:۔

"بعد اس فتح کے احمد شاہ پانی پت سے نواح دہلی میں آیا اور چند روز متوقف رہا، ہندوستان کا بادشاہ شاہزادہ عالی گوہر یعنی شاہ عالم کو مقرر کیا، اور بادشاہ سے شجاع الدولہ کے وزیر اور نجیب الدولہ کے امیر الامراء ہونے کی سفارش کی شاہ عالم اس وقت

---

[1] تاریخ ہندوستان جلد نہم صـ۳۹ [2] شاہ ولی اللہ دہلوی کے سیاسی مکتوبات صـ۴۵

دہلی میں نہ تھا، اس لئے اس کے بیٹے جواں بخت کو بادشاہ کا نائب دہلی میں مقرر کیا اور نجیب الدولہ کو دہلی کا منتظم مقرر کیا اور شجاع الدولہ کو خلعت دے کر اودھ اور الہ آباد کے صوبوں پر بھیج دیا اور خود قندھار کو چلا گیا۔"[1]

پروفیسر خلیق احمد نظامی لکھتے ہیں کہ :۔

"جنگ پانی پت کے بعد احمد شاہ ابدالی نے شاہ عالم کو دہلی بلانے کی بے حد کوشش کی اور اپنا آدمی بھیجا جب نہ آیا تو احمد شاہ ابدالی نے شاہ عالم کی والدہ نواب زینت محل سے خط لکھوایا احمد شاہ نے شاہ عالم کو بلانے کی کوشش اس لئے کی تھی کہ وہ انگریزوں کے اثر سے نکل آئے اور دہلی آ کر احمد شاہ کی موجودگی میں اپنی طاقت کا استحکام کرے۔"[2]

خلیق صاحب لکھتے ہیں کہ :۔

"مرہٹوں، جاٹوں، سکھوں کسی تحریک میں اتنی وسعت اور ہمہ گیری نہ تھی کہ وہ ہندوستان کی مرکزیت و وحدت کو برقرار رکھ سکنے کی تدبیر سوچتی، شاہ صاحب اپنے مجوزہ نظام میں اکبر، جہانگیر، شاہجہاں اور اورنگ زیب کے زمانہ کی مرکزیت اور سلطنت ہند کے اقتدار اعلیٰ کو بحال دیکھنا چاہتے تھے لیکن اس طرح سے کہ مطلق العنان بادشاہوں کے بجائے انصاف کی حکومت ہو۔"[3]

اگر سلطنت میں تھوڑی سی بھی جان ہوتی تو وہ جنگ پانی پت کے نتائج سے فائدہ اٹھا کر اپنے اقتدار کو ہندوستان میں پھر کچھ صدیوں کے لئے قائم کر سکتی تھی لیکن حقیقت یہ ہے کہ مغلیہ سلطنت اس وقت بے روح جسم کی مانند تھی، جنگ پانی پت کا اصلی فائدہ فاتحین جنگ پلاسی نے اٹھایا۔"[4]

---

[1] تاریخ ہندوستان ج ۹ ص ۳۰۹-۳۱۰ [2] سیاسی مکتوبات ص ۴۵-۴۶ [3] ایضاً ص ۴۷ [4] ایضاً ص ۴۵

شاہ عالم نے اپنی پست ہمتی اور کوتاہ نظری سے یہ زرّیں موقع کھو دیا اور ساری کوششوں اور خود اپنی والدہ زینت محل کے مشفقانہ خط کے باوجود پورے دسؔ برس کے بعد ۱۷۷۱ء کے آخر میں ۲۵ دسمبر ۱۷۷۱ء کو قلعہ میں داخل ہوا اس کے بعد اس کے اور اس کے جانشینوں کے ساتھ جو کچھ پیش آیا وہ تاریخ میں تفصیل کے ساتھ درج ہے، اس کا نقطۂ عروج (CLIMAX) ۱۸۵۷ء کا انقلاب سلطنت بلکہ انتزاعِ سلطنت ہے (اگرچہ سلطنت برائے نام تھی) جو انگریزوں کے ہاتھ پیش آیا، جنھوں نے اپنی دانشمندی اور سیاسی ذہانت سے ہندوستان پر تسلّط کا کوئی موقع ہاتھ سے جانے نہیں دیا۔

شاہ صاحب کے بعد ان کے صحیح جانشین اور علم و بصیرت اور غیرت و حمیت دینی کے وارث ان کے فرزند ارجمند سراج الہند حضرت شاہ عبدالعزیزؒ نے اپنے والد نامدار کے شروع کئے ہوئے کام کو نہ صرف جاری رکھا بلکہ اس کی توسیع و تکمیل کی کوشش کی اور سیاسی حالات کی تبدیلی کے ساتھ اپنی توجہ اس وقت کے سیاسی میدان کے اصل حریف اور حقیقی طاقت (انگریزی اقتدار) کی طرف موڑ دی جس نے اب "خطرہ" سے بڑھ کر (جس کے دیکھنے کے لئے سیاسی بصیرت درکار ہوتی ہے) "واقعہ" کی شکل اختیار کرلی تھی جس کے دیکھنے کے لئے بصارت بھی کافی ہوتی ہے۔[1]

شاہ عبدالعزیزؒ کے بعد انھیں کے دانش گاہ کے دو تربیت یافتہ صاحبِ عزیمت داعی و مصلح حضرت سید احمد شہیدؒ اور شاہ اسماعیل شہیدؒ نے حضرت شاہ صاحبؒ کے سیاسی نقشہ میں (جو انھوں نے نظری طور پر "حجۃ اللہ البالغہ" اور "ازالۃ الخفا" کے صفحات اور تفہیمات میں پیش کیا تھا) رنگ بھرنے کی کوشش کی اور اس کو خلافت علیٰ منہاج النبوۃ کی اساس پر قائم کرنے کے لئے اپنی جان کی بازی لگا دی، انھوں نے حضرت شاہ ولی اللہ صاحب کی

---

[1] اس اجمال کی تفصیل باب یازدہم میں حضرت شاہ عبدالعزیزؒ کے سلسلہ میں آئیگی۔

تعلیمات اوران کی دی ہوئی روشنی سے کتنا فائدہ اٹھایا ان کے عزائم کتنے بلند ان کی نگاہ کتنی دور بین، ان کا قلب کتنا وسیع اور فراخ تھا، وہ پنجاب کے مسلمانوں کو سکھوں کی فوجی حکومت کے استیصال و استحصال کی اسی طرح کی فوری مصیبت سے بچانے کے بعد (جس طرح شاہ ولی اللہ صاحب نے مرہٹوں اور جاٹوں کے روزمرہ کے قتل و غارت گری سے اپنے وقت کے ماحول و معاشرہ کو بچانے کی کوشش کی تھی) اور انگریزوں کو جن کو وہ "بیگانگان بعید الوطن و تاجران متاع فروش" کے الفاظ سے یاد کرتے ہیں، نکالنے کے بعد ہندوستان کو وہ کس طرح آزاد کرانا اور اسلام کے عدل و مساوات کے اصول پر اس کا نظم و نسق قائم کرنا چاہتے تھے، اس کا اندازہ ان کے مکاتیب سے ہوگا جو انھوں نے سلاطین وقت، امراء نامدار، صاحب حمیت مسلمانوں اور ہوشمند والیان ریاست کو لکھے ہیں[1]:-

اس طرح اس سلسلے کے اہل دعوت و عزیمت کو یہ کہنے کا حق ہے کہ ؎

آغشتہ ایم ہر سرِ خارے بخونِ دل
قانونِ باغبانیٔ صحرا نوشتہ ایم

[1] تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو "سیرت سید احمد شہید" جلد اول کا سولھواں باب جہاد اور اس کے مقاصد و اسباب ص ۳۸۵-۳۹۴

بابِ دہم

امت کے مختلف طبقات کا احتساب

اور

ان کو دعوتِ اصلاح و انقلاب

شاہ صاحب کا امتیاز

عام طور پر جن علمائے کبار کا ذوق علمی، تصنیفی اور تحقیقی ہوتا ہے، اور ان کو ذکاوت، باریک بینی اور دقیقہ رسی سے حصۂ وافر عطا ہوتا ہے، وہ عام طور پر مطالعۂ کتب، علمی مباحث پر تحقیق و تدقیق یا تدریس و تصنیف کے مشغلہ میں ہمہ تن منہمک و مستغرق رہتے ہیں، اور معاشرہ کے مختلف طبقات اور عامۃ المسلمین کی کمزوریوں اور بیماریوں سے یا تو بے خبر ہوتے ہیں، یا ان کے لئے اس عوامی سطح تک اترنا اور اس علمی نظری بلندی سے (جس میں دنیا کی ہر لذّت و حلاوت سے بڑھ کر لذّت و حلاوت ہوتی ہے) "نزول" دشوار ہوتا ہے۔

علمائے سلف میں اس بارے میں دو شخصیتوں کا واضح طریقہ پر استثنا کیا جا سکتا ہے، ایک حجۃ الاسلام امام غزالیؒ (متوفی ۵۰۵ھ) کا، جنھوں نے اپنی شہرۂ آفاق و زندۂ جاوید کتاب احیاء علوم الدین میں اپنے زمانہ کے مسلم معاشرہ اور ملت اسلامیہ کے مختلف طبقات کی بیماریوں اور کمزوریوں کی اس طرح نشاندہی کی ہے کہ صاف معلوم ہوتا ہے کہ وہ

اپنے زمانہ کی عوامی زندگی اور معاشرہ کے مختلف طبقات سے، علماء کے حلقہائے درس اور مشائخ کی مجالسِ ذکر وفکر سے لے کر خلفاء وسلاطین کے درباروں، امراء کے ایوانوں اور رؤسا کے عشرت خانوں تک، اور ان محل سراؤں سے لے کر اہلِ حرفہ وتاجروں کی دوکانوں اور بازاروں کے پرشور ہنگامہ خیز ماحول تک سے واقف ہیں، اور جانتے ہیں کہ نفس وشیطان نے کس کس طرح سے علماء ورؤسا کے مختلف طبقوں اور عوام وخواص کے مختلف حلقوں کو فریب دے رکھا ہے، دینی مفاہیم وحقائق کس طرح تبدیل ہوگئے ہیں، اور وہ مقصدِ اصلی (سعادتِ اخروی اور رضائے الٰہی) سے کس طرح غافل ہیں۔[1]

یہی حال (اجمال وتفصیل اور طرز واسلوب کے فرق کے ساتھ) علّامہ ابن جوزی (متوفی ۵۹۷ھ) کا اپنی مشہور تصنیف تلبیس ابلیس میں ہے، اس کتاب میں انھوں نے اپنے زمانہ کی پوری مسلمان سوسائٹی کا جائزہ لیا ہے، اور مسلمانوں کے ہر طبقہ اور جماعت کو سنت وشریعت کے معیار سے جانچا ہے، اور اس کی کمزوریوں بے اعتدالیوں اور غلطیوں کی نشاندہی کی ہے، اور اس بارے میں کسی طبقہ کی رعایت نہیں کی، علماء ومحدثین فقہاء وواعظین، ادباء وشعراء، سلاطین وحکام، عبّاد وزہّاد، صوفیائے اہل دین اور عوام سب کا بے لاگ احتساب کیا، اور ان کے مغالطوں کا پردہ چاک کیا ہے۔[2]

لیکن (جہاں تک تلبیس ابلیس کا تعلق ہے) یہ تنقید واحتساب زیادہ تر "سلبی" اور منفی انداز کا ہے، اس کے ساتھ اصلاحِ حال کی مفصل وپرزور "مثبت" دعوت نہیں ہے، یا اگر ہے تو مقدار وتاثیر میں اس کے درجہ کی نہیں ہے، غالباً اس کی وجہ یہ ہے کہ اس کے

---

[1] تفصیل اور مثالوں کے لئے ملاحظہ ہو احیاء علوم الدین ج ۳ یا تاریخ دعوت وعزیمت ج ۱ ص ۱۴۶ تا ۱۶۶

[2] تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو تلبیس ابلیس از ص ۱۱۹ تا ۳۹۴ یا تاریخ دعوت وعزیمت ج ۱ ص ۲۳۴ تا ۲۳۹

موضوع کے دائرہ میں اس سے زیادہ گنجائش نہیں تھی۔

مختلف طبقات امت سے خصوصی خطاب

ان دو شہرۂ آفاق علماء و داعیان دین و معلّمین اخلاق کے بعد (جو اپنے اصلاحی وتربیتی مقام کے ساتھ عظیم المرتبت عالم و مصنف بھی تھے) ہمیں (اپنے محدود مطالعہ میں) اس سلسلہ میں شاہ ولی اللہ صاحب کا کارنامہ سب سے زیادہ روشن اور تابناک نظر آتا ہے، انھوں نے سلاطین اسلام، امراء و ارکان دولت، فوجی سپاہیوں، اہل صنعت و حرفت مشائخ کی اولاد (پیرزادوں) غلط کار علماء، متقشّف اور خوردہ گیر واعظوں اور تارک الدنیا وعزلت گزیں زاہدوں کو علیحدہ علیحدہ خطاب کیا ہے، ان کی دکھتی ہوئی رگوں پر انگلی رکھی ہے، اور ان کی اصلی بیماریوں اور خود فریبیوں کی نشاندہی کی ہے، ان سب کے علاوہ امت اسلامیہ سے عمومی اور جامع خطاب فرمایا ہے، اور ان کے امراض کی تشخیص کی ہے، اور ان کا علاج بتایا ہے، ان خصوصی خطابات میں شاہ صاحب کے دل کا درد، اسلامی حمیت کا جوش، دعوت کا جذبہ اور زورِ قلم اس نقطۂ عروج پر ہے، جس کی مثال سابق الذکر مصلحین و ناقدین اور ان کی مذکورہ بالا کتابوں میں ملنی مشکل ہے، شاہ صاحب کی مشہور کتاب "التفہیمات الالٰہیۃ"[1] (جلد ۱-۲) سے یہاں پر مختلف اقتباسات پیش کئے جاتے ہیں، جن میں آپ نے اپنے زمانہ کے مختلف ممتاز اور صاحب اثر طبقوں کے سربراہوں سے خطاب کیا ہے[2]، ان خصوصی خطابات سے شاہ صاحب کی ژرف نگاہی،

---

[1] یہ کتاب المجلس العلمی ڈابھیل سورت کی طرف سے ۱۳۵۵ھ ۱۹۳۶ء میں مدینہ پریس بجنور سے دو جلدوں میں شائع ہوئی

[2] شاہ صاحب کی اصل عبارت عربی میں ہے، اس کا ترجمہ خود پیش کرنے کے بجائے ہم نے فاضل گرامی (باقی صفحہ ۳۲۶ پر)

حکمت دعوت، اخلاقی جرأت اور واقفیتِ عامّہ وخاصّہ کا ایسا اظہار ہوتا ہے، جس کو دیکھ کر تاریخ کا ایک ایسا طالب علم جو اس عہد و معاشرہ کی زبوں حالی، اہل علم و اہل قلم کی مصلحت اندیشی اور داعیوں و مصلحوں کی اصلاح حال سے مایوسی کی کیفیت سے واقف ہے، انگشت بدنداں رہ جاتا ہے، اور بے اختیار کہہ اٹھتا ہے۔ ع

ایسی چنگاری بھی یارب اپنے خاکستر میں تھی؟

سلاطین اسلام سے خطاب

"اے بادشاہو! ملأ اعلیٰ کی مرضی اس زمانہ میں اس امر پر مستقر ہو چکی ہے کہ تم تلواریں کھینچ لو اور اس وقت تک نیام میں داخل نہ کرو جب تک مسلم مشرک سے بالکلیہ جدا نہ ہو جائے، اور اہل کفر و فسق کے سرکش لیڈر کمزوروں کے گروہ میں جاکر شامل نہ ہو جائیں، اور یہ کہ ان کے قابو میں پھر کوئی ایسی بات نہ رہ جائے جس کی بدولت وہ آئندہ سر اٹھا سکیں" وَقَاتِلُوْهُمْ حَتّٰى لَا تَكُوْنَ فِتْنَةٌ وَّيَكُوْنَ الدِّيْنُ كُلُّهٗ لِلّٰهِ" (یعنی ان سے جنگ کرتے رہو تا آنکہ فتنہ فرو ہو جائے، اور "دین" صرف اللہ کے لئے مخصوص ہو جائے) پھر جب کفر و اسلام کے درمیان ایسا کھلا نمایاں امتیاز پیدا ہو جائے، تب تمہیں چاہئے کہ ہر تین[۳] دن

(باقی ص۳۲۵ کا) مولانا سید مناظر احسن گیلانی کے اس مضمون کے اقتباسات پیش کرنے پر اکتفا کی ہے جو انھوں نے الفرقان کے شاہ ولی اللہ نمبر کے لئے "آغوشِ موج کا ایک دُرِّ تابندہ" کے عنوان سے لکھا تھا، اس مضمون میں تفہیمات کے ان ٹکڑوں کو اردو میں ترجمہ کرکے پیش کیا ہے، اور ان پر مختلف عنوانات لگا دیئے ہیں، اس طرح شاہ صاحب کے مبارک تذکرے کے ساتھ ایک مخلص و متبحر عالم کی یاد بھی تازہ اور زندہ رہے گی۔ رحمہ اللہ تعالیٰ۔

یا چار[۴] دن کے سفر کی منزلوں پر اپنا ایک ایک حاکم مقرر کرو، ایسا حاکم جو عدل وانصاف کا مجسّمہ ہو، قوی ہو، جو ظالم سے مظلوم کا حق وصول کر سکتا ہو، اور خدا کے حدود کو قائم کر سکتا ہو، اور اس میں سرگرم ہو کر پھر لوگوں میں بغاوت وسرکشی کے جذبات پیدا نہ ہوں، نہ وہ جنگ پر آمادہ ہوں، اور نہ دین سے مرتد ہونے کی کسی میں جرأت باقی رہے، نہ کسی گناہ کبیرہ کے ارتکاب کی کسی کو مجال ہو، اسلام کا کھلے بندوں اعلان ہو، اور اس کے شعائر کا علانیہ اظہار کیا جائے، ہر شخص اپنے متعلقہ فرائض کو صحیح طور پر ادا کرے، چاہیئے کہ ہر شہر کا حاکم اپنے پاس اتنی قوت رکھے جس کے ذریعہ سے اپنی متعلقہ آبادی کی اصلاح کر سکتا ہو۔

مگر اسی کے ساتھ اس کو اتنی قوت فراہم کرنے کا موقع نہ دیا جائے جس کے بل بوتے پر وہ خود ان سے نفع گیر ہونے کی تدبیریں سوچنے لگے، اور حکومت کے مقابلہ پر آمادہ ہو جائے۔

چاہیئے کہ اپنے متعلقہ مقبوضات کے بڑے علاقہ اور اقلیم پر ایسے امیر مقرر کئے جائیں جو جنگی مہمات کا بھی اختیار رکھتے ہوں، ایسے امیر کے ساتھ بارہ ہزار کی جمعیت رکھی جائے، مگر جمعیت ایسے آدمیوں سے بھرتی ہو، جن کے دل میں جہاد کا ولولہ ہو، اور خدا کی راہ میں کسی کی ملامت سے خوف زدہ نہ ہوں، ہر سرکش اور متمرّد سے جنگ اور مقابلہ کی ان میں صلاحیت ہو ——— اے بادشاہو! جب تم یہ کر لو گے تو اس کے بعد ملأ اعلیٰ کی رضامندی یہ چاہے گی کہ تم لوگوں کی منزلی اور عائلی زندگی کی طرف توجہ کرو، ان کے باہمی معاملات کو سلجھاؤ، اور ایسا کر دو کہ پھر کوئی معاملہ ایسا نہ ہونے پائے، جو شرعی قوانین کے مطابق نہ ہو، اسی کے بعد

لوگ امن و امان کی صحیح مسرت سے فائز المرام ہو سکتے ہیں۔[1]

امراء و ارکان دولت سے خطاب

اے امیرو! دیکھو کیا تم خدا سے نہیں ڈرتے، دنیا کی فانی لذّتوں میں تم ڈوبے جا رہے ہو، اور جن لوگوں کی نگرانی تمہارے سپرد ہوئی ہے، ان کو تم نے چھوڑ دیا ہے تاکہ ان میں بعض بعض کو کھاتے اور نگلتے رہیں، کیا تم علانیہ شرابیں نہیں پیتے؟ اور پھر اپنے اس فعل کو تم بُرا بھی نہیں سمجھتے، تم نہیں دیکھ رہے ہو کہ بہت سے لوگوں نے اونچے اونچے محل اس لئے کھڑے کئے ہیں کہ ان میں زناکاری کی جائے، اور شرابیں ڈھالی جائیں، جوا کھیلا جائے لیکن تم اس میں دخل نہیں دیتے، اور اس حال کو نہیں بدلتے، کیا حال ہے ان بڑے بڑے شہروں کا جن میں چھ سو سال سے کسی پر حد شرعی نہیں جاری ہوئی، جب کوئی کمزور مل جاتا ہے تو اسے پکڑ لیتے ہو، اور جب قوی ہوتا ہے تو چھوڑ دیتے ہو، تمہاری ساری ذہنی قوتیں اس پر صرف ہو رہی ہیں کہ لذیذ کھانوں کی قسمیں پکواتے رہو، اور نرم گداز جسم والی عورتوں سے لطف اٹھاتے رہو، اچھے کپڑوں اور اونچے مکانات کے سوا تمہاری توجہ اور کسی طرف منعطف نہیں ہوتی، کیا تم نے اپنے سر کبھی اللہ کے سامنے جھکائے؟ خدا کا نام تمہارے پاس صرف اس لئے رہ گیا ہے کہ اپنے تذکروں اور قصے کہانیوں میں اس نام کو استعمال کرو، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اللہ کے لفظ سے تمہاری مراد زمانہ کا انقلاب ہے، کیونکہ تم اکثر بولتے ہو خدا قادر ہے کہ ایسا کر دے، یعنی زمانہ کے انقلاب کی یہ تعبیر ہے۔

---

[1] تفہیمات الٰہیہ جلد اول از ص ۲۱۵ تا ۲۱۶

فوجی سپاہیوں کو خطاب

"اے فوجیو! اور عسکریو! تمہیں خدا نے جہاد کے لئے پیدا فرمایا تھا مقصد یہ تھا کہ اللہ کی بات اونچی ہوگی، اور خدا کا کلمہ بلند ہوگا، اور شرک اور اس کی جڑوں کو تم دنیا سے نکال پھینکو گے، لیکن جس کام کے لئے تم پیدا کئے گئے تھے، اسے تم چھوڑ بیٹھے اب جو تم گھوڑے پالتے ہو، ہتھیار جمع کرتے ہو، اس کا مقصد صرف یہ رہ گیا ہے کہ محض اس سے اپنی دولت میں اضافہ کرو، اس سلسلہ میں جہاد کی نیت سے تم بالکل خالی الذہن رہتے ہو ــــــ تم شرابیں پیتے ہو، بھانگ کے پیالے چڑھاتے ہو، ڈاڑھیاں منڈواتے ہو، اور مونچھیں بڑھاتے ہو، عام لوگوں پر زیادتیاں اور ظلم کرتے ہو، حالانکہ جو کچھ ان کا لے کر کھاتے ہو، اس کی قیمت ان تک نہیں پہونچتی ــ ــــ خدا کی قسم تم عنقریب اللہ کی طرف واپس جاؤ گے، پھر تمہیں وہ بتائے گا جو کچھ تم کیا کرتے تھے، تمہارے ساتھ خدا کی یہ مرضی ہے کہ اچھے پارسا صالحین غازیوں کا لباس اور ان کی وضع اختیار کرو، چاہیئے کہ اپنی ڈاڑھیاں بڑھاؤ، مونچھیں کٹواؤ، پنج وقتہ نماز ادا کیا کرو اور عام لوگوں کے مال سے بچتے رہو، جنگ اور مقابلہ کے میدان میں ڈٹے رہو، تمہیں چاہیئے کہ سفر اور جنگ وغیرہ کے موقع پر نماز میں جو آسانیاں اور رخصتیں رکھی گئی ہیں، انھیں سیکھ لو، مثلاً قصر کرنا، جمع کرنا، سنتوں کے ترک کرنے کی اجازت ہے، اس سے واقف ہونا، تیمم کی اجازت سے مطلع ہونا، پھر اس کے بعد نماز کو خوب زور سے پکڑ لو، اور اپنی نیتوں کو درست کر لو، اللہ تعالےٰ تمہارے جاہ و منصب میں برکت دے گا، اور دشمنوں پر تمہیں فتح عطا فرمائے گا"[1]

---

[1] تفہیمات ۲، ص ۲۱۶

اہل صنعت و حرفت سے خطاب

"ارباب پیشہ! دیکھو! امانت کا جذبہ تم سے مفقود ہوگیا ہے تم اپنے رب کی عبادت سے بالکل خالی الذہن ہو چکے ہو، اور تم اپنے فرضی بنائے ہوئے معبودوں پر قربانیاں چڑھاتے ہو، تم مدار[1] اور سالار[2] کا حج کرتے ہو تم میں بعض لوگوں نے فال بازی اور ٹوٹکا اور گنڈے وغیرہ کا پیشہ اختیار کر رکھا ہے، یہی ان کی دولت ہے اور یہی ان کا ہنر ہے، یہ لوگ خاص قسم کا لباس اور جامہ اختیار کرتے ہیں، خاص طرح سے کھاتے کماتے ہیں ان میں جن کی آمدنی کم ہوتی ہے، وہ اپنی عورتوں اور اپنے بچوں کے حقوق کی پروا نہیں کرتے، تم میں بعض صرف شراب خواری کو پیشہ بنائے ہوئے ہیں، اور تم ہی میں کچھ لوگ عورتوں کو کرایہ پر چلا کر پیٹ پالتے ہیں، یہ کیسا بدبخت آدمی ہے، اپنی دنیا اور آخرت دونوں کو برباد کر رہا ہے، حالانکہ حق تعالیٰ نے تمہارے لئے مختلف قسم کے پیشے اور کمانے کھانے کے دروازے کھول رکھے ہیں، جو تمہاری اور تمہارے متعلقین کی ضرورتوں کے لئے کافی ہو سکتے ہیں، بشرطیکہ تم اعتدال کی راہ اپنے خرچ میں اختیار کرو، اور محض اتنی روزی پر قناعت کرنے کے لئے آمادہ ہو جاؤ جو تمہیں بآسانی اخروی زندگی کے نتائج تک پہونچا دے، لیکن تم نے خدا کی ناشکری کی، اور غلط راہ حصول رزق کی اختیار کی، کیا تم جہنم کے عذاب سے نہیں ڈرتے جو بڑا برا ٹھکانا ہے۔

---

[1] شاہ بدیع الدین مدار مکنپوری مراد ہیں جو شاہ مدار کے نام سے مشہور ہیں۔ [2] سید سالار مسعود غازی مدفون بہرائچ جن کے جھنڈے نکالے جاتے ہیں، اور لوگ دور دور سے آکر ان کے عرس میں شریک ہوتے ہیں۔

دیکھو! اپنی صبح وشام کو تم خدا کی یاد میں بسر کیا کرو، اور دن کے بڑے حصہ کو اپنے پیشہ میں صرف کرو اور رات کو اپنی عورتوں کے ساتھ گذارو، اپنے خرچ کو اپنی آمدنی سے ہمیشہ کم رکھا کرو، پھر جو بچ جایا کرے اس سے مسافروں کی، مسکینوں کی مدد کیا کرو، اور کچھ اپنے اتفاقی مصائب اور ضرورتوں کے لئے پسماندہ بھی کیا کرو۔ تم نے اگر اس راہ کو اختیار نہ کیا تو تم غلط راہ پر جا رہے ہو، اور تمہاری تدبیر درست نہیں ہے[1]۔"

پھر اسی طرح مشائخ کی اولاد، اس زمانہ کے طلبۂ علم اور واعظوں زاہدوں کو بھی آپ نے خصوصیت کے ساتھ پکارا ہے، مثلاً مشائخ کی اولاد کو نصیحت کرتے ہوئے فرماتے ہیں۔

مشائخ کی اولاد یعنی پیرزادوں سے خطاب

"اے وہ لوگو! جو اپنے آبا و اجداد کے رسوم کو بغیر کسی حق کے پکڑے ہوئے ہو، یعنی گذشتہ بزرگان دین کی اولاد میں ہو، میرا آپ سے سوال ہے کہ آپ کو کیا ہو گیا ہے کہ ٹکڑیوں ٹکڑیوں، ٹولیوں ٹولیوں میں آپ بنٹ گئے ہیں، ہر ایک اپنے اپنے راگ اپنی اپنی منڈلی میں الاپ رہا ہے، اور جس طریقہ کو اللہ نے اپنے رسول محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ سے نازل فرمایا تھا، اور محض اپنے لطف و کرم سے جس راہ کی طرف راہنمائی فرمائی تھی، اسے چھوڑ کر ہر ایک تم میں ایک مستقل پیشوا بنا ہوا ہے، اور لوگوں کو اسی کی طرف بلا رہا ہے، اپنی جگہ اپنے کو راہ یافتہ اور راہ نما ٹھہرائے ہوئے ہے، حالانکہ دراصل وہ خود گم کردۂ راہ

---

[1] ایضاً ص۲۱۷

اور دوسروں کو بھٹکانے والا ہے، ہم ایسے لوگوں کو قطعاً پسند نہیں کرتے جو محض لوگوں کو اس لئے مرید کرتے ہیں تاکہ ان سے ٹکے وصول کریں، ایک علم شریف کو سیکھ کر دنیا بٹورتے ہیں، کیونکہ جب تک اہل دین کی شکل وشباہت اور طرز وانداز وہ نہ اختیار کریں گے، دنیا حاصل نہیں ہو سکتی۔

اور نہ میں ان لوگوں سے راضی ہوں جو سوائے اللہ ورسول کے خود اپنی طرف لوگوں کو بلاتے ہیں، اور اپنی مرضی کی پابندی کا لوگوں کو حکم دیتے ہیں، یہ لوگ بٹ مار اور راہ گیر ہیں، ان کا شمار دجالوں کذابوں فتانوں اور ان لوگوں میں ہے جو خود فتنہ اور آزمائش کے شکار ہیں۔

خبردار! خبردار! ہرگز اس کی پیروی نہ کرنا، جو اللہ کی کتاب اور رسول کی سنت کی طرف دعوت نہ دیتا ہو، اور اپنی طرف بلاتا ہو، اور چاہیئے کہ زبانی جمع خرچ صوفیائے کرام کے اشاروں کے متعلق عام مجلسوں میں نہ کیا جائے کیونکہ مقصد تو (تصوف) سے صرف یہ ہے کہ آدمی کو احسان کا مقام حاصل ہو جائے، لوگو، دیکھو! کیا تمہارے لئے اللہ تبارک وتعالیٰ کے اس ارشاد میں کوئی عبرت نہیں ہے۔

وَاَنَّ هٰذَا صِرَاطِيْ مُسْتَقِيْمًا	یہ میری راہ ہے سیدھی، تو اس پر چل پڑو
فَاتَّبِعُوْهُ وَلَا تَتَّبِعُوا السُّبُلَ فَتَفَرَّقَ	اور مختلف راہوں کے پیچھے نہ پڑو، وہ
بِكُمْ عَنْ سَبِيْلِهٖ ۔ (الانعام ۔۱۵۳)	تمہیں اللہ کی راہ سے بچھڑا دیں گے۔[1]

پھر اس زمانہ کے طلبۂ علم کو خطاب کر کے فرماتے ہیں:۔

---

[1] ایضاً ص ۲۱۴

غلط کار علماء سے خطاب

"ارے بدعقلو! جنھوں نے اپنا نام "علماء" رکھ چھوڑا ہے، تم یونانیوں کے علوم میں ڈوبے ہوئے ہو، اور صرف ونحو و معانی میں غرق ہو اور سمجھتے ہو کہ یہی علم ہے، یاد رکھو! علم یا تو قرآن کی کسی آیت محکم کا نام ہے، یا سنتِ ثابتہ قائمہ کا۔

چاہیئے کہ قرآن سیکھو، پہلے اس کے غریب لغات کو حل کرو، پھر سبب نزول کا پتہ چلاؤ، اور اس کے مشکلات کو حل کرو، اسی طرح جو حدیث رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی صحیح ثابت ہو چکی ہے اسے محفوظ کرو، یعنی رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نماز کس طرح پڑھتے تھے، وضوء کرنے کا حضور صلے اللہ علیہ وسلم کا کیا طریقہ تھا، اپنی ضرورت کے لئے کس طرح جاتے تھے، اور حج کیونکر ادا فرماتے تھے، جہاد کا آپ کے کیا قاعدہ تھا، گفتگو کا کیا انداز تھا، اپنی زبان کی حفاظت کس طرح فرماتے تھے، حضور صلے اللہ علیہ وسلم کے اخلاق کیا تھے، چاہیئے کہ حضور صلے اللہ علیہ وسلم کی پوری روش کی پیروی کرو، اور آپ کی سنت پر عمل کرو، مگر اس میں بھی اس کا خیال رہے کہ جو سنت ہے اسے سنت ہی سمجھو، نہ کہ اسے فرض کا درجہ عطا کرو، اسی طرح چاہیئے کہ جو تم پر فرائض ہیں، انھیں سیکھو، مثلاً وضو کے ارکان کیا ہیں، نماز کے ارکان کیا ہیں، زکاۃ کا نصاب کیا ہے، قدر واجب کیا ہے، میت کے حصوں کی مقدار کیا ہے، پھر حضور صلے اللہ علیہ وسلم کی عام سیرت کا مطالعہ کرو، جس سے آخرت کی رغبت پیدا ہو، صحابہ اور تابعین کے حالات پڑھو، اور یہ چیزیں فرائض سے فاضل اور زیادہ ہیں، لیکن ان دنوں تم جن چیزوں میں الجھے ہوئے ہو اور

جس میں سر کھپایا ہے ہو، اس کو آخرت کے علم سے کیا واسطہ، یہ دنیا کے علوم ہیں۔[1]

پھر ان ہی طلباء کو فرماتے ہیں:۔

"جن علوم کی حیثیت صرف ذرائع اور آلات کی ہے (مثلاً صَرف و نحو وغیرہ) تو ان کی حیثیت آلہ اور ذریعہ ہی کی رہنے دو، نہ کہ خود انہی کو مستقل علم بنا بیٹھو، علم کا پڑھنا تو اس لئے واجب ہے کہ اس کو سیکھ کر مسلمانوں کی بستیوں میں اسلامی شعائر کو رواج دو، لیکن تم نے دینی شعار اور اس کے احکام کو تو پھیلایا نہیں اور لوگوں کو زائد از ضرورت باتوں کا مشورہ دے رہے ہو۔

تم نے اپنے حالات سے عام مسلمانوں کو یہ باور کرا دیا ہے کہ علماء کی بڑی کثرت ہو چکی ہے، حالانکہ ابھی کتنے بڑے بڑے علاقے ہیں، جو علماء سے خالی ہیں، اور جہاں علماء پائے بھی جاتے ہیں، وہاں بھی دینی شعاروں کو غلبہ حاصل نہیں ہے۔"[2]

پھر آپ نے ان لوگوں کو بھی مخاطب کیا ہے جنھوں نے اپنے وسوسوں کا نام دین رکھ چھوڑا ہے، اور جو ان کے وسواسی معیار پر پورا نہیں اترتا، گویا دین سے وہ خارج ہے، اس گروہ میں زیادہ تر زہّاد، عبّاد اور وعّاظ ہی اس زمانہ میں مبتلا تھے، اس لئے عنوان کا آغاز انہیں سے کیا گیا ہے، فرماتے ہیں:۔

دین میں تنگی پیدا کرنے والے واعظوں اور کنج نشیں زاہدوں سے خطاب

"دین میں خشکی اور سختی کی راہ اختیار کرنے والوں سے میں پوچھتا ہوں، اور

---

[1] ایضاً ص ۲۱۴ [2] ایضاً ص ۲۱۵

واعظوں اور عابدوں اور ان کنج نشینوں سے سوال ہے جو خانقاہوں میں بیٹھے ہیں کہ بہ جبر اپنے اوپر دین کو عائد کرنے والو! تمہارا کیا حال ہے، ہر بری بھلی بات، ہر رطب و یابس پر تمہارا ایمان ہے، لوگوں کو تم جعلی اور گڑھی ہوئی حدیثوں کا وعظ سناتے ہو، اللہ کی مخلوق پر تم نے زندگی تنگ کر چھوڑی ہے، حالانکہ تم تو (اے امتِ محمدیہ) اس لئے پیدا ہوئے تھے کہ لوگوں کو آسانیاں بہم پہونچاؤگے نہ کہ ان کو دشواریوں میں مبتلا کر دوگے، تم ایسے لوگوں کی باتیں دلیل میں پیش کرتے ہو، جو بیچارے مغلوب الحال تھے، اور عشق و محبت الٰہی میں عقل و حواس کھو بیٹھے تھے، حالانکہ اہل عشق کی باتیں وہیں کی وہیں لپیٹ کر رکھ دی جاتی ہیں، نہ کہ ان کا چرچا کیا جاتا ہے تم نے وسواس کو اپنے لئے گوارا کر لیا ہے، اور اس کا نام احتیاط رکھ چھوڑا ہے، حالانکہ تمہیں صرف یہ چاہئے تھا کہ اعتقاداً وعملاً احسان کے مقام کے لئے جن امور کی ضرورت ہے بس اس کو سیکھ لیتے، لیکن جو بیچارے اپنے اپنے خاص حال میں مغلوب تھے، خواہ مخواہ ان کی باتوں کو احسانی خالص امور میں گڈمڈ کرنے کی حاجت نہ تھی، اور نہ اربابِ کشف کی چیزوں کو ان میں مخلوط کرنے کی ضرورت تھی، چاہئے کہ مقام احسان کی طرف لوگوں کو بلاؤ، پہلے اسے خود سیکھ لو، پھر دوسروں کو دعوت دو، کیا تم اتنا بھی نہیں سمجھتے کہ سب سے بڑی رحمت اور سب سے بڑا کرم اللہ کا وہ ہے جسے رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے پہونچایا ہے، وہی صرف ہدایت ہے، جو آپ کی ہدایت ہے، پھر تم کیا بتا سکتے ہو؟ کہ تم جن افعال کو کرتے ہو وہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم اور آپ کے صحابہ کرام رض کیا کرتے تھے![1]

---

[1] ایضاً ص۲۱۵

آخر میں ایک عام خطاب عام مسلمانوں کے نام ہے جس میں کسی خاص طبقہ کی تخصیص نہیں ہے، فرماتے ہیں :۔

عام امتِ مسلمہ سے جامع خطاب امراض کی تشخیص اور علاج کی تجویز

"میں مسلمانوں کی عام جماعت کی طرف اب مخاطب ہوں اور کہتا ہوں، اے آدم کے بچو! دیکھو تمہارے اخلاق سو چکے ہیں، تم پر بیجا حرص و آز کا ہوکھا سوار ہو گیا ہے، تم پر شیطان نے قابو پالیا ہے، عورتیں مردوں کے سر چڑھ گئیں ہیں، اور مرد عورتوں کے حقوق برباد کر رہے ہیں، حرام کو تم نے اپنے لئے خوشگوار بنالیا ہے، اور حلال تمہارے لئے بدمزہ ہو چکا ہے، پھر قسم ہے اللہ کی، اللہ نے ہرگز کسی کو اس کے بس سے زیادہ تکلیف نہیں دی ہے، چاہئے کہ تم اپنی شہوانی خواہشوں کو نکاح کے ذریعہ پوری کرو، خواہ تمہیں ایک سے زیادہ نکاح ہی کیوں نہ کرنا پڑے، اور اپنے مصارف وضع قطع میں تکلف سے کام نہ لیا کرو، اسی قدر خرچ کرو جس کی تم میں سکت ہو، یاد رکھو! ایک کا بوجھ دوسرا نہیں اٹھاتا، اور اپنے اوپر خواہ مخواہ تنگی سے کام نہ لو، اگر تم ایسا کروگے تو تمہارے نفوس بالآخر فسق کے حدود تک پہونچ جائیں گے، اللہ تعالیٰ اس کو پسند فرماتا ہے کہ اس کے بندے اس کی آسانیوں سے نفع اٹھائیں، جیسا کہ یہ بھی اسی کو پسند ہے کہ جو چاہیں وہ اعلیٰ مدارج پر احکام کی پابندی بھی کر سکتے ہیں، اپنے شکم کی خواہشوں کی تکمیل چاہئے کہ کھانوں سے کرو اور اتنا کمانے کی کوشش کرو جس سے تمہاری ضرورتیں پوری ہوں، دوسروں کے سینوں کے بوجھ بننے کی کوشش نہ کرو کہ ان سے مانگ مانگ کر کھایا کرو،

تم ان سے مانگو اور وہ نہ دیں، اسی طرح بیچارے بادشاہوں اور حکّام کے اوپر بھی بوجھ نہ بن جاؤ، تمہارے لئے یہی پسندیدہ ہے کہ تم خود کما کر کھایا کرو، اگر تم ایسا کروگے تو خدا تمہیں معاش کی بھی راہ سجھائے گا، جو تمہارے لئے کافی ہوگی۔

اے آدم کے بچو! جسے خدا نے ایک جائے سکونت دے رکھی ہو، جس میں وہ آرام کرے، اتنا پانی جس سے وہ سیراب ہو، اتنا کھانا جس سے بسر ہو جائے، اتنا کپڑا جس سے تن ڈھک جائے، ایسی بیوی جو اس کی شرمگاہ کی حفاظت کر سکتی ہو، اور اس کو رہن سہن کی جدوجہد میں مدد دے سکتی ہو، تو یاد رکھو کہ دنیا کامل طور سے اس شخص کو مل چکی ہے، چاہیئے کہ اس پر خدا کا شکر کرے۔

بہرحال کوئی نہ کوئی کمائی کی راہ آدمی ضرور اختیار کرے اور اسی کے ساتھ قناعت کو اپنا دستورِ زندگی بنائے، اور رہنے سہنے میں اعتدال کا جادہ اختیار کرے، اور اللہ کی یاد کے لئے جو فرصت ہم دست ہو اسے غنیمت شمار کرے، کم از کم تین وقتوں صبح شام اور پچھلی رات کے ذکر کا خاص طور پر خیال رکھے، حق تعالٰی کی یاد اس کی تسبیح و تہلیل اور قرآن کی تلاوت کے ذریعہ سے کیا کرے، اور رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی حدیث سنے اور ذکر کے حلقوں میں حاضر ہوا کرے۔

اے آدم کے بچو! تم نے ایسے بگڑے ہوئے رسوم اختیار کر لئے ہیں، جن سے دین کی اصلی صورت بگڑ گئی ہے، تم عاشوراء کے دن جھوٹی باتوں پر اکٹھے ہوتے ہو، اسی طرح شب برات میں کھیل کود کرتے ہو، اور مُردوں کے لئے کھانے پکا پکا کر کھلانے کو اچھا خیال کرتے ہو، اگر تم سچے ہو تو اس کی دلیل پیش کرو۔

اسی طرح اور بھی بری بری رسمیں تم میں جاری ہیں، جس نے تم پر تمہاری زندگی

تنگ کردی ہے، مثلاً تقریبات کی دعوتوں میں تم نے حد سے زیادہ تکلف برتنا شروع کر دیا ہے، اسی طرح ایک بڑی رسم یہ بھی ہے کہ کچھ بھی ہو جائے لیکن طلاق کو گویا تم نے ناجائز ٹھہرالیا ہے، یونہی بیوہ عورتوں کو نکاح سے روکے رہتے ہو، ان رسموں میں تم اپنی دولت ضائع کرتے ہو، وقت برباد کرتے ہو اور جو صحت بخش روش تھی، اسے چھوڑ بیٹھے ہو۔

تم نے اپنی نمازیں برباد کر رکھی ہیں، تم میں کچھ لوگ ہیں، جو دنیا کمانے میں اور اپنے دھندوں میں اتنے پھنس گئے ہیں کہ نماز کا انھیں وقت ہی نہیں ملتا، کچھ لوگ ہیں، جو قصہ کہانی سننے میں وقت گنواتے ہیں، خیر پھر بھی اگر ایسی مجلسیں لوگ ایسے مقامات پر قائم کیا کرتے جو مسجدوں سے قریب ہوں تو شاید ان کی نمازیں ضائع نہ ہوتیں، تم نے زکاۃ کو بھی چھوڑ دیا ہے، حالانکہ کوئی ایسا دولت مند نہیں ہے، جس کے اقربا و اعزہ میں حاجت مند لوگ نہیں ہوتے، اگر ان لوگوں کی وہ مدد کیا کریں اور ان کو کھلایا پلایا کریں اور زکاۃ کی نیت کر لیا کریں تو یہ بھی ان کے لئے کافی ہو سکتی ہے۔

تم میں بعضوں نے روزے چھوڑ رکھے ہیں، خصوصاً جو فوجی ملازم ہیں کہتے ہیں کہ وہ روزہ رکھنے پر قادر نہیں ہیں، یعنی جو محنت انھیں برداشت کرنی پڑتی ہے، اس کے ساتھ روزے نہیں رکھ سکتے، تم کو معلوم ہونا چاہئے کہ تم نے راہ غلط کر دی ہے، اور تم حکومت کے سینہ پر بوجھ بن گئے ہو، بادشاہ جب اپنے خزانہ میں اتنی گنجائش نہیں پاتا جس سے تمہاری تنخواہ ادا کرے، تب رعایا پر زندگی کو دشوار کرتا ہے، سپاہیو! یہ تمہاری کیسی بُری عادت ہے ـــ کچھ لوگ ایسے بھی ہیں

جو روزے رکھتے ہیں، لیکن سحری نہیں کرتے، اور رمضان میں ان سخت کاموں کو نہیں چھوڑتے، جن کی وجہ سے روزے ان پر گراں ہو جاتے ہیں۔"

آخر میں فرماتے ہیں:۔

"لأ اعلیٰ کی طرف سے اصلاحی مطالبات کا اس زمانہ میں جن جن امور سے متعلق تقاضا ہو رہا ہے، اس کا ایک طویل باب ہے، لیکن کھڑکی سے آدمی بڑی نیکیوں کو جھانک سکتا ہے، اور ڈھیر کے لئے اس کا نمونہ کافی ہے۔[1]"

اصلاح رسوم و تطہیر معاشرہ

شاہ صاحب نے ان خصوصی طبقات سے خصوصی خطاب پر ہی اکتفا نہیں کیا، بلکہ اس وقت کے مسلم معاشرہ میں صدیوں سے ہندوؤں کے درمیان رہنے، حدیث و سنت کی عدم اشاعت، علمائے دین کی غفلت و کوتاہی اور اسلامی حکومت کی فرض ناشناسی اور دینی احتساب کے فقدان کی وجہ سے جو ہندوانہ رسوم، بدعات اور غیر اسلامی شعائر رواج پا گئے تھے، اور مسلمان سختی سے ان کے پابند تھے، ان پر بھی شاہ صاحب نے نکیر فرمائی، اور ان عقائدِ فاسدہ، توہمات اور غیر مسلموں کی تقلید کی مذمت کی، عام طور پر وہ علماء، جن کا معقولات و علوم حکمت سے اشتغال تھا، ان عادات و رسوم کو معمولی سمجھ کر، یا اس بکھیڑے اور مخالفتِ عوام سے بچنے کے لئے ان کو نظر انداز کر دیا کرتے تھے، حضرت مجدد الف ثانیؒ کے بعد جنھوں نے اپنے متعدد مکتوبات میں ان عقائد شرکیہ، شعائر جاہلیت و رسوم فاسدہ کی تردید و مذمت کی ہے،[2] اصلاحِ رسوم اور اسلامی معاشرہ کی تطہیر کا کام حضرت شاہ ولی اللہ صاحب کے ذریعہ

---

[1] ایضاً ص ۲۱۷ تا ۲۱۸ [2] ملاحظہ ہو "تاریخ دعوت و عزیمت" ج ۴ از ص ۲۳۹ تا ۲۵۳

شروع ہوا، جس کی تکمیل ان کے فرزندان گرامی مرتبت اور انھیں کے خاندان کے تربیت یافتہ مصلحین امت، حضرت سید احمد شہیدؒ (خلیفہ شاہ عبدالعزیزؒ) حضرت شاہ اسماعیل شہیدؒ (نبیرۂ حضرت شاہ ولی اللہؒ) نے کی۔[1]

یہاں پر تفہیمات اور وصیت نامہ (فارسی) کا ایک اقتباس پیش کیا جاتا ہے:-

"ہندوؤں کی عادات شنیعہ میں سے ایک یہ ہے کہ جب کسی عورت کا شوہر مرجاتا ہے تو اسے وہ دوسری شادی نہیں کرنے دیتے، عربوں میں یہ عادت بالکل نہ تھی، نہ آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم سے پہلے، نہ ان کے زمانہ میں، نہ بعد میں، اللہ تعالیٰ اس شخص پر رحم فرمائے جو اس شنیع عادت کو ختم کرے، اور اگر عام لوگوں سے اس کا رواج ختم نہ ہوسکے تو اپنی قوم کے درمیان ہی عربوں کے طریقہ کو رواج دینا چاہئے، اور اگر یہ بھی ممکن نہ ہو تو اس عادت کو قبیح سمجھنا اور دل سے اس کا دشمن ہونا چاہئے کہ یہ ہی منکر کا سب سے آخری درجہ ہے۔

ہماری دوسری بری عادت یہ ہے کہ بہت لمبا مہر باندھتے ہیں، آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم (کہ آپ سے ہمارے دین و دنیا کی عزت وابستہ ہے) اپنے گھر والوں کے مہر (جو بہترین خلائق تھے) ساڑھے بارہ اوقیہ مقرر فرمائے تھے جس کے پانچ سو درم ہوتے ہیں۔

ہماری ایک دوسری بری عادت اسراف کی ہے کہ خوشی کے موقعوں اور رسموں میں بہت خرچ کرتے ہیں، آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم سے شادیوں میں صرف ولیمہ اور

---

[1] ملاحظہ ہو صراط مستقیم (از افادات حضرت سید احمد شہیدؒ، جمع کردہ شاہ اسماعیل شہیدؒ) نیز کتاب سیرت سید احمد شہیدؒ (۱-۲) "و کاروان ایمان و عزیمت" از مصنف۔

عقیقہ ثابت ہے' چنانچہ ان دونوں کی پابندی کرنی چاہئے، اور اس کے علاوہ سے بچنا چاہئے، یا ان کا زیادہ اہتمام نہیں کرنا چاہئے۔

ہماری بری عادتوں میں غم کے موقعوں، سُوّم، چہلم، ششماہی، فاتحہ اور سالانہ کے نام پر بھی اسراف ہے' حالانکہ ان میں سے کسی کا عرب اولین میں رواج نہیں تھا، بہتر یہی ہے کہ میت کے ورثا کی تین دن تعزیت اور ایک شب و روز کے کھانے کے علاوہ کوئی اور رسم نہ کریں، تین دن کے بعد قبیلہ کی عورتیں جمع ہو کر میت کی عورتوں کے کپڑوں میں عطر ملیں، اور اگر میت کی زوجہ حیات ہو تو عدت گذرنے کے بعد سوگ کا سلسلہ ختم کر دیں[1]۔"

مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی مرحوم نے اپنے مضمون "منصب تجدید کی حقیقت' اور تاریخ تجدید میں حضرت شاہ ولی اللہ کا مقام" (الفرقان ولی اللہ نمبر) میں "ازالۃ الخفا" اور "تفہیمات" کے اقتباسات کو پیش کرنے کے بعد صحیح لکھا ہے کہ:۔

"ان اقتباسات سے ایک دھندلا سا اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ شاہ صاحب نے مسلمانوں کے ماضی اور حال کا کس قدر تفصیلی جائزہ لیا ہے' اور کس قدر جامعیت کے ساتھ ان پر تنقید کی ہے' اس قسم کی تنقید کا لازمی نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ سوسائٹی میں جتنے صالح عناصر موجود ہوتے ہیں، جن کے ضمیر و ایمان میں زندگی، جن کے قلب میں بُرے اور بھلے کی تمیز ہوتی ہے' ان کو حالات کی خرابی کا احساس سخت مضطرب کر دیتا ہے' ان کی اسلامی حس اتنی تیز ہو جاتی ہے' کہ اپنے گرد و پیش کی زندگی میں جاہلیت کا ہر اثر انھیں کھٹکنے لگتا ہے' ان کی قوت امتیاز اتنی بڑھ جاتی ہے' کہ وہ زندگی کے ہر پہلو میں

---

[1] تفہیمات الٰہیہ از ص ۲۴۶ تا ۲۴۷ طبع بجنور ۱۳۵۵ھ ۱۹۳۶ء، وصیت نامہ فارسی مطبوعہ دہلی ۱۲۶۸ھ ص ۲۴

اسلام اور جاہلیت کی آمیزشوں کو محسوس کرنے لگتے ہیں، اوران کی قوت ایمانی اس قدر بیدار ہو جاتی ہے کہ خارزار جاہلیت کی ہر کھٹک انھیں اصلاح کے لئے بیچین کر دیتی ہے، اس کے بعد مجدد کے لئے یہ ضروری ہوتا ہے کہ ان کے سامنے تعمیر نو کا ایک نقشہ واضح صورت میں پیش کرے، تاکہ حالت موجودہ کو جس حالت سے بدلنا مطلوب ہے، اس پر وہ اپنی نظر جما سکیں، اور اپنی تمام سعی و عمل کو اسی سمت میں مرکوز کر دیں، یہ تعمیری کام بھی شاہ صاحب نے اسی خوبی اور جامعیت کے ساتھ انجام دیا، جو ان کے تنقیدی کام میں آپ دیکھ چکے ہیں۔[1]"

---

[1] الفرقان شاہ ولی اللہ نمبر صلا ۱۰۲،۱۰۱

بابِ یازدہم

فرزندانِ گرامی قدر، خلفائے عالی مرتبت، نامور معاصر

لائق فرزندان و جانشین

مصلحینِ امت و مجدّدینِ اسلام میں حکیم الامت حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ پر اللہ تعالیٰ کے جو خصوصی انعامات اور اہلِ دعوت و عزیمت میں آپ کو جو امتیازات حاصل ہیں، ان میں ایک تاریخی امتیاز اور اللہ تعالیٰ کا آپ کے ساتھ معاملۂ خاص یہ تھا کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو ایسے فرزند و جانشین عطا فرمائے جو "نعم الخلف لنعم السلف" کے صحیح مصداق ہیں، اور جنھوں نے حضرت شاہ صاحبؒ کے جلائے ہوئے چراغ کو نہ صرف روشن و تاباں رکھا، بلکہ اس سے سیکڑوں چراغ جلائے، پھر ان چراغوں سے وہ چراغ جلتے رہے جن سے اس پورے تحتی برِّاعظم (ہندوستان) اور ہندوستان کے باہر بھی کتاب و سنت، عقائدِ حقّہ، اشاعتِ توحیدِ خالص، ردِّ شرک و بدعت، اصلاح رسوم، تزکیۂ نفس، حصول درجۂ احسانی، اعلائے کلمۃ اللہ و جہاد فی سبیل اللہ، حمیّت دینی، تاسیس مدارس دینیہ، دین کی صحیح تعلیمات کی ترجمانی و تبلیغ کے لئے تصنیف و تالیف اور تراجم قرآن و کتب حدیث و فقہ کا مبارک سلسلہ اس وقت سے لے کر اس وقت تک جاری ہے، اگر ان مبارک اقدامات و مساعی کی تاریخ دیکھی جائے اور خیر و برکت کے ان مراکز اور سلسلوں کے "شجرۂ نسب" کی تحقیق کی جائے،

تو معلوم ہوگا کہ ایک دیئے سے دوسرا دیا جلتا رہا، اور یہ سب چراغ اس چراغ سے روشن ہوئے جو بارہویں صدی ہجری کے وسط میں حکیم الاسلام حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ نے آندھیوں کے طوفان میں جلایا تھا، اس وقت بے اختیار فارسی کا یہ شعر زبان پر آتا ہے ؎

یک چراغیست دریں خانہ کہ از پرتوِ آں
ہر کجا می نگرم انجمنے ساختہ اند

عجیب مماثلت

فرزندان گرامی اور ان کے ذریعہ سے اپنی خصوصی دعوت اور اس سلسلہ کی اشاعت میں (جو ہزار کمالات کے باوجود تذکرہ وتراجم کی کتابوں میں ایک نادر ونایاب خصوصیت ہے) آپ کو اپنے ہی سلسلۂ نقشبندیہ مجددیہ کے بانی اور شیخ الشیوخ حضرت مجدد الف ثانیؒ سے عجیب مماثلت ہے، حضرت مجدد الف ثانیؒ کے چار فرزندان گرامی درجۂ کمال کو پہونچے[1] خواجہ محمد صادق، خواجہ محمد سعید، خواجہ محمد معصوم، خواجہ محمد یحییٰ، ان میں سے اول الذکر حضرت خواجہ محمد صادق کا ۲۵ سال کی عمر میں ۱۰۲۵ھ میں انتقال ہوگیا، حضرت مجددؒ سے ان کے بارے میں بلند کلمات منقول ہیں، سلسلۂ مجددیہ کی اشاعت تینوں آخر الذکر فرزندان گرامی کے ذریعہ ہوئی اور حضرت سید آدم بنوریؒ کو مستثنیٰ کر کے (جن کا تعلق حضرت سے نسب کے بجائے نسبت کا تھا، اور وہ نسبت ایسی قوی اور مقبول تھی کہ انھیں کے سلسلہ میں حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ، حضرت سید احمد شہیدؒ اور حضرت حاجی امداد اللہ صاحب مہاجر مکیؒ، اور ان کے خلفائے نامدار اور علمائے کبار ہیں) اس سلسلۂ عالیہ کی توسیع وتبلیغ اور حضرت مجددؒ کے شروع کئے ہوئے

---

[1] ان چار کے علاوہ حضرت مجدد کے بقیہ صاحبزادے شیر خوارگی اور صغر سنی میں وفات پا گئے تھے۔

کارِ تجدید و انقلاب کی تکمیل انھیں تینؒ فرزندان گرامی قدر کے ذریعہ ہوئی، پھر ان تینوں میں حضرت خواجہ محمد معصومؒ کو امتیاز خاص حاصل ہے کہ ان کے ذریعہ سے یہ سلسلہ ترکستان و عرب اور ترکی تک پہونچا اور کہنے والے نے صحیح کہا کہ ؎

چراغِ ہفت کشور خواجہ معصومؒ
منوّر از فروغش ہند تا روم

پھر آپ ہی کا مخفی ہاتھ اور توجہات باطنی تھیں کہ اکبر کے تخت پر دو پشتوں کے بعد ہی وہ باحمیّت، مجاہد و غازی، متشرع اور فقیہ سلطان آیا، جو ماحیِ دین تینے کے بجائے حامی دین، اور ہادم ملّت کے بجائے خادم ملت قرار پایا، جس کو حضرت خواجہ شروع سے اپنے مکتوبات میں "شہزادۂ دین پناہ" لکھ کر اس کارِ عظیم کے لئے تیار کر رہے تھے۔

بالکل اسی طرح حضرت شاہ ولی اللہ صاحبؒ نے چارؔ[1] باکمال فرزند چھوڑے، حضرت شاہ ولی اللہ صاحبؒ کے فرزندان گرامی کا بھی یہی معاملہ ہے کہ ان کے چارؔ[2] صاحبزادوں میں سے شاہ عبدالغنی صاحب کا (جو اپنے بھائیوں میں سب سے صغیر السن تھے) اپنے بھائیوں میں سب سے پہلے (۱۲۲۷ھ میں) انتقال ہو گیا[3]، شاہ صاحبؒ کی تعلیمات آپ کے علوم و معارف کی

---

[1] شاہ صاحبؒ کی پہلی اہلیہ سے شیخ محمد کے نام سے ایک فرزند تھے، جن کا انتقال شاہ صاحبؒ کی وفات کے کچھ عرصہ بعد جوانی میں ہو گیا تھا، ان کا ذکر گذشتہ صفحات میں گذر چکا ہے، مختصر ترجمہ "نزہۃ الخواطر" میں بھی ہے۔

[2] حضرت شاہ اسماعیل شہیدؒ انھیں کے فرزند تھے، شاہ صاحبؒ کی وفات کے بعد یہی چار صاحبزادے (شاہ عبدالعزیز صاحبؒ، شاہ رفیع الدین صاحبؒ، شاہ عبدالقادر صاحبؒ اور شاہ عبدالغنی صاحبؒ) معروف و مشہور ہوئے۔

[3] صاحبزادوں کی ترتیبِ وفات عکسی ہے، سب سے چھوٹے صاحبزادہ شاہ عبدالغنی صاحبؒ نے پہلے (۱۲۲۷ھ میں)، پھر ان سے بڑے شاہ عبدالقادر صاحبؒ نے (۱۲۳۰ھ میں)، پھر شاہ رفیع الدین صاحبؒ نے (۱۲۳۳ھ میں)، پھر حضرت شاہ عبدالعزیز صاحبؒ نے (۱۲۳۹ھ میں) وفات پائی۔

تبلیغ واشاعت، مردانِ کار کی تربیت وتکمیل اور تدریس وتصنیف کا وہ طرزِ خاص جس میں شاہ صاحبؒ کا ذوق، اور اجتہاد وتجدید کا رنگ جھلکتا تھا، انھیں تین صاحبزادوں کے ذریعہ جاری رہا، پھران تینوں میں بھی سراج الہند حضرت شاہ عبدالعزیز صاحبؒ کو اپنے بھائیوں میں وہ مقام حاصل ہوا، جو حضرت مجددؒ کے صاحبزادوں میں حضرت خواجہ محمد معصومؒ کو حاصل ہوا تھا، اوران کے ذریعہ حضرت شاہ صاحبؒ کے سلسلہ، اور آپ کے علوم وتعلیمات کی عالمگیر اشاعت ہوئی، اور بعض شعبوں کی تو اس طرح توسیع وتکمیل ہوئی کہ ادب کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ۔ ؎

اگر پدر نتواند پسر تمام کند

قبل اس کے کہ ہم شاہ صاحبؒ کے شروع کئے ہوئے کاموں کی اس تکمیل، توسیع وترقی کا ذکر کریں، جو شاہ عبدالعزیز صاحبؒ کے ہاتھوں عمل میں آئی، ہم ان کے مختصر حالاتِ زندگی اور تذکرہ وتعارف پیش کرتے ہیں، اس سلسلہ میں ہم مولانا حکیم سید عبدالحی حسنی رحمۃ اللہ علیہ کی کتاب "نزہۃ الخواطر" کی جلد ہفتم سے ان کا تذکرہ نقل کرنے پر اکتفا کریں گے، جو ماقلّ ودلّ کا مصداق ہے۔

حضرت شاہ عبدالعزیز دہلویؒ

امام العلماء، راس الفضلاء، علامۂ محدث، شاہ عبدالعزیز بن شاہ ولی اللہ بن شاہ عبدالرحیم عمری دہلویؒ، خود اپنے زمانہ کے علماء کے سردار اور گزشتہ علماء کے سرتاج کے چشم وچراغ، بعض لوگوں نے آپ کو "سراج الہند" اور بعض نے "حجۃ اللہ" کا خطاب دیا۔ آپ پنجشنبہ کی رات ۲۵ رمضان ۱۱۵۹ھ میں پیدا ہوئے، جیسا کہ آپ کے

تاریخی نام "غلام حلیم" سے معلوم ہوتا ہے، آپ نے قرآن شریف کے حفظ سے فراغت پائی، اور اپنے والد ماجد سے تعلیم کا سلسلہ شروع کیا، آپ نے ان سے قرأت وسماعت کے ذریعہ پوری تحقیق ودرایت اور توجہ سے علم حاصل کیا، جس سے آپ کو علوم میں ملکۂ راسخہ حاصل ہوگیا، جب آپ ۱۶ سال کے تھے، تو آپ کے والد ماجد نے انتقال کیا، اس کے بعد آپنے شیخ نور اللہ بڑھانوی، شیخ محمد امین کشمیری سے استفادہ کیا، آپ کو اجازت علمی شاہ محمد عاشق بن عبید اللہ پھلتی سے حاصل ہوئی جو آپ کے والد ماجد کے تربیت یافتہ اور محرم راز تھے، آپ نے ان حضرات سے ان علوم وکمالات میں استفادہ اور ان کی تکمیل کی جو والد صاحب کی وفات سے تشنۂ تکمیل تھے، اپنے ایک رسالہ میں آپ نے اپنے والد صاحب اور دوسرے علماء سے اپنے استفادہ کی تفصیل لکھی ہے، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ نے کتب حدیث میں پوری مؤطا مع مسوّیٰ اور مشکوٰۃ المصابیح اپنے والد صاحب سے پڑھیں، حصن حصین، اور شمائل ترمذی کی آپ کے درس میں سماعت کی جس کی قرأت آپ کے بھائی شیخ محمد کرتے تھے، صحیح بخاری کتاب الحج تک کی سماعت سید غلام حسین مکی کی قرأت سے کی، جامع الترمذی، سنن ابی داؤد کی سماعت مولوی ظہور اللہ مراد آبادی کی قرأت سے اور مقدمۂ صحیح مسلم اور اس کی بعض احادیث اور سنن ابن ماجہ کے کچھ حصوں کی سماعت محمد جواد پھلتی کی قرأت سے، مسلسلات اور مقاصد جامع الاصول کے بعض حصوں کی سماعت مولوی جار اللہ نزیل مکہ کی قرأت اور سنن النسائی کے کچھ حصوں کی سماعت آپ نے اپنے والد ماجد کے حلقۂ درس میں کی، صحاح ستّہ کے باقی ابواب کی سماعت آپ نے اپنے والد ماجد کے خلفاء سے جیسے شیخ نور اللہ اور خواجہ محمد امین سے کی اور ان کے علاوہ کتابوں کی اجازت عامہ اپنے والد کے خلیفۂ ارشد

اور ماموں زاد بھائی شاہ محمد عاشق پھلتی اور خواجہ محمد امین سے پائی، اور ان دونوں کے لئے آپ کے والد ماجد صاحب کا اجازت نامہ "تفہیمات الٰہیہ" اور "شفاء العلیل" میں موجود ہے، ان لوگوں نے آپ کے والد صاحب سے پڑھا ہے جبکہ شاہ محمد عاشق، آپ کے والد ماجد کی شیخ ابوطاہر مدنی کی خدمت میں قرأت وسماعت اور ان سے اجازت میں شریک بھی تھے، ان کی اسانید ان کی کتاب "الارشاد فی مہمات الاسناد" وغیرہ رسائل میں مذکور ہیں۔

آپ طویل القامت، نحیف البدن، گندم گوں، کشادہ چشم تھے، داڑھی گھنی تھی، خط نسخ ورقاع بڑی خوبصورتی کے ساتھ لکھتے تھے، تیر اندازی، شہ سواری اور موسیقی میں بھی مہارت تھی، آپ سے آپ کے بھائیوں، شاہ عبدالقادرؒ، شاہ رفیع الدینؒ، شاہ عبدالغنیؒ اور آپ کے داماد مولانا عبدالحیؒ بن ہبۃ اللہ بڑھانوی نے درس لیا، مفتی الٰہی بخش کاندھلوی اور سید قمر الدین سونی پتی آپ سے قرأت وسماعت میں آپ کے بھائیوں کے ساتھ تھے، حضرت شاہ غلام علی مجددیؒ (خلیفہ حضرت مرزا مظہر جان جاناںؒ) نے آپ سے صحیح بخاری پڑھی، مولانا سید قطب الہدیٰ بن مولانا محمد واضحؒ رائے بریلوی نے آپ سے صحاح ستہ کا درس لیا۔

آپ کے دوسرے اصحاب نے آپ کے بھائیوں سے پڑھا ہے اور آپ سے سند لی ہے، آپ کی مجلسوں میں حاضر رہے ہیں، اور آپ کا درس قرآن سنا ہے، اور آپ سے حسب توفیق استفادہ کیا ہے، آپ کے نواسہ شاہ محمد اسحاق بن افضل عمری آپ کے یہاں قاری تھے، جو ہر روز قرآن مجید کے ایک رکوع کی تلاوت کرتے تھے، اور شاہ صاحبؒ اس کی تفسیر فرماتے تھے، یہی آپ کے والد ماجد حضرت شاہ ولی اللہؒ کا طریقہ بھی تھا، شاہ ولی اللہ صاحبؒ

کا آخری درس قرآن آیت "اِعْدِلُوْا هُوَ اَقْرَبُ لِلتَّقْوٰى"[1] تک ہوا تھا، جہاں سے شاہ عبدالعزیز صاحب نے اپنا درس شروع کیا، آپ کا آخری درس "اِنَّ اَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللّٰهِ اَتْقٰكُمْ"[2] تک ہوا تھا، وہاں سے آپ کے نواسہ شاہ محمد اسحاق صاحب نے اپنا درس شروع کیا جیسا کہ "مقالات طریقت" میں ہے، آپ اپنے علم وفضل، فہم وذکاء اور سرعت حفظ میں یگانۂ روزگار تھے، آپ نے پندرہ ۱۵ سال کی عمر ہی سے درس وافادہ کا سلسلہ شروع کر دیا اور آپ سے بڑے بڑے فضلاء نے استفادہ کیا، اکثر اطراف کے طلبہ آپ کی خدمت میں اس ذوق وشوق سے حاضر ہوئے جیسے پیاسا پانی پر گرتا ہے۔

پچیس ۲۵ سال کی عمر میں آپ کو متعدد اذیت رساں امراض نے گھیر لیا، جن کے سبب آپ مراق، جذام، برص میں مبتلا ہوئے اور بصارت بھی جاتی رہی، بعض واقفان حال نے آپ کے چودہ ۱۴ تکلیف دہ امراض کا ذکر کیا ہے، اس وجہ سے آپ نے اپنی تدریسی ذمہ داری اپنے دونوں بھائیوں شاہ رفیع الدین صاحبؒ اور شاہ عبدالقادر صاحبؒ کے سپرد کر دی، مگر اس کے ساتھ خود بھی درس دیتے تھے، تصنیف وافتاء اور وعظ کا سلسلہ بھی جاری رہتا تھا، ہر سہ شنبہ کو آپ کا ہفتہ وار وعظ قرآن مجید کی تفسیر پر مشتمل ہوتا تھا، اخیر عمر میں آپ مجلس میں تھوڑی دیر بھی نہیں بیٹھ سکتے تھے، اس لئے اپنے قدیم وجدید مدرسہ کے درمیان ٹہلتے رہتے اور لوگ بڑی تعداد میں اس حالت میں بھی استفادہ کرتے اور آپ کا درس وافتاء اور وعظ ہوتا رہتا تھا، اسی طرح عصر ومغرب کے درمیان دو آدمیوں کی مدد سے مدرسہ اور جامع مسجد کی درمیانی سڑک پر نکلتے تھے، لوگ راستہ میں آپ کے منتظر رہتے اور اپنی مشکلات حل کراتے۔

انھیں امراض میں عدمِ اشتہا کا مرض اس حد تک بڑھ گیا کہ کئی کئی دن کسی چیز کے

---

[1] المائدہ — ۸ [2] الحجرات — ۱۳

چکھنے کی بھی نوبت نہ آتی، اور بخار کی طرح اس کی بھی باری آتی تھی، آپ نے "مناقب حیدریہ" کی تقریظ میں لکھا ہے :۔

"اس تقریظ میں کوتاہی کے لئے میں معذرت خواہ ہوں، جو اعذار اور امراض کے سبب ہوئی جن کی وجہ سے بھوک بالکل ختم ہوگئی ہے اور کھانے کی نوبت باری کے بخار کی طرح آتی ہے، ایسا غالباً پت کے غلبہ کے سبب ہے، قویٰ مضمحل ہوگئے، حواس میں فرق آگیا، اعضاء کمزور پڑگئے، ہڈیاں اور ڈاڑھیں بھی کمزور ہوگئیں"

امیر حیدر بن نور الحسنین بلگرامی کو خط میں لکھتے ہیں :۔

"اگر آپ اپنے محب کا حال پوچھتے ہیں تو وہ بہت خراب ہے اور صبح و شام اس میں اضافہ ہی ہوتا رہتا ہے، اور اسے ظاہری و باطنی آلام گھیرے ہوئے ہیں، قرار و سکون چھن گیا ہے، اور قلق و اضطراب بڑھ گیا ہے اور یہ سب ایسے امراض کے سبب ہے جن میں سے ایک مرض بھی آدمی کو پریشان اور غمزدہ کرنے کے لئے کافی ہے، جیسے بواسیر، معدہ اور آنتوں میں ریاح کا رکنا، اس حد تک فقدانِ اشتہا کہ کئی رات دن کھانا چکھنے کی بھی نوبت نہیں آتی، بخارات جب قلب کی طرف چڑھتے ہیں تو دم گھٹنے کی کیفیت ہوجاتی ہے، یہ جب دماغ کی جانب پہونچتے ہیں تو تکلیف دہ دردِ سر شروع ہوجاتا ہے، جو ہاون دستہ کے ضرب کی طرح محسوس ہوتا ہے "وَإِلَى اللّٰهِ الْمُشْتَكَىٰ وَهُوَ الْمُسْتَعَانُ" یہ حالت ایک لفظ بھی بولنے کی اجازت نہیں دیتی، چہ جائیکہ کوئی کتاب املا کراسکے یا کوئی پیغام لکھوا سکے"

آپ کو حیرت ہوگی کہ آپ ان موذی امراض کے باوجود لطیف الطبع، حاضر جواب، خوش گفتار ہے، اور تواضع، بشاشت اور مہر و محبت کی یہی ادا قائم رہی جو شروع سے تھی، آپ کی صحبت ذہن و فکر کو

جلا بخشتی تھی، ان صحبتوں میں حیرت انگیز خبریں، چیدہ اشعار، دور دراز کے ملکوں، ان کے باشندوں اور وہاں کے عجائبات کا بیان اس طرح ہوتا تھا جس سے سامعین کو محسوس ہوتا تھا کہ آپ اپنے مشاہدات بیان فرما رہے ہیں، حالانکہ آپ نے کلکتہ کے علاوہ کوئی اور شہر نہیں دیکھا تھا، مگر آپ غیر معمولی طور پر ذہین اور متجسس فطرت کے مالک تھے، جس کے سبب آپ نے باہر سے دہلی آنے والوں اور معلومات افزا کتابوں سے (جن کے مطالعہ سے مشاہدہ کی کیفیت حاصل ہو سکتی ہے) یہ معلومات اپنے دماغ میں محفوظ کر لئے تھے۔

لوگ آپ سے علمی استفادہ کے لئے حاضر ہوتے، شاعر و ادیب ادبی استفادہ اور اپنا کلام دکھانے کے لئے[1]، اور محتاج و ضرورت مند لوگ امراء سے سفارش کرانے اور آپ کی ممکن مدد حاصل کرنے کے لئے آتے، کیونکہ آپ کے اخلاق کریمانہ کی شہرت عام تھی، اسی طرح مریض دوا علاج کے لئے حاضر ہوتے، اہل جذب و سلوک آپ سے روحانی استفادہ کے لئے آپ کے پاس جاتے تھے، پردیسی علماء و مشائخ کو آپ اپنے یہاں ٹھہراتے اور ان کی حاجت روائی کرتے، اگر آپ کے پاس کوئی مخالف یا ایسا شخص بیٹھتا جسے دینی مسائل میں کچھ اختلاف ہوتا تو آپ اپنی سحر بیانی سے

---

[1] مولوی محمد حسین آزاد "آب حیات" میں لکھتے ہیں کہ شاہ نصیر نے دکن میں کسی کی فرمائش سے ۹ شعر کی ایک غزل کہی تھی جس کی ردیف تھی، "آتش و آب و خاک و باد، وہ غزل مشاعرہ میں سنائی اور کہا کہ اس طرح میں جو غزل کہے اسے میں استاد مانتا ہوں، دوسرے مشاعرہ میں استاد ذوق نے (جو شاہ نصیر کے شاگرد تھے) اسی پر غزل پڑھی، شاہ صاحب کی طرف سے بجائے خود اس پر اعتراض ہوئے، جشن قریب تھا، شیخ علیہ الرحمہ نے بادشاہ کی تعریف میں ایک قصیدہ اسی طرح میں لکھا مگر پہلے مولوی شاہ عبدالعزیز صاحب کے پاس لے گئے کہ اس کے صحت و سقم سے آگاہ فرمائیں، انھوں نے سن کر پڑھنے کی اجازت دی مگر ولی عہد بہادر نے اپنے شقہ کے ساتھ اسے پھر شاہ صاحب کے پاس بھیجا انھوں نے جو کہا تھا وہی جواب میں لکھ دیا، شیخ مرحوم کا دل اور بھی قوی ہو گیا اور دربار شاہی میں جا کر قصیدہ سنایا" آب حیات ص ۴۵۲-۴۵۳" از مصنف

آگ اور پانی اور متضاد چیزوں میں اتحاد پیدا کر دیتے، اور وہ آپ سے متفق وہم خیال ہو کر جدا ہوتا۔

شیخ محسن بن یحییٰ ترہتی "الیانع الجنی" میں لکھتے ہیں:۔

"وہ فضل و کمال اور شہرت و مقبولیت کے اس مقام پر فائز تھے کہ اطراف ہند کے لوگ ان سے انتساب بلکہ آپ کے تلامذہ و منتسبین سے بھی ادنیٰ نسبت پر فخر کرتے تھے.......آپ کے ان کمالات میں جن میں آپ کا کوئی معاصر آپ کا مقابل نہ تھا، آپ کی حاضر دماغی اور حاضر جوابی بھی تھی، جس کے سبب آپ بحث میں غالب آتے اور مخاطب کو لاجواب کر دیتے، انھیں کمالات میں آپ کی قادر الکلامی حسن تعبیر و خوبیٔ تحریر بھی تھی جس میں اہل نظر نے آپ کو سب پر فائق تسلیم کیا تھا"

آپ کے ایسے ہی کمالات میں آپ کی بے مثل فراست بھی تھی، جس کے ذریعہ اللہ تعالیٰ نے تعبیر خواب کی امتیازی صلاحیت عطا کی تھی، آپ خواب کی ایسی تعبیر دیتے جو پوری ہوتی تھی اور آپ کی چشم دید معلوم ہوتی تھی، یہ صلاحیت بڑے پاک نفس انسانوں ہی کے حصہ میں آتی ہے ان کے علاوہ بھی آپ کے متعدد فضائل و کمالات ہیں، مختصراً یہی کہا جا سکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کی ذات میں نوع بہ نوع اور گوناگوں فضائل جمع کر دیئے تھے، جو ابنائے دہر میں پھیلے ہوئے تھے، اگر یہ شعر کہنے والا شاعر ان کو دیکھتا تو اس کو صاف معلوم ہوتا کہ اس کا مبالغہ بھی قاصر ہے ؎

ولم أر أمثال الرجال تفاوتا　　لدى المجد حتى عُدَّ ألفٌ بواحد

(میں نے انسانوں کی طرح فرق مراتب نہیں دیکھا جس کے سبب ہزار انسان ایک کے برابر شمار ہوتے ہیں۔)

اس صورت میں آپ کے مفاخر و فضائل کا شمار کون کر سکتا ہے؟ شاہ عبدالعزیز صاحبؒ کی سب تصنیفات علماء کے حلقوں میں بالعموم وقعت و قبولیت کی نگاہ سے دیکھی جاتی ہیں اور ان سے استدلال کیا جاتا ہے، ان کے اسلوب تحریر میں ایسی قوت اور فصاحت و سلاست ہے کہ

کان ان سے حلاوت پاتے ہیں، اور دل ان سے لذت یاب ہوتے ہیں، ان کے کلام میں تاثیر وتسخیر کی ایسی قوت ہے کہ اس سے متاثر ومتفق نہ ہونا مشکل ہے، آپ کوئی کمزور اور قابل اعتراض تحریر دیکھتے تو بڑی خوش اسلوبی سے اس کی تردید فرماتے تھے، کلامی مسائل میں مذہب تشیّع آپ کا خاص موضوعِ بحث وتنقید رہا ہے، آپ نے ایسے عالمانہ ومتکلّمانہ انداز سے اس پر بحث کی ہے کہ اس کا جواب شافی ابھی تک نہیں ہوسکا ہے۔

آپ کی مشہور تصانیف میں یہ کتابیں ہیں:۔

تفسیر قرآن مسمّی بہ "فتح العزیز" جسے آپ نے شدت مرض اور ضعف کی حالت میں املاء کرایا تھا، یہ کئی بڑی جلدوں میں تھی، جس کا بڑا حصہ ۵۷ء کے ہنگامہ میں ضائع ہوگیا، اور صرف شروع اور اخیر کی دو جلدیں بچ گئیں، انھیں میں "الفتاوی فی المسائل المشکلة[1]" بہت ضخیم تھی، مگر اب اس کا خلاصہ دو جلدوں میں ملتا ہے، انھیں کتابوں میں "تحفۂ اثنا عشریہ" (جو مذہب شیعہ کی تنقید وتردید میں ہے) ایک بے مثل کتاب ہے، دوسری کتابوں میں "بستان المحدّثین[2]" ہے جو کتب حدیث اور محدثین کی تفصیلی فہرست وتذکرہ ہے، جو نامکمل رہی، "العجالة النافعة" اصول حدیث میں ایک فارسی رسالہ ہے، طلبہ حدیث کے حفظ کے لئے بھی ایک رسالہ ہے "میزان البلاغة" علم بلاغت کا ایک بہترین متن ہے، اسی طرح "میزان الکلام" علم کلام میں ایک متن ہے، ایک رسالہ "السرّ الجلیل فی مسئلة التفضیل" ہے، جس میں خلفائے راشدینؓ کے فرق مراتب پر گفتگو ہے، ایک رسالہ "سرّ الشہادتین" جو شہادت

---

[1] حضرت شاہ عبدالعزیزؒ کا پایہ فقہ حنفی میں بہت بلند تھا، اس میں ان کو رسوخ کامل اور تفقہ کا درجہ حاصل تھا اور بعض اہل نظر کے نزدیک وہ اس میں حضرت شاہ ولی اللہؒ سے بھی فائق تھے۔ (مصنف)

[2] اس کتاب سے شاہ صاحب کی طبقات محدثین اور کتب حدیث پر وسعت نظر کا اندازہ ہوتا ہے۔

حضرات حسنین رضؓ کے بیان میں ایک عمدہ رسالہ ہے، ایک رسالہ انساب میں ہے، ایک رسالہ تعبیر رؤیا پر ہے، ان کے علاوہ اور بھی رسائل ہیں، منطق وحکمت کی کتابوں میں "میر زاہد رسالہ" "میر زاہد ملا جلال" "میر زاہد شرح مواقف" پر آپ کے حاشیے ہیں" حاشیہ ملا کو سیح" پر "عزیزیہ" کے نام سے آپ کا حاشیہ ہے، صدر شیرازی کی "شرح ہدایۃ الحکمۃ" پر بھی آپ کا حاشیہ ہے "ارجوزۂ اصمعی" کی شرح بھی لکھی ہے، علماء وادباء کے نام آپ کے بہت سے خطوط بھی ہیں، اپنے والد ماجدؒ کے قصائد بائیہ وہمزیہ کی نفیس تخمیس بھی کی ہے[۱]، نظم ونثر، قوت تحریر، حسن انشاء، خوبیٔ تعبیر میں آپ اپنی مثال تھے، آپ کی تحریریں برجستگی، وبدیہہ گوئی، قلم کی روانی اور زود نویسی کی اچھی مثال ہیں۔

نماز فجر کے بعد یکشنبہ، ۷ شوال ۱۲۳۹ھ کو اسّی سال کی عمر میں انتقال فرمایا، آپ کی قبر دہلی میں شہر کے باہر آپ کے والد ماجد کے قریب ہے[۲]۔

شاہ صاحب ... تبلیغ وتکمیل

شاہ صاحبؒ کے تجدیدی کارنامہ کو ہم پانچ شعبوں میں تقسیم کرسکتے ہیں۔

۱۔ قرآن مجید کی ترجمانی، مسلمانوں میں اس کی تعلیمات ومضامین کی اشاعت عام، اس کے ذریعہ سے عقائد کی اصلاح اور دین خالص سے عوام کے براہ راست ربط وتعلق کی سعی جمیل۔

---

[۱] شاہ صاحب کا عربی کلام بالخصوص ان کا قصیدۂ لامیہ (جو ان کے ترجمہ میں "نزہۃ الخواطر" میں منقول ہے) عربیت کا اعلیٰ نمونہ ہے، اور اس میں وہ حضرت شاہ ولی اللہ صاحبؒ کے عربی کلام سے بھی فائق معلوم ہوتا ہے، اہل زبان کی سی یہ عربیت ان کے بعد ان کے تلمیذ رشید مفتی صدرالدین خاں صاحب کے عربی کلام میں نظر آتی ہے، ملاحظہ ہو وہ ابیات جو نمونۂ کلام کے طور پر "الثقافۃ الاسلامیۃ فی الہند" اور "نزہۃ الخواطر" میں مفتی صاحب کے تذکرہ میں منقول ہیں۔ (مصنف)

[۲] "نزہۃ الخواطر" ج ۷، ص ۲۶۸-۲۷۰ باختصار خفیف۔

۲۔ حدیث کی نشر و اشاعت، اس کے درس و اجازت کے سلسلہ کا احیاء، اس کے حلقہائے درس کا اجراء اور اساتذۂ حدیث اور شارحین کتب حدیث کی تربیت۔

۳۔ فتنۂ رفض و تشیّع کا مقابلہ، صحابہ کرامؓ اور قرآن عظیم کو مجروح و مشکوک بنانے والی کوششوں اور سازشوں کا سدباب۔

۴۔ جہاد فی سبیل اللہ کا احیاء اور ہندوستان میں اسلامی اقتدار اور مسلمانوں کی آزادی کے لئے بڑے بڑے خطرے اور چیلنج کا مقابلہ۔

۵۔ ان مردان کار کی تربیت جو حالات اور وقت کے تقاضوں اور دین کے حقیقی مطالبوں کے مطابق دعوت و اصلاح کا کام انجام دیں۔

اشاعت و تبلیغ قرآن

جہاں تک عوام تک قرآن مجید کے پہونچانے اور اس کے ذریعہ سے عقائد باطلہ اور رسوم فاسدہ کی اصلاح اور ربط مع اللہ کی کوشش کا تعلق ہے، حضرت شاہ عبدالعزیزؒ نے اس سلسلہ میں اپنے والد بزرگوار کے کام کو بہت ترقی دی، اور اس میں بڑی عمومیت اور وسعت پیدا کر دی، شاہ ولی اللہ صاحبؒ کا درس قرآن سورہ نساء کی آیت "اعدلوا هو اقرب للتقوى" تک پہونچا تھا کہ آپ کی وفات ہو گئی، شاہ عبدالعزیز صاحبؒ نے یہیں سے درس شروع کیا، سورہ حجرات کی آیت "ان اکرمکم عند اللہ اتقاکم" تک پہونچے تھے کہ یہ سلسلہ بھی آپ کے سلسلہ حیات کے ساتھ ختم ہوا، آپ کی وفات کے بعد آپ کے نواسہ (جو کلیۃً آپ ہی کے تربیت یافتہ اور آپ کے صحیح جانشین تھے) شاہ محمد اسحاقؒ صاحب نے درس شروع کیا۔

حضرت شاہ عبدالعزیز صاحبؒ کا درس قرآن ہر ہفتہ شنبہ و جمعہ کے روز ہوتا تھا جس میں خواص بطریقِ خاص اور عوام بڑے ذوق و شوق سے شریک ہوتے تھے، اس درس میں آپ کی طبیعت اپنے پورے جوش پر ہوتی تھی، اور مضامین کی آمد سیل رواں کی طرح[1]، اس درس سے دار السلطنت دہلی میں (جو علماء و فضلاء کا بھی مرکز تھا) قرآن مجید کا ذوق عام ہوا، اصلاح عقائد کی ایک طاقتور رو چلی، اور ترجمۂ قرآن اور درس تفسیر کا وہ مبارک سلسلہ شروع ہوا جو اس وقت تک اس برصغیر میں جاری ہے، اور جس سے لاکھوں انسانوں کی اصلاح ہوئی، اور ان کے دل و دماغ حلاوتِ توحید اور لذّت قرآن سے آشنا ہوئے، خود مدارس عربیہ میں اسی درس کے فیض یافتہ اور تربیت یافتہ علماء کے اثر سے متنِ قرآن کے درس و افہام و تفہیم کا سلسلہ شروع ہوا جس کو نصاب درس میں مختصر تفسیر[2] کی شکل میں تبرکاً جگہ دی گئی تھی، اور علمائے دنیا کا پھیلایا ہوا طلسم ٹوٹا کہ قرآن مجید کی اشاعت عوام میں بڑے دینی خطرات، بلکہ ضلالت کا پیش خیمہ ہے، اس میں یہ مخفی اندیشہ کام کر رہا تھا کہ عوام ان پیشہ ور علماء کے ہاتھ سے نکل جائیں گے، جنھوں نے قرآن کو چیستان بنا رکھا تھا، اور عوام کو اس سے دور رکھنے کی کوشش کی تھی۔

حضرت شاہ صاحبؒ کا دوسرا علمی و اصلاحی کارنامہ تفسیر "فتح العزیز" کی شکل میں ہے، جسے "تفسیر عزیزی" اور "بستان التفاسیر" کا نام بھی دیا گیا ہے، یہ شاہ صاحبؒ کی باقاعدہ املا کی ہوئی مستقل تصنیف ہے، خود شاہ صاحبؒ کی تصریح کے مطابق وہ سورۃ الفاتحہ، سورۃ البقرہ، پھر سورۃ الملک، آخر قرآن تک ہے[3]، لیکن سورۂ بقرہ مکمل نہیں ہو سکی (جس کے اسباب معلوم نہیں ہو سکے) صرف ربع پارۂ دوم کے قریب تک آیت "اَنْ تَصُوْمُوْا خَیْرٌ لَّکُمْ" تک طبع ہو سکی، اصل فارسی تفسیر کے

---

[1] ملاحظہ ہو ملفوظات حضرت شاہ عبدالعزیزؒ ص۱

[2] قدیم درس میں جلالین کامل اور بیضاوی شریف (سورۂ بقرہ) ہوتی تھی، پورے متن قرآن کے ترجمہ و تفسیر کا رواج نہ تھا۔

[3] مقدمہ تفسیر "فتح العزیز" از حضرت شاہ عبدالعزیزؒ ص۳، مقدمہ سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ اس تصنیف کا سلسلہ برادر بزرگ مولانا محمد بن شاہ ولی اللہ صاحبؒ کی تحریک و تقاضے سے ۱۲۰۸ھ میں شروع کیا گیا۔

متعدد ایڈیشن شائع ہوئے ہیں، کتاب تین جلدوں میں ہے، پہلی جلد سورۂ فاتحہ سے لے کر پارۂ دوم کے ربع کے قریب تک ہے، دوسری جلد سورۃ الملک (انتیسویں ۲۹ پارے) سے لے کر آخر سورۃ المرسلات تک ہے، تیسری جلد سورۂ "عَمَّ یَتَسَآءَلُوۡنَ" (سورۂ نباء) سے شروع ہو کر آخر قرآن مجید یعنی سورۃ النّاس کے ختم تک ہے۔

شاہ صاحبؒ کے بعد ان کے شاگرد رشید علامہ حیدر علی فیض آبادی (م ۱۲۹۹ھ) صاحبِ "منتہی الکلام" نے اس کا تکملہ لکھا، صاحبِ "مقالات طریقت" لکھتے ہیں کہ: "مولوی حیدر علی صاحبِ "منتہی الکلام" نے حسبِ خواہش سکندر بیگم والیِ بھوپال تفسیر "فتح العزیز" کا تکملہ ستائیس ۲۷ جلدوں میں کیا، راقم نے دیکھا ہے۔"[۱]

یہ تکملہ صرف پانچویں ۵ پارہ کے اختتام تک کتب خانہ ندوۃ العلماء میں محفوظ ملتا ہے، ابتدا کے ایک دو ورق نہیں ہیں۔

ایک کتاب (اردو میں) "تفسیر عزیزی" المعروف بوعظِ عزیز کے نام سے مطبع انصاری دہلی کی چھپی ہوئی بھی ملتی ہے، جس میں اس کے مرتب ابوالفرید محمد امام الدین صاحبؒ کی تصریح کے مطابق شاہ صاحبؒ کا درس قرآن و حدیث (جو ہر سہ شنبہ اور جمعہ کو ہوتا تھا) قلمبند کر کے پیش کیا گیا ہے، یہ ۱۲۵۹ھ کی تالیف ہے اور سورۃ المومنون سے سورۃ الصّافات تک ہے۔

لیکن اس عدم تکمیل کے باوجود اس تفسیر میں بہت سے ایسے نکات و تحقیقات ہیں جو بہت سی مشہور تفاسیر میں نہیں ملتیں، شاہ صاحبؒ کے درس تفسیر اور آپ کی کتاب تفسیر فتح العزیز میں ان مسائل پر خاص طور پر محققانہ کلام کیا گیا ہے، جن کے بارے میں اس وقت کے علماء نے تحقیق و صفائی سے کام نہیں لیا تھا، اور اس کی وجہ سے عوام کی ایک بڑی تعداد فسادِ عقیدہ اور مشرکانہ اعمال تک میں گرفتار تھی، مثلاً آیت "وَمَآ اُهِلَّ بِهٖ لِغَيۡرِ اللّٰهِ" کی تفسیر جو اس کتاب کے خصوصی مقامات میں سے ہے، اسی طرح سحر کی بحث ("وَمَا كَفَرَ سُلَيۡمٰنُ" الخ کے ذیل میں)

---

[۱] مقالاتِ طریقت ص ۳۳

اور بعض دوسری آیات کے سلسلہ میں تحقیقات نادرہ اس کتاب کی خصوصیات میں سے ہیں۔

حدیث کی تدریس و ترویج

جہاں تک درس حدیث اور اس کی ترویج و اشاعت کا تعلق ہے، ہندوستان کی علمی و دینی تاریخ میں اس کی مثال ملنی مشکل ہے۔ آپ کے درس حدیث کی مدت تقریباً چونسٹھ (۶۴) سال کی ہے، اس مدت میں آپ نے نہ صرف صحاح کا درس دیا اور بستان المحدثین، العجالۃ النافعہ جیسی مفید کتابیں تصنیف کیں جو حدیث کا صحیح ذوق، طبقات حدیث سے واقفیت، اور محدثین کا مرتبہ شناس بناتی اور اصول سے واقف کرتی [illegible] گیا سیکڑوں صفحات کا عطر آگیا ہے، آپ نے حدیث کے ایسے اساتذۂ کاملین [illegible] پیدا کئے جنھوں نے ہندوستان ہی میں نہیں حجاز میں بھی درس حدیث کا فیض عام کیا اور ایک عالم کو مستفید کیا۔ آپ کے ان باکمال تلامذہ کی تعداد جن کے تراجم مختصر "نزہۃ الخواطر" کی جلد ہفتم میں موجود ہیں، چھتیس سے اوپر ہے، ان میں وہ حضرات جن سے حدیث کے درس کے حلقے قائم ہوئے اور انھوں نے حدیث کے دوسرے شیوخ و اساتذہ پیدا کئے، حسب ذیل ہیں:۔

مولانا شاہ محمد اسحٰق دہلوی، مولانا شاہ محمد یعقوب دہلوی، مفتی الٰہی بخش کاندھلوی، مولانا سید اولاد حسن قنوجی، مرزا حسن علی شافعی لکھنوی، مولانا حسین احمد ملیح آبادی محدث، مولانا حیدر علی ٹونکی، مولانا خرم علی بلہوری، مفتی صدر الدین دہلوی، مولانا مفتی علی کبیر مچھلی شہری، مولانا سید قطب الہدیٰ حسنی رائے بریلوی۔

ان کے علاوہ جن لوگوں نے آپ سے حدیث کی سند لی ان کی فہرست اتنی طویل ہے کہ اس کا استقصاء مشکل ہے، یہاں ان چند حضرات کے نام لکھے جاتے ہیں، جو اپنے بعض دوسرے کمالات، یا سلسلۂ طریقت، یا شہرت کے لحاظ سے امتیاز خاص رکھتے ہیں:۔

حضرت شاہ غلام علی دہلوی (خلیفہ اعظم حضرت مرزا مظہر جانِ جاناںؒ)

حضرت شاہ ابوسعید دہلوی (خلیفہ حضرت شاہ غلام علی صاحبؒ)

حضرت شاہ احمد سعید دہلوی (خلیفہ حضرت شاہ غلام علی صاحبؒ)

حضرت مولانا فضل رحمٰن گنج مراد آبادیؒ (خلیفہ حضرت شاہ محمد آفاق دہلوی)
مولانا بزرگ علی مارہروی (استاد مفتی عنایت احمد صاحب کاکوروی)
شاہ بشارت اللہ بہرائچی (مجدّدی سلسلہ کے ایک بڑے شیخ)
شاہ پناہ عطا سلونوی (سلسلۂ چشتیہ نظامیہ کے ایک بڑے شیخ جن کو مکاتبۃً اجازت حاصل تھی)
شیخ ظہور الحق پھلواروی۔

ان تلامذۂ حدیث اور تربیت یافتہ شیوخ میں حدیث کی سب سے بڑی اشاعت حضرت شاہ محمد اسحاق صاحب کے ذریعہ ہوئی، جنھوں نے ۱۲۵۸ھ میں مکہ معظمہ ہجرت کی اور ان سے حجاز کے ممتاز ترین علماء نے حدیث کی سند لی۔

آپ کے تلامذہ میں مولانا سید نذیر حسین محدث دہلویؒ معروف بہ میاں صاحب، قاری عبد الرحمٰن صاحب، پانی پتی، مولانا سید عالم علی مراد آبادی، مولانا مفتی عبد القیوم ابن مولانا عبد الحی بڑھانوی (خلیفۂ اجل حضرت سید احمد شہیدؒ) حضرت مولانا فضل رحمٰن گنج مراد آبادیؒ، نواب قطب الدین دہلوی (مصنف مظاہر حق) مولانا احمد علی سہارنپوری (محشّی و ناشر صحیح بخاری) مفتی عنایت احمد کاکوروی (استاد استاد العلماء مولانا لطف اللہ صاحب علی گڑھی) اور بہت سے علماء ہیں جن کی فہرست طویل ہے، بقول صاحب "نزہۃ الخواطر" ہندوستان میں یہی سند حدیث باقی رہی۔

حضرت شاہ محمد اسحٰق صاحبؒ کے تلامذہ میں تنہا مولانا سید نذیر حسین صاحب محدث دہلوی (م ۱۳۲۰ھ) نے دہلی میں سالہا سال حدیث کا درس دیا اور آپ کے درس سے متعدد جلیل القدر ناشرین و شارحین حدیث پیدا ہوئے، جن میں مولانا عبد المنان وزیر آبادی (جن کے کثیر التعداد تلامذہ پنجاب میں مصروف درس و افادہ تھے) عارف باللہ سید عبد اللہ غزنوی امرتسری اور ان کے

فرزند جلیل مولانا سید عبدالجبار غزنوی امرتسری (والد مولانا سید داؤد غزنوی) مولانا شمس الحق ڈیانوی مصنف غایۃ المقصود، مولانا محمد حسین بٹالوی، مولانا غلام رسول قلعوی، مولانا محمد بشیر سہسوانی، مولانا امیر احمد سہسوانی، مولانا حافظ عبداللہ غازیپوری ابو محمد مولانا ابراہیم آروی صاحب طریق النجاۃ، مولانا سید امیر علی ملیح آبادی، مولانا عبدالرحمٰن مبارک پوری صاحب تحفۃ الاحوذی، (اور علمائے عرب میں سے) شیخ عبداللہ بن ادریس الحسنی السنوسی، شیخ محمد بن ناصر النجدی، شیخ سعد بن احمد بن عتیق النجدی، کے نام اس درس کی وسعت وافادیت کا اندازہ کرنے کے لئے کافی ہیں۔

حضرت شاہ محمد اسحٰق صاحب کے تلامذہ میں حضرت شاہ عبدالغنی مہاجر مدنی (م ۱۲۹۶ھ) بھی شامل ہیں، جن سے ہندوستان کے کبار علماء واساتذۂ حدیث کو شرف تلمذ حاصل ہے، اور ان کے ذریعہ سارا ہندوستان حدیث کے نور سے منور اور معمور ہوگیا، اور اس وقت کے سارے حلقہائے درس اور مدارس عربیہ انھیں سے شرف انتساب رکھتے ہیں، حضرت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ اور حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ (بانی دارالعلوم دیوبند) ان کے نامور تلامذہ میں سے ہیں، حضرت مولانا رشید احمد صاحب گنگوہیؒ کے تلامذہ کبار میں مولانا محمد یحییٰ کاندھلویؒ، اور حضرت مولانا خلیل احمد صاحب سہارنپوریؒ صاحب بذل المجہود کا نام لینا کافی ہے، مولانا خلیل احمد صاحب سہارنپوریؒ کے تلامذہ میں حضرت شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا کاندھلوی مصنف اوجز المسالک وغیرہ کا نام لینا کافی ہے، مولانا محمد قاسم صاحب کے تلامذہ میں مولانا سید احمد حسن امروہی اور شیخ الہند مولانا محمود حسن دیوبندی اور ان کے تلامذہ میں مولانا سید انور شاہ کشمیری اور مولانا سید حسین احمد مدنی کا نام اور کام محتاج تعارف نہیں، شاہ صاحبؒ

کے علوا اسناد، عموم فیض اور بلند مرتبہ کے لئے ان کے شاگرد رشید مولانا محسن بن یحییٰ ترہتی کی مشہور کتاب "الیانع الجنی فی أسانید الشیخ عبد الغنی" کا مطالعہ معلومات افزا و بصیرت افروز ہے۔

نصرتِ سنّت وردِّ شیعہ

جہاں تک فتنہ رفض و تشیّع کے مقابلہ اور اس کے اثر سے اہل سنت کو محفوظ رکھنے کے کارنامہ کا تعلق ہے، اور جس کی ابتدا حضرت شاہ ولی اللہ صاحبؒ نے اپنی بے نظیر کتاب "ازالۃ الخفاء" سے کی تھی، اس کی تکمیل اور تقویت حضرت شاہ عبدالعزیزؒ نے اپنی نادرۂ روزگار تصنیف "تحفہ اثنا عشریہ" سے کی، جو ان کتابوں میں ہے، جن کو ——— تاریخ ساز کہا جاسکتا ہے، اور جس طرح ملا محبّ اللہ بہاری کی تصانیف "سلّم العلوم" اور "مسلّم الثبوت" نے تقریباً سو برس تک علمائے ہند کو اپنی شرح و تحشیہ میں مشغول رکھا، اور ان کی بہترین ذہانتوں اور توانائیوں کو مرکوز کر لیا[1]، اسی طرح اس کتاب کے جواب نے ممتاز ترین شیعہ علماء کو تصنیف و تالیف میں مشغول کر دیا، تنہا عبقات جس کا پورا نام "عبقات الانوار فی إمامۃ الأئمۃ الأطہار"[2] ہے اور جس کے مصنف مولوی سید حامد حسین صاحب کنتوری (م ۱۳۰۶ھ) ہیں، آٹھ جلدوں میں لکھی گئی،

---

[1] مولانا حکیم سید عبدالحی صاحبؒ کی کتاب "الثقافۃ الاسلامیۃ فی الهند" مطبوعہ مجمع اللغۃ العربیۃ دمشق اور اس کے اردو ترجمہ "اسلامی علوم و فنون ہندوستان میں" مطبوعہ دار المصنفین اعظم گڑھ سے ان شروح و حواشی کی حیرت خیز تعداد معلوم ہو سکتی ہے، جو ان دونوں کتابوں بالخصوص سلم کی شرح میں لکھی گئیں۔ [2] کتاب کے متعدد اجزاء لکھنؤ و لدھیانہ کے مختلف مطابع میں شائع ہوئے ہیں۔

اس کتاب کی ضخامت کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ اس کی جلد اول ۱۲۵۱ صفحات میں، جلد دوم ۹۷۷ صفحات میں، سوم ۶۰۹ صفحات میں، چہارم ۳۹۹ صفحات میں، پنجم ۵۹۴ صفحات میں، ششم کل صفحات ۷۰۹، بقیہ حصص علیٰ ہذا القیاس ـــــ پوری کتاب ۳۰ حصوں میں ہے، مصنف کے فرزند مولوی سید ناصر حسین صاحب نے کتاب کی تکمیل کی، کتاب نجوم السماء سے معلوم ہوتا ہے کہ مولوی سید حامد حسین صاحب کے علاوہ مولوی دلدار علی صاحب مجتہد اول، حکیم مرزا محمد کامل دہلوی، مفتی محمد قلی خاں کنتوری، اور سلطان العلماء سید محمد صاحب نے بھی اس کتاب کی تردید میں اور اس کے اثر کو زائل کرنے کے لئے ضخیم کتابیں تصنیف کیں، یہ سلسلہ مرزا ہادی رسوا لکھنوی پر جا کر ختم ہوا، جو ادب و فلسفہ کے میدان کے آدمی تھے، لیکن انھوں نے بھی اس کار خیر میں حصہ لینے کی کوشش کی۔

تدریسی مشغولیت وانہماک، درس تفسیر و حدیث، اشاعت کتاب و سنت، بیعت و ارشاد و تربیت مریدین، افتاء و فصل خصومات کی ہوش رُبا مشغولیت میں اور مختلف عوارض و امراض کی موجودگی میں شاہ صاحبؒ کو اس مسئلہ کی طرف ہمہ تن متوجہ ہونے کا خیال اور ایک ایسی کتاب تصنیف کرنے کی فرصت کیسے ہوئی جس کے لئے بیسیوں کتابوں اور ہزاروں صفحات کا مطالعہ اور ذہنی یکسوئی اور توجہ کامل ضروری تھی؟ اس کا اندازہ اس وقت تک نہیں ہو سکتا جب تک کہ بارہویں صدی ہجری کے وسط و آخر (اٹھارویں صدی کے نصف آخر کی) ہندوستان بالخصوص شمالی ہند، دہلی اور اس کے اطراف، اور اودھ، بہار و بنگال کے مسلم معاشرہ و تمدن کی صورت حال پر گہری نظر نہ ہو، اور اس ذہنی انتشار، دینی تشکیک اور مسلمان خاندانوں بالخصوص شرفاء، اہل حکومت اور صاحب اثر طبقہ پر تشیّع کے اثرات اور اس کے اقدامی و جارحانہ رویّہ سے واقفیت نہ ہو، اس کا اندازہ وہ شخص نہیں کر سکتا جس نے ہمایوں کے

ایران سے واپس آنے کے بعد سے فرخ سیر اور اس کے بعد تک کے سیاسی و انتظامی انقلابات ایرانی النسل امراء و علماء کے اثر و نفوذ، سید برادران (حسن علی خاں اور حسین علی خاں) کے دربار دہلی پر اثر و رسوخ، پھر دہلی میں نواب نجف علی خاں کے تسلط کی تفصیلات[1]، نیز اودھ میں نواب ابوالمنصور خاں صفدر جنگ نیشاپوری کے خاندان کی حکومت قائم ہو جانے اور شجاع الدولہ کے بعد سے شیعیت کے اثرات کا جائزہ نہ لیا ہو، اس کا کسی قدر اندازہ شاہ عبدالعزیز صاحب کے اس بیان سے ہو سکتا ہے، جو تحفہ کے مقدمہ میں ان کے محتاط قلم سے نکلا ہے، وہ فرماتے ہیں:-

"اس ملک میں جس میں ہم سکونت پذیر ہیں، اور اس زمانہ میں جو ہمارے حصہ میں آیا ہے، مذہب اثنا عشری کا رواج اور اس کے شیوع کی نوبت اس حد تک آگئی ہے کہ (سنیوں کے) کم گھر ہوں گے جن میں ایک دو شخص اس گھر کے اس مذہب کے پیرو اور اس عقیدہ کی طرف راغب نہ ہوں، ان میں سے اکثر علم تاریخ و اخبار سے بے خبر اور اپنے اسلاف کے حالات و اصول سے ناواقف اور غافل نظر آتے ہیں، جب مجالس اور محافل میں اہل سنت والجماعت کے ساتھ گفتگو کرتے ہیں تو کچھ بیانی

---

[1] نواب نجف علی خاں کا دہلی پر مکمل تسلط و اقتدار تھا، اور وہ کھل کر تشیع کے حامی اور اہل سنت کے مخالف تھے ان کی تعدّی کے متعدد واقعات مشہور ہیں، جو خواہ کلیتہً صحیح نہ ہوں اور ان میں مبالغہ یا تعصب سے کام لیا گیا ہو، مگر ان کی کچھ اصل ضرور ہے، غالباً اس تعدّی سے بچنے کے لئے، شاہ صاحب نے تحفہ کی تصنیف کی نسبت اپنے مشہور نام کے بجائے، اپنے تاریخی نام "غلام حلیم" کی طرف کی ہے، اور سرورق پر حسب ذیل عبارت ہے۔

"مصنفہ عالم با عمل فاضل اکمل حافظ غلام حلیم ابن شیخ قطب الدین احمد بن شیخ ابوالفیض دہلوی قدس سرہم" کتاب کا جواب لکھنے والوں نے جہاں مصنف کا حوالہ دیا ہے، وہاں "فاضل عزیز" کے لقب سے یاد کیا ہے۔

اور غلط مبحث سے کام لیتے ہیں، اس غرض کے لئے حسبۃً للہ تعالیٰ یہ رسالہ ترتیب
دیا گیا تاکہ بحث و مناظرہ کے وقت اس مذہب کے پیرو پٹری سے اترنے نہ پائیں،
اور خود اپنے اصول کے منکر نہ ہوں، اور ان بعض امور میں جو حقیقت پر مبنی ہیں،
شک و تردّد کو راہ نہ دیں۔[1]"

شاہ صاحبؒ نے اس کتاب میں ان مناظرانہ اور متکلمانہ کتابوں اور اسلوب کی پیروی نہیں کی، جو کسی مخالف فرقہ کی تردید و ابطال میں لکھی جاتی ہیں، اور ان کی خاص زبان ہوتی ہے، اولاً اس کتاب میں مذہب تشیّع کے پیدا ہونے اور اس کے مختلف فرقوں میں تقسیم ہونے کا بیان ہے، اسی طرح فرقۂ شیعہ کے اسلاف علماء اور ان کی کتابوں کا تعارف ہے، پھر خلافت کی بحث اور مطاعن صحابہؓ اور ان کے جوابات پر اکتفا کرنے کے بجائے اصولی مسائل، الہیّات، نبوت، معاد، اور امامت پر مستقل ابواب تحریر کئے گئے ہیں، پھر خلفائے ثلاثہ، اور حضرت ام المؤمنین حضرت عائشہؓ اور دوسرے صحابہؓ پر شیعوں کی طرف سے جو اعتراضات اور قدح کی گئی ہے، ان کا مفصل جواب ہے، پھر مذہب شیعہ کے خواص، ان کے اوہام و تعصّبات پر کلام کیا گیا ہے، اور ان کی غلطیوں اور غلط فہمیوں پر تبصرہ ہے، آخری باب (دوازدہم) تولّا و تبرّا پر مشتمل ہے، جو دس مقدمات پر مبنی ہے، کتاب بڑی تقطیع اور باریک طباعت میں ۷۰۰ صفحات میں آئی ہے۔

دوسری خصوصیت زبان کی حلاوت و سلاست اور برجستگی ہے جس کا اعتراف ہندوستان اور ایران کے متعدد شیعہ علماء نے بھی کیا ہے، خود نام سے اس طرز فکر اور قصد و ارادہ کا اظہار ہوتا ہے، جو اس کتاب کی تصنیف کا محرک ہوا ہے، اس کے مقابلہ میں

---

[1] تحفۂ اثنا عشریہ ص۲ مطبوعہ مطبع نولکشور، لکھنؤ ۱۳۲۵ھ

جو کتابیں لکھی گئیں، ان کے ناموں سے اکثر غضب و اشتعال کا اظہار ہوتا ہے اور سیف و سناں کی چمک ظاہر ہوتی ہے، مثلاً ایک کتاب کا نام "صوارم الإلٰهیات" ہے ایک کا "حسام الإسلام"، ایک کا "سیف ناصری" ایک کا "ذو الفقار"۔

اس عہد میں اس کا اندازہ کرنا مشکل ہے کہ اس کتاب کی تصنیف نے جو وقت کی ایک ضرورت تھی، کیا خدمت انجام دی، راقم نے نواب صدر یار جنگ مولانا حبیب الرحمٰن خاں شروانی سابق صدر الصدور امور مذہبی ریاست حیدر آباد سے (جن کا خاندان حضرت شاہ عبدالعزیز صاحبؒ اور ان کے خلفاء سے وابستہ رہا ہے) خود سنا کہ "اس کتاب کی تصنیف نے شیعیت کے بڑھتے ہوئے سیلاب کے مقابلہ میں ایک مضبوط پشتہ کا کام کیا" یہ کتاب شاہ صاحبؒ کی زندگی میں ۱۲۱۵ھ میں طبع ہو کر مشہور ہو گئی تھی[1]، اور اس کے جوابات کا سلسلہ شروع ہو گیا تھا، شاہ صاحبؒ کے ایک فاضل شاگرد مولوی اسلمی مدراسی نے اس کا عربی میں ترجمہ کیا، راقم نے یہ ترجمہ شیخ الاسلام عارف حکمت بے کے کتب خانہ واقع باب جبریل مدینہ طیبہ میں دیکھا ہے۔

انگریزی اقتدار کی مخالفت اور مسلمانوں کا ملّی تحفّظ

جہاں تک ہندوستان میں اسلامی اقتدار کی حفاظت اور مسلمانوں کی آزادی کی راہ میں پیش آنے والے خطرے اور چیلنج کے مقابلہ کا تعلق ہے، شاہ صاحبؒ نے اس سلسلہ میں حالات کے اس حقیقت پسندانہ جائزہ، بیدار مغزی، دور بینی اور شان عزیمت کا نمونہ پیش کیا، جو ایک صاحبِ بصیرت و فراست عالم دین، داعی و مصلح، اور اپنے وقت کے دینی رہنما کے

---

[1] مقالات طریقت صـ۳۳

شایانِ شان ہے حضرت شاہ ولی اللہ صاحبؒ کے زمانہ میں وقت کا سب سے بڑا مسئلہ مرہٹوں کی تاخت اور ان کی اس فوج کشی و غارت گری کو روکنا تھا، جو ایک روزمرّہ کا واقعہ بن گیا تھا، اور جس سے ایک طرف سلطنت مغلیہ بے بس، بے اثر اور ذلیل ہو رہی تھی، دوسری طرف مسلمانوں کی عزت و ناموس محفوظ نہیں رہے، اور شہروں کی معمول کے مطابق زندگی باقی نہیں رہی تھی، اس وقت اس خطرہ کو دور کرنا، اور اس کو روکنے کے لئے کسی امکانی امداد کو حاصل کرنا ایسا ہی تھا جیسے کسی گھر یا محلہ میں آگ لگنے کے وقت آگ بجھانے والے انجن و دستہ FIRE BRIGADE کو طلب کیا جاتا ہے، اور شاہ صاحبؒ کی نظر میں احمد شاہ ابدالی اور اس کی فوج کی یہی حقیقت تھی، اور ان سے یہی شرط ہو گئی تھی کہ اس آگ کو بجھانے کے بعد واپس چلے جائیں گے، شاہ صاحبؒ کی نظر میں یہ سلطنت مغلیہ کو سنبھلنے کا موقعہ دینے کے لئے اور کسی بہتر نظام کو اس کی جگہ لینے کے لئے (اگر اس کے بغیر چارہ نہیں ہے) ایک عارضی انتظام اور تدبیر کے درجہ کی چیز تھی جو اس وقت کے مغل تاجدار شاہ عالم کی دُوں ہمتی اور کوتاہ نظری کی وجہ سے کامیاب نہیں ہو سکی، اس وقت تک ایسٹ انڈیا کمپنی کے ہندوستان کی زمام اقتدار سنبھالنے، پھر اس وسیع ملک پر سات سمندر پار کی ایک ملک کی حکومت قائم ہو جانے کے وہ آثار ظاہر نہیں ہوئے تھے، جو شاہ صاحبؒ کی توجہ کو پورے طور پر اس پر مرکوز کر دیتے۔

لیکن شاہ صاحبؒ کی وفات کے بعد ہندوستان کے حالات تیزی سے بدلے ۱۱۷۹ھ / ۱۷۶۵ء میں (شاہ ولی اللہ صاحبؒ کی وفات کے تین سال بعد) بنگال، بہار، اڑیسہ تینوں صوبوں کی دیوانی بلا شرکت غیرے بطور "التمغا" (انعامی یا عطا شدہ جاگیر کی سند) سرکار کمپنی کو دی جا چکی تھی، سرکار بنارس اور غازیپور بطور جاگیر کمپنی کو مل چکے تھے، اب

خاندان تیموریہ کے بادشاہ شاہ عالم کے پاس ملک میں صرف ایک صوبہ الہٰ آباد تھا، اور آمدنی میں وہ روپیہ تھا جو انگریز اس کو دیتے تھے، ۸ مارچ ۱۷۸۶ء (۱۲۰۲ھ) میں کلکتہ گزٹ میں مشتہر کیا گیا کہ "مسلمانوں کی سلطنت تو نہایت حقیر و ذلیل ہو گئی ہے، ہندوؤں سے ہم کو کچھ خوف نہیں ہے" ۱۷۵۷ء میں انگریزوں نے پلاسی کے میدان میں سراج الدولہ کو اور ۲۳ اکتوبر ۱۷۶۴ء (۱۱۷۸ھ) میں بکسر کے میدان میں شجاع الدولہ کو شکست دی، ۱۷۹۹ء (۱۲۱۴ھ) میں سلطان شہید سلطان ٹیپو نے سرنگا پٹن کے میدان میں شہادت حاصل کی، اور گویا ہندوستان میں مسلمانوں کے اقتدار کی قسمت پر مہر لگ گئی، سلطان شہید کی نعش دیکھ کر جنرل ہارس HARRIS نے بجا طور پر کہا کہ "آج ہندوستان ہمارا ہے"۔[1]

شاہ عبدالعزیز صاحبؒ نے جو دہلی میں مصروف درس و افادہ تھے، لیکن ان کی حقیقت بین نگاہ سارے ہندوستان پر تھی، اور اللہ تعالیٰ نے ان کو غیر معمولی طور پر حقیقت رسید ذہن اور صاحبِ حمیّت و عزیمت طبیعت عطا فرمائی تھی، اس انقلاب کا پورا جائزہ لیا، اور اس نتیجہ تک پہونچ گئے کہ اس وقت بچے کھچے اسلامی اقتدار اور اس ملک میں مسلمانوں کے مستقبل کے لئے خطرہ انگریز ہیں، ان کے ایک عربی شعر میں اس حقیقت کی پوری عکاسی ہے، اور اس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ انگریزوں کے اثرات کو ہندوستان ہی تک محدود نہیں سمجھتے تھے، ان کو اس سے زیادہ وسیع اور دور رس سمجھ رہے تھے، وہ فرماتے ہیں:۔

وانی أری الافرنج أصحاب ثروۃ ۔۔۔ لقد أفسدوا ما بین دھلی وکابل

(میں فرنگیوں کو جو دولت کے مالک ہیں دیکھتا ہوں کہ انھوں نے دہلی اور کابل کے درمیان فساد برپا کر رکھا ہے)

---

[1] ملاحظہ ہو تاریخ سلطنت خداداد میسور از محمود خاں محمود بنگلوری ص ۲۶۶

ہمارے علم میں وہ پہلے شخص ہیں جنھوں نے اس وقت ہندوستان کو دارالحرب قرار دینے کی جرءت کی، اور صورت حال کا حقیقت پسندانہ جائزہ لیتے ہوئے فقہ و اصول فقہ کی روشنی میں مسئلہ کی ایسی تنقیح کی جس سے ان کی بصیرت کا بھی اظہار ہوتا ہے، اور اخلاقی و دینی جرءت کا بھی، فتاوی عزیزی جلد اول میں اس سوال کے جواب میں کہ دارالاسلام دارالحرب ہو سکتا ہے یا نہیں؟ "درّ مختار" کی ایک طویل عبارت نقل کرنے کے بعد تحریر فرماتے ہیں کہ:-

> "اس شہر (دہلی) میں امام المسلمین کا حکم اصلاً جاری نہیں ہے، نصرانی حکام کا حکم بے دغدغہ جاری ہے فقہاء جس کو اجرائے احکام کفر کہتے ہیں، اس سے مراد یہ ہے کہ ملکداری کے معاملہ، رعایا کے بندوبست، خراج و باج، اور اموال تجارت کے عشور کے وصول کرنے، ڈاکوؤں، چوروں کو سزا دینے، فصل خصومات اور جرائم کی تعزیر میں کفار بطور خود حاکم و مختار ہوں، اگر بعض اسلامی احکام جیسے جمعہ اور عیدین، اذان و ذبح بقر سے وہ تعرّض نہ کرتے ہوں لیکن اصل الاصول یہی ہے کہ یہ چیزیں ان کے رحم و کرم پر ہوں، ہم دیکھتے ہیں کہ وہ مساجد کو بے تکلف منہدم کر دیتے ہیں، کوئی مسلمان، یا (غیر مسلم) ذمّی ان کی اجازت کے بغیر اس شہر اور اس کے نواح میں داخل نہیں ہو سکتا، اپنی منفعت کے لئے وہ باہر سے آنے والوں، مسافروں، اور سوداگروں کو منع نہیں کرتے لیکن دوسرے ذی وجاہت لوگ مثلاً شجاع الملک، ولایتی بیگم بغیر ان کے حکم کے ان شہروں میں داخل نہیں ہو سکتے، اس شہر دہلی سے کلکتہ تک نصاریٰ کی عملداری پھیلی ہوئی ہے، ہاں دائیں بائیں مثلاً حیدرآباد، لکھنؤ اور رام پور میں انھوں نے اپنے احکام جاری نہیں کئے ہیں،

(فتاویٰ عزیزی، حصہ اول)

کچھ تو اپنے مصالح کی بنا پر اور کچھ ان ریاستوں کے حکام کے ان کی اطاعت قبول کر لینے کی بنا پر[1]"

حضرت شاہ صاحبؒ کے خیالات کا، اور وہ انگریزوں کو جس نظر سے دیکھتے تھے، پورا عکس ان کے جلیل القدر خلیفہ اور تربیت یافتہ داعی و مصلح حضرت سید احمد شہیدؒ کے خیالات و جذبات میں پایا جاتا ہے، جن کی صاف جھلک آپ کے خطوط میں نظر آتی ہے، جو آپ نے اس وقت ہندوستان کے بعض ذی اثر و صاحبِ حکومت رؤسا، اور بعض غیر ملکی مسلمان اہل حکومت کو لکھے ہیں، شاہ سلیمان والیٔ چترال کو ایک خط میں لکھتے ہیں:۔

قضارا از مدت چند سال حکومت	تقدیر سے چند سال سے ہندوستان
وسلطنت ایں ملک برایں عنوان	کی حکومت و سلطنت کا یہ حال
گردیدہ کہ نصارا انکوہیدہ خصال	ہو گیا ہے کہ عیسائیوں اور مشرکین
ومشرکین بدمآل براکثر بلاد ہند استیلاً	نے ہندوستان کے اکثر حصہ پر
یافتند و آں دیار را بظلمات ظلم وبدا	غلبہ حاصل کر لیا ہے، اور ظلم و بدا
مشحون ساختند[2]	شروع کر دی ہے۔

اس سے زیادہ واضح الفاظ میں ہندو راؤ وزیر گوالیار کو لکھتے ہیں:۔

بررائے سامی روشن و مبرہن است کہ	جناب کو خوب معلوم ہے کہ یہ پردیسی
بیگانگان بعید الوطن، ملوک زمین	سمندر پار کے رہنے والے، دنیا
وزمن گردیدہ، وتاجران متاع فروش	جہاں کے تاجدار اور یہ سودا

[1] فتاویٰ عزیزی جلد اول مطبوعہ مطبع مجتبائی، دہلی ص۱۱۴ [2] سیرت سید احمد شہید حصہ اول ص۳۸۹

بہ پایہ سلطنت رسیدہ، امارت امرائے کبار و ریاست رؤسائے عالی مقدار بر باد نمودہ اند و عزت و اعتبار ایشاں بالکل ربودہ۔[1]

بیچنے والے سلطنت کے مالک بن گئے ہیں، بڑے بڑے اہل حکومت کی حکومت اور ان کی عزت و حرمت کو انھوں نے خاک میں ملا دیا ہے۔

غلام حیدر خاں کے نام لکھتے ہیں، جو گوالیار کے ایک فوجی افسر تھے:۔

اکثر بلاد ہندوستان بدست بیگانگان افتادہ و ایشاں ہر جا بنائے آئین جور و ظلم نہادہ، ریاست رؤسائے ہندوستان برباد رفتہ۔[2]

ملک ہندوستان کا بڑا حصہ غیر ملکیوں کے قبضہ میں چلا گیا ہے، اور انھوں نے ہر جگہ ظلم و زیادتی پر کمر باندھ لی ہے، ہندوستان کے حاکموں کی حکومت برباد ہو گئی۔

سید صاحبؒ کے اس خط سے جو انھوں نے شہزادہ کامران کو لکھا ہے، صاف معلوم ہوتا ہے کہ اس جہاد سے آپ کا مقصود اصلی ہندوستان تھا، جو بتدریج انگریزوں کے قبضہ میں چلا جا رہا تھا، خط میں تحریر فرماتے ہیں:۔

باز خود ایں جانب معہ مجاہدین صادقین بہ سمت بلاد ہندوستان بنا بر ازالہ کفر و طغیان متوجہ خواہد شد، کہ مقصود اصلی خود ہندوستان است۔[3]

اس مہم (سرحد و پنجاب) سے فراغت کے بعد یہ خاکسار مع مجاہدین صادقین کفر و طغیان کے ازالہ کی نیت سے ملک ہندوستان کی طرف متوجہ ہوگا کہ وہی مقصود اصلی ہے۔

---

[1] سیرت سید احمد شہیدؒ حصہ اول ص ۳۸۹-۳۹۰ [2] ایضاً ص ۳۹ [3] ایضاً

اس کا اندازہ اس سے بھی ہو سکتا ہے کہ سید صاحبؒ ۱۲۲۷ھ میں (حضرت شاہ عبدالعزیزؒ کی وفات سے بارہ۱۲ سال پہلے) امیر خاں کے لشکر میں تشریف لے گئے، جو اس وقت انگریزوں سے برسرپیکار تھے، ان کے ساتھ ہندوستان کا بہترین فوجی عنصر، مسلمانوں کا گرم و تازہ خون، ہندوستان کی فاتح طاقت کا بچا کھچا سرمایہ، اور وقت کے بہت سے شاہین و شہباز تھے، یہ ہندوستان میں ایک بڑھتی ہوئی آزاد طاقت تھی، جس کو وقت کا کوئی مبصر نظرانداز نہیں کر سکتا[1] اور جس کو بامقصد اور منظم بنا کر انگریزوں کی ابھرتی ہوئی طاقت کے مقابلہ میں لایا جا سکتا تھا، کہ ملکوں اور قوموں کی تاریخ میں ایسی حوصلہ مند طاقتوں نے اپنی عددی اور سلاحی کمزوری کے باوجود حالات کا رخ بدل دیا ہے، اس کا کوئی تحریری ثبوت ابھی تک نہیں ملا ہے، کہ حضرت سید صاحبؒ حضرت شاہ عبدالعزیز صاحبؒ کی صریح ہدایت اور حکم سے نواب امیر خاں کے لشکر میں تشریف لے گئے، لیکن اس کا قرینہ ضرور پایا جاتا ہے کہ یہ اقدام حضرت شاہ صاحبؒ کے ایماء پر یا کم سے کم تائید و پسندیدگی پر ہوا، اس لئے کہ ۱۲۳۳ھ میں جب نواب نے انگریزوں سے مصالحت کر لی اور راجپوتانہ اور مالوہ کے چند متفرق اور غیر اہم حصوں پر قناعت کر کے جن کے مجموعہ کا نام ریاست ٹونک تھا، انگریزوں سے جنگ کرنے سے علیحدگی اختیار کر لی، اور سید صاحبؒ نے اب وہاں مزید قیام بے سود سمجھا تو آپ نے علیحدگی کا فیصلہ فرمایا اور ایک خط حضرت شاہ عبدالعزیز صاحبؒ کو لکھا جس کا مضمون تھا:۔

---

[1] تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو "سیرت سید احمد شہیدؒ" حصۂ اول۔ امیر خاں مرحوم کو پنڈاروں سے جن کو انگریزی تاریخوں، اور ان سے متأثر مؤرخوں کی کتابوں میں ایک راہزن اور تخریبی گروہ کی حیثیت سے یاد کیا گیا ہے، کوئی تعلق نہ تھا، اصلیت صرف اتنی ہے کہ پنڈارے کبھی کبھی ان کی پناہ لے لیتے تھے، اور وہ ان کو فوری خطرہ سے بچا لیتے تھے۔

"خاکسار قدم بوسی کو حاضر ہوتا ہے، یہاں لشکر کا کارخانہ درہم برہم ہوگیا،
نواب صاحب انگریزوں سے مل گئے، اب یہاں رہنے کی کوئی صورت نہیں"[1]

اس سے یہ نتیجہ نکالا جا سکتا ہے کہ یہ سفر شاہ صاحبؒ کے ایماء و مشورہ سے ہوا تھا، اس لئے واپسی پر آپ کو اس کی اطلاع دینی ضرور تھی۔

اس طرح شاہ صاحبؒ نے اس خطرہ کے پہچاننے میں جو مسلمانوں اور ہندوستان کو درپیش تھا، خداداد بصیرت اور مومنانہ فراست سے کام لیا، اور اس کے لئے وہ اپنے زمانہ میں جو تدبیر کر سکتے تھے، اس میں کوئی کمی نہیں کی، ان کی یہی بصیرت اور جذبہ ان سے انتساب رکھنے والی جماعت مجاہدین (جس کی قیادت حضرت سید احمد شہیدؒ اور شاہ صاحبؒ کے قابل فخر بھتیجے حضرت شاہ اسماعیل شہیدؒ کر رہے تھے) میں پورے طور پر کارفرما نظر آتا ہے، اور جس کا پورا مظاہرہ مولانا ولایت علی عظیم آبادی، مولانا یحییٰ علی صادقپوری، مولانا احمد اللہ، و مولانا عبداللہ صاحب کی انگریزوں کے خلاف سرحدی جنگوں، اور صادقین صادقپور کی عظیم قربانیوں میں جلوہ فگن ہے، جن کی نظیر ملنی مشکل ہے۔[2]

پھر یہ جذبہ اس جماعت سے ان علماء اور دینی قائدین کی طرف منتقل ہوا جنھوں نے ۱۸۵۷ء میں اس کے لئے جان کی آخری بازی لگائی، اور جن میں مولانا احمد اللہ شاہ مدراسیؒ، مولانا لیاقت علی الہ آبادیؒ، حضرت حاجی امداد اللہ تھانویؒ اور حضرت حافظ ضامن شہیدؒ کے نام معروف و مشہور ہیں، اور اس کے بعد ان علماء کی طرف جنھوں نے اس شمع کو روشن رکھا اور ۱۹۴۷ء تک اس کا سلسلہ کسی نہ کسی طرح جاری رکھا۔ ع

---

[1] وقائع احمدی (قلمی) ص۸۵ نسخہ محفوظہ کتب خانہ ندوۃ العلماء لکھنؤ۔

[2] تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو مصنف کی کتاب "کاروان ایمان وعزیمت" از ص۴۴ تا ۶۱

خدا رحمت کند ایں عاشقانِ پاک طینت را

مردانِ کار کی تربیت

جہاں تک ان مردانِ کار کی تربیت کا تعلق ہے جو حالات اور وقت کے تقاضوں اور دین کے حقیقی مطالبوں کے مطابق دعوت و اصلاح کا کام انجام دیں اور جُہد و جہاد کا بیڑہ اٹھائیں، یہ تقدیر اور حکمت الٰہی کی بات ہے کہ اس میں حضرت شاہ عبدالعزیز صاحبؒ کا حصہ اپنے بہت سے مشائخ و اسلاف اور بعض ایسے حضرات سے بھی بڑھا ہوا ہے، جن کا درجہ ممکن ہے (اور قرائن اس پر دلالت کرتے ہیں) کہ اللہ تعالیٰ کے یہاں ان سے بڑھا ہوا ہو، شاہ صاحبؒ کے ذریعہ اللہ تعالیٰ نے ایسے متعدد عالی استعداد اور بلند ہمت و عزیمت رکھنے والے صاحبِ تاثیر نفوس کی تربیت کا کام لیا، جنھوں نے ہزاروں انسانوں کی زندگیوں میں انقلاب برپا کر دیا، اور ایک پوری صدی سنبھال لی، شاہ صاحبؒ کے علم اور زندگی کے دریا کی سطح ساکن تھی، لیکن بقول اقبالؔ ؎

اسی دریا سے اٹھتی ہے وہ موجِ تند جولاں بھی
نہنگوں کے نشیمن جس سے ہوتے ہیں تہ و بالا

حضرت سید احمد شہیدؒ

اس دعوے کے ثبوت کے لئے تنہا ان کے خلیفۂ ارشد حضرت سید احمد شہیدؒ (۱۲۰۱ھ تا ۱۲۴۶ھ) کا نام لینا کافی ہے جنھوں نے اس تحتیٔ برّاعظم میں اس عظیم اسلامی تحریک کی رہنمائی کی جس کی نظیر جامعیت، قوت تاثیر اور اسلام کی اولین دعوت اور

طریق نبوت سے قریب مماثلت ہیں نہ صرف تیرہویں صدی میں نظر نہیں آتی جو اس کا عہد ہے، بلکہ گزشتہ کئی صدیوں میں بھی اس جیسی ایمان آفریں تحریک، اور صادقین و مخلصین کی ایسی مربوط و منظم جماعت کا کوئی سراغ نہیں ملتا، وہ عقائد و اعمال کی تصحیح، افراد کی تربیت، وعظ و تبلیغ، اور جہاد و سرفروشی کے وسیع و طویل محاذ پر جس طرح سرگرم عمل رہے، اس کا اثر صرف ان کے میدان کارزار، اور ان کی معاصر نسل تک محدود نہ رہا، بلکہ اس نے آئندہ نسل، اپنے بعد آنے والے اہل حق، اصحاب دعوت اور دین کے علمبرداروں اور خادموں پر گہرے اور دیرپا نقوش چھوڑے، بڑھتے ہوئے انگریزی اقتدار کے مقابلہ ہندوستان اور اس کے پڑوسی مسلم ممالک کی حفاظت اور قیام حکومت اسلامیہ علی منہاج الخلافۃ الراشدہ کی جدوجہد کی ابتدا بھی آپ ہی نے کی، اس تحریک اور جدّوجہد کی زمام قیادت ہندوستان میں اول اول اسی جماعت کے علماء اور قائدین کے ہاتھ میں رہی، ہندوستان کے مختلف حصوں میں دینی کتابوں کی تصنیف و تالیف، اور ترجمہ اور نشر و اشاعت کی جدید تحریک (جس نے اس وسیع و عمیق خلیج کو پُر کیا، جو مسلم عوام اور صحیح اسلامی تعلیمات اور کتاب و سنت کے درمیان پائی جاتی تھی) انھیں کی کوششوں کی رہین منّت ہے، مسلمانوں کی دینی و سیاسی بیداری بالواسطہ اور بلا واسطہ اسی دعوت و تحریک کا نتیجہ اور ثمرہ ہے، اس تحریک کے اثرات، علم و ادب، فکر اسلامی، اور زبان و اسالیب بیان پر بھی پڑے، اس نے اصلاح معاشرہ، جاہلی رسوم کے ابطال، ہندوانہ اثرات کے ازالہ اور صحیح اسلامی زندگی کی طرف بازگشت کا زبردست کام انجام دیا۔

سید صاحبؒ اور ان کی دعوت و تربیت کے اثرات کی وسعت، قوت اور گہرائی و گیرائی کا اندازہ کرنے کے لئے یہاں پر ہم چند اہل نظر کی تحریروں کے کچھ اقتباسات

پیش کرتے ہیں۔

ہندوستان کے شہرۂ آفاق مصنف ومؤرخ نواب سید صدیق حسن خاں والی بھوپال (م ۱۳۰۷ھ) جنھوں نے سید صاحبؒ کی تعلیم وتربیت کے اثرات کو خود دیکھا تھا، اور آپ کے دیکھنے والوں کی ایک بڑی جماعت کا زمانہ پایا تھا، اپنی تصنیف "تقصار جیود الاحرار" میں لکھتے ہیں:۔

"خلق خدا کی رہنمائی اور خدا کی طرف رجوع کرنے میں وہ خدا کی ایک نشانی تھے، ایک بڑی خلقت اور ایک دنیا آپ کی قلبی وجسمانی توجہ سے درجۂ ولایت کو پہونچی؛ آپ کے خلفاء کے مواعظ نے سرزمین ہند کو شرک وبدعت کے خس وخاشاک سے پاک کردیا، اور کتاب وسنّت کی شاہراہ پر ڈال دیا، ابھی تک ان کے وعظ وپند کے برکات جاری وساری ہیں۔"

آگے چل کر لکھتے ہیں:۔

"خلاصہ یہ کہ اس زمانہ میں دنیا کے کسی ملک میں بھی ایسا صاحب کمال سنا نہیں گیا اور جو فیوض اس گروہ حق سے خلق خدا کو پہونچے ان کا عشر عشیر بھی اس زمانہ کے علماء ومشائخ سے نہیں پہونچا۔"[1]

علامۂ عصر استاد الاساتذہ حضرت مولانا حیدر علی رام پوری ٹونکی (م ۱۲۷۳ھ) تلمیذ حضرت شاہ عبدالعزیز دہلویؒ "صیانۃ الناس" میں تحریر فرماتے ہیں:۔

"ان کی ہدایت کا نور آفتاب کے مثل کمال زور وشور کے ساتھ بلاد وقلوب عباد میں منور ہوا، ہر ایک طرف سے سعیدان ازلی رخت سفر باندھ کر منزلوں سے

---

[1] تقصار جیود الاحرار من تذکار جنود الابرار (فارسی) مطبوعہ بھوپال ۱۲۹۸ھ ص ۱۱۰-۱۰۹

آ آ کے شرک و بدعات وغیرہ منہیات سے (جن کے حسب عادت زمانہ خوگر ہو رہے تھے) توبہ کرکے توحید و سنت کی راہ راست اختیار کرتے لگے اور اکثر ملکوں میں خلفائے راست کردار جناب موصوف نے سیر فرما کر لاکھوں آدمی کو دین محمدیؐ کی راہ راست بتادی، جن کو سمجھ تھی، اور توفیق الٰہی نے ان کی دستگیری کی، وہ اس راہ پر چلے[1]"۔

ہندوستان کے ایک باخبر اور ثقہ عالم دین مولوی عبدالاحد صاحب جنھوں نے اس جماعت قدسیہ کے بہت سے افراد کی زیارت کی تھی، اور جن کا زمانہ سید صاحبؒ سے قریب تھا، لکھتے ہیں :۔

"حضرت سید صاحبؒ کے ہاتھ پر چالیس۴۰ ہزار سے زیادہ ہندو وغیرہ کفار مسلمان ہوئے، اور تیس۳۰ لاکھ مسلمانوں نے آپ کے ہاتھ پر بیعت کی اور جو سلسلۂ بیعت آپ کے خلفاء کے خلفاء کے ذریعہ تمام روئے زمین پر جاری ہے، اس سلسلہ میں تو کروڑوں آدمی آپ کی بیعت میں داخل ہیں[2]"۔

---

[1] "صیانۃ الناس عن وسوسۃ الخناس" مطبوعہ ۱۲۷۰ھ ص ۴۔

[2] سوانح احمدی، اس سلسلہ میں مزید شہادتیں اور حضرت مولانا ولایت علی عظیم آبادی (م ۱۲۶۹ھ) مولانا کرامت علی جونپوری (م ۱۲۹۰ھ) کے بیانات مصنف کے رسالہ "تحقیق و انصاف کی عدالت میں ایک مظلوم مصلح کا مقدمہ" میں دیکھے جائیں۔ سید صاحبؒ کے مفصل حالات و کمالات کے لئے مولانا غلام رسول مہر کی کتاب "سید احمد شہید" (۱۔۲۔۳۔۴) اور مصنف کی کتاب "سیرت سید احمد شہید" (۱۔۲) کا مطالعہ کیا جائے۔ سید صاحبؒ کے خلفاء کے ذریعہ جو عمومی ہدایت و اصلاح ہوئی اور جس درجہ کے صاحب تاثیر تھے اس کا کچھ اندازہ "الذکر الجلی فی کرامات السید محمد علی" (اردو تصنیف افسر الدولہ جان جہاں خاں ابن نواب محمد خاں عالم خاں بہادر تہور جنگ مطبوعہ ۱۳۰۵ھ مطبع مرغوب دکن سکندر آباد) سے ہو سکتا ہے جو سید صاحبؒ کے خلیفہ مولانا سید محمد علی واعظ رامپوری کے حالات و کرامات اور مدراس میں ان سے جو ہدایت و فیض پہونچا اس کے تذکرہ میں ہے۔

اسی عظیم الشان اصلاحی و تجدیدی کارنامہ کی بناء پر اکثر اصحاب نظر و اہل انصاف آپ کو تیرہویں صدی کا مجدّد مانتے ہیں۔

مولانا عبدالحی بڑھانویؒ اور مولانا محمد اسماعیل شہیدؒ

شاہ عبدالعزیز صاحبؒ کی تعلیم و تربیت کا دوسرا نمونہ آپ کے دو تلامذۂ رشید اور عزیز قریب مولانا عبدالحی بڑھانویؒ اور مولانا محمد اسماعیل شہیدؒ ہیں، حضرت شاہ عبدالعزیزؒ خود ان دونوں کی فضیلت علمی اور تبحر کے قائل تھے، آپ نے ایک خط میں ان دونوں کو "تاج المفسّرین فخر المحدّثین سرآمدِ علمائے محقّقین" لکھا ہے، اور فرمایا ہے کہ:-

"دونوں حضرات تفسیر و حدیث، فقہ و اصول و منطق وغیرہ میں اس فقیر سے کم نہیں ہیں، جناب باری کی جو عنایت ان دونوں بزرگوں کے شامل حال ہے، اس کا شکر مجھ سے ادا نہیں ہو سکتا، ان دونوں کو علمائے ربّانی میں شمار کرو اور جو اشکال حل نہ ہو ان کے سامنے پیش کرو۔"[1]

مولانا عبدالحی صاحبؒ کا پایہ اہل علم کے نزدیک علوم رسمیّہ میں بہت بلند تھا، اور تفسیر میں خود شاہ صاحبؒ مولانا کو اپنے تمام تلامذہ پر فضیلت دیتے تھے، اور فرماتے تھے کہ وہ میرا نمونہ ہیں، شیخ الاسلام کا لقب جو اسلام میں خاص خاص علماء کو دیا گیا ہے، شاہ صاحبؒ نے خود مولانا کو ایک خط میں دیا ہے۔

علمی تبحر اور ذہنی کمالات پر بھی جو چیز فوقیت رکھتی ہے، وہ آپ کی للّٰہیت اور اخلاص ہے کہ اس علم و فضل کے ساتھ سید صاحبؒ کی طرف رجوع ہوئے، جو عمر میں آپ سے کہیں خورد سال

[1] مکتوب بنام منشی خیر الدین صاحبؒ (سرائے معالی خاں لکھنؤ) ملاحظہ ہو "سیرت سید احمد شہیدؒ" حصہ اول ص۲۱۶-۲۱۷

اور علم میں آپ سے تلمذ کا شرف رکھتے تھے، بیعت ہوتے ہی آپ سید صاحبؒ کے رنگ میں رنگ گئے، اور اپنے سارے علم و فضل کو آپ پر اور دعوت و جہاد کے کام پر تصدّق، اور قلم و زبان اور خدا کی دی ہوئی ہر قوت و قابلیت کو حق کی اشاعت و نصرت کے لئے وقف کر دیا، اور سفر ہجرت و جہاد ہی میں جان جاں آفریں کے سپرد کی۔

جہاں تک مولانا شاہ محمد اسماعیل شہیدؒ کا تعلق ہے، وہ ان اولوالعزم، عالی ہمت، ذکی، جری اور غیر معمولی افراد میں تھے، جو صدیوں میں پیدا ہوتے ہیں، وہ مجتہدانہ دماغ کے مالک تھے، اور اس میں ذرا مبالغہ نہیں کہ ان میں بہت سے علوم کو از سر نو مدوّن کرنے کی قدرت و صلاحیت تھی، حضرت شاہ عبدالعزیز صاحبؒ نے ایک خط میں ان کو حجّۃ الاسلام کے لقب سے یاد کیا ہے، آپ کی تصانیف اور علم میں حضرت شاہ ولی اللہ صاحبؒ کے طرز کی جھلک نظر آتی ہے[1]، وہی علم کی تازگی، استدلال کی لطافت، نکتہ آفرینی، سلامت ذوق و قرآن و حدیث کا خاص تفقّہ اور استحضار اور زور کلام۔

شاہ صاحبؒ کی بڑی خصوصیت یہ ہے کہ آپ نے علماء اہل درس اور اہل ذکاوت کے اس دائرہ سے باہر قدم نکالا، جو برسوں بلکہ صدیوں سے اس گروہ کے لئے مقرر ہو چکا تھا، اور اصلاح و ارشاد عام اور جہاد و عزیمت کے دائرہ میں نہ صرف قدم رکھا، بلکہ اس میں قیادت کا فرض انجام دیا، ان کی تنہا تصنیف "تقویۃ الایمان" سے خلق خدا کو وہ فائدہ پہونچا اور عقائد کی ایسی اصلاح ہوئی کہ شاید کسی حکومت کی منظم کوشش سے مشکل سے ہوتی، حضرت مولانا رشید احمد صاحب گنگوہی فرماتے تھے کہ "مولوی اسماعیل صاحبؒ کی حیات ہی میں ڈھائی لاکھ آدمی درست ہو گئے تھے، اور ان کے بعد جو نفع ہوا، اس کا تو اندازہ

---

[1] ملاحظہ ہو "منصب امامت" "عبقات" "ایضاح الحق الصریح فی احکام المیت والضریح"

ہو ہی نہیں ہو سکتا"

عمومی دعوت و اصلاح کے اس عظیم کام کے ساتھ آپ نے جہاد فی سبیل اللہ کے لئے اپنے کو پورے طور پر تیار کیا، سید صاحبؒ کی (جن سے آپ نے بیعت سلوک و بیعت جہاد کی تھی) نہ صرف ہمرکابی اور رفاقت کا حق ادا کیا، بلکہ اس کام میں آپ کی حیثیت تحریک کے ایک قائد، اور امیر کے وزیر و نائب کی تھی، پھر اسی کام میں اپنی ہستی فنا کر دی اور بالاکوٹ کے معرکہ میں شہادت کا شرف حاصل کیا، اقبال نے ایسے ہی حضرات کے متعلق کہا ہے ؎

تکیہ بر حجّت و اعجاز بیاں نیز کنند   کارِ حق گاہ بشمشیر و سناں نیز کنند
گاہ باشد کہ تہِ خرقہ زرہ می پوشند   عاشقاں بندۂ حال اند و چناں نیز کنند

مولانا شاہ محمد اسحٰق صاحبؒ و شاہ محمد یعقوب صاحبؒ

شاہ صاحبؒ کے ذوق خاص، درس حدیث، اجازت و اسناد اور علوم دینیہ کی نشر و اشاعت میں آپ کے جانشین آپ کے دونوں نواسے حضرت شاہ محمد اسحٰقؒ (۱۱۹۷ھ-۱۲۶۲ھ) اور شاہ محمد یعقوبؒ (۱۲۰۰ھ-۱۲۸۲ھ) تھے، جو شاہ محمد افضل کے صاحبزادے تھے، حضرت شاہ عبدالعزیزؒ نے حضرت شاہ محمد اسحٰقؒ کو اپنا جانشین بنایا، اور اپنی تمام کتابیں اور گھر وغیرہ آپ ہی کو ہبہ کر دیا، آپ شاہ صاحبؒ کی وفات کے بعد ان کی مسندِ درس پر بیٹھے اور ۱۲۳۹ھ سے لے کر ۱۲۵۸ھ تک دہلی میں اور ۱۲۵۸ھ سے (جب آپ نے مکہ معظمہ ہجرت کی) ۱۲۶۲ھ تک حجاز مقدس میں حدیث کی تدریس و خدمت میں سرتاپا غرق و منہمک رہے، اور ہندوستان کے صدہا علماء نے آپ سے حدیث کا درس لیا، اور بڑے بڑے علماء

واساتذۂ حدیث نے بلاد وامصار سے آکر آپ سے استفادہ کیا اور حدیث کی سند لی جن میں شیخ عبداللہ سراج مکّی اور دوسرے کبار علماء شامل ہیں، حضرت شاہ عبدالعزیز صاحبؒ اس پر اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرتے تھے کہ اللہ نے ان کو شاہ محمد اسماعیل (بھتیجہ) اور شاہ محمد اسحٰق (نواسہ) کی شکل میں دو قوتِ بازو اور عصائے پیری عطا فرمائے، اور اکثر یہ آیت پڑھتے "اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ الَّذِی وَھَبَ لِی عَلَی الْکِبَرِ اِسْمٰعِیْلَ وَاِسْحٰقَ" دوشنبہ ۲۷ رجب ۱۲۶۲ھ مکہ معظمہ میں وفات پائی اور جنۃ المعلاۃ میں حضرت سیدہ خدیجہؓ کی قبر کے پاس دفن ہوئے[1]

شاہ محمد یعقوب صاحبؒ نے بھی دہلی میں ایک مدت تک درس وافادہ کا سلسلہ جاری رکھا، پھر اپنے بڑے بھائی شاہ محمد اسحٰق صاحبؒ کے ساتھ ۱۲۵۸ھ میں مکہ معظمہ ہجرت کی اور وہیں متوطّن ہو گئے، ان سے نواب سید صدیق حسن خاں قنوجیؒ (والی بھوپال)[2] حضرت مولانا سید خواجہ احمد حسنی نصیرآبادیؒ[3]، اور ایک خلق نے استفادہ کیا، جمعہ کے دن ۲۷ ذی قعدہ ۱۲۸۲ھ میں مکہ مکرمہ میں انتقال کیا، اور جنۃ المعلاۃ میں مدفون ہوئے۔

اجلّۂ علماء واساتذۂ کبار

حضرت شاہ عبدالعزیز صاحبؒ کے درس وتربیت وصحبت سے جن علماء نے

---

[1] حالات کے لئے ملاحظہ ہو "نزہۃ الخواطر" ۷۔ [2] نواب صاحب نے حدیث کی جو خدمت کی اور ان کی ذات سے کتب حدیث کی جو اشاعت ہوئی، ان کی توجہ اور سرپرستی سے ریاست بھوپال جس طرح درس حدیث کا ایک مرکز اور محدثین یمن کا مسکن وموطن بن گیا وہ ایک تاریخی حقیقت اور ان کا ایک کارنامہ ہے، پہلی بار فتح الباری کی طباعت واشاعت جو مطبع بولاق مصر سے ہوئی اور اس پر پچاس ہزار روپیہ کی رقم صرف ہوئی، علماء اور طلبائے علم حدیث پر احسان عظیم ہے، اور یہ شرف اولیت ان کو حاصل ہے۔ [3] آپ حضرت سید احمد شہیدؒ کے خاندان اور سلسلہ کے بلندپایہ مصلح، داعی الی اللہ اور خلفائے سلسلہ تھے، تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو "کاروان ایمان وعزیمت"۔

فائدہ اٹھایا، پھر اپنا حلقۂ درس قائم کر کے سارے ہندوستان میں نام پیدا کیا، اور دینی نظام تعلیم میں زندگی کی ایک نئی روح پھونک دی، پھر خود ان کے درس کے فیض سے کثیر التعداد جید علماء تیار ہو کر نکلے، ان میں سے چند کے نام یہاں لکھے جاتے ہیں، جو اپنی قوت و ملکۂ تدریس منقول و معقول کی جامعیت اور تبحّر علمی میں مشہور و مسلّم تھے، اور جو اپنی اپنی جگہ خود ایک مدرسہ اور دبستان تھے۔

(۱) مولانا مفتی الٰہی بخش کاندھلوی (۲) مولانا امام الدین دہلوی (۳) مولانا حیدر علی رامپوری ٹونکی (۴) مولانا حیدر علی فیض آبادی صاحبِ "منتہی الکلام" (۵) مولانا رشید الدین دہلوی (٦) مولانا مفتی صدرالدین دہلوی۔

ان کاملین علم و فن، اساتذۂ کبار اور ان سے بیشتر جن اہل دعوت و عزیمت اور تحریک اصلاح و تجدید اور جہاد فی سبیل اللہ کے قائدین کا نام آیا، جو شاہ صاحبؒ سے نسبت روحانی اور استفادۂ باطنی رکھتے تھے، ان سب کی وجہ سے کہا جا سکتا ہے کہ تیرہویں صدی حضرت شاہ عبدالعزیزؒ کے تعلیم و ارشاد اور تربیت افراد کی صدی تھی، "وَذٰلِكَ فَضْلُ اللّٰهِ يُؤْتِيْهِ مَنْ يَّشَآءُ"۔

شاہ صاحبؒ کے تذکرہ سے فارغ ہو کر جو سلسلۂ ولی اللّٰہی کے دائرہ کا نقطۂ مرکزی، اور ان کے صاحبزادگان اور تلامذہ کے سلک نور میں دُرّ شہوار (واسطۃ العقد) کی حیثیت رکھتے تھے، ہم شاہ صاحبؒ کے دوسرے دو صاحبزادوں حضرت شاہ رفیع الدینؒ اور حضرت شاہ عبدالقادرؒ کا اور شاہ صاحبؒ کے تین خلفائے کبار حضرت شاہ محمد عاشق پھلتیؒ، خواجہ محمد امین کشمیری اور سید شاہ ابوسعید حسنیؒ رائے بریلوی کا تذکرہ پیش کریں گے، جو "نزہۃ الخواطر" ج ۷، سے ماخوذ و مقتبس ہوگا۔

شاہ رفیع الدین دہلویؒ

شیخ امام، عالم کبیر، علامہ رفیع الدین عبدالوہاب بن ولی اللہ بن عبدالرحیم عمری دہلوی اپنے وقت کے مشہور محدث، متکلم، اصولی، مسند وقت، فرید عصر اور نادرۂ دہر تھے، دہلی میں ولادت اور نشو و نما ہوئی، اور اپنے برادر اکبر شاہ عبدالعزیز صاحبؒ سے تحصیل علم کی اور ایک مدت تک ان کے ساتھ رہے، طریقت میں شاہ محمد عاشق بن عبیداللہ پھلتی سے استفادہ کیا، اور بیس سال کی عمر میں علم و افتاء اور درس میں امتیاز و شہرت حاصل کی، اپنے برادر مذکور کی زندگی ہی میں آپ نے تصنیف و تالیف کا سلسلہ شروع کر دیا تھا، اور اکابر علماء میں شمار ہونے لگے تھے، شاہ صاحبؒ کے آنکھوں سے معذور ہونے کے بعد درس و تدریس کا کام آپ نے سنبھال لیا، طلبہ کا ہجوم ہوا اور انھوں نے بقدر استعداد آپ کے علمی افادات سے فائدہ اٹھایا، علمائے آفاق نے آپ کے علم و فضل کا اعتراف کیا، اور آپ کی تصانیف نے قبولیت و شہرت حاصل کی، آپ کے برادر معظم شاہ عبدالعزیز صاحبؒ نے شیخ احمد بن محمد شروانی کو شاہ رفیع الدین صاحبؒ کے بارے میں لکھا تھا:۔

> "اب برادر یگانہ اور خلیق زمانہ کا وقت ہے، جو نسبًا میرے حقیقی بھائی ہیں، اور فنون علم و ادب میں (جن کا لوگ مجھ سے انتساب کرتے ہیں) میرے شریک ہیں، وہ عمر میں مجھ سے کچھ ہی چھوٹے ہیں، مگر فن و حکمت میں میرے برابر ہیں، اللہ تعالٰی نے اپنی مہربانی سے ان کی پرورش میرے ہاتھوں کی اور ان کی تکمیل کا مجھے ذریعہ بنا کر مجھ پر احسان کیا، وہ چند دنوں کے سفر کے بعد

واپس آئے تو مجھے ایک مختصر مگر قیمتی رسالہ کا تحفہ دیا، جو ایسے لطائف و نکات پر مشتمل ہے، جن میں وہ منفرد ہیں اور ان سے پہلے انھیں کسی نے نہیں لکھا اُن کی یہ انفرادیت آیت نور کی تفسیر اور اس کے اندر پوشیدہ معانی کی رونمائی کے سلسلہ میں ہے، میں پورے یقین کے ساتھ کہتا ہوں کہ اس باب میں ان کے بیانات ایسے حیرت انگیز ہیں، جن کے ذریعہ انھوں نے مغز سخن کو ظاہر کر دیا اور دلوں کے چراغ روشن کر دیئے اور اپنے اسلوب کی انفرادیت سے سعید روحوں کو تازہ دم کر دیا ہے۔"

شیخ محسن بن یحییٰ ترہتی "الیانع الجنی" میں فرماتے ہیں:۔

"ان مروّجہ علوم کے علاوہ شاہ صاحبؒ کو علوم اوائل میں بھی مہارت تامّہ حاصل تھی، جو ان کی طرح بہت کم اہل علم کے حصہ میں آتی ہے، ان کی تصانیف بہت عمدہ اور منقّح ہیں، ———— میں نے بعض کتابیں دیکھیں تو آپ کی علمی و فنّی عبارتوں میں ایسے اسرار و رموز نظر آئے جن کے رمز آشنا کم ہی ہوتے ہیں، تھوڑے سے لفظوں میں آپ بہت سے مسائل جمع کر دیتے ہیں جس سے آپ کی علمی گہرائی اور دقّت فہم کا اندازہ ہوتا ہے، آپ کی کتاب "دمغ الباطل" علم حقائق کے بعض مشکل مسائل پر مشتمل ہے جس کی اہل فن نے تعریف کی ہے، آپ کا ایک مختصر و جامع رسالہ اور ہے، جس میں آپ نے ہر چیز میں محبت کی کارفرمائی دکھائی ہے، اور اس کی وضاحت کی ہے، اس کا نام "اسرار المحبۃ" ہے، ایسے بہت کم لوگ ملیں گے جنھوں نے اس موضوع پر اظہار خیال کیا ہو، میرے خیال میں آپ سے پہلے اس موضوع پر

صرف دو فلسفیوں، ابو النصر فارابی اور بو علی سینا نے لکھا ہے، جیسا کہ نصیر الدین طوسی کی بعض کتابوں سے معلوم ہوتا ہے۔"

شیخ محسن کی ذکر کردہ کتابوں کے علاوہ بھی ان کی کتابیں ہیں، جن میں عروض میں ایک رسالہ، مقدمہ علم تاریخ، اثبات شق القمر، حکماء کے اصول پر براہین حکمیہ کے ابطال، تحقیق الوان، آثار قیامت، حجاب، برہان تمانع، عقد انامل، اربعین کافات کی شرح، منطق، امور عامہ پر بھی آپ کے رسالے ہیں، رسالہ میر زاہد پر حاشیہ بھی لکھا ہے۔

آپ کی کتابوں میں "تکمیل الصناعۃ" ایسی عجیب کتاب ہے کہ بہت کم مصنفین کو ایسی کتاب لکھنے کا اتفاق ہوا ہوگا، ان کے علاوہ بھی آپ کی متعدد بلند پایہ کتابیں ہیں، اپنے والد ماجد کے بعض عربی قصائد کی آپ نے تخمیس بھی کی ہے، ان کے عربی اشعار کا نمونہ یہ ہے:۔

یا احمد المختار یا زین الوریٰ　　یا خاتما للرسل ما اعلاکا

یا کاشف الضراء من مستنجد　　یا منجیاً فی الحشر من والاکا

هل کان غیرک فی الأنام من استوی　　فوق البراق وجاوز الأفلاکا　الخ

ان کا ایک اور فصیح و بلیغ قصیدہ ہے جس سے علوم عقلیہ میں ان کی بلندی اور عربی پر قدرت کا پتہ چلتا ہے آپ نے اس میں بو علی سینا کے قصیدہ "عینیہ" کا جواب لکھا ہے، جو "قصیدۃ الروح" کہلاتا ہے، اور جس کا مطلع ہے ؎

هبطت الیک من المحل الارفع　　ورقاء ذات تعزز و تمنع

یہ قصیدہ ابن سینا کی عربی زبان پر قدرت، بیک وقت حلاوت و سلاست اور شکوہ الفاظ کا مظہر ہے، ہر شخص کا کام نہیں تھا کہ اس کا جواب دے، حضرت شاہ

رفیع الدین صاحبؒ نے اس کا جواب لکھا ہے، جس سے آپ کی قادر الکلامی اور عربیت کا اظہار ہوتا ہے آپ کے قصیدہ کا مطلع ہے ؎

عجبا الشیخ فیلسوف ألمعی خفیت لعینیہ منارۃ مشرع[1]

آپ نے اپنے برادر بزرگ شاہ عبدالعزیزؒ کی حیات ہی میں ۶؍ شوال ۱۲۳۳ھ کو دہلی میں وفات پائی اور شہر کے باہر اپنے والد ماجد و جدّ امجد کے پاس دفن ہوئے۔[2]

شاہ عبدالقادر دہلویؒ

شیخ امام، عالم کبیر و عارف شہیر شاہ عبدالقادر بن شاہ ولی اللہ بن شاہ عبدالرحیم عمری دہلوی علوم الٰہیہ کے ممتاز علماء میں تھے، آپ کی ولایت و جلالت پر لوگوں کا عام اتفاق ہے، جب آپ کے والد ماجد کی وفات آپ کے بچپن میں ہو گئی تو آپ نے اپنے برادر بزرگ شاہ عبدالعزیز صاحبؒ سے تحصیل علم کیا، اور شاہ عبدالعدل دہلویؒ سے طریقت کی تعلیم پائی اور علم و عمل، زہد و تواضع، اور حسن سلوک میں امتیاز کے مالک ہوئے، ان فضائل کے سبب اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں کے دلوں میں آپ کی محبت پیدا کر دی اور آپ اپنے شہر میں مرجع عام بن گئے اور علم روایت و درایت، اصلاح نفس، اور روحانی تربیت میں آپ سے رجوع کیا جانے لگا۔

آپ درس و افادہ میں مشغول اور دہلی کی اکبر آبادی مسجد میں مقیم رہتے تھے آپ سے مولانا عبدالحیؒ بن ہبۃ اللہ بڑھانوی، مولانا محمد اسماعیلؒ بن شاہ عبدالغنی دہلویؒ، مولانا فضل حق بن

---

[1] علامہ نعمان آلوسی بغدادی کی "جلاء العینین" میں دونوں قصیدے ملاحظہ ہوں صـ۱۵۲-۱۴۸ شاہ صاحبؒ کا قصیدہ ایک سو سولہ (۱۱۶) اشعار کا ہے۔ [2] نزہۃ الخواطر جلد سابع صـ۱۸۲-۱۸۶

فضل امام خیر آبادی، مرزا حسن علی شافعی لکھنوی، شاہ اسحٰق بن شاہ افضل عمری دہلوی (مدفون مکہ مکرمہ) مولانا سید محبوب علی جعفری، مولانا سید اسحٰق بن عرفان رائے بریلوی (برادر معظم حضرت سید احمد شہیدؒ) اور بہت سے لوگوں نے استفادہ کیا۔

آپ پر اللہ تعالیٰ کی سب سے بڑی عنایت یہ تھی کہ آپ کو ہندوستانی زبان میں قرآن کریم کے ترجمہ و تفسیر کی توفیق ملی، علماء نے اس کی بڑی قدر دانی کی اور اسے معجزاتِ نبویؐ میں سے ایک معجزہ قرار دیا، والد ماجدؒ نے "مہر جہاں تاب" میں لکھا ہے کہ "شاہ عبدالقادرؒ نے یہ ترجمہ لکھنے سے پہلے خواب دیکھا تھا کہ آپ پر قرآن نازل ہوا، اسے آپ نے اپنے بھائی شاہ عبدالعزیزؒ سے بیان کیا تو انھوں نے فرمایا کہ یہ سچا خواب ہے، مگر چونکہ اب نبی صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بعد سے وحی آنے کا سلسلہ موقوف ہوگیا ہے، تو اس کی تعبیر یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ تم سے قرآن کی بے مثال خدمت لے گا" چنانچہ یہ بشارت "موضح القرآن" کی صورت میں پوری ہوئی۔

اس کی خصوصیات میں سے یہ ہے کہ انھوں نے زبان کے مقابلہ میں ایسی زبان اختیار کی ہے جس میں عموم و خصوص اور اطلاق و تقیید اور محل استعمال کا پورا لحاظ ہے، یہ اللہ کی ایسی عنایت ہے جس کے لئے وہ چند ہی لوگوں کو مخصوص کرتا ہے۔[1]

---

[1] مختلف مثالوں سے یہ ثابت کیا جا سکتا ہے کہ شاہ صاحبؒ کو عربی زبان و ادب کا جیسا صحیح ذوق اور قرآنی الفاظ کی روح اور طاقت اور منشاء کے مطابق اردو کے الفاظ کے انتخاب میں جو کامیابی حاصل ہوئی ہے، اس کی نظیر کم سے کم ہندوستان میں نہیں ہے، اور بعض مقامات پر وہ علامہ زمخشری و راغب اصفہانی جیسے علمائے بلاغت و ائمہ لغت سے بھی بڑھ جاتے ہیں، تائید الٰہی، اعلیٰ درجہ کے اخلاص اور وہبی ادبی اور لسانی صحیح ذوق کے سوا کسی چیز سے اس کی توجیہ نہیں کی جا سکتی۔ (مصنف)

میں نے "موضح القرآن" کی سماعت و روایت اپنی نانی صاحبہ سیدہ حمیراء بنت شاہ علم الہدیٰ حسنی نصیر آبادی سے کی ہے جنھوں نے شاہ عبدالقادر صاحبؒ کی صاحبزادی سے روایت کی ہے اور جنھوں نے اپنے والد ماجد سے روایت کی تھی، آپ کی وفات چہارشنبہ ۱۹ رجب ۱۲۳۰ھ میں ہوئی اور اپنے والد کے پاس دفن ہوئے، اس وقت شاہ عبدالعزیز صاحبؒ اور شاہ رفیع الدین صاحبؒ حیات تھے، اس لئے قدرتی طور پر انھیں بہت صدمہ ہوا، وہ حضرات ان کے دفن کے وقت یہ کہہ رہے تھے کہ "ہم ایک انسان کو نہیں بلکہ سراپائے علم و عرفان کو دفن کر رہے ہیں۔"

یہ عجائبات زمانہ میں سے ہے کہ شاہ ولی اللہ صاحبؒ کے چار صاحبزادے ارادت خاتون بنت سید ثناء اللہ سے تھے جن میں بڑے شاہ عبدالعزیز صاحبؒ پھر شاہ رفیع الدین صاحبؒ پھر شاہ عبدالقادر صاحبؒ پھر سب سے چھوٹے شاہ عبدالغنی صاحبؒ (مولانا اسمٰعیل شہیدؒ کے والد) تھے، مگر سب سے پہلے چھوٹے بھائی شاہ عبدالغنی صاحبؒ کی وفات ہوئی پھر ان کے بعد شاہ عبدالقادر صاحبؒ کی، پھر شاہ رفیع الدین صاحبؒ کی، پھر شاہ عبدالعزیز صاحبؒ کی وفات ہوئی، یہ سب بھائی علم و عمل، افادہ و فیض رسانی میں (شاہ عبدالغنی صاحبؒ کے سوا، کیونکہ ان کی وفات عنفوان شباب میں ہو گئی تھی) فضلائے زمانہ میں ممتاز تھے، شاہ عبدالغنی صاحبؒ کے صاحبزادہ گرامی قدر حضرت مولانا اسماعیل شہیدؒ کو اللہ نے ایسی توفیق عطا کی جس سے انھوں نے اپنے والد ماجد کی طرف سے پوری تلافی کر دی[1]۔

شاہ محمد عاشق پھلتی

عالم کبیر و محدث جلیل مولانا شاہ محمد عاشق بن عبیداللہ بن محمد صدیقی پھلتی،

---

[1] نزہۃ الخواطر ج ۷، ص ۲۹۵-۲۹۶

کبار مشائخ میں سے تھے' آپ کا نسب حضرت محمد بن ابی بکر صدیقؓ تک اکیس۲۱ واسطوں سے پہونچتا ہے' بچپن ہی سے تحصیل علم میں مشغول ہوئے' اور شیخ اجل حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ کی صحبت اختیار کی' (جو آپ کے پھوپھی زاد بھائی تھے) اُن سے آپ نے علم و معرفت حاصل کی' اور ان کے ساتھ ۱۱۴۳ھ میں حرمین شریفین کا سفر بھی کیا اور حج و زیارت سے مشرف ہوئے' اور اساتذۂ حرمین سے اخذ و استفادہ میں آپ کے ساتھ شریک رہے' جن میں شیخ ابوطاہر محمد بن ابراہیم کردی مدنی امتیاز خاص رکھتے ہیں' شیخ ابوطاہر نے ان کو اجازت بھی دی۔

شاہ ولی اللہ صاحبؒ کے اصحاب میں آپ علم و معرفت کے لحاظ سے سب پر فائق تھے' اس طرح آپ شاہ صاحب دہلویؒ کے محرمِ اسرار ہو گئے، جیساکہ شیخ ابوطاہرؒ نے اپنے اجازت نامہ میں ان کے بارے میں لکھا ہے کہ "یہ اُن (شاہ ولی اللہؒ) کے کمالات کا آئینہ اور خصالِ جمیلہ کا نمونہ ہیں" ان کے استاد حضرت شاہ ولی اللہؒ نے انھیں مخاطب کرتے ہوئے فرمایا تھا ؎

یحدثنی نفسی بأنک واصل إلی نقطۃ قصوا و وسط المراکز
وأنک فی تیک البلاد مفخم بکفیک یوماً کل شیخ وناھز

(میرا دل کہتا ہے کہ تم علمی مرکزوں کے مقامِ بلند پر فائز ہو گے اور ان شہروں میں محترم ہو گے اور چھوٹا بڑا تمہارا تابع ہو گا۔)

دوسری جگہ کہتے ہیں ؎

وان یک حقاہ اعلمت فانہ سیلقی إلیک الامر لابد سابغا
سیاتیک أمرلا یطاق بھاءہ إلی کل سرلا محالۃ بالغا

وثلج وبرد یجمعان شتاتکم　　یزیلان ھمانی فؤادک لاذعا

(اگر میرا یقین صحیح ہے تو سررشتہ تمہارے ہاتھ آئے گا، اور تمہیں وہ نور حاصل ہوگا جس سے نگاہیں خیرہ ہو جائیں گی اور وہ ہر راز کو افشا کر دے گا، اور شرح صدر سے وہ جمعیت خاطر حاصل ہو گی جو تمہارا غم غلط کر دے گی۔)

شرح دعائے اعتصام کی تقریظ میں شاہ صاحبؒ نے لکھا تھا ؎

لیھنك ما أوتیت ذروۃ حقہ　　من الفحص والتفتیش والفہم والفکر

ویھنك عن طی العلوم ونشرھا　　ونظمك أصناف الجواھر والدر

وحفظك للرمز الخفی مکانہ　　وغوصك بحراز اخرا أیما بحر

فللہ ما أوتیت من حل المنی　　وللہ ما أعطیت من عظم الفخر

(علم وتحقیق اور فکر ونظر کی بلندیوں پر فائز ہونا مبارک ہو، اور علوم کی تحقیق و اشاعت اور علم کے ہیرے موتیوں کی تنظیم و ترتیب بھی مبارک ہو، نیز رمز مخفی کی حفاظت اور علم و عمل کے بحر زخار کی غواصی و شناوری تمہیں یہ مرادیں اللہ ہی کی طرف سے ملی ہیں، اور مفاخر کا سرمایہ بھی اللہ ہی کا عطیہ ہے۔)

ان سے شاہ عبدالعزیزؒ اور ان کے بھائی شاہ رفیع الدینؒ اور سید ابوسعید رائے بریلویؒ اور ایک خلق نے استفادہ کیا، ان کی کتابوں میں "سبیل الرشاد" فارسی میں تصوف کی ایک بسوط کتاب ہے، دوسری کتاب "القول الجلی فی مناقب الولی" ان کے شیخ حضرت شاہ ولی اللہؒ کے حالات میں ہے، "دعائے اعتصام" حقائق و معارف میں حضرت شاہ صاحبؒ کی کتاب کی شرح، ان کی سب سے بڑی کتاب "تبییض المصفیٰ شرح المؤطا" ہے جو شاہ صاحبؒ کی کتاب "مصفی" سے

متعلق ہے ۱۱۸۷ھ میں انتقال کیا جیسا کہ سید ابو سعید رائے بریلویؒ کے نام حضرت شاہ عبدالعزیزؒ کے گرامی نامہ سے معلوم ہوتا ہے۔

خواجہ محمد امین کشمیری ولی اللّٰہی

حضرت شاہ ولی اللہ صاحبؒ کے ان چار خلفاء و مسترشدین کبار میں سے جن سے ان کے سلسلۂ تعلیمات اور مقاصد کی اشاعت و تبلیغ ہوئی، ان کے ایک اہم شاگرد خلیفہ خواجہ محمد امین کشمیری بھی تھے، مولانا حکیم سید عبدالحی رحمۃ اللہ علیہ "نزہۃ الخواطر" میں ان کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ "وہ اصلاً کشمیر سے تعلق رکھتے تھے لیکن دہلی میں سکونت تھی، وہ شاہ صاحبؒ کے اجلّۂ اصحاب میں تھے، اپنے شیخ کی طرف اپنی نسبت کرتے تھے، اور ولی اللّٰہی لکھتے اور کہلاتے تھے، ان کے امتیاز و شرف کے لئے اتنا کافی ہے کہ شاہ عبدالعزیز صاحبؒ نے شاہ صاحبؒ کی وفات کے بعد ان سے علوم کی تکمیل کی جیسا کہ خود شاہ عبدالعزیز صاحبؒ نے اپنے رسالہ "عجالۂ نافعہ" میں اس کی صراحت کی ہے، ان کے اعزاز و امتیاز کی دوسری دلیل یہ ہے کہ حضرت شاہ ولی اللہ صاحبؒ نے ان کے لئے خصوصی طور پر بعض رسائل تصنیف فرمائے، حضرت شاہ عبدالعزیز صاحبؒ کے اس مکتوب گرامی سے جو انھوں نے حضرت شاہ ابو سعید رائے بریلوی کے نام بھیجا ہے۔

لہ مولانا عبیداللہ صاحب سندھی مرحوم اپنی کتاب "التمہید" (حصۂ اردو) میں لکھتے ہیں :-
"شاہ صاحبؒ کے مکمل نظریہ کو سمجھنے والوں میں چار رفقاء سے زیادہ نہیں ہیں (۱) ان کے ماموں زاد بھائی شاہ محمد عاشق (۲) جمال الدین شاہ محمد امین ولی اللّٰہی کشمیری (۳) شاہ نوراللہ بڈھانوی (۴) شاہ ابو سعید بریلوی" (شاہ ولی اللہ اور ان کی سیاسی تحریک از مولانا عبیداللہ سندھی ص۱۴۳-۱۴۴)
اصحاب ثلاثہ شیخ محمد عاشق پھلتی، خواجہ محمد امین کشمیری ولی اللّٰہی اور شاہ ابو سعید صاحب رائے بریلوی کا ذکر مستقل طور پر آیا ہے، چوتھے صاحب شیخ نوراللہ صدیقی بڈھانوی حضرت شاہ ولی اللہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے خصوصی تلامذہ میں تھے، اور شاہ صاحب کی زندگی ہی میں اُن کو امتیازی شہرت حاصل ہوگئی تھی، اور حضرت شاہ عبدالعزیز صاحبؒ نے جوان کے داماد بھی تھے ان سے فقہ کی کتابیں پڑھیں ۱۱۸۷ھ کے قریب ان کی وفات ہوئی۔
(نزہۃ الخواطر جلد ۶)

پتہ چلتا ہے کہ ان کا انتقال ۱۱۸۰ھ میں یا اس کے آس پاس ہوا، اس لئے کہ حضرت سید شاہ ابوسعید صاحبؒ ربیع الاول ۱۱۸۰ھ میں عازم حج ہوئے تھے اور ۱۱۸۰ھ میں ان کی مراجعت ہوئی اور شاہ صاحبؒ کا یہ خط ان کی واپسی پر ملا۔[1]

خواجہ محمد امین کشمیری کی خصوصیت اس سے بھی معلوم ہوتی ہے کہ "کلمات طیبات" میں شاہ صاحب کے ان کے نام چار اہم مکتوب ہیں جو دقیق حقائق و معارف پر مشتمل ہیں۔[2]

ان چار خلفائے عظام کے علاوہ شاہ صاحب کے بعض دوسرے خلفاء بھی تھے، جن کے حالات تفصیل سے نہیں ملتے، ان میں ایک حافظ عبدالنبی معروف بہ عبدالرحمٰن بھی تھے، جن سے شاہ صاحب کا خصوصی تعلق معلوم ہوتا ہے۔[3]

شاہ ابوسعید حسنی رائے بریلویؒ

سید والا تبار ابوسعید بن محمد ضیاء بن آیت اللہ بن شیخ اجل علم اللہ نقشبندیؒ بریلوی، علمائے ربانیین میں سے تھے، رائے بریلی میں ولادت اور نشو ونما ہوئی، اور ملا عبداللہ امیٹھوی سے تعلیم حاصل کی، پھر اپنے چچا سید محمد صابر بن آیت اللہ نقشبندیؒ سے بیعت ہوئے اور صوفیہ کے اذکار و اشغال میں ایک مدت تک مصروف رہے، اس کے بعد دہلی جا کر حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ کے پاس رہ کر ان سے استفادہ کیا اور ان کی وفات کے بعد ضرورت کا احساس کر کے شاہ صاحبؒ کے شاگرد شیخ محمد عاشق بن عبیداللہ پھلتی سے بھی استفادہ کیا، شاہ محمد عاشق صاحبؒ نے آپ کے

---

[1] نزہۃ الخواطر ج ۶ ص ۲۸۶ [2] کلمات طیبات ص ۱۶۱-۱۶۷

[3] ملاحظہ ہو رسالہ برہان مقالہ مسعود انور صاحب علوی ایم۔ اے علیگ شمارہ ستمبر و اکتوبر ۱۹۸۳ء۔

اجازت نامہ میں لکھا ہے:۔

"سید تقی و نقی، عارف باللہ، قابل تعریف ولی میر ابوسعید ہمارے شیخ ولی اللہ محدث کے ساتھ رہے ہیں، اور ان سے بعض اشغالِ طریقت معلوم کرکے ان پر مداومت کی ہے، حتیٰ کہ ان پر شیخ کی توجہ کی برکت سے ظاہری و باطنی لطائف و اسرار کے دروازے کھل گئے، اور ان کی شخصیت میں صوفیہ کے احوال و آثار ظاہر ہوئے اور انھیں وہ "شہود" حاصل ہوا جو صوفیہ کا مقصود ہے۔"

آگے تحریر فرماتے ہیں:۔

"پھر جب حضرت شیخ نے دارِ رضوان کو انتقال فرمایا تو انھیں خیال ہوا کہ سلسلۂ نقشبندیہ، قادریہ، چشتیہ وغیرہ کے بقیہ اشغال فقیر سے حاصل کریں، اور صوفیہ کے متوارث طریقہ میں داخل ہوں، میں نے ان کی طلب دیکھ کر حدیث "الجام" کے خوف سے حصول مقصد میں ان کی مدد کی اور ان اشغال کی تلقین کی، اور جب ان میں ان کے آثار و انوار کا مشاہدہ کیا اور ان کی پختگی کا اندازہ کرلیا، تو استخارہ کے بعد انھیں طالبین و سالکین کی رہنمائی کی اجازت دی، اور انھوں نے تمام طریقوں میں بیعت کی، اور انھیں "خرقۂ فقریہ فخریہ" انابت و اجازت کے طور پر پہنایا، جیسا کہ ہمارے شیخ نے ہمیں پہنایا تھا، اور اس کی اجازت دی تھی، اور جیسا کہ شیخ عبید اللہ نے ہمیں اپنے آباء و مشائخ کرام کے ذریعہ حاصل ہونے والے لباس اور اجازت سے نوازا تھا، اس کے ساتھ میں نے انھیں تفسیر و حدیث، فقہ و تصوف کے درس کی (بشرط مطالعہ و مراجعت شروح) اور

نحو وصرف کے درس کی اجازت دی، نیز جائز ضرورتوں کے وقت تعویذ اور اعمال مشائخ کی اجازت دی" القول الجمیل فی بیان سواء السبیل" "الانتباہ فی سلاسل اولیاء اللہ" میں مندرج تمام اعمال واشغال کی اجازت دی۔"

سید شاہ ابو سعیدؒ ایک باوقار، کریم النفس، کثیر الاحسان، مہمان نواز، غریب پرور بزرگ تھے، رفقاء کے ساتھ آپ نے حجاز کا سفر کیا اور ۲۸ ربیع الاول ۱۱۸۶ھ کو مکہ مکرمہ پہونچے اور حج سے مشرف ہوکر مدینہ منورہ حاضر ہوئے اور وہاں چھ ماہ مقیم رہے اور "مصابیح" کی شیخ ابوالحسن سندھی صغیر سے سماعت کی، ایک بار آپ مرقد نبویؐ (صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے پاس بیٹھے ہوئے تھے، آپؒ کو دیکھا کہ حجرۂ مبارکہ سے باہر جلوہ افروز ہیں، پہلے آپؐ کے دوش مبارک ظاہر ہوئے، پھر جسد مطہر ظاہر ہوا اور آنحضرتؐ سامنے تشریف فرما ہوکر متبسّم ہوئے، آپ کے مرید ومجاز شیخ امین بن حمید علوی کاکوروی اپنے رسالہ میں لکھتے ہیں کہ :۔

"شیخ ابو سعیدؒ فرماتے تھے کہ میں نے رسول اللہ صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کو مدینہ منورہ میں بچشم سر دیکھا ہے۔"

پھر آپ مکہ مکرمہ واپس ہوئے اور "جزریہ" شیخ محمد میر داد انصاری سے پڑھی، پھر طائف ہوتے ہوئے، ہندوستان آئے اور "مدراس" میں داخل ہوئے، اور وہاں ایک مدت تک قیام کیا اور مقبولیت حاصل کی، اور آپ سے بہت سے لوگ مستفید ہوئے ان میں الحاج امین الدین بن حمید الدین کاکوروی، مولانا عبدالقادر خاں خالص پوری، میر عبدالسلام بدخشی، شیخ میر داد انصاری مکی، مولانا جمال الدین بن محمد صدیق قطب، مولانا عبداللہ آفندی، اور شیخ عبداللطیف حسینی مصری، اور بہت سے دوسرے

لوگ تھے، ۹ رمضان ۱۱۹۳ھ کو رائے بریلی میں وفات پائی اور وہیں سپرد خاک ہوئے۔[1]

ایک نامور معاصر و مصلح شیخ محمد بن عبد الوہاب

حضرت شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ کے ایک نامور معاصر اور عظیم مصلح نجد کے ایک ممتاز عالم اور صاحبِ عزیمت داعی و مصلح شیخ محمد بن عبد الوہاب بن سلیمان التمیمی، الحنبلی، (۱۱۱۵-۱۲۰۶ھ) (۱۷۰۳-۱۷۹۲ء) ہیں، وہ سنہ ولادت کے لحاظ سے شاہ صاحبؒ کے متقارب السن،[2]

---

[1] واضح رہے کہ آپ حضرت سید احمد شہیدؒ کے حقیقی نانا تھے، خاندان ولی اللہی سے آپ کے تعلقات کی نوعیت، اور آپ کی خصوصیت و عظمت کا اندازہ ان خطوط سے ہوتا ہے، جو شاہ اہل اللہ (برادر حضرت شاہ ولی اللہ) مولانا نور اللہ، حضرت شاہ محمد عاشقؒ، اور حضرت شاہ عبد العزیزؒ نے آپ کے نام بھیجے ہیں، اور جن میں خاندانی حوادث اور پیش آنے والے واقعات کی اطلاع، نیز آپ کے بلند مقام اور کمالات کا اعتراف ہے، یہ مجموعہ مولوی سید ابو القاسم صاحبؒ ہنسوی کا مرتب کیا ہوا "مکتوب المعارف" کے نام سے خاندانی ذخیرۂ کتب میں محفوظ ہے، آپ ہی کے حقیقی چچا زاد بھائی مولانا سید محمد واضح حسنی کو بھی حضرت شاہ ولی اللہؒ کی طرف سے اجازتِ عامہ تھی اور شاہ صاحبؒ ان کا بلند الفاظ میں ذکر فرماتے ہیں۔

(ملاحظہ ہو مکتوب مشمولہ مکتوبات قلمی عثمانیہ یونیورسٹی لائبریری حیدر آباد ص ۱۵۰)

[2] شاہ صاحبؒ کی ولادت ۱۱۱۴ھ کی ہے، اس طرح آپ شیخ سے ایک سال بڑے تھے۔

اور سنہ وفات کے لحاظ سے ان سے تیس۳۰ سال متاخر ہیں، معاصر ہونے اور متعدد مابہ الاشتراک باتوں کے باوجود، ملاقات تو بجائے خود ایک کی دوسرے سے واقفیت کا بھی ابھی تک کوئی سراغ نہیں ملا، حضرت شاہ صاحب[رح] ۱۱۴۳ھ میں حج کے لئے گئے اور ایک سال سے کچھ زیادہ حجاز میں قیام فرمایا، یہ وہ زمانہ ہے کہ شیخ محمد بن عبدالوہاب کی دعوت و تحریک نجد کے علاقہ عُیینہ و درعیہ وغیرہ میں محدود تھی، امیر محمد بن سعود نے اس وقت تک نہ شیخ سے بیعت کی تھی اور نہ ان دونوں کے درمیان (دعوت کی نشر و اشاعت اور اس کی بنیاد پر حکومت کے قیام اور اس کی تائید کا) کوئی معاہدہ اور سمجھوتہ ہوا تھا، یہ معاہدہ ۱۱۵۸ھ میں ہوا اور اس کے نتیجہ میں درعیہ دعوت کا مرکز اور ایک دینی دارالحکومت بنا، شیخ کی دعوت کا حجاز میں اس وقت تعارف اور اثر و نفوذ پیدا ہوا جب ۱۲۱۸ھ میں (شیخ کی وفات کے بارہ۱۲ سال اور شاہ صاحب[رح] کی وفات کے بیالیس۴۲ برس بعد) مکہ معظمہ پر آل سعود کا قبضہ ہوا۔

شیخ محمد بن عبدالوہاب کی دعوت و جدّ و جہد کا اصل دائرہ توحیدِ خالص کی دعوت و تبلیغ، ردّ شرک، و استیصال رسوم جاہلیت (جس کے بعض مظاہر و شعائر کا بُعدِ زمانہ، جہالت، اور علماء کی غفلت سے جزیرۃ العرب کے مشرقی حصہ کے بعض علاقوں اور قبائل میں ظہور ہوگیا تھا[۱]) توحید الوہیت و توحید ربوبیت کا فرق اور خدا کی طرف سے جس توحید کا اپنے بندوں سے مطالبہ اور قرآن مجید میں

---

[۱] تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو مولانا مسعود عالم ندوی کی کتاب "محمد بن عبدالوہاب ایک مظلوم اور بدنام مصلح" (مطبوعہ مکتبۂ نشأت ثانیہ حیدر آباد) نیز عربی کی وہ کتابیں جو شیخ کے حالات میں لکھی گئیں اور ان کی فہرست طویل ہے۔

اس کی صریح دعوت ہے، اس کی وضاحت و تنقیح تھی[۱]، اس بارے میں شیخ کو جو کامیابی ہوئی اس کی مثال پچھلے دور کے مصلحین میں ملنی مشکل ہے، اگرچہ بقول ڈاکٹر احمد امین، اس میں اس کو بہت دخل تھا کہ اس کی بنیاد پر ایک حکومت، (حکومت سعودیہ) قائم ہوئی، اور اس نے اس دعوت کو اپنا لیا، اور اس کی سرپرستی کی[۲]، لیکن بہرحال یہ حقیقت ہے کہ شیخ نے اس سلسلہ میں ایک انقلابی مصلح کا کردار ادا کیا، اور خواہ کسی صاحبِ علم کو ان کے افکار، دعوت پیش کرنے کے طریقہ و لہجہ اور طرزِ عمل سے سو فیصدی اتفاق نہ ہو، اس دعوت کی افادیت، اثر انگیزی اور ان خاص حالات میں اس کی ضرورت سے انکار نہیں ہو سکتا۔

عقیدۂ توحید کی توضیح و تنقیح، قرآن مجید سے اس کے ثبوت، اور توحید الوہیت و توحید ربوبیت کے درمیان فرق کا جہاں تک تعلق ہے، اس میں حضرت شاہ صاحبؒ اور شیخ محمد بن عبدالوہابؒ کے خیالات و تحقیقات میں بڑی مماثلت نظر آتی ہے، جو قرآن مجید کے عمیق اور براہ راست مطالعہ و تدبّر اور کتاب و سنّت سے گہری واقفیت کا نتیجہ ہے، اور جس نے اپنے زمانہ میں شیخ الاسلام ابن تیمیہؒ اور اپنے اپنے زمانہ میں دوسرے محققین و مصلحین کو مماثل نتائج پر پہونچایا اور ان کو واضح اور دو ٹوک دعوت توحید کی اشاعت و تبلیغ پر آمادہ کیا۔

لیکن شاہ صاحبؒ کا دائرۂ عمل اور ان کے اصلاحی و تجدیدی کام کا میدان اس سے کہیں زیادہ وسیع ہے، اس میں علوم اسلامیہ کا احیاء، فکر اسلامی کی تجدید،

---

[۱] ملاحظہ ہو شیخ کا شہرۂ آفاق رسالہ "التوحید الذی هو حق الله على العبيد"

[۲] ملاحظہ ہو "زعماء الاصلاح فی العصر الحدیث" ترجمہ شیخ محمد بن عبدالوہاب۔

اسرار و مقاصدِ شریعت کی نقاب کشائی، شریعت اور تعلیماتِ اسلامی کو مربوط و مکمل شکل میں پیش کرنے کا علمی کارنامہ، علمی جمود اور مذاہبِ فقہیہ کے تعصّب کی اصلاح، تطبیق بین العقل والنقل اور توفیق بین المذاہب الفقہیہ کا مجتہدانہ کام، ہندوستان میں اسلامی اقتدار کی حفاظت کی سعی، حدیث کا عمیق مطالعہ اور اس کی نشر و اشاعت کی مجدّدانہ کوشش، تزکیۂ نفس اور حصولِ درجۂ احسان کی دعوت اور اس کی تعلیم اور مردان کار کی تربیت شامل ہے، اسی کے ساتھ شاہ صاحبؒ کے یہاں (اقبالؔ کے الفاظ میں) "حجازی ریگزار" (توحیدِ خالص کی مضبوط زمین) میں زمزم کا چشمۂ شیریں (محبّت و لینت کی جوئے شیر) بھی ہے، جو شاہ صاحبؒ کے خاص ماحول و تربیت اور تصوف و سلوک کا نتیجہ ہے، اور جس کا نمونہ ان کے نعتیہ قصائد اور شوقیہ اشعار میں دیکھا جاسکتا ہے؛ اس لحاظ سے ان کا اور شیخ محمد بن عبدالوہاب کا (جن کی سعی بہرحال مشکور ہے) تقابلی مطالعہ کرنے اور ان دونوں میں مماثلت و اتفاق کے نقاط تلاش کرنے کے بجائے شاہ صاحبؒ کا اور شیخ الاسلام حافظ ابن تیمیہؒ کا تقابلی مطالعہ اور اتفاق و اختلاف کے نقاط تلاش کرنا زیادہ مناسب ہوگا کہ دونوں اپنے علمی تبحّر، علوم کتاب و سنت میں درجۂ امامت و اجتہاد تک پہونچنے، عمق و وسعتِ نظر، کارِ اصلاح و تجدید کے تنوّع اور شخصیت کی عظمت و عبقریت میں زیادہ مماثل نظر آتے ہیں؛ (اور کتاب میں اس کی طرف جابجا اشارات گزر چکے ہیں) اس اختلاف کے ساتھ جو ماحول تعلیم و تربیت، زمان و مکان کے اختلاف اور سلوک و تربیتِ باطنی کا نتیجہ ہے۔

باب دوازدہم

حضرت شاہ ولی اللہ صاحبؒ کی تصنیفات

کتب و رسائل

یہاں حضرت شاہ صاحبؒ کی چھوٹی بڑی عربی فارسی تصنیفات کی حروف تہجی کے اعتبار سے فہرست دی جا رہی ہے، اہم کتابوں کا مختصر تعارف بھی کرایا گیا ہے، قلمی و مطبوعہ اور زبان کی نشان دہی کی بھی کوشش کی گئی ہے۔

(ا)

۱۔ الأربعین (عربی) چالیس احادیث کا مجموعہ جو ان مختصر اور جامع احادیث پر مشتمل ہے جو "جوامع الکلم" کا مصداق ہیں، مطبع انوار محمدی لکھنؤ سے ۱۳۱۹ھ میں شائع ہوا، ۱۲۵۴ھ میں اس کا اردو ترجمہ حضرت سید احمد شہیدؒ کے ایک خلیفہ سید عبداللہ مرحوم نے مطبع احمدی کلکتہ سے شائع کیا، اس کے بعد متعدد ترجمے شائع ہوئے، مولانا عبدالماجد دریاآبادی نے ۱۳۸۶ھ (۱۹۶۶ء) میں اس کا ترجمہ اور مختصر تشریح کی، جو ہندوستان و پاکستان سے "چہل حدیث ولی اللہی" اور "اربعین ولی اللہی" کے نام سے شائع ہوئی۔

۲۔ الإرشاد إلی مُہمّات علم الاسناد (عربی) اس میں اپنے اساتذہ و شیوخ حجاز کا

ذکر ہے، رسالہ مطبوعہ ہے۔

۳۔ ازالۃ الخفاء عن خلافۃ الخلفاء (فارسی) موضوع، حجم، طباعت اور اہم مضامین کی تلخیص، کتاب کے تعارف میں گزر چکی ہے۔

۴۔ أطیب النغم فی مدح سیّد العرب والعجم (عربی) یہ شاہ صاحبؒ کے نعتیہ قصائد کا مجموعہ ہے، جن سے شاہ صاحبؒ کی قادر الکلامی اور عشق نبویؐ کا اندازہ ہوتا ہے، مطبع مجتبائی دہلی سے ۱۳۰۸ھ میں شائع ہوا۔

۵۔ ألطاف القدس (فارسی) کتاب لطائف باطنی کی تشریح اور تصوف کے بنیادی مسائل کی توضیح میں ہے، سید ظہیر الدین صاحب کے اہتمام میں مطبع احمدی سے شائع ہوئی۔

۶۔ الإمداد فی مآثر الأجداد (فارسی) مختصر رسالہ ہے، اس میں شاہ صاحبؒ نے اپنے چند اجداد کا حال لکھا ہے، اس میں اپنا سلسلۂ نسب بھی درج کیا ہے، "انفاس العارفین" میں یہ رسالہ بھی شامل ہے، نیز مطبع احمدی دہلی کے طبع کردہ مجموعہ خمسہ رسائل شاہ ولی اللہ دہلویؒ میں بھی شامل ہے۔

۷۔ الانتباہ فی سلاسل أولیاء اللہ[1] (فارسی) تصوف کے مختلف سلاسل کی تاریخ اور ان کی تعلیمات کا مختصر تذکرہ، ۱۳۱۱ھ میں سید ظہیر الدین صاحب کے اہتمام میں اردو ترجمہ کے ساتھ مطبع احمدی سے شائع ہوا۔

---

[1] الانتباہ فی سلاسل اولیاء اللہ میں ص۱۰۰ پر کشف قبور کے عنوان کے ماتحت جو طریقہ لکھا گیا ہے وہ ان تمام احتیاطوں اور محققانہ ومحدثانہ ذوق سے مطابقت نہیں رکھتا، جو شاہ صاحبؒ کی اہم تصنیفات بالخصوص حجۃ اللہ البالغہ، تفہیمات الٰہیہ اور الفوز الکبیر میں نمایاں ہے، اور اگرچہ اس کی تاویل کی جاسکتی ہے (ملاحظہ ہو "حفظ الایمان" از حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ ص۸) لیکن ان موہم الفاظ میں بھی اس مضمون کا آنا جو مشائخ طریقت کے تجربات اور بعض کے عمل کے مطابق ہے علمی لغزش اور غلط فہمی کا باعث ہو سکتا ہے، امام مالکؒ کے درجے اللہ تعالیٰ بلند فرمائے کہ انھوں نے مسجد نبویؐ کے درس میں قبر انور کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا: "کلٌّ یُؤخذ من قوله ويُردّ، إلا صاحب هذا القبر" (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم)

۸۔ انسان العین فی مشائخ الحرمین (فارسی) اس رسالہ کا تعارف شاہ صاحبؒ کے تذکرہ میں گزر چکا ہے "انفاس العارفینؒ کا جزء ہے، مطبع احمدی سے مجموعۂ خمسہ رسائل شاہ ولی اللہؒ کے ضمن میں بھی شائع ہوا ہے۔

۹۔ الانصاف فی بیان أسباب الاختلاف (عربی) رسالہ کے تعارف کے سلسلہ میں اس کی اہمیت، طباعت اور مختلف ایڈیشنوں کی تفصیل گزر چکی ہے۔

۱۰۔ انفاس العارفین (فارسی) کتاب کا تعارف شاہ صاحبؒ کے تذکرہ میں گزر چکا ہے، ۱۳۳۵ھ (۱۹۱۷ء) میں مطبع مجتبائی دہلی سے شائع ہوئی، یہ کتاب دراصل حسب ذیل ساتؔ رسالوں کے مجموعہ کا نام ہے۔

(۱) بوارق الولایۃ (۲) شوارق المعرفۃ (۳) الامداد فی مآثر الاجداد

(۴) النبذۃ الابریزیۃ فی اللطیفۃ العزیزیۃ (۵) العطیۃ الصمدیۃ فی انفاس المحمدیۃ

(۶) انسان العین فی مشائخ الحرمین (۷) الجزء اللطیف فی ترجمۃ العبد الضعیف

اس میں سے اکثر رسائل علیحدہ بھی طبع ہوئے ہیں۔

(ب)

۱۱۔ البدور البازغۃ۔ (عربی) کتاب فلسفۂ دینی کے بیان پر مشتمل ہے، لیکن اس میں فلسفہ کی اصطلاحات فطرت و ترکیب انسانی، طبقات و افراد کے خصائص پر فلسفیانہ اور اشراقی رنگ میں روشنی ڈالی گئی ہے، اور طبعیات و علم الاخلاق کے مباحث ملے جلے ہیں، ارتفاقات کو بھی تفصیل سے بیان کیا گیا ہے، اور صالح تمدن اور اس بارے میں شریعت کی رہنمائی پر بھی روشنی ڈالی گئی ہے، جماعت انسانی کی صحیح تنظیم اور خلافت و امارت کے احکام و آداب بھی بیان کئے گئے ہیں، پھر معرفت الٰہی،

اور اسماء وصفات سے بھی پردہ اٹھایا گیا ہے، مراتب احسان اور ان کے حجابات کا بھی ذکر کیا گیا ہے، مرض شرک اور اس کے اصناف اور طبقات کا بھی ذکر ہے، فتن اور قیامت کا اثبات بھی ہے، عالم برزخ وحشر کے منازل، فضائل اعمال و مناقب کا تذکرہ، نبوت کا اثبات، اقسام انبیاء و مراتب وحی کی بھی تفصیل ہے، ملّت کی حقیقت، اس کے ظہور کے انواع، جاہلیت اولیٰ کا تذکرہ اور ملل سابقہ کا بھی تعارف کرایا گیا ہے، پھر اس ملّت کی شریعت، اس کے ارکان دین، علم تشریع اور مقاصد شرع کا بیان تفصیل سے ہے، اور ارکان اربعہ کے اسرار و حکم پر خاص طور سے روشنی ڈالی گئی ہے۔

اس کتاب میں "حجۃ اللہ البالغہ" کے مقابلہ میں مضامین کی کثرت اور ان کا تنوّع زیادہ ہے، اور اس میں بعض ایسے مباحث الٰہیہ اور مسائل کلامیہ بھی آگئے ہیں، جن کو جمہور متکلمین اور حکمائے امت نے بیان نہیں کیا تھا، لیکن حجۃ اللہ البالغہ اپنے عمق، علم و نظر کی پختگی، ذہنی و علمی ارتقاء اور علوم و حقائق کو شریعت و سنت کی زبان اور زیادہ طاقتور عربی اسلوب میں بیان کرنے میں فائق ہے، مجلس علمی ڈابھیل نے ۱۳۵۴ھ میں مدینہ پریس بجنور سے شائع کیا۔

۱۲۔ بوارق الولایۃ (فارسی) یہ رسالہ انفاس العارفین کا جزء ہے، اس میں اپنے والد شاہ عبدالرحیم صاحبؒ کے اقوال و احوال و واقعات و تصرّفات ذکر کئے ہیں۔

(ت)

۱۳۔ تاویل الاحادیث (عربی) اس میں انبیاء علیہم السلام کے ان قصص کے جو قرآن مجید میں بیان کئے گئے ہیں، لطائف و نکات اور ان سے استخراج کئے ہوئے بہت سے اصول تشریعیہ کا بیان ہے، اختصار کے باوجود کتاب میں بعض بڑے قیمتی اشارات اور قرآن مجید کے عمیق فہم کے نمونے ہیں، شاہ ولی اللہؒ اکیڈمی حیدرآباد (پاکستان) کی جانب سے شائع ہوئی۔

۱۴۔ تحفۃ الموحدین ۔ یہ عقیدۂ توحید کی تشریح پر شاہ صاحب کا فارسی میں ایک مختصر رسالہ ہے جس کا متن افضل المطابع دہلی سے شائع ہوا تھا، مولانا حافظ محمد رحیم بخش دہلوی مصنف "حیات ولی" نے اس کا اردو میں ترجمہ کیا، ۱۳۸۱ھ بمطابق ۱۹۶۲ء میں مکتبۂ سلفیہ شیش محل روڈ لاہور کی طرف سے یہ ترجمہ شائع ہوا ہے، شاہ صاحب کی تصنیفات میں عام طور پر اس رسالہ کا ذکر نہیں آتا، رسالہ کا بنیادی مضمون اگرچہ شاہ صاحب کی دوسری تحریرات کے مطابق ہے، لیکن بعض مضامین کی بنا پر بعض اہل نظر کو اس کی شاہ صاحب کی طرف نسبت میں تردد ہے، واللہ اعلم بالصواب ۔

۱۵۔ تراجم ابواب البخاری (عربی) اس میں اصولی طور پر ایسے قواعد بیان کئے گئے ہیں، جن سے تراجم بخاری کے حل میں مدد ملے، مجموعہ رسائل اربعہ نیز مسلسلات مطبوعہ مطبع نور الانوار آرہ کے آخر میں طبع ہوا ہے ۔

۱۶۔ التفہیمات الإلٰہیۃ (عربی وفارسی) اس میں شاہ صاحبؒ کے وارداتِ قلبی اور وجدانی مضامین ہیں، جو زیادہ تر عربی اور کمتر فارسی میں ہیں، اس کی حیثیت ایک ایسی بیاض کی سی ہے جس میں آدمی اپنے تأثرات و مشاہدات قلم بند کرلیتا ہے، اور وہ خاص حلقۂ احباب و تلامذہ کے مطالعہ میں آنے کے لئے موزوں ہوتی ہے، بعض اوقات صاحبِ بیاض ان کی عام اشاعت کو پسند نہیں کرتا، اس کو مجلس علمی ڈابھیل نے ۱۳۵۵ھ (۱۹۳۶ء) میں مدینہ پریس بجنور سے شائع کیا، اس کتاب میں شاہ صاحبؒ نے مسلمانوں کے مختلف طبقات کو الگ الگ خطاب کیا ہے، جو کتاب کا مؤثر ترین اور مفید ترین حصہ ہے، کتاب دو جلدوں میں ہے ۔

(ج)

۱۷۔ الجزء اللطیف فی ترجمۃ العبد الضعیف (فارسی) ذاتی حالات کا مختصر بیان

اور یادداشت، تذکرہ کے سلسلہ میں تعارف گزرچکا ہے "انفاس العارفین" کا جزء ہے اور علیحدہ بھی طبع ہوا ہے،

(ح)

۱۸۔ حجۃ اللہ البالغۃ (عربی) کتاب کا تعارف، اس کے اہم مضامین کا بیان اور اس کے طبعات کا تذکرہ باب ہفتم میں گزرچکا ہے۔

۱۹۔ حسن العقیدۃ (عربی) اسلام کے بنیادی عقائد کو اہل سنت کے مسلک اور قرآن وحدیث کی روشنی میں جامع طریقہ پر بیان کیا گیا ہے، رسالہ کا تعارف اور اس کی طباعت واشاعت کا تذکرہ باب پنجم میں گزرچکا ہے، رسالہ "العقیدۃ الحسنۃ" کے نام سے بھی معروف ہے، مولانا محمد اویس صاحب نگرامی ندوی مرحوم نے اس کی شرح "العقیدۃ السنیہ" کے نام سے کی، جو مکتبۂ ندوۃ العلماء سے شائع ہوئی اور دارالعلوم ندوۃ العلماء میں نصاب میں شامل ہے۔

(خ)

۲۰۔ الخیر الکثیر (عربی) یہ حقیقتاً فلسفۂ دینی کی کتاب ہے، اس میں معرفت ذات، اسماء الٰہی کی حقیقت، حقیقت وحی، کلام الٰہی وغیرہ کی تشریح کی گئی ہے، وحدۃ الوجود پر بھی فلسفیانہ انداز میں گفتگو کی گئی ہے، عرش، زمان ومکان، افلاک وعناصر، معدن، نبات، وحیوان، اعیان ثابتہ، عالم مثال وغیرہ سے بحث کی گئی ہے، کتاب کا باب الخزانۃ الخامسۃ اہم ہے، جس میں نبی کی بعثت، نبوت کے پانچ مزاج، اور انبیاء کے اصناف وغیرہ کا بیان ہے۔

کتاب فلسفہ، طبعیات، تصوف، حکمۃ الاشراق سب کا مجموعہ ہے۔

خزانہ ثالثہ میں بعثت سے پہلے رسول اللہ صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کے کمالات سے بحث ہے۔

خزانہ ثامنہ میں شریعت کے نشو ونما اور اس کے ارتقاء سے بحث ہے۔

خزانہ تاسعہ میں معاد کے احوال و مراتب سے بحث ہے۔

خزانہ عاشرہ میں متفرق فوائد ہیں۔ مجلس علمی ڈابھیل سے ۱۳۵۲ھ میں شائع ہوئی۔

(د)

۲۱۔ الدُّرُّ الثمین فی مبشّرات النبیّ الأمین (عربی) آنحضرت صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کے مبشرات کا ایک مجموعہ جو شاہ صاحبؒ کی ذات یا بزرگوں سے متعلق ہیں، رسالہ مسلسلات اور النوادر کے ساتھ ۱۳۹۱ھ (۱۹۷۰ء) میں طبع ہوا ہے، کتب خانہ یحیوی سہارنپور سے بھی شائع ہوا۔

۲۲۔ دیوان اشعار (عربی) جسے شاہ عبدالعزیز صاحبؒ نے جمع کیا، اور شاہ رفیع الدین صاحبؒ نے مرتب کیا، مخطوطہ کتب خانہ ندوۃ العلماء لکھنؤ۔

(ر)

۲۳۔ رسالہ۔ حضرت خواجہ خورد شیخ عبداللہ بن عبدالباقی کے جواب میں اپنے کشف کے مطابق۔

۲۴۔ رسالہ دانشمندی (فارسی) اصولِ تعلیم و اساتذہ کے لئے قیمتی ہدایات پر مشتمل ایک پُر مغز اور مفید رسالہ ہے، اردو ترجمہ "الرحیم" حیدر آباد سندھ سے ستمبر ۱۹۶۴ء میں پروفیسر محمد سرور نے شائع کیا، نیز عربی ترجمہ "البعث الاسلامی" شمارہ ۴ جلد ۲۷ محرم ۱۴۰۳ھ میں محمد اکرم ندوی کے قلم سے "اصول الدراسۃ والتعلیم" کے عنوان سے شائع ہوا۔

(ز)

۲۵۔ زھراوین ۔ سورۂ بقرہ و سورۂ آلِ عمران کی تفسیر۔

(س)

۲۶۔ سطعات (فارسی) در بیان طلسم الٰہی کہ رابطہ است در بیان مجرد محض و عالم شہادت وبعض حواس وآثار آں ۔

کتاب کو فلسفۂ الٰہیہ میں سمجھنا چاہئے جس میں فلسفیانہ اور متصوفانہ اصطلاح اور فلسفۂ وحدۃ الوجود کی تعبیرات استعمال کی گئی ہیں، اور جس میں حقیقتاً "ربط الحادث بالقدیم" کے معمّہ کو حل کرنے کی کوشش کی گئی ہے، کتاب ان اخصّ الخواص کے مطالعہ کے قابل ہے، جو فلسفۂ قدیم کے پورے رمز شناس اور وحدۃ الوجود کی تائیدی وتردیدی بحثوں کے کوچہ سے آشنا ہوں، عام اشاعت اور دعوت کی چیز نہیں ہے، کتاب میں طبّی اصطلاحات، اور حکمت طبعیہ کے مضامین کی بھی شمولیت ہے، کتاب میں ان اصولوں کے ماتحت بعض آیات کی لطیف تفسیر بھی ہے، کہیں کہیں اپنی تحقیق سے فلاسفہ اور متکلمین دونوں سے اختلاف ظاہر کیا ہے، تعلیم الٰہی کے اقسام کو بھی تفصیل سے ذکر کیا ہے، اور اس کے اشکال اور صورتوں کو بیان کیا ہے "شخص اکبر" کی اصطلاح جا بجا استعمال کی ہے، ہدایت الٰہی و بعثت انبیاء سے بحث کی ہے، اور یہ کہ وہ کن کن مظاہر میں ظاہر ہوتی ہے، تجلّیات الٰہیہ، ان کے اقسام ومظاہر سے بھی بحث کی ہے کُل رسالہ چوبیس ۲۴ صفحے میں آیا ہے، مطبع احمدی سے سید ظہیر الدین صاحب کے اہتمام میں شائع ہوا، ۱۹۳۹ئہ میں مولوی فضل احمد صاحب نے بیت الحکمہ کراچی سے اور ۱۹۶۴ئہ میں مولانا غلام مصطفےٰ قاسمی نے شاہ ولی اللہؒ اکیڈمی سے بھی شائع کیا۔

۲۷۔ سرور المحزون (فارسی) ابن سید الناس کی سیرت پر مشہور کتاب "نور العیون فی سیر الامین المامون" کا خلاصہ ہے، اپنے نامور معاصر اور سلسلۂ مجددیہ کے شیخ کبیر حضرت مرزا مظہر جانجاناں کی فرمائش سے تصنیف کیا، اردو میں اس کے متعدد ترجمے شائع ہوئے۔

(ش)

۲۸۔ شرح تراجم ابواب صحیح البخاری (عربی) صحیح بخاری کے تراجم اور عنوانات واحادیث کے مطابق لطائف واسرار پر ۱۳۲۳ھ میں دائرۃ المعارف حیدرآباد سے شائع ہوا، اس کے شروع میں تراجم ابواب البخاری بھی ہے۔

۲۹۔ شفاء القلوب (فارسی) حقائق ومعارف میں ایک رسالہ ہے۔

۳۰۔ شوارق المعرفۃ (فارسی) شاہ صاحبؒ کے چچا شیخ ابوالرضا کے حالات پر مشتمل ہے، انفاس العارفین کا جزء ہے۔

(ع)

۳۱۔ العطیۃ الصمدیۃ فی انفاس المحمدیۃ (فارسی) یہ مختصر رسالہ شیخ محمد پھلتیؒ کے حالات میں ہے، جو شاہ صاحبؒ کے جد مادری تھے "انفاس العارفین" کا جزء ہے، مجموعہ خمسہ رسائل میں بھی شامل ہے۔

۳۲۔ عقد الجید فی احکام الاجتہاد والتقلید (عربی) باب ششم میں رسالہ کا تعارف گزر چکا ہے۔

العقیدۃ الحسنۃ دیکھئے حسن العقیدۃ۔

(ف)

۳۳۔ فتح الرحمٰن (فارسی) قرآن مجید کا فارسی ترجمہ، باب پنجم میں اس کا تعارف و تذکرہ گزر چکا ہے۔ مطبع فاروقی دہلی سے ۱۲۹۴ھ میں شاہ ولی اللہ صاحبؒ کے فارسی فوائد اور شاہ عبدالقادر صاحبؒ کے ترجمہ اردو اور فوائد موضح القرآن کے ساتھ شائع ہوا، جو کلکتہ کے مطبوعہ نسخہ کی نقل ہے۔

۳۴۔ فتح الخبیر (عربی) قرآن مجید کے مشکل الفاظ کی تشریح، یہ رسالہ "الفوز الکبیر" کے تتمہ کے طور پر شامل ہے۔

۳۵۔ فتح الودود لمعرفۃ الجنود (عربی) مطبوعہ، مصنف کی نظر سے نہیں گذرا، مولانا رحیم بخش نے "حیاتِ ولی" میں اس کو اخلاق و تصوف سے متعلق لکھا ہے، لیکن نام سے اس کی وضاحت نہیں ہوتی۔

۳۶۔ الفضل المبین فی المسلسل من حدیث النبی الأمین (عربی) مطبوعہ، یہ رسالہ مسلسلات کے نام سے معروف ہے، فن حدیث سے متعلق ہے۔

۳۷۔ الفوز الکبیر (فارسی) رسالہ کا تذکرہ و تعارف باب پنجم میں گزر چکا ہے۔

۳۸۔ فیوض الحرمین (عربی) کتاب زیادہ تر قیام حجاز کے زمانہ کے مشاہدات، حقائق باطنی، مسائل کلامی اور مسائل تصوف سے تعلق رکھتی ہے، یہ کتاب بھی خواص کے مطالعہ کی ہے، ان لوگوں کے دسترس سے بالاتر ہے جو فلسفہ اور تصوّف میں پورا درک نہیں رکھتے۔

(ق)

۳۹۔ قُرّۃ العینین فی تفضیل الشیخین (فارسی) حضرات شیخین کی فضیلت کے اثبات میں متعدد مرتبہ طبع ہو چکا ہے۔

۴۷۔ القول الجمیل فی بیان سواء السبیل (عربی) عربی کا رسالہ ہے، جس میں بیعت کا ثبوت، بیعت کی سنّیت، بعض ابتدائی زمانوں میں اس کے عدم رواج اور پابندی نہ ہونے کے اسباب، حکمت بیعت، شرائط مرشد، شرائط مرید، صوفیا کی بیعت کے اقسام، تکرار بیعت کے حکم سے بحث کی گئی ہے، طریقۂ تربیت اور تعلیم مرید کو بیان کیا گیا ہے، عالمِ حقّانی کے صفات اور تذکیر و وعظ گوئی کے آداب کا ذکر ہے، پھر سلسلۂ قادریہ، چشتیہ، نقشبندیہ کے اشغال و مراقبات اور طریقۂ مجدّدیہ کے اشغال کا تکملہ بھی ہے، اور اصطلاحات کی تشریح بھی، شاہ صاحب نے اپنے خاندانی اعمال و مجرّبات کو بھی درج کر دیا ہے، جو مختلف حالات اور ضرورتوں میں معمول بہا اور آزمودہ ہیں، مختصراً کتاب ان طالبین کے دستور العمل اور ہدایت نامہ کی حیثیت رکھتی ہے، جو ان سلاسلِ ثلاثہ میں کسی سے منسلک ہوں، اور ان کو سنت حقّہ کا اہتمام اور دعوت و اصلاح کا بھی ذوق ہو۔

کتاب کا مطالعہ کرنے والے کو اس کتاب میں کہیں کہیں وہ محدّثانہ و مجتہدانہ رنگ نظر نہیں آئے گا، جو شاہ صاحب کی اہم و مشہور کتابوں کی خصوصیت ہے، بلکہ اس کے بعض مندرجات توحید کے بارہ میں شاہ صاحب کے معروف عالمانہ اور مصلحانہ مسلک سے میل نہیں کھاتے، مثلاً اصحابِ کہف کے ناموں کے بارہ میں لکھا ہے، "أسماء أصحاب الكهف امان من الغرق والحرق والنهب والشرق"[۱]

پھر ان کے نام لکھے ہیں، حالانکہ یہ نام بھی کسی صحیح حدیث یا قطعی الثبوت ذریعہ سے ثابت نہیں ہیں۔

---

[۱] نسخہ مطبوعہ مصر، مطبع الجلیہ مصر ۱۲۹۰ھ ص ۳۹

اس کی وجہ یہ معلوم ہوتی ہے کہ یہ کتاب سفرِ حرمین (۱۱۴۳ھ یا ۱۱۴۵ھ) کے پیشتر کی تصنیف ہے اس کی ایک بڑی دلیل یہ ہے کہ کتاب میں جہاں اپنے مشائخ تصوّف، ان کی اجازت اور خرقوں کا ذکر کیا ہے، وہاں اپنے محبوب و مربّی استاذ شیخ ابو طاہر مدنی کا ذکر نہیں ہے، حالانکہ "الجزء اللّطیف فی ترجمۃ العبد الضعیف" میں اس کی صراحت موجود ہے، شاہ صاحب تحریر فرماتے ہیں:۔

"ولبست الخرقۃ الصوفیۃ عن الشیخ ابی طاھر المدنی رحمہ اللہ ولعلھا حاویۃٌ لخرق الصوفیۃ کلھا"[۱]

حدیث کی اسانید اور ان کے شیوخ میں بھی والد ماجد (حضرت شاہ عبد الرحیم) اور حاجی محمد افضل کا ذکر کیا ہے، شیخ ابو طاہر اور شیوخ حجاز میں سے کسی کا ذکر نہیں ہے حالانکہ اس موقعہ پر یہ ضروری اور ہر طرح قرین قیاس تھا۔[۲]

---

[۱] الجزء اللطیف ص۵ مطبوعہ سلفیہ لاہور۔

[۲] ڈاکٹر مظہر بقا نے اپنی کتاب "اصول فقہ اور شاہ ولی اللہ" (مطبوعہ ادارۂ تحقیقات اسلامی، اسلام آباد، پاکستان) میں لکھا ہے: "یہ کتاب سفرِ حرمین کے بعد کی ہے"۔ (ص۶۸)

لیکن یہ ایک مفروضہ سے زیادہ کی حیثیت نہیں رکھتا کہ "یہ کتاب سفرِ حرمین کے بعد کی ہے" قرائن اور داخلی شہادتیں جیسا کہ اوپر گذرا اس بات پر دلالت کرتی ہیں کہ یہ کتاب شاہ عبد الرحیم صاحب کی وفات ۱۱۳۱ھ اور سفرِ حج ۱۱۴۳ھ کے درمیان کی ہے، جب شاہ صاحب کے منتسبین اور طالبینِ سلوک کا ان کے فرزندِ جلیل (حضرت شاہ ولی اللہ صاحبؒ) کی طرف رجوع ہوا۔

"القول الجمیل" کے کتب خانہ ندوۃ العلماء میں دو قدیم مخطوطہ نسخے ہیں، ایک نسخہ مولانا سید قطب الہدیٰ حسنی (م ۱۲۳۶ھ) کے قلم کا ہے، جو حضرت شاہ عبد العزیزؒ کے ممتاز تلامذہ میں ہیں، اور وہ مستند اور قدیم العہد نسخہ ہے جو مولانا حکیم سید عبد الحی حسنیؒ کے کتب خانہ کا ہے، جو کتب خانہ ندوۃ العلماء میں محفوظ ہے، دوسرا نسخہ نواب سید صدیق حسن خاںؒ کے کتب خانہ کا ہے۔

پھر بھی اس کتاب میں شاہ صاحب کا اصلاحی رنگ نمایاں ہو کر رہا ہے صوفیہ کی عبادت کے بعض طریقوں مثلاً صلوٰۃ معکوس کا اس بنا پر ذکر نہیں کیا ہے کہ اس کا سنّت اور اقوالِ فقہا سے ثبوت نہیں ہے، اسی طرح مصحف کو آگے پیچھے، دائیں بائیں رکھ کر ضرب لگانے سے اختلاف کیا ہے اور اس کو بے ادبی پر محمول کیا ہے، بعض احادیث پر جو ان سلاسل میں رسول اللہ صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم سے سلوک کی تلقین کے سلسلہ میں وارد ہوئی ہیں، محدّثانہ کلام کیا ہے، شاہ صاحب کا مسلک اور اصلی ذوق اس عبارت سے ظاہر ہوتا ہے :۔

"یہ وصیت ہے کہ صحبت نہ اختیار کرے صوفیان جاہل کی، اور نہ جاہلان عبادت شعار کی، اور نہ فقیہوں کی جو زاہدِ خشک ہیں، اور نہ محدثین ظاہری کی جو فقہ سے عداوت رکھتے ہیں، اور نہ اصحابِ معقول اور کلام کی جو منقول کو ذلیل سمجھ کر استدلال عقلی میں افراط کرتے ہیں، بلکہ طالبِ حق کو چاہئے کہ عالم صوفی ہو، دنیا کا تارک، ہر دم اللہ کے دھیان میں، حالات بلندیں ڈوبا ہوا سنت مصطفویہ میں راغب، حدیث اور آثار صحابہؓ کرام کا متجسّس، حدیث وآثار کی شرح اور بیان کا طلب کرنے والا، ان فقیہان محققین کے کلام سے جو حدیث کی طرف مائل ہیں نظر سے، اور ان اصحاب عقائد کے کلام سے جن کے عقائد ماخوذ ہیں سنت سے، جو ناظر ہیں دلیل عقلی میں بطریق تبرّع اور عدم لزوم کے، اور ان اصحٰب سلوک کے کلام سے جو جامع ہیں علم وتصوّف کے، تشدّد کرنے والے نہیں اپنے نفوس پر، اور نہ تدقیق سے کام لینے والے سنت نبویہ پر اضافہ کر کے۔"[1]

---

[1] شفاء العلیل ص ۱۱۶-۱۱۷

اس کتاب میں شاہ صاحب کا تطبیقی ذوق (جوان کو وراثت میں ملا تھا' اور ان کا فطری رجحان تھا) نمایاں ہو کر رہا ہے' انھوں نے مذاہب فقہا میں سے کسی مذہب کو دوسرے مذہب پر ترجیح دینے کو ناپسند کیا ہے' ان کے نزدیک مناسب یہ ہے کہ ان کو بالاجمال قبولیت کی نظر سے دیکھے اور پیروی اس کی کرے جو صریح اور مشہور سنت کے موافق ہو۔[1]

ہندوستان کے مخطوطہ نسخوں کے علاوہ یہ رسالہ مولانا محمد صادق مدراسی کے مختصر مقدمہ اور تشریحات کے ساتھ سنہ ۱۲۹۰ھ میں الحاج منصور محمد کے مطبع (المجلیہ مصر) میں عبدالعال احمد کا کتابت کیا ہوا لیتھو میں چھپا ہے اور کتب خانہ ندوۃ العلماء میں موجود ہے' کتاب کا ترجمہ مولانا خرم علی بلہوری (م ۱۲۷۱ھ) نے سنہ ۱۲۶۰ھ میں اردو میں کیا وہ لکھتے ہیں کہ "جو حواشی مصنف قدس سرہٗ اور ان کے خلف الرشید علامۂ عصر مسند دہر مولانا شاہ عبدالعزیزؒ کے اس کتاب پر صحیح پائے مزید توضیح و تفسیر فوائد کے ساتھ اس کا ترجمہ بھی ذیلی فوائد میں مندرج کر دیا" یہ ترجمہ پہلی مرتبہ ۱۲۷۸ھ/۱۸۶۱ء میں مطبع درخشانی میں اور دوسری بار ۱۳۰۷ھ/۱۸۸۹ء میں مطبع نظامی کانپور میں چھپا۔

(ک)

۱۴۱۔ کشف الغین عن شرح الرباعیتین (فارسی) حضرت خواجہ باقی باللہؒ کی دو رباعیوں کی خواجہ کے قلم سے شرح ہے' اس شرح کی شرح شاہ صاحبؒ نے فرمائی ہے' مطبع مجتبائی دہلی سے سنہ ۱۳۱۰ھ میں شائع ہوئی۔

---

[1] شفاء العلیل ص۱۱۷

(ل)

۴۲۔ لمعات (فارسی) مطبوعہ، علم تصوف سے متعلق ہے۔

(م)

۴۳۔ المقالۃ الوضیّۃ فی النصیحۃ والوصیۃ (فارسی) "وصیت نامہ" کے نام سے متعدد بار شائع ہو چکا ہے، مطبع مطیع الرحمٰن سے قاضی ثناء اللہ صاحب پانی پتی کی شرح کے ساتھ بھی ۱۲۶۸ھ میں دہلی سے شائع ہوا، قاضی صاحب کی تشریحات ان کے مشہور رسالہ ارشاد الطالبین سے ماخوذ ہیں۔

۴۴۔ المقدمۃ السنیۃ فی الإنتصار للفرقۃ السُّنّیۃ (عربی) مجدد صاحبؒ کے رسالہ" ردِ روافض" کا ترجمہ مع اضافہ فوائد ہے[له]، ٹونک اور بھوپال کے کتب خانوں میں اس کے قلمی نسخے موجود ہیں، حال میں مولانا ابوالحسن زید صاحب مجددی کے اہتمام میں دہلی سے بھی شائع ہوا ہے۔

۴۵۔ المقدمۃ فی قوانین الترجمۃ (فارسی) مطبوعہ فتح الرحمٰن کے شروع میں بھی شامل ہے۔

۴۶۔ المسوّٰی من أحادیث المؤطّا (عربی) مؤطا کی عربی شرح دہلی سے دوبار اور مکہ معظمہ سے ایک بار شائع ہوئی۔

۴۷۔ مُصفّٰی (فارسی) مؤطا امام مالکؒ کی فارسی شرح ہے جو بڑے فوائد و تحقیقات پر مشتمل ہے، اور شاہ صاحبؒ کی اہم کتابوں میں ہے، جلد اول مطبع فاروقی دہلی اور جلد ثانی مطبع مرتضوی دہلی سے ۱۲۹۳ھ میں طبع ہوئی۔

۴۸۔ المکتوب المدنی (عربی مطبوعہ) ایک اہم مکتوب وحدۃ الوجود اور وحدۃ الشہود کے تقابل میں جو شیخ اسماعیل بن عبداللہ رومی کے نام لکھا گیا،

[له] شاہ صاحبؒ نے یہ ترجمہ اپنے استاد شیخ ابو طاہر مدنی کی خواہش اور فرمائش پر ۱۱۴۴ھ میں قیام حجاز کے دوران کیا۔

یہ" التفهيمات الإلٰهية" میں موجود ہے، نیز علیحدہ بھی بعض رسائل کے ساتھ طبع ہوا ہے۔

۴۹۔ مکتوبات مع مناقب امام بخاری و فضیلت ابن تیمیہؒ (فارسی) مولوی عبدالرؤف صاحب مہتمم کتب خانہ نذیریہ نے شائع کیا، یہ کوئی مستقل تصنیف نہیں ہے، کلمات طیبات کا ایک مکتوب جو امام بخاری کے مناقب میں لکھا تھا، اور ایک مکتوب جو حافظ ابن تیمیہؒ کے دفاع میں لکھا گیا ہے، لے کر جمع کر دیا گیا ہے۔

(ن)

۵۰۔ النبذة الابريزية في اللطيفة العزيزية (فارسی) اس میں شاہ عبدالرحیمؒ کے نانیہالی جداعلیٰ شیخ عبدالعزیز دہلویؒ اور ان کے اسلاف و اخلاف کے حالات ہیں، "انفاس العارفین" کا جزء ہے، مجموعہ خمسہ رسائل مطبوعہ مطبع احمدی میں بھی شامل ہے۔

۵۱۔ النوادر من أحاديث سيد الأوائل والأواخر (عربی) مطبوعہ مسلسلات کے ساتھ طبع ہوا ہے۔

(ھ)

۵۲۔ همعات (فارسی) ضخامت ۶۰ صفحے، متوسط سائز، مطبوعہ تحفۂ محمدیہ، دربیان نسبت الی اللہ، تمہید میں کہا گیا ہے کہ "جب اللہ تعالےٰ نے دین محمدیؐ کی حفاظت کا ذمہ لیا اور وہ تمام ادیان پر غالب ہوا، تو تہذیب نفوس عرب و عجم اور ان کے درمیان جو مظالم تھے، ان کا ازالہ بوجہ اتم وجود میں آیا، اور چونکہ دین محمدیؐ کا ایک ظاہر ہے ایک باطن، ظاہر کا تعلق صور و مظاہر، تعیین اوقات، اور

اوضاع ومقادیر سے ہے، اور اس کا پورا اہتمام کیا گیا ہے، اور تحریف کا سدِّباب کیا گیا، باطن کا تعلق طاعات کے انوار وآثار کے حصول سے ہے، اس کا تعلق دو چیزوں سے ہے، ظاہر کے حامل وارثین پیغمبر ہیں، جنھوں نے ظاہر شرع کی حفاظت کی، ان میں فقہاء ومحدثین، مجاہدین وقاری داخل ہیں، اور باطن کے حامل (جس کا نام احسان ہے) وہ انوارِ طاعات، حلاوت کے احساس اور اخلاق فاضلہ سے متخلّق اور احوال سنیہ کے حامل ہیں، (جو صوفیۂ کرام ہیں) ان پر ہر زمانہ میں ان اشغال کا القاء ہوا، جو اس زمانہ کے لوگوں کی طبیعت کے مناسب تھے، اور ان کے کلام وصحبت میں اللہ تعالیٰ نے ایک جذب وتاثیر عطا فرمائی اور ان کو کرامات اور نورِ باطن سے نوازا اور ہر سلسلہ میں مخصوص اشغال واوراد کا تعیین ہوا، اور لوگ ان کی پیروی کرکے فائز المرام ہوئے، ہر زمانہ میں ایک خانوادہ کے وابستگان اپنے خانوادہ کو دوسرے خانوادوں پر ترجیح دیتے ہیں، یہ ایک طرح سے صحیح ہے، بعض پہلوؤں سے امتیاز ہوتا ہے، لیکن حصر صحیح نہیں

پھر شاہ صاحبؒ نے ان خانوادوں اور ان خانوادوں سے نکلنے والی شاخوں، اور ان کے بانیوں کا تذکرہ فرمایا، اس کے بعد شاہ صاحبؒ نے ان تغیرات کلیہ کا ذکر کیا ہے جو طریق تصوف میں پیش آئے، اور عہد رسالت کے بعد زمانہ کے تغیر سے حصول احسان کے جو طریقے اور معالجات تجویز کئے گئے ان کا ذکر کیا، اس بارے میں شاہ صاحبؒ نے جس دقیقہ رسی اور تحلیل وتجزیہ سے کام لیا ہے، وہ انھیں کا حصہ ہے، شیخ اکبر اور ان کے مسلک وحدۃ الوجود کے ظہور میں آنے کا بھی ذکر کیا ہے، آپ نے بتایا ہے کہ

سید الطائفہ حضرت جنید بغدادیؒ مسلکِ تصوف کے سب سے بڑے مقنّن اور مرتّب ہیں، پھر ان کے نزدیک اس کے جو شرائط اور بنیادی ارکان ہیں، ان کا ذکر کیا ہے، پھر اپنے اپنے زمانہ کے جن مجدّدین و مجتہدین نے اپنے زمانہ کی استعداد و مزاج کے مطابق اس کا جو نصاب و دستور العمل مرتب کیا، اس کی تفصیل کی ہے، پھر شاہ صاحبؒ نے اپنے زمانہ کے سالک کے لئے جو نصاب ہونا چاہئے وہ بیان کیا ہے، اور جن چیزوں کی طرف اس کی توجہ ہونی چاہئے اس کو بیان کیا ہے، پھر اس طریق کے موانع اور مضر اسباب کا ذکر کیا ہے، اور ان کا طریقِ علاج بتایا ہے، اس راہ میں جو منزلیں پیش آتی ہیں، اُن کی طرف بھی اشارہ کیا ہے، پھر نسبتوں کا ذکر کیا ہے، اس سلسلہ میں صحابہؓ و تابعین اور جمہور صالحین کی نسبت کا ذکر کیا ہے، اور اس کو احسان سے موسوم کیا ہے، پھر اس کی تعریف کی ہے، پھر مختلف انسانوں کی استعدادات کا ذکر کیا ہے، اور لطائف کو بھی بیان کیا ہے، پوری کتاب دقیق مضامین، لطیف نکات اور ذاتی تجربات سے اس طرح مملوء ہے جیسے کوئی حاذق اور طویل تجربہ رکھنے والا طبیب انسانی مزاجوں، اجسام اور صحت و بیماری کے اسباب اور ان کے معالجات پر روشنی ڈالتا ہے۔

۵۳۔ ہوامع شرح حزب البحر (فارسی) مطبوعہ۔

INDEX

اشاریہ

"تاریخ دعوت و عزیمت حصہ پنجم"

مرتبہ

محمد غیاث الدین ندوی

شخصیات

ب پ

کتابیات

قرآن مجید

(الف)

آب حیات ۳۵۱

وفیات الأعیان ۲۵۶

ابن کثیر (البدایہ والنہایہ) ۲۶۱

اتحاف السادۃ المتقین لشرح احیاء علوم الدین ۱۹۰

آثار الصنادید ۱۲۸

الأحکام السلطانیہ والولایات الدینیہ ۲۵۵، ۲۵۷

احیاء علوم الدین ۳۲۳، ۳۲۴

اخبار الأخیار ۶۵

الأربعین ۳۹۸

ارجوزۂ اصمعی ۳۵۴

الارشاد الی مہمات علم الاسناد ۱۰۰، ۱۰۵، ۳۴۸

ارشاد الطالبین ۴۱۲

ازالۃ الخفاء عن خلافۃ الخلفاء ۱۲۵، ۵۵–۲۴۹، ۲۶۲، ۲۶۳، ۲۶۶، ۲۶۹، ۲۷۰، ۲۷۳، ۲۹۶، ۳۲۱، ۳۴۱، ۳۶۱، ۳۹۹

اسرار المحبۃ (رسالہ) ۳۸۳

الاسفار الأربعہ ۳۶

اسلامی علوم وفنون ہندوستان میں ۱۸۰، ۱۸۱، ۱۸۳، ۳۶۱

اسلامی مزاج وماحول کی تشکیل وحفاظت میں حدیث کا بنیادی کردار (رسالہ) ۱۷۰، ۱۷۶، ۲۱۶

اشراق ہیاکل النور ۳۶

اصول بزدوی ۱۰۰

اصول فقہ اور شاہ ولی اللہ ۴۰۹

اطیب النغم فی مدح سید العرب والعجم ۳۹۹

الأعلام (زرکلی) ۲۳، ۱۱۰

الأفق المبین ۳۶

ألطاف القدس ۱۲۵، ۳۹۹

الامداد فی مآثر الأجداد ۶۶، ۷۳، ۳۹۹، ۴۰۰

الانتباہ فی سلاسل اولیاء اللہ ۳۹۳، ۳۹۹

انسان العین فی مشائخ الحرمین (رسالہ) ۶۶، ۹۷، ۱۲–۱۰۹، ۱۹۹، ۴۰۰

انسائیکلوپیڈیا آف اسلام ۳۱۳

انسائیکلوپیڈیا تاریخ عالم ۲۷، ۲۸

الانصاف فی بیان اسباب الاختلاف ۱۹۴، ۱۹۵، ۲۰۳، ۴۰۰

انفاس العارفین ۶۶، ۶۷، ۷۷، ۷۸، ۸۴–۸۰، ۸۹، ۹۷، ۹۸، ۱۰۳، ۱۰۴، ۱۲۵، ۲۰۱، ۳۹۹، ۴۰۰، ۴۰۳، ۴۰۶

الأوائل السنبلیہ فی أوائل کتب الحدیث ۳۳

ج چ

ح خ

مقامات

بسم اللہ الرحمن الرحیم

حرفِ گفتنی

الحمد للہ وسلام علیٰ عبادہ الذین اصطفیٰ !

اللہ تعالیٰ کا ہزار ہزار شکر ہے کہ سیرتِ سید احمد شہیدؒ کی جلد دوم کو ناظرین کی خدمت میں پیش کرنے کی دیرینہ آرزو پوری ہو رہی ہے۔ اس کتاب کی پہلی جلد غیر معمولی اضافوں کے ساتھ اکتوبر ۱۹۵۸ء میں خواجہ بکڈپو اردو بازار لاہور کی طرف سے شائع ہوئی تھی یہ اس کتاب کا چوتھا ایڈیشن تھا، جو فاضل گرامی مولانا ظفر اقبال صاحب کی نگرانی اور اہتمام میں شائع ہوا، مصنف کو دوسری جلد پر نظرِ ثانی، اس کے اضافہ و تکمیل اور اسکو اشاعت کے لیے آخری طور پر تیار کرنے میں اپنی گوناگوں مصروفیتوں اور اندرونِ و بیرونِ ملک کے طویل طویل سفروں کی بنا پر خاص دیر لگی، بالآخر ستمبر ۱۹۶۲ء میں اس کا مبیضہ مکمل طریقہ پر لاہور کے چند مخلص احباب کے سپرد کر دیا گیا، جو اُسکی طباعت و اشاعت کے ایک بڑی دینی خدمت اور سعادت سمجھ کر آرزومند تھے، یقین واثق تھا کہ یہ جلد قریب مدت میں شائع ہو جائیگی، لیکن اس کام میں کچھ ایسی رکاوٹیں پڑتی رہیں، اور چند در چند ایسے حوادث پیش آئے کہ پورے چھ برس اس کام کی تکمیل میں لگ گئے، ایسے اوقات بھی آئے کہ اس کی اشاعت سے مایوسی بھی پیدا ہو گئی، لیکن یہ کشتی جس پر یہ متاع گراں مایہ تھی، حوادث و موانع کے تھپیڑے کھاتی ہوئی بالآخر کنارہ لگ گئی اور مصنف بے مایہ کی ایک بڑی قیمتی پونجی ضائع ہونے سے بچ گئی :

"وللہ الامر من قبل ومن بعد ویومئذ یفرح المومنون بنصر اللہ"

کسی کتاب کے اجزاء کے ترتیب و اشاعت میں اتنا عظیم تفاوت اور اتنا طویل فصل، تصنیف کے موضوع و مقصد اور مصنف کے غرض و غایت کے لیے سخت مضرت رساں ہوتا ہے، پھر جبکہ وہ کتاب متفرق مضامین کا مجموعہ نہ ہو، بلکہ ایک

ہی زندگی اور کارنامہ کی تفصیلات اور ایک ہی زنجیر کی کڑیاں ہوں تو اولؔ آخر اور آغاز و انجام کے سامنے آنے میں اتنا طویل وقفہ کتاب کی قوت و افادیت کو سخت نقصان پہنچاتا ہے، یہ صاحب سوانح (رحمۃ اللہ علیہ) کی عظمت و مقبولیت ہی ہے کہ پڑھنے والوں کی پیاس اور اشتیاق اب بھی باقی ہے اور سیکڑوں آدمیوں کو اس کے دوسرے حصہ کا انتظار ہے بعض ایسے طالب صادق اور محب عاشق میرے علم میں ہیں، جو اس حصہ کی اشاعت کے لیے دن گنتے ہیں اور جن کے استفسار اور اشتیاق کو دیکھ کر شدت سے یہ خواہش پیدا ہوتی تھی کہ یہ حصہ ان کی زندگی میں شائع ہو جائے اور وہ اس سے اپنے دل کی پیاس بجھا سکیں، جہاں تک میرا اندازہ ہے ان میں سے بعض اس دنیا سے رخصت ہو گئے ہیں اور یہ حسرت اپنے ساتھ لے گئے، اللہ تعالیٰ اُن کے اس شوق اور مخلصانہ محبت کی شایانِ شان جزا عطا فرمائے کہ اس محبت کی اللہ تعالیٰ کے یہاں بڑی قدر ہے۔ " و منهم من قضى نحبه و منهم من ينتظر "

ناچیز مصنف اُن سب دوستوں[1] کے لیے دُعاگو ہے جنھوں نے اس کام کی تکمیل میں کسی طرح کا حصہ لیا اور اُن تمام کوتاہیوں کے لیے عذرخواہ ہے جو اس کام میں بلاارادہ اور نادانستہ طریقہ پر پیش آئیں۔ اس وقت عالم اسلام، اور خاص طور پر یہ برِّعظیم جن نئے حالات اور جس نئے دَور سے گزر رہا ہے، دُعا ہے کہ اللہ تعالیٰ اس میں اس کتاب اور اس کے مندرجات اور اس کے ایمان آفریں، روح پرور واقعات اور ان واقعات کی مرکزی شخصیت کے اسوہ و نمونہ اور دعوت و پیام سے فائدہ اٹھانے اور رہنمائی حاصل کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔

وما التوفيق إلا من عند الله

ابوالحسن علی
دائرہ شاہ علم اللہ رحمۃ اللہ علیہ
رائے بریلی

۲۴ر ذیقعدہ ۱۳۸۸ھ
۱۲ر فروری ۱۹۶۹ء
(چہارشنبہ)

---

[1] حاجی متین احمد صاحب، مولانا ظفر اقبال صاحب، مفتی سید سیاح الدین صاحب اور سید انورحسین نفیس رقم صاحب۔

فہرستِ مضامین

باب	عنوان	صفحہ

صفحہ	عنوان	باب

باب	عنوان	صفحہ

باب	عنوان	صفحہ

باب	عنوان	صفحہ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

أَلْحَمْدُ لِلّٰهِ وَحْدَهٗ وَالصَّلٰوةُ وَالسَّلَامُ عَلٰى مَنْ لَّا نَبِيَّ بَعْدَهٗ

پہلا باب

شَیدُو کی جنگ

سرداران پشاور کی رفاقت

حصۂ اوّل کے چھبیسویں باب میں گزر چکا ہے کہ ۱۲ جُمادی الآخرہ ۱۲۴۲ھ کو ہنڈ میں سید صاحبؒ نے بیعتِ امامت لی۔ خادی خاں، اشرف خاں، فتح خاں، بہرام خاں، سعادت خاں اور علماء و سادات و خوانین نے بیعتِ امامت کی۔ جب یہ خبر مشہور ہوئی، تو قُرب و جوار کے خوانین و رُؤسا، اور بعض پیرزادوں نے آکر بیعت کی۔ جُمعے کے خُطبے میں آپ کا نام داخل کیا گیا اور دُور دُور تک اس کی شہرت ہو گئی۔

سید صاحبؒ نے بیعتِ امامت کی اطلاع کے خطوط اور دعوت نامے نامور سرداروں، والیانِ مُلک، عُلماء و مشائخ و رُؤسائے ہندوستان کو بڑے اہتمام سے بھیجے۔ سردار خادی خاں، اشرف خاں اور دوسرے یوسف زئی سرداروں نے سردار یار محمد خاں اور سلطان محمد خاں والیانِ پشاور کو سید صاحبؒ کی امامت و امارت کی اطلاع دیتے ہوئے ایک پُر زور اور طاقتور دعوتی خط لکھا جس کا کچھ حصہ (جس میں صوبۂ سرحد کی زبوں حالی اور مسلمانوں کی بے کسی کا پُر اثر طریقے پر اظہار ہے) گزر چکا ہے۔ اسی خط میں اُنھوں نے لکھا ہے:

"بخدمتِ سراسر رفعت گزارش می نماید کہ	جنابِ والا کی خدمتِ عالی میں گزارش ہے کہ
اگر رفاقتِ آں امامِ ہمام، آں مُعلّی القاب ہم	اگر عالی جناب بھی امام المسلمین (حضرت سید احمد)

اختیار نمایند، نہایت مصلحتِ وقت خواہد بُود زیراکہ از رُوئے آں اِمامِ ہُمام اجتماعِ جُمہُورِ انام بمصارفِ اقلِ قلیل بحدّے می شود کہ اگر از رُؤسائے عالی مقام اضعاف مُضاعف آں صرف نمایند، عُشرِ عشیرِ آں اجتماع صُورت نہ بندد۔ و بالجُملہ آنچہ از رُوے اُو بغایتِ سہولت سرانجام می شود، از غیرِ او بکمالِ صعُوبت ہم متصوّر نیست با وصفیکہ اصلاً بہ تحصیلِ سلطنت و حکومت رغبت نمی دارند، پس چرا رفاقتِ اُو را اختیار نکنند و صَرفِ خرچِ قلیل گوارا نہ نمایند کہ ہم سعادتِ اُخرویہ بدست آید و ہم مَنافعِ دُنیویہ حاصل کنند و ہم اعداے دین را کہ فی الحقیقت دشمنِ جان و مالِ سلطنت و حکومت و ننگ و ناموسِ کافۂ مُسلمین اَند عمُوماً و درحقِ رُؤسائے مُسلمین خصُوصاً مستاصل گردانیدہ؟ و وسعتِ مملکت باخذِ بلادِ کفّار و استقلالِ حکومت باستیصالِ مخالفین و آسُودگیِ عساکر بکثرتِ غنائم آنہا بدست آرند و نیک نامی درمیانِ جمہُورِ انام برفاقتِ آں اِمامِ ہُمام حاصل نمایند۔[1]

کی رفاقت اختیار فرمائیں، تو نہایت مناسب ہوگا۔ اس لیے کہ سیّد صاحب کے ذریعے عامۃ المُسلمین کا اجتماع ایسی سہولت اور اس طرح بے منّت و بے زحمت ہو جائے گا کہ اگر بڑے بڑے سردارانِ قوم اس سے بدرجہا زیادہ صرف کریں گے اور بڑی مشکلات اور زحمتیں برداشت کریں گے، تو اس کا عُشرِ عشیر بھی نہ ہو سکے گا جب آپ کو حصُولِ سلطنت و حکومت کی طرف قطعاً مَیلان نہیں تو والیانِ سلطنت و اہلِ ریاست کو آپ کی رفاقت اختیار کرنے اور تھوڑے صرف سے زیادہ سے زیادہ نفع حاصل کرنے میں کیا عُذر ہو سکتا ہے جبکہ اس میں سعادتِ اُخروی بھی ہے اور فوائدِ دُنیوی بھی اور اُن دُشمنانِ دین کی سرکوبی و استیصال بھی، جو سلطنت و حکومت کے دشمن، تمام مسلمانوں کے ننگ و ناموس کے لیے خطرہ اور خاص طور پر مسلمان اہلِ حکومت کے حریف و رقیب ہیں؟ اِن سب کے علاوہ اس منظّم و شرعی جہاد سے مسلمانوں کے حُدُودِ حکومت میں توسیع، اُن کی مملکت کی حفاظت اور اُس کی خود مختاری کی ضمانت، اسلامی افواج کی آسودگی اور سرداروں کی نیک نامی بھی ہے۔

---

[1] مجموعۂ خطوطِ قلمی صفحہ ۳۰۳

سردار یار محمد خاں اور سردار سلطان محمد خاں کابل میں سیّد صاحبؒ کی ملاقات و زیارت سے مشرّف ہو چکے تھے۔ اُنھوں نے آپ کی قوّتِ ایمانی، عالی حوصلگی، اُولُوالعزمی، آپ کے رُفقاء کی للّٰہیت و جاں نثاری اور اہلِ سرحد اور افغانی قبائل کی عقیدت و رجوعِ عام کا منظر اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا اور وُہ برابر سُن رہے تھے کہ مسلمان پروانہ وار آپ کے گرد جمع ہو رہے ہیں۔ سمہ میں پہنچ کر آپ کی مقبولیّت اور مرجعیت اپنے عروج کو پہنچ گئی۔ یوسف زئی سردار، جو اپنی شرافت اور شجاعت میں ممتاز و نامور تھے، آپ کو اپنا اِمام اور امیر و قائد اور شیخ و مُرشد مان چُکے ہیں۔ صُوبۂ سرحد، جو ایک زمانۂ دراز سے اِنتشار و بے نظمی کا شکار اور سِکھ فوجوں کے گھوڑوں کی ٹاپوں سے پامال اور زار و نزار ہے، ایک نئی قوّت اور قیادت سے رُوشناس ہو رہا ہے، جس میں رُوحانیت و شجاعت، سیادت اور قیادت دونوں جمع ہیں اور افغانی علاقے کے لیے اس سے زیادہ موزوں اور پُرکشش قیادت نہیں ہو سکتی۔ افغانی اپنی قوّتِ مشاہدہ اور نفع و نُقصان کے موازنے میں ہمیشہ سے فائق رہے ہیں۔ پشاور کے جہاں دیدہ اور سرد و گرم چشیدہ سرداروں نے محسوس کر لیا کہ وُہ سیّد صاحب کی رفاقت اختیار کر کے اپنا کھویا ہُوا اقتدار حاصل کر سکتے ہیں اور قبل اس کے کہ یہ نئی طاقت اُن سے بے نیاز ہو کر کسی نئی سلطنت کی بُنیاد ڈالے اور سکھوں کو بے دخل کر کے اس پُورے علاقے کو اپنے اقتدار میں لے لے، اُن کو اس کے اندر اپنی جگہ بنا لینی چاہیے۔ سب سے پہلے ان کو ایک تجربہ کار و دُنیادار رئیس کی طرح اس کا اطمینان چاہیے تھا کہ یہ نئی جماعت اور نیا عَلَمِ جہاد محض وقتی جوش اور جرأتِ قلندرانہ نہیں ہے، جس کا صوبۂ سرحد نے پچھلی مدّت میں بار بار تجربہ کیا اور جو ہر مرتبہ پانی کی سطح سے اُبھرا اور حُباب کی طرح بیٹھ کر رہ گیا۔ سردار یار محمد خاں نے سیّد صاحبؒ کے نوشہرے پہنچنے کے چند ہی روز بعد سیّد صاحبؒ کو ایک خط لکھا جس میں آپ کی فوجی طاقت اور مالیات کے متعلق استفسار کیا گیا تھا۔ سیّد صاحبؒ نے اس کا جواب ۲۵ جُمادی الاُولیٰ ۱۲۴۲ھ کو نوشہرے سے دیا۔[۱] اِس جواب سے یار محمد خاں کو سیّد صاحبؒ کے اخلاص و للّٰہیت، بے غرضی اور بے نفسی اور عزم و پختگی کا اندازہ ہو گیا ہو گا۔ یوسف زئی سرداروں کے دعوت نامے نے، جو فغانی

[۱] ملاحظہ ہو مجموعۂ خطوطِ قلمی، صفحہ ۲۹۷۔

سرداروں اور والیانِ ملک کی نفسیات و مزاج کا پورا لحاظ کر کے لکھا گیا تھا۔ سید صاحبؒ کی رفاقت کے فیصلے میں مددوی یسمہ کے علاقے نے سردارانِ پشاور اور پائندہ خیل امیروں کے اقتدار کو کبھی بخوشی منظور نہیں کیا تھا۔ ایک قلمی خط میں ہے: "ملک سمہ گاہے در قابوے او نبود"[1]۔ ممکن ہے، اس طرح سے سردارانِ پشاور کو اس کی بھی اُمید پیدا ہوئی کہ وہ سید صاحبؒ کی رفاقت کے ذریعے اس سرکش و خودمختار علاقے کو مستقل طور پر اپنے اقتدار میں لے سکیں گے۔ بہرحال ان دونوں بھائیوں نے سید صاحبؒ کو اپنی رفاقت و شرکتِ جہاد کی اطلاع کی اور یسمہ کی طرف عنانِ عزیمت موڑی اور لشکر اور توپ خانے کے ساتھ پشاور سے نوشہرے کا رُخ کیا

سردارانِ پشاور کی آمد اور شیدو کی جنگ

سید صاحبؒ کو ہنڈ میں اطلاع ملی کہ سردار یار محمد خاں، سردار سلطان محمد خاں اور پیر محمد خاں توپخانے اور لشکر کے ساتھ نوشہرے سے پانچ کوس موضع سرہائی[2] میں داخل ہوئے ہیں اور حکم کے منتظر ہیں۔ ایک روز آپ خادی خاں، اشرف خاں اور فتح خاں اور چار پانچ سو آدمیوں کے ساتھ اُن کی ملاقات کے لیے نوشہرے تشریف لے گئے۔ یہاں اُن تینوں سرداروں نے بھی امامت کی بعیت کی۔ آپ دو تین دن قیام فرما کر خادی خاں، اشرف خاں، فتح خاں اور باقی لوگوں کو ساتھ لے کر ہنڈ کو روانہ ہو گئے

اُن دنوں لشکرِ مجاہدین میں اکثر لوگ بیمار تھے۔ غلّے کی بھی بےحد گرانی تھی۔ لوگوں کو کبھی پیٹ بھر روٹی ملتی تھی، اکثر نہیں ملتی تھی۔ یُوں ہی ساگ پات کھا کر رہ جاتے تھے

خادی خاں، اشرف خاں اور فتح خاں نے غزا کے واسطے اطراف و جوانب سے مُلکی لوگ جمع کیے۔ ہنڈ سے کُوچ کی تیاری ٹھیری۔ پہلے روز ہنڈ سے کُوچ کر کے موضع جَلبَسَی ڈیرہ کیا اور ایک یا دو مقام بھی کیے۔ دوسری منزل وہاں سے چل کر مصری بانڈے میں کی صبح کو وہاں سے کُوچ کیا۔ نوشہرے میں آئے۔ دریائے لُنڈہ کے پار دُرّانیوں کا ڈیرہ تھا۔ وہ پیادہ و سوار، بھیڑ وغیرہ ملا کر کوئی بیس ہزار کی جمعیت رکھتے تھے اور آٹھ توپیں اُن کے ساتھ تھیں۔ اس طرف نوشہرے میں سید صاحبؒ کا اور آپ کے ہمراہیوں کا ڈیرہ تھا۔ یہ مُلکی بھی خادی خاں، اشرف خاں اور فتح خاں کے ہمراہ اسی ہزار سے کچھ زیادہ ہی ہوں گے۔ آپ

[1] مجموعۂ خطوط قلمی ۱۴۵ب [2] اصل لفظ غالباً پیر سپائی ہوگا

نے نوشہرے میں دو تین مقام کیے۔ نوشہرے سے لشکر نے شَیدو[۱] کی طرف کوچ کیا۔ لشکر میں تقریباً لاکھ آدمیوں کی جمعیت تھی اور کوئی آٹھ دس ہزار فقط نشان تھے۔ ملکی لوگ دف بجاتے اور چار بیت گاتے، ننگی تلواریں ہلاتے اور اُچھلتے کُودتے جاتے تھے۔ جاتے جاتے جب موضع اکوڑہ کوس یا ڈیڑھ کوس رہ گیا، تو تمام لشکر نے ڈیرہ کیا۔

زہر خُورانی سیّد صاحبؒ کا کھانا اور میوہ دونوں وقت دُرّانیوں کے لشکر سے آتا تھا۔ رات کو سردار یار محمدؐ خاں نے کھچڑی اور گنّے کی گنڈیریاں ولی محمدؐ اور نذر محمدؐ کے ذریعے (جو یار محمدؐ خاں کی طرف سے سیّد صاحبؒ کا کھانا لانے پر مُقرر تھے) بھیجیں۔ آپ نے کھچڑی کھائی اور چند گنڈیریاں چُوسیں۔ کچھ دیر کے بعد آپ کی طبیعت بگڑ گئی۔ کبھی غشی آتی تھی، کبھی افاقہ ہوتا تھا۔ لشکر میں چرچا تھا کہ یار محمدؐ خاں نے آپ کو زہر دلوایا ہے اور سب علامتیں زہر ہی کی ہیں۔ پچھلے پہر دو تین گھڑی رات رہے کُوچ کا نقّارہ ہُوا۔ یار محمدؐ خاں نے آپ کی سواری کے لیے اپنا ہاتھی بھیجا اور یہاں یہ حال تھا کہ آپ کبھی بیہوش ہو جاتے تھے۔ کبھی ہوشیار۔ استفراغ جاری تھا۔ ادھر خانِ مذکور کی طرف سے لحظہ بہ لحظہ تاکید آتی تھی کہ جلد حضرت کو لاؤ۔ لشکر روانہ ہو گیا۔ اس عرصے میں آپ کو قدرے ہوش آیا۔ مولانا محمدؐ اسمٰعیل صاحب نے عرض کی: "سردار یار محمدؐ خاں کی طرف سے کئی آدمی آپ کو سوار کرانے کو آچکے ہیں۔ کیا ارشاد ہے؟" آپ نے فرمایا: "خیر بہتر ہے اور ہمارا سفید گھوڑا، جو فتح خاں نے ہم کو دیا ہے، شادل خاں گنج پورے والے سے کہو کہ اس پر سوار ہو کر فتح خاں کے ہمراہ جائیں اور باقی ہندوستانی سب کے سب ہمارے ساتھ رہیں۔"

یار محمدؐ خاں نے آپ کی سواری کے لیے جو ہاتھی بھیجا تھا، اس پر آپ کو سوار کیا گیا اور مولانا محمدؐ اسمٰعیل صاحب خواصی میں بیٹھے۔ شَیدو کے میدان میں جانب مغرب سردار یار محمدؐ خاں کا لشکر پہاڑ کے متصل پرا باندھے کھڑا تھا، اُس کی بائیں طرف سلطان محمدؐ خاں کا لشکر تھا اور اس کی بائیں طرف سردار پیر محمدؐ خاں کا لشکر اور اس کی بائیں طرف اور تمام خوانینِ یُوسف زئی، فتح خاں، اشرف خاں اور خادی خاں وغیرہ اپنے اپنے لوگ لیے کھڑے تھے۔ اسی طرف سکھوں نے اپنے سنگر سے آگے بڑھ کر ایک نالے میں چار مورچے چار جگہ لگائے تھے۔

---

[۱] شَیدو اکوڑے سے تقریباً چار میل جنوب مشرق میں ہے، یعنی اٹک کی سمت میں۔ سیّد صاحبؒ کے زمانے میں یہ گاؤں موجودہ جگہ کی بجائے مشرق میں دریا کے قریب آباد تھا۔ شَیدو کی لڑائی اس وقت ہوئی تھی، جب گاؤں پہلی جگہ آباد تھا۔ گاؤں کے جنوب مغرب میں میل ڈیڑھ میل پر خٹک کی پہاڑیاں ہیں۔ (سیّد احمد شہیدؒ، جلد ۱، صفحہ ۳۸۹)

جب مسلمانوں کا لشکر ان کے قریب پہنچا، تو وہ نالے سے بندوقیں مارنے لگے اور باقی سکھ سنگر سے توپ سر کرنے لگے۔ مسلمانوں کی طرف سے بھی توپیں چلنے لگیں۔

یار محمد خاں کا فرار اس عرصے میں سردار سلطان محمد خاں، پیر محمد خاں اور فتح خاں نے اپنے اپنے سوار لے کر گھوڑوں کی باگیں اٹھائیں اور جا کر وہ نالہ لیا، جہاں سکھوں نے اپنے چار مورچے قائم کر لیے تھے۔ اس نالے کے چاروں مورچوں کے سکھ بھاگ کر اپنے سنگر میں جا گھسے۔ موضع شیدو کی طرف سے گوڑی شاہزادہ اپنی جماعت اور باقی اور غازی لے کر سنگر میں جا کودا۔ اس عرصے میں غازیوں نے سکھوں پر کئی حملے کیے یہاں تک کہ اُن کی توپیں چلنا موقوف ہو گئیں اور صاف نظر آنے لگا کہ لشکرِ اسلام کو فتح ہوئی یہاں تک کہ بعض لوگوں نے سید صاحبؒ کو اس کی مبارکباد بھی دی۔ سید صاحبؒ کی طبیعت اب بھی خراب تھی۔ کبھی ہوش آتا تھا، کبھی بے ہوش ہو جاتے تھے۔ مولانا محمد اسمٰعیل صاحب میدانِ جنگ سے الگ آپ کی خدمت میں تھے۔ سردار یار محمد خاں اپنے سوار لیے ہوئے جہاں کھڑا تھا، وہیں کھڑا رہا، اپنی جگہ سے نہ ہلا۔ ناگہاں توپ کا ایک گولا سکھوں کی طرف سے سردار یار محمد خاں کے قریب آیا جس سے کئی سوار اُڑ گئے۔ یہ واقعہ دیکھ کر یار محمد خاں نے پیچھے کو باگ پھیری اور فرار اختیار کیا۔ اُس کے بھاگتے ہی اُس کے تمام سوار بھاگ گئے۔ اس طرف میدان خالی دیکھ کر سکھوں کے دو تین ہزار سوار اپنے سنگر سے نکلے۔ یہ حال دیکھ کر کر سکھ آپہنچے، نالے والے سواروں نے حملہ کیا اور ان میں جا کر گڈمڈ ہو گئے۔ کئی بار انھوں نے اُن کا حملہ پھیر دیا۔ اس عرصے میں ایک سوار نے پکار کر کہا کہ یار محمد خاں تو اپنے سوار لے کر بھاگ گیا۔ یہ خبر سُن کر سکھوں کے مقابلے سے یہ تمام سوار پیچھے ہٹے اور بھاگے۔ سکھوں نے اُن کا تعاقب کیا۔ یہ حال دیکھ کر گوڑی شاہزادہ مع جماعت موضع شیدو میں مورچہ پکڑ کر بیٹھ گیا اور جم کر مقابلہ کیا۔ وہ اپنی جماعت کو لیے ہوئے ایک آہنی دیوار کی طرح مقابلہ کرتا اور دادِ شجاعت دیتا رہا یہاں تک کہ شہادت پا کر سُرخروئی حاصل کی۔

جب یار محمد خاں بھاگ گیا، تو لوگوں نے مولانا محمد اسمٰعیل صاحب سے عرض کیا کہ لڑائی بگڑ گئی، دُرانیوں نے دغا کی اور حضرت کو ہوش نہیں ہے، جلد یہاں سے چلنے کی تیاری کیجیے۔ مولانا سید صاحبؒ

کو ہاتھی پر لیے ہوئے چلے۔ ہندوستانی آپ کے ہمرکاب تھے۔ کچھ تھوڑی دُور گئے ہوں گے کہ فیلبان نے اپنے پیچھے دیکھا کہ سکھوں کے سوار بندوقیں مارتے ہوئے چلے آرہے ہیں۔ مولانا سے کہا کہ میں آپ کی خیرخواہی کے واسطے عرض کرتا ہوں کہ اِس وقت حضرت کو تو گھوڑے پر سوار کرکے چند آدمیوں کے ہمراہ پہاڑ کی طرف، جو ایک گاؤں ہے، اُدھر کو روانہ کر دیجیے اور آپ سب جمعیت کے ہمراہ اسی ہاتھی پر سوار رہیے کیونکہ سکھوں کے جو سوار آرہے ہیں، عجب نہیں کہ اسی ہاتھی کے اُوپر حضرت کا خیال کرکے آئیں۔ یہ سُن کر مولانا نے ایک گھوڑے پر آپ کو سوار کرنا چاہا۔ اس اثنا میں آپ کو قدرے ہوش آیا۔ پوچھا کہ مولانا صاحب لڑائی کا کیا طور ہے؟ اُنھوں نے عرض کیا کہ یار محمد خاں نے دغا کی، لڑائی بگڑ گئی۔ اِس وقت یہ صلاح ہے کہ آپ گھوڑے پر سوار ہو کر پہاڑ کی طرف تشریف لے جائیں اور میں اس ہاتھی پر لوگوں کو لیے ہوئے اَور طرف سے آپ کے پاس آتا ہوں۔ آپ گھوڑے پر سوار ہو کر چند ہندوستانیوں کے ساتھ پہاڑ کی طرف روانہ ہو گئے۔

زخمی اَور بیمار تُورو میں | مُجاہدین کے پیچھے موضع شَیدُو میں توپ اور شاہین چلتی رہی۔ نوشہرے میں مُجاہدین نے اُونٹوں پر کجاوے کس کر (جن کو سید صاحبؒ نے شیدُو کی جنگ سے پہلے تیاری کا حکم دیا تھا) اور خچروں اور ٹٹوؤں کو تیار کرکے زخمیوں اور بیماروں کو سوار کیا اور موضع تُورو میں لے گئے۔ بہادر خاں رئیسِ تُورو نے اپنی گڑھی کا مکان خالی کرا کے بیماروں کو اُتارا اور جانوروں کے لیے حکم دیا کہ ہمارے کھیتوں میں چھوڑ دو۔

سید صاحبؒ سے محبّت | اس بستی کی تمام عورتیں آئیں اور لوگوں سے پوچھنے لگیں کہ کہو، سید بادشاہ کہاں ہیں۔ باوجودیکہ اُن کے تمام اعزّا و اقربا بھی اس لڑائی میں گئے تھے، مگر اُن کے متعلق کوئی عورت نہیں پوچھتی تھی۔ ہر ایک دُعا دیتی تھی کہ الٰہی، سید بادشاہ کو صحیح سلامت رکھ!

سردار بہادر خاں نے مجاہدین کو اپنے پاس بُلایا اور کہا کہ بھائیو، میں تمھارا خادم اور خیرخواہ ہوں، پر کیا کروں، عاجز و ناچار ہوں۔ سکھوں کے آنے کی اِس طرف خبر ہے اور میں اُن کے مقابلے کے لائق نہیں۔ مناسب یہ ہے کہ تم اپنے بیماروں کو یہاں سے جلد نکال کر اَور کہیں امن کی جگہ میں لے جاؤ۔ چنانچہ وہ حضرات تُورو سے

پنجتار کے لیے روانہ ہو گئے۔

سید صاحبؒ محفوظ مقام پر ہندوستانی سید صاحبؒ کو چارپائی پر لیے ہوئے گھاٹ پر آئے۔ گھاٹ پر بکثرت ملکی بھی تھے اور درانیوں کے لوگ بھی تھے۔ ملکی کہتے تھے کہ ہم پہلے اتریں اور درانی کہتے کہ ہم اتریں۔ اس ردّ و بدل میں درانی سید صاحبؒ کی چارپائی کشتی پر نہیں رکھنے دیتے تھے۔ بیچارے ہندوستانی شش و پنج میں تھے۔ پیچھے سے سکھوں کی آمد کی خبر بھی گرم تھی۔ اس عرصے میں مولانا محمد اسمٰعیل صاحب اپنی جماعت کے ساتھ گھاٹ پر مسلح آ پہنچے اور سب کو ڈانٹ ڈپٹ کر کشتی سے اتار دیا۔ وہ شور و غل کرتے رہے۔ آپ نے جلد سید صاحبؒ کی چارپائی کشتی پر رکھ دی اور اپنے سب لوگ مل کر کشتی پر سوار ہوئے اور پار اتر گئے۔ چارسدے کے سادات سید صاحبؒ اور ہندوستانیوں کو اپنے مکان پر لے گئے۔ سید صاحبؒ کو جب کچھ ہوش آتا، تو مولانا محمد اسمٰعیل صاحب پوچھتے کہ آپ کی طبیعت کیسی ہے۔ آپ اُن کو تسلی دیتے کہ اللہ کا فضل ہے، آپ کچھ اندیشہ نہ کریں، اللہ تعالیٰ اس صدمے سے مجھ کو زندہ رکھے گا۔

چارسدے کے سیدوں نے یہ مشورہ کیا کہ سید صاحبؒ کو یہاں سے موضع محبیٰ، ہجلالہ اور موضع پٹی کی طرف لے جائیں اور موضع باغ میں ہو کر موضع چنگلئی کو پہنچا دیں۔ رات رہے سیدوں نے اپنا ایک رہبر ہمراہ کر کے اس طرف روانہ کیا۔ مولانا محمد اسمٰعیل صاحب سید صاحبؒ کو لے کر جماعت کے ساتھ موضع باغ میں مع الخیر پہنچ گئے۔ صبح کو سردار فتح خاں، مولانا محمد اسمٰعیل صاحب سے مشورہ کر کے سید صاحبؒ کو تمام مجاہدین سمیت موضع چنگلئی میں جو باغ سے ڈھائی یا تین کوس ہے لے گیا۔ بعد میں معلوم ہوا کہ جو لوگ سید صاحبؒ کو اترنے نہیں دیتے تھے، اُن کو یار محمد خاں نے بھیجا تھا کہ تم گھاٹ پر ایسا شور و فساد مچانا کہ پہر ڈیڑھ پہر کا وقفہ اُن کے اترنے میں ہو جائے۔ تب تک سکھوں کے سوار جا پہنچیں گے۔ تم الگ الگ رہو گے۔ وہ خود سید صاحب سے جیسا چاہیں گے، سمجھ لیں گے۔

رضا بالقضا اور دعا موضع چنگلئی میں کئی روز کے بعد سید صاحبؒ کو بخوبی ہوش آیا۔ آپ نے لوگوں کو غمگین اور اداس دیکھ کر مولانا محمد اسمٰعیل صاحب سے فرمایا کہ میاں صاحب، کیا حال ہے اور یہ تمام ہمارے مجاہدین بھائی کیوں اداس اور غمگین ہیں؟ جس روز سے آپ کو بے ہوشی ہوئی تھی، مولانا نے اس وقت تک

کا حال، جو بیان کرنے کے قابل تھا، بیان کیا۔ آپ نے پُوچھا: ہمارے اور مجاہدین بھائی کہاں ہیں؟" مولانا نے کہا کہ پنجتار اور تُورو میں ہیں۔ آپ نے فرمایا کہ اِن سب کو یہاں بُلوا لو اور فرمایا کہ مولانا صاحب، ہمارے سب مجاہدین بھائیوں کی تسلی اور دلجمعی کیجیے کہ یہ جو کچھ حال ہم پر اور سب بھائیوں پر گزرا، کچھ جناب الٰہی میں ہم لوگوں سے خطا اور بے ادبی ہُوئی ہے، اُسی کا یہ بدلہ ہے، اور یہ بھی ایک امتحانِ الٰہی تھا۔ وہ سُبحانہٗ تعالیٰ ایسی ایسی آزمائشوں پر ہم لوگوں کو اور ہمارے مجاہدین بھائیوں کو ثابت قدم رکھے اور ہماری تکلیف کو راحت سے بدل دے، اور ان لوگوں کا زہر دینا بھی حکمتِ الٰہی سے خالی نہیں۔ یہ بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک سُنّت ہم سے ادا ہوئی۔

پھر آپ نے ننگے سر ہو کر جناب باری میں اِلحاح و زاری کے ساتھ دُعا کی کہ "الٰہی! یہ ہم سب تیرے بندے ذلیل و خاکسار، عاجز و ناچار ہیں اور تیرے سوا ہمارا کوئی حامی و مددگار نہیں، محض تیرے ہی فضل و کرم کے اُمیدوار ہیں۔ ہم تیری آزمائش و امتحان کے قابل نہیں۔ ہماری خطاؤں کو نہ پکڑ۔ اپنی رحمت سے معاف کر اور ہم کو اپنی راہِ مستقیم پر ثابت قدم رکھ اور جو لوگ تیری اس راہ کے مخالف ہیں، اُن کو ہدایت کر۔ اسی طرح کے الفاظ بار بار کہے۔ لوگ "آمین! آمین!" کہتے تھے۔ دُعا کے بعد آپ نے سب کو تسلی اور دلاسا دیا کہ بھائیو، مت گھبراؤ۔ اللہ تعالیٰ تم پر اپنا فضل و کرم کرے گا۔

پنجتار کے سب غازی بھی بُلائے گئے اور تمام اسی بستی میں آکر جمع ہُوئے۔ بیس پچیس آدمی جو موضع تُورو میں میاں عبدالقیوم صاحب بہادر خاں کے پاس چھوڑ آئے تھے، اُن کو بھی آپ نے وہیں بُلوا لیا۔

کھانے کی تنگی اور مُجاہدین کا مُجاہدہ

مجاہدین کے لیے یہ بڑے اِبتلا کا زمانہ تھا۔ گنتی کے چھ سات آدمی تو تندرست تھے، باقی سب بیماروں کی خدمت کرتے تھے۔ کھانے کی تنگی کا یہ حال تھا کہ ایک مُٹھی مکئی ہر آدمی کو ملتی تھی۔ تندرست لوگ اس کو چکّی میں پیس لاتے اور لپٹا پکا کر مریضوں کو کھلاتے اور خُود کھاتے۔ ایک ترش تین پتّی کی گھاس ہوتی تھی، جس کو فارسی میں سہ برگہ کہتے ہیں؛ اس کو پیس چھان کر تھوڑا سا نمک ملا کر ان مریضوں کو پلاتے تھے۔ یہی دوا تھی۔ کسی دن وہ ایک مُٹھی مکئی بھی نہ ملتی۔ اس دن گھاسوں کی پتّیاں، جو بے مزہ نہ ہوتیں اور پکانے میں گل جاتیں، جنگل سے توڑ لاتے اور بڑی بڑی ہانڈیوں میں نمک ڈال

کرا آیا لیتے اور اُن مریضوں کو کھلاتے اور خود بھی کھاتے۔ کسی روز ایک بیمار مرتا، کسی روز دو، کسی روز تین؛ تار بندھا تھا۔ جو مر جاتے، اگر اُن کی کوئی چادر ہوتی، تو اسی کو پاک کر کے اس میں لپیٹ کر دفن کرتے۔ کئی جا جمیں بھی دُھلی ہوئی رکھی تھیں۔ اگر مرنے والے کے پاس کوئی چادر بھی نہ ہوتی، تو انھیں جا جموں میں سے ایک چادر پھاڑ کر اُس کے کفن کا انتظام کرتے تھے۔ جب متواتر فاقے ہوئے، تو ایک مرتبہ ایک پگڑی اور ایک تھان بیچ کر چند روز گزارا کیا۔ اس کے بعد پھر فاقے کی نوبت آگئی۔ اس عرصے میں فتح خاں پنجتاری کو اطلاع ہوئی۔ انھوں نے چند روز کے لیے غلّے کا انتظام کر دیا۔ اس عرصے میں ایک چھوٹا سا ہندوستانی قافلہ آ گیا۔ انھوں نے وہ روپے، جو جماعت کے لیے لائے تھے، حوالے کیے۔ اسی طرح جب تک سیّد صاحبؒ تشریف لائے، کام چلتا رہا۔

مرنے والوں میں، جن کے نام معلوم ہیں، ایک مولانا ولایت علی صاحب عظیم آبادیؒ کے چھوٹے بھائی مولوی طالب علیؒ تھے؛ دوسرے عبداللہ بسم اللہ تھے، جو پہلے مُنشّوں کے طائفے میں شامل تھے، پھر لشکرِ مجاہدین میں شامل ہوئے اور مردانہ وار راہِ خدا میں جان دی۔

جنگِ شیدو اور یار محمد خاں کا طرزِ عمل جنگِ شیدو کے موقع پر اسلامی افواج کی اتنی بڑی جمعیت فراہم ہو گئی تھی کہ جو نہ صرف سردار بدھ سنگھ کی فوج کو شکست دینے کے لیے، بلکہ پورے صوبۂ سرحد کو سکھوں سے آزاد کرانے کے لیے بھی کافی تھی۔ مسلمان تقریباً ایک لاکھ تھے، جن میں اسلامی ہند کا جاں نثار اور رشوقِ شہادت میں سرشار عنصر بھی تھا، جو کئی ہزار میل کا ہفتخواں سر کر کے اعلاءِ کلمۃ اللہ کے لیے آیا تھا۔ ان میں یوسف زئی سرداروں کی فوجی طاقت بھی تھی، جو ستّر اسّی ہزار افراد پر مشتمل تھی اور ان سب کے علاوہ سردارانِ پشاور کی کارآزمودہ فوج بھی تھی۔ اگر سردارانِ پشاور اس موقع پر اخلاص اور تعاون سے کام لیتے اور کچھ بھی ثابت قدمی اور استقامت دکھاتے، تو نہ صرف میدانِ جنگ کا، بلکہ ہندوستان کا نقشہ ہی دُوسرا ہوتا۔ لیکن عین اُس وقت جب کہ معرکۂ کارزار گرم تھا اور سکھ فوجیں پسپا ہو رہی تھیں، انھوں نے میدانِ جنگ سے علیحدگی اختیار کی اور نہ صرف خود میدان سے فرار اختیار کیا، بلکہ سیّد صاحبؒ کے ساتھ (جو جماعتِ مسلمین کے امام اور عساکرِ اسلامیہ کے قائدِ عام اور اس پورے سلسلے کے رُوحِ رواں تھے) ایسا معاملہ کیا کہ نہ صرف

اس معرکے میں تزلزل و انتشار پیدا ہوا، بلکہ قریب تھا کہ پورا سلسلۂ دعوت و جہاد، جو صدیوں کے بعد اپنی صحیح شکل میں ہندوستان میں پیدا ہوا تھا، درہم برہم ہو جائے۔

یار محمد خاں نے ایسا کیوں کیا؟ اس کے اسباب و محرکات کیا تھے؟ اس قدر جلد اس کی طبیعت میں برگشتگی کیوں پیدا ہوئی؟ اس کے حالات و مزاج سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس کو ابتدا سے سیّد صاحبؒ اور ان کے مقاصد سے خلوص نہ تھا۔ سیّد صاحبؒ تو یار محمد خاں کے لیے محض اجنبی اور پردیسی تھے اور ان کی رفاقت کے لیے سوائے خلوص اور دینی جذبے کے کوئی اور محرک نہ تھا اور اس کا یار محمد خاں کے یہاں فقدان تھا۔ اس نے اپنے ذاتی اقتدار اور مصلحتوں کے مقابلے میں اپنے بھائیوں کے ساتھ بھی وفاداری اور رفاقت کا معاملہ نہ کیا اور ہمیشہ لاہور کی سکھ حکومت سے اظہارِ وفاداری اور اپنی کار برآری کرتا رہا۔ اس نے اپنے سیاسی و ملکی مصالح کی بنا پر سیّد صاحبؒ کی رفاقت کا فیصلہ کیا، لیکن معلوم ہوتا ہے کہ شیدو کی جنگ سے پہلے سردار بدھ سنگھ نے اس کو ملا لیا اور یہ منصوبہ تیار ہو گیا کہ وہ عین معرکے میں میدانِ جنگ سے اپنی فوجوں کو لے کر علٰحدہ ہو جائے گا۔ سردار بدھ سنگھ کے لیے ایک مذبذب، موقع پرست، دنیادار رئیس کو دنیوی منافع کی لالچ دے کر اور اس جنگ کے عواقب سے ڈرا کر توڑ لینا کچھ مشکل نہ تھا۔ زہر خورانی کا واقعہ ایک مسلّمہ تاریخی حقیقت ہے۔ شیدو اور اس کے گرد و نواح میں اس کی عام شہرت تھی۔ مولانا عبدالحی صاحب نے (جو ۲ ذی قعدہ ۱۲۴۲ھ کو لشکر میں پہنچے ہیں) پنجتار سے اپنے دوستوں اور متعلقین کو جو خط لکھا ہے، اس میں یہی تذکرہ کیا ہے۔[1] خود سیّد صاحبؒ نے بھی متعدد خطوط میں اس کا تذکرہ فرمایا ہے۔[2] معاصر مؤرخوں میں سے لالہ سوہن لال "عمدۃ التواریخ" میں لکھتے ہیں:

منقولِ السنہ باشندگانِ آں روئے آب	دریائے اٹک کے اس پار رہنے والوں کے زباں
اٹک است کہ عالی جاہ یار محمد خاں بپاسِ ارتباطِ	زد ہے کہ عالی جاہ یار محمد خاں نے اس اتحاد و
اتحادِ سرکارِ دولت مدار درحینِ اشتعالِ نوائرِ	یگانگت کی بنا پر، جو ان کو سرکارِ دولت مدار
جدال و قتال احمد شاہ را شربتِ شیرین	(مہاراجہ) سے ہے، عین معرکۂ کارزار میں احمد شاہ

---

[1] مجموعۂ خطوط قلمی ص ۲۳۰　　[2] ایضاً ص ۵۹ و ص ۲۰۶

سمّ قاتل نوشانیدہ قرار بر فرار دادند و تمامی لشکریان نیز بمتابعتِ او پرداختند۔[1]

(سیّد صاحب) کو زہرِ ہلاہل دیا اور میدانِ جنگ کو چھوڑ کر چلا جانا طے کیا۔ ان کے تمام لشکریوں نے بھی اُن کی تقلید کی۔

جنگِ شیدو کے نتیجے پر دربارِ لاہور کی مسرّت

یوسف زئی اور دُرّانی سرداروں کے اس اتحاد اور مجاہدین کی اس جمعیت سے (جس کی مہاراجہ رنجیت سنگھ کو اطلاع ملتی رہتی تھی) لاہور میں بڑی تشویش اور خطرہ محسوس کیا جاتا تھا۔ اس جنگ کے نتیجے پر سکھ حکومت کے مستقبل کا بہت کچھ انحصار تھا۔ یار محمّد خاں کی بے وفائی نے جب جنگ کا پانسہ پلٹ دیا اور مسلمانوں کی فوج (جس سے تعداد میں بڑی فوج سکھوں کے مقابلے میں کبھی جمع نہیں ہوئی) منتشر اور پراگندہ ہو گئی، تو لاہور میں بڑی مسرّت و شادمانی کا اظہار کیا گیا اور خوشی میں چراغاں ہُوا اور توپیں سر کی گئیں۔ لالہ سوہن لال لکھتے ہیں:

سرکارِ دولت مدار بعد از استماعِ این خبر میمنت اثر شلیق توپخانہ کنانیدہ، منادی در شہر جلوہ ظہور پذیرفت کہ از روشنائی چراغاں دیدۂ بینندگاں را روشن سازند موافقِ حکمِ عالی ہنگامِ شب روشنائی بکمالِ لطافت و زیبائش رونقِ اعلان یافت۔[2]

سرکارِ دولت مدار نے یہ مُبارک خبر سُن کر حکم دیا کہ توپیں سر کی جائیں۔ شہر میں منادی ہُوئی کہ بڑے اہتمام کے ساتھ چراغاں ہو۔ چنانچہ فرمانِ شاہی کے مطابق شہر میں بڑے زور کا چراغاں ہُوا۔

مہاراجہ نے اس پر اکتفا نہیں کیا۔ اُنھوں نے اس واقعہ کی خوشی میں جشن منایا اور ہزاروں روپے تقسیم کیے۔ دیوان امرناتھ لکھتے ہیں:

چراغاں در لاہور و تمامی ممالکِ محروسہ شد و سرکارِ والا ہزارہا بر محتاجین و فقرا ایثار کردہ جشنِ شاہانہ فرمودند۔[3]

لاہور اور تمام ممالکِ محروسہ میں چراغاں ہُوا۔ سرکار نے ہزاروں روپے محتاجوں اور فقرا پر تقسیم کیے اور جشنِ شاہانہ منایا۔

---

[1] عُمدۃ التواریخ، دفترِ دوم صفحہ ۳۴۰ [2] ایضاً صفحہ ۳۴۰ [3] ظفرنامۂ دیوان امرناتھ، صفحہ ۱۸۱

دُوسرا باب

بونیر و سوات کا دَورہ

چَمَلہ و بونیر شَیدُو کے غیر مُتوقّع و دِل شکن واقعہ سے سیّد صاحبؒ کے عزم و ہمّت اور دعوتِ جہاد کے انہماک میں کوئی فرق واقع نہیں ہُوا۔ چنگلئی میں آپ نے ایک مہینہ گزارا، جس کا ابتدائی حصّہ علالت کے اثرات اور ان سے مکمّل افاقے میں گزرا۔ مہینہ گزُرتے ہی آپ نے بونیر و سوات کا دَورہ شروع فرما دیا۔

چنگلئی سے آپ علاقہ چَمَلہ کو روانہ ہُوئے۔ اس علاقہ میں کوگا نام ایک بستی ہے۔ ظُہر کے وقت اس میں تشریف فرما ہُوئے۔ وہاں سے تھوڑی دُور سیّدوں کی ایک بستی ناوگئی تھی۔ وہاں کے رئیس سیّد حَسَن رسُول صاحب بہت لوگوں کے ساتھ آپ کی ملاقات کو آئے۔ دُوسرے خوانین اور اطراف و جوانب کے سردار بھی روزانہ ملاقات کو آتے رہے اور بیعت سے مشرف ہوتے رہے۔ چار روز آپ نے کوگا میں قیام کیا۔ پھر وہاں سے علاقۂ بونیر کی طرف روانہ ہُوئے۔ شام کو دامن کوہ میں ایک بستی میں قیام کیا۔ آپ کی آمد کی خبر سُن کر تختہ بند کا رئیس سیّد میاں آپ کو لینے کو آیا اور صُبح کو آپ کو اپنی بستی میں لے گیا اور اپنے مکان پر اُتارا۔ آپ کی تشریف آوری کی خبر سُن کر اس نواح کے بہت سے خوانین اور سردار ملاقات کو آئے۔ مجاہدین اور اُن لوگوں کو ملا کر پانچ چھ سَو کی جمعیت ہو گئی۔ سیّد میاں اور اُن کی برادری والوں نے اِس جمِّ غفیر میں سب کے سامنے آپ کے ہاتھ پر بیعت کی۔ اُن کے بعد اِس نواح کے خوانین اور رُؤسا میں سے جو اُس

وقت حاضر تھے۔ دو ڈھائی سو آدمیوں نے بیعت کی اور سب نے کہا کہ ہم جان و مال سے آپ کے فرماں بردار ہیں؛ جو آپ فرمائیں، ہم بسرو چشم بجالائیں۔

سوات آپ نے تختہ بند میں چار روز قیام کیا۔ اسی عرصے میں مولانا محمد اسمٰعیل صاحب اور شیخ سعدالدین پھلتی، جو زخمی تھے، بیمار ہو گئے۔ ان دونوں صاحبوں کو آپ نے تختہ بند میں چھوڑا۔ باقی لوگوں کو لے کر آپ علاقۂ سوات کی طرف روانہ ہوئے۔ موضع الئی، تورسک، جوڑ[1] ٹھیرتے ہوئے کڑاکڑ پہاڑ کی چڑھائی چڑھ کر اس کی چوٹی پر گئے، جہاں سے علاقۂ بونیر کے مواضعات صاف نظر آتے تھے اور دوسری طرف علاقۂ سوات کی ایک ایک بستی دکھائی دیتی تھی۔ پھر اُس پہاڑ سے اُتر کر علاقۂ سوات میں داخل ہوئے۔ شافعیوں کے ایک موضع[2] میں سے ہوتے ہوئے، جو پہاڑ سے اُترنے پر ملا، موضع بُری کوٹ، موضع تھانہ میں قیام فرمایا۔ وہاں سے موضع اُچ کے سادات میں سے بہت سے لوگ آپ سے ملنے کو آئے اور اپنی بستی میں لے گئے۔ اور اپنے عزیز و اقارب کے ساتھ آپ کے ہاتھ پر بیعت کی۔

موضع اُچ میں آپ نے تین روز قیام فرمایا۔ اس عرصے میں مولوی محمد یوسف صاحب بیمار ہو گئے موضع کوٹی گرام کے سادات آپ کو لینے کو آئے تھے۔ آپ مولوی محمد یوسف صاحب کو بھی اپنے ساتھ کوٹی گرام میں لے گئے۔

مولوی قلندر صاحب کا قافلہ چوتھے یا پانچویں دن مولوی قلندر صاحب کا ستر اسی آدمیوں کا قافلہ کوٹی گرام پہنچا۔ آپ اُن کو دیکھ کر بہت خوش ہوئے اور مُصافحہ و مُعانقہ کیا اور ہندوستان کا حال پوچھا۔ پھر آپ نے سر کھول کر بطورِ معمول دیر تک دُعا کی۔

نمازِ عید اور قاضی احمد اللہ صاحب کا قافلہ کوٹی گرام میں آپ نے نمازِ عید پڑھی اور دیر تک دُعا کی۔ یہ ۱۲۴۲ھ کی عید الفطر تھی۔ آپ جب تک اس بستی میں رہے، صدہا لوگوں کو ہدایت ہوئی۔ وہاں بر سوات کے علاقے کے لوگ بھی حاضر تھے۔ اُنھوں نے اپنے یہاں آپ کو لے جانے کی درخواست کی۔ عید کے تیسرے دن آپ نے

---

[1] یہ سالارزئی پٹھانوں کی بستی ہے۔ نواب امیر خاں بانیِ ریاستِ ٹونک اسی قبیلے اور اسی بستی سے تعلق رکھتے تھے۔
[2] شافعیوں کی اس بستی کا نام "تاڈگئی" ہے۔

کوٹی گرام سے کوچ فرمایا اور بر سوات کی طرف روانہ ہوئے۔ راستے میں موضع اُچ کی دُوسری بستی میں تین دن قیام فرمایا۔ وہاں سے روانگی پر راستے میں قاضی احمد اللہ صاحب کا قافلہ ملا۔ قافلے میں ساٹھ، ستر آدمی تھے۔ آپ اُن کو دیکھ کر بہت خوش ہوئے۔ ہر ایک سے مُصافحہ و مُعانقہ کیا اور مزاج پُرسی کی۔ یہاں جن بستیوں کے درمیان تپنہ داری (گروہ بندی) تھی، اُن کے درمیان مصالحت فرمائی۔ اسی دوران میں مولانا محمد اسمٰعیل صاحب بھی تندرست ہو کر قافلے میں شامل ہو گئے۔ جمعدار عبدالحمید خاں، جن سے ٹونک میں ملاقات ہوئی تھی، چند آدمیوں کے ساتھ آکر آپ سے ملے۔

مولوی محمد یُوسُف صاحب کی وفات | مولوی محمد یُوسُف صاحب نہایت علیل تھے، مگر ہمراہ تھے۔ راستے میں ایک جگہ اُن کی وفات ہو گئی۔ سید صاحبؒ کو بہت ہی رنج ہُوا۔ دیر تک اُن کی خُوبیاں اور بُزرگیاں بیان فرماتے رہے۔ پھر اُن کے واسطے دُعائے مغفرت کی اور اُن کی نعشِ مبارک لانے کے لیے پھلت کے چند آدمیوں کو بھیجا۔ سید رستم علی صاحب نے عرض کیا کہ وہاں کے لوگ کہتے ہیں کہ ہماری بستی میں ایک بڑے ولی کا مزارِ پُر انوار ہے۔ وہیں پر مولوی صاحب کو دفن کرو۔ اُن کے ہمسایے میں اُن کو بہت فائدہ ہوگا۔ حضرت نے فرمایا کہ ہمارے مولوی صاحب آپ اللہ کے ولی ہیں۔ ہم اُن کو اسی بستی میں دفن کریں گے۔ اُن کی برکت سے یہاں کے مُردوں کو فائدہ ہوگا۔ پھر وُہ صاحبان وہاں سے نعشِ مُبارک لائے اور تجہیز و تکفین و نمازِ جنازہ کے بعد اس بستی کے گورستان میں دفن کیا۔ مولوی محمد یُوسف صاحب کے انتقال کا ہر شخص کو بڑا رنج تھا۔ خصوصاً پھلت والوں کو بڑا صدمہ ہُوا، اس لیے کہ وہ اُن پر باپ سے زیادہ شفیق تھے۔

مولوی رمضان صاحب کا قافلہ | بستی بانڈہ میں رڑکی والے مولوی رمضان صاحب سَو آدمیوں کا قافلہ لے کر آئے اور آپ سے ملے۔

منگورے میں آپ نے تین روز قیام فرمایا۔ وہاں سے منگلور (پرگنہ بابوزئی) ہوتے ہُوئے آپ چار باغ آئے، جو اس نواح میں بڑا آباد اور پُر رونق شہر تھا۔ بستی میں آپ کی آمد پر نقارہ ہُوا۔ وہاں کے مَلِک اور خوانین آئے۔ دعوتوں کا ایسا سلسلہ شروع ہُوا کہ ایک وقت میں کئی کئی جگہ دعوت ہوتی اور مُجاہدین میزبانوں کی خوشی کے لیے سب جگہ تھوڑا تھوڑا کھا لیتے۔ تین دن میں صدہا آدمیوں نے بیعت کی۔

گلی باغ کے سرداروں نے کوس، سوا کوس باہر نکل کر آپ کا استقبال کیا، ملّا اپنی زبانِ پشتو میں آپ کی سواری کے آگے آگے آپ کے فضائل بیان کرتے ہوئے چلتے تھے۔ گلی باغ کے ملک اور خوانین بیعت سے مشرّف ہوئے۔

شاہِ چترال کو تحفہ خواجہ خیل بستی میں چند لوگ آپ کے پاس آئے اور آپ سے کاشکار (چترال) کی باتیں کہنے لگے کہ وہاں کا بادشاہ بڑا دیندار اور غازی ہے۔ اکثر اپنے ملک کے کفّار و روافض سے جہاد کیا کرتا ہے۔ اگر آپ اس ملک میں تشریف لے جائیں، تو خوب ہو۔ آپ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ اس ملک میں ہم سے اپنی رضامندی کا کام لے۔ یہاں بھی جہاد موجود ہے۔ ان شاء اللہ تعالیٰ، وہاں بھی دعوتِ جہاد اور ترغیبِ غزا کے واسطے اپنے چند آدمی بھیجیں گے۔

خواجہ خیل سے آپ نے خونے کی طرف کوچ فرمایا۔ وہاں کے ایک سیّد اور رئیس، جو بڑے پیرزادے بھی تھے، آپ کو اپنی بستی میں لے گئے اور اپنا مہمان کیا۔ رفقاء اُن کی خانقاہ میں ٹھیرے۔ وہیں سے آپ نے اخوند فیض محمد کو کئی آدمیوں کے ساتھ کاشکار کی طرف روانہ کیا اور وہاں کے بادشاہ کے لیے ایک قرآن مجید پستول کی ایک جوڑی اور ایک پیش قبض تحفے کے طور پر بھیجے۔

خونے سے روانہ ہو کر موضع اشالہ[1]، درشت خیل، خنجرہ، شکر درہ، باندہ ہوتے ہوئے دریا اُتر کر چار باغ میں داخل ہوئے۔

مولانا عبدالحی صاحبؒ کی آمد چار باغ میں آپ کو اطلاع ملی کہ مولانا عبدالحی صاحب موضع چکدرہ میں مع الخیر داخل ہوئے۔ صبح کو، کچھ دن رہے، سیّد صاحبؒ نے بیس پچیس غازی، جن میں اکثر پھلت والے تھے، کہاروں کے ساتھ مولانا کو لانے کے لیے بھیجے۔ یہ لوگ چلنے کی تیاری کر رہے تھے کہ اُدھر سے مولانا دریا پر پہنچ گئے۔ سیّد صاحبؒ کو اطلاع ہوئی۔ آپ استقبال کے لیے دریا پر تشریف لائے۔ مصافحہ و معانقہ ہوا۔ مولانا نے آپ کے دستِ مبارک کو بوسہ دیا۔ سیّد صاحبؒ کو مولانا سے ملنے کا کمال اشتیاق تھا، اُدھر مولانا صاحب کو آپ سے ملنے کی بے حد آرزو تھی۔ وہاں سے باتیں کرتے ہوئے آپ

---

[1] اشالہ فتح پور اور خواجہ خیل کے درمیان ہے۔ (سیّد احمد شہید، ج ۱، صفحہ ۴۲۷)

چار باغ کو آئے اور مولانا کو علیحدہ مکان میں اُتارا۔

چار باغ سے منگورہ ہوتے ہوئے آپ ہوڈی گرام تشریف لائے۔

میاں مقیم کا قافلہ | ہوڈی گرام میں میاں مقیم صاحب رامپوری تیس چالیس آدمیوں کے قافلے کے ساتھ پہنچے۔ وُہ اپنے ساتھ کچھ نقد روپیہ اور کئی ضرب قرابین لائے تھے۔ وُہ اُنھوں نے نذر کیں اور آپ کے دستِ مُبارک پر اپنے ہمراہیوں کے ساتھ بعیتِ ہدایت اور بعیتِ جہاد کی۔ جیسے اس قافلے کے لوگ چالاک اور چُست اور سلاح و پوشاک سے دُرست تھے، ایسے جوان کسی قافلے کے نہیں تھے۔ جُرأت و شجاعت میں یکتا اور بانکے ترچھے ایسے تھے کہ کھانسی اور تھُوکنے پر تلوار مارتے تھے۔ مگر جس وقت سے اُنھوں نے آپ کے ہاتھ پر بعیت کی، ایسے صالح و پرہیزگار اور غمخوار و بُردبار ہو گئے کہ جو کوئی چار باتیں اُن سے ناحق کہتا، وُہ دیدہ و دانستہ پی جاتے اور کوئی کلام بیجا زبان پر نہ لاتے۔

پنجتار کو واپسی | ہوڈی گرام سے بری کوٹ ہوتے ہوئے کڑاکڑ کی چڑھائی کے کنارے شافعیوں کی بستی میں کچھ دیر ٹھیرتے ہوئے جوڑ، تورسک، موضع باجا، شل بانڈی، تختہ بند، کوگا ہوتے ہوئے چنگلئی تشریف لائے۔ وہیں آپ نے عیدالاضحیٰ کی نماز پڑھی اور قربانی کی۔ وہاں سے پنجتار کا رُخ کیا۔ فتح خاں کو خبر ہُوئی۔ وُہ چند سواروں کے ساتھ استقبال کو آیا اور باتیں کرتے کرتے اپنے ہمراہ پنجتار میں لے گیا۔ اس کے گرد سنگین کوٹ ہے۔ اس کے باہر ایک دیوان شاہ کا باغ مشہور تھا۔ وہیں سب لوگ اُترے۔ سید صاحبؒ نے بھی وہیں قیام فرمایا۔ کئی سفری ڈیرے، خیمے تھے؛ وہ کھڑے کیے گئے۔

دَورے پر ایک نظر | بونیر و سوات کا یہ دَورۂ تبلیغ و دعوت، افادہ و ہدایت اور جہاد کی تبلیغ و تحریض کے لحاظ سے بہت کامیاب رہا۔ اس دَورے میں اللہ کے ہزاروں بندوں نے آپ کے ہاتھ پر بعیت توبہ و جہاد کی اور آپ سے اور آپ کے خُلفاء سے باطنی فیوض حاصل کیے اور اُن کی خُدا پرستانہ و سرفروشانہ زندگی دیکھی۔ بہت سے قبائل میں، جن میں سخت کینہ داری اور نزاع و مناقشہ تھا، مصالحت ہُوئی۔ چنگلئی میں مہینہ بھر جس تنگی اور عُسرت اور بیماری کی حالت میں فاقے کے ساتھ وقت بسر ہُوا، یہاں اُسی قدر فراغت اور آسُودگی رہی۔ آپ جس وقت علاقۂ چیلہ کو روانہ ہُوئے تھے، پہاڑ کی چوٹی پر آپ نے ننگے سر ہو کر دیر تک بہت گریہ زاری

کے ساتھ دُعا کی تھی۔ دُعا کے بعد فرمایا تھا کہ جنابِ باری میں دُعا قبول ہُوئی اور اللہ سبحانہ تعالیٰ نے ہماری تکلیف دُور کی اور اپنا فضل ارزانی فرمایا۔ اس سفر میں ہر جگہ دُعا کی قبولیت کے آثار نظر آئے۔ اسی دَورے میں ہندوستان سے تازہ دم مُجاہدین اور سراپا اشتیاق مخلصین کے چار قافلے پہنچے، جن میں مجموعی طور پر پَونے تین سَو کے قریب مجاہدین تھے اور مولوی قلندر صاحب، قاضی احمد اللہ صاحب، جمعدار عبدالحمید خاں، مولوی رمضان صاحب، میاں مقیم رامپوری جیسے ممتاز حضرات تھے، جنھوں نے بعد کی جنگوں میں کارہائے نمایاں انجام دیے اور آخر وقت تک رفاقت کی۔ سب سے بڑھ کر یہ کہ اسی سفر میں مولانا عبدالحی صاحب بڈھانوی تشریف لائے، جن کا خود سیّد صاحبؒ کو بڑا اشتیاق و انتظار تھا۔ غرض، بونیر و سوات کا یہ دَورہ جماعت کے دائرے کی توسیع، مقاصدِ جہاد کی اشاعت اور مجاہدین کی تقویت کا پورا سامان رکھتا تھا اور نفسیاتی اور انتظامی حیثیت سے اس کی بڑی ضرورت تھی

خوشا وقتِ شوریدگانِ غمش
اگر ریش بینند و گر مرہمش

○

تیسرا باب

پنجتار کا مرکزِ مجاہدین

پنجتار کی اسلامی چھاؤنی | جنگِ بازار کے بعد جب آپ ہُنڈ کے قریب مقیم تھے، خدوخیل کے سردار فتح خاں پنجتاری نے بیعت کی تھی اور پنجتار کو، جو علاقۂ سوات کے قریب پہاڑوں کے بیچ میں ایک محفوظ مقام تھا، مرکز بنانے کی دعوت دی تھی۔ اس کے بعد ہی شَیدُو کا معرکہ پیش آیا اور آپ کو اور رُفقاء کو ایک مہینہ چِنگلئی میں قیام کرنا پڑا۔ اس کے بعد آپ نے بُنیر و سوات کا دَورہ فرمایا اور اس میں تقریباً تین مہینے لگ گئے۔ اس دَورے کے اختتام اور سفر سے واپسی پر آپ نے پنجتار ہی کا رُخ فرمایا۔ مجاہدین کے قیام، رُفقاء کی تعلیم و تربیت اور مجاہدانہ نقل و حرکت کے لیے اس سے زیادہ موزوں کوئی اور مقام نہ تھا۔ اسی مقام کو بالآخر طویل ترین عرصے کے لیے سیّد صاحبؒ اور آپ کے رُفقاء کا مستقر، اسلام کی چھاؤنی اور مرکزِ اصلاح و ارشاد بننے کی سعادت حاصل ہوئی[1] اور یہاں اسلامی زندگی اور اسلامی معاشرت کا صحیح نمونہ اور عبادت و مجاہدہ، اُخوّت و مساوات، خدمت و مواسات، ایثار و ہمدردی، سادگی و بے تکلّفی اور محنت و جفاکشی کے ایسے بھلے بھلے مناظر دیکھنے میں آئے، جو قرونِ اُولیٰ کی یاد تازہ کرتے ہیں۔ یہاں پر اُس زندگی کی، جو کم سے کم ہندوستان کی سرزمین

---

[1] صوبۂ سرحد کے زمانۂ قیام میں کسی مقام کو اس طرح مسلسل اور اتنے طویل عرصے کے لیے سیّد صاحبؒ کی مجاہدانہ سرگرمیوں کا مستقر و مرکز بننے کا شرف حاصل نہیں ہوا۔

پر صدیوں کے بعد وجُود میں آئی تھی مختلف روایات و بیانات اور خطوط کی مدد سے ایک تصویر پیش کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔

مولانا عبدالحیؒ نے اپنے ہندوستانی احباب کو پنجتار سے اپنی خیریت کا خط لکھا ہے جس میں وہاں کے بہت سے حالات بھی تحریر میں آگئے ہیں۔ مولانا فرماتے ہیں :

سرحد میں مجاہدین کی نوآبادی

"ان دنوں ۱۱ ذی الحجہ سے آج پنجشنبہ ۲۳ ذی الحجہ تک حضرت کا قیام پنجتار میں ہے۔ یہاں کا رئیس فتح خاں نامی بڑا صاحب ایمان اور مخلص شخص ہے۔ اس مُلک میں اس کی نظیر نہیں۔ مہاجرین کے ساتھ اس کا سلوک اور طرزِ عمل حضراتِ انصار کے سلوک اور طرزِ عمل کی یاد تازہ کرتا ہے، جو اُن حضرات نے مہاجرین کے ساتھ اختیار کیا تھا۔ دوسرے مواضعات کے رُؤسا کا بھی کم و بیش یہی حال ہے۔ کسی کا کم، کسی کا زیادہ۔ عوام بھی اسی طرح ہیں اِلّا ماشاء اللہ۔

مہاجرین مواضعات میں متفرق طور پر قیام پذیر ہیں۔ سات سَو آدمی گرد و نواح کے قصبات میں اور تین سَو حضرت کے ساتھ ہیں۔ یہ مواضعات ایک دُوسرے سے مُتّصل اور قریب قریب ہیں، گویا ایک شہر کے دُور دُور کے محلّے ہیں، جیسے ہمارے وطن کے قریب بارہ سادات یا بارہ بستی۔ دس بارہ من جنس سرکار (بیت المال) سے روزانہ تقسیم ہوتی ہے۔ اسی طرح ضرورت کے مطابق کپڑے بھی ملتے ہیں۔

ایک شخص نے، جو شاید ہندوستان سے آیا ہُوا تھا، مجھ سے پُوچھا: "یہاں سے واپس جانے والوں کو کیا حکم ہے؟" مَیں نے کہا: "گُناہگار ہیں"۔ کہنے لگا: "اگر بھُوک کے رہنے کی وجہ سے ہو؟" اس کا اصل جواب تو وقت کی تنگی اور اُس کے حال کے اشتباہ کی وجہ سے کہ سمجھے گا یا نہ سمجھے گا، میں نے دیا نہیں؛ اس کی اس طرح تسلّی کر دی کہ میرے عِلم میں یہ عُذر یہاں موجُود نہیں، اس لیے کہ جو لوگ یہاں بیمار ہیں، اُن سے سچ سچ پوچھو کہ تمھاری بیماری کا کیا سبب ہے۔ وُہ کہیں گے کہ زیادہ کھانے کی وجہ سے۔ کم سے کم میرے عِلم میں ایک آدمی بھی ایسا نہیں آیا، جو محض بھُوک کے رہنے

کی وجہ سے بیمار ہُوا ہو۔ تم ایسے دو تین بھُوکے لے آؤ؛ مَیں بیس ایسے آدمی پیش کر دوں گا، جو محض اپنی بسیار خوری کی وجہ سے بیمار پڑے۔ حدیث شریف میں ہے کہ انسان کے معدے کے تین حصّے ہیں؛ ایک حصّہ غذا کے لیے ہے، ایک حصّہ پانی کے لیے اور ایک حصّہ سانس لینے کے لیے۔ ایک شخص بھی ایسا نہیں جس کو اس کے معدے کے تیسرے حصّہ بھر کھانا نہ ملتا ہو؛ بلکہ ایسا آدمی بھی مشکل سے ملے گا، جس کو دو حصّے نہ پہنچتے ہوں۔ جو اس سے زیادہ کی بھی فکر کرے، وہ ضرور مُصیبت میں مُبتلا ہوگا۔ اس پر مجھے ایک قصّہ یاد آیا کہ ایک بے دین نے یہ حدیث سُن کر کہا: "مَیں تو پُورے معدے کو غذا سے پُر کر لیتا ہوں۔ پانی لطیف چیز ہے، وہ آپ اپنی گنجائش پیدا کر لیتا ہے۔ سانس کا کچھ نہیں، آئے، آئے؛ نہ آئے، نہ آئے، مجھے اس کی فکر نہیں۔ بہرحال جس کا اعتماد مضمونِ حدیث پر ہے، وُہ تو یہاں خُوش و خُرّم ہے اور جس کو یہ بات حاصل نہیں، وہ بے شک تکلیف اور کوفت میں مُبتلا ہے۔ باقی اصل جواب تو ان آیات میں ہے:

(۱) وَلَنَبْلُوَنَّكُمْ بِشَيْءٍ مِّنَ الْخَوْفِ وَالْجُوْعِ (أَلْبَقَرَةُ : ۱۵۵)	(۱) البتہ ہم تم کو آزمائیں گے کچھ خوف سے کچھ بھوک سے۔ (۲ : ۱۵۵)
(۲) ذٰلِكَ بِأَنَّهُمْ لَا يُصِيبُهُمْ ظَمَأٌ وَّلَا نَصَبٌ وَّلَا مَخْمَصَةٌ فِي سَبِيلِ اللّٰهِ وَلَا يَطَئُونَ مَوْطِئًا يَّغِيظُ الْكُفَّارَ وَلَا يَنَالُونَ مِنْ عَدُوٍّ نَّيْلًا إِلَّا كُتِبَ لَهُمْ بِهٖ عَمَلٌ صَالِحٌ ۭ إِنَّ اللّٰهَ لَا يُضِيعُ أَجْرَ الْمُحْسِنِينَ (أَلتَّوْبَةُ : ۱۲۰)	(۲) یہ اس واسطے کہ نہ کہیں پیاس کھینچتے ہیں، نہ محنت اور نہ بھُوک اللہ کی راہ میں اور نہ زیادہ ٹھیرتے ہیں کہیں جس سے ناراض ہوں کافر اور نہ چھینتے ہیں دشمن سے کوئی چیز، مگر لکھا جاتا ہے اس پر ان کا نیک عمل۔ بے شک اللہ نہیں کھوتا حق نیکی والوں کا۔ (۹ : ۱۲۰)
(۳) لَقَدْ تَّابَ اللّٰهُ عَلَى النَّبِيِّ وَ	(۳) اللہ مہربان ہُوا نبی پر اور مہاجرین پر اور

الْمُهٰجِرِيْنَ وَالْأَنْصَارِ الَّذِيْنَ اتَّبَعُوْهُ فِيْ سَاعَةِ الْعُسْرَةِ مِنْۢ بَعْدِ مَا كَادَ يَزِيْغُ قُلُوْبُ فَرِيْقٍ مِّنْهُمْ

(اَلتَّوْبَة : ۱۱۷)

انصار پر، جو ساتھ رہے نبیؐ کے مشکل کی گھڑی میں بعد اس کے کہ قریب ہُوئے کہ دل پھر جائیں بعضوں کے ان میں سے [1]

(۹ : ۱۱۷)

مجاہدین کی معاشرت اور طرزِ زندگی | مجاہدین کا عجیب عالم تھا۔ تکبّر، شان، خودی، ننگ و عار کا نام نہ تھا۔ ایک دوسرے کی خدمت کرتے، ہر کام میں للہ فی اللہ شریک ہوتے، دُوسرے کا ہاتھ بٹاتے، کسی کو محنت کا کام کرتے دیکھتے، تو بے کہے شریک ہو جاتے اور کرنے لگتے، اگرچہ اس کام کی اس روز ان کی باری نہ ہوتی۔ فقط ثواب جان کر کہ یہ کام خدا کا ہے، دُنیا کے سب کام کرتے: چکّی پیستے، کھانا پکاتے، کپڑے دھوتے اور سیتے، لکڑی چیرتے، گھاس چھیلتے، گھوڑا ملتے، بیماروں کی خدمت کرتے، اُن کا پیشاب، پاخانہ، قے اُٹھاتے، آپس میں ایک دُوسرے کی حجامت بناتے، پیر دباتے، زمین پر سوتے، پھٹے پُرانے کپڑے پہنتے۔ فحش گوئی، بدزبانی، حسد، عداوت کوئی نہ جانتا تھا۔ جہادِ کفّار کے ساتھ جہادِ نفس بھی اور مجاہدۂ رُوحانی بھی خانقاہوں سے زیادہ ہو رہا تھا اور ان تمام کاموں میں بڑے بڑے مخدوم اور امیرزادے شریک ہوتے اور اپنی سعادت و عزّت سمجھتے۔

جو لوگ بعد میں قافلوں کے ساتھ آئے اور آپ کے صحبت یافتہ نہ تھے، اُن کو یہ کاروبار دیکھ کر ننگ و عار معلوم ہوتا۔ وُہ کہتے کہ یہ رذیلوں کے کام ہیں، شُرفا کی شان کے لائق نہیں۔ سیّد صاحبؒ کو اُن کا عندیہ معلوم ہُوا۔ آپ کی عادت تھی کہ جو نصیحت کرتے، کسی کی طرف خطاب کر کے یا کسی کا نام لے کر نہ کرتے تاکہ لوگوں میں اُس کو ندامت نہ ہو۔ حکایت کے طور پر مثالیں بیان کرتے چنانچہ آپ نے ایک مثال دی کہ ایک عورت کا خاوند مر گیا۔ اس کے چھوٹے چھوٹے بچّے ہیں۔ اس کا

---

[1] مکتوباتِ فارسی قلمی، بمکتوب مولانا عبدالحی از پنجتار۔

خاوند کچھ مال و دولت چھوڑ کر نہیں مرا۔ وہ بیچاری چرخہ کاتتی ہے، پسائی کرتی ہے، سلائی کرتی ہے اور ہر طرح کی محنت مزدوری، جو بن پڑتی ہے، کرتی ہے اور بچوں کو پالتی ہے صرف اس اُمید پر کہ یہ پرورش پاکر جوان ہونگے، نوکری چاکری کریں گے، بڑھاپے میں مجھ کو روٹی دیں گے، خدمت کریں گے، میرا بڑھاپا آرام سے بسر ہوگا۔ اُس کی یہ اُمید موہوم ہے، یقینی نہیں۔ اگر وہ لڑکے زندہ رہے اور صالح اور لائق ہوئے۔ اپنی ماں کا حق پہچانا، تو اُس کی آرزو پوری ہوئی اور اگر وہ نالائق اور نکمّے نکلے، تو وہ بھیک بھیک کر مری۔ یہاں جو ہمارے بھائی محض خدا کے واسطے خالص نیّت سے چکّی پیستے ہیں، کھانا پکاتے ہیں، لکڑی چیرتے ہیں، گھاس چھیلتے ہیں، گھوڑا ملتے ہیں، کپڑے سیتے ہیں، اپنے ہاتھ سے کپڑے دھوتے ہیں اور اسی طور کے سب کام کرتے ہیں، یہ تمام داخلِ عبادت ہیں اور حضرت پیغمبر صلّی اللہ علیہ وسلّم اور صحابۂ کرام سے ثابت ہیں، سب اولیاء اللہ آج تک ایسے ہی کام کرتے آئے ہیں۔ جتنے کام شرع کے موافق ہیں، کسی کے کرنے میں عار نہیں۔ ان سب کاموں کا اجر اللہ اور اُس کے رسولؐ کے ارشاد کے مطابق اللہ تعالیٰ کے ہاں ملنا یقینی ہے۔ سب بھائیوں کو چاہیے کہ ان کاموں کو فخر و عزّت اور سعادتِ دارین سمجھ کر بلا عار و انکار کیا کریں اور یہ ہمارے صاحبِ ایمان مسلمان بھائی اپنے گھر بار، خویش و تبار، ناموس و نام، عیش و آرام ترک کر کے محض اللہ و رسولؐ کی خوشنودی کے لیے آئے، ہمارے لیے گوہرِ نایاب اور لعلِ بے بہا کے ٹکڑے ہیں کہ سیکڑوں بلکہ ہزاروں میں سے چھٹ کر آئے ہیں۔ ان کی قدر و منزلت ہم جانتے ہیں، ہر ایک نہیں پہچان سکتا۔ ان باتوں سے اور ماحول کے اثر سے رفتہ رفتہ نئے بھی پُرانے لوگوں کے رنگ میں رنگ جاتے۔

کاموں میں سیّد صاحبؒ کی شرکت ایک مرتبہ آپ ایک طرف کو گئے۔ وہاں دیکھا کہ میاں الٰہی بخش رامپوری بیٹھے چکّی پیس رہے ہیں۔ آپ نے فرمایا کہ ہم نے مکّے میں چکّی پیسی ہے، یہاں پر بھی پیسیں گے۔ یہ کہہ کر آپ بھی بیٹھ کر پیسنے لگے، شہرت ہوئی، تو سب لوگ جمع ہو گئے اور جن کو اِس سے پہلے اس کام سے عار تھی جاتی رہی۔

آپ کے باورچی خانے کا ایندھن جب ختم ہو جاتا، تو قادر بخش کنج پورے والے عرض کرتے

کہ حضرت، باورچی خانے میں ایندھن نہیں ہے۔ آپ فرماتے کہ آج لشکر کی سب کلہاڑیاں لا رکھو، کل چلیں گے۔ شام کو قادر بخش سب کلہاڑیاں منگوا رکھتے۔ صبح کی نماز پڑھ کر گھوڑے پر چڑھ کر آپ جنگل کو روانہ ہوتے اور کلہاڑیاں لے کر قادر بخش آدمیوں کے ساتھ جاتے۔ لشکر میں خبر ہوتی کہ آج حضرت امیر المؤمنین لکڑیاں لینے کو گئے ہیں۔ کھانا پکانے والے تو چار چار آدمی ہر بھیلے میں رہتے، باقی سب جاتے اور آپ کے واسطے لکڑیاں کاٹتے۔ آٹھ آٹھ آدمی آپ کے ساتھ کاٹتے کاٹتے تھک جاتے اور آپ اکیلے نہ تھکتے۔ جب لکڑیاں کاٹ کر فارغ ہوتے، تب ہر کوئی پشتارہ باندھ کر اپنے سر پر اُٹھا لاتا اور آپ کے باورچی خانے میں جمع کر دیتے۔ پھر ایک روز وہ لوگ جاتے، جو کھانا پکانے کو اُس دن بھیلے میں رہ گئے تھے اور اپنے اپنے حصّے کا ایک ایک پشتارہ آپ کے باورچی خانے میں پہنچا دیتے۔ یہ اہتمام لکڑیوں کا صرف مہمانداری کے واسطے تھا، کیونکہ جتنے مہمان لشکر میں آتے تھے وُہ سب آپ ہی کے باورچی خانے سے کھاتے تھے

ایک جگہ نمازِ جمعہ کے لیے خط کھنچا ہُوا تھا۔ وہاں سنگریزے بہت تھے۔ نمازیوں نے شکایت کی۔ آپ نے سیّد اسمٰعیل صاحب بریلوی سے فرمایا کہ درانتیاں رات کو لے کر جمع کر لینا، کل گھاس چھیلنے چلیں گے۔ صبح اُٹھ کر گھاس چھیل کر لائے اور مسجد میں بچھا دی

ایک مرتبہ لوگوں نے شکایت کی کہ خیمے میں دُھوپ جاتی ہے اور تکلیف ہوتی ہے۔ آپ نے فرمایا کہ درانتیاں جمع کر دینا۔ صبح اُٹھ کر آپ تشریف لے گئے۔ آپ نے نہایت انتظام سے خوبصورت ہوادار، کھڑکی دار جھونپڑے بنا دیے جنھیں دیکھ کر لوگوں میں بہت شوق پیدا ہوا اور بہت جگہ دیکھا دیکھی ایسے ہی جھونپڑے بن گئے۔[1]

مُجاہدین کی خوراک و پوشاک سب لوگوں کو ایک تاملوٹ گیہوں اور دو مُٹھی دال ملتی تھی۔ ہر بھیلے میں کھانا پکانے کا یہ معمول تھا کہ ہر روز اپنی اپنی باری سے چار آدمی بھیلے بھر کا کھانا پکاتے۔ ہر بھیلے میں بیس آدمی سے کم اور پچیس سے زیادہ نہ تھے۔ اسی طور آٹا پیسنے کا معمول تھا کہ چار چار آدمی

---

[1] وقائع احمدی

اپنی اپنی باری سے پلتے تھے۔

لکڑی لانے کا یہ دستور تھا کہ بہیلے وار چار آدمیوں کو تو اپنے بہیلے میں کھانا پکانے کو چھوڑ جاتا اور باقی سب کو جنگل میں لے جاتا اور وہاں سے کلھاڑیوں سے لکڑی کاٹ کر پشتارہ باندھ کر ہر کوئی اپنے اپنے سر پر لے آتا اور دُوسرے روز وہ چار آدمی، جو کھانا پکانے کر رہتے تھے، اپنے اپنے حِصّے کا ایک پشتارہ لکڑی کاٹ لاتے۔

جتنے مہمان لشکر میں آتے تھے، وہ سیّد صاحبؒ کے باورچی خانے سے کھاتے تھے۔ آپ نے وُہ باورچی خانہ فقط مہمانوں کے لیے رکھا تھا، وہ خاص آپ کی ذات کا نہ تھا۔ البتہ جہاں سب مہمانوں کا کھانا پکتا، وہیں آپ کا بھی پک جاتا۔

تقسیمِ لباس کا یہ معمول تھا کہ سال بھر میں دو جوڑے جُوتی کے، اور تین جوڑے موٹی کھادی کے ہر کسی کو ملتے تھے۔ اس کے علاوہ جاڑوں میں ایک دگلا اور رضائی کے واسطے ایک دوہر اور سیر بھر روئی ہر شخص پاتا تھا۔ اس کے سوا جس کا کپڑا جلد پھٹ جاتا یا گُم ہو جاتا، اُس کو ملتا تھا۔

کپڑے دھونے کے لیے ہر جمعرات کو سب کو صابُون کی دو، دو ٹکیاں تقسیم ہوتی تھیں۔ لوگ ندی نالے یا چشمے پر جا کر اپنے اپنے کپڑے دھولاتے تھے۔ سیّد صاحبؒ نے ترغیب کے لیے کئی بار اپنا حال بیان کیا کہ جب ہم نواب امیر خاں کے لشکر میں تھے، ہماری عادت تھی کہ جب اپنے کپڑے دھونے کو جی چاہتا، تو پانچ سات دوستوں کے مَیلے کپڑوں کی گٹھڑی باندھ کر کندھے میں ڈالتے۔ سب دوست "نہیں"، "نہیں" کرتے رہتے، ہم ایک نہ سُنتے اور ایک دیگچہ اور صابون اور آگ لے کر جہاں پانی ہوتا، چلے جاتے اور سب کپڑے دھولاتے اور سب دوستوں کو لا کر دے دیتے۔ وُہ خُوش ہو جاتے تھے۔

آپ کی اس ترغیب سے سُننے والوں کو بھی رغبت ہوئی اور ایسا ہی کرنے لگے کہ ایک آدمی یا دو آدمی اپنے بہیلے بھر کے کپڑے اور سب کے حِصّے کا صابون لے جاتے اور دھولاتے تھے۔

سید صاحبؒ کی مصروفیت | مولانا عبدالحی صاحب پنجتار سے اپنے دوستوں کو لکھتے ہیں کہ اپنے کام کی مصروفیت کے باوجود ارشاد و تلقین، بیعت و اجازت اور دَور و سَیر کا سلسلہ بھی بڑی سرگرمی اور انہماک سے جاری ہے؛ علماء و سادات، مشائخ زادوں اور عوام و خواص کا تانتا لگا رہتا ہے۔ ہندوستانی، سندھی اور ولایتی علماء و طلبہ سے مسائلِ دینیہ کا مذاکرہ بھی جاری رہتا ہے، آنے والے معززین و رؤسا کی ملاقات، ان سے مشورہ، غرباء اور معذورین کی دلجوئی، جو حصولِ برکت کے شوق میں دُور دُور سے آتے ہیں، ہندوستان اور افغانستان سے آنے والے مجاہدین کے قافلوں کی خبرگیری اور دیکھ بھال، لوگوں کو جہاد کی دعوت و ترغیب کے سلسلے بھی ایک وقت میں جاری ہیں۔ میں جب سے آیا ہوں، نگرانی اور دیکھ بھال میں کمی نہیں دیکھی۔ ان حالات اور مشاغل کو دیکھ کر یہاں کے خوانین اور سردار بھی سمجھ گئے ہیں کہ یہ شخص (حضرت سید صاحب) ان علماء و مشائخ کی طرح نہیں ہیں، جنھوں نے ہندوستان یا افغانستان میں کوئی شورش برپا کی اور دو تین دن کی مدت میں جیسے چراغ پھونک کر بجھا دیا جائے، پراگندہ ہو گئے؛ بلکہ یہ ایک صاحبِ عزم شخص ہیں، جن کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی مختلف تائیدیں ہیں۔[1]

○

---

[1] مجموعۂ خطوط (قلمی)

چوتھا باب

ہزارے کے سرداروں کی امداد

سوات کے دورے کے بعد سید صاحبؒ نے ہزارے کی طرف توجہ فرمائی، جو ایک عرصے تک آپ کی توجہات اور مجاہدین کی مجاہدانہ سرگرمیوں کا مرکز رہا۔ اس علاقے کے خوانین جو سکھ حکومت کے عہد میں اپنی ریاستوں اور جاگیروں سے محروم اور اپنے علاقوں سے جلاوطن ہو گئے تھے، فوجی امداد کے لیے خود حاضر ہوئے یا اپنے وکیلوں اور عزیزوں کو بھیجا۔ بالآخر اسی علاقہ ہزارہ کو آپ کی آخری مجاہدانہ سرگرمیوں کا مرکز بننا نصیب ہوا۔ اس لیے ضروری ہے کہ اس علاقے کی سیاسی تاریخ اور اس انتشار کا نقشہ ہمارے سامنے آجائے، جو تقریباً ایک صدی سے وہاں قائم تھا اور یہ اندازہ بھی ہو جائے کہ اگر وہاں کے رؤسا اور سرداروں میں اسلامی حمیت اور سیاسی شعور ہوتا، تو وہ کس طرح اس مخلص جماعت اور مجاہدانہ طاقت سے فائدہ اٹھا کر ایک نئی اسلامی حکومت کے قیام میں مدد دے سکتے تھے۔

ہزارہ دُرّانی عہد میں | نادر شاہ کے جانشین احمد شاہ دُرّانی نے ۱۷۴۸ء میں پنجاب پر حملہ کیا اور ۱۷۵۲ء میں پنجاب اور کشمیر پر اس کا قبضہ ہو گیا۔ اسی کے ساتھ ہزارے کی تاریخ میں ایک نئے دور کا آغاز ہوا۔ احمد شاہ کے عہد میں ہزارے کے نظم و نسق میں کسی قدر استحکام تو ضرور پیدا ہوا،

لیکن لگان میں اضافہ کرنا خود افغانی حکمرانوں کے مفاد میں نہ تھا۔ ضرورت کے وقت اُن کو اِس ضلع سے اچھے سپاہی مل جاتے تھے اور کشمیر کا ایک بہترین راستہ اس سے ہو کر گزرتا تھا۔ اس لیے اُنھوں نے مقامی سرداروں اور امیروں کے بڑے بڑے وظیفے مقرر کر دیے اور اس سے جو بچتا، اس پر وُہ قناعت کرتے تھے۔ شمالی ضلع کا اِنتظام سواتی قبیلے کے سردار کے سپرد تھا، تناوُل، کرّال اور گکھڑ کے پہاڑی خطّے کی نگرانی وہاں کے اُمراء کے ذمّے تھی اور میدانی علاقے کا اِنتظام کارداروں اور ترین کے سردار کے سپرد تھا۔ مگر انیسویں صدی شروع ہوتے ہی دُرّانی حکومت کی طاقت بہت گھٹ گئی تھی اور اسی کی مناسبت سے ہزارے کی اطاعت میں بھی کمی آ گئی تھی، اگرچہ یہ بات دُرّانی فرمانرواؤں اور کشمیر میں اُن کے نائبوں کو زیادہ متفکّر نہ کر سکی۔ اُن کی توجّہ کا مرکز دراصل کشمیر کی دولتمند وادی تھی اور وُہ راستے میں وقت صرف کرنا ایک فضول بات سمجھتے تھے۔ کشمیر جاتے ہُوئے اُن کی خواہش یہی ہوتی تھی کہ جلد از جلد وہاں پہنچ جائیں اور واپسی کے وقت یہ خواہش اور بھی زیادہ قوی ہوتی تھی۔ ایک غیر نفع بخش راہ میں قیام کرنا اُن کے دلوں کو بالکل نہیں بھاتا تھا۔ اس زمانے میں امن و اطمینان کے اِن حالات کا، جنھوں نے ہزارے کو اس کی موجودہ خوشحالی عطا کی ہے، کہیں پتہ نہ تھا۔

اٹھارویں صدی کے آخر اور انیسویں صدی کے شروع کی تاریخ نفاق، دغابازی، قتل قبائل کی خانہ جنگی اور عام بدامنی کی داستان کے سوا کچھ بھی نہیں ہے۔

سکھ حکومت کی اِبتدا سکھوں کی طاقت بڑھنا شروع ہو گئی تھی اور تقریباً ۱۸۰۲ء ہی میں اُنھوں نے کابل کی سلطنت کے خلاف آزادی کا اعلان کر دیا۔ ہزارے میں سکھوں کی حکومت ۱۸۱۸ء میں قائم ہُوئی۔ اس سال مانک رائے کے ترک ہاشم خاں نے اپنے قبیلے کے دُوسرے سردار کمال خاں کو قتل کر دیا۔ ترین کے سردار محمّد خاں نے کمال خاں کے خون کا بدلہ لینے کی ٹھانی۔ ہاشم خاں نے اپنے بچاؤ کی یہ تدبیر کی کہ مُلک سکھوں کو سونپ دیا۔ اس کی دعوت پر راولپنڈی کے سکھ گورنر مکھن سنگھ نے پانچ سو سوار لے کر ہزارے پر حملہ کر دیا، سرائے صالح میں قلعہ بنا لیا اور ہری پور کے میدان پر خراج

باندھ دیا۔

دوسرے سال مہاراجہ رنجیت سنگھ نے کشمیر فتح کیا اور لکھن سنگھ نے غالباً اپنے آقا کی روز افزوں کامیابیوں سے حوصلہ پاکر ترین کے سردار پر خراج کے لیے دباؤ ڈالنا شروع کر دیا۔ نتیجے میں ہزارے کی رعایا لکھن سنگھ کے خلاف اُٹھ کھڑی ہوئی۔ دریائے دوڑ کے کنارے شاہ محمدؐ نامی مقام پر جنگ ہوئی، جس میں لکھن سنگھ کو شکست کا مُنہ دیکھنا پڑا۔ دوسرے روز اس کی فوج سرائے صالح کا قلعہ خالی کرکے اٹک لوٹ گئی۔ اٹک کے گورنر حکما سنگھ نے سرکشوں کو سزا دینے کا ارادہ کیا اور فوج لے کر وہاں سے چلا۔ راستے میں موتا، سلطانپور اور ہرّوہ میں مخالفین سے جھڑپیں ہوئیں، جن میں اس نے محسوس کیا کہ اس کی فوج اِس مُہم کے لیے کافی نہ تھی اور وُہ اٹک لوٹ گیا۔ لاہور سے اُس نے مزید فوج طلب کی، جہاں سے دیوان رام دیال اور کرنل الٰہی بخش اس کی مدد کو آئے۔ ہزارے کا کچھ حصّہ سکھوں کے قبضے میں آگیا، مگر ترین کے سردار محمدؐ خاں اور رسید خانی اُتمان زئی اور مشوانی قبائل نے کوہ گنگر کے دامن میں ناڑا کے مقام پر زبردست مقابلہ کیا۔ دیوان رام دیال نے پوری احتیاط برتے بغیر اُن پر حملہ کر دیا، اُس نے مُنہ کی کھائی اور مارا گیا۔

امر سنگھ مجیٹھہ کی گورنری | رنجیت سنگھ نے امر سنگھ مجیٹھہ کو جنوبی ہزارے کا گورنر مقرر کیا۔ شمالی ہزارے، یعنی، سُواتی علاقے اور تناوُل کا انتظام اب تک کشمیر سے ہوتا تھا۔ نیا گورنر ایک نہایت ہوشیار آدمی تھا۔ اس نے تمام اُمراء کو بلا لیا اور ہزارے کے میدانی علاقے سے جو لگان اور خراج وغیرہ سابقہ دُرّانی حکومت وصُول کیا کرتی تھی، وُہ خُود وصُول کرنے لگا، مگر کرال کے سردار حسن علی خاں کے خلاف کامیاب لشکر کشی کرکے جب وُہ ناڑا کی راہ سے واپس آرہا تھا، تو قبائلیوں نے ایسا چھاپہ مارا کہ پس لشکر کو کاٹ کر رکھ دیا اور امر سنگھ کو بھی موت کے گھاٹ اُتار دیا۔ یہ واقعہ "سمندر" کے کنارے پیش آیا تھا، جو دریائے ہرّوہ کا ایک معاون چشمہ ہے۔ اس کے بعد مائی سدا کور اور رنجیت سنگھ کے لڑکے شیر سنگھ کی سرکردگی میں لاہور سے مزید کمک آئی۔ یہ فوج ہری پور کے میدان میں اُتری اور تربیلہ میں اس نے قلعہ تعمیر کر لیا۔ سرداروں سے جو خراج وصُول کیا جاتا تھا، اس پر نظر ثانی

کی گئی اور سدا کور نے ایک باقاعدہ جشن منعقد کر کے ترین کے سردار محمد خاں کو متبنیٰ کر لیا۔

سردار ہری سنگھ نلوہ کی آمد مگر بڑے اہم واقعات ہزارے کے سر پر منڈلا رہے تھے۔ مہاراجہ نے کشمیر کے مشہور و معروف گورنر ہری سنگھ نلوہ کو اپنی عملداری کا حساب پیش کرنے کے لیے طلب کیا تھا۔ چنانچہ وہ سات ہزار پیادہ سپاہیوں کے ہمراہ مظفر آباد اور پکھلی کے راستے سے روانہ ہوا۔ منگل پہنچ کر اُس نے دیکھا کہ جدون اور تناول قبیلوں کی بہت بڑی تعداد کوئی پچیس ہزار اُس کا راستہ روکنے کو موجود تھی۔ ہری سنگھ نے پہلے مصالحت کی گفتگو کی۔ مگر جب وہ ناکام رہی، تو اُس نے اس زور کا حملہ کیا کہ قبائلی میدان چھوڑ کر بھاگ کھڑے ہوئے۔ ہری سنگھ نے شہر کو نذرِ آتش کر دیا۔ ان جل کر مرنے والوں اور اُن کے علاوہ، جنھوں نے فصیلوں پر سے پھاند کر جان دے دی تھی، تقریباً دو ہزار قبائلی جنگ میں مارے گئے۔ نیز ہری سنگھ نے جدونوں پر پانچ پانچ، چھ چھ روپے فی گھر جرمانہ بھی مقرر کیا اور نواں شہر میں قلعہ تعمیر کیا۔ اس کے بعد اس نے جنوبی ہزارے کی طرف کوچ کیا۔ اس فتح اور کشمیر سے وہ جو بیش بہا تحائف اور عظیم دولت ساتھ لایا تھا، ان سے خوش ہو کر رنجیت سنگھ نے اسے حساب داخل کرنے سے معاف کر دیا اور اسے کُل ہزارے کا گورنر بھی مقرر کر دیا۔

ہری سنگھ کے عہد میں ہزارے کے حالات ۱۸۲۲ء سے لے کر اپنے آخر وقت، یعنی ۱۸۳۷ء تک ہری سنگھ ہزارے پر حکومت کرتا رہا۔ اُس نے قبائل کو بڑی سختی سے دبایا اور سکھوں کی طاقت میں خوب اضافہ کیا۔ اس کے اولین کاموں سے ایک کام ہری پور کے قلعے کی تعمیر تھی، جو نہایت درجہ مضبوط تھا۔ اس کا نام اُس نے ہری کشن گڑھ رکھا۔ اس نے سواتیوں اور تناولیوں کو زبردست سزائیں دیں، جنھوں نے اس کے ڈیرہ جات کے سفر سے فائدہ اُٹھا کر نواں شہر، شنکیاری اور دربند کے قلعوں پر چڑھائی کر دی تھی۔ جدونوں کو تہ تیغ کر ڈالا گیا۔ اگرور، ٹکاری اور کونش پر پانچ سو سواروں سے حملہ کیا گیا۔ سواتیوں کی ایک ہزار عورتیں اور بچے گرفتار کر لیے گئے۔ بلال تنولی کے سردار سربلند خاں کے صدر مقام شنگری کو آگ لگا دی گئی۔ خود سردار کو باندہ لوہاران کے قریب شکست دی گئی اور اس کے فرزند شیر خاں کو ہری سنگھ نے اپنے ہاتھ سے قتل کر ڈالا۔

ناڑا میں ہری سنگھ کو شکست اس کے بعد ہری سنگھ گنگر کی پہاڑیوں کی طرف متوجہ ہوا جہاں محمدؐ خاں اور کچھ دُوسرے باغی سردار پناہ گزیں ہو گئے تھے۔ اس سے قبل ۱۸۲۲ء میں سکھ اس پہاڑی سلسلے کے دامن میں سرائے نامی مقام پر فتحیاب ہونے کے بعد سری کوٹ کو زیر کرنے کی کوشش کر چکے تھے، مگر ناکام رہے تھے۔ اب ۱۸۲۴ء میں اُنھوں نے دوبارہ کوشش کی اور پھر ناکام رہے ناڑا میں، جو ایک سری کوٹ جانے والے راستے کے ابتدائی سرے پر واقع ہے، مشوانیوں اور سید خانی اُتمان زئیوں نے جم کر مقابلہ کیا اور سکھ افواج کو، جن کی تعداد تقریباً آٹھ ہزار تھی شکستِ فاش دے کر ہری پور لوٹنے پر مجبور کر دیا۔ ۵۰۰ سکھ سپاہی مارے گئے۔ قبائلیوں کی اس فتح کی یادگار کے طور پر کرنل ایبٹ نے یہاں ایک سفید ستون نصب کرایا ہے، جو دُور سے نظر آتا ہے۔ خُود ہری سنگھ ایک پتھر سے زخمی ہو کر، جو کسی نے گاؤں سے پھینک مارا تھا، زمین پر گرا اور لڑھکتا ہُوا نیچے کھڈ میں جا پہنچا۔ وہاں وہ دیر تک بے ہوش پڑا رہا۔ اس اثنا میں اس کی موت کی افواہ پھیل گئی، مگر ہوش آتے ہی وہ اچانک موضع بگرا میں آدھمکا، جہاں بہت سے قبائلی جمع ہو گئے تھے۔ ہری سنگھ کو وہاں جو بھی مسلح آدمی نظر آیا، اس کو موت کے گھاٹ اُتروا دیا۔

ہزارے میں رنجیت سنگھ کی آمد ہری سنگھ کی شکست کی اطلاع پاتے ہی رنجیت سنگھ ایک بڑی فوج لے کر ہزارے آیا۔ اس نے ان تمام سرداروں اور دُوسرے ممتاز افراد کو، جنھوں نے سری کوٹ میں پناہ لے لی تھی، طلب کیا، لیکن صرف ترین کے محمدؐ خاں، تنولی کے سربلند خاں اور مشوانیوں کے شاہ محمدؐ نے اس کے حکم کی تعمیل کی۔ چنانچہ اس نے سری کوٹ کی پہاڑیوں پر ایک ساتھ کئی مقاموں پر حملہ کر دیا اور جو بھی مقابلے پر آیا، اس کو زیر کرتا ہُوا دو رات وہاں مقیم رہا اور پھر تربیلہ کو کوچ کر گیا۔ وہاں وہ ہاتھی پر سوار دریا کے کنارے سیر کر رہا تھا کہ کھبّل کے اُتمان زئیوں نے دُوسری طرف سے اس پر گولی چلا دی۔ اس سے برہم ہو کر اس نے دُوسرے روز صبح اپنے سواروں کو دریا عبُور کرنے کا حکم دیا اور کھبّل اور کایا کے مواضع برباد کر کے رکھ دیے۔ اُن کے باشندے پہاڑیوں پر بھاگ گئے۔ رنجیت سنگھ ترین کے محمدؐ خاں کو ساتھ لے کر یُوسف زئی اور سرائے کالا ہوتا ہُوا لاہور لوٹ آیا۔

رنجیت سنگھ کی واپسی کے بعد سردار ہری سنگھ کے سخت اقدامات رنجیت سنگھ کی واپسی کے بعد ہری سنگھ کرال کی طرف متوجہ ہوا، جنھوں نے جنگ کے بغیر اطاعت قبول کرلی۔ اُن کے سردار حسن علی خاں کو ایک بڑی جاگیر عطا ہوئی اور ناڑا میں قلعہ تعمیر کیا گیا۔ ان کاموں سے فارغ ہو کر ہری سنگھ نے موہن سنگھ کو نائب گورنر مقرر کیا اور خود لاہور چلا گیا۔ اس کے جانے کے کچھ ہی دن بعد محمد خاں، جو لاہور میں اسیر تھے، ان کے بھتیجے بوستان خاں ترین نے سری کوٹ میں علمِ بغاوت بلند کیا۔ اس لیے وُہ پھر واپس ہُوا اور بغیر کسی خاص دقت کے بغاوت کا سر کچل دیا۔ آئندہ کے لیے شورشوں کا سدِّ باب کرنے کی خاطر اس نے سخت ترین کارروائی کی۔ محمد خاں کو، جسے اُس نے رنجیت سنگھ سے پچاس ہزار روپے میں خرید لیا تھا، اُس نے زہر دلوا دیا۔ بوستاں خاں ترین اور دو مشوانی اُمرا اور چند دُوسرے ممتاز اشخاص کو توپ سے اُڑا دیا گیا۔ مشوانیوں کو سری کوٹ سے دریائے سندھ کے اس پار مُلک بدر کر دیا گیا، جہاں سے ۱۸۳۰ء میں اُن کی واپسی ہُوئی۔ وہ پچاس ہزار جن کے عوض محمد خاں کو خریدا گیا تھا، ہزارے کے قریب کُل مواضع سے ڈھائی روپیہ فی گھر کے حساب سے بطورِ جُرمانہ وصُول کیے گئے۔[۱]

فوجی امداد کے لیے خوانین کی آمد اس دورِ انتشار میں ہزارے میں کوئی ایسی بلند اور مرکزی شخصیت نہ تھی، جس کی قیادت میں یہ مختلف و منتشر عناصر جمع ہو کر اپنے مشترک حریف کا مقابلہ کرتے اور نہ کہیں کوئی ایسی فوجی طاقت پائی جاتی تھی، جس سے یہ اپنے علاقے کو بازیافت کرنے کے لیے مدد لیتے۔ عین اسی حالت میں سیّد صاحبؒ نے پنجتار کو اپنا فوجی مستقر اور اسلامی امارت کا مستقر بنایا اور تنہ کے نامی گرامی سردار، بالخصوص فتح خاں پنجتاری، اشرف خاں زیدے والا وغیرہ ایک جھنڈے کے نیچے جمع ہوئے۔ ہزارے کا یہ علاقہ پنجتار کے علاقے سے متصل تھا۔ ہزارے کے ان زخم خوردہ سرداروں نے اس نئی اُبھرتی ہُوئی اسلامی طاقت کے دامن میں پناہ لینے کے سوا اپنے لیے کوئی اور راستہ نہ دیکھا۔ اُنھوں نے یکے بعد دیگرے خود سے یا اپنے وکیلوں اور عزیزوں کو بھیج کر سیّد صاحبؒ سے

---

[۱] ترجمہ و اقتباس از ہزارہ گزیٹیر، ترجمۂ ڈاکٹر محمد آصف قدوائی۔

اپنے تعلق اور عقیدت کا اظہار اور اپنی حمایت اور امداد کی درخواست کی۔

علاقۂ پکھلی سے سربلند خاں نے آکر سید صاحبؒ سے بیعت کی اور اپنی جلاوطنی کا حال عرض کیا اور کہا کہ سکھوں نے ظلم و تعدّی کرکے مجھے نکال دیا اور درخواست کی کہ آپ اس کی فوجی امداد کریں اور وہ اپنی ریاست کو دشمن کے قبضے سے نکال لے۔ اسی طرح حبیب اللہ خاں کا وکیل؛ مظفرآباد سے سلطان نجف خاں اور سلطان زبردست خاں کا وکیل، امِب کا رئیس راجہ پارس، علاقۂ اگرُور سے عبدالغفور خاں کا بھائی کمال خاں، امان اللہ خاں خان خیل اور ان کا بیٹا عنایت اللہ خاں، ناصر خاں بھٹ گرامی (علاقۂ سندھیاڑ) بھی اسی غرض کے لیے آنے والوں میں تھے۔ اسی اثنا میں امب کے پائندہ خاں تنولی کی عرضی آئی کہ میں آپ کا مطیع و فرمانبردار ہوں اور جان و مال سے حاضر ہوں۔

آپ نے خوانین اور اُن کے وکلاء کو رخصت فرمایا اور ارشاد فرمایا کہ آپ پہنچ کر اپنے موافقین کو جمع کریں، ہمارے آدمی بھی پیچھے سے آتے ہیں۔

پائندہ خاں سے استصواب | شیدو کے واقعہ کے بعد سید صاحبؒ کو تردّد تھا کہ پہلے پشاور کا بندوبست اور امرائے پشاور کا تصفیہ کیا جائے جنھوں نے عین موقع پر مجاہدین کو دغا دی اور بنا بنایا کھیل بگاڑ دیا یا ہزارے کی طرف رُخ کیا جائے، جہاں بہت سے سردار اور والیانِ ریاست مجاہدین کی امداد کے طالب اور سکھوں سے جنگ کرنے پر آمادہ تھے۔ ان سرداروں میں سید صاحبؒ کا سب سے زیادہ رُجحان پائندہ خاں والیِ امب کی طرف تھا۔ سید صاحبؒ نے اس کی مردانگی اور سکھوں کے مقابلے میں پامردی اور استقلال کی بہت تعریف سُنی تھی۔ سید صاحبؒ کو طبعاً مردانگی و شجاعت، سپاہیانہ اوصاف اور دشمنانِ اسلام سے نبرد آزمائی اور معرکہ آرائی اتنی عزیز تھی کہ جس شخص کے متعلق معلوم ہوتا تھا کہ اس میں یہ اوصاف ہیں، اس کی بڑی قدر کرتے تھے۔ پائندہ خاں کی عرضی پڑھی گئی، تو جو خوانین حاضر تھے، وہ اس کی مذمت کرنے لگے اور اس کی بدعہدی اور بے وفائی کے واقعات بیان کرنے لگے۔ آپ نے فرمایا: "بھائیو، ایسی بات نہ کہنی چاہیے۔ وہ خان بڑا نامی بہادر اور جوانمرد ہے۔ اُس نے ہم کو اِس طرح لکھا ہے۔ وہ مسلمان ہے۔ ہم اس پر کیونکر بدگمانی کریں؟ ہدایت اور

ضلالت اللہ تعالیٰ کے اختیار میں ہے۔ ایک دم میں بُرے کو بھلا اور بھلے کو بُرا کر دیتا ہے۔"[1]

سیّد صاحبؒ نے ۲۸ ذی الحجہ ۱۲۴۲ھ کو ایک خط لکھا، جس میں اس کی حمیّت و شجاعت اور کفّار سے مسلسل جنگ کرتے رہنے کی بڑی داد دی اور تحریر فرمایا: "جب سے اس علاقے میں آیا ہوں، تمھاری دینی غیرت اور بہادری کی تعریف سُن رہا ہوں، خصوصاً میاں سید شاہ کی زبانی تمھارا جو تذکرہ سُنا، اس سے تعلق بہت بڑھ گیا ہے۔ اس وقت ہمارے سامنے دو مہمیں درپیش ہیں: ایک پشاور کی مہم اور ایک کفّار سے جہاد۔ اس کے بارے میں تمھارا مشورہ بھی مفید اور وقیع ہوگا۔ اس مقصد کے لیے ملا شاہ سید اخوند زادہ اور خان عالی شان سید مقیم کو، جو اس فقیر کے بڑے عزیز و معتمد اور بڑے عاقل و فرزانہ شخص ہیں، روانہ کیا جا رہا ہے۔ آپ ان کو اپنے خیالات سے آگاہ فرمائیں۔ اس وقت اس معاملے میں تعویق کی گنجائش نہیں۔"[2]

○

---

[1] وقائع احمدی، جلد سوم ص ۱۲۹۴ [2] مکاتیب شاہ اسمٰعیل شہید ص ۱۲۲، ۱۳۰

پانچواں باب

اگرور اور پکھلی کے علاقے میں

لشکر کی تیاری سید صاحبؒ نے پکھلی کے لیے لشکر مرتب فرمایا، جس کے لیے سید محمد مقیم صاحب رامپوری اور اُن کے ساتھیوں کا انتخاب ہُوا۔ یہ جب سے آئے تھے، درخواست کر رہے تھے کہ ہم لوگ یہاں روٹیاں کھانے کے لیے نہیں آئے ہیں، ہم چاہتے ہیں کہ کچھ خدا کا کام ہمارے ہاتھوں سے ہو۔ اس قافلے کے لوگ سلاح و پوشاک سے بھی خوب آراستہ اور کارآزمودہ تھے۔ آپ نے اس پورے قافلے کو اور اس کے علاوہ سَو آدمی اور ہر پہلے سے دو دو، چار چار چُن کر مقرر کیے مولانا محمد اسماعیل صاحب ہی کو سب کا امیر مقرر کیا اور بارُود کا سامان بھی سپرد کیا۔ گولی بارود کے علاوہ بانس کے پانچ سات سُونل بھی دیے گئے تھے، جو ایک ایک ڈیڑھ ڈیڑھ بالشت لمبے تھے۔ ان میں بارُود بھری ہُوئی تھی۔ ان نلوں کو آگ دے کر دشمنوں پر پھینکتے تھے۔ رخصت کے وقت ننگے سر ہو کر دیر تک دُعا فرمائی اور لوگ مصافحہ کر کے رخصت ہُوئے۔

اگرور اور اَمب کے حالات مولانا اسمٰعیل شہید کی زبانی مولانا اسمٰعیل شہید نے، جو امیرِ جیش بھی تھے، اگرور اور اَمب سے سید صاحبؒ کی خدمت میں متعدد مراسلے ارسال کیے، جن میں سفر کی پوری روئداد، چشم دید حالات اور اس علاقے کے خوانین اور اُمراء کے خیالات،

مزاجی کیفیت اور اس علاقے میں جہاد کے امکانات اور مشکلات کا بڑے مُبصرانہ طریقے پر جائزہ لیا گیا ہے۔ ان خطوط کا خلاصہ پیش کیا جاتا ہے، جو حالاتِ سفر کے متعلق ایک قیمتی دستاویز ہے۔ ان خطوط سے مولانا کی بیدار مغزی، سیاسی ہوشمندی اور قائدانہ صلاحیتوں کا بھی اندازہ ہوتا ہے۔[1]

ستھانے میں | "جنابِ والا سے ہم لوگ رخصت ہو کر موضع ٹوپئ میں پہنچے۔ وہاں ایک رات گزارنے کے بعد ہم کھبل میں آئے۔ تیسرے روز وہاں سے اَمب کا رُخ کیا۔ فدوی محمد اسمٰعیل نے راستے میں سُنا کہ مقام ستھانہ میں، جو راستے سے ذرا ہٹا ہوا ہے، کسی تقریب کے سلسلے میں کھبل کے ملک حضرات اخوان خیل کے معززین اور ملا اسمٰعیل اخوندزادہ، سیّد اعظم شاہ اور سیّد اکبر شاہ کے پاس، جو اس علاقے کے مشاہیر اور اکابر میں سے ہیں، مجتمع ہیں۔ اس بنا پر سیدھا راستہ چھوڑ کر شاہ سیّد کو اپنے ہمراہ لے کر چند رُفقاء کے ساتھ ستھانے پہنچا۔[2] میں نے ستھانے میں کچھ دیر قیام کیا اور اُن تمام حضرات کو، جو وہاں مجتمع تھے، جہاد کی ترغیب دی اور اُن سے جنابِ والا کی بیعتِ امامت لی۔ میں نے یہ بھی چاہا کہ ان لوگوں کو ہمراہ لے کر اَمب آؤں، لیکن اُنھوں نے بعض عُذر پیش کیے اور کہا کہ آج تو ہمارا جانا مشکل ہے، ایک دو روز کے بعد اگر آپ طلب کریں گے، تو ہم حاضر ہو جائیں گے۔[3] میں نے اخوندزادہ

---

[1] یہ خطوط تعداد میں پانچ ہیں۔ عام طور پر فارسی میں ہیں، بعض حصے بلیغ عربی میں ہیں۔ ان میں سے بعض تینوں صاحبوں کی طرف سے ہیں، بعض صرف مولانا محمد اسمٰعیل اور میاں محمد مقیم صاحب کی طرف سے۔ ایک عربی کا رقعہ بھی ہے جو مولانا کی طرف سے ہے اور اس میں دونوں ہمراہیوں سیّد محمد مقیم اور شاہ سیّد کے متعلق مولانا نے اپنی رائے کا اظہار فرمایا ہے۔

[2] کھبل سے لشکر کو براہِ راست اَمب بھیج دیا گیا تھا اور شاہ صاحب ایک مختصر جماعت کے ساتھ ستھانے آ گئے تھے۔

[3] وقائع احمدی میں ہے:

"ستھانے میں سید اکبر صاحب، جو غائبانہ سیّد صاحبؒ کے نہایت معتقد تھے، کمالِ اخلاق اور تواضع و تعظیم سے ملے اور مولانا سے بطریقِ خیر خواہی کہا کہ آپ کو یہاں کے رئیسوں کا حال معلوم نہیں، ہم سے دن رات معاملہ رہتا ہے۔ یہ آپ کو خوشامد و چاپلوسی سے لے جائیں گے اور سکھوں سے بھڑا دیں گے اور خود دُور سے تماشا دیکھیں گے۔ اگر آپ نے فتح پائی، تو مال و اسباب لوٹنے کو موجود ہوں گے اور اگر خدا نخواستہ شکست ہوئی، تو پھر الگ ہی الگ اپنی راہ لیں گے۔ آپ ان سے ہوشیار رہیے گا اور ان کے عہد پر اعتماد نہ کیجیے گا۔"

مُلا اسمٰعیل کو، جو اُن میں ایک امتیازی حیثیت رکھتے ہیں، اپنے ہمراہ لے لیا۔

اُمب اور اُس کا محلِّ وُقوع موضع امب میں سردار پائندہ خاں نے اپنے مکان سے باہر نکل کر ہمارا استقبال کیا، لیکن بمطابق أَلْحَزْمُ سُوْءُ الظَّنِّ (احتیاط بدگمانی کا نام ہے) اپنی رہائش گاہ سے فاصلے پر مجاہدین کو ٹھیرایا۔ اس روز مشورے کا وقت باقی نہیں رہا تھا۔ ہم نے صرف ملاقات پر اکتفا کی۔ علی الصباح امب کے محلِ وقوع اور ماحول کو غور سے دیکھنے سے معلوم ہُوا کہ امب دریائے سندھ کے ایک کنارے[1] پر واقع ہے، دُوسرے کنارے[2] پر سکھوں کے چھوٹے چھوٹے قلعے اور سلسلۂ کوہ میں دشوار گزرا اور تنگ گلیاں مسلسل واقع ہیں۔ چنانچہ ہم لوگوں کے قیام گاہ کے بالکل محاذات میں ان کا ایک چھوٹا قلعہ ایک گولی کے فاصلے پر ہے۔ چنانچہ دونوں طرف کی آوازیں سُننے میں آتی رہتی ہیں۔

پائندہ خاں گفتگو سے اندازہ ہُوا کہ میزبان (پائندہ خان) ہم خدّام کا ساتھ دینے کی بالکل ہمّت اور آمادگی نہیں رکھتا اور جان و مال اور اپنے اعوان و انصار کسی کے ساتھ بھی ہماری رفاقت و نصرت کے لیے تیار نہیں۔

دریائے سندھ کے مشرقی جانب وہ مقام جہاں پہنچنا تھا، دریا کے مشرقی کنارے سے آٹھ میل کے فاصلے پر تھا۔ اگر امب ہی سے دریا کو عبور کیا جاتا، تو دشمنوں کے قلعے راستے میں پڑتے تھے اور اُن سے جھڑپ ہو جانے کا اندیشہ تھا۔ اس لیے ہم نے اس گھاٹ کو چھوڑ دیا اور ایک دُوسرے گھاٹ[3] کا انتخاب کیا، جو اُمب سے تین میل یا کچھ زیادہ تھا۔ دریا سے اُس مقام کو جاتے ہُوئے، جو ہماری منزلِ مقصود تھی، اُن مسلمانوں کا علاقہ پڑتا تھا، جو کبھی کسی حکومت کے ماتحت نہیں رہے اور خاص طور پر سکھوں سے ہمیشہ آزاد رہے اور وہ پائندہ خاں سے تعلق کا اظہار کرتے تھے۔

---

[1] مغربی کنارے پر [2] مشرقی کنارے پر [3] یہ گھاٹ چھتربائی کا تھا

مصلحت معلوم ہوئی کہ دریائے سندھ کے کناروں پر جو قبائل آباد ہیں، مثلاً، عیسیٰ زئی، امان زئی، حدّون اُتمان زئی ان کو دعوت و ترغیب کے لیے کسی معتمد و مخلص شخص کو بھیج دیا جائے۔ چنانچہ مُلّا عصمت اللہ اخوندزادہ اور مولوی عبداللہ خاں کو دو تین آدمیوں کے ہمراہ صاحبزادہ شاہ محمد نصیر صاحب کے پاس، جو اس علاقے کے اکابر میں سے ہیں بھیج دیا، ایک خط اپنی طرف سے اور ایک اعلام نامہ، جو جناب والا کی مُہر کے ساتھ مزیّن ہے، بھیج دیا گیا۔ خود رُفقاء کی ایک جمعیّت کے ساتھ جمعے کے دن امب سے کوچ کر کے اس گھاٹ پر، جو تین کوس کے فاصلے پر واقع ہے، پہنچے۔ چونکہ اس گھاٹ پر صرف ایک جالا تھا اور تمام ساتھیوں کا ایک دن میں اس سے پار ہو جانا ناممکن معلوم ہوتا تھا اور ساتھیوں کی اس طرح کی تفریق بھی نامناسب تھی کہ کچھ لوگ اِس پار رہ جائیں اور کچھ لوگ اُس پار پہنچ جائیں اور رات ہو جانے کی وجہ سے انتظار کرنا پڑے۔ اِس بنا پر ایک جماعت کو دُوسرے گھاٹ پر، جو وہاں سے دو تین کوس کے فاصلے پر تھا، بھیج دیا گیا۔ وہاں دو جالے تھے۔ رات ہم نے دریا کے کنارے گزاری اور ہفتے کے روز نمازِ صبح کے بعد یہ فدوی چند تفنگچیوں کے ساتھ پہلے جالے میں بیٹھ کر دریا کے پار پہنچ گیا۔ اس کے بعد یکے بعد دیگرے جاتے آتے رہے اور سب ساتھی خیر و عافیت کے ساتھ پار آ گئے۔[1]

موضع نکّا پانی یہاں سے دربند کا قلعہ ایک کوس کے فاصلے پر واقع ہے۔ اس لیے اگرچہ دن تھوڑا رہ گیا تھا، لیکن اس مقام پر رات گزارنا نامناسب معلوم ہوا۔ اس لیے دو تین کوس وہاں سے چل کر ایک دوسرے مقام پر پڑاؤ ڈالا۔ اِس نواح کے لوگ پائندہ خاں کی ہدایت و اشارہ سے بہت خوش خُلقی اور کُشادہ رُوئی سے پیش

---

[1] مکتوب مؤرخہ ۲۴ محرم ۱۲۴۳ھ

آئے اور رات بھر اُنھوں نے لشکر کے گرد پہرہ دیا۔ علی الصباح وہاں سے کوچ کر کے موضع نکاپانی پہنچے۔ وہاں کے لوگوں نے بھی جو خانِ ممدوح سے تعلق رکھتے ہیں، خاطر مدارات کی۔ اِس نواح کے چند علما بھی مُلاقات کرنے آئے اور جہاد کی نیت ظاہر کی اور کہا کہ اگر ابھی طلب کیا جائے، تو سات آٹھ سَو آدمیوں کے ساتھ ہم رفاقت کریں گے۔ مصلحۃً اُن سے کہہ دیا گیا کہ چند دن کے بعد ہم آپ کو طلب کریں گے۔ ہمارا خط پاکر آپ تشریف لے آئیں، کچھ اعلام نامے اس نواح میں بھیجے گئے۔"

پائندہ خاں سے تعلق یا بے تعلقی؟ گرامی ناموں سے اظہار ہوتا ہے کہ پائندہ خاں سے دوستی کا تعلق اور رفاقت کی اُمید منقطع کر لی جائے اور عجلت کے ساتھ پکھلی کا رُخ کیا جائے۔ لیکن اس نواح میں سوائے ان مقامات کے، جن کا تعلق پائندہ خاں سے ہے، کوئی محفوظ و مامون مقام نظر نہیں آتا اور ابھی تک اُس کی طرف سے سوائے حُسنِ سلوک کے اور کوئی معاملہ نہیں ہُوا۔ اگرچہ اس سے عملی شرکت کی بالکل توقع نہیں ہے لیکن مخالفت اور بدخواہی کا بھی اس سے خدشہ نہیں۔ اُس نے ملّا اسمٰعیل اخوند زادہ کو ہماری رفاقت کے لیے مقرر کیا ہے اور خانِ ممدوح نے اپنے پُورے علاقے کے رُؤسا۔ اور معزّزین کو ہماری خدمت و رفاقت کے لیے خطُوط لکھ کر ان کو دے دیے ہیں۔

جفاکش اور فرماں بردار غازیوں کی ضرورت یہ بھی گزارش ہے کہ چُونکہ یہ پہاڑی علاقہ ہے، اور راستے نہایت دُشوار گزار ہیں، اس لیے کسی ایسے آدمی کو یہاں نہ بھیجا جائے، جو سواری کا عادی یا محتاج ہو اور انقیادِ کلّی اور اطاعتِ مُطلق اس کی فطرت نہ بن گئی ہو۔ جس کو جنابِ والا کے ساتھ اطاعت و فرماں برداری کا پورا تعلق نہیں ہے، وہ آپ کے نائبین کے ساتھ اطاعت کا کیا حق ادا کر سکتا ہے؟

ایسے لوگوں کے لیے یہی مناسب ہے کہ جناب کی تربیت وصحبت میں رہیں تاکہ ان کے اخلاق درست اور نفس مزکّٰی ہو جائے۔ اس وقت یہاں کے مجاہدین کی سب سے بڑی مدد یہ ہے کہ غازیوں کی جماعتوں کو سامانِ جنگ کے ساتھ آہستہ آہستہ بھیجا جائے؛ اس طرح سے کہ ایک ایک دو دو اور تین تین روز کے فاصلے سے پے در پے جماعتیں پہنچتی رہیں۔ یہ اہلِ ایمان کے لیے ہمّت و رغبت اور اہلِ کفر و ارتیاب کے لیے مرعوبیت اور دہشت کا باعث ہوگا۔"[1]

ضلع اگرُوڑا اور عبدالغفور خاں

بکّا پانی سے ہم لوگ کوچ کر کے شیر گڑھ پہنچے۔ یہ بھی پائندہ خاں کی ریاست کا علاقہ ہے۔ یہاں کے جمعدار جانو نے ہماری خاطر مدارات کی۔ وہاں قیام مناسب نہیں معلوم ہوا۔ اس لیے صبح ہی وہاں سے کوچ کر کے علاقۂ اگرُوڑ آئے۔ یہاں کے رئیس عبدالغفور خاں کو ہمارے آنے کی اطلاع ہو گئی تھی۔ اس کا بھائی کمال خاں ہمارے استقبال کو آیا اور ہر طرح سے ہماری خاطر مدارات کی۔ اثنائے گفتگو میں اس نے بیان کیا کہ عبدالغفور خاں کی طبیعت کچھ روز سے علیل ہے، اس لیے خود نہیں آئے۔ کمال خاں نے ہم کو موضع کلکٹی تک پہنچایا اور یہ کہا کہ آج یہیں ڈیرہ کرنا چاہیے۔ صبح اس موضع میں جس میں عبدالغفور خاں مقیم ہیں، چلیں گے۔ میاں محمد مقیم صاحب کو مجاہدین کے پاس چھوڑ کر میں اخوند زادہ ملّا محمد اسمٰعیل، شاہ سیّد اور چند دوسرے ساتھیوں کے ہمراہ کمال خاں کی معیّت و رہبری میں عبدالغفور خاں کی قیام گاہ پر آیا۔ وہاں احمد خاں پکھلی والا، حیدر شاہ ابنِ عم سیّد محمد علی شاہ پکھلی والا اور ارسلاں خاں برادر زادۂ عبدالغفور خاں بھی بسلسلۂ عیادت آئے ہوئے تھے۔ ان سب سے بھی ملاقات ہوئی اور ان سب نے میرے ہاتھ پر آپ کی بیعتِ امامت کی۔

---

[1] مکاتیب شاہ اسمٰعیل، مکتوب دوم

مجاہدین کا مرکز | اثناءِ گفتگو میں ہم نے یہ مسئلہ اُٹھایا کہ ہمارے قیام کے لیے بطور گڑھی کے کوئی محفوظ مقام تجویز کر دیا جائے۔ عبدالغفور خاں نے کہا کہ چھتر گڑھی تو میرے قبضے میں نہیں ہے۔ ایک گڑھی جبی کوٹ ہے اور دوسری گڑھی شمدڑہ، یہ دونوں حاضر ہیں۔ چونکہ گڑھی جبی کوٹ بہت دُور ہے، جہاں سے بیٹھ کر جہاد مُشکل ہے، اس لیے شمدڑہ کو مَیں نے انتخاب کیا۔ مَیں نے محمّد اسمٰعیل کو وہیں چھوڑا، سیّد شاہ کو اس نواح کے مُسلمانوں کو، جو عبدالغفور خاں کی برادری ہیں، لیکن اس کے تابع نہیں ہیں، جہاد کی دعوت و ترغیب دینے کے لیے بھیجا اور اپنے لشکرگاہ کلکٹی میں آ گیا۔

مزید لشکر اور کمک کی ضرورت | شاہ غلام حُسین کی طرف سے آدمی آیا اور اس کا پیغام لایا کہ جب تک دُوسرا لشکر نہیں آتا، یہاں کے لوگ جہاد اور آپ کی رفاقت کے لیے نہیں اُٹھیں گے۔ یہ لشکر کی قلت کی وجہ سے کچھ اعتبار نہیں کر رہے ہیں۔ صاحبزادہ سیّد محمد نصیر صاحب کا بھی خط آیا کہ یہاں کے آدمی لشکر کی اس مقدار پر جہاد کے لیے آمادہ نہیں ہوں گے۔ اگر دُوسرا لشکر، خصُوصًا بونیر کا لشکر، کمک پر آتا ہے، تو یہاں بہت لوگ اکٹھا ہو جائیں گے۔[۱]

ارسلاں خاں برادر زادہ عبدالغفور خاں کچھ آدمیوں کے ساتھ حبیب اللہ خاں کی کُمک کے لیے گیا۔ مصلحت معلوم ہوئی کہ تھوڑا سا لشکر حبیب اللہ خاں کی سمت روانہ کیا جائے، اس لیے کہ جب تک ہم لوگ ہاتھ پاؤں نہیں ماریں گے اور ہماری کچھ مجاہدانہ سرگرمی دیکھی نہیں جائے گی، یہاں کے لوگ نہیں اُٹھیں گے۔ اس بنا پر غازیوں کی ایک جماعت کو میاں محمد مقیم صاحب کی سرکردگی میں متعین کر دیا۔[۲]

اہلِ علاقہ کا تردّد اور سکھوں سے وابستگی | سیّد محمد علی شاہ اور ناصر خاں کے خطوط آئے، جن کا

۱ے مکتوب سوم ۲ے مکتوب چہارم

مُدّعا یہ تھا کہ ابھی مجاہدین اگروُڑ ہی میں قیام کریں اور قُرب وجوار کی طرف رُخ نہ کریں۔ بظاہر وُہ سکھوں کے ساتھ بھی دُنیوی مصالح کی بنا پر وابستگی رکھتے ہیں۔ لشکرِ اسلام کے غلبے کا (ظاہری ساز و سامان کی کمی کی بنا پر) اُن کو ابھی تک یقین نہیں ہے۔ اِس بنا پر وُہ سکھوں کے ساتھ اپنے تعلّق و ارتباط کو منقطع کرنا اور آپ کے ساتھ اپنی وابستگی کو مشہور کرنا قرینِ مصلحت نہیں سمجھتے۔ اس وجہ سے اُنھوں نے لشکرِ مجاہدین کو مُعطّل اور بیکار کر رکھا ہے۔ اس بنا پر ہم نے بھی مناسب نہیں سمجھا کہ ہم پائندہ خاں، خوانینِ اگروُڑ اور حبیب اللہ خاں کے ساتھ اپنے رابطۂ اتّحاد کو منقطع کریں۔ اس کا راستہ یہی سمجھ میں آتا ہے کہ لشکرِ مذکور اگروُڑ میں قیام کیے رہے اور حبیب اللہ خاں کی تائید کا قصد ظاہر کرتا رہے اور مَیں چند رُفقاء کے ساتھ اُن رؤساء کی مُلاقات کے لیے جاؤں۔ اس بنا پر مَیں عبدالغفور خاں کی ملاقات کو گیا اور اپنے ساتھ اُس کے بھائی کمال خاں کو لے گیا۔ ارسلاں خاں برادر زادۂ عبدالغفور خاں کو وہیں بُلا لیا۔ احمد خاں علاقۂ پکھلی، سیّد حیدر شاہ (برادر زادہ محمد علی شاہ) بھی وہیں مل گئے۔

خوانینِ پکھلی کی اصل کیفیّت بہرحال ان تمام خوانین سے وہیں ملاقات ہو گئی اور اچھی طرح گفتگو اور مشورے کی نوبت آئی۔ اس ساری گفتگو کی تفصیل لکھنی مشکل ہے، لیکن حاصلِ کلام یہ ہے کہ اگرچہ یہ خوانین زبانی ایک دُوسرے سے بڑھ چڑھ کر خاطر تواضع کی بات کرتے ہیں یہاں تک کہ اُنھوں نے اس فقیر کے ہاتھ پر جناب کی بیعتِ امامت بھی کی، لیکن ان کی باتوں سے صاف ٹپکتا ہے کہ ان کے دلوں میں ایمانی غیرت، اسلامی حمیّت اور قلبی اخلاص کا ایک ذرّہ اور اطاعتِ الٰہی کا کوئی جذبہ نہیں ہے۔ ان کا مطمحِ نظر اور منتہائے فکر محض دُنیاوی مال و متاع کا حصُول اور ہمچشموں پر تفوق و امتیاز ہے۔ مَیں نے انھیں کے مسلک کے مطابق اُن سے گفتگو کی اور ان

کے مقاصد کے حصول کا اظہار کیا۔ اثنائے گفتگو میں وعظ و تذکیر کے مضامین بھی آ گئے۔
بہرحال کسی قدر رابطۂ اتحاد کی شکل پیدا ہوئی۔ وہاں سے میں اپنے لشکر گاہ پر آیا۔

خرچ کی تنگی اور بعض مجاہدین کا اضطراب اس درمیان میں یہ واقعہ پیش آیا کہ میاں محمد صاحب کے پاس نقد و خرچ میں سے صرف اشرفی تھی، روپیہ بالکل نہ تھا۔ اگر وُر کے آدمی اشرفی کے نرخ سے بالکل بے خبر تھے۔ اس لیے غلّہ فروخت کرنے کے لیے بالکل تیار نہ تھے اور جب تک اشرفی کہیں بھیج کر تڑائی جائے، غلّے کا بطورِ قرض ملنا اس وقت تک مشکل معلوم ہوتا تھا، جب تک کہ وہاں کے رؤسا کو اس بات کا پورا یقین نہ ہو جائے کہ مجاہدین کا لشکر حبیب اللہ خاں کی تائید میں جائے گا۔ دو روز لشکر میں خرچ کی ایسی تنگی رہی کہ اکثر اہلِ قافلہ عموماً اور اہلِ رامپور خصوصاً بڑے مضطرب ہوئے اور وہاں پر (بغیر مشغلۂ جہاد کے) پڑا رہنا اُن کو بہت دشوار معلوم ہوا۔ ان میں سے بعض عُقلا نے واپسی کا مشورہ دیا، بعض بغیر اجازت چلے گئے۔ میاں محمد مقیم خاں نے اپنی فطری شجاعت اور جرأت کی بنا پر سلسلۂ جہاد شروع کرنے کا بہ شدّت تقاضا کیا، اگرچہ میں نے حُسنِ تدبیر اور لطفِ کلام سے اُن کو بہت کچھ روکا، لیکن ایک ایک دن اُن کو ایک سال معلوم ہوتا تھا۔ میں نے منشی خواجہ محمد کو اشرفی دے کر سربلند خاں کے پاس بھیج دیا کہ اُن سے مشورہ بھی ہو جائے اور اشرفی بھی فروخت کر کے روپیہ لے آئیں۔

حبیب اللہ خاں کی مدد کے لیے اُن کے جانے کے بعد ارسلان خاں نے آکر کہا کہ میں تو حبیب اللہ خاں کی مدد کے لیے جاتا ہوں۔ اگر تم میں سے کسی کو جہاد کا شوق ہو اور مظلوم مسلمانوں کی حمایت کا جذبہ ہو، تو ہمارے ساتھ ہو جائے۔ خرچ میرے ذمّے ہوگا۔ اس خبر کو سُن کر بہت سے اہلِ قافلہ اور خاص طور پر میاں محمد مقیم خاں اُن کے ساتھ جانے پر آمادہ ہو گئے اور مجھ سے اجازت لی۔ اگرچہ ان کو اجازت دینا خلافِ مصلحت

تھا، لیکن آپ کی ہدایت کے مطابق اُن کی دلجوئی بھی ضروری تھی۔ میں نے لشکر کو دو حصّوں پر تقسیم کر دیا۔ میاں محمد مقیم خاں کے ساتھیوں کو اور ان سب لوگوں کو جو عُجلت کر رہے تھے، ارسلاں خاں کے ساتھ بھیج دیا اور خود باقی ماندہ لوگوں کے ساتھ جبی کوٹ میں مقیم رہا۔

سربلند خاں اور اُس کے ساتھی ارسلاں خاں اور میاں محمد مقیم خاں کی روانگی کے بعد مع اپنے ہمراہیوں کے، جن کی تعداد چالیس کے قریب ہے اور جن میں ملا محمد اسمٰعیل اخوندزادہ اور مُلا شاہ سید وغیرہ ہیں، سربلند خاں کی طلب پر اُن کی ملاقات کے لیے گئے۔ ملا عصمت اللہ برادر شاہ سید بھی وہاں ملے۔ سربلند خاں اس وقت اس مقام پر مسافرانہ ٹھیرا ہُوا ہے۔ اس مقام کا اصل رئیس شاہی خاں ہے، جو خان ممدوح کا دوست اور حامی و مددگار رہے۔ سربلند خاں اور شاہی خاں اور ان کے بھائیوں سے ملاقات ہوئی۔ اگرچہ اُنس و اتّحاد اور محبت کی بہت سی باتیں ہوئیں لیکن ایسا اندازہ ہُوا کہ وہ یکسوئی اور یک روئی کے ساتھ گروہ مجاہدین میں شامل ہونے کے لیے تیار نہیں۔ دو دن اور دو رات ہمارا اُن کے یہاں قیام رہا اور ہم نے اُن کو ترغیب دینے میں کوئی کمی نہیں کی

سربلند خاں کا مقصودِ اصلی لیکن اُن کی باتوں اور قرینوں سے معلوم ہُوا کہ اُن کا مقصودِ اصلی پائندہ خاں کی سرکوبی اور شکست ہے۔ یہ اُس وقت تک مجاہدین کی رفاقت اختیار نہیں کریں گے، جب تک اُن کو قوّت و شوکت حاصل نہیں ہو جائے گی۔ اگر مجاہدین کو کفّار پر غلبہ حاصل ہوگا، تو یہ بڑی تیزی کے ساتھ مجا[illegible] کے [illegible]ن ہو جائیں گے ورنہ اُن کی مخالفت و موافقت کے درمیان سلا[illegible]ی کا راستہ اختیار کریں گے اتنی بات یقینی ہے کہ یہ مجاہدین کو نقصان پہنچانے میں کوئی حصّہ نہیں لیں گے لیکن فی الحال اُن کی نصرت وحمایت میں دلیرانہ اور مردانہ طریقے پر میدان میں بھی اُترنے

کے لیے تیار نہیں ہیں۔ اگر اُن کے حریف (پائندہ خاں) کی بیخ کنی پر کمر باندھ لی جائے، تو یہ بھی ساتھ دینے کے لیے کمربستہ ہیں، لیکن اگر بیخ کنی کا وعدہ کیا جائے، تو یہ بھی موافقت کے وعدے پر ٹال دیں گے۔

پائندہ خاں کی مخالفت خلافِ مصلحت | یہ فدوی پائندہ خاں سے اظہارِ بیگانگی کو کئی وجوہ سے مضر سمجھتا ہے۔ پہلی بات یہ ہے کہ دریائے سندھ کے دونوں طرف کے گھاٹ اور علاقۂ اگرور اس کے زیرِ حکومت ہے۔ اس سے رابطۂ دوستی ختم کر دینے کی صورت میں مجاہدین کا دریا سے گزرنا مشکل ہو جائے گا۔ دوسرے یہ کہ اس ضلع کے بقیہ خوانین کے مقابلے میں پائندہ خاں سب سے زیادہ صاحبِ حشمت و اقتدار ہے۔ اس کے مقابلے میں دوسرے خوانین کی موافقت کچھ مفید نہیں۔ تیسرے یہ کہ اس کے درمیان اور حبیب اللہ خاں اور دوسرے خوانین اگرور کے درمیان رابطۂ اتحاد نہایت مستحکم ہے۔ میاں محمد مقیم صاحب مجاہدین کی ایک جماعت کے ساتھ حبیب اللہ خاں کے یہاں گئے ہوئے ہیں۔ اگر خوانینِ اگرور کو یہ علم ہو گیا کہ ہمارا پائندہ خاں سے رابطۂ اتحاد منقطع ہو گیا، تو میاں محمد مقیم خاں اور اُن کے ساتھیوں کو مضرت پہنچنے کا اندیشہ ہے۔ چوتھے یہ کہ سلطان زبردست خاں، جو نواحِ کشمیر کا رئیسِ اعظم ہے، حبیب اللہ خاں کے ساتھ زمانۂ قدیم سے رابطۂ اتحاد و اخلاص رکھتا ہے، ممکن ہے کہ ہمارا اور حبیب اللہ خاں کا تعلق سلطان زبردست خاں کے ساتھ تعلق کا ذریعہ بن جائے۔

خوانین کے متعلق عام تأثر | اس علاقے کے جن خوانین سے میں مل چکا ہوں، اُن کے متعلق براہِ راست اور ناصر خاں، حسن علی خاں اور سید محمد علی شاہ جن سے ابھی تک ملاقات کا اتفاق نہیں ہوا، اُن کے متعلق بہ طریقِ قیاس اندازہ ہے کہ ان سے لشکرِ اسلام کے شوکت و غلبہ کا ذریعہ بننے اور کفار سے مقابلہ کرنے کے لیے کسی سلسلہ جنبانی کی

اُمید نہیں۔ البتہ اگر ہم کو حشمت و شوکت حاصل ہو جائے، تو یہ ساتھ دینے کے لیے تیار ہیں۔ لیکن ان سے کسی نقصان اور مضرّت کا اندیشہ بھی بہت بعید ہے۔ ان کی حیثیت ان ساکتین اور قاعدین کی ہے کہ جو دل سے تو اسلام کا غلبہ چاہتے ہیں، لیکن معرکۂ کارزار میں کوئی حصّہ لینے کے لیے تیار نہیں ہیں۔ فی الحال سربلند خاں اور شاہی خاں کے مشورے سے مقام جویاں ستور میں اقامت اختیار کی ہے یہاں سے مختلف سرداروں اور معززین کے نام ترغیبی خطوط لکھے ہیں اور مختلف سمتوں کی طرف ترغیبِ جہاد کے لیے قاصد و مبلغین روانہ کیے ہیں۔ بہر حال اپنی طاقت اور اپنی استطاعت کے مطابق سعی میں مشغول ہوں اور سر رشتۂ کار کو قادرِ مختار کے ہاتھ میں دے دیا ہے۔

اِس علاقے کے لیے صحیح طریقِ کار اس علاقے میں آکر ایسا معلوم ہوا کہ اگرچہ طویل مدّت میں خدا کی مہربانی سے مقصود کا حصول متوقع ہے لیکن ابھی اس نواح میں لشکر کے آنے کا وقت نہیں آیا تھا۔ ابھی تو اس کی ضرورت تھی کہ یہ فدوی چند خدمت گزاروں کے ساتھ اس نواح میں آتا اور دیہاتوں اور بستیوں کا خفیہ اور علانیہ دَورہ کرتا جب اس علاقے کے رُؤسا، تیار ہو جاتے اور لشکر کے قیام کے لیے کوئی جگہ معین ہو جاتی؛ اس وقت لشکرِ اسلام رونق افروز ہوتا یا ابتدا ہی میں ایک بڑا لشکرِ جرّار یہاں کا رُخ کرتا اور یہاں کے باشندوں کی موافقت یا مخالفت سے قطعِ نظر کرتے ہوئے علمِ جہاد بلند کرتا اور بغیر کسی تردّد اور دغدغہ کے کفّار و منافقین پر دست اندازی کرتا پھر جو مخالفت کرتا، وہ سزا پاتا۔ بہر حال اَلْخَيْرُ فِيْ مَا وَقَعَ ۔ اگر میاں محمد مقیم فتحیاب ہو جاتے ہیں، تو مقصود بہ آسانی حاصل ہو جاتا ہے، ورنہ اس میں کچھ مدّت لگے گی۔

جہاد کی حقیقت ایک دقّت یہ ہے کہ ہمارے اکثر ساتھیوں کے مزاج میں عجلت ہے

بعض پورے طور پر منقاد و مطیع نہیں اور اس بات کو خوب سمجھ چکے ہیں کہ جہاد صرف اس بات کا نام ہے کہ دین کی نصرت کے سلسلے میں مساعیِ جمیلہ کام میں لائی جائیں، جو وقت کے مناسبِ حال ہوں۔ وہ تو ہر حالت میں اپنی شرکت باعثِ افتخار سمجھتے ہیں۔ اس وقت ہماری واپسی بھی مقصد کے لیے مضر ہے اور بغیر غور و فکر اور تدبیر کے حملہ اور دست اندازی بھی خلافِ مصلحت ہے، بلکہ عجب نہیں دینی اور عقلی طور پر ممنوع ہو۔ اس وقت تو اس کی ضرورت ہے کہ خوراک و پوشاک کی تنگی پر صبر کریں، پہاڑوں کے نشیب و فراز اور گھاٹیوں کے طے کرنے کے لیے مستعد رہیں اور ہر طرح کی ضروری اور مناسب کوششیں عمل میں لائیں اور اس کو جہاد کی اعلیٰ قسم شمار کریں۔ بارگاہِ الٰہی سے اُمیدِ واثق ہے کہ اس فدوی کے رُفقاء عموماً اور اس کے اہلِ شوریٰ خصوصاً اس بارے میں اس فدوی کے ساتھ پورے طور پر شریکِ حال ہوں گے۔ انشاء اللہ کچھ مدت کے بعد مقصود میں کامیابی حاصل ہوگی۔[1]

---

[1] مکتوب پنجم (مکاتیب شاہ اسمٰعیلؒ)

چھٹا باب

ڈمگلا اور شنکیاری کی جنگیں اور ہندوستانی مجاہدین کے قافلے

ڈمگلا کا شب خون | اِس اثنا میں شہرت ہوئی کہ مجاہدین ڈمگلا پر حملہ کرنا چاہتے ہیں۔[1] یہ مقام خاص فوجی اہمیت رکھتا تھا۔ اِس کے فتح ہو جانے سے مظفر آباد و کشمیر کی طرف پیش قدمی کا راستہ کُھل جاتا تھا۔ ہری سنگھ نلوہ نے پھول سنگھ کی ماتحتی میں دو تین ہزار سکھوں کا لشکر مقابلے کے لیے بھیجا۔ لشکر نے ڈمگلا میں ڈیرہ کیا۔

میاں مقیم رامپوری اور رئیسوں نے مولانا محمد اسمٰعیل صاحب سے مشورہ کیا کہ سکھوں کا لشکر ڈمگلا میں داخل ہُوا۔ عجب نہیں کہ کل ہم سے اور اُن سے مقابلہ ہو۔ مناسب یہ ہے کہ آج ہی رات کو ہم اُن پر شبخون ماریں۔ اس تجویز سے سب نے اتفاق کیا۔

اُسی روز میاں مقیم کے تمام ہمراہی اور پچاس دُوسرے مجاہدین اور چودہ پندرہ سو ملکی چھاپے کے واسطے مقرر ہُوئے۔ باقی ہندوستانی اور ملکی مولانا محمد اسمٰعیل صاحب نے اپنے پاس رکھے۔ گولی بارُود سب کو بانٹ دی اور وُہ چھ سات سو بانس کے بارُود بھرے ہُوئے نل تین تین، چار چار ہر غازی

---

[1] وقائع احمدی اور دُوسرے قدیم ماخذ سے پتہ نہیں چلتا کہ میاں مقیم اور ارسلان خاں کے ساتھ مجاہدین کی جو جمعیت حبیب اللہ خاں کی مدد کے لیے روانہ ہوئی تھی، اس نے کیا کیا اور کیا واقعات پیش آئے اور کس طرح ڈمگلا پر حملہ کرنے کا منصوبہ بنا۔ وقائع احمدی میں اس واقعہ کو جس طرح بیان کیا گیا ہے، درج کیا جاتا ہے۔

کے حوالے کیے اور سمجھا دیا کہ جدھر مخالفوں کا مجمع دیکھنا، ادھر ایک دو نل داغ کر پھینک دینا۔ وہ اس طرف متوجہ ہو جائیں گے اور تم اس طرف سے بندوق اور قرابین مارنا شروع کرنا، اور چار یا پانچ چار پائیاں بھی سنگر سے اُترنے کے لیے ساتھ کر دیں۔ ہر ایک سے فرمایا کہ سورۂ لِاِیْلٰفِ گیارہ گیارہ بار پڑھ کر۔ روانہ ہو۔ سب کا امیر میاں مقیم صاحب کو کیا اور مولوی خیر الدین صاحب کو شریک کیا اور شناخت کے لیے اپنے لشکر کے شبخون والوں کا نام عبداللہ رکھ دیا اور دُعا کر کے رُخصت فرمایا۔ سوا پہر رات باقی ہو گی کہ آگے پیچھے حملہ آور جمع ہو کر آگے بڑھے۔ جب سنگر کے قریب آئے اور سب نے مل کر ارادہ کیا کہ تکبیر کہہ کر سنگر میں گھسیں، اس وقت تخمیناً تین سو، ساڑھے تین سو آدمی باقی رہے اور خدا جانے کدھر چھپ گئے۔ ادھر سکھوں کی جماعت مُلکی اور سکھ ملا کر پانچ چھ ہزار سے کم نہ تھی۔ پھر میاں مقیم وہ چار پائیاں سنگر پر ڈال کر خود آگے ہوئے اور اُن کے پیچھے مجاہدین چلے۔ مجاہدین نے میاں مقیم کے پیچھے یکبار با آوازِ بلند اَللّٰہُ اَکْبَر! اَللّٰہُ اَکْبَر! کہہ کر بندوق اور قرابین مارتے ہوئے حملہ کیا۔ سکھ بھی ہوشیار ہو گئے کہ چھاپہ آپہنچا۔ اُنھوں نے جلد نقارہ بجایا اور غول غول ہو کر کئی جگہ جمع ہو گئے اور بندوقیں مارنے لگے۔ اس وقت مجاہدین نے وہی نل داغ کر اُن کے غول میں پھینکے اور پیچھے سے قرابینوں سے حملہ کیا۔ اس وقت میاں مقیم کے لوگوں نے ایسی شجاعت و بہادری کا مظاہرہ کیا کہ (وقائع احمدی کے راوی کے بقول) لوگ رُستم و اسفندیار کی جرأت و دلیری بھول گئے۔ وہ اس طرح بیباک ہو کر سکھوں کی جماعت میں گھستے تھے، جیسے کوئی کبڈی کھیلتا ہے یہاں تک کہ تین چار ریلوں میں اُن کو سنگر سے نکال کر باہر کر دیا۔

اس عرصے میں وہ مُلکی لوگ، جو طرح دے کر پیچھے دب رہے تھے، وہ بھی آ کر سنگر میں داخل ہوئے اور سکھوں کا مال و اسباب لُوٹ لُوٹ کر چلنے لگے۔ مجاہدین سکھوں کے مقابلے میں جمے رہے۔ اس عرصے میں سکھوں نے موضع ڈمگلا کی دو تین جھونپڑیوں میں آگ لگا دی۔ اس کی روشنی سے تمام سنگر اور اُس کے اطراف میں دن سا ہو گیا۔ اِس اُجالے میں سکھوں نے دیکھا کہ سنگر میں لُوٹ مچی ہے، ہر کوئی مال و اسباب لیے ہوئے چلا جاتا ہے۔ اس وقت مولوی خیر الدین صاحب شیر کوٹی نے

میاں مقیم سے کہا کہ مُلکیوں نے لڑائی بگاڑ دی، وہ تو لوٹ لُوٹ کر اپنا رستہ لیتے ہیں اور آپ زخمی ہیں۔ مناسب یہی ہے کہ آپ بھی جلد یہاں سے نکلنے کی تدبیر کریں۔

زخمیوں کا جذبہ | مولوی خیرالدین صاحب چند مجاہدین کے ساتھ سکھوں کے مقابلے میں رہے اور اُن کو مشغول رکھا اور لوگوں سے کہا کہ جو زخمی اُٹھانے کے قابل ہوں، اُن کو سنگر کے باہر اُٹھا لے چلو اور باقیوں کو رہنے دو۔ مجاہدین نے چھ یا سات زخمیوں کو، جو لے چلنے کے قابل تھے، اُٹھایا۔ دو صاحب سیّد لُطف علی اور عبدالخالق محمّد آبادی زیادہ زخمی تھے۔ جب اُن کو لے چلنے کے لیے اُٹھایا، تو انھوں نے کہا کہ ہمارے ہتھیار لے لو اور ہم کو تکلیف نہ دو، ہم کو یہی میدان پسند ہے۔ مجاہدین نے ان کے ہتھیار لے لیے اور اُن کو وہیں چھوڑ دیا۔ وُہ ظاہرًا گھڑی، دو گھڑی کے مہمان تھے۔ چند ہندوستانی شہید ہُوئے اور چند غازی تھوڑے تھوڑے زخمی۔ اُنھیں میں میاں مقیم بھی تھے۔

جب سب زخمی سنگر کے باہر نکل چکے، تب مولوی خیرالدین صاحب بھی استقامت اور دل جمعی کے ساتھ اپنے لوگوں کو لے کر سنگر سے نکلے اور سب کو لے کر روانہ ہُوئے۔ اس وقت سکھوں کو ایسی شکست فاش نصیب ہوئی تھی کہ باوجودیکہ کئی ہزار تھے، کسی کو تعاقب کی جرأت نہیں ہُوئی۔

جنگِ شنکیاری | مولانا محمد اسمٰعیل صاحب کی فوج میں دو روز سے فاقہ تھا۔ ڈمگلے کی شبخون کی شام کو کچھ غلّہ میسّر آگیا تھا۔ لوگ کھانے کے انتظام میں مشغول تھے۔ سکھوں کا ایک لشکر رونّد گشت کے طور پر شنکیاری کی گڑھی سے، جو مجاہدین کی قیام گاہ سے تھوڑے فاصلے پر تھی، باہر نکلا۔ مولانا محمد اسمٰعیل صاحب کو، جن کی نگاہ اس گڑھی کی طرف تھی، یہ گمان ہُوا کہ دشمن مقابلے کو آتے ہیں۔ آپ نے لوگوں کو کمربندی کا حکم دیا اور ایک دو باڑھ مار کر اُن پر حملہ کر دیا۔ سکھوں نے بھاگنا شروع کیا۔ اُس وقت ایک شخص نے سکھ لشکر کے عقب میں سے اپنے ساتھیوں کو پکار کر کہا کہ یہ تھوڑے سے آدمی ہیں، تم کیوں بھاگتے ہو؟ یہ پکار سُن کر لشکر لوٹ آیا اور مقابلہ شروع ہُوا۔ اس وقت مولانا اسمٰعیل صاحب کے ہمراہ کُل بارہ آدمی تھے، باقی سب آدمی لشکر کے نگراں تھے۔ مگر یہ بارہ آدمی سیسے کی دیوار کی طرح وہیں جم گئے اور بھرمار شروع کی۔

وقائع میں ہے کہ: کہ حملہ کرتے ہوئے نزدیک آئے، تو مجاہدین نے مورچوں سے نکل کر قرابینوں سے مقابلہ کیا جب اور قریب آئے، تو نوبت تلوار کی پہنچی۔ اس وقت لوگوں نے مولانا کی شجاعت و دلیری کا تماشا دیکھا۔ آپ نے تلوار سے لاش پر لاش بچھا دی۔ منظورہ میں ہے کہ ایک سکھ تلوار کھینچ کر مولانا پر حملہ آور ہوا۔ آپ نے وار کرنے سے پہلے اُس کو گولی سے ختم کر دیا۔ جب آپ دوسری بار بندوق بھر رہے تھے، اس وقت دوسرے شخص نے تلوار سے آپ پر حملہ کرنا چاہا۔ آپ نے اُس کو بھی گولی سے اُڑا دیا۔ جب آپ تیسری بندوق بھر کر پیالے میں رنجک ڈال رہے تھے اُس وقت ایک سکھ کی گولی آپ کی انگلی میں لگی۔ اس گولی کے صدمے سے آپ کا ہاتھ بندوق کے پیالے سے جُدا ہو گیا۔ اس حالت میں بھی آپ نے بندوق چلا دی۔ لیکن جب آپ نے چوتھی بار بندوق بھرنے کا ارادہ کیا، تو اُس زخمی اُنگلی سے اتنا خون بہا کہ بارُود بھی تر ہو گئی اور ہاتھ میں بندوق بھرنے کی طاقت بھی نہ رہی۔ اس بے بسی کی حالت میں ایک سکھ نے ننگی تلوار سے مولانا پر حملہ کیا۔ مولانا نے اُس کو ڈرانے کے واسطے خالی بندوق اُس کے سامنے کر دی۔ وہ گھبرا کر بھاگ گیا اور مولانا اُس کی ضرب سے بچ گئے۔ مولانا بارہا اُس اُنگلی کی طرف اشارہ کر کے فرمایا کرتے تھے کہ اگر اللہ تعالیٰ قبول فرمائے، تو یہ میری انگشتِ شہادت ہے، ورنہ بہت سے زخم لگتے ہیں اور ان میں کوئی ثواب نہیں۔ بالآخر سکھ میدان چھوڑ کر چلے گئے۔

ادھر میاں مقیم اور اُن کے ساتھی ڈمگلا سے واپس آ رہے تھے۔ راستے میں اُنھوں نے بندوقوں کی آواز سُنی۔ معلوم ہُوا کہ مجاہدین کی قیام گاہ پر مولانا محمد اسمٰعیل صاحب کے ہمراہیوں اور سکھوں کے درمیان جنگ ہو رہی ہے۔ میاں مقیم اور مولوی خیر الدین صاحب جب مولانا کے پاس پہنچے، تو سکھ جا چکے تھے۔ دیکھا، تو چھ سات آدمی مجاہدین میں شہید ہوئے ہیں اور نو دس زخمی۔ مولانا کی اُنگلی میں گولی لگی تھی اور دگلے میں چھ سات سوراخ گولیوں کے ہو گئے تھے۔ سکھوں کے دو ڈھائی سو آدمی مارے گئے تھے۔

مجاہدین کی واپسی مولانا نے کمال خاں اور ناصر خاں کے مشورے سے اگر ور میں قیام کیا۔ وہاں سے شمدڑہ اور وہاں سے اوگئی آئے۔ وہاں آٹھ روز قیام فرمایا۔ مولانا کا ارادہ تھا کہ یہاں سے نکل کر

سکھوں کی بستیوں پر شبخون ڈالیں گے۔ اس اثناء میں سیّد صاحبؒ کا فرمان پہنچا کہ آپ وہاں سے جلد تشریف لے آئیں، ہندوستان سے مجاہدین کے بہت سے قافلے آئے ہیں۔ چنانچہ آپ وہاں سے منزل بمنزل کوچ کرتے ہوئے مرکز میں پہنچ گئے۔ سیّد صاحبؒ نے پنجتار سے نکل کر ڈھائی، تین سو آدمیوں کے ساتھ مولانا اور اُن کے ہمراہیوں کا استقبال کیا۔ مولانا سیّد صاحبؒ کی سواری دیکھ کر کمالِ اشتیاق کے ساتھ تیز قدم ہو کر چلے مُصافحہ و مُعانقہ ہُوا اور آپ نے سیّد صاحبؒ کے ہاتھ کو بوسہ دیا۔ تمام لوگ آپس میں ایک دُوسرے سے ملے۔

ہندوستان کے قافلے اُوپر گزر چکا ہے کہ بونیر و سوات کے دَورے میں پانچ ہندوستانی قافلے پہنچے، جن میں پَونے تین سَو کے قریب آدمی تھے۔ جب ہندوستان میں سیّد صاحبؒ اور اُن کے رُفقاء کے صُوبۂ سرحد میں استقرار اور معرکہ آرائیوں کی اطلاع پہنچی اور رُفقاء اور اہلِ سرحد نے سیّد صاحبؒ کے ہاتھ پر بیعتِ امامت و جہاد کی اور اس کے اطلاعی خطوط اور اعلام نامے ہندوستان پہنچے، تو وہاں سے مخلصین کے قافلے، جن میں سے اکثر پہلے سے مستعد و عازم تھے اور مختلف دینی اور انتظامی مصلحتوں سے جن کا بہ یک وقت چلنا مناسب نہ تھا، جُوق در جُوق آنا شروع ہُوئے۔ چنانچہ اس عرصے میں کہ شاہ صاحب اور میاں مقیم ہزارے کے محاذِ جہاد پر تھے، پندرہ قافلے تھوڑے تھوڑے وقفے سے پہنچے۔ ان قافلوں میں بڑے بڑے عُلماء، ذی وجاہت اور پُرجوش مجاہد تھے۔ ایک قافلہ سیّد صاحبؒ کے بڑے بھانجے سیّد احمد علی صاحب رائے بریلوی کا تھا، دُوسرا قافلہ مولانا عنایت علی[1] کا، تیسرا مولوی قمرالدین صاحب کا، چوتھا باقر علی صاحب کا، پانچواں عثمان علی صاحب کا، چھٹا مولانا مظہر علی عظیم آبادی کا، ساتواں مولوی خرّم علی بلہوری کا، آٹھواں مولوی عبدالقدوس کانپوری کا، نواں مولانا سیّد محمد علی رامپوری کا، دسواں مولوی عبداللہ امروہی کا، گیارھواں حافظ قطب الدین پھلتی کا، بارھواں مولانا محبوب علی دہلوی کا، تیرھواں حکیم محمد اشرف دہلوی کا، چودھواں میرن شاہ نارنولی کا، پندرھواں مولوی عبدالحق نیوتنی کا۔

ڈیرہ اسمٰعیل خاں اور پشاور کے درمیان ایک بستی کنڈوہ ہے۔ کئی قافلے وہاں دُرّانیوں کے

---

[1] برادرِ مولانا ولایت علی عظیم آبادی

خوف سے رُکے رہے اور دریا عبور نہ کر سکے۔ کم و بیش دو مہینے اس تشویش و تردد میں گزرے۔ بالآخر سید صاحبؒ نے اپنے کچھ آدمی بھیجے۔ اُنھوں نے مقامی لوگوں سے مل کر ان قافلوں کے دریا عبور کرنے کا بندوبست کیا اور تقریباً دو مہینے کے توقف کے بعد اپنی منزلِ مقصود پر پہنچے جب یہ قافلے درّے میں داخل ہوئے، تو سید صاحبؒ نے آگے بڑھ کر اُن کا استقبال کیا اور مصافحہ اور معانقہ کر کے اُن کو اپنے ساتھ لائے۔

مولوی محبوب علی صاحب کا اختلاف مولوی میر محبوب علی صاحب حضرت شاہ عبدالعزیز صاحب علیہ الرحمۃ کے مشہور شاگردوں اور نامی علماء میں سے تھے۔ سید صاحبؒ اور شاہ صاحبؒ سے پُرانا تعارف اور تعلق تھا۔ جن ہندوستانی علماء و احباب کے نام سرحد سے خطوط و اطلاعات جاتی تھیں اُن میں مولوی محبوب علی صاحب بھی تھے۔ آپ نے سید صاحبؒ کی ہجرت کے بعد ہندوستان میں جہاد و ہجرت کی دعوت جاری رکھی اور آپ کی ترغیب و تحریض سے مجاہدین کا ایک قافلہ آپ کی ہمراہی میں روانہ ہوا۔ راستے کی مشکلات اور ناگوارِ طبع اُمور کے پیش آنے، نیز طبیعت کی اُفتاد سے اُن کی گرانی اور کدورت بڑھتی گئی۔ مولانا نے راستے سے سید صاحبؒ کو ایک خط لکھا جس میں اس بات پہ ناگواری کا اظہار اور اعتراض تھا کہ آپ نے دُرّانیوں سے صُلح کر لی ہے، جو مُجاہدین و مُہاجرین کے سدِّ راہ بن رہے ہیں اور اس کو توکّل و عزیمت کے منافی بتایا اور صاف صاف مشورہ دیا تھا کہ پہلے ان کلمہ گو کافروں سے جہاد کرنا چاہیئے اور کچھ قرآن مجید کی آیتیں بھی اس مضمون کی لکھ کر بھیجی تھیں۔ سید صاحبؒ نے ۱۱ محرم ۱۲۴۳ھ کو اُن کو بڑا محبت آمیز خط لکھا جس میں تشریف لانے اور حالات کا خود مطالعہ کرنے اور صبر و تحمل سے کام لینے اور اعتماد کرنے کی دعوت دی اور اپنے موقف کی وضاحت کی۔[1] مولوی صاحب اس انتظام کے مطابق جس کا اہتمام خود سید صاحبؒ نے فرمایا تھا، پنجتار کے مرکز میں تشریف لائے۔ سید صاحبؒ نے جب مولوی صاحب کی آمد کی خبر سُنی، تو آپ استقبال کے لیے روانہ ہوئے۔ آپ کا سبزہ گھوڑا، جو سردار سید محمد خاں نے نذر کیا تھا، کوتل چلا آ رہا تھا۔ اُس پر زریں

---

[1] مکاتیب شاہ اسمٰعیل صاحبؒ صفحہ ۱۹۸-۱۰۰

حاشیے کا مخملی زین پوش پڑا ہوا تھا۔ سید صاحبؒ خود پیادہ پا تھے۔ مولوی صاحب کی نظر پہلے گھوڑے پر پڑی۔ فرمایا: گھوڑے پر زرّیں زین پوش! جہاں ایسا امیرانہ ٹھاٹھ ہو، وہاں دیکھنا چاہیے، انجام کیا ہو۔ سید صاحبؒ سے مصافحہ و معانقہ کے بعد آپ اپنے خیمے میں بیٹھنے لگے، لیکن آپ کے اعتراضات اور شبہات بڑھتے گئے۔ کبھی کہتے کہ آپ امام ہو کر ایسے نفیس کپڑے پہنتے ہیں اور ایسے عمدہ کھانے کھاتے ہیں اور مجاہدین بیچارے چکی چلاتے ہیں، گھاس چھیلتے ہیں اور پاؤ پاؤ غلہ پاتے ہیں۔ یہ آپ کو زیبا نہیں۔ سید صاحبؒ نے نرمی سے فرمایا کہ مولوی صاحب، اب تو آپ ہمارے یہاں مہمان آئے ہیں۔ جو کچھ میں کھاتا ہوں، وہ آپ بھی کھائیں گے، تب آپ ہی معلوم ہو جائے گا۔

اِس گفتگو کا چرچا پہلے پہلے، ڈیرے ڈیرے، تمام لشکر میں ہونے لگا اور نا اتفاقی اور فساد کی ایک صورت ظاہر ہونے لگی۔

کھانے کی تفصیل سید صاحبؒ کے یہاں یہ طرز تھا کہ اس مُلک کے جو لوگ آپ کی ملاقات کو آتے تھے، وُہ تحفہ کے طور پر کوئی دو مُرغ لاتے، کوئی سیر دو سیر شہد یا گھی لاتے، کوئی چاول، کوئی مُرغی کے انڈے لاتے۔ آپ یہ تمام چیزیں بحفاظت تمام اپنے باورچی خانے میں رکھوا دیتے۔ مہمانوں کا حال یہ تھا کہ کبھی بیس، کبھی تیس چالیس بھی آتے۔ ان کے کھلانے کی بھی کئی صُورتیں تھیں۔ ایک تو یہ کہ اگر وُہ سویرے لشکر والوں کے کھانے کے قبل آگئے، تو آپ ایک ایک، دو دو، گنجائش کے موافق، ہر پہلے میں بھیج دیتے اور ان میں جو ذی عزت، دو چار مُلّا مولوی یا خان و سردار ہوتے، ان کو اپنے ساتھ کھلاتے۔

دُوسری صورت یہ تھی کہ اگر وہ مہمان دیر سے لشکر کے کھانے کے بعد آتے، تو آپ اِسی تحفے اور سوغات میں سے جو مُرغ، چاول، انڈے وغیرہ ہوتے، اُن کے لیے کھانا پکواتے اور اُن کو کھلاتے اور اُن کے شریک ہو کر آپ بھی کھا لیتے۔

تیسری صورت یہ تھی کہ کسی روز اپنے لوگوں کے موافق کھانا پک چکا اور دس پندرہ مہمان آ گئے، تو اسی کھانے میں اُن کو بھی شریک کر لیتے۔ اگر پندرہ آدمی کے لائق کھانا پکا ہے اور اسی قدر مہمان بھی آگئے، تو جہاں فی اسم آدھ سیر کھانا تھا، اب پاؤ بھر[۱] فی اسم ہوا۔ جس قدر مہمان زیادہ ہوتے،

---

[۱] اس سے مُراد فی کس ہے۔

اُسی قدر ہر کسی کے حصّے میں کھانا کم آتا۔ اکثر اوقات کھانے میں کمی کا خیال کر کے خود سیّد صاحب نہ کھاتے کہ یہ مہمان کھالیں، ہم کسی کے بیلے میں کھالیں گے۔ مگر وُہ مہمان ہرگز نہ مانتے، اصرار سے کھلاتے اور کہتے کہ ہم تو آپ ہی کے ساتھ کھانے کو آئے ہیں۔ اگر آپ نہ کھائیں گے، تو ہم اپنے بھائی بندوں کے یہاں چلے جائیں گے، ہمارے واسطے وہاں بھی کھانا موجود ہے۔ اُن کی خاطر سے آپ کو ضرور ہی کھانا پڑتا۔ اسی کشمکش میں ایک ہفتہ مولوی محبوب علی صاحب نے سیّد صاحبؒ کے ساتھ کھانا کھایا اور گھبرا گئے اور کہا کہ ہم سے تو آپ کے ساتھ کھانا نہ کھایا جائے گا۔ آپ نے فرمایا: کیا وجہ ہے؟ آخر ہم بھی تو کھاتے ہیں۔ کہا: ہر روز بھوکا نہیں رہا جاتا۔ سیّد صاحبؒ نے دو تین آدمی مولوی محبوب علی صاحب کے مُعتقدین میں سے اور دو تین آدمی اپنے لوگوں میں سے پہلے ہی دن سے کھانے کی کیفیّت معلوم کرنے کے لیے مولوی صاحب کے شریک کر رکھے تھے۔ آپ کے لوگوں نے مولوی صاحب کے مُعتقدین سے کہنا شروع کیا کہ ایسے ہی کھانے پر تمھارے مولوی صاحب سیّد صاحبؒ پر اعتراض کرتے تھے کہ خود ایسے عمدہ اور نفیس کھانے کھاتے ہیں اور لشکر والے خشک روٹی بمشکل پاتے ہیں۔ اب وُہ عمدہ کھانا مولوی صاحب کیوں نہیں کھاتے ہیں؟

پوشاک پر اعتراض اور اس کا جواب دوسرا اعتراض مولوی صاحب کا پوشاک اور خرچ وغیرہ پر تھا۔ اس کا حال یہ ہے کہ شیخ غلام علی صاحب الٰہ آبادی سِلے ہُوئے کپڑوں کے گٹھے کے گٹھے خاص آپ کی ذات کے لیے بھیجتے رہتے تھے اور جُوتوں کے جوڑے بھی وہیں سے آتے تھے۔ اسی طرح اور مُریدین کے یہاں سے ہر قسم کے تھان اور سیکڑوں، بلکہ ہزاروں روپے خاص آپ کے خرچ کے واسطے آتے تھے۔ یہ روپیہ آپ اپنی مرضی کے موافق جہاں مناسب سمجھتے، صرف کرتے۔ چنانچہ آپ نے ہزار، دو ہزار روپے کی اسی قسم کی قبائیں سلطان مُحمّد خان، یار مُحمّد خاں اور سید مُحمّد خاں کو عطا فرمائیں۔

جہاد و قتال میں فرق مولوی محبوب علی صاحب اہلِ لشکر سے کہتے تھے کہ تمھارے اوپر بیوی بچوں اور والدین کے حقوق ہیں، تم یہاں کیوں بیٹھے ہو؟ لوگوں نے کہا: جہاد کے واسطے۔ مولوی صاحب نے کہا: جہاد کہاں ہے اور کون کُفّار سے مقابلہ ہے؟ کس مُلک میں تمھارا عمل دخل ہُوا؟ صُبح سے

شام تک تم لوگ کھانے پکانے کی فکر میں رہتے ہو۔ جہاد کا محض بہانہ ہے۔ تمھاری دُنیا و آخرت دونوں خراب ہیں۔

لوگوں کو ایک معتبر عالم کی زبان سے یہ سُن کر خواہ مخواہ انتشار ہُوا اور لشکر میں اس کا عام چرچا ہُوا۔ آخر ایک روز مولوی محمّد حسن رامپوری[1] نے سیّد صاحبؒ سے کچھ کہنے کی اجازت چاہی۔ نماز کے بعد سب لوگ موجود تھے، آپ نے مولوی صاحب سے کہا کہ آپ یہاں کے لوگوں کو کس طرح خارج از جہاد سمجھتے ہیں؟ مولوی صاحب نے کہا کہ تم کس سے جہاد کر رہے ہو، اور کون سا جہاد ہو رہا ہے؟ مولوی محمّد حسن نے کہا کہ جنگ کا نام ہی جہاد نہیں ہے، جنگ کو قتال کہتے ہیں، اور وُہ کبھی کبھی پیش آتا ہے۔ جہاد کے معنے ہیں " اعلاءِ کلمۃ اللّٰہ میں کوشش کرنا"۔ یہ مدّتِ دراز تک باقی رہتا ہے اور اس کی مختلف صُورتیں ہوتی ہیں۔ یہ آپ کی غلط فہمی ہے کہ قتال کا نام جہاد رکھا ہے اور اُن کوششوں کو جو اعلاءِ کلمۃ اللّٰہ کے لیے لوگ کر رہے ہیں، عبث قرار دیتے ہیں۔ مَیں آپ سے پُوچھتا ہوں کہ اس وقت جہاد کا انکار کر کے آپ وطن دہلی تشریف لے جائیں اور کسی دن کُفّار سے مقابلہ اور قتال، جس کو آپ جہاد کہتے ہیں، پیش آجائے، تو کس پہاڑ کی چوٹی پر چڑھ کر آپ کو اطلاع دی جائے گی؟ اور آپ یہ اپنی کون سی کرامات سے اُڑ کر داخلِ جہاد ہوں گے؟

مولوی محبُوب علی صاحب کی واپسی ان اعتراضات واختلافات اور نا اتفاقی سے سیّد صاحبؒ بہت تنگ آئے۔ جب کسی طرح مولوی صاحب نہ سمجھے، تو ایک روز سیّد صاحبؒ نے آپ سے فرمایا کہ مولوی صاحب اِس لشکرِ اسلام میں آپ نے اپنی نفسانیت سے تفرقہ ڈالا ہے اور تو میں کیا کہوں؟ میدانِ حشر میں آپ کا گریبان ہوگا اور میرا ہاتھ۔[2]

---

[1] مولوی محمّد حسن رامپوری لشکر کے اہم اور ممتاز افراد میں سے تھے۔ مولوی سیّد جعفر علی کے الفاظ ہیں: "مولانا محمّد اسمٰعیل و مولوی محمّد حسن رامپوری بجائے وزیر انتخاب بُودند" (ص۵۵، وقائع)

[2] "منظورہ" میں مذکور ہے کہ سیّد صاحبؒ نے مولانا سے یہ بھی فرمایا کہ اگر آپ کو میری امامت پر اعتراض ہے، تو آپ خود ہی منصبِ امامت قبول فرمائیں کہ عالم، فاضل، مُہاجر، سیّد ہیں۔ مَیں آپ کے ہاتھ پر بیعت کرنے کیلیے تیار ہُوں، مگر مولانا نے منظور نہیں فرمایا۔

مولانا محمد اسمٰعیل صاحب کی ڈمگلا و سِشنگیاری سے واپسی سے تین روز پہلے ایک دن مولوی محبُوب علی صاحب رات کو بے بلے اپنے لوگوں کو ساتھ لے کر پشاور کی طرف چلے گئے۔ مولانا اسمٰعیل صاحب نے آکر سُنا، تو بڑا افسوس کیا اور فرمایا: افسوس! مولوی صاحب چلے گئے۔ اگر میرے آنے تک توقّف کرتے، تو اِن شاء اللہ تعالیٰ میں اُن کو سمجھاتا، اُنھوں نے سیّد صاحبؒ کو پہچانا نہیں۔

میرن شاہ نارنولی اپنی آمد کے تیسرے ہی روز کچھ لوگ لے کر پشاور کی طرف چلے گئے۔ راستے میں چمکنی ہی میں چند دن بیمار رہ کر انتقال کیا۔ حکیم محمد اشرف دہلوی بھی واپس چلے گئے۔

ہندوستان سے امدادی رقمیں ہندوستان سے احباب و معاونین صاحبزادہ شاہ محمد اسحٰق صاحب دہلوی کی معرفت برابر مالی امداد کرتے رہتے اور بیش قرار رقموں کی ہُنڈیاں ہندوستان سے آتی تھیں[1] چنانچہ ان دنوں میں بھی ایک پانچ ہزار کی، دُوسری بارہ سَو کی، تیسری دو سَو ستّر روپے کی پہنچی، جو میاں دین محمّد کی دانائی و سلیقہ مندی سے ٹُوٹ کر مہاجرین کے مصارف میں آئیں۔

داعیوں اور مبلّغوں کی روانگی اسی اثنا میں سیّد صاحبؒ نے محمّد قاسم صاحب پانی پتی کو وعظ و نصیحت اور جہاد کی دعوت کے لیے بمبئی روانہ کیا۔ اُن کے بعد آپ نے مولانا محمد علی رامپوری سے فرمایا کہ آپ حیدر آباد دکن جائیے۔ اُنھوں نے عُذر کیا کہ مجھ کو نہ اس قدر علم ہے کہ کسی عالم سے مباحثہ یا مناظرہ کروں اور نہ یہ سلیقہ ہے کہ لوگوں کے مجمع میں وعظ و درس کروں۔ مجھ کو تو آپ کسی کام کو کہیں بھیجیں کہ وُہ کام کر کے چلا آؤں۔ آپ نے فرمایا کہ آپ جس بات کا عُذر کرتے ہیں، اللہ تعالیٰ سے اُمید ہے کہ وہ عُذر دُور کر دے۔ آپ نے اپنا کُرتا، پائجامہ اور تاج اُن کو پہنایا اور کہا کہ مَیں اپنی زبان نکالوں، آپ اپنی زبان سے چاٹ لیں۔ اُنھوں نے ایسا ہی کیا۔ آپ نے چار پانچ آدمی اُن کے ہمراہ کیے اور فرمایا کہ یہاں سے سندھ جائیے گا، وہاں سے پیر کوٹ میں بی بی صاحبہ سے ملتے ہوئے کراچی جائیے گا، وہاں سے کشتی پر سوار ہو کر بمبئی اُتریے۔ وہاں سے حیدر آباد جائیے۔

---

[1] شاہ اسحٰق صاحبؒ کے نام شاہ اسمٰعیل صاحبؒ و سیّد صاحبؒ کے عربی خطوط ہیں، جو رقموں کی وصول یابی اور طلب کے سلسلے میں اصطلاحات اور رمُوز میں لکھے گئے ہیں۔

آپ نے مولوی صاحب کو وصیت کی کہ کلمۂ حق کہنے سے باز نہ رہیے گا، کوئی خوش ہو یا ناخوش؛ کوئی مارے یا سرفراز کرے۔ خیر و برکت اسی میں ہے۔

کئی دن کے بعد مولوی ولایت علی عظیم آبادی کو بھی دکن بھیجنے کی تجویز ٹھیری۔ آپ نے اُن کو اپنا ملبُوسِ خاص، تاج اور کُرتا اور پائجامہ پہنا کر سینے اور پُشت پر ہاتھ پھیرا اور دُعا کی کہ اللہ تعالےٰ تمھاری مدد کرے، اور وصیّت فرمائی کہ کلمۂ حق کے بیان کرنے میں کسی کا خوف اور لحاظ نہ کرنا۔

اُنھیں دنوں رامپور سے خط آیا کہ میاں مقیم کے بھائی کریم اللہ خاں کا، جو نواب احمد علی خاں کے نائب کُل تھے، انتقال ہو گیا۔ آپ نے میاں مقیم سے فرمایا کہ تمھارے بھائی کا انتقال ہوا، مناسب ہے کہ تُم جا کر اُن کے اہل و عیال کے خبر گیراں ہو اور اُن کی جگہ نواب احمد علی خاں کے یہاں کام کرو۔ میاں مقیم نے عُذر کیا کہ میں وہاں سے جہادِ فی سبیل اللہ کی نیّت کر کے آیا ہوں، اب وہاں جا کر کیا کروں؟ آپ نے فرمایا کہ ہم تم کو بھیجتے ہیں۔ تمھارے بغیر وہاں کا کاروبار ابتر ہو جائے گا اور تمھارے وہاں رہنے سے خُدا کا بھی بہت کام نکلے گا۔ وہ مجبوراً جانے پر راضی ہُوئے اور سب سلاح و اسباب، جو اُن کے پاس تھا، وہیں چھوڑا۔

ان کے علاوہ حافظ قطب الدین اور مولوی عنایت علی کو بھی ہندوستان بھیجنے کی تجویز ہُوئی۔ آپ نے مولوی عنایت علی کو بُلا کر فرمایا کہ آپ کو جہاد کی ترغیب کے لیے بنگالے کو بھیجتے ہیں۔ انھوں نے عرض کیا کہ حاضر ہوں، مگر دل چاہتا ہے کہ یہاں کا بھی کوئی واقعہ دیکھ لیتا۔ آپ نے فرمایا کہ وہاں تمھارے ہاتھوں اللہ تعالیٰ کا بہت کام نکلے گا۔ خُدا کے کام کی کوشش کے لیے تمھارا وہاں رہنا گویا ہمارے ساتھ یہاں کا رہنا ہے اور اللہ تعالیٰ تم کو وقائع بہت دکھائے گا۔[1]

مولوی مظہر علی عظیم آبادی کی آمد مولوی عنایت علی کی روانگی کے چند ہی دن بعد آپ کے پاس خبر آئی کہ مولوی مظہر علی عظیم آبادی کا قافلہ زیارت میں آ کر داخل ہُوا۔ آپ اُن کے آنے سے کمال خوش

---

[1] چنانچہ مولانا ولایت علی صاحب کے بعد مولانا عنایت علی غازی ہی مجاہدین کے قائد اور ستھانہ میں مجاہدین و مُہاجرین کے امیر رہے۔

چڑے اور فرمایا کہ مولوی ولایت علی اور مولوی عنایت علی کی جگہ پر اللہ تعالیٰ نے مولوی مظہر علی صاحب کو بھیجا۔

شاہِ چترال کے تحائف آپ نے پنجتار سے اخوند فیض محمدؐ کو کچھ تحفے دے کر شاہ کاشکار (چترال) کے پاس جہاد کی دعوت کے لیے روانہ کیا۔ اخوند صاحب چترال سے واپس آئے اور شاہ کے تحائف بھی لائے۔ شاہ نے ایک سیدہ صاحبزادی اور ایک پشمینے کی نہایت باریک اور بیش قیمت چادر، ایک خوشخط و مُطلّا قرآن مجید اور ایک فولادی شیر ماہی کے دستے کی پیش قبض، جس کا تہنال و مہنال نقرئی تھا، بھیجا، ان تحائف کے ساتھ بادشاہ کا خط بھی تھا۔

○

ساتواں باب

کھر[1] کا قیام

ایک تبلیغی دورہ پنجتار میں ارباب بہرام خاں[2] بیس پچیس سواروں اور پیادوں کے ساتھ آپ کی ملاقات کو آئے اور آپ کے دستِ مبارک پر بیعت کی اور کئی دن قیام کیا۔ ایک روز انھوں نے سید صاحبؒ سے مشورۃً عرض کیا کہ ان دنوں یہاں کوئی مشغولیت نہیں ہے۔ اگر مناسب سمجھیں، تو چند دن اس نواح میں دورہ فرمائیں اور جہاد کی ترغیب کے لیے وعظ و نصیحت فرمائیں۔ اِس ملک کے اکثر لوگوں میں زمینداری کے سلسلے میں رقابتیں اور مخالفتیں ہیں۔ اگر آپ اُن کے درمیان مصالحت کرا دیں، تو وہ آپ کے شکر گزار اور فرماں بردار بن جائیں گے۔

آپ کو ارباب صاحب کی یہ صلاح پسند آئی۔ آپ نے بیمار اور معذور لوگوں کو پنجتار میں چھوڑا اور باقی لشکر لے کر وہاں سے کوچ کیا اور قرب و جوار کے مضافات میں دورہ کر کے واپس پنجتار تشریف لائے۔ اس دورے میں شیوہ، چارگلئی، موضع مہر علی، پنجی، امان زئی، اسماعیلہ،

---

[1] عام طور سے "خار" کا لفظ استعمال ہوتا ہے۔

[2] ارباب صاحب تہکال مضافاتِ پشاور کے رہنے والے تھے۔ اس زمانے میں پنجتار کے قریب کے موضع مہر علی میں مقیم تھے۔ سرحد کے اہلِ تعلق و مخلصین میں ارباب بہرام خاں کو سب پر امتیاز و فوقیت حاصل تھی۔ بالاکوٹ میں شہید ہوئے۔

کالوخاں، ٹلانڈی، شیخ جانا مقامات پر جانا ہوا۔ ہر جگہ لوگوں نے بیعت کی۔ آپ نے وعظ و نصیحت فرمائی اور سواضعات کے خوانین و شرفاء نے اہلِ سرحد کے دستور کے مطابق دعوت و ضیافت کا شرف حاصل کیا۔ اس دَورے میں پندرہ روز صرف ہوئے۔

پنجتار آپ کی واپسی پر اطراف و نواح کے خوانین آکر جمع ہوئے اور چند روز تک متواتر اُن سے مشورہ رہا۔ اس کے بعد دفعۃً آپ مع لشکر پنجتار سے روانہ ہوئے اور موضع شیوہ، بچی، کاٹ لنگ، لُوند خوڑ، شاہ کوٹ[1] میں قیام کرتے ہوئے اور جہاد کی دعوت دیتے ہوئے عنایت اللّٰہ خاں[2] سواتی کے مشورے سے درگئی ٹھیرتے ہوئے (جو ضلع سَمَہ کا آخری موضع ہے) علاقۂ سوات میں خہر تشریف لے گئے[3] اور وہیں لشکر کو طلب فرمالیا۔ امیر خاں مورانوی دُرگئی میں رہے اس لیے کہ لشکر کے اونٹوں کو چارے پانی کا وہاں زیادہ آرام تھا۔ یہاں خہر میں پورے ایک سال سید صاحبؒ اور لشکر مجاہدین کا قیام رہا۔ اس نواح کے خوانین آپ کی ملاقات کو آئے اور مرید ہوئے اور سب نے اطاعت و شرکتِ جہاد کا عہد کیا اور آپ نے اِس نواح کا بھی دَورہ کر کے لوگوں کو مستفید فرمایا۔

مولانا عبدالحی صاحب کی وفات | مولانا عبدالحی صاحب مرضِ بواسیر میں مبتلا تھے۔ کوئی دوا مفید نہیں ہو رہی تھی۔ روز بروز بیماری بڑھتی جاتی تھی یہاں تک کہ نزع کی حالت ہوئی۔ کسی وقت آپ بے ہوش ہو جاتے تھے، کبھی وقت ہوش میں آتے تھے۔ یہ حال سُن کر سید صاحبؒ آپ کے پاس تشریف لائے۔ جب مولانا کو ہوش آیا، سید صاحبؒ کو دیکھا اور پہچانا۔ آپ نے پوچھا: "کیا حال ہے؟" فرمایا: "نہایت تکلیف ہے، آپ میرے واسطے دُعا کریں اور میرے سینے پر اپنا قدم رکھ دیں کہ اُس کی برکت سے اللّٰہ تعالیٰ اس مُصیبت سے مجھ کو نجات دے۔" آپ نے فرمایا: "مولانا صاحب!

---

[1] قدیم کتابوں میں شاہ کوٹ لکھا ہوا ہے، لیکن غالباً اس سے مُراد سخاکوٹ ہے، جو آج کل مالاکنڈ ایجنسی میں درگئی سے اِس طرف پانچ میل ریلوے سٹیشن اور منڈی ہے۔ قدیم گاؤں ریلوے اسٹیشن سے کچھ فاصلے پر اب بھی موجود ہے۔

[2] یہ موضع اَلاڈنڈ کا رئیس تھا۔

[3]

آپ کے سینے میں قرآن و حدیث کا علم ہے۔ یہ اس لائق نہیں کہ میں اس پر اپنا قدم رکھوں۔ پھر آپ نے بسم اللہ کر کے اپنا ہاتھ رکھ دیا۔ مولانا کو قدرے تسکین ہوئی اور کئی بار اَللّٰہُ الرَّفِیْقُ الْاَعْلٰی! اَللّٰہُ الرَّفِیْقُ الْاَعْلٰی! اپنی زبان سے کہا اور انتقال فرمایا۔

اُس وقت مولانا کے فرزند مولوی عبدالقیوم، جو خُرد سال تھے، اور مولوی عبدالقیوم کے دو ماموں شیخ جلال الدین اور شیخ صلاح الدین وہاں موجود تھے اور پُھلت والے تمام اعزّہ و اقربا حاضر تھے اور مجاہدین کا بھی اِزدحام تھا۔ سب نہایت غمگین و رنجیدہ تھے، خصُوصًا مولوی عبدالقیوم کا، جن کی عمر بارہ تیرہ سال کی تھی، رنج و غم سے بُرا حال تھا۔ سیّد صاحبؒ بار بار اُن کو سینے سے لگاتے تھے اور تسلّی اور دلاسا دیتے تھے۔

مولانا کا انتقال پچھلی رات کو ہُوا۔ رات کو تجہیز و تدفین عمل میں نہ آسکی۔ صبح کو قبر کی تیاری اور غُسل شروع ہُوا۔ مولانا محمد اسمٰعیل، مولوی محمد حسن، قاضی علاء الدین، میاں جی چشتی، میاں جی محی الدین نے غُسل دیا۔ سیّد صاحبؒ مجمع میں مولانا کے فضائل و مناقب بیان کرتے تھے، آنکھوں سے آنسو جاری تھے اور فرماتے تھے کہ مولانا دین کے ایک رُکن اور بڑے برکت والے شخص تھے۔ اللہ نے اُن کو اُٹھا لیا۔ مالک کی مرضی۔ سیّد صاحبؒ نے نمازِ جنازہ پڑھائی۔ مقامی اصحاب کے علاوہ سات سَو غازی شریکِ نماز و دُعا تھے۔ پہر، ڈیڑھ پہر دن چڑھے دفن سے فارغ ہُوئے۔

مولانا عبدالحی صاحب ذی الحجہ ۱۲۴۲ھ کے پہلے عشرے میں ہندوستان سے پنجتار تشریف لائے تھے اور شعبان کی آٹھ تاریخ کو آٹھ مہینے زندہ رہ کر خہر میں انتقال فرمایا[1]۔ سیّد صاحبؒ نے پُھلت والوں کو، جو مولانا کے عزیز و اقربا تھے، بُلا کر تسلّی دی اور سب کو کھانا کھلایا اور اسی دن سے مولوی عبدالقیوم صاحب کا کھانا اپنے ساتھ مقرر کیا۔

مولوی احمد اللہ صاحب کی آمد مولانا عبدالحی صاحب کے ایک دُوسرے بھائی تھے دوسری ماں سے، جن کا نام مولوی احمد اللہ صاحب تھا۔ وُہ ناگپور میں رہتے تھے اور بڑے عالم اور بڑے متقی

---

[1] وقائع احمدی میں آپ کی وفات رجب کے اخیر عشرے میں بیان کی گئی ہے، لیکن سیّد احمد علی صاحب کے ایک مکتوب (بنام وزیر الدولہ) میں ہے کہ آپ نے ۸ شعبان کو وفات پائی اور یہی صحیح ہے۔

تھے۔ دونوں بھائیوں میں کبھی ملاقات کی نوبت نہیں آئی تھی، صرف خط و کتابت تھی۔ دونوں کو ایک دوسرے سے ملنے کا بڑا اشتیاق تھا۔ وہ جہاد کے ارادے سے چند آدمیوں کو ساتھ لے کر وطن سے چلے اور مولانا عبدالحی صاحب کی وفات کے تیسرے یا چوتھے دن موضع ورگئی میں داخل ہوئے اور لوگوں سے سُنا کہ مولانا کا انتقال ہو گیا۔ دُوسرے دن خہر میں آئے اور سید صاحبؒ سے ملے اور مصافحہ و معانقہ کیا، اپنا حال بیان کیا اور آپ کے ہاتھ پر بیعت کی اور مولانا کے انتقال پر بڑا افسوس و غم کیا کہ مجھ کو بھائی صاحب سے ملنے کا بڑا اشتیاق تھا، مگر مرضیٔ الٰہی یوں ہی تھی "اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ! آپ نے اُن کو سمجھایا اور تسلّی دی اور مولوی عبدالقیوم کو بُلا کر اُن سے ملایا اور فرمایا کہ یہ آپ کے بھائی صاحب کے بیٹے ہیں۔ اُنھوں نے بڑی محبت سے اُن کو اپنے سینے سے لگایا اور پیار کیا۔ مولوی عبدالقیوم صاحب اُن کو اپنے ڈیرے پر لے گئے اور وہیں اُن کو اور اُن کے لوگوں کو اُتارا۔ مولوی احمد اللہ صاحب برابر سید صاحبؒ کی رفاقت میں رہے یہاں تک کہ بالاکوٹ میں شہید ہوئے۔

سید صاحبؒ کا تیسرا نکاح | شَیدُو کے واقعے میں یار محمد خاں کی طرف سے آپ کو جو زہر دیا گیا تھا، اس کی گرمی کا اثر آپ کی طبیعت میں ظاہر ہونے لگا تھا۔ اُس کے دُور ہونے کے لیے لشکر کے تجربہ کار لوگوں کی رائے ہُوئی کہ آپ کہیں نکاح کر لیں۔[1] آپ نے فرمایا: "بات تو مناسب ہے، مگر والدۂ سید محمد اسمٰعیل (زوجۂ ثانیہ) نے مجھ سے عہد لیا تھا کہ مَیں اُن کے اُوپر کوئی اور شادی نہیں کروں گا۔ اس لیے مَیں اُن کی اجازت کے بغیر عقد نہیں کروں گا۔" لوگوں نے عرض کیا کہ اگر اتنی ہی بات ہے، تو کسی قاصد کو سندھ بھیج کر اُن سے اجازت منگوا لی جائے۔ چنانچہ والدۂ صاحبۂ سید محمد اسمٰعیل کو اس مضمون کا خط آپ کی طرف سے گیا کہ اِن دنوں مجھ کو ایسا عارضہ لاحق ہے اور تجربہ کار شخصوں نے اس کے دفعیہ کے لیے نکاح تجویز کیا ہے، لیکن یہ بات آپ کی اجازت پر موقوف ہے، اس لیے کہ آپ نے

---

[1] آپ کی دونوں زوجۂ محترمہ سندھ میں تھیں، سرحد کے پُر خطر اور غیر محفوظ راستوں سے گزر کر مستورات کا پنجتار میں پہنچنا بہت مشکل اور تقریباً ناممکن تھا۔ اس لیے وہیں کہیں عقد کی تجویز ہُوئی۔

اپنے نکاح کے وقت یہ عہد لیا تھا کہ ہماری زندگی میں ہماری اجازت کے بغیر نکاح نہ کیجیے گا۔ اس لیے آپ سے پوچھنے کی ضرورت پیش آئی، آپ کے خلاف ہم نہیں کریں گے۔ کچھ عرصے کے بعد اس کا جواب آیا کہ آپ نے ہمارا عہد وفا کیا۔ ہمیں بخوشی منظور ہے۔ ہماری طرف سے اس کی پوری اجازت ہے۔ ایک تو آپ یہ کام بیماری کے عذر سے کرتے ہیں، دوسرے ابھی دو اور بیویاں کرنے کی اللہ تعالیٰ کی طرف سے رخصت ہے اور لونڈیوں کے رکھنے کی بھی شریعت کی طرف سے اجازت ہے۔ البتہ ہماری خواہش ہے کہ آپ ایسی جگہ یہ رشتہ کریں کہ ہمارے آپس میں کوئی قصّہ بکھیڑا نہ ہو۔ ہمارا آپ سے ملنا تو اللہ تعالیٰ کے ارادے ہی پر موقوف ہے۔

آپ نے خط پڑھ کر اُن کی ہمّت و قوّتِ ایمانی کی بہت داد دی اور دُعائیں دیں۔ پھر سب کی تجویز سے کاشکاری (چترالی) صاحبزادی سے آپ کا عقد ہوا۔ میاں جی چشتی نے خُطبہ پڑھ کر ایجاب و قبول کرایا۔ بی بی صاحبہ کو قرآن مجید پڑھانے کے لیے مولوی سعادت علی کو مقرر کیا اور مسائل و ضروریاتِ دین کی تعلیم کے لیے مولانا عبدالحی صاحب کے شاگرد قاضی علاء الدین صاحب کو متعیّن فرمایا اور قاضی صاحب موصوف سے فرمایا کہ کوئی مختصر منظوم رسالہ سلیس اُردو میں اُن کے لیے بنا دیجیے، اس لیے کہ نظم جلد یاد ہو جاتی ہے۔ اُنھوں نے نماز روزے کے مسائل پر رسالہ نظم کرنا شروع کیا، جو جو مسائل وہ نظم کرتے تھے، مولانا محمد اسمٰعیل صاحب کو سُنا دیا کرتے تھے۔ مولوی صاحب بالاکوٹ میں شہید ہوئے اور وُہ رسالہ ناتمام رہا۔

جنگی مشقیں | خہر کے قیام کے دَوران میں ایک روز چند مجاہدین نے سیّد صاحبؒ سے عرض کیا کہ اِن دنوں ہم لوگ یہاں مُعطّل بیٹھے ہیں۔ اگر اجازت ہو، تو قواعد بھرماری وغیرہ کی مشق کیا کریں اور لوگ رنجک بھی اُڑایا کریں تاکہ بندوق لگانے میں آنکھ نہ جھپکے۔ آپ نے پسند فرمایا۔ چنانچہ میر عبدالرحمٰن، حافظ امام الدین رامپوری اور ایک دُوسرے رامپوری سیّد لوگوں سے توڑے دار بندوقوں کی قواعد لینے لگے اور حاجی عبداللہ رامپوری، میر امام علی عظیم آبادی، شیخ خواہش علی غازی پوری، شیخ بلند بخت، شیخ نصر اللہ خورجوی اور اکبر خاں، چقماق اور قرابین کی قواعد کراتے تھے اور رات کو سیّد صاحبؒ

حال بیان کرتے تھے اور آپ کبھی کبھی اصلاح فرمایا کرتے تھے۔ رنجک دن اور رات کو بھی اپنے اپنے ڈیروں پر اُڑاتے تھے۔ یہ قواعد کم و بیش ڈھائی تین مہینے رہی۔ قواعد لینے والوں نے ایک روز آپ سے بہت تعریف کی اور کہا کہ اَلْحَمْدُ لِلّٰہ، اب ہمارے ساتھی بہت مشّاق اور ہوشیار ہو گئے ہیں آپ نے فرمایا کہ اِنشاء اللہ کل صبح کو ہم بھی دیکھنے آئیں گے۔

آپ کے آنے کی خبر سُن کر مجاہدین خاص طور پر آراستہ ہو کر آئے اور خوب چُستی اور چالا کی کے ساتھ قواعد کرنے میں مشغول ہوئے۔ کچھ دن چڑھے جماعت کے پچاس، ساٹھ خاص آدمیوں کے ساتھ آپ وہاں تشریف لے گئے اور دیر تک قواعد کو ملاحظہ فرمایا اور کہا کہ بھائیو، اب دو، دو، چار، چار چوٹ بندوقیں بھر کر اسی پھُرتی کے ساتھ لگاؤ۔ لوگوں نے بندوقیں بھی چلائیں اور قرابینیں بھی لگائیں۔ آپ بہت خوش ہوئے۔ پھر آپ نے جنابِ الٰہی میں سب کے واسطے دعا فرمائی اور فرمایا کہ بھائیو، قواعد پر اعتماد نہ کرنا۔ فتح و شکست اللہ تعالیٰ کے دستِ قدرت میں ہے، قواعد پر موقوف نہیں ہے۔ اگر تم صرف عنایتِ الٰہی پر اعتماد کرو گے، تو اللہ تعالیٰ تمہیں قواعد والوں پر فتحیاب کرے گا۔ اب کل سے قواعد موقوف کرو جس کا دل چاہے، تنہا تنہا بھر ماری کی مشق کر لیا کرے۔

سرحد کا ایک مخلص عالِم | خہر میں ایک روز کانڑا، غُوربند کے باشندے مولوی سیّد محمد حبان صاحب، جو اِس نواح کے ایک بڑے ذکی الطبع اور خوش تقریر عالم تھے، آئے اور عرض کیا کہ میں اپنے گھر سے بہت آسُودہ حال ہوں، اللہ تعالیٰ نے روپیہ پیسہ بہت دیا ہے۔ میں آپ کی خدمت بابرکت میں صرف خُدا کے لیے آیا ہوں۔ اگر آپ کی برکت کا اثر دل میں پاؤں گا، تو بیعت کروں گا۔ آپ نے فرمایا: آپ پہلے بیعت کر لیجیے، پھر انشاء اللہ برکت کا اثر بھی معلوم ہو جائے گا۔ اُنھوں نے بیعت کی اور آپ کے حکم سے نظام الدین اولیاء نے، جو ایک ناخواندہ آدمی تھے، اُن کو توجہ دی۔ مولوی سید محمد حبان صاحب نے توجہ کے بعد کہا کہ میاں نظام الدین ایک عامی آدمی ہیں اور مجھ کو لوگ عالم جانتے ہیں؛ سو اُن کی توجہ دینے سے مجھ کو وُہ فائدہ ہُوا کہ تمام عُمر میں کبھی کسی سے نہ ہُوا تھا، جیسے کسی اندھے کی آنکھیں کھُل جاتی ہیں، اِس وقت ایسا ہی میرا حال ہُوا۔ میں نے اپنے دل میں جانا کہ میں از سرِ نو آج

مُسلمان ہُوا ہوں، اگلی تمام عُمر میری یُوں ہی برباد ہُوئی۔ سیّد صاحبؒ نے فرمایا کہ مولوی صاحب اللہ کے فضل سے آپ ہمیشہ کے مُسلمان ہیں، مگر اس کی حقیقت کا آپ کو آج احساس ہُوا۔

مولوی حبّان صاحب اس کے بعد برابر سیّد صاحبؒ کی خدمت میں رہے۔ آپ نے اُن کو قاضی القضاۃ کا عہدہ بھی دیا۔ مردان کی جنگ میں شہید ہوئے۔

○

آٹھواں باب

اُتمان زئی کی جنگ

دُرّانیوں کے ستائے ہُوئے سردار ایک روز خہر میں موضع اُتمان زئی کے عالم خاں اور جلالہ کے رسُول خاں سیّد صاحبؒ کے پاس آئے اور اپنی جلاوطنی کا شکوہ کیا اور کہا کہ دُرّانیوں نے ہمارے گھر کا تمام مال و اسباب لُوٹ لیا اور ہمیں ہماری بستی سے نکال دیا۔ آپ ہمارا کچھ انتظام فرمائیں۔ آپ نے فرمایا کہ چند روز صبر کرو اور ٹھیرو۔ دیکھو، اللہ تعالیٰ کو کیا منظور ہے۔ تمھاری طرح چند لوگ اور بھی اُن کے ستائے اور جلاوطن کیے ہُوئے یہاں موجود ہیں، جیسے ارباب بہرام خاں اور ان کے بھائی ارباب جمعہ خاں وغیرہ۔ اس دُشمنی اور ایذا رسانی کا سبب یہ ہے کہ جو لوگ للہ فی اللہ ہماری رفاقت کرتے ہیں اور ہم سے راہ و رسم رکھتے ہیں، اُن سے دُرّانیوں کو قلبی عداوت ہے۔ وہ سکھوں کے خیرخواہ اور معاون و مددگار ہیں یہاں تک کہ ہمارے جو قاصد یا غازی اِکّا دُکّا ہندوستان سے آتے ہیں، اُن کو بھی وُہ طرح طرح کی ایذا دیتے ہیں اور اُنھوں نے وہاں کے سیٹھ ساہوکاروں کو روک دیا ہے کہ اُن کی ہُنڈیاں نُھلنے نہ پائیں۔ جب ہم لوگ پنجتار سے اس طرف کو آتے تھے، وہ ہمارے مقابلے کے لیے پانچ چھ ہزار آدمیوں کے ساتھ شاہ کوٹ[1] پر آکر جمع ہُوئے تھے۔ ہم نے مُقابلہ کرنا مناسب نہیں سمجھا۔ طرح دے کر چلے

---

[1] غالباً سنا کوٹ مراد ہے جیسا کہ گزر چکا۔

آئے۔اب دیکھو، اللہ کیا کرتا ہے۔

عُلماء سے استفسار | یہ گفتگو سُن کر وُہ دونوں خان اس روز تو خاموش ہو گئے۔کئی روز کے بعد ارباب بہرام خاں اور ارباب جُمعہ خاں وغیرہ کو لے کر پھر آپ کے پاس آئے اور یہ خبر لائے کہ دُرّانیوں کا لشکر دریائے کابل (لُنڈے) اُتر کر اُتمان زئی میں آیا ہے۔اب آپ اس کا ضرور انتظام کریں ایسا نہ ہو کہ وُہ اس طرف کا رُخ کریں۔یہ سُن کر آپ نے دُوسرے یا تیسرے دن الاڈنڈ کے عنایت اللہ خاں کھہر کے زید اللہ خاں، گھڑیالے کے محمود خاں، چارگُلّی کے منصور خاں، نیز مولوی حبّان، تُورو کے مولوی عبدالرحمٰن، کھہر کے مُلّا کلیم کو بُلایا۔ان کے علاوہ اور جو عُلماء نزدیک تھے، ان سب کو جمع کیا اور عالم خاں اور رسول خاں وغیرہ کی جلا وطنی کا حال سُنایا اور شروع سے اس وقت تک دُرّانیوں نے آپ کے ساتھ جو شرارتیں اور بغاوتیں کی تھیں، سب بیان کیں اور سب علماء سے اس امر میں فتوٰی طلب کیا کہ ان سے جہاد کرنا کیسا ہے۔یہ لوگ باغی ہیں یا نہیں؟[1]

عُلماء میں اس مسئلے میں مختلف تقریریں رہی۔آپ نے تُورو کے مولوی عبدالرحمٰن اور مولوی حبّان کو، جو اِسی مُلک کے تھے، اپنی طرف سے مقرر فرمایا کہ آپ ان سے گفتگو کر کے اس کا تصفیہ کیجیے۔ آخر کچھ قیل و قال کے بعد اس پر اتفاق ہُوا کہ وُہ باغی ہیں، اُن سے لڑنا شرعاً درست ہے۔

ارباب بہرام خاں کی خیبر کی طرف روانگی | جب تمام عُلماء نے متفق ہو کر اُن کی بغاوت کا فتوٰی دے دیا، تب آپ نے لوگوں سے مشورہ کیا کہ اب کیا کرنا چاہیے۔آخر یہ تجویز ہُوئی کہ پچاس ساٹھ آدمیوں کے ساتھ ارباب بہرام خاں اور ارباب جمعہ خاں خیبر کی طرف روانہ کیے

---

[1] معلوم ہوتا ہے کہ سیّد صاحبؒ محض دو آدمیوں کی مدد کے لیے (جن کو اپنے مخالفین کی عداوت و ایذا رسانی سے ترکِ وطن کرنا پڑا تھا) لشکرِ اسلام کو حرکت دینے اور معرکۂ جہاد گرم کرنے کی ضرورت نہیں سمجھتے تھے۔آپ کے سامنے یہ مقصد تھا کہ اُتمان زئی کی طرف کوچ کر کے پشاور کی طرف پیش قدمی کی جائے، جو مخالفت و ایذا رسانی اور صَدٌّ عَنْ سَبِیْلِ اللّٰہِ کا مرکز بن گیا تھا۔اِسی کے لیے آپ کو ان دُرّانیوں کی بابت علماء و خوانین کا نقطۂ نظر معلوم کرنے اور اُن سے جہاد کرنے پر اتفاقِ رائے حاصل کرنے کی ضرورت پیش آئی اور اسی منصوبے کے پیش نظر اس کی ضرورت تھی کہ خیبر کی طرف کے قبائل کو متحد و متفق کیا جائے تاکہ سردارانِ پشاور کو نہ اُن سے کمک حاصل ہو سکے، نہ کابل کی طرف سے کوئی مدد آ سکے۔

جائیں کہ وُہ وہاں سے اپنی قوم کو متفق کر کے پشاور پر لائیں اور ادھر سے آپ باقی لشکر لے کر اُتمان زئی کی طرف کُوچ فرمائیں اس لیے کہ ارباب بہرام خاں خیبر کی طرف اپنی قوم اور دُوسرے قبائل کو بلالیں گے، تو اس طرف سے دُرّانیوں کو مدد نہیں مل سکے گی۔

یہ تدبیر سب کو پسند آئی اور آپ نے ارباب بہرام خاں کو ساتھ بھیجنے کے لیے مولوی مظہر علی عظیم آبادی کو جماعت کے ساتھ اور شیخ ولی محمد پھلتی کی جماعت کے چند لوگوں کے ساتھ شیخ علی محمد دیوبندی اور مولوی نصیر الدین منگلوری کو مقرر فرمایا اور پوری جماعت کا امیر سید احمد علی رائے بریلوی کو، جو آپ کے بھانجے تھے، بنایا اور اُن کو رخصت کرتے وقت ننگے سر ہو کر دیر تک بڑے عجز و انکسار سے دُعا کی اور روانہ فرمایا۔

موضع ٹوٹئی میں جب یہ لوگ خیریت کے ساتھ خیبر میں داخل ہُوئے اور ارباب بہرام خاں نے وہاں کے لوگوں کے متفق ہونے کی خبر بھیجی اور کہلایا کہ مہمند اور خلیل کے سرداروں اور خوانین کو بھی میں نے بلایا ہے، تو آپ نے یہ معلوم کر کے کُوچ کی تیاری کی، معذورین کو بی بی صاحبہ کی حفاظت کے لیے خہر میں چھوڑا اور میاں جی غلام محمد سہارنپوری کو انتظام اور بند و بست کے لیے مقرر کیا، پھر اَلاڈنڈ کے عنایت اللہ خاں اور خہر کے زید اللہ خاں وغیرہ خوانین کو مع لشکر اُتمان زئی کے عالم خاں تنگی کے محمود خاں، جلالہ کے رسُول خاں کے ساتھ موضع ٹوٹئی کی طرف چلنے کی تیاری کی اور معمول کے مطابق دُعا کر کے روانہ ہُوئے۔ وہاں سے کوچ کر کے منزل بہ منزل موضع ٹوٹئی میں داخل ہُوئے۔ وہاں ایک مہینے کے قریب قیام فرمایا۔ مُلکِ سوات اور سمہ کے جو خوانین اور سردار آپ سے موافقت رکھتے تھے، وُہ اپنی جمعیت لے کر اور سوات کا سردار انبالی خاں بھی اپنے لوگوں کے ساتھ وہیں حاضر ہُوا۔

مشورہ ہُوا کہ اُتمان زئی پر چھاپہ مارا جائے۔ آپ نے لوگوں کو تیاری کا حکم دیا اور فرمایا کہ ظہر کی نماز کے بعد میدان میں سب کمر باندھ کر ہتھیار لگا کر رخصت کے لیے حاضر ہوں۔ جب سب مجاہدین میدان میں جمع ہو گئے، آپ تشریف لائے، نمازِ عصر پڑھائی اور بڑی گریہ و زاری کے ساتھ دُعا کی اور مصافحہ کر کے سب کو رُخصت کیا۔

مجاہدین کی آزمائش مجاہدین نے مغرب کے قبل نالے پر پہنچ کر وضو کیا اور مشکیزوں اور لوٹوں میں پانی بھر لیا اور مغرب و عشا پڑھ کر رہبر کی رہنمائی میں روانہ ہوئے۔ راہبر گھاٹی سے نکال کر آگے لے چلا۔ وہاں کوسوں میدان ہی میدان نظر آتا تھا۔ رات اندھیری تھی۔ راہبر سے راستہ چھوٹ گیا۔ تمام رات سراسیمہ و سرگرداں سب کو لیے اسی بیابان میں پھرا کیا یہاں تک کہ سورج نکلا اور دھوپ تیز ہونے لگی۔ جو پانی لوگوں نے نالے سے ساتھ لیا تھا، ختم ہو گیا اور پیاس معلوم ہونے لگی۔ پانی کا وہاں کوسوں نام نہ تھا۔ لوگوں نے رہبر کو تنگ کرنا اور الزام دینا شروع کیا کہ تم نے ہم کو کہاں لا کر ڈالا۔ اس نے دیر تک سوچ کر ایک طرف ہاتھ سے اشارہ کیا اور کہا کہ وہ جو ایک ٹیلا سا نظر آتا ہے، وہاں پانی ہے۔ وہ ٹیلا وہاں سے ڈیڑھ یا دو کوس تھا۔ آخر سب لوگ اس کے ساتھ چلے۔ وہاں جا کر دیکھا، تو پانی کا نام و نشان بھی نہ تھا۔ لوگ گھبرا کر اس سے کہنے لگے: "تو کہاں ہم کو حیران و پریشان کرتا پھرتا ہے؟" وہاں دو ڈھائی کوس پر ایک دوسرا ٹیلا نظر آیا۔ اس نے کہا: "بھائیو، گھبراؤ نہیں، میرے ساتھ آؤ، وہاں پانی ملے گا۔" آخر سب اس ٹیلے کی طرف روانہ ہوئے۔ لوگ دھوپ کی تمازت اور پیاس کی شدت سے بیتاب تھے۔ بہ ہزار دقت گرتے پڑتے وہاں تک پہنچے، مگر وہاں بھی پانی کا پتہ نہ تھا۔ سوا پہر، ڈیڑھ پہر دن ہو چکا تھا۔ گرمی اور تشنگی سے ہر ایک کے بدن میں چنگاریاں سی لگ رہی تھیں، ہلاکت کا قوی اندیشہ تھا، ہر ایک شخص سمجھ رہا تھا کہ اسی میدان میں موت آنی ہے اور تڑپ تڑپ کر جان دینا ہے، مگر شکرِ الٰہی کے سوا کوئی شکایت کا کلمہ زبان پر نہ آیا۔ اگرچہ ہر ایک اضطراب اور پیاس سے نیم جان ہو رہا تھا، مگر دوسرے کو تسلی دیتا تھا کہ مت گھبراؤ، اللہ تعالیٰ فضل فرمائے گا، خدا کی راہ میں مسلمانوں نے بڑی بڑی تکلیفیں اٹھائی ہیں، یہ پیاس کی تکلیف تو کچھ بھی نہیں ہے۔

آخر اس راہبر نے کہا: بھائیو، اب کچھ اندیشہ مت کرو، اب راستہ یہاں سے قریب ہے ایک تیسرا ٹیلا وہاں سے کوئی سوا کوس تھا۔ ہاتھ کے اشارے سے اس نے بتایا کہ وہاں گوجروں کے جانوروں کی چراگاہ ہے، پانی بھی بہت ہے اور دودھ دہی سب موجود ہے۔ کسی طرح وہاں تک چلے

چلو۔ مجھ کو سورج نکلتے ہی معلوم ہوا تھا کہ راستہ اتنی دُور ہے۔ اگر مَیں پہلے سے پانچ چھ کوس بتا دیتا، تو تُم سب کے سب گھبرا کر بے حواس ہو جاتے، راستہ طے کرنا پہاڑ ہو جاتا۔ الغرض، سب کو اُمید ہوئی کہ انشاء اللہ تعالیٰ وہاں ضرور پانی ہوگا، اِس لیے کہ وہاں سے اس ٹیلے کی طرف چار پانچ گوجروں کے جھونپڑے نظر آتے تھے۔ مگر پیاس سے سب کے سب جاں بلب تھے۔ رہبر نے کہا کہ مَیں آگے چل کر تمہارے واسطے پانی بھیجتا ہوں، تم بھی آہستہ آہستہ اسی طرف چلے آؤ۔ یہ کہہ کر وُہ آگے بڑھ گیا اور جو قوی دل اور باحواس تھے، وہ اُس کے ساتھ ہو لیے۔ ایک سقّہ بیل پر پکھال لیے ہُوئے اور ایک سقّہ مشک لیے ہُوئے اُن کے ساتھ ہُوا۔ تقریباً پونے دو سَو آدمی آگے گئے۔ باقی لوگوں کا یہ حال تھا کہ جابجا مارے دُھوپ کے چھوٹی چھوٹی جھاڑیوں میں سر ڈالے ہُوئے بے حواس پڑے تھے اور کچھ آہستہ چلے بھی جاتے تھے۔ اس عرصے میں آگے جانے والوں نے ایک پکھال پانی بیل پر اور دو مشکیں گدھے پر لاد کر پچھلے لوگوں کے لیے بھیجیں۔ گوجر بھی مٹکوں میں چھاچھ، دُودھ اور پانی لے کر دَوڑے۔ جو لوگ راستے میں تھے، وُہ ایسے پیاسے تھے کہ سب پانی اور چھاچھ وغیرہ پی گئے اور جو جھاڑیوں میں جابجا پڑے تھے، اُن تک پانی نہ پہنچا، جنھوں نے پیا تھا، وہ چراگاہ پہنچے اور پکھال، مشکیں اور مٹکے وغیرہ پانی سے دوبارہ بھر کر لے دَوڑے۔ چراگاہ سے جھاڑیوں تک آدمیوں کی ایک قطار سی بندھ گئی۔ سب سیراب ہُوئے اور وہاں سے چراگاہ میں آئے۔ چراگاہ پہنچتے پہنچتے دوپہر ہوگئی تھی۔

سیّد صاحبؒ کی آمد اور مُجاہدین کی تشفّی

اسی روز سیّد صاحبؒ ڈھائی تین سَو سواروں اور پیادوں کے ساتھ عصر اور مغرب کے درمیان چراگاہ میں آئے۔ تمام لوگ اس دن کی تکلیف سے بیتاب و پژمردہ پڑے ہُوئے تھے۔ آپ کو دیکھ کر سب اپنی تکلیف بھول گئے اور خوشی سے تر و تازہ ہوگئے۔ لوگوں نے آپ سے دن کا واقعہ بیان کیا۔ آپ نے ہر ایک کو تسلّی دی اور فرمایا کہ یہ بھی اللہ کی طرف سے ایک آزمائش تھی۔ اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کو طرح طرح کی تکلیفوں اور مُصیبتوں سے آزماتا ہے: بھوک سے، پیاس سے، خوف سے، نُقصانِ مال و جان سے۔ جو صبر کر کے اِن بلاؤں کو سہتا ہے اور دین کے راستے پر ثابت قدم رہتا ہے، اُس کو اللہ تعالیٰ اپنی رحمت سے بڑے بڑے درجے اور

مرتبے عنایت فرماتا ہے۔ اسی طرح آپ فرماتے رہے اور کہتے کہتے دفعتہً دریائے محبتِ الٰہی نے جوش مارا اور آپ برہنہ سر ہو کر دُعا کرنے لگے۔ طرح طرح سے اللہ تعالیٰ کی حمد و ثنا بیان کرتے تھے اور گوہرِ اشک سے دامن بھرتے تھے اور اللہ تعالیٰ کی تعریف میں عجیب عجیب الفاظ آپ کی زبان سے نکلتے تھے۔ اُس وقت اِس دُعا کی تاثیر اور برکت سے ہر شخص کا عجیب حال تھا۔ دن بھر کی تکلیف خواب و خیال ہوگئی تھی، سب میں نئی زندگی اور تازگی پیدا ہوگئی تھی۔ لوگوں نے دُعا کے بعد عرض کیا کہ اگر ارشاد ہو، تو نمازِ مغرب کے بعد ہم لوگ اُتمان زئی کو روانہ ہوں۔ آپ نے فرمایا کہ اتنی عُجلت کی ضرورت نہیں، تسلی اور دل جمعی سے کام خوب ہوتا ہے۔ لوگ یہ سُن کر خاموش ہو گئے۔

آپ نے مولانا محمد اسمٰعیل، مولوی حبّان، رسُول خاں، عالم خاں، محمُود خاں اور منصُور خاں، زَید اللہ خاں، عنایت اللہ خاں اور ربانی خاں وغیرہ کو جمع کیا اور فرمایا کہ آج ہمارے مجاہدین کو راستے میں بڑی تکلیف ہوئی۔ اگرچہ اپنی ہمت و جرأت سے باتیں کرتے ہیں، مگر جان ہی جان باقی ہے۔ اب یہاں سے کُوچ کی کیا تدبیر ہے؟

آخر مشورے میں یہ قرار پایا کہ اُتمان زئی تو یہاں سے کڑی منزل ہے، راستے میں پانی بھی نہیں ہے، وہاں تک تو پہنچنا دُشوار ہے۔ یہاں سے ڈھائی یا تین کوس موضع جلالہ ہے۔ وہاں سے بھی موضع اُتمان زئی اسی قدر ہے۔ آج رات تو سب اسی چراگاہ میں رہیں تاکہ ماندگی بھی رفع ہو اور نیند کا خمار بھی دُور ہو، پھر کل یہاں سے چل کر جلالہ میں ڈیرہ ہو۔

کُوچ کی تیاری آپ کو یہ صلاح پسند آئی۔ رات کو اسی چراگاہ میں وُہ لشکر رہا، وہاں کے گوجروں نے دُودھ دہی کی خُوب مہمانی کی۔ نمازِ فجر کے بعد کُوچ ہُوا۔ دن چڑھے موضع جلالہ میں داخل ہُوئے وہاں پانچ دن قیام رہا۔ دُرّانیوں کا حال معلوم کرنے کے لیے وہاں سے دو مُخبر اُتمان زئی کو روانہ کیے گئے۔ رسُول خاں کے مشورے سے مٹی کی ایک ہزار ٹلکیاں بنوائی گئیں، جن میں دو ڈھائی سیر پانی سما سکتا تھا۔ دونوں جاسُوسوں نے آکر خبر دی کہ دُرّانیوں کا لشکر، پیادہ و سوار ملا کر، چار ہزار کے قریب ہوگا۔ ان کے ساتھ دو توپیں بھی ہیں۔

یہ خبر سُن کر آپ نے رسُول خاں اور عالم خاں کو بُلا کر فرمایا کہ چالیس پچاس گھڑے پانی آج کسی وقت جس راستے ہم جائیں گے، یہاں سے روانہ کر دو اور جب تک ہمارا لشکر وہاں داخل ہو تب تک مزدوروں کو وہیں اپنے ساتھ رکھنا۔ اس روز نمازِ عشا کے بعد، کوئی پہر رات گئے، پندرہ بیس بندوقچیوں کے ساتھ رسُول خاں اور عالم خاں پانی کے گھڑے مزدوروں کے سروں پر رکھ کر روانہ ہوئے۔ صبح کو آپ نے وُہ بطکیاں منگوائیں اور چاروں جماعت داروں کو بُلا کر آپ نے حکم دیا کہ جو لوگ چالاک وچُست اور صحیح تندرست ہوں کہ دس بارہ کوس جانے اور پلٹ آنے کی طاقت رکھتے ہوں، ان کو ایک ایک بطکی دے کر کہ دو کہ ہر کوئی دو دو وقت کی روٹیاں پکا کر باندھ لے۔ آج عصر سے پہلے کوچ ہے اور جو لوگ بیمار اور چلنے سے ناچار ہوں، اُن کو یہیں رہنے دینا اور ہماری طرف سے اُن کی تسلّی و تشفّی کر دینا کہ ان شاء اللّٰہ تعالیٰ پیچھے سے تم کو بھی بُلوا لیں گے یا ہم بھی آ کر ملیں گے۔

لوگ سب سامان درُست کر کے سو رہے کہ تمام رات چلنا ہوگا۔ جب ظُہر کی اذان ہُوئی، آپ نے اُٹھ کر وضُو کیا اور نماز پڑھائی۔ نماز کے بعد آپ نے فرمایا کہ پہر دن رہے سے سب بھائی کمر باندھ کر نالے پر، جو یہاں سے پاؤ کوس ہے، جمع ہوں، عصر کی نماز وہیں پڑھیں گے۔ لوگ تیار ہو کر گئے۔ سیّد صاحبؒ بھی دو سو پیادہ اور سواروں کے ساتھ تشریف لے گئے۔ میدان میں نمازِ عصر پڑھائی اور بہت الحاح وزاری کے ساتھ دُعا فرمائی اور اُن جاسُوسوں کو، جو اُتمان زئی سے دُرّانیوں کی خبر لائے تھے، آگے کیا اور وہاں سے کوچ فرمایا۔

قریب پہر رات گئے اس پانی پر، جو رکھایا تھا، جا پہنچے اور وہیں نمازِ عشا پڑھی۔ ہندوستانی اور مُلکی ملا کر قریب ہزار آدمی کے ہوں گے۔ آپ نے ان دو جاسُوسوں سے کہا کہ ایک تم میں سے آگے جائے اور دُرّانیوں کے لشکر کی خبر لائے کہ اُن کے لشکر میں کس طرف لوگ ہوشیار ہیں اور کس طرف غافل، اور ایک ہمارے لشکر کے ساتھ رہے۔ پھر ان دونوں نے آپس میں مشورہ کیا کہ میں تو لشکر کو لے کر اُتمان زئی سے آدھ کوس جانبِ شمال فلاں جگہ ٹھیروں گا اور تم خبر لے کر وہیں آنا۔ پھر ایک اُدھر گیا اور دُوسرا لشکر کے ساتھ رہا۔ جاتے جاتے اس جاسُوس نے پتے کی

جگہ پر پہنچایا۔ اس عرصے میں دُوسرا مُخبر بھی آیا اور کہا کہ موضع اُتمان زئی کو بائیں ہاتھ کی طرف چھوڑ کر میرے پیچھے پیچھے چلے آؤ۔ اُس وقت کوئی پانچ چھ گھڑی رات رہی ہوگی۔

کامیاب شبخون | یہ سُن کر آپ نے اپنے لشکر کو دو گروہوں میں تقسیم کیا۔ ایک گروہ مولانا محمد اسمٰعیل صاحب کے سُپرد کیا اور فرمایا کہ آپ اس جاسوس کے ساتھ جاکر دُرّانیوں کے لشکر پر شبخون ماریں؛ اور ایک گروہ اپنے ہمراہ لے کر موضع اُتمان زئی کی طرف روانہ ہُوئے کہ اگر دُرّانی چھاپے سے بھاگیں گے تو بستی میں آ کر گھُسیں گے، یہاں ہم اُن سے مقابلہ کریں گے۔ یہ آپ نے ہمراہیوں سے فرمایا کہ جو کوئی تم سے مقابلہ کرے، اس کو مارنا اور جو تم سے امن مانگے، اُس کو امن دینا، اُس کا پیچھا نہ کرنا۔ مولانا محمد اسمٰعیل صاحب کے ساتھیوں سے بھی یہ فرما دیا تھا۔

جب مولانا اپنی جماعت لے کر دُرّانیوں کے لشکر سے توپ کی زد پر گئے اور وہاں کھڑے ہُوئے، آپ نے سب لوگوں سے کہا کہ اب یہاں سے حملہ کریں گے؛ جب تک ہماری بندوق نہ چلے، کوئی دُوسرا نہ چلائے۔ پھر وہاں سے آگے بڑھے۔ دُرّانیوں کا چوکیدار پہرا کھڑا تھا۔ اُس نے آواز دی: "کون ہے؟" اس طرف سے کوئی نہ بولا۔ دُوسری بار پھر اُس نے آواز دی۔ پھر اِدھر سے کوئی نہ بولا۔ تیسری آواز پھر اس نے دی۔ جب کوئی اِدھر سے نہ بولا، تب اُس نے بندوق ماری اور شور کر کے بھاگا کہ لشکر آ پہنچا۔ اِدھر سے سب نے بآوازِ بلند تکبیر کہتے ہُوئے حملہ کیا۔ اُدھر سے گولنداز نے توپ سر کی۔ سب مُجاہدین بیٹھ گئے۔ پھر اُٹھ کر دَوڑے یہاں تک کہ اُن کے لشکر میں جا داخل ہُوئے۔ پھر اُدھر سے دُوسری توپ چلی۔ اِدھر سے مولانا نے بندوق سَر کی۔ اس کے ساتھ ہی مجاہدین کی ایک باڑھ چلی اور سب نے جا کر اُن کی دونوں توپیں لے لیں۔ اُن کا ایک گولنداز مارا گیا، باقی لشکر اور گولہ انداز بھاگ کھڑے ہُوئے یہاں تک کہ کسی نے بندوق بھی نہ چلائی۔ اِدھر فضلِ الٰہی سے نہ کوئی مارا گیا اور نہ زخمی ہُوا۔

مجاہدین کی مورچہ بندی اور دن بھر کی جنگ | اِدھر سے سیّد صاحب بھی اپنا غول لے کر آ پہنچے۔ آپس میں مُبارکباد ہُوئی اور سب نے اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کیا کہ سب طرح سے اللہ نے

خیمہ کی۔ وہاں سے توپ کی زد پر ایک ٹیلا تھا۔ دُرّانیوں کا لشکر اُس کی آڑ پکڑ کر کھڑا ہُوا۔ سیّد صاحبؒ نے فرمایا کہ دونوں توپیں جو بھری ہُوئی تیار ہیں، اس ٹیلے کے سامنے لگا دو۔ آدھے لوگ اُن کے مقابلے پر رہیں اور آدھے لوگ نمازِ فجر پڑھ لیں۔ اس کے بعد یہ مقابلے پر جائیں، وُہ نماز پڑھ لیں۔ چنانچہ ایسا ہی ہُوا۔ اس عرصے میں کچھ مجاہدین دائیں بائیں سے مورچہ بندی کے طَور پر پہلے قافلے کے بیچ میں گئے تھے۔ اُن کو دیکھ کر دُرّانیوں کے سوار دو دو، چار چار کر کے اس ٹیلے پر جمع ہُوئے۔ مُجاہدین نے سیّد صاحبؒ سے عرض کیا کہ یہ سوار ٹیلے پر جمع ہیں، ایسا نہ ہو کہ ہم پر حملہ کریں۔ سیّد صاحبؒ نے آگے بڑھ کر مُجاہدین کے چار مورچے چار جگہ قائم کیے۔ جانبین سے بندوقیں چلنے لگیں۔ پھر مجاہدین نے عرض کی کہ اگر اجازت ہو، تو توپ چلائیں۔ آپ نے فرمایا کہ ابھی تامُّل کرو۔ تھوڑی دیر کے بعد آپ توپوں کے پاس آئے اور اُن کو پھِرا کر ایک ٹیلے پر لگا دیا اور سواروں کے غول پر شست باندھی۔ مرزا احسن بیگ بانس بریلوی سے، جو توپ چلانے میں بڑے اُستاد تھے، فرمایا کہ دیکھو تو، شست ان توپوں کی اس غول کی طرف کیسی ہے۔ مرزا صاحب نے دیکھ کر کہا کہ دُرست ہے۔ آپ نے فرمایا کہ بتّی دو۔ اُنھوں نے ایک توپ کو سر کیا۔ وہ گولہ ان سواروں کے سر پر ہو کر نکل گیا۔ اس میں وُہ سوار پراگندہ ہو گئے۔ مرزا صاحب نے دُوسری توپ سر کی۔ اس گولے میں ان میں سے دو سوار اُڑ گئے اور باقی اُوپر سے اُتر کر اسی ٹیلے کی آڑ میں کھڑے ہو گئے اور پیادوں کی بندوقیں چلتی رہیں۔ جب مجاہدین ان کے کسی مورچے کا زیادہ زور دیکھتے، تو اس طرف ایک یا دو گولے مار دیتے، یا جب دس بیس سواروں کا مجمع ٹیلے پر ہوتا، تب ایک یا دو گولے مار دیتے۔

اسی طرح صبح سے شام تک اُس روز لڑائی رہی، مگر مجاہدین میں سے نہ کوئی زخمی ہُوا اور نہ مقتول۔ ظہر اور عصر کی نماز فجر کی نماز کی طرح دو بار کر کے آدھے آدھے لوگوں نے پڑھی۔ جب مغرب کا وقت آیا، اُس وقت دُرّانیوں نے بہت زور دیا۔ شاید اُن کو کسی طرف سے کچھ کمک آگئی، اس لیے کہ ان میں دو شاہینیں اُن کی طرف سے چلنے لگیں، جو پہلے نہ تھیں۔ گولیوں کا مینہ سا مجاہدین پر برستا تھا، مگر سرد گولیاں آتی تھیں۔ مغرب کی نماز مجاہدین کو پڑھنی دُشوار ہو گئی۔ پھر اسی تقسیم و انتظام سے

نماز پڑھی۔ شاہینوں کی گولیاں ایسی تیز آتی تھیں کہ مجاہدین میں سے کوئی سر نہیں اُٹھا سکتا تھا۔ اُس وقت لوگوں نے سیّد صاحبؒ سے عرض کی کہ اگر اجازت ہو، تو ہم لوگ اُن پر ہلّہ کریں: سامنے سے تو مورچے والے ماریں، اور کچھ لوگ اُن کے بائیں جانب سے جاکر ماریں۔ پھر جس کو اللہ فتح دے، وہ لے۔ آپ کو یہ مشورہ پسند آیا اور فرمایا کہ آفرین ہے تم کو! اللہ تعالیٰ اس سے زیادہ جُرأت و بہادری نصیب کرے، مگر ابھی توقّف کرو۔ دیکھو کہ اللہ تعالیٰ اپنی قدرت و حکمت سے کیا راستہ نکالتا ہے؛ لیکن آگے بڑھ کر اُن کے بائیں جانب مورچہ لگا کر بندوقیں مارو اور ہماری اجازت کے بغیر ہلّہ نہ کرنا۔ ہم سیّد ابو محمّد صاحب کو بھیجیں گے۔ جیسا وہ کہیں، ویسا عمل میں لانا۔

آپ کے فرمان کے موافق لوگوں نے آگے بڑھ کر وہیں دُرّانیوں کے بائیں جانب مورچہ لگایا اور سَو سوا سَو مجاہدین کے ساتھ سیّد صاحبؒ توپوں کے پاس تشریف لائے اور مرزا حسن بیگ سے فرمایا کہ دُرّانیوں کی شاہینوں نے ہمارے غازیوں کو بہت تنگ کر رکھا ہے۔ کسی طرح اُن کو بند کرو۔ اُنھوں نے عرض کی کہ بہت خوب، دیکھیے، انشاء اللہ تعالیٰ بند کرتا ہوں۔ سیّد صاحبؒ تو وہاں سے ایک درخت کے نیچے تشریف لے گئے اور مرزا صاحب نے اُن کی شاہینوں کی طرف شست باندھی۔ جیسے ہی ایک شاہین کی رنجک اُڑی ویسے ہی مرزا صاحب نے ایک توپ کو بتّی دی۔ مگر وہ گولا خالی گیا۔ اِس دوران میں اُنھوں نے توپ کے جواب میں دُوسری سر کی۔ مرزا صاحب نے فوراً اُس کی رنجک پر ایک توپ کی شست باندھی۔ اِس عرصے میں دوسری شاہین بھی چلی۔ مرزا صاحب نے اس کی رنجک پر دوسری توپ کی شست باندھی اور دونوں توپوں کو آگے پیچھے بتّی دی۔ واللہ اعلم اس طرف کیا حال گزرا کہ پھر ان شاہینوں میں سے ایک بھی نہ چلی، مگر بندوقیں بدستور دونوں طرف چلتی رہیں۔ کچھ کچھ دیر کے بعد مرزا صاحب دو ایک توپ بھی اپنے موقع پر چلاتے رہے۔

عالم خاں کی کمزوری اور معذرت اس عرصے میں اُتمان زئی کا عالم خاں، جس نے دُرّانیوں پر حملے کی تحریک اور دعوت دی تھی، سیّد صاحبؒ کے پاس آیا اور رونے لگا اور اپنے سر کی پگڑی اُتار کر آپ کے قدموں پر ڈال دی اور کہنے لگا کہ میرا بیٹا مجھ سے منحرف ہو کر اور میرے طرفداروں کو

اپنے ساتھ لے کر دُرّانیوں سے جا ملا۔ اب کوئی بات میرے قابو کی نہیں رہی، اس لیے کہ جن سے مجھ کو زور اور طاقت حاصل تھی، وہ سب اُس کے ساتھ چلے گئے۔ اب آپ جیسا مناسب جانیں، ویسا کریں۔

یہ خبر سیّد صاحبؒ کو اُسی روز عصر سے پہلے پہنچ چکی تھی کہ عالم خاں کی نیّت میں کچھ فتور آ گیا ہے، مگر یہ نہیں معلوم تھا کہ فی الحقیقت اُس کا بیٹا اُس سے منحرف ہو کر دُرّانیوں سے جا ملا، یا اس میں اسی کی سازش ہے۔ سیّد صاحبؒ نے عالم خاں سے کہا کہ خان بھائی، تم اپنے گھر جا کر تسلّی سے بیٹھو، ہم کو تمھارے بیٹے اور کسی دوسرے کی پروا نہیں کہ کوئی ہماری مدد کرے۔ ہم کو اللہ تعالیٰ کافی ہے۔

خیبریوں کا اختلاف اور دُرّانیوں سے اتّحاد

عالم خاں اپنے مکان کو چلا گیا۔ اس عرصے میں مولوی نصیر الدین منگلوری ایک آدمی کے ساتھ عشا کے قریب آپ کے پاس آئے اور عرض کیا کہ ارباب بہرام خاں وغیرہ کی کوششوں سے خیبریوں میں جو اتّحاد ہُوا تھا، وہ ٹوٹ گیا، وہ سب کے سب پھُوٹ کر دُرّانیوں کی طرف ہو گئے۔ یہ خبر سُن کر آپ نے فرمایا کہ کیا اندیشہ ہے، ہمارا اللہ تعالیٰ ہمارے ساتھ ہے۔ ہم نے تو انھیں لوگوں کی خوشامد اور چاپلوسی کے سبب وہاں خیبر کو بھی لوگ روانہ کیے تھے اور یہاں بھی اپنے لشکر کو لے کر آئے تھے، مگر یہ لوگ کوئی بھی اپنے عہد و پیمان کے پُورے نہیں ہیں۔ اب یہ جانیں، ہم سے کچھ کام نہیں۔

مراجعت کی تجویز

آپ نے نمازِ عشا کے بعد سب جماعت داروں اور رسالہ داروں کو اپنے پاس بُلا کر مشورہ کیا کہ عالم خاں کی تقریر آپ سب سُن چکے، خیبریوں کا حال بھی مولوی نصیر الدین صاحب کی زبانی معلوم ہو گیا کہ ارباب بہرام خاں نے جن لوگوں کو متّفق کیا تھا، اُن میں اختلاف پڑ گیا، سب کے سب پھُوٹ کر دُرّانیوں کی طرف ہو گئے۔ اس لیے اب یہاں سے چلنے کی تدبیر کرنی چاہیے، مگر اس طرح کہ ہر مورچے میں دو یا تین آدمی تو رہنے دینے چاہئیں کہ وہ بندوق چلاتے رہیں، باقی سب کو بستی اُتمان زئی سے کوئی پاؤ کوس پر جو درخت ہے، وہاں جمع کیجیے، اُن سے یہ کہیے کہ یہ صلاح ٹھیری ہے کہ دُرّانیوں کی پُشت پر چل کر شبخون مارا جائے۔

پھر آپ نے بستی سے عالم خاں کو بھی وہیں بُلوایا اور فرمایا کہ ہم نے سُنا ہے کہ سردار سید محمدؐ خاں کا بھائی دو آبے سے ان دُرّانیوں کی مدد کو لشکر لا رہا ہے، اس لیے تم تسلّی سے اپنے مکان میں جا کر بیٹھو۔ ہم اس وقت جا کر اُن پر شبخون ماریں گے۔ یہ سُن کر عالم خاں بہت گھبرایا، وہاں سے جلد اپنے مکان پر آیا اور اپنا ایک آدمی دُرّانیوں کی طرف روانہ کیا کہ ہوشیار ہو جاؤ، سید بادشاہ کا چھاپہ تمہارے کُمک والوں کے لشکر پر آتا ہے اور عجب نہیں کہ تم پر بھی آ پڑے۔ سیّد صاحبؒ بھی اسی وقت سَو سوا سَو مجاہدین کے ساتھ اس درخت کی طرف تشریف لے گئے اور جماعت دار بیلے دار سب مورچوں کو روانہ ہوئے اور آپ کے ارشاد کے موافق ہر مورچے میں دو یا تین غازی رہنے دیے اور باقی سب کو وہاں سے لا کر اسی درخت کے پاس سیّد صاحبؒ کی خدمت میں جمع کیا۔ آپ نے سب کو مولانا محمدؐ اسمٰعیل صاحب کے ساتھ جلالہ کی طرف رخصت کیا اور کوئی پچاس آدمی اپنے پاس رکھ لیے۔ پھر سیّد ابو محمدؐ صاحب کو مورچوں میں بھیجا کہ جو لوگ وہاں ہیں اُن کو بھی اپنے ساتھ لے آؤ۔ ابو محمدؐ صاحب سب کو آپ کے پاس لے آئے۔ اُن کو آپ اپنے ساتھ لے کر روانہ ہوئے۔ صرف ایک ہندو راجہ رام سلون ضلع رائے بریلی کے پاس کا رہنے والا اور مولوی احمد اللہ صاحب کا ساتھی توپوں پر رہ گیا۔ اُس کو آپ کے کُوچ کی خبر نہ ہوئی۔ وہ خود ہی دونوں توپوں کو بھرتا تھا اور آپ ہی چلاتا تھا۔ مجاہدین راستے میں اُس کی توپوں کی آواز سُنتے چلے جاتے تھے۔ بستی والے بھی اس سے مزاحم نہیں ہوتے تھے۔ وہ سمجھتے تھے کہ سیّد بادشاہ کے ساتھی دُرّانیوں پر چھاپہ مارنے گئے ہیں۔ وہاں سے وہ لوگ پھر یہاں آئیں گے۔

جونہی مجاہدین کے مورچوں سے بندوقیں چلنی موقوف ہوئیں، مقابل کا لشکر بھاگا، کیونکہ عالم خاں سے شبخون کی خبر اُن کو مل چکی تھی۔

جلالہ سے دُوسرے دن ظہر کے وقت جب مجاہدین نماز سے فارغ ہوئے، یکبارگی غُل ہوا کہ نالے کی طرف کچھ سوار اور پیادے نظر آتے ہیں۔ سب کو احتمال ہوا کہ دُرّانی آ پہنچے۔ سیّد صاحبؒ نے لوگوں کو حکم دیا کہ جلد کمر باندھ کر ہتھیار لگا کر تیار ہو جاؤ۔ اور رسُول خاں جلالہ والے سے کہا کہ بخند

آدمی اپنے ساتھ لے کر جاؤ اور خبر لاؤ کہ کون لوگ آتے ہیں۔ کچھ دیر میں لوگوں کی زبانی معلوم ہوا کہ اپنے ہی لشکر کے آدمی ہیں، جو پیچھے رہ گئے تھے۔ وہ ۲۵، ۳۰ آدمی تھے، جن میں شیخ امجد علی غازی پوری سوار، اور راجہ رام راجپوت پیادوں میں تھا۔ آپ نے راجہ رام کو شاباش دی اور فرمایا کہ اللہ تعالیٰ تم کو ہدایت نصیب کرے! تم نے خوب ہی بہادری کا کام کیا۔ شیخ امجد علی کو دیکھ کر تبسّم کیا اور فرمایا ہمارے شیخ بھائی گویا زندہ شہید ہیں۔ جس نے شہید نہ دیکھا ہو، وہ ان کو دیکھے کہ ایسی خطرناک جگہ سے زندہ سلامت بچ آئے۔

اسی روز کئی ملکیوں کی زبانی جو اُتمان زئی سے آئے تھے، معلوم ہوا کہ سیّد صاحبؒ تو لشکر کے ساتھ رات کو کُوچ کر کے جلالہ کی طرف روانہ ہوئے، مگر دُرّانی خوف کے مارے پہر دن چڑھے تک توپوں کے پاس نہ آئے کہ ایسا نہ ہو بستی میں غازیوں کا لشکر چھپا ہو جب اُن کو اچھی طرح ثابت ہو گیا کہ وہاں کوئی نہیں، تب وہ آ کر توپیں لے گئے۔

خہر کو واپسی | جلالہ سے آپ مع لشکر خہر واپس آئے۔ وہیں سیّد احمد علی، مولوی مظہر علی عظیم آبادی، حسن خاں، شیخ علی محمّد دیوبندی، ارباب جُمعہ خاں وغیرہ بھی خیبر سے واپس آ گئے اور وہاں کے لوگوں کی بد عہدی کا حال بیان کیا۔

دس پندرہ دن کے بعد آپ نے مولانا اسمٰعیل صاحب اور شیخ ولی محمّد سے فرمایا کہ ٹوٹی میں جو روپے ہم اُتمان زئی کے کُوچ سے پہلے دفن کر آئے تھے، لے آئے جائیں۔ چنانچہ وہ واپس لائے گئے۔

بُخارا کی طرف سفارتِ جہاد | لشکر کے چند اہل الرائے اور اہلِ علم حضرات نے آپ کی خدمت میں عرض کیا کہ اگر مناسب سمجھیں، تو ایک جماعت، دعوتِ جہاد کے لیے بخارا روانہ فرمائیں آپ کو یہ مشورہ پسند آیا۔ مولانا اسمٰعیل صاحب نے میاں جی چشتی صاحب کو اس مہم کے لیے تجویز کیا آپ نے فرمایا کہ بالکل توارُد ہوا۔ چنانچہ میاں جی چشتی کو نو آدمیوں کے ساتھ روانہ فرمایا اور ایک قرآن مجید کا نہایت خوشخط و مطلّا نسخہ، جو آپ کو نواب امیر خاں نے ہدیہ کیا تھا، شاہِ بخارا کے لیے دیا اور دعوت و جہاد کا ایک عام اعلام نامہ بھی سپرد کیا۔

تنخواہ دار سپاہی اور اُن کی برطرفی

ایک مرتبہ شہر میں لشکر کے چند لوگوں نے سیّد احمد علی صاحب کے توسّط سے آپ کی خدمت میں عرض کیا کہ مولوی سیّد محبوب علی صاحب کے چلے جانے اور اُن کے ساتھ کچھ اور لوگوں کے واپس ہو جانے، نیز اُن کے اثر سے ہندوستان کے قافلوں کی آمد بند ہو جانے کی وجہ سے آدمیوں کی کچھ کمی ہو گئی ہے۔ اگر اس وقت دو ڈھائی سَو پردیسی آدمی چار چار روپے کی شرح پر ملازم رکھ لیے جائیں، تو بہتر ہے۔

آپ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ اپنا کام آپ بناتا ہے، وہ کسی کا مُحتاج نہیں ہے۔ چاہے تو قلیل جماعت کو کثیر جماعت پر غالب کر دے؛ اور چاہے، اس کے برعکس کرے۔ اُس کو سب قُدرت ہے۔ وُہ اپنا کام بغیر کسی کی اعانت و شرکت کے بناتا ہے، مگر خیر، اگر آپ کی رائے میں یہی ہے، تو دو سَو آدمی نوکر رکھ لیں۔

دونوں صاحبوں نے لوگوں سے کہا کہ حضرت کی مرضی تو نہ تھی، مگر تم لوگوں کی خاطر سے آپ نے دو سَو آدمیوں کی اجازت دی ہے۔ ان سب نے اخوند ظہورُ اللہ کو تجویز کیا۔ آپ نے اُن کو رخصت دی۔ وہ اپنے وطن کو گئے اور کوئی ڈیڑھ یا پونے دو مہینے کے بعد اُن کی عرضی آئی کہ ہم نے آپ کی اجازت کے موافق دو سَو پنجابی مسلمان چار چار روپے کی شرح کے نوکر رکھے ہیں۔ وُہ اُن کو کاٹ لنگ میں لے کر آئے۔

کچھ عرصے کے بعد اُن کی تنخواہیں چڑھ گئیں اور اُنھوں نے اخوند ظہورُ اللہ کو پریشان کرنا شروع کیا۔ اسی عرصے میں ہندوستان سے کچھ رقمیں آئیں۔ لشکر کے بعض مُخلص خیر خواہوں اور مُخلصین نے آپ سے عرض کیا کہ یہ جو اتنے لوگ آپ نے نوکر رکھے ہیں، یہ کس مُلک کی آمدنی پر رکھے ہیں۔ ڈھائی ہزار روپے اُن کی تنخواہ کے چڑھ گئے ہیں اور ابھی تک ایک پیسے کا کام اُن سے نہیں نکلا۔ مُناسب یہ ہے کہ اُن کا چڑھا ہُوا اُن کو دے کر جلد اُن کو برطرف کر دیا جائے۔ آپ بارہا ارشاد فرما چکے ہیں کہ میرا جو کام کسی صاحب کے نزدیک نامناسب ہو، وُہ بے تکلّف مجھے اطلاع کرے۔ میں یا تو جواب دے کر اُس کو تسلّی کر دُوں گا یا میں اُس کام کو چھوڑ دُوں گا۔ اس امر میں جو کوئی جان بُوجھ کر سکوت کرے گا،

ہیں قیامت کے دن اُس کا دامنگیر ہوں گا۔ اس لیے ہم لوگ اس سلسلے میں اپنی رائے بے تکلف عرض کر رہے ہیں۔

آپ نے فرمایا کہ تم نے بہت خُوب کیا۔ ہمارے چند غازیوں نے آکر مجھ سے کہا کہ ان دنوں مولوی محبُوب علی صاحب کے جانے سے بہت سے آدمی ہندوستان چلے گئے، اگر کچھ لوگ رکھ لیجیے، تو لشکر میں آدمیوں کا اضافہ ہو جائے گا۔ ان کے کہنے سے میں نے انکار کرنا مناسب نہ سمجھا۔ تم نے بہتر صلاح دی ہے۔ اب تم جاکر اس کا مشورہ کرو اور جو کچھ مشورے میں قرار پائے، اُس کی اطلاع کرو۔

مولانا اسمٰعیل اور دوسرے اہل الرائے حضرات کے مشورے سے یہ طے پایا کہ اُن کا حساب صاف کر دیا جائے۔ آپ کو اس مشورے کی اطلاع ہُوئی اور آپ نے اس کی منظوری دی۔ چنانچہ اُن کا حساب بیباق کر دیا گیا۔

ترغیب و فضائل کی قوّت جب حساب ہو چکا، آپ کو اس کی اطلاع دی گئی۔ آپ نے فرمایا کہ ان سب صاحبوں کو ہمارے پاس لاؤ۔ جب وُہ سب آئے، تو آپ نے پوچھا کہ تم سب اپنا جو کچھ حق تھا، پا چکے ؟ سب نے عرض کی کہ پا چکے۔ پھر آپ نے اُن کے سامنے جہاد فی سبیل اللہ کے فضائل بیان کیے اور مُجاہدینِ مُخلصین اور شہداء کے مراتب کا ذکر کیا اور فرمایا کہ جو کوئی نوکر ہو کر جہاد فی سبیل اللہ کرتا ہے اور کُفّار کے ہاتھوں مارا جاتا ہے، کم درجے کا وُہ بھی شہید ہوتا ہے، بہ نسبت اور موتوں کے اُس کی موت بہتر ہوتی ہے۔ مگر جو لوگ خالصًا لوجہ اللہ جہاد کرتے ہیں اور کُفّار کے مقابلے میں مارے جاتے ہیں، اُن کے درجۂ شہادت کو کوئی نہیں پہنچتا۔ حاصل کلام یہ ہے کہ یہ نمازی جو خُدا کے واسطے ہمارے ساتھ ہیں، یہ سب اپنے گھر کے کھاتے پیتے خوش حال تھے، کوئی تو اُن میں بیش قرار نوکری چھوڑ کر آیا ہے، کوئی اپنی جاگیر زراعت اور کوئی پیشہ اور تجارت چھوڑ کر آیا ہے اور یہاں یہ سب ہمارے پاس اللہ تعالیٰ کے لیے رہتے ہیں، فقر و فاقہ سہتے ہیں، خُوش و خُرّم راضی برضا صابر بقضا ہیں۔ اگر اسی طرح تم صاحب بھی رہو، جو کچھ ہمارے یہ بھائی کھائیں پہنیں، وُہ تم کھاؤ پہنو، اس امر میں ہم حاضر ہیں اور جب اللہ تعالیٰ اپنے فضل و کرم سے ہم کو کسی اور طور کی فراغت دے گا، تب

ہم تم کو اس کے سوا اور بھی دیں گے اور وہ تم کو تمھاری نوکری سے زیادہ پڑے گا، مگر اس کا ہم ابھی سے اقرار نہیں کرتے ہیں کہ کل کو کوئی ہم سے مُطالبہ کرے۔

یہ سُن کر پنجاب کے ایک احمد بیگ [1] مرزا بولے کہ مَیں اللہ تعالیٰ کے واسطے حاضر ہوں، آپ کے ساتھ رہوں گا۔ یہ بات سُن کر اُن میں کے تیس چالیس آدمی اور بھی بولے کہ ہم بھی خدا کے واسطے آپ کا ساتھ دینے کے لیے حاضر ہیں۔ پھر جب آپ نے وہاں سے کُوچ فرمایا، وُہ سب دو سَو آدمی آپ کے ہمرکاب پنجتار تک آئے، پھر وُہ تیس چالیس آدمی تو رہے اور باقی رفتہ رفتہ چند روز میں اپنے اپنے گھر کو روانہ ہو گئے۔

○

---

[1] مرزا احمد بیگ پنجابی بڑے مخلص مجاہد اور وفادار رفیق ثابت ہوئے اور بالاکوٹ کے معرکے تک شریک رہے۔

نواں باب

بَیعتِ امامت کی تجدید اور نظامِ شرعی کا قیام
اور
اُس کے اثرات

احکامِ شریعت کا نفاذ و اجرا[1] سوات میں یہ خیال اور پختہ ہوا کہ باقاعدہ شرعی جہاد جس کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی تائید ہوتی ہے اور اُس کی طرف سے فتح و نصرت کا وعدہ ہے، اُس کے بغیر ممکن نہیں کہ ان اطراف کے مسلمانوں کو احکامِ شرع کے قبول کرنے اور رسُومِ افغانی کے ترک کرنے اور امام کی اطاعت کی ایسی دعوت دی جائے کہ بدعات و منکرات اور امام کی مخالفت و سرتابی کا سدِّباب ہو جائے اور اللہ و رسُولؐ اور اُولی الامر کی اطاعت پُورے طور پر ہونے لگے۔ اسی صُورت میں جہاد کا پورا نظام قائم ہو سکے گا۔

اس بنا پر شہر میں وضاحت اور قوّت کے ساتھ اس کی دعوت دی گئی اور سادات، علماء و خوانین و عوام میں سے ہزاروں آدمیوں نے فرداً فرداً بیعت کی اور احکامِ شرعیہ کے اجراء کا اقرار کیا، لیکن چونکہ ہر ہر شخص نے انفرادی طور پر اقرار کیا تھا اور مسلمانوں کی کسی جماعت نے اجتماعی طور پر اس کا عہد نہیں کیا تھا، اِس لیے بہت بعید معلوم ہوتا تھا کہ ان متفرق اشخاص سے اس عظیم الشان مقصد

---

[1] اس باب کا سارا مضمون ایک قلمی تحریر سے ماخوذ ہے جو قلمی مکتوبات کے مجموعے میں شامل ہے۔ اُس کا عنوان ہے :
" ذکر سرگزشت حضرتِ امامِ ہمام دریں ایّام برایں نمط است" ص۹۵

کی تکمیل ہو سکے گی۔ اس لیے آپ یہاں سے کسی دُوسرے مناسب مقام کو منتقل ہونے کا قصد رکھتے تھے

سردار فتح خاں اور اشرف خاں کی دعوت اسی اثنا میں سردار فتح خاں اور سردار اشرف خاں کی طرف سے اس مضمون کا عریضہ پہنچا کہ اگر جناب والا غریب خانے پر رونق افروز ہوں تو ہم ضرور احکامِ شریعت کی بے کم وکاست تعمیل کی ذمے داری قبول کرنے کے لیے تیار ہیں اور اپنی رعیت پر بھی اُن کو جاری کریں گے۔ اس معاملے میں جان و دل سے کوشش کریں گے۔

ڈاگئی میں علما کا ایک اجتماع اور بیعتِ امامت چونکہ اُن کے اس مضمون کے عریضے متواتر و مسلسل پہنچے، اس لیے سید صاحبؒ نے خہر سے کوچ فرمایا اور پنجتار کا رُخ کیا[1]۔ راستے میں ضلع سمہ صدہ میں جو مندن قوم کے علما، داعیان کے دو مرکزوں میں سے ایک مرکز ہے اور موضع ڈاگئی میں جو اس علاقے کا صدر مقام ہے، ڈیرہ کیا۔ آپ کی ملاقات کے لیے علما میں سے ایک بڑی جماعت، جو دو سو افراد سے کم نہ ہوگی، آئی۔ ان سب علما کا اس موضع میں قیام ہوا اور آپ نے امام کے تعیُّن و وُجُوب اور اُس کی اطاعت کا مسئلہ اُن کے سامنے پیش کیا۔ کچھ قیل و قال اور سوال و جواب کے بعد اس مسئلے کی تنقیح ہوئی۔ مولانا نیاز محمد، جو سرگروہ علما تھے، اور دُوسرے علما نے صاف صاف اعتراف کیا کہ ہم نے امام کے تقرر کے بارے میں واقعی بڑے تساہل سے کام لیا اور ہم خطاوار ہیں۔ انھوں نے اس موقع پر قوم کے سربرآوردہ اشخاص اور سرداروں کو بھی نصیحت آمیز ملامت کی کہ انھوں نے مسائل میں عموماً اور جہاد اور امام کے تقرر کے بارے میں خصوصاً مجرمانہ غفلت اور سہل انگاری سے کام لیا ہے۔ اکثر اہلِ مجلس اُن کی اس مؤثر اور پُرخلوص گفتگو سے متأثر ہوئے اور مولانا نے اور تمام حاضرینِ مجلس نے سید صاحبؒ کے ہاتھ پر بیعتِ امامت کی۔

پنجتار میں آمد اور فتح خاں سے گفتگو اس کے بعد آپ موضع پنجتار میں تشریف لائے اور بار بار جلوت و خلوت میں مختلف طریقوں سے آپ نے فتح خاں کو سمجھایا کہ صلح و جنگ میں ہماری

---

[1] سید صاحبؒ خہر میں جمادی الآخرہ ۱۲۴۳ھ سے جمادی الآخرہ ۱۲۴۴ھ تک کچھ کم یا زیادہ ایک سال رہے، رمضان بھی وہیں ہوا اور عیدین اور محرم بھی وہیں ہوا۔ (وقائع احمدی)

تمہاری شرکت اور تمہارے وطن کی سکونت کی شرط یہی ہے کہ ریاست وسیاست کی تمام رسُوم اور باقی تمام خلافِ شرع رسم و آئین، جو محض حصُولِ مال وجاہ کی غرض سے چلی آرہی ہیں، یک قلم ترک ہو جائیں اور تم اپنے کو معمولی آدمی کی طرح ہمارے نظام کے تابع کر دو، احکامِ شرع کے اجراء میں اپنے احباب و اعزّاء کی پاسداری کا خیال بالکل چھوڑ دو اور مال و دولت کے حصُول کے تمام خلافِ شرع استعمالی ذرائع سے دست بردار ہو جاؤ اور معاش اور گزران کے بارے میں اللہ تعالیٰ کی کفالت پر توکّل کرو۔

چند دن گزرے تھے کہ علاقۂ اُتمان نامہ کا سفر پیش آگیا، جو قوم مَندن کے سربرآوردہ لوگوں کا دوسرا مرکز ہے۔ جب آپ موضع باجا میں، جو اُتمان نامہ کا صدر مقام ہے، پہنچے، اس نواح کے عُلماء آپ کی ملاقات کے لیے جمع ہوئے اور وہی واقعہ پیش آیا، جو ضلع سمہ صدہ کے موضع ڈاگئی میں پیش آیا تھا۔ وہاں سے پنجتار کو واپسی پر آپ نے فتح خاں کے سامنے پھر وہی مضمون پیش کیا۔ آخر کار خانِ ممدوح نے اقرار کیا کہ کچھ دنوں کے بعد آپ کے ارشاد کے مطابق عمل کروں گا۔

عُلماء اور رُؤساء کا اجتماعِ عظیم | انھیں دنوں میں آپ نے کسی تقریب سے سمہ صدہ اور اُتمان نامہ کے عُلماء کو پنجتار میں مدعو کیا۔ چنانچہ اساتذہ و عُلماء میں سے ایک بڑی جماعت، جو دو ہزار آدمیوں سے کم نہ ہوگی اور ایک جمِ غفیر اُن کے تلامذہ کا، کہ وُہ بھی دو ہزار ہوں گے، پنجتار میں جمع ہُوا۔ آپ نے اُنھیں دنوں میں اشرف خاں اور خادی خاں کو بھی آنے کی دعوت دی اور عُلماء و خوانین کے لیے بہت بڑی ضیافت کا اہتمام فرمایا۔ جمعے کے دن یکم شعبان ۱۲۴۴ھ کو عُلماء و رُؤساء کے اس مجمع میں فتح خاں کو پھر وُہی مضمون سمجھایا اور فرمایا کہ اگر ہمارے اس مُطالبے کو قبول کرتے ہو تو اسی مجمع میں قبول کرو، ورنہ ہمارے اِتحاد سے دست بردار ہو جاؤ۔

فتح خاں کا اِقرار | فتح خاں نے بڑے غور و فکر کے بعد کہا کہ اگرچہ اس کا اِقرار و معاہدہ بڑا دُشوار کام ہے کہ جاہ و دولت سے بھی دست بردار ہونا پڑے گا، معاش کے دروازے بھی بند کرنے ہوں گے اور مُروّجہ رُسُوم کو، جو سیکڑوں برس سے جاری ہیں، ترک کر کے پٹھانوں سے لڑائی مول لینی پڑے گی، لیکن محض لِلّٰہ فی اللّٰہ، اللہ کی رضا کے لیے اور اللہ کی کفالت پر بھروسہ کرتے ہُوئے مَیں نے اس

ذمہ داری کو جان و دل سے قبول کیا اور تمام احکامِ عبادات و معاملات میں خدا و رسولؐ اور صاحبِ امرؑ کا اتباع اختیار کیا، مدیرِ نفع کو فوری ضررپر آخرت کی صلاح کو معاش کی بربادی پر ترجیح دی، انشاء اللہ تعالیٰ نمازِ جمعہ کے بعد مجمعِ عام میں بعیتِ امام کی تجدید کروں گا اور اس مضمون کا تحریری عہدنامہ بھی پیش کروں گا اور دُوسرے خوانین کو بھی اسی بات کی ترغیب دُوں گا۔

اسی روز آپ نے عُلماء کو بھی حُکم دیا کہ جو بعیتِ امامت وُہ پہلے کر چُکے ہیں، اس مجمع میں اس کی پھر تجدید کریں۔ چُنانچہ اُنھوں نے بھی عہدنامہ تحریر کیا اور اس پر مشاہیرِ عُلماء کی مُہریں ثبت کر کے اس کو تیار کیا کہ نمازِ جُمعہ کے بعد تجدیدِ بعیت بھی کریں گے اور عہدنامہ بھی پیش کریں گے۔

اِسی اثناء میں آپ نے ایک استفتاء تحریر کروایا جس میں مخالفِ امام اور باغی کے احکام دریافت کیے تھے اور فرمایا کہ تجدیدِ بعیت اور عہدنامے کے بعد یہ استفتاء علماء کی خدمت میں پیش کرنا چاہیے اور اس کا جواب مشاہیرِ عُلماء کی مُہروں کے ساتھ طلب کرنا چاہیے۔

بعیتِ امامت کی تجدید | نمازِ جُمعہ کے بعد تمام عُلماء و رؤساء نے بعیتِ امامت کی تجدید کی۔ عُلماء نے اپنا عہدنامہ، جو عربی زبان میں تھا اور جس پر اُن کی مُہریں بھی لگی ہُوئی تھیں، پیش کیا اور خوانین نے عہدنامہ، جو فارسی زبان میں تھا، اپنی مُہروں کے ساتھ خدمت میں گزارا۔ اس کے بعد علماء نے استفتا کا مفصّل و مُدلّل جواب لکھا، جس کا خلاصہ یہ تھا کہ سیّد صاحب کی امامت از رُوئے قوانینِ شرعیّہ و دلائل ثابت و برحق ہے، آپ کی اطاعت فرض اور اس سے خارج باتفاقِ کتاب وسُنّت و اجماعِ نُصوصِ فقہ باغی، اس کا قتل واجب، اُس کا خُون حلال اور وُہ ناری ہے۔ اس پر نمازِ جنازہ بھی نہیں پڑھنی چاہیے، مع حوالہ جاتِ آیات و احادیث وکُتبِ فقہ، اس پر پچیس مشاہیر و اکابرِ عُلماء نے اپنی مُہریں اور دستخط کیے۔[1]

تیسرے جُمعے، ۱۵ شعبان ۱۲۴۴ھ کو فتح خاں نے اپنی رعیّت کے سربرآوردہ لوگوں کو جمع کیا اور اُن سے بھی سیّد صاحبؒ کے ہاتھ پر بعیتِ امامت کرنے، احکامِ شرعیہ کا اجراء اور رُسُوم

[1] ان عہدناموں، اِفتاء اور دُوسری دستاویزوں کی نقل مجموعۂ خطُوطِ قلمی میں موجود ہے۔

جاہلیت کے ترک کا مطالبہ کیا، ان مخلصین نے بھی نمازِ جمعہ کے بعد بیعتِ امامت کی اور دونوں باتوں کا اقرار کیا۔

قضاۃ کا تقرر اور اقامتِ شریعت

اسی مجمع میں ایک دیندار اور بڑے عالم مولانا سید محمد میر کو ضلاع پنجتار کا منصب قضا سپرد ہوا، دستارِ قضا اُن کے سر پر باندھی گئی اور فرمانِ قضا عطا ہوا۔[1] اور اُس کے بعد احکامِ شرع جاری ہوگئے۔ پنجتار کے اضلاع میں مقدمات وتنازعات کا شرع شریف کے مطابق فیصلہ ہونے لگا۔

ایک دوسرے بزرگ ملا قطب الدین ننگرہاری کو جو بڑے دیندار و متقی تھے، بے نمازیوں پر احتساب کی خدمت سپرد کی گئی اور تیس قندھاری تفنگچی اُن کی ماتحتی میں دیے گئے۔

نظامِ شرعی کے برکات

اس نظامِ شرعی کے برکات جلد ظاہر ہونے شروع ہوگئے۔ شریعت کے احکام جاری ہوگئے، مقدمات شریعت کے مطابق فیصل ہونے لگے اور شریعت کے سامنے لوگوں کے سر جھک گئے۔

افغانیوں کی بھی عربِ جاہلیت کی سی عادت تھی کہ اگر کوئی شخص حقوق اللہ یا حقوق العباد کا کوئی گناہ کرتا، تو دوسرے کسی گاؤں میں چلا جاتا اور اُس کے رؤسا کی حمایت حاصل کرلیتا، وہ جان و مال سے اُس کی پوری جانبداری وحمایت کرتے۔ اس طرح کسی جرم کا استیصال اور مجرم کی گوشمالی نہ ہو سکتی۔ لیکن اس نظام کے بعد کوئی کسی کی بیجا حمایت و پاسداری نہیں کرسکتا تھا عبرتناک سزائیں دی جاتیں، علانیہ تعزیر جاری کی جاتی اور کوئی مداخلت نہ کرتا۔

مانیری کا واقعہ

ایک واقعہ ایسا بھی ہوا جس سے معلوم ہوا کہ یہ نظام کامیاب ہے اور بڑی بڑی حکومتوں سے زیادہ اس میں قدرت وطاقت ہے۔

ہنڈ کے علاقے میں، جو خادی خاں کے زیر حکومت تھا، مانیری ایک گاؤں تھا جس کے باشندے نہایت سرکش و شورہ پشت تھے۔ دو ہزار تفنگچی دیہات میں رہتے تھے اور چھ ہزار اس کے

---

[1] سندِ قضا مندرجۂ خطوطِ قلمی مورخہ ۱۵ شعبان ۱۲۴۴ھ۔

گرد کے گاؤں میں تھے۔ نوّے برس ہوئے، جب اُن لوگوں نے ایک مرتبہ اتفاق کرکے اپنے گاؤں کے رؤسا، و زمینداروں کی زمینوں اور املاک پر زبردستی قبضہ کر لیا اور اُن کو بے دخل کر دیا۔ ان مظلوموں نے بھاگ کر دُوسرے مقامات پر، جو اشرف خاں کے قبضے میں تھے، پناہ لی اور مدد چاہی۔ وہاں کے لوگوں نے اُن کی امداد کی اور اس گاؤں پر حملہ کیا۔ سخت جنگ ہُوئی اور بڑا کُشت و خُون ہُوا۔ اُس وقت سے دونوں قوموں اور دونوں مقامات کے باشندوں میں عداوت مستحکم اور موروثی ہو گئی اور ہمیشہ جنگ ہوتی رہی یہاں تک کہ ایک صدی گزر گئی اور فریقین کے تین چار ہزار آدمی قتل ہُوئے۔ جب اس نظام کی شہرت و کامیابی ہُوئی، تو یہ مظلوم سیّد صاحبؒ کے پاس حاضر ہُوئے اور فریاد کی۔ سیّد صاحبؒ نے خادی خاں، فتح خاں، اشرف خاں اور دُوسرے معززین اور قُرب و جوار کے خوانین کو جمع کیا اور معاملے کی تحقیق کی۔ تفتیش کے بعد اُنھیں مظلوموں کا حق ثابت ہُوا۔ وہاں کے قوانینِ عُرفیہ میں سے یہ بھی تھا کہ اگر کسی جائدادِ منقولہ یا غیرِ منقولہ پر قبضۂ مخالفانہ ہو جائے اور اس پر کُشت و خُون بھی ہو، تو وُہ قبضہ تسلیم کر لیا جائے گا۔ چُونکہ اس جائداد پر ہزاروں آدمیوں کا کُشت و خُون ہو چکا تھا اور بڑی طویل مدّت گزر گئی تھی، اس لیے اصل مالکوں کا حق منقطع سمجھ لیا گیا تھا۔ آپ نے اصل حقداروں کو حُکم دیا کہ اپنی زمینوں پر قابض ہو جائیں اور اپنے باپ دادا کے گھروں میں آباد ہوں۔ اوّل مانیری والوں نے مزاحمت کی اور خادی خاں نے اُن کی حمایت کی۔ سیّد صاحبؒ، فتح خاں و اشرف خاں اور اُن کے لشکروں اور اپنے لشکر و عُلمار و طلبہ کی معیّت میں اُن کی تادیب کے لیے چلے۔ عُلمار نے اُن کے مُستحقُّ الدّم ہونے کا فتویٰ دیا۔ وہ مرعُوب ہو کر خود حاضر ہُوئے اور مدّعیوں کو لے جا کر اُن کی زمینوں اور مکانات پر قبضہ دِلا دیا اور خود اُن کی رعایا بن گئے۔ اس طرح سے اللہ کے فضل سے وُہ قضیہ جو سَو برس سے طے نہیں ہُوا تھا اور جس پر ہزاروں آدمیوں کی جانیں گئیں، چٹکیوں میں فیصل ہو گیا۔ سارے دیکھنے والوں اور سُننے والوں کو سخت حیرت تھی کہ آج تک اس مُلک میں ایسا نہیں ہُوا۔

اِحتِساب کا ایسا اثر ہُوا کہ کوسوں تک ڈھونڈے سے کوئی بے نمازی نہیں مِلتا تھا۔ لوگوں

پر ایسی ہیبت طاری ہوئی ہے کہ اگر کوئی ہندوستانی یا قندھاری کسی دیہات میں پہنچتا، تو شور مچ جاتا اور وہاں کے رؤسا و حکام باہر نکل آتے اور عرض کرتے کہ یہاں کوئی بے نمازی نہیں ہے۔[1]

○

---

[1] مجموعۂ خطوطِ قلمی

دسواں باب

پنجتار کا نظارہ

مُمتاز مُجاہدین کے ڈیرے | پنجتار کی چھوٹی سی پہاڑی[1] مُجاہدین کی ایک بارونق چھاؤنی اور زندہ مُسلمان نوآبادی تھی، جس کا کونہ کونہ مجاہدوں اور عابدوں سے آباد اور ذِکر و عبادت، جہاد اور مجاہدے اور محبت اور اخوت سے گُلزار تھا۔

شہرپناہ کے مشرق اور شمال کے کونے پر جو بُرج تھا، اُس میں سیّد صاحبؒ نے مع اپنی جماعتِ خاص کے قیام فرمایا۔ دُوسرا بُرج جو شمال اور مغرب کے کونے پر تھا، اُس میں آپ کا باورچی خانہ اور غلّے کی تقسیم کا کوٹھا تھا۔ اس حُجرے کے جنُوب کی طرف مسجد کے دو حُجرے تھے۔ اُن میں سے جو ایک مشرق کی طرف تھا، اُس میں مُنشی خانہ مُقرر ہُوا۔ قاضی احمد اللہ صاحب میرٹھی مُنشی تھے۔ نمازِ جُمعہ اور نمازِ عیدین بھی وہی پڑھاتے تھے اور کبھی کبھی نمازِ پنجگانہ بھی پڑھاتے تھے۔ دُوسرے حُجرے میں، جو مغرب کی طرف تھا، مورانواں کے پیر خاں اپنی جماعت کے ساتھ مقیم تھے۔ مسجد کے جنُوب میں جو بُرج تھا، اُس میں مولوی سیّد مظہر علی عظیم آبادی اپنی جماعت کے ساتھ فروکش تھے۔

---

[1] یہ پہاڑی اب بالکل کھنڈر اور پتھروں کا ایک ڈھیر ہے، جہاں اب فتح خاں مرحُوم کے خاندان کے چند مکانات کے سوا کوئی آبادی نہیں۔

جنوب و مشرق کے کونے کے بُرج میں مولانا محمد اسمٰعیل صاحب اپنی جماعت کے ساتھ مقیم تھے۔ فصیل کے مشرقی دروازے کے متصل مسجد اور ایک حجرہ تھا۔ اس میں مولانا عبدالحیؒ کے علاتی بھائی مولوی احمد اللہ ناگپوری اپنے چند آدمیوں کے ساتھ مقیم تھے۔

سیّد صاحبؒ کے بُرج کے متصل جانب مغرب مولوی وارث علی بنگالی اپنے رُفقاء کے ساتھ، اور اُن کے مُتصل، جانب مغرب مولوی امام الدین بنگالی اپنے ساتھیوں کے ساتھ، ان سے مغرب میں متصلاً سیّد صاحبؒ کے اعزہ، سیّد احمد علی، سیّد ابو محمد، داوا سیّد ابوالحسن اور سیّد موسٰی فرزند سیّد احمد علی اپنے رفیقوں کے ساتھ حجروں میں مقیم تھے۔ اس حُجرے کے جانب جنوب جو مکان تھا، اُس میں امان اللہ خاں لکھنوی، جو سیّد صاحبؒ کے شُتر خانے کے مُنتظم تھے، مقیم تھے۔ اُن کے مشرق اور جنوب کے کونے میں پانی پت کے حافظ جانی اور حافظ مانی اپنے رفیقوں کے ساتھ، اور اُن کے جانب مشرق قاضی حمایت اللہ اور قاضی بُرہان الدین اور شیخ عبدالوہاب مقیم تھے۔

سیّد صاحبؒ والے بُرج میں آپ کے اہلِ خانہ کا قیام تھا۔ اس بُرج کے آگے ایک وسیع میدان تھا، جس میں چھپّر کے اندر آپ کا پلنگ بچھا تھا۔ اِس چھپّر میں شیخ عبدالحکیم پھلتی اور سیّد اسمٰعیل رائے بریلوی اپنے رفیقوں کے ساتھ مقیم تھے۔ یہ فصیل کے اندر کی آبادی تھی

فصیل کے باہر فصیل سے مُتصل سیّد صاحبؒ کے بُرج کے قریب ابراہیم خاں خیرآبادی اور اُن کے بھائی امام خاں اپنے بیٹے کے ساتھ مقیم تھے۔ اُن کے ڈیرے کے مُتصل جانب جنوب شیخ حسن علی اپنے بیٹے کے ساتھ، اُن کے متصل صُوفی نُور محمد صاحب بنگالی اپنے بیٹے کے ساتھ، صُوفی صاحب کے مُتصل مولوی خیرالدین صاحب شیر کوٹی، اُن کے مُتصل شیخ صلاح الدین صاحب پھلتی، جو مولانا عبدالحی صاحب کے برادرِ نسبتی تھے، اپنے رفیقوں کے ساتھ مقیم تھے۔

پنجتار سے متصل کے دیہاتوں میں مُجاہدین کا قیام تھا۔ موضع قاسم خیل میں، جو پنجتار کے قریب شمالی جانب میں ہے، حاجی زین العابدین خاں رامپوری اپنے رُفقاء کے ساتھ اور پنجتار کے جانب مغرب تھوڑے فاصلے پر شیشم کے چند درخت اور ایک نالہ تھا۔ وہاں نمازِ جُمعہ بھی ہوتی تھی۔ ان درختوں کے

سایے میں مرزا احمد بیگ پنجابی اپنی چھاؤنی ڈالے ہوئے تھے۔ مرزا صاحب سے ایک بندوق کی زد پر جنوب کی طرف موضعِ غُور غُشتی ہے۔ وہاں حاجی حمزہ علی خاں لوہاروی اپنے رفیقوں کے ساتھ اور اُن کے جنوبی جانب اسی بستی میں مولوی نصیر الدین بنگلوری اپنے بہیلے کے ساتھ مقیم تھے۔ مولوی نصیر الدین صاحب سے جانبِ جنوب ایک تیر کی زد پر موضع سنگ بُنیُ میں قندھاری قافلہ مقیم تھا، جن میں چار سردار بڑے نامی تھے: ایک لال محمد، دُوسرے مُلّا قطب الدین، تیسرے مُلّا نور محمد، چوتھے مُلّا عظمت۔ ان قندھاریوں کے جنوب کی طرف ایک تیر کی زد پر موضع خلی کلے میں متفرق ولایتی وغیرہ مقیم تھے۔ پنجتار کے مغرب اور جنوب کے کونے پر ایک تیر کی زد پر شہتوت کا باغ تھا۔ اس میں ارباب بہرام خاں، اُن کے بھائی ارباب جُمعہ خاں اور ان کے بھتیجے محمد خاں اپنے رفیقوں کے ساتھ مقیم تھے۔ باقی ہندوستانی متفرق پانچ پانچ، دس دس کر کے پنجتار کے اندر اور باہر جہاں کہیں جگہ ملی، چھپّر ڈال کر پڑے ہوئے تھے۔

غلّے کی تقسیم میں میر امانت علی کی امانت

میر امانت علی پیرانِ سادھور ضلع پٹیالہ کے رہنے والے خاندانی پیرزادے اور بڑے مُحتاط اور مُتّقی تھے۔ اُن کے مزاج میں یہاں تک احتیاط تھی کہ غلّے کی تقسیم کرتے ہوئے اگر کوئی بہیلے دار اُن سے کہتا کہ آج میرے بہیلے میں ایک یا دو مہمان آئے ہیں، اُن کا بھی غلّہ دو، تو وُہ غلّہ بانٹنا موقوف کر کے وہاں سے سیّد صاحبؒ کے پاس جاتے اور آپ سے اجازت لاتے، باوجود کہ آپ کی طرف سے اُن کو اجازت تھی، آپ نے فرما دیا تھا کہ مال اللہ تعالیٰ کا ہے، اس کی خیر خواہی اور حفاظت جیسی مجھ پر ہے، ویسی ہی تم پر ہے، جس کو مستحق جانو، مجھ سے بے پوچھے دیا کرو۔ مگر وُہ اپنی احتیاط نہیں چھوڑتے تھے۔ لوگ تو غلّہ لینے کو اپنے اپنے تھیلے لیے ہوئے بیٹھے ہوتے اور وُہ دو دو بار، تین تین بار اجازت لینے جاتے۔ لوگوں کا حرج ہوتا اور وہ تنگ ہوتے۔ آخر کئی بار سیّد صاحبؒ سے اس کی شکایت کی گئی۔ آپ نے فرمایا کہ اس کام کے لیے کسی اور کو تجویز کر کے مجھے بتلاؤ۔

مولوی عبد الوہاب کا تقرر

لوگوں نے مولوی عبد الوہاب صاحب اور بعض اور آدمیوں کو تجویز کیا۔

آپ نے مولوی عبدالوہاب کو پسند کیا اور اُن کو بُلوایا۔ مولوی صاحب بہت دنوں سے بیمار اور دائم المرض سے تھے۔ نہایت لاغر ہو رہے تھے، چہرہ زرد تھا۔ اس بیماری کی حالت میں قرآن مجید بھی حفظ کرتے تھے۔ آپ نے اُن سے فرمایا کہ ہم نے آج سے تم کو میر امانت علی صاحب کے عُہدے پر قائم کیا۔ تم ہی لوگوں کو غلّہ اور آٹا تقسیم کیا کرو۔ اُنھوں نے عرض کی کہ میں حاضر ہوں مگر کئی عارضوں میں گرفتار ہوں اور اسی حال میں تھوڑا تھوڑا قرآن مجید بھی حفظ کرتا ہوں اور یہ محنت کا کام ہے، اس کے واسطے طاقت اور تندرستی چاہیے۔

آپ نے یہ سُن کر سکوت کیا۔ پھر فرمایا: "مولوی صاحب، تم بسم اللہ کر کے مسلمان بھائیوں کی خدمت کے لیے کمر باندھو، ہم تمھارے واسطے دُعا کریں گے۔ اِنشاء اللہ تعالیٰ تمھارے سب عارضے جاتے رہیں گے اور طاقت و توانائی بھی آجائے گی اور اسی خدمتِ عُظمٰی کے انجام دینے کے دَوران میں تم کو قرآن شریف بھی حفظ ہو جائے گا۔"

یہ بشارت سُن کر وُہ خوش ہوئے اور اسی روز غلّہ بانٹنے لگے۔ تمام لوگ اُن سے راضی تھے اور سیّد صاحبؒ سے اُن کی خوبیاں بیان کرتے تھے۔ چند روز میں اسی خدمت کے اندر اللہ تعالیٰ نے اُن کے تمام امراض دُور کر دیے اور وُہ بالکل صحیح سالم اور طاقتور ہو گئے۔ اسی خدمت کے اندر قرآن مجید ان کو حِفظ ہو گیا۔ ایک روز سیّد صاحبؒ نے خُوش ہو کر فرمایا کہ مولوی صاحب، اب تو اللہ تعالیٰ نے اپنے فضل و کرم سے تم کو خُوب تندرست و توانا کر دیا اور قرآن مجید بھی تم کو یاد ہو گیا۔ اُنھوں نے عرض کیا کہ ہاں، اللہ تعالیٰ نے آپ کی دُعا کی برکت سے میری دونوں مرادیں پوری کر دیں، اب میرے واسطے آپ دُعا کریں کہ میرا قرآن شریف پُختہ ہو جائے۔ میری یہ آرزو ہے کہ ایک بار تراویح میں قرآن مجید اوّل سے آخر تک آپ کو سُنا دُوں۔ آپ نے فرمایا: بہت خُوب، ہم دُعا کریں گے۔ اب انشاء اللہ تعالیٰ قرآن شریف تم نہ بھولو گے۔ تم جو خالصاً لِلّٰہ مسلمان بھائیوں کی خدمت کرتے ہو، اللہ تعالیٰ نے تم کو گویا مزدُوری میں یہ عنایت کیا ہے۔

مولوی عبدالوہاب صاحب کا ہر روز یہ معمول تھا کہ قرآن شریف پڑھتے جاتے تھے اور غلّہ یا آٹا

لوگوں کو تقسیم کرتے جاتے تھے۔ بعض اوقات بیس بیس، پچیس پچیس آدمیوں کا آٹا غلہ ایک ایک کو دیتے اور زبان سے نہ گنتے مگر کبھی کسی کے آٹے غلے میں کسی قسم کی کمی بیشی نہ آتی۔

ایثار و بے نفسی ایک روز آٹا تقسیم کر رہے تھے۔ میر امام علی عظیم آبادی آٹا لینے کو آئے۔ وُہ زُوار دستے اور بڑے قوی اور جسیم تھے۔ آٹا وار سے تقسیم ہوتا تھا۔ جو پہلے آتا، وُہ پہلے پاتا؛ جو پیچھے آتا، وُہ پیچھے پاتا۔ وہ پہلے مانگنے لگے۔ مولوی صاحب نے کہا کہ تمھارا ابھی وار آتا ہے، ٹھیر جاؤ۔ وہ جلدی کرنے لگے۔ اُنھوں نے نہ مانا۔ آخر میر امام علی نے مولوی صاحب کو دھکا دیا اور وہ گر پڑے۔ وہاں قندھاری بھی آٹا لینے کو بیٹھے تھے۔ اُن کو بُرا معلوم ہُوا اور سب مل کر میر امام علی کو مارنے پر تیار ہُوئے۔ مولوی صاحب نے قندھاریوں کو روکا اور کہا: "وُہ ہمارا بھائی ہے۔ دھکا دیا، تو ہم کو دیا؛ تم سے کیا مطلب؟" وُہ سب نادم ہو کر چُپ ہو رہے۔ مولوی صاحب نے اُن کو آٹا دیا۔ وُہ اپنے ڈیرے کو گئے۔ لوگوں نے سیّد صاحبؒ سے جا کر یہ قصّہ بیان کیا۔ جب اُس دن مولوی صاحب رات کو حضرت کے پاس گئے، آپ نے پوچھا کہ مولوی صاحب، آج میر امام علی نے تم سے کیا قصّہ کیا۔ انھوں نے کہا: "میرے نزدیک اُنھوں نے کچھ نہیں کیا۔ وُہ تو بڑے نیک بخت آدمی ہیں۔ وُہ آٹا لینے کو آئے اور مجھ سے مانگا۔ اُن کا وار نہ تھا، اُنھوں نے جلدی کی، اس میں اُن کا دھکا میرے لگ گیا؛ بس اتنی بات تھی۔" سیّد صاحبؒ یہ بات سُن کر خاموش ہو رہے۔ کسی نے یہ بات میر امام علی کو پہنچائی کہ مولوی عبدالوہاب نے تمھارے متعلق سیّد صاحب سے ایسی گفتگو کی۔ وہ اپنی حرکت پر بہت نادم ہُوئے اور اسی وقت سیّد صاحبؒ کے سامنے آ کر مولوی عبدالوہاب سے اپنی خطا معاف کرائی اور مصافحہ کیا۔

کئی سال کے بعد موضع راج دواری میں مولوی عبدالوہاب صاحب نے سیّد صاحبؒ کو تراویح میں قرآن شریف سُنایا اور اس کے بعد ہی ذی قعدہ میں بالاکوٹ کی جنگ میں شہید ہُوئے۔

سرداروں کے درمیان مصالحت شہر سے واپسی کے چھ سات مہینے پیشتر سے فتح خاں اور اُن کے چھوٹے بھائی ناصر خاں سے بگاڑ ہو گیا تھا۔ گرد و پیش کے دیہاتوں کے جتنے رئیس اور سردار فتح خاں کے طرفدار و مددگار تھے، اُن سب کو ناصر خاں نے توڑ کر اپنی طرف کر لیا تھا اور فتح خاں کو یہاں

سایے میں مرزا احمد بیگ پنجابی اپنی چھاؤنی ڈالے ہوئے تھے۔ مرزا صاحب سے ایک بندوق کی زد پر جنوب کی طرف موضع غُور غُشتی ہے۔ وہاں حاجی حمزہ علی خاں لوہاروی اپنے رفیقوں کے ساتھ اور اُن کے جنوبی جانب اسی بستی میں مولوی نصیر الدّین منگلوری اپنے بھیلے کے ساتھ مقیم تھے۔ مولوی نصیر الدّین صاحب سے جانب جنوب ایک تیر کی زد پر موضع سنگ بُتّی میں قندھاری قافلہ مقیم تھا، جن میں چار سردار بڑے نامی تھے: ایک لال محمد، دوسرے مُلّا قطب الدّین، تیسرے مُلّا نور محمد، چوتھے مُلّا عظمت۔ ان قندھاریوں کے جنوب کی طرف ایک تیر کی زد پر موضع خلی کلے میں متفرق ولایتی وغیرہ مقیم تھے۔ پنجتار کے مغرب اور جنوب کے کونے پر ایک تیر کی زد پر شہتوت کا باغ تھا۔ اس میں ارباب بہرام خاں، اُن کے بھائی ارباب جُمعہ خاں اور ان کے بھتیجے محمّد خاں اپنے رفیقوں کے ساتھ مقیم تھے۔ باقی ہندوستانی متفرق پانچ پانچ، دس دس کر کے پنجتار کے اندر اور باہر جہاں کہیں جگہ ملی، چھپّر ڈال کر پڑے ہوئے تھے۔

غلّے کی تقسیم میں میر امانت علی کی امانت

میر امانت علی پیرانِ ساڈھورہ ضلع پٹیالہ کے رہنے والے خاندانی پیرزادے اور بڑے محتاط اور متّقی تھے۔ اُن کے مزاج میں یہاں تک احتیاط تھی کہ غلّے کی تقسیم کرتے ہوئے اگر کوئی بھیلے دار اُن سے کہتا کہ آج میرے بھیلے میں ایک یا دو مہمان آگئے ہیں، اُن کا بھی غلّہ دو، تو وُہ غلّہ بانٹنا موقوف کر کے وہاں سے سیّد صاحبؒ کے پاس جاتے اور آپ سے اجازت لاتے، باوجود کہ آپ کی طرف سے اُن کو اجازت تھی، آپ نے فرما دیا تھا کہ مال اللہ تعالیٰ کا ہے، اس کی خیر خواہی اور حفاظت جیسی مجھ پر ہے، ویسی ہی تم پر ہے، جس کو مستحق جانو، مجھ سے بے پوچھے دیا کرو۔ مگر وُہ اپنی احتیاط نہیں چھوڑتے تھے۔ لوگ تو غلّہ لینے کو اپنے اپنے تھیلے لیے ہوئے بیٹھے ہوتے اور وُہ دو دو بار، تین تین بار اجازت لینے جاتے۔ لوگوں کا حرج ہوتا اور وہ تنگ ہوتے۔ آخر کئی بار سیّد صاحبؒ سے اس کی شکایت کی گئی۔ آپ نے فرمایا کہ اس کام کے لیے کسی اور کو تجویز کر کے مجھے بتلاؤ۔

مولوی عبد الوہاب کا تقرّر

لوگوں نے مولوی عبدالوہاب صاحب اور بعض اور آدمیوں کو تجویز کیا۔

جنوب و مشرق کے کونے کے بُرج میں مولانا محمد اسمٰعیل صاحب اپنی جماعت کے ساتھ مقیم تھے۔ فصیل کے مشرقی دروازے کے متّصل مسجد اور ایک حجرہ تھا۔ اس میں مولانا عبد الحیؒ کے علاتی بھائی مولوی احمد اللہ ناگپوری اپنے چند آدمیوں کے ساتھ مقیم تھے۔

سیّد صاحبؒ کے بُرج کے متّصل جانبِ مغرب مولوی وارث علی بنگالی اپنے رُفقاء کے ساتھ، اور اُن کے مُتّصل، جانبِ مغرب مولوی امام الدین بنگالی اپنے ساتھیوں کے ساتھ، ان سے مغرب میں متصلاً سیّد صاحبؒ کے اعزّہ، سیّد احمد علی، سیّد ابو محمد، دادا سیّد ابوالحسن اور سیّد موسیٰ فرزند سیّد احمد علی اپنے رفیقوں کے ساتھ حجروں میں مقیم تھے۔ اس حجرے کے جانب جنوب جو مکان تھا، اُس میں امان اللہ خاں لکھنوی، جو سیّد صاحبؒ کے شُتر خانے کے مُنتظم تھے، مقیم تھے۔ اُن کے مشرق اور جنوب کے کونے میں پانی پت کے حافظ جانی اور حافظ مانی اپنے رفیقوں کے ساتھ، اور اُن کے جانبِ مشرق قاضی حمایت اللہ اور قاضی بُرہان الدین اور شیخ عبد الوہاب مقیم تھے۔

سیّد صاحبؒ والے بُرج میں آپ کے اہلِ خانہ کا قیام تھا۔ اس بُرج کے آگے ایک وسیع میدان تھا، جس میں چھپّر کے اندر آپ کا پلنگ بچھا تھا۔ اِس چھپّر میں شیخ عبد الحکیم پھلتی اور سیّد اسمٰعیل رائے بریلوی اپنے رفیقوں کے ساتھ مقیم تھے۔ یہ فصیل کے اندر کی آبادی تھی

فصیل کے باہر فصیل سے مُتّصل سیّد صاحبؒ کے بُرج کے قریب ابراہیم خاں خیر آبادی اور اُن کے بھائی امام خاں اپنے بیٹے کے ساتھ مقیم تھے۔ اُن کے ڈیرے کے مُتّصل جانبِ جنوب شیخ حسن علی اپنے بیٹے کے ساتھ، اُن کے متّصل صُوفی نُور محمد صاحب بنگالی اپنے بیٹے کے ساتھ، صُوفی صاحب کے مُتّصل مولوی خیر الدین صاحب شیرکوٹی، اُن کے مُتّصل شیخ صلاح الدین صاحب پھلتی، جو مولانا عبد الحی صاحب کے برادرِ نسبتی تھے، اپنے رفیقوں کے ساتھ مقیم تھے۔

پنجتار سے متّصل کے دیہاتوں میں مُجاہدین کا قیام تھا۔ موضع قاسم خیل میں، جو پنجتار کے قریب شمالی جانب میں ہے، حاجی زین العابدین خاں رامپوری اپنے رُفقاء کے ساتھ اور پنجتار کے جانبِ مغرب تھوڑے فاصلے پر شیشم کے چند درخت اور ایک نالہ تھا۔ وہاں نمازِ جمعہ بھی ہوتی تھی۔ ان درختوں کے

دسواں باب

پنجتار کا نظّارہ

ممتاز مجاہدین کے ڈیرے | پنجتار کی چھوٹی سی پہاڑی[1] مجاہدین کی ایک بارونق چھاؤنی اور زندہ مسلمان نوآبادی تھی، جس کا کونہ کونہ مجاہدوں اور عابدوں سے آباد اور ذِکر و عبادت، جہاد اور مجاہدے اور محبت اور اخوت سے گلزار تھا۔

شہر پناہ کے مشرق اور شمال کے کونے پر جو بُرج تھا، اُس میں سیّد صاحبؒ نے مع اپنی جماعتِ خاص کے قیام فرمایا۔ دُوسرا بُرج جو شمال اور مغرب کے کونے پر تھا، اُس میں آپ کا باورچی خانہ اور غلّے کی تقسیم کا کوٹھا تھا۔ اس حُجرے کے جنُوب کی طرف مسجد کے دو حُجرے تھے۔ اُن میں سے جو ایک مشرق کی طرف تھا، اُس میں مُنشی خانہ مُقرر ہوُا۔ قاضی احمد اللہ صاحب میرٹھی میرمُنشی تھے۔ نمازِ جُمعہ اور نمازِ عیدین بھی وہی پڑھاتے تھے اور کبھی کبھی نمازِ پنجگانہ بھی پڑھاتے تھے۔ دُوسرے حُجرے میں، جو مغرب کی طرف تھا، مورانواں کے پیر خاں اپنی جماعت کے ساتھ مقیم تھے۔ مسجد کے جنُوب میں جو بُرج تھا، اُس میں مولوی سیّد مظہر علی عظیم آبادی اپنی جماعت کے ساتھ فروکش تھے۔

---

[1] یہ پہاڑی اب بالکل کھنڈر اور پتھروں کا ایک ڈھیر ہے، جہاں اب فتح خاں مرحُوم کے خاندان کے چند مکانات کے سوا کوئی آبادی نہیں۔

پر ایسی ہیبت طاری ہوئی کہ اگر کوئی ہندوستانی یا قندھاری کسی دیہات میں پہنچتا، تو شور مچ جاتا اور وہاں کے رؤسا و حکام باہر نکل آتے اور عرض کرتے کہ یہاں کوئی بے نمازی نہیں ہے۔[1]

○

---

[1] مجموعۂ خطوطِ قلمی

گروکے گاؤں میں تھے۔ نوّے برس ہوئے، جب اُن لوگوں نے ایک مرتبہ اتفاق کر کے اپنے گاؤں کے رؤسا، و زمینداروں کی زمینوں اور املاک پر زبردستی قبضہ کر لیا اور اُن کو بے دخل کر دیا۔ ان مظلوموں نے بھاگ کر دُوسرے مقامات پر، جو اشرف خاں کے قبضے میں تھے، پناہ لی اور مدد چاہی وہاں کے لوگوں نے اُن کی امداد کی اور اس گاؤں پر حملہ کیا۔ سخت جنگ ہوئی اور بڑا کُشت و خُون ہُوا۔ اُس وقت سے دونوں قوموں اور دونوں مقامات کے باشندوں میں عداوت مستحکم اور موروثی ہو گئی اور ہمیشہ جنگ ہوتی رہی یہاں تک کہ ایک صدی گزر گئی اور فریقین کے تین چار ہزار آدمی قتل ہوئے۔ جب اس نظام کی شہرت و کامیابی ہوئی، تو یہ مظلوم سیّد صاحبؒ کے پاس حاضر ہوئے اور فریاد کی۔ سیّد صاحبؒ نے خادی خاں، فتح خاں، اشرف خاں اور دُوسرے معززین اور قُرب و جوار کے خوانین کو جمع کیا اور معاملے کی تحقیق کی۔ تفتیش کے بعد انھیں مظلوموں کا حق ثابت ہُوا۔ وہاں کے قوانینِ عُرفیہ میں سے یہ بھی تھا کہ اگر کسی جائدادِ منقولہ یا غیر منقولہ پر قبضۂ مخالفانہ ہو جائے اور اس پر کُشت و خُون بھی ہو، تو وُہ قبضہ تسلیم کر لیا جائے گا۔ چونکہ اس جائداد پر ہزاروں آدمیوں کا کُشت و خُون ہو چکا تھا اور بڑی طویل مدّت گزر گئی تھی، اس لیے اصل مالکوں کا حق منقطع سمجھ لیا گیا تھا۔ آپ نے اصل حقداروں کو حکم دیا کہ اپنی زمینوں پر قابض ہو جائیں اور اپنے باپ دادا کے گھروں میں آباد ہوں۔ اوّل مانیری والوں نے مزاحمت کی اور خادی خاں نے اُن کی حمایت کی۔ سیّد صاحبؒ، فتح خاں، اشرف خاں اور اُن کے لشکروں اور اپنے لشکر و عُلماء و طلبہ کی معیت میں اُن کی تادیب کے لیے چلے۔ عُلماء نے اُن کے مُستَحِلّ الدّم ہونے کا فتویٰ دیا۔ وہ مرعُوب ہو کر خود حاضر ہوئے اور مقبوضہ کر لے جا کر اُن کی زمینوں اور مکانات پر قبضہ دِلا دیا اور خود اُن کی رعایا بن گئے۔ اس طرح سے اللہ کے فضل سے وُہ قضیہ جو سَو برس سے طے نہیں ہُوا تھا اور جس پر ہزاروں آدمیوں کی جانیں گئیں، چٹکیوں میں فیصل ہو گیا۔ سارے دیکھنے والوں اور سُننے والوں کو سخت حیرت تھی کہ آج تک اس مُلک میں ایسا نہیں ہُوا۔

احتساب کا ایسا اثر ہُوا کہ کوسوں تک ڈھونڈے سے کوئی بے نمازی نہیں ملتا تھا۔ لوگوں

جاہلیت کے ترک کا مطالبہ کیا، ان مخلصین نے بھی نمازِ جمعہ کے بعد بیعتِ امامت کی اور دونوں باتوں کا اقرار کیا۔

قضاۃ کا تقرر اور اقامتِ شریعت اسی مجمع میں ایک دیندار اور بڑے عالم مولانا سید محمد میر کو ضلع پنجتار کا منصبِ قضا سپرد ہوا، دستارِ قضا اُن کے سر پر باندھی گئی اور فرمانِ قضا عطا ہوا[۱] اور اُس کے بعد احکامِ شرع جاری ہو گئے۔ پنجتار کے اضلاع میں مقدمات و تنازعات کا شرعِ شریف کے مطابق فیصلہ ہونے لگا۔

ایک دوسرے بزرگ ملا قطب الدین ننگر ہاری کو جو بڑے دیندار و متقی تھے، بے نمازیوں پر احتساب کی خدمت سپرد کی گئی اور تیس قندھاری تفنگچی اُن کی ماتحتی میں دیے گئے۔

نظامِ شرعی کے برکات اس نظامِ شرعی کے برکات جلد ظاہر ہونے شروع ہو گئے۔ شریعت کے احکام جاری ہو گئے، مقدمات شریعت کے مطابق فیصل ہونے لگے اور شریعت کے سامنے لوگوں کے سر جھک گئے۔

افغانیوں کی بھی عرب جاہلیت کی سی عادت تھی کہ اگر کوئی شخص حقوق اللہ یا حقوق العباد کا کوئی گناہ کرتا، تو دوسرے کسی گاؤں میں چلا جاتا اور اُس کے رؤسا کی حمایت حاصل کر لیتا، وہ جان و مال سے اُس کی پوری جانبداری و حمایت کرتے۔ اس طرح کسی جرم کا استیصال اور مجرم کی گوشمالی نہ ہو سکتی۔ لیکن اس نظام کے بعد کوئی کسی کی بیجا حمایت و پاسداری نہیں کر سکتا تھا، عبرتناک سزائیں دی جاتیں، علانیہ تعزیر جاری کی جاتی اور کوئی مداخلت نہ کرتا۔

مانیری کا واقعہ ایک واقعہ ایسا بھی ہوا جس سے معلوم ہوا کہ یہ نظام کامیاب ہے اور بڑی بڑی حکومتوں سے زیادہ اس میں قدرت و طاقت ہے۔

ہنڈ کے علاقے میں، جو خادی خاں کے زیرِ حکومت تھا، مانیری ایک گاؤں تھا جس کے باشندے نہایت سرکش و شورہ پشت تھے۔ دو ہزار تفنگچی دیہات میں رہتے تھے اور چھ ہزار اس کے

---

[۱] سندِ قضا مندرجہ خطوطِ قلمی مورخہ ۱۵ شعبان ۱۲۴۴ھ۔

ذمہ داری کو جان و دل سے قبول کیا اور تمام احکامِ عبادات و معاملات میں خدا و رسولؐ اور صاحبِ امر کا اتباع اختیار کیا، بدیں نفع کو فوری ضررِ آخرت کی صلاح کو معاش کی بربادی پر ترجیح دی، انشاء اللہ تعالیٰ نمازِ جمعہ کے بعد مجمع عام میں بیعتِ امام کی تجدید کروں گا اور اس مضمون کا تحریری عہدنامہ بھی پیش کروں گا اور دُوسرے خوانین کو بھی اسی بات کی ترغیب دُوں گا۔

اسی روز آپ نے عُلماء کو بھی حُکم دیا کہ جو بیعتِ امامت وُہ پہلے کر چکے ہیں، اس مجمع میں اس کی پھر تجدید کریں۔ چُنانچہ اُنھوں نے بھی عہدنامہ تحریر کیا اور اس پر مشاہیر عُلماء کی مُہریں ثبت کر کے اس کو تیار کیا کہ نمازِ جُمعہ کے بعد تجدید بیعت بھی کریں گے اور عہدنامہ بھی پیش کریں گے۔

اسی اثناء میں آپ نے ایک استفتاء تحریر کروایا جس میں مخالفِ امام اور باغی کے احکام دریافت کیے تھے اور فرمایا کہ تجدیدِ بیعت اور عہدنامے کے بعد یہ استفتاء علماء کی خدمت میں پیش کرنا چاہیے اور اس کا جواب مشاہیر عُلماء کی مُہروں کے ساتھ طلب کرنا چاہیے۔

بیعتِ امامت کی تجدید نمازِ جُمعہ کے بعد تمام عُلماء و رؤساء نے بیعتِ امامت کی تجدید کی۔ عُلماء نے اپنا عہدنامہ، جو عربی زبان میں تھا اور جس پر اُن کی مُہریں بھی لگی ہوئی تھیں، پیش کیا اور خوانین نے عہدنامہ، جو فارسی زبان میں تھا، اپنی مُہروں کے ساتھ خدمت میں گزارا۔ اس کے بعد علماء نے استفتا کا مفصّل و مُدلّل جواب لکھا، جس کا خلاصہ یہ تھا کہ سیّد صاحب کی امامت از رُوئے قوانینِ شرعیّہ و دلائل ثابت و برحق ہے، آپ کی اطاعت فرض اور اس سے خارج باتفاقِ کتاب وسُنّت و اجماعِ نُصوصِ فقہ باغی، اس کا قتل واجب، اُس کا خُون حلال اور وُہ ناری ہے۔ اس پر نمازِ جنازہ بھی نہیں پڑھنی چاہیے، مع حوالہ جاتِ آیات و احادیث وکُتبِ فقہ، اس پر پچیس مشاہیر و اکابر عُلماء نے اپنی مُہریں اور دستخط کیے۔[1]

تیسرے جُمعے، ۱۵ شعبان ۱۲۴۴ھ کو فتح خاں نے اپنی رعیّت کے سربرآوردہ لوگوں کو جمع کیا اور اُن سے بھی سیّد صاحبؒ کے ہاتھ پر بیعتِ امامت کرنے، احکامِ شرعیہ کا اجراء اور رُسُومِ

---

[1] ان عہدناموں، اِفتاء اور دُوسری دستاویزوں کی نقل مجموعۂ خطُوطِ قلمی میں مَوجُود ہے۔

تمہاری شرکت اور تمہارے وطن کی سکونت کی شرط یہی ہے کہ ریاست و سیاست کی تمام رسوم اور باقی تمام خلافِ شرع رسم و آئین، جو محض حصولِ مال و جاہ کی غرض سے چلی آرہی ہیں، یک قلم ترک ہو جائیں اور تم اپنے کو معمولی آدمی کی طرح ہمارے نظام کے تابع کر دو، احکامِ شرع کے اجرار میں اپنے احباب و اعزّار کی پاسداری کا خیال بالکل چھوڑ دو اور مال و دولت کے حصول کے تمام خلافِ شرع استعمال ذرائع سے دست بردار ہو جاؤ اور معاش اور گزران کے بارے میں اللہ تعالیٰ کی کفالت پر توکل کرو۔

چند دن گزرے تھے کہ علاقۂ اُتمان نامہ کا سفر پیش آگیا، جو قوم مندن کے سربرآوردہ لوگوں کا دوسرا مرکز ہے۔ جب آپ موضع باجا میں، جو اُتمان نامہ کا صدر مقام ہے، پہنچے، اس نواح کے علمار آپ کی ملاقات کے لیے جمع ہوئے اور وہی واقعہ پیش آیا، جو ضلع سمہ صدہ کے موضع ڈاگئی میں پیش آیا تھا۔ وہاں سے پنجتار کو واپسی پر آپ نے فتح خاں کے سامنے پھر وہی مضمون پیش کیا۔ آخر کار خانِ ممدوح نے اقرار کیا کہ کچھ دنوں کے بعد آپ کے ارشاد کے مطابق عمل کروں گا۔

علمار اور رؤسار کا اجتماعِ عظیم انھیں دنوں میں آپ نے کسی تقریب سے سمہ صدہ اور اُتمان نامہ کے علمار کو پنجتار میں مدعو کیا۔ چنانچہ اساتذہ و علمار میں سے ایک بڑی جماعت، جو دو ہزار آدمیوں سے کم نہ ہوگی اور ایک جمِ غفیر اُن کے تلامذہ کا، کہ وہ بھی دو ہزار ہوں گے، پنجتار میں جمع ہوا۔ آپ نے انھیں دنوں میں اشرف خاں اور خادی خاں کو بھی آنے کی دعوت دی اور علمار و خوانین کے لیے بہت بڑی ضیافت کا اہتمام فرمایا۔ جمعے کے دن یکم شعبان ۱۲۴۴ھ کو علما و رؤسار کے اس مجمع میں فتح خاں کو پھر وہی مضمون سمجھایا اور فرمایا کہ اگر ہمارے اس مطالبے کو قبول کرتے ہو، تو اسی مجمع میں قبول کرو، ورنہ ہمارے اتحاد سے دست بردار ہو جاؤ۔

فتح خاں کا اقرار فتح خاں نے بڑے غور و فکر کے بعد کہا کہ اگرچہ اس کا اقرار و معاہدہ بڑا دشوار کام ہے کہ جاہ و دولت سے بھی دست بردار ہونا پڑے گا، معاش کے دروازے بھی بند کرنے ہوں گے اور مروّجہ رسوم کو، جو سیکڑوں برس سے جاری ہیں، ترک کر کے پٹھانوں سے لڑائی مول لینی پڑے گی۔ لیکن محض للہ فی اللہ، اللہ کی رضا کے لیے اور اللہ کی کفالت پر بھروسہ کرتے ہوئے میں نے اس

کی تکمیل ہو سکے گی۔ اس لیے آپ یہاں سے کسی دوسرے مناسب مقام کو منتقل ہونے کا قصد رکھتے تھے

سردار فتح خاں اور اشرف خاں کی دعوت

اسی اثنا میں سردار فتح خاں اور سردار اشرف خاں کی طرف سے اس مضمون کا عریضہ پہنچا کہ اگر جنابِ والا غریب خانے پر رونق افروز ہوں تو ہم ضرور احکامِ شریعت کی بے کم و کاست تعمیل کی ذمے داری قبول کرنے کے لیے تیار ہیں اور اپنی رعیت پر بھی اُن کو جاری کریں گے۔ اس معاملے میں جان و دل سے کوشش کریں گے۔

ڈاگئی میں علما کا ایک اجتماع اور بیعتِ امامت

چونکہ اُن کے اس مضمون کے عریضے متواتر و مسلسل پہنچے، اس لیے سید صاحب نے شہر سے کوچ فرمایا اور پنجتار کا رُخ کیا۔[1] راستے میں ضلع سمہ صدہ میں جو مندن قوم کے علما داعیان کے دو مرکزوں میں سے ایک مرکز ہے اور موضع ڈاگئی میں جو اس علاقے کا صدر مقام ہے، ڈیرہ کیا۔ آپ کی ملاقات کے لیے علما میں سے ایک بڑی جماعت، جو دو سو افراد سے کم نہ ہوگی، آئی۔ ان سب علما کا اس موضع میں قیام ہوا اور آپ نے امام کے تعیُّن و وُجوب اور اُس کی اطاعت کا مسئلہ اُن کے سامنے پیش کیا۔ کچھ قیل و قال اور سوال و جواب کے بعد اس مسئلے کی تنقیح ہوئی۔ مولانا نیاز محمد، جو سرگروہ علما تھے، اور دوسرے علما نے صاف صاف اعتراف کیا کہ ہم نے امام کے تقرر کے بارے میں واقعی بڑے تساہل سے کام لیا اور ہم خطاوار ہیں۔ انھوں نے اس موقع پر قوم کے سربرآوردہ اشخاص اور سرداروں کو بھی نصیحت آمیز ملامت کی کہ انھوں نے مسائل میں عموماً اور جہاد اور امام کے تقرر کے بارے میں خصوصاً مجرمانہ غفلت اور سہل انگاری سے کام لیا ہے۔ اکثر اہلِ مجلس اُن کی اس مؤثر اور پُرخلوص گفتگو سے متاثر ہوئے اور مولانا نے اور تمام حاضرینِ مجلس نے سید صاحبؒ کے ہاتھ پر بیعتِ امامت کی۔

پنجتار میں آمد اور فتح خاں سے گفتگو

اس کے بعد آپ موضع پنجتار میں تشریف لائے اور بار بار جلوت و خلوت میں مختلف طریقوں سے آپ نے فتح خاں کو سمجھایا کہ صلح و جنگ میں ہماری

---

[1] سید صاحبؒ شہر میں جمادی الآخرہ ۱۲۴۳ھ سے جمادی الآخرہ ۱۲۴۴ھ تک کچھ کم یا زیادہ ایک سال رہے، رمضان بھی وہیں ہوا اور عیدین اور محرم بھی وہیں ہوا۔ (وقائعِ احمدی)

نواں باب

بیعتِ امامت کی تجدید اور نظامِ شرعی کا قیام اور اُس کے اثرات

احکامِ شریعت کا نفاذ و اجرا [1] "سوات میں یہ خیال اور پختہ ہوا کہ باقاعدہ شرعی جہاد جس کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی تائید ہوتی ہے اور اُس کی طرف سے فتح و نصرت کا وعدہ ہے، اُس کے بغیر ممکن نہیں کہ ان اطراف کے مسلمانوں کو احکامِ شرع کے قبول کرنے اور رسومِ افغانی کے ترک کرنے اور امام کی اطاعت کی ایسی دعوت دی جائے کہ بدعات و منکرات اور امام کی مخالفت و سرتابی کا سدِّباب ہو جائے اور اللہ و رسولؐ اور اُولی الامر کی اطاعت پُورے طور پر ہونے لگے۔ اسی صُورت میں جہاد کا پورا نظام قائم ہو سکے گا۔

اس بنا پر شہر میں وضاحت اور قوّت کے ساتھ اس کی دعوت دی گئی اور سادات، علماء و خوانین و عوام میں سے ہزاروں آدمیوں نے فرداً فرداً بیعت کی اور احکامِ شرعیہ کے اجراء کا اقرار کیا، لیکن چونکہ ہر ہر شخص نے انفرادی طور پر اقرار کیا تھا اور مسلمانوں کی کسی جماعت نے اجتماعی طور پر اس کا عہد نہیں کیا تھا، اس لیے بہت بعید معلوم ہوتا تھا کہ ان متفرق اشخاص سے اس عظیم الشان مقصد

---

[1] اس باب کا سارا مضمون ایک قلمی تحریر سے ماخوذ ہے جو قلمی مکتوبات کے مجموعے میں شامل ہے۔ اُس کا عنوان ہے:
"ذکر سرگزشت حضرتِ امامِ ہمام دریں ایّام بریں نمط است" ص۹۵

ہم تم کو اس کے سوا اور بھی دیں گے اور وہ تم کو تمھاری نوکری سے زیادہ پڑے گا، مگر اس کا ہم ابھی سے اقرار نہیں کرتے ہیں کہ کل کو کوئی ہم سے مطالبہ کرے۔

یہ سن کر پنجاب کے ایک احمد بیگ[1] مرزا بولے کہ میں اللہ تعالیٰ کے واسطے حاضر ہوں، آپ کے ساتھ رہوں گا۔ یہ بات سن کر ان میں کے تیس چالیس آدمی اور بھی بولے کہ ہم بھی خدا کے واسطے آپ کا ساتھ دینے کے لیے حاضر ہیں۔ پھر جب آپ نے وہاں سے کوچ فرمایا، وہ سب دو سو آدمی آپ کے ہمرکاب پنجتار تک آئے، پھر وہ تیس چالیس آدمی تو رہے اور باقی رفتہ رفتہ چند روز میں اپنے اپنے گھر کو روانہ ہو گئے۔

○

---

[1] مرزا احمد بیگ پنجابی بڑے مخلص مجاہد اور وفادار رفیق ثابت ہوئے اور بالاکوٹ کے معرکے تک شریک رہے۔

میں قیامت کے دن اُس کا دامنگیر ہوں گا۔ اس لیے ہم لوگ اس سلسلے میں اپنی رائے بے تکلف عرض کر رہے ہیں۔

آپ نے فرمایا کہ تم نے بہت خوب کیا۔ ہمارے چند غازیوں نے آکر مجھ سے کہا کہ ان دنوں مولوی محبوب علی صاحب کے جانے سے بہت سے آدمی ہندوستان چلے گئے، اگر کچھ لوگ رکھ لیجیے، تو لشکر میں آدمیوں کا اضافہ ہو جائے گا۔ ان کے کہنے سے میں نے انکار کرنا مناسب نہ سمجھا۔ تم نے بہتر صلاح دی ہے۔ اب تم جا کر اس کا مشورہ کرو اور جو کچھ مشورے میں قرار پائے، اُس کی اطلاع کرو۔

مولانا اسمٰعیل اور دوسرے اہل الرائے حضرات کے مشورے سے یہ طے پایا کہ اُن کا حساب صاف کر دیا جائے۔ آپ کو اس مشورے کی اطلاع ہوئی اور آپ نے اس کی منظوری دی۔ چنانچہ اُن کا حساب بیباق کر دیا گیا۔

ترغیب و فضائل کی قوت جب حساب ہو چکا، آپ کو اس کی اطلاع دی گئی۔ آپ نے فرمایا کہ ان سب صاحبوں کو ہمارے پاس لاؤ۔ جب وہ سب آئے، تو آپ نے پوچھا کہ تم سب اپنا جو کچھ حق تھا، پا چکے؟ سب نے عرض کی کہ پا چکے۔ پھر آپ نے اُن کے سامنے جہاد فی سبیل اللہ کے فضائل بیان کیے اور مجاہدین مخلصین اور شہداء کے مراتب کا ذکر کیا اور فرمایا کہ جو کوئی نوکر ہو کر جہاد فی سبیل اللہ کرتا ہے اور کفّار کے ہاتھوں مارا جاتا ہے، کم درجے کا وہ بھی شہید ہوتا ہے، بہ نسبت اور موتوں کے اُس کی موت بہتر ہوتی ہے۔ مگر جو لوگ خالصاً لوجہ اللہ جہاد کرتے ہیں اور کفّار کے مقابلے میں مارے جاتے ہیں، اُن کے درجۂ شہادت کو کوئی نہیں پہنچتا۔ حاصل کلام یہ ہے کہ یہ غازی جو خدا کے واسطے ہمارے ساتھ ہیں، یہ سب اپنے گھر کے کھاتے پیتے خوش حال تھے، کوئی تو اُن میں بیش قرار نوکری چھوڑ کر آیا ہے، کوئی اپنی جاگیر زراعت اور کوئی پیشہ اور تجارت چھوڑ کر آیا ہے اور یہاں یہ سب ہمارے پاس اللہ تعالیٰ کے لیے رہتے ہیں، فقر و فاقہ سہتے ہیں، خوش و خرّم راضی برضا صابر بقضا ہیں۔ اگر اسی طرح تم صاحب بھی رہو، جو کچھ ہمارے یہ بھائی کھائیں پہنیں، وہ تم کھاؤ پہنو، اس امر میں ہم حاضر ہیں اور جب اللہ تعالیٰ اپنے فضل و کرم سے ہم کو کسی اور طور کی فراغت دے گا، تب

تنخواہ دار سپاہی اور اُن کی برطرفی

ایک مرتبہ شہر میں لشکر کے چند لوگوں نے سیّد احمد علی صاحب کے توسّط سے آپ کی خدمت میں عرض کیا کہ مولوی سیّد محبوب علی صاحب کے چلے جانے اور اُن کے ساتھ کچھ اور لوگوں کے واپس ہو جانے، نیز اُن کے اثر سے ہندوستان کے قافلوں کی آمد بند ہو جانے کی وجہ سے آدمیوں کی کچھ کمی ہو گئی ہے۔ اگر اس وقت دو ڈھائی سَو پر دیسی آدمی چار چار روپے کی شرح پر ملازم رکھ لیے جائیں، تو بہتر ہے۔

آپ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ اپنا کام آپ بناتا ہے، وہ کسی کا محتاج نہیں ہے۔ چاہے تو قلیل جماعت کو کثیر جماعت پر غالب کر دے؛ اور چاہے، اس کے برعکس کرے۔ اُس کو سب قدرت ہے۔ وُہ اپنا کام بغیر کسی کی اعانت و شرکت کے بناتا ہے، مگر خیر، اگر آپ کی رائے میں یہی ہے، تو دو سَو آدمی نوکر رکھ لیں۔

دونوں صاحبوں نے لوگوں سے کہا کہ حضرت کی مرضی تو نہ تھی، مگر تم لوگوں کی خاطر سے آپ نے دو سَو آدمیوں کی اجازت دی ہے۔ ان سب نے اخوند ظہور اللہ کو تجویز کیا۔ آپ نے اُن کو رخصت دی۔ وہ اپنے وطن کو گئے اور کوئی ڈیڑھ یا پونے دو مہینے کے بعد اُن کی عرضی آئی کہ میں نے آپ کی اجازت کے موافق دو سَو پنجابی مسلمان چار چار روپے کی شرح کے نوکر رکھے ہیں۔ وُہ اُن کو کاٹ لنگ میں لے کر آئے۔

کچھ عرصے کے بعد اُن کی تنخواہیں چڑھ گئیں اور اُنھوں نے اخوند ظہور اللہ کو پریشان کرنا شروع کیا۔ اسی عرصے میں ہندوستان سے کچھ رقمیں آئیں۔ لشکر کے بعض مُخلص خیر خواہوں اور مُخلصین نے آپ سے عرض کیا کہ یہ جو اتنے لوگ آپ نے نوکر رکھے ہیں، یہ کس مُلک کی آمدنی پر رکھے ہیں۔ ڈھائی ہزار روپے اُن کی تنخواہ کے چڑھ گئے ہیں اور ابھی تک ایک پَیسے کا کام اُن سے نہیں نکلا۔ مناسب یہ ہے کہ اُن کا چڑھا ہوا اُن کو دے کر جلد اُن کو برطرف کر دیا جائے۔ آپ بارہا ارشاد فرما چکے ہیں کہ میرا جو کام کسی صاحب کے نزدیک نامناسب ہو، وُہ بے تکلّف مجھے اطلاع کرے۔ مَیں یا تو جواب دے کر اُس کو تسلی کر دوں گا یا مَیں اُس کام کو چھوڑ دُوں گا۔ اس امر میں جو کوئی جان بُوجھ کر سکوت کرے گا،

آدمی اپنے ساتھ لے کر جاؤ اور خبر لاؤ کہ کون لوگ آتے ہیں۔ کچھ دیر میں لوگوں کی زبانی معلوم ہُوا کہ اپنے ہی لشکر کے آدمی ہیں، جو پیچھے رہ گئے تھے۔ وُہ ۲۵، ۳۰ آدمی تھے، جن میں شیخ امجد علی غازی پوری سوار؛ اَور راجہ رام راجپوت پیادوں میں تھا۔ آپ نے راجہ رام کو شاباش دی اور فرمایا کہ اللہ تعالیٰ تم کو ہدایت نصیب کرے؛ تم نے خوب ہی بہادری کا کام کیا۔ شیخ امجد علی کو دیکھ کر تبسّم کیا اَور فرمایا ہمارے شیخ بھائی گویا زندہ شہید ہیں۔ جس نے شہید نہ دیکھا ہو، وُہ ان کو دیکھے کہ ایسی خطرناک جگہ سے زندہ سلامت بچ آئے۔

اسی روز کئی مُلکیوں کی زبانی جو اُتمان زئی سے آئے تھے، معلوم ہُوا کہ سیّد صاحبؒ تو لشکر کے ساتھ رات کو کُوچ کر کے جلالہ کی طرف روانہ ہُوئے، مگر دُرّانی خوف کے مارے پہر دن چڑھے تک توپوں کے پاس نہ آئے کہ اَیسا نہ ہو بستی میں غازیوں کا لشکر چُھپا ہو جب اُن کو اچھی طرح ثابت ہو گیا کہ وہاں کوئی نہیں، تب وُہ آکر توپیں لے گئے۔

خہر کو واپسی | جلالہ سے آپ مع لشکر خہر واپس آئے۔ وہیں سیّد احمد علی، مولوی مظہر علی عظیم آبادی، حسن خاں، شیخ علی محمّد دیوبندی، ارباب جُمعہ خاں وغیرہ بھی خیبر سے واپس آگئے اور وہاں کے لوگوں کی بد عہدی کا حال بیان کیا۔

دس پندرہ دن کے بعد آپ نے مولانا اسمٰعیل صاحب اور شیخ ولی محمّد سے فرمایا کہ لوٹنی میں جو روپے ہم اُتمان زئی کے کوُچ سے پہلے دفن کر آئے تھے، لے آئے جائیں۔ چنانچہ وہ واپس لائے گئے۔

بُخارا کی طرف سفارتِ جہاد | لشکر کے چند اہل الرائے اور اہلِ علم حضرات نے آپ کی خدمت میں عرض کیا کہ اگر مناسب سمجھیں، تو ایک جماعت، دعوتِ جہاد کے لیے بُخارا روانہ فرمائیں آپ کو یہ مشورہ پسند آیا۔ مولانا اسمٰعیل صاحب نے میاں جی چشتی صاحب کو اس مہم کے لیے تجویز کیا آپ نے فرمایا کہ بالکل قرارِ دہُوا۔ چنانچہ میاں جی چشتی کو نو آدمیوں کے ساتھ روانہ فرمایا اور ایک قرآن مجید کا نہایت خوشخط و مطلّا نسخہ، جو آپ کو نواب امیر خاں نے ہدیہ کیا تھا، شاہ بُخارا کے لیے دیا اور دعوت وجہاد کا ایک عام اعلام نامہ بھی سپُرد کیا۔

پھر آپ نے بستی سے عالم خاں کو بھی وہیں بلوایا اور فرمایا کہ ہم نے سُنا ہے کہ سردار سید محمد خاں کا بھائی دو آبے سے ان دُرّانیوں کی مدد کو لشکر لا رہا ہے، اس لیے تم تسلّی سے اپنے مکان میں جا کر بیٹھو۔ ہم اس وقت جا کر اُن پر شبخون ماریں گے۔ یہ سُن کر عالم خاں بہت گھبرایا، وہاں سے جلد اپنے مکان پر آیا اور اپنا ایک آدمی دُرّانیوں کی طرف روانہ کیا کہ ہوشیار رہو جاؤ، سید بادشاہ کا چھاپہ تمھارے کمک والوں کے لشکر پر آتا ہے اور عجب نہیں کہ تم پر بھی آ پڑے۔ سید صاحب بھی اسی وقت سَو سوا سَو مجاہدین کے ساتھ اس درخت کی طرف تشریف لے گئے اور جماعت دار، ہیلے دار سب مورچوں کو روانہ ہُوئے اور آپ کے ارشاد کے موافق ہر مورچے میں دو یا تین غازی رہنے دیے اور باقی سب کو وہاں سے لا کر اسی درخت کے پاس سید صاحب کی خدمت میں جمع کیا۔ آپ نے سب کو مولانا محمد اسمٰعیل صاحب کے ساتھ جلالہ کی طرف رخصت کیا اور کوئی پچاس آدمی اپنے پاس رکھ لیے۔ پھر سید ابو محمد صاحب کو مورچوں میں بھیجا کہ جو لوگ وہاں ہیں اُن کو بھی اپنے ساتھ لے آؤ۔ ابو محمد صاحب سب کو آپ کے پاس لے آئے۔ اُن کو آپ اپنے ساتھ لے کر روانہ ہُوئے۔ صرف ایک ہندو راجہ رام سلون ضلع رائے بریلی کے پاس کا رہنے والا اور مولوی احمداللہ صاحب کا ساتھی توپوں پر رہ گیا۔ اُس کو آپ کے کوچ کی خبر نہ ہُوئی۔ وُہ خود ہی دونوں توپوں کو بھرتا تھا اور آپ ہی چلاتا تھا۔ مجاہدین راستے میں اُس کی توپوں کی آواز سُنتے چلے جاتے تھے۔ بستی والے بھی اس سے مزاحم نہیں ہوتے تھے۔ وُہ سمجھتے تھے کہ سید بادشاہ کے ساتھی دُرّانیوں پر چھاپہ مارنے گئے ہیں، وہاں سے وہ لوگ پھر یہاں آئیں گے۔

جونہیں مُجاہدین کے مورچوں سے بندوقیں چلنی موقوف ہُوئیں، مقابل کا لشکر بھاگا، کیونکہ عالم خاں سے شبخون کی خبر اُن کو مل چکی تھی۔

جلالہ سے دُوسرے دن ظہر کے وقت جب مُجاہدین نماز سے فارغ ہُوئے، یکبارگی غُل ہُوا کہ نالے کی طرف کچھ سوار اور پیادے نظر آتے ہیں۔ سب کو احتمال ہُوا کہ دُرّانی آ پہنچے۔ سید صاحب نے لوگوں کو حکم دیا کہ جلد کمر باندھ کر ہتھیار لگا کر تیار ہو جاؤ۔ اور رسُول خاں جلالہ والے سے کہا کہ چند

اپنے ساتھ لے کر دُرّانیوں سے جا ملا۔ اب کوئی بات میرے قابو کی نہیں رہی، اس لیے کہ جن سے مجھ کو زور اور طاقت حاصل تھی، وہ سب اُس کے ساتھ چلے گئے۔ اب آپ جیسا مناسب جانیں ویسا کریں۔

یہ خبر سیّد صاحبؒ کو اسی روز عصر سے پہلے پہنچ چکی تھی کہ عالم خاں کی نیّت میں کچھ فتور آ گیا ہے، مگر یہ نہیں معلوم تھا کہ فی الحقیقت اُس کا بیٹا اُس سے منحرف ہو کر دُرّانیوں سے جا ملا، یا اس میں اسی کی سازش ہے۔ سیّد صاحبؒ نے عالم خاں سے کہا کہ خان بھائی، تم اپنے گھر جا کر تسلّی سے بیٹھو، ہم کو تمہارے بیٹے اور کسی دوسرے کی پروا نہیں کہ کوئی ہماری مدد کرے۔ ہم کو اللہ تعالیٰ کافی ہے۔

خیبریوں کا اختلاف اور دُرّانیوں سے اتّحاد

عالم خاں اپنے مکان کو چلا گیا۔ اس عرصے میں مولوی نصیر الدین منگلوری ایک آدمی کے ساتھ عشا کے قریب آپ کے پاس آئے اور عرض کیا کہ ارباب بہرام خاں وغیرہ کی کوششوں سے خیبریوں میں جو اتّحاد ہوا تھا، وہ ٹوٹ گیا، وہ سب کے سب پھوٹ کر دُرّانیوں کی طرف ہو گئے۔ یہ خبر سُن کر آپ نے فرمایا کہ کیا اندیشہ ہے ہمارا اللہ تعالیٰ ہمارے ساتھ ہے۔ ہم نے تو انھیں لوگوں کی خوشامد اور چاپلوسی کے سبب وہاں خیبر کو بھی لوگ روانہ کیے تھے اور یہاں بھی اپنے لشکر کو لے کر آئے تھے، مگر یہ لوگ کوئی بھی اپنے عہد و پیمان کے پورے نہیں ہیں۔ اب یہ جانیں، ہم سے کچھ کام نہیں۔

مراجعت کی تجویز

آپ نے نمازِ عشا کے بعد سب جماعت داروں اور رسالہ داروں کو اپنے پاس بُلا کر مشورہ کیا کہ عالم خاں کی تقریر آپ سب سُن چکے۔ خیبریوں کا حال بھی مولوی نصیر الدین صاحب کی زبانی معلوم ہو گیا کہ ارباب بہرام خاں نے جن لوگوں کو متّفق کیا تھا، اُن میں اختلاف پڑ گیا، سب کے سب پھوٹ کر دُرّانیوں کی طرف ہو گئے۔ اس لیے اب یہاں سے چلنے کی تدبیر کرنی چاہیے، مگر اس طرح کہ ہر مورچے میں دو یا تین آدمی تو رہنے دینے چاہئیں کہ وہ بندوق چلاتے رہیں، باقی سب کو بستی اُتمان زئی سے کوئی پاؤ کوس پر جو درخت ہے، وہاں جمع کیجیے، اُن سے یہ کہیے کہ یہ صلاح ٹھیری ہے کہ دُرّانیوں کی پُشت پر چل کر شبخون مارا جائے۔

نماز پڑھی۔ شاہینوں کی گولیاں ایسی تیز آتی تھیں کہ مجاہدین میں سے کوئی سر نہیں اُٹھا سکتا تھا۔ اُس وقت لوگوں نے سیّد صاحبؒ سے عرض کی کہ اگر اجازت ہو، تو ہم لوگ اُن پر حملہ کریں: سامنے سے تو مورچے والے ماریں، اور کچھ لوگ اُن کے بائیں جانب سے جا کر ماریں۔ پھر جس کو اللہ فتح دے، وہ لے۔ آپ کو یہ مشورہ پسند آیا اور فرمایا کہ آفرین ہے تم کو! اللہ تعالیٰ اس سے زیادہ جرأت و بہادری نصیب کرے، مگر ابھی توقف کرو۔ دیکھو کہ اللہ تعالیٰ اپنی قدرت و حکمت سے کیا راستہ نکالتا ہے، لیکن آگے بڑھ کر اُن کے بائیں جانب مورچہ لگا کر بندوقیں مارو اور ہماری اجازت کے بغیر حملہ نہ کرنا۔ ہم سیّد ابو محمد صاحب کو بھیجیں گے۔ جیسا وہ کہیں، ویسا عمل میں لانا۔

آپ کے فرمان کے موافق لوگوں نے آگے بڑھ کر وہیں دُرّانیوں کے بائیں جانب مورچہ لگایا اور سو سوا سو مجاہدین کے ساتھ سیّد صاحبؒ توپوں کے پاس تشریف لائے اور مرزا احسن بیگ سے فرمایا کہ دُرّانیوں کی شاہینوں نے ہمارے غازیوں کو بہت تنگ کر رکھا ہے۔ کسی طرح اُن کو بند کرو۔ اُنھوں نے عرض کی کہ بہت خوب، دیکھیے، انشاء اللہ تعالیٰ بند کرتا ہوں۔ سیّد صاحبؒ تو وہاں سے ایک درخت کے نیچے تشریف لے گئے اور مرزا صاحب نے اُن کی شاہینوں کی طرف شست باندھی۔ جیسے ہی ایک شاہین کی رنجک اُڑی ویسے ہی مرزا صاحب نے ایک توپ کو بتّی دی۔ مگر وہ گولا خالی گیا۔ اِس دوران میں اُنھوں نے توپ کے جواب میں دوسری سر کی۔ مرزا صاحب نے فوراً اُس کی رنجک پر ایک توپ کی شست باندھی۔ اِس عرصے میں دوسری شاہین بھی چلی۔ مرزا صاحب نے اس کی رنجک پر دوسری توپ کی شست باندھی اور دونوں توپوں کو آگے پیچھے بتّی دی۔ واللہ اعلم اس طرف کیا حال گزرا کہ پھر ان شاہینوں میں سے ایک بھی نہ چلی، مگر بندوقیں بدستور دونوں طرف چلتی رہیں۔ کچھ کچھ دیر کے بعد مرزا صاحب دو ایک توپ بھی اپنے موقع پر چلاتے رہے۔

عالم خاں کی کمزوری اور معذرت | اس عرصے میں اُتمان زئی کا عالم خاں، جس نے دُرّانیوں پر حملے کی تحریک اور دعوت دی تھی، سیّد صاحبؒ کے پاس آیا اور رونے لگا اور اپنے سر کی پگڑی اُتار کر آپ کے قدموں پر ڈال دی اور کہنے لگا کہ میرا بیٹا مجھ سے منحرف ہو کر اور میرے طرفداروں کو

خیمے کی۔ وہاں سے توپ کی زد پر ایک ٹیلا تھا۔ دُرّانیوں کا لشکر اُس کی آڑ پکڑ کر کھڑا ہُوا۔ سید صاحبؒ نے فرمایا کہ دونوں توپیں جو بھری ہُوئی تیار ہیں، اس ٹیلے کے سامنے لگا دو۔ آدھے لوگ اُن کے مقابلے پر رہیں اور آدھے لوگ نمازِ فجر پڑھ لیں۔ اس کے بعد یہ مقابلے پر جائیں، وُہ نماز پڑھ لیں۔ چنانچہ ایسا ہی ہُوا۔ اِس عرصے میں کچھ مجاہدین دائیں بائیں سے مورچہ بندی کے طَور پر پہلے قافلے کے بیچ میں گئے تھے۔ اُن کو دیکھ کر دُرّانیوں کے سوار دو دو، چار چار کر کے اس ٹیلے پر جمع ہُوئے مُجاہدین نے سیّد صاحبؒ سے عرض کیا کہ یہ سوار ٹیلے پر جمع ہیں، ایسا نہ ہو کہ ہم پر حملہ کریں۔ سیّد صاحبؒ نے آگے بڑھ کر مُجاہدین کے چار مورچے چار جگہ قائم کیے۔ جانبین سے بندوقیں چلنے لگیں۔ پھر مجاہدین نے عرض کی کہ اگر اجازت ہو، تو توپ چلائیں۔ آپ نے فرمایا کہ ابھی تامُّل کرو تھوڑی دیر کے بعد آپ توپوں کے پاس آئے اور اُن کو پھرا کر ایک ٹیلے پر لگا دیا اور سواروں کے غول پر شست باندھی۔ مرزا احسن بیگ بانس بریلوی سے، جو توپ چلانے میں بڑے اُستاد تھے، فرمایا کہ دیکھو تو، شست ان توپوں کی اس غول کی طرف کیسی ہے۔ مرزا صاحب نے دیکھ کر کہا کہ دُرست ہے۔ آپ نے فرمایا کہ بتّی دو۔ اُنھوں نے ایک توپ کو سر کیا۔ وہ گولہ ان سواروں کے سر پر ہو کر نکل گیا۔ اس میں وُہ سوار پراگندہ ہو گئے۔ مرزا صاحب نے دُوسری توپ سر کی۔ اس گولے میں ان میں سے دو سوار اُڑ گئے اور باقی اُوپر سے اُتر کر اسی ٹیلے کی آڑ میں کھڑے ہو گئے اور پیادوں کی بندوقیں چلتی رہیں۔ جب مجاہدین ان کے کسی مورچے کا زیادہ زور دیکھتے، تو اس طرف ایک یا دو گولے مار دیتے۔ یا جب دس بیس سواروں کا مجمع ٹیلے پر ہوتا، تب ایک یا دو گولے مار دیتے۔

اِسی طرح صبح سے شام تک اُس روز لڑائی رہی، مگر مجاہدین میں سے نہ کوئی زخمی ہُوا اور نہ مقتول۔ ظہر اور عصر کی نماز فجر کی نماز کی طرح دو بار کر کے آدھے آدھے لوگوں نے پڑھی۔ جب مغرب کا وقت آیا، اُس وقت دُرّانیوں نے بہت زور دیا۔ شاید اُن کو کسی طرف سے کچھ کمک آ گئی، اس لیے کہ ان میں دو شاہینیں اُن کی طرف سے چلنے لگیں، جو پہلے نہ تھیں۔ گولیوں کا مینہ سا مجاہدین پر برستا تھا، مگر سرد گولیاں آتی تھیں۔ مغرب کی نماز مجاہدین کو پڑھنی دُشوار ہو گئی۔ پھر اسی تقسیم و انتظام سے

جگہ پر پہنچایا۔ اس عرصے میں دُوسرا مُخبر بھی آیا اور کہا کہ موضع اُتمان زئی کو بائیں ہاتھ کی طرف چھوڑ کر میرے پیچھے پیچھے چلے آؤ۔ اُس وقت کوئی پانچ چھ گھڑی رات رہی ہوگی۔

کامیاب شبخون | یہ سُن کر آپ نے اپنے لشکر کو دو گروہوں میں تقسیم کیا۔ ایک گروہ مولانا محمد اسمٰعیل صاحب کے سپرد کیا اور فرمایا کہ آپ اس جاسوس کے ساتھ جاکر دُرّانیوں کے لشکر پر شبخون ماریں؛ اور ایک گروہ اپنے ہمراہ لے کر موضع اُتمان زئی کی طرف روانہ ہوئے کہ اگر دُرّانی چھاپے سے بھاگیں گے، تو بستی میں آکر گھسیں گے، یہاں ہم اُن سے مقابلہ کریں گے۔ یہ آپ نے ہمراہیوں سے فرمایا کہ جو کوئی تم سے مقابلہ کرے، اس کو مارنا اور جو تم سے امن مانگے، اُس کو امن دینا، اُس کا پیچھا نہ کرنا۔ مولانا محمد اسمٰعیل صاحب کے ساتھیوں سے بھی یہ فرما دیا تھا۔

جب مولانا اپنی جماعت لے کر دُرّانیوں کے لشکر سے توپ کی زد پر گئے اور وہاں کھڑے ہوئے، آپ نے سب لوگوں سے کہا کہ اب یہاں سے حملہ کریں گے؛ جب تک ہماری بندوق نہ چلے، کوئی دُوسرا نہ چلائے۔ پھر وہاں سے آگے بڑھے۔ دُرّانیوں کا چوکی پہرا کھڑا تھا۔ اُس نے آواز دی: "کون ہے؟" اس طرف سے کوئی نہ بولا۔ دُوسری بار پھر اُس نے آواز دی۔ پھر اِدھر سے کوئی نہ بولا۔ تیسری آواز پھر اس نے دی۔ جب کوئی اِدھر سے نہ بولا، تب اُس نے بندوق ماری اور شور کر کے بھاگا کہ لشکر آپہنچا۔ اِدھر سے سب نے بآوازِ بلند تکبیر کہتے ہُوئے حملہ کیا۔ اُدھر سے گولنداز نے توپ سر کی۔ سب مُجاہدین بیٹھ گئے۔ پھر اُٹھ کر دَوڑے یہاں تک کہ اُن کے لشکر میں جا داخل ہُوئے۔ پھر اُدھر سے دُوسری توپ چلی۔ اِدھر سے مولانا نے بندوق سر کی۔ اس کے ساتھ ہی مجاہدین کی ایک باڑھ چلی اور سب نے جاکر اُن کی دونوں توپیں لے لیں۔ اُن کا ایک گولنداز مارا گیا، باقی لشکر اور گولہ انداز بھاگ کھڑے ہُوئے یہاں تک کہ کسی نے بندوق بھی نہ چلائی۔ اِدھر فضلِ الٰہی سے نہ کوئی مارا گیا اور نہ زخمی ہُوا۔

مجاہدین کی مورچہ بندی اور دن بھر کی جنگ | ادھر سے سیّد صاحبؒ بھی اپنا غول لے کر آپہنچے۔ آپس میں مُبارکباد ہُوئی اور سب نے اللہ تعالیٰ کا شُکر ادا کیا کہ سب طرح سے اللہ نے

یہ خبر سُن کر آپ نے رسُول خاں اور عالم خاں کو بُلا کر فرمایا کہ چالیس پچاس گھڑے پانی آج کسی وقت جس راستے ہم جائیں گے، یہاں سے روانہ کر دو اور جب تک ہمارا لشکر وہاں داخل ہو تب تک مزدوروں کو وہیں اپنے ساتھ رکھنا۔ اس روز نمازِ عشا کے بعد، کوئی پہر رات گئے، پندرہ بیس بندوقچیوں کے ساتھ رسُول خاں اور عالم خاں پانی کے گھڑے مزدوروں کے سروں پر رکھ کر روانہ ہوئے۔ صبح کو آپ نے وُہ ٹلکیاں منگوائیں اور چاروں جماعت داروں کو بُلا کر آپ نے حکم دیا کہ جو لوگ چالاک وچُست اور صحیح تندرست ہوں کہ دس بارہ کوس جانے اور پلٹ آنے کی طاقت رکھتے ہوں، ان کو ایک ایک ٹلکی دے کر کہہ دو کہ ہر کوئی دو دو وقت کی روٹیاں پکا کر باندھ لے۔ آج عصر سے پہلے کُوچ ہے اور جو لوگ بیمار اور چلنے سے ناچار ہوں، اُن کو یہیں رہنے دینا اور ہماری طرف سے اُن کی تسلّی وتشفّی کر دینا کہ انشاء اللہ تعالیٰ پیچھے سے تم کو بھی بُلوا لیں گے یا ہم بھی آکر ملیں گے۔

لوگ سب سامان درُست کرکے سو رہے کہ تمام رات چلنا ہوگا۔ جب ظُہر کی اذان ہُوئی، آپ نے اُٹھ کر وضُو کیا اور نماز پڑھائی۔ نماز کے بعد آپ نے فرمایا کہ پہر دن رہے سے سب بھائی کمر باندھ کر نالے پر، جو یہاں سے پاؤ کوس ہے، جمع ہوں، عصر کی نماز وہیں پڑھیں گے۔ لوگ تیار ہو کر گئے۔ سیّد صاحبؒ بھی دو سو پیادہ اور سواروں کے ساتھ تشریف لے گئے۔ میدان میں نمازِ عصر پڑھائی اور بہُت الحاح وزاری کے ساتھ دُعا فرمائی اور اُن جاسُوسوں کو، جو اُتمان زئی سے دُرّانیوں کی خبر لائے تھے، آگے کیا اور وہاں سے کُوچ فرمایا۔

قریب پہر رات گئے اس پانی پر، جو رکھایا تھا، جا پہنچے اور وہیں نمازِ عشا پڑھی۔ ہندوستانی اور مُلکی ملا کر قریب ہزار آدمی کے ہوں گے۔ آپ نے ان دو جاسُوسوں سے کہا کہ ایک تم میں سے آگے جائے اور دُرّانیوں کے لشکر کی خبر لائے کہ اُن کے لشکر میں کس طرف لوگ ہوشیار ہیں اور کس طرف غافل، اور ایک ہمارے لشکر کے ساتھ رہے۔ پھر ان دونوں نے آپس میں مشورہ کیا کہ میں تو لشکر کو لے کر اُتمان زئی سے آدھ کوس جانب شمال فلاں جگہ بٹھیروں گا اور تم خبر لے کر وہیں آنا۔ پھر ایک اُدھر گیا اور دُوسرا لشکر کے ساتھ رہا۔ جاتے جاتے اس جاسُوس نے پتّے کی

مرتبہ عنایت فرماتا ہے۔ اسی طرح آپ فرماتے رہے اور کہتے کہتے دفعتہً دریائے محبتِ الٰہی نے جوش مارا اور آپ برہنہ سر ہو کر دُعا کرنے لگے۔ طرح طرح سے اللہ تعالیٰ کی حمد و ثنا بیان کرتے تھے اور گوہرِ اشک سے دامن بھرتے تھے اور اللہ تعالیٰ کی تعریف میں عجیب عجیب الفاظ آپ کی زبان سے نکلتے تھے۔ اُس وقت اِس دُعا کی تاثیر اور برکت سے ہر شخص کا عجیب حال تھا۔ دن بھر کی تکلیف خوابِ و خیال ہو گئی تھی، سب میں نئی زندگی اور تازگی پیدا ہو گئی تھی۔ لوگوں نے دُعا کے بعد عرض کیا کہ اگر ارشاد ہو، تو نمازِ مغرب کے بعد ہم لوگ اُتمان زئی کو روانہ ہوں۔ آپ نے فرمایا کہ اتنی عُجلت کی ضرورت نہیں، تسلّی اور دل جمعی سے کام خوب ہوتا ہے۔ لوگ یہ سُن کر خاموش ہو گئے۔

آپ نے مولانا محمد اسمٰعیل، مولوی حبّان، رسُول خاں، عالم خاں، محمُود خاں اور منصُور خاں، زُبید اللہ خاں، عنایت اللہ خاں اور ربنالی خاں وغیرہ کو جمع کیا اور فرمایا کہ آج ہمارے مجاہدین کو راستے میں بڑی تکلیف ہُوئی۔ اگرچہ اپنی ہمت و جُرأت سے باتیں کرتے ہیں، مگر جان ہی جان باقی ہے۔ اب یہاں سے کُوچ کی کیا تدبیر ہے؟

آخر مشورے میں یہ قرار پایا کہ اُتمان زئی تو یہاں سے کڑی منزل ہے، راستے میں پانی بھی نہیں ہے، وہاں تک تو پہنچنا دُشوار ہے۔ یہاں سے ڈھائی یا تین کوس موضع جلالہ ہے۔ وہاں سے بھی موضع اُتمان زئی اسی قدر ہے۔ آج رات تو سب اسی چراگاہ میں رہیں تاکہ ماندگی بھی رفع ہو اور نیند کا خمار بھی دُور ہو، پھر کل یہاں سے چل کر جلالہ میں ڈیرہ ہو۔

کُوچ کی تیاری آپ کو یہ صلاح پسند آئی۔ رات کو اسی چراگاہ میں وُہ لشکر رہا، وہاں کے گوجروں نے دُودھ دہی کی خُوب مہمانی کی۔ نمازِ فجر کے بعد کُوچ ہُوا۔ دن چڑھے موضع جلالہ میں داخل ہُوئے وہاں پانچ دن قیام رہا۔ دُرّانیوں کا حال معلوم کرنے کے لیے وہاں سے دو مُخلص اُتمان زئی کو روانہ کیے گئے۔ رسُول خاں کے مشورے سے مٹی کی ایک ہزار ٹلکیاں بنوائی گئیں، جن میں دو ڈھائی سیر پانی سما سکتا تھا۔ دونوں جاسُوسوں نے آکر خبر دی کہ دُرّانیوں کا لشکر، پیادہ و سوار ملا کر، چار ہزار کے قریب ہے گا۔ ان کے ساتھ دو توپیں بھی ہیں۔

چلو۔ مجھ کو سُورج نکلتے ہی معلوم ہُوا تھا کہ راستہ اتنی دُور ہے۔ اگر مَیں پہلے سے پانچ چھ کوس بتا دیتا، تو تُم سب کے سب گھبرا کر بے حواس ہو جاتے، راستہ طے کرنا پہاڑ ہو جاتا۔ الغرض، سب کو اُمّید ہوئی کہ انشاء اللہ تعالیٰ وہاں ضرور پانی ہوگا، اِس لیے کہ وہاں سے اس ٹیلے کی طرف چار پانچ گوجروں کے جھونپڑے نظر آتے تھے۔ مگر پیاس سے سب کے سب جاں بلب تھے۔ رہبر نے کہا کہ مَیں آگے چل کر تمھارے واسطے پانی بھیجتا ہوں، تم بھی آہستہ آہستہ اسی طرف چلے آؤ۔ یہ کہہ کر وُہ آگے بڑھ گیا اور جو قوی دل اور باحواس تھے، وہ اُس کے ساتھ ہو لیے۔ ایک سقّہ بیل پر پکھال لیے ہُوئے اور ایک سقّہ مشک لیے ہُوئے اُن کے ساتھ ہُوا۔ تقریباً پونے دو سَو آدمی آگے گئے۔ باقی لوگوں کا یہ حال تھا کہ جا بجا مارے دُھوپ کے چھوٹی چھوٹی جھاڑیوں میں سر ڈالے ہُوئے بے حواس پڑے تھے اور کچھ آہستہ چلے بھی جاتے تھے۔ اس عرصے میں آگے جانے والوں نے ایک پکھال پانی بیل پر اور دو مشکیں گدھے پر لاد کر پچھلے لوگوں کے لیے بھیجیں۔ گوجر بھی مشکوں میں چھاچھ، دُودھ اور پانی لے کر دَوڑے۔ جو لوگ راستے میں تھے، وُہ ایسے پیاسے تھے کہ سب پانی اور چھاچھ وغیرہ پی گئے اور جو جھاڑیوں میں جا بجا پڑے تھے، اُن تک پانی نہ پہنچا۔ جنھوں نے پیا تھا، وہ چراگاہ پہنچے اور پکھال، مشکیں اور مٹکے وغیرہ پانی سے دوبارہ بھر کر لے دَوڑے۔ چراگاہ سے جھاڑیوں تک آدمیوں کی ایک قطار سی بندھ گئی۔ سب سیراب ہُوئے اور وہاں سے چراگاہ میں آ گئے۔ چراگاہ پہنچتے پہنچتے دوپہر ہو گئی تھی۔

سیّد صاحبؒ کی آمد اور مُجاہدین کی تشفّی

اسی روز سیّد صاحبؒ ڈھائی تین سَو سواروں اور پیادوں کے ساتھ عصرؔ و مغرب کے درمیان چراگاہ میں آئے۔ تمام لوگ اس دن کی تکلیف سے بیتاب و پژمردہ پڑے ہُوئے تھے۔ آپ کو دیکھ کر سب اپنی تکلیف بھُول گئے اور خوشی سے تر و تازہ ہو گئے۔ لوگوں نے آپ سے دن کا واقعہ بیان کیا۔ آپ نے ہر ایک کو تسلّی دی اور فرمایا کہ یہ بھی اللہ کی طرف سے ایک آزمائش تھی۔ اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کو طرح طرح کی تکلیفوں اور مُصیبتوں سے آزماتا ہے: بھُوک سے، پیاس سے، خَوف سے، نُقصانِ مال و جان سے۔ جو صبر کر کے اِن بلاؤں کو سہتا ہے اور دین کے راستے پر ثابت قدم رہتا ہے، اُس کو اللہ تعالیٰ اپنی رحمت سے بڑے بڑے درجے اور

مُجاہدین کی آزمائش | مُجاہدین نے مغرب کے قبل نالے پر پہنچ کر وضو کیا اور مشکیزوں اور لوٹوں میں پانی بھر لیا اور مغرب و عشا پڑھ کر رہبر کی رہنمائی میں روانہ ہُوئے۔ راہبر گھاٹی سے نکال کر آگے لے چلا۔ وہاں کوسوں مَیدان ہی مَیدان نظر آتا تھا۔ رات اندھیری تھی۔ راہبر سے راستہ چھُوٹ گیا۔ تمام رات سراسیمہ و سرگرداں سب کو لیے اسی بیابان میں پھرا کیا یہاں تک کہ سُورج نکلا اور دُھوپ تیز ہونے لگی۔ جو پانی لوگوں نے نالے سے ساتھ لیا تھا، ختم ہو گیا اور پیاس معلوم ہونے لگی۔ پانی کا وہاں کوسوں نام نہ تھا۔ لوگوں نے رہبر کو تنگ کرنا اور الزام دینا شروع کیا کہ تم نے ہم کو کہاں لا کر ڈالا۔ اس نے دیر تک سوچ کر ایک طرف ہاتھ سے اشارہ کیا اور کہا کہ وُہ جو ایک ٹیلا سا نظر آتا ہے، وہاں پانی ہے۔ وہ ٹیلا وہاں سے ڈیڑھ یا دو کوس تھا۔ آخر سب لوگ اس کے ساتھ چلے۔ وہاں جا کر دیکھا، تو پانی کا نام و نشان بھی نہ تھا۔ لوگ گھبرا کر اس سے کہنے لگے: "تو کہاں ہم کو حیران و پریشان کرتا پھرتا ہے؟" وہاں دو ڈھائی کوس پر ایک دُوسرا ٹیلا نظر آیا۔ اُس نے کہا: "بھائیو، گھبراؤ نہیں، میرے ساتھ آؤ، وہاں پانی ملے گا۔" آخر سب اُس ٹیلے کی طرف روانہ ہُوئے۔ لوگ دُھوپ کی تمازت اور پیاس کی شدت سے بیتاب تھے۔ بہ ہزار وقت گرتے پڑتے وہاں تک پہنچے، مگر وہاں بھی پانی کا پتہ نہ تھا۔ سوا پہر، ڈیڑھ پہر دن ہو چکا تھا۔ گرمی اور تشنگی سے ہر ایک کے بدن میں چنگاریاں سی لگ رہی تھیں، ہلاکت کا قوی اندیشہ تھا، ہر ایک شخص سمجھ رہا تھا کہ اسی مَیدان میں مَوت آنی ہے اور تڑپ تڑپ کر جان دینا ہے، مگر شکرِ الٰہی کے سوا کوئی شکایت کا کلمہ زبان پر نہ آیا۔ اگرچہ ہر ایک اضطراب اور پیاس سے نیم جان ہو رہا تھا، مگر دُوسرے کو تسلّی دیتا تھا کہ مت گھبراؤ، اللہ تعالیٰ فضل فرمائے گا، خُدا کی راہ میں مسلمانوں نے بڑی بڑی تکلیفیں اٹھائی ہیں، یہ پیاس کی تکلیف تو کچھ بھی نہیں ہے۔

آخر اس راہبر نے کہا: بھائیو، اب کچھ اندیشہ مت کرو، اب راستہ یہاں سے قریب ہے ایک تیسرا ٹیلا وہاں سے کوئی سوا کوس تھا۔ ہاتھ کے اشارے سے اُس نے بتایا کہ وہاں گوجروں کے جانوروں کی چراگاہ ہے، پانی بھی بہت ہے اور دُودھ دہی سب موجود ہے۔ کسی طرح وہاں تک چلیے

جائیں کہ وہ وہاں سے اپنی قوم کو متفق کر کے پشاور پر لائیں اور ادھر سے آپ باقی لشکر لے کر اُتمان زئی کی طرف کوچ فرمائیں اس لیے کہ ارباب بہرام خاں خیبر کی طرف اپنی قوم اور دوسرے قبائل کو ملا لیں گے، تو اس طرف سے دُرّانیوں کو مدد نہیں مل سکے گی۔

یہ تدبیر سب کو پسند آئی اور آپ نے ارباب بہرام خاں کو ساتھ بھیجنے کے لیے مولوی مظہر علی عظیم آبادی کو جماعت کے ساتھ اور شیخ ولی محمد پھلتی کی جماعت کے چند لوگوں کے ساتھ شیخ علی محمد دیوبندی اور مولوی نصیر الدین منگلوری کو مقرر فرمایا اور پوری جماعت کا امیر سیّد احمد علی رائے بریلوی کو، جو آپ کے بھانجے تھے، بنایا اور اُن کو رخصت کرتے وقت ننگے سر ہو کر دیر تک بڑے عجز و انکسار سے دُعا کی اور روانہ فرمایا۔

موضع ٹوٹئی میں جب یہ لوگ خیریت کے ساتھ خیبر میں داخل ہوئے اور ارباب بہرام خاں نے وہاں کے لوگوں کے متفق ہونے کی خبر بھیجی اور کہلایا کہ مہمند اور خلیل کے سرداروں اور خوانین کو بھی میں نے بلایا ہے، تو آپ نے یہ معلوم کر کے کوچ کی تیاری کی، معذورین کو بی بی صاحبہ کی حفاظت کے لیے خہر میں چھوڑا اور میاں جی غلام محمد سہارنپوری کو انتظام اور بندوبست کے لیے مقرر کیا، پھر اَلاڈنڈ کے عنایت اللہ خاں اور خہر کے زید اللہ خاں وغیرہ خوانین کو مع لشکر اُتمان زئی کے عالم خاں تنگی کے محمود خاں، جلالہ کے رسول خاں کے ساتھ موضع ٹوٹئی کی طرف چلنے کی تیاری کی اور معمول کے مطابق دُعا کر کے روانہ ہوئے۔ وہاں سے کوچ کر کے منزل بہ منزل موضع ٹوٹئی میں داخل ہوئے۔ وہاں ایک مہینے کے قریب قیام فرمایا۔ ملکِ سوات اور سَمہ کے جو خوانین اور سردار آپ سے موافقت رکھتے تھے، وہ اپنی جمعیت لے کر اور سوات کا سردار انبالی خاں بھی اپنے لوگوں کے ساتھ وہیں حاضر ہوا۔

مشورہ ہوا کہ اُتمان زئی پر چھاپہ مارا جائے۔ آپ نے لوگوں کو تیاری کا حکم دیا اور فرمایا کہ ظہر کی نماز کے بعد میدان میں سب کمر باندھ کر ہتھیار لگا کر رخصت کے لیے حاضر ہوں جب سب مجاہدین میدان میں جمع ہو گئے، آپ تشریف لائے، نمازِ عصر پڑھائی اور بڑی گریہ و زاری کے ساتھ دُعا کی اور مصافحہ کر کے سب کو رخصت کیا۔

آئے۔ اب دیکھو، اللہ کیا کرتا ہے۔

عُلماء سے استفتاء یہ گفتگو سُن کر وُہ دونوں خان اس روز تو خاموش ہو گئے۔ کئی روز کے بعد ارباب بہرام خاں اور ارباب جُمعہ خاں وغیرہ کو لے کر پھر آپ کے پاس آئے اور یہ خبر لائے کہ دُرّانیوں کا لشکر دریائے کابل (لُنڈے) اُتر کر اُتمان زئی میں آیا ہے۔ اب آپ اس کا ضرور انتظام کریں ایسا نہ ہو کہ وُہ اس طرف کا رُخ کریں۔ یہ سُن کر آپ نے دُوسرے یا تیسرے دن اللّٰہ ڈنڈ کے عنایت اللہ خاں، خہر کے زید اللہ خاں، گھڑیالے کے محمود خاں، چارگلئی کے منصور خاں، نیز مولوی حبّان، تُورو کے مولوی عبدالرحمٰن، خہر کے مُلّا کلیم کو بُلایا۔ ان کے علاوہ اور جو عُلماء نزدیک تھے، ان سب کو جمع کیا اور عالم خاں اور رسُول خاں وغیرہ کی جلاوطنی کا حال سُنایا اور شروع سے اس وقت تک دُرّانیوں نے آپ کے ساتھ جو شرارتیں اور بغاوتیں کی تھیں، سب بیان کیں اور سب علماء سے اس امر میں فتوٰی طلب کیا کہ ان سے جہاد کرنا کیسا ہے۔ یہ لوگ باغی ہیں یا نہیں؟[1]

عُلماء میں اس مسئلے میں مختلف تقریریں رہی۔ آپ نے تُورو کے مولوی عبدالرحمٰن اور مولوی حبّان کو، جو اسی مُلک کے تھے، اپنی طرف سے مقرر فرمایا کہ آپ ان سے گفتگو کر کے اس کا تصفیہ کیجیے۔ آخر کچھ قیل و قال کے بعد اس پر اتفاق ہُوا کہ وُہ باغی ہیں، اُن سے لڑنا شرعاً دُرست ہے۔

ارباب بہرام خاں کی خیبر کی طرف روانگی جب تمام عُلماء نے متفق ہو کر اُن کی بغاوت کا فتوٰی دے دیا، تب آپ نے لوگوں سے مشورہ کیا کہ اب کیا کرنا چاہیے۔ آخر یہ تجویز ہُوئی کہ پچاس ساٹھ آدمیوں کے ساتھ ارباب بہرام خاں اور ارباب جمعہ خاں خیبر کی طرف روانہ کیے

[1] معلوم ہوتا ہے کہ سیّد صاحبؒ محض دو آدمیوں کی مدد کے لیے (جن کو اپنے مخالفین کی عداوت و ایذا رسانی سے ترکِ وطن کرنا پڑا تھا) لشکرِ اسلام کو حرکت دینے اور معرکۂ جہاد گرم کرنے کی ضرورت نہیں سمجھتے تھے۔ آپ کے سامنے یہ مقصد تھا کہ اُتمان زئی کی طرف کوچ کر کے پشاور کی طرف پیش قدمی کی جائے، جو مخالفت و ایذا رسانی اور صَدٌّ عَنْ سَبِیْلِ اللّٰہِ کا مرکز بن گیا تھا۔ اِسی کے لیے آپ کو ان دُرّانیوں کی بابت علماء و خوانین کا نقطۂ نظر معلوم کرنے اور اُن سے جہاد کرنے پر اتفاقِ رائے حاصل کرنے کی ضرورت پیش آئی اور اِسی منصُوبے کے پیشِ نظر اِس کی ضرورت تھی کہ خیبر کی طرف کے قبائل کو متحد و متفق کیا جائے تاکہ سردارانِ پشاور کو نہ اُن سے کمک حاصل ہو سکے، نہ کابل کی طرف سے کوئی مدد آ سکے۔

آٹھواں باب

اُتمان زئی کی جنگ

درّانیوں کے ستائے ہُوئے سردار | ایک روز ظہر میں موضع اُتمان زئی کے عالم خاں اور جلالہ کے رسُول خاں سیّد صاحبؒ کے پاس آئے اور اپنی جلاوطنی کا شکوہ کیا اور کہا کہ درّانیوں نے ہمارے گھر کا تمام مال و اسباب لُوٹ لیا اور ہمیں ہماری بستی سے نکال دیا۔ آپ ہمارا کچھ انتظام فرمائیں، آپ نے فرمایا کہ چند روز صبر کرو اور ٹھیرو۔ دیکھو، اللہ تعالیٰ کو کیا منظور ہے۔ تمھاری طرح چند لوگ اور بھی اُن کے ستائے اور جلاوطن کیے ہُوئے یہاں موجود ہیں، جیسے ارباب بہرام خاں اور ان کے بھائی ارباب جمعہ خاں وغیرہ۔ اس دشمنی اور ایذا رسانی کا سبب یہ ہے کہ جو لوگ لِلّٰہ فی اللّٰہ ہماری رفاقت کرتے ہیں اور ہم سے راہ و رسم رکھتے ہیں، اُن سے درّانیوں کو قلبی عداوت ہے۔ وہ سکھوں کے خیرخواہ اور معاون و مددگار ہیں یہاں تک کہ ہمارے جو قاصد یا غازی اِکّا دُکّا ہندوستان سے آتے ہیں، اُن کو بھی وہ طرح طرح کی ایذا دیتے ہیں اور اُنھوں نے وہاں کے سیٹھ ساہوکاروں کو روک دیا ہے کہ اُن کی ہُنڈیاں چلنے نہ پائیں۔ جب ہم لوگ پنجتار سے اس طرف کو آتے تھے، وہ ہمارے مقابلے کے لیے پانچ چھ ہزار آدمیوں کے ساتھ شاہ کوٹ[1] پر آکر جمع ہُوئے تھے۔ ہم نے مُقابلہ کرنا مناسب نہیں سمجھا۔ طرح دے کر چلے

---

[1] غالباً سنا کوٹ مراد ہے جیسا کہ گزر چکا۔

مُسلمان ہُوا ہوں، اگلی تمام عُمر میری یُوں ہی برباد ہُوئی۔ سیّد صاحبؒ نے فرمایا کہ مولوی صاحب اللہ کے فضل سے آپ ہمیشہ کے مُسلمان ہیں، مگر اس کی حقیقت کا آپ کو آج احساس ہُوا۔

مولوی حبّان صاحب اس کے بعد برابر سیّد صاحبؒ کی خدمت میں رہے۔ آپ نے اُن کو قاضی القضاۃ کا عہدہ بھی دیا۔ مردان کی جنگ میں شہید ہُوئے۔

○

حال بیان کرتے تھے اور آپ کبھی کبھی اصلاح فرمایا کرتے تھے۔ رنجک دن اور رات کو بھی اپنے اپنے ڈیروں پر اُڑاتے تھے۔ یہ قواعد کم و بیش ڈھائی تین مہینے رہی۔ قواعد لینے والوں نے ایک روز آپ سے بہت تعریف کی اور کہا کہ الحمدُ للہ، اب ہمارے ساتھی بہت مشاق اور ہوشیار ہو گئے ہیں۔ آپ نے فرمایا کہ انشاء اللہ کل صبح کو ہم بھی دیکھنے آئیں گے۔

آپ کے آنے کی خبر سُن کر مجاہدین خاص طور پر آراستہ ہو کر آئے اور خوب چُستی اور چالا کی کے ساتھ قواعد کرنے میں مشغول ہوئے۔ کچھ دن چڑھے جماعت کے پچاس، ساٹھ خاص آدمیوں کے ساتھ آپ وہاں تشریف لے گئے اور دیر تک قواعد کو ملاحظہ فرمایا اور کہا کہ بھائیو، اب دو دو، چار چار چوٹ بندوقیں بھر کر اسی پُھرتی کے ساتھ لگاؤ۔ لوگوں نے بندوقیں بھی چلائیں اور قرابینیں بھی لگائیں۔ آپ بہت خوش ہوئے۔ پھر آپ نے جنابِ الٰہی میں سب کے واسطے دعا فرمائی اور فرمایا کہ بھائیو، قواعد پر اعتماد نہ کرنا۔ فتح و شکست اللہ تعالیٰ کے دستِ قدرت میں ہے، قواعد پر موقوف نہیں ہے۔ اگر تم صرف عنایتِ الٰہی پر اعتماد کرو گے، تو اللہ تعالیٰ تمھیں قواعد والوں پر فتحیاب کرے گا۔ اب کل سے قواعد موقوف کرو جس کا دل چاہے، تنہا تنہا ہتھیاروں کی مشق کر لیا کرے۔

سرحد کا ایک مخلص عالم | شہر میں ایک روز کانڑا، غور بند کے باشندے مولوی سید محمد حبان صاحب، جو اس نواح کے ایک بڑے ذکی الطبع اور خوش تقریر عالم تھے، آئے اور عرض کیا کہ میں اپنے گھر سے بہت آسودہ حال ہوں، اللہ تعالیٰ نے روپیہ پیسہ بہت دیا ہے۔ میں آپ کی خدمت بابرکت میں صرف خدا کے لیے آیا ہوں۔ اگر آپ کی برکت کا اثر دل میں پاؤں گا، تو بیعت کروں گا۔ آپ نے فرمایا: آپ پہلے بیعت کر لیجیے، پھر انشاء اللہ برکت کا اثر بھی معلوم ہو جائے گا۔ انھوں نے بیعت کی اور آپ کے حکم سے نظام الدین اولیا، نے، جو ایک ناخواندہ آدمی تھے، اُن کو توجہ دی۔ مولوی سید محمد حبان صاحب نے توجہ کے بعد کہا کہ میاں نظام الدین ایک عامی آدمی ہیں اور مجھ کو لوگ عالم جانتے ہیں؛ سو اُن کی توجہ دینے سے مجھ کو وہ فائدہ ہوا کہ تمام عمر میں کبھی کسی سے نہ ہوا تھا، جیسے کسی اندھے کی آنکھیں کھل جاتی ہیں، اس وقت ایسا ہی میرا حال ہوا۔ میں نے اپنے دل میں جانا کہ میں از سرِ نو آج

اس کے علاوہ مولوی صاحب نے اور بھی کڑی کڑی باتیں کیں اور وہاں سے سوار ہو کر سید صاحبؒ کے پاس آئے اور جو کچھ ونیٹورہ سے گفتگو ہوئی تھی، آپ کے سامنے دُہرائی۔

ونیٹورہ کی پسپائی | اگلے روز آپ نے مولوی صاحب ممدوح کو تین سو مجاہدین پر امیر کر کے فرمایا کہ تم پنجتار کے درے کا بندوبست کرو اور وہیں اُترو۔ اوّل تو انشاء اللہ تعالیٰ مقابلے کی نوبت ہی نہ آئے گی اور اگر آئی، تو کچھ اندیشہ نہیں، اللہ تعالیٰ ہمارے ساتھ ہے اور ہم بھی وہیں آجائیں گے پھر آپ نے دُعا کر کے مولوی صاحب کو روانہ کیا۔ مولوی صاحب گئے اور اس درے سے باہر نکل کر میدان میں ڈیرہ کیا۔ وہاں سے کوئی ڈھائی کوس کے فاصلے سے ونیٹورہ کی فوج پڑی تھی۔ نکلیوں کی زبانی ونیٹورہ کو اطلاع ملی کہ سید صاحبؒ کا لشکر درے سے نکل کر میدان میں آگیا ہے اور اس نے درے کا بخوبی انتظام کر لیا ہے۔ اس کو اندیشہ ہُوا کہ ایسا نہ ہو کہ وُہ رات کو ہم لوگوں پر شبخون ماریں اس خیال سے اُس نے بھی خوب بندوبست کیا۔ موضع صوابیؔ اور مانیریؔ کے جو لوگ ونیٹورہ کے خوف سے پنجتار کو چلے آئے تھے اور کچھ ادھر اُدھر پہاڑ پر چڑھ گئے تھے، جب اُن کو معلوم ہُوا کہ مجاہدین کا لشکر درے کے میدان میں اُترا ہے، اُن کو تسلی ہُوئی اور جا بجا سے سوار و پیادہ اپنے گھروں کی خبر گیری کو چلے۔ ونیٹورہ کی فوج کا شبینہ اس وقت گشت کر رہا تھا۔ اُن لوگوں کو دُور سے دیکھ کر ونیٹورہ کو جا کے خبر کی کہ خلیفہ کا چھاپہ آپہنچا ہے، ہوشیار ہو جاؤ۔ یہ خبر سُن کر ونیٹورہ بدحواس ہو گیا۔ جو کچھ اسباب فوراً لیا گیا، وُہ لے لیا اور باقی ڈیرہ، خیمہ، سلاح و اسباب چھوڑ کر مع فوج فرار ہو گیا اور دریائے اٹک عبور کر کے پنجاب کی سرحد میں پہنچ گیا۔

قلعۂ اٹک پر مُہم | خیر الدین نامی ایک شخص بہت عرصے سے قلعۂ اٹک[1] سے آپ کے پاس آیا کرتا تھا اور آپ سے کہتا تھا کہ قلعے کے بہت سے مسلمان یکدل اور متفق ہیں، اس قلعے کا بندوبست و انتظام ہمارے ہی سپرد ہے۔ اگر آپ سو پچاس مُجاہدین یہاں سے روانہ کریں، تو ہم اُن کو قلعے کے اندر داخل کر دیں گے۔ اگر آپ کے یہاں سے ہتھیار اور اسلحہ کے لیے کچھ خرچ بھی مل جائے، تو اَور لوگوں کو بھی ہم

[1] قلعۂ اٹک پنجاب کا پھاٹک ہے۔ اگر اس پر مُجاہدین کا قبضہ ہو جاتا، تو گویا پنجاب کا راستہ صاف ہو جاتا۔

موافق کرلیں گے'' اسی طرح کی باتیں وُہ اکثر آ کے کرتا تھا۔ آخر آپ نے بمبئی والے امام الدین کو اور دو اور آدمیوں کو خیرالدین کے ساتھ وہاں کا حال دریافت کرنے کے لیے ہمراہ کر دیا۔ وُہ تینوں شخص آٹھ دس روز وہاں جا کر رہے اور وہاں کا حال دیکھ کر آئے اور خیرالدین کے بیان کی تصدیق کی۔ کئی بار آپ نے امام الدین کو بھیجا اور وہ وہاں کئی کئی روز رہ کر آئے۔ جب آپ کو اطمینان ہو گیا، تو آپ نے اسلحہ کی خریداری اور تیاری کے لیے پانچ سو روپے دیے اور فرمایا کہ جب تم وہاں کا انتظام خاطر خواہ کر کے آؤ گے، تو جتنے آدمی کہو گے، ہم تمھارے ساتھ کر دیں گے۔ گڑھی امان زئی میں خیرالدین آیا اور عرض کی کہ مَیں سب انتظام کر کے آیا ہُوں، وہاں سپاہی اور رعایا ملا کر پانچ سو آدمیوں کے قریب مَیں نے متفق کیے ہیں اور جن لوگوں کے پاس ہتھیار نہیں ہیں، اُن کے لیے ہتھیار بھی خرید لیے ہیں اور رسّوں کی کئی سیڑھیاں بھی بنا کر رکھ آیا ہوں اور اپنے بھائی اور سیّد جمیل شاہ، اُن کے بہنوئی سیّد محبوب شاہ، فتح میر خاں اور اُن کے بھائی منگا خاں، محمود خاں، قادر بخش اور محمد بخش سے کہ آیا ہُوں کہ تم سب بارات لانے کے بہانے سے فلاں دن رات کو قلعے سے نکل کر دریا کے کنارے فلاں وقت فلاں جگہ آنا، مَیں وہیں مجاہدین کو لے کر آؤں گا۔ سو آپ لوگوں کو بھیجنے کا انتظام فرمائیں۔

آدمیوں کا انتخاب اور روانگی یہ سُن کر آپ نے لشکر سے ساٹھ ستر اچھے اچھے، چُست، چالاک اور کارآزمودہ جوان انتخاب کیے اور ارباب بہرام خاں کو امیر کیا اور فرمایا کہ اُن کے بعد حاجی بہادر شاہ خاں امیر ہیں، اُن کے بعد امام خاں، اُن کے بعد جس کو لوگ اتّفاق کر کے امیر بنا دیں، وُہ امیر ہے اور اخوند ظہور اللہ صاحب[1] کو، جو اِس مُلک کے واقف کار تھے، رہبر کیا۔ چنانچہ آپ کی ہدایت کے مطابق سب مُقرر جگہ پر جمع ہُوئے۔ آدھی رات کے قریب اخوند صاحب سب کو لے کر وہاں سے روانہ ہُوئے۔ موضع خلبٹ کے اِسی طرف دو کوس ایک نالے پر فجر ہو گئی۔ دن بھر سب لوگ وہیں اِدھر اُدھر چھپے رہے، رات کو عشا کے بعد وہاں سے چلے اور جہانگیرہ کے گھاٹ پر پہنچے۔ اس وقت فتح شیر خاں، سیّد جمیل شاہ، سیّد محبوب شاہ، محمود اور قادر بخش وہاں بیٹھے انتظار کر رہے تھے۔ دریا اُترنے کے لیے جالے باندھنے کی

---

[1] اخوند ظہور اللہ صاحب جہانگیرے کے رہنے والے تھے، جو قلعۂ اٹک کے سامنے ہے۔

تدبیر ہونے لگی۔

قلعہ دار کو اطلاع اسی عرصے میں شتنائی پر سوار ہو کر محمد بخش اُس پار سے ادھر آئے اور کہا کہ وہاں تو معاملہ بگڑ گیا، اب یہاں سے پلٹ چلو۔ خیرالدین نے پوچھا کہ کیا قصّہ ہے؟ محمد بخش نے کہا کہ فلاں پنجابی جو ہم لوگوں کے مشورے میں شریک تھا، اُس نے جاکر لالہ خزانہ مل قلعہ دار سے کہا کہ تمھارے فلاں فلاں ملازم جو آج بارات لانے کو تم سے پوچھ کر گئے ہیں، وُہ سیّد بادشاہ کے چھاپے کو لینے گئے ہیں تم ہوشیار ہو جاؤ۔ قلعہ دار نے یہ بات سُن کر اُس سے کہا کہ تو دیوانہ ہے، سیّد بادشاہ کا چھاپہ لانے کی کیا غرض؟ وُہ ہمارے نمک حلال اور معتبر ملازم ہیں، اُن سے ایسی حرکت ہرگز نہ ہوگی۔ اس نے کہا کہ میں سچ کہتا ہوں، دو چار گھڑی میں اپنی آنکھوں سے دیکھ لینا۔ اگر اس میں فرق ہو، تو آپ مجھ کو توپ سے اُڑا دیجیے گا۔ اس غرض سے اُنھوں نے بہت سے ہتھیار بھی خریدے ہیں اور رسّی کی کئی سیڑھیاں بھی بنائی ہیں۔ اگر یہ سامان اُن کے گھر میں سے نکلے، تب تو مجھے سچا جانو گے اور اس خیرخواہی کا انعام دو گے؟

خادی خاں کی مخبری اس عرصے میں خادی خاں کا ایک آدمی آیا اور قلعہ دار سے کہا کہ ہمارے سردار خادی خاں کو کسی کی زبانی خبر ملی ہے کہ سیّد بادشاہ کا چھاپہ مُلک چھچھ میں جاتا ہے، تمھارے پاس مُجھ کو اسی اطّلاع کی غرض سے بھیجا ہے۔ یہ حال سُنتے ہی قلعہ دار کو پنجابی کی تمام باتوں کا یقین ہُوا اور اُس کے ساتھ اپنے چند آدمیوں کو بھیجا کہ فلاں فلاں شخص کے گھر کی تلاشی لو اور اُن لوگوں کو جلد تلاش کر کے لاؤ۔ یہ خبر سُن کر میں تو وہاں سے چل دیا کہ ایسا نہ ہو کہ میں بھی گرفتار ہو جاؤں۔ یہ خبر سُن کر ارباب بہرام خاں مع مجاہدین وہاں سے روانہ ہو گئے اور امازئی کی گڑھی میں آپ کے پاس آئے اور محمد بخش نے وہ سارا ماجرا آپ کے گوش گزار کیا۔ آپ کو بہت افسوس ہُوا اور اس کی فکر ہوئی کہ وہاں کے باقی مسلمانوں کے ساتھ وُہ قلعہ دار کس طرح پیش آئے اور ان کے ساتھ کیا سلوک کرے۔

کئی دن کے بعد خیرآباد سے ایک شخص خیرالدین کے پاس آیا اور اُس نے بتلایا کہ قلعہ دار نے مکانوں کی تلاشی لی، اُن میں سے ہتھیار اور سیڑھیاں نکلیں۔ اُس نے تمھاری عورتوں اور لڑکوں کو گرفتار کر لیا اور تمھارے بھائی کو توپ سے اُڑا دیا۔

بعد میں منگا خاں قلعے سے بچ کر نکل آئے۔ عورتوں اور بچوں کی اس طرح مُخلصی ہُوئی کہ دِنیٹورؔ فرانسیسی قلعۂ اٹک میں آیا اور سب حال معلوم کر کے کہا کہ جنھوں نے وُہ فساد کیا تھا، وہ تو تمھارے ہاتھ نہ آئے، ان بیچاروں نے کیا قصور کیا ہے؟ ان کو چھوڑ دو۔ قلعہ دار نے سپاہیوں سے کہا کہ ان کو یہاں سے نکال کر دریا کے پار اُتار دو۔ جہاں چاہیں، چلے جائیں۔ وہ سب دریا سے اُتر کر اکوڑہ چلے گئے۔ وہاں سے پنجتار آگئے۔

بارھواں باب

علما اور خوانین کا دوبارہ اجتماع اور نیا عہد و پیمان

مسلمانوں کی نااتفاقی کا شکوہ | گڑھی امازئی سے پنجتار تشریف لانے کے چھ سات دن بعد سیّد صاحبؒ نے مولانا محمد اسمٰعیل، سیّد احمد علی، ارباب بہرام خاں، مولوی محمد حسن اور فتح خاں پنجتاری کو بلایا اور خانِ موصوف کی طرف مخاطب ہو کر فرمایا کہ خان بھائی، ہم نے تم کو اس مشورے کے واسطے بلایا ہے کہ ہم لوگ اس ملک میں صرف جہاد فی سبیل اللہ کے واسطے آئے ہیں اور مسلمانوں کی ریاست سمجھ کر یہاں فقط اس نیت سے اترے ہیں کہ سب مسلمان بھائیوں کے اتفاق سے کچھ دینِ اسلام کا کام درست ہو اور یہاں کے مسلمان بھائیوں کی نااتفاقی کا یہ حال ہے کہ اگر ہم کفّار کے زیر کرنے کی کوئی صورت نکالتے ہیں، تو انھیں مسلمانوں میں سے ایک نہ ایک حامی بن کر آڑے آتا ہے اور ان کو خبر کر دیتا ہے۔ چنانچہ شیدو کی لڑائی، جس میں اسّی نوّے ہزار آدمی ہماری طرف جمع تھے، سردار یار محمد خاں کی شرارت سے شکست ہو گئی اور مسلمانوں کی جمعیّت پراگندہ ہوئی۔ اسی طرح سے خادی خاں نے چند مہینوں سے کیسی کیسی بیجا حرکتیں کرنی شروع کی ہیں۔ چنانچہ تم کو خود معلوم ہے کہ جو غازی ہندوستان سے جہاد فی سبیل اللہ کا ارادہ کر کے آتا ہے، سکھوں کے ملک سے زندہ سلامت چلا آتا ہے، مگر ان کے ہاتھ سے کسی طرح نہیں بچتا۔ کسی کو لوٹ کر دریائے سندھ میں غوطے دیتے ہیں، کسی کا مال واسباب

چھین کر بزورِ بخشواتے ہیں۔ سردار اشرف خاں مرحوم پر انھوں نے محض اس وجہ سے فوج کشی کی کہ وہ خانِ مرحوم ہم سے موافق تھا۔ اس کے بعد یہ فساد کیا کہ ونیٹورہ فرانسیسی کو چڑھا لائے۔ اُنھوں نے اپنی طرف سے حتی المقدور کچھ درگزر نہیں کی، مگر اللہ تعالیٰ نے اپنی مدد سے اُس کو دفع کیا۔ اس کے بعد ایک تازہ فساد یہ کیا کہ اِدھر سے اٹک پر ہمارا چھاپہ چلا، اُدھر سے خادی خاں نے اپنا آدمی بھیج کر وہاں کے قلعہ دار کو خبر کر دی ایسی طرح اور بھی بہت فساد اُس نے کیے ہیں اور ابھی دیکھا چاہیے، اَور کیا کیا فساد کرے۔ اس نے جو شرارتیں ہمارے ساتھ کی ہیں، اُس کی کدُورت ہمارے دل میں بالکل نہیں ہے۔ جو کچھ اُس نے کیا، اپنے واسطے کیا۔ جو جیسا کرے گا، اپنے واسطے کرے گا مقصود یہ ہے کہ اب کوئی ایسی تدبیر کرو کہ مسلمانوں میں اتفاق ہو، جس کے سبب سے اللہ تعالیٰ کا کام نکلے اور دینِ اسلام کی کچھ ترقی ہو۔

اجتماع کی تجویز و انتظام فتح خاں نے عرض کیا کہ میری ناقص رائے میں یہ آتا ہے کہ آپ مُلک سمہ کے سادات، عُلما، اور خوانین کو جمع کریں اور یہی بات ان کو سمجھائیں۔ ان سب نے آپ کے دستِ مبارک پر بیعت کی ہے اور آپ کو امیر المؤمنین تسلیم کیا ہے۔ انشاء اللہ تعالیٰ آپ کے فرمانے سے کوئی باہر نہ ہوگا، اس لیے کہ آپ تو صرف اللہ کے واسطے یہ تدبیر کرتے ہیں، اس سے آپ کی کوئی غرض متعلق نہیں۔ اور جو کوئی نہ مانے گا اور بد عہدی کرے گا، وہ اس کی سزا اپنے خدا سے پائے گا۔

فتح خاں کی یہ تدبیر سب کو پسند آئی اور اسی پر مشورہ قرار پایا۔ سیّد صاحبؒ نے فرمایا کہ خان بھائی، تم یہاں کے رئیس ہو، ہماری طرف سے آپ ہی سب کو بلاؤ۔ خانِ ممدوح نے اپنے آدمی ہر طرف یہ پیام دے کر روانہ کیے کہ ایک ضروری دینی کام کا مشورہ کرنا ہے، سب صاحب یہاں تشریف لائیں۔ مقررہ تاریخ میں تمام سادات، عُلما، اور خوانین پنجتار میں جمع ہوئے تمام لوگ دس گیارہ سو تھے۔ اس روز پنجتار کی پانچوں بستیوں والوں نے اُن کی دعوت کی اور اپنے مکانوں میں اُن کو اُتارا۔ مغرب کی نماز کے بعد سیّد صاحبؒ نے عبد القیومؒ کو فرمایا کہ صبح طلوع

آفتاب سے پہلے کھانا پک کر تیار ہو جائے اور مولانا محمد اسمٰعیل صاحب کو اہتمام پر مقرر کیا۔ دُوسرے دن جب سب لوگ کھانا کھا کر فارغ ہوئے، تو مولانا نے فرمایا کہ آج جُمعے کا دن ہے، سب بھائی نالے پر شیشم کے درختوں کے نیچے ہماری مسجد میں جمعے کی نماز پڑھیں۔ قاضی احمد اللہ صاحب میرٹھی نے خطبہ پڑھا اور سید صاحبؒ نے نماز پڑھائی۔

سید صاحبؒ کی تقریر: آمد کا مقصد

نماز پڑھ کر سید صاحبؒ کھڑے ہوئے اور فرمایا کہ سب بھائی اپنی اپنی جگہ پر بیٹھے رہیں۔ جو کچھ ہم کہیں، توجّہ سے سُنیں۔ آپ نے منگل تھانہ کے کامل آخون زادے کو، جو بڑے سیاح، جہاں دیدہ، پنجابی، پشتو، فارسی، تُرکی اور ہندی کے ترجمان اور بڑے بزرگ آدمی تھے، حرمین اور بیت المقدس کی زیارت سے مشرف ہو چکے تھے اور آپ کے مُرید اور بڑے مُعتقد تھے، اپنے برابر کھڑا کیا اور فرمایا کہ جو کچھ میں کہوں، تم اِن بھائیوں کی زبان میں اُن کو سمجھاتے جاؤ۔ آپ نے اوّل اللہ تعالیٰ کی شانِ عظمت اور قُدرت کو طرح طرح سے بیان کیا۔ اس کے بعد سب کی طرف مخاطب ہو کر فرمایا کہ آپ سب اس بات کو خُوب جانتے ہیں کہ دُنیا میں لوگ اپنی معاش اور میراث حاصل کرنے میں کیسی کیسی کوششیں اور جانفشانی کرتے ہیں اور اس رنج کو راحت جان کر ہرگز نہیں گھبراتے، فقط اس خیال سے کہ اگر وہ معاش و میراث ہاتھ آ جائے گی، تو چین سے کھائیں گے اور یہ امرِ موہوم ہے۔ اگر یہ امر خواہش کے موافق حاصل ہُوا، تو خیر؛ نہیں تو کچھ نہیں۔ لیکن جہاد فی سبیل اللہ سے، جو دین کی دولت ہے، اس کی وجہ سے دُنیا و آخرت کی فلاح، اسلام کی ترقی اور اللہ تعالیٰ کی رضامندی حاصل ہوتی ہے۔ لوگ غافل ہیں۔ مُجھ کو جنابِ باری تعالیٰ سے ارشاد ہُوا کہ تُو دارُالحرب ہندوستان سے ہجرت کر کے دارُالامن میں جا اور کفّار سے جہادِ فی سبیل اللہ کر۔ مَیں نے ہندوستان میں خیال کیا کہ کوئی جگہ ایسی مامون ہو کہ وہاں مسلمانوں کو لے کر جاؤں اور جہاد کی تدبیر کروں۔ باوجُود اس وسعت کے کہ صدہا کوس میں مُلکِ ہند واقع ہُوا ہے، کوئی جگہ ہجرت کے لائق خیال میں نہ آئی۔ کِتنے لوگوں نے صلاح دی کہ اِسی مُلک میں جہاد کرو۔ جو کچھ مال، خزانہ، سلاح وغیرہ درکار ہو، ہم دیں گے، مگر مجھ کو منظور نہ ہُوا، اس لیے

کہ جہاد سُنّت کے موافق چاہیے، بلوہ کرنا منظور نہیں ہے۔ تمھارے اس مُلک کے ولایتی بھائی بھی یہاں حاضر تھے۔ اُنھوں نے کہا کہ ہمارا مُلک اس کے واسطے بہت خُوب ہے۔ اگر وہاں چل کر کسی مُلک میں قیام اختیار کریں، تو وہاں کے لاکھوں مسلمان جان و مال سے آپ کے شریک ہوں گے خصُوصًا اس سبب سے کہ رنجیت سنگھ والئ لاہور نے وہاں کے مسلمانوں کو نہایت تنگ کر رکھا ہے، طرح طرح کی ایذا پہنچاتا ہے اور مُسلمانوں کی بے آبروئی کرتا ہے۔ جب اُس کی فوج کے لوگ اس مُلک میں آتے ہیں، مسجدوں کو جلا دیتے ہیں، کھیتیاں تباہ کرتے ہیں، مال و اسباب لُوٹ لیتے ہیں، بلکہ عورتوں بچوں کو پکڑلے جاتے ہیں اور اپنے مُلک پنجاب میں جا کر بیچ ڈالتے ہیں۔ اور پنجاب میں وُہ مسلمانوں کو اذان بھی نہیں کہنے دیتے، مسجدوں میں گھوڑے باندھتے ہیں، گاؤکُشی کا تو کیا ذِکر، جہاں سُنتے ہیں کہ کسی مُسلمان نے گائے ذبح کی، اُس کو جان سے مار ڈالتے ہیں۔

یہ سُن کر میرے خیال میں آیا کہ یہ سچ کہتے ہیں اور یہی مناسب ہے کہ ہندوستان سے ہجرت کر کے وہیں چل کر ٹھیریں اور سب مسلمانوں کو متفق کر کے کُفّار سے جہاد کریں اور اُن کے ظُلم سے مسلمانوں کو چھُڑائیں۔ سو محض اسی ارادے سے تمھارے اس مُلک میں ہم آئے ہیں۔ تم سب نے اللہ تعالیٰ کے واسطے میرے ہاتھ پر امامت کی بیعت کی، اپنا امام گردانا اور تمھیں سب نے جہاد کا کام مجھ سے شروع کرایا۔ اب تمھیں لوگ اس میں کوشش اور تندہی نہیں کرتے، بلکہ تمھیں لوگوں میں سے بعض بعض اس امر میں حارج ہوتے ہیں۔ تم عالِم اور وارثُ الانبیاء کہلاتے ہو۔ تم کو لازم ہے کہ سب مِل کر اس میں کوشش اور جانفشانی کرو کہ اسلام کی ترقی ہو۔

تقریر کی تاثیر اس وقت آپ کے کلام میں عجیب رقّت اور تاثیر تھی۔ آپ کی آنکھوں سے آنسو جاری تھے اور طبیعت میں حمیّتِ اسلام کا ایک جوش تھا۔ بڑی فصاحت و بلاغت کے ساتھ آپ تقریر فرماتے تھے اور طرح طرح کی مثالوں سے سمجھاتے تھے۔ جو لوگ وہاں حاضر تھے، کیا عالِم اور کیا عامی سب پر ایک حال ساواقع تھا، بلکہ بعض بعض گویا اپنی ہستی سے گزر گئے تھے۔ بعض لوگ روتے تھے اور بعض غمزدہ سے عالمِ سکوت میں تھے۔ پھر آپ نے دُعا کی اور فرمایا کہ باقی جو کچھ گفتگو مولانا اسمٰعیل صاحب

اس امر میں کریں، وُہ سُنیئے اور اس کا جواب دیجیے۔ مَیں تو اس وقت مکان پر جاتا ہُوں۔

مولانا اسمٰعیل صاحب کی گفتگو اور حکیمانہ مثال

یہ فرما کر آپ رُخصت ہُوئے اور مولانا ان صاحبوں میں بیٹھے اور ان سے امام کی اطاعت کے بارے میں گفتگو شروع کی اور یہ مثال بیان کی کہ ایک بادشاہ نے اپنے ملازمین میں ایک شخص کو افسر بنایا اور اپنے ملازمین کی ایک جماعت سے فرمایا کہ فلاں مہم پر اسی کے ساتھ جاؤ۔ اور جو کچھ یہ افسر تم سے ہمارے احکام کی تعمیل کے واسطے کہے، بلا انکار بجالاؤ۔ اس مہم پر اس کو جماعت کے ساتھ روانہ کیا۔ اس افسر نے وہاں جاکر اس جماعت سے ایک کو افسر کیا اور چند لوگ اس کے ساتھ گئے اور اُن سے کہا کہ بادشاہی احکام کی تعمیل کے واسطے یہ افسر جو کچھ تم سے کہے، بے تامّل اس کو کرنا۔ اس نے وہاں جاکر اپنے لوگوں میں ایک کو افسر کیا اور کئی شخص اس کے تابع کیے اور اُن سے کہا کہ شاہی کام کی درستی کے واسطے یہ شخص جو حکم کرے، بلا انکار بجالانا اور کسی کام پر اُن کو روانہ کیا۔ اگر ان لوگوں میں سے بعضوں نے ان افسروں کی نافرمانی کی اور اُن کے حکم کے خلاف کام کیا۔ اگر وُہ اپنے زعم میں یہ سمجھیں کہ ہم نے تو بادشاہ کی حکم عدولی نہیں کی؛ اگر کی، تو اس افسر کی کی، تو کیا کوئی عاقل صاحب تمیز تسلیم کرے گا کہ انھوں نے بادشاہ کی نافرمانی نہیں کی، ان افسروں کی کی، اس لیے کہ افسر کو اس بادشاہ نے اپنی طرف سے مختارِ کار کیا تھا اور اس کی اطاعت کا سب کو حکم دیا تھا اور اس نے اپنی طرف سے اسی کے حکم کی تعمیل کے واسطے دوسرے کو افسر کیا اور اس دُوسرے نے تیسرے کو۔ اسی طرح پر سلسلہ جہاں تک چلا جائے حقیقت میں حاکم ایک ہے اور حکم بھی ایک ہے۔ جنھوں نے ان افسروں کی اطاعت کی، فی الحقیقت اسی بادشاہ کی کی؛ اور جنھوں نے ان افسروں کی نافرمانی کی، تو اس بادشاہ کی کی؛ اور ان افسروں کے مُطیع بادشاہ کے مطیع ہیں، اور اس بادشاہ کے نزدیک وُہ شاباشی کے لائق اور خلعت و انعام کے مستحق ہیں؛ اور وہ جو ان افسروں کی نافرمانی میں ہیں، وُہ حقیقت میں اس بادشاہ کے نافرمان ہیں اور اس کے نزدیک لائق ملامت اور سزاوارِ تعزیر ہیں۔ سو مَیں سب علماءِ دین کی خدمت بابرکت میں عرض کرتا ہوں کہ جو مَیں نے یہ مثال بیان کی ہے، وہ بجا ہے یا بیجا؟ اس کا جو کچھ جوابِ باصواب

ہو، ارشاد فرمائیں۔

مولانا کا استفسار یہ پُوری تقریر کامل اخوندزادے نے ان سب عالموں کی زبان میں سمجھائی۔ ان سب نے مولانا صاحب کو داد دی اور کہنے لگے سُبحان اللہ! آپ نے خُوب مثال بیان فرمائی اور حقیقت یہی ہے کہ ان افسروں کے مطیع بادشاہ کے مطیع اور بخشش اور انعام شاہی کے لائق ہیں اور جنھوں نے اِن افسروں کی نافرمانی کی، وُہ بادشاہ کے نافرمان اور تعزیر و عذاب کے مستحق ہیں۔ اس میں کچھ شک و شُبہ نہیں۔

اخوندزادے نے افغانی علمار کے جواب کا ہندوستانی میں ترجمہ کیا۔ مولانا صاحب نے فرمایا کہ ان سب بھائیوں نے اِس مثال کو پسند کیا اور ان مطیعوں کے انعام اور نافرمانوں کے عذاب کے مُعترف ہوئے۔ اب ہمارا سوال ان سے یہ ہے کہ اس کا جواب سوچ سمجھ کر دیں کہ جب دُنیاوی بادشاہ کے تابعدار و نافرمان اُن کے نزدیک انعام و سزا کے لائق ہیں اور اللہ تعالیٰ قرآن مجید میں فرماتا ہے: يَاأَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا أَطِيعُوا اللَّهَ وَأَطِيعُوا الرَّسُولَ وَأُولِي الْأَمْرِ مِنْكُمْ (النساء، ۵۹)

یعنی، اے ایمان والو، اللہ کی اطاعت کرو اور اُس کے رسُول کی اطاعت کرو اور تم میں سے جو صاحبِ حکومت ہیں اُن کی بھی اطاعت کرو، اور مُسلمان حاکم قاضی مُفتی اور امامِ جہاد ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے امیرالمومنین سیّد احمد صاحب کو امامِ زماں اور ہادیٔ دوراں کیا ہے اور آپ سب عُلمارِ کرام اور ساداتِ عظام اور خوانین ذوی الاحترام نے اُن کے دستِ مبارک پر بیعت کی ہے۔ اب جو کوئی بیعت کرنے اور اپنا امام تسلیم کرنے کے باوجود اُن کی اطاعت نہ کرے، بلکہ اُس کے خلاف عمل کرے، تو آپ سب عُلمارِ دین کے نزدیک اُس کا حُکم کیا ہے؟

عُلمار کا اقرار یہ تمام گفتگو اخوندزادہ نے اُن کی زبان میں سمجھائی۔ سب نے اِقرار کیا کہ وُہ شخص مُجرم اور عِنداللہ اور عِندالنّاس قصُوروار ہے۔ مولانا نے فرمایا کہ وُہ مُجرم اور قصُوروار کیسا؟ وُہ صاف صاف باغی ہے۔ اگر اپنی بغاوت اور نافرمانی سے تائب نہ ہو، تو اس پر جہاد ہے۔ امام کی بغاوت اور نافرمانی کا یہ مسئلہ اپنی فلاں فلاں فقہ کی کتاب میں فلاں باب اور فلاں فصل میں نکال کر دیکھیے۔ وُہ

کتابیں ان علماء کے پاس وہیں موجود تھیں، سب نے دیکھ کر عرض کیا کہ آپ حق فرماتے ہیں۔ بیشک یوں ہی ہے۔

اس کے بعد مولانا نے ایک بڑے سے کاغذ میں اپنی وہی تقریر بطور سوال لکھ کر فرمایا کہ اس پر اپنی اپنی کتاب کی عبارت اور دلیل لکھ کر مُہر اور دستخط کر دیجیے۔ سب نے آپ کے سوال کے موافق جواب تحریر کرکے اپنی اپنی مُہر ثبت کی اور جن کے پاس مُہر نہ تھی، انھوں نے دستخط کیے اور وہ کاغذ مولانا کو دے دیا۔ آپ نے ان سب کے جواب کو دیکھ کر فرمایا کہ جن کتابوں کی یہ عبارتیں لکھ کر آپ نے مُہر دستخط کیے ہیں، یہ کتابیں تو مدّت سے پڑھی ہیں اور ان مسائل کے آپ پُرانے عالم ہیں، یہ کتابیں آپ نے آج نہیں پڑھی ہیں۔ کئی سال کا عرصہ گزرا کہ حضرت امیرالمومنین آپ کے اس مُلک میں جہاد فی سبیل اللہ کے واسطے تشریف لائے اور آپ سب نے اُن کو اپنا امام مانا۔ یہاں کے رُؤسا اور بے علم خوانین بغاوت سے اس کارِ خیر میں طرح طرح کی شرارتیں کرتے ہیں اور کافروں کے شریک ہیں۔ آپ لوگ عُلماءِ دین اور وارثُ الانبیا کہلاتے ہیں اور آپ ہی کا اس مُلک میں غلبہ ہے۔ دین کے معاملے میں سب خان اور رئیس آپ کے مُحتاج اور فرماں بردار ہیں۔ آپ نے اب تک اُن لوگوں کو اس مسئلے سے آگاہ نہ کیا۔ سارا قصُور و غفلت آپ ہی کی ہے اور آپ سب واجب التعّزیر ہیں۔ اگر آپ لوگ حق پوشی نہ کرتے اور اُن کو خدا و رسُول کا حُکم صاف صاف سُناتے اور سمجھاتے رہتے، تو بغاوت کی نوبت کیوں آتی؟ اب آپ سب مِل کر خُوب سوچ سمجھ کر معقُول جواب ارشاد فرمائیں۔

مولانا کی یہ تقریر سُن کر ہر ایک عالِم نے اپنا اپنا عُذر بیان کیا اور اپنی خطا اور غفلت کا اعتراف کیا کہ بیشک ہم سب اس امر میں خطا وار ہیں اور ہمیں سے غفلت ہوئی اور بے شبہ ہمیں لوگوں کا یہاں غلبہ ہے، مگر اب ہم اپنی خطا سے توبہ کرتے ہیں، اللہ تعالیٰ اس کا ہم سے مواخذہ نہ فرمائے، آپ بھی ہماری خطا معاف کریں، اب ہم اِس کارِ خیر میں آپ کے ساتھ شریک ہیں۔ ہر ایک کے سمجھانے میں حتی الامکان تساہل و تغافل نہ کریں گے، وعظ و نصیحت سے راہِ راست پہ

لائیں گے اور جو نہ مانے گا، وہ اپنی بغاوت کی سزا پائے گا۔

خادی خاں کو تفہیم اس کے بعد مولانا نے دُعاءِ خیر فرمائی۔ خادی خاں بھی اس مجلس میں شریک تھا۔ وُہ دُعا میں شریک نہیں ہُوا۔ ناخوش ہو کر اُٹھ گیا۔ اس عرصے میں عصر کی اذان ہُوئی۔ سیّد صاحبؒ اپنے مکان سے تشریف لائے اور نماز پڑھائی۔ نماز کے بعد جو علما، و خوانین نزدیک نزدیک کے تھے، آپ سے رُخصت ہو کر اپنی بستیوں کو گئے۔ باقی، جو دُور دُور کے تھے، وُہ رہ گئے۔ کامل آخوندزادہ نے مولانا اور عُلما کا سارا مکالمہ آپ کے سامنے نقل کیا اور یہ بھی کہا کہ خادی خاں دُعا کے وقت اُٹھ گیا اور دُعا میں شریک نہیں ہُوا۔ سب حال سُن کر حضرت بہت خوش ہُوئے مگر خادی خاں کا حال سُن کر ملُول ہُوئے کہ بڑے افسوس کی بات ہے کہ ایسا دانا اور ہوشیار شخص جو ہمارے انصارِ سابقین میں سے ہے، اُسی نے بغاوت میں سبقت کی۔ پھر اُسی روز نمازِ مغرب کے بعد آپ نے خادی خاں کو بلوایا اور جو عُلما، وہاں موجود تھے، اُن کے بیچ میں بٹھایا اور سمجھانا شروع کیا کہ خان بھائی، تمھیں نے ہم لوگوں کو اِس مُلک میں ٹھیرایا تھا اور تمھیں سب سے پہلے ہمارے انصار بنے اور آج اس مجلسِ عُلما کے مشورے سے منحرف ہو کر اُٹھے۔ یہ بات تمھاری دانشمندی سے نہایت بعید ہے۔ تم کو لازم تھا کہ اور کوئی منحرف ہو کر اٹھتا، اُس کو تم سمجھاتے، نہ یہ کہ تم ہی نے اس میں سبقت کی۔ تم کو لائق ہے کہ جس بات پر علما، نے اِتّفاق کیا ہے، اس سے اختلاف نہ کرو۔ اس میں تمھاری دین و دُنیا دونوں کی بہتری ہے اور اس کے خلاف میں دُنیا و عُقبیٰ دونوں کی خرابی ہے۔ یہ ہم تمھاری خیر خواہی کی راہ سے کہتے ہیں۔ آگے ماننے، نہ ماننے کا تمھیں اختیار ہے۔

خادی خاں کا متکبرانہ جواب خادی خاں نے اس کا جواب دیا کہ حضرت ہم تو پٹھان لوگ ہیں، ریاست ہمارا کام ہے۔ یہ مشورہ مُلّانوں نے مِل کر کیا ہے۔ یہ لوگ ہمارے یہاں اِسقاط اور خیرات کے کھانے والے ہیں، ریاست کے معاملات کا اُن کو کیا شعور؟ اُن کا مشورہ، جو ہمارے ذہن میں آتا ہے، اُس کو ہم تسلیم کرتے ہیں اور جو ہماری سمجھ میں نہیں آتا، اُس کو ہم نہیں مانتے۔ اُن کی

صلاح اور مشورے کی ہم کو کچھ پروا نہیں۔ خود ہماری قوم اور جمعیّت بہت ہے۔ ہم پر اُن کا کسی طرح کا بھی دباؤ نہیں ہے۔ یہ ہمارے تابع ہیں، ہم اُن کے تابع نہیں۔

خادی خاں کی یہ بیہودہ گفتگو سُن کر سیّد صاحبؒ کو اتنا غصّہ آیا کہ آپ کا چہرہ مُتغیّر ہو گیا۔ آپ کا یہ خاصّہ تھا کہ کیسا ہی کوئی دوست ہوتا، جہاں اُس نے اللہ اور اُس کے رسُولؐ کے حُکم کے خلاف کوئی بات زبان سے نکالی، آپ اپنے آپے میں نہیں رہتے تھے اور اس کو دشمن سمجھتے تھے۔ لیکن آپ نے غصّے کو تھام کر نرمی سے فرمایا کہ عُلما، وارث الانبیاءؑ اور ہادیِ دین ہیں، اُن کی شان میں اہانت آمیز کلام کمال نادانی اور بے ادبی ہے۔ دینی اور دُنیوی مُعاملات کی لوگ خُوب سمجھتے ہیں۔ جو کچھ یہ لوگ دین یا دُنیا کی اصلاح کے واسطے خُدا اور رسُولؐ کے حُکم کے موافق فرمائیں، سب مسلمانوں کو جان و دِل سے بلا انکار ماننا چاہیے، اگرچہ وُہ حکم اپنے نفس اور عادت کے خلاف ہو، مسلمانوں کو ہر حال میں شریعت کا پابند ہونا چاہیے۔

خادی خاں نے کہا کہ ہم لوگ پشتون بے علم ہیں، ہماری سمجھ میں یہ باتیں نہیں آتیں۔ سیّد صاحبؒ نے فرمایا کہ خادی خاں، ہم پر جو سمجھانے کا حق تھا، وہ ادا کیا؛ چاہو، مانو یا نہ مانو۔ اب ایک بات یہ بھی سُن لو کہ تم نے حدِّ شریعت سے اپنا قدم باہر نکالا، فقط اِس خیالِ خام سے کہ ہم اس مُلک کے خان ہیں، ہماری قوم اور جمعیّت بہت ہے، ہمارا کوئی کیا کر سکے گا؟ سو یہ گمراہی اور شیطان کا فریب ہے۔ اللہ تعالیٰ بڑا قادر اور بڑی طاقت والا ہے، بڑے بڑے سرکشوں اور مفسدوں کے سر اُس نے ایک دم میں توڑ دیے ہیں۔ اس بات کو یاد رکھنا کہ کبھی روز انشاءاللہ تعالیٰ تم سوتے سوتے اُٹھو گے اور دیکھو گے کہ ہمارے قلعے میں کسی اور کا انتظام اور بند و بست ہو رہا ہے، اور کسی جگہ کُتّے کی طرح مُردار ہو کر پڑے ہو گے۔

عشا کی نماز کے بعد خادی خاں سیّد صاحبؒ کو سلام کر کے جہاں اُترا تھا، وہاں گیا۔ اگلے روز کچھ دن چڑھے رخصت کے واسطے آیا۔ آپ نے فرمایا: کل ہم نے تم کو اتنا سمجھایا مگر تمھارے خیال میں نہ آیا؛ اب ہم مجبُور رہیں، تم جانو۔ وہ رُخصت ہو کر ہنستا ہُوا چلا گیا۔

تیرھواں باب

ونیٹورہ کی دوبارہ آمد اور جنگِ پنجتار

ونیٹورہ کی دوبارہ آمد کئی مہینے کے بعد جب سکھوں کے دَورے کا موسم آیا، تو ونیٹورہ فرانسیسی کی قیادت میں سکھوں کی ایک فوج نے سَمہ کا رُخ کیا۔ سکھوں کا دستور تھا کہ جب اُن کا لشکر چھچھ میں موضع حضرو کے قریب اُترتا، تو توپوں کی ایک باڑھ سر کرتا جس کو سُن کر تمام رئیس اور سَمہ کی رعایا پر ہیبت طاری ہو جاتی اور لُوٹ مار کے خوف سے لوگ جا بجا بھاگنے لگتے۔ اِس مرتبہ جب اُنھوں نے حضرو میں آ کر توپیں چلائیں، تو سَمہ والے تہ و بالا ہونے لگے کہ سکھوں کا لشکر آ پہنچا۔ مخبروں نے سیّد صاحبؒ کو خبر دی کہ ونیٹورہ لشکر کے ساتھ حضرو میں داخل ہُوا اور سردار خادی خاں نے جا کر گھوڑا، باز، کُتّا اُس کو نذر میں دیا اور اُس سے کہا کہ سیّد صاحبؒ کی رفاقت کی وجہ سے مُلک کے تمام لوگ آپ سے مُنحرِف ہیں، کوئی آپ کو سالیانہ نہیں دے گا۔ اگر آپ کو لینے کی قُدرت ہو تو پار چلیے، مَیں آپ کا شریک ہُوں۔ گزشتہ پسپائی پر مہاراجہ نے ونیٹورہ پر الزام لگایا تھا کہ اُس نے سیّد صاحبؒ سے سازباز کر لی ہے، ورنہ سب لڑے بھِڑے اسباب اور ہتھیار چھوڑ کر کیوں بھاگ آیا۔ ونیٹورہ کو اس کی ندامت تھی۔ خادی خاں نے اُس کو غیرت دلائی، تو وہ پار اُترنے پر راضی ہو گیا۔ کم و بیش

دس ہزار کی جمعیّت اُس کے ساتھ تھی۔ صاف معلوم ہوتا تھا کہ اُس کا پنجتار پر آنے کا اِرادہ ہے۔

اہل علاقہ کو خطوط اور دفاعی دیواریں

دُوسرے دن خبر آئی کہ سردار خادی خاں نے فرانسیسی کو لشکر کے ساتھ اُتار لیا ہے۔ سیّد صاحبؒ نے سردار فتح خاں کو بُلا کر فرمایا کہ خادی خاں فرانسیسی کو اس پار اُتار لایا ہے اور قرینے سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ اُس کو پنجتار پر لائے گا۔ اب کی وُہ بہت بھاری جمعیّت سے آیا ہے۔ اس کی تدبیر جو کچھ تم سے ہو سکے، جلد کرو۔

خانِ موصوف نے کہا کہ مَیں حاضر ہُوں؛ جو کچھ آپ کا ارشاد ہو، بجا لاؤں گا۔ آپ نے فرمایا کہ تمھاری قوم کے جو لوگ تمھارے شریک ہوں، اُن کو خطوط بھیجو۔ ان کے علاوہ جو علما، سادات اور خوانین ہم سے مشورہ کر کے اتّفاق کر گئے ہیں، اُن کو خطوط بھیج کر بلواؤ۔ خانِ موصوف نے اسی روز خطوط لکھ کر جا بجا قاصدوں کے ہاتھ روانہ کیے۔ نزدیک کی بستیوں کے لوگ تو دُوسرے ہی دن حاضر ہو گئے اور آنے کا سلسلہ ابھی جاری تھا۔ سیّد صاحبؒ سوار ہو کر لڑائی کی جگہ تجویز کرنے کے لیے پنجتار کے درے کی طرف تشریف لے گئے۔ فتح خاں بھی ہمراہ تھے۔ موضع خلی کلے کے پاس جو دو پہاڑ ہیں، اُن کے درمیان کا مَیدان آپ کو پسند آیا۔ فتح خاں سے فرمایا: اس پہاڑ سے اُس پہاڑ تک چار ہاتھ چوڑی سنگین قدِ آدم دیوار جلد تیار کراؤ۔ تمھاری ہی حکومت اور کوشش سے یہ کام ہو گا۔

اگلے روز صُبح کو خانِ ممدُوح تمام رعایا کو لے کر گیا اور اُس زمین کو ناپ ناپ کر سب لوگوں میں تقسیم کر دیا۔ اُن لوگوں نے پتھر لا کر دیوار اُٹھانی شروع کر دی۔ صدہا مزدور لگے ہُوئے تھے۔ فتح خاں نے پنجتار آ کر سیّد صاحبؒ کو اطلاع کی۔ آپ نے اُن سے فرمایا کہ چملہ اور بُنیر کے علما، سادات اور خوانین کو بھی خطوط بھیجو کہ خادی خاں ہم پر فرانسیسی کو چڑھا لایا ہے؛ تم بھی آ کر ہمارے شریک ہو۔ یہ نہ خیال کرنا کہ ہمارا مُلک پنجتار سے الگ کوہستان میں ہے۔ یہ پنجتار تمھارے مُلک کا دروازہ ہے۔ اگر خدانخواستہ اُنھوں نے اس پر قبضہ کر لیا، پھر تمھارے واسطے بھی قباحت ہو گی۔ مناسب ہے کہ خط دیکھتے ہی یہاں آ کر ہمارے شریک ہو۔ خانِ موصُوف نے

اسی وقت خطوط لکھ کر دونوں مُلکوں میں قاصد روانہ کیے۔

اگلے روز نمازِ عصر کے بعد خانِ ممدوح سیّد صاحبؒ کو دیوار دکھانے کے واسطے لے گیا۔ اس میں کہیں کہیں کام رہ گیا تھا، باقی سب تیّار ہو گئی تھی۔ آپ اس دیوار کو دیکھ کر بہت خوش ہوئے۔ خانِ مذکور کو بہت شاباشی دی اور فرمایا کہ خان بھائی، اللہ تعالیٰ فرانسیسی کے لشکر کو یہاں نہ لائے۔ اُدھر سے اُدھر ہی دفع کر دے؛ اور اگر آئے، تو عاجز اور ضعیف بندوں کو ثابت قدم رکھے۔ اس دیوار کا سنگر بھی تم نے خُوب بنوایا ہے۔ اس کی آڑ سے لڑنے کا خوب موقع ہے۔ اس کے بعد آپ نے وہاں چار جگہ چار پہرے مُقرر کیے: دو ہندوستانیوں اور دو قندھاریوں کے۔ پھر وہاں سے پنجتار میں آئے اور رات کے لیے چار چوکی پہرے مقرر کیے: دو درۂ پنجتار کے دائیں طرف اور دو بائیں طرف اور اُن کو حکم دیا کہ جب کہیں یقینی کھٹکا دیکھنا، تب بندوق چلا کر دیوار کے پہروں میں آجانا۔ شبینے کے واسطے آپ نے فتح خاں کے سوار مُقرر فرمائے اور مولانا محمد اسمٰعیل صاحب سے کہا کہ فتح خاں نے دیوار بنوائی ہے، مگر اُس کے درے تورنالی کی آمد کا جو راستہ ہے، اُس کا بھی بندوبست ضروری ہے۔ اگر کوئی بھیدی لشکرِ مخالف کو اِدھر سے نکال لائے، تو لا سکتا ہے۔ مولانا نے عرض کیا کہ بہت خوب، کل آپ تشریف لے چلیں، اس کا بھی انتظام ہو جائے گا۔

اگلے روز نمازِ فجر کے بعد آپ تمام مُجاہدین کے ساتھ وہاں تشریف لے گئے اور اُس کے روکنے کا موقع تجویز کیا۔ آخر نالے پر پنجتار کے قریب شیشم کے درختوں کے پاس، جہاں نمازِ جُمعہ پڑھی جاتی تھی، جگہ پسند کی اور تجویز ہُوا کہ نالے کے کنارے سے دائیں جانب کے پہاڑ تک ایک سنگین دیوار بنائی جائے۔ اس فاصلے کا طُول چالیس پچاس گز ہو گا۔

غزوۂ خندق کی یاد آپ نے اس زمین کے پانچ حصّے کیے: چار حصّے اپنی چار جماعتوں کو دیے اور ایک حصّہ متفرّق لوگوں کو۔ جماعتِ خاص کے حصّے میں آپ شریک ہوئے۔ مُجاہدین نالے سے پتھر لا لا کر دیوار بنانے لگے۔ آپ نے سب کی طرف مخاطب ہو کر فرمایا کہ مدینۂ مُنوّرہ میں غزوۂ احزاب کے موقع پر حضرت سلمان فارسیؓ کے مشورے سے سرورِ عالم صلّی اللہ علیہ وسلّم نے اپنے لشکر کے

گرد خندق بنانے کی تجویز فرمائی اور تھوڑی تھوڑی زمین ہر جماعت کو تقسیم فرمائی اور ایک حصّہ اپنا بھی رکھا۔ چنانچہ سب صحابۂ کرام، رضی اللہ عنہم، نے مل کر وہ خندق تیار کی۔ اسی طرح آج ہم بھی کفّار کو روکنے کے لیے دیوار بناتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے یہاں ہم سے رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم، کی وہ سُنّت ادا کرائی۔ جو اس کاروبار میں شریک ہوگا اور محنت و مشقت اُٹھائے گا، عنایتِ الٰہی سے ویسا ہی ثواب پائے گا۔

یہ سُن کر ہندوستانیوں کے علاوہ صدہا ولایتی بھی شریک ہو گئے۔ بعض بعض بھاری پتھر کئی کئی آدمی اُٹھا کر لاتے تھے اور سیّد صاحبؒ اپنے دستِ مُبارک سے اُس کو دیوار پر جماتے تھے۔ چند دنوں میں وُہ دیوار بن کر تیار ہُوئی۔

لشکر کی آمد دیوار تیار ہونے کے دُوسرے یا تیسرے روز مجاہدین نمازِ فجر کی تیاری کر رہے تھے کہ یکایک شنکیاری کے سواروں نے آکر خبر دی کہ فرانسیسی لشکر لے کر درے کے اس طرف آپہنچا۔ سیّد صاحبؒ نے نماز پڑھ کر جلد فراغت کی اور لوگوں کو کمر بندی کا حُکم دیا۔ مجاہدین ہتھیار باندھ کر تیار ہو گئے اِس وقت — تک اُوراُجالا ہو گیا۔ اتنے میں لوگوں نے دیکھا کہ موضعِ مانیری اور موضعِ صوابیؔ کی طرف دُھواں اُٹھ رہا ہے۔ لوگوں نے کہا کہ معلوم ہوتا ہے کہ دونوں بستیوں میں سِکھوں نے آگ لگا دی ہے۔

جب لشکر درۂ پنجتار میں آکر داخل ہُوا، تو اُس کے آدمی نظر آنے لگے۔ درے کے دہانے پر موضع سلیم خاں ہے۔ اُس کو بھی اُنھوں نے جلا دیا اور اس موضع کے مَیدان میں اپنا لشکر جمایا اور آگے بڑھا۔ اِدھر پنجتار سے سیّد صاحبؒ سب غازیوں کو لے کر باہر نکلے اور دیوار کے پاس تشریف لے گئے۔ سب مُلکی لوگ بھی وہیں آکر جمع ہو گئے۔ اگلے سنگر پر جہاں آپ نے چار پہرے مُقرر کیے تھے، آپ نے مرزا احمد بیگ پنجابی کو سَو جوانوں کے ساتھ ہدایت دے کر روانہ کیا کہ اِن چاروں پہروں کو جاتے ہی ہمارے پاس بھیج دو اور جب فرانسیسی کا لشکر تمھارے پاس آئے، تو تم اپنے لوگوں کو لے کر پہاڑ پر چڑھ جانا اور ان سے مقابلہ کرنا۔ جب وُہ ہم سے آکر مقابلہ کریں،

تم اُتر کر پُشت کی طرف سے حملہ کرنا۔ فتح خاں سے آپ نے فرمایا کہ تم ہمارے پاس رہو اور اپنے چالیس پچاس سوار مرزا احمد بیگ کی تقویت کے لیے بھیج دو اور جو تمھارے پیادہ لوگ ہیں، اُن کو بائیں جانب کے پہاڑ پر روانہ کر دو کہ درۂ توتالی کا بندوبست کریں اور جیلہ اور بُنیر کے لوگوں کو دائیں پہاڑ پر بھیجو اور اُن سب سے کہہ دو کہ خبردار، تم سکھوں کا کوئی مقابلہ نہ کرنا۔ جب وُہ ہمارے مقابلے پر آئیں اور جانبین سے لڑائی شروع ہو، تب تم ان کے دونوں طرف سے پہلے پہلو مارنا۔ خانِ موصُوف نے یہی تقریر سب کو سمجھا کر دو پہاڑوں پر روانہ کیا اور قندھاری اور ہندوستانی اور اس مُلک کے چند عُلماء و سادات وغیرہ آپ کے پاس حاضر ہُوئے۔

جہاد کی تحریص اور مَوت کی بَیعت

اس وقت مولانا اسمٰعیل صاحب نے اس مسجد میں کھڑے ہو کر، جہاں نمازِ جُمعہ پڑھا کرتے تھے۔ آیتِ بَیعت الرضوان کی تلاوت فرمائی اور اُس کا ترجمہ کیا۔ آپ نے اس بیعت کے فضائل بیان کیے اور سب کی طرف مخاطب ہو کر فرمایا: "اس وقت سب صاحب، جو حاضر ہیں، حضرت امیر المؤمنین کے دستِ مُبارک پر خالص اس نیّت سے بَیعت کریں کہ ہم اِنشاء اللہ میدان سے نہ ہٹیں گے: یا کُفّار کو مار کر فتح پائیں گے یا اِسی میدان میں شہید ہو جائیں گے۔ اِس میں جو صاحب مشیّتِ ایزدی سے شہید ہوں گے، وُہ شہادتِ کُبریٰ کا درجہ پائیں گے؛ اور جو زندہ بچیں گے، وُہ اعلیٰ مرتبے کے غازی ہوں گے۔

مولانا کی یہ تقریر سُن کر لوگوں پر بڑی بشاشت اور سرُور طاری ہُوا اور ہر ایک پر یہ شوق غالب ہُوا کہ مَیں شہید ہو کر سیدھا بہشت کو چلا جاؤں اور سب بَیعت کرنے کو تیار ہو گئے۔ سب سے پہلے مولانا اسمٰعیل صاحب نے اپنا ہاتھ سیّد صاحبؒ کے ہاتھ پر رکھا، اس کے بعد اور صاحبوں نے اپنا اپنا ہاتھ آپ کے ہاتھ پر رکھا۔ جب ہاتھ پر ہاتھ رکھنے کا موقع نہ ملا، تو جنھوں نے ہاتھ رکھے تھے، لوگوں نے اُن کی پُشتوں اور کاندھوں پر ہاتھ رکھے۔ سیّد صاحبؒ سب کے بیچ میں تھے۔ اسی طرح سب نے بَیعت کی۔ بَیعت کے جو الفاظ آپ اپنی زبان سے بآوازِ بلند فرماتے تھے، وُہی سب کہتے جاتے تھے۔ جب بَیعت لینے سے آپ فارغ ہُوئے، تو سر کھول کر دُعا فرمائی

اور اللہ تعالیٰ کی حمد و ثنا کے بعد بڑی عجز و زاری کے ساتھ کہا کہ الٰہی، ہم تیرے عاجز و ناچار بندے صرف تیری مدد کے اُمیدوار ہیں۔ ہم پر اُن کافروں کو نہ لا اور ہم کو اُن کے شر سے بچا اور اگر تیری مشیّتِ ازلی میں لانا ہی منظور ہو، تو ہم عاجزوں اور ضعیفوں کو صبر و استقامت عطا کر اور اُن کے مقابلے میں ثابت قدم رکھ اور اُن پر فتحیاب کر۔ اسی طرح کے بہت سے الفاظ آپ نے اپنی زبانِ مُبارک سے ادا فرمائے۔ اُس وقت یہ حال تھا کہ گویا ہر شخص اپنی ہستی سے گزر گیا تھا اور ایک دُوسرے عالم میں تھا۔

شہادت کی تیاری اور وصیّت | دُعا کے بعد ہر شخص بڑے تپاک اور اشتیاق سے ایک دوسرے سے گلے ملا، اپنی خطائیں معاف کرائیں اور کہنے لگا کہ اللہ نے فتحیاب کیا اور ہم کو تم کو زندہ رکھا، تو پھر ملیں گے، ورنہ اگر اللہ ملائے گا، تو جنّت میں ملیں گے اور آپس میں ایک دُوسرے کو وصیّت کی کہ بھائیو، جو کوئی شہید یا زخمی ہو جائے، تو اُس کے اُٹھانے سنبھالنے کا خیال نہ کرنا، آگے ہی بڑھنے کا ارادہ رکھنا۔

اس کے بعد سیّد صاحبؒ نے جنگی پوشاک پہنی اور ہتھیار لگائے۔ ہندوستانی اور قندھاری مجاہدین ملا کر آٹھ نو سو ہوں گے۔ اُن کو لے کر آپ دیوار کے قریب گئے اور موقع موقع پر صف باندھ کر سب کو کھڑا کیا اور سب سے کہا کہ جب تک ہم بندوق نہ چلائیں، تُم میں سے کوئی نہ چلائے؛ اور جب تک ہم یہ دیوار پھاند کر نہ جائیں، کوئی نہ جائے۔ صف کے آگے آپ اِدھر سے اُدھر چہل قدمی کرتے تھے اور یہی کہتے جاتے تھے۔ آپ نے یہ بھی فرمایا کہ سب بھائی، جن کو سُورۂ لِاِیلٰف یاد ہو، گیارہ گیارہ بار پڑھ کر اپنے اُوپر دم کر لیں، اور اسی کا وِرد رکھیں؛ اور جن کو یاد نہ ہو، اُن پر اور بھائی پڑھ کر دم کر دیں۔ یہ فرما کر اپنا رائفل دیوار سے کھڑا کر دیا اور آپ مُتوجّہ اِلی اللہ ہو گئے۔

لشکر کے نشان | لشکرِ مُجاہدین میں صرف تین نشان تھے۔ جو خاص جماعت کا نشان تھا، اُس کا نام سیّد صاحبؒ نے صِبْغَۃُ اللہ رکھا تھا۔ اُس پر پارہ الٓمّٓ کا آخرِ رکوع وَمَنْ یَّرْغَبُ عَنْ

مِّلَّةِ إِبْرٰهِمَ إِلَّا مَنْ سَفِهَ نَفْسَهُ سے آخر پارہ تک سُرخ ریشم سے کڑھا ہوا تھا۔ وہ نشان داداسید ابوالحسن نصیر آبادی کے پاس تھا جس لڑائی میں سید صاحبؒ خود تشریف لے جاتے تھے، وہ نشان بھی جاتا تھا۔ نہیں تو کہیں نہیں جاتا تھا۔ دوسرا نشان ابراہیم خاں خیر آبادی اُٹھاتے تھے۔ اُس کا نام آپ نے مُطیع اللہ رکھا تھا۔ اس پر سُورۂ بقرہ کا آخری رُکوع لِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ سے آخر تک سُرخ ریشم سے کڑھا ہوا تھا۔ تیسرا نشان، جو محمد عرب[1] کے پاس تھا، اُس کا آپ نے فتح اللہ نام رکھا تھا اور اُس پر سُورۂ صف کا آخر رکوع يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا هَلْ اَدُلُّكُمْ عَلٰى تِجَارَةٍ سے آخیر سُورہ تک لکھا تھا۔

ونٹورہ کا اضطراب ونٹورہ موضع سلیم خاں کے میدان سے اپنی فوج کا پرا باندھے چلا آتا تھا۔ موضع توتالی کے برابر داہنی طرف ایک پہاڑی ہے۔ وہ کچھ فوج ساتھ لے کر اس پر چڑھا اور وہاں بیٹھ کر حاضری کھائی۔ اس عرصے میں خادی خاں کچھ سکھوں کو لے کر توتالی میں گیا اور وہاں کے گھروں میں آگ لگا کر چلا آیا۔ جب ونٹورہ حاضری کھا کر فارغ ہوا، تو دُوربین لگا کر دائیں بائیں دونوں پہاڑوں پر اور درے کے سامنے دیر تک دُوربین سے دیکھتا رہا۔ اُسے لشکرِ مجاہدین کے لوگ دونوں پہاڑوں پر اور درے کے سامنے اس کثرت سے نظر آئے کہ وہ مرعُوب ہو گیا اور گھبرا کے خادی خاں سے کہا کہ تم نے ہمارے ساتھ بڑا فریب کیا ہے۔ ہم سے تو تم نے یہ کہا کہ پنجتار میں تھوڑے سے لوگ ہیں۔ اس وقت تو دائیں بائیں دونوں پہاڑوں پر اور سامنے درے میں سواروں، پیادوں اور نشانوں کے سوا کچھ نظر نہیں آتا۔ وہ یہ الزام خادی خاں کو دے کر وہاں سے اپنے لوگوں کو لے کر نیچے اُترا اور سنگین دیوار کے قریب اپنی فوج لا کر کھڑی کر دی۔

حملہ اور ونٹورہ کی پسپائی مرزا احمد بیگ پنجابی سید صاحبؒ کی ہدایت کے مطابق اپنے لوگوں کو لے کر پہاڑ پر چڑھ گئے اور سکھوں نے دیوار گرانی شروع کر دی۔ مُخبر نے آکر حضرت کو خبر کی کہ سکھ آگے کی دیوار گراتے ہیں۔ آپ نے سواروں کو حُکم بھیجا کہ آگے بڑھیں اور مرزا حسین بیگ

---

[1] محمد عرب سید صاحبؒ کے بڑے مُخلص اور نہایت مُعتقد تھے۔ سفرِ حج سے آپ کے ہم راہِ رکاب آئے تھے۔

کو کہلا بھیجا کہ شاہینیں ماریں اور سکھوں کو وہیں روکیں۔ سواروں نے گھوڑے بڑھائے اور مرزا شاہینیں سر کرنے لگے اور دونوں پہاڑوں کے دائیں بائیں بھی بلّہ کر کے اُترنے لگے۔ ہر طرف سے لوگوں کی یورش دیکھ کر ونیٹورہ گھبرایا اور اُس کو یقین کُلّی ہو گیا کہ مَیں اِس لڑائی میں فتحیاب نہیں ہوں گا۔ کوئی ڈیڑھ پہر دن چڑھا ہو گا کہ وہ اپنی فوج کو لے کر بھاگا۔ لوگوں نے درّۂ پنجتار تک اُس کا تعاقب کیا۔ اس اثنار میں اُس کے کئی آدمی بھی مقتول ہوئے۔ درحقیقت مُجاہدین کی اتنی تعداد نہ تھی، جتنی اُس کو دُوربین سے نظر آئی۔ یہ محض ایک تائیدِ غیبی تھی۔

نمازِ شُکر جب اُس کے بھاگنے کی خبر مخبروں نے سیّد صاحبؒ کو پہنچائی، تو سب کو کمال خوشی ہُوئی اور وہیں سب نے نالے سے وضُو کر کے شکرانے کی نماز ادا کی۔ سیّد صاحبؒ مجاہدین کے ساتھ پنجتار تشریف لے آئے۔

اگلے روز سردار فتح خاں نے آپ سے عرض کیا کہ اللہ تعالیٰ نے فرانسیسی کو یہاں سے دفع کر دیا، اب اجازت ہو کہ سب لوگوں کو رُخصت کر دیں۔ آپ نے فرمایا کہ ابھی توقّف کرو، اس کی تحقیق ہو جائے کہ اس کا ڈیرہ کہاں ہے۔ اُس سے اگلے روز شام کو مخبروں نے آکر خبر دی کہ آج فرانسیسی اسباب و سامان کے ساتھ دریائے سندھ اُتر گیا اور خادی خاں کو اُس نے بہت تسلّی دی ہے کہ تم کسی بات کا اندیشہ نہ کرنا جس وقت تم پر کچھ بھی دباؤ پڑے، فوراً خبر کرنا۔ خالصہ جی کی فوج تمہاری کُمک کو آئے گی۔ یہ سُن کر آپ نے فتح خاں سے فرمایا کہ اگلے روز سب صاحبوں کو رُخصت کر دو۔ صُبح کو لوگ آپ سے رُخصت ہو کر اپنی اپنی بستی چلے گئے۔[1]

نظامِ شرعی کی توسیع اور استحکام پنجتار کی فتحِ مُبین اور ونیٹورہ کی پسپائی سے مُجاہدین کی استقامت اور اُن کی عنداللہ مقبولیّت کا چرچا خُوب ہُوا۔ اس زمانے میں جن عُلمار و رُؤسار نے ابھی تک بیعت نہیں کی تھی، وہ بھی حاضر ہُوئے اور اُنھوں نے بھی اطاعت کا عہد و پیمان کیا۔ سیّد صاحبؒ نے دیہاتوں کا اور قصبات کا دَورہ فرمایا اور کثرت سے لوگ بیعت اور توبہ سے مُشرّف ہُوئے اور

---

[1] پنجتار کی جنگ (جیسا کہ منظورہ کے بیان اور دوسرے قرائن سے معلوم ہوتا ہے) ذی قعدہ ۱۲۴۴ھ میں پیش آئی۔

بعض ایسے نامی قبائل اور برادریاں، جنھوں نے ابھی تک کوئی توجہ نہیں کی تھی، اپنی خوشی سے بیعت اور امارتِ شرعی میں داخل ہوئیں۔ یہاں ایک قلمی تحریر کا اقتباس پیش کیا جاتا ہے:

"اہلِ سمہ میں دو قبیلے اسمٰعیل زئی، دولت زئی بڑے طاقتور، قول و قرار کے بڑے پکّے اور صداقت اور وفاداری میں بڑے مشہور ہیں۔ انھوں نے ابھی تک بیعت، اور توبہ نہیں کی تھی اور وہ بہت بیگانہ اور دُور دُور تھے۔ مُلّا قطب الدین ننگرہاری، جن کو خدمتِ احتساب سپرد تھی، وہ دورہ کرتے ہوئے ان قبائل کے مرکز میں پہنچ گئے۔ وہاں انھوں نے وعظ و نصیحت کی اور اس علاقے کے مسلمانوں کو غیرت دلائی کہ انھوں نے ابھی تک بیعت نہیں کی اور نظامِ شرعی کو قبول نہیں کیا۔ انھوں نے اہلِ سرحد کے رواجِ اسقاط وغیرہ کی مخالفت کی[۱]۔ لوگوں کو اس پر بہت غصّہ آیا کہ ہم ناواقف عوام ہیں، ہمارے علماء نے ابھی تک ہم کو صحیح دین کی تعلیم نہیں دی۔ انھوں نے اپنے علاقے کے مولویوں کو جمع کیا اور اُن سے کہا کہ وہ مُلّا قطب الدین ننگرہاری سے مناظرہ کریں۔ وہ علماء مُلّا قطب الدین کی تقریر سُن کر لاجواب ہو گئے۔ اور انھوں نے خوانین سے کہا کہ اخوند قطب صحیح کہتے ہیں اس پر تمام خواص و عوام نے کہا کہ اب ہم توبہ کرتے ہیں اور بیعت وغیرہ کے متعلق جو خدا و رسولؐ کا حکم ہے، اس کو قبول کر کے اُس کو جاری کرتے ہیں۔

عیدُ الاضحیٰ سے فارغ ہو کر وہاں کے تمام رؤساء آپ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور آپ کو اپنے ساتھ (گڑھی امان زئی) لے گئے۔ اس نواح کے تمام لوگوں نے آپ کے ہاتھ پر بیعتِ امامت کی۔ اور شریعت قبول کی اور سالہا سال کا

---

[۱] سرحد و افغانستان میں رواج ہے کہ جب کسی کا انتقال ہو جاتا ہے، تو قرآنِ مجید کا ایک نسخہ ایک مجلس میں کسی ایک کو ہبہ کر دیا جاتا ہے پھر وہ چکر کھاتا ہوا پہلے شخص کے پاس پہنچ جاتا ہے۔ پھر کچھ نقد دے کر اس کو خرید لیا جاتا ہے۔ پھر وہ نقد اہلِ مجلس کے درمیان تقسیم کر دیا جاتا ہے۔ اس عمل کو اسقاط کہتے تھے۔ یعنی متوفّی کے ذمّے جو فرائض، حقوق و عبادات باقی تھیں وہ ساقط ہو گئے اور گناہوں کا کفّارہ ہو گیا۔

فتنہ و فساد اور نزاع ختم ہوگیا۔"

۱۲ ذی الحجہ ۱۲۴۴ھ کے ایک قلمی خط سے بھی، جس کی تکمیل ۱۳ محرم ۱۲۴۵ھ کو ہوئی، چند اقتباسات درج ذیل ہیں:

"اوائل شعبان میں بیعتِ امامت سیّد صاحبؒ کے ہاتھ پر ہوچکی تھی اور انھیں دنوں سے مقدمات اور تنازعات کے فیصلے اور مجرمین کی تعزیر کے لیے دیہاتوں میں قاضی مقرر ہوگئے تھے اور جاہلی اور افغانی رسوم بالکل موقوف ہوگئی تھیں۔

مائیری کا واقعہ اُوپر گزر چکا ہے۔ اس کے علاوہ بعض دُوسرے مقدّمے امیرالمؤمنین کے حکم سے فیصل ہوئے۔ یہاں کا دستور تھا کہ اگر کوئی فاسق کسی کی عورت کو نکال کر ایک دیہات سے دُوسرے دیہات کو لے جائے، تو اس دیہات کے لوگ اس مجرم کی حمایت کے لیے کمربستہ ہوجاتے ہیں اور لڑنے مرنے کے لیے تیار ہوجاتے ہیں اور مجرم کو کسی طرح مدعی کے حوالے نہیں کرتے۔ دو ایک آدمیوں نے اسی جرم کا ارتکاب کیا اور لشکر کشی سے بھی گرفتار نہیں ہوئے۔ اس نظامِ شرعی کے نفاذ کے بعد چند مجاہدین امام کے حکم سے آدھی رات کو گئے اور اُن کو گرفتار کرکے لے آئے اور سب لوگوں کے سامنے ان مجرمین کو جو سردار فتح خاں کی برادری کے تھے، سرِراہ درخت پر لٹکا کر سزا دی۔ اسی طرح دو تین ڈاکو گرفتار ہوئے اور تحقیق کے بعد اُن کو سزا دی گئی اور بعض کو قصاص میں قتل کیا گیا۔

کفّار کے فرار کے بعد ضلع سمہ کے دُور دُور کے مسلمانوں نے، جنھوں نے اس سے پہلے نظامِ شریعت کو قبول نہیں کیا تھا، ذی الحجہ کے اوائل میں بخوبی قبول کیا۔ سمہ میں ایک مقام ہے، جس کا نام گڑھی امان زئی ہے، جس میں دس بارہ ہزار جنگجو لوگ رہتے ہیں۔ انھوں نے آپس میں مشورہ کیا کہ یہ کفّار مجاہدین کے مقابلے سے بھاگ گئے ہیں۔ آئندہ سال ضرور آئیں گے اور یہاں کا انتظام کریں گے اور ہم

لوگوں کو بہرصورت ایک سے مقابلہ کرنا پڑے گا۔ اس صورت میں بہتر یہی ہے کہ ہم امام المسلمین کے جھنڈے کے نیچے جنگ کر کے دارین کی سُرخروئی حاصل کریں اُن لوگوں نے آپس میں اس کا اچھی طرح مشورہ کر کے امیر المؤمنین کے ہاتھ پر بعیت کی اور عُشر دینا قبول کیا۔ چنانچہ آج روزِ تحریر کہ ذی الحجہ کی بارہ تاریخ ہے، حضرت امیر المؤمنین اس قوم میں بعیت لینے تشریف لے گئے ہیں۔

سردار اشرف خاں مرحوم کا بیٹا مُقرّب خاں بھی بڑا مخلص ثابت ہُوا۔ اُس نے بھی اپنے علاقے کے ہندوؤں میں جزیہ اور مسلمانوں میں عُشر مُقرر کر دیا ہے اور خادی خاں منافق خفاش کی طرح ایک گوشے میں خائف اور ترساں پڑا ہُوا چاپلوسی اور معذرت خواہی میں لگا ہُوا ہے۔ اب اُس کے لیے دو ہی راستے ہیں: یا مسلمان کامل ہو جائے یا یار محمد خاں کے گروہ میں مخذول بنے۔

اس اثنا میں گڑھی امان زئی کے خوانین کا جرگہ امیر المؤمنین کو اپنے یہاں لانے کے لیے پنجتار گیا اور امیر المؤمنین کو گڑھی میں لا کر آپ کے ہاتھ پر بعیتِ امامت کی اور وہاں کے تمام لوگوں نے امیر المؤمنین کے حلقۂ اطاعت کو اپنی گردن میں ڈالا اور شرعِ شریف کی پیروی کے لیے کمربستہ ہو گئے اور جائداد کا جو مناقشہ چلا آ رہا تھا، آنجناب کی کوشش سے وُہ فیصل ہو گیا اور جو کچھ تھوڑا بہت باقی ہے وُہ بھی حکمِ الٰہی سے فیصل ہو جائے گا۔ اس خط کی تحریر کے وقت کہ ۱۳ محرم ۱۲۴۵ھ ہے، امیر المؤمنین کا قیام موضع بازار نامی میں ہے۔"

چودھواں باب

ہنڈ کی تسخیر اور تنگی کی مہم

خادی خاں سے شاہ اسمٰعیل صاحب کی ملاقات اور اتمامِ حجت

سید صاحبؒ نے ایک معتبر آدمی کے ذریعے خادی خاں کو دعوت دی اور فرمایا کہ تم سے کچھ باتیں کرنی ہیں۔ خادی خاں نے جواب دیا کہ پنجتار میں ہمارا آنا نہ ہوگا۔ اگر آپ موضع سلیم خاں تشریف لائیں، تو وہاں ہم آ سکتے ہیں۔

آپ اگلے روز پنجتار سے کُوچ کرکے کوئی تین سو آدمیوں کے ساتھ سلیم خاں تشریف لے گئے اور درے کے سامنے قیام کیا۔ پانچویں روز خادی خاں پچاس ساٹھ سواروں اور چار سو پیادوں اور سامانِ جنگی کے ساتھ تیار ہوکر آیا اور درۂ پنجتار کے باہر میدان میں ٹھیرا۔ سید صاحبؒ نے جانے کی تیاری کی، تو مولانا محمد اسمٰعیل صاحب نے عرض کیا کہ آپ کا جانا مناسب نہیں۔ مجھ کو اجازت ہو، تو میں ہو آؤں۔ یہ مشورہ سب کو پسند آیا۔ آپ نے مولانا کو چند باتیں سمجھا کر دو سو آدمیوں کے ساتھ بھیجا اور سو غازی اپنے پاس رکھے۔

مولانا اسمٰعیل صاحب نے خادی خاں کو اپنے آنے کی اطلاع کی۔ خادی خاں نے کہلایا کہ مولانا دو چار آدمیوں کے ساتھ آئیں، میں بھی اتنے آدمیوں کے ساتھ آؤں گا۔ مولانا چار قرابینچی

اپنے ساتھ لے کر جانے کے لیے تیار ہوئے۔ غازیوں نے کہا کہ ہم صرف چار آدمیوں کے ساتھ آپ کو نہ جانے دیں گے، اس شخص کا کچھ اعتبار نہیں۔ مولانا نے فرمایا: اللہ تعالیٰ ہمارے ساتھ ہے، ہم کو کسی چیز کا اندیشہ نہیں، تم اس وقت اس کارِ خیر میں حارج نہ ہو۔

مولانا تشریف لے گئے اور میدان میں خادی خاں سے ملاقات کی۔ آپ نے سید صاحبؒ کا پیغام خادی خاں کو پہنچایا کہ ہم کو تم سے یہ اُمید نہ تھی کہ تم مسلمانوں پر کفار کو چڑھا لاؤ گے اور اُن کے ساتھ ہو کر مسلمانوں سے مقابلہ کرو گے۔ تم نے بالکل بغاوت ہی پر کمر باندھ لی ہے۔ اب بھی خیریت ہے۔ کفار کی شرکت سے توبہ کرو اور دائرۂ شریعت سے قدم باہر مت رکھو۔ اللہ تعالیٰ غفورٌ رحیمٌ ہے، تمھارا قصور معاف کر دے گا۔ نہیں تو دُنیا میں بھی ذلیل و رُسوا ہو گے اور آخرت میں بھی۔

خادی خاں کا صاف جواب خادی خاں نے جواب دیا کہ خفا نہ ہونا، ہم لوگ رئیس اور حاکم ہیں، سید بادشاہ کی طرح مُلّا مولوی نہیں ہیں۔ ہماری شریعت جُدا ہے، اُن کی جُدا۔ اُن کی شریعت پر ہم پٹھان لوگ کب چل سکتے ہیں؟ بار بار سید بادشاہ ہمارے پیچھے کیوں پڑتے ہیں؟ ہمارے حق میں اُن سے جو کچھ ہو سکے، وہ درگزر نہ کریں۔

خادی خاں یہ جواب دے کر ہنڈ چلا گیا اور مولانا محمد اسمٰعیل صاحب سید صاحبؒ سے آملے اور سب مجاہدین واپس پنجتار آ گئے۔

تنگی والوں کی فریب دہی موضع تنگی[1] کے کئی آدمی عرصے تک سید صاحبؒ کے پاس آتے رہے اور کہتے رہے کہ جب سے ہماری بستی میں دُرّانیوں کا عمل ہوا ہے، وہ ہم لوگوں کو بہت ستاتے ہیں۔ ہم نے کوشش کر کے اپنی بستی کے تمام لوگوں کو ملا لیا ہے۔ اگر کچھ مجاہدین ہمارے ہمراہ کر دیئے تو ہم اپنی بستی پر آپ کا قبضہ کرا دیں۔ اس سے پشاور کا راستہ کُھل جائے گا اور ہم لوگ خود ہی پشاور والوں سے نمٹ لیں گے۔ سید صاحبؒ نے خوانین سے مشورہ لیا۔ اُنھوں نے بھی وہاں ایک مہم

[1] یہ قصبہ تحصیل چارسدہ، ضلع پشاور، میں چارسدہ سے بجانب شمال تقریباً ۱۰ میل کے فاصلے پر ہے۔

بھیجنے کی تائید کی۔

آپ نے کوئی تین سو آدمی اچھے چُست اور چالاک انتخاب کیے اور مولانا محمد اسمٰعیل صاحب کو امیر کیا اور ارباب بہرام خاں اور مولوی امیرالدین صاحب کو بھی آپ کے ہمراہ کیا۔ جب تنگی دو میل کے قریب رہ گیا، تو تنگی کے دو تین آدمی جو ساتھ تھے، اُنھوں نے مجاہدین کو کھڑا کر دیا اور خود آگے بڑھے۔ تیس چالیس قدم پر چار زرہ پوش سوار نیزے باندھے انتظار میں کھڑے تھے۔ وہ اُن سے ملے اور مولانا محمد اسمٰعیل صاحب، ارباب بہرام خاں اور مولوی امیرالدین صاحب کو بلا کر اُن سے ملایا۔ اُن لوگوں نے کہا کہ جن لوگوں کے مشورے سے ہم نے آپ لوگوں کو بلایا تھا، اُن سب لوگوں نے صاف صاف جواب دے دیا اور سب جا کر دُرّانیوں سے مل گئے۔ اگر آپ ہم کو وہاں لے چلیں، تو ہم لوگوں کی بربادی اور خرابی کے سوا کچھ حاصل نہ ہوگا۔ اب ہم لوگوں کی یہی صلاح ہے کہ آپ اپنے لوگوں کو لے کر پلٹ جائیں۔ اُنھوں نے تو ہم سے فریب کیا، مگر ہم آپ کے قصور وار ہیں۔ آپ ہم کو جو چاہیں، سو کریں؛ صبح کو ہم بھی آ کر حاضر ہوں گے۔

یہ تقریر سُن کر مولانا نے غصے ہو کر فرمایا کہ تم جھوٹے ہو، یہ تمام شرارت اور دغا بازی تم ہی لوگوں کی ہے کہ ہم لوگوں کو اتنی دُور سے بلا کر حیران و سرگردان کیا اور اپنا مطلب نکال کر ہم کو صاف جواب دے دیا۔ بیشک تم لوگ تعزیر و ملامت کے لائق ہو۔

مولانا اپنے لوگوں کو ساتھ لے کر سیّد صاحبؒ کے پاس واپس آ گئے اور پوری رُوداد سُنا دی سیّد صاحبؒ بہت ناخوش ہوئے اور فرمایا کہ اتنے میلنے سے وہ نامعقول آتے جاتے تھے، بڑے فریبی اور دغاباز نکلے۔

قلعۂ ہنڈ کی تسخیر کی تجویز فرانسیسی جنرل کی پسپائی اور مسلمانوں کی اس تائیدِ غیبی سے قُرب و جوار کے علاقوں اور عام سرداروں اور خوانین پر بڑا اچھا اثر پڑا اور کئی نئے علاقے اور قبائل و سردار اپنی خوشی سے نئے نظام میں داخل ہوئے۔ یہ سلسلہ بہت وسیع ہوتا، مگر خادی خاں کی مخالفت اور علٰحدگی مذبذب اشخاص اور قبائل کے لیے بہت بڑا بہانہ اور راستے کی بڑی رکاوٹ تھی۔ لوگ برملا

کہتے تھے کہ خادی خاں نے شریعت قبول نہیں کی، تو اس کا کیا ہو گیا اور ہم نہ قبول کریں گے، تو ہمارا کیا ہو جائے گا۔ دو ایک گاؤں والوں نے مجاہدین کے ساتھ دغابھی کی اور اُن کو اپنے یہاں جہاد کی دعوت دے کر اور سرداروں سے اپنا ذاتی کام نکال کر واپس کر دیا۔ پشاور اور دُرّانی سرداروں بالخصوص یار محمّد خاں کا معاملہ کچھ کم اہم نہ تھا۔ ایک وقت میں جماعت کے سامنے یہ سب مسائل تھے لیکن خادی خاں کا معاملہ پُرانا اور سب سے اہم تھا اور اس کی اہمیت اس لیے بھی سب سے زائد تھی کہ اس نے فرانسیسی جرنیل اور سکھوں کو مُجاہدین کے خلاف جنگ کی دعوت دے کر اسلام اور شعائرِ اسلام کی بڑی ہتک کی تھی۔ ہمّہ کے علاقے اور پنجتار اور اس کے نواح میں نظم و اطاعت کی جو ایک فضا اور ماحول پیدا ہو رہا تھا، ہنڈ اس میں بہت رخنہ انداز تھا۔ وُہ اپنے جائے وُقوع اور فوجی نقطۂ نظر سے بھی بڑی اہمیت رکھتا تھا۔ ان سب خصوصیات کی بنا پر خادی خاں اور ہنڈ کا مسئلہ اوّلین توجّہ کا محتاج تھا۔

سیّد صاحبؒ اس زمانے میں موضع بازار (سُدُم) میں تشریف رکھتے تھے۔ آپ نے مُبین خاں سے کہ کر کسی کی ایک حویلی خالی کرائی۔ اس حویلی کے گرد کئی پہرے مقرر کر دیے اور وہاں آپ نے چیڑ کی لکڑی کے قلابے اور چار سیڑھیاں بنوائیں۔ تمام جماعتوں میں سے پانچ سَو چُست و چالاک اور آزمودہ کار غازی انتخاب کیے۔ مولانا شاہ اسمٰعیل صاحب کو اس کا امیر اور ارباب بہرام خاں کو اُس کا نائب امیر بنایا۔ ان دونوں صاحبوں کے علاوہ کسی کو معلوم نہ تھا کہ یہ سب تیاری کس لیے کی جا رہی ہے۔ رُخصت کے وقت آپ نے سب کو سُنا کر مولانا سے فرمایا کہ آپ امان زئی کی گڑھی سے ہو کر جائیے۔ انشاء اللہ ہم بھی آپ کے پیچھے پنجتار آتے ہیں۔ اپنے باورچی خانے کا اسباب سامان بھی خچروں پر لدوا کر اُن کے ساتھ کر دیا اور شلیتوں میں لپیٹ کر دو اونٹوں پر وُہ چاروں سیڑھیاں بھی لدوائیں اور اُن اونٹوں کو ارباب بہرام خاں کے ساتھ کیا۔

مولانا سُدُم سے گڑھی امان زئی ہوتے ہُوئے ترکئی پہنچے۔ ارباب بہرام خاں بھی شیوہ ہوتے ہُوئے ترکئی میں مولانا سے مِل گئے اور وہاں سے سب نے مل کر ہنڈ کی طرف کُوچ کیا۔

سفر کی رُوداد | اِس مُہم کی رُوداد ایک خط میں مَوجُود ہے، جو حالات کی اطلاع اور شرکتِ جہاد کی ترغیب کے لیے ہندوستان بھیجا گیا تھا:

"تُرنگئی میں لشکر کا رُخ پنجتار کی طرف تھا، جس کو لوگ سمجھتے تھے کہ پنجتار کو واپسی ہے۔ یہاں سے ہنڈ کا قلعہ سات کوس کے فاصلے پر ہے۔ مولانا نے قلعے کو عبُور کرنے کے لیے چوبی زردبان تیار کرائے۔ ۷ صفر[1] کو عصر کے وقت جہاد کے ارادے سے کُوچ ہُوا جب دیہات سے نکلے، تو اہلِ دیہات نے خیال کیا کہ یہ خادی خاں کی طرف جاتے ہیں۔ وُہ اِس مُنافق کے دوست تھے۔ زردبان کے اونٹوں کا سامان اچھا نہ تھا۔ اس لیے وُہ بار بار گرتے تھے اور باندھے جاتے تھے۔ اس کی وجہ سے اِسی دیہات کے قریب عِشا کا وقت ہو گیا۔ دیہات اور قلعۂ ہنڈ کے درمیان اگرچہ صرف سات کوس کا فاصلہ تھا، لیکن یہ مَیدان ایک دشتِ بے نشان تھا جس میں سمت وجہت کی بھی تمیز نہ ہوتی تھی۔ محمد بیگ خاں نامی ایک شخص جو خادی خاں کا چچا تھا اور اُس کی زبردستی کی وجہ سے ایک مُدّت سے مارا مارا پھرتا تھا، وُہ اس لشکر کا رہبر تھا اور اُس کو مَیدان مَیدان لیے جا رہا تھا اگرچہ راستہ سات کوس سے زیادہ تھا، لیکن رات کا بڑا حصّہ اسی دشت میں گزر گیا اور ہنڈ کا راستہ نہ معلوم ہو سکا اور خود رہبر بھی راستہ بھُول گیا۔ لشکر بے حد خستہ و پریشان اور منزلِ مقصُود سے مایُوس ہو کر ٹھیر جاتا اور کبھی تَوکّل پر چلنے لگتا۔ چار پانچ گھڑی رات رہے یہ مشورہ ہُوا کہ اب کسی دُوسری جگہ واپس ہونا چاہیے، لیکن یہ خیال کرکے کہ اس قدر مُشقّت اُٹھائی اور کچھ ہاتھ نہ آیا، اہلِ لشکر کو بڑا رنج و قلق ہوتا تھا۔ اس سے پہلے تنگی کی مُہم میں ناکام واپس ہُوئے تھے۔ اس سے اہلِ لشکر کا دِل ٹُوٹا جاتا تھا اور وُہ اپنی قسمت پر افسوس کر رہے تھے۔ آخر اللہ پر بھروسہ کرکے اس رہبر

---

[1] ۱۲۴۵ھ

کے پیچھے پیچھے ایک طرف کو چلے۔ اس اثنا میں ایک شخص، جو قلعۂ ہنڈ کے راستے سے خوب واقف تھا، پہنچ گیا اور اُس نے صحیح رہنمائی کی۔ لشکر میں اس وقت ایک ہزار آدمی تھے۔ گرمی کی شدّت، سایہ دار درخت اور پانی نہ ملنے کی وجہ سے پیاس اور خستگی شدّت کی تھی۔ ابھی کچھ رات باقی تھی اور قلعہ کے آثار نظر نہیں آتے تھے۔ سب سے بڑا تردّد یہ تھا کہ قلعے پر حملہ اندھیری رات ہی میں مناسب ہے۔ دن نکل آنے اور روشنی ہو جانے کے بعد یہ کام نہیں ہو سکے گا۔ پانی کے بغیر بھی قلعہ کی لڑائی مشکل ہے۔ اس تمام تردّد کے باوجود خدا کے بھروسے پر دوڑے چلے جا رہے تھے کہ اب تو جو کچھ ہوگا، وُہ ہوگا، اپنی کوشش میں کمی نہیں کرنی چاہیے۔

قلعۂ ہنڈ کے اندر اتنے میں صبح کی سفیدی ظاہر ہُوئی اور دیکھا، تو قلعے کے سامنے تھے اور قلعے کے آثار صاف نظر آ رہے تھے۔ مولانا نے پچیس نفر قرابین باز اور تفنگچیوں کو، جو اپنی چابک دستی اور چالاکی میں تمام لشکر میں ممتاز تھے، پہلے روانہ کر دیا اور کہا کہ تم کمال ہوشیاری کے ساتھ خفیہ طریقے پر قلعے کے دروازے کے بہت نزدیک پہنچ جاؤ، اب نردبان کی ضرورت باقی نہیں رہی۔ نماز کا وقت ہو گیا ہے۔ لوگ رفع ضروریات کے لیے قلعے سے باہر آئیں گے اور دروازہ کھولیں گے۔ دروازے کھلتے ہی یکبارگی حملہ کر دینا اور دروازے میں داخل ہو جانا اور قلعے میں داخل ہوتے ہی یکبارگی تفنگ اور قرابینیں چلا دینا۔ آواز کے سُنتے ہی ہم لوگ یورش کر دیں گے اور تمام خفیہ لشکر قلعے میں داخل ہو جائے گا۔ ان تمام باتوں کو انھیں اچھی طرح سمجھا کر روانہ کر دیا۔ پچیس آدمی ایک ایک دو دو کر کے روانہ ہُوئے۔ قلعے کا دروازہ کھلتے ہی اُنھوں نے تفنگ اور قرابین کی باڑھ ماری۔ مولانا نے اپنے ہمراہیوں کے ساتھ، جو اس وقت ایک سو پچاس کے قریب تھے، ایک دم حملہ کر دیا۔ جس وقت وہ داخل ہُوئے، چند غافل چوکیدار ان مقابلے میں پڑ گئے: دو ایک قتل ہو گئے اور باقی بھاگ گئے۔ چند

مجاہدین دروازے کے انتظام کے لیے دروازے پر کھڑے رہ گئے اور باقی خادی خاں کے مکان کی طرف چلے اور ایک بار اُس کے گھر کے اندر تفنگ اور قرابین کی باڑھ ماری۔

خادی خاں کا قتل خادی خاں کو اپنے فہم اور اپنے اقبال کا اتنا غُرّہ تھا کہ رات کو لوگوں نے اس کو خبر دی تھی کہ سیّد صاحبؒ کا لشکر تمہارے سر پر آتا ہے، خبردار رہنا۔ خادی خاں بہت ہنسا اور خبر دینے والے کو بیوقوف بنایا اور کہا کہ سیّد کی یہ طاقت کہاں ہے کہ وہ اس طرف کا رُخ کرے۔ وُہ بیچارہ درویش آدمی ہے۔ اگر وہ اس طرف کا ارادہ بھی کرے گا، تو ہمارے گرد و پیش کے دیہات کے لوگ اس کے لیے کافی ہیں، وہ راستے ہی میں اُس کی خبر لے لُونگا، یہاں کی نوبت ہی نہ آئے گی۔ وہ اسی غفلت میں تھا کہ اُس کے لیے صُبح قیامت نمُودار ہُوئی اور صاعقۂ قومِ ثمُود کی طرح قرابین کی باڑھ اُس نے سُنی۔ وُہ ہر طرف گھبرا گھبرا کر دَوڑتا تھا اور اپنے لوگوں کو کمر بندی کا حکم دیتا تھا۔ لوگوں پر افواجِ الٰہی کا ایسا ہراس طاری تھا کہ وُہ بھاگے جا رہے تھے۔ اُس کے بہت سے ساتھی اور بھائی بھاگ گئے۔ پہلی ہی باڑھ کے وقت اُس نے اپنے متعلقین کو اپنے مکان سے نکال کر سادات کے مکان میں بھیج دیا، جو اِس مُلک میں سب سے زیادہ محفوظ جگہ ہوتی ہے اور غنیم اُس پر دست انداز نہیں ہوتا۔ خود اپنے گھر کے اندر اپنا مال و دولت لینے کے لیے ٹھیر گیا۔ جب مُجاہدین اس کے گھر کے اندر آئے، تو اُن کی نظر اُس پر نہیں پڑی۔ جب دوسری بار اُنھوں نے حملہ کیا، تو وُہ گھر کے اندر سے نکل کر اپنے کوٹھے کے اُوپر آگیا اور گھبراہٹ میں ہر طرف دَوڑنے لگا۔ وقت آچکا تھا۔ مُجاہدین کی پے درپے گولیوں سے اس کا کام تمام ہوگیا۔ اس وقت قلعے میں لشکر میں زیادہ سے زیادہ صرف دو سَو آدمی تھے، باقی میدان میں سرگرداں ہوکر پیچھے رہ گئے تھے۔ دو گھڑی دن چڑھے تک سب قلعے میں جمع ہو گئے۔ قلعے میں جو کچھ

نقد روپیہ تھا معلوم نہیں، وہ کہاں گیا اور اُس کو کون لے گیا۔ توفیقِ الٰہی سے مجاہدین کو لوٹ سے بہت احتراز ہے، لیکن دُوسرے ولایتی لوگ اس سے باز نہیں آتے۔ البتہ چند گھوڑے اور اُونٹ، جو لشکرِ مجاہدین کے کام آنے والے ہیں، سرکار میں داخل ہو گئے ہیں، جو مالِ غنیمت کی تقسیم کے وقت لشکر کو تقسیم کر دیے جائیں گے۔[1]

چار چھ گھڑی دن چڑھے مولانا نے سیّد صاحبؒ کو اطلاع دی کہ فضلِ الٰہی سے قلعۂ ہنڈ میں ہم نے اپنا بندوبست کر لیا ہے، اور صرف خادی خاں اور ایک ہلواہا وہاں مارا گیا، عنایتِ الٰہی سے ہماری طرف کا کوئی زخمی بھی نہیں ہُوا، سب لوگ سلامت ہیں۔[2]

خادی خاں کی لاش کو طالب علموں کے ذریعے ایک چارپائی پر رکھوا کر مکان کے پچھواڑے ایک حُجرے میں رکھوا دیا گیا۔ کچھ دیر کے بعد خادی خاں کے بھائی امیر خاں اور غلام خاں نے چند ملاؤں کو خادی خاں کی لاش اور اہل و عیال کے لینے کو بھیجا۔ مولانا نے لاش لے جانے کی اجازت دے دی اور اہل و عیال کے لیے فرمایا کہ بغیر سیّد صاحبؒ کی اجازت کے ہم نہیں بھیجیں گے۔ وہاں سے جیسا حکم ہوگا، ویسا ہم کریں گے۔ خادی خاں کے عزیزوں اور لوگوں نے خادی خاں کو اُس کے آبائی گورستان میں، جو ہنڈ کے قلعے سے آٹھ نو سو قدم کے فاصلے پر ہے، رات کو دفن کر دیا۔

مولانا کے حُسنِ تدبیر سے ہنڈ کا نامی قلعہ اس طرح سے فتح ہو گیا کہ مجاہدین میں سے کسی کی نکسیر بھی نہ پھُوٹی، مخالفین میں سے صرف خادی خاں اور ایک ہلواہا قتل ہُوا۔

---

[1] مکاتیب قلمی [2] وقائع احمدی صفحہ ۱۴۸۸

پندرھواں باب

جنگِ زیدہ اور یار محمد خاں کا قتل

جنگ کے مُحرّکات و اسباب ہنڈ کی فتح اور زیدہ کی جنگ اور اُس کے مُحرّکات و اسباب کے متعلق (قلمی) مکتوبات کے ایک مجموعے میں ایک مُفصّل فارسی تحریر ہے جو سید صاحبؒ کے مرکز سے اطلاعِ احوال کے لیے بھیجی گئی تھی۔ یہ تحریر زیدہ کی جنگ کے اگلے مہینے ۶ ربیع الآخر کو لکھی گئی تھی[1] یہ ایک سلسلۂ یادداشت اور مُفصّل رُوداد ہے، جس کا ترجمہ پیش کیا جاتا ہے:

امیر خاں کی فتنہ انگیزی "خادی خاں، سردار اشرف خاں مرحُوم کا داماد اور اُس کے جانشین مُقرّب خاں کا بہنوئی تھا۔ سردار اشرف خاں مرحوم حضرت امیر المومنین کے مخصُوص مُخلصین میں سے تھے اور اسی بنا پر وُہ اور اُن کے لڑکے خادی خاں کے مخالف تھے۔ سردار مُقرّب خاں بھی جماعت میں داخل تھا اور خادی خاں کی مخالفت کو پسند نہیں کرتا تھا، لیکن اس کا بھی روادار نہ تھا کہ خادی خاں کو قتل کر دیا جائے۔ اس واقعے سے اُس کو کچھ ملال ہُوا، لیکن اُس نے خادی خاں کی علانیہ حمایت اور جماعت سے انحراف پسند نہ کیا۔ خادی خاں کا حقیقی بھائی امیر خاں مُقرّب خاں

---

[1] زیدہ کی جنگ، ربیع الاول ۱۲۴۵ھ کے مہینے کی کسی تاریخ میں ہوئی، غالباً ۵ یا ۶ ربیع الاول کو۔

کے پاس آیا اور مُقرّب خاں سے یہ خواہش کی کہ وہ بھائی کا انتقام لینے میں اُس کی مدد کرے اور اُس کو مشتعل کرنے کی بہت کوشش کی۔ مقرّب خاں نے اس کو منظور نہیں کیا اور کہا کہ مَیں صرف مرحوم کے متعلقین کی رہائی اور تمھاری جانشینی کے لیے حضرت سے سفارش کرسکتا ہوں۔ چنانچہ وُہ امیر المومنین کے پاس آیا اور درخواست کی کہ خادی خاں کے لواحق کو، جو محصُور ہیں، رہا کر دیا جائے اور امیر خاں کو جانشین تسلیم کرکے قلعہ اُن کے حوالے کر دیا جائے۔ حضرت نے اُس کو بہت دلاسا دیا اور بڑی خاطر داری فرمائی اور خادی خاں کے متعلقین کی رہائی کے لیے مولانا کو، جو لشکر کے امیر تھے، ایک شُقّہ تحریر فرمایا۔

ابھی قلعہ کو فتح ہُوئے تین ہی روز ہُوئے تھے۔ اسی دن واقعہ یہ پیش آیا کہ مولانا نے مُلّا سید شاہ نامی اپنے ایک معتمد کو ایک ضرب شاہین لانے کے لیے پنجتار بھیجا۔ مُلّا صاحب کے ساتھ چودہ آدمی غیر مسلح پنجتار سے آرہے تھے۔ ۱۲ صفر کی صُبح کو فصیلِ قلعہ کے بُرجوں پر سے چوکیداروں نے دیکھا کہ دُور سے کچھ سوار آ رہے ہیں۔ اُنھوں نے نقارے پر چوٹ لگائی اور تمام لشکر کمر بندی کرکے تیار کھڑا ہوگیا، لیکن یہ قطعی طور پر نہیں معلوم ہوتا تھا کہ یہ دشمن ہی ہیں۔ احتمال تھا کہ شاید اپنے ہی لوگ ہوں۔ بعد میں معلوم ہوا کہ یہ غلام خاں اور امیر خاں کے سوار ہیں، جو بندو تیس سر کرتے ہیں اور میدان میں گھوڑوں کو دَوڑاتے ہیں۔ بعض لوگوں نے کہا کہ ہمارے آدمی شاہین لانے گئے ہیں، یہ لوگ اُن کو مارنے کے لیے دَوڑ رہے ہیں؛ جلد پہنچ کر اُن کی مدد کرنی چاہیے۔ اسی حیص بیص میں دو گھنٹے گزر گئے۔ اتنے میں شاہین والوں میں سے ایک شخص ظالموں کے ہاتھ سے بچ کر قلعے میں پہنچ گیا۔ اس نے اطلاع دی کہ مُنافقین کے سوار شاہین کو لے گئے اور بارہ مُجاہدین شہید ہو گئے۔ اس خبرِ جانکاہ کو سُن کر خصوصیّت کے ساتھ اس لیے کہ یہ واقعہ قلعۂ ہنڈ کے

متّصل ہی واقع ہُوا تھا، نہایت درجہ تأسف و حسرت ہُوئی اور اس پر سخت افسوس ہُوا کہ کیوں پہلے ہی تحقیق کرکے اُن کی مدد نہیں کی، لیکن مشیتِ ایزدی سے چارہ نہیں۔

مُقرّب خاں کی کنارہ کشی جب خادی خاں کے متعلقین کی رہائی کی بابت حضرت کا شُقّہ مولانا کو ملا، تو آپ نے اس وجہ سے کہ ان متعلقین کے محصور ہونے کے باوجود ان منافقین نے اتنی شورش کی، تو اُن کے رہا ہونے کے بعد، واللہ اعلم، کیا فِتنہ اٹھائیں گے، مصلحت کی بنا پر اس واقعے کو حضرت کی خدمت میں لکھ کر بھیج دیا۔ اس کے بعد دو مرتبہ مُقرّب خاں کے پاسِ خاطر سے اور اس خیال سے کہ یہ لواحق محض بے قصُور ہیں، اُن کو تکلیف دینا اور مُقیّد رکھنا خُوب نہیں، حضرت کے کئی شُقّے پہنچے، لیکن پھر میاں عقلائے لشکر کے مشورے سے مولانا نے حقیقتِ حال عرض کرتے ہُوئے اور متعلقین کی رہائی کو خلافِ مصلحت سمجھتے ہُوئے اپنی اصطلاحی زبان میں ایک عرضداشت مُقرّب خاں کی معرفت حضرت کی خدمت میں روانہ کی۔ مُقرّب خاں نے اس خط کو اپنے مُنشی سے پڑھوایا۔ اس بیچارے کو کیا خبر تھی؟ وہ ایک حرف بھی نہ پڑھ سکا۔ اس نامانوس خط سے مقرب خاں کے ہوش اُڑ گئے اور اُس کو ڈر پیدا ہُوا کہ مولوی مُحمّد اسمٰعیل صاحب نے کہیں میری شکایت تو نہیں کی اور کوئی خطرناک بات تو نہیں لکھی۔ چنانچہ وُہ اس ڈر سے نہ تو حضرت کی خدمت میں گیا اور نہ امیر خاں وغیرہ سے ملا، بلکہ اپنے کو اس معاملے سے الگ کرکے گھر بیٹھ رہا۔

راستے مسدُود ہو گئے جب یہ خبر تمام اطراف میں مشہور ہُوئی، تو متعلقینِ خادی خاں کے رہا نہ ہونے کی وجہ سے بہت سے لوگ لشکرِ مجاہدین سے بد دل ہو گئے اور جو دیہات منافقین کے جانبدار تھے، وُہ جانی دشمن بن گئے اور اُنھوں نے ہندوستانیوں کا آنا جانا ہر طرف سے بند کر دیا۔ ہندوستان کے راستے مسدُود ہو گئے اور خطوط کا پہنچنا بھی بے انتہا مُشکِل ہو گیا۔

سیّد صاحبؒ زَیدہ میں مقرب خاں کی خانہ نشینی کے بعد اُس کے دو بھائی فتح خاں اور ارسلاں خاں، جو اشرف خاں کے سعادت مند بیٹے اور سیّد صاحبؒ کے مُخلصین میں سے تھے، سیّد صاحب کی خدمت میں حاضر ہُوئے اور کہا کہ ہم اپنے باپ کی طرح حضرت کے غلام اور حلقہ بگوش ہیں، تا دمِ زلیست آپ کے فرماں بردار رہیں گے اور جان و مال آپ کی خدمت میں قربان کریں گے۔ ہماری آرزو ہے کہ بالفعل حضرت ہمارے غریب خانے میں، جو مقامِ زَیدہ میں ہے اور قلعۂ ہَنڈ سے دو کوس کا فاصلہ ہے، تشریف لے چلیں۔ ہماری قوم ہرگز سرکشی نہیں کرے گی اور آپ کے وہاں تشریف رکھنے سے سب زیر ہو جائیں گے۔ پس حضرت موضع زَیدہ میں تشریف لے آئے اور ہنڈ کے سامنے مُجاہدین کی کُمک پر بیٹھ گئے۔ لیکن ابھی اطراف کے راستے مُجاہدین کی آمد و رفت کے لیے نہیں کُھلے، جن لوگوں کو علاقۂ سُدوم میں بعض ضرورتوں سے چھوڑ کر چلے آئے تھے، وہ وہیں محصور رہ گئے۔ کچھ لوگ پنجتار میں سامان کی حفاظت کے لیے پڑے ہُوئے ہیں اور لشکر کا بڑا حصّہ حصار کی حفاظت کے لیے قلعے میں رہتا ہے۔ باقی دو سَو آدمی حضرت کے ہمرکاب ہیں غرض یہ کہ ایک ہزار مُجاہدین، جو پہلے مجتمع تھے، اب متفرق و پراگندہ ہیں۔

امیر خاں کی یار محمد خاں کے ساتھ سازش حضرت نے فرمایا کہ اگر خادی خاں کا بھائی امیر خاں پہلے بیعت کر لے، تو ہم قلعۂ ہَنڈ اُس کو بخش دیں گے اور اس قصّے کو ختم کر دیں گے، یا قلعے کو اُس کے بھائیوں میں سے کسی مستحق کے حوالے کر کے دُوسرے کاروبار میں مشغول ہو جائیں گے۔ اس کے بھائیوں نے حضرت کو قلعے مرحمت ہو جانے پر صُلح کا پیغام بھیجا۔

ایک طرف صُلح کی بات چیت ہو رہی تھی، دُوسری طرف امیر خاں جنگ کے بندوبست کے لیے اور دُرّانیوں کا لشکر اپنی مدد کے واسطے لانے کے لیے بڑی جدوجہد کر رہا

تھا۔ وہ یار محمد خاں سردار پشاور کے پاس گیا اور کمک کے لیے دس بارہ ہزار روپیہ پیش کیے۔

ہنڈ پر حملے کی تیاری ہنڈ کا ملک سردار پشاور کے قبضے میں کبھی بھی نہیں رہا تھا۔ گزشتہ سال یار محمد خاں نے فوج کشی کی تھی، مگر مجاہدین کے خوف سے ناکام واپس آیا۔ اس موقع پر جب اُس نے اِن اطراف کی اکثریت کو حضرت کی مخالفت پر کمربستہ دیکھا اور اپنی کئی قسم کی منفعتیں دیکھیں، جن میں سے ایک منفعت یہ بھی تھی کہ دس بارہ ہزار روپے محض فوج کشی کرنے سے مل جائیں گے، تو اُس نے ہنڈ پر حملہ کرنے کے لیے لشکر تیار کیا۔ اُس کے بھائی سُلطان محمد خاں نے اس کو بہت منع کیا اور کہا کہ تم ہرگز سیّد صاحبؒ کے مقابلے میں وہاں مت جاؤ، یہ وہی شخص ہے، جس کے مقابلے میں فرانسیسی جرنیل کو لشکرِ جرار اور ہزاروں کی فوج کے باوجود شرمندگی و ذلت اُٹھانی پڑی اور سیّد صاحبؒ بڑے تمکنت اور وقار کے ساتھ پہاڑ کی طرح اپنی جگہ پر جمے رہے۔ اگر تم کو شکست ہوگئی، تو پشاور تک سلامتی کے ساتھ پہنچنا بھی مشکل ہو جائے گا۔

لیکن یار محمد خاں نے جو اپنی طاقت کے غرور کے نشے میں سرشار اور مجاہدین کی بے سروسامانی سے اچھی طرح واقف تھا، اس کی پروا نہ کی۔ پہلے تین سو معتمد سواروں کو چار بڑے بڑے سرداروں کے ساتھ اپنے آگے روانہ کیا تاکہ وہ گڑھی ہرایانہ میں جو خادی خاں کے بھائی کا مرکز تھا، ڈیرہ ڈالیں۔

مجاہدین سے مختلف معرکے وہاں سے قلعہ ہنڈ پورے ایک کوس کے فاصلہ پر ہے۔ پشاوری سواروں کے پہنچنے سے پہلے ملکی منافقین کے سوار روزانہ قلعے کے گرد اہلِ قلعہ کے مویشیوں کو لوٹنے کے لیے حملہ کرتے تھے۔ اہلِ قلعہ جن کو صرف قلعے کی نگہبانی کا حکم تھا، قلعہ میں رہ کر جنگ کرتے رہتے تھے۔ البتہ اُونٹوں کو چرانے کے لیے دیں تیس بندوقچی

حفاظت کے لیے اُن کے ساتھ جنگل تک جایا کرتے تھے۔ ایک دن لوگ اُونٹوں کو چرانے کے لیے گئے ہوئے تھے اور تمام لشکر قلعے کے اندر تھا کہ زیدہ اور قلعہ ہنڈ کے بیچ میں مغرب و شمال کے درمیان موضع کُنڈہ سے بندوقوں کی آوازیں آئیں تمام مُجاہدین مولانا کے ساتھ دروازۂ قلعہ کے باہر تفتیش کے لیے گئے، لیکن کچھ نظر نہ آیا۔ وہاں سے لَوٹ کر لوگ تو اپنی جگہ چلے گئے، لیکن مولانا اسی دروازے پر بیٹھے رہے جو لوگ فصیل اور بُرجوں کے رُوبرُو تھے، اُنھوں نے دیکھا کہ چاروں طرف سے سواروں اور پیادوں کا لشکر خیل خیل قلعے کی طرف بڑے عزم و ارادہ کے ساتھ آ رہا ہے۔

یہ معلوم ہوتے ہی مولانا نے نقارہ بجانے سے منع کر دیا اور چند مجاہدین کو، جو بڑے چابک دست اور کارگزار تھے، حکم دیا کہ خفیہ طریقے پر جوار اور گنے کے کھیتوں میں، جو سواروں کے ٹھیرنے کی پُرانی جگہ تھی، چھُپ کر بیٹھ جائیں جس وقت یہ لوگ اطمینان کے ساتھ اپنی پُرانی جگہ پر آ کر کھڑے ہو جائیں، یکبارگی اُن کے سینوں کو گولیوں کا نشانہ بنا لیا جائے۔ لیکن جب یہ لوگ مولانا کی اجازت سے قلعے کے اندر سے نکلے، تو یکدم مخالفین کے سر پر جا پڑے اور مولانا کی ہدایت کو بالکل بھول گئے بس فوراً جنگ شروع ہو گئی اور میدان کے وسط میں معرکۂ کارزار گرم ہو گیا۔

چُونکہ مُجاہدین نے مولانا کے مشورے سے تھوڑی سی جماعت کو باہر نکالا تھا، لیکن اپنے جوش میں مولانا کے مشورے کو بھُول کر اپنے کو دو تین سَو سواروں اور صدہا لشکر کے نرغے میں ڈال دیا تھا اور اُن میں گھر کر رہ گئے تھے، اس لیے چار و ناچار اُن کی کمک کے لیے دُوسرے مجاہدین کا نکلنا ضروری ہُوا اور تین سو کے قریب آدمی قلعے سے نکل کر اس معرکے میں شریک ہو گئے۔ وہ تین سَو سوار، جن کو یار محمد خاں نے پیش خیمے کے طَور پر پہلے بھیج دیا تھا، وُہ دُور سے یہ تماشا دیکھ رہے تھے کہ مخالفین کی بندُوقیں جتنی دیر میں ایک باڑھ مارتی ہیں، مجاہدین کی بندوقیں دس باڑھیں مارتی

ہیں۔ اس سے اُن کے قدم ڈگمگا گئے۔ اس وقت امیر خاں نے اُن سے کہا کہ اب تم بھی حملہ کرو۔ اُنھوں نے جواب دیا کہ یہ ہندوستانی بلا کے لوگ ہیں۔ جتنی دیر میں تم ایک بندوق چلاتے ہو، اُن کی بے حساب چلتی ہیں۔ ہم آگ کی اس بارش میں کُود نہیں سکتے۔ آخرکار وُہ سب کے سب مَیدان چھوڑ کر بھاگ گئے اور مُجاہدین آسمانی کمک سے مظفر و منصُور و نیک نام ہوئے۔

اس دن سے ولایتیوں نے جان لیا کہ ہندوستانی شبخون کے علاوہ کُھلے مَیدان میں بھی خُوب لڑ سکتے ہیں۔ مُنافقوں کو غُرور تھا کہ ہم سوار ہیں اور ہندوستانی پیادہ، وُہ مقابلہ نہیں کر سکتے۔ اُن کی جُرأت روز بروز بڑھ رہی تھی۔ لیکن اُس دن وُہ افسردہ خاطر ہو گئے اور طرفین سے خاموشی ہو گئی اور مخالفین پر ایک طرح کا رُعب طاری ہو گیا کہ کہیں ہندوستانی شبخون نہ ماریں۔

یار مُحمّد خاں ہریانے میں کچھ دنوں کے لیت و لعل کے بعد سردار یار مُحمّد خاں چھ ضرب توپ اور شاہینوں کے ساتھ اور ہاتھیوں اور اونٹوں اور بے شمار سوار و پیادہ لشکر کے ساتھ ہریانے میں داخل ہُوا اور داخل ہوتے ہی اُس نے توپیں چلائیں۔ حضرت امیرالمومنین نے مولانا صاحب کو تمام لشکر کے ساتھ قلعۂ ہنڈ میں طلب کیا اور مولانا مظہر علی کو دو سَو مُعتبر مُجاہدین کے ساتھ قلعے کی حفاظت کے لیے وہاں چھوڑا۔ مُلکی آدمی (جو توپ سے بہت ڈرتے ہیں) توپ کی آواز سُنتے ہی اپنا اپنا سامان لے کر پہاڑوں کی طرف بھاگ گئے۔ مُنافقینِ پشاور کو خوب معلوم تھا کہ اس ملک کے لوگ توپ سے بہت ڈرتے ہیں۔ وُہ صُبح و شام فیر کرتے رہتے تھے۔ سَمہ کے اکثر لوگ جو خادی خاں کے جانبدار تھے، پشاور کے لشکر میں شریک ہو گئے اور جو مخلص تھے، وُہ دُرّانی توپ خانے کے ڈر سے اسلامی افواج میں شرکت کرنے سے پہلوتہی کرنے لگے۔ اب خُدا کی کمک، کمزور مسلمانوں کے لشکر یا زیدہ والے فتح خاں پنجتاری اور فتح خاں اور

ارسلاں خاں کے سوا کوئی حامی اور مددگار نظر نہیں آتا تھا۔

دیہاتوں میں لُوٹ مار ایک دن پانچ سو مخالف سوار گنڈہ کی طرف گئے اور گنڈہ کے برابر ایک موضع شاہ منصور میں جمع ہُوئے۔ اس طرف اس احتمال سے کہ شاید آج جنگ پیش آئے، وُہ تمام سوار اور پیادہ، جو موجود تھے، جابجا سے اکٹھے ہو کر اس کے مقابلے کے لیے تیار ہُوئے، لیکن مخالفین صوابی، کالا، درہ اور مانیریؔ کے دیہاتوں کی طرف، جو زیدہ والوں کے ساتھ تھے، مال و مویشی لُوٹنے کے لیے کنارے کنارے حملہ کرتے رہے اور اُن گاؤں والوں کو سیّد صاحبؒ کے خلاف ورغلاتے رہے۔ مانیریؔ میں چند دلاور نوجوانوں نے حملہ کر دیا اور اُن میں سے ایک کو قتل کر دیا اور اُن سے دو تین گھوڑے چھین لیے۔ حملہ آور شکست کھا کر وہاں سے بھاگے، ایک دُوسرے گاؤں میں گھُس کر وہاں کے مال و مویشی کو بالکل تاراج کر دیا۔ غرض اسی طرح وُہ لُوٹ مار کرتے رہے اور مقابلے کی تاب نہ لا سکے۔ ایک ہفتے تک یہی خبر پہنچتی رہی کہ یار محمد خاں کل مقابلے کے لیے آئے گا اور لشکر کی کمر بندی ہوتی رہی، لیکن یہ موقع پیش نہ آیا۔

نامہ و پیام چند روز تک اسی طرح لشکروں کی آراستگی و صف آرائی اور کبھی کبھی معمولی جھڑپ ہوتی رہی، جس سے مخالفین کو مُجاہدین کی قوّت کا اندازہ ہوتا رہا۔ ایک دن مخالفین کی طرف سے ایک شخص، جو خاندانِ سادات میں سے تھا، مجاہدین کے لشکر میں صُلح کا سفیر ہو کر آیا۔ حضرت نے فرمایا کہ صُلح بہر صُورت اچھی چیز ہے، لیکن یہ معلوم ہونا چاہیے کہ اس جنگ کا مقصد کیا تھا۔ جہاں تک ہمارا تعلق ہے، ہم تو صرف یہ چاہتے ہیں کہ تمام مُسلمان شریعتِ الٰہی کو قبول کر لیں اور نظامِ شرعی کو جاری کر دیں۔ اس کے سوا ہمارا کوئی مطالبہ اور جھگڑا نہیں۔

اس گفتگو سے مصالحت میں شام کا وقت ہو گیا۔ کچھ لوگوں نے حضرت سے عرض کیا کہ اگر ہم کو حکم ہو، تو ہم رات ہی کے وقت شبخون ماریں۔ اگر مخالفین

غافل ہُوے، تو کیا کہنا؛ ورنہ رات کو لشکر کی قلّت و کثرت کا حال معلوم نہیں ہو سکتا۔ ہم رات کے اندھیرے میں اپنی جان پر کھیل کر اپنی تلواروں کے جوہر دکھائیں گے۔ حضرت نے فرمایا کہ صُلح کا پیغام درمیان میں ہے، مَیں چھاپہ مارنے کی اجازت کِس طرح دے سکتا ہوں؟ یہ طریقہ خدا کو پسند نہیں۔ اکثر ہندوستانی مولانا سے بڑی گریۂ زاری کے ساتھ کہتے تھے کہ اگر یہ رات گزر گئی، تو بہت حسرت ہوگی۔

یار محمّد خاں کا مُتکبّرانہ جواب اِسی گفتگو میں رات کا کچھ حصّہ گزر گیا اور حضرت مخالفین کے جواب کے انتظار میں بیٹھے رہے اور تمام مُجاہدین تیار و کمربستہ اپنے اپنے بستروں پر اپنی کمر سیدھی کرنے لگے اور اُنھوں نے کمر کھولنا مصلحت نہ سمجھی۔ اسی اثنا میں جو آدمی صُلح کے لِیے گیا تھا، مُتکبّرانہ جواب لے کر آیا کہ ہم کو صُلح بالکل قبول نہیں، بلکہ لشکر کے بعض مُتکبّروں نے کہا کہ اگر اب سیّد کی طرف سے کوئی صُلح کا پیغام لے کر آئے گا، تو ہم اُس کا سر اُڑا دیں گے۔

حملے کا حُکم یہ سُن کر حضرت امیرالمُومنین کی حمیّتِ ربّانی کو جوش آیا اور اُسی وقت فوراً حُکم دیا کہ لشکرِ اسلام کمربستہ ہو کر مولانا کے ساتھ جائے اور شبخون مارے[1]۔ پس تمام ہندوستانی و قندھاری مُجاہدین اور اِس مُلک کے دُوسرے مُخلصین، جو زیادہ سے زیادہ آٹھ سو سوار و پیادہ ہوں گے، چھاپے کے لِیے مولانا کے ہمراہ روانہ ہُوے اور دو سَو آدمی حضرت کی خدمت میں کمربستہ موجود رہے تاکہ بعد میں کمک کے لِیے جائیں۔

---

[1] وقائع میں ہے کہ عشا کی نماز کے بعد سیّد صاحبؒ نے کھانا تناول فرمایا اور لوگوں کو آرام کرنے کا حکم دیا اور خود بھی آرام کے لِیے لیٹ گئے۔ تھوڑے ہی عرصے کے بعد آپ یکبارگی اُٹھے اور مولانا اسمٰعیل صاحب کو بلایا اور فرمایا کہ مجھ کو جنابِ الٰہی سے الہام ہوا کہ تو کیوں اپنی تدبیر سے غافل ہے؟ تیرے دشمن تیری تدبیر کر رہے ہیں فتح و شکست تو ہمارے ہاتھ میں ہے، تو بھی جو کچھ تدبیر کر سکے کر، یہی وقت ہے۔ چنانچہ چھاپے کی تیاری ہُوئی اور مولانا بستی کے باہر گڑھی میں ٹھیرے۔ اس عرصے میں سردار یار محمد خاں کے افسروں (ارباب جمعہ خاں، فیض اللہ خاں اور حاجی کاکڑ وغیرہ) نے خفیہ خط بھیجا جس میں اِطلاع دی کہ یہاں لشکر میں یہ بات طے ہو چکی ہے کہ صبح زیدے کو توپوں کے گولوں سے مسمار کر دیا جائے گا اور مجاہدین کو گھوڑوں کی ٹاپوں سے روند ڈالا جائیگا۔ اس لِیے اس وقت جو کچھ ہو سکتا ہے، اُس میں تساہُل نہ کیا جائے۔

زیدہ کی جنگ مولانا نے لشکر کو زیدہ کے باہر مرتّب کیا اور جنگ کے مقدمات اور رفتار کی وضع اچھی طرح سمجھا دی۔ ہندوستانی ولایتیوں سے الگ ہو کر سب سے آگے روانہ ہُوئے اور بڑی پُھرتی اور چالاکی کے ساتھ جس طرف مخالف توپ خانہ وشاہین خانہ اور مخالفین کا مورچہ تھا، چلے۔ لشکر بہت قریب تھا، لیکن کترا کر چلنے کی وجہ سے نصف کوس کا فاصلہ طے کرنا پڑا۔ اس اثنا میں لشکر کا ایک چوکیدار نظر آیا، جو اپنے ہاتھ میں مشعل لیے ہُوئے تھا۔ اُس نے جب لشکر کو دیکھا، تو فوراً مشعل بُجھا دی۔ مُجاہدین نے وہاں سے اپنے قدم اور تیز کر دیے۔ وُہ ابھی چند قدم آگے بڑھے تھے کہ مخالفین کے لشکر کے سَو سوار ہمارے لشکر کے سامنے ظاہر ہُوئے، لیکن اُنھوں نے ہم سے کوئی مزاحمت نہ کی۔ مُجاہدین نے اپنی رفتار اور تیز کر دی۔ بعض آدمیوں نے چاہا کہ ان سواروں پر بندوق چلائیں، لیکن مولانا اور دُوسرے عُقلاء نے بڑی سختی سے روکا اور کہا کہ یہ وقت تیز رفتاری کا ہے، بندوق چلانے کا نہیں۔ جب ہم دو تیر کے فاصلے پر پہنچ گئے، تو ہمارے لشکر میں کسی نے بڑی جلدی کے ساتھ اُن سواروں پر بندُوق کا فیر کر دیا، جو ہمارے آگے آگے چل رہے تھے گویا کہ ہمارے رہبر ہیں۔ فَیر ہوتے ہی سوار یک لخت بھاگے اور اسی وقت یکبارگی مجاہدین کی بندوقیں بے تحاشہ چل گئیں اور تکبیر کا غلغلہ بلند ہو گیا۔

مُجاہدین کی جانبازی اور توپوں پر قبضہ لیکن ابھی اصل لشکر یہاں سے کافی فاصلے پر تھا۔ لوگ دَوڑنے سے تھک گئے۔ کچھ لوگ آگے بڑھے اور اکثر تھک کر پیچھے رہ گئے۔ تکبیر کے سوا صِرف یہ آواز سُنائی دیتی تھی کہ بھائیو، آؤ، ہم نے توپ پر قبضہ کر لیا۔ یہ کمزور کسی نہ کسی طرح سے اُفتاں وخیزاں بڑھے۔ جب ایک بیگھے کا فاصلہ رہ گیا، تو توپ خانے میں مہتابی روشن ہُوئی اور اس کے روشن ہوتے ہی توپیں اور شاہین چلنے لگیں۔ اس موقع پر لشکر کا ہر گروہ ایک دُوسرے سے مُمتاز ہو گیا۔ مولانا صاحب اور بعض دُوسرے

دیندار دلاور پیاسوں کی طرح توپوں کے سر پر پہنچ گئے اور اپنے کو اس آگ میں ڈال دیا۔ باقی دوسرے ہندوستانی بھائی اپنے اپنے مراتب اور ہمّت کے مطابق یکے بعد دیگرے وہاں پہنچ گئے۔ اس موقع پر ان دلیر بندگانِ خدا نے عجیب و غریب قوّت سے کام لے کر آگ کی اس بارش میں کود کر توپوں پر قبضہ کر لیا۔

دُرّانی لشکر کا فرار جس وقت مُجاہدین کا توپوں پر قبضہ ہو گیا، دُرّانی بے تحاشا بھاگے اور پشاور کے سوا کسی طرف اُنھوں نے نظر اُٹھا کر نہیں دیکھا۔ لیکن ابھی تک مخالفین کی صرف چار توپوں پر قبضہ ہُوا تھا، دو توپیں ابھی اُن کے قبضے میں تھیں اور کسی کو اُن کی خبر نہ تھی جب مُجاہدین کو اس کا علم ہُوا، تو مَولانا نے حُکم دیا کہ مردانِ خُدا، ہمّت کرو اور دونوں توپوں پر بھی قبضہ کر لو۔ مُجاہدین نے بڑھ کر وُہ دونوں توپیں بھی دشمن سے چھین لیں اور مُجاہدین کو شاندار فتح ہُوئی۔ خدا کی قدرت کا تماشا اور تُعِزُّ مَنْ تَشَاءُ وَ تُذِلُّ مَنْ تَشَاءُ کا مضمُون ظاہر ہُوا اور ثابت ہُوا کہ عسکر و سامان نمائش ظاہری کے سوا کچھ نہیں، اصل چیز نُصرتِ الٰہی اور جوشِ ایمانی ہے۔

ہندوستانی مُجاہدین، جن کا خدمتِ دین کے سوا کچھ کام نہیں، مالِ غنیمت کی لُوٹ مار سے بالکل مجتنب رہے، لیکن قندھاری اور ولایتی اپنی قدیم عادت کے مطابق لُوٹ مار میں پڑ گئے۔

غلط خبر زیدہ میں مُجاہدین کی شکست کی خبر مشہور ہو گئی[1] اور اس کو باور کرنے کے تمام ظاہری

---

[1] وقائع میں ہے کہ جب مولانا اسمٰعیل صاحب شبخون کے لیے آگے بڑھے، تو سیّد صاحب مسجد میں چلے گئے اور ننگے سر ہو کر بہت دیر تک بڑی گریہ و زاری کے ساتھ دُعا کرتے رہے۔ اس کے بعد گڑھی کے بُرج پر تشریف لے آئے۔ کچھ دیر میں بندوقوں کی ایک باڑھ چلی۔ پھر کچھ عرصے میں توپوں کی پانچ آوازیں ہُوئیں۔ پھر کچھ دیر میں توپیں چلنی موقوف ہو گئیں، پھر ادھر سے توپ کی آواز آنے لگی اس کے بعد مولوی امیر الدین ولایتی نے آ کر عرض کیا کہ وہاں تو جتنے مُجاہد آپ نے بھیجے تھے، اس میں سے ایک نہیں بچا، سب شہید ہو گئے۔ یہ سُن کر سب لوگ بڑے غمزدہ ہُوئے۔ سردار فتح خاں نے ہاتھ جوڑ کر کہا کہ اب آپ پنجتار کو تشریف لے چلیں۔ اگر آپ رہیں گے، تو اللہ تعالیٰ پھر جہاد کا سامان درست کر دے گا۔ سیّد احمد علی صاحب کی بھی یہی رائے تھی۔ سیّد صاحب فرماتے تھے کہ نہیں؛ بندوقوں کی باڑھ کے بعد جو توپیں چلتی تھیں اُس کا شعلہ رنجک اس طرف نظر آتا تھا اور کارتوس کا شعلہ اس طرف۔ جب توپیں کچھ دیر بند ہو کر پھر چلنے لگیں، تو اس کے برعکس معاملہ نظر آنے لگا، یعنی اس طرف شعلہ کارتوس اس دلیل سے ہم کہتے ہیں کہ فتح اللہ تعالیٰ نے ہم کو دی ہے لیکن دونوں صاحب اصرار کر کے آپ کو پنجتار لے گئے۔

اسباب موجود تھے۔ اس لیے دیہات کے تمام مُخلصین اپنے دیہاتوں سے چلے گئے اور مخالفین کے جانبداروں نے ہر طرف سے یورش کی اور بندوقیں چلاتے ہوئے اس طرف بڑھے۔ اُن کی گولیوں کا جواب مُجاہدین کے توپ خانہ نے اپنے گولوں سے دیا اور وُہ اُلٹے پاؤں واپس ہٹے۔ یہ چار پانچ گھڑی رات رہے کا واقعہ ہے۔

یار مُحمّد خاں کی ہلاکت | یار مُحمّد خاں اور اُس کے لشکری فرار کے وقت کوئی سامان نہ لے جا سکے، یہاں تک کہ پاؤں کی جُوتیاں بھی وہیں رہ گئیں۔[۱] یار مُحمّد خاں کو کاری زخم لگا اور وُہ پشاور پہنچنے سے پہلے اس دُنیا سے کوچ کر گیا۔[۲] اُس کے لشکر کے سات بڑے بڑے سردار اور تین سو کے قریب لشکری مقتول ہوئے۔ مُجاہدین کے لشکر میں سے صرف چار آدمی شہید ہوئے اور سات آدمیوں کو خفیف زخم لگا۔

مالِ غنیمت | مالِ غنیمت میں ہندوستانیوں کے ہاتھ چھ ضرب توپ، آٹھ ضرب شاہین، چالیس قطار اُونٹوں اور ایک ہاتھی کے سوا کچھ نہ لگا، باقی اکثر مُلکی اور ولایتی لے گئے، جو فتح کی خبر سُن کر چاروں طرف سے آ گئے تھے۔ امیر المومنین نے فتح خاں پنجتاری اور فتح خاں زیدہ والے اور چند مجاہدین کو، جو پشتو زبان جانتے تھے، حُکم دیا کہ وُہ لوگوں کو سمجھائیں کہ اُنھوں نے جو ڈیرے اور گھوڑے لُوٹے ہیں، وُہ ہمارے ہی ہاتھ فروخت کر دیں، اس لیے کہ لشکر کو ان چیزوں کی ضرورت ہوگی۔ اس طرح سے کچھ خیمے اور کُچھ گھوڑے اور جمع ہو گئے۔

پنجتار میں فاتحانہ داخلہ | اس کے بعد حضرت امیر المومنین توپ خانے، لشکر، شتر، ہاتھی اور اپنے

---

[۱] وقائع میں ہے کہ سردار یار مُحمّد خاں کے باورچی خانے میں پلاؤ کی دیگیں پکی ہُوئی تیار رکھی تھیں اور منوں ہر قسم کا میوہ تھا۔ لشکر میں چند عورتیں بھی تھیں، جنھیں دُرّانی لوگ پکڑ کر لائے تھے۔ مولانا نے انھیں اپنے اپنے گھر بھیج دیا۔

[۲] وقائع میں ہے کہ اخوند ظہور اللہ اور امیر خاں خٹک نے بیان کیا کہ ہم نے اکثر معتبر لوگوں سے سُنا ہے کہ سردار یار مُحمّد خاں ہریانہ اور دو ڈھیر کے درمیان فوت ہُوا۔

اہلِ ملک کے ساتھ پنجتار میں داخل ہوئے[1] مبارکباد کا غلغلہ زمین و آسمان سے بلند ہوا اور شادمانی اور اظہارِ مسرّت کے لیے توپیں چلیں۔ مخالفین شرمندہ اور زرد رُو ہوئے۔ بعضوں نے جلا وطنی اختیار کی اور بعضوں نے توبہ و استغفار کیا۔ کیا دوست، کیا دشمن، ایک دُنیا تھی، جو اس خبر کو سُن کر نیازمندانہ حاضر ہوتی تھی اور مُبارکباد دیتی تھی۔

لُوٹ مار کی مذمّت کا پُر اثر وعظ ایک روز حضرت نے لشکریوں اور تمام حاضرین کو جمع کیا اور وعظ فرمایا کہ لُوٹ بہت بُری چیز ہے، یہ حقیقت میں اسلام کی بدخواہی ہے۔ جس طرح جہادِ دین کی اعانت اور قوّت کے لیے ایسا مقبول کام ہے کہ اکثر گناہ اس کی برکت سے بخش دیے جاتے ہیں، اسی طرح سے عین معرکے میں لُوٹ کرنا دین کی شکست ہے اور اس کے سبب سے تمام اعمالِ صالحہ اکارت ہوجاتے ہیں، اور اس کا مُرتکب جہنّم کا مستحق ٹھیرتا ہے۔ اس بات کا ایسا اثر پڑا کہ لوگوں نے لوٹ کا تمام مال پنجتار کی مسجد میں جمع کر دیا اور ایک سو ستائیس گھوڑے

---

[1] وقائع میں ہے کہ مولانا جب زیدے پہنچے، تو سیّد صاحبؒ کے استقبال کے لیے نقاروں اور نشان سمیت دو سو سوار روانہ کیے اور مرزا حسین بیگ اور کئی غازیوں سے فرمایا کہ جب حضرت کی سواری نزدیک آئے۔ تو اکیس فیر خوشی کے چلانا اور توپوں کے پیچھے نمازیوں کی صف آراستہ کر کے کھڑی کی۔ جب موضع شاہ منصور میں حضرت کی سواری نمودار ہوئی، تو مولانا چند غازیوں کو ہمراہ لے کر آپ کی مُلاقات کو آگے بڑھے۔ سیّد صاحبؒ مولانا کو دیکھ کر اپنی سواری سے اُترے اور آکر مولانا کو اپنے سینے سے لگا لیا۔ ادھر توپیں چلنی شروع ہوئیں۔ جب اکیس فیر ہو چکے، تو غازی لوگ قرابین و بندوق کی بھرمار کرنے لگے، یہاں تک کہ سیّد صاحبؒ توپوں کے قریب تشریف لائے اور فرمایا کہ بھائی، اب بھرماری موقوف کرو۔ پھر ننگے سر ہو کر جناب الٰہی میں بڑے الحاح و زاری کے ساتھ دُعا کی اور طرح طرح سے اللہ تعالےٰ کی ثنا و صفت اور قدرت و عظمت اور اپنی مسکینی اور محتاجی کو بیان فرمایا، سب لوگ آمین! آمین! کہتے تھے۔

جب آپ زیدے سے پنجتار کی طرف روانہ ہوئے، تو ملکی لوگ دف بجاتے تھے اور پشتو میں چار بیت گاتے تھے، ننگی تلواریں لیے اُچھلتے کُودتے تھے، خان اور ملک، جو سردار یار محمد خاں سے مل گئے تھے، آآ کر اپنا عُذر بیان کرتے تھے۔ آپ اُن کی تسلّی اور دلجمعی کرتے تھے۔ سواری کے آگے زیدے کی تمام عورتیں غول باندھ کر دف بجاتی چار بیت گاتی ہوئی آئیں۔ آپ نے ان کو پانچ پانچ روپے بطورِ انعام دلوائے۔ راستہ بھر یہی حال رہا۔ پنجتار پہنچ کر اوّل آپ مسجد میں گئے اور دو رکعت نفل پڑھی، پھر اپنے بُرج میں تشریف لے گئے اور جماعت مجاہدین اپنے ٹھکانوں پر اُترے۔

لشکر کی طرف سے اور کچھ دیہات کی طرف سے تقریباً ڈیڑھ سو کے قریب جمع ہو گئے اور بہت سے خیمے ڈیرے بھی اکھٹے ہو گئے۔ خدا کی راہ کا پانچواں حصہ نکال کر باقی شریعت کے احکام کے مطابق مالِ غنیمت مجاہدین میں تقسیم کر دیا گیا۔

فتح کا اثر | اس طرح یہ کامیاب مہم شاندار فتح اور عظیم الشان نیکنامی پر ختم ہوئی اور یار محمد خاں کی سازشوں اور مخالفتوں سے غریب الوطن مجاہدین کو امان ملی، بند راستے کھل گئے، مجاہدین اور مہاجرین کی آمد و رفت شروع ہو گئی، ہندوستان کے خطوط پہنچنے لگے اور دُور دُور تک مجاہدین کی قوّت و اقبال مندی کا سکّہ دلوں پہ بیٹھ گیا۔

امیر خاں کا قتل | امیر خاں خٹک، جو اس مُلک میں سرگروہ منافقین تھا، وہ بھی اس فتح کے بعد کمال اخلاص مندی کے اظہار کے ساتھ حاضر ہُوا اور درخواست کی کہ حضور بندے کے لیے ایک شُقّہ لکھ دیں کہ فلاں دیہات، جو قدیم سے ہماری مِلک تھا اور اب دُشمنوں کے قبضے میں چلا گیا ہے، مجھے واپس مل جائے اور وہاں کے لوگ مزاحم نہ ہوں۔ اس شُقّے کی وجہ سے میرا خاص اعتبار ہوگا اور کام نکل جائے گا۔ حضرت کو اس کا حال خُوب معلوم تھا اور اس کی بدطینتی سے اچھی طرح آگاہ تھے۔ آپ نے اُس سے فرمایا کہ کچھ دن ہمارے ساتھ رہو، بیعت اور توبہ کرو، اس کے بعد ہم تم کو اطمینان کے ساتھ تمھاری زمین پر قابض کر دیں گے۔ امیر خاں کے دل میں فتور تھا، وُہ اس وقت آپ کے پاس سے چلا گیا اور حضرت کی طرف سے ایک جعلی تحریر بنائی اور اپنے لشکر کو لے کر اس موضع میں گیا۔ وہاں اہلِ دیہات نے اُس کا مقابلہ کیا، دونوں طرف سے بندوقیں چلیں، امیر خاں کو گولی لگی اور وُہ بھی مقتول ہُوا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ یہ سال منافقین کی نکبت و زوال کا ہے۔[1]

قیدی کے ساتھ سلوک | سردار یار محمد خاں کا ایک مصاحب زخمی مقید تھا۔ اُس کو آپ نے پنجتار کی شمالی

---

[1] مکتوباتِ فارسی (قلمی)

فصیل کے اندر ایک خیمے میں اپنے قریب اتارا۔ نور بخش جراح اس کی مرہم پٹی کرتے تھے اور ہر روز حلوا پکا کر کھلاتے تھے۔ پاؤ بھر گھی، پاؤ بھر گڑ اور آدھ سیر آٹا آپ کے باورچی خانہ سے روزانہ اُس کے لیے مقرر تھا۔ چند روز میں اُس کا زخم اچھا ہو گیا۔ آپ نے اُس سے فرمایا کہ اب اگر تمھارا جی چاہے، تو ہمارے لشکر میں رہو۔ سب بھائیوں کو جو کھانا کپڑا ملتا ہے، تم کو بھی ملے گا اور اگر کہیں جانے کا ارادہ ہو، تو وہاں تم کو بھجوا دیں۔ اس نے کہا کہ میں پشاور جاؤں گا۔ آپ نے کئی جوڑے عُمدہ کپڑے بنوا دیے اور سواری کو ایک عُمدہ گھوڑا عنایت کیا، اور راستے کا کچھ خرچ دیا اور کئی مُلکیوں سے کہا کہ ان کو نوشہرے تک پہنچاؤ۔ وہاں سے یہ آپ پشاور کو چلے جائیں گے۔ آپ کے فرمانے کے مُطابق دو مُلکی نوشہرے تک چھوڑ آئے۔

مالِ غنیمت کی تقسیم اور مجاہدین کا ایثار

غنیمت کے مال واسباب کے پانچ حصّے کیے گئے۔ اُن میں سے ایک حصّہ بیت المال میں داخل کیا گیا اور چار حصّے غازیوں میں تقسیم کیے گئے۔ ایک ایک حصّہ پیادوں کو ملا اور دو دو سواروں کو۔ مُلکی لوگ، جو چھاپے میں شریک تھے، وہ تو اپنے اپنے حصّے لے گئے، ہندوستانی غازیوں نے کہا کہ ہم تو بیت المال سے کھاتے پیتے ہیں، حصّہ لے کر کیا کریں گے؟ یہ بھی بیت المال میں داخل کر دینا چاہیے۔ یہ خبر سیّد صاحبؒ کو ہُوئی، تو آپ نے سب کے سامنے فرمایا کہ بھائیو، یہ حصّہ تمھارا حق ہے۔ تم جو چاہو، سو کرو۔ جو کوئی خوشی سے اسے بیت المال میں داخل کر دے، ہم اس کو روکتے نہیں۔ اس کا ثواب اس کو جُدا ہو گا۔ اس امر میں کسی پر جبر نہیں اور نہ فرض و واجب۔ یہ بات سُن کر اکثر نے تو داخل کر دیا اور کمتر لوگوں نے اور جن کو حاجت تھی، اُنھوں نے رکھ لیا اور اپنے اپنے صرف میں لائے۔[1]

---

[1] وقائع احمدی

سولھواں باب

پنجتار میں

قاضیوں کے تقرر کی درخواست ایک روز پنجتار اور زیدہ کے دونوں فتح خاں آپس میں مشورہ کر کے سید صاحبؒ کے پاس آئے اور عرض کرنے لگے کہ حضرت، اب اللہ تعالیٰ نے اپنے فضل و کرم سے آپ کو ہمارے اس مُلک کا بادشاہ کیا، ہم برضا و رغبت یہ چاہتے ہیں کہ آپ اپنا ایک ایک قاضی ہمارے یہاں مقرر کریں کہ وہ ہم لوگوں میں شرعی احکام جاری کرے اور ہماری بستیوں سے آپ کے واسطے عُشر بھی مقرر ہو اور ہم تمام مُلکِ سُمَہ کے خوانین سے کہیں گے، انشاء اللہ تعالیٰ وہ بھی اس باب میں چوں و چرا نہ کریں گے۔

آپ نے کہا: "جَزَاکُمُ اللہُ فِی الدَّارَیْنِ! مسلمانوں کو ایسا ہی کرنا چاہیے، مگر ہم یہ بارِ گراں کسی بھائی پر نہیں ڈالتے۔ اگر کوئی برضا و رغبت تمھارے کہنے سے قبول کرے، تو بہتر ہے، اللہ تعالیٰ تم کو اجر دے گا۔

دونوں فتح خاں آپ سے رخصت ہو کر اپنے اپنے مکان پر گئے اور مُلکِ سُمَہ کے تمام خوانین کو اسی مضمون کا خط لکھ کر روانہ کیا اور کئی دن کے بعد دو دو چار چار ملک اور خان اپنی اپنی بستیوں سے سید صاحبؒ کے پاس آئے اور کہا کہ ہم نے بخوشی شریعت کے احکام قبول کیے۔ ہمارے یہاں آپ قاضی مقرر کر دیں کہ ہم لوگوں میں شریعت کے موافق احکام جاری کریں اور ہم آپ کو عُشر بھی شریعت کے موافق

دیں گے۔

آپ نے اُن سے فرمایا کہ تم اپنی اپنی بستی کے عُلمار کو ہمارے پاس بھیجو، ہم انھیں تمھاری بستیوں کا قاضی مقرر کر دیں گے۔ وہ خوانین اپنی اپنی بستیوں میں جاکر اپنے اپنے عُلمار کو بھیجتے تھے اور آپ اُن کو قاضی مقرر کرکے روانہ کر دیتے تھے۔

چند دنوں کے بعد غلّے کی فصل آئی۔ ہر ایک ملک اور خان نے اپنی بستیوں سے خچروں، گدھوں پر عُشر کا غلّہ وغیرہ لاد کر بھیجنا شروع کیا، مگر اپنی مرضی کے موافق۔ سیّد صاحبؒ کسی سے کچھ کمی بیشی کے امر میں تعرُّض نہیں کرتے تھے۔ جو وہ بھیجتے تھے، وُہ آپ لے لیتے تھے۔

توپ خانے کا مرکز اور گولے کا کارخانہ

ایک روز آپ چند غازیوں کے ساتھ موضع چنڈلئی کے درے کی طرف جو پنجتار سے میل بھر کے قریب ہے، تشریف لے گئے۔ وہاں ایک چھوٹا سا پہاڑ کا ٹیکرا ہے۔ اس کے اوپر ایک ہموار میدان ہے۔ آپ نے اس مقام کو توپ خانے کے واسطے پسند فرمایا اور فرمایا کہ پنجتار سے توپیں لاکر اس پر لگا دی جائیں اور بقدرِ حاجت گولہ بارُود وغیرہ رکھنے کو اور گولندازوں کے رہنے کو مکان بنائے جائیں۔

آپ وہاں سے مکان پر تشریف لے آئے۔ کئی روز کے بعد غازیوں نے آپ کے فرمانے کے مطابق وہاں مکان بنانے شروع کیے۔ چند روز میں بن کر تیار ہوگئے۔ آپ کو اطلاع کی۔ آپ نے اجازت دی اور غازیوں نے پنجتار سے توپوں کو لے جاکر اس ٹیکرے پر چڑھا دیا اور توپوں کے علاقے کے لوگ وہیں جاکر رہنے لگے۔ ہر ایک توپ کے پیٹے میں کچھ کچھ جنگی کارتوس تھے۔ آپ نے مولوی خیر الدین صاحب اور مولوی احمد اللہ صاحبؒ سے فرمایا کہ توپوں کے گولے کم ہیں، ہر توپ کے پانچ پانچ سو گولے پورے کر لیے جائیں۔

چند دنوں کے بعد دونوں صاحبوں نے موضع قاسم خیل میں گولے بنانے کا کارخانہ جاری کر دیا۔ ایک روز سیّد صاحبؒ چند مجاہدین کو لے کر وہاں تشریف لے گئے اور وہاں بیٹھ کر گولے بنانے کا کام دیکھا۔

فنونِ سپہ گری کی مشق اور اکھاڑے نواب وزیر الدولہ مرحوم نے ایک گھوڑا اسمند میانہ اور خوبصورت ساز و یراق سے درست پنجار بھیجا۔ آپ نے وہ گھوڑا مولوی احمد اللہ صاحب ناگپوری کے سپرد کر دیا، جو گھوڑے کی سواری کے بڑے اُستاد تھے اور فرمایا کہ اس کو لے جائیے اور اس کی خدمت و پرورش کیجیے۔ اس پر ہم سوار ہوا کریں گے۔ دس بارہ دن کے بعد سیّد صاحبؒ اس پر سوار ہوئے اور مولوی احمد اللہ صاحب بھی اپنے گھوڑے پر سوار ہو کر آئے اور نالے پر میدان میں شیشموں کے درختوں کے وہاں تشریف لے گئے اور اس کو پھیرنا شروع کیا اور اس کی طبیعت اور چال کی بہت تعریف کی۔

آپ کی عادت تھی کہ جس فن و ہُنر میں آپ کامل مہارت رکھتے تھے، اُس فن کا اگر کوئی اور بھی ماہر ہوتا، تو اُس پر اپنی اُستادی نہیں جتاتے تھے۔ چنانچہ گھوڑے پر سوار ہو کر برچھے چلانے کی آپ کو بڑی مہارت تھی اور مولوی احمد اللہ صاحب بھی اس ہُنر میں مہارت رکھتے تھے۔ اس روز آپ نے فرمایا کہ مولانا صاحب، آپ برچھا خُوب چلاتے ہیں۔ ہم کو بھی دو چار ہاتھ سکھائیے۔ مولوی صاحب عُذر کرنے لگے کہ سُبحان اللہ! آپ خود اس فن میں اُستادِ کامل ہیں، آپ مجھ کو تعلیم فرمائیں۔ مَیں کیا آپ کو سکھاؤں گا؟ آپ نے فرمایا کہ مولانا صاحب، اللہ تعالیٰ نے ایک سے ایک کو زیادہ کیا ہے اور فضل و ہُنر دیا ہے اور خصوصًا اس ہُنر کے اُستاد تمھارے ہی مُلک میں ہوتے ہیں۔ پھر آپ نے اور مولوی صاحب نے اس میدان میں نیزہ بازی شروع کی۔ بے شمار ہندوستانی اور ولایتی کھڑے تماشا دیکھ رہے تھے۔ اس چُستی و چالاکی سے دونوں صاحب اپنے اپنے گھوڑے پر نیزہ بازی کے پیچ کرتے تھے کہ دیکھنے والے حیرت میں تھے؛ نہ وُہ اِن کی چوٹ کھاتے، نہ یہ اُن کی۔ پھر سیّد صاحبؒ نے اپنا گھوڑا ٹھیرا کر لٹّو دار بنیٹی اپنے ہاتھ میں لی اور ایک مولوی صاحب کو دی اور فرمایا کہ مولانا صاحب، خُوب ہوشیار رہنا۔ اب ہم تم پر چوٹ کریں گے، تم بھی اپنا وار کرنے میں درگزر نہ کرنا۔ پھر دونوں صاحبوں نے کسرت کرنی شروع کی۔ سیّد صاحبؒ پیچ کرتے کرتے کبھی مولوی صاحب کی کمر میں بنیٹی لگا دیتے اور کبھی پہلو میں، کبھی شانے میں، اور کبھی گردن میں۔ مولوی صاحب بہتیری

کوشش کرتے تھے، مگر نہیں بچ سکتے تھے۔ شام کے قریب آپ نے کسرت موقوف کی۔

مولوی صاحب نے عرض کیا کہ حضرت، مَیں نے کئی اُستادوں سے نیزہ بازی سیکھی، مگر جو پیچ آپ نے اس وقت مجھ پر کیے، یہ مجھ کو آج تک کسی نے نہیں بتائے۔ یہ پیچ آپ ضرور مجھ کو سکھائیں۔ آپ نے فرمایا: ماشاء اللہ! مولانا صاحب، اِس فن میں آپ کو بھی خُوب مہارت ہے اور آپ کے ہاتھ بھی خُوب منجھے ہُوئے ہیں۔ باقی اس کے جو نکات مجھ کو معلوم ہیں، اگر آپ سیکھیں گے، تو مَیں ضرور آپ کو سکھاؤں گا۔ پھر وہیں مسجد میں مغرب کی اذان ہُوئی۔ سب نے نماز پڑھی، سید صاحبؒ اپنے مکان پر آئے اور مولوی احمد اللہ صاحب اپنے ڈیرے میں چلے گئے۔

اسی روز سے نیزہ بازی کی کسرت پنجتار میں شروع ہُوئی۔ تیسرے چوتھے روز سید صاحبؒ اسی گھوڑے پر سوار ہو کر تشریف لے جاتے اور عصر اور مغرب کے درمیان مولوی احمد اللہ صاحب کے ساتھ ٹھیٹی لے کر نیزہ بازی کی کسرت کرتے اور مولوی صاحب کو سکھاتے۔ کچھ کم یا زیادہ دو مہینے تک اسی گھوڑے پر آپ نے برچھا ہلایا اور مولوی صاحب کو سکھایا۔

عبدالحمید خاں فنِ سپہ گری اور جُرأت و دلاوری میں یکتا اور طبیعت کے نہایت تند اور تیز تھے۔ اُنھوں نے بھی سید صاحبؒ سے عرض کیا کہ اگر ارشاد ہو، تو مَیں بھی آپ کے ساتھ گھوڑا پھیرا کروں۔ میری کسرت بہت دِنوں سے چھُوٹی ہُوئی ہے۔ وُہ بھی تازہ ہو جائے گی۔ آپ نے فرمایا: بہتر ہے، آپ بھی آیا کیجیے۔ چنانچہ وُہ بھی حضرت کے ساتھ کسرت کرنے لگے۔ چند دنوں کے بعد آپ نے فرمایا کہ خان بھائی، تم تو خود اس فن میں اُستاد ہو، ہمارے ساتھ کسرت کرنے کی تم کو کچھ ضرورت نہیں۔ تم ہمارے غازی بھائیوں کو سواری اور سپہ گری کی تعلیم دیا کرو۔ اُنھوں نے عرض کیا کہ حضرت! اُستاد تو آپ ہی ہیں، مجھ کو کیا سلیقہ؟ مگر بہرحال فرماں بردار ہوں، جو کچھ مجھ کو آتا ہے، میں بھائیوں کو سکھاؤں گا۔ پھر جہاں سید صاحبؒ کسرت کرتے تھے، وہاں سے ساٹھ ستّر قدم کے فاصلے سے جنُوب کی طرف دُوسرے روز سے عبدالحمید خاں غازیوں کو لے کر جانے لگے اور سواری، نیزہ بازی، بندوق چلانے اور تلوار لگانے کی مشق کرانے لگے۔ اُن کے یہ کرتب دیکھ کر فتح خاں اور اُن کے سوار بھی سب غازیوں کے

ساتھ اس کسرت میں شریک ہونے لگے۔

اسی میدان میں ایک جگہ شیخ عبدالوہاب اور خدا بخش نے پھری گدکے کا اکھاڑا قائم کیا اور لوگوں کو رستم خانی پھینک سکھانے لگے۔ مرزا محمدی بیگ شاہجہان آبادی نے بھی وہیں اپنا اکھاڑا جدا بنایا اور وہ امردھج پھینکتے تھے۔ سید لطف علی اور امام الدین رامپوری نے غفور خانی پھینک کا اکھاڑا قائم کیا۔ استاد رجب خاں نے اپنا اکھاڑا الگ جمایا۔ سب کے شاگرد جدا جدا تھے۔ ہر روز نماز عصر کے بعد سے شام تک لوگ کسرت کرتے تھے اور وہیں نالے میں وضو کرکے مغرب کی نماز پڑھ کر اپنے ڈیرے میں چلے جاتے تھے۔

ایک روز مولانا اسمٰعیل صاحب اور ارباب بہرام خاں کے مشورے سے آپ نے عبدالحمید خاں کو بلایا اور فرمایا کہ خان بھائی، کئی دن سے ہمارے خیال میں تھا کہ لشکر کے سواروں میں کسی کو رسالدار کردیں۔ تم ان بھائیوں کو سواری اور سپہ گری کی تعلیم تو دیتے ہی ہو۔ آج سے ہم نے اُن کا رسالدار بھی تم ہی کو کیا۔

خاں صاحب نے جواب دیا کہ حضرت میں آپ کے فرمانے سے باہر نہیں ہوں، مگر بات یہ ہے کہ میری طبیعت تند ہے اور یہ امر اختیاری نہیں کہ چھوڑ دوں۔ شاید بھائیوں کو اس سبب سے میری افسری گراں گزرے۔ یہاں کا کام خدا کے واسطے ہے، رئیسوں کی فوج کا سا نہیں ہے۔

آپ نے فرمایا کہ خان بھائی، اس کا اندیشہ نہ کرو، ہم تمہارے لیے دعا کریں گے۔ اُمید ہے کہ اللہ تعالیٰ یہ نقصان دُور کردے، اور تابعداری تو خدا ہی والے لوگ کرتے ہیں، رئیسوں حاکموں کے لوگ تو تابعداری کیا کریں گے؟

خاں صاحب نے عرض کیا کہ اگر یہی بات ہے، تو میں حاضر ہوں۔ آپ نے میاں دین محمد صاحب سے فرمایا کہ ہمارے یہاں سے ایک دوشالہ، ایک رومال لے آؤ۔ اُنھوں نے لاکر حاضر کیا۔ آپ نے اپنا خاص عمامہ اپنے دست مبارک سے عبدالحمید خاں کے سر پر باندھا اور فرمایا کہ خان بھائی، یہ دوشالہ، یہ رومال ہے۔ اس میں جو پسند ہو، لے لو۔ اُنھوں نے عرض کیا کہ مجھ کو تو رومال اچھا معلوم ہوتا ہے،

آگے جو آپ کو پسند ہو۔ آپ نے فرمایا کہ مجھ کو بھی یہی اچھا معلوم ہوتا ہے۔ آپ نے وہ خان صاحب کو اُٹھا دیا اور جو سمند گھوڑا نواب وزیر الدّولہ کا بھیجا ہُوا تھا، اُن کو عنایت کیا اور فرمایا کہ یہ تم کو مُبارک ہو! اللہ تعالیٰ تم کو کُفّار پر فتحیاب کرے! پھر آپ نے ہاتھ اُٹھا کر برہنہ سر ہو کر جنابِ الٰہی میں بڑے تضرّع کے ساتھ دیر تک دُعا کی۔ دُعا کے بعد رسالدار صاحب نے پانچ روپے اور ایک اشرفی نذر کی۔ تمام حاضرینِ مجلس نے رسالدار صاحب کو مُبارکباد دی۔ وہ رُخصت ہو کر مسجد میں گئے۔ وہاں دو رکعت شُکرانہ پڑھ کر اپنے ڈیرے میں آئے۔ اسی روز سے اللہ تعالیٰ نے اپنے فضل سے اُن کو ایسا حلیم الطبع، سلیم المزاج اور خوش اخلاق کر دیا کہ گویا ہمیشہ سے یُوں ہی تھے۔

دو جاسُوسوں کا قبولِ اسلام دو سکھ پنجتار میں آپ کے پاس ملنے آئے۔ آپ نے اُن سے آنے کا سبب پُوچھا۔ اُنھوں نے عرض کیا کہ صرف آپ کی مُلاقات کو آئے ہیں۔ آپ نے فرمایا: خیر تم ہمارے مہمان ہو، جب تک چاہو، رہو۔ آپ نے اُن کے واسطے اپنے یہاں سے دو سیر آٹا، پاؤ بھر دال اور آٹھ پیسے بھر کا گھی مقرر کر دیا۔ وہ دونوں روزانہ فجر اور عصر کی نماز کے بعد آپ کے پاس بیٹھتے تھے اور آپ کی باتیں سُن کر اپنے بستر پر چلے جاتے تھے۔ آپ نے اُن سے فرمایا کہ تمھیں جو کچھ ضرورت ہُوا کرے، ہم سے کہہ دیا کرو اور کسی بات کا اندیشہ نہ کرنا، مگر وہ کچھ نہیں کہتے تھے۔

دس بارہ دن کے بعد اُنھوں نے ایک دن عرض کیا کہ حضرت، اتنے دن ہم آپ کی خدمت میں رہے، آپ کی باتیں خُوب سُنیں، جو کچھ لوگوں سے آپ کے اوصافِ حمیدہ اور اخلاقِ پسندیدہ سُنے تھے، اُن سے بڑھ کر پایا اور آپ کا طریقہ اور دین ہم کو بہت پسند آیا۔ اب ہم چاہتے ہیں کہ ہم کو بھی یہی دین اور طریقہ آپ تعلیم کریں۔

سیّد صاحبؒ یہ سُن کر بہت خوش ہوئے اور اسی وقت اُن کو کلمۂ شہادت پڑھا کر مُسلمان کیا۔ بڑے کا نام عبدالرحمٰن اور چھوٹے کا عبدالرحیم رکھا، اور میاں جی چشتی سے فرمایا کہ ان کو اپنے ڈیرے میں لے جا کر نماز سکھاؤ اور شیخ ولی محمّد صاحب سے فرمایا کہ ان کو دو دو جوڑے کپڑے بنوا دو۔ میاں جی چشتی نے اُن کو لے جا کر اُن کے سر کے بال مُنڈوائے، اُن کی لبیں کتروائیں اور نہلایا۔ اُس وقت کسی

غازی نے اپنا پائجامہ دیا، کسی نے انگرکھا، کسی نے دوپٹہ، کسی نے عمامہ۔ کوئی تین تین، چار چار جوڑے اُن کے پہننے کو ہو گئے۔ تیسرے روز نئے چار جوڑے کپڑے شیخ ولی محمدؒ صاحب نے الگ بنوا دیے۔ اسی روز سیّد صاحبؒ نے نُور بخش جراح کو بُلا کر اُن کا ختنہ کرا دیا اور ہر ایک کے کھانے کو پاؤ بھر گُڑ۔ پاؤ بھر گھی اور آدھ سیر آٹے کا حلوہ مقرر کر دیا۔ میاں جی چشتی صاحب حلوہ پکا کر اُن کو کھلاتے تھے۔ چند دن میں زخم اچھا ہو گیا۔ میاں جی چشتی صاحب نے سیّد صاحبؒ کی اجازت سے پانچ چھ روز ایک ایک مُرغ کا شوربہ اُن کو پلایا۔ پھر ایک روز اُن کو نہلا کر اور نئی پوشاک پہنا کر سیّد صاحبؒ کے پاس لائے۔ آپ نے اُن کی مزاج پُرسی کی اور باتیں کیں۔ اُس وقت اُنھوں نے اپنا حال سیّد صاحبؒ سے بیان کیا کہ ہم کو خیر آباد سے ہمارے افسر لہنا سنگھ نے آپ کے پاس بھیجا تھا کہ ہم لوگوں سے خلیفہ صاحب کی خُوبیاں اور بزرگیاں بہت سُنتے ہیں، سو تم خود جا کر اپنی آنکھ سے دیکھ آؤ اور ہم سے آ کر بیان کرو۔ اسی واسطے ہم آپ کو دیکھنے آئے تھے۔ یہاں اللہ تعالیٰ نے آپ کے طفیل سے ہم کو اسلام کی نعمت عطا فرمائی۔

سیّد صاحبؒ اُن کی تقریر سُن کر بہت خوش ہوئے اور اُن کو دو گھوڑے دیے اور فرمایا کہ اگر تمھاری خوشی ہو، تو ہمارے یہاں لشکر میں رہو اور چاہو، تو خیر آباد میں لہنا سنگھ کے پاس جاؤ۔ تم کو اختیار ہے۔ وُہ دو مہینے کے قریب لشکر میں رہے اور نماز سیکھی اور رُخصت ہو کر خیر آباد یا کسی اور طرف کو چلے گئے۔

ضروری تعمیر | ایک روز سیّد صاحبؒ نے جُمعے کی نماز پڑھ کر مولوی محمّد حسن جماعت دار سے فرمایا کہ ہمارے لشکر میں اکثر بھائیوں کو مکان کے بغیر تکلیف ہوتی ہے۔ ان دنوں بھائیوں کو فرصت بھی ہے اگر ضرورت کے مطابق اپنے اپنے بھیلے میں کوٹھے بنا لیں، تو بہتر ہے۔ ہمارا بھی ارادہ ہے کہ ہم بھی ایک کوٹھا بنا لیں۔ اُنھوں نے عرض کیا کہ بات تو مناسب ہے۔ جب آپ وہاں سے مکان پر آنے لگے، تو نالے سے اُٹھا کر دو پتھر اپنے کندھے پر رکھ لیے۔ آپ کو دیکھ کر ہر کسی نے اپنی طاقت کے موافق ایک ایک دو دو پتھر اُٹھا لیے اور سب نے لا کر حضرت ہی کے مکان پر جمع کیے۔ سب کی یہ نیّت ہوئی کہ پہلے حضرت کا کوٹھا بنایا جائے اُس کے بعد اور نہیں۔

اس کے اگلے روز سے غازیوں نے گارے اور پتھروں کی دیوار اُٹھانی شروع کر دی۔ کوئی پتھر لاتا تھا، کوئی گارا کرتا تھا اور کوئی اُٹھاتا تھا۔ وُہ دالان کوئی دس گز لمبا اور قبلہ رُخ تھا۔ اس میں تین در رکھے گئے۔ چند روز میں وُہ دالان بن کر درُست ہُوا۔ تب چیڑ کی کڑیوں سے اُسے پاٹا اور اُس کے آگے ایک چھپر کا سائبان ڈالا۔

اس کے بعد اپنے اپنے بھیلے میں اور صاحبوں نے بھی مکان بنانے شروع کیے۔ ایک کوٹھا شیخ عبدالحکیم پھلتی نے بنایا، ایک سیّد اسمٰعیل رائے بریلوی نے، ایک مولوی امام الدین بنگالی نے، ایک مولوی وارث علی پُوربی نے، اور ایک نُور بخش جراح نے۔ یہ کوٹھے پاس ہی پاس خاص جماعت والوں کے تھے اور ایک کوٹھا شیخ ولی محمد صاحب پھلتی نے بنایا اور ایک مسجد کے قریب سید احمد علی صاحب کا بنایا گیا، اور ایک مولوی مظہر علی عظیم آبادی نے بنایا، اور ایک کوٹھا بستی کے باہر مشرق کی جانب بارُود رکھنے کی خاطر بنایا گیا۔ یہ تمام مکانات غازیوں نے اپنے ہاتھوں سے اُٹھائے اور ان سب کے پاٹنے کے واسطے سردار فتح خاں کی معرفت ایک ایک روپے کی تئیس تئیس چیڑ کی بہت عُمدہ کڑیاں منگائی گئیں۔

قصاص کا ایک مُقدّمہ | لشکرِ مُجاہدین میں غازی پور کے رہنے والے لاہوری نام ایک شخص تھے، جو قاضی م۔ نی بنگالی کے گھوڑے کی خدمت کرتے تھے۔ شکل وصُورت میں اگرچہ کم رُو اور حقیر تھے، مگر صلاحیت اور خوش اخلاقی میں بے نظیر تھے۔ ایک شخص عنایت اللہ نام منڈیاہو کے رہنے والے جماعتِ خاص میں تھے۔ سیّد صاحبؒ کے پلنگ کے قریب رہا کرتے تھے۔ آپ کے پُرانے رفیقوں میں تھے۔ آپ کے ساتھ بیت اللہ شریف کو بھی گئے تھے اور آپ اُن سے بہت محبت فرماتے تھے۔ یہ عنایت اللہ ایک روز لاہوری کے ڈیرے پر گئے۔ لاہوری اس وقت ڈیرے پر نہیں تھے۔ گھوڑے کے دانے بھگونے کا ایک طاش وہاں رکھا تھا۔ عنایت اللہ وُہ طاش آٹا گُوندھنے کے لیے اپنے ڈیرے پر اُٹھا لائے۔ لاہوری اپنے ڈیرے پر آئے اور دانہ بھگونے کو طاش تلاش کیا، تو نہ پایا۔ لوگوں سے پُوچھا۔ کسی نے کہا: تمھارا طاش عنایت اللہ لے گئے ہیں۔ وُہ عنایت اللہ کے پاس گئے اور کہا کہ تم ہمارا طاش بلا پُوچھے اُٹھا لائے ہم کو

دانہ بھگونا ہے ہمارا طاش ہم کو دو۔ اُس وقت خُشک آٹا گوندھنے کے واسطے طاش میں نکال رکھا تھا۔ عنایت اللہ کے مزاج میں ذرا تُندی تھی۔ لاہوری سے کہنے لگے کہ تمھارا طاش کیسا، طاش سرکاری ہے۔ ہم اپنا کام کرکے دے دیں گے۔

لاہوری نے کہا کہ طاش بیشک سرکاری ہے، مگر قاضی مدنی کی تحویل میں ہے اور اُنھوں نے ہمارے سپرد کیا ہے اور تم ہماری اجازت کے بغیر لائے ہو۔ اس پر اُلٹے گرم ہوتے ہو! ہمارا حرج ہوتا ہے۔ ہم تو اپنا طاش لے جائیں گے۔ عنایت اللہ نے کہا کہ بھلا، دیکھیں، تم کیونکر لے جاؤ گے۔ لاہوری نے طاش کا آٹا عنایت اللہ کے کپڑے پر رکھ دیا اور طاش لے کر اپنے ڈیرے پر چلے۔ عنایت اللہ نے اُٹھ کر دو گھونسے لاہوری کے پہلو میں مارے اور طاش چھین لیا۔ لاہوری بیتاب ہو کر گر پڑے اور نالہ و فریاد کرنے لگے۔ لوگوں نے اُن کو اُٹھایا اور پانی پلایا۔

یہ قصّہ سیّد صاحبؒ کے خاص بُرج کے نیچے ہُوا۔ کسی نے آپ کو اطلاع کی کہ لاہوری کو عنایت اللہ نے مارا۔ یہ بات سُن کر آپ بُرج کی چھت سے سیڑھی پر آئے اور لاہوری اور عنایت اللہ کو بُلایا اور حال پوچھا۔ لاہوری نے پُورا ماجرا سُنایا۔ آپ نے عنایت اللہ سے پُوچھا کہ یہ قصّہ یُوں ہی پیش آیا یا اس میں کچھ فرق ہے؟ اُنھوں نے عرض کیا کہ واقعہ یوں ہی ہے۔ یہ سُن کر آپ کمال ناخوش اور خفا ہُوئے اور عنایت اللہ سے کہا کہ تم اپنے دل میں یوں جانتے ہو گے کہ ہم سیّد صاحبؒ کے پُرانے رفیق اور اُن کے پلنگ کے پاس رہتے ہیں۔ تم کو یہ خیال نہیں ہے کہ ہم یہاں اللہ کے واسطے آئے ہیں اور کام ایسے نکمّے کرتے ہو۔ تم سمجھتے ہو کہ لاہوری قاضی مدنی کا سائیس اور کم رُو و حقیر ہے۔ یہی جان کر تم نے اُس کو مارا۔ یہ تم نے بڑی زیادتی اور حرکت بیجا کی۔ ہمارے نزدیک تمؒ اور لاہوری بلکہ سب برابر ہیں۔ کسی کو کسی پر فوقیت نہیں ہے۔ سب لوگ یہاں خُدا کے واسطے آئے ہیں۔

اس کے بعد آپ نے حافظ صابر تھانوی اور شرف الدّین بنگالی سے فرمایا کہ ان دونوں کو قاضی حبّان صاحب کے پاس لے جاؤ۔ عنایت اللہ کی زیادتی ہے۔ اُن سے کہنا کہ اِس معاملے میں کسی کی رُو رعایت نہ کریں۔ شرعِ شریف کے موافق فیصلہ کر دیں۔

جب آپ نے سب کے سامنے یُوں فرمایا، تو پھلت والے لوگ، جن کی جماعت میں عنایت اللہ تھے، آپس میں کہنے لگے کہ اب لاہوری کو کسی طرح راضی کرنا چاہیے۔ اگر وُہ راضی ہو کر معاف کر دے، تو بہتر ہے، یہ بلا ٹل جائے گی، ورنہ عنایت اللہ پر ضرور تعزیر آئے گی۔ انھیں میں سے دو تین شخصوں نے لاہوری کو سمجھایا کہ بھائی صاحب، اب تو عنایت اللہ کی یہ زیادتی تم پر ہُوئی اور انھوں نے بہت بُرا کیا، مگر وُہ تمھارا بھائی ہے۔ بہتر یہی ہے کہ اُس کا قصُور معاف کر دو اور خوشامد کے طور پر کچھ دینے پر راضی ہو گئے۔ مگر لاہوری نے کسی طرح نہ مانا اور کہا کہ بھائیو! اب تو جو کچھ سیّد صاحبؒ نے فرمایا، میں اُسی پر راضی ہوں۔ وہاں چل کر جیسا کچھ ہوگا ہو رہے گا۔ یہاں اس مُعاملے میں مجھ سے نہ بولو۔ وُہ مجبُور ہو کر چُپ ہو رہے اور حافظ صابر و شرف الدین ان دونوں کو قاضی حبّان کے پاس لے گئے۔

قاضی صاحب بستی کی مسجد میں تھے۔ اُس وقت گھڑی ڈیڑھ گھڑی دن باقی ہوگا۔ قاضی صاحب نے پُوچھا کہ بھائیو، اس وقت سب مِل کر کہاں آئے ہو؟ حافظ صابر و شرف الدین نے ان دونوں کا حال بیان کیا کہ اس طور سے لڑائی ہُوئی ہے اور جو سیّد صاحبؒ نے اُن کے بارے میں ارشاد فرمایا تھا، وُہ بھی عرض کر دیا۔ قاضی صاحب نے لاہوری سے معاملہ پوچھا۔ اُنھوں نے شروع سے جو کچھ گزرا تھا، بیان کیا۔ پھر عنایت اللہ سے پُوچھا۔ اُنھوں نے وَیسا ہی کہا جیسا کہ لاہوری نے کہا تھا۔ قاضی صاحب نے فرمایا کہ اب تو اس وقت شام ہو گئی ہے، اس وقت جاؤ۔ کل نمازِ اشراق کے بعد آنا، ہم تُمھارا فیصلہ کر دیں گے۔ وہ اپنے اپنے ڈیرے پر آ گئے۔

نمازِ مغرب کے بعد شیخ عبد الرحمٰن رسالئے بریلی والے قاضی صاحب کے پاس گئے۔ وہ اُن کے بڑے دوست تھے۔ اُنھوں نے کہا کہ قاضی صاحب، کوئی تدبیر آپ ایسی کریں کہ لاہوری راضی ہو جائے اور عنایت اللہ ذِلّت سے بچ جائے۔ اس امر میں زیادتی ضرور عنایت اللہ کی ہے اور جو لاہوری کسی طرح نہ مانے، تو پھر مجبُوری ہے، پھر جو حکم شرع شریف کا ہو، وہ آپ جاری کر دیں۔ قاضی صاحب نے فرمایا کہ شیخ صاحب، آپ بہت اچھا فرماتے ہیں۔ ہم اوّل لاہوری کو سمجھائیں گے، حتی الامکان اس میں کمی نہ کریں گے۔ اگر اس نے مان لیا، تو بہتر ہے، نہیں تو حکمِ خدا و رسُولؐ کے موافق انصاف کیا جائے گا

اگلے روز دو تین گھڑی دن چڑھے حافظ صابر اور شرف الدین، لاہوری اور عنایت اللہ کو لے کر قاضی صاحب کے پاس گئے۔ اُنھوں نے عنایت اللہ اور لاہوری کو سامنے بٹھایا اور پہلے عنایت اللہ کی طرف مخاطب ہو کر خوب ملامت کی کہ تم نے بہت بُرا کیا اور تم سزا کے قابل ہو۔ پھر لاہوری کی طرف متوجہ ہو کر فرمایا کہ بھائی صاحب، تم بہت نیک بخت اور بے شر آدمی ہو اور تم سب صاحب ہندوستان سے اپنا اپنا گھر بار چھوڑ کر محض جہاد فی سبیل اللہ کے واسطے آئے ہو کر اللہ تعالیٰ تم سے راضی ہو اور آخرت میں ثواب ملے اور دُنیا کا کارخانہ تو چند روز کے واسطے خواب و خیال کی طرح ہے۔ سو بات یہ ہے کہ عنایت اللہ تمھارا بھائی ہے اور اس سے شامتِ نفس کے بسبب یہ قصور ہو گیا جو اُس نے تم کو مارا۔ اگر اس کا قصور معاف کر دو اور دونوں مل جاؤ، تو بہت خوب بات ہے۔ اللہ تعالیٰ کے یہاں اس کا اجر پاؤ گے اور جو تم اس کا عوض لو گے، تو برابر ہو جاؤ گے۔ جو معاف کرنے میں ثواب ہے، وہ نہ ملے گا معاف کرنا بھی خدا اور رسولؐ کا حکم ہے اور عوض لینا بھی، مگر معاف کرنے میں ثواب ہے اور عوض لینے میں اپنے نفس کی خوشی ہے۔

یہ بات سُن کر لاہوری نے کہا: قاضی صاحب، اگر ہم عنایت اللہ کو معاف کر دیویں، تو ثواب پاویں گے اور جو اپنا عوض لے لیں، تو برابر ہو جاویں گے۔ بھلا کسی طرح کا گناہ تو نہیں ہے؟ انھوں نے کہا: کچھ گناہ نہیں ہے، دونوں حکم خدا اور رسولؐ کے ہیں۔ جو چاہو منظور کرو۔ لاہوری نے کہا: میں تو اپنا حق چاہتا ہوں۔ قاضی صاحب نے کچھ دیر سکوت کر کے فرمایا کہ بھائی لاہوری حق تو تمھارا یہی ہے کہ تم بھی عنایت اللہ کے اسی جگہ دو گھونسے مار لو، اور عنایت اللہ کو لاہوری کے سامنے کھڑا کر دیا کہ اپنا عوض لے لو۔ لاہوری نے کہا کہ حق ہمارا یہی ہے کہ ہم بھی اُسی جگہ دو گھونسے ماریں۔ قاضی صاحب نے کہا کہ ہاں، بیشک یہی بات ہے۔

اس وقت جو لوگ موجود تھے، سب کی اُمید منقطع ہو گئی اور یقین ہو گیا کہ لاہوری بے عوض لیے نہ چھوڑے گا۔ لاہوری نے کہا: بھائیو، جو سب حاضر ہو، گواہ رہو کہ قاضی صاحب نے ہم کو ہمارا عوض دلایا اور ہم لے سکتے ہیں، مگر ہم نے محض اللہ تعالیٰ کی رضامندی کے لیے چھوڑ دیا۔ اور عنایت اللہ کو اپنی چھاتی سے لگا لیا اور مصافحہ کیا۔ تمام لوگ، جو وہاں تھے، لاہوری کو آفرین کرنے لگے اور شاباشی دینے

لگے کہ تم نے بڑے مردوں اور دینداروں کا کام کیا۔

یہ خبر سیّد صاحبؒ کو ہوئی، تو آپ نے لاہوری کو بُلایا اور اپنے پاس بٹھایا اور فرمایا کہ تم نے یہ کام بڑے دیندار مردوں کا کیا کہ اپنے بھائی کا قصور معاف کر دیا اور عوض نہ لیا۔ اس کا اجر اللہ تعالےٰ تم کو آخرت میں دے گا۔ اور فرمایا کہ اللہ تعالیٰ سب مسلمانوں کو یہی توفیقِ نیک عطا کرے۔ اور لاہوری کے لیے آپ نے دُعا کی۔

○

ستر ھواں باب

پائندہ خاں کی ملاقات، قلعۂ ہنڈ کا تخلیہ

تربیلا کی دعوت پائندہ خاں تنولی حاکم امب کے دو معزز مصاحب ایک سید حسن شاہ اور دوسرے شاہا جمعدار کبھی کبھی سید صاحبؒ کے پاس بطورِ وکالت آتے تھے اور پائندہ خاں کی خوبی اور اخلاص منشی بیان کرتے تھے اور کہتے تھے کہ وہ آپ کا خیر خواہ، فرماں بردار اور مخلص جان نثار ہے۔ اسی عرصے میں گن گر کے محمد زماں خاں کا (جو سید صاحبؒ کے بڑے مخلص اور معتقد تھے) خط آیا کہ ہماری تمام بستیوں کی قوم مشوانی سب اس بات پر متفق اور ایک دل ہیں کہ تربیلا ان دنوں سکھوں کی فوج سے خالی ہے۔ اگر آپ کچھ مجاہدین کے ساتھ کھبل تشریف لائیں، تو ہم اسی روز حملہ کرکے اس پر قبضہ کرلیں۔ وہاں سب کے سب مسلمان بھی ہمارے شریک ہیں۔ آپ نے لکھا کہ انشاءاللہ ہم اسی ہفتے کھبل آئیں گے۔

چوتھے یا پانچویں روز آپ نے چلنے کی تیاری کی۔ عبدالحمید خاں رسالدار سے فرمایا کہ ڈیڑھ سو سواروں کے ساتھ تم کو ہمارے ساتھ چلنا ہوگا اور چاروں جماعتوں میں سے تین سو پیادوں کو اپنے ساتھ لیا۔ خاص جماعت کے تمام لوگ، کچھ لوگ شیخ ولی محمد کی جماعت سے، کچھ لوگ مولانا محمد اسمٰعیل صاحب کی جماعت سے اور کچھ قندھاریوں کی جماعت سے، اور آٹھ ضرب شاہین اپنے ساتھ لیں۔ باقی لوگ، جو پنجتار میں رہے، اُن پر مولوی احمد اللہ ناگپوری کو امیر کرکے آپ نے کوچ فرمایا۔ چند مقامات ٹھہرتے ہوئے

ایک روز صبح کو کھبل میں داخل ہوئے۔ شب کو پچھلے پہر محمد زماں خاں تربیلے پر چھاپا لے گئے۔ سکندرپور سے آنے کے راستے پر دو سَو آدمی بندوبست کے لیے بھیج دیے کہ ادھر سے سکھوں کی کمک نہ آنے پائے۔ یہ لوگ گھاٹی کی حفاظت میں رہے اور اُنھوں نے تربیلے پر جاکر قبضہ کرلیا۔

ہری سنگھ کی مزاحمت و مقابلہ ہری سنگھ پانچ چھ ہزار فوج کے ساتھ چار کوس پر پڑا تھا۔ اس کو خبر پہنچی کہ محمد زماں خاں نے تربیلے پر قبضہ کرلیا۔ وہ فوراً یہ خبر سنتے ہی اپنی فوج لے کر دَوڑا۔ جب گھاٹی کے قریب آیا، تو گھاٹی والوں نے روکا۔ جانبین سے بندوقیں چلنے لگیں۔ چار گھڑی کامل اُنھوں نے روکا۔ مگر وُہ پانچ چھ ہزار، یہ دو سَو آدمی جب اُن کے مقابلے کی تاب نہ لا سکے، تو گھاٹی چھوڑ کر پہاڑ پر چڑھ گئے اور وُہ گھاٹی میں آ گھسے۔

یہ خبر محمد زماں خاں کو پہنچی کہ ہری سنگھ پانچ چھ ہزار فوج کے ساتھ گھاٹی میں گھس آیا اور ہمارے لوگ پہاڑ پر چڑھ گئے۔ یہ خبر سُن کر وُہ بھی اپنے لوگوں کے ساتھ تربیلا خالی کرکے گنگر پہاڑ پر چڑھ گئے۔ اب گڑھی کے مورچے قائم تھے۔ جب مورچوں میں ان قندھاریوں اور ملکیوں کو یہ خبر پہنچی کہ ہری سنگھ اس قدر فوج کے ساتھ آپہنچا اور محمد زماں خاں تربیلا خالی کرکے پہاڑ پر چڑھ گئے، تب مُلکی لوگ تو مورچے چھوڑ کر محمد زماں خاں کی طرف چلے گئے اور قندھاری کھبل کی طرف روانہ ہوگئے۔ کھبل سے تربیلا تک ایک کوس کا فاصلہ ہے۔ کھبل سے غازی دیکھ رہے تھے۔ قندھاری تربیلا سے نکل کر آدھ کوس آئے ہوں گے کہ ہری سنگھ کے سوار تربیلا میں داخل ہوئے اور قندھاریوں کو دیکھا کہ کھبل کی طرف جاتے ہیں۔ یکبارگی اُنھوں نے اُن کے پیچھے گھوڑے ڈالے اور بندوقیں مارتے ہوئے دَوڑے۔ لوگوں نے سید صاحبؒ کو اطلاع کی کہ ہمارے قندھاریوں کے پیچھے سکھوں کے سوار بندوقیں مارتے چلے آتے ہیں۔ آپ نے شیخ عبداللہ جمعدار اور شیخ وزیر کو بلاکر فرمایا کہ تم بھی ادھر سے شاہین مارو۔ کھبل کے لوگ بھی اپنی اپنی پلیتے دار بندوقیں لے کر تیار ہوئے۔ اس عرصے میں قندھاریوں نے آکر دریائے سندھ کا کنارا پکڑا اور جابجا مورچے لگا کر بیٹھ گئے۔ کھبل سے شاہینیں اور بندوقیں چلنے لگیں۔ سکھوں کے سوار بھی بے دھڑک بندوقیں سر کرتے چلے آتے تھے۔ جب اور قریب آئے، تو قندھاریوں نے اُٹھ کر ایک

باڑھ ماری۔ وُہ سوار وہیں رُکے، آگے نہ بڑھ سکے۔ دو گھڑی تک جانبین سے خوب بندوقیں چلیں۔ آخر سوار قندھاریوں سے مایوس ہو کر تربیلا روانہ ہو گئے۔

اِدھر کھبّل سے شاہینیں اور بندُوقیں چلتی رہیں۔ آپ نے پیر خاں جمعدار سے فرمایا کہ کشتی لے جا کر قندھاریوں کو اُس پار سے اُتار لاؤ۔ خاں صاحب آدمیوں کے ساتھ گئے اور سب کو ناؤ پر اُتار لائے۔ اسی روز سکھوں نے تربیلا سے نکل کر سَرَن ندی کے کنارے ڈیرہ کیا۔ جب مجاہدین نمازِ ظہر پڑھ کر فارغ ہُوئے، تو کوئی تین چار سَو سکھ سوار اپنے لشکر سے نکل کر کھبّل کے پاس آئے۔ سیّد صاحبؒ نے شیخ عبداللہ جمعدار اور شیخ وزیر سے فرمایا کہ تم بھی شاہینیں پہاڑ کی ٹیکری پر جا کر لگاؤ۔ اگر سکھوں کے سوار نزدیک شاہینوں کی زد پر آئیں، تو مارنا اور جو وہیں سے لَوٹ جائیں، اِدھر نہ آئیں، تو کچھ تعرّض نہ کرنا۔ مگر وہ چلے ہی آتے تھے۔ اُنھوں نے جلد جا کر ٹیکری پر شاہینیں لگا دیں اور اُن کو مارنے لگے۔ اس میں دو یا تین سوار اُن کی شاہین کے گولے سے گرے۔ وُہ پراگندہ ہو کر بھاگ کھڑے ہُوئے اور اپنے لشکر میں جا ملے۔ رات بھر سب مجاہدین دستور کے موافق اپنی چوکی پہرے سے ہوشیار رہے۔

رات کو سکھوں کے کوئی دو سَو آدمی آ کر دریائے سندھ کے کنارے چھپ کر بیٹھ رہے۔ مجاہدین کو یہ حال معلوم نہ تھا۔ جب وہ سویرے دریا پر وضُو کرنے لگے، تو سکھوں نے لوگوں کی آواز سُن کر بندُوقوں کی ایک باڑھ ماری، مگر خدا نے خیر کی، کسی کے گولی نہ لگی۔ مجاہدین بھی بندُوقیں مارنے لگے اور کوئی تین گھڑی دِن چڑھے تک شاہینیں اور بندُوقیں چلائیں۔ جب سکھوں نے اِدھر کا بہت زور دیکھا، تو وہ بھاگ کر اپنے لشکر میں چلے گئے۔

سیّد اکبر شاہ کی مُلاقات اسی روز ستھانے سے سید اکبر شاہ بیس، پچیس آدمیوں کے ساتھ اُن کے بھائی سید صغر شاہ مُنڈی والے، سیّد نُور جمال اور سیّد کامل شاہ سیّد صاحبؒ کی ملاقات کو تشریف لائے۔ اُس وقت تک سیّد اکبر شاہ کی سیّد صاحبؒ سے مُلاقات نہیں ہُوئی تھی، فقط خطُوط اور لوگوں کی زبانی سلام پیام آتا تھا۔ سیّد صاحبؒ کو غائبانہ اُن کی خُوبیاں سُن کر اُن سے مُلاقات کا بڑا شوق تھا۔

جب مُلاقات ہُوئی، تو وُہ بھی بہت خوش ہُوئے اور سید صاحبؒ بھی مسرور ہُوئے۔[1]

سیّد اکبر شاہ نے عرض کیا کہ مَیں اُمیدوار ہُوں کہ اُدھر سے آپ میرے غریب خانے پر تشریف لے چلیں۔ مَیں اِسی ارادے سے یہاں آپ کی خدمت میں آیا ہوں۔ آپ نے فرمایا کہ سید بھائی، انشاء اللہ تعالیٰ کل ہم یہاں سے کُوچ کر کے تمہارے ہی مکان پر چلیں گے۔

اِسی سے پائندہ خاں کے بھیجے ہُوئے سید حسن شاہ اور شاما جمعدار آئے ہُوئے تھے اور خانِ ممدوح کے اشتیاقِ مُلاقات کا پیام لائے تھے۔ آپ نے اُن کو اطمینان دلایا تھا کہ انشاء اللہ تعالیٰ تمہارے خان سے ضرور ملاقات کریں گے اور اُن کو اپنے پاس ٹھیرایا تھا۔ آپ نے اُن سے کہا کہ ہم سید اکبر کے ساتھ آکر ستھانہ میں ٹھیریں گے، تم جا کر اپنے خان سے ہمارے ستھانے جانے کی خبر کر دو۔ جو کچھ وہ تم سے کہیں، ہم سے ستھانے میں آکر کہنا۔

سید صاحبؒ ستھانے میں | سید صاحبؒ نے سب لشکر کھبّل میں چھوڑا اور ڈیڑھ سو غازیوں کے ساتھ ستھانے کو (جو کھبّل سے پانچ کوس ہے) سید اکبر شاہ کی معیت میں تشریف لے گئے اور اُن

---

[1] سید اکبر شاہ ابن سید شاہ گُل ابن سید ضامن شاہ، سید علی ترمذی غوث ظہیر کی اولاد میں سے تھے۔ پکھلی اور ہزارے کا بڑا حصّہ اُن کے خاندان کا معتقد اور مخلص تھا۔ اور اُن کی قناعتیں ہزارے کے سادات اور وہاں کے خوانین و رُؤساء نامدار میں تھیں یہ خاندان سخاوت، شجاعت، اخلاص و للّٰہیت اور استقامت و استقلال میں سارے علاقے میں ممتاز تھا۔ سید صاحبؒ اور اُن کی دعوت و تحریک کے ساتھ اس خاندان نے اخیر تک وفاداری اور شیفتگی اور ایثار و قربانی کا ایسا ثبوت دیا، جس کی نظیر صُوبۂ سرحد کی تاریخ میں نہیں ملتی۔ منظورۃ السعداء میں ہے:

"اخلاقِ کریمۂ ایں سادات، خصوصاً سید اکبر شاہ بیرون از بیان است۔ اخلاص و وفا از ابتدا تا انتہا یکساں نمودند"

وقائع میں ہے:

"سید اکبر شاہ کے اخلاقِ حمیدہ اور اوصافِ پسندیدہ کا بیان کہاں تک کروں؛ جس نے اُن کو دیکھا ہے اور اُن کی صحبت اٹھائی ہے، وہ ہی خوب واقف ہے کہ ایسا خوش خلق، خندہ رُو، کشادہ پیشانی، حلیم الطبع، سلیم المزاج، سخی اور شجاع، صاحبِ تدبیر، صاف دل، راست گفتار اور حضرت علیہ الرحمۃ کا مخلصِ بے ریا، اور محبِ باوفا اور مُعتقدِ صادق کوئی رئیس اس ولایت میں نہ تھا۔"

سید صاحبؒ کی شہادت اور بالاکوٹ کے معرکے کے بعد پھر ستھانہ مجاہدین کی پناہ گاہ اور سارے ہندوستان میں جہاد و دعوت کا صدر مقام تھا اور یہی ساداتِ ستھانہ اِن عالی حوصلہ مجاہدین اور غریب الوطن مہاجرین کے اعوان و انصار تھے، رِجَالٌ صَدَقُوا مَا عَاهَدُوا اللّٰهَ عَلَيْهِ الخ

کے مکان پر اُترے۔ سیّد موصوف چھ بھائی تھے : سیّد اعظم، سیّد اکبر، سیّد عُمر، سیّد عمران، سیّد اصغر، سیّد مدار۔ اُن سب کی والدہ بھی زندہ تھیں۔ اُن سب نے سیّد صاحبؒ کے ہاتھ پر بیعت کی اور منڈی والے سیّد نور جمال اور سیّد کامل شاہ نے بھی بیعت کی۔

پائندہ خاں کی ملاقات کا مشورہ اور سیّد اکبر شاہ کی رائے

عشاء کی نماز کے بعد سیّد صاحبؒ نے سید اکبر صاحب سے پائندہ خاں کی ملاقات کے متعلق مشورہ لیا اور اُس کے اشتیاق و پیغامات کا ذکر کیا۔ اس وقت مجلس میں صرف مولانا محمد اسمٰعیل صاحب اور منشی خواجہ محمد تھے۔ سید اکبر شاہ نے تواضع اور معذرت کے بعد جواب دیا کہ آپ نے مجھے سرفراز فرمایا اور مجھ سے مشورہ طلب فرماتے ہیں۔ تو جو کچھ میری رائے ناقص میں ہے، عرض کرتا ہوں کہ اس قوم تنولی کے لوگ اکثر بڑے غدّار اور مکّار ہیں۔ یہاں کی ضرب المثل ہے "تنولی بے قولی"۔ ہمارا پائندہ خاں سے اکثر معاملہ پڑتا ہے۔ اُس نے کسی کے ساتھ سوائے بدعہدی کے کبھی وفاداری نہیں کی اور یہ ملاقات کسی طرح بھی مکر و فریب سے خالی نہیں۔ آپ لوگ اللہ والے صاف دل، پاک طبیعت اور اس مُلک میں نووارد ہیں۔ آپ کو یہاں کے حالات کا علم نہیں۔ ہم یہاں کے راز دار ہیں، لیکن بہرحال آپ کے خُرد ہیں۔ سیّد نادر شاہ اور سیّد مردان منڈی والے ہمارے عزیزوں میں بڑے سال خُورد اور جہاں دیدہ شخص ہیں۔ سیّد نادر شاہ پائندہ خاں کے بڑے مشیر و مصاحب ہیں۔ وُہ پائندہ خاں کے والد نواب خاں کے مصاحب تھے۔ یہاں سے پاؤ کوس اُن کا مکان ہے۔ اگر ارشاد ہو، تو سواری بھیج کر اُن کو یہاں بُلالیں۔

سیّد صاحبؒ نے فرمایا کہ سید بھائی، تم نے معقول دانائی و خیر خواہی کی باتیں کی ہیں اور یہ مشورہ بھی معقول ہے۔ مگر وہ بڑھے ضعیف آدمی ہیں، اُن کو تکلیف دینے کی کیا ضرورت ہے؟ ہم خود اُن کے مکان پر چل کر ملاقات کریں اور جو باتیں کرنی ہوں، وہیں کرلیں۔ سید اکبر نے عرض کیا کہ آپ کیوں زحمت فرمائیں؟ وُہ خود یہیں حاضر ہوں گے۔ انھوں نے اپنا آدمی بھیجا۔ وُہ گھوڑا لے گیا اور اُن دونوں صاحبوں کو سوار کر کے لے آیا۔ سیّد صاحبؒ نے اُٹھ کر اُن سے مُعانقہ اور مصافحہ کیا اور عافیت مزاج پوچھی اور اپنے پاس بٹھایا۔ وُہ آپ کی خوش اخلاقی اور ملاقات سے بہت خوش ہُوئے۔

سیّد نادر شاہ کی گفتگو پھر آپ نے پائندہ خاں کی مُلاقات کے مُتعلّق اُن سے دریافت کیا۔ سیّد نادر شاہ نے پائندہ خاں کے والد نواب خاں کی بدعہدی، گرفتاری اور قتل کا پُورا واقعہ سنایا اور کہا: اُس نے پائندہ خاں سے بھی وصیّت کی کہ کیسا ہی کوئی رئیس، سردار اور حاکم ہو اور تجھ کو بُلانا چاہے، تو اُس سے بے کھٹکے اور صاف دِل سے نہ مِلنا اور اُس کی باتوں کے فریب میں نہ آنا، نہیں تو پچھتائیگا۔ چنانچہ پائندہ خاں آج تک کسی سردار رئیس سے صاف دِل ہو کر نہیں مِلتا اور اس کے دل کا چور نہیں نکلتا۔ اُس کا عُروج ہُوا، تو پہلے اُس کے ساتھ بے وفائی کی، جنھوں نے اس کا ساتھ دیا اور جس نے اُس کی رفاقت اور خیر خواہی کی، اُسی کو اُس نے دغا دی۔ مَیں اُس کی مجلس میں رہتا ہُوں۔ مَیں نے خود اُس کی زبان سے سُنا ہے کہ مجھ کو اپنے والد نواب خاں کی وصیّت اور فہمائش یاد ہے اور کسی حاکم و رئیس کی طرف سے میرا دِل مطمئن اور صاف نہیں اور جو آپ کو اُس نے سیّد حسن شاہ کی زبانی پیام بھیجا ہے، تو وہ رافضی مذہب ہے۔ خدا جانے، اُس نے کیا پیام بھیجا ہے اور اُس نے آپ کے پاس کیا پہنچایا ہے۔ میرے نزدیک اُس کی یہ بات بھی مکر و فریب سے خالی نہ ہوگی۔ اگر اُس کو آپ سے مُلاقات ہی کرنی ہے، تو یہاں سے آدھ کوس پر گڑھی ہے، وہاں اُس کو بُلا کر مُلاقات کر لیجیے۔ اگر اُس کی طبیعت میں مکر و فریب نہ ہُوا، تو بے دغدغہ چلا آئے گا اور اگر آپ کی طرف سے اُس کو اندیشہ ہوگا، تو نہیں آئے گا۔

سیّد صاحبؒ کا ارشاد آپ نے یہ سُن کر جواب دیا: جَزَاکَ اللہ! سیّد بھائی، تم نے اس مُعاملے کا نشیب و فراز خُوب بیان کیا، عقل کی رُو سے بجا ہے۔ جتنے سردار اور رئیس جاہ طلب دُنیادار ہیں، اُن سب کا یہی برتاؤ ہے کہ اُن کو اوّل بڑا خطرہ اپنی جان کا ہوتا ہے، دُوسرے زوالِ ریاست کا، اور ہمارا تو تمام معاملہ دِین کا ہو، خواہ دُنیا کا، اللہ تعالیٰ کی رضامندی پر موقوف ہے۔ اُس کی رضامندی کے کام میں جان و مال صرف کرنا ہم سعادتِ ابدی جانتے ہیں۔ جو کوئی ہم سے دغا اور فریب کرے گا، اُس سے نہ ہمارا دِین بگڑ سکے گا، نہ ایمان۔ اس کا عوض وُہ اپنے اللہ تعالیٰ سے پائے گا۔ پھر ہم کو کس بات کا خطرہ؟ اور ہم جو پائندہ خاں سے مُلاقات کا ارادہ رکھتے ہیں، تو صرف اس نیت سے کہ وُہ بھی ہمارا

مسلمان بھائی ہے اور نامی رئیس اور مردانہ آدمی ہے۔ اگر ہم سے موافق ہو جائے، تو اُس کی عملداری میں سے ہو کر ہمارے لیے کشمیر کا راستہ صاف ہو جائے، ہمارے لوگ بے اندیشہ آنے جانے لگیں، کچھ کام اللہ تعالیٰ کا نکلے۔ اپنا تو یہی مدّعا ہے اور جو ہم سے مکر و فریب کرے گا، تو اُس کا بدلہ خدا سے پائے گا۔ اور ہم تو اپنا حامی و مددگار فقط اللہ تعالیٰ کو جانتے ہیں۔ اور سیّد بھائی، تم جو کہتے ہو کہ اُس کو سہیاں گڑھی پر بُلا کر ملاقات کرو، اگر اس کا ہم پیام بھیجیں، تو وُہ اور بھی بھڑک جائے گا اور نہ آئے گا کہ مبادا کچھ مجھ سے دغا فریب کریں۔ سو اس امر کو ہم نے اُس کی رائے پر موقوف رکھا، جہاں وہ بُلائے گا، ہم وہیں جائیں گے اور جو یہ کہتے ہو کہ سیّد حسن شاہ رافضی ہے، اُس کی بات کا کیا اعتبار، تو کیا عجب ہے کہ اللہ تعالیٰ اُس کو ہدایت کرے اور وُہ سُنّی ہو جائے۔

آپ کی یہ تقریر سُن کر سیّد نادر شاہ نے کہا کہ حضرت، اگر آپ کی خالصاً لِلّٰہ یہی نیّت ہے، تو بہر طور آپ کو فائدہ نقصان کسی طرح کا متصوّر نہیں۔ آپ نے فرمایا کہ سیّد بھائی، اب جنابِ الٰہی میں دُعا کرو، وُہ سب معاملہ درست کر دے گا۔ سب نے مل کر دُعا کی۔

پائندہ خاں کی درخواستِ ملاقات | اگلے روز دن چڑھے سیّد حسن شاہ اور شاما جمعدار آئے اور پائندہ خاں کا پیام لائے کہ خانِ موصوف امب سے عشرہ میں آیا ہے اور سلام کے بعد عرض کیا ہے کہ آپ عشرہ کے میدان میں نالے پر بڑ کے درخت کے نیچے تشریف لائیں، مگر تھوڑے لوگوں کے ساتھ آئیں، تو میں آپ کی قدم بوسی سے شرف یاب ہوں۔ سیّد صاحب یہ پیام سُن کر بہت خوش ہُوئے اور اُن دونوں کو کھانا کھلایا اور فرمایا کہ تم آگے چل کر اپنے خان کو خبر کرو، ہم ظہر کی نماز پڑھ کر آئیں گے۔ یہ سُن کر وُہ رخصت ہُوئے۔ آپ نے مولانا محمد اسمٰعیل صاحب سے فرمایا کہ پائندہ خاں کے دِل میں خوف زیادہ ہے، اس خیال سے اُس نے کہلا بھیجا ہے کہ آپ کے ہمراہ تھوڑے آدمی آئیں اور لوگ اس کے عادی ہیں کہ جہاں میں جاتا ہوں، سب کے سب چلنے پر مستعد ہو جاتے ہیں۔ سو آج میرے ہمراہ کوئی پچیس تیس آدمی چلیں، مجھ کو تو اس سے راہ پیدا کرنا اور اُس کو مِلانا منظور ہے۔

مولانا نے عرض کیا: جیسا آپ مناسب سمجھیں، بہتر ہے؛ مگر میرے نزدیک اچھا یہ ہے کہ

یہاں سے جو لوگ ساتھ چلیں، آپ مانع نہ ہوں جب آپ پہاڑ کی کھڑی[1] کے پار ہوں، وہاں سب کو ٹھیرا دیں۔ پھر اُنھیں میں سے جتنے منظور ہوں اپنے ہمراہ لے جائیں آپ نے فرمایا: کیا مضائقہ ہے! یہ بہتر ہے۔

مولانا محمد اسمٰعیل صاحب کا انتظام اور پیش بندی

مولانا اپنے ڈیرے پر گئے اور معتبر لوگوں سے کہہ دیا کہ آج ظہر کے بعد سیّد صاحبؒ پائندہ خاں کی ملاقات کو چلیں گے، سب بھائیوں سے خبر کر دینا کہ سب چلیں اور اطلاع کے طور پر اُن سے کہا کہ جو گفتگو سیّد اکبر صاحب اور سیّد نادر شاہ صاحب نے کی ہے، وہ میرے دل میں نقش ہوگئی ہے اور میں کہتا ہوں کہ پائندہ خاں فریبی اور مکار ہے، ایسا نہ ہو کہ کچھ دغا کرے۔ اس لیے اور بھی کہتا ہوں کہ سب لوگ چلیں۔

ظہر پڑھ کر سیّد صاحبؒ نے چلنے کی تیاری کی اور رسالدار عبدالحمید خاں کو کہلا بھیجا کہ اپنا سمند گھوڑا تیار کر کے ہمارے پاس بھجوا دو اور تم یہیں ستھانے میں رہو۔ رسالدار موصوف نے اُسی وقت گھوڑا بھجوا کر بھیج دیا۔ آپ نے کمر باندھی، تلوار طمنچہ لگایا، سوار ہوئے اور برچھا ہاتھ میں لیا۔ سب مجاہدین آپ کے ہمرکاب ہوئے۔

آپ جب پہاڑی کی کھڑی کے پار ہوئے، سیّد حسن شاہ اور رشاما جمعدار آکر ملے اور عرض کیا کہ آپ تو بہت لوگ ساتھ لائے۔ آپ نے فرمایا: آنے میں کیا مضائقہ، سب یہاں ٹھیر جائیں گے۔ یہاں سے جتنے آدمی کہو گے، اتنے چلیں گے۔ اُنھوں نے کہا کہ دس بارہ آدمیوں کے ساتھ تشریف لے چلیے۔

اُس وقت مولانا محمد اسمٰعیل صاحب نے شیخ علی محمد دیوبندی، ابراہیم خاں، اُن کے بھائی امان خاں اور محمد خاں کے کان میں چپکے سے کہہ دیا کہ جب سیّد صاحبؒ یہاں سے آگے روانہ ہوں، تو تم بیس پچیس مجاہدین کو لے کر دریائے سندھ کے کراڑے کی آڑ میں ہو کر چلے جانا[2] اور جہاں سیّد صاحبؒ سے ملنے کی جگہ مقرر ہوئی ہے، اُسی کے نزدیک کراڑے کے نیچے چھپ کر بیٹھ رہنا۔ اگر وہاں پائندہ خاں

---

[1] ستھانہ اور عشرہ کے درمیان ایک کھڑی (پہاڑ کی ایک کم بلند دیوار) تھی جو دریا کے کنارے تک پہنچی ہوئی تھی اور آنے جانے والے اُس کے اوپر سے گزرتے تھے۔ خوانین امب نے اس کھڑی کو کٹوا دیا۔ آج کل راستہ ہموار ہے۔ (سیّد احمد شہیدؒ ج ۲، ص ۱۵۲)

[2] مہر صاحب لکھتے ہیں: "اب ان مقامات پر دریا کے کنارے اوٹ کی کوئی جگہ نہیں۔ ۱۸۴۱ء کی طغیانی میں دریائے سندھ کے اردگرد کی زمین تیس تیس گز گہرائی میں کٹ گئی تھی۔ لہٰذا ان مقامات کے جن نقشے کا ذکر متن میں ہے، اسے آج کل موقع پر تلاش کرنا بے سود ہوگا۔" (سیّد احمد شہیدؒ، ص ۱۵۲/۲۵)

کی طرف سے کچھ فساد کی صورت دیکھنا، تو تم بھی سیّد صاحب کی مدد کو پہنچ جانا، ورنہ کسی پر اپنے کو ظاہر نہ کرنا۔

یہ تدبیر بتا کر آپ سیّد صاحبؒ کے پاس گئے اور سیّد صاحبؒ بارہ آدمیوں کو اپنے ساتھ لے کر روانہ ہو گئے۔ اُدھر شیخ علی محمدؐ اور ابراہیم خاں وغیرہ سیّد صاحبؒ کے پہنچنے سے پیشتر دریا کے کراڑے کی آڑ میں جا بیٹھے۔ جب سیّد صاحبؒ سے بڑ کا درخت، جو ملاقات کے لیے مقرر ہوا تھا، پچاس ساٹھ قدم رہ گیا، تو آپ نے دس بارہ آدمیوں کو وہاں ٹھیرا دیا اور فقط مولانا محمد اسمٰعیل صاحب اور منشی خواجہ محمدؐ صاحب کو ساتھ لے کر پیادہ پا چلے اور سیّد حسن شاہ اور شاما جمعدار سے فرمایا کہ تم آگے بڑھ کر اپنے خان کو بلا لاؤ۔

پائندہ خاں کی سازش کی ناکامی وہاں سے بندوق کی گولی کی زد پر پائندہ خاں تین چار سو سوار لیے کھڑا تھا اور جہاں ملاقات کی جگہ مقرر ہوئی تھی، وہاں سے گولی کی زد پر جانب مغرب دامن کوہ میں ایک جنگل تھا۔ پانچ سو پیادے اُس کے اندر چھپا دیے اور اُن سے کچھ اشارہ کر رکھا ہو گا کہ جب سید حسن شاہ و شاما جمعدار اُس کے پاس گئے، تو وہ بھی سب سواروں کو وہاں چھوڑ کر اکیلا پیادہ پا سید حسن شاہ اور شاما جمعدار کے ساتھ بڑ کے درخت کے قریب ٹیلے پر پہنچا اور دو ہی آدمیوں کے ساتھ سیّد صاحبؒ وہاں پہنچے۔ دونوں میں سلام علیک اور مصافحہ ہوا۔ ٹیلے پر سیّد حسن شاہ نے اپنی پشاوری لُنگی بچھا دی۔ اُس پر سب بیٹھ گئے۔ پائندہ خاں زرہ پہنے تھا اور چار آئینہ اور خود لگائے ہوئے تھا۔ آنکھوں کے سوا اُس کے جسم کا کوئی حصّہ نظر نہیں آتا تھا۔ ایک جوڑی پستول، ایک کشمیری شیر بچہ اور ایک تلوار باندھے تھا۔

ابھی سیّد صاحبؒ اور پائندہ خاں سے باتیں ہو ہی رہی تھیں کہ تین چار سو سواروں نے، جن کو پائندہ خاں نے کھڑا کرایا تھا، گھوڑوں کی باگیں اُٹھائیں۔ زمین پتھریلی تھی۔ اُن کے ٹاپوں کی آواز اس طرح سنائی دیتی تھی، جیسے اولے پڑتے ہیں۔ جب تک وہ پائندہ خاں کے وہاں پہنچیں، تب تک دریا کے کنارے کے مجاہدین ایک دم سے چڑھ آئے اور قرابینیں اور چقماقیں چڑھا کر سیّد صاحبؒ

اور پائندہ خاں کے گرد کھڑے ہو گئے۔ اُن کے پیچھے وہ دس آدمی، جن کو سیّد صاحبؒ کہیں دُور چھوڑ آئے تھے، آن پہنچے۔ اُن سواروں نے آن کر سب کا محاصرہ کر لیا، مگر انھوں نے اپنے خان کو غازیوں کے قابو میں دیکھا اور سمجھ لیا کہ اگر ہم نے جُنبش کی، تو خان کو زندہ نہ چھوڑیں گے۔ اس خیال سے ایک سکتے کے عالم میں کھڑے رہ گئے۔

پائندہ خاں کے چہرے کا رنگ فق ہو گیا اور مُردنی چھا گئی۔ سیّد صاحبؒ نے اُس کو ہوش باختہ دیکھ کر فرمایا: "خان بھائی، تم کسی بات کا اندیشہ نہ کرو۔ تم تو ہمارے بھائی ہو۔ ہم نے جو تم سے ملاقات کی ہے، وُہ محض خدا کے واسطے کی ہے کہ کشمیر کا راستہ تمھاری عملداری میں سے ہو کر گزرتا ہے اور دریائے سندھ کی کشتیاں بھی تمھارے قابو میں ہیں۔ ہم چاہتے ہیں کہ اگر ہمارے آدمی اللہ تعالیٰ کے کام کے لیے تمھاری عملداری میں آئیں، تو کوئی اُن سے مزاحم نہ ہو۔ اگر تم بھی للہ فی اللہ اس کارِ خیر میں شریک رہو گے، تو اللہ تعالیٰ تمھارے واسطے دُنیا و آخرت کی خیر و فلاح کرے گا۔"

سیّد صاحبؒ کی شفقت | پائندہ خاں چاہتا تھا کہ کسی طرح اس کشمکش سے رہائی پا کر اپنے مکان کو سلامت چلا جائے۔ اُس نے عرض کیا کہ حضرت، آپ تو ہمارے پیر و مُرشد اور امام ہیں اور ہم آپ کے مُطیع و فرمانبردار ہیں۔ جو کچھ آپ فرماتے ہیں، سب مجھ کو منظور ہے۔ آپ نے منشی خواجہ محمدؒ سے فرمایا کہ مُنشی جی، ہماری دستار لاؤ۔ اُنھوں نے رُومال میں لپٹی ہُوئی آپ کے سامنے رکھ دی۔ آپ نے اُس کا سرا کھول کر اپنے ہاتھ سے اُٹھایا اور فرمایا کہ خان بھائی، بسم اللہ کر کے اس کو باندھ لو۔ اُس نے رُومال کے ساتھ اپنے ہاتھ میں لے لی اور عرض کیا کہ مکان پر جا کر باندھ لُوں گا۔ آپ نے فرمایا: ابھی باندھ لو۔ تین بار آپ نے یہی فرمایا اور تین بار اُس نے وُہی جواب دیا۔ سیّد صاحبؒ نے فرمایا کہ خان بھائی، تم اللہ کے واسطے ہم سے ملے ہو اور کارِ خیر میں شریک ہُوئے ہو اور تمھاری عملداری کی سرحد سکھوں کی سرحد سے ملی ہُوئی ہے۔ ہم تم کو ایک ضرب توپ، جو بہت بھاری ہے، اور ایک ہاتھی دیں گے، اور وُہ بھی خدا ہی کا مال ہے۔

توپ اور ہاتھی کا نام سُن کر پائندہ خاں بہت خُوش ہُوا اور کہا: آپ کی میرے حال پر پرورش ہ

عنایت ہے اور آپ سے رخصت چاہی۔

ستھانے واپسی | اُس وقت کوئی گھڑی دن باقی تھا۔ آپ نے بھی چلنے کی تیاری کی اور کہا کہ خان بھائی، ستھانہ دُور ہے، ہمارے لوگوں کو تکلیف ہوگی۔ اگر کہو، تو تمھارے عشرے میں رات بھر کے لیے اُتر لیں؟ پائندہ خاں کو اندیشہ ہُوا کہ مبادا وہاں جاکر اپنا قبضہ کر لیں۔ اُس نے ہاتھ جوڑ کر عرض کیا کہ آپ ستھانے تشریف لے جائیں، ہیں نہیں آپ کے لیے دعوت بھیجوں گا جنگل میں جو اُس نے کئی سَو پیادے چھپا رکھے تھے، وُہ اُس وقت تک چھپے رہے۔ جب سیّد صاحبؒ ستھانے کی طرف روانہ ہوئے اور پائندہ خاں اپنے گھر کی طرف۔ تو وُہ اس جنگل سے نکلے اور سواروں میں شریک ہو گئے۔

سیّد صاحبؒ ایک دیندار عالم سے ملنے موضع چنپئی میں تشریف لے گئے[1] اور مولانا اسمٰعیل صاحب سب لوگوں کو لے کر کھبّل روانہ ہوئے۔

دُرّانیوں کا قلعۂ ہنڈ پر حملہ | چنپئی میں ایک آدمی خبر لایا کہ سردار سُلطان محمّد خاں کو اُس کی ماں نے غیرت دلائی کہ تو بڑا بے غیرت ہے کہ تیرا بھائی یار محمّد خاں مارا گیا، تجھ سے اُس کا کچھ بھی تدارک نہ ہُوا! اس غیرت پر سردار سُلطان محمّد خاں نے اپنے بھائی پیر محمّد خاں اور سید محمّد خاں کو متفق کرکے ہنڈ پر چڑھائی کی ایک فرنگی کیول نام، جو اُس کا نوکر تھا، وُہ بھی ساتھ آیا۔ قلعۂ ہنڈ میں پچاس ساٹھ مجاہدین تھے۔ اُنھوں نے مقابلہ کیا۔ جانبین سے خوب بندوقیں اور شاہینیں چلتی رہیں۔ دُرّانیوں نے قابو نہ پایا کہ قلعہ خالی کرالیں۔ اُن کے تردّد کو دیکھ کر فرنگی مذکور نے سُلطان محمّد خاں سے کہا کہ ابھی تو پچاس ساٹھ آدمیوں سے مقابلہ ہے، اُن سے تم قلعہ نہیں لے سکتے، جب کسی طرف سے اُنھیں مدد آ جائے گی، تو اَور بھی دُشوار ہو گا۔ اگر تم مجھ سے پکّا عہد و پیمان کرو کہ قلعہ کے خالی ہونے کے بعد ہم قلعہ والوں سے مزاحم نہ ہوں گے، تو میں اس کا کوئی راستہ نکالوں۔ خان ممدوح نے عہد کیا کہ ہم کو

---

[1] یہ عالم پہلے مانسہرے میں رہتے تھے سکھوں کے عمل دخل کے بعد وہاں سے ہجرت کرکے چنپئی میں آ گئے تھے۔ صاحب درس گوشہ نشین بزرگ تھے۔ اِن اطراف میں اُنھیں کا فتوٰی معتبر تھا۔ (وقائع)

قلعہ خالی کرانے سے کام ہے۔ اُن کی مزاحمت سے کیا غرض؟ تم سے جو تدبیر ہو سکے، کرو۔ کیول نے قلعہ والوں کو پیغام بھیجا اور سمجھایا کہ تم چند آدمی کیوں مُفت میں اپنی جانیں ہلاک کرتے ہو؟ بہتر یہ ہے کہ تم قلعہ خالی کر دو۔ ہم تمھاری جانیں بچالیں گے۔ اُس کے عہد و پیمان پر اُن لوگوں نے قلعہ خالی کر دیا۔ سُلطان محمّد خاں نے بدعہدی کر کے اُن کو گرفتار کر لیا اور قلعہ میں اپنا بندوبست کر لیا۔ یہ سب معاملہ میرے سامنے ہو چکا تھا۔ تب مَیں اِدھر آپ کے پاس آیا۔

یہ حال سُن کر سیّد صاحبؒ نے اُسی وقت کھبّل میں مولانا اسمٰعیل صاحب کو سب ماجرا لکھا اور تاکید کی کہ خط دیکھتے ہی آپ سب آدمیوں کو لے کر موضع گندف میں آجائیے[1]۔ اگلے روز سیّد صاحبؒ بھی وہیں تشریف لے گئے اور اُس کے اگلے روز وہاں سے سب لوگ کُوچ کر کے پنجتار کو روانہ ہُوئے۔

پنجتار کے قریب فتح خاں پنجتاری آمد کی خبر سُن کر استقبال کے لیے چلا۔ راستے میں مُلاقات ہُوئی۔ فتح خاں نے ہُنڈ کے تخلیے کی تفصیل سُنائی اور کہا کہ کیول نے اخوند ظہور اللہ کو اپنی ضمانت پر قلعہ خالی کرنے کی ترغیب دی۔ اخوند صاحب کو اُمید تھی کہ شاید آج کسی وقت ہماری مدد آجائے۔ انھوں نے وعدہ کیا کہ آج ہم اپنے لوگوں سے دریافت کر کے کل تم کو اس کا جواب دیں گے۔

مجاہدین کی جوانمردی اگلے روز اخوند صاحب نے کہا کہ ہم لوگوں کو دُرّانیوں پر ہرگز اعتماد نہیں اور تُم اُن کے نوکر ہو، حاکم نہیں ہو۔ ہم لوگ اگرچہ تھوڑے ہیں، مگر ہم کو اس میں کُچھ تردُّد نہیں۔ ہم تو اللہ کی راہ میں اپنی جانیں ہتھیلی پر لیے پھرتے ہیں۔ اگر مارے گئے، تو اِنشاء اللہ درجۂ شہادت پائیں گے اور زندہ رہے، تو غازی کہلائیں گے۔ ہمارے لیے دونوں باتیں بہتر ہیں۔ تم اس جھگڑے میں نہ پڑو، ہم لڑیں گے۔

کیول نے کہا: اخوند صاحب، تم سچ کہتے ہو۔ دُرّانی فی الحقیقت فریبی اور دغا باز ہیں اور یہ بھی ہم جانتے ہیں کہ خلیفہ صاحب کے لوگ بڑے مردانے، شجاع اور اللہ والے ہیں اور اپنی جان ہتیلی پر لیے پھرتے ہیں، لیکن اس کا عہد و پیمان ہم پُختہ کر چکے ہیں اور ہم اپنی ضمانت کرتے ہیں۔ اگر دُرّانی کچھ بدعہدی کریں گے، تو ہم تمھارے شریک ہیں۔ اخوند صاحب نے کہا کہ خیر، اگر تم نے اطمینان کر لیا

---

[1] یہ گندف پہاڑوں کے بیچ میں چِنگئی سے پنجتار کے راستے پر واقع ہے (سیّد احمد شہیدؒ، ج ۲ ص ۱۵۴)

ہے، تو مضائقہ نہیں۔ ہم قلعہ خالی کر دیں گے۔ اخوند صاحب نے قلعہ خالی کر دیا۔

سلطان محمد خاں کی عہد شکنی سُلطان محمد خاں نے قلعہ پر اپنا تسلّط کر لیا اور مجاہدین کا اسباب اور ہتھیار چھین کر اُن کو گرفتار کر لیا۔ کیول نے کہا سردار، یہ بات نامناسب ہے۔ تم نے مجھ کو زبان دی ہے اور میں نے اُن کو اپنے ہاتھ سے نکالا ہے۔ تم اُن کو چھوڑ دو۔ سُلطان محمد خاں نے کچھ سماعت نہ کی۔ کیول ناخُوش ہو کر نوشہرے چلا گیا۔ رات کو اخوند ظہور اللہ صاحب خدا جانے کس طرح قید سے نکل گئے۔ دُرّانیوں نے صُبح کو سب قیدیوں کو تین سواروں کے ضابطے کے ساتھ ہشت نگر بھیج دیا اور سب کے سامنے پکار کر کہ دیا کہ اِن سب کو اپنے بھائی سردار یار محمد خاں کی قبر پر ذبح کروں گا۔ اب دُرّانیوں کا لشکر ہریانے سے آکر ہنڈ کے مَیدان میں پڑا ہے اور اُنھوں نے زَیدہ، کُھنڈہ اور شاہ منصُور وغیرہ کو لُوٹ لیا اور جلا دیا ہے۔

سیّد صاحبؒ نے یہ سب حال سُن کر فرمایا کہ خدا کی مرضی، اُنھوں نے مسلمانوں کے ساتھ جو بدعہدی کی ہے، اُس کا اللہ تعالیٰ اُن سے عوض لے گا۔ مجھ کو امید ہے کہ اِنشاء اللہ وُہ سب ان مُوذیوں کے چنگل سے چھوٹ جائیں گے۔ پھر آپ مع لشکر پنجتار میں داخل ہُوئے اور سب لوگ اپنے اپنے مکانوں میں اُترے۔

ہُنڈ کا تخلیہ اگلے روز ظہر کی نماز کے بعد سیّد صاحبؒ نالے پر شیشموں کے درختوں کے نیچے (جہاں جُمعہ کی نماز ہوتی تھی) بیٹھے تھے اور صدہا مُجاہدین اور اُس نواح کے مُسلمان حاضر تھے۔ بعض بعض مُلکیوں کی زبانی افواہاً خبر معلوم ہُوئی کہ دُرّانیوں کا ارادہ پنجتار پر حملہ کرنے کا ہے۔ سیّد صاحبؒ نے مولانا محمد اسمٰعیل صاحب، رسالدار عبدالحمید خاں، ارباب بہرام خاں، سردار فتح خاں اور اپنے بھانجے سیّد احمد علی صاحب کو بُلایا اور علیحدہ بٹھا کر کچھ مشورہ کیا۔ اس کے بعد بآوازِ بلند سب کے سامنے فرمایا کہ دُرّانی ہم پر پنجتار میں کیا حملہ کریں گے، ہم نے اُن کے پشاور پر لشکر بھیجنے کی تیاری اور تدبیر کی ہے، اور مولانا محمد اسمٰعیل صاحب اور عبدالحمید خاں رسالدار کی طرف مخاطب ہو کر بآوازِ بلند ارشاد فرمایا کہ ہمارے لشکر میں پانچ سَو کے قریب گھوڑے ہیں، ایک ایک گھوڑے پر دو دو آدمی

ہتھیار لگا کر سوار ہوں اور آج رات کو نمازِ عشا کے بعد پشاور کا راستہ لیں۔ سب سواروں کو خبر کر دو کہ جلد دو دو روز کی روٹیاں پکالیں اور تیار ہولیں۔ یہ خبر جماعت جماعت کی گئی۔ وہ سب آپ کے حکم کے مطابق روٹیاں پکانے لگے۔

یہ خبر مخبروں نے دُرانیوں کو پہنچائی کہ سیّد بادشاہ نے اپنے لشکر میں یہ تدبیر کی ہے ہم اُن کے سواروں کو روٹیاں پکاتے چھوڑ آئے ہیں۔ آج رات کو ضرور اُن کے سوار پشاور روانہ ہوں گے۔ یہ خبر سُن کر دُرّانیوں کے لشکر میں ہَول پڑ گیا اور سب لوگوں کو تردّد لاحق ہُوا کہ ایسا نہ ہو کہ وہاں جا کر غازی ہمارے اہل و عیال کو پکڑ لیں اور شہر کو تباہ کر دیں۔ اُسی وقت سردار سلطان محمّد خاں نے اپنے بھائی سردار سید محمّد خاں کو ہُنڈ پر چھوڑا اور دونوں بھائی کئی ہزار سوار لے کر پشاور کو روانہ ہو گئے اور پشاور ہی میں جا کر دم لیا۔ اُن کے بعد سردار سید محمد خاں نے خادی خاں کے بھائی امیر خاں کو بُلا کر کہا کہ ہم تو اب یہاں سے روانہ ہوتے ہیں، اگر تم سے ہو سکے، تو اپنے بھائی کے قلعے کو سنبھالو، نہیں تو تم جانو۔ یہ کہہ کر اُس نے کُوچ کیا اور ہشت نگر جا کر دم لیا اور قلعۂ ہُنڈ میں نام کو بھی کوئی دُرّانی نہ رہا۔

اِدھر پنجتار میں مجاہدین روٹیاں پکا کر کمر باندھے اپنے ساز و سامان کے ساتھ تین پہر رات گئے تک کُوچ کے منتظر بیٹھے رہے۔ اس عرصے میں سیّد صاحبؒ کے پاس خبر آئی کہ دُرّانیوں کا لشکر ہُنڈ کے میدان سے پشاور کی طرف کوچ کر گیا۔ اب وہاں کوئی بھی نہیں۔ سیّد صاحبؒ نے کہا: الحمد للہ! اور سر کھول کر بڑے الحاح و زاری کے ساتھ دُعا کی۔ کچھ دیر میں دُوسرا شخص بھی یہی خبر لایا اور صُبح کی اذان ہُوئی۔ تیسری مرتبہ یہ خبر آئی کہ سردار سید محمّد خاں قلعہ امیر خاں کو سُپرد کر کے اپنے لوگوں کو لے کر چلا گیا۔ فجر کی نماز پڑھ کر سیّد صاحبؒ نے سب کے ساتھ دوبارہ دُعا کی اور سواروں سے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے فضل و کرم سے بلا ٹال دی۔ اب کمر کھول ڈالو۔ اُس وقت لوگوں کو معلوم ہُوا کہ آپ نے یہ تدبیر صرف دُرّانیوں کے بھگانے کے لیے کی تھی۔

قیدیوں کی رہائی | اگلے روز ایک مُلکی نے آکر خبر دی کہ مَیں نے بعض لوگوں کی زبانی سُنا ہے کہ دُرّانیوں

نے جن لوگوں کو قلعہ ہنڈ سے نکال کر قید کر کے ہشت نگر میں پہنچا دیا تھا، وہ سید محمد خاں کے پہنچنے سے پہلے نکل گئے۔ یہ خبر سُن کر سید صاحبؒ بہت ہی خوش ہوئے اور فرمایا: الحمد للہ کہ کیا عجب ہے کہ اُس قادرِ مطلق نے اپنے عاجز بندوں کو ان موذیوں کے پنجے سے رہائی بخشی ہو۔ جنابِ الٰہی سے ہم کو یہی اُمید ہے۔ دوسرے یا تیسرے دن محمد خاں جمعدار پنجابی اٹھارہ یا بیس آدمیوں کے ساتھ آئے۔ سید صاحبؒ اور سب لوگوں سے مُلاقات کی۔ لشکر کے تمام لوگ اُن کو دیکھ کر خوش ہوئے کہ اللہ تعالیٰ نے اُن موذیوں سے بچا لیا۔ سید صاحبؒ نے محمد خاں سے پُوچھا کہ تمھارے باقی ہمراہی کہاں ہیں؟ اُنھوں نے کہا: وہ ندامت کے مارے آپ کے پاس نہیں آسکے کہ اب جا کر کیا مُنہ دکھائیں، وہ ہم کو بھی غیرت اور شرم دلاتے تھے کہ تم بھی نہ جاؤ۔ مگر ہم نے کہا کہ ہم تو وہیں جائیں گے، ہمارا تو مرنا جینا آپ ہی کے ساتھ ہے۔ سید صاحبؒ نے فرمایا: جزاکم اللہ! تم نے خُوب کام کیا، جو یہاں چلے آئے۔ اس میں شرم و ندامت کی کیا بات ہے؟

پھر سید صاحبؒ نے اُن سے اُن کی خلاصی کا سبب پُوچھا۔ اُنھوں نے کہا کہ جب ہم کو دُرّانی ہنڈ سے ہریانے لے گئے۔ ہمارے ہتھیار چھین لیے اور ہمیں گرفتار کر لیا۔ رات کو اخوند ظہور اللہ صاحب کسی تدبیر سے نکل گئے۔ جب سُلطان محمد خاں کو یہ خبر ہُوئی، تو اُس نے ہم سب کو سخت قید کر کے تین سَو سواروں کے ضابطے کے ساتھ ہشت نگر کو روانہ کر دیا اور ہم سب کو سُنانے کے لیے کہا کہ ان لوگوں کو بڑی حفاظت کے ساتھ لے جاؤ۔ جب ہم پشاور جائیں گے، تو ان سب کو اپنے بھائی یار محمد خاں کی قبر کے گرد پھرا کر ذبح کریں گے۔ وہ ہم کو لے گئے اور ہشت نگر میں ایک مکان میں قید کر دیا اور دروازہ بند کر کے پہرہ لگا دیا۔ ہم سب حواس باختہ تھے۔ ہم نے مشورہ کیا کہ یہاں سے نکلنے کی کوئی تدبیر کرنی چاہیے۔ آخر تو یہ موذی ہم کو ذِلّت کے ساتھ ماریں گے۔ ہم یہاں سے کسی تدبیر سے نکل چلیں۔ اگر اُن کو معلوم ہو جائے، تو ہم اُن کا مقابلہ کرتے اور لڑتے بھڑتے نکل جائیں۔ سب نے کہا کہ تم ہمارے سردار ہو، تمھیں کوئی تدبیر کرو۔ میں نے اس چُھرے سے اس مکان کے پچھواڑے کی دیوار، جو مٹی اور پتھر کی تھی کھودنی شروع کر دی۔ آدھی رات کے قریب آدمی نکلنے کا راستہ ہو گیا اور ہم لوگ ٹولی

باندھ کر چلے۔ جب بستی کے باہر پہنچے، تب شاید بستی والوں میں سے کسی نے ہم کو دیکھ لیا اور یکبارگی شور وغُل ہُوا کہ سیّد بادشاہ کا چھاپہ آپہنچا۔ پھر ہم کو نہیں معلوم کہ وہاں کیا ہُوا۔

سکھ لشکر کے مُسلمان عُہدہ داروں سے تعلقات اور خط و کتابت

میاں دین محمدؐ کو بعض ضرورتوں سے سیّد صاحبؒ نے ہندوستان روانہ فرمایا اور سکھ لشکر کے مسلمان عُہدہ داروں کے نام خطوط لکھ کر دیے۔ میاں دین محمدؐ حضرو لشکر میں جا کر ٹھہرے اور محمدؐ سعید خاں کے ڈیرے میں اُترے۔ جو لوگ سیّد صاحبؒ سے اعتقاد و اخلاص رکھتے تھے، وہ سب آکر ملے۔ میاں دین محمدؐ نے ہر ایک کو سیّد صاحبؒ کا پیام پہنچایا اور اُن کے نام کے تئیس خط دیے۔

○

اٹھارھواں باب

پائندہ خاں کی مزاحمت اور عشرہ اور امب کی جنگیں

کشمیر کا مشورہ ملکیوں کی زبانی متواتر خبریں آنے لگیں کہ خادی خان کا بھائی امیر خاں حضرو سے سات سو سکھ لایا ہے اور اب قلعۂ ہنڈ میں انھیں کا بندوبست ہے۔ یہ سُن کر سیّد صاحبؒ نے فرمایا کہ کیا مضائقہ ہے؟ اس میں اللہ کی حکمت ہے۔ اب کی بار انشاء اللہ سکھوں سے ہم ہنڈ خالی کرالیں گے۔

اس کے کئی روز کے بعد جا بجا سے خبریں آنے لگیں کہ ملک سَمہ کے اکثر ملک اور خوانین سکھوں سے مل کر اُن کے تابعدار ہو گئے ہیں اور فتح خاں اُن کے بھائی ارسلاں خاں (زیدہ والے) ابراہیم خاں، اُن کے بھائی اسمٰعیل خاں (کلابٹ والے) عشرہ والے مردان خاں اور کوٹھئی والے مُلّا سیّد میر وغیرہ، جن کو سکھوں کی اطاعت ناگوار تھی، اپنے گاؤں چھوڑ کر پہاڑوں پر چلے گئے۔ پائندہ خاں نے اپنے بھائی امیر خاں کو پنجتار سے بُلا لیا اور سیّد صاحبؒ کی اطاعت میں پس و پیش کرنے لگا اور بغاوت کے آثار ظاہر ہوئے۔ اِدھر ناصر خاں بھٹ گرامی، مدد خاں (برادر پائندہ خاں) راجہ پارس، وکیل سُلطان زبردست خاں وغیرہ نے کشمیر کی طرف رُخ کرنے کا مشورہ دیا اور کہا کہ اس مُلک کے سرداروں کی ایک مدت سے عرضداشتیں آرہی ہیں کہ

آپ ادھر تشریف فرما ہوں یا اپنے کچھ لوگ روانہ فرمائیں۔ ہم سب آپ کے فرماں بردار ہیں۔ پھر مشورہ سے یہ طے ہُوا کہ پہلے چند لوگ مظفرآباد روانہ کیے جائیں کہ وُہ گویا مُلک کشمیر کا دروازہ ہے اس سے راستے کی حالت بھی معلوم ہو جائے گی اور اس مُلک کے لوگوں کا انداز بھی ہو جائے گا۔ اس کے بعد آپ تشریف لے چلیں۔

سیّد صاحبؒ نے مولانا محمد اسمٰعیل صاحب کو مظفرآباد کے لیے تجویز فرمایا اور قندھاری اور پنجابی اور تقریباً دو سو ہندوستانی آپ کی ہمراہی کے لیے مُقرر کیے اور مولوی خیرالدین صاحب کو آپ کا نائب مُقرر کیا۔

پائندہ خاں کا انکار مولانا پنجتار سے چل کر تیسرے روز سید اکبر صاحب کے مکان پر ستھانے پہنچے۔ اگلے روز مولانا نے اپنا ایک آدمی خط دے کر پائندہ خاں کے پاس روانہ کیا کہ کل ہم اتنے آدمیوں سے تمھارے یہاں آئیں گے، کشتیاں تیار رکھنا، ہم کو سیّد صاحب نے پکھلی کی طرف روانہ کیا ہے۔ اُس نے جواب دیا کہ مَیں تو سیّد بادشاہ کا تابعدار ہوں۔ آپ کا یہاں آنا میرے لیے باعثِ سرفرازی تھا، لیکن اگر آپ اس طرف سے ہو کر دریا اُتریں گے، تو ہری سنگھ ہم کو تکلیف دے گا۔ ادھر سے آپ کا جانا مناسب نہیں ہے۔ پائندہ خاں اور سکھوں کے درمیان ہمیشہ ناموافقت ہی رہتی تھی۔ اس لیے پائندہ خاں کا یہ عُذر صحیح نہیں تھا۔ مولانا نے جواب دیا کہ سکھوں کی تم سے صُلح اور موافقت کب تھی، جو اَب تم کو اُن کی مخالفت کا خوف ہے؟ اور سیّد بادشاہ کی فرماں برداری کے کیا یہی معنی ہیں، جو تم کہتے ہو؟ ہم کو تو سیّد صاحبؒ نے بھیجا ہے اور جانے سے غرض ہے۔ اگر تم امب میں سے ہو کر نہ جانے دوگے، تو ہم بھیٹ گلی میں ہو کر چلے جائیں گے[1]، مگر تم کو ہمارے راستے میں حارج نہیں ہونا چاہیے، اس لیے کہ تم نے سیّد صاحبؒ کی اطاعت کا اقرار کیا ہے اور اُن کو اپنا امام گردانا ہے۔

---

[1] ایک بڑا نالہ مہابن سے نکل کر مختلف مقامات کے چکر لگاتا ہُوا امب اور ستھانے کے عین وسط میں پہاڑ سے باہر نکل کر دریا میں ملا ہے۔ اس کا نام "بھیٹ گلی" ہے۔ یہ بارہ تیرہ میل سے کم لمبا نہ ہوگا۔ (سیّد احمد شہیدؒ ج ۲ ص ۱۶۱)

جب یہ خط پائندہ خاں کو ملا، تو وُہ بہت برہم ہُوا۔ اُس نے صاف صاف لکھ کر بھیج دیا کہ بہتر یہی ہے کہ آپ میری عملداری میں سے ہو کر نہ جائیں، خواہ امب ہو، خواہ بھیٹ گلی، اور جو آپ نہ مانیں گے، تو بیشک لڑائی ہوگی۔

مولانا کی مراجعت | مولانا نے یہ خط پنجتار سیّد صاحبؒ کے پاس بھیج دیا۔ سیّد صاحبؒ نے ان لوگوں سے مشورہ کیا، جن لوگوں نے کشمیر کی رائے دی تھی۔ اُنھوں نے کہا کہ مولانا کا واپس آنا تو مناسب نہیں ہے۔ جس طرح ممکن ہو، مولانا آگے روانہ ہوں۔ پھر آپ یہاں سے تشریف لے چلیں۔ آپ نے فرمایا کہ بھائیو، ہم کو تو مُسلمان سے لڑائی منظور نہیں۔ مگر اس طرف جانا بھی ضرور ہے۔ اس کے لیے مناسب یہ ہے کہ میاں صاحب (مولانا محمّد اسمٰعیل صاحب) کو یہاں بُلالیں۔ اس کے بعد ہم پائندہ خاں کو خط لکھ کر للّٰہ فی اللّٰہ ایک دو بار سمجھائیں گے۔ اگر اُس نے مان لیا، تو بہت اچھّا، ورنہ جیسا کچھ ہوگا، دیکھا جائے گا۔ آپ نے مولانا کو پنجتار بُلا لیا اور وُہ تشریف لے آئے۔

پائندہ خاں کو خط اور اُس کا جواب | جب مولانا محمّد اسمٰعیل صاحب ستھانے سے واپس آئے اور پائندہ خاں نے اپنے ملک میں ہو کر جانے نہیں دیا، تو سیّد صاحبؒ نے اپنے خاص لوگوں کو جمع کر کے فرمایا کہ جس بات کا ہم ارادہ کرتے ہیں، یہاں کے ایک نہ ایک مسلمان بھائی حارج ہو جاتے ہیں اور وہ کام ہونے نہیں پاتا۔ چنانچہ یہی پائندہ خاں ہے کہ اُس نے ہمارے لوگوں کو اپنی عملداری میں آنے سے روکا اور ہم کو مسلمانوں سے حتی الامکان لڑنا منظور نہیں اور جو وہ اپنی شرارت سے باز نہ رہے، تو مجبوری کی بات ہے۔ مگر ہم چاہتے ہیں کہ ایک بار اُس کو اور فہمائش کر لیں اور اُس پر حُجّتِ شرعی قائم کر دیں۔

آپ نے مولانا سے فرمایا کہ آپ ہماری طرف سے پائندہ خاں کو اس مضمون کا ایک خط لکھ کر بھیج دیں کہ ہم دین کے کام کے واسطے تمھاری عملداری میں سے ہو کر جانے کا ارادہ رکھتے ہیں کہ دریا سے اُتر کر چلے جائیں۔ اس کے سوا ہماری کوئی غرض نہیں اور تم نے ہماری اطاعت

کا اقرار کیا ہے۔ تم کو لازم ہے کہ تم ہمارے ساتھ شرکت کرو اور جو تم سے یہ نہ ہو سکے، تو ہمارے حارج بھی نہ ہو۔ یہ بھی تمہارا ایک طرح کا احسان ہوگا۔

مولانا نے اس مضمون کا ایک خط لکھ کر پائندہ خاں کے پاس بھیج دیا۔ اُس کے جواب میں اُس نے لکھا کہ مَیں سب طرح سے آپ کا خادم اور فرماں بردار ہوں، مگر یہ مجھ کو منظور نہیں کہ آپ ادھر تشریف لائیں۔ آپ ہرگز ہرگز اس طرف کا ارادہ نہ فرمائیں اور جو آپ آئیں، تو ہوشیار ہو کر آئیں۔

حملے کی تیاری | آپ نے پائندہ خاں کا یہ جواب اس مُلک کے عُلمار کے سامنے، جو وہاں لشکر میں تھے، پڑھوایا۔ اُنھوں نے کہا کہ اس خط کے مضمون سے تو وُہ صاف باغی ہو گیا۔ اُس پر جہاد کرنا دُرست ہے۔ آپ نے اپنے خاص لوگوں سے مشورہ کیا کہ ہمارے لشکر میں جو توپیں ہیں، اُن کو موقع سے کسی جگہ دبا دینا چاہیے۔ آپ نے اُن کے دبانے کی جگہ تجویز کر کے چند معتبر اور امانت دار لوگوں کو بُلایا اور اُن سے عہد و پیمان لیا کہ اس راز کو سوا تمھارے دوسرا نہ جانے۔ یہ اللہ تعالیٰ کی امانت ہے۔ اس میں جو کوئی تم میں سے خیانت کرے گا، وہ اللہ تعالیٰ کا خائن ہوگا۔ پھر آپ نے ان توپوں کے دبانے کی جگہ بتا دی۔ وہ اس کے کھودنے میں مشغول ہوئے اور لشکر میں اعلان کر دیا گیا کہ لوگ اپنا ضروری اسباب دُرست کر لیں، امُب پر چڑھائی ہے۔ اور شیخ ولی محمدؐ صاحب کو حُکم بھجوا دیا گیا کہ لشکر میں جس بھائی کے پاس ضروری سامان نہ ہو، اُس کو بنوا دیجیے۔ پھر آپ نے مولوی احمد اللہ صاحب سے، جو توپ خانے کے داروغہ تھے، فرمایا کہ سب توپیں توپ خانہ سے یہاں لشکر میں کھچوا لاؤ، اُن کا بھی ساز و سامان دیکھنا ہے۔ مولوی (احمد اللہ) صاحب نے وہاں سے توپیں لا کر لشکر میں کھڑی کر دیں۔ دو روز وہ توپیں لشکر میں رہیں۔ تیسرے روز اُن مُعتمد لوگوں کے ذریعے، جن سے عہد و پیمان لیے گئے تھے، اُن کو دفن کرا دیا گیا۔

اس کے بعد ایک روز آپ نے سیّد احمد علی صاحب اور عبدالحمید خاں رسالدار کو بُلایا اور سیّد احمد علی صاحب سے فرمایا کہ ہم نے تم کو عبدالحمید خاں صاحب اور اُن کے سواروں پر

امیر کیا۔ کل یہاں سے ان سب کو ساتھ لے کر ستھانے جاؤ اور وہاں ٹھیرو۔ وہاں تم کو ہمارا جو کچھ حکم پہنچے، اُس کے موافق کرنا۔

سید احمد علی صاحب کے خط سے، جو اُنھوں نے ستھانے پہنچ کر لکھا، معلوم ہُوا کہ پائندہ خاں جنگ کے لیے آمادہ ہے۔ آپ نے فتح خاں کے مشورے سے موضع دکھاڑا میں، جو پنجتار سے ڈھائی تین کوس کے فاصلے پر پہاڑ پر واقع ہے، اپنے اور مجاہدین کے اہل و عیال کو پہنچا دیا اور اُن کی خدمت کے لیے شیخ حسن علی اور چند آدمیوں کو تجویز کیا۔

اس کے بعد آپ نے سب مجاہدین کے ساتھ پنجتار سے کُوچ کیا۔ دو روز چِنگئی میں قیام فرمایا اور معززین اور افسرانِ فوج کو جمع کیا اور اُن سب کی طرف مخاطب ہو کر فرمایا کہ ہم نے تُم سب لوگوں پر میاں صاحب (مولانا محمد اسمٰعیل) کو امیر کیا۔ جو کچھ تم کو وُہ حکم کریں، بلا انکار بجا لانا۔ اور مولانا سے فرمایا کہ آپ اپنی طرف سے لڑائی میں سبقت نہ کریں۔ اگر دُوسری جانب سے پیشقدمی ہو، تو پھر آپ کو اختیار ہے۔ آپ نے اُن کو ہدایات دے کر اور دُعائے خیر فرما کر مَداخیل[1] کی طرف رُخصت فرمایا اور سات یا آٹھ آدمی اپنے ساتھ رہنے دیے۔

مولانا کے انتظامات مولانا نے دو سَو مجاہدین، جو خاص اور معتمد لوگ تھے، راستے میں ڈَگیڑہ[2] میں چھوڑے اور باقی لوگ اپنے ساتھ لے کر فرُوسہ میں قیام فرمایا۔ پائندہ خاں کو خبر ہُوئی کہ ڈَگیڑہ اور فرُوسہ میں سیّد صاحبؒ کا لشکر داخل ہُوا۔ پائندہ خاں نے اپنے مشیروں سے کہا کہ ڈَگیڑہ اور فرُوسہ میں مولانا محمد اسمٰعیل صاحب پیادوں کی فوج لے کر آ گئے اور اِدھر ستھانے میں سیّد احمد علی صاحب سواروں کے لشکر کے ساتھ ہیں۔ اب کیا تدبیر کرنی چاہیے؟ مشیروں نے کہا کہ مناسب یہ معلوم ہوتا ہے کہ کچھ لوگ موضع کَنیر ڑِئی کے پہاڑ[3] پر بھیجے جائیں تاکہ غازیوں کی کمک

[1] مَداخیل ایک قوم کا نام ہے جو اس علاقے میں آباد ہے [2] بھیٹ گل کے آغاز میں اس کے مغربی کنارے پر ڈگیڑہ ہے اور اس سے دو تین میل نیچے فرُوسہ ہے۔ دریا میں داخل ہونے کے مقام پر ٹیلے کے اوپر عشرہ آباد ہے۔ اس کا فاصلہ امب اور ستھانے سے یکساں ہے۔ (سیّد احمد شہیدؒ ۲: ۱۶۱) [3] یہ عشرہ کے مقام بھیٹ گل کے مغربی کنارے پر دَرہ کے اندر ایک اونچا ٹیلہ ہے جس کی حیثیت ایک بُرج کی سی ہے، یہ بارہ سو فٹ اونچا ہوگا، اس کا نام کوہ کنیر ڑئی ہے اور اس پر کنیر ڑئی نام گاؤں آباد ہے۔ (سید احمد شہید ص۱۶۱)

آنے کا راستہ بند ہو جائے اور ستھانے کے سواروں کے مقابلے کے لیے عشرہ کے میدان میں سوار بھیجے جائیں اور باقی لشکر کے ساتھ ڈگیڑہ اور رُوسہ کی فوج کا مقابلہ آپ کیجیے۔

یہ تمام خبر مخبروں نے مولانا محمد اسمٰعیل صاحب کو دی۔ پائندہ خاں کے بھائی مدد خاں نے مولانا سے عرض کیا کہ آپ اسی وقت اپنے آدمی موضع کنیرڑی کو روانہ کریں کہ اس پر قبضہ کرلیں، ورنہ اگر پائندہ خاں کے لوگ وہاں آجائیں گے، تو پھر ویسا ہی ہوگا، جیسا انھوں نے مشورہ کیا ہے۔ مولانا نے اسی وقت اپنے آدمی بھیج کر ڈگیڑہ کے غازیوں کو اپنے پاس بلوا لیا اور اُن سب سے پکار کر کہا کہ ہم نے تم سب پر ارباب بہرام خاں کو امیر کیا۔ اُن کے بعد مولوی خیر الدین کو، اُن کے بعد شیخ بلند بخت دیوبندی کو، اُن کے بعد امام خاں خیرآبادی کو، اور جب اُن میں سے کوئی نہ ہو، تب تم سب کو اختیار ہے۔ جس کو چاہنا، امیر بنا لینا۔

پھر ارباب بہرام خاں، مولوی خیر الدین، شیخ بلند بخت اور امام خاں کو الگ بلا کر فرمایا کہ تم یہاں سے سب لوگوں کو ساتھ لیے ہوئے مدد خاں کے ساتھ کنیرڑی کے پہاڑ پر جاؤ اور جس جگہ مدد خاں تم کو مقرر کردیں، وہاں اپنا بند و بست کر کے ہوشیاری سے جمے رہنا۔ کل صبح کو تم ادھر عشرہ کو اُترنا اور ہم ادھر سے امب کی طرف اُتریں گے اور ہم سید احمد علی صاحب کو لکھتے ہیں، وہ بھی تمھاری مدد کے لیے عشرہ کی طرف آئیں گے۔ پھر دعاءِ خیر کر کے اُن کو رخصت کیا اور سید احمد علی صاحب کو اس کی اطلاع کی۔[۱]

پائندہ خاں کا فریب | سید احمد علی صاحب نے کھبّل سے پیر خاں کو مع جماعت کے بلوا لیا۔ پائندہ خاں کو اُس کے مخبروں نے اِس کی اطلاع پہنچائی۔ پائندہ خاں نے اپنے مشیروں سے کہا کہ اب

---

[۱] مہر صاحب "سید احمد شہید" میں لکھتے ہیں:

"جو لوگ اب تک اس غلط فہمی میں مبتلا ہیں کہ غازی محض علمائے دین تھے اور انھیں فنونِ حرب سے چنداں آگاہی نہ تھی، وہ محض اس جنگی نقشے کو دیکھ کر اندازہ فرما سکتے ہیں کہ غازیوں کی مہارتِ حربیات کا درجہ کتنا بلند تھا۔ سید عبد الجبار شاہ ستھانوی کو میں نے یہ تفصیلات سنائیں، تو انھوں نے فرمایا کہ جو مقاصد مولانا کے سامنے تھے، اُن کے حصول کے لیے اس سے بہتر نقشہ ذہن میں نہیں آسکتا۔ بڑے سے بڑا جرنیل بھی ان مقاصد کے لیے وہی نقشۂ جنگ بناتا، جو مولانا نے بنایا۔" (ج ۲ ص ۱۶۳)

تو اُس تدبیر کا وقت نہیں رہا۔ اب کیا کِیا جائے؟

اُنھوں نے کہا کہ اب یہ تدبیر ہمارے خیال میں آتی ہے کہ آپ ایک خط سیّد بادشاہ کو اور ایک مولانا محمد اسمٰعیل صاحب کو اس مضمون کا لکھیے کہ ہم آپ کے فرماں بردار ہیں، آپ کی جناب میں جو کچھ قصور ہوا ہے، للہ آپ معاف فرمائیں۔ ہم اپنی گستاخی سے توبہ کرتے ہیں اور آپ سے صُلح چاہتے ہیں۔ کل آپ فرُوسہ سے دس پانچ آدمی لے کر ادھر باندڑے[1] میں تشریف لائیں اور اسی قدر آدمیوں کے ساتھ میں بھی آپ کی مُلاقات کے واسطے حاضر ہوں گا۔ اس کا فائدہ یہ ہو گا کہ جب یہ خط مولانا صاحب کو پہنچے گا، تو اسے دیکھ کر وُہ جا بجا اپنے لوگوں کو آنے سے روک دیں گے اور صبح کو وہ باندڑے میں آپ کی ملاقات کے منتظر رہیں گے۔ آپ اپنے سوار اور پیادے لے کر کنیرڑی کے پہاڑ پر چلے جائیے۔ وہاں سَو، دو سَو، جو اُن کے غازی ہیں، اُن کو مار لیجیے۔ یہی لوگ اُن کے خواص اور معتمد ہیں۔ جب آپ اُن کو مار لیں گے، تو اُن کا تمام لشکر پراگندہ ہو جائے گا اور آپ کے مقابلہ کو نہیں آئے گا اور رحمت خاں بھیٹ گلی والا بھی یہاں حاضر ہے۔ اُس کو اسی وقت کچھ لوگوں کے ساتھ یہ کہہ کر باندڑے میں بھیج دیجیے کہ جب مولانا صاحب صبح کو وہاں آئیں تو کسی حکمتِ عملی سے اُن کو گرفتار کر لیں۔ اس تدبیر کے سوا اس وقت اور کوئی تدبیر نہیں۔ اگر یہ فریب چل گیا، تو پھر کیا کہنا ہے اور جو نہ چلا، تو پھر جیسا کچھ ہو گا، دیکھا جائے گا۔

پائندہ خاں نے ان کے اس فریب کو بہت پسند کیا اور اسی وقت رات ہی کو ایک خط اس مضمون کا لکھ کر مولانا کے پاس اپنے ایک آدمی کے ہاتھ روانہ کیا اور ایک خط عُذر و معذرت اور تابعداری و اطاعت کا لکھ کر سیّد صاحبؒ کے پاس ارسال کیا اور رحمت خاں کو اُسی وقت چند آدمیوں کے ساتھ وُہ تدبیر سمجھا کر باندڑے کو روانہ کیا۔ جب مولانا کو وُہ خط رات کو پہنچا، تو آپ اس خط کو پڑھ کر نہایت خوش ہوئے اور اپنے لوگوں کو پڑھ کر سُنایا اور فرمایا کہ ہم تو خدا سے یہ چاہتے تھے کہ پائندہ خاں ہم سے موافق ہو جائے اور لڑائی کی نوبت نہ آئے۔

---

[1] یہ مقام فروسہ سے قریب امب کی سمت ہے۔ (سیّد احمد شہیدؒ صفحہ ۱۶۳/۲)

اسی وقت ایک خط اپنا اور پائندہ خاں کا نقل کر کے ارباب بہرام خاں کے پاس روانہ کیا کہ کل صبح کو وہیں ہوشیاری سے رہنا۔ جب تک ہمارا دُوسرا خط تمہارے پاس نہ آئے، نیچے نہ اُترنا اس لیے کہ پائندہ خاں نے صُلح کا پیغام بھیجا ہے اور ہم کو بھی یہی منظور ہے۔ اسی مضمون کا ایک خط سیّد احمد علی صاحب کو لکھا کہ جب تک ہمارا دُوسرا خط نہ پہنچے، آپ تھانے سے ابھی کُوچ نہ کریں اور جو شاید کُوچ کیا ہو، تو وہیں پلٹ جائیں۔ اسی کے ساتھ پائندہ خاں کا خط بھی نقل کر کے ہمراہ کیا۔

وہاں سیّد احمد علی صاحب نے پہلے خط کے مضمون کے بموجب کہ آپ صُبح عشرہ کے مَیدان میں داخل ہو جائیے اور ادھر کنیرڑئی کے پہاڑ سے ارباب بہرام خاں اپنے لوگ لے کر عشرہ کی طرف اُتریں گے، اپنے تمام سواروں میں حُکم بھجوا دیا تھا کہ صُبح کو سب اپنے گھوڑے تیار کر کے ہتھیار لگا کر فجر کی نماز پڑھیں۔ چنانچہ سب نے اسی حُکم کے مطابق گھوڑے تیار کر کے ہتھیار لگا کر فجر کی نماز اوّل وقت پڑھی اور سب ڈیرے ڈنڈے لپیٹ کر سیّد اکبر شاہ کے مکان پر رکھ دیے اور آٹھ آدمی کا ایک پہرا وہاں مقرر کر دیا اور سیّد احمد علی صاحب نے سواروں اور پیادوں کے ساتھ کوچ کیا۔ سید اکبر صاحب بھی اپنے چند لوگوں کے ساتھ لشکر کے ہمراہ ہوئے۔

جاتے جاتے جب عشرہ آدھے کوس یا پون کوس کے قریب رہ گیا، تو اُنھوں نے دیکھا کہ پائندہ خاں کا تمام لشکر امب کے مَیدان میں جما کھڑا ہے۔ اس عرصے میں مولانا کا آدمی وہی خط لے کر سیّد احمد علی صاحب کے پاس آیا۔ سیّد احمد علی صاحب نے خط پڑھا اور اپنے دل میں بہت متردّد ہوئے۔ رسالدار عبدالحمید خاں اور سید اکبر صاحب کو بُلایا اور خط پڑھ کر سُنایا اور کہا کہ مولانا صاحب نے اس میں لکھا ہے کہ جب تک ہمارا دُوسرا خط نہ آئے، تم تھانے سے ابھی کوچ نہ کرنا اور جو کوچ کیا ہو، تو پلٹ جانا۔ اب تو مناسب یہی ہے کہ یہاں سے پلٹ چلیں۔

رسالدار اور سید اکبر صاحب نے کہا کہ یہ پائندہ خاں کا محض فریب ہے۔ اُس نے مولانا صاحب کو دھوکا دیا ہے، کیونکہ اُس کا لشکر سامنے امب کے مَیدان میں تیار کھڑا ہے اس لیے

یہاں سے پلٹنا تو مناسب نہیں معلوم ہوتا ہے۔ ایسا ہی ہے، تو آپ اسی جگہ ٹھیر جائیں، دیکھیں کیا معاملہ ہوتا ہے۔ سید احمد علی صاحب نے کہا: ہم کو اس بات سے کچھ کام نہیں ہے، ہم تو اُن کے حکم کے موافق کام کریں گے۔ سید اکبر صاحب نے دوبارہ کہا کہ سیّد احمد علی صاحب آپ کہتے ہیں کہ ہم کو اس طرح لکھا ہے۔ خیر، بجا لکھا ہے۔ ہم آپ کے فرماں بردار اور بہرحال شریک کار ہیں، لیکن پائندہ خاں کے حیلہ و فریب سے خُوب واقف ہیں، کیونکہ ہمیں تو اس سے دن رات واسطہ پڑتا ہے۔ مَیں اس کے فریب کا اس طرح مشاہدہ کر رہا ہوں، جس طرح اپنا ہاتھ دیکھتا ہُوں۔ میرے نزدیک یہی مناسب ہے کہ آپ اسی جگہ ڈیرا کر دیں اور جو کچھ مَیں عرض کر رہا ہوں، دو چار گھڑی کے اندر ہی اس کو بچشم خود دیکھ لیں اور اگر یہاں سے ستھانے ہی کو چلیں، تو بسم اللہ، ہم آپ کے ہمراہ ہیں۔ اطاعت میں فرق نہ آئے گا۔

سیّد احمد علی صاحب نے فرمایا کہ بھائی سید اکبر، آپ بجا کہتے ہیں، میرا بھی یہی خیال ہے، لیکن اطاعت سے ناچار ہوں۔ یہ کہ کر وہاں سے گھوڑے کی باگ پھیری اور سب کو لے کر ستھانے کی طرف روانہ ہو گئے۔

کوہ کنیر ڑئی کی جنگ ستھانے پہنچ کر سب سوار اپنے اپنے گھوڑے کی باگ پکڑے کھڑے رہے۔ دو تین گھڑی کا عرصہ ہُوا ہوگا کہ کنیر ڑئی کی طرف سے ایک ایک دو دو بندوق کی آوازیں آنے لگیں۔ سید اکبر صاحب نے کہا: دیکھیے، کنیر ڑئی میں لڑائی شروع ہو گئی اور بھی اکثر لوگوں نے یہی کہا۔ سیّد احمد علی صاحب نے فرمایا کہ ایک ایک، دو دو بندوقیں چلتی ہیں۔ کہیں کسی کے گھر بچہ پیدا ہُوا ہوگا۔ اگر لڑائی کی بندوقیں ہوتیں، تو باڑھ چلتی۔ ایسی ہی رد و بدل آپس میں رہی، یہاں تک کہ سب نے عصر کی نماز پڑھی۔ بندوقیں زیادہ چلنے لگیں۔

رسالدار عبدالحمید خاں کا اضطراب رسالدار صاحب نے خفا ہو کر کہا کہ سیّد احمد علی صاحب، وہاں کنیر ڑئی میں لڑائی ہو رہی ہے۔ ہمارے بھائی کٹ رہے ہوں گے۔ آپ یہاں تشریف رکھیے، ہم تو وہیں جاتے ہیں۔ یہ کہ کر وہ گھوڑے پر سوار ہُوئے اور جتنے سوار تھے سب سوار

ہو گئے۔ سید احمد علی صاحب نے اُٹھ کر رسالدار کے گھوڑے کی باگ پکڑ لی اور مولانا صاحب کا وہی خط دکھایا اور فرمایا کہ تم اُن کا حکم نہیں مانتے، اپنی رائے سے کام کرتے ہو۔ یہ بات اچھی نہیں ہے۔ انھوں نے جھنجھلا کر جواب دیا کہ سیّد احمد علی صاحب، بڑے تعجّب کا مقام ہے، نہ تو آپ جاتے ہیں نہ ہم کو جانے دیتے ہیں۔ وہاں جو مسلمان ضائع ہوں گے، اُن کا مواخذہ اللہ تعالیٰ کے یہاں جو کچھ ہو، آپ جانیں، ہم بری الذّمہ ہیں۔ یہ کہہ کر اپنے گھوڑے سے اُتر پڑے اور سب سوار اُتر پڑے۔

عشرہ اور امب پر قبضہ رسالدار صاحب اُسی طرح چُپ چاپ غصّے میں بیٹھے رہے یہاں تک کہ مغرب کا وقت آیا۔ اس عرصے میں لشکر کے کئی آدمی رسالدار صاحب کے پاس آئے اور کہنے لگے کہ اس وقت ایک سوار عشرہ کی طرف سے تیز چلا آرہا ہے خدا جانے، کچھ خبر لیے آتا ہے یا کیا بات ہے۔ یہ بات سُنتے ہی رسالدار صاحب اپنے گھوڑے پر سوار ہو گئے اور سب لوگوں سے باوازِ بلند پکار کر کہا کہ بھائیو، ہوشیار اور تیّار ہو جاؤ۔ یہ سُن کر سب لوگ اپنے اپنے گھوڑوں پر سوار ہو گئے اور پیادے خبردار ہو گئے۔ کچھ عرصے میں وُہ سوار قریب آیا، تو معلوم ہُوا کہ وُہ کرم خاں تھا۔ خچر پر سوار تھا اور دُور ہی سے پکارتا ہُوا آرہا تھا کہ جلد تیار ہو کر چلو، غازیوں نے جنگ فتح کر کے عشرہ پر قبضہ کر لیا اور کوٹلہ بھی لے لیا ہو گا۔

اس وقت کچھ بھی دن باقی نہ تھا۔ سیّد احمد علی صاحب سوار اور پیدل سب کے ساتھ عشرہ کی طرف روانہ ہُوئے۔ عشا کے وقت عشرہ میں داخل ہُوئے۔ وہاں سُنا کہ مُجاہدین نے کوٹلہ بھی لے لیا اور امب میں شیخ ولی محمّد صاحب نے ڈیرا کیا۔ پائندہ خاں امب سے بھاگ کر چھتربائی کے گھاٹ سے دریائے سندھ اُتر گیا۔ امب کی گڑھی سے کچھ بندوقیں چل رہی تھیں، جن کی آواز عشرہ میں سُنی جاتی تھی، جس سے عشرہ کے مجاہدین کو تردّد تھا کہ معلوم نہیں امب میں کیا ہو رہا ہے۔ سیّد احمد علی صاحب رسالدار عبدالحمید خاں اور اُن کے رسالے کو عشرہ میں چھوڑ کر امب روانہ ہو گئے۔ دوسرے دن صبح کو رسالدار صاحب بھی اپنے ساتھیوں سمیت امب میں

جا پہنچے اور مولانا محمد اسمٰعیل صاحب سے ملے۔ اُس وقت امب کی گڑھی خالی نہیں ہُوئی تھی۔ تھوڑی دیر کے بعد گڑھی والوں نے چادر ہلائی اور امن کی درخواست کی اور اپنا اسباب اور ہتھیار لے کر سلامت نکل جانے کی اجازت چاہی۔

مولانا نے فرمایا کہ جو خاص تمھارا مال و اسباب ہو اور جو تمھارے اپنے ہتھیار ہوں، وُہ لے کر باہر نکل آؤ اور جو مال و اسباب یا ہتھیار سرکاری ہوں، وہ گڑھی میں رہنے دو۔ اگر اُس میں سے کچھ لے جاؤ گے، تو مُجرم ہو گے۔ اُنھوں نے کہا کہ آپ کا فرمانا ہم کو منظور ہے۔ ہم جانتے ہیں کہ آپ سیّد بادشاہ کے لوگ بدعہدی نہیں کریں گے، مگر ہم چاہتے ہیں کہ آپ بھی آئیں اور مولانا صاحب کو بھی بلائیں، پھر ہم دروازہ کھولیں۔ مولانا نے سُن کر فرمایا کہ بہتر ہے۔ چنانچہ آپ اور شیخ ولی محمدؐ صاحب گڑھی کے دروازے پر گئے، گڑھی کا دروازہ انھوں نے بند کر کے چُن دیا تھا۔ اُنھوں نے وہ چُنی ہُوئی دیوار توڑ کر کھڑکی بھر کا راستہ کیا۔ دونوں صاحب گڑھی کے اندر گئے، تو انھوں نے دیکھا کہ سب لوگ اپنا اسباب لیے اور ہتھیار باندھے تیار کھڑے ہیں، مگر سب ہراساں ہیں۔ مولانا نے اور شیخ صاحب نے اُن کو تسلّی دی کہ اب تم سے ہمارا کوئی غازی مزاحم نہ ہوگا اور انھوں نے کہا کہ آپ ہماری حفاظت کے لیے چند غازی اِدھر اُدھر کھڑے کر دیں کہ ہم نکلیں۔ وُہ تنولی دو سَو کے قریب تھے۔ پھر وہ سب نکلے۔ مجاہدین نے اُن کو دریا پہ لے جا کر کشتی پر سوار کر کے دریاے سندھ کے پار کر دیا۔

امب کی سرگزشت اِس لڑائی کا قصّہ یہ ہے کہ پائندہ خاں نے شبِ گزشتہ میں فریب کر کے مصالحت کی درخواست کا خط مولانا محمد اسمٰعیل صاحب کے پاس فرڈ سے میں بھیجا تھا۔ اس خط کے موافق مولانا نے اتنے ہی آدمی لے کر فرڈسے سے پانڈے کا قصد کیا۔ شیخ ولی محمد صاحب اور قاضی حبّان صاحب نے کہا کہ ہم تو اس قدر تھوڑے آدمیوں کے ساتھ آپ کو جانے نہ دیں گے، اس لیے کہ پائندہ خاں کا کچھ اعتبار نہیں۔ شاید اس میں کچھ فریب ہو۔ اگر ایسے ہی آپ کو منظور ہو، تو اور ابھی کچھ دیر آپ یہاں توقّف کریں جب پائندہ خاں خُود

اپنے وعدے کے مطابق آئے، تب آپ بھی وہاں تشریف لے جائیں، ورنہ ہم سب لوگ آپ کے ہمراہ رکاب چلیں۔ اس بنا پر مولانا تو فروسے میں رُک گئے اور زامب کے میدان میں پائندہ خاں اپنا تمام لشکر لیے تیار کھڑا تھا اور اپنے رات کے مشورے کے موافق کنیر ڑی کے غازیوں پر حملے کا ارادہ رکھتا تھا۔ اس عرصے میں سیّد احمد علی صاحب کے سواروں کا لشکر ستھانے کی گرلھی سے اُتر کر نمودار ہُوا، کیونکہ سیّد احمد علی صاحب کو مولانا کا دُوسرا خط ابھی نہیں ملا تھا۔ پائندہ خاں لشکر کو دیکھ کر اپنے دل میں متردد ہُوا کہ شاید میرا رات کا فریب نہ چلا۔ وُہ اسی پس و پیش میں تھا کہ مولانا کا خط سیّد احمد علی صاحب کے پاس آیا۔ اس کو پڑھ کر وہ مع لشکر ستھانے کی طرف واپس ہو گئے۔

پائندہ خاں کو یقین ہُوا کہ ہمارا داؤں چل گیا۔ اُس نے کہا کہ بھائیو، یہی موقع ہے۔ اب کیا دیکھتے ہو؟ گھوڑوں کی باگیں اُٹھاؤ اور عشرہ کو چلو۔ یہ کہہ کر اُس نے اپنا گھوڑا آگے بڑھایا اور چلا۔ اس کے تمام سوار اور پیادے کچھ کم ہزار تھے۔ غازیوں نے جو کنیر ڑی کے پہاڑ پر تھے، اُن کے نشان دیکھے اور عشرہ کی چھتوں پر، جو دیکھا، تو آدمی ہی آدمی نظر آتے ہیں، تو اُنھوں نے پائندہ خاں کے بھائی مدد خاں سے پوچھا کہ یہ کیا معاملہ ہے اور یہ کیسی صُلح ہے؟ مدد خاں نے کہا کہ یہ تو خان نے مولانا صاحب سے فریب کیا ہے۔ تم سب لوگ ہوشیار رہو، گھڑی ساعت میں لڑائی ہُوا چاہتی ہے۔

اس وقت مجاہدین میں سے کوئی تو ظہر کی نماز پڑھتا تھا، کوئی وضُو کرتا تھا، کوئی مکئی بھُون رہا تھا اور کوئی کچی مکئی چاب رہا تھا اس لیے کہ اُس دن لوگوں کو آٹا نہیں ملا تھا۔ مدد خاں کی یہ بات سُن کر سب نے مکئی بھُوننا اور چابنا موقوف کیا اور نمازِ ظُہر سے فراغت کر کے اپنے اپنے ہتھیار لے کر سب کھڑے ہو گئے۔ اس عرصے میں دفعتہً اُن کا نقارہ بجا اور تمام لشکر عشرے سے نیچے اُترنے لگا۔ ایک نالہ تھا، اُس میں آیا اور وہاں اُس کے چار غول ہو گئے۔ کنیر ڑی کے غازیوں کے دائیں طرف ایک بلند پہاڑ تھا۔ ایک غول اُن میں سے اُوپر چڑھنے لگا۔

مدو خاں اور رسُول خاں تنولی ارباب بہرام خاں کی اجازت سے بیس غازیوں کو لے کر پہاڑ کی چوٹی پر گئے اور اُس غول کو روکا اور اُن کے سواروں کے دو غول ہو گئے۔ ایک غول فرُّو سے کی طرف، جدھر سے مولانا کی آمد تھی، جا کھڑا ہُوا اور دُوسرا غول ستھانے کے راستے کو روک کر کھڑا تھا، جدھر سے سید احمد علی صاحب کے لشکر کے آنے کا راستہ تھا، اور اُن کے پیادوں کے تین غول غازیوں کی طرف چیخیں مارتے اور ہلّہ کرتے ہُوئے چلے۔ اِدھر سے غازیوں نے اُن کو ڈانٹا اور للکار کر کہا کہ خبردار! آگے قدم نہ بڑھانا۔ مگر وُہ کب سُنتے تھے؟ گالیاں دیتے ہُوئے پہاڑ سے پلٹ گئے اور بندوقیں مارنے لگے۔

ادھر ارباب بہرام خاں نے اپنے غازیوں سے کہا کہ بھائیو، دیکھتے کیا ہو؟ تکبیر کہ کر تم بھی بندوقیں مارو۔ یہ حُکم سُن کر جماعتِ خاص کے غازیوں نے، جو صبغۃ اللہ نشان کے پاس تھے، تکبیر کہ کر بندوقوں کی پہلی باڑھ ماری، پھر اور غازی مارنے لگے۔ وہ لوگ پہاڑ کی چڑھائی پر تھے اور غازی پہاڑ کے سر پر برابر میدان میں تھے۔ وہ اسی طرح برابر ہلّہ کرتے اور بندوقیں مارتے بے دھڑک چڑھتے چلے آتے تھے۔ وہ یہاں تک قریب آ پہنچے کہ سیّد دلاور علی کے گولی لگی اور وُہ گرے تو اُنھوں نے ادھر سے پَیر پکڑے اور غازیوں نے ادھر سے ہاتھ پکڑے اور دونوں جانب سے کشاکش ہونے لگی۔ اس میں امام خاں خیر آبادی نے جا کر ایک بندوق ان پر سر کی۔ اسی کے ساتھ ایک نے اُدھر سے گولی ماری۔ وہ امام خاں کی کنپٹی میں لگی، اور وہ اُسی جگہ شہید ہو گئے۔ بالآخر غازیوں نے سید دلاور علی کی لاش چھڑا لی۔

مُجاہدین گھبرائے کہ وُہ نشیب میں ہیں اور ہم یہاں مَیدان میں ہیں۔ ہماری بندوق کام نہیں کرتی اور ہم اُن کے نشانہ ہیں۔ بعض بعض آدمی کہنے لگے کہ پیچھے ہٹ کر اُن کو مَیدان دو کہ وہ اُوپر آئیں۔ پھر تلوار پکڑ کر جس کو اللہ تعالیٰ فتح دے، وُہ لے اور اس طرح تو مُفت میں اپنے لوگ ضائع ہوتے ہیں۔ اس عرصے میں شیخ بلند بخت دیو بندی نے ارباب بہرام خاں سے کہا کہ خان صاحب، تم نشان اس جگہ سے نہ ہٹاؤ اور سب کو لیے ہُوئے اسی جگہ جمے رہو

اور مجھ کو اجازت دو کہ جو کچھ تدبیر بنے، کروں۔ انھوں نے کہا: بسم اللہ، آپ کو اجازت ہے۔

شیخ بلند بخت چند غازی اپنے ساتھ لے کر مولوی خیر الدین صاحب شیرکوٹی کے پاس گئے۔ اُن کا مورچہ بائیں طرف تھا۔ اُن سے کہا کہ لڑائی تو بگڑ گئی اور امام خاں شہید ہو گئے۔ اب میرے خیال میں یہ تدبیر آتی ہے کہ اتنے آدمی میں لایا ہوں۔ آپ اپنے سب آدمیوں کے ساتھ میرے آگے اور نیچے اُتر کر اُن کی کمر کی طرف سے حملہ کریں۔ مولوی صاحب نے فرمایا کہ بسم اللہ، چلو، تدبیر خوب ہے۔ جیسے ہی وہ سب نیچے اُتر کر تنولیوں کی کمر پر پہنچے، تو معلوم ہوا کہ اپنے قندھاریوں کا نشان آپہنچا اور سب قندھاری پائندہ خاں کے سواروں کے پیچھے ننگی تلواریں لیے ہوئے چلے جاتے ہیں۔ اُن لوگوں کو دیکھ کر اُنھوں نے کپڑا ہلایا اور اشارہ کیا کہ تم بھی جلد اُتر کر ہمارے شریک ہو جاؤ۔

اِدھر عشرے میں پائندہ خاں اپنے لوگوں کو للکار للکار کر لڑا رہا تھا۔ اُس نے جو اپنے سواروں کو دیکھا کہ بدحواس بھاگے چلے آتے ہیں اور قندھاری اُن کے تعاقب میں ہیں، دفعتہً آپ بھی بھاگا۔ ادھر سے مولوی خیر الدین صاحب اور شیخ بلند بخت کے لوگوں نے تنولیوں کی کمر پر ایک باڑھ ماری اور اُن کا پیچھا کیا اور وہ بھاگے۔ اس کے ساتھ ہی ادھر سے ارباب بہرام خاں اپنے لوگوں کے ساتھ ہلّہ کر کے دَوڑے۔ پھر تو اللہ دے اور بندہ لے، تنولیوں کو اپنے ہتھیار سنبھالنے دشوار ہو گئے۔ بھاگتے جاتے تھے اور اپنی بولی میں کہتے جاتے تھے کہ خان چُل گئے، خان چُل گئے۔[1]

پھر تمام غازی پہاڑ سے اُتر کر عشرے کے نالے میں آئے اور کچھ دیر ٹھہرے۔ اس عرصے میں شیخ ولی محمد صاحب اور قاضی حبّان صاحب اور مولوی نصیر الدین صاحب منگلوری قندھاریوں اور پنجابیوں کو لیے چلے آتے تھے۔ وہ یکبارگی ہلّہ کر کے عشرے میں داخل ہوئے اور اُس پر قبضہ کیا۔ عشرے کے پہاڑ کے سر پر ایک گڑھی تھی، جس کو کوٹلہ کہتے تھے۔ اس پر بھی مجاہدین نے قبضہ کیا۔ وہاں کے لوگ دیواریں پھاند کر بھاگے۔ جنھوں نے

---

[1] خان چلے گئے۔

امان چاہی، اُن کو امان دے کر سلامت نکال دیا۔

شیخ ولی محمد صاحب تمام غازیوں کو لے کر پہاڑوں کے راستے امب کو روانہ ہوئے۔ امب سے پائندہ خاں نے دیکھا کہ لشکر آپہنچا۔ وہ امب چھوڑ کر بھاگ گیا اور شیخ صاحب نے امب پر قبضہ کر لیا۔

آتش زنی پر ناراضگی اور ملامت مدد خاں اور سربلند خاں تنولی کے لوگوں نے امب کے کئی گھروں میں آگ لگا دی۔ شیخ ولی محمد صاحب اُن پر خفا ہوئے کہ تم نے سکھوں کا طریقہ اختیار کیا۔ بڑے ظلم کی بات ہے۔ مسلمانوں کو ایسا نہ چاہیے۔ پھر اسی وقت لوگوں کو بھیج کر وہ آگ بجھوا دی۔

فتح کی خوشخبری شیخ صاحب نے فتح کی خوشخبری کی ایک عرضی سید صاحبؒ کی خدمت میں بھیجی، حضرت نے خط لانے والے کو انعام میں ایک چوغا عنایت کیا اور ایک خط اسی مضمون کا مولانا محمد اسمٰعیل صاحب کو دُوسرے آدمی کے ہاتھ فردوسے میں بھیجا۔

مولانا دُوسرے دن شیخ کو اپنے آدمیوں کے ساتھ امب میں داخل ہوئے۔

○

اُنیسواں باب

چھتر بائی

چھتر بائی کی گڑھی

اسی اثنا میں خبر آئی کہ چھتر بائی کی گڑھی خالی پڑی ہے، پائندہ خاں اس کو چھوڑ کر چلا گیا ہے اور چھتر بائی والے بھی فرار کر گئے۔ آپ نے عبدالحمید خاں رسالدار کو اس پر قبضہ کرنے کے لیے روانہ کیا۔ جب رسالدار صاحب وہاں پہنچے، تو ایک مخبر نے آ کر خبر دی کہ چھتر بائی کی گڑھی[1] خالی پڑی تھی؛ جب تمہارا لشکر وہاں نہ گیا، تو پائندہ خاں کے لوگ وہاں آ کر داخل ہو گئے۔ مولانا اسمٰعیل صاحب بھی اپنے آدمی لے کر چھتر بائی پہنچ گئے اور گڑھی سے نیچے اُتر کر نشیب میں ڈیرہ کیا۔ وہاں سے چھتر بائی کی گڑھی اتنی دُور تھی کہ وہاں کی گولی مولانا کے ڈیروں میں ٹھنڈی گرتی تھی۔ مولانا نے اس گڑھی کے تین طرف مورچے لگائے۔ دونوں جانب سے بندوقیں چلنے لگیں اور لڑائی شروع ہو گئی۔

مجاہدین کے مورچوں سے اس گڑھی کا راستہ ایسا اینچ پیچ کا تھا کہ کچھ قابو نہیں چلتا تھا کہ اس پر حملہ کر کے فتحیاب ہوں اور نہ اتنی دُور سے گولیاں وہاں کام کرتی تھیں گڑھی

[1] چھتر بائی کی بستی ۱۸۴۱ء کی طغیانی میں بہ گئی۔ پھر اس کی جگہ کوئی بستی آباد نہیں ہوئی۔ اس بستی کا نشان اب تک بتایا جاتا ہے۔ امب قدیم سے پانچ چھ میل شمال میں دریا کے مغربی کنارے پر یہ واقع تھی۔ (سید احمد شہید ص ۱۶۹/۲۴)

بہت سخت اور بے موقع تھی۔ پائندہ خاں دریا اُترتے ہوئے ایک چھوٹی توپ دریا کے کنارے ڈبوتا گیا تھا۔ مولانا نے آدمی بھیج کر وہ توپ منگوا لی۔ اس توپ کے بھی دس بارہ گولے چلائے گئے مگر کوئی موقع پر نہ لگا اور لڑائی جم گئی۔ وہاں سے مورچے ہٹانے بھی مناسب نہ ہوئے اور لڑائی بھی مفید ثابت نہ ہوئی۔ مولانا نے سید صاحبؒ کی خدمت میں لکھا کہ یہاں ایسا حال ہے۔ آپ جلد پنجتار سے کوچ کر کے امب میں تشریف لائیں، تو اس امر کی کچھ تدبیر فرمائیں۔

سید صاحبؒ کی امب میں آمد اگلے روز سید صاحبؒ ایک تیز خرام خچر پر (جو یار محمد خاں کے لشکر سے غنیمت میں ملا تھا) عشرہ کے گورستان میں تشریف لائے، جہاں مجاہدین دفن تھے۔ آپ نے اُن کے واسطے دُعا کی۔ پھر وہاں سے کنیرڑی کے پہاڑ پر گئے، جہاں لڑائی ہوئی تھی اور مجاہدین زخمی اور شہید ہوئے تھے۔ اس جگہ کو دیکھ کر پھر عشرہ میں زخمیوں کے پاس آئے، اُن کی تسلی کی اور حال پوچھا۔ میاں خدا بخش رامپوری کی پنڈلی میں گولی کا زخم تھا اس پر اپنا دستِ مبارک پھیرا اور فرمایا کہ انشاء اللہ تعالیٰ تمہارا پاؤں جیسا تھا، ویسا ہی درست رہے گا، کچھ نقصان باقی نہ رہے گا۔

آپ اسی خچر پر سوار ہو کر روانہ ہوئے اور امب کی گڑھی میں داخل ہوئے۔ اُس وقت آپ کے ہمرکاب کوئی تیس بتیس آدمی تھے۔ گڑھی کے سب لوگ آپ سے ملے اور سب نے فتح کی مبارکباد دی اور آپ سے اجازت لے کر سب نے خوشی کی بندوقیں چلائیں۔ آپ نے مولانا اسمٰعیل صاحب کو اس مضمون کا خط لکھوا کر روانہ کیا کہ عنایتِ الٰہی سے ہم امب کی گڑھی میں آ کر داخل ہوئے۔ آپ لڑائی میں ابھی تعجیل نہ کیجیے۔ ہم یہاں سے اس کی تدبیر کرتے ہیں اور شیخ بلند بخت کو پچیس سواروں کے ساتھ روانہ کر دیجیے کہ ہم اُن کو پنجتار بھیج کر توپیں منگوا لیں۔

یہ خط مولانا محمد اسمٰعیل صاحب کو ملا۔ آپ نے پڑھا اور خوش ہوئے اور لوگوں کو سُنایا

اور حضرت کی طرف سے سب کی تسلّی اور دلجمعی کی۔ پھر رسالدار عبدالحمید خاں اور شیخ بلند بخت کو بُلا کر وہ خط سُنایا اور رسالدار صاحب سے فرمایا کہ اسی وقت پچیس سواروں کے ساتھ شیخ صاحب کو حضرت کے پاس روانہ کر دو۔ رسالدار صاحب نے فوراً شیخ صاحب کو پچیس سواروں کے ساتھ روانہ کیا۔ شیخ بلند بخت کی سیّد صاحبؒ سے ملاقات ہوئی۔ سیّد صاحبؒ نے اُن سے چھتر بائی کی گڑھی کی کیفیت پوچھی۔ اُنھوں نے اُس کا جائے وقوع اور مفصّل کیفیت بیان کی۔ حضرت نے سُن کر فرمایا کہ شیخ بھائی، انشاء اللہ تعالیٰ وہ گڑھی بے لڑائی کے خالی ہو جائے گی۔ تم جا کر پنجتار سے توپیں لاؤ۔ ہم یہاں کچھ اور بھی تدبیر کریں گے۔

ایک مجاہد کی خود رائی شیخ بلند بخت کی روانگی کے بعد چھتر بائی کا محاصرہ کرنے والوں کو آپ نے حکم بھیجا کہ جب تک پنجتار سے توپیں نہ آلیں، تب تک تم کسی امر میں تعجیل نہ کرنا۔ یہ بھی سُننے میں آیا کہ اب میں سیّد صاحب سیڑھیاں اور رن گڑھ بنوا رہے ہیں اور ایک سیڑھی بن کر مولانا محمد اسمٰعیل صاحب کے پاس آئی بھی ہے۔

ادھر حافظ عبداللطیف صاحب نے ہر مورچے میں جا کر لوگوں سے کہ دیا کہ مولانا صاحب کا حکم ہے کہ آج عصر کے بعد ہلّہ کر دو۔ لوگوں نے جانا کہ شاید مولانا نے اُن کو اطلاع کے لیے بھیجا ہے۔ مولانا اپنے ڈیرے میں تھے۔ سب نے حافظ صاحب کو معتبر جان کر مولانا سے بھی اس بات کی تحقیق نہ کی اور عصر کی نماز پڑھ کر تیار ہو گئے اور حافظ جی کے ساتھ سب نے یکبارگی تکبیر کہہ کر ہلّہ کر دیا۔ تین طرف کانٹوں کے دو سنگر تھے اور اُن کے ورے برابر دُور تک زمین میں کانٹے گڑے تھے۔ سیڑھی مولانا صاحب کے ڈیرے میں تھی۔ آخر الامر تمام غازی دونوں سنگر کود پھاند کر گڑھی کے نیچے جا پہنچے اور پکارنے لگے: "جلد سیڑھی لاؤ"۔ سیڑھی وہاں کہاں؟ اس میں چار پانچ گھڑی کا عرصہ ہوا۔ اس میں کئی غازی شہید ہوئے اور شیخ بلند بخت کے بھائی شیخ علی محمد دیوبندی بھی شہید ہوئے۔ اس وقت مولانا صاحب کے ڈیرے سے سیڑھی آئی اور گڑھی میں لگائی گئی۔ مگر سیڑھی چھوٹی تھی، گڑھی کی منڈیر تک نہ پہنچی۔

اس میں کوئی چار گھڑی رات جاتی رہی۔ جب گڑھی میں داخل ہونے کی کوئی تدبیر نہ بنی، تب تھوڑے تھوڑے غازی چپکے چپکے اپنے اپنے مورچوں کو چلنے لگے۔ رات گئے تک وہ سب وہاں سے نکل آئے اور شہیدوں اور زخمیوں کو بھی اُٹھا لائے۔ مولانا محمد اسمٰعیل صاحب بھی اُس وقت آئے اور لوگوں سے خفا ہو کر فرمایا: تم نے کس کے حکم سے حلّہ کیا؟ جو لوگ اس حملے میں شہید اور زخمی ہوئے، سب کا وبال تمھیں لوگوں پر ہوگا۔ تم نے بڑی نافرمانی کی۔ جب مولانا غصّہ فرما کر چُپ ہوئے، تب لوگوں نے عرض کی کہ ہم نے تو آپ ہی کا حکم پاکر حملہ کیا۔ آج سویرے سے سُنتے تھے کہ دریائے اٹک کے پاس سے گڑھی میں کمک آئے گی۔ عصر کے وقت حافظ عبداللطیف نے ہمارے مورچوں میں آکر کہا کہ مولانا صاحب کا حکم ہے کہ عصر کی نماز پڑھ کر حملہ کردو۔ یہ حکم سُن کر سب تیار ہو گئے اور حافظ جی تکبیر کہتے ہوئے آگے ہوئے۔ اُن کے پیچھے ہم بھی سب چلے۔ اُن سے دریافت کیجیے کہ ہم کچھ خلاف تو نہیں کہتے۔

یہ سُن کر مولانا صاحب نے حافظ عبداللطیف صاحب کو بُلا کر پوچھا کہ یہ لوگ کیا کہتے ہیں۔ حافظ صاحب نے کچھ جواب نہ دیا۔ مولانا کو یقین ہوا کہ سب انھیں کا کیا دھرا ہے۔ آپ نے اُن کو بڑی ملامت کی اور فرمایا: جو بیچارے شہید اور زخمی ہوئے اور لوگوں کو جو ایذا پہنچی، اس سب کا وبال تمھاری گردن پر ہے۔ اِتنے مسلمانوں کا تم نے ناحق خون کرایا۔ حافظ صاحب چُپ کھڑے سُنتے رہے، کچھ بولے نہیں۔

مولانا نے ڈیروں کے شہیدوں اور زخمیوں کو اپنے یہاں اُٹھوا لیا اور اُن کے دفن کا انتظام کیا۔ اسی اثنا میں پنجتار سے شیخ بلند بخت دیوبندی توپیں لے کر اب پہنچ گئے۔ توپیں مرزا حسین بیگ بانس بریلوی، شیخ ہمدانی اور شیخ مولا بخش گولہ اندازوں کے سپرد ہوئیں۔ سید صاحبؒ نے فرمایا کہ اِن کو آج ہی چرخ پر چڑھاؤ۔ آپ وہیں کھڑے رہے۔ غازیوں نے مل کر اُن کو چرخ پر چڑھایا۔ آپ نے شیخ ولی محمدؒ صاحب کو مولانا محمد اسمٰعیل صاحب کے پاس بھیجا اور اُن کے ڈیرے کھبّل بائی منتقل کرا دیے۔ مولانا نے پہلے زخمیوں، بڈھوں، بیماروں اور معذوروں

کو روانہ کیا۔ پھر مورچوں کے مجاہدین جو ڈھائی تین سَو کے قریب تھے، کھبّل بائی کی طرف روانہ ہُوئے۔ راستے میں تنولیوں نے کچھ مزاحمت کی، لیکن لشکر بخیریت پہنچ گیا۔

بھائی کی خبرِ شہادت پر شیخ بلند بخت نے پنجتار سے آتے ہُوئے ستھانے پہنچ کر سُنا کہ اُن کے بھائی شیخ علی محمّد چھتر بائی کے حملے میں شہید ہو گئے۔ شیخ بلند بخت نے کہا: الحمدللہ! ہمارا بھائی جس مُراد کو آیا تھا، اللہ تعالیٰ نے وُہ مُراد اُس کی پوری کی۔ ہم سب مسلمانوں کو اللہ تعالیٰ شہادت نصیب فرمائے۔

غمزدہ کی خاطرداری جب شیخ بلند بخت امب پہنچے، تو سیّد صاحبؒ سے سلام اور مصافحہ ہُوا۔ سیّد صاحبؒ نے سب کو شاباشی دی اور سب کے لیے دُعا کی اور بہت خوش ہُوئے۔ نمازِ مغرب پڑھا کر آپ گڑھی میں تشریف لے گئے اور شیخ بلند بخت کو اپنے پاس بُلا کر بٹھایا۔ اُن کے علاوہ کچھ اور لوگ بھی وہاں موجود تھے۔ آپ کچھ دیر سکوت میں رہے۔ اس کے بعد آپ نے اُن کے بھائی علی محمّد کی ماتم پُرسی کی اور شیخ بلند بخت کی تسلّی کی اور فرمایا کہ تمھارے بھائی صاحب جس مُراد کو اپنے وطن سے اللہ تعالیٰ کی راہ میں نکلے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے انھیں اُن کی مُراد کو پہنچایا۔ ہم سب کو اللہ تعالیٰ اپنی رضامندی کی راہ میں صرف کرے اور ہم سب سے راضی ہو! یہی ہم سب بھائیوں کی دِلی مُراد ہے۔

تسلّی کے اسی طرح کے اور چند جُملے فرما کر آپ نے اُن کے بھائی کے لیے دُعائے مغفرت کی اور شیخ بلند بخت سے فرمایا کہ صبح کی نماز کے بعد اپنے سواروں کو کھبّل بائی میں میاں صاحب کے پاس بھیج دینا اور تم یہیں ہمارے ساتھ رہنا۔ یہ فرما کر آپ نے کھانا منگایا اور شیخ بلند بخت کو اپنے ساتھ کھلایا۔

حافظ عبداللطیف کی تادیب حافظ عبداللطیف صاحب چھتر بائی کے واقعہ کے بعد بجائے کھبّل بائی جانے کے امب چلے آئے۔ سیّد صاحبؒ نے اُن کو بُلایا اور سب کے سامنے اُن کو بہت ملامت کی اور جھڑکی دی کہ تم بڑے فتنہ انگیز اور مُفسد آدمی ہو، ناحق بیٹھے بٹھائے

اتنے آدمی شہید اور زخمی کروا دیے۔ خبردار، اب وہاں تم لشکر میں نہ جانا۔

پائندہ خاں کا دُوسرا فریب پائندہ خاں کو خبر پہنچی کہ سیّد صاحبؒ نے کئی بھاری بھاری توپیں پنجتار سے منگوا لی ہیں اور کئی رن گڑھ اور سیڑھیاں بھی بنوائی ہیں۔ اب چھتر بائی پر چڑھائی کی تیاری ہے۔ بے گڑھی خالی کیے نہ رہیں گے۔ ان دنوں پار کے سکھوں سے اس کی سخت ناموافقت تھی جب اُس نے جانا کہ اب کسی طرح بچاؤ نہیں ہے، تو اس نے سیّد حسن شاہ اور منشی غوث محمد کو اپنی طرف سے وکیل کر کے امب میں سیّد صاحبؒ کے پاس بھیجا۔ انھوں نے آ کر کہا کہ ہمارے خان نے سلام عرض کیا ہے اور کہا ہے کہ ہم آپ کے بہرصورت مطیع اور فرمانبردار ہیں۔ اگر آپ کھبل بائی سے اپنا لشکر بُلا لیں، تو ہم آپ کی دلجمعی اور رفعِ شک کے لیے اپنا بیٹا اُول (یرغمال) میں آپ کے پاس بھیج دیں اور چھتر بائی کی گڑھی بھی خالی کر دیں۔ آپ کا کوئی معتبر شخص آئے ہم اپنے بیٹے کو ساتھ کر دیں گے۔

سیّد صاحبؒ نے فرمایا: کیا مضائقہ ہے؟ تمھارے خان کا کہنا ہم کو منظور ہے اور پندرہ بیس قرابینچی اور جقماق والے ساتھ کر کے اپنے بھانجے سید احمد علی صاحب کو پائندہ خاں کے پاس بھیجا۔ انھوں نے جا کر اُس سے ملاقات کی۔ اُس نے اُن کو بڑی تعظیم و تکریم سے بٹھایا اور آپ سے ایسی لسّانی اور چاپلوسی کی باتیں کیں کہ سیّد احمد علی صاحب اس سے بہت خوش ہُوئے اور جانا کہ یہ صلاحیت پر ہے۔ اُس نے وہی سوال کیا کہ سیّد بادشاہ اپنا لشکر کھبل بائی سے ہٹا لیں، تو میں چھتر بائی کی گڑھی بھی خالی کر دُوں اور اپنا بیٹا بھی سیّد بادشاہ کے پاس اُول میں بھیج دُوں۔

سیّد احمد علی صاحب نے اس بات کا اُس سے اقرار کیا کہ انشاء اللہ تعالےٰ میں اس امر میں کوشش کر کے وہاں سے لشکر اُٹھوا دُوں گا۔ اس طرح اس کی تسلّی کر کے سیّد صاحبؒ کے پاس آئے اور اُس کا عہد و پیمان اور اُس کی صلاحیت کا حال سیّد صاحبؒ سے ذکر کیا۔ آپ کو چونکہ جہاد فی سبیل اللہ مقصود تھا، نہ تو چھتر بائی لینے کی حاجت تھی اور نہ کھبل بائی میں

لشکر رکھنے کی ضرورت۔ آپ کی تو اس سے غرض تھی کہ دریائے اٹک سے آنے جانے کا راستہ مجاہدین کے واسطے خالی رہے۔ اس لیے کہ اصل مقابلہ تو سکھوں سے تھا۔ آپ نے سید احمد علی صاحب کی گفتگو سن کر فرمایا کہ خیر، کیا مضائقہ ہے، ہم کھبّل بائی سے لشکر بلا لیں گے۔ آپ نے مولانا محمد اسمٰعیل صاحب کو کھبّل بائی سے امب میں بلایا اور پائندہ خاں کی ساری گفتگو جو سید احمد علی صاحب کی زبانی سنی تھی، بیان کی اور فرمایا کہ آپ کھبّل بائی کی گڑھی کا بخوبی بندوبست کر کے اور اپنے کچھ لوگ وہاں چھوڑ کر باقی لشکر یہاں اٹھا لائیے۔ پھر مولانا کھبّل بائی تشریف لے گئے اور وہاں کا بندوبست کر کے پچاس ساٹھ غازی رہنے دیے اور باقی سب سوار اور پیادے لے کر امب کو چلے آئے۔

چند روز کے بعد سید صاحبؒ نے اپنے خاص خاص لوگوں کو بلا کر ان سے فرمایا کہ پائندہ خاں کے کہنے سے ہم نے اپنا لشکر کھبّل بائی سے اٹھا لیا، لیکن اس نے اب تک اپنا اقرار بھی پورا نہیں کیا۔ اب اس کے پاس کسی کو بھیجیں، دیکھیں، وہ کیا کہتا ہے۔ لوگوں نے عرض کی کہ ہاں، مناسب ہے۔ آپ نے شیخ ولی محمد صاحب پھلتی، مولوی خیر الدین صاحب شیرکوٹی اور رامپور منہیاراں کے مولوی محمد حسن صاحب کو اس کے لیے تجویز فرمایا اور کہا کہ خان سے صاف صاف گفتگو کرنا، کسی بات میں ہرگز نہ دبنا۔ چھتربائی تو اللہ تعالیٰ کی تائید سے بے لڑے بھڑے خالی ہو جائے گی، وہ ہم کو کیا چھتربائی خالی کر کے دے گا۔ ہم کو تو اپنے پروردگار کی رضامندی کے کام سے کام ہے، نہ اس کی چھتربائی سے غرض ہے، نہ اس کے بیٹے کے اول لینے سے۔

شیخ صاحب بیس چست و چالاک غازی لے کر روانہ ہوئے۔ خاں نے نو دس دن ان کی خوب خاطر تواضع کی اور چکنی چپڑی باتیں کرتا رہا۔ اس عرصے میں سید صاحبؒ نے شیخ ولی محمد صاحب کو کسی ضرورت سے بلایا۔ انھوں نے سب حالات بیان کیے اور کہا کہ اس کے قول و قرار کا ہم کو کچھ ٹھکانا نہیں معلوم ہوا۔ یقین ہے کہ دو چار روز میں سب خالی چلے آئیں گے۔

سات آٹھ روز میں مولوی خیرالدین اور مولوی محمد حسن صاحب سب کو لے کر سیّد صاحبؒ کے پاس چلے آئے اور کہا کہ اُس نے ہم کو یُوں ہی خالی رُخصت کر دیا، مگر اُس نے قسم کھائی ہے کہ تمھارے جانے کے دس بارہ روز کے بعد میں اپنے بیٹے جاندار کو اس کی ماں کی تسلّی اور دلجمعی کر کے ضرور بھیج دُوں گا۔

پندرہ روز کے بعد پائندہ خاں نے جہاندار کو دس آدمیوں کے ساتھ سیّد صاحبؒ کے پاس بھیجا۔ جہاندار ان دنوں دس گیارہ برس کا تھا۔ سیّد صاحبؒ نے اُس کی بہت خاطرداری کی اور فرمایا کہ جس جگہ تمھاری خوشی ہو، رہو۔ اُس لڑکے نے ایک کوٹھڑی پسند کی اور اپنے آدمیوں کے ساتھ اُس میں اُترا۔ سیّد صاحبؒ نے اپنے باورچی خانے سے اُن سب کے لیے کھانا مقرر کر دیا۔ پندرہ سولہ دن کے بعد جہاندار کے ساتھیوں نے ایک دن سیّد صاحبؒ سے عرض کیا کہ جہاندار کی والدہ نے آپ کو نیاز نامہ لکھا ہے اور جہاندار کو دیکھنے کے واسطے بُلایا ہے۔ اگر آپ اجازت دیں، تو ہم دو چار روز کے لیے اُس کو لے جائیں اور ساتھ لے کر چلے آئیں اور وُہ خط سیّد صاحبؒ کو دیا۔ اس میں لکھا تھا کہ جہاندار کے والد نے جہاندار کو بھیجتے وقت مجھ سے اقرار کیا تھا کہ جب تم کہو گی، میں جہاندار کو سیّد بادشاہ کے پاس سے بُلوا دُوں گا۔ میرا وُہی ایک بیٹا ہے۔ اُس کے بے دیکھے میرا دل بہت بیقرار ہے۔ مَیں نے جہاندار کے والد سے کہا، تو اُنھوں نے جواب دیا کہ ابھی اُس کو گئے ہُوئے دِن ہی کِتنے ہُوئے ہیں؟ ہم ابھی سیّد بادشاہ سے اس معاملے میں عرض نہیں کریں گے۔ تب مَیں نے بے چین ہو کر اس معاملے میں آپ سے گزارش کی ہے۔ آپ للّٰہ فی اللّٰہ دو چار دن کے لیے اُس کو بھیج دیں، تو کمال سرفرازی ہو گی۔ سیّد صاحبؒ نے اس کو پڑھ کر فرمایا کہ کیا مضائقہ ہے، ہم اس کو رخصت کر دیں گے۔

جب آپ نے اُس کو رخصت کرنے کا وعدہ کیا، تو جہاندار کے ہمراہی ایک روز گوشت کھانے کے واسطے کسی کی ایک گائے مول لائے اور کوٹھڑی کے آگے اُس کو ذبح

کیا۔ گوشت اُنھوں نے کھایا اور لوگوں کو کھلایا اور آپ سے رُخصت کے لیے عرض کیا۔ آپ نے فرمایا کہ اچھا، کل تم کو رخصت کریں گے۔ اُنھوں نے اسی رات کو دفینہ کھود کر، جو اُس کوٹھری میں دفن تھا، گائے کے چمڑے میں لپیٹ لیا اور گائے کی ہڈیاں اس گڑھے میں ڈال کر زمین برابر کر دی۔ صبح کی نماز کے بعد جاندار رُخصت ہونے آیا۔ سیّد صاحبؒ نے ایک پگڑی اور تین تھان دے کر رخصت کیا اور اپنا سب اسباب اور وہ چمڑا لے کر چلے گئے۔ جب وُہ کُھدی ہُوئی جگہ دیکھی گئی اور اس کو کھودا گیا، اُس میں سے ہڈیاں نکلیں اور معلوم ہُوا کہ اُس میں سے کچھ مال کھود کر لے گئے۔ پھر پائندہ خاں نے جاندار کو نہ بھیجا۔

○

بیسواں باب

پھولڑے کی جنگ

حملے کی تجویز سید صاحبؒ کو کشمیر کی طرف بڑھنے کا خیال تھا۔ امب اور عشرہ پر مجاہدین کا قبضہ ہو چکا تھا۔ کشمیر کے راستے میں تنولیوں کا علاقہ اور پائندہ خاں کی ریاست واقع تھی۔ درمیان میں دریائے سندھ حدِ فاصل تھا، جس کو عبور کر کے اور تنولیوں کے علاقے کو طے کر کے کشمیر کی جانب رُخ کیا جا سکتا تھا۔ سلیمان شاہ والیٔ چترال کا وعدہ تھا کہ جب مجاہدین کا لشکر کشمیر کا رُخ کرے گا، تو وہ گلگت کے راستے امداد کو پہنچ جائے گا۔ ادھر دیوان رام دیال کی برطرفی کے بعد سے کشمیر میں حکومت لاہور کی طرف سے کسی ناظم (گورنر) کا تقرر نہیں ہوا تھا اور یہ کشمیر پر حملہ کرنے کے لیے بہت موزوں وقت تھا۔ اسی عرصے میں پائندہ خاں کے بھائی مدد خاں ہندوال اور سربلند خاں بلال نے سید صاحبؒ سے عرض کیا کہ ہمارے نزدیک یہ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ آپ اپنے کچھ غازی دریا کے پار اُتار کر سری کوٹ اور موضع پھولڑہ[1] پر اپنا قبضہ

[1] پھولڑہ مانسہرے سے دس میل ہو گا۔ وہ پہاڑوں کے حلقے میں ہے۔ دامن کوہ کی زمین اُونچی ہے۔ اس پر بستی آباد ہے۔ سرن ندی بستی کے مشرق میں تقریباً ایک میل کے فاصلے سے گزرتی ہے۔ بستی کے پاس سے ایک نالہ گزرتا ہے جس کا نام "ٹھنڈا ابن" ہے اس سے پنچکیاں بھی چلتی ہیں اور کھیتوں کو پانی بھی ملتا ہے۔ مانسہرے کو جانے والا راستہ مشرقی سمت میں ہے۔ (سید احمد شہید ص ۳۶۴)

کرلیں۔ ملکِ تنول کے یہی دو ٹھکانے گویا سرہیں۔ اگر یہ ہاتھ آگئے، تو اِنشاءاللہ تعالیٰ سب درستی ہو جائے گی۔ جو لوگ حاضر تھے اُنھوں نے اس کی تائید کی۔

آپ نے فرمایا کہ اچھا، کسی کو تجویز کرو۔ سیّد احمد علی صاحب بولے کہ اگر اجازت ہو تو مَیں جاؤں، مگر اس شرط سے کہ جس کو مَیں چاہوں، اپنے ہمراہ لے جاؤں۔ آپ نے اجازت دے دی۔ شیخ ولی محمّد صاحب نے بعد میں سیّد احمد علی صاحب سے پوچھا کہ آپ نے تو کبھی اپنے جانے کی درخواست نہیں کی۔ آج تو سیّد صاحبؒ نے کسی کو تجویز کرنے کو فرمایا تھا، آپ نے اپنے جانے کی کیوں درخواست کی؟ اُنھوں نے کہا کہ اس کا سبب یہ ہے کہ وہاں دریا اُترتے ہی پہلے سکھوں سے مقابلہ ہے۔ جب اُن سے نپٹ لیں گے، تب کہیں وہاں تک جانا ہوگا۔

سیّد احمد علی صاحب نے اپنی فرد مرتّب کی۔ سیّد صاحبؒ نے چند آدمی فرد سے نکال دیے اور اس کے عوض اور کر دیے اور فرمایا کہ ان کو لے جاؤ۔ آپ نے اپنی سواری کا گھوڑا اندور نامی اور ایک سیاہ قبا بھی دی جو آپ نے رمضان کی ستائیسویں شب میں زیبِ تن فرمائی تھی۔

لشکر کی روانگی اور عبورِ دریا | سیّد جعفر علی صاحب نقوی "منظورۃ السّعداء" میں لکھتے ہیں[1] کہ سیّد صاحبؒ نے تین لشکروں کو دریاے اٹک کو تین گھاٹوں سے عبور کرنے کا حکم دیا۔ سردار محمّد خاں کو میر فیض علی منشی کے ساتھ، جن کو آپ کا مُشیر مقرر کیا گیا تھا، کربلیاں کے گھاٹ سے، جو اسب کے مقابل ہے، ماما نورالحسن اور اُن کے دوسرے رُفقاء کو ستھانے کی جانب سے اور سیّد احمد علی صاحب کو دوسرے گھاٹ سے عبور کرنے کی ہدایت کی گئی۔ سیّد احمد علی صاحب کے ساتھ مولوی محمّد حسن[2] رامپوری کو کیا گیا۔ جماعت کے پاس ایک ہی کشتی

---

[1] مولوی سیّد جعفر علی صاحب نقوی رمضان ۱۲۴۵ھ میں لشکرِ اسلام میں پہنچ گئے تھے۔ پھولڑے کا معرکہ ان کے پہنچنے کے کچھ ہی عرصے بعد پیش آیا ہے۔ اس لیے اس معرکے کے متعلق ان کی معلومات مستند اور مفصّل ہیں۔

[2] مولوی سیّد جعفر علی صاحب اُن کے متعلق لکھتے ہیں کہ وہ خاکساری و عاجزی، علم و حلم اور قابلیت میں مولانا محمّد اسمٰعیل صاحبؒ کے بعد اپنی نظیر نہیں رکھتے تھے۔ (منظورۃ السّعداء، ص۸۰)

تھی، جو پائندہ خاں کے مال میں سے ملی تھی۔ اُس کشتی کو پہلے امب کے قریب سے کرپلیوں کے طرف لایا گیا۔ دو ضرب توپ بھی لوگ کھینچ کر گڑھی کی طرف لائے اور گڑھی کے مقابل اُن کو نصب کیا۔ محمد خاں اپنے ہمراہیوں کے ساتھ اس پر بیٹھ گئے اور ملّاحوں نے کشتی چلائی۔ مخالفین نے، جو کرپلیوں کی گڑھی میں تھے، آواز لگا کر اور بندوقوں کے ساتھ مزاحمت کی۔ ادھر سے توپ کے گولے متواتر چلے۔ مخالفین بھاگ کر کچھ گڑھی کی دیوار کے نیچے اور بعض گڑھی کے اندر پناہ گزیں ہوئے اور ان کی مزاحمت کچھ کارگر نہ ہوئی۔ کشتی کے تین پھیروں میں سب لوگ دریا کے پار پہنچ گئے۔ محمد خاں نے اپنے آدمیوں کو بھی بندوقیں سر کرنے کا حکم دیا۔ مخالفین مقابلے کی تاب نہ لا کر گڑھی میں رُوپوش ہو گئے۔ سیّد صاحبؒ نے چکر توپ کا رُخ گڑھی کی طرف کرنے کا حکم دیا اور گولہ اندازوں نے ہاتھ دے کر توپ سر کیا جس سے گڑھی کی دیوار کا ایک کنارہ گولہ کی چوٹ سے گر گیا۔ ادھر کے زمینداروں نے امان حاصل کرنے کے لیے ہجوم کیا۔ پانچ چھ منشی کاغذ کے ٹکڑوں پر امان نامے لکھ لکھ کر دیتے رہے۔ اشراق کے وقت سے دوپہر تک توپیں رُکی رہیں اور امان نامے لکھے جاتے رہے۔ جب مجاہدین دریا پار کر کے پہاڑی کی چوٹی پر چلے گئے اور نظر سے اوجھل ہو گئے اور زمینداروں کا ہجوم بھی کم ہُوا، تو توپیں قلعے میں واپس لائی گئیں۔ دُوسرے گھاٹوں سے بھی لشکر کے دُوسرے حصّے دریا کے پار پہنچ گئے۔ اس کے بعد مولانا محمد اسمٰعیل صاحب بھی چوتھی جماعت کے ساتھ دریا عبور کر کے گڑھی شنگلئی اور چمبیڑی میں تشریف لے آئے۔"

شاہ کوٹ پر قبضہ وقائع احمدی میں ہے کہ سیّد احمد علی صاحب آدھی رات کو شاہ کوٹ میں پہنچے اور یکبارگی گڑھی کا محاصرہ کر لیا۔ گڑھی والے غافل سو رہے تھے۔ شور و غل سُن کر جاگے اور دو چار بندوقیں چلائیں۔ پھر جانا کہ ہم مُفت میں مارے جائیں گے۔ اُنھوں نے امان مانگی کہ ہم اپنے ہتھیار لے کر نکل جائیں۔ سیّد احمد علی صاحب نے اُن کو اجازت دی اور وہ اپنے ہتھیار لے کر نکل گئے۔

چھتر بائی کا تخلیہ شاہ کوٹ کے سپاہی موضع برُوٹی پہنچے اور پائندہ خاں سے گڑھی چھٹ جانے کا حال بیان کیا اور کہا کہ عجب نہیں، اب غازی آکر شیر گڑھ کو لے لیں۔ آپ جلد اس کا تدارک کریں۔ وہی شیر گڑھ اُس کے بھاگنے کا ایک راستہ تھا۔ یہ خبر سُن کر سیّد حسن شاہ اور منشی غوث محمدؐ سے کہا کہ ہیں تو شیر گڑھ کو چلتا ہوں، تم جاکر چھتر بائی کا بندوبست کرو۔ یہ دونوں سیّد صاحبؒ کے مخلص تھے۔ اُنھوں نے چھتر بائی والوں سے کہا کہ اسباب و ہتھیار لے کر جلد گڑھی سے نکل جاؤ۔ سید بادشاہ کا لشکر آتا ہے۔ ایسا نہ ہو کہ گھیرے میں پڑ جاؤ اور خان تو برُوٹی سے شیر گڑھ کو چلا گیا۔ یہ خبر سُن کر تمام آدمی اپنا اپنا اسباب لے کر نکل گئے۔ ان دونوں نے آکر سیّد صاحبؒ کو خوشخبری سُنائی اور آپ کے حکم سے مولوی خیرالدین صاحب نے گڑھی میں اپنا بندوبست کیا۔ ادھر مولانا محمد اسمٰعیل صاحب نے سیّد صاحبؒ کے حکم سے برُوٹی کا رُخ کیا۔ وہ برُوٹی پہنچے، تو پائندہ خاں شیر گڑھ سے اگرُور چلا گیا۔ مولانا برُوٹی سے نکّا پانی اور شیر گڑھ ہوتے ہُوئے شنگلئی اور وہاں سے شمدڑہ آگئے۔

جب سیّد احمد علی صاحب نے شاہ کوٹ کو خالی کر لیا اور پائندہ خاں برُوٹی سے بھاگ کر اگرُور کو گیا اور ہر طرف سے اُس کا زور ٹوٹا اور کسی خان نے اُس کا ساتھ نہ دیا تب اُس نے ہری سنگھ سے، جو مہاراجہ رنجیت سنگھ کا جاگیر دار تھا، جاکر فریاد کی کہ ہمارا ملک سیّد بادشاہ نے چھین لیا ہے اور ہم اِدھر اُدھر آوارہ پھرتے ہیں، کہیں ٹھکانا نہیں، جہاں ٹھیریں۔ اگر تم ہماری اعانت کرو، تو ہمارا ملک مِل جائے۔ ہری سنگھ نے کہا کہ خان، تم بے وفا اور فریبی شخص ہو۔ تمھارے عہد و پیمان کا ہم کو اعتبار نہیں۔ پائندہ خاں نے اُس کی تسلّی کے لیے اپنے بیٹے جہاندار کو اوّل میں دیا اور ہری سنگھ کو موافق کیا۔ ادھر سیّد احمد علی صاحب شاہ کوٹ کا بندوبست کر کے پھولڑے پر لشکر لے کر روانہ ہُوئے اور وہاں جاکر اپنا قبضہ کیا۔

لشکر گاہ سیّد جعفر علی صاحب منظورہ میں لکھتے ہیں: "تینوں لشکر حسب قرارداد پھولڑے کے مقام میں یکجا ہُوئے۔ سیّد احمد علی صاحب کو سیّد صاحبؒ کی ہدایت تھی کہ مُدہ پہاڑ کا

دامن نہ چھوڑیں۔ محمدؐ خاں اور میر فیض علی خاں نے میدان میں پڑاؤ ڈالا تھا۔ یہ جگہ دامن کوہ سے دُور تھی۔ یہ دریافت کرنے کے لیے کہ سیّد احمد علی صاحب اور مولوی محمد حسن پہنچ گئے یا نہیں، میر فیض علی خود اور ماما نور الحسن کی طرف سے کوئی آدمی میر احمد علی کے لشکر گاہ میں آئے۔ سید احمد علی صاحب نے فرمایا کہ تم سب لوگ یہاں پر میرے پاس آجاؤ۔ میر فیض علی صاحب نے کہا کہ چونکہ ہم نے میدان میں مورچال قائم کر لی ہے، اس لیے اس کو پیچھے لانا مناسب نہیں معلوم ہوتا۔ آپ خود وہاں تشریف لے آئیے۔ وہ ایک وسیع میدان ہے، جنگ کے لیے زیادہ موزوں ہے۔ اس وقت سید احمد علی صاحب کو سیّد صاحبؒ کی ہدایت اور تاکید کا خیال نہیں رہا اور تینوں لشکر میں جمع ہو گئے۔ وہ میدان بہت وسیع اور فراخ تھا۔ چاروں جانب پہاڑ فاصلے فاصلے سے تھے۔ وہاں سے ہزارہ کو راستہ جاتا تھا۔ اس راستے پر از رہِ احتیاط و دُور اندیشی پہرہ بٹھا دیا گیا اور ساری رات ہوشیاری کے ساتھ پہرہ دینے کی تاکید کر دی گئی۔"

"وقائع احمدی" میں ہے: "دو روز تک یہی خبر رہی کہ آج چھاپہ آئے گا۔ تمام لوگ ہوشیار اور بیدار رہے۔ مگر کوئی نہ آیا، نہ گیا۔ لوگوں کو خیال ہُوا کہ یوں ہی لوگ جھوٹی خبر اڑا دیتے ہیں اور وہ غافل ہو گئے۔

اچانک حملہ "فجر کے قریب لشکر کے لوگ نماز کی تیاری میں مشغول تھے۔ کوئی استنجے میں، کوئی وضو میں اور کوئی صبح کی سنّت میں مشغول تھا کہ راستے کی جانب سے بندوقوں کی آواز آئی۔ اب بندوق کی آوازیں آنی شروع ہوئیں۔ لوگوں نے جلدی جلدی تنہا تنہا یا دو دو چار چار نے فرض ادا کیے اور اپنے ہتھیار سنبھال کر دشمنوں کی طرف دَوڑے۔ اس سے جماعت میں ایک اِنتشار سا پیدا ہو گیا۔ سید احمد علی صاحب اپنی جگہ پر کھڑے قبلہ رُو دُعا میں مشغول ہو گئے اور اپنے بعض ہمراہیوں سے فرمایا کہ آواز دو کہ لوگ یہاں آ کر دُعا کر لیں۔ لوگوں نے آواز دی اور جو جو آدمی قریب تھے، وہ جمع ہو گئے۔ طرفین سے بندوق کے ساتھ مقابلہ ہُوا۔ مخالف سواروں نے فریب کیا۔ اُن میں سے ہر ایک ایک طرف کو بھاگا: کوئی مشرق کی طرف، کوئی مغرب کی

طرف۔ مجاہدین نے اُن کا تعاقب کیا۔ اس سے لشکر میں پہلے کی طرح، بلکہ اس سے زیادہ پراگندگی پیدا ہُوئی۔ اُس وقت وُہ سوار پلٹ پڑے اور مجاہدین میں ایک ایک، دو دو، تین تین کو، جو لشکر سے جُدا ہو گئے تھے، شہید کر دیا۔ سیّد احمد علی صاحب اور فیض علی صاحب دیر تک بڑی شجاعت اور دلیری کے ساتھ مقابلہ کرتے رہے۔ آخر میں اُن کا سنگ چقماق خطا کرنے لگا۔ اُنھوں نے بندوق کی نال پکڑ کر اس کے کندے کو لاٹھی کی طرح استعمال کرنا شروع کیا اور اس سے گُرس کا کام لینے لگے۔ اس وقت سکھوں کے لشکر کے بہت سے لوگ جمع ہو گئے اور تلوار اور نیزے سے زد پر زد لگا کر ان دونوں حضرات کو شہید کر دیا۔ مولوی محمد حسن رامپوری اور رحیم بخش جرّاح، جو لشکر کے ڈیرے میں موجُود تھے، ان کی شہادت کی خبر سُن کر دیوانہ وار دوڑے اور لڑ کر شہادت حاصل کی۔ مخالفین ڈیرے خیمے اور سیّد احمد علی صاحب کے سواری کے گھوڑے کو، جو سیّد صاحبؒ کی سواری خاصے کا گھوڑا تھا، لُوٹ کر لے جانے لگے۔ اس وقت محمد خاں نشان بردار کو غیرت آئی اور اُنھوں نے آواز دی کہ مسلمانو، یہ حضرت امیر المؤمنین کی سواری کا گھوڑا ہے، اس کو کفّار لے جا رہے ہیں۔ ایمانی حمیّت اس کو گوارا نہیں کرتی کہ نائبِ رسُولؐ کی سواری خاص کے گھوڑے کو کفّار استعمال کریں۔ اُنھوں نے اپنی جماعت کے ساتھ سخت حملہ کیا۔ بہت سکھ مقتول ہُوئے۔ محمد خاں نے گھوڑے کی لگام تھام کر اس پر قبضہ کیا اور اس کو ہاتھوں سے چھڑا لیا۔ یہ دیکھ کر سکھوں نے لشکر کی دُوسری جمعیّت سے دوبارہ حملہ کیا۔ محمد خاں نے بڑی شجاعت اور جُرأت سے اُن کا مُقابلہ کیا اور دست بدست لڑتے ہُوئے وہ خود بھی شہید ہُوئے اور گھوڑا بھی کام آیا اور اُن کی جماعت کے سارے آدمی شہادت سے سرفراز ہُوئے۔ جو آدمی پہاڑ کی چوٹی پر تھے۔ اُنھوں نے سکھوں کو اپنی بندوقوں کی گولیوں کا نشانہ بنایا۔ راستہ دامنِ کوہ میں سے جاتا تھا۔ اُن کے قدم وہاں پر جم نہ سکے اور اُنھوں نے گریز اختیار کیا۔ اس وقت اُن لوگوں نے جو پہاڑ پر تھے، اس جانب، جس طرف وہ بھاگ رہے تھے، زور کیا اور مسلمانوں کے مال کا بڑا حصّہ، جس کو لُوٹے لیے جا رہے تھے، چھڑا لیا۔ جب میدان سکھوں سے خالی ہو گیا، تو

مجاہدین نے شہدا کی نمازِ جنازہ پڑھ کر اُن کو دفن کیا۔

مجاہدین کی جوانمردی اور دلیرانہ شہادت سکھوں کے اچانک حملے پر مجاہدین نے جابجا بڑی جوانمردی اور بڑی شجاعت و استقلال کے ساتھ اُن کا مقابلہ کیا۔ اُن کی شہادت کے واقعات بڑے ولولہ انگیز اور بڑے ایمان افروز ہیں:

مرزا عبدالقدوس کشمیری نے، جو کانپور سے شامل ہوئے تھے، پیدل تھے۔ دیر تک سواروں کا مقابلہ کرتے رہے۔ جب کوئی سوار گھوڑا دوڑاتا ہوا آتا، وہ گھوڑے کے سینے کے نیچے آکر گھوڑے کی لگام پکڑ لیتے اور اس کے سوار کو تلوار سے دو ٹکڑے کر دیتے اور کبھی سوار نیزے کی نوک بائیں جانب کرتے۔ وہ دائیں جانب سے آکر اس کا نیزہ کاٹ دیتے، پھر اس کا سر قلم کر دیتے۔ اس طرح سے بہت سے حملہ آوروں کو قتل کرتے دادِ شجاعت دیتے ہوئے شربتِ شہادت نوش فرمایا۔

میر احمد علی بہاری نوعمر جوان تھے۔ بندوق کی بھرماری میں اپنی نظیر نہیں رکھتے تھے۔ اُنھوں نے اپنی گولیوں سے بہت سے سواروں کو ہلاک کیا۔ بالآخر دشمنوں نے اُن کو اپنے حلقے میں لے لیا۔ اُس نوجوان نے اُن کو للکار کر کہا کہ تم کو تمھارے پیدا کرنے والے کی قسم ہے کہ کوئی مجھ پر گولی نہ چلائے۔ میری شمشیر زنی کا تماشا دیکھیں اور شجاعت کی داد دیں۔ میں تمھارے حلقے سے باہر نہیں جاؤں گا۔ اُنھوں نے دیر تک اپنی تلوار کے جوہر دکھائے، جس پر اُن کی تلوار پڑ جاتی، سر قلم ہو جاتا یا ہاتھ یا پاؤں کٹ جاتا۔ آخر ایک شقی نے گولی سے اُن کا کام تمام کر دیا اور وہ شہادت سے سرخرو ہوئے۔

امام خاں سہسرامی اور شیخ برکت اللہ گورکھپوری دیر تک دادِ شجاعت دیتے رہے۔ آخر شیخ برکت اللہ کے سنگرڑے میں آگ لگ گئی، جس سے اُن کے بدن کا اکثر حصّہ جل گیا اور سکھوں نے اُن کو شہید کر دیا۔

لشکرِ اسلام میں ایک فقیر تھا، جس کے پاس صرف لکڑیاں کاٹنے والی کلھاڑی تھی۔ وہ

ایک پتھر پر کھڑا ہو گیا۔ ایک سکھ سوار کسی مسلمان کے پیچھے گھوڑا دوڑاتا اُس کے پاس سے گزرا۔ اُس نے اپنا تبر اُس سوار کے سر پر مارا۔ سوار تو گھوڑا دوڑانے کی وجہ سے محفوظ رہا، لیکن تبر گھوڑے کے پُٹھے پر پڑا اور گوشت میں اُتر گیا۔ گھوڑا چند قدم آگے جا کر گر گیا اور سوار بھی زمین پر آ رہا۔ میر احمد علی بہاری نے (جو اُس وقت زندہ تھے) دوڑ کر اس کا سر اُڑا دیا۔

اس معرکے میں سیّد احمد علی، میر احمد علی بہاری اور ان حضرات کے علاوہ جن کا اوپر ذکر ہوا، سید عبد الرزاق نگرامی (برادر سیّد نور احمد نگرامی مؤلف نورِ احمدی) کریم بخش سہارنپوری، فیض الدین بنگالی، رحیم بخش جرّاح اور علی خاں وغیرہ شہید ہوئے۔ جو غازی صحیح سالم تھے، وہ پہاڑ کی طرف چلے گئے۔ سکھوں نے جا کر بستی کے گھروں میں آگ لگا دی۔

سیّد احمد علی کی شہادت کی اطلاع اور پس ماندگان سے تعزیت اب میں سیّد صاحبؒ کے پاس سیّد احمد علی کی شہادت کی اطلاع پہنچی۔ آپ نے سُن کر اِنَّا لِلّٰہِ وَ اِنَّآ اِلَیْہِ رٰجِعُوْنَ پڑھا اور فرمایا کہ اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ، جس مُراد کو آئے تھے، اللّٰہ تعالیٰ نے اُن کو اُس مُراد کو پہنچایا اور بہت دیر تک آپ سکوت میں رہے۔[1]

عشا کی نماز کے بعد آپ نے سیّد احمد علی صاحب کے نوجوان صاحبزادے سیّد موسیٰ، نور بخش جرّاح شہید کے بھائی ابراہیم خاں اور معرکے کے دوسرے شہیدوں کے عزیزوں کو بلایا اور فرمایا کہ فلاں فلاں صاحب آج پھولڑے میں شہید ہوئے اور وعظ و نصیحت اور شہدار کے فضائل بیان کر کے اُن کی تسلّی کی اور صبر کی تلقین فرمائی اور اُن کا کھانا وہیں منگوایا اور سب صاحبوں کو اپنے ساتھ کھلایا[2] اور اس کے بعد فرمایا کہ وُہ تو سب صاحب اپنے مقصودِ دلی کو پہنچے، اب اُن کے لیے دُعاءِ مغفرت کیا کرو۔ ہم تم سب کو اللّٰہ تعالیٰ اپنی رضامندی کے راستے میں صرف کرے

---

[1] "منظورہ" میں ہے کہ جب قاصد نے بیان کیا کہ تمام زخم سیّد احمد علی صاحب کے چہرے پر آئے، تو آپ کے آنسو جاری ہو گئے۔ دونوں ہاتھوں سے آنسو پونچھتے جاتے تھے اور الحمد للہ! الحمد للہ! فرماتے تھے۔

[2] سیّد صاحبؒ کا معمول تھا کہ ایسے موقع پر شہدار کے غمزدہ وارثوں اور اعزّہ خاص کو اپنے ساتھ خصوصیت کے ساتھ کھلانے میں شریک فرماتے اور اُن کی دلداری فرماتے۔

شاہ اسمٰعیل صاحب کی مُراجعت | مولانا شاہ اسمٰعیل صاحب کو، جو پیش قدمی کے خیال سے جمپیڑی تک پہنچ گئے تھے اور اس کے منتظر تھے کہ سیّد احمد علی صاحب کو فتح ہو، تو آگے کشمیر کی طرف بڑھیں، اُن کو جب سیّد احمد علی کی شہادت کی خبر ملی، تو اُنھوں نے مستقل مزاجی کے ساتھ گڑھی کے سرداروں کو طلب فرمایا اور اُن سے خدمتِ دین و رفاقتِ مجاہدین کا عہد و میثاق لے کر اُن میں سے ایک کو سردار مقرر کر کے امب کی طرف مُراجعت فرمائی۔

پائندہ خاں کی زنبورکیں | سیّد صاحبؒ کی خدمت میں ایک سیّد نے جو پائندہ خاں کی زنبورکوں کا محافظ و منتظم تھا، آ کر عرض کیا کہ پائندہ خاں کا سامان جابجا پڑا ہُوا ہے۔ چنانچہ اُس کی زنبورکیں فلاں کوہستان میں کہ بیابانِ محض ہے، لاوارثوں کے مال کی طرح پڑی ہُوئی ہیں۔ آپ اُن کو اُٹھوا لیں۔ سیّد صاحبؒ نے یہ خدمت شیخ بلند بخت دیوبندی کے سپُرد کی کہ اس کا انتظام کریں۔ اُن کی ہدایت سے مولوی سیّد جعفر علی صاحب نقوی نے پانچ آدمیوں کی معیّت میں بڑی مشقّت برداشت کر کے اور اپنے کو خطرے میں ڈال کر اُن زنبورکوں کو ۱۰ ذی الحجہ ۱۲۴۵ھ کو امب میں پہنچا دیا۔

اِکیسواں باب

امن کا قیام

پائندہ خاں کی مصالحت ۲۷ شوال ۱۲۴۵ھ کو سید صاحبؒ نے ایک اِعلام جاری فرمایا تھا کہ اگر پائندہ خاں اپنے عہد اور وعدے کے مطابق، جو صلحنامے میں مندرج ہے، مدد خاں کا مُلک و مال اس کے حوالے کر دے، تو اُس کی گلی ہند وال کی خانی اور سرداری برقرار رہے گی[1]

پائندہ خاں نے بھی ۲۹ ذی قعدہ ۱۲۴۵ھ کو ایک اقرار نامہ جس میں اپنی غلطیوں کا اعتراف اور آئندہ کے لیے اِتباعِ شریعت اور اطاعت کا وعدہ تھا، تحریر کیا۔ اس میں یہ بھی وعدہ کیا گیا تھا کہ کبھی سکھوں اور مخالفینِ اسلام کے ساتھ تعلقات نہیں قائم کیے جائیں گے اور مسلمانوں اور لشکرِ اسلام کی بدخواہی نہیں ہوگی، مدد خاں کا علاقہ اُس کے حوالے کر دیا جائے گا، کلکٹی کے سوا اگرور کے علاقے سے دست بردار ہو جاؤں گا اور پلال کے علاقے سے بھی کوئی غرض نہیں رکھی جائے گی؛ نیز ۱۶۰ سواروں اور شاہین کے ساتھ جہاندار خاں کی معیت میں ایک لشکر مُلک سمہ کو اور دو ہزار پیادوں کا ایک لشکر اکبر علی کے ہمراہ جانب کشمیر روانہ کیا جائے گا۔ اگر اس معاہدے کے

---

[1] مکاتیب شاہ اسمٰعیل صہ ۲۶۱ -

خلاف کوئی بات وقوع میں آئے، تو میری جان و مال مسلمانوں کے لیے مباح و حلال ہے اور میں اپنے ملک و ریاست سے بالکلیہ دست بردار ہوں[1]۔ اس کے جواب میں سیّد صاحبؒ کی طرف سے بھی ایک تحریر لکھی گئی، جس میں اس بات کا وعدہ تھا کہ اگر پائندہ خاں اپنے شرائط کو پورا کرے گا، تو ہنڈوال کا علاقہ اور اُس کی سرداری برقرار رہے گی اور بشرطِ خیریت و رفاقت کشمیر میں بیس ہزار کی جاگیر اور پشاور فتح ہونے پر دس ہزار کی جاگیر اُس کو دی جائے گی اور اُس کو بڑے درجے کا سردار بنایا جائے گا[2]۔

نظامِ قضاء و اصلاحِ اخلاق اسی دوران میں قاضی محمد حبّان صاحب قاضی القضاۃ کے منصب پر مامور ہوئے اور ہر گاؤں اور قصبے میں قاضی، مفتی اور محتسب مقرر ہوئے۔ تنول کے علاقے میں، جہاں مقامی لوگوں میں سے کوئی متدیّن عالم دستیاب نہ ہو سکا، فردوسہ کے ایک عالم قاضی منتخب ہوئے۔ قاضی محمد حبّان صاحب نے مقامی و مہاجر علماء کے مشورے سے امورِ شرعیّہ کے ترک کر دینے پر جرمانے اور تعزیرات مقرر کیں۔ اسی طرح مخالفِ تہذیب و شریعت امور، مثلاً برہنہ غسل کرنے پر سزا مقرر ہوئی، کسی کی کھیتی کو نقصان پہنچانے اور اس میں جانور چرانے پر جرمانے تجویز کیے گئے۔

جو عورت تارک الصلوٰۃ ہوتی، اُس کو بھی زنان خانے میں سزا دی جاتی۔ بعض عورتوں نے اپنے کو بیوہ ظاہر کیا، بعد میں اُن کا فریب کھل گیا اور معلوم ہوا کہ شادی شدہ ہیں۔ بعض افغانی عورتوں نے اپنی ہم قوم عورتوں کو طعنہ دیا کہ تم نے کالے کلوٹے ہندوستانی سے شادی کی۔ اُن عورتوں کی تادیب کی گئی اور فتنہ پردازی کا سدِّ باب کیا گیا۔

لشکرِ اسلام کی اسلامی معاشرت اسب کے زمانۂ قیام میں سیّد صاحبؒ اور اہلِ لشکر کی معاشرت اور زندگی اسلامی معاشرت اور مجاہدانہ زندگی کا نمونہ تھی۔ ہر شخص اپنے سب کام اپنے ہاتھ سے کرتا تھا۔ سیّد صاحبؒ مسلمانوں کے اجتماعی کاموں میں پیش قدمی فرما کر مسلمانوں میں عمل کا جذبہ

---

[1] مکاتیب شاہ اسمٰعیل ص ۲۵۹ [2] ایضاً ص ۲۵۹

اور مُسابقت اِلی الخَیر کا جوش پیدا فرما دیتے تھے۔

ایک مرتبہ باورچی خانے میں، جس میں مسلمانوں کا کھانا پکتا تھا، پانی نہ تھا۔ دریا کچھ فاصلے پر تھا اور اندھیری رات تھی۔ لوگوں نے پانی لانے میں کچھ سستی کی۔ آپ نے مولانا اسمٰعیل صاحب سے فرمایا کہ آئیے، مولانا، ہم مشک سنبھالیں، آپ گھڑا اُٹھائیں اور پانی بھر لائیں۔ چنانچہ ایسا ہی ہُوا اور دونوں حضرات دریا پر آئے۔ لوگوں کو اطلاع ہُوئی، تو ہجوم ہوگیا اور مشک اور گھڑا دونوں حضرات سے لے کر بات کی بات پر پانی باورچی خانے پہنچا دیا گیا۔

اسی طرح ایک مرتبہ مسجد میں گنجائش نہ تھی۔ اس کے قریب ایک ہاتھی بندھا ہُوا تھا، جس کی وجہ سے اس کے گرد گندگی ہو رہی تھی۔ جب ہوتی مردان سے لشکر واپس ہُوا، تو مسجد کی تنگی کی وجہ سے لوگوں نے الگ الگ جماعتیں کیں۔ آپ نے صبح کی نماز کے بعد پھاوڑا لیا اور مولانا اسمٰعیل صاحب نے ٹوکرا اُٹھایا اور جہاں ہاتھی بندھا ہُوا تھا۔ وہاں تشریف لائے۔ ہاتھی کے لیے دُوسری جگہ تجویز کی۔ سیّد صاحبؒ نے پھاوڑے سے سارا کوڑا کھودا اور مولانا نے ٹوکرے میں رکھ کر دُوسری جگہ ڈال دیا۔ لوگ یہ دیکھ کر دوڑے اور سیّد صاحبؒ کے ہاتھ سے پھاوڑا اور مولانا کے ہاتھ سے ٹوکرا لے لیا۔ مولانا دُوسرا ٹوکرا لے آئے اور دو گھنٹے کے اندر اندر جگہ کی صفائی ہوگئی۔ دُوسرے روز سیّد صاحبؒ نے فرمایا کہ سب بھائی پانچ پانچ پتھر لے آئیں تاکہ اُس کا فرش کر کے مسجد کی توسیع کر دی جائے۔ خود آپ بھی دریا پر تشریف لے گئے اور دو بڑے پتّھر دونوں ہاتھوں سے اُٹھا کر لے آئے۔ لوگوں نے بڑے اصرار سے لینا چاہا۔ آپ ناراض ہُوئے اور فرمایا کہ تم مجھے نیک کام سے روکتے ہو اور خوشامد پسند اُمراء کی طرح میری بھی چاپلوسی کرتے ہو۔ یہ بھی نہیں سوچتے کہ یہ پتّھر کس قدر بھاری ہیں۔ یہ کہہ کر آپ نے پتّھر زمین پر رکھ دیے اور فرمایا کہ اب جس کو ہمّت ہو، اٹھا کر دیکھے۔ لوگوں نے ان پتّھروں کی جسامت دیکھ کر ہمّت نہ کی۔ آپ نے اسی طرح ان دونوں کو اُٹھا کر مسجد تک پہنچا دیا۔

مولانا محمد اسمٰعیل صاحب نے ایک مرتبہ ایک زنبورک اُٹھائی اور مولوی سیّد جعفر علی صاحب

سے فرمایا کہ اس کو میرے کاندھے پر رکھ دو۔ مولوی جعفر علی صاحب نے عرض کیا کہ وزن بہت ہے۔آپ اُٹھا نہ سکیں گے، مجھے اُٹھانے دیجیے۔ فرمایا کہ میری مصلحت اسی میں ہے۔میں نے حکم کی تعمیل کی۔ زنبورک مولانا کے کاندھے پر رکھی، تو اُن کے پاؤں لڑکھڑائے۔ لوگوں نے دُور سے دیکھا، تو دَوڑے اور اُس کو اُٹھالیا۔ آپ نے فرمایا کہ یہ ثواب کا کام ہے، لیکن ایک ہی صاحب پر اس کا بار نہیں ہونا چاہیے۔تین کوس کے فاصلے پر لے جانا ہے۔ باری باری سے سب لے جائیں ۔ اسی طرح عمل ہُوا۔

ایک مرتبہ دو تین روز تک مُوسلا دھار بارش ہوئی۔قلعۂ امب کے جنوبی اور مشرقی گوشے کا بُرج گر گیا۔ دو تین آدمی بھاری بھاری پتھروں اور صدہا من مٹی کے نیچے دب گئے۔یہ سُنتے ہی سیّد صاحبؒ نے پھاوڑے طلب کیے۔کچھ لوگ پھاوڑے لینے دَوڑے، کچھ کہنے لگے کہ بُرج ابھی پُورا نہیں گرا ہے۔ اگر بُرج پُورا گر چکا ہوتا، تو حرج نہ تھا۔اب اندیشہ ہے کہ باقی حصّہ بھی گر جائے گا اور لوگ دب جائیں گے۔ آپ نے کچھ سماعت نہ فرمائی اور پھاوڑا لے کر دو آدمیوں کے ہمراہ بُرج کے نیچے تشریف لے گئے اور ملبہ ہٹانے لگے۔آپ کی کوشش سے ایک آدمی جو قلعۂ اٹک کا رہنے والا تھا، زندہ نکل آیا۔ اگرچہ زخمی ہو گیا تھا، مگر سلامت تھا۔اُس وقت آپ نے حاضرین سے فرمایا کہ اگر مَیں تمھارے روکنے سے رُک جاتا، تو ایک مسلمان کی جان بچانے کے ثواب سے محروم رہتا۔الحمدللہ کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے کرم سے اُس کو زندہ نکال دیا اور ہم کو اس کا ثواب عطا فرمایا۔ لوگوں نے کہا کہ حضرت، یہ آپ کی کرامت ہے۔ ورنہ اس کی ہلاکت میں کیا شک تھا؟

ایک رہزن کی توبہ اور اصلاح | ٹوپئی میں پھلیلہ نام کا ایک شخص بڑا ظالم اور مردم آزار تھا۔تمام بستی والے اُس سے تنگ اور عاجز تھے۔آخر سب نے متفق ہو کر اُس کو ٹوپئی سے نکال دیا۔ وُہ وہاں سے دریائے اٹک اُتر کر سمّہ میں جا رہا اور اُن سے موافقت پیدا کی۔انھوں نے اٹک کے کنارے اُس کے لیے ایک بُرج بنا دیا اور زراعت کے واسطے کچھ زمین بھی دی۔ وُہ اس بُرج

میں رہنے لگا۔ پچاس ساٹھ آدمی اُس کے پاس ہر وقت رہتے تھے۔ وہ اکثر ٹوپئی کے علاقے میں ڈاکہ مارا کرتا تھا اور وہاں بیٹھ کر کھاتا تھا۔ ایک مرتبہ اُس نے سکھوں کو اپنے ساتھ لے کر مشوانی قوم کے ایک آباد موضع کو خُوب لوٹا۔ اُس بستی کے اسّی آدمی مارے گئے اور اس بستی پر قبضہ کر کے خود وہاں رہنے لگا اور سکھوں کی شہ پر ٹوپئی، مینئی، منارہ اور کھبّل وغیرہ پر ڈاکہ ڈالنے لگا۔ ان بستیوں کے لوگ سیّد صاحبؒ کے پاس نالشی ہُوئے اور اُس کی سرکوبی کی درخواست کی۔ آپ نے ان کی تسلّی اور دلجمعی کر کے واپس کر دیا اور پھلیلہ کے پاس اس مضمون کا خط بھیجا کہ تم مسلمان ہو، تم کو مناسب نہیں ہے کہ تم اپنے مسلمان بھائیوں کو لُوٹو، مارو اور تنگ کرو۔ تم یہاں ہمارے پاس چلے آؤ، ہم تم کو تمہاری بستی میں بسا دیں گے اور جو تمہاری زمین جاگیر ہو گی، تم کو دلا دیں گے اور اِنشاء اللہ تعالیٰ! تم کو ایک گاؤں اَور دیں گے۔

جب یہ خط اُس کو مِلا، اُس نے اپنے ساتھیوں سے صلاح لی۔ سب نے کہا: چلنا ہی مناسب ہے، کیونکہ وُہ سیّد اور ہم سب کے امام اور بادشاہ ہیں۔ ہم سب کو تو پکڑنے سے رہے اگر دو چار کو ہم میں سے گرفتار کر لیں گے، تو ہم جیسا ہوگا، دیکھ لیں گے۔ چنانچہ پھلیلہ امب میں آ کر سیّد صاحبؒ سے مِلا۔ آپ بہت خوش ہُوئے۔ اُس نے تین گھوڑے، چار بندُوقیں اور نَو تلواریں، جو سکھوں سے ایک روز پہلے لُوٹی تھیں، آپ کی نذر کیں۔ آپ نے اُس کے آدمیوں کو ایک ایک پگڑی اور ایک ایک لُنگی عنایت کی اور پھلیلہ کو ایک سبز دوشالہ، بہت سے کپڑے اور کچھ نقد روپے دیے۔ پھر پھلیلہ نے اور اُس کے سب آدمیوں نے آپ سے بیعت اور فسق و فجُور اور بُرے کاموں سے توبہ کی۔ تین روز آپ نے اُس کو اپنے پاس رکھا اور اُس کو خُوب نصیحت فرمائی اور اُس کو تسلّی کر کے رُخصت کیا۔ تھوڑے دن کے بعد آپ نے موضع ٹوپئی کے رئیسوں کو اور پھلیلہ کو بُلایا اور اُن سے صُلح صفائی کرائی اور پھلیلہ کا جو حق ٹوپئی میں تھا، اُن رئیسوں سے دِلا دیا اور ایک گاؤں کھبّل سے کوس بھر، جو دریائے اٹک کے کنارے ایک ٹیکری پر ویران پڑا تھا اور وہاں اکثر مُسافر لوگ لُٹ جاتے تھے، وہ پھلیلہ کو دِلوا دیا اور فرمایا

کہ اب تم وہیں رہا کرو۔ آپ نے ٹوپئی والوں کو رُخصت کر دیا اور بھلیلیہ آپ کے پاس رہا۔

بھلیلیہ کی کارگزاری | دُوسرے یا تیسرے روز کسی مخبر نے آکر بھلیلیہ سے کہا کہ سکھوں کی رسد سکندر پور سے دَربند کو جاتی ہے۔ یہ حال سُن کر بھلیلیہ نے عرض کی کہ اگر مجھ کو اجازت ہو، تو میں آپ کو اس کا تماشا دکھاؤں۔ آپ نے فرمایا کہ تم کو اجازت ہے۔ بھلیلیہ نے کوئی سَوسوا سَو آدمی بُلا کر جمع کیے اور عشرہ کے کوٹلے پر بٹھائے اور اُن سے کہا کہ ہم لوگ جا کر نالے میں چھُپیں گے۔ جب سکھوں کی رسد ہمارے مقابل آئے، تب تم بندُوق چلا دینا۔ وُہ رات ہی کو شناچوں پر سوار کر کے اپنے لوگوں کو سندھ کے پار لے گیا اور سب دامنِ کوہ کے نالے میں جا چھُپے۔

اگلے روز کوئی تین گھڑی دن چڑھے سکھ رسد لیے ہُوئے آئے۔ کوئی پانچ سَو سوار اور پیادے رسد کے آگے تھے، اتنے ہی پیچھے تھے۔ رسد بیلوں، خچروں اور گدھوں پر تھی۔ اس میں گیہوں اور گھی کے کُپّے اور آٹا اور شکر تھی۔ ایک سال کا سامان تھا۔ وہ جب آتے آتے اس نالے کے مقابل پہنچے تو کوٹلے والوں نے دو بندوقیں چلائیں۔ ادھر بھلیلیہ کے لوگوں نے نالے سے نکل کر بندوقوں کی ایک باڑ ماری اور تلواریں کھینچ کر اُن پر دَوڑے۔ یہ لوگ جا کر رسد پر گرے جس سے جو اسباب لیا گیا، وُہ لیا اور دریائے سندھ کا کنارا پکڑا۔ اُدھر سکھوں نے اُن کا پیچھا کیا اور بندوقیں مارنے لگے۔ جب اُن پر سکھوں کا زیادہ دباؤ ہُوا، تو سیّد صاحبؒ نے شیخ وزیر گولہ انداز کو توپ سر کرنے کا حکم دیا۔ شیخ وزیر نے سکھوں کے ایک غول کی طرف چار گولے مارے۔ وُہ تمام پراگندہ ہو گئے۔ اس فُرصت میں یہ لوگ اپنے اپنے شناچے پھُونک کر دریا میں سوار ہُوئے اور اسبابِ غنیمت اور اپنے ہتھیار لے کر پَیرنے لگے اور سلامت پار اُتر آئے۔

اسب کا آم | اسب میں دریائے سندھ کے کنارے دامنِ کوہ میں آم کا ایک بڑا درخت تھا۔ ایک بار سیّد صاحبؒ نے وہاں کے لوگوں سے پُوچھا کہ یہ درخت پھلتا بھی ہے۔ اُنھوں نے کہا کہ ہماری یاد میں تو کبھی نہیں پھلا۔ پھُول تو آتا ہے، مگر گر جاتا ہے۔ آپ نے فرمایا کہ اس کا کیا سبب ہے کہ بُور آتا ہے اور پھل نہیں لگتے۔ اُنھوں نے عرض کیا کہ ہم اپنے بزرگوں سے

سُنتے آئے ہیں کہ اگلے زمانے میں جب یہاں کا حاکم دیانتدار، منصف اور رعیّت پرور تھا، اُس کی خوش نیّتی اور برکت کے سبب سے یہ درخت پھلا کرتا تھا۔ اس کے بعد جب سے یہاں کے حاکم لوگوں پر ظلم اور زیادتی کرنے لگے، تب سے یہ درخت نہیں پھلتا۔

آپ نے یہ سُن کر فرمایا کہ اگر اس کے نہ پھلنے کا سبب یہی ہے، جو تم کہتے ہو، تو ہم اپنے پروردگار سے دُعا کریں گے کہ جو ہمارے غازی بھائی اپنے اپنے گھر بار چھوڑ کر اللہ تعالیٰ کی رضامندی کو آئے ہیں، کیا عجب ہے کہ یہ درخت ان سب بھائیوں کی نیک نیّتی اور برکت سے پھلے اور جنابِ الٰہی سے مجھے اُمیدِ قوی ہے کہ یہ درخت پھلے گا۔

اُن دنوں آموں میں بُور آنا شروع ہُوا تھا۔ ایک روز نمازِ عصر کے بعد آپ اُس درخت کی طرف گئے، لشکر اور بستی کے بہت سے لوگ ہمراہ تھے۔ آپ نے اُس درخت کو ہر طرف سے دیکھا، پھر برہنہ سر ہو کر دیر تک دُعا کی۔ ہمراہی "آمین!" کہتے تھے۔ لوگوں کے آنسو جاری تھے۔ دُعا کے بعد آپ نے میاں جی سیّد محی الدین پھلتی سے فرمایا کہ تم کل سے اپنے شاگردوں کو اسی درخت کے نیچے پڑھایا کرو۔ چڑیاں بھی اس کا بُور نہ گرائیں گی۔ اگلے روز میاں جی سیّد محی الدین اسی آم کے تلے اپنے شاگردوں کو پڑھانے لگے یہاں تک کہ اس میں کیریاں آئیں اور لوگ چٹنی کھانے لگے۔ جب آپ پنجتار تشریف لے گئے، شیخ ولی محمد صاحب نے اس درخت کے تلے ایک پہرا بٹھا دیا۔ آپ کی اہلیہ صاحبہ امب ہی میں تھیں۔ جو پھل ٹپکتے تھے، اُن کے پاس جاتے تھے۔ پھر شیخ صاحب نے سب آم تُڑوا کر پال رکھوا دیے۔ جب پال تیار ہوئی، تب کئی ٹوکرے آپ کے پاس پنجتار بھیجے اور کئی ٹوکرے اپنے پاس رکھ لیے۔ ان میں سے بی بی صاحبہ کو کھلائے اور ایک ایک، دو دو آم غازیوں کو دیے۔[1]

---

[1] وقائع صفحہ ۱۴۳۲

بائیسواں باب

سکھوں کی سعیِ مصالحت
اور
مسلمان سفیروں کی حق گوئی و جرأت

مہاراجہ رنجیت سنگھ کا پیغامِ مصالحت سرحدی آویزشوں اور متعدد معرکہ آزمائیوں کے ساتھ مہاراجہ رنجیت سنگھ کو وقتاً فوقتاً یہ خیال آتا رہا کہ سیّد صاحبؒ ایک فقیر منش، درویش صفت بزرگ ہیں۔ سرحد و افغانستان میں بارہا ایسا ہوا ہے کہ کسی شیخ طریقت یا صاحب حمیّت بزرگ نے علمِ جہاد بلند کیا اور مریدین و مخلصین کی جمعیت اپنے گرد جمع کرلی، لیکن پھر حکومت نے اُن کو کوئی علاقہ یا جاگیر دے کر یا وظیفہ اور نذرانہ مقرر کر کے گوشہ نشینی، یادِ الٰہی اور خدمتِ خلق پر آمادہ کرلیا، اور شورش رفع ہوگئی۔ اس نے پہلے قیامِ امب کے زمانے میں آپ کے پاس اسی مقصد کے لیے ایک مؤقر سفارت بھیجی، جس میں اُس کے مشیرِ خاص اور معتمد حکیم عزیز الدین بھی تھے، پھر وینتورا کو اس مسئلے میں گفت و شنید اور نامہ و پیام کرنے کی ہدایت کی۔

وقائع کا بیان ہے کہ امب کے زمانۂ قیام میں حکیم عزیز الدین دہلوی مہاراجہ کی طرف سے وکیل ہوکر آئے۔ وزیر سنگھ[1] ہمراہ تھا۔ حکیم عزیز الدین مہاراجہ کا خط لائے تھے، جس کا مضمون یہ

[1] وقائع میں ہے کہ وزیر سنگھ پوشیدہ سیّد صاحبؒ کے ہاتھ پر بیعت کر گیا تھا اور مسلمان ہو چکا تھا۔ یہ بھی ذکر ہے کہ وُہ مہاراجہ کا برادر نسبتی تھا۔ دوسرے ذرائع سے اس بیان کی تصدیق یا تکذیب نہیں ہوسکی۔

تھا کہ خلیفہ صاحب، آپ سیّد، حاجی اور غازی، اللہ والے ہیں۔ ہم آپ کی دُعا کے اُمیدوار ہیں۔ اگر ہندوستان سے اس مُلک میں مُلک گیری کے ارادے سے تشریف لائے ہیں، تو آپ دریائے اٹک کے اُس پار کی نو لاکھ روپے کی آمدنی کی جاگیر ہم سے لے لیں اور دریا کے اُس پار جہاں آپ تشریف رکھتے ہیں، اُس مُلک کی نعلبندی ہم لیتے آئے ہیں، وہ مُلک بھی ہم آپ ہی کی نذر کریں۔ آپ بفراغت اپنے صاحب کی بندگی میں مشغول رہیں اور ہم سے لڑنے بھڑنے کا خیال نہ کریں۔ اور جو یہاں لاہور میں ہمارے پاس چلے آئیں، تو ہم آپ ہی کو اپنی کُل فوج کا افسر بنا دیں۔

آپ نے اس کے جواب میں فرمایا کہ ہم جو مسلمانوں کے اس مُلک میں اتنے لوگوں کے ساتھ آئے ہیں، تو نہ کسی کی ریاست چھیننے کی غرض سے آئے ہیں، نہ مُلک گیری کے شوق میں ہم تو محض جہاد فی سبیل اللہ اور اعلاءِ کلمۃ اللہ کے واسطے آئے ہیں اور جو رنجیت سنگھ اتنے مُلک دینے کا لالچ دیتا ہے، اگر وُہ اپنا تمام مُلک دے، تب بھی ہم کو غرض نہیں ہے۔ البتہ اگر وُہ مسلمان ہو جائے، تو ہمارا بھائی ہے۔ اللہ کی تائید سے جو مُلک ہمارے ہاتھ لگے ہیں، ہم اُس کو دے دیں اور جو اُس کا مُلک ہے، وُہ بھی اُس کے پاس رہے۔

حکیم صاحب نے کہا کہ ہم غائبانہ آپ کا جو حال لوگوں سے سُنتے تھے، اُس سے زیادہ ہم نے آپ کو پایا۔ آپ کا دعویٰ سچا ہے۔ سوائے "اٰمَنَّا وَسَلَّمْنَا" کے ہمارے پاس کوئی جواب نہیں۔ سیّد صاحبؒ نے حکیم صاحب کو بہت خاطرداری اور عزّت و توقیر سے اپنے یہاں اُتارا اور مہمانی کی۔ آپ کے لشکر میں ڈوگروں کا ایک جمعدار رنجیت سنگھ کے یہاں سے کسی امر میں ناخوش ہو کر چلا آیا تھا۔ آپ نے اُس کو اور پچاس ساٹھ اُس کے ساتھ کے ڈوگروں کو نوکر رکھ لیا تھا۔ اُس کے نام کا بھی مہاراجہ کا ایک پروانہ حکیم صاحب لائے تھے کہ اپنے لوگوں کے ساتھ ہمارے یہاں چلا آئے۔ حکیم صاحب نے وُہ پروانہ اُس جمعدار کو دیا اور اپنے ساتھ لے جانا چاہا۔ اُس نے آ کر یہ حال حضرت سے عرض کیا۔ آپ نے فرمایا: تُم کو اختیار ہے، چلے جاؤ۔ جو

کچھ اُس جمعدار اور اُس کے ساتھیوں کی تنخواہ چڑھی تھی، آپ نے سب اپنے یہاں سے دِلوادی۔ حکیم عزیز الدین صاحب رُخصت ہونے لگے، تو آپ نے مہاراجہ رنجیت سنگھ کے نام دعوتِ اسلام کا مضمون، جو حکیم عزیز الدین صاحب سے زبانی فرمایا تھا، لکھوا دیا۔

ونیتورا کی خواہش پر سفارت کی روانگی

اس عرصے میں ونیتورا اور الارڈ نے بارہ ہزار سواروں اور پیادوں کے ساتھ پشاور کی نعلبندی (جو گھوڑوں اور باڑہ کے چاولوں کی شکل میں سالانہ وصول کی جاتی تھی) وصول کرنے کے لیے کوچ کیا اور دریائے لُنڈے کے کنارے ڈیرہ کیا۔

"منظورہ" سے معلوم ہوتا ہے کہ ونیتورا نے خود اِس بات کی خواہش ظاہر کی کہ کوئی قابلِ اعتماد اور فہیم شخص لشکرِ مجاہدین سے آکر اس سے گفتگو کرے۔ سیّد صاحبؒ نے پہلے حاجی بہادر شاہ خاں کو اس کام کے لیے مامور فرمایا اور اُن کو ہدایات دیں، پھر مولوی خیر الدین صاحب شیر کوٹی کو اس مہم کے لیے منتخب فرمایا اور اُن کے انتخاب پر بہت اطمینان و مسرّت کا اظہار فرمایا اور ارشاد ہوا کہ پہلے مجھے اُن کا خیال نہیں آیا تھا، حاجی بہادر شاہ خاں کو (جو ایک سپاہیانہ مزاج مخلص بزرگ تھے) بہت دیر تک گفتگو کے نشیب و فراز سمجھاتا رہا، لیکن طبیعت کو اطمینان نہیں ہوتا تھا۔ اچانک مولوی خیر الدین صاحب سامنے آ گئے، تو ذہن اُن کی طرف منتقل ہوا کہ یہ اس کام کے لیے بڑے موزوں ہیں۔ آپ نے مولوی صاحب سے فرمایا کہ ونیتورا فرانسیسی نے خط لکھا ہے کہ کسی معتبر آدمی کو ہمارے پاس بھیجیے، جس کی زبانی ہم کچھ پیغام بھیجیں۔ آپ تشریف لے جائیے اور جو وُہ کہے، اس کا معقول جواب دیجیے۔ اس کے بعد مولوی ولی محمد صاحب کو ارشاد ہوا کہ ان کے مصارف کے لیے دس روپے دے دیجیے، اور مولوی خیر الدین صاحب کی سواری کے لیے گھوڑے کا انتظام کر دیجیے۔ مولانا اسمٰعیل صاحب نے فرمایا کہ حاجی بہادر شاہ خاں کو تین روز سمجھانے کی ضرورت پڑی۔ مولوی صاحب کو تین گھنٹے تو ہدایات دینے کی ضرورت پڑے گی۔ ارشاد ہوا کہ ان کو سمجھانے کی ضرورت نہیں۔

ان دونوں حضرات کے ساتھ دس بارہ دُوسرے اشخاص کو بھی، جن کو ہندوستان جانا تھا،

رُخصت فرمایا گیا۔ وزیر سنگھ سے ارشاد ہُوا کہ اِن لوگوں کو دریائے سندھ کے پار کرا دیا جائے۔ ستھانے تک یہ سب ساتھ آئے۔ وہاں سے حکیم صاحب اور وزیر سنگھ لشکر کی طرف چلے گئے اور مولوی خیر الدین صاحب اور حاجی بہادر شاہ خاں نے موضع سلیم خاں میں قیام کیا اور ونیتورا کو اطلاع کی کہ ہم آپ کی فرمائش کے مطابق حضرت امیر المومنین کے فرستادہ آئے ہیں۔ ہمارا قیام سلیم خاں میں ہے۔ سکھ غیر ذمّے دار لوگ ہیں۔ ہم کو خود آنے میں تامّل ہے کہ ہم سے مزاحمت نہ کی جائے۔ اگر آپ اس کا بندوبست کر سکیں، تو ہم آپ کے پاس آئیں۔

دوسرے روز جمعدار وزیر سنگھ پانچ سواروں کے ساتھ طلُوعِ آفتاب کے بعد ہی ونیتورا کا رقعہ لے کر پہنچا، جس میں تحریر تھا کہ آپ بلا دغدغہ تشریف لے آئیے۔ آپ کو کوئی گزند نہیں پہنچ سکتا۔ مولوی صاحب موصُوف اپنے رُفقاء کے ساتھ لشکر میں پہنچے۔ لشکر دریا کے دونوں کنارے خیمہ زن تھا۔ آمد و رفت کے لیے پُل بنا لیا گیا تھا۔ مولوی صاحب اور اُن کے ہمراہیوں کا علاقۂ سمہ کے ایک مُلّا کے یہاں (جو سید صاحبؒ کے مریدین میں سے تھا) قیام ہُوا۔ وزیر سنگھ نے مہمانوں کی تعداد اور تفصیلات سے ونیتورا کو مطلع کیا۔ وہاں سے دس سیر چاول، دس سیر آٹا، ڈیڑھ سیر گھی، ایک بکرا اور بیس روپے ضیافت کے لیے آئے۔ جب تک ان حضرات کا وہاں قیام رہا، اسی طرح جنس لشکر کی طرف سے دعوت کے لیے آتی رہی۔

فرانسیسی جنرل کے خیمے میں دُوسرے روز وزیر سنگھ نے آکر اطلاع دی کہ آپ کو صاحب (ونیتورا) بُلاتے ہیں۔ مولوی خیر الدین صاحب نے فرمایا: یہ بتلا دو کہ ہم اپنے ہتھیار سمیت آئیں یا ہتھیار رکھ کر۔ اگر ہتھیار سمیت یہاں سے چلیں گے، تو ہم اپنے ہتھیار کہیں اور اُتار کر نہیں رکھیں گے۔ وزیر سنگھ نے کہا کہ آپ ہتھیار سمیت چلیے۔

خیمے میں پہنچے، تو دیکھا کہ دونوں ولایتی افسر (ونیتورا اور ایلارڈ) اپنی اپنی کُرسی پر بیٹھے ہُوئے ہیں۔ ایک چھوٹی میز اُن کے سامنے رکھی ہے۔ اُن کی کُرسیوں کے علاوہ کوئی اور کُرسی خیمے میں نہیں ہے۔ البتہ ایک عُمدہ اور بہت بڑا قالین میز کے نیچے بچھا ہُوا ہے۔ حاجی بہادر شاہ خاں

"اَلسَّلَامُ عَلٰی مَنِ اتَّبَعَ الْهُدٰی" کہتے ہُوئے داخل ہُوئے اور میز کے قریب بیٹھ گئے۔ وزیر سنگھ خیمے کے دروازے پر رہا۔ اس وقت ونیتورا نے اخبار نویس اور حکیم عزیز الدین کو بھی بُلا کر کیلوں کے پاس بٹھایا۔

ونیتورا اور مولوی خیر الدین صاحب کی گفتگو ونیتورا نے سُفراء سے خطاب کر کے پُوچھا کہ آپ میں مولوی کون ہے۔ حاجی صاحب نے مولوی خیر الدین صاحب کی طرف اشارہ کیا۔ ونیتورا جوان آدمی تھا اور فارسی پر خوب قدرت رکھتا تھا۔ اُس نے کہا کہ مَیں آپ سے کچھ علمی گفتگو کرنا چاہتا ہُوں۔ مولوی خیر الدین صاحب نے فرمایا کہ اگر گفتگو دینی اُمُور و مسائل میں ہو گی، تو صاف اور تلخ جواب سے آزردہ اور برافروختہ نہ ہوں، ورنہ ایسی گفتگو کی ضرورت نہیں۔ ونیتورا نے کہا کہ جو کچھ آپ کے دل میں آئے، بے تکلف کہیے، مَیں بُرا نہ مانوں گا، لیکن جواب عالمانہ ہونا چاہیے، اس لیے کہ مَیں آپ کے دین سے واقف ہُوں، خاص طور پر مَیں نے آپ کی تاریخ اور دینیات کی کتابیں بہت پڑھی ہیں۔ دوسرا ولایتی افسر (الارڈ)، جو مُعمّر تھا، کم گو اور خاموش تھا۔

ونیتورا نے گفتگو شروع کی اور کہا کہ جس زمانے میں ہمارا ڈیرہ حضرو میں تھا، اس زمانے میں ایک فقیر صُورت شخص خلیفہ صاحب کی طرف سے ہم سے ملا تھا۔ اُس نے کہا تھا کہ اگر سرکارِ خالصہ (مہاراجہ) مُلک یوسف زئی کا مالیہ ہماری معرفت وصُول کر لیا کرے، تو سرکار کو فوج کشی کی تکلیف اور زیر باری سے چھٹی مل جائے اور علاقے کے لوگ سال بسال تاخت و تاراج ہونے اور ویرانی و آتش زنی کی مُصیبت سے بچ جائیں۔ ہم کو یہ بات معقول معلوم ہُوئی، اس لیے کہ اس میں فریقین کا فائدہ ہے۔ سرکار کو سرگرانی اور رعیّت کو پریشانی سے ہمیشہ کے لیے نجات مل جائے گی۔ میں دریافت کرنا چاہتا ہوں کہ یہ بات صحیح ہے۔

مولوی خیر الدین صاحب نے فرمایا کہ یہ بات محض دروغ اور بے اصل ہے۔ اس دروغ گو نے محض اپنی جان بچانے کے لیے آپ سے یہ بات بنائی۔ خلیفہ صاحب کو کفار کی اطاعت اور اُن کو مالیہ دینے سے کیا سروکار؟ اس لیے کہ وہ علاقۂ دُور دراز میں مُلک و جاگیر کے حصُول کے

لیے نہیں آئے۔

وینتورا نے کہا کہ اچھا، اگر اُن کو کسی قسم کی طمع نہیں ہے، تو اس بے سروسامانی کے ساتھ ایک ایسی ہستی سے کیوں برسرِ جنگ ہیں، جو خزانوں، دفتروں اور فوج اور لشکروں کی مالک ہے؟ مولوی صاحب نے فرمایا کہ آپ نے سُنا ہو گا کہ خلیفہ صاحب ہندوستان میں صاحبِ وجاہت و عزّت ہیں، لاکھوں آدمی بڑے فخر و مسرت کے ساتھ آپ کے سلسلۂ بیعت میں داخل ہیں، آپ وہاں اُمراءِ عالی مقام کی طرح عیش و آرام کے ساتھ زندگی گزار سکتے تھے، آپ کو ترکِ وطن اور رکوہ گردی کی ضرورت نہ تھی۔

وینتورا نے کہا کہ ہاں، مجھے معلوم ہے کہ خلیفہ صاحب کو یہ سب عیش و عزّت اپنے مقام پر بھی حاصل تھی اور وہاں کے اہلِ حکومت آپ کی بڑی عزّت و توقیر کرتے تھے۔ مولوی صاحب نے فرمایا کہ ایسی دولت و عزّت کو خیرباد کہ کر سفر کی صعوبتیں اور وطن کی مفارقت، اور ایک اُمیدِ موہوم کے پیچھے دن رات کوہستان میں مشقّت کا اختیار کرنا اور بے سروسامانی کے باوجود ایک طاقتور دشمن کے مقابلے کا عزم رکھنا، جو مُلک و افواج کا مالک ہے، کون دانشمند روا رکھتا ہے؟

جہاد کا اسلامی فریضہ اب آپ مُتوجّہ ہو کر سُنیئے کہ اس کا سبب یہ ہے کہ آپ کو معلوم ہے کہ دینِ اسلام میں پانچ احکام فرض کا درجہ رکھتے ہیں، جن کی ادائی کی خداوندِ عالم کی طرف سے تاکیدِ شدید ہے اور وُہ نماز، روزہ، زکوٰۃ، حج اور جہاد ہے۔ نماز ہر مسلمان پر فرض ہے، غنی ہو یا فقیر؛ اسی طرح روزہ؛ البتہ زکوٰۃ غنی پر فرض ہے، سال گزرنے پر وُہ اپنے مال کا چالیسواں حصّہ راہِ خُدا میں نکالتا ہے۔ اِن تینوں سے مُشکل تر حج کا فریضہ ہے۔ وُہ اگرچہ عُمر بھر میں غنی پر ایک ہی بار فرض ہے، لیکن چُونکہ اس کے لیے اکثر سمندر کا سفر کرنا اور اپنے کو خطرات میں ڈالنا اور اپنے خاندان و خانمان سے جُدا ہونا ضروری ہوتا ہے اور بھی بہت سی مشقّتیں اس سے وابستہ ہیں، اس لیے اکثر مالدار دُنیا طلب اس فریضے کی ادائی میں سُستی سے کام لیتے ہیں اور اس سعادت سے محروم رہتے

ہیں۔ اس سلسلے میں آپ نے سُنا ہوگا کہ سیّد صاحبؒ نے بے سروسامانی کے باوجود سیکڑوں آدمیوں کی معیّت میں حج کیا اور اس میں ہزاروں روپے صرف ہُوئے کہ کسی امیرِ کبیر کو بھی اس عالی حوصلگی اور دریا دلی کے ساتھ حج کرنے اور کرانے کی توفیق نہیں ہُوئی۔ ونیتورا نے کہا کہ آپ سچ کہتے ہیں کہ اِس شان کے ساتھ اس زمانے میں کسی نے حج نہیں کیا۔

مولوی صاحب نے فرمایا کہ جہاد کی عبادت حج سے بھی دُشوار تر ہے۔ وہ دولت کی کثرت اور فراوانی پر بھی موقوف نہیں۔ وہ محض توفیقِ الٰہی پر منحصر ہے۔ اللہ تعالیٰ محض اپنے فضل سے کسی کو اس سعادت کے لیے انتخاب فرمالیتا ہے۔ اِنھیں مشکلات و خصُوصیات کی بنا پر اس عبادت کا ثواب بھی دوسری عبادات کے مقابلے میں زیادہ ہے، اس لیے کہ اِس عبادت میں جان و مال اور اہل وعیال سے دست بردار ہونا پڑتا ہے۔ یہ بھی یاد رہے کہ یہ جہاد محض ہمارے پیغمبر صلّی اللہ علیہ وسلّم ہی پر فرض نہیں تھا، بلکہ حضرتِ ابراہیم و مُوسیٰ و داؤد علیہم السّلام پر بھی فرض تھا۔ آپ کو خود تاریخ کی کتابوں سے یہ بات معلوم ہُوئی ہوگی۔ ونیتورا نے کہا: جی ہاں۔ مولوی صاحب نے فرمایا کہ چُونکہ سیّد صاحب عنایتِ الٰہی سے مقبولِ بارگاہ اور صاحبِ ارادہ و عالی ہمّت بزرگ ہیں، اُنھوں نے اس فریضے کی ادائی کا تہیّہ کیا۔ اس کی ادائی کی دو شرطیں ہیں: ایک یہ کہ جماعتِ مجاہدین کا کوئی امیر اور امام ہو، جس کی ماتحتی میں شرعی طریقے پر جہاد کیا جائے؛ دُوسرے یہ کہ کوئی دارالامن ہو، جہاں سے اس فریضے کی ابتدا کی جائے۔ ہندوستان میں کوئی دارالامن نہیں ہے۔ وہاں یہ معلوم ہُوا کہ قبائلِ یوسف زئی سکھوں کے ساتھ جہاد کرتے رہتے ہیں، لیکن اُن کا کوئی شرعی امیر یا امام نہیں، اُن کا مُلک کوہستان اور جائے امن ہے۔ اس لیے آپ چھ سَو اشخاص کے ساتھ اس مُلک میں تشریف لائے اور اس مُلک کے مسلمانوں کو اس فریضے کی ادائی کی ترغیب دی اور اُن کو اِس پر آمادہ کیا یہاں تک کہ اُن لوگوں نے آپ کے دستِ مُبارک پر بیعتِ امامت کر کے آپ کو اپنا سردار بنایا۔ اُسی وقت سے آپ کو امام، امیرالمومنین اور خلیفہ کے لقب سے موسُوم کیا جاتا ہے۔

جہاد کی حقیقت | یہ بھی آپ کو معلوم ہونا چاہیے کہ جہاد جنگ و مُلک گیری کا نام نہیں۔ جہاد کا شرعی مفہوم یہ ہے کہ اعلاءِ کلمۃ اللہ، کفّار کا زور توڑنے اور اُن کے دین و مذہب کی شورش کو دفع کرنے کی امکانی کوشش کی جائے۔ یہ بھی یاد رہے کہ جماعتِ مجاہدین کے امام کے لیے یہ بھی شرط نہیں کہ اس کی تیاریاں اور ساز و سامان دشمن کے ساز و سامان کے مساوی ہو۔ دین کی ترقی اور اُس کے سامان کی فراہمی کی کوشش البتہ شرط ہے۔ پس اگر جنگ پیش آ جائے اور مصلحت کا تقاضا ہو، تو جنگ کی جائے گی اور اگر فتح ہو جائے، تو دشمنوں کے مال کو مالِ غنیمت بنانا اور اُن کے زن و فرزند کو اسیر کرنا اور اُن کے مُلک پر قبضہ کر لینا بھی روا ہے۔ بہرحال اصل مقصود ترقیِ دین ہے، فتوحات اُس کا ثمرہ ہیں۔ بلکہ اعلیٰ درجے کی فتح یہ ہے کہ جب تک جان میں جان ہے، غازی مُجاہد ہی رہیں۔ جن کے فضائل اور مراتب و مناقب قرآن مجید میں واضح اور مفصّل طریقے پر بیان کیے گئے ہیں۔ اور اگر کفّار کے ہاتھ سے خدا شہادت نصیب فرمائے، تو زہے نصیب! رسالت کے بعد اس مرتبے سے بڑھ کر کوئی مرتبہ ہی نہیں۔

ونیتورا نے کہا کہ ہاں، بیشک آپ کے مذہب میں شہید کا بڑا مرتبہ ہے۔ مولوی صاحب نے فرمایا کہ آپ پر بڑا تعجب ہے کہ آپ نے ابھی اقرار کیا تھا کہ تمام پیغمبروں نے اپنے اپنے زمانے میں جہاد کیا؛ پھر آپ یہ کہتے ہیں کہ "تمھارے مذہب میں"۔ بھلا "تمھارے مذہب" کی اِس قید کی کیا ضرورت تھی؟ آپ کو تو یہ کہنا چاہیے تھا کہ "پیغمبروں کے یہاں یہ عبادت اعلیٰ مرتبے کی ہے"۔

مجاہدین کا اعتقاد و اعتماد | ونیتورا نے کہا کہ میں نے یہ مانا، لیکن یہ بات عقل کے خلاف معلوم ہوتی ہے کہ اس بے سر و سامانی کے ساتھ کہ خلیفہ صاحب کے پاس نہ افواج ہیں، نہ توپ خانہ، نہ سرمایہ، نہ مُلک، لیکن اُن کے عزائم یہ ہیں! مولوی صاحب نے فرمایا کہ ہاں، اہلِ دُنیا کو فوج، توپ اور خزانوں پر اعتماد ہوتا ہے اور ہم کو اللہ تعالیٰ کی قوت و قدرت پر توکل و اعتماد۔ ہم نہ فتح کا دعویٰ کرتے ہیں، نہ شکست سے ملول ہوتے ہیں۔ یہ دونوں چیزیں اللہ تعالیٰ کے دستِ قدرت

میں ہیں۔ ہمارا عقیدہ ہے کہ کَم مِّنْ فِئَةٍ قَلِيلَةٍ غَلَبَتْ فِئَةً كَثِيرَةً بِإِذْنِ اللّٰهِ ۔(البقرۃ:۲۴۹)

تاریخ کی شہادت | اگر آپ کو اس سے انکار ہے، تو آپ کی تاریخ دانی کا دعوٰی غلط ہے، اس لیے کہ کتب تاریخ سے ثابت ہے کہ بہت سے زبردست و سرکش اور کثیر التعداد گروہ حقیر و کمزور لوگوں کے ہاتھ سے زیر و پامال ہوئے، خصوصاً جب کہ ضعفاء اللہ تعالیٰ کے دین کی حمایت و نصرت کے لیے کمربستہ ہوتے ہیں۔ چنانچہ پیغمبروں کو بھی ایسے معاملات پیش آئے، جو تاریخ کی کتابوں میں مذکور ہیں۔ کسی پیغمبر کے پاس بھی خزانہ، توپ اور فوج نہ تھی۔ تھوڑے تھوڑے پیرووں کے ساتھ، جو غریب و فقیر تھے، انھوں نے بڑے بڑے زبردستوں اور گردن فرازوں کو خاک میں ملا دیا۔ اُن کے جانشینوں اور نائبین نے بھی عظیم الشان سلطنتوں کو درہم برہم کر دیا۔ اس سلسلے میں زیادہ کہنے کی ضرورت نہیں۔ آپ خود تاریخ داں ہیں۔ تاریخ کی کتابیں خود رہنمائی کرنے کے لیے کافی ہیں۔

اس موقع پر جنرل الارڈ نے کہا کہ یہ نہیں ہوا کرتا کہ بے سر و سامان صاحب ساز و سامان کے مقابلے میں اور غیر مسلح مسلح کے مقابلے میں کامیاب ہوں۔ ونٹورا نے کہا کہ نہیں، مولوی صاحب صحیح کہتے ہیں کہ بڑوں نے چھوٹوں کے ہاتھوں شکست کھائی۔

امب کا جائے وقوع | ونٹورا نے کہا کہ دیکھیے، یہ ساری فوج پنجتار کا رُخ کرے گی۔ مولوی صاحب نے فرمایا کہ پنجتار میں تو ہم آپ کے قابو میں نہیں آئیں گے۔ اس لیے کہ خلیفہ صاحب اس وقت امب میں ہیں اور وہ مقام آپ کا دیکھا ہوا ہے کہ ایک طرف تو اُس کے غیبی خندق ہے، یعنی دریائے سندھ، جس کا عبور کرنا نہایت دشوار ہے؛ دوسری جانب تمہ کا غیبی حصار ہے، یعنی، ایسے دشوار گزار پہاڑ کہ اگر کسی درے پر دس بند وقچی بھی بیٹھ جائیں، تو آپ کی یہ ساری فوج، بلکہ اگر ایسی ہی دوسری فوج بھی ہو، تو اس سے گزر نہیں سکتی۔

پنجتار میں مقابلے کی تیاریاں | ونٹورا نے کہا کہ صحیح ہے، امب سخت مقام ہے، لیکن میں تو پنجتار جانے کا ذکر کرتا ہوں۔ مولوی صاحب نے فرمایا کہ پنجتار کیا چیز ہے اور وہاں فوج کشی کرنے

سے کیا ملے گا؟ فتح خاں نے اپنی قوم کی ایک جماعتِ کثیرہ کو جمع کیا ہے اور مولانا محمد اسمٰعیل صاحب کو اپنی تقویت کے لیے طلب کیا ہے۔ مولانا ایک جماعتِ مجاہدین اپنے ساتھ رکھتے ہیں۔ سب ملا کر دس بارہ ہزار آدمی وہاں جمع ہیں۔ اس کے علاوہ پنجتار میں عورتیں، بچے اور کھیتی باڑی کچھ نہیں ہے، جس کے تاراج و سوخت ہو جانے کا خطرہ ہو۔ اگر فتح کے آثار نظر آئیں گے اور دشمن پر غلبے کی اُمید ہوگی، تو کیا کہنا! ورنہ ایک پہاڑ کو چھوڑ کر دوسرے پہاڑ کی چوٹی پر چلے جائیں گے۔ بہرحال آپ کو ہمیں نقصان پہنچانے کی قُدرت نہیں۔ اس کے علاوہ پنجتار آپ کا دیکھا ہوا ہے کہ تین کوس تک دونوں جانب پہاڑوں کا سلسلہ ہے، اس کے بعد پنجتار واقع ہے۔ اگر اللہ تعالیٰ نے ہم کو ثابت قدمی عطا فرمائی اور تمھارے قدم ڈگمگائے، تو یہ سوچ لینا چاہیے کہ تمھارا اس درے سے گزر کر نکل جانا کتنا دُشوار ہوگا۔ اُس وقت اس پہاڑ کی عورتیں اور بچے تمھارے گھوڑوں اور ہتھیاروں پر قبضہ کرلیں گے۔ پہلے اپنے متعلق غور کرلینا چاہیے، پھر پنجتار کا رُخ کرنا چاہیے۔ پُرانی مثل ہے کہ کہیں داخل ہونے سے پہلے نکلنے کا بندوبست سوچ لینا چاہیے۔

ونیتورا نے کہا کہ بات تو اور ہو رہی تھی، ہم بات کرتے کرتے کہیں اور پہنچ گئے۔ ہم کو خلیفہ صاحب سے بہت محبّت ہے۔ اس وجہ سے میں مہاراجہ کی سرکار میں بدنام ہوں، لیکن جنگ کے موقع پر یہ محبّت کچھ کام نہ آئے گی۔

تحائف کے لیے ونیتورا کا اصرار مولوی صاحب نے فرمایا کہ آپ نے ٹھیک کہا۔ اگر آپ نے کچھ رعایت کی، تو اپنی سرکار میں نمک حرام کہلائیں گے۔ ونیتورا نے کہا: میری صرف اتنی خواہش ہے کہ میرے اور خلیفہ صاحب کے درمیان تحفہ تحائف کی رسم جاری ہو جائے۔ پہلے مَیں کوئی چیز بھیجوں، پھر خلیفہ صاحب کوئی تحفہ بھیج دیں تاکہ یہاں سے واپس جانے کے لیے مجھے کوئی عُذر مل جائے۔ اس کے بعد خلیفہ صاحب کو یُوسف زئیوں کے مُلک کا اختیار ہے؛ جو چاہیں، کریں۔ خالصہ کی فوج پھر اس مُلک پر کبھی نہ آئے گی۔

مولوی خیرالدین صاحب کی دُوراندیشی مولوی صاحب نے فرمایا کہ خلیفہ صاحب کو تمھاری محبت اور

دوستی سے کوئی غرض نہیں۔ اگر آپ کو غرض ہو، تو پہلے آپ سلسلہ جنبانی کریں۔ خلیفہ صاحب بڑے بلند حوصلہ اور عالی ہمت ہیں۔ وہ آپ کے تحفوں کا جواب ضرور دیں گے، لیکن خلیفہ صاحب کی سرکار کا تحفہ یہی ہے کہ کسی کو سربند، کسی کو کُلاہ اور کسی کو جبہ بھی عنایت فرماتے ہیں۔ اُن کی سرکار میں ہتھیار بھی بڑے بڑے بیش قیمت ہیں۔ تعجب نہیں کہ اُن میں سے بھی کچھ عنایت فرمائیں۔

ونیتورا نے کہا: سربند اور کُلاہ کو ہم کیا کریں گے؟ ہاں، اگر تحائف کے عوض میں ایک گھوڑا خلیفہ صاحب عنایت فرما دیں، تو معقول بات ہوگی۔ مولوی صاحب نے کہا کہ میں آپ کا مطلب سمجھا۔ ہم گھوڑا آپ کو ہرگز نہ دیں گے۔ ونیتورا نے کہا کہ آپ انکار کر رہے ہیں۔ آپ خلیفہ صاحب کو لکھیے۔ وہ عقلمند ہیں، وہ اس تجویز کو پسند فرمائیں گے۔ اس کے لیے دور اندیشی کی ضرورت ہے۔

اُس وقت حکیم صاحب، اخبار نویس، بلکہ حاجی بہادر شاہ خاں تک نے مولوی صاحب کو اشارہ کیا کہ ونیتورا جو کچھ کہ رہا ہے، اس کو قبول کر لیں، مگر مولوی صاحب اپنی عقل دُور اندیش سے معاملے کی تہ تک پہنچ گئے[1] اور فرمایا یہ بات اس کے لیے تو مناسب ہے، جو مُلک اور جاگیر پر قابض ہو، لیکن اُس شخص کے لیے مناسب نہیں، جس نے جہاد محض اعلاءِ کلمۃ اللہ کے لیے شروع کیا ہو۔ جس طرح جو شخص نماز، روزہ اور دُوسرے اعمالِ صالحہ محض خلق اللہ میں بزرگی حاصل کرنے کے لیے کرے، عذاب و وبال کا مستحق ہوتا ہے، اسی طرح جہاد فسادِ نیت کے ساتھ مُوجب وبال ہے۔ میں ایسی بات خلیفہ صاحب کو نہیں لکھ سکتا۔ اس نیت میں ہم اور خلیفہ صاحب یکساں ہیں۔ فرق اتنا ہے کہ ہم نے اُن کو اپنا امام قرار دیا ہے، اس لیے کہ امام کا تقرر شرائطِ جہاد میں سے ہے۔ جو چیز جہاد کے ثواب کو باطل کرنے والی ہے، اس کے انکار میں ہم اور خلیفہ صاحب برابر ہیں۔

مولوی صاحب کا صاف جواب ونیتورا نے دو تین بار یہی بات دُہرائی۔ مولوی صاحب نے فرمایا کہ اس بات کو بار بار دُہرانے سے کچھ فائدہ نہیں۔ گھوڑا تو گھوڑا ہے، ہم تو گدھا بھی تم کو نہیں

---

[1] ونیتورا کا مقصد یہ تھا کہ کسی طرح سید صاحبؒ تحفے میں ایک گھوڑا ونیتورا کے پاس بھیج دیں اور وہ اور مہاراجہ کی حکومت لوگوں میں مشہور کر سکے کہ سید صاحبؒ نے نعلبندی دے کر مہاراجہ کی حکومت کا باجگزار اور علاقہ دار ہونا منظور کر لیا۔ مولوی خیرالدین صاحب اس نکتے کو سمجھتے تھے۔ اس لیے وہ کسی طرح گھوڑے کے تحفے کا اقرار نہیں کرنا چاہتے تھے۔

دیں گے۔ ہمارا تو ارادہ خود آپ سے جزیہ اور خراج لینے کا ہے، ہم آپ کو خراج کیا دیں گے؟

ونیتورا نے کہا کہ اگر خلیفہ صاحب اپنی کرامت سے اس بے سرو سامانی اور قلتِ فوج کے ساتھ ایسی صاحبِ حشمت و جاہ سرکار پر فتحیاب ہو جائیں، اس صورت میں ہم سرکارِ خالصہ کو چھوڑ کر خلیفہ صاحب کی طرف رجوع کرلیں گے۔ مولوی صاحب نے فرمایا کہ میں خلیفہ صاحب کا حال تم سے کیا کہوں۔ آپ نے خود دیکھا نہیں۔ اگر ملاقات کا حوصلہ ہو، تیار ہو جائیے۔ اِنشاء اللہ آپ اُن کی گفتگو سُن کر سوائے آمَنَّا وَ صَدَّقْنَا کہنے کے اور کچھ نہ کہیں گے۔

یہ سُن کر ونیتورا نے کہا: "نہیں، نہیں"۔ پھر وہ تھوڑی دیر خاموش رہا۔ اس کے بعد کہا کہ اگر آپ کو اس مضمون کے لکھ کر بھیجنے میں عُذر ہے، تو زبانی آپ یہ پیغام پہنچا دیں گے؟ مولوی صاحب نے فرمایا کہ آپ کے کچھ کہنے پر منحصر نہیں۔ میں ذرّہ برابر بھی اُن سے کوئی بات نہیں چھپاؤں گا اور ساری گفتگو بے کم وکاست نقل کر دُوں گا۔ ونیتورا نے کہا کہ اس کے بعد جو آپ ارشاد فرمائیں، وہ حضرت میں ہم تک پہنچا دیں۔ مولوی صاحب نے فرمایا کہ جواب کا پہنچانا یا نہ پہنچانا ہمارے اختیار میں نہیں۔ یہ خلیفہ صاحب کی رائے اور حکم پر منحصر ہے۔ اس وجہ سے میں اس کا وعدہ نہیں کرتا۔

ونیتورا نے کہا کہ آپ نے میرے سامنے جو کچھ کہا ہے، کیا آپ کھڑک سنگھ کے سامنے بھی کہہ دیں گے؟ مولوی صاحب نے فرمایا کہ کچھ آگے بڑھ کر کہوں گا۔

بات یہاں تک پہنچی تھی کہ ونیتورا نے کہا کہ آپ اس وقت تشریف لے جائیں، ہم پھر کسی اور وقت بلائیں گے۔

پنجتار پر حملہ کی تیاری اور پسپائی مولوی صاحب وہاں سے رخصت ہو کر حکیم عزیز الدین کے ڈیرے پر آئے اور کھانا تناول کیا۔ نمازِ مغرب تک وہیں رہے۔ نماز کے بعد اپنے ڈیرے پر آئے۔ دوسرے روز وزیر سنگھ نے آکر خفیہ طریقے سے بیان کیا کہ آج ظہر کے وقت کھڑک سنگھ کے ڈیرے پر دونوں ولایتی افسر اور سلطان محمد خاں کا بھائی امیر خاں اکھٹے تھے۔ اُنھوں نے مشورہ کیا کہ یہ مولوی بہت تیز مزاج ہے۔ ہماری بات قبول نہیں کرتا۔ پنجتار کی طرف فوج کا جانا ضروری ہے۔

ایک پہر رات رہے کُوچ کی تجویز ہُوئی۔ اِس کی اطلاع مولانا اسمٰعیل صاحب کو ضرور ہونی چاہیے۔ اُسی وقت مولوی صاحب نے اس مُلّا کی معرفت، جس کے یہاں وہ مقیم تھے، ایک شخص کو پنجتار روانہ کیا اور قاصد سے فرمایا کہ جو جو دیہات راستے میں پڑیں، وہاں کے لوگوں کو خبردار کرتے جانا کہ کل سکھوں کا لشکر پنجتار پر چڑھائی کرے گا۔ اپنی اپنی جان اور مال سے ہوشیار رہیں۔

ایک پہر رات رہے کھڑک سنگھ کے علاوہ تمام لشکر نے زیدے کے مقام پر پڑاؤ ڈالا۔ یہاں سے پنجتار چھ کوس ہے۔ غروبِ آفتاب کے وقت لشکر میں مشہور ہو گیا کہ آج رات غازی پنجتار سے سکھ لشکر پر شبخون ماریں گے۔ اس اطلاع سے سارے لشکر میں ایک اضطراب اور انتشار پیدا ہو گیا کہ کوئی اپنے بستر پر آرام سے لیٹ نہ سکا۔ سب اپنے گھوڑے کی لگام ہاتھ میں لیے کھڑے تھے۔ چونکہ اُنھوں نے زمین سے میخیں اُکھاڑ لی تھیں، تمام لشکر میں شور بپا ہو گیا اور ہر شخص بھاگنے کے لیے تیار ہو گیا۔ ولایتی افسروں نے لشکر کا یہ رنگ دیکھ کر یوسف خاں اجنٹین اور دُوسرے افسروں کو طلب کر کے کہا کہ آخر، یہ کیا مُصیبت ہے اور لشکر پر ہراس کیوں طاری ہے؟ ہر شخص بھاگنے پر تیار ہے! اُن کو تسلّی دے کر ٹھیرانا چاہیے۔ افسروں نے حسب الحکم لشکر کو سمجھایا۔ تھوڑی رات باقی تھی کہ سارا لشکر دریا لنڈے کی طرف چل کھڑا ہُوا۔ اس طرح پر کسی نے کسی کو نہیں پوچھا۔ پھر نہایت تیزی کے ساتھ پل کے ذریعے دریا عبور کر کے پُل کو توڑ دیا۔ وہاں کچھ دیر ٹھیر کر ایک پہر دن باقی تھا، اٹک کی طرف کوچ کر گئے۔

سیّد صاحبؒ کی تحسین و تائید اسی روز مولوی خیرالدین صاحب پنجتار روانہ ہُوئے۔ وہاں یہ افواہ مشہور ہو گئی کہ مولوی صاحب کو کھڑک سنگھ قید کر کے لاہور لے گیا، اس لیے اُن کی تشریف آوری پر لشکرِ اسلام میں بڑی خوشی ہُوئی۔ امب میں یہی افواہ مشہور ہو گئی۔ اس لیے مولوی خیرالدین صاحب دوسرے روز ہی عصر کے بعد امب میں پہنچے۔ اُن کے پہنچنے پر سیّد صاحبؒ غایت مسرّت کے ساتھ بنفسِ نفیس اُن کی جائے سکونت پر تشریف لائے اور ونٹورا کی ملاقات اور وہاں کا سارا ماجرا سُنا۔ سارا قصّہ سُننے کے بعد فرمایا کہ شاباش، جَزَاکَ اللّٰہُ خَیْراً! آپ نے جو جواب دیا، وُہ

ہماری مرضی کے عین مطابق تھا، خاص طور پر آپ کے اس جواب سے کہ گھوڑا تو کیا، ہم آپ کو گدھا بھی نہیں دیں گے، بہت خوش ہوئے اور فرمایا کہ یہ بات آپ نے میرے دل کی فرمائی۔ اسی غرض کے لیے ہم نے آپ کو بھیجا تھا۔ دوسرے سے یہ کام ہونا مشکل تھا۔ یہ بھی آپ نے اچھا کیا کہ جواب بھیجنے کا وعدہ نہیں کیا۔[1]

---

[1] منظورۃ السعداء، ص ۷۹۴ تا ۸۰۱۔

تئیسواں باب

ملکِ سَمہ کی دوبارہ تسخیر و انتظام

اور

جنگِ مردان

قاضی حبّان صاحب کی تجویز جس زمانے میں سیّد صاحبؒ کے حکم سے مجاہدین نے پائندہ خاں کی درخواست پر کھبل بائی سے اپنا لشکر اُٹھا لیا، اُسی زمانے میں قاضی حبان صاحب نے سیّد صاحبؒ سے ایک روز عرض کی کہ ہم سب سوار اور پیادے یہاں مُعطّل بیٹھے ہیں اور تمام مُلکِ سَمہ کا باغی اور ناموافق سا ہو رہا ہے۔ اگر آپ میرے ہمراہ کچھ لشکر کر دیں اور مجھ کو امیر کر کے ادھر کو روانہ فرما دیں، تو مَیں وعظ و نصیحت کر کے وہاں کے لوگوں کو موافق کروں اور جو لوگ نہ مانیں، اُن کو بزور راہ پر لاؤں، مگر شرط یہ ہے کہ آپ مجھ کو اختیارِ کُل دے دیں۔ جیسا مَیں مُناسب جانوں، ویسا کروں؛ اس لیے کہ مَیں اس مُلک کا بھیدی ہوں۔ مولانا صاحب کو بھی آپ میرے ہمراہ کر دیں تاکہ مَیں جو کام خُدا اور رسُولؐ کے حکم کے خلاف کروں، مولانا صاحب مجھے وُہ کام نہ کرنے دیں۔

سیّد صاحبؒ نے اُن کا مشورہ پسند فرمایا اور قاضی صاحب کو نصیحت کی کہ خُدا و رسُولؐ کے خلاف اپنے نفس کی خواہش کا کوئی کام نہ کریں۔ اور مولانا محمّد اسمٰعیل صاحب سے فرمایا کہ آپ بھی قاضی صاحب کے ہمراہ جائیں۔ رسالدار عبدالحمید خاں کو مع تمام سواروں کے قاضی صاحب کے ساتھ کیا اور لوگوں کو تاکید کی کہ بلا انکار قاضی صاحب کی اطاعت کریں اور دُعاءِ خیر کر کے اُن

کو رخصت کیا۔

قاضی صاحب کے ساتھ تین سَو سوار، ڈھائی سو پیادے، ایک اُونٹ پر نقارہ اور اُونٹوں پر چھ ضرب زنبورک تھے۔

قاضی صاحب پنجتار میں | پنجتار میں قاضی صاحب نے فتح خاں کے مشورے سے زیدے کے فتح خاں اور ارسلان خاں کلابٹ والے ابراہیم خاں اور اسمٰعیل خاں اور مرغز والے سرفراز خاں اور جو خان اور مُلک سکھوں سے بھاگے ہُوئے تھے، اُن سب کو بُلا کر جمع کیا اور فتح خاں نے اُن سے قاضی صاحب کا منشا ظاہر کیا کہ سمہ میں جہاں جہاں سکھوں نے مسلمانوں کی زمین دبا لی ہے، اُن پر لشکر کشی کی جائے اور مُلک اُن سے خالی کرا لیا جائے۔ اُن سب نے اس پر رضامندی ظاہر کی اور اپنی بستی کے عُلمار کو بلایا اور سب کے سامنے وُہی تقریر کی۔ وہ سب اس امر پر متفق ہُوئے اور کہا: ہم سب اس امر میں تمھارے شریک ہیں۔ فتح خاں نے ان سب عُلمار و خوانین سے کہا کہ ہم اپنی قوم سے قاضی صاحب کو عُشر بھی دلوائیں گے اور جب تم اپنی اپنی بستی پر قابض ہو جاؤ گے تو تم سب کو بھی دینا پڑے گا۔ اُن سب نے قبول کیا۔ البتہ عُلمار کے درمیان کچھ قیل وقال ہُوئی اس لیے کہ یہی اُن کا ذریعۂ معاش تھا۔ قاضی صاحب نے اگلے روز اُن عُلمار سے گفتگو کی اور ثابت کیا کہ عُشر امام کا حق ہے اور امام غازیوں اور مُحتاجوں اور مستحقین کو پہنچانے کا ذمّہ دار ہے۔ عُلمار نے بالآخر قبول کر لیا۔ قاضی صاحب نے عُلمار سے کہا کہ آپ اپنی بستیوں میں جا کر وہاں کے عُلمائے مُلک اور خوانین کو فہمائش کیجیے کہ سکھوں کی اطاعت چھوڑ دیں، مسلمانوں کے شریک ہوں اور سکھوں کو اپنے مُلک سے نکالیں۔

ہنڈ کی تسخیر | اس عرصے میں قاضی صاحب نے کھلابٹ کو تسخیر کر کے اُس کا بندوبست کیا۔ پھر اسی طرح مرغز، ٹھنڈ کوئی اور موضع گڈی اور پنج پیر کا انتظام کیا اور معتمد آدمیوں کے سپرد کیا۔ ہنڈ پھر سکھوں کے قبضے میں چلا گیا تھا۔ اُن کو جب غازیوں کی جا بجا فتوحات کی اطّلاع ملی، تو اُنھوں نے ایک دُوسرے سے کہا کہ اب یہ سب مسلمان آپس میں ایک ہو جائیں گے اور ہم مُفت

ہیں خراب ہوں گے۔ اب یہاں رہنا ہمارے لیے مناسب نہیں۔ اُسی وقت سے اُنھوں نے اپنا اسباب و سامان قلعے سے دریاے اٹک کے پار بھیجنا شروع کر دیا اور سات سِکھ اور ہتھیار رہ گئے۔ اس عرصے میں عبدالحمید خاں رسالہ دار ہُنڈ کا اندازہ کرنے کے لیے ایک سوار لے گئے قلعے والوں نے گھوڑوں کی آواز پر کچھ بندوقیں سر کیں، ادھر سے شاہین والوں نے گولیوں سے جواب دیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہُوا کہ سکھوں نے رات بھر میں قلعہ خالی کر دیا۔ کچھ طالب علموں نے قاضی صاحب کو آ کر اطلاع دی کہ ہنڈ کا قلعہ خالی پڑا ہے۔ قاضی صاحب مولانا محمد اسمٰعیل صاحب کی معیت میں شہر میں داخل ہُوے، دروازوں پر پہرے لگا دیے اور رعایا کی تسلّی کی اور اُن کو امن دی اور اپنے لشکر میں کہہ دیا کہ کوئی ان سے تعرّض نہ کرے۔

دُوسرے دن فتح خاں پنجتاری اور زَیدہ کے فتح خاں اور ارسلان خاں مبارکباد کے واسطے آئے۔ پہلے قاضی صاحب نے خوانین اور اہل الرائے حضرات سے مشورہ کر کے اس قلعے کے کھودنے کا حکم دیا۔ اطراف کے ہزاروں آدمی اُس کے کھودنے میں لگ گئے۔ لیکن قلعہ نہایت سنگین و مستحکم تھا۔ قاضی صاحب نے اُس کا کھودنا موقوف کیا۔ قاضی صاحب نے فتح خاں اور ارسلان خاں سے کہا کہ آپ اپنے زَیدہ کو آباد کریں اور اِس قلعۂ ہنڈ کی حفاظت کریں۔ ان دونوں نے منظور کیا۔

اداے عُشر اور اطاعت و شرکت کا دوبارہ اقرار اس کے بعد قاضی صاحب نے موضع نَوِی کلی اور موضع شیخ جانا (جن میں قوم رَزَڑ آباد تھی) کی تسخیر کا ارادہ کیا اور سیّد صاحب کے پاس سے کچھ اور لشکر طلب کیا۔ مولوی مظہر علی صاحب عظیم آبادی کچھ فوج لے کر آئے۔ قوم رَزَڑ کے لوگ مشکار خاں اور آنند خاں، محمود خاں، مُنیر خاں اور مُبین خاں کی فہمائش سے قاضی صاحب کی خدمت میں حاضر ہُوے اماں زئی کے خوانین اور اطراف کے لوگوں کو ایک جگہ جمع کیا۔ ان سب نے مشورہ کر کے قاضی صاحب سے عرض کیا کہ ہم سب نے عُشر دینے اور اطاعت و شرکت کرنے کا جو عہد و پیمان کیا تھا، اُسی عہد و پیمان پر اب بھی قائم ہیں۔ ان شاء اللہ کسی طرح کا فرق نہ پڑے گا۔

خان ہُوتی کی سرکشی تیسرے، چوتھے روز قاضی صاحب نے موضع کاٹ لنگ اور موضع لوند خوڑ

کے خانوں اور موضع ہوتی کے خان احمد خاں کو بلایا۔ سب خوانین حاضر ہوئے اور عشر و اطاعت میں شرکت قبول کی، مگر ہوتی کا رئیس احمد خاں نہ آیا اور زبانی کہلا بھیجا کہ قاضی صاحب سے ہمارا سلام کہنا اور کہنا کہ ہم آٹھویں دن آکر ملاقات کریں گے۔

ادھر اُس نے اپنے بھائی رسول خاں کو مردان بھیجا اور کہا کہ وہاں اچھی طرح انتظام اور حفاظت سے رہنا کہ یہاں سیّد بادشاہ کا لشکر پڑا ہے اور تمام خوانین اُن کے متفق ہیں۔ ایسا نہ ہو کہ ادھر کا ارادہ کریں اور ہوتی میں اپنے نوکروں چاکروں کو متعین کیا کہ تم یہاں بڑی حفاظت اور ہوشیاری سے رہنا اور خود لشکر لینے پشاور روانہ ہو گیا۔ قاضی صاحب کو اس کی اطلاع ملی۔ قاضی صاحب نے ہوتی کے حالات خفیہ طور پر معلوم کیے اور لشکر کو تیار رہنے کا حکم دیا اور ایک دن اچانک ہوتی کی طرف روانہ ہو گئے۔

مجاہدین ہوتی مردان میں ہوتی کے لوگ گھوڑوں کی آواز سے، جو اُس وقت ہنہناتے تھے اور خاموش نہیں ہوتے تھے، ہوشیار ہو گئے اور نقارہ بجنے لگا۔ قاضی صاحب نے لشکر کو ٹھیرا دیا اور اپنے مشیروں سے فرمایا کہ ہوتی میں نقارہ بج رہا ہے، معلوم ہوتا ہے، کسی جاسوس نے اُن کو خبردار کر دیا ہے۔ اب کیا تدبیر ہے؟ مولانا اور رسالدار عبدالحمید خاں نے کہا کہ قاضی صاحب، وہاں سے یہاں تک اللہ تعالیٰ نے پہنچایا ہے، اب پیچھے ہٹنا مناسب نہیں۔ اگر چھاپا نہ ہوا، تو دن کی لڑائی سہی۔ اُمید قوی ہے کہ انشاء اللہ تعالیٰ ہم اُن پر غالب ہوں گے۔ قاضی صاحب نے فرمایا کہ آپ نے میرے دل کی بات کہی اور بسم اللہ کر کے آگے بڑھے اور ایک طرف سے مولوی مظہر علی صاحب، دوسری طرف سے رسالدار عبدالحمید خاں نے شہر پر حملہ کیا۔ قاضی صاحب اپنے لوگوں کے ساتھ بستی کے دروازے کی طرف چلے اور ہلّہ کر کے بستی میں گھس گئے۔[1]

وہاں کے لوگ کچھ بھاگ کر گڑھی میں جا گھسے اور باقی مردان کی طرف بھاگ گئے۔ مولانا محمد اسمٰعیل صاحب اور قاضی صاحب حملہ کر کے گڑھی میں گھسے اور گڑھی والے سمٹ کر شمالی

---

[1] وقائع احمدی

فصیل کی طرف جا کھڑے ہُوئے۔ مولوی مظہر علی صاحب کو جنھوں نے کھلیانوں کی طرف سے حملہ کیا تھا، بندوق کی گولی لگی اور وُہ زمین پر گر گئے۔ جو شخص اُن کے پاس سے گزرتا اور اُن کا حال دریافت کرتا، بلند آواز سے فرماتے کہ جلدی جاؤ، مَیں بھی آتا ہُوں۔ لوگ سمجھتے کہ شاید پاؤں میں کانٹا چُبھ گیا ہے، وہ نکالنے کے لیے بیٹھے ہیں۔ اتنے میں مولانا اسمٰعیل صاحب پاس سے گزرے۔ آپ نے بھی حال دریافت کیا۔ فرمایا: ہماری فکر نہ کیجیے، فتح کے بعد تحقیق فرمایئے گا۔[1]

مُستامَن کا مال | شمالی فصیل کی طرف سے کچھ لوگوں نے مُجاہدین کی طرف مخاطب ہو کر آواز دی کہ سوار بھائیو، تم میں کوئی ہندوستانی بھی ہے؟ گلاب خاں نے کہا: ہاں۔ تمھارا کیا مطلب ہے؟ اُس نے کہا: اگر ہندوستانی ہو، تو اِدھر آؤ، ہم کچھ کہیں۔ اُس نے کہا کہ تم لوگ سیّد بادشاہ کے ہندوستانی غازی سچّے اور اپنے عہد و پیمان کے پُورے ہوتے ہو اور مُلکیوں کے قول و قرار پر ہم کو اعتماد نہیں۔ ہم تُم سے امن چاہتے ہیں، اس لیے کہ تمھارے مُجاہدین گڑھی کے اندر آ گئے ہیں۔ گلاب خاں نے کہا کہ ہم اس کے ذمّے دار نہیں۔ تم جتنے آدمی ہو، سب دیوار پھاند کر ہماری طرف چلے آؤ، تم سب کو امن ہے۔ انشاءاللہ تعالیٰ تم سے کوئی مزاحم نہ ہوگا۔ وہ سب کُود کر آ گئے۔ گلاب خاں ان سب کو مولانا اسمٰعیل صاحب کے پاس لے گئے اور ان لوگوں کا حال بیان کیا کہ مَیں اس طرح ان کو امن دے کر گڑھی سے نکال لایا ہوں۔ ان لوگوں کے پاس ایک بندوق بہت خوبصورت اور عمدہ تھی۔ گلاب خاں نے کہا: یہ بندُوق میں باندھوں گا۔ آخر اور سب مالِ غنیمت میں داخل کی جائیں گی۔ یہ بات سُن کر مولوی امیر الدین صاحب نے خفا ہو کر کہا کہ تمھیں اس مسئلے کی ابھی تک خبر نہیں ہے کہ یہ لوگ امن دے کر نکالے گئے ہیں۔ اُن کا اسباب نہ بیت المال میں داخل ہوگا، نہ کسی کو لینا درست ہے۔ اُن کا جو کچھ مال و اسباب ہے، انھیں کو ملے گا۔ ایسی باتوں سے تم توبہ کرو۔ مولانا نے فرمایا کہ ان کے سب ہتھیار اُن کے حوالے کرو اور جو اُن کے سنگروں میں بارُود ہو، وُہ جھڑ دا ڈالو اور اپنے یہاں کے پانچ سوار اُن کے ساتھ کر دو کہ ان کو کرس، سُوا کوس ہوتی

---

[1] منظورۃ السعداء [2] مُستامن شریعت کی اصطلاح میں اس شخص کو کہتے ہیں جس کو جنگ کی حالت میں امن دیا گیا ہو۔

سے پرلی کی طرف پہنچا کر چلے آئیں۔ پھر سب ہتھیار اُن کے حوالے کیے۔[1]

مردان کی فتح اور قاضی حبّان صاحب کی شہادت

مولانا اسمٰعیل صاحب اور قاضی حبّان صاحب ہوتی کا انتظام کرکے مردان تشریف لے گئے۔ مردان کے ایک بُرج پر سے بندوقیں چل رہی تھیں۔ اس میں ایک تُکی طالب علم اور ایک جوان ہندوستانی شہید ہُوا۔ بُرج والے نے گلی کو باندھ رکھا تھا۔ قاضی صاحب جوش میں آکر چند آدمیوں کے ساتھ نکلے۔ اَور لوگ تو سلامت نکل گئے، مگر قاضی صاحب کے سر میں گولی لگی۔ اسی جگہ گر گئے اور شہید ہُوئے۔

مولانا محمد اسمٰعیل صاحب کو قاضی صاحب کی شہادت کی اطلاع ملی تو فرمایا: الحمد للہ! قاضی القضاۃ اپنی دلی مُراد کو پہنچے، لیکن اس وقت اُن کی شہادت کا تذکرہ بلند آواز سے نہ کیا جائے تاکہ دشمن کو ہمارے لشکر کے امیر کی شہادت کی اطلاع نہ ہو۔

مولانا نے رسالدار عبدالحمید خاں سے کہا کہ جلد چالیس، پچاس سوار اپنے وہاں بھیجو۔ وہ دو ضرب شاہین لے جائیں اور بُرجوں کی بندوق بند کریں۔ اسی وقت سوار شاہینیں لے کر پہنچے اور بُرج کے مقابل ایک مکان میں دونوں شاہینیں لگائیں اور مارنے لگے اور بندوقیں بھی چلانے لگے یہاں تک کہ بُرج سے بندوق چلنی موقوف ہُوئی۔ شاہینیں تو وہیں چلتی رہیں اور لوگ مکانوں کی آڑ ہی آڑ ہو کر دیوار کے قریب پہنچ گئے۔ ایک بُرج کی بندوقیں موقوف نہیں ہوتی تھیں۔ ملّا لعل محمّد قندھاری نے پشتو میں کہا: "اَندَر دَ پَایَہ رَاوڑَہ ، اَندَر دَ پَایَہ رَاوڑَہ"، یعنی سیڑھی لاؤ، سیڑھی لاؤ، حالانکہ وہاں کوئی سیڑھی نہ تھی۔ لیکن بُرج والے سمجھے کہ اب غازی سیڑھی پر چڑھ کر بُرج پر آجائیں گے۔ اُنھوں نے امان طلب کی اور بندوقیں موقوف کیں۔

گڑھی والوں نے جانا کہ غازی گڑھی کی دیوار میں آپہنچے۔ اس وقت احمد خاں کا بھائی رسُول خاں گڑھی کے تہ خانے میں ناچ دیکھ رہا تھا۔ لوگوں نے کہا کہ خان، بیٹھے کیا کرتے ہو؟ غازی تو گڑھی سے آلپٹے اور اُن کی شاہین کی گولی بُرج میں کھڑا ہونے نہیں دیتی۔ یہ خبر سُن کر وہ

---

[1] وقائع

اُٹھا اور بُرج پر چڑھ کر دیکھا کہ فی الحقیقت غازی گڑھی کے نیچے ہیں۔ گھبرا کر لوگوں سے کہا کہ چادر ہلا دو۔ انھوں نے جلد بُرج پر چڑھ کر چادر ہلائی اور امن مانگی۔ مُجاہدین کی طرف سے شاہین اور بندوق چلنی بند ہُوئی۔

لوگوں نے جا کر مولانا سے اطلاع کی کہ لوگ چادر ہلاتے ہیں اور امن چاہتے ہیں۔ مولانا تشریف لے گئے اور رسُول خاں سے فرمایا کہ تم اپنے آدمیوں کو لے کر گڑھی سے باہر نکل آؤ، تم کو امن ہے، مگر احمد خاں کا جو مال و اسباب ہو، اُس میں دست اندازی نہ کرنا، وُہ مال و اسباب غنیمت کا ہے، اِس لیے کہ وُہ باغی ہیں۔ اس کے علاوہ جو مال و اسباب تمھارا یا رعایا کا ہو، اُس کو امن ہے۔ جس کا ہو، وُہ اُٹھا لائے، ہم کو کچھ غرض نہیں۔

رسُول خاں بیس پچیس آدمی گڑھی سے باہر لے کر نکل آیا۔ جب اُس کو یہ معلوم ہُوا کہ قاضی حبان صاحب شہید ہو گئے، تو وُہ سمجھا کہ مجھ کو اُنھوں نے گرفتار کر لیا۔ مولانا نے اُس کو حواس باختہ دیکھ کر اُس کی تسلّی و دلجمعی کی اور عہد و پیمان مضبوط لے کر فرمایا کہ خبردار، اب تم کبھی ہم سے بغاوت نہ کرنا، اب ہم اپنی طرف سے تم کو مردان اور ہوتی سپرد کرتے ہیں اور رسالدار عبدالحمید خاں سے فرمایا کہ تم اپنے سَو غازی لے کر رسُول خاں کے ساتھ جاؤ اور ہماری طرف سے اُن کو گڑھی میں بٹھا دو اور جو جو مال و اسباب اُن کے بھائی احمد خاں کا ہوگا، یہ بتاتے جائیں گے، تم وہاں سے بھیجتے جانا۔

رسالدار صاحب اُسی وقت رسُول خاں کو گڑھی میں لے گئے اور اپنے لوگوں سے کہ دیا کہ خبردار، کوئی کسی چیز کو ہاتھ نہ لگائے۔ پھر رسُول خاں سے احمد خاں کا مال و اسباب طلب کیا اور جو جو اُس نے بتلایا، اپنے قبضے میں کیا۔ اِسی طرح ہوتی کی گڑھی میں بھی رسُول خاں کا قبضہ کروا دیا[1]

لُوٹ کے مال کی واپسی موضع مردان کے چند آدمی مولانا کے پاس آئے اور عرض کی کہ آپ کے امن دینے کے بعد آپ کے مُلکی غازیوں نے ہمارا کچھ کچھ اسباب گھروں سے اُٹھا لیا ہے۔ مولانا نے

---

[1] وقائع

ایک غازی اُن کے ساتھ کر دیا اور فرمایا کہ تم اُن کو بتا دینا، یہ اُن کو ہمارے پاس بُلا لائیں گے۔ وُہ غازی اُن کو مولانا کے پاس بُلا لایا۔ وُہ فقط تین یا چار آدمی تھے۔ مولانا نے اُن سے پُوچھا کہ تم نے اُن کا کیا کیا مال و اسباب لیا ہے۔ اُنھوں نے جو کچھ لیا تھا، وہ لا کر رکھ دیا۔ وہ صرف تین یا چار لُنگیاں تھیں اور چھ یا سات کھادی کے تھان۔ مولانا نے اُن سے پوچھا کہ تمھارا یہی مال و اسباب ہے یا کچھ اور بھی ہے؟ اُنھوں نے عرض کیا کہ یہی اسباب ہے اور کچھ نہیں۔ مولانا نے اُن تینوں چاروں غازیوں سے فرمایا کہ بھائیو، تم نے بہت نامناسب حرکت کی کہ امن دینے کے بعد اُن کا اسباب لے لیا۔ اس طرح کا نقد یا اسباب لینا حرام ہے۔ خبردار! اب پھر کبھی ایسی حرکت نہ کرنا۔ ہر بھائی مُسلمان اس کو یاد رکھے کہ حربی کافروں اور باغی مسلمانوں کے علاوہ ہر مسلمان کی جان و عزّت اور مال مُسلمان پر حرام ہے۔ وہ اپنی حرکت سے نادم ہُوئے اور عرض کی کہ ہم سے خطا ہوئی، ہم کو یہ مسئلہ معلوم نہ تھا۔ اب ہم توبہ کرتے ہیں۔

جب ہوتی والوں نے یہ حال دیکھا کہ مولانا نے مردان والوں کا اسباب واپس کروا دیا، تو ان سب نے مِل کر اپنے اپنے مال کی مولانا سے نالش کی۔ اُن کا بہت مال و اسباب مُلکی غازیوں نے لے لیا تھا۔ مولانا نے دس بارہ غازی مقرر کیے کہ لشکر میں خبر کر دو کہ ہوتی کا مال و اسباب جس جس کے پاس ہو، وہ لا کر ہمارے پاس جمع کریں۔ اس حُکم کے سُنتے ہی جس کے پاس جو کچھ تھا، اُس نے لا کر حاضر کیا اور لوگ اپنا اپنا مال پہچان کر لے گئے۔[1]

مولانا محمد اسمٰعیل صاحب کا وعظ و نصیحت بعض بعض ولایتیوں اور قندھاریوں کو یہ بات ناگوار معلوم ہُوئی۔ مولانا نے ظہر کی نماز کے بعد فرمایا کہ امیر کی اطاعت ہر ایک پر فرض ہے۔ ہر مسلمان کو چاہیے کہ اُس کا حکم ماننے میں چُون و چرا نہ کرے اگرچہ اپنے نفس کے خِلاف معلوم ہو۔ ہم نے سُنا ہے کہ آج جو لوگوں کا مال و اسباب واپس ہُوا، تو بعض بعض بھائیوں کو ناگوار گزرا۔ یہ بات نہ چاہیے۔ ہم نے خدا و رسُولؐ کے حکم کے موافق واپس کروا دیا ہے۔ اِس مال کا لینا بھائیوں کو

---

[1] وقائع

درست نہ تھا۔ اس بات سے تو خوش ہونا چاہیے اور شکر کرنا چاہیے کہ اللہ تعالیٰ نے ہم کو قیامت کے مواخذے سے بچایا اور جو کسی کے دل میں بشریت کی راہ سے کچھ خطرۂ نفسانی آیا ہو، تو اُس سے توبہ کرے۔ اللہ تعالیٰ غفورٌ رّحیم ہے۔ اُمید ہے کہ بخش دے گا۔

اسی قسم کے بہت سے مسائل، جو مُناسبِ وقت تھے، بیان کیے۔ مولانا کی نصیحت سُن کر جنھوں نے اسباب لیا تھا، اپنے دل میں بہت نادم ہُوئے اور کہا کہ مولانا نے حق فرمایا۔[1]

عُشر کے تحصیلداروں کا تقرُّر مولانا یہاں سے اَمَازَئی[2] میں تشریف لے گئے اور وہاں مختلف مواضعات کے خوانین کو جمع کر کے فرمایا کہ تم سب صاحبوں نے قاضی حبّان صاحب کو عُشر دینے کا اقرار کیا تھا۔ اب اِس وقت تمھاری ربیع کی فصل تیار ہے۔ اب تم کیا کہتے ہو؟ اُنھوں نے کہا کہ ہم اپنے عہد پر قائم ہیں۔ جہاں کہیں ارشاد ہو، وہیں ہم سب پہنچا دیں، لیکن بہتر یہ ہے کہ آپ اپنے چند غازی ہمارے ضلع میں تحصیلِ عُشر کے واسطے مُقرر کر دیں۔

مُولانا نے اس کو بہت پسند کیا اور حاجی بہادر شاہ رامپوری کو تحصیلِ عُشر کے واسطے مقرر کیا اور کوئی پندرہ ہندوستانی اور ولایتی آدمی اُن کے ساتھ کر دیے اور اُن کو سمجھا دیا، اور حاجی محمود خاں کو علاقۂ سُدّم کی تحصیلِ عُشر کے واسطے مُقرر کیا، اور کوئی دس ہندوستانی غازی اُن کے ساتھ کر دیے۔ اور مولوی مظہر علی صاحب عظیم آبادی کو بیس پچیس غازیوں کے ساتھ پنجتار روانہ کیا اور اگلے روز امان زئی سے روانہ ہو کر پنجتار میں قیام فرمایا۔ موضع ٹوپی میں تحصیلِ عُشر کے واسطے مولوی نصیر الدین منگلوری کو مُقرر کیا اور اٹھارہ بیس مواضعات کا عُشر اُن کے ذمّے کیا، اور سردار فتح خاں کے علاقے کے عُشر کے لیے خود خانِ موصُوف کو مُقرر کیا۔

اِس عرصے میں موضع امب سے سیّد صاحبؒ کا فرمان پہنچا کہ آپ ہمارے پاس تشریف لے آئیے اور رسالدار عبد الحمید خاں کو مع سواروں کے مُلکِ سمہ کے دَورے کے واسطے چھوڑ دیجیے۔

---

[1] وقائع [2] اَمَازَئی یا امان زئی، در اصل قوم کا بھی نام ہے اور یہ قوم جہاں آباد تھی، وُہ گڑھی امازئی کہلاتی تھی۔ آج کل اُمازو گڑھی کے نام سے مشہُور قصبہ مردان سے تقریباً آٹھ میل بہ جانبِ مشرق واقع ہے۔

مولانا نے رسالدار صاحب کو اس علاقے کا ذمّے دار اور مُختارِ کار بنایا اور اُن کو تاکید کی کہ وُہ اس عِلاقے کا برابر دَورہ کرتے رہیں اور کوئی کِسی پر ظُلم و تعدّی نہ کرنے پائے۔ رسالدار صاحب کے ساتھ پانچ سو سوار کے قریب تھے۔ وہ سب اُن کے ساتھ رہے۔

مولانا دو سَو پیادوں کے ہمراہ امب میں داخل ہُوئے اور ملک سَمہ کے سب حالات سیّد صاحبؒ کو سُنائے۔ قاضی صاحب کی شہادت کا حال سُن کر سیّد صاحبؒ بہت غمگین ہُوئے اُن کی خُوبیاں بیان کیں اور فرمایا کہ قاضی صاحب دینداری کے ہر فن میں کامل تھے الحمدللہ! اللہ تعالیٰ نے اُن کے مقصُودِ دلی کو پہنچایا۔ پھر آپ نے برہنہ سر ہو کر اُن کے لیے دُعائے مغفرت کی۔

قاضی صاحب کے بعد مولانا جو عُشر وغیرہ کا انتظام کر کے آئے تھے، وہ سب آپ کے سامنے پیش کیا، آپ بڑے خوش ہُوئے اور بہت دُعائیں دیں۔[1]

○

---

[1] وقائع

چوبیسواں باب
سُلطان محمّد خاں کی لشکرکشی

دُرّانیوں کا لشکر ہُوتی کو وقائع میں ہے کہ موضع تُورو سے ولیل خاں نے اطّلاع کی کہ احمد خاں، جو دُرّانیوں کا لشکر پشاور لینے گیا تھا، اب لشکر لیے ہُوئے آتا ہے۔ رسالدار عبدالحمید خاں نے سردار فتح خاں کے مشورے سے سیّد صاحبؒ کو اس خبر کی اطّلاع کی۔ سردار سُلطان محمّد خاں نے ملک سمہ کے خوانین کو ڈرایا دھمکایا کہ تمھارے مُلک میں ہمارا بھائی یار محمّد خاں مارا گیا ہے اور مردان اور ہُوتی کو بھی تم نے چھنوا دیا ہے۔ اب ہم آتے ہیں تم سب سے سمجھیں گے اور اپنا عوض لیں گے۔ لشکر کے ساتھ سردار سُلطان مُحمّد خاں، سردار پیر مُحمّد خاں، سردار سید مُحمّد خاں اور عظیم خاں کا بیٹا حبیب اللہ خاں بھی تھا۔

خوانین کا مشورہ رسالدار عبدالحمید خاں نے سردار فتح خاں کے ذریعے علاقے کے تمام خوانین کو جمع کروایا اور مشورہ کیا کہ کیا کرنا چاہیے۔ ان سب کا یہی مشورہ ہُوا کہ سیّد صاحبؒ کو اس کی اطّلاع دینی چاہیے۔ آپ کا تشریف لانا ضروری ہے۔ چنانچہ ان سب کی طرف سے اس مضمون کی ایک عرضداشت لکھی گئی کہ دُرّانیوں کا لشکر ہماری طرف آتا ہے، ہم سب نے مشورہ کیا ہے کہ آپ یہاں تشریف لائیں اور ہم لوگ آپ کے لشکر کے ساتھ اُن کے مقابلہ کے لیے بڑھیں۔

سیّد صاحبؒ پنجتار میں | سیّد صاحبؒ نے رسالدار صاحب کو لکھا کہ تم اپنے سوار لے کر امان زئی کی گڑھی میں ڈیرہ کرو۔ اس میں اس علاقے کے لوگوں کو تقویت اور تسلّی ہوگی اور ان خوانین کے سوال و جواب میں فتح خاں کو لکھا کہ تم سب خوانین کی تسلّی کرو کہ کسی امر کا اندیشہ نہ کریں اللہ تعالیٰ سب طرح سے خیر کرے گا۔ ہم نے رسالدار عبدالحمید خاں کو لکھا ہے۔ وہ تمھارے یہاں کوچ کر کے امان زئی کی گڑھی میں جا کر ڈیرہ کریں گے۔ ہم بھی جلد انشاء اللہ تعالیٰ تمھارے یہاں آتے ہیں۔

آپ نے امب سے کوچ کی تیاری کی۔ مولوی خیرالدین صاحب شیرکوٹی کو چھتربائی میں برقرار رکھا۔ حافظ مُصطفےٰ کاندھلوی کو اُن کی مدد کے لیے دیا۔ مولانا اسمٰعیل صاحب اور شیخ ولی محمد صاحب پھلتی کو امب میں مُقرر کیا اور چھتربائی اور امب میں تین سَو کے قریب آدمی چھوڑے اور اتنے ہی آدمی اپنے ہمراہ لے کر کُوچ کیا اور پنجتار پہنچ کر اپنے قدیم بُرج میں قیام فرمایا۔ آپ نے اُن سب خوانین کو پنجتار میں طلب فرمایا، جنھوں نے آپ کے بُلانے کے واسطے خط بھیجا تھا اور اُن سے گفتگو کی۔ عُشر کا غلّہ، جو جا بجا جمع تھا، اُس کو محفوظ کرنے کے لیے دو جگہ جمع کرنے کا بندوبست کیا۔

تُورو میں | چند دن کے بعد یہ اِطّلاع ملی کہ دُرّانیوں کا لشکر حُمگنی سے کُوچ کر کے دریا لُنڈے سے اُتر کر چارسدّے میں آگیا۔ آپ نے کُوچ کی تیّاری کی اور ضروری اسباب تیّار کر کے پنجتار سے روانہ ہوگئے۔ آپ کے ہمراہ چار سَو آدمیوں سے زائد تھے۔ امان زئی کی گڑھی میں آپ نے قیام فرمایا۔ دُرّانیوں نے چارسدّے سے کُوچ کر کے موضع اُتمان زئی میں ڈیرہ کیا تھا۔ جب انھوں نے سیّد صاحبؒ کو سُنا کہ آپ پنجتار سے امان زئی کی گڑھی میں داخل ہوئے، تو وہ اُتمان زئی سے کُوچ کر کے موضع ہُوتی میں آکر ٹھیرے۔ جب یہ خبر آپ کو ہوئی، تو آپ امان زئی کی گڑھی سے کُوچ کر کے موضع تُورو میں تشریف لے گئے اور وہیں ڈیرہ کیا۔

سردارانِ پشاور کو فہمائش و نصیحت | سیّد صاحبؒ نے مولوی عبدالرحمٰن صاحب کو، جو موضع تورُو کے رہنے والے تھے، اپنے پاس بُلا کر فرمایا کہ ہماری طرف سے تم سردار سلطان محمّد خاں کے پاس

جاؤ اور اُن کو سمجھاؤ کہ ہم ہندوستان سے اپنا گھر بار چھوڑ کر محض جہاد فی سبیل اللہ کے واسطے اس مُلک میں آئے ہیں کہ کافرِ لاہور سے جہاد کریں اور تم سب مسلمان بھائی ہمارے شریک ہو۔ یہاں کے اور مسلمانوں سے پہلے تم نے ہمارے ہاتھ پر بیعت کی ہے۔ حیرت کا مقام ہے کہ ہم مسلمانوں کی شرکت چھوڑ کر تم نے کافروں اور باغیوں کی رفاقت اختیار کی۔ تم کو مناسب ہے کہ ہم مسلمانوں سے مقابلہ نہ کرو اور اپنے شہر کو جاؤ۔ ہم کو کسی طرح یہ بات منظور نہیں کہ مسلمانوں سے جدال و قتال کریں۔ اگر تم نہ مانوگے، تو یہ بات سمجھ لو کہ اس میں تمھارے دین کا بھی نقصان ہے اور دُنیا کا بھی، ہم نے اپنی حُجّتِ شرعی تم پر قائم کر دی۔ آگے تم جانو، چار مُلّا اور بھی اُن کے ساتھ گئے۔

سُلطان محمّد خاں کا جواب تیسرے روز اُنھوں نے آکر کہا کہ سُلطان محمد خاں نے آپ کے پیغام کے جواب میں کہا کہ تم ہم سے ابلہ فریبی کی باتیں کرنے آئے ہو کہ سیّد بادشاہ فرماتے ہیں کہ ہم ہندوستان سے اس مُلک میں محض جہاد فی سبیل اللہ کے واسطے آئے ہیں اور فرماتے ہیں کہ ہمارا مقابلہ نہ کرو، اپنے وطن کو چلے جاؤ، نہیں تو تمھارا دین و دُنیا میں نقصان ہوگا۔ ہم اُن کے اِن فریبوں میں ہرگز نہیں آئیں گے۔ بھلا ہم اُن کی ایسی دینداری اور پرہیزگاری کی باتوں کو کیونکر مانیں اور سچ جانیں؟ اوّل تو اُنھوں نے ہمارے بھائی یار محمّد خاں کو قتل کیا اور مسلمانوں کے لشکر کا تمام مال و اسباب لُوٹ لیا۔ علاوہ اس کے احمد خاں کے موضع مردان اور ہُوتی کو تاراج کیا۔ جہاد فی سبیل اللہ اُنھوں نے اسی کا نام رکھا ہے، ہمارے بھائی یار محمّد خاں پر اُنھوں نے رات کو چھاپا مارا تھا اس میں وہ فتحیاب ہو گئے۔ اب دن دوپہر ہم سے مقابلہ کریں، تب اُن کی لِلّٰہیّت اور شجاعت کا حال معلوم ہو، اور دو چار دن کے عرصے میں جو ہوگا، دیکھ لینا۔

سیّد صاحبؒ کی طرف سے اتمام حُجّت مولوی عبد الرحمٰن صاحب سے سردار سلطان محمّد خاں کی یہ پوری تقریر سُن کر سیّد صاحبؒ نے فرمایا کہ اب کی بار تم پھر جاؤ اور نرمی کے ساتھ ہماری طرف سے اُن کو سمجھاؤ کہ تم ناحق پر اصرار نہ کرو، خدا سے ڈرو اور اس بات کو یاد کرو کہ جب ہم اوّل مُلک

سندھ سے آئے اور تمہارے قلعہ قاضی میں اُترے اور تم استقبال کر کے ہم کو وہاں سے کابل لے گئے اور وزیر کے باغ میں تم نے ہم کو اُتارا، ہماری ضیافتیں کیں، ہم نے تم لوگوں کو جہاد کی دعوت دی، تم نے اور تمہارے بھائی یار محمد خاں اور بہت صاحبوں نے ہمارے ہاتھ پر بیعت کی اور اس بات کا عہد و پیمان کیا کہ ہم جان و مال سے تمہارے اس کارِ خیر میں شریک ہیں اُن دنوں تمہارے اور تمہارے بھائی دوست محمد خاں کے درمیان ناچاقی تھی۔ ہم نے چالیس روز وہاں للہ فی اللہ اس واسطے قیام کیا کہ تمہارے درمیان صلح کرا کے تم کو ملا دیں کہ تم آپس کی نزاع چھوڑ کر جہاد فی سبیل اللہ میں ہمارے شریک ہو اور کافرِ لاہور سے لڑو کہ اسلام کی ترقی ہو، مگر تم کسی طرح ہمارے مِلانے سے نہ ملے، اپنے ہی اصرار پر قائم رہے۔ تمہارے بھائی دوست محمد خاں نے علانیہ ہم سے کہا کہ میں سچا مسلمان ہوں جس اعتقاد اور صاف دلی سے مَیں آج آپ سے ملا ہوں، اسی طرح زندگی بھر آپ سے ملتا رہوں گا، اور یہ میرے بھائی منافق اور دغا باز ہیں۔ یہ آپ سے کبھی وفا نہ کریں گے۔ ہم نے اُن کے کہنے کا کچھ خیال نہ کیا۔

پھر جب وہاں سے ہم پشاور ہوتے ہوئے مُلکِ سمہ میں آئے اور بُدھ سنگھ سے مقابلہ ہوا، تو وُہی بات، جو تمہارے بھائی دوست محمد خاں نے کہی تھی، پیش آئی۔ پھر تمہارے بھائی یار محمد خاں نے سکھوں سے خفیہ مِل کر وَاللّٰہُ اَعْلَمُ بِالصَّوَاب ہم کو زہر بھی دیا، مگر اللہ تعالیٰ نے اپنے فضل و کرم سے بچا لیا۔ مقابلہ کُفّار کے وقت وُہ طرح دے کر آپ بھاگ گیا۔ لڑائی بگڑ گئی۔ چند روز کے بعد وُہ خود فوج کشی کر کے پشاور سے ہمارے اُوپر چڑھ آیا۔ ہم نے آدمی بھیج کر اس کو بھی بہت سمجھایا، مگر وُہ اپنی شامتِ نفس سے نہ سمجھا۔ آخر مارا گیا۔ اِس میں ہماری کون سی خطا ہے؟

اِسی طرح یہاں کے تمام مَلک و خوانین نے بیعتِ امامت کی اور سب نے عُشر دینے کا اقرار کیا۔ ان میں احمد خاں بھی تھا۔ اب کی بار جب اِس عُشر کے بندوبست کے لیے سب مَلک اور خوانین مُلائے گئے اور سب نے پھر از سرِ نَو عُشر دینے کا عہد و پیمان کیا، تو احمد خاں نہیں آیا اور باغی ہو کر پشاور کو بھاگ گیا اور وہاں سے تم کو لڑائی کے واسطے چڑھا لایا۔ ہم نے جس طرح تمہارے

بھائی یار محمدؔ خاں کو فہمائش کی تھی، اُس کو بھی کی۔ اُس نے نہ مانا۔ اب تمھیں ہم فہمائش کرتے ہیں۔ اگر مانو گے، بہتر؛ ورنہ ہم پر الزام نہیں۔

اور تم جو یہ کہتے ہو کہ تم نے یار محمدؔ خاں پر رات کو چھاپا مارا، اس سبب سے تم فتحیاب ہُوئے؛ اگر دن دوپہر کو ہم سے مقابلہ کرو، تو تمھاری بہادری اور مردانگی کا حال معلوم ہو، اُس کا جواب یہ ہے کہ نہ ہم رات کو تم سے لڑنے کا ارادہ رکھتے ہیں، نہ دن کو، اس لیے کہ تم مسلمان ہو اور ہم تو کفّار سے لڑنے کو آئے ہیں۔ اگر تم خود زیادتی کرکے ہمارے مقابلے میں آؤ گے، تو ہم مجبور ہیں۔ اپنے بچانے کو جو کچھ ہم سے ہو سکے گا، کریں گے۔ ہم کو اُمید ہے کہ جس خدا نے رات کو تمھارے بھائی پر فتیاب کیا تھا، وُہی خدا تم پر دن کو فتحیاب کرے گا۔ مگر بہتر یہ ہے کہ تم خدا سے ڈرو اور ناحق پر اصرار نہ کرو، بُرائی کا انجام بُرا ہی ہوتا ہے، وَالسَّلَامُ عَلیٰ مَنِ اتَّبَعَ الْھُدٰی۔

اور ایک خط دیا۔[1]

---

[1] منظورۃ السعداء" میں اس سلسلے کے دو خط سلطان محمدؔ خاں کے نام اور ایک خط سُلطان محمدؔ خاں کا نقل ہُوا ہے۔ سیّد صاحبؒ نے اپنے پہلے خط میں اپنی ہجرت اور جہاد کا مقصد بیان کیا اور تحریر فرمایا کہ ہم اس مُلک میں محض کفّار سے جنگ کرنے کے لیے آئے تھے ہمارا کسی مسلمان سے جدال و قتال کا ارادہ ہرگز نہ تھا۔ لیکن افسوس ہے کہ خود ہمارے کلمہ گو بھائیوں نے مزاحمت کی اور ہمارے اوپر لشکر کشی کرکے ہم کو نیست و نابود کرنا چاہا، لیکن اللہ تعالیٰ نے ہم بے سرو سامان اور کمزوروں کی مدد فرمائی۔ ہم پہلے بھی عاجز و ناچار تھے، اب بھی عاجز و ناچار ہیں۔ البتہ اُس قادرِ مطلق مالک الملک کی بُطش شدید سے ڈرنا چاہیے، جو اپنے کمزور بندوں کی مدد کرتا ہے۔

اوست سُلطاں، ہرچہ خواہد آں کند عالمے را در دمے ویراں کند
ہست سُلطانی مُسلّم مراورا نیست کس را زہرۂ چُون وچرا

سُلطان محمدؔ خاں نے اُس کا بڑا متکبّرانہ جواب دیا اور لکھا کہ "آپ کا یہ کہنا کہ ہم اس مُلک میں محض کفّار سے جہاد کرنے آئے تھے اور ہم کو مسلمانوں سے کچھ سروکار نہیں، محض ابلہ فریبی ہے۔ آپ کا عقیدہ فاسد اور آپ کی نیت کاسد ہے۔ آپ فقیر بنتے ہیں اور ارادہ امارت کا کرتے ہیں۔ ہم نے بھی اس بات پر کمر باندھ لی ہے کہ تم جیسے لوگوں کو ختم کرکے اس زمین کو پاک کر دیں گے۔

اس خط کو پڑھ کر اگرچہ اکثر لوگوں کی رائے یہ ہُوئی کہ اب کچھ گفت و شنید کی گنجائش نہیں ہے، لیکن سیّد صاحبؒ نے فرمایا کہ ایک بار اور اتمام حجّت کرنا چاہیے۔ آپ نے ایک دُوسرا لکھا جس میں سُلطان محمد خاں سے خواہش کی کہ کسی خلاف شرع بات کی نشان دہی کی جائے، جو ہم لوگوں سے صادر ہوئی ہو۔ اگر ایسا کوئی فعل ثابت ہو گیا، تو کسی لشکر کشی کی ضرورت نہیں پڑے گی ہم خود شرعی سزا کے لیے حاضر ہو جائیں گے اور آپ کو یہاں تک آنے کی تکلیف نہیں دیں گے سلطان محمد خاں نے اس کا کوئی جواب نہیں دیا۔

سُلطان محمّد خاں کا متکبّرانہ جواب مولوی عبدالرحمٰن صاحب اور اُن کے ساتھیوں نے واپس آکر بیان کیا کہ سردار سُلطان محمد خاں نے درشتی سے جواب دیا کہ ان قصّوں کہانیوں کی کچھ ضرورت نہیں، اپنے گھر کو جاؤ اور خبردار! پھر ہمارے پاس نہ آنا اور نہ سیّد بادشاہ کا پیام لانا۔

اُنھوں نے یہ بھی بیان کیا کہ سَمہ کے اکثر مُلک اور خوانین خُفیہ طور پر سردارِ موصوف سے ملے ہوئے ہیں۔ اُنھوں نے سردارِ ممدوح سے یہ بھی کہا ہے کہ سیّد بادشاہ یہاں توُرو میں تنہا خود ہی لشکر کے ساتھ ہیں۔ مولانا محمد اسمٰعیل صاحب، جنھوں نے سردار یار محمّد خاں پر شبخون مارا تھا، وہ ان دنوں موضع امب میں ہیں۔ ہم نے پنجتار سے سیّد بادشاہ کو بُلا کر شکار کی طرح تمھارے سامنے کر دیا ہے۔ اب تم اُن سے نبٹ لو۔

مولانا محمد اسمٰعیل صاحب کی آمد سیّد صاحبؒ نے مولانا محمد اسمٰعیل صاحب کو طلبی کا خط لکھا اور فرمایا کہ وہاں کے انتظام اور بندوبست کے لیے سید اکبر صاحب کو مقرر کر کے آپ اور شیخ ولی محمّد صاحب جلتی جلد آجائیں۔ شاہ صاحب نے سید اکبر صاحب کو وہاں کا ذمّے دار بنایا، شیخ بلند بخت دیوبندی کو قلعدار کیا اور مولوی خیرالدین صاحب کو بدستور چھتربائی میں رکھا اور امب سے کچھ کم دو سَو غازی ہمراہ لے کر شیخ ولی محمّد صاحب کے ساتھ موضع توُرو کو روانہ ہوگئے۔ جب موضع توُرو دو یا ڈھائی کوس رہا، آپ نے سیّد صاحبؒ کو اپنے آنے کی اطلاع کی۔ سیّد صاحبؒ نے کہلایا کہ آپ وہیں تشریف رکھیں اور ہمارے آدمیوں کا انتظار کریں۔ رات ہی کو آپ نے کوئی تین سَو مُسلّح آدمی مولانا کے لینے کو بھیجے۔ نمازِ فجر کے بعد بڑے تجمّل و اہتمام سے توُرو کو روانہ ہوئے۔ جب توُرو کے قریب پہنچے، تو سیّد صاحبؒ چند آدمیوں کے ساتھ استقبال کو آئے۔ اس کا مقصد یہ تھا کہ مخالفین پر رُعب ہو کہ مولانا اپنے مجاہدین کے ساتھ آپہنچے۔

مولانا کے آنے کے بعد دُوسرے دن نمازِ عشا کے بعد مخبر نے خبر دی کہ سردار سلطان محمّد خاں سے نجومیوں نے گھڑی ساعت دیکھ کر کہا ہے کہ کل سویرے تم اپنا کُل لشکر لے کر سیّد بادشاہ کے لشکر کے سامنے جاؤ اور اِدھر اُدھر گشت کر کے چلے آؤ، پھر اُس کے اگلے روز اُن سے

مقابلہ کرو، تمہاری فتح ہو گی۔ سو کل اُن کا لشکر ضرور آئے گا، آپ ہوشیار رہیں۔

اگلے روز گھڑی، ڈیڑھ گھڑی دن چڑھا ہو گا کہ طلیعہ کے ایک سوار نے آکر اطلاع دی کہ درّانیوں کا لشکر آتا ہے۔ نقارہ بجا اور لوگ تیار ہو کر اُس طرف کو روانہ ہوئے اور موضع توُرو سے نکل کر آدھ کوس پر جمع ہوئے۔ سردار سلطان محمد خاں ادھر سے آتے آتے پاؤ کوس کے فاصلے پر مع لشکر کے کھڑا ہو گیا۔ اِس عرصے میں ایک سوار آیا اور کہا کہ ہمارے سردار سُلطان محمد خاں نے کہا ہے کہ آج تو ہم یُوں ہی سیر و تماشہ کے طور پر آئے ہیں، مگر کل ہم آکر آپ سے مُقابلہ کریں گے۔ آپ نے اُس سوار سے فرمایا کہ تم اپنے سردار سے ہماری طرف سے کہ دینا کہ ہم نہ آج تم سے لڑنے کا ارادہ رکھتے ہیں اور نہ کل۔ لیکن اگر تم خود چڑھ کر آؤ گے، تو ہم مجبور ہیں۔

پچیسواں باب

مایار کی جنگ

جنگ کی تیاری تُورو اور ہُوتی کے درمیان مایار نام کا ایک مقام تھا[1]۔ اُس کے کنارے مشرقی جانب ایک چشمے دار پانی کا نالہ[2] تھا۔ اُس کی حفاظت کے لیے سیّد صاحبؒ نے اپنے لشکر کے چند قندھاری مُتعیّن کر دیے۔ وہ وہاں رات دن رہتے تھے۔ رات کو مولانا محمد اسمٰعیل صاحب نے فرمایا کہ کل سردار سُلطان محمد خاں نے آپ سے لڑائی کا وعدہ کیا ہے۔ ایسا نہ ہو کہ کل سویرے آ کر اس نالے اور مایار پر اپنا بندوبست کر لے، تو پانی اور وُہ بستی ہم سے چھُوٹ جائے اور مایار کے گرد کچّی دیوار ہے، وہ لڑائی کے لیے بڑے مَوقع کی جگہ ہے۔ آپ اُس کا ضرور کچھ بندوبست کریں آپ نے مولانا کی یہ تجویز بہت پسند کی اور مُلّا لعل محمد اور مُلّا قطب الدین سے فرمایا کہ تم اسی وقت دو سَو آدمیوں کے ساتھ جا کر اُس نالے پر اپنا مورچہ قائم کرو۔ ہم نے تم کو اس کام پر متعیّن کیا۔ ہم سے اور دُرّانیوں سے کیسا ہی سخت مُقابلہ پڑے، تم اس نالے کو نہ چھوڑنا۔

دُعا آپ کے حُکم سے رات بھر لشکر تیار رہا۔ تمام پیادہ و سوار رات بھر بیدار اور ہتھیار

---

[1] یہ مقام اب بھی ہے۔ بڑا گاؤں ہے۔ عُرفِ عام میں اُسے "مایار" کہتے ہیں۔ "مَنیار" بھی لکھا جاتا ہے۔

[2] یہ نالہ کلپانی ندی ہے جو مردان اور ہوتی کے پاس سے گزرتی ہُوئی مایار اور تُورو کے پاس بہتی ہے۔ یہ سارے مقامات اس کلپانی ندی کے کنارے پر واقع ہیں۔

باندھے ہوشیار رہے۔ صبح کی نماز میں بہ نسبت اور دنوں کے آپ کے ساتھ نمازیوں کی بڑی کثرت تھی۔ نماز کے بعد آپ نے بڑی دیر تک ننگے سر ہو کر بڑی گریہ و زاری اور عجز و انکسار کے ساتھ دُعا کی۔ پروردگار کی جبّاری و قہّاری اور اپنی ناتوانی و خاکساری کا ایسا بیان کیا کہ لوگوں پر رِقّت طاری اور آنکھوں سے آنسو جاری تھے۔

جُونہیں آپ نے دُعا کر کے اپنے مُنہ پر ہاتھ پھیرے، ایک شخص نے آپ کو سلام کر کے عرض کیا کہ میں مایار کے نالے پر سے مُلّا لعل محمّد قندھاری کا بھیجا ہُوا آپ کی اطلاع کو آیا ہُوں کہ موضع ہُوتی میں دُرّانیوں کا نقارہ ہُوا ہے، آپ پھر ہوشیار ہو جائیں۔ یہ سُن کر آپ نے اپنے لشکر میں نقّارہ بجانے کا حکم دیا اور لوگ اپنے ساز و سامان سے تیّار ہو کر تورُو کے میدان میں جمع ہوگئے۔

سیّد ابو محمّد کی بعیتِ اخلاص | سیّد ابو محمّد صاحب نصیرآبادی آپ کی اہلیہ کے خالہ زاد بھائی، جو بانکوں میں مشہور تھے، اپنا گھوڑا تھان پر چھوڑ کر پیادہ پا آپ کے پاس آئے اور کہنے لگے کہ میاں صاحب، جس روز سے میں آپ کے ساتھ اپنے گھر سے نکلا ہوں، آج تک میرا یہی خیال رہا کہ یہ میرے عزیز اور رشتے دار ہیں، مَیں بھی اُن کے ساتھ رہوں۔ جو ان کو اللہ تعالیٰ کہیں عروج دے گا، تو اُن کی وجہ سے میری بھی ترقّی ہوگی۔ نہ میں آج تک خدا کے واسطے رہا اور نہ کچھ ثواب جان کر۔ مگر اب مَیں نے اس خیالِ فاسد سے توبہ کی اور از سرِ نو آپ کے ہاتھ پر اللہ تعالیٰ کی رضامندی کے واسطے بعیتِ جہاد کرنے کو آیا ہُوں۔ آپ مجھ سے بعیت لیں اور میرے واسطے دُعا کریں کہ اللہ تعالیٰ مجھ کو اس نیّت اور ارادے پر ثابت قدم رکھے۔ آپ نے اُن سے بعیت لی اور اُن کے واسطے دُعا کی۔ اُس وقت تمام حاضرین پر رِقّت سے ایک عجیب حال واقع تھا کہ ہر ایک کی آنکھ سے آنسو جاری تھے۔

دُعا کے بعد سیّد ابو محمّد صاحب آپ سے مُصافحہ کر کے اپنے گھوڑے کی طرف چلے۔ اُن کی آنکھوں سے آنسو جاری تھے۔ اُنھوں نے بسم اللہ کر کے اپنا داہنا پاؤں رکاب میں رکھا اور بآوازِ بلند پُکار کر کہا کہ سب بھائیو، اس بات کے گواہ رہنا کہ آج تک ہم گھوڑے پر اپنی شان و

شوکت اور خواہش نفس کے لیے سوار ہوتے تھے۔ اس میں کچھ خدا کا واسطہ نہ تھا۔ مگر اس وقت ہم محض اللہ تعالٰی کی خوشنودی و رضا جوئی کے واسطے بہ نیت جہاد اس گھوڑے پر سوار ہوئے ہیں۔

جنگ کی ابتدا "شام کو سردار سلطان محمد خاں اور اس کے بھائیوں پیر محمد خاں، سید محمد خاں اور بھتیجے حبیب اللہ خاں (پسر محمد عظیم خاں وزیر) نے قرآن مجید پر ہاتھ رکھ کر قسم کھائی کہ ہم سید کے مقابلے سے کسی طرح منہ نہ موڑیں گے۔ پھر انھوں نے یہ قسم اپنے سب مشیروں اور افسروں سے لی۔ باقی لشکر کی قسم کے لیے انھوں نے دو طرف نیزے گاڑ کر ایک دروازہ سا بنایا۔ اس میں ایک لنگی باندھ کر کلام اللہ لٹکایا۔ اس کے نیچے سے سارا لشکر نکل کر میدان میں آیا۔

پچھلی رات کو کوچ کا نقارہ ہوا۔ موضع ہوتی کے لوگوں کا بیان ہے کہ اکثر درانی شراب پی کر اور خوب مست ہو کر اور کمر باندھ کر اور گھوڑے کھینچ کر تیار ہوئے۔ جب دوسرا نقارہ ہوا، تب چاروں سردار اس دروازے سے نکلے اور دروازے کے کنارے ایک طرف کھڑے ہوئے تاکہ سب کو اپنے سامنے اس دروازے سے نکالیں۔ پھر آگے پیچھے تمام لشکر نکلا۔ وہاں انھوں نے تمام لشکر کے چار غول کیے: تین سواروں کے، ایک پیادوں کا۔ پیادوں کی بٹالین میں افسر کیول نام فرنگی تھا۔ اس بٹالین میں چھوٹی چھوٹی دو توپیں تھیں۔ سواروں کے ایک غول میں پیر محمد خاں سردار تھا، ایک غول میں حبیب اللہ خاں، ایک غول میں خود سردار سلطان محمد خاں۔ اور دو ضرب توپ تھیں۔ جب چار غول جدا جدا مقرر ہو چکے اور تیسرا نقارہ ہوا، تب لشکر کا وہاں سے کوچ ہوا۔"[1]

اس عرصے میں ایک سوار بآواز بلند مجاہدین کے لشکر میں پکارتا ہوا آیا کہ بھائیو، خبردار اور ہوشیار ہو جاؤ، درانیوں کا لشکر آتا ہے اور حضرت سے عرض کیا کہ نالے پر ملا لعل محمد کے ساتھ آدمی کم ہیں، لشکر قریب آ گیا ہے، ایسا نہ ہو کہ نالہ ان سے چھوٹ جائے۔ یہ خبر سن کر آپ اس سے اٹھ کھڑے ہوئے اور جناب باری میں نہایت الحاح و زاری سے دعا کی۔ پھر گھوڑے

---

[1] منظورہ

پر سوار ہو کر روانہ ہوئے۔[1]

جب تُورُو اور مایار کے درمیان نالے پر پہنچے اور لوگ اُترنے لگے، وہاں ایک جگہ پانی کم تھا۔ دائیں بائیں گہرا تھا کہ کمر کمر تک پہنچتا تھا۔ نالے کو پار کرنے میں صف کی ترتیب و انتظام قائم نہ رہا۔ نالہ پار ہونے کے بعد پھر صفوں کی ترتیب قائم ہو گئی۔ اُدھر سے توپ چلی اور لوگ نالے اُتر کر پار ہوئے۔ آپ نے بآوازِ بلند پکار کر کہا کہ سب بھائی، جو سُنتے ہیں، وُہ گیارہ گیارہ بار سُورۂ لِاِیْلٰفِ پڑھ کر اپنے اُوپر دم کر لیں اور لشکر میں سب بھائیوں سے یہی کہ دیں اور جن کو یاد ہو، یہ دُعا پڑھتے ہوئے چلیں: "اَللّٰهُمَّ اهْزِمْهُمْ وَ زَلْزِلْ اَقْدَامَهُمْ وَشَتِّتْ شَمْلَهُمْ وَ فَرِّقْ جَمْعَهُمْ وَ خَرِّبْ بُنْيَانَهُمْ وَ خُذْهُمْ اَخْذَ عَزِيْزٍ مُّقْتَدِرٍ۔"

ہدایات پھر آپ نے رسالدار عبدالحمید خاں صاحب کو بُلا کر فرمایا کہ تم اپنے سواروں کو لیے ہوئے ہم لوگوں کی بائیں جانب پُشت پر رہو اور تم بغیر ہمارے حکم کے حملہ نہ کرنا۔ شاہینچیوں کے جمعدار شیخ عبدُاللہ سے فرمایا کہ تم لوگوں کے برابر بائیں طرف اور سواروں کے آگے رہو۔

پھر آپ آہستہ آہستہ آگے کو روانہ ہوئے۔ جب موضع مایار کے برابر پہنچے، تو مخالفین کا لشکر صاف نظر آنے لگا۔ اُدھر سے دو توپیں چل رہی تھیں اور لشکر کے چار غول تھے: تین سواروں کے اور ایک پیادوں کا۔ آپ نے اپنے لوگوں سے صف باندھنے کے لیے فرمایا اور سب سے کہ دیا کہ خبردار، کوئی بھائی ہم سے آگے نہ بڑھے اور نہ ہماری اجازت کے بغیر بندوق چلائے۔

"مجاہدین کی تین صفیں تھیں۔ اگلی اور پچھلی میں تو ہندوستانی تھے، بیچ کی صف میں مُلکی لوگ تھے۔ ہر صف میں اتنے فرق سے آدمی کھڑے تھے کہ بندوقچی بافراغت بندوق بھر کر بھر ماری کر سکے۔"

آپ نے فرمایا کہ بھائیو، دَوڑنا حرام سمجھ کر تیز قدمی کے ساتھ اسی طرح صف باندھے ہوئے توپوں کی طرف روانہ ہو، اس لیے کہ دَوڑنے سے آدمی کی سانس پھُول جاتی ہے اور وُہ تھک کر

---

[1] "منظورۃ السعداء" میں ہے کہ دُرّانیوں کے لشکر میں تخمیناً چار ہزار پیادے اور آٹھ ہزار سوار تھے۔ اور حضرت امیرالمومنین کے ہمراہی اس وقت ہندی و مُلکی ملا کر تین ہزار پیادے اور پانچ سو سوار تھے۔

رہ جاتا ہے اور کسی کام کے لائق نہیں ہوتا۔ یہ بھی یاد رکھو کہ توپ کی آواز ہوتی تو ہے بڑی مہیب اور ڈراؤنی، لیکن ایک گولہ ایک آدمی کے سوا کسی کی جان نہیں لے سکتا، بشرطیکہ صفوں میں خلل واقع نہ ہو۔[1]

لشکر کے مخلصین اس عرصے میں پے درپے دو گولے اس طرف سے ٹپا کھا کر آئے اور صفوں کے اوپر ہو کر نکل گئے۔ لوگوں نے آپ سے عرض کیا کہ اِدھر سے گولے آتے ہیں، آپ گھوڑے سے اُتر پڑیں۔

یہ حال بیچ کی صف کے مُلکیوں نے دیکھا کہ گولے آتے ہیں اور آپ اپنے گھوڑے سے اُتر گئے ہیں۔ وہ تمام مُلکی در پردہ سردار سلطان محمد خاں سے ملے ہوئے تھے۔ یہ حال دیکھ کر مارے خوف کے وہاں سے کھسکنے لگے۔ کوئی بستی کی دیوار کی آڑ میں جا کھڑا ہوا اور کوئی نالے کے نشیب میں۔ فقط آپ کے لشکر کے سوار اور پیادے اور رفیقوں کے سوار و پیادے کم و بیش دو ہزار رہ گئے۔ فتح خاں پنجتاری، گھڑیالہ کے منصور خاں، شیوہ کے دونوں بھائی مشکار خاں اور انند خاں، کلابٹ کے اسمٰعیل خاں، گڑھی امازئی کے سرور خاں، اکوڑے کے خواص خاں خٹک اور اُن کے عزیزوں میں شہباز خاں خٹک، زیدے کے فتح خاں، تورو کے دلیل خاں، لُوند خوڑ کے نسیم خاں، کوٹھے کے مُلّا سیّد امیر آخوند زادہ، ٹوپی کے مُلّا بہاء الدین، ڈاگی کے مُلّا باقی، ان کے علاوہ اور مُلّا و طالب علم آپ کے ساتھ شریک رہے۔

پہلا شہید کالے خاں افغان قوم آفریدی ساکن موضع شمس آباد، جو چھتر بائی کے بعد سے ناراض ہو کر چلے گئے تھے اور نادم ہو کر پھر آئے تھے اور سیّد صاحبؒ کے ساتھ ہی رہا کرتے تھے، گھوڑے پر سوار صف کے آگے دائیں سے بائیں اور بائیں سے دائیں پھرتے تھے۔[2] اور لوگوں سے کہتے تھے کہ بھائیو! صف کے برابر جمے چلو۔ ناگہاں اُدھر سے ایک گولہ ٹپا کھا کر آیا اور اُن کے بائیں پہلو میں لگا اور وہ

---

[1] منظورہ

[2] "منظورۃ السعداء" میں ہے کہ کالے خاں سامنے آئے، تو سید صاحبؒ نے عبد اللہ والیہ کا گھوڑا، جو سبزہ رنگ تھا، ان کو دیا۔ اس کی لگام تھامتے ہی انھوں نے کہا کہ ان شاء اللہ اپنا سر توپ کے منہ میں دے دوں گا۔

گھوڑے پر سے زمین پر گر سے۔ لوگوں نے آپ سے عرض کیا کہ کالے خاں کے گولہ لگا۔ آپ نے سُن کر "اِنَّا لِلّٰهِ وَ اِنَّا اِلَیْهِ رَاجِعُوْنَ" پڑھا۔ صف کے لوگ آہستہ آہستہ جمے ہوئے آگے چلے جاتے تھے۔ جب کالے خاں کے قریب پہنچے، تو لوگوں نے دیکھا کہ قدرے جان باقی ہے۔ گولے سے پہلو نہیں ٹوٹا، مگر ایک نیلا داغ پڑگیا ہے۔ کالے خاں نے آہستہ سے کہا کہ میرے بازو پر تعویذ ہے، اُس کو کھول لو۔ کسی نے وہ تعویذ کھول لیا۔ کالے خاں وہیں رہے اور صف آگے نکل گئی۔

"انھیں گولوں سے لشکرِ اسلام کا سقہ اور کریم بخش گھاٹم پوری، جو سیّد صاحبؒ کے لیے کھانا پکا کر کمر میں باندھے ہوئے تھے اور چند لوگ شہید ہوئے۔

ایک فقیر، جن کو قلندر کابلی کہتے تھے، چند روز سے لشکرِ اسلام میں مقیم تھے۔ وہ قدسی کی مشہور نعت کی تضمین ع ـــــ "یا رسُولِ عربی، شاہسوارِ مدنی" ـــــ بڑی خوش الحانی سے پڑھا کرتے تھے۔ سیّد صاحبؒ بھی اُن سے بڑی بشاشت کے ساتھ فارسی میں گفتگو فرماتے تھے۔ وہ صف سے چار قدم آگے کھڑے تھے۔ اُنھوں نے جب حریف کی توپ کی آواز سُنی، تو اپنی جگہ سے اچھل کر رقص کرنے لگے اور کچھ زبان سے کہا، جس کو قریب کے آدمیوں نے سُنا۔ اتنے میں ایک گولہ اُن کے پاؤں کے پاس آکر گرا اور اُس سے اس قدر غبار اٹھا کہ قلندر اُس میں چھپ گیا۔ لوگ سمجھے کہ شہادت پائی۔ جب غبار چھٹا، تو قلندر برآمد ہوا۔ وہ اپنی گدڑی اپنے ہاتھ سے نچاتا تھا اور مست تھا"[1]

مجاہدین کی رجز خوانی | مولوی سیّد جعفر علی لکھتے ہیں کہ اس وقت دو شخص جنگ کی تحریض و تحریص کر رہے تھے اور اُن کی آواز اس وقت بڑی دل کش اور مُؤثّر تھی، ایک امان اللہ خاں ملیح آبادی، جو مُعمّر آدمی تھے، لیکن نہایت جری اور شجاع، وہ اس طرح بہادری، ثابت قدمی اور دلاوری کی باتیں کرتے تھے کہ بُزدل سے بُزدل انسان بھی اُن کی باتیں سُن کر جنگ پر آمادہ ہو جاتا۔ دُوسرے شیخ ریاست علی سوہانی جو مولوی خُرّم علی کے رسالۂ جہادیہ کے اشعار بڑے جوش و اثر کے ساتھ پڑھ رہے تھے۔

معرکہ | آگے بڑھ کر سیّد صاحبؒ نے ننگے سر ہو کر کمال عجز و زاری سے پھر دُعا کی کہ "الٰہی، ہم

[1] منظورہ

عاجز و ضعیف بندے ہیں۔ تیرے سوا ہمارا کوئی حامی و مددگار نہیں ہے، جو ہم کو بچائے۔ ہم نے اُن کو بہتیرا سمجھایا کہ تم ہم مسلمانوں سے نہ لڑو، مگر اُنھوں نے نہ مانا اور تُو دانا و بینا ہے، ہمارے دلوں کے بھید کو جانتا ہے۔ اگر تیرے علم میں ہم حق پر ہوں، تو ہم ضعیفوں کو فتحیاب کر اور جو وُہ حق پر ہوں، تو اُن کو۔"

اس عرصے میں اُن کے چار غولوں میں سے ایک نے، جس میں دو توپیں چلتی تھیں، گھوڑوں کی باگیں اُٹھا کر حملہ کیا، اس ہیئت سے کہ تلواریں ننگی علم کیے، داڑھیاں دانتوں میں دابے، دائیں بائیں مُنہ پھیرے "سیّد کُجاست، سیّد کُجاست؟" کہتے ہُوئے چلے۔ جب اتنے قریب آ پہنچے کہ چالیس پچاس قدم کا فاصلہ رہ گیا، سیّد صاحبؒ نے اپنے رفل بردار سے رفل لیا اور بآوازِ بلند تکبیر کہہ کر سر کیا۔ اس کے ساتھ ہی تمام غازیوں نے تکبیر کہہ کر ایک باڑھ ماری اور حملہ کر دیا، مگر وہ کسی طرح نہ رُکے۔ دفعتہً آ کر گڈمڈ ہو گئے۔ غازیوں نے اُن کو بھر ماری پر رکھ لیا۔ قرابینچی تو قرابین مارتے تھے، بندوقچی بندوق، تلوار والے تلوار، اور گنڈاسے والے گنڈاسے۔ خدا کی مدد سے اُن کا مُنہ پھر گیا۔ سیّد صاحبؒ نے فرمایا کہ ہاں، سواروں سے کہہ دو کہ تم بھی حملہ کر کے اُن کو لو۔ کسی نے کہا کہ سوار تو اوّل ہی شکست کھا کر، معلوم نہیں، کہاں چلے گئے۔[1]

---

[1] یہ سوار پیادہ فوج کی پشت پر تھے۔ دُرّانیوں کا ایک غول اُن کی طرف بڑھا اور دونوں طرف کے آدمی ایک دُوسرے میں گڈمڈ ہو گئے۔ مُلکی سوار بھاگ کھڑے ہُوئے۔ ساری لڑائی ہندوستانی سواروں پر پڑ گئی۔ رسالدار عبدالحمید خاں بڑی شجاعت اور جواںمردی سے لڑتے رہے۔ زخمی ہو کر گرے۔ سیّد موسیٰ، سیّد اسمٰعیل بریلوی بھی زخمی ہُوئے۔ تین ہزار دُرّانیوں کا مقابلہ پانسو ہندوستانی سواروں سے تھا۔ آخر ہندوستانی سوار متفرق ہو کر دُرّانیوں کے مجمع سے نکل آئے۔ دُرّانیوں نے کچھ دُور اُن کا تعاقب کیا؛ پھر اپنے لشکر کی طرف واپس گئے۔

"منظورہ" میں ہے کہ جس وقت سیّد صاحبؒ کی جماعت پر دُرّانی سواروں اور پیادوں کا حملہ ہوا، چُونکہ اُن کا ہجوم بہت تھا اور سیّد صاحبؒ کے ساتھ کے پیادے تھوڑے تھے، حاجی عبدالرحیم خاں مرحوم جو ایک مردِ درویش اور سیّد صاحبؒ کے محبِّ جاں نثار تھے، فرطِ محبت سے تاب نہ لا سکے اور سواروں کو للکار کر کہا کہ عزیزو، دُرّانیوں کے اس انبوہِ عظیم نے امیر المومنین کی جماعتِ قلیل پر حملہ کیا ہے۔ اگر آپ ہی نہ رہے، تو زندگی کا کیا مزہ؟ آؤ، بائیں جانب سے حملہ کریں۔ یہ سوار چُونکہ تعداد میں تھوڑے تھے اور دُرّانی تین ہزار کے قریب تھے، مقابلہ کی تاب نہ لا سکے۔ اس حالت میں حاجی عبدالرحیم، سیّد ابو محمدؒ، شیخ عبدالحکیم وغیرہ نے شہادت پائی اور سیّد موسیٰ اور رسالدار عبدالحمید خاں سخت زخمی ہو کر گھوڑے کی پیٹھ سے گرے۔ دُرّانی سوار جتنی بار پیادوں کے مقابلے سے پسپا ہوتے تھے، انھیں سواروں پر گرتے تھے۔ ۱۲ منہ

یہ سُن کر آپ خاموش ہوگئے۔ شیخ ولی محمد صاحب نے مولانا محمد اسمٰعیل صاحب سے کہا کہ اپنے سوار تو شکست کھا گئے۔ اب چل کر اُن کی توپیں لیں۔ شیخ صاحب اور مولانا نے کوئی ڈیڑھ سو غازیوں کے ساتھ اُن کا تعاقب کیا اور قواعد بھر باری پر رکھ لیا۔ ادھر اُن کا ایک دُوسرا غول اُسی ہیئت کے ساتھ "سیّد کجاست؟ سیّد کجاست" کہتا ہُوا اور اسی طرح گڈمڈ ہو گئے۔

سیّد صاحبؒ کی شجاعت اُس وقت سیّد صاحبؒ کے ساتھ کم و بیش پانسو غازی ہوں گے، باقی جا بجا متفرق ہو گئے۔ آپ کا حال یہ تھا کہ دائیں بائیں سے دونوں رفل بردار رفل بھر بھر کر دیتے تھے اور آپ دونوں طرف سے سر کرتے تھے۔ داہنے طرف والے کا سینہ داہنی جانب رکھ کر اور بائیں طرف والا بائیں جانب رکھ کر، چہرے پر خوف و ہراس کا نشان نہ تھا۔ یہ غول بھی بالآخر پسپا ہُوا۔ پچاس پچاس، ساٹھ ساٹھ مجاہدین ہر غول کے تعاقب میں گئے۔ سیّد صاحبؒ بھی پچاس ساٹھ آدمیوں کی جمعیت کے ساتھ ایک غول کے پیچھے بندوقیں سر کرتے ہُوئے چلے جاتے تھے۔

ادھر چھ سات سَو سواروں کا ایک اور پرا کھڑا تھا۔ اُنھوں نے دیکھا، تو گھوڑوں کی باگیں اُٹھا کر سیّد صاحبؒ کی جماعت پر حملہ آور ہُوئے۔ آپ اُس وقت ایک اَور غول کے تعاقب میں مشغول تھے۔ میاں خدا بخش رامپوری نے تین یا چار بار پُکار کر کہا کہ حضرت، سواروں کا ایک غول اس طرف بھی آتا ہے۔ یہ بات سُن کر ایک غازی نے کہا کہ چُپ رہو، آنے دو، حضرت کا نام نہ لو۔ یہ آواز سُن کر آپ بھاگنے والے غول کا تعاقب چھوڑ کر بڑی چُستی اور چالاکی کے ساتھ اُس آنے والے غول کی طرف پلٹ پڑے۔ یہ غول بھی اُسی ہیئت کے ساتھ ڈاڑھیاں دانتوں میں دابے، ننگی تلواریں علم کیے "سیّد کُجاست؟ سیّد کجاست؟" کہتے ہُوئے گڈمڈ ہو گیا۔ سیّد صاحبؒ نے اُنھیں پچاس ساٹھ غازیوں کے ساتھ بندوقوں، قرابینوں، تلواروں اور گنڈاسوں پر رکھ لیا۔ تائیدِ الٰہی سے وُہ پسپا ہُوئے اور دس بارہ غازیوں نے اُن کا پیچھا کیا اور آپ کے ہمراہ دس بارہ غازی رہ گئے۔

ایک لڑکے کی جُرأت تیرہ، چودہ برس کے ایک ننگی لڑکے کے پاس گنڈاسا تھا جس کو ملکی لوگ

کفر حپٹ کہتے تھے۔ اُس لڑکے نے لپک کر ایک سوار پر وار کیا۔ گنڈاسے کی نوک خمدار تھی۔ اِس سوار کی زرہ میں اٹک گئی۔ سوار بھاگا۔ لڑکا دونوں ہاتھوں سے اپنا گنڈاسا پکڑے ہوئے کھچا چلا جاتا تھا اور پشتو زبان میں کہتا تھا کہ " زُما کفرحپٹ ئے یوڑو، زُما کفرحپٹ ئے یوڑو" یعنی، ہمارا کفرحپٹ یہ شخص لیے جاتا ہے۔ اس کا یہ حال دیکھ کر کئی غازیوں نے اس سوار پر بندوقیں سرکیں۔ آخر اُس کے ایک گولی لگی اور گھوڑے سے زمین پر گرا اور گنڈاسے کی نوک اُس کی زرہ سے چھوٹ گئی۔ اس لڑکے نے اُس گنڈاسے سے اُس کا خاتمہ کیا۔

مولانا محمد اسمٰعیل اور شیخ ولی محمد صاحب کا کارنامہ

اس عرصے میں تین چار توپیں سر ہوئیں اور دُرّانیوں کے سواروں کے غول پراگندہ ہو کر بھاگ گئے۔ لوگوں نے سمجھا کہ مولانا اور شیخ ولی محمد صاحب نے دُرّانیوں کی توپوں پر قبضہ کر لیا۔ سیّد صاحبؒ نے آپ کے پاس آدمی بھیجا کہ آپ وہاں نہ ٹھیریے جلد توپیں لے کر ہمارے پاس آجائیے۔ انھوں نے آکر بیان کیا کہ ہم نے سواروں کا تعاقب کیا۔ اور اُن کو بھرماری پر رکھ لیا۔ وُہ سوار بدحواس ہو کر بھاگ گئے۔ جب وہ توپوں کے قریب پہنچے، تو وُہ توپ والے بھی اُن کا یہ حال دیکھ کر بھاگ کھڑے ہوئے اور ہم نے اُن کی توپوں پر قبضہ کیا۔ توپ بھرنے کا سامان وُہ اپنے ساتھ لیتے گئے۔ اُس وقت نواب خاں لنگڑے گھنتی والے وہاں موجود تھے۔ اُن کا لٹھ بالکل شنبے کی طرح تھا۔ اُن سے اُن کا لٹھ اور شیر محمد خاں سے توڑا لے کر چار فَیر سر کیے جس سے ... کا غول پراگندہ ہو گیا۔

مولانا اسمٰعیل صاحب نے فرمایا کہ کئی دُرّانی سوار مجھ تک آئے۔ میں نے (اپنی زخم خوردہ انگلی[1] کی وجہ سے) جتنے بار اپنی چقماقی بندوق چلائی، اُس کے پتھر نے خطا کی۔ جب کئی بار یہی صورت پیش آئی، تو مجھے گمان ہُوا کہ میری شہادت کا وقت آگیا۔ یہ دیکھ کر حافظ وجیہ الدین صاحب نے اپنی فتیلے دار بندوق سے حملہ آور سوار کو قتل کیا۔

---

[1] یاد ہوگا کہ پکھلی کی جنگ میں مولانا کی دائیں ہاتھ کی چھنگلیا زخمی ہو گئی تھی۔ اس کی وجہ سے وہ ہتھیلی پورے طور پر کام نہیں کرتی تھی اور بندوق کا بھرنا مشکل تھا۔ اسی بنا پر جنگ کے وقت اکثر اپنے ساتھ کار توس رکھتے تھے۔ اکثر از راہِ ظرافت اپنی اس چھنگلیا کے متعلق فرماتے تھے کہ یہ میری دُوسری انگشتِ شہادت ہے۔ (منظور ہ)

دُرّانیوں کی ہزیمت اس عرصے میں دُرّانیوں کے سوار جو جا بجا پراگندہ اور منتشر ہو گئے تھے، اپنی پہلی صف گاہ پر پرا باندھ کر کھڑے ہو گئے۔ سید صاحبؒ نے اُن کی جمعیت دیکھ کر سر برہنہ ہو کر بآوازِ بلند دُعا کی۔ پھر مولانا سے فرمایا کہ میاں صاحب، آپ جا کر شاہینیں سر کرائیں۔ مولانا نے جا کر اُونٹوں پر سے شاہینیں اُتروائیں اور زمین پر قطار باندھ کر رکھوائیں اور ہر شاہین پر چار چار غازی متعین کیے اور اجازت دی کہ ڈیوڑھ مارو۔ شاہینوں کی آہنی گولیاں پڑتی تھیں، مگر سواروں کا غول اُسی طرح جما کھڑا تھا۔ سید صاحبؒ توپوں کے پاس گئے۔ شیخ مولا بخش الہ آبادی نے توپ بھر کر دُرّانیوں کی طرف لگا رکھی تھی۔ آپ کی اجازت کا انتظار تھا۔ آپ نے جُھک کر دیکھا تو معلوم ہوا کہ توپ دُرّانیوں کے نشان کے سامنے ہے۔ آپ نے اُس کا پیچ تھوڑا سا پھیر کر فرمایا کہ اب سر کرو۔ شیخ مولا بخش نے آگ دی اور اُس فیر میں نشان بردار اُڑ گیا اور وہ غول پراگندہ ہو گیا۔ دُوسرے یا تیسرے فیر میں دُرّانی پسپا ہو کر بھاگے۔ جب تک وہ توپ کی زد پر رہے، شیخ ممدوح توپ چلاتے رہے؛ جب دُور نکل گئے، تب توپ چلانی موقوف کی اور شاہینیں بھی بند ہوئیں۔

جنگ کے اختتام پر معرکۂ جنگ سے فارغ ہو کر مجاہدین، جو بہت پیاسے تھے، اس تالاب پہ آئے، جو مایار کے قریب دائیں ہاتھ کو تھا۔ تالاب کا پانی دُھوپ سے گرم تھا، لیکن شدتِ تشنگی میں مجاہدین اسی سے اپنی پیاس بجھانے لگے۔ اتنے میں گاؤں کے لوگ پانی کے گھڑے بھر بھر کر لائے اور غازیوں کو سیراب کیا۔

اِسی عرصے میں پراگندہ اور منتشر لوگ بھی جمع ہونا شروع ہو گئے۔ شاہین و نقارہ بھی وہیں آگیا۔ اس تالاب پر دیر تک سید صاحبؒ اور مجاہدین نے قیام کیا۔ یہ بھی خیال تھا کہ چونکہ دُرّانی سوار تعداد میں زیادہ ہیں، اگرچہ شکست کھا کر دُور تک چلے گئے ہیں، لیکن کیا عجب ہے کہ اُن کے سواروں میں سے کوئی جرأت سے کام لے کر پھر پلٹ پڑے۔ جب آفتاب ڈوبنے لگا اور دشمن زیادہ فاصلہ طے کر چکے، تو آپ نے مایار کی گڑھی کی طرف مراجعت فرمائی۔

زخمیوں کی مرہم پٹی مولوی مظہر علی عظیم آبادی زخمیوں کو جمع کرنے، نمازِ جنازہ پڑھنے اور شُہدا کی تدفین

کے لیے مقرر ہوئے۔ تمام زخمی مایار کی گڑھی میں جمع کیے گئے۔ جرّاح حاضر ہوئے اور وہ زخموں کے سینے اور مرہم پٹی میں مشغول ہوئے۔ مغرب کی نماز گڑھی مایار میں ہوئی۔

مولوی جعفر علی صاحب لکھتے ہیں: لوگ اگرچہ صبح سے بھوکے تھے، لیکن فتح کی خوشی سے کھانے سے بے پروا اور آسودہ تھے۔ دن بھر کے تھکے ماندے ہونے کی وجہ سے اکثر لوگ پڑ کر سو گئے لیکن جراحوں کو زخموں کے سینے اور مرہم پٹی سے فرصت نہ تھی۔ عام طور پر لوگ سو رہے تھے۔ چراغ پکڑنے والا اور روشنی دکھانے والا بھی بڑی مشکل سے ملتا تھا۔ نُعَاسًا یَّغْشٰی طَآئِفَۃً مِّنْهُمْ کا منظر تھا۔ آنکھ بے اختیار بند بند ہو ہو جاتی تھی۔ نصف شب کے بعد زخموں کے سینے اور مرہم پٹی سے فراغت ہوئی۔

چھبیسواں باب

مایار کے شہدا و مجروحین

شہدا کا دمِ واپسیں ہدایت اللہ بانس بریلوی کہتے ہیں کہ جس وقت کالے خاں[1] کے گولہ لگا اور وہ گھوڑے سے گر پڑے اور صف آگے بڑھ گئی، ہم کئی آدمی اُن کو وہاں سے مایار کی مسجد کے حجرے میں اُٹھا لائے۔ وہ جان کنی کی حالت میں تھے۔ گھڑی گھڑی، دو دو گھڑی کے فاصلے سے اُنھوں نے پوچھا کہ بھائی، لڑائی کا کیا حال ہے اور کس کی فتح ہے؟ اس وقت تک دُرّانیوں کا پہلا اور دوسرا غول آیا تھا۔ میں نے اُن سے کہا کہ ابھی تو معاملہ گڈمڈ ہے، ابھی تک فتح اور شکست کسی کی نہیں ہوئی۔ یہ سُن کر وہ چپ ہو رہے اور اللہ اللہ کیا کیے۔ پھر جب دُرّانیوں کا دُوسرا غول آیا اور شکست کھا کر بھاگ گیا، تب اُنھوں نے پھر پوچھا کہ اب لڑائی کا کیا طور ہے؟ کسی کی فتح ہوئی یا نہیں؟ میں نے کہا کہ اللہ تعالیٰ نے

---

[1] یہ کالے خاں چھترباڑی سے رُوٹھ کر پنجاب کو چلے گئے تھے۔ چند روز کے بعد پھر آئے اور سید صاحبؒ کے ہاتھ پر تائب ہو کر از سرِ نو بیعت کی۔ اوّل اُن کا یہ طور تھا کہ اپنی ڈاڑھی بیچ میں صفاچٹ رکھتے تھے۔ ایک دن اُنھوں نے ٹھوڑی منڈائی تھی۔ سید صاحبؒ نے اُن کی ٹھوڑی اپنے ہاتھ سے ٹٹول کر اُن سے فرمایا کہ خان بھائی، تمھاری ٹھوڑی کیا چکنی چکنی ہے! اس بات سے وہ شرما گئے اور کچھ نہ بولے، مگر سید صاحبؒ کا وہ کہنا اُن کے دل میں اُتر گیا۔ کئی دن کے بعد جب معمول کے موافق نائی آیا اور چاہا کہ ٹھوڑی بھگوئے اور مونڈے، تو اُنھوں نے کہا کہ اس ٹھوڑی میں سید صاحبؒ کا ہاتھ لگا ہے؛ اب تو اس میں ہاتھ نہ لگاؤ، یوں ہی رہنے دے۔ پھر اُس دن سے اُنھوں نے اپنی ٹھوڑی نہ منڈائی اور بڑے صالح اور متقی ہو گئے۔ یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ نے اُن کو نعمتِ شہادت سے سرفراز کیا۔

ہمارے سید صاحبؒ کو فتحیاب کیا۔ یہ خوشخبری سُن کر اُنھوں نے کہا: اَلْحَمْدُ لِلّٰہ! اسی دم اُن کا دم نکل گیا۔

قاضی گل احمدالدین صاحب بیان کرتے ہیں کہ مَیں نے ایک جگہ دیکھا کہ سیّد ابو محمّدؒ صاحب[1] زخمی پڑے ہیں، مگر ایسے کاری زخم لگے تھے کہ قدرے جان تو اُن میں باقی تھی، ہوش و حواس کچھ بر جا نہ تھے۔ مَیں نے کئی بار اُن کے کان میں پکار کر کہا کہ سیّد ابو محمّد صاحب، حضرت امیرالمؤمنین کی فتح ہوئی۔ اُنھوں نے کچھ خیال نہ کیا اور نہ کچھ جواب دیا، مگر اُن کا حال یہ تھا کہ ہونٹ اپنے چاٹتے جاتے تھے اور اَلْحَمْدُ لِلّٰہ! اَلْحَمْدُ لِلّٰہ! کہتے جاتے تھے اور جو لوگ لاشیں اُٹھا رہے تھے، مَیں نے اُن کو آواز دی کہ کوئی ادھر آؤ، سیّد ابو محمّد صاحب اِدھر پڑے ہیں۔ ادھر سے ایک آدمی آیا۔ میرے پاس ایک کمّل تھا۔ اُن کو اُٹھا کر اُس میں لٹایا۔ ہم دونوں آدمی اُن کو تورو میں لائے۔ تب تک اُن میں رمق باقی تھی۔ اسی طرح ہونٹ بھی چاٹتے تھے اور لبوں سے کچھ اشارہ اَلْحَمْدُ لِلّٰہ! کہنے کا معلوم ہوتا تھا۔ پھر کچھ دیر میں جان نکل گئی۔

نوجوان زخمی سیّد موسیٰ ۱۷، ۱۸ سال کے جوان تھے۔ اُن کے والد سیّد احمد علی صاحب جس دن پھولڑے کی لڑائی میں شہید ہُوئے، اس دن سے سیّد مُوسیٰ کی طبیعت مغموم رہنے لگی۔ کبھی کبھی اپنے دوستوں سے کہتے کہ اگر کبھی میرا کسی لڑائی میں جانے کا اتفاق ہُوا، تو انشاء اللہ بیچ کھیت میں مجھ کو دیکھنا،

---

[1] سیّد ابو محمد صاحب لکھنؤ میں ٹبالین میں جمعدار تھے۔ بہت بانکے ترچھے، وضعدار اور خوبصورت جوان تھے۔ بڑے بڑے چابک سوار اُن کی اُستادی کے قائل تھے۔ مزاج میں بڑی لطافت اور نفاست تھی۔ کسی کے ہاتھ کا پکا کھانا ان کو پسند نہ آتا تھا۔ اپنے ہی ہاتھ سے دن رات میں ایک بار پکا کر کھاتے تھے۔ اکثر فنون میں مہارت رکھتے تھے۔ کپڑا ایسا قطع کرتے اور سیتے کہ بڑے بڑے اُستاد حیران رہ جاتے تھے۔ پندرہ بیس وضع کی پگڑی باندھتے تھے۔ اپنے ہاتھ سے گھوڑے کا سب ساز و یراق سی لیتے تھے اور آپ ہی اپنا خط آئینہ سامنے رکھ کر بناتے تھے۔ غرارے دار پاجامہ، چُست انگرکھا پہنتے تھے۔ بانکپن کے باوجود نہ کبھی سر پر بال رکھے، نہ کبھی حُقّہ پیا، نہ نشے کی کوئی چیز کھائی پی، نہ کسی نامحرم عورت کی طرف بُری نگاہ سے دیکھا۔ تیمار داری، خدمتگزاری میں بڑے چُست تھے۔ بیماروں کا بول و براز اٹھاتے تھے۔ جب سیّد صاحبؒ نے ہجرت کی تیاری کی، تو آپ نوکری چھوڑ کر رُخصت کرنے آئے۔ کوئی پوچھتا کہ سیّد ابو محمّد، کیا تم بھی ہجرت کر کے جہاد کو چلو گے، تو کہتے: مَیں تو نہیں جانتا کہ ہجرت اور جہاد کس کو کہتے ہیں۔ ہمارے بھائی میاں صاحب جاتے ہیں، ہم نے کہا کہ ہم بھی دلمئو تک پہنچا آئیں۔ یوں کہتے کہتے دلمئو سے باندہ، گوالیار، ٹونک، اجمیر اور یہاں تک کہ سرحد پہنچ گئے۔

یعنی، مَیں بھی لڑ کر شہید ہو جاؤں گا۔ اُن کے اس حال کی اطلاع سیّد صاحبؒ کو بھی تھی۔ وہ رسالدار عبدالحمید خاں کے سواروں میں تھے۔ جب تُورو سے مایار کی طرف لشکر چلا، تو آپ نے اُن سے کہا کہ تم اپنا گھوڑا اور کسی بھائی کو دے دو اور تم ہمارے ساتھ پیادوں میں رہو۔ اُنھوں نے عرض کیا کہ آپ مجھ کو یوں ہی رہنے دیجیے۔ جب دُرّانیوں کا حملہ آیا، آپ گھوڑے کی باگ اُٹھا کر اُس میں گُھس گئے اور خوب تلوار سے لوگوں کو مارا اور زخمی کیا اور آپ بھی زخمی ہُوئے، مگر لڑتے رہے۔ جب زخموں کے مارے دونوں ہاتھ بیکار ہو گئے اور کئی زخم سر میں لگے، اُس وقت بیتاب ہو کر گھوڑے سے گرے۔

خادی خاں[1] کہتے ہیں کہ مَیں نے دُور سے سُنا کہ کوئی زخمی پڑا ہُوا اللّٰہ ! اللّٰہ کہ رہا ہے۔ مَیں نزدیک گیا، تو پہچانا کہ یہ تو سیّد موسیٰ ہیں۔ سر کے زخموں سے جو خُون بَہ رہا تھا، اُس سے اُن کی آنکھیں بند تھیں۔ مَیں نے کہا کہ میاں مُوسیٰ، مَیں آپ کو اُٹھا لے چلوں ؟ اُنھوں نے پوچھا کہ تم کون ہو اور فتح کس کی ہُوئی ؟ مَیں نے کہا کہ میں خادی خاں ہُوں اور فتح سیّد بادشاہ کی ہُوئی۔ یہ سُن کر اُنھوں نے کہا : اَلْحَمْدُ لِلّٰہ ! اور قدرے چاق سے ہو گئے اور مجھ سے کہا کہ مجھ کو لے چلو۔ مَیں اپنی پشت پر سوار کر کے اُٹھا لایا۔ سیّد صاحبؒ نے اُن کو بے چین دیکھ کر فرمایا کہ ان کو مایار کی مسجد کے حجرے میں پہنچاؤ۔ آپ نے اُن کے بعض رفیقوں کو اُن کی خدمت کے لیے ساتھ کر دیا۔

مولوی سیّد جعفر علی لکھتے ہیں کہ سیّد صاحبؒ اُن کو دیکھنے تشریف لائے۔ آپ نے فرمایا کہ یہ بچّہ بڑا مردانہ نکلا اور مالکِ حقیقی کا حق خوب ادا کیا۔ پھر اُن سے خطاب کر کے فرمایا کہ الحمدللہ، تمھارے ہاتھ پاؤں اللہ کے راستے میں کام آئے اور تمھاری کوششیں مشکور ہوئیں۔ اگر تم کسی کو دیکھو کہ خوش رفتار گھوڑے پر سوار ہے اور اُس کو ایڑ لگاتا ہے اور دَوڑاتا ہے، تو تم کبھی اس کی حسرت نہ کرنا کہ ہمارے ہاتھ پاؤں سلامت ہوتے، تو ہم بھی اسی طرح شہسواری کرتے، اس لیے کہ تمھارے ہاتھ پاؤں اللہ تعالیٰ کے یہاں قبول ہو گئے۔ بڑے مُبارک ہیں وُہ ہاتھ پاؤں، جو رضائے مولیٰ کے راستے میں کام آئیں اور اس پر قربان ہو جائیں۔ اگر کبھی کسی شخص کو دیکھو کہ وہ پٹہ باز استادوں کی طرح تلوار سے کھیلتا ہے، تو کبھی یہ غم نہ کرنا کہ ہم بھی تندرست ہوتے، تو سپہ گری کا کمال دکھلاتے، اس لیے کہ

---

[1] یہ خادی خاں قندھاری ہیں، جو سیّد صاحب کی فوج مجاہدین میں تھے۔

تمھارے اِن ہاتھ پاؤں کا بڑا مرتبہ ہے کہ اللہ کے راستے میں اُنھوں نے زخم کھائے۔ جو ہاتھ پاؤں صحیح و سالم ہیں، اُن سے گناہ کا اندیشہ ہے، لیکن تمھارے ہاتھ پاؤں کا ثواب اللہ تعالیٰ کے یہاں جمع ہے۔ سیّدنا علی مرتضیٰؓ کے بھائی حضرت جعفر طیارؓ کے دونوں بازو اللہ کے راستے میں کٹ گئے! اللہ تعالیٰ نے اُن کو جنّت الفردوس میں ذوالجناحین کے لقب سے سرفراز فرمایا اور زمرّد کے دو بازو اُن کو عطا فرمائے۔

سیّد موسیٰ نے عرض کیا کہ حضرت، مَیں ہزار زبان سے اللہ کا شکر ادا کرتا ہوں اور اس حال پر راضی و شاکر ہوں۔ میرے دل میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے قطعاً کوئی شکایت نہیں آتی، اس لیے کہ اسی کام کے لیے آپ کی ہمرکابی میں یہاں آیا تھا۔ الحمدللہ کہ اپنی ہستی کو اس افضل ترین عبادت میں ہٹا دیا۔ اللہ تعالیٰ قبول فرمائے! لیکن میری اتنی تمنّا ہے کہ حضرت مجھے روزانہ اپنی زیارت سے مشرف فرما دیا کریں، اس لیے کہ اپنی بے دست و پائی سے خود حاضر ہونے سے معذور ہوں۔ اس محرومی کے سوا مجھے کسی بات کا قلق نہیں۔

یہ سُن کر سیّد صاحبؒ نے دادا ابوالحسن سے فرمایا کہ مَیں تم کو اس کام کے لیے مقرر کرتا ہوں۔ تم مجھ کو جس وقت ذرا بھی فارغ دیکھو، متوجہ کر دو تاکہ مَیں خود سیّد موسیٰ کے پاس آ جاؤں۔ پھر آپ نے سیّد موسیٰ کی بڑی تعریف کی اور اُن کو شاباش دی اور تشریف لے گئے۔[1]

ایک زخمی کی استقامت مولوی سیّد جعفر علی لکھتے ہیں کہ "شیخ محمد اسحاق گورکھپوری نے جب مجاہدین کے سواروں کو شکست کھاتے ہوئے دیکھا، تو اگرچہ وہ پیادوں میں تھے، لیکن وہ سواروں کی طرف دوڑے۔ ایک سوار نے اُن کے سینے پر نیزے سے حملہ کیا۔ اُنھوں نے اُس کے وار سے بچنے کے لیے اپنے سینے کو دائیں طرف جھکا دیا۔ نیزہ بائیں شانے پر لگا۔ اُنھوں نے زور کیا، تو نیزے کی ڈنڈی ٹوٹ گئی اور اُس کی انی شانے کی ہڈی میں پیوست ہو گئی۔ اُنھوں نے اِس حالت میں اس سوار پر تلوار سے حملہ کیا۔ اتنے میں دوسرے سوار اس سوار کی مدد کے لیے آ گئے۔ اُن میں سے ایک نے اُن کے سر پر تلوار

---

[1] "منظورۃ السعداء"۔ بز ڈھیری میں (غالباً رجب ۱۲۴۶ھ میں) سیّد موسیٰ کے انتقال کی خبر پہنچی۔

ماری، دُوسرے نے اُن کے دائیں ہاتھ پر وار کیا، جس سے اُن کی کئی انگلیاں کٹ گئیں۔ تیسرے نے اُن کے بائیں شانے پر، جہاں نیزے کا زخم تھا، ضرب لگائی۔ یہ ضرب کاری تھی۔ اس کے علاوہ اور بھی زخم آئے۔ ان کی رفل اس دن ٹھیک کام نہیں کر رہی تھی۔ اُنھوں نے اس حالت میں رفل تو سعدی خاں غازی کے حوالے کی اور تلوار دُوسرے غازی کو، جو بے سرو سامان تھا اور صرف تبر لیے ہُوئے تھا۔ اُنھوں نے دونوں کو سخت تاکید کی کہ یہ اللہ کا مال ہے۔ تم کو اپنی جان کر تمھارے حوالے کیا ہے۔ یہ ضائع نہ ہونے پائے۔ اُن کے دونوں ہاتھ بیکار ہو گئے تھے۔ اس لیے وہ مایار کی طرف روانہ ہو گئے۔ راستے میں میاں جی محی الدین ملے، جو زخمی پڑے ہُوئے تھے۔ انھوں نے اُن کا ہاتھ دائیں ہاتھ سے تھام کر جس کی اُنگلیاں زخمی تھیں، اُن کو لے کر چلنا شروع کیا۔ تھوڑی دیر چل کر اُن کو غش آ گیا اور زمین پر گر گئے۔ یہ خاکسار (مولوی سیّد جعفر علی) پاس سے گُزرا، تو سب سے پہلے اُنھوں نے دریافت کیا کہ لشکرِ اسلام کو فتح ہُوئی یا نہیں؟ مَیں نے جب اُن کو فتح کی بشارت سنائی، تو وُہ شگفتہ اور مسرور ہو گئے اور فرمایا کہ بھائی، آؤ، تم سے گلے مل لُوں۔ جب معانقے سے فارغ ہُوئے، تو کہنے لگے کہ حدیث میں آیا ہے کہ شُہدا کو سکراتِ موت کی تکلیف نہیں ہُوتی، بس صرف اِتنا معلوم ہوتا ہے کہ چیونٹی نے کاٹ لیا ہے۔ چنانچہ مَیں دیکھ رہا ہوں کہ مجھے اتنے زخم آئے ہیں، مگر معلوم ہوتا ہے کہ بس کانٹا چُبھا ہے۔[۱]

رسالدار عبدالحمید خاں رسالدار عبدالحمید خاں سیّد صاحبؒ کی صف کی پشت پر چلے جاتے تھے۔ درانیوں کے تین غول تھے، جو سیّد صاحبؒ کے مقابل میں اور ایک سواروں کے مقابلے میں، ایک غول سیّد صاحبؒ کی طرف گھوڑوں کی باگیں اُٹھا کر حملہ آور ہُوا اور ایک سواروں کی طرف۔ اس عرصے میں کسی شخص نے رسالدار عبدالحمید خاں سے کہا کہ حضرت کا حکم ہے کہ تم بھی ہلّہ کرو۔ یہ حکم سُنتے ہی رسالدار صاحب نے اپنے سواروں کو لے کر ہلّہ کر دیا اور سب سوار رسالدار صاحب کے ہمراہ اُن میں جا کر گڈ مڈ ہو گئے۔ جتنے مُلکی سوار مجاہدین کے سواروں کے ساتھ تھے، وہ سب اسی دم طرح دے کر بھاگ کھڑے ہُوئے۔

---

۱ منظورۃ السعداء

ساری لڑائی مجاہدین پر آپڑی اور سب سوار سمٹ کر رسالدار صاحب کے ساتھ ہو گئے۔ جدھر رسالدار صاحب اپنے سواروں کو لے کر باگ اٹھاتے تھے، دُرّانیوں کا غول صاف چیر کر تلواریں مارتے ہوئے اس پار نکل جاتے تھے۔ رسالدار صاحب افسوس کر کے کہتے تھے کہ اگر اس وقت میرے پاس سبزہ گھوڑا ہوتا، تو میرے دل کا ارمان نکلتا[1]۔ تین چار بار اسی طرح اپنے سب سواروں کے ساتھ حملہ کر کے اُن کے غول میں گھسے اور تلواریں مارتے ہوئے پار نکل گئے۔ انھیں حملوں میں سوار شہید بھی ہوئے اور زخمی بھی ہوئے۔ رسالدار صاحب کے بھی تلواروں کے ہلکے سے کئی زخم لگے، مگر وہ اسی طرح لڑتے رہے۔ پھر رسالدار صاحب نہایت زخمی ہو کر گھوڑے سے گرے۔ جسم فربہ تھا۔ زرہ کی کڑیاں دشمن کی تلوار کے ساتھ ان کے جسم میں پیوست ہو گئیں۔ جب اُن کو اور سید موسیٰ کو میدان سے اٹھا کر مایار کی گڑھی میں لائے، تو اُن کی صورت دیکھ کر ہر ایک پر رقت طاری ہو جاتی تھی۔ زخموں کی مرہم پٹی کے لیے اُن کو موضع تورو میں لائے۔ وہاں سے دوسرے زخمیوں کے ساتھ پنجتار بھیجے گئے، جہاں وفات پائی۔

شیخ امیر اللہ تھانوی شیخ امیر اللہ تھانوی کی ران میں بندوق کی گولی اور دائیں ہاتھ میں تلوار کا زخم لگا تھا۔ وہ بائیں ہاتھ میں خون آلود تلوار لے کر کہتے تھے کہ میرا دایاں ہاتھ بیکار ہو گیا ہے، بائیں ہاتھ سے کچھ کام نہیں ہو سکتا۔ اس لیے یہ تلوار اس غازی کو دوں گا، جو اس سے دشمنانِ دین کو قتل کرے۔

جب نور بخش جرّاح اُن کے زخموں کی مرہم پٹی کے لیے آئے، تو اُنھوں نے شیخ صاحب سے کہا کہ آپ کہا کرتے تھے کہ یہاں آ کر مجھے کیا حاصل ہوا؟ ابھی تک تو نکسیر تک نہ پھوٹی۔ اب سچ فرمائیے، نکسیر پھوٹی یا نہیں؟ شیخ امیر اللہ نے فرمایا کہ ہاں، الحمد للہ، اللہ تعالیٰ قبول فرمائے۔

دوسرے شہدا مایار کی جنگ میں چالیس غازیوں کے قریب شہید ہوئے۔ جن حضرات کا نام خصوصیت کے ساتھ اُوپر آچکا ہے، اُن کے علاوہ چند نام، جو مل سکے ہیں، وہ یہ ہیں:

شیخ عبد الرحمٰن رائے بریلوی، میر رستم علی چلکانوی، مولوی عبد الرحمٰن تورو کے،

---

[1] رسالدار صاحب کے پاس دو گھوڑے تھے: ایک سمند، دوسرا سبزہ۔ سبزہ اُن کا قدیمی گھوڑا تھا۔ وہ خوب درست کیا ہوا تھا۔ برچھے، تلوار، بندوق پر خوب لگا ہوا تھا۔ اس پر سوار ہو کر وہ چھری کٹار سے خاطر خواہ لڑ لیتے۔ جس سمند پر وہ اس وقت سوار تھے وہ اُن کی مرضی کے موافق تربیت یافتہ نہ تھا۔

حاجی عبدالرحیم[1] پھلی والے، شیخ عبدالحکیم پھلتی ، کریم بخش گھاٹم پوری۔

غازیوں کی اٹھائیس لاشیں تھیں، جو مولوی مظہر علی صاحب کو ملیں۔ نو لاشیں مولانا اسمٰعیل صاحب نے دفن کرائیں۔

مایار کے مجروحین مایار کے جن مجروحین کے نام اُوپر آئے ہیں، اُن کے علاوہ حسبِ ذیل حضرات زخمی پائے گئے :

عبدالکریم خاں (آنولہ)، نُور محمدؐ، اُن کے بھائی حاجی چاند ناگوری، اللہ بخش باغپتی، میاں جی سید محی الدین پھلتی، محمد سعید خاں رائے بریلوی، قاضی مدنی، مولوی عبدالحکیم بنگالی مولوی احمد اللہ برادر مولانا عبدالحی، عبدالرحمٰن دکھنی، اعتباری، پیر محمد پانی پتی۔

سید اسمٰعیل رائے بریلوی، شیخ نصر اللہ خورجوی، امام الدین پانی پتی، کریم بخش پنجابی، اسمٰعیل خاں خانپوری ہلکے طور پر زخمی تھے۔

میدانِ جہاد کا غبار وقائع میں ہے کہ معرکے کے بعد سید صاحبؒ سب غازیوں کے ساتھ نالے پر آئے۔ نالے کے پار چند درختوں کا ایک باغیچہ سا تھا۔ نالہ اُتر کر اس میں ٹھیرے اس وقت تمام لوگوں کے کپڑے اور چہرے ایسے گرد آلود تھے کہ بعض آدمی فوراً پہچانے نہیں جا سکتے تھے۔ ارباب بہرام خاں حضرت کے پاس آئے اور رُومال لے کر چاہا کہ آپ کے چہرے سے گرد جھاڑیں۔ آپ نے فرمایا کہ خان بھائی، ابھی ٹھیر جاؤ، یہ غبار بہت برکت والا ہے۔

حضرت سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس گرد کی بڑی فضیلت بیان کی ہے کہ جس کے پیروں پر یہ غبار پڑے، وُہ شخص عذابِ نار سے نجات پائے گا۔ یہ تمام تکلیف و مشقت اسی گرد کے لیے ہم نے اُٹھائی ہے۔ یہ بات سُن کر سب لوگ اسی طرح گرد آلود رہے۔ اس جگہ کسی نے گرد نہ جھاڑی۔

تُورو کو واپسی اور دُعا ظہر کی نماز کے بعد ننگے سر ہو کر بہت دیر تک آپ نے دُعا کی۔ اس دُعا میں اپنی دانست میں اللہ تعالیٰ کی خداوندی اور پروردگاری، عظمت و جبّاری اور رحمت و غفاری

---

[1] یہ غالباً حضرت حاجی عبدالرحیم ولایتی، میاںجی نُور محمد جھنجھانوی رحمۃ اللہ علیہ کے شیخ اور سلسلۂ صابریہ امدادیہ کے رُکن رکین ہیں۔

اور اپنی ناتوانی و خاکساری کا کوئی دقیقہ اُٹھا نہیں رکھا۔ آپ کے آنسو اس طرح جاری تھے کہ ڈاڑھی تر ہو گئی تھی اور یہی حال تقریباً تمام لوگوں کا تھا۔ دُعا کے بعد چند گھڑی اور بیٹھے رہے، پھر کُوچ کیا اور موضع تُورو میں آکر عصر کی نماز پڑھی۔

ترانۂ حمد و توحید میدان سے مظفرؔ و منصوُر واپس آنے کے بعد سیّد صاحبؒ نے ارشاد فرمایا کہ اللہ تعالیٰ کا ہزار ہزار شکر ہے کہ اس نے اپنے کرم عمیم سے ہم کو فتح نصیب فرمائی اور مسلمان بھی رکھا اور یہ بھی بڑا فضل فرمایا کہ باوجود قلت تعداد و سامان ہم سے کوئی یہ نہیں کہتا کہ ہم نے فتح حاصل کی یا ہم دشمن پر غالب آئے۔ ہمارے سب غازیوں کا یہی کہنا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے محض اپنی قوت و قدرت سے ہم کو ایسے زور آور حریف پر، جو سلطنت اور خزانوں کا مالک تھا اور جو مور و ملخ کی طرح ہم پر چڑھ کر آیا تھا، ہم کو فتحمند کیا۔

اس کے بعد فرمایا کہ یہ بھی اللہ تعالیٰ کا بڑا کرم تھا کہ اس جنگ میں ہمارے دل میں عجیب قسم کا اطمینان اور سکینت نازل فرمائی کہ جنگ کا شور و ہنگامہ ہمارے دل پر کوئی اثر نہ کر سکا۔ اس وقت ہم کو میدانِ جنگ میں جانا اور دشمن سے لڑنا ایسا معلوم ہوتا تھا، جیسے کوئی دعوت کو جاتا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جیسے ہم کہیں کھچڑی کھانے گئے تھے۔

شہداء کی تدفین اور دُعا شہداء کو دفن کے لیے لایا گیا۔ مولانا محمد اسمٰعیل صاحب نے فرمایا کہ ان سب کے چہرے ان کے عماموں سے چھپا دو اور ان کے کپڑے دیکھ لو۔ جو کچھ پیسہ روپیہ وغیرہ بندھا ہو اس کو کھول لو۔ کسی شخص نے قبر میں اُتر کر اُن کے چہرے ڈھک دیے اور پٹکے وغیرہ ٹٹول لیے۔ پھر کئی آدمی ایک بڑی سی چادر قبر کے مُنہ پر تان کر کھڑے ہو گئے اور سب مٹی دینے لگے۔ تختے بنگے کچھ نہیں رکھے گئے۔ اسی طرح صرف مٹی سے توپ دیا۔ اس کے بعد مولانا صاحب اور سب نے مل کر بہت دیر تک اُن سب کے لیے دُعاءِ مغفرت کی۔ جو لوگ شریکِ دفن تھے، محبت سے روتے جاتے تھے اور کہتے تھے کہ یہ لوگ تو جس مُراد کو آئے تھے، اُس مُراد کو پہنچے، ہم لوگوں کو بھی اللہ تعالیٰ ایسی شہادت نصیب کرے!

تھوڑی دیر کے بعد مغرب کی اذان ہُوئی۔ سب نے سیّد صاحبؒ کے پیچھے نماز پڑھی۔ نماز کے

بعد آپ نے بہت دیر تک سر برہنہ ہو کر ان شہیدوں کی مغفرت کے واسطے دُعا کی کہ پروردگار، تُو خوب جانتا ہے کہ یہ تمام لوگ محض تیری خوشنودی اور رضا کے لیے اپنا گھر بار اور مال و متاع چھوڑ کر یہاں آئے تھے اور صرف تیری ہی راہ میں اُنھوں نے اپنی جانیں صرف کیں۔ اُن کے گناہوں کو اپنے دامنِ رحمت میں چھپا لے اور فردوسِ بریں میں اُن کو جگہ دے اور اُن سے راضی ہو! اور جو ہم چند ضعفا اور غربا تیرے عاجز بندے باقی ہیں، اُن کو بھی اپنی رضامندی اور خوشنودی کی راہ میں جان و مال کے ساتھ قبول فرما! خطرات و وساوس دُور کر اور دلوں کو اپنے اخلاص و محبت سے معمور کر اور اپنے اِس دینِ محمّدی کو قوّت اور ترقی عطا کر! اور جو لوگ اِس دینِ متین کے دشمن و بدخواہ ہوں، اُن کو ذلیل و رُسوا کر! اور جو مسلمان فریبِ نفس و شیطان سے شریعت کی راہِ راست سے بھٹک کر بادیۂ ضلالت میں پڑے ہیں، اُن کو ہدایت کر کہ پکّے مُسلمان ہو کر تیرے اس کارِ خیر میں جان و مال اور اہل و عیال کے ساتھ شریک ہوں!

ہمارے پھُلت والے بھائیوں کو نظر نہ لگاؤ

دُعا کے بعد کسی صاحب نے کہا کہ حضرت، آج کی لڑائی میں چالیس غازیوں کے قریب شہید ہُوئے اور زخمی بھی بہت ہُوئے اور اچھے اچھے لوگ کام آئے، مگر شہیدوں اور زخمیوں میں جو خیال کیا، تو پھلت والے بھائیوں میں سے سوائے شیخ عبدالحکیم صاحب کے کوئی شہید نہیں ہُوا اور نہ زخمی ہُوا۔ یہ سُن کر آپ نے فرمایا کہ ہمارے پھلت والے بھائیوں کو نظر نہ لگاؤ۔ انشاء اللہ تعالیٰ ان کا گنجِ شہیداں کہیں اکٹھا ہو گا۔[1]

---

[1] جنگِ بالاکوٹ میں ایسا ہی ہُوا کہ سوائے شیخ ولی محمّد اور شیخ وزیر صاحب کے سب شہید ہو گئے۔

ستائیسواں باب

پشاور کا قصد

خدا کا رعب اور سہارا کافی ہے | مایار کی جنگ سے فراغت کے بعد سید صاحبؒ نے اطراف و جوانب کے خوانین کو جمع کر کے پشاور کا ارادہ ظاہر فرمایا۔ ان سب نے تائید کی۔ سردار فتح خاں اور ارباب بہرام خاں نے رائے دی کہ پشاور کی مہم میں توپیں ساتھ رکھی جائیں۔ آپ نے فرمایا کہ تم صاحبوں کا خیال ہے کہ توپوں کا لشکر میں بڑا رعب اور سہارا ہوتا ہے؛ سو یہ بات کچھ نہیں۔ خدا کا رعب اور سہارا ہمارے لیے کافی ہے۔ سردار یار محمد خاں بھی تو اپنے ساتھ توپیں لایا تھا۔ پھر اُن توپوں سے کیا کر لیا؟ وہ سب توپیں اللہ تعالیٰ نے ہمیں دلوا دیں۔ سردار سلطان محمد خاں نے بھی توپوں سے کیا کام بنا لیا؟ فتح و شکست اللہ تعالیٰ کے قبضۂ قدرت میں ہے جسے چاہے، دے۔

روانگی | آپ نے موضع توُرو سے موضع مردان کی طرف مع لشکر کوچ کیا۔ آپ گھوڑے پر سوار پیادوں کی جماعت میں تھے۔ سواروں کا لشکر آگے پیچھے تھا۔ دو نشان پیادوں میں تھے اور ایک سواروں میں، اور تینوں کے پھریرے کھلے تھے۔ شتری نقارہ بجتا تھا اور مولوی رحمٰن علی مولوی خرم علی صاحب کا لکھا ہوا رسالہ نظمِ جہادیہ بآوازِ بلند خوش الحانی کے ساتھ پڑھتے جاتے تھے، جو مندرجۂ ذیل ہے:

بعدِ تحمیدِ خدا، نعتِ رسولِ اکرمؐ
یہ رسالہ ہے جہادیہ کہ لکھتا ہے قلم

واسطے دین کے لڑنا، نہ پئے طمعِ بلاد
اہلِ اسلام اسے شرع میں کہتے ہیں جہاد

ہے جو قرآن و احادیث میں خوبیِّ جہاد
ہم بیاں کرتے ہیں تھوڑا سا، اسے کر لو یاد

فرض ہے تم پہ مسلمانو، جہادِ کفّار
اس کا سامان کرو جلد، اگر ہو دیندار

جس کے پیروں پہ پڑی گردِ صفِ جنگِ جہاد
وہ جہنّم سے بچا، نار سے ہے وہ آزاد

جو مسلمان رہِ حق میں لڑا لحظہ بھر
روضۂ خلدِ بریں ہو گیا واجب اس پر

اے برادر، تو حدیثِ نبویؐ کو سن لے
باغِ فردوس ہے تلواروں کے سائے کے تلے

دل سے اس راہ میں پیسہ کوئی دیوے گا اگر
سات سو اس کو خدا دیوے گا روزِ محشر

اور اگر مال بھی خرچا و لگائی تلوار
پھر تو دیوے گا خدا اس کے عوض سات ہزار

جو کہ مال اپنے سے غازی کو بنا دے اسباب
اس کو بھی مثلِ مجاہد کے خدا دے گا ثواب

جو نہ خود جاوے لڑائی میں نہ خرچے کچھ مال
اس پہ ڈالے گا خدا پیشتر از مرگ وبال

جو رہِ حق میں ہوئے ٹکڑے، نہیں مرتے ہیں
بلکہ وہ جیتے ہیں، جنّت میں خوشی کرتے ہیں

عمر بھر ہی کے گناہِ شہدا مٹتے ہیں
کیوں نہ ہو؟ راہِ خدا ان کے تو سر کٹتے ہیں

فتنۂ قبر و غمِ صور و قیامِ محشر
ایسے صدموں سے شہیدوں کو نہیں کچھ ہے خطر

حق تعالیٰ کو مجاہد وہ بہت بھاتے ہیں
مثلِ دیوار جو صف باندھ کے جم جاتے ہیں

اے مسلمانو، سنی تم نے جو خوبیِ جہاد
چلو اب رن کی طرف، مت کرو گھر بار کو یاد

مال و اولاد کی، جورو کی محبت چھوڑو
راہِ مولیٰ میں خوشی ہو کے شتابی دوڑو

مال و اولاد تری قبر میں جانے کی نہیں
تجھ کو دوزخ کی مصیبت سے بچانے کی نہیں

گر پھرے جیتے، تو گھر بار میں پھر آؤ گے
اور گئے مارے، تو جنّت میں چلے جاؤ گے

دینِ اسلام بہت سست ہوا جاتا ہے
غلبۂ کفر سے اسلام مٹا جاتا ہے

پیشوا لوگ اسی طور نہ کرتے جو جہاد
ہند پھر کس طرح اسلام سے ہوتا آباد

زورِ تلوار سے غالب رہا اسلام مدام — سُستی اگلے جو کبھی کرتے، تو ہوتا گمنام
کب تلک گھر میں پڑے جُوتیاں چٹخاؤ گے — اپنی سُستی کا جُز افسوس نہ پھل پاؤ گے
اب تو غیرت کرو، نامردی کو چھوڑو، یارو — سیّد احمد سے ملو، جلد سے کافر مارو
بارہ سَو سال کے بعد ایسے ارادے والا — ہُوا پیدا ہے، مُسلمانو، کرو شکرِ خدا
تھے مُسلمان پریشان بغیر از سردار — ہُوا سردار ہے از آلِ رسُولِ مختارؐ
بات ہم کام کی کہتے ہیں، سُنو، اے یارو، — وقت آیا ہے کہ تلوار کو بڑھ بڑھ مارو
حضرتِ مولوی، اب طاق میں رکھ دیجے کتاب — لیجے تلوار و میدان کو چل دیجے شتاب
وقتِ جانبازی ہے، تقریروں کو اب مت چھانٹو — غیرِ شمشیر کسی سمت کو دل مت بانٹو
ہادیٔ دین ہو تو، تم کو ہے سبقت لازم — تم چلو گے، تو بہت ساتھ چلیں گے خادم
اے گروہِ فقرا، نفس کُشی کے اُستاد — عملِ نفس کشی کون ہے بہتر ز جہاد
مت گھُسو کونے میں، اے پیرجی، مانندِ حجا — چھوڑو اب چلّہ کشی وقتِ جہاد آ پہنچا
اے جوانانِ اسد حملہ و رُستم قوّت — کام کس دن کو پھر آوے گی تمھاری جرأت
اُن کا سر کاٹ لیا یا کہ کٹا اپنا سر — دونوں صورت میں جو سمجھو، تو تمھیں ہو بہتر
یعنی، گر مار لیا اُن کو، تو پھر بن آئی — اور گئے مارے، تو پھر خاصی شہادت پائی
ایک دن تجھ سے یہ دُنیا کا مزا چھوٹے گا — لشکرِ موت ترا کُلبۂ بَدن لُوٹے گا
دوستو، تم کو تو مرنا ہی مقرّر ٹھیرا — پھر تو بہتر ہے کہ جاں دیجیے در راہِ خُدا
سیکڑوں جنگ میں جاتے ہیں، وُہ پھر آتے ہیں — سیکڑوں گھر میں بھی رہتے ہیں، وُہ مر جاتے ہیں
موت کا وقت مُعیّن ہے، تو سُن، اے غافل — پھر بھلا موت سے ڈرنے میں تجھے کیا حاصل
جب تلک موت نہیں ہے، تو نہیں مرتے ہیں — موت جب آئی، تو گھر میں بھی نہیں بچتے ہیں
تم اگر ڈرتے ہو تکلیفِ سفر سے، نہ ڈرو — مرد ہو، خطرۂ آلام کو دل سے کھو دو
جیسی عادت کرے انسان، سو ہو سکتا ہے — عیش و آرام کی عادت کو بھی کھو سکتا ہے

طمع دُنیا کے لیے دیکھو ہزاروں یہ سپاہ
چھوڑ کر سر کو کٹاتے ہیں، نہیں کرتے "آہ!"

ہے عجب یہ کہ مُسلمان بھی کہلاتے ہو
جھوٹے حیلے رہِ اللہ میں بتلاتے ہو

تم تو اس طور سے دُنیا پہ بہت پھُول گئے
جورو لڑکوں کی محبت میں خُدا بھُول گئے

آج اگر اپنی خوشی راہِ خدا جاں دو گے
پھر تو کل چین سے جنّت میں مزے لُوٹو گے

چھوڑ دو گے لذّتِ دُنیا کو اگر بہرِ خدا
پھر تو جنت میں ہمیشہ ہی اُڑاؤ گے مزا

سر ٹپک، پیر رگڑ گھر میں کا مرنا بہتر
یا رہِ حق میں فدا جان کا کرنا بہتر

گر رہِ حق میں نہ دی جان، تو پچھتاؤ گے
اور پیمبر کو یہ مُنہ کیا دِکھلاؤ گے

ایک ہے شرط کہ تم مانو بدل حکمِ امام
ورنہ تلوار لگانا بھی نہیں آوے کام

جو کہ خُود رائے بھی لڑنے لگے در راہِ جہاد
اُن کا ناحق یہ بہا خُون، ہے محنت برباد

خُوب اللہ و محمّد کو جو پہچانتے ہیں
اپنے سردار کے کہنے کو بدِل مانتے ہیں

اہلِ ایمان کو کافی ہے دِلا اتنا پیام
اب مُناجات سے، بہتر ہے کہ ہو ختمِ کلام

اے خداوندِ سماوات و زمیں، ربِ عباد
اب مُسلمانوں کو دے جلد سے توفیقِ جہاد

اپنا دے زور، مسلمانوں کو کر زور آور
وعدہ فتح جو ہے اُن سے کیا، پُورا کر

ہند کو اِس طرح اسلام سے بھر دے اَے شاہ
کہ نہ آوے کوئی آواز بجز اللہ! اللہ!

مردان کی گڑھی کا تخلیہ | گرد و نواح کے جو خوانین اور ہوتی مردان کے جو مُلّا حاضر ہوئے اُنھوں نے عرض کیا کہ دُرّانیوں کا مال خیمہ واسلحہ وغیرہ ہوتی اور مردان میں پڑا ہے؛ ایسا نہ ہو کہ کوئی اُن کو تلف کر دے اور اُس کی گرفت اہلِ قصبہ سے ہو۔

سید صاحبؒ نے مولانا اسمٰعیل صاحب سے فرمایا کہ سَو آدمیوں کی جمعیت کے ساتھ تشریف لے جائیں اور اس سامان کو اپنے قبضے میں لے لیں۔ مولانا نے سَو آدمیوں کا انتخاب کیا۔

سیّد جعفر علی صاحب کہتے ہیں کہ میرا بھی اس سلسلے میں انتخاب ہُوا۔ مَیں نے رات کو کھانا نہیں

کھایا تھا۔ اس سے اگلا دن بھی خشک روٹی کے ایک ٹکڑے پر گزرا تھا۔ میں نے عرض کیا کہ اگر اجازت ہو، تو میں کچھ کھاؤں۔ مولانا نے فرمایا کہ روٹی لے لو، دیہات کے باہر جا کر کھا لینا۔ غرض، یہ لشکر بڑی عجلت کے ساتھ مولانا کے ساتھ روانہ ہوا۔ جب ہوتی کے قریب پہنچے، تو احمد خاں کے پنجابی ملازمین نے بندوقیں چلانی شروع کیں۔ مولانا نے اس کی کچھ پروا نہیں کی اور گڑھی کے جنوبی دروازے کے بہت قریب پہنچ گئے۔ بندوق کی کچھ گولیاں ہماری جماعت کے اندر بھی پہنچیں۔ آپ نے گڑھی کے مغرب کی جانب رُخ کیا اور وہاں سے گڑھی کی طرف بڑھنا شروع کیا۔ ہمراہیوں سے فرمایا کہ متفرق ہو جاؤ اور تم میں سے ہر ایک اپنے ساتھی سے چار چار قدم کے فاصلے پر رہے۔ خود جماعت کے آگے آگے تھے۔ ہوتی سے مردان تک سیکڑوں گولیاں ہمارے سر سے گزر گئیں، لیکن اللہ کے فضل سے کسی کو کوئی گزند نہیں پہنچا۔

مردان کے مغربی جانب ایک باغ تھا۔ اس میں بڑے بڑے درخت تھے۔ باغ کے بیچ میں کچھ نشیبی زمین ایسی تھی کہ اگر کوئی شخص اس میں بیٹھ جائے، تو گڑھی کی جانب سے آنے والی گولیوں سے محفوظ رہے گا۔ مولانا خود بھی وہیں بیٹھ گئے اور لشکر کو بھی وہیں بٹھایا۔ دیر تک وہیں بیٹھے رہے۔ چہرے پر غصّے کے آثار ظاہر تھے۔ دیر تک گولیاں اس زمین کے کنارے پر پڑتی رہیں، جو بلندی پر واقع تھا۔ اس سے ڈھیلے اُڑ اُڑ کر ہمارے سر پر پڑتے تھے۔ ایک گھڑی کے بعد بندوقچی سُست پڑ گئے۔ اتنے میں دیہات کے مُلّا حاضر ہوئے اور مولانا سے عرض کیا کہ اگر اجازت ہو، تو کھانا لے آئیں۔ مولانا نے فرمایا کہ تمھارا ارادہ یہ معلوم ہوتا ہے کہ جو بندوق کی گولی سے بچ گیا ہے، اس کو زہر آلود کھانا کھلا کر مار ڈالو۔ خبردار ہو جاؤ کہ ہم دُرّانیوں کی وہ توپیں، جو ہم کو مالِ غنیمت میں ملی ہیں، منگوا کر تمھاری اس گڑھی کو مسمار کر دیں گے۔ ملاؤں نے بڑی لجاجت سے کہا کہ اس میں ہمارا قصور نہیں، احمد خاں باغی کے نوکروں کا فعل ہے۔ ہم نے اُن کو بہت منع کیا تھا، لیکن اُنھوں نے کہا کہ اگر ہم بغیر بندوق چلائے گڑھی حوالے کر دیں گے، تو ہم اپنے آقا کے نمک حرام ہو کر عذابِ الٰہی میں مبتلا ہوں گے۔ مولانا نے فرمایا کہ جاؤ، پہلے گولیاں موقوف کراؤ، پھر کھانا لاؤ۔ احمد خاں کے نوکروں سے کہ دو کہ گڑھی سے باہر نہ

جائیں، عنقریب توپیں آتی ہیں۔ ان توپوں کے گولوں سے گڑھی کو مسمار کر کے تم کو تلاش کیا جائے گا۔

جب ملا گڑھی کی طرف واپس ہوئے اور اُن کو پیغام پہنچا، تو گولیاں فوراً موقوف ہو گئیں مولانا نے سب حال لکھ کر سید صاحبؒ کی خدمت میں بھیج دیا اور توپوں کی بھی درخواست کی۔ گڑھی کے چاروں طرف فصیل بھی اور دو دروازے تھے : ایک جنوب کی جانب اور ایک مغرب کی جانب۔ گڑھی کے اندر سے کھانا آیا اور مولانا نے اپنے ہمراہیوں کے ساتھ تناول فرمایا۔[1]

رسول خاں برادر احمد خاں کی طرف سے ملا پیغام لائے، جس میں اُس نے بڑی خوشامد سے عرض کیا تھا کہ میں بے قصور ہوں۔ دُرّانیوں نے احمد خاں کو اس گڑھی پر قابض کر دیا تھا۔ میں نے مجبور ہو کر ان کی رفاقت کی۔ اس اطاعت و رفاقت کے باوجود رعایا اُن کی دست درازی سے محفوظ نہیں رہی۔ اب آپ میرے حق میں جو تجویز فرمائیں، مجھے بسر و چشم قبول ہے۔ مولانا نے جواب میں فرمایا کہ تمھاری بے گناہی اور خیر خواہی جب ثابت ہوگی، جب تم حضرت امیر المومنین کی اطاعت قبول کر لو گے۔ میں اُن کا نائب ہوں، اب تم کو چاہیے کہ گڑھی کے چھ بُرجوں کو خالی کر دو۔ ہمارے غازی وہاں جا کر ان بُرجوں میں قیام کریں گے اور لشکر کا ایک گروہ دیہات کے اندر قیام کرے گا۔ سردار اپنے ہتھیاروں کے ساتھ اپنے گھوڑے پر سوار ہو کر یہاں آ ئے۔ ہم اپنے سواروں کے ساتھ اُس کو امیر المومنین کے پاس بھیجیں گے۔ کل یا پرسوں جب بھی آپ یہاں تشریف لائیں گے، وہ اُن کے ہمراہِ رکاب آئے گا۔ پھر امیر المومنین جیسا مناسب سمجھیں گے، اُس کے حق میں فیصلہ کریں گے۔

رسول خاں نے یہ تمام باتیں قبول کر لیں، لیکن عرض کیا کہ ایک بات میری قبول کر لی جائے کہ لشکر ہمارے قصبے میں داخل نہ ہو اس لیے کہ رعایا دُرّانیوں کے ہاتھوں تباہ ہو گئی ہے۔ جب یہ لشکرِ جرار قصبے میں داخل ہوگا، تو اہلِ قصبہ کے لیے بیٹھنے کی جگہ نہ رہے گی۔ مولانا نے فوراً اس بات کو قبول کر لیا، لیکن فرمایا کہ دو گروہ مستثنیٰ ہیں، ایک تو خود سید صاحبؒ گڑھی میں قیام فرمائیں گے، دوسرے مولوی عبد الوہاب قاسم غلہ کسی مسجد میں اپنے ہمراہیوں کے ساتھ قیام کریں گے۔

---

[1] منظورہ ص ۸۶۹ تا ۸۷۰

جانبین سے یہ معاملہ طے ہوگیا، تو آپ نے مرزا احمد بیگ پنجابی اور اُن کی جماعت کو بُرجوں کے پہرے اور قصبے کے دروازے کی حفاظت کے لیے مقرر فرمایا۔ مولانا نے سردار رسُول خاں کو اپنے دس بارہ سواروں کے ساتھ لشکر گاہِ اسلام تورُو کو روانہ کیا۔ مولانا نے ان سواروں کی زبانی اس معاہدے کی بھی اطّلاع سیّد صاحبؒ کو بھیج دی کہ لشکرِ اسلام میں سے کوئی شخص ہوتی اور مردان کے دیہات میں داخل نہیں ہوگا۔[1]

وقائع میں ہے کہ "گڑھی کے قریب کسی مُلکی نے مولانا محمد اسمٰعیل صاحب سے کان میں کہا تھا کہ آپ گڑھی میں خبردار ہوکر داخل ہوں اور جب تک وہاں کے تمام مکانوں کی تلاشی نہ لے لیں، تب تک سیّد صاحبؒ کو وہاں نہ بُلائیں کہ کہیں کچھ دغا فریب نہ ہو۔ یہ بات سُن کر مولانا وہیں ٹھیر گئے اور مزید تیس چالیس غازی لشکر سے بلوائے۔ پہلے گڑھی کے دروازے پر بیس غازی مُتعین کیے اور کہ دیا کہ کوئی آدمی باہر سے اندر نہ جانے پائے اور جو اندر سے کوئی اپنا مال و اسباب لے کر باہر نکلے، تو اُس سے مزاحمت نہ کی جائے۔ اس کے بعد مولانا اسمٰعیل صاحب اور شیخ ولی محمّد صاحب گڑھی کے اندر داخل ہُوئے۔ شیخ صاحب تو لوگوں کے مال و اسباب نکلوانے میں مشغول ہُوئے اور مولانا نے گڑھی کے مکانوں کی تلاشی لینی شروع کی کہ کہیں بارُود نہ بچھی ہو یا بارُود کا کوئی کُپّا نہ دبا ہو۔

غلط اطلاع کی بنا پر سیّد صاحبؒ کی آمد اور مولانا اسمٰعیل صاحبؒ کی ناراضگی

ابھی کچھ تھوڑا سا سامان نکلوانا باقی تھا کہ کسی مُلکی نے سیّد صاحبؒ سے جاکر کہا کہ آپ گڑھی میں تشریف لے چلیں، مولانا صاحب بُلاتے ہیں۔ یہ سُن کر آپ بسم اللہ کہ کر اُٹھ کھڑے ہُوئے اور گڑھی کو تشریف لے چلے۔ تقریباً دو سَو آدمی جو آپ کے ساتھ درختوں کے نیچے تھے، آپ کے ہمراہ ہُوئے لشکر والوں نے دیکھا، تو اُن میں سے بہت آپ کے ساتھ ہولیے۔ اور آنے والوں کا تانتا بندھ گیا۔

کسی نے مولانا اسمٰعیل صاحب سے کہا کہ سیّد صاحبؒ تشریف لائے ہیں اور آپ کے ہمراہ بہت لوگ ہیں۔ یہ سُن کر مولانا اسمٰعیل صاحب نہایت غصّے کی حالت میں سیّد صاحبؒ کے پاس

---

[1] منظورہ، ص ۸۷۹ تا ۸۸۲

آئے اور کہنے لگے کہ آپ نے تو مجھ سے فرمایا تھا کہ تیرے بُلائے بغیر ہم نہ آئیں گے اور نہ کوئی لشکر کا آدمی جانے پائے گا، اب آپ کے تشریف لانے سے لشکر کے صدہا آدمی یہاں گھس آئے! نہ میں نے آپ کو بُلوایا اور نہ آپ نے مجھ سے پُچھوا بھیجا۔ آپ یوں ہی چلے آئے۔ رعایا کا اسباب گھروں سے نکلوایا جا رہا ہے۔ اگر کسی کا مال و اسباب جاتا رہا، تو نقضِ عہد ثابت ہوگا۔ بہتر یہی ہے کہ اس وقت آپ یہاں سے تشریف لے جائیں۔ یہ بات اُنھوں نے کئی بار کہی۔ یوں غصّے ہو کر سیّد صاحبؒ سے کلام کرنا لوگوں کو ناگوار ہُوا، مگر کسی نے دم نہ مارا۔

سیّد صاحبؒ نے فرمایا کہ میاں صاحب، مجھ سے تو کسی نے جا کر یہ کہا کہ مولانا صاحب آپ کو بُلاتے ہیں، تب میں یہاں آیا، ورنہ کاہے کو آتا۔ مولانا صاحب نے کہا کہ میں نے تو کسی سے نہیں کہا تھا۔ یہ بات سُن کر آپ اُٹھ کھڑے ہُوئے اور کہا کہ میں جاتا ہوں اور درختوں کے نیچے تشریف لے گئے اور آپ کے ہمراہی بھی باہر نکل گئے۔ جو لوگ اِدھر اُدھر گڑھی میں باقی رہ گئے تھے، اُن کو تلاش کر کے مولانا نے باہر نکال دیا۔

جب کچھ دیر میں رعایا کا سب اسباب نکل چکا اور مولانا مکانوں کی تلاشی بھی لے چکے، تب شیخ ولی محمّد صاحب نے جا کر سیّد صاحبؒ سے عرض کیا کہ گڑھی خالی ہے، اب آپ تشریف لے چلیں۔ یہ بات سُن کر آپ گڑھی میں تشریف لائے اور دو ڈھائی سو آدمی، جو آپ کے ہمراہ گڑھی میں گئے تھے، وُہ جابجا گڑھی کے مکانوں میں اُترے۔ اُس وقت شیخ ولی محمّد صاحب نے آپ سے کہا کہ مولانا صاحب جو اُس وقت آپ کے آنے سے ناخوش ہُوئے تھے، اُس کا سبب یہ تھا کہ ایک مُلکی نے اُن سے کہا تھا کہ گڑھی میں ہوشیاری سے جانا اور جب تک وہاں کے ہر مکان کی تلاشی نہ لے لینا، تب تک سیّد صاحبؒ کو گڑھی میں نہ بُلانا۔ وہ اس وقت مکانوں کی تلاشی لے رہے تھے، دُوسرے رعایا کا سب اسباب بھی نہیں نکل چکا تھا۔ اگر اس بھیڑ بھاڑ میں کسی کا کچھ اسباب جاتا رہتا، تو الزام اور بدنامی کی ایک صُورت ہوتی۔

امیر و مامُور کا اخلاص و للٰہیت | منظورہ میں ہے کہ جب مولانا کو سیّد صاحبؒ کی آمد کی اطلاع ہُوئی،

تو فرطِ تاثر میں یہاں تک فرمایا کہ یہ لشکر ہے، اُس کو میدان میں ٹھیرنا چاہیے تھا؛ پیرزادوں کا قافلہ نہیں ہے کہ دیہات میں گھس آئے۔ سید صاحبؒ نے جب مولانا کے چہرے پر غصّے کے آثار ظاہر دیکھے، تو فرمایا کہ مولانا، میں ابھی باہر جاتا ہوں اور قلعے میں جہاں نشست تھی، فوراً اُٹھ کر گڑھی کے مشرقی دروازے سے باہر تشریف لے آئے اور شہتوت کے درختوں کے نیچے پانی کے کنارے آکر بیٹھ گئے۔ لشکر کے لوگ اور مُلکی بھی وہاں موجود تھے۔

جیسے ہی سید صاحبؒ گڑھی سے تشریف لے چلے، مولانا کا غُصّہ فرو ہوگیا اور سید صاحبؒ کے ساتھ ہی درخت کے نیچے آکر دو زانو مؤدّب بیٹھ گئے۔ سید صاحبؒ نے قصبے کے باشندوں کو خطاب کر کے فرمایا کہ تم نے ہمارے اہلِ لشکر کی مولانا سے شکایت کی اور مولانا کو غصّے میں لے آئے، حالانکہ تم کو اچھی طرح معلوم ہے کہ ہمارے لشکری کسی کی کوئی چیز نہیں لیتے۔ اگر کبھی ضرورت پڑتی ہے تو دو چیزیں مانگ لیتے ہیں اور جاتے وقت دے کر جاتے ہیں: ایک چارپائی، دوسرے مٹی کی ہانڈیاں کھانا پکانے کے لیے۔ ایسی چھوٹی چیز کے لیے تمھیں مولانا سے شکایت کرنے کی کیا ضرورت تھی؟

اس وقت اہلِ قریہ نے بہت عُذر معذرت کی اور عرض کیا کہ ہماری تقصیر معاف ہو اور آپ اندر تشریف لے چلیں۔ آپ نے مولانا سے مخاطب ہو کر فرمایا کہ مولانا، کسی نے بھی مجھے آپ کے معاہدے کی اطلاع نہیں دی۔ مولانا نے بڑے عجز و انکسار کے ساتھ سر جُھکا کر کہا کہ حضرت، مَیں نے دو بار یہ اطلاع آپ کے پاس بھیجی: ایک بار کل سواروں کی زبانی اور ایک بار آج آخوند فیض محمّد کی زبانی۔ سید صاحبؒ نے فرمایا: مجھ تک تو کسی نے بھی اطلاع نہیں پہنچائی، ورنہ ایسی غلطی نہ ہوتی۔ مولانا نے آخوند فیض محمّد سے کہا کہ تم نے بھی اتنا ضروری پیغام نہ پہنچایا۔ آخوند نے کہا کہ مَیں جس وقت یہاں سے روانہ ہو کر سید صاحبؒ کی خدمت میں پہنچا، آپ کی سواری روانہ ہو چکی تھی۔ ہجوم اس قدر تھا کہ میں باوجود کوشش کے بھی آپ تک نہ پہنچ سکا۔ یہ سمجھ کر کہ کل سواروں نے پیغام پہنچا دیا ہوگا، مَیں بھی مجمع کے پیچھے پیچھے ہولیا۔ سید صاحبؒ نے اور مولانا نے آخوند فیض محمّد کا یہ عُذر قبول کیا۔[1]

[1] منظورہ ص ۸۸۴ تا ۸۸۶

اٹھائیسواں باب

مردان سے پشاور تک

مردان سے کُوچ مردان میں دو رات رہ کر تیسرے دن آپ نے وہاں سے کُوچ کیا۔ گڑھی کے بندوبست کے لیے آپ نے حاجی بہادر شاہ خاں کو سو غازیوں کے ساتھ، جن میں کئی شخص کچھ کچھ زخمی بھی تھے، چھوڑا۔ حاجی حمزہ علی خاں ساکن تُہاری کو عبدالحمید خاں کے بجائے سوروں کا رسالدار بنایا۔ وہاں سے کوچ کرنے کے وقت آپ کے ہمراہِ رکاب مُلکی اور ہندوستانی ملا کر تخمیناً چھ سات ہزار آدمی تھے۔

راستے میں چارسدے میں قیام ہُوا۔ وہاں کے لوگوں نے دُرّانیوں کے ظُلم و ستم کی شکایت کی کہ جب وہ شکست کھا کر اس طرف سے گزرے، تو اُنھوں نے خود اپنے علاقے اور مُلکِ مقبُوضہ پر دست درازی کی، گویا کہ اُن کا اِس مُلک سے علاقۂ ریاست باقی نہیں رہا تھا۔ وہاں کی تمام رعایا اُن کے ظلم و ستم سے نالاں اُن کے حق میں بد دُعا کرتی تھی۔

وہاں سے پشاور پندرہ سولہ میل تھا، لیکن دریا پر کوئی کشتی نہ مل سکی۔ دُرّانیوں نے دریا عبور کرکے کشتیوں کو ڈبو دیا تاکہ غازیوں کے ہاتھ نہ لگیں۔ بالآخر وہاں سے تنگی کی طرف کُوچ ہُوا، جو چارسدّے سے شمال مغرب ہے۔ وہاں سے دریائے سوات کو، جو ایک جگہ سے پایاب تھا، عبُور

کیا اور منڈہ میں قیام ہُوا۔ وہاں کے لوگ لشکر کی آمد سے بہت خوش تھے اور کہتے تھے کہ سُبحان اللہ! یہ عجیب لشکر ہے کہ باوجود اس کے کہ چھ سات ہزار پیادہ و سوار نے پڑاؤ ڈالا ہے، لیکن کسی پر کوئی ظلم و تعدّی نہیں ہے۔ اس کے برخلاف دُرّانیوں کے دو پیادے آجاتے تھے، تو ہم لوگ گھر چھوڑ کر چلے جاتے تھے۔

منڈہ سے چل کر شَبْ قَدَر پڑاؤ ہُوا۔ شَبْ قَدَر کے لوگ ارباب بہرام خاں سے تعلق رکھتے تھے۔ بڑی عقیدت کے ساتھ سیّد صاحبؒ سے پیش آئے۔ مرد و زن سب لشکرِ اسلام کی آمد سے مسرور تھے اور اللہ کا شکر ادا کرتے تھے۔ مرد بہت دُور تک پہنچانے آئے، عورتیں دو رویہ صف بنا کر کھڑی ہوگئیں۔ جب سیّد صاحبؒ کی سواری گزری، اُنھوں نے سلام کیا۔ بعض بوڑھی عورتوں نے آپ کے قدم کی طرف ہاتھ بڑھائے۔ آپ ایسے موقع پر گھوڑے کو تیز کر دیتے اور اُن کو اس حرکت سے منع کرتے۔

حکومت کا رعیت کے ساتھ معاملہ | مولوی سیّد جعفر علی صاحب لکھتے ہیں کہ "دو تین روز اُس نواح میں قیام ہُوا۔ اس علاقے کے ارباب، جن کی حیثیت وہ ہے، جو ہمارے مُلک میں قانون گو کی ہوتی ہے، آپ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور پشاور کا انتظام سنبھال لینے کی درخواست کی۔ آپ نے اُن سے پوچھا کہ تمھارے یہاں کس طرح انتظام ہوتا ہے۔ انھوں نے کہا کہ سردارانِ پشاور کی طرف سے خراج محاصل کا یہ اصُول ہے کہ رعایا کی کھیتی کا غلّہ نصف وصُول کر لیتے ہیں اور اربابِ منشی خانہ، دڑوائی[1] اور محافظ کا خرچ بھی رعایا کے ذِمّے ہے۔ اُس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ رعایا کے حصّے میں پیداوار کا صرف تہائی حصّہ آتا ہے۔ آپ نے فرمایا کہ رعایا پیداوار کا تہائی حصّہ نقد کی صُورت میں ہم کو ادا کر دے۔ باقی سارے انتظامات کا خرچ امام کے ذمّے ہے، نہ کہ رعایا کے۔ اس سال تو یہی انتظام ہے، آئندہ سال مستقل انتظام کیا جائے گا، اس لیے کہ حاکم کو یہ جائز نہیں ہے کہ ایک بار قول قرار کر کے سال دو سال بعد اس سے پھر جائے۔ اس لیے ہم نے اس سال کی قید لگائی ہے۔

---

[1] دڑوائی پشتو میں غلّہ تولنے والے کو کہتے ہیں۔

آپ نے فرمایا کہ ارباب، منشی خانے اور ڈروائی کے مصارف حکومت کے ذمّے ہوں گے۔ اس کا اجر اللہ تعالیٰ سے ملے گا۔ اور اگر ہمارے انتظام میں کسی سے مزدوری یا نوکری پر کام لیا جائیگا تو اُس کی اُجرت دی جائے گی۔ البتہ اگر کوئی سوار یا پیادہ تحصیل وصُول کے لیے دیہات کے خوانین کے پاس جائے، تو ان خوانین کو چاہیے کہ اس کو اپنا بھائی سمجھ کر اُس کی دعوت کریں اور اس کو چاہیے کہ وہ کسی چیز کی فرمائش نہ کرے۔ اگر خوانین سے وہ کسی چیز کی فرمائش کرے، تو ہمارے یہاں اس کی باز پُرس ہوگی اور خوانین بھی اس کو سرکاری مطالبہ ادا نہ کریں۔

یہاں کے لوگوں کو لشکرِ اسلام میں شرکت کی بھی دعوت دی گئی۔ چنانچہ قوم کُتوزئی لشکر کے ساتھ شریک ہُوئے۔ جو لوگ لشکرِ اسلام میں پہلے سے موجود تھے اور اُن کے دیہاتوں کو دُرّانیوں نے ضبط کر لیا تھا، اُنھوں نے اپنی سند و کاغذات کے مطابق اپنی جائداد، پائی اور اپنے کارندوں کو جاگیر کی آبادی کا حکم دے کر خود لشکرِ اسلام میں حاضر رہے۔ اسی سلسلے میں تُرنگ زئی کے رسُول خاں کو اس دیہات کی مُعافی کا پروانہ ملا۔

عبورِ دریا کے انتظامات مِچنئی کے گھاٹ پر دُرّانی سوار روزانہ آتے تھے۔ اُنھوں نے اہلِ خیبر کو سات سَو روپے اس غرض کے لیے دیے تھے کہ غازیوں کو دریا اُترنے نہ دیا جائے۔ خیبریوں کا ملک ارباب بہرام خاں کے ہاتھ گرفتار ہو گیا۔ ارباب نے اُس کو مُجاہدین کے دریا سے پار ہونے کا انتظام کرنے کا حکم دیا اور سیّد صاحبؒ کی اجازت سے دو تین سو غازی اپنے ساتھ لے کر مِچنئی کو روانہ ہُوئے۔ میر رحمان علی، مُلّا قطب الدین اور مُلّا لعل مُحمّد نے اپنی جماعتوں کے ساتھ دریا عبور کیا۔ ان کو تاکید کی گئی کہ لشکرِ پیادہ پہاڑ پر قیام کرے اور ساری رات ہوشیاری کے ساتھ رہے۔ صبح لشکر پار اُتر جائے گا۔ اگر دُرّانی ادھر سے حملہ کریں گے، تو اُن کی تدبیرات کو نہیں چل سکے گی۔ دُرّانی سوار اپنے معمُول کے مطابق صُبح صادق سے پہلے پہنچے۔ اِدھر نمازِ فجر کے بعد سیّد صاحبؒ شَب قدر سے روانہ ہُوئے۔ دُرّانیوں نے دن کی روشنی میں جب لشکر کو پہاڑ کے اوپر دیکھا، اُنھوں نے لشکر کی طرف رُخ کیا اور اُن پر گولیاں چلائیں۔ ادھر دریا کے اس پار سیّد صاحبؒ اپنے لشکر کے ساتھ پہنچ گئے۔

دُرّانی یہ دیکھ کر پشاور کی طرف روانہ ہو گئے۔ لشکر جالوں کے ذریعے دریا پار ہوا۔ جو لوگ تیرنا جانتے تھے انھوں نے گھوڑوں کی لگام پکڑ کر ان کو دریا کے پار پہنچا دیا۔ جو لوگ تیرنا نہیں جانتے تھے، ان کو دوسرے پیراک ساتھیوں نے ان کے گھوڑوں کو دریا کے پار کرایا۔ چنانچہ فریج اللہ عرب نشان بردار لشکرِ اسلام نے سترہ گھوڑوں کو پار کرایا۔ دو دن میں تمام لشکر دریا کے پار ہوا۔ مولوی مظہر علی عظیم آبادی کو حکم ہوا کہ پانسو آدمیوں کی جمعیت کے ساتھ آگے جائیں۔

اسلامی مساوات اس وقت میچنی ایک چھوٹا سا گاؤں تھا جس میں اکثر پھونس کے جھونپڑے تھے۔ ہر جھونپڑا ایک دوسرے سے الگ تھا۔ ایک روز لشکر میں تقسیم کرنے کے لیے غلّہ نہ تھا۔ جس کے پاس کچھ بچا ہوا رہ گیا تھا، اُس نے کھایا۔ باقی لشکر نے ایک گائے کے گوشت پر بسر کی۔ وہ کسی کو پہنچا، کسی کو نہیں پہنچا۔ جو تھوڑا سا غلّہ ملا، وہ سیّد صاحبؒ کے حکم سے اُن لوگوں کو بھیج دیا گیا، جو دریا کے دوسری طرف حفاظت کے لیے بھیج دیے گئے تھے۔ سیّد صاحبؒ کے لیے کھانا تیار ہو کر آیا، تو فرمایا کہ معاذ اللہ! کہ میں تنہا کھاؤں اور دوسرے فاقے سے ہوں! لوگوں نے عرض کیا کہ اتنے کھانے میں تو اہلِ لشکر کا بھلا نہ ہوگا۔ مناسب یہی ہے کہ یہ آپ نوش فرمالیں۔ ہر چند لوگوں نے اصرار کیا، آپ نے قبول نہیں فرمایا۔ ایک پہر گزرنے کے بعد آٹا آیا۔ مولوی عبدالوہاب صاحب قاسم غلّہ نے عرض کیا کہ آپ کے لیے جو کھانا تیار کیا گیا تھا، اب نوش فرمالیں۔ فرمایا کہ جو آٹا آیا ہے، سارے لشکر کے لیے کافی ہو جائے گا؟ مولوی عبدالوہاب صاحب نے کہا کہ گزر کے لیے کافی ہو جائے گا۔ فرمایا کہ کتنا حصّے میں آئے گا؟ اُنھوں نے عرض کیا کہ فی کس آدھ پاؤ۔ آپ نے الحمد للہ کہی اور کھانا منگا کر تناول فرمایا۔

میچنی سے موضع ریگی میں آئے، جو قوم خلیل (ارباب بہرام خاں کی قوم) کا دیہات ہے۔ اہلِ دیہات نے حسبِ استطاعت ضیافت کی۔ یہاں ارباب بہرام خاں کے حقیقی بھائی ارباب جمعہ خاں بن چار سو آدمیوں کے ساتھ آکر لشکر میں شامل ہو گئے۔ پشاور کے بعض طالب علموں سے معلوم ہوا کہ سردارانِ پشاور نے اپنے متعلقین کو کوہاٹ روانہ کر دیا ہے اور خود اپنے لشکر کے ساتھ کسی دیہات میں پڑے ہوئے ہیں۔ صبح کو ریگی سے کوچ کر کے گمٹ فردسہ میں آئے اور پیر تاریک کی قبر

کے قریب قیام ہُوا[1]

سُلطان محمّد خاں کا پیغام یہیں ارباب فیض اللہ خاں سُلطان محمّد خاں کی طرف سے وکیل ہو کر آئے۔

وقائع میں ہے کہ "ارباب فیض اللہ خاں نے سُلطان محمّد خاں کی طرف سے عرض کیا کہ وہ کہتے ہیں کہ ہم سے بڑا قصُور ہُوا کہ ہم نے آپ کا مقابلہ کیا۔ ہم اپنے قصُور سے تُوبہ کرتے ہیں۔ آپ ہمارا قصُور معاف فرمائیں[2] اور یہاں سے پلٹ جائیں۔

آپ نے فرمایا کہ خان بھائی، ہم کو تمھاری خاطر منظور ہے، مگر یہاں سے پلٹ جانے میں یہ بات ہے کہ تمھارے سردار اس بات کا احسان نہ مانیں گے۔ یہاں سے انشاء اللہ کل پشاور کو چلیں گے۔ اگر وہ اپنے اس عہد و پیمان پر سچّے دل سے قائم ہیں، تو ہم اُن کو اپنی طرف سے پشاور میں بٹھا کر چلے آئیں گے، اس لیے کہ ہم ہندوستان سے اس مُلک میں صرف اس واسطے آئے ہیں کہ یہاں کے سب بھائی مسلمانوں کو متّفق کر کے کافروں پر جہاد کریں کہ اسلام کی ترقی ہو اور کُفّار مغلُوب ہوں۔ سو یہ دُرّانی وغیرہ اپنی نادانی اور بیوقوفی سے ہم مسلمانوں کی شرکت چھوڑ کر کافروں کے حامی و مددگار بنے ہیں اور اُن کی طرف سے ہمارا مقابلہ کرتے ہیں۔ ہم نے اُن کو بارہا خط لکھ کر وعظ و نصیحت سے بہتیرا سمجھایا کہ یہ اپنی شرارت اور بغاوت سے باز رہیں اور ہمارے شریک ہوں، مگر اُن کے خیالِ فاسد میں کچھ نہ آیا یہاں تک کہ ہم پر لشکر کشی کر کے یہاں سے سُمّہ کو گئے اور ہم سے لڑے اور ہیبتِ الٰہی سے ایسی شکستِ فاش کھا کر وہاں سے بھاگے۔ تب ہم نے بھی وہاں سے اُن کا تعاقب کیا کہ اب اُن کو سزا دینی ضروری ہے۔ اس کے بغیر یہ اپنی شرارت سے باز نہ رہیں گے۔ واِلّا ہم کو غرض نہ تھی کہ ہم اُن کا پشاور چھین لیں۔ سو خان بھائی، اب تم جا کر ان کو اس عہد و پیمان پر پکّا کرو کہ بارِ دیگر پھر بد عہدی نہ کریں۔

---

[1]

[2] منظورہ کے الفاظ ہیں کہ "سلطان محمد خاں توبہ کے لیے حاضر ہے۔ وہ کہتا ہے کہ اگر کوئی کافر بھی آپ کی خدمت میں آکر ایمان لائے، آپ اس کو ضرور مسلمان بنائیں گے۔ میں تو مسلمان اور مسلمان زادہ ہوں۔ اپنی غلطی کا اقرار کرتا ہوں۔ اب کبھی مجھ سے ایسی تقصیر نہ ہوگی۔ مدۃ العمر آپ کا تابع رہوں گا" (صفحہ ۹۰۴)

ارباب فیض اللہ خاں بہت خوش ہوئے اور آپ سے رُخصت ہو کر اُس کے پاس گئے۔ اگلے روز کچھ دن چڑھے پھر حاضر ہوئے اور عرض کی کہ آپ کے فرمانے کے موافق میں اُن کو خوب سمجھا کر آیا ہوں۔ آپ نے فرمایا کہ انشاء اللہ آج ہم پشاور میں داخل ہوں گے۔ تم جا کر اُن سے کہو کہ خبردار، اپنی جگہ سے نہ ہلنا، وہیں رہنا۔ یہ کہہ کر تم ہمارے پاس آجانا، ہم تم کو اپنے ساتھ لے چلیں گے۔

○

اُنتیسواں باب

پشاور میں

پشاور میں داخلہ سیّد صاحبؒ نے سردار فتح خاں اور ارباب بہرام خاں کو بُلا کر فرمایا کہ تم اپنے لوگوں کو یہ خبر پہنچا دو کہ آج پشاور کو چلنا ہوگا۔ خبردار، کوئی بھائی کسی رعایا پر دست اندازی نہ کرے، اس لیے کہ سردار سلطان محمد خاں کی طرف سے صُلح کا پیام ہے۔ پھر آپ نے ارباب بہرام خاں سے فرمایا کہ تم اپنے کسی معتبر آدمی کو پشاور بھیج دو کہ جا کر بازار میں پُکار دے کہ آج سیّد صاحبؒ کا لشکر یہاں آئے گا۔ سب دوکاندار اپنی اپنی دوکان کے دروازے بند کرلیں کہ کسی کا کچھ مال و اسباب جاتا نہ رہے۔

ارباب بہرام خاں نے اپنے ارباب جمعہ خاں کو یہ تقریر فہمائش کر کے ساٹھ ستّر سوار اور اسی قدر پیادوں کے ساتھ نمازِ ظہر کے بعد پشاور کی طرف روانہ کیا۔ ادھر لشکر میں کوچ کا نقّارہ ہُوا۔ سب پیادہ و سوار کمر باندھ کر اور ہتھیار لگا کر تیار ہُوئے۔ کچھ دیر میں عصر کی اذان ہُوئی۔ وہیں سب نے نماز پڑھی۔ سیّد صاحبؒ نے ننگے سر ہو کر دُعا کی اور وہاں سے مع لشکر کوچ کیا۔ سواروں کا پرا پیچھے تھا اور پیادوں کی صف آگے تھی۔ اسی کے اندر سیّد صاحبؒ اپنے اژدر گھوڑے پر سوار تھے۔ شتری نقارہ بجتا تھا۔ ایک نشان سواروں میں، دو پیادوں میں تھے۔ تینوں کے پھریرے کھُلے تھے۔ تلنگوں کی جماعت الگ

میں بھی بہت سے نشان تھے۔ اکثر ملکی لوگ اپنی اپنی جماعت میں ننگی تلواریں ہلاتے، اچھلتے، کودتے اور سید صاحبؒ کی تعریف میں چار بیت کہتے ہوئے چلے جاتے تھے۔

مغرب کا وقت آیا۔ لوگوں نے نماز کا ارادہ کیا۔ لشکر میں کہیں کہیں لوگ پڑھنے بھی لگے۔ اس عرصے میں مولانا محمد اسمٰعیل صاحب نے پکار کر کہا کہ بھائیو، نماز کا موقع یہاں نہیں ہے۔ پشاور میں پہنچ کر مغرب اور عشا جمع کر کے پڑھ لینا۔ یہ آواز سن کر جو نماز کے لیے کھڑے ہو چکے تھے، انھوں نے تو پڑھ لی، باقی لوگ سب اسی طرح روانہ ہوئے۔

اہلِ شہر کی مسرت و استقبال مغرب کی جانب کابلی دروازے سے بازار میں ہو کر شہر میں داخل ہوئے۔ بازار کی دکانیں تو بند تھیں، مگر جا بجا سبیلیں رکھی تھیں، کوئی پانی کی، کوئی شربت کی۔ جا بجا چراغ بکثرت دکانوں کے چبوتروں پر اور دکانوں کی چھتوں پر روشن تھے۔ تمام رعایا سید صاحبؒ اور غازیوں کے واسطے دعائے خیر کرتی تھی۔

سید صاحبؒ اور لشکر کی فرودگاہ لشکر گول گھٹڑی میں، جو ایک وسیع پختہ سرائے تھی، سرائے کے باہر ٹھیرا۔ سرائے کے اندر غربی اور جنوبی کونے کی طرف ایک دو منزلہ تہ خانے دار حویلی تھی کہ تین طرف اس میں اکہرے دالان تھے اور ایک طرف دہرا دالان تھا۔ اس میں سید صاحبؒ کا قیام ہوا۔ باقی تین طرف کے دالانوں میں جماعتِ خاص کے لوگ اترے۔ حویلی کے سامنے جو مکان تھا، اس میں مولانا محمد اسمٰعیل صاحب اور ان کی جماعت کے لوگ اترے۔ حویلی کی پشت کی طرف کے مکان میں شیخ ولی محمد صاحب اور ان کی جماعت کے لوگ اترے۔ ارباب بہرام خاں نے اپنے ہمراہیوں کے ساتھ اس پھاٹک پر قیام کیا، جو مغرب رو تھا، اس لیے کہ وہ اس ملک کے روسا میں سے تھے، ہر ایک سے ان کی واقفیت تھی۔ خوانینِ سمہ کو آپ نے سرائے کے شرقی دروازے کے باہر انتظام کے واسطے اتارا۔ باقی لشکر سرائے کے اور مکانوں میں اترا۔ سرائے کے کوٹھوں کی جو منڈیریں ٹوٹ گئی تھیں، بنوا دی گئیں۔ سرائے کی مسجد میں خس و خاشاک بہت پڑا ہوا تھا اور دو تین ٹکڑے پھٹی ٹوٹی چٹائی کے بھی بچھے ہوئے تھے۔ مسجد کو صاف کروا دیا گیا اور نئی چٹائیاں بازار سے خرید کر بچھائی گئیں۔

حفاظتی انتظامات رسالدار حاجی حمزہ علی خاں کو شب بینی کے انتظام کے واسطے حکم ہوا۔ جن سواروں کی اس رات کو باری تھی، اُن کو بتاکید روانہ کیا گیا کہ بہت خبرداری اور ہوشیاری سے رہنا۔ مولانا محمد اسمٰعیل صاحب کو حکم ہوا کہ جہاں جہاں سرائے کی چھتوں پر مناسب جانیں، پہرے لگا دیں۔ جن صاحبوں کی رونْد مقرر تھی، اُن کو رونْد کرنے کی تاکید کی گئی۔ ارباب جمعہ خاں اپنے لوگوں کے ساتھ شہر کی حفاظت پر متعین تھے۔ شہر کے ہر کوچے اور گلی میں انھوں نے پہرے لگا دیے تھے کہ کسی اجنبی آدمی کو آنے کی مجال نہ تھی۔ اس طرح سے سارا شہر گویا مٹھی میں تھا۔

صبح سید صاحبؒ نے حویلی میں نماز پڑھی اور دعا کی۔ دعا کے بعد آپ نے ارباب بہرام خاں سے کہلا بھیجا کہ بازار کے دکانداروں کو حکم بھجوا دیں کہ سب اپنی اپنی دکانیں کھولیں۔ انھوں نے اسی دم اپنا آدمی بھیج کر دکانیں کھلوا دیں۔

لشکرِ مجاہدین کا اخلاقی اثر مولوی سید جعفر علی لکھتے ہیں کہ "سید صاحبؒ نے ارباب بہرام خاں کی معرفت کہلوا دیا کہ دکاندار اطمینان سے دکانیں کھولیں، کوئی کسی پر ظلم نہیں کرے گا۔ چنانچہ دکانداروں نے دکانیں کھول لیں۔ زنانِ بازاری، جن کی پشاور میں بڑی تعداد تھی، روپوش ہو گئیں۔ اگر کسی مرد نے اُن کے یہاں جانا چاہا، تو اُنھوں نے پکار کر کہا کہ خبردار، یہاں نہ آنا، ورنہ نہ تمھاری خیر ہو گی نہ ہماری۔ اسی طرح سے بھنگ وغیرہ کی دکانیں بند ہو گئیں اور پینے والے غائب ہو گئے۔" سید صاحبؒ نے مزید تاکید فرمائی کہ لشکر کا کوئی آدمی پشاور کے باغات کا ایک پھل بھی نہ توڑے۔

کھانے کا انتظام ظہر کی نماز کے بعد میاں عبداللہ دہلوی نومسلم جن کے ذمے غلے کی خریداری کا کام تھا، آئے اور عرض کیا کہ کل سے آج تک لشکر میں غلے کی تقسیم کی کوئی تدبیر نہیں ہو سکی، لوگ بھوکے ہیں۔ آپ نے فرمایا کہ تم اس کا فکر کیوں کرتے ہو؟ جا کر اپنے ڈیرے میں بیٹھو۔ جس کے یہ بندے ہیں، وہ آپ جہاں سے چاہے گا، اُن کو روزی پہنچا دے گا اور جو ابھی تک نہیں پہنچایا ہے، اِس میں کچھ حکمت ہوگی۔ میاں عبداللہ اپنے ڈیرے پر گئے۔ اس روز بھی کچھ کھانے کی تدبیر کہیں سے نہ ہوئی۔ سب لوگ یوں ہی سو رہے۔

اگلے روز نمازِ فجر کے بعد ارباب بہرام خاں نے آکر عرض کیا کہ لشکر میں لوگ پرسوں سے بھوکے

ہیں اور سرکار سے کچھ نہیں ملا ہے۔ اگر ارشاد ہو، تو مَیں اس کی کچھ تدبیر کروں؟ آپ نے فرمایا: بہتر ہے۔ جو تدبیر ہو سکے، کرو۔ تم کو اجازت ہے۔

خان صاحب نے اپنے ڈیرے پر جا کر شہر کے کل مہاجنوں کو بُلوایا اور اُن سے کچھ مشورہ کیا۔ ظہر کی نماز کے بعد ارباب بہرام خاں نے میاں عبداللہ کو اپنے ڈیرے پر لے جا کر مہاجن کی دُکان سے روپے منگوا کر حوالے کیے۔ میاں عبداللہ نے ایک بنیے کی آڑھت سے کئی دکانوں کا آٹا خرید کر ایک دکان پر جمع کروا دیا۔ تنور والوں کی دکانوں پر پکوا کر روٹیاں ڈیروں پر آئیں اور تیسرے روز لشکر والوں کو کھانا ملا۔ جس روز موضع مٹہ سے لشکر کا کوچ ہوا تھا، اُس دن اکثر لوگ بہت خوش تھے اور آپس میں ایک دُوسرے سے کہتے تھے کہ آج پشاور میں چل کر انگور، بہی، سیب، انار، ناشپاتی وغیرہ خوب کھائیں گے اور باڑے کے چاول اور دُنبوں کا گوشت پکائیں گے۔ جس وقت لوگ روٹی کھا رہے تھے، آپس میں کہ رہے تھے کہ بھائیو، یہ جو تیسرے روز روٹی ملی، یہ ہماری اُسی خام خیالی کی سزا ہے۔

دو عورتوں کی گفتگو ایک دن لشکر کے لوگ شہر میں سَیر کر رہے تھے۔ ایک مکان کے بالاخانے پر دو عورتیں بیٹھی تھیں۔ کئی غازیوں کو دیکھ کر ایک عورت نے دُوسری سے کہا کہ سیّد بادشاہ کے لشکر کے یہی غازی ہیں، جن کی شکل وصورت اور یہ ہتھیار اور پوشاک ہے۔ اُنھیں نے سردار سلطان محمّد خاں کے لشکر کو شکست دی۔ میرا خاوند ایسا پہلوان اور قوی ہیکل ہے کہ ایسے چار آدمیوں کے سر ٹکرا کر مار ڈالے اور کھانا اتنا کھاتا ہے کہ مَیں اس کے واسطے گوشت روٹی الگ، پلاؤ الگ پکاتی ہوں، مگر وہ سب کھا جاتا ہے۔ مگر ان لوگوں سے ایسا ہیبت زدہ ہو گیا ہے کہ ان کے نام سے اُس کی جان فنا ہوتی ہے بلکہ رات کو نیند سے چونک چونک پڑتا ہے کہ غازی آپہنچے۔

دُوسری عورت نے کہا کہ ہاں، بی بی، یہ وُہی غازی ہیں۔ خُدا کی قُدرت ہے، جس کو چاہے، غلبہ دے۔ ہمارے دُرانی لوگ کہتے ہیں کہ دیکھنے میں تو یہ غازی حقیر اور کم رُو معلوم ہوتے ہیں مگر لڑائی کے میدان میں خُدا جانے، ان میں کہاں سے جُرأت اور بہادری آجاتی ہے کہ شیر سے زیادہ جری اور بہادر معلوم ہوتے ہیں کہ مارے ہیبت اور رعب کے ہم سے اُن کا سامنا نہیں ہو سکتا۔

دُرّانی لشکر میں انتشار و پراگندگی | دُرّانی لشکر کا ایک حصّہ لشکرِ مجاہدین کے داخلۂ پشاور سے پہلے اس تاک میں تھا کہ پشاور کے راستے میں کہیں حملہ کرے لیکن اس کو موقع نہیں مل سکا اور لشکر بخیر و عافیت پشاور میں داخل ہو گیا۔ اُنھوں نے سردار سے عرض کیا کہ ہم نے بہتیری تدبیر کی کہ ہم سیّد بادشاہ کے لشکر پر حملہ کریں، لیکن ہمیں جرأت نہ ہوئی۔ یہ حال سن کر سُلطان محمد خاں کو بڑا تردّد ہوا اور اُس کے لشکر والوں کے دل ٹوٹ گئے اور جتنے سوار و پیادے اِدھر اُدھر کے تھے، وہ حیلہ بہانہ کر کے اپنی اپنی بستی کو چلنے لگے کہ جس وقت ضرورت ہوگی، اُس وقت ہم آکر حاضر ہو جائیں گے۔ یہ حال دیکھ کر سردارِ ممدوح اور بدحواس ہوا۔ ارباب فیض اللہ خاں نے مشورہ دیا کہ اب اِس سے بہتر کوئی تدبیر نہیں کہ جس طرح سے ہو سکے، سیّد بادشاہ کو راضی کرو، ان سے ملو اور اُن کی تابعداری قبول کرو۔ سردار سلطان محمّد خاں تو سُن کر خاموش رہا، مگر سردار پیر محمّد خاں اور سردار حبیب اللہ خاں کو بڑا غصّہ آیا اور کہنے لگے کہ کاکا، تم نے یہ کیا بات کہی؟ یہ ہرگز نہیں ہوگا کہ ہم عُذر و معذرت کر کے اُن سے ملیں۔ ہم تو سردار کے حکم کے منتظر ہیں۔ اگر فرمائیں، تو ہم اسی وقت جا کر پشاور کو اُن سے خالی کریں اور کل ہم ضرور لشکر لے جا کر اُن سے مقابلہ کریں گے۔

اس اطّلاع کو سُن کر ارباب بہرام خاں نے تمام لشکر میں حکم بھجوا دیا کہ بھائیو، آج کل میں دُرّانیوں کے آنے کی خبر ہے۔ اپنی اپنی چوکی پہرے سے ہر وقت ہوشیار رہنا۔

سُلطان محمّد خاں کی طرف سے نامہ و پیام | ظُہر کی نماز کے بعد ایک آدمی ارباب فیض اللہ خاں کا پیام لایا کہ سردار سُلطان محمّد خاں نے اپنی طرف سے مجھ کو وکیل کر کے بھیجا ہے۔ مَیں ہزارخانی میں اپنے مکان پر ہُوں۔ اگر اجازت ہو، تو مَیں آپ کی خدمت میں حاضر ہُوں اور سردار ممدوح کی طرف سے کچھ عرض کروں۔ آپ نے اجازت دی۔

نمازِ عصر کے بعد ارباب فیض اللہ خاں ساٹھ ستّر سواروں کے ساتھ آئے اور پانچ چھ سواروں کے ساتھ سیّد صاحبؒ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ آپ نے بڑی عزّت و توقیر سے اپنے پاس بٹھلایا اور عافیت مزاج پوچھی[1]۔ ارباب فیض اللہ خاں نے دُرّانیوں کے لشکر کی بددلی کا حال، سردار حبیب اللہ خاں

---

[1] ارباب فیض اللہ خاں سیّد صاحبؒ کے مخلص معتقد اور خیر خواہ تھے اور مرید بھی تھے۔ سرداروں کے بھی خیر خواہ اور نمک حلال تھے (وقائع)

اور پیر محمد خاں کے غصّے اور اپنے مشورے کا سب حال سُنایا اور سردار سُلطان محمد خاں کا پیغام عرض کیا کہ اُنھوں نے کہا ہے کہ آپ ہمارے دین و دُنیا کے امام و مقتدا ہیں اور ہم آپ کے بہر نوع مطیع اور فرماں بردار ہیں۔ ہم سے بڑا قصور ہُوا کہ اپنی شامتِ اعمال سے ہم نے آپ کے اُوپر لشکر کشی کی۔ ہم اپنی سزا کو پہنچے۔ اب ہم آپ کے اخلاقِ کریمانہ سے اُمیدوار ہیں کہ آپ ہمارا قصور ِللہ معاف کر دیں۔ اب ہم ان تمام شرارتوں سے توبہ کرتے ہیں۔ اِنشاء اللہ تعالیٰ پھر ہم سے کبھی ایسی حرکت نہ ہوگی۔

سیّد صاحبؒ کا ارشاد اُن کی یہ تمام تقریر سُن کر سیّد صاحبؒ نے فرمایا کہ خان بھائی، تم اُن کے بیچ میں نہ پڑو۔ وُہ بڑے لسّان اور اپنی غرض کے یار ہیں۔ اُن کے عہد و پیمان کا کچھ ٹھکانا نہیں۔ اپنے مطلب کے لیے یہ لوگ ہر طرح تابعدار بن جاتے ہیں اور جب مطلب نکل جاتا ہے، تو یہ لوگ کسی کے آشنا نہیں ہوتے۔ نہ دُنیا کی شرم رکھتے ہیں، نہ خُدا و رسُولؐ کا خوف۔ ہم نے اِن کو اس لڑائی سے پہلے بھی، جب وُہ یہاں سے لشکر لے کر گئے تھے، کئی بار آدمی بھیج کر سمجھانے کا حق ادا کر دیا، مگر انھوں نے ایک نہ سُنی اور ناحق ہمارا مقابلہ کیا اور ہمارے بہت سے غازیوں کو شہید کیا، مگر اللہ تعالیٰ نے ہم غُربا و ضُعَفاء کو اُن پر فتحیاب کیا اور وہ شکست کھا کر بھاگے۔ ہم نے یہاں تک اُن کا پیچھا کیا۔ اب اُنھوں نے خیال کیا کہ اب ہمارا کہیں ٹھکانا نہیں ہے، تب تم کو درمیان میں ڈال کر یہ چال چلی۔

اس سے پیشتر شَیدُو کی لڑائی میں ہم سے بُدھ سنگھ کا مقابلہ تھا۔ وہاں یہ چاروں بھائی اپنی اپنی جماعت کے ساتھ ہماری کمک کو آئے تھے۔ انھیں نے اپنی دغا بازی سے ہماری لڑائی بگاڑ دی۔ ہم لوگوں کو سکھوں سے بھڑا کر آپ بھاگ کھڑے ہُوئے اور صدہا مسلمان شہید کروائے۔ تب بھی انھوں نے ہمارے ساتھ عہد و پیمان کیا تھا کہ ہم جان و مال سے تمھارے شریک ہیں۔ پھر اس عہد کو کیسے توڑا کیا، تم سب جانتے ہو۔ اب از سرِ نو عہد کرنے کو کہتے ہیں، تو اپنے دل میں ایسا ہی سمجھ لیا ہوگا کہ اپنی غرض نکل جائے؛ پھر جیسا ہوگا، دیکھا جائے گا۔ خان بھائی، ہم نے تم سے جو جو باتیں بیان کی ہیں، اچھی طرح سے بے کم و کاست اُن کے آگے کہنا اور خان بھائی، تم خوب جانتے ہو کہ ہم لوگ جو ہندوستان سے اس مُلک میں آئے ہیں تو صرف اس نیت سے کہ مُسلمان غالب ہوں اور اسلام کی ترقی ہو۔ نہ ہم کو بادشاہت

لینے سے غرض ہے، نہ کابل لینے سے۔ اگر ان کے عہد و پیمان کی صداقت ہم پر ثابت ہوجائے اور منہیات شرعی اور شرکت کفار سے سچی توبہ کرلیں اور ہم مسلمانوں کے اتفاق میں شامل ہوں تو ہم اب بھی موجود ہیں۔

ارباب فیض اللہ خاں نے عرض کیا کہ آپ جو کچھ فرماتے ہیں، حق اور بجا ہے۔ اس میں چون و چرا کی گنجائش نہیں۔ جو کچھ خطا ہے، انھیں کی ہے۔ انشاء اللہ تعالیٰ میں لفظ بلفظ آپ کا فرمانا اُن سے عرض کروں گا۔ مَیں صاف دل مسلمان ہوں۔ منافقانہ گفتگو مجھ کو نہیں آتی۔ ان کا تو مَیں نمک خوار ہوں اور آپ کا خادم فرماں بردار۔ دونوں کی خیر خواہی مجھ کو منظور ہے۔

سلطان محمد خاں کا دوبارہ پیغام تیسرے چوتھے روز وہ پھر آئے اور کہا کہ مَیں نے آپ کی اُس روز کی تقریر لفظ بلفظ سردار سلطان محمد خاں سے نقل کی۔ وہ سن کر بہت نادم اور پشیمان ہوئے اور کہا کہ سید بادشاہ نے جو کچھ فرمایا، اُس میں سرِ مُو تفاوت نہیں، مگر اب ہم خالص دل سے عہد و پیمان کرتے ہیں کہ انشاء اللہ ہم سے بغاوت و نافرمانی کا کوئی کام ظہور میں نہ آئے گا، باغیوں اور کافروں کی رفاقت اور شرکت سے ہم نے توبہ کی، خدا و رسولؐ کا جو کچھ حکم ہے، وہ ہمارے سر آنکھوں پر۔ اس وقت اور جس جگہ جہاد فی سبیل اللہ کے واسطے سید بادشاہ ہم کو یاد کریں گے، اُسی وقت اور اُسی جگہ ہم بلا عذر اپنی جان و مال اور فوج و لشکر سے حاضر ہوں گے۔ اب ہم یہ چاہتے ہیں کہ سید بادشاہ کی خدمت میں حاضر ہو کر از سرِ نو بیعتِ امامت کی تجدید کریں اور تمام منہیاتِ شرعیہ سے بالمشافہ تائب ہوں اور جو کچھ سید بادشاہ کا ملکِ سمہ سے یہاں تک تشریف لانے میں زرِ نقد صرف ہوا ہے، وہ تو ہم کو معلوم نہیں ہے، کس قدر ہوگا، مگر چالیس ہزار روپے ہم نذر کریں گے، بیس ہزار تو اس وقت جب سید بادشاہ اپنے ہاتھ سے ہم کو پشاور میں بٹھا کر کوچ کریں گے اور دس ہزار روپے جبکہ سید بادشاہ ہشت نگر پہنچیں گے تب وہیں بالا حصار سے ملیں گے اور دس ہزار روپے جبکہ پنجتار میں پہنچیں گے۔

آمد کا مقصد آپ نے فرمایا کہ خان بھائی، ہم تو یہی چاہتے ہیں کہ وہ مسلمانوں کے اتفاق میں شریک ہوں اور کفار کا مقابلہ کریں۔ ہم نہ کسی کی ریاست چھیننے کو آئے ہیں، نہ کسی کا ملک لینے کو۔ یہ تو اُس

دُنیا دار شخص کا کام ہے، جو مُلک گیری کا ارادہ رکھتا ہو۔ ہم صرف جہاد فی سبیل اللہ کی نیّت رکھتے ہیں کہ کُفّار کو زیر کریں کہ اسلام کی ترقّی ہو۔ اگر وُہ سچّے دل سے اس اقرار پر مستعد ہیں، تو ہم بھی اس بات سے اِنشاء اللہ تعالیٰ باہر نہ ہوں گے۔

○

تیسواں باب

پشاور کی سپردگی کی تجویز

مشورہ | وقائع میں ہے کہ عشاء کی نماز کے بعد سید صاحبؒ نے مولانا محمد اسمٰعیلؒ اور شیخ ولی محمدؒ، ارباب بہرام خاں، مولوی مظہر علی عظیم آبادی، مُلّا لعل محمدؒ اور مُلّا قطب الدین ننگرہاری اور سمہ کے خوانین کو بُلایا اور تخلیے میں اُن سے گفتگو کی۔ رات گئے دیر تک باتیں ہوئیں۔ لوگوں کو اس کا خلاصہ یہ معلوم ہُوا کہ سردار سلطان محمد خاں کی طرف سے صُلح کا پیام ہے اور حضرت نے منظور کیا ہے۔ یہ بھی معلوم ہُوا کہ صرف مولانا محمد اسمٰعیل آپ کے لحاظ کے سبب خاموش تھے، باقی سب اپنی اپنی سمجھ کے موافق گفتگو کرتے تھے۔ لشکر والوں کو یہ امر بہت شاق ہُوا کہ حضرت دُرّانیوں سے پھر ملاپ کرتے ہیں۔ لوگ کہتے تھے کہ دُرّانی شر و فتنہ سے باز نہیں آئیں گے۔

شہر میں تشویش | رفتہ رفتہ یہ خبر تمام پشاور میں پھیلی۔ جو ہندو اور مسلمان وہاں کے تھے، سب کو تشویش ہُوئی اور اُن میں کچھ سربرآوردہ آدمی مولانا محمد اسمٰعیل صاحب کے پاس آئے اور کہا کہ ہمارے شہر میں یہ خبر عام طور پر مشہور ہے کہ سیّد بادشاہ نے پشاور دُرّانیوں کے سپرد کرنے کا ارادہ فرمالیا ہے۔ ہم کو بڑی خوشی تھی کہ سیّد بادشاہ یہاں کے حاکم ہُوئے۔ اللہ تعالیٰ نے ہم لوگوں کو ان ظالموں کے ہاتھ سے نجات دی، اب چین سے رہیں گے۔ لیکن اس خبر سے نیا کھٹکا پیدا ہُوا کہ پھر ہم لوگ انھیں کے چنگل

میں گرفتار ہوں گے اور اب پہلے کی بہ نسبت ہم لوگوں کو زیادہ ستائیں گے۔ ہم لوگ اُن سے خُوب واقف ہیں۔ اُن کی اطاعت و فرماں بَرداری میں ایک عُمر بسر ہُوئی۔ اس طلاپ کے پردے میں محض فریب ہے۔ ہمارا مُدعا یہ ہے کہ آپ ہم لوگوں کو سید بادشاہ کے پاس لے چلیں۔

اُن کی یہ تقریر سُن کر مولانا نے فرمایا کہ ہم سب جانتے ہیں کہ وہ ایسے ہی ہیں، مگر اس امر میں ہم سید صاحبؒ سے کچھ عرض نہیں کر سکتے۔ تم کو جو کچھ کہنا ہو، ارباب بہرام خاں سے جا کر کہو۔ وُہ تم کو سید صاحبؒ کے پاس لے جائیں گے اور تمھاری طرف سے گفتگو بھی خاطر خواہ کریں گے، اس لیے کہ وُہ بھی تمھارے مُلک کے ہیں اور تمھارے اور دُرّانیوں کے حالات سے خوب واقف ہیں۔

اُنھوں نے یہ تجویز پسند کی اور ارباب بہرام خاں کے پاس گئے۔ خانِ موصوف نے اُن کی تسلّی و تشفّی کی اور کہا کہ تم جا کر اپنا کاروبار کرو، شام کو ہمارے پاس آنا۔ اُس وقت تم کو حضرت کے پاس لے چلیں گے اور تمھاری طرف سے وکالت کریں گے۔

کچھ دیر کے بعد لشکر سے خاص خاص قندھاری اور سمہ کے بڑے بڑے خوانین ارباب بہرام خاں کے پاس آئے اور اپنی تشویش اور خطرے کا اظہار کیا اور دُرّانیوں کے ظُلم اور اُن کی زیادتیاں بیان کیں اور خواہش کی کہ یہ ساری گفتگو سید صاحبؒ کے گوش گزار کر دی جائے۔ ارباب بہرام خاں نے اُن کو اطمینان دلایا کہ وُہ سید صاحبؒ کی خدمت میں اُن کی پوری ترجمانی اور نمائندگی کریں گے۔

ارباب بہرام خاں کی سید صاحبؒ سے گفتگو

عشاء کی نماز کے بعد ارباب بہرام خاں اپنے بھائی ارباب جُمعہ خاں کے ساتھ سید صاحبؒ کی خدمت میں گئے اور کہا کہ حضرت، کچھ بات آپ سے تنہائی میں عرض کرنی ہے۔ یہ سُن کر وہ آدمی، جو اُس وقت وہاں تھے، اُٹھ کر چلے گئے۔ ارباب بہرام خاں نے اہلِ شہر کے نمائندوں کی گفتگو نقل کی اور اُن کی تشویش کا اظہار کیا اور کہا کہ اہلِ شہر کہتے ہیں کہ جب سُلطان محمد خاں پھر اس شہر پر قابض اور متصرّف ہوں گے، تو ہم پر اور بھی ہاتھ صاف کریں گے، اس واسطے کہ سید بادشاہ کے یہاں تشریف لانے پر جو ہم لوگوں نے خوشیاں منائی تھیں، اُن کو اس کی ذرا ذرا خبر پہنچی۔ وُہ آپ کے چلے جانے کے بعد ہم پر غصّہ اُتاریں گے اور ہماری تباہی میں کوئی کسر نہیں اُٹھا رکھیں گے۔

شہر والے کوئی اس بات پر راضی نہیں ہیں کہ سیّد بادشاہ پشاور اُن کے حوالے کر کے یہاں سے تشریف لے جائیں۔ اگر سیّد بادشاہ کو اپنے لشکر کے خرچ اور یہاں کے بندوبست کے لیے دو چار لاکھ روپے کی بھی ضرورت ہو۔ تو ہم اُس کی بھی سبیل کر دیں گے اور اس کے سوا جو کچھ بھی وُہ فرمائیں گے، ہم کو عُذر نہیں ہوگا۔

اہلِ شہر کے علاوہ فتح خاں پنجتاری اور اسمٰعیل خاں کو چھوڑ کر سُمّہ کے سب خوانین اور لشکر کے فلاں فلاں قندھاری بھائی بھی میرے پاس آئے اور اُنھوں نے دُرّانیوں کی بیوفائی اور بدعہدی اور اپنی تباہی؛ خانہ ویرانی اور بے عزّتی کا حال بیان کیا اور کہا کہ ہم ہرگز اس بات پر راضی نہیں ہیں کہ سیّد بادشاہ اُن سے مصالحت کریں اور پشاور اُن کو دیں۔ اُن سب نے مجھ سے کہا کہ تم ہماری طرف سے وکالتًا تمام باتیں سیّد بادشاہ کے گوش گزار کر دو۔ مَیں نے اُن سے اقرار کیا کہ مَیں تمھاری طرف سے عرض کر دوں گا۔

ان سب کا خیال کر کے میری ناقص رائے میں یُوں آتا ہے کہ اگر آپ کو پشاور دینا ہی منظور ہے، تو آپ مجھی کو سرفراز فرمادیں، مَیں بھی آپ کا ایک ادنیٰ خادم ہُوں اور یہیں کا باشندہ اور یہاں کے راہ و رسم سے خوب واقف ہوں۔ تمام رعایا مجھ سے راضی بھی ہے۔ اگر آپ یہ ریاست مجھے سپرد کر کے یہاں سے تشریف لے جائیں گے، تو مَیں دُرّانیوں سے سمجھ لوں گا۔ اب جو کچھ آپ ارشاد کریں مَیں اُن کو وُہی جواب دُوں۔

سیّد صاحبؒ کی تقریر ارباب بہرام خاں کی پوری گفتگو سُن کر سیّد صاحبؒ نے سکوت کے بعد فرمایا کہ جزاک اللہ! خان بھائی، تم نے خُوب کیا، جو سب لوگوں کے حال کی مجھ کو اطّلاع کی اور جو ہمارے لشکر کے بھائی اور شہر کے لوگ دُرّانیوں کی غدّاری اور حیلہ سازی بیان کرتے ہیں، وہ سچ ہے؛ بلکہ میرے پروردگار نے مجھ پر جو ان کا حال منکشف کیا ہے، اگر وہ بھائی لوگ جان لیں، تو خدا جانے کیا کریں۔ مگر تم سب خُوب جانتے ہو کہ ہم لوگ ہندوستان سے گھر بار چھوڑ کر اور عزیزوں آشناؤں سے مُنہ موڑ کر صرف اس لیے آئے ہیں کہ وُہ کام کریں جس میں پروردگار کی رضامندی و خوشنودی ہو، مخلوق کی خوشی و ناخوشی سے ہم کو کچھ غرض نہیں۔ خوش ہوں گے، تو کیا بنائیں گے، اور ناخوش ہوں گے، تو

کیا بگاڑیں گے؟ نادان سمجھتے ہیں کہ یہ مُلک گیری اور دُنیا طلبی کے لیے آئے ہیں۔ یہ اُن کا خیال خام ہے، ابھی وُہ دینِ اسلام سے واقف نہیں ہیں۔

اور جو سَمَہ کے خوانین بھائی اُن کے ظُلم و تعدّی کا شکوہ اور اپنی بے عزّتی، خانہ ویرانی اور زیربلیوں کا قصّہ بیان کرتے ہیں، یہ سب سچ ہے۔ اس بات کو یوں سمجھیں کہ ہمیشہ سے کافر و باغی اور منافق مسلمانوں پر طرح طرح کی تعدّی اور مکّاری کرتے رہے ہیں، مگر جس وقت اللہ تعالیٰ کی رضامندی کا کام مقابلے میں آجاتا ہے، اُس وقت سب بُغض و عداوت کو اپنے دل سے دُور کرتے ہیں اور زبان پر نہیں لاتے اور اُن کے ساتھ وُہی معاملہ کرتے ہیں، جس میں پروردگار کی رضامندی اور اُس کے فرمان کی تعمیل ہو، اگرچہ نفس اور ابناءِ زمانہ کے مخالف ہو۔ مسلمانی اور دینداری و خدا پرستی اسی کا نام ہے، نہیں تو نفس پرستی اور دنیا داری ہے۔

اور جو اپنے قندھاری بھائی شکایت کرتے ہیں کہ ہمارے اتنے بھائی انھوں نے شہید کیے، تو یہ بات شُکر کے لائق ہے نہ کہ شکایت کے، اس لیے کہ وُہ سب بھائی اپنی دلی مُراد کو پہنچے۔ وُہ اسی مطلب کے حصُول کے لیے یہ تمام تکالیف و مصائب اُٹھا کر اتنی دُور دراز کی مسافت سے جہاد فی سبیل اللہ کو آئے تھے کہ اپنے پروردگار کی رضامندی کی راہ میں اپنی جانیں صرف کریں۔ سو وُہی اُنھوں نے کیا اور یہ جہاد کا کاروبار صرف پروردگار کی رضامندی کا ہے، نفسانیت اور جنبہ داری کا نہیں ہے، جیسے دُنیا دار اور جاہ طلب لوگ کرتے ہیں۔

اور جو شہر والے اس بات کا خوف کرتے ہیں کہ ہم نے جو سیّد صاحبؒ کے آنے سے خوشیاں کی ہیں، اس لیے وُہ ہم کو تباہ کر دیں گے، یہ اُن کی نافہمی اور نادانی ہے۔ یہ نہیں جانتے کہ اگر وُہ رعایا کو تباہ و خراب کریں گے، تو حاکم اور رئیس کس کے کہلائیں گے؟ رعایا تو بے بس اور عاجز ہوتی ہے۔ جو کوئی اُس پر غالب آجاتا ہے، اُس کی وُہ تابع اور فرماں بردار ہو جاتی ہے اور جو تابعدار نہ ہو تو کہاں رہے؟ رعایا کو کوئی نہیں خراب کرتا۔ نہ اُس کا حاکم، نہ کوئی غنیم بلکہ دونوں اس سبب سے آرام پاتے ہیں اور سردار کہلاتے ہیں۔ رعایا میوے دار باغ کی طرح ہے کہ مالک اور غیر مالک سب اس کے میوے سے

فائدہ حاصل کرتے ہیں۔ کوئی میوے دار درخت کو تباہ نہیں کرتا اور جو باغ ہی کاٹ ڈالے گا، تو باغ والا کیونکر کھلائے گا اور فائدہ کیا پائے گا؟ سو خان بھائی، تم اُن کو تسلّی کر کے سمجھا دینا کہ انشاء اللہ تعالیٰ تم کو کوئی تباہ و خراب نہ کرے گا۔

اور جو یہ کہتے ہیں کہ اگر ضرورت ہو، تو شہر کے انتظام اور لشکر کے خرچ کے لیے ہم دو چار لاکھ روپے کا بندوبست کر دیں، مگر میاں کی حکومت دُرّانیوں کو نہ دیں، سو یہ بات ہم کو منظور نہیں، اس لیے کہ ہم کو تو اپنے پروردگار کی رضامندی چاہیے۔ جس میں وُہ راضی ہوگا، ہم کریں گے۔ اس میں چاہے تمام جہان ناخوش ہو، کچھ پروا نہیں۔ اگر ایک جگہ ہفت اقلیم کی دولت اور سلطنت پروردگار کی رضامندی کے خلاف ملتی ہو، تو اس دولت اور سلطنت کی کچھ حقیقت نہیں، اور ایک جگہ پروردگار کی رضامندی کے موافق ہفت اقلیم کی دولت اور سلطنت جاتی ہو، تو اُس کی رضامندی سب کچھ ہے۔

خلاصہ اِس گفتگو کا یہ ہے کہ سردار سلطان محمّد خاں اپنی خطا و قصور سے نادم اور تائب ہوا ہے اور شریعت کے تمام احکام کو اُس نے قبول کیا ہے اور کہتا ہے کہ اب دوبارہ بغاوت و شرارت اور خُدا و رسُولؐ کی مرضی کے خلاف کوئی فعل نہیں کروں گا، میری خطا للہ معاف کرو۔ اگر یہ کلام نفاق اور دغابازی سے کرتا ہے، تو وُہ جانے، اُس کا خدا جانے۔ شریعت کا حُکم تو اقرارِ ظاہری پر ہے، کسی کے دل کے حال پر نہیں۔ دل کا حال خُدا کو معلوم ہے۔ ہم تو اُس کے ساتھ وہی معاملہ کریں گے، جو ظاہر شریعت کا حکم ہے۔ اس میں چاہے کوئی راضی ہو، چاہے ناراض ہو۔ اب جو ہم اُس کا عُذر نہ مانیں، تو اس پر ہمارے پاس کونسی دلیل اور حُجّت ہے؟ اگر کوئی عالم دیندار خداپرست کسی دلیلِ شرعی سے ہم کو سمجھا دے کہ تم خطا پر ہو، تو ہم منظور کر لیں گے۔ اِس کے بغیر ہرگز نہ مانیں گے، کیونکہ ہم تو خُدا و رسُولؐ کے تابع ہیں اور کسی کے تابع نہیں ہیں۔

تقریر کا اثر جس وقت سیّد صاحبؒ یہ تقریر فرما رہے تھے، اس وقت رحمتِ الٰہی کا عجیب نزول ہو رہا تھا۔ روتے روتے ارباب بہرام خاں اور ارباب جُمعہ خاں کے ہچکیاں لگ گئی تھیں اور وہ عالمِ سکوت میں بیہوش اور خود فراموش تھے۔ جب آپ خاموش ہُوئے، تب ارباب بہرام خاں نے

عرض کی کہ حضرت، جو کچھ آپ نے فرمایا، حق اور بجا ہے۔ خدا و رسولؐ کی رضامندی کے کاموں سے آپ ہی واقف ہیں، ہم دُنیاداروں اور نفس پرستوں کو کیا خبر ہے؟ ہم نے اِس وقت جانا کہ دینِ اسلام اس کو کہتے ہیں اور خدا و رسولؐ کی اطاعت اس کا نام ہے اور جو خیال اس کے خلاف میرے دل میں تھا، اب میں اُس سے آپ کے سامنے توبہ کرتا ہوں اور از سرِ نو آپ کے ہاتھ پر بیعت کرتا ہوں۔ آپ میرے لیے دُعا کریں۔

صُبح ارباب بہرام خاں نے سَمَہ کے سرداروں اور قندھاریوں کے سامنے سیّد صاحبؒ کی رات کی تقریر دُہرائی۔ وُہ بھی سب مطمئن اور خاموش ہو گئے۔ لیکن شہر والوں کو اطمینان نہیں ہُوا اور انھوں نے کہا کہ سیّد بادشاہ تو ولی شخص اور اللہ والے لوگ ہیں۔ اُنھوں نے جو کچھ فرمایا، بجا فرمایا۔ ہماری تو صرف یہ غرض تھی کہ اگر سیّد بادشاہ یہاں کے حاکم ہوتے تو ہم رعایا لوگ آرام اور چین سے اپنی گزران کرتے اور دُرّانیوں کے جَور و جفا سے نجات پاتے، مگر سیّد بادشاہ اپنے کاروبار کے مختار ہیں۔ جو کچھ اپنے نزدیک بہتر جانیں، وُہ کریں، اس میں ہم ناچار ہیں۔

پشاور کے ایک سیٹھ کی گفتگو شہر کے سیٹھوں نے جو دیکھا کہ ارباب بہرام خاں کے ذریعے مطلب برآری نہیں ہُوئی، تو انھوں نے آپس میں صلاح و مشورہ کر کے ایک سیٹھ کو سیّد صاحبؒ کے پاس بھیجا، جس کا نام بُدھ رام تھا۔ اُس نے کچھ میوہ کئی ٹوکروں میں اور زرِ نقد نذر کیا اور عرض کی کہ کچھ تنہائی میں آپ سے عرض کرنا ہے۔ اُس وقت جو لوگ وہاں حاضر تھے، پہرے والوں کے سوا آپ نے سب کو رُخصت کر دیا اور سیٹھ سے پوچھا: کیا کہتے ہو؟

اُس نے عرض کی کہ شہر میں مشہور ہے کہ سیّد بادشاہ سردار سُلطان محمد خاں کو یہاں کی ریاست و حکومت پھر دیتے ہیں۔ یہ خبر سُن کر یہاں کے سیٹھوں کو بڑا تردّد اور اندیشہ ہُوا کہ ہم تو یہاں سیّد بادشاہ کے تشریف لانے سے بہت خوش ہوتے تھے کہ اللہ تعالیٰ نے ایسے مُنصف، خدا ترس اور غریب پرور حاکم کو یہاں بھیجا، اب ہم لوگ آرام و چین سے گزران کریں گے۔ لیکن اب یہ مشہور ہو رہا ہے کہ آپ حکومت پھر انھیں کے حوالے کر رہے ہیں۔ اس سبب سے سب سیٹھوں نے اپنی طرف سے مجھے مختار

کر کے بھیجا ہے کہ جس صورت سے سیّد بادشاہ راضی ہوں، اُس صورت سے راضی کر لو اور یہاں سے جانے نہ دو۔

سو خدمت شریف میں میری عرض یہ ہے کہ آپ کس لیے یہ ملک سردار سلطان محمد خاں کو دیتے ہیں؟ اگر یہ سبب ہے کہ آپ کے پاس فوج و لشکر کم ہے اور اس کے لیے لشکر بہت چاہیے اور اس کے انتظام کو خزانہ بھی بہت چاہیے، تو آپ اس کا اندیشہ نہ کریں۔ آپ کے فرمانے کی دیر ہے، میں آپ ہی کے پاس حاضر ہوں۔ جس قدر روپیہ آپ فرمادیں، دو گھڑی کے عرصے میں اسی جگہ روپوں کا ڈھیر لگا دوں، اور ادھر آپ نوکر رکھنا شروع کر دیں۔ جس قدر ضرورت ہو، نوکر رکھ لیں اور اُس کے سوا اور سبب ہو، تو اِس بات کو آپ جانیں۔

سیّد صاحبؒ کا جواب | سیّد صاحبؒ نے اُس کی باتیں سُن کر اُس کو بہت شاباش دی اور فرمایا کہ تم بڑے لائق اور خیر خواہ شخص ہو۔ جو کام تمھارے لائق تھا، اُس میں تم نے کچھ کوتاہی نہیں کی۔ ہم اس امر میں تم سے بہت خوش ہیں اور فرمایا کہ سیٹھ جی، تم یہ بات بہت اچھی کہتے ہو جو حاکم مُلک گیری کا ارادہ رکھتے ہیں، اُن کے کام کی ہے، لیکن ہم اُن حاکموں میں نہیں ہیں۔ ہم اپنے مالک کے فرمانبردار ہیں۔ جو کچھ کام ہم لوگ کرتے ہیں، اُسی کی مرضی کے موافق کرتے ہیں۔ لوگوں کے رُوبرُو اس میں کچھ نقصان نظر آتا ہو یا فائدہ، اس سے کچھ غرض نہیں۔ ہمارے مالک کا حکم ہے کہ کوئی شخص کیسا ہی قصوروار ہو، جب وہ اپنے قصور سے توبہ کرے اور اپنی خطا کا عُذر کرے، تو اس کی خطا معاف کرنی چاہیے اور اُس کا عُذر قبول کرنا لازم ہے، اگر اُس نے توبہ دغابازی سے کی ہو، تو اس بات سے ہم کو کچھ کام نہیں، وُہ جانے، اُس کا خُدا جانے۔ اُس کا مال و مُلک زبردستی لینا درُست نہیں۔ ہمارے اور سردار سُلطان محمد خاں کے درمیان اسی طور کا معاملہ ہے۔ اور جو تم لشکر اور خزانے کا ذکر کرتے ہو، تو ہمیں اِس کا کچھ اندیشہ نہیں، چاہے ہو یا نہ ہو، کیونکہ ہمارے مالک کے یہاں سب کچھ ہے، کسی چیز کی کمی نہیں۔ اگر وُہ اپنا کام ہم سے لے گا، تو بہتر سے بہتر فوج و لشکر اور مال و خزانہ بغیر مانگے عنایت کرے گا۔

اور جو تم لوگوں کو یہ خوف ہے کہ وُہ ہم کو تباہ و برباد کر دیں گے، تو یہ تمہارا وہم ہے۔ اس بات کا تم کچھ اندیشہ نہ کرو۔ کسی ریاست میں حاکموں کا یہ دستور نہیں کہ سیٹھوں، ساہوکاروں کو تباہ کریں، کیونکہ اُن کے سبب سے اُن کے مُلک و شہر کی آبادی ہوتی ہے اور اُن کے بڑے بڑے کام سیٹھوں ساہوکاروں سے نکلتے ہیں۔ اگر وُہ سیٹھوں، ساہوکاروں کو تباہ و برباد کر دیں، تو اُنھیں کا نقصان ہوگا، اور کوئی سیٹھ ساہوکار اُن کی ریاست میں بُود و باش اختیار نہ کرے گا۔

سید صاحبؒ کا یہ جواب سُن کر بُدھ رام خاموش ہو گیا اور کہنے لگا کہ آپ سچے اللہ والے لوگ ہیں، آپ کی باتوں کا کون جواب دے سکتا ہے؟ جو کچھ آپ فرماتے ہیں، سب بجا ہے۔ اس کے بعد وُہ آپ سے رُخصت ہو کر اپنے مکان کو چلا گیا۔

○

اکتیسواں باب

سُلطان محمّد خاں کی مُلاقاتیں اور پشاور کی سپُردگی

سردار سُلطان محمّد خاں اور مولانا محمد اسمٰعیل صاحب کی مُلاقات

ارباب فیض اللہ خاں نے سردار سُلطان محمّد خاں کا ملنے کا تقاضا پہنچایا سیّد صاحبؒ کی رائے ہُوئی کہ شہر کے باہر ہزار خانی کے مَیدان میں آپ کچھ لوگوں کے ساتھ جائیں اور اُدھر سے سُلطان محمّد خاں اپنے لوگوں کے ساتھ آکر ملاقات کریں لیکن لشکر کے اہل الرائے نے اس سے اختلاف کیا اور انھوں نے یہ رائے دی کہ پہلے مولانا محمد اسمٰعیل صاحب سردار سے ملاقات کریں۔ دو تین ملاقاتوں میں اُن کا رویہ معلوم ہو جائے گا۔ اُس کے بعد سیّد صاحبؒ مُلاقات کریں، تو مضائقہ نہیں۔

آپ نے بھی اس رائے کو پسند فرمایا۔ اوّل سُلطان محمّد خاں نے اس سے اتفاق نہیں کیا اور کہا کہ مولانا سے مُلاقات کرنے سے تو کچھ حاصل نہیں، مُلاقات کرنا، نہ کرنا دونوں برابر ہے۔ براہِ راست سیّد صاحبؒ سے مُلاقات کرنا ضروری ہے۔ یہ رائے سُلطان محمّد خاں کے دونوں سردار سیّد محمّد خاں اور اُن کے بھتیجے حبیب اللہ خاں کی بھی اور اُن کا اصرار تھا۔ سیّد صاحبؒ نے اصرار فرمایا کہ پہلے مولانا محمد اسمٰعیل صاحب سے مُلاقات ہو اور ارشاد فرمایا کہ اُن کو ہمارے حُکم کو بلا عُذر و بلا انکار قبول کرنا چاہیے کہ یہ اطاعت کا معاملہ ہے۔ اس میں جانبین کے تمام شُبہات بھی دفع ہو جائیں گے

آخر فیض اللہ خاں کے سمجھانے سے سلطان محمد خاں نے منظور کیا اور فیض اللہ خاں کے مکان پر ملاقات قرار پائی۔

مولوی سید جعفر علی لکھتے ہیں: "ہزار خانی کے مقام میں (جو ارباب فیض اللہ خاں کا گاؤں ہے اور پشاور سے جانب جنوب ایک میل یا اس سے کچھ زائد فاصلے پر واقع ہے) ملاقات طے ہوئی۔ قرار پایا کہ مولانا چالیس پچاس آدمیوں کے ساتھ ہزار خانی تشریف لے جائیں اور اتنے ہی آدمیوں کی جمعیت کے ساتھ سردار پشاور وہاں آئے اور مولانا سے ملاقات کرے اور آپ کے ہاتھ پر توبہ اور بیعت کرے۔

نمازِ عصر کے بعد مولانا اپنی جمعیت کے ساتھ ہزار خانی کے قریب پہنچ گئے۔ سلطان محمد خاں فاصلے پر تھا۔ مولانا جب گاؤں کی آبادی میں داخل ہوئے، تو سلطان محمد خاں نے ملاقات کا ارادہ فسخ کر دیا اور ارباب سے کہلا بھیجا کہ آج ملاقات ملتوی ہے۔ ہم کل شام کو ملنے آئیں گے۔ معلوم ہوا کہ اس کو مولانا محمد اسمٰعیل صاحب بلکہ خود سید صاحبؒ کی طرف سے اطمینان نہیں ہے اور دل میں اندیشے ہیں وَ الْمَرْءُ يَقِيْسُ عَلٰى نَفْسِهٖ۔[1]

اس عرصے میں پشاور اور اطراف و نواح کے گاؤں میں تذکرہ ہوا کہ ہزار خانی کی گڑھی میں سردارِ پشاور نے کوئی توپ چھپا دی ہوگی یا بارود سے اس کو بھر رکھا ہوگا۔ "درانیوں کے متعلق عام طور پر اسی طرح کی شہرت تھی۔ جب مولانا محمد اسمٰعیل صاحب تک یہ بات پہنچی، تو فرمایا کہ عجب نادان لوگ ہیں کہ ایسی ناسمجھی کی باتیں کہتے ہیں۔ اگر یہی بات ہے کہ اس مکان میں بارود بچھا رکھی ہے، تو میں تنہا تو نہیں جا رہا ہوں، سردارِ پشاور خود وہاں موجود ہوگا۔ وہ ایسے موقع پر کیسے بچ سکتا ہے؟ یہ بات بالکل ناقابلِ قیاس اور بے بنیاد ہے۔

دوسرے روز مولانا نے اتنا توقف فرمایا کہ سردارِ پشاور سو مسلح آدمیوں سے زیادہ اپنے ساتھ لے کر ہزار خانی کی گڑھی میں داخل ہوا۔ اس کے بعد مولانا تشریف لے گئے۔ آپ کے ساتھ

---

[1] "منظورہ" کا بیان ہے۔ وقائع میں دو ملاقاتوں کا تذکرہ ہے۔ دوسری ملاقات کی روداد آگے آتی ہے۔

سو کے قریب آدمی تھے، لیکن رُودار اور چیدہ چیدہ۔ اکثر قرابین سے مُسلّح تھے۔ مولانا گڑھی کے قریب ایک باغ میں تشریف فرما ہُوئے۔ سردار کو اطلاع ہُوئی۔ اس نے گڑھی میں طلب کیا اور کہا کہ میں گڑھی کے دروازے تک جاکر پیشوائی کروں گا، لیکن فیض اللہ خاں کی رائے نہ ہُوئی اور ایک فرش گڑھی کے باہر ڈال دیا گیا۔ مولانا باغ کے دروازے سے اور سلطان محمد خاں گڑھی کے دروازے سے ساتھ ساتھ پہنچے۔ سلام و مصافحہ و معانقہ کے بعد مولانا اور سردار فرش پر بیٹھ گئے۔ جانبین کے مسلّح آدمی کھڑے رہے۔ مولانا نے پندرہ آدمیوں کو دیہات کے باہر پہرے دار کے طور پر چھوڑ دیا تھا تاکہ دُرّانیوں کی طرف سے کوئی جماعت پر حملہ آور نہ ہو۔

مزاج پُرسی کے بعد سُلطان محمد خاں نے نیاز مندانہ گفتگو کی۔ اپنے گزشتہ افعال سے توبہ اور مولانا کے ہاتھ پر بیعت اور خدمتِ دین و شرکتِ مجاہدین کا عہد کیا۔ مولانا نے سیّد صاحبؒ کے نائب کی حیثیت سے بیعت لی۔

اسی اثنار میں دُرّانیوں کی طرف سے ایک بندوق سر ہُوئی۔ بندوق کے چلنے کی آواز سُنتے ہی مولانا کے تمام ہندوستانی رفیقوں نے اپنی اپنی قرابینوں اور چقماقوں کے پائے چڑھا لیے۔ یہ دیکھ کر سُلطان محمد خاں کے چہرے کا رنگ فق ہو گیا۔ دونوں ہاتھ مولانا کے زانو پر رکھ کر کہنے لگا "خیر است، خیر است"، خیریت ہے، خیریت ہے۔ مولانا نے کسی اضطراب اور اپنی نشست میں تغیر کے بغیر فرمایا کہ ہاں، مجھے معلوم ہے، خیریت ہے، لیکن آپ بھی خوف نہ کیجیے، اس لیے کہ ہماری طرف سے قرابینوں اور بندوقوں کو احتیاطاً تیار کر لیا گیا ہے۔ دُرّانی یہ منظر دیکھ کر پیچھے ہٹ گئے اور ایک تحیر اور سناٹے میں آ گئے، جس کی بندوق چلی تھی، وہ اپنے گروہ میں رَل مِل گیا۔ ارباب فیض اللہ خاں نے للکار کر کہا کہ اے بیوقوفو، اگر تم میں سے کسی نے اس طرف کا رُخ کیا، تو یہ ہندوستانی کسی کو چھوڑیں گے نہیں۔ سردار کے ہمراہیوں نے اپنے سر سے الزام دُور کرنے کے لیے اُس شخص کو، جس سے یہ خطا ہُوئی تھی، ارباب کے سامنے حاضر کیا۔ ارباب نے بندوق چلنے کا سبب پُوچھا۔ اس پر خوف سے کپکپی طاری تھی اور بے حواس ہو رہا تھا۔ بولا کہ نادانستگی میں میری بندوق کی چانپ چڑھی ہُوئی تھی اور میری

انگلی لبلبی پر تھی، پیچھے سے دھکا لگنے کی وجہ سے بے خبری میں بندوق چل گئی۔ ارباب نے پوری بات سردار سلطان محمد خاں سے نقل کر دی۔ وہ سن کر خاموش ہو گیا۔ اسی وقت سلطان محمد خاں رخصت ہو کر گڑھی میں آیا اور مولانا باغ میں تشریف لائے۔ ارباب نے عرض کیا کہ ماحضر تیار ہے۔ مولانا نے فرمایا کہ سردار اور اس کے ساتھیوں کو کھلا دیجیے۔ میں پشاور جاتا ہوں۔ ارباب نے عرض کیا کہ آپ کو اختیار رہے۔ اگر تشریف لے جاتے ہیں، تو کھانا وہیں پہنچ جائے گا۔

ایک تہائی رات گزری تھی کہ مولانا اپنی جماعت کے ساتھ سرائے پشاور کی مسجد میں نماز پڑھ کر استراحت کے لیے تشریف لے گئے۔ ارباب کا بھیجا ہوا کھانا، جو حلوائے فواکہ کی شکل میں تھا، پہنچا۔ مولانا نے سید صاحبؒ سے عرض کیا کہ ملاقات کی رُوداد تو کل گوش گزار کروں گا، لیکن ارباب کا بھیجا ہوا کھانا آیا ہے، اس کے متعلق کیا ارشاد ہے؟ فرمایا کہ خود نوش فرمائیں اور اپنے ساتھیوں کو، جو ساتھ گئے تھے، کھلا دیں۔

مولانا محمد اسمٰعیل صاحب کی دوسری ملاقات رات کو سید صاحبؒ نے مولانا محمد اسمٰعیل صاحب سے تنہائی میں باتیں کیں۔ صبح کو مولانا نے ساتھیوں سے کہلا بھیجا کہ کھانا کھا کر سب لوگ کمر باندھ کر اور تیار ہو کر آ جائیں۔ ہزار خانی میں آپ اسی باغ میں اترے، جہاں پہلی ملاقات ہوئی تھی۔ آپ نے ظہر کی نماز وہیں پڑھی اور عصر کی نماز بھی وہیں پڑھی اور سلطان محمد خاں کا انتظار کرتے رہے۔ عصر کے بعد سردار موصوف کی سواری آئی۔ گڑھی کے دروازے پر پہلی ملاقات کی جگہ فرش پر دونوں کی ملاقات ہوئی اور دونوں وہیں پر بیٹھ کر باتیں کرنے لگے۔ دونوں طرف کے لوگ فرش کے کنارے پر کھڑے تھے۔ اس روز سردار ممدوح نے بالمشافہ اپنے عہد و پیمان کی وہ باتیں کیں، جو ارباب فیض اللہ خاں نے سردار ممدوح کی طرف سے وکالۃً سید صاحبؒ سے کی تھیں۔ اس کے بعد یہ بھی کہا کہ مجھ سے اور آپ سے دو ملاقاتیں ہوئیں، اب سید بادشاہ کی ملاقات باقی رہی۔ سو جس روز جس وقت سید بادشاہ ملاقات کے واسطے یاد کریں، میں حاضر ہوں۔

مغرب کے قریب تک مولانا اور سردار موصوف میں باتیں ہوتی رہیں۔ اس کے بعد ارباب

فیض اللہ خاں نے تنہائی میں مولانا سے کچھ باتیں کیں۔ پھر آپ اپنی قیامگاہ پر آئے اور سید صاحبؒ سے سب حال بیان کیا اور یہ بھی کہا کہ سردارِ ممدوح نے کہا کہ ہماری اور تمھاری تو دو ملاقاتیں ہو چکیں، اب سید بادشاہ سے ملاقات کرنی ہے اور یہ انھیں کی رائے پر ہے۔ جس روز مجھ کو یاد فرمائیں میں حاضر ہوں۔ آپ نے فرمایا کہ خیر، جس طرح آپ سب صاحبوں کی صلاح ہوگی، اس طرح دیکھا جائے گا۔

شہر میں وعظ و اصلاح | پشاور میں تین جمعے پڑھنے کا اتفاق ہوا۔ تین جمعوں کو مولوی مظہر علی صاحب عظیم آبادی نے جہاد کا وعظ کہا۔ وہ لوگوں کو فارسی میں بھی سمجھاتے تھے اور اردو میں بھی۔ اُن کے وعظ میں ایسی رقت تھی کہ اکثر آدمی زار زار روتے تھے۔

حافظ عبداللطیف صاحب نے عرض کیا کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت کو اس ملک پر فتحیاب کیا ہے۔ شہر اور جوارِ شہر کے لیے دینی احتساب اور امر بالمعروف اور نہی عن المنکر ضروری ہے۔ فرمایا کہ آپ اور خضر خاں قندھاری اپنے ہمراہیوں کے ساتھ شہر کی تمام مساجد کا دورہ کرو اور نماز کی تاکید کرو۔ جس کو تارک الصلوٰۃ پاؤ، اس کی تادیب اور گوشمالی کی تم کو اجازت ہے۔ اہل فسق و معاصی تمھارے ڈر سے اور احتساب کے خوف سے رُو پوش ہو جائیں گے۔

حافظ صاحب نے خضر خاں اور دوسرے ساتھیوں کے ساتھ شہر کا گشت کیا اور نماز اور جماعت کے التزام کی تاکید کی۔[1]

سید صاحبؒ اور سردار سلطان محمد خاں کی ملاقات | ارباب فیض اللہ خاں سردار سلطان محمد خاں کا پیغام پھر لائے کہ ملاقات کے لیے دن مقرر کر دیا جائے۔ آپ نے اپنے مشیروں کو جمع کر کے فرمایا کہ سردار صاحب نے ملاقات کا دن دریافت کیا ہے، سو کس قدر آدمیوں کے ساتھ اور کس مقام پر اور کب بلائیں؟ ان اہلِ شوریٰ نے لشکر کے سب افسروں اور سمہ کے سب خوانین کو جمع کر کے مشورہ کیا۔ آخر میں مولانا محمد اسمٰعیل صاحب کی تجویز پر سب کا اتفاق ہوا کہ اُن کو کہلا بھیجا جائے کہ اپنے تمام

---

[1] منظورہ ص ۹۱۷، ۹۱۸

سواروں و پیادوں کے ساتھ تم آؤ اور یوں ہی ادھر سے ہم اپنے تمام لشکر کے ساتھ آتے ہیں پھر دونوں کو اختیار رہے، جتنی جمعیت سے چاہیں، وُہ آئیں اور جتنی جمعیت سے یہ چاہیں، جائیں۔ اس میں نہ اُن کو ہماری طرف سے کچھ شُبہہ ہوگا، نہ ہماری طرف سے اُن کو۔ اس لیے ہر کوئی جانے گا کہ جو کچھ معاملہ ہوگا، وُہ ہمارے سامنے ہوگا۔

مُلاقات کے لیے ہزار خانی کا میدان سردار سُلطان محمّد خاں کی طرف سے تجویز ہُوا۔ دو دن پہلے مولانا محمد اسمٰعیل صاحب ارباب بہرام خاں دو ڈھائی سَو آدمیوں کے ساتھ ملاقات کے میدان کو دیکھنے تشریف لے گئے اور اچھی طرح اس کا گشت کر کے اُس کا نشیب و فراز دیکھا۔ اگلے روز سیّد صاحبؒ نے تمام لشکر میں کہلا بھیجا کہ سب بھائی اپنے ساز و سامان سے تیار رہیں، کل سویرے ہمارے ساتھ سردار سلطان محمّد خاں کی مُلاقات کو چلنا ہوگا۔ خوانینِ سمہ کو بھی اس کی اطلاع کر دی گئی۔ ارباب جمعہ خاں کو آپ نے بُلا کر تاکید فرمایا کہ کل سویرے ہم تو سردار سُلطان محمّد خاں کی مُلاقات کو جائیں گے، تم بدستورِ سابق اپنے لوگوں کے ساتھ خوب ہوشیاری اور خبرداری سے شہر کا بندوبست رکھنا۔

دُوسرے روز لشکر کے غازی لوگ کمر باندھ، ہتھیار لگا میدان میں جمع ہو کر آپ کا انتظار کرنے لگے۔ کچھ دیر میں آپ وضو کر کے پوشاک پہن کر اور ہتھیار لگا کر حویلی سے باہر نکلے۔ سرائے کی مسجد میں دو رکعت نفل پڑھی۔ آپ کو دیکھ کر اور بھی بہت صاحبوں نے نفل کا دوگانہ پڑھا۔ پھر سر برہنہ کھڑے ہو کر بڑے الحاح و زاری کے ساتھ دُعا کی۔ تمام حاضرین پر ایک وجد کی سی حالت طاری تھی۔

دُعا کے بعد آپ گھوڑے پر سوار ہو کر تشریف لے چلے۔ پشاور کے باہر گورستان کے پاس (جہاں آخوند دُرویزہ بابا کا مزار ہے) کچھ دُور آگے بڑھ کر گورستان کو پُشت دے کر کھڑے ہُوئے۔ وہیں تمام لشکر صف آرا ہُوا۔ پشاور کے ہزاروں وضیع و شریف تماشا دیکھنے کو آئے تھے۔ آدمیوں کی کثرت سے میدان میں آدمیوں کے سوا کچھ نظر نہیں آتا تھا۔ آپ نے ظہر کی نماز وہیں پڑھی۔ سردار سُلطان محمّد خاں اپنی تمام جمعیت کے ساتھ آیا اور موضع ہزار خانی کی طرف پُشت کر کے کھڑا ہُوا۔

کچھ دیر کے بعد سردارِ ممدُوح پندرہ بیس آدمیوں کو ہمراہ لے کر اس طرف سے چلا اور اسی قدر

غازیوں کو لے کر سید صاحب آگے بڑھے۔ سردارِ موصوف نے پہلے ہی ایک جگہ اس میدان میں زین پوش بچھوا رکھا تھا۔ جب اُس کے اور سید صاحبؒ کے درمیان سَو، سوا سَو قدم کا فاصلہ باقی رہا، تب آپ نے سب ہمراہیوں کو وہاں ٹھیرا دیا۔ وُہ سب وہیں کھڑے رہے۔ آپ گھوڑے سے اُتر کر پیادہ پا صرف مولانا محمد اسمٰعیل صاحب اور ارباب بہرام خاں کو ہمراہ لے کر آگے چلے۔ اُس وقت مولانا ممدوح کمر میں فقط تلوار لگائے ہُوئے تھے اور ارباب بہرام خاں کی کمر میں تلوار اور ہاتھ میں شیر بچہ تھا۔ آپ کو دیکھ کر سردارِ ممدُوح نے بھی اپنے ہمراہیوں کو روک دیا۔ وہ بھی وہیں کھڑے رہے۔ فقط ارباب فیض اللہ خاں اور ایک شخص مُراد علی کو اپنے ساتھ لے کر چلا اور سید صاحبؒ سے السلام علیکم کر کے مِلا اور مصافحہ کیا۔ پھر مولانا صاحب اور ارباب بہرام خاں سے مصافحہ کیا۔ سید صاحبؒ اور مولانا اسمٰعیل صاحب زین پوش پر بیٹھے اور ارباب بہرام خاں سید صاحبؒ کی پُشت پر کھڑے ہُوئے اور ادھر ارباب فیض اللہ خاں اور مُراد علی سردار سُلطان محمد خاں کے پیچھے کھڑے ہُوئے۔

مولانا محمد اسمٰعیل صاحب کی احتیاط مولانا محمد اسمٰعیل صاحب نے پہلے رجب خاں ٹپیٹ اور سلو خاں بھکیت کو جو قوی ہیکل اور چُست و چالاک آدمی تھے، کہلا بھیجا تھا کہ مُلاقات کے وقت تم دونوں صاحب سید صاحبؒ کے پاس پہنچ جانا۔ اگر سید صاحبؒ منع بھی کریں، تب بھی نہ ماننا۔ وہ دونوں باوجُود سید صاحبؒ کے ہاتھ سے منع کرنے کے بیس پچیس قدم کے فاصلے پر کھڑے ہو گئے۔ جس میدان میں آپ بیٹھے گفتگو کر رہے تھے، وہاں سے جنوب کی طرف سَو قدم پر ایک جوار کا کھیت تھا۔ اُس میں سردار سلطان محمد خاں نے پہلے سے چالیس پچاس سپاہی مسلح بٹھا رکھے تھے۔ مُجاہدین کو یہ حال معلوم نہ تھا۔ اتفاقاً اُن کی ایک جماعت کھیت کے قریب گئی، تو دیکھا کہ کچھ لوگ کھیت میں مسلح چُھپے بیٹھے ہیں۔ یہ غازی اُن کی پُشت پر کھڑے ہو گئے کہ مبادا کچھ دغا فریب ہو، تو پہلے ہم اُن کو سمجھ لیں۔ مگر خدا کے فضل و کرم سے کوئی بات نہیں ہونے پائی۔

سید صاحبؒ کی سردار سلطان محمد خاں سے گفتگو سید صاحبؒ نے کابل سے مایار کی جنگ تک جنگ کی ساری سرگزشت سردار سلطان محمد خاں اور اُن کے بھائیوں کے بیعت کرنے اور جہاد و رفاقت

کے عہد و پیمان، پھر بار بار عہد شکنی اور چڑھائی کرنے اور کفّار کا ساتھ دینے کا سب حال بیان کیا اور فرمایا کہ اب تک تمھارے بھائی اور تمھاری بغاوت کا سبب معلوم نہ ہُوا کہ کیا ہے؟

ہندوستانی محضر سردار سُلطان محمّد خاں نے بہت کچھ معذرت کی اور اپنی خطاؤں کا اقرار کیا اور کہا کہ ہماری نافرمانی اور بغاوت کا سبب یہ ہے۔ یہ کہ کر ایک لپٹا ہُوا کاغذ اپنے خریطے سے نکال کر آپ کے سامنے رکھ دیا۔ آپ نے اُس کو کھول کر دیکھا، تو وُہ ایک بڑا سا محضر تھا جس پر ہندوستان کے بہت سے عُلما، اور پیرزادوں کی مُہریں لگی ہُوئی تھیں۔ خُلاصۂ مضمُون یہ تھا کہ تم سرداروں اور خوانین کو اطلاعاً لکھا جاتا ہے کہ سیّد احمد نامی ایک آدمی چند علماے ہند کو متّفق کر کے اس قدر جمعیت کے ساتھ تمھارے مُلک میں گئے ہیں۔ وہ بظاہر جہاد فی سبیل اللہ کا دعوٰی کرتے ہیں، یہ صرف اُن کا مکر و فریب ہے۔ وہ ہمارے اور تمھارے دین و مذہب کے مخالف ہیں۔ اُنھوں نے ایک نیا دین و مذہب نکالا ہے۔ وہ کسی ولی بزرگ کو نہیں مانتے، سب کو بُرا کہتے ہیں۔ وُہ انگریزوں کے بھیجے ہُوئے تمھارے مُلک کا حال معلوم کرنے گئے ہیں۔ تم کسی طرح اُن کے وعظ و نصیحت کے دام میں نہ آنا۔ عجب نہیں کہ تمھارا مُلک چھنوا دیں۔ جس طرح تم سے ہو سکے، اُن کو تباہ کرو اور اپنے مُلک میں جگہ نہ دو۔ اگر اس معاملے میں سستی اور غفلت سے کام لوگے، تو پچھتانا پڑے گا اور ندامت کے سوا کچھ ہاتھ نہ آئے گا۔

دُنیادار عُلما، و مشائخ کی مُخالفت کی وجہ سیّد صاحبؒ یہ مضمُون پڑھ کر عالمِ حیرت میں رہ گئے۔ آپ نے سردار موصُوف سے فرمایا کہ ہندوستان میں دُنیادار عُلما، اور مشائخ پیرپرستی اور قبرپرستی میں گرفتار ہیں۔ اِسی کو اپنا دین و آئین جانتے ہیں۔ حلال و حرام میں امتیاز نہیں رکھتے اور یہی اُن کا ذریعۂ معاش ہے۔ ہمارے وعظ و نصائح سے اللہ تعالیٰ نے وہاں لاکھوں آدمیوں کو ہدایت نصیب کی۔ وہ پکّے مُوحّد اور مُتّبعِ سُنّت ہو گئے۔ اس کی وجہ سے اُن دُنیادار عالموں، پیروں کے شرک کا بازار سرد ہو گیا اور اہلِ حق کی نگاہوں سے وہ گر گئے اور جب اُن سے کچھ نہ ہو سکا تب اُنھوں نے ہم پر یہ بُہتان و افترا کیا اور آپ کے پاس بھیجا۔ مگر آپ سے بڑی غلطی ہُوئی، جو اب تک اس امر کی

اطلاع ہم کو نہ کی اور اپنا دین و دُنیا کا نقصان کیا، ورنہ یہ شک وشبہہ ہم آپ کے دل سے پہلے ہی دُور کر دیتے۔ اس میں بھی خدا کی کوئی مصلحت ہوگی۔

بدخواہوں کے ساتھ خیر خواہی آپ نے وُہ محضر لپیٹ کر مولانا محمد اسمٰعیل صاحب کے حوالے کیا اور فرمایا کہ اس کو بڑی حفاظت سے رکھیے گا، ہر کسی کو نہ دکھلائیے گا اور نہ بیان کیجیے گا، اس لیے کہ لشکر میں ہمارے اکثر غازیوں کا ایسا حال ہے کہ یہ بہتان و افترا سُن کر اگر اُن بدخواہوں کے حق میں بددُعا کر دیں تو عجب نہیں کہ فوراً اُن لوگوں کو نقصان پہنچ جائے۔ ہمارے دل میں یہ ہے کہ اگر کبھی اللہ تعالیٰ ہم کو اُن سے ملائے، تو ہم اُن کے ساتھ نیکی اور احسان کے سوا کچھ نہ کریں۔

عالی ہمتی اور دریا دلی پھر آپ نے سردارِ موصوف سے فرمایا کہ خان بھائی، تم نے جو ارباب فیض اللہ خاں کی زبانی چالیس ہزار روپے خرچ کے واسطے دینے کا وعدہ کیا تھا، تو اب اس کی فکر نہ کیجیے گا۔ ہم نے آپ کو معاف کیے، کیونکہ ہمارے پروردگار کے یہاں کسی بات کی کچھ کمی نہیں ہے۔ آپ ہمارے بھائی ہیں۔ آپ سے کسی طرح کا جُرمانہ یا تاوان لینا ہم کو منظور نہیں ہے۔ یہ بات کہہ کر آپ اُٹھ کھڑے ہوئے اور سردارِ موصوف بھی اپنے لشکر کو گئے اور دونوں لشکر اپنی اپنی جگہ آگئے۔

قاضی کا تقرر سردار سلطان محمد خاں نے ایک درخواست کی کہ سیّد صاحبؒ اپنا ایک قاضی پشاور میں مقرر کر دیں، جو شرع شریف کے موافق لوگوں کا فیصلہ کرے اور جمعہ کو وعظ بھی کہے۔ ہم لوگ اُن کی فرمانبرداری کریں گے اور اُن کے وعظ و نصیحت سے لوگوں کو ہدایت ہوگی۔ آپ نے مولوی مظہر علی صاحب عظیم آبادی کو تجویز کیا۔ دس بارہ غازی آپ نے اُن کے ہمراہ کیے اور اُن کا ہاتھ ارباب فیض اللہ خاں کے ہاتھ میں دے کر فرمایا کہ تمہارے سردار کی خواہش کے مطابق ہم اُن کو قاضی کر کے چھوڑے جاتے ہیں۔

○

بتیسواں باب

پنجتار کو واپسی

روانگی پشاور سے روانہ ہو کر ہزار خانی میں ارباب فیض اللہ خاں کی مہمانی قبول کر کے چمکنی، ہشت نگر، مردان ہوتے ہوئے امان زئی کی گڑھی میں قیام فرمایا۔ وہاں کے خوانین آپ کی آمد کی خبر سُن کر حاضر ہوئے۔ آپ نے اُن کی بیوفائی اور بدعہدی کی شکایت اور ملامت کی۔ اُنھوں نے بڑے عُذر و معذرت کے بعد دوبارہ وعدہ کیا اور عُشر دینا قبول کر لیا۔

اہلِ سوات کی شوخ چشمی گڑھی امان زئی میں میر عالم خاں باجوڑی کی طرف سے ایک قاصد قاضی نام چند آدمیوں کے ساتھ حاضر ہوئے اور یہ پیغام لائے کہ ہم کو پشاور کی فتح سے بڑی مسرت ہوئی، سُنّت (جہاد) کے اجرا سے ہم نہایت مسرور و شادماں ہیں۔ اگر آپ ہمارے علاقے کو اپنے قُدوم سے مُشرّف فرمائیں، تو ہم سب بھی احکامِ شریعت کو قبول کریں گے اور سُنّتوں کا اجرا کریں گے۔

آپ نے یہ سُن کر اہلِ شوریٰ سے مشورہ فرمایا۔ سب کی رائے یہ ہوئی کہ آپ خود تو پنجتار تشریف لے جائیں اور مولانا محمد اسمٰعیل صاحب کو سَو آدمیوں کے ساتھ باجوڑ روانہ فرمائیں۔ چنانچہ مولانا محمد اسمٰعیل صاحب لشکر کے سَو چیدہ چیدہ آدمیوں کے ساتھ روانہ ہوئے۔ امان زئی سے چل کر بزگڑھی ٹھیرتے ہوئے لُوند خوڑ قیام فرمایا۔ وہاں چند روز قیام رہا اور عُشر کے تحصیل وصُول کا انتظام فرمایا۔

کاٹ لنگ والوں نے بھی اس انتظام کو قبول کیا۔ لُوند خُوڑ سے آپ سوات کی طرف روانہ ہُوئے۔ پہاڑ کی چوٹی پر پہنچے، تو مُلّا کلیم، مُلّا سید عمران خار سے آئے اور بیان کیا کہ موضع لوند خُوڑ میں آپ کے قیام کی اطلاع اہلِ سوات کو ہو گئی۔ باجَوڑ اور سوات کی طرف آپ کے توجّہ کرنے سے اس علاقے کے خوانین تردّد میں پڑ گئے کہ آپ یہاں تشریف لا کر شریعت جاری کریں گے۔ انھوں نے اپنے جاسُوس خبر رسانی کے لیے متعیّن کر دیے تھے۔ جب لُوند خُوڑ سے آپ کی روانگی کی اطلاع ملی، تو وُہ سب مقام ڈیری میں جمع ہو گئے اَور وُہ باجوڑ جانے سے آپ کو روکنے پر کمربستہ ہیں۔ اس پر ہمارے پُورے دیار کا اتّفاق ہو گیا ہے۔ اِس پر جرگہ ہو چکا ہے کہ کون لوگ کس درے پر بندوقیں لے کر بیٹھیں گے اور کون لوگ کس مقام کی ناکہ بندی کریں گے۔ اِس لیے جنگ کے بغیر باجوڑ جانا ناممکن ہے۔

مولانا نے مشورۃً دریافت فرمایا کہ اب طریق کار کیا ہے؟ مُلّا کلیم نے کہا کہ خار تک تو جانا ضروری ہے تاکہ دوستی و دشمنی کا اندازہ ہو جائے اور چُونکہ وہ سب آپ کے ملاقاتی ہیں، کیا عجب ہے کہ آپ کو دیکھ کر اُن کو لحاظ و مروّت آئے اور وُہ مزاحمت نہ کریں، لیکن اس میں عجلت کی ضرورت ہے

مولانا نے اپنے لشکر کے ساتھ تیزی سے کُوچ کیا اور خار میں داخل ہُوے۔ وہاں تمام خوانین نے خار کے دونوں جانب حصار قائم کر لیا اور باجوڑ کا راستہ بالکل روک دیا۔ مولانا نے مسجد میں قیام فرمایا اَور تجاہلِ عارفانہ برت کر دریافت کیا کہ یہ لشکرِ عظیم آخر کس ضرورت کے لیے جمع ہُوا ہے؟ آپ نے ہر ایک سے پوچھا کہ آخر ہم سے کیا قصور ہُوا ہے کہ ہمارے لیے یہ مجمع اکٹھا ہُوا ہے؟ لوگ ایک دُوسرے پر ٹالتے تھے۔ آخر عنایت اللہ خاں پر یہ سلسلہ ختم ہُوا۔ آپ نے اس سے دریافت کروایا اور کہا کہ ہمارے تمھارے درمیان زمانۂ سابق میں محبّت و تعلقات تھے اور ہم ایک عرصے تک اِس جوار میں رہے ہیں۔ ہم سے ابھی تک کوئی ایسا فعل نہیں ہُوا، جو محبّت و مروّت کے خلاف ہو۔

عنایت اللہ خاں نے جواب دیا کہ آپ میر عالم خاں کی طلبی پر باجُوڑ جا رہے ہیں۔ جب آپ اور میر عالم خاں باہم متفق ہو جائیں گے، تو پھر ہمارے اُوپر بھی احکامِ شرعی جاری کریں گے۔ ان احکام کا قبول کرنا اور اُن پر عمل کرنا ہمارے اُوپر شاق ہے، اِس لیے ہم آپ کو وہاں جانے نہیں دینا چاہتے۔

آپ نے فرمایا کہ تم خدا کے فضل سے مسلمان اور مسلمانوں کی اولاد ہو، تمھیں دینی محبت کی بنا پر احکامِ شرعیہ کے اجرا سے خوش ہونا چاہیے اور اس کو غنیمت سمجھنا چاہیے۔ یہ کیا اسلام اور دینداری ہے کہ تم احکامِ شرعی سے بیزاری کا اظہار کرتے ہو؟ ہاں، اگر ہم سے اجراءِ احکام میں کچھ افراط و تفریط سرزد ہو، تو اپنے مقامی عُلما سے دریافت کر کے کتابُ اللہ و سُنّتِ رسُول اللہؐ کی رُو سے ہماری اِصلاح کرو۔

اِس کے جواب میں اُن لوگوں نے کہا کہ تم کتاب و سُنّت سے بال برابر بھی زائد عمل نہیں کرتے۔ قُرآن و سُنّت اور عُلما، سب تمھاری طرف ہیں، لیکن دینی احکام، جو کتاب و سُنّت سے ثابت ہیں، ہمارے اُوپر شاقّ اور بار ہیں۔ اِس لیے ہم تمھیں یا جوڑ جانے سے مانع ہیں اور ہم کسی طرح تم کو جانے نہ دیں گے اور اس سلسلے میں ہم جنگ تک کے لیے تیار ہیں۔ پھر جو فیصلہ ہو۔ اگر ہم غالب آئے، تو ہم اپنے رُسُومِ افغانی پر قائم رہیں گے؛ اگر تم غالب آئے اور تمھارا عمل دخل اِس مُلک میں ہُوا، تو ہم اس مُلک کو چھوڑ کر کسی کافر کی عملداری میں چلے جائیں گے تاکہ وہاں اطمینان سے اپنے باپ دادا کے طریقے پر عمل کر سکیں۔

مولانا نے جب یہ تقریر سُنی، تو فرمایا کہ ہم نے ایسے کلمہ گو، جو شٰهِدِيْنَ عَلٰٓى اَنْفُسِهِمْ بِالْكُفْرِ کا مصداق ہوں، ابھی تک نہیں دیکھے تھے۔ ہم کو آج معلوم ہُوا کہ تم ایسے کلمہ گو ہو کہ احکامِ شرعیہ کا انکار کر کے بھی تم کو ایمان کے سلب ہو جانے کا اندیشہ نہیں۔ ہم مجبور ہیں کہ امیرالمومنین نے ہم کو تم سے جنگ کرنے کی اجازت نہیں دی اور تم کو معلوم ہے کہ ہم بغیر اُن کے حُکم کے کوئی کام نہیں کر سکتے، ورنہ تمھاری اس پوری جمعیت کو دس قرابینوں کی باڑھ سے هَبَآءً مَّنْثُوْرًا کر دیتے۔

قریب کے ایک گاؤں کے لوگوں کا پیغام آیا کہ اگر مولانا یہاں تشریف لے آئیں، تو ہم باجوڑ پہنچا دیں گے، مگر مولانا نے فرمایا کہ اس میں ایک قباحت تو یہ ہے کہ قدم قدم پر جنگ ہو گی۔ سید صاحبؒ نے جنگ کی اجازت نہیں دی اور غازی بھی کم ہیں۔ پھر اگر باجوڑ پہنچ بھی گئے، تو سید صاحبؒ سے اور اپنے مرکز سے بالکل منقطع ہو جائیں گے اور لشکرِ اسلام دو جگہوں میں منقسم ہو جائے گا۔ نہ ہماری خبر سید صاحبؒ

تک پہنچ پائے گی، نہ وہاں کی خبر یہاں آئے گی۔ آخر یہ طے ہُوا کہ واپسی مناسب ہے اور تیاری شروع ہو گئی۔

جب تیاری شروع ہُوئی اور واپسی کا ارادہ مصمّم ہُوا، تو اہلِ غار نے کہا کہ آج کی رات ضیافت کھائے بغیر ہم آپ کو جانے نہ دیں گے۔ مجاہدین نے کہا کہ جب آپ لوگوں کو احکامِ شرعی کا قبول کرنا گوارا نہیں اور صاف انکار ہے اور آپ اِس بے مروّتی سے پیش آئے، تو اب ضیافت کی کیا ضرورت ہے؟ ان میں سے بعض لوگوں نے کہا کہ ہم اس گروہ میں شامل نہیں، البتہ ان کی مخالفت کرنے کی بھی طاقت نہیں۔ بالآخر رات اُن کی مہمانی قبول کر کے صُبح وہاں سے کُوچ کیا۔ رات بھر اہلِ سوات نے غول درغول پہرہ دیا کہ کہیں یہ لوگ نظر بچا کر باجوڑ نہ چلے جائیں۔

ایک جاہلی رسم کی اصلاح احمد خاں کاکا نے سیّد صاحبؒ سے عرض کیا کہ ہمارے اِس مُلک میں یہ رسم ہے کہ اپنی حیثیت کے مطابق لڑکے والوں سے زرِ نقد لیے بغیر کوئی اپنی بیٹی کا نکاح کسی کے بیٹے کے ساتھ نہیں کرتا۔ کوئی لڑکے والے سے سَو روپے، کوئی چار پانسو، کوئی ہزار لیتا ہے۔ لڑکے والے غریب روپے کی تلاش میں حیران سرگردان رہتے ہیں۔ اُن کی بیٹیاں بیچاری بیٹھی رہتی ہیں اور نکاح نہیں ہوتا۔ اس بستی کی عورتیں آپ سے داد خواہ اور انصاف طلب ہیں۔ وہ کہتی ہیں کہ سیّد بادشاہ کو اللہ تعالیٰ نے ہمارا امام بنایا ہے۔ وُہ خُدا کے لیے ہماری بیٹیوں کا انتظام کریں اور رسم کو عذاب سے نجات دیں۔

یہ سُن کر سیّد صاحبؒ بڑی دیر تک عالَمِ سُکوت میں رہے۔ اس کے بعد فرمایا کہ تم نے بہت اچھا کیا، جو ہم سے کہا۔ انشاء اللہ تعالیٰ ہم ضرور اس کا تدارک کریں گے، تم خاطر جمع رکھو اور یہ بہت ہی بُری رسم تمھارے مُلک میں ہے، اللہ تعالیٰ تم لوگوں سے اس کو چھڑا دے اور تم سب لوگوں کو پُورا پُورا مُسلمان اور متبعِ سُنت بنا دے!

سیّد صاحبؒ نے اُسی دن یا اُس کے اگلے دن بستی کے سب لوگوں کو بُلوایا اور نرمی کے ساتھ وعظ و نصیحت فرمائی اور نکاح کی ضرورت و فضیلت اور اِس رسم کی قباحت بیان کی اور فرمایا

کہ تم سب صاحبوں نے میرے ہاتھ پر بعیتِ ہدایت اور بعیتِ امامت کی ہے اور شریعت کے تمام احکام قبول کیے ہیں اور ہر ایک گناہ اور بُرے کام سے توبہ کی ہے، تو خدا و رسولؐ کا حکم جان کر اس گناہ سے بھی توبہ کرو اور دستورِ شریعت کے موافق برضا و رغبت اپنی بیٹیوں کا اپنی برادری میں نکاح کر دو، اور یہ خدا اور رسولؐ کے حکم کے خلاف روپیہ لینے کا دستور ترک کر و۔ اگر تم نہ مانو گے، تو اپنے حق میں بہت بُرا کرو گے۔

آپ کی یہ تقریر سُن کر سب نے جاہلیت کی اس رسم سے طوعاً و کرہاً توبہ کی اور اپنی بیٹیوں کے نکاح کر دینے کا اقرار کیا۔

لڑکیوں کی رخصتی جن لڑکیوں کا نکاح ہو جایا کرتا تھا، وہ بھی اس انتظار میں کہ پٹھانوں کی رسوم کے مطابق رخصتی کا سامان ہو، برسوں بیٹھی رہتی تھیں، یہاں تک کہ بعض سن رسیدہ ہو جاتیں اور اس سے بہت سی قباحتیں پیدا ہوتیں۔ منظورہ میں ہے کہ اسی زمانے میں تاکید ہوئی کہ جن لوگوں نے اپنی لڑکیوں کا نکاح کر دیا ہے اور وہ سنِ بلوغ کو پہنچ چکی ہیں، ان کو ان کے شوہروں کے گھر رخصت کیا جائے۔ حکم جاری ہوا کہ جن بالغ لڑکیوں کو نکاح کے باوجود اُن کے شوہروں کے گھر رخصت نہیں کیا جاتا، اُن کی اطلاع کی جائے۔ اس کے لیے کارندے مقرر ہوئے کہ جو والدین یا سرپرست اپنی جوان لڑکیوں کو رخصت نہیں کرتے، اُن سے بزورِ حکومت رخصتی کرائی جائے اور اُن کے شوہروں کے حوالے کیا جائے۔ حافظ عبد اللطیف صاحب اور خضر خاں کابلی اپنی جماعت کے ساتھ اس خدمت پر مامور ہوئے۔ دیہاتوں میں شوہروں کے اظہار و بیان کے مطابق اِن لڑکیوں کو رخصت کرایا گیا اس کی عملی صورت یہ تھی کہ جب شوہر حاکم (شرعی) کے یہاں نالش کرتا کہ فلاں دیہات یا موضع میں میری منکوحہ بالغہ ہے اور اس کو رخصت نہیں کیا جاتا، تو لڑکی کے باپ کو دوسرے اولیائے شرعی کے ساتھ طلب کیا جاتا اور اُن کو فہمائش بلیغ کی جاتی کہ اپنی لڑکی کو رخصت کرے۔ اگر وہ قبول کرتے، تو ایک دن اُس کے لیے معین کر لیتا، ورنہ حاکم کی طرف سے ایک دن اُس کے لیے متعین ہو جاتا اس روز اس کا شوہر حافظ عبد اللطیف یا خضر خاں کو اپنے ساتھ لے جا کر اپنی بیوی کو رخصت کرا لاتا۔[1]

---

[1] منظورہ ص ۷۲۶

قاضیوں کی شکایت موضع ڈاگئی میں مولوی خیرالدین صاحب نے عرض کیا کہ چھتر بائی سے آتے ہوئے جس بستی میں بھی مجھ کو اُترنے کا اتفاق ہُوا، وہاں کے لوگوں نے اپنے قاضی کی مجھ سے شکایت کی کہ وہ ہم لوگوں پر بہت زیادتی اور تعدّی کرتے ہیں اور ہم سے ناحق ہماری استطاعت سے زیادہ تاوان و جرمانے لیتے ہیں۔ آپ سیّد بادشاہ سے عرض کر کے ہمارے لیے کوئی سبیل نکالیں۔ اب آپ جیسا مناسب جانیں، فرمائیں۔ آپ نے فرمایا کہ انشاء اللہ پنجتار پہنچ کر ہم آپ کو قاضی القضاۃ مقرر کریں گے۔ آپ دورہ کر کے اور حق و ناحق کی تحقیق کر کے فیصلہ کیجیے گا۔ مولوی صاحب نے کہا کہ میں اس عہدے کی لیاقت و استعداد نہیں رکھتا۔ اس عہدے کے لیے کسی اور صاحب کو آپ مقرر فرمائیں۔ آپ نے ارشاد فرمایا کہ ہم خوب جانتے ہیں کہ آپ میں اس کام کی بخوبی استعداد و لیاقت ہے۔ مولوی صاحب نے عرض کیا کہ دو کاموں کے متعلق آپ مجھے مجبور نہ فرمائیں: ایک عدالت کا کام، دوسرا مالی کام۔ دونوں کاموں میں اکثر لوگوں کا قدم پھسل جاتا ہے۔ آپ مسکرا کر خاموش ہو رہے۔

پنجتار میں پنجتار کے قریب آپ کی آمد کی خوشی میں سینکڑوں آدمی مرد و عورت آپ کی تعریف میں چار بیت کہتے، تنبل[1] بجاتے اور خوشی کرتے ہوئے اپنے اپنے غول بنا کر آئے اور آپ سے انعام طلب کیا۔ آپ نے ہر ایک کو انعام دلوایا اور ہر ایک کو خوش کیا۔ آپ کی تشریف آوری کی خوشی میں پنجتار کے مجاہدین نے گیارہ فیر توپ کے سر کیے۔

آپ سواری سے اُتر کر مسجد میں تشریف لے گئے اور دو رکعت نفل پڑھی اور اکثر غازیوں نے دو دو نفلی رکعتیں پڑھیں۔ پھر آپ نے سر برہنہ ہو کر بہت دیر تک بآوازِ بلند دعا کی اور سب نے آمین کہی۔ دعا کے بعد آپ نے سب کو اجازت دی کہ اپنے اپنے ڈیرے پر جا کر اُتریں۔ آپ نے بھی اپنے ڈیرے پر قیام فرمایا۔

جمعے میں سیّد صاحبؒ کا وعظ جمعے کے دن مولوی احمد اللہ صاحب میرٹھی نے خطبہ پڑھا اور سیّد صاحبؒ نے نماز پڑھائی۔ نماز کے بعد آپ نے وعظ کہا۔ آپ نے فرمایا: بھائیو، اللہ تعالیٰ نے اپنے فضل و کرم

[1] پشتو میں طبل کو تنبل کہتے ہیں۔

سے تم تھوڑے لوگوں کو کئی بار بڑے بڑے لشکروں پر غالب اور فتحیاب کیا اور تمہارے دل بڑھ گئے کہ ہم نے لڑائی جیتی۔ اس خیال پر مغرور نہ ہونا۔ اللہ سے ڈرو اور توبہ و استغفار کرو۔ بڑائی اور کبریائی اُسی قادرِ مطلق اور خداوندِ برحق کو سزاوار ہے۔ یہ محض اس کی مدد و عنایت تھی کہ ہم جیسے ناتوانوں کو اُس نے ایسے زور آوروں پر منصور و مظفر کیا جس طرح اُس کو غلبہ اور اقبال دیتے دیر نہیں لگتی، اُسی طرح چھینتے بھی دیر نہیں لگتی۔

چھین لینے کا لفظ آپ کی زبان سے سُن کر اکثر لوگوں کے دِلوں کو دھکا سا لگا کہ اللہ خیر کرے کہ حضرت نے یہ کیا فرمایا۔ اُس وقت آپ کی بھی آنکھوں سے آنسو جاری تھے اور اکثر مجاہدین کے بھی۔ پھر آپ نے ننگے سر ہو کر کمال گریہ وزاری اور عجز و انکسار کے ساتھ دُعا کی۔ تمام لوگ آمین کہتے تھے اور روتے تھے۔

قاضی القضاۃ کا تقرر اس کے اگلے روز سیّد صاحبؒ نے مولوی رمضان صاحب سہارنپوری کو قاضی القُضاۃ کا عہدہ دیا اور چند غازیوں کے ساتھ موضع شیوہ کو رُخصت کیا؛ اور لوہاری کے حمزہ علی خاں کو مع رسالہ، اور قصبہ پھُلت کے شیخ ناصر الدین اور شیخ عبدالرحمٰن کو، جو نائب رسالدار تھے، نقارہ اور نشان اور شاہین خانہ دے کر موضع شیوہ کو رُخصت کیا اور رسالدار صاحب کو یہ اختیار دیا کہ اُس اطراف کی بستیوں میں جس قدر مناسب جانیں، اس قدر سوار متعین کر دیں کہ اپنی اپنی بستی کی بخوبی حفاظت کرتے رہیں اور کوئی رعایا پر کسی طرح کا ظلم و زیادتی کرنے نہ پائے۔

سوات کے سرحدی علاقے میں احکامِ شرعی کا اجرا موضع ٹُونڈ خُوڑ اور کاٹ لنگ وغیرہ کے ملک اور قاضی پنجتار آئے اور انھوں نے سیّد صاحبؒ سے عرض کیا کہ ہم نے بھی آپ کی امامت قبول کی ہے، ہمارے ساتھ آپ کوئی مُعتمد عالم اور مُدبّر روانہ فرمائیں، جو ہماری بستیوں میں شرعی احکام جاری کرے اور عُشر و زکوٰۃ و جزیہ کی تحصیل کرے۔

آپ نے اپنے مُعتمدین سے فرمایا کہ وہاں بھیجنے کے لیے کوئی شخص تجویز کرنا چاہیے۔ کسی صاحب نے عرض کیا کہ وُہ علاقہ مُلکِ سَمہ سے جُدا ہے اور سوات کا مُلک وہاں سے قریب ہے۔ وہاں کے والے

کوئی مُدبّر، مُتحمّل اور احکامِ شرعی سے واقف آدمی چاہیے، جو وہاں کے لوگوں کو اپنی حکمت عملی سے قابو میں لائے اور نرمی و آہستگی کے ساتھ اُن کو احکامِ شرعی کی تعلیم دے۔ تیز طبیعت آدمی سے وہاں کام نہ چل سکے گا، کیونکہ وہاں کے لوگ اطاعت و فرمانبرداری کے خوگر نہیں ہیں۔

آپ نے فرمایا کہ ایسا کون آدمی ہے؟ اُنھوں نے عرض کیا کہ وہاں کے واسطے مولوی خیر الدین صاحب مناسب ہیں۔ آپ نے اس کو بہت پسند فرمایا اور مولوی صاحب موصوف کو پچاس ہندوستانیوں اور تیس قندھاریوں کے ساتھ مع لعل محمّد صاحب جمعدار ان مُلکیوں کے ساتھ رُخصت فرمایا۔

مولوی صاحب موضع لوندخوڑ میں داخل ہُوئے۔ لوندخوڑ بڑی بستی تھی۔ سو دُکان سے زیادہ فقط بقّالوں کی تھیں اور چھ مَلِک تھے۔ ہر ایک کا حُجرہ جُدا تھا اور تمام رعایا اور بقّال چھ جگہ میں برابر تقسیم تھے۔ پانچ چھ دن کے بعد مولوی صاحب نے وہاں کے سب مَلِکوں کو جمع کر کے کہا کہ آپ مجھ کو جس کام کے لیے لائے ہیں، اس کام کا اجرا کرنا چاہیے۔ مُناسب یُوں ہے کہ جن باتوں کا آپ سب حضرات امیر المومنین سے اقرار کر کے آئے ہیں اور مُلک سَمہ میں بستی بستی اس کے اجراء کے واسطے آدمی مُتعیّن ہُوئے ہیں، اب ان باتوں کے رواج دینے میں آپ سب سے سبقت لے جائیں۔ اس میں خُدا و رسُولؐ کے نزدیک بھی آپ کی نیکنامی اور سُرخروئی ہو گی اور حضرت امیر المومنین بھی آپ سے راضی ہوں گے اور رعایا پر بھی آپ کی حکومت بنی رہے گی۔ اگر مَیں نے رعایا میں سے ہر ایک کو خود بُلا کر اپنا حُکم اُس پر جاری کیا، تو رعایا تمھارے قبضے میں نہ رہے گی اور تم کو بھی ناگواری ہو گی اور پھر مجھ سے بھی ناخوش ہو گے۔ یہی بہتر ہے کہ جس آرزو اور خواہش سے آپ مجھ کو لائے ہیں، اسی طرح میرے اور آپ کے درمیان موافقت رہے۔ اب جس کام کو آپ لائے ہیں اور امیر المومنین نے بھیجا ہے، وُہ کام میں آپ سے چاہتا ہُوں۔

اُنھوں نے کہا: یہ بات آپ نے معقول کہی۔ ہماری سمجھ میں آئی۔ مگر رعایا لوگ ہمارا کہنا مان لیں گے، پٹھان لوگ نہیں مانیں گے۔ اِس کی کیا صُورت کرنی چاہیے؟

مولوی صاحب نے کہا: اگر آپ اپنے وعدے کے سچے ہیں؛ تو جو جو کام میں کہوں، اُن کو آپ

پہلے اپنے گھروں میں جاری کریں: پھر جو نہ مانے گا، اس سے منوالوں گا۔ اُنھوں نے کہا: وُہ کیا باتیں ہیں؟ بیان کیجیے۔ مولوی صاحب نے کہا: آپ نماز روزہ تو کرتے ہی ہیں، اس میں کچھ تاکید کی حاجت نہیں۔ آپ لوگوں میں اَیسے کم ہوں گے، جو نماز روزے کے خوگر نہ ہوں۔ اگر اس میں ان سے تاکید کی جائے گی، تو وُہ بھی بُرا نہ مانیں گے اور منظور کرلیں گے۔ اس لیے کہ آپ سردار ہیں، ایک بات تو یہ ہے کہ آپ اپنی زراعت سے پُورا پُورا عُشر دیجیے۔ دُوسری بات یہ ہے کہ زکوٰۃ دیجیے۔ اس مُلک میں اَور تو کسی مال پر زکوٰۃ معلوم نہیں ہوتی، مگر جو بکریاں چرانے اور بیچنے کا پیشہ رکھتے ہیں، اُن سے زکوٰۃ لینی چاہیے تیسرے ہندوؤں سے جزیہ۔ آپ کے اپنے اپنے علاقے میں جس قدر بقّال ہیں، تاکید اور کوشش کرکے ان سے جزیہ وصُول کیجیے۔ اس میں آپ کا بھی فائدہ ہوگا۔ اِس لیے کہ اگر جزیے کا پُورا پُورا روپیہ وصُول ہوجائے گا، تو چہارم حصّہ حق السّعی آپ کو ملے گا اور تین حصّے حضرت امیرالمومنین کو ارسال کیے جائیں گے چوتھے اگرچہ بیوہ عورت کے نکاح کی تاکید کی چنداں ضرورت نہیں، اس لیے کہ یہ رسم اِس مُلک میں جاری ہے، مگر یہ رسم کہ تم اپنی کنواری بیٹیوں کا نکاح روپیہ لیے بغیر نہیں کرتے یہاں تک کہ وُہ جوانی سے بھی گزر جاتی ہیں، یہ رسم اگر ترک کرو، تو معلوم ہو کہ تم اپنے دعووں کے سچّے ہو۔ جس رسم کے چھوڑنے میں تم نقصان جانو، اُسے تم ترک نہ کرو اور جس کا نفع و نقصان برابر ہے، اُس کو چھوڑو، یہ کیا دینداری اور احکامِ الٰہی قبول کرنے کا کیسا دعوٰی ہے؟

مولوی خیرالدین صاحب کی یہ تقریر سُن کر ایک مَلک، جن کا نام صدرالدین تھا، بولا کہ اوّل مَیں اِس رسم کو اپنے گھر سے اٹھاتا ہوں۔ میری ایک بیٹی کنواری ہے۔ تین روز کے عرصے میں اس کا نکاح کردوں گا اور روپیہ نہ لُوں گا، مگر آپ اپنے چند غازیوں کو حُکم دیجیے کہ اس روز نکاح کے بعد دس پندرہ بندوقیں داغ دیں تاکہ بستی میں شہرت ہو جائے۔ مولوی صاحب نے کہا کہ تم اس سے خاطر جمع رکھو، انشاء اللہ تعالےٰ میں خود بندوقچیوں کو لے کر تمھارے مکان پر آؤں گا تیسرے روز اُس نے اَیسا ہی کیا۔ اس کے بعد اُس نے کوشش کرکے چار پانچ نکاح ایسے ہی اور کروائے اور کپاس کا عُشر اور بکریوں کی زکوٰۃ جاری ہوگئی اور ہندوؤں کی خانہ شماری جزیہ کے لیے مکمل ہوگئی اور لوگ بخوبی اطاعت کرنے لگے۔

تینتیسواں باب

حکومتِ شرعیہ کے عمّال اور غازیوں کا قتلِ عام

اسباب و محرّکات پشاور کی سپردگی کو تھوڑا ہی عرصہ گزرا تھا کہ پشاور اور سمہ کے پورے علاقے میں حکومتِ شرعیہ کے اُن عمّال، محصّلین، قضاۃ و محتسبین اور اُن غازیوں کو، جو پنجتار کے علاوہ پورے علاقے میں جا بجا متعین اور مقرر تھے، بیک دفعہ قتل کر دینے کا منصوبہ بنایا گیا اور خفیہ طور پر یہ طے کر لیا گیا کہ ایک ہی دفعہ اس کشمکش سے، جو چند سال سے جاری تھی، ہمیشہ کے لیے نجات حاصل کر لی جائے۔ یہ کشمکش کیوں تھی اور اس فیصلہ کُن و نامبارک اقدام کے اصلی اور اندرونی اسباب و محرکات کیا تھے؟ اُن کو اس اندوہناک واقعہ کی تفصیلات پڑھنے سے پہلے معلوم کر لینا ضروری ہے۔

اس کشمکش کا سب سے بڑا سبب اور محرّک سرداروں، خوانین اور مُلّاؤں کے ذاتی اغراض و مصالح ہیں۔ سیّد صاحبؒ اور مجاہدین کی آمد سے پہلے یہ تمام گروہ اپنے اغراض و مقاصد کی تکمیل اور اپنے منافع اور فوائد کے حصول میں بالکل آزاد تھے۔ وہ سب اس علاقے میں من مانی کارروائی کرتے تھے۔ اس علاقے میں جو کچھ پیدا ہوتا تھا، اُس سے یہ سب گروہ اپنے اپنے حصے اور مُلک کے رواج کے مطابق فائدہ اُٹھاتے تھے۔ اُوپر گزر چکا ہے کہ سردارانِ پشاور رعایا کی کھیتی کا نصف غلّہ وصول کرتے تھے اور مختلف انتظامات کا خرچ بھی رعایا کے ذمّے تھا۔ اس طرح پیداوار کا دو تہائی حصہ اُن کے پاس چلا جاتا تھا۔

سید صاحبؒ کی آمد، آپ کی بیعت و امامت اور نظام شرعی کے نفاذ و اجرا سے اُن کے اُن تمام حقوق و فوائد پر زد پڑی اور اُن کو صاف نظر آنے لگا کہ اگر یہ صورتِ حال باقی رہی اور نظامِ شرعی کی جڑیں گہری اور مستحکم ہوگئیں، تو اُن کا یہ اقتدار اور انتفاع ہمیشہ کے لیے ختم ہو جائے گا اور وہ اپنے حقوق سے ہمیشہ کے لیے محروم ہو جائیں گے۔ سرحد کا سارا مُلک انہی دُنیاوی حاکموں اور دینی پیشواؤں کی غلامی میں بٹا ہُوا تھا۔ جن دلوں میں ایمان کی حلاوت، خوفِ خدا اور فکرِ آخرت اچھی طرح پیوست نہ ہُوئے ہوں اور اُن کے بجائے مال کی محبت، جاہ و منصب کا شوق اور تن آسانی و تن پروری کی عادت راسخ ہو چکی ہو، وُہ کسی دینی منفعت، اجتماعی مصلحت اور اُخروی سرفرازی و کامیابی کے لیے اپنے ذاتی منافع اور مصالح سے دست بردار نہیں ہوسکتے۔ وُہ اپنے ذاتی اغراض و مقاصد کی حفاظت اور کاربرآری کے لیے دین کو بڑے سے بڑا نقصان پہنچا سکتے ہیں اور اجتماعی مصلحت کو آسانی کے ساتھ قربان کرسکتے ہیں اور سنگین سے سنگین تر جرم کا ارتکاب کرسکتے ہیں۔ مسلمانوں کی تاریخ اغراض پرستی کے ان افسوسناک واقعات سے داغدار ہے، جن میں بارہا اجتماعی مصلحتوں کا خون ہُوا اور مستحکم سلطنتیں چند اشخاص یا کسی خاص گروہ کی ذاتی اغراض اور حقیر فوائد کی نذر ہوگئیں۔

اس کا دُوسرا سبب یہ ہے کہ صُوبہ سرحد اور افغانستان میں شریعتِ اسلامی کے بالکل متوازی ایک دُوسرا آئین و قانون صدیوں سے جاری تھا، جس پر اہلِ سرحد آسمانی شریعت کی طرح عامل و راسخ تھے اور کسی حال میں اس کو ترک کرنے کے لیے تیار نہیں تھے۔ اس آئینِ افغانی میں اُن کے اغراض و مصالح بھی محفوظ تھے اور باپ دادا کی رسم اور صدیوں کے مُلکی رواج پر بھی عمل ہوتا تھا۔ چند صفحات پہلے ہم نے عنایت اللہ خاں سواتی اور اُس کے ساتھیوں کا یہ صاف صاف اقرار و اعلان پڑھا ہے، جو اُس نے مولانا اسمٰعیل صاحب شہید کے جواب میں کیا کہ:

"تم کتاب و سُنّت سے بال برابر بھی زائد عمل نہیں کرتے، قرآن و سُنّت و علما سب تمہاری طرف ہیں۔ لیکن وُہی احکام، جو کتاب و سُنّت سے ثابت ہیں، ہمارے اُوپر شاق اور بار ہیں۔ اس لیے ہم تمہیں بانجوڑ جانے سے مانع ہیں اور ہم کسی طرح تم کو جانے

نہیں دیں گے۔ اس سلسلے میں ہم جنگ کے لیے تیار ہیں۔ پھر جو فیصلہ ہو اگر ہم غالب آئے، تو ہم اپنے رسُومِ افغانی پر قائم رہیں گے؛ اگر تم غالب آئے اور تمھارا عمل دخل اس مُلک میں ہُوا، تو ہم اس مُلک کو چھوڑ کر کسی کافر کی عملداری میں چلے جائیں گے تاکہ وہاں اطمینان سے اپنے باپ دادا کے طریقے پر عمل کر سکیں۔"

عنایت اللہ خاں اور اُس کے ساتھیوں نے اپنے اِس اعلان و اِقرار میں نہ صرف سوات، بلکہ حقیقۃً اُس پورے علاقے کی اکثریت کی اصلی ذہنیت اور خیالات کی ترجمانی کی ہے، جو اُس زمانے میں وہاں عام تھی۔

یہ دو بنیادی اسباب ہیں، جنھوں نے نہ صرف غریب الوطن مجاہدین کے خلاف اس خطرناک اقدام پر آمادہ کیا، بلکہ پُورے شرعی نظام اور مستقبل کے دینی توقّعات و امکانات کو درہم برہم کر دینے پر اُبھارا، جو اس مُلک میں صدیوں کے بعد پیدا ہُوئے تھے اور ان اہلِ علاقہ سے، جن کو انصار کی جانشینی کرنی چاہیے تھی، ایسی قساوت اور سنگ دلی کا ظہور ہُوا، جس نے میدانِ کربلا اور واقعۂ حرّہ کی یاد تازہ کر دی شاید اُن کو آسانی سے ایسے سنگدلانہ فعل کی ہمّت نہ ہوتی، اس لیے کہ جن کے ساتھ وحشت و بربریّت کا یہ سلوک کیا گیا، وُہ مُسلمان تھے اور دینی اعمال و شعائر کی پابندی میں، نیز اپنے عبادت و تقوٰی میں کھُلے طریقے پر اپنے گرد و پیش میں ممتاز اور نمایاں تھے۔ لیکن سردارانِ پشاور اور اُن کے درباری علماء نے نیز پیشہ ور اور رسم پرست مُلّاؤں نے اس جماعت اور اُس کے امیر کے متعلق فسادِ عقیدہ اور مسلمانوں کے جان و مال پر تعدّی وغیرہ کی جو افواہیں پھیلا رکھی تھیں اور انھوں نے اُن پر مختلف قسم کے جو الزامات لگائے تھے اور اُن کی تشہیر کی تھی، ان سب نے مل کر اس فعل کے لیے اخلاقی اور مذہبی جواز مُہیّا کر دیا تھا اور اگرچہ سب کارفرمائی ذاتی اغراض و نفسانیت کی تھی، لیکن اُس کو تھوڑا سا سہارا اِس الزام تراشی سے بھی مل گیا تھا، جس کو پشاور کی فتح اور حوالگی کے بعد سے خاص طور پر ہَوا دی گئی۔

مولانا خیر الدین صاحب شیرکوٹی نے، جو لشکرِ اسلام کے ایک بڑے ذہین، ذکی اور مُبصّر عالم تھے۔ اِس قتلِ عام کا بڑی حقیقت پسندی کے ساتھ جائزہ لیا اور اُس کے اسباب و محرکات کو بڑی خوبی سے بیان

کیا ہے۔ وُہ اپنی ایک تحریر میں جس کا خلاصہ مولوی سیّد جعفر علی صاحب نے منظورۃ السعداء میں نقل کیا ہے، فرماتے ہیں:

"تقدیرِ الٰہی اور شُہداء کی خوش قسمتی کے علاوہ اس واقعہ کے چند ظاہری سبب معلوم ہوتے ہیں: ایک تو یہ کہ اس علاقے کے لوگ زمانۂ قدیم سے اطاعت و فرمانبرداری کے عادی نہیں ہیں۔ جب اُن کو اس بات کا تنبّہ ہُوا کہ امام (امیر) کی اطاعت ضروریاتِ دین میں سے ہے، تو اُنھوں نے اس کو قبول تو کر لیا، لیکن اطاعت کو نماز، روزے اور عُشر کے اندر منحصر سمجھتے تھے۔ اُن کے نزدیک اتنی ہی بات میں اطاعت ضروری تھی اور وُہ بھی مرضی کے مطابق، جتنا دل چاہتا، عُشر وغیرہ دے دیتے کم یا زیادہ جب اُن سے پُورے پُورے عُشر کا مُطالبہ ہُوا اور جنگ میں شرکت نہ کرنے کا تاوان بھی طلب کیا گیا، نیز لڑکیوں کی شادی اور داماد سے کچھ لیے بغیر اُن کو رخصت کر دینے کی تاکید بھی کی گئی، تو اُن کی طبیعت پر یہ بہت شاق ہُوا اور اُن کو یہ معاملات ناقابلِ برداشت اور تکلیفِ مَا لَا یُطاق معلوم ہونے لگے۔

اِسی کے ساتھ وُہ محضر، جو ہندوستان اور سرحد کے عُلماء نے تیّار کیا تھا، اُس کا اثر سردارانِ پشاور کی کوشش سے جا بجا پھیل گیا اور یہ مشہور ہو گیا کہ یہ گروہ، جو جہاد کے نام سے یہاں آیا ہے، وُہ دِین کا مخالف ہے اور وہابی فرقے سے تعلق رکھتا ہے اس سے ان لوگوں کے دِل میں بدعقیدگی پیدا ہُوئی۔ انھوں نے مجبوراً اُن کی اطاعت تسلیم کی۔ چُونکہ مُجاہدین کی قُوّت و شوکت روز افزوں تھی، اُن کا کوئی قابُو نہیں چلا اور حضرت امیر المؤمنین کی تاکید لڑکیوں کے نکاح کی بابت خود لڑکیوں کی فریاد اور درخواست پر تھی، اُنھوں نے آپ کے پاس پیغام بھیجا تھا کہ ہمارے ساتھ انصاف فرمایا جائے۔ اس پر یہ حکم صادر ہُوا کہ جس منکوحہ کا شوہر موجُود ہے، تین دن کے اندر اُس کی رخصتی کر دی جائے اور جو لڑکیاں بالغ ہو چکی ہیں اور اُن کے شوہر غیر موجُود ہیں، ایک مہینے

کے اندر اُن کا نکاح اور رخصتی کر دی جائے۔ جن لڑکیوں کی نسبت ہو چکی تھی، اُنھوں نے ان لوگوں سے، جو اس کام کے لیے مُقرر ہُوئے تھے، اپنی رخصتی کی درخواست کی۔ چُونکہ اہلِ علاقہ احکامِ شرعی قبول کر چکے تھے، اس لیے اُن کا حیل و حُجّت کرنا معقول نہ تھا۔ اپنے مروّجہ رسُوم و عادات کا، جو خلافِ شرع تھے، ترک کرنا مناسب تھا۔ (یہ سب ناراضگی اور شکایت مقامی خوانین تک محدود تھی) باقی ہندو بنیے اور اہلِ حرفہ ہندُستانیوں کی حکومت سے بہت خوش تھے۔ خوانین کی حکومت میں بڑا ظلم تھا۔ وہ اپنی لڑکیوں کی شادی میں رعیّت سے بڑی گراں قدر رقمیں وصُول کرتے تھے۔ یہ سب احکامِ شرعی کے اجراء کی وجہ سے موقوف ہو گیا۔ اس لیے یہ سب حضرت امیر المومنین اور ہندوستانیوں کو بڑی دُعائیں دیتے تھے کہ ان کی وجہ سے وہ اس ظلم و تعدّی سے محفوظ ہو گئے۔[1]

مذکورۂ بالا اسباب میں اتنا اور اضافہ کیا جا سکتا ہے کہ سمہ کے علاقے میں جو غازی معیّن یا مقیم تھے یا کبھی کبھی کسی ضرورت سے دَورہ کرتے تھے، اُن میں سے جن کو زیادہ صحبت و تربیت میں رہنے کا اتفاق نہیں ہُوا تھا یا مزاجًا درشت اور لااُبالی واقع ہُوئے تھے، اُن سے کہیں کہیں بے عنوانیوں اور تعدّی کے واقعات بھی پیش آئے۔ انسانی فطرت ناقابلِ تبدیل ہے۔ اتنی بڑی جماعت کا ایک اخلاقی اور دینی معیار پر ہونا اور شریعت و اخلاق کے سانچے میں سر سے پاؤں تک ڈھل جانا بعید از قیاس ہے۔ جو لوگ نووارد تھے یا پست معاشرے اور خاندانی ماحول سے تعلق رکھتے تھے، اُن سے شاذ و نادر ایسے واقعات بھی ظاہر ہُوئے جو اہلِ علاقہ کے لیے آزردگی کا سبب بنے۔ سیّد صاحبؒ کو جب ان کا علم ہُوا، تو سختی کے ساتھ اُن کی سرزنش فرمائی اور فورًا اُن کے تدارک کا انتظام فرمایا۔ مولوی سیّد جعفر علی صاحب لکھتے ہیں: جب آپ کو چھیدا یا بیلدار کے متعلق، جو رائے بریلی کا رہنے والا تھا، معلوم ہُوا کہ اُس نے کہیں سے ایک تلوار حاصل کر لی ہے، اپنے سر کے بال سکھوں کی طرح بڑھائے ہیں، دیہاتوں میں گشت کرتا ہے اور ہر جگہ کھانے کی فرمائش

---

[1] منظورۃ السعداء، ص ۱۰۳۹، ۱۰۴۰۔ مولوی سیّد جعفر علی لکھتے ہیں کہ میری دانست میں رخصتی کی مدت مختلف تھی، کسی کے لیے کم، کسی کے لیے زائد۔ منشی محی الدین کشمیری (مشہور بہ منشی امان زئی) خضر خاں اور حافظ عبداللطیف تاکید کے لیے مقرر تھے۔ جن لڑکیوں کی نسبت ہو چکی تھی، انھوں نے خود ان حضرات کے ذریعے اپنے شوہروں سے رخصتی کی درخواست کی۔

کرتا ہے، تو آپ کو سخت غصّہ آیا اور بلند آواز سے فرمایا کہ سُن لو، مَیں ظالموں کا دشمن ہُوں، ظالم کا سر پتھر سے کُچلوں گا۔ آپ نے ایک شخص کو حکم دیا کہ اِس بیلدار کی تلوار چھین لو اور اُس کی گوشمالی کرو کہ پھر مُسلمانوں پر حکومت نہ کرے اور اپنے روزمرّہ کے کام دیوار بنانے اور زمین کھودنے میں مشغول ہو، ورنہ ہم خود اپنے ہاتھ سے اُس کو سزا دیں گے۔ اِسی طرح کریم بخش (جو مولوی نصیر الدین صاحب منگلوری کے رفیقوں میں تھے) کے متعلق معلُوم ہُوا کہ بدوضعی اختیار کی ہے اور لکھنؤ کے آزاد اور شوقینوں کی طرح صُورت اور لباس اختیار کیا ہے، مایار اور پشاور کی جنگوں میں شرکت بھی نہیں کی، خُفیہ خُفیہ رعایا پر ظُلم کرتے ہیں۔ آپ نے فرمایا کہ اُن کو میرے پاس گرفتار کر کے لاؤ۔ مَیں خود اُن کو ایسی سزا دُوں گا کہ ساری شرارت دماغ سے اُڑ جائے گی۔[1]

وقائع احمدی میں بعض بعض عُمّال کی سختی اور بے عنوانی کی شکایت کے واقعات بھی ہیں۔ اسی کے انتظام کے لیے مولوی رمضان صاحب کو قاضی القُضاۃ بنایا گیا تھا اور اُن کو پُورے علاقے کا دَورہ کرنے کی ہدایت کی گئی تھی۔ حمزہ علی خاں رسالدار کو بھی تاکید تھی کہ وہ اُس کی نگرانی رکھیں کہ کوئی رعایا پر کسی قسم کا ظُلم و تعدّی نہ کرنے پائے۔ حُکم تھا کہ جس پر ظُلم ہو، وہ سیّد صاحبؒ کے یہاں نالش کرے اور واقعات کی اطّلاع کرے، لیکن جیسا کہ منظورہ میں ہے، اہلِ سرحد کو نالش و فریاد کرنے اور ذِمّے داروں کو واقعات کی اطلاع دینے کی بہت کم عادت ہے۔[2] وہ اندر ہی اندر اپنی ناراضگی اور شکایت کو رکھتے ہیں اور جب موقع ملتا ہے، اشخاصِ متعلقہ سے اس کا سخت انتقام لیتے ہیں۔

سیّد صاحبؒ اور آپ کی جماعت کے خلاف عُلمائے سرحد کے الزامات

سیّد صاحبؒ اور آپ کی جماعت کے اکثر علماء حضرت شاہ ولی اللہؒ صاحبؒ کی طرح مسائل میں تحقیقی مسلک رکھتے تھے اور فقہ و حدیث کی تطبیق کی کوشش کرتے تھے، لیکن تیرھویں صدی میں تمام عالمِ اسلامی میں بالعموم، ہندوستان میں بالخصوص اور سرحد و افغانستان میں بالاخص جو دینی اور علمی جمُود طاری تھا، اُس کے سامنے مروّجہ عادات اور عوام کے مسلک سے سرِمُو انحراف اور ہر ایسی تحقیق، جو عُلماء کے لیے نامانُوس اور نئی تھی، الحاد و زندقہ اور

---

[1] منظورۃ، ص ۹۶۰، ۹۶۱ [2] منظورہ، ص ۹۵۸

مذہب سے آزادی کے مرادف تھی۔ چنانچہ سرحد کے علماء نے مشہور کیا کہ یہ ہندوستانی علماء اور اُن کا امیر لامذہب لوگ ہیں، خواہشِ نفسانی کے پیرو اور آزاد خیال ہیں۔ عوام میں اس پروپیگنڈے کا جو اثر ہوا ہوگا، اُس کا اندازہ آج بھی کیا جا سکتا ہے۔

مجاہدین کے ساتھ جنگ کرنے میں جو بعض مُسلمان سردار اور باغی قتل ہُوئے تھے (جس کے اسباب اور تفصیلات اُوپر گزر چکی ہیں) اُن کا قتل اور اُن کے علاقوں پر قبضہ بھی مجاہدین کے خلاف سخت الزام تھا۔ عُلماء کہتے تھے کہ یہ لوگ مسلمان کے جان و مال کو کوئی چیز نہیں سمجھتے اور بلا وجہ شرعی مسلمانوں کی جان و مال پر دست درازی کرتے ہیں۔ بعض لوگ اُس سے آگے بڑھ کر مجاہدین کو باغی، اور باغی مقتولین کو شہید کہتے تھے۔

اِن دو الزامات کے علاوہ ذاتی طور پر سیّد صاحبؒ کے متعلق ان لوگوں نے مشہور کیا تھا کہ آپ نہایت دُرشت مزاج، زُود رنج اور غضبناک آدمی ہیں۔ کوئی اگر نصیحت کرے یا معقول بات کہے، تو ناراض ہو جاتے ہیں اور اُس کے اِیذا کے درپئے ہو جاتے ہیں۔ سیّد صاحبؒ نے ان غلط فہمیوں کو رفع کرنے اور ان الزامات کی تردید کے لیے عُلماءِ پشاور کے نام ایک پُر زور اور مُدلّل خط لکھا، جو قلمی خطوط کے مجمُوعے میں شامل ہے۔ اس خط سے سیّد صاحبؒ کے بہت سے خیالات اور اُس وقت کے حالات پر روشنی پڑتی ہے۔ اس لیے اُس خط کے بعض حصّے نقل کیے جاتے ہیں۔

مذہبی بے قیدی کے الزام کا ذکر فرماتے ہیں اور اُس کا جواب دیتے ہیں:

چناں شنیدہ ایم کہ از جملہ مفتریات آں	سُننے میں آیا ہے کہ ان افترا پردازوں کا ایک
مفتریان آنست کہ ایں فقیر را، بلکہ زُمرۂ	افترا یہ ہے کہ اس فقیر، بلکہ پُوری جماعت مجاہدین
مُجاہدین بالحاد و زندقہ نسبت می نمایند	کو الحاد و زندقہ کی طرف نسبت کرتے ہیں اور
یعنی، چُناں اظہار می کنند کہ ایں جماعت	اس طرح بیان کرتے ہیں کہ اِن پردیسیوں کا
مُسافرین ہیچ مذہب ندارند و بہیچ مسلک	کوئی مذہب نہیں اور یہ کسی مسلک کے پابند
مُقیّد نیستند، بلکہ محض راہِ نفسانیت می پویند	نہیں بلکہ محض نفسانیت پرست اور لذات
و بہرچہ لذاتِ نفسانی می جویند خواہ موافقِ کتاب باشد خواہ	نفسانی کے جویا ہیں، خواہ کتاب اللہ کے

مخالف۔ معاذ اللہ من ذالک! پس باید دانست کہ نسبتِ ما مردم بایں امرِ شنیع افترائیست قبیح و بہتانیست صریح۔ ایں فقیر در بلادِ ہندوستان گمنام نیست۔ اُلوفِ اُلوف انام از خواص و عوام ایں فقیر و اسلافِ ایں فقیر را می دانند کہ مذہب ایں فقیر اَباً عَنْ جَدٍّ حنفی است و بالفعل ہم جمیع اقوال و افعالِ ایں ضعیف بر قوانینِ اُصولِ حنفیہ و آئینِ قواعدِ ایشاں منطبق است۔ یکے ازاں خارج از اصولِ مذکورہ نیست اِلّا ما شاء اللہ۔ آنچہ از ہمہ افرادِ انسان بسببِ غفلت و نسیان صادر می گردد کہ بخطائے خود معترف می باشد و بعد از اعلام براہِ راست معاودت می نماید۔ آرے۔ در ہر مذہب طریقِ محققین دیگر می باشد و طریقِ غیرِ ایشاں دیگر۔ ترجیحِ بعضِ روایات بر بعضِ دیگر بقوتِ دلیل و توجیہِ بعضی عبارات منقول از سلف و تطبیقِ مسائلِ مختلفہ مدوّن در کتب و امثالِ ذالک دائماً از کاروبارِ اہلِ تدقیق و تحقیق است۔ بایں سبب

موافق ہو یا مخالف۔ خدا کی پناہ! واضح ہو کہ ہم غریبوں کی اس امرِ شنیع کی طرف نسبت محض افترا و بہتان ہے۔ یہ فقیر اور اِس فقیر کا خاندان ہندوستان میں گمنام نہیں۔ ہزاروں ہزار آدمی، کیا خاص اور کیا عام، اس فقیر کو اور اس کے بزرگوں کو جانتے ہیں اور اُن کو معلوم ہے کہ اِس فقیر کا مذہب اَباً عَنْ جَدٍّ حنفی ہے اور اس وقت بھی خاکسار کے تمام اقوال و اعمال احناف کے اصول، قوانین اور قواعد کے مطابق ہیں، ان میں سے ایک بھی ان اصول سے باہر نہیں۔ ہاں، انسان سے بمقتضائے بشریت جو کچھ غلطی ہو جائے، اس کا امکان ہے اور اس کے ہو جانے کے بعد اس کا اعتراف ہے اور اگر کوئی تنبیہ کرے، تو رجوع کرنے کے لیے تیار ہوں۔ البتہ، ہر مذہب میں محققین کا طریقہ اور ہوتا ہے اور غیر محققین کا اور۔ بعض روایتوں کو بعض پر ترجیح دینا دلیل کی قوت کا لحاظ کر کے سلف سے منقول، عبارتوں کی توجیہ مختلف مدوّن مسائل میں تطبیق دینا اور اس طرح کی باتیں اہلِ تدقیق و تحقیق کا ہمیشہ سے دستور رہا ہے

ایشاں خارج از مذہب نمی توانند شد، بلکہ ایشاں را اُلبِّ لُبابِ اہلِ آں مذہب باید شمرد۔ ہر کہ دریں مقدمہ شبہہ داشتہ باشد، لازم کہ نزدِ ایں فقیر آمدہ بالمشافہ حلِّ اشکال نماید، یا خود بفہمد یا ایں فقیر را بفہماند۔

محض اتنی سی بات پر وہ مذہب سے خارج نہیں ہو جاتے، بلکہ ان لوگوں کو اس مذہب کے پیروؤں کا لُبّ لُباب سمجھنا چاہیے جس شخص کو اس مسئلے میں کچھ شبہہ ہو، اس کو چاہیے کہ اس فقیر کے پاس آکر زبانی یا اور رُو در رُو اس اشکال کو حل کرے یا خود سمجھ لے یا اس فقیر کو سمجھا دے۔

مُسلمانوں کی جان و مال کی بے وقعتی اور دست درازی کے اِلزام کا جواب دیتے ہیں :

و از جملۂ مفتریاتِ آں مفتریانِ مذکورہ آنست کہ ایں فقیر را بظلم و تعدی نسبت می کنند کہ ایں فقیر بر جان و مالِ مسلمین بلا وجہِ شرعی دست درازی می کنند و دریں باب بچرب زبانی و حیلہ سازی می نماید۔ سُبْحٰنَكَ هٰذَا بُهْتَانٌ عَظِيْمٌ! ایں فقیر گاہے کسے را بلا وجہِ شرعی یک تازیانہ ہم نہ زدہ باشد، بلکہ زدنِ سگ ہم بلا وجہ از عاداتِ ایں فقیر نیست۔ ہر کہ چند روز با فقیر ملازمت کردہ باشد، لابد بریں معنی آگاہ شدہ باشد۔ فامّا آنچہ سرزنش و گوشمالِ ملکِ جبّار از دستِ ایں ذرّۂ بے مقدار

ان افترا پردازوں کا ایک افترا یہ ہے کہ اس فقیر پر ظلم اور دست درازی کا الزام لگاتے ہیں اور کہتے ہیں کہ وہ مسلمانوں کے جان و مال پر بلا وجہِ شرعی دست اندازی کرتا ہے اور اس بارے میں چرب زبانی اور حیلہ سازی سے کام لیتا ہے۔ سُبْحٰنَكَ هٰذَا بُهْتَانٌ عَظِيْمٌ! اس فقیر نے تو کبھی کسی کو بلا وجہِ شرعی ایک کوڑا بھی نہ مارا ہوگا، بلکہ بلا وجہ کُتّے کو بھی مارنا اس کی عادت نہیں۔ جس شخص کو چند دن بھی اس کے ساتھ رہنے کا اتفاق ہوا ہے، اُس کو ضرور اس بات کا علم ہوگا۔ باقی اللہ نے اس ناچیز کے ذریعے بعض مُنافقین و مُرتدین کی جو سرزنش اور

بہ بعضے از مُرتدین اشرار و مُنافقین
بد شعار رسید، پس آں را از اعاظم
سعاداتِ خود می شمارم و اقوی علاماتِ
مقبولیتِ خود می انگارم بلکہ غیرت در
اعانتِ دین و رغبت باہانت معاندین
از لوازمِ ایمان است۔ ہر کہ غیرتِ ایمانی و
حمیتِ اسلامی نمی دارد، فی الحقیقت
ایمان نمی دارد۔ آیۂ کریمۂ تبارک و تعالیٰ
يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا مَنْ يَرْتَدَّ
مِنْكُمْ عَنْ دِينِهِ فَسَوْفَ يَأْتِي اللَّهُ
بِقَوْمٍ يُحِبُّهُمْ وَيُحِبُّونَهُ أَذِلَّةٍ عَلَى
الْمُؤْمِنِينَ أَعِزَّةٍ عَلَى الْكَافِرِينَ
يُجَاهِدُونَ فِي سَبِيلِ اللَّهِ وَلَا
يَخَافُونَ لَوْمَةَ لَائِمٍ (۵ : ۵۴)
وَقَالَ اللَّهُ تَعَالَىٰ يَا أَيُّهَا النَّبِيُّ جَاهِدِ
الْكُفَّارَ وَالْمُنَافِقِينَ وَاغْلُظْ
عَلَيْهِمْ وَمَأْوَاهُمْ جَهَنَّمُ (۹ : ۷۳)
و اگر بالفرض والتقدیر چیزے ازیں قبیل
از دستِ ایں فقیر صادر شدہ باشد، پس
ایں فقیر را بطریقِ وعظ و نصیحت بر آں
آگاہ باید گردانید، نہ ایں کہ بطریقِ غیبت

گوشمالی فرمائی ہے، اس کو میں اپنی انتہائی
سعادت اور اللہ کے یہاں مقبولیت کی
علامت سمجھتا ہوں، بلکہ حقیقت تو یہ ہے کہ
اعانتِ دین میں غیرت اور مُعاندین کی
اہانت و تذلیل کا شوق ایمان کے لوازم
میں سے ہے۔ جس میں غیرتِ ایمانی نہیں،
حقیقت میں ایمان سے عاری ہے۔ اللہ
تعالیٰ فرماتا ہے: "اے لوگو، تم میں سے جو
اپنے دین سے پھر جائے گا، (تو اللہ کو کچھ پروا
نہیں) کہ وہ عنقریب ایسے لوگوں کو لے آئیگا،
جو مومنین کے حق میں نرم ہوں گے، کافروں
کے حق میں سخت، اللہ کے راستے میں جہاد
کریں گے اور کسی ملامت کرنے والے کی
ملامت کی پروا نہ کریں گے۔" (المائدہ: ۵۴)
(اور فرمایا) "اے نبیؐ، کفار اور مُنافقین
سے جہاد کرو اور اُن پر سختی کرو اور اُن کا
ٹھکانا جہنم ہے۔" (التوبہ: ۷۳)
اور اگر بالفرض کوئی چیز اس فقیر کے ہاتھ سے ایسی
صادر ہوئی ہو، تو فقیر کو وعظ و نصیحت
کے ذریعے اس پر آگاہ کر دیا جائے، نہ یہ
کہ محفلوں اور مجلسوں میں اس کی غیبت کی

درمیانِ محافل و مجالس مذکور نمایند و
فقیر را بآں سہو و نسیان مطعون سازند
و برہمیں خیال از رفاقتِ ایں فقیر در
امرِ جہاد و مشارکتِ زمرۂ مجاہدین دست
بردار شوند کہ حدیث "اَلْجِهَادُ مَاضٍ
إِلَىٰ يَوْمِ الْقِيَامَةِ لَا يُبْطِلُهُ جَوْرُ
جَائِرٍ وَّ لَا عَدْلُ عَادِلٍ" درمیانِ
ہمہ اہلِ حدیث مشہور است۔

بالجملہ درخواستِ ایں فقیر از
جمیع علماءِ زمانہ ہمیں است کہ تمام مسلمین
را عموماً و ایں فقیر را خصوصاً امر بالمعروف
و نہی عن المنکر نمایند و براہِ راست
ہدایت فرمایند و آنچہ اعتراض و اشکال
در غیبت ذکر می نمایند، آں را بالمشافہ
بدلائلِ شرعیہ بپایۂ اثبات رسانند و
روئے ایں فقیر را بوعظ و تذکیر از راہِ
خود پرستی براہِ خدا پرستی گردانند کہ
مستعد برہمیں امر است کہ اگر بر چیزے
از اقوال و افعالِ خود مطلع شود کہ مخالفِ
حکمِ خدا و رسول ؐ باشد، فی الفور از آں
توبہ نماید و براہِ راست مراجعت کند

جائے اور فقیر کو سہو و نسیان پر نشانۂ طعن
بنایا جائے اور محض اس بنا پر جہاد میں اس
کی رفاقت اور جماعتِ مجاہدین کے ساتھ
شرکت چھوڑ دی جائے۔ حدیث میں آیا
ہے: "جہاد قیامت تک باقی رہے گا۔
کسی ظالم کا ظلم اور کسی منصف کا انصاف
اس کو اٹھا نہیں سکتا۔ یہ حدیث علماءِ
حدیث کے یہاں مشہور ہے۔

مختصراً اس فقیر کی تمام علماءِ وقت
سے یہی درخواست ہے کہ تمام مسلمانوں کو
بالعموم اور اس فقیر کو بالخصوص بھلائی کا حکم
دیں اور برائی سے روکیں اور سیدھے راستے
کی رہنمائی کریں اور جس اعتراض و اشکال کا
غیبت میں ذکر کرتے ہیں، اس کو رُو در رُو شرعی
دلائل سے ثابت کریں اور اس فقیر کا رُخ
خود پرستی سے خدا پرستی کی طرف موڑ دیں۔
وہ اس کے لیے بالکل تیار ہے کہ اگر اپنے
اقوال و افعال میں سے کوئی ایسی چیز اس
کو معلوم ہو، جو خدا و رسول ؐ کے حکم کے مخالف
ہو، تو وہ فی الفور اس سے توبہ کرے گا اور
سیدھے راستے کی طرف لوٹ آئے گا۔

اگر مجادلین مذکورین بر افعال و اقوالِ این فقیر اعتراض می دارند و آں را مخالفِ شرع می انگارند، باز این فقیر را بر آں مطلع نہ گردانند و قدرے رنج سفر کشیدہ آں را بالمشافہ بپایۂ اثبات نرسانند، پس وبالِ آں ہمہ بر گردنِ ایشان است۔

و آنچہ بعضے از سفہاءِ دروغ گو و حمقاءِ فتنہ جو مشہور گردانیدہ کہ ہر کہ از علماءِ کرام و فضلاءِ ذوی الاحترام این فقیر را امر بالمعروف و نہی عن المنکر می نمایند، این فقیر با ایشاں بقہر و غضب پیش می آید و بجان و مالِ ایشاں مضرت می رساند و بدست و زبانِ ایشاں را بوجہ من الوجوہ می رنجاند، پس این امر باطلِ محض است و افتراءِ بحت۔ بارہا جواسیسِ کفار و منافقین را گرفتہ و با ایشاں کلامِ غضب ہم نہ گفتہ، بلکہ از ایذاءِ ایشاں بالکل دست برداشتہ و ایشاں را بہ سلامت و عافیت فرا گذاشتہ۔ چوں بجواسیسِ کفار و منافقین این معاملہ کردہ باشد، آیا ہیچ عاقل تجویز این معنی خواہد نمود

اگر معترضین، جو اس فقیر کے اقوال و افعال پر اعتراض کرتے ہیں اور اُن کو مخالفِ شرع سمجھتے ہیں، اگر خود اُس کو اس کی اطلاع نہ کریں گے اور کچھ زحمتِ سفر برداشت کر کے بالمشافہ اس کو ثابت نہ کریں گے، تو اس کا وبال اُنھیں کی گردن پر ہوگا۔

اور بعض دروغ گو، کم عقل اور مفسدوں نے یہ جو مشہور کیا ہے کہ علماء و فضلاء میں سے جو صاحب اِس فقیر کو بھلائی کی تلقین کرتے ہیں اور برائی سے روکتے ہیں، یہ فقیر اُن کے ساتھ قہر و غضب سے پیش آتا ہے اور اُن کی جان و مال کو نقصان پہنچاتا ہے اور اپنے ہاتھ اور زبان سے اُن کو کسی نہ کسی طرح آزار پہنچاتا ہے۔ پس یہ بات محض بے اصل و بے بنیاد ہے اور محض بہتان و افترا۔ بارہا کفار و منافقین کے جاسوس گرفتار ہوئے ہیں اور اُن سے خفگی کی بات بھی نہیں کی، بلکہ اُن کو تکلیف دینے سے بھی احتراز کیا ہے اور اُن کو عافیت و سلامتی کے ساتھ رہا کر دیا گیا ہے۔ جب کفار اور منافقین کے جاسوسوں کے ساتھ ایسا معاملہ روا رکھا ہے، تو کوئی عقلمند آدمی

که این فقیر با علماءِ عظام و فضلاءِ کرام
کہ محض بر بناءِ امر بالمعروف و نہی عن المنکر
نزدِ این فقیر آمده باشند، کلامِ غضب
سخنِ سخیف درمیان آرد؟ این امر بعید
است از خُلقِ ایمانی و ابعد از مروّتِ
انسانی است۔ مَعَاذَ اللّٰهِ مِنْ ذٰلِكَ!

یہ باور کر سکتا ہے کہ یہ فقیر عُلماء اور فُضلاء کے
ساتھ محض فریضۂ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر
کی بجاآوری کی پاداش میں غصّہ کی بات یا
خلافِ شان گفتگو کرے گا؟ یہ بات ایمانی
اخلاق اور انسانی مروّت سے بہت بعید
ہے۔ ایسے کام سے اللہ کی پناہ!

چونتیسواں باب

ابرارِ مجاہدین کی مظلومانہ شہادت

فتنے کا آغاز وقائع احمدی میں ہے کہ "ایک دن مولوی مظہر علی صاحب عظیم آبادی کا خط آیا، جس میں اُنھوں نے لکھا تھا کہ چند روز سے یہاں پشاور میں اور سردار سُلطان محمّد خاں کے دربار میں مُلکِ سَمہ کے خوانین کے آدمیوں کی آمد و رفت بہت رہتی ہے۔ یہ معلوم نہیں کہ اس کا سبب کیا ہے۔ مَیں اطلاعاً لکھ رہا ہوں۔ آپ نے اُس کے جواب میں اُن کو لکھا کہ اس سے پہلے سَمہ کے خوانین اور دُرّانیوں میں نااتّفاقی تھی، اِس لیے آمد و رفت بند تھی : اب اتّفاق ہو گیا ہے۔

مولوی سیّد مظہر علی صاحب سے سُلطان محمّد خاں کی جواب طلبی اور عُلماء کا سوال و جواب منظورہ میں ہے کہ مولوی سیّد مظہر علی صاحب نے پشاور سے ایک طویل خط مُولانا محمّد اسمٰعیل صاحب کے نام لکھا، جس میں اُنھوں نے تحریر فرمایا کہ ایک ہفتہ ہوتا ہے کہ ارباب فیض اللّٰہ خاں نے مجھ سے کہا کہ سردارانِ پشاور کی نیّت اچھی نہیں معلوم ہوتی۔ مجھے معتبر ذرائع سے معلوم ہُوا ہے کہ وہ حضرت امیرالمومنین سے خاوت کا ارادہ رکھتے ہیں اور وہ میرے اور آپ کے ساتھ بھی کچھ دغا اور فریب کریں گے۔ اِس لیے اس کا خیال رہے کہ جب وُہ مجھے اپنی مجلس میں طلب کریں، تو اُس وقت آپ کو وہاں نہیں ہونا چاہیئے اور جب آپ کو طلب کریں، تو مَیں موجود نہیں رہوں گا۔ میرا ارادہ تھا کہ مَیں آپ کو اس سے مُطّلع کر دُوں کہ

اسی اثنا میں سردار سُلطان محمد خاں نے مجھے[1] اپنی مجلس میں طلب کیا۔ میرے پہنچنے سے پہلے اُس نے شہر کے تمام عُلما کو بُلا رکھا تھا۔ سردار نے مجھ سے اپنے بھائی (یار محمد خاں) کے قتل کے بارے میں استفسار کیا کہ وُہ قتل ناحق تھا یا برحق۔ عُلما بھی بڑے جوش و خروش کے ساتھ اس سوال و جواب میں شریک تھے۔ مَیں نے کہا: "اس شور و غوغا سے کچھ فائدہ نہیں۔ بہتر یہ ہے کہ آپ سب کو خاموش کر دیں اور اپنے میں سے ایک کو وکیل بنا دیں تاکہ وُہ اہلِ مجلس کی طرف سے بات کرے اور مَیں اُس کو جواب دوں" اس پر ہنگامہ کم ہُوا اور انھوں نے ایک عالم کو اپنا وکیل مقرر کیا۔ مَیں نے کہا: "یار محمد خاں کا نام لینے کے بجائے اگر خادی خاں کا نام لے کر اُس کے متعلق دریافت کیا جائے، تو مناسب ہوگا، اس لیے کہ یار محمد خاں کے نام سے سرداروں کا دِل دُکھے گا اور اُن کو رنج ہوگا۔" اس کے بعد مَیں نے کہا: "جب سردار سلطان محمد خاں نے مولانا محمد اسمٰعیل صاحب کے ہاتھ پر امیر المومنین کے نائب کی حیثیت سے بَیعت کی، تو اُسی وقت اس شبہے کا ازالہ کیوں نہ کر لیا؟" سُلطان محمد خاں نے جواب دیا: "اُس وقت عُلما موجود نہ تھے۔ سب تمھارے لشکر کے خوف سے کوہستان میں چلے گئے تھے۔ ہم ناواقف تھے، ہم نے بلا تحقیق بَیعت کر لی۔" میں نے کہا: "یہ بات عجیب ہے کہ آپ کو اپنے بھائی کا مقتول ہونا اُس وقت یاد نہیں رہا اور آپ یہ کیسے فرماتے ہیں کہ اُس وقت علما موجود نہیں تھے؟ آپ کے اُستاد محمد عظیم آخون زادہ اُس وقت شہر میں موجود تھے اور سیّد صاحبؒ سے انھوں نے مُلاقات بھی کی تھی!"

گفتگو یہاں تک پہنچی تھی کہ اہلِ مجلس کی طرف سے گفتگو کرنے کے لیے جو وکیل مقرر ہُوا تھا، اُس نے کہا: "آپ سردار صاحب سے کچھ نہ کہیے۔ ہماری اس بات کا جواب دیجیے کہ آپ نے سردار یار محمد خاں کو کیوں قتل کیا اور اُن کے مال کو کس طرح حلال سمجھ کر کھایا۔ کیا وُہ مُسلمان نہ تھے؟" میں نے کہا: "سردارِ مذکور و خادی خاں دونوں نے حضرت امیر المومنین کے ہاتھ پر بیعتِ امامت کی تھی۔ جب اُن دونوں نے بغاوت اختیار کی، تو اُن کا قتل شرع شریف کی رُو سے جائز ہو گیا۔ باغیوں کا مسئلہ فقہ کی کتابوں میں دیکھ لو۔" اُس شخص نے جواب دیا: "یار محمد خاں نے کیا بغاوت کی تھی؟" میں نے کہا: "وہ پشاور سے فوج کشی کر کے توپیں، شاہینیں اور ہزارہا سوار اور پیادوں کے ساتھ ہنڈ اور زیدہ آئے۔ حضرت امیر المومنین

[1] یعنی سیّد مظہر علی صاحب اپنے خط میں لکھتے ہیں کہ مجھے سردار سلطان محمد خاں نے طلب کیا۔

نے عُلماء کے ذریعے پیغام دیا کہ اس طرح ہم پر چڑھ کر آنے کی کیا ضرورت تھی۔ اگر خادی خاں کے بھائیوں کی مدد کے لیے آئے ہیں، تو مسئلے کو کتاب میں دیکھنا چاہیے کہ ہمارا خادی خاں کو قتل کرنا مسئلے کے مطابق تھا یا نہیں؟ اگر یہ مسئلے کے مطابق ہے، تو چون و چرا کی گنجائش نہیں، اور اگر اس کے خلاف ثابت ہو، تو ہم خود شرعی سزا کے لیے تیار ہیں۔ تمھاری فوج کشی کی ضرورت نہیں۔ لیکن اُنھوں نے اس پر کان نہیں دھرا اور اُن عُلماء سے جو پیغام لے کر آئے تھے کہا: "اگر تم دوبارہ سیّد کا پیغام لے کر آئے، تو ہم تمھارے کان کٹوا دیں گے۔" مجبور ہو کر حضرت امیر المومنین نے اُن کے مقابلے کے لیے فوج بھیجی اور اس کا جو کچھ انجام ہُوا، آپ کو معلوم ہے۔"

اُس طرف کے عُلماء بولے: "یار محمّد خاں خود امام تھے۔ خادی خاں پہلے یار محمّد خاں کے ہاتھ پر بیعتِ امامت کر چکے تھے۔ جب تم نے خادی خاں کو قتل کیا، تو سردار نے مجبور ہو کر خادی خاں کے انتقام کے لیے لشکر کشی کی۔" مَیں نے جواب دیا: "پہلے تو آپ یہ ثابت کیجیے کہ سردار یار محمد خاں نے اپنی پُوری عُمر بھر میں کبھی امامت کا دعوٰی بھی کیا ہے اور اُن کے لیے شرائطِ امامت ثابت کیجیے۔ اگر یہ ثابت بھی ہو جائے، تو جب یار محمّد خاں نے امیر المؤمنین کے ہاتھ پر بیعتِ امامت کر لی، تو اپنی امامت کو خود کالعدم قرار دے دیا اور امیر المومنین کے مبایعین میں شامل ہو گئے۔ اس کے بعد ان کی لشکر کشی اور سرتابی عینِ بغاوت ہے۔"

بات یہیں تک پہنچی تھی کہ عُلماءِ شہر میں سے ایک نے کہا: "آج تو آپ اِمامت اور بغاوت کے مسئلے میں گفتگو کر رہے ہیں، لیکن آپ کے گروہ کے تمام لوگ ہمارے سرداروں کے بھائیوں کے بارے میں ہمیشہ یہ کہتے رہتے ہیں کہ وہ مُنافق ہیں، حالانکہ حضرت علیؓ[1] کا یہ قول نقل کیا گیا ہے کہ نفاق آنحضرت صلّی اللّٰہ علیہ وسلّم کے زمانے ہی میں تھا؛ اس زمانے میں یا تو کُھلا ہُوا کفر ہے یا اسلام۔ دُوسرے یہ کہ منافقوں کا قتل ممنوع بھی ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے عبداللّٰہ بن اُبَی وغیرہ مُنافقین کو قتل نہیں کیا۔"

مَیں نے اس کے جواب میں کہا: "ہم نے اُن کے قتل کی علّت بغاوت کو قرار دیا ہے، نہ کہ نفاق

---

[1] یہ قول بجائے حضرت علیؓ کے کتابوں میں حضرت عُمرؓ کی طرف منسُوب ہے۔

کو" اِس پر مجلس برخواست ہوگئی۔

مولوی سیّد مظہر علی صاحب نے مولانا محمد اسمٰعیل صاحب سے اس کی بھی فرمائش کی کہ وُہ دلائلِ قطعیہ سے علماء کے ان شبہات کا جواب بھی دیں۔ مولانا نے دو قطعہ خط لکھے: ایک میں یار محمد خاں کے ایسے نفاق کا ثبوت، جو مستوجب قتل ہوتا ہے، دُوسرے میں اس کا ثبوت تھا کہ اُس نے ظلم کی ابتدا کی، اس کی وجہ سے قتل کی نوبت آئی۔ خط میں ہدایت تھی کہ اگر اس مسئلے میں دوبارہ گفتگو کی نوبت آئے اور عداوت اور اصرار میں زور بڑھ گیا، تو پہلا خط اُن کے پاس بھیج کر بلا توقف و تاخیر اس طرف کا رُخ کرنا چاہیے اور اگر اس مسئلے میں گفتگو ہو کر اس میں بحث و مباحثہ کی نوبت نہ آئے، تو دُوسرا خط اپنے پاس رکھا جائے اور اُن سے رُخصت طلب کر کے اِس طرف کا قصد کرنا چاہیے اور اس مسئلے میں اپنی طرف سے گفتگو کی ابتدا نہیں کرنی چاہیے اور اگر کوئی دُوسرا اس مسئلے کو پیش کرے، تو جواب نرمی سے دیا جائے۔ آخر میں ہدایت کی کہ حالات کی اطلاع دی جاتی رہے۔[۱]

مکتوب میں اس شبہے پر علمی بحث تھی کہ نفاق و منافقین کا وجود صرف آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں تھا اور اُس کے بعد اُن کا وجود ختم ہو گیا۔ آپ نے تحریر فرمایا تھا: "اِس قول کا مطلب یہ ہے کہ منافقین کا قطعی علم جیسا زمانۂ رسالت میں (وحی کی وجہ سے) ہو سکتا تھا، بعد کے زمانے میں نہیں ہو سکتا۔ اِس لیے قرونِ متاخرہ میں منافقین کی قطعی تعیین ممکن نہیں۔ اسی لیے جب تک کوئی شخص اپنے ایمان کا اظہار کرے گا اور کلمہ گو ہو گا، مسلمان اُس کو مسلمان سمجھتے رہیں گے۔ لیکن جس وقت وُہ اپنے خبثِ باطن اور کفر کا اظہار کرے گا، تو وُہ کافروں میں شمار کیا جائے گا۔ اگر ایسا نہ ہو تو جن حدیثوں میں منافقین کی علامات بیان کی گئی ہیں اور یہاں تک کہا گیا ہے کہ" وَ إِنْ صَلّٰى وَ صَامَ وَ ظَنَّ أَنَّهٗ مُسْلِمٌ" (چاہے، وُہ نماز روزہ کرتا ہو اور اپنے کو مسلمان ہی سمجھتا ہو) ان احادیث کا مصداق ہو گا۔[۲]

---

[۱] منظورہ صفحہ ۹۶۵ تا صفحہ ۹۷۱

[۲] محققین کا مسلک یہی ہے کہ نفاق فطرتِ انسانی کی ایک کمزوری اور ایک ایسا اخلاقی اور نفسانی مرض ہے، جو کسی زمانے اور مقام سے مخصوص نہیں۔ حضرت شاہ ولی اللہ صاحبؒ نے اپنی جلیل القدر تصنیف "الفوز الکبیر" میں اس پر مختصر اور بڑی عالمانہ بحث کی ہے۔ حضرت حسن بصریؒ اور جمہور محققین کا یہی مسلک ہے اور اب اس بارے میں کوئی اختلاف نہیں رہا۔ تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو "تاریخ دعوت و عزیمت، حصۂ اوّل، از مُصنّف، "تذکرہ حضرت خواجہ حسن بصریؒ"۔

ایک مخلص کی اطلاع ایک دن پنجتار کے قریب کی مسجد کے امام[1] سید اصغر نے شیخ عبدالعزیز صاحب سے کہا کہ آج اس بستی میں خوانین کا مشورہ تھا۔ تم کو کچھ اس کا حال معلوم ہے؟ انھوں نے کہا ہم کو کیا معلوم؟ کسی امر کا مشورہ ہوگا۔ اُس نے غُصّے ہو کر کہا: "تم ہندوستانی لوگ بڑے سیدھے ہو، کچھ اپنے حال سے خبر نہیں رکھتے۔" انھوں نے گھبرا کر پوچھا: "کیا بات ہے؟" سید اصغر نے کہا کہ مَیں مسلمان ہوں، کافر نہیں ہوں۔ یہاں کے سب خوانین کافر ہو گئے۔ انھوں نے یہ مشورہ کیا ہے کہ جس جس بستی میں سیّد بادشاہ کے غازی متعین ہیں، آج کے چھٹے روز سب قتل کیے جائیں گے۔ سو جلد جا کر یہ خبر سیّد بادشاہ کو کرو کہ اس کے دفع کی کوئی صورت تجویز کریں اور اپنے غازیوں کو جا بجا سے بلوا کر اکٹھا کرلیں۔

شیخ عبدالعزیز صاحب نے اپنے بڑے بھائی شیخ حسن علی صاحب سے ذکر کیا۔ اوّل تو انھوں نے بڑے زور سے تردید کی، پھر سمجھانے بُجھانے سے سیّد صاحبؒ کو اس کی اطّلاع کی۔ آپ نے فرمایا کہ شیخ بھائی، تم سے یُوں ہی کسی نے کہہ دیا ہے۔ پھر شیخ عبدالعزیز صاحب نے خود جا کر گفتگو کی، آپ نے فرمایا کہ یہ اطّلاع غلط معلوم ہوتی ہے، لوگ ہمارے اور اُن کے درمیان نااتّفاقی ڈالنے کو ایسی خبر اُڑاتے ہیں۔

مولوی مظہر علی صاحب اور ارباب فیض اللہ خاں کی شہادت محمد امیر خاں قصوری بیان کرتے ہیں کہ دُوسری یا تیسری رات کو میرا پہرہ تھا۔ اچانک ایک سوار نے آکر آواز دی کہ پہرے پر کوئی ہے۔ مَیں نے کہا کہ ہاں، مَیں پہرے پر ہوں۔ تم کون ہو اور کہاں سے آئے ہو؟ اُس نے کہا کہ مَیں امام الدین ہوں اور پشاور سے آیا ہوں۔ سیّد صاحبؒ کو جلد میری اطّلاع کرو۔ سیّد صاحبؒ نے اپنے پاس بُلا لیا۔ آپ نے فرمایا: "کہو، کیا بات ہے؟" امام الدین نے عرض کی: "سردار پیر محمّد خاں نے مولوی مظہر علی صاحب کو دعوت کے بہانے سے اپنے مکان پر بُلایا۔ اُن کو اور چار غازیوں اور ارباب فیض اللہ خاں کو شہید کر دیا۔"

سیّد صاحبؒ نے یہ واقعہ سُن کر مولانا محمد اسمٰعیل صاحب، شیخ ولی محمّد صاحب اور ارباب بہرام خاں

---

[1] منظورہ سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ موضع دکھاڑا کی مسجد کے امام تھے، جو پنجتار کے قریب جانب مشرق چند میل کے فاصلے پر ہے۔

وغیرہ کو بُلا کر یہ حادثہ بیان کیا اور مُلکِ سَمہ کے دیہات میں جو مُجاہدین متعین تھے، اُن کو بُلانے اور اکٹھا کرنے کے لیے فرمایا۔ اس مشورے میں جو رات باقی تھی، وہ گزر گئی۔[1] دِن کو سیّد صاحبؒ نے سیّد اسمٰعیل رائے بریلوی کو بُلا کر فرمایا کہ اسی وقت تم ہمارے اشدر گھوڑے پر سوار ہو کر جلد موضع شیوہ کو جاؤ اور مولوی رمضان شاہ قاضی القُضاۃ سے خلوت میں بُلا کر کہو کہ پشاور میں دُرّانیوں نے مولوی مظہر علی اور کئی غازیوں کو شہید کر دیا ہے۔ تم کو سیّد صاحبؒ کا حکم ہے کہ اسی وقت اپنا سب کارخانہ جہاں کا تہاں چھوڑ کر اپنے سب لوگوں کے ساتھ ہمارے پاس چلے آؤ اور یہی بات یار حسین[2] میں جا کر رسالدار حمزہ علی خاں سے کہو اور دو چار سوار رسالدار سے لے کر اور یہی پیغام لے کر اس اطراف کی بستیوں کے غازیوں کے پاس بھیج دینا اور تم یہ خبر پہنچا کر کہیں نہ ٹھیرنا، یہیں چلے آنا۔[3] مولانا محمد اسمٰعیل صاحب نے حکم دیا کہ توپ کو کھینچ کر مسجد کے شمال مغرب کی ٹیکری پر نصب کر دیا جائے۔ آپ نے بائیں ہاتھ کی طرف اشارہ کر کے فرمایا کہ اس طرف کفّار پر ضرب لگانی چاہیے۔ دُوسری جانب دائیں ہاتھ کی طرف اشارہ کر کے فرمایا کہ اس طرف منافقین پر۔[4]

اسی وقت سیّد اسمٰعیل صاحب روانہ ہو گئے اور شیوہ میں جا کر مولوی رمضان شاہ کو آپ کا پیغام پہنچایا اور وہاں سے یار حسین میں جا کر رسالدار حمزہ علی خاں کو یہی حکم سُنایا اور کئی سوار رسالدار سے لے کر اور وہی حکم دے کر اس اطراف کی بستیوں کے غازیوں کے پاس روانہ کر دیے۔ مگر یہ حکم سُن کر سب کو یہ گمان ہُوا کہ مولوی مظہر علی صاحب وغیرہ کے ساتھ دُرّانیوں نے جو یہ معاملہ کیا ہے، تو شاید سیّد صاحبؒ پھر لشکر جمع کر کے پشاور جائیں گے۔ اس لیے جلد ہم لوگوں کو بُلاتے ہیں اور سَمہ والوں کی غدّاری اور مکّاری کا کسی کے دل میں خیال بھی نہ تھا۔ اس سبب سے کسی نے کہا کہ ہم یہاں سے شام کو روانہ ہوں گے، کسی بستی کے غازیوں نے کہا کہ ہم آدھی رات یا پچھلے پہر سے چلیں گے۔ اس تساہُل اور غفلت میں ہر

---

[1] منظورہ میں ہے کہ شیخ ولی محمد صاحب نے فرمایا کہ رات کا وقت ہے، کل دن کے وقت لوگ روانہ ہو جائیں گے۔ سیّد صاحبؒ نے سکوت فرمایا اور یہی رائے قرار پائی۔ صفحہ ۹۷۶

[2] یار حسین عام طور پر بولا جاتا ہے۔ لکھتے یار حسین ہیں۔ تپۂ رزڑ کا بہت بڑا قصبہ ہے۔ اسماعیلہ سے راستہ جاتا ہے۔

[3] وقائع [4] منظورہ صفحہ ۹۷۶

بستی کے مجاہدین بستی ہی میں رہے اور اپنے اپنے دوستوں سے بستی میں ملنے لگے اور مصافحہ کرکے رخصت ہونے لگے کہ سیّد صاحبؒ نے کسی ضروری کام کو پنجتار میں اپنے پاس بُلایا ہے، سو آج شام کو یا صبح کو ہم یہاں سے کُوچ کریں گے۔

ان لوگوں کا مشورہ پہلے سے ٹھیر چکا تھا کہ فلاں تاریخ، فلاں وقت اپنی اپنی بستیوں کے غازیوں کو قتل کر ڈالیں اور اس کی اصطلاح انھوں نے آپس میں یہ ٹھیرائی تھی کہ فلاں روز جوار کُوٹیں گے۔ اس میعاد میں دو دِن باقی تھے۔ پشاور والے دو دِن پہلے دست اندازی کر بیٹھے۔ یہ خبر بعض بعض خوانین کو ہو گئی۔ انھوں نے جانا کہ یہ غازی یہاں سے سلامت نِکلے جاتے ہیں۔ اُن کو یہ آج ہی سمجھ لیں[1]۔ اس بات کا سب نے مشورہ کیا اور اپنی بستی کے ڈُوموں سے کہا کہ حُجروں کے کوٹھوں پر چڑھ کر نقارے بجاؤ اور بآوازِ بلند پکار دو کہ سیّد بادشاہ کی تاکیدِ شدید ہے کہ جلد عُشر کا غلّہ پہنچاؤ۔ سو سب مِل کر جس طرح سے ہو سکے، آج ہی جوار کُوٹنی شروع کر دو۔ پھر وُہ ڈوم حجروں پر نقارے رکھ کر بجانے لگے اور وُہی کہنے لگے اور جابجا سے لوگ آکر جمع ہو گئے۔

یہ حال دیکھ کر غازی لوگ اُن سے پوچھتے کہ آج یہاں بھی نقّارے بجتے ہیں اور اِدھر اُدھر کی بستیوں سے بھی نقّاروں کی آواز آتی ہے، یہ کیا معاملہ ہے؟ تو وُہ اُن سے کہتے کہ سیّد بادشاہ کا حکم ہے کہ جلد عُشر کا غلّہ بھیجو، سو جَوار کُوٹنے کے لیے ہم لوگوں کو خبر کرتے ہیں اور کوئی بات نہیں ہے۔ یہ سُن کر وُہ خاموش ہو رہتے اور اُن کی سازش کا کوئی احساس نہ ہوتا۔

عشاء کی نماز کے وقت اچانک بستی والوں نے گھیر لیا اور اُن غازیوں کو قتل کرنا شروع کر دیا۔ کوئی نماز پڑھنے میں شہید ہُوا اور کوئی وضو اور استنجا کرنے میں۔ یہی حال ہر بستی میں ہُوا، مگر کہیں عشاء کے وقت اور کہیں آدھی رات کو اور کہیں پچھلے پہر کو اور کہیں فجر کی نماز میں۔ کوئی کوئی آدمی بھاگ کر یا کسی

---

[1] منظورہ میں ہے کہ جس وقت سیّد اسمٰعیل کو اس اطلاع کے لیے بستیوں میں بھیجا گیا ہے اور پشاور سے اطلاع آئی ہے۔ نصراللہ خاں، ساکن گڑھی امان زئی پنجتار میں موجود تھا۔ وُہ ایک بد باطن و منافق شخص تھا۔ سیّد اسمٰعیل کے روانہ ہوتے ہی وُہ بھی اپنے گھوڑے پر سوار ہو کر روانہ ہو گیا اور سب جگہ اطلاع کرتا گیا کہ پنجتار اس مشورے کی اطلاع ہو گئی ہے۔ جو کام پرسوں کرنا ہے، اگر آج ہی نہ انجام دے لیا گیا، تو موقع ہاتھ سے جاتا رہے گا۔ صـ ۹۷۷

گھر میں چھپ کر بچے اور جان سلامت لے کر پنجتار میں سیّد صاحبؒ کے پاس آئے۔ باقی سب شہید ہو گئے۔

حاجی بہادر شاہ خاں کی شہادت حاجی بہادر شاہ خاں رامپوری سیّد صاحبؒ کے پاس سے رخصت ہو کر امان زئی کی گڑھی کو جاتے تھے۔ جب موضع اسمٰعیلہ میں گئے، تب وہاں کے لوگوں نے اُن کو ٹھیرا لیا کہ آج تشریف نہ لے جائیے یہیں رہیے، آپ کی ضیافت ہے۔ یہ لوگ حاجی صاحب کے بظاہر بڑے معتقد تھے اور اُن سے توجّہ لیا کرتے تھے۔ وہ وہاں ٹھیر گئے۔ انھوں نے بڑی تعظیم و تکریم سے کھانا کھلایا اور عشار کے وقت اُن کو امام بنایا۔ وُہ نماز پڑھنے لگے۔ پہلی رکعت کا سجدہ کر کے دوسرے میں گئے تھے کہ وہاں کے خان اسمٰعیل خاں نے تلوار ماری اور سر جُدا ہو گیا۔

مولوی رمضان شاہ اور اُن کے ساتھیوں کی شہادت شیوہ میں سب غازی سب طرف سے سمٹ کر مولوی رمضان شاہ صاحب کے پاس جمع ہو گئے۔ آنند خاں و مشکار خاں مولوی صاحب کے پاس آئے اور کہنے لگے کہ آپ کسی بات کا اندیشہ نہ کریں، ہمارے مکان پر چل کر بیٹھیں۔ جب تک ہم جیتے ہیں، کیا مجال جو کوئی آپ پر ہاتھ ڈالے۔ مولوی صاحب نے کہا "جَزَاكُمُ اللهُ تَعَالیٰ" جو تم نے اس وقت تسلّی و تشفّی کی بات کہی، مگر اس وقت اللّٰہ تعالیٰ کے سوا ہم کسی کو اپنا یار و مددگار نہیں جانتے۔ آپ اپنے مکان پر تشریف لے جائیں۔ جو کوئی ہم پر چڑھ کر آئے گا، ہم آپ جیسا ہوگا، دیکھ لیں گے۔

اس عرصے میں ملوائیوں نے آ کر ہر طرف سے گھیر لیا۔ جب فجر ہوئی اور اُجالا پھیلا اس وقت مولوی صاحب اپنی جمعیّت کے ساتھ نکلے اور مُلوائیوں نے اُن کا تعاقب کیا۔ لڑتے بھڑتے شیوہ کے درے نالے تک پہنچے۔ وہاں سے آگے اُنھوں نے نہ جانے دیا۔ وہیں ہر طرف سے گھیر کر شہید کر دیا۔

موضع شیوہ میں جب سیّد امیر علی نے، جو عُشر کی تحریر پر مامور تھے اور اس سلسلے میں دورہ کرتے رہتے تھے، مُلکیوں کا اجتماع دیکھا اور نقّارے کی پے در پے آواز سُنی، تو انھوں نے اپنا گھوڑا تیار کیا اور عُشر و زکوٰۃ کی پانچ ہزار کی جو رقم پہلے سے جمع تھی، گھوڑے پر بار کی اور پنجتار کی طرف رُخ کیا۔

اُس وقت اُن سے سب سے زیادہ قریب حافظ عبد العلی پھلتی پسر حافظ قطب الدین پھلتی تھے۔ اُن سے بھی اُنھوں نے کہا کہ اپنا گھوڑا تیار کرو، ہم تم دونوں پنجتار نکل چلیں۔ حافظ عبد العلی دیہات کے باہر تک

ساتھ آئے۔ اس کے بعد یہ کہ کر میں ایسی حالت میں اپنے بھائیوں کا ساتھ چھوڑ نہیں سکتا، پھر موضع میں آگئے۔ سیّد امیر علی یہ کہہ کر روانہ ہو گئے کہ مجھے تو اس رقم کو پنجتار پہنچانا ضروری ہے۔ حافظ صاحب نے جواب دیا کہ میں اپنی زندگی سے سیر ہو گیا ہوں اور شہادت کی موت کی تمنّا ہے۔ میں تو اپنے ساتھیوں کے ساتھ رہوں گا۔ میرا جینا بھی اُن کے ساتھ ہے، میرا مرنا بھی اُن کے ساتھ ہے۔ چنانچہ وُہ مولوی رمضان شاہؒ وغیرہ کے ساتھ ہی شہید ہوئے۔[1]

مینئی میں مجاہدین کا محاصرہ موضع مینئی میں وہاں کے مُلّا نے تین غازیوں کو اپنے گھر میں چھپا کر اُن کی جان بچائی۔ پیر خاں جماعت دار مورائیں والے ایک مسجد میں محصُور ہو گئے اور وہاں سے مقابلہ کرتے رہے۔ بلوائیوں نے ہر طرف سے ایسا سخت گھیرا کہ نکلنے اور بچنے کا کوئی راستہ نہ رہا۔ بستی والوں نے سب ناکے بھی روک لیے۔ کوٹھوں کی چھتوں پر بھی لوگ بندوقیں لیے بیٹھے تھے۔ غازیوں کی مار اُن پر نہیں پڑتی تھی اور یہ اُن کے نشانہ بنے ہوئے تھے۔ جب غازیوں کے پاس گولی بارُود نہ رہی اور تلوار کی زد پر یہ لوگ نہ گئے، تب مجبور ہو کر پیر خاں اپنے غازیوں کے ساتھ مسجد میں گھس گئے اور اندر سے کواڑ بند کر کے زنجیر لگالی۔ اس وقت بندوقیں چلنی موقوف ہوئیں اور سب بلوائیوں نے ہر طرف سے آکر مسجد کا محاصرہ کر لیا اور اس فکر میں ہوئے کہ اب اُن کو کس ترکیب سے ماریں۔ بعضوں نے کہا کہ دیوار میں نقب کر کے بندوقوں سے مار لیں اور بعضوں نے کہا کہ مسجد میں آگ لگا دیں۔ اس سے آپ ہی جل کر مر جائیں گے اور جو کوئی باہر نکلیں گے، ہم اُن کو مار لیں گے۔ شاہ ولی خاں نے، جس کی یہ مسجد تھی، کہا: "میں نہ اپنی مسجد کھودنے دُوں گا، نہ جلانے دوں گا۔"

عُلماء، سادات اور عورتوں کی خوشامد اس گفتگو میں اس بستی کے عُلماء اور سادات کلام اللہ شریف لے کر آئے اور بڑی خوشامد کے ساتھ خدا و رسُولؐ کا واسطہ دے کر کہنے لگے کہ ان مُسلمان مظلوموں کو ناحق ظلم سے قتل نہ کرو۔ خدا کے غضب سے ڈرو، یہ حاجی، غازی اور مُہاجر ہیں اور اُنھوں نے

---

[1] منظورہ ص ۹۷۹، ۹۸۰۔ مولوی سیّد جعفر علی صاحب لکھتے ہیں کہ حافظ عبد العلی بلیتی جب پھولڑے کی جنگ سے صحیح سلامت امب میں آئے، تو اپنے شہید نہ ہونے پر بڑی ندامت اور حسرت کا اظہار کرتے تھے اور شہادت کی موت کی تمنا رکھتے تھے۔

تمھارا کوئی نقصان بھی نہیں کیا۔ اسی طرح بستی کی تمام عورتیں کوئی اپنے خاوند کو، کوئی اپنے بیٹے کو، کوئی اپنے بھائی بھتیجے وغیرہ کو لپٹی تھی اور ہتھیار چھینتی تھی اور کہتی تھی کہ ان مظلوموں، بے گناہوں کو مارتے ہو اور کافر ہوتے ہو، غضبِ الٰہی سے ڈرو اور خون ناحق نہ کرو۔ مگر وہ کسی کا کہنا خیال میں نہیں لاتے تھے۔

ہندوؤں کی خوشامد اور سفارش سب کے بعد وہاں کے ہندو بنیے جمع ہو کر آئے اور کہنے لگے کہ ہم ہندو لوگ ہیں، کوئی جانور نہ آپ مارتے ہیں، نہ امکان بھر غیر کو مارنے دیتے ہیں اور تم ان آدمیوں کے مارنے پر آمادہ ہو! جو تم چاہو، ہم سے لو، ان کو ہمیں دے دو۔ ہم تم سے اقرار کرتے ہیں کہ ان کو پنجتار میں سید بادشاہ کے پاس نہیں بھیجیں گے، دریائے سندھ کے پار سکھوں کی عملداری میں اُتار دیں گے۔ وہاں سے جدھر چاہیں گے، چلے جائیں گے۔ مگر انھوں نے یہ بھی نہ مانا۔

قتلِ عام غازی یہ تمام قیل و قال مسجد کے اندر سے سُن رہے تھے۔ اس بحث مباحثے میں پانچ گھڑی دن چڑھا۔ آخر سب اس امر پر متفق ہوئے کہ مسجد میں آگ لگا دو۔ جب غازیوں کو یقین ہُوا کہ اب یہ مسجد میں ضرور آگ لگا دیں گے، تب وُہ سب مسجد کے کواڑ کھول کر ننگی تلواریں لے کر باہر نکلے۔ مسجد کے صحن میں آکر پیر خاں کا پاؤں پھسلا اور زمین پر گرے۔ جلد ایک جوان نے اُن کو اُٹھا لیا اور باہر مشرق کی طرف لے چلا۔ کسی بلوائی نے جان کے خوف سے اُس وقت اُن غازیوں کا تعاقب نہ کیا۔ سب لوگ مسجد کے اندر اُن کے مال و اسباب لُوٹنے لگ پڑے۔ تب یہ لوگ بستی کے باہر نالے پر جا پہنچے اور تسلّی سے پانی پینے پر جُھکے اور جانا کہ ہم سب سلامت بچ گئے۔ اس عرصے میں بلوائی مال و اسباب کے لُوٹنے سے فارغ ہو کر اُن کے تعاقب میں دَوڑے اور نالے کے اندر چاروں طرف سے گھیر لیا اور پتھروں اور نیزوں سے مارنا شروع کیا اور سب کو وہیں قتل کر ڈالا۔ اُن میں سے ایک کو زندہ نہ چھوڑا اور اُن کے کپڑے لتّے ہتھیار وغیرہ لے کر بستی کو چلے آئے۔

مُلّاؤں کی جُرأت بستی میں آکر اُن کو مخبروں سے معلوم ہُوا کہ بعض مُلّاؤں کے گھروں میں ایک ایک دو دو غازی چُھپے ہیں، تو اُنھوں نے خانہ تلاشی شروع کی اور اصرار کیا کہ جس گھر میں کوئی غازی ہو، وہ حوالہ کر دے۔ مُلّاؤں نے صاف انکار کیا اور کہا کہ وُہ ہماری جان کے ساتھ ہیں۔ جب تک دم میں دم ہے

ہم اُن کو ہرگز حوالے نہ کریں گے۔ آخر بلوائی ناکام رہے اور اِن مُلّاؤں نے اپنی جرأت و جوانمردی سے کئی آدمیوں کی جان بچالی۔

مُجاہد کے جذبات | ایک مُلّا کے گھر میں چند غازی چھُپے تھے۔ جب خانہ تلاشی موقوف ہُوئی، تو اُس مُلّا نے اپنے محلّے کے ایک سیّد صاحب سے، جن کا نام میاں مُحمّد تھا، کہا کہ رات کو تین غازی میں نے اپنے یہاں لاکر چھپائے۔ دو کو رات ہی کو بستی کے باہر سلامت نکال دیا۔ اب ایک ہے، مگر بیمار ہے۔ میاں مُحمّد نے مُلّا کو بہت شاباشی دی کہ تم نے بڑی جوانمردی کا کام کیا اور کہا کہ دو غازی میرے حُجرے میں بھی ہیں: ایک زخمی ہے اور ایک تندرست، اور مُلّا سے کہا کہ آج کچھ دیر کے بعد تمھارے یہاں آؤں گا، مگر تم اس غازی کو تسلّی کر دینا کہ میرے وہاں جانے سے کِسی بات کا اندیشہ نہ کرے۔

میاں خدابخش رامپوری، جو اس مُلّا کے گھر میں چھُپے ہُوئے تھے، کہتے ہیں کہ کچھ دن رہے وُہ سیّد ایک سیاہ کمبل سر سے پاؤں تک اوڑھے ہُوئے خفیہ دیوار پھاند کر آئے، مجھ سے لپٹ کر ملے اور بہت روئے اور کہا کہ ان بلوائیوں نے بڑا ظلم اور بے دینی کا کام کیا کہ بے گناہ لوگوں کو مارا۔ مَیں نے کہا: "میاں صاحب، ہم سب لوگ اپنے گھروں سے اسی نیّت سے آئے تھے کہ اپنی جانیں اللہ تعالیٰ کی راہ میں صرف کریں۔ سو جو صاحب شہید ہُوئے، وہ اپنی مُراد کو پہنچے اور جو باقی ہیں، اُن کا ارادہ بھی اللہ تعالیٰ پورا کرے۔ اس بات کا ہم کو کچھ گِلہ شکوہ نہیں۔ اللہ تعالیٰ ہمارے سیّد صاحبؒ کو سلامت رکھے! جو وُہ سالم رہیں گے، تو پھر جہاد کا سامان دُرست ہو جائے گا اور بہتیرے غازی آجائیں گے۔

یہ منظور نہیں | میاں مُحمّد، خدابخش صاحب کو اپنے حُجرے میں لے گئے۔ وہاں دو غازی اور تھے، ایک قصبہ کاکوری کے سیّد حیدر علی، جو زخمی تھے، اور ایک غازی، جو لشکر میں شاہ جی کہلاتے تھے۔ میاں مُحمّد نے تینوں آدمیوں کو کھانا کھلایا۔ جب نمازِ عشاء سے فارغ ہُوئے، تب اُنھوں نے کہا کہ سیّد حیدر علی تو زخمی ہیں؛ جب تک یہ اچھے ہوں، تب تک ہم اُن کو یہیں رکھیں گے، اس لیے کہ یہ کسی صُورت سے چل نہیں سکتے۔ تم دونوں صاحب کہو کہ تمھارا کیا ارادہ ہے۔

ہم دونوں نے کہا کہ ہماری خاص نیّت تو یہ ہے کہ جس طرح ہو سکے، پنجتار میں حضرت امیرالمومنین کے پاس پہنچا دیں۔ میاں محمّد کے دو بیٹے جوان اور بڑے وجیہ تھے۔ اُنھوں نے اُن سے کہا کہ بیٹا، ان دونوں غازیوں کو سیّد بادشاہ کے پاس پنجتار میں پہنچاؤ۔ انھوں نے کہا کہ ہم یہ پہلے معلوم کر لیں کہ راستہ محفوظ بھی ہے یا نہیں۔ ان میں کا ایک باہر نکلا اور کئی گھنٹے کے بعد آ کر اپنے باپ سے کہنے لگا کہ میں معتبر لوگوں سے معلوم کر کے آیا ہوں کہ یہاں سے پنجتار تک جا بجا غدر ہو رہا ہے، ان کے پہنچنے کی کوئی صورت نہیں ہے، باقی، آپ جو کچھ فرمائیں، ہم فرماں بردار ہیں۔ میاں محمّد نے اُن سے کہا کہ خدا پر توکّل کر کے آج اَور آپ یہاں رہ جائیے، اِنشاءاللہ کل اس کی کوئی صورت نکالیں گے۔

پھر وُہ رات اور ایک دن ہم اَور رہے۔ دُوسری رات کو پھر اُنھوں نے بیٹوں سے کہا۔ اُن میں سے ایک باہر گیا اور کچھ دیر کے بعد آ کر کہنے لگا کہ پنجتار کی طرف تو جانا دشوار ہے، مگر ہاں، اگر یہ راضی ہوں، تو دریاے اٹک پار اُتار کر سکھّوں کی عملداری میں ان کو پہنچا دیں۔ وہاں ان سے کوئی مزاحم نہ ہوگا۔

غازیوں نے کہا کہ وہاں جانا تو کسی طرح ہم کو منظور نہیں، حضرت کے سِوا اَور کہیں نہ جائیں گے، اور اگر پنجتار کا راستہ غیر مامون ہے، تو ہم کو موضع کوٹھہ میں سیّد میر آخوند زادہ کے پاس پہنچا دو۔ جب تک غدر ہے، ہم وہیں رہیں گے۔ انھوں نے اس کو قبول کیا اور اُن کو کوٹھہ پہنچا دیا، جہاں وہ چند دن ٹھیر کر پنجتار میں سیّد صاحبؒ کے پاس پہنچ گئے۔

وفادار رفیق | مولوی سیّد جعفر علی لکھتے ہیں کہ حبیب خاں بُنیر والے، جو مینئی کے بلوے میں غازیوں کے ہمراہ تھے اور اُن کی عُمر تقریبًا ساٹھ سال تھی، اُن کو بلوائیوں نے آواز دی کہ تم ہمارے پاس آؤ، تم ولایتی ہو، ہم تم کو قتل نہیں کریں گے۔ اُنھوں نے جواب دیا کہ ہم کو تمھارے ہاتھوں زندہ رہنا منظور نہیں اور غازیوں کے ساتھ شہید ہو جانا منظور ہے۔ اُنھوں نے اپنے ساتھیوں کی رفاقت نہ چھوڑی۔ جب ساتھی تلواریں کھینچ کر مقابلے کے لیے مسجد سے باہر آئے، تو حبیب خاں بھی ساتھ تھے۔ بلوائیوں میں سے ایک نے اُن کے سر پر تلوار ماری، سر میں زخم آیا۔ ایک سُنار نے بیچ میں آ کر اُن کی جان بچائی۔ وُہ

بالاکوٹ کے معرکے تک زندہ رہے۔[1]

حاجی محمود خاں رامپوری اور اُن کے ساتھیوں کی شہادت

حاجی محمود خاں رامپوری بیس آدمیوں کے ساتھ تحصیل عُشر کے واسطے موضع سُدم میں متعین تھے جب اُنھوں نے سمہ کی بستیوں کی خبر سُنی، تو اپنے سب لوگوں کو ہتھیار بندھوا کر اور ساتھ لے کر بستی سے باہر نکل پڑے اور بستی کے کنارے نالے پر جاکر ٹھیرے، اس خیال سے کہ دن کو کوئی ہمارے نزدیک نہ آسکے گا، اور اگر آئیگا، تو ہم مقابلہ کریں گے اور جب رات ہوگی، تو پہاڑ کے راستے سے پنجتار چلے جائیں گے۔ جب وہاں کا خان مبین خاں موضع اسمٰعیلہ سے حاجی بہادر خاں صاحب کا کام تمام کر کے آیا اور اُس کو معلوم ہوا کہ حاجی محمود خاں اپنے لوگوں کو لے کر صحیح وسلامت نکل گئے اور نالے پر ٹھیرے ہیں، تو وہ حاجی محمود خاں کے پاس گیا اور تسلی اور دلاسے کی باتیں کرنے لگا کہ تم مجھ کو اپنا خیر خواہ دوست جانتے ہو یا بدخواہ دشمن؟ وُہ سیدھے سادھے مسلمان، کہنے لگے کہ مَیں تم کو اپنا خیر خواہ دوست جانتا ہوں۔ اُس نے کہا کہ بات یہ ہے کہ مَیں آج بستی میں نہ تھا، ورنہ یہ شر و فساد ہرگز نہ ہونے دیتا۔ اب مَیں آیا ہوں سب کو تم لوگوں کے پاس سے دفع کیے دیتا ہوں۔ تم خاطر جمع رکھو اور یہیں نالے پر ٹھیرے رہو۔ آج رات کو صحیح وسالم تم سب کو پنجتار پہنچا دُوں گا۔

کچھ دیر کے بعد پھر ان کے پاس آیا اور کہنے لگا کہ اب تھوڑا دن رہا ہے، تم چلنے کو تیار رہو، مگر میں اپنی بدنامی سے ڈرتا ہوں، تم کو ہتھیار باندھے ہُوے نہیں لے جاسکتا۔ تم سب اپنے ہتھیار میرے گھر میں امانت رکھ دو، مَیں تیسرے روز پنجتار تمھارے پاس پہنچا دُوں گا۔ تقدیر کا لکھا ٹلتا نہیں۔ ان سب نے اپنے ہتھیار کھول کر اس کے حوالے کیے۔ وُہ لے کر اپنے گھر گیا۔ جب یہ سب خالی ہاتھ رہ گئے، تو بلوائیوں نے آکر گھیر لیا اور ایک ایک کو پچھاڑ کر بھیڑ بکریوں کی طرح ذبح کر دیا۔ ان لوگوں میں اکثر حاجی صاحب کے ہم قوموں میں تھے۔ عظیم اللہ خاں نام حاجی صاحب موصُوف کے چھوٹے بھائی نے وہیں ایک پٹھان کے یہاں نکاح کیا تھا۔ اُن کو اُنھیں کے خُسر نے چھاتی پر چڑھ کر ذبح کیا۔ اس واقعہ میں پندرہ آدمی شہید ہُوے۔ دو آدمی بھاگ کر ایک بُڑھیا کے گھر میں جا چھپے۔ اس نیک بخت نے رحم

[1] منظورہ ص ۱۰۰۰، ۱۰۰۱

کھا کر اپنے گھر میں بھُس کے اندر چھُپا رکھا۔ اُوپر ایک گُدڑی ڈال دی۔ رات کو سلامت نکال دیا۔ اور وُہ راتوں رات بھاگ کر پنجتار آ گئے۔ ان سے اس واقعہ کی تفصیل معلوم ہُوئی۔

بعض مُلّاؤں کی ہمدردی | بعض زخمیوں کو اور بعض ایسے مُجاہدین کو، جو قاتلوں کے نرغے میں تھے، مُلّاؤں نے بچایا۔ گُلاب خاں کہتے ہیں: "مَیں نیم جان شہیدوں کے گروہ میں زخمی پڑا ہُوا تھا۔ ظالم جب غازیوں کے ہتھیار لے کر اور مجھے مُردہ سمجھ کر گھر چلے گئے، تو ایک مُلّا نے مجھے زخمی دیکھ کر میرے حال پر رحم کھایا اور مجھے اپنے گھر لے جا کر ایک دن اور ایک رات رکھا۔

لکھمیر خاں کا واقعہ | لکھمیر خاں اپنا قصّہ بیان کرتے ہیں کہ ہم پانچ سوار موضع ٹُلانڈئی میں تھے۔ مُجھے رات کو غُسل کی حاجت ہُوئی۔ مَیں تلوار لیے ہُوئے ایک ندّی پر گیا، جسے باغی محاصرہ کیے ہُوئے تھے۔ اُن میں سے ایک نے کہا: "کہاں جاتے ہو؟" مَیں نے کہا: "غُسل کو جاتا ہوں۔" اُس کے ساتھی نے کہا: "جانے دو۔" طہارت کے بعد مَیں نماز میں دُوسری رکعت میں کھڑا ہُوا تھا کہ دو آدمی پہنچے۔ ایک نے تلوار اُٹھائی، دُوسرے نے کپڑے لیے اور عین نماز کی حالت میں میرا ہاتھ پکڑ لیا۔ ایک نے ایک ہاتھ پکڑا، دُوسرے نے دُوسرا اور دیہات کی طرف لے چلے۔ ایک نے کہا کہ کام تمام کرو، دُوسرے نے کہا کہ جہاں اس کے ساتھی مارے گئے ہیں، وہیں ماریں گے۔ مجھے اپنی ہلاکت کا یقین ہُوا۔ بچنے کی اُمید نہ تھی۔ اپنے دونوں ہاتھوں سے زور کیا اور ہاتھ چھڑا لیے اور بھاگا۔ وُہ کچھ دُور میرے پیچھے دَوڑے۔ پھر واپس گئے اور سواروں کو جا کر خبر کی۔ ایک سوار نے اپنا گھوڑا میرے پیچھے دَوڑایا۔ ندی کے پاس پہنچ کر گھوڑا کسی چیز کو دیکھ کر بدکا، سوار گِرا اور گھوڑا بھاگا، سوار تو اپنے گھوڑے کے پیچھے دَوڑا اور مَیں بھاگ کر پنجتار آ گیا۔

ایک لڑکے کی ہمّت | حافظ الٰہی بخش نابالغ تھے۔ اُن کے ماموں کو ملوائیوں نے شہید کر دیا۔ ایک ظالم نے اُن کے سر پر تلوار رکھی، دوسرا ساتھی اُن کے اوپر گر پڑا اور کہا کہ اس جوان کو چھوڑ دو، یہ حافظِ قرآن ہے۔ مَیں اس کو غلام بنا لُوں گا۔ چنانچہ زخم کے باوجُود وُہ زندہ رہے۔ جب سیّد صاحبؒ سے یہ واقعہ بیان کیا گیا، تو فرمایا کہ وُہ خدا کا غلام ہے، کِس کی مجال ہے کہ اس کو اپنا غلام بنائے؟ بہرحال

وُہ شخص حافظ الٰہی بخش کو اپنے گھر لے گیا اور ایک جرّاح کو اُن کی مرہم پٹی کے لیے مقرر کیا اور حافظ جی سے کہا کہ میرے بچّوں کو قرآن پڑھایا کرو۔ حافظ اتنا فرزانہ تھا کہ اس کے باوجود کہ بچّوں کے ساتھ کھیلتے کھیلتے اس کو پشتو بخوبی آگئی تھی، مگر وُہ انجان بنا رہا اور اُن کی باتیں غور سے سُنتا رہا۔ وہ سمجھتے تھے کہ یہ لڑکا پشتو سے ناواقف ہے۔ ایک روز جرّاح کچھ لوگوں سے کہنے لگا کہ مَیں اس بچّہ کے ایسی دوا لگاتا ہوں کہ زخم مندمل ہونے کے بجائے ہرا رہے، مگر زخم ہے کہ خشک ہوتا جا رہا ہے۔ اب میرا ارادہ ہے کہ ایک زہر آلود بتّی اس میں رکھ دوں تاکہ یہ مرجائے۔ حافظ نے اپنے ایک عزیز شاگرد، سے، جو طاقتور جوان تھا، ایک روز یہ قصّہ سُنایا اور کہا کہ میری خواہش ہے کہ آپ مجھ کو امیرالمومنین کے پاس پہنچا دیں۔ مَیں پانچ روپیہ آپ کو نذر کروں گا۔ اس نے پہنچا دیا۔ سیّد صاحبؒ نے فوراً پانچ روپے عنایت فرمائے اور اس بچے کو اُس کے استاد حافظ صابر کے سپرد کیا، اور نُور بخش جرّاح کو علاج کے لیے مقرر کیا۔ نُور بخش نے زخم دیکھ کر کہا کہ واقعی اس بدنیّت جرّاح نے اس کو ہلاک کرنے کی تدبیر کی تھی، اس کے سر کی ہڈّی خراب ہوگئی ہے، اس کو نکالنے کی ضرورت ہے۔ چنانچہ ہڈّی نکالی گئی۔ لڑکے نے حرکت تک نہ کی، نہ زبان سے اُف کہا۔ جرّاحی کے بعد کسی نے ارادہ کیا کہ لڑکے کو گود میں لے کر پہنچا دے۔ کہنے لگا کہ زخم میرے سر میں ہے، میرے پاؤں میں تو نہیں! چنانچہ خود اپنے پاؤں چل کر لشکر میں گئے۔ پھر سارے لشکر میں گشت کرکے غازیوں سے مُلاقات کی۔[1]

---

[1] منظورۃ السعداء، ص ۱۰۰۵، ۱۰۰۶

پینتیسواں باب

محفوظ مجاہدین

مولوی خیرالدین صاحب کا حزم و تدبر مولوی خیرالدین صاحب لُوند خوڑ میں تھے، جہاں کے مُلک اُن کو اپنے علاقے میں عُشر و زکوٰۃ و جزیہ کے اجراء کے لیے سید صاحبؒ سے طلب کر کے لائے تھے انھوں نے سمہ کے مواضعات میں مجاہدین کے قتل عام کی خبر سنی اور معلوم ہُوا کہ پورے مُلک میں غدر مچا ہُوا ہے۔ اس اثنا میں سید صاحبؒ کی طلبی کی اطلاع ملی۔ آپ نے اس اطلاع کو عام نہ کیا۔ اگلے روز قاصد کے ہاتھ سید صاحبؒ کا پروانہ پہنچا کہ تم سے یہاں کچھ ضروری کام ہے، وہاں کے قاضی کو اپنی جگہ قائم کر کے ایک مُلک کو اپنے ہمراہ لے کر اپنی جمعیت سمیت جلد ہمارے پاس چلے آؤ۔ اس خط کا مضمون بھی مولوی صاحب نے سوائے اپنے غازیوں کے کسی پر ظاہر نہ کیا کہ جب تک چلنے کی تیاری کسی طرف قرار نہ پائے، اس حال کا اظہار مناسب نہیں۔

اسی دن ایک غریب صورت، آخوند گھبرایا ہُوا آیا اور پوچھنے لگا: "مولوی خیرالدین صاحب کہاں ہیں؟ اُن سے کچھ بات کہنی ہے۔" لوگوں نے مولوی صاحب کی طرف اشارہ کیا۔ اُس نے اُن کو الگ لے جا کر کہا: تم کو کچھ سمہ کا حال معلوم ہے؟ انھوں نے کہا کہ نہیں۔ اُس نے کہا کہ تمھارے غازی لوگ جہاں جہاں متعین تھے، سب قتل کر ڈالے گئے اور اکثروں کا نام لیا اور اُن کے قتل کی صورت بیان کی

اور کہا کہ تمہارا کا حال نہیں معلوم کہ سید بادشاہ پر کیا گزری، تم جلد اپنی جان بچانے کی کوشش کرو۔ میں سید بادشاہ کا غلام اور فرمانبردار ہوں۔ اس وقت صرف تم کو خبر دینے آیا ہوں، اور اب میں اپنے گھر جاتا ہوں کہ یہاں سے نزدیک ہے۔ یہ کہہ کر وہ اُسی وقت چلا گیا۔

یہ خبر سُن کر مولوی صاحب کے ساتھی گھبرائے۔ آپ نے سب کو تسلی دی اور کہا کہ گھبرانے سے کام بنتا نہیں، بگڑتا ہے۔ استقامت سے کام لو اور جنابِ الٰہی میں دُعا کرو کہ تمہارے نکلنے کی کوئی راہ پیدا کر دے اور جیسا میں تم سے کہوں، ویسا کرو۔ اللہ تعالیٰ اپنا فضل کرے گا۔

نماز کے بعد پھر آپ نے سب لوگوں کو جمع کیا اور کہا کہ بھائیو، ایک بات میں تمہاری خدمت میں عرض کرتا ہوں۔ اگر تم مجھ کو اپنا امیر جانتے ہو، تو بدل و جان اس کو مانو اور وقت پر کوئی عقل و تدبیر نہ بتلاؤ۔ ایسے وقت پر متفرق باتوں سے طبیعت پراگندہ ہو جاتی ہے اور بنی ہوئی تدبیر بگڑ جاتی ہے۔ مجھ کو امیر المومنین نے تم پر امیر کیا ہے۔ معاذ اللہ! اگر کوئی سوءِ تدبیر مجھ سے صادر ہو اور اس سے تم بھائیوں کو گزند پہنچے، تو بیشک میں خدا کے نزدیک پکڑا جاؤں گا۔ تم نے اپنے بھائیوں کی شہادت کا حال سُنا کہ کہیں غفلت میں نماز پڑھتے اور کہیں سوتے مارے گئے اور کہیں اپنی سوءِ تدبیر سے۔ مخالفین میں سے ایک بھی نہ مارا گیا اور نہ زخمی ہوا۔ اُن کی شہادت ہی مقدر تھی۔ اس وقت خدا کے فضل و کرم سے تم سب ہوشیار اور بیدار ہو اور اپنے سپہ گری کے ساز و سامان سے تیار ہو۔ تقدیرِ الٰہی کا معاملہ تو جُدا ہے، مگر بظاہر اسباب ایسا نہیں ہو سکتا کہ مخالفین اپنے کو صحیح و سلامت رکھ کر تم سب کو مار لیں۔ ان کو بھی اپنی جان پیاری ہے، بلکہ ہماری دہشت اُن پر غالب ہے۔ اگر ہم سو آدمی شہید ہوں گے، تو وہ انشاء اللہ سیکڑوں مارے جائیں گے اور اگر تقدیر میں ہم لوگوں کی شہادت ہی لکھی ہے، تو کچھ کوشش و تدبیر پیش رہ جائے گی، بلکہ جو تدبیر کریں گے، اُلٹی پڑے گی۔ سب نے کہا کہ ہم آپ کے فرمانبردار ہیں۔ جو فرمائیے گا، ہم وہی کریں گے۔

مولوی خیر الدین صاحب نے کہا کہ میں ایک جال پھیلاتا ہوں، اگرچہ اس وقت وہ کسی کے خیال میں نہ آئے گا۔ یہ خوب سمجھ لو کہ بستی کے لوگوں میں جب تک اُن کے ملک شریک نہ ہوں گے، تب تک

ہم پر کوئی ہاتھ نہیں اُٹھا سکتا۔ سو اب سب کمر باندھ ہتھیار لگا کر اپنی مسجد میں بیٹھے رہو اور اس وقت کسی کو اللہ تعالیٰ کے سوائے اپنا دوست نہ جاننا اور اُس کی باتوں میں نہ آنا اور جتنا تم سے کہوں، اُتنا کرنا۔ اب مَیں نماز پڑھ کر مُصلّے پر بیٹھتا ہُوں، تم چقماق والے چار آدمی میری پُشت پر کھڑے رہو، اور تم میں سے چار قرابین والے اس درخت کے نیچے، جو مسجد کے صحن میں ہے، کھڑے رہیں۔ جب دیکھیں کہ مَلِک گاؤں کے آدمیوں کو لے کر آئیں اور ہم پر حملہ کریں، تب اِن مَلکوں کے قتل کی طرف توجہ کریں اور ہماری شرکت کا لحاظ نہ کریں، اگرچہ ہم مارے جائیں۔ اگر مَلک ہمارے قابو میں آگئے، تو پھر مسجد سے باہر نہ نکلنے دینا۔ مزید چھ آدمی مسلح ہو کر بازار جائیں اور چھیوں بنیوں سے کہیں کہ کئی روز ہُوئے، تم نے نام لکھوائے ہیں، اب تک جزیے کا روپیہ تم نہیں لائے۔ اِسی وقت لے چلو۔

یہ سُن کر میر عبدالرحمٰن جہالوی بولے کہ مولوی صاحب، یہ کیا فرماتے ہو؟ یہ جزیے کے تحصیل وصُول کا وقت ہے؟ مولوی صاحب نے کہا کہ میں نے تو پہلے ہی کہ دیا تھا کہ کوئی مجھ کو تدبیر نہ بتائے۔ جو کہوں، کرے۔ تم اتنے جلد ہی اس بات کو بھُول گئے۔ یہ سُن کر وُہ خاموش ہو گئے۔

چھ آدمی مسلح ہو کر بازار گئے اور انھوں نے بنیوں سے تقاضا کیا۔ وُہ اپنے اپنے عِلاقے کے مَلک کے پاس دَوڑے گئے اور کہا کہ یہ سعی کا وقت ہے، آپ جزیے کے روپے میں کچھ تخفیف کرا دیجیے۔ چنانچہ آگے آگے بنیے، پیچھے پیچھے مَلک مسجد میں آکر جمع ہو گئے۔ مولوی صاحب نے عصر کے وقت سے جزیے کی تحصیل وصُول شروع کی، مغرب تک یہ سلسلہ جاری رہا۔ مغرب کے بعد وہ سب مَلکوں کو مسجد کے اندر لے گئے اور سید صاحبؒ کا خط پیش کیا۔ مَلکوں نے کہا کہ اب تو رات ہُوئی، کل دن کو ہم سب آپس میں صلاح کر کے ایک مَلک کو تمھارے ساتھ کر دیں گے۔ مولوی صاحب نے کہا: "یہ کام کل کی صلاح کا نہیں ہے۔ جو صلاح کرنی ہو، اس وقت کر لو۔ انھوں نے کہا کہ ہم جاتے ہیں اور جرگہ کر کے ایک مَلک کو تمھارے ساتھ کر دیتے ہیں۔ مولوی صاحب نے کہا کہ یہیں مسجد میں جرگہ کر لو۔ وُہ جرگہ کر کے صدرالدین مَلک کو مولوی صاحب کے پاس لائے اور اُس کا ہاتھ مولوی صاحب کے ہاتھ میں دے کر کہا کہ یہ تو آپ کے ساتھ جائے گا، اس کی شرم آپ کے ہاتھ ہے اور راستہ بھی ہم نے اس کو بتا دیا ہے۔ اب آپ کو اختیار

ہے، جب چاہیے، جائیے۔ مولوی صاحب نے صدرالدین کو اپنے پاس بٹھالیا اور باقی ملکوں سے کہا کہ اب تم اپنے گھر جاؤ اور روٹی کھاؤ۔ ملک صدرالدین نے کہا کہ اگر اجازت ہو، تو مَیں بھی اپنے گھر سے روٹی کھا آؤں۔ مولوی صاحب نے کہا کہ تم ہمارے ساتھ کھانا کھانا اور اُس کو جانے نہ دیا۔

ملک ظُہر سے مغرب تک مسجد میں رہے تھے۔ اُن کو سُمہ کی سازش کا کچھ حال معلوم نہ تھا جب وُہ اپنے اپنے گھر گئے، تو وُہ خبر انھوں نے بھی سُنی۔ وُہ ششدر رہ گئے اور انھوں نے آپس میں جرگہ کیا اور کہا کہ ہمارے ساتھ اس مولوی نے کوئی ایسا کام نہیں کیا، جو ہم اس کی جان کے خواہاں ہوں۔ کام تو وہی کیا، جو سُمہ میں اور ہندوستانیوں نے کیا۔ فرق اتنا ہے کہ اُنھوں نے خود کیا اور اس سبب سے لوگوں پر شاق گزرا اور وُہ اُن کے دشمن ہو گئے اور اس مولوی نے وہی کام ہماری رضامندی سے کیا اور ہمارے ہاتھوں سے کرایا۔ اور دُوسری بستیوں میں تو ہندوستانی لوگ سیّد بادشاہ کے فرمانے سے بیٹھے اور ہم اس کو اپنی خوشی سے اور سیّد بادشاہ سے درخواست کرکے لائے تھے۔ سو اس پر ہاتھ ڈالنا نہایت بے دینی اور بے انصافی ہے۔ لیکن اگر یوں ہی چھوڑ دیں، تو کل سُمہ والے ہمارے دشمن ہو جائیں گے۔ اب ایسا کرو کہ ان کے ہتھیار تو لے لو اور ان کو اپنی بستی سے سلامت نکال دو۔ ہتھیار لینے میں بھی اتنی مروّت کرو کہ اس حُجرے والے اُس حُجرے والے غازی کے ہتھیار لیں۔ اور اُس حُجرے والے اِس حُجرے والے غازیوں کے ہتھیار لیں۔ چنانچہ تھوڑے عرصے میں بستی والوں نے مسجد کو گھیر لیا۔ چالیس پچاس آدمی بندوقیں باندھے کچھ مسجد کی صحن کی دیوار پر بیٹھے تھے اور کچھ متفرق دائیں بائیں کھڑے تھے۔ مولوی خیرالدین صاحب نے باہر نکل کر پوچھا: تم یہاں کیوں جمع ہو؟ یہاں کون سا تماشا ہو رہا ہے جو تم دیکھتے ہو؟ انھوں نے کہا کہ ہم مال لُوٹنے کے واسطے جنگل کو جاتے ہیں، اس لیے جمع ہیں۔ مولوی خیرالدین صاحب نے کہا کہ کہیں جاؤ، مگر ہمارے پاس نہ آؤ، نہیں تو ہماری تمھاری لڑائی ہے۔ اُنھوں نے جانے میں تامّل کیا۔ مولوی خیرالدین صاحب نے اپنے آدمیوں سے پکار کر کہا کہ تم مسجد سے باہر نکل آؤ، ان کی نیّت میں کچھ فتور معلوم ہوتا ہے۔ اور ان طلوائیوں سے غُصّے ہو کر کہا کہ جیسے سُمہ کی بستیوں میں ہمارے بھائیوں کو غفلت میں شہید کیا، اگر ہم بھی غافل ہوتے، تو ویسے ہی مارے جاتے۔ اب تو ہم ہشیار اور اپنے ہتھیاروں سے تیار ہیں۔ اتنے

آدمی تب مریں گے، جب تمہاری صدہا عورتوں کو بیوہ اور تمہارے صدہا لڑکوں کو یتیم کر دیں گے تمہاری اس میں خیر ہے کہ جلد یہاں سے چلے جاؤ، نہیں تو اپنے غازیوں کو حکم دیتا ہوں کہ ایک طرف سے بستی کا قتل عام شروع کر دیں۔ اس وقت تم سے کچھ نہ ہو سکے گا۔ غازی لوگ تو مسجد میں مسلح بیٹھے تھے جونہی وہاں سے باہر نکلے، تمام بلوائی جنگل کی طرف بھاگ گئے۔

مولوی صاحب نے بستی سے نکل جانے کی تیاری کی۔ پنجتار کا راستہ بالکل غیر مامون تھا۔ آپ نے پڑاں غار[1] کا ارادہ کیا، جہاں کا ملک لعل محمد بڑا دیندار اور سید صاحبؒ کا مخلص تھا۔ تھوڑی دیر کے بعد سب ملک آئے اور خوشامد آمیز باتیں کہنے لگے کہ کچھ ہماری عرض ہے، مگر ہم کہہ نہیں سکتے ہیں۔ مولوی خیرالدین صاحب نے کہا کہ تم اپنے حصے کے روپوں کو کہتے ہو گے۔ مولوی صاحب نے پوچھا کتنے روپے تحصیل وصول ہوئے ہیں اور کس کے پاس ہیں اور تمہارے حصے کے کتنے روپے ہیں؟ انھوں نے کہا کہ سو روپے تحصیل ہوئے ہیں اور تمہارے حکم سے قاضی کے پاس امانت ہیں، تمہارے وعدے کے موافق ہمارے حصہ کے پچیس روپے ہوئے۔ مولوی صاحب نے قاضی صاحب سے کہا کہ پچیس روپے ان کے حوالے کرو اور باقی پچھتر روپے میں نے سب ملکوں کو انعام دیے۔ ان باتوں سے وہ بہت خوش ہوئے اور خوشامد سے کہنے لگے کہ اس وقت رات میں کہاں جاؤ گے، جب تک پنجتار کا راستہ صاف نہ ہو، تب تک تم یہاں سے کہیں نہ جاؤ۔ جس طرح ہم لوگ پہلے آپ کے فرمانبردار تھے، اسی طرح اب بھی ہیں، بلکہ اب اس سے زیادہ آپ کی فرمانبرداری اور خدمت گزاری نہ کریں تو ہم اشراف نہ ہوں گے۔ ہماری طرف سے کچھ شبہ اور وسوسہ آپ اپنے دل میں نہ لائیے۔ مولوی صاحب نے فرمایا کہ تم صاحبوں سے ایسی ہی امید ہے، مگر ہم کو حضرت امیرالمومنین کے پاس پہنچنا ضرور ہے۔

پنجتار کا سفر پڑاں غار جانے کا حال آخوند گل کے سوا کسی کو معلوم نہ تھا۔ آخوند گل پشاوری عالم، دیندار، پرہیزگار اور سید صاحبؒ کا مخلص تھا۔ لونڈ خوڑ سے کچھ کم ایک کوس پنجتار کی طرف چلے۔ وہاں

---

[1] اصل لفظ "پڑانگ غار" ہے۔ کثرت استعمال سے "پڑاں غار" کہتے ہیں۔ پڑانگ پشتو میں چیتے کو کہتے ہیں۔ کسی زمانے میں وہاں چیتے کا غار ہوگا، پھر بستی کا یہ نام ہوا۔

ایک گورستان تھا۔ اُس میں پہنچ کر آخوند گل نے ملک صدرالدین اور رہبر کا ہاتھ پکڑ کہا کہ یہاں سے پڑاں غار کا راستہ لو۔ صدرالدین نے کہا کہ بھائی ہندوستانیو، دانائی تم پر ختم ہے کہ لُوند خوڑ سے یہ ارادہ کسی پر ظاہر نہ کیا۔ میں بھی سوچ میں تھا کہ یہاں سے پنجتار تک کیونکر جانا ہوگا، مگر خوف سے کہ نہیں سکتا تھا۔ اب میری جان میں جان آئی، اب فضلِ الٰہی سے تم صحیح و سلامت بچ گئے۔ مولوی خیرالدین صاحب نے گورستان سے پڑاں غار کا راستہ لیا اور صدرالدین کو گورستان سے رُخصت کیا اور موضع جلالہ اور دُوسری بستیوں میں ہوتے ہوئے پڑاں غار پہنچ گئے۔ موضع جلالہ میں آپ نے ایک طالبِ علم کو سیّد صاحبؒ کے نام خط دینا چاہا۔ اُس نے خط لے جانے سے عُذر کیا۔ آپ نے اُس کی بغل سے کتاب لے کر اور کھول کر ایک جگہ یہ عبارت لکھ دی کہ خدا کے فضل و کرم سے ہم جلالہ تک آئے ہیں اور موضع پڑاں غار تک جاتے ہیں۔ آپ دُعا کریں کہ اللہ تعالیٰ آپ کے قدموں تک پہنچائے۔ ملک لعل محمد اُن کے آنے سے بہت خوش ہُوا اور اُن کو اپنی بستی میں ٹھیرایا کہ جب تک پنجتار کا راستہ صاف نہ ہو، یہیں قیام کریں۔

ایک مہینہ پڑاں غار میں قیام رہا۔ وہیں سیّد صاحبؒ کا مکتوب اس مضمون کا پہنچا کہ راستہ تجویز کر کے تمھارے لانے کے لیے تنگئی کے محمود خاں بارک زئی کو بھیجا ہے۔ جس راستے سے وُہ تم کو لائیں، بلا اِنکار اُن کے ساتھ آنا۔ دوپہر کو محمود خاں آگئے۔ راستے میں بارہ آدمیوں کو، جن کے پاؤں میں چھالے پڑ گئے تھے، چلنے سے معذور تھے اورنگ شاہ کی گڑھی[۱] میں چھوڑا۔ کچھ دیر گھڑیالہ میں ٹھیر کر جب موضع مہرعلی کے پاس نکلے، وہاں ایک آدمی ملا۔ اُس نے کہا کہ تمھاری تو شیوہ میں آج رات بھر بڑی نگہبانی رہی کہ لُوند خوڑ کا مولوی کہیں نکل نہ جائے۔ ابھی دو سوار یہاں سے گئے ہیں تم جلد نکل جاؤ، اگر تم راستے راستے آتے، تو کوئی نہ کوئی ضرور ملتا، مگر تم راستہ چھوڑ کر آئے اس لیے کوئی نہ ملا۔ راستے میں مولوی صاحب نے ایک آدمی سے جو شیوہ کی کسی بستی میں رہتا تھا، کہا کہ شیوہ والوں سے کہ دینا کہ لُوند خوڑ کا مولوی جس کی تم رات کو جُستجو کرتے تھے، وُہ آج سلامت نکل گیا۔ اب آدھ کوس پر ٹھیرا ہے۔ اگر تم کو کچھ

---

[۱] یہ بستی لُوند خوڑ سے دو کوس پر واقع تھی۔ معلوم ہُوا کہ اب وہاں کوئی گاؤں نہیں۔　　(سیّد احمد شہید صفحہ ۳۱)

ہمت اور جرأت ہو، تو جاؤ، نہیں تو پچھتاؤ گے۔ وہاں سے پہاڑ کے راستے راستے موضع مکدرہ میں آئے۔

مولوی خیرالدین صاحب کا استقبال اور حمد و دعا

مکدرے سے زیدے کے فتح خاں نے سید صاحبؒ کو مولوی خیرالدین صاحب کی آمد کی اطلاع دی۔ مولوی خیرالدین صاحب کا بھی خط تھا۔ سید صاحبؒ بہت خوش ہوئے اور سر برہنہ ہو کر دعا کی اور یہ پیغام بھیجا کہ کل سویرے ہم آپ کے استقبال کو آئیں گے۔ آپ نے توپ خانے کے داروغے مولوی احمد اللہ صاحب سے فرمایا کہ جب ہم مولوی خیرالدین صاحب کو لے کر آئیں، تو تم خوشی کی گیارہ توپیں سر کرنا۔

اگلے روز آپ نماز فجر کے بعد تین سو آدمیوں کے ساتھ روانہ ہوئے۔ جب مولوی خیرالدین صاحب آتے ہوئے نظر آئے اور آپ کے اور اُن کے درمیان تھوڑا سا فاصلہ رہا، آپ پیادہ پا تشریف لے چلے اور مولوی خیرالدین صاحب اور سب غازیوں سے بڑی محبت اور تپاک سے ملے، ہر ایک کو سینے سے لگایا اور عافیت مزاج پوچھی اور پنجتار کی طرف لے کر چلے۔ لوگوں کو اشارہ کیا کہ خوشی کی بندوقیں داغتے چلو۔ جب پنجتار کے نالے پر سواری آئی، تو پنجتار میں توپوں کے گیارہ فیر سر ہوئے اور بندوقوں کی باڑھیں چلنے لگیں۔ وہاں سے سب کو ہمراہ لیے ہوئے بستی میں داخل ہوئے۔ پہلے مسجد میں تشریف لائے اور نفل شکرانہ کی دو رکعت پڑھ کر دعا میں مشغول ہو گئے اور دیر تک دعا کی کہ "خداوندا، تو نے ان بھائیوں کو موذیوں کے چنگل سے چھڑا کر ہم تک سلامت پہنچایا۔ ہمارے نزدیک یہ لوگ گویا از سرِ نو پیدا ہوئے۔ دعا کے بعد سب کو اجازت دی کہ سب بھائی اپنے اپنے بھیلے میں جا کر اُتریں۔ اس کے بعد آپ اپنے ڈیرے پر تشریف لائے اور بھیلے میں حکم بھجوا دیا کہ جو بھائی جس بھیلے کے ہیں، ان کی تین تین وقت ضیافت کریں اور شیخ ولی محمد صاحب سے فرمایا کہ اِن بھائیوں کے کپڑے پھٹ گئے ہیں اور جوتے ٹوٹ گئے ہیں۔ جلد نئے بنوا کر اُن کو پہنا دو اور جس چیز کی حاجت ہو، اس کی درستگی کرا دو۔

چھتر بائی اور امب کے مجاہدین

سمہ کے علاقے سے باہر جو مجاہدین چھتر بائی اور امب کی گڑھی میں متعین تھے، وہ اس غدر اور کشت و خون سے محفوظ رہے۔ ان میں سے حافظ مصطفےٰ جھنجھانوی تیس غازیوں کے ساتھ اور شیخ بلند بخت دیوبندی ساٹھ ستر آدمیوں کے ساتھ تھے۔ یہ لوگ سید صاحبؒ کی طلبی تک وہیں

رہے اور سفرِ ہجرت ثانیہ میں برڈھیری کے مقام پر آپ سے آکر مل گئے۔

اسب کی گڑھی کا تخلیہ | پائندہ خاں کو سمہ کے غدر کا حال معلوم ہوا۔ وہ تنولیوں کو جا بجا سے جمع کر کے چھتربائی اور اسب پر آیا اور یہ پیغام بھیجا کہ ہمارے دونوں مکان خالی کر دو اور تم سب اپنے سید بادشاہ کے پاس پنجتار چلے جاؤ۔ حافظ مصطفیٰ، شیخ بلند بخت اور سید عمر نے جواب دیا کہ امیر المومنین کے حکم کے بغیر ہم اپنی جگہ سے کوئی جنبش نہیں کریں گے۔ اس پر پائندہ خاں نے لڑائی شروع کر دی۔ ان تینوں صاحبوں نے سید صاحبؒ کو اطلاع کی۔ آپ نے اُن کو لکھا کہ تم سب وہیں اپنی اپنی جگہ قیام رکھو، اللہ تعالیٰ تمہارا مددگار ہے۔ چند روز میں ہم ہجرت کر کے اسی طرف کو آئیں گے۔ اگر کسی اور طرف کو جائیں گے، تو ہم سب کو بلالیں گے۔

پائندہ خاں نے جب اسب کی گڑھی پر حملہ کیا، تو شیخ بلند بخت نے اُس گڑھی کی مورچہ بندی کی اور توپیں نصب کر دیں اور کئی بار حملہ آوروں کو پسپا کیا۔ اسی طرح ان کے متواتر حملے ہوتے رہے اور مجاہدین اپنی جوانمردی سے اُن کو پسپا کرتے رہے۔ آخر شیخ بلند بخت نے ایک لڑکے کے ذریعے پنجتار سید صاحبؒ کو اطلاع کی۔ سید صاحبؒ نے اس کے جواب میں سمہ کے غدر کی اطلاع دی اور تحریر فرمایا کہ "میں نے تمہارے متعلق سید اکبر صاحب کو لکھا ہے، تم اُن کی ہدایت کے مطابق عمل کرو۔ چند روز کے بعد سید اکبر صاحب شیخ بلند بخت کے پاس گڑھی میں آئے اور مجاہدین کا اسباب گڑھی سے نکلوا کر عشرے میں بھجوا دیا اور سب لوگوں کو ساتھ لے کر عشرے میں آگئے۔ ۲۰ دن تک مجاہدین اور پائندہ خاں کے لشکر کے درمیان جنگ رہی۔ عشرے سے دریائے سندھ کے ذریعے توپیں اور گولہ و بارود اور غلہ لدوا کر ستھانہ روانہ کیا۔

ہری سنگھ کا پیغام اور مجاہدین کا جواب | دریائے اٹک کے کنارے کنارے کوس کوس کے فاصلے سے سکھوں کی کئی گڑھیاں تھیں۔ اُن کی ایک گڑھی اسب کی گڑھی کے بالکل مقابل تھی۔ پائندہ خاں اور مجاہدین کی جنگ کے دوران میں ایک روز اس گڑھی کے سکھوں نے دریا کے کنارے سے غازیوں کو پکارا کہ تمہاری گڑھی میں جو کوئی معتبر آدمی ہو، وہ دریا کے کنارے آئے، ہم اس سے بات کہیں گے۔ شیخ بلند بخت

نے تین آدمیوں کو تجویز کیا کہ دریا پر پہنچیں اور اس کا پیغام سنیں۔

جب وُہ تینوں دریا کے کنارے پہنچے، تو دریا کے پار سے ایک سکھ نے پکار کر کہا کہ غازیو! سپاہی کی قدر سپاہی خوب جانتا ہے، مَیں تنولیوں کے ساتھ تمھاری لڑائی دیکھ کر بہت خُوش ہُوا کہ تم خلیفہ کے لوگ بڑے بہادر اور سپاہی ہو۔ مجھ کو تمھاری خیر خواہی منظور ہے۔ مَیں اپنا ایک آدمی خط دے کر تمھارے پاس بھیجتا ہوں اور کچھ زبانی پیغام بھی اس سے کہہ دُوں گا۔ تم دونوں کا جواب سمجھ بوجھ کر میرے آدمی کے زبانی کہلا بھیجنا۔

پھران کا ایک آدمی اس پار آیا اور ان تینوں آدمیوں سے کہا کہ مجھ کو اپنے سردار کے پاس لے چلو، تو مَیں خط بھی اُن کو دُوں اور زبانی پیغام بھی کہوں۔ لوگ اس آدمی کو شیخ بلند بخت کے پاس لے گئے۔ اس نے وہ خط دیا۔ وہ کھولا گیا۔ اس کا خط ہندی[1] میں تھا اور اُس پر ہری سنگھ کے نام کی مُہر تھی۔ وہاں اُس وقت کوئی ہندی پڑھنے والا نہ تھا کہ اس خط کا حال معلوم ہوتا۔ اس آدمی نے زبانی بیان کیا کہ اس کا یہ مضمون ہے کہ ہمارے خالصہ یعنی سردار ہری سنگھ نے لکھا ہے کہ تم خلیفہ صاحب کے غازی لوگ بڑے بہادر، امانت دار اور نمک حلال ہو۔ پائندہ خاں کے لشکر نے تم کو گھیر رکھا ہے۔ تم کو مناسب یہ ہے کہ گڑھی اور گڑھی میں جو کچھ ہتھیار وغیرہ پائندہ خاں کے ہوں، وُہ پائندہ خاں کے لشکر کے سپرد کر دو اور تم سب ہمارے پاس چلے آؤ۔ ہم تم سب کو نوکر رکھ لیں گے اور خلیفہ صاحب سے زیادہ تمھاری عزت کریں گے۔

شیخ بلند بخت نے اس کو جواب دیا کہ تم جا کر ہماری طرف سے اپنے خالصہ سے کہو کہ وُہ کہتے ہیں کہ ہم لوگ حضرت امیر المومنین حضرت سید صاحبؒ کے فرمانبردار ہیں اور اُن کے حکم کے بغیر اپنی طرف سے کوئی کام نہیں کر سکتے۔ ہم اپنے وطن سے صرف خدا کی راہ میں کافروں سے جہاد کرنے کو آئے ہیں۔ ہم لوگ مُلک کے طالب نہیں ہیں اور نہ کسی کی نوکری چاکری کرتے ہیں۔ ہمارا جینا مرنا سید صاحبؒ کے ساتھ ہے، اور ہم خدا کے سوا کسی سے نہیں ڈرتے۔ پائندہ خاں کا لشکر کیا حقیقت رکھتا ہے؟ اگر تمھارا راجہ

---

[1] غالباً گرمکھی کہ وُہ بھی ہندی کی ایک شاخ ہے۔

رنجیت سنگھ اپنا لشکر لے کر آئے، تو ہم اُس کو بھی کچھ نہیں سمجھتے۔ اس لیے کہ خوف تو موت کا ہوتا ہے اور ہم لوگ خدا کی راہ میں اپنی جانیں نثار کرنے آئے ہیں۔ پھر ہم کو کس بات کا غم؟ اور خبردار، پھر کسی کی زبانی ایسا بیہودہ پیغام ہم کو نہ بھیجنا۔ یہ سُن کر وہ آدمی جہاں سے آیا تھا، واپس چلا گیا۔

چھتر بائی کا تخلیہ | چھتر بائی کے مجاہدین نے بھی چالیس روز تک پائندہ خاں کے لشکر کا مقابلہ کیا۔ پائندہ خاں نے مجاہدین کے امیر حافظ مصطفےٰ کاندھلوی سے کہلا بھیجا کہ یا تو تم لوگ پنجتار چلے جاؤ یا ہماری نوکری کر لو۔ ہم اچھی طرح تمھاری خدمت اور قدر دانی کریں گے۔ اگر یہ بھی منظور نہ ہو اور ہندوستان جانے کا ارادہ ہو، تو ہم تم کو صحیح و سالم سندھ کے پار اُتار دیں۔ اپنے وطن چلے جاؤ، مگر بہرصورت گڑھی خالی کر دو۔

حافظ صاحب نے کہا کہ اپنے خان سے ہماری طرف سے جا کر کہو کہ وُہ کہتے ہیں کہ ہم حضرت امیرالمومنین کے فرماں بردار ہیں۔ اُن کے حکم کے بغیر ہم ہرگز گڑھی خالی نہیں کریں گے۔ ہم لوگ خدا کی راہ میں جہاد کرنے آئے ہیں۔ کسی کی نوکری چاکری کرنے نہیں آئے، نوکری چاکری وُہ کرے، جو مال و دولت کا طالب ہو۔ ہم کو اس کی پروا نہیں۔

متواتر چالیس دن تک جنگ کا سلسلہ جاری اور گولیاں چلتی رہیں۔ ایک روز رات گئے کسی آدمی نے تین بار بآوازِ بلند پکار کر کہا کہ حضرت امیرالمومنین کے حکم سے سید اکبر صاحب امب کی گڑھی کے غازیوں کو عشرے میں لے گئے ہیں، اُن کے آدمی تم کو بھی لینے آئیں گے۔ تم اُن کے ساتھ بلا انکار چلے جانا۔ ایک روز سید اکبر صاحب کے آدمی آئے اور اُن کے ساتھ مجاہدین گڑھی سے باہر نکلے اور سب ہندوستانی کھبل بائی کے کنارے ہو کر امب گئے اور وہاں سے عشرے کو آئے اور بڑا دشوار گزار سفر طے کر کے بھس ڈھیری میں سید صاحبؒ کے ساتھ شامل ہو گئے۔

○

چھتیسواں باب

غدر کے اسباب کی تحقیق
اور
ہجرت کا عزم

پنجتار پر بلوائیوں کا نرغہ جب جا بجا سے غازیوں کی شہادت کی خبریں آ رہی تھیں، اس سے کچھ دن بعد ایک روز سردار فتح خاں کی قوم غدو خیل اور زیدوں کے غول اپنے اپنے نشان لے کر آئے اور سردار موصوف کے حجرے میں اُترے۔ کچھ دیر کے بعد ایک دوسرا غول آیا اور فتح خاں کے حجرے میں اُترا۔ لوگوں نے پوچھا کہ تم اس طرح مسلح ہو کر کیوں آئے ہو۔ انھوں نے کہا کہ ہم سید بادشاہ کی مدد کو آئے ہیں اور جن لوگوں نے سمہ کی بستیوں میں غازیوں کو قتل کیا ہے، اُن سے بدلہ لیں گے اور ابھی ہمارے اور بھی بہت سے لوگ آئیں گے۔

پھر اس کے بعد چار چار گھنٹے کے فاصلے سے اور کئی غول اپنے اپنے نشان لیے ہوئے آئے اور اسی حجرے میں اُترے۔ رات کو بھی ایک غول بستی کے باہر جنوبی جانب گورستان میں اُترا۔ سب لوگوں کا گمان قوی تھا کہ یہ تمام فساد فتح خاں کا برپا کیا ہوا ہے۔ آخر معمور خاں لکھنوی، ابراہیم خاں خیر آبادی اور امیر خاں قصوری، جو پہرے پر مقرر تھے، سید صاحبؒ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور ان لوگوں کی آمد کی اطلاع کی اور فتح خاں اور ان پر اپنا شبہہ ظاہر کیا۔ آپ نے مولانا محمد اسمٰعیل صاحب، ارباب بہرام خاں، مولوی احمد اللہ صاحب ناگپوری، منشی خواجہ محمد (حسین پوری)، شیخ ولی محمد پھلتی وغیرہم کو بلایا

اور ان میں فتح خاں کا ایک علاتی بھائی احمد خاں بھی تھا۔ پھر آپ نے سب سے کہا کہ بعض بعض لوگوں سے سُنا ہے کہ یہ لوگ فساد کے ارادے سے آئے ہیں۔ ہم کو تو اس بات کا اُن سے گمان نہیں ہے۔ کہو، تمھارے نزدیک کیا ہے؟

یہ بات سُن کر ارباب بہرام خاں اور احمد خاں نے عرض کی کہ جو کچھ آپ نے سُنا ہے، یہ بات، سچ ہے۔ یہ تمام فساد فتح خاں کا ہے۔ اُس مُفسد نے ان سب کو بُلا کر جمع کیا ہے۔ کچھ عجب نہیں کہ یہ منافق آپ کے ساتھ کچھ فریب کرے، کیونکہ ہم کو معتبر لوگوں سے معلوم ہُوا ہے کہ سُمہ سے پشاور تک اسی مفسد کی مشورت سے اپنے استنے غازی مارے گئے ہیں، بلکہ احمد خاں نے یہ بھی عرض کی کہ اگر آپ کی اجازت ہو، تو مَیں اس مُوذی کو مار ڈالوں، سب فساد دفع ہو جائے گا۔ اپنے بعض بعض ہندوستانیوں نے کہا کہ اگر آپ فرمائیں، تو ہم فتح خاں کو زندہ گرفتار کریں اور آپ پنجتار پر قبضہ کریں۔ ارباب بہرام خاں اور مولوی احمد اللہ صاحب نے عرض کی کہ آپ صرف پانسو غازی اور دو ضرب توپ ہمارے ہمراہ کر دیں تمام مُلکِ سمہ کو مُفسدوں سے خالی کرنے کا ہمارا ذمہ ہے۔ جہاں ایک دو بستیوں کو توپوں سے اُڑا دیا، سارا مُلک تھرّا جائے گا اور کوئی مقابلے پر نہ آئے گا، سب فرماں بردار ہو جائیں گے۔ اسی طور اور لوگوں نے بھی گزارش کی۔

سیّد صاحبؒ کا ارشاد جب سب اپنی اپنی تقریر کر چکے، تب سیّد صاحبؒ نے فرمایا کہ جو کچھ تم صاحبوں نے کہا، یہ ایک بھی ہم کو منظور نہیں، نہ فتح خاں کے حق میں، اور نہ سُمہ والوں کے حق میں۔ فتح خاں ہمارا مُحسن ہے، اُس نے ہم پر بڑے بڑے احسان کیے ہیں۔ اوّل تو اُس نے اپنے یہاں ہم کو جگہ دی، دُوسرے آج تک ہر کہیں ہماری شرکت کی، اس کی طرف سے کسی امر میں بدگمانی کرنی نہیں چاہیے اور جو کچھ یہ معاملہ پیش آیا، مشیّتِ الٰہی یوں ہی تھی، یقینی بات جانے بغیر کسی پر قیاس سے گمان کرنا اور اس کا الزام دھرنا نہیں چاہیے۔ یہ معاملہ اللہ تعالےٰ پر چھوڑ دینا چاہیے۔ جنھوں نے یہ فساد کیا ہے، اللہ تعالیٰ ان سے آپ سمجھ لے گا۔ ہم تو اپنے پروردگار کی رضامندی کا کام کرنے آئے ہیں، تپندداری اور نفسانیت کے واسطے نہیں آئے ہیں اور جو تم صاحبوں کو ان لوگوں کی طرف سے وسوسہ ہے، سو

فتح خاں کو بُلا کر اس کا حال بھی دریافت کر لیں گے تم کسی نوع کا اندیشہ نہ کرو۔ اللہ تعالیٰ سب طرح سے خیر کرے گا۔

فتح خاں سے گفتگو پھر اُسی وقت آپ نے سردار فتح خاں کو بُلوایا اور اپنے پاس بٹھایا اور پوچھا کہ خان بھلائی، اِن ملکیوں نے آکر ہجوم کیا ہے۔ ان کو کس نے بُلایا ہے؟ خان موصوف نے کہا کہ ان کو آپ کی مدد کے واسطے میں نے بلایا ہے۔ آپ نے فرمایا کہ ابھی ہم کو کچھ مدد کی ضرورت نہیں ہے، ان کو رخصت کر دو۔ اپنے اپنے مکان کو جائیں۔ جب کبھی حاجت ہوگی، تب اُن کو بُلا لینا۔ ہم کو تو اپنے پروردگار کی مدد کافی ہے، غیر کی مدد کی کچھ پروا نہیں۔ جو وُہ مددگار ہوگا، تو سب مددگار ہو جائیں گے۔ خانِ موصوف یہ بات سُن کر اپنے دل میں بہت نادم ہُوا اور کہا کہ میں ابھی جا کر اُن کو رخصت کیے دیتا ہوں۔ پھر اُسی وقت اُن سب کو جواب دیا۔ اسی روز وہ اپنی اپنی طرف چلے گئے۔ پھر کچھ لوگ گورستان میں پڑے رہے۔ پھر دو تین روز کے اندر وُہ بھی دفع ہُوئے۔

فتح خاں کی حاضری فتح خاں پنجتاری، جو اس ہنگامے کے پورے عرصے میں پنجتار سے باہر رہا، اپنے گھر آیا۔ اس نے سیّد صاحبؒ کی ملاقات کے لیے اندر آنے کی اجازت چاہی۔ چوکیداروں نے اس کو اجازت نہ دی اور آپ کو اندر جا کر اطلاع دی کہ فتح خاں ہتھیار لگائے ہُوئے اندر آنا چاہتا ہے۔ کیا حکم ہے؟ فرمایا: "جیسے وہ ہمیشہ آیا کرتا تھا، آنے دو۔" بعض خیر خواہوں نے عرض کیا کہ اگر اجازت ہو، تو اس کے ہتھیار رکھوالیں۔ جب وہ ملاقات کر کے جائے گا، تو ہتھیار اس کے حوالے کر دیے جائیں گے۔ فرمایا کہ یہ مجھے منظور نہیں۔ باغیوں کے ساتھ اس کی شرکت ظنی ہے یقینی نہیں کہ شرعی طریقے پر اس کو ثابت کیا جا سکے اس لیے اس کو مسلّح آنے دو۔ اگر اس کی کوئی اور نیّت ہے، تو بھی کچھ ڈر نہیں۔

دِل کا علاج فتح خاں نے عرض کیا کہ ہماری قوم آپ کی نُصرت کرنا چاہتی ہے اور معمول کے مطابق عُشر وغیرہ دینا چاہتی ہے۔ فرمایا کہ اپنی قوم سے کہ دو کہ ہمیں یہ کیسے معلوم ہو کہ تم اپنے قول میں سچے ہو؟ ہزارہا آدمی اپنے قول سے پھر گئے اور انھوں نے غازیوں کی لاشوں کے ساتھ وُہ کیا، جو کُفّار نہیں کرتے۔ اب تو ہم کو تمھارے لَآ إِلٰهَ إِلَّا اللهُ کہنے میں بھی شک ہے کہ سچّے دل سے کہتے ہو کہ جھوٹے دِل سے تمھارا اقرار کلمۂ توحید محض قوم کے رسم و رواج کی بنا پر ہے۔ ہم کو تو اب ضروری ہو گیا ہے کہ ہم اپنے

دل کا علاج کریں کہ کلمہ گویوں کی طرف سے ہمارا شک زائل ہو۔[1]

علما اور سادات کا اجتماع اور سبب کی تحقیق ایک روز سید صاحبؒ نے اپنے معتمد لوگوں اور سردار فتح خاں سے فرمایا کہ ہم یہ چاہتے ہیں کہ اس ملک کے علما اور سادات اور بعض بعض ملک اور خوانین کو، جو ہمارے مخلص دوست ہیں، بلا کر جمع کریں اور اُن سے پوچھیں کہ اس ملک کے لوگوں نے ہمارے غازیوں کے ساتھ کُشت و خُون کا جو معاملہ کیا، اس کا سبب کیا ہے؟ دغابازی کا ایسا معاملہ مسلمان لوگ عہد و پیمان کرکے کافروں کے ساتھ بھی نہیں کرتے چہ جائیکہ مسلمانوں کے ساتھ۔ اگر ایسا ہی کوئی قصور ہم لوگوں سے صادر ہوا ہے کہ ایسی سزا کے لائق تھے، تو ہم کو آگاہ کریں کہ ہم اس سے تائب ہوں اور اپنے قصور پر نادم ہوں اور جو بے خطایوں ہی افترا و بہتان کرکے انھوں نے یہ زیادتی کی ہے وہ بھی معلوم ہو جائے۔ پھر ہم کو اختیار ہے؛ چاہے، معاف کریں، چاہے، اپنا بدلہ لیں۔

حاضرین نے اس سے اتفاق کیا اور یہ تجویز بہت پسند کی۔ آپ نے فتح خاں سے فرمایا کہ خاں بھائی، جن صاحبوں کے نام ہم طلبی کے خطوط لکھوائیں، اُن کو تم اپنے آدمیوں کے ہاتھ بھجوا دو۔ اس لیے کہ لوگ تمھارے زیادہ واقف کار ہیں اور رستے میں اُن سے کوئی مزاحم بھی نہ ہوگا۔ ہمارے ہندوستانی کسی صورت سے نہیں جا سکتے، اس لیے کہ تمام ملک بگڑا ہوا ہے۔ اس کے بعد آپ نے مولانا محمد اسمٰعیل صاحب کو اہم آدمیوں کے نام بتلائے۔ اُن میں علما، و سادات اور خوانین و رؤسا بھی تھے۔ سب کے نام خطوط لکھے گئے اور وہ خطوط فتح خاں نے اپنے آدمیوں کے ہاتھ بھجوا دیے۔

اہلِ علاقہ کی مہمانداری اور مدارات سید صاحبؒ نے اپنے ساتھیوں سے فرمایا کہ جو صاحبان آئیں، اُن کی پوری مہمانداری و خدمت گزاری کی جائے۔ اس میں کسی طور کا فرق نہ ہو۔ اور اگر بلائیوں میں سے اُن کے ساتھ کوئی آئے اور یہ معلوم ہو کہ انھیں لوگوں نے ہمارے غازیوں کو شہید کیا ہے، تو اُن سے کوئی شخص کسی طرح کا تعرض نہ کرے اور نہ اُن کو چھیڑے، بلکہ اوروں کے مقابلے میں اُن کی زیادہ خاطرداری کی جائے۔

تین چار دن میں سب صاحبان تشریف لے آئے۔ اُن میں سادات و علما بھی تھے اور ملک

---

[1] منظورۃ السعدا، صـ ۱۰۰۱، ۱۰۰۲

اور خوانین بھی اور بہت سے مُفسدین اور ربلوائی بھی۔ سید صاحبؒ کی ہدایت کے مطابق اُن لوگوں کی پوری خاطرداری اور کھانے پینے سے تواضع کی گئی اور مُفسدوں اور بلوائیوں کو پہچان لینے کے باوجود کسی نے اُن سے تعرّض نہیں کیا اور نہ کوئی فرق محسوس ہونے دیا۔

سید صاحبؒ کا استفسار | سب حضرات سید صاحبؒ کے ڈیرے پر جمع ہوئے۔ آپ نے عُلما، کی طرف مخاطب ہو کر فرمایا کہ ہم آپ صاحبوں سے سوال کرتے ہیں کہ جب ہم اپنے وطن ہندوستان سے ہجرت کر کے جہاد فی سبیل اللہ کے انتظام کے لیے آپ کے اس مُلک میں آئے، تو یہاں کے اکثر خوانین وغیرہ میں نااتفاقی اور کینہ داری نظر آئی کہ ایک دوسرے کا جانی دشمن بنا ہُوا تھا اور کفار سے جہاد مسلمانوں کے اتفاق کے بغیر نہیں ہو سکتا، تو ایک مُدّت تک للہ فی اللہ سعی اور کوشش کر کے ان لوگوں کو آپس میں ملایا۔ پھر اُنھوں نے اور آپ سب نے ہمارے ہاتھ پر برضا و رغبت بیعتِ امامت اور بیعتِ ہدایت کی اور ہم کو اپنا پیر و مُرشد اور امام بنایا اور عہد و پیمان کیا کہ ہم ہر حال میں اس کارِ خیر میں جان و مال سے تمھارے شریک ہیں، پھر آپ سب نے خود ہی کہا کہ ہم شریعت کا حکم بسر و چشم قبول کیا۔ اب آپ ہماری بستیوں میں ہمارے ہی لوگوں میں سے ایک ایک قاضی مقرر کر دیں کہ شرع شریف کے موافق ہمارے درمیان فیصلہ کیا کرے اور ہماری شادی غمی میں شرعی احکام جاری کیا کرے۔ تو آپ ہی کے کہنے کے مطابق، جن کو آپ نے کہا، اُن کو ہم نے قاضی بنایا۔ پھر شریعت کے موافق آپ سب نے برضا و رغبت عُشر دینے کا اقبال کیا اور کہا کہ اُس کی تحصیل وصُول کے لیے آپ اپنے مُجاہدین متعین کر دیں اور ہم سے عُشر کا غلّہ وصُول کر لیا کریں۔ آپ کے کہنے کے مطابق ہم نے اپنے غازی متعیّن کر دیے۔ ایک مُدّت تک یہ کارخانہ جاری رہا۔ پھر ہمارے لوگوں سے خدا و رسُولؐ کے خلاف کون سی بات سرزد ہُوئی کہ جس کی وجہ سے آپ کا تمام مُلک ہم لوگوں کا مخالف اور جانی دشمن ہو گیا؟ اس سے پہلے ہم سے کسی نے نہ کسی بات کی شکایت کی اور نہ کوئی اطلاع دی۔ آپ ہی آپ آپ لوگوں نے یکبارگی بدعہدی کر کے ہمارے صدہا غازی قتل کر ڈالے۔ اس کا سبب ہم کو بالکل معلوم نہ ہُوا۔ آپ خود سوچ سمجھ کر ہم کو اس کا جواب دیجیے۔

معاملے کی تحقیق لوگوں نے اس مجلس سے اُٹھ کر کئی روز تک آپس میں گفتگو کی، لیکن وہ کسی نتیجے پر نہ پہنچے۔ آخر آپ کے پاس آکر کہا کہ ہم سب مُتحیّر و مُتفکّر ہیں کہ اتنا کُشت و خون کس سبب سے ہُوا۔ ہمیں اس کی کوئی معقول وجہ معلوم نہیں ہوسکی، کیونکہ نہ تو ہم اس معاملے میں شریک تھے اور نہ اُنھوں نے ہم کو مشورے میں شریک کیا۔ اس کا سبب وہی لوگ جانتے ہوں گے، جنھوں نے یہ معاملہ کیا۔

آپ نے فرمایا کہ ہم تو سبب جاننا چاہتے ہیں۔ آپ ہی اُن سے معلوم کر کے ہمیں مطلع کیجیے۔ آخر سب نے مشورہ کر کے یہ عرض کیا کہ تختہ بند کے سید میاں اس مُلک کے بڑے با اثر بزرگ اور سب کے پیشوا و مقتدا ہیں۔ اگر یہ دڑّوں کی بستیوں میں جائیں اور اس کی تحقیق کریں، تو ہو سکتا ہے۔ آپ نے اس کو پسند فرمایا اور سید میاں کے ساتھ قابل آخوند زادہ کو، جو بڑے عالم اور خوش تقریر تھے، ان کے ہمراہ کر دیا۔

سیّد میاں پانچویں یا چھٹے روز واپس آئے۔ آپ نے حال پوچھا۔ قابل آخوند زادہ نے کہا کہ ہم اور سید میاں یہاں سے چل کر دڑّوں کے علاقے میں جا کر ٹھیرے اور اپنا آدمی بھیج کر بستیوں کے کئی نامی نامی آدمیوں کو بلایا۔ جب سب آکر جمع ہُوئے، تو ہم نے اُن سے سوال کیا کہ تم نے جو بلوہ کر کے سیّد بادشاہ کے اتنے غازی قتل کیے، اس کا کیا سبب ہے؟ اگر معقول جواب دو گے، تو تمھارے بچاؤ کی صُورت ہے؛ نہیں تو بہت ذلت و خواری اُٹھاؤ گے اور قرار واقعی سزا پاؤ گے۔ تم نے اُن کو دغا دے کر غفلت میں قتل کیا۔ نہیں تو تمھاری کیا مجال تھی، جو تم اُن پر ہاتھ ڈالتے؟ یہ وُہ لوگ تھے، جنھوں نے سردار یار محمّد خاں کی لڑائی جیتی اور سلطان محمّد خاں کو شکست دے کر پشاور تک پیچھا کیا۔ بُدھ سنگھ چار توپوں اور دس ہزار فوج کے ساتھ اکوڑے میں پڑا تھا۔ صرف سات سو غازیوں نے جا کر اُس پر چھاپہ مارا۔ اور ان سب کی کیا حقیقت ہے؟ سیّد بادشاہ تو مہاراجہ رنجیت سنگھ والیِ لاہور سے لڑائی کا ارادہ رکھتے ہیں اور اِسی نیّت سے ہندوستان کو چھوڑ کر یہاں آئے ہیں۔ یہ حال تم سب جانتے ہو۔ سیّد بادشاہ کے پاس پنجتار میں جو لشکر ہے، وہ توپ خانہ لیے گولے بارُود سے تیار ہے۔ اگر اُنھوں نے اس طرف قصد کیا، تو تم میں سے کسی کو مقابلے کی جُرأت نہ ہوگی اور سب کے سب مارے جاؤ گے۔

سید بادشاہ نے ہم کو تمھارے پاس اس کا جواب لینے کے لیے بھیجا ہے۔ تم ہمیں اس کا جواب دو۔

بلوائیوں کا بیان دھمکی کی یہ گفتگو سن کر وہ گھبرائے اور سر جھکا کر عذر بیان کرنے لگے اور کہنے لگے: یہ لوگ ہم پر ظلم و تعدی کر کے ہماری بہنوں، بیٹیوں کا نکاح کر ڈالتے تھے اور تھوڑے تھوڑے قصور پر ہم کو بے عزت کرتے تھے اور جرمانہ کرتے تھے۔ جب ہم لوگ حد سے زیادہ تنگ ہوئے، تب ہم نے یہ کام کیا۔

میں نے کہا کہ تمھارا یہ عذر بیجا اور نامعقول ہے اور اس کی کوئی اصل نہیں ہے۔ تم جو نکاحوں کی شکایت کرتے ہو، وہ محض غلط ہے۔ انھوں نے جو نکاح کروائے، وہ شریعت کے موافق اور تمھاری رضامندی سے تمھاری ہی قوم میں کروائے۔ کسی نے تمھاری بہن بیٹی کا نکاح اپنے ساتھ نہیں کیا کہ جس سے تم کو ننگ و عار آتا ہے۔ باقی رہے جرمانے کے معاملے، تو جب کوئی حاکم ہوتا ہے تو وہ قصورداروں سے جرمانہ بھی لیتا ہے، قید بھی کرتا ہے، زد و کوب بھی کرتا ہے۔

پھر خطوط جب وہ لوگ کوئی معقول جواب نہ دے سکے، تو انھوں نے آپس میں مشورہ کیا اور یہ خطوط لاکر دیے اور کہا کہ یہ خط ہندوستان کے علماء نے اور پشاور سے درانیوں نے ہم کو بھیجے۔ ان خطوط کی بنا پر ہم لوگوں نے متفق ہو کر یہ کام کیا۔ اصل وجہ یہی ہے۔ سید صاحبؒ نے وہ خطوط ملاحظہ فرمائے۔ یہ اسی محضر کی نقل تھے، جو ہزار خانی کے میدان میں ملاقات کے وقت سردار سلطان محمد خاں نے سید صاحبؒ کو دیا تھا۔

سید صاحبؒ کا ارشاد آپ نے یہ سب سن کر فرمایا کہ بڑے افسوس کی جگہ ہے کہ کچھ اوپر چار برس ہم کو ہندوستان سے یہاں آئے ہو گئے۔ اتنی مدت تک ہم ان لوگوں کی اصلاح کی کوشش کرتے رہے، ہر طرح کے وعظ و نصیحت سے ان کو سمجھایا اور ان کے دین و دنیا کی بھلائی کا کوئی دقیقہ اٹھا نہ رکھا، مگر خدا جانے، یہ کیسے سخت دل کے لوگ ہیں کہ ہمارے وعظ و نصیحت کا ان پر ذرہ بھر بھی اثر نہ ہوا۔ ہم نے حتی الامکان ان کی خیر خواہی میں کوتاہی نہیں کی اور انھوں نے اپنی شرارت اور بغاوت میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھی اور نفاق ان کے دلوں سے نہیں گیا۔ معلوم ہوتا ہے کہ ان لوگوں

پر عتابِ الٰہی ہے۔ ہم کو ان لوگوں سے اپنا عوض لینا بھی منظور نہیں۔ ہم کس کس شخص سے عوض لیں؟ بہتر یہی ہے کہ یہ معاملہ ہم اپنے خدا کے سپرد کریں۔ وُہی مُنتقِم حقیقی ہے جس طرح چاہے گا، انتقام لے گا۔

اور بڑے حیف کی جگہ ہے کہ جب سُلطان محمد خاں نے ہم کو یہ کاغذ دیا تھا اور کہا تھا کہ ہماری بغاوت کا سبب یہی ہے، اُسی وقت ہم نے کہا تھا کہ ہمارے ہندوستان کے دُنیاداروں، بدعتیوں اور گور پرستوں نے ہم پر یہ افترا کیا ہے اور اس افترا کا سبب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے وہاں وعظ و نصیحت کی برکت سے بے شمار لوگوں کو ہدایت نصیب کی، وُہ تمام شرک و بدعت سے تائب ہو کر پُورے پُورے مُوحّد اور مُتّبعِ سُنّت ہو گئے اور اُن کی پیر پرستی اور گور پرستی پر ردّ و قدح کرنے لگے، اُن کی آمدنی کا بازار سرد ہو گیا اور وُہ خود تمام مُوحّدین کی نظروں میں خفیف اور حقیر ہو گئے۔ اس کے حسد اور بُغض سے اُنھوں نے ہم پر یہ بُہتان اور افترا کیا اور تم سے بڑی نادانی اور خطا یہ ہُوئی کہ تم نے اس بہتان نامے کو اب تک اپنے پاس رکھا اور دل ہی میں ہم سے عداوت اور بغاوت پیدا کی اور اس سے ہم کو آگاہ نہ کیا۔ وَ اِلّا ہم تمھارے دلوں کا شُبہہ دفع کر دیتے۔ اس پر اُس نے کہا کہ مجھ سے خطا ہُوئی اور مَیں از سرِ نَو آپ کے سامنے توبہ کرتا ہوں کہ اب بارِ دیگر تم سے بغاوت نہ کروں گا۔ اسی پر ہم نے پشاور لیا ہُوا اُس کو دے دیا اور پھر اس بہتان نامے کو دستاویز کر کے اس دغا باز منافق نے لوگوں کو فساد پر آمادہ کر کے یہ خرابی کی کہ صدہا مسلمانوں کا خونِ ناحق ہُوا۔ اب ہم کیا کہیں؟ خدا اس کو سمجھے! اس سے بہتر تو بہر حال اس کا بھائی دوست محمد خاں ہے۔ آج تک خُوب رہا کہ نہ ہمارے ساتھ اُس نے کچھ بھلائی کی اور نہ کچھ بُرائی، اور اُنھوں نے مُنافقانہ ہمارے ہاتھ پر بیعت کی اور ہم کو اپنا امام بھی بنایا اور آخر کو اس کا ثمرہ ظاہر ہُوا۔

حاصل اس گفتگو کا یہ ہے کہ اب ان لوگوں میں رہنا خُوب نہیں۔ اب یہاں سے ہجرت کریں گے اور جدھر اللہ تعالیٰ لے جائے گا، اُدھر جائیں گے، مگر یہاں نہ رہیں گے، انشاء اللہ تعالیٰ۔ قدیم سے یہ سُنّت اللہ جاری ہے۔ انبیاء علیہم السّلام حضرت نوح علیہ السلام سے حضرت خاتم المرسلین صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرتؐ کے نائبوں میں سے اب تک جو داعی الی اللہ ہُوئے ہیں، آپ ہی آپ مخالفینِ بے دین

اُن کی ایذا رسانی کے درپے ہوئے ہیں۔ اگر نام بنام ہر ایک کے حال کو بالتفصیل بیان کریں، تو بہت عرصہ چاہیے اور وہ ہمیشہ خلائق کی خیر خواہی و جانفشانی کرتے رہے اور مخالفین اُن کی بے عزتی و ایذا رسانی کے درپے رہے، مگر یہ لوگ اُن پر بھی سبقت لے گئے اس لیے کہ وہ ان ہادیوں کے دین کے مُنکر و مخالف تھے اور انھوں نے باوجود مُقر اور موافق ہونے کے یہ فعل کیا۔

اس کے بعد دُعاءِ خیر کرکے آپ نے اہلِ مجلس کو رُخصت کیا۔ سب اپنے اپنے ڈیرے پر گئے۔ اگلے روز جمعہ کا دن تھا۔ نمازِ جمعہ میں بے شمار آدمی جمع ہوئے۔ آپ نے نماز کے بعد یہی مضمون بعض نئے مضامین کے اضافے کے ساتھ پھر بیان کیا۔ تمام سامعین پر حال ساطاری تھا اور اکثر کے آنسو جاری تھے۔ وعظ و نصائح کے بعد آپ نے دُعا کی اور ڈیرے پر تشریف لائے۔

جہاد بہ طریقِ سنّت مولوی خیرالدین صاحب نے سیّد صاحبؒ سے عرض کیا کہ مجھے کچھ تنہائی میں عرض کرنا ہے۔ یہ بات سُن کر آپ مسجد کے اندر ہو بیٹھے۔ مولوی خیرالدین صاحب نے عرض کیا کہ مَیں خُوب جانتا ہُوں کہ آپ کی نیّت میں یہ بات ہے کہ کسی طرح ہم جہاد بطریقِ سُنّت کریں اور جس طرح سیّد المرسلین صلّی اللہ علیہ وسلم اور خلفاءِ راشدین رضی اللہ عنہم کے وقت میں لوگ امام کے حُکم پر کمر باندھ کر کفّار سے لڑتے تھے اور اللہ تعالیٰ اُن کو فتحیاب کرتا تھا اسی طرح للّٰہی لوگ میرے ساتھ جمع ہو کر جہاد کریں۔ اسی نیّت سے آپ نے ہندوستان کے اکثر شہروں اور یہاں یوسف زئی کی بستی میں دَورہ کرکے وعظ اور نصیحت فرمائی اور ہندوستان سے یہاں تک لاکھوں آدمیوں نے آپ کے ہاتھ پر بیعتِ ہدایت، بیعتِ جہاد اور بیعتِ امامت کی۔ آپ کے خیالِ مُبارک میں یہ بات آئی کہ اگر ان لاکھوں آدمیوں میں سے ہزاروں بھی جمع ہو جائیں گے، تو سُنّتِ نبوی کے طریق کے موافق جہاد بخوبی ہوگا۔ اسی وجہ سے آپ کو نوکر رکھنے سے نفرت رہی۔ اگر کسی کے کہنے سُننے سے کچھ لوگ نوکر بھی رکھے تو پھر کسی حیلے بہانے سے چند روز بعد اُن کو موقوف کر دیا۔ اس عرض سے میری غرض یہ ہے کہ کیا اب بھی آپ کو یہ اُمید باقی ہے کہ نوکر رکھے بغیر اس زمانے میں جہاد ہو سکے گا؟ لاکھوں آدمی جنھوں نے آپ کے ہاتھ پر بیعتِ جہاد کی تھی اور جہاد کے قائم ہونے پر حاضر ہونے کا پختہ وعدہ کیا تھا، کہاں گئے؟ اسی واسطے پہلے

بھی غرض تھی اور اب بھی ہے کہ یہ زمانہ سُنّت کے مطابق جہاد کرنے کا نہیں۔

سیّد صاحبؒ کا عزم اور فیصلہ آپ نے یہ سب نشیب و فراز کی گفتگو سُن کر فرمایا کہ آپ دُنیا کا ظاہری کارخانہ دیکھ کر اپنی سمجھ کے مطابق ٹھیک کہتے ہیں، مگر میں اپنی طرف سے شروع سے آج تک اسی طرح سعی و کوشش کرتا رہا اور انشاء اللہ تعالیٰ جب تک زندگی باقی ہے، اسی کوشش میں لگا رہوں گا اور کسی کے اقرار کرنے اور حاضر ہونے سے کوئی غرض نہیں، اور نہ فتح و شکست سے کچھ مطلب ہے۔ یہ بات اللہ تعالیٰ کے اختیار میں ہے۔ چاہے، اپنے دینِ اسلام کو سُست کرے یا چُست، میں اس کا فرماں بردار بندہ ہوں۔ اگر تن تنہا رہ جاؤں گا، تب بھی اسی کے کام میں اپنی جان صرف کروں گا۔

یہ جواب سُن کر مولوی خیرالدین صاحب خاموش ہو رہے۔

ہجرت کے متعلق مولوی خیرالدین صاحب کی گفتگو مولوی خیرالدین صاحب نے ہجرت کے متعلق سیّد صاحبؒ سے گفتگو کی۔ اُنھوں نے عرض کی کہ جو آپ یہاں سے ہجرت کی تیاری فرما رہے ہیں، تو میری ناقص رائے یہ ہے کہ یہاں سے منتقل ہونا مناسب نہیں ہے۔ اگر آپ دُوسرے مُلک میں جائیں گے، تو پھر ایک مُدّتِ مدید چاہیے کہ وہاں کے لوگوں کو وعظ و نصائح کریں اور اُن کی عادت و خصلتوں سے واقف ہوں۔ پھر دیکھنا چاہیے کہ وہ لوگ کس قسم کے ہوں۔ آپ کے وہاں ٹھیرنے سے راضی ہوں یا نہ ہوں۔ اس سے تو یہیں ٹھیرنا مناسب ہے، کیونکہ یہاں کے آدمی برتے ہوئے ہیں مخلص و منافق اور مطیع و باغی ایک دوسرے سے ممتاز ہو گئے ہیں۔ جہاد کا جو معاملہ یہاں آسانی سے بنے گا، اس کو دوسری جگہ ایک مُدّتِ دراز چاہیے۔

اہلِ سَمہ سے مایوسی اور طبعی تنفّر آپ نے فرمایا: بات تم سچ کہتے ہو، مگر یہاں قیام کرنے کی کوئی صُورت نظر نہیں آتی، کیونکہ مخلص لوگ تو تھوڑے ہیں اور مُفسد بہت۔ اب اُن سے ہدایت و صلاحیت کی اُمید نہیں رہی۔ ایک بار اُن سے دھوکا کھا کر پھر ان میں رہنا دینداری اور ہوشیاری سے بھی بعید ہے۔ حضرت رسُولِ خدا صلّی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ "لَا يُلْدَغُ الْمُؤْمِنُ مِنْ جُحْرٍ مَرَّتَيْنِ"[1]۔ سوات

---

[1] مومن ایک سُوراخ سے دو مرتبہ نہیں ڈسا جاتا، یعنی ایک جگہ سے کئی کئی بار دھوکا نہیں کھاتا۔

کا مُلک، جو اِس علاقے کی پُشت پر ہے، وہ بھی مخالف ہے۔

اِس کے علاوہ فتح خاں، جس کے یہاں ہم مقیم ہیں، اس کی طرف سے بھی ہم کو اعتماد جاتا رہا۔ اگر تمام لوگ مخالف ہوتے، تو کچھ بھی پروا نہ تھی۔ فقط یہ ہمارے قیام سے راضی ہوتا، تو بھی یہاں رہنے کی ایک صُورت تھی۔ اب یہاں کے لوگوں سے مجھ کو ایسی نفرت معلوم ہوتی ہے، جیسی آدمی کو اپنی قے سے۔ اب یہاں سے ہجرت ہی کرنی بہتر ہے۔

مولوی خیرالدین صاحب نے کہا کہ ہم فرماں بردار ہیں۔ آپ جس طرف کو چلیں گے، ہم لوگ بلاعُذر آپ کے ہم رکاب ہوں گے۔

شُہدا پر سَمہ اپنے مُلک کا خلاصہ اور لُبِّ لباب تھے

ارباب بہرام خاں نے کہا کہ آپ اجازت دیں، تو میں لشکر کا ایک حِصّہ اور توپ لے کر دیہاتوں کا دَورہ کرلوں اور انشاء اللہ جنگ کی نوبت بھی نہیں آئے گی اور سب تابع ہو جائیں گے۔

سیّد صاحبؒ نے فرمایا کہ بھائی، اوّل اوّل جب ہم اس مُلک میں پہنچے، تو نہ ہم اس قوم کے حالات سے واقف تھے، نہ وُہ ہمارے حالات سے۔ ہم نے کئی سال وعظ و نصیحت کے ساتھ اُن کی دلجوئی کی۔ جب اس کا کوئی اثر نہیں ہُوا، تو ہم نے حاکمانہ معاملہ کیا اور فہمائش اور دلائل کے ساتھ اپنے احکام کی حقیقت ثابت کرنے سے دریغ نہیں کیا اور ہمارا مقصُود اس تمام جد و جہد سے محض دینِ حق کا اجرا تھا۔ اس پر بھی کوئی اثر نہیں ہُوا، بلکہ اُن کی سرکشی اور تمرد میں اتنی ترقی ہُوئی کہ اتنے مُسلمانوں کو جو اپنے مُلک کا خلاصہ اور لبِّ لباب تھے، شہید کر دیا۔ ہماری نیّت اس پورے طرزِ عمل سے مُلک گیری یا جاہ طلبی کی نہ تھی۔ ہمارا مقصُود محض اصلاح و تربیت تھی۔ اب ہم اس مُلک کے لوگوں کو منتقمِ حقیقی کے انصاف پر چھوڑتے ہیں اور اپنے باقی ماندہ رفیقوں کو لے کر کسی دُوسرے مُلک کی طرف رُخ کرتے ہیں، اس لیے کہ جب ہم نے اپنے مُلک سے ہجرت اختیار کی، تو جہاں کہیں راستباز اور صادق القول لوگ ملیں گے، وہیں ہم قیام اختیار کرلیں گے، کچھ اسی مُلک پر انحصار نہیں ہے۔[1]

---

[1] منظورۃ السعداء، ص ۱۰۰۳

سَینتیسواں باب

ہجرت کا دُوسرا سفر

ہجرت کے داعی چار مشہور سردار اس بات کے داعی تھے کہ سید صاحبؒ سَمَہ سے ہجرت کر کے اُن کے علاقے میں تشریف لائیں اور اپنی نُصرت و رفاقت کا وعدہ کرتے تھے۔ ایک سلطان زبردست خاں مُلک کھکھا بمبا کا سردار تھا۔ بارہا اُس کی عرضیاں سید صاحبؒ کے پاس آئیں اور اُس کا بڑا دیندار وکیل راجہ پارس نام کئی سال سے اسی مقصد سے آپ کے پاس پنجتار میں مقیم تھا۔ دُوسرا ناصر خاں سواتیوں کا سردار تھا۔ وُہ بھی کئی سال سے اس غرض کے لیے آپ کی خدمت میں حاضر تھا۔ تیسرے حبیب اللہ خاں خان خیل کھیلئی کا سردار تھا۔ اس کے بھی کئی سال سے اس درخواست کے خُطوط آتے تھے اور اس کے آدمی بھی آتے جاتے رہتے تھے۔ چوتھا سردار عبدالغفور خاں مُلک اگرُور کا خان تھا۔ اس کا بھائی کمال خاں اس مقصد کے لیے کئی سال سے آپ کے ساتھ تھا۔

ہجرت کی شہرت اور مخلصین کا تأسف جب آپ کی ہجرت کی خبر مشہور ہوئی، تو جو حقّانی عالم مخلص سادات اور معتقد خوانین پنجتار میں حاضر تھے، سب کو اس خبر سے بڑا رنج ہُوا۔ یہ خبر سُن کر اطراف و نواح کے مخلصین و معتقدین بھی آنے لگے اور سمجھانے لگے کہ کسی طرح آپ یہاں سے نہ جائیں۔ ایک روز سردار فتح خاں کی قوم کے لوگ، جو اطراف کی بستیوں میں رہتے تھے، جمع ہو کر پنجتار آئے اور فتح خاں کو ساتھ لے کر آپ

کے پاس حاضر ہوئے۔ اس وقت عصر و مغرب کا درمیان تھا اور آپ مسجد میں بیٹھے تھے۔ فتح خاں نے عرض کیا کہ میری قوم کے یہ لوگ آئے ہیں اور آپ سے کچھ عرض کرنا چاہتے ہیں۔ آپ نے فرمایا کہ اچھا، بیان کرو، یہ بھائی کیا کہتے ہیں۔ فتح خاں نے کہا: یہ سب صاحب عرض کرتے ہیں کہ آپ یہاں سے کہیں تشریف نہ لے جائیں، ہم سب آپ کے فرماں بردار و جاں نثار ہیں۔ ہم سے آج تک آپ کی خدمت میں کوئی گستاخی و بے ادبی نہیں ہوئی۔

فتح خاں کی مرضی آپ نے فرمایا: یہ بھائی سچ کہتے ہیں۔ آج تک اُن سے کوئی قصور صادر نہیں ہوا۔ ہم اُن سے راضی ہیں۔ ان پر بغاوت کا حکم نہیں لگاتے۔ اور جو یہ کہتے ہیں کہ سیّد بادشاہ یہاں سے نہ جائیں، اللہ تعالیٰ اُن کو جزاء خیر دے! بات یہ ہے کہ اگر یہ لوگ اور ملکِ سمہ و سوات، بُنیر وغیرہ کے تمام لوگ یہ کہیں کہ تم یہاں سے نہ جاؤ اور اکیلے تم کہو کہ جاؤ، تو میں چلا جاؤں گا اور تمام لوگ کہیں کہ تم یہاں سے چلے جاؤ اور تم اکیلے کہو کہ نہ جاؤ، تو میں ہرگز نہ جاؤں گا اور اگر اس بات کے کہنے سے تم کو کچھ لحاظ معلوم ہوتا ہو، تو اپنے دل کی بات چُپکے سے میرے کان میں کہ دو۔

یہ فرما کر آپ نے فتح خاں کو اپنے پاس بٹھا کر اپنا کان فتح خاں کے مُنہ کے پاس کر دیا۔ بہت دیر تک فتح خاں کچھ باتیں کرتا رہا اور آپ بھی اُس کے کان میں کچھ باتیں کہتے رہے۔ تمام لوگ دُور سے دیکھتے رہے، مگر کسی کو معلوم نہ ہُوا کہ وہ باتیں کیا تھیں۔

ہر کہ مارا رنج دادہ راحتش بسیار باد! جب سیّد صاحب فتح خاں سے باتیں کر چکے، تو آپ اُس کی قوم کی طرف مخاطب ہُوئے اور فرمایا کہ بھائیو، ہم تم سے راضی ہیں، تم پر بغاوت کا حُکم نہیں لگاتے۔ ہم جو یہاں سے جاتے ہیں، تو کسی مصلحت سے جاتے ہیں اور ہم تمھارے فتح خاں کو خلیفہ بنا کر جائیں گے۔ جو کچھ عُشر کا غلہ تم سب ہم کو دیتے تھے، اب اُن کو دیا کرنا اور شریعت کے جو احکام فتح خاں تم کو تعلیم کریں، اُن کو قبول کرنا اور اُن سے کسی امر میں بغاوت نہ کرنا، اور ہندوستان کے جو لوگ اس طرف ہو کر کبھی آئیں، تو اُن کی خاطر داری کرنا، اُن کو کسی طرح کی تکلیف نہ دینا۔"

اسی طرح اُن کو اچھی طرح سمجھا بُجھا کر رُخصت کیا۔

ہجرت کے بارے میں ایک فقہی اشکال اور اس کا جواب

پنجتار میں جب ہجرت کی تیاری شروع ہوئی اور اس کا عام چرچا ہوا، تو قاضی سیّد محمّد حبان شہید مرحوم کے استاد مُلّا شریعت، جو اُس وقت وہاں موجود تھے، فرمانے لگے کہ چونکہ یہ اسلامی مُلک ہے اور یہاں کے خوانین سب مسلمان ہیں اور جو کچھ کُشت و خوُن و بدعہدی و نافرمانی یہاں کے لوگوں سے سرزد ہوئی ہے، وُہ کبیرہ گناہ سے زیادہ نہیں اور کُفر تک نہیں پہنچتی، اس لیے اس مُلک سے ہجرت از رُوے شریعت جائز نہیں۔

چونکہ اکثر لوگوں کو ہجرت کے مقابلے میں وہاں کا قیام مرغوب تھا، اُنھوں نے سیّد صاحبؒ تک اس کی اطلاع پہنچائی۔ آپ نے مولانا اسمٰعیل صاحب سے فرمایا کہ مُلّا شریعت اس طرح کہتے ہیں، آپ اُن کو شرعی دلیل سے مطمئن کر دیں۔ مولانا نے ایک حدیث پڑھی[1] اور فرمایا کہ اِس حدیث سے اس مسئلے کا استنباط ہوتا ہے۔ مُلّا صاحب نے فرمایا کہ ہاں، اس حدیث سے یہ مسئلہ نکلتا ہے کہ ایسی جگہ سے ہجرت کرنی چاہیے، لیکن مَیں اِس کو اُس وقت مانوں گا، جب فُقہاے حنفیہ میں سے کِسی کا قول یا فقہِ حنفی کا کوئی جُزئیہ اس کی تائید میں مِل جائے۔ مولانا نے فرمایا کہ یہ بات تو مشکل ہے، اس لیے کہ کُتبِ فقہ کی کوئی ایسی صراحت میری نظر سے نہیں گزری۔ یہ ایک استنباط ہے۔ اگر فقہاءِ متقدّمین میں سے کسی کو اس مسئلے کی ضرورت پڑتی اور یہ حدیث بھی یاد ہوتی، تو وُہ اس سے استنباط کر کے اپنی کتاب میں لکھ دیتے۔

مولانا نے یہ ساری گفتگو سیّد صاحبؒ سے نقل کی۔ سیّد صاحبؒ نے فرمایا: کیا مُلّا صاحب اس کے قائل ہوئے کہ یہ مسئلہ اس حدیث سے نکلتا ہے؟ مولانا نے فرمایا: جی ہاں، وُہ اتنی بات کے تو قائل تھے۔ سیّد صاحبؒ نے فرمایا: "مَیں اُن کو سمجھا لوں گا"۔ سیّد صاحبؒ نے مُلّا صاحب کو بُلایا اور ایک پرندے کا نام لے کر فرمایا: مولانا، اُس کا کیا حکم ہے؟ حلال ہے کہ حرام؟ مُلّا صاحب نے کہا: اس پرندے کے پنجے ہیں یا نہیں؟ سیّد صاحبؒ نے فرمایا: فقہ کی کسی کتاب میں بھی اس پرندے کا نام اور اس کی حِلّت و حُرمت کی تصریح ہے یا نہیں؟ مُلّا صاحب نے کہا: صحیح حدیث میں یہی قاعدۂ کُلّیہ

---

[1] مولانا جعفر علی صاحب فرماتے ہیں کہ مَیں چونکہ اس مجلس میں نہیں تھا، اس لیے مجھے حدیث کے الفاظ اور مضمون معلوم نہیں ہو سکا۔

آیا ہے۔ اسی پر فقہاء حلّت و حُرمت کا فیصلہ کرتے ہیں۔ اگر کوئی فقیہ کسی پنجے والے پرندے کو حلال بھی لکھ دے، تو جمہور فقہاء اُس کی تحریر پر فتویٰ نہیں دیں گے اور اُس کے قول کو رد کر دیں گے۔" سید صاحبؒ نے فرمایا: "جب ایک حدیثِ صحیح سے ایسے مقام سے ہجرت کا استنباط ہوتا ہے، تو اس کی کیا ضرورت ہے کہ کوئی فقیہ اس جزئیہ کو اپنی کتاب میں بھی درج کرے؟ فقہاء عالم الغیب تو نہیں تھے، جو اُن کو معلوم ہوتا کہ فلاں وقت آپ کو اس مسئلے کی ضرورت پڑے گی۔ فقہاء کے قول پر عمل اسی وجہ سے ہوتا ہے کہ انھوں نے کتاب و سُنّت سے استنباط کر کے اپنی کتابوں میں اُن مسائل کو درج کر دیا ہے۔ بس شریعت کی بُنیاد اللہ اور اُس کے رسُولؐ کا قول ہے۔"

اس پر مُلّا صاحب بہت خوش ہوئے اور اپنی غلطی کا اقرار کیا اور خود بھی شریکِ ہجرت ہوئے۔[۱]

ہجرت کی اطلاع اور وصیّت آپ نے ہجرت سے پیشتر پنجتار سے پیر صبغۃ اللہ، ابوالقاسم خاں امیرانِ سندھ اور دونوں بیویوں کے نام الگ الگ خطوط تحریر فرمائے۔ امیرانِ سندھ اور پیر صاحب کو تحریر فرمایا: "آپ کے اخلاقِ کریمانہ سے اُمید ہے کہ اگر تقدیر کا نوشتہ اور مالکِ حقیقی کی مرضی یہی ہے کہ ہماری زندگی اسی عبادت میں صرف ہو جائے، تو اُس صُورت میں از راہِ خیر خواہی اور دینداری اس کو ضروری سمجھیں کہ ان مستورات کو جو اپنے وطن سے ہجرت کر چکی ہیں، حرمین شریفین تک پہنچا دیں۔" بیبیوں کے نام خط میں تحریر تھا: "اگر ہمارا پیمانۂ عُمر اسی عبادت کے دَوران میں پُر ہو جائے، تو تم حرمین شریفین چلی جانا کہیں اور سکونت اختیار نہ کرنا، اس لیے کہ اس زمانۂ پُرفتن میں ایمان کی حفاظت کسی اور جگہ نظر نہیں آتی۔ وہاں کی زیادتیوں کی تکالیف پر صبر کرنا اور وہاں توطّن اختیار کرنا بہتر ہو گا۔"[۲]

راستے کا انتخاب ایک روز آپ نے سردار فتح خاں کو بُلا کر فرمایا کہ ہمارا یہ ارادہ ہے کہ ہم یہاں سے جھنڈے بوکے اور سینئی، ٹوپیے اور کھبل ہو کر جائیں۔ تم ان بستیوں کے خوانین سے کہلا بھیجو کہ وہ ہم سے تعرّض نہ کریں۔ اس راستے کے اختیار کرنے میں فائدہ یہ تھا کہ راستہ ہموار ہے، تو بیبیاں چلی جائیں گی۔

خوانین کا انکار فتح خاں نے ان بستیوں کے خانوں کو کہلا بھیجا۔ یہ وُہی بستیاں تھیں جہاں غازیوں

---

[۱] منظورہ ص ۱۰۵۰، ۱۰۵۱ [۲] ایضاً ص ۱۰۵۲

کو شہید کیا گیا تھا۔ اُن کو اندیشہ ہُوا کہ مبادا اس بہانے سے اگر غازی ہم سے اِنتقام لیں۔ اُنھوں نے صاف جواب دیا کہ ہماری طرف سے ہو کر نہ آئیں، ہم کو منظور نہیں ہے۔ فتح خاں نے یہ جواب آپ سے عرض کیا۔ آپ نے فرمایا: اگر نہیں مانتے، تو نہ سہی؛ کوئی اور راستہ تجویز کرو۔ ہم کو تو راستے راستے جانا ہے، کسی سے کچھ چھیڑ چھاڑ کرنی منظور نہیں ہے۔

فتح خاں نے کچھ دیر سوچ کر عرض کیا کہ ایک راستہ تو ہے، مگر سخت دشوار، پہاڑ ہو کر ہے۔ اس راستے پر توپیں نہ جا سکیں گی۔ وُہ یہ ہے کہ آپ یہاں سے موضع کنگلئی اور بڑھیری پیواڑ بیون کے پہاڑ پر چڑھیں اور موضع کنا بیں جا اُتریں۔ وہاں سے کابل گرام ایک میل ہے۔ اس کے بیچ دریائے سندھ اُترنا ہوگا۔ آپ نے فرمایا: ہم کو منظور ہے۔ ہم اسی طرف ہو کر چلے جائیں گے۔

سردار فتح خاں کے ساتھ مُشفقانہ سلوک ایک روز آپ عصر کی نماز پڑھ کر مسجد میں بیٹھے۔ سردار فتح خاں بھی اس وقت موجود تھا۔ آپ نے اپنا کُرتا اپنے ہاتھ سے خانِ ممدوح کو پہنایا اور اپنا عمامہ اُس کے سر پر باندھا اور خلافت نامہ لکھوا کر دیا۔

رفیقوں کو اختیار روانگی سے پیشتر آپ نے اپنے ساتھیوں اور مقامی مسلمانوں کو جمع کر کے فرمایا کہ بھائیو! اللہ تعالیٰ نے تم کو اس عبادت (جہاد) میں شریک کیا اور تم نے محض لوجہ اللہ اس راستے کے گرم و سرد کو برداشت کیا۔ تم نے نُصرت و رفاقت کا حق ادا کیا، اب ہم اس مُلک سے دُور دراز مُلک کا قصد رکھتے ہیں۔ ہم کو خود معلوم نہیں کہ کہاں جائیں گے۔ سفر کو قِطْعَةٌ مِّنَ الْعَذَابِ کہا گیا ہے، خصُوصیت کے ساتھ یہ سفر کوہستان کا ہے۔ اس میں کھانے پانی کی ضرور تکلیف ہوگی اور مالوفات و عادات کو ترک کرنا ہوگا۔ اس لیے وہ شخص ہمارے ساتھ چلے، جو صبر و استقامت کے لیے تیار ہو اور مالک کی شکایت زبان پر بھی نہ لائے۔ ہم ابھی سے خبر دار کر دیتے ہیں کہ تکلیف کے پیش آنے کے وقت کوئی یُوں نہ کہے کہ سیّد نے ہم کو دھوکا دیا، یا یہ کہ ہم کو معلوم نہ تھا کہ اتنی تکلیفیں پیش آئیں گی۔ پس جو شخص اپنے اندر صبر و برداشت کی طاقت پائے، وُہ ہمارا شریک ہو۔

زندگی کا فیصلہ ہم تو اپنی پوری زندگی اپنے مالک کی رضا میں صرف کر دیں گے اور جو شخص تکلیف جانی

اور نفسانی پر صبر نہ کر سکے، وہ ہم سے علٰحدہ ہو جائے۔ لیکن اُس کو خراسان یا ہندوستان نہیں جانا چاہیے اگر وُہ جاتا ہے، تو عرب کا رُخ کرے، اس لیے کہ ایمان کی حفاظت عرب کے سوا اور جگہ مشکل ہے۔ وہ حرمین شریفین کی اقامت اختیار کرے اور وہاں کے حکّام کی زیادتی اور وہاں کے مصائب پر صبر کرے کہ وہاں دین میں خلل نہیں آئے گا، اگرچہ بدعات سے وہ مُلک بھی پاک نہیں ہے۔[1]

اس کے بعد مولانا اسمٰعیل صاحب سے خطاب کر کے فرمایا کہ مولانا، آپ تلاوت خُوب کریں۔ ہم کثرت سے مراقبہ کرتے ہیں یہاں تک کہ ہم کسی ایسے مقام پر پہنچ جائیں، جہاں جہاد کا اچھی طرح نظم ہو سکے۔ اِن کلمات کو سُن کر لوگوں کی آنکھوں سے آنسوؤں کی جھڑیاں لگ گئیں اور لوگ مُرغِ بسمل کی طرح تڑپنے لگے۔[2]

راہِ خدا کا نیا مہمان | مولوی سیّد جعفر علی صاحب لکھتے ہیں کہ اسی موقع پر شیخ امجد علی غازی پوری، جو زخمی تھے، پہنچے۔ یہ وُہی نوجوان ہیں، جن کو ان کے والد شیخ فرزند علی رئیس غازی پور نے اسمٰعیلؑ ذبیح کی طرح اللہ کے راستے میں قربانی کے لیے پیش کیا تھا۔

روانگی کی تیاری | آپ نے ہجرت کی تیاری شروع کی اور لشکر کے غازیوں کو جماعت جماعت اور بھیلے بھیلے کہلا بھیجا کہ جو اسباب ضرورت سے زائد ہو، اس کو جلد دو چار روز کے اندر اندر بیچ ڈالیں یا کسی کو للہ فی اللہ حوالے کر دیں اور سفر کی تیاری کریں اور کئی مُلکی موضع گنگلئی وغیرہ کی طرف راستہ صاف کرنے کے لیے روانہ کیے۔

جب سفر کا سامان دُرست ہو گیا، تو ایک روز آپ نے پنجتار سے کُوچ فرمایا۔[3] جو مکان غازیوں نے چھاٹے بنائے تھے، وُہ سب بدستور چھوڑ دیے۔ بعضوں نے ارادہ بھی کیا کہ ان کو جلا دیں۔ آپ نے منع فرمایا اور فرمایا کہ اس کے جلانے بگاڑنے سے کیا فائدہ؟ اگر یہ گھر بنے رہیں گے، تو مسلمانوں کے کام آئیں گے وُہ اس میں آرام پائیں گے اور تم کو ثواب ہوگا۔ پھر کسی نے اُن کو ہاتھ نہ لگایا۔

---

[1] منظورۃ السعداء: اس تقریر کو سُن کر بھی رُفقاء ساتھ ہی رہے اور کسی نے واپس جانا گوارا نہ کیا۔

[2] ایضاً، صفحہ ۱۰۵۴

[3] یہ ماہِ رجب ۱۲۴۶ھ کا کوئی دن تھا۔

جاں بلب نواسے سے ملاقات سیّد موسیٰ (بن سیّد احمد علی شہید) جو مایار کی جنگ میں سخت زخمی ہُوئے تھے، موضع دکھاڑا میں تھے۔ شیخ محسن علی اپنے بھائیوں کے ساتھ اُن کی خدمت اور تیمار داری میں تھے۔ ان کو اطلاع بھیجی گئی کہ کن گلئی میں آکر ملیں۔ شیخ صاحب آپ کے پہنچنے سے ایک روز پیشتر سیّد موسیٰ کو لے کر کن گلئی میں آگئے تھے۔ اُن کی حالت نازک تھی اور تکلیف بہت تھی۔ شدّت سے سیّد صاحبؒ کے منتظر تھے اور بار بار پوچھتے تھے کہ کب تشریف لائیں گے۔ سیّد صاحبؒ کن گلئی تشریف لائے، تو سیّد موسیٰ کو دیکھنے آئے اور اُن کی خاطر ایک روز وہاں قیام فرمایا۔

اگلی منزلیں کن گلئی سے کُوچ کے وقت اپنے اہل و عیال کو لانے کے لیے قاصد کو آپ نے منگل تھانہ روانہ کیا۔ اسی منزل میں وُہ بھی آکر شریک قافلہ ہُوئے۔

اگلی منزل نمری میں ہُوئی۔ وہاں سے چل کر بر ڈھیری منزل ہُوئی۔ وہیں سیّد موسیٰ کی وفات کی خبر سُنی۔ یہیں شیخ بلند بخت دیوبندی اور حافظ مُصطفےٰ کاندھلوی شریکِ لشکرِ اسلام ہُوئے۔[1]

اسلامی معاشرت کا ایک نمونہ ایک روز لشکر کے سب لوگ چلے جاتے تھے۔ اس اثنا میں ارباب بہرام خاں کی بیوی اور بیٹی گھوڑی پر سوار آئیں۔ سب غازی مُنہ پھیر کر کھڑے ہو گئے۔ ارباب نے کہا کہ بھائیو، میری کیا حقیقت اور کون سی عزّت ہے؟ صحابۂ کرامؓ کی بیبیاں لشکرِ مُجاہدین میں رہی ہیں۔ یہ پاؤں میں پتیابہ اور ہاتھ میں دستانہ پہنے اور سر تک کپڑا اوڑھے ہیں۔ اسی کا نام پردہ ہے اور یہ تم بھائی جانتے ہو کہ ان میں ایک بہرام خاں کی بیوی اور ایک بیٹی ہے۔ اس میں کون سی شرم و حقارت کی بات ہے؟

زُود پشیمان شاہزاد خاں، جو باغیوں اور مُفسدوں کا سرگروہ تھا، سیّد صاحبؒ کی ہجرت کا شہرہ سُن کر پریشان ہُوا کہ آپ بڑے صاحبِ ارادہ اولوالعزم ہیں۔ ایسا نہ ہو کہ یہاں سے جا کر کسی مُلک میں اقتدار حاصل کر لیں اور پھر ہم سے اپنے غازیوں کا بدلہ لیں۔ وُہ بہت سے مَلکوں اور خانوں کو ساتھ لے کر موضع بر ڈھیری میں حاضر ہُوا اور اپنے آنے کی اطلاع کی۔ آپ مُجاہدین کے ساتھ اُس کے لینے کو گئے اور اپنے ڈیرے پر لائے، بڑی عزّت و توقیر سے اس کو اپنے پاس بٹھایا اور خیر و عافیت پوچھی۔ آپ نے

---

[1] منظورہ: ص ۱۰۶۳، ۱۰۶۴

اُس سے مُجاہدین کے خلاف فوج کشی کی شکایت کی۔ اُس نے کہا: آپ بجا فرماتے ہیں، مگر میں کیا کروں؛ مجھ کو سمہ والوں نے جھوٹ سچ باتیں کر کے بہکایا کہ سید بادشاہ ہم لوگوں پر ناحق زور و زیادتی کرتے ہیں اور نئے نئے احکام جاری کرتے ہیں اور ادنیٰ ادنیٰ قصور پر ہم کو بے عزّت کرتے ہیں"۔

آپ نے فرمایا: "خان بھائی، بڑے حیف کی بات ہے کہ ان مُفسدوں کے بہکانے سے تم نے ہزاروں سے لے کر ہم پر چڑھائی کی اور یہ نہ کیا کہ اپنے دو چار معتبر عالموں کو بھیجتے اور اس کی تحقیق کرتے کہ کون سے نئے نئے احکام اور کون سے زور زیادتی کے احکام ہیں۔ اگر وُہ واقعی خلافِ شرع ہوتے، تو وُہ قرآن و حدیث سے ہم کو سمجھا کر الزام دیتے اور ہم سے توبہ کرواتے اور اگر کتاب اللہ اور سُنّتِ رسول اللہ کے موافق ہوتے، تو اُن کو الزام دیتے اور اُن سے توبہ کرواتے۔

شاہزاد خاں نے کہا: "آپ حق فرماتے ہیں اور بے شک میں خطاوار ہوں۔ آپ میری خطا معاف فرمائیں اور بغاوت کا حکم مجھ پر نہ لگائیں"۔ سید صاحبؒ نے فرمایا: "تم نے ہماری کوئی خطا نہیں کی۔ جو کچھ خطا کی، اپنے خدا کی کی۔ یہ ہمارے معاف کرنے سے معاف نہیں ہو سکتی۔ وہ پروردگار تم کو چاہے معاف کرے؛ چاہے، پکڑے۔ اگر تم سچے دل سے توبہ کرتے ہو اور اس قادرِ مطلق کی پکڑ سے ڈرتے ہو، تو اُمید قوی ہے کہ وُہ غفور رحیم بے نیاز تم کو معاف کر دے اور جو فقط ہمارے راضی کرنے کو زبانی توبہ کرتے ہو، تو تم جانو، ہم سے کچھ مطلب نہیں"۔

یہ سُن کر وُہ رونے لگا اور کہا کہ مجھ کو تو سمہ والوں نے دین و دُنیا دونوں سے کھویا۔ اب میرا کہیں ٹھکانا نہیں۔ آپ نے فرمایا کہ اس کا علاج یہی ہے کہ اپنے پروردگار کے سامنے گریہ و زاری کرو اور اس کے غضب سے ڈرو۔ وُہ پروردگار تم پر رحم کرے گا۔ اور جو تم یہ کہتے ہو کہ مجھ کو باغیوں میں شمار نہ کیجیے؛ تو یہ بات ہم نے قبول کی، تم ہمارے فرماں برداروں میں ہو، باغیوں میں نہیں۔ اب ہم یہاں سے جاتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ اپنے کرم سے کوئی مُلک ہم کو عنایت کرے گا، تو انشاء اللہ تعالیٰ جیسے اور مسلمان بھائیوں کے ساتھ سلوک کریں گے، ویسے ہی تمھارے ساتھ بھی سلوک کریں گے۔ اب ہماری طرف سے تم پر یہ حکم ہے کہ اگر ہمارے ہندوستان سے کوئی قافلہ آئے، تو حتی المقدور اُن کے ساتھ سلوک کرنا اور کسی طرح اُن کو

تکلیف نہ دینا اور اگر تم سے ہو سکے، تو اُن کو بحفاظتِ تمام ہمارے پاس پہنچا دینا۔ اللہ تعالیٰ تم کو جزاءِ خیر دے گا۔

سردار فتح خاں کو بھی (جو ابھی تک آپ کے ہمراہ تھا) بڑا پچھتاوا ہُوا کہ سیّد صاحبؒ کے پنجتار میں رہنے کی وجہ سے تمام مُلکِ سَمہ کے خوانین پر میرا بڑا رُعب تھا اور سب خوانین مجھ سے دبتے تھے۔ آپ وہاں سے چلے آئے، اب میں سب کی نظروں میں خفیف ہو جاؤں گا اور میرا سارا رُعب جاتا رہے گا۔ وُہ شاہزاد خاں کے پاس گیا اور اُس سے کہا کہ تم چل کر میری طرف سے عُذر معذرت کر کے سیّد صاحبؒ کو یہاں سے پھیرے چلو۔ اب میری تو جُرأت نہیں پڑتی کہ مَیں ان سے اس معاملے میں کچھ کہوں، کیونکہ پہلے پنجتار میں سیّد بادشاہ نے مجھے ہر طرح سے سمجھایا کہ تم مجھ کو یہاں رہنے کی اجازت دو، تو مَیں یہاں رہوں مگر اُس وقت مَیں نے اپنی بیوقوفی سے اس بات کا اقرار نہیں کیا۔ شاہزاد خاں سیّد صاحبؒ کے پاس آیا اور بہت کچھ عُذر معذرت کر کے آپ سے عرض کی کہ آپ یہاں سے پنجتار تشریف لے چلیں، ہم سب اپنی جان و مال سے آپ کی اطاعت و خدمت کریں گے۔ جس طرح آپ ہم لوگوں پر حکومت کرتے تھے، اسی طرح کریں اور جو احکامِ شریعت ہم پر جاری کریں، وُہ سب ہمیں منظور ہیں، اب کسی طرح کا انکار نہ ہوگا۔

آپ نے فرمایا کہ خان بھائی، اب تم ہم سے اس معاملے میں گفتگو نہ کرو۔ اس کا وقت نکل گیا۔ اتنے برس ہم یہاں رہے اور تم لوگوں کو طرح طرح کے وعظ و نصیحت سے سمجھایا اور تم لوگوں کے درمیان جو تپنہ داری[۱] تھی، اُس کو دفع کر کے سب کو ملایا۔ اسی نیّت سے کہ کچھ خدا کا کام نکلے اور جس مطلب کے لیے ہم ہندوستان سے یہاں آئے، وُہ مطلب پُورا ہو، لیکن آج تک تم لوگوں سے سوائے حیلہ سازی و دغابازی کے ہم نے کچھ نہ دیکھا اور نہ ہماری طرف سے تم لوگوں کا دِل صاف ہُوا۔ پھر اب یہاں رہنے کی کون سی صُورت ہے اور ہدایت اور اتفاق کی تم لوگوں سے کیا اُمید ہے؟ اب ہماری یہ نیّت ہے کہ وہاں چل کر ٹھیریں، جہاں کچھ اللہ تعالیٰ کی رضامندی کا کام نکلے۔

---

[۱] خاندانی جنبہ داری اور عصبیت۔

بادُشمناں مُدارا اس کے بعد آپ نے اپنے آدمیوں سے فرمایا کہ سلو خاں ہمارے واسطے جو گھوڑا لایا ہے، اُسے لاؤ، تو شاہزادخاں کو دے کر رُخصت کریں۔ اُن کو یہ بات ناگوار ہُوئی اور آہستہ سے حضرت سے عرض کی کہ یہ شخص تو بڑا مُفسد اور آپ کا دشمن ہے۔ یہ اس لائق نہیں ہے کہ وُہ عمدہ گھوڑا آپ اُس کو دیں۔ آپ نے فرمایا کہ تم سچ کہتے ہو، مگر اس کو ایسا سمجھو کہ جیسے کوئی کٹکھنے کُتّے کے آگے اُس کے شر سے بچنے کے لیے لُقمہ ڈال دیتا ہے۔

○

اڑتیسواں باب

بڑھیری سے راج دواری تک

مجاہدین کی تروتازگی اور نشاط بڑھیری سے روانگی سے ایک روز پہلے آپ نے لوگوں سے فرمایا: "بھائیو، کل سویرے کوچ ہوگا، ہوشیار ہو رہو اور جن صاحبوں کو کچھ کارِ ضروری ہو، اُس سے فراغت کر لیں۔ اس کے بعد اسی مجلس میں آپ نے بہت دیر تک ہجرت و جہاد کے فضائل اور مجاہدین و شہدا کے بلند مراتب کا بیان کیا۔ یہ وعظ سُن کر حاضرین کے قلوب از سرِ نو تر و تازہ ہو گئے اور وہ سفر کی تکلیفوں کو بھول گئے، جیسے مُرجھائی ہوئی کھیتی پانی دینے سے لہلہا اُٹھے۔

یہاں سادات تختہ بند و نواگئی وغیرہ اور علماء و خوانین کو، جو پنجتار سے ساتھ آئے تھے رُخصت فرمایا۔ فتح خاں اور قابل آخوند زادہ ساتھ رہے۔[1]

اگلے روز نمازِ فجر کے بعد آپ نے لشکر سمیت کوچ فرمایا۔ چار کوس پر ایک ندی بُرنڈو ملی۔ نمازِ ظہر کے بعد اُتر کر اُس کے کنارے ڈیرہ کیا۔ وہاں سے پیواڑ پہاڑ کی چڑھائی شروع ہوتی تھی۔ راستے کی دُشوار گزاری پہاڑ کی چڑھائی بڑی سخت تھی۔ پتھروں پر سنبھال سنبھال کر اور پاؤں جما جما کر چڑھنا پڑتا تھا۔ تمام دن لشکر پہاڑ پر چڑھتا رہا۔ ایک جگہ ایک اُونٹ پھسل کر نیچے گر پڑا اور ایک جگہ

---

[1] منظورہ ص ۱۰۸۹

ایک گھوڑا۔ دونوں کو لوگوں نے اُتر کر ذبح کیا اور ٹکڑے ٹکڑے کرکے اُوپر اُٹھا لائے، پہاڑ عبُور کرکے موضع کرنا میں قیام ہُوا۔ فتح خاں یہاں سے رُخصت ہُوا۔

موضع کابل گرام میں دریائے سندھ سے اُتر کر آپ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے ہم کو بھڑوں کے چھتّے سے سلامت نکالا۔ شکرانہ کی دو رکعت نفل پڑھ لیں، پھر وضو کرکے آپ نے دوگانہ ادا کیا۔ پھر آپ نے لوگوں کی طرف مخاطب ہو کر فرمایا کہ بھائیو، اب اس وقت ہم تم سے کہتے ہیں کہ سمہ میں جو کچھ بلوا و کُشت و خُون ہُوا، یہ سب فتح خاں کی شرارت تھی، اور جو مَیں نے اُس کو خلیفہ کیا اور خلافت نامہ دیا، تو صرف مصلحتِ وقت جان کر، ورنہ وُہ اس قابل نہ تھا اور دُرّانیوں نے ہم سے بل کر پھر ہم سے دغا کی، مگر دوست محمّد خاں بہت اچھا رہا۔ اُس نے نہ بہت دوستی کی اور نہ دشمنی۔ اُس کی طرف سے ہم کو کوئی شکایت نہیں اور بلوے کے بعد جو ہمارے بعض غازی بھائی کہتے تھے کہ ہم کو اجازت دیجیے، تو ہم ان سے اپنے بھائیوں کا بدلہ لیں، ہم نے اُن کو منع کیا اور اس کا سبب یہ تھا کہ ہم نے وُہ تمام معاملہ اپنے پروردگار کے سپُرد کر دیا تھا، وُہی خُوب اُن سے ہمارے بھائیوں کا بدلہ لے گا۔ ہم لوگ تو اپنے گھر سے یہ نیّت کرکے نکلے ہیں کہ اپنی جانوں کو اللہ تعالیٰ کی رضامندی میں صرف کریں گے، باغیوں کے ہاتھ سے مارے گئے یا کافروں کے ہاتھ سے، ہمارا مطلب دونوں صُورت میں حاصل ہے۔

اللہ کا شکر پہاڑ کے دامن میں آپ کے حُکم سے مُجاہدین نے الاؤ جلایا۔ سردی بہت تھی نمازِ مغرب کے بعد آپ بھی اس الاؤ پر تشریف لائے اور کھڑے کھڑے ہاتھ پیر سینکنے لگے، اور ارباب بہرام خاں کی طرف مخاطب ہو کر فرمانے لگے کہ خان بھائی، اَلْحَمْدُ لِلّٰہ! پروردگار کی ہم لوگوں پر کیا عنایت ہے! اگر ہم کسی امیر یا بادشاہ کے نوکر ہوتے اور وُہ ہم کو اپنی کسی مہم پر ایسے کوہستان میں بھیجتا، تو طمعِ دُنیا سے بالضرور جانا پڑتا اور سفر کی مُصیبت اُٹھانی پڑتی اور انجام اس کا سوائے مشقّت کے اور کچھ نہ تھا۔ آج ہم لوگ نہ کسی کے نوکر، نہ چاکر، صرف اپنے پروردگار کی رضامندی کو ایسے سخت راستے میں آئے ہیں اور جہاں پروردگار لے جائے گا، وہاں جائیں گے اور تمام صحابہ و

تابعین رضی اللہ عنہم اجمعین جو درجاتِ عالیات کو پہنچے، سو ایسی ہی محنت و مشقّت راہِ خدا میں اٹھا کر پہنچے ہیں۔ اللہ تعالیٰ ہم لوگوں کو بھی ان صاحبوں کی اتّباع نصیب کرے اور ہم سے راضی ہو! اسی طرح اور بہت سی باتیں آپ نے فرمائیں۔ اکثر لوگ رقّت سے آبدیدہ تھے اور سب پر ایک کیفیت طاری تھی۔

موضع راج دواری میں قیام | موضع تاکوٹ میں، جو ناصر خاں کی حکومت کا علاقہ تھا، آٹھ نو روز رہنے کا اتفاق ہُوا۔ کیونکہ برف پڑنے کا موسم قریب تھا۔ ناصر خاں نے ضلع کے ممتاز لوگوں سے مشورہ کر کے تجویز کیا کہ اس عرصے میں موضع راج دواری میں قیام کیا جائے، کیونکہ وُہ بستی مرکزی جگہ پر تھی۔ کئی پنچکیاں بھی تھیں اور ایندھن پانی کی بھی بہت افراط تھی۔ وہاں کی رعایا کو اور بستیوں میں گھر بتا دیے گئے تھے اور راج دواری کو مجاہدین کے لیے خالی کر دیا گیا۔ آپ وہاں مع لشکر مقیم ہُوئے۔ ایک مکان، جو مسجد کے قریب تھا، آپ کے قیام کے لیے تجویز ہُوا۔ یہ شعبان کا مہینہ اور ۱۲۴۶ھ تھا۔

دو سرداروں کی مصالحت | ایک روز حبیب اللہ خاں[1]، جو سعادت خاں کا بیٹا تھا، راج دواری میں آپ سے ملنے آیا۔ اُس کی گڑھی بالاکوٹ اور مظفرآباد کے درمیان واقع تھی۔ سکھوں نے وُہ گڑھی چھین لی تھی اور خانِ ممدوح وہاں سے جلاوطن تھا۔ حبیب اللہ خاں کے باپ نے ناصر خاں کے کسی عزیز کو مار ڈالا تھا۔ اس سبب سے ان دونوں کے درمیان تپنہ داری تھی۔ ناصر خاں نے سیّد صاحبؒ سے اپنی تپنہ داری کا شکوہ کیا اور کہا کہ مجھ سے اور حبیب اللہ خاں سے عداوت ہے۔ آپ نے ناصر خاں کو سمجھایا اور فرمایا کہ خان بھائی، ہم یہاں جہاد فی سبیل اللہ کے انتظام کے واسطے آئے ہیں۔ ہماری یہ نیّت ہے کہ سب مسلمان بھائیوں کو، جس صورت سے ہو سکے، متفق کر کے سکھوں سے جہاد کریں اور تم اپنی نااتفاقی کا گلہ کرتے ہو! تم کو چاہیے کہ آپس کی عداوت کو دُور کرو اور للہ فی اللہ حبیب اللہ خاں سے مل جاؤ کہ کچھ دین کا کام نکلے۔ ناصر خاں نے جواب دیا کہ مَیں تو آپ کا فرماں بردار خادم ہُوں۔ جو کچھ مجھ کو ارشاد ہو گا، بلا انکار بجا لاؤں گا۔

---

[1] مشہور گڑھی حبیب اللہ اسی کی طرف منسوب ہے۔

پھر آپ نے حبیب اللہ خاں کو تنہائی میں سمجھایا اور ملنے پر راضی کیا اور نمازِ عصر کے بعد دونوں صاحبوں کو اپنے پاس بُلا کر بٹھایا اور دونوں کو ہاتھ پکڑ کر ملایا۔ دونوں اُٹھ کر کشادہ پیشانی کے ساتھ بغلگیر ہُوئے۔ یہ دونوں سردار اِس مُلک کے بڑے نامی رُکن تھے۔ باقی جو چھوٹے چھوٹے رئیس تھے، وہ اُن کے حکم پر تھے۔

لشکر کے کھانے کا انتظام سیّد صاحبؒ نے ناصر خاں اور حبیب اللہ خاں سے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے فضل و کرم سے آپ دونوں کے درمیان کی عداوت اور خصومت دُور فرمائی، اب کوئی ایسی راہ نکالیے کہ کچھ جہاد کا کاروبار شروع ہو۔ دُوسری بات یہ ہے کہ ہم لوگ ابھی اِس مُلک میں نووارد ہیں۔ یہاں چال ڈھال اور گاؤں بستی سے واقف نہیں ہیں اور کھانے کی تدبیر کرنی بھی ضرور ہے ہم یہ چاہتے ہیں کہ نقد روپیہ تو ہم سے لیجیے اور بازار کے نرخ کے موافق اپنی کوشش اور انتظام سے غلّہ بھجوا دیا کیجیے اور جتنے آدمیوں کی ضرورت ہو، وُہ ہم سے لے لیا کیجیے۔" انھوں نے اس کو منظور کیا۔ آپ نے دُعاءِ خیر کر کے مجلس برخاست کی۔ اس دن سے انھیں دونوں صاحبوں کی معرفت لشکر کے خرچ کے لیے اس نواح کی بستیوں سے غلّہ آنے لگا۔

سُمّہ کا عبرتناک انجام راج دواری میں ضلع ٹوپی کے آخوند بہار الدین نے وطن سے آکر بیان کیا کہ آپ کے تشریف لانے کے بعد مُلک سُمّہ والوں کی بڑی بڑی خرابیاں و بے عزتیاں ہوئیں۔ جب آپ نے پنجتار سے کُوچ کیا اور اس طرف کو روانہ ہُوئے، اس کے کئی روز کے بعد ہری سنگھ بیس پچیس ہزار فوج کے ساتھ دریائے سندھ اُتر کر سُمّہ میں آیا اور جن بستیوں کے لوگوں نے آپ کے ساتھ بغاوت کر کے غازیوں کو قتل کیا تھا، ان سب کو بُلا کر یہ سوال کیا کہ تم سب خالصہ رنجیت سنگھ کی رعیت تھے اور ہمیشہ سے تم خالصہ کو تحفے تحائف دیا کرتے تھے، کئی برس سے خلیفہ صاحب یہاں آکر تم پر حاکم، اور تم اُن کی رعیت ہُوئے اور اُن کو تم سب نے اپنا امام بنایا، پھر اُن سے بغاوت کر کے اُن کے غازیوں کو قتل کیا اور اُن کے ہتھیار وغیرہ لُوٹ کر اپنے گھر میں رکھ لیے۔ خلیفہ صاحب یہاں سے کُوچ کر گئے۔ اب پھر تم سب خالصہ کی رعیت ہو۔ بدستورِ سابق جو سالیانہ تم دیا کرتے تھے، وُہ دیا کرو اور

جو خلیفہ صاحب کے غازیوں کے ہتھیار وغیرہ تم نے لے لیے ہیں، وُہ ہم کو دے دو۔ اُن کا مالک خالصہ ہے، وُہ تم کو ہضم نہ ہوں گے۔

اس کے جواب میں اُن لوگوں نے عُذر و حیلہ کیا کہ ہمارے پاس اُن کا کچھ مال و اسباب نہیں ہے۔ اس میں گفتگو بڑھ گئی۔ ہری سنگھ نے اپنے لشکر کو اشارہ کیا کہ ان کے گھر بار لُوٹ لو۔ انھوں نے اُن کا مال و اسباب گھروں میں گھُس کر لُوٹا اور اکثر آدمیوں کی بیویوں اور بیٹیوں کو بھی پکڑ لیا اور ہری سنگھ کے پاس لے گئے۔ کچھ لوگوں نے اس سے جا کر کہا کہ ہم سیّد بادشاہ کے باغیوں میں نہیں ہیں اور نہ اُن کے غازیوں کو ہم نے لُوٹا مارا ہے۔ ہمارا مال و اسباب تمھارے سپاہیوں نے کیوں لُوٹا اور ہماری عورتوں کو کیوں یہ لوگ پکڑ لائے؟ ہری سنگھ نے اس بات کو لوگوں سے تحقیق کر کے مال و اسباب واپس کر دیا اور اُن کی عورتیں بھی اُن کے حوالے کیں اور باقی کو اپنے ساتھ لے کر مع لشکر دریائے سندھ اُتر کر چلا گیا۔[۱]

اہلِ سمہ کو جواب مولوی سیّد جعفر علی صاحب لکھتے ہیں:

"سمہ کے کچھ لوگ بھاگ کر آپ کے پاس آئے اور راستے میں ملے اور واپس چلنے کے لیے سخت اصرار کیا۔ آپ نے قبول نہیں فرمایا کہ لَا يُلْدَغُ الْمُؤْمِنُ مِنْ جُحْرٍ مَّرَّتَيْنِ (مومن سانپ کے سُوراخ سے دو مرتبہ ڈسا نہیں جاتا)۔ وُہ لوگ آپ کے ساتھ ساتھ رہے اور اُن کا اصرار بڑھتا رہا۔ موضع راج دواری میں پہنچ کر آپ نے اُن سے اتنا فرمایا: "جاؤ اور اپنے جلے ہُوئے مکانات کو درست کرو"۔[۲]

صاحبزادی کا تولّد ماہ شعبان ۱۲۴۶ھ کی تیسری شب کو آپ کے یہاں صاحبزادی کی ولادت ہُوئی۔ آپ نے حاضرین کی طرف مخاطب ہو کر فرمایا کہ ہم پنجتار سے ہجرت کر کے آئے ہیں اس سبب سے ہم نے نام اُس کا ہاجرہ رکھا۔ میاں جی چشتی نے آپ کے حکم سے جا کر اُن کے کان میں اذان

---

[۱] محمد امیر خاں قصوری نے اپنا چشم دید واقعہ بیان کیا ہے کہ اُنھوں نے سمہ کی متعدد عورتوں کو لاہور کے بازار میں طوائف کی حیثیت سے دیکھا ہے۔

[۲] منظورہ صفحہ ۱۰۹۴

کی اور ساتویں روز عقیقہ ہُوا۔

درون کا انتظام ایک روز آپ نے ناصر خاں و حبیب اللہ خاں وغیرہ خوانین سے، جو وہاں موجود تھے، فرمایا کہ بھائیو، ہم لوگ پنجتار سے جہاد کے انتظام کے لیے تم صاحبوں کے بلانے پر یہاں آئے ہیں۔ اتنے دن تم صاحبوں کی ضیافتیں اور مہمانیاں کھالیں۔ اب کوئی ایسی راہ نکالو کہ کچھ کام جہاد کا جاری ہو۔ بیکار بیٹھے بیٹھے طبیعت گھبراتی ہے۔

ان صاحبوں نے درون کے خوانین کا جرگہ کیا اور مشورہ کیا کہ سکھوں کی تحصیل کے دن قریب ہیں۔ اُن کے آنے سے پہلے اگر دو تین درون کے دہانے پر تھوڑا تھوڑا لشکر متعین کر دیا جائے، تو درون کے اندر کی رعایا قابو میں آجائے۔ ان سے سکھ ظلم و تعدّی کرکے دو چند، سہ چند محاصل لیتے ہیں۔ اگر سید بادشاہ کے لوگ اُن کو قابو میں لاکر اُن پر عُشر مقرر کریں گے، تو اُن پر گرانی نہ ہوگی اور وہ سید بادشاہ کی اطاعت اور اعانت منظور کریں گے۔ پھر جب اِدھر سے سکھوں کا لشکر آئیگا، اس وقت انشاء اللہ اس نواح کے ہم سب مسلمان سید بادشاہ کے شریک ہوکر ان سے نبٹ لیں گے۔

سید صاحب نے یہ سُن کر فرمایا کہ عُشر کا انتظام تمھارے ہی ذمے ہے۔ ایسا کرنا کہ رعایا پر کسی طرح کی زیادتی نہ ہونے پائے کہ اُن کو ہم لوگوں کی حکومت ناگوار گزرے۔ اس بات سے ہم راضی نہیں ہیں۔

دوسرے یا تیسرے روز آپ نے مولانا محمد اسمٰعیل صاحب کی امارت اور مولوی خیر الدین صاحب شیرکوٹی کی ہمراہی میں درون کو روکنے کے لیے لشکر بھیج دیا اور تھوڑا سا لشکر راج دواری میں اپنے پاس رکھا۔ مولانا نے پچاس ساٹھ آدمی اپنے پاس رکھ کر باقی لشکر پر مولوی خیر الدین صاحب کو امیر کرکے بھوگڑمنگ کی طرف روانہ کر دیا اور آپ موضع بچون میں داخل ہوئے۔

بیعت صُفّہ راج دواری میں اکثر غازیوں نے آپ کے ہاتھ پر اصحاب صُفّہ کی بیعت کی۔ اس بیعت میں عہد و پیمان یہ تھا کہ اپنی چھوٹی بڑی سب حاجتوں کو سوائے خدا کے کسی سے نہ طلب کریں گے اور جو بات اپنے حق میں معیوب و مکروہ جانیں گے، وہ اور کسی مسلمان بھائی کو نہ کہیں گے اور اپنی

ضرورت پر مسلمان بھائی کی ضرورت کو مقدم رکھیں گے اور جو چیز اپنے نفس کے لیے پسند کریں گے، وُہی اور مسلمانوں کے واسطے بھی پسند کریں گے اور جو کام کریں گے، وُہ پروردگار کی رضامندی کے واسطے کریں گے، اپنے نفس کی خواہش کا کام نہ کریں گے۔

میاں خدا بخش رامپوری کہتے ہیں کہ مولانا محمد اسمٰعیل صاحب کے ہمراہ جانے کو میرا نام بھی لکھا گیا تھا۔ میرے چھوٹے بھائی الٰہی بخش نے مجھ سے کہا کہ بھائی، زندگی و موت خدا کے اختیار میں ہے۔ اب تم حضرت امیر المومنین سے جُدا ہو گے، پھر دیکھا چاہیے کہ اللہ تعالےٰ کب ملائے۔ سو جیسے اور بھائیوں نے اصحابِ صُفّہ کی بیعت کی ہے، تم بھی کر لو۔ مَیں نے کہا کہ ہاں، تم اچھی بات کہتے ہو، مگر میرے نہ کرنے کا سبب یہ ہے کہ مَیں اس بیعت کا حال ابھی تک نہیں سمجھا ہوں، اور سمجھ بوجھ کر کام کرنا اچھا ہوتا ہے۔ اگر کوئی بھائی مجھ کو سمجھا دیں، تو پھر مَیں بھی کر لُوں۔ انھوں نے کہا کہ اس وقت تک تو اس کا حال معلوم کرنا ممکن نہیں، اس وقت بیعت کر لو، پھر کبھی کسی صاحب سے پوچھ کر دل بھی کر لینا، کیونکہ یہ تو جانتے ہی ہو کہ یہ بات کچھ تو بہتر ہے، جو سید صاحبؒ کے خاص لوگوں نے بیعت کی ہے۔

یہ بات میرے خیال میں بھی آ گئی۔ مَیں نے آپ کی خدمت میں جا کر عرض کی کہ آپ نے مجھ کو مولانا صاحب کے ہمراہیوں میں لکھوایا ہے، اب دیکھیے، کب اللہ تعالیٰ آپ کے دیدار سے مشرف کرے۔ اس وقت مَیں آپ کے پاس اس لیے آیا ہوں کہ اصحابِ صُفّہ کی بیعت میں تبرکاً مَیں بھی شریک ہوں، اگرچہ مَیں اس کے حال سے بخوبی واقف نہیں ہُوں اور نہ اپنے میں اس قدر حوصلہ و جُرأت دیکھتا ہوں کہ اس بارِ گراں کو اُٹھاؤں، مگر تائیدِ الٰہی کے ساتھ میری مثال اس امر میں ایسی ہے، جیسے حضرت یوسف علیٰ نبینا وعلیہ السلام کی خریداری کو ایک بڑھیا سُوت کی انٹی لے کر گئی تھی۔ لوگوں نے اس سے کہا کہ بڑے بڑے خریدار لاکھوں روپیہ دینے کو موجود ہیں، تجھ کو وہاں کون پوچھے گا؟ اس نے کہا کہ یہ بات مَیں بھی جانتی ہوں کہ مَیں وہاں کس گنتی میں ہوں لیکن خریداروں میں تو شمار ہُوں گی۔ سو حضرت، آپ میرے واسطے دُعا کریں کہ اللہ تعالےٰ مجھ کو اس بیعت پر تا دمِ مرگ

ثابت قدم رکھے۔

حضرت نے فرمایا کہ تم سچ کہتے ہو۔ میرا بھی یہی حال ہے کہ مجھ کو اپنے نفس پر اعتماد نہیں مگر پروردگار کی تائید کے ساتھ۔ تم میرے واسطے بھی دُعا کرو کہ مجھ کو اللہ تعالیٰ ثابت رکھے۔ پھر آپ نے میرا ہاتھ پکڑا اور مجھ سے بیعت لی اور دُعا کر کے مجھ کو رخصت کیا۔

○

اُنتالیسواں باب

لشکرِ مجاہدین
بالاکوٹ، سچوں اور مظفر آباد میں

بالاکوٹ کا انتخاب اس زمانے میں پکھلی اور وادیٔ کاغان کے رُؤسا، اور اہلِ علاقہ کی امارت و ریاست کچھ تو سکھوں کے حملوں اور تعدیوں سے، اور کچھ آپس کی ناچاقیوں اور خانہ جنگیوں سے تزلزل میں تھی۔ بعض اہلِ ریاست اپنی ریاستوں سے جلا وطن اور معزول تھے۔ سُلطان نجف خاں اپنے چچیرے بھائی سلطان زبردست خاں کو سکھوں کی حمایت سے گڑھی مظفر آباد سے شہر بدر کرکے گڑھی پر قابض تھا۔ اسی نام کا ایک دُوسرا سردار سُلطان نجف خاں گھوڑی والا اپنے مرکزِ ریاست سے جلا وطن کوہ درابہ میں مقیم تھا۔ راجہ مظفر خاں اپنے بھائی راجہ منصور خاں والیٔ مُلکِ درابہ کے خوف سے بھاگا ہُوا تھا۔ حبیب اللہ خاں (گڑھی حبیب اللہ) سکھوں کے خوف سے اپنی گڑھی چھوڑ کر بالاکوٹ کے درے میں پناہ گزین تھا۔ یہ سب سیّد صاحبؒ کی اعانت کے طالب تھے۔ کشمیر جانے والے راستے میں ان خوانین اور سرداروں کی ریاستیں اور علاقے پڑتے تھے۔ ان کے ساتھ دینے اور مطمئن ہونے سے کشمیر کا راستہ بھی محفوظ ہو جاتا تھا اور کشمیر پر قبضہ کرنا بھی آسان ہو جاتا تھا۔

ان سب کو مدد دینے اور ان کی حمایت اور فوجی قوت حاصل کرنے اور کشمیر کی طرف بڑھنے کی تیاری کرنے کے لیے سب سے موزوں مقام بالاکوٹ تھا۔ اس لیے آپ نے مولوی خیر الدین صاحب

اور مولانا محمد اسمٰعیل صاحب کو بالاکوٹ بھیجنے کی تجویز کی۔

مولانا محمد اسمٰعیل صاحب کو اس کا اندازہ تھا۔ اس لیے انھوں نے مولوی خیرالدین صاحب کو لکھا کہ آپ اپنے لوگوں کے ساتھ تیار رہیے؛ اغلب ہے کہ دو تین روز کے اندر آپ کے لیے امیرالمومنین کی طرف سے بالاکوٹ جانے کا حکم آنے والا ہے۔ چنانچہ تیسرے ہی روز (۲۷ شعبان ۱۲۴۶ھ کو) مولانا کا حکم پہنچا کہ آپ لشکر کے ساتھ بالاکوٹ چلیے۔ آپ کے تین چار روز کے بعد ہم بھی آئیں گے۔

مولوی خیرالدین صاحب بالاکوٹ میں

بالاکوٹ پہنچنے کا حکم مولوی صاحب کے پاس دو پہر کو آیا تھا۔ اس رات کو برف پڑی تھی، لیکن مولوی صاحب نے اس بات کا کچھ خیال نہ کر کے اسی روز بھوگڑمنگ سے بالاکوٹ کی طرف کوچ کیا۔ اگرچہ بالاکوٹ وہاں سے تین ہی کوس کے قریب تھا، مگر برف کے پہاڑوں کے چڑھنے اُترنے میں لوگوں کو بہت تکلیف ہوئی۔ چار گھڑی رات گئے فضلِ الٰہی سے صحیح سلامت بالاکوٹ میں داخل ہو گئے۔

مظفرآباد پر حملے کا مشورہ اور مولوی خیرالدین صاحب کا انکار

مولوی خیرالدین صاحب کے بالاکوٹ پہنچنے کے بعد ان سب رئیسوں نے جو اپنی ریاستوں سے بے دخل یا اپنے بھائیوں سے خائف اور بر سرِ جنگ تھے، دریائے کنہار کے کنارے، جو بالاکوٹ کے نیچے بہتا ہے، آ کر مولوی خیرالدین صاحب کو پیغام دیا کہ ہم بالاکوٹ نہیں آسکتے۔ اگر آپ دریا کے اس پار تکلیف فرمائیں، تو ہم آپ سے کچھ رازدارانہ بات کہیں۔ مولوی صاحب تشریف لے گئے۔ انھوں نے آپ کے آنے پر بڑی مسرت کا اظہار کیا اور کہا کہ سلطان نجف خاں والیِ مظفرآباد شیر سنگھ کے ساتھ پشاور کی طرف گیا ہوا ہے۔ مظفرآباد خالی پڑا ہے سوائے ۸۰۰ آدمیوں کے جن کا دریا کے اوپر گڑھی میں تھانہ ہے۔ کوئی اور نہیں ہے۔ لشکرِ اسلام کے آنے کی خبر ہی سے وہ بھاگ جائیں گے۔ بالفرض اگر مقابلے کی نوبت بھی آئے گی، تو ہم کافی ہوں گے۔ غازیوں کا لشکر محض برکت کے لیے ہوگا۔ جس وقت مظفرآباد پر ہمارا قبضہ ہو جائے گا، ہم سب اپنی اپنی ریاستوں میں داخل و متصرف ہو جائیں گے۔ اُس وقت امیرالمومنین کو بھی بلا دغدغہ راج دواری سے بُلا کر مظفرآباد میں بٹھا دیں گے، پھر کشمیر کو فتح کرنے کی طرف رُخ کریں گے۔ جس وقت سُلطان نجف خاں اور شیر سنگھ

پشاور سے واپس آجائیں گے۔ اُس وقت مظفر آباد کا فتح کرنا دُشوار ہوگا۔

مولوی خیر الدین صاحب نے یہ بات سُن کر فرمایا کہ ہم کو حضرت امیر المومنین نے اسی قدر حُکم دیا ہے کہ ہم بالاکوٹ میں قیام کریں۔ مولانا محمد اسمٰعیل صاحب پیچھے سے آتے ہیں۔ مَیں تو مولانا کا فرمانبردار ہوں، خود مختار نہیں۔ دوسری بات یہ ہے کہ حضرت امیر المومنین اس مُلک میں تازہ وارد ہیں یہاں کے اُمراء و خوانین کے حالات ابھی اُن کو پُورے طور سے معلوم نہیں۔ اُن سے ملنے اور اُن کے حالات دریافت کرنے کے بعد جیسا مناسب سمجھیں گے، عمل کریں گے۔ آپ لوگوں نے بھی ابھی تک جناب ممدوح کی نہ تو زیارت کی ہے اور نہ ہماری نیّت اور مقاصد سے واقف ہیں شاید آپ ہم کو بھی اپنی طرح جاہ و حشمتِ دُنیا کا طالب سمجھتے ہیں۔ اس وقت آپ کے لیے مناسب یہی ہے کہ آپ امیر المومنین کی خدمت میں حاضر ہو جائیں اور اپنے حالات اور مقاصد کو آپ کے سامنے پیش کریں، اس کے بعد اپنی رفاقت کی درخواست کریں۔

ان رؤسا نے سیّد صاحبؒ کے پاس جانے کی مشکلات اور معاملے کی طوالت اور اپنے اہل و عیال کے غیر محفوظ رہ جانے کا عُذر کیا۔ مولوی صاحب نے ہر بات کا معقول جواب دیا۔ یہ بھی فرمایا کہ ہمارے پاس اتنا لشکر بھی نہیں ہے کہ نصف ہم بالاکوٹ میں چھوڑیں اور نصف مظفر آباد میں۔ انھوں نے کہا کہ ہمیں آپ کے غازیوں کی شرکت برائے نام چاہیے، مقابلہ تو ہم خود کریں گے۔ مولوی صاحب نے فرمایا کہ مَیں اس خوش گمانی میں مُبتلا نہیں ہو سکتا۔ اگر آپ میں ایسی ہی ہمّت اور جُرأت ہوتی، تو آپ کیوں اپنے اپنے مقامات چھوڑنے پر مجبور ہوتے۔ ہم پانچ سال سے اسی طرح کے معاملات دیکھ رہے ہیں ہمیں آپ کے مُلک کا خُوب تجربہ ہے۔ تین روز تک اسی طرح گفتگو رہی، لیکن مولوی صاحب مظفر آباد پر حملہ کرنے کے لیے تیار نہ ہُوئے۔[1]

سکھوں کے زیرِ حکومت بستیوں کو لُوٹنے سے احتراز

مولوی خیر الدین صاحب کے بالاکوٹ روانہ ہونے کے بعد مولانا محمد اسمٰعیل صاحب نے موضع سچون سے کُوچ کر کے بھوگڑمنگ میں قیام کیا۔ وہاں کئی قندھاریوں نے مولانا صاحب سے عرض کیا کہ اگر اجازت ہو، تو اُس درے کے باہر ضلع پکھلی کی جو بستیاں سکھوں کی عملداری میں ہیں، اُن میں سے دو ایک لُوٹ لائیں۔ مولانا صاحب نے فرمایا کہ ہاں،

---

[1] منظورہ ص ١١١٦، ص ١١١٧

کفار کی بستیاں غازیوں کو لُوٹنی درست تو ہیں، مگر اس میں ایک نکتہ ہے۔ وُہ یہ ہے کہ ان بستیوں کی رعایا مسلمان ہے۔ وُہ کُفّار کے غلبے کی وجہ سے اُن کے محکوم ہو گئے ہیں۔ جب اللہ تعالیٰ اہلِ اسلام کو غلبہ دے گا، تو وُہ اُن کے محکوم ہو جائیں گے۔ اگر آج اُن کو لُوٹو مارو گے، تو وُہ لوگ اس کو سند بنالیں گے کہ مُسلمانوں کو مُسلمانوں کا لُوٹنا درست ہے۔ سیّد بادشاہ کے غازیوں نے ہماری بستیوں کو لُوٹا تھا۔ پھر یہ بھی اپنے مُلک میں لُوٹ مار کیا کریں گے اور اُن کی یہ عادت نہ چھُوٹے گی، جیسے عرب کے بدوؤں میں اسلام کے باوجود لُوٹ مار کی عادت جاری ہے اور کسی طرح نہیں چھُوٹتی۔ بہتر یہ ہے کہ تم ایسا کام نہ کرو کہ اوروں کو دستاویز ہو جائے۔ قندھاری آپ کی یہ تقریر سُن کر اپنے ارادے سے باز آ گئے۔

مولانا محمد اسمٰعیل صاحب بالاکوٹ کو مولانا محمد اسمٰعیل صاحب نے بھوگڑمنگ سے روانہ ہو کر ایک گاؤں میں کچھ دیر توقف فرمایا۔ وہاں لوگوں نے مشورہ دیا کہ اگر مزید توقف کیا گیا، تو برف ریزی کی شدّت سے بالاکوٹ کا راستہ بالکل مسدود ہو جائے گا اور ایک مہینے کے قریب انتظار کرنا پڑے گا۔ یہ سُن کر مولانا نے کُوچ کا فیصلہ فرمایا۔

ہمراہیوں کے ساتھ دوپہر کے قریب بھوگڑمنگ سے بالاکوٹ کی طرف روانہ ہُوئے۔ چلتے چلتے پہاڑ کی چڑھائی آئی۔ وہاں کئی چشمے جاری تھے۔ ظہر کا وقت ہُوا۔ سب نے وضو کر کے وہیں نماز پڑھی۔ پھر قطار باندھ کر پہاڑ پر چڑھنے لگے۔ تمام پہاڑ برف کے مارے سفید بلّور سا نظر آتا تھا۔ سب کے آگے ناصر خاں چند گوجروں کے ساتھ چل رہے تھے۔ گوجر پیال کی چپّل پاؤں میں پہنے برف پر چلتے تھے۔ ان کے چلنے سے برف پر نشان سا بنتا جاتا تھا۔ اسی نشان پر سب آگے پیچھے چل رہے تھے۔ اس عرصے میں ابر آ گیا اور برف برسنے لگی۔ عصر اخیر کو برف برسنی موقوف ہُوئی اور آفتاب نظر آیا۔ اسی وقت لوگوں نے جلد جلد اسی برف سے وضو کر کے جس نے جہاں موقع پایا، وہاں نماز پڑھی۔ کسی نے اکیلے، کسی نے جماعت سے۔ کسی نے پہاڑ کی چوٹی پر مغرب کی نماز پڑھی، کسی نے درے میں۔ اُسی وقت لوگوں نے رمضان المبارک کا چاند دیکھا۔

راستہ کی دُشوار گزاری اور مُجاہدین کی جاں سپاری وہاں سے پہاڑ کا اُتار شروع ہُوا۔ برف کی کثرت سے

پہاڑ کا نشیب و فراز برابر ہو گیا تھا، راستے کا پتہ نشان نہیں معلوم ہوتا تھا، سب لوگ اٹکل سے چل رہے تھے اور جا بجا ایک دوسرے پر پھسل پھسل کر گرتے تھے۔ اس وقت تکلیف کے مارے لوگ اپنی زندگی سے تنگ تھے۔ جو دو چار بار پھسل کر گرا، اس میں چلنے کی طاقت نہ رہی۔ باربرداری کے جو چند خچر گولی بارود وغیرہ سے لدے ہوئے تھے، وہ بھی لوگوں سے چھوٹ گئے۔ اس اثنا میں کئی آدمیوں نے پکار کر آواز دی کہ مولانا محمد اسمٰعیل صاحب گر گئے۔ یہ سن کر تمام لوگ مارے غم کے رونے لگے۔ دامن کوہ میں جا بجا چند گھر گوجروں کے تھے۔ ناصر خاں کے ساتھی گوجروں نے اپنی بولی میں گوجروں کو پکارا کہ جلد دوڑو غازی لوگ برف میں گر گئے۔ ان کو اٹھاؤ۔

اسی وقت وُہ تمام گوجر اپنے اپنے گھر سے ایک ایک کلہاڑی اور چیڑ کی ایک ایک لکڑی مشعل کی طرح جلا کر دوڑے۔ اُن میں سے ایک گوجر نے مولانا محمد اسمٰعیل صاحب کو اپنی پشت پر چڑھا لیا۔ مولانا صاحب نے اور گوجروں سے فرمایا کہ اوپر اور بہت غازی بھائی گرے پڑے ہیں۔ اُن کو سنبھالو۔ انھوں نے جا کر اُن کو اپنی پشت پر سوار کیا اور وہاں سے اُتار کر اپنے گھروں میں لائے اور بہت غازی لوگ نہ آسکے۔ وُہ اسی پہاڑ پر برف میں پڑے رہے۔ گوجروں نے اُن کے نزدیک آگ جلائی تھی اور اُن سے کہ دیا تھا کہ خبردار آگ کے نزدیک نہ جانا، دُور ہی سے دیکھنا۔ جن کو اپنے گھروں میں لے گئے تھے، اُن کے نزدیک بھی آگ جلا کر کہ دیا کہ آگ کے پاس نہ جانا، نہیں تو ہلاک ہو جاؤ گے۔ پھر اُن گوجروں نے غازیوں کو گرم گرم دُودھ پلایا اور اُسی وقت کئی بکرے ذبح کیے اور اُن کا گوشت بھون کر دو دو، تین تین تکّے تقسیم کیے اور کہا کہ اس وقت تمھاری یہی دوا ہے۔

مولوی جعفر علی صاحب اپنی سرگزشت بیان کرتے ہیں کہ ہم نے عصر کی نماز پہاڑ کے نیچے ادا کی۔ برف پتھروں کے اوپر سے بہ رہی تھی۔ شام کے قریب چڑھنے کی نوبت آئی۔ برف کی کثرت سے سارا پہاڑ اور درخت سپید تھے۔ اونچا نیچا کچھ معلوم نہیں ہوتا تھا۔ رہبر آگے آگے چلتا تھا اور تمام لشکر اس کے پیچھے پیچھے۔ مغرب کی نماز کا وقت کسی کو پہاڑ کے اُوپر، کسی کو کمرِ کوہ میں آگیا۔ کسی نے اشارے سے نماز ادا کی، کسی نے اور طرح سے۔ لشکر قطار باندھے ہوئے چلا جا رہا تھا۔ ایک آگے، ایک پیچھے

چل رہا تھا جیسے تسبیح کے دانے ہوتے ہیں۔ آگے کا آدمی جس جگہ قدم رکھتا تھا، پیچھے والا اسی پر قدم رکھے ہُوئے چلتا تھا۔ دائیں بائیں کسی طرف پاؤں نہیں رکھتا تھا کہ مبادا کوئی گڑھا ہو یا اندر سے زمین خالی ہو اور وُہ اس میں غرق ہو جائے۔

جب پہاڑ کی چوٹی سے نیچے اُترنا ہُوا، تو اَور زیادہ دُشواری محسوس ہُوئی۔ کہیں کہیں تو ایسی نوبت آئی کہ سر نیچے پاؤں اُوپر کرکے اُترنا پڑا۔ ہاتھ پاؤں درد کرنے لگے اور ہاتھ پاؤں میں کثرت سے کانٹے چبھ گئے، لیکن سردی کی شدّت کی وجہ سے تمام بدن ایسا سُن ہو گیا تھا کہ کانٹوں کے چبھنے کی تکلیف محسوس نہیں ہوتی تھی۔ بدن کے بیرونی حصّے میں سردی سے تکلیف محسوس ہوتی تھی اور سینے اور پیٹھ میں رُوئی کا لباس پہنے ہُوئے ہونے کی وجہ سے پسینہ تھا، سانس پھُولنے کی وجہ سے زبان سے بات نہیں نکلتی تھی، ہر شخص ہر سانس کو دمِ واپسیں سمجھتا تھا۔ اِس لیے کرتے وقت کلمۂ توحید اور اللہ کا نام وِردِ زبان ہوتا تھا۔[1]

جو لوگ مولانا اسمٰعیل صاحب کے پاس تھے، اُنھوں نے پوچھا کہ کل صبح کو پہلا روزہ ہے۔ ہمارے واسطے آپ کیا فرماتے ہیں؟ مولانا صاحب نے فرمایا کہ ہم لوگ مسافر ہیں، مسافروں پر روزہ رکھنا فرض نہیں ہے۔ جہاں مقیم ہوں گے، دیکھا جائے گا۔ صبح لوگوں نے وضو کرکے نماز پڑھی اور سب لوگ جا بجا سے آکر مولانا صاحب کے پاس اکٹھے ہُوئے۔ مولانا نے گوجروں سے فرمایا: جو غازی لوگ پہاڑ پر رہ گئے ہیں، اُن کو بھی لاؤ۔ ہم آج مٹی کوٹ میں مقام کریں گے۔

اگلے روز کچھ دن چڑھے وہاں سے کُوچ ہُوا۔ پانچ چھ گھڑی دن چڑھے مع الخیر سب لوگ بالاکوٹ میں داخل ہو گئے اور مولوی خیرالدین صاحب ان کے ہمراہیوں سے ملے۔ اس روز شام کو مولانا صاحب نے اپنے سب ہمراہیوں سے کہ دیا کہ جو جو بھائی بیمار و معذور نہ ہوں، وُہ کل سے روزہ رکھیں، اب ہم یہاں مقیم ہیں۔ اگلے روز سے لوگوں نے روزے رکھنے شروع کیے۔ رمضان سب کو وہیں گزرا اور وہیں سب نے عید کی نماز پڑھی۔

---

[1] منظورہ: ص ۱۲۰، ۲۲۰،۱۱

سیّد صاحبؒ کا سچون میں قیام سرداروں اور خوانین نے سیّد صاحبؒ کی خدمت میں عرض کیا کہ اب عنایاتِ الٰہی سے یہاں سے بالاکوٹ تک آپ کے مجاہدین کا عمل دخل ہو گیا ہے، پہاڑوں کی برف پگھل گئی اور سکھوں کے آنے کا موسم قریب آیا۔ یہی اُن کی تحصیل کا موسم ہے۔ اب مناسب یہ ہے کہ آپ یہاں سے چل کر کچھ دن موضع سچون میں قیام کریں، کیونکہ سچون کے بعض بعض لوگ حسن علی خاں ہمہ شبہہ کرتے ہیں کہ وُہ کہیں سکھوں سے مِل نہ جائے۔ اگر وُہ سکھوں سے کچھ خفیہ سازش رکھتا ہوگا، تو وہاں آپ کے رہنے سے دبا رہے گا اور سکھوں سے نہ مِلے گا۔

سیّد صاحبؒ نے اُن کے مشورے کو پسند فرمایا اور بیوی صاحبہ اور دُوسرے غازیوں کی بیویوں کی خدمت اور دیکھ بھال کے لیے چند آدمی متعین کر دیے اور ساڑھے تین سَو غازیوں کے ساتھ سچون روانہ ہوئے۔ ۲۴ رمضان المبارک (۱۲۴۶ھ) کو سچون میں تشریف فرما ہوئے۔

مظفر آباد کی طرف مہم کی روانگی مولانا محمد اسمٰعیل صاحب جب بالاکوٹ پہنچ گئے، تو پکھلی اور کاغان کے رُؤسا سلطان زبردست خاں وغیرہ اُن کی خدمت میں حاضر ہوئے اور مظفر آباد پر فوج کشی کی تجویز ٹھہرائی۔ مولانا نے اُن کو زبان دے دی کہ ہمارے لشکر کا ایک حصّہ بھی آپ کے ساتھ جائے گا۔ انھوں نے اس سے زیادہ کی درخواست کی۔ آپ نے انکار فرمایا اور فرمایا کہ غازیوں کی جماعت برکت اور نام کے لیے چاہیے۔ جب آپ اس مجلس سے اُٹھے، تو فرمایا کہ سلطان زبردست خاں کی باتوں کے انداز سے معلوم ہوتا ہے کہ وُہ نفاق کے شائبے سے خالی نہیں۔ اس لیے اُس کو لشکر کے بڑے حصّے کی شرکت پر اصرار ہے۔

مولوی خیر الدین صاحب کو اس تجویز سے اختلاف تھا۔ اُنھوں نے کہا کہ آپ کا حکم ہے، تو لشکر جائے، لیکن مجھے جانے پر مجبور نہ فرمایا جائے، اس لیے کہ لشکر بے سروسامان ہے۔ اگر سلطان زبردست خاں کی خواہش ہے کہ لشکر جائے، تو سامان کی درستی کے لیے پانچ ہزار روپیہ دے۔ اگر آنجناب کا ارشاد ہے، تو تین ہزار، نہیں تو دو ہزار ضرور عنایت فرمائیے۔

مولانا نے فرمایا: اس وقت اتنی رقم کہاں ہے؛ زبردست خاں وعدہ کرتا ہے کہ مظفر آباد

پہنچنے کے بعد سارا سامان مُہیّا کر دیا جائے گا۔" مولوی صاحب نے کہا: "یہ سب اُس کی حیلہ سازی ہے۔ آپ اس لشکر کا کسی اور کو سردار بنا دیں۔"[1]

آپ نے مُلّا قطب الدین خان ننگرہاری، منصور خاں قندھاری اور منشی غوث محمّد امازئی والے کو سردار کر کے تقریباً دو سَو غازیوں[2] کے ہمراہ، جن میں اکثر قندھاری تھے، سلطان زبردست خاں کی معیّت میں مظفر آباد روانہ فرمایا۔

جب سلطان زبردست خاں مع لشکر جاتے جاتے دریاے مظفر آباد پر پہنچا، سکھوں کو خبر ہوئی دریا کے گھاٹ پر دو کشتیاں تھیں۔ اُنھوں نے دونوں کشتیاں کھینچ کر اپنی گڑھی کے نیچے باندھ لیں اور آپ گڑھی میں گھس کر لڑائی کے لیے تیار ہو گئے۔ دریا پر مقامی لوگوں نے ناڑہ[3] باندھ دیا تھا، جس سے وُہ دریا عبور کرتے تھے۔ ہندوستانیوں نے کہا کہ ہم کو ناڑہ سے دریا عبور کرنے کی مہارت نہیں، ہم اللہ کا نام لے کر دریا میں داخل ہوں گے۔ چنانچہ اُنھوں نے بِسمِ اللہ کہہ کر دریا میں قدم رکھ دیے۔ وہ دریا کبھی پایاب نہیں ہوتا تھا، مگر قدرتِ الٰہی سے اُس دن پایاب ہو گیا۔ تمام لشکر زانو زانو پانی تک اُتر گیا۔ اور جا کر شہر مظفر آباد میں داخل ہُوا۔ سکھ گولیاں چلاتے رہے، لیکن مجاہدین نے کوئی پروا نہ کی۔ بازار اور سلطان منظفر خاں کے مکانات پر قبضہ کر لیا۔ سکھ گڑھی اور چھاؤنی پر قابض رہے۔

مولوی خیرالدین صاحب نے سیّد صاحبؒ کو اپنا عُذر لکھ کر بھیج دیا تھا اور اپنا یہ خیال ظاہر کر دیا تھا کہ خوانین صرف اپنی مطلب براری چاہتے ہیں۔ ہم اِس مُلک میں تازہ وارد ہیں، یہاں کے سلاطین اور خوانین کے خصائل سے واقِف نہیں، ہم اُن کی رفاقت نہیں کر سکتے۔

سیّد صاحبؒ نے مولوی صاحب کو لکھا کہ آپ کا عُذر معقول اور بجا ہے۔ مولانا صاحب نے جلدی کی، مگر اب تو لشکر گیا۔ اب یہ دغدغہ ہے کہ بغیر کسی تجربہ کار سردار کے وہاں کا معاملہ بگڑ نہ جائے۔

---

[1] منظورہ: ص ۱۱۳۱، ۱۱۳۲

[2] منظورہ میں تین سَو تعداد بیان کی گئی ہے۔ منشی غوث محمّد امان زئی کے بجاے منظورہ میں منشی محی الدین امان زئی کا نام ہے۔

[3] ناڑہ ایک رسہ ہے، جو دو شہتیروں سے، جو دونوں کنارے پر رکھے رہتے ہیں، باندھ دیا جاتا ہے۔ عبور کرنے والا ایک رستے پر پاؤں رکھتا ہے، دُوسرا رسّہ ہاتھ سے تھامے رہتا ہے۔ رستے برابر جُنبش میں رہتے ہیں جس کو عادت نہ ہو، وُہ اس کو استعمال نہیں کر سکتا۔

اب آپ کا وہاں جانا ضروری ہے۔ اس جواب کے پہنچتے ہی آپ ادھر کو روانہ ہو جائیں۔

یہ جواب پا کر مولوی صاحب دس ہندوستانی غازی اپنے ہمراہ لے کر مظفر آباد کو روانہ ہو گئے۔

زبردست خاں کی سازش سلطان زبردست خاں نے بازار اور مکان پر قبضہ پانے کے بعد سکھوں کو خفیہ خفیہ پیغام بھیجا کہ میرا لوٹا ہوا سامان اگر تم پورا واپس دے دو، تو میں غازیوں کو کسی حیلے بہانے سے رخصت کر دوں اور مدت العمر تمہارا فرماں بردار رہوں۔ لیکن اس کی اس سازش کا غازیوں کو علم ہو گیا۔ انھوں نے اس سے تقاضا کرنا شروع کیا کہ بازار وغیرہ پر قبضہ پا جانے کے بعد تم کیوں خاطر جمع کیے بیٹھے ہو، اس چھاؤنی اور گڑھی پر کیوں نہیں قبضہ کرتے؟ معلوم ہوتا ہے کہ تمھاری سکھوں سے سازش ہے زبردست خاں اس کو حیلے بہانے سے ٹالتا تھا۔ غازیوں نے کہنا شروع کیا کہ تم منافق ہو اور ہم کو فریب دے کر یہاں لے آئے ہو۔ مولوی صاحب نے بھی اس سے گولے بارود اور سامانِ جنگ کا مطالبہ شروع کیا۔ باوجود اس کے کہ وہ بالاکوٹ میں اس کا اقرار کر چکا تھا کہ وہ مظفر آباد پہنچ کر یہ سامان مہیا کر دے گا، لیکن وہاں پہنچنے کے بعد اُس نے چپ سادھ لی اور اس کو صاف ٹال گیا۔

مجاہدین کا چھاؤنی پر قبضہ آخر ایک روز ملّا قطب الدین ننگرہاری، عبدالصمد خاں خیبری اور جعفر خاں پنجابی کی جماعت کے علاوہ سب جماعتوں نے مولوی خیر الدین صاحب کی اجازت کے بغیر گڑھی پر حملہ کر دیا۔ زبردست خاں کا بھائی بھی اپنی جماعت کے ساتھ شریک ہو گیا۔ دونوں طرف سے خوب گولے چلے۔ بالآخر غازیوں نے چھاؤنی کو سکھوں سے چھڑا لیا اور سکھوں کے بڑے جمعدار اور اس کے ساتھیوں کو قتل کر دیا۔ ادھر ملّا قطب الدین اور عبدالصمد خاں کچھ زخمی ہوئے۔ سکھ چھاؤنی چھوڑ کر گڑھی میں گھس گئے۔ مولوی خیر الدین صاحب نے پہلے تو مجاہدوں کو اُن کی اس خود رائی پر زجر و توبیخ کی، پھر پائندہ خاں اور بہرام خاں برادرانِ عمزاد حبیب اللہ خاں کی سفارش سے معافی دے دی۔

مولوی صاحب نے زبردست خاں کو طلب کر کے فرمایا کہ تم نے کل کا حال دیکھا؛ اگر تم اب بھی گولے بارود کا سامان کر دو، تو بہتر ہے، ورنہ پچھتاؤ گے۔ لیکن اُس کو نقد دینا منظور نہ تھا، وہ لیت و لعل کرتا رہا۔ مولانا محمد اسمٰعیل صاحب کو مجاہدین کی یہ خود رائی ناپسند ہوئی، اس لیے کہ بڑے دشمن کا مقابلہ

درپیش تھا۔ ادھر جو سردار موجود تھے، انھوں نے رعایا پر ظلم و زیادتی کرنی شروع کر دی۔ مولوی صاحب نے اُن کی زیادتیوں اور زبردست خاں کی بے پروائی کا حال سیّد صاحبؒ کو لکھ کر بھیجا۔ آپ نے جواب میں لکھوایا کہ اگر سُلطان آپ کے چلے آنے سے ناخوش ہو، تو آپ وہیں رہیے، لیکن قندھاریوں کو یہاں بھیج دیجیے۔ جب مولوی صاحب کو یہ حکم پہنچا اور اس کی شُہرت ہُوئی، تو زبردست خاں نے مولوی صاحب کے جانے کو پسند نہ کیا۔ قندھاری بھی آپ کو چھوڑ کر جانے پر راضی نہ ہُوئے۔ اس طرح مولوی صاحب کو بھی ایک مہینہ مظفر آباد میں قیام کا اتفاق ہُوا۔

اسی اثنا میں ایک دن اطلاع ملی کہ شیر سنگھ سُلطان نجف خاں کے ساتھ بالاکوٹ کے درے میں آگیا اور گڑھی حبیب اللہ خاں میں اُترا ہُوا ہے۔ دو گھڑی رات گئے یہ اطلاع سُلطان زبردست خاں کو ملی۔ اس نے مولوی خیرالدین صاحب کو بُلا کر کہا کہ اب کیا کرنا چاہیے۔ مولوی صاحب نے کہا کہ میں نے تم سے پہلے ہی کہا تھا اور میرے ذہن میں پہلے ہی سے یہ پورا نقشہ تھا۔ تم نے میرے کہنے پر عمل نہیں کیا۔ جو شخص اپنی سلطنت کی تسخیر کا ارادہ کرتا ہو اور روپیہ صرف کرنے میں اُس کو عُذر ہو، وہ کیسے مُلک کی تسخیر کر سکتا ہے؟ اسی خیال سے مجھے تمھاری رفاقت میں عُذر تھا۔ تم جانتے ہو کہ یہ دریا قدرتی مورچال ہے۔ سکھوں کی طاقت نہیں کہ اس کو دفعۃً عبور کر لیں۔ دریا کے اس طرف بھی پہاڑی گھاٹیاں ہیں، جو بہت دشوار گزار ہیں۔ جن جن مقامات کو تم دُشوار اور خطرناک سمجھتے ہو، اُن کو ہمارے حوالے کر دو اور جہاں کم خطرہ ہو، وہاں تم رہو۔ اگر صبر و استقامت سے کام لوگے، تو اللہ تعالیٰ یہ مُشکل آسان فرما دے گا إِنَّ اللَّهَ مَعَ الصَّابِرِينَ لیکن مجھے تم سے جُرأت کی توقع بہت کم ہے۔

زبردست خاں کی بے ہمتی اور مجاہدین کی واپسی

تمام اہلِ مشورہ نے اس مشورے کو بہت پسند کیا اور رُخصت ہو گئے اور یہ طے ہُوا کہ کل صُبح اس کا انتظام کیا جائے گا۔ صُبح ہُوئی، تو لوگوں نے اچانک دیکھا کہ صُبح سے پہلے ہی زبردست خاں کا سارا سامان بندھا ہُوا چھوٹی مسجد کے قریب، جو شہر کے کنارے پر تھی اور بھاگنے کا راستہ وہاں سے مُتصل ہی تھا، رکھا ہُوا ہے۔ زبردست خاں نے مولوی صاحب کو بُلا کر کہا کہ بس چلیے۔ مولوی صاحب نے فرمایا کہ کدھر؟ زبردست خاں نے کہا کہ اسی کوہستان

ہیں۔ مولوی صاحب نے فرمایا کہ وُہ رات کا مشورہ کہاں گیا؟ زبردست خاں بجائے کچھ جواب دینے کے یہی کہے جاتا تھا کہ چلیے۔ مولوی صاحب نے غازیوں کو مطلع کر کے کُوچ کر دیا۔ زبردست خاں کے ساتھی راستہ بے راستہ کچھ نہیں دیکھتے تھے، پہاڑ پر چڑھتے چلے جا رہے تھے۔ یہ سب جمعیّت ملا کر پانچ سَو سے زائد تھی۔ سکھوں نے بھی گڑھی سے نکل کر اُن کا تعاقب کیا اور مُلکی بھاگ کر پہاڑ کی گھاٹیوں میں چُھپ گئے۔ مولوی صاحب نے یہ حال دیکھ کر لوگوں کو بھاگنے سے منع کیا اور خود سکھوں کے مقابلے میں کھڑے ہو گئے۔ سکھوں نے جب یہ دیکھا کہ مُجاہدین مقابلے میں کھڑے ہو گئے ہیں اور اُن کے گولے بھی آ رہے ہیں تو بھاگ کر مظفرآباد میں داخل ہو گئے اور وہاں کے مکانوں میں آگ لگانا شروع کر دی۔ تمام مُجاہدین مولوی صاحب کے پاس جمع ہو گئے۔ اس وقت زبردست خاں کے بھتیجے اور داماد قطب الدین خاں نے اپنے خُسر کا ہاتھ پکڑ کر مولوی خیرالدین صاحب کے ہاتھ میں دیا اور کہا: "اس شخص کی شرم آپ کے ہاتھ میں ہے۔ اس وقت اس کا کوئی رفیق نہیں ہے۔" مولوی صاحب نے فرمایا کہ جاؤ، جب تک مَیں زندہ ہُوں، کوئی اس پر ہاتھ نہیں اُٹھا سکتا۔

مولوی صاحب وہاں سے روانہ ہُوئے۔ کوہستان کے سِرے پر ایک دیہات میں قیام کیا۔ وہاں سے دریا عبُور کر کے ایک چھوٹے دیہات میں پہنچے، جہاں منصور خاں اور سُلطان زبردست خاں کے متعلقین پہلے سے موجود تھے۔ وہاں سے بالاکوٹ کو جو راستہ گڑھی حبیب اللہ خاں کے قریب سے جاتا ہے وُہ شیر سنگھ کے لشکر کے پڑاؤ کی وجہ سے بند ہو گیا تھا۔ دُوسرا راستہ کاغان کا تھا، جو نہایت دشوار گزار تھا۔ یہاں سے بالاکوٹ کا راستہ برف باری کی کثرت کی وجہ سے مسدُود تھا۔

سیّد صاحبؒ کو جب مولوی خیرالدین صاحب کے اس طرف سے جانے کا حال معلوم ہُوا، تو آپ نے چالیس پچاس گوجروں کو برف ہٹانے اور راستہ کے صاف کرنے کے لیے روانہ فرمایا۔ اس عرصے میں مولوی خیرالدین صاحب تپ لرزہ میں مُبتلا ہو گئے اور اُن کو ایک گاؤں میں مجبوراً قیام کرنا پڑا۔ اِس میں اتنی تاخیر ہُوئی کہ جب وُہ ۲۴ ذی قعدہ ۱۲۴۶ھ کو چارپائی پر لیٹے ہُوئے بالاکوٹ کے قریب پہنچے، تو سیّد صاحبؒ کا رُقعہ ملا کہ ہم نے بالاکوٹ کے نیچے کا پُل توڑ دیا ہے، آپ اُوپر کے پُل سے آئیں۔ دو میل

گئے تھے کہ ایک دُوسرا رقعہ مِلا کہ یہاں جنگ پیش آگئی ہے۔ مضبوط اور تندرست آدمی جلد آجائیں، آپ آرام کے ساتھ آئیں۔ چنانچہ اُن کے سب ہمراہی روانہ ہو گئے۔ مولوی صاحب کے صرف دو ساتھی اور دو گوجر اُن کے ساتھ تھے۔[1]

---

[1] مولوی صاحب جب چکر کاٹ کر بالاکوٹ کے شمالی پہاڑوں پر پہنچے، تو معلوم ہُوا کہ معرکہ ختم ہو چکا ہے اور ان کے اکثر ساتھی شہادت سے سُرخرو ہُوئے۔ تفصیل آگے ملاحظہ ہو

چالیسواں باب

سچوں میں

سید صاحبؒ کا ایک وعظ ایک روز سید صاحبؒ نے سچوں میں وعظ فرمایا، جس میں آپ نے ایک مثال بیان کی۔ آپ نے فرمایا: "جب کسی کے مکان کی کوئی دیوار گر جاتی ہے، سارے گھر والوں کو تکلیف ہوتی ہے۔ چنانچہ مرد، عورت، بچے سب اُس کی درستی کی فکر میں لگ جاتے ہیں۔ ہر ایک اپنے مقدور بھر اس کی تیاری میں سرگرم ہوتا ہے۔ کوئی اینٹ لاتا ہے، کوئی مٹی لاتا ہے اور چھت کی تیاری میں منہمک ہو جاتا ہے۔ جب سارے گھر والے دن رات لگ کر اور مشقت اور تکلیف برداشت کر کے ایک زمانے کے بعد اپنے گھر کو درست اور آباد کر لیتے ہیں، تو پھر مدتوں تک اس میں آرام پاتے ہیں۔

اسی طرح اس زمانے میں مسلمانوں کے دین کی عمارت منہدم ہو گئی ہے۔ کفار رہزنوں کی طرح مسلمانوں کے گھر کے مال و اسباب کو لوٹ رہے ہیں اور دستِ تعدّی دراز کر رہے ہیں، اس لیے کہ اس گھر کا کوئی نگہبان اور پاسبان نہیں رہا۔ اب سونے والوں کو خوابِ غفلت سے بیدار ہونا چاہیے اور اپنے ویران مکان کی پاسبانی کر کے اور اس کا سامان مہیا کر کے اس کو آباد کرنا چاہیے اور ان رہزنوں اور چوروں کو گرفتار کر کے اُن کو اُن کے اعمال کی سزا دینی چاہیے اور اُن سے اپنی خدمت لینی چاہیے۔ مکان کے آباد ہو جانے کے بعد اطمینان کے ساتھ وہ مکان میں آرام کر سکتے ہیں۔"[1]

---

[1] منظورہ: ص

سید صاحبؒ کا یہ وعظ سُن کر حسن علی خاں ایسا رویا کہ تمام ڈاڑھی آنسوؤں سے تر ہو گئی یہاں سے اُٹھنے کے بعد اُس نے کسی سے کہا کہ میں تو اس جہاد کا کارخانہ بچوں کا کھیل سمجھتا تھا، لیکن جب اِس سیّدِ عالی مقام کے چہرے پر میری نظر پڑی، تو مجھے یقین ہو گیا کہ ایسا صاحبِ عزم آدمی ہفت اقلیم کی تسخیر کرنے کا ارادہ کرے، تو کیا عجب ہے کہ اللہ تعالیٰ تمام ممالک کی تسخیر کو اس کے لیے آسان کر دے[1]۔

کشمیر پر حملے کا مشورہ اور خوانین کی عرضداشت

مولانا محمد اسمٰعیل صاحب جس وقت بالاکوٹ میں تھے، کشمیر کے کچھ معتبر اشخاص اور خوانین کی عرضداشت جن کو اہلِ کشمیر نے بھیجا تھا، آپ کی خدمت میں آئے اور کشمیر کے مسلمانوں کا پیغام پہنچایا کہ ہم بالاکوٹ میں لشکرِ اسلام کی آمد سے بہت خوش ہوئے۔ یہاں سے کشمیر صرف تین منزل کی راہ ہے۔ ہم دست بدعا ہیں کہ اللہ تعالیٰ جلد لشکرِ اسلام کو ہمارے مُلک میں لائے تاکہ ہم کفّار کے ظلم و جَور سے نجات پائیں اور امام المسلمین کے سایۂ حکومت میں آزادی کے ساتھ اسلام کے احکام پر چل سکیں اور سُنّت کی پیروی کر سکیں۔

مولانا نے اِس مضمون کا ایک خط سیّد صاحبؒ کی خدمت میں روانہ کیا۔ اس میں یہ بھی تحریر فرمایا کہ چونکہ جناب والا اسی وقت سے، جب امب میں قیام تھا، کشمیر کی تسخیر کا ارادہ فرماتے تھے، وہاں سے تو وُہ مُلک بہت دُور تھا، لیکن اب جب کہ ہمارا لشکر مظفر آباد تک آ گیا ہے، وہاں سے کشمیر صرف دو روز کا راستہ ہے۔ اگر مُلکی ساتھ دیں، تو پہلی لمبی منزل کر کے ایک رات کسی جگہ قیام کر کے دُوسرے روز اللہ تعالیٰ کی مدد سے ہم کشمیر میں داخل ہو سکتے ہیں۔ وہاں کی رعایا کرپا رام کے ظلم سے بہت تنگ آ چکی ہے۔ وہاں کی اکثریت مسلمان ہے۔ اُمید ہے کہ وہاں کے اکثر لوگ لشکرِ اسلام میں شامل ہو جائیں گے۔

مولانا کا جب یہ خط پہنچا، تو آپ نے حسن علی خاں اور حبیب اللہ خاں وغیرہ سے مشورہ لیا۔ اُنھوں نے کہا کہ اگر آپ کشمیر کا ارادہ فرمائیں گے، تو آپ اللہ کی مدد سے اس مُلک میں داخل ہو جائیں گے، لیکن آپ کے تشریف لے جانے اور لشکرِ اسلام کے کُوچ کر جانے کے بعد سکھ ہم کو تباہ کر دیں گے اور

---

[1] منظورہ: ص ۱۱۲۷، ۱۱۲۸

کہیں گے کہ انھیں ملکیوں نے لشکرِ اسلام کی رہبری کی اور خلیفہ صاحب کو کشمیر تک پہنچایا۔ اس لیے آپ اُن کے ساتھ کسی مقام پر ایک جنگ کر کے اُن کو شکست دے کر آگے کا قصد فرمائیں۔ اس سے لشکرِ اسلام کی ہیبت بیٹھ جائے گی اور ہم بھی ہمرکاب ہو کر چلیں گے۔

مولوی سیّد جعفر علی صاحب فرماتے ہیں کہ چونکہ آپ کو غربار، اور رعایا کے حال پر کمال شفقت تھی، آپ نے اُن کا مشورہ قبول کر لیا اور مولانا اسمٰعیل صاحب کو اسی مضمون کا خط لکھ کر بھیج دیا۔ مولانا آپ کے حکم کے مطیع و فرمانبردار تھے۔ خط پڑھ کر خاموش ہو گئے۔ اتنا فرمایا کہ حضرت امیرالمومنین کو سیّدالانبیار، صلی اللہ علیہ وسلم، کی پیروی اور اقتدا میں غربار کے حال پر بڑی شفقت ہے، ورنہ فقہی مسئلہ یہ ہے کہ اگر کفّار مسلمانوں کو گرفتار کر کے اُن کو سپر بنا لیں یا قلعے کی دیوار سے اُن کو لٹکا دیں، اس وقت بھی اس خیال سے کہ ان مسلمانوں کو گزند پہنچے گا، جنگ کا موقوف کرنا اور قلعے کی تسخیر سے دست بردار ہو جانا مناسب نہیں، بلکہ ان کفّار سے جنگ کی جائے گی اور امکانی حد تک مسلمانوں کو اپنے ہتھیاروں کی گزند سے محفوظ رکھنے کی کوشش کی جائے گی۔ اگر بالفرض مسلمانوں کو کچھ گزند پہنچے یا وہ مسلمانوں کے ہتھیاروں سے شہید ہو جائیں، تو اس میں نہ دیت ہے، نہ قصاص، نہ گناہ۔[1]

شیر سنگھ کی نقل و حرکت کی اطلاع | شیر سنگھ اپنے لشکر کے ساتھ گڑھی میں قیام کر کے پہلے مظفرآباد کی سمت گیا۔ وہاں اُس کو سلطان زبردست خاں اور اُس کے ہمراہیوں کے فرار کا حال معلوم ہوا۔ وہاں سے اُس نے گڑھی کی طرف پھر مراجعت کی اور بالاکوٹ جانے کے لیے راستہ تلاش کیا۔ جہاں جہاں گڑھی میں غلّہ اور آدمی تھے، سب کو جمع کیا۔ جس گڑھی میں سَو آدمی تھے، وہاں دس، جہاں دو سَو تھے، وہاں بیس متعیّن کیے۔ اس طرح سے غلّے کو جابجا سے سمیٹ کر جمع کر لیا۔ مولانا کو بھی اس کی اطلاع ہوئی۔ شیر سنگھ نے درۂ بھوگڑ منگ کا ارادہ کیا۔ اس وقت مولانا نے سیّد صاحبؒ کو اس مضمون کا خط لکھا کہ شیر سنگھ اپنے لشکر کے ساتھ بھوگڑ منگ کے درے کا ارادہ رکھتا ہے اور فی الحقیقت صاحب عزم کے لیے یہی مناسب بات ہے کہ وہ سردارِ لشکر سے مقابل ہو۔ آپ ہوشیار رہیں اور اہلِ لشکر حالات سے باخبر رہنے میں غفلت سے کام نہ لیں۔ جس وقت جنگ کی صورت پیدا ہو، قاصدِ تیز گام ہم لوگوں

---
[1] منظورۃ السعدار: ص ۱۱۳۸ تا ۱۱۴۰

کو بھی اطلاع کر دے تاکہ ہم بھی اپنی جماعت کے ساتھ شریکِ جنگ ہو جائیں۔

شبخون کی تجویز شیر سنگھ نے اپنی قیام گاہ کی طرف مراجعت کی۔ مولانا نے اپنے رُفقاء خاص سے مشورہ فرمایا اور تجویز کی کہ شیر سنگھ کے لشکر پر شبخون مارا جائے۔ آپ نے شبخون کا پُورا نقشہ تجویز کیا، اور تجویز فرمایا کہ عصر کے بعد لشکر متفرق طریقے پر پہاڑ پر چڑھے، چوٹی پر پہنچ کر پہاڑ کی اوٹ میں ہو جائے پھر شب کی تاریکی میں ان کو غافل یا مشغول پا کر حملہ کر دیں۔

مولانا کی سِکھوں میں طلبی ابھی اس تجویز پر عمل کرنے کی نوبت نہیں آئی تھی کہ سیّد صاحبؒ کی طرف سے طلبی کا رقعہ پہنچا، جس کا مضمون یہ تھا کہ عرصہ ہو گیا کہ وُہ برگزیدۂ بارگاہ ہم سے جُدا ہیں۔ ہم کو ملنے کا بہت اشتیاق ہے۔ آپ کی طلبی کا یہ خط جاتا ہے اور پیچھے سے حبیب اللہ خاں روانہ ہوتے ہیں۔ اپنے لیے اس کو حکمِ قطعی جانیں اور جلد سے جلد روانہ ہو کر یہاں تشریف لے آئیں۔ سردار حبیب اللہ خاں بالاکوٹ میں اپنی جگہ کی حفاظت کریں گے۔ خاتمۂ خط پر آپ کی مُہر اور پیشانی پر "اَللّٰهُ کَافِیْ" کے لفظ آپ کے ہاتھ کے لکھے ہُوئے تھے جس کا یہ مطلب ہوتا تھا کہ اس کی تعمیل نہایت ضروری اور فوری ہے۔

مولانا نے یہ خط پڑھ کر اہلِ لشکر سے فرمایا کہ آپ لوگ اپنی جگہ پر جائیں شبخون کی تجویز ملتوی ہے۔ لوگوں نے پوچھا کہ کیا سبب پیش آیا۔ فرمایا ہماری طلبی آگئی ہے۔ لوگوں نے کہا کہ اگر شبخون کے بعد آپ تشریف لے جائیں تو بہتر ہے فرمایا: مَیں اپنے ارادے کا مُختار نہیں ہُوں، تابعِ فرماں ہُوں۔ بعض لوگوں نے کہا کہ اپنا عُذر اور حالات کی تفصیل لکھ بھیجیں۔ فرمایا کہ دیکھتے نہیں کہ تاکیدی مُہر اور دستخطِ خاص ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ تعمیل فوری طور پر ضروری ہے۔ کل کُوچ ہے۔ یہ معلوم نہیں کہ اس کا انجام کیا ہو گا۔ اللہ تعالیٰ بہتر کرے! لیکن قرینۂ تحریر سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ سب حبیب اللہ خاں نے بالاکوٹ پر قبضہ کرنے کی تجویز کی ہے۔ اگر ہمارا اندازہ صحیح ہے، تو ایک ہفتہ نہیں گزرے گا کہ حبیب اللہ خاں کا خط ہماری طلبی میں آئے گا اور ہم کو پھر یہیں آنا ہو گا۔

مولانا سِکھوں میں دُوسرے روز مولانا نے شیخ بلند بخت کو اپنا قائم مقام بنایا اور اپنی جماعت کے ساتھ ستّ بنی کے راستے سے پہاڑ پر چڑھ کر بھوگڑمنگ کے درے میں آئے اور جبوڑی کے دیہات میں رات بسر کی

اگلے روز ڈیڑھ پہر دن چڑھے پھولڑا پہنچ گئے۔ سید صاحبؒ نے بستی سے باہر نکل کر استقبال کیا۔

عُشر کا انتظام دوسرے روز مولانا صاحب نے سید صاحبؒ کی اجازت سے اِس علاقے کے ملکوں اور خانوں کو جمع کر کے فرمایا کہ آپ لوگوں کے اُوپر آج تک کفار سکھ حاکم تھے اور اپنی بستیوں کا حاصل اُن کو دیتے تھے، بلکہ وُہ آپ لوگوں پر ظلم و تعدّی کر کے لیتے تھے۔ اب اللہ تعالیٰ ہم مسلمانوں کو آپ کی امانت کے لیے لایا ہے، آپ صاحبوں کے لیے مُوزوں ہے کہ وُہی حاصل ہم کو دیا کریں، بلکہ ہم کو اُن سے کم دیا کریں۔ اس میں آپ کے واسطے دُنیا میں بھی بہتری ہے اور آخرت میں بھی اجرِ عظیم ملے گا، کیونکہ حضرت امیر المومنین اسی واسطے یہاں تشریف لائے ہیں کہ کفارِ نابکار کے ظلم و تعدّی سے آپ کو چھڑائیں اور اُن کو مار کر مغلوب کریں۔ آپ بھی اس کارِ خیر میں ہمارے شریک ہوں۔ یہ مُلک آپ ہی مسلمانوں کا ہے۔ ہمارے حضرت امیر المومنین کو اسلام کے احکام کا آپ مسلمانوں پر جاری کرنا منظور ہے۔ آپ کے مُلک سے کچھ غرض نہیں۔ آپ کا مُلک آپ کو مُبارک رہے، بلکہ عنایتِ الٰہی سے اگر کفار کا مُلک ہاتھ آئے گا، تو وُہ بھی آپ مسلمانوں کو دیں گے۔

مولانا کی یہ تقریر سُن کر سب نے کہا کہ آپ نے جو کچھ فرمایا، وُہ سب ہم کو منظور ہے۔ اس کارِ خیر میں ہم سب اپنے جان و مال سے شریک ہیں۔ خدا و رسُول کا جو حکم آپ فرمائیں گے، وہ ہم بسرو چشم بجا لائیں گے۔

مشکوٰۃ شریف کا درس ایک روز سید صاحبؒ نے مولانا صاحب سے فرمایا کہ میاں صاحب مُعطّل بیٹھے ہُوئے دل نہیں لگتا، کوئی کتاب شروع کیجیے کہ دل لگے۔ مولانا نے فرمایا کہ کچھ ارشاد ہو۔ آپ نے فرمایا کہ ہر روز ظُہر کی نماز کے بعد سے عصر تک مشکوٰۃ شریف کا درس فرمایا کیجیے۔ اس روز سے مولانا صاحب نے مشکوٰۃ شریف کا درس شروع کیا۔ ہر روز ظُہر کی نماز کے بعد سے عصر تک درس ہوتا تھا۔ سید صاحبؒ اور تمام مُجاہدین سُنتے تھے۔ مولانا اسمٰعیل صاحب درس دیتے تھے اور حدیث شریف کے اسرار و نکات سید صاحبؒ بیان فرماتے تھے۔ بعض دن ایک ہی حدیث کے اسرار و نکات بیان کرنے میں عصر کا وقت آجاتا تھا اور بعض دن دو یا تین حدیثوں کی نوبت آتی تھی۔

سید جعفر علی صاحب لکھتے ہیں کہ اُن دنوں اکثر مشکوٰۃ شریف آپ کے ہاتھ میں ہوتی تھی اور آپ اُس کا مطالعہ فرماتے تھے۔ کبھی کسی لفظ کے معنے نہ معلوم ہوتے، تو جو صاحب علم سامنے سے گزرتا اُس سے بے تکلف دریافت فرماتے۔ مولانا اسمٰعیل صاحب کے اس درس سے لوگوں کو بڑا فائدہ ہُوا۔ ایک مہینہ تک یہ سلسلہ رہا۔

سیّد ضامن شاہ کی آمد و بیعت انھیں دنوں درۂ کاغان کے رئیس سیّد ضامن شاہ بیس بائیس آدمیوں کے ساتھ آئے۔ سیّد صاحبؒ نے سیّد ضامن شاہ اور اُن کے ساتھیوں کی بہت خاطر تواضع کی اور اُن کو اپنے پاس اُتارا۔ اُن میں آٹھ یا نو آدمی سیّد ضامن شاہ کے عزیزوں میں تھے۔ اگلے روز سیّد ضامن شاہ نے اپنے ساتھیوں کے ساتھ بیعت کی اور عرض کیا کہ مَیں آپ کے اِس کارِ خیر میں جان و مال سے شریک ہوں۔

سیّد صاحبؒ کی ایک گفتگو ایک روز آپ جنگل سے تیر اندازی کر کے واپس تشریف لائے اور گھوڑے سے اُترے۔ کسی نے ایک چارپائی لاکر بچھا دی۔ آپ زمین پر بیٹھ گئے۔ کتنا ہی لوگوں نے کہا کہ آپ ہمارے امام اور پیر و مُرشد ہیں، اس چارپائی پر بیٹھیں، ہم سب زمین پر بیٹھیں گے۔ آپ نے کسی طرح نہ مانا اور فرمایا کہ جیسے تم سب ہو، ویسا ہی ایک مَیں بھی ہوں۔ مجھ کو کب مناسب ہے کہ تم سب زمین پر بیٹھو اور مَیں چارپائی پر بیٹھوں؟

اس وقت غریب، امیر سب تقریباً دو سَو آدمی ہوں گے۔ آپ نے اُن سب کی طرف مخاطب ہو کر فرمایا کہ بھائیو، مَیں جو اپنے وطن سے اتنے بندگانِ خدا کو جا بجا سے لے کر اور طرح طرح کی سختی و مصیبت اُٹھا کر تمھارے اِس مُلک کوہستان میں آیا ہوں، تو فقط اِسی واسطے کہ تم مسلمانوں کے مُلک پر کفّار غالب ہو گئے ہیں اور تم کو طرح طرح کی تکلیف اور ذلّت دیتے ہیں۔ اُن کو اللہ کی مدد سے مغلوب کروں تاکہ تم اپنی اپنی ریاستوں پر قابض اور مُتصرف ہو اور دینِ اسلام قوّت پکڑے۔ اگر میں عیش و آرام کا طالب ہوتا، تو میرے واسطے مُلکِ ہندوستان میں ہر طرح کا عیش و آرام تھا، اِس کوہستان میں کبھی نہ آتا۔ میری مُراد اِس گفتگو سے یہ ہے کہ تم سب بھائی بھی کفّار کی حکومت سے غیرت کرو اور اپنی جان و مال سے میرے ساتھ

شرکت کرو اور کافروں کو مار کر یہاں سے نکالو۔ اس کے بعد ان کا ملک چھینو اور اپنے تصرّف میں لاؤ۔ اگر تم لوگ میرے ساتھ شرکت نہ کروگے، تو چند دن کے بعد ایسا غم و افسوس کروگے کہ اس کا بیان تقریر سے باہر ہے۔ پھر وُہ افسوس و غم بھی کام نہ آئے گا۔ اور اگر اللہ تعالیٰ میرے ہاتھوں اپنا کام لینا چاہے گا، تو اپنے اَور بندوں کو میرے ساتھ کر دے گا اور اُن کے ہاتھوں سے اپنے دینِ اسلام کو غالب کرے گا۔

سب حاضرینِ مجلس نے اُس کے جواب میں عرض کیا کہ ہم اپنی جان و مال سے ہر طرح سے شریک ہیں۔ جو کچھ آپ فرمائیں، ہم بسر و چشم بجا لائیں گے۔[1] آپ نے اُن کے حق میں دُعا فرمائی اور اپنی قیام گاہ پر تشریف لائے۔

دُعا کا اہتمام جن دنوں مشکوٰۃ شریف کا درس ہوتا تھا، ایک روز سیّد صاحبؒ نے مولانا محمد اسمٰعیل صاحب سے فرمایا کہ میاں صاحب، دل میں آتا ہے کہ اب چند روز جنابِ الٰہی میں خوب سے مل کر دُعا کریں، مگر اِس طرح کہ ہم ایک گوشۂ تنہائی میں بیٹھ کر اکیلے دُعا کریں اور آپ سب بھائیوں کو ساتھ لے جا کر کہیں جنگل میں دُعا کریں۔ مولانا صاحب نے فرمایا کہ بہت بہتر، مَیں حاضر ہوں۔ سیّد صاحبؒ نے عصر کا وقت دُعا کرنے کے لیے مقرر فرمایا۔ ہر روز نمازِ عصر سے فارغ ہو کر سیّد صاحبؒ ایک کوٹھڑی میں اکیلے بیٹھ کر دُعا کرتے تھے اور مولانا صاحب سب غازیوں کو اپنے ہمراہ لے کر بستی کے باہر ایک نالے پر جاتے تھے۔ پہلے آپ سب لوگوں کی طرف مخاطب ہو کر کچھ دیر وعظ و نصیحت فرماتے تھے۔ اس کے بعد برہنہ سر ہو کر کمال گریہ و زاری اَور عجز و انکسار کے ساتھ جنابِ باری میں بہت دیر تک دُعا کرتے تھے۔ اس دُعا میں طرح طرح اپنی محتاجی و انکسار اور جنابِ باری کی عظمت و جبّاری اور رحمت و غفّاری بیان کرتے تھے۔ دُعا کے بعد سب کو ہمراہ لے کر سیّد صاحبؒ کے پاس آتے تھے اور دُعا کرنے کا حال عرض کرتے تھے۔ یہ دُعا پانچ سات روز متواتر ہوئی۔

گوجروں کی توقیر ایک روز گوجروں کا ایک سردار (جس کو وہ لوگ مقدم کہتے ہیں) سات آٹھ

---

[1] یہ حضرات اوّل سے آخر تک اپنے عہد و پیمان پر قائم رہے۔ اِن میں سے کچھ لوگ تو جنگِ بالاکوٹ میں شہید ہوئے، باقی جو زندہ بچے، وُہ مولانا ولایت علی کے عہدِ ولایت میں اُن کے شریک ہوئے۔

آدمیوں کے ساتھ مُلاقات کو آیا۔ وُہ سب لوگ کمّل کا لباس پہنے ہُوئے تھے۔ آپ اُن سے بڑے تپاک سے مِلے اور بڑی عزّت و توقیر سے اپنے پاس بٹھایا اور ہر ایک سے عافیت مزاج پوچھی اور اُن کے واسطے مُکلّف کھانا پکوایا اور حاضرین سے فرمایا کہ یہ لوگ بڑے دیندار ہیں۔ پہاڑوں پر رہتے ہیں، بھیڑ، بکری، گائے بھینس پالتے ہیں اور انھیں کے دُودھ دہی وغیرہ سے اپنی گزران کرتے ہیں اور شر و فساد سے کام نہیں رکھتے۔ انشاءاللہ تعالیٰ یہ لوگ ہمارے بڑے مُخلص انصار ہوں گے۔

اِسی طرح اکثر اوقات اس مُلک کے صاحب اخلاص گوجر آپ کی خدمت میں آتے اور آپ اُن کی بہت عزّت و توقیر کرتے تھے اور اُن سے محبّت رکھتے تھے۔

○

اِکتالیسواں باب

سچوں سے بالاکوٹ

بالاکوٹ کی تجویز سچوں میں مولوی خیرالدین صاحب کا مظفر آباد سے رقعہ آیا کہ سکھوں نے پشاور میں شیر سنگھ کو حالات کی اطلاع دی ہے اور وہ مع لشکر کمک کر آتا ہے۔ آپ نے خوانین اور اہل الرائے کو جمع کر کے فرمایا کہ شیر سنگھ مظفر آباد کے سکھوں کی کمک کے لیے آتا ہے، ہمارے مجاہدین جابجا متفرق ہیں، کچھ تو راج دواری میں ہیں، کچھ بالاکوٹ میں، کچھ مظفر آباد میں اور کچھ ہمارے ساتھ یہاں ہیں۔ آپ سب صاحب اس مُلک کے واقف کار ہیں اور ہم لوگ نووارد۔ آپ کا اِس امر میں کیا مشورہ ہے؟

اِسی اثنا میں حبیب اللہ خاں کا (جو بالاکوٹ میں تھا) خط پہنچا۔

مولوی سیّد جعفر علی صاحب لکھتے ہیں کہ ذی قعدہ (۱۲۴۶ھ) کا مہینہ نصف ہوا تھا[1] کہ سردار حبیب اللہ خاں کی عرضداشت پہنچی جس میں آپ کی تشریف آوری (بالاکوٹ) کی استدعا اور شیر سنگھ کے بالاکوٹ سے ڈھائی کوس کے فاصلے پر اس دریا[2] کے جنوبی کنارے پہنچنے کی اطلاع تھی، جو بالاکوٹ کے نیچے جنوب کو بہتا ہے۔

---

[1] وقائع میں سچوں سے سیّد صاحبؒ کی بالاکوٹ کی روانگی کی تاریخ ۵ ذی قعدہ درج ہے۔ اگر اس کو صحیح مانا جائے تو یہاں وسط ذی قعدہ صحیح نہیں، غالباً وسطِ شوال ہو۔

[2] دریائے کنہار

آپ نے لشکرِ مجاہدین کے ساتھ بالاکوٹ تشریف لے جانے کا قصد فرمایا۔

گھر والوں کو پیغام | آپ نے میاں الٰہی بخش رامپوری اور نظام الدّین اُولیا کو راج دواری بیوی صاحبہ کی تسلّی تشفّی کے لیے بھیجا اور فرمایا کہ اُن سے ہماری طرف سے بہت تسلّی تشفّی کر کے کہنا کہ اوّل تو ہمارا ارادہ تھا کہ تم کو اپنے پاس بُلالیں، مگر اب سکھوں کے لشکر کی خبر گرم ہے۔ ہم اس طرف کو جائیں گے۔ عجب نہیں کہ ان سے مقابلہ ہو۔ پھر دیکھا چاہیے، انجام اس کا کیا ہو؟ اس سبب سے تمہارا بلانا مُناسب نہ جانا۔ تم وہیں رہو اور کسی بات کا اندیشہ نہ کرنا۔ اللہ تعالیٰ تمہارے ساتھ ہے۔ ہم سب کے واسطے دُعا کریں گے۔ اگر اللہ تعالیٰ ملائے گا، تو پھر آ کر ملیں گے۔

معیّت و رفاقت کا اشتیاق | میاں الٰہی بخش اور نظام الدّین اُولیا راج دواری سے آتے ہوئے جب موضع سرکول پہنچے، تو وہاں ارباب بہرام خاں نے، جو وہاں کسی کام کے لیے متعیّن تھے، کہا کہ میں یہاں حضرت امیر المؤمنین کے حکم سے متعیّن ہوں، سکھوں کے پشاور سے آنے کی خبر لوگوں میں گرم ہے اور حضرت بھی سچوں سے اسی طرف جانے والے ہیں۔ میری طبیعت گھبراتی ہے، مگر حضرت کی اجازت کے بغیر یہاں سے ہٹ نہیں سکتا۔ تم میری طبیعت کا حال حضرت سے عرض کرنا۔ حضرت فرمائیں، تو میں بھی آپ کی خدمت میں حاضر ہو جاؤں۔

دونوں صاحبوں نے ارباب بہرام خاں کا پیغام پہنچایا، تو آپ نے اُن کو سرکول سے بُلا لیا۔ بیس آدمی اُن کے ہمراہ تھے اور وہ سب اُن کے عزیزوں اور نوکروں میں تھے۔

بالاکوٹ کو روانگی | ۵ ذی قعدہ ۱۲۴۶ھ کو آپ نے مع لشکر سچوں سے کُوچ کی تیاری کی۔ اوّل مولوی نصیر الدین صاحب منگلوری کو تیس پینتیس غازی ہمراہ کر کے درۂ بھوگڑمنگ کے بندوبست کے لیے روانہ کیا کہ شاید سکھوں کا لشکر اس طرف آئے، تو اُن کو روکیں، کیونکہ وہاں سے کوئی تین کوس موضع شنکیاری ہے۔ وہاں سکھوں کا تھانہ تھا۔ اس کے بعد آپ نے سچوں سے کوچ کیا۔ راستے میں پہاڑ کی چڑھائی تھی۔ مولانا محمد اسمٰعیل صاحب چڑھتے چڑھتے تھک جاتے، تو بیٹھ جاتے اور وعظ فرمانے لگتے جب ماندگی قدرے دفع ہوتی اور پچھلے لوگ وہاں آ کر جمع ہو جاتے، تب وہاں سے آگے چڑھتے۔

مولانا محمد اسمٰعیل صاحب کی تقریر میاں خدا بخش رامپوری کہتے ہیں کہ ایک جگہ بیٹھ کر مولانا صاحب نے لوگوں کی طرف مخاطب ہو کر فرمایا کہ بھائیو، اس بات کو خیال کرو کہ اگر ہم کسی امیر یا رئیس کے نوکر چاکر ہوتے اور وُہ ایسے سخت راستے میں اپنے کسی کام کو بھیجتا، تو بلا عذر جانا پڑتا اور راستے کی یہ ساری تکلیف اُٹھانی پڑتی۔ وُہ نوکری بھی صرف دُنیا کے گزران کے واسطے ہوتی۔ آج الحمد للہ کسی کے نہ نوکر ہیں نہ چاکر، صرف اپنے پروردگار کی خوشنودی و رضامندی کے لیے یہاں آئے ہیں اور یہ محنتیں اور مشقتیں اُٹھاتے ہیں اگر ہماری نیتیں خالص ہیں، تو اللہ تعالیٰ آخرت میں اِس کے بڑے بڑے درجے دے گا۔

گوجر عورتوں کی محبت و تواضع ایک جگہ اس پہاڑ کی چڑھائی پر حضرت کی آمد کی خبر سُن کر اس طرف کے کئی گوجروں کی عورتیں دہی کی ہانڈیاں لے کر آئیں اور لوگوں سے پُوچھنے لگیں کہ سید بادشاہ کہاں ہیں؟ وہاں کا راستہ نشیب و فراز کا زیادہ تھا۔ آپ اُس وقت ہاتھی سے اُتر کر پیادہ پا اور طرف سے تھوڑا پھیر کھا کر آرہے تھے۔ لوگوں نے اشارہ کر کے بتلایا کہ سید بادشاہ وُہ آتے ہیں۔ وہ عورتیں وہیں بیٹھ گئیں۔

آپ قریب آئے اور آپ کو معلوم ہوا کہ وُہ آپ کے لیے کچھ دُودھ دہی لائی ہیں، تو اپنے ہمراہیوں سے فرمایا کہ تم یہیں ٹھیر جاؤ، ہماری بہنیں ہمارے لیے کچھ نذر لائی ہیں، ہم اُن کے پاس جاتے ہیں۔ سب لوگ ٹھیر گئے اور آپ اُن کے پاس تشریف لے گئے۔ وُہ اُٹھ کر کھڑی ہوگئیں اور آپ کو دعائیں دینے لگیں کہ جس مطلب کو جاتے ہو، اُس مطلب کو اللہ تعالیٰ پُورا کرے اور دہی کی وہ ہانڈیاں آپ کے سامنے رکھ دیں۔ آپ نے ہر ہانڈی سے تھوڑا تھوڑا کھایا اور لوگوں سے فرمایا کہ یہ دہی آپس میں تقسیم کرلو۔ سب نے تھوڑا تھوڑا دہی تقسیم کرلیا اور آپ نے سب لوگوں سے فرمایا کہ بھائیو، اِن بہنوں کے واسطے تم سب دُعا کرو کہ اللہ تعالیٰ ان کی گائیوں بھینسوں اور مال و اولاد میں برکت دے! پھر آپ نے اور سب نے دُعا کی اور شاید کچھ نقد بھی ان کو دیا۔

توکل اور خدائی انتظام ایک جگہ کمر کوہ میں ایک وسیع سطح میدان تھا۔ آپ وہاں سو غازیوں کے ساتھ ٹھیر گئے اور مولانا اپنے ساتھیوں کے ساتھ آگے بڑھ گئے۔ آپ نے مولانا اسمٰعیل صاحب سے کہلوا دیا کہ ہماری طبیعت چاہتی ہے کہ آج یہیں رہیں۔ انشاء اللہ کل سویرے آپ کے پاس آئیں گے۔ بعض

غازیوں نے آپس میں کہا کہ ہمارا اوڑھنا بچھونا مولانا صاحب کے ساتھ گیا۔ یہاں پہاڑ پر رات کی سردی زیادہ ہوتی ہے۔ تمام دن کے بھوکے بھی ہیں۔ یہاں کھانے کی ظاہرا کوئی صورت نہیں معلوم ہوتی۔ سید صاحب نے سنا، تو فرمایا کہ بھائی صاحب، میرے پروردگار نے بڑی بڑی مہمانیوں کا مجھ سے وعدہ کیا ہے۔ ابھی تو بہت دنوں اس کی مہمانیاں کھانی ہیں، اُن میں سے ایک مہمانی آج ہی سہی

مغرب کی نماز پڑھ کر آپ نے اللہ تعالیٰ کی قدرت اور رزّاقی کا بیان شروع کیا۔ عشاء تک اللہ تعالیٰ کی رضامندی اور پروردگاری کا بیان فرماتے رہے۔ اس وقت آپ کے کلام میں ایسی رقت تھی کہ تمام حاضرینِ مجلس کے آنسو جاری تھے اور ایک بیخودی سی طاری تھی اور اس کے بعد سربرہنہ کرکے کمال عجز و زاری کے ساتھ دعا کرنی شروع کی اور اللہ تعالیٰ کے جمال و جلال کا بیان کرنے لگے۔ تمام حاضرین کا یہ حال تھا کہ گویا دریائے بیخودی و بیہوشی میں ڈوبے ہوئے تھے۔ بعضے صاحبوں کے اُوپر جذب کی سی حالت طاری تھی۔

عشاء کے بعد آپ جنگل کی طرف گئے۔ وہاں سے واپس آکر فرمایا کہ بھائیو، ہم کو اس وقت نیند معلوم ہوتی ہے۔ کچھ بچھا دو، تو کچھ دیر ہم لیٹ رہیں۔ کسی نے اپنا دوہر بچھا دیا۔ اس پر آرام کرنے لگے۔ کوئی آپ کے ہاتھ دابنے لگا اور کوئی پاؤں۔ اس وقت آپ نے فرمایا کہ بھائیو، خیال کرو، پروردگار نے ہم لوگوں کے واسطے کہاں کہاں روزی مقرر کی۔ جس طرح چڑیاں اپنی روزی کے دانے جہاں جہاں پروردگار نے مقرر کیا ہے، وہاں چنتی پھرتی ہیں، اسی طرح ہم لوگ بھی اپنے مقدر کی روزی کھاتے پھرتے ہیں اور اپنے پروردگار کا کام بھی طاقت کے موافق کرتے ہیں۔

یہی باتیں آپ کر رہے تھے کہ اسی اثناء میں پہاڑ کی چڑھائی کی طرف دو تین مشعلیں نظر آئیں۔ جب کچھ قریب آئیں، تو پہرے والے نے آواز دی کہ کون ہو۔ انھوں نے کہا کہ ہم سید بادشاہ کی ملاقات کو آتے ہیں۔ کچھ رات گئے ہم نے خبر پائی تھی۔ اس سبب سے دیر ہوگئی۔ یہ گفتگو سن کر آپ نے فرمایا کہ اُن کو آنے دو، اللہ تعالیٰ نے ہم کو دعوت بھیجی ہے۔ وہ حضرت کے پاس آئے۔ آپ اُٹھ کر بیٹھ گئے وہ سب کمل پوش تھے۔ آگے ایک صاحب تھے، جو صرف عصا پکڑے تھے۔ اُن کے پیچھے ایک کے سر پر

چارپائی اور بچھونا تھا اور دو آدمیوں کے سر پر ایک ایک گھڑا دُودھ کا تھا۔ پھر سب نے وُہ اسباب و سامان رکھ کر آپ سے مصافحہ کیا اور عُذر کیا کہ ہم کو دیر سے خبر ہُوئی، اِس سبب سے اس وقت آئے۔ آپ نے اُن کو بٹھایا اور کچھ دیر باتیں کیں۔ پھر وُہ رُخصت ہو کر جدھر سے آئے تھے، اُدھر چلے گئے۔

ایک خواہش اُسی رات کو عشاء کے بعد آپ قضاء حاجت کے لیے جنگل کی طرف گئے۔ دو تین صاحب اور ساتھ تھے۔ آپ نے اُن سے فرمایا: بھائیو، دِل چاہتا ہے کہ اگر تم چند روز مجھ کو فرصت دو، تو کسی پہاڑ پر تنہا بیٹھ کر عبادت کر کے اپنے پروردگار کو اچھی طرح راضی کروں اور تم بھی سب اپنی اپنی جگہ بیٹھ کر اپنے پروردگار کی عبادت میں مشغول رہو اور دُعائیں کر کے راضی کرو۔

ایک صاحب نے عرض کی کہ آپ بجا فرماتے ہیں۔ اگر آپ فرصت پائیں، تو یوں ہی کریں؛ مگر ہم لوگ جب تک آپ کو دیکھتے ہیں، تب ہی تک سب طرح کی تسکین اور دلجمعی ہوتی ہے اور اپنے حوصلے کے موافق عبادت کر سکتے ہیں اور دُعا بھی کر سکتے ہیں۔ جب ہم آپ کی صحبت سے جُدا ہوتے ہیں، اُس وقت ہم سے کچھ نہیں ہو سکتا: نہ عبادت، نہ دُعا اور پریشانی اور پراگندگی طبیعت پر چھا جاتی ہے۔ جب آپ کی جُدائی میں ہم لوگوں کا یہ حال ہو، پھر بھلا ہم لوگ کیونکر آپ کو چھوڑیں؛ اگر آپ قضاء حاجت کو بھی تشریف لے جاتے ہیں اور دو چار گھڑی غائب رہتے ہیں، تو اتنی دیر میں بھی ہم بیتاب ہو جاتے ہیں۔ جب آپ تشریف لاتے ہیں اور آپ کے دیدار سے ہماری آنکھیں روشن ہوتی ہیں، تو دل کو چین اور آرام ہوتا ہے۔

طبیعت پر اثر اُسی رات کو آپ جب قضاء حاجت کے لیے تشریف لے گئے تھے، آپ کے جانے کے بعد اس پہاڑ کے ایک درے سے اِس طرح کی ایک سخت آواز آئی، جیسے کوئی بڑی سُرنگ اُڑتی ہے۔ تمام لوگ یکبارگی چونک پڑے اور متعجب ہُوئے کہ یہ آواز کہاں سے آئی اور کس کی آواز ہے، مگر اس آواز کا کچھ پتہ نہ چلا۔ آپ کو کوئی چار گھڑی کا عرصہ ہُوا۔ لوگ انتظار کرتے کرتے گھبرا گئے بلکہ بعض صاحب وہیں سو رہے اور باقی لوگ اِدھر اُدھر تلاش کرنے لگے کہ کیا سبب ہے کہ اتنی دیر ہُوئی اور حضرت تشریف نہیں لائے۔ اس پہاڑ پر شیر کا بھی خوف تھا اور ریچھ کا بھی۔ یہ بھی بعضوں کو وہم ہُوا کہ

ابھی آپ فرماتے تھے کہ اگر تم لوگ مجھ کو فرصت دو، تو مَیں کسی پہاڑ کے گوشے میں بیٹھ کر اپنے پروردگار کی عبادت کروں، تو کہیں اسی وقت سے تو ہم سے جُدا نہیں ہو گئے؟ غرض، جو جس کے خیال میں آتا تھا، وہ کہتا تھا۔

بہت دیر کے بعد آپ تشریف لائے اور لوگ بشّاش اور تازہ دل ہو گئے۔ لوگوں نے اِس تاخیر کا سبب پوچھا۔ آپ نے فرمایا کہ ہاں، مجھ کو بھی معلوم ہوتا ہے کہ بہت دیر ہوئی کہ وہاں بیٹھے بیٹھے میرے پاؤں سُن ہو گئے۔ باقی اور حال آپ نے کچھ نہ بیان فرمایا، مگر اسی وقت سے آپ کی طبیعت اور طرح کی ہو گئی۔ جہاد کے معاملے میں جو صلاحیں اور مشورے آپ ہمیشہ کیا کرتے تھے، اس وقت سے یک لخت موقوف کر دیے اور اس کا سب معاملہ تقدیرِ الٰہی پر موقوف رکھا، بلکہ جو لوگ کفّار کے مارنے اور مغلوب کرنے کی تدبیریں آپ کی خدمت میں عرض کرتے تھے، آپ اُنھیں مزید تقریر سے روک دیتے تھے اور ہرگز نہیں مانتے تھے۔

صبح کی نماز کے بعد چلنے کی تیاری ہوئی۔ کسی نے عرض کیا کہ یہ چارپائی اور کمّل کس کے حوالے کریں۔ آپ نے فرمایا: یہیں رہنے دو۔ جو مالک ہو گا، وہ آپ لے جائے گا۔ چنانچہ وہ چارپائی اور کمّل جہاں کے تہاں چھوڑ کر سب لوگ روانہ ہو گئے۔[1]

○

---

[1] وقائع میں ہے کہ ایک غازی نے جو پیچھے رہ گئے تھے، بیان کیا کہ ایک نوجوان لڑکا آیا اور اس نے مجھ سے پوچھا کہ چارپائی اور کمل کہاں ہے۔ مَیں نے بتلا دیا۔ اُس نے کہا: اب تم چلے جاؤ، ہم پہنچا دیں گے۔

بیالیسواں باب

بالاکوٹ میں

بالاکوٹ میں داخلہ | اِدھر بالاکوٹ سے فجر کی نماز پڑھ کر مولانا محمد اسمٰعیل صاحب سب لوگوں کو لے کر آپ کے استقبال کو آئے۔ جب آپ پہاڑ سے اُتر کر موضع ستبنی کے نالے پر پہنچے، تو وہاں مولانا صاحب اور سب لوگوں سے مُلاقات ہوئی۔ سب کے ساتھ آپ بالاکوٹ میں داخل ہُوئے۔ بستی کے خان وصل خاں نے آپ کے لیے اپنی حویلی خالی کر دی۔ اس میں آپ اُترے۔ باقی لوگ بستی کے دُوسرے گھروں میں۔

بالاکوٹ اور اس کا اجمالی خاکہ | بالاکوٹ وادی کاغان کے جنوبی دہانے پر واقع ہے۔ یہاں پہنچ کر وادی کو پہاڑی دیوار نے بند کر دیا ہے۔ دریائے کنھار کے منفذ کے سوا کوئی راستہ نہیں ہے۔ پہاڑ کی دو دیواریں متوازی چلی گئی ہیں۔ بیچ میں خلا ہے جس کا عرض آدھ میل سے زیادہ نہیں۔ اسی خلا میں دریائے کنھار گزرا ہے۔

بالاکوٹ کے مشرق میں کالوخاں کا بلند ٹیلہ واقع ہے، جس کی چوٹی پر کالوخاں نام کا گاؤں ہے۔ مغرب میں مٹی کوٹ کا ٹیلہ ہے، جو بہت بلند ہے۔ ٹیلے کے شمالی حصے میں چوٹی پر مٹی کوٹ گاؤں ہے، جس کے بارے میں مثل مشہور تھی کہ "جس کا مٹی کوٹ، اُس کا بالاکوٹ"۔ ایک پُرانی پگڈنڈی جنوبی و مغربی سمت کے پہاڑوں میں سے مٹی کوٹ کے ٹیلے پر پہنچتی تھی۔ مولوی سید جعفر علی صاحب لکھتے ہیں کہ "ایک

راستہ جو ہندوستان کے سلاطینِ قدیم کا تراشا ہوا تھا، اس چوٹی تک جاتا تھا۔ مرورِ زمانہ سے وہاں بڑے بڑے درخت کھڑے ہوگئے تھے اور جنگل ہو گیا تھا۔ پہاڑوں سے لڑھک کر گرنے والے پتھروں نے بھی اس راستے کو خراب کر دیا تھا، لیکن مقامی لوگوں کو اس راستے کی شناخت تھی۔

بالاکوٹ کے شمالی جانب تین ٹیلے ہیں، جنھوں نے مل کر ایک دیوار بنا دی ہے۔ وہ دیوار بالاکوٹ کے شمالی اور مغربی گوشے سے شروع ہو کر شمالی اور مشرقی گوشے تک چلی گئی ہے۔ مغرب کی سمت میں ست بنے کا ٹیلہ ہے، جس پر اسی نام کا گاؤں آباد ہے۔

جنوب کی سمت میں کنھار کی وادی ہے، جس نے کاغان سے باہر نکلتے ہی بالاکوٹ کے پاس جنوبی و مغربی رُخ اختیار کر لیا ہے۔

حلقے کے عین بیچ میں ایک ٹیلہ یا قدرتی پشتہ ہے، جس پر بالاکوٹ کا قصبہ آباد ہے۔ پشتے کے شمالی و مغربی سمت میں زمین کی سطح تک مکان چلے گئے ہیں اور عام پہاڑی آبادیوں کی طرح درجہ بدرجہ ہیں، یعنی، نیچے کے مکان کی چھت اوپر کے مکان کا صحن ہے۔[۱]

حفاظتی انتظامات شیر سنگھ دریائے کنھار کے مشرقی کنارے بالاکوٹ سے دو، ڈھائی کوس پر اپنے لشکر کے ساتھ پڑاؤ ڈالے ہوئے تھا۔ وقائع میں ہے کہ "لوگ بالاکوٹ سے اُس کے ڈیرے خیمے دیکھتے تھے"۔ اس کے لیے بالاکوٹ پر حملے کی دو ہی صورتیں ہو سکتی تھیں۔ یا وہ پہاڑ پر اس پرانی پگڈنڈی سے چڑھتا، جو جنوبی و مغربی سمت کے پہاڑوں میں سے مٹی کوٹ کے ٹیلے پر پہنچتی ہے اور مٹی کوٹ کے ٹیلے پر پہنچ کر نیچے اُترتا۔ یہ راستہ کسی مقامی واقفِ حال آدمی کی رہبری کے بغیر طے نہیں ہو سکتا تھا۔ اس راستے سے بھاری سامان اور توپیں بھی لے جانا ممکن نہ تھا۔

دوسری صورت یہ تھی کہ وہ دریائے کنھار کے مشرقی کنارے کے ساتھ ساتھ بالاکوٹ کے سامنے پہنچتا۔ یہ صورت نسبتہً آسان تھی۔ ان دونوں راستوں کی حفاظت اور ناکہ بندی ضروری تھی اور سید صاحبؒ نے بالاکوٹ پہنچتے ہی اس کا بندوبست فرمایا۔ ملا لعل محمد قندھاری کو اس پہاڑی پگڈنڈی کی حفاظت کے

---

[۱] اختصار از "سید احمد شہید"۔ صفحہ ۳۶۸، ۳۶۹ ج ۲

لیے مقرر فرمایا، جو مٹی کوٹ آتی تھی۔ اُن کی پشتیبانی اور کمک کے لیے قندھاریوں کی ایک جماعت کو مٹی کوٹ میں بٹھا دیا۔ جنوبی سمت کی ناکہ بندی اور دریا کے مشرقی کنارے سے لشکر کے آنے کو روکنے کے لیے امان اللہ خاں لکھنوی کو ۲۰، ۲۵ غازیوں کے ساتھ متعیّن فرمایا۔ اس حصّے میں محافظین کی ایک مختصر سی تعداد ایک بڑے جیش کو روکنے کے لیے کافی تھی۔ وقائع احمدی میں ہے: "جانب مغرب جو پہاڑ بھوگر منگ اور بالاکوٹ کے درمیان ہے، وہاں مع جماعت مُلّا لعل محمّد قندھاری کو بھیجا۔ بھوگر منگ کے درے کی حفاظت کے لیے مولوی نصیرالدین صاحب منگلوری اوّل ہی سے وہاں متعیّن تھے اور دس بارہ قندھاری مُلّا لعل محمّد کی جماعت کے موضع مٹی کوٹ کے پہاڑ پر مقرر کیے اور اُن کو سمجھا دیا کہ اگر لعل محمّد کی طرف کچھ سکھوں کا دباؤ ہو اور وہاں بندوقیں چلیں، تو ادھر تم بھی بندوقیں چلا دینا تاکہ یہاں ہم لوگوں کو خبر ہو جائے۔

ایک راستہ جنوب کی طرف بالاکوٹ کی ندی کے کنارے پہاڑ کی کھڑی پر ہے۔[1] وہاں کی حفاظت کے لیے پچیس، تیس غازیوں کے ساتھ دو ضرب شاہین دے کر امان اللہ خاں لکھنوی کو بھیجا اور اس دریا کے پُل پر، جو بالاکوٹ کے مشرق و جنوب کے کونے میں تھا، کوئی دس آدمی متعیّن کیے کہ رات کو پُل کے پاس رہا کریں اور دن کو اپنے ڈیرے پر رہیں اور سب ناکہ والوں سے کہہ دیا کہ جس کی طرف سے سکھ لوگ آئیں، اُن کو روکیں اور بندوقیں ماریں اور اگر وہ نہ رکیں، تو یہاں چلے آئیں۔

سیّد جعفر علی صاحب لکھتے ہیں کہ "آپ نے بالاکوٹ پہنچ کر ایک لکڑی کا پُل دریا کے کنار پر بنوا دیا۔ سکھوں نے بھی (جو مشرقی کنارے پر اُترے ہوئے تھے) مغربی کنارے پر آنے جانے کے لیے جہاں کھلا میدان ہے، ایک پُل بنا لیا تھا۔ سیّد صاحبؒ نے بالاکوٹ کے پُل کے جنوب کی طرف ملکیوں اور دوسرے لوگوں کی ایک جماعت کو متعیّن کر دیا تھا کہ وہ دریا سے متّصل تھا اور ان دونوں پُلوں کے درمیان ایک محفوظ جگہ تھی، جو جماعت ان دونوں پُلوں کے درمیان متعیّن تھی، وہ سکھوں کے لشکر کو نقصان پہنچاتی رہتی تھی اور اُن کے جانوروں کو جو پُل کے راستے سے میدان میں چرنے کے لیے

---

[1] یہ جنوبی سمت کی کھڑیاں ہیں جو ترنہ اور بالاکوٹ کے درمیان واقع ہیں۔

آیا کرتے تھے، اکثر حملہ کر کے پکڑ لیا کرتے تھے اور کبھی کبھی سکھ سپاہیوں کا تعاقب کر کے پل تک پہنچا دیا کرتے تھے۔

پہرے کی تبدیلی لوگوں نے سید صاحبؒ سے صلاحاً عرض کیا کہ مُلّا لعل محمّد قندھاری پہاڑ پر کئی روز سے متعین ہیں۔ وہاں سردی بھی بہت ہے۔ اگر مناسب ہو، تو آپ اُن کی بدلی بھیجیں اور اُن کو یہاں بُلوالیں۔ آپ نے فرمایا کہ بہتر ہے، اُن کی بدلی بھیجی جائے۔

مُلّا لعل محمّد یہ خبر سُن کر آپ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا کہ مجھ کو بدلی کرنا کسی طرح منظور نہیں، مجھ کو آپ وہیں رہنے دیجیے کیونکہ مجھے اپنے قندھاریوں پر خدا کی طرف سے اعتماد ہے۔ وہ کسی طرح اُن کے مکر و فریب میں نہیں آئیں گے۔ مبادا آپ کسی دُوسرے کو وہاں متعیّن فرمائیں اور اس سے وہاں کا بخوبی انتظام نہ ہو سکے اور معاملہ بگڑ جائے۔

آپ نے فرمایا کہ ہم خُوب جانتے ہیں کہ تم اپنے لوگوں سمیت ماشاء اللہ ایسے ہی حقانی ربانی اور مخلص صادق ہو۔ اسی سبب سے یہ تدبیر ہم نے کی ہے کہ ہمارے پاس رہو۔ پھر آپ نے مرزا احمد بیگ پنجابیوں کے جمعدار کو اُن کے لوگوں سمیت مُلّا لعل محمّد کی جگہ متعیّن کیا اور مُلّا لعل محمّد کو اُن کے لوگوں سمیت اپنے پاس بُلا لیا۔

بالاکوٹ سے سیّد صاحبؒ کا آخری خط آپ نے بالاکوٹ سے نواب وزیر الدولہ مرحوم کو ۱۳ ذی قعدہ ۱۲۴۶ھ یعنی، شہادت سے صرف گیارہ روز پہلے ایک خط لکھا۔ اُس کے ایک حصّے کا ترجمہ یہاں درج کیا جاتا ہے:

"باقی حال یہ ہے کہ اہلِ سمہ چونکہ بدبخت ازلی تھے، اُنھوں نے جہاد کے بارے میں مُجاہدین کی رفاقت اختیار نہیں کی، بلکہ کافروں کے اغوا سے بعض مجاہدینِ ابرار کو، جو بعض ضرورتوں سے اپنے لشکر سے نکل کر گاؤں میں متفرق ہو گئے تھے اور منتشر تھے، بے خبری میں شہید کر دیا۔ اگرچہ اصل لشکر اُن کے گزند سے محفوظ اور خدمتِ دین کے لیے مستعد، خصوصاً اُن منافقین کو زیر و زبر کرنے اور ان سرکشوں سے انتقام لینے کا آرزومند تھا، لیکن چونکہ وہاں ٹھیرنے سے اصل مقصود یہی تھا کہ مسلمانوں کی بڑی جماعت

مجاہدین کی رفاقت اختیار کر کے کفّار کا مقابلہ کرے اور اس چیز کی اب اُن سے بالکل توقع نہیں رہی، اس لیے وہاں سے ہجرت کر کے پکھلی کے پہاڑوں میں آگیا ہوں۔ ان پہاڑوں کے رہنے والے حُسنِ اخلاق سے پیش آئے اور جہاد کے بارے میں اُنھوں نے پختہ وعدے کیے اور اپنے وطن میں اُنھوں نے رہنے کے لیے جگہ دی۔ چنانچہ فی الحال بالاکوٹ کے قصبے میں کہ اس کے دروں میں سے ایک درّے میں واقع ہے، جمعیتِ خاطر کے ساتھ ٹھیرا ہُوا ہوں اور کفار کا لشکر بھی مجاہدین کے مقابلے کے لیے تین چار کوس کے فاصلے پر ڈیرہ ڈالے ہوئے ہے۔ لیکن چونکہ مقامِ مذکور نہایت محفوظ ہے، لشکرِ مخالف خدا کے فضل سے وہاں تک نہیں پہنچ سکتا، ہاں، اگر مجاہدین خود پیش قدمی کریں اور اُن سے نکل کر لڑیں، تو جنگ ہو سکتی ہے۔ مجاہدین کا ارادہ ہے کہ دو تین روز میں جنگ کی جائے۔ بارگاہِ واہب العطیات سے اُمید یہی ہے کہ فتح و نصرت کے دروازے کھول دے گا۔ اگر اللہ کے حکم سے تائیدِ ربانی شاملِ حال رہی اور یہ جنگ کامیاب رہی، تو انشاء اللہ دریائے جہلم تک کشمیر تک مجاہدین کا قبضہ ہو جائے گا۔ دن رات دین کی ترقی اور لشکرِ مجاہدین کی کامرانی کے لیے دُعا کرتے رہیں۔ والسلام۔"

ایک جاسوس ایک روز لشکرِ مجاہدین میں اسی مُلک کا ایک مسلمان آیا۔ غازیوں کو معلوم ہُوا کہ یہ سکھوں کے لشکر کا جاسوس ہے۔ اُنھوں نے اُس کا مُنہ کالا کیا اور خوب زد و کوب کر کے سید صاحبؒ کے پاس لے گئے اور عرض کی کہ یہ سکھوں کا جاسوس ہے۔ آپ کو اُس کا مُنہ کالا کرنا بہت ناپسند ہُوا۔ فرمایا: "کسی کا مُنّہ کالا نہ کیا کرو۔ اگر ایسی ہی ذلت دینی منظور ہو، تو مُنّہ میں آٹا لگا دیا کرو۔" اُس جاسوس سے فرمایا کہ چھپ کر اور بھیس بدل کر کیوں لشکر میں جاسوسی کرتے ہو؟ جب تم کو کوئی شخص کسی امر کے دریافت کے لیے بھیجے، تو تم علانیہ ہمارے پاس چلے آیا کرو۔ تم سے کوئی مزاحم نہ ہوگا اور وہ حال ہم سے معلوم کر کے چلے جایا کرو۔ ہمارا تمام کارخانہ پروردگار کی مرضی پر موقوف ہے۔ ہم کسی کے آنے جانے سے اندیشہ

نہیں کرتے۔ پھر آپ نے اپنے لوگوں سے فرمایا کہ یہ ہمارا مہمان ہے، اس کو ہمارے باورچی خانہ میں لے جاؤ اور رکھو اور کھانا کھلاؤ۔ لوگوں نے اس کو اس دن کھانا کھلا کر رکھا اور دُوسرے دن کھانا کھلا کر اور حضرت کی اجازت سے دو آدمی ساتھ کر دیے۔ وُہ بحفاظت اُس کو اپنی حد سے باہر نکال کر چلے آئے۔

○

تینتالیسواں باب

آخری جنگ کی تیاریاں

سکھوں کا لشکر مٹی کوٹ پر وقائعِ احمدی میں ہے: "ایک مُلکی نے آکر خبر دی کہ آج سکھ لوگ اِس پار اُترنے کو دریا پر لکڑیوں کا پُل بنا رہے ہیں۔"[1] یہ خبر سُن کر آپ نے حبیب اللہ خاں سے کہا کہ اس دریا کی کھڑی پر تو ہمارے امان اللہ خاں مُتعیّن ہیں۔ اِس کے علاوہ کوئی اور بھی آنے کا راستہ ہے؟ انھوں نے عرض کیا کہ ہاں ایک اور بھی پگڈنڈی ہے، جہاں مرزا احمد بیگ کا پہرہ ہے۔ آپ نے پوچھا: وہ راستہ سکھوں کو معلوم ہے؟ خانِ موصوف نے عرض کیا کہ سکھوں کو تو معلوم نہیں، مگر اِسی مُلک کا کوئی بھیدی اگر طمعِ دُنیا سے کچھ لے کر اُن کو لے آئے، تو آسکتے ہیں۔ یہ سُن کر آپ نے فرمایا کہ کچھ اندیشہ نہیں، اللہ تعالیٰ ہمارے ساتھ ہے۔

اُس کے اگلے روز اسی وقت مُخبر نے آکر خبر دی کہ آج سکھوں کا لشکر دریا کے اِس پار اُترتا ہے، مگر اِدھر نہیں آتا، اور طرف جاتا ہے۔ آپ نے سُن کر فرمایا کہ خیر، لشکر اِدھر آئے اور کہیں جائے اللہ تعالیٰ ہمارا حافظ و ناصر ہے۔ پھر وہ لشکر شام تک نہ معلوم ہوا کہ دریا اُتر کر کہاں چلا گیا۔

اس کے اگلے روز ظہر کے اخیر وقت مرزا احمد بیگ کے پہاڑ پر یکبارگی بندوقیں چلنے لگیں۔ اِدھر

---

[1] مٹی کوٹ جانے کے لیے پہاڑی پگڈنڈی سے گزرنے کے لیے (جس کے لیے شیر سنگھ نے رہبر کا انتظام کر لیا تھا) لشکر کو مغربی کنارے پہنچنا ضروری تھا۔ شیر سنگھ نے بالاکوٹ پر حملہ کرنے کے لیے اسی راستے کو ترجیح دی۔

سب غازی ہوشیار ہو گئے اور کہنے لگے کہ دیکھو تو یہ بندوقیں کیوں چلتی ہیں۔ اسی اثنار میں پہاڑوں پر جابجا گوجر لوگ پکارنے لگے کہ سکھوں کا لشکر آپہنچا۔ آپ نے فرمایا کہ کچھ لوگ مرزا احمد بیگ کی کمک کو جلد جائیں اور اُن کو وہاں سے اِدھر لے آئیں اور وہاں اُن سے مقابلہ نہ کریں۔ مگر ابراہیم خیرآبادی کہ نشان بردار تھے اور اُن کے جوڑی دار فتح اللہ شیدی کو حکم ہُوا کہ تُم نشان لے کر جاؤ۔ اُن کے پیچھے سیّد اللہ نور تنلو ولایتی کو مع جماعت اور اُن کے پیچھے آپ نے ایک اور نشان بھیجا۔ اس کے ہمراہ بھی کچھ لوگ تھے۔ ان چاروں نشانوں کے ہمراہ کچھ اُوپر دو سَو آدمی ہوں گے۔[۱] کوئی پہر دن رہے سب جا کر مٹی کوٹ پر پہنچے۔ اِدھر سے مرزا احمد بیگ اپنی جماعت کے ساتھ آپہنچے اور کہنے لگے کہ اب آگے جا کر کیا کرو گے، وہاں تو سکھوں کا لشکر آگیا۔ چنانچہ سب وہیں مٹی کوٹ پر ٹھیر گئے۔ عصر کو پہاڑ کی چوٹی پر جابجا سکھ نظر آنے لگے۔ اُن کے سفید سفید بھیگے ہُوئے کپڑے، جو انھوں نے سُوکھنے کے لیے پھیلا دیے تھے، دکھائی دیتے تھے۔

سُلطان نجف خاں کا خط وقائع احمدی میں ہے: "اسی روز گھڑی ڈیڑھ گھڑی دن رہے سلطان نجف خاں کا خط آپ کے پاس آیا۔ اس کا مضمون یہ تھا کہ مَیں سکھوں کو آپ کے مقابلے کے لیے نہیں، بلکہ مظفرآباد کے لیے لایا ہُوں۔ مَیں آپ کا خیرخواہ خادم ہُوں۔ اس واسطے عرض کرتا ہُوں کہ بالاکوٹ میں آپ کی موجودگی کی وجہ سے شیر سنگھ آپ سے لڑنے کا مصمم ارادہ رکھتا ہے۔ اس کے ساتھ بارہ ہزار بندوقیں ہیں۔ اگر آپ اس کا مقابلہ کر سکیں، تو بالاکوٹ میں ٹھیریں، نہیں تو بالاکوٹ کو چھوڑ کر پچھلے پہاڑ پر جابیٹھیں۔ یہ اپنا سر مار کر چلا جائے گا۔

دُوسری تدبیر یہ ہے کہ شیر سنگھ آپ کی طرف صرف اپنے پیادوں کو ساتھ لے کر گیا ہے۔ باقی سب اسباب، توپ خانہ، گھوڑے، تمبو، قنات وغیرہ تھوڑے لوگوں کے ساتھ یہاں مُجھ کو سپرد کر گیا ہے۔

---

[۱] مولوی جعفر علی لکھتے ہیں: "ارباب بہرام خاں کو ایک جماعت کے ساتھ دُوسری جانب بھیجا گیا کہ سکھوں کے لشکر کے روکنے میں مرزا احمد بیگ کی امکانی مدد کریں۔ مجھے بھی اپنی جماعت کے توپی اور مستعد لوگوں کے ساتھ روانہ کیا گیا۔ مَیں جب ارباب صاحب کی جماعت کے پاس پہنچا، تو انھوں نے فرمایا کہ حضرت امیرالمومنین نے سکھوں کا راستہ روکنے کے لیے بھیجا تھا، لیکن اب دو چار راستے نہیں ہیں کہ ہم اُن کی ناکہ بندی کریں، پہاڑ پر پہنچ جانے کے بعد تو بہت سے راستے ہو گئے ہیں۔" (منظورہ : ص ۱۱۷۵)

آپ وہاں سے اپنے سب لوگوں کو لے کر رات کو دریا کے اس پار چلے آئیں اور اپنے کچھ غازیوں کا چھاپہ ہم لوگوں پر بھیج دیں۔ یہاں ہمارے پاس کوئی مقابلہ کرنے والا نہیں ہے۔ سب غازیوں کے آتے ہی جان کے خوف سے بھاگ جائیں گے۔ تمام مال و اسباب غازیوں کے قبضے میں آجائے گا اور میں بھی آپ کے ساتھ شریک ہو جاؤں گا، ورنہ کل آپ کے خلاف دو طرف سے جنگ ہو گی: اُدھر سے شیر سنگھ آپ کا مقابلہ کرے گا، اِدھر سے یہ لوگ گولی ماریں گے۔ جو کچھ تدبیر کرنی ہو آج ہی رات کو کر لیں۔ خیر خواہی سمجھ کر مَیں نے آپ کو اطلاع کر دی۔[1]

اس وقت ناصر خاں، حبیب اللہ خاں اور کاغان کے سیّد ضامن شاہ، ان کے علاوہ اَور بھی بہت لوگ موجود تھے۔ سب کے سامنے وہ خط پڑھا گیا۔ آپ نے سب کی طرف مخاطب ہو کر فرمایا: بھائیو، تم سب نے یہ مضمون سُنا۔ اب اس میں تمھاری کیا صلاح ہے؟ جو بات بہتر معلوم ہو، ہم سے کہو ناصر خاں نے عرض کیا کہ حضرت، اَور بھائیوں کا حال تو مجھ کو معلوم نہیں کہ وہ کیا صلاح دیں، مگر میری ناقص رائے میں آتا ہے کہ یہ خط، جو سُلطان نجف نے بھیجا ہے، فریب سے خالی نہیں ہے، کیونکہ وُہ اگر آپ کا مخلص صادق ہوتا، تو جب لشکر نانگلی یا مانسہرے میں آیا تھا، اُس وقت یہ خط بھیجتا، تو قابلِ اعتبار ہوتا۔ اب جبکہ سکھوں کا لشکر سامنے پہاڑ پر چڑھ آیا، اُس وقت وُہ اپنی دوستی اور خیر خواہی جتاتا ہے۔ یہ محض دغا و فریب معلوم ہوتا ہے۔

ناصر خاں کے بعد حبیب اللہ خاں نے عرض کیا کہ سُلطان نجف خاں نے یہ خط آپ کو خیر خواہی سے بھیجا ہو یا فریب سے، یہ تو ہم کو معلوم نہیں، مگر اُس نے جو کچھ لکھا ہے، وُہ سچ ہے۔ بیشک شیر سنگھ کے ساتھ دس بارہ ہزار بندوقیں ہیں۔ اگر آپ یہاں سے اُٹھ کر پچھلے پہاڑ پر جا بیٹھیں، تو اُس کا کچھ زور نہ چلے گا اور حیران ہو کر اور سر مار کر دو ایک روز میں مظفر آباد کو چلا جائے گا اور یہ بھی سچ لکھا ہے کہ مقابلے

---

[1] منظورہ سے معلوم ہوتا ہے کہ ارباب بہرام خاں نے بھی یہ مشورہ دیا تھا کہ سکھوں کے توپ خانہ پر قبضہ کر کے اس لشکر کو محصور کر لیا جائے، جو مٹی کوٹ پر پہنچ چکا ہے اور سلسلۂ رسد کو اس سے منقطع کر دیا جائے۔ آپ نے اُن سے عذر فرمایا کہ ہم نے پُل توڑ دیا ہے اب اس کا انتظام مشکل ہے۔ اب تو جو کچھ ہونا ہے، یہیں ہوگا۔ ارباب بہرام خاں نے اپنی گردن کی طرف کلمۂ شہادت سے اشارہ کرتے ہوئے کہا: "یہ سر راہِ خُدا میں کٹنے کے لیے حاضر ہے" (منظورہ، ص ۱۱۷۴، تا ۱۱۷۷)

کے وقت آپ کے لوگوں پر دونوں طرف سے لڑائی پڑے گی۔ یہ سب تو ہم آنکھوں دیکھ رہے ہیں کہ اس طرف پہاڑ پر شیر سنگھ لشکر لیے پڑا ہے اور دریا کے پار اُس کا توپ خانہ ہے۔ اور جو یہ لکھا ہے کہ آپ غازیوں کے ساتھ دریا کے اس پار چلے آئیں اور کچھ لوگوں کا چھاپہ یہاں بھیج دیں، اس میں بھی بظاہر کچھ فریب نہیں معلوم ہوتا۔ بلکہ یوں ہی مناسب نظر آتا ہے کہ اگر آپ وہاں چھاپہ بھیجیں، تو کچھ عجب نہیں کہ اُن کا توپخانہ اور مال و اسباب وغیرہ اپنے غازیوں کے ہاتھ آجائے اور پھر یہ سکھ، جو پہاڑ پر ہیں، بے لڑائی کے بھاگ جائیں۔

اِسی میدان میں لاہور ہے اسی میں جنت ہے

حبیب اللّٰہ خاں کی یہ تقریر سُن کر آپ نے فرمایا کہ خان بھائی، تم سچ کہتے ہو، مگر اب کُفّار کے ساتھ چوری سے لڑنا ہم کو منظور نہیں[1]۔ اِسی بالاکوٹ کے نیچے اُن سے لڑیں گے۔ اِسی مَیدان میں لاہور ہے، اِسی میں جنّت ہے۔ اور جنّت تو پروردگار نے ایسی عُمدہ چیز بنائی ہے کہ ساری دُنیا کی ریاست اُس کے آگے کچھ حقیقت نہیں رکھتی۔

بارگاہِ الٰہی میں نذرانہ

مَیں تو یہ چاہتا ہوں کہ تمام جہان سے جو عُمدہ چیز ہو، اُس کو اپنے پروردگار کے نذر کر کے اس کی رضامندی حاصل کروں اور اپنی جان کو اس کی راہ میں نثار کرنے کو تو مَیں ایسا سمجھتا ہوں جیسے کوئی ایک تنکا توڑ کر پھینک دیتا ہے۔

اِسی صلاح و مشورے میں دو ڈھائی گھڑی رات گزر گئی۔ اس وقت یہ بات ٹھیری کہ دریا کا پُل توڑ کر غازیوں کا پہرہ اُٹھا لیا جائے۔ چنانچہ یہی کیا گیا[2]۔

عشاء کی نماز کے بعد آپ نے مُلّا لعل محمد قندھاری سے فرمایا کہ بھلا، تم ستبنی کے اس نالے پر ہو کر اور پہاڑ کے اُوپر جا کر سکھوں پر چھاپہ مار سکتے ہو؟ اُنھوں نے عرض کیا کہ ہاں، کیوں نہیں مار سکتے،

---

[1] جنگ کے سلسلے میں ایک مقام ضرور ایسا آتا ہے، جہاں فیصلہ کُن جنگ اور ثبات و استقامت کی ضرورت ہوتی ہے۔
سیّد صاحبؒ نے اس موقع پر پورے مقابلے کا فیصلہ فرمایا۔ بظاہر بالاکوٹ چھوڑ کر چلے جانے کے مشورے قرینِ عقل معلوم ہوتے ہیں، لیکن زیادہ گہری نظر اور ایک غیور بہادر کے نقطۂ نظر سے دیکھا جائے، تو یہ مشورہ قابلِ قبول اور یہ تدبیر کارگر نہ تھی۔ اس کا انجام صرف یہ ہوتا کہ وقتی طور پر لشکر کی جان بچ جاتی، مگر سکھ بالاکوٹ کی پوری بستی کو پھونک دیتے اور ناکردہ گناہ آبادی کو تہ تیغ کر کے رکھ دیتے۔

[2] پُل غالباً اس لیے توڑا گیا کہ سکھ لشکر اس سے عبور کر کے مشرق کی جانب سے بالاکوٹ پر حملہ نہ کر سکے۔

مگر اس شرط سے کہ آپ کو یہاں تنہا نہ چھوڑیں گے۔ اپنی جان کے ساتھ رکھیں گے، کیونکہ اتنے برس اس ملک میں رہ کر یہاں کے لوگوں کا حال خوب دیکھ لیا۔ ان سے نفاق دُور ہونا بہت مشکل ہے۔ سکھوں کا جو یہ لشکر پہاڑ پر آیا ہے، اُن کو بھی ملکی لوگ لائے ہیں، ورنہ کیا مجال تھی کہ آسکے۔

کل صبح کو اسی بالاکوٹ کے نیچے ہمارا اور کفار کا میدان ہے

آپ نے فرمایا کہ تم سچ کہتے ہو حقیقت حال یہی ہے اتنے برس ہم نے اس کارِ خیر کے واسطے طرح طرح کی کوشش و جانفشانی کی، اپنی دانست میں کوئی دقیقہ نہیں چھوڑا، ہندوستان، خُراسان اور ترکستان میں اپنے خُلفاء روانہ کیے، اُنھوں نے بھی حتی الامکان دعوت فی سبیل اللہ میں کوئی کوتاہی نہیں کی اور ہم بھی جہاں جہاں گئے، وہاں کے لوگوں کو ہر طریقے پر وعظ و نصیحت سے سمجھاتے رہے، مگر سوائے تم غُرباء کے کسی نے ہمارا ساتھ نہ دیا، بلکہ ہم پر طرح طرح کا افترا کیا۔ اب ہمارے کاتب بھی خطوط لکھتے لکھتے تھک گئے اور ہم بھیجتے بھیجتے تنگ آگئے اور کچھ ظہور میں نہ آیا۔ اب یہی خُوب ہے کہ اپنے سب غازی بھائیوں کو پہروں پہرے سے اپنے پاس بُلوالیں کل صبح کو اسی بالاکوٹ کے نیچے ہمارا اور کفار کا میدان ہے۔ اگر اللہ نے ہم عاجز بندوں کو اُن پر فتحیاب کیا تو پھر چل کر لاہور دیکھیں گے اور جو شہید ہو گئے، تو انشاءاللہ تعالیٰ جنت الفردوس میں چل کر عیش کریں گے۔

اُس وقت تمام لوگ عالمِ سکوت میں تھے، کوئی کسی طرح کا چُون و چرا نہ کرتا تھا۔ پھر آپ نے مٹی کوٹ کے سب غازیوں کو بُلوا کر اپنے پاس جمع کر لیا۔

شہادت کی تیاری

آپ نے سب غازیوں کی طرف مخاطب ہو کر فرمایا کہ بھائیو آج رات کو اپنے پروردگار سے بکمال اخلاص توبہ و استغفار کرو اور گناہوں کی بخشش چاہو۔ یہی وقت فرصت کا ہے۔ کل صبح کو کُفار سے مقابلہ ہے۔ خدا جانے، کس کی شہادت ہے اور کون زندہ رہے۔

آخری انتظامات

جب یہ بات واضح ہو گئی کہ سکھ مٹی کوٹ سے اُتر کر بالاکوٹ پر حملہ آور ہوں گے تو ایک مُؤثر اور فیصلہ کُن جنگ کے انتظامات کیے گئے۔ قصبے کا جائے وقوع اور میدانِ جنگ کی طبعی کیفیت مجاہدین کے لیے سازگار تھی۔ اس سے پُورا فائدہ اُٹھانے کی کوشش کی گئی۔ حملہ آور جب مٹی کوٹ سے اُترتے، تو اُن کو قصبے پر حملہ کرنے سے پہلے (جو بلندی پر واقع تھا) اسی نشیبی میدان سے سابقہ پڑتا،

جو ٹیلے اور قصبے کے درمیان واقع ہے۔ اس نشیبی میدان میں دھان کے کھیت تھے۔ آپ کے حکم سے وہاں چشمے کا پانی چھوڑ دیا گیا تاکہ مسطح میدان دلدل میں تبدیل ہو جائے، جس کا عبور کرنا اور وہاں جنگی نظام کا قائم رکھنا حملہ آوروں کے لیے دشوار ہو۔ اس کے بالمقابل مجاہدین کو جو قصبے کی بلندی پر موجود اور مورچے لگائے ہوئے تھے، اُن پر حملہ کرنا آسان ہو اور حملہ آور آسانی کے ساتھ اُن کی گولیوں کی زد میں آجائیں۔

اس تدبیر کے علاوہ مختلف مورچوں پر جہاں سے سکھ لشکر کے دباؤ اور زور کا اندیشہ تھا، مجاہدین کی مختلف جماعتوں کو مقرر کر دیا گیا تھا۔ زیادہ تر مورچے ست بنے کے نالے پر تھے، جو بالاکوٹ سے شمال مغرب کے گوشے پر ہے اور مٹی کوٹ سے اُترنے والے لشکر کا اس طرف سے بالاکوٹ پر حملہ کرنا زیادہ متوقع تھا۔ یہاں سب سے پہلا مورچہ مُلا لعل محمد قندھاری کا تھا، جو ست بنے کے نالے اور ٹیلے کے درمیان تھا۔ وہاں سے سلسلہ وار قصبے کی جانب مولانا اسمٰعیل صاحب اور شیخ ولی محمد صاحب کی جماعت کے مورچے تھے، پھر ناصر خاں اور حبیب اللہ خاں کے مورچے تھے۔

قصبے کی تینوں مسجدوں اور مناسب مقامات پر بھی مورچہ بندی کر دی گئی۔

وقائع احمدی میں ہے: "بالاکوٹ کے جانب مغرب مٹی کوٹ ہے، اس کی جڑ بھی زینے کی مانند ڈھلوان تھی۔ وہاں دھان بوئے جاتے تھے۔ حضرت امیر المومنینؒ کی اجازت سے اس زمین میں چشمے کا پانی رات ہی کو چھوڑ دیا گیا۔

بالاکوٹ میں تین مسجدیں تھیں۔ بستی کے بیچ میں ایک مسجد بڑی تھی، جس میں حضرت نماز پڑھتے تھے ایک اَور مسجد اس مسجد سے تھوڑی دُور تھی، اور ایک مسجد بالاکوٹ کے نیچے اُتار پر تھی۔ سو حضرت نے رات ہی کو اپنے سب غازیوں سے فرمایا کہ جس کو جو کچھ لکڑی یا پتھر دستیاب ہو، وہ اپنے اپنے ٹھکانے پر لڑائی کے واسطے مورچہ بنا لے۔ پھر اپنے پاس سے سب کو رخصت کیا۔ اسی وقت جا کر لوگوں نے اپنے اپنے مورچے بستی کے کواڑ، تختے، لکڑی، پتھر لا کر بنائے اور چوکی پہروں کا بندوبست کر کے سونے لگے۔"

رخصتی لباس | آپ مسجد سے اپنے ڈیرے پر تشریف لے گئے، کھانا تناول فرمایا اور اپنے کپڑے اور ہتھیار منگوائے۔ آپ نے چار کپڑے منشی خواجہ محمد (حسن پوری) کو بھیجے کہ کل فجر کو یہی کپڑے پہن کر مقابلے

کو چلیں اور تین کپڑے حکیم قمرالدین پھلتی کو کہ وہ بھی کل فجر کو یہی پوشاک پہنیں، اور ایک ارخالق، ایک دستار کاکریزی، ایک شالی کشمیری پٹکا اور سپید پاجامہ، یہ چار کپڑے اپنے واسطے رکھے اور ہتھیاروں میں سے ایک تفنگچہ، ایک ولایتی چھری، ایک ہندوستانی تلوار اور کٹار، یہ چار ہتھیار اپنے واسطے رکھے۔ پھر لوگوں سے فرمایا کہ اب اپنے اپنے بستر پر جاکر سو رہو، ہم بھی سوتے ہیں۔

شہادت کی رات | میاں عبدالقیوم صاحب کہتے ہیں کہ وہ رات اس طرح وحشتناک تھی کہ اُس کا بیان تقریر سے باہر ہے۔ آسمان پر ابر بھی تھا اور بُوندیاں بھی پڑتی تھیں۔ شام سے صُبح تک تمام پرند جانور شور و غل کرتے رہے۔ خود اس بستی کے لوگ ہم لوگوں سے کہتے تھے کہ ہم نے ایک سے ایک اندھیری اور ابر آلُود رات دیکھی، مگر ایسی اُداس اور خوفناک رات دیکھنے میں نہیں آئی۔

میاں لعل محمد مگڈلیس پوری کہتے ہیں کہ بالاکوٹ کی لڑائی سے کئی روز پہلے سے کُہر کی مانند ایک سُرخ غُبار چھایا ہُوا تھا اور لوگوں کو ایک ہیبت اور اُداسی سی معلوم ہوتی تھی؛ ویسا دُھواں کبھی دیکھا نہ تھا۔ غازیوں میں اس کا تذکرہ ہُوا اور قاضی علاء الدین صاحب نے سیّد صاحبؒ سے ذکر کیا۔ آپ کچھ دیر دیر تک سوچ میں رہے اور آسمان کی طرف دیکھنے لگے۔ اس کے بعد فرمایا کہ مجھے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ شاید ہمارے لشکر کے مُجاہدین میں سے کچھ لوگ راہِ خُدا میں اپنی جانیں دے کر اپنی دلی مُراد کو پہنچ کر کامیاب ہوں گے اور تم لوگوں میں سے کوئی شخص جُدا بھی ہو جائے گا۔ آگے اس کی حقیقت اللہ تعالیٰ جانے۔

چوالیسواں باب

مشہدِ بالاکوٹ

شہادت کی صبح | ۲۴ ذی قعدہ (۱۲۴۶ھ) کی صبحِ صادق اور صبح کی اذان ہوئی، تو سب لوگ وضو کرکے مسلح ہو کر حاضر ہوئے۔ آپ نے نماز پڑھائی۔ پھر اجازت دی کہ اپنی اپنی جگہ پر جا کر ہوشیار رہو۔ آپ بھی اپنے ڈیرے پر آکر وظیفے میں مشغول ہو گئے۔ جب آفتاب نکلا۔ تو نمازِ اشراق پڑھ کر کچھ دیر کے بعد وضو کرکے سُرمہ لگایا اور ڈاڑھی میں کنگھی کی اور لباس اور ہتھیار پہن کر مسجد کو چلے۔ اس وقت سکھ پہاڑ سے مٹی کوٹ کی طرف اُترتے تھے۔ لوگوں نے اُن کی طرف اشارہ کرکے آپ سے عرض کیا کہ سکھوں کا لشکر پہاڑ سے اُترتا ہے۔ آپ نے فرمایا کہ اُترنے دو۔ پھر آپ مسجد میں داخل ہوئے اور اُس کے سائبان کے تلے بیٹھے اور ایک ایک، دو دو کرکے بہت سے غازی بھی وہیں جمع ہو گئے۔

ایک عبرتناک واقعہ | میاں خدابخش صاحب رامپوری کہتے ہیں کہ ضلع اجوری کا ایک شخص پنجتار سے حضرت کے لشکر میں شریک ہوا تھا۔ اُس کا نام معلوم نہیں کیا تھا، مگر راجہ کرکے مشہور تھا۔ جب اُس نے شیر سنگھ کا لشکر دیکھا کہ سامنے پڑا ہے، خدا معلوم اس کے دل میں کیا آیا کہ یکبارگی اپنے ہتھیار لے کر لشکرِ مجاہدین سے نکل کر شیر سنگھ کے لشکر میں چلا گیا اور اُن میں شریک ہو گیا۔ تقدیرِ الٰہی سے اُس کے جانے کے بعد شیر سنگھ کے لشکر کا ایک سکھ حضرت کے پاس آکر مسلمان ہوا اور غازیوں میں شریک ہوا۔ حضرت نے اُس کا نام عبداللہ

بکما جس دن بالاکوٹ میں لڑائی شروع ہوئی اور سکھوں نے غازیوں پر یورش کی، تب وُہ جو ماجھ کر کے مشہور تھا، ہتھیار باندھے سب سکھوں کے آگے تھا۔ اِدھر کی گولی اُس کے لگی اور وُہ وہیں مُردار ہُوا۔ اس کے بعد سکھوں کی طرف کی ایک گولی اس سکھ نومسلم کے لگی اور وُہ اُسی جگہ شہید ہو گیا۔

پہلا شہید الٰہی بخش رامپوری کہتے ہیں کہ ہماری جماعت میں ضلع پٹیالہ کے ایک سید چراغ علی تھے وُہ کھیر پکا رہے تھے اور قرابین اُن کے کندھے پر پڑی ہوئی تھی۔ بسکہ مٹی کوٹ سے نیچے اُتر رہے تھے۔ وُہ اپنی کھیر بھی چمچے سے چلاتے جاتے تھے اور سکھوں کی طرف بھی دیکھتے تھے۔ اس وقت اُن پر ایک اَور ہی حالت واقع تھی۔ یکبارگی آسمان کی طرف دیکھ کر بولے کہ وہ دیکھو، ایک حُور کپڑے پہنے ہوئے چلی آتی ہے۔ کچھ دیر کے بعد کہنے لگے کہ دیکھو ایک پوشاک پہنے ہوئے آتی ہے۔ یہ کہ کر وُہ چمچہ دیگچی پر مارا اور یہ کہتے ہوئے کہ اب تمھارے ہی ہاتھ کا کھانا کھائیں گے، سکھوں کی طرف روانہ ہوئے۔ کتنا ہی لوگ کہتے رہے کہ میر صاحب، ٹھیر جاؤ، ہم بھی چلیں گے، اُنھوں نے کسی کے کہنے کا کچھ خیال نہ کیا اور جاتے ہی سکھوں کے مجمع میں گھس گئے اور داد جوانمردی دے کر شہید ہو گئے۔

دُنیا سے بے تعلقی میاں الٰہی بخش صاحب رامپوری کہتے ہیں کہ شیخ ولی محمد صاحب پھلتی نے، جن کی تحویل میں توشک خانہ تھا، مال و اسباب کی گٹھڑیاں باندھتے ہوئے مجھ سے اور نظام الدین اولیا سے کہا کہ حضرت کا معمول ہے کہ دشمن کے مقابلے کے وقت اپنے توشک خانے کا اسباب کہیں محفوظ مکان میں رکھوا دیتے ہیں۔ تم جا کر میری طرف سے کئی باتیں عرض کر کے جلد جواب لاؤ۔ ایک یہ کہ توشک خانہ کا یہ اسباب جہاں ارشاد ہو، وہاں پہنچا دیا جائے۔ اور ایک یہ کہ چار پانچ آدمی، جو بیمار ہیں، اُن کو کہاں لے جا کر رکھیں، اور ایک یہ کہ موضع کنسی ضلع تاکوٹ کے ساٹھ آدمی آپ کی مدد کو آئے ہیں، وہ گولی بارُود مانگتے ہیں۔ اپنے اکثر غازی بھائی بھی گولی بارُود اور بندوق کے پتھر مانگتے ہیں۔ جو ارشاد ہو، وُہ کیا جائے۔ ہم دونوں مسجد میں گئے اور یہ تمام حال حضرت سے جُدا جُدا عرض کیا۔ آپ نے سب کے جواب میں فرمایا کچھ حاجت نہیں، یعنی، توشک خانے کا مال و اسباب جہاں ہے، وہیں رہنے دو، کہیں لے جانے اور پہنچانے کی حاجت نہیں اور یُوں ہی بیماروں کو بھی، جہاں ہیں، وہیں رہنے دو، اور جو لوگ گولی بارُود مانگتے

ہیں، سو وُہ بھی دینے کی کچھ حاجت نہیں۔

سیّد صاحبؒ پہلے مورچے پر | محمد امیر خاں قصوری کہتے ہیں کہ آپ مسجد کے سائبان کے تلے بیٹھے تھے۔ باری باری ایک ایک آدمی کا پہرہ آپ کے پاس رہتا تھا۔ اُس وقت میری باری تھی اُدھر پہاڑ کے سکھ لوگ اُترتے تھے۔ جو ضربِ شاہین اُن کی طرف سے چلتی تھیں، اُن کا کوئی گولا مسجد کے اُوپر نکل جاتا تھا، کوئی مسجد کے دائیں بائیں ہو کر۔ مگر کسی آدمی کے نہیں لگتا تھا۔ ہماری طرف کے مورچوں سے بھی شاہین اور بندوقیں چلتی تھیں، مگر ایک مورچے کی شاہینیں، جو مسجد کے جنوب کی طرف تھا، نہیں چلتی تھیں۔ لوگوں نے آپ سے سکھوں کی گولیوں کی شکایت کی۔ آپ نے فرمایا کہ تم بھی مارو۔ تب اس مورچے سے بھی شاہینیں سر ہونے لگیں۔ اس اثنا میں نور محمد جراح کسوت لیے ہوئے حضرت کے پاس آئے اور آپ کی لبیں کتریں اور ڈاڑھی میں کنگھی کی۔

فتح و شکست اللہ کے اختیار میں ہے | اس عرصے میں حبیب اللہ خاں کسی آدمی سے کہنے لگے کہ سکھوں کی جمعیت بہت ہے اور ہم لوگوں کی تھوڑی۔ اُن کے مقابلے کا طَور کچھ میری طبیعت میں اچھی طرح جمتا نہیں۔ کہیں یہ آواز حضرت کے کان میں پہنچی۔ آپ نے فرمایا: حبیب اللہ خاں کیا باتیں کرتے ہیں؟ کسی نے کہا کہ وُہ یہ کہتے ہیں کہ سکھ بہت ہیں اور ہم لوگ تھوڑے ہیں، اُن کے مقابلے کا طَور میرے خیال میں اچھی طرح سے نہیں آتا۔ آپ نے خانِ موصوف کو اپنے پاس بُلا کر فرمایا کہ خان بھائی، فتح اور شکست اللہ تعالیٰ کے اختیار میں ہے، جس کو چاہے، دے۔ بہت اور تھوڑے لوگوں پر موقوف نہیں ہے، کبھی اللہ تعالیٰ تھوڑوں کو بہتوں پر غالب کر دیتا ہے اور کبھی بہتوں کو تھوڑوں پر۔ ہم کو صرف اپنے پروردگار کی رضامندی درکار ہے، فتح و شکست سے کچھ غرض نہیں۔ اس کی خوشنودی میں بہرصورت ہماری فتح مندی ہے۔

اُن کو نزدیک آنے دو | اسی اثنا میں مُلّا لعل محمد قندھاری گھبرائے ہوئے آئے اور حضرت سے عرض کی کہ سکھ لوگ پہاڑ پر سے اُتر کر نزدیک آگئے ہیں۔ آپ نے پوچھا کہ تم لوگوں کے مورچوں سے کتنی دُور پر آئے ہیں؟ انھوں نے عرض کی کہ بندوق کی زد پر۔ آپ نے فرمایا کہ تم بھی جا کر اپنے اپنے مورچوں

سے بندوقیں مارو اور اُن کو نزدیک آنے دو اور جب تک ہم نہ آئیں، تب تک اُن پر کوئی حملہ نہ کرے۔

یہ جواب سُن کر مُلّا لعل محمّد اپنے مورچے پر چلے گئے۔ کچھ دیر کے بعد آکر وہی عرض کیا کہ سکھ لوگ بہت نزدیک آگئے ہیں۔ آپ نے پھر وُہی فرمایا کہ ابھی اُن کو اور نزدیک آنے دو۔ یہ سُن کر وہ پھر اپنے مورچوں میں گئے۔ تیسری بار کچھ دیر کے بعد پھر وُہی عرض کیا اور کہا کہ اگر اجازت ہو، تو ہم لوگ اُن پر حملہ کریں آپ نے پھر وُہی جواب دیا کہ بغیر ہمارے تم کوئی حملہ نہ کرنا اور ابھی اُن کو اور بھی نزدیک آنے دو۔ یہ سُن کر مُلّا لعل محمّد اپنے مورچے کی طرف گئے۔

دُعا | اِدھر آپ سائبان کے نیچے سے اُٹھے اور سب لوگوں سے فرمایا کہ تم سب یہیں رہو، ہم اکیلے جاکر دُعا کرتے ہیں۔ ہمارے ساتھ کوئی نہ آئے۔ پھر سب لوگ جہاں کے تہاں ہتھیار باندھے تیار کھڑے رہے آپ مسجد کے اندر گئے اور دروازہ اور کھڑکی کے کواڑ بند کر لیے اور دُعا میں مشغول ہُوئے۔ کچھ دیر کے بعد یکایک کھڑکی کھول کر آپ نے پوچھا کہ مجھ کو کس نے پکارا؟ محمّد امیر خاں کہتے ہیں کہ میں نے عرض کی کہ اِدھر سے تو آپ کو کسی نے نہیں پکارا، کیونکہ اِدھر میرے سوا کوئی اور آدمی نہیں ہے۔ یہ سُن کر پھر آپ نے کھڑکی بند کر لی۔ کچھ دیر کے بعد آپ نے پھر کھڑکی کھول کر پوچھا کہ مجھ کو کسی نے آواز دی؟ میں نے پھر عرض کیا کہ اِدھر سے آپ کو کسی نے نہیں پکارا۔ الغرض تین بار کھڑکی کھول کر وُہی پوچھا اور تینوں بار میں نے وُہی جواب دیا کہ اِدھر سے آپ کو کسی نے نہیں پکارا، یہی حال بڑے دروازے کی طرف گُزرا۔

میدانِ جنگ کی طرف | شیر محمّد خاں کہتے ہیں کہ تیسری بار آپ نے وُہی پکارنے کا سوال کیا اور لوگوں نے وُہی پہلا جواب دیا۔ آپ مسجد سے نکلے اور جلد باہر کو روانہ ہُوئے۔ صحنِ مسجد سے نکل کر بالاکوٹ کے نیچے اُترنے لگے۔ آپ آگے تھے اور سب لوگ آپ کے پیچھے تھے۔ ایک مسجد جو نیچے اُتار پر تھی غازیوں کا ایک مورچہ اُس میں بھی تھا۔ آپ اُس میں تشریف لے گئے۔

میدانِ جنگ کے اندر | محمّد امیر خاں قصُوری کہتے ہیں کہ جب آپ بالاکوٹ کے نیچے کی مسجد میں تشریف لے گئے، وہاں سکھوں کی گولیاں اولوں کی طرح برس رہی تھیں۔ کئی آدمی زخمی ہُوئے۔ آپ نے لوگوں سے فرمایا کہ یہاں تختے اور کواڑ کی آڑیں جلد بنالو۔ بعض غازی بستی کے کواڑ اُتار لائے۔ مگر آڑ بنانے کی نوبت نہیں آئی،

کیونکہ اسی اثنا میں آپ نے مسجد کے کونے کی آڑ میں کھڑے ہو کر سکھوں کی طرف دیکھا اور فرمایا کہ جو قرابین والے اور لمبی بندوق والے ہوں، وہ ہمارے آگے چلیں۔ پھر کوئی کوئی قرابین والے آگے ہونے پائے۔ اس میں جلد آپ نے مسجد سے باہر نکل کر اور تکبیر کہہ کر حملہ کیا[1] اور جس طرح شیر اپنے شکار پر جاتا ہے، اسی سرعت سے آپ جاتے تھے۔

میاں عبدالقیوم صاحب کی روایت ہے کہ جب آپ نیچے کی مسجد میں تشریف لائے، وہاں سکھوں کی گولیاں اولے کی طرح برستی تھیں۔ کوئی آدھ گھڑی مسجد میں ٹھیر کر واوا سید ابوالحسن سے فرمایا کہ نشان لے کر آگے چلو۔ پھر بآوازِ بلند تکبیر کہتے ہوئے آپ حملہ آور ہوئے۔

اس وقت ارباب بہرام خاں آپ کے آگے آگے گویا سپر بن کر چلتے تھے۔ وہاں سے پچیس تیس قدم کھیت میں ایک بڑا سا پتھر زمین سے نکلا ہوا تھا۔ آپ اس کی آڑ میں جا کر ٹھیرے۔ مولانا محمد اسمٰعیل صاحب نے کہا کہ جن غازیوں کے پاس قرابینیں ہیں۔ وہ اس وقت حضرت کے پاس سے جدا نہ ہوں۔ سب قرابینچی آپ کے قریب مورچہ بنا کر بیٹھے۔ آپ اس پتھر کی آڑ میں اس نیت سے ٹھیرے تھے کہ جب سکھوں کا حملہ بہت نزدیک آئے، تو ایک باڑھ قرابینوں کی مار کر تلوار کی لڑائی لڑیں۔ حکمتِ الٰہی سے یوں ہی ہوا کہ جب ان کا حملہ اوپر سے اترتے اترتے پندرہ بیس قدم کے فاصلے پر آیا، تب یکبارگی تکبیر کہہ کر ایک باڑھ بندوق والوں نے ماری، اس کے بعد دوسری باڑھ قرابین والوں نے ماری۔ ان دونوں باڑھوں میں بے شمار کفار مقتول ہوئے۔

حافظ وجیہ الدین صاحب باغپتی کہتے ہیں کہ میں بندوق لگاتے لگاتے ایک نالے پر پہنچا، تو دیکھتا ہوں

---

[1] میاں لکھمیر کی روایت ہے کہ آپ کا غازیوں کو حکم تھا کہ سکھ جب تک تلوار کے مقابلے پر نہ آئیں، تب تک کوئی حملہ نہ کرے۔ ملا فضل محمد قندھاری اپنی جماعت کے ساتھ ست بنّے کے نالے پر مورچہ لگائے سکھوں پر گولیاں چلا رہے تھے۔ جب سکھ آتے آتے چالیس قدم کے فاصلے پر آ پہنچے، تو ملا فضل محمد نے بغیر اجازت اپنا نشان اٹھا کر حملہ کر دیا۔ قریب تھا کہ جا کر سکھوں میں گڈمڈ ہو جائیں۔ اگرچہ اس وقت اتنے فاصلے سے حضرتؒ کا ارادہ نہ تھا کہ حملہ کریں، مگر قندھاریوں کو دیکھ کر دیر کرنا مناسب نہ جانا۔ بآوازِ بلند تکبیر کہتے ہوئے مسجد سے نکل کر حملہ آور ہوئے۔ (وقائع احمدی)

خدا بخش خاں رامپوری، محمد ابراہیم خاں قصوری اور میاں عبدالقیوم اس کی تردید کرتے ہیں کہ ملا فضل محمد قندھاری نے بلا اجازت حملہ کیا اور حملہ کرنے میں سبقت کی۔

کہ چند آدمیوں کے ساتھ سید صاحبؒ قبلہ رُو بیٹھے ہوئے بندوقیں چلا رہے ہیں اور آپ کے قریب شہیدوں کی کئی لاشیں پڑی ہیں، شیخ عبدالرؤف پھلیتی کی لاش اور دوسری شاہ محمد کی لاش، جو جماعت خاص میں تھے، میں نے پہچانی، باقی اوروں کے نام یاد نہیں۔ اس وقت حضرت نے میرے رُوبرُو اپنی داہنی چھاتی پر بندوق جما کر فیر کیا، تو مجھ کو آپ کے داہنے ہاتھ کی چھوٹی انگلی میں یا اُس کے پاس والی میں تازہ خون نظر آیا۔ میں نے اپنے قیاس سے معلوم کیا کہ شاید آپ کے مونڈھے میں گولی لگی ہے۔ بندوق چھاتی پر رکھتے وقت اُس کا خون آپ کی انگلی میں لگ گیا ہے۔

میاں حفیظ اللہ دیوبندی کہتے ہیں کہ مجھ کو چند روز پہلے سے بخار آتا تھا۔ اس سبب سے میں پیچھے رہ گیا اور میری جماعت کے سب لوگ آگے بڑھ گئے۔ آہستہ آہستہ میں بھی اُن کے پیچھے چلا جاتا تھا۔ دھانوں کے ایک کھیت میں میں نے دیکھا کہ مولانا محمد اسمٰعیل صاحب کھڑے ہوئے بندوق لگا رہے ہیں۔ میں نے دُور ہی سے پکار کر پُوچھا کہ مولانا صاحب، حضرت امیرالمومنین کہاں ہیں؟ اُنھوں نے کہا شور نہ کرو، سکھ سُنتے ہیں۔ حضرت آگے نالے میں ہیں۔ وہیں چلے جاؤ۔ میں وہاں گیا، تو دیکھا کہ حضرت ایک ہاتھ میں تلوار اور دُوسرے میں بندوق پکڑے قبلہ رُخ نالے میں بیٹھے ہیں اور ایک طرف آپ کے قریب پچیس تیس غازی صف باندھے آڑ میں بیٹھے ہوئے بندوقیں لگا رہے ہیں۔ میں بھی اُنھیں میں جا بیٹھا اور بندوق بھر بھر کر مارنے لگا۔ اس دوران میں حضرت نے فرمایا کہ بھائیو، ان سونڈیوں کو تاک تاک کر گولیاں مارو۔

مجاہدین کا غلبہ اور سکھوں کی پسپائی

محمد امیر خاں قصوری کہتے ہیں: اُس وقت آسمان صاف تھا: نہ ابر تھا نہ غبار۔ دُھوپ پھیلی ہوئی تھی، مگر بارود کے دُھویں کے سبب سے اس طرح کی تاریکی تھی کہ نزدیک کا آدمی بھی بمشکل پہچانا جاتا تھا۔ سکھوں کی بندوقوں کے کارتوس کے کاغذ یُوں معلوم ہوتے تھے، جیسے ٹیڈیاں[1] اُڑتی ہیں۔ وہ وقت نہایت اُداس اور خوفناک نظر آتا تھا۔ سب مجاہدین نے قرابین اور بندوقیں گلے میں ڈال کر تلواریں کھینچیں اور یکبارگی باآواز بلند اللہ اکبر! اللہ اکبر! کہہ کر حملہ آور ہوئے۔ اس وقت لڑائی کا یہ رنگ تھا کہ تمام سکھ منہزم ہو کر پہاڑ پر چڑھے جاتے تھے اور مجاہدین پہاڑ کی جڑ

---

[1] ٹڈیاں

تک پہنچ گئے تھے اور سکھوں کی ٹانگیں پکڑ پکڑ کر کھینچتے تھے اور تلواریں مار مار کر مُردار کرتے تھے اور جانبین سے پتھر چلتے تھے۔

مجاہدین کی تشویش اور سیّد صاحبؒ کی تلاش

اسی اثناء میں سب لوگوں نے پیچھے پھر کر جو دیکھا، تو نہ سیّد صاحبؒ کا نشان نظر پڑا اور نہ خود آپ نظر آئے۔ تب تو سب مُتردّد ہو کر گھبرائے اور لڑنے بھڑنے سے سُست ہو گئے۔ پھر بھی کچھ غازی سکھوں کے مقابلے میں لڑتے رہے اور اکثر آپ ہی کی تلاش میں لڑائی کے کھیت میں جابجا پھرنے لگے۔

لعل مُحمّد جگدلیس پوری کہتے ہیں کہ مولانا محمّد اسمٰعیل صاحب رفل کندھے میں ڈالے ننگی تلوار ہاتھ میں لیے پیشانی سے خُون بہتا ہوا میرے پاس آئے اور پوچھنے لگے کہ حضرت امیرالمومنین کہاں ہیں؟ مَیں نے اپنے داہنے طرف ہاتھ سے اشارہ کر کے کہا کہ اس ہجوم میں ہیں۔ یہ سُن کر وُہ اس طرف جھپٹتے ہُوئے چلے گئے۔ اُن کے پیچھے مولوی سیّد نُور احمد صاحب نگرامی (جو سیّد صاحبؒ کے حالات کی کتاب لکھا کرتے تھے) ننگی سر تلوار ہاتھ میں لیے ہُوئے آئے۔ وُہ بھی حضرت کو پوچھنے لگے۔ اُن سے بھی مَیں نے ہاتھ کے اشارے سے کہا کہ اس ہجوم میں ہیں۔ یہ خبر پا کر وُہ دَوڑتے ہُوئے اس طرف کو چلے گئے۔

میاں امام الدین صاحب بڑھانوی کہتے ہیں کہ املیکے حافظ عبداللہ کی مَیں نے آواز سُنی کہ وُہ کہتے ہیں کہ حضرت امیرالمومنین کہاں ہیں اور روتے ہُوئے پیچھے کو چلے جاتے ہیں۔ مَیں بھی بارُود سنگری میں بھر کر اُنھیں کے پیچھے چلا۔ تھوڑی دُور جا کر کیا دیکھتا ہوں کہ مولانا محمّد اسمٰعیل صاحب رفل کندھے میں ڈالے ہُوئے پیشانی سے خون جاری چہل قدمی کر رہے ہیں۔ مَیں نے کہا: مولانا صاحب، آپ بھی چلیے۔ اُنھوں نے کوئی جواب نہ دیا۔

الٰہی بخش رامپوری کہتے ہیں کہ حضرت کے مورچے کی طرف سے قصبہ نیوتنی کے حافظ عبداللطیف صاحب آبدیدہ "حضرت امیرالمومنین کہاں ہیں؟ حضرت امیرالمومنین کہاں ہیں؟" کہتے ہُوئے ہم لوگوں کے قریب آئے۔ مَیں نے کہا کہ مجھ کو معلوم نہیں۔ پھر وُہ یہی کہتے ہُوئے ست بُنے کے نالے کی طرف چلے گئے۔ شیخ ولی مُحمّد صاحب پُھلتی بھی مجھ کو ملے۔ وُہ بھی حضرت امیرالمومنین کو مجھ سے پوچھنے لگے۔ اُن

سے بھی مَیں نے کہا کہ مَیں نے تو نہیں دیکھا، مگر احتمال ہے کہ اسی ہجُوم میں؛ جہاں تلوار چل رہی ہے، ہونگے۔

مولانا محمد اسمٰعیل صاحب کی شہادت محمد امیر خاں قصوری کہتے ہیں کہ جب سکھ پسپا ہو کر پہاڑ پر چڑھ رہے تھے، میرے پیچھے کی طرف سے مولانا محمد اسمٰعیل صاحب انگریزی رفل کندھے سے لٹکائے ہُوئے آئے اور پوچھنے لگے کہ سیّد صاحبؒ کہاں ہیں؟ مولانا صاحب کے سر میں گولی لگی تھی اور کنپٹی سے خون جاری تھا۔ لوگوں نے کہا کہ سیّد صاحبؒ آگے ہیں۔ وہ آگے گئے۔ کچھ دیر کے بعد ابراہیم خاں خیر آبادی کے باپ حیات خاں اس طرف سے زخمی روتے ہوئے آئے اور کہنے لگے کہ مولانا صاحب شہید ہو گئے۔

○

پینتالیسواں باب

مشہدِ بالاکوٹ

(۲)

دُشمن کا دوبارہ حملہ اور مُجاہدین کی شکست

میاں عبدالقیوم صاحب کہتے ہیں کہ جب سکھ مُنہزم ہو کر اُوپر کی طرف بھاگے، تو اِدھر سے غازیوں نے اپنے اپنے ہتھیار لے کر اُن کا تعاقب کیا۔ کوئی تلوار سے، کوئی گنڈاسے سے، کوئی پتھروں سے اور کوئی بندوق وغیرہ سے اُن کو مارنے لگا۔ دشمن کے بےشمار آدمی مقتول ہُوئے۔ باقی بھاگتے بھاگتے پہاڑ کی جڑ میں جا پہنچے۔ پہاڑ کے اُوپر لشکر کا سکھ افسر شیر سنگھ بیٹھا تھا۔ اُس نے یہ حال دیکھا، تو کہنے لگا: ارے سکھو، کہاں بھاگے آتے ہو؟ لاہور دُور ہے۔ اُس وقت بالاکوٹ کی رعایا اپنا اپنا اسباب لیے بھاگی جاتی تھی۔ اس حال میں سکھوں کے ترم نواز نے ترم بجایا اور اُس کی آواز میں کچھ کہا۔ اس کی آواز سنتے ہی جو سکھ بھاگ کر پہاڑ کی جڑ میں چلے گئے تھے، وُہ پھر کر وہیں سے غازیوں کی طرف بندوقوں کی باڑھیں مارنے لگے۔ اُس وقت کچھ غازی تو اُن کے مقابلے میں رہے، باقی سب اس لڑائی کے کھیت میں سیّد صاحبؒ کو تلاش کرنے لگے اور جس پتھر کی آڑ میں آپ کو چند آدمیوں کے ساتھ بیٹھا دیکھا تھا، وہاں آپ کو نہ پایا۔ یہ سب تو حضرت کی تلاش میں اِدھر اُدھر مُتردّد پھرتے تھے، اُدھر سے سکھ بندوقوں کی باڑھیں مارتے تھے۔ اس حالت میں بہت مجاہدین شہید ہُوئے اور جو سکھ غول کے غول پہاڑ پر چڑھے تھے، اُنھوں نے ہم لوگوں کے دائیں اور

بائیں طرف آکر محاصرہ کرلیا۔

اسی اثنا میں ایک آواز سب لوگوں نے سُنی کہ غازیو، تم یہاں کیا کرتے ہو؟ حضرت امیرالمومنین کو گوجر لوگ ست بنے کے نالے میں ہو کر لیے جاتے ہیں۔ یہ آواز سُنتے ہی غازی، جو حضرت امیرالمومنین کے ساتھ بلتے میں تھے، اس کھیت سے باہر نکلنے لگے۔ اُن میں سے شاید کوئی بچے ہوں، باقی سب شہید ہوگئے اور جو غازی اِدھر اُدھر دُور تھے، اُن میں سے اکثر بچ کر سلامت نکل گئے۔

مولوی سید جعفر علی کا چشم دید بیان

مولوی سید جعفر علی اپنا چشم دید حال لکھتے ہیں:

"فجر کے وقت نماز کے بعد حُکم ہُوا کہ ہر شخص اپنی جگہ پر تختے وغیرہ سے مورچہ بنالے اور کھانے سے جلدی فرصت کرلے۔ چنانچہ ہم چند آدمیوں نے اس بالائی مسجد کے بیچ، جو حضرت امیرالمومنین کا مسکن تھی، تختہ بندی کرلی۔ سکھوں کے لشکر نے (جو سب کے سب پیادے تھے) آہستہ آہستہ اس طرح اُترنا شروع کیا کہ ہم اُن کو پہاڑ کے اوپر دیکھ رہے تھے۔ اس مسجد کی مورچہ بندی کے بعد ہم نے اپنے دُوسرے مقامات پر مورچے باندھے۔ ہر شخص نے کھانے سے فراغت کی۔ حضرت امیرالمومنین نے بھی صاف کپڑے پہنے۔ آپ کی قبا سیاہ رنگ کی تھی۔ آپ ہتھیار باندھ کر مسجد کے سائبان میں بیٹھ گئے۔ جو اسلحہ آپ نے زیب کمر فرمائے، ان میں تفنگچہ اور ایک قدیم ولایتی چھُری تھی۔ منشی محمدی انصاری نے آپ کی وہ انگوٹھی، جو مُہر کرنے کے لیے اپنی انگلی میں پہنے ہوئے تھے، آپ کی انگشتِ مبارک میں پہنادی تاکہ اگر وہ خود شہید ہو جائیں، تو امانت اپنے مالک کے پاس ہو۔ انھوں نے مجھ سے بھی یہ فرمایا کہ مولانا محمد اسمٰعیل صاحب کی انگوٹھی بھی انگلی سے نکال کر جناب ممدوح کو پہنا دو۔ چنانچہ ایسا ہی کیا گیا۔ جو گنڈاسے تیار کیے گئے تھے، ان میں سے ایک شیخ محمد اسحٰق گورکھپوری کے لیے مَیں نے طلب کیا۔ آنجناب نے فرمایا کہ ان بھائی کو میرے پاس بھیج دو۔ مَیں نے تعمیل کی۔ جب وہ حاضر ہُوئے، تو فرمایا کہ بھائی، تم بندوق لے لو۔ اُنھوں نے عرض کیا: میرا بایاں ہاتھ بندوق پکڑنے کے قابل

نہیں۔ اس پر اُن کو گنڈاسہ عطا ہُوا۔

اس وقت سکھوں کا لشکر اس قدر قریب آگیا تھا کہ ان کی طرف کی شاہین کی گولیاں بالاکوٹ کے مکانات تک پہنچ رہی تھیں۔ اس طرف بھی مسجد کے دروازے پر شاہین رکھی گئی اور شاہینچیوں نے اُن کو سر کرنا شروع کیا۔ ملّا لعل محمد قندھاری کو حکم ہُوا کہ اپنی جماعت کے ساتھ دھان کے کھیتوں کو عبور کر کے پہاڑ کے دائیں جانب اپنی کمین گاہ بنائیں تاکہ جس وقت سکھ بالاکوٹ کا قصد کریں، تو اُن کے بغل کی طرف سے وہ یورش کریں۔ جس مسجد میں آپ تشریف رکھتے تھے، اس کے نیچے ایک مکان تھا، غرب رویہ، طول میں جُنوباً شمالاً۔ مولانا محمد اسمٰعیل صاحب نے مولوی احمد اللہ ناگپوری کی جماعت کو، جو اُس وقت راقم الحروف کے زیرِ فرمان تھی، اس جگہ متعین فرمایا اور حکم دیا کہ جب سکھوں کا لشکر بندوق کی گولی کی زد پر آجائے، تو اسی جگہ سے اُن پر بندوق چلائیں۔ جب وہ دلدل عبور کر کے بالاکوٹ پر چڑھنے کا ارادہ کریں، تو پھر وُہ وقت تلوار کا ہے۔ ہر مورچے والے اسی طرح عمل کریں۔ خود مولانا ممدوح بڑی مسجد کے نیچے شمالی سمت میں اپنی جماعت کے ساتھ بیٹھے۔

ہم جس جگہ ٹھیرے ہُوئے تھے، وہاں چارپائیاں بہت زیادہ پڑی ہُوئی تھیں۔ اُن کو بچھا کر بیٹھ گئے۔ ہر ایک نے اپنے ہتھیار اپنے سامنے رکھ کر اُن کو درست کرنا شروع کیا۔ ہر ایک نے دُوسرے سے اپنی غلطیوں کی معافی مانگی۔ شیخ محمد اسحٰق نے مجھ سے فرمایا کہ ابھی تک وطن و اہل و عیال کی محبت میرے دل پر غالب تھی۔ آج سوائے شہادت اور اللہ سے ملنے کی تمنا کے کوئی تمنا دل میں نہیں۔ مَیں نے کہا: اللہ کا شکر ہے اس وقت یہی نیّت ہونی چاہیے۔ انشاء اللہ آپ زندہ رہیں گے۔

اتنے میں دونوں جانب شاہینیں چلنے لگیں۔ آنجناب مسجد کے اُوپر سے یکبارگی نیچے تشریف لائے اور نیچے کی مسجد کا رُخ فرمایا۔ تمام غازی آپ کے ساتھ ہو گئے۔ ہر

مورچے پر یہ تذکرہ تھا کہ آپ کفّار کے مقابلے کے لیے میدان کا رُخ فرما رہے ہیں۔ اس پر تعجّب بھی ہُوا کہ طے تو یہ ہُوا تھا کہ کفّار جب نیچے پہنچ کر بالاکوٹ کی طرف چڑھنے کا ارادہ کریں گے اور دلدل اور پیاز کے کھیتوں سے آگے بڑھ جائیں گے، اس وقت اس طرف حملہ ہوگا، اس لیے کہ اُوپر کی طرف دَوڑنا زیادہ پُرمشقّت اور دُشوار ہے بہ نسبت نشیب کی طرف دَوڑنے کے۔ اُس وقت اُن کے لیے چڑھنا مُشکل ہوگا اور ہمارے لیے اُترنا آسان۔

جب آپ کی جماعت شاہراہ پر پہنچی، تو اُس کے ایک طرف اس خاکسار کی جماعت کا ایک مورچہ تھا اور دُوسری طرف مولانا محمد اسمٰعیل صاحب کی جماعت کا۔ ہم سب آپ کے شریکِ حال ہو گئے۔ آپ نیچے تشریف لائے اور مسجدِ زیریں میں توقف فرمایا۔ میں نے جنگ کے بعد یہ واقعہ سُنا کہ آپ نے تین بار دریافت فرمایا کہ کون شخص مجھے آواز دیتا ہے۔ اسی طرح میں نے سُنا کہ آپ نے خواب دیکھا تھا کہ آپ کے لیے ایک تخت لایا گیا، جس کے پایے سُرخ ہیں۔ بہرحال سکھوں کے لشکرگاہ کا ہراول دستہ دو توپیں دریا کے قریب لایا اور بالاکوٹ کی طرف اُن کو سَر کرنا شروع کیا۔ لیکن اس سے کسی کو نقصان نہ پہنچا۔ اس مسجد میں پہنچنے کے بعد جب کفّار کا لشکر بندوق کی گولی کی زد پر پہنچا، ان کی گولیاں بارش کی طرح برسنے لگیں۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ مسجد کی چھت اور اس کے احاطے پر دائیں بائیں اَولے پڑ رہے ہیں۔ بعض غازی مجروح بھی ہوئے۔ ایک گولی شیخ محمد اسحٰق گورکھپوری کے دائیں ہاتھ پر پڑی۔ اُن کا بایاں ہاتھ پہلے سے بیکار تھا۔ اب دایاں ہاتھ بھی بیکار ہوگیا۔ شیخ موصوف نے مجھ سے کہا کہ میں تو اب دُعا کے قابل ہی رہ گیا ہوں۔ یہ کہ کر وہ بالاکوٹ کی طرف واپس چلے گئے۔ شیخ حفیظ اللہ دیوبندی کی آنکھ کے نیچے ایک تیر ایسا لگا کہ اس کا پیکان دوسری طرف سے نکل گیا۔

تھوڑے وقفے کے بعد آپ اُس مسجد سے باہر تشریف لائے اور دشمنوں کی

گولیوں کی بارش میں آپ نے اُس دلدل کا رُخ کیا۔ لوگوں نے اُس وقت عرض کیا کہ لوگ زخمی ہو رہے ہیں، اس طرف سے بھی حملے کا حکم ہو۔ آپ نے فرمایا کہ لمبی بندوقوں کو سر کرو اور اگر ہو سکے، تو جا بجا مورچے بنالو، لیکن چونکہ ابھی تک دلدل کو عبور نہیں کیا گیا تھا، مورچے کا سامان کم تھا، کیونکہ زمین کسی قدر ہموار تھی۔ مولانا محمد اسمٰعیل صاحب نے پکار کر فرمایا کہ قرابین والے حضرت امیر المومنین کے گرد ہو جائیں۔ مَیں نے مولوی احمد اللہ ناگپوری سے کہا کہ اپنی جماعت کی خبر رکھیے گا، مجھے حضرت امیر المومنین کے قریب رہنے کا حکم ہوا ہے اور اپنی جماعت والوں کو بندوقوں کو سر کرنے کے لیے آواز دی۔ اس وقت ہم میں سے ہر شخص آہستہ آہستہ تکبیر کہ رہا تھا۔ اس دلدل کے اوپر ایک پتھر نکلا ہوا تھا۔ اس پتھر پر آپ اپنے دونوں بازوؤں پر ٹیک لگا کر بیٹھ گئے اور شیخ ولی محمد پُھلتی کو بالاکوٹ کے اُوپر سے شاہین لانے کے لیے روانہ فرمایا۔ ارباب بہرام خاں بائیں جانب آپ کی بغل میں بیٹھے ہوئے تھے۔ ایک شخص نے عرض کیا کہ لشکرِ کفار کا زور قندھاریوں کی جماعت کی طرف زیادہ ہے، ان کی مدد کے لیے کوئی جماعت چلی جائے، تو اچھا ہے۔ آپ نے فرمایا: اتنی ہی تعداد کافی ہو گی۔

تھوڑی دیر کے بعد ایک دوسرے شخص نے عرض کیا کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ سکھوں کا لشکر جنوب کی جانب سے قصبۂ بالاکوٹ میں داخل ہو جائے۔ آپ نے فرمایا کہ ہم نے ایک جماعت کو اس طرف متعیّن کر دیا ہے۔ اس شخص نے عرض کیا کہ وہ جماعت تھوڑی ہے۔ فرمایا کہ اتنی ہی کافی ہے۔ اس اثنا میں سکھوں کی ایک جماعت پہاڑ سے نیچے اُتر کر ڈھلان کے کھیتوں میں پہنچ گئی تھی۔ ان کی بندوقوں کی گولیاں بارش کی طرح آرہی تھیں۔ غازیوں میں سے ایک شخص نے تلوار کھینچ کر جست لگائی اور اُن پر حملہ کرنے کے لیے دلدل میں گھس گیا۔ دلدل کی مٹی چونکہ بہت لیس دار تھی، اس کا حال دیکھ کر آپ نے منع فرمایا۔ دُوسرے آدمی نے اس کو آواز دی کہ لے فلاں شخص!

آگے مت جاؤ، حضرت امیر المومنین منع فرماتے ہیں۔ وُہ شخص اپنے مرکز کی طرف واپس آگیا۔

اس اثنار میں آپ نے ارباب بہرام خاں سے فرمایا کہ یوں دل چاہتا ہے کہ نیچے اُتر کر اس گروہ پر حملہ کروں۔ ارباب صاحب نے عرض کیا: "آپ کے حملے سے نیچے والا گروہ ضرور مقتول ہو جائے گا لیکن جو لوگ پہاڑ کے اُوپر ہیں، اُن پر حملہ مشکل ہے" آپ نے فرمایا: بہتر ہے، کوئی بڑا دل نیچے آجائے۔ کچھ دیر کے بعد آپ بغیر کسی کو اطلاع دیے ہُوئے بنفسِ نفیس بِسْمِ اللّٰہِ اَللّٰہُ اَکْبَرُ کہتے ہُوئے اس دلدل میں گُھس گئے۔ اگرچہ آپ کے پاؤں زانو تک دلدل میں اُتر جاتے تھے اور پاؤں کا نکالنا مُشکل ہوتا تھا، لیکن خداداد رُوحانی و جسمانی طاقت سے شیر کی طرح چُستی اور تیزی کے ساتھ حملہ کرتے ہُوئے بڑھتے جاتے تھے۔ اس وقت ارباب بہرام خاں اور وُہ لوگ، جن کی نگاہ آپ کی طرف تھی، آپ کے ہمراہ ہوگئے۔ دادا ابوالحسن نصیر آبادی، جو نشان بردار تھے، اس وقت وُہ بے خبر تھے۔ کسی نے ان کو مطلع کیا۔ مَیں بھی پائینچے چڑھا کر دلدل میں گھس گیا۔ چونکہ کچھ بیمار چلا آرہا تھا اور کمزور تھا، آپ کے پاس نہ پہنچ سکا۔

اکثر بندوق والوں نے جب دیکھا کہ دلدل سے پاؤں نکالنا مشکل ہے، تو انھوں نے لاٹھی کی طرح بندوقوں کا سہارا لے کر اور اُن پر زور دے کر اپنے پاؤں نکالے۔ اس طرح سے اکثر بندوقیں بیکار ہو گئیں۔ آپ اور آپ کے ہمراہی برق و باد کی طرح دشمنوں کے سر پر پہنچ گئے۔ بعض سکھوں نے نیزے اور تلوار سے مقابلہ کیا، لیکن وہ سب کے سب بھاگ گئے۔ بھاگنے کا راستہ بھی نہیں تھا، اس لیے کہ وہ پہاڑ سے اُتر چکے تھے، دشوار گزار پہاڑ کے اوپر کس طرح وہ دوڑ سکتے تھے؟ اس طرح وُہ سب لوگ، جو پہاڑ کے نیچے آچکے تھے، مُردار ہُوئے اور وُہ سکھ، جو پہاڑ کے اوپر تھے، انھوں نے بے تحاشا گولیاں چلانی شروع کیں، نہ اپنوں کو چھوڑا، نہ بیگانوں کو۔ اس وقت گولیاں اولے کی طرح

برس رہی تھیں اور کارتوس کے کاغذ ہوا میں اُڑ رہے تھے اور دونوں طرف سے سنگباری ہو رہی تھیں۔ میں اور منشی محمدی انصاری اس وقت پہنچے کہ تھوڑے سے سکھ پہاڑ کے نیچے زندہ تھے اور دیکھتے دیکھتے مجاہدین کا شکار ہو گئے۔ آپ کے ساتھ کے غازی پہاڑ کی جڑ تک پہنچ گئے تھے، دھانوں کے کھیت سے گزر چکے تھے اور پہاڑ کا سلسلہ شروع ہو گیا تھا۔

نیچے کے سکھوں کے مقتول ہو جانے کے بعد بندوق کی گولیاں اور پتھر پہاڑ کے اُوپر سے بارش کی طرح آ رہے تھے۔ حضرت امیر المؤمنین اس گروہ میں میری نظر سے اوجھل ہو گئے۔ منشی صاحب سے میں نے پوچھا: حضرت امیر المومنین کہاں ہیں؟ انھوں نے فرمایا: ہمارے پیچھے بائیں جانب ہیں۔ میں نے کہا: الحمد للہ کہ ہم آپ کے سامنے اس مقام پر ہیں۔ اس وقت ہم دونوں بیٹھ گئے اور بندوق بھر بھر کر کھڑے ہو کر چلاتے تھے، اس لیے کہ دھان کے کھیتوں کی بلندی آڑ بن جاتی تھی اور جب ہم بیٹھ جاتے تھے تو دشمنوں کی گولی اور پتھروں سے محفوظ ہو جاتے تھے اور جب کھڑے ہو جاتے تھے، تو کسی دشمن کو نشانہ کر کے تیزی کے ساتھ بندوق چلا کر بیٹھ جاتے تھے۔

آپ کے اُس وقت عین معرکے میں گم ہو جانے سے مخلصین و محبین جنگ سے دست کش ہو کر آپ کی تلاش میں جابجا دوڑ رہے تھے اور دشمنوں کی گولیوں سے شربتِ شہادت نوش کر رہے تھے۔ اس وقت شیخ ولی محمد، امان اللہ خاں اور تمام حاضرین نے مشورہ کیا کہ چونکہ میدان خالی ہو گیا ہے، یہ قلیل جماعت اس مقام پر کوئی مفید خدمت انجام نہیں دے سکتی۔ اکثر آدمی بالاکوٹ کی طرف جا رہے ہیں، پس اگر ہم بھی اس جگہ سے حرکت کر کے ان سب لوگوں کو بھی جمع کر کے قصبے میں پناہ لیں اور دشمنوں سے جنگ کریں، تو اگرچہ فتح بظاہر ممکن نہیں معلوم ہوتی، لیکن چونکہ ہم اُس جگہ پناہ لے کر جنگ کریں گے، کیا عجب ہے کہ دشمن اپنی جان کے خوف سے بالاکوٹ

پر حملہ نہ کرے اور ہم ہزیمت کے داغ سے بچ جائیں۔ چنانچہ ہم مطابق مضمونِ آیت
إِلَّا مُتَحَرِّفًا لِّقِتَالٍ أَوْ مُتَحَيِّزًا إِلَىٰ فِئَةٍ (۸: ۱۶) بالاکوٹ کی طرف آگئے۔
ہمارے اور بالاکوٹ کے درمیان ایک ٹیلہ حائل تھا۔ اس وقت بالاکوٹ کی طرف سے دُھواں اُٹھ رہا تھا۔ معلوم ہُوا کہ سکھوں نے اس موضع میں آگ لگا دی ہے۔ پانی کے چشمے پر ہم جمع ہُوے اور وہاں لشکر کا بڑا حصہ اکٹھا ہو گیا۔ وہاں ہم نے وضو کیا اور نماز پڑھی اور حضرت امیرالمومنین اور مولانا محمد اسمٰعیل صاحب اور دوسرے اہلِ جماعت اور رُفقا کے حالات کی تحقیق کی۔ وہیں حضرت امیرالمومنین کی ران پر بندوق کی گولی لگنے اور سرِ مبارک پر پتھر سے زخم آنے، رُوبقبلہ بیٹھنے اور نور بخش جرّاح کے حاضر ہونے کا حال معلوم ہُوا۔ نیز یہ معلوم ہُوا کہ مولانا محمد اسمٰعیل صاحب کی پیشانی پر گولی لگی۔ سیّد عبدالرحمٰن، امان اللہ خاں لکھنوی اور شیخ ولی محمد پھلتی کی زبانی بیان کرتے ہیں کہ پہلی گولی مولانا کے سر پر لگی۔ اگرچہ زخم ہلکا تھا لیکن آپ کی پیشانی اور چہرہ خُون سے رنگین ہو گیا۔ آپ نے امان اللہ خاں سے پوچھا: حضرت امیرالمومنین کہاں ہیں؟ مَیں نے خبر دی کہ اس رود کی طرف ہیں۔ مولانا موصوف باوجود اس کے کہ بندوق کی گولیاں کثرت سے آ رہی تھیں، یہ کلمہ فرماتے ہُوے: "بھائی، ہم تو جاتے ہیں" اپنی جان کی پروا نہ کرتے ہُوے بڑی تیزی کے ساتھ اس جماعت میں داخل ہو گئے، جو اس خشک ندی میں تھی۔ اس کے بعد معلوم نہیں ہُوا کہ کس حربے سے آپ شہید ہُوے۔[1]

مُجاہدین نے کس طرح جان دی | محمد امیر خاں قصُوری کہتے ہیں کہ مَیں ایک پتھر کی آڑ میں ہو کر گولی چلا رہا تھا۔ مجھ سے تھوڑے فاصلے پر مولوی نور احمد صاحب نگرامی کھڑے تھے۔ ایک گولی اُن کے بازو میں آکر لگی۔ انھوں نے مجھ سے کہا کہ میرے تو گولی لگ گئی، تمھیں جو چیز درکار ہو، مجھ سے لے لو۔ میرے پاس

---

[1] منظورہ: ص ۱۱۷۸ تا ۱۱۹۵

گولیاں کم تھیں۔ جو چالیس پچاس گولیاں اُن کے ساز میں تھیں، وہ مَیں نے نکال لیں۔ پھر وہ میرے پاس سے پیچھے کو چلے۔ اس دَوران میں انھیں ایک اور گولی لگی۔ وہ اسی جگہ پر بیٹھ گئے۔ پھر اُن کا حال مجھ کو معلوم نہ ہُوا کہ اسی جگہ شہید ہوئے یا کسی اور جگہ۔

سید صاحبؒ پہلی مسجد میں لیٹے ہُوئے تھے۔ معمور خاں لکھنوی آپ کے پاس آکر بیٹھے کہ حضرت، میرا دل چاہتا ہے کہ اس وقت آپ اپنا دستِ مبارک میرے چہرے پر پھیریں۔ یہ بات سُن کر آپ اُٹھ بیٹھے اور اپنا داہنا ہاتھ خانِ ممدوح کے چہرے پر پھیرا۔ وہ خوش ہو کر وہاں سے اپنے مورچے میں گئے۔ اُن کی شہادت کا واقعہ لعل محمد جگدیس پوری یوں بیان کرتے ہیں کہ مَیں نے دیکھا کہ معمور خاں لکھنوی دانتوں سے ننگی تلوار پکڑے ہُوئے ایک سکھ کے پاؤں پکڑ کر اپنی طرف کھینچ رہے ہیں اور ایک سکھ اس سکھ کے ہاتھ پکڑ کر اپنی طرف کھینچتا ہے۔ آخرالامر خانِ موصوف نے ایسا زور کیا کہ وہ سکھ اس کھینچنے والے سے چھوٹ کر اُن کے اُوپر آرہا اور دونوں وہاں سے غلطاں نیچے نالے میں آکر گرے اور دونوں وہیں رہے۔ خانِ ممدوح تو شہید ہو گئے اور وہ مُردار ہُوا۔

نجم الدین شکارپوری کہتے ہیں کہ مَیں نے دیکھا کہ پانی پت کا ایک نوجوان غازی، جس کا نام مجھے یاد نہیں، ننگی تلوار لیے ہُوئے کھڑا ہے۔ اس کے سامنے سکھوں کا ایک افسر بڑا طویل القامت ننگی تلوار لیے ہُوئے آیا۔ غازی نے لپک کر اپنا ہاتھ اُس کی گردن میں ڈال دیا، اُس سکھ نے بھی یُوں ہی اپنا ایک ہاتھ اُس کی گردن میں ڈال دیا۔ وُہ غازی دُوسرے ہاتھ سے اُس کو تلوار سے مارنے لگا اور وُہ سکھ اس غازی کو مارنے لگا۔ مگر وہ دونوں ایک دُوسرے سے اتنے متصل تھے کہ پوری تلوار کسی پر نہیں پڑتی تھی۔ اِدھر تو مَیں کھڑا تھا، اُدھر سکھوں کا اِزدحام اور بیچ میں وہ دونوں لڑ رہے تھے، مگر اس وقت نہ تو مجھ کو یہ جُرأت پڑتی تھی کہ اس غازی کی مدد کو جاؤں اور نہ اُن سکھوں کو ہمت ہوتی تھی کہ اس افسر کی کمک کو آئیں۔ جب وہ دونوں بہت زخمی ہو گئے اور بدن کا خون نکل گیا، تو وہ سُست ہو کر گر پڑے۔ ایک اور سکھ نے اس اِزدحام میں سے آکر اس غازی کو تلوار مار کر شہید کیا اور وُہ سکھ زخمی دم لے کر زمین سے اُٹھ کھڑا ہُوا۔ میری بندوق میں دو گولیاں بھری تھیں۔ مَیں نے وہ بندوق اس

پر سر کی، مگر یہ نہیں معلوم کہ وہ گولیاں اُس کے لگیں یا کسی اَور کے۔ مَیں آگے چلا، تو ایک جگہ کیا دیکھتا ہوں کہ ایک غازی مہربان خاں نامی بہت زخمی پڑے ہیں۔ مجھ کو دیکھ کر انھوں نے کہا کہ مجھ کو پانی پلا دو۔ مَیں نے کہا: یہ وقت پانی لانے کا نہیں ہے، مگر ہاں، اگر تم یہاں سے چلو، تم کو پکڑ کر آہستہ آہستہ لے چلوں۔ صدہا سکھ قریب کھڑے تھے، مگر بے حواس اور متردّد تھے۔ انھوں نے کہا: کہ مجھ کو تو یہی جگہ اچھی لگتی ہے، یہاں سے مَیں نہ جاؤں گا۔ اگر کہیں سے پانی لا سکتے ہو، تو لا کر مجھ کو پلا دو۔ مَیں نے کہا: تمام سکھ نزدیک کھڑے ہیں اور میرے پاس کوئی برتن بھی نہیں ہے، پانی کیونکر لاؤں؟ انھوں نے کہا: اگر پانی نہیں لا سکتے، تو خیر، نہ لاؤ، مگر میری گردن میں روپوں کی حمائل پڑی ہے، اُس کو تم کھول کر لے جاؤ۔ مَیں نے اپنے دل میں اندیشہ کیا کہ مبادا روپے کھولنے میں دیر ہو اور گولی لگ جائے، تو خدا جانے، میری مَوت کیسی ہو یا روپے دیکھ کر کوئی سکھ مار ڈالے۔ مَیں نے اُن سے کہا کہ مَیں روپے تو نہ لے جاؤں گا۔ انھوں نے کہا: تو خیر، یہاں سے چلے جاؤ۔ مَیں وہاں سے چلا گیا۔

شہدار کی تدفین میاں عبدالقیوم صاحب کہتے ہیں کہ مجاہدین کی شکست کے بعد سکھوں نے بالاکوٹ کو آکر گھیر لیا اور وہاں کے گھروں میں آگ لگا دی۔ جو بیمار غازی اپنے اپنے ڈیروں میں رہ گئے تھے، اُن کو جا کر شہید کیا۔ ان میں سے بعض غازی سکھوں سے مقابلہ کر کے اور ایک دو کو مار کر شہید ہوئے اور بعضے غازی، جو بہت بیمار تھے، اپنے اپنے بستروں پر شہید کیے گئے۔

بالاکوٹ کے معتبر لوگوں کی زبانی یہ معلوم ہوا کہ سکھوں کے چلے جانے کے بعد جب بالاکوٹ کے بھاگے ہوئے لوگ آئے، تو اُنھوں نے دھانوں کے کھیتوں میں تمام لاشوں کو پڑا دیکھا۔ ان میں سے مولانا محمد اسمٰعیل صاحب اور ارباب بہرام خاں صاحب کی لاش کو اُنھوں نے دو جگہ جُدا جُدا دفن کر دیا۔[1] اور باقی لاشوں کو وہاں سے اُٹھا کر مٹی کوٹ کے نالے میں ایک جگہ جمع کیا اور اُوپر سے مٹی ڈال کر گنج شہیداں بنا دیا۔

شیخ ولی محمد صاحب، میاں عبدالقیوم صاحب، محمد امیر خاں صاحب قصوری وغیرہم کہتے ہیں کہ

---

[1] مولانا محمد اسمٰعیل صاحب کی قبر قصبے کے شمال مشرق میں ست بنے کے نالے کے پار بنی۔ قبر اب بھی معروف ہے۔

بالاکوٹ کی لڑائی کے بعد جب ہم لوگ تخت بند ہو گئے، تو ان دنوں اکثر لوگوں کی زبانی، جو پشاور سے آئے تھے، متواتر یہ خبر سننے میں آئی کہ ارباب بہرام خاں کے بھتیجے محمد خاں نے اپنی قوم کو جمع کر کے کہا کہ میرا یہ ارادہ ہے کہ میں اپنے چچا بہرام خاں کی لاش بالاکوٹ سے لا کر اپنی بستی تہکال میں دفن کروں۔ انھوں نے کہا کہ وہاں دفن ہوئے چھ مہینے کا عرصہ ہو گیا ہے، اب وہاں سے اُن کی ہڈیاں کھود کر لانا کیا ضرور ہے؟ جہاں مدفون ہیں، وہیں رہنے دو۔ محمد خاں نے کہا کہ میرا چچا خالص نیت سے سیّد بادشاہ کے ساتھ جہاد فی سبیل اللہ کے واسطے گیا تھا اور اُس نے اپنا تمام مال و اسباب خدا کی راہ میں صرف کیا یہاں تک کہ شہید ہو گیا۔ مجھ کو یقین ہے کہ انشاء اللہ تعالیٰ اُس کی لاش قبر میں سلامت ہو گی اور میں وہاں سے لاؤں گا۔ لوگوں نے سمجھایا، مگر اُس نے نہ مانا۔ آخر ایک صندوق اور اپنی قوم کے چالیس آدمی تہکال سے لے کر بالاکوٹ کو گیا۔ وہاں بھی لوگوں نے قبر کھودنے سے منع کیا، پھر بھی نہ مانا۔ آخر قبر کو کھود کر لاش کو نکالا، تو قدرتِ الٰہی سے وہ لاش تر و تازہ نکلی۔

○

پینتالیسواں باب (۲)

مشہدِ بالاکوٹ

(۳)

سید صاحبؒ کی شہادت آج سے چالیس پچاس سال پہلے سید صاحبؒ کے معتقدین و منتسبین میں اس کا بڑا چرچا تھا اور یہ نہایت اہم اور عام سوال تھا کہ سید صاحبؒ کی شہادت ہوئی یا آپ بمصلحت رُوپوش ہو گئے ہیں اور ابھی بقیدِ حیات ہیں۔ ایک بڑا گروہ، جن میں سرحد کے مقیم اور اہلِ صادق پور اور اُن کے متوسلین تھے، سید صاحبؒ کی غیبت کا قائل، آپ کے ظہور کا منتظر اور آپ کے لیے چشم براہ تھا۔ مولانا ولایت علی عظیم آبادی رسالہ "دعوت" میں لکھتے ہیں:

"اس کے بعد اللہ رب العٰلمین نے لشکرِ اسلام کو شکست دی کہ ایمان والوں کے دل میں غرور کا مَیل جمنے نہ پائے، کفار کو دھوکا رہے، مسلمانوں کے مرتبوں کی ترقی ہو جائے۔ قرآن و حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ آج تک جتنے اولوالعزم انبیاءؑ گزرے ہیں، کوئی شکست کا صدمہ اٹھائے بغیر باقی نہ رہا۔ ہمارے حضرت کو بھی تو اللہ تعالیٰ نے انبیاءؑ کی نیابت نصیب کی ہے۔ اُن کے لشکر پر شکست کیونکر نہ آئے؟ اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے حضرت کو چلّہ گزاری و دُعا و زاری کے لیے پہاڑوں میں بُلایا اور دشمنوں کی آنکھ سے بچایا۔ سچ ہے کہ خلوت بھی اکثر انبیاء علیہم السلام کی سنّت ہے۔

چنانچہ حضرت یونس علیہ السلام کو اثناءِ ہدایت میں مچھلی کے پیٹ میں چھپایا اور کتنے دنوں تک جنگل و بیابان میں رکھا۔ آخر انھیں کی ذاتِ متبرک سے ایک عالم کو ہدایت ہوئی۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کو عین اجراءِ ہدایت کے وقت کوہِ طور پر جانے کے واسطے فرمایا۔ جب یہاں لوگوں میں گوسالہ پرستی پھیل گئی، تو آپ بعد از فراغت جلد تشریف لائے اور لوگوں سے توبہ کروائی۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ نے ایک مدّتِ مدید سے غائب کیا اور آسمان پر اُٹھایا اور جب چاہے گا، ظاہر کرے گا اور اُن سے دین کا کام لے گا۔ ہمارے رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم کو کئی روز غار میں چھپایا اور جنگ میں شکست دی اور شیطان نے شہادت کی جھوٹی خبر مشہور کی۔ کیوں نہ ہو؟ یہ بھی تو اُن لوگوں کے پورے پیرو ہیں۔ ان سُنتوں سے کیونکر محروم رہیں؟ خلوت کے کچھ دن اللہ کی طرف سے سب کے واسطے برابر مقرر نہیں جس کو اللہ جب تک چاہتا ہے، چھپاتا ہے؛ جب چاہتا ہے، ظاہر کرتا ہے۔ ہمارے حضرت کی خلوت کوئی حضرتِ عیسیٰ علیہ السلام کی سی نہ سمجھے کہ کسی سے ملاقات نہیں ہوتی یا اُن کے ظہور میں عرصۂ بعید گزرے گا، یہاں تو اکثر لوگ جب چاہتے ہیں، تھوڑی سی کوشش میں حضرت کی زیارت سے مشرف ہوتے ہیں اور انشاء اللہ تعالیٰ عرصۂ قریب میں خورشیدِ درخشاں کی مثل ظاہر ہو کر عالم کو اپنے انوارِ ہدایت سے منور فرمائیں گے۔[1]

تذکروں میں متعدد واقعات ایسے ہیں کہ لوگوں نے سید صاحبؒ کو کسی مقام پر دیکھا اور پہچانا اور سب سے بڑی بات یہ تھی کہ خود سید صاحبؒ نے بعض کلمات ایسے فرمائے تھے، جن سے اس خیال کو تقویت ہوتی تھی۔ مثلاً خاندان میں یہ روایت مشہور رہی ہے اور وقائع احمدی میں بھی مذکور ہے کہ آپ نے اپنی ہمشیرہ سے فرمایا کہ لوگ کہیں گے کہ سید احمد کا انتقال ہو گیا یا شہادت ہو گئی لیکن جب تک ہندوستان کا شرک، ایران کا رفض، سرحد و افغانستان کا غدر نہیں جائے گا، میرا کام

---

[1] رسالہ "دعوت" شامل مجموعۂ رسائل تسعہ، مولانا ولایت علی عظیم آبادی، مطبوعہ مطبع فاروقی، دہلی، صفحہ ۴۷

ختم نہیں ہوگا۔ (او کما قال)

مولانا یحییٰ علی عظیم آبادی پھانسی گھر میں اکثر نہایت درد سے درؔد کی یہ رباعی سید صاحب کے اشتیاق میں پڑھا کرتے تھے۔

اِتنا پیغام درؔد کا کہنا جب صبا کوئے یار سے گزرے
کون سی رات آپ آئیں گے دن بہت انتظار میں گزرے

مولوی محمد جعفر صاحب تھانیسری (مصنّفِ سوانح احمدی و تواریخ عجیبہ) جو سید صاحبؒ کے بہت بڑے تذکرہ نگار اور واقفِ حال تھے، والدِ مرحوم مولانا عبد الحی صاحبؒ کو ایک خط میں لکھتے ہیں:

"مَیں خاندانِ پٹنہ کے بتوسل جناب سیّدنا کے حضور میں انتسابِ بیعت رکھتا ہوں، مگر براہِ راست بھی مجھ کو ایک مرتبہ پھانسی گھر میں، جس کا ذکر صفحہ ۲۶ کے آخری پارے (تواریخ عجیبہ) میں درج ہے اور ایک مرتبہ بروقتِ رہائی ۱۳۰۰ھ میں پیام و سلام پہنچنے کا فخر حاصل ہُوا ہے اور مجھ کو حضرت مُرشدنا کی حیات و ظہور کا ایسا یقین ہے، جیسے اپنی موت کا۔ مولوی حیدر علی صاحب اور اُن کے فرزند کو ۱۳۰۲ھ میں زیارت کا فخر حاصل ہُوا۔ مولوی حیدر علی صاحب تو بعدِ حصولِ قدمبوسی چند ماہ بعد انتقال کر گئے اور اُن کے فرزند زندہ موجود ہیں۔"

یہ ۶ر فروری ۱۸۹۲ء کا خط ہے۔ "ارمغانِ احباب" میں والدِ مرحوم نے بسندِ صحیح[۵] حضرت مولانا مظفر حسین کاندھلوی سے یہ روایت کی ہے کہ مَیں نے حضرت سیّد صاحبؒ سے دَس باتیں سُنی تھیں، جن میں سے نَو پوری ہو چکیں، ایک باقی ہے، یعنی، آپ کی غَیبُوبت و ظُہور۔

والدِ مرحوم نے حضراتِ دیوبند کے استفسار پر اپنی یہ رائے ظاہر کی تھی جس سے ان حضرات

---

[۵] والدؒ مولانا محمود حسنؒ صاحب سے اور حافظ احمد صاحبؒ و مولانا حبیب الرحمٰن صاحب سے اور وُہ حضرت مولانا رشید احمد صاحب گنگوہیؒ سے روایت کرتے ہیں۔

نے بھی اتفاق کیا کہ "اس میں تو کوئی شک نہیں کہ سیّد صاحبؒ نے اس قسم کی پیشین گوئیاں بیان فرمائی ہیں، لیکن وقوع میں اب تک اشتباہ ہے۔"[1]

مولوی محمد جعفر صاحب تھانیسری نے سوانح احمدی میں، جو اس خط کے بعد کی تصنیف ہے، اس کے متعلق جو اظہارِ خیال کیا ہے، وہ انھیں کے الفاظ میں نقل کیا جاتا ہے:

"ایسی بھی بہت روایتیں ہیں کہ اس واقعۂ بالاکوٹ کے بعد متعدد لوگوں نے سیّد صاحبؒ اور اُن کے رفیقوں کو دیکھا۔ اس میں شک نہیں کہ آپ کی شہادت اور غیبوبت میں روزِ اوّل سے اختلاف ہے، مگر اب بُعدِ زمانہ کے سبب جو ساٹھ برس سے بھی زیادہ ہو گئے، خیالِ غیبوبت خُود بخُود لوگوں کے دلوں سے محو ہوتا جاتا ہے۔ سیّد صاحبؒ کی چھوٹی بیوی صاحبہ، جن سے قبل از معرکۂ بالاکوٹ سیّد صاحبؒ نے اپنی غیبوبت کی پیشین گوئی کی تھی، اور سیّد صاحبؒ کے اکثر اقربا اور اہلِ قافلہ آپ کی غیبوبت کے قائل تھے، مگر پنجاب اور ہندوستان کے اکثر آدمی پلّۂ شہادت کو غلبہ دیتے ہیں۔"

معلوم ہوتا ہے کہ بعض روایات کی بنا پر یا گرتے ہُوئے دِلوں کو تھامنے کے لیے یا بعض حلقوں میں جوشِ محبت میں کچھ دنوں تک یہ خیال قائم رہا، مگر بُعدِ زمانہ سے کمزور پڑتا گیا۔ مولوی محمد جعفر صاحب جیسے عاشقِ صادق، جن کو اپنی موت کی طرح سیّد صاحبؒ کی حیات کا یقین تھا، اپنی آخری تصنیف میں یہ لکھنے پر مجبور ہُوئے کہ "بُعدِ زمانہ کے بسبب یہ خیال خود بخود لوگوں کے دلوں سے محو ہوتا جاتا ہے اور پنجاب و ہندوستان کے اکثر آدمی پلّۂ شہادت کو غلبہ دیتے ہیں۔"

نواب وزیر الدولہ مرحوم نے ایک جگہ لکھا ہے کہ آپ اکثر محبتِ الٰہی کے جوش میں یہ شعر پڑھا کرتے تھے:

---

[1] "ارمغانِ احباب" - یہ کتاب "دہلی اور اُس کے اطراف: اُنیسویں صدی کے آخر میں" کے نام سے شائع ہو چکی ہے۔ (مؤلف)

در مسلخ عشق جز نکو را نکشند　　لاغر صفتان و زشت خو را نکشند
گر عاشق صادقی، ز کشتن مگریز　　مردار بود هر آنکہ او را نکشند

کبھی کبھی یہ قطعہ وردِ زبان ہوتا :

اے آنکہ زنی دم از محبت　　از ہستیٔ خویشتن بپرہیز
برخیز و بہ تیغ تیز بنشیں　　یا از رہِ راہِ دوست برخیز

آپ کے مکاتیب اور آپ کی تقریریں اور آپ کی مجلس کی گفتگوئیں، شوقِ شہادت اور راہِ خدا میں اسمٰعیلؑ ذبیح اللہ کی طرح قربان ہونے کے جذبے سے لبریز ہیں۔ آپ کی صحبت نے ہزاروں انسانوں کے دل میں عشقِ الٰہی کا شعلۂ بیتاب اور شہادت فی سبیل اللہ کا ایسا جذبۂ صادق پیدا کر دیا تھا کہ اُن کو اپنی جان وبالِ جان اور اپنا سر وبالِ دوش معلوم ہونے لگا تھا اور اُن کے ہر بُنِ مُو سے یہ صدا آتی تھی :

جان کی قیمت دیارِ عشق میں ہے کوئے دوست
اس نویدِ جانفزا سے سر وبالِ دوش ہے

اس پوری جماعت کا، جس کے آپ امام تھے، عقیدہ اور نظریہ یہ تھا :

اے دل تمام نفع ہے سودائے عشق میں
اِک جان کا زیاں ہے، سو ایسا زیاں نہیں

واقعات و بیانات، میدانِ جنگ کی شہادتیں، قرائن اور وجدان سب یہ کہتا ہے کہ جس کی دعوت و تربیت اور جس کی ترغیب و تحریض سے سینکڑوں بندگانِ خدا کو، جو اپنے وطن میں عافیت و سلامتی کی زندگی گزار رہے تھے، شہادت کی لازوال دولت نصیب ہوئی، وہ اِس نعمتِ عظمٰی اور سعادتِ کبریٰ سے ہرگز محروم نہیں رہا، بلکہ جس طرح اس کو ہندوستان میں اس کی دعوت میں اولیت و تقدم حاصل ہوا، اس کے حصول میں بھی اس کو سبقت اور امتیاز حاصل ہوا اور وہ شہداء اہلِ بیتؓ میں اپنے اُن آباءِ کرام سے جا ملا، جنھوں نے مختلف طریقوں پر شہادت پائی

اور اُن کا جسدِ طاہر شہادت کے بعد بھی دشمنوں کی گستاخیوں اور جذبۂ انتقام سے محفوظ نہیں رہا اور آپ فنائی سبیل اللہ کے اس مقام کو پہنچ گئے، جو کم کسی کو نصیب ہوتا ہے اور اس طرح آپ کی وہ آرزو پوری ہوئی، جس کا اظہار جوشِ محبت میں کبھی کبھی اس شعر کے ذریعے فرمایا کرتے تھے:

دِلم براہِ تو صد پارہ باد و ہر پارہ
ہزار ذرّہ و ہر ذرّہ در ہوائے تو باد[1]

مولوی سید جعفر علی صاحب منظورہ میں لکھتے ہیں:

"دوسرے روز گولہ انداز شیخ وزیر کا لڑکا، جو آٹھ یا نو سال کا ہوگا، پہنچا۔ تمام غازی اس کے گرد جمع ہو گئے اور اس سے پوچھنے لگے کہ تم کہاں تھے اور کس طرح صحیح سلامت پہنچ گئے۔ اس نے کہا کہ لڑائی ختم ہو جانے کے بعد سکھوں نے مجھے پکڑ لیا اور مجھے شہادت گاہ میں لے گئے اور کہنے لگے کہ شہیدوں کی لاشیں پہچان کر بتلاؤ کہ خلیفہ صاحب کون ہیں۔ مَیں نے پہچان کر اُن کو بتلا دیا۔ پھر مجھے سکھوں کے سردار کے پاس لے گئے۔ اس نے مجھے اپنے ایک مسلمان ملازم کے حوالے کیا اور کہا کہ اس کو غلام بنا لو۔ وہ مجھے اپنی قیام گاہ پر لایا اور مجھ سے پوچھنے لگا: تمہارے ماں باپ ہیں؟ مَیں نے کہا: ہاں۔ اس نے کہا: اپنے ماں باپ کے پاس چلے جاؤ۔ مَیں ست بنے کے راستے سے یہاں چلا آیا۔ جب اس بچے نے یہ کہا کہ مَیں نے خلیفہ صاحب کی نعشِ مبارک کو پہچانا، تو بعض آدمیوں نے کہا کہ زخمی جسم کو پہچاننا تو ہوشیار آدمی کے لیے بھی مشکل ہے، یہ بیچارہ بچہ کیا پہچان سکا ہوگا، لیکن بچے آپ سے بہت مانوس تھے۔ سید باقر علی مرہانی، جو فقیر کا بھیس بنا کر سکھوں کے لشکر میں پناہ گزیں تھے، پھر اپنے مکان واپس آئے۔ وہ اس معاملے سے زیادہ واقف ہوں گے۔"

اِس کے بعد خضر خاں وغیرہ آئے اور اُنھوں نے بتلایا کہ ہم بالاکوٹ گئے اور بعض تکیوں کے

---

[1] وصایا الوزیر

پاس جو سکھوں کے لشکر کے ہمراہ تھے، رات بھر رہے۔ ہم نے اُن سے حضرت امیرالمؤمنین کے متعلق دریافت کیا۔ اُنھوں نے بتلایا کہ جنگ کے اختتام پر جب غازی بالاکوٹ سے باہر چلے گئے، سکھوں اور مسلمانوں کی لاشیں اکٹھی پڑی ہوئی تھیں۔ شیر سنگھ نے بعض غازیوں کو، جو زندہ گرفتار ہو گئے تھے، اپنے پاس بُلایا اور اُن سے کہا: سچ سچ بتلاؤ کہ ان لاشوں میں سے خلیفہ صاحب کا جسمِ مُبارک کون سا ہے۔ وہ میدان میں گئے۔ اُنھوں نے لاشوں میں ایک جسم دیکھا، جس کا سر نہیں تھا۔ اس جسم کو اُنھوں نے آپ کا جسم قرار دیا۔ شیر سنگھ نے اس پر دوشالہ ڈال دیا اور رضاعے کے دو تھان اور پچیس روپے خیرات کے لیے دیے اور مسلمانوں سے کہا کہ اپنے مذہب کے مطابق تجہیز و تکفین کریں۔ چنانچہ ملکیوں نے اسی طرح عمل کیا"۔

آپ کا مدفن سیّد صاحبؒ کے مدفن کے متعلق تمام روایتوں اور بیانات کو جمع کرنے کے بعد جو بات قرینِ قیاس معلوم ہوتی ہے، وہ یہ ہے کہ آپ کا جسم و سرِ مُبارک جمع کر کے اُس قبر میں دفن کیا گیا، جو دریا کے کنھار کے قریب ہے اور آپ کی طرف منسُوب ہے۔ پھر وہ نعش نکال لی گئی اور دریا میں ڈال دی گئی۔ سر اور جسم الگ الگ بہتے بہتے کہیں سے کہیں پہنچ گئے اور دو علیحدہ مقامات پر دفن کیے گئے۔ ممکن ہے کہ سر اس جگہ دفن کیا گیا ہو، جو گڑھی حبیب اللہ میں آپ کے سر کے مدفن کی حیثیت سے مشہور ہے اور جسم تلہٹہ میں مدفون ہو، جہاں آپ کی قبر بتلائی جاتی ہے۔

بہرحال آپ کی یہ دُعا مقبول اور یہ تمنا پوری ہُوئی کہ میری قبر کا نام و نشان باقی نہ رہے۔

نواب وزیر الدولہ مرحوم لکھتے ہیں:

"ایک مرتبہ حضرت سے ایک شخص نے کہا کہ آپ قبر پرستی اور بزرگانِ دین کے مزارات پر مُشرکانہ اعمال اور بدعات سے اس شد و مد کے ساتھ روکتے ہیں؛ لیکن خود آپ کے ہزاروں مُرید اور ہزاروں معتقد مُلک میں ہیں۔ آپ کی وفات کے بعد آپ کے مزار پر وہی ہوگا، جو دُوسرے بزرگانِ دین کے مزارات پر ہو رہا ہے

اور آپ کی قبر کی پرستش بھی اسی طرح ہوگی، جس طرح ان قبروں کی پرستش ان کی وفات کے بعد ہوتی ہے۔ حضرت نے فرمایا کہ میں درگاہِ الٰہی میں بصد آہ و زاری درخواست کروں گا کہ اللہ تبارک و تعالیٰ میری قبر کو معدوم اور میرے مدفن کو نامعلوم کر دے۔ نہ قبر رہے گی، نہ اس پر شرک و بدعت ہوگی۔ خدا کی قدرت و رحمت ملاحظہ ہو کہ حضرت کی یہ دُعا قبول ہُوئی اور آپ کی قبر کا آج تک پتہ نہ چلا۔

مولانا محمد اسمٰعیل شہیدؒ اسی مشہدِ بالاکوٹ میں اسی تاریخ ۲۴ ذی قعدہ ۱۲۴۶ھ کو مولانا محمد اسمٰعیل صاحب نے بھی شہادت پائی۔ اکثر ساتھیوں نے آپ کو جس وقت دیکھا، پیشانی سے خُون جاری تھا، ڈاڑھی خون سے تر تھی، بھری ہُوئی بندوق کاندھے پر اور ننگی تلوار ہاتھوں میں تھی، سر برہنہ تھا، سیّد صاحبؒ کو دریافت فرماتے تھے اور شوقِ شہادت میں سرشار اور پروانہ وار پھر رہے تھے۔ بالآخر اس دلی مُراد کو پہنچے، جس کی بدوِ شعُور سے خونِ جگر سے پرورش کی تھی اور اس طرح جہد و جہاد کی اس طویل و مسلسل حیاتِ طیّبہ کا خاتمہ ہُوا جس میں شاید ایک دن بھی فراغت و راحت اور ایک رات بھی غفلت و استراحت کی نہ تھی۔

سرحد کا قیام اور ہجرت کے بعد کا زمانہ ایک مسلسل جہاد کا زمانہ تھا جس میں یا تو عملاً جنگ تھی یا اُس کی تیاری یا اُس کے مُقدمات یا اُس کے نتائج۔ سالہا سال کی اس مدّت میں اطمینان کی گھڑی شاید ہی کبھی نصیب ہُوئی ہو۔ جنگ کی تدابیر و انتظامات اور جنگی مُہموں کی قیادت میں سب سے بڑا حصہ آپ ہی کا تھا۔ اس مُدت میں میدانِ جنگ کے سب نشیب و فراز اور حالات کے سب تغیّرات پیش آئے، فتوحات بھی ہوئیں، عملداری بھی قائم ہُوئی، ایک دینی ریاست کا انتظام بھی کرنا پڑا، شکستیں بھی ہُوئیں، فتح کیا ہُوا علاقہ بارہا ہاتھ سے نکل نکل گیا، سالہا سال کے رُفقاء اور مُعتمدین کے ساتھ دغا بھی کی گئی، ایک ایک وقت میں بیسیوں کی تعداد میں برسوں کے ساتھیوں کی اچانک شہادت کی خبر بھی سننے میں آئی، دن رات کے ساتھیوں اور عُمر بھر کے رفیقوں کو بارہا اپنے ہاتھ سے قبر میں اُتارا، وفادار رفیقوں اور جانبازوں کا جو قیمتی سرمایہ ہندوستان سے لے کر چلے تھے، اس میں برابر کمی واقع ہوتی رہی جن توقعات

کے ساتھ ہندوستان سے رُخصت ہُوئے تھے، اُن میں سے بہت کم پوری ہُوئیں، جن سے مدد کی اُمید تھی، اُنھوں نے مدد کے بجائے دھوکا دیا اور زک پہنچانے سے باز نہ آئے، برسوں کی کھیتی دنوں اور گھنٹوں میں لُٹ پُھنک گئی، تنگی ترشی، مسلسل فاقے، مسلسل آزمائشیں رہیں، لیکن اس مجاہد کی پیشانی پر کبھی بل نہیں پڑا۔ بارہا سیّد صاحبؒ کی رائے سمجھ میں نہیں آئی، لیکن اطاعتِ امیر اور محبت و تعلق میں کبھی فرق نہیں آیا۔ زمانے کے امتداد، سلسلۂ جنگ کی طوالت اور اُس کی پیچیدگیوں اور بار بار کی قسمت آزمائی نے کبھی طبیعت پر اثر نہیں کیا۔ جو جذبات، جو یقین اور جو شوق لے کر آئے تھے، اُس میں کوئی افسردگی پیدا نہیں ہُوئی اور بالآخر عین میدانِ کارزار میں اپنے محبوب مقصد کے لیے اپنے محبوب امام و رفیق کے ساتھ راہِ خدا میں سر دے کر ثابت کر دیا کہ

جو تجھ بن نہ جینے کو کہتے تھے ہم
سو اُس عہد کو ہم وفا کر چلے

مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ رِجَالٌ صَدَقُوْا مَا عَاهَدُوا اللّٰهَ عَلَيْهِ (۲۳:۳۳)

مولانا نے اپنے ایک فارسی مکتوب میں لکھا تھا:

"رسُول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلم، کی طرف نسبت کرنے والے مُسلمان کو لازم ہے کہ جان و مال اور عزّت و آبرُو کی اِس راہ میں بازی لگا دے اور اُس کو اپنی عین سعادت سمجھے اور موافق و مخالف کی ترقی و تنزّل کو قدرتِ الٰہی کے حوالے کر دے بقولِ شخصے ؎ بخت اگر مدد کند، دامنش آورم بکف
گر بکشم زہے طرب! ور بکشد زہے شرف!

بالاکوٹ کے معرکے نے ثابت کر دیا کہ اللہ نے فتح و غلبہ کی مسرّت و طرب کے بجائے ان کو فدائیت و شہادت کا شرف عطا فرمایا اور رضا و قبول کے دستِ شفقت نے اُن کو اپنی آغوشِ رحمت کی طرف کھینچ لیا۔ وَ مَا عِنْدَ اللّٰهِ خَيْرٌ لِّلْاَبْرَارِ (۳ : ۱۹۸)

مولانا کی دُوسری فضیلتیں تو رہیں برطرف، اُن کی شہادت مُسلّم ہے اور شہداء کی مغفرت مُسلّم؛

لیکن ۲۴ ذوالقعدہ ۱۲۴۶ھ سے لے کر آج تک کم و بیش ۱۳۶ برس کے طویل عرصے میں شاید ہی کوئی ایسا دن طلوع ہوا ہو، جس کی صبح کو اس شہیدِ اسلام کی تکفیر و تضلیل کا کوئی فتویٰ نہ نکلا ہو، لعنت اور سبّ وشتم کا کوئی صیغہ نہ استعمال کیا گیا ہو۔ فقہ و فتاوٰی کی کوئی دلیل ایسی نہیں، جو اُس کے کفر کے ثبوت میں پیش نہ کی گئی ہو۔ وُہ ابوجہل و ابولہب سے زیادہ دشمنِ اسلام، خوارج و مرتدین سے زیادہ مارق من الدین و خارج از اسلام، فرعون و ہامان سے زیادہ مستحقِ نار، کفر و ضلالت کا بانی، بے ادبوں اور گستاخوں کا پیشوا، شیخ نجدی کا مُقلّد و شاگرد بتایا گیا! یہ اُن لوگوں نے کہا، جن کے جسمِ نازک میں آج تک اللہ کے لیے ایک پھانس بھی نہیں چُبھی، جن کے پیروں میں اللہ کے راستے میں کبھی کوئی کانٹا نہیں گڑا، جن کو (خُون چھوڑ کر کہ اس کا اُن کے سیاں کیا ذکر؟) اسلام کی صحیح خدمت میں پسینے کا ایک قطرہ بہانے کی سعادت بھی حاصل نہیں ہوئی! یہ اُن لوگوں نے کہا، جن کی ماؤں، بہنوں اور بیٹیوں کی عزّت و عصمت بچانے کے لیے اُس نے سر کٹایا! کیا اُس کا یہی گناہ تھا اور کیا دُنیا میں احسان فراموشی کی اس سے بڑھ کر نظیر مل سکتی ہے؟ جس وقت پنجاب میں مسلمانوں کا دین و ایمان، جان و مال، عزّت و آبرو محفوظ نہ تھی، سکھ اپنے گھروں میں مسلمان عورتیں ڈال لیتے تھے، مساجد کی بے حُرمتی ہو رہی تھی اور اُن میں گھوڑے باندھے جاتے تھے: اُس وقت یہ غیرتِ ایمانی و حمیّتِ اسلامی کے مُدّعی کہاں تھے؟

رکھیو غالب مجھے اِس تلخ نوائی میں معاف
آج کچھ درد مرے دِل میں سوا ہوتا ہے

دربارِ لاہور میں بالاکوٹ کے واقعے کی اطلاع اور مہاراجہ کی مسرت وجشنِ شادمانی

کیپٹن سی ایم ویڈ (C.M. WADE) پولیٹیکل ایجنٹ نے گورنر جنرل کے سیکرٹری مسٹر ایچ ٹی پرنسپ (H.T. PRINCEP) کو ۱۷ مئی ۱۸۳۱ء کو (معرکۂ بالاکوٹ سے گیارہ روز بعد) کیمپ دسوہہ سے جو خط شملے بھیجا، اُس میں لکھتا ہے:

"رنجیت سنگھ اِس فتح (بالاکوٹ) کی اطلاع کی خوشی سے باغ باغ ہو گیا، جس نے اُس کو اس دردِ سری اور پریشانی سے نجات دی جس میں اُس کی حکومت مسلسل کئی سال سے مُبتلا تھی۔ اُس نے حکم جاری کیا کہ سرکاری طور پر سلامی کی توپیں سر ہوں اور

امرتسر میں اس واقعے کی مسرّت و شادمانی میں چراغاں کیا جائے۔"

مسٹر سی ایم ویڈ کے دُوسرے خط میں، جو دُوسرے روز ۱۸ مئی ۱۸۳۱ء کو لکھا گیا، حسبِ ذیل اضافہ ہے۔ یہ خط مہاراجہ کے اخبار نویس کی اُس تحریر کا ترجمہ ہے، جو ۱۴ مئی ۱۸۳۱ء کو لکھی گئی:

"مہاراجہ نے (بالاکوٹ کی) فتح کی اطلاع سے مسرور ہو کر قاصد کو، جو یہ خبر لایا تھا، سونے کے کنگن کی ایک جوڑی انعام میں دی، جن کی قیمت تین سَو روپے تھی۔ اس کے علاوہ ایک شالی پگڑی بھی عنایت کی۔ مہاراجہ نے کنوّر شیر سنگھ کو خط لکھا، جس میں اُن کے مُراسلے کی رسید دی اور اُن کی اس گراں قدر خدمت پر اظہارِ خوشنودی فرمایا، اور لکھا کہ جب وُہ واپس آئیں گے، تو اُن کو اس خدمت کے صِلے میں ایک نئی جاگیر عطا کی جائے گی۔ ایک فرمان فقیر امام الدین حاکم گووند گھر کے نام صادر ہُوا کہ وُہ اِس واقعے کی مسرّت میں اس قلعے کی ہر بندوق سے گیارہ فَیر سلامی کے سر کریں۔

مسٹر ویڈ اِسی خط میں لکھتا ہے:

"اب جبکہ سِکھوں نے سیّد (صاحب) کے قضیے سے فراغت پالی ہے، جنھوں نے سِکھوں کی جنگی قوّت کو پانچ سال تک مشغول رکھا، اب غالباً وُہ اپنی سرگرمیوں کے لیے نیا مَیدان تلاش کریں گے۔"

اِن خطوط کے جواب اور بالاکوٹ کے واقعے کی اِطّلاع پر ۲۳ مئی ۱۸۳۱ء کو گورنر جنرل کے سیکرٹری نے شملے سے کیپٹن سی ایم ویڈ، پولٹیکل ایجنٹ، لُدھیانہ کو ایک خط میں ہدایت کی کہ اگر سیّد صاحبؒ کے مقابلے میں شیر سنگھ کی کامیابی اور مجاہدین کے قضیے کے اِختتام کی اِطّلاع کی تصدیق ہو جائے، تو آپ کو گورنر جنرل کی طرف سے مہاراجہ کو اِس فتح پر مُبارکباد پیش کرنی چاہیے۔ [۱]

○

---

[۱] نقل از گورنمنٹ ریکارڈ آفس، مغربی پاکستان، مُصدّقہ حکومتِ پاکستان

فہرستِ شُہداءِ بالاکوٹ

بہ ترتیبِ حُرُوفِ تہجّی

جنگِ بالاکوٹ میں غازی تین سَو سے زیادہ شہید ہُوئے، مگر جن صاحبوں کے نام راویوں کو یاد رہے، وُہ یہ ہیں:[1]

ا

(۱) حضرت امیر المومنین سیّد احمد رحمۃ اللہ علیہ (۲) مولانا شاہ محمّد اسمٰعیل رحمۃ اللہ علیہ

(۳) (دادا) سیّد ابوالحسن نصیر آبادی (۴) مرزا احمد بیگ بانکے (پنجابی)

(۵) مولوی احمد اللہ ناگپوری برادرِ عم زادِ مولانا عبد الحی صاحب

(۶) قاضی احمد اللہ میرٹھی (۷) محمّد اسحٰق پنج تنی

(۸) شیخ محمّد اسحٰق گورکھپوری (۹) اصغر علی درگاہی غازی پوری

(۱۰) اللہ بخش انبالوی (۱۱) اللہ بخش عظیم آبادی

(۱۲) اللہ بخش باغپتی (۱۳) اللہ داد عظیم آبادی

(۱۴) اللہ داد (وطن نامعلوم) (۱۵) حافظ الٰہی بخش کیرانوی

(۱۶) امام الدین ساکن بمبئی (۱۷) شیخ امام علی محی الدین پوری، علاقۂ الہ آباد

(۱۸) شیخ امام علی الہ آبادی (جو غازیوں سے قواعد لیتے تھے)

(۱۹) میر امانت علی ساڈھورہ (۲۰) شیخ امجد علی غازی پوری فرزند شیخ فرزند علی رئیس غازی پور

(۲۱) حافظ امیر خاں

(۲۲) سیّد امیر علی حانسی (۲۳) حافظ امیر الدین گڈھ مکتیسری

---

[1] یہ فہرست زیادہ تر میاں خدا بخش، الٰہی بخش، شیر محمد خاں رامپوری، شیخ محب اللہ، محمد امیر خاں قصوری، نجم الدین شکار پوری اور مولوی سید جعفر علی بستوی کی یادداشت اور بیانات پر مبنی ہے۔

(۲۴) سید امیر الدین ساکن گھرا
(۲۵) شیخ امیر الدین
(۲۶) شیخ امیر اللہ تھانوی

ب

(۲۷) بادل خاں بانس بریلوی
(۲۸) مولوی باقر علی عظیم آبادی
(۲۹) بخش اللہ خاں برادر مہر علی انبالوی
(۳۰) بخش اللہ خاں بہادر گڈھی
(۳۱) بخش اللہ خاں، (بارہ بستی)
(۳۲) بخش اللہ خان لوہری
(۳۳) حاجی برکات عظیم آبادی
(۳۴) شیخ بلند بخت دیوبندی
(۳۵) شیخ بہادر علی پھلتی
(۳۶) بھیکن شاہ پوری
(۳۷) ارباب بہرام خان تہکالی

ت

(۳۸) توکل پھلتی

ج

(۳۹) مرزا جان ساکن چنبئی
(۴۰) مرزا جان کا لڑکا (جس کا نام معلوم نہیں)

چ

(۴۱) چاند خاں ناگوری
(۴۲) سید چراغ علی ساکن پٹیالہ

ح

(۴۳) حسن خاں بنارسی
(۴۴) حسن خاں ساکن زمانیہ
(۴۵) مرزا حسین بیگ
(۴۶) شیخ حماد
(۴۷) حیات خاں خیرآبادی

خ

(۴۸) خدا بخش لکھنوی شاگرد حافظ مولوی عبدالوہاب لکھنوی

(۴۹) خدابخش الہ آبادی
(۵۰) خدابخش غازی پوری (ابن اصغر علی درگاہی)
(۵۱) منشی خواجہ محمد حسن پوری
(۵۲) خیر اللہ ساکن امروہہ
(۵۳) خیر اللہ کے والد (نام نامعلوم)

د

(۵۴) داؤد خاں خورجوی
(۵۵) داؤد خاں ساکن ہیٹھیالہ
(۵۶) شیخ درگاہی غازی پوری
(۵۷) دلاور خاں گورکھپوری

ر

(۵۸) راجا (غالباً سید صاحبؒ کے ہم وطن تھے)
(۵۹) راحت حسین عظیم آبادی
(۶۰) رحیم بخش الہ آبادی
(۶۱) رحیم اللہ سہارنپوری
(۶۲) روشن سقا ساکن کوٹلی
(۶۳) سید زین العابدین (پشاور)

س

(۶۴) سخاوت رامپوری
(۶۵) سرانداز خاں ساکن پکھلی
(۶۶) سلو خاں دیوبندی

ش

(۶۷) شیخ شجاعت علی فیض آبادی
(۶۸) شرف الدین پنجتنی دہلوی
(۶۹) شرف الدین بنگالی
(۷۰) شمس الدین ساکن ہریانہ
(۷۱) شیر جنگ خاں خالص پوری

ص

(۷۲) حافظ محمد صابر تھانوی
(۷۳) صندل خاں پنجابی

ض

(۷۴) سید ضامن شاہ ساکن درۂ کاغان
(۷۵) شیخ ضیاء الدین پھلتی

ع

(۷۶) عبدالجبار خاں شاہجہانپوری
(۷۷) عبدالرحمٰن ناگپوری
(۷۸) عبدالرؤف پھلتی
(۷۹) عبدالسبحان خاں گورکھپوری
(۸۰) عبدالعزیز دیوبندی
(۸۱) عبدالقادر جھنجھانوی
(۸۲) عبدالقادر غازی پوری
(۸۳) حافظ عبدالقادر ساکن میان دوآب
(۸۴) عبدالقادر (وطن نامعلوم)
(۸۵) میاں جی عبدالکریم ساکن انبیٹھہ
(۸۶) عبداللہ دہلوی (خادم خاص امیر المومنین)
(۸۷) عبداللہ خاں گورکھپوری
(۸۸) عبداللہ (غالبًا پانی پتی)
(۸۹) عبدالمنان بنارسی
(۹۰) مولوی حافظ عبدالوہاب لکھنوی (قاسم غلہ)
(۹۱) عبداللہ (نومسلم)
(۹۲) عظیم اللہ خاں ساکن اکوڑہ
(۹۳) قاضی علاء الدین بگھرا
(۹۴) علی خاں سہارنپوری
(۹۵) علیم الدین بنگالی

غ

(۹۶) غازی الدین (وطن نامعلوم)
(۹۷) غلام محمد پانی پتی (والد محمد حسن پانی پتی)

ف

(۹۸) فرجام علی خاں ساکن ضلع سہارنپور (خادم خاص امیر المومنین)
(۹۹) فیض الدین بنگالی
(۱۰۰) فیض اللہ (تخت ہزارے کا)
(۱۰۱) فیض اللہ شیدی

ق

(۱۰۲) قادر بخش ساکن لہاری
(۱۰۳) قادر بخش ساکن کنج پورہ
(۱۰۴) قادر بخش (وطن نامعلوم)
(۱۰۵) قلندر خاں قندھاری
(۱۰۶) حکیم قمرالدین پھلتی
(۱۰۷) مولوی قمرالدین عظیم آبادی

ک

(۱۰۸) کریم بخش خیاط لکھنوی
(۱۰۹) کریم بخش ساکن ساڈھورہ
(۱۱۰) کریم بخش
(۱۱۱) شیخ کریم بخش سہارنپوری

ل

(۱۱۲) لطف اللہ بنگالی
(۱۱۳) لعل محمد مہاجر پرانغاری

م

(۱۱۴) محمد حسن پانی پتی (ابنِ غلام محمد)
(۱۱۵) شیخ محمد رضا ساکن ضلع میرٹھ
(۱۱۶) محمد عرب
(۱۱۷) محمد معصوم علی عظیم آبادی
(۱۱۸) شیخ محمد علی غازی پوری
(۱۱۹) منشی محمدی انصاری
(۱۲۰) محمود خاں لکھنوی
(۱۲۱) مراد خاں خورجوی
(۱۲۲) مرزا مرتضیٰ بیگ لکھنوی
(۱۲۳) سیّد مردان علی میران پوری
(۱۲۴) مشرف خاں گورکھپوری
(۱۲۵) حافظ مصطفےٰ جھنجھانوی
(۱۲۶) حافظ مصطفےٰ کاندھلوی
(۱۲۷) سیّد مظفر حسین بنگالی
(۱۲۸) معمور خاں لکھنوی
(۱۲۹) منصور خاں گورکھپوری
(۱۳۰) منور خیاط لکھنوی
(۱۳۱) مولا بخش میراتی ساکن نورح ضلع گوڑگانواں
(۱۳۲) مہربان خاں (بانگرمئو)
(۱۳۳) میاں جی چشتی بڈھانوی

ن

(۱۳۴) نبی حسین عظیم آبادی
(۱۳۵) نتھے خاں ساکن ہزارہ
(۱۳۶) شیخ نصرت بانس بریلوی
(۱۳۷) شیخ نصر اللہ خورجوی
(۱۳۸) نواب خاں ساکن گرتنی
(۱۳۹) مولوی سیّد نور احمد ساکن نگرام مؤرخ اسلام
(۱۴۰) نور بخش جرّاح ساکن شاملی
(۱۴۱) نور علی لکھنوی

(۱۴۲) نور محمد ناگوری

و

(۱۴۳) وزیر خاں سیواتی
(۱۴۴) ولی داد خاں خورجوی

○

شہدائے بالاکوٹ کا مقام و پیغام

اس معرکے میں وہ پاک نفوس شہید ہوئے، جو عالمِ انسانیت کے لیے رونق و زینت اور مسلمانوں کے لیے شرف و عزت اور خیر و برکت کا باعث تھے۔ مردانگی و جوانمردی، پاکیزگی و پاکبازی، تقدس و تقوٰی، اتباعِ سنّت و شریعت اور دینی حمیت و شجاعت کا وہ عطر، جو خدا جانے کتنے باغوں کے پھولوں سے کھینچا گیا تھا اور انسانیت اور اسلام کے باغ کا جیسا عطر مجموعہ صدیوں سے تیار نہیں ہوا تھا اور جو ساری دنیا کو معطر کرنے کے لیے کافی تھا، ۲۴ ذوالقعدہ ۱۲۴۶ھ کو بالاکوٹ کی مٹی میں مل کر رہ گیا۔ مسلمانوں کی نئی تاریخ بنتے بنتے رہ گئی۔ حکومتِ شرعی ایک عرصہ تک کے لیے خواب بے تعبیر ہوگئی۔ بالاکوٹ کی زمین اس پاک خون سے لالہ زار اور اس گنجِ شہیداں سے گلزار بنی، جس کے اخلاص و للّٰہیت، جس کی بلند ہمتی و استقامت، جس کی جرأت و ہمت اور جس کے جذبۂ جہاد و شوقِ شہادت کی نظیر پچھلی صدیوں میں ملنی مشکل ہے۔ بالاکوٹ کی سنگلاخ و ناہموار زمین پر چلنے والے بے خبر مسافر کو کیا خبر کہ یہ سرزمین کن عشاق کا مدفن اور اسلامیت کی کس متاعِ گرانمایہ کا مخزن ہے۔

یہ بلبلوں کا، صبا، مشہدِ مقدس ہے
قدم سنبھال کے رکھیو، یہ تیرا باغ نہیں

اللہ کے کچھ مخلص بندوں نے ایک مخلص بندے کے ہاتھ پر اپنے مالک سے اس کی رضا، اس کے نام کی بلندی اور اس کے دین کی فتحمندی کے لیے آخری سانس تک کوشش کرنے اور اس راہ میں اپنا سب کچھ مٹا دینے کا عہد کیا تھا۔ جب تک ان کے دم میں دم رہا، اسی راہ میں سرگرم رہے۔

بالآخر اپنے خونِ شہادت سے اس پیمانِ وفا پر آخری مُہر لگا دی۔ یقین کے ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ ۲۴ ذوالقعدہ کا دن گزر کر جو رات آئی، وہ پہلی رات تھی، جس رات کو وہ سُبک دوش و سُبک سر ہو کر میٹھی نیند سوئے۔

وہ خلعتِ شہادت پہن کر جس کریم کی بارگاہ میں پہنچے، وہاں نہ مقاصد کی کامیابی کا سوال ہے، نہ کوششوں کے نتائج کا مطالبہ، نہ شکست و ناکامی پر عتاب ہے، نہ کسی سلطنت کے عدمِ قیام پر محاسبہ، وہاں صرف دو چیزیں دیکھی جاتی ہیں: صدق و اخلاص اور اپنی مساعی اور وسائل کا پورا استعمال۔ اِس لحاظ سے شہداءِ بالاکوٹ اس دُنیا میں بھی سرخرو ہیں اور انشاءاللہ دربارِ الٰہی میں بھی باآبرو، کہ اُنھوں نے اخلاص کے ساتھ اپنے مالک کی رضا کے لیے اپنی مساعی اور وسائل کے استعمال میں ذرہ برابر کمی نہیں کی۔ اُن کا وُہ خونِ شہادت، جو ہماری مادّی نگاہوں کے سامنے بالاکوٹ کی مٹی میں جذب ہو گیا اور اس کے جو چھینٹے پتھروں پر باقی تھے، ۲۶ ذوالقعدہ کی بارش نے اُن کو بھی دھو دیا، وُہ خون، جس کے نتیجے میں کوئی سلطنت قائم نہیں ہوئی، کسی قوم کا مادّی و سیاسی عُروج نہیں ہُوا اور کوئی نخلِ آرزو اس سے سرسبز ہو کر بار آور نہیں ہُوا، اُس خون کے چند قطرے اللہ کی میزانِ عدل میں پُوری پُوری سلطنتوں سے زیادہ وزنی ہیں۔ یہ فقیرانِ بے نوا، جنھوں نے عالمِ مسافرت میں بے کسی کے ساتھ جان دی اور جن کی اب دُنیا میں کوئی مادّی یادگار نہیں، یہ اللہ کے ہاں اُن بانیانِ سلطنت اور فرماں روایانِ حکومت سے کہیں زیادہ قیمتی اور معزز ہیں، جن کی تصویر قرآن نے ان الفاظ میں کھینچی ہے، وَإِذَا رَأَيْتَهُمْ تُعْجِبُكَ أَجْسَامُهُمْ وَإِن يَقُولُوا تَسْمَعْ لِقَوْلِهِمْ كَأَنَّهُمْ خُشُبٌ مُّسَنَّدَةٌ - (المنٰفقون: ۴)

بے شک شہداءِ بالاکوٹ کے خون نے دُنیا کے سیاسی و جغرافیائی نقشے میں کوئی فوری تغیر نہیں پیدا کیا۔ خونِ شہادت کی ایک مختصر سی سُرخ لکیر اُبھری تھی۔ اُس کی جگہ نہ جغرافیہ نویس کے طبعی نقشے میں تھی، نہ مُورخ کے سیاسی مُرقّع میں، لیکن کِسے خبر کہ یہ خونِ شہادت دفترِ قضا و قدر میں کس اہمیت و اثر کا مستحق سمجھا گیا، اُس نے مسلمانوں کے نوشتۂ تقدیر کے کتنے دھبے دھوئے۔ اُس نے اللہ تعالیٰ کے یہاں جس کے یہاں محو و اثبات کا عمل جاری رہتا ہے (يَمْحُو اللَّهُ مَا يَشَاءُ وَيُثْبِتُ وَعِندَهُ أُمُّ الْكِتَابِ)
(الرعد: ۳۹)

کون سے نئے فیصلے کروائے، اُس نے کسی مستحکم سلطنت کے لیے خاتمہ و زوال اور کسی پس ماندہ قوم کے لیے عروج و اقبال کا فیصلہ کروایا، اس سے کس قوم کا بخت بیدار ہوا اور کس سرزمین کی قسمت جاگی اس نے کتنی بظاہر ناممکن الوقوع باتوں کو ممکن بنا دیا اور کتنی بعید از قیاس چیزوں کو واقعہ اور مشاہدہ بنا کے دکھا دیا۔

یوں تو شہداء بالاکوٹ میں سے ہر فرد کا پیغام یہ ہے کہ يَا لَيْتَ قَوْمِي يَعْلَمُونَ بِمَا غَفَرَ لِي رَبِّي وَجَعَلَنِي مِنَ الْمُكْرَمِينَ (یٰس: ۲۶)، مگر گوشِ شنوا اور دیدۂ بینا کے لیے ان کا مجموعی پیغام یہ ہے کہ ہم ایک ایسے خطۂ زمین کے حصول کے لیے جد و جہد کرتے رہے، جہاں ہم اللہ کے منشا اور اسلام کے قانون کے مطابق آزادی کے ساتھ زندگی گزار سکیں، جہاں ہم دنیا کو اسلامی زندگی اور اسلامی معاشرے کا نمونہ دکھا کر اسلام کی طرف مائل اور اُس کی صداقت و عظمت کا قائل کر سکیں، جہاں نفس و شیطان، حاکم و سلطان اور رسم و رواج کے بجائے خالص اللہ کی حکومت و اطاعت ہو، وَيَكُونَ الدِّينُ كُلُّهُ لِلَّهِ (الانفال: ۳۹)، جہاں طاعت و عبادت اور صلاح و تقویٰ کے لیے اللہ کی زمین وسیع اور فضا سازگار ہو اور فسق و فجور و معصیت کے لیے زمین تنگ اور فضا ناسازگار ہو، جہاں ہم کو صدیاں گزر جانے کے بعد پھر اَلَّذِينَ إِن مَّكَّنَّاهُمْ فِي الْأَرْضِ أَقَامُوا الصَّلَوٰةَ وَآتَوُا الزَّكَوٰةَ وَأَمَرُوا بِالْمَعْرُوفِ وَنَهَوْا عَنِ الْمُنكَرِ (الحج: ۴۱) کی تفسیر اور تصویر پیش کرنے کا موقع مل سکے۔ تقدیر الٰہی نے ہمارے لیے اس سعادت و مسرت اور اس آرزو کی تکمیل کے مقابلے میں میدانِ جنگ کی شہادت اور اپنے قرب و رضا کی دولت کو ترجیح دی۔ ہم اپنے رب کے اس فیصلے پر رضامند و خورسند ہیں۔ اب اگر اللہ نے تم کو دنیا کے کسی حصے میں کوئی ایسا خطۂ زمین عطا فرمایا، جہاں تم اللہ کے منشا اور اسلام کے قانون کے مطابق آزادی کے ساتھ زندگی گزار سکو اور اسلامی زندگی اور اسلامی معاشرے کے قائم کرنے میں کوئی مجبوری مخل اور کوئی بیرونی طاقت حائل نہ ہو، پھر بھی تم اس سے گریز کرو اور ان شرائط و اوصاف کا ثبوت نہ دو،

ترجمہ: وہ لوگ کہ اگر ہم ان کو قدرت دیں ملک میں تو وہ قائم رکھیں نماز اور دیں زکوٰۃ اور حکم کریں بھلے کام کا اور منع کریں برائی سے۔ (الحج : ۴۱)

جو مہاجرین و مظلومین کے اقتدار اور سلطنت کا تمغۂ امتیاز ہیں[1]، تو تم ایسے کفرانِ نعمت اور ایک ایسی بدعہدی کے مرتکب ہو گے، جس کی نظیر تاریخ میں ملنی مشکل ہے۔ ہم نے جس زمین کے چپے چپے کے لیے جد و جہد کی اور اس کو اپنے خون سے رنگین کر دیا، اکوڑے اور شیدو کے میدان اور تورو اور مایار کی رزم گاہ سے لے کر بالاکوٹ کی شہادت گاہ تک ہمارے خونِ شہادت کی مہریں اور ہمارے شہیدوں کی قبریں ہیں۔ تم کو خدا نے اس زمین کے وسیع رقبے اور سر سبز و شاداب خطے سپرد فرمائے اور بعض اوقات قلم کی ایک جنبش اور برائے نام کوشش نے تم کو عظیم سلطنتوں کا مالک بنا دیا، ثُمَّ جَعَلْنٰكُمْ خَلٰٓئِفَ فِي الْأَرْضِ مِنْۢ بَعْدِهِمْ لِنَنْظُرَ كَيْفَ تَعْمَلُوْنَ[2]۔ اب اگر تم اس سے فائدہ نہیں اٹھاتے اور تم نے آزادی کی اس نعمت اور خداداد سلطنت کی اس دولت کو جاہ و اقتدار کے حصول اور حقیر و فانی مقاصد کی تکمیل کا ذریعہ بنایا، تم نے اپنے نفوس اور اپنے متعلقین، ملک کے شہریوں اور باشندوں پر خدا کی حکومت اور اسلام کا قانون جاری نہ کیا اور تمھارے ملک اور تمھاری سلطنتیں اپنی تہذیب و معاشرت اور اپنے قانون و سیاست اور تمھارے حاکم اپنے اخلاق و سیرت اور اپنی تعلیم و تربیت میں غیر اسلامی سلطنتوں اور غیر مسلم حاکموں سے کوئی امتیاز نہیں رکھتے، تو تم آج دنیا کی ان قوموں کے سامنے، جن سے تم نے مسلمانوں کے لیے الگ خطۂ زمین کا مطالبہ کیا اور کل خدا کی عدالت میں جہاں اس امانت کا ذرّہ ذرّہ حساب دینا پڑے گا، کیا جواب دو گے؟ خدا نے تم کو ایک ایسا نادر و زرّیں موقع عطا فرمایا ہے، جس کے انتظار میں چرخِ کہن نے سیکڑوں کروٹیں بدلیں اور تاریخ اسلام نے ہزاروں صفحے الٹے، جس کی حسرت و آرزو میں خدا کے لاکھوں پاک نفس اور عالی ہمت بندے دنیا سے چلے گئے۔ اس موقع کو اگر تم نے ضائع کر دیا، تو اس سے بڑا تاریخی سانحہ اور اس سے بڑھ کر حوصلہ شکن اور یاس انگیز واقعہ نہ ہو گا۔ بالاکوٹ کے

---

[1] اذن للذین یقاتلون بانہم ظلموا و ان اللہ علی نصرہم لقدیر، الذین اُخرجوا من دیارہم بغیر حق الا ان یقولوا ربنا اللہ ولو لا دفع اللہ الناس بعضہم ببعض لہدمت صوامع و بیع و صلوات و مساجد یذکر فیہا اسم اللہ کثیرا و لینصرن اللہ من ینصرہ ان اللہ لقوی عزیز۔ (۲۲ : ۳۹-۴۰)

[2] یونس، ع ۲ - ترجمہ: پھر ہم نے تم کو ان کے بعد زمین میں جانشین کیا تاکہ دیکھیں کہ تم کیسے عمل کرتے ہو۔

ان شہیدوں کا، جو ایک دور افتادہ بستی کے ایک گوشے میں آسودۂ خاک ہیں، ان سب لوگوں کے لیے جو اقتدار و اختیار کی نعمت سے سرفراز اور ایک آزاد اسلامی ملک کے باشندے ہیں پیغام ہے کہ فَهَلْ عَسَيْتُمْ إِنْ تَوَلَّيْتُمْ أَنْ تُفْسِدُوا فِي الْأَرْضِ وَتُقَطِّعُوا أَرْحَامَكُمْ۔[1]

جماعت کی امارت اور نظم و نسق

میاں خدا بخش، الٰہی بخش، شیر محمد خاں رامپوری، محمد امیر خاں قصوری، لعل محمد جگدیس پوری اور وارد خود عبدالقیوم وغیرہ کہتے ہیں کہ لڑائی کے کھیت سے نکل کر ہم اکثر لوگ پہاڑ کی آڑ میں چشمے پر جمع ہوئے۔ کچھ لوگ آگے بھی چلے گئے۔ وہیں چشمے پر دو یا تین غازی مولوی خیرالدین صاحب کے ہمراہی آ پہنچے اور کہنے لگے: بھائیو، ہراساں نہ ہونا۔ مولوی صاحب کے سب ہمراہی مجاہدین پیچھے آتے ہیں پھر جب ہم لوگوں نے لڑائی میں شکست ہونے کا حال بیان کیا، تب وہ بھی ایک سکوت کے عالم میں رہ گئے۔ ہم لوگوں میں سے ہر ایک حضرت علیہ الرحمۃ کے غم فراق میں اس قدر پراگندہ خاطر اور حواس باختہ تھا، جیسے مجنون اور سودائی ہوتا ہے۔ کوئی کسی کا پرسانِ حال نہ تھا۔ وہاں سے سب لوگ چل کر ناصر خاں کے گاؤں انگرائی میں ٹھیرے، وہاں سے میاں کلی ٹھیرتے ہوئے درہ ندھیار میں موضع شملئی پہنچے۔ جب ہم لوگ موضع بنیر پہنچے، تو وہاں کے خان بہرام خاں خیل نے، جو حبیب اللہ خاں کا بڑا بھائی تھا، ہم سب کو تسلی دے کر، بنیر میں ٹھیرایا۔ بیوی صاحبہ معظمہ مکرمہ ہم لوگوں سے ایک یا دو روز پہلے راج دواری سے آکر بنیر کے پہاڑ پر ایک گوجر کے مکان میں ٹھیری تھیں۔ جو غازی لڑائی کے روز جابجا اِدھر اُدھر پراگندہ ہو گئے تھے، وہ بھی آکر ہم لوگوں میں شریک ہو گئے۔ مولوی سید نصیر الدین صاحب منگلوری جو موضع بھوگڑ منگ میں تیس بتیس آدمیوں کے ساتھ متعین تھے، وہ بھی اپنے لوگوں سمیت آکر شریک ہوئے اور جو لوگ سچون میں بیمار تھے، وہ بھی آئے۔ اس روز شام کو تقریباً سات سو آدمیوں کی جنس تقسیم ہوئی۔

---

[1] سورۂ محمدؐ، ع ۳۔ ترجمہ: کیا یہ احتمال بھی ہے کہ اگر تمہاری حکومت ہو تو تم زمین میں فساد کرو اور قطع رحمی سے کام لو۔

اس سے اگلے روز لوگوں میں پراگندگی کی ایک صورت ظاہر ہوئی، کیونکہ تمام لوگ بے سوار تھے۔ اُن پر ایسا کوئی امیر نہ تھا کہ اُس کے رعب سے دبے رہیں۔ جس کے دل میں جو بات آتی تھی، وہ کہتا تھا۔ کسی نے ہند کا ارادہ کیا، کسی نے سندھ کا، کسی نے کابل اور قندھار کا۔ بعضوں نے کہا کہ ہم تو امیر المومنین کی بیوی صاحبہ کے ساتھ ہیں۔ اُن کو چھوڑ کر کہیں نہ جائیں گے۔ غرض، ہر کوئی اپنی علیحدہ تقریر کرتا تھا اور شیخ ولی محمد صاحب پھلتی کا یہ حال تھا، جیسے کوئی دیوانہ یا مست ہوش باختہ ہوتا ہے۔ سب کی باتیں سنتے تھے اور جواب کسی کو نہ دیتے تھے۔ حضرت کے غمِ فراق سے ہوش و حواس بر جا نہ تھے۔ یہی حال اکثر لوگوں کا تھا۔ جو شخص حضرت سے جس قدر محبت اور دلی اخلاص رکھتا تھا، اسی قدر اس کو غم تھا۔ جو کوئی شیخ صاحب موصوف سے کہتا کہ حضرت امیر المومنین کے رُوبرُو بھی آپ ہم سب کے سردار تھے اور اب بھی آپ ہی سردار ہیں۔ تمام مجاہدین متفرق ہوئے جاتے ہیں، بلکہ بہت لوگ دو دو، چار چار کر کے چلے بھی گئے۔ اگر دو چار روز یوں ہی بے انتظامی اور پراگندگی رہی، تو لشکر ختم ہو جائے گا۔ آپ اس کا جلد تدارک کریں تاکہ غازیوں کا بیڑا قائم رہے۔ شیخ صاحب اس کے جواب میں کہتے تھے کہ مجھ سے کچھ کام نہیں۔ جو چاہے، سو رہے؛ جو چاہے، سو چلا جائے۔ میں تو حضرت کی بیوی صاحبہ کے ساتھ ہوں اور انھیں کا فرماں بردار اور خدمت گزار ہوں۔ لیکن آخر شیخ حسن علی صاحب، سید نصیر الدین صاحب منگلوری اور مولوی حاجی قاسم صاحب پانی پتی کے اصرار اور سمجھانے سے شیخ صاحب راضی ہو گئے اور ان تینوں صاحبوں نے لشکر کے تمام افسروں کو بلوایا اور اُن سے یہ حال بیان کیا۔ سب خوش ہو کر اس پر راضی ہو گئے اور سب نے اتفاق کر کے شیخ صاحب کو اپنا امیر بنایا اور اُن کی اطاعت اور فرمانبرداری کا عہد کیا۔[1]

○

[1] جماعتِ مجاہدین نے اس کے بعد سید صاحبؒ کے جانشینوں اور اپنے اُمرا جماعت کے ماتحت جہاد و جد و جہد کا جو سلسلہ جاری رکھا، وہ سرفروشی و جانبازی، اخلاص و وفاداری، عالی ہمتی اور اولو العزمی اور ثبات و استقامت کی ایک مسلسل تاریخ ہے جس کے لیے ایک علیحدہ کتاب کی ضرورت ہے۔

چھیالیسواں باب

فطری اخلاق و اوصاف

اخلاق و اوصاف کا مرکزی نقطہ | سیّد صاحبؒ کے اخلاق و اوصاف کا مرکزی نقطہ اور نمایاں وصف یہ ہے کہ آپ میں آنحضرت صلّی اللّٰہ علیہ وسلّم سے مناسبتِ تامّہ اور مزاجِ نبوی سے طبعی و ذوقی اتحاد نظر آتا ہے۔ آپ کے حالات و اخلاق کا جو شخص دیانتداری اور غیر جانبداری کے ساتھ مطالعہ کرے گا، وہ آپ کے فیصلوں، طبعی رجحانات اور حدیث و سیرت کے واقعات میں بکثرت توارُد پائے گا، اور یہی طبعی مناسبت کے معنی ہیں کہ جہاں علم نہ ہو، وہاں بھی بے تکلف طبیعت اسی طرف مائل ہو جائے۔ جدھر آنحضرت صلّی اللّٰہ علیہ وسلّم کی طبیعت کا مَیلان ہوتا۔ سلامتِ طبع، توازنِ دماغی، اعتدال و توسط، جامعیت، معاملہ فہمی؛ سادگی کے ساتھ گہرا فہم، حیا کے ساتھ جُرأت و اظہارِ حق، تحمّل و عفو کے ساتھ حمیّتِ شرعی اور غیرتِ دینی، شفقت کے ساتھ جذبۂ جہاد و اجرائے حدود، ذوقِ عبادت کے ساتھ ذوقِ جہاد و شوقِ شہادت، مسلمانوں کے معاملے میں لینت و رِفق کے ساتھ اہلِ کفر پر شدت، قناعت و استغنا کے ساتھ عالی ہمتی و بلند حوصلگی، فقر اور فاقہ کی حالت میں سخاوت و دریا دلی، رُفقا کے ساتھ مساوات و اشتراکِ عمل، شجاعت و قوّتِ قلب کے ساتھ رقّتِ قلب و لطافتِ نفس، صبر و تحمّل کے ساتھ نزاکتِ فہم و ذکاوتِ حِس، تواضع کے ساتھ وقار و ہیبت، مروّجہ علوم کے بغیر اعلیٰ درجے کی حکمت و فقاہت،

بسط وتفصیل کے بجائے اجمال واختصار، فروع وجزئیات کے بجائے اُصول وکُلّیات کی طرف رُجحان، اپنی ذات کے لیے کبھی انتقام نہ لینا، نہ کسی کا دل توڑنا، احکام وحُدود کے سلسلے میں کسی کی پروا نہ کرنا، ہر شخص کے ساتھ اس طرح برتاؤ کرنا کہ وہ یہ سمجھے کہ اس سے زیادہ مُقرّب ومحبُوب کوئی نہیں، لیکن حدیث أمرنا رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم أنزِلُوا النّاسَ منازِلَهُم[1] (لوگوں کو ان کے مرتبوں پر رکھو) پر پُورا عمل۔ یہ وُہ اوصاف وخصُوصیات ہیں، جن میں شمائل نبوی کا پرتو صاف نظر آئے گا۔ یہ اتباعِ سُنّت اور اقتداءِ کامل کا وہ اعلیٰ درجہ ہے، جو فطری مناسبت، تربیتِ ربّانی اور سنّت میں فنا ہوئے بغیر عموماً حاصل نہیں ہوتا، مولانا ولایت علی صاحب عظیم آبادیؒ نے اس حقیقت کو بڑی سادگی سے اِن الفاظ میں بیان کیا ہے:

"حضرت کے پہچاننے کو تھوڑی سی سیدھی عقل، اور حدیث سے تھوڑی سی واقفیت چاہیے کہ اکثر اولیاء اللہ کو بعض انبیا کا پرتو عنایت ہوتا ہے۔ ہمارے حضرت کو اللہ نے پیغمبرِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم کا پرتو عنایت کیا اور گروہ حضرت کے صحابہ کا پرتو ڈالا کہ لوگوں کے دل میں اتباعِ سُنّت کی محبّت اور ایمان کی غیرت حد سے زیادہ ہوئی۔ اللہ کا دین زیادہ ہونے کے واسطے دل بے قرار ہونے لگا۔"[2]

ہم یہاں مختلف عنوانات کے ماتحت آپ کے اخلاق واوصاف کو بیان کرتے ہیں۔

اِعتدال وتوسّط مولوی سیّد جعفر علی صاحبؒ منظورۃ السّعداء میں لکھتے ہیں:

مولانا اسمٰعیل می فرمودند کہ ہر چند مردم بسیار براہِ راست آمدہ اند، لیکن آنچہ می خواہم ہیچکس از ایشاں اختیارِ آں وضع نہ نمودہ اند و آں راہِ توسّط است در افراط وتفریط کہ در ملازمینِ صحبتِ حضرت امیر المؤمنین یافتہ می شود۔ و من ہر چند سعی بسیار

مولانا اسمٰعیل فرماتے ہیں کہ اگرچہ بہت کثرت سے لوگ راہِ راست پر آگئے ہیں، لیکن اُن میں سے کسی نے وہ وضع اختیار نہیں کی، جو میں چاہتا ہُوں اور وُہ افراط وتفریط کے درمیان توسّط واعتدال کی راہ ہے، جو حضرت سیّد صاحب کے صحبت یافتہ لوگوں میں پائی جاتی ہے میں

---

[1] حدیثِ نبویؐ، روایتِ ابوداوُد بروایت ام المؤمنین عائشہؓ۔

[2] رسالۂ دعوت مشمولہ مجموعۂ رسائل تسعہ از مولانا ولایت علی عظیم آبادی علیہ الرحمۃ صک ۹۴

می نمایم کہ آں طریقۂ توسّط بتعلیم یافتگان از من حاصل شود، لیکن حسبِ مُرادِ من ہیچ یکے از ایشاں تعلیم قبول نمی کنند، یا راہِ افراط می روند یا تفریط می کنند۔

ہر چند کوشش کرتا ہُوں کہ ان لوگوں کو، جنھوں نے مجھ سے تعلیم حاصل کی ہے، وُہ راستہ حاصل ہو، لیکن میرے منشاء کے مطابق اُن میں سے کوئی وُہ تعلیم قبول نہیں کرتا یا افراط کے راستے پر چلتے ہیں یا تفریط کرنے لگتے ہیں۔

عالی ہمتی مولوی سید جعفر علی صاحب لکھتے ہیں:

"ہیچکس از صدہا سال باین ہمتِ عالیہ مخلوق نشد"

صدیوں سے ایسا عالی ہمت پیدا نہیں ہُوا

آگے چل کر فرماتے ہیں:

"نقل است کہ حکیم مہدی نائب سلطانِ لکھنؤ کہ باوجودِ مذہبِ تشیع در فہم و فراست در اُمورِ دنیا و قدر شناسیِ اہلِ فضل و کمال یکتائے روزگار بُود، چوں بعضے غزواتِ آنجناب شنیدہ از راہِ عقل و انصاف گفت کہ آنچہ وسعتِ حوصلہ و ہمّتِ عالیِ ایں سیّد ست از ما و از سلطانِ ما صورتِ امکان ندارد باآنکہ ما مالکِ مُلکِ عظیم ایم و اُو رئیسِ یک دیہ ہم نیست۔[1]

منقول ہے کہ اودھ کے نائب السلطنت حکیم مہدی جو تشیع کے باوجود دُنیاوی فہم و فراست اور اہلِ فضل و کمال کی قدر شناسی میں یکتائے روزگار تھے، سیّد صاحب کی بعض جنگوں کے واقعات سُن کر از راہِ عقل و انصاف ایک دن کہنے لگے کہ اس سیّد کی سی بلند حوصلگی اور عالی ہمتی تو ہم سے اور ہمارے بادشاہ (شاہِ اودھ) سے بھی ممکن نہیں، حالانکہ ہم ایک بڑی سلطنت کے مالک ہیں اور وُہ ایک دیہات کے بھی رئیس نہیں۔

مولوی صاحب موصوف یہ بھی فرماتے ہیں:

حسن علی خاں، خانِ مقامِ سچون دُرہ بھوگڑمنگ کہ از درہ ہائے مُلکِ پکھلی است، چوں ابتدائے نامِ حضرت امام، و مجتمع شدنِ ناس برائے جہاد می شنید، می گفت کہ ایں سلطان و ایں لشکر چنانست کہ

حسن علی خاں نے، جو سچوں، درۂ بھوگڑمنگ (ملکِ پکھلی) کے خان و رئیس تھے، جب شروع شروع میں سیّد صاحب کا نام سُنا اور معلوم ہُوا کہ لوگ جہاد کے لیے اُن کے پاس جمع ہوئے ہیں تو وُہ یوں کہتے تھے کہ اس بادشاہ اور لشکر کی

---

[1] منظورۃ السعداء فی احوال الغزاۃ والشہداء (قلمی) از مولوی سیّد جعفر علی بستوی۔

طفلاں از نوعے بازی دلہو در خود سُلطانے مقرر می کنند و لشکرے از طفلاں برائے او مُہیّا می سازند۔ تا وقتیکہ شرفِ ملازمتِ آنحضرت نہ دریافتہ، جُز ایں سُخنے دیگر نمی گفت۔

مثال ایسی ہے کہ بچے کسی کو اپنے میں سے بادشاہ بنالیں اور اُس کے لیے بچوں کا ایک لشکر تیار کریں، جب تک سیّد صاحب کی خدمت میں اُن کو باریابی حاصل نہیں ہُوئی، وہ اسی طرح باتیں کرتے تھے۔

وقتیکہ مولانا محمد اسمٰعیل با لشکرِ خود از سچون بہ بالاکوٹ رفتند و دائرہ حشمتِ حضرتِ امیر المومنین در سچون رسید، ہماں حسن علی خاں بملاحظہ جمالِ جہان آرائے حضرتِ امیر المومنین با یارانِ خود گفت کہ از ناصیۂ ایں امامِ ہمام چناں مفہوم می شود کہ اگر ارادۂ تسخیرِ ہفت اقلیم خواہد نمود عالمے زیرِ نگین او استقرار خواہد گرفت۔ و من بعد چوں در مجلسِ وعظِ آنجناب نشست، از غایتِ گریہ کہ در نصائحِ آنجناب در دلش اثرے پیدا کرد، تمام لحیۂ اش از اشک تر گردید[۱]

جب مولانا محمد اسمٰعیل اپنے لشکر کے ساتھ سچون سے بالاکوٹ تشریف لے گئے اور سیّد صاحب نے سچون میں نزولِ اجلال فرمایا، وُہی حسن علی خاں آپ کو دیکھ کر اپنے دوستوں سے کہنے لگے کہ اس سردار کی پیشانی سے تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ اگر ہفت اقلیم کو مُسخّر کرنے کا ارادہ کرے، تو ایک عالم کو زیر کرلے۔ اس کے بعد جب مجلسِ وعظ میں انھوں نے شرکت کی، تو سیّد صاحب کی نصیحتیں سُن کر شدّتِ گریہ سے یہ حال ہُوا کہ ڈاڑھی آنسوؤں سے تر ہوگئی۔

سخاوت و دریا دلی اللہ تبارک و تعالیٰ جب اپنے کسی بندے کو شرحِ صدر کی دولت سے نوازتا ہے اور "قُلْ مَتَاعُ الدُّنْيَا قَلِيلٌ" کی حقیقت اس پر منکشف فرما دیتا ہے، تو اِس متاعِ قلیل کے کسی جُز کو، جو اقلِّ قلیل ہے، وہ کبھی خاطر میں نہیں لاتا۔ اس دُنیا کی بڑی سی بڑی دولت اور نایاب سے نایاب تحفہ اُس کی نگاہ میں نہیں جچتا۔ بڑی سی بڑی چیز کے دے دینے میں اُس کو کبھی تامّل نہیں ہوتا۔ دیکھنے والوں کو اس سے استعجاب ہوتا ہے، مگر اُس کو اُن کے استعجاب پر استعجاب ہوتا ہے۔

نواب وزیر الدولہ مرحوم، جو خود والیِ ریاست تھے، اپنا تاثّر ان لفظوں میں ظاہر کرتے ہیں:

---

[۱] منظورۃ السعداء

"آپ نہایت درجہ سیر چشم، دریا دل اور شاہانہ مزاج کے انسان تھے طبیعت بیحد مستغنی اور بے نیاز تھی۔ دُنیا کی دولت کو نگاہ اُٹھا کر نہ دیکھتے اور خزائنِ شاہی کو خاطر میں نہ لاتے۔"

آپ اپنا ہاتھ ہمیشہ اُونچا رکھتے۔ اُمرا، اور والیانِ ریاست کا عُلما، ومشائخ اور شرفا وسادات کو تحفہ دینے کا دستور ہے، مگر آپ نے خود اُمرا، اور والیانِ ریاست کو تحفہ دیا۔ لکھنؤ سے رُخصت کے وقت آپ نے ایک عمدہ گھوڑی، جو بہت بلند اور قدآور تھی، جس پر آپ اُس وقت سوار تھے نواب معتمد الدولہ آغا میر نائب السلطنت اودھ کو (جس کی داد و دہش کی دُنیا میں دُھوم تھی) بچّے سمیت تحفے کے طور پر دی۔ نواب صاحب نے بہت عُذر کیا اور کہا کہ تین چار گھوڑے خود ہمارے اصطبل میں سے پسند فرما کر ہماری طرف سے قبول کیجیے۔ آپ نے فرمایا: نہیں، یہ گھوڑی تو آپ کو قبول کرنی ہوگی۔[1]

پائندہ خاں والیِ ریاستِ امب سے ملاقات ہُوئی، تو آپ نے اُس کو ایک دستار، ایک بہت بھاری ضرب توپ اور ایک ہاتھی عنایت فرمایا۔ سفرِ حج سے واپسی پر دیوان غلام مرتضیٰ نے ایک رُومی بندوق پیش کش کی تھی جس میں سات دیدبان تھے۔ دیدبانوں کا حساب یہ تھا کہ ہر دیدبان سے دو سَو قدم فاصلہ بڑھ جاتا تھا۔ چنانچہ ساتویں دیدبان سے ایک ہزار چار سَو قدم کا فاصلہ ہوتا تھا۔ آپ نے یہ بندوق یار محمد خاں دُرّانی والیِ پشاور کو عطا فرما دی۔[2]

سُنّتِ نبوی کے مطابق کبھی سوال کا رد کرنا تو آپ کے اصول کے بالکل خلاف تھا۔ کوئی شخص بیش قیمت سے بیش قیمت چیز کا سوال کر لیتا اور آپ کو کیسی ہی ضرورت ہوتی، کبھی اُس کی درخواست نامنظور نہ فرماتے اور وہ چیز اس کو ضرور عطا فرما دیتے۔

مولوی سیّد جعفر علی شیخ فرزند علی غازی پوری کے حوالے سے روایت کرتے ہیں کہ ایک روز شیخ غلام علی رئیسِ الہ آباد نے ایک تلوار پیش کی اور عرض کیا کہ ایسی بیش قیمت تلوار نواب لکھنؤ کے

---

[1] سیرتِ سیّد احمد شہیدؒ، جلد اوّل ص ۱۹۲ [2] ایضاً ص ۳۳۸

سلاح خانے میں بھی نہیں ہے۔ آپ نے اُس کو ملاحظہ فرمایا اور حاضرینِ مجلس نے بھی باری باری اُس کو دیکھا اور ہر ایک نے اُس کی بےحد تعریف کی۔ رامپور کے ایک پٹھان کھڑے تھے۔ انھوں نے کہا کہ حضرت، یہ تلوار مجھے عنایت ہو۔ آپ نے بلا تامّل اُن کو عنایت فرما دی۔ لوگوں کو بڑا تعجب ہوا۔[1]

سخاوت و دریا دلی کا یہ معاملہ صرف دوستوں کے ساتھ نہ تھا، بلکہ جو ہمیشہ مخالفت و عداوت میں سرگرم رہے اور ایذا رسانی اور بیخ کنی کے درپے رہے، اُن کے ساتھ بھی یہی عنایت و الطاف تھے۔

پشاور میں جب سردار سلطان محمد خاں سے ملاقات ہوئی، تو آپ نے سردار موصوف سے فرمایا کہ خان بھائی، تم نے جو ارباب فیض اللہ خاں کی زبانی چالیس ہزار روپے خرچ کے واسطے دینے کا وعدہ کیا تھا، تو اب اُس کی فکر نہ کیجیے گا، ہم نے آپ کو معاف کیے، کیونکہ ہمارے پروردگار کے یہاں کسی بات کی کچھ کمی نہیں ہے۔ آپ ہمارے بھائی ہیں۔ آپ سے کسی طرح کا جرمانہ یا تاوان لینا ہم کو منظور نہیں ہے۔

شجاعت اور اعتماد علی اللہ آپ کی شجاعت اور اللہ تعالیٰ کی نصرت پر اعتماد و توکّل اور بےخوفی کے واقعات بہت ہیں۔ ان میں سے صرف ایک واقعہ مولوی سیّد جعفر علی نقوی صاحب منظورۃ السعداء کی زبانی نقل کیا جاتا ہے:

"مہیار کی جنگ میں دُرّانی بارہ ہزار سے زائد کی تعداد میں میدان میں آئے۔ انھوں نے دو توپوں اور پیادوں کے لشکر کا رُخ قلعۂ مہیار کی طرف، جو مجاہدین کے قبضے میں تھا، کر دیا اور دو بڑی توپوں کو لشکرِ مجاہدین کی طرف سر کرنا شروع کیا۔ مجاہدین کے ہاتھ میں سوائے چند زنبورکوں کے ایک توپ بھی نہ تھی۔ اکثر توپیں اسپ میں اور بعض پنجتار میں تھیں۔ اکثر آدمیوں نے حضرت سے توپوں کے منگوانے کے متعلق عرض کیا، حضرت نے فرمایا کہ ہم کو اللہ کی فتح و نصرت پر اعتماد ہے، توپوں اور زنبورکوں پر نہیں؛ وَمَا النَّصْرُ اِلَّا مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ الْعَزِيْزِ الْحَكِيْمِ۔ اس وقت

---

[1] منظورۃ السعداء

کم و بیش پانسو سوار آپ کے ہمرکاب تھے اور تین ہزار کے قریب پیادے۔ مخالفین کے لشکر میں لوگوں کے تخمینے کے مطابق آٹھ ہزار سوار تھے۔ اُس وقت مشورہ یُوں ہُوا کہ اپنے سواروں کو، جو بہت قلیل ہیں، اُن کے سواروں کے مقابل کرنا مناسب نہیں، اگرچہ اپنے پیادے بھی اُن کے پیادوں کے مقابلے میں بہت کم ہیں، لیکن ہندوستانی پیادے بڑی ثابت قدمی دکھاتے ہیں۔ پھر یہ غازیوں کا لشکر ہے اور غازی جان دینے میں دریغ نہیں کرتے۔ اس لیے حضرت نے سواروں کو تاکیدِ شدید کی کہ پیادوں کے پیچھے رہیں۔ آپ خود اپنے گھوڑے پر سوار ہو کر پیادوں کے گروہ میں تشریف لے گئے، جن کی صف مہیار کے باغیچے کے قریب پہنچ گئی تھی۔ کالے خاں رامپوری، جن کے ذِمّے صف آرائی کی خدمت تھی، توپ کے گولے سے شہید ہو گئے۔ چند اَور غازی بھی شہادت سے سرخرُو ہُوئے۔ آپ نے پہلے پیادوں کی صف میں کھڑے ہو کر کچھ وصیّت کے طَور پر فرمایا کہ بھائیو، تم دشمن کے پیچھے ہرگز نہ دَوڑنا، دَوڑنے کو اپنے اُوپر حرام سمجھو۔ چونکہ قریب ہی فاصلے میں دَوڑنے والے کے ہاتھ پاؤں پُھول جاتے ہیں اور ہانپنے لگتا ہے، اس لیے کسی کام کے قابل نہیں رہتا۔ ہاں، پُھرتی کے ساتھ پیدل ہی ان توپوں کی طرف بڑھو اور پھر مددِ الٰہی کا تماشا دیکھو۔ یاد رکھو، اگر صف سیدھی رہے گی اور انتشار پیدا نہیں ہوگا، توپ کے ایک گولے سے ایک ہی آدمی مرے گا۔ ایک سے زائد کو نقصان نہیں پہنچے گا۔ اُس وقت آپ گھوڑے پر سوار صف کے آگے آگے توپ کی طرف بڑھ رہے تھے۔ ہمراہیوں میں سے ایک شخص نے گھوڑے کی لگام تھام کر عرض کیا کہ چونکہ پیادوں کی صف میں ایک اکیلا سوار دُور سے امیر معلوم ہوتا ہے، اس لیے گولہ انداز اسی کو تاک کر گولے کا نشانہ بناتا ہے۔ مناسب ہے کہ آنجناب اس وقت پیادہ ہو جائیں۔ آپ نے اس مشورے کو قبول کیا اور گھوڑے سے اُتر آئے اور پیادہ پا شیرِ ژیاں کی طرح توپ کی طرف بڑھے اور قرابینوں اور بندوقوں کے چھوٹنے کا اُس وقت تک حُکم نہیں دیا جب تک کہ مخالفین کی ایک توپ تختے کے اُوپر سے گر نہیں گئی۔ اس وقت لشکرِ اسلام آہستہ آہستہ تکبیر کہہ رہا تھا۔ امان اللہ خاں لکھنوی بلند آواز سے جنگ پر اُبھار رہے تھے اور غیرتِ ایمانی میں ڈوبے ہُوئے جوشِ آفریں کلمات زبان سے کہہ رہے تھے۔ ریاست علی موہانی، جو منشی خانے میں

تھے، مولوی خرّم علی صاحب کے رسالۂ جہادیہ کے اشعار پڑھ رہے تھے۔ اُن میں سے دو شعر یہ ہیں:

آج گر اپنی خوشی جان خدا کو دو گے		کل تو پھر شوق سے جنّت کے مزے لُوٹو گے

سر ٹپک پیر رگڑ گھر میں کا مرنا بہتر؟		یا رہِ حق میں فدا جان کا کرنا بہتر؟

جب آپ اپنے تمام ہمراہیوں کے ساتھ توپ کے اتنے قریب پہنچے کہ بندوق کام کر سکتی تھی: گولہ انداز نے توپ چلانا موقوف کی اور ایک دو شمانچے، جن کو انگریزی میں گراپ کہتے ہیں، سر کیے۔ الحمدللہ جس طرح گولے اُوپر اُوپر سے نکل جاتے تھے، اسی طرح گراپ پاؤں کے سامنے گرے اور ایک دو کے سوائے کوئی زخمی نہیں ہُوا جس وقت فاصلہ اس سے بھی قریب رہ گیا، گولہ انداز توپ چھوڑ کر بھاگ کھڑے ہُوئے اور ہزاروں سواروں نے اس طرف حملہ کر دیا۔ اُس وقت آپ بھی دو بندوقیں، جو ایک ایک خادم کے ہاتھ میں تھیں، سر کرتے جاتے تھے اور قرابین بازوں اور تفنگچیوں کو بھی حکم دے رہے تھے۔ بندوقوں اور قرابین کی گولیوں سے دشمن کے سوار متفرق ہو گئے۔ دونوں لشکروں کے درمیان گھوڑوں اور سواروں کی لاشیں اس طرح پڑی ہُوئی تھیں کہ میدان میں چلنا مشکل تھا۔ آناً فاناً میدان صاف ہو گیا اور دونوں توپیں مجاہدین کے قبضے میں آگئیں۔"

عفو و حلم | اسی شجاعت و قوت کے ساتھ عفو و حلم، تحمل و برداشت اور عالی ظرفی کی بھی حیرت انگیز مثالیں ملتی ہیں، جن سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ ساری شجاعت و قوت اور شدّت اہلِ کفر و نفاق اور اسلام کو نقصان پہنچانے والوں کے ساتھ تھی۔ ذاتی طور پر تکلیف دینے والوں اور قصور وار مسلمانوں کے ساتھ سراسر عفو و حلم اور معافی و درگزر کا معاملہ تھا۔ کثیر التعداد واقعات میں سے چند واقعات ذکر کیے جاتے ہیں:

"پیر داد خاں باشندہ لوہانی پور کی گائے حضرت کے خربوزے کے کھیت میں چلی گئی اور بہت نقصان کیا۔ چوکیداروں نے اُس گائے کو دَوڑا کر پیر داد خاں کے گھر پہنچا دیا۔ گائے دَوڑنے کی وجہ سے بہت سُست ہو گئی۔ پیر داد خاں نے بہت غصّہ کیا اور آپ کے پاس آکر بیٹھ گئے۔ چند اور شرفار بھی وہاں موجود تھے۔ اس وقت ایک بہت خوش رنگ اور عمدہ خربوزہ، جو فصل کا پہلا پھل تھا، اور

تین آم، جو موسم کے ابتدائی پھل تھے، رکھے ہوئے تھے۔ آپ نے بڑی مہربانی اور شفقت کے ساتھ اُن میں سے ایک آم میاں شیخ امان اللہ رائے بریلوی کو، جو ایک بزرگ آدمی تھے، عطا فرمایا اور دُوسرا آم دُوسرے صاحب کو دیا اور خربوزہ پیر داد خاں کو عنایت فرمایا۔ اُن دونوں بزرگوں نے تو تبرّکاً وُہ پھل لے لیے، لیکن پیر داد خاں نے وُہ خربوزہ وہیں آپ کے سامنے ڈال دیا اور کہا کہ مَیں نہیں لیتا۔ میاں شیخ امان اللہ کہنے لگے کہ یہ حضرت کا عطیہ ہے اور تمھارے لیے مُوجبِ برکت ہے، اس کو واپس نہیں کرنا چاہیے۔ وہ زیادہ غصّے میں آکر کہنے لگے کہ ہمارے لیے مُوجبِ برکت نہیں، موجبِ حرکت ہے اور بُرا بھلا کہنا شروع کر دیا اور بے ادبی اور گستاخی میں حد سے بڑھ گئے۔ آپ نے بڑی عاجزی اور انکسار سے معذرت کی اور فرمایا کہ مَیں فصل رکھانے والوں کو تنبیہ کروں گا۔ انھوں نے بہت بُرا کیا کہ تھارے جانور کو تکلیف دی۔ اگر وہ جانور مر جاتا، تو ہم تم کو اُس کے عوض میں اُس سے اچھا جانور دیتے۔ اِتنا رنج نہ کرو۔ سیّد عبدالرحمٰن، جو اِس قصّے کے راوی ہیں، فرماتے ہیں کہ مَیں ایک کام سے بازار گیا ہُوا تھا۔ واپس آیا، تو کیا دیکھتا ہُوں کہ غلام رسُول خاں، جو آپ کے گھوڑوں کی دیکھ بھال پر مقرر تھے اور ذی عزّت آدمی تھے، غصّے کے مارے رو رہے ہیں۔ مَیں نے پوچھا: خاں صاحب، خیریت ہے؟ انھوں نے کہا کہ عجب قِصّہ ہے۔ اس بدتمیز آدمی نے حضرت کی شان میں گستاخی کی اور غیر مُہذّب الفاظ زبان سے نکالے اور حد سے بڑھ گیا۔ مَیں نے چاہا کہ اُس کو ڈانٹ دُوں اور اُس کو اس بدتمیزی سے باز رکھوں۔ حضرت تو انتہا درجے کے بُردبار ہیں، انھوں نے مجھے ڈانٹ دیا اور فرمایا کہ یہاں سے چلے جاؤ۔ مَیں آپ کے حکم کی تعمیل میں باہر آگیا۔ میاں امان اللہ نے پیر داد خاں کو بہت سمجھایا کہ اس قدر بے تمیزی اور بدلگامی شرفا کی شان کے خلاف ہے۔ پیر داد خاں اپنے گھر چلے گئے۔ سیّد عَلَمُ الھُدیٰ اور سیّد فخر الدین، جو آپ کے بھائی بند تھے، غصّے سے بھرے ہُوئے آئے اور کہا کہ ہم اس بدتمیز کی مرمّت کریں گے۔ آپ نے فرمایا: خاموش رہو، ایسا نہیں چاہیے، نہیں تو اُس کی جُمعہ جماعت ترک ہو جائے گی، صبر کرو۔ سیّد عبدالرحمٰن کہتے ہیں کہ مَیں بھی غصّے سے بے قابُو ہو گیا۔ میں نے بھی آگے عرض کیا کہ یہ نالائق ایسی بدتمیزی کر کے یہاں سے سلامت چلا گیا۔ افسوس کہ مَیں

موجود نہ تھا! آپ نے اُن کو بھی ملامت کی اور کہا: تم بچّے ہو، تم کیا جانو؟ اگر اُس سے جمعہ وجماعت فوت ہو جائے گی، تو اُس کے حق میں بڑی قباحت ہوگی۔ اس کے بعد آپ تیار ہُوئے کہ مَیں خود معذرت کے لیے خاں صاحب کے پاس جاؤں گا۔ آپ کا معمول تھا کہ بڑی بہن سے ملنے کے لیے قلعے تشریف لے جایا کرتے تھے۔ آپ گھوڑے پر سوار ہُوئے اور لوگ آپ کے ساتھ چلے۔ بہن سے مِل کر آپ لوہانی پور خاں صاحب کے دروازے پر آئے۔ وہ آپ کی سواری دیکھ کر گھر میں گُھس گئے۔ آپ گھوڑے سے اُتر کر دروازے پر بیٹھ گئے اور فرمایا: آج خاں صاحب سے خطا معاف کرائے بغیر نہیں جاؤں گا۔ خاں صاحب گھر سے باہر نہیں آتے تھے یہاں تک کہ گاؤں کے رَوسا، و اشراف جمع ہو گئے۔ اُن کو بڑی ملامت کی اور اُن کا ہاتھ پکڑ کر سیّد صاحبؒ کے پاس کھینچ کر لے آئے۔ آپ اُن سے بغلگیر ہُوئے اور اُن سے معافی چاہی اور فرمایا کہ اگر تمھاری گائے مر جاتی، تو ہم تمھیں اُس سے اچھی دیتے پھر آپ نے اُن کی ایسی دلجوئی اور خاطر داری کی کہ اُن کو راضی کر کے گھر واپس ہُوئے۔ پیر داد خاں کے چھوٹے بھائی نُور داد خاں آپ کی یہ عاجزی اور انکسار اور بھائی کا یہ غرور و تکبّر دیکھ کر بھائی سے جُدا ہو گیا اور گھر بار چھوڑ کر آپ کے ساتھ ہو گیا یہاں تک کہ بالاکوٹ میں آپ کے ساتھ شربتِ شہادت نوش کیا۔[1]

مولوی سیّد جعفر علی ایک دُوسرا واقعہ سیّد عبدُالرحمٰن اور سیّد زین العابدین کی زبانی نقل کرتے ہیں کہ سفرِ حج میں آپ کے ساتھ مولوی نصیر الدین اور شیخ نجم الدین پھکیت ساکنانِ لکھنؤ کے بھائی امام الدین بھی ہمراہ تھے۔ آپ اُن کی بڑی مراعات فرماتے تھے اور اُن کو بھی ابتدا میں آپ کے ساتھ اعلیٰ درجے کی ارادتمندی اور عقیدت تھی لیکن مکّہ معظّمہ پہنچ کر بعض کج طبیعت لوگوں کے اِغوا سے آپ کی طرف سے طبیعت میں بے اعتقادی اور مخالفت پیدا ہو گئی۔ ایک روز آپ اپنی قیامگاہ پر تشریف رکھتے تھے کہ حاجی عبدالرحیم (ولایتی) کے رفیق حاجی عمرؔ جو بڑے صالح وسعید، عابد و زاہد، مُتّقی بزرگ تھے، آپ کی مُلاقات کو آئے۔ آپ نے اُن کی بڑی عزّت و توقیر فرمائی اور فرمایا کہ اِن

---

[1] منظورۃ السُّعداء

جیسے آدمیوں سے ملائکہ کو بھی لحاظ آتا ہے اور ایسے ہی آدمی ہوتے ہیں جو فرشتوں پر بھی فضیلت رکھتے ہیں۔ یہ سُن کر امام الدین کو غصّہ آگیا اور انھوں نے برملا کہا کہ آپ جھوٹ کہتے ہیں۔ آپ نے انتہائی ملائمت سے فرمایا کہ بھائی، غلط نہیں ہے۔ اللّٰہ کے بندوں میں بعض خاص الخاص بندے خواصِ ملائکہ پر شرف رکھتے ہیں۔ آپ جس قدر نرمی اور آہستگی کے ساتھ یہ فرماتے، امام الدین اسی قدر غصّے اور درشتی کے ساتھ آپ کو جواب دیتے اور بدتمیزی سے پیش آتے۔ رامپور کے ایک شخص حافظِ نابینا، جو سیّد صاحب سے بداعتقاد تھے اور کبھی کبھی کہتے تھے کہ آپ سخت دُنیادار ہیں، پاس سے گزر رہے تھے۔ یہ منظر دیکھ کر اپنے دل میں پشیمان ہوئے اور آپ کے حِلم و بُردباری اور بزرگی کے قائل ہوگئے اور دُوسرے روز انھوں نے حطیم میں آپ سے بڑی معذرت کی اور اپنی غلطی سے تائب ہو کر بیعت کی اور مُخلصینِ صادقین کے گروہ میں شامل ہوگئے۔"

تیسرا واقعہ یہ ہے کہ سفرِ حج سے واپسی پر آپ موضع ڈگھاہیں، جو عظیم آباد کے قریب ہے، اپنے ایک مُرید بااخلاص شیخ جان کے مکان پر مقیم تھے کہ آپ نے ایک شخص سے فرمایا کہ مکان کے باہر ایک شخص مسلّح چکّر لگا رہا ہے، اس کو میرے پاس لاؤ۔ جب وُہ شخص آپ کے سامنے لایا گیا، آپ نے مکان خالی کروا دیا۔ سب لوگ باہر چلے گئے، لیکن ایک شخص، جو حقیقتہً جاگ رہا تھا، بظاہر سوتا دکھائی دیتا تھا۔ وُہ سب حال دیکھتا رہا[1]۔ اس وقت آپ کے پاس کوئی ہتھیار نہ تھا۔ جب سب لوگ باہر چلے گئے، تو آپ نے اُس سے کہا کہ تم جس کام کے لیے آئے ہو، اُس میں کیوں دیر کرتے ہو؟ آپ کے یہ فرماتے ہی اُس کے جسم میں رعشہ پڑ گیا اور وُہ بدحواس ہوگیا۔ آپ نے پھر فرمایا کہ مَیں نے اسی لیے تنہائی کرائی ہے کہ تم اپنا کام پُورا کر لو، ڈرو نہیں اور یہ شک نہ کرو کہ شاید یہ کوئی دُوسرا آدمی ہو۔ مَیں وُہی شخص ہُوں، جس کے لیے تم آئے ہو۔ اُس شخص نے اپنے تمام ہتھیار اُتار کر آپ کے سامنے رکھ دیے اور عرض کیا کہ یہ سب حضُور کی نذر ہیں۔ مَیں اپنے فعل سے توبہ کرتا ہوں۔ اس کے بعد اُس نے بیان کیا کہ

---

[1] سید جعفر علی صاحب کہتے ہیں کہ وہ سونے والے یا تو میاں صلاح الدین پھلتی تھے یا آپ کے خادم میاں دین محمّد تھے۔ میاں دین محمّد نے بھی اس حکایت کی تصدیق کی ہے۔

فلاں شخص نے مجھے پانچ سو روپے آپ کو شہید کرنے کے لیے دیے ہیں اور میں مال کے لالچ اور شیطان کے فریب میں آکر اس حرکت پر آمادہ ہو گیا اور یہاں تک پہنچا۔ اللہ تعالیٰ معاف فرمائے اور آپ بھی درگزر کریں۔ اس کے بعد اُس نے بیعت کی۔ آپ نے اُس کے سارے ہتھیار واپس کر دیے اور پانچ روپے اُوپر سے دیے اور اُن پانچ روپوں میں سے ایک روپے کو الگ کر کے فرمایا کہ یہ چار تو اپنی ضروریات میں خرچ کرنا اور اس ایک کو محفوظ رکھنا اور کسی کی نوکری کبھی نہ کرنا۔ انشاء اللہ تعالیٰ تم زندگی بھر کسی کے محتاج نہ رہو گے اور ہمیشہ خوشحال رہو گے۔"

ایک دُوسرا واقعہ بھی اسی طرح کا ہے کہ تکیے پر بھی ایک شخص اسی ارادے سے آیا۔ نمازِ عصر کے بعد آپ کا معمول تھا کہ سئی ندی کے کنارے تشریف لے جاتے اور دونوں پاؤں پانی میں لٹکا کر بیٹھ جاتے۔ وہ شخص تلوار کھینچ کر آپ کی طرف دوڑا۔ اُس وقت اور لوگ بھی تھے۔ کسی نے اُس کی تلوار پکڑی اور کسی نے اُس کو پکڑا، بلکہ کسی کا ہاتھ بھی تلوار پکڑنے سے زخمی ہو گیا۔ بعض آدمیوں نے اُس کو مارنے پیٹنے کا بھی ارادہ کیا۔ حاجی نور محمد دُرّانی نے اُس کی گردن پکڑ لی۔ قریب تھا کہ اُس کا گلا گھٹ جائے۔ آپ بڑی شفقت کے ساتھ تیزی سے اپنی جگہ سے اُٹھے، لوگوں کو منع کیا اور فرمایا کہ ہم اس شخص کو بند رکھیں گے، تم چھوڑ دو۔ لوگوں نے تعمیلِ ارشاد میں چھوڑ دیا اس خیال سے کہ میں اگر اُس کو معاف بھی کر دُوں گا، تو شاید حاکم نہ چھوڑے۔ آپ نے اُس کو درشن سنگھ کے پاس، جو رائے بریلی میں نواب کی طرف سے مقرر تھا، بھیجا اور پیغام دیا کہ ہم نے اس کی خطا معاف کر دی ہے، آپ بھی اُس کی خطا معاف کریں اور چھوڑ دیں۔

میاں دین محمد کہتے ہیں کہ درشن سنگھ نے اُس کو دو روز قید میں رکھا اور پھر اُس کو آپ کے پاس بھیج دیا اور کہا یہ شخص آپ کا قصوروار ہے۔ آپ جو چاہیں، کریں۔ آپ نے اُس کو تکیے پر ٹھیرا لیا اور سیر بھر گوشت اور پاؤ بھر گھی اور دُوسری اجناس اُس کے لیے مقرر کر دیں۔ چنانچہ وہ کچھ مدّت تک تکیے پر مقیم رہا۔ کبھی کبھی اپنے ہاتھ کا پکایا کھانا بھی آپ کی خدمت میں بھیجتا تھا۔ جب اُس نے آپ سے رخصت چاہی، تو آپ نے اُس کو کچھ عطا بھی کیا۔

مولوی سیّد جعفر علی اسی طرح کا ایک اور واقعہ بیان کرتے ہیں۔ سدو خاں دُرّانی سید محمد خاں شہید کے ساتھ سمہ کی بعض جنگوں میں شریک تھا۔ فتح کے بعد جب لشکر نے مالِ غنیمت جمع کیا، تو سونے چاندی کے کچھ زیورات، مروارید، دو ٹوٹی پھوٹی بندوقیں اور ایک زنگ آلود تلوار اُس کے ہاتھ بھی لگی تھی۔ اُس نے مجاہدین کی فہمائش کے باوجود یہ مال مالِ غنیمت میں شامل نہ کیا۔ لوگوں نے کہا بھی کہ تقسیم شرعی سے پہلے مالِ غنیمت پر قبضہ کر لینے کی سزا دُنیا میں عار اور آخرت میں نار ہے لیکن اس نے کچھ پروا نہ کی، بلکہ سیّد صاحب کی شان میں گستاخانہ الفاظ کہے اور وہاں سے بھاگ کر سیّد صاحبؒ کے پاس چلا گیا۔ بعض مخلصین نے عریضے کے ذریعے سیّد صاحبؒ کو اطلاع بھی کر دی۔ قلعۂ امب کے بُرج پر آپ ایک جماعت کے ساتھ تشریف رکھتے تھے۔ دوپہر کو جب مجلس برخاست ہوئی، تو آپ نے سدو خاں کو طلب فرمایا اور ارشاد ہُوا کہ تم مالِ غنیمت میں سے جو کچھ لے کر آئے ہو، یہاں لے آؤ۔ اُس نے سب زیورات تھیلی سے نکال کر سامنے رکھ دیے۔ آپ نے ان زیورات کو ملاحظہ بھی نہیں فرمایا اور ارشاد فرمایا کہ یہ چیزیں عورتوں کے قابل ہیں، ہمارے لائق نہیں۔ جاؤ اِن کو اپنے سے علیحدہ کرو اور فروخت کر ڈالو۔ ہتھیار کو دیکھ کر فرمایا کہ ہاں، یہ مردِ میدان کے ہتھیار ہیں یہ مجاہدین کے کام کے ہیں۔ اس کے بعد سدو خاں سے مخاطب ہو کر فرمایا کہ سدّو خاں، سچ کہنا، تم نے یہ کہا تھا کہ میں اپنی دُرّانی قوم کے پاس سے بھاگ کر آیا ہوں۔ اگر اس سیّد کے سینے پر ایک نیزہ مار کر اُس کو شہید کر کے واپس چلا جاؤں، تو وہ مجھے ہاتھوں ہاتھ لیں گے اور میری بڑی قدر ہو گی۔ اگر یُونہی خالی ہاتھ گیا، تو کون میری بات پوچھے گا؟ سدو خاں نے شرم سے سر جھکا دیا اور کہنے لگا کہ لوگوں نے مجھے تنگ کیا، تو میری زبان سے ایسے لفظ نکل گئے، مَیں خطاوار ہُوں۔ آپ نے فرمایا کہ مَیں تمھیں اپنے سے زیادہ بہادر اور جوانمرد نہیں سمجھتا کہ تم میرے مقابلے میں آسکو، لیکن ایسے لشکر میں جس کے سردار قاضی حبّان تھے، تمھیں ایسے لفظ کہنا بہت نا روا تھا۔ اگر یہ بات قاضی صاحب کے کان میں پڑ جاتی، تو تمھیں زندہ نہ چھوڑتے۔ یہ تم نے اچھا کیا کہ میرے پاس آ گئے۔ یہاں جو جی میں آئے، کہو۔ انتقام تو انتقام، مجھے اس کی پروا بھی نہیں، لیکن سواروں کے لشکر میں کبھی نہ جانا، ورنہ ایسی باتوں

سے تمہاری جان چلی جائے گی۔

یہ معاملہ صرف قصور وار اور بداندیش مسلمانوں کے ساتھ نہ تھا، بلکہ غیر مسلم اسیروں اور آنے جانے والوں کے ساتھ بھی مراعات و خاطرداری کا معاملہ تھا۔ وقایع احمدی میں ہے:

رنجیت سنگھ کے لشکر کے دو سکھ حضرت کے پاس آئے۔ آپ نے اُن سے آنے کا سبب پوچھا۔ انھوں نے عرض کیا کہ صرف آپ کی ملاقات کو آئے ہیں۔ آپ نے فرمایا: خیر، تم ہمارے مہمان ہو جب تک چاہو، رہو۔ اُن کے واسطے آپ نے اپنے یہاں سے غلّہ مقرر کر دیا۔ ہر روز نمازِ فجر و عصر کے بعد وہ دو چار گھڑی بیٹھتے۔ انھوں نے ایک روز عرض کیا کہ ہم نے آپ کی باتیں خوب سُنیں اور جو کچھ آپ کے اخلاق و اوصاف کے متعلق سُنا تھا، اُس سے بڑھ کر پایا۔ آپ کا طریقہ اور دین ہم کو پسند آیا۔ ہم کو بھی دین اور طریق کی تعلیم کریں۔ حضرت یہ بات سُن کر بہت خوش ہوئے۔ اُن کو کلمۂ شہادت پڑھایا اور اُن کے نام عبدالرحمٰن اور عبدالرحیم رکھے۔ غازیوں نے اُن کو کپڑے دیے۔ بعد میں اُنھوں نے سُنایا کہ لہنا سنگھ نے اُن کو تحقیقِ حال کے لیے بھیجا تھا۔ پھر وہ چلے گئے۔

جاسوسوں اور غیر مسلم قیدیوں اور زخمیوں کے ساتھ آپ کی شفقت و مراعات کے واقعات بابِ چہارُم میں گزر چکے ہیں۔ مخالف اور دشمن کے ساتھ عفو و درگزر اور احسان و عنایت اور نہ صرف جان بخشی، بلکہ مُلک بخشی کی جو مثال آپ نے سُلطان محمد خان سردارِ پشاور کے معاملے میں پیش کی ہے وہ للّٰہیّت و اخلاصِ کامل، بے نفسی اور دریا دلی کی ایسی مثال ہے، جس کی نظیر تاریخ میں آسانی سے نہیں مل سکتی۔ آپ کی تقریر، جو ارباب بہرام خاں کی گفتگو کے جواب میں کی تھی، ناظرین کی نظر سے گزر چکی ہے۔ آپ نے آخر میں فرمایا تھا کہ "سردار سلطان محمّد خاں اپنی خطا و قصور سے نادم اور تائب ہو گیا ہے اور شریعت کے تمام احکام کو اُس نے قبول کیا ہے اور کہتا ہے کہ اب دوبارہ بغاوت و شرارت اور خُدا و رسُولؐ کی مرضی کے خلاف کوئی فعل نہیں کروں گا، میری خطا للّٰہ معاف کرو۔ اگر یہ کلام نفاق و دغابازی سے کرتا ہے، تو وُہ جانے اور اُس کا خدا جانے۔ شریعت کا حُکم تو اقرارِ ظاہری پر ہے، کسی کے دل کا حال خدا کو معلوم ہے، ہم تو اُس کے ساتھ وہی معاملہ کریں گے، جو ظاہر شریعت کا حُکم ہے۔

پھر بدخواہ کے ساتھ خیر خواہی کی مثال اس سے بڑھ کر کیا ملے گی کہ جب سلطان محمد خاں نے ملاقات کے وقت غلط فہمی اور مخالفت کی وجہ بیان کرنے کے لیے وہ محضر سامنے رکھا، جو ہندوستان سے سید صاحب کو بدنام کرنے کے لیے بھیجا گیا تھا، تو آپ نے وہ محضر لپیٹ کر مولانا محمد اسمٰعیل صاحب کے حوالے کیا اور فرمایا کہ اس کو بڑی حفاظت سے رکھیے گا، نہ کسی کو دکھایئے گا اور نہ بیان کیجیے گا، اس لیے کہ لشکر میں ہمارے اکثر غازیوں کا ایسا حال ہے کہ یہ بہتان و افترا سُن کر اگر ان بدخواہوں کے حق میں بد دُعا کریں، تو عجب نہیں کہ فوراً اُن لوگوں کو نقصان پہنچ جائے، ہمارے دل میں یہ ہے کہ اگر کبھی اللہ تعالیٰ ہم کو اُن سے ملائے تو ہم اُن کے ساتھ نیکی اور احسان کے سوا کچھ نہ کریں۔

عالی ہمتی اور دریا دلی کا یہ واقعہ بھی نظر سے گزر چکا ہے کہ جب آپ نے فتح کیے ہوئے دارالسلطنت کو اپنے حریف کو واپس کر دینے کا عزم فرما لیا، تو سردارِ پشاور نے تاوانِ جنگ کے طور پر فوجی مصارف کے لیے، جو اس مُہم میں پیش آئے تھے، چالیس ہزار روپے کی پیش کش کی، تو آپ نے اُس کو بھی قبول نہیں فرمایا اور کسی منّت اور بدل کے بغیر فتح کیا ہوا مُلک واپس کر دیا۔ "وقائع احمدی" میں ہے:

"آپ نے سردارِ موصوف سے فرمایا کہ خان بھائی، تم نے جو ارباب فیض اللہ کی زبانی چالیس ہزار روپے خرچ کے واسطے دینے کا وعدہ کیا تھا، تو اب اس کی فکر نہ کیجیے گا۔ ہم نے آپ کو معاف کیے۔ کیونکہ ہمارے پروردگار کے ہاں کسی بات کی کچھ کمی نہیں ہے آپ ہمارے بھائی ہیں۔ آپ سے کسی طرح کا جرمانہ یا تاوان لینا ہم کو منظور نہیں ہے"

حیا باوجود شجاعت اور بے نظیر جرأت کے مزاج میں حیا کا مادّہ بہت تھا اور یہ بھی اس ذاتِ گرامی کا ایک پرتَو تھا، جس کے متعلق دیکھنے والوں کی شہادت ہے: "كَانَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ أَشَدَّ حَيَاءً مِّنَ الْعَذْرَاءِ فِيْ خِدْرِهَا وَكَانَ إِذَا كَرِهَ شَيْئًا، عَرَفْنَاهُ فِيْ وَجْهِهٖ"[1]

مولوی سید جعفر علی لکھتے ہیں: آپ کی عادت تھی کہ اگر کوئی شخص جھوٹ کہتا تھا، تو آپ اس کو

---

[1] ترمذی، روایت حضرت ابوسعید خدریؓ۔ ترجمہ: آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اس سے بھی زیادہ شرمیلے تھے، جتنی کنواری لڑکی پردے میں ہوتی ہے جب آپ کو کوئی چیز ناگوار ہوتی تھی، تو چہرے پر اس کا اثر ظاہر ہوتا تھا (زبان سے نہیں فرماتے تھے)

جھوٹا اور دروغ گو نہیں کہتے تھے، بلکہ اس بات کو اس طرح ظاہر فرماتے تھے کہ یہ شخص کچی پیاز کھاتا ہے، یعنی جھوٹ بولتا ہے۔ حاجی زین العابدین خاں رامپوریؒ فرماتے ہیں کہ ہزاروں عورتوں نے آپ سے بیعت کی۔ بعض پردہ نشین تھیں اور بعض آپ کے سامنے آجاتی تھیں، لیکن کبھی آپ کی نظر اُن پر نہیں پڑی۔ بیعت کا بھی طریقہ یہ تھا کہ آپ کپڑے کا ایک کنارہ پکڑ لیتے تھے اور دُوسرا کنارہ وُہ تھام لیتیں اور آپ اُن کو توبہ کراتے اور احکامِ شریعت کی پابندی کا عہد لے لیتے۔

بعض مرتبہ غایتِ حیا سے خود اپنے قصُوروار اور مُجرم پر نظر نہیں کرتے تھے اور خود آپ کی نگاہیں جُھک جاتی تھیں۔ سدّو خاں دُرّانی کو آپ نے خیمہ، گھوڑا اور بہت سا سامان عطا فرمایا تھا۔ جس وقت پائندہ خاں تنولی سے لڑائی ہُوئی، وہ لشکرِ اسلام سے ساز و سامان سمیت بھاگ کر تنولی کے پاس چلا گیا۔ اس کے بھاگنے کے وقت مجاہدین نے آپ سے عرض کیا کہ سدّو خاں بھاگا جا رہا ہے۔ اگر حکم ہو، تو اس کو گرفتار کر لیں۔ فرمایا: دُور کرو۔ اُنھوں نے پھر عرض کیا کہ وُہ خیمہ وغیرہ بھی، جو سرکاری سامان اور آپ کا عطیّہ ہے کہ وہ جہاد میں کام آئے، نہ یہ کہ ایسے نالائق اور مُفسد لوگوں کے تصرّف میں آئے، لیے جا رہا ہے۔ اگر اجازت ہو، تو چھین لیں۔ فرمایا: جانے دو۔ اگر اللہ تعالیٰ اپنی مہربانی سے ہم کو فتح دے گا، تو یہ سب ہمارے ہاتھ لگے گا۔ چند دنوں کے بعد تنولی سے صُلح کی درخواست ہُوئی اور مصالحت کے بعد دونوں طرف سے آمد و رفت شروع ہو گئی۔

سدّو خاں نے پھر لشکرِ اسلام میں آنے کا ارادہ کیا۔ پائندہ خاں نے اس کا سامان وغیرہ ضبط کر لیا۔ وہ اپنے ہمراہیوں کے ساتھ آپ کے پاس حاضر ہُوا اور اپنے ساتھیوں کے لیے بڑی کشادہ پیشانی کے ساتھ کھانے پینے کی جنس کی درخواست کی اور پائندہ خاں کی شکایت کرنے لگا کہ اس نے مجھے کھانا تک نہ دیا اور میرا ڈیرہ گھوڑا اسب مجھ سے زبردستی لے لیا۔ اب میرے پاس آپ کا دیا ہُوا کوئی سامان نہیں ہے۔ آپ نے فرمایا: پھر اُس لُچّے کے پاس کیوں گئے تھے؟ جو اُس کے ظرف میں تھا، اُس نے دیا۔ اُس نے کہا کہ میری قسمت مجھے لے گئی۔ آپ نے بڑے اخلاق سے فرمایا: جاؤ، ڈیرہ لگاؤ، خوراک اور ضروری سامان ہمارے یہاں سے ملتا رہے گا۔ جب وُہ بے حیا وہاں سے اُٹھ کر

چلا گیا، تو آپ نے فرمایا کہ میں شرم کے مارے اُس کے چہرے پر نظر بھی نہیں ڈالتا۔ یہ شخص ایسی حرکاتِ ناشائستہ کرتا ہے، پھر انتہائی بے باکی کے ساتھ مجھ سے سامان کا مطالبہ کرتا ہے اور میرے سامنے آنے سے اس کو شرم بھی نہیں آتی۔

سینتالیسواں باب

دینی اخلاق و اوصاف

ایذارسانی سے احتراز اور عمومی شفقت حقیقت یہ ہے کہ خدا کی کسی مخلوق کو (خواہ وُہ جانور ہی کیوں نہ ہو) ایذا دینا اور اپنے نفس کا انتقام لینا یا کسی پر غصّہ اُتارنا اور نفس کے تقاضے سے اُس کو اذیت پہنچانا آپ کے مسلک میں ناجائز اور آپ کی اُفتادِ طبع سے بعید تھا۔ علماء پشاور کے نام آپ نے جو خط لکھا ہے، اس میں آپ کا اپنی ذات کے متعلق یہ فرمانا بالکل حقیقت حال کی تصویر ہے:

ایں فقیر کسے را بلا وجہِ شرعی یک تازیانہ هم نہ زده باشد، بلکہ زدنِ سگ هم بلا وجہ از عادات ایں فقیر نیست۔ ہر کہ چند روز با فقیر ملازمت کرده باشد لابد براین معنی آگاه شده باشد۔	اس فقیر نے کبھی کسی کو بلا وجہِ شرعی ایک کوڑا بھی نہ مارا ہوگا، بلکہ بلا وجہ کُتّے کو بھی مارنا اس کی عادت نہیں۔ جس شخص کو چند دن بھی اس کے ساتھ رہنے کا اتفاق ہُوا ہے، اُس کو ضرور اس بات کا علم ہوگا۔

(مجموعۂ خطوط قلمی)

متعدد واقعات سے یہ پتہ چلتا ہے کہ جانوروں کو ناحق تکلیف دینے اور اُن کو بھوکا پیاسا

رکھنے یا اُن کے ساتھ زیادتی کرنے سے آپ کو سخت تکلیف ہوتی تھی اور آپ اس کو برداشت نہیں کر سکتے تھے۔

مولوی سیّد جعفر علیؒ لکھتے ہیں کہ جمال الدین نے (جو شاہ زماں کا وکیل تھا) ایک روز ایک کُتّے کے سر پر تبر مارا۔ تبر اُس کے سر میں پیوست ہو گیا اور کُتا بھاگا۔ آپ نے جمال الدین کو بہت سرزنش فرمائی اور فرمایا کہ یہ کُتا دیوانہ بھی نہ تھا کہ مار ڈالا جائے۔ تم نے یہ دیوانوں کی سی حرکت کی کہ بلا وجہ ظلم کیا۔ تم خدا سے نہیں ڈرتے کہ اُس کی مخلوق کو ستاتے ہو؟ چنانچہ آپ کے فرمانے سے قاضی مدنی نے بہت دُور تک کُتّے کا پیچھا کیا اور تبر کو اُس کے سر سے نکالا۔

دوسری روایت یہ بیان کرتے ہیں کہ میاں نجم الدین راوی ہیں کہ ایک روز آپ حاضرینِ مجلس کے ساتھ تشریف رکھتے تھے کہ یکایک ایک طرف سے ایک کُتّے کی دردناک آواز آئی۔ سُنتے ہی آپ کے چہرے کا رنگ بدل گیا۔ فرمایا: معلوم کرو، کون ظالم ہے؟ لوگوں نے تحقیق کر کے عرض کیا کہ فلاں شخص ہے۔ آپ نے اُس کو بہت ملامت کی، سخت سُست کہا اور فرمایا کہ اس کی سزا یہ ہے کہ اب روزانہ ہمارے باورچی سے روٹی لے کر گاؤں کے سب کُتّوں کو تلاش کر کے کھلایا کرو۔

لشکر میں ایک شخص کالے خاں نامی تھے۔ سرکاری اونٹ اُن کی تحویل میں رہتے تھے کہ ضرورت کے وقت لشکر کا سامان اُن پر بار کریں۔ وہ اس شعبے کے داروغہ تھے۔ اُن کی چرائی اور دانہ پانی کے ذمّے دار تھے۔ ایک روز آپ کو اطلاع ملی کہ کالے خاں اُونٹوں کے دانے پانی کی خبر گیری میں کوتاہی اور غفلت سے کام لیتے ہیں اور بار برداری میں مضبوط اور کمزور کی رعایت نہیں کرتے۔ آپ نے اُن کو طلب فرمایا۔ جب وہ حاضر ہوئے، تو آپ نے اُن سے غصّے سے فرمایا: "کالے خاں، خدا سے ڈرو اور ان بے زبان مخلوقات کے حق میں کوتاہی نہ کرو، ورنہ یہ اُونٹ تم کو دوزخ میں پہنچا دینگے۔ ہم نے تم کو صرف بوجھ لادنے کا ذمّہ دار نہیں بنایا ہے، بلکہ اُن کے دانے پانی کی خبر لینا بھی تمھارے ذمّے کیا ہے۔ منتقمِ حقیقی کے انتقام کا خوف کرو اور ہر وقت ان بے زبانوں کی رعایت رکھو۔ یہ تقریر سُن کر حاضرین کے جسم پر لرزہ طاری ہو گیا اور خوفِ الٰہی سب کے دلوں پر چھا گیا۔ کالے خاں

نے اُسی دن سے احتیاط کرنی شروع کر دی۔

مولوی سید جعفر علی اس عمومی شفقت کے بارے میں لکھتے ہیں:

"شفقتِ آں جناب بر تمامی مخلوقات الٰہی بود حتیٰ کہ در ایامِ سرما مگس شہد پیش آں حضرت بتلاشِ روزیِ خود می پرید۔ بعضے خدام را ارشاد شد کہ اندکے شہد برائے ایں مگس در ینجا بنیدازید زیرا کہ ایں مگسان دریں ایام چوں شہد را ذخیرہ می کنند، لاجرم گرسنہ می مانند۔ چنانچہ اندکے شہد بحکمِ آں جناب ریختہ شد۔	آپ کو خدا کی تمام مخلوقات پر شفقت تھی یہاں تک کہ جاڑوں کے دنوں میں ایک مرتبہ شہد کی مکھی اپنی روزی کی تلاش میں اُڑ رہی تھی۔ آپ نے بعض خادموں سے ارشاد فرمایا کہ تھوڑا سا شہد اس مکھی کے سامنے ڈال دو، اس لیے کہ یہ مکھیاں ان دنوں میں شہد کا ذخیرہ کرتی ہیں۔ اس لیے بھوکی رہتی ہیں۔ چنانچہ تھوڑا سا شہد ڈال دیا گیا۔

کلمہ گو کا احترام جب آپ کا عام انسانوں، بلکہ جانوروں تک کے ساتھ شفقت و رعایت کا یہ معاملہ تھا، تو مسلمانوں کے ساتھ مراعات و لحاظ اور حفاظت و احترام کا جو رویہ ہوگا، وہ ظاہر ہے۔ اس کا اندازہ اس واقعے سے کیا جا سکتا ہے:

"پشاور کی فتح کے بعد جب لشکرِ اسلام گڑھی امان زئی میں تھا، میر عالم خاں باجوڑی نے سید صاحبؒ کی خدمت میں اپنا ایک معتبر آدمی اس پیغام کے ساتھ بھیجا کہ ہم لوگ احکامِ شرعی قبول کرنے کے لیے تیار ہیں، آپ تشریف لائیں۔ آپ نے مشورے کے بعد مولانا اسمٰعیل صاحب کو سو آدمیوں کے ساتھ باجوڑ کے لیے روانہ کیا۔ جب یہ حضرات موضع خہر میں پہنچے تو ان اطراف کے رہنے والوں نے ایکا کر کے اس موضع کو گھیر لیا اور ہر طرف سے شور و غوغا بلند کرنے لگے۔ مولانا نے فرمایا کہ تم قومِ رسائے زئی کے لوگ تو ہمارے دوستوں میں سے ہو، ہم سے تمھارے حق میں کون سا قصور ہوا کہ ہم سے جنگ کرنے کے لیے تم سب اکٹھے ہو گئے؟

بڑی پُرسش و جُو اور تحقیق و استفسار کے بعد بعض لوگوں نے جواب دیا کہ آپ چُونکہ عالم خاں کے پاس جا رہے ہیں، جب آپ وہاں پہنچیں گے، تو وہ بھی آپ کی حمایت و رفاقت اختیار کرے گا اور آپ مُلکِ سمہ کی طرح ہمارے مُلک میں بھی قانونِ شرعی جاری کر دیں گے اور یہ ہم پر بہت شاق ہے۔ ہم حُکمِ شرعی کے قبول کرنے کی طاقت نہیں رکھتے۔ مولانا کو جب اُن کا یہ جواب مِلا، تو آپ نے کہلایا کہ تم مسلمان اور مسلمانوں کی اولاد ہو۔ کسی مسلمان کو حُکمِ شرعی کا انکار جائز نہیں۔ اگر ہم سے کچھ کمی زیادتی ہو، تو مناسب یہ ہے کہ تمھارے مُلّا کتاب سامنے رکھ کر ہم سے گفت گو کر لیں اور افراط و تفریط کو دُور کر کے ہم کو راہِ راست پر لے آئیں۔ اُنھوں نے یہ جواب سُن کر کہا کہ مُلّا سب تمھاری طرف ہیں اور تم خُود بھی کتاب سے زائد کوئی بات نہیں کرتے، لیکن صاف بات یہ ہے کہ ہم کو کسی طرح شرع کی فرماں برداری منظور نہیں ہے۔ اگر اس مُلک میں تمھارا عمل دخل ہو جائیگا تو ہم مُلک چھوڑ کر کہیں کسی کافر کی عملداری میں چلے جائیں گے تاکہ اپنے افغانی طور و طریق اور قانون کے مطابق زندگی گزاریں اور شرعِ محمّدی کی پابندیوں سے ہماری زندگی تنگ نہ ہو۔

یہ جواب سُن کر مولانا کو سخت غصّہ آیا اور فرمایا کہ ابتدا برسنِ شعور سے اس وقت تک ایسے کلمہ گو نہیں دیکھے کہ اسلام کے دعوے کے باوجود خود اپنے اُوپر کُفر کی شہادت دیتے ہیں اور شریعت کے انکار میں ان کو ذرا حیا نہیں آتی۔ حضرت امیرالمومنین کا حُکم تم سے جنگ کرنے کا نہیں ہے، ورنہ تمھارے اس انبوہ کو بکریوں کے گلّے کی طرح متفرق کر دیتے۔ ہمارا قصد چونکہ باجوڑ کی جانب ہے اور تم سدِّ راہ ہُوئے ہو، اس لیے ہم لشکرِ اسلام کی طرف مراجعت کرتے ہیں۔ یہاں تک کہ ہمارے امیر اور امام (سیّد صاحب) کا حُکم تمھارے بارے میں آجائے۔

فَانْتَظِرُوْا اِنِّیْ مَعَکُمْ مِّنَ الْمُنْتَظِرِیْنَ ۔ (الاعراف : ۷۱)

لوند خوڑ سے آپ نے سیّد صاحبؒ کی خدمت میں تمام حالات لکھ کر کمک اور شاہین طلب فرمائی۔ سیّد صاحبؒ نے مولانا کو جو جواب دیا، وہ مولوی سیّد جعفر علی کے الفاظ میں حسبِ ذیل ہے:

مولانا، ایں قوم آخر مسلمانانند و ما مدّتے	مولانا، یہ لوگ آخر مسلمان ہیں اور ہم
درمیانِ ایشان اقامت داشتہ ایم۔	عرصے تک اُن کے درمیان رہ چکے ہیں۔
ایں وقت بسببِ جہل و عادتِ قوم	اس وقت جہالت اور قومی عادات کے
ایں چنیں کلماتِ کفر بر زبانہا سے	سبب سے ایسے کلماتِ کفران کی زبانوں
ناپاکِ شاں بر آمد۔ من خطوط بنامِ ہر یکے	سے نکلے ہیں۔ میں (اُن کے سرداروں
بشکایت ایں حرکاتِ نا ملائم می نویسم۔	میں سے) ہر ایک کے نام اس حرکت
چہ عجب کہ براہ آیند و اگر ایں وقت	ناشائستہ کی شکایت کے خطوط لکھوں گا،
نخواہند آمد، آئندہ را اُمید است و	کیا عجب کہ یہ راہِ راست پر آجائیں اگر
اِلّا ذاتِ قوی و عزیزِ مالکِ خود رجا	اس وقت نہیں آئیں گے، تو آئندہ اُمید
می داریم کہ بعد ایں قدر امہال بسزائے	ہے، ورنہ اپنے مالکِ ذوالجلال سے جو
شدید آنہا را خواہد رسانید وَ اُمْلِیْ	قوی اور غالب ہے، امید رکھتا ہوں کہ اتنی
لَهُمْ اِنَّ كَيْدِيْ مَتِيْنٌ	مہلت کے بعد ان کو سخت سزا دے گا۔
(الاعراف : ۱۸۳) شانِ اوست۔	وَاُمْلِيْ لَهُمْ اِنَّ كَيْدِيْ مَتِيْنٌ (اور اُن کو

ڈھیل دیے جاتا ہوں، بیشک میرا داؤ پکا ہے) اُس کی شان ہے۔

مسلمانوں کے درمیان مصالحت | کلمہ اور کلمہ گو کے احترام ہی کا یہ تتمّہ اور تکمِلہ ہے کہ آپ کے نزدیک ابتدا ہی سے مسلمانوں کے درمیان مصالحت کی بہید اہمیت تھی۔ مندرجۂ ذیل واقعہ سے اس کا اندازہ ہوتا ہے:

"محسن خاں بیان کرتے ہیں کہ رمضان المبارک کے دن تھے۔ آپ نے ایک روز فرمایا کہ آج

روزہ ٹھنڈے کنوئیں پر کھولیں گے، جو تکیے سے ایک کوس کے فاصلے پر تھا۔ سب تیار رہیں جب روانگی کا سامان اور افطاری کی تیاری ہو گئی، تو رائے بریلی سے اطلاع آئی کہ فلاں فلاں مسلمانوں کے درمیان جنگ درپیش ہے اور عجب نہیں کہ تلوار بندوق کی نوبت آ جائے۔ آپ نے یہ سن کر محسن خاں، شیخ لطافت، معمور خاں، ابراہیم خاں، امام خاں وغیرہ دس آدمیوں سے فرمایا کہ ہمیں معلوم ہے کہ تم کو اس وقت پیاس کی شدت ہو گی اور اب یہ شدت بڑھتی ہی جائے گی، لیکن کیا کیا جائے کہ بغیر ان مشقتوں کے برداشت کیے ہوئے مراتب کمال تک پہنچنا میسر نہیں آتا۔ چونکہ دو مسلمانوں کے درمیان کشت و خون کی نوبت آگئی ہے، تم دوڑ کر جاؤ اور فریقین کے درمیان اپنے کو ڈال دو اور کہو کہ جو دوسرے کے قتل کے درپے ہے، وہ پہلے ہم کو قتل کر دے۔ چونکہ یہ رمضان کے دن ہیں اور آپ روزے سے ہیں، اس لیے آپ اس اکبر الکبائر کے مرتکب انشاء اللہ نہیں ہوں گے۔ کل سید صاحب کے پاس چل کر اپنے جھگڑے کا تصفیہ کرا لیجیے گا۔ آپ نے محسن خاں سے فرمایا کہ چونکہ تمھارے ماموں کا مکان قریب ہے، وہیں افطار کر کے اپنے ساتھیوں کے ساتھ واپس آ جانا۔

وہ سب دوڑتے ہوئے گئے۔ محسن خاں ایک فریق کی طرف دوڑے اور شیخ لطافت نے دوسرے فریق کا رخ کیا اور آٹھوں آدمی فریقین کے درمیان کھڑے ہو گئے اور دونوں کو مصالحت پر راضی کر لیا۔ افطار کے وقت محسن خاں کے ماموں کے گھر سے افطاری آئی۔ افطار اور نماز مغرب کے بعد سب تکیے واپس ہوئے۔ اس کے بعد یہ قضیہ بھی طے ہو گیا۔"[1]

ناظرین کو یاد ہو گا کہ آپ مسلمانوں کے درمیان مصالحت کی خاطر ڈیڑھ مہینے تک کابل میں مقیم رہے اور سرداران کابل کے درمیان، جو ایک باپ کی اولاد تھے، لیکن آپس میں سخت اختلاف اور رسہ کشی تھی، صلح کی کوشش کرتے رہے۔ ڈیڑھ مہینے کی لگاتار کوشش کے بعد جب آپ نے کامیابی نہ دیکھی، تو پشاور کا قصد فرمایا۔

---

[1] منظورۃ السعداء

رُفقاء پر شفقت رفقاء اور دین کے راستے میں ساتھ دینے والوں کے ساتھ آپ کا معاملہ اس حکمِ الٰہی کی تعمیل اور اس آیت کی تفسیر تھی:

وَاخْفِضْ جَنَاحَكَ لِمَنِ اتَّبَعَكَ مِنَ الْمُؤْمِنِينَ (۲۶ : ۲۱۵)

ان لوگوں کے ساتھ فروتنی سے پیش آیئے جو اہلِ ایمان میں سے آپ کی راہ پر چلیں،

آپ کو اُن کے حال پر جو شفقت و عنایت تھی، اُس نے ماں باپ کی شفقت کو بھلا دیا تھا۔

مولوی سیّد جعفر علی لکھتے ہیں:

وُفورِ شفقت بر غازیانِ دیندار آنچناں بُود کہ ہر کس از ایشاں جنابِ ممدوح را زائد از پدر و مادرِ خود می دانست۔

دیندار مجاہدین کے حال پر آپ کی شفقت کا یہ حال تھا کہ اُن میں سے ہر ایک آپ کو اپنے ماں باپ سے زیادہ سمجھتا تھا۔

اس شفقت و تعلق کا یہ اثر تھا کہ رُفقاء و خُدّام آپ کے ہوتے ہوئے ہشاش بشاش رہتے تھے، بڑے سے بڑا صدمہ ہنسی خوشی برداشت کر لیتے تھے اور اپنے میں قوّت محسوس کرتے تھے لیکن آپ کی جُدائی میں اُن کو ایسا خلا محسوس ہوتا تھا، جو کسی چیز سے پُر نہیں ہو سکتا تھا۔ بالاکوٹ کے راستے میں ایک مخلص نے اس کیفیت کو ان لفظوں میں بیان کیا، جو پچھلے صفحات میں گزر چکے ہیں:

"ہم لوگ جب تک آپ کو دیکھتے ہیں، تب ہی تک سب طرح کی تسکین اور دلجمعی ہوتی ہے اور اپنے حوصلے کے موافق عبادت بھی کر سکتے ہیں اور دُعا بھی کر سکتے ہیں جب ہم آپ کی صحبت سے جدا ہو جاتے ہیں، اس وقت ہم سے کچھ نہیں ہو سکتا، نہ عبادت نہ دُعا، اور پریشانی اور پراگندگی طبیعت پر چھا جاتی ہے۔ جب آپ کی جُدائی میں ہم لوگوں کا یہ حال ہو، پھر بھلا ہم کیونکر آپ کو چھوڑ دیں، اگر آپ قضاءِ حاجت کو تشریف لے جاتے ہیں اور دو چار گھڑی آپ ہم سے غائب رہتے ہیں، اس عرصۂ قلیل میں ہم لوگ آپ کے فراق میں بے صبر اور بیتاب ہو جاتے ہیں۔ جب آپ تشریف لاتے ہیں اور آپ کے دیدار سے ہماری آنکھیں روشن ہو جاتی ہیں، اُس وقت دل کو چین اور آرام ہوتا ہے۔"[1]

---

[1] وقائع احمدی، ج ۳

آپ اپنے ساتھیوں کو اس محبت و قدر کی نگاہ سے دیکھتے اور ایسے محبت و قدردانی کے الفاظ فرماتے کہ ان کا غم و فکر اور تکان دُور ہو جاتی، وُہ تازہ دم ہو جاتے اور آپ کے اخلاق پر فریفتہ اور راہِ خدا میں جان دینے کے لیے سُو جان سے تیار ہو جاتے۔ پنجتار میں ایک مرتبہ آپ نے اپنے نئے پُرانے ساتھیوں کے سامنے فرمایا:

"یہ ہمارے سب مسلمان بھائی اپنے گھر بار، خویش و تبار، ناموس و نام، عیش و آرام ترک کر کے محض اللہ اور رسُولؐ کی خوشنودی کے لیے آئے۔ ہمارے لیے گوہرِ نایاب اور لعل بے بہا کے ٹکڑے ہیں کہ سیکڑوں، بلکہ ہزاروں میں سے چھٹ کر آئے ہیں۔ ان کی قدر و منزلت ہم جانتے ہیں، ہر ایک نہیں پہچان سکتا۔"[۱]

مولوی سیّد جعفر علی لکھتے ہیں کہ جب میں اپنے رُفقار کے ساتھ اسب میں حاضرِ خدمت ہُوا، تو حضرتؒ نے مجھے ارشاد فرمایا کہ

همراہیانِ شما مردمِ سیاہ سیاہ رنگ اند، همه جواہر اند۔[۲]　　تمھارے ساتھی کالے کالے لوگ ہیں لیکن ہیں جواہرات۔

مساوات باوجود اس کے کہ سب رُفقار و خدام آپ کی ہر خدمت کے لیے ہر وقت تیار رہتے۔ سیّد صاحبؒ امتیاز و مشیخت پسند نہیں کرتے تھے۔ ہر کام میں مجاہدین اور رُفقار کے شریکِ حال رہتے، مشقّت اور مجاہدے کے کام میں ان کا ہاتھ بٹاتے، تنگی اور کشائش، فقر و فاقہ، ہر حال میں اُن کے شریک رہتے اور اپنے ہاتھ سے سب کام کرتے۔ پچھلے صفحات میں پنجتار کے حالات میں گزر چکا ہے کہ آپ کے باورچی خانے کا ایندھن ختم ہو جاتا، تو آپ کلھاڑیاں لے کر جنگل چلے جاتے۔ لشکر میں خبر ہوتی کہ آپ لکڑیاں لینے گئے ہیں، تو اکثر آدمی لکڑیاں کاٹنے چلے جاتے۔ آپ لکڑیاں کاٹنا شروع کرتے، تو آٹھ آٹھ آدمی آپ کے ساتھ کاٹتے کاٹتے تھک جاتے اور آپ اکیلے نہ تھکتے۔ ایک مرتبہ لوگوں نے مسجد میں سنگریزوں کی شکایت کی۔ آپ اگلے دن گھاس چھیلنے تشریف لے گئے۔ گھاس چھیل کر

---

۱ وقائع احمدی ج ۴　　۲ منظورۃ السعداء

ہوئے اور مسجد میں بچھا دی۔ ایک مرتبہ لوگوں نے شکایت کی کہ خیمے میں دھوپ جاتی ہے اور تکلیف ہوتی ہے۔ آپ نے فرمایا کہ درانتیاں جمع کر دینا۔ صبح کو اٹھ کر آپ تشریف لے گئے اور بڑے انتظام سے خوبصورت لکڑی دار جھونپڑے بنا دیے۔ اس کی وجہ سے بہت جگہ دیکھا دیکھی ایسے ہی جھونپڑے بن گئے۔

آپ کو یہ گوارا نہیں تھا کہ رُفقاء و اہلِ لشکر، جن کی تعداد سیکڑوں سے متجاوز تھی، کسی موقع پر فاقے سے رہیں اور آپ کھانا تناول فرمائیں۔

مقام میچنی میں ایک روز شام تک غلّے کا انتظام نہ ہو سکا۔ باورچیوں نے آپ کے لیے آدھ سیر کے بقدر کھانا تیار کر لیا۔ جب آپ کو اس کی اطلاع دی گئی کہ آپ کے لیے کھانا تیار ہے، فرمایا: اَسْتَغْفِرُ اللّٰہ ! بھلا یہ ہو سکتا ہے کہ میں تنہا کھاؤں اور تمام لشکر فاقے سے رہے؟ مخلصین نے عرض کیا کہ یہ آدھ سیر کھانا، جو تیار ہے، سارے لشکر کے لیے تو کافی نہیں ہے، اسے ہم کس کو کھلائیں؟ فرمایا: جس کا جی چاہے، کھا لے، لیکن مجھے یہ گوارا نہیں کہ میں تنہا کھا لوں اور تمام مسلمان فاقے سے رہیں۔ غرض، وہ کھانا اسی طرح سے رکھا رہا۔ ایک پہر رات گزرنے کے بعد غلّے کا انتظام کرنے والے خبر لائے کہ لشکر کے لیے غلّہ آ رہا ہے۔ مولوی عبدالوہاب صاحب قاسم غلّہ نے عرض کیا کہ وہ کھانا تیار ہے۔ آپ نوش فرما لیں۔ فرمایا: یہ غلّہ تمام لشکر کے لیے کافی ہو جائے گا؟ مولوی صاحب نے عرض کیا: ضرورت بھر کے لیے کافی ہو جائے گا۔ اس کے بعد آپ نے کھانا تناول فرمایا۔

ایک مرتبہ (غالباً سمہ سے ہجرت کے زمانے میں) آپ پہاڑ سے گزر کر تاکوٹ ابھی نہیں پہنچے تھے کہ عصر کے وقت ایک شخص دریا عبور کر کے گھی لگی ہوئی دو روٹیاں لے کر آیا اور آپ کو پیش کیں۔ آپ گھوڑے کی پیٹھ پر تھے۔ آپ نے وہ روٹیاں لے لیں۔ اُس نے عرض کیا کہ یہ خالص آپ کے لیے لایا ہوں۔ فرمایا: اَلْحَمْدُ لِلّٰہ ! اس وقت مجھے بھوک بھی تھی۔ گھوڑے کے اُوپر بیٹھے بیٹھے تقریباً آدھی روٹی تناول فرمائی اور اپنی عادت کے مطابق آدھی دوسرے کو عنایت فرما دی:

نیم نانے گر خورد مردِ خدا بذلِ درویشاں کند نیمے دِگر

آپ کو گفتگو اور خطاب میں بھی کوئی ایسا لفظ اور عبارت پسند نہ تھی، جس سے تفوّق اور

بالاتری کا اظہار ہوتا ہو۔ اکثر ساتھیوں اور خُدّام کو خان بھائی، سیّد بھائی کے الفاظ سے مُخاطب فرماتے۔

پیر خاں مورانوی آپ کی طرف سے پھُلت کے ناظم تھے۔ اُن کے نام آپ کی طرف سے جو خطوط جاتے تھے، آپ کے مُنشی اُن کو اس طرح خطاب کرتے تھے: "از امیر المومنین مطالعۂ اخلاص نشان پیر خاں سلّمہ اللہ تعالیٰ، بعد از سلام مسنون و دُعاءِ اجابت مقرون واضح آں کہ" الخ۔ ایک روز آپ نے اخلاص نشان کے جُملے پر مُنشی صاحب سے فرمایا کہ بھائی انصاری، اُمراء و رُؤساءِ زمانہ کے مُنشی اکثر اُن کے نوکروں کو اخلاص نشان کے لقب سے خطاب کرتے ہیں مجھے اس سے کراہت آتی ہے کہ سرداروں کو نوکروں کے الفاظ سے خطاب کیا جائے۔ حقیقت میں یہ سب بھائی ہیں، جن کو ایسا لکھا جاتا ہے۔ مُنشی صاحب نے عرض کیا کہ اخلاص نشان ہونا ہمارے لیے سعادتِ دارین ہے، لیکن آج سے برادرِ اخلاص نشان لکھا کروں گا۔ چنانچہ اس روز سے یہی معمول ہو گیا۔

اپنے علاوہ اپنے متعلقین کے لیے بھی آپ اہلِ لشکر کے متعلقین کے مقابلے میں کوئی خصوصیت اور امتیاز پسند نہیں کرتے تھے۔ بالاکوٹ کی روانگی کے دوران میں ایک روز ارباب بہرام خاں کی خواتین نے یابُو کی سواری پر بیٹھنے سے انکار کیا اور کہنے لگیں: حضرت امیر المومنین نے اپنی اہلیہ کو تو پالکی پر سوار کرایا ہے، ہمارے لیے پالکی کا انتظام کیوں نہیں کیا؟ آپ ایک فرلانگ آگے جا چکے ہونگے کہ آپ کو اطلاع ملی کہ ارباب صاحب نے ابھی اپنے اہل و عیال کے ساتھ کُوچ نہیں کیا۔ اُن کے متعلقین یابُو کی سواری سے عُذر کرتے ہیں۔ آپ نے یہ سُنتے ہی پانچ روپے ارباب صاحب کو بھیجے اور فرمایا کہ میری جانب سے ارباب صاحب سے کہہ دینا کہ میں آپ کو مومن سمجھتا ہوں اور اہلِ ایمان کی خوشامد و خاطر داری ضروری نہیں سمجھتا، اس لیے کہ یقین رکھتا ہوں کہ اہلِ ایمان اس عبادتِ عظمےٰ، یعنی، جہاد فی سبیل اللہ کے تعلق سے میری رفاقت سے ہاتھ نہیں کھینچیں گے۔ البتہ منافقوں کی خاطر داری اور دلجوئی اُن کے ایمان کی طمع میں بہت کرتا ہُوں اور اس کا حُکم بھی ہے۔ مَیں اپنی بیوی کو اُن کی بیویوں پر کسی امر میں بھی فوقیت نہیں دیتا، لیکن اہلیہ کے لیے یہ سواری "پالکی" اس مجبوری سے اختیار کی ہے کہ اُن کو اُمید ہے اور شرعی قاعدے کے مطابق اُن کی رعایت اس وقت ضروری ہے۔ اگر یہ عُذر نہ ہوتا، تو دوسری عورتوں کو اگر سواری

کے لیے یا لُو دیا ہے، تو اُن کو کسی گدھے پر سوار کرنے میں مجھے تامّل نہ ہوتا۔ اگر یہی عُذر ارباب بہرام صاحب کی بیویوں میں سے بھی کسی کو ہو، تو اس روپے سے اس کا انتظام کر لیا جائے۔

حمیّتِ شرعی اور غیرتِ دینی | حیا اور انتہائی مروّت و لحاظ کے باوجود شریعت کے معاملے میں آپ انتہائی غیور اور حسّاس تھے اور دینی حمیّت و غیرت کا یہی جوہر ہے، جس نے آپ کو اسلام کی حمایت و نُصرت، بیکس مسلمانوں کی امداد اور جہاد فی سبیل اللہ پر آمادہ کیا اور آپ وعظ و تبلیغ اور سلوک و ارشاد پر قانع نہ رہ سکے اور بالآخر اسی راہ میں آپ نے جان دے دی۔

عُلماءِ پشاور کے نام آپ نے جو طویل مکتوب تحریر فرمایا ہے، اس میں اپنے دلی جذبے اور فطری حمیّت کو اس طرح بیان کرتے ہیں۔ اس بات کی تردید کرنے کے بعد کہ مسلمانوں کے جان و مال پر بلا وجہِ شرعی دست درازی کی جاتی ہے اور یہ محض افترا و بہتان ہے، لکھتے ہیں:

فامّا آنچہ سرزنش و گوشمالیِ مُلکِ جبّار از دستِ ایں ذرّۂ بے مقدار بہ بعضے از مرتدینِ اشرار و مُنافقینِ بدشعار رسید پس آں را از اعاظمِ سعاداتِ خود می شمارم و اقویٰ علاماتِ مقبولیتِ خود می انگارم، بلکہ غیرت در اعانتِ دین و رغبت باہانتِ معاندین از لوازمِ ایمان است۔ ہر کہ غیرتِ ایمانی و حمیّتِ اسلامی نمی دارد، فی الحقیقت ایمان ندارد۔

باقی اللہ نے اس ناچیز کے ذریعے بعض منافقین مُرتدین کو جو سرزنش اور گوشمالی فرمائی ہے، اس کو مَیں اپنی انتہائی سعادت اور اللہ کے یہاں مقبولیت کی علامت سمجھتا ہوں، بلکہ حقیقت تو یہ ہے کہ اعانتِ دین میں غیرت اور معاندین کی اہانت و تذلیل کا شوق ایمان کے لوازم میں سے ہے جس میں غیرتِ ایمانی نہیں، حقیقت میں ایمان سے عاری ہے۔

آیۂ کریمۂ تبارک و تعالیٰ: یَآ اَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا مَنْ یَّرْتَدَّ مِنْكُمْ عَنْ دِیْنِهٖ فَسَوْفَ یَاْتِی اللّٰهُ بِقَوْمٍ یُّحِبُّهُمْ

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ اے لوگو، تم میں سے جو اپنے دین سے پھر جائے گا (تو اللہ کو کچھ پروا نہیں)، وہ عنقریب ایسے لوگوں

وَ يُحِبُّوْنَهٗۤ اَذِلَّةٍ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ	کو لے آئے گا، جو مومنین کے حق میں نرم
اَعِزَّةٍ عَلَى الْكٰفِرِيْنَ يُجَاهِدُوْنَ	ہوں گے، کافروں کے حق میں سخت، اللہ
فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَلَا يَخَافُوْنَ لَوْمَةَ	کے راستے میں جہاد کریں گے اور کسی ملامت
لَآئِمٍ۔ (المائدہ : ۵۴)	کرنے والے کی ملامت کی پروا نہیں کریں گے۔
وَقَالَ اللّٰهُ تَعَالٰى : يٰۤاَيُّهَا	اور فرمایا : اے نبیؐ، کفّار و منافقین
النَّبِيُّ جَاهِدِ الْكُفَّارَ وَالْمُنٰفِقِيْنَ	سے جہاد کرو اور اُن پر سختی کرو اور اُن کا
وَاغْلُظْ عَلَيْهِمْ وَمَاْوٰىهُمْ جَهَنَّمُ	ٹھکانا جہنّم ہے۔ (التوبہ : ۷۳)

سیّد صاحبؒ کی ساری جدّ و جُہد کا محرّک اور سبب اصلی یہی اسلامی حمیّت و غیرت ہے، جو ہندوستان پر کفر کے تسلّط اور اسلام کے زوال کو دیکھ کر حرکت میں آئی اور اُس نے کبھی آپ کو سکون سے بیٹھنے اور دُنیا کا کوئی اور کام کرنے کی اجازت نہیں دی۔ شاہ سُلیمان کے نام آپ نے جو خط لکھا ہے، اُس میں اس حقیقت کو بہت کُھلے لفظوں میں بیان کیا ہے۔ فرماتے ہیں :

قضا را از مُدّتِ چند سال حکومت و	تقدیر سے چند سال سے ہندوستان کی
سلطنتِ ایں مُلک بریں عُنوان گردیدہ	حکومت و سلطنت کا یہ حال ہو گیا ہے کہ
کہ نصارائے نکوہیدہ خصال و مشرکینِ بدِّل	عیسائی اور ہندوؤں نے ہندوستان کے کثر
بر اکثر بلادِ ہند استیلا یافتند و آں دیار	حصّے پر غلبہ حاصل کر لیا ہے اور ظلم و بیداد
را بظُلماتِ ظُلم و بیداد مشحون ساختند و	شروع کر دی ہے، کُفر و شرک کا غلبہ ہو
دراں بلاد و اَمصار رُسُومِ کُفر و شرک	گیا ہے اور شعائرِ اسلام اُٹھ گئے۔ یہ حال
اشتہار یافتہ شعائرِ اسلام را روباستتار	دیکھ کر ان لوگوں کو بڑا صدمہ ہُوا۔ ہجرت کا
آوردہ۔ ناگزیر سینۂ بے کینۂ بمعائنۂ	شوقِ دامنگیر ہُوا، دل میں غیرتِ ایمانی
ایں حال پُر از رنج و ملال بُود، بشوقِ	اور سر میں جہاد کا جوش و خروش
ہجرت مالامال۔ غیرتِ ایمانی بدل در جوش	ہے۔

بُود و اقامتِ جہاد بسرِ خروش۔ (مکتوباتِ قلمی)

نواب وزیر الدّولہ مرحوم آپ کی اِس دینی فکر مندی کا تذکرہ کرتے ہُوئے لکھتے ہیں:

"آپ فنا فی الدین تھے۔ اس کے سوا آپ کو کوئی اور فکر اور کوئی ذوق نہ تھا۔ سوتے جاگتے، اُٹھتے بیٹھتے اسی کا خیال رہتا۔ آپ کی گفتگو میں اسی کی سربلندی اور اسی کی ترقی کا ذکر رہتا۔ آپ کے ہر کام، آپ کی تمام کوششوں، جنگ اور فوج کشی کا مقصد یہی تھا"

یہ حمیتِ دینی محض مخالفین اور دشمنانِ اسلام ہی کے مقابلے میں نہیں تھی، بلکہ اگر کسی قریب ترین رفیق اور عزیز ترین دوست کی زبان سے بھی کوئی کلمہ ایسا نکل جاتا، جس سے شریعت کی تحقیر یا جنابِ الٰہی میں بے ادبی کا پہلو نکلتا، تو آپ کی یہ حمیت جوش میں آجاتی اور آپ غایتِ حیا اور انتہاءِ مروّت کے باوجود ضبط نہ فرما سکتے۔

سفرِ حج سے واپسی پر راستے میں مولوی سیّد کرامت علی بہاری کا الہ آباد سے خط آیا۔ سیّد عبدالرحمٰن صاحب کہتے ہیں کہ آپ نے وُہ خط پڑھنے کے لیے مجھے دیا۔ اس میں القاب و آداب کے بعد یہ لکھا ہُوا تھا کہ جنابِ والا کا سرفراز نامہ اس طرح شرفِ صُدُور لایا، جیسے آسمان سے وحی۔ ابھی میں یہیں تک پہنچا تھا کہ ان لفظوں کو سُنتے ہی آپ نے خط میرے ہاتھ سے لے لیا اور اس کو پھاڑ کر بتّی بتّی کر دیا۔ آپ کو خط کے ایسے بُرے عنوان سے بڑا رنج پہنچا، پیشانی پر سخت غصّہ اور غضب کی علامتیں ظاہر ہوئیں۔ شیخ محمّد خیر آبادی راوی ہیں کہ ایک شخص نے عرض کیا کہ کم از کم خط کا مضمون تو معلوم ہو جاتا۔ فرمایا کہ جس خط کا عنوان بارگاہِ الٰہی میں ایسی گستاخی اور بے ادبی ہو، اُس کا مضمون کیا دیکھا جائے؟ خود کو تو پیغمبر ٹھیرایا اور مجھے نعوذُ باللہ خدا ہی بنا دیا! مولوی کرامت علی صاحب کو جب اس واقعہ کی اطلاع ہُوئی، تو بڑے پشیمان اور خوف زدہ ہُوئے، لیکن جب وہ حاضر ہُوئے، تو آپ نے پہلے سے بھی زیادہ شفقت کا برتاؤ کیا۔[1]

---

[1] منظورۃ السعداء

اِتّباع | سید صاحبؒ کی زندگی کا سب سے بڑا جوہر اور امتیاز اتباع ہے، یعنی، فوائد و مصالح، نفع و نقصان، نیکنامی و بدنامی سے بالکل قطع نظر کر کے حکمِ شرعی کی پیروی اور رضائے الٰہی کے درپے ہونا اور صرف اسی سے غرض رکھنا۔ یہ وُہ چیز ہے، جو اس اُمّت کے کاملین و مخلصین کو خالص اہلِ سیاست اور موقع پرستوں ہی سے ممتاز نہیں کرتی، بلکہ ان متوسط درجے کے اہلِ اطاعت و اتباع سے بھی ممتاز کرتی ہے، جو اتباع کے ایسے نازک امتحان میں مصالح و منافع کو نظر انداز نہیں کر سکتے۔ یہی وہ مقام ہے، جہاں عقل کے بھی پَر جلتے ہیں، بڑے بڑے وفادار رفیق پیچھے رہ جاتے ہیں، دُور اندیشی اور عاقبت شناسی دانتوں میں اُنگلیاں دیتی ہے اور ہر شخص تصویرِ حیرت بن کر رہ جاتا ہے، لیکن صاحبِ یقین اور مُتّبعِ کامل جس کے سامنے صرف احکامِ الٰہی اور فرائضِ عبودیّت ہوتے ہیں، اپنا کام کیے جاتا ہے۔ وُہ اس موقع پر بڑے سے بڑے نقصان کو گوارا کرتا ہے۔ حکمِ الٰہی کی تعمیل اور رضائے الٰہی کی اُمید میں مُلک کے ہاتھ سے نکل جانے کو مُلک کے فتح ہو جانے سے زیادہ نفع بخش سودا سمجھتا ہے۔ یہ اتباع کی وُہ شان ہے کہ حُدَیبیہ کی صُلح میں، جب صحابہ کرامؓ میں بھی جلیل القدر ہستیوں کو اپنی ذلّت اور کمزوری اور شرائطِ صُلح کے سخت ہونے کا احساس ہو رہا تھا، تو ابوبکر صدّیقؓ حضرتِ عُمرؓ سے یہ فرما رہے تھے: "آپ کی رکاب تھام لو۔ یہ یقینی بات ہے کہ وُہ اللہ کے رسُولؐ ہیں"۔ یہی مقامِ صدّیقیّت تھا کہ جب آنحضرت صلّی اللہ علیہ وسلّم کی وفات پر سارے عرب میں ارتداد کی آگ پھیل جاتی ہے اور قبائل یکے بعد دیگرے خزاں کے پتّوں اور تسبیح کے دانوں کی طرح اسلام سے نکلتے جاتے ہیں اور بعض صحابہؓ کے اپنے الفاظ میں "مسلمانوں کی وہ کیفیت ہو جاتی ہے، جیسے بارش کی رات میں بھیڑوں کی کہ وُہ اپنے باڑے میں دُبک جاتی ہیں اور سردی سے ٹھٹھرنے لگتی ہیں"۔ مدینہ حملہ آوروں کی طرف سے ہر وقت خطرے میں ہے، اُس وقت حضرت ابوبکرؓ حضرت اُسامہؓ کا لشکر جس کو رسُول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم نے شام بھیجنے کے لیے تیّار کیا تھا، روانہ کر دینے پر مُصر ہیں۔ اس لشکر میں مُہاجرین و انصار کے بڑے بڑے سردار اور میدانِ جنگ کے آزمودہ کار سپاہی ہیں، خود حضرت عُمرؓ بھی اس لشکر میں ہیں، یہ اُس وقت کے مسلمانوں کی فوجی طاقت کا کُل سرمایہ تھا۔ لوگوں نے حضرت ابوبکرؓ سے عرض کیا کہ اس وقت اس لشکر کا مدینہ سے باہر جانا

کسی طرح مناسب نہیں۔ حملہ آوروں اور دشمنوں کی نگاہیں مدینے پر ہیں۔ اس لشکر کے کوچ کرتے ہی مدینے پر حملہ ہو جائے گا۔ اس مشورے میں مدینے کے تمام عقلاء شریک تھے، لیکن حضرت ابوبکر صدیقؓ کے نزدیک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا منشاء پورا کرنا اور آپ کے ارادے کو عمل میں لانا ہی سب سے بڑی عقلمندی اور سیاست تھی۔ آپ صاف جواب دیتے ہیں کہ قسم ہے اُس ذاتِ پاک کی، جس کے قبضے میں ابوبکرؓ کی جان ہے، اگر مجھے اس کا بھی یقین ہو جائے کہ جنگل کے درندے مجھے اٹھالے جائیں گے، تب بھی میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا منشاءِ مبارک پورا کروں گا اور اُسامہؓ کا لشکر بھیج کر رہوں گا۔

یہی اتباع، خلافتِ راشدہ کی رُوح ہے اور یہی وُہ پہلو ہے، جو حضرت ابوبکرؓ اور حضرت علیؓ کی خلافتوں میں پُورے طور پر مشترک ہے۔ ایک نے فتوحات کی حالت اور اسلام کے اقبال و ترقی کے دَوران میں اتباع کا حق ادا کیا اور خلافتِ نبوّت کا شاندار نمونہ پیش کیا، دُوسرے نے انتہائی فتنوں اور آزمائشوں اور اپنی خلافت کے پُرآشوب دَور میں نبوّت کی جانشینی کا حق ادا کر کے دِکھلا دیا اور خلافت علیٰ منہاج النبوۃ کے معیار سے بال برابر ہٹنا اور اپنے اُصول میں ذرّہ برابر ترمیم اور ادنیٰ لچک پیدا کرنا بھی گوارا نہیں کیا۔ بیت المال کی آمد و خرچ کے معاملے میں، عمّال و حکّام کے عزل و نصب میں وہ اسی پُل صراط پر قائم رہے جو بال سے زیادہ باریک اور تلوار سے زیادہ تیز ہے۔ یہ کام مؤرخ کا ہے کہ وُہ صدّیقی اور علَوی دَورِ خلافت کی تفصیلات مرتّب کرے اور اُن کے اسباب و نتائج سے بحث کرے۔ گہری نظر رکھنے والے کی نگاہ میں اصل چیز "اتباع" ہے اور اس لحاظ سے اس کو حضرت علیؓ کی خلافت درحقیقت حضرت ابوبکرؓ کی خلافت کا طبعی اِمتداد و تسلسل نظر آئے گا اور دونوں میں بُنیاد، رُوح اور مزاج کا کوئی فرق نہیں محسوس ہوگا۔

سیّد صاحبؒ کی تاریخ میں جو مقام سب سے زیادہ نازک پیش آتا ہے، جس کی توجیہ میں بڑی سی بڑی عقیدتمندی کو بھی دُشواری محسوس ہوتی ہے، وُہ پشاور فتح کرنے کے بعد سلطان محمدؐ خاں کے حوالے کر دینے کا واقعہ ہے۔ اس موقع پر خود آپ کے لشکر کے اہلِ اخلاص بھی سخت کشمکش میں تھے۔ ایک طرف آپ پر اعتماد اور آپ کی اطاعت کا معاملہ تھا، دُوسری طرف ایک ایسے ناقابلِ اعتماد اور بار بار کے

آزمودہ دشمن اور بداندیش کو دارالسلطنت حوالے کر دینے کا مسئلہ تھا جس نے زک پہنچانے اور مجاہدین کا استیصال کرنے میں کوئی دقیقہ کبھی اُٹھا نہیں رکھا، حقیقت یہ ہے کہ یہ موقع بڑے بڑے راسخ عقیدت لوگوں کے لیے بھی بڑا نازک اور صبر آزما تھا، اور اب بھی ایک پُرجوش مؤرخ اور عقیدتمند سوانح نگار یہاں پہنچ کر ٹھٹک کر کھڑا ہو جاتا ہے۔

لیکن واقعہ یہ ہے کہ اس معاملے کا سمجھنا بہت دُشوار بھی ہے اور نہایت آسان بھی۔ دُنیا میں ہر قفل کی ایک کُنجی ہے۔ اس کُنجی سے اس قفل کا کُھلنا نہایت آسان ہے اور اس کُنجی کے بغیر اس کا کُھلنا نہایت دُشوار۔ اس مسئلے کی بھی ایک کُنجی ہے، جس سے وہ بآسانی حل کیا جاسکتا ہے۔ اگر وہ کُنجی ہاتھ نہ آئے تو یہ ایک عقدۂ لاینحل ہے۔

اس واقعہ کی کُنجی آپ کی اس تقریر میں موجود ہے، جو آپ نے ارباب بہرام خاں کی گفتگو کے جواب میں فرمائی ہے۔ آپ پچھلے صفحات میں اس کو پھر ایک بار پڑھیے اور غور کیجیے کہ اس میں کونسی رُوح اور کونسا جذبہ کام کر رہا ہے اور اس فعل کا اصلی محرّک کیا ہے، خصوصیت کے ساتھ اس ٹکڑے پر غور کیجیے:

> "تم سب خُوب جانتے ہو کہ ہم لوگ ہندوستان سے گھر بار چھوڑ کر اور عزیزوں اور آشناؤں سے مُنہ موڑ کر صرف اس لیے آئے ہیں کہ وہ کام کریں، جس میں پروردگار کی رضامندی و خوشنودی ہو، مخلوق کی خوشی و ناخوشی سے ہم کو کچھ غرض نہیں۔ خوش ہوں گے تو کیا بنائیں گے اور ناخوش ہوں گے، تو کیا بگاڑیں گے؟ نادان سمجھتے ہیں کہ یہ ملک گیری اور دُنیا طلبی کے لیے آئے ہیں۔ یہ اُن کا خیالِ خام ہے۔ وہ دینِ اسلام سے واقف نہیں ہیں..... اور جو سمہ کے خوانین بھائی اُن کے ظُلم و تعدّی کا شکوہ اور اپنی بے عزتی خانہ ویرانی اور زیرباری کا قصّہ بیان کرتے ہیں، یہ سب سچ ہے۔ اس بات کو یُوں سمجھیں کہ ہمیشہ سے کافر و باغی اور مُنافق مسلمانوں پر طرح طرح کی تعدّی اور مکّاری کرتے رہے ہیں، مگر جس وقت اللہ تعالیٰ کی رضامندی کا کام مقابلے میں آجاتا ہے، اس وقت سب بغض و عداوت کو اپنے دل سے دُور کر دیتے ہیں اور زبان پر نہیں لاتے اور اُن کے

ساتھ وہی معاملہ کرتے ہیں، جس میں پروردگار کی رضامندی اور اُس کے فرمان کی تعمیل ہو، اگرچہ نفس و ابناءِ زمانہ کے مخالف ہو۔ مسلمانی اور دینداری و خداپرستی اس کا نام ہے، نہیں تو نفس پروری اور دُنیاداری ہے۔ اور جو اپنے قندھاری بھائی شکایت کرتے ہیں کہ ہمارے اتنے بھائی انھوں نے شہید کیے، تو یہ بات شکر کے لائق ہے نہ کہ شکایت کے، اس لیے کہ وُہ سب بھائی اپنی دلی مُراد کو پہنچے۔ وہ اسی مطلب کے حصُول کے لیے یہ تمام تکالیف و مصائب اُٹھا کر اتنی دُور دراز کی مسافت سے جہاد فی سبیل اللہ کو آئے تھے کہ اپنے پروردگار کی رضامندی کی راہ میں اپنی جانیں صرف کریں سو وُہی انھوں نے کیا۔ اور یہ جہاد کا کاروبار صرف پروردگار کی رضامندی کا ہے، نفسانیت اور جنبہ داری کا نہیں ہے، جیسے دُنیادار اور جاہ طلب لوگ کرتے ہیں۔"

پھر آگے چل کر اسی بات کو مزید وضاحت اور قوت کے ساتھ بیان کرتے ہیں کہ

"ہم کو صرف اللہ کی رضا اور اُس کے حُکم کی تعمیل منظور ہے، نفع و نقصان سے کوئی بحث نہیں۔ اس معاملے میں سلطنت آنے جانے کی بھی پروا نہیں،

اور جو یہ کہتے ہیں کہ اگر ضرورت ہو، تو شہر کے انتظام اور لشکر کے خرچ کے لیے ہم دو چار لاکھ روپے کا بندوبست کر دیں، مگر یہاں کی حکومت دُرانیوں کو نہ دیں، سو یہ بات ہم کو منظور نہیں، اس لیے کہ ہم کو تو اپنے پروردگار کی رضامندی چاہیے جس میں وُہ راضی ہوگا، ہم کریں گے۔ اس میں چاہے تمام جہان ناخوش ہو، کچھ پروا نہیں۔ اگر ایک جگہ ہفت اقلیم کی دولت اور سلطنت پروردگار کی رضامندی کے خلاف ملتی ہو، تو اس دولت اور سلطنت کی کچھ حقیقت نہیں، اور ایک جگہ پروردگار کی رضامندی کے موافق ہفت اقلیم کی دولت اور سلطنت جاتی ہو، تو اس کی رضامندی سب کچھ ہے۔"

آپ کے پیشِ نظر صرف یہ بات ہے کہ ایک شخص جب تائب ہوتا ہے، خدا کا نام بیچ میں لاتا ہے احکامِ شرعی کے نفاذ اور انھیں مقاصد کے اجرا کا عہد کرتا ہے، جو اس ساری جدّ و جُہد اور جہاد و قتال کا

محرک ہیں، تو کس بنیاد پر اس پیش کش کو ٹھکرا دیا جائے اور اس کے مقابلے میں اپنے آپ کو ترجیح دی جائے؟ پھر ایک نفسانی جنگ اور خود غرضانہ جدّ و جُہد اور جہاد فی سبیل اللہ میں کیا فرق رہ جاتا ہے؟ ارشاد فرماتے ہیں :

"اس گفت گو کا خلاصہ یہ ہے کہ سردار سلطان محمد خاں اپنی خطا و قصور سے نادم اور تائب ہو گیا ہے اور شریعت کے تمام احکام کو اُس نے قبول کر لیا ہے اور کہتا ہے کہ اب دوبارہ بغاوت و شرارت اور خدا و رسولؐ کی مرضی کے خلاف کوئی فعل نہیں کروں گا۔ میری خطا اللہ معاف کرو۔ اگر یہ کام نفاق اور دغا بازی سے کرتا ہے، تو وہ جانے، اس کا خدا جانے۔ شریعت کا حکم تو اقرارِ ظاہری پر ہے، کسی کے دل کے حال پر نہیں، دل کا حال خدا کو معلوم ہے۔ ہم تو اس کے ساتھ وہی معاملہ کریں گے، جو ظاہر شریعت کا حکم ہے۔ اس میں چاہے کوئی راضی ہو، چاہے ناراض ہو۔ اب ہم جو اُس کا عُذر نہ مانیں، تو اس پر ہمارے پاس کون سی دلیل اور حُجّت ہے؟ اگر کوئی دیندار، خدا پرست عالم کسی دلیلِ شرعی سے ہم کو سمجھا دے کہ تم خطا پر ہو، تو ہم منظور کر لیں گے۔ اس کے بغیر ہرگز نہ مانیں گے، کیونکہ ہم تو خدا اور رسولؐ کے تابع ہیں اور کسی کے تابع نہیں۔

اس تقریر کا جو اتباعِ و بےنفسی اور للّٰہیت کے رنگ میں ڈوبی ہوئی تھی اور دل کی گہرائی سے نکلی تھی، سامعین پر ایسا اثر ہُوا کہ حاضرینِ مجلس کا بیان ہے کہ

جس وقت سید صاحب یہ تقریر فرما رہے تھے، اس وقت رحمتِ الٰہی کا عجب نزول ہو رہا تھا۔ ارباب بہرام خاں اور ارباب جمعہ خاں کے روتے روتے ہچکیاں لگ گئی تھیں اور وہ عالمِ سکوت میں بیہوش و خود فراموش تھے۔"

جب آپ خاموش ہو گئے، تب ارباب بہرام خاں نے عرض کیا کہ حضرت، جو کچھ آپ نے فرمایا، حق اور بجا ہے۔ خدا و رسولؐ کے کاموں سے آپ ہی واقف ہیں، ہم دنیاداروں اور

نفس پرستوں کو کیا خبر ہے؟ ہم نے اس وقت جانا کہ دینِ اسلام اس کو کہتے ہیں اور خدا و رسُولؐ کی اطاعت اس کا نام ہے اور جو خیال اس کے خلاف میرے دل میں تھا، اس سے میں آپ کے سامنے توبہ کرتا ہوں اور از سرِ نو آپ کے ہاتھ پر بیعت کرتا ہوں اور آپ میرے لیے دعا کریں۔

ایک مُلک گیر اور فاتح اور ایک فرماں بردار مجاہد بندے کے درمیان یہی فرق ہے کہ اول الذکر کو مُلکی مصالح اور سلطنت کے حصُول سے تعلق ہے اور ثانی الذکر کو تعمیلِ حُکم اور طاعتُ بندگی سے۔ پشاور کے سیٹھوں نے یہ سمجھ کر کہ شاید سیّد صاحبؒ پشاور اس لیے حوالہ فرما رہے ہیں کہ آپ کے پاس خزانہ و لشکر کی کمی ہے، اپنا ایک نمائندہ آپ کے پاس بھیجا اور یہ کہلوایا کہ اگر شہر سپرد کر دینے کی یہی وجہ ہے، تو اس کا آپ اندیشہ نہ کریں۔ آپ کے فرمانے کی دیر ہے۔ میں آپ ہی کے پاس حاضر ہوں۔ جس قدر روپیہ آپ فرمائیں، دو گھڑی کے عرصے میں اس جگہ روپوں کا ڈھیر لگا دوں اور ادھر آپ نوکر رکھنا شروع کر دیں جس قدر ضرورت ہو نوکر رکھ لیں اور اس کے سوا اور کوئی سبب ہو، تو اس کی بات آپ جانیں۔"

آپ نے اس کے جواب میں فرمایا کہ

"سیٹھ جی، تم یہ بات بہت اچھی کہتے ہو۔ جو حاکم مُلک گیری کا ارادہ رکھتے ہیں اُن کے کام کی ہے، لیکن ہم اُن حاکموں میں نہیں۔ ہم اپنے مالک کے فرمانبردار ہیں جو کچھ ہم لوگ کرتے ہیں، اُسی کی مرضی کے موافق کرتے ہیں۔ لوگوں کے رُوبرُو اس میں کچھ نقصان نظر آتا ہو یا فائدہ، اس سے کچھ غرض نہیں۔ ہمارے مالک کا حُکم ہے کہ کوئی شخص کیسا ہی قصُور وار ہو، جب وُہ اپنے قصور سے توبہ کرے اور اپنی خطا کا عُذر کرے، تو اس کی خطا معاف کرنی چاہیے اور اُس کا عُذر قبول کرنا لازم ہے۔ اگر اس نے توبہ دغا بازی سے کی ہو، اس بات سے ہم کو کچھ کام نہیں۔ وُہ جانے اور اُس کا خدا جانے۔ اُس کا مال و مُلک زبردستی لینا درست نہیں۔ ہمارے اور سردار سلطان محمّد خاں سے اِسی طور کا مُعاملہ ہے۔ اور جو تم لشکر اور خزانے

کا ذکر کرتے ہو، تو ہمیں اس بات کا اندیشہ نہیں، چاہے ہو یا نہ ہو، کیونکہ ہمارے مالک کے یہاں سب کچھ ہے، کسی چیز کی کمی نہیں۔ اگر وہ اپنا کام ہم سے لے گا تو بہتر سے بہتر فوج و لشکر اور مال و خزانہ بغیر مانگے عنایت کرے گا۔"

○

اڑتالیسواں باب

رُوحانی اَوصاف اور باطنی کیفیات

اِنابت و استغفار خطا کا ظہور اور بھول چوک بشریت کا اقتضا اور فطرتِ انسانی کا لازمہ ہے غیر معصُوم کا اس سے بچنا تو امرِ محال ہے، لیکن اہل اصطفا اور مقبولین بارگاہ اور عوام النّاس میں یہی فرق ہے کہ ان مقبولین کو اپنی غلطی پر سخت ندامت ہوتی ہے اور غلطی کے صدُور کے بعد ان کی بندگی کا نمایاں طریقے پر ظہور ہوتا ہے، اس اِنابت (اِلیٰ اللہ) اور توجہ اِلیٰ اللہ کی ایسی کیفیت پیدا ہوتی ہے اور وُہ اس کثرت اور شدّت سے استغفار کرتے ہیں کہ نہ صرف اس غلطی کا کفّارہ ہو جاتا ہے، بلکہ ان کے درجات میں پہلے سے زیادہ ترقی اور اُن کے قُرب میں مزید اضافہ ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے حضراتِ انبیاء علیہم السّلام کے تذکرے میں بھی اُن کی اِس صفتِ اِنابت کا خصوصی طور پر ذکر فرمایا ہے۔ حضرتِ داوٗد علیہ السلام کے ایک واقعہ کا ذکر کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

وَظَنَّ دَاوٗدُ أَنَّمَا فَتَنّٰهُ فَاسْتَغْفَرَ	داوٗدؑ کو خیال آیا کہ ہم نے ان کا امتحان لیا ہے
رَبَّهٗ وَخَرَّ رَاكِعًا وَّ أَنَابَ	سو اُنھوں نے اپنے رب کے سامنے توبہ کی اور
(ص : ۲۴)	سجدے میں گر پڑے اور رجُوع ہوئے۔

اس استغفار و انابت کا نتیجہ صرف مغفرت و عفو ہی نہیں، بلکہ ترقیِ درجات اور قُرب مزید ہُوا، ارشاد ہے:

فَغَفَرْنَا لَهُ ذٰلِكَ وَ إِنَّ لَهُ عِنْدَنَا لَزُلْفٰى وَحُسْنَ مَاٰبٍ (ص ۲۵)

سو ہم نے اُن کو وُہ معاف کر دیا اور ہمارے یہاں اُن کے لیے قُرب اور نیک انجامی ہے

حضرت سلیمانؑ کے تذکرے میں بڑی محبت و اعزاز کے ساتھ ارشاد ہے:

وَوَهَبْنَا لِدَاوٗدَ سُلَيْمٰنَ نِعْمَ الْعَبْدُ إِنَّهٗ أَوَّابٌ (ص ۳۰)

اور ہم نے داؤدؑ کو سلیمانؑ عطا کیا۔ وُہ بہت اچھے بندے تھے کہ بہت رجوع ہونے والے تھے۔

درحقیقت کسی انسان کی یہ تعریف صحیح نہیں ہے کہ اس سے غلطی کا صُدُور ہی نہیں ہوتا اور وُہ نبی کی طرح معصُوم ہے، بلکہ اس کی تعریف یہ ہے کہ غلطی کے صُدُور پر اُس کی بندگی کا پُورا ظہُور ہوتا ہے۔ وُہ ایک خطا کار بندے کی طرح اپنی تقصیر کا اقرار و اعتراف کرتا ہے اور پوری ندامت و انابت کے ساتھ خدا کے حضور اپنے گناہ پر تَوبہ و استغفار کرتا ہے۔

سیّد صاحب کی سیرت میں ایسے واقعات بھی ملتے ہیں، جن سے اس صفتِ عبُودیت اور کیفیتِ انابت کا پُورا اظہار ہوتا ہے۔

مولوی سیّد جعفر علی لکھتے ہیں کہ سفرِ حج میں آپ کے ساتھ عبداللہ نومسلم دہلوی اور اُن کی بیوی، جو آپ کے گھر کی ملازمہ اور خدا کی ایک نیک بندی تھیں، ساتھ تھے۔ اس عورت کی گود میں ایک بچہ تھا اور آپ کی ایک صاحبزادی بھی شیرخوار تھیں۔ وہ عورت دونوں بچوں کو دُودھ پلاتی تھی۔ کچھ دنوں کے بعد اُس کا دُودھ کم ہوگیا۔ اُس نے صاحبزادی کو دُودھ پلانا چھوڑ دیا۔ آپ کی اہلیہ محترمہ کو اُس پر غصّہ آیا اور اُنھوں نے ایک دن آپ سے شکایت کی۔ آپ نے اس خادمہ سے کہا کہ تم اس بچی کو ضرور دُودھ پلاؤ، ہم تمھاری خوراک ایسی مقرر کر دیں گے کہ دُودھ بڑھ جائے گا اُس نے کہا کہ مَیں نے بہت سی چیزیں کھائیں، لیکن دُودھ نہیں بڑھا۔ میں اس بچی کو دُودھ پلانے کے

لیے تیار ہوں ۔ لیکن پوچھتی ہوں کہ اگر میرا بچہ بھوکوں مر گیا ، تو اس کا گناہ مجھ پر ہے یا نہیں ؟
آپ نے اپنی بچی کا دودھ اُس سے چھڑا دیا ۔ اُس کا میاں عبداللہ کو بھی بہت رنج ہوا ۔ چار پانچ
دن کے اندر آپ کو بہت تردّد و پریشانی لاحق ہوئی اور دعا و مناجات وغیرہ میں کمی محسوس
ہوئی ۔ اس پر آپ نے مغموم ہو کر بارگاہِ بے نیاز میں بہت دعا و التجا کی ۔ آپ کو تنبیہ ہوا کہ بچی
کو دودھ پلانے کے واقعے میں آپ سے ایک غریب عورت کی دل شکنی اور اس کے بچے کی حق تلفی
ہوئی ۔ آپ صبح ہی صبح مکان پر تشریف لائے اور لوگوں کو جمع کر کے ارشاد فرمایا کہ مجھ سے اس
معاملے میں قصور ہوا اور سب واقعہ بیان کیا ۔ پھر سب مستورات کو ساتھ لے کر آپ میاں عبداللہ
کی بیوی کے پاس تشریف لے گئے ۔ وہ یہ دیکھ کر ڈر گئیں اور رونے لگیں ۔ آپ نے اُن کو تسلی دی
اور فرمایا کہ ہم سے خطا ہوئی کہ ہم نے تم کو بچی کے دودھ پلانے کا حکم دیا ۔ خدا کے لیے معاف کر دو
یہ سُن کر وہ اور زیادہ رونے لگی ۔ عورتوں نے اُن کو سمجھایا کہ زبان سے کہہ دو کہ ہم نے معاف کیا ۔
اسی طرح تین بار اُن کی زبان سے کہلوایا ، پھر آپ نے اُن کے لیے دعاءِ خیر کی اور اہلیہ محترمہ کو
بڑی تاکید فرمائی کہ اس عورت کی پہلے سے بھی زیادہ خاطر داری اور دلجوئی کرنا ۔ پھر آپ شیخ
عبداللطیف تاجر کے مکان پر تیز قدمی کے ساتھ تشریف لائے ۔ شیخ صاحب موصوف مولانا عبدالحی
مولانا محمد اسمٰعیل اور حکیم مغیث الدین وغیرہ دالان میں بیٹھے ہوئے تھے ۔ آپ نے فرمایا کہ میں اس
وقت تمہارے پاس ایک ضروری کام کے لیے آیا ہوں ۔ آپ نے میاں عبداللہ کو پہلو میں بٹھایا
اور ایک بڑی پُر اثر تقریر کی جس میں پروردگارِ عالم کی بے نیازی کا مضمون بیان کیا اور یہ کہ
سب بندوں سے قصور و نافرمانی ہوتی ہے اور سب یکساں خدا کے محتاج ہیں ۔ پھر آپ کھڑے
ہو گئے اور آپ کے ساتھ سب اہلِ مجلس کھڑے ہو گئے ۔ آپ نے بچی کے دودھ پلانے کے واقعہ
کو بیان کیا اور فرمایا کہ میں نے میاں عبداللہ کی بیوی سے تمام عورتوں کے روبرو معافی مانگ لی
ہے ، لیکن چاہتا ہوں کہ میاں عبداللہ سے آپ کے اور سب مسلمانوں کے سامنے معافی مانگوں تاکہ
آپ سب بھی دعا میں داخل ہو جائیں ۔ آپ کے اس فرمانے سے تمام اہلِ مجلس پر رقّت طاری

ہوگئی۔ میاں عبداللہ اتنا روئے کہ جواب کی طاقت نہ رہی۔ انھوں نے انتہائی عجز سے عرض کیا کہ مَیں آپ کا خادم و فرمانبردار ہُوں۔ آپ نے فرمایا: نہیں، بلکہ تم ہمارے بھائی ہو۔ ہم سے قصور ہُوا۔ اب ہمارے معافی مانگنے اور تمھارے معاف کر دینے میں بڑی خیر و برکت ہے۔ تم کو معاف کر دینا چاہیے۔ میاں عبداللہ پر ایسا گریہ طاری تھا کہ بات زبان سے نہیں نکلتی تھی۔ ایک دُوسرے شخص نے اُن کے شانے پر ہاتھ رکھا اور کہا کہ کہو: مَیں نے معاف کیا۔ میاں عبداللہ نے عرض کیا کہ اگر میرے کہنے ہی پر موقوف ہے، تو مَیں نے دِل و جان سے معاف کیا۔ اِس کے بعد آپ نے دُعا کے لیے ہاتھ اُٹھائے اور بڑی گریہ و زاری سے مسلمانوں کے لیے عموماً اور میاں عبداللہ کے لیے خصوصیّت کے ساتھ دُعا فرمائی۔ پھر آثارِ قبولیت پر، جو ظاہر ہُوئے، اللہ تعالیٰ کا شُکر ادا کیا۔

اِسی طرح کا ایک واقعہ وقائع احمدی سے نقل کیا جاتا ہے:

"حضرت علیہ الرحمۃ کے باورچی خانے کے داروغہ میاں عبدالقیوم صاحب تھے اور عبداللہ بہرے مولانا صاحب کی جماعت والے بھی باورچی خانے کے کاروبار میں شریک تھے، اور قادر بخش خاں گنج پورے والے حضرت کا کھانا پکایا کرتے تھے اور کھانا پکانے کے فن میں وُہ بڑے اُستاد تھے۔ ایک روز وُہ گوشت پکا رہے تھے اور گوشت میں پانی کم تھا۔ اس عرصے میں مغرب کی اذان ہُوئی۔ انھوں نے حاجی عبداللہ سے کہا کہ تم گوشت کی خبر لیتے رہو، مَیں نماز کر جاتا ہوں۔ یہ کہ کر وہ نماز کو گئے۔ حاجی عبداللہ نے گوشت کے نیچے سے آگ کھینچ کر الگ کر دی اور آپ بھی جا کر جماعت میں شامل ہوگئے۔ بعدِ فراغِ نماز قادر بخش خاں آئے اور گوشت دیکھا، تو اُس میں داغ لگ گیا تھا۔ اُنھوں نے جو داغی بوٹیاں معلوم کیں، وُہ نکال ڈالیں اور جو بوٹیاں باقی رہیں، ان میں شوربے کے واسطے پانی ڈال دیا گیا۔ پھر بھی اُس میں جلنے کی بُو باقی رہی۔ پھر جب کھانا تیار ہُوا، تب حضرت علیہ الرحمۃ کے پاس لے گئے۔ آپ نے اس کو چکھ کر قادر بخش خاں سے پوچھا کہ تم نے آج یہ کھانا کیسا پکایا ہے کہ داغ کھا گیا؟ اُنھوں نے اپنا عُذر بیان کیا کہ مَیں حاجی عبداللہ کو گوشت سپرد کر کے نماز کو

آیا اور میرے پیچھے وُہ نماز کو چلے آئے۔ اس سبب سے گوشت میں داغ لگ گیا۔ یہ بات سُن کر بے ساختہ عادتِ شریف کے خلاف آپ کی زبان سے نکل گیا کہ تم اس کو گوشت سپرد کرکے نماز کو گئے، اُس مرڈود نے خبر نہ لی، گوشت جل گیا اور کھانے کے قابل نہ رہا۔ خلافِ عادت آپ کی زبان سے یہ سخت کلام سُن کر جو لوگ اس وقت وہاں حاضر تھے، سب خاموش ہو رہے، کسی نے کچھ دم نہ مارا۔ پھر آپ نے گوشت کی رکابی اُٹھا کر قادر بخش خاں کے حوالے کی اور روٹی دال کے ساتھ کھائی۔ پھر جب آپ کھانا کھا کر اور نمازِ عشا پڑھ کر فارغ ہُوئے اور معمُول کے موافق بیٹھے، اُس وقت قاضی علاء الدین اور میاں جی چشتی اور مولوی وارث علی اور مولوی امام الدین اور حافظ صابر صاحب وغیرہم نے آپس میں کہا: آج اِس وقت مرڈود کا لفظ خلافِ عادت زبانِ شریف سے نکلا ہے۔ ایسا سخت کلام کہنا آپ کی لیاقت سے بعید ہے۔ اس کی اطلاع آپ کو ضرور کرنی چاہیے اور آپ نے بارہا ہم لوگوں سے فرمایا بھی ہے کہ مَیں بھی بشر ہوں۔ اگر کسی وقت کچھ بیجا کلام شریعت کے خلاف میری زبان سے صادر ہو، تو مجھ کو ضرور اطلاع کرو اور جو نہ کرو گے، تو قیامت کے روز تمہارا دامن گیر ہونگا۔ سو اس بات کی اطلاع کرنی ہم پر واجب ہے کہ ہم اپنی طرف سے بری الذمہ ہو جائیں۔ اس بات پر متفق ہو کر سب آپ کے پاس دستور کے موافق آئے اور بیٹھے۔ پھر مولوی امام الدین صاحب بنگالی اور میاں جی چشتی صاحب بڑھانوی نے آپ کی خدمت میں عرض کی کہ سب بھائی لوگ جو حاضر ہیں کہتے ہیں کہ آج آپ نے گوشت کے جل جانے پر حاجی عبد اللہ کو مرڈود کہا۔ یہ کلام کسی مُسلمان کو کہنا کیسا ہے؟ آپ نے اُن کا یہ سوال سُن کر دیر تک سکوت فرمایا، اور کہا کہ یہ بات کسی مسلمان کو کہنی نہیں چاہیے۔ یہ کلمہ میری زبان سے بے اختیاری میں بے ساختہ نکل گیا اور بڑا قصُور ہُوا۔ اور تم سب بھائیوں نے خُوب کیا، جو اس قصُور سے مجھ کو آگاہ کیا۔ پھر آپ نے حاجی عبد اللہ کو اور باورچی خانے کے سب لوگوں کو بُلوایا اور ہر ایک جماعت کے بہت لوگ اُس وقت حاضر تھے اور حاجی عبد اللہ بہت سادہ مزاج، سلیم الطبع، صالح آدمی تھے۔ حضرت نے اُن کو اپنے پاس بٹھا کر فرمایا کہ حاجی صاحب، ہم تمہارے قصور مند ہیں۔ اس وقت غصّے میں بے خفیا

ہماری زبان سے مردود کا جو لفظ نکل گیا۔ ہماری یہ خطا للہ معاف کرو اور ہم سے مصافحہ کرو۔ وہ سُننے کم تھے۔ اپنے جی میں ڈر گئے اور عُذر کرنے لگے کہ حضرت، آپ کا سالن مجھ سے جل گیا، میں بہت نادم ہوں۔ یہ میری خطا اب خدا کے واسطے معاف کر دیں۔ آپ نے اُن کے کان میں زور سے پُکار کر کہا کہ تمھاری کچھ خطا نہیں ہے، خطا ہم سے ہُوئی کہ مردود کا لفظ ہماری زبان سے نکل گیا۔ تم ہم کو معاف کر دو۔ یہ بات سُن کر اُنھوں نے حضرت کا ہاتھ پکڑ لیا اور کہا کہ حضرت، مَیں نے مُعاف کیا۔ آپ میرے لیے دُعا کریں کہ اللہ تعالیٰ میری مغفرت کرے اور آپ نے مصافحہ کیا۔ پھر آپ نے اِسی مجلس میں سب کے سامنے بآوازِ کہا کہ مَیں اپنی خطا سے تَوبہ کرتا ہوں، اب کبھی ایسا بیجا کلام انشاء اللہ تعالیٰ، میری زبان سے نہ نکلے گا۔ پھر بہت دیر تک وعظ کے طور پر فرماتے رہے کہ ہر مسلمان بھائی کو چاہیے کہ اِس قِسم کے الفاظ، مثلاً، کافر، مُشرِک، مُنافِق، مردود وغیرہ کِسی مُسلمان کے حق میں اپنے منہ سے نہ نکالے اور ان لفظوں سے زبان کو روکے رہے اور جو کبھی بے اختیاری سے نکل جائے، تو اسی وقت توبہ کر لے۔ ان لفظوں سے ایمان میں نقصان آ جاتا ہے اور۔ اسی طرح بہت دیر تک آپ نے منہیاتِ شرعیہ کے الفاظ بیان کیے۔ اِس طرح آپ کی زبانِ ہدایت بیان میں تاثیر تھی کہ یہ کلامِ رُشد التیام سُن کر تمام حاضرینِ مجلس پر ایک عجیب حال واقع ہُوا کہ وُہ تحریر و تقریر میں نہیں آ سکتا۔ بعد اس کے آپ نے دُعا کی۔ پھر سب لوگ اپنے اپنے ڈیرے میں گئے اور آپس میں کہنے لگے کہ آج جو یہ لفظ حضرت کی زبان سے واقع ہُوا، یہ بھی حکمتِ الٰہی سے خالی نہ تھا کہ اس کے ذیل میں آپ نے منہیاتِ شرعیہ کے اور بہت سے الفاظ بیان کر کے ہم سب کو خبردار کر دیا۔ پھر اس کے کئی دن کے بعد جب مولانا محمد اسمٰعیل صاحب موضعِ امب سے تشریف لائے، تب بعض لوگوں نے حضرت کے مردود کہنے اور توبہ کرنے کا وُہ حال آپ سے بیان کیا۔ آپ نے فرمایا کہ اولیاء اللہ کی زبان سے جو کبھی وقت بشریّت کے بسبب کوئی کلام مکروہ شریعت کے خلاف نکل جاتا ہے اور وہ اس سے تَوبہ کرتے ہیں، تو حقیقت میں وُہ کلام حکمت اور فائدے سے خالی نہیں ہوتا اور نہ اس سے ان کا مرتبہ کم ہو جاتا ہے، بلکہ اُن کا درجہ اس کے بسبب بڑھ جاتا ہے۔ چنانچہ حضرتِ آدم علیہ السّلام کا گیہوں کھانا اور جنت سے

نکالا جانا بظاہر تو بے شک ان سے اللہ تعالیٰ کی نافرمانی ہوئی اور انھوں نے اپنی خطا سے توبہ کی اور اللہ تعالیٰ نے وُہ خطا عفو فرمائی۔ مگر اس میں حکمتِ الٰہی یہ تھی کہ اس خطا کے بسبب وُہ جنّت سے نکالے جائیں اور دُنیا میں آئیں، اُن سے انبیاءؑ، اولیاء، مومن، مسلمان، سب پیدا ہوں، دُنیا اور آخرت کا کارخانہ جاری ہو۔ اگر وُہ جنّت سے نہ نکالے جاتے، تو یہ کچھ بات نہ ہوتی۔ یا جیسے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے ایک قبطی کا خون ہو گیا اور وُہ فرعون کے خوف سے مدین چلے گئے اور اپنی خطا سے تائب ہُوئے۔ اللہ تعالیٰ نے اُن کی خطا معاف کی اور وہاں حضرتِ شعیب علیہ السلام نے اپنی صاحبزادی سے اُن کا نکاح کر دیا اور ایک عصا عنایت کیا پھر جب چند سال کے بعد اپنی بی بی کو ساتھ لے کر وہاں سے مصر کو چلے اور کوہِ طُور کے قریب پہنچے، تب وہاں اللہ تعالیٰ نے اُن کو درجۂ رسالت سے سرفراز فرمایا۔ اب خیال کیا چاہیے کہ اس خطا میں اور وہاں سے بھاگنے میں اللہ تعالیٰ کی کیا کیا حکمتیں تھیں۔ اگر اُن سے وُہ خطا نہ ہوتی، تو یہ فوائد کیونکر ظہور میں آتے؟ یا ان بزرگ لوگوں کا حال دریا کی مثال سمجھنا چاہیے کہ کبھی جب مینہ برستا ہے، تو ہر طرف سے گندہ و ناپاک سیلاب مع خس و خاشاک نالوں میں سے ہو کر دریا میں جاتا ہے اور دریا کو مکدّر کر دیتا ہے کہ نافہم لوگ جانتے ہیں کہ دریا کا پانی ناپاک اور نکمّا ہو گیا، طہارت کے قابل نہ رہا۔ حالانکہ وُہ دریا بدستور پاکی میں رہتا ہے، بلکہ اس کا پانی بڑھ جاتا ہے اور رفتہ رفتہ کچھ عرصے میں وُہ کدورت بھی زائل ہو جاتی ہے اور خلق اللہ کو اس سے نفعِ عام اور فائدۂ تام ہوتا ہے۔ اور اسی طور سے کئی مثالیں دے کر لوگوں کو سمجھایا۔ (اِنتہیٰ)

اِسی طرح اگر دَورانِ جنگ اور سلسلۂ جہاد میں مجاہدین سے کوئی بے عنوانی، کسی کی حق تلفی یا دِل آزاری کا کوئی واقعہ پیش آتا، تو اس پر آپ تمام رُفقاء و مُجاہدین کے ساتھ بڑے اہتمام سے استغفار کرتے اور اللہ تبارک و تعالیٰ سے دُعا کرتے کہ اس پر کوئی مواخذہ نہ فرمائے تاکہ ایک مسلمان کی تقصیر سے پوری جماعت اور مقصد کو نقصان نہ پہنچے۔ مولوی سیّد جعفر علیؒ لکھتے ہیں:

"مان خاں کنج پوری نے ایک مظلوم عورت کا حال بیان کیا۔ آپ جُمعے کے دن عصر

کے وقت پنجتار سے جانب مغرب شیشم کے درخت کے پاس تشریف لے گئے اور برہنہ سر ایک جماعت کے ساتھ دُعا و استغفار میں مشغول ہوئے اور اتنی گریہ وزاری فرمائی کہ حاضرین میں کہرام مچ گیا۔[1]

دُعا دین کے جن شعبوں کی اللہ تبارک و تعالیٰ نے آپ سے تجدید کرائی اور اُن کو نئی زندگی، قوّت اور رواج بخشا، اُن میں سے ایک دُعا ہے، جو عبودیت کا لُبِّ لُباب اور حضراتِ انبیاءؑ کی وراثت ہے۔ گزشتہ حالات سے معلوم ہُوا ہوگا کہ دُعا آپ کا خاص سلاح، سپر اور سرمایۂ زندگی تھا۔ ہر جنگ اور ہر اہم واقعے سے پہلے اور اس کے بعد اہتمام کے ساتھ دُعا کرنا آپ کا خاص معمول تھا۔ پھر دُعا بھی ایسی کہ دل نکال کر رکھ دیتے۔ اکثر برہنہ سر ہو کر اپنے عجز و انکسار، درماندگی، بیچارگی اور کمزوری، فقر و احتیاج کو اس الحاح و زاری کے ساتھ پیش کرتے کہ رحمتِ الٰہی کو جوش آتا، سُننے والوں کے دل اُمنڈ آتے اور آنکھیں اشکبار ہو جاتیں، سب پر عالمِ بیخودی طاری ہو جاتا اور قلوب دُعا کی قبولیت کی شہادت دینے لگتے۔ نواب وزیر الدولہ مرحوم نے "وصایا الوزیر" میں آپ کے ذوقِ دُعا اور کیفیتِ دُعا کا اِن الفاظ میں ذکر کیا ہے:

"دُعا اور خدا کے سامنے گریہ و زاری کا آپ کو بڑا ذوق تھا۔ لوگوں کو دُعا کی تعلیم دیتے اور خدا سے عرض و نیاز کا شوق دِلاتے۔ آپ کی مجلس میں عجیب و غریب کیفیت پیدا ہوتی اور ہر شخص اپنے ذوقِ ایمانی کے مرتبے کے مطابق لذّتِ ایمانی حاصل کرتا۔ اُس وقت خطراتِ شیطانی اور وساوسِ نفسانی یکسر معدوم ہو جاتے، آنکھوں سے آنسوؤں کی جھڑیاں لگ جاتیں، بعض شخص وارفتہ اور مدہوش ہو جاتے، حاضرینِ مجلس کو اس قدر صفائی باطن اور ترقیِ رُوحانی حاصل ہوتی جو دُوسرے اشغال و اذکار اور چِلّوں سے کم حاصل ہوتی۔"[2]

دُعا کا آپ کو اس قدر اہتمام اور اس پر اتنا اعتماد تھا کہ واقعۂ بالاکوٹ سے پہلے سچون کے

---

[1] منظورۃ السعداء　[2] وصایا الوزیر علی طریقۃ البشیر النذیر

زمانۂ قیام میں متواتر کئی روز دُعا کا معمول رہا۔ وقائع احمدی کی یہ روایت آپ کی نظر سے گزر چکی ہے کہ

"جن دنوں مشکوٰۃ شریف کا درس ہوتا تھا، ایک روز سیّد صاحبؒ نے مولانا محمد اسمٰعیل صاحب سے فرمایا کہ میاں صاحب، دل میں آتا ہے کہ اب چند روز جنابِ الٰہی میں خوب سے سب مل کر دُعا کریں، مگر اس طرح سے کہ ہم ایک گوشۂ تنہائی میں بیٹھ کر اکیلے دُعا کریں اور آپ سب بھائیوں کو ساتھ لے جا کر کہیں جنگل میں دُعا کریں۔ مولانا صاحب نے فرمایا کہ بہت بہتر، مَیں حاضر ہوں۔ سیّد صاحبؒ نے عصر کا وقت دُعا کرنے کے لیے مقرر فرمایا۔ ہر روز نمازِ عصر سے فارغ ہو کر سیّد صاحبؒ ایک کوٹھڑی میں اکیلے بیٹھ کر دُعا کرتے تھے، اور مولانا صاحب سب غازیوں کو اپنے ہمراہ لے کر بستی کے باہر ایک نالے پر جاتے تھے۔ پہلے آپ سب لوگوں کی طرف مخاطب ہو کر کچھ دیر وعظ و نصیحت فرماتے تھے، اس کے بعد برہنہ سر ہو کر کمالِ گریہ وزاری اور عجز و انکسار کے ساتھ جنابِ باری میں بہت دیر تک دُعا کرتے تھے۔ اس دُعا میں طرح طرح سے اپنی محتاجی و انکسار اور جنابِ باری کی عظمت و جبّاری اور رحمت و غفاری بیان کرتے تھے، دُعا کے بعد سب کو ہمراہ لے کر سیّد صاحبؒ کے پاس آتے تھے اور دُعا کرنے کا حال عرض کرتے تھے۔ یہ دُعا پانچ سات روز متواتر ہوئی۔"

نواب وزیر الدولہ مرحوم لکھتے ہیں کہ آپ کی تین خصوصیتیں تھیں :

ایک خشوع و خضوع اور گریہ و نیاز کے ساتھ نماز

دُوسرے قرآن کا علم و عمل

تیسرے دُعا مقبول۔[1]

---

[1] وصایا الوزیر

ایمان و احتساب دین کا دُوسرا اہم بالشّان شعبہ، جس کے آپ اپنے دَور میں مُجدّد تھے اور جو درحاصل پُورے نظامِ دینی کی رُوح رواں ہے، وہ ایمان و احتساب ہے، یعنی، زندگی کے تمام اعمال و اشغال میں صرف رضائے اِلٰہی کی طلب، نیّت کے استحضار اور موعود اجر و ثواب کی طمع میں انجام دیا جائے۔ اس سلسلے میں اللہ تبارک وتعالیٰ نے آپ کی ایسی تربیت فرمائی تھی کہ یہ ایمان و احتساب شروع سے آپ کا مزاج اور آپ کی فطرت بن گیا تھا۔ اپنے متعلق ارشاد فرماتے تھے کہ

"مَیں نے مُدّۃُ العُمر آنے جانے، لینے دینے، اُٹھنے بیٹھنے، حرکت وسکُون، غصّہ وبُردباری، قہر و مہر، کھانے پینے، پہننے اور سوار ہونے کا کوئی کام نہیں کیا، جس میں رضائے اِلٰہی کی نیّت نہ ہو اور کوئی کام مَیں نے نفس کے تقاضے اور خواہش سے نہیں کیا"۔[1]

آپ نے اس ایمان و احتساب کو مکمّل سلوک بنا دیا تھا اور چاروں طُرق کے ساتھ آپ اس میں بھی بیعت لیا کرتے تھے۔ یہ طریقِ نبوّت کا تزکیہ و تربیت تھی، جس سے پُوری زندگی اپنی تمام عبادات و عادات کے ساتھ خالص عبادت اور تقرّب اِلی اللہ کا ذریعہ بن جاتی۔ آپ اس کو طریقۂ محمّدیہ کے نام سے موسوم فرماتے، جمعدار مرتضیٰ خاں صاحب رامپوری لکھتے ہیں:

"رامپور میں حکیم غلام حُسین نائب والیِ ریاست کے بڑے بھائی حکیم عطاء اللہ اور میاں مُحمّد مقیم نے ایک روز بڑے ادب سے عرض کیا کہ جناب والا، پہلے طریقۂ چشتیہ، قادریہ، نقشبندیہ اور مُجدّدیہ میں بیعت لیتے ہیں، اس کے بعد طریقۂ مُحمّدیہ میں داخل فرماتے ہیں، اس کا سبب سمجھ میں نہیں آیا۔ اگر یہ سب طُرق طریقۂ مُحمّدیہ ہی ہیں، تو ان طُرق کے بعد طریقۂ محمّدیہ میں بیعت لینے کی کیا ضرورت ہے"؟

آپ نے فرمایا کہ اس کا اجمالی جواب تو یہ ہے کہ اصحاب طُرق نے اپنے

---

[1] وصایا الوزیر، نواب وزیر الدولہ مرحُوم

اپنے طریق کے مطابق اشغال کی تعلیم کی ہے۔ مثلاً طریقۂ چشتیہ اور قادریہ کے شیوخ بتاتے ہیں کہ ذکرِ جہر اس طرح کیا جائے اور ضرب اس طرح لگائی جائے۔ نقشبندی اور مجددی طُرق کے شیوخ بتاتے ہیں کہ ذکرِ خفی کریں اور یہ لطیفۂ قلب ہے اور وُہ لطیفۂ رُوح، اور یہ لطیفۂ نفس ہے اور وہ لطیفۂ سِر۔ لطیفۂ خفی یہ ہے اور لطیفۂ اخفیٰ فلاں، اور اسی طرح وُہ تمام لوازم، جو ہم اور تمام پیرانِ طریقت اپنے مریدوں کو تعلیم کرتے ہیں، اِن طُرق کی نسبت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے باطنی ہے، لیکن ہم طریقۂ محمدیہ کے اشغال کی تعلیم اس طرح کرتے ہیں کہ کھانا اس نیت سے کھایا جائے، کپڑا اس نیت سے پہنا جائے، نکاح اس نیت سے کیا جائے، سونے کی نیت یہ ہے، کپڑا پہننے کی نیت یہ ہو، زراعت، تجارت، ملازمت کی نیت یہ ہونی چاہیے۔ اِس طریقے کی نسبت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے ظاہری ہے۔"[1]

اس ایمان و احتساب کا آپ پر ایسا غلبہ تھا کہ جو لوگ چند روز آپ کے ساتھ رہتے، وُہ اس کے رنگ میں رنگ جاتے، نفس کا تقاضا نکل جاتا اور ہر کام میں رضائے الٰہی کی طلب غالب آجاتی۔ پچھلے صفحات میں آپ نے سید ابو محمد صاحب کا یہ پُر اثر واقعہ پڑھا ہے کہ آپ مہیار کی جنگ کے موقع پر سید صاحبؒ کی خدمت میں تشریف لائے اور کہا کہ

"میاں صاحب، جس روز سے مَیں آپ کے ساتھ اپنے گھر سے نکلا ہوں، آج تک میرا یہی خیال رہا کہ میرے عزیز اور رشتہ دار ہیں، مَیں ان کے ساتھ رہوں جو ان کو اللہ تعالیٰ کہیں عروج دے گا، تو ان کی وجہ سے میری بھی ترقی ہو گی۔ نہ مَیں آج تک خدا کے واسطے رہا اور نہ کچھ ثواب جان کر۔ مگر اب مَیں نے اس خیال فاسد سے توبہ کی اور از سرِ نَو آپ کے ہاتھ پر اللہ تعالیٰ کی رضامندی کے واسطے بیعت

---

[1] کتاب دافع الفساد و نافع العباد

جہاد کرنے کو آیا ہوں۔ آپ مجھ سے بیعت لیں اور میرے واسطے دُعا کریں کہ اللہ تعالیٰ مجھ کو اِس نیت اور ارادے پر ثابت قدم رکھے۔ آپ نے اُن سے بیعت لی اور اُن کے واسطے دُعا کی۔ اس وقت تمام حاضرین پر رِقّت سے ایک عجیب حال واقع تھا کہ ہر ایک کی آنکھ سے آنسو جاری تھے۔ دُعا کے بعد سیّد ابو محمّد صاحب آپ سے مُصافحہ کرکے اپنے گھوڑے کی طرف چلے۔ اُن کی آنکھوں سے آنسو جاری تھے اُنھوں نے بسم اللہ کرکے اپنا داہنا پاؤں رکاب میں رکھا اور بآوازِ بلند پکار کر کہا کہ سب بھائیو، اِس بات کے گواہ رہنا کہ آج تک گھوڑے پر اپنی شان و شوکت اور خواہش نفس کے لیے سوار ہوتے تھے، خدا کا واسطہ اس میں کچھ نہ تھا، مگر اس وقت ہم محض اللہ تعالیٰ کی خوشنودی و رضا جوئی کے واسطے بہ نیّتِ جہاد اِس گھوڑے پر سوار ہوئے ہیں۔"

درحقیقت اس ایمان و احتساب کے کمال اور غلبۂ حال کے بغیر یہ طویل المدۃ جہاد اور اس کے متنوّع اعمال و اشغال، طویل طویل وقفے اور اُن کے اندر کے مشاغل و اوقات، تزکیۂ رُوحانی اور ترقیِ درجات اور قُربِ خداوندی کا ذریعہ نہیں بن سکتے تھے، مگر ایمان و احتساب کی چٹکی ایسی تھی، جس نے اس پوری زندگی کو اکسیر بنا دیا تھا۔

اِتّباعِ سُنّت | نواب وزیر الدولہ مرحوم لکھتے ہیں کہ

"آپ مجسّم شریعت و سراپا اتّباعِ سُنّت تھے۔ فرماتے تھے کہ مجھے اللہ کے فضل سے فضائلِ ظاہری، مراتبِ باطنی، روشن دِلی اور صفائیِ قلب جو کچھ حاصل ہوئی ہے وہ سب اتّباعِ شریعت کی برکت اور پیرویِ سُنّت کی سعادت سے ہے۔"[1]

اتّباعِ سُنّت آپ کی زندگی اور آپ کی دعوت کا جُز بن گیا تھا۔ آپ کے نزدیک عبادات کے ساتھ معاملات اور امُورِ معاد کے ساتھ امُورِ معاش میں بھی اتّباعِ سُنّت اور ترکِ بدعات ضروری

---

[1] وصایا الوزیر

ہے۔ بیعت کے وقت آپ توحید و ترکِ اِشراک کے ساتھ اِتّباعِ سُنّت اور ترکِ بدعات کی تاکید فرماتے تھے اور ترکِ بدعت کا مفہوم اور دائرہ عبادات سے تجاوز کر کے عادات، معاشرت و معاملات پر حاوی ہے۔ ایک خلافت نامے میں ترکِ بدعت کی تشریح کرتے ہوئے ارشاد فرماتے ہیں:

امّا ترکِ بدعت، پس بیانش آنکہ در جمیع عبادات و معاملات و امورِ معاشیہ و معادیہ طریقِ خاتم الانبیاء محمد رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم بکمالِ قوّت و عُلوِّ ہمّت باید گرفت و آنچہ مردمانِ دیگر بعدِ پیغمبر صلّی اللہ علیہ وسلّم از قسمِ رُسومِ اختراع نمودہ اند، مثلِ رُسومِ شادی و ماتم و تجمّلِ قبور و بناءِ عمارات برآں و اسراف در مجالسِ اعراس و تعزیہ سازی و امثالِ ذلک، ہرگز پیرامونِ آں نباید گردید و حتّی الوسع سعی در محوِ آں باید کرد۔ اوّل خود ترک باید نمود، بعد ازاں ہر مُسلمانے را دعوت بسوئے آں باید کرد۔ چنانچہ اتّباعِ شریعت فرض ہست، ہمچنیں امر بالمعروف و نہی عن المنکر نیز فرض۔

ترکِ بدعت کی تشریح یہ ہے کہ تمام عبادات و معاملات اور اُمورِ معاشیہ و معادیہ میں حضرت خاتم الانبیاء محمد رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم کے طریقے کو پوری قوت اور بلند ہمتی کے ساتھ پکڑا جائے اور یہ جو آنحضرت صلّی اللہ علیہ وسلّم کے بعد لوگوں نے اس میں ایجاد کی ہیں، مثلاً رُسومِ شادی و غمی قبروں کی زیب و زینت، اُن پر عمارتوں کی تعمیر، عُرسوں کا اِسراف و فضول خرچی، تعزیہ سازی وغیرہ، ان کو ہرگز اختیار نہ کیا جائے اور حتی الامکان اُن کے مٹانے کی کوشش کی جائے۔ پہلے خود اُن کو ترک کیا جائے پھر ہر مسلمان کو اس کی طرف دعوت دینی چاہیے، اِس لیے کہ جیسے اتباعِ شریعت فرض ہے، اُسی طرح امر بالمعروف و نہی عن المنکر بھی فرض ہے۔

”صراطِ مستقیم“ کے دوسرے باب میں آپ نے سالک کو اِن تمام بدعات و رُسوم سے

بچنے کی ہدایت فرمائی ہے، جو مسلمانوں کی زندگی میں مختلف راستوں سے داخل ہو گئی تھیں۔ اس سلسلے میں آپ نے اپنی خداداد ذکاوتِ حس، دقیقہ رسی اور دُور بینی سے مسلمانوں کی پُوری زندگی کا جائزہ لے کر ان تمام بدعات کی نشان دہی فرمائی ہے، جو مسلمانوں کی زندگی کے مختلف شعبوں میں راہ پا گئی تھیں۔ آپ نے اُن کو تین قسموں میں تقسیم فرمایا ہے :

(۱) وُہ بدعات، جو تصوّف کو بدنام کرنے والے مُلحدین و مُشرکین کے اختلاط سے پَیدا ہُوئیں۔

(۲) جو روافض کے اثر سے مُسلمانوں میں آئیں۔

(۳) جو رُسُومِ فاسدہ کی پابندی سے پیدا ہُوئیں۔

اس طرح پُوری زندگی میں کہیں بدعت کی گنجائش نہیں رہتی۔

بدعات سے آپ کو ایسی طبعی کراہت و نفرت تھی کہ آپ کو اُن کا سایہ اور پرچھائیں بھی گوارا نہ تھی، قبر پرستی سے ایسی نفرت اور دحشت تھی کہ یہ بھی گوارا نہ فرمایا کہ آپ کے بعد آپ کی قبر پر اس کا امکان بھی باقی رہے۔ نواب وزیر الدولہ مرحُوم لکھتے ہیں :

"ایک مرتبہ حضرتؒ سے ایک شخص نے کہا کہ آپ قبر پرستی اور بزرگانِ دین کے مزارات پر مُشرکانہ اعمال اور بدعات سے اِس شدّ و مد کے ساتھ روکتے ہیں، لیکن خود آپ کے ہزاروں مُرید اور ہزاروں مُعتقد مُلک مُلک میں ہیں۔ آپ کی وفات کے بعد آپ کے مزار پر وُہی سب ہوگا، جو دوسرے بُزرگانِ دین کے مزارات پر ہو رہا ہے اور آپ کی قبر کی پرستش بھی اسی طرح ہو گی جس طرح ان کی قبروں کی پرستش اُن کی وفات کے بعد ہوتی ہے۔ حضرتؒ نے فرمایا کہ مَیں درگاہِ الٰہی میں بصد آہ و زاری درخواست کروں گا کہ اللہ تبارک و تعالیٰ میری قبر کو معدوم اور میرے مدفن کو نامعلوم کر دے۔ نہ قبر رہے گی، نہ اس پر شرک و بدعت ہوگا۔ خدا کی قدرت و رحمت ملاحظہ ہو کہ حضرتؒ کی یہ دُعا قبول ہُوئی اور آپ کی قبر کا

آج تک پتہ نہ چلا۔[1]

محبّت و خشیت | محبّت و محبُوبیّت ان حضرات کے خواص میں سے ہے، جن کے ساتھ اللہ تبارک و تعالیٰ کا معاملہ اِجتبا۔ و انتخاب کا ہوتا ہے اور وُہ مطلوب و مُراد ہوتے ہیں۔ اس کے آثار اُن کی زندگی میں ظاہر و نُمایاں ہوتے ہیں۔ سیّد صاحبؒ میں محبت کی نسبت اتنی غالب تھی کہ اُس کے اثرات پاس بیٹھنے والوں اور نماز کے اندر مقتدیوں کے اُوپر پڑتے تھے۔ مولوی سیّد جعفر علی تحریر فرماتے ہیں کہ

"اہلِ باطن می دریافتند کہ وقتیکہ حضرت امیرالمومنینؒ امامِ فرائضِ نماز می شُدند، بر دلِ مأمومین اثرِ محبّت و رغبت طاری می گردید۔"

نواب وزیرالدولہ مرحوم لکھتے ہیں کہ

"حضرت کبھی کبھی محبّتِ الٰہی کے جذباتِ سے مغلُوب ہو کر مندرجۂ ذیل اشعار پڑھتے:

دِلم براہ تو صد پارہ باد! وھر پارہ
ہزار ذرّہ! و ہر ذرّہ در ہوائے تو باد!

رُباعی

در مسلخ عشق ہر عدُو را نکشند — لاغر صفتان و زِشت خُو را نکشند
گر عاشقِ صادقی زکُشتن مگریز — مُردار بُود ھر آنکہ او را نکشند

قطعہ

اے آنکہ زنی دم از محبّت — از ہستی خویشتن بہ پرہیز
برخیز و بہ تیغِ تیز بنشیں — یا از رہِ راہِ دوست برخیز

---

[1] وصایا الوزیر، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ نواب صاحب مرحوم کے زمانے میں سیّد صاحبؒ کی قبر تحقیقی طور پر معلوم نہ تھی۔ اب بالاکوٹ میں جو قبر بتائی جاتی ہے، وُہ بالکل مشتبہ ہے۔

لیکن محبت کے ساتھ ساتھ کاملین پر خشیتِ الٰہی کا بھی غلبہ رہتا ہے۔ وُہ خُوب سمجھتے ہیں کہ خدا کی ذات بے نیاز ہے، اس کو کسی کی عبادت و اطاعت کی پروا نہیں، وُہ اُس کے فضل کے اُمیدوار بھی رہتے ہیں، اس کی نعمتوں اور رحمتوں کا مشاہدہ بھی کرتے رہتے ہیں اور اُس کی بے نیازی سے ڈرتے بھی رہتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے قرآنِ مجید میں خود فرما دیا ہے: وَهَلْ يَأْمَنُ مَكْرَ اللهِ إِلَّا الْقَوْمُ الْخَاسِرُونَ۔ (خدا کی پکڑ سے بجز اُن کے جن کی شامت ہی آگئی ہو، اَور کوئی بے فکر نہیں ہوتا)۔ (الاعراف: ع ۱۲)

نواب وزیر الدولہ مرحُوم لکھتے ہیں:

"حضرتؒ پر محبتِ الٰہی کے ساتھ خشیتِ الٰہی ہر وقت طاری رہتی تھی۔ سُوءِ خاتمہ کا ڈر ایسا غالب رہتا تھا کہ جو آپ کی صحبت میں رہا، اُس کا یہی حال بن گیا، اس کی مجلس و گفتگو میں یہی ذکر رہنے لگا، اُس کو دِن رات یہی کھٹکا لگا رہا، دُنیا کی دولت و عزت، وجاہت و اعزاز، عیش و عشرت اُس کو خاک معلوم ہونے لگے، رِقّت و خشیت کی تصویر بن گیا، اس کے ساتھ خدا کی محبتُ سرور نے اس کو ایسا وارفتہ و خود فراموش بنا دیا کہ دُنیا اُس کو بے حقیقت معلوم ہونے لگی اور وہ ایک ہی وقت میں باغِ خنداں اور دیدۂ گریاں بن گیا، اخلاصُ خشیت کا مُجسّمہ، سوز و دردمندی کی تصویر، جس کو دیکھنے سے خدا یاد آئے، جس کے پاس بیٹھنے سے دل گرمائے، رِقّت سے دل بھر آئے، دُنیا سے دل سرد ہو، دین کا جوش اُٹھے، عاقبت کی فکر ہو، عبادت و ذِکر کا ولولہ ہو، رضائے الٰہی کی طلب اور اعضاء و جوارح پر اس کا قبضہ ہو۔"[1]

[1] وصایا الوزیر

اُنچاسواں باب

صفاتِ اِمارت

قیادت کی ذِمّہ داریاں جماعتی کام کی ذِمّہ داری، ایک بڑی دینی تحریک کی قیادت مسلمانوں کے ایک بڑے گروہ کی اِمامت و اِمارت، جس میں مختلف المذاق افراد، مختلف صلاحیتوں اور استعدادوں کے اشخاص ہوں، بڑی وسیع اور متنوع صلاحیتوں کی طالب ہے۔ اس کے لیے ایسا ہی شخص موزوں ہو سکتا ہے، جو بیدار مغز، عالی دماغ، فراخ حوصلہ، کشادہ قلب، عالی ظرف، متحمل، سلیم الفہم، متوازن دماغ اور جوہر شناس ہو جس میں مختلف شعبوں اور کارخانوں کے چلانے اور مختلف عناصر اور متضاد طبائع کو ساتھ لے چلنے کی صلاحیت ہو، جو اپنے دینی مقاصد اور دین کی ترقی و عروج کے لیے ہر صلاحیت اور ہر جوہر اور ہر کمال کی قدر کرنے والا، ہر استعداد اور ہر سطح کے آدمی کی تربیت و ترقی کی قابلیت رکھتا ہو اور اُس کے جوہر کو چمکا سکتا ہو، کسی سطح اور کسی استعداد کا آدمی اُس کے پاس آکر اپنے کو بیکار اور اپنی زندگی کو ضائع سمجھنے پر مجبور نہ ہو، اور کوئی صاحبِ ہنر اور صاحبِ کمال اُس کے پاس پہنچ کر اپنے ہنر اور اپنے کمال پر متأسف اور نادِم نہ ہو، بلکہ اُس کو یہ محسوس ہو کہ وہ اپنے اس ہنر اور خصوصی کمال سے دِین کی ایک خصوصی خدمت انجام دے سکتا ہے، دینی خدمت کا ایک خانہ ایسا ہے، جو تنہا وہی بھر سکتا ہے۔ جن لوگوں کا نشأ و نما علیٰحدہ علیٰحدہ ہوا، وہ یہاں پہنچ کر یہ محسوس

کریں کہ وہ اِس دینی جدّ و جہد اور اِس دینی جماعت کے چوکھٹے میں کہیں موزوں نہیں ہو سکتے، بلکہ یہ محسوس کریں کہ مربّیِ مطلق نے اُن کی اِسی کام کے لیے تربیت کی تھی اور اُن کی حقیقی جگہ یہیں ہے۔ وہ مختلف باغوں اور مختلف خوشبو کے پھولوں سے ایک ایسا انسانی گلدستہ تیار کر سکتا ہو جس کے سب پھول ایک مقصد کے رشتے سے جُڑے اور محبّت کے دھاگے سے بندھے ہوئے ہوں اور اُن کی مجموعی خوشبو سے مجلس معطّر ہو، شعبوں کی کثرت، رُفقاء کا اختلافِ ذوق اور ان کی صلاحیتوں اور استعدادوں کا نشیب و فراز اس کی طبیعت میں انتشار نہ پیدا کر سکے۔ وہ ایک کی قدردانی کے لیے دوسرے کی دل شکنی اور ناقدری ضروری نہ سمجھے، بلکہ ہر ایک سمجھے إِنَّهُ أَكْرَمُ عَلَيْهِ مِنْ صَاحِبِهِ (وہ سب سے زیادہ مقرّب اور عزیز ہے) وہ انسانی فطرت سے کش مکش اور زور آزمائی نہ کرے، بلکہ اُس کی رعایت اور احترام کرتے ہوئے مشترک مقصد کے لیے اس کے ملکات اور صلاحیتوں کی پرورش کرے اور اُن کو زیادہ سے زیادہ کارآمد بنائے۔

سید صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے طالبِ راہِ نبوّت کی تربیت کے سلسلے میں بعض صفات و خصوصیات کا تذکرہ فرمایا ہے، جو بعض صفاتِ الٰہی کے مراقبے اور سلوکِ راہِ نبوّت کی خصوصیات ہیں۔ اُن میں سے ایک "شانِ وسعت" ہے۔ اِس سلسلے میں آپ نے جو کچھ فرمایا ہے، وہ ایک "امام" کی اِس صفتِ جامعیت کو پورے طور پر ظاہر کرتا ہے۔ آپ فرماتے ہیں:

و من جملہ آں شانِ وسعت است	اور من جملہ اُن کے شانِ وسعت ہے کہ
کہ در نفس کاملۂ انسانیہ وسعتِ حوصلہ	انسان کے نفس کاملہ میں وسعتِ حوصلہ
نمونۂ الیست۔ ازاں بیانش آنکہ چنانکہ	اس کا نمونہ ہے۔ اس کی تشریح یہ ہے کہ
بعضے نفوسِ کاملۂ بشریہ در مرتبۂ	جس طرح بعض مکمل بشری نفوس فراخیٔ
قصوی از مراتبِ وسعتِ صدر واقع	سینہ میں اعلیٰ مرتبے میں ہوتے ہیں کہ مختلف
می شوند کہ از ہجومِ اُمورِ متشتتہ و معاملاتِ	اُمور کے ہجوم، مختلف معاملات، متعدد
مختلفہ و کارخانجاتِ متعددہ دل تنگ	کارخانوں سے دل تنگ اور

پراگندہ خاطر نمی شوند، بلکہ بہ ہر امر توجّہے
مبذول می سازند و ہر یک مُعاملہ را
بخُوبی سر انجام می دہند و ہر یک کارخانہ
را بحدے کہ شایانِ اوست، می دارند
نہ بحدے افراط می کنند کہ در یک
کارخانہ ہمگی ہمّتِ خُود غرقِ شدہ کارخانۂ
دیگر را برباد دہند یا اہلِ آں کارخانہ را
چنداں قُوّتِ تسلُّط دہند کہ اہلِ
کارخانجاتِ دیگر مثلِ رعایا در دستِ
ایشاں مقہُور شدہ خود ایشاں را فراموش
کنند و نہ چنداں تفریط می ورزند
کہ آں کارخانہ بے رونق شود و اہلِ
آں چادرِ مذلّت پوشیدہ در زاویۂ
خُمول و تعطّل بنشینند و ہمچنیں در امرِ
مُلاقات مع النّاس وُسعتِ عُظمیٰ می
دارند کہ با ہر یکے از اشخاصِ مُختلف
الاستعدادات والأمزجہ و مُتغائرِ
الحاجات والاغراض بوضع پیش
می آیند کہ شایانِ اوست و مُعاملۂ
بر رُوے کار می آرند کہ پیمانۂ استعدادِ
آں شخص پُر شود و در ذہن چناں نشیند

پراگندہ خاطر نہیں ہوتے۔ بلکہ ہر معاملے پر توجّہ
مبذول رکھتے ہیں اور ہر کام کو بحُسن و خوبی انجام
دیتے ہیں اور ہر کارخانے کو جیسا کہ اس
کے لائق ہے، چلاتے ہیں، نہ اتنی زیادتی
کرتے ہیں کہ ایک ہی کارخانے میں
محو ہو جائیں اور دُوسرے کارخانے
کو تباہ کر دیں یا اس کارخانے کے لوگوں
کو اتنا تسلُّط دے دیں کہ دوسرے کارخانے
والے رعایا کی طرح اُن کے ہاتھوں میں
مجبُور ہو جائیں اور اُن کو بھُول جائیں،
اور نہ اتنی کمی کرتے ہیں کہ وُہ کارخانہ
بے رونق ہو جائے اور اس کے مُتعلّقین
چادرِ مذلّت اوڑھ کر زاویۂ خمُول و
تعطّل میں بیٹھ رہیں۔ اور اسی طرح
لوگوں سے ملاقات کرنے میں بڑی وسعت
رکھتے ہیں۔ مختلف الاستعداد، مختلف
الطبائع، مُتغائر الحاجات والاغراض
اشخاص میں سے۔ ہر ایک کے ساتھ
اس طرح سے پیش آتے ہیں، جیسے کہ
اس کے لائق ہوتا ہے اور اُس سے ایسا
معاملہ کرتے ہیں جو اُس کے پیمانۂ استعداد کے

کہ اختصاصے کہ مرا باایشاں بہم رسیدہ کسے را از دیگراں، اگرچہ اعلیٰ وارفع باشد باعتبار خدمت و مرتبت از من باشند، حاصل نشدہ باشد۔[1]

مطابق ہوتا ہے اور اُس کے ذہن میں بیٹھ جاتا ہے کہ جو تعلّق اور خصوصیت مجھ سے ہے، وُہ ایسے شخص سے بھی نہیں ہے، جو باعتبار خدمت و مرتبت مجھ سے ارفع و اعلیٰ ہے۔

پچھلے صفحات سے آپ کو اس کا اندازہ ہؤا ہوگا کہ اللہ تعالیٰ نے یہ جامعیت اور یہ شانِ امامت سیّد صاحبؒ کو عطا فرمائی تھی۔ اُوپر کے اقتباس میں اُنھوں نے سالکِ راہِ نبوّت کی جس شان وُسعت کو بیان کیا ہے، وُہ بدرجۂ اتمّ اُن میں موجُود تھی۔ دین کے مُختلف شُعبے اُن کی ذات اور جماعت سے وابستہ تھے۔ دین کی تجدید و احیا کے عظیم و وسیع کام میں ہر طرح کی صلاحیتیں اور استعدادیں اور ہر ذُوق و رُجحان کے لوگ مصرُوف تھے۔ جسمانی قوّت، فنِ سپہ گری، قوّتِ تدریس، علمی استعداد، سلیقۂ تصنیف و تالیف، تحریر و انشاء، ادب و شاعری، تدبّر و سیاست، دولت و امارت، قوّتِ قلبی اور کمالِ باطنی، سب دین کی خدمت میں مصرُوف تھے اور اپنا اپنا کام انجام دے رہے تھے۔ معمولی حیثیت کے سپاہی، ناز و نعم کے پلے ہُوئے شریف زادے، صاحبِ سلسلہ مشائخ، مُحقّق عُلماء، زبان آور ادیب و شاعر سب ایک دُوسرے کے دوش بدوش خدمتِ دین کے مَیدان میں کام کر رہے تھے اور اپنی مخصوص صلاحیتوں سے کام لے رہے تھے۔ اُن میں سے کسی کی صلاحیت اور جوہر کی تحقیر نہیں ہوتی تھی۔

آپ جماعت کے افراد میں سے جس فرد میں جو نمایاں خصوصیّت و استعداد دیکھتے تھے، وُہی خدمت اُس کے سپُرد فرماتے تھے اور اُس کی اسی استعداد کی ہمّت افزائی اور سرپرستی فرماتے تھے۔ بعض بعض ممتاز افرادِ جماعت کو جہاد بالسّیف کے بجائے آپ نے تبلیغ و دعوت اور اصلاح و تربیت پر مامُور فرمایا اور باصرار اُن کو اِس مُہم پر روانہ کیا اور واقعات نے ظاہر کر دیا کہ وُہ ان کے پورے اہل تھے اور اُن کی ذات سے ہزاروں بندگانِ خدا کو ہدایت ہُوئی۔ چنانچہ مولانا

---

[1] صراطِ مستقیم صفحہ ۱۸۵

سیّد محمد علی رامپوریؒ اور مولانا ولایت علی عظیم آبادی کو سرحد سے ہدایت و اصلاح کے لیے جنوبی ہند بھیجا اور اُن کے حق میں دُعا بخیر فرمائی اور اُن کی کامیابی کی اُمید ظاہر کی۔ مولانا ولایت علی صاحب پر سیّد صاحبؒ کی جُدائی بہت شاق تھی۔ آپ نے فرمایا: "مولانا، ہم آپ کو تخم کرکے اُٹھاتے ہیں" چنانچہ لوگوں نے دیکھا کہ ہدایت و اصلاح کا یہ تخم کیسا بارآور ہُوا اور ان دونوں بزرگوں بالخصوص مولانا ولایت علی عظیم آبادی نے بالاکوٹ کے حادثے کے بعد سیّد صاحبؒ کی نیابت اور جماعت کی تنظیم و امارت کا کام کس کامیابی اور خوش اسلوبی سے انجام دیا۔

مولانا کرامت علی جونپوریؒ سے آپ نے بیعت لینے کے بعد ہی اوّل ہی ہفتے میں فرمادیا کہ اب ہدایت کے کام میں لگ جائیے اور شجرہ و خلافت نامہ بتوسط حضرت مولانا شاہ اسمٰعیل شہید رحمۃ اللہ علیہ عطا فرمایا۔

مولانا کرامت علیؒ کو جہاد بالسّیف کا ازحد شوق تھا۔ چنانچہ اسی شوق میں آپ نے فنِ سپہ گری و شمشیر زنی کو محنت سے حاصل کیا تھا۔ جب سیّد صاحبؒ نے جہاد کے لیے روانگی کا قصد کیا، تو مولانا مرحوم نے بھی آمادگی ظاہر کی۔ آپ نے اس کا مشورہ نہیں دیا، بلکہ جہاد باللّسان کے لیے حکم دیا اور فرمایا کہ "تم سے خدا کو وراثتِ نبویؐ اور تبلیغِ دین کا کام لینا منظور ہے اور تمہارے اندر اس کی استعداد و دیعت فرما دی ہے۔ تمہارے لیے یہ تبلیغی کام جہادِ اکبر ہے اور تمہاری زبان و قلم میری ہدایت کی توسیع اور ترجمانی کریں گے۔" یہ پیشین گوئی حرف بحرف پُوری ہُوئی۔ مولانا کرامت علیؒ کی تبلیغ و دعوت سے بنگال کے لاکھوں آدمی ہدایت یاب ہُوئے اور اُنھوں نے اسلام کی راہ پائی۔

جماعت کے نمایاں اشخاص پر ایک نظر ڈالنے سے اس کا اندازہ ہو جائے گا کہ ہر صلاحیت اور ہر کمال اور ہر ذوق کے لوگ اس میں شامل تھے اور سب اپنی مخصوص صلاحیت اور ذوق سے جماعت اور اُس کے مقاصد کو کسی نہ کسی طرح کا فائدہ پہنچا رہے تھے اور سب سے کم درجے کی بات یہ ہے کہ اس جماعتی تعلّق اور محبّت کی وجہ سے وُہ صحیح عقائد پر قائم اور شرک و بدعات اور معصیت و بغاوت کی زندگی سے محفوظ تھے۔ آپ کو اس جماعت کے مخلصین میں جہاں حضرت شاہ اسمٰعیل شہیدؒ

اور مولانا عبدالحیؒ جیسے سرآمدِ روزگار فضلاء، حاجی عبدالرحیمؒ ولایتی اور مولانا محمد یوسفؒ پھلتی جیسے صلحاء نظر آئیں گے، اُردو کے سب سے بڑے غزل گو شاعر اور اُستادِ عصر حکیم مومن خاں دہلوی بھی شریکِ بزم نظر آئیں گے۔ سرحد سے ہندوستان کے اہلِ تعلّق کو جو خطوط لکھے گئے ہیں۔ اُن میں جہاں علماءِ عصر اور مشائخ وقت کو سلام و پیام لکھا ہے، وہاں مومن خاں کو بھی خصوصیّت سے سلام پہنچایا گیا ہے اور محبّت و خصوصیت کے اِن الفاظ کے ساتھ،

"از طرفِ امامِ ہُمام بخدمتِ معدنِ غیرتِ ایمانی، منبعِ حمیّتِ اسلامی مومن خاں سلام شوق برسد"

مولانا اسمٰعیلؒ اپنے خطوط میں اُن کو سلام لکھتے ہیں، تو "ہدایت نشان مودّت عنوان" کے خطاب سے یاد فرماتے ہیں۔ اس تعلّق و اعتماد کا یہ اثر ہے کہ خاں صاحب آخر آخر تک عقائدِ صحیحہ پر قائم رہے اُن کا مشہور مصرع زبان زد ہے۔ ؎

مومن نہیں، جو ربط رکھیں بدعتی سے ہم

اُن کے مجموعۂ کلام میں مثنویِ جہادیہ اور قصیدۂ منقبت اب بھی یادگار ہے، جس کا یہ شعر اُن کے اس قلبی تعلّق و ارادت کو ظاہر کرتا ہے :

گلابِ ناب سے دھوتا ہوں مغزِ اندیشہ
کہ فکرِ مدحتِ سبطِ قسیمِ کوثر ہے

ایسی گوناگوں خصوصیات رکھنے والی جماعت کے نظم، نیز ایک دینی ریاست کے انتظام کے لیے، جس کی آپ داغ بیل ڈال رہے تھے، اعلیٰ درجے کی فراست اور مردُم شناسی کی ضرورت تھی، مختلف ذمّہ داریوں کے لیے موزوں و صحیح آدمیوں کا انتخاب اور ہر شخص سے اُس کی صلاحیت اور استعداد کے مطابق کام لینے کے لیے ہر شخص کو سمجھنے اور اُس کی استعداد و استطاعت کا صحیح اندازہ کرنے کی ضرورت تھی۔ اللہ تعالیٰ نے آپ کو یہ جوہر بدرجۂ کمال عطا فرمایا تھا۔ نواب وزیر الدولہ مرحوم لکھتے ہیں :

"آپ بڑے صاحبِ فراست اور مردم شناس تھے۔ کوئی شخص کیسا ہی دانا،

معاملہ فہم اور تجربہ کار ہوتا، لیکن اگر اُس کو ذرا بھی کسی عہدے کا شوق یا امارت کی طلب ہوتی، تو لوگوں اور مُقربین کی سفارش کے باوجُود اُس کو وُہ عُہدہ سپُرد نہ کرتے۔ اگرچہ آغاز سے حضرت کا یہی مذاقِ طبیعت تھا، مگر سرحدی فتوحات کے زمانے میں سختی سے اس اصُول پر کاربند رہے۔ سرحدی فتوحات کے بعد مختلف ممالک سے لوگوں کا ہجوم ہُوا، جن میں سے اکثر جہاد کی نیت سے اور کمتر حکومت و منصب کی طمع میں دُور دُور سے آئے اور ان میں بہت سے لوگوں نے اپنی شان میں قصیدہ خوانی کی اور اپنے مناقب و فضائل اور کارنامے بیان کیے، لیکن حضرت نے ہمیشہ معتبر، آزمودہ کار اور متّقی و مُتدیّن لوگوں کو عُہدے دیے۔

مولانا محمّد یُوسف صاحب (برادر زادۂ حضرت شاہ ولی اللہ صاحب دہلویؒ) جو سیّد صاحبؒ کے نزدیک لشکرِ اسلام کے قطب تھے، اس جماعت میں امین الاُمّۃ حضرت ابُوعبیدہ بن الجراحؓ کے قائم مقام تھے۔ آپ جماعت کے خازن اور بیت المال کے محافظ تھے۔ عطایا اور اموال کی تقسیم آپ ہی کے سپرد تھی۔ تقسیم میں بے انتہا احتیاط اور تدقیق سے کام لیتے اور خود امیر المومنین کے حصّے میں ذرا زیادتی روا نہ رکھتے، اگر کبھی سیّد صاحبؒ مزاحًا فرماتے کہ مولانا، مجھے کچھ زیادہ نہیں دیتے، تو مولانا نہایت ادب سے عرض کرتے کہ اگر حکم ہو، تو سارا مال قدموں پر ڈال دُوں، لیکن تقسیم میں مجھ سے کمی زیادتی نہیں ہوسکتی، اس میں مساوات ہی ہوگی

امانت اور دیانت داری کے امتحان کے لیے آپ کبھی عجیب طریقہ اختیار فرماتے، آپ جب کبھی کسی کی دیانت داری کا امتحان کرنا چاہتے، تو اُس کو کسی وقت کچھ پیسے یا روپے رکھنے کو دے دیتے اور بہت دنوں تک اُس کا تقاضا نہ کرتے۔ پھر کسی وقت دفعتًہ اس کا مُطالبہ کرتے۔ اگر وُہ شخص امین ہوتا، تو فورًا حاضر کر دیتا، ورنہ تاخیر ہوتی اور امتحان میں ناکامیاب ہوتا۔"[1]

[1] وصایا الوزیر

پچاسواں باب

تجدید و اِمامت و تزکیۂ باطن

مقامِ تجدید کُتُبِ سُنن کی حدیث ہے :

اِنَّ اللّٰہَ یَبْعَثُ عَلٰی رَاْسِ کُلِّ مِائَۃِ سَنَۃٍ مَنْ یُّجَدِّدُ لِھٰذِہِ الْاُمَّۃِ اَمْرَ دِیْنِھَا ۔	اللہ تعالیٰ ہر سو برس کے اُوپر ایسے شخص کو پیدا کرے گا جو اِس اُمّت کے لیے اس کا دین نیا اور تازہ کر دے ۔

"تجدیدِ دین" اسلام میں بہت بلند مقام اور مخصوص رُتبہ ہے ۔ رسُول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم کے بعد کوئی نبی آنے والا نہیں ، اس لیے تجدیدِ دین کا کام اللہ تعالیٰ وقتاً فوقتاً آپ کی اُمّت کے چند اُولوالعزم افراد سے لے گا ، جن کی کوششوں اور مسیحا نفسی سے دین میں جان پڑے گی اور اہلِ دین میں نئی زندگی پیدا ہوگی ۔ بہت سے لوگوں نے ، جو اس مقام سے واقف نہیں ، محض کثرتِ تصنیف یا تبحّرِ علمی کو کافی سمجھا اور مجدّدینِ اُمّت کی فہرست ترتیب دی ، جس پر بحث کرنا اس وقت ہمارے دائرے سے خارج ہے ۔ عُلماء و مبصّرین کے ایک بڑے گروہ کا خیال ہے کہ حضرت سیّد احمد صاحبؒ تیرھویں صدی کے مُجدّد تھے اور اگر تجدیدِ دین کوئی چیز ہے ، تو آپ کی ذات سے اس کا ظہور ہوا ۔ سیّد صاحبؒ کی تجدید کی ایک بڑی خصوصیّت یہ ہے کہ وہ اپنے اصُول و مبادی میں ،

اپنی جامعیت میں اور اپنے نظام و ترتیب میں اور اپنے نتائج و آثار میں اسلام کی اصل دعوت سے بہت مشابہ اور قریب ہے اور حقیقت میں کسی ایسی ہی ہمہ گیر اور بنیادی کوشش پر "تجدید" کا لفظ (جس کے معنی اصل دین کو نیا اور تازہ کر دینا ہے) منطبق ہوتا ہے۔

سید صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا اصل کام، جس کی تاریخ و تفصیل کئی سو صفحوں پر پھیلی ہوئی ہے، اسی نقطے سے شروع ہوتا ہے، جو اصل اسلامی دعوت کا نقطۂ آغاز ہے اور ہمیشہ اس کی ہر تجدیدی کوشش کا نقطۂ آغاز رہے گا، یعنی، صحیح اور کامل مسلمان پیدا کرنا، اسلام کی دعوت کو نئے سرے سے اسی قوت اور روح کے ساتھ پیش کرنا، جس طرح اس زمانے میں اس کی ضرورت ہے۔

یہ تحریک جس طرح شروع ہوئی اور جہاں تک پہنچی، اس کی تفصیل گزشتہ اوراق میں نظر سے گزر چکی ہے اور اس کے نتائج اور عملی مثالیں آئندہ اوراق میں نظر سے گزریں گی۔ اس تجدید سے مسلمانوں کی عام زندگی میں جو مجموعی انقلاب برپا ہوا، اس موقع پر اس کے بعض پہلوؤں کی طرف توجہ دلانا مقصود ہے۔

اسلام کی طرف رجوعِ عام پہلا انقلاب حقیقی اسلام کی طرف بازگشت اور دینی زندگی کا احیاء ہے، جو پہلی حالت کی نسبت سے انقلابِ عظیم ہے۔ اس بارے میں آپ کا شمار امت کے عظیم ترین مصلحین اور مجددین میں ہے۔ آپ کے وجود نے اسلام کے حق میں بارانِ رحمت اور بادِ بہاری کا کام کیا۔ آپ کے ہاتھ پر لاکھوں انسانوں نے توبہ کی، خدا کا نام سیکھا اور دین کا راستہ اختیار کیا۔ فساق و فجار ابرار و اخیار ہو گئے، ہزارہا غافل و کم ہمت شیخِ وقت اور سالکِ طریق بن گئے۔ آپ جدھر سے گزرے، عمل کا شوق، عبادتِ الٰہی کا ذوق، اتباعِ سنت کا ولولہ پیدا ہو گیا، طاعات آسان ہو گئیں، معاصی سے نفرت ہو گئی، خشیتِ الٰہی پیدا ہو گئی۔ جہاں آپ نے کچھ دن قیام کیا، شراب کی دوکانیں بند ہو گئیں، میخانوں میں خاک اڑنے لگی، مسجدیں آباد ہو گئیں۔ جب آپ سفرِ حج کے لیے مکان سے چلے تھے، تو آپ نے فرمایا تھا:

"مجھ کو عنایتِ الٰہی سے اُمیدِ قوی ہے کہ اس سفر میں اللہ تعالیٰ میرے ہاتھوں لاکھوں آدمیوں کو ہدایت نصیب کرے گا اور ہزاروں ایسے لوگ کہ دریائے شرک و بدعت اور فسق و فجور میں ڈوبے ہوئے ہیں اور شعائرِ اسلام سے مطلق ناواقف ہیں، وہ پکّے موحّد اور متّقی ہو جائیں گے۔"

کتاب کا باب سوم (سفرِ حج) پڑھنے والے جانتے ہیں کہ یہ پیشین گوئی حرف بحرف پوری ہوئی۔

ہندوستان میں آپ کی دعوت و اصلاح نے قلوب میں جو ایک عام حرکت اور زندگی میں جو ایک عام انقلاب پیدا کر دیا تھا اور مسلمانوں نے جس طرح اس دعوت کا استقبال کیا اور اُن کے ہر طبقے نے اس سے فائدہ اُٹھایا، اس کا کچھ اندازہ مولانا ولایت علی عظیم آبادیؒ کی اس تحریر سے ہوگا:

"جس وقت دعوت کی آواز ملکِ ہندوستان میں بلند ہوئی، تمام ملک کے لوگ پروانوں کی طرح اس شمعِ ہدایت پر ہجوم کرنے لگے یہاں تک کہ ایک ایک روز میں دس دس ہزار آدمیوں کی جماعت بیعت ہونے لگی۔ ان کا گروہ روز بروز بڑھتا گیا اور ہزارہا انسان اپنا دین چھوڑ کر اسلام سے مشرّف ہوئے اور ہزارہا لوگوں نے مذاہبِ باطلہ سے توبہ کی۔ پانچ چھ برس کے عرصے میں ہندوستان میں تیس لاکھ آدمیوں نے حضرت سے بیعت کی اور سفرِ حج میں تقریباً لاکھ آدمی بیعت سے مشرّف ہوئے۔ ان سب لوگوں میں ہزارہا عالم ہیں اور ہزارہا عاقل اور سیکڑوں حافظ ہیں اور سیکڑوں مفتی اور بہتیرے جہاندیدہ ہیں اور بہتیرے کار آزمودہ۔ اس سے صاف ظاہر ہوا کہ اللہ کے حضور میں اُن کی بڑی مقبولیت اور تائید ہے کہ تمامی خلائق کا دل اُن کی طرف بے اختیار کھنچا جاتا ہے اور وہ بے اختیار ہو کر مُرید ہوتے ہیں۔"[1]

---

[1] رسالۂ دعوت مشمولۂ مجموعۂ رسائل تسعہ از مولانا ولایت علی عظیم آبادیؒ۔ صفحہ ۶۵

پھر اس دعوت کے اثرات اور اس کے اثر سے زندگی کے تغیرات کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں :

"اس متبرک گروہ کا اثر دریافت کیا چاہیے کہ جو شخص اعتقاد کے ساتھ اس گروہ میں داخل ہوا اور اس نے بیعت کی، اسی وقت سے اس کو دنیا سے نفرت اور عاقبت کا خوف پیدا ہوتا ہے اور روز بروز یہ کیفیت بڑھتی جاتی ہے اور شرک و بدعت سے محض پاک ہو جاتا ہے اور اللہ کی محبت اور عظمت، شرع کی تعظیم و توقیر، نماز کا شوق، سب اس کے دل میں جگہ پکڑتے ہیں، اللہ کے مخالف اس کو برے لگتے ہیں، اگرچہ باپ دادا ہوں، بیٹا بیٹی یا پیر استاد۔ دل میں اللہ کا خوف کچھ ایسا آ جاتا ہے کہ ان کی مروت ہرگز باقی نہیں رہتی۔ اکثر لوگوں نے عمدہ نوکریاں چھوڑ دی ہیں، حرام پیشے ترک کر دیے اور کتنے خانماں سے ہاتھ اٹھا کر محض اللہ کے واسطے نکل پڑے اور اس گروہ کے سبب ایک عالم نمازی ہوا، بلکہ اس گروہ کو دیکھ کر گمراہ کرنے والے بھی اپنے معتقدوں کو نماز کی تقیید کرنے لگے کہ ہمارے لوگ کہیں ہم سے نہ پھر جائیں۔"[1]

مولانا کرامت علی جونپوریؒ لکھتے ہیں :

"اس امت مرحومہ کے واسطے حضرت قطب الاقطاب امیر المومنین سید احمدؒ کو اس تیرھویں صدی کا مجدد پیدا کیا اور اس جناب نے دین کو تازہ اور نیا کر دیا اور غافلوں کو ہوشیار کر دیا اور دین کے علم کو خوب پھیلایا اور اس طرح فہمائش کر کے ذکر و مراقبہ تعلیم کیا اور مشاہدے کی حقیقت کو ایسا سمجھا دیا کہ جو نعمت برسوں میں حاصل نہ ہوتی تھی، سو اس جناب کے طریقے میں بآسانی ایک ہفتے عشرے میں حاصل ہونے لگی۔ ان کے اوصاف و کرامات لکھنے کی حاجت

---

[1] رسالۂ دعوت، صفحہ ۶۸

نہیں، تمام مُلک میں مشہور ہیں۔ اِس سے بڑھ کر کیا کرامات ہوگی کہ اِس مُلک کے مردوں، عورتوں میں نماز روزہ خُوب جاری ہوگیا؟ اور آگے ہندوستان کے پیرزادوں اور مولویوں سے لے کر عوام تک کی عورتوں میں نماز کا چرچا بھی نہ تھا اور اب ہر قوم کی عورت مرد نمازمیں بالکل مُستعد ہوگئے ہیں۔ قرآن شریف کا صحیح اور باتجوید پڑھنا اور قرآن شریف کا حفظ خُوب جاری ہوگیا ہے اور حافظوں کی کثرت ہوگئی ہے یہاں تک کہ عوام کی عورتیں حافظ ہوگئیں اور دیہات اور شہروں میں لوگ حفظ کر رہے ہیں اور پرانی مسجدیں آباد ہوگئیں اور نئی مسجدیں بننے لگیں، ہزاروں آدمی مکّے مدینے کے حج اور زیارت سے مُشرّف ہوئے اور شرک و بدعت اور کُفر کی رسم اور خلافِ شرع کام سے لوگ باز آگئے اور سب کو دین کی تلاش ہوئی، اور دینی کتابیں، جو نادر و کمیاب تھیں، سو شہر گاؤں میں ہر کہیں گھر گھر پھیل گئیں، اور حقیقت میں حضرت سیّد احمد صاحبؒ اِس زمانے کے سارے مُسلمانوں کے مُرشِد ہیں، کوئی سمجھے، یا نہ سمجھے؛ جانے یا نہ جانے؛ مانے یا نہ مانے"۔[1]

مولانا حیدر علی رامپوری رسالہ "صِیَانَۃُ النَّاسِ" میں تحریر فرماتے ہیں:

"اُن کی ہدایت کا نُور آفتاب کی مثل کمال زور اور شور کے ساتھ بلاد اور قلوبِ عباد میں مُنوّر ہوا۔ ہر ایک طرف سے سعیدانِ ازلی رختِ سفر باندھ کر منزلوں سے آ آ کے اِشراک و بدعات وغیرہ منہیات سے کہ حسبِ عادتِ زمانہ خوگر ہو رہے تھے توبہ کر کے توحید و سُنّت کی راہِ راست اختیار کرنے لگے اور اکثر مُلکوں میں حسُلغابِ راست کردارِ جنابِ موصُوف نے سَیر فرما کر لاکھوں آدمی کو دینِ محمّدیؐ کی راہِ راست بتادی، جن کو سمجھ تھی اور توفیقِ الٰہی نے اُن کی دستگیری کی، وہ اس راہ پر چلے"۔[2]

---

[1] مکاشفاتِ رحمت از مولانا کرامت علی جونپوری، صفحہ ۱۵
[2] صیانۃ الناس عن وسوسۃ الخناس از مولانا حیدر علی رامپوری، مطبوعہ ۱۲۷۰ھ، صفحہ ۴

"اور ہزاروں خلیفہ جابجا مقرر ہوئے کہ اُن سے ایک سلسلۂ بیعت و ارشاد و تلقین جاری ہے اور وہ لوگ، جو نماز روزے سے بیزار اور بھنگ بوزیسے کاروبار رکھتے تھے، شراب اور تاڑی اُن کے بدن کا خمیر ہو رہا تھا، برملا کہتے تھے کہ نماز کمپنی کا حکم نہیں اور نہ روزہ کونسل کا آئین، زکوٰۃ و حج کا پھر کیا ذکر ہے؟ شب و روز رشوت و زنا اور مردم آزاری و سُود خوری میں مشغول رہتے تھے اور مرد و عورت مثل حیوانات بے نکاح باہم ہوتے اور سیکڑوں ولد الزنا اُن سے پیدا ہوئے اور صدہا پیر و جوان نامختون نصاریٰ اور مشرکوں کی شکل تھے۔ محض حضرت کی تعلیم سے اپنے گناہوں سے توبہ کر کے نکاح اور ختنے کروائے، نیک اور پاک متقی ہو گئے۔ حضرت کے ہاتھ پر دس دس ہزار آدمی ایک ایک بار بیعت کرتے گئے اور بہت بہت ہندو اور رافضی اور جوگی اور انت حضرت کے ارشاد و تلقین سے خالص مسلمان ہو گئے اور بعضے نصاریٰ اپنی قوم سے آکر خفیہ ایمان لائے۔ پھر ہزارہا عُلماء نے بعد حصولِ بیعت و خلافت رہنمائیِ خلق اللہ اختیار کی۔ بعضوں نے وعظ و نصیحت و ارشاد و تلقین کو عادت سی ٹھیرائی اور بعضوں نے آیاتِ قرآنی و احادیثِ صحیحہ کی کتابیں لکھیں اور رسالے اور ترجمے شائع کیے کہ جس میں ترغیبِ عبادت اور ترہیبِ گناہ ہی سے اپنے مُلک کی زبان میں پیشہ اپنا کر کے ہزاروں جُہلاء کو کہ سیدھا کلمہ بھی پڑھنا نہیں جانتے تھے، عالم بنا دیا اور بعضوں نے دونوں طریقے اختیار کیے۔"[1]

مولوی عبد الاحد صاحب لکھتے ہیں:

"حضرت سیّد احمد صاحبؒ کے ہاتھ پر چالیس ہزار سے زیادہ ہندو وغیرہ کُفّار مسلمان ہوئے اور تیس لاکھ مسلمانوں نے آپ کے ہاتھ پر بیعت کی اور جو سلسلۂ بیعت آپ کے خُلفاء اور خُلفاء کے خُلفاء کے ذریعے تمام رُوئے زمین پر جاری

---

[1] نصیحۃ الناس صفحہ ۲-۵

ہے، اس سلسلے میں تو کروڑوں آدمی آپ کی بیعت میں داخل ہیں۔[1]

نواب صدیق حسن خاں مرحوم "تقصار جیود الاحرار" میں سید صاحبؒ کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

در ہدایت خلق و انابت بسوے خدا	خلق خدا کی رہنمائی اور خدا کی طرف رجوع
آیتے از آیات الٰہی ظاہر شدہ۔ جہانے	کرنے میں وہ خدا کی ایک نشانی تھے۔ ایک
بزرگ و عالمے بے شمار بتوجہ قلبی و	بڑی خلقت اور ایک دنیا آپ کی قلبی و جسمانی
قالبی او برتبہ ولایت فائز شدہ و	توجہ سے درجۂ ولایت کو پہنچی۔ آپ کے
وعظ خلفاے وے سرزمین ہند را	خلفاء کے مواعظ نے سرزمین ہند کو
از خس و خاشاک شرک و بدع پاک	شرک و بدعت کے خس و خاشاک سے
ساختہ و بر شاہراہ اتباع کتاب	پاک کر دیا اور کتاب و سنت کی شاہراہ
سنت آوردہ کہ ہنوز برکات آں نصائح	پر ڈال دیا۔ ابھی تک اُن کے وعظ و پند
جاری و ساری است۔[2]	کے برکات جاری و ساری ہیں۔

آگے چل کر لکھتے ہیں:

حاصل کلام آنکہ دریں قرب زماں ایں	خلاصہ یہ کہ اس زمانے میں دُنیا کے کسی
چنیں صاحب کمالے در قطرے از	مُلک میں بھی ایسا صاحب کمال سُنا نہیں گیا
اقطار جہاں نشاں ندادہ اند، وچنداں	اور جو فیوض اس گروہِ حق سے خلق خدا
فیوض کہ ازیں جماعت منصورہ بخلق	کو پہنچے، اُن کا عُشرِ عشیر بھی اس
رسید، عُشرِ عشیر آں از دیگر مشائخ علماً	زمانے کے عُلماء و مشائخ سے نہیں
ایں ارض معلوم نیست۔[3]	پہنچا۔

شرک و بدعت کا استیصال دُوسرا انقلاب شرک و بدعت کا استیصال اور توحید و سُنّت کی اشاعت ہے۔ اس میں کم سے کم ہندوستان کی تاریخ میں آپ کا کوئی مثیل نہیں۔ آپ سے شرک

---

[1] سوانح احمدی [2] تقصار جیود الاحرار، صفحہ ۱۰۹، ۱۱۰ [3] تقصار، صفحہ ۱۱۰

بدعت کی اس قدر بیخ کنی ہوئی کہ اگر کوئی حکومت بزورِ شمشیر کرتی، تو اس سے زیادہ استیصال ممکن نہ تھا۔ آپ توحید و سُنّت پر لوگوں سے بَیعت لیتے اور سب سے زیادہ اسی پر زور دیتے۔ آپ کے مُتّبعین و مُنتسبین میں یہی رنگ سب سے زیادہ نمایاں تھا اور اس میں وُہ صحابہ کا نمونہ تھے۔ شِرک و بدعت کے نام سے بھاگتے تھے اور توحید و سُنّت پر جان دیتے تھے۔

بَیعت کے وقت آپ کی سب سے بڑی تاکید اور آپ کے طریق کی سب سے مقدم اور سب سے اہم دفعہ یہی تھی کہ شِرک و بدعت سے پُوری طرح احتراز کیا جائے گا اور توحید و سُنّت پر استقامت کی جائے گی۔ آپ کے نزدیک یہی طریقت کا مقصود اور یہی شریعت کی بُنیاد تھی، ایک اجازت نامہ میں ارشاد فرماتے ہیں:

پوشیدہ نماند کہ بَیعت بر دو قسم است بیعتِ طریقت و بیعتِ امامت، امّا بیعتِ طریقت پس مقصود ازاں ہمیں است کہ راہِ رضامندیِ حق بدست آید و راہِ رضامندیٔ حضرتِ حق منحصر در اتّباعِ شریعتِ غرا ست، ہر کہ سوائے شریعتِ مصطفویہ راہِ طریقِ تحصیلِ رضامندیِ حق انگارد، پس بیشک آں شخص کاذب و گمراہ است دعوٰے او باطل و نامسموع، و اساس شریعت دو امر است، اوّل ترکِ اِشراک و ثانی ترک بدعات

معلوم ہونا چاہیے کہ بَیعت دو قسم کی ہوتی ہے: ایک بیعتِ طریقت، دوسری بیعتِ امامت۔ بیعتِ طریقت کا مقصود تو صرف یہ ہے کہ حق تعالیٰ کی رضامندی کا راستہ ہاتھ آجائے اور حق تعالیٰ کی رضامندی منحصر ہے شریعت کی پیروی میں۔ جو شخص شریعتِ محمدیؐ کے سوا کسی اور راستے کو حصُولِ رضائے خداوندی کا ذریعہ سمجھتا ہے، وُہ شخص جھُوٹا اور گمراہ ہے، اور اس کا دعوٰی باطل اور نامسموع۔ اور شریعت کی بنیاد دو باتوں پر ہے: ایک ترکِ اشراک، دُوسرے ترکِ بدعات۔

اما ترکِ اشراک پس بنایش آنکہ ہیچ کس را از مَلک وجن و پیر و مُرید و اُستاد و شاگرد و نبی و ولی حلّالِ مشکلات و دافعِ بلیّات و قادر بر تحصیلِ منافع نداند ہمہ را مثلِ خود عاجز و نادان در جنب قدرت و علمِ حضرتِ حق شمارد، و ہرگز بنا بر طلبِ حوائج خود نذر و نیاز کسے از انبیاء و اولیاء و صُلحاء و ملائکہ بجا نیارد، آرے ایں قدر داند کہ ایشاں مقبولانِ بارگاہ صمدیت اند و ثمرۂ مقبولیت ایشاں ہمیں است کہ در بابِ تحصیلِ رضامندیِ پروردگار اتباعِ ایشاں باید کرد و ایشاں را پیشوایانِ ایں طریق باید شمرد نہ آنکہ ایشاں را قادر بر حوادث زمان و عالم السّر والاعلان داند کہ ایں امر محض کفر و شرک است ہرگز مومنِ پاک را ملوّث بآں شُدن جائز نیست۔

ترکِ اشراک کی تفصیل یہ ہے کہ فرشتوں جنّات، پیر و مُرید، اُستاد و شاگرد نبی و ولی میں سے کسی کو مُشکل کُشا، دافعِ بلا اور منافع کے حاصل کرانے پر قادر نہ سمجھے سب کو اللہ تعالیٰ کی قدرت اور علم کے سامنے اپنی طرح عاجز و نادان سمجھے اور اپنی ضرورتوں کی طلب میں انبیاءؑ اولیاء، صُلحاء، اور ملائکہ میں سے ہرگز ہرگز کسی کی نذر و نیاز نہ کرے، ہاں، یہ ضرور عقیدہ رکھے کہ وہ مقبولِ بارگاہِ الٰہی ہیں اُن کی مقبولیت کا تقاضا یہ ہونا چاہیے کہ اللہ تعالیٰ کی خوشنودی حاصل کرنے کے لیے اُن کی پیروی کی جائے اور ان کو اپنا پیشوا سمجھا جائے، نہ یہ کہ اُن کو اس عالم میں متصرّف اور ظاہر و باطن کا عالِم سمجھا جائے۔ یہ محض کفر و شرک ہے، مومن کا اس سے آلودہ ہونا کسی طرح درست نہیں۔

امّا ترکِ بدعت پس بنایش آنکہ در جمیع عبادات و معاملات و امورِ معاشیہ و معادیہ طریقِ خاتم الانبیاء

ترکِ بدعت کی تفصیل یہ ہے کہ تمام عبادات و معاملات اور امورِ معاش و معاد میں خاتم الانبیاء جناب محمد رسول اللہ

محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم را
بکمال قوت و علوِ ہمت باید گرفت
و آنچہ مردمان دیگر بعدِ پیغمبر صلی اللہ علیہ
وسلم از قسمِ رسوم اختراع نمودہ اند،
مثلِ رسومِ شادی و ماتم و تجمل قبور و
بناء عمارات بر آں و اسراف در
مجالسِ اعراس و تعزیہ سازی و امثال
ذلک ہرگز بپیرامونِ آں نباید گردید
وحتی الوسع سعی در محو آں باید کرد،
اوّل خود ترک باید نمود۔ بعد ازاں
ہر مسلمان را دعوت بسوئے آں باید
کرد، چنانچہ اتباعِ شریعت فرض
است، ہمچنیں امر بالمعروف و نہی
عن المنکر نیز فرض۔

صلی اللہ علیہ وسلم کے طریقے کو پوری قوت
اور بلند ہمتی سے پکڑنا چاہیے اور جو
آپ کے بعد لوگوں نے بہت سی رسمیں ایجاد
کر لی ہیں، مثلاً رسومِ شادی و ماتم،
قبروں کی زینت و آرائش، اُن پر عمارتیں
بنوانا، شادی کی تقریبات میں فضول
خرچی و اسراف، تعزیہ سازی وغیرہ
ہرگز ان کو اختیار نہ کیا جائے اور
حتی الامکان اُن کے ازالے کی کوشش
کی جائے۔ اوّلاً خود ان کو ترک کیا جائے
پھر ہر مسلمان کو ان سے اجتناب کی دعوت
دی جائے جس طرح اتباعِ شریعت فرض ہے
اسی طرح امر بالمعروف اور نہی عن المنکر
بھی فرض ہے۔

ہندوستان میں اُس وقت جاہل و مبتدع صوفیوں کے اثر، ہندوؤں کے اختلاط اور علماء و مشائخ کی چشم پوشی اور مصلحت کوشی کے نتیجے میں شرک و بدعات کی گرم بازاری تھی۔ ناموں میں، قسموں میں، نذر و نیاز میں، دعاء و التجا میں، قبور و مزارات پر، شادی و غمی اور تقریبات میں، حتیٰ کہ مساجد کے اندر شرک داخل ہو گیا تھا، توحیدِ خالص پر تو بر تو پردے پڑے ہوئے تھے، شرک کی شناعت کا احساس جاتا رہا تھا اور بڑے بڑے مشرکانہ فعل کی آسانی سے تاویل کر لی جاتی تھی۔ سید صاحبؒ کی اس صاف گوئی اور اعلانِ حق نے لوگوں کو چونکا دیا اور لوگوں کو عام طور پر اس مسئلے کی طرف توجہ ہوئی اور صدیوں کی عادات و رسوم کا پردہ چاک ہوا۔ مولانا

ولایت علی صاحبؒ رسالہ "دعوت" میں لکھتے ہیں :

"گلی گلی شرک و بدعت کی تحقیق ہونے لگی اور پانچ پانچ سو برس کی رسومات بد جہان سے اُٹھنے لگیں۔ اگر اس گروہ کا کوئی ادنیٰ مُرید بھی ہے، تو اُس کو بھی تین چیزیں لازم ہوتی ہیں : شرک سے بھاگنا، نماز کی قید، شرع کی تعظیم"[1]

شرک و بدعت سے دین کی تطہیر اور تحریفات کا اِزالہ آپ کا ایک مستقل تجدیدی کارنامہ ہے۔ مولانا سخاوت علی صاحب مہاجر مکّی جونپوریؒ رسالۂ "نصائح" میں لکھتے ہیں :

"جیسا کہ ملّتِ ابراہیم علیہ السّلام کو مکّے والوں نے بدل ڈالا تھا۔ اور حضرت خاتم النّبیین صلی اللہ علیہ وسلم نے اُن کو سیدھا کیا تھا اور تحریفات کو دُور فرمایا تھا، ویسا ہی سمجھو کہ شریعتِ محمّدیہ کو جاہلوں اور بدعتیوں نے بدل ڈالا اور حضرتِ مُجدّدِ وقت سیّد احمد امامِ دورہ دامت برکاتہٗ نے تحریفات اور بدعتوں کو دفع کیا۔ اب سلامتِ دین و ایمان اِسی خاندان اور طریقۂ محمّدیہ میں ہے۔"[2]

توحید و سُنّت کا یہ رنگ اتنا گہرا اور آپ کی بیعت و صُحبت اس بارے میں اتنی مُؤثّر اور انقلاب انگیز تھی کہ جس نے ایک مرتبہ آپ کے ہاتھ میں ہاتھ دے دیا، یا گھڑی دو گھڑی صحبت میں بیٹھ گیا، اس پر ایسا رنگ چڑھ گیا کہ کسی طرح نہیں اُترتا تھا، بچّے اور عورتیں بھی اِس رنگ میں ایسی کامل تھیں کہ کوئی اُن کو اس سے ہٹا نہیں سکتا تھا۔

آپ سے بیعت و تعلّق کا پہلا اثر عقیدے کی صحت و صفائی اور توحید و سُنّت میں پختگی کی شکل میں ظاہر ہوتا تھا۔ اور وُہ اثر اکثر مُتعدّی اور بہت طاقتور ہُوا کرتا تھا۔

حضرت حاجی عبدالرحیم ولایتیؒ چند روز آپ کے ساتھ سہارنپور میں رہے، لیکن اِن چند دنوں میں وُہ اس اثر سے اتنے متاثّر ہُوئے کہ وُہ اس کے مستقل داعی بن چکے تھے۔

---

[1] رسالۂ دعوت، صفحہ ۹۔ [2] رسالۂ نصائح، نصیحتِ اوّل

آپ نے اس زمانے میں اپنے خلیفہ میاں جی نور محمد صاحب جھنجھانوی ؒ کو جو اجازت نامہ لکھا ہے، اس کے لفظ لفظ سے یہ اثر ظاہر ہوتا ہے۔ تحریر فرماتے ہیں:

"از حاجی عبد الرحیم بخدمت میانجیو صاحب،	حاجی عبدالرحیم کی طرف سے میانجیو صاحب کی خدمت میں
مہربانِ مخلصاں میانجیو نور محمد صاحب،	مہربانِ مخلصاں میانجیو نور محمد صاحب،
بعدِ سلامِ مسنونُ الاسلام مکشوفِ	بعد سلام مسنون الاسلام کے معلوم ہو کہ
ضمیر آنکہ مدعاے ضروری آنکہ آں	ضروری مدعا یہ ہے کہ آپ کو (بیعت
صاحب را اجازت است ہر کسے	لینے کی) اجازت ہے۔ جو آپ سے
کہ ارادۂ بیعت ازاں مہربان دارد،	بیعت کا ارادہ کرے، آپ پورے
آں مخلص بہ دلِ جمعیِ تمام بیعت و تلقین	اطمینانِ قلب کے ساتھ طالبین کو
بطالبین کردہ مانند۔ دریں امر ہرگز	بیعت و تلقین فرمائیں۔ اس معاملے میں
درگزر روا ندارند، و وسوسہ و خطرہ	ہرگز تکلف سے کام نہ لیں اور کسی مخالف
مخالفِ ایں معنیٰ را اصلا بدل راہ ندہند	وسوسے اور خطرے کو دل میں جگہ نہ دیں۔
و از اہمِ مقاصد و اعظمِ مرادات	اہم مقصد و مطلوب یہ ہے کہ انسان
آنست کہ انسان خود بذاتہ مستحکم علی الشریعۃ	خود بذاتہ شریعت پر ثابت قدم ظاہراً و
بظاہر و باطن ہر وقت ماند و از بدعت	باطناً ہر وقت رہے اور ہر طرح کے شرک و
شرک بہر کیف پاک باشد و ہمچنیں برائے	بدعت سے پاک رہے۔ اسی طرح سے
دیگر مومنینِ مخلصین اہتداء ملحوظِ خاطر	دوسرے مومنینِ مخلصین کی ہدایت اس کے
ماند اللہ بس! زیادہ خیریت والسلام۔	پیشِ نظر رہے، زیادہ خیریت، والسلام
و شرک فقط ہمیں نیست کہ غیرِ	یاد رہے کہ شرک فقط یہی نہیں ہے
خدا را خدا گوید۔ بلکہ شرک را اقسام است	کہ غیر اللہ کو خدا کہے۔ شرک کی کئی قسمیں
شرک فی العبادۃ و آں آنست کہ افعال	ہیں: شرک فی العبادۃ، وہ یہ ہے کہ جو افعال

برائے تعظیمِ خدا مشروع اند برائے
غیرِ خدا بعمل آرد، چنانچہ سجدہ۔
و شرک فی العلم و آں آنست کہ عالمِ
غیب سوائے خدائے تعالیٰ دیگرے
را داند۔ چنانچہ جہالِ ایں زماں می دانند،
آنچہ می گوئیم پیرِ ما می شنوند۔ و
شرک فی القدرۃ و آں آنست کہ دیگرے
را مثلِ قدرتِ خدائے تعالیٰ ثابت کند
مثلاً، بگوید کہ ایں فرزند مرا فلاں پیرزادہ
دادہ است یا رزقم فلاں پیری دہد۔
و بدعت آنست کہ در شریعت کہ
از پیغمبر علیہ الصلوٰۃ والسلام ثابت گردیدہ
برآں زیادتی کمی نماید چنانچہ سجدہ و رکوع
در رکعت دو مشروع اند، کسے سہ کند
و فہمد کہ زیادہ عبادت است و یا
کمی کند چنانچہ یک رکوع یا سجدہ، و گوید
کہ من عبادت کردم۔ ایں ہر دو عند
الشرع مردود اند، فقط۔ از حکیم
مغیث الدین سلامِ شوق مطالعہ باد و
از کاتب الحروف امان اللہ سلامِ شوق
مطالعہ باد![1]

خدا کی تعظیم کے لیے مقرر کیے گئے ہیں اُن
کو اللہ کے سوا کسی اور کے لیے بجا لائے جیسے
سجدہ۔ شرک فی العلم، اور وہ یہ ہے کہ
خدا کے سوا کسی اور کو عالم الغیب سمجھے
جیسے کہ اس زمانے کے جہلاء سمجھتے ہیں،
مثلاً ہم جو کچھ کہتے ہیں ہمارا پیر سنتا ہے
شرک فی القدرۃ، اور وہ یہ ہے کہ دوسرے
کے لیے اللہ تعالیٰ کی سی قدرت ثابت کرے
مثلاً یوں کہے کہ میرا یہ لڑکا فلاں پیرزادے
کا عطا کیا ہوا ہے، یا میری روزی فلاں پیر دیتا ہے۔
اور بدعت یہ ہے کہ اس شریعت میں،
جو پیغمبر علیہ الصلوٰۃ والسلام سے ثابت ہے،
کچھ زیادتی کمی کرے۔ چنانچہ رکعت میں ایک
رکوع اور سجدے دو مشروع ہیں۔ کوئی تین
کرے اور سمجھے کہ زیادتی عبادت ہے، یا
کمی کرے، چنانچہ ایک رکوع اور ایک سجدہ
کرے اور کہے کہ میں نے عبادت کی ہے۔
یہ دونوں شرع کے نزدیک مردود ہیں۔
فقط حکیم مغیث الدین کی طرف سے اور
کاتب الحروف امان اللہ کی طرف سے سلامِ
شوق پہنچے۔

---

[1] رسالۂ انوارِ محمدی از مولانا شیخ محمد تھانویؒ، مطبوعہ مطبع ضیائی ۱۲۹۱ھ

مولانا رشید احمد صاحب گنگوہیؒ کے الفاظ ہیں :

"مجھ کو حضرت سیّد احمد صاحبؒ کے ساتھ اعلیٰ درجے کی محبّت و عقیدت ہے۔ مَیں یہ جانتا ہُوں کہ وُہ اپنے پیر شاہ عبدالعزیز صاحبؒ سے بڑھ کر ہیں۔ باقی خدا جانے، کون بڑھ کر ہے، لیکن میرے دل میں ہمیشہ یہی آتا ہے۔ مَیں اپنے قلب کا مُختار نہیں ہُوں۔ یہ کچھ خدا کی طرف سے ہے۔ پھر مَیں یہ کہتا ہُوں : اللہ (تعالیٰ) تو ہی جانے۔ مَیں مجبُور ہُوں۔ شاہ صاحبؒ کے پہلے بھی اِس خاندان میں اِتّباعِ سُنّت تھا، مگر حضرت نے نہایت درجے کو اتّباع کیا۔ ہندوستان میں نُور پھیلا دیا۔ عُلماء کہتے ہیں کہ وُہی کتابیں پہلے تھیں، وُہی اب بھی ہیں، لیکن اب، خدا جانے، کیا بات ہوگئی، جو اُن کی صُحبت میں ایک گھڑی بیٹھا، اُس میں وُہی رنگ آگیا۔"[1]

"سیّد صاحبؒ توحید و رسالت و اتّباعِ سنّت پر بیعت لیتے تھے اور بس۔ سیّد صاحبؒ اتّباعِ سُنّت کے لیے از حد تاکید فرمایا کرتے تھے اور بدعت کے سخت ماحی اور مخالف تھے۔ مولانا عبدالحی صاحب سے ایک دن فرمایا کہ اگر کوئی امر خلافِ سُنّت مجھ سے ہوتا دیکھو، تو مجھے اِطلاع کر دینا۔ مولانا نے فرمایا کہ حضرت، جب کوئی مُخالفِ سُنّت فعل آپ سے عبدالحی دیکھے گا، تو وُہ آپ کے ساتھ ہوگا ہی کہاں؟ یعنی، ہمراہی چھوڑ دونگا۔"[2]

ایک دُوسرے بزرگ کہتے ہیں :

"سب فضیلتیں ایک طرف اور یہ فضیلت ایک طرف ہے کہ سیّد صاحبؒ کے مُریدوں میں اُن کا رنگ ایسا جم جاتا تھا کہ پھر کسی طرح اس میں تغیّر نہیں آتا تھا۔ بلا کی تاثیر تھی۔ ایک مرتبہ جس نے اُن کی صحبت اختیار کر لی، وُہ پھر نہیں

---

[1] ارمغانِ احباب (سفرنامہ) مولانا سیّد عبدالحی صاحب مرحوم ص ۱۳۵
[2] تذکرۃ الرشید ص ۲۴۲ / ۲۵

کا دم بھرنے لگتا تھا۔ مرد تو مرد، عورتیں، جنھوں نے سوائے ایک بار کے کبھی اُن کی زیارت نہیں کی، وُہ ایسی پختہ ہو جاتی تھیں کہ پھر کسی طرح اپنے خیالات سے نہیں ٹلتی تھیں۔ میری والدہ سیّد صاحب کی مُرید تھیں، لیکن اس طور پر کہ جب سیّد صاحب نانوتہ تشریف لے گئے اور عورتوں نے مُرید ہونا چاہا تو ایک مکان میں وُہ سب جمع کر دی گئیں۔ سیّد صاحب تشریف لائے اور دروازے سے پگڑی پھینک دی گئی۔ سبھوں نے اس کو تھام لیا اور توبہ کر لی۔ اُن عورتوں پر اچھی طرح وعظ و پند کا بھی اثر نہیں پڑ سکا، لیکن باوجود اس کے میری والدہ عقائدِ صحیحہ پر ایسی پختہ تھیں کہ اُن پر کسی کا جادُو نہیں چل سکا۔ پیرزادوں میں اُن کی شادی ہُوئی اور گنگوہ کے نہایت سخت پیرزادے سب ایک طرف، بلکہ والد ایک طرف اور وُہ ایک طرف، لیکن اگر اثر پڑا ہے، تو انھیں کا دُوسروں پر پڑا ہے، اُن پر کسی کا نہیں پڑا۔"[1]

سیّد صاحبؒ نے اپنے حلقۂ اثر میں رُسُومِ شرک و بدعت کا بخوبی قلع قمع فرما دیا اور اچھی طرح سے اصلاحِ رسُوم کی۔ بعض برادریوں میں ان رسُومِ غیر شرعیہ پر سزائیں اور تعزیرات مقرر ہو گئیں، سیکڑوں خاندانوں میں ان جاہلانہ رُسُوم کا ہمیشہ کے لیے خاتمہ ہو گیا، سیکڑوں امام باڑے ٹوٹ گئے، بیسیوں مقاماتِ شیعیت و بدعتِ تفضیل سے پاک ہو گئے۔

آپ نے اسلام کے عقائدِ صحیحہ کی تبلیغ اور توحید و سُنّت کی عالمگیر اشاعت فرمائی۔ ہندوستان کا کوئی گوشہ نہیں چھُوٹا، جہاں آپ کا فیض نہ پہنچا ہو۔ دہلی اور کلکتے کے درمیان سیکڑوں مقامات پر آپ نے خود دَورہ فرمایا۔ مولانا عبدالحی صاحب اور مولانا اسمٰعیل صاحب کے مواعظ ہُوئے اور اللہ کی حُجّت تمام ہو گئی۔ سندھ اور سرحد میں خود قیام فرمایا۔ حیدر آباد دکن، بمبئی، مدراس میں مولانا

---

[1] ارمغانِ احباب ص ۱۳۹

سیّد محمد علی صاحب رامپوریؒ و مولانا ولایت علی صاحب عظیم آبادیؒ کو بھیجا، جنھوں نے وہاں قیام فرما کر اصلاحِ عقائد و اعمال و رُسوم کا عظیم الشان کام انجام دیا، ہزاروں بندگانِ خدا اور سیکڑوں امراء و رُؤساء و اہلِ علم و فضل مستفید ہُوئے اور توحید و سُنّت کا عام چرچا ہوگیا۔ پُورب میں آپ کے خُلفاء مولانا ولایت علی صاحبؒ و مولانا سخاوت علی صاحب جونپوریؒ نے تبلیغ و ہدایت کے فرائض انجام دیے، بنگال میں مولانا کرامت علی صاحب کی کوششوں سے لاکھوں آدمی ہدایت یاب ہوئے۔ نیپال کی ترائی میں مولانا جعفر علی صاحبؒ نے روشنی پھیلائی۔

افغانستان میں بھی آپ کے خلیفہ مولوی حبیب اللہ صاحب قندھاریؒ سے اصلاح ہُوئی، جن کے خلیفہ مولوی عبداللہ صاحب غزنویؒ سے پنجاب میں بڑی ہدایت اور روشنی پھیلی۔

مُلکِ تبت میں بھی آپ نے تبتیوں کا ایک وفد تبلیغ و ہدایت کے لیے بھیجا اور مسلمانوں کی اصلاح اُن کے سپُرد کی۔ اوّل اوّل اُن کی سخت مخالفت ہُوئی، پھر اُن کو بہت کامیابی اور ترقی ہُوئی۔ ہزاروں آدمی اُن کے حلقہ بگوش ہو گئے یہاں تک کہ انھوں نے اپنے چند آدمی تبلیغ کے لیے چین بھیجے۔[1]

جاوا، بلغار، مراکش وغیرہ کے بھی بہت سے اہلِ علم و فضل نے آپ سے بیعت کی اور آپ نے اُن کو اجازت دی۔ اس طرح آپ کا پیغام اور آپ کے دینی اثرات ان دُور دراز مقامات پر بھی پہنچے

بعض مُردہ سُنّتوں اور غیر مُروّج فرائض کا احیاء تیسرا انقلاب یہ ہے کہ بعض ایسے اسلامی احکام، جو اس وقت معاشرتی رواج کے زور سے قطعاً منسوخ ہو گئے تھے اور جن کے دوبارہ رائج ہونے کی بظاہر کوئی اُمّید نہیں تھی، آپ کی ہمّت اور کوشش سے دوبارہ رائج و مقبول ہُوئے، بیوہ کا نکاحِ ثانی شرفاء وقت کی شریعت میں کُفر و ارتداد سے بڑھ کر تھا جس کی سزا اکثر قتل اور ادنیٰ

---

[1] وفد کو روانہ کرنے کا حال باب سوم میں گزر چکا ہے۔ میاں دین محمد صاحب، سیّد صاحبؒ کے خادم فرماتے ہیں کہ سرحد سے سیّد صاحبؒ کے پاس ایک مرتبہ میں ہندوستان آیا۔ تو دو مرتبہ انھیں لوگوں میں کے چند آدمیوں سے ملاقات ہُوئی۔ انھوں نے اپنی کامیابی کی رُوداد سُنائی اور کہا کہ اب ہم نے اپنے چند آدمی تبلیغ کے لیے چین بھیجے ہیں۔ ۱۲

سزا مقاطعہ و اخراج تھی۔ بارہا ایسا ہوا ہے کہ تلواریں کھنچ گئی ہیں، کُشت و خُون کی نوبت آگئی ہے، بارہا گھربار چھوڑ کر جان بچانی پڑی ہے اور اس "جرم" کا مُرتکب کبھی مُنہ دکھانے کے قابل نہیں رہا ہے۔ سیّد صاحب نے اس پر مسلسل وعظ فرمائے اور پھر خود اپنی بیوہ بھاوج سے نکاح کر کے اس کا دروازہ کھول دیا، پھر آپ کے متّبعین نے آپ کی پیروی کی اور نکاحِ بیوگاں کی رسم جاری ہو گئی۔

اِسی طرح حج عُلما، کی تاویلوں سے اِس فقہی عُذر کی بنا پر کہ راستے میں امن نہیں ہے اور سمندر بھی ایک مانعِ شرعی اور "مَنِ اسْتَطَاعَ إِلَيْهِ سَبِيلًا" کے مُنافی ہے، اِس لیے فرض نہیں ہے اور اِس حالت میں حج کرنا فرمانِ خداوندی "وَلَا تُلْقُوا بِأَيْدِيكُمْ إِلَى التَّهْلُكَةِ" (اپنے ہاتھوں ہلاکت میں نہ پڑو) کی مخالفت ہے، کچھ وقت کے لیے بالکل متروک یا بہت ہی کم ہو گیا تھا اور ایک بہت بڑا فتنہ پیدا ہو گیا تھا۔ مُجدّدِ وقت کے لیے اس کا انتظام کرنا اور اِحیاءِ سُنّت نہیں، بلکہ احیاءِ فرض کرنا ضروری تھا۔ چنانچہ آپ نے اس کی دعوت دی۔ مولانا عبدالحی صاحب و مولانا اسمٰعیل صاحب نے اس کی فرضیت کا فتویٰ دیا اور مُنکرین کے دلائل رد کیے جس کی وجہ سے عُلماء میں کافی ہنگامہ پیدا ہوا۔ لوگوں نے شاہ عبدالعزیز صاحبؒ سے دریافت کیا۔ شاہ صاحبؒ نے شیخین سے اتّفاق کیا اور اُن کی بے حد مدح فرمائی۔ ۱۲۳۶ھ میں آپ نے سیکڑوں آدمیوں کے قافلے کے ساتھ بڑے اعلان اور شان و شوکت کے ساتھ حج کیا۔ آپ کا یہ سفرِ حج کی بہت بڑی تبلیغ اور اُس کی فرضیت کا اعلان تھا۔ آپ جدھر سے جاتے تھے سیکڑوں آدمی آپ کے ہمراہ ہو جاتے تھے۔ اس سے لوگوں میں حج کا عام شوق پیدا ہو گیا اور اس کا دروازہ ہمیشہ کے لیے کھُل گیا۔

اس کے علاوہ آپ نے مسلمانوں کی زندگی اور معاشرت میں انقلابِ عظیم برپا کر دیا۔ بیسیوں آداب و اسلامی عادات معاشرت میں داخل ہو گئے اور ایک نئی نسل پیدا ہو گئی، جو اپنے اخلاق، معاملات اور روزانہ زندگی میں تیرھویں یا چودھویں صدی کی نہیں، بلکہ قرنِ اوّل کی معلوم ہوتی ہے

سب سے بڑا مُہتم بالشّان اور انقلاب انگیز انقلاب جہاد کا اِحیا ہے، جو اِس دَور میں باوجُود انتہائی ضرورت اور حالات کے تقاضے کے بالکل فراموش ہو چکا تھا۔ وعظ، درس اور عمل، کسی جگہ بھی اس کا وجُود نہ تھا۔ مدارس میں بقول حضرت شاہ سمٰعیل شہید مسائلِ حیض و نفاس کے برابر بھی اس کی طرف توجّہ اور اس کی اہمیّت نہیں رہی تھی۔ مسلمان و غیر مُسلم بھُول چکے تھے کہ اسلام میں جہاد کا بھی حکم ہے۔ مُسلمانوں کے قُویٰ مُضمحل ہو رہے تھے، حوصلے پست ہو چکے تھے، فاتح اور زندہ اقوام کی خصوصیات رُخصت ہو رہی تھیں حتّٰی کہ ہتھیار لگانا تقدّس و مشیخت کے خلاف سمجھا جانے لگا تھا اور انگشت نمائی ہوتی تھی۔ مُسلمان کُفر کا غلبہ اور اپنی مظلومی برداشت کرنے کے عادی ہوتے جا رہے تھے، جو نہایت مُضر تھا۔ ہندوستان کے اِس نازک ترین اور پُرآشوب دَور کا مقابلہ کرنے سے مسلمان غافل تھے۔ سیّد صاحبؒ نے اس زمانے میں جہاد کا نام لیا، علانیہ اس کی تعلیم و تبلیغ کی، منبروں پر بیان کیا، سارے مُلک اور بیرُونِ مُلک میں اپنے داعی اور مبلّغ بھیجے، سیکڑوں آتشیں خطوط لکھے، جن کا ایک ایک فقرہ شمشیر و سناں کا کام کرتا ہے، اہلِ ایمان کو غیرت دلائی، عُلماء کو اُن کا فریضہ یاد دلایا، عوام و خواص کے دِلوں پر اُس کی دینی عظمت و تقدّس کا نقش بٹھایا، عُلماء و شُرفاء کو اس میں شریک کر کے لوگوں کی جھجک دُور کی اور خود اس میں فنا ہو کر مشائخ و بزرگانِ اُمّت کے لیے اُسوہ چھوڑا، پھر جہاد کر کے سارے ہندوستان میں سرفروشی اور جانبازی کی رُوح پھُونک دی اور ایک ایسی قوم پیدا کر دی، جس کے سر میں قرنِ اوّل کا نقشہ اور دِلوں میں صحابہؓ کا سا ولولہ تھا۔ قلُوب و ارواح کا یہ انقلابِ عظیم، ہزاروں انسانوں میں موت کا یہ عشق اور سرفروشی کی یہ رُوح پیدا کرنا آسان کام نہیں۔ یہ امامت کا وُہ منصب بلند ہے، جس کی حقیقت شاعرِ حکیم اقبالؔ نے بیان کی ہے :

تُو نے پُوچھی ہے امامت کی حقیقت مجھ سے — حق تجھے میری طرح صاحبِ اَسرار کرے
ہے وُہی تیرے زمانے کا امامِ برحق — جو تجھے حاضر و موجُود سے بیزار کرے
مَوت کے آئنے میں تجھ کو دکھا کر رُخِ دوست — زندگی اور بھی تیرے لیے دُشوار کرے

دے کے احساس زیاں تیرا لہو گرما دے   فقر کی سان چڑھا کر تجھے تلوار کرے

فتنۂ ملّت بیضا ہے امامت اُس کی
جو مسلماں کو سلاطیں کا پرستار کرے

جماعت کی سیرت و اخلاق سید صاحبؒ کا سب سے بڑا تجدیدی کارنامہ آپ کی سب سے بڑی کرامت اور آپ کی زندہ یادگار آپ کی پیدا اور تربیت کی ہوئی وہ بے نظیر جماعت تھی، جس کی مثال اتنی بڑی تعداد میں اور اس جامعیت و کاملیت کے ساتھ خیر القرون کے بعد بہت کم ملتی ہے۔ اُن کی صحیح اور محتاط تعریف یہ ہے کہ وُہ تیرھویں صدی میں صحابۂ کرامؓ کا نمونہ تھے اور یہ کسی مسلمان فرد یا جماعت کے لیے آخری تعریف ہے۔ یہ لوگ بلا مبالغہ عقائد، اعمال و اخلاق، توحید، اتباعِ سنّت، شریعت کی پابندی، عبادت و تقویٰ، سادگی و تواضع، ایثار و خدمتِ خلق، غیرتِ دینی، شوقِ جہاد و شہادت، صبر و استقامت میں مہاجرین کا نمونہ تھے۔ مولانا حالی مرحوم نے مسدّس میں صحابۂ کرامؓ کی نہایت سچی اور بولتی ہوئی تصویر کھینچی ہے۔ ان بزرگوں کا سراپا بھی اس سے زیادہ مکمل نہیں کھینچا جا سکتا اور یہ لباس صحابہؓ کے بعد اُن کے بدن پر راست آتا ہے:

سب اسلام کے حکم بردار بندے   سب اسلامیوں کے مددگار بندے
خدا اور نبیؐ کے وفادار بندے   یتیموں کے، رانڈوں کے غمخوار بندے

رہ کفر و باطل سے بیزار سارے
نشے میں مئے حق کے سرشار سارے

جہالت کی رسمیں مٹا دینے والے   کہانت کی بنیاد ڈھا دینے والے
سر احکامِ دیں پر جھکا دینے والے   خدا کے لیے گھر لٹا دینے والے

ہر آفت میں سینہ سپر کرنے والے
فقط ایک اللہ سے ڈرنے والے

اگر اختلاف اُن میں باہم دگر تھا   تو بالکل مدار اُس کا اِخلاص پر تھا
جھگڑتے تھے لیکن نہ جھگڑوں میں شر تھا   خلاف آشتی سے خوش آئندہ تر تھا

یہ تھی مَوج پہلی اُس آزادگی کی
ہرا جس سے ہونے کو تھا باغِ گیتی

نہ کھانوں میں تھی واں تکلف کی کلفت   نہ پوشش سے مقصود تھی زیب و زینت
امیر اور لشکر کی تھی ایک صورت   فقیر اور غنی سب کی تھی ایک حالت

لگایا تھا مالی نے اِک باغ ایسا
نہ تھا جس میں چھوٹا بڑا کوئی پَودا

خلیفے تھے اُمّت کے ایسے نگہباں   ہو گلّے کا جیسے نگہبان چوپاں
سمجھتے تھے ذِمّی و مُسلِم کو یکساں   نہ تھا عبد و حُر میں تفاوت نمایاں

کنیز اور بانو تھیں آپس میں ایسی
زمانے میں ماں جائی بہنیں ہوں جیسی

رہِ حق میں تھی دَوڑ اور بھاگ اُن کی   فقط حق پہ تھی جس سے تھی لاگ اُن کی
بھڑکتی نہ تھی خود بخود آگ اُن کی   شریعت کے قبضے میں تھی باگ اُن کی

جہاں کر دیا نرم، نرما گئے وُہ
جہاں کر دیا گرم، گرما گئے وُہ

کِفایت جہاں چاہیے، واں کِفایت   سخاوت جہاں چاہیے، واں سخاوت
جچی اور تُلی دشمنی اور محبت   نہ بے وجہ اُلفت، نہ بے وجہ نفرت

جُھکا حق سے جو، جُھک گئے اُس سے وُہ بھی
رُکا حق سے جو، رُک گئے اُس سے وُہ بھی

تزکیہ و اصلاحِ باطن

اسلام میں تزکیے کا مقام | قرآن مجید نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے تین اوصاف بیان کیے ہیں:

(۱) تلاوتِ آیات (۲) تزکیہ (۳) تعلیم کتاب و حکمت

هُوَ الَّذِيْ بَعَثَ فِي الْأُمِّيّٖنَ	وہ جس نے بھیجا اُن پڑھوں میں ایک پیغمبر
رَسُوْلًا مِّنْهُمْ يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِهٖ	اُنھیں میں کا، جو پڑھ کر سُناتا ہے اُن کو اُس کی
وَ يُزَكِّيْهِمْ وَ يُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ	آیتیں اور پاک کرتا ہے اُن کو اور سکھاتا ہے
وَالْحِكْمَةَ (الجمعۃ : ۲)	اُن کو کتاب و حکمت۔

اِن اوصاف میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مخصوص صفت آپ کی صفتِ تزکیہ ہے۔

تزکیہ کا مطلب یہ ہے کہ آپ صرف پڑھ کر سُنا دینے اور سمجھا دینے پر اکتفا نہیں کرتے، بلکہ اس تلاوت و تعلیم کا رنگ اُن پر چڑھا دیتے ہیں۔ اس کتاب و تعلیم کو اُن کے کانوں اور دماغوں سے گزار کر اُن کے قلوب و ارواح کو رنگین کرتے ہوئے اُن کے اعضاء و جوارح سے جاری کر دیتے ہیں۔ یہی صفت آپ کو دُنیا کے تمام واعظین و معلمین سے ممتاز کرتی ہے کہ آپ واعظ و معلم کے علاوہ "مزکّی" بھی تھے اور اسی لیے آپ دُنیا کے سب سے کامیاب مُرشد و ہادی تھے۔ صحابہ کی حیرت انگیز رُوحانی اخلاقی، ذہنی، عملی تبدیلی اور اسلام کی ابتدائی کامیابی کا راز یہی تھا اور آج اِسی کی کمی اسلامی زندگی کے ہر گوشے میں سب سے زیادہ نمایاں طور پر محسوس ہوتی ہے۔

دوست دشمن سب تسلیم کرتے ہیں کہ آپ کی صحبت میں پارس کی تاثیر تھی جس کو میسر آئی، وہ کُندن نہیں، بلکہ خود پارس بن گیا۔ بہائم انسان بن گئے اور انسان فرشتے۔ اُن کی اعتقادی، اخلاقی، رُوحانی تربیت اِتنی اعلیٰ اور مکمل ہوئی، جس سے زیادہ تصوّر میں نہیں آسکتی۔ جو آپ کے پاس بیٹھا آپ کے رنگ میں رنگ گیا، شریعت کے سانچے میں ڈھل گیا۔ اِتباعِ شریعت بلا ارادہ ہونے لگا، طاعات آسان اور طبعًا مرغوب ہوگئیں، معاصی مکروہ اور طبعًا مبغوض ہوگئے، یہاں تک کہ اُمت کا

صحابہؓ کے متعلق عقیدہ ہے کہ وُہ سب کے سب عادل ہیں اور ادنیٰ صحابی بھی بعد کے بڑے سے بڑے ولی اللہ سے افضل ہے۔

فوری تبدیلی اور باطنی تصرّف کے واقعات سے بھی سیرت کی کتابیں بھری ہیں:

فضالہؓ بن عُمیر کہتے ہیں کہ رسُول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم فتح مکّہ میں طواف فرما رہے تھے۔ میں بُرے ارادے سے آیا۔ جب قریب ہُوا، تو آپ نے فرمایا: "فضالہ؟" میں نے کہا: "یا رسُول اللہؐ، فضالہ ہی ہے۔" فرمایا: "کیا ارادہ کر رہے تھے؟" میں نے کہا: کچھ نہیں۔ اللہ کا ذکر کر رہا تھا۔" آپ ہنسے اور کہا: "فضالہ، اللہ سے مغفرت چاہو۔" پھر آپ نے دستِ مُبارک میرے سینے پر رکھ دیا۔ میرا دل ٹھیر گیا۔ خدا کی قسم ابھی آپ نے ہاتھ نہیں ہٹایا تھا کہ اللہ کی مخلوقات میں آپ سے زیادہ کوئی چیز میری نظر میں محبُوب نہیں رہی۔ میں واپس گیا، تو وُہ عورت ملی جس سے میں باتیں کیا کرتا تھا۔ اُس نے کہا: آؤ، فضالہ، باتیں کریں۔" میں نے کہا: اسلام کے بعد یہ نہیں ہوسکتا۔"[1]

حضرت عمروؓ بن العاص کہتے ہیں کہ بیعت سے پہلے میری یہ حالت تھی کہ میری نظر میں آپ سے زیادہ مبغوض ہستی دُنیا میں کوئی نہ تھی۔ اگر خدانخواستہ اس وقت مجھے موقع مل جاتا، تو اپنی عاقبت ضرور خراب کر لیتا۔ لیکن بیعت کے بعد میری نظر میں آپ سے زیادہ محبُوب و محترم ذات دُنیا کے پردے میں کوئی نہ تھی، یہاں تک کہ میں نظر بھر کر آپ کو دیکھ نہیں سکتا تھا۔ اگر مجھ سے کوئی آپ کا حُلیہ پُوچھتا، تو واللہ! میں آپ کا حُلیۂ مُبارک نہیں بتلا سکتا تھا، اِس لیے کہ میں نے آپ کو نظر بھر کر دیکھا ہی نہیں تھا۔[2]

تزکیہ میں نیابتِ نبوّت آپ کے بعد آپ کی اُمّت میں آپ کے ان اوصاف میں بہت سے لوگ علیٰحدہ علیٰحدہ اور بعض مجموعی طور پر آپ کے جانشین و نائب ہُوئے اور قیامت تک ہوتے رہیں گے

---

[1] زاد المعاد

[2] مسلم، کتاب الایمان نیز ابی محذورہ و ثمامہ بن اثال و ہند بنت ابی سفیان رضی اللہ عنہم کے واقعات ملاحظہ ہوں۔

بعض کے حصے میں تلاوتِ کتاب آئی، بعض کو تعلیمِ کتاب، بعض کو تعلیمِ حکمت سپرد ہوئی اور بعض کا منصب تزکیہ ہے اور بعض جامع اوصاف ہیں۔

صرف تلاوتِ کتاب کرنے والے حفّاظ و قرّاء ہیں، تعلیمِ کتاب کی خدمت انجام دینے والے علماءِ ظاہر ہیں اور حکمت کی تعلیم دینے والے علماءِ باطن اور محققین صوفیہ ہیں اور تزکیہ کرنے والے آپ کی اُمّت کے وہ اہلِ دل اور صاحبِ حال بزرگ ہیں، جو آپ کے انفاس و انوار کے وارث و حامل ہیں۔

انبیاء کی بعثت کا مقصد پورا کرنے کے لیے اور اُن کی برکات پہنچانے کے لیے تزکیہ بھی اتنا ہی ضروری کام ہے، جتنی کتاب و حکمت کی تعلیم۔ یوں سمجھنا چاہیے کہ یہ تعلیم ہے اور وہ تربیت، اور تکمیلِ انسانیت کے لیے دونوں کی ضرورت ہے۔

اعلیٰ تعلیم کے باوجود تزکیے کی کمی اسی طرح محسوس ہوتی ہے، جس طرح کھانے میں نمک کی کمی اور دونوں کے نتائج میں وہی فرق ہے جو اکبر مرحوم نے بیان کیا ہے۔　ع

زباں گو صاف ہو جاتی ہے، دل طاہر نہیں ہوتا

اہلِ دل نے ہمیشہ یہ ضرورت پوری کی اور اُمّت کی اصلاح اور دین کی خدمت میں علماء کا اچھی طرح ہاتھ بٹایا۔ دونوں نے مل کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی کامل نیابت کا فرض انجام دیا۔ علماءِ ظاہر سے اگر لوگوں کو اللہ اور اُس کے رسولؐ کی مرضی، اُس کی خوشی و ناخوشی کا حال اور شریعت کے احکام کا علم ہوا، تو ان بزرگوں سے حقائقِ شرعیہ اور حِکَمِ الٰہیہ کا علم اور احکام پر عمل کرنے کا شوق و ولولہ، متابعت کا جذبہ، قلب میں تازگی و رقّت، روح میں بالیدگی، طاعات میں سہولت و اخلاص، تہذیبِ نفس اور طہارتِ اخلاق حاصل ہوئی، جن کو نصوصِ قرآن و حدیث میں لفظ "احسان" سے تعبیر کیا جاتا ہے۔

بعد میں اسی تزکیہ و احسان کو لوگوں نے تصوّف، طریقت، علمِ باطن، سلوک، مختلف ناموں سے یاد کرنا شروع کیا۔ اُسی وقت سے یہ بحثیں پیدا ہوئیں کہ یہ چیز بدعت ہے یا سُنّت، فرض ہے یا واجب

مستحب ہے مباح، اور شریعت و طریقت میں موافقت ہے یا مغایرت۔ پھر اس میں مختلف مذاہب اور گروہ ہوگئے اور یہ ایک بہت بڑا اختلافی مسئلہ بن گیا۔ رفتہ رفتہ ظاہر و باطن کی تقسیم ہوئی اور بہت سے لوگوں نے اس پر مصالحت کر لی کہ شریعت و طریقت کی راہ الگ الگ ہے، رہنما الگ الگ ہیں اور رہ نورد الگ الگ، حالانکہ یہ تقسیم سراسر بدعت ہے۔ لیکن اگر خیال رکھا جائے کہ تزکیہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا وہ وصفِ خاص ہے، جس کو زبانِ وحی نے آپ کے اوصاف کے تذکرے میں کبھی نظر انداز نہیں کیا، تو یہ مباحث، جنھوں نے بہت کچھ تلخی پیدا کر لی ہے اور دو محترم گروہوں میں، جن میں سے ہر ایک کو دوسرے کی امداد کی ضرورت ہے، بہت ہی غیریت اور دوری پیدا کر دی ہے، از خود ختم ہو جاتے ہیں۔

لیکن جس طرح کتاب و حکمت کی تعلیم بعد میں ایک فن اور "صناعت" بن گئی اور اس کے لیے بہت سے علوم و مقدمات، کتابوں اور اساتذہ کا ایک پورا ضروری سلسلہ پیدا ہو گیا اور دین کے خادموں نے اپنے اپنے وقت میں اس میں پوری کوشش کی اور اہلِ حق نے اس کو بدعات میں شمار نہیں کیا، بلکہ خدمتِ دین اور قربتِ خداوندی کا ذریعہ سمجھا، اسی طرح تزکیہ بھی رفتہ رفتہ ایک فن اور صناعت ہو گیا، جس کے لیے تعلیم اور اساتذۂ فن کی ضرورت ہوئی۔ نیز ہر زمانے کی صحت و مرض اور اہلِ زمانہ کے مزاج کے موافق ان اطباءِ امت نے قلوب و ارواح کا علاج کیا اور وقتاً فوقتاً اس "طبِّ نبوی" کی تجدید کرتے رہے۔

سید صاحبؒ بھی اسی سِلسِلَۃُ الذَّہَب کی ایک کڑی ہیں، جو نہ صرف ایک شیخِ طریقت ہی تھے، بلکہ مجدّدِ طریقہ اور مجتہدِ فن بھی تھے۔

جہاد و قربانی اور اصلاح و انقلاب کے لیے تزکیے کی ضرورت

یہ بات بھی قابلِ ذکر ہے کہ سرفروشی و جانبازی، جہاد و قربانی اور اصلاح و انقلاب و تسخیر کے لیے جس روحانی و قلبی قوت، جس وجاہت و شخصیت، جس اخلاص و للّٰہیت، جس جذب و کشش اور جس حوصلے اور ہمت کی ضرورت ہے، وہ بسا اوقات روحانی ترقی، صفائی باطن، تہذیبِ نفس، ریاضت و عبادت کے بغیر نہیں پیدا ہوتی

اس لیے آپ دیکھیں گے کہ جن حضرات نے اسلام میں مُجدّدانہ یا مجاہدانہ کارنامے انجام دیے ہیں اُن میں سے اکثر افراد رُوحانی حیثیت سے بلند مقام رکھتے تھے۔ اِن آخری صدیوں ہی پر نظر ڈالیے۔ امیر عبدالقادر الجزائری مجاہدِ الجزائر، محمّد احمد السوڈانی (مہدیِ سُودانی)، سیّدی احمد الشریف السنوسی (امامِ سنوسی) کو بھی آپ اِس مَیدان کا مرد پائیں گے۔

حقیقت یہ ہے کہ مُجاہدات و ریاضات، تزکیۂ نفس اور قُربِ الٰہی سے عشقِ الٰہی اور جذبِ شوق کا جو مرتبہ حاصل ہوتا ہے، اس میں ہر رونگٹے سے یہی آواز آتی ہے ؎

ہمارے پاس ہے کیا، جو فدا کریں تجھ پر
مگر یہ زندگیٔ مُستعار رکھتے ہیں!

اِس لیے رُوحانی ترقّی اور کمالِ باطنی کا آخری اور لازمی درجہ شوقِ شہادت ہے اور مجاہدے کی تکمیل جہاد ہے۔

اب ہم سیّد صاحبؒ کے طریقے کی چند خصُوصیات لکھتے ہیں اور اہلِ ذوق کو "صراطِ مُستقیم" کے مُطالعے کا مشورہ دیتے ہیں، جو علمِ سُلوک میں ایک انقلابی اور مُجتہدانہ تصنیف ہے۔

سیّد صاحب کے طریقے کی خُصُوصیّات (۱) پہلی خصوصیّت یہ ہے کہ اس زمانے میں اللہ کے یہاں آپ کا طریقہ سب سے زیادہ مقبُول تھا اور جناب رسُول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم کی خُوشی اِن دیارِ مشرقیہ میں اس میں مُنحصر تھی۔ چُنانچہ حضرت حاجی عبدالرّحیم صاحب ولایتیؒ، جو اپنے وقت کے جلیل القدر شیخ و سالِک اور سلسلۂ چشتیہ میں بیعت مُجاز تھے اور آپ کے سیکڑوں ہزاروں مُرید تھے، فرماتے تھے:

"مجھے کسی سے سُلوک میں رُجُوع کی ضرورت نہیں، لیکن رسُول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم کی خوشی اِسی میں پاتا ہُوں کہ مَیں سیّد صاحبؒ سے بُعیت ہو جاؤں"۔ [۱]

(۲) دُوسری خصُوصیت مشائخ و عُلماء میں مقبولیت ہے۔ چنانچہ ہندوستان کا کوئی خانوادہ اور کوئی سِلسلہ نہیں ہے، جس کے اکابر نے سیّد صاحبؒ کو اپنا بڑا نہ مانا ہو اور آپ سے اِستفادہ نہ

---

[۱] روایت حضرت مولانا حُسین احمد صاحب مدنی رحمۃ اللہ علیہ

کیا ہو۔ سلسلۂ چشتیہ صابریہ کے دو نامور شیخ حاجی عبدالرحیم صاحب ولایتیؒ اور آپ کے خلیفہ میاں جی نور محمد صاحب جھنجھانویؒ آپ سے بیعت ہوئے اور آپ کے رنگ میں رنگ گئے۔ حاجی صاحب بیعت کے بعد ہمیشہ خدمت میں رہے یہاں تک کہ بالاکوٹ میں شہید ہوئے۔ اس سلسلے کے دوسرے حضرات مولانا محمد قاسم صاحب نانوتویؒ، مولانا رشید احمد صاحب گنگوہیؒ، مولانا محمود حسن صاحب دیوبندیؒ اور اُن کی جماعت کا تعلق تو آپ سے ایسا تھا، جیسا کہ عاشق کو معشوق سے ہوتا ہے۔ شاہ ابوسعید صاحبؒ، جو خاندانِ نقشبندیہ مجددیہ کے سلسلۃ الذہب کا ضروری حلقہ اور حضرت شاہ غلام علی صاحبؒ کے خلیفہ تھے، عرصے تک آپ کی خدمت میں رہے اور استفادہ کیا۔ سلسلۂ قادریہ کے مشہور شیخ سید صبغت اللہ بن سید محمد راشدؒ نے، جن کا سلسلہ سندھ میں بہت مشہور و معمور ہے، آپ سے استفادہ کیا۔ حضرت شاہ عبدالعزیز صاحبؒ کی حیات میں آپ کے خاندان کے اہلِ علم و فضل نے آپ سے بیعت کی۔ مولانا محمد اسمٰعیل صاحبؒ مولانا عبدالحی صاحبؒ، مولانا محمد یوسف صاحبؒ پھلتی کے علاوہ شاہ اسحٰق صاحبؒ و مولانا محمد یعقوب صاحبؒ نے استفادہ و باطنی تعلیم حاصل کی۔ اس کے علاوہ تمام مشائخ و علماء آپ کی عظمت و مقبولیت آپ کے طریقے کی رفعت و فضیلت، آپ کی محبت اور آپ سے عقیدت پر متفق العقیدہ و متفق اللسان ہیں۔ آپ کی محبت اہلِ سنت و صحیح الخیال جماعت کا شعار اور علامت بن گئی ہے اور آپ کے متعلق وہی کہنا بالکل صحیح ہوگا۔ جو بعض اہلِ علم نے آپ کے ہمنام امام احمدؒ کے متعلق کہا ہے:

إِذَا رَأَيْتَ الرَّجُلَ يُحِبُّ أَحْمَدَ	جب تم کسی کو دیکھو کہ اس کو احمدؒ بن حنبل
بْنَ حَنْبَلٍ فَاعْلَمْ أَنَّهُ صَاحِبُ سُنَّةٍ	سے محبت ہے، تو سمجھ لو کہ وہ سنت کا متبع ہے

ایک دوسرے عالم کا قول ہے:

مَنْ سَمِعْتُمُوْهُ يَذْكُرُ أَحْمَدَ	جس کو تم احمدؒ بن حنبل کا ذکر برائی سے کرتے سنو
بْنَ حَنْبَلٍ بِسُوْءٍ فَاتَّهِمُوْهُ عَلَى الْإِسْلَامِ	اُس کے اسلام کو مشکوک نظر سے دیکھو۔

یہی حال اپنے زمانے میں سید صاحبؒ کا تھا کہ توحید و سنت کے بارے میں آپ کی دعوت،

آپ کا طرزِ عمل اور آپ کا مسلک اتنا واضح، نمایاں اور مشہور تھا کہ آپ سے تعلق و انتساب صاف صاف توحید و سُنّت سے محبت اور شرک و بدعات سے نفرت کی دلیل تھی اور آپ سے اور آپ کی جماعت سے عداوت و انکار اکثر حالات میں اس بات کی دلیل اور علامت ہوا کرتا تھا کہ توحید و سُنّت کی طرف سے دل میں کچھ کھوٹ اور ذہن میں کچھ اُلجھنیں ہیں۔ مولانا کرامت علی صاحبؒ نے اپنے رسالہ "مکاشفاتِ رحمت" میں اپنے زمانے کی اسی صورتِ حال کو بیان کیا ہے:

"(سیّد صاحبؒ کے) طریقے میں جو جو برکتیں اور باطنی خوبیاں ہیں، سو وہ تو ہیں، ظاہر میں بھی ایک بہت ہی عجیب و غریب برکت موجود ہے۔ وہ یہ ہے کہ جو شخص اُن کے طریقے میں بیعت ہونے کا ارادہ کرتا ہے، وہ پہلے ہی بُت پرستی اور شرک اور بدعت اور ڈھول باجے، ناچ تماشے کے چھوڑنے پر مضبوط ہو لیتا ہے۔ تو حقیقت میں سیّد صاحبؒ کے طریقے میں داخل ہونا اس مُلک میں اسلام کی نشانی ہے۔"[1]

آگے چل کر اسی رسالے میں فرماتے ہیں:

"(جس شخص نے) حضرت سیّد صاحبؒ کے قافلے کو دیکھا ہوگا، وہاں کی جُمعے اور جماعات کی رعایات اور سارے احکامِ شرعی کی قید اور تاکید کو دیکھا ہوگا، اُس کے دین و مذہب کی مضبوطی کو دیکھا ہوگا، ان لوگوں کی خاکساری اور مراقبے اور توجّہ کی تاثیر کو دیکھا ہوگا، ان لوگوں کے گھاس لانے، لکڑی چیرنے، بوجھ ڈھونے کو دیکھا ہوگا، اس بات کو دیکھا یا سُنا ہوگا کہ اس قافلے میں پیر مُرید، بڑے اَن بڑھے اِن کاموں میں سب برابر تھے اور سب کی ایک رائے تھی اور اُن کے جہاد کرنے کی ہمّت اور قوّت اور ثابت قدمی کو دیکھا یا سُنا ہوگا، وہ شخص پہچاننے لگا کہ حضرت سیّد صاحبؒ کیسے بزرگ تھے اور اُس شخص پر صاف کُھل جائے گا کہ ایسے پکّے مسلمان

---

[1] مکاشفاتِ رحمت، صفحہ ۲۴

کا دشمن اور حاسد سوا ۓ کافروں اور منافقوں کے کوئی نہیں ہوتا۔" [1]

(۳) تیسری خصوصیت آپ کی عجیب و غریب تاثیر اور انوار و برکات ہیں۔ حضرت حاجی عبدالرحیم صاحب ولایتی ؒ باایں جلالت قدر و کمالِ رُوحانی فرماتے ہیں:

"جب مجھ کو حضرتؒ سے بیعت نہ تھی اور اپنے مشائخ کے طور و طریق پر تھا، چلّہ کشی کرتا تھا، جَو کی روٹی کھاتا تھا، موٹے کپڑے پہنتا تھا، میرے صدہا مُرید تھے اور جو درویشی کا طالب میرے پاس آتا، اس کو تعلیم کرتا تھا اور کسی سے کچھ غرض نہیں رکھتا تھا، جو کوئی اپنے مطلب کے لیے دو چار کوس یا دو ایک منزل لے جانے کی درخواست کرتا، لِلّٰہ فی اللہ چلا جاتا تھا اور میری نسبت کا یہ طور تھا کہ اگر آدھ کوس یا کوس بھر سے کسی پر توجّہ کی نظر ڈالتا تھا، تو اُسی جگہ اُس کو حال آجاتا اور بعض بعض باتیں مجھ میں اس سے بڑھ کر تھیں اور مَیں اپنے اس حال میں بہت خوش تھا اور میرے مریدوں میں بعض بعض صاحبِ تاثیر تھے، باوجود ان سب باتوں کے جب اللہ تعالیٰ نے اِن سیّد صاحبؒ کو سہارنپور پہنچایا اور مجھ سے ملایا اور مجھ کو توفیق دی کہ مَیں نے آپ کے دستِ مُبارک پر بیعت کی اور اُن کا طریقہ دیکھا، اُس وقت اپنے نزدیک مجھ کو یہ خیال ہُوا کہ اگر مَیں اُس حالت میں مَر جاتا، تو میری مَوت بُری ہوتی۔ پھر مَیں نے اپنے سب مُریدوں سے کہا کہ اگر تم اپنی عاقبت بخیر چاہتے ہو، تو اب دُوسری مرتبہ ان سیّد صاحبؒ کے ہاتھ پر بیعت کرو اور جو نہ کرے گا، وُہ جانے۔ مَیں نے آگاہ کر دیا ہے۔ اس کا مواخذہ قیامت کے روز مجھ سے نہیں ہوگا۔ پھر دوبارہ سب نے بیعت کی۔ سو مَیں نے عیش و آرام اور ناموس و نام کو ترک کر کے سیّد صاحبؒ کے یہاں کی محنت بشقّت و تنگی و کلفت اختیار کی۔ اینٹیں بھی بناتا ہوں، دیوار بھی اُٹھاتا ہوں۔ گھاس بھی چھیلتا

---

[1] مکاشفاتِ رحمت، صفحہ ۲۶

ہوں، لکڑی بھی چیرتا ہوں اور ہر طرح کے کام کرتا ہوں، مگر اللہ تعالیٰ نے اپنے فضل سے اس کاروبار کی بدولت جو نعمت دی اور خیر و برکت عطا کی، اس کے دسویں حصّے کے برابر اُن معاملاتِ (سابقہ) کی تمام خیر و برکت کو نہیں پاتا ہوں۔ اگر ایسا نہ ہوتا، تو اِس راحت کو چھوڑ کر یہ محنت کیوں اختیار کی؟"

(۴) چوتھی اور سب سے بڑی خصُوصیت یہ ہے کہ آپ کی نسبت اور تزکیہ جناب رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم کی نسبتِ تزکیہ سے خاص مُناسبت رکھتا تھا۔ چنانچہ، آپ کے مُریدین، خُلفاء و رُفقاء میں اِسی قسم کا رنگ اور اِسی طرح کے انوار پیدا ہو جاتے تھے، جو حضراتِ صحابۂ کرامؓ میں پیدا ہو گئے تھے۔

حضرت حاجی عبدالرّحیم صاحبؒ سے کسی نے کہا کہ آپ تو بڑے باکمال آدمی ہیں اور کمالِ باطن میں سیّد صاحب سے گھٹے ہُوئے نہیں بلکہ بڑھے ہُوئے ہیں۔ پھر آپ سیّد صاحب پر اس درجہ کیوں مِٹ گئے کہ آپ بھی مُرید ہو گئے اور اپنے مُریدوں کو بھی اُن کا مُرید کرایا؟ اس کے جواب میں حاجی صاحب نے فرمایا کہ یہ سب کچھ ہے، مگر ہم کو نماز پڑھنی اور روزہ رکھنا نہ آتا تھا۔ سیّد صاحب کی برکت سے نماز پڑھنی بھی آگئی اور روزہ رکھنا بھی آگیا۔[1]

غالباً یہی کچھ دیکھ کر حاجی صاحب نے سیّد صاحبؒ سے بیعت ہو کر فرمایا تھا کہ:

"جب اللہ نے اِن سیّد صاحب کو سہارنپور پہنچایا اور مُجھ سے مِلایا اور مُجھ کو توفیق دی کہ مَیں نے آپ کے دستِ مُبارک پر بیعت کی اور آپ کا طریقہ دیکھا، اُس وقت اپنے نزدیک مُجھ کو خیال ہُوا کہ اگر مَیں مر جاتا، تو میری موت بُری ہوتی۔"

آگے فرماتے ہیں:

"اللہ نے اپنے فضل سے اس کاروبار کی بدولت جو دولت اور خیر و برکت عطا کی، اُس کے دسویں حِصّے کے برابر ان تمام معاملات کی خیر و برکت کو نہیں پاتا ہوں۔"

---

[1] امیر الروایات

اور اسی لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خوشی یہ تھی کہ آپ سید صاحب سے بیعت ہو جائیں۔
یہ اثر آپ کے اُن مریدین میں بھی منتقل ہوا، جو سید صاحبؒ سے بیعت ہونے کے بعد آپ سے بیعت ہوئے۔ شاہ عبدالرحیم صاحب رائپوریؒ فرماتے تھے کہ:

"شاہ عبدالرحیم صاحب ولایتیؒ سے جو لوگ اُن کے سید صاحبؒ سے بیعت ہونے کے بعد بیعت ہوئے، اُن کی حالت نہایت اچھی تھی اور اُن پر اتباعِ سُنّت نہایت غالب تھا، اور جو لوگ سید صاحبؒ کی بیعت سے پہلے بیعت ہوئے تھے، اُن کی حالت اس درجے کی نہ تھی۔"

حافظ عبدالکریم صاحبؒ میاں محمد حسین صاحبؒ (سید صاحبؒ کے مرید) کے ایک مرید کہتے ہیں:

"مَیں نے میاں صاحب سے جب سے بیعت کی ہے، کبھی شرک و بدعت میں مبتلا ہونے کا اتفاق نہیں ہوا، کبھی ایسا نہیں ہوا ہے کہ دھوکے سے بدعت کا کوئی کام کر لیا ہو، پھر بعد کو معلوم ہوا کہ یہ بدعت ہے اور ندامت اُٹھانی پڑی ہو۔"[1]

(۵) پانچویں خصوصیت یہ ہے کہ آپ نے طریقے کو تمام بدعات سے پاک کیا اور ضروریاتِ زمانہ اور طبائع کے مطابق اس میں اصلاح و ترمیم فرمائی۔

مولانا رشید احمد صاحب گنگوہیؒ فرماتے ہیں:

"سب مشائخ طبیبِ اُمّت ہیں۔ اپنے اپنے زمانے کے لوگوں کے اعتبار سے اُنھوں نے طرق رکھے ہیں، سب کا مآل ایک ہے اور سب کا خلاصہ اتباعِ سُنّت ہے۔ بعد کو لوگوں نے بدعتیں داخل کر دی تھیں۔ اُن کے مجدّد حضرت سید صاحبؒ ہوئے۔"[2]

مولانا نے دوسرے موقع پر مصلحینِ طریقت میں شیخ عبدالقادر جیلانیؒ، شیخ شہاب الدین سہروردیؒ،

---

[1] ارمغانِ احباب ص ۱۴۷ [2] ارواحِ ثلٰثہ

مُجدّدِ الفِ ثانیؒ اور سیّد احمد صاحبؒ کا نام لیا ہے اور کئی مواقع پر سیّد صاحبؒ کو اِن اکابر کے ساتھ مُصلحین میں شمار کیا۔

صِراطِ مُستقیم | اِس موقع پر سیّد صاحبؒ کے مجموعۂ ملفوظات "صراطِ مستقیم" کا مختصر سا تعارف ضروری معلوم ہوتا ہے، جس سے تزکیہ و اصلاحِ باطن اور علمِ سُلوک و تصوّف میں آپ کا مرتبہ اور آپ کے اِجتہاد و تجدید کا مقام معلوم ہو سکتا ہے۔

یہ مجموعہ حضرت شاہ اسمٰعیل صاحبؒ کا مُرتّب کیا ہُوا ہے۔ اس کے دو ابتدائی باب مولانا عبدالحی صاحب بڈھانویؒ کے قلم سے ہیں۔[1] سیّد صاحبؒ جو فرماتے تھے، اس کو شاہ صاحبؒ اپنے الفاظ و عبارت اور علمی اصطلاحات کے ساتھ لکھ لیتے تھے۔ پھر سیّد صاحبؒ اس پر نظر فرماتے تھے اور اصلاح و تصحیح کر دیتے تھے۔[2] یہ ۱۲۳۳ھ کی تالیف ہے۔[3]

تصوّف و معرفت اور اِصلاح و تربیت باطنی کی کتابوں کے ذخیرے میں یہ کتاب اپنی بعض خصُوصیات کے لحاظ سے مُنفرد ہے اور ایک انقلابی کتاب کہی جا سکتی ہے۔ اس کا اندازہ پُوری کتاب کے گہرے مُطالعے اور اس فن کی دُوسری کتابوں سے مُقابلہ کرنے سے ہو سکتا ہے۔ یہاں پر نہایت اختصار کے ساتھ اشارات کے طور پر اس کے بعض تفرّدات لکھے جاتے ہیں:

(۱) حُبِّ عشقی اور حُبِّ ایمانی اور طریقِ ولایت اور طریقِ نبوّت کی تشریح اور باہمی امتیاز پر جو کچھ لکھا گیا ہے، وُہ اِس کتاب کے لطیف ترین مباحث اور سیّد صاحبؒ کے تفرّدات میں سے ہے، جو وجد انگیز معارف و حقائق سے لبریز ہے اور اس کتاب کے سوا اس تفصیل و وضاحت کے ساتھ کسی اور دُوسری جگہ نہیں مِل سکتا۔ دونوں محبّتوں اور طریقوں کے وُجُوہِ امتیاز، جُداگانہ مُؤیّدات، آثار اور ثمرات کو تفصیل کے ساتھ بیان کیا گیا ہے، جن کے پڑھنے سے اسلام کا پُورا رُوحانی نظام سامنے آجاتا ہے۔

(۲) بابِ دُوم میں بدعات سے اجتناب کی تاکید، طاعات ادا کرنے کے طریقے اور اخلاق

---

[1] صراطِ مستقیم ص۲ [2] صراطِ مستقیم ص۲ [3] صراطِ مستقیم ص۹۵، مطبع مجتبائی دہلی

کے مباحث میں بدعات کے سلسلے میں نہایت صفائی کے ساتھ اپنے زمانے کا جائزہ لیا گیا ہے اور اہلِ تصوف اور عوام کی اِن بدعات کی مخالفت کی گئی ہے۔ جو جاہلیتِ قدیمہ کی یادگار ہیں یا ہندوؤں اور شیعوں کی صحبت سے پیدا ہوئی ہیں۔ اخلاق کے مباحث میں نہایت حکیمانہ نکتے بیان کیے گئے ہیں اور تہذیب نفس اور اصلاحِ اخلاق کی مؤثر تدبیریں اور علاج تجویز کیے گئے ہیں۔

طاعات و فرائض کے تذکرے میں نماز، روزہ، حج و زکوٰۃ کے ساتھ پوری اہمیت کے ساتھ جہاد کی ترغیب و تحریض اور اُس کے فوائد کا اظہار ہے۔ جو تصوف کی کتاب میں ایک غیر متوقع مضمون ہے۔ اِن مضامین کے علاوہ سماع وغیرہ پر نہایت منصفانہ اور بے لاگ محاکمہ اور دُوسرے فوائد ہیں۔

(۳) تیسرے باب میں سلسلۂ قادریہ، چشتیہ، نقشبندیہ اور مجددیہ کے اذکار و تعلیمات ہیں، جن میں اجتہاد و تجدید سے کام لیا گیا ہے اور اُن کو زیادہ مؤثر اور مفید بنا دیا گیا ہے

(۴) چوتھا باب طریقِ سلوکِ راہِ نبوت کی تفصیل و تشریح پر ہے، جو سید صاحبؒ کا الہامی مضمون ہے اور جس کے آپ امام ہیں۔ یہ ایک مستقل "طریقت" اور "سلوک" ہے، جس کو آپ نے پورے طور پر مرتب اور مکمل کر دیا ہے۔

کتاب پڑھنے والے پر چند اثرات لازمی طور پر پڑتے ہیں، ایک اُمیت کے باوجود سید صاحبؒ کی حکمت و بصیرت اور شرحِ صدر۔ پڑھنے والا اپنے کو نکات و حقائق میں گھرا ہوا پاتا ہے۔ وُہ ایک نکتے کا لطف نہیں لینے پاتا کہ دُوسرا نکتہ اس کے سامنے آجاتا ہے اور وُہ اپنے اُوپر ایک وجد کی سی کیفیت پاتا ہے۔

دُوسرا، سید صاحبؒ کی اعلیٰ درجے کی سلامتِ فہم اور سلامتِ طبع کا اثر پڑتا ہے۔ تصوف اور حقائق و معارف کی دُوسری کتابوں کے برخلاف اس کو اس میں کوئی پیچ و خم اور تکلفات نہیں ملتے۔

تیسرا، آپ کے مسلک کے اعتدال کا اثر پڑتا ہے۔ مختلف فیہ مباحث و مسائل میں افراط و تفریط سے پاک اور معتدل رائے آپ کی خصوصیت ہے۔

الحمد للہ والمنۃ

تمام شد

سیرتِ سیّد احمد شہیدؒ

از

مولانا سیّد ابو الحسن علی ندوی

INDEX

اشاریہ

("سیرت سید احمد شہیدؒ۔ دوم")

مرتب

محمد غیاث الدین ندوی

شخصیات

(ع)

اقوام وقبائل

کتابیات

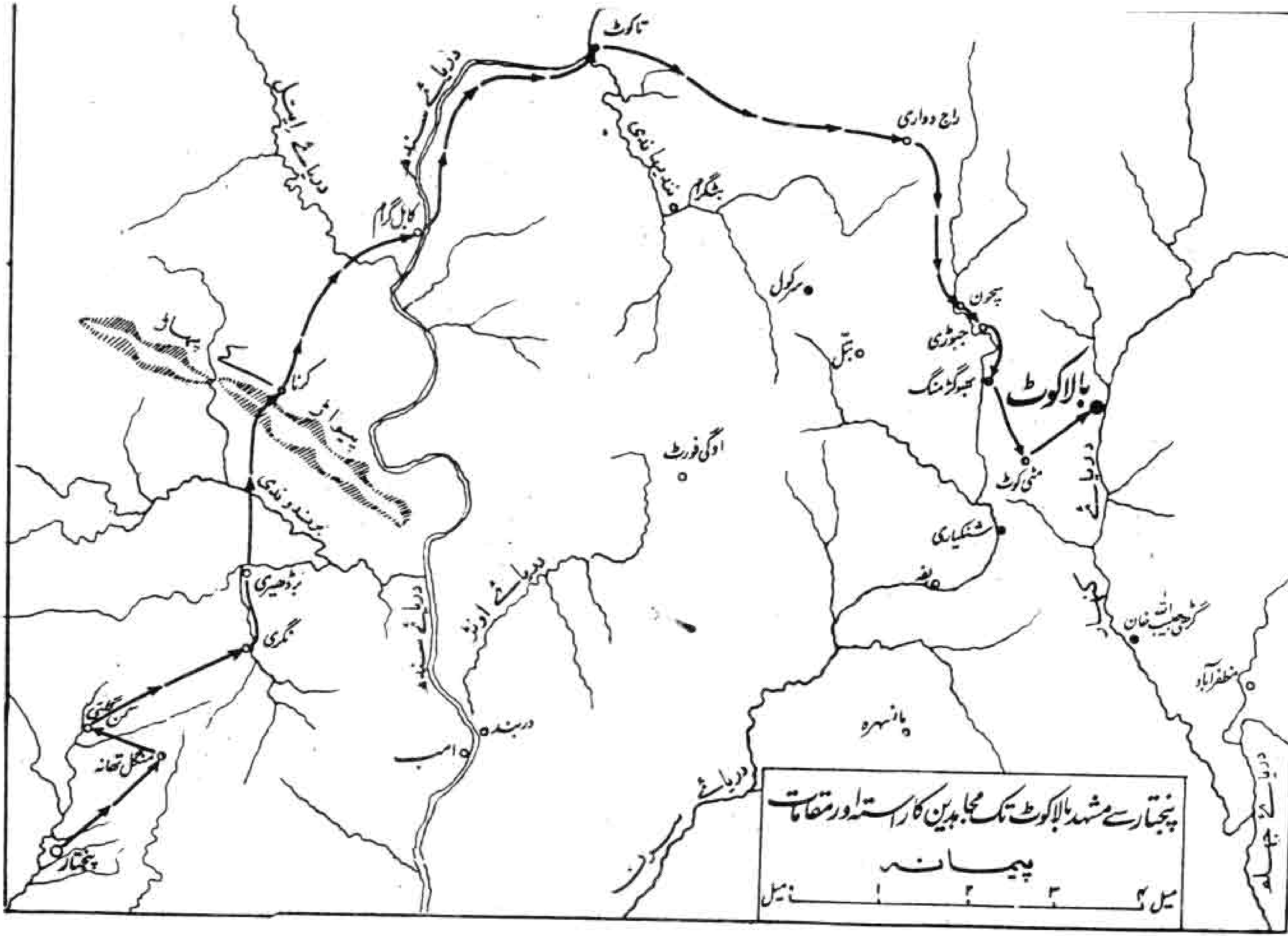
مقامات

نہر و دریا، پہاڑ و قلعے اور گھاٹ

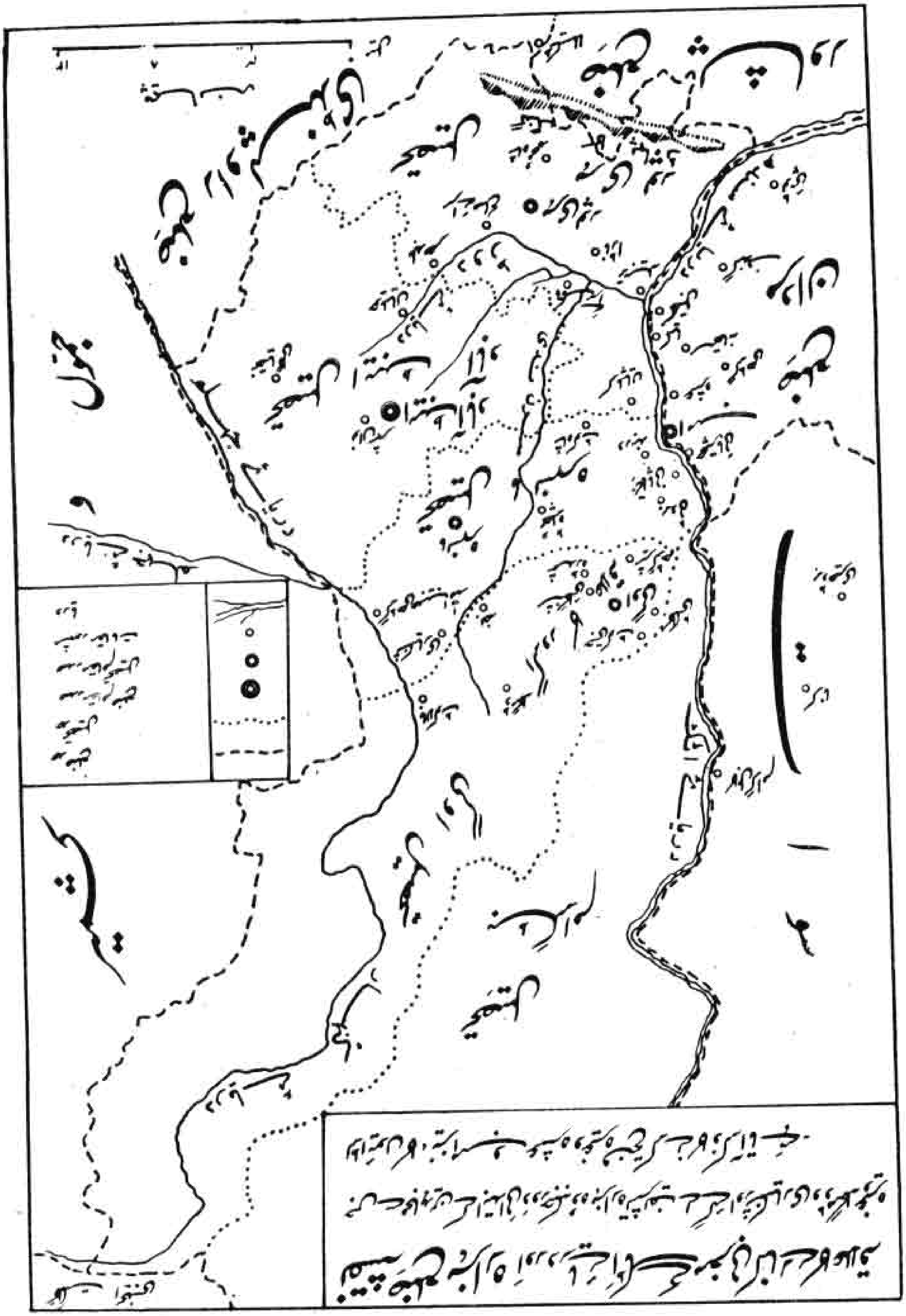
متفرقات

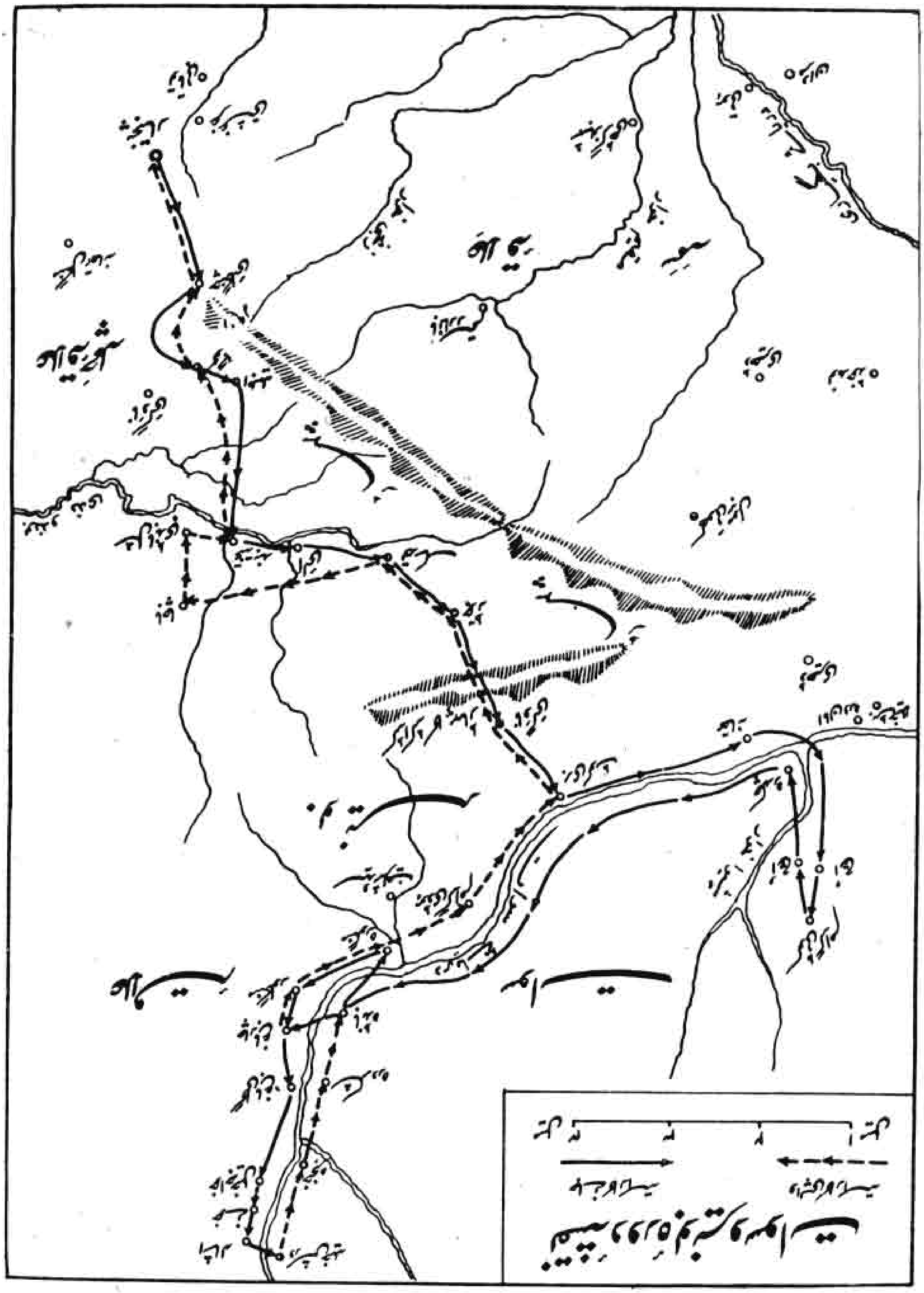
متفرقات:

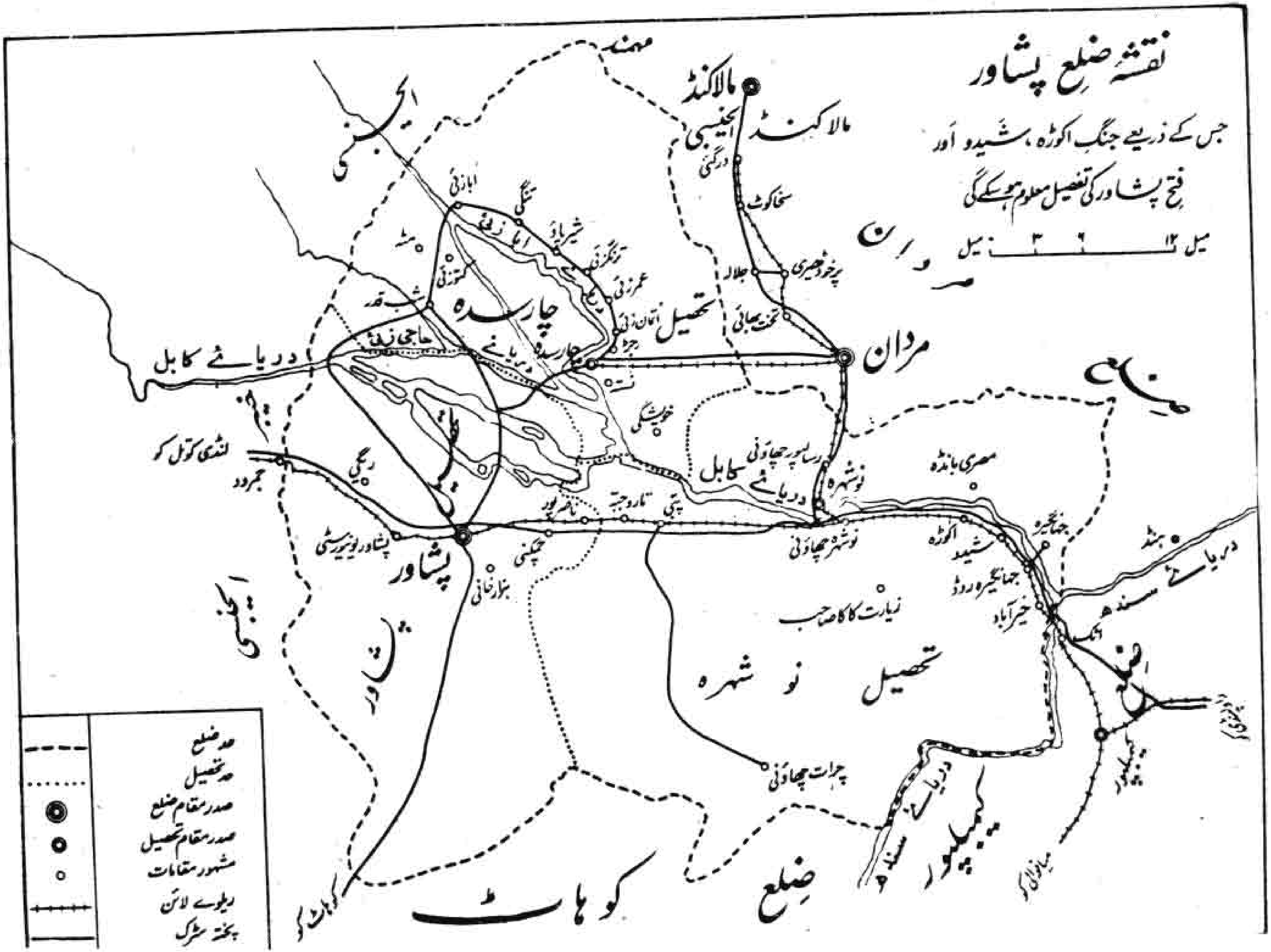




پنجتار سے مشہد بالاکوٹ تک مجاہدین کا راستہ اور مقامات
پیمانہ
میل ۴ ۳ ۲ ۱ ۰ میل
پنجتار
منگل تھانہ
سن گجری
نگری
بڑوھیری
جہنبند و ندی
کبل گرام
دریائے سندھ
دریائے اباسین
پیپاؤ
کرنا
تاکوٹ
راج دواری
نندیہار ندی
بٹگرام
اوگی فورٹ
دریائے اونر
دربند
اب
پچھوں
جیوڑی
بھوگڑمنگ
بالاکوٹ
مٹی کوٹ
شنکیاری
بفہ
مانسہرہ
گڑھی حبیب اللہ خان
مظفرآباد
دریائے جہلم







نقشۂ ضلع پشاور
جس کے ذریعے جنگِ اکوڑہ، شیدو اور
فتح پشاور کی تفصیل معلوم ہو سکے گی
میل ۱۲ ۹ ۶ ۳ میل
مالاکنڈ
مالاکنڈ ایجنسی
درگئی
سخاکوٹ
پرخو چیری
جلالہ
تخت بھائی
مردان
ضلع
مردان
مہمند
ایجنسی
اباذئی
تنگی
شیرپاؤ
ترنگزئی
عمرزئی
اتمان زئی
تحصیل
چارسدہ
حاجی زئی
دریائے
دریائے کابل
خویشگی
رسالپور چھاؤنی
نوشہرہ
دریائے کابل
مصری بانڈہ
جہانگیرہ
اکوڑہ
شیدو
جہانگیرہ روڈ
خیرآباد
اٹک
دریائے سندھ
ہنڈ
لنڈی کوتل کو
جمرود
ریگی
پشاور یونیورسٹی
پشاور
چمکنی
بازار خانی
نوشہرہ چھاؤنی
پبی
تاروجبہ
پشاور
زیارت کاکا صاحب
تحصیل نوشہرہ
چراٹ چھاؤنی
ضلع کیمبلپور
کیمبلپور
دریائے سندھ
ضلع کوہاٹ
کوہاٹ کو
حدِ ضلع
حدِ تحصیل
صدر مقام ضلع
صدر مقام تحصیل
مشہور مقامات
ریلوے لائن
پختہ سڑک

